اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خطبات وتحریرات)

جلد نمبر ۱

اسلامی عقائد

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

اسلامی عقائد

جلد ۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۱

اسلامی عقائد

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی
فون ۳۷۲۴۴۱۲، ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۳۲۸۵ فون ۳۷۳۵۳۲۵۵، ۳۷۲۳۲۹۹۱ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات و تحریرات

جلد اول

اسلامی عقائد

اشاعت اول

سن اشاعت ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارۂ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴۔دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰۔ انارکلی لاہور۔ پاکستان ــــ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱ ، ۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار کراچی۔ پاکستان ــــ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

عرضِ ناشر	۱۷
عرضِ مرتب	۱۹
توحیدِ باری تعالیٰ	۲۱
کلمہ طیبہ کے تقاضے	۲۹
ان کا حسن ظن سچا ہو جائے	۲۹
یہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت کا نتیجہ ہے	۳۰
کلمہ طیبہ نے ہم سب کو ملا دیا ہے	۳۰
اس رشتے کو کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی	۳۱
اس کلمہ کے ذریعہ زندگی میں انقلاب آجاتا ہے	۳۲
ایک چرواہے کا ایمان افروز واقعہ	۳۳
کلمہ طیبہ پڑھ لینا، معاہدہ کرنا ہے	۳۵
کلمہ طیبہ کے تقاضے	۳۶
تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ	۳۷
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دین کہاں سے حاصل کیا؟	۳۸
حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا زہد	۳۸
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا	۴۰
سچے اور متقی لوگ کہاں سے لائیں؟	۴۱
ہر چیز میں ملاوٹ	۴۱
جیسی روح ویسے فرشتے!!!	۴۲
مسجد کے مؤذن کی صحبت اختیار کرلو	۴۲
عقل کا دائرۂ کار	۴۵
''بنیاد پرست'' ایک گالی بن چکی ہے	۴۵
اسلامائزیشن کیوں؟	۴۶
ہمارے پاس عقل موجود ہے	۴۶
کیا عقل آخری معیار ہے؟	۴۶
ذرائع علم	۴۷
حواسِ خمسہ کا دائرۂ کار	۴۷
دوسرا ذریعۂ علم ''عقل''	۴۷
عقل کا دائرہ کار	۴۸
تیسرا ذریعۂ علم ''وحی الٰہی''	۴۸
اسلام اور سیکولر نظام میں فرق	۴۹
وحی الٰہی کی ضرورت	۴۹
عقل دھوکہ دینے والی ہے	۴۹
بہن سے نکاح خلاف عقل نہیں	۴۹
بہن اور جنسی تسکین	۵۰
عقلی جواب ناممکن ہے	۵۱
عقلی اعتبار سے بداخلاقی نہیں	۵۱
نسب کا تحفظ کوئی عقلی اصول نہیں	۵۱
یہ بھی ہیومن ارج (Human Urge) کا حصہ ہے	۵۱

وحی الٰہی سے آزادی کا نتیجہ	۵۲
عقل کا فریب	۵۲
عقل کا ایک اور فریب	۵۲
عقل کی مثال	۵۳
اسلام اور سیکولرازم میں فرق	۵۴
آزادی فکر کے علم بردار ادارے کا حال	۵۴
آج کل کا سروے	۵۵
کیا آزادی فکر کا نظریہ بالکل مطلق (Absolute) ہے؟	۵۶
آپ کے پاس کوئی ناپ تلا معیار (Yardstick) نہیں	۵۶
انسان کے پاس وحی کے علاوہ کوئی معیار نہیں	۵۷
صرف مذہب معیار بن سکتا ہے	۵۸
ہمارے پاس اس کو رد کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے	۵۸
اس حکم کی ریزن (Reason) میری سمجھ میں نہیں آتی	۵۹
قرآن و حدیث میں سائنس اور ٹیکنالوجی	۵۹
سائنس اور ٹیکنالوجی تجربہ کا میدان ہے	۶۰
اسلام کے احکام میں لچک (Elasticity) موجود ہے	۶۰
ان احکام میں قیامت تک تبدیلی نہیں آئے گی	۶۱
اجتہاد کہاں سے شروع ہوتا ہے	۶۱
خنزیر حلال ہونا چاہئے	۶۱
سود اور تجارت میں کیا فرق ہے؟	۶۱
ایک انوکھا اور دلچسپ واقعہ	۶۲
آج کے مفکر کا اجتہاد	۶۲
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ	۶۳

ایمانِ کامل کی چار علامتیں ۶۴

ایمانِ کامل کی پہلی علامت	۶۴
خرید و فروخت کرتے ہوئے کیا نیت ہونی چاہئے؟	۶۵
صرف زاویہ نگاہ بدل لیجئے	۶۵
ہر نیک کام صدقہ ہے	۶۶
ایمانِ کامل کی دوسری علامت	۶۶
رسم کے طور پر ہدیہ دینا	۶۶
ایمانِ کامل کی تیسری علامت	۶۷
دنیا کی خاطر اللہ والوں سے تعلق	۶۷
دنیاوی محبتیں بھی اللہ کے لئے ہونی چاہئیں	۶۸
بیوی سے محبت اللہ کے لئے ہو	۶۸
ہمارے کام نفسانی خواہش کے تابع ہوتے ہیں	۶۹
''عارف'' کون ہوتا ہے؟	۶۹
مبتدی اور منتہی کے درمیان فرق	۶۹
مبتدی اور منتہی کی مثال	۷۰
حب فی اللہ کے لئے مشق کی ضرورت ہے	۷۱
بچوں کے ساتھ بھی اللہ کے لئے محبت ہو	۷۱
حبّ فی اللہ کی علامت	۷۲
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۷۲

ایمان کامل کی چوتھی علامت ۷۳
ذات سے نفرت نہ کریں ۷۳
حضور اقدس ﷺ کا بے مثال عفو و درگزر ۷۴
خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ۷۴
غصہ بھی اللہ کے لئے ہو ۷۵
حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ۷۵
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ ۷۶
مصنوعی غصہ کر کے ڈانٹ لیں ۷۷
چھوٹوں پر زیادتی کا نتیجہ ۷۸
غصہ کا غلط استعمال ۷۸
علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جملہ ۷۹
تم خدائی فوج دار نہیں ہو ۷۹

ایمان کے تقاضے ۸۰

حقیقی مؤمن کون ہیں؟ ۸۰
کامیابی کا مدار عمل پر ہے ۸۰
فلاح کا مطلب ۸۱
کامیاب مؤمن کی صفات ۸۱
پہلی صفت ''خشوع'' ۸۲
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت ۸۲
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سرکاری فرمان ۸۳
نماز کو ضائع کرنے سے دوسرے امور کا ضیاع ۸۳
ایک گمراہانہ فکر ۸۴
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور گمراہی کا علاج ۸۴
اپنے آپ کو کافروں پر قیاس مت کرنا ۸۵
نماز میں خشوع مطلوب ہے ۸۵
''خضوع'' کے معنی ۸۵
نماز میں اعضاء کو حرکت دینا ۸۶
شاہی دربار میں حاضری کی کیفیت ۸۶
حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اور خضوع ۸۶
گردن جھکانا خضوع نہیں ۸۷
خشوع کے معنی ۸۷
خضوع کا خلاصہ ۸۷

اسلام کا مطلب کیا؟ ۸۸

کیا ایمان اور اسلام علیحدہ علیحدہ ہیں؟ ۸۸
''اسلام'' لانے کا مطلب ۸۹
حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بیٹے کی قربانی ۸۹
بیٹے کا بھی امتحان ہو گیا ۹۰
چلتی چھری نہ رُک جائے ۹۰
اللہ کے حکم کے تابع بن جاؤ ۹۱
ورنہ عقل کے غلام بن جاؤ گے ۹۱
حصول علم کے ذرائع ۹۱
ان ذرائع کا دائرۂ کار متعین ہے ۹۲
ایک اور ذریعۂ علم ''عقل'' ۹۲
عقل کا دائرۂ کار ۹۳
ایک اور ذریعۂ علم ''وحی الٰہی'' ۹۳
عقل اور ''وحی الٰہی'' ۔ ایک موازنہ ۹۳
وحی الٰہی کو عقل سے مت تولو ۹۴
اچھائی اور بُرائی کا فیصلہ ''وحی'' کرے گی ۹۴
انسانی عقل بعض اوقات غلط رہنمائی کرتی ہے ۹۵

اشتراکیت کی بنیاد عقل پر تھی	۹۵
وحی الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کرلو	۹۶
پورے داخل ہونے کا مطلب	۹۶
اسلام کے پانچ حصے	۹۶
''اللہ تو دیکھ رہا ہے''	۹۷
ایک چرواہے کا عجیب واقعہ	۹۸
حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ	۱۰۰
حق و باطل کا پہلا معرکہ ''غزوۂ بدر''	۱۰۰
گردن پر تلوار رکھ کر لیا جانے والا وعدہ	۱۰۰
پیغمبرِ عالم اور ایفائے عہد	۱۰۱
جہاد کا مقصد حق کی سربلندی	۱۰۱
یہ ہے وعدہ کا ایفاء	۱۰۲
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ایفائے عہد	۱۰۲
سارا مفتوحہ علاقہ واپس کردیا	۱۰۴
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور معاہدہ	۱۰۴
دوسروں کو تکلیف پہنچانا اسلام کے خلاف ہے	۱۰۵
حقیقی مفلس کون؟	۱۰۶
آج ہم پورے اسلام میں داخل نہیں	۱۰۶
پورے داخل ہونے کا عزم کریں	۱۰۷
دین کی معلومات حاصل کریں	۱۰۷
دین کیا ہے؟	۱۰۸
دین کا مطلب سمجھنے کی ضرورت ہے	۱۰۸
دین کے لئے ہی انسان کو پیدا کیا گیا ہے	۱۰۹
دنیا میں دو قسم کے معاملات	۱۰۹
اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت کا خلاصہ	۱۰۹
حقیقی دین کونسا ہے؟	۱۱۰
اسلام کا معنی کیا ہے؟	۱۱۰
اسلام کی حقیقت	۱۱۰
احکامِ اسلام کے بارے میں ایک گمراہانہ روش	۱۱۲
دین کے احکام میں تاویلات کی تلاش کا رویہ	۱۱۲
حکمتِ دین کا سوال کرنا مناسب نہیں	۱۱۳
زاویۂ نگاہ تبدیل کرنے سے دین حاصل ہوسکتا ہے	۱۱۳
دین اور دنیا ایک دوسرے کے حریف نہیں	۱۱۴
امام شیبانی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک سوال	۱۱۴
انسان کا ہر لمحہ دین بن سکتا ہے	۱۱۵
دین کی حقیقت: تسلیم و رضا	۱۱۶
بیماری اور سفر میں نیک اعمال لکھے جاتے ہیں	۱۱۶
نماز کسی حالت میں معاف نہیں	۱۱۷
بیماری میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں	۱۱۷
اپنی پسند کو چھوڑ دو	۱۱۷
آسانی اختیار کرنا سنت ہے	۱۱۸
دین ''اتباع'' کا نام ہے	۱۱۸
اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری مت دکھاؤ	۱۱۹
انسان کا اعلیٰ ترین مقام	۱۱۹

توڑتا ہے حسن کا پندار کیا؟	۱۲۰
رمضان کا دن لوٹ آئے گا	۱۲۱
اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دل میں رہتے ہیں	۱۲۲
دین تسلیم و رضا کے سوا کچھ نہیں	۱۲۳
تیمارداری میں معمولات کا چھوٹنا	۱۲۳
وقت کا تقاضا دیکھو	۱۲۴
اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں	۱۲۴
مفتی بننے کا شوق	۱۲۵
تبلیغ کرنے کا شوق	۱۲۵
مسجد میں جانے کا شوق	۱۲۵
سہاگن وہ جسے پیا چاہے	۱۲۶
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے	۱۲۷
اذان کے وقت ذکر چھوڑ دو	۱۲۷
جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے	۱۲۷
نماز اپنی ذات میں مقصود نہیں	۱۲۸
افطار میں جلدی کیوں؟	۱۲۹
سحری میں تاخیر کیوں؟	۱۲۹
''بندہ'' اپنی مرضی کا نہیں ہوتا	۱۲۹
بتاؤ! یہ کام کیوں کر رہے ہو؟	۱۳۰
حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ	۱۳۱
تمام بدعات کی جڑ۔ نفس پرستی	۱۳۲
اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو	۱۳۳
شکر کی اہمیت اور اس کا طریقہ	۱۳۳
شیطان کا بنیادی داؤ۔ ناشکری پیدا کرنا	۱۳۴
شیطانی داؤ کا توڑ۔ اداءِ شکر	۱۳۴
پانی خوب ٹھنڈا پیا کرو	۱۳۴
سونے سے پہلے نعمتوں کا استحضار اور ان پر شکر	۱۳۵
شکر ادا کرنے کا آسان طریقہ	۱۳۶
اللہ تعالیٰ کا حکم بے چون و چرا تسلیم کر لو	۱۳۸
تمہاری رائے کا حضور ﷺ کی رائے سے مختلف ہونا	۱۳۸
خبر کی تحقیق کر لینی چاہیے	۱۳۹
تحقیق کے نتیجے میں بات واضح ہوگئی	۱۳۹
رسول براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر چلتے ہیں	۱۴۰
عقل ایک حد تک صحیح فیصلہ کرتی ہے	۱۴۰
رسول کا حکم مانو، چاہے عقل میں آئے یا نہ آئے	۱۴۱
''حکمت'' اور ''فائدے'' کا سوال	۱۴۱
ایسا ''نوکر'' ملازمت سے نکال دینے کے قابل ہے	۱۴۲
ہم اللہ کے ''بندے'' ہیں	۱۴۲
''کیوں'' کا سوال بے عقلی کی دلیل ہے	۱۴۳
آج کل کے لیڈروں کا حال	۱۴۳
صلح حدیبیہ میں دب کر صلح کیوں کی گئی؟	۱۴۴
خلاصہ	۱۴۴
تقدیر پر راضی رہنا چاہئے	۱۴۵
دنیا کی حرص مت کرو	۱۴۵
دین کی حرص پسندیدہ ہے	۱۴۶

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور نیک کاموں کی حرص	۱۴۶
حضور ﷺ کا دوڑ لگانا	۱۴۷
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اس سنت پر عمل	۱۴۸
ہمت بھی اللہ سے مانگنی چاہئے	۱۴۸
ایک لوہار کا ایمان افروز واقعہ	۱۴۹
حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فکر اور سوچ کا انداز	۱۵۰
نیکی کی حرص عظیم نعمت ہے	۱۵۱
لفظ ''اگر'' شیطانی عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے	۱۵۱
دنیا راحت اور تکلیف سے مرکب ہے	۱۵۲
اللہ کے محبوب پر تکالیف زیادہ آتی ہیں	۱۵۲
حقیر کیڑا مصلحت کیا جانے!	۱۵۳
ایک بزرگ کا بھوک کی وجہ سے رونا	۱۵۳
مسلمان اور کافر کا امتیاز	۱۵۴
اللہ کے فیصلے پر راضی رہو	۱۵۴
رضاء بالقضاء میں تسلی کا سامان ہے	۱۵۵
تقدیر ''تدبیر'' سے نہیں روکتی	۱۵۵
تدبیر کے بعد فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو	۱۵۵
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ	۱۵۶
''تقدیر'' کا صحیح مفہوم	۱۵۷
غم اور صدمہ ''رضا بالقضاء'' کے منافی نہیں	۱۵۷
ایک بہترین مثال	۱۵۸
کام کا بگڑنا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے	۱۵۸
تقدیر کے عقیدے پر ایمان لا چکے ہو	۱۵۹
یہ پریشانی کیوں ہے؟	۱۶۰
آبِ زر سے لکھنے کے قابل جملہ	۱۶۰
لوحِ دل پر یہ ''جملہ'' نقش کرلیں	۱۶۱
حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے راحت وسکون کا راز	۱۶۱
تکالیف بھی حقیقت میں رحمت ہیں	۱۶۱
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان فرمودہ مثال	۱۶۲
تکلیف مت مانگو، لیکن آئے تو صبر کرو	۱۶۲
اللہ والوں کا حال	۱۶۳
کوئی شخص تکلیف سے خالی نہیں	۱۶۳
چھوٹی تکلیف بڑی تکلیف کو ٹال دیتی ہے	۱۶۴
اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو	۱۶۵
ایک نادان بچے سے سبق لیں	۱۶۵
اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر رضامندی خیر کی دلیل ہے	۱۶۶
برکت کا مطلب اور مفہوم	۱۶۶
ایک نواب کا واقعہ	۱۶۷
قسمت پر راضی رہو	۱۶۷
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے	۱۶۸
فتنہ کے دور کی نشانیاں	۱۶۹
حضور ﷺ تمام قوموں کے لئے قیامت تک کے لئے نبی ہیں	۱۶۹
آئندہ پیش آنے والے حالات کی اطلاع	۱۷۰

عنوان	صفحہ
اُمت کی نجات کی فکر	۱۷۱
آئندہ کیا کیا فتنے آنے والے ہیں؟	۱۷۲
فتنہ کیا ہے؟	۱۷۳
''فتنہ'' کے معنی اور مفہوم	۱۷۳
حدیث شریف میں ''فتنہ'' کا لفظ	۱۷۳
دو جماعتوں کی لڑائی ''فتنہ'' ہے	۱۷۴
قتل و غارت گری ''فتنہ'' ہے	۱۷۵
مکہ مکرمہ کے بارے میں ایک حدیث	۱۷۵
مکہ مکرمہ کا پیٹ چاک ہونا	۱۷۶
عمارتوں کا پہاڑوں سے بلند ہونا	۱۷۶
موجودہ دور احادیث کی روشنی میں	۱۷۷
فتنہ کی ۷۲ نشانیاں	۱۷۷
مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا	۱۸۲
شراب کو شربت کے نام سے پیا جائے گا	۱۸۴
سود کو تجارت کا نام دیا جائے گا	۱۸۴
رشوت کو ہدیہ کا نام دیا جائے گا	۱۸۵
کشتوں پر سوار ہو کر مسجد میں آنا	۱۸۵
عورتیں لباس پہننے کے باوجود ننگی	۱۸۵
عورتوں کے بال اُونٹ کے کوہان کی طرح	۱۸۶
یہ عورتیں ملعون ہیں	۱۸۶
لباس کا مقصدِ اصلی	۱۸۶
دوسری قومیں مسلمانوں کو کھائیں گی	۱۸۷
مسلمان تنکوں کی طرح ہوں گے	۱۸۷
مسلمان بزدل ہو جائیں گے	۱۸۸
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہادری	۱۸۸
ایک صحابی کا شوقِ شہادت	۱۸۹
''فتنہ'' کے دور کے لئے پہلا حکم	۱۸۹
''فتنہ'' کے دور کے لئے دوسرا حکم	۱۹۰
''فتنہ'' کے دور کے لئے تیسرا حکم	۱۹۰
فتنہ کے دور کا بہترین مال	۱۹۱
فتنہ کے دور کے لئے ایک اہم حکم	۱۹۱
فتنہ کے دور کی چار علامتیں	۱۹۲
اختلافات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل	۱۹۳
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا طرزِ عمل	۱۹۴
حالتِ امن اور حالتِ فتنہ میں ہمارے لئے طرزِ عمل	۱۹۵
اختلافات کے باوجود آپس کے تعلقات	۱۹۵
حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل	۱۹۶
حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا قیصرِ روم کو جواب	۱۹۶
تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمارے لئے معزز اور مکرم ہیں	۱۹۶
حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی للّٰہیت اور خلوص	۱۹۷
کنارہ کش ہو جاؤ	۱۹۷
اپنی اصلاح کی فکر کرو	۱۹۸
اپنے عیوب کو دیکھو	۱۹۸
گناہوں سے بچاؤ	۱۹۹
بدعات کیوں حرام ہیں؟	۲۰۰
بدعت دین میں اضافہ کے مترادف ہے	۲۰۰
جدید چیزوں کا استعمال جائز ہے	۲۰۱
ہر بدعت گمراہی ہے	۲۰۱

بدعت گمراہی کیوں ہے؟	۲۰۲
شب برأت میں سو رکعت نفل پڑھنا	۲۰۲
ہم کوئی گناہ کا کام نہیں کر رہے	۲۰۳
مغرب کی تین کے بجائے چار رکعت پڑھیں تو کیا نقصان؟	۲۰۳
افطار کرنے میں جلدی کیوں؟	۲۰۳
عید کے دن روزہ رکھنے پر گناہ کیوں؟	۲۰۴
سفر میں چار رکعت پڑھنا گناہ کیوں؟	۲۰۵
شب برأت میں حلوہ گناہ کیوں؟	۲۰۶
ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ	۲۰۷
تیجہ کرنا گناہ کیوں؟	۲۰۷
عید کے دن گلے ملنا بدعت کیوں؟	۲۰۸
فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کا حکم	۲۰۸
قبروں پر پھول کی چادر چڑھانا	۲۰۹
خلاصہ	۲۰۹

تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک ۲۱۱

اُمتِ محمدیہ کی کثرت	۲۱۱
کثرتِ اُمت دیکھ کر آپ ﷺ کی خوشی	۲۱۲
ستر ہزار افراد کا بلاحساب جنت میں دخول	۲۱۲
چار اوصاف والے	۲۱۲
ستر ہزار کا عدد کیوں؟	۲۱۳
ستر ہزار میں شامل ہونے کی دعا	۲۱۳
ہر مسلمان کو یہ دعا مانگنی چاہئے	۲۱۴
تکلیف یقینی اور فائدہ غیر یقینی والا علاج	۲۱۴
علاج میں بھی اعتدال مطلوب ہے	۲۱۵
بدشگونی اور بدفالی کوئی چیز نہیں	۲۱۵
تعویذ گنڈوں میں افراط وتفریط	۲۱۵
جھاڑ پھونک میں غیر اللہ سے مدد	۲۱۶
جھاڑ پھونک کے الفاظ کو مؤثر سمجھنا	۲۱۶
ہر مخلوق کی خاصیت اور طاقت مختلف ہے	۲۱۷
جنات اور شیاطین کی طاقت	۲۱۷
اس عمل کا دین سے کوئی تعلق نہیں	۲۱۸
بیمار پر پھونکنے کے مسنون الفاظ	۲۱۸
معوذتین کے ذریعہ دم کرنے کا معمول	۲۱۹
مرضِ وفات میں اس معمول پر عمل	۲۱۹
حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ	۲۲۰
جھاڑ پھونک پر معاوضہ لینا	۲۲۱
تعویذ کے مسنون کلمات	۲۲۱
ان کلمات کے فائدے	۲۲۲
اصل سنت "جھاڑ پھونک" کا عمل ہے	۲۲۲
کون سے "تمائم" شرک ہیں	۲۲۲
جھاڑ پھونک کے لئے چند شرائط	۲۲۳
یہ رُقیہ حضور ﷺ سے ثابت ہے	۲۲۳
تعویذ دینا عالم اور متقی ہونے کی دلیل نہیں	۲۲۴
تعویذ گنڈے میں انہماک مناسب نہیں	۲۲۴
ایک انوکھا تعویذ	۲۲۵
ٹیڑھی مانگ پر نرالا تعویذ	۲۲۵
ہر کام تعویذ کے ذریعہ کرانا	۲۲۶
تعویذ کرنا نہ عبادت نہ اس پر ثواب	۲۲۶
اصل چیز دعا کرنا ہے	۲۲۶
تعویذ کرنے کو اپنا مشغلہ بنالینا	۲۲۷

روحانی علاج کیا ہے؟	۲۲۷
صرف تعویذ دینے سے پیر بن جانا	۲۲۷
ایک عامل کا وحشت ناک واقعہ	۲۲۸
حاصلِ کلام	۲۲۸
دنیا کی حقیقت	۲۳۰
حقیقی زندگی	۲۳۰
قبر تک تین چیزیں جاتی ہیں	۲۳۱
مال اور عزیز و اقارب کام آنے والے نہیں	۲۳۱
قبر ۔ جنت کا باغ یا جہنم کا گڑھا	۲۳۲
اس دنیا میں اپنا کوئی نہیں	۲۳۳
جہنم کا ایک غوطہ	۲۳۳
جنت کا ایک چکر	۲۳۴
دنیا بے حقیقت چیز ہے	۲۳۵
دنیا کی حیثیت ایک پانی کا قطرہ ہے	۲۳۵
دنیا ایک مردار بکری کے بچے کے مثل ہے	۲۳۶
اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کردوں	۲۳۷
وہ کم نصیب ہوں گے	۲۳۸
حضور ﷺ کا حکم نہ ٹوٹے	۲۳۹
صاحبِ ایمان جنت میں ضرور جائے گا	۲۳۹
گناہوں پر جرأت مت کرو	۲۴۰
دنیا میں مسافر کی طرح رہو	۲۴۰
دنیا ایک ”خوبصورت جزیرے“ کے مانند ہے	۲۴۱
دنیا سفر کی ایک منزل ہے، گھر نہیں	۲۴۲
دنیا کو دل و دماغ پر حاوی نہ ہونے دو	۲۴۳
دل میں دنیا ہونے کی ایک علامت	۲۴۳
ایک سبق آموز قصہ	۲۴۳
دنیا کی محبت دل سے نکالنے کا طریقہ	۲۴۵
فکرِ آخرت	۲۴۶
ہماری ایک بیماری	۲۴۶
اس بیماری کا علاج	۲۴۷
کوئی خوشی کامل نہیں	۲۴۷
تین عالم	۲۴۸
آخرت کی خوشی کامل ہوگی	۲۴۹
موت یقینی ہے	۲۵۰
حضرت بہلول کا واقعہ	۲۵۰
موت کو کثرت سے یاد کرو	۲۵۲
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ	۲۵۳
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۲۵۳
آخرت کی فکر	۲۵۴
یہ فکر کس طرح پیدا ہو؟	۲۵۴
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت	۲۵۵
جادوگروں کا مضبوط ایمان	۲۵۶
صحبت کا فائدہ	۲۵۷
آج کی دنیا کا حال	۲۵۸
مرنے سے پہلے موت کی تیاری کیجئے	۲۶۰
موت یقینی چیز ہے	۲۶۰
موت سے پہلے مرنے کا مطلب	۲۶۰

ایک دن مرنا ہے، آخر موت ہے	۲۶۱
دو عظیم نعمتیں اور ان سے غفلت	۲۶۱
حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ کا نصیحت آموز واقعہ	۲۶۲
عقل مند کون؟	۲۶۴
ہم سب بیوقوف ہیں	۲۶۴
موت اور آخرت کا تصور کرنے کا طریقہ	۲۶۵
حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ	۲۶۶
اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق	۲۶۶
آج ہی اپنا محاسبہ کرلو	۲۶۷
صبح کے وقت نفس سے ''معاہدہ''	۲۶۸
معاہدہ کے بعد دعا	۲۶۸
پورے دن اپنے اعمال کا ''مراقبہ''	۲۶۸
سونے سے پہلے ''محاسبہ''	۲۶۹
پھر شکر ادا کرو	۲۶۹
اپنے نفس پر سزا جاری کرو	۲۷۰
سزا مناسب اور معتدل ہو	۲۷۰
کچھ ہمت کرنی پڑے گی	۲۷۰
یہ چار کام کرلو	۲۷۱
یہ عمل مسلسل کرنا ہوگا	۲۷۱
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ	۲۷۱
ندامت اور توبہ کے ذریعہ درجات کی بلندی	۲۷۲
ایسی تیسی مرے گناہوں کی	۲۷۳
نفس سے زندگی بھر کی لڑائی ہے	۲۷۳
تم قدم بڑھاؤ، اللہ تعالیٰ تھام لیں گے	۲۷۴
اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا یہ جواب دو گے؟	۲۷۵
ہمت اور حوصلہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو	۲۷۵
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں	۲۷۶
جزا و سزا کا تصور	۲۷۷
جنت کے حسین مناظر	۲۸۱
آخرت کے حالات جاننے کا راستہ	۲۸۱
ایک بزرگ کا عجیب قصہ	۲۸۱
ادنیٰ جنتی کی جنت کا حال	۲۸۲
ایک اور ادنیٰ جنتی کی جنت	۲۸۳
حدیث مسلسل بالضحک	۲۸۵
پورے کرۂ زمین کے برابر جنت	۲۸۵
عالمِ آخرت کی مثال	۲۸۵
یہ جنت تمہارے لئے ہے	۲۸۶
حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ اور آخرت کا دھیان	۲۸۶
جنت کے اندر بازار	۲۸۶
جنت میں اللہ تعالیٰ کا دربار	۲۸۷
مشک و زعفران کی بارش	۲۸۸
جنت کی سب سے عظیم نعمت ''اللہ کا دیدار''	۲۸۸
حسن و جمال میں اضافہ	۲۸۹
جنت کی نعمتوں کا تصور نہیں ہوسکتا	۲۸۹
جنت میں خوف اور غم نہیں ہوگا	۲۹۰
جنت کی نعمتوں کی دنیا میں جھلک	۲۹۱
یہ جنت متقین کے لئے ہے	۲۹۱
جنت کے گرد ''کانٹوں'' کی باڑ	۲۹۲

دوزخ کے گرد شہوات کی باڑ	۲۹۳
یہ کانٹوں کی باڑ بھی پھول بن جاتی ہے	۲۹۳
ایک صحابی کا جان دے دینا	۲۹۳
دنیا والوں کے طعنوں کو قبول کرلو	۲۹۴
عزت دین پر چلنے والوں کی ہوتی ہے	۲۹۵
پھر عبادتوں میں لذت آئے گی	۲۹۵
گناہ چھوڑنے کی تکلیف	۲۹۶
ماں بچے کی تکلیف کیوں برداشت کرتی ہے؟	۲۹۶
جنت اور عالمِ آخرت کا مراقبہ کریں	۲۹۶
خواب، اسلام کی نظر میں	۲۹۸
سچے خواب نبوت کا حصہ ہیں	۲۹۸
خواب کے بارے میں دو رائیں	۲۹۹
خواب کی حیثیت	۳۰۰
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور تعبیرِ خواب	۳۰۰
حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مبشرات	۳۰۱
شیطان آپ ﷺ کی صورت میں نہیں آسکتا	۳۰۱
حضور ﷺ کی زیارت عظیم سعادت	۳۰۲
زیارت کی اہلیت کہاں؟	۳۰۲
حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور روضۂ اقدس کی زیارت	۳۰۳
اصل مدار بیداری کے اعمال ہیں	۳۰۴
اچھا خواب دھوکے میں نہ ڈالے	۳۰۴
خواب میں حضور ﷺ کا کسی بات کا حکم دینا	۳۰۵
خواب حجتِ شرعی نہیں	۳۰۵
خواب کا ایک عجیب واقعہ	۳۰۵
خواب اور کشف وغیرہ سے شرعی حکم نہیں بدل سکتا	۳۰۶
حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ایک واقعہ	۳۰۷
خواب کے ذریعہ حدیث کی تردید جائز نہیں	۳۰۸
خواب دیکھنے والا کیا کرے؟	۳۰۸
خواب بیان کرنے والے کیلئے دعا کرنا	۳۰۹
تبرکات شریعت کی نظر میں	۳۱۰
لمحۂ فکریہ	۳۱۱
تبرک بآثار الانبیاء علیہم السلام جائز ہے	۳۱۲
تبرک بآثار الانبیاء کا انکار غلو اور مکابرہ ہے	۳۱۳
دلائلِ جوازِ تبرک	۳۱۳
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے منع کرنے کی وجہ	۳۱۵
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نفس تبرک بالمآثر کے منکر نہیں تھے	۳۱۶
شجرۂ بیعت رضوان کو کٹوانے کی وجہ	۳۱۶
مآثر انبیاء کے تبرکات کا مقصد	۳۱۷
تبرکات مثاؤ والے موقف کی حقیقت	۳۱۸
مستند تبرکات	۳۱۹
بیماری اور پریشانی ایک نعمت	۳۲۱
پریشان حال کے لئے بشارت	۳۲۱

پریشانیوں کی دو قسمیں	۳۲۱
''تکالیف'' اللہ کا عذاب ہیں	۳۲۲
''تکالیف'' اللہ کی رحمت بھی ہیں	۳۲۲
کوئی شخص پریشانی سے خالی نہیں	۳۲۳
ایک نصیحت آموز قصہ	۳۲۳
ہر شخص کو دولت الگ الگ دی گئی ہے	۳۲۵
محبوب بندے پر پریشانی کیوں؟	۳۲۵
صبر کرنے والوں پر انعامات	۳۲۶
تکالیف کی بہترین مثال	۳۲۶
تکالیف کی ایک اور مثال	۳۲۷
تکالیف پر ''اناللہ'' پڑھنے والے	۳۲۷
ہم دوست کو تکلیف دیتے ہیں	۳۲۸
ایک عجیب وغریب قصہ	۳۲۸
یہ تکالیف اضطراری مجاہدات ہیں	۳۳۰
ان تکالیف کی تیسری مثال	۳۳۱
چوتھی مثال	۳۳۱
حضرت ایوب علیہ السلام اور تکالیف	۳۳۱
تکالیف کے رحمت ہونے کی علامات	۳۳۲
دعا کی قبولیت کی علامت	۳۳۳
حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۳۳۴
خلاصہ حدیث	۳۳۴
تکالیف میں عاجزی کا اظہار کرنا چاہئے	۳۳۵
ایک بزرگ کا واقعہ	۳۳۵
ایک عبرت آموز واقعہ	۳۳۶
تکالیف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ	۳۳۶
نفاق کی علامتیں	۲۳۸

عرضِ مرتب

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کے نام نامی اور ذات گرامی کو نہ کسی تعارف کی ضرورت ہے اور نہ ان کے علمی اور عملی کارنامے کسی سے ڈھکے چھپے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی شخصیت میں جو کشش رکھی ہے اور آپ کے علمی اور عملی فیوض کے جو چشمے عالم اسلام میں جاری ہیں وہ محض اللہ تعالیٰ ہی کی دین ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی باتیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔ کچھ عرصے قبل ادارہ اسلامیات کے جناب سعود عثمانی صاحب نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ مولانا مدظلہم کے وہ خطبات اور تحریریں جو عام اور روزمرہ زندگی سے متعلق ہیں اور جن کو اصلاح ذات اور اصلاح معاشرہ میں خاص اہمیت حاصل ہے اور جن کی بدولت ہزاروں لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب بپا ہوا ہے، اضافوں کے ساتھ موضوعاتی ترتیب سے یکجا ہو جائیں تو ان سے استفادہ بہت آسان ہو جائے گا۔ ان کی تحریک پر میں نے بنام تعالیٰ اس کام کا آغاز کر دیا اور سال ہا سال کی محنت کے بعد الحمد للہ یہ کام آپ کے سامنے ہے۔ جس کی چند نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں۔

''اسلام اور ہماری زندگی''، شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی ''تحریرات اور خطبات'' کا مجموعہ ہے، جس میں تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق آپ کی لازوال علمی تحریرات اور پرسوز خطبات کو خاص ترتیب اور سلیقہ سے جمع کیا گیا ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ مجموعہ درج ذیل خصوصیات کا حامل ہو:

1- موضوعات کی جلدوں میں تحدید، یعنی ہر موضوع سے متعلق مواد ایک جلد میں یکجا کر دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے قاری کے لئے اپنے مطلوبہ مضامین تک رسائی اور اس سے استفادہ انتہائی آسان ہو گیا ہے۔ بعض اوقات قاری کو ایک ہی موضوع پر معلومات درکار ہوتی ہیں، اب اس کی ضرورت آسانی سے پوری ہو سکے گی۔

2- قرآن مجید کی تمام آیات کے حوالے درج کئے گئے اور ان پر مکمل اعراب لگا دیئے گئے ہیں۔

3- احادیث نبویہ کے مکمل حوالے درج کر دیئے گئے ہیں۔ نیز اس مجموعہ میں موجود احادیث کی تمام عربی عبارتوں پر اعراب لگا دیے ہیں۔ اس امر کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ اس مجموعہ میں مذکور تمام عربی عبارتوں پر اعراب لگائے گئے ہیں تا کہ اس سے استفادہ کرنے والے حضرات عربی عبارات کو درست طریقے سے پڑھ سکیں۔

5- پہلے نسخوں میں موجود اردو اشعار میں خاطر خواہ اغلاط موجود تھیں، جنہیں رفع کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

4- اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ صرف وہ تحریرات اور تقریرات شامل کی جائیں جو عام فہم ہوں، دقیق علمی مباحث کو اس مجموعہ میں شامل کرنے سے حتی الوسع اجتناب کیا گیا ہے۔

6- پہلے سے طبع شدہ مواد میں موجود لفظی اغلاط کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

7- اس بات کا دھیان رکھا گیا ہے کہ ضبط شدہ خطبات پر مشتمل عبارتوں کی تراکیب اور رموز واقف پہلے سے بہتر ہوں۔

8- اس مجموعہ میں بہت سے ایسے بیانات کو بھی سپرد قرطاس کیا گیا ہے جو اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے تھے۔

9- تاریخی واقعات اور آثار صحابہ و تابعین میں سے اکثر کو تلاش کر کے ان کے حوالے درج کر دیئے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو قبول فرمائے اور اسے حضرت اقدس مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم، ناشر کتاب ادارہ اسلامیات، ان کے جملہ معاونین اور راقم کے لئے فلاح کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔

محمد اویس سرور

عرضِ ناشر

یوں تو ہر ناشر کے لیے کسی ایسے مصنف کی کتاب شائع کرنا، جس کی مقبولیت خواص و عوام میں بے پناہ ہو، فخر اور فضیلت کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ اگر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کا ہمارے ادارۂ اسلامیات کے ساتھ رشتہ محض مصنف اور ناشر کا ہوتا تب بھی یہ ادارۂ اسلامیات کے لیے باعثِ افتخار ہوتا کہ اس نے ایک ایسے عالم بے بدل کی کتب شائع کی ہیں جس کا شہرہ اور جس کے علمی فیض و برکت کا دائرہ دنیا کے کونے کونے میں پہنچ رہا ہے۔ تنہا یہی بات ادارۂ اسلامیات کے لیے باعث سعادت اور اس کی شناخت کے لیے کافی ہوتی۔

لیکن عم مکرم مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کا رشتہ ہمارے ادارۂ اسلامیات سے جس مضبوط اور غیر معمولی محبت پر استوار ہے، وہ ناشر اور مصنف سمیت دیگر ہر تعلق سے بدرجہا بلند اور برتر ہے۔ وہ ادارے کے سرپرست بھی ہیں اور ادارہ اپنے معاملات میں ان سے رہنمائی کا بھی طالب اور خواستگار رہتا ہے۔ عم مکرم نے ہمیشہ ہماری درخواستوں کو شرفِ پذیرائی بھی بخشا ہے اور بے بدل محبت اور شفقت سے بھی نوازا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چچا جان محترم مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم (اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ شفقت ہم پر تادیر قائم رکھے) کی کتب شائع کرتے ہوئے عقیدت و عظمت کے دھاروں میں محبت، اپنائیت اور انسیت کے پھوٹتے ہوئے چشمے بھی شامل ہوتے جاتے ہیں۔

خواص و عوام اس دل سوزی، تاثیر اور خیر خواہی سے بہت اچھے انداز میں واقف ہیں جن سے مولانا تقی عثمانی صاحب کی تحریریں، خطبات اور تقاریر لبریز ہیں۔ ان کا ایک طرۂ امتیاز وہ عام فہم انداز بھی ہے جو مخاطب کی رعایت سے ہر دل میں جاگزین ہوتا جاتا ہے اور اہل محفل علمی اور عملی طور پر مالا مال ہوکر محفل سے اٹھتے ہیں۔ بہت عرصے سے خواہش تھی کہ ان تحریروں بیانات، خطبات، تقاریر کا ایک ایسا مجموعہ موضوعاتی انداز میں میسر آسکے جس سے استفادہ آسان ہو اور گھر بیٹھے یہ خزانہ دستیاب رہے۔

زیرِ نظر کتاب ''اسلام اور ہماری زندگی'' ہمارے اس خواب کی ایک تعبیر بھی ہے اور ادارۂ اسلامیات کے شرف و سعادت کے اس سلسلے میں ایک اہم اضافہ بھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ چچا جان محترم نے اس سلسلے میں ہماری درخواست قبول فرماتے ہوئے اس ارادے کو بروئے کار لانے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس طرح دینی و دنیوی کامیابیوں کا یہ لازوال نسخہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کتاب کے

مطالعے کے دوران یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مولانا دامت برکاتہم کی بے پایاں مصروفیات کے باعث انہیں اس مجموعے پر نظر ثانی کا موقعہ نہیں مل سکا ہے۔ اگر دوران مطالعہ کوئی بات قابل استفسار محسوس ہو تو براہ کرم مرتب اور ناشر کے علم میں لا کر ممنون فرمائیں۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عمِ مکرم کو ہر طرح کے خطرات اور آفات، حسد و کینہ سے محفوظ و مامون فرماتے ہوئے ان کے فیوض و برکات کا سلسلہ دیر تک اور دور تک قائم و دائم رکھیں اور اس کتاب کی تکمیل میں جن جن حضرات نے حصہ لیا ہے انہیں بھی اس کی برکات سے بہرہ مند فرمائیں۔ آمین

اشرف برادران (سلمہم الرحمن)

کارکنان ادارۂ اسلامیات

(لاہور۔ کراچی)

۶ رجب ۱۴۳۱ھ - ۱۷۔ جون ۲۰۱۰

توحیدِ باری تعالیٰ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَحَبِيْبَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ (۱)

آمَنْتُ بِاللّٰهِ صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمُ، وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ، وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! آج کی محفل میں ہمیں اسلام کے سب سے بنیادی عقیدے یعنی ”توحید“ کے بارے میں کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں، ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام کی بنیاد کلمۂ توحید پر ہے، جو شخص بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہوتا ہے، وہ کلمۂ توحید پڑھ کر یعنی ”لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ کا اقرار کر کے داخل ہوتا ہے، اس کلمۂ توحید کی انقلابی حیثیت بھی ہر مسلمان کو معلوم ہے، اور اس کا یہ عجیب نتیجہ بھی کہ اس ایک کلمہ کو پڑھ لینے کے بعد انسان کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہو جاتا ہے، یعنی جو شخص کہ اس کلمہ کے پڑھنے سے پہلے کافر تھا، وہ اس کلمہ کے پڑھ لینے کے بعد مسلمان ہو جاتا ہے، پہلے جو شخص اللہ تعالیٰ کا مبغوض تھا، اس کلمہ کے پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے، پہلے جو شخص جہنم اور دوزخ کا مستحق تھا، اس کلمہ کے پڑھنے کے بعد جنت کا اور اللہ کی رحمتوں کا سزاوار بن جاتا ہے، اور اگر میں یہ کہوں تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا کہ یہ ایک ایسا کلمہ ہے جو انسان کو ایک ہی لمحہ میں جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین درجے میں

☆ نشری تقریریں، ص: ۵-۱۶ (۱) الحشر: ۲۲

داخل کر دیتا ہے اور یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں، بلکہ ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے، جس کی بے شمار مثالیں تاریخِ اسلام میں ملتی ہیں۔

ذرا سی تشریح کے لئے ایک واقعہ آپ حضرات کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں، غزوۂ خیبر کا واقعہ جس میں نبی کریم سرکارِ دو عالم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے ساتھ یہودیوں کے سب سے بڑے قلعے خیبر پر حملہ آور ہوئے تھے، اور وہاں کا محاصرہ کیا تھا، کیونکہ ان یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کی جاتی تھیں، نبی کریم سرکارِ دو عالم ﷺ نے جب اس قلعے کا محاصرہ کیا تو یہ محاصرہ کئی روز تک جاری رہا۔

اس محاصرہ کے دوران خیبر کے شہر کا ایک چرواہا جس کا نام تاریخ میں اسود راعی ہے، وہ ایک روز اپنے شہر سے باہر نکلا، اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں ذرا یہ معلوم کروں کہ یہ محمد رسول اللہ ﷺ جو اتنا بڑا لشکر لے کر اتنا بڑا فاصلہ طے کر کے اور مشقتیں اٹھا کر اس خیبر پر حملہ آور ہو رہے ہیں ان کی بنیادی دعوت کیا ہے؟ اور ان کا پیغام کیا ہے؟ وہ کیا چاہتے ہیں؟ یہ معلوم کرنے کی غرض سے وہ چرواہا باہر نکلا، اور مسلمانوں کے پڑاؤ کی طرف بڑھا، مسلمانوں کے پڑاؤ میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی، اس سے اس نے پوچھا کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم لوگ خیبر پر حملہ کرنے کے لئے کیوں آئے ہو؟ اور کیا وجہ ہے کہ ہمارے شہر کے رہنے والے تمہارے دشمن ہیں؟ اور تمہاری بنیادی دعوت اور تمہارا بنیادی پیغام کیا ہے؟ وہ ایک صحابی تھے، انہوں نے خود اسلام کے عقائد کی تشریح کرنے کے بجائے اسود چرواہے سے کہا کہ تم ہمارے سردار یعنی محمد رسول اللہ ﷺ سے جا کر خود مل لو، اور انہی سے یہ سوال کرو، وہ جواب میں تمہیں تفصیل کے ساتھ اپنی بنیادی دعوت اور پیغام بتا دیں گے۔

اسود راعی کے لئے یہ بات انتہائی حیرت انگیز تھی اس لئے کہ وہ کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی لشکر کا سپہ سالار، کسی فوج کا بڑا افسر، یا کسی مملکت کا فرمانروا، اسے بنفسِ نفیس اپنے دربار میں حاضر کرے، اور باریابی کا شرف بخشے، وہ تو ساری عمر یہ دیکھتا آیا تھا کہ وہ تو ایک چرواہا ہے، جس کے ساتھ کوئی بھی معزز انسان، کوئی بھی دولت مند انسان، کوئی بھی صاحبِ منصب انسان بات کرنے کو بھی ذلت اور حقارت سمجھتا ہے۔

اس لئے اسود راعی نے کہا کہ میں تمہارے سردار کے پاس کیسے جا سکتا ہوں، جبکہ وہ تمہاری مملکت کے فرمانروا ہیں، تمہاری فوج کے سپہ سالار ہیں، اور میں ایک ادنیٰ چرواہا ہوں۔ ان صحابی نے جواب میں کہا کہ ہمارے سردار نبی کریم سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ غریبوں کے انتہائی ہمدرد اور غمگسار ہیں، اور ان کی بزم اور محفل میں غریب و امیر کے درمیان، حاکم محکوم کے درمیان اور راعی و رعیت کے درمیان کوئی فرق، امتیاز نہیں ہوتا۔ وہ حیرانی کے عالم میں نبی کریم ﷺ کی طرف بڑھا، اور آپ کی

خدمت میں حاضر ہوا، اور ڈرتے ڈرتے یہ سوال کیا کہ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کی بنیادی دعوت کیا ہے؟ اور آپ کیوں اس جگہ پر تشریف لائے؟

نبی کریم ﷺ نے جواب میں مختصراً اس کو عقیدۂ توحید سمجھایا، اور یہ بتایا کہ ہم بار بار اس عقیدے کی وضاحت کر چکے ہیں، اسود راعی نے جب اس عقیدہ توحید کی تشریح سنی تو نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص اس عقیدہ کا قائل ہو جائے، اور آپ کے ساتھ شامل ہو جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ اگر تم اس عقیدہ کو قبول کرلو، اور اسلام کے دائرے میں داخل ہو جاؤ تو تم ہمارے بھائی ہو گے، ہم تمہیں اپنے سینے سے لگائیں گے، اور تمہیں وہی حقوق حاصل ہونگے جو تمام مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

اسود راعی نے بڑی حیرانی کے عالم میں کہا کہ مجھے کیسے وہ حقوق حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ میں ایک معمولی درجے کا چرواہا ہوں، میرا رنگ سیاہ ہے، میں سیاہ فام ہوں، میرے جسم سے بدبو اٹھ رہی ہے، میرے جسم پر میل کچیل جمع ہے، ایسی حالت میں آپ لوگ مجھے کیسے سینے سے لگائیں گے؟ اور مجھے اپنے برابر کا درجہ اور مقام کیسے دیں گے؟ نبی کریم ﷺ نے اسے یقین دلایا تو اس نے کہا کہ اگر یہ واقعہ ہے کہ آپ مجھے اپنے برابر حقوق دینے کے لئے تیار ہیں، اور آپ کے اس عقیدۂ توحید کے پیغام میں بھی اتنی کشش ہے کہ میں اپنے دل میں اس کی طرف ایک غیر معمولی انسیت محسوس کر رہا ہوں، میں اتنی بات اور پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری اس سیاہ فامی اور میرے جسم کے میل کچیل اور بدبو کا کیا علاج ہوگا؟

نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اگر تم اس عقیدۂ توحید کو قبول کرلو تو چاہے دنیا میں تمہارے اس چہرے کی سیاہی کا کوئی علاج نہ ہو سکے، لیکن جب آخرت میں تم اٹھائے جاؤ گے تو تمہارا چہرہ چمک رہا ہوگا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اس چہرے کی سیاہی کو نور سے بدل دے گا، اور تمہارے جسم کی بدبو کو خوشبو سے بدل دے گا، اس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر ''اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ'' یہ کہہ کر مسلمان ہو گیا۔ پھر پوچھا کہ اب مجھے بتایئے کہ میرے ذمے کیا فریضہ عائد ہوتا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یوں تو اسلام کے بہت سے فرائض ہیں، لیکن اس وقت نہ تو نماز کا وقت ہے کہ تمہیں نماز کا حکم دیا جائے، نہ روزہ کا مہینہ ہے کہ روزہ رکھوایا جائے، نہ زکوٰۃ تم پر واجب ہے کہ تم سے زکوٰۃ دلوائی جائے، نہ حج کا موسم ہے کہ تم سے حج کرایا جائے، اس وقت تو ایک ہی عبادت اللہ کے لئے انجام دی جا رہی ہے، وہ یہ کہ خیبر کے میدان میں حق و باطل کا معرکہ برپا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں دینِ اسلام کے جاں نثار اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں، اس وقت تو تمہارا فریضہ یہ ہے کہ اس جہاد میں شامل ہو جاؤ۔ اسود راعی نے کہا کہ اگر

میں اس جہاد میں شہید ہوگیا تو میرا انجام کیا ہوگا؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ اگر تم جہاد میں شہید ہو گئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں سیدھا جنت الفردوس میں پہنچائے گا، تمہارے چہرے کی سیاہی نور سے تبدیل ہو جائے گی، تمہارے جسم سے بدبو کے بجائے خوشبوئیں مہکیں گی، میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔

یہ سن کر اسود راعی نے بکریوں کو شہر کی طرف ہنکایا، اور لشکرِ اسلام میں شامل ہوگیا، لڑائی کافی دیر تک جاری رہی، جب جنگ کا اختتام ہوگیا، اور خیبر فتح ہوگیا اور نبی کریم ﷺ شہدا کی لاشوں کا معائنہ کرنے کے لئے نکلے، تو انہی لاشوں میں سے ایک لاش اسود راعی کی بھی تھی، جب وہ آپ کی خدمت میں لائی گئی تو آپ کی مبارک آنکھوں میں آنسو آگئے، اور آپ نے فرمایا کہ یہ عجیب وغریب شخص ہے، یہ ایک ایسا شخص ہے جس نے اللہ کے راستے میں کوئی ایک سجدہ نہیں کیا، یہ وہ شخص ہے جس نے اللہ کے راستے میں کوئی ایک پیسہ خرچ نہیں کیا، یہ وہ شخص ہے جس نے اللہ کے راستے میں کوئی اور عبادت انجام نہیں دی، لیکن میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ شخص سیدھا جنت الفردوس میں پہنچ گیا ہے، اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے چہرے کی سیاہی کو نور سے بدل دیا ہے، اس کے جسم کی بدبو اور میل کچیل کو خوشبو سے مہکا دیا گیا ہے۔ (۱)

یہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' ایک لمحہ میں انسان کو جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین درجے میں پہنچا دیتا ہے، یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے، بلکہ اس واقعے سے اس کا ایک عملی ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ صرف ایک ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' نے اس شخص کے انجام میں اتنا حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ زبردست انقلاب جو انسان کی زندگی میں بھی اور اس کے انجام میں بھی اس کلمہ کی بدولت پیدا ہوتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ کلمہ کوئی منتر ہے، یا کوئی طلسم ہے کہ اس کے پڑھ لینے کے بعد انسان جہنم سے، اللہ کے عذاب سے اور اللہ کے غضب سے محفوظ ہو جاتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی منتر نہیں، کوئی طلسم نہیں، حقیقت یہ ہے کہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' ایک معاہدہ ہے، ایک اقرار ہے جو انسان اپنے پروردگار سے کرتا ہے۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اللہ کے سوا ہر معبود سے بری ہوتا ہوں، اور ہر معبود کی معبودیت سے انکار کرتا ہوں، اور محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا سچا پیغمبر مانتا ہوں، اس معاہدہ کا مطلب یہ ہے کہ میں پوری زندگی جو گذاروں گا وہ تمام تر اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق، اسکے

(۱) البدایہ والنہایۃ (۶۰۹/۴۔۶۱۱)

احکام کے مطابق اور اس کی خوشنودی کے مطابق گذارنے کی کوشش کروں گا، یہی معاہدہ کرنے کی بدولت اس کی زندگی میں یہ انقلاب برپا ہوتا ہے کہ پہلے وہ اللہ کا مبغوض تھا تو اب محبوب بن گیا، پہلے کافر تھا تو اب مسلمان بن گیا، پہلے جہنمی تھا تو اب جنتی بن گیا، یہ سارا انقلاب اس معاہدہ کی بدولت پیدا ہوتا ہے، اسی معاہدہ کا نام شریعت میں ''توحید'' ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے لے کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک جتنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے، ان سب نے ایک ہی بنیادی دعوت دی، وہ ''توحید'' کی دعوت تھی، جتنی قوموں پر عذاب نازل ہوئے وہ اسی ''توحید'' سے رُوگردانی کی بنیاد پر نازل ہوئے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے جو مشقتیں اور صعوبتیں اٹھائیں، وہ اسی ''توحید'' کی نشر و اشاعت کے لئے اٹھائیں، یہ ایک ایسا بنیادی عقیدہ ہے جو اسلام اور اللہ تعالیٰ کے دین کا بنیادی پتھر کہلانے کا مستحق ہے، اور اسلام کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معبود قرار دے کر اس کے سوا ہر معبود کی نفی کی جائے، ہر معبود سے براءت کا اظہار کیا جائے، اور اللہ کے سوا کسی کے حکم کی تعمیل نہ کی جائے۔

علماء نے لکھا ہے کہ توحید کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک توحید اعتقادی، دوسری توحید عملی۔ توحید اعتقادی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس بات پر یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کائنات کا نہ کوئی خالق ہے نہ کوئی معبود ہے، اور نہ کوئی عبادت کے لائق ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اللہ کی ذات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو معبود قرار نہ دے، اور صفات میں شریک نہ ٹھہرانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی جتنی ایسی صفات ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں ان میں کسی اور کو اس کا شریک نہ بنائے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے، وہ رزّاق ہے، اس رزّاقیت کی صفت میں کسی اور کو شامل نہ کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے قبضہ وقدرت میں ہر انسان کا نفع اور نقصان ہے، اس نفع ونقصان کو اللہ تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں سمجھے، اسکے سوا کسی اور کو نفع ونقصان کا ذمہ دار قرار نہ دے، اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں شفا اور مرض ہے، تو شفا اور مرض کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب نہ کرے، لہٰذا جتنی بھی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں ان میں سے کسی میں بھی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرائے۔

اس بات کی وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات میں شریک ٹھہرانے کا تعلق ہے، دنیا کے بیشتر مذاہب اسکے قائل رہے ہیں، وہ کافر اور مشرک لوگ جن کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا، اور آپ نے ان کو توحید کی دعوت دی، وہ بھی اس بات کو مانتے تھے کہ پیدا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ وہ بھی اس بات کو مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کو پیدا کیا ہے، اور ہمیں بھی اسی نے پیدا کیا ہے، لیکن ان کا شرک یہ تھا کہ وہ اللہ کی صفات میں کچھ

دیوتاؤں کو شریک مانتے تھے، وہ کہتے تھے کہ رزق کا شعبہ اللہ تعالیٰ نے فلاں دیوتا کے سپرد کر رکھا ہے۔ بارش کا شعبہ اللہ تعالیٰ نے فلاں دیوتا کے حوالے کر دیا ہے۔ شفا کا شعبہ اللہ تعالیٰ نے فلاں دیوتا کو سونپ دیا ہے، اس طرح وہ صفاتِ باری تعالیٰ کے اندر دوسرے دیوتاؤں کو شریک ٹھہرانے کے مجرم تھے۔ اس وجہ سے ان کو مشرک قرار دیا گیا، ورنہ خود قرآن کریم کہتا ہے کہ:

''اگر آپ ان سے پوچھئے کہ کس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، تو وہ جواب میں کہیں گے کہ اللہ نے پیدا کیا''

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

﴿أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ﴾ (۱)

کہ تم مانتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں اسکے باوجود اسکی صفات میں تم دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو؟ یہ تو کوئی عقلمندی اور دانش مندی کی بات نہیں۔

اسی لئے توحید اعتقادی اس وقت کامل ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی ذات میں بھی کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، اس کی صفات میں بھی کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، یعنی عبادت کرے انسان تو صرف اللہ کی کرے، معبود مانے تو اللہ کو مانے، پوجے تو اللہ کو پوجے، مانگے تو اللہ سے مانگے، اور مشکل کشا، رزّاق اور تمام بیماریوں کو دور کرنے والا اللہ کے سوا کسی اور کو نہ سمجھے، یہ ہے توحید کامل جس کی دعوت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک تمام انبیاء نے دی ہے۔

توحید کی دوسری قسم ''توحیدِ عملی'' ہے، توحید عملی کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعتقاد کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے یہ انسان کی عملی زندگی میں اس طرح رچ بس جائے کہ ہر آن اس کو یہ حقیقت مستحضر رہے کہ اللہ کے سوا کوئی شخص مجھ کو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے، اور نہ نفع پہنچا سکتا ہے، اور نہ اللہ کے سوا کوئی واجب الاطاعت ہے، مجھے اللہ کے حکم کی اطاعت کرنی ہے، اللہ کے حکم کی اطاعت میں کوئی بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا، یہ اعتقاد جب انسان کی زندگی میں رچ بس جاتا ہے تو اس کو صوفیاء کی اصطلاح میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کو توحید عملی کا مقام حاصل ہو گیا۔

اس توحید عملی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ہر شعبے میں ہر موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کو پیشِ نظر رکھتا ہے، وہ یہ دیکھتا ہے کہ میرے اس قدم سے اللہ راضی ہو گا یا ناراض ہو گا، کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے اس عمل سے اللہ کی نافرمانی ہو جائے، اگر نافرمانی کا اندیشہ ہو تو وہ اس قدم سے باز رہتا ہے، اور اللہ کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتا، کسی سے اُمید نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف اگر کوئی شخص اس کے قدموں میں ساری دنیا جہاں کی دولت لا کر ڈھیر کر دے تو بھی وہ دولت

(۱) النمل: ٦٠

اس کے پائے استقامت کو لغزش میں نہیں لاسکتی، وہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے رُوگردانی نہیں کرسکتا۔ کوئی شخص زور اور زبردستی کی انتہا کردے، اور اس کو اپنے سامنے موت ناچتی نظر آرہی ہو، لیکن اسکے باوجود وہ جانتا ہے کہ موت اور زندگی، شفا اور مرض سب کچھ اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے، اگر اس نے میرے لئے یہی وقت مقرر کیا ہے تو اسکو کوئی نہیں ٹال سکتا، اور اگر میری زندگی باقی ہے تو کوئی شخص مجھے موت کے حوالے نہیں کرسکتا، اس لئے وہ کبھی بھی کسی ڈر اور خوف کی بنا پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے رُوگردانی پر آمادہ نہیں ہوتا۔

اسی کو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش
چہ شمشیر ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد نہ کس
بریں است بنیاد توحید و بس (۱)

موحد کا مقام یہ ہوتا ہے کہ اگر تم اس کے پاؤں پر دنیا جہاں کا سونا ڈھیر کردو، یا اس کے سر پر ہندی تلوار لٹکادو، اس کو خدا کے سوا نہ کسی اور سے امید قائم ہوتی ہے، نہ خدا کے سوا کسی کا خوف ہوتا ہے، اور یہی توحید کی بنیاد ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک غزوہ کے موقع پر آپ ایک جگہ دوپہر کے وقت ایک درخت کے سائے میں آرام فرمارہے تھے کہ اتنے میں دشمن کا ایک شخص ادھر آنکلا، آپ کی تلوار درخت سے لٹکی ہوئی تھی، اس نے اس تلوار پر قبضہ کیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جگایا، اور آپ سے کہا کہ اب تمہیں میری تلوار سے کون بچاسکتا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے، اچانک یہ منظر سامنے آیا کہ تلوار اس شخص کے ہاتھ میں ہے، ایسے موقع پر جبکہ موت نگاہ کے سامنے ناچتی نظر آرہی ہو، ظاہر ہے کہ وہ شخص دشمن ہے، آپ کے خون کا پیاسا ہے، اس کے ہاتھ میں تلوار بھی ہے، بازو میں طاقت بھی ہے، اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بُری نیت سے حملہ کرنے آیا ہے، لیکن اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اطمینان سے یہ جواب دیا کہ ''مجھے بچانے والا اللہ ہے''، مطلب یہ تھا کہ اگر اللہ کو اس وقت مجھے مارنا منظور ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں بچاسکتی، اور اگر اللہ تعالیٰ نے میری زندگی اور لکھی ہے تو تمہاری یہ تلوار اور تمہاری یہ عداوت میرا بال بیکا نہیں کرسکتی۔ یہ جواب آپ نے اس اعتماد اور بھروسے کے ساتھ دیا کہ اس اعتماد اور بھروسے سے دشمن پر لرزہ طاری ہوگیا، اور اس حالت میں تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، اب تلوار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھی، آپ نے تلوار اٹھا کر

(۱) گلستان، ص: ۲۴۳

فرمایا کہ تمہیں اس تلوار سے اور میرے حملے سے کون بچا سکتا ہے؟ اس شخص کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، اس نے نبی کریم ﷺ کے اس اعتماد اور توکل کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیا اور مسلمان ہو گیا۔ (۱)

عرض کرنے کا منشا یہ تھا کہ ''توحید عملی'' اس وقت کہلاتی ہے جب انسان اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اس بات کو پیشِ نظر رکھے کہ میں نے ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھنے کے بعد اپنے پروردگار سے ایک معاہدہ کیا ہے، اور اس اقرار اور معاہدہ کا تقاضا یہ ہے کہ میں زندگی کے کسی بھی قدم پر اس کے کسی بھی حکم کی خلاف ورزی نہ کروں گا، جب یہ مقام انسان کو حاصل ہو جاتا ہے تو یہ ''توحید عملی'' کہلاتا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جو درحقیقت انسان کی زندگی میں انقلاب برپا کرتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو انسان کو جہنمی سے جنتی بناتی ہے، اور اللہ کے مبغوض سے محبوب بنا دیتی ہے۔

اس ''توحید عملی'' کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ اس معاہدہ کے بعد میرے اُوپر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا احکام مجھے دیے ہیں، اور کن باتوں سے مجھے روکا ہے، سب سے پہلا مرحلہ انہی باتوں کو معلوم کرنے کا ہے، اس واسطے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ)) (۲)

ہر مسلمان پر ایمان لانے کے بعد سب سے پہلا فریضہ یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ علم کی طلب کرے، یعنی یہ معلوم کرے کہ اللہ کی مرضی کیا ہے؟ اور اس کی نافرمانی کیا ہے؟ جب یہ باتیں انسان کو معلوم ہو جاتی ہیں تو پھر اس بات پر اس کو قدرت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اندر اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرے، اور اس کی نافرمانی سے بچنے کی کوشش کرے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توحید کے صحیح تقاضوں کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ان پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس کے تمام ثمرات اور نتائج سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

❁❁❁

---

(۱) صحيح البخارى، كتاب الجهاد والسير، باب من علق سيفه بالشجر فى السفر عند القائلة، رقم: ۲٦۹٤، صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، رقم: ۱۳۹۱. مسند احمد، رقم: ۱۳۸۱٦.

(۲) سنن ابن ماجه، كتاب المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، رقم: ۲۲۰

کلمہ طیبہ کے تقاضے ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴾(۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز!

آج اس مبارک مدرسہ میں حاضر ہو کر ایک زمانہ دراز کی دِلی تمنا پوری ہو رہی ہے، عرصہ دراز سے اس مبارک درسگاہ میں حاضری کا شوق تھا اور میرے مخدوم بزرگ حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی دامت برکاتہم العالیہ(۲) کی زیارت اور ان کی صحبت سے استفادہ کی غرض سے بار بار یہاں آنے کو دل چاہتا تھا، لیکن مصروفیات اور مشاغل نے اب تک مہلت نہ دی، اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ آج یہ دیرینہ آرزو اس نے پوری فرمائی۔ یہاں حاضری کا میرا اصل مقصد حضرت دامت برکاتہم کی زیارت اور ان کے حکم کی تعمیل تھی، جب میں یہاں حاضری کا ارادہ کر رہا تھا تو ذہن میں بالکل نہیں تھا کہ ماشاء اللہ اتنا بڑا مسلمانوں کا اجتماع موجود ہوگا اور ان سے خطاب کرنے کی نوبت آئے گی۔ بہرصورت یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے حضرت مولانا کی زیارت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اتنے بڑے مجمع کی بھی زیارت کی توفیق عطا فرمائی جو خالصتاً اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت اور اللہ کے دین کی طلب کی خاطر اس صحن میں جمع ہے۔

ان کا حسنِ ظن سچا ہو جائے

میرے بزرگ حضرت مولانا مشرف علی صاحب تھانوی، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو دنیا اور

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۹۱۔۱۱۸)

(۱) التوبة: ۱۱۹

(۲) مفتی عبدالشکور ترمذی صاحب وفات پاچکے ہیں، رحمہ اللہ رحمة واسعة

آخرت کی کامیابیاں عطا فرمائے اور ان کے فیوض سے ہمیں مستفید فرمائے، انہوں نے مجھ ناکارہ کے بارے میں جو تعارفی کلمات ارشاد فرمائے، وہ میرے لئے باعثِ شرم ہیں اور یہ ان کی شفقت ہے اور کرم فرمائی ہے کہ انہوں نے مجھ ناکارہ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار فرمایا، میں سوائے اس کے اور کیا عرض کروں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے اس حسنِ ظن کو میرے حق میں سچا فرمادے، آپ حضرات سے بھی اسی دُعا کی درخواست ہے۔

سوچ رہا تھا کہ اس موقع پر آپ حضرات کی خدمت میں کیا عرض کروں؟ حضرت مفتی عبدالشکور صاحب مدظلہم العالی سے بھی پوچھا کہ کس موضوع پر بیان کروں؟ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، یہاں بیٹھنے کے بعد دل میں ایک بات آئی اور اسی کے بارے میں چند مختصر گذارشات آپ حضرات کی خدمت میں عرض کروں گا۔

یہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت کا نتیجہ ہے

میں دیکھ رہا ہوں کہ ماشاء اللہ مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع ہے کہ چہروں پر مسرت کے آثار ہیں، شوق و ذوق کے آثار ہیں، طلب کے آثار ہیں۔ یہ آخر کیوں؟

دل میں خیال پیدا ہوا کہ مجھ جیسا ایک ناکارہ مفلسِ علم بے عمل انسان ان کے سامنے بیٹھا ہے، اکثر حضرات وہ ہیں کہ جن سے اس سے پہلے ملاقات کی سعادت حاصل نہیں ہوئی، لیکن آخر وہ کیا بات ہے کہ اک اَن دیکھا شخص جس کو پہلے کبھی دیکھا نہیں، کبھی برتا نہیں، ایسے شخص کو دیکھنے کے لئے اتنا شوق و ذوق! اس کی بات سننے کے لئے اتنا ذوق و شوق! یہ آخر کیا بات ہے؟ ذہن میں یہ آیا کہ میری حالت تو جو کچھ ہے وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی اصلاح فرمائے۔ لیکن جو طلب اور جو ذوق و شوق لے کر یہ اللہ کے بندے یہ محمد رسول اللہ ﷺ کے اُمتی اس صحن میں جمع ہوئے ہیں یہ ہم سب کے لئے اتنی بڑی سعادت اور اتنی بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ اس کا بیان الفاظ سے نہیں ہوسکتا۔ یہ درحقیقت محبت ہے، ایک شخص سے نہیں، ایک ذات سے نہیں، یہ محبت ہے اللہ کی اور اللہ کے رسول محمد مصطفیٰ ﷺ کی، اس محبت کی خاطر یہ سب نظارے دیکھنے میں آتے ہیں اور میں یہ نظارے آج پہلی مرتبہ نہیں دیکھ رہا ہوں، اس سے پہلے بھی ایسے ایسے مقامات پر دیکھے ہیں جہاں اس کا کوئی تصور بھی انسان کے ذہن میں نہیں آسکتا۔

کلمہ طیبہ نے ہم سب کو ملا دیا ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کے بہت سے ملکوں میں جانے کا موقع فراہم فرمایا، ایسے ایسے

کفرستانوں میں جہاں کفر کی ظلمت چھائی ہوئی ہے، اندھیرا چھایا ہوا ہے، ایسی ایسی جگہوں پر جہاں کے لوگ ہماری زبان نہیں جانتے، ایک جملہ ہم بولیں تو وہ اس کو سمجھ نہیں سکتے، وہ اگر کوئی جملہ بولیں تو ہم اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ ابھی گزشتہ سال مجھے چین جانے کا اتفاق ہوا، آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے اور وہاں پر کافر اور غیر مسلم آباد ہیں، لیکن وہاں پر اللہ کے مسلمان بندے بھی ہیں، وہاں جاکر پہلی بار یہ بات تحقیق سے معلوم ہوئی کہ چین کے اندر مسلمانوں کی تعداد کم از کم آٹھ کروڑ ہے۔ جب گاؤں اور دیہات میں یہ اطلاع پہنچی کہ پاکستان سے کچھ مسلمان آرہے ہیں تو گھنٹوں پہلے سے دونوں طرف دورویہ قطاریں لگا کر انتظار میں کھڑے ہوگئے، حالانکہ برف باری ہورہی تھی، لیکن اس انتظار میں کہ پاکستان سے کچھ مسلمان آئے ہیں ان کو دیکھیں، چنانچہ جب ہم وہاں پہنچے اور انہوں نے ہمیں دیکھا تو کوئی جملہ وہ ہم سے نہیں کہہ سکتے تھے اور ہم کوئی جملہ ان سے نہیں کہہ سکتے تھے، کیونکہ وہ ہماری زبان نہیں جانتے اور ہم ان کی زبان نہیں جانتے، لیکن ایک لفظ ایسا ہے جو ہمارے دین نے ہمیں مشترک دے دیا ہے، خواہ کوئی زبان انسان بولتا ہو، اپنے دل کی ترجمانی وہ اس لفظ کے ذریعہ کرسکتا ہے، وہ ہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ! تو ہر شخص دیکھنے کے بعد السلام علیکم کا نعرہ لگاتا اور یہ کہہ کر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے۔ ایک رشتہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے درمیان پیدا فرمادیا، چاہے وہ مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، کوئی زبان بولتا ہو، بات اس کی سمجھ میں آتی ہو یا نہ آتی ہو، اس کی معاشرت، اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کچھ بھی ہو، لیکن جب یہ پتہ چل گیا کہ یہ مسلمان ہے اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے رشتہ میں ہمارے ساتھ شریک ہے تو اس کے لئے دل کے اندر محبت کے جذبات اُبھرنے شروع ہوجاتے ہیں، ہمیں اور آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت سے رشتوں میں جوڑا ہے، ان میں جو سب سے مضبوط رشتہ جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، جو کبھی ختم نہیں ہوسکتا، جو کبھی کمزور نہیں پڑسکتا، وہ رشتہ ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا رشتہ۔

اس رشتے کو کوئی طاقت ختم نہیں کرسکتی

میرا بنگلہ دیش جانے کا اتفاق ہوا، جو کبھی بہر حال پاکستان ہی کا حصہ تھا، مشرقی پاکستان کہلایا کرتا تھا، وہاں لوگوں کے اندر یہ بات مشہور ہے کہ جب سے بنگلہ دیش الگ ہوا، اس وقت سے پورے بنگلہ دیش میں ڈھاکہ سے لے کر چٹاگام اور سلہٹ تک کسی جگہ اُردو سنائی نہیں دیتی، اس لئے کہ اُردو کا تو بیج مار دیا گیا، بلکہ اُردو کا لفظ سن کر لوگوں کو غصہ آتا ہے کہ اُردو زبان میں کیوں بات کی گئی؟ بنگلہ زبان میں بات کرو یا انگریزی میں۔

جب چٹاگام پہنچا تو وہاں یہ اعلان ہوگیا کہ فلاں میدان میں بیان ہوگا، چنانچہ وہ میدان پورا

بھر گیا، اس مجمع کے اندر میں نے اُردو میں بیان کیا۔ اس میں لوگوں کا اندازہ یہ تھا کہ کم از کم پچاس ہزار مسلمانوں کا اجتماع تھا اور لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد اتنا بڑا اجتماع ہم نے نہیں دیکھا، اور لوگوں کا کہنا یہ بھی تھا کہ اگر کوئی اتنے بڑے جلسے کے اندر اُردو زبان میں بیان کرے تو لوگ اس کے خلاف نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں، احتجاج شروع کر دیتے ہیں، لیکن لوگوں نے میری بات اتنی محبت سے، اتنے پیار سے اور اتنے اشتیاق سے سنی کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ وہاں بھی میں نے یہ بات عرض کی کہ ہمارے درمیان سرحدیں قائم ہو سکتی ہیں، پولیس اور فوج کے پہرے حائل ہو سکتے ہیں، دریا اور سمندر اور پہاڑوں کے فاصلے حائل ہو سکتے ہیں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسے رشتے میں پرو دیا ہے کہ اس کو دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی، اور وہ ہے کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

اس کلمہ کے ذریعہ زندگی میں انقلاب آجاتا ہے

یہ کلمہ جس نے ہمیں اور آپ کو جوڑا ہوا ہے، عجیب و غریب چیز ہے، عجیب و غریب مناظر دکھاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کلمہ ایسا ہے کہ انسان کی زندگی میں اس کلمے کے پڑھتے ہی اتنا بڑا انقلاب برپا ہوتا ہے کہ اس سے بڑا انقلاب کوئی ہو نہیں سکتا، ایک شخص جو اس کلمہ کے پڑھنے سے پہلے کافر تھا، کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس شخص نے یہ کلمہ نہیں پڑھا تھا، اس وقت تک وہ جہنمی تھا، اللہ کا مبغوض تھا، دوزخ کا مستحق تھا، اور اس کلمے کو پڑھنے کے بعد ایک لمحے کے اندر وہ شخص جنتی بن گیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا محبوب بن گیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ))(۱)

''جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہہ دے بس جنتی ہے''

گناہوں کی سزا بھگتے گا اگر گناہ کیے ہیں، گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آخر انجام اس کا جنت ہے۔ گناہ کیے، غلطیاں کیں، کوتاہیاں کیں، اگر اس نے توبہ نہیں کی تو سزا ملے گی، لیکن سزا ملنے کے بعد آخری انجام اس کا جنت ہے۔ یہ میری بات نہیں، یہ سرکارِ دو عالم ﷺ کا کلام ہے کہ اس سے زیادہ سچا اس کائنات میں کوئی اور کلام ہو نہیں سکتا کہ وہ جنتی ہے، اور کلمہ شریف پڑھنے کے بعد ایک شخص جہنم کے ساتویں طبقے سے نکل کر جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین طبقے تک پہنچ جاتا ہے۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب الایمان عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، باب ما جاء فیمن یموت وهو یشهد ان لا اله الا اللّٰه، رقم: ٢٥٦٢

ایک چرواہے کا ایمان افروز واقعہ

غزوۂ خیبر کا واقعہ یاد آیا، غزوۂ خیبر وہ جہاد ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے یہودیوں کے خلاف حملہ کیا تھا، آپ ﷺ خیبر تشریف لے گئے تھے، خیبر کے قلعے کے باہر پڑاؤ ڈالا ہوا تھا اور اس کا محاصرہ کیا ہوا تھا، اس میں کئی دن گزر گئے، لیکن قلعہ ابھی فتح نہیں ہوا تھا۔ اندر سے یہودیوں کا ایک چرواہا باہر نکلا، وہ بکریاں چرا رہا تھا، سیاہ فام تھا، کالی رنگت تھی اور کسی یہودی نے اس کو بکریاں چرانے کے لئے اپنا نوکر رکھا ہوا تھا، وہ بکریاں چرانے کی غرض سے خیبر کے قلعے سے باہر نکلا، تو دیکھا کہ مسلمانوں کا لشکر ٹھہرا ہوا ہے۔ اس نے یہ سن رکھا تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ حجاز سے یہاں پر حملہ کرنے کے لئے آئے ہیں، یثرب کے بادشاہ ہیں، اس کے دل میں خیال آیا کہ ذرا میں بھی دیکھوں، آج تک میں نے کوئی بادشاہ نہیں دیکھا، اور دیکھ کے آؤں کہ یثرب کا بادشاہ کیسا ہے اور وہ کیا بات کہتا ہے؟ لوگوں سے پوچھا کہ سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ کہاں تشریف فرما ہیں؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اشارہ کرکے بتادیا کہ فلاں خیمہ کے اندر تشریف رکھتے ہیں۔ اوّل تو وہ خیمے کو دیکھ کر ہی حیران رہ گیا، اس کے ذہن میں یہ تھا کہ جب یہ یثرب کے بادشاہ ہیں اور جن کی قوت اور طاقت کا ڈنکا بجا ہوا ہے تو ان کا جو خیمہ ہوگا وہ قالینوں سے مزین ہوگا، اس پر شاندار پردے پڑے ہوئے ہوں گے، باہر پہرے دار کھڑے ہوئے پہرہ دے رہے ہوں گے۔ وہاں جاکر دیکھا تو ایک معمولی کھجور کا بنا ہوا خیمہ نظر آرہا ہے، نہ کوئی چوکیدار ہے نہ کوئی پہرہ دار ہے، نہ کوئی مصاحب ہے نہ کوئی ہٹو بچو کے نعرے لگانے والا ہے۔ خیر وہ چرواہا اندر داخل ہوگیا، اندر سرکارِ دو عالم رحمت للعالمین ﷺ تشریف فرما تھے، اس نے حضور ﷺ کو دیکھا تو بڑی عجیب و غریب نورانی صورت نظر آئی، وہ جلوہ نظر آیا تو دل کچھ کھنچنا شروع ہوا، جاکر عرض کیا کہ آپ یہاں پر کیوں تشریف لائے ہیں؟ آپ کا پیغام اور آپ کی دعوت کیا ہے؟

نبی کریم سرورِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا کہ میری تو ایک ہی دعوت ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ مانو اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لو، کچھ نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ کے جلوہ جہاں آرا اور کچھ آپ ﷺ کے ارشادات ان دونوں کا طبیعت پر اثر ہونا شروع ہوا تو اس نے پوچھا: اچھا یہ بتائیے کہ اگر میں آپ کی اس دعوت کو قبول کرلوں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ لوں تو میرا انجام کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا انجام یہ ہوگا کہ تم تمام مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل کرلو گے، ہم تمہیں سینے سے لگائیں گے اور جو ایک مسلمان کا حق ہے وہی تمہارا بھی حق ہوگا۔

اس نے کہا کہ آپ مجھے سینے سے لگائیں گے؟ ساری عمر کبھی یہ بات اس کے تصور میں بھی

نہیں آئی تھی کہ کوئی سردار یا کوئی بادشاہ یا کوئی سربراہ مجھے گلے لگا سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ میرا حال تو یہ ہے کہ میں سیاہ فام ہوں، میری رنگت کالی ہے، میرے جسم سے بدبو اٹھ رہی ہے، اس حالت میں آپ مجھے کیسے سینے سے لگائیں گے؟

آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم یہ ایمان قبول کرلو گے تو پھر سب تمہیں سینے سے لگائیں گے، تمہارے حقوق تمام مسلمانوں کے برابر ہوں گے۔

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اس نے کہا کہ آپ اتنے بڑے بادشاہ ہو کر مجھ سے مذاق کی بات کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ مجھے گلے سے لگائیں گے۔

نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، میں مذاق نہیں کرتا، واقعۃً میں اس دین کا پیغام لے کر آیا ہوں جو کالے اور گورے، امیر اور مامور، غریب اور سرمایہ دار کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا، وہاں تو فضیلت اس کو حاصل ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہو، اس واسطے تم ہمارے برابر ہو گے اور ہم تمہیں گلے سے لگائیں گے۔ اس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو میں مسلمان ہوتا ہوں۔ پھر اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمدًا رسول اللہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

پھر اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! اب میں مسلمان ہو چکا، اب مجھے بتایئے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ میرے ذمہ فرائض کیا ہیں؟

سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ تم ایسے وقت میں مسلمان ہوئے ہو کہ نہ تو یہ کوئی نماز کا وقت ہے کہ تمہیں نماز پڑھوائی جائے، نہ یہ رمضان کا مہینہ ہے کہ تم سے روزہ رکھوایا جائے، نہ تمہارے پاس مال و دولت ہے کہ تم سے زکوٰۃ دلوائی جائے۔ اس وقت تک حج فرض نہیں ہوا تھا۔ وہ عبادتیں جو عام مشہور ہیں ان کا تو کوئی موقع نہیں، البتہ اس وقت خیبر کے میدان میں ایک عبادت ہو رہی ہے اور یہ وہ عبادت ہے جو تلواروں کے سائے میں انجام دی جاتی ہے، وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ، تو آؤ اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ اس جہاد میں شامل ہو جاؤ۔

اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں جہاد میں شامل تو ہو جاؤں لیکن جہاد میں دونوں باتیں ممکن ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمادے اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسان اپنا خون دے کر آئے، تو اگر میں اس جہاد میں مر گیا اور شہید ہو گیا تو پھر میرا کیا ہوگا؟

سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اس جہاد میں شہید ہو گئے تو میں تمہیں بشارت دیتا ہوں اس بات کی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں سیدھے جنت الفردوس کے اندر لے جائیں گے، تمہارے اس سیاہ جسم کو اللہ تبارک وتعالیٰ منور جسم بنا دیں گے، نورانی جسم بنا دیں گے، اور تم کہتے ہو کہ میرے جسم سے بدبو اٹھ رہی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے جسم کی بدبو کو خوشبو میں تبدیل فرما دیں گے۔

اس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو بس مجھے اور کسی چیز کی حاجت نہیں۔

وہ جو بکریاں لے کر آیا تھا ان کے بارے میں نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ یہ بکریاں جو تم لے کر آئے ہو، یہ کسی اور کی ہیں، ان کو پہلے واپس کر کے آؤ۔

اندازہ لگائیے! میدانِ جنگ ہے، دشمن کی بکریاں ہیں، وہ چرواہا دشمن سے بکریاں باہر لے کر آیا ہے، اگر آپ چاہتے تو ان بکریوں کے ریوڑ کو پکڑ کر مالِ غنیمت میں شامل فرما لیتے، لیکن وہ چرواہا ان کو بطور امانت لے کر آیا تھا اور امانت کو واپس دلوانا یہ نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ کی تعلیمات میں سرفہرست تھا، اس واسطے آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلے ان بکریوں کو قلعے کی طرف بھگا دو تا کہ یہ شہر کے اندر چلی جائیں اور جو مالک ہے اس تک پہنچ جائیں۔ تو پہلے نبی کریم ﷺ نے بکریاں واپس کروائیں پھر اس کے بعد وہ چرواہا جہاد میں شامل ہو گیا، کئی روز تک جہاد جاری رہا، جب جہاد ختم ہوا اور نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ حسبِ معمول شہداء اور زخمیوں کا جائزہ لینے کے لئے نکلے تو جہاں بہت سی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تھے، دیکھا کہ ایک لاش پڑی ہوئی ہے، اس کے گرد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمع ہیں اور آپس میں یہ مشورہ کر رہے ہیں کہ یہ کس کی لاش ہے؟ اس واسطے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو پتہ نہیں تھا کہ یہ کون ہے؟ پہچانتے نہیں تھے۔ آنحضرت ﷺ تشریف لے گئے، جا کر دیکھا تو یہ وہی اسود راعی چرواہے کی لاش تھی، نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ نے اس کو دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ یہ شخص بھی عجیب وغریب انسان ہے، یہ ایسا انسان ہے کہ اس نے اللہ کے لئے کوئی سجدہ نہیں کیا، ایک نماز نہیں پڑھی، اس نے کوئی روزہ نہیں رکھا، اس نے ایک پیسہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کیا، لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ سیدھا جنت الفردوس میں پہنچا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے جسم کی بدبو کو خوشبو سے تبدیل فرما دیا ہے، میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا یہ انجام فرمایا۔[1] بہر حال! یہ جو میں عرض کر رہا تھا کہ ایک لمحے میں یہ کلمہ انسان کو جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین طبقے تک پہنچا دیتا ہے، کوئی مبالغہ کی بات نہیں، درحقیقت اللہ تعالیٰ نے یہ کلمہ ایسا ہی بنایا ہے۔

کلمہ طیبہ پڑھ لینا، معاہدہ کرنا ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کلمہ جو اتنا بڑا انقلاب برپا کرتا ہے کہ جو پہلے دوست تھے وہ دشمن بن گئے، جو پہلے دشمن تھے وہ اب دوست بن گئے، بدر کے میدان میں باپ نے بیٹے کے خلاف اور بیٹے نے باپ کے خلاف تلوار اٹھائی ہے اس کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی وجہ سے، تو اتنا بڑا

(۱) البداية والنهاية (٤/٦٠٩-٦١١)

انقلاب جو برپا ہو رہا ہے، کیا یہ کوئی منتر ہے یا کوئی جادو ہے کہ یہ منتر پڑھا اور جادو کے کلمات زبان سے ادا کیے اور اس کے بعد انسان کے اندر انقلاب برپا ہو گیا۔ ان الفاظ میں کوئی تاثیر ہے یا کیا بات ہے؟ حقیقت میں یہ کوئی منتر یا جادو یا طلسم قسم کے کلمات نہیں، حقیقت میں اس کلمہ کے ذریعہ جو انقلاب برپا ہوتا ہے یا وہ اس واسطے ہوتا ہے کہ جب میں نے کہہ دیا کہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ میں گواہی دیتا ہوں اس بات کی کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے ایک معاہدہ کر لیا اور ایک اقرار کر لیا اس بات کا کہ آئندہ حکم مانوں گا تو صرف اللہ کا مانوں گا، اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکاؤں گا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو اپنا معبود قرار نہیں دوں گا، کسی اور کی بات اللہ کے خلاف نہیں مانوں گا۔ یہ ایک معاہدہ ہے جو انسان نے کر لیا اور جب اللہ کو الٰہ قرار دے لیا اور محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا رسول مان لیا، جس کے معنی یہ ہوئے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو پیغام لے کر آئے ہیں، اس کے آگے سر تسلیم خم کر دوں گا، چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، چاہے عقل مانے یا نہ مانے، دل چاہے یا نہ چاہے، لیکن اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا جب حکم آ گیا تو اس کے بعد پھر اس کی سرتابی کرنے کی مجال نہیں ہوگی۔ یہ ہے معاہدہ، یہ ہے اقرار، یہ ہے میثاق، یہ ہے اعلان اس بات کا کہ آج سے میں نے اپنی زندگی کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی مرضی کے تابع بنا لیا۔ انسان جب یہ اقرار کر لیتا ہے اور یہ معاہدہ کر لیتا ہے تو اس دن سے وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور اس کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔

کلمہ طیبہ کے تقاضے

اس سے پتہ چلا کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ یہ محض کوئی زبانی جمع خرچ نہیں ہے کہ زبان سے کہہ لیا اور بات ختم ہو گئی، بلکہ آپ نے جس دن یہ کلمہ پڑھا، اس دن آپ نے اپنے آپ کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حوالے کر دیا اور اس بات کا وعدہ کر لیا کہ اب میری کچھ نہیں چلے گی، اب تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے تابع زندگی گزاروں گا۔ لہٰذا اس کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے کچھ تقاضے ہیں کہ زندگی گزارو تو کس طرح گزارو، عبادت کس طرح کرو، لوگوں کے ساتھ معاملات کس طرح کرو، اخلاق تمہارے کیسے ہوں، معاشرت تمہاری کیسی ہو، زندگی کے ایک ایک شعبے میں ہدایات ہیں جو اس کلمے کے دائرہ کے اندر آتی ہیں، اور وہ ہدایات سرکارِ دو عالم ﷺ زبانِ مبارک سے بھی دے کر گئے ہیں اور اپنے افعال سے بھی، اپنی زندگی کی ایک ایک نقل و حرکت سے اور ایک ایک ادا سے آپ ﷺ دین کا طریقہ سکھا کر اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اب مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کا علم حاصل کر کے اس کے مطابق اپنی زندگی گزارے، اور زندگی اس کے مطابق

گزارنے کا نام ہی درحقیقت تقویٰ ہے، تقویٰ کے معنی ہیں اللہ کا ڈر، کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور معاہدہ تو کرلیا لیکن میں جب آخرت میں باری تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوں تو مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے کہ جو معاہدہ میں نے کیا تھا، میں نے اس معاہدہ کو پورا نہیں کیا، اس بات کا خوف اور اس بات کے ڈر کا نام ہے تقویٰ!

تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ

پورا قرآن کریم اس سے بھرا ہوا ہے کہ اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو، سارے دین کا خلاصہ اس تقویٰ کے اندر آجاتا ہے۔

اور پھر فرمایا کہ:

﴿وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ﴾ (۱)

اللہ تبارک وتعالیٰ کا کلام بھی عجیب وغریب ہے، کلام اللہ کے عجیب وغریب اعجازات ہیں، ایک جملہ کے اندر باری تعالیٰ جتنا کچھ انسان کے کرنے کا کام ہوتا ہے وہ بھی سارے کا سارا بتادیتے ہیں اور پھر اس پر عمل کرنے کا جو طریقہ ہے اور اس کا جو آسان راستہ ہے وہ بھی اپنی رحمت سے اپنے بندوں کو بتادیتے ہیں کہ ویسے کرنا تمہارے لئے مشکل ہوگا، ہم تمہیں اس کا راستہ بتائے دیتے ہیں۔ فرمایا کہ اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو، تقویٰ اختیار کرلیا تو اب اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی، تقویٰ میں سبھی کچھ آگیا، لیکن سوال پیدا ہوا کہ تقویٰ کیسے اختیار کریں؟ تقویٰ تو بڑا اونچا مقام ہے، اس کے لئے بڑے تقاضے ہیں، بڑی شرائط ہیں، وہ کیسے اختیار کریں، کہاں سے اختیار کریں؟ اس کا جواب اگلے جملے میں باری تعالیٰ نے دے دیا کہ ویسے تقویٰ اختیار کرنا تمہارے لئے مشکل ہوگا لیکن آسان راستہ تمہیں بتائے دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ سچے لوگوں کے ساتھی بن جاؤ، صادقین کے ساتھی بن جاؤ۔ سچے کے معنی صرف یہی نہیں کہ وہ سچ بولتے ہوں اور جھوٹ نہ بولتے ہوں، بلکہ سچے کے معنی یہ ہیں کہ جو زبان کے سچے، جو بات کے سچے، جو معاملات کے سچے، جو معاشرت کے سچے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ اپنے کیے ہوئے معاہدے میں سچے ہیں، ان کے ساتھی بن جاؤ اور ان کی صحبت اختیار کرو، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کرو، جب اُٹھنا بیٹھنا شروع کروگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے تقویٰ کی جھلک تمہارے اندر بھی پیدا فرمادیں گے۔ یہ ہے تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ اور اسی طریقہ سے دین منتقل ہوتا چلا آیا ہے، نبی کریم سرکارِ دوعالم محمد مصطفیٰ ﷺ کے وقت سے لے کر آج تک جو دین آیا ہے، وہ سچے لوگوں کی صحبت سے آیا، صادقین کی صحبت سے آیا۔

(۱) التوبة:۱۱۹

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دین کہاں سے حاصل کیا؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دین کہاں سے حاصل کیا؟ کسی یونیورسٹی میں پڑھا؟ کسی کالج میں پڑھا، کوئی سرٹیفکیٹ حاصل کیا؟ کوئی ڈگری لی، ایک ہی یونیورسٹی تھی وہ سرکارِ دوعالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اُٹھائی، اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین کا رنگ چڑھا دیا، ایسا چڑھایا ایسا چڑھایا کہ اس آسمان وزمین کی نگاہوں نے دین کا ایسا چڑھا ہوا رنگ نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا، نہ اس کے بعد دیکھ سکیں گی۔ وہ لوگ جو دنیا کے معمولی معمولی معاملات کے اُوپر جان قربان کرنے کے لئے تیار ہوتے تھے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے تھے، ایک دوسرے کی جان لینے پر آمادہ ہو جاتے تھے، ان کی نظر میں دنیا ایسی بے حقیقت ہوئی اور ایسی ذلیل ہوئی اور ایسی خوار ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے آگے اور آخرت کے بہبود کے آگے ساری دنیا کے خزانوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا زہد

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا واقعہ یاد آیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک میں قیصر و کسریٰ کی بڑی بڑی سلطنتیں جو اس زمانے کی سپر پاور سمجھی جاتی تھیں (جیسے آج کل روس اور امریکہ) ان کا غرور اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں خاک میں ملا دیا۔ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو شام کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شام کے دورے پر تشریف لے گئے کہ دیکھیں کیا حالات ہیں؟ وہاں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے بھائی کا گھر دیکھوں، دل میں شاید یہ خیال ہوگا کہ ابوعبیدہ بن جراح مدینے سے آئے ہیں اور شام کے گورنر بن گئے ہیں، مدینہ منورہ کا علاقہ بے آب وگیاہ تھا اور اس میں کوئی زرخیزی نہیں تھی، معمولی کھیتی باڑی ہوا کرتی تھی اور شام میں کھیت لہلہا رہے ہیں، زرخیز زمینیں ہیں اور روم کی تہذیب پوری طرح وہاں پر مسلط ہے تو یہاں آنے کے بعد کہیں ایسا تو نہیں کہ دنیا کی محبت ان کے دل میں پیدا ہو گئی ہو اور اپنا کوئی عالی شان گھر بنا لیا ہو جس میں بڑے عیش وعشرت کے ساتھ رہتے ہوں۔ شاید اسی قسم کا کچھ خیال حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں پیدا ہوا ہو، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنے بھائی یعنی ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ امیر المؤمنین! آپ میرا گھر دیکھ کر کیا کریں گے، آپ میرا گھر دیکھیں گے تو آپ کو شاید آنکھیں نچوڑنے کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ بھائی کا گھر دیکھوں۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ایک دن ان کو اپنے ساتھ لے کر چلے، چلتے جارہے ہیں چلتے جارہے ہیں، کہیں گھر نظر ہی نہیں آتا، جب شہر کی آبادی سے باہر نکلنے لگے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ بھائی! میں تمہارا گھر دیکھنا چاہتا تھا، تم کہاں لے جارہے ہو؟

فرمایا: امیر المؤمنین! میں آپ کو اپنے گھر ہی لے جارہا ہوں، بستی سے نکل گئے تو لے جاکر ایک گھاس پھونس کے جھونپڑے کے سامنے کھڑا کردیا اور کہا: امیر المؤمنین! یہ میرا گھر ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس جھونپڑے کے اندر داخل ہوئے، چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھنے لگے، کوئی چیز ہی نظر نہیں آتی، ایک مصلّی بچھا ہوا ہے، اس کے سوا پورے اس جھونپڑے کے اندر کوئی اور چیز نہیں،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ابوعبیدہ! تم زندہ کس طرح رہتے ہو، یہ تمہارے گھر کا سامان کہاں ہے؟

اس پر حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ آگے بڑھے، بڑھ کر ایک طاق سے پیالہ اُٹھا کر لائے، دیکھا تو اس پیالے کے اندر پانی پڑا ہوا تھا اور اس میں روٹی کے کچھ سوکھے ٹکڑے بھیگے ہوئے تھے اور عرض کیا ''امیر المؤمنین! مجھے اپنی مصروفیات اور ذمہ داریوں میں مصروف رہ کر اتنا وقت نہیں ملتا کہ میں کھانا پکا سکوں، اس لئے میں یہ کرتا ہوں کہ ہفتہ بھر کی روٹیاں ایک خاتون سے پکوالیتا ہوں اور وہ ہفتے بھر کی روٹی پکا کر مجھے دے جاتی ہے، میں اس کو اس پانی میں بھگو کر کھالیتا ہوں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے زندگی اچھی گزر جاتی ہے''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تمہارا اور سامان؟

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اور سامان کیا یا امیر المؤمنین! یہ سامان اتنا ہے کہ قبر تک پہنچانے کے لئے کافی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو رو پڑے اور کہا کہ ابوعبیدہ! اس دنیا نے ہم میں سے ہر شخص کو بدل دیا، لیکن خدا کی قسم تم وہی ہو جو سرکار دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میرے گھر پر جائیں گے تو آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ (۱)

یہ وہ شخص ہے جو شام کا گورنر تھا، آج اس شام کے اندر جو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے زیرنگیں تھا، مستقل چار ملک ہیں، اس شام کے گورنر تھے، ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے قدموں میں دنیا کے خزانے روزانہ ڈھیر ہورہے ہیں، روم کی بڑی بڑی طاقتیں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا نام سن کر لرزہ براندام ہیں، ان کے دانت کھٹے ہورہے ہیں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام سے، اور روم کے محلات کے خزانے، زر و جواہر اور زیورات لاکر

(۱) حلية الأولياء (۱/۱۰۱)، الإصابة (۲/۲۵۳)، حياة الصحابة (۲/۳۷۹)

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے قدموں میں ڈھیر کیے جا رہے ہیں، لیکن ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اسے ٹھوکر مار کر اس پھونس کے جھونپڑے میں رہ رہے ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو جماعت تیار کی تھی، حقیقت یہ ہے کہ اس روئے زمین پر ایسی جماعت مل ہی نہیں سکتی، دنیا کو ایسا حقیر اور ایسا خوار کر کے رکھا کہ دنیا کی کوئی حقیقت آنکھوں میں باقی رہی ہی نہیں تھی، اس واسطے کہ ہر وقت دل میں یہ خیال لگا ہوا تھا کہ کسی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے، زندگی ہے تو وہ زندگی ہے، یہ چند روزہ زندگی کیا حقیقت رکھتی ہے، یہ حقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں جاگزیں فرما دی تھی، اسی کا نام تقویٰ ہے۔ یہ کہاں سے حاصل ہوئی؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے حاصل ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں چند دن جس نے گزار لیے، اس کے دل میں دنیا کی حقیقت بھی واضح ہوگئی اور آخرت بھی سامنے آگئی، تو دین اس طریقہ سے چلتا آیا ہے۔

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے، صحابہ کرام سے تابعین نے اور تابعین سے تبع تابعین نے اور اسی طریقہ سے آخر دم تک دین اس طرح پھیلا ہے اور پہنچا ہے۔ جن کی زندگیاں تقویٰ کے سانچے میں ڈھلی ہوتی ہیں، جو کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے تقاضوں کو جاننے اور سمجھنے والے ہوتے ہیں، ان کی صحبت سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے، یہ کتابیں پڑھنے سے نہیں آتی، یہ محض تقریریں لینے سے یا کر لینے سے نہیں آتی، یہ آتی ہے کسی اللہ والے کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے سے، اس کا طرزِ عمل دیکھنے سے، اس کی زندگی کی ادا کو پڑھنے سے، اور اس طرح دین کا یہ رنگ انسان کے اندر منتقل ہوتا ہے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کتابیں پڑھ کر دین حاصل کرلوں گا تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ بالکل صحیح بات کہی ہے۔

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

دین کتاب پڑھ لینے سے نہیں آتا، لفاظیوں سے نہیں آتا، بلکہ بزرگوں کی نظر سے اور ان کی صحبت سے دین آتا ہے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سچے لوگوں کی اور اللہ والوں کی صحبت اختیار کرو، تو اس صحبت کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں بھی متقی بنا دیں گے، تمہارے اندر بھی وہ رنگ پیدا ہو جائے گا۔

سچے اور متقی لوگ کہاں سے لائیں؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سچے لوگ کہاں سے لائیں؟ ہر شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں بھی سچا ہوں، میں بھی صادق ہوں اور اسی فہرست میں داخل ہوں، بلکہ لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! آج کل تو دھوکہ بازی کا دور ہے، ہر شخص لمبا کرتا پہن کر اور عمامہ سر پر لگا کر اور داڑھی لمبی کر کے کہتا ہے کہ میں بھی صادقین میں داخل ہوں، اقبال نے کہا تھا۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دِل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

یہ حالت نظر آتی ہے تو اب کہاں سے لائیں وہ صادقین جن کی صحبت انسان کو کیمیا بنا دیتی ہے، وہ کہاں سے لائیں اللہ والے جن کی ایک نظر سے انسان کی زندگیاں بدل جاتی ہیں، وہ جنید وہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بڑے بڑے اولیاء کرام اس دور میں کہاں سے لے کر آئیں، کس طرح ان کی صحبت حاصل کریں، آج کل تو عیاری کا اور مکاری کا دور ہے۔

ہر چیز میں ملاوٹ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ اس کا ایک بڑا عمدہ جواب دیا کرتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ میاں! لوگ یہ کہتے ہیں کہ آج کل صادقین کہاں سے تلاش کریں؟ ہر جگہ عیاری مکاری کا دور ہے، تو بات دراصل یہ ہے کہ یہ زمانہ ہے ملاوٹ کا، ہر چیز میں ملاوٹ، گھی میں ملاوٹ، چینی میں ملاوٹ، آٹے میں ملاوٹ، دنیا کی ہر چیز میں ملاوٹ، یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ زہر میں بھی ملاوٹ ہے۔ کسی نے لطیفہ سنایا کہ ایک شخص نے ہر چیز میں ملاوٹ دیکھی کہ کوئی چیز خالص نہیں ملتی تو عاجز آ گیا، اس نے سوچا کہ میں خودکشی کرلوں، اس دنیا میں زندہ رہنا فضول ہے جہاں پر کوئی چیز خالص نہیں ملتی، نہ آٹا خالص ملے، نہ چینی خالص ملے، نہ گھی خالص ملے، کچھ بھی خالص نہیں، تو اس نے سوچا کہ خودکشی کرلینی چاہئے اور اس دنیا سے چلے جانا چاہئے۔ چنانچہ وہ بازار سے زہر خرید کر لایا اور وہ زہر کھالیا، اب کھا کر بیٹھا ہے انتظار میں کہ اب موت آئے اور تب موت آئے، لیکن موت ہے کہ آتی ہی نہیں، معلوم ہوا کہ زہر بھی خالص نہیں تھا، تو دنیا کی کوئی چیز خالص نہیں، ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔

حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کی ہر چیز میں ملاوٹ ہے تو بھائی آٹے میں بھی ملاوٹ ہے اور یہ آٹا بھی خالص نہیں ملتا، لیکن یہ بتاؤ کہ اگر آٹا خالص نہیں ملتا تو کسی نے

آٹا کھانا چھوڑ دیا کہ صاحب! آٹا تو اب خالص ملتا نہیں، لہٰذا اب آٹا نہیں کھائیں گے، اب تو بھس کھایا کریں گے، یا گھی اگر خالص نہیں ملتا تو کسی نے گھی کھانا چھوڑ دیا کہ صاحب! گھی تو اب خالص ملتا نہیں، لہٰذا اب مٹی کا تیل استعمال کریں گے، کسی نے بھی باوجود اس ملاوٹ کے دور کے نہ آٹا کھانا چھوڑا، نہ چینی کھانی چھوڑی، نہ گھی کھانا چھوڑا، بلکہ تلاش کرتا ہے کہ گھی کونسی دکان پر اچھا ملتا ہے اور کونسی بستی میں اچھا ملتا ہے، آدمی بھیج کر وہاں سے منگواؤ، مٹھائی کونسی دکان والا اچھی بناتا ہے، آٹا کس جگہ سے اچھا ملتا ہے، وہاں سے جا کر تلاش کر کے لائے گا، اسی کو حاصل کرے گا، اسی کو استعمال کرے گا۔ تو فرمایا کہ بے شک آٹا گھی چینی کچھ خالص نہیں ملتی، لیکن تلاش کرنے والے کو آج بھی مل جاتی ہے۔ اسی طرح مولوی بھی خالص نہیں ملتا، لیکن تلاش کرنے والے کو آج بھی مل جاتا ہے، اگر کوئی اللہ کا بندہ تلاش کرنا چاہے، طلب کرنا چاہے تو اس کو آج کے دور میں بھی صادقین مل جائیں گے، یہ کہنا بالکل شیطان کا دھوکہ ہے کہ آج کے دور میں صادقین ختم ہوئے۔ ارے جب اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ تم صادقین کے ساتھی بن جاؤ، یہ حکم کیا صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کے ساتھ مخصوص تھا کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر عمل کرسکیں، بیسویں صدی میں آنے والے اس پر عمل نہیں کرسکتے؟ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے ہر حکم پر قیامت تک جب تک مسلمان باقی ہیں عمل کرنا ممکن رہے گا، تو اس کے معنی خود بخود نکال لو کہ صادقین اس وقت بھی ہیں، ہاں تلاش کرنے کی بات ہے، یہ نہیں کہ صاحب ملتا ہی نہیں، لہٰذا بیٹھے ہیں، تلاش کرو گے اور طلب پیدا کرو گے تو مل جائے گا۔

جیسی روح ویسے فرشتے!!!

حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں! آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود خواہ کسی حالت میں ہوں، گناہ میں، معصیت میں، کبائر میں، فسق و فجور میں مبتلا ہوں، لیکن اپنے لئے صادقین تلاش کریں گے تو معیار سامنے رکھیں گے جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا اور بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا اور بڑے بڑے اولیاء کرام کا جن کے نام سن رکھے ہیں کہ صاحب! ہمیں تو ایسا صادق چاہئے جیسا کہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ تھے یا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ حالانکہ اصول یہ ہے کہ جیسی روح ویسے فرشتے، جیسے تم ہو ویسے ہی تمہارے مصلح ہوں گے، تم جس معیار کے ہو تمہارے لئے یہی لوگ کافی ہوسکتے ہیں، جنید و شبلی کے معیار کے نہ سہی لیکن تمہارے لئے یہ بھی کافی ہیں۔

مسجد کے مؤذن کی صحبت اختیار کرلو

بلکہ میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ میں تو قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص

اللہ تعالیٰ کی طلب لے کر اپنی مسجد کے ان پڑھ مؤذن کی صحبت میں جا کر بیٹھے گا تو اس کی صحبت سے بھی فائدہ پہنچے گا۔ اس واسطے کہ وہ مؤذن کم از کم پانچ وقت اللہ کا نام بلند کرتا ہے، اس کی آواز فضاؤں میں پھیلتی ہے، وہ اللہ کے کلمے کو بلند کرتا ہے، اس کی صحبت میں جا کر بیٹھو، تمہیں اس سے بھی فائدہ پہنچے گا۔ یہی شیطان کا دھوکا ہے کہ صاحب! ہمیں تو اس معیار کا بزرگ اور اس معیار کا مصلح چاہئے، یہ انسان کا اپنے آپ کو دھوکا دینے کی بات ہے، حقیقت میں تمہاری اپنی اصلاح کے واسطے تمہارے معیار کے اور تمہاری سطح کے مصلح آج بھی موجود ہیں۔

بات لمبی ہوگئی، میں عرض یہ کرنا چاہ رہا تھا کہ دین حاصل کرنے کا اور اس کی سمجھ حاصل کرنے کا اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ معلوم کرنے کا کوئی راستہ آج کل کے حالات میں اس کے سوا نہیں ہے کہ کسی اللہ والے کو اپنا دامن پکڑا دے، اللہ تبارک وتعالیٰ کسی اللہ والے کی صحبت عطا فرما دے تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ دین عطا فرما دیتے ہیں۔

میں آپ حضرات کو مبارک باد پیش کرتا ہوں، بہت سی جگہیں ایسی ہیں کہ وہاں بھی جا کر یہ بات کہنے کی نوبت آتی ہے تو لوگ پوچھتے ہیں کہ صاحب! ہم کہاں جائیں تو بتلانے کے لئے ذرا دشواری ہوتی ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا اتنا بڑا کرم ہے کہ آپ اس کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتے کہ اس بستی میں جو دور افتادہ بستی ہے، کسی کے منہ پر کوئی بات کہنا اچھا نہیں ہوتا، مگر ہمارا دین وہ ہے جو بے تکلف ہے تو اس بے تکلفی کی وجہ سے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بستی کے اندر آپ اور ہم سب پر یہ بڑا فضل فرمایا ہے کہ حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی دامت برکاتہم العالیہ کو اس بستی کے اندر بھیج دیا، اور انہیں کا یہ نور ظہور ہے جو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، یہ مدرسہ، یہ بڑا اجتماع، یہ مسلمانوں کے اندر دینی جذبات، یہ ذوق وشوق اور یہ جوش وخروش، یہ سب کچھ ایک اللہ والے کے دل کی دھڑکنوں سے نکلنے والی آہوں اور دعاؤں کا نتیجہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ نعمت میسر ہے اور ہماری قوم کا حال یہ ہے کہ جب تک نعمت میسر رہتی ہے اس کی قدر نہیں پہچانتے، جب چلی جاتی ہے تو قوم اس کو سر پر بٹھانے کے لئے تیار، اس کا عرس منانے کے لئے تیار، اس کے مزار پر چادریں چڑھانے کے لئے تیار، اس کو آسمان پر اُٹھانے کے لئے تیار، لیکن جب تک وہ نعمت موجود ہے قدر نہیں پہچانیں گے، قدر نہیں مانیں گے، ہمیشہ اس میں عیب ہی نظر آتے رہیں گے، تنقیدیں ہی کرتے رہیں گے، لہٰذا جہاں کوئی اللہ والا بیٹھ گیا ہو، اس کو بہت ہی غنیمت سمجھ کو اس سے استفادہ کی کوشش کیجئے۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو وہ مقام بخشا ہے کہ لوگ سفر کر کے آئیں اور آ کر استفادہ کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بستی کے اندر آپ کو یہ نعمتِ عظمیٰ عطا

فرمائی ہوئی ہے۔ میں دور سے آنے والا، اوّل تو کچھ آتا جاتا نہیں، کوئی اہلیت نہیں، کوئی صلاحیت نہیں، میں آپ سے کیا عرض کروں، لیکن اگر اتنی بات آپ حضرات کے ذہن میں بیٹھ جائے اور اس نعمت کی قدر پہچاننے کی کوشش کرلیں اور اس سے استفادہ کی کوشش کرلیں تو میں سمجھتا ہوں کہ بہت بڑے بڑے جلسوں اور تقریروں کا خلاصہ اور اس کا فائدہ حاصل ہوگیا، یوں تو جلسے اور تقریریں اور کہنا سننا تو بہت ہوتا رہتا ہے اور عام طور پر لوگ کہتے بھی ہیں، سنتے بھی ہیں، لیکن کم از کم اگر دل میں یہ داعیہ اور یہ شوق پیدا ہو جائے کہ کسی اللہ والے کی صحبت سے استفادہ کرنا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس مجلس کا فائدہ حاصل ہوگیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی دین کی صحیح فہم عطا فرمائے، صادقین کی صحبت عطا فرمائے، ان کی محبت اور ان کی خدمت کے ذریعہ دین کا صحیح مزاج ہمارے دلوں کے اندر پیدا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

عقل کا دائرہ کار ☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ. أَمَّا بَعْدُ.

میرے لئے اس اکیڈمی کے مختلف تربیتی کورسوں میں حاضری کا یہ پہلا موقع نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی جو تربیتی کورس منعقد ہوتے رہے ہیں، ان سے بھی خطاب کرنے کا موقع ملا۔ اس مرتبہ مجھ سے یہ فرمائش کی گئی کہ میں ''اسلامائزیشن آف لاز'' (Islamisation of Laws) کے سلسلے میں آپ حضرات سے کچھ گفتگو کروں۔ اتفاق سے ''اسلامائزیشن آف لاز'' کا موضوع بڑا طویل اور ہمہ گیر ہے اور مجھے اس وقت ایک اور جگہ بھی جانا ہے، اس لئے وقت بھی مختصر ہے۔ لیکن اس مختصر سے وقت میں ''اسلامائزیشن آف لاز'' کے صرف ایک پہلو کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

''بنیاد پرست'' ایک گالی بن چکی ہے

جب یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ ہمارا قانون، ہماری معیشت، ہماری سیاست یا ہماری زندگی کا ہر پہلو اسلام کے سانچے میں ڈھلنا چاہئے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ڈھلنا چاہئے؟ اس کی کیا دلیل ہے؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوا کہ آج ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں جس میں سیکولر تصورات (Secular Ideas) اس دنیا کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں اور یہ بات تقریباً ساری دنیا میں بطور ایک مسلمہ مان لی گئی ہے کہ کسی ریاست کو چلانے کا بہترین سسٹم سیکولر سسٹم (Secular System) ہے اور اسی سیکولرازم (Secularism) کے دائرے میں رہتے ہوئے ریاست کو کامیابی کے ساتھ چلایا جاسکتا ہے۔ ایسے ماحول میں جہاں دنیا کی بیشتر ریاستیں بڑی سے لے کر چھوٹی تک، وہ نہ صرف یہ کہ سیکولر (Secular) ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتی ہیں، ایسے معاشرے میں یہ آواز بلند کرنا کہ ''ہمیں اپنے ملک کو، اپنے قانون کو، اپنی معیشت اور

☆ اصلاحی مواعظ (۲/۱۴۷۔۱۷۰)

سیاست کو، اپنی زندگی کے ہر شعبے کو اسلامائیز (Islamize) کرنا چاہئے'' یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ معاشرے کو چودہ سو سال پرانے اصولوں کے ماتحت چلانا چاہئے تو یہ آواز آج کی اس دنیا میں اجنبی اور اجنبی معلوم ہوتی ہے اور اس کو طرح طرح کے طعنوں سے نوازا جاتا ہے۔ بنیاد پرستی اور فنڈامینٹل ازم (Fundamentalism) کی اصطلاح ان لوگوں کی طرف سے ایک گالی بنا کر دنیا میں مشہور کردی گئی ہے، اور ان کی نظر میں ہر وہ شخص بنیاد پرست (Fundamentalist) ہے جو یہ کہے کہ ''ریاست کا نظام دین کے تابع ہونا چاہئے، اسلام کے تابع ہونا چاہئے۔'' ایسے شخص کو بنیاد پرست کا خطاب دے کر بدنام کیا جارہا ہے، حالانکہ اگر اس لفظ کے اصل معنی پر غور کیا جائے تو یہ کوئی بُرا لفظ نہیں تھا۔ فنڈامینٹلسٹ کے معنی یہ ہیں کہ جو بنیادی اصولوں (Fundamental Principles) کو اختیار کرے۔ لیکن ان لوگوں نے اس کو گالی بنا کر مشہور کردیا ہے۔

اسلامائیزیشن کیوں؟

آج کی مجلس میں، میں صرف اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں کہ ہم کیوں اپنی زندگی کو اسلامائیز (Islamize) کرنا چاہتے ہیں؟ اور ہم ملکی قوانین کو اسلام کے سانچے میں کیوں ڈھالنا چاہتے ہیں؟ جبکہ دین کی تعلیمات چودہ سو سال بلکہ بیشتر تو ہزارہا سال پرانی ہیں۔

ہمارے پاس عقل موجود ہے

اس سلسلے میں، میں جس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک سیکولر ریاست (Secular State) جس کو لادینی ریاست کہا جائے، وہ اپنے نظامِ حکومت اور نظامِ زندگی کو کس طرح چلائے، اس کے لئے اس کے پاس کوئی اصول موجود نہیں ہیں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے پاس عقل موجود ہے، ہمارے پاس مشاہدہ اور تجربہ موجود ہے، اس عقل، مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر ہم یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ہمارے اس دور کی ضروریات کیا ہیں؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اور پھر اس کے لحاظ سے کیا چیز ہماری مصلحت کے مطابق ہے؟ اور پھر اسی مصلحت کے مطابق ہم اپنے قوانین کو ڈھال سکتے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں ہم اس کے اندر تبدیلی لاسکتے ہیں اور ترقی کرسکتے ہیں۔

کیا عقل آخری معیار ہے؟

ایک سیکولر نظامِ حکومت میں عقل، تجربے اور مشاہدے کو آخری معیار قرار دے دیا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ معیار کتنا مضبوط ہے؟ کیا یہ معیار اس لائق ہے کہ قیامت تک آنے والی انسانیت

کی رہنمائی کر سکے؟ کیا یہ معیار تنہا عقل کے بھروسے پر، تنہا مشاہدے اور تجربے کے بھروسے پر ہمارے لئے کافی ہو سکتا ہے؟

ذرائع علم

اس کے جواب کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کوئی بھی نظام جب تک اپنی پشت پر اپنے پیچھے علمی حقائق کا سرمایہ نہ رکھتا ہو اس وقت تک وہ کامیابی سے نہیں چل سکتا۔ اور کسی بھی معاملے میں علم حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ ذرائع عطا فرمائے ہیں۔ ان ذرائع میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص دائرۂ کار ہے۔ اس دائرۂ کار تک وہ ذریعہ کام دیتا ہے اور اس سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے، لیکن اس سے آگے وہ ذریعہ کام نہیں دیتا ہے، اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

حواسِ خمسہ کا دائرۂ کار

مثال کے طور پر انسان کو سب سے پہلے جو ذرائع علم عطا ہوئے وہ اس کے حواسِ خمسہ ہیں، آنکھ، کان، ناک اور زبان وغیرہ۔ آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر بہت سی چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ زبان کے ذریعہ چکھ کر علم حاصل ہوتا ہے۔ ناک کے ذریعہ سونگھ کر علم حاصل ہوتا ہے۔ ہاتھ کے ذریعہ چھو کر حاصل ہوتا ہے۔ لیکن علم کے یہ پانچ ذرائع جو مشاہدے کی سرحد میں آتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا ایک دائرۂ کار ہے۔ اس دائرۂ کار سے باہر وہ ذریعہ کام نہیں کرتا۔ آنکھ دیکھ سکتی ہے لیکن سن نہیں سکتی۔ کان سن سکتا ہے، لیکن دیکھ نہیں سکتا۔ ناک سونگھ سکتی ہے، دیکھ نہیں سکتی۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں آنکھ تو بند کرلوں اور کان سے دیکھنا شروع کردوں تو اس شخص کو ساری دنیا احمق کہے گی۔ اس لئے کہ کان اس کام کے لئے نہیں بنایا گیا۔ اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ تمہارا کان نہیں دیکھ سکتا، اس لئے کان سے دیکھنے کی تمہاری کوشش بالکل بیکار ہے، جواب میں وہ شخص کہے کہ اگر کان دیکھ نہیں سکتا تو وہ بیکار چیز ہے تو اس کو ساری دنیا احمق کہے گی۔ اس لئے کہ وہ اتنی بات بھی نہیں جانتا کہ کان کا ایک دائرۂ کار ہے، اس حد تک وہ کام کرے گا۔ اس سے اگر آنکھ کا کام لینا چاہو گے تو وہ نہیں کرے گا۔

دوسرا ذریعۂ علم ''عقل''

پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم کے حصول کے لئے یہ پانچ حواس عطا فرمائے ہیں، ایک مرحلہ پر جا کر ان پانچوں حواس کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ اس مرحلہ پر نہ تو آنکھ کام دیتی ہے، نہ کان کام دیتا ہے، نہ زبان کام دیتی ہے، نہ ہاتھ کام دیتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں اشیا براہِ راست مشاہدہ کی

گرفت میں نہیں آتیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو علم کا ایک اور ذریعہ عطا فرمایا ہے اور وہ ہے ''عقل''، جہاں پر حواسِ خمسہ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں وہاں پر ''عقل'' کام آتی ہے۔ مثلاً میرے سامنے یہ میز رکھی ہے، میں آنکھ سے دیکھ کر یہ بتا سکتا ہوں کہ اس کا رنگ کیا ہے؟ ہاتھ سے چھو کر معلوم کرسکتا ہوں کہ یہ سخت لکڑی کی ہے، اور اس پر فارمیکا لگا ہوا ہے۔ لیکن اس بات کا علم کہ یہ میز وجود میں کیسے آئی؟ یہ بات میں نہ تو آنکھ سے دیکھ کر بتا سکتا ہوں، نہ کان سے سن کر، نہ ہاتھ سے چھو کر بتا سکتا ہوں۔ اس لئے کہ اس کے بننے کا عمل میرے سامنے نہیں ہوا۔ اس موقع پر میری عقل میری رہنمائی کرتی ہے کہ یہ چیز جو اتنی صاف ستھری بنی ہوئی ہے، خود بخود وجود میں نہیں آسکتی۔ اس کو کسی بنانے والے نے بنایا ہے، اور وہ بنانے والا اچھا تجربہ کار ماہر بڑھئی (Carpenter) ہے، جس نے اس کو خوبصورت شکل میں بنایا ہے۔ لہٰذا یہ بات کہ اس کو کسی کارپنٹر نے بنایا ہے مجھے میری عقل نے بتائی۔ تو جس جگہ پر میرے حواسِ خمسہ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا، وہاں میری عقل آئی اور اس نے میری رہنمائی کر کے ایک دوسرا علم عطا کیا۔

عقل کا دائرہ کار

لیکن جس طرح ان پانچوں حواس کا دائرۂ کار لامحدود (Unlimited) نہیں تھا، بلکہ ایک حد پر جا کر ان کا دائرۂ کار ختم ہوگیا تھا، اسی طرح عقل کا دائرۂ کار (Jurisdiction) بھی لامحدود (Unlimited) نہیں ہے۔ عقل بھی ایک حد تک انسان کو کام دیتی ہے۔ ایک حد تک رہنمائی کرتی ہے۔ اس حد سے آگے اگر اس عقل کو استعمال کرنا چاہیں گے تو وہ عقل صحیح جواب نہیں دے گی، صحیح رہنمائی نہیں کرے گی۔

تیسرا ذریعۂ علم ''وحی الٰہی''

جس جگہ عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، وہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو ایک تیسرا ذریعۂ علم عطا فرمایا ہے۔ اور وہ ہے ''وحی الٰہی'' یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وحی اور آسمانی تعلیم۔ یہ ذریعۂ علم شروع ہی اس جگہ سے ہوتا ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جس جگہ ''وحی الٰہی'' آتی ہے، اس جگہ پر عقل کو استعمال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ آنکھ کے کام کے لئے کان کو استعمال کرنا۔ کان کے کام کے لئے آنکھ کو استعمال کرنا۔ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ عقل بیکار ہے۔ نہیں بلکہ وہ کارآمد چیز ہے، بشرطیکہ آپ اس کو اس کے دائرۂ کار (Jurisdiction) میں استعمال کریں۔ اگر اسکے دائرۂ کار سے باہر استعمال کریں گے تو یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص آنکھ اور کان سے سونگھنے کا کام لے۔

اسلام اور سیکولر نظام میں فرق

اسلام اور ایک سیکولر نظامِ حیات میں یہی فرق ہے کہ سیکولر نظام میں علم کے پہلے دو ذرائع استعمال کرنے کے بعد رک جاتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کے پاس علم کے حصول کا کوئی تیسرا ذریعہ نہیں ہے، بس ہماری آنکھ، کان، ناک ہے اور ہماری عقل ہے۔ اس سے آگے کوئی اور ذریعۂ علم نہیں ہے۔ اور اسلام یہ کہتا ہے کہ ان دونوں ذرائع کے آگے تمہارے پاس ایک اور ذریعۂ علم بھی ہے اور وہ ہے ''وحی الٰہی''

وحی الٰہی کی ضرورت

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کا یہ دعویٰ کہ عقل کے ذریعہ ساری باتیں معلوم نہیں کی جاسکتیں، بلکہ آسمانی ہدایت کی ضرورت ہے، وحی الٰہی کی ضرورت ہے، پیغمبروں اور رسولوں کی ضرورت ہے، آسمانی کتابوں کی ضرورت ہے، اسلام کا یہ دعویٰ ہمارے موجودہ معاشرے میں کس حد تک درست ہے؟

عقل دھوکہ دینے والی ہے

آج کل عقل پرستی (Rationalism) کا بڑا زور ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہر چیز کو عقل کی میزان پر پرکھ کر اور تول کر اختیار کریں گے، لیکن عقل کے پاس کوئی ایسا لگا بندھا ضابطہ (Formula) اور کوئی لگا بندھا اصول (Principle) نہیں ہے، جو عالمی حقیقت (Universal Truth) رکھتا ہو۔ جس کو ساری دنیا کے انسان تسلیم کرلیں اور اس کے ذریعہ وہ اپنے خیروشر اور اچھائی اور برائی کا معیار تجویز کرسکیں۔ کون سی چیز اچھی ہے؟ کون سی چیز بُری ہے؟ کون سی چیز اختیار کرنی چاہئے؟ کون سی چیز اختیار نہیں کرنی چاہئے؟ یہ فیصلہ جب ہم عقل کے حوالے کرتے ہیں تو آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ جایئے، اس میں آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اس عقل نے انسان کو اتنے دھوکے دیئے ہیں جس کا کوئی شمار اور حدوحساب ممکن نہیں۔ اگر عقل کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے لئے میں تاریخ سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

بہن سے نکاح خلافِ عقل نہیں

آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے عالمِ اسلام میں ایک فرقہ پیدا ہوا تھا، جس کو ''باطنی فرقہ'' اور ''قرامطہ'' کہتے ہیں۔ اس فرقے کا ایک مشہور لیڈر گزرا ہے جس کا نام عبید اللہ بن حسن قیروانی ہے۔

اس نے اپنے پیروکاروں کے نام ایک خط لکھا ہے وہ خط بڑا دلچسپ ہے۔ جس میں اس نے اپنے پیروکاروں کو زندگی گزارنے کے لئے ہدایات دی ہیں۔ اس میں وہ لکھتا ہے:

''میری سمجھ میں یہ بے عقلی کی بات نہیں آتی ہے کہ لوگوں کے پاس اپنے گھر میں ایک بڑی خوبصورت، سلیقہ شعار لڑکی بہن کی شکل میں موجود ہے اور بھائی کے مزاج کو بھی سمجھتی ہے۔ اس کی نفسیات سے بھی واقف ہے۔ لیکن یہ بے عقل انسان اس بہن کا ہاتھ اجنبی شخص کو پکڑا دیتا ہے۔ جس کے بارے میں یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ نباہ صحیح ہو سکے گا یا نہیں؟ وہ مزاج سے واقف ہے یا نہیں؟ اور خود اپنے لئے بعض اوقات ایک ایسی لڑکی لے آتے ہیں جو حسن و جمال کے اعتبار سے بھی، سلیقہ شعاری کے اعتبار سے بھی، مزاج شناسی کے اعتبار سے بھی اس بہن کے ہم پلہ نہیں ہوتی۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس بے عقلی کا کیا جواز ہے کہ اپنے گھر کی دولت تو دوسرے کے ہاتھ میں دیدے۔ اور اپنے پاس ایک ایسی چیز لے آئے جو اس کو پوری راحت و آرام نہ دے۔ یہ بے عقلی ہے۔ عقل کے خلاف ہے۔ میں اپنے پیروؤں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اس بے عقلی سے اجتناب کریں اور اپنے گھر کی دولت کو گھر ہی میں رکھیں''(۱)

بہن اور جنسی تسکین

اور دوسری جگہ عبید اللہ بن حسن قیروانی عقل کی بنیاد پر اپنے پیروؤں کو یہ پیغام دے رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ:

''کیا وجہ ہے کہ جب ایک بہن اپنے بھائی کے لئے کھانا پکا سکتی ہے، اس کی بھوک دور کر سکتی ہے، اس کی راحت کے لئے اس کے کپڑے سنوار سکتی ہے، اس کا بستر درست کر سکتی ہے تو اس کی جنسی تسکین کا سامان کیوں نہیں کر سکتی؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ تو عقل کے خلاف ہے''(۲)

---

(۱) الفرق بین الفرق للبغدادی، ص: ۲۹۷، وبیان مذاهب الباطنیه للدیلمی، ص: ۸۱

(۲) الفرق بین الفرق للبغدادی، ص: ۲۹۷، وبیان مذاهب الباطنیه للدیلمی، ص: ۸۱

عقلی جواب ناممکن ہے

آپ اس کی بات پر جتنی چاہے لعنت بھیجیں، لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ خالص عقل کی بنیاد پر جو وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہو، جس کو وحی الٰہی کی روشنی میسر نہ ہو، اس عقل کی بنیاد پر آپ اس کے اس استدلال کا جواب دیں۔ خالص عقل کی بنیاد پر قیامت تک اس کے اس استدلال کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔

عقلی اعتبار سے بداخلاقی نہیں

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ تو بڑی بداخلاقی کی بات ہے، بڑی گھناؤنی بات ہے، تو اس کا جواب موجود ہے کہ یہ بداخلاقی اور گھناؤنا پن یہ سب ماحول کے پیدا کردہ تصورات ہیں۔ آپ ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوئے ہیں جہاں اس بات کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے آپ اس کو معیوب سمجھتے ہیں۔ ورنہ عقلی اعتبار سے کوئی عیب نہیں۔

نسب کا تحفظ کوئی عقلی اصول نہیں

اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ اس سے حسب ونسب کا سلسلہ خراب ہو جاتا ہے تو اس کا جواب موجود ہے کہ نسبوں کا سلسلہ خراب ہو جاتا ہے تو ہونے دو۔ اس میں کیا برائی ہے؟ نسب کا تحفظ کون سا ایسا عقلی اصول ہے کہ اس کی وجہ سے نسب کا تحفظ ضرور کیا جائے۔

یہ بھی ہیومن ارج (Human Urge) کا حصہ ہے

اگر آپ اس استدلال کے جواب میں یہ کہیں کہ اس سے طبی طور پر نقصانات ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اب یہ تصورات سامنے آئے ہیں کہ استلذاذ بالاقارب (Incest) سے طبی نقصانات بھی ہوتے ہیں۔

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آج مغربی دنیا میں اس موضوع پر کتابیں آرہی ہیں کہ استلذاذ بالاقارب (Incest) انسان کی فطری خواہش (Human Urge) کا ایک حصہ ہے۔ اور اس کے جو طبی نقصانات بیان کیے جاتے ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں۔ وہی نعرہ جو آج سے آٹھ سو سال پہلے عبیداللہ بن حسن قیروانی نے لگایا تھا، اس کی نہ صرف صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے بلکہ آج مغربی ملکوں میں اس پر کسی نہ کسی طرح عمل بھی ہو رہا ہے۔

وحی الٰہی سے آزادی کا نتیجہ

یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ عقل کو اس جگہ استعمال کیا جا رہا ہے جو عقل کے دائرہ کار (Jurisdiction) میں نہیں ہے۔ جہاں وحی الٰہی کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور عقل کو وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ کی پارلیمنٹ ہم جنس پرستی (Homo Sexuality) کے جواز کا بل تالیوں کی گونج میں منظور کر رہی ہے۔

اور اب تو باقاعدہ یہ ایک علم بن گیا ہے۔ میں ایک مرتبہ اتفاق سے نیویارک کے ایک کتب خانہ میں گیا۔ وہاں پر پورا ایک علیحدہ سیکشن تھا، جس پر یہ عنوان لگا ہوا تھا کہ "گے اسٹائل آف لائف" (GAY STYLE OF LIFE) تو اس موضوع پر کتابوں کا ایک ذخیرہ آچکا ہے اور باقاعدہ ان کی انجمنیں ہیں، ان کے گروپ اور جماعتیں ہیں، اور وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ اس زمانے میں نیویارک کا میئر (Mayor) بھی ایک Gay تھا۔

عقل کا فریب

پچھلے ہفتے کے امریکی رسالے ٹائم کو اگر آپ اٹھا کر دیکھیں تو اس میں یہ خبر آئی ہے کہ خلیج کی جنگ میں حصہ لینے والے فوجیوں میں سے تقریباً ایک ہزار افراد کو صرف اس لئے فوج سے نکال دیا گیا کہ وہ ہم جنس پرست (Homo Sexual) تھے۔ لیکن اس اقدام کے خلاف شور مچ رہا ہے، مظاہرے ہو رہے ہیں، اور چاروں طرف سے یہ آواز اُٹھ رہی ہے کہ یہ بات کہ ہم جنس پرست ہونے کی وجہ سے آپ نے ان لوگوں کو فوج کے عہدوں سے برخاست کر دیا ہے، یہ بات بالکل عقل کے خلاف ہے اور ان کو دوبارہ بحال کرنا چاہئے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ تو ایک ہیومن ارج (Human Urge) ہے۔ اور آج "Human Urge" کا بہانہ لے کر دنیا کی ہر بُری سے بُری بات کو جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ سب عقل کی بنیاد پر ہو رہا ہے کہ بتاؤ عقلی اعتبار سے اس میں کیا خرابی ہے۔ اور یہ تو صرف جنسِ انسانی کی بات تھی۔ اب تو بات جانوروں، کتوں، گدھوں اور گھوڑوں تک نوبت پہنچ گئی ہے اور اس کو بھی باقاعدہ فخریہ بیان کیا جا رہا ہے۔

عقل کا ایک اور فریب

بات واضح کرنے کے لئے ایک اور مثال عرض کر دوں کہ یہ ایٹم بم جس کی تباہ کاریوں سے تمام دنیا آج خوف زدہ اور پریشان ہے، اور ایٹمی اسلحہ میں تخفیف کے طریقے تلاش کر رہی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا (Encyclopedia of Britannica) میں ایٹم بم پر جو مقالہ لکھا گیا ہے اس کو ذرا کھول کر دیکھیں۔ اس میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ دنیا میں ایٹم بم کا استعمال دو جگہ پر کیا گیا ہے۔ ایک ہیروشیما اور دوسرے ناگاساکی پر، اور ان دونوں مقامات پر ایٹم بم کے ذریعہ جو تباہی ہوئی اس کا ذکر تو بعد میں آگے چل کر کیا ہے، لیکن اس مقالے کو شروع یہاں سے کیا گیا ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو ایٹم بم برسائے گئے اس کے ذریعہ ایک کروڑ انسانوں کی جانیں بچائی گئیں، اور ان کو موت کے منہ سے نکالا گیا۔ اور اس کی منطق یہ لکھی ہے کہ اگر ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم نہ گرائے جاتے تو پھر جنگ مسلسل جاری رہتی اور اس میں اندازہ یہ تھا کہ تقریباً ایک کروڑ انسان مزید مر جاتے۔ تو ایٹم بم کا تعارف اس طرح کرایا گیا کہ ایٹم بم وہ چیز ہے جس سے ایک کروڑ انسانوں کی جانیں بچائی گئیں۔ یہ اس واقعہ کا جواز (Justification) پیش کیا جا رہا ہے، جس پر ساری دنیا لعنت بھیجتی ہے کہ ایٹم بم کے ذریعہ ہیروشیما اور ناگاساکی میں ان بچوں کی نسلیں تک تباہ کر دی گئیں، بے گناہوں کو مارا گیا، اور یہ جواز (Justification) بھی عقل کی بنیاد پر ہے۔

لہٰذا کوئی بُری سے بُری بات اور کوئی سنگین سے سنگین خرابی ایسی نہیں ہے جس کے لئے عقل کوئی نہ کوئی دلیل اور کوئی نہ کوئی جواز فراہم نہ کر دے۔

آج ساری دنیا فاشزم (Fascism) پر لعنت بھیج رہی ہے اور سیاست کی دنیا میں ہٹلر اور مسولینی کا نام ایک گالی بن گیا ہے۔ لیکن آپ ذرا ان کا فلسفہ تو اٹھا کر دیکھیں کہ انہوں نے اپنے فاشزم (Fascism) کو کس طرح فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک معمولی سمجھ کا آدمی اگر فاشزم کے فلسفے کو پڑھے گا تو اسے اعتراف ہونے لگے گا کہ بات تو سمجھ میں آتی ہے، معقول بات ہے۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ عقل ان کو اس طرف لے جا رہی ہے۔۔۔ بہرحال! دنیا کی کوئی بد سے بدتر بُرائی ایسی نہیں ہے جس کو عقل کی دلیل کی بنیاد پر صحیح تسلیم کرانے کی کوشش نہ کی جاتی ہو۔ اس لئے کہ عقل کو اس جگہ استعمال کیا جا رہا ہے جہاں اس کے استعمال کی جگہ نہیں ہے۔

عقل کی مثال

علامہ ابن خلدون جو بہت بڑے مؤرخ اور فلسفی گزرے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عقل دی ہے وہ بڑی کام کی چیز ہے۔ لیکن یہ اسی وقت تک کام کی چیز ہے جب اس کو اس کے دائرے میں استعمال کیا جائے۔ لیکن اگر اس کو اس کے دائرہ سے باہر استعمال کرو گے تو یہ کام نہیں دے گی اور پھر اس کی ایک بڑی اچھی مثال دی ہے کہ عقل کی مثال ایسی ہے جیسے سونا تولنے کا کانٹا۔ وہ کانٹا چند گرام سونا تول لیتا ہے اور بس اس حد تک وہ کام دیتا ہے۔ اور وہ صرف سونا تولنے کے لئے بنایا

گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کانٹے میں پہاڑ تولنا چاہے گا تو اس کے نتیجے میں وہ کانٹا ٹوٹ جائے گا اور جب پہاڑ تولنے کے نتیجے میں وہ ٹوٹ جائے تو اگر کوئی شخص کہے کہ یہ کانٹا تو بیکار چیز ہے، اس لئے کہ اس سے پہاڑ تو تلتا نہیں ہے، اس نے تو کانٹے کو توڑ دیا تو اسے ساری دنیا احمق کہے گی۔

بات دراصل یہ ہے کہ اس نے کانٹے کو غلط جگہ پر استعمال کیا اور غلط کام میں استعمال کیا اس لئے وہ کانٹا ٹوٹ گیا۔ (۱)

اسلام اور سیکولرازم میں فرق

اسلام اور سیکولرازم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ بیشک تم عقل کو استعمال کرو، لیکن صرف اس حد تک جہاں تک وہ کام دیتی ہے۔ ایک سرحد ایسی آتی ہے جہاں عقل کام دینا چھوڑ دیتی ہے بلکہ غلط جواب دینا شروع کر دیتی ہے، جیسے کمپیوٹر ہے۔ اگر آپ اس کو اس کام میں استعمال کریں جس کے لئے وہ بنایا گیا ہے تو وہ فوراً جواب دیدے گا۔ لیکن جو چیز اس کمپیوٹر میں فیڈ (Feed) نہیں کی گئی، وہ اگر اس سے معلوم کرنا چاہیں تو نہ صرف یہ کہ وہ کمپیوٹر کام نہیں کرے گا، بلکہ غلط جواب دینا شروع کر دے گا۔ اسی طرح جو چیز اس عقل کے اندر فیڈ نہیں کی گئی، جس چیز کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک تیسرا ذریعہ علم عطا فرمایا ہے، جو وحی الٰہی ہے، جب وہاں عقل کو استعمال کرو گے تو یہ عقل غلط جواب دینا شروع کر دے گی۔ یہی وجہ ہے جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ تشریف لائے۔ جس کے لئے قرآن کریم اتارا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم کی آیت ہے کہ:

﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ﴾ (۲)

''ہم نے آپ کے پاس یہ کتاب بھیجی جس سے واقع کے موافق آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں''

یہ قرآن کریم آپ کو بتائے گا کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے؟ یہ بتائے گا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ یہ بتائے گا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ یہ سب باتیں آپ کو محض عقل کی بنیاد پر نہیں معلوم ہو سکتیں۔

آزادیٔ فکر کے علمبردار ادارے کا حال

ایک معروف بین الاقوامی ادارہ ہے۔ جس کا نام ''ایمنسٹی انٹرنیشنل'' ہے۔ اس کا ہیڈ آفس پیرس میں ہے۔ آج سے تقریباً ایک ماہ پہلے اس کے ایک ریسرچ اسکالر سروے کرنے کے لئے

(۱) مقدمہ ابن خلدون، بحث علم کلام، ص: ۴۴۰
(۲) النساء: ۱۰۵

پاکستان آئے ہوئے تھے۔ خدا جانے کیوں وہ میرے پاس بھی انٹرویو کرنے کے لئے آ گئے اور انہوں نے آکر مجھ سے گفتگو شروع کی کہ ہمارا مقصد آزادی فکر اور حریتِ فکر کے لئے کام کرنا ہے۔ بہت سے لوگ آزادی فکر کی وجہ سے جیلوں اور قیدوں میں بند ہیں۔ ان کو نکالنا چاہتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا غیر متنازعہ موضوع ہے، جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے اس لئے پاکستان بھیجا گیا کہ میں اس موضوع پر مختلف طبقوں کے خیالات معلوم کروں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کا بھی مختلف اہلِ دانش سے تعلق ہے۔ اس لئے میں آپ سے بھی کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔

آج کل کا سروے

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہ سروے کس مقصد کے لئے کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے مختلف حلقوں میں اس سلسلے میں کیا آراء پائی جاتی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کراچی کب تشریف لائے؟ جواب دیا کہ آج صبح پہنچا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ واپس کب تشریف لے جائیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ کل صبح میں اسلام آباد جارہا ہوں (رات کے وقت یہ ملاقات ہو رہی تھی) میں نے پوچھا: اسلام آباد میں کتنے روز قیام رہے گا؟ فرمایا کہ ایک دن اسلام آباد میں رہوں گا۔ میں نے ان سے کہا کہ پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں آپ پاکستان کے مختلف حلقوں کے خیالات کا سروے کرنے جارہے ہیں اور اس کے بعد آپ رپورٹ تیار کر کے پیش کریں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ان دو تین شہروں میں دو تین دن گزارنا آپ کے لئے کافی ہوگا؟ کہنے لگے کہ ظاہر ہے کہ تین دن میں سب کے خیالات تو معلوم نہیں ہو سکتے۔ لیکن میں مختلف حلقہ ہائے فکر سے مل رہا ہوں۔ کچھ لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی ہیں اور اسی سلسلے میں آپ کے پاس بھی آیا ہوں، آپ بھی میری کچھ رہنمائی کریں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آج آپ نے کراچی میں کتنے لوگوں سے ملاقات کی؟ کہنے لگے: میں نے پانچ آدمیوں سے ملاقات کر لی ہے، اور چھٹے آپ ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ ان چھ آدمیوں کے خیالات معلوم کر کے ایک رپورٹ تیار کر دیں گے کہ کراچی والوں کے خیالات یہ ہیں۔ معاف کیجئے مجھے آپ کے اس سروے کی سنجیدگی پر شبہ ہے اس لئے کہ تحقیقی ریسرچ اور سروے کا کوئی کام اس طرح نہیں ہوا کرتا ہے۔ اس لئے میں آپ کے کسی سوال کا جواب دینے سے معذور ہوں۔ اس پر وہ معذرت کرنے لگے کہ میرے پاس وقت کم تھا۔ اس لئے صرف چند حضرات سے مل سکا ہوں۔ احقر نے عرض کیا کہ وقت کی کمی کی صورت میں سروے کا یہ کام ذمہ لینا کیا ضروری تھا؟ پھر انہوں نے اصرار شروع کر دیا کہ اگرچہ آپ کا اعتراض حق بجانب ہے، لیکن میرے چند سوالات کا جواب تو آپ دے ہی دیں۔ احقر نے پھر معذرت کی اور عرض کیا کہ

میں اس غیر سنجیدہ اور نا تمام سروے میں کسی تعاون سے معذور ہوں ۔ البتہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے اس ادارے کی بنیادی فکر کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں ۔ کہنے لگے کہ دراصل تو میں آپ سے سوال کرنے کے لئے آیا تھا، لیکن اگر آپ جواب نہیں دینا چاہتے تو بیشک آپ ہمارے ادارے کے بارے میں جو سوال کرنا چاہیں کرلیں۔

کیا آزادیِ فکر کا نظریہ بالکل مطلق (Absolute) ہے؟

میں نے ان سے کہا کہ آپ نے فرمایا کہ یہ ادارہ جس کی طرف سے آپ کو بھیجا گیا ہے یہ آزادیِ فکر کا علمبردار ہے، بیشک یہ آزادیِ فکر بڑی اچھی بات ہے، لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ آزادیِ فکر آپ کی نظر میں بالکل مطلق (Absolute) ہے؟ یا اس پر کوئی پابندی بھی ہونی چاہئے؟ کہنے لگے کہ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا ۔ میں نے کہا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ آزادیِ فکر کا یہ تصور کیا اتنا ابسلوٹ (Absolute) ہے کہ جو بھی انسان کے دل میں آئے وہ دوسروں کے سامنے برملا کہے اور اس کی تبلیغ کرے اور لوگوں کو اس کی دعوت دے؟ مثلاً میری سوچ یہ کہتی ہے کہ سرمایہ داروں نے بہت دولت جمع کرلی ہے، اس لئے غریبوں کو یہ آزادی ہونی چاہئے کہ وہ ان سرمایہ داروں پر ڈاکے ڈالیں اور ان کا مال چھین لیں اور میں اپنی اسی سوچ کی تبلیغ بھی شروع کردوں کہ غریب جاکر ڈاکہ ڈالیں اور کوئی ان کو پکڑنے والا نہ ہو۔ اس لئے کہ سرمایہ داروں نے غریبوں کا خون چوس کر یہ دولت جمع کی ہے۔ اب آپ بتائیں کہ کیا آپ اس آزادیِ فکر کے حامی ہوں گے یا نہیں؟

آپ کے پاس کوئی نپا تلا معیار (Yardstick) نہیں

وہ کہنے لگے: اس کے تو ہم حامی نہیں ہوں گے۔

میں نے کہا کہ میں یہی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جب آزادیِ فکر کا تصور بالکل ابسلوٹ (Absolute) نہیں ہے، تو کیا آپ اس کو مانتے ہیں کہ کچھ قیدیں ہونی چاہئے؟

انہوں نے کہا کہ ہاں! کچھ قیدیں تو ہونی چاہئے، مثلاً میرا خیال یہ ہے کہ آزادیِ فکر کو اس شرط کا پابند ہونا چاہئے کہ اس کا نتیجہ دوسروں پر تشدد (Violance) کی صورت میں ظاہر نہ ہو۔

میں نے عرض کیا کہ یہ قید تو آپ نے اپنی سوچ کے مطابق عائد کردی، لیکن اگر کسی شخص کی دیانت دارانہ رائے یہ ہو کہ بعض اعلیٰ مقاصد تشدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتے، اور ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے تشدد کے نقصانات برداشت کرنے چاہئیں تو کیا اس کی یہ آزادیِ فکر قابلِ احترام ہے یا نہیں؟ دوسرے جس طرح آپ نے اپنی سوچ سے "آزادیِ فکر" پر ایک پابندی عائد کردی، اسی طرح

اگر کوئی دوسرا شخص اسی قسم کی کوئی اور پابندی اپنی سوچ سے عائد کرنا چاہے تو اس کو بھی اس کا اختیار ملنا چاہئے، ورنہ کوئی وجہ ہونی چاہئے کہ آپ کی سوچ پر عمل کیا جائے اور دوسرے کی سوچ پر عمل نہ کیا جائے لہٰذا اصل سوال یہ ہے کہ وہ قیدیں کیا ہونی چاہئے، اور یہ فیصلہ کون کرے گا کہ یہ قید ہونی چاہئے؟ اور آپ کے پاس وہ معیار کیا ہے جس کی بنیاد پر آپ یہ فیصلہ کریں کہ آزادی فکر پر فلاں قسم کی پابندی لگائی جاسکتی ہے اور فلاں قسم کی پابندی نہیں لگائی جاسکتی؟ آپ مجھے کوئی نپا تلا معیار (Yardstick) بتائیں، جس کے ذریعہ آپ یہ فیصلہ کرسکیں کہ فلاں قسم کی پابندی جائز ہے اور فلاں قسم کی پابندی ناجائز ہے۔

انہوں نے جواب دیا کہ صاحب! ہم نے اس پہلو پر کبھی باقاعدہ غور نہیں کیا۔

میں نے کہا: آپ اتنے بڑے عالمی ادارے سے وابستہ ہیں اور اسی کام کے سروے کے لئے آپ جارہے ہیں اور اسی کام کا بیڑہ اٹھایا ہے، لیکن یہ بنیادی سوال کہ آزادی فکر کی حدود کیا ہونی چاہئیں، اس کا اسکوپ (Scope) کیا ہونا چاہئے، اگر یہ آپ کے ذہن میں نہیں ہے پھر آپ کا یہ پروگرام مجھے بارآور ہوتا نظر نہیں آتا۔ براہِ کرم میرے اس سوال کا جواب آپ مجھے اپنے لٹریچر سے فراہم کردیں، یا دوسرے حضرات سے مشورہ کرکے فراہم کردیں۔

انسان کے پاس وحی کے علاوہ کوئی معیار نہیں

کہنے لگے کہ آپ کے یہ خیالات اپنے ادارے تک پہنچاؤں گا اور اس موضوع پر جو ہمارا لٹریچر ہے وہ بھی فراہم کروں گا۔ یہ کہہ کر انہوں نے میرا پھیکا سا شکریہ ادا کیا اور جلد رخصت ہوگئے۔ میں آج تک ان کے وعدے کے مطابق لٹریچر یا اپنے سوال کے جواب کا منتظر ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ قیامت تک نہ سوال کا جواب فراہم کرسکتے ہیں، نہ کوئی ایسا معیار پیش کرسکتے ہیں جو عالمگیر مقبولیت کا حامل (Universally Applicable) ہو۔ اس لئے کہ آپ ایک معیار متعین کریں گے دوسرا شخص دوسرا معیار متعین کرے گا۔ آپ کا بھی اپنے ذہن کا سوچا ہوا معیار ہوگا۔ اس کا معیار بھی اس کے ذہن کا سوچا ہوا ہوگا۔ اور دنیا میں کوئی شخص ایسا معیار تجویز کردے جو ساری دنیا کے لئے مکمل طور پر قابلِ قبول ہو، یہ بات میں کسی تردید کے خوف کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ واقعتاً انسان کے پاس وحی الٰہی کے سوا کوئی معیار نہیں ہے جو ان مبہم تصورات پر جائز حدیں قائم کرنے کا کوئی لازمی اور ابدی معیار فراہم کرسکے۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے سوا انسان کے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔

صرف مذہب معیار بن سکتا ہے

آپ فلسفہ کو اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے کہ قانون کا اخلاق سے کیا تعلق ہے؟ قانون میں ایک مکتبِ فکر ہے جس کا یہ کہنا ہے کہ قانون کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اچھے بُرے کا تصور غلط ہے۔ نہ کوئی چیز اچھی ہے، نہ کوئی چیز بُری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ Should اور Should not اور Ought وغیرہ کے الفاظ درحقیقت انسان کی خواہشِ نفس کے پیدا کردہ ہیں، ورنہ اس قسم کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس واسطے جو معاشرہ جس وقت جو چیز اختیار کرلے وہ اس کے لئے درست ہے۔ اور ہمارے پاس اچھائی اور برائی کے لئے کوئی معیار نہیں ہے جو یہ بتاسکے کہ فلاں چیز اچھی ہے اور فلاں چیز بُری ہے۔ اور اصولِ قانون پر مشہور ٹیکسٹ بک Jurisprudence ہے، اس میں اس بحث کے آخر میں ایک جملہ لکھا ہے کہ:

> ''انسانیت کے پاس ان چیزوں کے تعین کے لئے ایک چیز معیار بن سکتی تھی، وہ ہے مذہب (Religion) لیکن چونکہ ریلیجن (Religion) کا تعلق انسان کے بلیف (Belief) اور عقیدے سے ہے اور سیکولر نظامِ حیات میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے، اس واسطے ہم اس کو ایک بنیاد کے طور پر نہیں اپنا سکتے''

ہمارے پاس اس کو روکنے کی کوئی دلیل نہیں ہے

ایک اور مثال یاد آگئی ہے، جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا تھا جس وقت برطانیہ کی پارلیمنٹ میں ہم جنس پرستی (Homo Sexuality) کا بل تالیوں کی گونج میں پاس ہوا۔ اس بل کے پاس ہونے سے پہلے کافی مخالفت بھی ہوئی اور اس بل پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو اس مسئلہ پر غور کرے کہ آیا یہ بل پاس ہونا چاہئے یا نہیں؟ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی ہے اور فریڈ مین (Fridman) کی مشہور کتاب ''دی لیگل تھیوری'' (The Legal theory) میں اس رپورٹ کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اس کمیٹی نے ساری رپورٹ لکھنے کے بعد لکھا ہے:

> ''اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ چیز اچھی نہیں لگتی، لیکن چونکہ ہم ایک مرتبہ یہ فیصلہ کرچکے ہیں کہ انسان کی پرائیویٹ زندگی میں قانون کو دخل انداز نہیں ہونا چاہئے اس لئے اس اصول کی روشنی میں جب تک ہم سِن (Sin) اور کرائم (Crime) میں تفریق برقرار رکھیں گے کہ سِن اور چیز ہے اور کرائم علیحدہ چیز ہے، اس وقت تک ہمارے پاس اس عمل کو روکنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہاں! اگر سِن

اور کرائم کو ایک تصور کرلیا جائے تو پھر بیشک اس بل کے خلاف رائے دی جاسکتی ہے۔ اس واسطے ہمارے پاس اس بل کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لئے یہ بل پاس ہوجانا چاہیے"

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "Law" کو اسلامائز کیا جائے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ سیکولر نظام نے حصولِ علم کی جو دو بنیادیں، آنکھ، کان، ناک، زبان وغیرہ اور عقل اختیار کی ہوئی ہیں، اس سے آگے ایک اور قدم بڑھا کر وحی الٰہی کو بھی حصولِ علم اور رہنمائی کا ذریعہ قرار دے کر اس کو اپنا شعار بنائیں۔

اس حکم کی ریزن (Reason) میری سمجھ میں نہیں آتی

اور جب یہ بات ذہن میں آجائے کہ وحی الٰہی شروع ہی وہاں سے ہوتی ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہوجاتی ہے، تو پھر وحی الٰہی کے ذریعہ قرآن وسنت میں جب کوئی حکم آجائے، اس کے بعد اس بنا پر اس حکم کو رد کرنا کہ صاحب اس حکم کا ریزن (Reason) میری سمجھ میں نہیں آتا، احمقانہ فعل ہوگا۔ اس واسطے کہ وحی کا حکم آیا ہی اس جگہ پر ہے جہاں ریزن کام نہیں دے رہی تھی۔ اگر ریزن کام دے چکی ہوتی تو پھر وحی کے آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر اس حکم کے پیچھے جو حکمتیں ہیں اگر ان ساری حکمتوں کا تمہاری عقل ادراک کرسکتی تھی تو پھر اللہ کو وحی کے ذریعہ اس کے حکم دینے کی چنداں حاجت نہیں تھی۔

قرآن وحدیث میں سائنس اور ٹیکنالوجی

یہیں سے ایک اور سوال کا جواب بھی ہوگیا۔ جو اکثر ہمارے پڑھے لکھے طبقے کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ صاحب! آج سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ ساری دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کررہی ہے لیکن ہمارا قرآن اور ہماری حدیث سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں کوئی فارمولا ہمیں نہیں بتاتے، کہ کس طرح ایٹم بم بنائیں، کس طرح ہائیڈروجن بم بنائیں۔ اس کا کوئی فارمولا نہ تو قرآنِ کریم میں ملتا ہے اور نہ حدیث رسول ﷺ میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ سے بعض لوگ احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں کہ صاحب! دنیا چاند اور مریخ پر پہنچ رہی ہے اور ہمارا قرآن ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ چاند پر کیسے پہنچیں؟

سائنس اور ٹیکنالوجی تجربہ کا میدان ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا قرآن ہمیں یہ باتیں اس لئے نہیں بتاتا کہ وہ دائرہ عقل کا ہے۔ وہ تجربہ کا دائرہ ہے۔ وہ ذاتی محنت اور کوشش کا دائرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان کے ذاتی تجربے عقل اور کوشش پر چھوڑا ہے کہ جو شخص جتنی کوشش کرے گا اور عقل کو استعمال کرے گا، تجربہ کو استعمال کرے گا، اس میں آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ قرآن آیا ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کا دائرہ ختم ہو رہا تھا۔ عقل اس کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتی، ان چیزوں کا ہمیں قرآن کریم نے سبق پڑھایا ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں ہمیں یہ معلومات فراہم کی ہیں۔

لہٰذا اسلامائیزیشن آف لاز کا سارا فلسفہ یہ ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی کو اس کے تابع بنائیں۔

اسلام کے احکام میں لچک (Elasticity) موجود ہے

آخر میں ایک بات یہ عرض کردوں کہ جب اُوپر کی بات سمجھ میں آگئی تو پھر دل میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ہم چودہ سو سال پرانی زندگی کو کیسے لوٹائیں؟ چودہ سو سال پرانے اصولوں کو آج کی بیسویں اور اکیسویں صدی پر کیسے اپلائی کریں؟ اس لئے کہ ہماری ضروریات توع بنوع ہیں، بدلتی رہتی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اسلامی علوم سے انسیت نہ ہونے کی وجہ سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اسلام نے اپنے احکام کے تین حصے کیے ہیں، ایک حصہ وہ ہے جس میں قرآن وسنت کی نص قطعی موجود ہے۔ جس میں قیامِ قیامت تک آنے والے حالات کی وجہ سے کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں۔ زمانہ کیسا ہی بدل جائے، لیکن اس میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں اجتہاد اور استنباط کی گنجائش رکھی گئی ہے، اور اس میں اس درجہ کی نصوصِ قطعیہ نہیں ہیں جو زمانہ کے حال پر اپلائی کریں۔ اس میں اسلامی احکام کی لچک (Elasticity) خود موجود ہے۔ اور احکام کا تیسرا حصہ وہ ہے جس کے بارے میں قرآن وسنت خاموش ہیں۔ جن کے بارے میں کوئی ہدایت اور کوئی رہنمائی نہیں کی گئی۔ جن کے بارے میں قرآن وسنت نے کوئی حکم نہیں دیا۔ حکم کیوں نہیں دیا؟ اس لئے کہ اس کو ہماری عقل پر چھوڑ دیا ہے۔ اور اس کا اتنا وسیع دائرہ ہے کہ ہر دور میں انسان اپنی عقل اور تجربہ کو استعمال کر کے اس خالی میدان (Unoccupied Area) میں ترقی کر سکتا ہے اور ہر دور کی ضروریات پوری کر سکتا ہے۔

ان احکام میں قیامت تک تبدیلی نہیں آئے گی

دوسرا حصہ، جس میں اجتہاد اور استنباط کی گنجائش رکھی گئی ہے، اس کے اندر بھی حالات کے لحاظ سے علتوں کے بدلنے کی وجہ سے احکام کے اندر تغیر وتبدل ہوسکتا ہے۔ البتہ پہلا حصہ بیشک کبھی نہیں بدل سکتا۔ قیامت آجائے گی لیکن وہ نہیں بدلے گا۔ اس لئے کہ وہ درحقیقت انسان کی فطرت کے ادراک پر مبنی ہے۔ انسان کے حالات بدل سکتے ہیں، لیکن فطرت نہیں بدل سکتی۔ اور چونکہ وہ فطرت کے ادراک پر مبنی ہیں اس لئے ان میں بھی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔

بہرحال! جہاں تک شریعت نے ہمیں گنجائش دی ہے گنجائش کے دائرہ میں رہ کر ہم اپنی ضروریات کو پورے طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں۔

اجتہاد کہاں سے شروع ہوتا ہے

اجتہاد کا دائرہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں نص قطعی موجود نہ ہو۔ جہاں نص موجود ہو وہاں عقل کو استعمال کر کے نصوص کے خلاف کوئی بات کہنا درحقیقت اپنے دائرۂ کار (Jurisdiction) سے باہر جانے والی بات ہے اور اسی کے نتیجے میں دین کی تحریف کا راستہ کھلتا ہے۔ جس کی ایک مثال آپ حضرات کے سامنے عرض کرتا ہوں۔

خنزیر حلال ہونا چاہئے

قرآن کریم میں خنزیر کو حرام قرار دیا گیا ہے اور یہ حرمت کا حکم وحی کا حکم ہے۔ اس جگہ پر عقل کو استعمال کرنا کہ صاحب! یہ کیوں حرام ہے؟ یہ عقل کو غلط جگہ پر استعمال کرنا ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے خنزیر اس لئے حرام کیا تھا کہ اس زمانے میں خنزیر بڑے گندے تھے اور غیر پسندیدہ ماحول میں پرورش پاتے تھے اور غلاظتیں کھاتے تھے۔ اب تو خنزیر کے لئے بڑے ہائی جینک فارم (Hygenic Farm) تیار کیے گئے ہیں اور بڑے صحت مندانہ طریقے سے پرورش ہوتی ہے، لہٰذا وہ حکم اب ختم ہونا چاہئے، یہ اس جگہ پر عقل کو استعمال کرنا ہے جہاں وہ کام دینے سے انکار کر رہی ہے۔

سود اور تجارت میں کیا فرق ہے؟

اسی طرح ربا اور سود کو جب قرآن کریم نے حرام قرار دے دیا، بس وہ حرام ہوگیا۔ عقل میں

چاہے آئے یا نہ آئے۔ دیکھئے قرآن کریم میں مشرکینِ عرب کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ (۱)

کہ بیع بھی ربا جیسی چیز ہے۔ تجارت اور بیع وشراء سے بھی انسان نفع کماتا ہے اور ربا سے بھی نفع کماتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس کے جواب میں فرق بیان نہیں کیا کہ بیع اور ربا میں یہ فرق ہے بلکہ یہ جواب دیا کہ:

﴿وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (۲)

بس! اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربا کو حرام قر دیا ہے۔ اب آگے اس حکم میں تمہارے لئے چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ جب اللہ نے بیع کو حلال کر دیا ہے تو حلال ہے اور جب اللہ نے ربا کو حرام کر دیا اس لئے حرام ہے۔ اب اس کے اندر چون وچرا کرنا درحقیقت عقل کو غلط جگہ پر استعمال کرنا ہے۔

ایک انوکھا اور دلچسپ واقعہ

ایک واقعہ مشہور ہے کہ ہمارا ایک ہندوستانی گویّا ایک مرتبہ حج کرنے چلا گیا۔ حج کے بعد وہ جب مدینہ شریف جا رہا تھا۔ راستے میں منزلیں ہوتی تھیں۔ ان پر رات گزارنی پڑتی تھی۔ ایک منزل پر جب رات گزارنے کے لئے ٹھہرا تو وہاں ایک عرب گویا آ گیا۔ وہ بدو قسم کا عرب گویا تھا۔ اس نے بہت بھدے انداز سے سارنگی بجا کر گانا شروع کیا۔ آواز بڑی بھدی تھی اور اس کو سارنگی اور طبلہ بھی صحیح بجانا نہیں آتا تھا۔ جب ہندوستانی گویے نے اس کی آواز سنی تو اس نے کہا کہ آج یہ بات میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گانے بجانے کو کیوں حرام قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ آپ نے تو ان بدوؤں کا گانا سنا تھا۔ اگر آپ میرا گانا سن لیتے تو حرام قرار نہ دیتے۔ تو اس قسم کی فکر اور تھنکنگ (Thinking) ڈیولپ (Develop) ہو رہی ہے۔ جس کو اجتہاد کا نام دیا جا رہا ہے۔ یہ نصوصِ قطعیہ کے اندر اپنی خواہشاتِ نفس کو استعمال کرنا ہے۔

آج کے مفکر کا اجتہاد

ہمارے ہاں ایک معروف مفکر ہیں ''مفکر'' اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ اپنی فیلڈ (Field) میں ''مفکر'' (Thinker) سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی یہ جو آیت ہے:

﴿السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا﴾ (۳)

(۱) البقرہ: ۲۷۵ (۲) البقرۃ: ۲۷۵ (۳) المائدۃ: ۳۸

''چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ دو''

ان مفکر صاحب نے اس آیت کی یہ تفسیر کی کہ چور سے مراد سرمایہ دار ہیں جنہوں نے بڑی بڑی صنعتیں قائم کر رکھی ہیں۔ اور ''ہاتھ'' سے مراد ان کی انڈسٹریاں (Industries) اور ''کاٹنے'' سے مراد ان کا نیشنلائیزیشن (Nationalization) ہے، لہٰذا اس آیت کے معنی ہیں کہ سرمایہ داروں کی ساری انڈسٹریوں کو نیشنلائیز کر لیا جائے اور اس طریقے سے چوری کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

اس قسم کے اجتہادات کے بارے میں اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ۔

ز اجتہادے عالمانِ کم نظر
اقتداء با رفتگاں محفوظ تر

''ایسے کم نظر لوگوں کے اجتہاد سے پرانے لوگوں کی باتوں کی اقتدا کرنا زیادہ محفوظ ہے''

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

بہرحال میں آج کی اس نشست سے یہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور شاید میں نے اپنے استحقاق اور اپنے وعدے سے بھی زیادہ وقت آپ حضرات کا لیا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ جب تک ''اسلامائیزیشن آف لاز'' کا فلسفہ ذہن میں نہ ہو، اس وقت تک محض ''اسلامائیزیشن آف لاز'' کے لفظ کی دروبست درست کر لینے سے بات نہیں بنتی۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس لئے اسلامائیزیشن کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا یقین ہو کہ ڈنکے کی چوٹ پر، سینہ تان کر، کسی معذرت خواہی کے بغیر کسی سے مرعوب ہوئے بغیر یہ بات کہہ سکیں کہ ہمارے نزدیک انسانیت کی فلاح کا اگر کوئی راستہ ہے تو وہ صرف ''اسلامائیزیشن'' (Islamisation) میں ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم آپ کو اس کی حقیقت کو صحیح طور پر سمجھنے کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

ایمانِ کامل کی چار علامتیں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

((مَنْ أَعْطَى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ وَأَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ إِيْمَانَهُ))(۱)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو شخص کسی کو کچھ دے تو اللہ کے لئے دے اور کسی کو دینے سے منع کرے تو اللہ کے لئے منع کرے۔ اگر کسی سے محبت کرے تو اللہ کے لئے کرے اور اگر کسی سے بغض اور عناد رکھے تو اللہ کے لئے رکھے تو اس شخص کا ایمان کامل ہو گیا۔

حضورِ اقدس ﷺ نے اس کے ایمان کے کامل ہونے کی گواہی دی۔

ایمانِ کامل کی پہلی علامت

ایمانِ کامل کی پہلی علامت یہ بیان فرمائی کہ وہ دے تو اللہ کے لئے دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی موقع پر کچھ خرچ کر رہا ہے تو اس خرچ کرنے میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت ہو۔ انسان اپنی ذات پر بھی خرچ کرتا ہے، اپنے اہل و عیال پر بھی خرچ کرتا ہے اور صدقہ و خیرات بھی کرتا ہے تو ان تمام مواقع پر خرچ کرتے وقت اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت ہو۔ صدقہ و خیرات میں تو یہ بات واضح ہے کہ اس کو دیتے وقت یہ نیت ہونی چاہئے کہ میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے صدقہ دے رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کا ثواب مجھ کو عطا فرما دیں۔ اس صدقہ دینے میں احسان جتانا مقصود نہ ہو، نام و نمود مقصود نہ ہو، دکھاوا مقصود نہ ہو، تو یہ دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہوا۔

☆ اصلاحی خطبات (۹/ ۲۷۔۴۸)، ۲۵ اگست، ۱۹۹۵ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم: ٢٤٤٥، سنن أبی داؤد، کتاب السنة، باب الدليل على زيادة الايمان ونقصانه، رقم: ٤٠٦١، مسند أحمد، مسند معاذ بن جبل، رقم: ١٥٠٦٤

خرید وفروخت کرتے ہوئے کیا نیت ہونی چاہئے؟

صدقہ وخیرات کے علاوہ بھی جہاں خرچ کرو تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کرلو۔ مثلاً فرض کریں کہ آپ نے کوئی چیز خریدی اور دکان دار کو پیسے دے دیئے۔ اب بظاہر تو یہ ایک دنیاوی معاملہ ہے، لیکن اگر وہ چیز مثلاً گوشت، ترکاری خریدتے وقت یہ نیت کرلی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اہل وعیال کے جو حقوق میرے ذمے عائد کر رکھے ہیں، ان حقوق کی ادائیگی کے لئے یہ خریداری کر رہا ہوں، اور اگر اسی طرح دوسری نیت یہ کرلی کہ میں دکاندار کے ساتھ خرید وفروخت کا جو معاملہ کر رہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اس حلال طریقے کے مطابق کر رہا ہوں جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جائز کیا ہے اور حرام طریقے سے معاملہ نہیں کر رہا ہوں، تو ان دو نیتوں کے ساتھ خریداری کا جو معاملہ کیا اور دکاندار کو جو پیسے دیئے، یہ دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہوا۔ اگرچہ بظاہر یہ نظر آ رہا ہے کہ تم نے ایک دنیاوی لین دین کا معاملہ کیا اور گوشت خریدا یا کپڑا خریدا یا ترکاری خریدی لیکن یہ دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہوا۔

صرف زاویۂ نگاہ بدل لیجئے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دین اور دنیا میں صرف زاویۂ نگاہ بدلنے کا فرق ہے۔ اگر زاویۂ نگاہ بدل لو تو وہی دنیا تمہارے حق میں دین بن جائے گی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم دنیا کے اندر جو کچھ کام کر رہے ہو، سونا، جاگنا، اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، یہ سب کرتے رہو مگر ذرا سا زاویۂ نگاہ بدل لو۔ مثلاً کھانا کھانا ایک دنیاوی کام ہے، لیکن کھانا کھاتے وقت ذرا یہ سوچ لو کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))(۱)

یعنی تمہارے نفس کا بھی تمہارے اُوپر کچھ حق ہے۔ اس حق کی ادائیگی کے لئے کھانا کھا رہا ہوں۔ اور یہ سوچ لو کہ حضورِ اقدس ﷺ کے سامنے جب کھانا آتا تو آپ اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر اس پر شکر کرتے ہوئے کھانا تناول فرمالیا کرتے تھے۔ میں بھی آپ کی اسی سنت کی اتباع میں کھانا کھا رہا ہوں۔ تو اب یہی دنیا کا کام دین کا کام بن گیا۔ لہٰذا وہ سارے کام جن کو ہم دنیاوی کام سمجھتے ہیں، ان میں کوئی بھی کام ایسا نہیں ہے جس کو ہم زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے دین نہ بنا سکیں اور اس کو اللہ کے لئے نہ بنا سکیں۔ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی میں جتنے کام ہم کرتے ہیں ان کے بارے میں

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب من أقسم علی أخیه لیفطر فی التطوع، رقم: ۱۸۳۲، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، رقم: ۳۳۳۷، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب ما یؤمر به من القصد فی الصلاة، رقم: ۱۱۶۲، مسند أحمد، مسند عبداللّٰه بن عمرو، رقم: ۶۵۸۳

ذرا سوچیں کہ میں ان کے اندر زاویہ نگاہ بدل کر کس طرح ان کو دین بنا سکتا ہوں۔

ہر نیک کام صدقہ ہے

لوگ سمجھتے ہیں کہ صدقہ کرنا صرف اس کا نام ہے کہ آدمی کسی ضرورت مند کو پیسے دیدے یا کسی غریب کو کھانا کھلا دے وغیرہ۔ بس یہ کام صدقہ ہے اس کے علاوہ کوئی کام صدقہ نہیں۔ لیکن حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ہر نیک کام جو نیک نیت سے کیا جائے وہ صدقہ ہے۔[1] یہاں تک فرمایا کہ کھانے کا وہ لقمہ جو انسان اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے، یہ بھی صدقہ ہے۔[2] یہ صدقہ اس لئے ہے کہ آدمی یہ کام اس لئے کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ذمے یہ حق عائد کیا ہے، اس حق کی ادائیگی کے لئے میں یہ کام کر رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کام پر صدقہ کا اجر و ثواب عطا فرمائیں گے۔ یہ سب کام اللہ کے لئے دینے میں داخل ہیں۔

ایمانِ کامل کی دوسری علامت

دوسری علامت یہ بیان فرمائی کہ اگر روکے اور منع کرے تو اللہ کے لئے روکے۔ مثلاً کسی جگہ پر پیسہ خرچ کرنے سے بچایا تو وہ بچانا بھی اللہ کے لئے ہو۔ چونکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ فضول خرچی نہ کرو۔ اس فضول خرچی سے بچنے کے لئے میں اپنا پیسہ بچا رہا ہوں۔ تو یہ بچانا اور روکنا اللہ کے لئے ہے۔ یا مثلاً کوئی شخص آپ سے ایسے کام کے لئے پیسوں کا مطالبہ کر رہا ہے جو کام شرعاً ممنوع ہے۔ اب آپ نے اس کام کے لئے اس کو پیسے نہیں دیئے تو یہ نہ دینا اللہ تعالیٰ کیلئے ہوا۔

رسم کے طور پر ہدیہ دینا

ہمارے معاشرے میں نہ جانے کیسے کیسے رسم و رواج پڑ گئے ہیں کہ اس موقع پر فلاں تحفہ دیا جاتا ہے، اس موقع پر فلاں تحفہ دیا جاتا ہے، اس موقع پر یہ رسم ہے۔ اگر اس موقع پر نہیں دیں گے تو ناک کٹ جائے گی۔ اب اس موقع پر تحفہ دینے کا نہ تو شریعت نے کوئی حکم دیا اور نہ اللہ اور اللہ کے

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب کل معروف صدقة، رقم: ۵۵٦۲، صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب بیان أن اسم الصدقة یقع علی کل نوع من المعروف، رقم: ۱٦۷۳، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی طلاقة الوجه وحسن البشر، رقم: ۱۸۹۳

(۲) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب ما جاء ان الاعمال بالنیة والحسبة، رقم: ۵٤، سنن الدارمی، کتاب الوصایا، باب الوصیة بالثلث، رقم: ۳۰٦۵

رسول ﷺ نے کوئی حکم دیا۔ مثلاً تقریبات اور شادیوں میں ''نیوتہ'' دیا جاتا ہے، اس کو اس قدر لازمی سمجھا جاتا ہے کہ چاہے کسی کے پاس پیسے ہوں یا نہ ہوں، چاہے وہ قرض لے، چاہے وہ حرام طریقے سے کما کر دے یا رشوت لے کر دے، لیکن یہ ''نیوتہ'' ضرور دے، اگر نہیں دے گا تو معاشرے میں ناک کٹ جائے گی۔ اب ایک شخص کے پاس دینے کے لئے پیسے موجود ہیں اور معاشرے کی طرف سے دینے کا مطالبہ بھی ہے لیکن وہ شخص صرف اس لئے نہیں دے رہا کہ چاہے معاشرے کے اندر ناک کٹ جائے لیکن میرا اللہ تعالیٰ تو راضی ہوگا۔ اب یہ روکنا اللہ کیلئے ہوگا۔ یہ بھی ایمانِ کامل کی علامت ہے۔

ایمانِ کامل کی تیسری علامت

تیسری علامت یہ بیان فرمائی کہ اگر محبت کرے تو اللہ کے لئے محبت کرے۔ دیکھئے! ایک محبت تو بغیر کسی شائبہ کے خالصۃً اللہ کے لئے ہوتی ہی ہے۔ جیسے کسی اللہ والے سے محبت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے محبت اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ اس سے پیسے کمائیں گے بلکہ اس سے محبت اس نیت سے ہوتی ہے کہ اس سے محبت اور تعلق رکھیں گے تو ہمارے دین کا فائدہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے۔ یہ محبت اللہ کے لئے ہے اور بڑی برکت کی اور بڑے فائدے کی چیز ہے۔

دنیا کی خاطر اللہ والوں سے تعلق

بعض اوقات شیطان اور انسان کا نفس اس محبت میں بھی صحیح راستے سے گمراہ کر دیتا ہے۔ مثلاً اولیاء اللہ سے اس تعلق کے وقت شیطان یہ نیت دل میں ڈال دیتا ہے کہ اگر ہم ان کے مقرب بنیں گے تو دنیا والوں کی نگاہ میں ہماری قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔ العیاذ باللہ۔ یا مثلاً لوگ یہ کہیں گے یہ صاحب تو فلاں بزرگ کے خاص آدمی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو محبت خالص اللہ کے لئے ہونی چاہئے تھی وہ اللہ کے لئے نہیں ہوتی بلکہ وہ محبت دنیاداری کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یا بعض لوگ کسی اللہ والے کے ساتھ اس لئے رابطہ جوڑ لیتے ہیں کہ ان کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، صاحبِ منصب اور صاحبِ اقتدار بھی آتے ہیں اور بڑے بڑے مالدار لوگ بھی آتے ہیں۔ جب ہم ان بزرگ کے پاس جائیں گے تو ان لوگوں سے بھی تعلقات قائم ہوں گے اور پھر اس تعلق کے ذریعہ ان سے اپنی ضروریات اور اپنے مقاصد پورے کریں گے۔ العیاذ باللہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو محبت اللہ کیلئے ہونی تھی وہ دنیا حاصل کرنے کے لئے ہوگئی۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی اللہ والے کے پاس یا کسی استاد کے پاس یا کسی شیخ کے پاس دین حاصل کرنے کے لئے جارہا ہے تو یہ محبت خالص اللہ کے لئے ہے اور حب فی اللہ میں داخل ہے اور اس محبت پر اللہ تعالیٰ نے بڑے ثمرات اور اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔

دنیاوی محبتیں بھی اللہ کے لئے ہونی چاہئیں

لیکن اس محبت کے علاوہ جو دنیاوی محبتیں کہلاتی ہیں مثلاً ماں سے محبت ہے یا باپ سے محبت ہے یا بھائی بہن سے محبت ہے یا بیوی بچوں سے محبت ہے۔ رشتہ داروں سے محبت ہے، دوستوں سے محبت ہے، اگر انسان ذرا سا زاویہ نگاہ بدل لے تو یہ محبتیں بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص والدین سے محبت اس نیت سے کرے کہ اللہ اور اللہ کے رسول جناب رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ والدین سے محبت کرو۔ یہاں تک فرمادیا کہ اگر کوئی شخص والدین پر محبت سے ایک نظر ڈال لے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب عطا فرمائیں گے۔ اب بظاہر دیکھنے میں وہ شخص طبعی تقاضے کے نتیجے میں والدین سے محبت کر رہا ہے لیکن حقیقت میں وہ محبت اللہ کیلئے ہے۔

بیوی سے محبت اللہ کے لئے ہو

بیوی سے محبت ہے۔ اب بظاہر تو یہ محبت نفسانی تقاضے سے ہے۔ لیکن محبت میں اگر آدمی یہ نیت کر لے کہ اللہ اور اللہ کے رسول جناب رسول اللہ ﷺ نے اس محبت کا حکم دیا ہے اور میں حضور اکرم ﷺ کی سنت کی اتباع میں بیوی سے محبت کر رہا ہوں تو یہی محبت اب اللہ کے لئے ہو گئی۔ اب اگر ایک شخص اللہ کے لئے بیوی سے محبت کر رہا ہے اور دوسرا شخص اپنی نفسانی خواہشات کے لئے بیوی سے محبت کر رہا ہے تو بظاہر دیکھنے میں دونوں محبتیں ایک جیسی نظر آئیں گی، کوئی فرق معلوم نہیں ہو گا لیکن دونوں محبتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ احادیث میں یہ بات ثابت ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ اپنی ازواج مطہرات سے بڑی محبت فرماتے تھے اور ان کی دلداری کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں فرماتے تھے۔ حضورِ اقدس ﷺ کے ازواج مطہرات کے ساتھ ایسے ایسے معاملات نظر آتے ہیں جو بعض اوقات ہم جیسے لوگوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً حدیث شریف میں ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو گیارہ عورتوں کی کہانی سنائی کہ گیارہ عورتیں ایک جگہ جمع ہوئیں اور انہوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ ہر عورت اپنے اپنے شوہر کا حال بیان کرے گی۔ پھر ایک عورت نے یہ کہا۔ دوسری عورت نے یہ کہا۔ تیسری نے یہ کہا۔ چوتھی نے یہ کہا وغیرہ۔ اب جس ذاتِ گرامی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہو رہی ہے اور جس ذاتِ گرامی کا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہے، وہ ذاتِ گرامی اپنی بیوی کو گیارہ عورتوں کا قصہ سنا رہے ہیں۔ (۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب حسن المعاشرة مع الأهل، رقم: ۴۷۹۰، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب ذکر حدیث أم زرعة، رقم: ۴۴۸۱

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ سفر پر تشریف لے جارہے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں، راستے میں ایک کھلا میدان آیا تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ دوڑ لگاؤ گی؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں۔ چنانچہ آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس میدان میں دوڑ لگائی۔ وہاں بے پردگی کا کوئی احتمال نہیں تھا۔ اس لئے کہ جنگل تھا اور کوئی دوسرا شخص ساتھ نہیں تھا۔ (۱)

ہمارے کام نفسانی خواہش کے تابع ہوتے ہیں

اب بظاہر یہ کام ایسے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ سے یا اللہ کی عبادت سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ہم میں سے کوئی شخص بیوی کی دلداری اور اس کی دلجوئی کے لئے اس قسم کا کوئی تفریح کا کام کرتا ہے تو وہ بھی بظاہر ایسا ہی لگتا ہے جیسے حضورِ اقدس ﷺ دلجوئی کا معاملہ فرمایا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے اس کام میں اور حضورِ اقدس ﷺ کے اس کام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہم اس کام کو اپنی نفسانی خواہش اور نفسانی تقاضے کی بنیاد پر کرتے ہیں اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ اپنے مقامِ بلند سے نیچے اُتر کر اس کام کو اس لئے کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ بیوی کی دلداری کرو۔

''عارف'' کون ہوتا ہے؟

صوفیاءِ کرام نے فرمایا کہ ''عارف'' یعنی جو اللہ کی معرفت اور شریعت وطریقت کی معرفت رکھتا ہو، وہ ''عارف'' مجموعۂ اضداد ہوتا ہے۔ یعنی اس کی ذات میں اور اس کے عمل میں ایسی چیزیں جمع ہوتی ہیں جو بظاہر دیکھنے میں متضاد معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک طرف اس کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے بھی جڑا ہوا ہے۔ تعلق مع اللہ بھی حاصل ہے اور ملکہ یادداشت بھی حاصل ہے۔ یعنی ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر وفکر اور اس کی یاد دل میں بسی ہوئی ہے اور دوسری طرف لوگوں کے ساتھ اور گھر والوں کے ساتھ ہنس رہا ہے، بول بھی رہا ہے، کھا بھی رہا ہے، پی بھی رہا ہے۔ اس لئے ایسا شخص مجموعۂ اضداد ہوتا ہے۔

مبتدی اور منتہی کے درمیان فرق

اسی طرح صوفیاءِ کرام نے فرمایا کہ جو آدمی مبتدی ہوتا ہے یعنی جس نے ابھی طریقت کے راستے پر چلنا شروع کیا ہے اور دوسرا آدمی جو منتہی ہوتا ہے یعنی جو طریقت کا پورا راستہ طے کر کے آخری انجام تک پہنچ گیا ہے، ان دونوں کی ظاہری حالت ایک جیسی ہوتی ہے۔ بظاہر دونوں ایک جیسے نظر آتے

(۱) سنن أبي داود، كتاب الجهاد، باب في السبق على الرجل، رقم: ۲۲۱۴

ہیں اور جو آدمی درمیان میں ہوتا ہے اس کی حالت علیحدہ ہوتی ہے۔

مثلاً ایک شخص ہم جیسا مبتدی ہے جس نے ابھی دین کے راستے پر چلنا شروع کیا ہے تو وہ دنیا کے سارے کام کر رہا ہے۔ کھا رہا ہے، پی رہا ہے، ہنس بول رہا ہے، خرید و فروخت کر رہا ہے، بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہا ہے۔ دوسری طرف حضور اقدس ﷺ ہیں کہ آپ بازار میں خرید و فروخت بھی کر رہے ہیں، مزدوری بھی کر رہے ہیں، بیوی بچوں کے ساتھ ہنس بول بھی رہے ہیں جبکہ آپ منتہی ہیں۔ اب بظاہر مبتدی اور منتہی کی حالت ایک جیسی نظر آ رہی ہے۔ لیکن حقیقت میں دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور ایک تیسرا آدمی ہے جو مبتدی سے ذرا آگے بڑھ گیا ہے اور درمیان راستے میں ہے۔ اس کی حالت الگ ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ نہ تو بازار میں جاتا ہے، نہ بیوی بچوں کے ساتھ ہنستا بولتا ہے اور ہر وقت اللہ کی یاد اور استغراق میں لگا ہوا ہے۔ صبح سے شام تک اس کے علاوہ اس کا کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ یہ درمیان والا شخص ہے۔

مبتدی اور منتہی کی مثال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان تینوں اشخاص کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ جیسے ایک دریا ہے، ایک آدمی دریا کے اس کنارے پر کھڑا ہے اور دوسرا آدمی دریا پار کر کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہے اور تیسرا آدمی دریا کے اندر ہے، دریا پار کر رہا ہے اور ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے۔ اور اب بظاہر وہ شخص جو اس کنارے پر کھڑا ہے اور وہ شخص جو دوسرے کنارے پر کھڑا ہے، دونوں کی ظاہری حالت ایک جیسی ہے۔ یہ بھی ساحل پر کھڑا ہے اور وہ بھی ساحل پر کھڑا ہے لیکن جو اس ساحل پر کھڑا ہے وہ ابھی تک دریا میں داخل ہی نہیں ہوا اور ابھی تک اس نے دریا کی موجوں کا مقابلہ نہیں کیا ہے لیکن جو شخص دوسرے ساحل پر کھڑا ہے وہ دریا پار کر کے اور دریا کی موجوں کا مقابلہ کر کے دوسرے ساحل پر پہنچ چکا ہے۔ اور تیسرا شخص ابھی دریا میں غوطے لگا رہا ہے اور دوسرے ساحل پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے اور موجوں سے لڑ رہا ہے۔ اب بظاہر یہ نظر آ رہا ہے کہ یہ تیسرا شخص بڑا بہادر ہے جو دریا کی موجوں سے کھیل رہا ہے اور طوفانوں کا مقابلہ کر رہا ہے لیکن حقیقتاً بہادر وہ ہے جو ان موجوں اور طوفانوں کا مقابلہ کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکا ہے۔ اور اب اس کی حالت اس شخص جیسی ہوگئی جو ابھی تک دریا میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اس وجہ سے مبتدی اور منتہی کی حالت ایک جیسی نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت میں دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

حب فی اللہ کے لئے مشق کی ضرورت ہے

اب یہ کہ دنیاوی محبتیں بھی اللہ کے لئے ہو جائیں، یہ درجہ حاصل کرنے کے لئے انسان کو کچھ مشق کرنی پڑتی ہے۔ اور بزرگانِ دین اور صوفیاء کرام کے پاس جب کوئی شخص اپنی اصلاح کرانے کے لئے جاتا ہے تو یہ حضرات مشق کراتے ہیں کہ یہ ساری محبتیں اسی طرح رہیں لیکن ان محبتوں کا زاویہ بدل جائے اور ان کا طریقہ اس طرح بدل جائے کہ یہ محبتیں حقیقت میں اللہ کے لئے ہو جائیں۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ان محبتوں کو بدلنے کی سالہا سال تک مشق کی ہے تب جا کر اس میں کامیابی ہوئی اور اس طرح مشق کی ہے کہ مثلاً گھر میں داخل ہوئے، کھانے کا وقت ہے، بھوک لگی ہوئی ہے، اب کھانا کھانے کے لئے بیٹھے اور کھانا سامنے آیا۔ اب دل چاہ رہا ہے کہ جلدی سے کھانا شروع کر دیں لیکن ایک لمحے کے لئے رک گئے اور دل میں یہ خیال لائے کہ نفس کے تقاضے سے کھانا نہیں کھائیں گے۔ پھر یہ سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے نفس کا مجھ پر حق رکھا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ آپ کے سامنے جب کھانا آتا تو آپ شکر ادا کرتے ہوئے اور اس کھانے کی طرف اپنی احتیاج ظاہر کرتے ہوئے کھانا کھا لیا کرتے تھے۔ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کی اتباع کرنی چاہئے۔ لہٰذا آپ کی اتباع میں کھانا کھاتا ہوں۔ پھر کھانا شروع کیا۔ اس طرح زاویہ نگاہ بدل دیا۔

بچوں کے ساتھ بھی اللہ کے لئے محبت ہو

اسی طرح گھر میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ بچہ کھیل رہا ہے اور وہ بچہ کھیلتا ہوا اچھا لگا اور دل چاہا کہ اس کو گود میں اُٹھا کر اس کو پیار کروں۔ اس کے ساتھ کھیلوں۔ لیکن ایک لمحے کے لئے رک گئے اور یہ سوچا کہ اپنے نفس کے تقاضے سے بچے سے پیار نہیں کریں گے۔ پھر دوسرے لمحے دل میں خیال لائے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ آپ بچوں سے محبت فرمایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز مسجدِ نبوی میں جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، اتنے میں حضرت حسن یا حضرت حسین رضی اللہ عنہما گرتے پڑتے مسجدِ نبوی میں پہنچ گئے۔ جب آپ نے ان کو آتا دیکھا تو فوراً منبر سے اُترے اور ان کو گود میں اُٹھا لیا۔ (۱)

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نوافل پڑھ رہے تھے، حضرت امامہ رضی اللہ عنہا جو بچی تھیں وہ آکر آپ کے کندھے پر کسی طرح سوار ہو گئیں۔ جب آپ رکوع میں جانے لگے تو آپ نے ان کو آہستہ سے اُٹھا کر

---

(۱) حیاۃ الصحابۃ (۲/۶۱۳)

نیچے اُتار دیا۔ جب آپ سجدے میں گئے تو پھر وہ آپ کے اُوپر سوار ہو گئیں۔ (۱)

بہر حال! بچوں کے ساتھ پیار کرنا، محبت کرنا، ان کے ساتھ کھیلنا، یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے۔ اس سنت کی اتباع میں میں بھی بچوں سے پیار کرتا ہوں اور ان کے ساتھ کھیلتا ہوں۔ یہ تصور کر کے بچے کو اُٹھا لیا اور سنت کا استحضار کر لیا۔ شروع شروع میں آدمی تکلف سے یہ کام کرتا ہے لیکن بار بار کرنے کے نتیجے میں تکلف باقی نہیں رہتا بلکہ وہ کام طبیعت بن جاتا ہے اور پھر اس کے بعد ساری محبتیں اللہ کے لئے ہو جاتی ہیں۔ چاہے بیوی سے محبت ہو یا بچوں سے محبت ہو یا چاہے والدین سے محبت ہو۔

یہ نسخہ تو بہت آسان ہے۔ اس سے زیادہ آسان نسخہ اور کیا ہوگا کہ سب کام جو تم کرتے ہو اسی طرح کرتے رہو، صرف زاویۂ نگاہ بدل لو اور نیتوں کے اندر تبدیلی لے آؤ۔ لیکن اس آسان نسخہ پر عمل اس وقت ہوگا جب انسان اس کے لئے تھوڑی سی محنت اور مشقت کرے اور ہر ہر قدم پر اس مشق کو کرنے کی کوشش کرے۔ پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ ساری محبتیں اللہ کے لئے ہو جائیں گی۔

حبّ فی اللہ کی علامت

اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ کے لئے محبت ہونے کی علامت کیا ہے؟ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر کسی وقت اللہ کی محبت کا یہ تقاضا ہو کہ میں ان محبتوں کو خیر باد کہہ دوں اور چھوڑ دوں تو اس وقت انسان کی طبیعت پر نا قابلِ برداشت بوجھ نہ ہو۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ محبت اللہ کے لئے ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات یاد آگئی۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ آپ نے حاضرینِ مجلس سے فرمایا کہ آج اللہ تعالیٰ نے اپنے امتحان کا ایک عجیب موقع عطا فرمایا۔ وہ یہ کہ جب میں گھر گیا اور اہلیہ سے بات ہوئی تو اہلیہ نے تلخ لہجے میں کوئی بات کہہ دی۔ اس وقت میرے منہ سے یہ نکلا کہ ''بی بی مجھے اس لہجے کی برداشت نہیں اور اگر تم کہو تو میں یہ کرنے کے لئے تیار ہوں کہ اپنی چارپائی اُٹھا کر خانقاہ میں ڈال لوں اور ساری عمر وہیں گزار دوں، لیکن مجھے اس لہجے کی برداشت نہیں''

حضرت نے فرمایا کہ میں نے اپنی اہلیہ سے یہ بات کہہ تو دی لیکن بعد میں میں نے سوچا اور اپنا جائزہ لیا کہ بڑی بات کہہ دی کہ چارپائی اُٹھا کر خانقاہ میں ڈال دوں اور ساری عمر اس طرح

(۱) یہ حضرت امامہ بنت ابی العاص ہیں جو کہ حضور ﷺ کی نواسی ہیں۔ صحیح البخاری (۸۸۷/۲)، طبقات ابن سعد (۳۹/۸)

گزار دوں، کیا تم اس کام کے کرنے پر قادر بھی ہو؟ اگر اہلیہ کہہ دے کہ چلو ایسا کرلو تو کیا ایسا کرلو گے؟ اور ساری عمر خانقاہ میں گزار دو گے یا ویسے ہی جھوٹا دعویٰ کردیا؟ لیکن جائزہ لینے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ الحمدللہ میں اس کام پر قادر ہوں۔ چونکہ ساری محبتیں اللہ کے لئے ہوگئی ہیں اس لئے اب اگر کسی وقت اللہ کی محبت کی خاطر دوسری محبت کو چھوڑنا پڑے تو اس وقت کوئی نا قابلِ برداشت بوجھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ محبت تبدیل ہوکر اللہ کے لئے محبت بن گئی ہے۔

لیکن یہ مقام اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے محنت اور مشق کرنی پڑتی ہے اور یہ محنت اور مشق ایسی چیز نہیں ہے جو ناممکن ہو بلکہ ہر انسان کرسکتا ہے۔ پھر اس محنت اور مشق کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ مقام عطا فرمادیتے ہیں وہ کرکے دیکھنے کی بات ہے۔ یہ سب "احب للّٰہ" اللہ کے لئے محبت میں داخل ہے۔

ایمانِ کامل کی چوتھی علامت

چوتھی علامت ہے "وابغض للّٰہ" بغض اور غصہ بھی اللہ کے لئے ہو۔ یعنی جس کسی پر غصہ ہے یا جس کسی سے بغض ہے وہ اس کی ذات سے نہیں ہے بلکہ اس کے کسی بُرے عمل سے ہے یا اس کی کسی ایسی بات سے ہے جو مالکِ حقیقی کی ناراضگی کا سبب ہے تو یہ غصہ اور ناراضگی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔

ذات سے نفرت نہ کریں

اس لئے بزرگوں نے ایک بات فرمائی ہے جو ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے۔ وہ یہ کہ نفرت اور بغض کافر سے نہیں بلکہ اس کے کفر سے ہے۔ فاسق سے بغض نہیں بلکہ اس کے فسق سے بغض ہے۔ نفرت اور بغض گناہگار سے نہیں بلکہ گناہ سے ہے۔ جو آدمی فسق و فجور اور گناہ کے اندر مبتلا ہے اس کی ذات غصہ کا محل نہیں بلکہ اس کا فعل غصہ کا محل ہے۔ اس لئے کہ ذات تو قابلِ رحم ہے۔ وہ بیچارہ بیمار ہے، کفر کی بیماری میں مبتلا ہے، فسق کی بیماری میں مبتلا ہے اور نفرت بیمار سے نہیں ہوتی بلکہ بیماری سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اگر بیمار سے نفرت کروگے تو پھر اس کی کون دیکھ بھال کرے گا؟ لہٰذا فسق و فجور سے اور کفر سے نفرت ہوگی اس کی ذات سے نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اس کی ذات فسق و فجور سے باز آجائے تو وہ ذات گلے لگانے کے لائق ہے۔ اس لئے کہ ذات کے اعتبار سے اس سے کوئی پرخاش اور کوئی ضد نہیں۔

حضورِ اقدس ﷺ کا بے مثال عفو و درگزر

حضورِ اقدس ﷺ کا عمل دیکھئے، وہ خاتون جس نے آپ کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ نکال کر کچا چبایا یعنی حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا اور جو اس کے سبب بنے یعنی حضرت وحشی رضی اللہ عنہ، جب یہ دونوں اسلام کے دائرے میں داخل ہوگئے اور اسلام قبول کرلیا تو اب وہ آپ کے اسلامی بہن اور بھائی بن گئے۔ آج حضرت وحشی کے نام کے ساتھ "رضی اللہ تعالیٰ عنہ" کہتے ہیں۔ ہندہ جنہوں نے کلیجہ چبایا تھا آج ان کے نام کے ساتھ "رضی اللہ تعالیٰ عنہا" کہا جاتا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ ان کی ذات سے کوئی نفرت نہیں تھی بلکہ ان کے فعل اور ان کے اعتقاد سے نفرت تھی۔ پھر جب سچی توبہ کے ساتھ وہ بُرا فعل اور بُرا اعتقاد ختم ہوگیا تو اب ان سے نفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اولیاء اللہ میں اُونچا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے زمانے میں ایک بڑے عالم اور فقیہ اور مفتی مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب بھی موجود تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت "صوفی" کے مشہور تھے اور یہ بڑے عالم "مفتی اور فقیہ" کی حیثیت سے مشہور تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ "سماع" کو جائز کہتے تھے۔ بہت سے صوفیاء کے یہاں سماع کا رواج تھا۔ سماع کا مطلب ہے کہ موسیقی کے آلات کے بغیر حمد و نعت وغیرہ کے مضامین کے اشعار ترنم سے یا بغیر ترنم کے محض خوش آواز سے کسی کا پڑھنا اور دوسروں کا اسے خوش عقیدگی اور محبت سے سننا۔ بعض صوفیاء اس کی اجازت دیتے تھے اور بہت سے فقہاء اور مفتی حضرات اس سماع کو بھی جائز نہیں کہتے تھے بلکہ "بدعت" قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے زمانے کے مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب نے بھی "سماع" کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ اور حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ "سماع" سنتے تھے۔

جب مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ حضرت کی عیادت اور مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے اور اطلاع کروائی کہ جاکر حکیم ضیاء الدین صاحب سے عرض کیا جائے کہ نظام الدین مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا ہے۔ اندر سے حکیم ضیاء الدین صاحب نے جواب دیا کہ ان کو باہر روک دیں، میں کسی بدعتی کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے جواب بھجوایا کہ ان سے عرض کردو کہ بدعتی بدعت سے توبہ کرنے کے لئے حاضر ہوا ہے۔ اسی وقت مولانا حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی

پگڑی بھیجی کہ اسے بچھا کر خواجہ صاحب اس کے اُوپر قدم رکھتے ہوئے آئیں اور جوتے سے قدم رکھیں، ننگے پاؤں نہ آئیں۔ خواجہ صاحب نے پگڑی کو اُٹھا کر سر پر رکھا اور کہا کہ یہ میرے لئے دستارِ فضیلت ہے۔اس شان سے اندر تشریف لے گئے۔ آ کر مصافحہ کیا اور بیٹھ گئے اور حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کی طرف متوجہ رہے۔ پھر خواجہ صاحب کی موجودگی میں حکیم ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا وقت آ گیا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ الحمدللہ، حکیم ضیاء الدین صاحب کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا کہ ترقی مدارج کے ساتھ ان کا انتقال ہوا۔

غصہ بھی اللہ کے لئے ہو

بہرحال جو بغض اور غصہ اللہ کے لئے ہوتا ہے وہ کبھی ذاتی دشمنیاں پیدا نہیں کرتا اور وہ عداوتیں پیدا نہیں کرتا وہ فتنے پیدا نہیں کرتا، کیونکہ جس آدمی سے بغض کیا جارہا ہے اور جس پر غصہ کیا جارہا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ اس کو میری ذات سے دشمنی نہیں ہے بلکہ میرے خاص فعل سے اور خاص حرکت سے ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس کی بات کا برا نہیں مانتا۔ اس لئے کہ جانتا ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اللہ کے لئے کہہ رہا ہے۔اس کو فرماتے ہیں:

((وَأَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ))

یعنی جس سے تعلق اور محبت ہے تو وہ بھی اللہ کے لئے ہے اور جس سے بغض اور نفرت ہے تو وہ بھی اللہ کے لئے ہے۔تو یہ غصہ کا بہترین محل ہے بشرطیکہ یہ غصہ شرعی حد کے اندر ہو۔ اللہ تعالیٰ یہ نعمت ہم کو عطا فرمادے کہ محبت ہو تو اللہ کے لئے ہو، غصہ اور بغض ہو تو وہ اللہ کے لئے ہو۔

لیکن یہ غصہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے منہ میں لگام پڑی ہوئی ہو کہ جہاں اللہ کے لئے غصہ کرنا ہے وہاں تو ہو اور جہاں غصہ نہیں کرنا ہے وہاں لگام ڈال کر اس کو روک دو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھئے، ایک یہودی نے آپ کے سامنے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہہ دیا۔ العیاذ باللہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہاں برداشت کر سکتے تھے، فوراً اس کو پکڑ کر اُوپر اُٹھایا اور پھر زمین پر پٹخ دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ یہودی نے جب یہ دیکھا کہ اب میرا قابو تو ان کے اُوپر نہیں چل رہا ہے تو اس نے لیٹے لیٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھوک دیا۔ جیسے کہاوت ہے کہ "کھسیانی بلی کھمبا نوچے"، لیکن جیسے ہی اس یہودی نے تھوکا، آپ فوراً اس کو چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ لوگوں نے آپ سے کہا کہ حضرت! اس نے اور زیادہ گستاخی کا کام کیا کہ آپ کے منہ پر تھوک دیا۔

ایسے میں آپ اس کو چھوڑ کر الگ کیوں ہو گئے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ پہلے اس پر جو میں نے حملہ کیا تھا اور اس کو مارنے کا ارادہ کیا تھا وہ حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں کیا تھا۔ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی جس کی وجہ سے مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اس کو گرا دیا۔ پھر جب اس نے میرے منہ پر تھوک دیا تو اب مجھے اور زیادہ غصہ آیا لیکن اب اگر میں اس غصہ پر عمل کرتے ہوئے اس سے بدلہ لیتا تو یہ بدلہ لینا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ ہوتا بلکہ اپنی ذات کے لئے ہوتا، اور اس وجہ سے ہوتا کہ چونکہ اس نے میرے منہ پر تھوکا ہے، لہٰذا میں اس کو اور زیادہ ماروں۔ تو اس صورت میں یہ غصہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے نہ ہوتا بلکہ اپنی ذات کے لئے ہوتا۔ اس وجہ سے میں اس کو چھوڑ کر الگ ہو گیا۔

یہ درحقیقت اس حدیث وَأَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ پر عمل فرما کر دکھا دیا۔ گویا کہ غصہ کے منہ میں لگام دے رکھی ہے کہ جہاں تک اس غصہ کا شرعی اور جائز موقع ہے، بس وہاں تک تو غصہ کرنا ہے، اور جہاں اس غصہ کا جائز موقع ختم ہو جائے تو اس کے بعد آدمی اس غصے سے اس طرح دور ہو جائے کہ جیسے اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ انہیں حضرات کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کان وقافا عن حدود اللہ یعنی یہ اللہ کی حدود کے آگے ٹھہر جانے والے لوگ تھے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مسجدِ نبوی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر کا پرنالہ مسجدِ نبوی کی طرف لگا ہوا ہے، بارش وغیرہ کا پانی مسجدِ نبوی کے اندر گرتا تھا گویا کہ مسجد کی فضا میں وہ پرنالہ لگا ہوا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ مسجد تو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور کسی شخص کے ذاتی گھر کا پرنالہ مسجد کے اندر آ رہا ہو تو یہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے۔ چنانچہ آپ نے اس پرنالے کو توڑنے کا حکم دے دیا اور وہ توڑ دیا گیا۔ اب دیکھئے کہ آپ نے اس پرنالے کو توڑنے کا جو حکم دیا یہ غصے کی وجہ سے تو دیا لیکن غصہ اس بات پر آیا کہ یہ کام مسجد کے احکام اور آداب کے خلاف ہے۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ میرے گھر کا پرنالہ توڑ دیا گیا ہے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے فرمایا کہ آپ نے یہ پرنالہ کیوں توڑ دیا؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ جگہ تو مسجد کی ہے، کسی کی ذاتی جگہ نہیں ہے۔ مسجد کی جگہ میں کسی کا پرنالہ آنا شریعت کے حکم کے خلاف تھا اس لئے میں نے توڑ دیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ کو پتہ بھی ہے کہ یہ پرنالہ یہاں پر کس طرح لگا تھا؟ یہ پرنالہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لگا تھا اور آپ کی اجازت سے میں نے لگایا تھا۔ آپ اس کو توڑنے والے کون ہوتے ہیں؟ حضرت فاروق

اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی تھی؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں! اجازت دی تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ خدا کے لئے میرے ساتھ آؤ۔ چنانچہ اس پرنالے کی جگہ کے پاس گئے اور وہاں جاکر خود رکوع کی حالت میں کھڑے ہوگئے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اب میری کمر پر کھڑے ہوکر یہ پرنالہ دوبارہ لگاؤ۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں دوسروں سے لگوالوں گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عمر کی یہ مجال کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے پرنالے کو توڑ دے۔ مجھ سے یہ اتنا بڑا جرم سرزد ہوا، اس کی کم سے کم سزا یہ ہے کہ میں رکوع میں کھڑا ہوتا ہوں اور تم میری کمر پر کھڑے ہوکر یہ پرنالہ لگاؤ۔ چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی کمر پر کھڑے ہوکر وہ پرنالہ اس کی جگہ پر واپس لگا دیا۔ (۱)

وہ پرنالہ آج بھی مسجدِ نبوی میں لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر دے جن لوگوں نے مسجدِ نبوی کی تعمیر کی ہے، انہوں نے اب بھی اس جگہ پر پرنالہ لگا دیا ہے۔ اگرچہ اب اس پرنالے کا بظاہر کوئی مصرف نہیں ہے لیکن یادگار کے طور پر لگا دیا ہے۔ یہ درحقیقت اس حدیث پر عمل ہے من احب للہ وابغض للہ۔ پہلے جو غصہ اور بغض ہوا تھا وہ اللہ کے لئے ہوا تھا اور اب جو محبت ہے وہ بھی اللہ کے لئے ہے۔ جو شخص یہ کام کرلے اس نے اپنا ایمان کامل بنالیا۔ یہ ایمان کے کامل ہونے کی علامت ہے۔

مصنوعی غصہ کرکے ڈانٹ لیں

بہرحال، اس بغض فی اللہ کی وجہ سے بعض اوقات غصے کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور سے ان لوگوں پر غصہ کا اظہار کرنا پڑتا ہے جو زیرِ تربیت ہوتے ہیں۔ جیسے استاد ہے اس کو اپنے شاگردوں پر غصہ کرنا پڑتا ہے۔ باپ کو اپنی اولاد پر غصہ کرنا پڑتا ہے۔ شیخ کو اپنے مریدوں پر غصہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ غصہ اس حد تک ہونا چاہئے جتنا اس کی اصلاح کے لئے ضروری ہو۔ اس سے آگے نہ بڑھے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب انسان کی طبیعت میں اشتعال ہو، اس وقت غصہ نہ کرے۔ مثلاً استاد کو شاگرد پر غصہ آگیا اور اشتعال پیدا ہوگیا۔ اس اشتعال اور غصہ کے وقت ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ نہ کرے بلکہ جب طبیعت میں وہ اشتعال اور غصہ ختم ہوجائے اس وقت مصنوعی غصہ کرکے ڈانٹ ڈپٹ کرلے تاکہ یہ ڈانٹ ڈپٹ حد سے متجاوز نہ ہو۔ یہ کام ذرا مشکل ہے کیونکہ انسان غصہ کے وقت بے قابو ہوجاتا ہے۔ لیکن جب تک اس کی مشق نہیں کرے گا اس وقت تک

(۱) طبقات ابن سعد (۱۲/٤) کنزالعمال (٦٦/٧) مجمع الزوائد (٢٠٦/٤) حياة الصحابة (٤٢٤/٢)

اس غصہ کے مفاسد اور برائیوں سے نجات نہیں ملے گی۔

چھوٹوں پر زیادتی کا نتیجہ

اور پھر جو زیر تربیت افراد ہوتے ہیں جیسے اولاد، شاگرد، مرید، ان پر اگر غصہ کے وقت حد سے تجاوز ہو جائے تو بعض صورتوں میں یہ بات بڑی خطرناک ہو جاتی ہے، کیونکہ جس پر غصہ کیا جا رہا ہے وہ اگر آپ سے بڑا ہے یا برابر کا تو آپ کے غصہ کرنے کے نتیجے میں اس کو جو ناگواری ہوگی اس کا اظہار بھی کر دے گا اور وہ بتا دے گا کہ تمہاری یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی، یا کم از کم بدلہ لے لے گا لیکن جو تمہارا ماتحت اور چھوٹا ہے وہ تم سے بدلہ لینے پر تو قادر نہیں ہے بلکہ اپنی ناگواری کے اظہار پر بھی قادر نہیں۔ چنانچہ کوئی بیٹا اپنے باپ سے یا شاگرد اپنے استاد سے یا مرید اپنے شیخ سے یہ نہیں کہے گا کہ آپ نے فلاں وقت جو بات کہی تھی وہ مجھے ناگوار ہوئی۔ اس لئے آپ کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ آپ نے اس کی کتنی دل شکنی کی ہے، اور جب پتہ نہیں چلے گا تو معافی مانگنا بھی آسان نہیں ہوگا۔ اس لئے یہ بہت نازک معاملہ ہے اور خاص طور سے جو چھوٹے بچوں کو پڑھانے والے اساتذہ ہوتے ہیں، ان کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کا معاملہ تو بہت ہی نازک ہے۔ اس لئے کہ وہ نابالغ بچے ہیں اور نابالغ کا معاملہ یہ ہے کہ اگر وہ معاف بھی کر دے تو معافی نہیں ہوتی کیونکہ نابالغ کی معافی معتبر نہیں۔

بہر حال، آج کی مجلس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے غصہ پر قابو پانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ غصہ بے شمار برائیوں کی جڑ ہے اور اس کے ذریعہ بے شمار باطنی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ابتداء میں تو یہ کوشش کرے کہ غصہ کا اظہار بالکل نہ ہو، بعد میں جب یہ غصہ قابو میں آجائے تو اس وقت یہ دیکھے کہ کہاں غصہ کا موقع ہے اور کہاں غصہ کا موقع نہیں۔ جہاں غصہ کا جائز محل ہو بس وہاں جائز حد تک غصہ کرے اس سے زیادہ نہ کرے۔

غصہ کا غلط استعمال

جیسا کہ ابھی میں نے بتایا کہ بغض فی اللہ یعنی اللہ کے لئے غصہ کرنا چاہئے۔ لیکن بعض لوگ اس کا انتہائی غلط استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا یہ غصہ اللہ کے لئے ہے لیکن حقیقت میں وہ غصہ نفسانیت اور تکبر اور دوسرے کی حقارت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً جب اللہ تعالیٰ نے ذرا سی دین پر چلنے کی توفیق دے دی اور دین پر ابھی چلنا شروع کیا تو اب ساری دنیا کے لوگوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ میرا باپ بھی حقیر ہے، میری ماں بھی حقیر ہے، میرا بھائی بھی حقیر ہے، میری بہن بھی

حقیر ہے، میرے سارے گھر والے حقیر ہیں۔ ان سب کو حقیر سمجھنا شروع کر دیا اور یہ سمجھنے لگا کہ یہ سب تو جہنمی ہیں، میں جنتی ہوں اور مجھے اللہ تعالیٰ نے ان جہنمیوں کی اصلاح کے لئے پیدا کیا ہے۔ اب ان کی اصلاح کے لئے ان پر غصہ کرنا اور ان کے لئے نازیبا الفاظ کا استعمال کرنا اور ان کی تحقیر کرنی اور ان کے حقوق تلف کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر شیطان یہ سبق پڑھاتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ بغض فی اللہ کے ماتحت کر رہا ہوں حالانکہ حقیقت میں یہ سب نفسانیت کے تحت کرتا ہے۔

چنانچہ جو لوگ دین پر نئے نئے چلنے والے ہوتے ہیں۔ شیطان ان کو اس طرح بہکاتا ہے کہ ان کو بغض فی اللہ کا سبق پڑھا کر ان سے دوسرے مسلمانوں کی تحقیر اور تذلیل کراتا ہے، اور اس کے نتیجے میں لڑائیاں، جھگڑے اور فساد ہوتے ہیں۔ بات بات پر لوگوں پر غصہ کرتے ہیں۔ بات بات پر لوگوں کو ٹوک دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں فساد پھیل رہا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جملہ

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جملہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ حق بات، حق نیت سے، حق طریقے سے کہی جائے تو وہ کبھی بے اثر نہیں رہتی اور کبھی فتنہ و فساد پیدا نہیں کرتی۔ گویا کہ تین شرطیں بیان فرمادیں۔ نمبر ایک بات حق ہو، نمبر دو نیت حق ہو، نمبر تین طریقہ حق ہو۔ مثلاً ایک شخص کسی برائی کے اندر مبتلا ہے، اب اس پر ترس کھا کر نرمی اور شفقت سے اس کو سمجھائے تاکہ وہ اس برائی سے کسی طرح نکل جائے۔ یہ نیت ہو، اس میں اپنی بڑائی مقصود نہ ہو اور دوسروں کو ذلیل کرنا مقصود نہ ہو، اور طریقہ بھی حق ہو یعنی نرمی اور محبت سے بات کہے۔ اگر یہ تین شرطیں پائی جائیں تو فتنہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور جہاں کہیں یہ دیکھو کہ حق بات کہنے کے نتیجے میں فتنہ کھڑا ہو گیا تو غالب گمان یہ ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ان تینوں باتوں میں سے کوئی ایک بات موجود نہیں تھی۔ یا تو بات حق نہ تھی یا نیت حق نہیں تھی یا طریقہ حق نہیں تھا۔

تم خدائی فوج دار نہیں ہو

یہ بات یاد رکھیں کہ تم خدائی فوجدار بن کر دنیا میں نہیں آئے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ حق بات حق نیت اور حق طریقے سے دوسروں کو پہنچاؤ اور مناسب طریقے سے مسلسل پہنچاتے رہو۔ اس کام سے کبھی مت اُکتاؤ۔ لیکن ایسا کوئی کام مت کرو جس سے فتنہ پیدا ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

ایمان کے تقاضے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○ ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ○ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾ (۱)

حقیقی مؤمن کون ہیں؟

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! میں نے ابھی آپ کے سامنے سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیتیں تلاوت کی ہیں، یہ آیتیں اٹھارہویں پارے کے بالکل شروع میں آئی ہیں، ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''مؤمنین'' کی صفات بیان فرمائی ہیں کہ صحیح معنی میں ''مؤمن'' کون لوگ ہیں؟ ان کی صفات کیا ہیں؟ وہ کیا کام کرتے ہیں اور کن کاموں سے بچتے ہیں؟ ساتھ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ جو مؤمنین ان صفات کے حامل ہوں گے، ان کو فلاح حاصل ہوگی۔

کامیابی کا مدار عمل پر ہے

ان آیات کی ابتداء ہی ان الفاظ سے فرمائی:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۱۷۷۔۱۹۰)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱۔۷۔ آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے جو اپنی نمازوں میں دل سے جھکنے والے ہیں، اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں، اور جو زکوٰۃ پر عمل کرنے والے ہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابلِ ملامت نہیں''

یعنی ان مؤمنین نے فلاح پائی جن کے اندر یہ صفات ہیں۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اگر مسلمان فلاح چاہتے ہیں تو ان اعمال کو اختیار کرنا ہوگا، یہ صفات اپنانی ہوں گی اور اس بات کی پوری کوشش کرنی ہوگی کہ جو باتیں یہاں بیان کی جارہی ہیں ان کو اپنی زندگی کے اندر داخل کریں، کیونکہ اسی پر مسلمانوں کی فلاح کا دارومدار ہے اور اسی پر فلاح موقوف ہے۔

فلاح کا مطلب

پہلے یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ ''فلاح'' کا کیا مطلب ہے؟ جب ہم اُردو زبان میں ''فلاح'' کا ترجمہ کرتے ہیں تو عام طور پر اس کا ترجمہ ''کامیابی'' سے کیا جاتا ہے، اس لئے کہ ہمارے پاس اُردو زبان میں اس کے معنی ادا کرنے کے لئے کوئی اور لفظ موجود نہیں، اس وجہ سے مجبوراً اس کا ترجمہ ''کامیابی'' سے کردیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں عربی زبان کے لحاظ سے اور قرآن کریم کی اصطلاح کے لحاظ سے ''فلاح'' کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع اور عام ہے۔ اس لفظ کے اصل معنی یہ ہیں ''دنیا و آخرت میں خوشحال ہونا''، دنیا و آخرت دونوں کی خوشحالی کے مجموعے کو ''فلاح'' کہا جاتا ہے، چنانچہ اذان میں ایک کلمہ کہا جاتا ہے: "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" آؤ فلاح کی طرف، اذان کے اس کلمہ سے بھی یہ بات بتائی جارہی ہے کہ اگر تم دنیا و آخرت دونوں کی خوشحالی چاہتے ہو تو نماز کے لئے آؤ اور مسجد میں پہنچو۔ بہر حال! ''فلاح'' کا لفظ بڑا ہی جامع اور مانع لفظ ہے۔

قرآن کریم میں سورۃ بقرہ کی ابتداء میں بھی فلاح کا لفظ استعمال ہوا ہے:

﴿أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (۱)

یعنی جو لوگ تقویٰ اختیار کرنے والے ہیں اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں، قرآن کریم پر اور قرآن کریم سے پہلے نازل ہونے والی تمام کتابوں پر ایمان رکھنے والے ہیں، یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ لہٰذا ''فلاح'' کا لفظ بڑا جامع ہے اور دنیا و آخرت کی تمام خوشحالیوں کو شامل ہے۔

کامیاب مؤمن کی صفات

اس ''سورۃ المؤمنون'' میں یہ کہا جارہا ہے کہ وہ مؤمن فلاح پائیں گے جن کے اندر وہ صفات ہوں گی جو آگے مذکور ہیں، پھر ایک ایک صفت کو بیان فرمایا کہ وہ مؤمن فلاح پائیں گے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں اور بیہودہ اور فضول باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں اور زکوٰۃ

(۱) البقرۃ: ۵

دیتے ہیں اور زکوٰۃ کے حکم پر عمل کرنے والے ہیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور اپنی امانتیں اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں۔ یہ ساری صفات ان آیاتِ کریمہ میں بیان فرمائی ہیں۔ان میں سے ہر صفت تفصیل اور تشریح چاہتی ہے، ان صفات کا مطلب سمجھنے کی ضرورت ہے، اگر ان صفات کا صحیح مطلب اللہ تعالیٰ ہمارے ذہنوں میں بٹھادیں اور ان صفات کی اہمیت ہمارے ذہنوں میں پیدا فرمادیں اور ان صفات پر عمل کی توفیق عطا فرمادیں تو انشاء اللہ ہم سب فلاح یافتہ ہیں۔اس لئے خیال آیا کہ ان صفات کو تفصیل سے بیان کردیا جائے، ہوسکتا ہے کہ ان کے بیان میں چند ہفتے لگ جائیں، ایک ایک صفت کا بیان ایک ایک جمعہ کو ہوتا جائے گا تو ساری صفات کا انشاء اللہ بیان ہوجائے گا۔

پہلی صفت ''خشوع''

پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔گویا کہ فلاح کی اولین شرط اور فلاح کا سب سے پہلا راستہ یہ ہے کہ انسان نہ صرف یہ کہ نماز پڑھے بلکہ نماز میں خشوع اختیار کرے، کیونکہ نماز ایسی چیز ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ۶۲ سے زیادہ مقامات پر اس کا حکم فرمایا، حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ حکم دیدیتے تو بھی کافی تھا، کیونکہ اگر ایک مرتبہ بھی قرآن کریم میں کسی کام کا حکم آجائے تو اس کام کو کرنا انسان کے ذمے فرض ہوجاتا ہے، لیکن نماز کے بارے میں باسٹھ مرتبہ حکم دیا کہ نماز قائم کرو۔اس کے ذریعہ اس حکم کی اہمیت بتانا مقصود ہے کہ نماز کو معمولی کام مت سمجھو اور یہ نہ سمجھو کہ یہ روزمرہ کی ایک معمولی چیز ہے بلکہ مؤمن کے لئے دنیا و آخرت میں کامیابی کے لئے سب سے اہم کام نماز پڑھنا ہے، نماز کی حفاظت کرنا ہے، اور نماز کو اس کے احکام اور آداب کے ساتھ بجالانا ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خلیفہ ہیں، ان کے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں کو فتوحات بہت زیادہ ہوئیں، اللہ تعالیٰ نے انہی کے ہاتھوں قیصر و کسریٰ کی شوکت کا پرچم سرنگوں کیا، قیصر و کسریٰ کے محلات مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔ایک دن میں نے حساب لگایا تو یہ بات سامنے آئی کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زیرِ نگیں ممالک کا کُل رقبہ آج کے ۱۵ ملکوں کے برابر ہے، یعنی آج پندرہ ممالک ان جگہوں پر قائم ہیں جہاں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی۔ یہ ایسے امیر المؤمنین تھے کہ فرماتے تھے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مرجائے تو

مجھے ڈر ہے کہ مجھ سے آخرت میں یہ سوال ہوگا کہ اے عمر! تیری حکومت میں ایک کتا بھوکا مر گیا تھا۔(۱) اتنی زیادہ ذمہ داری کا احساس کرنے والے تھے۔ ان کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خوش حالی بھی عطا فرمائی، کوئی شخص ان کی حکومت میں بھوکا نہیں تھا، سب کو انصاف مہیا تھا، عدل وانصاف کا دور دورہ تھا، مسلمانوں کے ساتھ، غیر مسلموں کے ساتھ، مردوں کے ساتھ، عورتوں کے ساتھ، بوڑھوں کے ساتھ، بچوں کے ساتھ انصاف کا عظیم نمونہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت نے پیش کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سرکاری فرمان

اتنی بڑی حکومت کے جتنے فرمان رواں تھے اور مختلف صوبوں میں جتنے گورنر مقرر تھے اور مختلف شہروں میں جو حاکم مقرر تھے، ان سب کے نام حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک سرکاری فرمان بھیجا، یہ فرمان حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''مؤطا'' میں لفظ بہ لفظ روایت کیا ہے، اس فرمان میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”اِنَّ أَهَمَّ أَمْرِكُمْ عِنْدِي الصَّلَاةُ فَمَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَهُ وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا أَضْيَعُ“(۲)

میرے نزدیک تمہارے کاموں میں سب سے اہم کام نماز ہے، جس شخص نے نماز کی حفاظت کی اور اس پر مداومت کی، اس نے اپنے دین کی حفاظت کی، اور جس شخص نے نماز کو ضائع کیا، وہ اور چیزوں کو زیادہ ضائع کرے گا۔ ضائع کرنے کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ نماز نہیں پڑھے گا، اور یہ معنی بھی ہیں کہ نماز پڑھے گا لیکن غلط طریقے سے پڑھے گا، اور ضائع کرنے کے معنی یہ بھی ہیں کہ نماز پڑھنے میں لاپرواہی سے کام لے گا۔

نماز کو ضائع کرنے سے دوسرے امور کا ضیاع

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے حکام کو یہ فرمان اس لئے لکھ کر بھیجا کہ عام طور پر حاکم کے دل میں یہ بات ہوتی ہے کہ میرے سر پر تو قوم کی بہت بڑی ذمہ داریاں ہیں، لہٰذا اگر میں ان ذمہ داریوں کی خاطر کسی وقت کی نماز قربان بھی کر دوں تو کوئی حرج نہ ہوگا، کیونکہ میں بڑے فریضے کو ادا

---

(۱) مصنف ابن أبی شیبة، رقم: ۳۵۶۲۷، طبقات ابن سعد (۲۸۴/۳)، تاریخ دمشق (۲۱۵/۳۵)، تاریخ عمر بن الخطاب لابن الجوزی، ص: ۱۴۰۔ مذکورہ مراجع میں ذکر کردہ روایات میں شاۃ، جدی، سخلۃ اور جمل وغیرہ کا ذکر ہے۔ بندہ کو ایسی روایت نہیں ملی جس میں کلب کا ذکر ہو۔

(۲) مؤطا امام مالک، کتاب وقوت الصلاۃ، باب وقوت الصلاۃ، رقم: ۵

کررہا ہوں، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حاکموں کی اس غلط فہمی کو دور فرمارہے ہیں کہ تم یہ مت سمجھنا کہ حاکم بننے کے بعد تمہاری ذمہ داریاں نماز سے زیادہ فوقیت رکھتی ہیں، بلکہ میرے نزدیک سب سے اہم کام یہ ہے کہ تمہاری نماز صحیح ہونی چاہئے۔ اگر نماز کی حفاظت کروگے تو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہوگے اور اگر تم نے نماز کو ضائع کردیا تو تمہارے دوسرے کام اس سے زیادہ ضائع ہوں گے اور پھر حکومت کا کام تم سے ٹھیک نہیں چلے گا کیونکہ جب تم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق تمہارے شاملِ حال نہ رہی تو پھر تمہارے کام کیسے درست ہوں گے۔

ایک گمراہانہ فکر

آج کل ہمارے معاشرے میں ایک گمراہی پھیل گئی ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں کے دماغ میں یہ بات آگئی ہے کہ بہت سے کام ایسے ہیں جو نماز سے زیادہ فوقیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر یہ بات ان لوگوں کے اندر پیدا ہوگئی ہے جو دین کے کام میں مشغول ہیں، دعوت وتبلیغ کا کام کررہے ہیں، جہاد کا کام کررہے ہیں، سیاست کا کام کررہے ہیں، یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کام کررہے ہیں، لہٰذا چونکہ ہم بڑا کام کررہے ہیں، اس لئے اگر کبھی اس بڑے کام کی خاطر نماز چھوٹ گئی یا نماز میں کمی آگئی یا نماز میں کوئی نقص واقع ہوگیا تو کوئی حرج کی بات نہیں، کیونکہ ہم اس سے بڑے کام میں لگے ہوئے ہیں، ہم دعوت وتبلیغ کے کام میں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام میں لگے ہوئے ہیں، جہاد کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور سیاست کے کام یعنی دین کو اس دنیا میں برپا کرنے اور اقامتِ دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں، اس لئے اگر ہماری جماعت چھوٹ جائے گی تو ہم گھر میں نماز پڑھ لیں گے اور اگر نماز کا وقت نکل گیا تو قضا پڑھ لیں گے۔ یاد رکھئے! یہ بڑی گمراہانہ فکر ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور گمراہی کا علاج

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے زیادہ دین کا کام کرنے والا کون ہوگا؟ ان سے بڑا سیاست کا علم بردار کون ہوگا؟ ان سے بڑا جہاد کرنے والا کون ہوگا؟ ان سے بڑا داعی اور ان سے بڑا مبلغ کون ہوگا؟ لیکن وہ اپنے تمام فرمانرواؤں کو باقاعدہ یہ سرکاری فرمان جاری کررہے ہیں کہ میرے نزدیک تمہارے سب کاموں میں سب سے اہم چیز نماز ہے، اگر تم نے اس کی حفاظت کی تو تمہارے اور کام بھی درست ہوں گے اور اگر اس کو ضائع کردیا تو تمہارے اور کام بھی خراب ہوں گے۔

اپنے آپ کو کافروں پر قیاس مت کرنا

تم اپنے آپ کو کافروں پر قیاس مت کرنا، غیر مسلموں پر قیاس مت کرنا اور یہ مت سوچنا کہ غیر مسلم بھی تو نماز نہیں پڑھ رہے ہیں مگر ترقی کررہے ہیں، دنیا میں ان کا ڈنکا بج رہا ہے، خوشحالی ان کا مقدر بنی ہوئی ہے اور دنیا کے اندر ان کی ترقی کے ترانے پڑھے جارہے ہیں۔ یاد رکھو! تم اپنے آپ کو ان پر قیاس مت کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے مؤمن کا مزاج اور مؤمن کا طریقۂ زندگی کافر کے مقابلے میں بالکل مختلف قرار دیا ہے، قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ مؤمن کو فلاح نہیں ہوسکتی جب تک وہ ان کاموں پر عمل نہ کرے جو یہاں بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے سب سے پہلا کام نماز ہے۔

نماز میں خشوع مطلوب ہے

لہٰذا اگر تم فلاح چاہتے ہو تو اس کی پہلی شرط نماز کی حفاظت ہے۔ پھر یہاں پر یہ نہیں فرمایا کہ وہ لوگ فلاح پائیں گے جو نماز پڑھتے ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ وہ مؤمن فلاح پائیں گے جو اپنی نماز میں ''خشوع'' اختیار کرنے والے ہیں۔ خشوع کا کیا مطلب ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو ''خشوع'' عطا فرمادے۔

''خضوع'' کے معنی

دیکھئے! دو لفظ ہیں جو عام طور پر ایک ساتھ بولے جاتے ہیں، ایک ''خشوع'' دوسرا ''خضوع''، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں نے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھی۔ خشوع ''ش'' سے ہے اور خضوع ''ض'' سے ہے، دونوں کے معنی میں تھوڑا سا فرق ہے۔ خضوع کے معنی ہیں ''جسم کو اللہ تعالیٰ کے آگے جھکا دینا'' یعنی جب نماز میں کھڑے ہوئے تو جسم کو اللہ جل شانہ کے آگے جھکا دیا۔ جسم کو جھکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ جب نماز میں کھڑے ہوئے تو تمام آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے کھڑے ہوئے، رکوع کیا تو اس کے آداب کے ساتھ رکوع کیا، سجدہ کیا تو اس کے آداب کے ساتھ سجدہ کیا، گویا کہ ''اپنے ظاہری اعضاء کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دینا'' یہ معنی ہیں خضوع کے، لہٰذا خضوع کا تقاضا یہ ہے کہ جب آدمی نماز میں کھڑا ہو تو اس کے تمام اعضاء ساکن اور ساکت ہوں اور ان کے اندر حرکت نہ ہو۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ (۱)

---

(۱) البقرہ:۲۳۸

یعنی نماز میں اللہ تعالیٰ کے لئے کھڑے ہوں تو قانت بن کر کھڑے ہوں۔ قانت کے معنی ہیں سکون کے ساتھ کھڑا ہونا، لہٰذا نماز میں بلاوجہ اپنے جسم کو ہلانا، بلاوجہ بار بار ہاتھ اُٹھا کر اپنے جسم یا سر کو کھجانا، کپڑے درست کرنا، یہ سب باتیں خضوع کے خلاف ہیں۔

نماز میں اعضاء کو حرکت دینا

فقہاء کرام نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز کے ایک رکن مثلاً قیام میں تین مرتبہ بار بار بلاضرورت اپنے ہاتھ کو حرکت دے کر کوئی کام کرے گا تو اس کی نماز ہی ٹوٹ جائے گی، اور اگر تین مرتبہ سے کم کیا تو نماز نہیں ٹوٹے گی لیکن نماز کی جو شان ہے اور جو سنت طریقہ ہے وہ حاصل نہیں ہوگا، نماز کی برکت حاصل نہیں ہوگی۔ آج کل ہماری نمازوں میں یہ خرابی کثرت سے پائی جاتی ہے کہ جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو اپنے جسم کو بلاوجہ حرکت دیتے ہیں، یہ بلاوجہ حرکت دینا خضوع کے خلاف ہے اور سنت کے اور نماز کے آداب کے خلاف ہے۔

شاہی دربار میں حاضری کی کیفیت

جب تم نماز میں کھڑے ہوتے ہو تو اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوتے ہو۔ اگر کسی سربراہِ مملکت کا دربار ہو اور اس دربار میں پریڈ ہو رہی ہو تو اس پریڈ میں جو شریک ہوتا ہے وہ پریڈ کے آداب کی پوری پابندی کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے، وہ یہ نہیں کرتا کہ کبھی سر کھجا رہا ہے، کبھی ہاتھ کھجا رہا ہے، کبھی کپڑے درست کر رہا ہے، کیونکہ کسی بادشاہ کے دربار میں یہ حرکتیں نہیں کی جاتیں۔ جب دنیا کے عام بادشاہوں کا یہ حال ہے تو تم تو احکم الحاکمین کے دربار میں کھڑے ہو جو سارے بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اس کے دربار میں کھڑے ہو کر ایسی بیجا حرکتیں کرنا بالکل مناسب نہیں ہے بلکہ اس کے دربار کے تمام آداب کا لحاظ کر کے کھڑا ہونا چاہئے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اور خضوع

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ گرمی کے موسم میں رات کے وقت اپنے گھر کی چھت پر تہجد کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ ان کے پڑوسی ان کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے چھت پر کوئی لکڑی کھڑی ہے جس میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوں تو قانت بن کر اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر سمجھ کر کھڑے ہوں۔

گردن جھکانا خضوع نہیں

نماز میں کھڑے ہونے کا جو سنت طریقہ ہے، اس کے مطابق کھڑا ہونا ہی خضوع ہے۔ بعض لوگ خضوع پر عمل کرتے ہوئے قیام کی حالت میں بہت جھک جاتے ہیں اور سینہ بھی جھکا لیتے ہیں، یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے، سنت طریقہ یہ ہے کہ قیام کی حالت میں آدمی سیدھا کھڑا ہو اور گردن اس حد تک نیچی ہو کہ نگاہ سجدہ کی جگہ پر ہو، اس سے زیادہ گردن کو جھکا لینا کہ تھوڑی سینے سے لگ جائے، یہ سنت کے خلاف ہے۔ اور بلاوجہ نماز کے اندر حرکت کرنا بھی خلافِ سنت ہے، ہاں اگر کبھی بہت زیادہ خارش ہو رہی ہو تو کھجانا جائز ہے، لیکن بلاوجہ حرکت کرنا سنت کے خلاف ہے۔ بہر حال! خضوع کے معنی ہیں ''اپنے جسم کو اللہ تعالیٰ کے لئے جھکا لینا''

خشوع کے معنی

دوسرا لفظ ہے ''خشوع''، اس کے معنی ہیں ''دل کو اللہ تعالیٰ کے لئے جھکا لینا'' یعنی دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر لینا، دونوں کا مجموعہ خشوع و خضوع کہلاتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ نماز خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھو، یہ دونوں کام ضروری ہیں۔

خضوع کا خلاصہ

آج میں نے مختصراً ''خضوع'' کے بارے میں عرض کر دیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں جو سنت طریقہ ہے، اس کے مطابق اپنے اعضاء کو لے آؤ اور بلا ضرورت اعضاء کو حرکت نہ دو۔ اب سوال یہ ہے کہ کس طرح سنت کے مطابق اعضاء کو لائیں، اس کے لئے میرا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو ''نمازیں سنت کے مطابق پڑھئے'' کے نام سے شائع ہو گیا ہے، انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہو گیا ہے، اس رسالے کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ اپنے اعضاء کو نماز کے اندر رکھنے کے کیا آداب ہیں، اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو ان شاء اللہ خضوع حاصل ہو جائے گا۔ (۱)

خشوع کس طرح حاصل ہوگا، اس کے بارے میں انشاء اللہ آئندہ جمعہ میں عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

---

(۱) یہ رسالہ ''اسلام اور ہماری زندگی'' کی دوسری جلد میں مع تخریج و تحقیق ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کا مطلب کیا؟ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اما بعد! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ﴾(۱)

میرے محترم بزرگو اور دوستو! سب سے پہلے میں آپ حضرات کو اس جذبے پر مبارک باد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے اوقات میں سے کچھ وقت دین کی بات سننے کے لئے نکالا، اور اس غرض کے لئے یہاں جمع ہوئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام اور تعلیمات کی کچھ باتیں سن جائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس جذبے کو قبول فرمائے، اور اس کے کہنے والے اور سننے والے سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ۔۔۔۔ اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت تلاوت کی ہے۔ اس آیت کی تھوڑی سی تشریح آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مؤمنوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی مت کرو اور اس کے پیچھے مت چلو۔

کیا ایمان اور اسلام علیحدہ علیحدہ ہیں؟

یہاں سب سے پہلی بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان الفاظ سے خطاب کیا کہ ”اے ایمان والو“ یعنی ان لوگوں سے خطاب ہو رہا ہے جو ایمان لا چکے، جو کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پر اپنے اعتقاد کا اظہار کر چکے اور ”اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمدا رسول اللہ“ کہہ چکے،

☆ اصلاحی خطبات (۹/ ۹۵۔۱۲۳) ۲۲ نومبر، ۱۹۹۱ء، بیت المکرم، کراچی

(۱) البقرۃ: ۲۰۸۔ آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ”اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ یقین جانو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے“

ان سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب ایمان لا چکے تو ایمان لانے کے بعد اسلام میں داخل ہونے کے کیا معنی؟ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب ایک شخص ایمان لے آیا تو وہ اسلام میں بھی داخل ہو گیا، ایمان اور اسلام ایک ہی چیز سمجھی جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اے ایمان والو، اسلام میں داخل ہو جاؤ، جس سے یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ ایمان کچھ اور چیز ہے اور اسلام کچھ اور چیز ہے۔ اور ایمان لانے کے بعد اسلام میں داخل ہونا بھی ضروری ہے۔

''اسلام'' لانے کا مطلب

پہلی بات تو سمجھنے کی یہ ہے کہ اسلام کیا ہے؟ اور ایمان والوں کو اسلام میں داخل ہونے کی جو دعوت دی جا رہی ہے، اس سے کیا مراد ہے اور اسلام کس کو کہتے ہیں؟ ''اسلام'' عربی زبان کا لفظ ہے، اسلام کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے آگے جھکا دینا، یعنی کسی بڑی طاقت کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دینا اور اپنے آپ کو اس کا تابع بنا لینا کہ جیسا وہ کہے اس کے مطابق انسان کرے، یہ ہیں ''اسلام'' کے معنی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف زبان سے کلمہ طیبہ پڑھ لینا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر اور یوم آخرت پر ایمان لے آنا، یہ باتیں اسلام میں داخل ہونے کے لئے کافی نہیں، بلکہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے پورے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حکم اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے آگے جھکا دے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا اس وقت تک انسان صحیح معنی میں اسلام کے اندر داخل نہیں ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بیٹے کی قربانی

یہی لفظ ''اسلام'' اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سورۃ صافات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں بھی استعمال فرمایا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا کہ وہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کر دیں، جس کی یادگار ہم اور آپ ہر سال عید الاضحیٰ کے موقع پر مناتے ہیں۔ بیٹا بھی وہ جو منگوں اور مرادوں سے طلب کیا ہوا تھا، جس کے لئے آپ نے دعائیں کی تھیں کہ یا اللہ! مجھے بیٹا عنایت فرما دیجئے، جب وہ بیٹا ذرا چلنے پھرنے اور آنے جانے کے لائق ہوا اور باپ کا ہاتھ بٹانے کے لائق ہوا تو اس وقت یہ حکم آیا کہ اس کے گلے پر چھری پھیر کر اس کو ختم کر دو۔ اب اگر اس حکم کو عقل کی میزان میں تول کر دیکھا جائے اور اسکی حکمت اور مصلحت پر غور کیا جائے تو کوئی عقلی حکمت، عقلی مصلحت، کوئی عقلی جواز اس بات کا نظر نہیں آئے گا کہ

کوئی باپ اپنے بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دے، نہ تو کوئی باپ ایسا کر سکتا ہے اور نہ ہی دنیا کا کوئی انسان اس عمل کو عقل اور انصاف کے مطابق قرار دے سکتا ہے۔

بیٹے کا بھی امتحان ہو گیا

لیکن جب اللہ تعالیٰ کا حکم آ گیا کہ اپنے بیٹے کو قربان کر دو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا:

﴿إِنِّيْ أَرٰى فِي الْمَنَامِ أَنِّيْ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى﴾ (۱)

بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ یہ سوال اس لئے نہیں کیا کہ ان کے دل میں اس حکم پر عمل کرنے میں تردّد تھا بلکہ اس لئے سوال کیا کہ بیٹے کا بھی امتحان لیا جائے کہ دیکھیں بیٹا اس کے بارے میں کیا جواب دیتا ہے۔ وہ بیٹا بھی خلیل اللہ کا بیٹا تھا اور جس کی صلب سے نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لانے والے تھے۔ اس بیٹے نے بھی پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ ابا جان میں نے کون سا ایسا جرم کیا ہے، کیا خطا مجھ سے سرزد ہوئی ہے، کیا غلطی میں نے کی ہے جس کی پاداش میں مجھے زندگی سے محروم کیا جا رہا ہے اور مجھے قتل کیا جا رہا ہے۔ بلکہ جواب میں بیٹے نے یہ کہا:

﴿قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ﴾ (۲)

ابا جان! جو حکم آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے، اس کو کر گزریئے اور میری فکر نہ کیجئے، اس لئے کہ اس حکم پر عمل کرنے میں مجھے تکلیف پہنچے گی تو انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا کہ اے اللہ! آپ نے جو مجھے میرے چہیتے بیٹے کو قربان کرنے کا حکم دیا ہے اس میں کیا حکمت اور مصلحت ہے؟ بس دونوں نے یہ دیکھا کہ یہ حکم ہمارے خالق اور ہمارے مالک کی طرف سے آیا ہے اسی وقت دونوں باپ اور بیٹا اس حکم کی تعمیل پر تیار ہو گئے۔

چلتی چھری نہ رُک جائے

قرآن کریم نے اس واقعہ کو بڑے پیارے انداز میں ذکر فرمایا ہے، یعنی جب باپ اور بیٹا اس حکم کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور باپ کے ہاتھ میں چھری ہے اور بیٹا زمین پر لٹا دیا گیا ہے اور قریب ہے کہ وہ چھری گلے پر چل جائے اور بیٹے کا کام تمام کر دے۔ اس واقعہ کو ذکر کرنے کے لئے

(۱) الصافات:۱۰۲ (۲) الصافات:۱۰۲

قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ یہ ہیں:

﴿ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ﴾(۱)

یعنی جب باپ اور بیٹے دونوں اسلام لے آئے اور دونوں نے اللہ کے حکم کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ پیشانی کے بل اس لئے لٹایا کہ اگر سیدھا لٹائیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر اور اس صورت پر ظاہر ہونے والے کرب اور تکلیف کے اثرات دیکھ کر چھری چلنے کی رفتار میں کمی آجائے اور کہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے، اس لئے اُلٹا لٹایا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے لفظ "اسلما" استعمال فرمایا، یعنی دونوں اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھک گئے۔

اللہ کے حکم کے تابع بن جاؤ

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں "اسلام" کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو اور اپنے پورے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھکا دے اور جب اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم آجائے تو یہ نہ پوچھے کہ اس میں عقلی حکمت اور مصلحت کیا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم آنے کے بعد اس کی تعمیل کی فکر کرے۔ یہ ہے "اسلام" اور اسی اسلام میں داخل ہونے کے لئے قرآن کریم کی آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً میں حکم دیا گیا ہے، یعنی اے ایمان والو! تم نے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت تو پڑھ لیا لیکن اب اسلام میں داخل ہونے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ اپنے پورے وجود کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع بنا دو اور جو حکم بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے اس کو قبول کرو اور اس کو تسلیم کرو اور اس پر عمل کرو۔

ورنہ عقل کے غلام بن جاؤ گے

اب سوال یہ ہے کہ اللہ کے حکم کو بے چون و چرا کیوں مان لیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے حکم کو اس طرح بے چون و چرا نہیں مانو گے بلکہ اپنی عقل اور سمجھ استعمال کر کے یہ کہو گے کہ یہ حکم تو بے کار اور بے فائدہ ہے یا یہ حکم تو انصاف کے خلاف ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنی عقل کے غلام بن کر رہ جاؤ گے اور اللہ کی غلامی اور بندگی کو چھوڑ کر عقل کی غلامی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

حصولِ علم کے ذرائع

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں علم حاصل کرنے کے کچھ ذرائع عطا فرمائے ہیں، ان

(۱) الصافات: ۱۰۳

ذرائع کے ذریعہ انسان علم حاصل کرتا ہے۔ مثلاً سب سے پہلا ذریعۂ علم ''آنکھ'' ہے۔ آنکھ کے ذریعہ چیزوں کو دیکھ کر ان کے بارے میں انسان علم حاصل کرتا ہے۔ دوسرا ذریعۂ علم ''زبان'' ہے۔ اس زبان کے ذریعہ انسان بہت سی چیزوں کو چکھ کر ان کے بارے میں علم حاصل کرتا ہے۔ تیسرا ذریعۂ علم ''کان'' ہے۔ اس کان کے ذریعہ بہت سی چیزوں کے بارے میں سن کر انسان علم حاصل کرتا ہے۔ ایک ذریعۂ علم ''ہاتھ'' ہے۔ اس کے ذریعہ انسان بہت سی چیزوں کو چھو کر علم حاصل کرتا ہے۔ مثلاً یہ سامنے مائیکروفون ہے۔ اب مجھے آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر اس کے بارے میں یہ علم حاصل ہوا کہ یہ ایک آلہ ہے اور گول بنا ہوا ہے۔ اور ہاتھ لگانے سے پتہ چلا کہ یہ ٹھوس ہے، اور کان کے ذریعہ مجھے پتہ چلا کہ یہ آلہ میری آواز کو دور تک پہنچا رہا ہے۔ دیکھئے! کچھ علم آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر حاصل ہوا، کچھ علم کان کے ذریعہ سن کر حاصل ہوا، اور کچھ علم ہاتھ کے ذریعہ چھو کر حاصل ہوا۔

ان ذرائع کا دائرۂ کار متعین ہے

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان ذرائعِ علم کا ایک دائرہ کار مقرر کر دیا ہے۔ اس دائرہ کے اندر وہ ذریعۂ علم کام دے گا۔ اگر اس دائرہ سے باہر اس ذریعہ کو استعمال کرو گے تو وہ ذریعہ کام نہیں دے گا۔ مثلاً آنکھ کا دائرۂ کار یہ مقرر کر دیا ہے کہ وہ دیکھ کر علم عطا کرتی ہے لیکن سن کر علم نہیں دیتی، اس کے اندر سننے کی طاقت موجود نہیں، وہ کام کان کا ہے، اور کان سن سکتا ہے مگر دیکھ نہیں سکتا، زبان چکھ سکتی ہے لیکن اس کے اندر سننے اور دیکھنے کی صلاحیت موجود نہیں۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں اپنی آنکھیں تو بند کرلوں اور اپنے کانوں کے ذریعہ یہ دیکھوں کہ میرے سامنے کیا منظر ہے تو وہ احمق اور بیوقوف ہے، اس لئے کہ کان اس کو کوئی منظر نہیں دکھا سکے گا کیونکہ اس نے کان کو اس کے دائرۂ کار سے باہر استعمال کیا، کان دیکھنے کے لئے وضع ہی نہیں کیے گئے ہیں۔ یا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں کان کو تو بند کرلوں اور آنکھ کے ذریعہ یہ سنوں کہ میرے سامنے والا شخص کیا بات کہہ رہا ہے تو وہ شخص بھی بیوقوف ہے، اس لئے کہ یہ سننے کا کام آنکھ انجام نہیں دے سکتی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آنکھ بیکار ہے، یہ آنکھ بڑی کارآمد ہے، لیکن اس وقت تک کارآمد ہے جب تک اس کو اس کے دائرۂ کار میں اور دیکھنے کے کام میں استعمال کیا جائے، اگر سننے میں استعمال کرو گے تو یہ آنکھ کوئی کام نہیں دے گی۔

ایک اور ذریعۂ علم ''عقل''

لیکن ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں یہ ظاہری حواسِ خمسہ آنکھ، کان، ناک، زبان اور ہاتھ معلومات فراہم کرنا چھوڑ دیتے ہیں، کام دینا بند کر دیتے ہیں، اس مرحلے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک

اور ذریعۂ علم عطا فرمایا ہے، وہ ہے انسان کی عقل ۔ یہ عقل ان چیزوں کا علم انسان کو عطا کرتی ہے جن کا علم آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر حاصل نہیں ہوسکتا، مثلاً یہ مائیکروفون ہے، میں نے ہاتھ کے ذریعہ چھوکر اور آنکھ کے ذریعہ دیکھ کر یہ تو پتہ لگالیا کہ یہ ٹھوس ہے، لوہے کا بنا ہوا ہے، لیکن اس کو کس نے بنایا؟ اور کس طرح یہ وجود میں آیا؟ یہ بات نہ آنکھ دیکھ کر بتا سکتی ہے، نہ کان سن کر بتا سکتا ہے، نہ زبان چکھ کر بتا سکتی ہے ۔ اس کو معلوم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل عطا فرمائی ہے، اس عقل کے ذریعہ ہمیں پتہ چلا کہ اتنا خوبصورت اور شاندار بنا ہوا آلہ جو اتنا اہم کام انجام دے رہا ہے کہ ہماری آواز کو دور تک پہنچا رہا ہے، یہ آلہ خود بخود نہیں بن سکتا، ضرور کسی کاریگر نے اس کو بنایا ہے اور ایسے کاریگر نے بنایا ہے جو بڑا ماہر ہے اور اس فن کو جاننے والا ہے ۔ لہٰذا جس جگہ پر یہ حواسِ خمسہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم حاصل کرنے کے لئے عقل کا ذریعہ عطا فرمایا ہے ۔

عقل کا دائرۂ کار

لیکن جس طرح آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کا کام غیر محدود نہیں تھا بلکہ ایک دائرۂ کار کے اندر اپنا کام کرتے تھے، اس سے باہر یہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے تھے، اسی طرح عقل کا کام بھی غیر محدود نہیں بلکہ اس کا بھی ایک دائرۂ کار ہے، اس دائرۂ کار سے باہر نکل کر وہ بھی انسان کی رہنمائی نہیں کرتی، ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں پر عقل بھی خاموش ہوجاتی ہے، جواب دے جاتی ہے اور انسان کی صحیح رہنمائی نہیں کرسکتی ۔

ایک اور ذریعۂ علم ''وحی الٰہی''

اور جس جگہ پر عقل انسان کی صحیح رہنمائی کرنے سے عاجز ہوجاتی ہے، وہاں پر انسان کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے تیسرا ذریعۂ علم عطا فرمایا ہے، اس تیسرے ذریعۂ علم کا نام ہے ''وحی الٰہی'' یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ''وحی'' جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی ہے ۔ یہ ''وحی'' اسی جگہ پر انسان کی رہنمائی کرتی ہے جس جگہ پر انسان کی تنہا عقل کافی نہیں ہوتی ۔ لہٰذا جن باتوں کا ادراک عقل کے ذریعہ ممکن نہیں تھا، ان باتوں کو بتانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی، اس وحی کے ذریعہ ہمیں بتایا کہ یہ کام اس طرح ہے ۔

عقل اور ''وحی الٰہی'' ـــ ایک موازنہ

مثلاً یہ بات کہ اس کائنات کے ختم ہونے کے بعد اور انسان کے مرنے کے بعد ایک زندگی

اور آنے والی ہے، جس میں انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اس کو وہاں پر اپنے تمام اعمال کا جواب دینا ہے، اور وہاں پر ایک عالَم جنت ہے اور ایک عالَم جہنم ہے، یہ ساری باتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کے بارے میں وحی نازل نہ ہوتی، اور وحی کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کو نہ بتایا جاتا تو محض عقل کی بنیاد پر ہم اور آپ یہ پتہ نہیں لگا سکتے تھے کہ مرنے کے بعد کیسی زندگی آنے والی ہے اور اس میں کیسے حالات پیش آنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کس طرح جواب دینا ہے۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک تیسرا ذریعۂ علم ہمیں عطا فرمایا، جس کا نام ''وحی الٰہی'' ہے۔

وحی الٰہی کو عقل سے مت تولو

یہ ''وحی الٰہی'' آتی ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کام نہیں دے سکتی تھی اور انسان کی رہنمائی نہیں کر سکتی تھی، اس وجہ سے اس جگہ پر ''وحی الٰہی'' ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں وحی الٰہی کی بات اس وقت تک نہیں مانوں گا جب تک وہ بات میری عقل میں نہ آجائے، وہ شخص ایسا ہی بیوقوف ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں یہ بات اس وقت تک تسلیم نہیں کروں گا جب تک مجھے اپنے کان سے یہ چیز نظر نہ آنے لگے۔ ایسا شخص بیوقوف ہے، اس لئے کہ کان دیکھنے کے لئے بنایا ہی نہیں گیا۔ اسی طرح وہ شخص بھی بیوقوف ہے جو یہ کہے کہ میں وحی الٰہی کی بات اس وقت تک تسلیم نہیں کروں گا جب تک میری عقل نہ مان لے۔ اس لئے کہ وحی الٰہی تو آتی ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، جیسے میں نے آپ کو جنت اور جہنم کی مثال دی۔ اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ جنت اور جہنم کی بات ہماری عقل میں نہیں آتی۔ حالانکہ یہ چیزیں عقل کے اندر کیسے آسکتی ہیں؟ اس لئے کہ یہ چیزیں عقل کی محدود پرواز اور محدود دائرے سے باہر ہیں، اسی وجہ سے ان کو بیان کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر وحی نازل فرمائی۔

اچھائی اور بُرائی کا فیصلہ ''وحی'' کرے گی

اسی طرح یہ بات کہ کونسی چیز اچھی ہے اور کون سی چیز بُری ہے؟ کیا کام اچھا ہے اور کیا کام بُرا ہے؟ کیا چیز حلال ہے اور کیا چیز حرام ہے؟ کون سا کام جائز ہے اور کون سا کام ناجائز ہے؟ یہ کام اللہ تعالیٰ کو پسند اور یہ کام اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، یہ فیصلہ وحی پر چھوڑا گیا، محض انسان کی عقل پر نہیں چھوڑا گیا، اس لئے کہ تنہا انسان کی عقل یہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی کہ کون سا کام اچھا ہے اور کون سا کام بُرا ہے، کون سا حلال ہے اور کون سا حرام ہے۔

انسانی عقل بعض اوقات غلط رہنمائی کرتی ہے

اس دنیا کے اندر جتنی بڑی سے بڑی بُرائیاں پھیلی ہیں اور غلط سے غلط نظریات اس دنیا کے اندر آئے وہ سب عقل کی بنیاد پر آئے۔ مثلاً ہم اور آپ بحیثیت مسلمان کے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سور کا گوشت حرام ہے۔ اگر اس کے بارے میں وحی کی رہنمائی سے ہٹ کر صرف عقل کی بنیاد پر سوچیں گے تو عقل غلط رہنمائی کرے گی، جیسا کہ غیر مسلموں نے صرف عقل کی بنیاد پر یہ کہہ دیا کہ ہمیں تو سور کا گوشت کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے، اس کے کھانے میں کیا حرج ہے؟ اس میں کیا عقلی خرابی ہے؟ اسی طرح ہم اور آپ کہتے ہیں کہ شراب پینا حرام ہے، شراب بری چیز ہے، لیکن جو شخص وحی الٰہی پر ایمان نہیں رکھتا، وہ یہ کہے گا کہ شراب پینے میں کیا قباحت ہے؟ کیا برائی ہے؟ ہمیں تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی، لاکھوں افراد شراب پی رہے ہیں، ان کو اس کے پینے سے کوئی خاص نقصان نہیں ہو رہا ہے، اور ہماری عقل میں تو اس کے بارے میں کوئی خرابی سمجھ میں نہیں آتی۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ مرد و عورت کے درمیان بدکاری میں کیا حرج ہے؟ اگر ایک مرد اور ایک عورت اس کام پر رضامند ہیں تو اس کام میں عقلی خرابی کیا ہے؟ اور عقلی اعتبار سے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ برا کام ہے؟ اور اگر رضامندی کے ساتھ مرد و عورت نے یہ کام کر لیا تو تیسرے آدمی کو کیا اختیار ہے کہ اس کے اندر رُکاوٹ ڈالے؟ دیکھئے! اسی عقل کے بل بوتے پر بد سے بدتر برائی کو جائز اور صحیح قرار دیا گیا، اس لئے کہ جب عقل کو اس کے دائرہ کار سے آگے بڑھایا تو یہ عقل اپنا جواب غلط دینے لگی۔ لہٰذا جب انسان عقل کو اس جگہ پر استعمال کرے گا جہاں پر اللہ تعالیٰ کی وحی آ چکی ہے تو وہاں پر عقل غلط جواب دینے لگے گی اور غلط راستے پر لے جائے گی۔

اشتراکیت کی بنیاد عقل پر تھی

دیکھئے روس کے اندر چوہتر سال تک اس عقل کی بنیاد پر اشتراکیت، سوشلزم اور کمیونزم کا بازار گرم رہا، اور پوری دنیا میں مساوات اور غریبوں کی ہمدردی کے نام پر شور مچایا گیا، کمیونزم اور اشتراکیت کا پوری دنیا میں ڈنکا بجتا رہا، اور یہ کہہ دیا کہ عنقریب ساری دنیا پر اس کی حکومت قائم ہو جائے گی، اور یہ سب کچھ عقل کی بنیاد پر تھا۔ اگر اس وقت کوئی اُٹھ کر اس کے خلاف کوئی آواز نکالتا کہ یہ نظریہ غلط ہے، تو اس کو سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہا جاتا، جاگیرداروں کا ایجنٹ کہا جاتا، اس کو رجعت پسند کہا جاتا تھا۔ لیکن آج چوہتر سال کے بعد ساری دنیا اس کا تماشا دیکھ رہی ہے، لینن جس کی پوجا کی جا رہی تھی، اس کے بت خود اس کے ماننے والے گرا کر توڑ رہے ہیں۔ جو نظریہ وحی الٰہی سے آزاد ہو کر صرف عقل

کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے، اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔

وحی الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کرلو

اس لئے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اگر زندگی ٹھیک گزارنی ہے تو اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ جہاں اللہ کا اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم آجائے اور وحی الٰہی کا پیغام آجائے وہاں انسان اپنے آپ کو اس کے تابع بنالے، اس کے آگے جھک جائے، اور اس کے خلاف عقل کے گھوڑے نہ دوڑائے، چاہے بظاہر وہ عقل کے خلاف اور اپنی خواہشات کے خلاف اور مصلحت کے خلاف نظر آتا ہو۔ بس اللہ تعالیٰ کا حکم آجانے کے بعد اپنا سر اس کے آگے جھکادے۔ یہ ہے اسلام میں داخل ہونے کا مطلب۔ لہٰذا جو آیت میں نے تلاوت کی، اس کے پہلے جملے کا مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ، یعنی اپنے آپ کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے مکمل تابع کردو۔

پورے داخل ہونے کا مطلب

اس آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا کہ "پورے کے پورے داخل ہو جاؤ" یعنی یہ نہ ہو کہ ایمان اور عقیدے اور عبادات کی حد تک تو اسلام میں داخل ہوگئے کہ کلمہ طیبہ پڑھ لیا، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، زکوۃ دے دی، حج کرلیا، عبادتیں انجام دے دیں، اور جب مسجد میں پہنچے تو مسلمان، لیکن جب بازار پہنچے، جب دفتر پہنچے، یا گھر پہنچے تو وہاں مسلمان نہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اسلام" محض عبادتوں کا نام نہیں کہ صرف عبادتیں انجام دے دیں تو مسلمان ہوگیا، بلکہ اپنی پوری زندگی کو اللہ کے حکم کے تابع بنانے کا نام "اسلام" ہے۔ لہٰذا مسلمان وہ ہے جو بازار میں بھی مسلمان ہو، دفتر میں بھی مسلمان ہو، گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ بھی مسلمان ہو، دوست واحباب کے ساتھ بھی مسلمان ہو۔

اسلام کے پانچ حصے

اس "دینِ اسلام" کے اللہ تعالیٰ نے پانچ حصے بنائے ہیں، ان پانچ حصوں پر دین مشتمل ہے:

(۱) عقائد: یعنی عقیدہ درست ہونا چاہئے۔

(۲) عبادات: یعنی نماز، روزہ، حج، زکوۃ کی پابندی ہونی چاہئے۔

(۳) معاملات: یعنی خرید وفروخت کے معاملات اور بیع وشراء کے معاملات اللہ کے حکم کے مطابق ہوں، ناجائز اور حرام طریقے سے پیسے نہ کمائے۔

(۴) معاشرت: یعنی باہمی میل جول اور ایک دوسرے کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور زندگی گزارنے اور

رہن سہن کے طریقے میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیے ہیں ان احکام کو انسان پورا کرے۔

(۵) اخلاق: یعنی اس کے باطنی اخلاق، جذبات اور خیالات درست ہوں۔

آج ہم مسجد میں مسلمان ہیں، لیکن جب بازار پہنچے تو لوگوں کو دھوکہ دے رہے ہیں، امانت میں خیانت کرر ہے ہیں، دوسروں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں، ان کی دل آزاری کرر ہے ہیں۔ یہ تو اسلام میں پورا داخل ہونا نہ ہوا، اس لئے کہ اسلام کا ایک چوتھائی حصہ عبادات ہیں اور تین چوتھائی حصہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔ لہٰذا جب تک انسان بندوں کے حقوق کا لحاظ نہیں رکھے گا، پورا اسلام میں داخل نہ ہوگا۔

”اللہ تو دیکھ رہا ہے“

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سفر پر تھے، زادِ راہ جو ساتھ تھا وہ ختم ہوگیا، آپ نے دیکھا کہ جنگل میں بکریوں کا گلہ چر رہا ہے، اور اہل عرب کے اندر یہ رواج تھا کہ لوگ مسافروں کو راستے میں مہمان نوازی کے طور پر مفت دودھ پیش کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ چرواہے کے پاس گئے اور اس سے جا کر فرمایا کہ میں مسافر ہوں اور کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا ہے، تم ایک بکری کا دودھ نکال کر مجھے دے دو تاکہ میں پی لوں۔ چرواہے نے کہا کہ آپ مسافر ہیں، میں آپ کو دودھ ضرور دے دیتا لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ بکریاں میری نہیں ہیں، ان کا مالک دوسرا شخص ہے، اور ان کے چرانے کی خدمت میرے سپرد ہے۔ اس لئے یہ بکریاں میرے پاس امانت ہیں، اور ان کا دودھ بھی امانت ہے، لہٰذا شرعی اعتبار سے میرے لئے ان کا دودھ آپ کو دینا جائز نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کا امتحان لینا چاہا اور اس سے فرمایا کہ دیکھو بھائی! میں تمہیں ایک فائدے کی بات بتاتا ہوں، جس میں تمہارا بھی فائدہ ہے اور میرا بھی فائدہ ہے، وہ یہ کہ تم ایسا کرو کہ ان میں سے ایک بکری مجھے فروخت کر دو اور اس کی قیمت مجھ سے لے لو، اس میں تمہارا فائدہ یہ ہے کہ تمہیں پیسے مل جائیں گے، اور میرا فائدہ یہ ہوگا کہ مجھے بکری مل جائے گی، راستے میں اس کا دودھ استعمال کرتا رہوں گا۔ رہا مالک! تو مالک سے کہہ دینا کہ ایک بکری بھیڑیا کھا گیا، اور اس کو تمہاری بات پر یقین بھی آ جائے گا، کیونکہ جنگل میں بھیڑیے بکریاں کھاتے رہتے ہیں، اس طرح ہم دونوں کا کام بن جائے گا۔ جب چرواہے نے یہ تدبیر سنی تو فوراً اس نے جواب میں کہا: یا ھذا! فاین اللہ؟ اے بھائی! اگر میں یہ کام کرلوں تو اللہ کہاں گیا؟ یعنی یہ کام میں یہاں تو کرلوں گا، اور مالک کو بھی جواب دیدوں گا، وہ بھی شاید مطمئن ہو جائے گا، لیکن مالک کا بھی ایک اور مالک ہے، اس کے پاس جا کر کیا جواب دوں گا؟ اس لئے میں یہ کام کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ظاہر ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس کا امتحان لینا چاہتے تھے، جب اس چرواہے کا جواب سنا تو آپ نے فرمایا کہ

جب تک تجھ جیسے انسان اس روئے زمین پر موجود ہیں، اس وقت تک کوئی ظالم دوسرے شخص پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ (۱)

اس لئے کہ جب تک دل میں اللہ کا خوف، آخرت کی فکر، اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس موجود رہے گا، اس وقت تک جرائم اور مظالم چل نہیں سکیں گے۔ یہ ہے اسلام میں پورا کا پورا داخل ہونا۔ جنگل کی تنہائی میں بھی اس کو یہ فکر ہے کہ میرا کوئی کام اللہ کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔

یہ دین کا لازمی حصہ ہے جس کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں ہوسکتا۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهُ))

''جس کے دل میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں''(۲)

ایک چرواہے کا عجیب واقعہ

غزوۂ خیبر کے موقع پر ایک چرواہا حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آیا، وہ یہودیوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا، اس چرواہے نے جب دیکھا کہ خیبر سے باہر مسلمانوں کا لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے تو اس کے دل میں خیال آیا کہ میں جا کر ان سے ملاقات کروں اور دیکھوں کہ یہ مسلمان کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ چنانچہ بکریاں چراتا ہوا مسلمانوں کے لشکر میں پہنچا اور ان سے پوچھا کہ تمہارے سردار کہاں ہیں؟ صحابہ کرام نے اس کو بتایا کہ ہمارے سردار محمد ﷺ اس خیمے کے اندر ہیں۔ پہلے تو اس چرواہے کو ان کی باتوں پر یقین نہیں آیا، اس نے سوچا کہ اتنے بڑے سردار ایک معمولی سے خیمے میں کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ اس کے ذہن میں یہ تھا کہ جب آپ اتنے بڑے بادشاہ ہیں تو بہت ہی شان وشوکت اور ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ رہتے ہوں گے، لیکن وہاں تو کھجور کے پتوں کی چٹائی سے بنا ہوا خیمہ تھا۔ خیر وہ اس خیمے کے اندر آپ سے ملاقات کے لئے داخل ہوگیا اور آپ سے ملاقات کی۔ اور پوچھا کہ آپ کیا پیغام لے کر آئے ہیں؟ اور کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ حضور اقدس ﷺ نے اس کے سامنے اسلام اور ایمان کی دعوت رکھی اور اسلام کا پیغام دیا۔ اس نے پوچھا کہ اگر میں اسلام کی دعوت قبول کرلوں تو میرا کیا انجام ہوگا؟ اور کیا رتبہ ہوگا؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

''اسلام لانے کے بعد تم ہمارے بھائی بن جاؤ گے اور ہم تمہیں گلے سے لگائیں گے''

اس چرواہے نے کہا کہ آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں، میں کہاں اور آپ کہاں! میں ایک

(۱) أسد الغابة فی معرفة الصحابة (۲۲۸/۳)

(۲) مسند أحمد بن حنبل، مسند انس بن مالك، رقم: ۱۱۹۳۵

معمولی سا چرواہا ہوں، اور میں ایک سیاہ فام انسان ہوں، میرے بدن سے بدبو آرہی ہے، ایسی حالت میں آپ مجھے کیسے گلے سے لگائیں گے؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

''ہم تمہیں ضرور گلے سے لگائیں گے، اور تمہارے جسم کی سیاہی کو اللہ تعالیٰ تابانی سے بدل دیں گے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے جسم سے اُٹھنے والی بدبو کو خوشبو سے تبدیل کردیں گے''

یہ باتیں سن کر وہ فوراً مسلمان ہوگیا، اور کلمہ شہادت "اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا رسول الله" پڑھ لیا۔ پھر حضور ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اب میں کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

''تم ایسے وقت میں اسلام لائے ہو کہ نہ تو اس وقت کسی نماز کا وقت ہے کہ تم سے نماز پڑھواؤں، اور نہ ہی روزہ کا زمانہ ہے کہ تم سے روزے رکھواؤں، اور زکوٰۃ تم پر فرض نہیں ہے، اس وقت تو صرف ایک ہی عبادت ہورہی ہے جو تلوار کی چھاؤں میں انجام دی جاتی ہے، وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ''

اس چرواہے نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں اس جہاد میں شامل ہوجاتا ہوں، لیکن جو شخص جہاد میں شامل ہوتا ہے، اس کے لئے دو میں ایک صورت ہوتی ہے، یا غازی یا شہید۔ تو اگر میں اس جہاد میں شہید ہوجاؤں تو آپ میری کوئی ضمانت لیجئے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

''میں اس بات کی ضمانت لیتا ہوں کہ اگر تم اس جہاد میں شہید ہوگئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں پہنچادیں گے، اور تمہارے جسم کی بدبو کو خوشبو سے تبدیل فرمادیں گے، اور تمہارے چہرے کی سیاہی کو سفیدی میں تبدیل فرمادیں گے۔''

چونکہ وہ چرواہا یہودیوں کی بکریاں چراتا ہوا وہاں پہنچا تھا، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

''تم یہودیوں کی جو بکریاں لے کر آئے ہو، ان کو جاکر واپس کرو، اس لئے کہ یہ بکریاں تمہارے پاس امانت ہیں۔''(۱)

اس سے اندازہ لگائیں کہ جن لوگوں کے ساتھ جنگ ہورہی ہے، جن کا محاصرہ کیا ہوا ہے، ان کا مال مالِ غنیمت ہے، لیکن چونکہ وہ چرواہا بکریاں معاہدے پر لے کر آیا تھا، اس لئے آپ نے حکم دیا کہ پہلے وہ بکریاں واپس کرکے آؤ، پھر آکر جہاد میں شامل ہونا۔ چنانچہ اس چرواہے نے جاکر بکریاں واپس کیں، اور واپس آکر جہاد میں شامل ہوا، اور شہید ہوگیا ـــــ اس کا نام ہے ''اسلام''

---

(۱) البداية والنهاية (٤/٦٠٩)

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، اور حضور ﷺ کے راز دار ہیں۔ جب یہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو مسلمان ہونے کے بعد حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں مدینہ طیبہ آ رہے تھے، راستے میں ان کی ملاقات ابوجہل اور اس کے لشکر سے ہوگئی، اس وقت ابوجہل اپنے لشکر کے ساتھ حضورِ اقدس ﷺ سے لڑنے کے لئے جا رہا تھا۔ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ملاقات ابوجہل سے ہوئی تو اس نے انہیں پکڑ لیا، اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں مدینہ جا رہے ہیں۔ ابوجہل نے کہا کہ پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، اس لئے کہ تم مدینہ جا کر ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لو گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد تو صرف حضور ﷺ کی ملاقات اور زیارت ہے، ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ ابوجہل نے کہا کہ اچھا ہم سے وعدہ کرو کہ وہاں جا کر صرف ملاقات کرو گے، لیکن جنگ میں حصہ نہیں لو گے۔ انہوں نے وعدہ کر لیا۔ چنانچہ ابوجہل نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ جب مدینہ منورہ پہنچے تو اس وقت حضورِ اقدس ﷺ اپنے صحابہ کرام کے ساتھ غزوۂ بدر کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہو چکے تھے، لہٰذا ان کی راستے میں حضور ﷺ سے ملاقات ہوگئی۔

حق و باطل کا پہلا معرکہ "غزوۂ بدر"

اب اندازہ لگایئے کہ اسلام کا پہلا حق و باطل کا معرکہ (غزوۂ بدر) ہو رہا ہے۔ اور یہ وہ معرکہ ہے جس کو قرآن کریم نے "یوم الفرقان" فرمایا، یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والا معرکہ، یہ وہ معرکہ ہو رہا ہے جس میں جو شخص شامل ہو گیا وہ "بدری" کہلایا، اور صحابہ کرام میں "بدری" صحابہ کا بہت اُونچا مقام ہے۔ اور "اسماءِ بدریین" بطور وظیفے کے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے نام پڑھنے سے اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں۔ وہ "بدریین" ہیں جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے یہ پیشین گوئی فرما دی کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اہل بدر (جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا) بخشش فرما دی ہے، ایسا معرکہ ہونے والا ہے۔

گردن پر تلوار رکھ کر لیا جانے والا وعدہ

بہر حال، جب حضورِ اقدس ﷺ سے ملاقات ہوئی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سارا قصہ سنا دیا کہ اس طرح راستے میں ہمیں ابوجہل نے پکڑ لیا تھا، اور ہم نے یہ وعدہ کر کے بمشکل جان چھڑائی کہ ہم

لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے۔ اور پھر درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ بدر کا معرکہ ہونے والا ہے، آپ اس میں تشریف لے جارہے ہیں، ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں، اور جہاں تک اس وعدہ کا تعلق ہے، وہ تو انہوں نے ہماری گردن پر تلوار رکھ کر ہم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، اگر ہم وعدہ نہ کرتے تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لئے ہم نے وعدہ کرلیا، لہٰذا آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم اس جنگ میں حصہ لے لیں، اور یہ فضیلت اور سعادت ہمیں حاصل ہو جائے۔ (۱)

پیغمبرِ عالم اور ایفائے عہد

لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم وعدہ کر کے آئے ہو اور زبان دے کر آئے ہو، اور اسی شرط پر تمہیں رہا کیا گیا ہے کہ تم وہاں جا کر محمد رسول اللہ ﷺ کی زیارت کرو گے، لیکن ان کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لو گے، اس لئے میں تم کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ وہ مواقع ہیں جہاں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے وعدے کا کتنا پاس کرتا ہے۔ اگر ہم جیسا آدمی ہوتا تو ہزار تاویلیں کر لیتا، مثلاً یہ تاویل کر لیتا کہ ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، وہ سچے دل سے تو نہیں کیا تھا، وہ تو ہم سے زبردستی لیا گیا تھا۔ اور خدا جانے کیا کیا تاویلیں ہمارے ذہنوں میں آجاتیں۔ یا یہ تاویل کر لیتا کہ یہ حالتِ عذر ہے اس لئے حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا ہے اور کفر کا مقابلہ کرنا ہے۔ جب کہ وہاں ایک ایک آدمی کی بڑی قیمت ہے، کیونکہ مسلمانوں کے لشکر میں صرف ۳۱۳ نہتے افراد ہیں، جن کے پاس صرف ۷۰ اُونٹ، ۲ گھوڑے اور ۸ تلواریں ہیں۔ باقی افراد میں سے کسی نے لاٹھی اُٹھائی ہے، کسی نے ڈنڈے، اور کسی نے پتھر اُٹھالئے ہیں۔ یہ لشکر ایک ہزار مسلح سورماؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے جارہا ہے، اس لئے ایک ایک آدمی کی جان قیمتی ہے ـــــ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو بات کہہ دی گئی ہے، اور جو وعدہ کرلیا گیا ہے، اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ اس کا نام ہے ''اسلام''

جہاد کا مقصد حق کی سربلندی

اس لئے کہ یہ جہاد کوئی ملک حاصل کرنے کیلئے نہیں ہورہا تھا، کوئی اقتدار حاصل کرنے کیلئے نہیں ہورہا تھا، بلکہ یہ جہاد حق کی سربلندی کے لئے ہورہا تھا۔ اور حق کو پامال کر کے جہاد کیا جائے، گناہ

(۱) الاصابة (۳۱۶/۱)

کا ارتکاب کر کے اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کیا جائے، یہ نہیں ہوسکتا۔ آج ہم لوگوں کی ساری کوششیں بیکار جارہی ہیں، اور ساری کوششیں بے اثر ہورہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کر کے اسلام کی تبلیغ کریں، گناہ کر کے اسلام کو نافذ کریں، ہمارے دل و دماغ پر ہر وقت ہزاروں تاویلیں مسلط رہتی ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت کا یہ تقاضا ہے۔ چلو، شریعت کے اس حکم کو نظر انداز کردو۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت اس کام کے کرنے میں ہے، چلو، یہ کام کرلو۔

یہ ہے وعدہ کا ایفاء

لیکن وہاں تو ایک ہی مقصود تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہونا، نہ مال مقصود ہے، نہ فتح مقصود ہے، نہ بہادر کہلانا مقصود ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں ہے کہ جو وعدہ کرلیا گیا ہے، اس کو نبھاؤ۔ چنانچہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہما دونوں کو غزوۂ بدر جیسی فضیلت سے محروم رکھا گیا، اس لئے کہ یہ دونوں جنگ میں شرکت نہ کرنے پر زبان دے کر آئے تھے۔ یہ ہے "اسلام" جس کے بارے میں فرمایا کہ اس اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ایفائے عہد

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرام میں سے ہیں جن کے بارے میں لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا غلط قسم کے پروپیگنڈے کیے ہیں، اللہ تعالیٰ بچائے ــــ آمین ــــ لوگ ان کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ ان کا ایک قصہ سن لیجئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ شام میں تھے، اس لئے روم کی حکومت سے ان کی ہر وقت جنگ رہتی تھی، ان کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اور روم اس وقت کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی، اور بڑی عظیم الشان عالمی طاقت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کرلیا، اور ایک تاریخ متعین کرلی کہ اس تاریخ تک ہم ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے۔ ابھی جنگ بندی کے معاہدے کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی، اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ جنگ بندی کی مدت تو درست ہے لیکن اس مدت کے اندر اپنی فوجیں رومیوں کی سرحد پر لے جاکر ڈال دوں، تاکہ جس وقت جنگ بندی کی مدت ختم ہو، اس وقت میں فوراً حملہ کردوں، اس لئے کہ دشمن کے ذہن میں تو یہ ہوگا کہ جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگی، پھر کہیں جاکر لشکر روانہ ہوگا، اور یہاں آنے میں وقت لگے گا، اس لئے معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی فوراً مسلمانوں کا لشکر حملہ آور نہیں ہوگا،

لہٰذا وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ اس لئے اگر میں اپنا لشکر سرحد پر ڈال دوں اور مدت ختم ہوتے ہی فوراً حملہ کر دوں تو جلدی فتح حاصل ہو جائے گی۔

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر ان کے علاقے میں ڈال دیا، اور حملہ کے لئے تیار ہو گئے۔ اور جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدے کی آخری تاریخ کا سورج غروب ہوا، فوراً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو پیش قدمی کا حکم دے دیا، چنانچہ جب لشکر نے پیش قدمی کی تو یہ چال بڑی کامیاب ثابت ہوئی، اس لئے کہ وہ لوگ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر شہر کے شہر، بستیاں کی بستیاں فتح کرتا ہوا چلا جا رہا تھا، اب فتح کے نشے کے اندر پورا لشکر آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک دیکھا کہ پیچھے سے ایک گھڑ سوار دوڑتا چلا آ رہا ہے، اس کو دیکھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے انتظار میں رک گئے کہ شاید یہ امیر المؤمنین کا کوئی نیا پیغام لے کر آیا ہو، جب وہ گھڑ سوار قریب آیا تو اس نے آوازیں دینا شروع کر دیں:

"اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، قِفُوْا عِبَادَ اللّٰهِ قِفُوْا عِبَادَ اللّٰهِ"

اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ، اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ، جب وہ اور قریب آیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ وہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت معاویہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا:

"وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ، وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ"

مؤمن کا شیوہ وفاداری ہے، غداری نہیں ہے، عہد شکنی نہیں ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے، میں نے تو اس وقت حملہ کیا ہے جب جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی۔ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگرچہ جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی، لیکن آپ نے اپنی فوجیں جنگ بندی کی مدت کے دوران ہی سرحد پر ڈال دی تھیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر بھی داخل کر دیا تھا، اور یہ جنگ بندی کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ اور میں نے اپنے ان کانوں سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

((مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَحِلَّنَّهُ وَلَا يَشُدَّنَّهُ إِلٰى أَنْ يَّمْضِيَ أَجَلٌ لَهُ أَوْ يَنْبِذَ إِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ))(۱)

یعنی جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو، تو اس وقت تک عہد نہ کھولے اور نہ باندھے جب تک کہ اس کی مدت نہ گزر جائے، یا ان کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان نہ کر دے کہ ہم نے وہ عہد ختم کر دیا۔ لہٰذا مدت گزرنے سے پہلے یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کیے بغیر ان کے علاقے کے

(۱) سنن الترمذي، كتاب السير عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الغدر، رقم: ۱۵۰۶، سنن ابي داود، كتاب الجهاد، رقم: ۲۵۷۸، مسند احمد، مسند الشاميين، رقم: ۱۶۴۰

پاس لے جا کر فوجوں کو ڈال دینا حضورِ اقدس ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق آپ کے لئے جائز نہیں تھا۔

سارا مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا

اب آپ اندازہ لگایئے کہ ایک فاتح لشکر ہے، جو دشمن کا علاقہ فتح کرتا ہوا جا رہا ہے، اور بہت بڑا علاقہ فتح کر چکا ہے، اور فتح کے نشے میں چور ہے۔ لیکن جب حضورِ اقدس ﷺ کا یہ ارشاد کان میں پڑا کہ اپنے عہد کی پابندی مسلمان کے ذمے لازم ہے، اسی وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ جتنا علاقہ فتح کیا ہے، وہ سب واپس کر دو، چنانچہ پورا علاقہ واپس کر دیا اور اپنی سرحد میں دوبارہ واپس آ گئے۔ — پوری دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی کہ اس نے صرف عہد شکنی کی بناء پر اپنا مفتوحہ علاقہ اس طرح واپس کر دیا ہو۔ لیکن یہاں پر چونکہ کوئی زمین کا حصہ پیشِ نظر نہیں تھا، کوئی اقتدار اور سلطنت مقصود نہیں تھی، بلکہ مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا، اس لئے جب اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم ہو گیا کہ وعدہ کی خلاف ورزی درست نہیں ہے، اور چونکہ یہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا تھوڑا سا شائبہ پیدا ہو رہا تھا، اس لئے واپس لوٹ گئے —— یہ ہے ''اسلام'' جس کے بارے میں حکم دیا گیا کہ "اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً" کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور معاہدہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت وہاں پر جو عیسائی اور یہودی تھے، ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے، تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کے معاوضے میں تم ہمیں جزیہ ادا کرو گے ''جزیہ'' ایک ٹیکس ہوتا ہے جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے، چنانچہ جب معاہدہ ہو گیا تو وہ لوگ ہر سال جزیہ ادا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کا دوسرے دشمنوں کے ساتھ معرکہ پیش آ گیا، جس کے نتیجے میں وہ فوج جو بیت المقدس میں متعین تھی ان کی ضرورت پیش آئی۔ کسی نے یہ مشورہ دیا کہ اگر فوج کی کمی ہے تو بیت المقدس میں فوجیں بہت زیادہ ہیں، اس لئے وہاں سے ان کو محاذ پر بھیج دیا جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ مشورہ اور تجویز بہت اچھی ہے، لہٰذا فوجیں وہاں سے اٹھا کر محاذ پر بھیج دو، لیکن اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کرو، وہ یہ کہ بیت المقدس کے جتنے عیسائی اور یہودی ہیں، ان سب کو ایک جگہ جمع کرو، اور ان سے کہو کہ ہم نے آپ کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا، اور یہ معاہدہ کیا تھا کہ آپ کے جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کام کے لئے ہم نے وہاں فوج

ڈالی ہوئی تھی، لیکن اب ہمیں دوسری جگہ فوج کی ضرورت پیش آ گئی ہے، اس لئے ہم آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے، لہٰذا اس سال آپ نے ہمیں جو جزیہ بطور ٹیکس ادا کیا ہے، وہ ہم آپ کو واپس کر رہے ہیں، اور اس کے بعد ہم اپنی فوجوں کو یہاں سے لے جائیں گے۔ اور اب آپ لوگ اپنی حفاظت کا انتظام خود کریں۔

یہ ہے "اسلام" یہ نہیں کہ صرف نماز پڑھ لی اور روزہ رکھ لیا اور بس مسلمان ہو گئے، بلکہ جب تک اپنا پورا وجود، اپنی زبان، اپنی آنکھ، اپنے کان، اپنی زندگی کا طرزِ عمل پورا کا پورا اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں ہوگا اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہوں گے۔

دوسروں کو تکلیف پہنچانا اسلام کے خلاف ہے

جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمادیا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، اور دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچانا گناہِ کبیرہ ہے اور حرام ہے، اور یہ ایسا ہی بڑا گناہ ہے جیسے شراب پینا گناہ ہے۔ جیسے بدکاری کرنا گناہ ہے۔ جیسے سور کھانا گناہ ہے۔ اور تکلیف پہنچانے کے جتنے راستے ہیں، وہ سب گناہِ کبیرہ ہیں۔ مسلمان کا فرض یہ ہے کہ اپنی ذات سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچائے۔ مثلاً آپ گاڑی لے کر جا رہے ہیں اور کسی جگہ جا کر گاڑی کھڑی کرنے کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے ایسی جگہ جا کر گاڑی کھڑی کر دی جو جگہ دوسرے لوگوں کے لئے گزرنے کی جگہ تھی، آپ کے گاڑی کھڑے کرنے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو گزرنا مشکل ہو گیا، اب آپ تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے، آپ اس کو دین کی خلاف ورزی اور گناہ نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ صرف بداخلاقی کی بات نہیں، بلکہ گناہِ کبیرہ ہے۔ یہ ایسا ہی گناہ ہے جیسے شراب پینا گناہ ہے، اس لئے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمادیا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے یعنی اس کے پورے وجود سے دوسرے انسان محفوظ رہیں، ان کو تکلیف نہ پہنچے۔ (۱)

آپ نے اپنی گاڑی غلط جگہ پارک کر کے دوسروں کو تکلیف پہنچائی۔ آج ہم نے دینِ اسلام کو عبادت کی حد تک اور نماز روزے کی حد تک اور مسجد کی حد تک، اور وظائف اور تسبیحات کی حد تک

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ۹، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تفاضل الاسلام وأي أموره أفضل، رقم: ۵۸، سنن الترمذی، کتاب الایمان عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ، باب ما جاء فی أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ۲۵۵۱

محدود کرلیا ہے، اور بندوں کے جو حقوق اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ان کو ہم نے دین سے بالکل خارج کردیا۔

حقیقی مفلس کون؟

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ بتاؤ مفلس کون ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہم لوگ تو اس شخص کو مفلس سمجھتے ہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حقیقی مفلس وہ نہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو، بلکہ حقیقی مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے جب حاضر ہوگا تو اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے اعمال نامے میں بہت سارے روزے ہوں گے، بہت سی نمازیں اور وظیفے ہوں گے، تسبیحات و نوافل کا ڈھیر ہوگا، لیکن دوسری طرف کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کو دھوکہ دیا ہوگا، کسی کی دل آزاری کی ہوگی، کسی کو تکلیف پہنچائی ہوگی، اور اس طرح اس نے بہت سے انسانوں کے حقوق غصب کیے ہوں گے، اب اصحابِ حقوق اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں گے کہ یا اللہ! اس شخص نے ہمارا حق غصب کیا تھا، اس سے ہمارا حق دلوائیے۔ اب وہاں پر روپے پیسے تو چلیں گے نہیں کہ ان کو دے کر حساب کتاب برابر کرلیا جائے، وہاں کی کرنسی تو نیکیاں ہیں، چنانچہ صاحبِ حقوق کو اس کی نیکیاں دینی شروع کی جائیں گی، کسی کو نماز دیدی جائے گی، کسی کو روزے دیدیئے جائیں گے، اس طرح ایک ایک صاحبِ حق اس کی نیکیاں لے کر چلتے جائیں گے یہاں تک کہ اس کی ساری نیکیاں ختم ہوجائیں گی اور یہ شخص خالی ہاتھ رہ جائے گا، نماز روزے کے جتنے ڈھیر لایا تھا، وہ سب ختم ہوجائیں گے، لیکن حق والے اب بھی باقی رہ جائیں گے۔ تو اب اللہ تعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ اب حق دلوانے کا طریقہ یہ ہے کہ صاحبِ حق کے اعمال میں جو گناہ ہیں وہ اس شخص کے نامۂ اعمال میں ڈال دیئے جائیں۔ چنانچہ وہ شخص نیکیوں کا انبار لے کر آیا تھا، لیکن بعد میں نیکیاں تو ساری ختم ہوجائیں گی، اور دوسرے لوگوں کے گناہوں کے انبار لے کر واپس جائے گا، یہ شخص حقیقی مفلس ہے۔ (۱)

آج ہم پورے اسلام میں داخل نہیں

اس سے اندازہ لگائیں کہ حقوق العباد کا معاملہ کتنا سنگین ہے، لیکن ہم لوگوں نے اس کو دین

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم الظلم، رقم: ٤٦٧٨، سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب ما جاء في شان الحساب والقصاص، رقم: ٢٣٤٢، مسند احمد، مسند أبي هريرة، رقم: ٧٦٨٦

سے بالکل خارج کردیا ہے۔ قرآن کریم تو کہہ رہا ہے کہ اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہوجاؤ، آدھے نہیں، بلکہ پورے کے پورے داخل ہوجاؤ۔ تمہارا وجود، تمہاری زندگی، تمہاری عبادت، تمہارے معاملات، تمہاری معاشرت، تمہارے اخلاق، ہر چیز اسلام کے اندر داخل ہونی چاہئے، اس کے ذریعہ تم صحیح معنی میں مسلمان بن سکتے ہو۔ یہی وہ چیز تھی جس کے ذریعہ درحقیقت اسلام پھیلا ہے۔ اسلام محض تبلیغ سے نہیں پھیلا، بلکہ انسانوں کی سیرت اور کردار سے پھیلا ہے، مسلمان جہاں بھی گئے انہوں نے اپنی سیرت اور کردار کا لوہا منوایا، اس سے اسلام کی طرف رغبت اور کشش پیدا ہوئی۔ اور آج ہماری سیرت اور کردار دیکھ کر لوگ اسلام سے متنفر ہو رہے ہیں۔

پورے داخل ہونے کا عزم کریں

آج ہم لوگ جو دین کی باتیں سننے کے لئے اس محفل میں جمع ہوئے ہیں، اس سے کچھ فائدہ اُٹھائیں اور وہ فائدہ یہ ہے کہ ہم یہ عزم کریں کہ اپنی زندگی میں اسلام کو داخل کریں گے، زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کو داخل کریں گے، عبادات بھی، معاملات بھی، معاشرت بھی، اخلاق بھی، ہر چیز اسلام کے مطابق بنانے کی کوشش کریں گے۔

دین کی معلومات حاصل کریں

ایک گزارش آپ حضرات سے یہ کرتا ہوں کہ چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ وقت دین کی معلومات حاصل کرنے کے لئے نکال لیں، مستند کتابیں چھپی ہوئی ہیں، ان کو اپنے گھروں کے اندر پڑھنے کا معمول بنائیں، جس کے ذریعہ دینی تعلیمات سے واقفیت ہو۔ آج مصیبت یہ ہے کہ ہم لوگ دین کی تعلیمات سے واقف نہیں۔ اگر ہم یہ فائدہ حاصل کرسکیں اور اس کے ذریعہ ہمارے دلوں میں دین پر چلنے کا جذبہ پیدا ہوجائے تو یہ انشاء اللہ یہ مجلس مفید ہوگی، ورنہ کہنے سننے کی مجلسیں تو بہت ہوتی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے بھی اور آپ سب کو بھی ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

دین کیا ہے؟☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.
﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ (۱)

جنابِ صدر اور معزز حاضرین!

دین کا مطلب سمجھنے کی ضرورت ہے

''دین کی حقیقت'' کہنے کو اگرچہ چند لفظوں کا مجموعہ ہے لیکن اگر ہم اس کی تشریح کرنا چاہیں تو ایک طویل موضوع بن جائے گا۔ اور وہ اس طرح کہ پھر اس میں دین کے تمام گوشے آجائیں گے۔ لیکن میں اس وقت ایک بنیادی نکتہ کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ آج کی فضا میں جب دین کا نام لیا جاتا ہے تو عام طور سے اس کو دنیا کا حریف اور مدِمقابل سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کسی طرف سے یہ پکار بلند ہوتی ہے کہ دین کی طرف آؤ تو اس کا مطلب بسا اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا کو بالکل چھوڑ دو اور ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اگر ہم دین کی طرف آگئے تو ہمیں اپنی دنیا کی ضروریات، تقاضے، خواہشات اور دنیا میں رہنے سہنے کے معروف طریقے چھوڑنے پڑیں گے ورنہ ہم دین کی برکات حاصل نہیں کر سکتے۔ گویا دین و دنیا کو اس طرح ایک دوسرے کا حریف سمجھا جاتا ہے کہ دونوں جمع ہی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے میں اس محفل میں یہ بات مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس دین کی حقیقت کیا ہے؟ اور یہ کس معنی میں دنیا کا مدمقابل ہے اور کس معنی میں دنیا کا مدمقابل نہیں؟

☆ اصلاحی مواعظ (۲/۱۶۳۔۱۷۶)، سٹاف کلب، فوجی فرٹیلائیزر، کراچی۔

(۱) آل عمران: ۱۹

دین کے لئے ہی انسان کو پیدا کیا گیا ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جس شخص کو بھی اللہ جل شانہ کی ذات پر ایمان ہے یعنی وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ یہ کائنات کسی بنانے والے نے بنائی ہے، یہ چاند، سورج اور ستارے وجود میں لانے والا اور انسان کو پیدا کرنے والا کوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے اس بنانے اور بنا کر بھیجنے کا بھی تو کوئی مقصد ہوگا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی ضرور ہوگا۔ کیونکہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کردے اور انسان کو ہدایت کی روشنی سے محروم کر کے اندھیرے میں چھوڑ دے۔ حاصل یہ کہ جس شخص کو بھی اللہ جل شانہ کے وجود کا یقین ہے اس کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے انسان کو ہدایت اور دنیا میں رہنے سہنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

دنیا میں دو قسم کے معاملات

اس کو دوسرے عنوان سے یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ عالم الغیب بھی ہے اور حکیم مطلق بھی، اس لئے وہ جانتا تھا کہ انسان کے اس کائنات میں پہنچنے کے بعد وہ بعض چیزوں کو تو اطمینان سے سمجھ کر کسی بیرونی رہنمائی کے بغیر، ان کا اعتراف کر کے ان پر عمل کر سکے گا، لیکن ساتھ ساتھ اللہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر انسان کو کسی بیرونی رہنمائی کے بغیر چھوڑ دیا گیا تو کچھ معاملات ایسے بھی ہیں کہ جس میں انسان کی عقل ٹھوکر کھائے گی، جس کی وجہ سے انسان کے بھٹکنے کا اندیشہ ہو جائے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس اندیشے سے بچاؤ کے لئے انسان کو احکامات کا ایک ایسا مجموعہ عطا فرمادیا کہ جس کی وجہ سے انسان اچھے اور برے کی پہچان کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت کا خلاصہ

جس جگہ عقل کو کسی بیرونی رہنمائی کی ضرورت نہیں اس کی مثال ایسے ہے کہ اگر ایک طرف گندگی پڑی ہوئی ہو اور دوسری طرف صفائی ستھرائی ہو تو جس انسان کے اندر انسانیت کا ذرا سا بھی شائبہ ہے وہ کبھی بھی گندگی کو پسند نہیں کرے گا بلکہ ہمیشہ صفائی کو پسند کرے گا۔ معلوم ہوا کہ ایسی چیزوں میں احکام کی ضرورت ہی نہیں اس لئے کہ عقل اس بات کا صحیح فیصلہ کردیتی ہے کہ گندگی کے مقابلے میں صفائی زیادہ پسندیدہ ہے۔

اسی طرح لذیذ اور بدمزہ، میٹھی اور کڑوی چیزوں کے بارے میں کسی بیرونی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جن چیزوں میں انسان کی عقل دھوکہ دے سکتی تھی وہاں اللہ تعالیٰ نے

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے ہدایت کا سامان مہیا کیا اور بتایا کہ یہ چیز اچھی ہے اور یہ بری ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی ہدایت کا خلاصہ ہے۔

حقیقی دین کونسا ہے؟

جب گزشتہ کی ہوئی بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھئے کہ دین کی حقیقت کیا ہے؟ چنانچہ شروع میں تلاوت کردہ آیت میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (۱)

''بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے''

یعنی وہ حقیقی دین جو اللہ نے بندوں کے لئے چنا اور پسند فرمایا ہے وہ اسلام ہے۔ اسلام کے مصداق کے متعلق تو الحمد للہ ہر مسلمان کو علم ہے کہ اس کا مصداق توحید ورسالت، آخرت اور عقائد ہیں۔

اسلام کا معنی کیا ہے؟

لیکن جس چیز کی طرف میں آپ حضرات کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلام کا لفظی معنی ہے ''سر جھکا دینا'' اور ''تابع بن جانا'' یعنی جس شخص کا تابع ہوا ہے اس کے ہر قول پر سر تسلیم خم کر دینا۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (۲)

''اے ایمان والو، اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے''

یہاں اس بات میں غور یہ کرنا ہے کہ ایک طرف تو اس آیت میں خطاب ہی ان لوگوں سے ہے جو ایمان لا چکے ہیں، اور دوسری طرف یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ معلوم ہوا کہ کلمۂ توحید جس سے انسان کا ایمان لانا ثابت ہوتا ہے اس کو پڑھ لینا ہی کافی نہیں اور صرف اس پر ہی ایمان مکمل نہیں ہوتا بلکہ ایک اور کام ہے جس کو سرانجام دینے سے انسان اسلام میں داخل ہو سکے گا، اور وہ کام یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کے آگے اس طرح سر جھکا دے کہ اس کے آگے کسی طرح کی چون وچرا کی گنجائش نہ رہے۔

اسلام کی حقیقت

اور میں اس موقع پر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ''سورہ صٰفّٰت'' میں جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم

(۱) آل عمران: ۱۹ (۲) التوبة: ۲۰۸

خلیل اللہ اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہما السلام کا واقعہ ذکر کیا ہے وہاں اسلام کا لفظ لایا گیا ہے۔ مختصراً اس واقعہ کو عرض کیے دیتا ہوں کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر رہے ہیں۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس حکم کو پورا کرنے اور بیٹے کو آزمانے کے لئے فرمایا:

﴿يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ﴾ (۱)

اب اگر آپ غور کریں کہ ایک انسان کو قتل کرنا تو ویسے ہی گناہِ کبیرہ ہے اور قرآن حکیم میں ارشاد بھی ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾ (۲)

''جو کوئی ایک جان کو بغیر کسی جان کے بدلے قتل کرے یا زمین میں بغیر فساد کرنے کے قتل کرے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا''

اور قتل بھی نابالغ بچہ کا ہو تو وہ اور زیادہ گناہ کا باعث ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ جنگ میں بھی نابالغ بچے کے قتل سے روکا ہے۔

((نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ)) (۳)

''رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ جنگ میں عورتوں اور بچوں کو قتل سے منع فرمایا ہے۔''

پھر اگر وہ نابالغ بچہ خود اپنا بیٹا ہو اور اس کو قتل کرنے کا حکم آجائے تو عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ نابالغ بیٹے کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن وہ بیٹا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تھا اور جس کی صلب سے جناب نبی اکرم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لانے والے تھے، اس نے جواب دیا:

﴿يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ﴾ (۴)

''اے ابا جان! آپ کو جو حکم دیا جاتا ہے اس کو کر گزریئے''

اس تمام واقعہ کو نقل کرنے کے بعد قرآن اس قصے کو یوں پورا کرتا ہے:

---

(۱) الصّٰفّٰت:۱۰۲　　(۲) المائدة:۳۲

(۳) صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، باب قتل النساء في الحرب، رقم: ۲۷۹۲، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب تحريم قتل النساء والصبيان في الحرب، رقم: ۳۲۷۹، سنن الترمذي، كتاب السير عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في النهي عن قتل النساء والصبيان، رقم: ۱٤۹٤

(٤) الصّٰفّٰت:۱۰۲

﴿فَلَمَّآ اَسۡلَمَا وَتَلَّهٗ لِلۡجَبِيۡنِ﴾ (۱)

''جب باپ اور بیٹے نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا''

تو یہاں جو لفظ اسلام لایا گیا ہے اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ حقیقت اسلام کی یہ ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کوئی حکم آجائے تو انسان آگے سے ''کیوں'' کا سوال نہ کرے بلکہ اس پر سرِ تسلیم خم کر کے اس کے مطابق عمل کرے اس لئے کہ ''کیوں'' کا سوال بندگی کا نہیں بلکہ اعتراض کا ہے۔

احکامِ اسلام کے بارے میں ایک گمراہانہ روش

جیسا کہ ہمارے یہاں جب بھی دین سے متعلق کوئی حکم بیان کیا جاتا ہے تو اس میں ایک گمراہانہ طریقہ رائج ہے کہ ایسا حکم کیوں ہے؟ اور بعض اوقات اس کے پیچھے یہ جذبہ ہوتا ہے کہ اگر یہ بات ہماری سمجھ میں آگئی تو ہم اس کو مان کر اس پر عمل کریں گے ورنہ نہیں۔ یہ چیز اسلام کی روح کے خلاف ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی مواقع پر حکم بھیجے ہیں جہاں انسانی عقل کے ٹھوکر کھانے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا اگر کسی حکم کی مصلحت سمجھ میں نہ آئے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

دین کے احکام میں تاویلات کی تلاش کا رویہ

اگر آپ مغربی فلسفے کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک ایسا طبقہ بھی گذرا ہے جس کا دعویٰ ہی یہ ہے کہ اس کائنات میں خیر و شر یعنی اچھائی اور برائی سب اضافی چیزیں ہیں۔ لہٰذا جس ماحول میں جو چیز جس حیثیت سے رائج ہوگی اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور وہ لوگ احکامات میں طرح طرح کی تاویلات کرتے ہیں۔ مثلاً حکم شرعی ہے کہ خنزیر کا گوشت حرام ہے، اگرچہ طبی نقطۂ نظر سے اس کی کچھ وجوہات ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں لیکن حقیقی وجہ اللہ ہی کے علم میں ہے، لیکن وہ خنزیر کے گوشت کے جواز کا دعویٰ کر کے اس کی دلیل یوں پیش کرتے ہیں کہ جس وقت خنزیر کا گوشت حرام کیا گیا اس وقت عرب میں خنزیر گندی جگہوں پر پھرتے تھے اور نجاست کھاتے تھے جس کی وجہ سے ان سے بیماریاں پیدا ہوتی تھیں۔ لیکن آج کل خنزیروں کی تربیت بہت اچھے انداز میں ہو رہی ہے لہٰذا علت ختم ہو جانے کی وجہ سے حکم بھی باقی نہ رہا۔ اور بات اتنی بڑھ چکی ہے کہ ایک صاحب تو مجھ سے اس بات پر بحث کرنے کو بھی تیار تھے اور کہتے تھے کہ علماء کو چاہئے کہ خنزیر کے حرام ہونے کے حکم کے بارے میں اجتہاد کریں کہ خنزیر فلاں وجہ سے حرام تھا، اب چونکہ وہ وجہ ختم ہوگئی ہے اس لئے وہ حکم بھی

(۱) الصّٰفّٰت: ۱۰۲

ختم ہو گیا ہے اور خنزیر کا گوشت حلال ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ انسان نے اپنی عقل کو وہاں استعمال کیا جہاں انسانی عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔ لہٰذا یہ طرزِ عمل کہ احکاماتِ دینیہ کے بارے میں حقیقی مصلحت کا سوال کرنا اور مصلحت کے سمجھنے پر عمل کو موقوف کرنا دین کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

حکمتِ دین کا سوال کرنا مناسب نہیں

اس بات کو میں ایک مثال سے سمجھایا کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں انسانوں کے دو درجے ہوتے ہیں جن میں سے ایک درجہ غلامی جو الحمدللہ ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ملازمت آگئی ہے، جو غلامی سے بہت کم درجہ کی نسبت رکھتی ہے۔ کیونکہ غلامی میں غلام کو چوبیس گھنٹے کام کاج اور خدمت وغیرہ کے لئے موجود ہونا ضروری ہوتا تھا اور ان کی کوئی تنخواہ بھی مقرر نہیں ہوتی تھی۔ جبکہ ملازمت میں چوبیس گھنٹوں میں سے مخصوص وقت تک کام کاج کرنے پڑتے ہیں نیز ملازم کو تنخواہ بھی دی جاتی ہے۔

آپ کے گھر میں ایک ملازم ہو اور آپ اس سے یہ کہیں کہ مجھے ۵ گز دی دودھ لا کر دو! اور وہ ملازم کہے کہ آپ یہ دودھ کیوں منگوا رہے ہیں؟ اس کی وجہ بتائیں جب تک آپ مجھے اس کی وجہ نہ بتائیں گے میں آپ کو دودھ لا کر نہیں دوں گا۔ تو بتایئے کہ اس کے مقابلے میں آپ کا کیا ردِّ عمل ہوگا ظاہر ہے آپ اس سے ناراض ہوں گے حالانکہ وہ بھی آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہے۔ تو وہ اللہ جو خالق و مالک اور کائنات کی تمام چیزوں کا عالم ہے اس کے مقابلے میں تمہارا علم کیا حقیقت رکھتا ہے؟ لہٰذا بندے کو یہ حق کیسے دیا جا سکتا ہے کہ وہ کہے کہ پہلے مجھے اس کی حکمت بتاؤ پھر اس پر عمل کروں گا۔ اس بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ﴾ (۱)

''جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی حکم آجائے تو مؤمن مرد و عورت کے لئے اپنے کام میں کوئی اختیار نہیں رہتا''

زاویۂ نگاہ تبدیل کرنے سے دین حاصل ہو سکتا ہے

البتہ یہ بات سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے جو احکام دیے ہیں جن کے آگے سرِ تسلیم خم

(۱) الاحزاب: ۳۶

کرنا پڑتا ہے وہ احکام انسان کی زندگی میں معدودے چند (گنتی کے چند) ہیں اوران کے علاوہ زندگی کا سارا حصہ آزاد ہے۔ مثلاً کھانا پکانا اور معیشت کا انتظام وغیرہ بے شمار دائرے غیر معین ہیں۔

دین کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اللہ کے دیے ہوئے احکام کا پابند ہو جائے، خواہ وہ احکام اوامر ہوں یا نواہی، اور باقی امور میں بھی اگر انسان ان کا پابند ہو جائے تو وہ بھی دین بن جائے گا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ دین اور دنیا ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے مؤید اور مکمل (تکمیل کرنے والے) ہیں۔

یعنی دنیوی زندگی میں اگر ذرا سا زاویہ نگاہ بدل لیا جائے تو یہی دنیا دین بن جاتی ہے۔ مثلاً کھانا تو ہر شخص کھاتا ہے لیکن اگر اس نقطۂ نظر سے کھانا کھایا جائے کہ یہ میرے اللہ کی عطا ہے اور اس کی ایسی نعمت ہے جو میں نے حلال طریقے سے کمائی ہے اور میں اس کو اس لئے کھا رہا ہوں تاکہ جو حق اللہ نے میرے نفس کا مجھ پر عائد کیا ہے میں اس حق کو ادا کر دوں، تو یہ بھی دین بن جائے گا۔ جیسے آپ نے وہ تصویریں تو دیکھی ہی ہوں گی جن کو ایک طرف دیکھنے سے ایک چیز اور دوسری طرف دیکھنے سے دوسری چیز نظر آتی ہے بالکل اسی طرح دین اور دنیا کا معاملہ ہے۔

دین اور دنیا ایک دوسرے کے حریف نہیں

میں ایک پریکٹیکل بات عرض کرتا ہوں کہ صبح اُٹھنے کے بعد انسان یہ تہیہ کر لے کہ میں آج کے دن جو بھی کام کروں گا وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق انجام دوں گا اور ہر کام اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے حقوق کی ادائیگی کے لئے کروں گا۔ بس اگر آپ اپنی ڈیوٹی پر جا رہے ہیں تو اس تہیہ کے ذریعے آپ کا سارا دن دین بن جائے گا۔ اگر آپ بیوی بچوں کے ساتھ اسی نیت سے خوش طبعی کر رہے ہیں تو یہ بھی دین ہے۔ اور اس میں صرف ایک شرط ہے کہ وہ کام ناجائز یا حرام طریقے کے حصول کے لئے نہ کر رہا ہو تو یہی عمل آخرت میں اس کے دخولِ جنت کا سبب بن جائے گا۔ حاصل یہ کہ دین اور دنیا ایک دوسرے کے حریف نہیں ہیں۔

امام شیبانی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک سوال

اسی طرح معیشت کو انجام دینے کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں مثلاً زراعت، ملازمت، صنعت اور تجارت غرض یہ کہ تمام کام نیت کی بنا پر دین بن جاتے ہیں۔

امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ نے کتابیں تو بہت تصنیف کی ہیں لیکن تصوف اور روحانیت کے موضوع پر آپ نے کوئی کتاب نہیں لکھی؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں

نے انسان کی معیشت کے بارے میں جو کتاب لکھی ہے وہ تصوف ہی تو ہے۔ اس لئے کہ میں نے اس میں لکھا ہے کہ معیشت حاصل کرنے کے جو بھی طریقے ہیں ان کو انسان اللہ کی رضامندی کے لئے استعمال کرلے تو یہی چیزیں انسان کے لئے دین اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور درحقیقت یہ بھی تصوف ہی کی بات ہے۔

انسان کا ہر لمحہ دین بن سکتا ہے

انسان کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جس کو وہ دین نہ بنا سکے۔ صرف اور صرف اخلاصِ نیت سے انسان اپنی دنیا کو دین بنا سکتا ہے بشرطیکہ احکامِ الٰہیہ کے مطابق ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اتنا کام اور کرے کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے ان سے بچنے کا اہتمام کرے تو ساری دنیا دین بن جائے گی۔

رہی یہ بات کہ آپ کو حلال اور حرام چیزوں کے بارے میں علم کیسے ہو تو اس کے لئے اگر آپ روزانہ پانچ منٹ بھی نکالیں تو آہستہ آہستہ آپ کو یہ ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ اور ایک دوسرا کام یہ ہے کہ آپ حضرات اپنے اپنے گھروں میں چوبیس گھنٹوں میں سے صرف دس منٹ نکال کر سب گھر والوں کو جمع کر کے کوئی ایسی کتاب پڑھ کر سنا دیا کریں جس میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت، حلال و حرام اور فرائض و واجبات کی نشاندہی کی گئی ہو۔ اور آخر میں اللہ تعالیٰ سے اس پر عمل کی توفیق کی دعا مانگ لیا کریں تو آپ کی دنیا بھی دین بن جائے گی۔

اس کے لئے میں آپ کے سامنے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب عارفی قدس اللہ سرہ کی کتاب ''اُسوۂ رسولِ اکرم ﷺ'' کی تجویز پیش کرتا ہوں جو حضور ﷺ کی سیرت اور آپ کی سنتوں پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے اور دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

دین کی حقیقت☆

تسلیم و رضا

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

((عَنْ اَبِیْ مُوْسیٰ الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ اَوْ سَافَرَ کُتِبَ لَہٗ مِثْلَ مَا کَانَ یَعْمَلُ مُقِیْمًا صَحِیْحًا))(۱)

بیماری اور سفر میں نیک اعمال لکھے جاتے ہیں

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اجل صحابہ اور فقہاء صحابہ میں سے ہیں، اور ان حضرات میں سے ہیں جنہوں نے دو مرتبہ ہجرت فرمائی۔ ایک مرتبہ حبشہ کی طرف، اور دوسری مرتبہ مدینہ طیبہ کی طرف۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جب کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے، یا سفر کی حالت میں ہوتا ہے تو جو عبادات اور نیک اعمال صحت کی حالت میں یا اقامت کی حالت میں کیا کرتا تھا، جب بیماری یا سفر کی وجہ سے وہ چھوٹ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ وہ سارے اعمال اس کے نامۂ اعمال میں لکھتے رہتے ہیں، باوجودیکہ وہ بیماری یا سفر کی وجہ سے وہ اعمال نہیں کر پا رہا ہے، اس لئے کہ اگر وہ تندرست ہوتا، یا اپنے گھر میں ہوتا تو یہ اعمال کرتا''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی بڑی تسلی اور نعمت کی بات بتادی کہ بیماری میں معذوری اور مجبوری کی

☆ اصلاحی خطبات (۱/۱۸۱۔۲۰۶)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجھاد باب یکتب للمسافر مثل ما کان یعمل فی الاقامۃ، رقم: ۲۷۷۴، سنن أبی داود، کتاب الجنائز، رقم: ۲۶۸۷، مسند أحمد، رقم: ۱۸۸۴۸

وجہ سے جب معمولات چھوٹ رہے ہیں تو اس پر بہت صدمہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ اگر تندرست ہوتا تو یہ کام کر لیتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو لکھ رہے ہیں۔

نماز کسی حالت میں معاف نہیں

لیکن اس کا تعلق صرف نفلی عبادت سے ہے۔ جو عبادات فرض ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ نے جو تخفیف کر دی، اس تخفیف کے ساتھ ان کو انجام دینا ہی ہے۔ مثلاً نماز ہے۔ انسان کتنا ہی بیمار ہو، بسترِ مرگ پر ہو، اور مرنے کے قریب ہو، تب بھی نماز ساقط نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آسانی تو فرما دی کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی طاقت نہیں تو بیٹھ کر پڑھ لو۔ بیٹھ کر پڑھنے کی طاقت نہیں تو لیٹ کر پڑھ لو۔ وضو نہیں کر سکتے تو تیمم کر لو، اگر کپڑے پاک رکھنا بالکل ممکن نہیں تو اسی حالت میں پڑھ لو، لیکن نماز کسی حالت میں معاف نہیں۔ جب تک انسان کے دم میں دم ہے۔ ہاں! اگر کوئی بے ہوش ہو جائے، یا غشی طاری ہو جائے، اور اسی حالت میں چھ نمازوں کا وقت گزر جائے تو اس وقت نماز معاف ہو جاتی ہے، لیکن جب تک ہوش میں ہے، اور دم میں دم ہے، اس وقت تک نماز معاف نہیں۔

بیماری میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان بیمار ہوا۔ اور اب کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہے۔ بیٹھ کر پڑھنے کی قدرت نہیں تو لیٹ کر پڑھ رہا ہے۔ ایسے موقع پر بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ وہ دل تنگ کرتے رہتے ہیں کہ اس حالت میں اب کھڑے ہو کر پڑھنے کا موقع نہیں مل رہا ہے، اور بیٹھ کر پڑھنے کا بھی موقع نہیں مل رہا ہے، لیٹے لیٹے نماز پڑھ رہا ہوں، پتہ نہیں کہ وضو بھی ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں، تیمم بھی صحیح ہو رہا ہے یا نہیں، ان چیزوں میں پریشان رہتے ہیں۔ حالانکہ سرکارِ دو عالم ﷺ تسلی دے رہے ہیں کہ جب تم مجبوری کی وجہ سے ان چیزوں کو چھوڑ رہے ہو تو اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے نامۂ اعمال میں لکھ رہے ہیں جو تندرستی کی حالت میں تم کیا کرتے تھے۔

اپنی پسند کو چھوڑ دو

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ تُؤْتٰی رُخْصَۃُ کَمَا یُحِبُّ اَنْ تُؤْتٰی عَزَائِمُہٗ)) (۱)

یعنی جس طرح عزیمت جو اعلیٰ درجے کا کام ہے اس پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اسی

(۱) مجمع الزوائد (۱۶۲/۳)

طرح مجبوری کی وجہ سے اگر رخصت پر عمل کریں تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا اپنی پسند کی فکر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کو جو حالت پسند ہے، وہی حالت مطلوب ہے۔

آسانی اختیار کرنا سنت ہے

بعض لوگوں کی طبیعت سخت کوشی کی ہوتی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ مشقت کا کام کریں، بلکہ مشقت ڈھونڈتے ہیں، اس لئے ڈھونڈتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں زیادہ ثواب ہے، چونکہ بہت سے بزرگوں سے بھی اس قسم کی باتیں منقول ہیں، لہٰذا ان کی شان میں کوئی گستاخی کا کلمہ نہیں کہنا چاہئے۔ لیکن سنت کا طریقہ وہ نہیں۔ سنت کا طریقہ یہ ہے جو حدیث میں منقول ہے:

((مَا خُيِّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا)) (۱)

جب حضورِ اقدس ﷺ کو دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ ان میں سے آسان تر کو اختیار فرماتے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا حضورِ اقدس ﷺ کا آسانی اختیار کرنا۔ معاذ اللہ۔ تن آسانی کے لئے تھا؟ اور کیا مشقت اور تکلیف سے بچنے کے لئے یا دنیاوی راحت اور آرام حاصل کرنے کے لئے تھا؟ ظاہر ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں ہوسکتا کہ آپ تن آسانی اور راحت و آرام حاصل کرنے کے لئے آسان راستہ اختیار فرماتے تھے۔ لہٰذا اس کی وجہ وہی ہے کہ آسان راستہ اختیار کرنے میں عبدیت زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری نہیں ہے، بلکہ شکستگی ہے، میں تو عاجز بندہ ہوں، ناکارہ ہوں، میں تو آسان راستہ اختیار کرتا ہوں۔ یہ بندگی کا اظہار ہے۔ اور اگر مشکل راستہ اختیار کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری جتاتا ہے۔

دین ''اتباع'' کا نام ہے

دین کی ساری بنیاد یہ ہے کہ کسی خاص عمل کا نام دین نہیں۔ کسی خاص شوق کا نام دین نہیں۔ اپنے معمولات پورے کرنے کا نام دین نہیں۔ اپنی عادت پوری کرنے کا نام دین نہیں۔ دین نام ہے ان کی اتباع کا۔ وہ جیسا کہیں ویسا کرنے کا نام دین ہے۔ ان کو جو چیز پسند ہے، اس کو اختیار کرنے کا نام دین ہے۔ اور اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دینے کا نام دین ہے۔ وہ جیسا کرا رہے ہیں، وہی بہتر ہے۔ یہ جو صدمہ اور حسرت ہوتی رہتی ہے کہ ہم تو بیمار ہو گئے، اس واسطے کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھی

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب صفة النبی صلی اللہ علیه وسلم، رقم: ۳۲۹٦، صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب مباعدته للآثام...... رقم: ٤۲۹٤

جارہی ہے، لیٹ کر پڑھ رہے ہیں، یہ صدمہ کرنے کی بات نہیں۔ ارے اللہ تعالیٰ کو وہی پسند ہے۔ اور جب یہی پسند ہے تو اس وقت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ کرو۔ اور ان کو ویسا ہی کرنا پسند ہے۔ اگرچہ اس وقت تم کو زبردستی کھڑے ہو کر نماز پڑھنا پسند ہے۔ لیکن اپنی تجویز کو فنا کر دینے اور اللہ جل جلالہ نے جیسا مقدر کر دیا اس پر راضی رہنے کا نام بندگی ہے۔ اپنی طرف سے تجویز کرنا کہ یوں ہوتا تو یوں کر لیتا، یہ کوئی بندگی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری مت دکھاؤ

جب اللہ تعالیٰ یہ چاہ رہے ہیں کہ بندہ تھوڑا سا ہائے ہائے کرے۔ تو ہائے ہائے کرو۔ ایک بزرگ دوسرے بزرگ کے پاس عیادت کے لئے گئے تو دیکھا کہ وہ بزرگ بڑی سخت تکلیف میں ہیں، لیکن بجائے کچھ کراہنے کے ''اللہ اللہ'' اور ''الحمد للہ، الحمد للہ'' کا ورد کر رہے ہیں۔

ان بزرگ نے فرمایا: بھائی! یہ تمہارا ''الحمد للہ'' کرنا بڑا قابلِ مبارک باد ہے۔ لیکن یہ موقع اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کا ہے کہ ''یا اللہ! مجھے عافیت عطا فرما دیجئے''، اس وقت میں ''الحمد للہ'' کہنا، یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری دکھانا ہے کہ اللہ میاں! آپ تو مجھے بیمار کر رہے ہیں، لیکن میں اتنا بہادر ہوں کہ میری زبان پر کبھی آہ نہیں آئے گی۔ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری دکھانا یہ کوئی بندگی نہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے شکستگی دکھانا بندگی ہے۔ وہ جب چاہ رہے ہیں کہ بندہ تھوڑا سا ہائے ہائے کر کے پکارے تو عاجز اور بے بس بن کر اللہ میاں کو پکارو۔ کیسے پکارو؟ جیسے حضرت ایوب علیہ السلام نے پکارا تھا:

﴿اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ﴾ (۱)

پیغمبر سے زیادہ کون بہادر ہوگا۔ اتنی زبردست بیماری اور اتنی زبردست تکلیف، لیکن اللہ میاں کو پکار رہے ہیں کہ "مَسَّنِیَ الضُّرُّ" اے اللہ! مجھے تکلیف پہنچ گئی ہے، "وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ" لہٰذا وہ جب چاہ رہے ہیں کہ ان کو پکارا جائے، اور آدمی تھوڑا سا کراہے تو پھر کراہنے میں ہی مزہ ہے۔ وہ جیسا کہیں اسی کے کرنے میں مزہ ہے، اللہ میاں کے سامنے اتنا ضبط بھی اچھا نہیں، یہ بھی بندگی کے خلاف ہے۔

انسان کا اعلیٰ ترین مقام

یاد رکھو! انسان کا اعلیٰ ترین مقام، جس سے اونچا مقام کوئی اور نہیں ہو سکتا، وہ ''عبدیت'' اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کا مقام ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے اوصاف بیان

(۱) الانبیاء: ۸۳

فرمائے، ایک جگہ فرمایا:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾ (۱)

یعنی ہم نے آپ کو شاہد، مبشر، نذیر، داعی اور سراج منیر بنا کر بھیجا۔ دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ کے کتنے اوصاف ذکر فرمائے۔ لیکن جہاں معراج کا ذکر آیا، اور اپنے پاس بلانے کا ذکر فرمایا، وہاں حضورِ اقدس ﷺ کے لئے ''عبد'' کا لفظ ذکر کیا۔ فرمایا:

﴿سُبْحَانَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾ (۲)

یعنی ''وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندے کو لے گیا'' یہاں ''شاہد'' ''مبشر'' اور ''سراج منیر'' کے الفاظ نہیں لائے بلکہ صرف ایک لفظ ''عبد'' لائے۔ یہ بتلانے کے لئے کہ انسان کا سب سے اُونچا مقام عبدیت کا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی، شکستگی اور عاجزی کا مقام ہے۔

توڑنا ہے حسن کا پندار کیا؟

ہمارے بڑے بھائی تھے محمد ذکی کیفی مرحوم۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ شعر بہت اچھے کہا کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بہت اچھا شعر کہا ہے۔ لوگ اس کا صحیح مطلب نہیں سمجھتے۔ اسی بات کو انہوں نے بڑے خوبصورت پیرائے میں کہا ہے۔ کہتے ہیں کہ۔

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں
توڑنا ہے حسن کا پندار کیا؟ (۳)

یہ جو غم کو اتنا ضبط کر رہے ہو کہ منہ سے ''آہ'' بھی نہ نکلے ''کراہ'' بھی نہ نکلے، تو کیا تم اس کے پندار کو توڑنا چاہتے ہو جو تمہیں اس غم میں مبتلا کر رہا ہے؟ اس کا پندار توڑنا مقصود ہے؟ اس کے آگے بہادری دکھانا چاہتے ہو؟ یہ بندہ کا کام نہیں۔ بندہ کا کام تو یہ ہے کہ جب اس نے ایک تکلیف دی تو اس تکلیف کا تقاضا یہ ہے کہ اس تکلیف کے ازالے کے لئے اس کو پکارا جائے۔ اگر اس نے غم دیا ہے تو اس غم کا اظہار شرعی حدود میں رہ کر کیا جائے۔ جیسا کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے کیا کہ جب بچے کا انتقال ہو گیا تو فرمایا:

((اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ))

''اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی پر بڑے غمگین ہیں'' (۴)

---

(۱) الاحزاب: ۴۵۔ ۴۶ (۲) بنی اسرائیل: ۱ (۳) کیفیات: ذکی کیفی، ص: ۱۴۱

(٤) صحيح البخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی صلی الله علیه وسلم: انا بك لمحزونون، رقم: ۱۲۲۰، صحيح مسلم، کتاب الفضائل (٤٢٧٩)

بات یہ ہے کہ جس حالت میں اللہ تعالیٰ رکھتے ہیں وہی حالت پسندیدہ ہے۔ جب وہ چاہ رہے ہیں کہ لیٹ کر نماز پڑھو تو پھر لیٹ کر ہی نماز پڑھو۔ اس وقت لیٹ کر پڑھنے ہی میں وہ ثواب اور وہ اجر ہے جو عام حالت میں کھڑے ہو کر پڑھنے میں ہے۔

رمضان کا دن لوٹ آئے گا

ہمارے حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بات نقل فرماتے تھے کہ ایک شخص رمضان میں بیمار ہو گیا۔ اور بیماری کی وجہ سے روزہ چھوڑ دیا، اب اس کو غم ہو رہا ہے کہ رمضان کا روزہ چھوٹ گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غم کرنے کی کوئی بات نہیں، یہ دیکھو کہ تم روزہ کس کے لئے رکھ رہے ہو؟ اگر یہ روزہ اپنی ذات کے لئے رکھ رہے ہو، اپنی خوشی کے لئے اور اپنا شوق پورا کرنے کے لئے روزہ رکھ رہے ہو تو بے شک اس پر صدمہ کرو کہ بیماری آ گئی اور روزہ چھوٹ گیا۔ لیکن اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے روزہ رکھ رہے ہو، اور اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ بیماری میں روزہ چھوڑ دو، تو مقصود پھر بھی حاصل ہے۔ اس لئے کہ حدیث شریف میں ہے:

((لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ))[1]

سفر کی حالت میں جب کہ شدید مشقت ہو، اس وقت روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں۔ لیکن قضا کرنے کے بعد جب عام دنوں میں روزہ رکھو گے تو اس میں وہ تمام انوار و برکات حاصل ہوں گے جو رمضان کے مہینے میں حاصل ہوتے تھے۔ گویا کہ اس شخص کے حق میں رمضان کا دن لوٹ آئے گا، اور رمضان کے دن روزہ رکھنے میں جو فائدہ حاصل ہوتا، وہ فائدہ اس دن قضا کرنے میں حاصل ہو جائے گا۔ لہٰذا اگر شرعی عذر کی وجہ سے روزے قضا ہو رہے ہیں، مثلاً بیماری ہے، سفر ہے، یا خواتین کی طبعی مجبوری ہے، اس کی وجہ سے روزے قضا ہو رہے ہیں تو غمگین ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اس وقت میں روزہ چھوڑ دینا اور کھانا پینا ہی اللہ کو پسند ہے، اور لوگوں کو روزہ رکھ کر جو ثواب مل رہا ہے، تمہیں روزہ نہ رکھ کر وہی ثواب مل رہا ہے، اور عام لوگوں کو بھوکا رہ کر جو ثواب مل رہا ہے، تمہیں کھانا کھا کر مل رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ وہی انوار و برکات عطا فرما رہے ہیں، جو عام روزہ داروں کو عطا فرما رہے ہیں۔ اور پھر جب بعد میں اس روزے کی قضا کرو گے تو قضا کے دن رمضان کی ساری برکتیں اور سارے انوار حاصل ہوں گے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لیس من البر الصوم فی السفر، رقم: ۱۹۴۶، سنن الترمذی، کتاب الصوم عن رسول اللہ رقم: ٦٤٤

اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دل میں رہتے ہیں

اور اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بیماری کے اندر جو صدمہ ہو رہا ہے کہ ''روزہ'' چھوٹ گیا، اس صدمہ سے دل ٹوٹا، دل شکستہ ہوا۔ دل کی اس شکستگی کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو نواز دیتے ہیں، چاہے صدموں سے دل ٹوٹے، یا غموں سے ٹوٹے، یا افکار سے ٹوٹے، یا خوفِ خدا سے ٹوٹے، یا فکرِ آخرت سے۔ کسی بھی طرح ہو۔ بس جب دل ٹوٹتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتوں کا مورد بن جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

((أَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مِنْ أَجْلِيْ))(۱)

''میں ان لوگوں کے پاس ہوں جن کے دل میری وجہ سے ٹوٹے ہوں''

دل پر یہ چوٹیں جو پڑتی رہتی ہیں، اس طرح کہ کبھی کوئی تکلیف آگئی، کبھی کوئی صدمہ آگیا، کبھی کوئی پریشانی آگئی، یہ دل کو توڑا جا رہا ہے، کیوں توڑا جا رہا ہے؟ اس کو اس لئے توڑا جا رہا ہے کہ اس کو اپنی رحمتوں اور اپنے فضل وکرم کا مورد بنایا جا رہا ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

یہ دل جتنا ٹوٹے گا، اتنا ہی آئینہ ساز یعنی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عزیز ہوگا۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ ایک شعر سنایا کرتے تھے، فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے دل کو توڑتے ہیں، تو اس کے ذریعہ اس کو بلندیوں تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ یہ صدمے، یہ افکار، یہ غم جو انسان کو آتے ہیں، یہ مجاہداتِ اضطراری ہوتے ہیں، جس سے انسان کے درجات میں اتنی ترقی ہوتی ہے کہ عام حالات میں اتنی ترقی نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ شعر اکثر سناتے۔

یہ کہہ کے کوزہ گر نے پیالہ پٹک دیا
اب اور کچھ بنائیں گے اس کو بگاڑ کے

جب یہ دل ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات اور اس کی رحمتوں کا مورد بنتا ہے۔ ایک غزل کا شعر حضرت والا سنایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے۔

بتانِ ماہ وش اُجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
جسے برباد کرتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

(۱) اتحاف السادۃ المتقین (۲۹۰/۶)، اگرچہ محدثین نے حدیث کی حیثیت سے اس کو بے اصل کہا ہے، لیکن جو معنی اس میں بیان کیے گئے ہیں وہ صحیح ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ٹوٹے ہوئے دل میں تجلی فرماتے ہیں۔ اس لئے ان غموں اور صدموں سے ڈرو نہیں، یہ آنسو جو گر رہے ہیں، یہ دل جو ٹوٹ رہا ہے، یہ آہیں جو نکل رہی ہیں، اگر اللہ جل جلالہ پر ایمان ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی تصدیق دل میں ہے تو یہ سب چیزیں تمہیں کہیں سے کہیں پہنچا رہی ہیں۔

وادی عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادہ صد سالہ بہ آہے گاہے

وادی عشق کا راستہ بڑا لمبا چوڑا راستہ ہے، لیکن بعض اوقات سو سال کا فاصلہ ایک آن میں طے ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان صدموں اور غموں اور پریشانیوں سے گھبرانا نہیں چاہئے۔

دین تسلیم ورضا کے سوا کچھ نہیں

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ بات اُتار دے کہ دین اپنا شوق پورا کرنے کا نام نہیں، اپنی عادت پوری کرنے کا نام دین نہیں۔ دین اس کا نام ہے کہ جس وقت جو کام کرنے کو کہا جا رہا ہے وہ کریں۔ نہ کسی عمل میں کچھ رکھا ہے۔ نہ نماز میں کچھ رکھا ہے۔ نہ روزے میں کچھ رکھا ہے۔ کسی عمل میں کچھ نہیں رکھا۔ جو کچھ ہے وہ ان کی رضا میں ہے۔

عشق تسلیم و رضا کے ماسوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں تو پھر وفا کچھ بھی نہیں

اللہ تبارک وتعالیٰ جس کام سے خوش ہوں، وہی کام کرنے کا ہے، اسی کام میں مزہ ہے۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ بات ہمارے دلوں میں پیوست فرما دے تو دین کو سمجھنے کے راستے کھل جائیں۔

تیمارداری میں معمولات کا چھوٹنا

اور یہ جو بتایا کہ بیماری کی حالت میں اگر معمولات چھوٹ جائیں تو اس پر وہی کچھ لکھا جا رہا ہے جو صحت کی حالت میں کرنے سے ملتا۔ علماء کرام نے فرمایا کہ اس میں جس طرح اپنی بیماری داخل ہے، ان لوگوں کی بیماری بھی داخل ہے جن کی تیمارداری اور خدمت انسان کے فرائض میں شامل ہے۔ کسی کے والدین بیمار ہو گئے۔ اب دن رات ان کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ ان کی خدمت میں لگے رہنے کی وجہ سے معمولات چھوٹ گئے۔ اب نہ تلاوت ہو رہی ہے۔ نہ نوافل ہو رہے ہیں۔ نہ ذکر ہے

نہ تسبیح ہے۔ سب کچھ چھوٹا جارہا ہے۔ اور دن رات ماں باپ کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگرچہ خود بیمار نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی جو اعمال چھوٹ رہے ہیں، وہ اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں لکھے جارہے ہیں۔ کیوں؟

وقت کا تقاضا دیکھو

اس لئے کہ ہمارے حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بزرگوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے انسان کی زندگی درست کرنے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ فرماتے تھے: میاں! ہر وقت کا تقاضا دیکھو۔ اس وقت کا تقاضا کیا ہے؟ اس وقت مجھ سے مطالبہ کیا ہے؟ یہ نہ سوچو کہ اس وقت میرا کس کام کو دل چاہ رہا ہے۔ دل چاہنے کی بات نہیں۔ بلکہ یہ دیکھو اس وقت تقاضا کس کام کا ہے؟ اس تقاضے کو پورا کرو۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی ہے۔ تم نے تو اپنے ذہن میں بٹھا رکھا تھا کہ روزانہ تہجد پڑھا کروں گا، روزانہ اتنے پارے تلاوت کیا کروں گا، روزانہ اتنی تسبیحات پڑھا کروں گا، اب جب ان کاموں کا وقت آیا تو دل چاہ رہا ہے کہ یہ کام میں پورے کروں۔ اور ذہن پر اس کام کا بوجھ ہے۔ اب عین وقت پر گھر میں سے بیمار ہوگئیں۔ اور اس کے نتیجے میں اس کی تیمارداری، علاج اور دوا دارو میں لگنا پڑا۔ اور اس میں لگنے کی وجہ سے وہ معمول چھوٹنے لگا۔ اس وقت بڑا دل کڑھتا ہے کہ کیا ہوگیا۔ میرا تو آج کا معمول قضا ہو جائے گا۔ اس وقت تو میں بیٹھ کر تلاوت کرتا، ذکر و اذکار کرتا، اب مارا مارا پھر رہا ہوں کہ کبھی ڈاکٹر کے پاس، کبھی حکیم کے پاس، کبھی دواخانے، یہ میں کس چکر میں پھنس گیا۔ ارے! اللہ تعالیٰ نے جس چکر میں ڈالا، اس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کرو، اگر اس وقت وہ کام چھوڑ کر تلاوت کرنے بیٹھ جاؤ گے تو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام کرو۔ اب اسی میں وہ ثواب ملے گا جو تلاوت کرنے میں ملتا۔ اسی میں وہ ثواب ملے گا جو تسبیحات میں ملتا۔ یہ ہے اصل دین۔

اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین ــــ ان حضرات میں سے تھے جن کے قلب پر اللہ تعالیٰ کانٹے کی بات القا فرماتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا نام دین ہے۔ اس کا نام دین نہیں کہ فلاں کام کا شوق ہوگیا۔ لہٰذا اب تو وہی کام کریں گے۔ مثلاً علم دین پڑھنے اور عالم بننے کا شوق ہوگیا۔ اس سے قطع نظر کہ تمہارے لئے عالم بننا جائز بھی ہے یا نہیں؟ گھر

میں ماں بیمار پڑی ہے، باپ بیمار پڑا ہے، اور گھر میں دوسرا کوئی تیمارداری کرنے والا اور ان کی دیکھ بھال کرنے والا موجود نہیں، لیکن آپ کو شوق ہو گیا کہ عالم بنیں گے، چنانچہ ماں باپ کو بیمار چھوڑ کر مدرسہ میں پڑھنے چلے گئے۔ یہ دین کا کام نہیں ہے، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے۔ دین کا کام تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ چھوڑ کر ماں کی خدمت کرو۔ باپ کی خدمت کرو۔

مفتی بننے کا شوق

یا مثلاً تخصص پڑھنے اور مفتی صاحب بننے کا شوق ہو گیا۔ بہت سے طلبہ مجھ سے کہتے ہیں کہ ہمیں تخصص پڑھنے کا بڑا شوق ہے، اور ہم فتویٰ نویسی سیکھنا چاہتے ہیں۔ ان سے پوچھا کہ آپ کے والدین کا کیا منشا ہے؟ جواب دیا کہ والدین تو راضی نہیں ہیں۔ اب دیکھئے کہ والدین تو راضی نہیں ہیں اور یہ مفتی صاحب بننا چاہتے ہیں۔ یہ دین نہیں ہے، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے۔

تبلیغ کرنے کا شوق

یا مثلاً! تبلیغ کرنے اور چلّے میں جانے کا شوق ہو گیا۔ ویسے تو تبلیغ کرنا بڑی فضیلت اور ثواب کا کام ہے، لیکن گھر میں بیوی بیمار پڑی ہے، کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ اور آپ کو چلّہ لگانے کا شوق ہو گیا، یہ دین نہیں ہے، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے۔ اب اس وقت دین کا تقاضا اور وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس بیمار کی تیمارداری کرو، اور اس کا خیال کرو، اور اس کا علاج کرو، یہ دنیا نہیں ہے۔ یہ بھی دین ہے۔

مسجد میں جانے کا شوق

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ مجلس میں اس پر یہ مثال دی کہ ایک شخص جنگل اور ویرانے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ اور آس پاس کوئی آبادی بھی نہیں۔ بس میاں بیوی دونوں اکیلے رہتے ہیں۔ اب میاں صاحب کو آبادی کی مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا شوق ہو گیا، اب بیوی کہتی ہے کہ یہ تو جنگل اور ویرانہ ہے۔ اگر تم نماز پڑھنے آبادی کی مسجد میں چلے گئے تو مجھے اس ویرانے میں ڈر لگے گا۔ اور ڈر کے مارے میری جان نکل جائے گی، اس لئے بجائے مسجد جانے کے آج تم یہیں نماز پڑھ لو۔۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ وہ میاں صاحب تو تھے شوقین، چنانچہ شوق میں آکر اپنی بیوی کو وہیں جنگل میں اکیلا چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے۔ فرمایا کہ یہ شوق پورا کرنا ہے۔ یہ دین نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس وقت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ گھر میں نماز پڑھتا۔ اور اپنی

بیوی کی یہ پریشانی دور کرتا۔

یہ اس وقت ہے جہاں بالکل ویرانہ ہے، کوئی آبادی نہیں ہے، البتہ جہاں آبادی ہو تو وہاں مسجد میں جاکر نماز پڑھنی چاہئے۔

لہٰذا اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں۔ کسی کو جہاد میں جانے کا شوق۔ کسی کو تبلیغ میں جانے کا شوق۔ کسی کو مولوی بننے کا شوق۔ کسی کو مفتی بننے کا شوق۔ اور اس شوق کو پورا کرنے کے نتیجے میں ان حقوق کا کوئی خیال نہیں جو اس پر عائد ہو رہے ہیں۔ اس بات کا کوئی خیال نہیں کہ اس وقت میں ان حقوق کا تقاضا کیا ہے؟

یہ جو کہا جاتا ہے کہ کسی شیخ سے تعلق قائم کرو، یہ درحقیقت اسی لئے ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس وقت کا کیا تقاضا ہے؟ اس وقت تمہیں کونسا کام کرنا چاہئے؟ اب یہ باتیں جو اس وقت کہہ رہا ہوں، اس کو کوئی آگے اس طرح نقل کردے گا کہ وہ مولانا صاحب تو یہ کہہ رہے تھے کہ مفتی بننا بُری بات ہے۔ یا تبلیغ کرنا بُری بات ہے۔ وہ صاحب تو تبلیغ کے مخالف ہیں۔ کہ تبلیغ میں اور چلے میں نہیں جانا چاہئے۔ یا جہاد میں نہیں جانا چاہئے۔ ارے بھائی! یہ سب کام اپنے اپنے وقت پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے کام ہیں۔ یہ دیکھو کہ کس وقت کا کیا تقاضا ہے؟ تم سے کس وقت کیا مطالبہ ہو رہا ہے؟ اس مطالبے اور تقاضے پر عمل کرو۔ اپنے دل و دماغ سے ایک راستہ متعین کرلیا اور اس پر چل کھڑے ہوئے، یہ دین نہیں ہے۔ دین یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ اس وقت کس بات کا حکم دے رہے ہیں؟

سہاگن وہ جسے پیا چاہے

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندی زبان کی ایک مثل بہت کثرت سے سنایا کرتے تھے۔ فرماتے کہ:

سہاگن وہ جسے پیا چاہے

قصہ یوں ہے کہ ایک لڑکی کو دلہن بنایا جارہا تھا۔ اور اس کا سنگھار پٹار کیا جارہا تھا، اب جو کوئی آتا اس کی تعریف کرتا کہ تو بڑی خوبصورت لگ رہی ہے۔ تیرا چہرہ اتنا خوبصورت ہے۔ تیرا جسم اتنا خوبصورت ہے۔ تیرا زیور اتنا خوبصورت ہے۔ اس کی ایک ایک چیز کی تعریف کی جارہی تھی۔ لیکن وہ لڑکی ہر ایک کی تعریف سنتی، لیکن خاموش رہتی۔ اور سنی اَن سُنی کردیتی۔ کسی خوشی کا اظہار نہ کرتی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ یہ تیری سہیلیاں تیری اتنی تعریفیں کررہی ہیں، تجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ہورہی ہے؟ اس لڑکی نے جواب دیا کہ ان کی تعریف سے کیا خوشی ہو۔ اس لئے کہ یہ جو کچھ تعریفیں کریں گی، وہ ہوا میں اُڑ جائیں گی۔ بات جب ہے کہ جس کے لئے مجھے سنوارا جارہا ہے، وہ تعریف کرے۔ وہ پسند کرکے

کہہ دے کہ ہاں! تو اچھی لگ رہی ہے، تب تو فائدہ ہے۔ اور اس کے نتیجے میں میری زندگی سنور جائے گی ۔ لیکن اگر یہ عورتیں تو تعریف کر کے چلی گئیں اور جس کے لئے مجھے سنوارا گیا تھا، اس نے ناپسند کر دیا تو پھر اس دلہن بننے اور اس سنگھار پٹار کا کیا فائدہ؟

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

یہ قصہ سنانے کے بعد حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ یہ دیکھو کہ جو کام تم کر رہے ہو، جس کے لئے کر رہے ہو اس کو پسند ہے یا نہیں؟ لوگوں نے تو تعریف کر دی کہ بڑے مفتی صاحب ہیں۔ بڑے عالم اور بڑے مولانا صاحب ہیں۔ لوگوں نے تعریف کر دی کہ تبلیغ میں بہت وقت لگا تا ہے۔ اور اللہ کے راستے میں نکلتا ہے۔ کسی کے بارے میں کہہ دیا کہ یہ مجاہدِ اعظم ہے۔ ارے ان لوگوں کے کہنے سے کیا حاصل! جس کے لئے کر رہے ہو وہ یہ کہہ دے کہ۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

اس وقت فائدہ ہے۔ لہٰذا جب ہر کام کا مقصد ان کو راضی کرنا ہے تو پھر ہر وقت انسان کو یہ فکر رہنی چاہئے کہ اس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہو رہا ہے؟

اذان کے وقت ذکر چھوڑ دو

اچھے خاصے ذکر اللہ میں مشغول تھے۔ لیکن جیسے ہی اذان کی آواز کان میں پڑی، حکم آگیا کہ ذکر چھوڑ دو اور خاموش ہو کر مؤذن کی آواز سنو اور اس کا جواب دو۔ اگر چہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اذان کے وقت اگر ذکر کرتے رہتے تو کئی تسبیحات اور پڑھ لیتے ۔ مگر ذکر سے روک دیا گیا۔ جب روک دیا تو اب رک جاؤ۔ اب ذکر میں فائدہ نہیں۔ اب اذان سننے اور اس کا جواب دینے میں فائدہ ہے۔

جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حج بڑی عجیب وغریب عبادت بنائی ہے۔ اگر آپ حج کی عاشقانہ عبادت کو شروع سے آخر تک دیکھیں گے تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قدم قدم پر قاعدوں کے بت توڑے ہیں۔ اب دیکھیں کہ مسجدِ حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔ لیکن آٹھ ذی الحجہ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مسجدِ حرام چھوڑو، اور منیٰ میں جا کر پڑاؤ ڈالو۔ وہاں نہ حرم، نہ کعبہ، اور نہ وہاں پہ کوئی کام، نہ وقوف ہے، نہ رمی جمرات ہے۔ بس یہ حکم دے دیا کہ ایک لاکھ نمازوں

کا ثواب چھوڑ دو، اور منیٰ کے جنگل میں جا کر پانچ نمازیں ادا کرو، یہ سب کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ نہ اس کعبہ میں کچھ رکھا ہے اور نہ حرم میں کچھ رکھا ہے۔ نہ مسجدِ حرام میں کچھ رکھا ہے۔ جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے۔ جب ہم نے کہہ دیا کہ مسجدِ حرام میں جا کر نماز پڑھو، تو اب ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملے گا۔ اور جب ہم نے کہہ دیا کہ مسجدِ حرام کو چھوڑ دو۔ اب اگر کوئی شخص مسجدِ حرام میں نماز پڑھے گا تو ایک لاکھ نمازوں کا ثواب تو کیا ملے گا، بلکہ اُلٹا گناہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے ہمارے حکم کو توڑ دیا۔

نماز اپنی ذات میں مقصود نہیں

قرآن وسنت میں نماز وقت پر پڑھنے کی بہت تاکید وارد ہے۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا﴾ (۱)

نماز کو وقت کے ساتھ پابند کیا گیا ہے۔ وقت گزرنے سے پہلے نماز پڑھ لو۔ مغرب کی نماز کے بارے میں حکم دے دیا کہ تعجیل کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے پڑھ لو۔ تاخیر نہ ہو۔ لیکن عرفات کے میدان میں مغرب کی نماز جلدی پڑھو گے تو نماز ہی نہ ہوگی۔ حضورِ اقدس ﷺ مغرب کے وقت عرفات کے میدان سے نکل رہے ہیں۔ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ بار بار فرما رہے ہیں کہ "الصلاة یا رسول الله" "الصلاة یا رسول الله" اور حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ "الصلاة امامك" (نماز تمہارے آگے ہے)

سبق یہ دیا جا رہا ہے کہ یہ مت سمجھ لینا کہ اس مغرب کے وقت میں کچھ رکھا ہے۔ ارے بھائی! جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے۔ جب ہم نے کہا کہ جلدی پڑھو تو جلدی پڑھنا باعثِ ثواب تھا۔ اور جب ہم نے کہا کہ مغرب کا یہ وقت گزار دو، اور مغرب کی نماز عشاء کی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھو، تو اب تمہارے ذمے وہی فرض ہے۔ حج میں قدم قدم پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے قاعدوں کے بت توڑے ہیں۔ عصر کی نماز میں تقدیم کرا دی، اور مغرب میں تاخیر کرا دی۔ ہر کام اُلٹا کرایا جا رہا ہے۔ اور تربیت اس بات کی دی جا رہی ہے کہ کسی چیز کو اپنی ذات میں مقصود نہ سمجھنا۔ نہ نماز اپنی ذات میں مقصود ہے۔ نہ روزہ اپنی ذات میں مقصود ہے۔ نہ کوئی اور عبادت اپنی ذات میں مقصود ہے۔ مقصود اللہ جل جلالہ کی اطاعت ہے۔

---

(۱) النساء: ۱۰۳

افطار میں جلدی کیوں؟

یہ جو حکم دیا گیا کہ افطار میں جلدی کرو، اور بلاوجہ افطار میں تاخیر کرنا مکروہ ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اب تک تو بھوکا رہنا اور نہ کھانا باعثِ ثواب تھا۔ پیاسا رہنا باعثِ ثواب تھا، اس کی بڑی فضیلت اور بڑا اجر وثواب تھا۔ لیکن جب ہم نے کہہ دیا کہ کھاؤ اب کھانے میں تاخیر کرنا گناہ ہے۔ اس لئے کہ اب اگر کھانے میں تاخیر کرو گے تو اپنی طرف سے روزے میں اضافہ کرنا لازم آئے گا۔

سحری میں تاخیر کیوں؟

سحری میں تاخیر افضل ہے۔ اگر کوئی شخص پہلے سے سحری کھا کر سو جائے تو یہ سنت کے خلاف ہے۔ بلکہ عین وقت پر جب سحری کا وقت ختم ہو رہا ہو، اس وقت کھانا افضل ہے۔ کیوں؟ اس لئے اگر پہلے سے کوئی شخص سحری کھا کر سو گیا تو اس نے اپنی طرف سے روزے کی مقدار میں اضافہ کر دیا۔ وہ اتباع میں نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ اپنی طرف سے کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ساری بات ان کی اتباع میں ہے۔ ہم ان کے بندے ہیں۔ اور بندے کے معنی یہ ہیں کہ جو کہیں وہ کرو۔

''بندہ'' اپنی مرضی کا نہیں ہوتا

حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! ایک ہوتا ہے ملازم اور نوکر، ملازم اور نوکر خاص وقت اور خاص ڈیوٹی کا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک ملازم کا کام صرف جھاڑو دینا ہے۔ کوئی دوسرا کام اس کے ذمے نہیں۔ یا ایک ملازم آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے۔ آٹھ گھنٹے کے بعد اس کی چھٹی۔ اور ایک ہوتا ہے ''غلام'' جو نہ وقت کا ہوتا ہے اور نہ ڈیوٹی کا ہوتا ہے۔ وہ تو حکم کا ہے۔ اگر آقا اس سے کہے کہ تم یہاں قاضی اور جج بن کر بیٹھ جاؤ اور لوگوں کے درمیان فیصلے کرو تو وہ قاضی بن کر فیصلے کرے گا۔ اور اگر آقا اس سے کہہ دے کہ پاخانہ اُٹھاؤ تو وہ پاخانہ اُٹھائے گا۔ اس کے لئے نہ وقت کی قید ہے اور نہ کام کی قید، بلکہ آقا جیسا کہہ دے غلام کو ویسا ہی کرنا ہوگا۔

''غلام'' سے آگے بھی ایک درجہ اور ہے۔ وہ ہے ''بندہ'' وہ غلام سے بھی آگے ہے۔ اس لئے کہ ''غلام'' کم از کم اپنے آقا کی پرستش تو نہیں کرتا ہے۔ لیکن ''بندہ'' اپنے آقا کی عبادت اور پرستش بھی کرتا ہے۔ اور ''بندہ'' اپنی مرضی کا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اپنے آقا کی مرضی کا ہوتا ہے۔ وہ جو کہے وہ کرے، دین کی روح اور حقیقت یہی ہے۔

بتاؤ! یہ کام کیوں کر رہے ہو؟

میں نے صبح سے شام تک کا ایک نظام بنا رکھا ہے کہ اس وقت تصنیف کرنی ہے۔ اس وقت درس دینا ہے۔ اس وقت فلاں کام کرنا ہے۔ تصنیف کے وقت جب تصنیف کرنے بیٹھے، مطالعہ کیا، اور ابھی ذہن کو لکھنے کے لئے تیار کیا، اور قلم اُٹھایا تھا سوچ کر یوں لکھنا چاہئے کہ اتنے میں ایک صاحب آگئے، اور آکر ''السلام علیکم'' کہا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ اب اس وقت بڑا دل کڑھتا ہے کہ یہ خدا کا بندہ ایسے وقت آگیا، بڑی مشکل سے ابھی تو کتابیں دیکھ کر لکھنے کے لئے ذہن بنایا تھا۔ اور یہ صاحب آگئے۔ اور اس کے ساتھ پانچ دس منٹ باتیں کیں، اتنے میں جو کچھ ذہن میں آیا تھا، وہ سب نکل گیا۔ اب اس کو ازسرِ نو ذہن میں جمع کیا۔ اس طرح صبح سے شام تک یہ دھندہ ہوتا رہتا ہے۔ ایسے وقت میں بڑی کڑھن ہوتی تھی کہ ہم نے سوچا تھا کہ اس وقت میں اتنا کام ہو جائے گا۔ دو تین صفحے لکھ لیں گے۔ لیکن صرف چند سطروں سے زیادہ کام نہیں ہوا۔۔ اللہ تعالیٰ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ صاحب کے درجات بلند فرمائے۔ فرماتے تھے کہ میاں! یہ بتاؤ کہ یہ کام کیوں کر رہے ہو؟ یہ تصنیف، یہ تدریس، یہ فتویٰ کس کے لئے ہے؟ کیا یہ سب اس لئے ہے کہ تمہاری سوانحِ حیات میں لکھا جائے کہ اتنے ہزار صفحات تصنیف کر گیا۔ اور اتنی بہت سی تصانیف اور کتابیں لکھیں۔ یا اتنے بہت شاگرد پیدا کر دیئے۔ اگر یہ سب کام اس لئے کر رہے ہو تو بے شک اس پر افسوس کرو کہ اس شخص کی ملاقات کی وجہ سے حرج ہوا۔ اور تعداد میں اتنی کمی ہوگئی۔ جتنے صفحات لکھنے چاہئیں تھے، اتنے نہ لکھے۔ جتنے شاگردوں کو پڑھانا چاہئے تھا، اُتنوں کو نہ پڑھایا، اس پر افسوس کرو۔ لیکن یہ سوچو کہ اس کا حاصل کیا ہے؟ محض لوگوں کی طرف سے تعریف، توصیف، شہرت، پھر تو یہ سب کام اکارت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کی ایک دھیلہ قیمت نہیں، اور اگر مقصود ان کی رضا ہے کہ وہ راضی ہو جائیں، یہ قلم اس لئے ہل رہا ہے کہ وہ راضی ہو جائیں، ان کے یہاں یہ عمل مقبول ہو جائے، تو جب مقصود ان کی رضا ہے، وہ قلم ہلے، یا نہ ہلے، وہ قلم ہلنے سے راضی ہوں تو قلم ہلانا بہتر ہے، اگر قلم نہ ہلنے سے راضی ہو جائیں تو وہی بہتر ہے، بس دیکھو کہ وقت کا تقاضا کیا ہے۔ تم نے بے شک اپنے ذہن میں یہ منصوبہ بنایا تھا کہ آج دو صفحے ہو جانے چاہئیں۔ لیکن وقت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک ضرورت مند آگیا۔ وہ کوئی مسئلہ پوچھ رہا ہے۔ کوئی اپنی ضرورت لے کر آیا ہے۔ اس کا بھی حق ہے۔ اس کا حق ادا کرو۔ اب وہ اس کا حق ادا کرنے میں راضی ہیں۔ اس سے بات کرنے میں، اس کو مسئلہ بتانے میں وہ راضی ہیں۔ تو پھر گھبرانے کی کیا ضرورت ہے کہ میرا یہ معمول رہ گیا۔ اب تمہاری تصنیف میں اتنا ثواب نہیں، جتنا اس شخص کی حاجت پوری کرنے میں ثواب ہے۔ بس! یہ دیکھو کہ وقت کا تقاضا کیا ہے؟ جس وقت کا جو

تقاضا ہو، اس کے مطابق عمل کرو۔ یہ ہے دین کی فہم اور سمجھ کہ اپنی طرف سے کوئی تجویز نہیں، ہر بات ان کے حوالے ہے۔ وہ جیسا کرا رہے ہیں، انسان ویسا کر رہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اسی میں راضی ہیں۔ ہر چیز میں یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کس میں ہے۔ اس کے مطابق عمل کرو۔ بیماری ہو تو، سفر ہو تو، حضر ہو تو، صحت ہو تو، ہر حالت میں ان کی رضا کی فکر کرو۔ اس لئے یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ ہم نے منصوبے بنائے تھے۔ وہ منصوبے ٹوٹ گئے۔ ارے وہ منصوبے تو تھے ہی ٹوٹنے کے لئے۔ انسان کیا اور اس کا منصوبہ کیا؟ منصوبہ تو انہی کا چلتا ہے۔ کسی کا منصوبہ نہیں چلتا۔ جب بیماری آئیگی تو منصوبہ ٹوٹے گا۔ سفر آئے گا تو منصوبہ ٹوٹے گا۔ جب عوارض پیش آئیں گے تو منصوبہ ٹوٹے گا۔ منصوبوں کے پیچھے مت چلو۔ ان کی رضا کو دیکھو۔ انشاء اللہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار نہ ملا۔ کون مسلمان ایسا ہوگا جس کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور دیدار کی خواہش نہ ہو۔ خواہش تو کیا؟ تڑپ نہ ہو۔ جب کہ دیدار ہو بھی سکتا ہو۔ آپ کے عہد مبارک میں موجود بھی ہو۔ لیکن سرکار کی طرف سے حکم یہ ہو گیا کہ تمہیں دیدار نہیں کرنا۔ تمہیں اپنی ماں کی خدمت کرنی ہے۔ اب ماں کی خدمت ہو رہی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار چھوڑا جا رہا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کو یہ فرما دیا کہ فائدہ اس میں ہے کہ ہمارا حکم مانو، ہمارا حکم یہ ہے کہ مدینہ نہ جاؤ۔ ہمارا حکم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ کرو۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کہی ہوئی بات پر عمل کرو۔ اب ماں کی خدمت کر رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے محروم ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کیا، اور دیدار سے محروم رہے تو جو لوگ دیدار سے بہرہ ور ہوئے تھے، جن کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہوا تھا یعنی صحابہ کرام، وہ آ آ کر حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے دعائیں کراتے تھے کہ خدا کے واسطے ہمارے لئے دعا کر دو۔ بلکہ حدیث میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ وہاں قرن میں میرا ایک اُمتی ہے۔ جس نے میرے حکم کی خاطر اور اللہ کی رضا کی خاطر میرے دیدار کو قربان کیا ہے۔ اے عمر! وہ جب کبھی مدینہ آئیں تو جا کر ان سے اپنے حق میں دعا کرانا۔ اگر کوئی شوقین ہوتا تو کہتا کہ مجھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا شوق ہے۔ اور یہ دیکھے بغیر کہ میری ماں بیمار ہے، اور اس کو میری خدمت کی حاجت ہے، دیدار کے شوق میں چل کھڑا ہوتا۔ کیوں؟ صرف اپنا شوق پورا کرنے کے لئے۔ لیکن وہ اللہ کے بندے ہیں۔ اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جو آپ نے فرمایا وہ کرتے ہیں۔ میرا شوق کچھ نہیں۔ میری تجویز کچھ نہیں۔ میری رائے کچھ نہیں۔ بلکہ

جوانہوں نے فرمایا، وہی برحق ہے، اس پر عمل کرنا ہے۔ (۱)

تمام بدعات کی جڑ ــــ نفس پرستی

اور یہ ساری بدعتیں جتنی رائج ہیں، ان سب کی جڑ یہاں سے کٹتی ہے۔ اگر یہ فہم دل میں پیدا ہو جائے کہ ہمارا شوق کچھ نہیں۔ وہ جو حکم دیں، اس پر عمل کرنا ہے۔ بدعت کے معنی کیا ہیں؟ بدعت کے معنی یہ ہیں کہ ہم خود راستہ نکالیں گے کہ اللہ کو راضی کرنے کا کیا راستہ ہے؟ اللہ تعالیٰ سے نہیں پوچھیں گے۔ ہمیں یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کو عید میلاد النبی منانا اور میلاد پڑھنا یہ صحیح طریقہ ہے، اپنے دماغ سے یہ راستہ نکالا۔ اور اس پر عمل شروع کر دیا۔ نہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ نہ اللہ تعالیٰ نے کہا۔ اور نہ صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا۔ بلکہ ہم نے اپنے دماغ سے نکال دیا کہ یہ طریقہ موجب ثواب ہے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کا تیجہ کرنا اپنے دماغ سے نکال لیا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے پوچھے بغیر اس پر چل کھڑا ہو، اسی کا نام بدعت ہے۔ اسی کے بارے میں فرمایا:

((كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَّكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) (۲)

''ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے''

اب بظاہر دیکھنے میں تیجہ ایک اچھا عمل ہے کہ بیٹھ کر قرآن شریف پڑھ رہے ہیں۔ کھانا پکا کر لوگوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ اس میں کیا حرج ہے؟ اور اس میں کیا گناہ ہیں؟ گناہ اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے پوچھے بغیر کیا ہے۔ اور جو کام بظاہر نیک ہو، لیکن ان کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف کیا جائے، وہ اللہ کے ہاں قبول نہیں۔

میرے محبوب مری ایسی وفا سے توبہ
جو ترے دل کی کدورت کا سبب بن جائے

یعنی جو چیز بظاہر وفاداری نظر آرہی ہے، لیکن حقیقت میں تیرے دل کی کدورت کا سبب بن رہی ہے، ایسی وفاداری سے توبہ مانگتا ہوں۔ اور اسی کا نام بدعت ہے۔ جس حال میں اللہ تعالیٰ رکھیں، بس! اسی حال میں خوش رہو۔ اور اس کا تقاضا پورا کرو۔

---

(۱) صحیح مسلم، كتاب الفضائل، باب من فضائل اويس القرني رضي الله عنه، رقم: ٤٦١٢، مسند احمد، أول مسند عمر بن الخطاب، رقم: ٢٥٧۔

(۲) سنن النسائي، كتاب صلاة العيدين، باب كيف الخطبة، رقم: ١٥٧٨۔ سنن أبي داؤد، كتاب السنة، باب في لزوم السنة، رقم: ٣٩٩١۔ سنن ابن ماجه، المقدمة، باب اجتناب البدع والجدل، رقم: ٤٥

اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی کہ۔

چونکہ بر میخت ببندد بستہ باش

چوں کشاید چابک و برجستہ باش

وہ اگر تمہیں ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیں تو بندھے پڑے رہو۔ اور جب کھول دیں تو پھر چھلانگیں لگاؤ۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی تلقین فرمارہے ہیں کہ بیماری کی وجہ سے گھبراؤ نہیں، رخصت پر عمل کرنا بھی بڑا ثواب کا کام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے کہ میرے بندے نے میری دی ہوئی رخصت پر عمل کیا۔ اور اس رخصت کو بھی پورے اہتمام کے ساتھ استعمال کرو۔ اللہ تعالیٰ یہ بات ہمارے دلوں میں اُتار دے۔ آمین

شکر کی اہمیت اور اس کا طریقہ

اس باب کی آخری حدیث ہے:

((عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ لَيَرْضَى عَنِ الْعَبْدِ أَنْ يَّأْكُلَ الْاَكْلَةَ فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا أَوْ يَشْرِبَ الشَّرْبَةَ فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا))(۱)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو بہت پسند فرماتے ہیں اور اس سے راضی ہوجاتے ہیں جو بندہ کوئی لقمہ کھاتا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور پانی کا کوئی گھونٹ پیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے''

مطلب یہ ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت پر کثرت سے شکر ادا کرتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوجاتے ہیں۔

یہ بات بار بار عرض کرچکا ہوں کہ شکر سو عبادتوں کی ایک عبادت ہے۔ اور ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ کہاں کروگے مجاہدات اور ریاضتیں۔ اور کہاں وہ مشقتیں اُٹھاؤگے جیسی صوفیاء کرام نے اُٹھائیں، لیکن یہ ایک چٹکلا اختیار کرلو کہ ہر بات پر شکر ادا

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب استحباب حمد اللہ تعالی بعد الاکل والشرب، رقم: ۲۷۳٤

کرنے کی عادت ڈال لو۔ کھانا کھاؤ تو شکر، پانی پیو تو شکر، ہوا چلے تو شکر، بچہ سامنے آئے، اچھا لگے تو شکر، گھر والوں کو دیکھو، اور دیکھ کر راحت ہو تو شکر ادا کرو۔ شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، اور رٹ لگاؤ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، یاد رکھو کہ یہ شکر کی عادت ایسی چیز ہے کہ یہ بہت سارے امراضِ باطنی کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ یہ تکبر، یہ حسد، یہ عجب ان سب کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ جو آدمی کثرت سے شکر ادا کرتا ہے، وہ عام طور سے تکبر میں مبتلا نہیں ہوتا۔ یہ بزرگوں کا تجربہ ہے۔ بلکہ اس پر نص وارد ہے۔

شیطان کا بنیادی داؤ ــــ ناشکری پیدا کرنا

جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو راندہ درگاہ کیا، اور نکال دیا، تو کم بخت نے جاتے جاتے کہہ دیا کہ مجھے ساری عمر کی مہلت دے دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دے دی۔ اس نے کہا کہ اب میں تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا۔ اور ان کو گمراہ کرنے کے لئے دائیں طرف سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا۔ چاروں طرف سے ان پر حملے کروں گا، اور ان کو تیرے راستے سے بھٹکاؤں گا۔ اور آخر میں اس نے کہا:

﴿وَلَا تَجِدُ اَکْثَرَھُمْ شٰکِرِیْنَ﴾ (۱)

"میرے بہکانے کے نتیجے میں آپ اپنے بندوں میں سے اکثر کو ناشکرا پائیں گے"

شیطانی داؤ کا توڑ ــــ اداءِ شکر

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کا جو بنیادی داؤ ہے، وہ ہے ناشکری پیدا کرنا۔ اگر ناشکری پیدا ہوگئی تو معلوم نہیں کتنے امراض میں مبتلا ہوگیا، اور اس داؤ کا توڑ شکر کرنا ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروگے اتنا ہی شیطان کے حملوں سے محفوظ رہوگے۔ اس لئے روحانی بیماریوں سے بچنے کا مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، دن رات صبح شام رٹ لگاؤ "اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ" اس سے انشاء اللہ شیطان کے حملوں کا سدباب ہوجائے گا۔

پانی خوب ٹھنڈا پیا کرو

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں اشرف علی!

---

(۱) الاعراف: ۱۷

جب پانی پیو تو خوب ٹھنڈا پیو۔ تاکہ روئیں روئیں سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر نکلے۔ نبی کریم ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ مجھے دنیا کی تین چیزیں پسند ہیں۔ ان میں سے ایک ٹھنڈا پانی ہے۔ اور کسی کھانے پینے کی چیز کے بارے میں یہ ثابت نہیں کہ نبی کریم ﷺ کے لئے کوئی خاص چیز کہیں سے منگوائی جارہی ہے۔ لیکن صرف ٹھنڈا پانی تھا جو سرکارِ دو عالم ﷺ کے لئے تین میل کے فاصلے سے آیا کرتا تھا۔ بیرِ غرس نامی کنواں جو اب بھی مدینہ طیبہ میں موجود ہے، اس سے نبی کریم ﷺ کے لئے خاص طور پر ٹھنڈا پانی منگوایا جاتا تھا[1] حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ جب پیاس کی حالت میں ٹھنڈا پانی پیا جائے گا تو روئیں روئیں سے شکر نکلے گا۔

سونے سے پہلے نعمتوں کا استحضار اور ان پر شکر

اور رات کو سونے سے پہلے بیٹھ کر ساری نعمتوں کا استحضار کرلو۔ کہ گھر عافیت کا ہے۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ۔ بستر آرام دہ ہے۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ۔ میں عافیت سے ہوں۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ۔ بچہ عافیت سے ہے۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ۔ ایک ایک نعمت کا استحضار کر کے رٹ لگاؤ۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ چیز اپنے نانا سے سیکھی ہے۔ ایک مرتبہ میں ان کے گھر گیا تو رات کو میں نے دیکھا کہ وہ سونے سے پہلے بستر پر بیٹھے ہوئے ہیں، اور بار بار، بار بار اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ پڑھ رہے ہیں۔ اور عجیب کیفیت میں یہ عمل کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرمانے لگے: بھائی! سارے دن تو معلوم نہیں کس حالت میں رہتا ہوں، اور یہ پتہ نہیں لگتا کہ شکر ادا ہو رہا ہے یا نہیں، اس وقت بیٹھ کر دن بھر کی ساری نعمتوں کا استحضار کرتا ہوں، اور پھر ہر نعمت پر "اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ" کہتا جاتا ہوں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ دیکھا تو اس کے بعد الحمدللہ میں نے بھی اس کو اپنے معمول میں شامل کرلیا، کہ رات کو سوتے وقت سب نعمتوں کا استحضار کر کے شکر ادا کرتا ہوں۔

---

(۱) احیاء علوم الدین (۱/۲۱۲)، آپ ﷺ نے وفات کے بعد بئر غرس کے پانی سے غسل کی وصیت فرمائی تھی۔ سنن ابن ماجه، کتاب ما جاء فی الجنائز، باب ما جاء فی غسل النبی، رقم: ۱۴۵۷

شکر ادا کرنے کا آسان طریقہ

اور نبی کریم ﷺ پر قربان جائیں۔ آپ نے ہر ہر چیز کے طریقے بتا دیئے ہیں۔ کہاں تک انسان شکر ادا کرے گا۔ بقول شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے فرماتے ہیں کہ ایک سانس پر دو شکر واجب ہیں۔ سانس اندر جائے اور باہر نہ آئے تو موت، اور اگر سانس باہر آئے پھر اندر نہ جائے تو موت، تو ایک سانس پر دو نعمتیں، اور ہر نعمت پر ایک شکر واجب ہے۔ اس طرح ہر سانس پر دو شکر واجب ہو گئے۔ اس لئے اگر انسان سانس ہی کی نعمت کا شکر ادا کرنا چاہے تو کہاں تک کرے گا۔

﴿وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾(۱)

''اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے''

اس لئے سرکارِ دو عالم ﷺ نے شکر ادا کرنے کا ایک آسان طریقہ بتا دیا اور چند کلمات تلقین فرما دیئے۔ ہر مسلمان کو یاد کر لینے چاہئیں۔ فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَائِمًا مَعَ دَوَامِكَ، وَخَالِدًا مَعَ خُلُوْدِكَ، وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَا مُنْتَهٰى لَهُ دُوْنَ مَشِيْئَتِكَ، وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَا يُرِيْدُ قَائِلُهُ اِلَّا رِضَاكَ))(۲)

''اے اللہ! آپ کا شکر ہے۔ ایسا شکر کہ جب تک آپ ہیں، اس وقت تک وہ شکر جاری رہے، اور جس طرح آپ جاوداں ہیں، اسی طرح وہ شکر بھی جاوداں رہے۔ اور آپ کی مشیت کے آگے جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔ اور آپ کی ایسی حمد کرتا ہوں، جس کے کہنے والے کو سوائے آپ کی رضا کے کچھ اور مطلوب نہیں''

اور دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ زِنَةَ عَرْشِكَ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِكَ، وَعَدَدَ خَلْقِكَ، وَرِضَا نَفْسِكَ))(۳)

میں آپ کا شکر کرتا ہوں جتنا آپ کے عرش کا وزن ہے۔ اور اتنا شکر ادا کرتا ہوں جتنی آپ کے کلمات کی سیاہی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے تمام کلمات کو لکھنا چاہے، اور ساتوں کے ساتوں سمندر اس کے لئے سیاہی بن جائیں اور اس سے اللہ تعالیٰ کے کلمات لکھے جائیں تو

---

(۱) النحل: ۱۸

(۲) کنز العمال، (۲/۲۲۳)، رقم: ۳۸۵۷

(۳) سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب التسبيح بالخفي، رقم الحديث: ۱۲۸۵

سارے سمندر خشک ہو جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم نہ ہوں۔ تو آپ کے کلمات لکھنے کے لئے جتنی سیاہی درکار ہو سکتی ہے، اس کے بقدر شکر ادا کرتا ہوں۔ اور جتنی آپ کی مخلوقات ہیں، یعنی انسان، جانور، درخت، پتھر، جمادات، نباتات سب جتنی مقدار میں ہیں، اس کے برابر شکر ادا کرتا ہوں۔ اور آخر میں فرمایا کہ اتنا شکر ادا کرتا ہوں جس سے آپ راضی ہو جائیں۔ اب اس سے زیادہ انسان اور کیا کہہ سکتا ہے، لہٰذا رات کو سوتے وقت ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور یہ کلمات کہہ لینے چاہئیں:

((اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ مَلِيًّا عِنْدَ طَرْفَةِ كُلِّ عَيْنٍ، وَتَنَفُّسِ نَفْسٍ))[1]

''اے اللہ! آپ کی تعریف اور آپ کا شکر ہے ہر آنکھ جھپکنے کے وقت اور ہر سانس لینے کے وقت''

بہرحال! یہ شکر کے کلمات جو نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائے ہیں، یاد کر لینے چاہئیں۔ اور رات کو سوتے وقت ان کلمات کو پڑھ لینا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) کنز العمال، (۲/۲۲۳)، رقم: ۳۸۵۷

اللہ تعالیٰ کا حکم بے چون و چرا تسلیم کرلو ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۃ الحجرات کی تفسیر کا بیان چل رہا ہے، گزشتہ دو تین جمعوں میں آیت نمبر چھ کی تفسیر آپ کے سامنے پیش کی تھی، جس میں باری تعالیٰ نے فرمایا کہ جب کوئی فاسق شخص کوئی خبر لے کر آئے تو تمہارا فرض ہے کہ پہلے اس کی تحقیق کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس غلط خبر کی بنیاد پر کسی شخص کو نقصان پہنچادو، اور بعد میں تمہیں پشیمانی اور ندامت ہو۔ اس کا بقدرِ ضرورت بیان الحمد للہ پچھلے دو تین جمعوں میں ہو چکا۔

تمہاری رائے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے مختلف ہونا

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم بات کی طرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو متوجہ فرمایا ہے، اور صحابہ کرام کے واسطے سے پوری اُمتِ مسلمہ کو متوجہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/ ۲۹۷۔۳۰۶)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) الحجرات: ۷۔۸، آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسول موجود ہیں، بہت سی باتیں ہیں جن میں وہ اگر تمہاری بات مان لیں تو خود تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ لیکن اللہ نے تمہارے دل میں ایمان کی محبت ڈال دی ہے اور اسے تمہارے دلوں میں پُرکشش بنادیا ہے اور تمہارے اندر کفر کی اور گناہوں اور نافرمانی کی نفرت بٹھادی ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو ٹھیک ٹھیک راستے پر آچکے ہیں، جو اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت ہے، اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔"

خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بات یاد رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کے رسول (ﷺ) موجود اور تشریف فرما ہیں، اگر ہمارے رسول (ﷺ) بہت سی باتوں میں تمہاری اطاعت کرنے لگیں، یعنی جیسا تم کہو، ویسا ہی وہ کرلیں تو تم سخت مصیبت میں مبتلا اور پریشان ہو جاؤ گے۔ اس کے ذریعہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ بعض اوقات ایسے واقعات پیش آسکتے ہیں جن میں تمہاری ذاتی رائے رسول اللہ ﷺ کی رائے سے مختلف ہوگی، مثلاً آپ ﷺ کسی بات کا حکم دے رہے ہوں، اور تمہاری سمجھ میں وہ بات نہ آرہی ہو، یا ایسا ہوسکتا ہے کہ تمہارے دل میں ایک تقاضا پیدا ہوا کہ یہ معاملہ یوں ہونا چاہئے، اور تم نے اپنی وہ رائے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کردی، اور حضور ﷺ نے تمہاری وہ رائے نہیں مانی، اور فرمایا کہ میں تمہاری رائے پر عمل نہیں کرتا، تو ایسی صورت میں یہ خیال دل میں پیدا ہوسکتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ جو کچھ فرمارہے ہیں، یا آپ جس بات کا حکم دے رہے ہیں، وہ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

خبر کی تحقیق کرلینی چاہئے

جیسا کہ وہ واقعہ جو میں نے گزشتہ آیت کی تفسیر میں عرض کیا تھا کہ جب حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے قبیلہ بنو المصطلق کی طرف بھیجا، اور وہ صحابہ غلط فہمی میں یہ سمجھ کر واپس آگئے کہ جن لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے جارہا ہوں، وہ میرے دشمن ہیں، اور وہ مجھے قتل کرنے کے لئے آبادی سے باہر نکلے ہیں۔ اور انہوں نے واپس آکر حضور ﷺ کو یہ بات بتادی تو اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بہت جوش آیا کہ حضور ﷺ کا ایک نمائندہ جس کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا گیا، اور ان لوگوں نے خود بلایا کہ ہمارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے ایک آدمی بھیج دیں، پھر وہ لوگ ایسی غداری کریں کہ اس قاصد کو قتل کرنے کے لئے آبادی سے باہر آجائیں، اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بہت غصہ آیا، اور بہت صدمہ پہنچا، اور جوش و خروش کے عالم میں انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اب یہ لوگ اس لائق نہیں کہ ان کے ساتھ نرمی برتی جائے، آپ فوراً ان پر چڑھائی کا حکم دیں، اور ان پر حملہ کر کے ان سے جنگ کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ پہلے ہمیں اس خبر کی تحقیق کرنی چاہئے، اس کے بعد کوئی اقدام کرنا چاہئے، چنانچہ آپ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معاملے کی تحقیق کے لئے بھیجا۔

تحقیق کے نتیجے میں بات واضح ہوگئی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض کے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ یہ تو بالکل واضح بات ہے کہ

انہوں نے غداری کی ہے، اور حضور ﷺ کے نمائندے کی توہین کی ہے، لہٰذا اس بارے میں زیادہ تحقیق اور غور وفکر کی ضرورت نہیں تھی، براہِ راست ان پر حملہ کر دینا چاہئے تھا۔ لیکن حضور ﷺ نے صحابہ کرام کی بات نہیں مانی، اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پہلے تحقیق کے لئے بھیجا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر حضور ﷺ تمہاری بات مان لیتے، اور فوراً حملہ کر دیتے تو بے گناہ لوگ قتل ہو جاتے، کیونکہ حقیقت میں وہ لوگ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے ارادے سے شہر سے باہر نہیں نکلے تھے، بلکہ وہ تو ان کے استقبال کے لئے باہر نکلے تھے، وہ تو کسی نے آکر غلط خبر دیدی تھی کہ ان کے قتل کے ارادے سے نکلے ہیں۔ (۱)

رسول براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر چلتے ہیں

اگر حضورِ اقدس ﷺ تمہاری ہر بات کو مانا کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں ہی نقصان پہنچے گا، اور تم خود ہی مشکل میں پڑ جاؤ گے، اور مصیبتوں میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ اس کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک رسول بھیجا ہے، وہ رسول ﷺ جن کا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہے، جن پر صبح وشام وحی نازل ہو رہی ہے، جنہیں وہ باتیں بتائی جا رہی ہیں جو تمہارے علم میں نہیں ہیں، وہ احکام دیے جا رہے ہیں جو بسا اوقات تمہاری سمجھ میں نہیں آتے، اگر وہ تمہارے پیچھے چلنے لگیں، اور جیسا تم کہو، ویسا ہی وہ کرنے لگیں تو پھر رسول بھیجنے کا منشا ہی فوت ہو گیا، پھر رسول بھیجنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ رسول تو بھیجا ہی اس لئے جا رہا ہے تاکہ وہ ان باتوں کے بارے میں تمہیں بتائیں جو بسا اوقات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا کہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی حکم یا آپ کا کوئی اقدام، یا آپ کا کوئی عمل تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو تم اس پر اعتراض کرنے بیٹھ جاؤ، یا تمہارے دل میں اس پر شبہات پیدا ہونے لگیں۔ ارے رسول تو اسی لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ ان باتوں کو بتائے جو تم خود اپنی سمجھ سے اور اپنی عقل سے سمجھ نہیں سکتے۔

عقل ایک حد تک صحیح فیصلہ کرتی ہے

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے، اور یہ عقل اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، اگر انسان اس کو صحیح استعمال کرے تو اس سے دنیا وآخرت کے بہت سے فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ یہ عقل جو تمہیں دی گئی ہے، یہ ساری کائنات کی تمام حکمتوں کا احاطہ کر سکتی ہے، یہ عقل بڑی کام کی چیز ہے، لیکن اس کی بھی کچھ حدود ہیں، یہ لامحدود نہیں، ایک حد تک یہ کام کرتی ہے، اس حد

(۱) تفسیر ابن کثیر (۴/۲۶۵)

سے آگے یہ کام کرنا بند کر دیتی ہے۔ جیسے آنکھ ہے، یہ بڑے اعلیٰ درجے کی نعمت ہے، لیکن ایک حد تک دیکھے گی، جہاں تک نظر آئے گا، اس سے آگے نہیں دیکھے گی۔ اسی طرح عقل کی بھی ایک حد ہے، اس حد تک وہ کام کرتی ہے، اس حد سے آگے وہ کام نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور پیغمبر کو ان باتوں کی تعلیم کے لئے بھیجا ہے، جہاں انسان کی عقل کام نہیں کر سکتی، جہاں انسان کی عقل دھوکہ کھا سکتی ہے، ٹھوکر کھا سکتی ہے، اس موقع پر اللہ کا رسول ہی بتاتا ہے کہ وہ بات صحیح نہیں جو تم سمجھ رہے ہو، صحیح بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی کے ذریعہ بتائی۔

رسول کا حکم مانو، چاہے عقل میں آئے یا نہ آئے

جب یہ بات ہے تو اللہ کا رسول جب کوئی بات بتائے، یا کسی بات کا حکم دے، اور تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا؟ اس حکم کی حکمت اور مصلحت سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو ایسی صورت میں اگر تم اپنی عقل کے پیچھے چلو گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے رسول کو رسول ماننے سے انکار کر دیا، رسول تو بھیجا ہی اس لئے گیا تھا کہ جہاں تمہاری عقل کام نہیں کر رہی تھی، وہاں پر رسول وحی کی رہنمائی سے تمہیں بہرہ ور کرے۔ اس سے ہمیں یہ ہدایت ملی کہ جب نبی کریم ﷺ ہمیں کسی بات کا حکم دیدیں، چاہے قرآن کریم کے ذریعہ حکم دیں، یا حدیث کے ذریعہ حکم دیں کہ فلاں کام کرو، یا فلاں کام نہ کرو، تو اب چاہے وہ حکم تمہاری سمجھ میں آرہا ہو، یا نہ آرہا ہو، اس حکم کی علت، اور اس کی حکمت، اور فائدہ تمہاری سمجھ میں نہ آرہا ہو، پھر بھی تمہارے ذمہ لازم ہے کہ اس پر عمل کرو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾(۱)

یعنی اللہ اور اللہ کا رسول جب کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مؤمن مرد یا عورت کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار نہیں رہتا۔ اگر مؤمن ہے تو پھر اس حکم کو ماننا ہی ہوگا، اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ میری عقل ناقص ہے، اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی حکمت کامل ہے، لہٰذا مجھے اس کے آگے سر جھکانا ہے۔

"حکمت" اور "فائدے" کا سوال

آج ہمارے دور میں یہ ذہنیت بہت کثرت سے پھیلتی جارہی ہے کہ جب لوگوں کو شریعت کا کوئی حکم بتایا جائے کہ فلاں چیز حرام ہے، قرآن کریم نے اس کو منع کیا ہے، یا اللہ کے رسول ﷺ نے

(۱) الاحزاب: ۳۶

اس کو منع کیا ہے تو لوگ فوراً یہ سوال کرتے ہیں کہ کیوں منع کیا ہے؟ اس منع کرنے میں کیا حکمت اور کیا فائدہ ہے؟ گویا کہ وہ زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ جب تک ہماری سمجھ میں اس کا فلسفہ نہیں آئے گا، اور اس کی حکمت اور فائدہ ہماری عقل میں نہیں آئے گا، اس وقت تک ہم اس حکم پر عمل نہیں کریں گے۔ العیاذ باللہ العظیم۔ یہ ذہنیت عام ہو چکی ہے، خاص طور پر وہ لوگ جو ذرا پڑھ لکھ گئے، تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لی تو اب شریعت کے ہر حکم کے بارے میں یہ سوال کرتے ہیں یہ کیوں ہے؟ اس میں کیا حکمت ہے؟ اور جب تک حکمت معلوم نہیں ہوتی اس وقت تک ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

ایسا ''نوکر'' ملازمت سے نکال دینے کے قابل ہے

حالانکہ اگر دیکھا جائے تو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے آگے ''کیوں'' کا سوال کرنا انتہاء درجے کی بے عقلی کی بات ہے، اس لئے کہ ہم تو اللہ کے بندے ہیں، اور ''بندہ'' بہت ادنیٰ درجہ کی چیز ہوتا ہے۔ دیکھئے! ایک ہوتا ہے ''غلام'' اور ایک ہوتا ہے ''نوکر''۔ ان میں ترتیب اس طرح ہے کہ سب سے اعلیٰ ''نوکر'' دوسرے درجہ میں ''غلام'' اور تیسرے درجہ میں ''بندہ''۔ اگر کسی نے کسی کو نوکر رکھا ہے تو وہ خاص کاموں کے لئے اور خاص اوقات کے لئے ہوتا ہے، وہ نوکر چوبیس گھنٹے کا غلام نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف آٹھ گھنٹے کام کرے گا، اور متعین کام کرے گا، اب اگر آپ نے نوکر سے کہا کہ آج بازار سے دس کلو گوشت لے آؤ، اب وہ نوکر آپ سے یہ سوال کرے کہ دس کلو گوشت کیوں لاؤں؟ آپ کے گھر میں دو افراد ہیں، ایک کلو گوشت بھی بہت ہوتا ہے، پہلے یہ بتائیں کہ یہ دس کلو گوشت کیوں منگوا رہے ہیں؟ پھر میں لاؤں گا۔ بتایئے! کیا وہ نوکر اس لائق ہے کہ اس کو گھر میں رکھا جائے؟ یا اس لائق ہے کہ کان سے پکڑ کر اس کو باہر نکال دیا جائے؟ ارے بھائی تیرا یہ کام نہیں کہ تو ہم سے پوچھے کہ کیوں یہ چیز منگوا رہے ہو؟ تیرے کو اس لئے رکھا ہے کہ جب ضرورت ہوگی تو باہر سے سودا منگوایا کریں گے، تم اگر کیوں کا سوال کرتے ہو تم نوکر رہنے کے لائق نہیں۔ حالانکہ وہ تمہارا نوکر ہے، تمہارا غلام نہیں ہے، تمہارا بندہ نہیں ہے، آپ بھی مخلوق ہیں، وہ بھی مخلوق ہے، آپ بھی انسان ہیں، وہ بھی انسان ہے، آپ کے اندر بھی اتنی عقل ہے، جتنی عقل اس کے اندر ہے، اس کے باوجود آپ اس کے ''کیوں'' کا سوال گوارا نہیں کرتے۔

ہم اللہ کے ''بندے'' ہیں

جبکہ آپ تو اللہ کے ''بندے'' ہیں، نوکر نہیں ہیں، غلام نہیں ہیں، اللہ نے آپ کو پیدا کیا ہے، اللہ آپ کا خالق ہے، آپ اس کی مخلوق ہیں، اور آپ کی عقل اور اس کی حکمت میں کوئی مناسبت ہی

نہیں، آپ کی عقل محدود ہے، اس کی حکمت اور سمجھ لامحدود ہے، جب وہ خالق و مالک یہ کہتا ہے کہ فلاں کام کرو، آپ کہتے ہیں کہ میں یہ کام کیوں کروں؟ جب آپ اپنے نوکر سے یہ برداشت نہیں کرتے کہ وہ آپ سے ''کیوں'' کا سوال کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے ''کیوں'' کا سوال کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ تم اپنے خالق سے، اپنے مالک سے، اپنے آقا سے، اپنے پیدا کرنے والے سے یہ پوچھ رہے ہو کہ وہ یہ حکم کیوں دے رہے ہیں؟ یہ انتہاء درجے کی بے غیرتی کی بات ہے، انتہاء درجے کی بے شرمی کی بات ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر ''کیوں'' کا سوال کیا جائے۔

''کیوں'' کا سوال بے عقلی کی دلیل ہے

یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن ضروری نہیں کہ وہ حکمت تمہاری سمجھ میں بھی آجائے۔ لہٰذا اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے آگے سر جھکائے بغیر انسان مؤمن نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ ''کیوں'' کا سوال کرتا ہے تو وہ درحقیقت بے عقلی کا سوال ہے۔ اگر ہر بات تمہاری عقل میں آجایا کرتی، اور اپنے ہر اچھے برے کو تم پہچان سکتے تو اللہ تعالیٰ کو نہ پیغمبر بھیجنے کی ضرورت تھی، نہ آسمان سے کوئی کتاب نازل کرنے کی ضرورت تھی، اور نہ دنیا میں وحی کا سلسلہ قائم کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ سب اس لئے کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تمہاری عقل چھوٹی سی ہے، اور بہت محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کی عقل کچھ کہہ رہی ہے،، اور دوسرے کی عقل کچھ کہہ رہی ہے۔ ایک کی عقل میں ایک بات آرہی ہے، دوسرے کی عقل میں نہیں آرہی۔ یہ سب عقل کے محدود ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا حکم اسی جگہ بھیجتا ہے جہاں عقل کی پرواز رُک جاتی ہے۔ اس لئے قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ نہ تو یہ ہونا چاہئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے بارے میں یہ سوال کرو کہ یہ کیوں دیا جارہا ہے؟ اور یہ حکم ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، اور اس کے نتیجے میں اس حکم کو چھوڑ بیٹھو، اور نہ یہ ہونا چاہئے کہ جو کچھ تمہاری سمجھ میں آرہا ہے، اللہ کا رسول اس کو مانتا رہے کہ جو تم کہہ رہے ہو، وہ درست ہے۔

آج کل کے لیڈروں کا حال

آج کل کے لیڈروں کا معاملہ اُلٹا ہوگیا ہے۔ ''لیڈر'' اور ''قائد'' اس کو کہا جاتا ہے جو قوم کو لے کر چلیں، اور ان کی رہنمائی کریں۔ اگر ساری قوم ایک غلط راستے پر جارہی ہے، اور وہ لیڈر جانتا ہے کہ وہ غلط راستے پر جارہی ہے تو وہ ان کو بتائے گا کہ یہ راستہ صحیح نہیں ہے، صحیح راستہ یہ ہے۔ لیکن آج کا قائد اور رہنما عوام کے پیچھے چلتا ہے، جس سے عوام خوش ہوجائے، جس سے اس کو عوام کے ووٹ

مل جائیں، لہٰذا بعض اوقات وہ جانتا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے، مصلحت کے مطابق نہیں ہے، لیکن چونکہ اس کو عوام کی رضامندی مطلوب ہوتی ہے، اس لئے وہ ویسا ہی کرتا ہے جیسا عوام چاہتے ہیں۔

صلح حدیبیہ میں دب کر صلح کیوں کی گئی؟

صلح حدیبیہ کے واقعے کو دیکھئے! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جوش وخروش کی حالت میں ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور کفار سے مقابلہ کر کے ان کو شکست دے سکتے ہیں تو پھر دب کر صلح کیوں کی جارہی ہے؟ لیکن اللہ کا رسول ڈٹا ہوا ہے کہ اس وقت اللہ کا حکم یہی ہے کہ صلح کرلو، چاہے بظاہر دب کر صلح ہوتی نظر آرہی ہو، تب بھی یہی کرنا ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر فرمادیتے کہ چلو، جنگ کرو۔ لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ صلح ہو جائے۔ تمام صحابہ کی باتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رد کردیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے انسان تڑپتے پھر رہے ہیں کہ یا اللہ! یہ کیا ہوگیا؟ ہم اتنی دب کر دشمن سے صلح کر رہے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے ہیں، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟ لیکن اللہ کا رسول اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے، کیونکہ اللہ کی وحی کے ذریعہ اس کو یہی حکم ملا ہے۔

خلاصہ

بہرحال! یہ آیتِ کریمہ یہ سبق دے رہی ہے کہ جب اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم آجائے، یا آپ کا کوئی فیصلہ آجائے تو محض سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے اس کے خلاف شکوک وشبہات کو دل میں جگہ نہ دو۔ صحیح راستہ وہی ہے جو انہوں نے بتایا۔ اگر وہ تمہاری ہر بات ماننے لگیں گے تو تم خود پریشانی میں مبتلا ہو جاؤ گے، تم خود دکھ اُٹھاؤ گے، انجام کار تمہارے لئے نقصان کا سبب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ہمارے دلوں میں ذہن نشین فرمادے کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہی درحقیقت بلند وبالا ہے، چاہے وہ ہماری سمجھ میں آرہا ہو، یا نہ آرہا ہو، اگر ہمیں یہ بات حاصل ہو جائے تو بے شمار اشکالات اور شبہات اور وسوسے جو دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ سب ختم ہو جائیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

تقدیر پر راضی رہنا چاہئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((احْرِصْ عَلٰى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجِزْ، وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ لَكَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَإِنَّ "لَوْ" تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ))(۱)

دنیا کی حرص مت کرو

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان کاموں کی حرص کرو جو تم کو نفع پہنچانے والے ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ وہ اعمال اور وہ افعال جو آخرت میں نفع کا سبب بن سکتے ہیں ان کے اندر حرص کرو۔ دیکھئے! ویسے تو حرص بُری چیز ہے اور اس سے منع فرمایا گیا ہے کہ مال کی حرص، دنیا کی حرص، شہرت کی حرص، نام و نمود کی حرص، دولت کی حرص مت کرو اور انسان کے لئے یہ بہت بڑا عیب ہے کہ وہ ان چیزوں کی حرص کرے بلکہ ان تمام چیزوں میں قناعت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جو کچھ تمہیں جائز طریقے سے کوشش کرنے کے نتیجے میں مل رہا ہے اس پر قناعت کرو اور یہ سمجھو کہ میرے لئے یہی بہتر تھا۔ مزید کی حرص کرنا کہ مجھے اور زیادہ مل جائے، یہ درست نہیں اور اس حرص سے بچو، کیونکہ دنیا میں کوئی بھی شخص اپنی ساری خواہشات کبھی پوری نہیں کرسکتا۔ ''کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد'' بڑے سے بڑا بادشاہ، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ایسا نہیں ملے گا جو یہ

☆ اصلاحی خطبات (۷/۱۹۱۔۲۲۲)، یکم جولائی، ۱۹۹۵ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح مسلم، کتاب القدر، باب فی الامر بالقوة وترك العجز والاستعانة بالله، رقم: ٤٨١٦، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، رقم: ٤١٥٨

کہہ دے کہ میری ساری خواہشات پوری ہوگئی ہیں۔ بلکہ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر ابنِ آدم کو ایک وادی سونے کی بھر کر مل جائے تو وہ یہ چاہے گا کہ دو مل جائیں۔ اور جب دو مل جائیں گی تو پھر خواہش کرے گا کہ تین ہو جائیں۔ اور ابنِ آدمی کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ جب قبر میں جائے گا تو قبر کی مٹی اس کا پیٹ بھرے گی، دنیا کے اندر کوئی چیز اس کا پیٹ نہیں بھرے گی۔ (۱)

البتہ ایک چیز ہے جو اس کا پیٹ بھر سکتی ہے، وہ ہے ''قناعت'' یعنی جو کچھ اس کو اللہ تعالیٰ نے جائز اور حلال طریقے سے دے دیا ہے، اس پر قناعت کرلے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اس کے سوا پیٹ بھرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

دین کی حرص پسندیدہ ہے

لہٰذا دنیا کی چیزوں میں حرص کرنا بُرا ہے اور اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن دین کے کاموں میں، اچھے اعمال میں، عبادات میں حرص کرنا اچھی چیز ہے۔ مثلاً کوئی شخص نیک کام کر رہا ہے، اس کو دیکھ کر یہ حرص کرنا کہ میں بھی یہ نیک کام کروں۔ یا فلاں شخص کو دین کی نعمت حاصل ہے مجھے بھی یہ نعمت حاصل ہو جائے۔ ایسی حرص مطلوب ہے اور محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اس لئے اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ایسے کاموں کی حرص کرو جو آخرت میں نفع دینے والے ہیں۔ اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (۲)

''نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو''

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور نیک کاموں کی حرص

حضرت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نیکیوں میں بڑے حریص تھے اور ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح ہمارے نامۂ اعمال میں نیکی کا اضافہ ہو جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو انہوں نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب ما يتقى من فتنة المال، رقم: ٥٩٥٦، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، رقم: ١٧٣٩، سنن الترمذی، كتاب المناقب عن رسول الله، رقم: ٣٧٢٦

(۲) المائدة: ٤٨

''اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی نمازِ جنازہ میں شریک ہو تو اس کو ایک قیراط اجر ملتا ہے۔ اور اگر اس کے دفن میں بھی شریک رہے تو اس کو دو قیراط ملتے ہیں''

''قیراط'' اس زمانے میں سونے کا ایک مخصوص وزن ہوتا تھا۔ آپ ﷺ نے سمجھانے کے لئے قیراط کا لفظ بیان فرمادیا، پھر خود ہی فرمایا کہ آخرت کا وہ قیراط اُحد پہاڑ سے بھی بڑا ہوگا۔ مطلب یہ تھا کہ قیراط سے دنیا والا قیراط مت سمجھ لینا بلکہ آخرت والا قیراط مراد ہے جو اپنی عظمتِ شان کے لحاظ سے اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ اور یہ بھی اس اجر کا پورا بیان نہیں ہے۔ اس لئے کہ پورا بیان تو انسان کی قدرت میں بھی نہیں ہے کیونکہ انسان کی لغت اس کے بیان کے لئے ناکافی ہے۔ اس واسطے یہ الفاظ استعمال فرمائے تاکہ ہماری سمجھ میں آجائے۔ بہر حال، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جب یہ حدیث سنی تو حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کیا واقعۃً آپ نے حضورِ اقدس ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے خود یہ حدیث سنی ہے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: افسوس! ہم نے اب تک بہت سے قیراط ضائع کر دیئے۔ اگر پہلے سے یہ حدیث سنی ہوتی تو ایسے مواقع کبھی ضائع نہ کرتے۔ (۱)

تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا یہی حال تھا کہ وہ اس بات کے حریص تھے کہ کسی طرح کوئی نیکی ہمارے نامۂ اعمال میں بڑھ جائے۔

ہم اور آپ وعظوں میں سنتے رہتے ہیں کہ فلاں عمل کا یہ ثواب ہے، فلاں عمل کا یہ ثواب ہے۔ یہ درحقیقت اس لئے بیان کیے جاتے ہیں تاکہ ہمارے دلوں میں ان اعمال کو انجام دینے کی حرص پیدا ہو۔ فضیلت والے اعمال، نوافل، مستحبات اگرچہ فرض و واجب نہیں، لیکن ایک مسلمان کے دل میں ان کی حرص ہونی چاہئے کہ وہ ہمیں حاصل ہو جائیں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ دین کی حرص عطا فرماتے ہیں تو ان کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح کوئی نیکی ہمارے نامۂ اعمال میں بڑھ جائے۔

حضور ﷺ کا دوڑ لگانا

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ ایک دعوت میں تشریف لے جا رہے تھے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ساتھ تھیں۔ پیدل سفر تھا۔ راستے میں ایک جنگل اور میدان پڑتا تھا، اور بے پردگی کا احتمال نہیں تھا اس لئے کہ وہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اے عائشہ! کیا میرے ساتھ دوڑ لگاؤ گی؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب فضل اتباع الجنائز، رقم الحدیث: ۱۲۲۹۔

کیا کہ ہاں! دوڑ لگاؤں گی۔ اس دوڑ لگانے سے ایک طرف تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دلجوئی مقصود تھی اور دوسری طرف اُمت کو یہ تعلیم دینی تھی کہ بہت زیادہ بزرگ اور نیک ہو کر ایک کونے میں بیٹھ جانا بھی اچھی بات نہیں۔ بلکہ دنیا میں آدمیوں کی طرح اور انسانوں کی طرح رہنا چاہئے۔ اور ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ساتھ دو مرتبہ دوڑ لگائی۔ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے اور دوسری مرتبہ جب دوڑ لگائی تو چونکہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم نسبۃً بھاری ہو گیا تھا اس لئے میں آگے نکل گئی اور آپ پیچھے رہ گئے۔ اس وقت آپ نے فرمایا: "تِلْكَ بِتِلْكَ" یعنی دونوں برابر ہو گئے۔ ایک مرتبہ تم جیت گئیں اور ایک مرتبہ میں جیت گیا۔ (۱)

اب دیکھئے کہ بزرگانِ دین اس سنت پر کس طرح عمل کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اس سنت پر عمل

ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ تھانہ بھون سے کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں میں دعوت میں تشریف لے جا رہے تھے اور اہلیہ محترمہ ساتھ تھیں۔ جنگل کا پیدل سفر تھا، کوئی اور شخص بھی ساتھ نہیں تھا۔ جب جنگل کے درمیان پہنچے تو خیال آیا کہ الحمد للہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی سنتوں پر عمل کرنے کی توفیق ہو گئی ہے لیکن اہلیہ کے ساتھ دوڑ لگانے کی سنت پر ابھی تک عمل کا موقع نہیں ملا۔ آج موقع ہے کہ اس سنت پر بھی عمل ہو جائے۔ چنانچہ اس وقت آپ نے دوڑ لگا کر اس سنت پر بھی عمل کر لیا۔ اب ظاہر ہے کہ دوڑ لگانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے کے لئے دوڑ لگائی۔ یہ ہے اتباعِ سنت کی حرص۔ نیک کاموں کی حرص۔ اجر و ثواب حاصل کرنے کی حرص۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے اندر یہ حرص پیدا فرما دے۔ آمین

ہمت بھی اللہ سے مانگنی چاہئے

اب بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں ایک نیک کام کرنے کا شوق پیدا ہوا اور دل چاہا کہ فلاں شخص یہ عبادت کرتا ہے، میں بھی یہ عبادت انجام دوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ یہ عبادت اور یہ نیک کام ہمارے بس میں نہیں ہے، ہم نہیں کر پائیں گے، یہ تو بڑے لوگوں کا کام ہے۔ تو جب اس قسم کا خیال دل میں پیدا ہو تو اس وقت کیا کریں؟ اس کے لئے حدیث کے اگلے جملے میں

---

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في السبق على الرجل، رقم: ۲۲۱٤ ولفظة: قالت فسابقتُهُ فسبقتُهُ على رجليَّ فلما حملت اللحم سابقته فسبقتني فقال هذه بتلك السبقة

ارشاد فرمایا:

((وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجَزْ))

یعنی ایسے وقت میں مایوس اور عاجز ہو کر نہ بیٹھ جائے کہ مجھ سے یہ عبادت ہو ہی نہیں سکتی بلکہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے۔ اور کہے کہ یا اللہ! یہ کام میرے بس میں تو نہیں ہے، لیکن آپ کی قدرت میں ہے۔ آپ ہی مجھے اس نیک کام کی توفیق عطا فرمادیں اور اس کے کرنے کی ہمت عطا فرمادیں۔

مثلاً نیک لوگوں کے بارے میں سنا کہ وہ رات کو اُٹھ کر تہجد پڑھا کرتے ہیں اور رات کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں۔ تو اب دل میں شوق پیدا ہوا کہ مجھے بھی رات کو اُٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنی چاہئے۔ لیکن یہ خیال بھی آیا کہ رات کو اُٹھ کر تہجد پڑھنا میرے بس میں نہیں۔ چلو چھوڑو اور مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے بلکہ اللہ تعالیٰ سے کہے کہ یا اللہ! میری آنکھ نہیں کھلتی، میری نیند پوری نہیں ہوتی۔ یا اللہ! تہجد پڑھنے کی توفیق عطا فرمادیجئے اور اس کی فضیلت عطا فرمادیجئے۔

کیونکہ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا اور توفیق مانگے گا تو پھر دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو واقعۃً اللہ تعالیٰ اس عمل کی توفیق عطا فرمادیں گے۔ اور اگر اس عمل کی توفیق حاصل نہ ہوئی تو یقیناً اس نیک عمل کا ثواب انشاء اللہ ضرور حاصل ہو جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے شہادت طلب کرے اور یہ کہے کہ یا اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت نصیب فرما تو اللہ تعالیٰ اس کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمادیتے ہیں، اگرچہ بستر پر ہی اس کا انتقال ہو جائے۔ (۱)

ایک لوہار کا ایمان افروز واقعہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا جب انتقال ہوگیا تو کسی نے خواب میں ان کو دیکھا تو پوچھا کہ حضرت! کیسی گزری؟ جواب میں انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے کرم کا معاملہ فرمایا اور مغفرت فرمادی اور استحقاق کے بغیر بڑا درجہ عطا فرمایا۔ لیکن جو درجہ میرے سامنے والے مکان میں رہنے والے لوہار کو نصیب ہوا وہ مجھے نہیں مل سکا۔ جب خواب دیکھنے والا بیدار ہوا تو اس کو یہ جستجو ہوئی کہ یہ معلوم کروں کہ وہ کون لوہار تھا اور کیا عمل کرتا تھا، جس کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آگے بڑھ گیا۔ چنانچہ وہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے محلّے میں گیا اور پوچھا کہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب استحباب طلب الشهادة فی سبیل الله تعالی، رقم: ۳۵۳۲

یہاں کوئی لوہار رہتا تھا جس کا انتقال ہوگیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ہاں، اس سامنے والے مکان میں ایک لوہار رہتا تھا۔ اور چند روز پہلے اس کا انتقال ہوا ہے۔ چنانچہ یہ لوہار کے گھر گیا اور اس کی بیوی سے اپنا خواب بیان کیا اور پوچھا کہ تمہارا شوہر ایسا کون سا عمل کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آگے بڑھ گیا؟ لوہار کی بیوی نے بتایا کہ میرا شوہر ایسی کوئی خاص عبادت تو نہیں کرتا تھا۔ سارا دن لوہا کوٹتا رہتا تھا۔ البتہ میں نے اس کے اندر دو باتیں دیکھیں۔ ایک یہ کہ جب لوہا کوٹنے کے دوران اذان کی آواز "اللہ اکبر" کان میں پڑتی تو فوراً اپنا کام بند کر دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر اس نے اپنا ہتھوڑا کوٹنے کے لئے اُوپر اُٹھالیا ہوتا اور اتنے میں اذان کی آواز آجاتی تو وہ یہ بھی گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس ہتھوڑے سے چوٹ لگادوں، بلکہ ہتھوڑے کو پیچھے کی طرف پھینک دیتا اور اُٹھ کر نماز کی تیاری میں لگ جاتا۔ دوسری بات میں نے یہ دیکھی کہ ہمارے سامنے والے مکان میں ایک بزرگ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ رہا کرتے تھے۔ وہ رات بھر اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہوکر نماز پڑھا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرا شوہر یہ کہا کرتا تھا کہ یہ اللہ کے نیک بندے ساری رات عبادت کرتے ہیں۔ کاش اللہ تعالیٰ مجھے بھی فراغت عطا فرماتے تو میں بھی عبادت کرتا ــــــ یہ جواب سن کر اس شخص نے کہا کہ بس یہی حسرت ہے جس نے ان کو حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آگے بڑھا دیا ــــــ

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قصہ سنا کر فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہے "حسرتِ نایاب" جو بعض اوقات انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے ــــــ اس لئے جب کسی کے بارے میں سنو کہ فلاں شخص یہ نیک عمل کرتا ہے تو اس نیک عمل کے بارے میں دل میں حرص اور حسرت پیدا ہونی چاہئے کہ کاش ہمیں بھی اس نیک کام کے کرنے کی توفیق مل جائے۔

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فکر اور سوچ کا انداز

حدیث شریف میں آتا ہے کہ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ، ہمیں یہ فکر ہے کہ ہمارے بہت سے ساتھی دولت مند اور مالدار ہیں۔ ان پر ہمیں رشک آتا ہے۔ اس لئے کہ جو جسمانی عبادت ہم کرتے ہیں، وہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن جسمانی عبادت کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی کرتے ہیں، مثلاً صدقہ و خیرات کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں اور ان کے درجات بھی بلند ہوتے ہیں۔ لہٰذا آخرت کے درجات میں وہ ہم سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور ہم جتنی بھی کوشش کرلیں لیکن غریب ہونے کی وجہ سے ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے، اس لئے کہ ہم صدقہ و خیرات نہیں کرسکتے ــــــ دیکھئے، ہماری اور ان کی سوچ میں کتنا فرق ہے، ہم جب اپنے سے بڑے مالدار کے بارے میں سوچتے ہیں تو

اس کے صدقہ و خیرات کرنے پر ہمیں رشک نہیں آتا، بلکہ اس بات پر رشک آتا ہے کہ اس کے پاس دولت زیادہ ہے۔ اس لئے یہ بہت مزے سے زندگی گزار رہا ہے، کاش کہ ہمیں بھی دولت مل جائے تو ہم بھی عیش و آرام سے زندگی گزاریں۔ یہ ہے سوچ کا فرق۔

بہر حال، ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال کے جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں ایک ایسا عمل بتاتا ہوں کہ اگر تم اس عمل کو پابندی سے کرلو گے تو صدقہ و خیرات کرنے والوں سے تمہارا ثواب بڑھ جائے گا، کوئی تم سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ وہ عمل یہ ہے کہ ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ ''سبحان اللہ''، ۳۳ مرتبہ ''الحمد للہ''، ۳۴ مرتبہ ''اللہ اکبر'' پڑھ لیا کرو۔ (۱)

نیکی کی حرص عظیم نعمت ہے

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہی ذکر مالداروں نے بھی شروع کردیا تو پھر ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سوال برقرار رہے گا۔ کیونکہ مالدار لوگ پھر ان سے آگے بڑھ جائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتلانا چاہتے تھے کہ جب تمہیں یہ حرص اور حسرت ہورہی ہے کہ ہم بھی مالدار ہوتے تو ہم بھی اسی طرح صدقہ خیرات کرتے جس طرح یہ مال دار لوگ کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ اس حرص کی برکت سے تم کو صدقہ خیرات کا اجر و ثواب بھی عطا فرمادیں گے — بہر حال، کسی نیک کام کے کرنے کی حرص اور ارادہ اور اس کے نہ کرسکنے کی حسرت بھی بڑی نعمت ہے۔ اس لئے جب کسی شخص کے بارے میں سنو کہ فلاں شخص یہ نیک عمل کرتا ہے تو تم یہ دعا کرلو کہ اے اللہ! یہ نیک کام میرے بس سے باہر ہے۔ آپ ہی اس کام کے کرنے میں میری مدد فرمائیے، اور مجھے اس کے کرنے کی توفیق عطا فرمائیے، تو پھر اللہ تعالیٰ یا تو اس نیک کام کے کرنے کی توفیق عطا فرمادیں گے، یا اس نیک کام کا اجر و ثواب عطا فرمادیں گے۔ یہ نسخہ کیمیا ہے۔

لفظ ''اگر'' شیطانی عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے

آگے فرمایا:

((وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ لَكَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَإِنَّ "لَوْ" تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ))

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب الذکر بعد الصلاۃ، رقم: ۷۹۸، صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ وبیان صفتہ، رقم: ۹۳۶، مسند احمد، حدیث ابی ذر الغفاری، رقم: ۲۰۵۰۰۔

یعنی اگر دنیاوی زندگی میں تمہیں کوئی مصیبت اور تکلیف پہنچے تو یہ مت کہو کہ اگر یوں کر لیتا تو ایسا نہ ہوتا۔ اور اگر یوں کر لیتا تو ایسا ہو جاتا۔ یہ اگر مگر مت کہو، بلکہ یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیت یہی تھی۔ جو اللہ نے چاہا وہ ہو گیا، اس لئے کہ یہ لفظ ''اگر'' شیطان کے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے ــــ مثلاً کسی کے عزیز کا انتقال ہو جائے تو کہتا ہے کہ اگر فلاں ڈاکٹر سے علاج کرا لیتا تو یہ بچ جاتا، یا مثلاً کسی کے ہاں چوری ہو گئی یا ڈاکہ پڑ گیا تو یہ کہتا ہے کہ اگر فلاں طریقے سے حفاظت کر لیتا تو چوری نہ ہوتی وغیرہ۔ ایسی باتیں مت کہو، بلکہ یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ایسا ہی ہونا مقدر تھا، اس لئے ہو گیا، میں اگر ہزار تدبیر کر لیتا تب بھی ایسا ہی ہوتا۔

دنیا راحت اور تکلیف سے مرکب ہے

اس حدیث میں کیا عجیب و غریب تعلیم دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ بات اُتار دے۔ آمین۔ یقین رکھئے کہ اس دنیا میں سکون، عافیت، آرام اور اطمینان حاصل کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ انسان تقدیر پر یقین اور ایمان لے آئے۔ اس لئے کہ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کو اس دنیا میں کبھی کوئی غم اور پریشانی نہ آئی ہو۔ یا کبھی کوئی مصیبت اس کے اُوپر نہ آئی ہو۔ یہ عالمِ دنیا دونوں چیزوں سے مرکب ہے، جس میں خوشی بھی ہے، غم بھی ہے، راحت بھی ہے اور تکلیف بھی ہے۔ یہاں کوئی خوشی بھی خالص نہیں، کوئی غم خالص نہیں۔ لہٰذا غم، تکلیف اور پریشانی تو اس دنیا میں ضرور آئے گی، اگر ساری دنیا کی دولت خرچ کر کے یہ چاہو کہ کوئی تکلیف نہ آئے تو یہ نہیں ہو سکتا۔

اللہ کے محبوب پر تکالیف زیادہ آتی ہیں

ہماری اور تمہاری کیا حقیقت ہے۔ انبیاء علیہم السلام جو اللہ تعالیٰ کی پیاری اور محبوب مخلوق ہے، ان کے اُوپر بھی تکالیف اور پریشانیاں آتی ہیں۔ اور عام لوگوں سے زیادہ آتی ہیں۔ چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ)) (۱)

یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ تکالیف انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں۔ اور پھر جو شخص انبیاء علیہم السلام سے جتنا قریب ہوگا اس کو اتنی ہی زیادہ تکالیف اور پریشانیاں آئیں گی۔ وہ عالم جہاں کوئی پریشانی اور تکلیف نہیں آئے گی، وہ عالم جنت ہے لہٰذا اس دنیا میں پریشانیاں تو آئیں گی، لیکن اگر ان تکالیف پر یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ہائے یہ کیوں ہوا؟ اگر ایسا کر لیتے تو یہ نہ ہوتا۔ فلاں وجہ اور سبب کے ایسا

(۱) کنز العمال، رقم: ٦٧٨٣

ہو گیا۔ ایسا سوچنے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے حسرت بڑھتی ہے، تکلیف اور صدمہ بڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر شکوہ پیدا ہوتا ہے کہ معاذ اللہ' یہ ساری مصیبتیں میرے مقدر میں رہ گئی تھیں، وغیرہ۔ اور وہ مصیبت وبالِ جان بن جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی تکلیف ہوئی اور اس شکوہ کی وجہ سے آخرت میں اس پر عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات ایمان بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

حقیر کیڑا مصلحت کیا جانے!

اس لئے حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ جب تمہیں کوئی پریشانی یا تکلیف آئے تو یہ سمجھو کہ جو کچھ پیش آیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے سے پیش آیا ہے۔ میں اس کی حکمت کیا جانوں، اللہ تعالیٰ ہی اس کی حکمت اور مصلحت جانتے ہیں۔ ایک حقیر کیڑا اس کی حکمت اور مصلحت کو کیا جانے ـــــ البتہ اس تکلیف پر رونا آئے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بعض لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ تکلیف پر رونا نہیں چاہئے۔ یہ بات غلط ہے، اس لئے کہ تکلیف پر رونا برا نہیں ہے، بشرطیکہ اللہ تعالیٰ سے اس مصیبت پر شکوہ نہ ہو۔

ایک بزرگ کا بھوک کی وجہ سے رونا

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک صاحب ان سے ملنے گئے، دیکھا کہ وہ بیٹھے رو رہے ہیں۔ ان صاحب نے پوچھا کہ حضرت کیا تکلیف ہے جس کی وجہ سے آپ رو رہے ہیں؟ ان بزرگ نے جواب دیا کہ بھوک لگ رہی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ آپ کوئی بچے ہیں کہ بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں۔ بھوک کی وجہ سے تو بچے روتے ہیں۔ آپ تو بڑے ہیں، پھر بھی رو رہے ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا: تمہیں کیا معلوم، اللہ تعالیٰ کو میرا رونا دیکھنا ہی مقصود ہو۔ اس وجہ سے وہ مجھے بھوکا رکھ رہے ہیں تو بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو رونا بھی پسند آتا ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ شکوہ شکایت نہ ہو' اسی کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں ''تفویض'' کہا جاتا ہے۔ یعنی معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا اور یہ کہنا کہ اے اللہ! مجھے ظاہری طور پر تکلیف ہو رہی ہے۔ لیکن فیصلہ آپ کا برحق ہے' اگر انسان کو اس بات کا یقین حاصل ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے بغیر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا اور تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں تو اس یقین کے بعد اطمینان اور سکون حاصل ہو جائے گا اور بیماری اور پریشانی کے وقت جو ناقابلِ برداشت صدمہ اور تکلیف ہوتی ہے وہ نہیں ہو گی۔

مسلمان اور کافر کا امتیاز

ایک کافر کا عزیز بیمار ہوا۔ اس نے ڈاکٹر سے علاج کرایا، ڈاکٹر کے علاج کے دوران اس کا انتقال ہوگیا، تو اب اس کافر کے پاس اطمینان حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، کیونکہ وہ تو یہی سمجھے گا کہ ڈاکٹر نے دوا صحیح تجویز نہیں کی، صحیح دیکھ بھال نہیں کی، اس لئے یہ مرگیا۔ اگر علاج صحیح ہوجاتا تو یہ نہ مرتا ـــــ لیکن ایک مسلمان کا عزیز بیمار ہوگیا، ڈاکٹر نے علاج کیا، لیکن اس کا انتقال ہوگیا تو اب اس مسلمان کے پاس اطمینان اور سکون حاصل کرنے کا ذریعہ موجود ہے، وہ یہ کہ اگرچہ اس کی موت کا ظاہری سبب ڈاکٹر کی غفلت ہے، لیکن جو کچھ ہوا، یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوا، ان کے ارادے سے موت واقع ہوئی، اگر ڈاکٹر صحیح دوا دیتا، تب بھی وہ دوا اُلٹی پڑ جاتی۔ اور اگر میں اس ڈاکٹر کے علاوہ دوسرے ڈاکٹر کے پاس جاتا، تب بھی موت آتی۔ اس لئے کہ ہونا وہی تھا جو تقدیر میں اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا تھا۔ اس کی موت کا وقت آچکا تھا، اس کے دن پورے ہوگئے تھے، اس کو تو جانا تھا، اس لئے چلا گیا، اللہ تعالیٰ کی تقدیر برحق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں آگ کا کوئی انگارہ اپنی زبان پر رکھ لوں اور اس کو چاٹوں، یہ عمل مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں کسی ایسے واقعہ کے بارے میں جو ہوچکا، یہ کہوں کہ کاش! یہ واقعہ نہ ہوتا، اور کسی ایسے واقعہ کے بارے میں جو نہیں ہوا، یہ کہوں کہ کاش! وہ واقعہ ہوجاتا۔ (۱)

اللہ کے فیصلے پر راضی رہو

مقصد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بات کا فیصلہ فرمادیں، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق کوئی واقعہ پیش آجائے تو اب اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ یا یہ کہنا کہ ایسا ہوجاتا، یہ کہنا اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہونے کے خلاف ہے۔ ایک مؤمن سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اور اس کے فیصلے پر راضی رہے، اور اس تقدیر کے فیصلے پر اس کے دل میں شکایت پیدا نہ ہو، اور نہ دل میں اس کی برائی ہو۔ بلکہ دل و جان سے اس پر راضی رہے' ایک اور حدیث میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

((اِذَا قَضَى اللّٰهُ قَضَاءً أَحَبَّ أَنْ يُرْضٰى بِقَضَاءِهٖ))(۲)

---

(۱) كتاب الزهد، ص: ۳۰، رقم: ۱۲۲

(۲) كتاب الزهد، ص: ۳۲، رقم: ۱۲۴

یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی کام کے بارے میں فیصلہ فرما دیتے ہیں کہ یہ کام اس طرح انجام دیا جانا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ میرا بندہ اس فیصلے پر راضی ہو۔ اور اس فیصلے کو بے چوں چرا تسلیم کرے۔ یہ نہ کہے کہ یوں ہوتا تو اچھا تھا۔ فرض کریں کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جو طبیعت کو ناگوار ہے اور وہ غم اور تکلیف کا واقعہ ہے۔ اب پیش آچکنے کے بعد یہ کہنا کہ اگر یوں کر لیتے تو یہ واقعہ پیش نہ آتا، ایسا کہنے سے حضورِ اقدس ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ اس لئے کہ جو واقعہ پیش آیا، وہ تو پیش آنا ہی تھا، اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کی تقدیر تھی۔ تم اگر ہزار تدبیر بھی کر لیتے، تب بھی وہ فیصلہ ٹلنے والا نہیں تھا۔ لہٰذا اب فضول یہ باتیں کرنا کہ ایسا کر لیتے تو ایسا ہو جاتا، یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کے منافی ہیں۔ ایسی باتیں کرنا مؤمن کا کام نہیں۔

رضاء بالقضاء میں تسلی کا سامان ہے

حقیقت میں اگر غور کر کے دیکھا جائے تو انسان کے پاس رضا بالقضاء یعنی تقدیر پر راضی ہونے کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے؟ اس لئے کہ تمہارے ناراض ہونے سے وہ فیصلہ بدل نہیں سکتا، جو غم پیش آیا ہے، تمہاری ناراضگی سے وہ غم دور نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس ناراضگی سے غم کی شدت اور تکلیف میں مزید اضافہ ہو جائے گا اور یہ کہے گا کہ ہائے ہم نے یہ نہ کر لیا۔ فلاں تدبیر اختیار نہ کر لی، اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ رضا بالقضاء میں درحقیقت انسان کی تسلی کا سامان ہے۔ اور ایک مؤمن کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو تسلی کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

تقدیر ''تدبیر'' سے نہیں روکتی

اور یہ ''تقدیر'' عجیب و غریب عقیدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر صاحبِ ایمان کو عطا فرمایا ہے۔ اس عقیدہ کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ کسی واقعہ کے پیش آنے سے پہلے تقدیر کا عقیدہ کسی انسان کو بے عملی پر آمادہ نہ کرے۔ مثلاً ایک انسان تقدیر کا بہانہ کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور یہ کہے کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ میں کچھ نہیں کرتا۔ یہ عمل حضورِ اقدس ﷺ کی تعلیم کے خلاف ہے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ جس چیز کے حاصل کرنے کی جو تدبیر ہے، اس کو اختیار کرو۔ اس کے اختیار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑو۔

تدبیر کے بعد فیصلہ اللہ پر چھوڑ دو

دوسری بات یہ ہے کہ تقدیر کے عقیدے پر عمل کسی واقعہ کے پیش آنے کے بعد شروع ہوتا

ہے۔ مثلاً کوئی واقعہ پیش آچکا تو ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ یہ سوچے کہ میں نے جو تدبیریں اختیار کرنی تھیں وہ کرلیں اور اب جو واقعہ ہماری تدبیر کے خلاف پیش آیا، وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، ہم اس پر راضی ہیں، لہٰذا واقعہ پیش آچکنے کے بعد اس پر بہت زیادہ پریشانی، بہت زیادہ حسرت اور تکلیف کا اظہار کرنا اور یہ کہنا کہ فلاں تدبیر اختیار کرلیتا تو یوں ہو جاتا، یہ بات عقیدۂ تقدیر کے خلاف ہے، ان دو انتہاؤں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے ہمیں راہِ اعتدال یہ بتادی کہ جب تک تقدیر پیش نہیں آئی، اس وقت تک تمہارا فرض ہے کہ اپنی سی پوری کوشش کرلو، اور احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرلو، اس لئے کہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے؟

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ شام کے دورے پر تشریف لے جارہے تھے۔ راستے میں آپ کو اطلاع ملی کہ شام کے علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے، یہ اتنا سخت طاعون تھا کہ انسان بیٹھے بیٹھے چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتا تھا۔ اس طاعون میں ہزارہا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے ہیں۔ آج بھی اُردن میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے مزار کے پاس پورا قبرستان ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبروں سے بھرا ہوا ہے جو اس طاعون میں شہید ہوئے۔ بہر حال، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ وہاں جائیں یا نہ جائیں اور واپس چلے جائیں۔ اس وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث سنائی کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کسی علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑے تو جو لوگ اس علاقے سے باہر ہیں وہ اس علاقے کے اندر داخل نہ ہوں، اور جو لوگ اس علاقے میں مقیم ہیں، وہ وہاں سے نہ بھاگیں، یہ حدیث سن کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف صاف ارشاد ہے کہ ایسے علاقے میں داخل نہیں ہونا چاہئے۔ لہٰذا آپ نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کردیا، اس وقت ایک صحابی غالباً حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

"أَتَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ؟"

کیا آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے اس طاعون کے ذریعہ موت کا آنا لکھ دیا ہے تو وہ موت آکر رہے گی۔ اور اگر تقدیر میں موت نہیں لکھی تو جانا اور نہ جانا برابر ہے۔ جواب میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"لَوْ غَيْرُكَ قَالَهَا يَا أَبَا عُبَيْدَةَ"

اے ابو عبیدہ! اگر آپ کے علاوہ کوئی شخص یہ بات کہتا تو میں اس کو معذور سمجھتا، لیکن آپ تو

پوری حقیقت سے آگاہ ہیں، آپ یہ کیسے کہہ رہے ہیں کہ تقدیر سے بھاگ رہا ہوں۔ پھر فرمایا:

"نَعَمْ نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ اِلٰی قَدَرِ اللّٰہِ"

''ہاں! ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔''(۱)

مطلب یہ تھا کہ جب تک واقعہ پیش نہیں آیا، اس وقت تک ہمیں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم ہے۔ اور ان احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنا عقیدۂ تقدیر کے خلاف نہیں، بلکہ عقیدۂ تقدیر کے اندر داخل ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا ہے کہ احتیاطی تدابیر اختیار کرو، چنانچہ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے واپس جارہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر تقدیر میں ہمارے لئے طاعون کی بیماری میں مبتلا ہونا لکھا ہے تو اس کو ہم ٹال نہیں سکتے۔ لیکن اپنی سی تدبیر ہمیں پوری کرنی ہے۔

''تقدیر'' کا صحیح مفہوم

یہ ہے ایک مؤمن کا عقیدہ کہ اپنی طرف سے تدبیر پوری کی، لیکن تدبیر کرنے کے بعد معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ یا اللہ، ہمارے ہاتھ میں جو تدبیر تھی وہ تو ہم نے اختیار کر لی، اب معاملہ آپ کے اختیار میں ہے، آپ کا جو فیصلہ ہوگا، ہم اس پر راضی رہیں گے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، لہٰذا واقعہ کے پیش آنے سے پہلے عقیدۂ تقدیر کسی کو بے عملی پر آمادہ نہ کرے۔ جیسے بعض لوگ عقیدۂ تقدیر کو بے عملی کا بہانہ بنا لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ لہٰذا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ کام کیوں کریں؟ یہ درست نہیں، کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اپنی تدبیر کرتے رہو۔ ہاتھ پاؤں ہلاتے رہو۔ لیکن ساری تدابیر اختیار کرنے کے بعد اگر واقعہ اپنی مرضی کے خلاف پیش آجائے تو اس پر راضی رہو لیکن اگر تم اپنی رضامندی کا اظہار نہ کرو، بلکہ یہ کہہ دو کہ یہ فیصلہ تو بہت غلط ہوا، بہت برا ہوا تو اس کا نتیجہ سوائے پریشانی میں اضافے کے کچھ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جو واقعہ پیش آچکا ہے، وہ بدل نہیں سکتا، اور آخر کار تمہیں سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا۔ اس لئے پہلے دن ہی اس کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ جو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے ہم اس پر راضی ہیں۔

غم اور صدمہ ''رضا بالقضاء'' کے منافی نہیں

اب ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے۔ وہ یہ کہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آئے، یا کوئی غم یا صدمہ پیش آئے تو اس غم اور تکلیف پر رونا صبر کے منافی اور خلاف نہیں۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الطب، باب ما یذکر من الطاعون، رقم: ۵۲۸۸، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب الطاعون والطیرۃ والکھانۃ ونحوھا، رقم: ۴۱۱۴

اور گناہ نہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ غم اور صدمہ کرنا اور اس کا اظہار کرنا جائز ہے۔ رونا بھی جائز ہے۔ اور دوسری طرف آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہئے۔ یہ دونوں چیزیں کیسے جمع کریں کہ ایک طرف فیصلے پر راضی بھی ہوں اور دوسری طرف غم اور صدمہ کا اظہار بھی کرنا جائز ہو؟ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ غم اور صدمہ کا اظہار الگ چیز ہے۔ اور اللہ کے فیصلے پر راضی ہونا الگ چیز ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ عین حکمت پر مبنی ہے، اور ہمیں اس کی حکمت معلوم نہیں، اور حکمت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے دل کو تکلیف پہنچ رہی ہے، اس لئے غم اور صدمہ بھی ہے اور اس غم اور صدمہ کی وجہ سے ہم رو بھی رہے ہیں، اور آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ برحق ہے، حکمت پر مبنی ہے۔ لہٰذا ''رضا'' سے مراد رضاء عقلی ہے، یعنی عقلی طور پر انسان یہ سمجھے کہ یہ فیصلہ صحیح ہے۔

ایک بہترین مثال

مثلاً ایک مریض ڈاکٹر سے آپریشن کرانے کے لئے ہسپتال جاتا ہے، اور ڈاکٹر سے درخواست کرتا ہے، اور اس کی خوشامد کرتا ہے کہ میرا آپریشن کر دو۔ جب ڈاکٹر نے آپریشن شروع کیا تو اب یہ رو رہا ہے۔ چیخ رہا ہے۔ ہائے ہائے کر رہا ہے۔ اور اس تکلیف کی وجہ سے اس کو رنج اور صدمہ بھی ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ڈاکٹر کو آپریشن کی فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ عقلی طور پر جانتا ہے کہ جو کچھ ڈاکٹر کر رہا ہے، وہ ٹھیک کر رہا ہے، اور میرے فائدے کے لئے کر رہا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک مؤمن کو اس دنیا میں جتنی تکلیفیں اور جتنے صدمے پہنچتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچتے ہیں۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا آپریشن کر رہے ہیں۔ اب اگر ان تکالیف کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہے ہو تو اس کا انجام تمہارے حق میں بہتر ہونے والا ہے، لہٰذا عقلی طور پر اگر یہ بات دل میں بیٹھی ہوئی ہے، اور پھر انسان اس صدمے پر اور اس تکلیف پر اظہارِ غم کرے، روئے، چلائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

کام کا بگڑنا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک تاجر شخص اس بات کی کوشش میں لگا ہوتا ہے کہ میرا فلاں سودا ہو جائے تو اس کے ذریعہ میں بہت نفع کما لوں گا۔ یا ایک شخص کسی عہدے اور منصب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے فلاں منصب مل جائے تو بڑا اچھا ہو، اب اس

سودے کے لئے یا اس منصب کے لئے بھاگ دوڑ اور کوشش کر رہا ہے، دعائیں کر رہا ہے، دوسروں سے بھی دعائیں کرا رہا ہے، لیکن جب سب کام مکمل ہو چکے، اور قریب تھا کہ وہ سودا ہو جائے، یا وہ عہدہ اور منصب اس کو مل جائے، عین اس وقت اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرا یہ نادان اور بیوقوف بندہ اس سودے کے یا منصب کے حاصل کرنے کے پیچھے پڑا ہوا ہے، اور اپنی پوری کوشش صرف کر رہا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر یہ سودا یا یہ منصب اس کو حاصل ہو گیا تو مجھے اس کو جہنم میں ڈالنا پڑے گا، اس لئے کہ اس سودے یا اس عہدے کے نتیجے میں یہ گناہ میں مبتلا ہوگا، اور اس کے نتیجے میں مجھے اس کو جہنم میں دھکیلنا پڑے گا۔ اس لئے یہ منصب یہ سودا اس سے دور کر دیا جائے۔ چنانچہ عین اس وقت جب کہ وہ سودا ہونے والا تھا، یا وہ عہدہ ملنے ہی والا تھا کہ اچانک کوئی رکاوٹ کھڑی ہو گئی۔ اور وہ سودا نہیں ہوا۔ یا وہ عہدہ نہیں ملا۔ اب یہ شخص رو رہا ہے اور یہ شکایت کر رہا ہے کہ فلاں شخص نے بیچ میں آ کر میرا کام بگاڑ دیا۔ اور اب اس بگاڑ کو دوسروں کی طرف منسوب کر رہا ہے۔ حالانکہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ جو کچھ کیا وہ اس کے خالق اور مالک نے کیا ہے۔ اور اس کے فائدے کے لئے کیا، کیونکہ اگر یہ عہدہ مل جاتا تو جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوتا ـــــ یہ ہے تقدیر اور اللہ کا فیصلہ جس پر عقلی طور پر انسان کو راضی رہنا چاہئے۔

تقدیر کے عقیدے پر ایمان لا چکے ہو

عقیدہ کے اعتبار سے تو ہر مؤمن کا تقدیر پر ایمان ہوتا ہے۔ جب ایک بندہ ایمان لاتا ہے تو اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لانے کے ساتھ وہ تقدیر پر بھی ایمان لاتا ہے:

"اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَآئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى"

لیکن اس ایمان کا اثر عموماً اس کی زندگی پر ظاہر نہیں ہوتا اور اس عقیدے کا استحضار نہیں رہتا۔ اور اس کی طرف دھیان نہیں رہتا۔ جس کی وجہ سے وہ دنیا میں پریشان ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جب تم اس عقیدے پر ایمان لے آئے تو اس عقیدے کو اپنی زندگی کا جزو بناؤ، اور اس عقیدے کا دھیان پیدا کرو، اور اس کو یاد رکھو، اور جو بھی واقعہ پیش آئے اس وقت اس کو تازہ کرو کہ میں اللہ کی تقدیر پر ایمان لایا تھا، اس لئے مجھے اس پر راضی رہنا چاہئے۔ یہی فرق ہے ایک عام آدمی میں اور اس شخص میں جس نے صوفیاء کرام کی زیرِ تربیت اس عقیدے کو اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش کی ہو، لہٰذا اس عقیدے کو اس طرح حال بنا لیں کہ جب کبھی کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو اس وقت "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھے۔ اور ساتھ میں اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

ہے، آگے ہمیں اس کے اندر چون وچرا کرنے کی گنجائش نہیں، اس کی مشق کرنی پڑتی ہے۔ تب جا کر یہ عقیدہ حال بن جاتا ہے۔ اور جب یہ حال بن جاتا ہے تو پھر ایسے شخص کو دنیا میں کبھی پریشانی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اس عقیدے کو ہم سب کا حال بنادے۔ آمین

یہ پریشانی کیوں ہے؟

دیکھئے، صدمہ اور غم اور چیز ہے، یہ تو ہر شخص کو پیش آتے ہیں۔ لیکن ایک ہے پریشانی، وہ یہ کہ آدمی اس غم اور صدمہ کی وجہ سے بے تاب اور بے چین ہے۔ کسی کروٹ چین نہیں آرہا ہے۔ یہ پریشانی کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ شخص اس فیصلے پر عقلی طور پر راضی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو چین اور سکون کیسے میسر آئے؟ اور جس شخص کا اس بات پر ایمان ہے کہ میرے اختیار میں جو کچھ تھا وہ میں نے کرلیا۔ اب آگے میرے اختیار سے باہر تھا۔ اس لئے میں کچھ نہیں کرسکتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ برحق ہے، ایسے شخص کو کبھی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ غم اور صدمہ ضرور ہوگا، لیکن پریشانی نہیں ہوگی۔

آبِ زر سے لکھنے کے قابل جملہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو مجھے اس پر بہت شدید صدمہ ہوا، زندگی میں اتنا بڑا صدمہ کبھی پیش نہیں آیا تھا، اور یہ صدمہ بے چینی کی حد تک پہنچا ہوا تھا، کسی کروٹ کسی حال قرار نہیں آرہا تھا اور اس صدمہ پر رونا بھی نہیں آرہا تھا۔ اس لئے کہ بعض اوقات رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے، اس وقت میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ کو اپنی یہ کیفیت لکھی تو انہوں نے جواب میں صرف ایک جملہ لکھ دیا اور الحمدللہ آج تک وہ جملہ دل پر نقش ہے اور اس ایک جملے نے اتنا فائدہ پہنچایا کہ میں بیان نہیں کرسکتا، وہ جملہ یہ تھا:

"صدمہ تو اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن غیر اختیاری امور پر اتنی زیادہ پریشانی قابلِ اصلاح ہے"

یعنی صدمہ تو اپنی جگہ ہے، وہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ عظیم باپ سے جدائی ہوگئی، لیکن یہ ایک غیر اختیاری واقعہ پیش آیا، اس لئے تم یہ نہیں کرسکتے تھے کہ موت کے وقت کو ٹلا دیتے۔ اب اس غیر اختیاری واقعے پر اتنی پریشانی قابلِ اصلاح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رضا بالقضاء کا جو حکم ہے، اس پر عمل نہیں ہورہا ہے اور اس پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے پریشانی ہورہی ہے، یقین جانئے اس ایک جملے کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سینے پر برف رکھ دی۔ اور میری آنکھیں کھول دیں۔

لوحِ دل پر یہ ''جملہ'' نقش کر لیں

ایک اور موقع پر اپنے دوسرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے خط میں لکھا کہ حضرت! فلاں بات کی وجہ سے سخت پریشانی ہے۔ جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جملہ لکھا کہ:

''جس شخص کا اللہ جل جلالہ سے تعلق ہو، اس کا پریشانی سے کیا تعلق؟''

یعنی پریشانی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو تو پھر پریشانی آنے کی مجال نہیں، اس لئے کہ جو صدمہ اور غم ہو رہا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے کہو، یا اللہ! اس کو دور فرمادیں، اور پھر اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرمائیں اس پر راضی رہو۔ لیکن پریشانی کس بات کی؟ لہٰذا اگر رضا بالقضاء حال بن جائے اور جسم و جان کے اندر داخل ہو جائے تو پھر پریشانی کا گزر نہیں ہو سکتا۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے راحت وسکون کا راز

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے جا کر پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے؟ فرمایا: بڑے مزے میں ہوں۔ اور اس شخص کے مزے کا کیا پوچھتے ہو کہ اس کائنات میں کوئی واقعہ اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا۔ بلکہ جو واقعہ بھی پیش آتا ہے وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا دنیا کے سارے کام میری مرضی کے مطابق ہو رہے ہیں، سوال کرنے والے نے کہا کہ حضرت! یہ بات تو انبیاء علیہم السلام کو بھی حاصل نہیں ہوئی کہ دنیا کے تمام کام ان کی مرضی کے مطابق ہو جائیں۔ آپ کو یہ کیسے حاصل ہوئی؟ جواب میں فرمایا کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ جو اللہ کی مرضی، وہ میری مرضی، اور دنیا کے سارے کام اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ اور میری بھی وہی مرضی ہے۔ اور جب سارے کام میری مرضی سے ہو رہے ہیں تو میرے مزے کا کیا پوچھنا۔ پریشانی تو میرے پاس پھٹکتی بھی نہیں، پریشانی تو اس شخص کو ہو جس کی مرضی کے خلاف کام ہوتے ہوں۔

تکالیف بھی حقیقت میں رحمت ہیں

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو رضا بالقضاء کی دولت عطا فرمادیتے ہیں، ان کے پاس پریشانی کا گزر نہیں ہوتا، ان کو صدمہ ضرور ہوتا ہے۔ غم اور تکلیف ان کے پاس ضرور آتی ہے۔ لیکن پریشانی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ غم یا صدمہ آرہا ہے، وہ میرے مالک کی طرف

سے آرہا ہے۔ اور میرے مالک کی حکمت کے مطابق آرہا ہے، اور میرے مالک کی تقدیر کے مطابق میرا فائدہ بھی اسی میں ہے۔ حتیٰ کہ بعض بزرگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یعنی یہ بات تمہارے دشمن کو نصیب نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو اس پر اپنا خنجر آزمائے، یعنی یہ جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں، یہ بھی ان کی رحمت کا عنوان ہے۔ اور جب ان کی رحمت کا عنوان ہے تو دوسروں کو کیوں پہنچیں، یہ بھی ہمیں پہنچیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان فرمودہ مثال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ اس کی ایک مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک شخص آپ کا محبوب ہے۔ اس سے آپ کو انتہاء درجہ کی محبت ہے اور اس محبوب کے دور ہونے کی وجہ سے بہت عرصہ سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اچانک وہ محبوب آپ کے پاس آتا ہے، اور چپکے سے آکر آپ کو پیچھے سے پکڑ کر زور سے دبالیتا ہے۔ اور اتنی زور سے دباتا ہے کہ پسلیاں ٹوٹنے کے قریب ہونے لگتی ہیں، اور آپ کو تکلیف ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں آپ چیختے اور چلاتے ہیں اور اپنے کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ میں تمہارا فلاں محبوب ہوں۔ اگر تمہیں میرا یہ دبانا پسند نہیں ہے تو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں اور تمہارے رقیب کو دبالیتا ہوں۔ اگر تم عاشقِ صادق ہو تو یہی جواب دو گے کہ میرے رقیب کو مت دبانا، بلکہ مجھے ہی دباؤ اور زور سے دباؤ۔ اور یہ شعر پڑھو گے کہ۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں یہ ادراک عطا فرمادے کہ یہ تکلیفیں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا عنوان ہیں۔ لیکن ہم چونکہ کمزور ہیں، اس لئے ہم ان تکالیف کو مانگتے نہیں، لیکن جب وہ تکلیف آگئی تو ان کی حکمت اور فیصلے سے آئی ہے، اس لئے وہ ہمارے حق میں بہتر ہے۔

تکلیف مت مانگو، لیکن آئے تو صبر کرو

ہمارے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ ہم ان تکالیف کو مانگیں، لیکن جن کو ان تکالیف کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے، وہ بعض اوقات مانگ بھی لیتے ہیں، چنانچہ بعض صوفیاء کرام سے مانگنا منقول ہے،

خاص کردہ تکلیف جو دین کے راستے میں پہنچے اس کو تو عاشقانِ صادق نے ہزار ہا تکالیف پر مقدم اور افضل قرار دیا۔ اس کے بارے میں یہ شعر کہا کہ۔

بجرم عشق تو کشد عجب غوغا نیسیت
تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشا ایست

یعنی تیرے عشق کے جرم میں لوگ مجھے مار رہے ہیں، اور گھسیٹ رہے ہیں، اور ایک شور برپا ہے، آ کر دیکھ کہ تماشے کا کیسا شاندار منظر ہے' یہ تو بڑے لوگوں کی بات ہے لیکن ہم لوگ چونکہ کمزور ہیں، طاقت اور قوت اور صلاحیت نہیں ہے، اس لئے ان تکالیف کو اللہ تعالیٰ سے مانگتے نہیں ہیں، بلکہ عافیت مانگتے ہیں کہ یا اللہ عافیت عطا فرمایئے، اور جب تکلیف آ جاتی ہے تو اس کے ازالے کی بھی دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! یہ تکلیف اگرچہ آپ کی نعمت ہے، لیکن ہماری کمزوری پر نظر کرتے ہوئے اس نعمت کو عافیت کی نعمت سے بدل دیجئے، لیکن پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ اس کا نام ''رضا بالقضاء'' ہے۔ تقدیر پر ایمان تو سب کا ہوتا ہے کہ جو کچھ تقدیر میں لکھا تھا وہ ہو گیا۔ لیکن اس عقیدے کو اپنی زندگی کا حال بنانا چاہئے۔ ''حال'' بنانے کے بعد انشاء اللہ پریشانی پاس نہیں پھٹکے گی۔

اللہ والوں کا حال

چنانچہ آپ نے اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ ان کو آپ کبھی بے تاب اور بے چین اور پریشان نہیں پائیں گے۔ ان کے ساتھ کیسا ہی بڑے سے بڑا ناگوار واقعہ پیش آ جائے، اس پر ان کو غم تو ہوگا، لیکن بے تابی اور بے چینی اور پریشانی ان کے پاس پھٹکتی بھی نہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اس پر راضی رہنا ضروری ہے۔ لہٰذا انسان کی زندگی میں جب بھی کوئی ناگوار واقعہ پیش آ جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ خیال کرتے ہوئے اس پر راضی رہنے کی فکر کرے۔ غم، صدمہ اور پریشانی کا یہی علاج ہے۔ اور ایسا کرنے سے اس کو اعلیٰ درجہ کا صبر حاصل ہو جائے گا اور صبر وہ اعلیٰ عبادت ہے جو ساری عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۱)

''یعنی اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے''

کوئی شخص تکلیف سے خالی نہیں

ہر تکلیف کے موقع پر یہ سوچنا چاہئے کہ اس کائنات میں کوئی ایسا شخص ہو نہیں سکتا جس کو اپنی

(۱) الزمر: ۱۰

زندگی میں کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو۔ چاہے وہ بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، بڑے سے بڑا سرمایہ دار اور دولت مند ہو، بڑے سے بڑا صاحبِ منصب ہو، بڑے سے بڑا نیک، ولی اللہ ہو، بڑے سے بڑا نبی ہو۔ لہٰذا تکلیف تو تمہیں ضرور پہنچے گی۔ تم چاہو تو بھی پہنچے گی اور نہ چاہو تو بھی پہنچے گی۔ اس لئے کہ یہ دنیا ایسی جگہ ہے جہاں راحت بھی ہے، غم بھی ہے، خوشی ہے، پریشانی بھی ہے۔ خالص راحت بھی کسی کو حاصل نہیں۔ خالص غم بھی کسی کو میسر نہیں۔ یہ طے شدہ بات ہے۔ حتیٰ کہ خدا کا انکار کرنے والوں نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا۔ (العیاذ باللہ) لیکن اس بات سے انکار نہیں کر سکے کہ اس دنیا میں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ جب یہ بات طے شدہ ہے کہ تکلیف پہنچتی ہے تو اب سوال یہ ہے کہ کون سی تکلیف پہنچے اور کون سی تکلیف نہ پہنچے۔ اس کا ایک راستہ تو یہ ہے کہ تم خود فیصلہ کر لو کہ مجھے فلاں تکلیف پہنچے اور فلاں تکلیف نہ پہنچے۔ کیا تمہارے اندر اس بات کی طاقت ہے کہ تم یہ فیصلہ کرو کہ فلاں تکلیف میرے حق میں بہتر ہے اور فلاں تکلیف بہتر نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ تم نہیں جانتے کہ کون سی تکلیف کا انجام میرے حق میں بہتر ہوگا اور کون سی تکلیف کا انجام بہتر نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو، اور یہ کہہ دو کہ یا اللہ! آپ اپنے فیصلے کے مطابق جو تکلیف دینا چاہیں وہ دے دیجئے اور پھر اس کو برداشت کرنے کی طاقت بھی دے دیجئے اور اس پر صبر بھی عطا فرمائیے۔

چھوٹی تکلیف بڑی تکلیف کو ٹال دیتی ہے

انسان بے چارہ اپنی عقل کے دائرے میں محدود ہے، اس کو یہ پتہ نہیں کہ جو تکلیف مجھے پہنچی ہے اس نے مجھے کسی بڑی تکلیف سے بچالیا ہے۔ مثلاً کسی شخص کو بخار آ گیا، تو اب اس کو بخار کی تکلیف نظر آ رہی ہے، یا کوئی شخص کسی ملازمت کے لئے کوشش کر رہا تھا، لیکن وہ ملازمت اس کو نہیں ملی۔ اس کو یہ تکلیف نظر آ رہی ہے۔ یا گھر میں سامان کی چوری ہو گئی۔ اس کو یہ تکلیف نظر آ رہی ہے۔ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ اگر یہ تکلیف نہ پہنچتی تو دوسری کون سی تکلیف پہنچتی؟ اور وہ تکلیف بڑی تھی یا یہ تکلیف بڑی ہے؟ چونکہ اس کو اس کا علم نہیں ہے، اس لئے جو تکلیف اس کو پہنچی ہے تو اس کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس کا ذکر اور چرچا کرتا رہتا ہے کہ ہائے مجھے یہ تکلیف پہنچ گئی، بلکہ اس موقع پر انسان یہ سوچے کہ اچھا ہوا کہ اس چھوٹی سی تکلیف پر بات ٹل گئی۔ ورنہ خدا جانے کتنی بڑی مصیبت آتی۔ کیا بلا نازل ہوتی۔ یہ سوچنے سے انسان کو تسلی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ انسان کو دکھا بھی دیتے ہیں کہ جس مصیبت کو تم بڑی تکلیف سمجھ رہے تھے، دیکھو وہ کیسی رحمت ثابت ہوئی۔

اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو

حضورِ اقدس ﷺ نے ہماری تسلی کے لئے یہ دعا بھی تلقین فرمادی:

((لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ)) (۱)

اللہ تعالیٰ سے بچاؤ کا سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں کہ اسی کی آغوشِ رحمت میں پناہ لو، یعنی اس کے فیصلے پر راضی رہو، اور پھر اسی سے مدد مانگو، یا اللہ! اس کو دور فرما دیجئے، اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتے ہیں کہ ایک تیرانداز تصور کرو، جس کے پاس اتنی بڑی تیرکمان ہے جس نے ساری کائنات کو گھیرے میں لیا ہوا ہے، اور اس کمان کے ہر ہر حصے میں تیر لگے ہوئے ہیں، اور دنیا میں کوئی جگہ ایسی محفوظ نہیں ہے، جس جگہ پر وہ تیر نہ پہنچ سکتے ہوں۔ پوری دنیا کا چپہ چپہ اس کی زد میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے تیرانداز کے تیروں سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ کون سی جگہ ایسی ہے جہاں پر جا کر ان تیروں سے بچا جا سکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تم تیروں سے بچنا چاہتے ہو تو اس تیرانداز کے پہلو میں جا کر کھڑے ہو جاؤ، اس کے علاوہ کوئی اور جگہ بچاؤ کی نہیں ہے' اسی طرح یہ مصائب، یہ حوادثات، یہ پریشانیاں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے فیصلوں کے تیر ہیں۔ ان تیروں سے اگر بچاؤ کی کوئی جگہ ہے تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کے دامنِ رحمت میں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ہے' اس لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ یا اللہ! ناقابلِ برداشت تکلیف مت دیجئے اور جب تکلیف دیں تو اس پر صبر بھی عطا فرمادیں اور اس کو میری مغفرت اور ترقی درجات کا ذریعہ بنائیے۔ آمین۔

ایک نادان بچے سے سبق لیں

آپ نے چھوٹے بچے کو دیکھا ہوگا کہ جب ماں اس کو مارتی ہے، اس وقت بھی وہ ماں ہی کی گود میں اور زیادہ گھستا ہے، حالانکہ جانتا ہے کہ میری ماں مجھے مار رہی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ بچہ یہ بھی جانتا ہے کہ ماں پٹائی تو کر رہی ہے لیکن اس پٹائی کا علاج بھی اسی کے پاس ہے اور مجھے شفقت اور محبت بھی اسی کی آغوش میں مل سکتی ہے' لہٰذا جب بھی کوئی ناگوار بات یا واقعہ پیش آجائے تو یہ سوچو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اسی کی آغوشِ رحمت میں مجھے پناہ مل سکتی ہے، یہ سوچ کر پھر اسی سے اس کے ازالے کی اور اس پر صبر کی دعا کریں یہ ہے ''رضا بالقضاء''

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عطا فرمادیں۔ آمین

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب اذا بات طاهرا وفضله، رقم: ۵۸۳۶

اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر رضامندی خیر کی دلیل ہے

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبْدٍ خَیْرًا اَرْضَاہُ بِمَا قَسَّمَ لَہٗ وَبَارَکَ لَہٗ فِیْہِ، وَاِذَا لَمْ یُرِدْ بِہٖ خَیْرًا، لَمْ یُرْضِہٖ بِمَا قَسَّمَ لَہٗ وَلَمْ یُبَارِكْ لَہٗ فِیْہِ))(۱)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی اور خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو اپنی قسمت پر راضی کر دیتے ہیں، اور اس قسمت میں اس کے لئے برکت بھی عطا فرماتے ہیں، اور جب کسی سے بھلائی کا ارادہ نہ فرمائیں (العیاذ باللہ) تو اس کو اس کی قسمت پر راضی نہیں کرتے۔ یعنی اس کے دل میں قسمت پر اطمینان اور رضا پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس کے نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ حاصل ہے، اس میں بھی برکت نہیں ہوتی، اس حدیث کے ذریعہ یہ بتا دیا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو قسمت پر راضی کر دیتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ اس کو تھوڑا ملا ہو، لیکن اس تھوڑے میں ہی اللہ تعالیٰ برکت عطا فرما دیتے ہیں۔

برکت کا مطلب اور مفہوم

آج کی دنیا گنتی کی دنیا ہے اور ہر چیز کی گنتی گنی جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ مجھے ایک ہزار روپے ملتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ مجھے دو ہزار روپے ملتے ہیں۔ تیسرا کہتا ہے کہ مجھے دس ہزار روپے ملتے ہیں، لیکن کوئی شخص یہ نہیں دیکھتا کہ اس گنتی کے نتیجے میں مجھے کتنی راحت ملی؟ کتنا آرام ملا؟ کتنی عافیت حاصل ہوئی؟ اب مثلاً ایک شخص کو پچاس ہزار روپے مل گئے۔ لیکن گھر کے اندر پریشانیاں، بیماریاں ہیں اور سکون حاصل نہیں ہے اور ہر وقت پریشانی کے اندر مبتلا ہے۔ اب بتایئے وہ پچاس ہزار کس کام کے؟ اس سے پتہ چلا کہ وہ پچاس ہزار روپے برکت والے نہیں تھے۔ بے برکتی والے ہیں، ایک دوسرا شخص ہے جس کو ایک ہزار روپے ملے۔ لیکن اس کو راحت اور آرام اور عافیت میسر ہے۔ تو اگرچہ وہ گنتی میں ایک ہزار ہیں، لیکن اپنے حاصل اور نتائج کے اعتبار سے یہ ایک ہزار والا پچاس ہزار والے سے آگے بڑھ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہزار برکت والے تھے اور اس ایک ہزار سے بے شمار کام اور فائدے حاصل ہو گئے۔

---

(۱) کنز العمال، رقم: ۷۱۱۷، جامع الأحادیث، رقم: ۱۲۴۸

ایک نواب کا واقعہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ نے مواعظ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ایک نواب تھے۔ ان کی بڑی زمینیں، جائیدادیں، نوکر چاکر وغیرہ سب کچھ تھا۔ ایک مرتبہ میری ان سے ملاقات ہوئی تو ان نواب صاحب نے خود مجھے بتایا کہ "میں اپنے بارے میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میرے پاس یہ ساری دولتیں ہیں، جو آپ دیکھ رہے ہیں، لیکن مجھے ایک ایسی بیماری لاحق ہوگئی ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی چیز نہیں کھا سکتا۔ اور میرے معالج نے میرے لئے صرف ایک غذا تجویز کی ہے۔ وہ یہ کہ گوشت کا قیمہ بناؤ، اور اس قیمہ کو ایک کپڑے میں باندھ کر اس کا رس نکالو اور اس کو چمچے کے ذریعہ پیو' اب دیکھئے، دسترخوان پر دنیا بھر کے انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے ہیں، ہزار قسم کی نعمتیں حاصل ہیں لیکن صاحب بہادر نہیں کھا سکتے۔ اس لئے کہ بیمار ہیں۔ ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے۔ بتاؤ، وہ دولت کس کام کی جس کو انسان اپنی مرضی سے استعمال نہ کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نعمت میں برکت نہیں ڈالی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نعمت بیکار ہوگئی ——— ایک دوسرا آدمی ہے جو محنت مزدوری کرتا ہے، ساگ روٹی کھاتا ہے، لیکن بھر پور بھوک کے ساتھ اور پوری لذت کے ساتھ کھاتا ہے، اور وہ کھانا اس کے جسم کو جا کر لگتا ہے۔ اب بتائیے یہ مزدور بہتر ہے یا وہ نواب بہتر ہے؟ حالانکہ گنتی اس کی زیادہ ہے، اور اس مزدور کی گنتی کم ہے۔ لیکن راحت اس مزدور کو نصیب ہے۔ اس نواب کو میسر نہیں، اس کا نام ہے برکت۔

قسمت پر راضی رہو

بہر حال، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا جو بندہ قسمت پر راضی ہو جائے اور قسمت پر راضی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تدبیر چھوڑ دے، اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، بلکہ کام کرتا رہے، لیکن ساتھ میں اس پر راضی ہو کہ اس کام کرنے کے نتیجے میں جو کچھ مجھے مل رہا ہے، وہ میرے لئے بہتر ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسی میں برکت عطا فرما دیتے ہیں۔ اسی کو راحت کا سبب بنا دیتے ہیں' اور اگر کوئی شخص قسمت پر راضی نہ ہو، بلکہ ہر وقت ناشکری کرتا رہے اور یہ کہتا رہے کہ مجھے تو ملا ہی کیا ہے۔ میں تو محروم رہ گیا۔ میں تو پیچھے رہ گیا۔ تو اس کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت ملا ہوا ہے، اس کی لذت سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور اس میں برکت نہیں ہوتی' انجام تو وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ چاہیں گے، اور اتنا ہی ملے گا جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں گے، تمہارے رونے سے، ناشکری کرنے سے تمہاری حالت نہیں بدل جائے گی، لیکن اس ناشکری سے نقصان یہ ہوگا کہ موجودہ نعمت سے جو نفع حاصل ہو سکتا

تھا وہ بھی حاصل نہ ہوا۔

میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

اس لئے اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں پر راضی رہو، چاہے وہ مال و دولت کی نعمت ہو، پیشے کی نعمت ہو، صحت کی نعمت ہو، حسن و جمال کی نعمت ہو، دنیا کی ہر دولت اور نعمت پر راضی رہو، اور یہ سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت جس مقدار میں مجھے عطا فرمائی ہے وہ میرے حق میں بہتر ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا۔

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مے
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

یعنی دوسروں کے پیالوں میں کتنی مے بھری ہے، مجھے اس سے کیا تعلق، لیکن میرے پیمانے میں جو مے ہے، وہ میرے لئے کافی ہے۔ لہٰذا مجھے اس سے کیا غرض کہ کسی کو ہزار مل گئے، کسی کو لاکھ ملے، کوئی کروڑ پتی بن گیا، لیکن جو کچھ مجھے ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ میں اسی میں مگن ہوں، اور اس پر خوش ہوں، بس یہ فکر حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی فکر سے قناعت حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے رضا بالقضاء حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے تکلیفیں اور صدمے دور ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ فکر عطا فرمادے اور اس کو ہمارا حال بنادے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

فتنہ کے دور کی نشانیاں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾(۱)

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:((اِذَا رَاَیْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَهَوًى مُتَّبَعًا وَدُنْیَا مُؤْثَرَةً وَاِعْجَابَ كُلِّ ذِیْ رَأْیٍ بِرَأْیِهٖ فَعَلَیْكَ یَعْنِیْ بِنَفْسِكَ وَدَعْ عَنْكَ الْعَوَامَّ))(۲)

حضور ﷺ تمام قوموں کے لئے قیامت تک کے لئے نبی ہیں

حضورِ اقدس ﷺ کی تعلیمات کے سلسلہ میں آج ایک ایسے موضوع پر مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں جس کی آج ضرورت بھی ہے، اور آپ ﷺ کے ارشادات اور تعلیمات کا یہ پہلو بہت کم بیان کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ کو اس دنیا میں خاتم النبیین بنا کر مبعوث فرمایا۔ آپ پر نبوت کے سلسلے کی تکمیل ہوگئی۔ اور آپ کو دوسرے انبیاء پر یہ امتیاز عطا فرمایا کہ پہلے جو انبیاء تشریف لاتے تھے، وہ عموماً کسی خاص قوم کے لئے اور خاص جگہ کے لئے اور خاص زمانے کے لئے ہوتے تھے۔ ان

☆ اصلاحی خطبات (۷/۲۲۵۔۲۶۵)، ۱۴ جولائی، بیت المکرم، کراچی

(۱) المائدة: ۱۰۵

(۲) سنن أبی داؤد، کتاب لملاحم، باب الأمر والنهی، رقم: ۳۷۷۸، سنن الترمذی، کتاب التفسیر القرآن عن رسول الله، باب من سورة المائدة، رقم: ۲۹۸٤، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، رقم: ٤۰۰٤

کی تعلیمات اور دعوت ایک خاص علاقے تک محدود ہوتی تھی۔ اور ایک خاص زمانے تک محدود ہوتی تھی۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کے علاقے میں بنی اسرائیل کی طرف مبعوث فرمائے گئے۔ اسی قوم اور اسی علاقے تک آپ کی نبوت اور رسالت محدود تھی۔ لیکن حضور نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کسی خاص قوم، کسی خاص قبیلے اور کسی خاص جگہ کے لئے نبی نہیں بنایا تھا، بلکہ پوری دنیا، پوری انسانیت اور قیامِ قیامت تک تمام زمانوں کے لئے نبی بنایا تھا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ (۱)

''اے نبی (ﷺ) ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے''

تمام انسانوں سے مراد یہ ہے کہ وہ جہاں بھی بسنے والے ہوں اور جس زمانے میں بھی آنے والے ہوں، ان سب کی طرف آپ کو بھیجا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی رسالت صرف عرب تک مخصوص نہیں۔ اور صرف کسی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ قیامِ قیامت تک جتنے آنے والے زمانے ہیں، ان سب کے لئے آپ کو رسول بنایا۔

آئندہ پیش آنے والے حالات کی اطلاع

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آپ کی تعلیمات اور آپ کے بتائے ہوئے احکام قیامت تک نافذ العمل ہیں۔ کسی زمانے کے ساتھ آپ کی تعلیمات مخصوص نہیں۔ اسی لئے حضورِ اقدس ﷺ نے ہمیں جو تعلیمات عطا فرمائیں وہ زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہیں۔ اور پھر ان تعلیمات کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو میں تو شریعت کا بیان ہے کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام ہے، یہ کام جائز ہے، اور یہ کام ناجائز ہے۔ فلاں عمل واجب ہے۔ فلاں عمل مسنون ہے۔ فلاں عمل مستحب ہے۔ وغیرہ۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اُمت کو آئندہ آنے والے زمانوں میں کیا کیا حالات آنے والے ہیں، اور اُمت کو کن کن مسائل سے دوچار ہونا ہے اور ان حالات میں اُمت کو کیا کرنا چاہیے؟

یہ دوسرا پہلو بھی حضورِ اقدس ﷺ کی تعلیمات کا بہت اہم حصہ ہے۔ چنانچہ آپ نے نگاہِ نبوت سے آئندہ پیش آنے والے اہم واقعات کو دیکھنے کے بعد اُمت کو خبر دی کہ آئندہ زمانے میں یہ واقعہ پیش آنے والا ہے اور یہ حالات پیش آنے والے ہیں۔ اور ساتھ میں آپ ﷺ نے اُمت کو یہ بھی بتایا کہ جب ایسے حالات پیش آئیں تو ایک مؤمن کو اور سیدھے راستے پر چلنے والے کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ اور کیا طرز اختیار کرنا چاہیے؟ آج اس دوسرے پہلو پر تھوڑی سی گزارشات عرض

(۱) سبا: ۲۸

کرنا چاہتا ہوں۔

اُمت کی نجات کی فکر

حضورِ اقدس ﷺ کو اپنی اُمت کی ایسی فکر تھی کہ اس فکر کے اندر آپ ہر وقت پریشان رہتے تھے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

"كَانَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَائِمُ الْفِكْرَةِ مُتَوَاصِلُ الْأَحْزَانِ"(۱)

یعنی حضورِ اقدس ﷺ ہمیشہ فکر مند، سوچ میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر وقت آپ پر کوئی غم چھایا ہوا ہے۔ کیا وہ غم پیسے جمع کرنے کا تھا؟ یا وہ غم اپنی شان وشوکت بڑھانے کا تھا؟ بلکہ وہ غم اس بات کا تھا کہ جس قوم کی طرف مجھے بھیجا گیا ہے، میں اس کو کس طرح جہنم کی آگ سے بچاؤں۔ اور کس طرح ان کو گمراہی سے نکال کر سیدھے راستے پر لے آؤں۔ اور اس شدید غم میں مبتلا ہونے کی وجہ سے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بار بار آیات نازل فرمائیں۔ جن میں آپ کو اس غم کرنے سے روکا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾(۲)

''آپ اپنی جان کو کیوں ہلاک کر رہے ہیں، اس وجہ سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں''

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال اس شخص جیسی ہے جس نے ایک آگ سلگائی اور آگ کو دیکھ کر پروانے آگ پر گرنے لگے۔ وہ شخص ان پروانوں کو آگ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا ہے تا کہ وہ آگ میں گر کر جل نہ جائیں۔ اسی طرح میں بھی تمہیں جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں، تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر تمہیں روک رہا ہوں۔ مگر تم جہنم کی آگ کے اندر گرے جا رہے ہو۔(۳)

آپ کو اپنی اُمت کی اتنی فکر تھی، اور صرف اس اُمت کی فکر نہیں تھی جو آپ کے زمانے میں موجود تھی، بلکہ آئندہ آنے والے زمانے کے لوگوں کی بھی آپ کو فکر تھی۔

---

(۱) الشمائل المحمدية والخصائل المصطفوية، رقم: ۲۲٦

(۲) الشعراء: ۳

(۳) صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصی، رقم: ٦٠٠٢، صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب شفقته على أمته ومبالغته فی تحذيرهم مما يضرهم، رقم: ٤٢٣٤، سنن الترمذی، كتاب الأمثال عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم: ۲۷۹۹، مسند أحمد، رقم: ۷۰۱۹

آئندہ کیا کیا فتنے آنے والے ہیں؟

چنانچہ آپ ﷺ نے آئندہ آنے والے لوگوں کو بتایا کہ تمہارے زمانے میں کیا کیا حالات پیش آنے والے ہیں؟ چنانچہ تقریباً تمام احادیث کی کتابوں میں ایک مستقل باب ''ابواب الفتن'' کے نام سے موجود ہے، جس میں ان احادیث کو جمع کیا گیا ہے جن میں حضورِ اقدس ﷺ نے آنے والے فتنوں کے بارے میں لوگوں کو بتایا اور ان کو خبردار کیا کہ دیکھو! آئندہ زمانے میں یہ یہ فتنے آنے والے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((تَقَعُ الْفِتَنُ فِیْ بُیُوْتِکُمْ کَوَقْعِ الْمَطَرِ))(۱)

یعنی آئندہ زمانے میں فتنے تمہارے گھروں میں اس طرح گریں گے جیسے بارش کے قطرے گرتے ہیں۔ بارش کے قطروں سے اس لئے تشبیہ دی کہ جس طرح بارش کا پانی کثرت سے گرتا ہے، اسی طرح وہ فتنے بھی کثرت سے آئیں گے۔ اور دوسرے یہ کہ بارش کا پانی جس طرح مسلسل گرتا ہے کہ ایک قطرے کے بعد دوسرا قطرہ، دوسرے کے بعد فوراً تیسرا قطرہ، اسی طرح وہ فتنے بھی مسلسل اور لگاتار آئیں گے کہ ابھی ایک فتنہ آکر ختم نہیں ہوگا کہ دوسرا فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ دوسرے کے بعد تیسرا آئے گا۔ اور یہ فتنے تمہارے گھروں میں آکر گریں گے۔

ایک دوسری حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((سَتَکُوْنُ فِتَنٌ کَقِطَعِ اللَّیْلِ الْمُظْلِمِ))(۲)

عنقریب اندھیری رات کی تاریکیوں کی طرح تاریک فتنے ہوں گے۔ یعنی جس طرح تاریک رات میں انسان کو کچھ نظر نہیں آتا کہ کہاں جائے، راستہ کہاں ہے؟ اسی طرح ان فتنوں کے زمانے میں بھی یہ سمجھ میں نہیں آئے گا کہ انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ اور وہ فتنے تمہارے پورے معاشرے اور ماحول کو گھیر لیں گے، اور بظاہر تمہیں ان سے کوئی جائے پناہ نظر نہیں آئے گی۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان فتنوں سے پناہ کی دعا بھی مانگا کرو اور یہ دعا کیا کرو:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ))(۳)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب آطام المدینة، رقم: ۳۷۲۲، صحیح مسلم، کتاب الفتن وأشراط الساعة، باب نزول الفتن کمواقع المطر، رقم: ۵۱۳۵، مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۲۰۸۰۹

(۲) کنز العمال، رقم: ۲۱۹۹

(۳) مسند أحمد، باب بدایة مسند عبدالله بن العباس، رقم: ۲٦٤۲

اے اللہ! ہم آنے والے فتنوں سے آپ کی پناہ چاہتے ہیں۔ ظاہری فتنوں سے بھی اور باطنی فتنوں سے بھی پناہ چاہتے ہیں۔ دونوں قسم کے فتنوں سے پناہ مانگا کرو۔ اور یہ دعا حضورِ اقدس ﷺ کے معمولات کی دعاؤں میں شامل تھی۔

فتنہ کیا ہے؟

اب اس کو سمجھنا چاہئے کہ ''فتنہ'' کیا چیز ہے؟ کس کو ''فتنہ'' کہتے ہیں؟ اور اس ''فتنہ'' کے دور میں ہمارے اور آپ کے لئے حضورِ اقدس ﷺ کی تعلیم کیا ہے؟ اور اس میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اب یہ لفظ تو ہم صبح و شام استعمال کرتے ہیں کہ یہ بڑے فتنے کا دور ہے۔ قرآن کریم میں بھی ''فتنہ'' کا لفظ کئی بار آیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

﴿وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (۱)

''اللہ کے نزدیک فتنہ قتل سے بھی زیادہ شدید چیز ہے''

''فتنہ'' کے معنی اور مفہوم

''فتنہ'' عربی زبان کا لفظ ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں ''سونے یا چاندی وغیرہ کو آگ پر پگھلا کر اس کا کھرا کھوٹا معلوم کرنا'' آگ میں تپا کر اس کی حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ خالص ہے یا نہیں؟ اسی وجہ سے اس لفظ کو آزمائش اور امتحان کے معنی میں بھی استعمال کیا جانے لگا، چنانچہ ''فتنہ'' کے دوسرے معنی ہوئے آزمائش، لہٰذا جب انسان پر کوئی تکلیف یا مصیبت یا پریشانی آئے اور اس کے نتیجے میں انسان کی اندرونی کیفیت کی آزمائش ہو جائے کہ وہ انسان ایسی حالت میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے؟ آیا اس وقت صبر کرتا ہے یا واویلا کرتا ہے، فرمانبردار رہتا ہے یا نافرمان ہو جاتا ہے، اِس آزمائش کو بھی ''فتنہ'' کہا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں ''فتنہ'' کا لفظ

حدیث شریف میں ''فتنہ'' کا لفظ جس چیز کے لئے استعمال ہوا ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی وقت کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے جس میں حق مشتبہ ہو جائے اور حق و باطل میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے، صحیح اور غلط میں امتیاز باقی نہ رہے۔ یہ پتہ نہ چلے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟ جب یہ صورتِ حال پیدا ہو جائے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ فتنے کا دور ہے۔ اسی طرح معاشرے کے اندر گناہ،

(۱) البقرة:۱۹۱

فسق و فجور، نافرمانیاں عام ہوجائیں تو اس کو بھی ''فتنہ'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جو چیز حق نہ ہو اس کو حق سمجھنا، اور جو چیز دلیلِ ثبوت نہ ہو اس کو دلیلِ ثبوت سمجھ لینا بھی ایک ''فتنہ'' ہے۔ جیسے آج کل صورتِ حال ہے کہ اگر کسی سے دین کی بات کہو کہ فلاں کام گناہ ہے، ناجائز ہے، بدعت ہے۔ جواب میں وہ شخص کہتا ہے کہ ارے! یہ کام تو سب کر رہے ہیں، اگر یہ کام گناہ اور ناجائز ہے تو پھر ساری دنیا یہ کام کیوں کر رہی ہے۔ یہ کام تو سعودی عرب میں بھی ہو رہا ہے۔ آج کے دور میں یہ ایک نئی مستقل دلیل ایجاد ہو چکی ہے کہ ہم نے یہ کام سعودی عرب میں ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام سعودی عرب میں ہوتا ہو وہ یقینی طور پر حق اور درست ہے۔ یہ بھی ایک ''فتنہ'' ہے کہ جو چیز حق کی دلیل نہیں تھی اس کو دلیل سمجھ لیا گیا ہے۔ اسی طرح شہر کے اندر بہت ساری جماعتیں کھڑی ہو گئیں۔ اور یہ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے۔ کون صحیح کہہ رہا ہے اور کون غلط کہہ رہا ہے۔ اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہو گیا، یہ بھی ''فتنہ'' ہے۔

دو جماعتوں کی لڑائی ''فتنہ'' ہے

اسی طرح جب دو مسلمان یا مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں، اور ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار آجائیں، اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں، اور یہ پتہ چلانا مشکل ہو جائے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون ہے، تو یہ بھی ایک ''فتنہ'' ہے۔ ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا الْتَقَا الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ كِلَاهُمَا فِي النَّارِ))(۱)

جب دو مسلمان تلواریں لے کر آپس میں لڑنے لگیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ ایک صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! قاتل کا جہنم میں جانا تو ٹھیک ہے، اس لئے کہ اس نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا، لیکن مقتول جہنم میں کیوں جائے گا؟ حضور اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ مقتول اس لئے جہنم میں جائے گا کہ وہ بھی اسی ارادے سے ہتھیار لے کر نکلا تھا کہ میں دوسرے کو قتل کر دوں۔ اس کا داؤ چل جاتا تو یہ قتل کر دیتا۔ لیکن اُس کا داؤ چل گیا اس لئے اُس نے قتل کر دیا۔ ان میں سے کوئی بھی اللہ کے لئے نہیں لڑ رہا تھا، بلکہ دنیا کے لئے، دولت کے لئے، اور سیاسی مقاصد کیلئے لڑ رہے تھے، اور دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، لہٰذا دونوں جہنم میں جائیں گے۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب وان طائفتان من المؤمنين...... الخ، رقم: ۳۰، صحيح مسلم، كتاب الفتن وأشراط الساعة، رقم: ۵۱۳۹، سنن النسائي، كتاب تحريم الدم، رقم: ۴۰۴۸، سنن أبي داؤد، كتاب الفتن والملاحم، رقم: ۳۷۲۳

قتل و غارت گری ''فتنہ'' ہے

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ مِنْ وَّرَائِكُمْ اَيَّامًا يُرْفَعُ فِيهَا الْعِلْمُ وَيَكْثُرُ فِيهَا الْهَرَجُ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا الْهَرَجُ؟ قَالَ: اَلْقَتْلُ))(۱)

یعنی لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جس میں ''ہرج'' بہت زیادہ ہو جائے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یہ ہرج کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قتل و غارت گری، یعنی اس زمانے میں قتل و غارت گری بے حد ہو جائے گی اور انسان کی جان مچھر مکھی سے زیادہ بے حقیقت ہو جائے گی۔ ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ يَوْمٌ لَا يَدْرِي الْقَاتِلُ فِيْمَ قَتَلَ، وَلَا الْمَقْتُوْلُ فِيْمَ قُتِلَ، فَقِيْلَ: كَيْفَ يَكُوْنُ ذٰلِكَ؟ قَالَ: اَلْهَرَجُ، اَلْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِي النَّارِ))(۲)

یعنی لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ جس میں قاتل کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ میں نے کیوں قتل کیا۔ اور مقتول کو یہ پتہ نہیں ہوگا کہ میں کیوں قتل کیا گیا؟ آج کے زمانے کے موجودہ حالات پر نظر ڈال لو، اور حضورِ اقدس ﷺ کے ان الفاظ کو پڑھ لو۔ ایسا لگتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے اس زمانے کو دیکھ کر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ پہلے زمانے میں تو یہ ہوتا تھا کہ یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کس نے مارا، لیکن یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ شخص کیوں مارا گیا۔ مثلاً مال چھیننے کی وجہ سے مارا گیا، ڈاکوؤں نے مار دیا، دشمنی کی وجہ سے مار دیا گیا، مارے جانے کے اسباب سامنے آجاتے تھے۔ لیکن آج یہ حال ہے کہ ایک شخص ہے، کسی سے نہ کچھ لینا نہ دینا، نہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق، نہ کسی سے کوئی جھگڑا، بس بیٹھے بٹھائے مارا گیا۔ یہ ساری باتیں حضورِ اقدس ﷺ صاف صاف بتا گئے۔

مکہ مکرمہ کے بارے میں ایک حدیث

ایک حدیث جو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے مکہ مکرمہ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الفتن، باب ظهور الفتن، رقم: ٦٥٣٨، صحیح مسلم، کتاب العلم، رقم: ٤٨٢٦۔ سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول الله، ٢١٢٦، واضح رہے کہ اصلاحی خطبات میں اس حدیث میں لفظ ''الحرج'' پرنٹ ہوا ہے، جبکہ درست لفظ ''الهرج'' ہے۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الفتن وأشراط الساعة، باب لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل بقبر الرجل...... الخ، رقم: ٥١٧٨

کے بارے میں فرمایا:

((اِذَا رَأَیْتَ مَکَّۃَ قَدْ بُعِجَتْ کَظَائِمَ وَسَاوٰی بِنَاؤُھَا رُؤُوْسَ الْجِبَالِ فَاعْلَمْ اَنَّ الْاَمْرَ قَدْ اَظَلَّکَ))(۱)

''جب مکہ مکرمہ کا پیٹ چاک کردیا جائے گا، اور اس میں نہروں جیسے راستے نکال دیئے جائیں گے، اور مکہ مکرمہ کی عمارتیں اس کے پہاڑوں سے زیادہ بلند ہو جائیں گی، جب یہ چیزیں نظر آئیں گی تو سمجھ لو کہ فتنے کا وقت قریب آگیا''

آج سے چند سال پہلے تک اس حدیث کا صحیح مطلب لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ لیکن اب سمجھ میں آگیا۔

مکہ مکرمہ کا پیٹ چاک ہونا

یہ حدیث چودہ سو سال سے حدیث کی کتابوں میں لکھی چلی آرہی ہے، اور اس حدیث کی تشریح کرتے وقت شرّاحِ حدیث حیران تھے کہ مکہ مکرمہ کا پیٹ کس طرح چاک ہوگا؟ اور نہروں جیسے راستے بننے کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ اس کا کرنا مشکل تھا۔ لیکن آج کے مکہ مکرمہ کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے آج کے مکہ مکرمہ کو دیکھ کر یہ باتیں ارشاد فرمائی تھیں۔ آج مکہ مکرمہ کو چاک کر کے اس میں بے شمار سرنگیں نکال دی گئی ہیں۔ آج سے پہلے شرّاحِ حدیث فرماتے تھے کہ اس وقت تو یہ مکہ مکرمہ کا علاقہ خشک اور سنگلاخ پہاڑی علاقہ ہے، لیکن آئندہ کسی زمانے میں اللہ تعالیٰ اس میں نہریں اور ندیاں جاری کردیں گے۔ لیکن آج ان سرنگوں کو دیکھ کر یہ نظر آرہا ہے کہ کس طرح مکہ مکرمہ کا پیٹ چاک کردیا گیا۔

عمارتوں کا پہاڑوں سے بلند ہونا

دوسرا جملہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ جب اس کی عمارتیں پہاڑوں سے بھی بلند ہو جائیں گی۔ آج سے چند سال پہلے تک کسی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ مکہ مکرمہ میں پہاڑوں سے بھی زیادہ بلند عمارتیں بن جائیں گی۔ کیونکہ سارا مکہ پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ لیکن آج مکہ مکرمہ میں جا کر دیکھ لیں کہ کس طرح پہاڑوں سے بلند عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے چودہ سو سال پہلے آج کے حالات گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بیان فرمادیئے تھے، اللہ تعالیٰ کے عطا فرمودہ وحی اور علم کے ذریعہ یہ ساری

(۱) تاج العروس، مادۃ بعج، لسان العرب، مادۃ بعج

باتیں روزِ روشن کی طرح آشکار کردی گئی تھیں، آپ نے ایک ایک چیز کھول کھول کر بیان فرمادی کہ آئندہ زمانے میں کیا ہونے والا ہے۔ اور آپ نے یہ بتایا کہ اس زمانے میں مسلمانوں کو کیا کیا مشکلات اور فتنے پیش آنے والے ہیں۔ اور ساتھ میں یہ بھی بتادیا کہ اس وقت میں ایک مسلمان کو کیا راہِ عمل اختیار کرنا چاہئے؟

موجودہ دور احادیث کی روشنی میں

جن احادیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے آئندہ آنے والے فتنوں کی نشان دہی فرمائی ہے، ہر مسلمان کو وہ احادیث یاد رکھنی چاہئیں۔ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب مدظلہم نے ایک کتاب ''عصر حاضر حدیث کے آئینے میں'' کے نام سے تحریر فرمائی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے فتنوں سے متعلق تمام احادیث کو جمع کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس میں ایک حدیث ایسی لائے ہیں جس میں حضورِ اقدس ﷺ نے فتنہ کے دور کی ۷۲ باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان کو آپ سنتے جائیں اور اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتے جائیں کہ یہ سب باتیں ہمارے موجودہ ماحول پر کس طرح صادق آرہی ہیں۔

فتنہ کی ۷۲ نشانیاں

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے قریب ۷۲ باتیں پیش آئیں گی۔

(۱) لوگ نمازیں غارت کرنے لگیں گے۔ یعنی نمازوں کا اہتمام رخصت ہوجائے گا۔ یہ بات اگر اس زمانے میں کہی جائے تو کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں سمجھی جائے گی۔ اس لئے کہ آج مسلمانوں کی اکثریت ایسی ہے جو نماز کی پابند نہیں ہے۔ العیاذ باللہ۔ لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے یہ بات اس وقت ارشاد فرمائی تھی جب نماز کو کفر اور ایمان کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں مؤمن کتنا ہی بُرے سے بُرا ہو، فاسق و فاجر ہو، بدکار ہو، لیکن نماز نہیں چھوڑتا تھا۔ اس زمانے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ نمازیں غارت کرنے لگیں گے۔

(۲) امانت ضائع کرنے لگیں گے۔ یعنی جو امانتیں ان کے پاس رکھی جائیں گی، اس میں خیانت کرنے لگیں گے۔

(۳) سود کھانے لگیں گے۔

(۴) جھوٹ کو حلال سمجھنے لگیں گے۔ یعنی جھوٹ ایک فن اور ہنر بن جائے گا۔

(۵) معمولی معمولی باتوں پر خونریزی کرنے لگیں گے۔ ذرا سی بات پر دوسرے کی جان لے لیں گے۔

(۶) اُونچی اُونچی بلڈنگیں بنائیں گے۔

(۷) دین بیچ کر دنیا جمع کریں گے۔

(۸) قطع رحمی، یعنی رشتہ داروں سے بدسلوکی ہوگی۔

(۹) انصاف نایاب ہوجائے گا۔

(۱۰) جھوٹ سچ بن جائے گا۔

(۱۱) لباس ریشم کا پہنا جائے گا۔

(۱۲) ظلم عام ہوجائے گا۔

(۱۳) طلاقوں کی کثرت ہوگی۔

(۱۴) ناگہانی موت عام ہوجائے گی۔ یعنی ایسی موت عام ہوجائے گی جس کا پہلے سے پتہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اچانک پتہ چلے گا کہ فلاں شخص ابھی زندہ اور ٹھیک ٹھاک تھا اور اب مرگیا۔

(۱۵) خیانت کرنے والے کو امین سمجھا جائے گا۔

(۱۶) امانت دار کو خائن سمجھا جائے گا۔ یعنی امانت دار پر تہمت لگائی جائے گی کہ یہ خائن ہے۔

(۱۷) جھوٹے کو سچا سمجھا جائے گا۔

(۱۸) سچے کو جھوٹا کہا جائے گا۔

(۱۹) تہمت درازی عام ہوجائے گی۔ یعنی لوگ ایک دوسرے پر جھوٹی تہمتیں لگائیں گے۔

(۲۰) بارش کے باوجود گرمی ہوگی۔

(۲۱) لوگ اولاد کی خواہش کرنے کے بجائے اولاد سے کراہیت کریں گے۔ یعنی جس طرح لوگ اولاد ہونے کی دعائیں کرتے ہیں، اس کے بجائے لوگ یہ دعائیں کریں گے کہ اولاد نہ ہو۔ چنانچہ آج دیکھ لیں کہ خاندانی منصوبہ بندی ہورہی ہے۔ اور یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ بچے دو ہی اچھے۔

(۲۲) کمینوں کے ٹھاٹھ ہوں گے۔ یعنی کمینے لوگ بڑے ٹھاٹھ سے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزاریں گے۔

(۲۳) شریفوں کے ناک میں دم آجائے گا۔ یعنی شریف لوگ شرافت کو لے کر بیٹھیں گے تو دنیا سے کٹ جائیں گے۔

(۲۴) امیر اور وزیر جھوٹ کے عادی بن جائیں گے۔ یعنی سربراہِ حکومت اور اس کے اعوان و انصار اور وزراء جھوٹ کے عادی بن جائیں گے، اور صبح شام جھوٹ بولیں گے۔

(۲۵) امین خیانت کرنے لگیں گے۔
(۲۶) سردار ظلم پیشہ ہوں گے۔
(۲۷) عالم اور قاری بدکار ہوں گے۔ یعنی عالم بھی ہیں اور قرآن کریم کی تلاوت بھی کر رہے ہیں، مگر بدکار ہیں۔ العیاذ باللہ
(۲۸) لوگ جانوروں کی کھالوں کا لباس پہنیں گے۔
(۲۹) مگر ان کے دل مردار سے زیادہ بدبودار ہوں گے۔ یعنی لوگ جانوروں کی کھالوں سے بنے ہوئے اعلیٰ درجے کے لباس پہنیں گے۔ لیکن ان کے دل مردار سے زیادہ بدبودار ہوں گے۔
(۳۰) اور ایلوے سے زیادہ کڑوے ہوں گے۔
(۳۱) سونا عام ہو جائے گا۔
(۳۲) چاندی کی مانگ ہوگی۔
(۳۳) گناہ زیادہ ہو جائیں گے۔
(۳۴) امن کم ہو جائے گا۔
(۳۵) قرآن کریم کے نسخوں کو آراستہ کیا جائے گا اور اس پر نقش و نگار بنایا جائے گا۔
(۳۶) مسجدوں میں نقش و نگار کیے جائیں گے۔
(۳۷) اُونچے اُونچے مینار بنیں گے۔
(۳۸) لیکن دل ویران ہوں گے۔
(۳۹) شرابیں پی جائیں گی۔
(۴۰) شرعی سزاؤں کو معطل کر دیا جائے گا۔
(۴۱) لونڈی اپنے آقا کو جنے گی۔ یعنی بیٹی ماں پر حکمرانی کرے گی۔ اور اس کے ساتھ ایسا سلوک کرے گی جیسے آقا اپنی کنیز کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔
(۴۲) جو لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن، غیر مہذب ہوں گے وہ بادشاہ بن جائیں گے۔ کمینے اور نیچ ذات کے لوگ جو نسبی اور اخلاق کے اعتبار سے کمینے اور نیچے درجے کے سمجھے جاتے ہیں، وہ سربراہ بن کر حکومت کریں گے۔
(۴۳) تجارت میں عورت مرد کے ساتھ شرکت کرے گی۔ جیسے آج کل ہو رہا ہے کہ عورتیں زندگی کے ہر کام میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔
(۴۴) مرد عورتوں کی نقالی کریں گے۔
(۴۵) عورتیں مردوں کی نقالی کریں گی۔

یعنی مرد عورتوں جیسا حلیہ بنائیں گے اور عورتیں مردوں جیسا حلیہ بنائیں گی۔ آج دیکھ لیں کہ نئے فیشن نے یہ حالت کر دی ہے کہ دور سے دیکھو تو پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ یہ مرد ہے یا عورت ہے۔

(۴۶) غیر اللہ کی قسمیں کھائی جائیں گی۔ یعنی قسم تو صرف اللہ کی یا اللہ کی صفت کی اور قرآن کی کھانا جائز ہے، دوسری چیزوں کی قسم کھانا حرام ہے، لیکن اس وقت لوگ اور چیزوں کی قسم کھائیں گے۔ مثلاً تیرے سر کی قسم وغیرہ۔

(۴۷) مسلمان بھی بغیر کہے جھوٹی گواہی دینے کو تیار ہوگا۔ لفظ ''بھی'' کے ذریعہ یہ بتادیا کہ اور لوگ تو یہ کام کرتے ہی ہیں، لیکن اس وقت مسلمان بھی جھوٹی گواہی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔

(۴۸) صرف جان پہچان کے لوگوں کو سلام کیا جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر راستے میں کہیں سے گزر رہے ہیں تو ان لوگوں کو سلام نہیں کیا جائے گا جن سے جان پہچان نہیں ہے، اگر جان پہچان ہے تو سلام کرلیں گے۔ حالانکہ حضورِ اقدس ﷺ کا فرمان یہ ہے:

((اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ)) (۱)

''جس کو تم جانتے ہو، اس کو بھی سلام کرو، اور جس کو تم نہیں جانتے، اس کو بھی سلام کرو''

خاص طور پر اس وقت جب کہ راستے میں اِکا دُکا آدمی گزر رہے ہوں تو اس وقت سب آنے جانے والوں کو سلام کرنا چاہئے۔ لیکن اگر آنے جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو، اور سلام کی وجہ سے اپنے کام میں خلل آنے کا اندیشہ ہو تو پھر سلام نہ کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اِکا دُکا آدمی گزر رہے ہوں گے تب بھی سلام نہیں کریں گے اور سلام کا رواج ختم ہو جائے گا۔

(۴۹) غیر دین کے لئے شرعی علم پڑھا جائے گا۔ یعنی شرعی علم دین کے لئے نہیں، بلکہ دنیا کے لئے پڑھا جائے گا۔ العیاذ باللہ۔ اور مقصد یہ ہوگا کہ اس کے ذریعہ ہمیں ڈگری مل جائے گی، ملازمت مل جائے گی، پیسے مل جائیں گے، عزت اور شہرت حاصل ہو جائے گی۔ ان مقاصد کے لئے دین کا علم پڑھا جائے گا۔

(۵۰) آخرت کے کام سے دنیا کمائی جائے گی۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب اطعام الطعام من الاسلام، رقم:۱۱، صحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان تفاضل الاسلام وأی أموره أفضل، رقم:۵۶، سنن النسائی، کتاب الایمان وشرائعه، باب أی الاسلام خیر، ۴۹۱۴، سنن ابن ماجه، کتاب الأطعمة، باب اطعام الطعام، رقم:۳۲۴۴

(۵۱) مالِ غنیمت کو ذاتی جاگیر سمجھ لیا جائے گا۔ مالِ غنیمت سے مراد قومی خزانہ ہے۔ یعنی قومی خزانہ کو ذاتی جاگیر اور ذاتی دولت سمجھ کر معاملہ کریں گے۔

(۵۲) امانت کو لوٹ کا مال سمجھا جائے گا۔ یعنی اگر کسی نے امانت رکھوادی تو سمجھیں گے کہ یہ لوٹ کا مال حاصل ہوگیا۔

(۵۳) زکوٰۃ کو جرمانہ سمجھا جائے گا۔

(۵۴) سب سے رذیل آدمی قوم کا لیڈر اور قائد بن جائے گا۔ یعنی قوم میں جو شخص سب سے زیادہ رذیل اور بدخصلت انسان ہوگا، اس کو قوم کے لوگ اپنا قائد، اپنا ہیرو اور اپنا سربراہ بنالیں گے۔

(۵۵) آدمی اپنے باپ کی نافرمانی کرے گا۔

(۵۶) آدمی اپنی ماں سے بدسلوکی کرے گا۔

(۵۷) دوست کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرے گا۔

(۵۸) بیوی کی اطاعت کرے گا۔

(۵۹) بدکاروں کی آوازیں مسجدوں میں بلند ہوں گی۔

(۶۰) گانے والی عورتوں کی تعظیم وتکریم کی جائے گی۔ یعنی جو عورتیں گانے بجانے کا پیشہ کرنے والی ہیں، ان کی تعظیم اور تکریم کی جائے گی اور ان کو بلند مرتبہ دیا جائے گا۔

(۶۱) گانے بجانے کے اور موسیقی کے آلات کو سنبھال کر رکھا جائے گا۔

(۶۲) سرِراہ شرابیں پی جائیں گی۔

(۶۳) ظلم کو فخر سمجھا جائے گا۔

(۶۴) انصاف بکنے لگے گا۔ یعنی عدالتوں میں انصاف فروخت ہوگا۔ لوگ پیسے دے کر اس کو خریدیں گے۔

(۶۵) پولیس والوں کی کثرت ہوجائے گی۔

(۶۶) قرآنِ کریم کو نغمہ سرائی کا ذریعہ بنالیا جائے گا۔ یعنی موسیقی کے بدلے میں قرآن کی تلاوت کی جائے گی، تاکہ اس کے ذریعہ ترنم کا حظ اور مزہ حاصل ہو۔ اور قرآن کی دعوت اور اس کو سمجھنے یا اس کے ذریعہ اجر وثواب حاصل کرنے کے لئے تلاوت نہیں کی جائے گی۔

(۶۷) درندوں کی کھال استعمال کی جائے گی۔

(۶۸) اُمت کے آخری لوگ اپنے سے پہلے لوگوں پر لعن طعن کریں گے۔ یعنی ان پر تنقید کریں گے اور ان پر اعتماد نہیں کریں گے، اور تنقید کرتے ہوئے یہ کہیں گے کہ انہوں نے یہ بات غلط کہی۔ اور یہ غلط طریقہ اختیار کیا۔ چنانچہ آج بہت بڑی مخلوق صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شان میں

گستاخیاں کر رہی ہے، بہت سے لوگ ان ائمہ دین کی شان میں گستاخیاں کر رہے ہیں جن کے ذریعہ یہ دین ہم تک پہنچا، اور ان کو بیوقوف بتا رہے ہیں کہ وہ لوگ قرآن و حدیث کو نہیں سمجھے، دین کو نہیں سمجھے۔ آج ہم نے دین کو صحیح سمجھا ہے۔

پھر فرمایا کہ جب یہ علامات ظاہر ہوں تو اس وقت اس کا انتظار کرو کہ

(۶۹) یا تو تم پر سرخ آندھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آجائے۔

(۷۰) یا زلزلے آجائیں۔

(۷۱) یا لوگوں کی صورتیں بدل جائیں۔

(۷۲) یا آسمان سے پتھر برسیں۔ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اور عذاب آجائے۔ العیاذ باللہ۔ اب آپ ان علامات میں ذرا غور کر کے دیکھیں کہ یہ سب علامات ایک ایک کر کے کس طرح ہمارے معاشرے پر صادق آرہی ہیں۔ اور اِس وقت جو عذاب ہم پر مسلط ہے وہ درحقیقت انہی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔[1]

مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا

ایک اور حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب میری اُمت میں پندرہ کام عام ہو جائیں گے تو ان پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ پندرہ کام کون سے ہیں؟ جواب میں آپ نے فرمایا:

(۱) جب سرکاری خزانے کو لوٹ کا مال سمجھا جانے لگے۔ دیکھ لیجئے کہ آج کس طرح قومی خزانے کو لوٹا جا رہا ہے، اور پھر یہ صرف حکمرانوں کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ جب حکمران لوٹتے ہیں تو عوام میں سے جس کا بھی داؤ چل جائے وہ بھی لوٹتا ہے۔ چنانچہ بہت سے کام ایسے ہیں جس میں ہم اور آپ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس کام کی وجہ سے ہماری طرف سے قومی خزانے پر لوٹ ہو رہی ہے۔ مثلاً بجلی کی چوری ہے کہ کہیں سے خلافِ قانون کنکشن لے لیا اور اس کو استعمال کرنا شروع کر دیا، یہ قومی خزانے کی چوری ہے۔ یا مثلاً ٹیلیفون ایکسچینج والے سے دوستی کر لی، اور اب اس کے ذریعہ لمبی لمبی کالیں مفت کی جا رہی ہیں۔ یہ بھی قومی خزانے کی چوری ہے۔ یا مثلاً ریل کے ذریعہ بلاٹکٹ سفر کیا۔ یہ بھی قومی خزانے کی چوری ہے۔ یا مثلاً ریل میں اُونچے درجے میں سفر کر لیا، جبکہ ٹکٹ نیچے درجہ کا خریدا ہے۔ یہ بھی قومی خزانے کی چوری ہے۔

اور یہ قومی خزانے کی چوری عام چوری سے بہت زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے کہ اگر انسان

(۱) الدر المنثور (۶/۵۲)

کسی کے گھر پر چوری کرلے اور بعد میں اس کی تلافی کرنا چاہے تو اس کی تلافی کرنا آسان ہے کہ جتنی رقم چوری کی ہے اتنی رقم اس کو لے جا کر واپس کردے، یا اس سے جا کر معاف کرالے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی، مجھے معاف کردینا، اور اس نے معاف کردیا تو انشاء اللہ معاف ہو جائے گا۔ لیکن قومی خزانے کے اندر لاکھوں انسانوں کا حصہ ہے۔ اور ہر انسان کی اس میں ملکیت ہے۔ اگر اس مال کو چوری کرلیا یا زیادتی کرلی تو اب کس کس انسان سے معاف کراؤ گے؟ اور جب تک ان لاکھوں حقداروں سے معاف نہیں کراؤ گے اس وقت تک معافی نہیں ہوگی۔ اس لئے عام مال کی چوری کی معافی آسان ہے، لیکن قومی خزانے کی چوری کے بعد اس کی معافی بہت مشکل ہے۔ العیاذ باللہ۔

(۲) جب امانت کو لوگ لوٹ کا مال سمجھنے لگیں، اور اس میں خیانت کرنے لگیں۔

(۳) اور جب لوگ زکوٰۃ کو تاوان اور جرمانہ سمجھنے لگیں۔

(۴) آدمی بیوی کی اطاعت کرے، اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے۔ یعنی آدمی بیوی کی خوشنودی کی خاطر ماں کی نافرمانی کرے۔ مثلاً بیوی ایک ایسے غلط کام کو کرنے کے لئے کہہ رہی ہے جس میں ماں کی نافرمانی ہو رہی ہے تو وہ شخص ماں کی حرمت کو نظر انداز کردیتا ہے اور بیوی کو راضی کرنے کے لئے وہ کام کرلیتا ہے۔

(۵) اور آدمی دوست کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا اور باپ کے ساتھ برا سلوک کرے گا، یعنی دوست کے ساتھ دوستی کا لحاظ کرے گا، لیکن باپ کے ساتھ سختی اور بدسلوکی کا معاملہ کرے گا۔

(۶) مسجدوں میں آوازیں بلند ہوں گی۔ مسجدیں تو اس لئے وضع کی گئی ہیں کہ ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے، اور اللہ کی عبادت اور ذکر کرنے والوں کے ذکر اور عبادت میں کوئی خلل نہ ڈالا جائے۔ لیکن لوگ مسجدوں میں آوازیں بلند کرکے خلل ڈالیں گے، چنانچہ آج کل الحمد للہ مسجدوں میں نکاح کرنے کا رواج تو ہوگیا ہے، جو اچھا رواج ہے، لیکن نکاح کے موقع پر مسجد کی حرمت کا لحاظ نہیں کیا جاتا، اور اس وقت شور کیا جاتا ہے، آوازیں بلند کی جاتی ہیں، جو ایک گناہِ بے لذت ہے۔ اس لئے کہ بعض گناہ وہ ہوتے ہیں جس کے کرنے میں کچھ لذت اور مزہ بھی آتا ہے لیکن یہ گناہ ایسا ہے کہ جس کے کرنے میں کوئی لذت اور مزہ نہیں ہے بلکہ مسجد میں آواز بلند کرکے بلاوجہ اپنے سر گناہ لے لیا۔

(۷) قوم کا لیڈر ان کا ذلیل ترین آدمی ہوگا۔

(۸) آدمی کی عزت اس کے شر کے خوف سے کی جانے لگے کہ اگر اس کی عزت نہیں کروں گا تو یہ مجھے کسی نہ کسی مصیبت میں پھنسا دے گا۔

(۱۰) اور شرابیں پی جانے لگیں گی۔

(۱۱) ریشم پہنا جائے گا۔

(۱۲) گانے بجانے والی عورتیں رکھی جائیں گی۔ اور موسیقی کے آلات سنبھال کے رکھے جائیں گے۔ یہ اس وقت حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں جب اِن باتوں کا تصور بھی نہیں تھا۔ اور حضورِ اقدس ﷺ نے جو لفظ استعمال فرمایا وہ یہ کہ گانے بجانے والی عورتیں رکھنے لگیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہر شخص گانے بجانے والی عورتیں تو اپنے پاس کیسے رکھ سکتا ہے اس لئے کہ ہر شخص کے اندر اتنی استطاعت کہاں کہ وہ گانے بجانے والی عورت کو اپنے پاس رکھے۔ اور جب چاہے اس سے گانے سنے۔ لیکن ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹی وی اور وی سی آر نے اس مسئلہ کو آسان کر دیا۔ اب ہر شخص کے گھر میں ریڈیو اور ٹی وی موجود ہے۔ ویڈیو کیسٹ موجود ہے۔ جب چاہے گانا سنے اور گانے والی عورت کو دیکھ لے۔

اسی طرح گانے بجانے کے آلات ہر شخص اپنے پاس نہیں رکھتا، لیکن آج کے ریڈیو، ٹی وی اور وی سی آر نے یہ باجے گھر گھر پہنچا دیئے، اور اب آلاتِ موسیقی خرید کر لانے کی ضرورت نہیں۔ بس ٹی وی آن کر دو تو آلاتِ موسیقی کے تمام مقاصد اس کے ذریعہ تمہیں حاصل ہو جائیں گے۔

(۱۳) اور اس اُمت کے آخری لوگ پہلے لوگوں پر لعنت کرنے لگیں۔ بہر حال، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب یہ باتیں میری اُمت میں پیدا ہو جائیں گی تو ان پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔

العیاذ باللہ۔ اس حدیث میں بھی جتنی باتیں حضورِ اقدس ﷺ نے بیان فرمائی ہیں وہ سب باتیں آج ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔

شراب کو شربت کے نام سے پیا جائے گا

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب میری اُمت کے لوگ شراب کو شربت کہہ کر حلال کرنے لگیں۔ مثلاً شراب کو کہیں کہ یہ تو ایک شربت ہے، اس کے حرام ہونے کا کیا مطلب؟ چنانچہ آج لوگوں نے اس موضوع پر کتابیں اور مقالے لکھ دیئے کہ موجودہ شراب حرام نہیں ہے، اور قرآن کریم میں شراب کے لئے کہیں حرام کا لفظ نہیں آیا ہے، اس لئے شراب حرام نہیں۔ اور یہ جو بیئر ہے یہ جَو کا پانی ہے، اور جس طرح دوسرے شربت ہوتے ہیں یہ بھی ایک شربت ہے۔ اس طرح آج شراب کو حلال کرنے پر دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جس کی خبر حضورِ اقدس ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے دیدی تھی۔

سود کو تجارت کا نام دیا جائے گا

اور جب میری اُمت کے لوگ سود کو تجارت کہہ کر حلال کرنے لگیں کہ یہ سود بھی ایک تجارت

ہے۔ جیسے آج کل کہا جارہا ہے کہ یہ بینکوں میں جو سود کا لین دین ہو رہا ہے، یہ تجارت کی ہی ایک شکل ہے، اگر اس کو بند کر دیا تو ہماری تجارت ختم ہو جائے گی۔

رشوت کو ہدیہ کا نام دیا جائے گا

اور جب میری اُمت کے لوگ رشوت کو ہدیہ کہہ کر حلال کرنے لگیں۔ مثلاً رشوت دینے والا یہ کہے کہ یہ ہم نے آپ کو ہدیہ دیا ہے، اور رشوت لینے والا رشوت کو ہدیہ کہہ کر اپنے پاس رکھ لے۔ حالانکہ حقیقت میں وہ رشوت ہے۔ چنانچہ آج کل یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اور زکوٰۃ کے مال کو مالِ تجارت بنالیں تو اس وقت اس اُمت کی ہلاکت کا وقت آجائے گا۔ العیاذ باللہ۔ یہ چاروں باتیں جو حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمائیں، وہ ہمارے موجودہ دور پر پوری طرح صادق آرہی ہیں۔ (۱)

کشنوں پر سوار ہو کر مسجد میں آنا

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آخری دور میں (فتنے کے زمانے میں) لوگ میاسر پر سوار ہو کر آئیں گے اور مسجد کے دروازوں پر اُتریں گے۔ ''میاسر'' عربی زبان میں بڑے عالیشان ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں جو اس زمانے میں بہت شان و شوکت اور دبدبے والے لوگ اپنے گھوڑے کی زین پر ڈالا کرتے تھے اور بطور ''کشن'' کے استعمال کرتے تھے۔ گویا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کشنوں پر سواری کر کے مسجد کے دروازوں پر اُتریں گے۔ پہلے زمانے میں اس کا تصور مشکل تھا کہ لوگ کشنوں پر سواری کر کے کس طرح آکر مسجد کے دروازوں پر اُتریں گے۔ لیکن اب کاریں ایجاد ہو گئیں تو دیکھیں کہ کس طرح لوگ کاروں میں سوار ہو کر آرہے ہیں اور مسجد کے دروازوں پر اُتر رہے ہیں۔

عورتیں لباس پہننے کے باوجود ننگی

آگے فرمایا کہ ''ان کی عورتیں لباس پہننے کے باوجود ننگی ہوں گی''۔ پہلے زمانے میں اس کا تصور بھی مشکل تھا کہ لباس پہننے کے باوجود کس طرح ننگی ہوں گی، لیکن آج آنکھوں سے نظر آرہا ہے کہ لباس پہننے کے باوجود عورتیں کس طرح ننگی ہیں۔ اس لئے کہ یا تو وہ لباس اتنا باریک ہے کہ جسم اس سے نظر آرہا ہے، یا وہ لباس اتنا مختصر اور چھوٹا ہے کہ لباس پہننے کے باوجود اعضاء پورے نہیں چھپے، یا وہ لباس اتنا چست ہے کہ اس کی وجہ سے سارے اعضاء نمایاں ہو رہے ہیں۔

(۱) کنز العمال، رقم: ۳۸۴۹۷

عورتوں کے بال اُونٹ کے کوہان کی طرح

آگے فرمایا کہ "ان عورتوں کے سروں پر اُونٹوں کے کوہان جیسے بال ہوں گے" یہ حدیث بھی ان احادیث میں سے ہے کہ پچھلے علماء اس کی شرح کے وقت حیران ہوتے تھے کہ اُونٹوں کے کوہان جیسے بال کیسے ہوں گے۔ اس لئے کہ اُونٹوں کا کوہان تو اُٹھا ہوا اُونچا ہوتا ہے، بال کس طرح اُونچے ہو جائیں گے۔ لیکن آج اس دور نے ناقابلِ تصور چیز کو حقیقت بنا کر آنکھوں کے سامنے دکھا دیا۔ اور موجودہ دور کی عورتوں کی جو تشبیہ آپ ﷺ نے بیان فرمائی، اس سے بہتر تشبیہ کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ عورتیں ملعون ہیں

آگے فرمایا کہ "ایسی عورتوں پر لعنت بھیجو، اس لئے کہ ایسی عورتیں ملعون ہیں۔" اللہ تعالیٰ نے عورت کو ایک ایسی چیز بنایا ہے جو اپنے دائرے کے اندر محدود رہے۔ اور جب یہ عورت بے پردہ باہر نکلتی ہے تو حدیث شریف میں ہے کہ شیطان اس کی تانک جھانک میں لگ جاتا ہے[1] اور فرمایا کہ جب عورت خوشبو لگا کر بازاروں کے اندر جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر لعنت ہوتی ہے۔ اور فرشتے ایسی عورت پر لعنت بھیجتے ہیں۔

لباس کا مقصدِ اصلی

لباس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سترِ عورت حاصل ہو جائے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿يَا بَنِيٓ آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاساً يُّوَارِىْ سَوْءَاتِكُمْ وَرِيْشًا﴾ (۲)

"یعنی ہم نے لباس اس لئے اُتارا تاکہ وہ تمہارے ستر کو چھپائے اور زینت کا سامان ہو"

لہٰذا جو لباس ستر کو نہ چھپائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ لباس کا جو اصل مقصد تھا وہ فوت کر دیا گیا۔ اور جب اصل مقصد فوت ہو گیا تو لباس پہننے کے باوجود وہ لباس پہننے والا برہنہ ہے۔ خدا کے لئے اس کا اہتمام کریں کہ ہمارا لباس درست ہو۔ آج کل اچھے خاصے دیندار، نمازی، پرہیزگار لوگوں کے اندر بھی اس کا اہتمام ختم ہو گیا ہے۔ لباس میں اس کی پرواہ نہیں کہ اس میں پردہ پورا ہو رہا ہے یا نہیں؟ انہی چیزوں کا وبال آج ہم لوگ بھگت رہے ہیں۔ لہٰذا کم از کم اپنے گھرانوں میں اور اپنے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ما جاء فی كراهية الدخول على المغيبات، رقم: ۱۰۹۳

(۲) الأعراف: ۲۶

خاندانوں میں اس کا اہتمام کرلیں کہ لباس شریعت کے مطابق ہو، اور اس میں پردہ کا لحاظ ہو، اور حضور اقدس ﷺ کی لعنت کی وعید سے محفوظ ہو۔

دوسری قومیں مسلمانوں کو کھائیں گی

ایک حدیث میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم پر ایک ایسا وقت آنے والا ہے کہ دنیا کی دوسری قومیں تمہیں کھانے کے لئے ایک دوسرے کو دعوت دیں گی۔ جیسے لوگ دسترخوان پر بیٹھ کر دوسروں کو کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً دسترخوان بچھا ہوا ہے، اس پر کھانے چنے ہوئے ہیں۔ اس پر ایک آدمی بیٹھا ہے۔ اتنے میں دوسرا شخص آگیا تو پہلا اس سے کہتا ہے کہ آؤ کھانا تناول کرو اور کھانے میں شریک ہو جاؤ۔ اسی طرح ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس وقت مسلمانوں کا دسترخوان بچھا ہوگا، اور مسلمانوں کی حیثیت ایسی ہوگی جیسے دسترخوان پر کھانا ہوتا ہے۔ اور بڑی بڑی قومیں اور طاقتیں مسلمانوں کو کھا رہی ہوں گی۔ اور دوسری قوموں کو دعوت دے رہی ہوں گی کہ آؤ اور مسلمانوں کو کھاؤ۔ (۱)

جن حضرات کو پچھلے سو سال کی تاریخ کا علم ہے یعنی پہلی جنگِ عظیم سے لے کر آج تک غیر مسلم قوموں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، اور وہ کس طرح مسلمان ملکوں کو آپس میں تقسیم کرتی رہی ہیں کہ اچھا مصر تمہارا اور شام ہمارا، الجزائر تمہارا اور مراکش ہمارا، ہندوستان تمہارا اور برما ہمارا وغیرہ۔ گویا کہ آپس میں ایک دوسرے کی دعوت ہو رہی ہے کہ آؤ ان کو لے جا کر کھالو۔

مسلمان تنکوں کی طرح ہوں گے

جب حضورِ اقدس ﷺ نے مسلمانوں کی حالت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بیان فرمائی تو کسی صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا اس وقت ہماری تعداد بہت کم رہ جائے گی جس کی وجہ سے دوسرے لوگ مسلمانوں کو کھانے لگیں گے اور دوسروں کو بھی کھانے کی دعوت دینے لگیں گے؟ جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں، اس وقت تمہاری تعداد بہت زیادہ ہوگی۔ چنانچہ آج مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے زیادہ ہے۔ گویا کہ دنیا کی ایک تہائی آبادی مسلمانوں کی ہے۔ لیکن تمہاری مثال ایسی ہوگی جیسے سیلاب میں بہتے ہوئے بے شمار تنکے ہوتے ہیں۔ یعنی جیسے ایک پانی کا سیلاب جارہا ہے اور اس میں بے شمار تنکے گرے ہوئے ہیں جن کی کوئی گنتی نہیں ہو سکتی، لیکن وہ تنکے

---

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الملاحم، باب في تداعي الامم على الاسلام، رقم: ۳۷٤۵، مسند أحمد، رقم: ۲۱۳٦۳

سیلاب میں بہے چلے جارہے ہیں، ان تنکوں کی اپنی کوئی طاقت نہیں، اپنا کوئی فیصلہ نہیں، اپنا کوئی اختیار نہیں، پانی جہاں بہا کر لے جارہا ہے وہاں جارہے ہیں۔

مسلمان بزدل ہوجائیں گے

آگے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب نکال لیں گے اور تمہارے دلوں میں کمزوری اور بزدلی آجائے گی" ایک صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ کمزوری اور بزدلی کیا چیز ہے؟ گویا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ مسلمان اور بزدل؟ مسلمان اور کمزور؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ کمزوری یہ ہے کہ دنیا کی محبت دل میں آجائے گی اور موت سے نفرت ہوجائے گی۔ اور موت کا مطلب ہے "اللہ تعالیٰ سے ملاقات" گویا کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے نفرت ہوجائے گی۔ اور اس وقت یہ فکر ہوگی کہ دنیا حاصل ہو، پیسہ حاصل ہو، شہرت اور عزت حاصل ہو، چاہے حلال طریقے سے ہو یا حرام طریقے سے ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہادری

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا حال یہ تھا کہ ایک غزوہ میں ایک صحابی اکیلے رہ گئے۔ سامنے سے تین چار کافر مسلح جنگجو پہلوان قسم کے آگئے۔ یہ صحابی تنہا تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ان سے مقابلہ کرنا چاہا تو اتنے میں دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہاں پہنچ گئے۔ اور انہوں نے کہا کہ تم اکیلے ہو اور یہ زیادہ ہیں اور بڑے جنگجو اور پہلوان قسم کے لوگ بھی ہیں۔ اس لئے اس وقت بہتر یہ ہے کہ طرح دے جاؤ اور مقابلہ نہ کرو، اور ہمارے لشکر کے آنے کا انتظار کرلو۔ ان صحابی نے بے ساختہ جواب دیا کہ میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ تم میرے اور جنت کے درمیان حائل ہونے کی کوشش مت کرنا۔ یہ بڑے بڑے پہلوان تو میرے جنت میں پہنچنے کا راستہ ہیں۔ اور تم مجھے لڑنے سے روک رہے ہو اور میرے اور جنت کے درمیان حائل ہورہے ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا جس کی وجہ سے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بزدلی کیا چیز ہے؟ اور کمزوری کیا چیز ہے؟ حضورِ اقدس ﷺ کی صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت ختم فرمادی تھی۔ اور ہر وقت آنکھوں سے آخرت کو دیکھ رہے تھے۔ جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کررہے تھے۔ اس وجہ سے مرنے سے نہیں ڈرتے تھے، بلکہ اس بات کی خواہش کرتے تھے کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جائیں۔

ایک صحابی کا شوقِ شہادت

ایک صحابی ایک میدانِ جنگ میں پہنچے، دیکھا کہ سامنے کفار کا لشکر ہے، جو پورے اسلحے اور طاقت کے ساتھ حملہ آور ہوگا، اس لشکر کو دیکھ کر بے ساختہ زبان سے یہ شعر پڑھا:

غَدًا نَلْقَى الْأَحِبَّه مُحَمَّدًا وَصَحْبَه

''واہ واہ کیا بہترین نظارہ ہے۔ کل کو ہم اپنے دوستوں سے یعنی محمد ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملاقات کریں گے''(۱)

ایک صحابی کے تیر آکر لگا۔ سینے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا، اس وقت بے ساختہ زبان سے یہ کلمہ نکلا:

((فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ))

''ربِ کعبہ کی قسم، آج میں کامیاب ہوگیا''(۲)

یہ حضرات ایمان اور یقین والے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھنے والے تھے، دنیا کی محبت جن کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔

''فتنہ'' کے دور کے لئے پہلا حکم

ایسی صورت میں ایک مسلمان کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے؟ اس کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے پہلا حکم یہ دیا:

((تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاِمَامَهُمْ))

''پہلا کام یہ کرو کہ جمہور مسلمان اور ان کے امام کے ساتھ ہو جاؤ۔ اور جو لوگ بغاوت کر رہے ہیں ان سے کنارہ کشی اختیار کرلو اور ان کو چھوڑ دو''

ایک صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر مسلمانوں کی اکثریت والی جماعت اور امام نہ ہو تو پھر آدمی کیا کرے؟ یعنی آپ نے جو حکم دیا وہ تو اس وقت ہے جب مسلمانوں کی متفقہ جماعت موجود ہو، ان کا ایک سربراہ ہو جس پر سب متفق ہوں، اور اس امام کی دیانت اور تقویٰ پر اعتماد ہو، تب تو

(۱) کتبِ تاریخ میں ان اشعار کے دو حوالے ملتے ہیں، پہلی مرتبہ یہ اشعار اشعریین اور اہل یمن کے وفود نے حضور ﷺ کی ملاقات سے پہلے کہے تھے، زاد المعاد (۲/۳۲)، اسی طرح حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی وفات سے ایک دن پہلے یہ اشعار کہے تھے۔ سیر اعلام النبلاء (۱/۳۵۹)، اسد الغابۃ (۱/۲۰۹)

(۲) اس جملہ کے قائل حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے غزوۂ بئر معونہ میں شہید ہونے سے قبل یہ جملہ کہا تھا۔ حیاۃ الصحابۃ (۳/۶۵۰)

اس کے ساتھ چلیں گے، لیکن اگر نہ جماعت ہو اور نہ متفقہ امام ہو تو اس صورت میں ہم کیا کریں؟

جواب میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: ایسی صورت میں ہر جماعت اور ہر پارٹی سے الگ ہو کر زندگی گزارو اور اپنے گھروں کی ٹاٹ بن جاؤ۔ ٹاٹ جس سے بوریاں بنتی ہیں، پہلے زمانے میں اس کو بطور فرش کے بچھایا جاتا تھا۔ آج کل اس کی جگہ قالین بچھائے جاتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح گھر کا قالین اور فرش ہوتا ہے، جب ایک مرتبہ اس کو بچھا دیا تو اب بار بار اس کو اس کی جگہ سے نہیں اُٹھاتے، اسی طرح تم بھی اپنے گھروں کے ٹاٹ اور فرش بن جاؤ، اور بلا ضرورت گھر سے باہر نہ نکلو، اور ان جماعتوں کے ساتھ شمولیت اختیار مت کرو۔ بلکہ ان سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ الگ ہو جاؤ۔ کسی کا ساتھ مت دو۔(۱)

اس سے زیادہ واضح بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

''فتنہ'' کے دور کے لئے دوسرا حکم

ایک حدیث میں فرمایا کہ جس وقت تم لوگوں سے کنارہ کش ہو کر زندگی گزار رہے ہو، اس وقت اگر مسلمان آپس میں لڑ رہے ہوں، اور ان کے درمیان قتل و غارت گری ہو رہی ہو تو ان کو تماشہ کے طور پر بھی مت دیکھو۔ اِس لئے کہ جو شخص تماشہ کے طور پر ان فتنوں کی طرف جھانک کر دیکھے گا وہ فتنہ اس کو بھی اپنی طرف کھینچ لے گا اور اُچک لے گا، اس لئے ایسے وقت میں تماشہ دیکھنے کے لئے بھی گھر سے باہر نہ نکلو اور اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔

''فتنہ'' کے دور کے لئے تیسرا حکم

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ وہ فتنے ایسے ہوں گے کہ اس میں یہ صورت ہو گی:

((اَلْقَائِمُ فِيهَا خَيْرٌ مِنَ الْمَاشِي، وَالْقَاعِدُ فِيهَا خَيْرٌ مِنَ الْقَائِمِ))

''کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہو گا، اور بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہو گا''(۲)

(۱) صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الاسلام، رقم: ۳۳۳۸، صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب وجوب ملازمة جماعة المسلمين عند ظهور الفتن......الخ، رقم: ۳۴۳۴

(۲) صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الاسلام، رقم: ۳۳۳۴، صحيح مسلم، كتاب الفتن واشراط الساعة، باب نزول الفتن كمواقع القطر، رقم: ۵۱۳۶، سنن الترمذي، كتاب الفتن عن رسول الله، رقم: ۲۱۲۰

مطلب یہ ہے کہ اس فتنے کے اندر کسی قسم کا حصہ مت لو۔ اس فتنے کی طرف چلنا بھی خطرناک ہے۔ چلنے سے بہتر یہ ہے کہ کھڑے ہو جاؤ۔ اور کھڑا ہونا بھی خطرناک ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ بیٹھ جاؤ۔ اور بیٹھنا بھی خطرناک ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ لیٹ جاؤ۔ گویا کہ اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنی ذاتی زندگی کو درست کرنے کی فکر کرو۔ اور گھر سے باہر نکل کر اجتماعی مصیبت اور اجتماعی فتنے کو دعوت مت دو۔

فتنہ کے دور کا بہترین مال

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس میں آدمی کا سب سے بہتر مال اس کی بکریاں ہوں گی۔ جن کو وہ لے کر پہاڑ کی چوٹی پر چلا جائے اور شہروں کی زندگی چھوڑ دے۔ (1)

اور ان بکریوں پر اکتفا کر کے اپنی زندگی بسر کرے۔ ایسا شخص سب سے زیادہ محفوظ ہوگا، کیونکہ شہروں میں اس کو ظاہری اور باطنی فتنے اُچکنے کے لئے تیار ہوں گے۔

فتنہ کے دور کے لئے ایک اہم حکم

ان تمام احادیث کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ وہ وقت اجتماعی اور جماعتی کام کا نہیں ہوگا، کیونکہ جماعتیں سب کی سب غیر معتبر ہوں گی، کسی بھی جماعت پر بھروسہ کرنا مشکل ہوگا۔ حق اور باطل کا پتہ نہیں چلے گا۔ اس لئے ایسے وقت میں اپنی ذات کو ان فتنوں سے بچا کر اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگا کر کسی طرح اپنے ایمان کو قبر تک لے جاؤ۔ ان فتنوں سے بچاؤ کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ جو آیت میں نے شروع میں تلاوت کی ہے، وہ بھی اسی سیاق میں آئی ہے۔ فرمایا کہ اے ایمان والو! اپنی ذات کی خبر لو۔ اپنے آپ کو درست کرنے کی فکر کرو۔ اگر تم ہدایت پر آگئے تو پھر جو لوگ گمراہی کی طرف جا رہے ہیں ان کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی اگر تم نے اپنی اصلاح کی فکر کر لی۔ روایت میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ آیت تو بتا رہی ہے کہ بس انسان صرف اپنی فکر کرے اور دوسرے کی فکر نہ کرے۔ اور اگر کوئی دوسرا شخص غلط راستے پر جا رہا ہے تو اس کو جانے دے اور اس کو امر بالمعروف

(۱) صحيح البخاری، كتاب الفتن، باب اذا بقي في حثالة من الناس، رقم: ٦٥٥٩، سنن النسائی، كتاب الايمان وشرائعه، رقم: ٤٩٥٠، سنن أبي داود، كتاب الفتن والملاحم، رقم: ٣٧٢٢، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، رقم: ٣٩٧٠

اور نہی عن المنکر نہ کرے، اس کو تبلیغ نہ کرے۔ جبکہ دوسری طرف یہ حکم آیا ہے کہ امر بالمعروف بھی کرنا چاہئے، اور نہی عن المنکر بھی کرنا چاہئے، اور دوسروں کو نیکی کی دعوت اور تبلیغ بھی کرنی چاہئے تو ان دونوں میں کس طرح تطبیق دی جائے؟

فتنہ کے دور کی چار علامتیں

جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ وہ آیتیں بھی اپنی جگہ درست ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہئے اور دعوت و تبلیغ کرنی چاہئے لیکن ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس وقت انسان کے ذمے صرف اپنی اصلاح کی فکر باقی رہے گی۔ اور یہ وہ زمانہ ہوگا جس میں چار علامتیں ظاہر ہو جائیں۔

(۱) پہلی علامت یہ ہے کہ اس زمانے میں انسان اپنے مال کی محبت کے جذبے کے پیچھے لگا ہوا ہو۔ اور اپنے جذبۂ بخل کی اطاعت کر رہا ہو۔ مال طلبی میں لگا ہوا ہو۔ صبح سے لے کر شام تک بس ذہن پر ایک ہی دُھن سوار ہو کہ جس طرح بھی ہو پیسے زیادہ آجائیں۔ دولت زیادہ ہو جائے۔ اور میری دنیا درست ہو جائے۔ اور ہر کام مال و دولت کی محبت میں کر رہا ہو۔

(۲) دوسری علامت یہ ہے کہ لوگ ہر وقت خواہشاتِ نفس کی پیروی میں لگے ہوئے ہوں۔ جس طرف انسان کی خواہش اس کو لے جا رہی ہو، وہ جا رہا ہو۔ یہ نہ دیکھ رہا ہو کہ یہ کام حلال ہے یا حرام ہے۔ اور نہ یہ دیکھ رہا ہو کہ یہ جنت کا راستہ ہے یا جہنم کا راستہ ہے۔ یہ اللہ کی رضامندی کا راستہ ہے یا ناراضگی کا راستہ ہے، ان سب چیزوں کو بھول کر اپنی خواہشاتِ نفس کے پیچھے دوڑا جا رہا ہو۔ یہ دوسری علامت ہے۔

(۳) تیسری علامت یہ ہے کہ جب دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جانی لگے۔ یعنی آخرت کی تو بالکل فکر نہ ہو، لیکن دنیا کی اتنی زیادہ فکر ہو کہ لاکھ سمجھایا جائے اور بتایا جائے کہ آخرت آنے والی ہے، ایک دن مرنا ہے، اور قبر میں جانا ہے، اللہ کے سامنے پیشی ہوگی، ساری باتیں سمجھانے کے جواب میں وہ کہے کہ کیا کریں زمانہ ہی ایسا ہے، ہمیں آخر اسی دنیا میں سب کے ساتھ رہنا ہے، اس لئے اس دنیا کی بھی فکر کرنی چاہئے۔ گویا کہ ساری نصیحتوں اور وعظوں کو ہوا ہی میں اُڑا دے اور ان کی طرف کان نہ دھرے اور دنیا کمانے میں لگ جائے۔

(۴) چوتھی علامت یہ ہے کہ ہر انسان اپنی رائے پر گھمنڈ میں مبتلا ہو۔ دوسرے کی سننے کو تیار ہی نہ ہو۔ اور ہر انسان نے اپنا ایک موقف اختیار کر رکھا ہو۔ اور اسی میں اس طرح وہ مگن ہو کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ درست ہے، اور جو بات دوسرا کہہ رہا ہے وہ غلط ہے۔ جیسے آج کل یہی منظر نظر آتا ہے کہ ہر

انسان نے دین کے معاملے میں بھی اپنی ایک رائے متعین کرلی ہے کہ اس کے نزدیک کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے۔ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے۔ حالانکہ ساری عمر میں کبھی ایک دن بھی قرآن وحدیث سمجھنے کے لئے خرچ نہیں کیا۔ لیکن جب اس کے سامنے شریعت کا کوئی حکم بیان کیا جائے تو فوراً یہ جواب دیتا ہے کہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ فوراً اپنی رائے پیش کرنی شروع کردیتا ہے۔ اسی کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص اپنی رائے پر گھمنڈ میں مبتلا ہوگا۔

بہرحال، جس زمانے میں یہ چار علامتیں ظاہر ہوجائیں یعنی جب مال کی محبت کی اطاعت ہونے لگے۔ لوگ خواہشاتِ نفس کے پیچھے پڑ جائیں۔ دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جارہی ہو۔ اور ہر شخص اپنی رائے پر گھمنڈ میں مبتلا ہو۔ اس وقت اپنی ذات کو بچانے کی فکر کرو۔ اور عام لوگوں کی فکر چھوڑ دو کہ عام لوگ کہاں جارہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ایک فتنہ ہے۔ اگر عام لوگوں کی فکر کے لئے باہر نکلو گے تو وہ عام لوگ تمہیں پکڑ لیں گے۔ اور تمہیں بھی فتنے میں مبتلا کردیں گے۔ اس لئے اپنی ذات کی فکر کرو اور اپنے آپ کو اصلاح کے راستے پر لانے کی کوشش کرو۔ گھر سے باہر نہ نکلو۔ گھر کے دروازے بند کرلو۔ گھر کی ٹاٹ بن جاؤ، اور تماشہ دیکھنے کے لئے بھی گھر سے باہر مت جھانکو۔ فتنے کے زمانے میں حضورِ اقدس ﷺ کی یہی تعلیم ہے۔

اختلافات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

حضورِ اقدس ﷺ کے بعد جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ آیا۔ اور خلافتِ راشدہ کے آخری دور میں بڑے زبردست اختلافات حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان پیش آئے۔ اور جنگ تک نوبت پہنچ گئی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان اختلاف ہوا اور اس میں بھی جنگ کی نوبت پہنچی۔ ان اختلاف کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ہی یہ سب کچھ دکھادیا تاکہ آنے والی اُمت کے لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کی زندگی سے رہنمائی کا ایک راستہ مل جائے کہ جب کبھی آئندہ اس قسم کے واقعات پیش آئیں تو کیا کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس زمانے میں وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ جو یہ سمجھتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر ہیں، انہوں نے اس حدیث پر عمل کیا جس میں حضورِ اقدس ﷺ نے یہ فرمایا تھا:

((تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاِمَامَهُمْ))(۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، رقم:۳۳۳۸، صحیح مسلم، کتاب الأمارۃ، باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین عند ظھور الفتن.....الخ، رقم:۳۴۳۴

''یعنی ایسے وقت میں جو مسلمانوں کی بڑی جماعت ہو اور اس کا امام بھی ہو، اس کو لازم پکڑلو''

اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور یہ کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت امام ہیں، ہم ان کا ساتھ دیں گے، اور وہ جیسا کہیں گے ہم ویسا ہی کریں گے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو برحق سمجھا کہ یہ امام ہیں اور ان کا ساتھ دینا شروع کردیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تیسرا فریق وہ تھا جنہوں نے یہ کہا کہ اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ حق کیا ہے؟ اور باطل کیا ہے؟ اور ایسے موقع کے لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ ہے کہ تمام جماعتوں سے الگ ہوجائیں۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا، بلکہ الگ ہوکر اپنے گھروں میں بیٹھ گئے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا طرزِ عمل

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔ بڑے اُونچے درجے کے صحابی اور فقیہ تھے۔ اس زمانے میں یہ اپنے گھر میں بیٹھے تھے۔ ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا کہ آپ یہ کیا کررہے ہیں کہ گھر میں بیٹھ گئے، باہر حق و باطل کا معرکہ ہورہا ہے، حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان لڑائی ہورہی ہے، اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینا چاہئے، اس لئے کہ وہ برحق ہیں، تو آپ باہر کیوں نہیں نکلتے؟ جواب میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے کہ جب کبھی ایسا موقع آئے کہ مسلمان آپس میں ٹکرا جائیں اور حق و باطل کا پتہ نہ چلے تو اس وقت اپنے گھر کا دروازہ بند کرکے بیٹھ جاؤ، اور اپنے گھر کا ٹاٹ بن جاؤ۔ اور اپنے کمان کی تانتیں توڑ ڈالو، یعنی ہتھیار توڑ ڈالو۔ چونکہ مجھے حق و باطل کا پتہ نہیں چل رہا ہے، اس لئے میں اپنے ہتھیار توڑ کر گھر کے اندر بیٹھ گیا ہوں اور اللہ اللہ کررہا ہوں۔

اس شخص نے کہا کہ یہ آپ غلط کررہے ہیں، اس لئے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾(۱)

''یعنی اس وقت تک جہاد کرو جب تک فتنہ باقی ہے، اور جب فتنہ ختم ہوجائے، اس وقت جہاد چھوڑ دینا''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کا کیا عجیب جواب ارشاد فرمایا:

''قَاتَلْنَا حَتّٰى لَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ، وَقَاتَلْتُمْ حَتّٰى كَانَتِ الْفِتْنَةُ''(۲)

(۱) البقرة: ۹۳ (۲) صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ البقرۃ، رقم: ۴۵۱۳

ہم نے جب حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ مل کر قتال کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فتنہ ختم فرما دیا تھا، اور اب تم نے قتال کیا تو فتنہ ختم نہیں کیا، بلکہ فتنہ کو اور بڑھا دیا اور اسے جگا دیا۔ اس لئے میں تو حضورِ اقدس ﷺ کے ارشاد پر عمل کرتے ہوئے گھر میں بیٹھا ہوں۔

حالتِ امن اور حالتِ فتنہ میں ہمارے لئے طرزِ عمل

اسی بارے میں ایک محدث کا ایک قول میری نظر سے گزرا، جب میں نے اس کو پڑھا تو مجھے وجد آ گیا۔ وہ قول یہ ہے:

"اِقْتَدُوْا بِعُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْهُ فِی الْاَمْنِ وَبِابْنِهٖ فِی الْفِتْنَةِ"

''جب امن کی حالت ہو تو اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا کرو، اور جب فتنہ کی حالت ہو تو ان کے بیٹے یعنی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرو''

یعنی امن کی حالت میں یہ دیکھو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کیا طرزِ عمل تھا۔ ان کی اقتدا کرتے ہوئے وہ طرزِ عمل تم بھی اختیار کرو۔ اور فتنہ کی حالت میں یہ دیکھو کہ ان کے بیٹے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ وہ یہ کہ تلوار توڑ کر گھر کے اندر الگ ہو کر بیٹھ گئے، اور کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ تم بھی فتنہ کی حالت میں ان کی اتباع کرو۔

اختلافات کے باوجود آپس کے تعلقات

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کے دور میں یہ سارے منظر دکھا دیئے، چنانچہ جن صحابہ کرام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حق پر سمجھا، انہوں نے ان کا ساتھ دیا۔ اور جنہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حق پر سمجھا، انہوں نے ان کا ساتھ دیا۔ لیکن ساتھ دینے کے باوجود یہ عجیب منظر دنیا کی آنکھوں نے دیکھا کہ ایسا منظر دنیا نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہ کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار بھی ہیں، لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سے کسی کا انتقال ہو جاتا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے لوگ اس کے جنازے میں آ کر شریک ہوتے، اور جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں کسی کا انتقال ہو جاتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے لوگ اس کے جنازے میں شریک ہوتے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ لڑائی درحقیقت نفسانیت کی بنیاد پر نہیں تھی، یہ لڑائی جاہ اور مال کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ لڑائی کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کے حکم کا ایک مطلب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سمجھا تھا، یہ اس پر عمل کر رہے تھے۔ اور حکم کا ایک مطلب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سمجھا تھا، وہ اس پر عمل کر رہے تھے۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اللہ کے حکم کی تعمیل میں مشغول تھے۔

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ جو پڑھنے پڑھانے والے صحابی تھے۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ مولوی قسم کے صحابی تھے۔ اور ہر وقت پڑھنے پڑھانے کے مشغلے میں رہتے تھے، ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ یہ دونوں لشکروں میں دونوں کے پاس جایا کرتے تھے، کسی ایک کا ساتھ نہیں دیتے تھے، جب نماز کا وقت آتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں جا کر ان کے پیچھے نماز پڑھتے، اور جب کھانے کا وقت آتا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں جا کر ان کے ساتھ کھانا کھاتے۔ کسی نے ان سے سوال کیا کہ حضرت! آپ نماز تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھتے ہیں، اور کھانا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ جواب میں فرمایا کہ نماز وہاں اچھی ہوتی ہے اور کھانا وہاں اچھا ہوتا ہے۔ اس لئے نماز کے وقت وہاں اور کھانے کے وقت وہاں چلا جاتا ہوں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ہمیں آپس کے اختلافات کرنے کا سلیقہ بھی سکھادیا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا قیصرِ روم کو جواب

اس لڑائی کے عین دوران جب ایک دوسرے کی فوجیں آمنے سامنے ایک دوسرے کے خلاف کھڑی ہیں، اس وقت قیصر روم کا یہ پیغام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آتا ہے کہ میں نے سنا ہے کہ تمہارے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے، اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص نہیں لے رہے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہاری مدد کے لئے بہت بڑا لشکر بھیج دوں تاکہ تم ان سے مقابلہ کرو۔ اس پیغام کا جو فوری جواب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لکھ کر بھیجا، وہ یہ تھا کہ:

> ''اے نصرانی بادشاہ! تو یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے آپس کے اختلاف کے نتیجے میں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ آور ہوگا؟ یاد رکھ! اگر تو نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بُری نگاہ ڈالنے کی جرأت کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے نمودار ہونے والا پہلا شخص جو تیری گردن اُتارے گا وہ معاویہ (رضی اللہ عنہ) ہوگا''(۱)

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمارے لئے معزز اور مکرم ہیں

آج کل لوگ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کیسی کیسی زبان درازیاں کرتے ہیں۔ حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان اور مرتبے کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ان کے مدارک اور جذبے

(۱) تاج العروس (۲۰۸/۷) مادہ اصطفلین مطبوعہ دار لیبیا بحوالہ حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق ص: ۲۴۳

کو ہم نہیں پہنچ سکتے۔ آج ہم ان کی لڑائیوں کو اپنی لڑائیوں پر قیاس کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ جس طرح ہمارے درمیان لڑائی ہوتی ہے، اسی طرح ان کے درمیان بھی لڑائی ہوئی۔ حالانکہ ان کی ساری لڑائیاں اور سارے اختلافات کے ذریعہ درحقیقت اللہ تعالیٰ آئندہ اُمت کے لئے رہنمائی کا راستہ پیدا کر رہے تھے کہ آئندہ زمانے میں جب کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو اُمت کے لئے راستہ کیا ہے؟ چاہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں، یا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہوں، یا الگ بیٹھنے والے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہوں، ان میں سے ہر ایک نے ہمارے لئے ایک اُسوۂ حسنہ چھوڑا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے دھوکے میں کبھی مت آنا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان باہمی اختلافات کی بنیاد پر کسی ایک صحابی کی شان میں گستاخی یا زبان درازی کرتے ہیں۔ ارے ان کے مقام تک آج کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی لِلّٰہیت اور خلوص

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے چونکہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد بنا دیا تھا، جس کی وجہ سے ان کے بارے میں لوگ بہت سی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کے خطبے میں عین جمعہ کے وقت منبر پر کھڑے ہو کر یہ دعا کی کہ یا اللہ! میں نے اپنے بیٹے یزید کو جو اپنا ولی عہد بنایا ہے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کو ولی عہد بناتے وقت میرے ذہن میں سوائے اُمتِ محمدیہ کی فلاح کے کوئی اور بات نہیں تھی۔ اور اگر میرے ذہن میں کوئی بات ہو تو میں یہ دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ! قبل اس کے کہ میرا یہ حکم نافذ ہو، آپ اس کی روح قبض کر لیں۔ (۱)

دیکھئے! کوئی باپ اپنے بیٹے کے لئے ایسی دعا نہیں کیا کرتا، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ دعا فرمائی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا وہ خلوص کے ساتھ کیا۔ انسان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ پیغمبروں کے علاوہ ہر ایک سے غلطی ہو سکتی ہے۔ غلط فیصلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے کیا۔

کنارہ کش ہو جاؤ

بہرحال، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فتنوں کی تمام احادیث پر عمل کر کے ہمارے لئے نمونہ پیش کر دیا کہ فتنے میں یہ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جب اس دور میں جہاں مقابلہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کا تھا، اس دور میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت الگ ہو کر بیٹھ گئی تھی، جس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ کرام شامل تھے، تو اس دور میں بھی جب حق و باطل کا یقینی طور پر

(۱) تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص: ۱۵۷ ـ ۱۵۸

پتہ نہیں ہے، بلکہ حق و باطل مشتبہ ہے، اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ آدمی کنارہ کشی اختیار کر لے۔

حقیقت یہ ہے کہ تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ کو عجیب بات منظور تھی کہ جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس زمانے میں کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے تھے، ان سے اللہ تعالیٰ نے دین کی بہت بڑی خدمت لے لی۔ ورنہ اگر سب کے سب صحابہ جنگ میں شامل ہو جاتے تو بہت سے صحابہ ان میں سے شہید ہو جاتے، اور دین کی وہ خدمت نہ کر پاتے۔ چنانچہ جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم الگ ہو کر بیٹھ گئے تھے، انہوں نے احادیث کو مدوّن کرنا شروع کر دیا۔ اور اس کے نتیجے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کا لایا ہوا دین آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے مدوّن اور مرتب ہو گیا۔ اور ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے۔

اپنی اصلاح کی فکر کرو

بہر حال، فتنہ کے دور میں یہ حکم دیا کہ گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جاؤ اور اللہ اللہ کرو۔ اور اپنی اصلاح کی فکر کرو کہ میں گناہوں سے بچ جاؤں، اور اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار بن جاؤں، اور میرے بیوی بچے بھی مطیع اور فرمانبردار بن جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک پیغمبر ہی ایسا نسخہ بتا سکتا ہے، ہر انسان کے بس کا کام نہیں کہ وہ ایسا نسخہ بتا سکے، اس لئے اس نسخے پر عمل کرتے ہوئے ہر انسان اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جائے۔ معاشرہ تو انہی افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ جب ایک فرد کی اصلاح ہو گئی اور وہ درست ہو گیا تو کم از کم معاشرے سے ایک بُرائی تو دور ہو گئی۔ اور جب دوسرا فرد درست ہو گیا تو دوسری برائی درست ہو گئی۔ اسی طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اور افراد سے معاشرہ بنتا ہے۔ آہستہ آہستہ سارا معاشرہ درست ہو جائے گا۔

اپنے عیوب کو دیکھو

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، یہ شدید فتنے کا دور ہے۔ اس کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو سال پہلے یہ نسخہ بتا گئے کہ کسی پارٹی میں شامل مت ہونا، حتی الامکان گھر میں بیٹھو، اور تماشہ دیکھنے کے لئے بھی گھر سے باہر مت جاؤ۔ اور اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اور یہ دیکھو کہ میرے اندر کیا برائی ہے۔ اور میں کن برائیوں کے اندر مبتلا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ پورے معاشرے کے اندر جو فتنہ پھیلا ہوا ہے، وہ میرے گناہوں کی نحوست ہو۔ ہر انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، شاید میرے گناہوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لوگ قحط سالی کی شکایت کرنے گئے تو انہوں نے کہا کہ یہ سب میرے گناہوں کی وجہ سے ہو رہا ہے، میں یہاں سے چلا جاتا ہوں، شاید اللہ تعالیٰ تم پر رحمت نازل فرما دے۔ آج ہم لوگوں کو دوسروں پر تبصرہ کرنا آتا ہے کہ لوگ یوں

کررہے ہیں، لوگوں کے اندر یہ خرابیاں ہیں، جس کی وجہ سے فساد ہو رہا ہے، لیکن اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنے والا شاذ و نادر ہی آج کوئی ملے گا۔ اس لئے دوسروں کو چھوڑو اور اپنی اِصلاح کی فکر کرو۔

گناہوں سے بچاؤ

اور اپنی اصلاح کی فکر کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ صبح سے لے کر شام تک جو گناہ تم سے سرزد ہوتے ہیں، ان کو ایک ایک کر کے چھوڑنے کی فکر کرو۔ اور ہر روز اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ اور استغفار کرو۔ اور یہ دعا کرو کہ یا اللہ! یہ فتنہ کا زمانہ ہے۔ مجھے اور میرے گھر والوں اور میری اولاد کو اپنی رحمت سے اس فتنہ سے دور رکھئے۔

((اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ))

''اے اللہ! ہم آپ کی تمام ظاہری اور باطنی فتنوں سے پناہ مانگتے ہیں''(۱)

دعا کرنے کے ساتھ ساتھ غیبت سے، نگاہ کے گناہ سے، فحاشی اور عریانی کے گناہوں سے، اور دوسروں کی دل آزاری کے گناہ سے، رشوت کے گناہ سے، سود کے گناہ سے اپنے آپ کو جتنا ہو سکے ان سے بچانے کی کوشش کرو۔ لیکن اگر غفلت میں یہ زندگی گزار دی تو پھر اللہ تعالیٰ بچائے، انجام بڑا خراب نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) مسند احمد، مسند عبداللہ بن العباس، رقم: ٢٦٤٢

بدعات کیوں حرام ہیں؟☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۂ حجرات کی ابتدائی آیات کا بیان گزشتہ جمعہ کو شروع کیا تھا۔ پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو! اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو''

اس آیت سے کئی احکام نکلتے ہیں، جن میں سے تین احکام کا بیان گزشتہ جمعہ کو ہو چکا ہے۔

بدعت دین میں اضافہ کے مترادف ہے

اس آیت سے چوتھا حکم یہ نکل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے واسطے سے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے، وہ کامل اور مکمل دین ہے، جس کی صراحت قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمائی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾(۲)

''آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت کو تمہارے اُوپر کامل کر دیا''

لہٰذا کوئی بھی ایسا عمل جو حقیقت میں دین نہیں ہے، اور جو عمل حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھا، اور حضور ﷺ نے اس کی تلقین نہیں فرمائی تھی، اور قرآن کریم میں اس کا حکم نہیں آیا، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اس کو اختیار نہیں کیا تھا، ایسے نئے عمل کو ہم دین کا حصہ سمجھ کر شروع کر دیں، اور اس عمل کو واجب یا سنت قرار دیں، یا اس عمل کے ترک کرنے والے پر ملامت شروع

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/۲۲۳۔۲۳۸)، بیت المکرم، کراچی۔

(۱) الحجرات: ۱ (۲) المائدة: ۳

کر دیں، یہ طرزِ عمل بھی حضور ﷺ سے آگے بڑھنے کے مرادف ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے۔

جدید چیزوں کا استعمال جائز ہے

دیکھئے! بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو حضور ﷺ کے عہدِ مبارک میں نہیں تھیں، نہ ان کا رواج تھا، لیکن زمانے کے حالات کی تبدیلی کی وجہ سے وہ چیزیں وجود میں آئیں، اور لوگوں نے ان سے فائدہ اُٹھانا شروع کر دیا۔ مثلاً حضورِ اقدس ﷺ کے زمانے میں بجلی نہیں تھی، آج ہمارا بجلی کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں پنکھے نہیں تھے، آج ہمارا پنکھے کے بغیر گزارا نہیں۔ اس زمانے میں گھوڑے اور اُونٹوں پر سفر ہوتا تھا، آج موٹروں کی، بسوں کی، ریلوں اور ہوائی جہازوں کی بھرمار ہے، ان کے بغیر گزارا نہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ کوئی ان کو دین کا حصہ نہیں سمجھتا، مثلاً کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ پنکھا چلانا سنت ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ بجلی جلانا واجب ہے، اور شرعی اعتبار سے ضروری ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ ریل میں سفر کرنا سنت یا مستحب ہے، یا واجب ہے، لہٰذا کوئی شخص ان چیزوں کو دین کا حصہ نہیں سمجھتا، بلکہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے نئے نئے طریقے وجود میں آتے رہتے ہیں، اس لئے شریعت نے بھی ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی، ان سب چیزوں کو استعمال کرنا شرعاً جائز ہے۔

ہر بدعت گمراہی ہے

لیکن کوئی نیا کام انسان اس خیال سے شروع کرے کہ یہ دین کا حصہ ہے، یا یہ سوچے کہ یہ کام واجب ہے، یا سنت ہے، یا فرض ہے، یا مستحب ہے، یا یہ ثواب کا کام ہے، حالانکہ وہ کام نہ تو حضورِ اقدس ﷺ نے کیا، نہ آپ نے اس کا حکم دیا، اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ کام کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ دین کے معاملے میں ہم حضورِ اقدس ﷺ سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ استغفر اللہ۔ شریعت میں اسی کا نام "بدعت" ہے۔ "بدعت" کے لفظی معنی ہیں "نئی چیز"، لہٰذا لغت کے اعتبار سے تو یہ پنکھا بھی بدعت ہے، یہ بجلی بھی بدعت ہے، یہ ٹائلز اور ماربل بھی بدعت ہے، یہ کاریں یہ بسیں اور یہ ہوائی جہاز بھی بدعت ہے۔ لیکن شریعت کی اصطلاح میں "بدعت" اس نئے کام کو کہا جاتا ہے جس کا حکم نہ قرآن کریم نے دیا ہو، اور نہ ہی سنت سے اس کا ثبوت ہو، اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر عمل کیا ہو، اور نہ ہی اس کی تلقین کی ہو، ایسے کام کو شریعت کی اصطلاح میں "بدعت" کہا جاتا ہے۔ بدعت کے بارے میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))(۱)

ہر وہ نیا کام جو دین میں پہلے داخل نہیں تھا، اور نہ دین کا حصہ تھا، آج اس کو دین میں داخل کر دیا گیا، وہ ''بدعت'' ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے، اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔

بدعت گمراہی کیوں ہے؟

''بدعت'' گمراہی کیوں ہے؟ اس لئے کہ بدعت میں اگر غور کیا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ جو شخص بدعت کو اختیار کرنے والا ہے وہ درحقیقت یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے جو دین ہمیں دیا تھا وہ ادھورا اور ناقص تھا، آج میں نے اس میں اس عمل کا اضافہ کر کے اس کو مکمل کر دیا۔ گویا کہ آدمی عملی طور پر بدعت کے ذریعہ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے آگے نکل جاؤں۔ جو چیز دین میں داخل کی جاتی ہے بظاہر دیکھنے میں وہ ثواب کا کام معلوم ہوتی ہے، عبادت لگتی ہے، لیکن چونکہ وہ عبادت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہوتی، اس لئے وہ عبادت بدعت ہے، اور بدعت گمراہی ہے۔ جتنی بدعات ہوتی ہیں ان میں براہِ راست گناہ کا کام نہیں ہوتا، لیکن چونکہ اس عمل کو کسی اتھارٹی کے بغیر دین کے اندر شامل کر دیا گیا، اس عمل کے بارے میں ہمارے پاس قرآن کی اور سنت کی کوئی اتھارٹی نہیں تھی، بلکہ ہم نے اپنی طرف سے اس کو دین میں داخل کر دیا، اس لئے وہ بدعت بن گئی۔

شب برأت میں سو رکعت نفل پڑھنا

مثلاً بعض لوگوں نے ۱۵ ر شعبان کی رات یعنی شبِ برأت میں لوگوں کے لئے نماز کا ایک خاص طریقہ مقرر کر دیا، وہ یہ کہ ایک ہی تحریمہ اور ایک سلام کے ساتھ سو رکعتیں نفل پڑھیں، اور ہر رکعت میں خاص خاص سورتوں کا پڑھنا مقرر کر دیا کہ پہلی رکعت میں فلاں سورۃ، دوسری میں فلاں سورۃ اور تیسری میں فلاں سورۃ وغیرہ۔ ایک زمانے میں یہ طریقہ اتنی شہرت اختیار کر گیا تھا کہ جگہ جگہ باقاعدہ جماعت کے ساتھ سو رکعتیں پڑھی جا رہی تھیں۔ اگر کوئی شخص یہ سو رکعتیں نہیں پڑھتا تو اس کو برا کہا جاتا کہ اس نے شبِ برأت نہیں منائی۔

اب آپ دیکھیں کہ جو شخص شبِ برأت میں سو رکعتیں پڑھ رہا ہے، کیا وہ کوئی چوری کر رہا ہے، یا ڈاکے ڈال رہا ہے، یا وہ بدکاری کر رہا ہے، نہیں، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر اللہ کا

(۱) سنن النسائي، كتاب صلاة العيدين، باب كيف الخطبة، رقم: ۱۵٦۰، سنن أبي داود، كتاب السنة، رقم: ۳۹۹۱، سنن ابن ماجه، المقدمة، رقم: ٤٥۔

ذکر کررہا ہے، رکوع، سجدے کررہا ہے، لیکن تمام علماء اُمت نے فرمایا کہ یہ عمل گناہ ہے، اور بدعت ہے، ناجائز ہے، اس لئے کہ اس نے اپنی طرف سے دین میں ایک چیز کا اضافہ کردیا، جو دین کا حصہ نہیں تھا، لہٰذا یہ عمل بدعت ہوگیا، اور گناہ ہوگیا۔

ہم کوئی گناہ کا کام نہیں کررہے

اگر ان سے پوچھا جائے کہ بھائی تم یہ جو عمل کررہے ہو، اس کا نہ تو قرآن کریم میں کہیں ذکر ہے، نہ حدیث شریف میں اس کا کہیں ذکر ہے، یہ عمل تو بدعت ہے، یہ کیسے جائز ہوگیا؟ وہ لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم کوئی گناہ کررہے ہیں، یا ہم چوری ڈاکہ ڈال رہے ہیں؟ بلکہ ہم تو قرآن کریم پڑھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدے کررہے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کی تسبیح کررہے ہیں، کوئی گناہ کا کام تو نہیں کررہے ہیں۔

مغرب کی تین کے بجائے چار رکعت پڑھیں تو کیا نقصان؟

خوب سمجھ لیجئے کہ کوئی بھی عبادت اس وقت تک عبادت کہلانے کی مستحق نہیں جب تک اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے اس کی سند موجود نہ ہو، ورنہ وہ عبادت بدعت ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر پانچ نمازیں فرض فرمائی ہیں، اور ہر نماز کی رکعتوں کی تعداد متعین فرمائی ہے کہ فجر میں دو رکعت فرض پڑھو، اور ظہر، عصر اور عشاء میں چار چار رکعت فرض پڑھو، اور مغرب میں تین رکعت پڑھو، اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ یہ تین رکعتوں کی تعداد تو اچھی معلوم نہیں ہوتی، لہٰذا مغرب میں تین کے بجائے چار رکعت پڑھوں گا، اب اگر کوئی شخص مغرب کی تین رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھ لے تو کیا اس نے کوئی ڈاکہ ڈالا، کوئی چوری کی، کیا اس نے بدکاری کی؟ کیا اس نے شراب پی لی؟ نہیں، بلکہ اس نے تو ایک رکعت زیادہ پڑھ لی، اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، ایک رکوع زیادہ کیا، دو سجدے زیادہ کیے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح زیادہ کی۔ لیکن اس شخص نے یہ جو چوتھی رکعت اپنی طرف سے زیادہ پڑھ لی، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ثواب زیادہ ملنے کے بجائے یہ ایک رکعت پہلی تین رکعتوں کو بھی لے ڈوبے گی، اور اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے مغرب کی نماز کا جو طریقہ بتایا گیا تھا، اس طریقہ سے ہٹ کر اس نے اپنے طریقے پر نماز پڑھ لی، اور اس طریقہ کو دین کا حصہ سمجھ کر اس کو دین میں داخل کرلیا، اسی کا نام ''بدعت'' ہے۔

افطار کرنے میں جلدی کیوں؟

یاد رکھئے! دین نام ہے اس بات کا کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے جس کام کا جس درجہ

میں حکم دیا ہے، بس اسی درجہ میں اس کی اتباع کی جائے، اور اس پر عمل کیا جائے، اگر اس سے آگے یا پیچھے ہٹو گے تو وہ دین نہیں۔ اور اگر دین سمجھ کر اس کو اختیار کر رہے ہو تو وہ ''بدعت'' ہے۔ جیسے رمضان میں ہم روزہ رکھتے ہیں، روزے کے لئے صبح سحری کھاتے ہیں، سارا دن بھوکے رہتے ہیں، اور جب آفتاب غروب ہو جاتا ہے تو افطار کر لیتے ہیں۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب آفتاب غروب ہو جائے تو افطار کرنے میں جلدی کرو، افطار کرنے میں دیر مت کرو، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افطار کرنے میں جلدی کیوں کریں؟ جب دن بھر اللہ کے لئے بھوکے پیاسے رہے تو اب اگر ایک گھنٹہ مزید بھوکے پیاسے رہ جائیں گے تو اس میں کیا قیامت آجائے گی؟ اور کیا خرابی پیدا ہو جائے گی؟ بظاہر تو اس میں کوئی گناہ کی بات نظر نہیں آتی۔ لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ آفتاب غروب ہوتے ہی جلد از جلد افطار کرو، اور کچھ کھا پی لو۔ (۱)

اس لئے کہ اللہ کا حکم یہ تھا کہ تمہیں آفتاب کے غروب ہونے تک بھوکا پیاسا رہنا ہے، اب آفتاب غروب ہونے کے بعد روزہ نہیں ہے، اب اگر تم اس روزے کو آگے بڑھاؤ گے اور یہ سوچو گے کہ ایک گھنٹے کے بعد افطار کروں گا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ روزے کی جو میعاد اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے مقرر کی تھی، اس میں تم نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا، یہ اتباع نہیں ہوئی، اتباع تو یہ ہے کہ جب وہ کہیں کہ مت کھاؤ، تو نہ کھانا عبادت ہے، اور جب وہ کہیں کہ کھاؤ تو اب کھانا واجب ہے، اگر نہیں کھاؤ گے تو گنہگار ہو گے۔

عید کے دن روزہ رکھنے پر گناہ کیوں؟

یا مثلاً روزہ رکھتے ہوئے رمضان کا پورا مہینہ گزر گیا، اور روزے رکھنے کی اتنی فضیلت ہے کہ جو شخص رمضان کے روزے رکھے، اللہ تعالیٰ اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیتے ہیں، (۲) اور روزے کی یہ فضیلت ہے کہ روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کے منہ سے جو بو آرہی ہے، اللہ تعالیٰ کو وہ بو مشک و عنبر سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ (۳) لیکن جب عید کا دن آگیا تو اب اگر کسی نے روزہ رکھ لیا تو وہی روزہ جو رمضان میں بڑے اجر و ثواب کا موجب تھا، اب اُلٹا عذاب کا موجب بن جائے گا، حالانکہ اگر کوئی شخص عید کے دن روزہ رکھ لے تو بظاہر تو کوئی گناہ نظر نہیں آتا، کیونکہ وہ روزہ رکھ کر ایک عبادت

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب تعجیل الافطار، رقم: ۱۸۲۲، صحیح مسلم، کتاب الصیام، رقم: ۱۸۴۲، سنن أبي داؤد، کتاب الصوم، رقم: ۲۰۰۵

(۲) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب صوم رمضان احتسابا من الإیمان، رقم: ۳۷

(۳) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب فضل الصوم، رقم: ۱۷۶۱

ہی انجام دے رہا ہے۔ لیکن چونکہ وہ شخص اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف عبادت کر رہا ہے، لہٰذا وہ عبادت نہیں، بلکہ وہ گناہ ہے، اس پر عذاب ہوگا۔ تو دین نام ہے ''اتباع'' کا۔ اب اگر کوئی شخص دین میں کوئی نیا طریقہ جاری کر کے اس کا نام ''عبادت'' رکھ دے، اور اس کو دین کا حصہ قرار دیدے، اور اس کو ''سنت'' کہے، اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دے، اور اگر کوئی شخص اس پر عمل نہ کرے تو اس پر لعنت و ملامت کرے، اور یہ کہے کہ یہ شخص بے دین ہے، یہ طرزِ عمل اس کو ''بدعت'' بنا دیتا ہے، اور بدعت ہونے کے نتیجے میں وہ ثواب کا کام ہونے کے بجائے اُلٹا گناہ کا کام بن جاتا ہے، اس لئے کہ وہ شخص دین میں اپنی طرف سے اضافہ کر کے گویا کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، جبکہ قرآن کریم کا حکم یہ ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تُقَدِّمُواْ بَيْنَ يَدَيِ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ إِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾(۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔ جس حد پر انہوں نے رہنے کے لئے کہا ہے، اسی حد پر رہو، اللہ سے آگے نہ بڑھو، اگر آگے بڑھو گے تو تم بدعت کے مرتکب ہو گے۔

سفر میں چار رکعت پڑھنا گناہ کیوں؟

سفر کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے رکعتوں کی تعداد کم فرما دی اور یہ حکم دیا کہ شرعی سفر کے دوران چار فرضوں کے بجائے دو فرض پڑھو۔ اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے بیشک میرے لئے رکعتوں کی تعداد میں کمی کر دی ہے، لیکن میرا دل نہیں مان رہا ہے، میں تو پوری چار رکعت ہی پڑھوں گا۔ ایسا کرنا اس کے لئے جائز نہیں، حالانکہ اگر وہ شخص دو رکعتیں زائد پڑھ رہا ہے تو وہ کوئی گناہ نہیں کر رہا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اضافہ کر رہا ہے، لیکن چونکہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف عبادت کر رہا ہے، اس وجہ سے ناجائز اور گناہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر پکڑ ہو جائے گی کہ ہم نے تم سے دو رکعتیں پڑھنے کو کہا تھا، تم نے چار کیوں پڑھیں؟ معلوم ہوا کہ دین نام ہے ''اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع'' کا، وہ جب کم پڑھنے کا حکم دیں تو کم پڑھو، وہ جب زیادہ کا حکم دیں تو زیادہ پڑھو، لیکن اپنی طرف سے اس کے اندر کمی زیادتی تمہارے لئے جائز نہیں۔

یہ نکتہ اس لئے سمجھنا ضروری ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں بے شمار طریقے دین کے نام پر جاری کر دیئے گئے ہیں، اور اس طرح جاری کر دیے گئے ہیں کہ گویا کہ وہ دین کا لازمی حصہ ہیں، اگر

(۱) الحجرات: ۱

کوئی شخص وہ کام نہ کرے تو وہ ملامتی ہے، اس پر لعنت و ملامت کی جاتی ہے، اس پر طعن و تشنیع کی جاتی ہے، اس کو برا سمجھا جاتا ہے، اور اس کو ایک طرح سے مسلمانوں کی برادری سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ وہ تمام طریقے جو حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت نہیں ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ثابت نہیں ہیں، اور ان کو دین کا حصہ بنالیا گیا ہے، وہ سب ''بدعات'' کی فہرست میں شامل ہیں، اور یہ آیتِ کریمہ جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی یہ ان کی ممانعت کررہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔

شبِ برأت میں حلوہ گناہ کیوں؟

مثلاً شبِ برأت میں حلوہ پکنا چاہئے، اور یہ حلوہ شبِ برأت کا لازمی حصہ بن گیا ہے، اگر حلوہ نہیں پکا تو شبِ برأت ہی نہیں ہوئی۔ یا مثلاً رجب میں کونڈے ہوتے ہیں، اگر کوئی شخص کونڈے نہ کرے تو وہ ملامتی ہے، وہ وہابی ہے، اس پر طرح طرح کی طعن و تشنیع کی جاتی ہے۔ اب اگر ان سے پوچھا جائے کہ کیا کونڈے کا حکم قرآن کریم میں کہیں آیا ہے؟ یا حضورِ اقدس ﷺ نے حدیث میں ارشاد فرمایا؟ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر عمل کیا تھا؟ کوئی ثبوت نہیں، بس اپنی طرف سے ایک طریقہ جاری کر کے اس کو اس طرح لازمی قرار دے دیا گیا کہ اگر کوئی نہ کرے تو وہ لعنت و ملامت کا مستحق ہے، اس کو ''بدعت'' کہتے ہیں۔ اب اگر ان سے یہ کہا جائے کہ یہ عمل تو ''بدعت'' ہے تو جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم کوئی گناہ کا کام کررہے ہیں؟ ہم کوئی چوری ڈاکہ ڈال رہے ہیں؟ بلکہ اپنے گھر کے ہی آٹے سے یہ پوریاں بنائیں، اور یہ حلوہ بنایا، اور اس کو محلّہ میں تقسیم کردیا، اس میں گناہ کی کیا بات ہوئی؟ ارے بھائی! تم روزانہ پوری بناؤ، روزانہ حلوہ بناؤ، اور اس کو تقسیم کرو، کوئی گناہ کی بات نہیں۔ لیکن اس کو دین کا لازمی حصہ قرار دینا اور یہ کہنا کہ جو شخص یہ کام نہیں کررہا، وہ ملامت کا مستحق ہے، تمہارا یہ طرزِ عمل اس کام کو ''بدعت'' بنادیتا ہے، جس کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))(۱)

اور جو شخص اس عمل کو کسی اتھارٹی کے بغیر دین کا حصہ بناتا ہے، وہ شخص اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھانے کی کوشش کررہا ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔

(۱) سنن النسائي، كتاب صلاة العيدين، باب كيف الخطبة، رقم: ۱۵٦۰، سنن أبي داؤد، كتاب السنة، رقم: ۳۹۹۱، سنن ابن ماجه، المقدمة، رقم: ٤٥

ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ

شریعت نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے تو اس کے عزیز و اقارب اس کے لئے ایصالِ ثواب کریں، کوئی بھی نیک عمل کر کے اس کا ثواب اس کو پہنچائیں، اتنی بات نبی کریم ﷺ کی حدیث سے ثابت ہے۔ مثلاً تلاوتِ قرآن کریم کے ذریعے کسی کو ثواب پہنچائیں، نفلیں پڑھ کر پہنچائیں، تسبیحات پڑھ کر پہنچائیں، حج کر کے ثواب پہنچائیں، روزہ رکھ کر پہنچائیں، طواف کر کے ثواب پہنچائیں، عمرہ کر کے ثواب پہنچائیں، یہ سب جائز ہیں، اور نبی کریم ﷺ سے اس طرح ایصال کرنا ثابت ہے۔ لیکن اس ایصالِ ثواب کے لئے شریعت نے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا کہ بس اسی طریقے سے کرنا ہوگا، بلکہ سہولت کے ساتھ آدمی کو جس عبادت کا موقع ہو، اس عبادت کے ذریعہ ایصالِ ثواب کر دے، مثلاً کسی کو تلاوت کے ذریعہ ایصالِ ثواب کرنے کا موقع ہے، وہ تلاوت کے ذریعہ ایصال کر دے، اگر نفلیں پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنے کا موقع ہو تو نفلیں پڑھ کر ایصالِ ثواب کر دے۔ بس اخلاص کے ساتھ ایصالِ ثواب کر دے، شرعاً ایصالِ ثواب کے لئے نہ تو دن مقرر ہے نہ وقت مقرر ہے، نہ اس کے لئے کوئی طریقہ مقرر ہے، نہ تقریب مقرر ہے۔

تیجہ کرنا گناہ کیوں؟

لیکن لوگوں نے یہ طریقہ اپنی طرف سے مقرر کر لیا کہ مرنے کے تیسرے دن سب کا جمع ہونا ضروری ہے، اس دن سب مل کر قرآن خوانی کریں گے، اور جس جگہ ''تیجہ'' ہوگا، وہاں کھانے کی دعوت بھی ہوگی۔ اگر ویسے ہی پہلے دن یا دوسرے دن یا تیسرے دن قرآن شریف اکیلے پڑھ لیتے، لوگوں کے آنے کی وجہ سے جمع ہو کر پڑھ لیتے تو یہ طریقہ اصلاً جائز تھا، لیکن یہ تخصیص کرنا کہ تیسرے دن ہی قرآن خوانی ہوگی، اور سب مل کر ہی کریں گے، اور اس میں دعوت ضرور ہوگی، اور جو ایسا نہ کرے وہ ''وہابی'' ہے، جب اس مخصوص طریقہ کو دین کا لازمی حصہ قرار دیدیا کہ اس کے بغیر دین مکمل نہیں، اور اگر کوئی یہ عمل نہ کرے تو عمل نہ کرنے کے نتیجے میں اس کو مطعون کیا جائے، اس کو گناہ گار قرار دیا جائے تو یہی چیز اس عمل کو بدعت بنا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی میت کا تیجہ نہ ہوا تو کہنے والے اس میت کو طعنہ دیتے ہیں کہ

مر گیا مردود، نہ فاتحہ نہ درود

اس طرح اس میت پر طعنہ ہو رہا ہے، جو بیچارہ دنیا سے چلا گیا۔ بس لازمی سمجھنے اور طعنہ دینے نے اس عمل کو بدعت بنا دیا، ورنہ ضروری سمجھے بغیر جس دن چاہو ایصالِ ثواب کر لو، پہلے دن کر لو،

دوسرے دن کرلو، تیسرے دن کرلو، چوتھے دن کرلو، پانچویں دن کرلو، مگر یہ تیجہ، دسواں، چالیسواں یہ سب بدعت ہیں۔

عید کے دن گلے ملنا بدعت کیوں؟

اسی طرح ہمارے یہاں یہ عام دستور ہے کہ عید کے دن عید کی نماز کے بعد آپس میں گلے ملتے ہیں، اور معانقہ کرتے ہیں۔ اب معانقہ کرنا کوئی گناہ کا کام نہیں، جائز ہے، لیکن گلے ملنا اس وقت سنت ہے جب کوئی شخص سفر سے آیا ہے، اور اس سے پہلی ملاقات ہورہی ہے، تو اس وقت حضور ﷺ کی سنت یہ ہے کہ اس سے گلے ملا جائے، اور معانقہ کیا جائے۔ عام حالات میں معانقہ کرنا سنت بھی نہیں، اور گناہ بھی نہیں۔ مثلاً ایک مسلمان بھائی آپ سے ملنے کے لئے آیا، آپ کا دل چاہا کہ اس سے گلے ملوں، آپ نے اسے گلے سے لگالیا تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس میں نہ تو کوئی گناہ ہے، اور نہ یہ عمل سنت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ عید کے روز عید کی نماز کے بعد گلے ملنا حضورِ اقدس ﷺ کی سنت ہے، یا یہ عمل دین کا حصہ ہے، یا اگر گلے نہ ملے تو گویا کہ عید ہی نہ ہوئی، یا گناہ کا ارتکاب ہوگیا، یا دین میں خلل واقع ہوگیا، اگر اس عقیدے کی وجہ سے کوئی شخص عید کے دن گلے مل رہا ہے تو گلے ملنا بھی بدعت اور ناجائز ہے، اگر سادہ طریقے سے صرف اپنی خوشی کے اظہار کے لئے گلے مل رہا ہے تو ٹھیک ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کو سنت سمجھنا اور اس کو عید کا لازمی حصہ قرار دینا اس عمل کو بدعت بنا دیتا ہے۔

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کا حکم

اسی طرح فرض نماز کے بعد دعا کرنا نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ نماز کے بعد دعا فرمایا کرتے تھے، لیکن حضورِ اقدس ﷺ کے عہدِ مبارک میں دعا اس طرح ہوتی تھی کہ حضورِ اقدس ﷺ اپنے طور پر دعا فرمارہے ہیں، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے طور پر دعا فرمارہے ہیں۔ آج کل دعا کا جو طریقہ رائج ہوگیا ہے کہ امام دعا کے الفاظ کہتا ہے اور باقی لوگ اس پر آمین کہتے ہیں، یہ طریقہ روایات میں کہیں حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت نہیں۔ لیکن یہ طریقہ ناجائز بھی نہیں، حضورِ اقدس ﷺ نے اس کو ناجائز بھی نہیں کیا، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ طریقہ اختیار کرے تو کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص دعا کے اس طریقے کو لازمی قرار دیدے، اور اس کو نماز کا ضروری حصہ بنادے، اور اس طریقے پر دعا نہ کرنے والے پر طعن و تشنیع کرے تو اس صورت میں یہ عمل ''بدعت'' ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ حضرات نے یہاں دیکھا ہوگا کہ میں جمعہ کی نماز کے بعد کبھی اجتماعی

دعا کراتا ہوں، اور کبھی چھوڑ دیتا ہوں۔ جب پہلی مرتبہ میں نے دعا نہیں کرائی تو بہت سے لوگوں نے سوال کیا کہ حضرت! آپ نے دعا چھوڑ دی؟ میں نے جواب دیا کہ میں نے اسی لئے چھوڑی کہ لوگوں کے دلوں میں اس دعا کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ یہ دعا نماز کا لازمی حصہ ہے، اور جب دعا چھوڑ دی تو لوگوں کو اشکال ہو گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اجتماعی دعا کے بغیر نماز نامکمل ہے۔ بس یہ خیال اس کو ''بدعت'' بنا دیتا ہے، اس لئے کبھی دعا کر لینی چاہئے اور کبھی چھوڑ دینی چاہئے۔

جب لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ ''تیجہ'' کرنا بدعت ہے، ''چالیسواں'' کرنا بدعت ہے، تو جواب میں عام طور پر لوگ یہی کہتے ہیں کہ ہم تو کوئی گناہ کا کام نہیں کر رہے، بلکہ ہم تو قرآن شریف پڑھ رہے ہیں، اور لوگوں کی دعوت کر رہے ہیں، اور نہ قرآن شریف پڑھنا گناہ ہے، اور نہ لوگوں کی دعوت کرنا گناہ ہے۔ بیشک یہ دونوں گناہ نہیں، بشرطیکہ ان کو لازم مت سمجھو، اور اگر کوئی شخص اس میں شریک نہ ہو تو اس کو طعنہ مت دو، اور اس عمل کو دین کا حصہ مت سمجھو، تو پھر یہ عمل بیشک جائز ہے۔ جو آیتِ کریمہ میں نے تلاوت کی، اس کے معنی یہ ہیں کہ ''اللہ اور اللہ کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو'' اس مفہوم میں یہ سب بدعات بھی داخل ہیں کہ اپنی طرف سے کوئی طریقہ گھڑ کر اس کو لازمی قرار دے دیا جائے، اور جو شخص وہ طریقہ اختیار نہ کرے، اس کو مطعون کیا جائے۔

قبروں پر پھول کی چادر چڑھانا

اسی طرح قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانا ''بدعت'' میں داخل ہے۔ دیکھئے! ویسے ہی آپ کا دل چاہا کہ میں اپنے باپ کی قبر پر چادر چڑھاؤں، چنانچہ اس کو دین کا حصہ اور ثواب سمجھے بغیر آپ نے قبر پر چادر چڑھا دی تو یہ جائز ہے۔ لیکن اس کو دین کا حصہ قرار دینا، اور باعثِ اجر و ثواب قرار دینا، اور اگر کوئی شخص نہ چڑھائے تو اس پر طعنہ دینا، اور یہ کہنا کہ اس نے میت کی تعظیم میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے، یہ چیزیں اس عمل کو بدعت بنا دیتی ہیں۔ جو چیز جس حد میں نبی کریم ﷺ نے مقرر فرمائی ہے، اس کو اس کی حد سے آگے بڑھانا، مثلاً جو عمل مستحب ہے، اس کو سنت کا درجہ دینا، اور جو عمل سنت ہے، اس کو واجب کا درجہ دینا، یہ سب بدعت میں داخل ہے، اور اس آیت "لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" کی ممانعت کے تحت داخل ہے۔

خلاصہ

یہ ''بدعت'' کا مختصر مفہوم ہے، جس کا حکم اس آیتِ کریمہ سے نکل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی

رحمت سے ہمارے دلوں میں صحیح بات اُتار دے، اور دین کا صحیح مطلب ہماری سمجھ میں آجائے، دین کی صحیح تشریح اور تعبیر ہماری سمجھ میں آجائے، اور ہماری زندگی اپنی رضا کے مطابق قبول فرمالے، آمین۔
خوب سمجھ لیں کہ اس بیان کے ذریعہ کسی پر اعتراض کرنا مقصود نہیں، کسی پر ملامت کرنا مقصود نہیں، ہم سب کو اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے، ہم سب کو اپنی اپنی قبروں میں سونا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پاس اپنے ایک ایک عمل کا جواب دینا ہے، لہٰذا کسی بات پر ڈٹنے اور اڑنے کی بات نہیں کہ یہ طریقہ تو ہمارے باپ دادا سے چلا آرہا ہے، لہٰذا اس کو کیسے چھوڑیں؟ اللہ تعالیٰ ہمارے دل میں یہ بات ڈال دے کہ دین جو کچھ ہے وہ جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعلیم ہے، اس سے آگے بڑھ کر جو کام کیا جارہا ہے وہ دین نہیں ہوسکتا، چاہے اس کا رواج صدیوں سے چلا آرہا ہو، اور وہ کام قابلِ ترک ہے، اور چھوڑنے کے قابل ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ عُرِضَتْ عَلَيَّ الْأُمَمُ فَجَعَلَ يَمُرُّ النَّبِيُّ مَعَهُ الرَّجُلُ وَالنَّبِيُّ مَعَهُ الرَّجُلَانِ وَالنَّبِيُّ مَعَهُ الرَّهْطُ وَالنَّبِيُّ لَيْسَ مَعَهُ أَحَدٌ وَرَأَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْأُفُقَ فَرَجَوْتُ أَنْ تَكُوْنَ أُمَّتِيْ فَقِيْلَ هٰذَا مُوْسٰى وَقَوْمُهُ ثُمَّ قِيْلَ لِيْ انْظُرْ فَرَأَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْأُفُقَ فَقِيْلَ لِيْ انْظُرْ هٰكَذَا وَهٰكَذَا فَرَأَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْأُفُقَ فَقِيْلَ هٰؤُلَاءِ أُمَّتُكَ وَمَعَ هٰؤُلَاءِ سَبْعُوْنَ أَلْفًا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ فَتَفَرَّقَ النَّاسُ وَلَمْ يُبَيِّنْ لَهُمْ فَتَذَاكَرَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا أَمَّا نَحْنُ فَوُلِدْنَا فِي الشِّرْكِ وَلٰكِنَّا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَلٰكِنْ هٰؤُلَاءِ هُمْ أَبْنَاؤُنَا فَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَلَا يَسْتَرْقُوْنَ وَلَا يَكْتَوُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ فَقَامَ عُكَاشَةُ بْنُ مِحْصَنٍ فَقَالَ أَمِنْهُمْ أَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ نَعَمْ فَقَامَ آخَرُ فَقَالَ أَمِنْهُمْ أَنَا فَقَالَ سَبَقَكَ بِهَا عُكَاشَةُ"(۱)

اُمتِ محمدیہ کی کثرت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے موسمِ حج کے موقع پر ساری اُمتیں پیش کی گئیں، یعنی بذریعہ کشف آپ کو تمام پچھلی اُمتیں دکھائی گئیں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت اور دوسرے انبیاء کی اُمتیں

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۳۱-۶۲)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الطب، باب من لم یرق، رقم: ۵۳۱۱، صحیح مسلم، کتاب الایمان، رقم: ۳۲۳، سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة..... الخ، رقم: ۲۳۷۰

حضورِ اقدس ﷺ کے سامنے پیش کی گئیں، اور ان کے ساتھ اُمتِ محمدیہ بھی آپ کے سامنے پیش کی گئی، تو مجھے اپنی اُمت کی تعداد جو کہ بہت بڑی تھی، اس کو دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہوا۔ اس لئے کہ دوسرے انبیاء کے اُمتیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی، جتنی رسول کریم ﷺ کی اُمت کی تعداد تھی۔

کثرتِ اُمت دیکھ کر آپ ﷺ کی خوشی

دوسری روایت میں یہ تفصیل ہے کہ جب گزشتہ انبیاء کی اُمتیں آپ ﷺ کے سامنے پیش کی جانے لگیں تو بعض انبیاء کی اُمت میں دو تین آدمی تھے، کسی کے ساتھ دس بارہ تھے، اس لئے کہ بعض انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے والے معدودے چند افراد تھے، بعض انبیاء پر ایمان لانے والے دس بارہ افراد تھے، بعض پر ایمان لانے والے سو افراد تھے، بعض پر ایمان لانے والے ہزار تھے۔ جب یہ اُمتیں آپ کے سامنے پیش کی گئیں تو آپ کو ایک بڑا گروہ نظر آیا۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ آپ کو بتلایا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی اُمت تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ تھی۔ پھر بعد میں آپ کے سامنے ایک اور بڑا گروہ پیش کیا گیا جو سارے میدان پر چھا گیا، اور سارے پہاڑوں پر چھا گیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ آپ کو بتلایا گیا کہ یہ آپ کی اُمت ہے۔ پھر آپ سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ راضی ہوگئے؟ یعنی کیا اس سے خوش ہیں کہ آپ کی اُمت کی اتنی بڑی تعداد ہے جو کسی اور پیغمبر کی اُمت کی نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا ہاں اے میرے پروردگار، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ الحمدللہ، میری اُمت کے اندر اتنی بڑی تعداد لوگوں کی موجود ہے۔

ستر ہزار افراد کا بلا حساب جنت میں دخول

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ کو یہ خوشخبری سنائی:

((اِنَّ مَعَ هٰؤُلَاءِ سَبْعِيْنَ اَلْفًا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ))

یعنی یہ جو اُمت آپ کو نظر آرہی ہے اس میں ستر ہزار افراد ایسے ہیں جو بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے، ان سے حساب نہیں لیا جائے گا۔ پھر اس کی شرح فرمائی کہ وہ لوگ جو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر یہ چار صفات ہوں گی۔

چار اوصاف والے

پہلی صفت یہ ہے کہ وہ لوگ جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ وہ لوگ بیماری کا علاج داغ لگا کر نہیں کرتے۔ اہل عرب میں یہ رواج تھا کہ جب کسی بیماری کا کوئی علاج کارگر

نہیں ہوتا تھا تو اس وقت وہ لوگ لوہا گرم کر کے بیمار کے جسم سے لگاتے تھے۔ تیسری صفت یہ کہ وہ بدشگونی نہیں لیتے کہ فلاں بات ہوگئی تو اس سے برا شگون لے لیا۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ لوگ ان باتوں کے بجائے اللہ تبارک وتعالیٰ پر توکل کرتے ہیں۔ جن لوگوں میں یہ چار صفتیں ہوں گی وہ ان ستر ہزار افراد میں شامل ہوں گے جو بلا حساب کتاب جنت میں داخل ہوں گے۔

ستر ہزار کا عدد کیوں؟

اور یہ جو ستر ہزار افراد بلا حساب کتاب جنت میں داخل ہوں گے، ان کے لئے جو عدد بیان کیا گیا ہے کہ وہ ستر ہزار ہوں گے، بعض حضرات نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ واقعۃً وہ ستر ہزار افراد ہوں گے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ ستر ہزار کا لفظ یہاں عدد بیان کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ کثرت کو بیان کرنا مقصود ہے، جیسے کوئی شخص کسی چیز کی کثرت کو بیان کرتا ہے تو اس کے لئے عدد بیان کر دیتا ہے، جبکہ مقصود عدد بیان کرنا نہیں ہوتا، بلکہ کثرت بیان کرنی مقصود ہوتی ہے، اسی طرح یہاں بھی اس عدد سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس اُمت کے بے شمار افراد کو بلا حساب وکتاب کے جنت میں داخل فرمائیں گے۔ اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ یہ جو ستر ہزار افراد ہوں گے، پھر ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار افراد ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے ہم سب کو جنت میں داخل فرمادے۔ آمین

ستر ہزار میں شامل ہونے کی دعا

جس وقت حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کے سامنے یہ بات ارشاد فرمائی تو ایک صحابی حضرت عُکاشہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، عرض کیا:

"يَا رَسُولَ اللّٰهِ! فَادْعُ اللّٰهَ اَنْ يَّجْعَلَنِىْ مِنْهُمْ"

"یا رسول اللہ! میرے لئے آپ دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان میں داخل فرمادیں"

حضور اقدس ﷺ نے اسی وقت ان کے لئے دعا فرمادی کہ یا اللہ، ان کو ان لوگوں میں داخل فرمادے جو بلا حساب وکتاب کے جنت میں داخل ہونے والے ہیں۔ بس ان کا تو پہلے مرحلے پر ہی کام بن گیا۔ جب دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ یہ تو بڑا اچھا موقع ہے تو ایک صاحب اور کھڑے ہوگئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! میرے لئے دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں داخل

فرمادیں۔ اس پر حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((سَبَقَكَ بِهَا عُكَّاشَةُ))

''عکاشہ تم سے سبقت لے گئے''

مطلب یہ تھا کہ چونکہ سب سے پہلے انہوں نے دعا کی درخواست کردی، میں نے اس کی تعمیل کردی، اب یہ سلسلہ مزید دراز نہیں ہوگا، اب اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے اس کو داخل فرمائیں گے۔

ہر مسلمان کو یہ دعا مانگنی چاہئے

اس حدیث میں اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لئے بشارت ہے، اور ان لوگوں کے لئے بڑی بشارت ہے جن کو اللہ تعالیٰ اس جماعت میں داخل فرمالیں جو بلاحساب وکتاب جنت میں داخل کردی جائے گی۔ ہمارا کیا منہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس میں شامل فرمالیں، لیکن ان کی رحمت کے پیشِ نظر ایک ادنیٰ سے ادنیٰ اُمتی بھی یہ دعا مانگ سکتا ہے کہ یا اللہ، میں اس قابل تو نہیں ہوں، لیکن آپ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ میرے جیسے آدمی کو بھی بلاحساب وکتاب کے جنت میں داخل فرمادیں۔ آپ کی رحمت کی وسعت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ لہٰذا ہر مسلمان کو یہ دعا مانگنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بلاحساب وکتاب کے جنت میں داخل فرمادیں۔

تکلیف یقینی اور فائدہ غیر یقینی والا علاج

بہرحال، اس حدیث میں چار صفات بیان فرمائی ہیں کہ جن میں یہ چار صفات پائی جائیں گی، وہ جنت میں بلاحساب داخل ہوں گے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگ علاج کے وقت داغ نہیں لگاتے۔ اس زمانے میں اہل عرب کے یہاں یہ طریقہ تھا کہ لوگ جب کسی بیماری کا علاج کرتے اور کوئی دوا کارگر نہ ہوتی تو ان کے یہاں یہ بات مشہور تھی کہ لوہا آگ پر گرم کرکے اس بیمار کے جسم پر لگایا جائے۔ اس کے ذریعے مریض کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب جلتا ہوا لوہا جسم سے لگے گا تو کیا قیامت ڈھائے گا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ علاج ہے اور اس سے بیماری دور ہوتی ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس طریقۂ علاج کو پسند نہیں فرمایا، اس لئے کہ اس طریقۂ علاج میں تکلیف نقد ہے اور فائدہ یقینی نہیں، اور وہ علاج جس میں تکلیف تو نقد ہو جائے اور فائدہ کا پتہ نہ ہو کہ فائدہ ہوگا یا نہیں، ایسا علاج پسندیدہ نہیں، نبی کریم ﷺ نے اس کو ناپسند فرمایا۔

علاج میں بھی اعتدال مطلوب ہے

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ درحقیقت یہ داغنے کا طریقہ علاج کے اندر غلو اور مبالغہ ہے۔ عرب میں یہ مقولہ مشہور تھا کہ "آخِرُ الدَّوَاءِ الْکَيُّ" یعنی آخری علاج داغ لگانا ہے۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ جب آدمی بیمار ہو جائے تو اس کا علاج کرنا سنت ہے، لیکن علاج ایسا ہونا چاہئے جو اعتدال کے ساتھ ہو، یہ نہیں کہ علاج کے اندر آپ انتہا کو پہنچ جائیں، اور مبالغہ سے کام لیں، یہ بات پسندیدہ نہیں۔ یہ درحقیقت اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کی کمی ہے، جس کی وجہ سے آدمی مبالغہ کر رہا ہے۔ انسان اسباب ضرور اختیار کرے، لیکن اعتدال کے ساتھ کرے۔ حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ"(۱)

یعنی ایک اجمالی کوشش کرو، اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو، یہ ہے سنت، لہٰذا علاج میں اس طرح کا انہماک، اور بہت زیادہ غلو یہ پسندیدہ نہیں۔

بدشگونی اور بدفالی کوئی چیز نہیں

دوسری صفت جو بیان فرمائی وہ بدشگونی ہے۔ اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے کہ بدشگونی لینا کہ فلاں عمل سے یہ بدفالی ہو گئی، مثلاً بلی راستہ کاٹ گئی تو اب سفر ملتوی کر دیں، وغیرہ۔ یہ سب باتیں جاہلیت کے زمانے کی باتیں تھیں، اور اس کا اصل سبب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کی کمی تھی، اس وجہ سے فرمایا کہ وہ لوگ بدشگونی نہیں کرتے۔

تعویذ گنڈوں میں افراط و تفریط

تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگ جھاڑ پھونک نہیں کرتے، یعنی وہ لوگ جو جنت میں بلا سبب داخل ہوں گے وہ جھاڑ پھونک کے ذریعے علاج نہیں کرتے۔ اس کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے بارے میں لوگوں کے درمیان افراط و تفریط پائی جا رہی ہے۔ بعض لوگ وہ ہیں جو سرے سے جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے بالکل ہی قائل نہیں،

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب الاقتصاد فى طلب المعيشة، رقم: ٢١٣٥، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب أنه كان يقال الحمد لله الذى خلق كل شيء ......الخ، كنز العمال، رقم: ٩٢٩١

بلکہ وہ لوگ اس قسم کے تمام کاموں کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ اور بعض لوگ تو اس کام کو شرک قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف بعض لوگ ان تعویذ گنڈوں کے اتنے زیادہ معتقد اور ان میں اتنے زیادہ منہمک ہیں کہ ان کو ہر کام کے لئے ایک تعویذ ہونا چاہئے، ایک وظیفہ ہونا چاہئے، ایک گنڈا ہونا چاہئے۔ میرے پاس روزانہ بے شمار لوگوں کے فون آتے ہیں کہ صاحب بچی کے رشتے نہیں آرہے ہیں، اس کے لئے کوئی وظیفہ بتادیں، روزگار نہیں مل رہا ہے، اس کے لئے کوئی وظیفہ بتادیں، میرا قرضہ ادا نہیں ہو رہا ہے، اس کے لئے کوئی وظیفہ بتادیں۔ دن رات لوگ بس اس فکر میں رہتے ہیں کہ سارا کام ان وظیفوں سے اور ان تعویذ گنڈوں سے ہو جائے، ہمیں ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہ پڑے۔

جھاڑ پھونک میں غیر اللہ سے مدد

یہ دونوں باتیں افراط و تفریط کے اندر داخل ہیں، اور شریعت نے جو راستہ بتایا ہے وہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے، جو قرآن و سنت سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ جھاڑ پھونک کی کوئی حیثیت نہیں، اور تعویذ کرنا ناجائز ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ اس روایت میں ان لوگوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے، لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ اس سے ہر قسم کی جھاڑ پھونک مراد نہیں، بلکہ اس حدیث میں زمانۂ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کا جو طریقہ تھا، اس کی طرف اشارہ ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عجیب و غریب قسم کے منتر لوگوں کو یاد ہوتے تھے، اور یہ مشہور تھا کہ یہ منتر پڑھو تو اس سے فلاں بیماری سے افاقہ ہو جائے گا، فلاں منتر پڑھو تو اس سے فلاں کام ہو جائے گا، وغیرہ، اور ان منتروں میں اکثر و بیشتر جنات اور شیاطین سے مدد مانگی جاتی تھی، کسی میں بتوں سے مدد مانگی جاتی تھی۔ بہر حال ان منتروں میں ایک خرابی تو یہ تھی کہ ان میں غیر اللہ سے اور بتوں سے اور شیاطین سے مدد مانگی جاتی تھی کہ تم ہمارا یہ کام کر دو، اس طرح ان منتروں میں مشرکانہ الفاظ ہوتے تھے۔

جھاڑ پھونک کے الفاظ کو مؤثر سمجھنا

دوسری خرابی یہ تھی کہ اہل عرب ان الفاظ کو بذاتِ خود مؤثر مانتے تھے، یعنی ان کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ تاثیر دے گا تو ان میں تاثیر ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی تاثیر کے بغیر تاثیر نہیں ہوگی، بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان الفاظ میں بذاتِ خود تاثیر ہے، اور جو شخص یہ الفاظ بولے گا اس کو شفا ہو جائے گی۔ یہ دو خرابیاں تو تھیں ہی، اس کے علاوہ بسا اوقات وہ الفاظ ایسے ہوتے تھے کہ ان کے معنیٰ ہی سمجھ میں نہیں آتے تھے، بالکل مہمل قسم کے الفاظ ہوتے تھے، جن کے کوئی معنیٰ نہیں ہوتے تھے، وہ الفاظ بولے بھی جاتے تھے، اور ان الفاظ کو تعویذ کے اندر لکھا بھی جاتا تھا۔ درحقیقت ان الفاظ میں بھی اللہ کے سوا

شیاطین اور جنات سے مدد مانگی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب شرک کی باتیں تھیں، اس لئے نبی کریم ﷺ نے جاہلیت کے جھاڑ پھونک کے طریقے کو منع فرمادیا۔ اور یہ فرمایا کہ جو لوگ اس قسم کے جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں میں مبتلا نہیں ہوتے، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ بلا حساب و کتاب جنت میں داخل فرمائیں گے۔ لہٰذا اس حدیث میں جس جھاڑ پھونک کا ذکر ہے اس سے وہ جھاڑ پھونک مراد ہے جس کا زمانہ جاہلیت میں رواج تھا۔

ہر مخلوق کی خاصیت اور طاقت مختلف ہے

اس کی تھوڑی سی حقیقت بھی سمجھ لیجئے کہ یہ کارخانہ حیات یہ کائنات کا پورا نظام اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مختلف چیزوں میں مختلف خاصیتیں اور مختلف تاثیریں رکھ دی ہیں، مثلاً پانی کے اندر یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ پیاس بجھاتا ہے، آگ کے اندر جلانے کی خاصیت رکھ دی ہے، اگر اللہ تعالیٰ یہ تاثیر آگ سے نکال دیں تو آگ جلانا چھوڑ دے گی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے اسی آگ کو اللہ تعالیٰ نے گلزار بنا دیا تھا۔ ہوا کے اندر تاثیر الگ رکھی ہے۔ مٹی کی تاثیر الگ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی مخلوقات پیدا فرمادی ہیں، انسان، جنات، جانور، شیاطین، وغیرہ، اور ان میں سے ہر ایک کو کچھ طاقت دے رکھی ہے۔ انسان کو طاقت دے رکھی ہے، گدھے گھوڑے کو بھی طاقت دے رکھی ہے، شیر اور ہاتھی کو بھی طاقت دے رکھی ہے، اور ہر ایک کی طاقت کا معیار اور پیمانہ مختلف ہے، شیر جتنا طاقتور ہے، انسان اتنا طاقتور نہیں ہے، سانپ کے اندر زہر رکھ دیا، اگر وہ کسی کو کاٹ لے تو وہ مر جائے، اسی طرح بچھو کے اندر زہر رکھ دیا ہے، لیکن اس کے کاٹنے سے مرتا نہیں، بلکہ تکلیف ہوتی ہے۔ بہر حال ہر چیز کی خاصیتیں مختلف ہیں، اور طاقتیں مختلف ہیں۔

جنات اور شیاطین کی طاقت

اسی طرح جنات اور شیاطین کو بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ طاقتیں دے رکھی ہیں، وہ طاقتیں انسان کے لئے باعثِ تعجب ہوتی ہیں، مثلاً جنات کو اور شیاطین کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ کسی کو نظر نہ آئیں، یہ طاقت انسان کو حاصل نہیں، اگر انسان یہ چاہے کہ میں کسی کو نظر نہ آؤں، تو وہ ایسی صورت حاصل نہیں کرسکتا۔ اگر انسان یہ چاہے کہ میں ایک لمحہ میں یہاں سے اُڑ کر امریکہ چلا جاؤں تو یہ طاقت اس کو حاصل نہیں ہے۔ لیکن بعض جنات اور شیاطین کو اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت دے رکھی ہے۔ یہ شیاطین لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے دین سے پھیرنے کے لئے بعض اوقات انسانوں کو ایسے کلمات کہنے کی ترغیب دیتے ہیں جو شرک والے ہیں، وہ شیاطین انسانوں سے یہ کہتے ہیں کہ اگر تم

وہ کلمات کہو گے جو شرک والے ہیں اور نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرو گے تو ہم خوش ہوں گے، اور جو طاقت اللہ تعالیٰ نے ہمیں دے رکھی ہے، اس کو تمہارے حق میں استعمال کریں گے۔

اس عمل کا دین سے کوئی تعلق نہیں

مثلاً فرض کریں کہ کسی کی کوئی چیز گم ہوگئی ہے، اور وہ بیچارہ ڈھونڈتا پھر رہا ہے، اب اگر کسی جن یا شیطان کو پتہ چل گیا کہ وہ کہاں پڑی ہوئی ہے تو وہ اس چیز کو اُٹھا کر ایک منٹ میں لا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ طاقت دی ہے۔ اس شیطان نے اپنے معتقدین سے یہ کہہ رکھا ہے کہ اگر تم یہ کلمات کہو گے تو میں تمہاری مدد کروں گا، اور وہ چیز لا کر دیدوں گا۔ اس کا نام ''جادو'' اس کا نام ''سحر'' اور ''کہانت'' ہے، اور اسی کو ''سفلی'' عمل بھی کہا جاتا ہے، اس عمل کا تعلق نہ کسی نیکی سے ہے، نہ تقویٰ سے، نہ دین سے ہے، اور نہ ہی ایمان سے، بلکہ بدترین کافر بھی اس طرح کے شعبدے دکھا دیتے ہیں، اس وجہ سے کہ ان کے ہاتھ میں بعض جنات اور شیاطین مسخر ہیں، وہ جنات ان کا کام کر دیتے ہیں، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت پہنچا ہوا آدمی ہے، اور بڑا نیک آدمی ہے، حالانکہ اس عمل کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس عمل کے لئے ایمان بھی ضروری نہیں، اسی لئے سفلی عمل اور سحر کو حدیث شریف میں سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، اور سحر کرنے والے کی نوبت کفر تک پہنچتی ہے۔ بہر حال یہ طریقہ جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا، نبی کریم ﷺ نے اس کو منع فرمایا کہ اگر اللہ پر ایمان ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان ہے تو پھر یہ شرکیہ کلمات کہہ کر اور فضول مہمل کلمات ادا کر کے شیاطین کے ذریعہ کام کرانا شریعت میں ناجائز اور حرام ہے، اور کسی مسلمان کا یہ کام نہیں ہے۔

بیمار پر پھونکنے کے مسنون الفاظ

لیکن ساتھ ہی رسول کریم ﷺ نے اس قسم کے منتروں کے بجائے اور شرکیہ کلمات کے بجائے آپ نے خود اللہ جل شانہ کے نام مبارک سے جھاڑ پھونک کیا۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ طریقہ سکھایا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص بیمار ہو جائے تو یہ کلمات کہو:

((اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَذْهِبِ الْبَاسَ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِيْ لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُكَ، شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَمًا)) (۱)

اور بعض اوقات آپ نے کلمات سکھا کر فرمایا کہ ان کلمات کو پڑھ کر تھوکو، اور اس کے ذریعہ جھاڑ دو، آپ نے خود بھی اس پر عمل فرمایا، اور صحابہ کرام کو بھی اس کی تلقین فرمائی۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب المرضی، باب دعاء العائد للمریض، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

معوذتین کے ذریعہ دم کرنے کا معمول

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا روزانہ کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے پہلے معوذتین پڑھتے، اور بعض روایات میں "قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" کا بھی اضافہ ہے، یعنی "قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" اور "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" اور "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" ان تینوں سورتوں کو تین تین مرتبہ پڑھتے، اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک مارتے، اور پھر پورے جسم پر ہاتھ پھیرتے۔ یہ جھاڑ پھونک خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس عمل کے ذریعہ شیطانی اثرات سے حفاظت رہتی ہے، سحر سے اور فضول حملوں سے انسان محفوظ رہتا ہے۔ (۱)

مرضِ وفات میں اس معمول پر عمل

ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ وفات میں تھے، اور صاحبِ فراش تھے، اور اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ اپنا دستِ مبارک پوری طرح اُٹھانے پر قادر نہیں تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے خیال آیا کہ رات کا وقت ہے، اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر یہ عمل فرماتے رہے کہ معوذتین پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم فرماتے تھے، اور پھر ان ہاتھوں کو سارے جسم پر پھیرتے تھے، لیکن آج آپ کے اندر یہ طاقت نہیں کہ یہ عمل فرمائیں، چنانچہ میں نے خود معوذتین پڑھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر دم کیا، اور آپ ہی کے دستِ مبارک کو آپ کے جسم مبارک پر پھیر دیا، اس لئے کہ اگر میں اپنے ہاتھوں کو آپ کے جسم مبارک پر پھیرتی تو اس کی اتنی تاثیر اور اتنا فائدہ نہ ہوتا جتنا فائدہ خود آپ کے دستِ مبارک پھیرنے سے ہوتا۔ اور بھی متعدد مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تلقین فرمائی کہ اگر جھاڑ پھونک کرنی ہے تو اللہ کے کلام سے کرو، اور اللہ کے نام سے کرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے نام میں یقیناً جو تاثیر ہے وہ شیاطین کے شرکیہ کلام میں کہاں ہوسکتی ہے۔ لہٰذا آپ نے اس کی اجازت عطا فرمائی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رقم: ٥٢٤٣، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب استحباب رقیة المریض، رقم: ٤٠٦١، سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب فی دعاء المریض، رقم: ٣٤٨٨، ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے "اے اللہ، اے ہمارے رب! بیماری کو دور کردے اور شفا عطا فرمادے، تو ہی شفا دینے والا ہے شفا وہی ہے جو تو عطا کرے، ہم تجھ سے شفا کا سوال کرتے ہیں ایسی شفا جو بیماری کو بالکل ختم کردے"

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب التعوذ والقراءة عند المنام، رقم: ٥٨٤٤، صحیح مسلم، کتاب السلام، رقم: ٤٠٦٥۔ سنن أبی داود، کتاب الطب، رقم: ٣٤٠٣

حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

روایات میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک قافلہ کہیں سفر پر جارہا تھا، راستے میں ان کا زادِراہ، کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا، راستے میں غیر مسلموں کی ایک بستی پر اس قافلے کا گزر ہوا، انہوں نے جاکر بستی والوں سے کہا کہ ہم مسافر لوگ ہیں، اور کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا ہے، اگر تمہارے پاس کچھ کھانے پینے کا سامان ہو تو ہمیں دیدو، ان لوگوں نے شاید مسلمانوں سے تعصب اور مذہبی دشمنی کی بنیاد پر کھانا دینے سے انکار کردیا کہ ہم تمہاری مہمانی نہیں کرسکتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قافلے نے بستی کے باہر پڑاؤ ڈال دیا، رات کا وقت تھا، انہوں نے سوچا کہ رات یہاں پر گزار کر صبح کسی اور جگہ پر کھانا تلاش کریں گے۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس بستی کے سردار کو سانپ نے کاٹ لیا، اب بستی والوں نے سانپ کے کاٹنے کے جتنے علاج تھے، وہ سب آزمالیے، لیکن اس کا زہر نہیں اُترتا تھا، کسی نے ان سے کہا کہ سانپ کا زہر اُتارنے کے لئے جھاڑ پھونک کی جاتی ہے، اگر جھاڑ پھونک جاننے والا ہو تو اس کو بلایا جائے، تاکہ وہ آکر زہر اُتار دے۔ انہوں نے کہا کہ بستی میں تو جھاڑ پھونک کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ قافلہ جو بستی کے باہر ٹھہرا ہوا ہے، وہ مولوی قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں، ان کے پاس جاکر معلوم کرو، شاید ان میں سے کوئی شخص سانپ کی جھاڑ جانتا ہو، چنانچہ بستی کے لوگ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، اور پوچھا کہ کیا آپ میں کوئی شخص ہے جو سانپ کے ڈسے کو جھاڑ دے، بستی کے ایک شخص کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے میں جھاڑ دوں گا، لیکن تم لوگ بہت بخیل ہو کہ ایک مسافر قافلہ آیا ہوا ہے، تم سے کہا کہ ان کے کھانے پینے کا انتظام کردو، تم نے ان کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ بستی والوں نے کہا کہ ہم بکریوں کا پورا گلہ آپ کو دے دیں گے، لیکن ہمارے آدمی کا تم علاج کردو۔

چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ خود اپنا واقعہ سناتے ہیں کہ مجھے جھاڑ پھونک تو کچھ نہیں آتا تھا، لیکن میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں یقیناً برکت ہوگی، اس لئے میں ان لوگوں کے ساتھ بستی میں گیا، اور وہاں جاکر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کرتا رہا، سورۂ فاتحہ پڑھتا اور دم کرتا، اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا زہر اُتر گیا، اب وہ لوگ بہت خوش ہوئے، بکریوں کا ایک گلہ ہمیں دے دیا، ہم نے بکریوں کا گلہ ان سے لے تو لیا، لیکن بعد میں خیال آیا کہ ہمارے لئے ایسا کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ اور یہ بکریاں ہمارے لئے حلال بھی ہیں یا نہیں؟ لہٰذا جب تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پوچھ لیں، اس

وقت تک ان کو استعمال نہیں کریں گے۔

جھاڑ پھونک پر معاوضہ لینا

چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سارا واقعہ سنایا، اور پوچھا کہ یا رسول اللہ، اس طرح بکریوں کا گلہ ہمیں حاصل ہوا ہے، ہم اس کو رکھیں یا نہ رکھیں؟ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے لئے اس کو رکھنا جائز ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ سانپ کے کاٹنے کا یہ علاج ہے؟ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ، میں نے سوچا کہ بے ہودہ قسم کے کلام میں تاثیر ہو سکتی ہے تو اللہ کے کلام میں تو بطریق اولیٰ تاثیر ہوگی، اس وجہ سے میں سورۂ فاتحہ پڑھتا رہا، اور دم کرتا رہا، اللہ تعالیٰ نے اس سے فائدہ پہنچا دیا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس عمل سے خوش ہوئے، اور ان کی تائید فرمائی، اور بکریوں کا گلہ رکھنے کی بھی اجازت عطا فرمائی۔ اب دیکھئے، اس واقعے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک کی نہ صرف تائید فرمائی، بلکہ اس عمل کے نتیجے میں بکریوں کا جو گلہ بطور انعام کے ملا تھا، اس کو رکھنے کی اجازت عطا فرمائی۔[1] اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی یہ عمل فرمایا اور صحابہ کرام سے بھی کرایا۔ یہ تو جھاڑ پھونک کا قضیہ ہوا۔

تعویذ کے مسنون کلمات

اب تعویذ کی طرف آیئے۔ تعویذ کاغذ پر لکھے جاتے ہیں، اور ان کو کبھی پیا جاتا ہے، اور کبھی گلے اور بازو میں باندھا جاتا ہے، کبھی جسم کے کسی اور حصے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خوب سمجھ لیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو یہ ثابت نہیں کہ آپ نے کوئی تعویذ لکھا ہو، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تعویذ لکھنا ثابت ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے صحابہ کرام کو یہ کلمات سکھائے تھے:

((اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ))

چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو یہودی سے مسلمان ہوئے تھے، اور یہودی ان کے دشمن تھے، اور ان کے خلاف جادو وغیرہ کرتے رہتے تھے، تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ کلمات سکھاتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم یہ کلمات خود پڑھا کرو، اور اپنے اُوپر ان کا دم کر لیا کرو، پھر ان شاء اللہ کوئی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الطب، باب النفث فی الرقیة، رقم: ۵۳۰۸

جادو تم پر اثر نہیں کرے گا۔ چنانچہ وہ یہ کلمات پڑھا کرتے تھے۔

ان کلمات کے فائدے

اور حضورِ اقدس ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر رات کو سوتے ہوئے کسی کی آنکھ گھبراہٹ سے کھل جائے، اور اس کو خوف محسوس ہو تو اس وقت یہ کلمات پڑھ لے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی بڑی اولاد کو تو یہ کلمات سکھا دیئے ہیں، اور یاد کرا دیئے ہیں، تا کہ ان کو پڑھ کر وہ اپنے اُوپر دم کرتے رہا کریں، اور اس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہیں، اور جو میرے چھوٹے بچے ہیں، وہ یہ کلمات خود سے نہیں پڑھ سکتے، ان کے لئے میں نے یہ کلمات کاغذ پر لکھ کر ان کے گلے میں ڈال دیئے ہیں[1] یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر ہے، اور ثابت ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اگر کسی عورت کی ولادت کا وقت ہو تو ولادت میں سہولت پیدا کرنے کے لئے تشتری یا صاف برتن میں یہ کلمات لکھ کر اس کو دھو کر اس خاتون کو پلا دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے ولادت میں سہولت فرما دیتے ہیں، اسی طرح بہت سے صحابہ اور تابعین سے منقول ہے کہ وہ لکھ کر لوگوں کو تعویذ دیا کرتے تھے۔

اصل سنت ''جھاڑ پھونک'' کا عمل ہے

لیکن ایک بات یاد رکھنی چاہئے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے، اور احادیث سے یقیناً وہی بات ثابت ہوتی ہے، وہ یہ کہ تعویذ کا فائدہ ثانوی درجے کا ہے، اصل فائدے کی چیز ''جھاڑ پھونک'' ہے، جو براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، یہ عمل آپ نے خود فرمایا، اور صحابہ کرام کو اس کی تلقین فرمائی، اس عمل میں زیادہ تاثیر اور زیادہ برکت ہے، اور تعویذ اس جگہ استعمال کیا جائے جہاں آدمی وہ کلمات خود نہ پڑھ سکتا ہو، اور نہ دوسرا شخص پڑھ کر دم کر سکتا ہو، اس موقع پر تعویذ دیدیا جائے، ورنہ اصل تاثیر ''جھاڑ پھونک'' میں ہے۔ بہر حال صحابہ کرام سے دونوں طریقے ثابت ہیں۔

کون سے ''تمائم'' شرک ہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تعویذ لٹکانا شرک ہے، اور گناہ ہے، اس کی وجہ ایک حدیث ہے جس کا مطلب لوگ صحیح نہیں سمجھتے، اس کے نتیجے میں وہ تعویذ لٹکانے کو ناجائز سمجھتے ہیں، چنانچہ حدیث

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب منہ، رقم: ۳۴۵۱

شریف میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الرُّقٰی وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ))(۱)

''تمائم''، تمیمۃ کی جمع ہے، اور عربی زبان میں ''تمیمۃ'' کے جو معنی ہیں اُردو میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں تھا، اس لئے لوگوں نے غلطی سے اس کے معنی ''تعویذ'' سے کردیئے، اس کے نتیجے میں اس حدیث کے معنی یہ ہوئے کہ ''تعویذ شرک ہے''۔ اب لوگوں نے اس بات کو پکڑلیا کہ ہر قسم کا تعویذ شرک ہے۔ حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔ ''تمیمۃ'' عربی زبان میں سیپ کی ان کوڑیوں کو کہا جاتا ہے جن کو زمانہ جاہلیت میں لوگ دھاگے میں پروکر بچوں کے گلوں میں ڈال دیا کرتے تھے، اور ان کوڑیوں پر مشرکانہ منتر پڑھے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہ کہ ان کوڑیوں کو بذاتِ خود مؤثر سمجھا جاتا تھا، یہ ایک مشرکانہ عمل تھا، جس کو ''تمیمۃ'' کہا جاتا تھا، اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی کہ تمائم شرک ہے۔

جھاڑ پھونک کے لئے چند شرائط

لیکن جہاں تک اللہ تعالیٰ کے نام کے ذریعہ جھاڑ پھونک کا تعلق ہے، وہ خود حضورِ اقدس ﷺ سے اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، اس لئے وہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے جواز کے لئے چند شرائط انتہائی ضروری ہیں، ان کے بغیر یہ عمل جائز نہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ جو کلمات پڑھے جائیں ان میں کوئی کلمہ ایسا نہ ہو جس میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے مدد مانگی گئی ہو، اس لئے کہ بعض اوقات ان میں ''یافلاں'' کے الفاظ ہوتے ہیں، اور اس جگہ پر اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام ہوتا ہے، ایسا تعویذ، ایسا گنڈا، ایسی جھاڑ پھونک حرام ہے، جس میں غیر اللہ سے مدد لی گئی ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اگر جھاڑ پھونک کے الفاظ یا تعویذ میں لکھے ہوئے الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی ہی معلوم نہیں کہ کیا معنی ہیں، ایسا تعویذ استعمال کرنا بھی ناجائز ہے، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی مشرکانہ کلمہ ہو، اور اس میں غیر اللہ سے مدد مانگی گئی ہو، یا اس میں شیطان سے خطاب ہو، اس لئے ایسے تعویذ بالکل ممنوع اور ناجائز ہیں۔

یہ رُقیہ حضور ﷺ سے ثابت ہے

البتہ ایک ''رقیہ'' ایسا ہے جس کے معنی ہمیں معلوم نہیں، لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے اس کی

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الطب، باب في تعليق التمائم، رقم: ۳۳۸۵، سنن ابن ماجه، كتاب الطب، باب تعليق التمائم، رقم: ۳۵۲۱، مسند أحمد، مسند عبدالله بن مسعود، رقم: ۳۴۳۳۔

اجازت دی ہے، چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضور اقدس ﷺ کے سامنے عرض کیا کہ ایک عمل ایسا ہے کہ اگر سانپ یا بچھو کسی کو کاٹ لے تو اس کے کاٹے کا اثر زائل کرنے کے لئے اور اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے ہم یہ الفاظ پڑھتے ہیں:

"شَجَّةٌ قَرْنِيَّةٌ مِلْحَةٌ بَحْرٍ قفطا"(۱)

اب اس کے معنی تو ہمیں معلوم نہیں، لیکن جب حضور اکرم ﷺ پر پیش کیا گیا تو آپ نے اس کو منع نہیں فرمایا، شاید یہ عبرانی زبان کے الفاظ ہیں۔ اور یہ حدیث صحیح سند کی ہے، اس لئے علماء کرام نے فرمایا کہ صرف یہ ایک "رقیہ" ایسا ہے جس کے معنی معلوم نہ ہونے کے باوجود اس کے ذریعہ جھاڑ پھونک بھی جائز ہے، اور اس کے ذریعہ تعویذ لکھنا بھی جائز ہے۔ البتہ اس پر ایسا بھروسہ کرنا کہ گویا انہی کلمات کے اندر بذاتِ خود تاثیر ہے، یہ حرام ہے، بلکہ ان کلمات کو ایک تدبیر سمجھے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

بہرحال، تعویذ اور جھاڑ پھونک کی یہ شرعی حقیقت ہے، لیکن اس معاملے میں افراط و تفریط ہو رہی ہے، ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو اس عمل کو حرام اور ناجائز کہتے ہیں، ان کی تفصیل تو عرض کر دی۔

تعویذ دینا عالم اور متقی ہونے کی دلیل نہیں

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ بس سارا دین ان تعویذ گنڈوں کے اندر منحصر ہے، اور جو شخص تعویذ گنڈا کرتا ہے وہ بہت بڑا عالم ہے، وہ بہت بڑا نیک آدمی ہے، متقی اور پرہیزگار ہے، اسی کی تقلید کرنی چاہئے، اس کا معتقد ہونا چاہئے۔ اور جو شخص تعویذ گنڈا نہیں کرتا یا جس کو تعویذ گنڈا کرنا نہیں آتا اس کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو دین کا علم ہی نہیں۔ بہت سے لوگ میری طرف رجوع کرتے ہیں کہ فلاں مقصد کے لئے تعویذ دے دیجئے، میں ان سے جب کہتا ہوں کہ مجھے تو تعویذ دینا نہیں آتا تو وہ لوگ بہت حیران ہوتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو اتنا بڑا دارالعلوم بنا ہوا ہے، اس میں تعویذ گنڈے ہی سکھائے جاتے ہیں، اور اس میں جو درس ہوتے ہیں وہ سب تعویذ اور جھاڑ پھونک کے ہوتے ہیں، لہٰذا جس کو جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا نہیں آتا، وہ یہاں پر اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ جو اصل کام یہاں پر سیکھنے کا تھا، وہ تو اس نے سیکھا ہی نہیں۔

تعویذ گنڈے میں انہماک مناسب نہیں

ان لوگوں نے سارا دین تعویذ گنڈے میں سمجھ لیا ہے، اور ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دنیا کی

(۱) المعجم الكبير، رقم: ۹۹۰۷ (۴۱۹/۸)، مصنف ابن أبي شيبة (۱۲۹/۷)

کوئی غرض ایسی نہیں ہے جس کا علاج کوئی تعویذ نہ ہو، چنانچہ ان کو ہر کام کے لئے ایک تعویذ چاہئے۔ فلاں کام نہیں ہو رہا ہے، اس کے لئے کیا وظیفہ پڑھوں؟ فلاں کام کے لئے ایک تعویذ دیدیں۔ لیکن ہمارے اکابر نے اعتدال کو ملحوظ رکھا کہ جس حد تک حضورِ اقدس ﷺ نے عمل کیا، اس حد تک ان پر عمل کریں، یہ نہیں کہ دن رات آدمی یہی کام کرتا رہے، اور دین و دنیا کا ہر کام تعویذ گنڈے کے ذریعہ کرے، یہ بات غلط ہے۔ اگر یہ عمل درست ہوتا تو پھر سرکارِ دو عالم ﷺ کو جہاد کرنے کی کیا ضرورت تھی، بس کافروں پر کوئی ایسی جھاڑ پھونک کرتے کہ وہ سب حضور ﷺ کے قدموں میں آکر ڈھیر ہو جاتے۔ آپ نے اس جھاڑ پھونک پر کبھی کبھی عمل بھی کیا ہے، لیکن اتنا غلو اور انہماک بھی نہیں کیا کہ ہر کام کے لئے تعویذ گنڈے کو استعمال فرماتے۔

ایک انوکھا تعویذ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک دیہاتی آدمی آیا۔ اس کے دماغ میں یہی بسا ہوا تھا کہ مولوی اگر تعویذ گنڈا نہیں جانتا تو وہ بالکل جاہل ہے، اس کو کچھ نہیں آتا، چنانچہ آپ کو بڑا عالم سمجھ کر آپ کے پاس آیا، اور کہا کہ مجھے تعویذ دیدو۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھے تو تعویذ آتا نہیں۔ اس نے کہا کہ اجی نہیں مجھے دیدو۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے آتا نہیں تو کیا دیدوں؟ لیکن وہ پیچھے پڑ گیا کہ مجھے تعویذ دیدو۔ حضرت فرماتے ہیں کہ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا لکھوں، تو میں نے اس تعویذ میں لکھ دیا کہ ''یا اللہ یہ مانتا نہیں، میں جانتا نہیں، آپ اپنے فضل و کرم سے اس کا کام کر دیجئے'' یہ لکھ کر میں نے اس کو دیدیا کہ یہ لٹکا لے، اس نے لٹکالیا، اللہ تعالیٰ نے اسی کے ذریعہ اس کا کام بنا دیا۔

ٹیڑھی مانگ پر نرالا تعویذ

حضرت ہی کا واقعہ ہے کہ ایک عورت آئی، اور اس نے کہا کہ جب میں سر کے بال بناتی ہوں تو مانگ ٹیڑھی بن جاتی ہے، سیدھی نہیں بنتی، اس کا کوئی تعویذ دیدو۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے تعویذ آتا نہیں، اور اس کا کیا تعویذ ہوگا کہ مانگ سیدھی نہیں نکلتی۔ مگر وہ عورت پیچھے پڑ گئی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو میں نے ایک کاغذ پر لکھ دیا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اہدنا الصراط المستقیم''، اس کا تعویذ بنا کر پہن لو تو شاید تمہاری مانگ سیدھی ہو جائے۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدھی کر دی ہوگی۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے نیک بندوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ جب ان کی زبان سے کوئی کلمہ نکل جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سچا کر دیتے ہیں۔ بہرحال، بزرگوں کے واقعات اور حالات میں یہ جو لکھا ہوتا ہے کہ فلاں بزرگ نے یہ کلمہ لکھ دیا، اس سے فائدہ ہوگیا وہ اسی طرح ہے

کہ اللہ تعالیٰ کے کسی نیک بندے سے کوئی درخواست کی گئی، اور اس کے دل میں یہ آیا کہ یہ کلمات لکھ دوں، شاید اس سے فائدہ ہو جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ فائدہ دے دیا۔

ہر کام تعویذ کے ذریعہ کرانا

آج کل یہ صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ ہر وقت آدمی اسی جھاڑ پھونک کے دھندے میں لگا رہتا ہے، ہر وقت اسی تعویذ گنڈے کے چکر میں لگا رہتا ہے کہ صبح سے شام تک جو بھی کام ہو وہ تعویذ کے ذریعہ ہو، فلاں کام کا الگ تعویذ ہونا چاہئے، فلاں کام کا الگ تعویذ ہونا چاہئے، ملازمت کا الگ تعویذ ہونا چاہئے، بیماری کا الگ تعویذ ہونا چاہئے، ہر چیز کا الگ تعویذ ہونا چاہئے، ہر چیز کی ایک الگ دعا ہونی چاہئے۔ تعویذ گنڈے میں اتنا انہماک اور غلو سنت کے خلاف ہے۔ آپ ﷺ نے کبھی کبھی جھاڑ پھونک کی ہے، لیکن یہ نہیں تھا کہ دنیا کے ہر کام کے لئے جھاڑ پھونک کر رہے ہیں۔ کافروں کے ساتھ جہاد ہو رہے ہیں، لڑائی ہو رہی ہے، کہیں یہ منقول نہیں کہ کفار کو زیر کرنے کے لئے آپ نے کوئی جھاڑ پھونک کی ہو۔

تعویذ کرنا نہ عبادت نہ اس پر ثواب

ہاں! دعا ضرور فرماتے تھے، اس لئے کہ سب سے بڑی اور اصل چیز دعا ہے۔ یاد رکھئے، تعویذ اور جھاڑ پھونک کے ذریعہ علاج جائز ہے، مگر یہ عبادت نہیں۔ قرآن کریم کی آیات کو اور قرآن کریم کی سورتوں کو اور اللہ تعالیٰ کے ناموں کو اپنے کسی دنیوی مقصد کے لئے استعمال کرنا زیادہ سے زیادہ جائز ہے، لیکن یہ کام عبادت نہیں، اور اس میں ثواب نہیں ہے۔ جیسے آپ کو بخار آیا، اور آپ نے دوا پی لی، تو یہ دوا پینا جائز ہے، لیکن دوا پینا عبادت نہیں، بلکہ ایک مباح کام ہے۔ اسی طرح تعویذ کرنا اور جھاڑ پھونک کرنا، اس تعویذ اور جھاڑ پھونک میں اگرچہ اللہ کا نام استعمال کیا، لیکن جب تم نے اس کو اپنے دنیاوی مقصد کے لئے استعمال کیا تو اب یہ بذاتِ خود ثواب اور عبادت نہیں۔

اصل چیز دعا کرنا ہے

لیکن اگر براہِ راست اللہ تعالیٰ سے مانگو، اور دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! اپنی رحمت سے میرا یہ مقصد پورا فرما دیجئے، یا اللہ! میری مشکل حل فرما دیجئے، یا اللہ! میری یہ پریشانی دور فرما دیجئے، تو اس دعا کرنے میں ثواب ہی ثواب ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی حاجت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرو، اور اگر دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر دعا

کرو تو زیادہ اچھا ہے۔ اس سے یہ ہوگا کہ جو مقصد ہے وہ اگر مفید ہے تو ان شاء اللہ حاصل ہوگا، اور ثواب تو ہر حال میں ملے گا، اس لئے کہ دعا کرنا چاہے دنیا کی غرض سے ہو وہ ثواب کا موجب ہے، اس لئے کہ دعا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةِ"

''دعا بذاتِ خود عبادت ہے''(۱)

تعویذ کرنے کو اپنا مشغلہ بنالینا

لہٰذا اگر کسی شخص کو ساری عمر جھاڑ پھونک کا طریقہ نہ آئے، تعویذ لکھنے کا طریقہ نہ آئے، لیکن وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تو یقیناً اس کا یہ عمل اس تعویذ اور جھاڑ پھونک سے بدرجہا افضل اور بہتر ہے۔ لہٰذا ہر وقت تعویذ گنڈے میں لگے رہنا یہ عمل سنت کے مطابق نہیں۔ جو بات نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جس حد تک ثابت ہے اس کو اسی حد پر رکھنا چاہئے، اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ اگر کبھی ضرورت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جھاڑ پھونک کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن ہر وقت اس کے اندر انہماک اور غلو کرنا اور اس کو اپنا مشغلہ بنالینا کسی طرح بھی درست نہیں، بس، تعویذ گنڈوں کی یہ حقیقت ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

روحانی علاج کیا ہے؟

اب لوگوں نے یہ تعویذ گنڈے، یہ عملیات، یہ وظیفے، اور جھاڑ پھونک ان کا نام رکھ لیا ہے ''روحانی علاج'' حالانکہ یہ بڑے مغالطے اور دھوکے میں ڈالنے والا نام ہے، اس لئے کہ روحانی علاج تو دراصل انسان کے اخلاق کی اصلاح کا نام تھا، اس کے ظاہری اعمال کی اصلاح اور اس کے باطن کے اعمال کی اصلاح کا نام تھا، یہ اصل میں روحانی علاج تھا، مثلاً ایک شخص کے اندر تکبر ہے، اب یہ تکبر کیسے زائل ہو؟ یا مثلاً حسد پیدا ہوگیا ہے، وہ کیسے زائل ہو؟ یا مثلاً بغض پیدا ہوگیا ہے، وہ کیسے زائل ہو؟ حقیقت میں اس کا نام ''روحانی علاج'' ہے، لیکن آج اس تعویذ گنڈے کے علاج کا نام روحانی علاج رکھ دیا ہے، جو بڑے مغالطے والا عمل ہے۔

صرف تعویذ دینے سے پیر بن جانا

اور اگر کسی شخص کا تعویذ گنڈا اور جھاڑ پھونک اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کامیاب ہوگیا تو اس

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب منه، رقم: ۳۲۹۳

شخص کے متقی اور پرہیزگار ہونے کی دلیل نہیں، اور نہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شخص دینی اعتبار سے مقتدیٰ بن گیا ہے، وہ تو اللہ تعالیٰ نے الفاظ میں تاثیر رکھ دی ہے، جو شخص بھی اس کو پڑھے گا، تاثیر حاصل ہو جائے گی۔ یہ بات اس لئے بتادی کہ بعض اوقات لوگ یہ دیکھ کر کہ اس کے تعویذ بڑے کارگر ہوتے ہیں، اس کی جھاڑ پھونک بڑی کامیاب ہوتی ہے، اس کو "پیر صاحب" بنا لیتے ہیں، اور اس کو اپنا مقتدیٰ قرار دیتے ہیں، چاہے اس شخص کی زندگی شریعت کے احکام کے خلاف ہو، چاہے اس کی زندگی سنت کے مطابق نہ ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی اتباع کرنے والے بھی خلافِ شرع امور کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ایک عامل کا وحشت ناک واقعہ

میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک وحشت ناک منظر دیکھا، وہ یہ کہ ایک مسجد میں جانا ہوا، معلوم ہوا کہ یہاں ایک عامل صاحب آئے ہوئے ہیں، نماز اور سنت وغیرہ پڑھ کر باہر نکلا تو دیکھا کہ باہر لوگوں کی دورویہ لمبی قطار لگی ہوئی ہے، اور عامل صاحب مسجد سے باہر نکلے تو لوگ قطار میں کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے منہ کھول دیئے، اور پھر پیر صاحب نے ایک ایک شخص کے منہ کے اندر تھوکنا شروع کر دیا، ایک شخص دائیں طرف، پھر بائیں طرف کے منہ میں تھوکتے، اس طرح ہر شخص کے منہ میں اپنا بلغم اور تھوک ڈالتے جا رہے تھے، اور پھر آخر میں کچھ لوگ بالٹیاں، ڈونگے اور جگ لیے کھڑے تھے، اور ہر ایک اس انتظار میں تھا کہ پیر صاحب اس کے اندر تھوک دیں، تاکہ اس کی برکتیں اس کو حاصل ہو جائیں۔ یہ بات اس حد تک اس لئے پہنچی تھی کہ اس کے تعویذ گنڈے کارآمد ہوتے تھے۔

حاصلِ کلام

خدا کے لئے اس معاملے میں اپنے مزاج کے اندر اعتدال پیدا کریں۔ راستہ وہی ہے جو جناب رسول اللہ ﷺ نے اختیار فرمایا، یا آپ کے صحابہ کرام نے اختیار فرمایا۔ اور یہ بات خوب اچھی طرح یاد رکھیں کہ اصل چیز براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اور مانگنا ہے کہ یا اللہ! میرا یہ کام کر دیجئے، اس سے بہتر کوئی تعویذ نہیں، اس سے بہتر کوئی کام نہیں۔ اور یہ جھاڑ پھونک اور یہ تعویذ کوئی عبادت نہیں، بلکہ علاج کا ایک طریقہ ہے، اس پر کوئی اجر و ثواب مرتب نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اس کی اُجرت لینا، دینا بھی جائز ہے۔ اگر یہ عبادت ہوتی تو اس پر اُجرت لینا جائز نہ ہوتا، کیونکہ کسی عبادت پر اُجرت لینا جائز نہیں، مثلاً کوئی شخص تلاوت کرے، اور اس پر اُجرت لے تو یہ حرام ہے، لیکن تعویذ پر اُجرت لینا

جائز ہے۔ بہر حال، اگر واقعۃً ضرورت پیش آ جائے تو حدود و قیود میں رہ کر اس کو استعمال کر سکتے ہیں، لیکن اس کی حدود و قیود سے آگے بڑھنا، اور ہر وقت انہی تعویذ گنڈوں کی فکر میں رہنا یہ کوئی سنت کا طریقہ نہیں۔ اور حدیث شریف میں یہ جو فرمایا کہ وہ لوگ بلاحساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے اس حدیث کے ایک معنی تو میں نے بتا دیئے کہ اس سے زمانۂ جاہلیت میں کی جانے والی جھاڑ پھونک مراد ہے، اور بعض علماء نے فرمایا کہ ایک حدیث میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ جو جائز جھاڑ پھونک ہے اس میں بھی غلو اور مبالغہ، اور اس میں زیادہ انہماک بھی پسندیدہ نہیں، بلکہ آدمی اصل بھروسہ اللہ تعالیٰ پر رکھے، اور جب ضرورت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرے، یہی بہترین علاج ہے، اس کے نتیجے میں یہ بشارت بھی حاصل ہوگی، جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس کا مصداق بنادے، اور ہم سب کو اللہ تعالیٰ جنت میں بلاحساب داخلہ نصیب فرمادے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

دنیا کی حقیقت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"اَمَّا بَعْدُ!

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((إِنَّ الدُّنْیَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی مُسْتَخْلِفُكُمْ فِیْهَا فَیَنْظُرُ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ فَاتَّقُوا الدُّنْیَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ))(۱)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بیشک دنیا میٹھی اور سرسبز ہے، یعنی ایک انسان کو دنیا کی شان وشوکت، دنیا کی لذتیں، دنیا کی خواہشات بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہیں، گویا کہ یہ دنیا خوشنما بھی ہے اور بظاہر خوش ذائقہ بھی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو تمہاری آزمائش کا ایک ذریعہ بنایا ہے، اور تم کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے، تاکہ وہ یہ دیکھیں کہ تم اس دنیا میں کیسا عمل کرتے ہو، کیا دنیا کی یہ ظاہری خوبصورتی اور خوشنمائی تمہیں دھوکے میں ڈال دیتی ہے اور تم اس دنیا کے پیچھے لگ جاتے ہو یا تم اللہ اور اللہ کی پیدا کی ہوئی جنت اور آخرت کو یاد کرتے ہو اور اس کی تیاری کرتے ہو؟

لہٰذا تم دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو، اس لئے کہ عورت بھی مرد کے لئے دنیا کے فتنوں میں سے ایک فتنہ ہے، اگر انسان جائز طریقے کو چھوڑ کر ناجائز طریقے سے عورت سے لطف اندوز ہو، تو پھر یہ عورت دنیا کا دھوکہ اور فریب ہے۔

حقیقی زندگی

"عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

☆ اصلاحی خطبات (۱۲/۲۲۹-۲۵۵)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرقاق، باب اکثر اهل الجنة الفقراء، رقم: ۲۷٤۲، سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول الله صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، باب ماجاء ما أخبر النبی ...... الخ، رقم: ۲۱۱۷، سنن ابن ماجه، کتاب الجهاد، رقم: ۲۸٦٤

((اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَۃِ))(۱)

''حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِاقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کرتے ہوئے فرمایا کہ اے اللہ! حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے''

یعنی دنیا کی زندگی تو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، ہیچ در ہیچ ہے۔

قبر تک تین چیزیں جاتی ہیں

''عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ((یَتْبَعُ الْمَیِّتَ ثَلَاثَۃٌ، اَھْلُہٗ وَمَالُہٗ وَعَمَلُہٗ، فَیَرْجِعُ اِثْنَانِ وَیَبْقٰی وَاحِدٌ یَرْجِعُ اَھْلُہٗ وَمَالُہٗ وَیَبْقٰی عَمَلُہٗ))(۲)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِاقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی شخص کا انتقال ہوجاتا ہے اور اس کا جنازہ قبرستان لے جایا جاتا ہے تو اس وقت میت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں، ایک عزیز و اقارب جو اس شخص کو دفن کرنے کے لئے جاتے ہیں، دوسرا اس کا مال ساتھ جاتا ہے۔(اس لئے کہ بعض جگہوں پر یہ رواج ہے کہ مرنے والے کا مال قبرستان تک ساتھ لے جاتے ہیں) اور تیسرا اس کا عمل ہے جو اس کے ساتھ جاتا ہے، پھر فرمایا کہ قبر تک اس کو پہنچانے کے بعد دو چیزیں تو واپس لوٹ آتی ہیں، ایک عزیز و اقارب اور دوسرے اس کا مال وغیرہ، اور تیسری چیز یعنی اس کا عمل، وہ اس کے ساتھ قبر میں جاتا ہے''

مال اور عزیز و اقارب کام آنے والے نہیں

اس سے معلوم ہوا کہ میت کے اہل و عیال اور عزیز و اقارب جن کو وہ اپنا محبوب سمجھتا تھا، جن

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق، رقم: ۳۷۹۱، صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب غزوۃ الأحزاب وهی الخندق، رقم:۳۳٦٦، سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول الله صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، باب مناقب أبی موسی الأشعری، رقم:۳۷۹۱، مسند أحمد بن حنبل، رقم:۸۵۹٤

(۲) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب سکرات الموت، رقم:٦۰۳۳، صحیح مسلم ،کتاب الرقاق، باب، رقم: ۵۲٦۰، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، باب باب ماجاء مثل ابن آدم وأهله وولده وماله وعمله،رقم:۲۳۰۱، سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب النهی عن سب الأموات، رقم:۱۹۱۱

کو اپنا پیارا سمجھتا تھا، جن کے ساتھ محبتیں اور تعلقات تھے، جن کے بغیر ایک پل گزارنا مشکل معلوم ہوتا تھا، وہ سب اس کو قبر کے اندر کام آنے والے نہیں، اور وہ مال جس پر اس کو بڑا فخر اور ناز تھا کہ میرے پاس اتنا مال ہے، اتنا بینک بیلنس ہے، وہ بھی سب یہاں رہ جاتا ہے، وہ چیز جو اس کے ساتھ قبر کے اندر جاتی ہے وہ اس کا عمل ہے جو اس نے دنیا میں رہ کر کیا تھا، اس کے علاوہ کوئی چیز ساتھ جانے والی نہیں ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب کسی میت کو دفن کرنے کے بعد اس کے عزیز واقارب وہاں سے جانے لگتے ہیں تو ان کے جانے کے وقت میت ان کے قدموں کی آواز سنتا ہے، اور یہ آواز اس کو یہ بتانے کے لئے سنائی جاتی ہے کہ جن لوگوں پر تم بھروسہ کیے ہوئے تھے، جن کے ساتھ تمہارے صبح وشام گزر رہے تھے، جن کی محبت پر تم نے بھروسہ کر رکھا تھا، وہ سب تمہیں اس گڑھے میں اُتار کر چلے گئے، حقیقت میں وہ تمہارا ساتھ دینے والے نہیں تھے، گویا کہ مال بھی ساتھ چھوڑ گیا اور عزیز واقارب بھی ساتھ چھوڑ گئے، صرف ایک عمل ساتھ جا رہا ہے، اب اگر نیک عمل ساتھ میں ہے تو اس صورت میں قبر کا وہ گڑھا اس نیک عمل کے نور کی وجہ سے منور ہو جاتا ہے، اس میں روشنی ہو جاتی ہے، اس میں وسعت ہو جاتی ہے، اور پھر وہ قبر کا گڑھا نہیں رہتا، بلکہ جنت کا ایک باغ بن جاتا ہے۔

قبر۔۔۔ جنت کا باغ یا جہنم کا گڑھا

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب نیک عمل والا بندہ قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس کو خطاب کر کے کہا جاتا ہے:

((نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ الَّذِىْ لَا يُوْقِظُهٗ اِلَّا اَحَبُّ اَهْلِهٖ اِلَيْهِ))(۱)

اب تمہارے لئے جنت کی کھڑکی کھول دی گی ہے، اب جنت کی ہوائیں تمہارے پاس آئیں گی، تم اس طرح سو جاؤ جس طرح دلہن سوتی ہے اور اس دلہن کو سب سے زیادہ محبوب شخص بیدار کرتا ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا بیدار نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر عمل اچھا ہے تو وہ قبر کا گڑھا ابدی راحتوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے اور وہ جنت کا ایک باغ بن جاتا ہے۔ اور خدا نہ کرے اگر عمل خراب ہے تو پھر وہ جہنم کا گڑھا بن جاتا ہے، اس کے اندر عذاب ہے، اور عذاب اور تکلیفوں کا سلسلہ قبر کے اندر ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی اس سے حفاظت فرمائے۔ اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے پناہ مانگی کہ اے اللہ! میں عذابِ قبر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔

(۱) سنن الترمذي، كتاب الجنائز، باب ما جاء في عذاب القبر، رقم: ۹۹۱

اس دنیا میں اپنا کوئی نہیں

لہٰذا اس حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ یہ حقیقت بیان فرما رہے ہیں کہ جب وہ وقت آئے گا اور لوگ قبر کے گڑھے میں تمہیں رکھ کر چلے جائیں گے، اس وقت تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس دنیا میں اپنا کوئی نہیں، نہ عزیز و اقارب اور رشتہ دار اپنے ہیں اور نہ یہ مال اپنا ہے، لیکن اس وقت پتہ چلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس لئے کہ اگر اس وقت اپنی حالت بدلنا بھی چاہے گا اور اپنی اصلاح کرنا چاہے گا تو اس کا وقت گزر چکا ہوگا، بلکہ جب وہ وقت آجائے گا تو پھر اس کو مہلت نہیں دی جائے گی، چنانچہ لوگ اپنا برا انجام دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ ایک مرتبہ ہمیں پھر دنیا میں بھیج دیجئے کہ وہاں جا کر خوب صدقہ خیرات کریں گے اور نیک عمل کریں گے، لیکن باری تعالیٰ فرمائیں گے کہ

﴿وَلَن يُؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْساً إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا﴾ (۱)

''جب موت کا وقت آجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کسی کو مؤخر نہیں کرتے''

موت کا وقت آجانے کے بعد کسی نبی کو، کسی ولی کو، کسی صحابی کو اور کسی بھی بڑے سے بڑے آدمی کو مؤخر نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا اس وقت اپنی اصلاح کا خیال آنے کا فائدہ کچھ نہیں ہے، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ پہلے سے ہمیں باخبر کر رہے ہیں کہ اس وقت کے آنے سے پہلے یہ بات سوچ لو کہ اس وقت یہ سب تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے، تم اکیلے رہ جاؤ گے اور صرف تمہارا عمل تمہارے ساتھ جائے گا۔

شکریہ اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

اس لئے حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ آج ہی سے اس بات کا استحضار کر لو، پھر تمہیں یہ نظر آئے گا کہ دنیا کی ساری لذتیں، منفعتیں، دنیا کے کاروبار، دنیا کی خواہشات ہیچ در ہیچ ہیں، اور اصل چیز وہ ہے جو آخرت کے لئے تیار کی گئی ہو۔

جہنم کا ایک غوطہ

"عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((يُؤْتٰى بِأَنْعَمِ أَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَيُصْبَغُ فِي النَّارِ صَبْغَةً ثُمَّ يُقَالُ: يَا ابْنَ آدَمَ هَلْ رَأَيْتَ خَيْرًا قَطُّ هَلْ مَرَّ بِكَ نَعِيْمٌ قَطُّ فَيَقُوْلُ: لَا وَاللّٰهِ يَا

(۱) المنافقون: ۱۱

رَبِّ! وَيُؤْتَى بِأَشَدِّ النَّاسِ بُؤْسًا فِي الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُصْبَغُ صَبْغَةً فِي الْجَنَّةِ فَيُقَالُ لَهُ يَا ابْنَ آدَمَ: هَلْ رَأَيْتَ بُؤْسًا قَطُّ هَلْ مَرَّ بِكَ شِدَّةٌ قَطُّ فَيَقُولُ: لَا وَاللّٰهِ يَا رَبِّ! مَا مَرَّبِيْ بُؤْسٌ قَطُّ وَلَا رَأَيْتُ شِدَّةً قَطُّ))(۱)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک ایسے شخص کو بلائیں گے جس کی ساری زندگی نعمتوں میں گزری ہوگی، اور دنیا کے تمام انسانوں میں سب سے زیادہ جس کو دنیا کی نعمتیں میسر آئی ہوں گی، یعنی مال سب سے زیادہ، اہل وعیال زیادہ، نوکر چاکر، دوست احباب، کوٹھی بنگلے، اور دنیا کے اسبابِ عیش وعشرت سب سے زیادہ اس کو ملے ہوں گے، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ بلائیں گے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ جب سے یہ دنیا پیدا ہوئی، اس وقت سے لے کر قیامت کے دن تک جتنے انسان پیدا ہوئے، ان میں سے ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے گا جو اس دنیا میں سب سے زیادہ مالدار، سب سے زیادہ خوشحال اور سب سے زیادہ خوش وخرم رہا ہوگا، اور اس کو جہنم کے اندر ایک غوطہ دیا جائے گا اور ملائکہ سے کہا جائے گا کہ اس کو جہنم کے اندر ایک غوطہ دلا کر لے آؤ، پھر اس شخص سے پوچھا جائے گا کہ اے ابن آدم! کیا تم نے کبھی کوئی راحت اور آرام اور خوشحالی دیکھی ہے؟ کیا تم پر کبھی کوئی نعمت گزری، یعنی مال و دولت، عیش و آرام کچھ ملا ہے؟ وہ شخص جواب میں کہے گا کہ اے پروردگار! میں نے کبھی راحت و آرام، عیش وعشرت، مال و دولت کی شکل تک نہیں دیکھی۔ وہ ساری عمر جو دنیا کے اندر نعمتوں میں، راحتوں میں، مال و دولت میں، عیش و آرام میں گزاری تھی، جہنم کے ایک غوطے سے وہ سب نعمتیں اور راحتیں بھول جائے گا، اس لئے کہ اس ایک غوطے میں اس کو اتنی اذیت، اتنی تکلیف اور اتنا عذاب اور اتنی پریشانی ہوگی کہ وہ اس کی وجہ سے دنیا کی نعمتیں بھول جائے گا۔

جنت کا ایک چکر

اس کے بعد ایک ایسے شخص کو بلایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ تنگ دستی، پریشانی اور فقر وفاقے کا شکار رہا ہوگا، گویا کہ دنیا میں اس نے اس طرح زندگی گزاری ہوگی کہ کبھی راحت و آرام کی شکل ہی نہیں دیکھی ہوگی، اس کو بلا کر جنت کا ایک چکر لگوایا جائے گا اور فرشتوں سے کہا جائے گا کہ اس کو ذرا جنت میں سے ایک مرتبہ گزار کر لے آؤ اور پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ اے آدم کے بیٹے! کیا کبھی تم نے فقر وفاقہ دیکھا؟ کیا کبھی تم پر سختی اور پریشانی کا زمانہ گزرا؟ وہ جواب میں کہے گا کہ خدا کی

(۱) صحیح مسلم، كتاب صفات المنافقين، باب صبغ أنعم أهل الدنيا في النار، رقم: ۵۰۲۱، مسند أحمد، رقم: ۱۲۶۳۸

قسم! میرے اُوپر تو کبھی کوئی سختی اور پریشانی کا زمانہ نہیں گزرا اور کبھی مجھ پر فقروفاقہ نہیں گزرا۔ اس لئے کہ دنیا کی ساری زندگی جو مصیبت، پریشانی اور آلام میں گزاری تھی، جنت کا ایک چکر لگانے کے بعد وہ سب بھول جائے گا۔

دنیا بے حقیقت چیز ہے

یہ سب حضورِ اقدس ﷺ کی بتائی ہوئی باتیں ہیں اور ان کے بتانے کا مقصد یہ ہے کہ یہ دنیا کی نعمتیں آخرت کے مقابلے میں اتنی بے حقیقت، اتنی ناپائیدار اور ہیچ در ہیچ ہیں کہ جہنم کی ذرا سی تکلیف کے سامنے دنیا کی ساری راحتیں انسان بھول جائے گا، اور ساری عمر کی تکلیفیں اور مصائب و آلام جنت کا ایک چکر لگانے کے بعد بھول جائے گا۔ یہ دنیا اتنی بے حقیقت چیز ہے، جس کی خاطر تم دن رات دوڑ دھوپ میں لگے ہوئے ہو، صبح سے لے کر شام تک، شام سے لے کر صبح تک ہر وقت دماغ پر یہی فکر مسلط ہے کہ کس طرح دنیا زیادہ سے زیادہ کمالوں؟ کس طرح پیسے جوڑلوں؟ کس طرح مکان بنالوں؟ کس طرح زیادہ سے زیادہ اسبابِ عیش و عشرت جمع کرلوں؟ دن رات بس اسی کی دوڑ دھوپ ہے، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ فرمارہے ہیں کہ ذرا سوچ لو کہ کس چیز کی طلب میں تم لگے ہوئے ہو، اور اس کے مقابلے میں آخرت کی نعمتیں اور تکلیفیں بھولے ہوئے ہو۔ ''زہد'' اسی کا نام ہے کہ انسان دنیا کی حقیقت کو پہچان لے اور دنیا کے ساتھ وہی معاملہ کرے جس کی وہ مستحق ہے، اور آخرت کے ساتھ وہ معاملہ کرے جس کی وہ مستحق ہے۔

دنیا کی حیثیت ایک پانی کا قطرہ ہے

عَنِ الْمُسْتَوْرَدِ بْنِ شَدَّادٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((وَاللّٰهِ مَا الدُّنْیَا فِی الْآخِرَةِ إِلَّا مِثْلُ مَا یَجْعَلُ أَحَدُکُمْ إِصْبَعَهٗ فِی الْیَمِّ فَلْیَنْظُرْ بِمَ تَرْجِعُ)) (۱)

''حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی انگلی سمندر میں ڈالے اور پھر وہ انگلی نکال لے''

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب فناء الدنیا، رقم: ۵۱۰۱، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، رقم: ۲۲۴۵، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، رقم: ۴۰۹۸، مسند أحمد، رقم: ۱۷۳۲۲

یعنی اس انگلی پر جتنا پانی لگا ہوا ہوگا، آخرت کے مقابلے میں دنیا کی اتنی بھی حیثیت نہیں، اس لئے کہ سمندر پھر بھی متناہی ہے، غیر متناہی نہیں ہے، اور آخرت کی نعمتیں غیر متناہی ہیں، لافانی ہیں، کبھی ختم ہونے والی نہیں ہیں، اس لئے دنیا کی آخرت کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہیں ہے جو نسبت سمندر کو انگلی میں لگے ہوئے پانی سے ہوتی ہے، لیکن سمجھانے کے لئے فرمایا کہ دنیا بس اتنی ہے جتنا انگلی ڈبونے سے پانی لگ جاتا ہے، باقی آخرت ہے۔

اب عجیب بات یہ ہے کہ انسان صبح سے شام تک اس انگلی پر لگے ہوئے پانی کی فکر میں تو ہے اور اس سمندر کو بھولا ہوا ہے جس سمندر کے ساتھ مرنے کے بعد واسطہ پیش آنا ہے۔ اور خدا جانے اس کے ساتھ کب واسطہ پیش آجائے، آج پیش آجائے، کل پیش آجائے، کسی وقت کی گارنٹی نہیں، ہر لمحے پیش آسکتا ہے۔ اسی غفلت کے پردے کو اُٹھانے کے لئے حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے کہ آنکھوں پر جو غفلت کا پردہ پڑا ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں دن رات کی دوڑ دھوپ اس انگلی میں لگے ہوئے پانی پر لگی ہوئی ہے، اس سے توجہ ہٹا کر آخرت کے سمندر کی طرف توجہ لگائیں۔

دنیا ایک مردار بکری کے بچے کے مثل ہے

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِالسُّوْقِ وَالنَّاسُ كَنَفَتَهُ فَمَرَّ بِجَدْيٍ أَسَكَّ مَيِّتٍ فَتَنَاوَلَهُ فَأَخَذَ بِأُذُنِهِ ثُمَّ قَالَ ((أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنَّ هٰذَا لَهُ بِدِرْهَمٍ)) فَقَالُوْا: مَا نُحِبُّ أَنَّهُ لَنَا بِشَيْءٍ وَمَا نَصْنَعُ بِهِ؟ قَالَ ((أَتُحِبُّوْنَ أَنَّهُ لَكُمْ؟)) قَالُوْا وَاللّٰهِ لَوْ كَانَ حَيًّا كَانَ عَيْبًا فِيْهِ لِأَنَّهُ أَسَكُّ فَكَيْفَ وَهُوَ مَيِّتٌ! فَقَالَ ((فَوَاللّٰهِ لَلدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ))(۱)

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک بازار میں گزرے، اور آپ کے دونوں طرف لوگ چل رہے تھے، تو آپ بکری کے ایک مردار بچے کے پاس سے گزرے۔ وہ بکری کا بچہ بھی عیب دار تھا، یعنی چھوٹے کانوں والا تھا اور مردار بھی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مردار بچے کو کان سے پکڑ کر اُٹھایا اور پھر فرمایا:

''تم میں سے کون شخص بکری کے اس مردار بچے کو ایک درہم میں خریدنے کے لئے تیار ہے؟''

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزهد، باب، رقم: ۵۲۵۷، سنن أبي داؤد، کتاب الطهارة، رقم: ۱۵۸، مسند أحمد، رقم: ۱۴۴۰۲

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ایک درہم تو کیا، معمولی چیز کے بدلے میں بھی اس کو کوئی لینے کو تیار نہیں ہے، ہم اس کو لے کر کیا کریں گے؟ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک درہم میں نہ سہی، کیا تم میں سے کوئی اس کو مفت میں لینے کو تیار ہے؟''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ خدا کی قسم! اگر یہ بچہ زندہ بھی ہوتا تو بھی یہ عیب دار تھا، اس لئے کہ اس کے کان چھوٹے ہیں، تو جب زندہ لینے کے لئے کوئی تیار نہ ہوتا تو مردار لینے کو کون تیار ہوگا؟

اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تمہاری نظروں میں بکری کے اس مردار بچے کی لاش جتنی بے حقیقت اور ذلیل چیز ہے، اس سے زیادہ بے حقیقت اور ذلیل چیز یہ دنیا ہے جو تمہارے سامنے ہے۔ تم میں سے کوئی شخص بھی اس مردار بچے کو مفت میں لینے کو بھی تیار نہیں، اور وہ دنیا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے زیادہ بے حقیقت اور ذلیل ہے، تم اس کے پیچھے دن رات پڑے ہوئے ہو''

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا یہ انداز تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جگہ جگہ اور قدم قدم پر اس دنیا کی بے ثباتی بتانے کے لئے آپ ایسی باتیں ارشاد فرماتے تھے۔

اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کردوں

وَعَنْ أَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْه قَالَ: كُنْتُ أَمْشِیْ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ حَرَّةِ الْمَدِیْنَةِ فَاسْتَقْبَلَنَا أُحُدٌ فَقَالَ ((یَا أَبَا ذَرٍّ!)) قُلْتُ: لَبَّیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ ((مَا یَسُرُّنِیْ أَنَّ عِنْدِیْ مِثْلَ أُحُدٍ هٰذَا ذَهَبًا تَمْضِیْ عَلَیَّ ثَلَاثَةُ أَیَّامٍ وَعِنْدِیْ مِنْهُ دِیْنَارٌ إِلَّا شَیْئًا أَرْصُدُهُ لِدَیْنٍ إِلَّا أَنْ أَقُوْلَ بِهِ فِیْ عِبَادِ اللّٰهِ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا عَنْ یَمِیْنِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ وَمِنْ خَلْفِهِ)) ثُمَّ مَشٰی فَقَالَ ((إِنَّ الْأَكْثَرِیْنَ هُمُ الْأَقَلُّوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ إِلَّا مَنْ قَالَ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا عَنْ یَمِیْنِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ وَمِنْ خَلْفِهِ وَقَلِیْلٌ مَا هُمْ)) ثُمَّ قَالَ لِیْ مَكَانَكَ لَا تَبْرَحْ.........الخ (1)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ما یسرنی أن عندی مثلا أحد، رقم:۵۹٦۳، صحیح مسلم، کتاب الایمان عن رسول اللہ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، رقم:۲۵٦۸، مسند أحمد، رقم:۲۰۳۸۵

''حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بھی درویش صحابی ہیں، فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضورِاقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے ''حرہ'' سے گزر رہا تھا، ''حرہ'' کالے پتھر والی زمین کو کہا جاتا ہے، جن حضرات کو مدینہ منورہ حاضری کا موقع ملا ہے، انہوں نے دیکھا ہوگا کہ مدینہ منورہ کے چاروں طرف کالے پتھروں والی زمین ہے، اس کو ''حرہ'' کہا جاتا ہے، راستے میں حضورِاقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے ہمارے سامنے اُحد پہاڑ آگیا اور وہ ہمیں نظر آنے لگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اے ابوذر!''

میں نے عرض کیا ''یارسول اللہ! میں حاضر ہوں، کیا بات ہے؟''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے ابوذر! یہ تمہیں سامنے جو اُحد پہاڑ نظر آرہا ہے، اگر یہ سارا پہاڑ سونے کا بنا کر مجھے دے دیا جائے، تب بھی مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ تین دن مجھ پر اس حالت میں گذریں کہ اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی رہے، ہاں اگر میرے اُوپر کسی کا قرضہ ہے تو صرف قرضہ اُتارنے کے لئے جتنے دینار کی ضرورت ہو وہ تو رکھ لوں، اس کے علاوہ ایک دینار بھی میں اپنے پاس رکھنے کے لئے تیار نہیں، اور وہ مال میں اس طرح اور اس طرح اور اس طرح مٹھیاں بھر بھر کے لوگوں میں تقسیم کردوں''

وہ کم نصیب ہوں گے

پھر آگے فرمایا:

((اِنَّ الْاَکْثَرِیْنَ هُمُ الْاَقَلُّوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِلَّا مَنْ قَالَ هٰکَذَا وَهٰکَذَا وَهٰکَذَا عَنْ یَمِیْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَمِنْ خَلْفِهٖ وَقَلِیْلٌ مَا هُمْ))

''یادرکھو! دنیا میں جن کے پاس مال و دولت بہت زیادہ ہے، بڑے بڑے مالدار، بڑے بڑے سرمایہ دار، بڑے بڑے دولت مند، وہ قیامت کے دن بہت کم نصیب ہوں گے''

یعنی دنیا میں جتنی دولت زیادہ ہے، قیامت میں اس کے حساب سے آخرت کی نعمتوں میں ان کا حصہ دوسروں کے مقابلے میں کم ہوگا، سوائے ان دولت مندوں کے جو اپنی دولت کو اس طرح خرچ کریں اور اس طرح خرچ کریں اور اس طرح خرچ کریں، یعنی مٹھیاں بھر بھر کے اللہ کے راستے

میں خیرات کریں، لہٰذا جو ایسا کریں گے وہ تو محفوظ رہیں گے اور جو ایسا نہیں کریں گے، تو پھر یہ ہوگا کہ جتنی دولت زیادہ ہوگی، آخرت میں اتنا ہی کم حصہ ہوگا۔ اور پھر فرمایا کہ دنیا میں جن کے پاس دولت زیادہ ہے اور وہ دنیا میں خیرات وصدقات کر کے آخرت میں اپنا حصہ بڑھا لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔

حضور ﷺ کا حکم نہ ٹوٹے

ساری باتیں راستے میں گزرتے ہوئے ہو رہی تھیں، پھر ایک جگہ پہنچ کر حضور اقدس ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم اس جگہ ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد رات کے اندھیرے میں حضور اقدس ﷺ کہیں تشریف لے گئے اور مجھے پتہ نہیں چلا کہ آپ کہاں تشریف لے گئے، یہاں تک کہ آپ نظروں سے اوجھل ہو گئے، اس کے بعد مجھے کوئی آواز سنائی دی، اس آواز کے نتیجے میں مجھے یہ خوف ہوا کہ کوئی دشمن حضور اقدس ﷺ کے سامنے آ گیا ہو اور اس کی یہ آواز ہو، اس لئے میں نے آپ ﷺ کے پاس جانے کا ارادہ کیا، لیکن مجھے یاد آیا کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا تھا کہ اپنی جگہ سے مت ہلنا۔ یہ تھے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، جب حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمادیا کہ اپنی جگہ سے مت ہلنا اور یہیں رہنا، اس کے بعد آواز آنے کے نتیجے میں یہ خطرہ بھی ہوا کہ کہیں کوئی شخص حضور اقدس ﷺ کو نقصان نہ پہنچا دے، لیکن حضور ﷺ کا ارشاد یاد آ گیا کہ یہیں ٹھہرنا، کہیں مت جانا، اس لئے میں وہاں بیٹھا رہا۔

صاحبِ ایمان جنت میں ضرور جائے گا

تھوڑی دیر میں حضور اقدس ﷺ تشریف لے آئے تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک آواز سنی تھی جس کی وجہ سے مجھے آپ کے اُوپر خطرہ ہونے لگا تھا۔ حضور اقدس ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم نے وہ آواز سنی تھی؟ میں نے کہا: جی ہاں! میں نے وہ آواز سنی تھی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ آواز درحقیقت حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تھی، حضرت جبرئیل علیہ السلام میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ یا رسول اللہ! آپ کی اُمت میں سے جو شخص بھی اس حالت میں مر جائے کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو، یعنی کفر کا کوئی کلمہ نہ کہا ہو، بلکہ توحید کی حالت میں مر گیا اور توحید پر ایمان رکھتے ہوئے دنیا سے گزر گیا تو وہ ضرور جنت میں جائے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی وقت ضرور جنت میں جائے گا۔ اگر برے اعمال کیے ہیں تو برے اعمال کی سزا پا کر جائے گا، لیکن جنت میں ضرور جائے گا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: یا رسول اللہ! کیا اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو، تب بھی وہ جنت میں جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ چاہے اس نے زنا کیا ہو، اور چاہے اس نے چوری کی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر چہ اس نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہو، لیکن دل میں ایمان ہے تو آخر میں کسی نہ کسی وقت انشاء اللہ جنت میں پہنچ جائے گا، البتہ جن گناہوں کا ارتکاب کیا، جو بداعمالیاں کیں، ان کی سزا میں پہلے جہنم میں جائے گا اور اس کو گناہوں کی سزا دینے کے لئے جہنم میں رکھا جائے گا۔ اگر بدکاری کی تھی، چوری کی تھی، ڈاکے ڈالے تھے، غیبت کی تھی، جھوٹ بولا تھا، رشوت لی تھی، سود کھایا تھا، ان سب گناہوں کی سزا پہلے جہنم میں دی جائے گی پھر ایمان کی بدولت انشاء اللہ آخر میں کسی نہ کسی وقت جنت میں پہنچ جائے گا۔

گناہوں پر جرأت مت کرو

لیکن کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ چلو جنت کی خوشخبری مل گئی ہے کہ آخر میں تو جنت میں جانا ہی ہے، لہٰذا خوب گناہ کرتے جاؤ، اس میں کوئی حرج نہیں۔ خوب سن لیجئے! ابھی آپ پیچھے ایک حدیث سن آئے ہیں کہ دنیا کے اندر عیش و عشرت اور راحت و آرام میں زندگی گزارنے والے کو جہنم میں صرف ایک غوطہ دیا گیا تو اس ایک غوطے نے دنیا کی ساری خوشیاں اور سارے عیش و آرام کو بھلا دیا، ساری دنیا ہیچ معلوم ہونے لگی، ساری خوشیاں غارت ہو گئیں، اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ دنیا میں کوئی خوشی اور کوئی راحت حاصل نہیں کی۔ لہٰذا جہنم کے ایک غوطے کی بھی کسی کو سہار اور برداشت ہے؟ اس لئے یہ حدیث ہم لوگوں کو گناہوں پر جری نہ کرے کہ جنت میں جانا ہی ہے، اس لئے گناہ کرتے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔

دنیا میں مسافر کی طرح رہو

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: أَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْكِبِيْ فَقَالَ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ))(۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھا، کندھوں پر ہاتھ رکھنا بڑی شفقت، بڑی محبت، بڑے پیار کا انداز ہے اور اس کے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: کن فی الدنیا کأنك غریب. رقم: ۵۹۳۷، سنن الترمذی، کتاب الزھد، رقم: ۲۲۵۵، سنن ابن ماجه، کتاب الزھد، رقم: ۴۱۰۴، مسند أحمد، رقم: ۴۵۳۴

بعد فرمایا:

''دنیا میں اس طرح رہو جیسے اجنبی ہو یا راستے کے راہی اور مسافر ہو''

یعنی جیسے مسافر سفر کے دوران کہیں کسی منزل پر ٹھہرا ہوا ہوتا ہے، تو وہ یہ نہیں کرتا کہ اس منزل ہی کی فکر میں لگ جائے اور جس مقصد کے لئے سفر کیا تھا، وہ مقصد بھول جائے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص یہاں سے لاہور کسی کام کے لئے گیا، اب جس مقصد کے لئے لاہور آیا تھا، وہ کام تو بھول گیا اور اس فکر میں لگ گیا کہ یہاں اپنے لئے مکان بنالوں اور یہاں اسبابِ عیش و عشرت جمع کرلوں، اس شخص سے زیادہ احمق کون ہوگا۔

دنیا ایک ''خوبصورت جزیرے'' کے مانند ہے

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ ایک جہاز کہیں جا رہا تھا اور وہ پورا جہاز مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ راستے میں ایک جزیرہ آیا تو جہاز کے کپتان نے اس جزیرہ پر جہاز کو روک دیا تاکہ آگے کے سفر کے لئے کچھ راشن اور ضرورت کا سامان لے لیا جائے۔ اور اس کپتان نے اعلان کر دیا کہ ہمیں چونکہ چند گھنٹوں کے لئے اس جزیرے پر ٹھہرنا ہے، لہٰذا اگر کوئی مسافر اس جزیرے پر اُترنا چاہے تو اُتر سکتا ہے، ہماری طرف سے اجازت ہے۔ چنانچہ جہاز پر جتنے لوگ سوار تھے، سب کے سب اُتر کر جزیرے کی سیر کے لئے چلے گئے۔ جزیرہ بڑا شاندار اور خوشنما تھا، اس میں بہت خوبصورت قدرتی مناظر تھے، چاروں طرف قدرتی مناظر کا حسن و جمال بکھرا ہوا تھا، لوگ ان خوبصورت مناظر سے بہت محظوظ ہوتے رہے، یہاں تک کہ جہاز کی روانگی کا وقت قریب آگیا تو کچھ لوگوں نے سوچا کہ اب واپس چلنا چاہئے، روانگی کا وقت آرہا ہے، چنانچہ وہ لوگ جہاز پر واپس آگئے اور جہاز کی عمدہ اور اعلیٰ اور آرام دہ جگہوں پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے، دوسرے کچھ لوگوں نے سوچا کہ یہ جزیرہ تو بہت خوبصورت اور بہت خوشنما ہے، ہم تھوڑی دیر اور اس جزیرے میں رہیں گے اور لطف اندوز ہوں گے، چنانچہ تھوڑی دیر اور گھومنے کے بعد خیال آیا کہ کہیں جہاز روانہ نہ ہو جائے اور جہاز کی طرف دوڑے ہوئے آئے، یہاں آکر دیکھا کہ جہاز کی اچھی اور عمدہ جگہوں پر قبضہ ہو چکا ہے، چنانچہ ان کو بیٹھنے کے لئے خراب اور گھٹیا جگہیں مل گئیں اور وہ وہیں بیٹھ گئے اور یہ سوچا کہ کم از کم جہاز پر تو سوار ہو گئے۔ کچھ لوگ اور تھے، انہوں نے سوچا کہ یہ جزیرہ تو بڑا شاندار ہے، یہاں تو بہت مزہ آرہا ہے، جہاز میں مزہ نہیں آرہا تھا، چنانچہ وہ اس جزیرے پر رک گئے اور ان خوبصورت قدرتی مناظر میں اتنے بدمست ہوئے کہ ان کو واپسی کا خیال بھی بھول گیا، اتنے میں جہاز روانہ ہو گیا اور وہ لوگ اس میں سوار نہ ہو سکے۔ دن کے وقت تو وہ جزیرہ بہت خوشنما معلوم ہو رہا تھا اور اس کے مناظر بہت حسین معلوم

ہو رہے تھے، لیکن جب شام کو سورج غروب ہوگیا اور رات سر پر آ گئی تو وہی خوبصورت جزیرہ رات کے وقت بھیانک بن گیا کہ اس خوبصورت جزیرے میں ایک لمحہ گزارنا مشکل ہوگیا، کہیں درندوں کا خوف، کہیں جانوروں کا خوف۔

اب بتایئے! وہ قوم جو جزیرے کے حسن و جمال میں اتنی محو ہوگئی کہ جو جہاز جارہا تھا، اس کو چھوڑ دیا، وہ قوم کتنی احمق اور بے وقوف ہے۔

یہ مثال بیان کرنے کے بعد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس دنیا کی مثال اس جزیرے جیسی ہے، لہٰذا اس دنیا میں دل لگا کر بیٹھ جانا اور اس کی خوشنمائیوں پر فریفتہ ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے وہ قوم جو اس جزیرے کی خوشنمائیوں پر فریفتہ ہوگئی تھی، اور جس طرح اس جزیرے پر رہنے والوں کو ساری دنیا احمق اور بیوقوف کہے گی، اسی طرح اس دنیا پر دل لگانے والوں کو بھی دنیا احمق اور بیوقوف کہے گی۔

دنیا سفر کی ایک منزل ہے، گھر نہیں

اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ دنیا میں اس طرح رہو جیسے ایک مسافر رہتا ہے اور جیسے ایک اجنبی آدمی رہتا ہے، اس لئے کہ یہ دنیا سفر کی ایک منزل ہے، خدا جانے اصل وطن کی طرف روانگی کا وقت کب آجائے۔ ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَا دَارَ لَهُ وَلَهَا يَجْمَعُ مَنْ لَا عَقْلَ لَهُ))(۱)

''یہ دنیا اس کا شخص کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو، اور اس کے لئے وہ شخص جمع کرتا ہے جس کے پاس عقل نہ ہو''

یعنی کیا تم اس دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہو؟ حالانکہ یہ دیکھو کہ انسان کا اپنا گھر کونسا ہوتا ہے؟ انسان کا اپنا گھر وہ ہوتا ہے جس میں انسان کو مکمل اقتدار حاصل ہو، اس کے قبضے میں ہو، اس کی ملکیت میں ہو، جس وقت تک چاہے وہ اس میں رہے اور اس میں داخل ہونے سے کوئی نہ روک سکے، اور اس کو اس میں سے کوئی باہر نہ نکال سکے، وہ حقیقت میں اپنا گھر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کسی دوسرے شخص کے گھر میں داخل ہو کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ میرا گھر ہے، اس لئے کہ دوسرے کے گھر پر اقتدار حاصل نہیں، اور اپنا گھر وہ ہے جس پر اقتدار حاصل ہو۔

اب آپ سوچئے کہ اس دنیا کے گھر پر کس قسم کا اقتدار آپ کو حاصل ہے؟ آپ کے اقتدار کا یہ حال ہے کہ جس دن آنکھ بند ہوئی، اس دن سارے گھر والے مل کر آپ کو قبر کے گڑھے میں پھینک کر

(۱) مسند أحمد، حديث السيدة عائشة، رقم: ۲۳۲۸۳

آجائیں گے، اب اس گھر سے آپ کا کوئی تعلق نہیں، وہ گھر کسی بھی وقت آپ سے چھن جائے گا، اور یہ مال و دولت بھی کسی وقت آپ سے چھن جائے گا، لہٰذا جس گھر پر اتنا اقتدار بھی آپ کو حاصل نہیں، اس کو آپ اپنا گھر کیسے سمجھتے ہو؟ اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کو آخرت کا وہ گھر ملنے والا نہیں ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے، جس پر ہمیشہ قبضہ رہے گا، وہ گھر کبھی ہاتھ سے نکلنے والا نہیں، لہٰذا آخرت میں جس کا گھر نہ ہو، وہ اس دنیا کو اپنا گھر بنائے۔

دنیا کو دل و دماغ پر حاوی نہ ہونے دو

پھر آگے دوسرا جملہ ارشاد فرمایا کہ اس کے لئے وہ شخص مال و دولت جمع کرتا ہے جس کو عقل نہ ہو۔ ان احادیث سے درحقیقت یہ بتلانا مقصود ہے کہ اس میں ضرور رہو، لیکن اس کی حقیقت سمجھ کر رہو، اس کو اپنے دل اور خیالات پر حاوی نہ ہونے دو، بلکہ یہ سمجھو کہ یہ دنیا راستے کی ایک منزل ہے جیسے تیسے گزر ہی جائے گی، لیکن اصل فکر آخرت کی ہونی چاہئے، یہ نہ ہو کہ صبح سے لے کر شام تک اسی کی دھن اور دھیان ہے، اسی کی سوچ اور اسی کی فکر ہے، یہ مسلمان کا کام نہیں، مسلمان کا کام تو یہ ہے کہ بقدرِ ضرورت دنیا کو اختیار کرے اور زیادہ فکر آخرت کی کرے۔

دل میں دنیا ہونے کی ایک علامت

دل میں دنیا کی محبت ہے یا نہیں، اس کی پہچان اور علامت کیا ہے؟ اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ صبح سے لے کر شام تک تمہاری فکر اور سوچ کیا رہتی ہے، کیا ہر وقت یہ فکر رہتی ہے کہ زیادہ پیسے کہاں سے کما لوں؟ مال کس طرح جمع کرلوں؟ یا اس کا خیال بھی آتا ہے کہ مجھے مرنا بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے، اگر مرنے کا خیال اور آخرت کا خیال آتا ہے، پھر تو الحمدللہ، دنیا کی محبت کی مذمت جو قرآن و حدیث میں وارد ہوئی ہے، وہ آپ کے دل میں نہیں۔ ہاں! اگر صبح سے لے کر شام تک دل و دماغ پر یہی چھایا ہوا ہے کہ کس طرح دنیا جمع کرلوں تو پھر وہ آخرت کو بھولے ہوئے ہے اور دنیا کی محبت دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔

ایک سبق آموز قصہ

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''گلستان'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ میں ایک مرتبہ سفر کر رہا تھا۔ سفر کے دوران میں نے ایک تاجر کے گھر میں قیام کیا۔ اس تاجر نے ساری رات میرا دماغ چاٹا اور اپنی تجارت کے قصے مجھے سناتا رہا کہ فلاں جگہ میری یہ تجارت ہے، ہندوستان میں فلاں کاروبار

ہے، ایران میں فلاں چیز کا کاروبار ہے، خراسان میں فلاں چیز کا کاروبار ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سارے قصے سنانے کے بعد آخر میں کہنے لگا کہ میری تمام آرزوئیں تو پوری ہوگئیں، میری تجارت پروان چڑھ گئی ہے، البتہ اب مجھے ایک آخری سفر تجارت کے لئے کرنے کا ارادہ ہے، آپ دعا کر دیجئے کہ میرا وہ سفر کامیاب ہو جائے تو اس کے بعد قناعت کی زندگی اختیار کرلوں گا اور بقیہ زندگی دکان پر بیٹھ کر گزار لوں گا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا کہ وہ آخری سفر کہاں کا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں یہاں سے فلاں سامان خرید کر چین جاؤں گا، وہاں اس کو فروخت کروں گا، پھر چین سے چینی شیشہ خرید کر روم لے جا کر فروخت کروں گا، اس لئے کہ چینی شیشہ روم میں اچھے داموں میں فروخت ہوتا ہے، پھر روم سے فلاں سامان لے کر اسکندریہ جاؤں گا اور وہاں اس کو فروخت کروں گا، پھر اسکندریہ سے قالین ہندوستان لے جا کر فروخت کروں گا، اور ہندوستان سے گلاس خرید کر حلب لے جا کر فروخت کروں گا، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح اس نے ساری دنیا کے طویل سفر کا منصوبہ پیش کیا اور کہا کہ دعا کرو کہ میرا یہ منصوبہ کسی طرح پورا ہو جائے تو اس کے بعد بقیہ زندگی قناعت کے ساتھ اپنی دکان پر گزار دوں گا۔ یعنی یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی بقیہ زندگی دکان پر گزارے گا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد میں نے اس سے کہا کہ۔

آں شنید استی کہ در صحرائے غور
بار سالارے بیفتاد از ستور
گفت چشمِ تنگِ دنیادار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

میں نے اس سے کہا کہ تم نے یہ قصہ سنا ہے کہ غور کے صحراء میں ایک بہت بڑے سوداگر کا سامان اس کے خچر سے گرا ہوا پڑا تھا، اس کا خچر بھی مرا ہوا پڑا تھا اور خود وہ سوداگر بھی مرا ہوا پڑا تھا، اور وہ سامان اپنی زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا دار کی تنگ نگاہ کو یا قناعت پُر کر سکتی ہے یا قبر کی مٹی پُر کر سکتی ہے، اس کی تنگ نگاہ کو تیسری کوئی چیز پُر نہیں کر سکتی۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب یہ دنیا انسان کے اُوپر مسلط ہو جاتی ہے تو اس کے دل میں دنیا کے سوا دوسرا خیال نہیں آتا۔ یہ ہے ''حبِ دنیا'' جس سے منع کیا گیا ہے۔ اگر یہ ''حبِ دنیا'' نہ ہو اور پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مال دیدے اور اس مال کے ساتھ دل اٹکا ہوا نہ ہو اور وہ مال اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی میں رکاوٹ نہ بنے، بلکہ وہ مال اللہ تعالیٰ کے احکام بجالانے میں صرف ہو، تو پھر وہ مال دنیا نہیں ہے بلکہ وہ مال بھی آخرت کا سامان ہے۔ لیکن اگر اس مال کے ذریعہ آخرت

کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوگئی تو وہ حبِ دنیا ہے، جس سے روکا گیا ہے۔
یہ ساری تفصیل کا خلاصہ ہے۔

دنیا کی محبت دل سے نکالنے کا طریقہ

البتہ "حبِ دنیا" کو دل سے نکالنے اور آخرت کی فکر دل میں پیدا کرنے کا راستہ یہ ہے کہ چوبیس گھنٹے میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر اس بات کا مراقبہ کیا کرو۔ ہم لوگ غفلت میں دن رات گزار رہے ہیں، مرنے سے غافل ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے سے غافل ہیں، حساب و کتاب سے غافل ہیں، جزا و سزا سے غافل ہیں، آخرت سے غافل ہیں، لہٰذا ہم لوگ ان چیزوں کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے، اس لئے تھوڑا سا وقت نکال کر ہر شخص مراقبہ کیا کرے کہ ایک دن مروں گا، کس طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے میری پیشی ہوگی؟ کیا سوال ہوں گے اور مجھے کیا جواب دینا ہوگا؟ ان سب باتوں کا استحضار کرے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی روزانہ ان باتوں کا مراقبہ کیا کرے تو چند ہی ہفتوں میں انشاء اللہ وہ یہ محسوس کرے گا کہ دنیا کی محبت دل سے نکل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

فکرِ آخرت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ (۱)

حضرات علماء کرام، بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز، وکارکنان مجلس صیانۃ المسلمین ساہیوال! یہ میرے لئے بہت عظیم سعادت کا موقع ہے کہ آج اپنے محترم بزرگوں کی زیارت اور صحبت سے استفادہ کا موقع اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمایا۔

ہماری ایک بیماری

میں نے ایک آیت تلاوت کی جو سورۂ اعلیٰ کی آیت ہے اور قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی آیت لے لیجئے، وہ الفاظ کے اعتبار سے مختصر ہوگی، لیکن اگر اس کے معنی اور مفہوم کو دیکھا جائے اور اس کی گہرائی میں جایا جائے تو تنہا وہ چھوٹی سی آیت بھی انسان کی پوری زندگی کا دستور بن جاتی ہے۔ یہ چھوٹی سی آیت ہے، اس میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ (۲)

اس آیت میں اللہ جل جلالہ نے ہماری آپ کی ایک بنیادی بیماری کی تشخیص فرمائی ہے کہ تمہارے اندر یہ بیماری پائی جاتی ہے۔

اور وہ ایسی بیماری ہے کہ جو زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے لئے تباہی اور ہلاکت لانے والی ہے۔ وہ بیماری بتائی اور پھر اس بیماری کا علاج بتایا۔ دو مختصر جملوں میں بیماری بھی بتادی، بیماری کا علاج بھی بتادیا، یہ بھی بتایا کہ تمہارے اندر کیا خرابی ہے، اور یہ بھی بتادیا کہ اس خرابی سے بچنے کا راستہ کیا ہے۔ فرمایا:

☆ اصلاحی خطبات (۹/ ۲۵۷۔ ۲۷۷)، بعد از نماز عشاء، ۱۴ مارچ ۱۹۸۸ء، جامع مسجد حقانیہ، ساہیوال، سرگودھا

(۱) الاعلیٰ: ۱۶۔۱۷ (۲) الاعلیٰ: ۱۶۔۱۷

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾ (۱)

تمہاری بنیادی خرابی یہ ہے کہ تم ہر معاملے میں اس دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، دنیوی زندگی کے دائرے میں رہ کر سوچتے ہو، اسی کی بھلائی، اسی کی فلاح، اسی کی خوشحالی ہر وقت تمہارے پیش نظر رہتی ہے۔ اور اس دنیوی زندگی کو تم کس پر ترجیح دیتے ہو؟ مرنے کے بعد والی آخرت والی زندگی پر — اس پر ترجیح دیتے ہو۔ یہ تو تمہاری بیماری ہے، اور اب بیماری کا علاج کیا ہے؟

اس بیماری کا علاج

علاج یہ ہے کہ ذرا یہ بات سوچو کہ یہ دنیا جس کی خاطر تم دوڑ دھوپ کر رہے ہو، تمہاری مسلسل جدوجہد، تمہاری دوڑ دھوپ، تمہاری شب و روز کی کوشش ساری اسی دنیا کی خوشحالی کے گرد گھوم رہی ہیں۔ تمہاری کوشش یہ ہے کہ میرا مکان اچھا بن جائے، مجھے پیسے مل جائیں، میری دنیا میں عزت ہو، لوگ میرا نام جانیں، لوگوں میں میری شہرت ہو جائے، مجھے بڑا منصب مل جائے، مجھے بڑا مرتبہ حاصل ہو جائے، تمہاری سوچ کا محور یہ دنیوی زندگی بنی ہوئی ہے۔

لیکن کیا کبھی تم نے یہ سوچا کہ جس کی خاطر یہ ساری دوڑ دھوپ کر رہے ہو، جس کی خاطر حلال و حرام ایک کر رکھا ہے، جس کی خاطر لڑائیاں مول لے رہے ہو، جس کی خاطر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے ہو، وہ کتنے دن کی زندگی ہے؟

اور اس کے بعد مرنے کے بعد جو زندگی آنے والی ہے وہ اس کے مقابلے میں کیسی خیر کی زندگی ہے اور یہاں کی زندگی کے مقابلے میں بہتر ہے، یہاں کی زندگی کے مقابلے میں کہیں زیادہ پائیدار اور غیر متناہی ہے۔

کوئی خوشی کامل نہیں

خوب سمجھ لیجئے دنیا کی کوئی خوشی کامل نہیں، ہر خوشی کے ساتھ غم کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ کسی فکر کا کسی صدمے کا کسی تشویش کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ کوئی خوشی کامل نہیں، کوئی لذت کامل نہیں۔ کھانا اچھا رکھا ہوا ہے، بھوک لگی ہوئی ہے، اس کے کھانے میں لذت آرہی ہے، لیکن کوئی فکر دماغ کے اوپر مسلط ہے اس کی وجہ سے سارا کھانا اکارت ہو رہا ہے، اس کی لذت مکدر ہو رہی ہے۔ دنیا کی کوئی خوشی ایسی نہیں ہے جو کامل ہو۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ مال و دولت جمع کرلوں گا تو اطمینان حاصل ہو جائے گا، سکون مل جائے گا،

(۱) الاعلیٰ: ۱۶

لیکن آپ ذرا بڑے بڑے سرمایہ داروں، بڑے بڑے مل کے مالکوں کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھئے، بظاہر یہ نظر آئے گا کہ یہ ملیں کھڑی ہوئی ہیں، عالیشان کاریں ہیں، شاندار بنگلے ہیں، حشم وخدم ہیں، نوکر چاکر ہیں، سارے اسباب راحت کے میسر ہیں۔ لیکن صاحب بہادر کو رات کے وقت نیند نہیں آتی۔ نیند لانے کے لئے گولیاں کھانی پڑتی ہیں۔ ڈاکٹر سے گولیاں لے لے کر کھا کھا کر نیند لاتے ہیں۔

آرام دہ بستر اور مسہریاں ہیں، ایئر کنڈیشنڈ کمرے ہیں، لیکن نیند نہیں آتی۔ اس کے مقابلے میں ایک مزدور ہے، ایک کسان ہے جس کے پاس یہ مسہری تو نہیں، یہ گدے اور یہ بستر ے تو نہیں، لیکن رات کے وقت میں تھک کر اپنے سر کے نیچے اپنا ہاتھ رکھ کر سوتا ہے، آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لے کر اُٹھتا ہے۔ بتاؤ، رات اس سرمایہ دار کی اچھی گزری یا اس مزدور اور کسان کی اچھی گزری؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ اس کی کوئی خوشی کامل نہیں، کوئی لذت کامل نہیں، ہر خوشی کے ساتھ کوئی غم لگا ہوا ہے، اور ہر غم کے ساتھ کوئی خوشی لگی ہوئی ہے۔

تین عالم

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا کیے ہیں۔ ایک عالم ہے جس میں خوشی ہی خوشی ہے، لذت ہی لذت ہے، مزہ ہی مزہ ہے، غم کا نام نہیں، صدمے کا گزر نہیں۔ وہ عالم ہے جنت، اس میں غم صدمے کا کوئی گزر نہیں، فکر وتشویش کا کوئی راستہ نہیں۔ ایک عالم اللہ نے وہ پیدا کیا ہے جو صدمے ہی کی جگہ ہے، اس میں غم ہی غم ہیں، تکلیف ہی تکلیف ہے، پریشانی ہی پریشانی ہے، صدمہ ہی صدمہ ہے، اس میں خوشی کا گزر نہیں، اس میں راحت کا گزر نہیں، وہ جہنم، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

تیسرا عالم پیدا کیا یہ دنیا، یہ غم اور خوشی سے ملی جلی ہے۔ اس میں غم بھی ہے، اس میں خوشی بھی ہے، اس میں لذت بھی ہے، اس میں راحت بھی ہے، اس میں تکلیف بھی ہے۔ یہ دنیا دونوں چیزوں سے ملی جلی ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس دنیا میں مجھے کوئی صدمہ نہ پہنچے، مجھے کوئی تکلیف نہ ہو، کوئی میری مرضی کے خلاف کام نہ ہو تو وہ دنیا کی حقیقت سے بے خبر ہے، اس دنیا میں یہ نہیں ہوسکتا۔ ارے اور تو اور اللہ کے محبوب ترین بندے یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اس دنیا کے اندر تشریف لاتے ہیں تو ان کو بھی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کو بھی غم اُٹھانے پڑتے ہیں، ان کو بھی صدمے جھیلنے پڑتے ہیں۔

اگر اس دنیا میں کسی کو صرف راحت ملنی ہوتی، صرف خوشی ملنی ہوتی تو اللہ کے محبوب ترین

پیغمبروں سے زیادہ اس کا حقدار کوئی نہیں تھا۔ لیکن ان پر بھی صدمے آئے اور ان پر بھی تکلیفیں آئیں، بلکہ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ))(۱)

اس دنیا کے اندر سب سے زیادہ آزمائشیں انبیاء پر آتی ہیں، اس کے بعد جتنا جو قریب ہوتا ہے انبیاء سے، اتنی ہی آزمائشیں اس کے اُوپر آتی ہیں۔

میں عرض یہ کررہا تھا کہ دنیا کی کوئی خوشی کامل نہیں، کوئی لذت کامل نہیں، کوئی راحت کامل نہیں اور جتنی بھی خوشی مل جائے پائیدار نہیں، اور کچھ پتہ نہیں کہ اگلے لمحے یہ خوشی حاصل رہے گی یا نہیں؟ ہوسکتا ہے کہ اگلے گھنٹے ختم ہوجائے، ہوسکتا ہے کل ختم ہوجائے، ہوسکتا ہے اگلے مہینے ختم ہوجائے، ہوسکتا ہے کہ ایک سال چل جائے اس کے بعد ختم۔ تو نہ خوشی کامل اور نہ غم کامل۔

آخرت کی خوشی کامل ہوگی

باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخرت کی زندگی خیر ہے، خیر کے معنی کامل ہے۔ اس کی لذت بھی کامل، اس کی رحمت بھی کامل، اس کے اندرر خوشی بھی کامل اور پائیدار بھی ہے۔ یعنی ختم ہونے والی نہیں، جو نعمت مل گئی وہ ہمیشہ کے لئے ملے گی۔

حدیث کا مضمون ہے یہاں دنیا میں آپ کو ایک کھانا اچھا لگ رہا ہے، دل چاہ رہا ہے کھائیں، ایک پلیٹ کھائی، دو پلیٹ کھائی ایک روٹی کھائی، آخر ایک حد ایسی آگئی کہ پیٹ بھر گیا، اب اگر کھانا بھی چاہیں تو کھا نہیں سکتے، اسی کھانے سے نفرت ہوگئی، وہی کھانا جس کی طرف دل لپک رہا تھا، جس کی طرف آدمی شوق سے بڑھ رہا تھا، چند لمحوں کے اندر اس سے نفرت ہوگئی، اب کھانے کو دل بھی نہیں چاہتا، کوئی انعام بھی دینا چاہے ہزار روپیہ بھی دینا چاہے کہ کھالو، نہیں کھائے گا۔ کیوں؟ اس پیٹ کی ایک حد تھی وہ حد آگئی، اس کے بعد اس میں گنجائش نہیں اور نہیں کھاتا۔ لیکن آخرت میں جو کھانا آئے گا یا جو بھی غذا ہوگی اس میں یہ مرحلہ نہیں آئے گا کہ صاحب اب پیٹ بھر گیا، دل تو چاہ رہا ہے، کھایا نہیں جاتا، یہ مرحلہ جنت میں نہیں۔ جو لذت وہ کامل ہے اس میں کوئی تکدر نہیں، تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخرت بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی ہے۔ دنیا بہتر بھی نہیں اور ناپائیدار بھی ہے۔ اس کے باوجود تمہارا یہ حال ہے کہ دنیوی زندگی ہی کو ترجیح دیتے ہو، شب و روز اس کی دوڑ دھوپ میں مگن ہو اور آخرت کا خیال نہیں کرتے۔

اس آیت میں اب ہم ذرا غور کریں تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ہمارے سارے

---

(۱) کنز العمال، رقم: ۶۷۸۳

امراض ساری بیماریوں کی جڑ اور ان کا علاج بھی بتا دیا۔

موت یقینی ہے

اس دنیا کے اندر کوئی بات اتنی یقینی نہیں ہے اتنی متفق علیہ نہیں ہے کہ جتنی یہ بات یقینی اور متفق علیہ ہے کہ ہر انسان کو ایک دن مرنا ہے۔ کوئی بات اس سے زیادہ یقینی نہیں۔ یعنی یہ وہ بات ہے کہ جس کو مسلمان تو مسلمان کافر بھی مانتا ہے کہ ہاں! ایک دن وہ ضرور مرے گا۔ آج تک اس کائنات میں کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے یہ نظریہ پیش کیا ہو کہ انسان کو موت نہیں آئے گی۔ لوگوں نے خدا کا انکار کر دیا کہنے والوں نے کہہ دیا کہ خدا کو نہیں مانتے، لیکن موت سے انکار کرنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا، بڑے سے بڑا دہریہ، بڑے سے بڑا ملحد، بڑے سے بڑا منکرِ خدا وہ بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے موت نہیں آئے گی، اور سب باتوں میں اختلاف، لیکن یہ بات ایسی ہے کہ اس پر سب متفق ہیں کہ موت آنی ہے، مرنا ہے۔ اس بات پر بھی سب متفق ہیں کہ مرنے کے دن کا پتہ نہیں کہ کب مریں گے۔ سائنس ترقی کر گئی، لوگ چاند پر پہنچ گئے، مریخ پر پہنچ گئے، کمپیوٹر ایجاد ہو گئے، مصنوعی آدمی ایجاد ہو گئے، سب کچھ ہو گیا۔ لیکن پوچھو ان سائنسدانوں سے کہ بتاؤ بھائی جو سامنے بیٹھا ہوا انسان ہے، اس کی موت کب آئے گی؟

ساری سائنس، سارے علوم و فنون یہاں آکر عاجز ہیں کوئی نہیں بتا سکتا کہ موت کب آئے گی لیکن عجیب معاملہ ہے کہ جتنی یہ بات یقینی ہے کہ مرنا ہے اور جتنا اس کا وقت غیر یقینی ہے اتنا ہی اس موت سے ہم اور آپ غافل ہیں۔

ذرا گریبان میں ہم سب منہ ڈال کر دیکھیں۔ صبح بیدار ہونے سے لے کر رات کو بستر پر جانے تک اس پورے وقت میں کیا کچھ سوچتے ہیں، کیا کیا خیالات آتے ہیں، دنیاداری کے، روزگار کے، محنت مزدوری کے، ملازمت کے، تجارت کے، زراعت کے، کاشتکاری کے، خدا جانے کیا کیا خیالات آتے ہیں۔ کیا کبھی خیال آتا ہے کہ ایک دن قبر میں جا کے سونا ہے؟ کبھی خیال آتا ہے کہ قبر میں جانے کے بعد کیا حالت پیش آنے والی ہے۔

حضرت بہلول کا واقعہ

ایک بزرگ گزرے ہیں ان کا نام تھا بہلول۔ ''بہلول مجذوب'' کہلاتے تھے۔ مجذوب قسم کے آدمی تھے۔ لیکن باتیں بڑی حکمت کی کیا کرتے تھے۔ اس واسطے ان کو لوگ بہلول دانا بھی کہتے ہیں، بہلول حکیم بھی، مجذوب بھی۔

ہارون رشید کے زمانے میں تھے اور ہارون رشید ان سے کبھی مذاق بھی کیا کرتا تھا، اور اعلان کر رکھا تھا کہ جب بہلول مجذوب میرے پاس آنا چاہیں تو کوئی ان کے لئے رکاوٹ نہ ہوا کرے، سیدھا میرے پاس پہنچ جائیں۔ ایک دن ایسے ہی ہارون رشید کے پاس پہنچ گئے۔ ہارون رشید مذاق تو کرتے تھے، ہارون رشید کے ہاتھ میں چھڑی تھی، وہ چھڑی اُٹھا کر انہوں نے بہلول کو دی اور کہا: میاں بہلول یہ چھڑی میں تم کو امانت کے طور پر دیتا ہوں، ایسا کرنا کہ اس دنیا میں جو شخص تمہیں اپنے سے زیادہ بیوقوف ملے اس کو یہ چھڑی میری طرف سے ہدیہ دے دینا۔ اشارہ اس طرف تھا کہ تم سے زیادہ بیوقوف تو کوئی دنیا میں ہے ہی نہیں۔ تو اگر تمہیں اپنے سے زیادہ بیوقوف کوئی شخص ملے تو اس کو دیدینا۔ بہلول نے وہ چھڑی اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ مہینے گزر گئے، سال گزر گئے۔ اتفاق سے ہارون رشید بیمار پڑ گئے۔ بیمار ایسے پڑے کہ بستر سے لگ گئے، نہ کہیں آنا، نہ کہیں جانا، حکیموں نے کہیں جانے آنے سے منع کر دیا۔

بہلول عیادت کے لئے ہارون رشید کے پاس پہنچے۔ جا کر کہا کہ امیر المؤمنین کیا حال ہے؟ کہا: بہلول! کیا حال سناؤں، بہت لمبا سفر درپیش ہے۔ کہاں کا سفر امیر المؤمنین؟ کہا کہ آخرت کا سفر۔ اچھا تو وہاں پر آپ نے کتنے لشکر بھیجے ہیں، کتنی چھولداریاں؟ کتنے خیمے؟ ہارون رشید نے کہا: بہلول تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو، وہ سفر ایسا ہے کہ اس میں کوئی خیمہ نہیں جاتا، کوئی آدمی کوئی باڈی گارڈ کوئی لشکر ساتھ نہیں جاتا۔ اچھا جناب واپس کب آئیں گے؟ کہا کہ پھر تم نے ایسی بات شروع کر دی، وہ سفر آخرت کا سفر ہے، اس میں جانے کے بعد کوئی واپس نہیں آیا کرتا۔

اچھا اتنا بڑا سفر ہے کہ وہاں سے کوئی واپس بھی نہیں آتا اور کوئی آدمی بھی وہاں پہلے سے نہیں جاسکتا۔ کہا کہ ہاں بہلول! وہ ایسا ہی سفر ہے۔ کہا کہ امیر المؤمنین! پھر تو ایک امانت میرے پاس آپ کی بہت مدت سے رکھی ہوئی ہے جو آپ نے یہ کہہ کر دی تھی کہ اپنے سے زیادہ بیوقوف آدمی کو دے دینا، آج مجھے اس چھڑی کا مستحق آپ سے زیادہ کوئی نظر نہیں آتا۔ اس واسطے کہ میں دیکھتا تھا کہ جب آپ کو چھوٹا سا بھی سفر درپیش ہوتا جہاں سے جلدی واپسی ہوتی تو اس کے لئے آپ پہلے سے بہت سا لشکر بھیجا کرتے تھے۔ وہ آپ کا راستہ تیار کرتے تھے، منزلیں قائم کرتے تھے، لیکن اب آپ کا اتنا لمبا سفر ہو رہا ہے، اس کی کوئی تیاری بھی نہیں ہے اور جہاں سے واپس آنا بھی نہیں ہے، تو مجھے اپنے سے زیادہ بیوقوف صرف آپ ہی ملے ہیں، آپ کے علاوہ کوئی نہیں، یہ چھڑی آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہارون رشید یہ بات سن کر رو پڑے، کہا کہ بہلول! ہم تمہیں دیوانہ سمجھا کرتے تھے، لیکن معلوم یہ ہوا کہ تم سے زیادہ حکیم کوئی نہیں۔

موت کو کثرت سے یاد کرو

واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ذرا سا کوئی معمول کے خلاف سفر درپیش آجائے تو اس کی پہلے سے تیاریاں ہیں، اس کے تذکرے ہیں، اس کے لئے پہلے سے کیا کچھ منصوبے بنائے جاتے ہیں، لیکن جب آخرت کا سفر پیش آتا ہے اور وہ سفر بھی ایسا ہے بیٹھے بیٹھے پیش آجاتا ہے۔ پہلے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب میرے بغیر اس دنیا کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ میں نہیں ہوں گا تو بچوں کا کیا ہوگا؟ بیوی کا کیا ہوگا؟ اور کاروبار کا کیا ہوگا؟ وہ وقت آرہا ہے لیکن ہم اور آپ اس کے بارے میں سوچنے کے لئے تیار نہیں۔ اپنے ہاتھوں سے جنازوں کو کندھے دیتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے اپنے پیاروں کو قبر میں اُتارتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے ان کو مٹی دے کر آتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ ہوگیا یہ واقعہ۔ ہمارا اس کے ساتھ کیا تعلق؟

سرکارِ دو عالم حضرت محمد ﷺ فرماتے ہیں:

''لذتوں کو ختم کرنے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو''(۱)

ذرا ہم اپنا جائزہ لیں کہ چوبیس گھنٹوں میں سے کتنا وقت ہم اس موت کو یاد کرنے میں صرف کرتے ہیں؟ بہر حال، اس حدیث کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے بتلا دیا کہ تمہاری بنیادی بیماری یہ ہے کہ تم آخرت سے غافل ہو۔ آخرت اگر تمہارے پیشِ نظر ہوجائے، آخرت تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے اور اس کی فکر تمہارے دل و دماغ پر سوار ہوجائے، تمہاری ساری زندگی کی مشکلات ختم ہوجائیں۔ سارے جرائم، ساری بدامنی، ساری بدعنوانیاں اس بنیاد پر ہیں کہ اسی دنیا کے گرد ہمارا دماغ چکر لگا رہا ہے، آخرت کی طرف نہیں دیکھتا، آخرت کو نہیں سوچتا۔ اس کا مال ہڑپ کرلوں، اس کا حق ضائع کردوں، اس کا خون پی جاؤں۔ یہ سب اس لئے کرتا ہے تاکہ میری دنیا درست ہوجائے۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا، اس کی کچھ فکر نہیں۔

اور یہ فکر سرورِ کونین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے پیدا کی، اور یہ جو کچھ آپ سیرت کے اندر امن وامان کے، سکون اور اطمینان کے واقعات پڑھتے ہیں، وہ درحقیقت اس فکرِ آخرت کا نمونہ ہیں، کہ دل و دماغ پر ہر وقت جنت کا خیال چھایا ہوا ہے کہ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، وہ جنت نظر آرہی ہے اور اس جنت کے خیال میں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کے خیال میں انسان جو کام کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والا کرتا ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب منه، رقم: ۲۳۸٤

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مدینہ منورہ کے باہر کسی علاقے میں گئے۔ ایک بکریوں کا چرواہا اُن کے پاس سے گزرا، جو روزے سے تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کی دیانت کو آزمانے کے لئے اس سے پوچھا کہ اگر تم بکریوں کے اس گلے میں سے ایک بکری ہمیں بیچ دو تو اس کی قیمت بھی تمہیں دیدیں گے، اور بکری کے گوشت میں سے اتنا گوشت بھی دیدیں گے جس پر تم افطار کرسکو۔ اس نے جواب میں کہا کہ یہ بکریاں میری نہیں ہیں، میرے آقا کی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر اس کی ایک بکری گم ہوجائے گی تو وہ کیا کرے گا؟ یہ سنتے ہی چرواہے نے پیٹھ پھیری اور آسمان کی طرف انگلی اُٹھا کر کہا: فأين الله؟ یعنی اللہ کہاں گیا؟ اور یہ کہہ کر روانہ ہوگیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما چرواہے کے اس جملے کو دہراتے رہے۔ مدینہ منورہ پہنچے تو اس چرواہے کے آقا سے مل کر اس سے بکریاں بھی خرید لیں اور چرواہے کو بھی خرید لیا، پھر چرواہے کو آزاد کردیا، اور ساری بکریاں اس کو تحفے میں دیدیں۔ (۱)

یہ ہے وہ فکرِ آخرت کہ جنگل کی تنہائی میں بکریاں چراتے ہوئے چرواہے کے دماغ پر بھی یہ بات مسلط ہے کہ مجھے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، اور وہ زندگی بھی درست کرنی ہے۔ اگر غلط کام کرکے تھوڑے سے پیسے میرے ہاتھ آ بھی گئے تو دنیا کا کچھ فائدہ شاید ہوجائے، لیکن آخرت میرے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رات کے وقت لوگوں کے حالات دیکھنے کے لئے گشت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ گشت کرتے ہوئے ایک گھر کے قریب سے گزرے۔ صبح کے جھٹ پٹے کا وقت تھا، اس گھر میں ایک ماں بیٹی آپس میں باتیں کررہی تھیں۔ ماں بیٹی سے کہہ رہی تھی کہ بیٹی! دودھ نکالنے کا وقت آگیا، دودھ نکالو اور ایسا کرنا کہ آج کل ہماری گائے دودھ کم دے رہی ہے، اس لئے دودھ میں پانی ملادینا تاکہ وہ زیادہ ہوجائے۔ بیٹی نے کہا کہ اماں جان! میں دودھ میں پانی ملا تو دوں، لیکن امیر المؤمنین کا یہ حکم آیا ہوا ہے کہ کوئی شخص دودھ میں پانی نہ ملائے۔

ماں نے کہا کہ بیٹی امیر المؤمنین کا حکم ضرور ہے، لیکن وہ یہاں کہاں پانی ملاتے ہوئے تجھے دیکھ رہے ہیں، وہ تو کہیں اپنے گھر میں سو رہے ہوں گے، اگر ملالے گی تو امیر المؤمنین کو پتہ بھی نہیں

---

(۱) أسد الغابة (۳/ ۲۲۸)

چلے گا۔ بیٹی نے کہا کہ اماں جان ٹھیک ہے، ہوسکتا ہے کہ امیر المؤمنین کو پتہ نہ چلے، لیکن امیر المؤمنین کا جو امیر ہے، وہ تو دیکھ رہا ہے، اور جب وہ دیکھ رہا ہے تو میں پھر یہ کام کیسے کرسکتی ہوں؟

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ باہر کھڑے ہوئے یہ گفتگو سن رہے ہیں اور واپس اپنے گھر جانے کے بعد صبح کے وقت اس لڑکی کے بارے میں معلوم کیا کہ یہ کون ہے؟ اس لڑکی کو بلایا اور اپنے صاحبزادے سے ان کا نکاح کردیا اور انہیں کی نسل سے بعد میں امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ عمر ثانی پیدا ہوئے۔

آخرت کی فکر

یہ ہے وہ ذہنیت کہ جو جانتی ہے کہ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی آخرت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے، دل ودماغ پر جب یہ بات بیٹھ گئی تو پھر کوئی گناہ کوئی بدعنوانی کرنے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھتا۔ ہر شخص اس کام کی طرف لپک رہا ہے جو جنت بنانے والا ہے اور اللہ کو خوش کرنے والا ہے اور اس کام سے رک رہا ہے جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے۔

یہ ہے درحقیقت اس آیت کا منشاء کہ اگر تم اپنی اس بیماری کو پہچان لو کہ تم ساری دوڑ دھوپ ساری فکر ساری سوچ دنیا کے لئے کر رہے ہو، کبھی بیٹھ کر یہ بھی سوچا کرو کہ اتنے آدمیوں کو میں نے مرتے ہوئے دیکھا ہے، قبر میں دفن ہوتے ہوئے دیکھا ہے، ایک دن میرے ساتھ بھی وہی معاملہ پیش آنے والا ہے، اور قبر کے اندر کیا ہونے والا ہے اس کی تفصیل سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بتا گئے کہ قبر میں کیا ہوگا؟ قبر کے بعد کیا ہوگا؟ پورا قرآن کریم آخرت کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے اور احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیل سے بتادیا کہ آخرت کے اندر کیا ہونے والا ہے، تاکہ آخرت کا خیال دلوں پر مسلط ہوجائے، آخرت کا خیال دلوں پر بیٹھ جائے۔ لیکن ہم اور آپ اپنے چوبیس گھنٹوں میں سے کوئی وقت اس کام کے لئے نہیں نکالتے کہ جس کے اندر ہم اور آپ اس بات کو سوچا کریں۔

یہ فکر کس طرح پیدا ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی کی فکر جو غالب آئی ہوئی ہے اس کو کیسے مغلوب کیا جائے؟ اور آخرت کی فکر کو غالب کیسے کیا جائے؟ کیسے یہ بات دل میں بیٹھے جو اس چرواہے کے دل میں بیٹھ گئی تھی؟ کیسے وہ بات دل میں بیٹھے جو اس نوجوان لڑکی کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے یہ بات کس طرح دل میں پیدا ہو؟

راستہ اس کا ایک ہی ہے وہ یہ کہ جس کو آخرت کی فکر ہو، جس کے دل میں اللہ کے سامنے

جوابدہی کا احساس ہو، اس کی صحبت اختیار کرلو، اس کے ساتھ رہو، اس کے پاس بیٹھو، اس کی باتیں سنو تو وہ آخرت کی فکر تمہارے دل میں بھی منتقل ہو جائے گی۔

یہ صحبت ہی وہ چیز ہے جس نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بدل دیا۔ آخر یہ لوگ وہی تو تھے جو دنیا کی معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے، مرغی کے بچے کی خاطر چالیس سال جنگ جاری رہی۔ کنویں کی خاطر زمینوں کی خاطر معمولی معمولی بکریوں اور جانوروں کی خاطر ایک دوسرے کے گلے کاٹے جا رہے تھے، ایک دوسرے کی گردنیں اُتاری جارہی تھیں، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے، وہی لوگ تو تھے، لیکن جب سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ کی صحبت نصیب ہوگئی تو وہ ساری دنیا طلبی ایسی راکھ ہوئی کہ سارے گھربار مکہ مکرمہ میں چھوڑ کر دشمنوں کے حوالے کر کے صرف تن کے کپڑوں کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ چلے آئے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت

انصار مدینہ نے پیش کش کی کہ آپ ہمارے بھائی ہیں، لہٰذا ہماری زمینیں آدھی آپ لے لیں۔ آدھی ہم رکھ لیں، لیکن مہاجرین نے کہا کہ نہیں، ہم وہ زمینیں اس طرح لینے کے لئے تیار نہیں، البتہ آپ کی زمینوں میں محنت کریں گے، محنت کے بعد جو پیداوار ہوگی، وہ آپس میں تقسیم کرلیں گے ــــ بتایئے کہ ان کی وہ دنیا طلبی کہاں گئی؟

میدانِ جہاد میں جنگ ہورہی ہے، موت آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہے، اس وقت کوئی حدیث سنا دیتا ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ کے راستے میں شہید ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو جنت کے اعلیٰ درجات عطا فرماتے ہیں۔ ایک صحابی نے پوچھا: کیا واقعی یہ بات رسول اللہ ﷺ سے تم نے سنی؟ کہا کہ ہاں میں نے سنی، میرے کانوں نے سنی، میرے دل نے یاد رکھا۔ ان صحابی نے کہا کہ اچھا بس اب تو میرے اُوپر جہاد سے علیحدگی حرام ہے۔ تلوار اُٹھائی اور دشمن کے نرغے کے اندر گھسے، تیر آکر سینے کے اُوپر لگا، سینے سے خون کا فوارہ ابلتا ہوا دیکھ کر جو الفاظ زبان سے جاری ہوتے ہیں وہ یہ کہ "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ" رب کعبہ کی قسم آج میں کامیاب ہوگیا، آج منزل مل گئی۔ (۱)

یہ وہی دنیا کے طالب، وہی دنیا کے چاہنے والے، دنیا کے پیچھے دوڑنے والے تھے، لیکن نبی کریم سرورِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ کی صحبت سے آخرت دل ودماغ پر اس طرح چھاگئی۔

---

(۱) یہ جملہ حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بئر معونہ میں شہادت سے پہلے کہا تھا۔ حیاۃ الصحابۃ (۶۵۰/۳)

جادوگروں کا مضبوط ایمان

قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کو دعوت دی اور معجزہ دکھایا، عصا زمین پر ڈالا تو وہ سانپ بن گیا تو فرعون نے کہا کہ ان کے مقابلے کے لئے جادوگر لانے چاہئیں۔ سارے ملک سے جادوگر اکٹھے کر کے ان سے کہا کہ آج تمہارا مقابلہ ایک بڑے جادوگر سے ہے، اور آج تم ان کے اُوپر غالب آکر دکھاؤ، اپنے فن کا مظاہرہ کرو۔ جادوگر آئے، جو فرعون کے چہیتے جادوگر تھے۔ لیکن پہلے بھاؤ تاؤ طے کیا:

﴿قَالُوْا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِيْنَ﴾ (۱)

پہلے یہ بتایئے فرعون صاحب کہ اگر ہم موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے تو کچھ اُجرت بھی ملے گی یا نہیں ملے گی؟ کوئی انعام ملے گا کہ نہیں ملے گا؟

﴿قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴾ (۲)

ہاں ضرور انعام ملے گا اور نہ صرف انعام ملے گا بلکہ تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا مقرب بنالوں گا۔ جب مقابلہ کا وقت آیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جادوگر کھڑے ہوئے تو جادوگروں نے اپنی رسیاں ڈالیں، لاٹھیاں ڈالیں تو وہ سانپ بن کر چلنا شروع ہوگئیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی اور فرمایا کہ اب تم اپنا عصا ڈالو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا اور وہ عصا ایک اژدہا بن کر جتنے سانپ ان جادوگروں نے بنائے تھے ان سب کو ایک ایک کر کے نگلنا شروع کر دیا۔ سارے سانپوں کو نگل گیا، جادوگر فن جانتے تھے۔ سمجھ گئے یہ جو کچھ دکھایا جارہا ہے یہ جادو نہیں ہے، اگر جادو ہوتا تو ہم غالب آجاتے، ہمارا جادو مغلوب ہوگیا اس لئے یہ جادو نہیں ہے۔

یہ جو بات کر رہے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں، وہ یقیناً اللہ کے پیغمبر ہیں۔ دل میں بات آگئی اور جب پیغمبر پر ایمان لے آئے، اور پیغمبر کے معجزہ کو آنکھوں سے دیکھ لیا اور پیغمبر کی ذرا سی دیر زیارت کر لی، صحبت اس کی حاصل ہوگئی، ایک دم سارے کے سارے جادوگر پکار اُٹھے:

﴿اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى﴾ (۳)

"ہم موسیٰ و ہارون کے پروردگار پر ایمان لے آئے"

فرعون یہ سب نظارہ دیکھ رہا ہے، وہ کہتا ہے:

﴿اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ﴾ (۴)

---

(۱) الشعراء: ۴۱ (۲) الشعراء: ۴۲ (۳) طٰہٰ: ۷۰ (۴) طٰہٰ: ۷۱

ارے تم اس کے اوپر ایمان لے آئے، میں نے تمہیں اب تک ایمان لانے کی اجازت بھی نہیں دی، اجازت سے پہلے ایمان لے آئے، اور ساتھ میں پھر سزا کی دھمکی بھی دی کہ یاد رکھو کہ اگر تم اس پر ایمان لائے تو تمہارا حشر یہ ہوگا:

﴿لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَى﴾ (۱)

میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دوں گا، اور تمہیں کھجور کے شہتیر میں سولی پر چڑھاؤں گا اور تب پتہ چلے گا کہ کس کا عذاب زیادہ سخت ہے' یہ دھمکی دے رہا ہے فرعون۔ اب آپ ذرا غور فرمایئے کہ وہی جادوگر جو ابھی تھوڑی دیر پہلے بھاؤ تاؤ کر رہے تھے کہ کیا ہمیں اجرت بھی ملے گی؟ وہی جادوگر جو فرعون کی طلبی پر موسیٰ علیہ السلام کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، اب نہ صرف یہ کہ وہ اجرت کی طلب باقی نہ رہی، بلکہ اب پھانسی کا تختہ سامنے لٹکا ہوا نظر آرہا ہے، فرعون کہہ رہا ہے میں اس پر چڑھادوں گا، ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا، لیکن اس سب کے باوجود ان کی زبان سے نکلتا ہے:

﴿قَالُوا لَنْ نُؤْثِرَكَ عَلَى مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ﴾ (۲)

اے فرعون! خوب سمجھ لو کہ ہم تمہیں اور تمہارے مال و دولت کو تمہاری سلطنت کو اس معجزے پر ترجیح نہیں دیں گے جو اللہ نے ہمیں کھلی آنکھوں سے دکھادیا۔ جو تجھے کرنا ہو کر گزر۔ کیوں؟ اس واسطے کہ جو کچھ فیصلہ تو کرے گا وہ اسی دنیوی زندگی کا فیصلہ ہوگا، تو ہمارے ہاتھ کاٹے یا پاؤں کاٹے، سولی پر چڑھائے، یا پھانسی چڑھائے، یہ دنیا کا فیصلہ ہوگا، اور ہم نے جو منظر دیکھا ہے وہ آخرت کا منظر ہے، وہ ابدی زندگی کا منظر ہے۔ دیکھئے! ایک لمحے پہلے تو اُجرت مانگ رہے تھے کہ پیسے لاؤ اور اب ایک لمحے کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ سولی پر چڑھنے کے لئے تیار ہوگئے، یہ کایا کس نے پلٹی؟ یہ ایمان کے ساتھ جب صحبت نصیب ہوئی، اس نے یہ کایا پلٹ دی۔

صحبت کا فائدہ

بہر حال، ایمان کے ساتھ، اعتقاد کے ساتھ جب صحبت ہوتی ہے تو وہ دلوں کے اندر یہ جذبے پیدا کیا کرتی ہے، پھر دنیا طلبی مٹتی ہے، آخرت کی فکر غالب آجاتی ہے اور جب یہ غالب آجائے تو اس وقت انسان انسان بنتا ہے۔ جب تک اس کے دل و دماغ پر دنیا مسلط ہے وہ انسان نہیں، درندہ ہے۔ اس واسطے کہ وہ تو چاہتا ہے کہ دنیا کے اندر مجھے خوشحالی مل جائے، خواہ کسی کی گردن پھلانگ کر ہو،

(۱) طٰہٰ: ۷۱ (۲) طٰہٰ: ۷۲

کسی کی لاش پر کھڑے ہو کر ہو، اور کسی کی گردن کاٹ کر ہو، لیکن مجھے کسی طریقہ سے دنیا کا فائدہ حاصل ہو جائے، وہ درندہ بن جاتا ہے۔ انسان بننے کا راستہ سوائے اس کے نہیں کہ آدمی مرنے کے بعد کی بات کو سوچے۔ آخرت کی بات کو سوچے اور یہ صرف اور صرف آخرت کی فکر رکھنے والوں کی صحبت سے نصیب ہوتی ہے۔

درحقیقت اس دین کو حاصل کرنے کا اور اپنی زندگیوں میں اس کو رچانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اُٹھائی جائے۔ اللہ والا اسی کو کہتے ہیں جو آخرت کی فکر رکھتا ہو۔ اس کی صحبت میں آدمی بیٹھے گا تو اس کو آخرت کی فکر حاصل ہوگی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل وکرم سے ہمارے دلوں میں یہ جذبہ پیدا فرمائے تو ساری مشکلات حل ہو جائیں۔

آج کی دنیا کا حال

آج ہمارے اُوپر مسائل ومشکلات کا طوفان چاروں طرف مسلط ہے۔ اس کو حل کرنے کے لئے محکمے ہیں پولیس ہے، عدالتیں ہیں، لیکن سرکاری دفتروں میں رشوت بہت لی جاتی ہے۔ اچھا بھائی اس کا یہ علاج کیا جائے کہ محکمہ انسدادِ رشوت ستانی بناؤ۔ چنانچہ اب محکمہ انسدادِ رشوت ستانی بن گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا کہ رشوت پہلے پانچ روپے ہوتی تھی، اب دس روپے ہوگئی۔ اور رشوت میں اب دو حصے لگ گئے۔ ایک حصہ سرکاری افسر کا، اور ایک محکمہ انسدادِ رشوت ستانی کے افسر کا بھی حصہ لگ گیا۔ اب انسدادِ رشوت ستانی کے اُوپر ایک اور نگران بٹھا دو، اس نگران پر ایک اور نگران بٹھا دو اور چلتے چلے جاؤ، رشوت کا ریٹ بڑھتا چلا جائے گا لیکن رشوت نہیں بند ہوگی۔ کیوں؟ اس واسطے کہ جس کو بھی بٹھا رہے ہو، اس کے سامنے بس یہ دنیا چکر لگا رہی ہے، اس کے سامنے صرف یہ ہے کہ کسی طرح دوسرے کے بنگلے سے میرا اچھا بنگلہ بن جائے۔ دوسرے کی کار سے میری کار اچھی ہو جائے۔ دوسروں کے کپڑوں سے میرے کپڑے اچھے ہو جائیں۔ اس کے دل ودماغ پر ہر وقت یہ بھوت چھایا ہوا ہے۔ اب چاہے کتنے محکمے بٹھاتے چلے جاؤ، عدالتیں لگاتے چلے جاؤ، قانون بناتے چلے جاؤ، قانون بھی دو دو روپے میں بکتا ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر خدا کا خوف نہیں، اگر آخرت کی فکر نہیں، اللہ کے سامنے جوابدہی کے احساس نہیں، تو پھر ہزار قانون بنالو، ہزار محکمے بٹھا دو، ہزار پولیس والے بٹھا دو، لیکن خدا کے خوف کے بغیر سب بیکار۔

یہ امریکہ دنیا کے اندر سب سے مہذب ترین ملک کہلانے والا، بچہ بچہ تعلیم یافتہ، سو فیصد تعلیم، دولت کی ریل پیل، سائنس وٹیکنالوجی اور دنیا بھر کے تمام علوم وفنون کا مرکز، پولیس ہر وقت چوکس اور فعال، کوئی رشوت نہیں کھاتا، پولیس والے کو رشوت دے کر باز نہیں رکھا جا سکتا، پولیس تین منٹ کے

نوٹس پر پہنچ جاتی ہے، لیکن وہاں کا یہ حال ہے کہ مجھے نصیحت کرنے والوں نے یہ نصیحت کی کہ برائے کرم جب آپ اپنے ہوٹل سے باہر نکلیں تو بہتر یہ ہے کہ گھڑی ہاتھ پر نہ باندھیں اور آپ کی جیب کے اندر پیسے بھی نہ ہوں، تھوڑے بہت جو ضرورت کے ہوں رکھ لیجئے۔ کیونکہ خطرہ ہے کہ کسی وقت بھی کوئی آدمی گھڑی چھین کر لے جائے گا، کوئی آدمی آپ کی جیب سے پیسے نکال کر لے جائے گا، اور اس کی خاطر آپ کا خون تک کر دے گا۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اور قانون بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ پولیس تین منٹ کے نوٹس پر پہنچنے والی بے بس ہے۔ محکمے، عدالتیں سب اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی ہیں، ایک طرف چاند پر جھنڈے گاڑ رہا ہے، اور امریکہ کا صدر یہ بیان دے رہا ہے کہ آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جرائم پر کیسے قابو پائیں؟ وہ جو اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

دنیا یہ منظر دیکھ رہی ہے اور دیکھتی رہے گی، اور جب تک سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر سر نہیں رکھے گی، اور جب تک آپ کی رہنمائی میں آخرت کی فکر دل و دماغ پر مسلط نہیں ہوگی، اس وقت تک یہ منظر نظر آتے رہیں گے۔ ہزار قانون بناتے رہو، ہزار محکمے بٹھاتے رہو، تمہارے مسائل کا حل کبھی نہیں نکلے گا۔ مسائل کے حل کا راستہ یہ ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اختیار کریں، ان کے پاس بیٹھیں، ان کی بات سنیں، آخرت کے حالات معلوم کریں۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں اس کی حقیقت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آخرت کی فکر ہمارے دلوں کے اُوپر غالب فرمائے اور دنیا طلبی کی دوڑ جس کے اندر ہم مبتلا ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے ہمیں بچائے اور اہل اللہ کی صحبت نصیب فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

مرنے سے پہلے موت کی تیاری کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا وَحَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا)) (۱)

یہ ایک حدیث ہے جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ مرنے سے پہلے مرو، اور قیامت کے روز جو حساب و کتاب ہونا ہے اس سے پہلے اپنا حساب اور اپنا جائزہ لو۔

موت یقینی چیز ہے

موت ضرور آنے والی ہے۔ اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اور موت کے مسئلہ میں آج تک کسی کا اختلاف نہیں ہوا اور نہ کسی نے اس کے آنے کا انکار کیا۔ انکار کرنے والوں نے نعوذ باللہ خدا کا انکار کر دیا کہ ہم اللہ کو نہیں مانتے، رسولوں کا انکار کر دیا، مگر موت کا انکار نہیں کر سکے۔ ہر شخص یہ بات مانتا ہے کہ جو شخص اس دنیا میں آیا ہے، وہ ایک نہ ایک دن ضرور موت کے منہ میں جائے گا۔ اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی موت آ جائے۔ ایک منٹ کے بعد آ جائے۔ ایک گھنٹہ کے بعد آ جائے۔ ایک دن کے بعد آ جائے۔ ایک ہفتہ کے بعد آ جائے۔ ایک ماہ بعد آ جائے۔ یا ایک سال کے بعد آ جائے۔ کچھ پتہ نہیں۔ آج سائنس کی تحقیقات کہاں سے کہاں بامِ عروج تک پہنچ گئیں۔ لیکن سائنس یہ نہیں بتا سکتی کہ کونسا انسان کب مرے گا۔

موت سے پہلے مرنے کا مطلب

لہٰذا یہ یقینی بات ہے کہ موت ضرور آئے گی۔ اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ موت کا وقت متعین

☆ اصلاحی خطبات (۷/۲۶۹۔۲۹۰)، ۳۱ مئی ۱۹۹۶ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) کشف الخفاء، ۲/۴۰۲

نہیں۔ اب اگر انسان غفلت کی حالت میں دنیا سے چلا جائے تو وہاں پہنچ کر خدا جانے کیا حالات پیش آئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں پہنچ کر اللہ کے غضب اور اس کے عذاب کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لئے حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ اس حقیقی موت کے آنے سے پہلے مرو۔ کس طرح مرو؟ موت سے پہلے مرنے کا کیا مطلب؟ علماء کرام نے اس کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ حقیقی موت کے آنے سے پہلے تم اپنی وہ نفسانی خواہشات جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے معارض اور مقابل ہیں اور تمہارے دل میں گناہ کرنے کے اور ناجائز کام کرنے کے اور اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کرنے کے جو داعیے اور تقاضے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان کو کچل دو اور فنا کر دو اور مار دو۔

ایک دن مرنا ہے، آخر موت ہے

دوسرا مطلب علماء نے یہ بتایا کہ مرنے سے پہلے اپنے مرنے کا دھیان کرلو۔ کبھی کبھی یہ سوچا کرو کہ ایک دن مجھے اس دنیا سے جانا ہے۔ اور اس دنیا سے خالی ہاتھ جاؤں گا۔ نہ پیسے ساتھ جائیں گے، نہ اولاد ساتھ جائے گی، نہ کوٹھی بنگلے ساتھ جائیں گے، نہ دوست احباب ساتھ جائیں گے، بلکہ اکیلا خالی ہاتھ جاؤں گا، اس کو ذرا سوچا کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ہم سے جو ظلم، نافرمانیاں اور جرائم اور گناہ ہوتے ہیں، ان کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انسان نے اپنی موت کو بھلا دیا ہے۔ جب تک جسم میں صحت اور قوت ہے، اور یہ ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں، اس وقت تک انسان یہ سوچتا ہے کہ ''ہم چوں ما دیگرے نیست'' یعنی ہم سے بڑا کوئی نہیں۔ اور زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ اس وقت تکبر بھی کرتا ہے، شیخی بھگارتا ہے، دوسروں پر ظلم بھی کرتا ہے، دوسروں کے حقوق پر ڈاکے بھی ڈالتا ہے، صحت اور جوانی کی حالت میں یہ سب کام کرتا رہتا ہے، اور یہ دھیان اور خیال بھی نہیں آتا کہ ایک دن مجھے بھی اس دنیا سے جانا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے پیاروں کو مٹی دے کر آتا ہے، اپنے پیاروں کا جنازہ اُٹھاتا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ سوچتا ہے کہ موت کا واقعہ اس کے ساتھ پیش آیا ہے، میرے ساتھ تو پیش نہیں آیا۔ اس طرح غفلت کے عالم میں زندگی گزارتا ہے، اور موت کی تیاری نہیں کرتا۔

دو عظیم نعمتیں اور ان سے غفلت

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے کتنا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا:

((نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيهِمَا كَثِيْرٌ مِنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ)) (۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقائق، باب لا عیش الا عیش الآخرة، رقم: ۵۹۳۳، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم، باب الصحة (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

''اللہ تعالیٰ کی دو نعمتیں ایسی ہیں جس کی طرف سے بہت سے انسان دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، ایک صحت کی نعمت اور ایک فراغت کی نعمت''

یعنی جب تک ''صحت'' کی نعمت حاصل ہے اس وقت تک اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ یہ صحت کی نعمت ہمیشہ باقی رہے گی۔ اور صحت کی حالت میں اچھے اور نیک کاموں کو ٹلاتے رہتے ہیں کہ چلو یہ کام کل کر لیں گے، کل نہیں تو پرسوں کر لیں گے، لیکن ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ صحت کا وقت گزر جاتا ہے۔

دوسری نعمت ہے ''فراغت'' یعنی اس وقت اچھے کام کرنے کی فرصت ہے، وقت ملتا ہے، لیکن انسان اچھے کام کو یہ سوچ کر ٹال دیتا ہے کہ ابھی تو وقت ہے، بعد میں کر لیں گے۔ ابھی تو جوانی ہے، اور وہ اس جوانی کے عالم میں بڑے بڑے پہاڑ ڈھو سکتا ہے، بڑے سے بڑے مشقت کے کام انجام دے سکتا ہے، اگر چاہے تو جوانی کے عالم میں خوب عبادت کر سکتا ہے، ریاضتیں اور مجاہدات کر سکتا ہے، خدمتِ خلق کر سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اپنے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا ڈھیر لگا سکتا ہے۔ لیکن دماغ میں یہ بات بیٹھی ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں، ذرا زندگی کا مزہ لے لوں، عبادت کرنے اور نیک کام کرنے کے لئے بہت عمر پڑی ہے، بعد میں کر لوں گا۔ اس طرح وہ نیک کاموں کو ٹالتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جوانی ڈھل جاتی ہے، اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ یہاں تک کہ صحت خراب ہو جاتی ہے، اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب جوانی کے جانے کے بعد عبادت اور نیک کام کرنا بھی چاہتا ہے تو جسم میں طاقت اور قوت نہیں ہے۔ یا فرصت نہیں ہے، اس لئے کہ اب مصروفیت اتنی ہو گئی ہے کہ وقت نہیں ملتا۔

یہ سب باتیں اس لئے پیدا ہوئیں کہ انسان موت سے غافل ہے۔ موت کا دھیان نہیں۔ اگر روزانہ صبح و شام موت کو یاد کرتا کہ ایک دن مجھے مرنا ہے اور مرنے سے پہلے مجھے یہ کام کرنا ہے تو پھر موت کی یاد اور اس کا دھیان انسان کو گناہوں سے بچاتا ہے، اور نیکی کے راستے پر چلاتا ہے۔ اسی لئے حضورِ اقدس ﷺ یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ مرنے سے پہلے مرو۔

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ کا نصیحت آموز واقعہ

ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ مجذوب قسم کے بزرگ تھے۔ بادشاہ ہارون رشید کا زمانہ تھا۔ ہارون رشید ان مجذوب سے ہنسی مذاق کرتا رہتا تھا۔ اگرچہ مجذوب تھے لیکن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) والفراغ نعمتان مغبون فیهما کثیر من الناس، ۲۲۲٦، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب الحکمة، رقم: ٤١٦٠، مسند أحمد، رقم: ۳۰۳۸

بڑی حکیمانہ باتیں کیا کرتے تھے۔ہارون رشید نے اپنے دربانوں سے کہہ دیا تھا کہ جب یہ مجذوب میرے پاس ملاقات کے لئے آنا چاہیں تو ان کو آنے دیا جائے۔ان کو روکا نہ جائے۔چنانچہ جب ان کا دل چاہتا دربار میں پہنچ جاتے۔

ایک دن یہ دربار میں آئے تو اس وقت ہارون رشید کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ہارون رشید نے ان مجذوب کو چھیڑتے ہوئے کہا کہ بہلول صاحب! آپ سے میری ایک گزارش ہے۔

بہلول نے پوچھا: کیا ہے؟

ہارون رشید نے کہا کہ میں آپ کو یہ چھڑی بطور امانت کے دیتا ہوں۔اور دنیا کے اندر آپ کو اپنے سے زیادہ کوئی بیوقوف آدمی ملے، اس کو یہ چھڑی میری طرف سے ہدیہ میں دے دینا۔

بہلول نے کہا: بہت اچھا! یہ کہہ کر چھڑی رکھ لی۔

بادشاہ نے تو بطور مذاق کے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔اور بتانا یہ مقصود تھا کہ دنیا میں تم سب سے زیادہ بیوقوف ہو۔تم سے زیادہ بیوقوف کوئی نہیں ہے۔بہرحال، بہلول وہ چھڑی لے کر چلے گئے۔

اس واقعہ کو کئی سال گزر گئے۔ایک روز بہلول کو پتہ چلا کہ ہارون رشید بہت سخت بیمار ہیں، اور بستر سے لگے ہوئے ہیں، علاج ہو رہا ہے، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔یہ بہلول مجذوب بادشاہ کی عیادت کے لئے پہنچ گئے۔اور پوچھا کہ امیر المؤمنین! کیا حال ہے؟

بادشاہ نے جواب دیا کہ حال کیا پوچھتے ہو، سفر درپیش ہے۔

بہلول نے پوچھا: کہاں کا سفر درپیش ہے؟

بادشاہ نے جواب دیا کہ آخرت کا سفر درپیش ہے، دنیا سے اب جا رہا ہوں۔

بہلول نے سوال کیا: کتنے دن میں واپس آئیں گے؟

ہارون نے کہا: بھائی یہ آخرت کا سفر ہے، اس سے کوئی واپس نہیں آیا کرتا۔

بہلول نے کہا: اچھا آپ واپس نہیں آئیں گے تو آپ نے سفر کے راحت اور آرام کے انتظامات کے لئے کتنے لشکر اور فوجی آگے بھیجے ہیں؟ بادشاہ نے جواب میں کہا: تم پھر بیوقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔آخرت کے سفر میں کوئی ساتھ نہیں جایا کرتا۔نہ باڈی گارڈ جاتا ہے، نہ لشکر، نہ فوج اور نہ سپاہی جاتا ہے۔وہاں تو انسان تنہا ہی جاتا ہے۔بہلول نے کہا کہ اتنا لمبا سفر کہ وہاں سے واپس بھی نہیں آنا ہے، لیکن آپ نے کوئی فوج اور لشکر نہیں بھیجا۔حالانکہ اس سے پہلے آپ کے جتنے سفر ہوتے تھے، اس میں انتظامات کے لئے آگے سفر کا سامان اور لشکر جایا کرتا تھا۔اس سفر میں کیوں نہیں بھیجا؟

بادشاہ نے کہا کہ نہیں، یہ سفر ایسا ہے کہ اس سفر میں کوئی لاؤ لشکر اور فوج نہیں بھیجی جاتی۔

بہلول نے کہا: بادشاہ سلامت! آپ کی ایک امانت بہت عرصے سے میرے پاس رکھی ہے،

وہ ایک چھڑی ہے، آپ نے فرمایا تھا کہ مجھ سے زیادہ کوئی بیوقوف تمہیں ملے تو اس کو دے دینا۔ میں نے بہت تلاش کیا، لیکن مجھے اپنے سے زیادہ بیوقوف آپ کے علاوہ کوئی نہیں ملا، اس لئے کہ میں یہ دیکھا کرتا تھا کہ اگر آپ کا چھوٹا سا بھی سفر ہوتا تھا تو مہینوں پہلے سے اس کی تیاری ہوا کرتی تھی، کھانے پینے کا سامان، خیمے، لاؤلشکر، باڈی گارڈ سب پہلے سے بھیجا جاتا تھا۔ اور اب یہ اتنا لمبا سفر جہاں سے واپس بھی نہیں آنا ہے، اس کے لئے کوئی تیاری نہیں ہے۔ آپ سے زیادہ دنیا میں مجھے کوئی بیوقوف نہیں ملا۔ لہٰذا آپ کی یہ امانت واپس کرتا ہوں۔

یہ سن کر ہارون رشید رو پڑا، اور کہا: بہلول! تم نے سچی بات کی۔ ساری عمر ہم تم کو بیوقوف سمجھتے رہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکمت کی بات تم نے ہی کہی۔ واقعۃً ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی۔ اور اس آخرت کے سفر کی کوئی تیاری نہیں کی۔

عقل مند کون؟

درحقیقت حضرت بہلول نے جو بات کی وہ حدیث ہی کی بات ہے، حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ))(۱)

اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے بتادیا کہ عقلمند کون ہوتا ہے؟ آج کی دنیا میں عقلمند اس شخص کو کہا جاتا ہے جو مال کمانا خوب جانتا ہو۔ دولت کمانا اور پیسے سے پیسے بنانا خوب جانتا ہو، دنیا کو بیوقوف بنانا خوب جانتا ہو۔ لیکن اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ عقلمند انسان وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو کرے اور نفس کی ہر خواہش کے پیچھے نہ چلے، بلکہ اس نفس کو اللہ کی مرضی کے تابع بنائے، اور مرنے کے بعد کے لئے تیاری کرے، ایسا شخص عقلمند ہے۔ اگر یہ کام نہیں کرتا تو وہ بیوقوف ہے کہ ساری عمر فضولیات میں گنوادی۔ جس جگہ ہمیشہ رہنا ہے وہاں کی کچھ تیاری نہ کی۔

ہم سب بیوقوف ہیں

جو بات بہلول نے ہارون رشید کے لئے کہی، اگر غور کرو گے تو یہ بات ہم میں سے ہر شخص پر صادق آرہی ہے۔ اس لئے کہ ہم میں سے ہر شخص کو دنیا میں رہنے کے لئے ہر وقت یہ فکر سوار رہتی ہے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم، باب منه، رقم: ۳۳۸۳، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر الموت والاستعداد له، رقم: ۴۲۵۰، مسند أحمد، حدیث شداد بن اوس، رقم: ۱۶۵۰۱

کہ مکان کہاں بناؤں؟ کس طرح کا بناؤں؟ اس میں کیا کیا راحت و آرام کی اشیاء جمع کروں؟ اگر دنیا میں کہیں سفر پر جاتے ہیں تو کئی دن پہلے سے بکنگ کراتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں سیٹ نہ ملے۔ کئی دن پہلے سے اس سفر کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ جس جگہ پہنچنا ہے وہاں پر پہلے سے اطلاع دی جاتی ہے، ہوٹل کی بکنگ کرائی جاتی ہے، پہلے سے یہ سب کام کیے جاتے ہیں۔ اور سفر صرف تین دن کا ہے۔ لیکن جس جگہ ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے، جہاں کی زندگی کی کوئی انتہا نہیں ہے، اس کے لئے یہ فکر نہیں کہ وہاں کا مکان کیسے بناؤں؟ وہاں کے لئے کس طرح بکنگ کراؤں؟

حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ عقلمند شخص وہ ہے جو مرنے کے بعد کے لئے تیاری کرے۔ ورنہ وہ بیوقوف ہے، چاہے وہ کتنا ہی بڑا مالدار اور سرمایہ دار کیوں نہ بن جائے۔ اور آخرت کی تیاری کا راستہ یہ ہے کہ موت سے پہلے موت کا دھیان کرو کہ ایک دن مجھے اس دنیا سے جانا ہے۔

موت اور آخرت کا تصور کرنے کا طریقہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ دن میں کوئی وقت تنہائی کا نکالو، پھر اس وقت میں ذرا سا اس بات کا تصور کیا کرو کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے، فرشتہ روح قبض کرنے کے لئے پہنچ گیا، اس نے میری روح قبض کر لی، میرے عزیز و اقارب نے میرے غسل اور کفن دفن کا انتظام شروع کر دیا۔ بالآخر مجھے غسل دے کر کفن پہنا کر اُٹھا کر قبرستان لے گئے۔ نمازِ جنازہ پڑھ کر مجھے ایک قبر میں رکھا، پھر اس قبر کو بند کر دیا، اور اُوپر سے منوں مٹی ڈال کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اب میں اندھیری قبر میں تنہا ہوں، اتنے میں سوال و جواب کے لئے فرشتے آ گئے، وہ مجھ سے سوال و جواب کر رہے ہیں۔

اس کے بعد آخرت کا تصور کرو کہ مجھے دوبارہ قبر سے اُٹھایا گیا، اب میدانِ حشر قائم ہے، تمام انسان میدانِ حشر کے اندر جمع ہیں، وہاں شدید گرمی لگ رہی ہے، پسینہ بہہ رہا ہے، سورج بالکل قریب ہے۔ ہر شخص پریشانی کے عالم میں ہے، اور لوگ جا کر انبیاء علیہم السلام سے سفارش کرا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں کہ حساب و کتاب شروع ہو۔ پھر اسی طرح حساب و کتاب، پل صراط اور جنت اور جہنم کا تصور کرے۔ روزانہ فجر کی نماز کے بعد تلاوت، مناجات مقبول اور اپنے ذکر و اذکار سے فارغ ہونے کے بعد تھوڑا سا تصور کر لیا کرو کہ یہ وقت آنے والا ہے، اور کچھ پتہ نہیں کب آ جائے۔ کیا پتہ آج ہی آ جائے۔

یہ تصور کرنے کے بعد دعا کرو کہ یا اللہ! میں دنیا کے کاروبار اور کام کاج کے لئے نکل رہا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسا کام کر گزروں جو میری آخرت کے اعتبار سے میرے لئے ہلاکت کا باعث

ہو۔ روزانہ یہ تصور کرلیا کرو۔ جب ایک مرتبہ موت کا دھیان اور تصور دل میں بیٹھ جائے گا تو انشاء اللہ اپنی اصلاح کرنے کی طرف توجہ اور فکر ہو جائے گی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ

ایک بہت بڑے بزرگ اور محدث گزرے ہیں، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ، ان کے زمانے میں ایک شخص کے دل میں یہ خیال آیا کہ میں مختلف محدثین، علماء اور فقہاء اور بزرگانِ دین سے یہ سوال کروں کہ اگر آپ کو یہ پتہ چل جائے کہ کل آپ کی موت آنے والی ہے، اور آپ کی زندگی کا صرف ایک دن باقی ہے تو آپ وہ ایک دن کس طرح گزاریں گے، اور کن کاموں میں یہ دن گزاریں گے؟ سوال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس سوال کے جواب میں یہ بڑے بڑے محدثین، علماء، بزرگانِ دین بہترین کاموں کا ذکر کریں گے، اور اس دن کو بہترین کاموں میں خرچ کریں گے، اس طرح مجھے بہترین کاموں کا پتہ چل جائے گا اور میں آئندہ اپنی زندگی میں وہ بہترین کام انجام دوں گا۔ اس خیال سے انہوں نے بہت سے بزرگوں سے یہ سوال کیا۔ اب اس سوال کے جواب میں کسی نے کچھ کہا، اور کسی نے کچھ کہا، لیکن وہ شخص جب حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا، اور یہ سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ میں وہی کام کروں گا جو روزانہ کرتا ہوں، اس لئے کہ میں نے پہلے دن سے اپنا نظام الاوقات اس خیال کو سامنے رکھ کر بنایا ہے کہ شاید یہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو، اور آج مجھے موت آجائے۔ اس نظام الاوقات کے اندر اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں کسی اور عمل کا اضافہ کرسکوں۔ جو عمل روزانہ کرتا ہوں، آخری دن بھی وہی عمل کروں گا۔ یہ ہے اس حدیث کا مصداق:

"مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا"

انہوں نے موت کا دھیان اور اس کا استحضار کر کے اپنی زندگی کو اس طرح ڈھال لیا کہ ہر وقت مرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ جب آنا چاہے آجائے۔

اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق

اسی کے بارے میں حدیث شریف میں فرمایا:

((مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ أَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهُ))(۱)

جو اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند کرتا ہے، اور اس کو اللہ تعالیٰ سے ملنے کا شوق ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو بھی

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب من احب لقاء الله، رقم: ٦٠٢٦، صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة، رقم: ٤٨٤٤، سنن الترمذي، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس سے ملنے کا شوق ہوتا ہے۔ ایسے لوگ تو ہر وقت موت کی انتظار میں بیٹھے ہیں، اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں:

غَدًا نَلْقَى الْاَحِبَّه مُحَمَّدًا وَ حِزْبَه

کل کو اپنے دوستوں سے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے ملاقات ہوگی۔ اسی موت کے دھیان کے نتیجے میں زندگی شریعت اور اتباع سنت کے اندر ڈھل جاتی ہے، اور ہر وقت موت کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ بہر حال، تھوڑا سا وقت نکال کر موت کا تصور کیا کرو کہ موت آنے والی ہے، اس کے لئے میں نے کیا تیاری کی ہے۔

آج ہی اپنا محاسبہ کرلو

اس حدیث کے دوسرے جملے میں ارشاد فرمایا:

((حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا))

اپنا حساب لیا کرو قبل اس کے کہ تمہارا حساب لیا جائے۔ آخرت میں تمہارے ایک ایک عمل کا حساب لیا جائے گا۔

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾(۱)

یعنی تم نے جو اچھا کام کیا ہوگا وہ بھی سامنے آجائے گا، اور جو برا کام کیا ہوگا وہ بھی سامنے آجائے گا۔ کسی نے خوب کہا ہے ؏

تم آج ہوا سمجھو جو روزِ جزا ہوگا

قیامت کے روز جو حساب لیا جائے گا تم اس سے پہلے ہی اپنا حساب لینا شروع کر دو، یعنی روزانہ رات کو حساب لو کہ آج جو میرا سارا دن گزرا، اس میں کونسا عمل ایسا ہے کہ اگر اس عمل کے بارے میں قیامت کے روز مجھ سے پوچھا گیا کہ یہ عمل کیوں کیا تھا تو اس کا کیا جواب دوں گا۔ روزانہ اس طرح کرلیا کرو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) كتاب الجنائز عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم: ٩٨٦، سنن النسائي، كتاب الجنائز، رقم: ١٨١٣، مسند أحمد، رقم: ٢١٦٣٨

(۱) الزلزال: ۷۔ ۸

صبح کے وقت نفس سے ”معاہدہ“

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اصلاح کا ایک عجیب و غریب طریقہ تجویز فرمایا ہے۔ اگر ہم لوگ اس طریقے پر عمل کرلیں تو وہ اصلاح کے لئے نسخۂ اکسیر ہے۔ اس سے بہتر کوئی نسخہ ملنا مشکل ہے۔ فرماتے ہیں کہ روزانہ چند کام کرلیا کرو۔ ایک یہ کہ جب تم صبح کو بیدار ہوتو اپنے نفس سے ایک معاہدہ کرلیا کرو کہ آج کے دن میں صبح سے لے کر رات کو سونے تک کوئی گناہ نہیں کروں گا، اور میرے ذمے جتنے فرائض و واجبات اور سنتیں ہیں، ان کو بجالاؤں گا، اور جو میرے ذمے حقوق اللہ اور حقوق العباد ہیں، ان کو پورے طریقے سے ادا کروں گا۔ اگر غلطی سے اس معاہدہ کے خلاف کوئی عمل ہوا تو اے نفس! اس عمل پر تجھے سزا دوں گا۔ یہ معاہدہ ایک کام ہوا۔ جس کا نام ہے ”مشارطہ“ یعنی آپس میں شرط لگانا۔

معاہدہ کے بعد دعا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی اس پہلی بات پر تھوڑا اضافہ فرماتے ہوئے فرمایا کرتے کہ یہ معاہدہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ! میں نے یہ معاہدہ کرلیا ہے کہ آج کے دن گناہ نہیں کروں گا، اور فرائض و واجبات سب ادا کروں گا، شریعت کے مطابق چلوں گا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پابندی کروں گا۔ لیکن یا اللہ! آپ کی توفیق کے بغیر میں اس معاہدے پر قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے جب میں نے یہ معاہدہ کرلیا ہے تو آپ میرے اس معاہدے کی لاج رکھ لیجئے، اور مجھے اس معاہدے پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمایئے، اور مجھے عہد شکنی سے بچا لیجئے، اور مجھے اس معاہدے پر پوری طرح عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادیئے۔ یہ دعا کرلو۔

پورے دن اپنے اعمال کا ”مراقبہ“

دعا کرنے کے بعد زندگی کے کاروبار کے لئے نکل جاؤ۔ اگر ملازمت کرتے ہو تو ملازمت پر چلے جاؤ۔ اگر تجارت کرتے ہو تو تجارت کے لئے نکل جاؤ۔ اگر دکان پر بیٹھتے ہو تو وہاں چلے جاؤ۔ وہاں جاکر یہ کرو کہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے ذرا سوچ لیا کرو کہ یہ کام میرے اس معاہدے کے خلاف تو نہیں ہے، یہ لفظ جو زبان سے نکال رہا ہوں، یہ اس معاہدے کے خلاف تو نہیں ہے؟ اگر خلاف نظر آئے تو اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ اس کو ”مراقبہ“ کہا جاتا ہے، یہ دوسرا کام ہے۔

سونے سے پہلے ''محاسبہ''

تیسرا کام رات کو سونے سے پہلے کیا کرو۔ وہ ہے ''محاسبہ''، اپنے نفس سے کہو کہ تم نے صبح یہ معاہدہ کیا تھا کہ کوئی گناہ کا کام نہیں کروں گا، اور ہر کام شریعت کے مطابق کروں گا، تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کروں گا۔ اب بتاؤ کہ تم نے کونسا کام اس معاہدے کے مطابق کیا، اور کونسا کام اس معاہدے کے خلاف کیا؟ اس طرح اپنے پورے دن کے تمام اعمال کا جائزہ لو۔ صبح جب میں گھر سے باہر نکلا تھا، تو فلاں آدمی سے کیا بات کہی تھی؟ جب میں ملازمت پر گیا تو وہاں اپنے فرائض میں نے کس طرح ادا کیے؟ تجارت میں نے کس طرح کی؟ حلال طریقے سے کی یا حرام طریقے سے کی؟ اور جتنے لوگوں سے ملاقات کی ان کے حقوق کس طرح ادا کیے؟ بیوی بچوں کے حقوق کس طرح ادا کیے؟ ان سب معاملات کا جائزہ لو، اس کا نام ہے ''محاسبہ''۔

پھر شکر ادا کرو

اس ''محاسبہ'' کے نتیجے میں اگر یہ بات سامنے آئے کہ تم نے صبح جو معاہدہ کیا تھا، اس میں کامیاب ہو گئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے اس معاہدے پر قائم رہنے کی توفیق دی، اَللّٰھُمَّ لَکَ الحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ اس شکر کا نتیجہ وہ ہوگا جس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے:

﴿لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ﴾ (۱)

اگر تم نعمت پر شکر ادا کرو گے تو اللہ تعالیٰ وہ نعمت اور زیادہ دیں گے، لہٰذا جب تم نے اس معاہدے پر قائم رہنے کی نعمت پر شکر ادا کیا تو آئندہ اس نعمت میں اور اضافہ ہوگا، اور اس پر ثواب ملے گا۔

اور اگر اس ''محاسبہ'' کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئے کہ فلاں موقع پر اس معاہدے کی خلاف ورزی ہو گئی، فلاں موقع پر میں بھٹک گیا اور پھسل گیا اور اپنے اس عہد پر قائم نہ رہ سکا، تو اس وقت فوراً توبہ کرو، اور یہ کہو کہ یا اللہ! میں نے یہ معاہدہ تو کیا تھا، لیکن نفس و شیطان کے جال میں آکر میں اس معاہدے پر قائم نہیں رہ سکا، یا اللہ! میں آپ سے معافی مانگتا ہوں، اور توبہ کرتا ہوں، آپ مجھے معاف فرما دیجئے۔

---

(۱) ابراھیم: ۷

اپنے نفس پر سزا جاری کرو

توبہ کرنے کے ساتھ اپنے نفس کو کچھ سزا بھی دو، اور اپنے نفس سے کہو کہ تم نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے، لہٰذا تمہیں اب آٹھ رکعت نفل پڑھنی ہوں گی۔ یہ سزا صبح کو معاہدہ کرتے وقت ہی تجویز کرلو۔ لہٰذا رات کو اپنے نفس سے کہو کہ تم نے اپنی راحت اور آرام کی خاطر اور تھوڑی سی لذت حاصل کرنے کی خاطر مجھے عہد شکنی کے اندر مبتلا کیا، اس لئے اب تمہیں تھوڑی سزا ملنی چاہئے، لہٰذا تمہاری سزا یہ ہے کہ اب سونے سے پہلے آٹھ رکعت نفل ادا کرو۔ اس کے بعد سونے کے لئے بستر پر جاؤ۔ اس سے پہلے سونا بند۔

سزا مناسب اور معتدل ہو

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسی سزا مقرر کرو جس میں نفس پر تھوڑی مشقت بھی ہو، نہ بہت زیادہ ہو کہ نفس بدک جائے، اور نہ اتنی کم ہو کہ نفس کو اس سے مشقت ہی نہ ہو۔ جیسے ہندوستان میں جب سرسید مرحوم نے علی گڑھ کالج قائم کیا، اس وقت طلبہ پر یہ لازم کردیا تھا کہ تمام طلبہ پنج وقتہ نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کریں گے، اور جو طالب علم نماز سے غیر حاضر ہوگا اس کو جرمانہ ادا کرنا پڑے گا، اور ایک نماز کا جرمانہ شاید ایک آنہ مقرر کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو طلبہ صاحبِ ثروت تھے، وہ پورے مہینے کی تمام نمازوں کا جرمانہ اکٹھا پہلے ہی جمع کرادیا کرتے تھے کہ یہ جرمانہ ہم سے وصول کرلو، اور نماز کی چھٹی۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اِتنا کم اور معمولی جرمانہ بھی نہ ہو کہ آدمی اکٹھا جمع کرادے، اور نہ اِتنا زیادہ ہو کہ آدمی بھاگ جائے، بلکہ درمیانہ اور معتدل جرمانہ مقرر کرنا چاہئے۔ مثلاً آٹھ رکعت نفل پڑھنے کی سزا مقرر کرنا ایک مناسب سزا ہے۔

کچھ ہمت کرنی پڑے گی

بہرحال، اگر نفس کی اصلاح کرنی ہے تو تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں ہلانے پڑیں گے، کچھ نہ کچھ مشقت برداشت کرنی پڑے گی، کچھ نہ کچھ ہمت تو کرنی ہوگی، اور اس کے لئے عزم اور ارادہ کرنا ہوگا، ویسے ہی بیٹھے بیٹھے تو نفس کی اصلاح نہیں ہوجائے گی۔ لہٰذا یہ طے کرلو کہ جب کبھی نفس غلط راستے پر جائے گا تو اس وقت آٹھ رکعت نفل ضرور پڑھوں گا۔ جب نفس کو پتہ چلے گا کہ یہ آٹھ رکعت پڑھنے کی ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی، تو آئندہ کل وہ نفس تمہیں گناہ سے بچانے کی کوشش کرے گا، تاکہ اس آٹھ رکعت نفل سے جان چھوٹ جائے۔ اس طرح وہ نفس آہستہ آہستہ انشاء اللہ سیدھے

راستے پر آجائے گا، اور پھر تمہیں نہیں بہکائے گا۔

یہ چار کام کرلو

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت کا خلاصہ یہ ہے کہ چار کام کرلو:

(۱) صبح کے وقت مشارطہ یعنی معاہدہ۔

(۲) ہر عمل کے وقت مراقبہ۔

(۳) رات کو سونے سے پہلے محاسبہ۔

(۴) اگر نفس بہک جائے تو سونے سے پہلے معاقبہ یعنی اس کو سزا دینا۔

یہ عمل مسلسل کرنا ہوگا

ایک بات اور یاد رکھنی چاہئے کہ دو چار روز یہ عمل کرنے کے بعد یہ مت سمجھ لینا کہ بس اب ہم پہنچ گئے اور بزرگ بن گئے، بلکہ یہ عمل تو مسلسل کرنا ہوگا۔ اور اس میں یہ ہوگا کہ کسی دن تم غالب آجاؤ گے اور کسی دن شیطان غالب آجائے گا، لیکن ایسا نہ ہو کہ اس کے غالب آنے سے تم گھبرا جاؤ اور یہ عمل چھوڑ بیٹھو، اس لئے کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت ہے۔ انشاء اللہ اس طرح گرتے پڑتے ایک دن منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ اور اگر یہ عمل کرنے کے بعد پہلے دن ہی منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤ گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دماغ میں یہ خناس سوار ہو جائے گا کہ میں تو جنید اور شبلی بن گیا۔ اس لئے کبھی اس پر عمل کے ذریعہ کامیابی ہوگی اور کبھی ناکامی ہوگی۔ جس دن کامیابی ہو جائے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرو، اور جس دن ناکامی ہو جائے اس دن توبہ واستغفار کرو، اور اپنے نفس پر سزا جاری کرو، اور اپنے برے فعل پر ندامت اور شکستگی کا اظہار کرو۔ یہ ندامت اور شکستگی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قصہ لکھا ہے کہ آپ روزانہ تہجد کی نماز کے لئے بیدار ہوا کرتے تھے۔ ایک دن آپ کی آنکھ لگ گئی اور تہجد قضا ہوگئی۔ سارا دن روتے روتے گزار دیا اور توبہ واستغفار کی کہ یا اللہ! آج میری تہجد کا ناغہ ہوگیا۔ اگلی رات جب سوئے تو تہجد کے وقت ایک شخص آیا اور آپ کو تہجد کے لئے بیدار کیا۔ آپ نے بیدار ہو کر دیکھا کہ یہ بیدار کرنے والا شخص کوئی اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں ابلیس ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ

اگر تو ابلیس ہے تو تہجد کی نماز کے لئے اُٹھانے سے تجھے کیا غرض؟ وہ شیطان کہنے لگا: بس آپ اُٹھ جائیے، اور تہجد پڑھ لیجئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم تو تہجد سے روکنے والے ہو، تم اُٹھانے والے کیسے بن گئے؟ شیطان نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ گزشتہ رات میں نے آپ کو تہجد کے وقت سلا دیا اور آپ کی تہجد کا ناغہ کرادیا، لیکن سارا دن آپ تہجد چھوٹنے پر روتے رہے، اور استغفار کرتے رہے، جس کے نتیجے میں آپ کا درجہ اتنا بلند ہو گیا کہ تہجد پڑھنے سے بھی اتنا بلند نہ ہوتا۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ آپ تہجد ہی پڑھ لیتے۔ اس لئے آج میں خود آپ کو تہجد کے لئے اُٹھانے آیا ہوں تاکہ آپ کا درجہ مزید بلند نہ ہو جائے۔

ندامت اور توبہ کے ذریعہ درجات کی بلندی

بہرحال، اگر انسان کو اپنی گزشتہ غلطی پر صدقِ دل سے ندامت ہو، اور آئندہ اس کی طرف نہ لوٹنے کا عزم ہو تو اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اس بندے کے درجات بلند فرما کر اس کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ غلطی کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور معافی مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندے سے فرماتے ہیں کہ تجھ سے جو یہ غلطی ہوئی، اس غلطی نے تمہیں ہماری ستاری، ہماری غفاری اور ہماری رحمت کا مورد بنا دیا، اور یہ غلطی بھی تمہارے حق میں فائدہ مند بن گئی۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب عیدالفطر کا دن آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی عزت اور جلال کی قسم کھا کر فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ آج یہ لوگ یہاں جمع ہو کر فریضہ ادا کر رہے ہیں اور مجھے پکار رہے ہیں۔ مجھ سے مغفرت طلب کر رہے ہیں اور اپنے مقاصد مانگ رہے ہیں۔ میری عزت اور میرے جلال کی قسم، میں ضرور آج ان کی دعائیں قبول کروں گا۔ اور ان کی برائیوں اور گناہوں کو بھی حسنات اور نیکیوں میں تبدیل کر دوں گا۔ (۱)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گناہ اور یہ برائیاں کس طرح نیکیوں میں تبدیل ہو جائیں گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کسی انسان سے غفلت اور نادانی سے ایک گناہ سرزد ہو گیا، اور اس کے بعد وہ ندامت اور افسوس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے کہ یا اللہ! غفلت اور نادانی سے یہ گناہ ہو گیا، معاف فرما دیجئے، تو اللہ تعالیٰ اس کی ندامت کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ گناہ معاف فرما دیتے ہیں، بلکہ اس کی بدولت اس کے درجات بھی بلند فرما دیتے ہیں۔ اور اس

(۱) شعب الایمان (۱۳۵/۳)، رقم:۳۱۱۷، مشکوۃ المصابیح، کتاب الصوم، باب لیلۃ القدر، رقم:۲۰۹۶

طرح وہ گناہ بھی درجات کی بلندی کا سبب بن جاتا ہے، اور اس کے حق میں خیر بن جاتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾(۱)

''اللہ تعالیٰ ان کی سیئات کو حسنات میں تبدیل فرما دیتے ہیں''

ایسی تیسی مرے گناہوں کی

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازِ صحبت تھے، بہت اُونچے مقام کے بزرگ تھے۔ وہ شعر بھی کہا کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر مجھے بہت پسند ہے، اور بار بار یاد آتا ہے، وہ یہ کہ۔

دولتیں مل گئیں ہیں آہوں کی
ایسی تیسی مرے گناہوں کی

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں گناہوں پر ندامت اور عجز و نیاز اور آہ و بکا عطا فرما دی، اور ہم دعا بھی کر رہے ہیں کہ یا اللہ! میرے اس گناہ کو معاف فرما دیجئے، مجھ سے غلطی ہوگئی تو اب گناہ کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ گناہ بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز حکمت سے خالی پیدا نہیں کی۔ لہٰذا گناہ کے پیدا کرنے میں بھی حکمت اور مصلحت ہے، وہ یہ کہ گناہ ہو جانے کے بعد جب توبہ کرو گے، اور ندامت کے ساتھ آہ و بکا کرو گے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کرو گے تو اس توبہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیں گے۔

نفس سے زندگی بھر کی لڑائی ہے

لہٰذا رات کو جب پورے دن کے اعمال کا محاسبہ کرتے وقت پتہ چلے کہ آج گناہ سرزد ہو گئے ہیں تو اب توبہ و استغفار کرو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور مایوس مت ہو جاؤ۔ اس لئے کہ یہ زندگی ایک جہاد اور لڑائی ہے، جس میں مرتے دم تک نفس اور شیطان سے لڑائی اور مقابلہ کرنا ہے، اور مقابلے کے اندر یہ تو ہوتا ہے کہ کبھی تم نے گرا دیا، کبھی دوسرے نے گرا دیا، لہٰذا اگر شیطان تمہیں گرا دے تو اس وقت ہمت ہار کر پڑے مت رہنا، بلکہ دوبارہ نئے عزم اور ولولے کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ، اور پھر شیطان کے مقابلے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اور یہ تمہارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم ہمت نہیں ہارو گے، بلکہ دوبارہ مقابلے کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے، اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے

(۱) الفرقان: ۷۰

رہو گے تو انشاء اللہ بالآخر فتح تمہاری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۱)

انجام متقیوں کے ہاتھ میں ہے، فتح تمہاری ہوگی۔

تم قدم بڑھاؤ، اللہ تعالیٰ تھام لیں گے

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (۲)

جن لوگوں نے ہمارے راستہ میں جہاد کیا، یعنی نفس و شیطان کے ساتھ تم نے اس طرح لڑائی کی کہ وہ شیطان تمہیں غلط راستے پر لے جارہا ہے، اور تم اس سے مقابلہ کر رہے ہو، اور کوشش کر کے غلط راستے سے بچ رہے ہو تو پھر ہمارا وعدہ ہے کہ ہم ضرور بالضرور مقابلہ کرنے اور کوشش کرنے والوں کو اپنے راستے کی ہدایت دیں گے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں اس آیت کا ترجمہ یہ کرتا ہوں کہ جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں تو ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے چلتے ہیں۔

پھر ایک مثال کے ذریعہ اس آیت کو سمجھاتے ہوئے فرماتے کہ جب بچہ چلنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اس وقت ماں باپ کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ بچہ چلے، چنانچہ اس کو چلنا سکھاتے ہیں اور اس کو تھوڑی دور کھڑا کر دیتے ہیں، اور پھر اس بچے کو اپنے پاس بلاتے ہیں کہ بیٹا ہمارے پاس آؤ۔ اگر بچہ وہیں کھڑا رہے اور قدم آگے نہ بڑھائے تو ماں باپ بھی دور کھڑے رہیں گے، اور اس کو گود میں نہیں اُٹھائیں گے۔ لیکن اگر بچے نے ایک قدم بڑھایا، اور دوسرے قدم پر وہ گرنے لگا تو اب ماں باپ اس کو گرنے نہیں دیتے، بلکہ آگے بڑھ کر اس کو تھام لیتے ہیں اور گود میں اُٹھا لیتے ہیں۔ اس لئے کہ بچے نے قدم بڑھا کر اپنی سی کوشش کر لی۔ اسی طرح جب انسان اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے، اور اس کو نہیں تھامیں گے؟ ایسا نہیں کریں گے۔ بلکہ اس آیت میں وعدہ ہے کہ جب تم چلنے کی کوشش کرو گے تو ہم آگے بڑھ کر تمہیں گود میں اُٹھا کر لے جائیں گے۔ اس لئے آگے قدم بڑھاؤ، ہمت کرو، کوشش کرو، مایوس ہو کر مت بیٹھ جاؤ۔

سوئے مایوسی مرو امید ہا است
سوئے تاریکی مرو خورشید ہا است

ان کے دربار میں مایوسی اور تاریکی کا گزر نہیں ہے۔ لہٰذا نفس و شیطان سے مقابلہ کرتے رہو،

---

(۱) القصص: ۸۳ (۲) العنکبوت: ۶۹

اگر غلطی ہو جائے تو پھر امید کا دامن مت چھوڑو، مایوس مت ہو جاؤ، بلکہ کوشش جاری رکھو، انشاء اللہ تم ایک دن ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تم اپنے حصے کا کام کرلو، اللہ تعالیٰ اپنے حصے کا کام ضرور کریں گے۔ یاد رکھو، تمہارے حصے میں جو کام ہیں اس میں نقص اور کمی ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کے حصے کے کام میں نقص اور کمی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جب تم قدم بڑھاؤ گے تو تمہارے لئے راستے کھلیں گے انشاء اللہ۔ اسی کی طرف حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا:

((مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا وَحَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا))(۱)

یعنی مرنے سے پہلے مرو۔ اور آخرت کے حساب سے پہلے اپنا محاسبہ کرلو۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا یہ جواب دو گے؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ محاسبہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ یہ تصور کرو کہ آج تم میدانِ حشر کے اندر کھڑے ہو۔ اور تمہارا حساب و کتاب ہو رہا ہے۔ نامۂ اعمال پیش ہو رہے ہیں۔ تمہارے نامۂ اعمال کے اندر جو تمہارے برے اعمال درج ہیں، وہ سب سامنے آ رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تم سے سوال کر رہے ہیں کہ تم نے یہ برے اعمال اور گناہ کیوں کیے تھے؟ کیا اس وقت تم اللہ تعالیٰ کو وہی جواب دو گے جو آج تم مولویوں کو دیتے ہو؟ آج جب تم سے کوئی مولوی یا مصلح یہ کہتا ہے کہ فلاں کام مت کرو، نگاہ کی حفاظت کرو، سود سے بچو، غیبت اور جھوٹ سے بچو، ٹی وی کے اندر جو فحاشی اور عریانی کے پروگرام آ رہے ہیں، ان کو مت دیکھو، شادی بیاہ کی تقریبات میں بے پردگی سے بچو، تو ان باتوں کے جواب میں تم مولوی صاحب کو یہ جواب دیتے ہو کہ ہم کیا کریں۔ زمانہ ہی ایسا خراب ہے، ساری دنیا ترقی کر رہی ہے، چاند پر پہنچ گئی ہے، کیا ہم ان سے پیچھے رہ جائیں، اور دنیا سے کٹ کر بیٹھ جائیں۔ اور آج کے اس معاشرے میں یہ سب کام کیے بغیر آدمی کا گزارہ نہیں ہے۔ یہ وہ جواب ہے جو آج تم مولویوں کے سامنے دیتے ہو، کیا اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی یہی جواب دو گے؟ کیا یہ جواب وہاں اللہ تعالیٰ کے سامنے کافی ہوگا؟ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچ کر بتاؤ۔ اگر یہ جواب وہاں نہیں چلے گا تو پھر آج دنیا میں بھی یہ جواب کافی نہیں ہو سکتا۔

ہمت اور حوصلہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو

اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ جواب دو گے کہ یا اللہ! ماحول اور معاشرے کی وجہ سے میں

---

(۱) کشف الخفاء، ۲/ ۴۰۲

گناہ کرنے پر مجبور تھا، تو اللہ تعالیٰ یہ سوال کریں گے کہ اچھا یہ بتاؤ کہ تم مجبور تھے یا میں مجبور تھا؟ تم یہ جواب دو گے کہ یا اللہ! میں ہی مجبور تھا، آپ مجبور نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب میں مجبور نہیں تھا تو تم نے مجھ سے اپنی اس مجبوری کو دور کرنے کی دعا کیوں نہیں کی؟ اور کیا میں تمہاری اس مجبوری کو دور کرنے پر قادر نہیں تھا؟ اگر میں قادر تھا تو مجھ سے مانگتے، اور یہ کہتے کہ یا اللہ! یہ مجبوری پیش آگئی ہے، یا تو آپ اس مجبوری کو دور فرما دیجئے، یا پھر مؤاخذہ مت فرمائیے گا، اور مجھے اس پر سزا مت دیجئے گا۔ بتائیے! کیا تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کے اس سوال کا جواب ہے؟ اگر جواب نہیں ہے تو پھر آج زندگی کے اندر یہ کام کرلو۔ وہ یہ کہ جن کاموں کے کرنے پر تم اپنے آپ کو مجبور پا رہے ہو، خواہ واقعۃً مجبور ہو، یا معاشرے کی وجہ سے مجبور ہو، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے روزانہ دعا کرلو کہ یا اللہ! یہ مجبوری پیش آگئی ہے، اس کی وجہ سے میرے اندر اس سے بچنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے، آپ قادرِ مطلق ہیں، اس مجبوری کو بھی دور کرسکتے ہیں، اور اس بے ہمتی کو بھی دور کرسکتے ہیں۔ اس مجبوری کو دور کر دیجئے، اور اس گناہ سے بچنے کی ہمت اور حوصلہ عطا فرما دیجئے۔

ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

بہر حال، اللہ تعالیٰ سے مانگو، یہ تجربہ ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور عطا فرما دیتے ہیں۔ اگر کوئی مانگے ہی نہیں تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ:

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

لہٰذا مانگنے والا ہی نہ ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ ان کا دامنِ رحمت کھلا ہے۔ بہر حال، آج ہم نے صبح و شام چار کام کرنے کا جو نسخہ پڑھا ہے اگر ہم اس پر کاربند ہوجائیں تو انشاء اللہ اس حدیث پر عمل کرنے والے بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی مغفرت فرمائے اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

جزاوسزا کا تصور ☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡکَرِیۡمِ

اسلام کی بنیاد جن عقائد پر ہے، ان میں توحید اور رسالت کے بعد اہم ترین عقیدہ آخرت کا عقیدہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد ایک ایسی دائمی زندگی سے سابقہ پیش آئے گا جس میں اسے ان تمام کاموں کا حساب دینا ہوگا جو اس نے دنیا میں انجام دیئے، اسی دائمی زندگی کو آخرت کہا جاتا ہے اور قرآن کریم نے جابجا یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ آخرت میں انسان کو اپنے نیک اور اچھے کاموں پر انعام اور برے کاموں پر سزا دی جائے گی۔

﴿فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ﴾ (۱)

"پس جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسے (آخرت میں) دیکھ لے گا، اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اسے دیکھے گا"

آخرت کی یہ دائمی زندگی اگرچہ فی الحال ہمیں نظر نہیں آتی، لیکن آخرت کی جزاوسزا اور حقیقت ہماری اس دنیوی زندگی کا لازمی تقاضا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کا یہ نظام کتنے مضبوط، مستحکم اور حکیمانہ اصولوں پر چل رہا ہے تو لازماً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آگئی بلکہ اسے کسی ایسے علیم وحکیم خالق نے پیدا کیا ہے جس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ آباد ہیں، ان میں شریف بھی ہیں شریر بھی، پرہیزگار بھی ہیں گناہگار بھی، ظالم بھی ہیں مظلوم بھی، لہٰذا اگر یہ دنیوی زندگی ہی سب کچھ ہو اور اس کے بعد کوئی زندگی آنے والی نہ ہو تو یہ سارا کارخانہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے، کیونکہ اس طرح نہ اچھے آدمیوں کو ان کی نیکی کا کوئی انعام مل سکتا ہے اور نہ گنہگاروں اور ظالموں کو ان کے ظلم اور زیادتی اور نافرمانی کا بدلہ دیا جاسکتا ہے، اور یہ بات خالقِ کائنات کی حکمت

☆ نشری تقریریں، ص: ۱۷۔۲۱، فرد کی اصلاح، ص: ۴۱۔۴۴

(۱) الزلزال: ۷۔۸

سے ممکن نہیں کہ وہ ظالموں اور مظلوموں اور نیکوکاروں اور بدکاروں کے ساتھ ایک ہی جیسا معاملہ کرے، لہٰذا یہ کائنات خود اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ مرنے سے انسان کی زندگی ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ مرنے کے بعد انسان اس عالم میں چلا جاتا ہے، جہاں اس کو اس کی دنیوی زندگی کی جزا یا سزا ملنی ہے۔

قرآن حکیم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾ (۱)

''تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے؟ اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟''

اس سے معلوم ہوا کہ آخرت اور جزا و سزا کا قیام ایک عقلی ضرورت ہے اور اس کے بغیر کائنات کا یہ پورا کارخانہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اَن دیکھے حقائق سے باخبر کرنے اور اپنے احکام کی تعلیم دینے کے لئے جتنے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے، عقیدۂ آخرت کی تعلیم نہایت اہتمام کے ساتھ دی ہے اور آخرت کے واقعات کی تفصیل بھی بیان فرمائی ہے، خود قرآن کریم کا کم و بیش ایک تہائی حصہ آخرت اور جزا و سزا ہی کے بیان پر مشتمل ہے۔

قرآن و سنت اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں عقیدۂ آخرت پر اس قدر اہمیت کے ساتھ اس لئے زور دیا گیا ہے کہ انسان کو انسان بنانے کے لئے جزا و سزا کے پختہ یقین سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہیں، جب تک انسان کے دل و دماغ میں یہ حقیقت پیوست نہ ہو کہ اسے اللہ کے سامنے اپنے ایک ایک قول و فعل کا جواب دینا ہے اس وقت تک وہ اپنی نفسانی خواہشات کا غلام بنا رہتا ہے اور اس کو گناہوں، بری عادتوں اور فاسد اخلاق سے نجات نصیب نہیں ہوتی۔

اگر آخرت کی جوابدہی انسان کے پیشِ نظر نہیں ہے دنیا کا سخت سے سخت قانون بھی اسے جرائم اور بداخلاقی کے ارتکاب سے نہیں روک سکتا، کیونکہ پولیس اور عدالت کا خوف زیادہ سے زیادہ دن کی روشنی اور شہر کے ہنگاموں میں اسے جرم سے باز رکھ سکتا ہے، لیکن رات کی تاریکی اور جنگل کی تنہائی میں بھی انسان کے دل پر پہرہ بٹھانے والی چیز اللہ کا خوف اور فکرِ آخرت کے سوا کچھ نہیں۔

سرکارِ دو عالم ﷺ نے تیئیس سال کی مختصر مدت میں جو حیرت انگیز انقلاب برپا فرمایا اس کا ایک راز یہ تھا کہ آپ نے اپنی شب و روز کی تعلیمات کے ذریعہ لوگوں کے دل میں آخرت کا تصور اس قوت کے ساتھ جاگزیں کر دیا تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آخرت کے حساب و کتاب کو ہر وقت اس طرح پیشِ نظر رکھتے تھے جیسے وہ اسے کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہوں۔

---

(۱) المؤمنون: ۱۱۵

چنانچہ آخرت کی یہ فکر ان سے ایسے ایسے مشکل کام بآسانی کرا لیتی تھی جو سالہا سال کی تعلیم و تربیت کے بعد بھی انجام دینے مشکل معلوم ہوتے ہیں۔

مثلاً ایک شراب نوشی کی عادت ہی کو لے لیجئے، آج دنیا کی بیشتر مہذب اقوام اس بات پر متفق ہیں اور عقلی اور عملی طور پر اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ شراب نوشی ایک بری عادت ہے جو انسان کی صحت کو بھی تباہ کرتی ہے، اور اخلاق کو بھی، چنانچہ اس موضوع پر بڑے بڑے گرانقدر مقالے لکھے جاتے رہتے ہیں، اور بڑی فاضلانہ تحقیقات منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں، لیکن آج کی مہذب دنیا جسے اپنی عقل و خرد اور سائنٹفک ترقیات پر بڑا ناز ہے، اپنے تمام ناقابلِ تردید دلائل، مؤثر اعداد و شمار، نشر و اشاعت کے ترقی یافتہ ذرائع اور ذہن بدلنے کے جدید ترین وسائل استعمال کرنے کے باوجود شراب کے عادی افراد سے شراب چھڑانے میں قطعی ناکام ہو چکی ہے، آج کی مہذب دنیا تعلیم و تربیت اور اخلاق و ترغیب سے لے کر تعزیری قوانین تک شراب کا استعمال ختم کرانے کے لئے ہر تدبیر آزما چکی ہے، لیکن شراب نوشی کے اعداد و شمار روز بروز بڑھتے ہی چلے جارہے ہیں۔

اس کے برعکس عرب کے اس معاشرے کا تصور کیجئے جس میں سرکارِ دو عالم ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔

زمانۂ جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور تک عربوں کا حال یہ تھا کہ گھر گھر میں شراب پانی کی طرح پی جاتی تھی، اس سے عربوں کی والہانہ محبت کا یہ عالم تھا کہ عربی زبان میں شراب کے لئے کم و بیش ڈھائی سو الفاظ ملتے ہیں، اور شراب نوشی ان کے نزدیک عیب تو کیا ہوتی اسے سرمایۂ فخر و ناز سمجھا جاتا تھا، لیکن جب قرآن کریم نے حرمتِ شراب کا اعلان فرمایا تو اس قوم نے یکلخت اپنے اس محبوب ترین مشروب کو اس طرح چھوڑ دیا کہ تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حرمتِ شراب کی آیات نازل ہوئیں تو ایک مجلس میں شراب کا دور چل رہا تھا، جب میں نے ان کو یہ آیتیں سنائیں تو بعض لوگوں کے ہونٹ کے ساتھ پیالہ لگا ہوا تھا اور چند گھونٹ منہ میں تھے، انہوں نے آیات سننے کے بعد اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ جو گھونٹ منہ میں ہے حلق سے اُتار لیں، بلکہ کلّی کر کے پیالہ بہا دیا۔(۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مجلس میں شراب کا ساقی بنا ہوا تھا، اچانک منادی کی آواز سنائی دی کہ شراب حرام کر دی گئی، تو پوری محفل نے شراب کو بہا دیا، اور مٹکے توڑ ڈالے، اور مدینہ کی گلیوں میں شراب پانی کی طرح بہنے لگی۔(۲)

---

(۱) تفسیر ابن کثیر، سورۃ المائدۃ، رقم الآیۃ: ۹۰(۲/۱۳۲)

(۲) تفسیر ابن کثیر، سورۃ المائدۃ، رقم الآیۃ: ۹۰(۲/۱۳۰)

عادات و اخلاق کی یہ حیرت انگیز کایا پلٹ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی محبت اور خشیت اور اس کے جزا وسزا کے عقیدے کی بناء پر ہوئی، جو سرکارِ دو عالم ﷺ نے صحابہ کرام کی رگ و پے میں پیوست فرمادیا تھا۔ اسی عقیدے کا نتیجہ تھا کہ اول تو عہدِ رسالت میں جرائم کی شرح گھٹتے گھٹتے صفر تک پہنچ گئی، اور اگر بشری تقاضے کی بناء پر کسی سے کوئی جرم سرزد ہوا بھی تو اسے گرفتار کرنے کے لئے کسی پولیس کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی، بلکہ خود آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر اور اصرار کرکے اپنے اُوپر سزا جاری کروائی، کیونکہ یہ حقیقت ان کے دل میں پیوست تھی کہ دنیا کی سزا آخرت کے عذاب کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان اور قابلِ برداشت ہے، آج بھی اگر کوئی چیز دنیا کو جرائم، بداخلاقی، بدامنی اور دھوکہ فریب سے نجات دلاسکتی ہے تو وہ صرف اور صرف اللہ کا خوف، فکرِ آخرت اور جزا وسزا کی تیاری کا دھیان ہے، لیکن اس کے لئے ان عقائد کا محض زبانی اقرار کافی نہیں بلکہ ان کو ہر وقت مستحضر رکھنے کی ضرورت ہے۔

جس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں آخرت کی جو تفصیلات بیان فرمائی گئی ہیں انہیں بار بار پڑھا جائے، اور زندگی کی بے شمار مصروفیات میں سے کچھ وقت یہ سوچنے کے لئے نکالا جائے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ چنانچہ سرکارِ دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

((أَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ))(۱)

''لذتوں کو ختم کرنے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد رکھا کرو''

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سرورِ دو عالم ﷺ کے ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیقِ کامل عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب منه، رقم: ۲۳۸۴

جنت کے حسین مناظر ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.
﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ أُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَأْكُلُوْنَ﴾ (۱)

آخرت کے حالات جاننے کا راستہ

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! مرنے کے بعد کے حالات جاننے کا انسان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے، کوئی علم کوئی فن کوئی معلومات ایسی نہیں ہیں جو انسان کو مرنے کے بعد کے حالات سے باخبر کر سکے۔ جو شخص اس دنیا سے وہاں چلا جاتا ہے اس کو وہاں کے حالات کی خبر ہوتی ہے، لیکن ہمیں پھر اس جانے والے کی خبر نہیں رہتی۔

ایک بزرگ کا عجیب قصہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک بزرگ کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک بزرگ تھے، ان کے مریدین نے ایک مرتبہ ان بزرگ سے کہا کہ حضرت! جو شخص بھی مرنے کے بعد اس دنیا سے جاتا ہے وہ ایسا جاتا ہے کہ پلٹ کر خبر نہیں لیتا، نہ تو یہ بتاتا ہے کہ کہاں پہنچا اور نہ یہ بتاتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا اور نہ یہ بتاتا ہے کہ اس نے کیا مناظر دیکھے، کوئی ایسی تدبیر بتائیے کہ ہمیں بھی وہاں کی کوئی خبر مل جائے۔ ان بزرگ نے فرمایا: ایسا کرو کہ جب میرا انتقال ہو جائے اور مجھے قبر میں دفن کرو تو قبر کے اندر میرے پاس تم ایک کاغذ اور قلم رکھ دینا۔ مجھے اگر

☆ اصلاحی خطبات (۹/۲۳۱-۲۵۳)، ۱۷ نومبر ۱۹۹۵ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) الزخرف: ۷۲-۷۳

موقع ملا تو میں لکھ کر تمہیں وہاں کی خبر بتلادوں گا کہ وہاں کیا واقعات پیش آئے۔لوگ بہت خوش ہوئے کہ چلو کوئی بتانے والا ملا۔

جب ان بزرگ کا انتقال ہوا تو ان کی وصیت کے مطابق ان کو دفن کرتے وقت ان کے ساتھ ایک کاغذ اور قلم بھی رکھ دیا۔ان بزرگ نے یہ بھی وصیت کی تھی کہ دوسرے دن قبر پر آکر وہ کاغذ اُٹھالینا، اس پر تمہیں لکھا ہوا ملے گا۔ چنانچہ اگلے دن لوگ ان کی قبر پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک پرچہ ان کی قبر پر لکھا ہوا پڑا ہے۔اس پرچے کو دیکھ کر لوگ بہت خوش ہوئے کہ آج ہمیں اس دنیا کی خبر مل جائے گی،لیکن جب پرچہ اُٹھا کر پڑھا تو اس پر یہ لکھا ہوا تھا کہ:

''یہاں کے حالات دیکھنے والے ہیں، بتانے والے نہیں''

واللہ اعلم، یہ واقعہ کیسا ہے؟ سچا یا جھوٹا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو ہے کہ ایسا کر دیتے۔ اس لئے یہ واقعہ سچا بھی ہوسکتا ہے اور جھوٹا اور من گھڑت بھی ہوسکتا ہے۔لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہاں کے حالات بتانے کے نہیں ہیں، دیکھنے کے ہیں۔اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہاں کے حالات کو ایسا راز کے اندر رکھا ہے کہ کسی پر بھی ذرا سا ظاہر نہیں ہوتا۔بس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اور حضورِ اقدس ﷺ نے احادیث میں جتنی باتیں بتادیں اس سے زیادہ کسی کو وہاں کے حالات کے بارے میں معلوم ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔قرآن وحدیث کے ذریعہ جو حالات ہم تک پہنچے ہیں، ان کو یہاں پر تھوڑا سا بیان کرنا مقصود ہے۔

ادنیٰ جنتی کی جنت کا حال

چنانچہ حضرت مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ اے پروردگار! اہلِ جنت میں سب سے کم درجہ کس کا ہوگا اور سب سے ادنیٰ آدمی جنت میں کون ہوگا؟ جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جب سارے جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور جہنم والے جہنم میں چلے جائیں گے، ایک آدمی جنت میں جانے سے رہ گیا ہوگا اور جنت کے آس پاس کے علاقے میں بیٹھا ہوگا۔اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ جب تم دنیا میں تھے اس وقت تم نے بڑے بڑے بادشاہوں کا ذکر سنا ہوگا، ان بادشاہوں میں سے اپنی مرضی سے چار بادشاہوں کا انتخاب کرکے میرے سامنے بیان کرو، اور پھر ان بادشاہوں کی سلطنتوں کے جتنے حصے تھے، ان میں سے جتنے حصوں کا تم نام بیان کرسکتے ہو بیان کرو، چنانچہ وہ شخص کہے گا کہ یا اللہ! میں نے فلاں فلاں بادشاہ کا ذکر سنا تھا، ان کی سلطنت بڑی عظیم تھی، اس کو بڑی نعمتیں ملی ہوئی تھیں، میرا دل چاہتا ہے کہ مجھے بھی ویسی ہی سلطنت مل جائے۔اس طرح وہ ایک ایک کرکے چار مختلف بادشاہوں کی

سلطنت کا نام لے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ تم نے ان کی سلطنتوں کے اور ان کے علاقوں کے نام تو بتا دیئے لیکن ان بادشاہوں کو جو لذتیں حاصل تھیں اور ان کے بارے میں تم نے سنا ہوگا کہ فلاں بادشاہ ایسے عیش و آرام میں ہے، ان لذتوں میں سے جو لذت تم حاصل کرنا چاہتے ہو، ان کا ذکر کرو۔ چنانچہ وہ شخص ان لذتوں کا ذکر کرے گا کہ میں نے سنا تھا کہ فلاں بادشاہ کو یہ نعمت حاصل تھی، فلاں بادشاہ کو یہ لذت حاصل تھی، یہ لذتیں مجھے بھی مل جائیں۔

پھر اللہ تعالیٰ اس سے سوال کریں گے کہ جن بادشاہوں کا تم نے نام لیا ہے اور ان کی جن سلطنتوں کو تم نے گنوایا ہے اور ان کی جن نعمتوں اور لذتوں کا تم نے ذکر کیا ہے اگر وہ تمہیں مل جائیں تو تم راضی ہو جاؤ گے؟ وہ بندہ عرض کرے گا کہ یا اللہ! اس سے بڑی اور کیا نعمت ہو سکتی ہے، میں تو ضرور راضی ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا تم نے جتنی سلطنتوں کا نام لیا اور ان کی جن نعمتوں اور لذتوں کا تم نے نام لیا اس سے دس گنا زیادہ تمہیں عطا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ جنت کا سب سے کم تر آدمی جس کو سب سے ادنیٰ درجہ کی جنت ملے گی وہ یہ شخص ہوگا۔ موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ یا اللہ! جب ادنیٰ آدمی کا یہ حال ہے تو جو آپ کے پسندیدہ بندے ہوں گے جن کو اعلیٰ ترین درجات عطا کیے گئے ہوں گے، ان کا کیا حال ہوگا؟ جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے موسیٰ! جو میرے پسندیدہ بندے ہوں گے ان کے اکرام کی چیزیں تو میں نے اپنے ہاتھ سے بنا کر ان کو خزانوں میں مہر لگا کر محفوظ کر کے رکھ دی ہیں اور ان میں وہ چیزیں ہیں کہ:

((مَا لَمْ تَرَ عَيْنٌ وَلَمْ يَسْمَعْ أُذُنٌ وَلَمْ يَخْطُرْ عَلٰى قَلْبِ أَحَدٍ مِنَ الْخَلْقِ))

یعنی وہ نعمتیں ایسی ہیں کہ آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور آج تک کسی کان نے ان کا تذکرہ نہیں سنا، اور آج تک کسی انسان کے دل پر ان کا خیال بھی نہیں گزرا، ایسی نعمتیں میں نے تیار کر کے رکھی ہوئی ہیں۔ (۱)

ایک اور ادنیٰ جنتی کی جنت

ایک اور حدیث میں خود حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کا حال بیان فرمایا کہ سب سے آخر میں جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ ایسا شخص ہوگا جو اپنے اعمالِ بد کی پاداش میں جہنم میں ڈال دیا جائے گا، کیونکہ اگر آدمی مؤمن ہی کیوں نہ ہو، لیکن اگر اعمال خراب کیے ہیں تو پہلے اس کو ان اعمال کی سزا بھگتنی پڑے گی، اس لئے اس کو پہلے جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اب وہ شخص جہنم میں جھلس رہا ہوگا تو اس

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب أدنی أهل الجنة منزلة فيها، رقم: ۲۷۶، سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله، رقم: ۳۱۲۲

وقت وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا کہ یا اللہ! اس جہنم کی تپش اور اس کی گرمی نے تو مجھے جھلسا دیا ہے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کہ آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے جہنم سے نکال کر اُوپر کنارے پر بٹھا دیں تاکہ میں تھوڑی دیر کے لئے جلنے سے بچ جاؤں۔

اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ اگر ہم تمہیں وہاں بٹھا دیں گے تو تم کہو گے کہ مجھے اور آگے پہنچا دو۔ وہ بندہ کہے گا کہ یا اللہ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ بس ایک مرتبہ یہاں سے نکال کر اُوپر بٹھا دیں، پھر آگے جانے کے لئے نہیں کہوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں۔ چنانچہ اس کو جہنم سے نکال کر اُوپر بٹھا دیا جائے گا۔ جب وہاں تھوڑی دیر تک بیٹھے گا اور کچھ اس کے ہوش وحواس ٹھکانے پر آئیں گے تو تھوڑی دیر کے بعد کہے گا کہ یا اللہ! آپ نے مجھے یہاں بٹھا دیا اور جہنم سے نکال تو دیا لیکن ابھی جہنم کی لپٹ یہاں تک آرہی ہے، تھوڑی دیر کے لئے اور دور کر دیں کہ یہ لپٹ بھی نہ آئے۔

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم نے ابھی وعدہ کیا تھا کہ آگے جانے کے لئے نہیں کہوں گا، اب تو وعدہ خلافی کر رہا ہے؟ وہ کہے گا: یا اللہ! مجھے تھوڑا اور آگے بڑھا دیں تو پھر میں کچھ نہیں کہوں گا اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کو تھوڑا سا اور دور کر دیں گے۔ اور اب اس کو اس جگہ سے جنت نظر آنے لگے گی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہے گا کہ یا اللہ! آپ نے مجھے جہنم سے تو نکال دیا اور اب مجھے یہ جنت نظر آرہی ہے، آپ تھوڑی اجازت دیدیں کہ میں اس جنت کا تھوڑا سا نظارہ کرلوں اور اس کے دروازے کے پاس جا کر دیکھ آؤں کہ یہ جنت کیسی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو پھر وعدہ خلافی کر رہا ہے۔ وہ شخص کہے گا کہ یا اللہ! جب آپ نے اپنے کرم سے یہاں تک پہنچا دیا تو ایک جھلک مجھے جنت کی بھی دکھا دیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب تمہیں ایک نظر جنت کی دکھاؤں گا تو کہے گا کہ مجھے ذرا اندر بھی داخل کر دیں۔ وہ شخص کہے گا: نہیں یا اللہ! مجھے صرف جنت کی ایک جھلک دکھا دیں، اس کے بعد پھر کچھ نہیں کہوں گا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی ایک جھلک دکھا دیں گے۔ لیکن جنت کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا: یا اللہ! آپ ارحم الراحمین ہیں؟ (سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہیں) جب آپ نے مجھے جنت کے دروازے تک پہنچا دیا تو اب اے اللہ! اپنے فضل سے مجھے اندر بھی داخل فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھ ہم تو تجھ سے پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ تو وعدہ خلافی کرے گا، لیکن چل، جب ہم نے تجھے اپنی رحمت سے یہاں تک پہنچا دیا تو اب ہم تجھے اس میں داخل بھی کر دیتے ہیں اور جنت میں تجھے اتنا بڑا رقبہ دیتے ہیں جتنا پوری زمین کا رقبہ ہے۔ وہ شخص کہے گا: یا اللہ! آپ ارحم الراحمین ہیں اور میرے ساتھ مذاق کرتے ہیں؟ میں کہاں اور جنت کا اتنا بڑا

رقبہ کہاں؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں مذاق نہیں کرتا ہوں، تمہیں واقعی جنت کا اتنا بڑا رقبہ عطا کیا جاتا ہے۔(۱)

حدیث مسلسل بالضحک

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے یہ حدیث ہنستے ہوئے بیان فرمائی، اور پھر جن صحابی نے یہ حدیث سنی تھی انہوں نے یہ حدیث اپنے شاگردوں کے سامنے ہنستے ہوئے بیان فرمائی، پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہنستے ہوئے بیان فرمائی، یہاں تک کہ حضور اقدس ﷺ کے وقت سے لے کر آج تک جب بھی یہ حدیث بیان کی جاتی ہے تو بیان کرنے والا بھی ہنستا ہے اور سننے والے بھی ہنستے ہیں، اسی وجہ سے یہ حدیث ''مسلسل بالضحک'' کہلاتی ہے۔

پورے کرۂ زمین کے برابر جنت

بہرحال، یہ وہ شخص ہوگا جو سب سے آخر میں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اب آپ اندازہ کریں کہ سب سے آخر میں جنت میں داخل ہونے والے کے بارے میں یہ کہا جارہا ہے کہ جتنا پورا کرۂ زمین ہے، اتنا حصہ جنت میں عطا کیا جائے گا تو پھر اُوپر کے درجات والوں کا کیا حال ہوگا اور ان کو جنت میں کتنا بڑا مقام دیا جائے گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم اس دنیا کی چاردیوری میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہمیں اس عالَم کی ہوا بھی نہیں لگی، اس وجہ سے اس عالَم کی وسعتوں کا کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکتے، اسی لئے ہمیں اس پر تعجب ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو پورے کرۂ ارض کے برابر جگہ کیسے ملے گی؟ اور اگر مل بھی جائے گی تو وہ اتنی بڑی زمین کو لے کر کیا کرے گا؟ یہ اشکال بھی اس لئے ہورہا ہے کہ اس عالَم کی ہمیں ہوا بھی نہیں لگی۔

عالَمِ آخرت کی مثال

اس عالَمِ آخرت کے مقابلے میں ہماری مثال ایسی ہے جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ، اس بچہ کو اس دنیا کی ہوا نہیں لگی ہوتی، اس لئے وہ بچہ اس دنیا کی وسعتوں کا اندازہ نہیں کرسکتا، وہ بچہ ماں کے پیٹ ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے لیکن جب وہ بچہ دنیا میں آتا ہے تو اس وقت اس کو پتہ چلتا ہے کہ ماں کا پیٹ تو اس دنیا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت کا عالَم اپنی رضا کے ساتھ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار، رقم: ٢٠٨٦، صحیح مسلم، کتاب الایمان، رقم: ٢٧٢، سنن الترمذی، کتاب صفة جهنم عن رسول الله، رقم: ٢٥٢٠

دکھادے تو پتہ چلے کہ وہ عالَمِ آخرت کیا چیز ہے اور اس کے اندر کتنی وسعت ہے۔ اور وہ عالَم مؤمنوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

یہ جنت تمہارے لئے ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ الحمد للہ، جنت مؤمنوں کے لئے تیار کی گئی ہے، صاحب ایمان کے لئے تیار کی گئی ہے، اگر تم اللہ جل جلالہ پر ایمان رکھتے ہو تو یقین کرو کہ وہ تمہارے لئے ہی تیار کی گئی ہے، ہاں البتہ اس جنت تک پہنچنے کے لئے اور اس کے راستوں کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے تھوڑا سا کام کرنا ہے، بس وہ کام کرلو تو انشاء اللہ وہ جنت تمہاری ہے اور تمہارے لئے تیار کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو جنت عطاء فرمائے۔ آمین۔

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ اور آخرت کا دھیان

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں اور بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں، حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے استاد حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جمعہ کے دن کسی بازار میں چلا گیا، ان کو کوئی چیز خریدنی تھی، چنانچہ بازار جاکر وہ چیز خریدلی۔ جب بازار سے واپس لوٹنے لگے تو حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: اے سعید! میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمہیں دونوں کو جنت کے بازار میں جمع کرے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان دیکھئے کہ وہ ہر آن اور ہر لمحے آخرت کی کوئی نہ کوئی بات ادنیٰ سی مناسبت سے نکال کر اس کے دھیان کو اور اس کے ذکر کو تازہ کرتے رہتے تھے، تاکہ دنیا کی مشغولیات انسان کو اس طرح اپنے اندر مشغول نہ کردیں کہ انسان آخرت کو بھول جائے۔ لہٰذا دنیا کا کام کررہے ہیں، بازار میں خریداری کررہے ہیں اور خریداری کے دوران شاگرد کے سامنے یہ دعا کردی۔

جنت کے اندر بازار

حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا جنت میں بھی بازار ہوں گے؟ اس لئے کہ ہم نے یہ سنا ہے کہ جنت میں ہر چیز مفت ملے گی اور بازار میں خرید وفروخت ہوتی ہے۔ جواب میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہاں پر بھی بازار ہوں گے،

میں نے حضورِ اقدس ﷺ سے سنا ہے کہ ہر جمعہ کے دن جنت میں اہلِ جنت کے لئے بازار لگا کرے گا۔ پھر اس کی تفصیل حضورِ اقدس ﷺ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جب اہلِ جنت جنت میں چلے جائیں گے اور سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں گے، اور خوب عیش و آرام سے زندگی گزار رہے ہوں گے اور وہاں ان کو اتنی نعمتیں دی جائیں گی کہ وہاں سے کہیں اور جانے کا تصور بھی نہیں کریں گے، تو اچانک یہ اعلان ہوگا کہ تمام اہلِ جنت کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے باہر آجائیں اور ایک بازار کی طرف چلیں، چنانچہ اہلِ جنت اپنے اپنے ٹھکانوں سے باہر نکلیں گے اور بازار کی طرف چل پڑیں گے۔ وہاں جاکر ایک ایسا بازار دیکھیں گے جس میں ایسی عجیب وغریب اشیاء نظر آئیں گی جو اہلِ جنت نے اس سے پہلے کبھی دیکھی نہیں ہوں گی، اور ان اشیاء سے دکانیں سجی ہوں گی، لیکن خرید وفروخت نہیں ہوگی بلکہ یہ اعلان ہوگا کہ جس اہلِ جنت کو جو چیز پسند ہو وہ دکان سے اُٹھا لے اور لے جائے۔ چنانچہ اہلِ جنت ایک طرف سے دوسری طرف بازار میں دکانوں کے اندر عجیب و غریب اشیاء کا نظارہ کرتے ہوئے جائیں گے اور ایک سے ایک نعمت ان کو نظر آئے گی، اور جس اہلِ جنت کو جو چیز پسند آئے گی وہ اس کو اُٹھا کر لے جائے گا۔ (۱)

جنت میں اللہ تعالیٰ کا دربار

جب بازار کی خریداری ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہوگا کہ اب سب لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایک اجتماع ہوگا، اور یہ کہا جائے گا کہ آج وہ دن ہے کہ جب دنیا میں تم رہتے تھے تو وہاں جمعہ کا دن آیا کرتا تھا تو تم لوگ جمعہ کی نماز کے لئے اپنے گھروں سے نکل کر ایک جگہ جمع ہوا کرتے تھے، تو آج جمعہ کے اجتماع کا بدل جنت کے اس اجتماع کی صورت میں عطا فرما رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا دربار لگا ہوا ہے، وہاں پر حاضر ہونے کی دعوت دی جاتی ہے، چنانچہ تمام اہلِ جنت اللہ تعالیٰ کے اس دربار میں پہنچیں گے۔ اس دربار میں ہر شخص کے لئے پہلے سے کرسیاں لگی ہوں گی، کسی کی کرسی جواہر سے بنی ہوگی، کسی کی کرسی سونے سے بنی ہوگی، کسی کی کرسی موتیوں سے بنی ہوگی اور کسی کی کرسی چاندی سے بنی ہوئی ہوگی، اس طرح حسبِ درجات کرسیاں ہوں گی۔ جو شخص جتنا اعلیٰ درجے کا ہوگا اس کی کرسی اتنی شاندار ہوگی، ان پر اہلِ جنت کو بٹھایا جائے گا۔ اور ہر شخص اپنی کرسی کو اتنا اچھا سمجھے گا کہ اس کو یہ حسرت نہیں ہوگی کہ کاش مجھے ویسی کرسی مل جاتی جیسے فلاں شخص کی کرسی ہے، کیونکہ اس جنت کے عالم میں غم اور حسرت کا کوئی تصور نہیں ہے، اس لئے اس کو عمدہ کی خواہش ہی نہیں ہوگی۔

(۱) الترغیب والترهیب (٤/ ٤٩٦)، وصف الفردوس، ص: ٦٠

اور جنت میں جو سب سے کم رتبے کے لوگ ہوں گے ان کے لئے کرسیوں کے اردگرد مشک و عنبر کے ٹیلے ہوں گے، ان ٹیلوں پر ان کی نشستیں مقرر ہوں گی، اس پر ان کو بٹھا دیا جائے گا۔ جب سب اہلِ جنت اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں گے تو اس کے بعد دربارِ خداوندی کا آغاز اس طرح ہوگا کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام (جنہوں نے قیامت کا صور پھونکا تھا) سے اللہ تعالیٰ ایسے لحن میں اپنا کلام اور نغمہ سنوائیں گے کہ ساری دنیا کے لحن اور موسیقیاں اس کے سامنے ہیچ اور کمتر ہوں گے۔

مشک وزعفران کی بارش

نغمہ اور کلام سنوانے کے بعد آسمان پر بادل چھا جائیں گے جیسے گھٹا آجاتی ہے اور ایسا محسوس ہوگا کہ اب بارش ہونے والی ہے، لوگ ان بادلوں کی طرف دیکھ رہے ہوں گے، اتنے میں تمام اہلِ دربار کے اُوپر مشک اور زعفران کا چھڑکاؤ ان بادلوں سے کیا جائے گا اور اس کے نتیجے میں خوشبو سے پورا دربار مہک جائے گا، اور وہ خوشبو ایسی ہوگی کہ اس سے پہلے نہ کسی نے سونگھی ہوگی اور نہ اس کا تصور کیا ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک ہوا چلے گی اور اس ہوا کے چلنے کے نتیجے میں ہر انسان کو ایسی فرحت اور نشاط حاصل ہوگا کہ اس کی وجہ سے اس کا حسن و جمال دوبالا ہو جائے گا، اس کی صورت اور اس کا سراپا پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور خوبصورت ہو جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کا مشروب تمام حاضرین کو پلایا جائے گا، وہ مشروب ایسا ہوگا کہ دنیا کے کسی مشروب سے اس کو تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔

جنت کی سب سے عظیم نعمت ''اللہ کا دیدار''

اس کے بعد اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ اے جنت والو! یہ بتاؤ کہ دنیا میں جو ہم نے تم سے وعدے کیے تھے کہ تمہارے اعمالِ صالحہ اور ایمان کے بدلے میں ہم تمہیں فلاں فلاں نعمتیں دیں گے، کیا وہ ساری نعمتیں تمہیں مل گئیں یا کچھ نعمتیں باقی ہیں؟ تو سارے اہلِ جنت بیک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ یا اللہ! ان سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی جو آپ نے ہمیں عطا فرمادی ہیں، آپ نے تو سارے وعدے پورے فرمادیئے، ہمارے تمام اعمال کا بدلہ ہم کو مل گیا، ساری نعمتیں ہم کو عطا فرمادیں، اب اس کے بعد ہمیں کسی نعمت کی خواہش نظر نہیں آتی، ساری راحتیں حاصل ہوگئیں، ساری لذتیں حاصل ہوگئیں، اب اور کیا نعمت باقی ہے؟ لیکن روایت میں آتا ہے کہ اس وقت بھی علماء کام آئیں گے، چنانچہ لوگ علماء کی طرف رجوع کریں گے کہ آپ بتائیں کہ کونسی نعمت ایسی ہے جو ابھی باقی رہ گئی

ہے اور ہمیں نہیں ملی ہے۔ چنانچہ علماء بتائیں گے کہ ایک نعمت باقی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو، وہ ہے اللہ تعالیٰ کا دیدار۔ چنانچہ تمام اہلِ جنت بیک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ یا اللہ! ایک عظیم نعمت تو ابھی باقی ہے، وہ ہے آپ کا دیدار۔ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہاں تمہاری یہ نعمت باقی ہے، اب تمہیں اس نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا اور اللہ تعالیٰ اپنا جلوہ تمام اہلِ جنت کو دکھائیں گے، اور اس جلوہ کو دیکھنے کے بعد ہر اہلِ جنت یہ محسوس کرے گا کہ ساری نعمتیں جو اس سے پہلے دی گئی تھیں وہ اس عظیم نعمت کے آگے ہیچ در ہیچ ہیں، اس سے بڑی نعمت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ دیدار کی نعمت سے سرفراز ہونے کے بعد اس دربار کا اختتام ہوگا اور پھر تمام اہلِ جنت اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس چلے جائیں گے۔ (۱)

حسن و جمال میں اضافہ

جب وہ اہلِ جنت اپنے ٹھکانوں پر واپس پہنچیں گے تو ان کی بیویاں اور حوریں ان سے کہیں گی کہ آج کیا بات ہوئی کہ تمہارا حسن و جمال پہلے سے کہیں زیادہ ہو چکا ہے، آج تو تم بہت حسین و جمیل بن کر لوٹے ہو۔ جواب میں اہلِ جنت اپنی بیویوں سے کہیں گے کہ ہم تمہیں جس حالت میں چھوڑ کر گئے تھے، تم اس سے کہیں زیادہ حسین و جمیل اور خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ دونوں کے حسن و جمال میں اضافہ اس خوشگوار ہوا کی بدولت ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے چلائی تھی۔ (۲)

بہرحال، یہ جنت میں جمعہ کے دن کے اجتماع اور دربارِ خداوندی کی ایک چھوٹی سی منظر کشی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں کو عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی اس کا کچھ حصہ عطا فرمادے۔ آمین۔

جنت کی نعمتوں کا تصور نہیں ہو سکتا

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ کوئی بھی لفظ اور کوئی بھی تعبیر اور کوئی بھی منظر کشی جنت کے حالات کا صحیح منظر نہیں کھینچ سکتی۔ اس لئے کہ ایک حدیث قدسی میں خود اللہ جل شانہٗ نے فرمایا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار، رقم: ٦٠٦٧، صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، باب احلال الرضوان علی اهل الجنة، رقم: ٥٠٥٧

(۲) حاوی الارواح، ص: ٤١٣

((أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ))

''یعنی میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جو آج تک کسی آنکھ نے دیکھی نہیں، کسی کان نے سنی نہیں اور کسی دل میں اس کا خیال بھی نہیں گزرا''(۱)

اس لئے علماء کرام نے فرمایا کہ جنت کی نعمتوں کے نام تو دنیا کی نعمتوں جیسے ہیں، مثلاً وہاں پر طرح طرح کے پھل ہوں گے، انار ہوں گے، کھجور ہوگی، لیکن ان کی حقیقت ایسی ہوگی کہ آج ہم دنیا میں اس کا تصور نہیں کر سکتے کہ وہ کیسی کھجور ہوگی، کیسا انار ہوگا اور کیسے انگور ہوں گے، ان کی حقیقت کچھ اور ہوگی۔

روایت میں آتا ہے کہ جنت میں محلات ہوں گے۔ اب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جیسے محلات ہوتے ہیں ایسے محلات ہوں گے، لیکن حقیقت میں یہاں بیٹھ کر ان محلات کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح روایات میں آتا ہے کہ شراب اور دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی۔ اب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ دنیا کے دودھ اور شہد کی طرح ہوں گے، جس کی وجہ سے اس کی قدر و منزلت ہمارے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ حالانکہ وہاں کے شہد، شراب اور دودھ کا ہم یہاں پر بیٹھ کر تصور ہی نہیں کر سکتے۔

جنت میں خوف اور غم نہیں ہوگا

جنت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت جو دنیا کے اندر ہمارے لئے ناقابل تصور ہے اور وہ دنیا میں کسی انسان کے تصور میں آ ہی نہیں سکتی، وہ یہ ہے کہ وہاں نہ خوف ہوگا اور نہ حزن اور غم ہوگا، وہاں نہ ماضی کا غم ہوگا نہ مستقبل کا اندیشہ ہوگا۔ یہ وہ نعمت ہے جو دنیا میں کبھی کسی کو میسر آ ہی نہیں سکتی، اس لئے کہ یہ عالم دنیا اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ یہاں کوئی خوشی کامل نہیں، کوئی لذت کامل نہیں۔ پھر ہر خوشی کے ساتھ کوئی نہ کوئی غم ضرور لگا ہوا ہے، ہر لذت کے ساتھ کوئی نہ کوئی تلخی ضرور لگی ہوئی ہے، مثلاً آپ کھانا کھا رہے ہیں، کھانا بڑا لذیذ ہے، کھانے میں بڑا مزہ آ رہا ہے، لیکن یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اگر زیادہ کھا لیا تو بدہضمی ہو جائے گی۔ یا مثلاً آپ کوئی مشروب پی رہے ہیں، بڑا اچھا لگ رہا ہے، لیکن ساتھ یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اگر زیادہ پی لیا تو کہیں پھندا نہ لگ جائے، کسی نہ کسی تکلیف کا، کسی نہ

(۱) صحيح البخاري، كتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة وأنها مخلوقة، رقم: ۳۰۰۵، صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، رقم: ۵۰۵۰، سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة السجدة، رقم: ۳۱۲۱

کسی رنج کا، کسی نہ کسی غم کا اندیشہ ضرور لگا ہوا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جنت کے عالَم کو ہر اندیشہ، ہر غم، ہر تکلیف سے خالی بنایا ہے، وہاں کوئی اندیشہ نہیں ہوگا، کوئی غم نہیں ہوگا، وہاں پر نہ ماضی کا غم ہوگا، اور نہ مستقبل کا اندیشہ ہوگا، وہاں کسی خواہش کے پورے نہ ہونے کی حسرت نہیں ہوگی بلکہ جو خواہش ہوگی وہ پوری ہوگی۔

جنت کی نعمتوں کی دنیا میں جھلک

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اہلِ جنت کی ہر خواہش کو پورا کیا جائے گا، مثلاً یہ خواہش پیدا ہوئی کہ فلاں انار کا رس پیوں۔ اب یہ نہیں ہوگا کہ تمہیں انار توڑ کر اس کا جوس نکالنا پڑے گا بلکہ انار کا جوس خود تمہارے سامنے حاضر کردیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جنت کی نعمتوں کی تھوڑی تھوڑی جھلکیاں دنیا کے اندر بھی دکھائی ہیں، پہلے جب جنت کی نعمتوں کا تذکرہ کیا جاتا تھا تو لوگ ان کو بہت عجیب ناقابلِ یقین سمجھتے تھے کہ یہ طلسماتی باتیں ہیں اور ان باتوں پر یقین کرنے میں لوگوں کو تامل ہوتا تھا۔ لیکن آج اللہ تعالیٰ نے دکھادیا کہ جب انسان نے اپنی محدود سے محدود عقل کے بل بوتے پر اور تجربے کے بل بوتے پر ایسے کام کردکھائے کہ اگر سو سال پہلے ان کاموں کے بارے میں لوگوں کو بتادیا جاتا تو لوگ پاگل اور دیوانہ کہتے۔ مثلاً سو سال تو دور کی بات ہے، اگر آج سے صرف بیس سال پہلے یہ کہا جاتا کہ ایک ایسا آلہ ایجاد ہونے والا ہے جو ایک منٹ میں تمہارے خط کو امریکہ اور دنیا کے کونے کونے میں پہنچادے گا تو خبر دینے والے کو پاگل کہا جاتا کہ پاکستان کہاں اور امریکہ کہاں، اگر ہوائی جہاز سے بھی جائے تب بھی کم از کم بیس بائیس گھنٹے لگیں گے، ایک منٹ میں خط کیسے پہنچ جائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فیکس مشین اور ٹیلکس مشین کی ایجاد کے ذریعے دکھادیا، یہاں فیکس مشین میں خط ڈالا اور وہاں اس کی کاپی اسی وقت نکل آئی۔ اس محدود عقل کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے آلات ایجاد کرنے کی توفیق عطا فرمادی۔ جب یہ محدود انسان اپنی محدود عقل کے بل بوتے پر ایسے ایسے کام کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے اور اپنی رحمتِ کاملہ سے اپنے بندوں کے لئے ایسے اسباب مہیا نہیں فرماسکتے کہ ادھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی اور ادھر وہ خواہش پوری ہوجائے؟

یہ جنت متقین کے لئے ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جب تک انسان کے سامنے حقائق نہیں آتے، اس وقت تک وہ اعلیٰ درجے کی چیزوں کو ناقابلِ یقین تصور کرتا ہے، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام، جن کو اللہ تعالیٰ نے وہ علم عطا

فرمایا جو دنیا کے کسی بھی انسان کو عطا نہیں کیا گیا، انہوں نے ہمیں جنت اور اس کی نعمتوں کے بارے میں یقینی خبریں دی ہیں کہ اس سے زیادہ یقینی خبریں اور کوئی نہیں ہوسکتیں۔ لہٰذا یہ ساری خبریں سچی ہیں اور ہزار درجہ سچی ہیں، اور جنت حق ہے، اس کی نعمتیں حق ہیں، اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَسَارِعُوٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۱)

''اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس کی جنت کی طرف دوڑو جس کی وسعت آسمان اور زمین کے برابر ہے اور یہ جنت متقین کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں''

تقویٰ اختیار کرنے والے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنے والے ہوں۔

جنت کے گرد ''کانٹوں'' کی باڑ

بہرحال، یہ جنت جو عظیم الشان ہے اور جس کی نعمتیں عظیم الشان ہیں، لیکن اسی جنت کے بارے میں ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ)) (۲)

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جنت کو ایسی چیزوں سے گھیرا ہوا ہے جو ظاہری طور پر انسان کے نفس کو شاق ہوتی ہیں اور ناگوار ہوتی ہیں۔ جیسے ایک بہت عالیشان محل ہے لیکن اس محل کے اردگرد کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی ہے، اس محل میں داخل ہونے کے لئے کانٹوں کی باڑ کو عبور کرنا ہی پڑے گا، اور جب تک کانٹوں کی اس باڑ کو پار نہیں کروگے اس محل کی لذتیں اور نعمتیں حاصل نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس عالیشان جنت کے گرد ان چیزوں کی باڑ لگائی ہے جو انسان کے نفس کو شاق گزرتی ہیں۔ مثلاً فرائض و واجبات لازم کردیئے کہ یہ فرائض انجام دو۔ اب آدمی کے نفس کو یہ بات شاق گزرتی ہے کہ اپنے سب کام چھوڑ کر مسجد جائے اور مسجد میں جا کر نماز ادا کرے۔ اسی طرح بہت سے کام جن کے کرنے کو انسان کا دل چاہتا ہے لیکن ان کو حرام اور گناہ قرار دیدیا گیا۔ مثلاً یہ حکم دے دیا گیا کہ اس نگاہ کی حفاظت کرو، یہ نگاہ غلط جگہ پر نہ پڑے، نامحرم پر نہ پڑے، اور یہ نگاہ غلط اور ناجائز

(۱) آل عمران: ۱۳۳

(۲) صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، رقم: ۵۰۴۹، سنن الترمذي، كتاب صفة الجنة عن رسول الله، باب ما جاء صفت الجنة بالمكاره، رقم: ۲۴۸۲

پروگرام نہ دیکھے۔ ان سب کاموں سے رکنا انسان پر شاق گزرتا ہے، اب اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ یہ کام کرے لیکن اس کو روک دیا گیا۔ یہی کانٹوں کی باڑ ہے جو جنت کے گرد لگی ہوئی ہے۔ یا مثلاً مجلس میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، کسی کا ذکر آ گیا، اب دل چاہ رہا ہے کہ اس کی خوب غیبت کریں، لیکن یہ حکم دیدیا گیا کہ نہیں، غیبت مت کرو، اپنی زبان روک لو، یہ ہے کانٹوں کی باڑ۔ اگر جنت کو حاصل کرنا ہے تو کانٹوں کی اس باڑ کو عبور کرنا ہوگا، اس کے بغیر جنت کا حصول ممکن نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے۔

دوزخ کے گرد شہوات کی باڑ

اسی حدیث میں پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ))(۱)

یعنی دوزخ کے گرد اللہ تعالیٰ نے شہوات کی باڑ لگادی ہے، دوزخ کو بڑی خوشنما چیزوں اور دلکش خواہشات نے گھیر رکھا ہے، دل ان کی طرف بھاگنے کو چاہتا ہے لیکن اسکے اندر آگ ہی آگ ہے۔

یہ کانٹوں کی باڑ بھی پھول بن جاتی ہے

بہر حال، اس جنت کے گرد کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی ہے، لیکن یہ کانٹے بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے بنائے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہمت اور عزم کرلے کہ مجھے کانٹوں کی یہ باڑ عبور کرنی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ان کانٹوں کو بھی پھول بنادیتے ہیں۔ یہ کانٹے اس وقت تک کانٹے ہیں جب تک ان کو دور دور سے دیکھو گے اور جب تک ان کا تصور کرتے رہوگے تو یہ کانٹے ہیں اور ان کا عبور کرنا مشکل نظر آئے گا، لیکن جب ایک مرتبہ ڈٹ کر اور ہمت کرکے ارادہ کرلیا کہ میں تو کانٹوں کی یہ باڑ عبور کرکے رہوں گا اور مجھے اس کانٹے کی باڑ کے پیچھے وہ باغ نظر آرہا ہے اور اس کی نعمتیں نظر آرہی ہیں اور مجھے اس کانٹوں کی باڑ کو پار کرکے اس باغ میں جانا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کانٹوں کو بھی پھول بنادیتے ہیں اور اس کو گلزار بنادیتے ہیں۔

ایک صحابی کا جان دے دینا

ایک صحابی جہاد میں شریک ہیں، انہوں نے دیکھا کہ دشمن کا لشکر بڑی طاقت کے ساتھ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب حجبت النار بالشهوات، رقم: ٦٠٠٦، سنن الترمذی، کتاب صفة الجنة عن رسول الله، رقم: ٢٤٨٣، سنن النسائی، کتاب الایمان والنذور، رقم: ٣٧٠٣

مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہا ہے اور اب بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس وقت بے ساختہ زبان پر جو کلمہ آیا وہ یہ تھا کہ:

غَدًا نَلْقَى الْاَحِبَّهْ مُحَمَّدًا وَّ صَحْبَهْ

یعنی وہ وقت آ گیا کہ کل ہماری ملاقات اپنے محبوبوں سے اور دوستوں سے ہوگی یعنی محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ سے اس عالمِ آخرت میں ملاقات ہوگی۔ (۱)

گویا کہ آگ اور خون کا جو کھیل ہو رہا تھا، جس میں لاشیں تڑپ رہی تھیں اور جان دینا جو سب سے زیادہ مشکل نظر آ رہا تھا، لیکن وہ صحابی اس جان دینے کی تکلیف کو خوشی خوشی سہنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ کے راستے میں لڑنے والا شہید ہوتا ہے اور اس کو موت آتی ہے تو اس کو موت آنے کی تکلیف اتنی بھی نہیں ہوتی جتنی چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے۔ (۲) یہ درحقیقت جنت تک پہنچنے کے لئے کانٹے کی باڑ حائل تھی جس کو عبور کرنا تھا لیکن جب عزم کر لیا کہ یہ جان تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے اسی کو دینی ہے۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جب یہ عزم کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کانٹے کو پھول بنا دیا، اگر بستر پر مرتے تو نہ جانے کس طرح ایڑیاں رگڑ کر مرتے، کیا کیا تکلیف اُٹھانی پڑتیں، لیکن ہم نے تمہارے لئے قتل ہونے کی تکلیف بھی ایسی بنا دی جیسی چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے۔

دنیا والوں کے طعنوں کو قبول کرلو

بہرحال، یہ کانٹے بھی دور دور سے دیکھنے کے کانٹے ہیں، لیکن جب آدمی ایک مرتبہ عزم اور ہمت کر لے اور اس کی طرف چل پڑے تو اللہ تعالیٰ ان کانٹوں کو بھی اس کے لئے پھول بنا دیتے ہیں۔ لہٰذا ہم لوگ جو سوچتے رہتے ہیں کہ اگر ہم نے دین کے فلاں حکم پر عمل کر لیا یا فلاں گناہ سے بچ گئے یا فلاں کام کر لیا تو اول نفس کو بڑی مشقت ہوگی، پھر دوسری طرف معاشرے کا خیال آتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ یہ تو بالکل مولوی ہو گیا، یہ تو پرانے وقت کا آدمی ہو گیا، یہ تو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کو تیار نہیں، اس قسم کے طعنے ملنے کا خیال آتا ہے، یاد رکھو! یہ سب کانٹے ہیں اور جنت تک پہنچنے کے لئے راستے میں جو کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی ہے یہ بھی انہی میں سے ہیں۔ جب تم ایک مرتبہ ان کانٹوں کو

(۱) سیر اعلام النبلاء (۱/ ۳۵۹) اسد الغابۃ (۱/ ۲۰۹)

(۲) سنن الترمذی، کتاب فضائل الجہاد عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی فضل المرابط، رقم: ۱۵۹۱

خندہ پیشانی سے قبول کرلو گے اور ان سے یہ کہہ دو گے کہ ہاں! ہم مولوی ہیں اور بیک ورڈ ہیں، لیکن ہم ایسے بیک ورڈ ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت کی طرف دیکھنے والے ہیں۔ جب تم ایک مرتبہ یہ عزم کرلو گے تو یقین رکھو کہ یہ سب کانٹے تمہارے لئے پھول بن جائیں گے۔

عزت دین پر چلنے والوں کی ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ اس دنیا کے اندر دکھا دیتے ہیں کہ ان طعنہ دینے والے اور الزام عائد کرنے والوں کی زبانیں رک جاتی ہیں اور بالآخر اللہ تعالیٰ عزت انہی لوگوں کو عطا فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ عزت انہی کی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے تابع فرمان ہوں۔ عہدِ رسالت میں منافقین بھی مسلمانوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ ہم تو عزت والے ہیں، اور مسلمان ذلیل ہیں، اور جب مدینہ منورہ جائیں گے تو عزت والے ذلیل لوگوں کو باہر نکال دیں گے یعنی مسلمانوں کو۔ چنانچہ یہ منافقین مسلمانوں کو ذلیل ہونے کا طعنہ دیا کرتے تھے، ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۱)

''یعنی عزت تو اللہ کے لئے ہے اور اللہ کے رسول کے لئے ہے اور مؤمنین کے لئے ہے، لیکن منافقین نہیں جانتے، ان کو حقیقتِ حال کا پتہ نہیں''

پھر عبادتوں میں لذت آئے گی

تو جنت کے اردگرد کانٹے ضرور ہیں لیکن یہ آزمائش کے کانٹے ہیں، جب تم اس کے قریب جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ انہی کانٹوں کو پھول بنا دیں گے اور پھر یہی عبادتیں جو تم پر شاق گزر رہی تھیں، انہی عبادتوں میں وہ لذت حاصل ہوگی کہ دنیا کے بڑے سے بڑے لذیذ کام میں حاصل نہیں ہوتی، چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ فرمایا کرتے تھے:

((قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ)) (۲)

''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''

یعنی یہ نماز ویسے تو عبادت ہے لیکن اس میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسی لذت عطا فرمائی ہے کہ دنیا کی ساری لذتیں اس کے آگے ہیچ ہیں۔

---

(۱) المنافقون: ۸

(۲) سنن النسائي، كتاب عشرة النساء، باب حب النساء، رقم: ۳۸۷۸، مسند أحمد، مسند المكثرين من الصحابة، رقم: ۵۳۶۳

گناہ چھوڑنے کی تکلیف

اسی طرح گناہ چھوڑنے میں بیشک مشقت معلوم ہوتی ہے، دل پر آرے چل جاتے ہیں، لیکن دل پر آرے چلنے کے باوجود آدمی اللہ کے لئے یہ گناہ چھوڑ دے اور یہ کہے کہ میں اپنی ان خواہشات کو اللہ کے آگے قربان کر رہا ہوں تو ابتداء میں ضرور مشقت ہوتی ہے لیکن بالآخر پھر ان خواہشات کو کچلنے ہی میں مزہ آتا ہے۔ جب بندہ یہ تصور کرتا ہے کہ میں یہ خواہشات اپنے مالک کے لئے کچل رہا ہوں، اپنے خالق کے لئے کچل رہا ہوں تو پھر اس کو اسی میں لذت حاصل ہوتی ہے۔

ماں بچے کی تکلیف کیوں برداشت کرتی ہے؟

دیکھئے! ایک ماں ہے اور اس کا چھوٹا سا بچہ ہے، سردی کی رات ہے اور ماں اپنے بچے کے ساتھ لحاف میں لیٹی ہے، اتنے میں بچے نے پیشاب پاخانہ کر دیا، اب وہ ماں اس گرم اور نرم لحاف اور بستر کو چھوڑ کر اس بچے کے کپڑے بدل رہی ہے، اس کا بستر اور کپڑے ٹھنڈے پانی سے دھو رہی ہے، اب اس وقت میں اپنی نیند خراب کر کے ٹھنڈے پانی سے یہ کام کرنا کتنا مشکل کام ہے، لیکن وہ ماں یہ سب کام کرتی ہے اور اس کو اس کام میں مشقت بھی ہوتی ہے، لیکن جب وہ یہ تصور کرتی ہے کہ میں یہ کام اپنے بچے کے لئے کر رہی ہوں، اپنے جگر کے ٹکڑے کے لئے کر رہی ہوں تو اس مشقت ہی میں اس کو لطف اور مزہ آنے لگتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس خاتون سے کہے کہ تجھے بڑی مشقت اُٹھانی پڑتی ہے، راتوں کو اُٹھنا پڑتا ہے، سردی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اگر تیرا یہ بچہ تجھ سے چھن جائے تو تیری یہ مشقتیں اور تکلیفیں دور ہو جائیں، تو خاتون یہ کہے گی کہ اس مشقت سے ہزار گنا مشقت اور تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہوں لیکن میرا بچہ مجھ سے نہ چھن جائے۔ کیوں ایسا کہے گی؟ اس لئے کہ اس خاتون کو اس بچہ سے محبت ہے اور اس کی محبت کی خاطر سخت سے سخت کام کرنے کو نہ صرف تیار ہے بلکہ اس کو اسی مشقت اور تکلیف میں مزہ آتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب ایک بندے کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو جاتی ہے، تو پھر اللہ کی راہ میں اپنے نفس کی خواہشات کو کچلنے میں وہ لذت حاصل ہوتی ہے جو خواہشات کے پورا کرنے میں حاصل نہیں ہوتی۔

جنت اور عالمِ آخرت کا مراقبہ کریں

بہرحال، جنت کی یہ نعمتیں جو حضورِ اقدس ﷺ نے بیان فرمائیں اور سارا قرآن کریم ان نعمتوں کے تذکرے سے بھرا ہوا ہے، یہ اس لئے بیان کی گئی ہیں تاکہ انسان ان کو حاصل کرنے کی

کوشش کرے اور کانٹوں کی اس باڑ کو عبور کرے جو اس جنت کے اردگرد لگی ہوئی ہے۔ اس کے لئے بزرگوں نے یہ طریقہ بتایا ہے کہ اس دنیا میں رہ کر انسان جنت کی ان نعمتوں کا کبھی کبھی تصور اور دھیان کیا کرے۔

چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مواعظ میں فرماتے ہیں کہ "ہر مسلمان کو چاہئے کہ روزانہ تھوڑی دیر بیٹھ کر عالمِ آخرت کا تصور کیا کرے اور خاص طور پر جنت کی نعمتوں کا تصور کیا کرے، اور یہ مراقبہ کرے کہ میں دنیا سے جارہا ہوں، قبر میں رکھ دیا گیا ہوں، لوگ مجھے دفن کر کے رخصت ہوگئے ہیں، پھر عالمِ برزخ میں پہنچ گیا، پھر عالمِ آخرت شروع ہوگیا، یہاں حساب کتاب ہو رہا ہے، میزان لگی ہوئی ہے، پل صراط لگا ہوا ہے، ایک طرف جنت ہے، دوسری طرف جہنم ہے، اور پھر جنت کے اندر یہ نعمتیں ہیں اور جہنم کے اندر اس اس طرح کے عذاب ہیں۔ اس طرح تھوڑی دیر بیٹھ کر ان تمام چیزوں کا تصور اور دھیان کیا کرے" اس لئے کہ ہم صبح سے شام تک دنیا کی زندگی میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس عالمِ آخرت سے غافل ہوگئے ہیں۔ الحمد للہ ہم سب کا یہ عقیدہ ہے اور اس پر یقین ہے کہ اس دنیا سے ایک دن جانا ہے، اور آخرت آنے والی ہے، لیکن تنہا عقیدہ اور یقین کافی نہیں بلکہ اس کا استحضار بھی ضروری ہے اور اس کا دھیان بھی ضروری ہے، یہ دھیان اور استحضار ہی انسان کو اطاعت پر آمادہ کرتا ہے اور معصیت اور گناہ سے روکتا ہے۔ اس وجہ سے تھوڑا وقت نکال کر آخرت کا دھیان اور مراقبہ کرو، اس دھیان اور مراقبہ کے نتیجے میں انشاء اللہ آخرت کا استحضار پیدا ہوگا۔ دنیا کے کاموں کے اندر آخرت کا دھیان اور استحضار تمہیں اللہ کی اطاعت پر آمادہ کرے گا اور معصیت اور گناہ سے بچنے میں مدد دے گا۔ جنت کی ان نعمتوں کے بیان کرنے کا یہی مقصود ہے جو قرآن و حدیث میں بھری ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو جنت کی نعمتوں کا استحضار عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

خواب، اسلام کی نظر میں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: ((لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ)) قَالُوْا: وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ ((اَلرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''نبوت منقطع ہوگئی اور سوائے مبشرات کے نبوت کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! مبشرات کیا ہیں؟ (مبشرات کے معنی ہیں خوشخبری دینے والی چیزیں) جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''سچے خواب''

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبشرات ہوتے ہیں اور یہ نبوت کا ایک حصہ ہے۔

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔(۲)

سچے خواب نبوت کا حصہ ہیں

مطلب اس کا یہ ہے کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا وقت آیا، تو ابتداء میں چھ ماہ تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نہیں آئی۔ بلکہ چھ ماہ تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچے خواب آتے رہے۔ حدیث میں آتا ہے

☆ اصلاحی خطبات (۵/۸۹-۱۰۲)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب المبشرات، رقم:٦٤٧٥، مسند أحمد، رقم:٢٢٦٧٩، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب ماجاء في الرؤيا، رقم:١٥٠٦

(۲) صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب الرؤيا الصالحة جزء من ستة وأربعين جزءا من النبوة، رقم: ٦٤٧٢، صحيح مسلم، كتاب الرؤيا، رقم:٤٢٠١، سنن الترمذي، كتاب الرؤيا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، ٢١٩٧، سنن أبي داود، كتاب الأدب، رقم:٤٣٦٤

کہ جب حضور ﷺ کوئی خواب دیکھتے، تو جو واقعہ آپ نے خواب میں دیکھا ہوتا بعینہٖ وہی واقعہ بیداری میں پیش آجاتا اور آپ ﷺ کا وہ خواب سچا ہو جاتا اور صبح کے اُجالے کی طرح اس خواب کا سچا ہونا لوگوں کے سامنے واضح ہو جاتا۔ اس طرح چھ ماہ تک آپ ﷺ کو سچے خواب آتے رہے۔ اس کے بعد پھر وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔(۱) اور نبوت ملنے کے بعد تیئیس سال تک آپ ﷺ دنیا میں تشریف فرما رہے، ان تیئیس سالوں میں سے چھ ماہ کا عرصہ صرف سچے خوابوں کا زمانہ تھا۔ اب تیئیس کو دو سے ضرب دیں گے تو چھیالیس بن جائیں گے، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔ گویا کہ حضورِ اقدس ﷺ کے نبوت کے زمانے کو چھیالیس حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس میں سے ایک حصے میں آپ ﷺ کو سچے خواب ہی آتے رہے، وحی نہیں آئی۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے، اور اشارہ اس طرف کر دیا کہ یہ سلسلہ میرے بعد بھی جاری رہے گا اور مؤمنوں کو سچے خواب دکھائے جائیں گے، اور ان کے ذریعہ بشارتیں دی جائیں گی، اور ایک حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ قیامت کے قریب آخری زمانے میں مسلمانوں کو بیشتر خواب سچے آئیں گے۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ خواب بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اور آدمی کو اس کے ذریعے بشارتیں ملتی ہیں، لہٰذا اگر خواب کے ذریعہ کوئی بشارت ملے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

خواب کے بارے میں دو رائیں

لیکن ہمارے یہاں خواب کے معاملے میں بڑی افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ بعض لوگ تو وہ ہیں جو سچے خوابوں کے قائل ہی نہیں، نہ خواب کے قائل، نہ خواب کی تعبیر کے قائل ہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ اس لئے کہ ابھی آپ نے سنا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں، اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ سچے خواب مبشرات ہیں، اور دوسری طرف بعض لوگ وہ ہیں جو خوابوں ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، اور خواب ہی کو مدارِ نجات اور مدارِ فضیلت سمجھتے ہیں۔ اگر کسی نے اچھا خواب دیکھ لیا تو بس، اس کے معتقد ہو گئے، اور اگر کسی نے اپنے بارے میں اچھا خواب دیکھ لیا تو وہ اپنا ہی معتقد ہو گیا کہ میں اب پہنچا ہوا بزرگ ہو گیا ہوں، یہ خواب تو سونے کی حالت میں ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ بیداری کی حالت میں کچھ چیزیں دکھاتے ہیں، جس کو ''کشف'' کہتے ہیں۔

چنانچہ اگر کسی کو کشف ہو گیا تو لوگ اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے کہ یہ بہت بڑا بزرگ آدمی ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی، باب بدء الوحی، رقم: ۳

(۲) صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب القید فی المنام، رقم: ٦٤٩٩

اب چاہے بیداری کے اندر اس کے حالات سنت کے مطابق نہ بھی ہوں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ انسان کی فضیلت کا اصل معیار خواب اور کشف نہیں، بلکہ اصل معیار یہ ہے کہ اس کی بیداری کی زندگی سنت کے مطابق ہے یا نہیں؟ بیداری کی حالت میں وہ گناہوں سے پرہیز کر رہا ہے یا نہیں؟ بیداری کی حالت میں وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہا ہے یا نہیں؟ اگر اطاعت نہیں کر رہا ہے تو پھر اس کو ہزار خواب نظر آئے ہوں، ہزار کشف ہوئے ہوں، ہزار کرامتیں اس کے ہاتھ پر صادر ہوئی ہوں، وہ معیارِ فضیلت نہیں۔ آج کل اس معاملے میں بڑی سخت گمراہی پھیلی ہوئی ہے۔ پیری مریدی کے ساتھ اس کو لازم سمجھ لیا گیا ہے۔ ہر وقت لوگ خوابوں اور کشف و کرامات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

خواب کی حیثیت

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں، اور خواب کی تعبیر میں امام ہیں، پوری اُمتِ محمدیہ میں ان سے بڑا عالم خواب کی صحیح تعبیر دینے والا شاید کوئی اور پیدا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خواب کی تعبیر دینے میں ایک خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔ ان کے بڑے عجیب وغریب واقعات مشہور ہیں۔ لیکن ان کا ایک اتنا پیارا چھوٹا جملہ ہے، جو یاد رکھنے کے قابل ہے، وہ جملہ خواب کی حقیقت واضح کرتا ہے، فرمایا:

((اَلرُّؤْیَا تَسُرُّ وَلَا تَغُرُّ))

یعنی خواب ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان خوش ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اچھا خواب دکھایا، لیکن خواب کسی انسان کو دھوکے میں نہ ڈالے، اور وہ یہ نہ سمجھے کہ میں بہت پہنچا ہوا ہو گیا، اور اس کے نتیجے میں بیداری کے اعمال سے غافل ہو جائے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور تعبیرِ خواب

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت سے لوگ خواب کی تعبیر پوچھتے کہ میں نے یہ خواب دیکھا، میں نے یہ خواب دیکھا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ عام طور پر جواب میں یہ شعر پڑھتے کہ۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
ہمہ آفتاب گفتند، ہمہ آفتاب گویم

یعنی نہ تو میں رات ہوں اور نہ رات کو پوجنے والا ہوں کہ خواب کی باتیں کروں، اللہ تعالیٰ نے تو مجھے آفتاب سے نسبت عطا فرمائی ہے، یعنی آفتابِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے، اس لئے میں تو اسی کی بات کہتا ہوں، بہرحال خواب کتنے ہی اچھے آجائیں، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، وہ مبشرات ہیں، ہوسکتا

ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت اس کی برکت عطا فرمادے، لیکن محض خواب کی وجہ سے بزرگی اور فضیلت کا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مبشرات

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بیسیوں افراد نے خواب دیکھے۔ مثلاً خواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں دیکھا، یہ اور اس قسم کے دوسرے خواب بیشمار افراد نے دیکھے، چنانچہ جب لوگ اس قسم کے خواب لکھ کر بھیجتے تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کو اپنے پاس محفوظ رکھ لیتے، اور ایک رجسٹر جس پر یہی عنوان تھا ''مبشرات'' یعنی خوشخبری دینے والے خواب، اس رجسٹر میں نقل کرادیتے تھے، لیکن اس رجسٹر کے پہلے صفحے پر اپنے قلم سے یہ نوٹ لکھا تھا:

> ''اس رجسٹر میں ان خوابوں کو نقل کررہا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے میرے بارے میں دیکھے ہیں۔ اس غرض سے نقل کررہا ہوں کہ بہرحال، یہ مبشرات ہیں، فال نیک ہیں، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے میری اصلاح فرمادے۔ لیکن میں سب پڑھنے والوں کو متنبہ کررہا ہوں کہ آگے جو خواب ذکر کیے جارہے ہیں، یہ ہرگز مدارِ فضیلت نہیں، اور ان کی بنیاد پر میرے بارے میں فیصلہ نہ کیا جائے، بلکہ اصل مدار بیداری کے افعال واقوال ہیں، لہٰذا اس کی وجہ سے آدمی دھوکے میں نہ پڑے''

یہ آپ نے اس لئے لکھ دیا کہ کوئی پڑھ کے دھوکہ نہ کھائے۔ بس یہ حقیقت ہے خواب کی۔ بس جب انسان اچھا خواب دیکھے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ اور دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو میرے حق میں باعثِ برکت بنادے۔ لیکن اس کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا نہ ہو، نہ دوسرے کے بارے میں، اور نہ اپنے بارے میں، بس، خواب کی حقیقت اتنی ہی ہے' اسی خواب سے متعلق دو تین احادیث اور ہیں، جن کے بارے میں اکثر وبیشتر لوگوں کو معلومات نہیں ہیں، جس کی وجہ سے غلط فہمی میں پڑے رہتے ہیں، اس لئے ان احادیث کو بھی پڑھ لینا مناسب اور ضروری ہے۔

شیطان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں نہیں آسکتا

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي لَا يَتَمَثَّلُ الشَّيْطَانُ بِي))[1]

(۱) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا، (یعنی جس نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی) تو اس نے مجھ ہی کو دیکھا۔ کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا۔

اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی سعادت عطا فرمادے تو یہ بڑی عظیم سعادت ہے، اور اس کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معروف حلیے کے مطابق دیکھے جو احادیث کے ذریعہ ثابت ہے تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دیکھتا ہے، شیطان یہ دھوکہ نہیں دے سکتا کہ معاذ اللہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارک میں آجائے۔ یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں اپنی زیارت کی خصوصیت بیان فرمادی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت عظیم سعادت

الحمد للہ، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بہت سے لوگوں کو یہ سعادت عطا فرمادیتے ہیں، اور انہیں خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوجاتی ہے۔ یہ بڑی عظیم نعمت اور عظیم سعادت ہے۔ لیکن اس معاملے میں ہمارے بزرگوں کے ذوق مختلف رہے ہیں۔ ایک ذوق تو یہ ہے کہ اس سعادت کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے، اور ایسے عمل کیے جاتے ہیں جس سے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوجائے اور بزرگوں نے ایسے خاص خاص عمل لکھے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جمعہ کی شب میں اتنی مرتبہ درود شریف پڑھنے کے بعد فلاں عمل کرکے سوئے تو سرکا[illegible] عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہونے کی توقع اور اُمید ہوتی ہے، اس قسم کے بہت سے اعمال مشہور ہیں۔ [illegible]ت کا ذوق اور مذاق یہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس ذوق کے پیشِ نظر خواب میں زیارت کی کوشش کرنا چاہے تو کرلے، اور اس سعادت سے سرفراز ہوجائے۔

زیارت کی اہلیت کہاں؟

لیکن دوسرے بعض حضرات کا ذوق کچھ اور ہے۔ مثلاً میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آکر کہنے لگے کہ طبیعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا بہت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) صلى الله عليه وسلم، رقم:١٠٧، صحيح مسلم، كتاب الرؤيا، باب قول النبى صلى الله عليه وسلم: من رانى فى المنام، رقم:٤٢٠٦، سنن الترمذى، كتاب الرؤيا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم:٢٢٠٦، سنن أبى داود، رقم:٤٣٦٩

شوق ہو رہا ہے۔ کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جس کے نتیجے میں یہ نعمت حاصل ہو جائے، اور سرکارِ دو عالم ﷺ کی زیارت خواب میں ہو جائے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی! تم بڑے حوصلے والے آدمی ہو کہ تم اس بات کی تمنا کرتے ہو کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی زیارت ہو جائے۔ ہمیں یہ حوصلہ نہیں ہوتا کہ یہ تمنا بھی کریں۔ اس لئے کہ ہم کہاں اور نبی کریم ﷺ کی زیارت کہاں؟ اس لئے کبھی اس قسم کے عمل سیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اور نہ کبھی یہ سوچا کہ ایسے عمل سیکھے جائیں جن کی وجہ سے سرکارِ دو عالم ﷺ کی زیارت ہو جائے۔

اس لئے کہ اگر زیارت ہو جائے تو ہم اس کے آداب، اس کے حقوق، اس کے تقاضے کس طرح پورے کریں گے؟ اس لئے خود سے اس کے حصول کی کوشش نہیں کی، البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے خود ہی زیارت کرا دیں تو یہ ان کا انعام ہے، اور جب خود کرائیں گے تو پھر اس کے آداب کی بھی توفیق بخشیں گے، لیکن خود سے ہمت نہیں ہوتی، البتہ جس طرح ایک مؤمن کے دل میں آرزو ہوتی ہے، اس طرح کی آرزو دل میں ہے۔ لیکن زیارت کی کوشش کرنا بڑی ہمت اور حوصلہ والوں کا کام ہے۔ مجھے تو حوصلہ ہوتا نہیں ہے۔

بہر حال اس سلسلے میں ذوق مختلف رہے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور روضۂ اقدس کی زیارت

میں نے اپنے والد صاحب کا یہ واقعہ آپ کو پہلے بھی سنایا تھا کہ جب روضۂ اقدس پر حاضر ہوتے تو کبھی روضۂ اقدس کی جالی تک پہنچ ہی نہیں پاتے تھے، بلکہ ہمیشہ یہ دیکھا کہ جالی کے سامنے ایک ستون ہے، اس ستون سے لگ کر کھڑے ہو جاتے، اور جالی کا بالکل سامنا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہاں اگر کوئی آدمی کھڑا ہوتا تو اس کے پیچھے جا کر کھڑے ہو جاتے۔

ایک دن خود ہی فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید تو بڑا شقی القلب آدمی ہے۔ یہ اللہ کے بندے ہیں، جو جالی کے قریب تک پہنچ جاتے ہیں، اور قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور سرکارِ دو عالم ﷺ کا جتنا بھی قرب حاصل ہو جائے، وہ نعمت ہی نعمت ہے، لیکن میں کیا کروں کہ میرا قدم آگے بڑھتا ہی نہیں۔ شاید کچھ شقاوتِ قلب ہے۔ فرماتے ہیں کہ وہاں کھڑے کھڑے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا مگر اس کے بعد فوراً یہ محسوس ہوا جیسا کہ روضۂ اقدس سے یہ آواز آ رہی ہے:

''جو شخص ہماری سنتوں پر عمل کرتا ہے، وہ ہم سے قریب ہے، خواہ ہزاروں میل دور

ہو، اور جو شخص ہماری سنتوں پر عمل نہیں کرتا، وہ ہم سے دور ہے، چاہے وہ ہماری جالیوں سے چمٹا ہوا ہو"

اصل مدار بیداری کے اعمال ہیں

بہر حال، اصل دولت ہے حضورِ اقدس ﷺ کی سنتوں کا اتباع، اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین' بیداری کی حالت میں ان کی سنتوں کی توفیق ہو جائے، یہ ہے اصل نعمت، اصل دولت، اور حضور ﷺ کا اصل قرب یہی ہے، لیکن اگر سنتوں پر عمل نہیں اور روضۂ اقدس کی جالیوں سے چمٹا کھڑا ہے اور زیارت کی کوشش کر رہا ہے تو ہمارے خیال میں یہ بڑی جسارت ہے، اس لئے اصل فکر اس بات کی ہونی چاہئے کہ سنت کی اتباع ہو رہی ہے یا نہیں؟ حضورِ اقدس ﷺ کی سنتیں زندگی میں داخل ہو رہی ہیں یا نہیں؟ اس کی فکر کرو۔ خوابوں کے پیچھے بہت زیادہ پڑنا مطلوب اور مقصود نہیں، البتہ اگر حاصل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، لیکن اس پر نجات کا مدار نہیں، کیونکہ غیر اختیاری معاملہ ہے

ہمارے طبقے میں ایک بڑی تعداد ہے جو خوابوں ہی کے پیچھے پڑی ہے۔ دن رات یہی فکر ہے کہ کوئی اچھا خواب آجائے۔ اسی کو منتہاءِ مقصود سمجھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ اس لئے کہ پھر یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی کوئی اچھا خواب اپنے بارے میں دیکھ لیا تو بس یہ سمجھا کہ اب میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہوں۔ خوب سمجھ لیں کہ خواب اپنی ذات میں نہ تو کسی کا درجہ بلند کرتا ہے، اور نہ اجر و ثواب کا موجب ہوتا ہے، بلکہ اصل مدار بیداری کے اعمال پر ہے۔ یہ دیکھو کہ تم بیداری میں کیا عمل کر رہے ہو۔

اچھا خواب دھوکے میں نہ ڈالے

لہٰذا اگر کسی شخص نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت میں پھر رہا ہوں، اور جنت کے باغات اور محلات کی سیر کر رہا ہوں، تو یہ بڑی اچھی بشارت ہے، لیکن اس کی وجہ سے اس دھوکہ میں نہ آئے کہ میں تو جنتی ہو گیا، لہٰذا اب مجھے کسی عمل اور کوشش کی حاجت اور ضرورت نہیں' یہ خیال غلط ہے۔ بلکہ اگر کوئی شخص اچھا خواب دیکھنے کے بعد اعمال کے اندر اور زیادہ اتباع کا اہتمام کرنے لگتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خواب اچھا اور سچا تھا اور بشارت والا تھا، اور اس سے اس نے غلط نتیجہ نہیں نکالا، لیکن اگر خدانہ کرے یہ ہوا کہ خواب دیکھنے کے بعد اعمال چھوڑ بیٹھا، اور اعمال کی طرف سے غفلت ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خواب نے اس کو دھوکے میں ڈال دیا۔

خواب میں حضور ﷺ کا کسی بات کا حکم دینا

یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اگر خواب میں حضور ﷺ کی زیارت ہوگئی تو اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ جو کوئی مجھے خواب میں دیکھتا ہے تو مجھے ہی دیکھتا ہے، اس لئے کہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا، لہٰذا اگر خواب میں حضورِ اقدس ﷺ کی زیارت ہو، اور وہ کوئی ایسا کام کرنے کو کہیں جو شریعت کے دائرے میں ہے، مثلاً فرض ہے، یا واجب ہے، یا سنت ہے، یا مباح ہے، تو پھر اس کو اہتمام سے کرنا چاہئے، اس لئے جو کام شریعت کے دائرے میں ہے، اس کے کرنے کا جب آپ ﷺ حکم فرما رہے ہیں تو وہ خواب سچا ہوگا، اس کام کا کرنا ہی اس کے حق میں مفید ہے، اور اگر نہیں کرے گا تو بعض اوقات اس کے حق میں بے برکتی شدید ہو جاتی ہے۔

خواب حجتِ شرعی نہیں

لیکن اگر خواب میں حضورِ اقدس ﷺ ایسی بات کا حکم دیں جو شریعت کے دائرے میں نہیں ہے، مثلاً خواب میں حضور ﷺ کی زیارت ہوئی، اور ایسا محسوس ہوا کہ آپ ﷺ نے ایک ایسی بات کا حکم فرمایا جو شریعت کے ظاہری احکام کے دائرے میں نہیں ہے، تو خوب سمجھ لیجئے کہ اس خواب کی وجہ سے وہ کام کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارے دیکھے ہوئے خواب کی بات کو اللہ تعالیٰ نے مسائلِ شریعت میں حجت نہیں بنایا، اور جو ارشادات حضور ﷺ سے قابلِ اعتماد واسطوں سے ہم تک پہنچے ہیں، وہ حجت ہیں۔ ان پر عمل کرنا ضروری ہے، خواب کی بات پر عمل کرنا ضروری نہیں، کیونکہ یہ بات تو صحیح ہے کہ شیطان حضور ﷺ کی صورت مبارکہ میں نہیں آسکتا، لیکن بسا اوقات خواب دیکھنے والے کے ذاتی خیالات اس خواب کے ساتھ مل کر گڈمڈ ہو جاتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اس کو غلط بات یاد رہ جاتی ہے، یا سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے، اس لئے ہمارے خواب حجت نہیں۔

خواب کا ایک عجیب واقعہ

ایک قاضی تھے، لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک مقدمہ سامنے آیا، اور مقدمہ کے اندر گواہ پیش ہوئے، اور شریعت کے مطابق گواہوں کی جانچ پڑتال کا جو طریقہ ہے، وہ پورا کرلیا، اور آخر میں مدعی کے حق میں فیصلے کرنے کا دل میں ارادہ بھی ہوگیا، لیکن قاضی صاحب نے کہا کہ اس فیصلے کا اعلان کل کریں گے۔ یہ خیال ہوا کہ کل تک ذرا اور سوچ لوں گا، لیکن جب رات کو سوئے تو خواب میں حضور ﷺ کی زیارت ہوئی، اور جب صبح بیدار ہوئے تو ایسا یاد آیا کہ خواب میں

حضور ﷺ یہ فرمارہے تھے کہ جو تم فیصلہ کرنے کا ارادہ کررہے ہو، یہ فیصلہ غلط ہے۔ یہ فیصلہ یوں کرنا چاہئے، اب اُٹھ کر جو غور کیا تو جس طریقے سے فیصلہ کرنے کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا، وہ کسی طرح شریعت کے دائرے میں فٹ نہیں ہوتا۔ اب بڑے پریشان ہوئے کہ ظاہری طور پر شریعت کا جو تقاضا ہے، اس کے لحاظ سے تو یہ فیصلہ اس طرح ہونا چاہئے، لیکن دوسری طرف خواب میں حضور ﷺ فرمارہے ہیں کہ یوں فیصلہ کرو، اب معاملہ بڑا سنگین ہوگیا اور یہ جو مقدمہ کی ذمہ داری ہوتی ہے، یہ بڑی سنگین ذمہ داری ہے۔ جن لوگوں پر گزرتی ہے، وہی اس کو جانتے ہیں، راتوں کی نیندیں حرام ہوجاتی ہیں۔

چنانچہ قاضی صاحب نے خلیفۂ وقت سے جاکر بتایا کہ اس طرح سے یہ مقدمہ پیش آگیا، اور حضور ﷺ نے خواب میں اس طرح فیصلہ کرنے کو فرمایا۔ آپ علماء کو جمع فرمائیں، تاکہ اس کے بارے میں ان سے مشورہ ہوجائے۔ چنانچہ سارے شہر کے علماء جمع ہوئے، اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا کہ اس طرح سے مقدمہ درپیش ہے۔ ظاہری طور پر شریعت کا تقاضا یہ ہے، لیکن دوسری طرف خواب میں حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ علماء نے فرمایا کہ واقعۃً یہ معاملہ بڑا سنگین ہے۔ حضور ﷺ کی زیارت ہوئی، اور شیطان آپ کی صورت مبارکہ میں آنہیں سکتا، لہٰذا حضور ﷺ کے فرمان پر عمل کرنا چاہئے، لیکن اس زمانے کے ایک بزرگ جو اپنی صدی کے مجدد کہلاتے تھے، حضرت شیخ عزالدین ابن عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ، وہ بھی مجلس میں حاضر تھے، وہ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ میں پورے جزم اور وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ شریعت کے قاعدے کے مطابق آپ جو فیصلہ کرنے جارہے ہیں، وہی فیصلہ کیجئے اور سارا گناہ ثواب میری گردن پر ہے۔ خواب کی بات پر فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ خواب میں ہزاروں احتمالات ہوسکتے ہیں۔ خدا جانے اپنے دل کی کوئی بات اس میں آگئی ہو۔ اگرچہ حضور ﷺ کی صورت مبارکہ میں شیطان نہیں آسکتا، لیکن ہوسکتا ہے کہ بیداری کے بعد شیطان نے کوئی وسوسہ ڈال دیا ہو، کوئی غلط بات دل میں آگئی ہو۔ شریعت نے حضور ﷺ کے بیداری میں سُنے ہوئے ارشادات کے مقابلے میں ہمارے خواب کو حجت قرار نہیں دیا۔ اور حضور ﷺ کے جو ارشادات ہم تک سندِ متصل کے ساتھ پہنچے ہیں، وہی ہمارے لئے حجت ہیں۔ ہمیں انہی پر عمل کرنا ہے۔ آپ بھی اس پر عمل کیجئے، اور گناہ ثواب میری گردن پر ہے۔

خواب اور کشف وغیرہ سے شرعی حکم نہیں بدل سکتا

یہ اللہ کے بندے ہوتے ہیں، جو اس قوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، ورنہ یہ بات کہنا آسان کام نہیں تھا کہ "گناہ ثواب میری گردن پر"، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس دین کی صحیح تشریح کے لئے اور

اس دین کے تحفظ کے لئے بھیجتے ہیں، ان سے ایسی باتیں کرا دیتے ہیں ۔ اگر ایک مرتبہ یہ اصول مان لیا جاتا کہ خواب سے بھی شریعت بدل سکتی ہے تو پھر شریعت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا ۔ ایک سے ایک خواب لوگ دیکھ لیتے اور آ کر بیان کر دیتے ۔

آج آپ دیکھیں کہ یہ جتنے جاہل پیر ہیں، جو بدعات میں مبتلا ہیں، وہ انہی خوابوں کو سب کچھ سمجھتے ہیں ۔ کوئی خواب دیکھ لیا، یا کشف ہو گیا، الہام ہو گیا، اور اس کی بنیاد پر شریعت کے خلاف عمل کر لیا، خواب تو خواب ہے، اگر کسی کو کشف ہو جائے جو جاگتے اور بیداری کی حالت میں ہوتا ہے، اس میں آواز آتی ہے، اور وہ آواز کانوں کو سنائی دیتی ہے، لیکن اس کے باوجود کشف شریعت میں حجت نہیں ۔ کوئی شخص کتنا ہی پہنچا ہوا عالم یا بزرگ ہو، اس نے اگر خواب دیکھ لیا، یا اس کو کوئی کشف یا الہام ہو گیا، وہ بھی شرعی احکام کے مقابلے میں حجت نہیں ہے ۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت مولانا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جو رئیس الاولیاء ہیں، ایک مرتبہ رات کے وقت عبادت میں مشغول تھے ۔ تہجد کا وقت ہے، شیخ عبدالقادر جیسا ولی اللہ عبادت کر رہا ہے، اس وقت ایک زبردست نور چمکا اور اس نور میں سے یہ آواز آئی کہ اے عبدالقادر! تو نے ہماری عبادت کا حق ادا کر دیا ۔ اب تو اس مقام پر پہنچ گیا کہ آج کے بعد ہماری طرف سے تم پر کوئی عبادت فرض و واجب نہیں، نماز تیری معاف، تیرا روزہ معاف، تیرا حج اور تیری زکوٰۃ معاف ۔ اب تو جس طرح چاہے، عمل کر، ہم نے تمہیں جنتی بنا دیا، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے سنتے ہی فوراً جواب میں فرمایا کہ "مردود، دور ہو جا ۔ یہ نماز حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تو معاف نہیں ہوئی ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تو معاف نہیں ہوئی، مجھ سے کیسے معاف ہو جائے گی؟ دور ہو جا" یہ کہہ کر شیطان کو دور کر دیا، اس کے بعد ایک اور نور چمکا، جو پہلے نور سے بھی بڑا نور تھا، اس میں سے آواز آئی کہ "عبدالقادر، تیرے علم نے آج تجھے بچا لیا ۔ ورنہ یہ وہ داؤ ہے، جس سے میں نے بڑوں بڑوں کو ہلاک کر دیا ہے، اگر تیرے پاس علم نہ ہوتا تو ہلاک ہو چکا ہوتا" ۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ "مردود، دوبارہ بہکاتا ہے، میرے علم نے مجھے نہیں بچایا، میرے اللہ نے مجھے بچایا ہے"

عارفین فرماتے ہیں کہ یہ دوسرا داؤ پہلے داؤ سے زیادہ سنگین تھا ۔ اس لئے کہ اس وقت شیطان نے ان کے اندر علم کا ناز پیدا کرنا چاہا تھا، کہ تمہارے علم اور تقویٰ نے تمہیں بچا لیا ۔ لیکن آپ نے اس کو بھی رد کر دیا ۔

خواب کے ذریعہ حدیث کی تردید جائز نہیں

بھائی! یہ راستہ بڑا خطرناک ہے، آجکل خاص طور پر جس طرح کا مذاق بنا ہوا ہے کہ لوگ خواب، کشف، کرامات اور الہامات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ شریعت کا تقاضا کیا ہے؟ اچھے خاصے دیندار اور پڑھے لکھے لوگوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ مجھے یہ کشف ہوا ہے کہ فلاں حدیث صحیح نہیں ہے، اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی فلاں حدیث یہودیوں کی گھڑی ہوئی ہے، اور مجھے یہ بات کشف کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے' اگر اس طریقے سے کشف ہونے لگے تو دین کی بنیادیں ہل جائیں۔ اللہ تعالیٰ ان علماء کو غریقِ رحمت کرے، جن کو درحقیقت اللہ تعالیٰ نے دین کا محافظ بنایا، یہ دین کے چوکیدار ہیں۔ لوگ ان پر ہزار لعنتیں، ملامتیں کریں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کا محافظ اور نگہبان بنایا، تاکہ کوئی دین پر حملہ نہ کر سکے۔ اور دین میں تحریف نہ ہو۔ چنانچہ ان علماء نے صاف صاف کہہ دیا کہ چاہے خواب ہو، یا کشف ہو، یا کرامت ہو، ان میں سے کوئی چیز بھی دین میں حجت نہیں، وہ چیزیں حجت ہیں جو حضور اقدس ﷺ سے بیداری کے عالم میں ثابت ہیں۔ کبھی خواب، کشف اور الہام اور کرامت کے دھوکے میں مت آنا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح کشف تو دیوانوں، بلکہ کافروں کو بھی ہو جاتا ہے، اس لئے کبھی اس دھوکے میں مت آنا کہ نور نظر آ گیا، یا دل چلنے لگا، یا دل دھڑکنے لگا وغیرہ۔ اس لئے کہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ شریعت میں ان چیزوں پر فضیلت کا کوئی مدار نہیں۔

خواب دیکھنے والا کیا کرے؟

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جو شخص خواب میں کوئی ایسی چیز دیکھے جو ناگوار ہو، تو بائیں جانب تین مرتبہ تھتکار دے، اور "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" پڑھ لے، جس کروٹ پر خواب دیکھا تھا، اس کی جگہ دوسری کروٹ بدل لے، پھر یہ خواب انشاء اللہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا''(۱)

مثلاً بعض اوقات انسان کچھ ڈراؤنے خواب دیکھ لیتا ہے، یا کوئی برا واقعہ دیکھ لیتا ہے تو ایسے

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب التعبير، باب الرؤيا الصالحة، رقم:٦٤٧١، صحيح مسلم، كتاب الرؤيا، رقم:٤١٩٥، سنن الترمذي، كتاب الرؤيا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم:٢٢٠٣، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، رقم:٤٣٦٧، سنن ابن ماجه،باب تعبير الرؤيا، رقم:٣٨٩٩

موقع کے لئے حضورِ اقدس ﷺ نے تلقین فرمادی کہ جیسے ہی آنکھ کھلے، فوراً یہ عمل کرے، اور اگر کوئی اچھا خواب دیکھے، مثلاً اپنے بارے میں کوئی دینی یا دنیوی ترقی دیکھی، تو اس صورت میں اپنے جاننے والے اور اپنے محبت کرنے والوں کے سامنے اس خواب کا تذکرہ کرے، دوسروں کو نہ بتائے، کیونکہ بعض اوقات ایک آدمی وہ خواب سن کر اس کی اُلٹی سیدھی تعبیر بیان کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے اس اچھے خواب کی تعبیر اس کے مطابق ہو جاتی ہے، اس لئے اپنے محبت کرنے والوں کو وہ خواب بتائے، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

خواب بیان کرنے والے کے لئے دعا کرنا

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے خواب دیکھا ہے، اور پھر وہ اپنا خواب بیان کرنے لگے تو ایسے موقع پر حضورِ اقدس ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص آکر بتاتا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے تو حضورِ اقدس ﷺ یہ دعا پڑھتے:

((خَيْرًا تَلَقَّاهُ وَشَرًّا تَوَقَّاهُ، خَيْرٌ لَنَا وَشَرٌّ لِاَعْدَائِنَا))(۱)

''اللہ تعالیٰ اس خواب کی خیر تم کو عطا فرمائے، اور اس کے شر سے تمہاری حفاظت فرمائے اور خدا کرے کہ یہ خواب ہمارے لئے اچھا ہو، اور ہمارے دشمنوں کے لئے برا ہو''

اس دعا میں حضورِ اقدس ﷺ نے ساری باتیں جمع فرمادیں، آپ حضرات بھی اس کا معمول بنالیں کہ جب بھی کوئی شخص آکر اپنا خواب بیان کرے تو اس کے لئے یہ دعا کریں، اگر عربی میں یاد نہ ہو تو اُردو ہی میں کرلیں، یہ ہیں خواب کے آداب، اور خواب کی حیثیت، بس ان باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہئے، لوگوں میں بہت سی فضولیات خواب کے بارے میں پھیلی ہوئی ہیں، ان سے اپنے آپ کو بچانا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، اور دین پر صحیح طریقے سے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) المعجم الكبير للطبراني، تفسير الأحلام

تبرکات
شریعت کی نظر میں☆

بَابٌ: اَلْمَسَاجِدُ الَّتِیْ فِیْ طُرُقِ الْمَدِیْنَةِ

"حَدَّثَنَا مُوْسَى بْنُ عُقْبَةَ قَالَ: رَأَيْتُ سَالِمَ بْنَ عَبْدِاللّٰهِ يَتَحَرّٰى أَمَاكِنَ مِنَ الطَّرِيْقِ، فَيُصَلِّيْ فِيْهَا، وَيُحَدِّثُ أَنَّ أَبَاهُ كَانَ يُصَلِّيْ فِيْهَا، وَأَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ فِيْ تِلْكَ الْأَمْكِنَةِ، وَحَدَّثَنِيْ نَافِعٌ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّهُ كَانَ يُصَلِّيْ فِيْ تِلْكَ الْأَمْكِنَةِ، وَسَأَلْتُ سَالِمًا فَلَا أَعْلَمُهُ إِلَّا وَافَقَ نَافِعٌ فِي الْأَمْكِنَةِ كُلِّهَا إِلَّا أَنَّهُمَا اخْتَلَفَا فِيْ مَسْجِدٍ بِشَرَفِ الرَّوْحَاءِ"(۱)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب ان مساجد کے بیان میں قائم کیا ہے جو مدینہ منورہ کے راستہ میں واقع ہیں اور ان مواضع کا بیان جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی اور اس میں آگے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے طویل حدیث روایت کی ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان سفر کرتے تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان مقامات پر نماز پڑھتے تھے جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفر کے دوران نماز پڑھی تھی اور ان مواقع کو نہ صرف خود تلاش کر کے نماز پڑھتے تھے بلکہ لوگوں کو بتلاتے بھی تھے کہ دیکھو یہ جگہ ہے جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی، یہاں تک کہ بعض روایات

☆ انعام الباری (۳/۲۲۹_۲۳۹)

(۱) صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب المساجد التي على طرق المدينة، رقم: ٤٦١، صحيح مسلم، كتاب الحج، باب استحباب استلام الركنين اليمانيين في الطواف دون، رقم: ٢٢٢٥، وسنن النسائي، كتاب مناسك الحج، باب التعريس بذي الحليفة، رقم: ٢٦١٢، ومسند أحمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبدالله بن عمر بن الخطاب، رقم: ٤٢٣٠، وموطأ مالك، كتاب الحج، باب صلاة معرس والمحصب، رقم: ٨٠٤، وسنن الدارمي، كتاب المناسك، باب في أي طريق يدخل مكة، رقم: ١٨٤٧

میں آتا ہے کہ ایک جگہ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بتلایا کہ دیکھو یہاں حضور اکرم ﷺ نے پیشاب کیا تھا اور اسی تحری کے نتیجے میں اُنہوں نے لفظوں میں اپنے تمام شاگردوں کو ان تمام مواضع کی تفصیل بتادی تھی کہ کونسی جگہ ہے جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی۔

اگر چہ تفصیل ایسی تھی کہ اس کی مدد سے آج کوئی آدمی وہاں نہیں پہنچ سکتا کیونکہ وہ تفصیل انہوں نے اپنے زمانہ کے اعتبار سے بتائی تھی کہ دیکھو فلاں جگہ پر فلاں درخت ہے، فلاں جگہ پر گھاٹی ہے، فلاں جگہ پر پہاڑ ہے، فلاں جگہ پر بستی ہے، ظاہر ہے کہ مرور زمانہ کی وجہ سے اب وہ نشانیاں مٹ گئی ہیں۔ یہاں تک کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ میں یعنی آٹھویں صدی میں کہہ رہے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جو مقامات بیان فرمائے ہیں ان میں سے صرف دو باقی رہ گئے ہیں۔ ایک روحاء کا مقام اور ایک ذوالحلیفہ۔ باقی سارے مقامات اب دستیاب نہیں ہیں۔ اگر چہ بہت سی جگہیں اب تک ایسی ہیں جن کے نام اب تک وہی ہیں جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائے تھے، لیکن جو تفصیل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی تھی کہ بائیں مڑ اور دائیں مڑ و، وہ تفصیل اب نہیں رہی ہے۔ صرف روحاء ایک ایسی جگہ ہے جہاں سعودی حکومت کے ہاتھ نہیں پہنچے، اس واسطے وہ جگہ ایسی ہے کہ جہاں کوئی عمارت نہیں بنی تھی۔

چند سال پہلے میں گیا تھا تو وہاں وہ کنواں (بئر روحاء) اب بھی موجود ہے اور اس کے قریب جو ایک جگہ بتائی گئی ہے، واللہ اعلم وہ جگہ بھی محفوظ ہے۔ باقی جتنے مقامات بتائے ہیں یہاں تک کہ ذوالحلیفہ کی وہ جگہ جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی، اب وہاں بہت عالی شان، لمبی چوڑی مسجد بنادی گئی ہے، اُس جگہ کو خاص طور پر محفوظ نہیں رکھا گیا ہے، وہ اس مسجد کے اندر آ گئی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ علماء نجد کا کہنا ہے کہ اس قسم کے مقامات کو خاص طور پر محفوظ رکھنا ناجائز ہے اور شرک آثار میں ہونے کی وجہ سے منع ہے۔ چنانچہ انہوں نے مدینہ منورہ میں ایسی کوئی نشانی نہیں چھوڑی جسے نہ مٹایا ہو، حضور ﷺ کے جو آثار تھے ایک ایک کر کے سب مٹا دیئے اور چن چن کر ختم کر دیئے۔

لمحۂ فکریہ

افسوسناک اور ستم ظریفی کا پہلو یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں کعب بن اشرف کا قلعہ برقرار ہے اور اس پر بورڈ لگایا ہوا ہے کہ یہ آثار قدیمہ میں سے ہے، خبردار کوئی شخص اس کو نقصان نہ پہنچائے۔ تو کعب بن اشرف کا قلعہ تو محفوظ ہے، نہ صرف محفوظ بلکہ اس کی حفاظت کیلئے بورڈ لگایا ہوا ہے اور مدینہ منورہ کے جتنے آثار تھے ایک ایک کر کے، چن چن کر سب ختم کر دیئے ہیں۔ جس پر بس چلا اُسے اُٹھا کر ختم

کر دیا۔ وہاں کبھی ہم جایا کرتے تھے اور وہاں پر حاضری ہو جایا کرتی تھی۔ ایک آخری چیز باقی رہ گئی تھی اور وہ مسجد قباء کے برابر حضرت اسعد بن زرارۃ رضی اللہ عنہ کا وہ مکان تھا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ دن قیام فرمایا تھا۔ اب تین چار سال پہلے جب میں حاضر ہوا تو اس کو بھی ڈھا دیا گیا اور وہ بھی ختم کر دیا گیا۔

اس کی وجہ یہ کہتے ہیں کہ مآثر کو برقرار رکھنا اور مآثرِ انبیاء اور مآثرِ صلحاء سے تبرک حاصل کرنا "شعبة من شعب الشرك" یہ شرک ہے، لہٰذا اس کو ختم کرنا ضروری ہے۔

استدلال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کے ایک واقعہ سے ہے جو سنن سعید بن منصور میں مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ لوگ حج کے بعد ایک درخت کی طرف کثرت سے جا رہے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ مسجد ہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی، اس واسطے لوگ چاہتے ہیں کہ وہاں جا کر نماز پڑھیں۔ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ تم سے پہلی اُمتیں اس لئے ہلاک ہوئی تھیں کہ اُنہوں نے اپنے انبیاء کے مشاہد کو مساجد بنا دیا تھا اور ان کے اندر نماز پڑھنی شروع کر دی اور ثواب کی چیز بنا دیا اور پھر عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ اگر کسی کو نماز کا وقت ہے تو پڑھ لے اور اگر نہیں ہے تو چلا جائے۔ "من عرض له صلوة فليصل ومن لا فليمض"(۱)

تبرک بآثار الانبیاء علیہم السلام جائز ہے

کہتے ہیں کہ دیکھو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان جگہوں پر نماز پڑھنے سے منع کیا، اب یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام جگہوں پر نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔ اسی سے سارے علماء یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے مآثر سے تبرک جائز ہے جو فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے۔

لیکن ابھی حال میں سعودی عرب میں وہاں کے علماء کی نگرانی میں یہ کام ہوا ہے کہ وہاں کے جدید نسخوں میں جہاں جہاں یہ بات لکھی ہوئی ہے وہاں پر ایک حاشیہ لکھ دیا جاتا ہے کہ "هذا خطاء وهذا فيه نظر"(۲)

اور (بعض مرتبہ یوں کہا جاتا ہے) "وهو أعلم بهذا الشان من ابنه رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهما"

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: مصنف ابن أبي شيبة، رقم: ۷۵۵۰ (۱۵۱/۲) مكتبة الرشد، الرياض سنة النشر ۱٤۰۹ھ، وعمدة القاري، (۵۵۹/۳) وفتح الباري (۵٦۹/۱)

(۲) من اراد فليراجع في فتح الباري، ج:۱، ص:۵۲۲ و ۵٦۹، عربی عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ یہاں غلطی واقع ہوئی اور یہ مقام اشکال سے خالی نہیں۔

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی زیادہ اقتدا کرنی چاہئے بنسبت ان کے بیٹے کے!

اور اگر کہیں ایسا ہو تو کہ ایک حدیث صحیح بخاری کی ہو لیکن ایک حدیث سعید بن منصور کی ہو تو پھر کہا جائے گا کہ صاحب بخاری کا سعید بن منصور کی روایت سے کیا مقابلہ۔ سعید بن منصور کی روایت کہاں اور بخاریؒ کی روایت کہاں! لیکن یہاں پر بخاری کی روایت جو ہے اس کی کوئی قیمت نہ رہی اور سعید بن منصور کی روایت کی بنیاد پر یہ کہہ دیا کہ ایسا کرنا شرک ہے۔

تبرک بآثار الانبیاء کا انکار غلو اور مکابرہ ہے

درحقیقت یہ بالکل غلو ہے اور دلائلِ شریعہ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ احادیث میں آثار الانبیاء سے تبرک حاصل کرنے کے اتنے دلائل اور اتنے واقعات ہیں کہ ان کا انکار سوائے مکابرہ کے اور کچھ نہیں۔ ایک حدیث تو آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ کس کس طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جزری سے یہ بتایا کہ یہاں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی لہٰذا پڑھو، اور یہ واقعات آپ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر سے کوئی تھوک یا ریزش نہیں گرتی تھی، یہاں تک کہ لوگ اسے اپنے جسموں پر مل لیتے تھے، اب کہہ دو کہ یہ بھی شرک تھا؟

دلائل جوازِ تبرک

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم سے مس کی ہوئی چیز کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے جسم پر مل رہے ہیں یہ تبرک نہیں تو اور کیا تھا؟ پھر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ریش مبارک کے بال صحابہ میں تقسیم کیے تو اس تقسیم کرنے کا مقصد کیا تھا؟ اگر تبرک بآثار الانبیاءؑ جائز نہیں ہوتا تو خود آپ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کیوں تقسیم فرماتے، نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان تبرکات کا ایسا تحفظ فرمایا کہ وہ پانی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلی فرمائی تھی وہ تقسیم فرما رہے تھے۔ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کا ذکر پیچھے گزرا ہے ان سے فرمایا کہ اپنی ماں کے واسطے کچھ بچا کے رکھنا۔ (۱)

وہی اُم سلمہ رضی اللہ عنہا ہیں کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موئے مبارک ایک شیشی کے اندر محفوظ رکھا ہوا تھا اور اس میں پانی ڈالا ہوا تھا۔ بخاری شریف میں کتاب اللباس میں یہ روایت ہے، تو سارے شہر میں جب کوئی بیمار ہوتا تو وہ اپنے ایک پیالے میں پانی رکھ کر حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بھیجتے اور ان سے درخواست کرتے کہ آپ اس موئے مبارک کو ہمارے پانی میں بھی ڈال دیجئے تو وہ پانی جو شیشی میں ہوتا جس میں موئے مبارک تھا وہ اس پیالے میں ڈال دیتیں اور وہ لے جا کر اس

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، غزوۃ الطائف فی شوال سنۃ ثمان، رقم: ۴۳۳۸

مریض کو استفشاء پلاتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باقاعدہ ان کے پاس بھیج رہے ہیں اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہا یہ تبرک استفشاء کے لئے کرتی تھیں۔ (۱)

حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں۔ ان کی روایت بخاری، کتاب الاستئذان کے اندر آئے گی، وہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوئے ہوئے تھے، گرمی کا موسم تھا تو آپ کے جسم اطہر سے پسینہ بہنے لگا تو میں جلدی سے ایک شیشی لے کر آئی اور جو پسینہ آپ کے جسم اطہر سے بہہ رہا تھا اس کو میں نے شیشی کے اندر جمع کر کے محفوظ کرلیا تو جتنی بہتر سے بہتر خوشبو کسی عطر میں ہوسکتی ہے وہ اس پسینہ مبارک میں تھی اور لوگ مجھ سے کہتے تھے کہ ہم اپنی حنوط کو اس کے ساتھ تھوڑا سا مس کرلیں اور لوگ لے جایا کرتے تھے۔ (۲)

مسلم شریف کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ یہ کیا کر رہی ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! "اتبرك بها" کہ یہ میں اپنے بچوں کے واسطے تبرک جمع کر رہی ہوں، فقالَ رسول الله صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اصبت"(۳)

او كما قالَ عليه الصلوٰة والسلام.

آپ نے اس کی تصویب فرمائی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر بھی ثابت ہوگئی، فما ذا بعد الحق الا الضلال.

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ موئے مبارک تقسیم فرما رہے تھے اس وقت انہوں نے ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی کے چند بال لے لیے تھے جو انہوں نے اپنی ٹوپی سے لگالیے تھے اور اس ٹوپی کو پہن کر جنگوں میں شریک ہوتے اور فتحیاب ہوتے۔ جنگِ یمامہ میں وہ ٹوپی گر گئی تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس کو حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر نہایت زوردار حملہ کیا۔ (۴)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جو کتاب الاشربۃ میں مذکور ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سقیفہ بنی ساعدہ میں تشریف فرما تھے تو آپ نے حضرت سہل بن سعد سے فرمایا کہ بھائی ذرا پانی پلاؤ، وہ ایک پیالہ لے کر آئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پانی پلایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس پیالے کو اُٹھا کر محفوظ کر دیا۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد جب حدیث سنائی تو وہ کہتے ہیں

(۱) صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب ما يذكر في الشيب، رقم: ٥٨٩٦، ٥٨٩٧

(۲) صحيح البخاري، كتاب الاستئذان، باب من زار قوما فقالَ عندهم، رقم: ٦٣٨١

(۳) صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب طيب عرق النبي صلى الله عليه وسلم والتبرك به، رقم: ٤٣٠١

(٤) مستدرك الحاكم، رقم: ٥٣٠٥، المعجم الكبير، رقم: ٣٧١٤

کہ میں وہ پیالہ نکال کر لایا کہ دیکھو! یہ پیالہ ہے میں نے جس میں نبی کریم ﷺ کو پانی پلایا تھا تو سب نے کہا کہ ہم بھی اس میں پئیں گے تو ہر ایک نے اس میں پانی پیا اور اس پیالہ کو با قاعدہ اہتمام کے ساتھ صحابہ کرامؓ وتابعینؒ نے محفوظ رکھا۔ یہ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں (ان کی حدیث حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "الاصابة فی تمییز الصحابة" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حالات میں صحیح ابن السکن کے حوالے سے نقل کی ہے) کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک پیالہ رکھا ہوا تھا جس میں حضور اکرم ﷺ نے پانی پیا تھا تو وہ ٹوٹنے لگا تو اس کو زنجیر سے باندھ کر یعنی اس میں ٹیکے لگا کر اس کو محفوظ رکھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم با قاعدہ اس کے ٹیکے لگا لگا کر محفوظ رکھ رہے ہیں۔ (۲)

یہ ایک دو واقعے نہیں، بے شمار واقعات ہیں۔

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ جن کو نبی کریم ﷺ نے اذان سکھائی تھی کہ ساری عمر اپنے بال نہیں منڈوائے اس واسطے کہ نبی کریم ﷺ کے دست مبارک نے اُن کو مس کیا تھا۔ (۳)

یہ عشق کی باتیں ہیں، یہ خشک مزاج لوگوں کی عقل میں نہیں آتیں، لیکن یہ ساری تفصیل احادیث کے اندر موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو آپ دیکھ رہے ہیں، عمر بن شبہ نے اخبار مدینہ میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے سارے مدینہ منورہ میں اور اس کے ماحول میں جتنی مسجدیں تھیں جس میں نبی کریم ﷺ کا نماز پڑھنا ثابت ہے ایک ایک آدمی سے پوچھ کر تحقیق کر کے جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی اس کے اُوپر پتھر لگوائے تھے کہ یہ مسجد ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نے نماز پڑھی ہے۔ (۴)

یہ سب کام بے کار اور مشرکانہ تھے؟ اور کیا سب شرک کا ارتکاب کرتے تھے؟

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے منع کرنے کی وجہ

اب یہ بات کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منع کیا تھا تو بھائی منع کرنے کے اسباب ہوتے

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاشربة، باب شرب من قدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم وآنیة، رقم: ۵۶۳۷، ۱۲۱۳

(۲) ھکذا لفظ البخاری، فی کتاب الاشربة، باب الشرب من قدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم وآنیة، رقم: ۵۶۳۸

(۳) المستدرك علی الصحیحین (۵۸۹/۳) رقم: ۶۱۸۱، دار النشر دار المكتب العلمية، بیروت، ۱۴۱۱ھ، ۱۹۹۰ء

(٤) انظر: فتح الباری (۵۷۱/۱) وعمدة القاری (۵٦٨/۳)

ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منع اس لئے کیا تھا کہ اہلِ کتاب کے طریقے پر کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ان اماکن ہی کو نافع اور ضار سمجھنے لگیں، یا ان کے اندر نماز پڑھنے کو واجب سمجھیں اور فرائض کو ترک کر کے اس کی طرف زیادہ متوجہ ہو جائیں، یہ بیشک منع ہے۔ (۱)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نفس تبرک بالمآثر کے منکر نہیں تھے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جہاں یہ بات ہے وہاں ایک اور بات بھی ہے جو کتاب المغازی میں مذکور ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نیزہ تھا جس سے ابوذات الکرش کو قتل کیا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ نیزہ رہا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اُٹھا کر اپنے پاس رکھا۔ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ وہ نیزہ اپنے پاس لے گئے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تمہارے پاس وہ نیزہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا ہوا تھا تو انہوں نے کہا کہ جی ہاں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے دے دو میں اپنے پاس رکھوں گا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ نیزہ ساری عمر اپنے پاس رکھا اور جب ان کا وصال ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ نیزہ مانگا۔

تو یہ نیزہ ہی تو تھا لیکن اس کی اتنی حفاظت اور اتنا تحفظ؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسا آدمی اس کی حفاظت کر رہا ہے تو وہ کیوں؟ عنزہ کا لفظ آتا ہے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے وہ اُٹھا کر رکھا تو معلوم ہوا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی نفس تبرک بالمآثر کے منکر نہیں تھے۔ وہ وہی عنزہ اُٹھا کر کیوں رکھتے، دنیا میں اس نام کے ہزاروں عنزے تھے۔

ہمارے ہاں بھی ایک میزائل کا نام عنزہ رکھا ہوا ہے، یہ اسی کے نام پر رکھا ہوا ہے۔ تو درحقیقت وہ عنزہ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہا تھا، اس وجہ سے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو اپنے پاس رکھنے میں سعادت سمجھتے تھے۔ (۲)

شجرۂ بیعت رضوان کو کٹوانے کی وجہ

دوسرا واقعہ جو ان کا مشہور ہے وہ یہ کہ انہوں نے شجرۂ حدیبیہ (بیعتِ رضوان جس کے نیچے ہوئی) کو کٹوا دیا تھا۔ اس میں پہلی بات تو یہ ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ کی روایت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ درحقیقت جس درخت کو لوگ شجرۂ رضوان سمجھ رہے تھے اس کے شجرۂ رضوان ہونے میں شک تھا، بخاری کی روایت مغازی میں ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ''ہمیں تو پتہ نہیں ہے تم جانتے ہو تو

(۱) عمدة القاری (۳/۵۶۰-۵۶۸) (۲) صحیح البخاری، کتاب المغازی، رقم: ۳۹۹۸

بتاؤ'' مطلب یہ ہے کہ ہمیں تعیین کے ساتھ وہ درخت یاد نہیں ہے تمہیں معلوم ہو تو بتاؤ کہ کونسا درخت ہے؟(۱)

اور لوگ تعیین کے ساتھ اس کو شجرۂ رضوان سمجھ رہے تھے، اس لئے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کو کٹوادیا۔(۲)

اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اندیشہ ہوا کہ لوگ اس کو باقاعدہ عرس کی جگہ نہ بنالیں تو اس واسطے انہوں نے کٹوادیا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی بھی آثر کو باقی نہ رکھا جائے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو روایتیں میں نے پیش کی ہیں یہ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ تبرک بآثار الانبیاء والصالحین جائز ہے اور ثابت ہے۔(۳)

آثار انبیاء کے تبرکات کا مقصد

ان مشاہد اور تبرکات کا حاصل صرف اتنا ہے کہ آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت رکھنے والی چیز کے ساتھ ایک محبت کا اظہار کرے اور اس سے تبرک حاصل کرے، لیکن اس کو معبود سمجھ لے، العیاذ باللہ، یا اس کی عبادت شروع کردے، یا اس کے ساتھ مس کو واجب سمجھ لے، یہ حدود سے تجاوز کرنا ہے۔(۴)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو بعد میں لوگ ایسا کرنے لگیں، لہٰذا انہوں نے منع کردیا، لیکن منع کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تبرکات کی کوئی سرے سے حیثیت ہی نہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تو حجر اسود کو بھی کہہ دیا تھا کہ جانتا ہوں تو صرف پتھر ہی ہے، نہ تیرے اندر نفع پہنچانے کی طاقت ہے اور نہ تیرے اندر نقصان پہنچانے کی طاقت ہے لیکن میں تجھے اس لئے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا ہے۔(۵)

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب غزوة الحديبية، رقم: ٤١٦٢، ٤١٦٣، ٤١٦٤، ٤١٦٥

(۲) مصنف ابن ابی شيبة(١٥٠/٢)، والطبقات الكبرى(١٠٠/٢) وفتح الباري(٤٤٨/٧)وعمدة القاري(١٩١/١٢)

(۳) عمدة القاری(٥٣٦/٢)

(٤) عمدة القاری(١٩١/١٠)

(٥) سنن الترمذي، باب ما جاء في تقبيل الحجر، رقم: ٨٦٠، وصحيح البخاري، كتاب الحج، باب ما ذكر في الحجر الاسود، رقم: ١٥٩٧، و باب الرمل في الحج والعمرة، رقم: ١٦٠٥ وباب تقبيل الحجر، رقم: ١٦١٠

ان کی نگاہ اس پر گئی کہ کہیں لوگ دوسری طرف غلو میں مبتلا نہ ہو جائیں، اس واسطے انہوں نے اس کو روکا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تبرکات کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

تبرکات مٹاؤ والے مؤقف کی حقیقت

لہٰذا یہ جو مؤقف اختیار کیا ہے کہ تبرکات کو مٹاؤ یہ بالکل غلو ہے اور تشدد فی الدین ہے اور دلائل واضحہ کے خلاف اور مکابرہ ہے، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ یہ تبرک تبرک ہی کی حد میں رہنا چاہئے، اس سے آگے بڑھ کر عبادت نہ سمجھا جائے کہ تبرک کو عبادت بنالیں اور آدمی اسی کو نافع وضار سمجھنے لگیں اور تعظیم ایسی کرنے لگیں کہ عبادت کے ساتھ مشابہ ہو جائے تو یہ باتیں منع ہیں اور غلو ہے اور بعض جگہ شرک کی حد تک پہنچ جاتی ہیں تو اس وجہ سے جہاں اس بات کا خطرہ ہو اور وہاں ممکن ہو تو اس جگہ لوگوں کو ایسا کرنے سے روک لیں، بس حد میں رہنے کا پابند بنایا جائے اور جہاں ممکن نہ ہو تو وہاں سد ذریعہ کے طور پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بالکل رک جاؤ، یہ وہاں ہے جہاں لوگ حدود کے پابند نہیں رہیں گے، لیکن اس کو مطلق شرک قرار دینا اور آثار کو جان بوجھ کر مٹانا یہ بڑی زیادتی کی بات ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے آثار کو ایک ایک کر کے مٹایا جا رہا ہے۔

بھئی! تم نے روضۂ اقدس پر قابو پایا ہے کہ نہیں پایا، کہ روضۂ اقدس پر بھی لوگ شرک کرتے تھے، وہاں جا کر بدعات کرتے تھے، لیکن آدمی کھڑے کر دیئے، مجال ہے کہ کوئی آدمی ہاتھ باندھ کر بھی کھڑا ہو جائے، اس کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ ہاتھ نیچے کر دو، وہاں پر پابندی لگائی ہوئی ہے لیکن تم نے غلو اور شرک کے اندیشہ سے بند نہیں کیا ہے تو جو کام وہاں کر رہے ہو دوسرے آثار پر بھی کر سکتے ہو، اس واسطے غلو اور بدعات کو روکو، لیکن آثار کو ضائع کرنا اور باقاعدہ ختم کرنا اور اس کو مشن بنالینا یہ اتنی افسوسناک بات ہے کہ کوئی حدِ احساس نہیں۔

چودہ صدیوں سے اُمت نے نبی کریم ﷺ کے ایک ایک آثار کو محفوظ رکھا، ایک ایک یادگار کو اپنے سینہ سے لگا کر رکھا کہ کوئی آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، کوئی دوسری قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی تھی، ''خوخۂ ابوبکر'' کو محفوظ رکھا، یہ نہیں کہ شرک کی وجہ سے، ارے عشق بھی کوئی چیز ہوتی ہے، محبت بھی ہوتی ہے، تعلق خاطر بھی ہوتی ہے۔ آدمی جب ان یادگاروں کو دیکھتا ہے تو ان واقعات کو یاد کرتا ہے اور نبی کریم ﷺ اور ان کی سیرت طیبہ کو یاد کرتا ہے، اس سے استحضار ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ رسول کریم ﷺ کی محبت میں اضافہ فرماتے ہیں۔

چودہ صدیوں تک جن چیزوں کو محفوظ رکھا گیا ان کو یک لخت اُٹھا کر ختم کر دیا، جب سے یہ برسرِ اقتدار آئے ایک ایک کر کے سب مٹا دیئے، یعنی رفتہ رفتہ کر کے، ایک دم سے سارے نہیں

مٹائے، سوچا کہ لوگ ہنگامہ نہ کردیں، اس لئے رفتہ رفتہ کرکے کبھی ایک مٹایا، کبھی دوسرا، اس طرح کرکے سب ختم کردیئے، کوئی باقی نہیں چھوڑا۔

مستند تبرکات

جہاں سرکارِ دوعالم ﷺ کے تبرکات محفوظ کیے گئے ہیں، یوں تو دنیا کے مختلف حصوں میں آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب تبرکات پائے جاتے ہیں، لیکن مشہور یہ ہے کہ استنبول میں محفوظ یہ تبرکات زیادہ مستند ہیں۔ ان میں سرکارِ دوعالم ﷺ کا جبہ مبارک، آپ ﷺ کی دو تلواریں، آپ ﷺ کا وہ جھنڈا جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں استعمال کیا گیا تھا، موئے مبارک، دندانِ مبارک، مقوقس شاہِ مصر کے نام آپ ﷺ کا مکتوبِ گرامی اور آپ ﷺ کی مہر مبارک شامل ہیں۔

تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبرکات بنوعباس کے خلفاء کے پاس موجود تھے، چنانچہ یہ آخری عباسی خلیفہ المتوکل کے حصے میں بھی آئے تھے، وہ آخر میں مصر کے اندر مملوک سلاطین کے زیرِ سایہ زندگی بسر کررہا تھا، اقتدار واختیار میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ دسویں صدی ہجری میں جب حجاز اور مصر کے علاقوں نے عثمانی سلطان سلیم اوّل کی سلطنت تسلیم کرلی اور اسے ''خادم الحرمین شریفین'' کا منصب عطا کیا گیا تو عباسی خلیفہ المتوکل نے ''خلافت'' کا منصب بھی سلطان سلیم کو سونپ دیا، اور مقاماتِ مقدسہ وحرمین شریفین کی کنجیاں اور یہ تبرکات بھی بطورِ سندِ خلافت اُن کے حوالے کردیئے۔ اسی کے بعد سے سلاطین عثمان کو ''خلیفہ'' اور ''امیر المؤمنین'' کا لقب مل گیا، اور پوری دنیائے اسلام نے اُن کی یہ حیثیت کسی اختلاف کے بغیر تسلیم کرلی۔

اس طرح سلطان سلیم دسویں صدی ہجری میں یہ تبرکات مصر سے استنبول لے کر آئے، اور یہ اہتمام کیا کہ ''توپ کاپے سرائے'' میں ان کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک مستقل کمرہ تعمیر کیا۔ سلطان کی طرف سے ان تبرکات کی قدردانی اور ان سے عشق ومحبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب تک سلطان سلیم زندہ رہے استنبول میں مقیم رہنے کے دوران اس کمرے میں خود اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے اور اس کی صفائی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کمرے میں انہوں نے حفاظِ قرآن کو مقرر کیا کہ چوبیس گھنٹے یہاں تلاوت کرتے رہیں۔ حفاظ کی باریاں مقرر تھیں۔ ایک جماعت کا وقت ختم ہونے سے پہلے دوسری جماعت آکر تلاوت شروع کردیتی تھی۔ اس طرح یہ سلسلہ بعد کے خلفاء نے بھی جاری رکھا۔ اس طرح دنیا میں شاید یہ واحد جگہ ہو جہاں چارسو سال تک تلاوتِ قرآن ہوتی رہی، اس دوران ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہیں ہوئی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد یعنی کمال اتاترک نے

یہ سلسلہ بند کر دیا۔

ان تبرکات کو انتہائی نفیس لکڑی کے صندوقوں میں رکھا گیا ہے، اور سال بھر میں صرف ایک بار رمضان کی ستائیسویں شب میں باہر نکال کر ان کی زیارت کرائی جاتی ہے، عام دن میں یہ تبرکات صندوقوں میں بند رہتے ہیں، بس صرف صندوق ہی دیکھے جاسکتے ہیں۔ بہر حال اُس ظرف کی زیارت بھی ایک نعمت عظمیٰ ہے جسے ان کی صحبت ومساس کا شرف حاصل ہو سعادت سے خالی نہیں ہے۔

درجۂ استناد کے لحاظ سے ان تبرکات کی جو بھی حیثیت ہو، لیکن ایک اُمتی کے لئے اس نسبت کی سچائی کا احتمال، اور صرف احتمال بھی کیا کم ہے!

اسی کمرے میں کچھ اور تبرکات بھی رکھے ہوئے ہیں جو شوکیسوں میں محفوظ ہیں، اور شفاف شیشوں کے واسطے سے ان کی زیارت کی جاسکتی ہے۔ ان میں ایک تلوار حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، چار تلواریں چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب ہیں، ان کے علاوہ حضرت خالد بن ولید، حضرت جعفر طیار، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت ابوالحسین رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب تلواریں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ ایک حصہ میں کعبہ شریف کے دروازے کا ایک ٹکڑا، کعبہ شریف کا قفل اور چابیاں، میزابِ رحمت کے دو ٹکڑے اور وہ تھیلا بھی محفوظ ہے جس میں کسی زمانے میں حجرِ اسود رکھا گیا تھا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی مٹی بھی موجود ہے، لیکن محققین کا کہنا ہے کہ تلواروں کی نسبت مشکوک ہے۔ (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے پاس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بال رکھا ہوا ہے، جب میں مروں تو مرنے کے بعد وہ میرے منہ میں رکھ دینا اور اس کے ساتھ مجھے دفن کر دینا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا کہ دفن کے وقت ان کے منہ میں موئے مبارک رکھا ہوا تھا، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ تبرک بآثار الانبیاء والصالحین جائز ہے اور ثابت ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "جہانِ دیدہ" ص: ۳۳۸

بیماری اور پریشانی ایک نعمت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

اما بعد!

"فقد قَالَ النبی صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اَشَدُّ النَّاسِ بَلاءً اَلْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ)) (۱)

پریشان حال کے لئے بشارت

اس حدیث میں اس شخص کے لئے بشارت ہے جو مختلف پریشانیوں میں اور تکلیفوں میں مبتلا ہو اور ان پریشانیوں کے باوجود اس کا رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو اور وہ دعا کے ذریعہ اپنی اس تکلیف اور پریشانی کو دور کرنے کی فکر کر رہا ہو۔ ایسے شخص کے لئے اس حدیث میں بشارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت میں اور اپنے فضل و کرم سے یہ تکلیف دی ہے اور اس تکلیف کا منشاء اللہ تعالیٰ کی ناراضگی نہیں ہے۔

پریشانیوں کی دو قسمیں

جب انسان کسی پریشانی میں ہو، یا کسی بیماری یا تکلیف میں ہو، یا افلاس اور تنگ دستی میں ہو، یا قرض کی پریشانی یا بیروزگاری کی پریشانی میں ہو، یا گھر کی طرف سے پریشانی ہو، اس قسم کی جتنی پریشانیاں جو انسان کو دنیا میں پیش آتی ہیں یہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کی پریشانیاں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قہر اور عذاب ہوتا ہے۔ گناہوں کی اصل سزا تو انسان کو آخرت میں ملتی ہے۔ لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ انسان کو دنیا میں بھی عذاب کا مزہ چکھا دیتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے:

☆ اصلاحی خطبات (۷/۱۰۷۔۱۲۸)، ۲۳ اگست ۱۹۹۶ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) کنز العمال، رقم: ٦٧٨٣

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (۱)

''آخرت میں جو بڑا عذاب آنے والا ہے ہم اس سے پہلے دنیا میں بھی تھوڑا سا عذاب چکھا دیتے ہیں تاکہ یہ لوگ اپنی بداعمالیوں سے باز آجائیں''

اور دوسری قسم کی تکالیف اور پریشانیوں وہ ہوتی ہیں جن کے ذریعہ بندے کے درجات بلند کرنے ہوتے ہیں۔ اور اس کے درجات کی بلندی اور اس کو اجر وثواب دینے کے لئے اس کو تکلیفیں دی جاتی ہیں۔

''تکالیف'' اللہ کا عذاب ہیں

لیکن دونوں قسم کی پریشانیوں اور تکالیف میں فرق کس طرح کریں گے کہ یہ پہلی قسم کی پریشانی ہے یا دوسری قسم کی پریشانی ہے؟ ان دونوں قسموں کی پریشانیوں اور تکالیف کی علامات الگ الگ ہیں۔ وہ یہ کہ اگر انسان ان تکالیف کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چھوڑ دے اور اس تکلیف کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ کرنے لگے، مثلاً یہ کہنے لگے کہ (نعوذ باللہ) اس تکلیف اور پریشانی کے لئے میں ہی رہ گیا تھا؟ میرے اُوپر یہ تکلیف کیوں آرہی ہے؟ یہ پریشانی مجھے کیوں دی جارہی ہے؟ وغیرہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے ہوئے احکام چھوڑ دے، مثلاً پہلے نماز پڑھتا تھا اب تکلیف کی وجہ سے نماز پڑھنا چھوڑ دیا، یا پہلے ذکر واذکار کے معمولات کا پابند تھا، اب وہ معمولات چھوڑ دیئے اور اس تکلیف کو دور کرنے کے لئے دوسرے ظاہری اسباب تو اختیار کر رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار نہیں کرتا، دعا نہیں کرتا، یہ اس بات کی علامات ہیں کہ جو تکلیف اس پر آئی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس انسان پر قہر اور عذاب ہے اور سزا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مؤمن کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

''تکالیف'' اللہ کی رحمت بھی ہیں

اور اگر تکالیف آنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہا ہے اور دعا کر رہا ہے کہ یا اللہ! میں کمزور ہوں، اس تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتا، یا اللہ! مجھے اس تکلیف سے اپنی رحمت سے نجات دے دیجئے، اور دل کے اندر اس تکلیف پر شکوہ نہیں ہے، وہ اس تکلیف کا احساس تو کر رہا ہے، رو بھی رہا ہے، رنج اور غم کا اظہار بھی کر رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر شکوہ نہیں کر رہا ہے بلکہ اس تکلیف میں وہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہا ہے، پہلے سے زیادہ نمازیں پڑھ رہا ہے، پہلے

(۱) السجدة: ۲۱

سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور ترقی درجات ہے اور یہ تکالیف اس کے لئے اجر وثواب کا باعث ہیں، اور یہ تکلیف بھی اس کے لئے رحمت ہے، اور یہ اس انسان کے ساتھ اللہ کی محبت کی دلیل اور علامت ہے۔

کوئی شخص پریشانی سے خالی نہیں

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی کو دوسرے سے محبت ہوتی ہے تو محبت میں تو اس کو آرام پہنچایا جاتا ہے، راحت دی جاتی ہے، تو جب اللہ تعالیٰ کو اس بندے سے محبت ہے تو اس بندے کو آرام پہنچانا چاہئے، پھر اللہ تعالیٰ اس کو تکلیف کیوں دے رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کو کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی تکلیف نہ پہنچے، کوئی نہ کوئی صدمہ اور پریشانی نہ ہو، چاہے وہ بڑے سے بڑا نبی اور پیغمبر ہو، ولی اور صوفی ہو، یا بادشاہ ہو، یا سرمایہ دار ہو، ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا میں تکلیف کے بغیر زندگی گزارے، اس لئے کہ یہ عالم یعنی دنیا اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ اس میں غم اور خوشی، راحت اور تکلیف سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ خالص خوشی اور راحت کا مقام دنیا نہیں ہے۔ بلکہ وہ عالم جنت ہے۔ جس کے بارے میں فرمایا:

﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (۱)

''یعنی وہاں نہ کوئی خوف ہے اور نہ غم ہے''

اصل خوشی اور راحت کا مقام تو وہ ہے۔ دنیا تو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہی ایسی ہے کہ اس میں کبھی خوشی ہوگی اور کبھی غم ہوگا، کبھی سردی ہوگی کبھی گرمی ہوگی، کبھی دھوپ ہوگی کبھی چھاؤں ہوگی۔ کبھی ایک حالت ہوگی کبھی دوسری حالت ہوگی۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص اس دنیا میں بے غم ہو کر بیٹھ جائے۔

ایک نصیحت آموز قصہ

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے اپنے مواعظ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوگئی۔ اس شخص نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا کہ حضرت! میرے لئے یہ دعا فرمادیں کہ مجھے زندگی میں کوئی غم اور تکلیف نہ آئے اور ساری زندگی بے غم گزر جائے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ دعا تو میں نہیں کر سکتا، اس لئے کہ اس دنیا میں غم اور تکلیف تو آئے گی، البتہ ایک کام کر سکتا ہوں وہ یہ کہ تم دنیا میں ایسا آدمی تلاش کرو جو تمہیں سب سے زیادہ بے غم یا کم غم والا نظر آئے۔ پھر مجھے اس شخص کا پتہ بتا دینا، میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر دوں گا کہ اللہ تعالیٰ

(۱) البقرة: ۳۸

تمہیں اس جیسا بنادے۔

یہ شخص بہت خوش ہوا کہ چلو ایسا آدمی تو مل جائے گا جو بہت زیادہ آرام اور راحت میں ہوگا اور میں اس جیسا بننے کی دعا کرالوں گا۔ اب تلاش کرنے کے لئے نکلا، کبھی ایک آدمی کے بارے میں فیصلہ کرتا کہ اس جیسا بننے کی دعا کراؤں گا۔ پھر دوسرا آدمی اس سے زیادہ دولت مند نظر آتا تو پھر یہ فیصلہ بدل دیتا کہ نہیں، اس جیسا بننے کی دعا کراؤں گا۔ غرض کافی عرصہ تک تلاش کرنے کے بعد اس کو ایک جوہری اور زرگر نظر آیا جو سونا چاندی، جو ہرات اور قیمتی پتھر کی تجارت کرتا تھا۔ بہت بڑی اور آراستہ اس کی دکان تھی، اس کا محل بڑا عالی شان تھا۔ بڑی قیمتی اور اعلیٰ قسم کی سواری تھی۔ نوکر چاکر خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے بیٹے بڑے خوبصورت اور نوجوان تھے۔ ظاہری حالات دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص بڑے عیش و آرام میں ہے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس جیسا بننے کی دعا کراؤں گا۔ جب واپس جانے لگا تو خیال آیا کہ اس شخص کی ظاہری حالت تو بہت اچھی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اندر سے کسی بیماری یا پریشانی میں مبتلا ہو۔ جس کی وجہ سے میری موجودہ حالت بھی ختم ہو جائے۔ اس لئے اس جوہری سے جاکر پوچھنا چاہئے کہ وہ کس حالت میں ہے۔

چنانچہ یہ شخص اس جوہری کے پاس گیا اور اس سے جاکر کہا کہ تم بڑے عیش و آرام میں زندگی گزار رہے ہو۔ دولت کی ریل پیل ہے، نوکر چاکر لگے ہوئے ہیں۔ تو میں تم جیسا بننا چاہتا ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اندرونی طور پر تمہیں کوئی پریشانی لاحق ہو اور کسی بیماری یا مصیبت کے اندر مبتلا ہو؟

وہ جوہری اس شخص کو تنہائی میں لے گیا اور اس سے کہا کہ تمہارا خیال یہ ہے کہ میں بڑے عیش و آرام میں ہوں، بڑا دولت مند ہوں، بڑے نوکر چاکر خدمت گزاری میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن اس دنیا میں مجھ سے زیادہ غم اور تکلیف میں کوئی شخص نہیں ہوگا۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی اخلاقی حالت کا بڑا عبرت ناک قصہ سناتے ہوئے کہا کہ یہ خوبصورت اور جوان بیٹے جو تمہیں نظر آرہے ہیں یہ حقیقت میں میرے بیٹے نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے میرا کوئی لمحہ اذیت اور پریشانی سے خالی نہیں گزرتا اور اندر سے میرے دل میں غم اور صدمہ کی جو آگ سلگ رہی ہے تم اس سے واقف نہیں ہو۔ اس لئے میرا جیسا بننے کی ہرگز دعا مت کرانا۔ اب اس شخص کو پتہ چلا کہ جتنے لوگ مال و دولت اور عیش و آرام میں نظر آرہے ہیں وہ کسی نہ کسی مصیبت اور پریشانی میں گرفتار ہیں۔

جب دوبارہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ ہاں بتاؤ تم کس جیسا بننا چاہتے ہو؟ اس شخص نے جواب دیا کہ مجھے کوئی بھی شخص غم اور پریشانی سے خالی نظر نہیں آیا جس کے جیسا بننے کی دعا کراؤں۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس دنیا میں کوئی بھی شخص

تمہیں بے غم نظر نہیں آئے گا۔ البتہ میں تمہارے لئے یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عافیت کی زندگی عطا فرمائے۔

ہر شخص کو دولت الگ الگ دی گئی ہے

اس دنیا میں کوئی بھی شخص صدمے، غم اور تکلیف سے خالی ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ کسی کو کم تکلیف ہے، کسی کو زیادہ ہے، کسی کو کوئی تکلیف، کسی کو کوئی تکلیف۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ کسی کو کوئی دولت دے دی ہے اور کسی سے کوئی دولت لے لی ہے۔ کسی کو صحت کی دولت دے دی ہے لیکن روپیہ پیسہ کی دولت سے محروم ہے۔ کسی کو روپیہ پیسہ کی دولت حاصل ہے تو صحت کی دولت سے محروم ہے۔ کسی کے گھر کے حالات اچھے ہیں لیکن معاشی حالات خراب ہیں۔ کسی کے معاشی حالات اچھے ہیں لیکن گھر کی طرف سے پریشانی ہے۔ غرض ہر شخص کا اپنا الگ حال ہے۔ اور ہر شخص کسی نہ کسی تکلیف اور پریشانی میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن اگر یہ پریشانی پہلی قسم سے ہے تو یہ اس کے لئے عذاب ہے اور اگر دوسری قسم سے ہے تو یہ اس کے لئے رحمت اور باعثِ اجر و ثواب ہے۔

محبوب بندے پر پریشانی کیوں؟

ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا صَبَّ عَلَيْهِ الْبَلَاءَ صَبًّا)) (۱)

یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس پر مختلف قسم کی آزمائشیں اور تکالیف بھیجتے ہیں۔ وہ آزمائشیں اور تکالیف اس پر بارش کی طرح برستی ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ فرشتے پوچھتے ہیں کہ یا اللہ! یہ تو آپ کا محبوب بندہ ہے، نیک بندہ ہے، آپ سے محبت کرنے والا ہے، تو پھر اس بندے پر اتنی آزمائشیں اور تکالیف کیوں بھیجی جارہی ہیں؟ جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس بندے کو اسی حال میں رہنے دو، اس لئے کہ مجھے یہ بات پسند ہے کہ میں اس کی دعا کی اور اس کی گریہ وزاری اور آہ و بکا کی آواز سنوں۔ یہ حدیث اگرچہ سند کے اعتبار سے کمزور ہے لیکن اس معنی کی متعدد احادیث آئی ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرے بندے کے پاس جاؤ اور اس کو آزمائش میں مبتلا کرو، اس لئے کہ میں اس کی آہ و بکا اور اس کی گریہ وزاری کی آواز سننا پسند کرتا ہوں۔ بات وہی ہے کہ دنیا میں تکالیف اور پریشانیاں تو آتی ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا محبوب بندہ ہے، میں اس کے لئے تکلیف کو دائمی راحت کا ذریعہ بنانا

(۱) کنز العمال، رقم: ۶۸۱۱، جامع الأحادیث، رقم: ۱۱۲۹، الجامع الکبیر للسیوطی، رقم: ۱۱۴۰

چاہتا ہوں اور تاکہ اس کا درجہ بلند ہو جائے۔ اور جب آخرت میں میرے پاس پہنچے تو گناہوں سے بالکل پاک و صاف ہو کر پہنچے، اس لئے اپنے محبوب اور اپنے پیاروں کو تکالیف اور پریشانیاں عطا فرماتے ہیں۔

صبر کرنے والوں پر انعامات

اس کائنات میں انبیاء علیہم السلام سے زیادہ محبوب تو اللہ تعالیٰ کا کوئی اور ہو نہیں سکتا لیکن ان کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ:

((أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ))(۱)

یعنی اس دنیا میں سب سے زیادہ آزمائشیں انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں۔ پھر اس کے بعد جو شخص انبیاء علیہم السلام سے جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے اور جتنا تعلق رکھنے والا ہوتا ہے اس پر اتنی ہی آزمائشیں زیادہ آئیں گی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھئے! جن کا لقب ہے "خلیل اللہ" اللہ کا دوست۔ لیکن ان پر بڑی بڑی بلائیں اور بڑی بڑی مصیبتیں آئیں۔ چنانچہ آگ میں ان کو ڈالا گیا۔ بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ان کو دیا گیا۔ بیوی بچے کو ایک بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑنے کا حکم ان کو دیا گیا۔ غرض کہ یہ بڑی بڑی آزمائشیں اُن پر آئیں۔ یہ تکالیف کیوں دی گئیں؟ تاکہ ان کے درجات بلند کیے جائیں۔ چنانچہ جب تکالیف پر قیامت کے روز اللہ تعالیٰ لوگوں کو انعام عطا فرمائیں گے تو اس وقت معلوم ہوگا کہ ان تکلیفوں کی پَرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں تھی اور وہ ان تکالیف کو بھول جائیں گے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تکالیف پر صبر کرنے والوں کو آخرت میں انعام عطا فرمائیں گے تو دوسرے لوگ ان انعامات کو دیکھ کر یہ تمنا کریں گے کہ کاش ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں اور اس پر ہم صبر کرتے تو آج ہم بھی ان انعامات کے مستحق ہوتے۔(۲)

تکالیف کی بہترین مثال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ان تکالیف کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کے جسم میں کوئی بیماری ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر نے آپریشن کرنا تجویز کیا۔ اب مریض کو معلوم ہے کہ آپریشن میں چیر پھاڑ ہوگی، تکلیف ہوگی، لیکن اس کے باوجود

---

(۱) کنز العمال، رقم: ٦٧٨٣

(۲) زاد المعاد، (١٧٣/٤)

ڈاکٹر سے درخواست کرتا ہے کہ میرا آپریشن جلدی کردو، اور دوسروں سے سفارش بھی کرا رہا ہے اور ڈاکٹر کو بھاری فیس بھی دے رہا ہے گویا کہ اس مقصد کے لئے پیسے دے رہا ہے کہ میرے اُوپر نشتر چلاؤ۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہے؟ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ آپریشن کی اور نشتر چلانے کی تکلیف معمولی اور عارضی ہے۔ چند روز کے بعد زخم ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن اس آپریشن کے بعد جو صحت کی نعمت ملنے والی ہے وہ اتنی عظیم ہے کہ اس کے مقابلے میں یہ تکلیف کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اور جو ڈاکٹر چیر پھاڑ کر رہا ہے اگرچہ بظاہر تکلیف دے رہا ہے لیکن اس مریض کے لئے اس وقت میں اس سے زیادہ مشفق اور محسن کوئی اور نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ڈاکٹر آپریشن کے ذریعہ اس کے لئے صحت کا سامان کر رہا ہے۔

بالکل اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو تکلیف دیتے ہیں تو حقیقت میں اس کا آپریشن ہو رہا ہے تاکہ اس کے ذریعہ ہم اس کو پاک و صاف کرلیں اور جب یہ بندہ ہمارے پاس آئے تو گناہوں سے پاک وصاف ہو کر اور دھل کر ہمارے پاس آئے۔

تکالیف کی ایک اور مثال

یا مثلاً تمہارا ایک محبوب ہے جس سے عرصہ دراز سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی اور اس سے ملنے کو دل چاہتا ہے۔ کسی موقع پر اچانک وہ محبوب تمہارے پاس آیا اور تمہیں پیچھے سے پکڑ کر زور سے دبانا شروع کر دیا۔ اور اتنی زور سے دبایا کہ پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ اب یہ محبوب اس سے کہتا ہے کہ میں تمہارا فلاں محبوب ہوں، اگر میرے دبانے سے تمہیں تکلیف ہو رہی ہے تو چلو میں تمہیں چھوڑ کر کسی اور کو دبانا شروع کر دیتا ہوں تاکہ تمہاری یہ تکلیف دور ہو جائے۔ اگر یہ شخص اپنی محبت کے دعوے میں سچا ہے تو اس وقت یہی کہے گا کہ تم اس سے زیادہ زور سے دباؤ اور زیادہ تکلیف پہنچادو۔ اس لئے کہ میں تو مدتوں سے تمہاری ملاقات کا طالب تھا اور یہ شعر پڑھے گا کہ ؂

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کو یہ نصیب نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو جائیں۔ دوستوں کا سر سلامت ہے آپ اپنا خنجر اس پر آزمائیں۔

تکالیف پر ''انا للہ'' پڑھنے والے

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تکالیف آتی ہیں حقیقت میں ان بندوں کے درجات کی

بلندی کے لئے آتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ (۱)

"یعنی ہم تمہیں ضرور بالضرور آزمائیں گے، کبھی خوف سے آزمائیں گے، کبھی بھوک سے، کبھی تمہارے مالوں میں کمی ہو جائے گی، کبھی تمہارے اعزہ اور اقرباء میں اور ملنے جلنے والوں میں کمی ہو جائے گی، کبھی تمہارے پھلوں میں کمی ہو جائے گی۔ پھر آگے فرمایا کہ ان لوگوں کو خوشخبری سنا دو جو ان مشکل ترین آزمائشوں پر صبر کریں اور یہ کہہ دیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت پر ہیں"

بہر حال، یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو بعض اوقات اس لئے تکلیفیں دیتے ہیں تاکہ ان کے درجات بلند فرمائیں۔

ہم دوست کو تکلیف دیتے ہیں

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بعض اوقات بڑے وجد کے انداز میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را چوں و چرا نہ رسد در قضاء ما

یعنی بعض اوقات ہم اپنے دشمن کو پالتے ہیں اور اس کو دنیا کے اندر ترقی دیتے ہیں اور اپنے دوست کو تکلیف دیتے ہیں اور اس کو مارتے ہیں۔ ہماری قضا اور تقدیر میں کسی کو چون و چرا کی مجال نہیں۔ اس لئے کہ ہماری حکمتوں کو کون سمجھ سکتا ہے

ایک عجیب و غریب قصہ

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک شہر میں دو آدمی

(۱) البقرة: ۱۵۵۔۱۵۷

بسترِ مرگ پر تھے۔ مرنے کے قریب تھے۔ ایک مسلمان تھا اور ایک یہودی تھا۔ اس یہودی کے دل میں مچھلی کھانے کی خواہش پیدا ہوئی اور مچھلی قریب میں کہیں ملتی نہیں تھی۔ اور اس مسلمان کے دل میں روغنِ زیتون کھانے کی خواہش پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو بلایا۔ ایک فرشتے سے فرمایا کہ فلاں شہر میں ایک یہودی مرنے کے قریب ہے اور اس کا دل مچھلی کھانے کو چاہ رہا ہے۔ تم ایسا کرو کہ ایک مچھلی لے کر اس کے گھر کے تالاب میں ڈال دو تا کہ وہ مچھلی کھا کر اپنی خواہش پوری کر لے۔ دوسرے فرشتے سے فرمایا کہ فلاں شہر میں ایک مسلمان مرنے کے قریب ہے اور اس کا روغنِ زیتون کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ اور روغنِ زیتون اس کی الماری کے اندر موجود ہے۔ تم جاؤ اور اس کا روغن نکال کر ضائع کر دو تا کہ وہ اپنی خواہش پوری نہ کر سکے۔

چنانچہ دونوں فرشتے اپنے اپنے مشن پر چلے۔ راستے میں ان دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ تم کس کام پر جا رہے ہو؟ ایک فرشتے نے بتایا کہ میں فلاں یہودی کو مچھلی کھلانے جا رہا ہوں۔ دوسرے فرشتے نے کہا کہ میں فلاں مسلمان کا روغن زیتون ضائع کرنے جا رہا ہوں۔ دونوں کو تعجب ہوا کہ ہم دونوں کو دو متضاد کاموں کا حکم کیوں دیا گیا؟ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا اس لئے دونوں نے جا کر اپنا اپنا کام پورا کر لیا۔

جب واپس آئے تو دونوں نے عرض کیا کہ یا اللہ! ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل تو کر لی لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک مسلمان جو آپ کے حکم کو ماننے والا تھا اور اس کے پاس روغن زیتون موجود تھا، اس کے باوجود آپ نے اس کا روغن زیتون ضائع کرا دیا۔ اور دوسری طرف ایک یہودی تھا اور اس کے پاس مچھلی موجود بھی نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود آپ نے اس کو مچھلی کھلا دی، اس لئے ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا قصہ ہے؟

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ تم کو ہمارے کاموں کی حکمتوں کا پتہ نہیں ہے، بات دراصل یہ ہے کہ ہمارا معاملہ کافروں کے ساتھ کچھ اور ہے اور مسلمانوں کے ساتھ کچھ اور ہے۔ کافروں کے ساتھ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ چونکہ کافر بھی دنیا میں نیک اعمال کرتے رہتے ہیں، مثلاً کبھی صدقہ خیرات کر دیا، کبھی کسی فقیر کی مدد کر دی، اس کے یہ نیک اعمال اگرچہ آخرت میں ہمارے ہاں مقبول نہیں ہیں، لیکن ہم ان کے نیک اعمال کا حساب دنیا میں چکا دیتے ہیں تا کہ جب یہ آخرت میں ہمارے پاس آئیں تو ان کے نیک اعمال کا حساب چکا ہوا ہو اور ہمارے ذمے ان کی کسی نیکی کا بدلہ باقی نہ ہو۔ اور مسلمانوں کے ساتھ ہمارا معاملہ جدا ہے۔ وہ یہ کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے گناہوں کا حساب دنیا کے اندر ہی چکا دیں تا کہ جب یہ ہمارے پاس آئیں تو گناہوں سے پاک وصاف ہو کر آئیں۔

لہٰذا اس یہودی نے جتنے نیک اعمال کیے تھے ان سب کا بدلہ ہم نے دے دیا تھا، صرف ایک

نیکی کا بدلہ دینا باقی تھا۔ اور اب یہ ہمارے پاس آرہا تھا۔ جب اس کے دل میں مچھلی کھانے کی خواہش پیدا ہوئی تو ہم نے اُس کی اِس خواہش کو پورا کرتے ہوئے اس کو مچھلی کھلادی تا کہ جب یہ ہمارے پاس آئے تو اس کی نیکیوں کا حساب چکا ہوا ہو۔ اور اس مسلمان کی بیماری کے دوران باقی سارے گناہ تو معاف ہو چکے تھے البتہ ایک گناہ اس کے سر پر باقی تھا۔ اور اب یہ ہمارے پاس آنے والا تھا۔ اگر اسی حالت میں ہمارے پاس آجاتا تو اس کا یہ گناہ اس کے نامۂ اعمال میں ہوتا۔ اس لئے ہم نے یہ چاہا کہ اس کا روغن زیتون ضائع کر کے اور اس کی خواہش کو توڑ کر اس کے دل پر ایک چوٹ اور لگائیں اور اس کے ذریعہ اس کے ایک گناہ کو بھی صاف کر دیں۔ تا کہ جب یہ ہمارے پاس آئے تو بالکل پاک و صاف ہو کر آئے۔ بہر حال، اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا کون ادراک کر سکتا ہے۔ کیا ہماری یہ چھوٹی سی عقل ان حکمتوں کا احاطہ کر سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے تحت کائنات کا یہ نظام چل رہا ہے۔ ان کی حکمتیں اس کائنات میں متصرف ہیں۔ انسان کے بس کا کام نہیں کہ وہ ان کا ادراک بھی کر سکے۔ ہمیں کیا معلوم کہ کون سے وقت میں اللہ تعالیٰ کی کون سی حکمت جاری ہے۔

یہ تکالیف اضطراری مجاہدات ہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے زمانے میں لوگ جب اپنی اصلاح کرنے کے لئے کسی شیخ یا کسی بزرگ کے پاس جاتے تو وہ بزرگ اور شیخ ان سے بہت سے مجاہدات اور ریاضتیں کرایا کرتے تھے۔ یہ مجاہدات اختیاری ہوتے تھے۔ اب اس موجودہ دور میں وہ بڑے بڑے مجاہدات نہیں کرائے جاتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان بندوں کو مجاہدات سے محروم نہیں فرمایا، بلکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے بندوں سے اضطراری اور زبردستی مجاہدہ کرایا جاتا ہے۔ اور ان اضطراری مجاہدات کے ذریعہ انسان کو جو ترقی ہوتی ہے وہ اختیاری مجاہدات کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری سے ہوتی ہے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں اختیاری مجاہدات اتنے نہیں تھے۔ مثلاً ان کے یہاں یہ نہیں تھا کہ جان بوجھ کر فاقہ کیا جارہا ہے۔ یا جان بوجھ کر تکلیف دی جارہی ہے وغیرہ۔ لیکن ان کی زندگی میں اضطراری مجاہدات بے شمار تھے۔ چنانچہ کلمہ طیبہ پڑھنے کی پاداش میں ان کو تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جاتا تھا، سینے پر پتھر کی سلیں رکھی جاتی تھیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کی پاداش میں ان پر نہ جانے کیسے کیسے ظلم کیے جاتے تھے، یہ سب مجاہدات اضطراری تھے۔ اور ان اضطراری مجاہدات کے نتیجے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درجات اتنے بلند ہوگئے کہ اب کوئی غیر صحابی ان کے مقام کو چھو نہیں سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ اضطراری مجاہدات سے درجات زیادہ تیز رفتاری سے بلند ہوتے ہیں، اور انسان تیز رفتاری سے ترقی کرتا ہے۔ لہٰذا انسان کو جو تکالیف، پریشانیاں اور بیماریاں

آ رہی ہیں، یہ اضطراری مجاہدات کرائے جا رہے ہیں۔ اور جس کو ہم تکلیف سمجھ رہے ہیں، حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور محبت کا عنوان ہوتی ہے۔

ان تکالیف کی تیسری مثال

مثلاً ایک چھوٹا بچہ ہے، وہ نہانے اور ہاتھ منہ دھلوانے سے گھبراتا ہے۔ اور اس کو نہانے سے تکلیف ہوتی ہے، لیکن ماں زبردستی پکڑ کر اس کو نہلا دیتی ہے۔ اور اس کا میل کچیل دور کر دیتی ہے۔ اب نہانے کے دوران وہ روتا بھی ہے، چیختا چلاتا بھی ہے، اس کے باوجود ماں اس کو نہیں چھوڑتی ہے' اب وہ بچہ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھ پر ظلم اور زیاتی ہو رہی ہے، مجھے تکالیف پہنچائی جا رہی ہے، لیکن ماں شفقت اور محبت کی وجہ سے بچے کو نہلا رہی ہے، اور اس کا میل کچیل دور کر رہی ہے، اور اس کا جسم صاف کر رہی ہے' چنانچہ جب وہ بچہ بڑا ہوگا، اس وقت اس کی سمجھ میں آئے گا کہ یہ نہلانے دھلانے کا جو کام میری ماں کرتی تھی، وہ بڑی محبت اور شفقت کا عمل تھا، جس کو میں ظلم اور زیادتی سمجھ رہا تھا۔ اگر میری ماں میرا میل کچیل دور نہ کرتی تو میں گندہ رہ جاتا۔

چوتھی مثال

یا مثلاً ایک بچے کو ماں باپ نے اسکول میں داخل کر دیا، اب روزانہ صبح کو ماں باپ زبردستی اس کو اسکول بھیج دیتے ہیں۔ اسکول جاتے وقت وہ بچہ روتا چیختا ہے، چلاتا ہے، اور سکول میں چار پانچ گھنٹے بیٹھنے کو اپنے لئے قید سمجھتا ہے۔ لیکن بچے کے ساتھ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو زبردستی اسکول بھیجیں۔ چنانچہ جب وہ بچہ بڑا ہوگا تب اس کی سمجھ میں آئے گا کہ اگر بچپن میں ماں باپ زبردستی مجھے اسکول نہ بھیجتے اور مجھے نہ پڑھاتے تو آج میں پڑھے لکھوں کی صف میں شامل نہ ہوتا، بلکہ جاہل رہ جاتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر جو تکالیف اور پریشانیاں آتی ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی محبت اور شفقت کا عین تقاضا ہے۔ اور انسان کے درجات بلند کرنے کے لئے اس کو یہ تکالیف دی جا رہی ہیں۔ بشرطیکہ ان تکالیف میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہو جائے تو پھر سمجھ لو کہ یہ تکالیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہی رحمت ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور تکالیف

حضرت ایوب علیہ السلام کو دیکھئے۔ کیسی سخت بیماری کے اندر مبتلا ہوئے کہ اس بیماری کے تصور

کرنے سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، اور پھر اس بیماری کے اندر شیطان ان کے پاس آیا اور اس نے آپ کو تکلیف دینے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آپ کے گناہوں کی وجہ سے یہ بیماری آئی ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہیں، اس لئے آپ کو اس تکلیف کے اندر مبتلا کر دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور قہر کی وجہ سے آپ کو یہ تکالیف آرہی ہیں۔ اور اس پر اس نے اپنے دلائل بھی پیش کیے۔ اس موقع پر حضرت ایوب علیہ السلام نے شیطان سے مناظرہ کیا۔ بائبل کے صحیفہ ایوبی میں اب بھی اس مناظرے کے بارے میں کچھ تفصیل موجود ہے۔ چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام نے شیطان کے جواب میں فرمایا کہ تمہاری بات درست نہیں کہ یہ بیماری اور تکالیف میرے گناہوں کی وجہ سے اللہ کے غضب اور قہر کے طور پر آئی ہے۔ بلکہ یہ تکالیف میرے خالق اور میرے مالک کی طرف سے محبت کا عنوان ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور شفقت کی وجہ سے یہ تکالیف دے رہے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا تو ضرور مانگتا ہوں کہ یا اللہ مجھے اس بیماری سے شفا عطا فرما دیجئے۔ لیکن مجھے اللہ تعالیٰ سے اس بیماری پر گلہ اور شکوہ نہیں ہے اور مجھے اس بیماری پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ بیماری کیوں دی ہے؟ اور الحمد للہ، روزانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں، اور یہ دعا کرتا ہوں:

﴿رَبِّ اِنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ﴾ (۱)

''اے اللہ! مجھے یہ تکلیف ہے، آپ ارحم الراحمین ہیں۔ اس تکلیف کو دور فرما دیجئے''

لہٰذا یہ میرا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا بھی ان کی طرف سے عطا ہے اور جب وہ مجھے اس تکلیف کے دوران اپنی بارگاہ میں رجوع کرنے کی توفیق دے رہے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ تکلیف بھی ان کی طرف سے رحمت اور محبت کا ایک عنوان ہے، یہ ساری باتیں ''صحیفہ ایوبی'' میں موجود ہیں۔

تکالیف کے رحمت ہونے کی علامات

اس میں حضرت ایوب علیہ السلام نے اس کی علامات بتا دیں کہ کون سی تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے قہر اور عذاب ہوتی ہے اور کون سی تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور انعام ہوتی ہے۔ وہ علامت یہ ہے کہ پہلی قسم کی تکلیف میں انسان اللہ تعالیٰ سے گلہ شکوہ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتا، اور دوسری قسم کی تکلیف میں اللہ تعالیٰ سے گلہ شکوہ کوئی نہیں ہوتا، لیکن دعا کرتا ہے کہ یا اللہ، میں کمزور ہوں اور اس تکلیف اور آزمائش کا متحمل نہیں ہوں، اپنی رحمت سے مجھے اس تکلیف اور آزمائش سے نکال دیجئے، لہٰذا جب بھی صدمے کے وقت،

(۱) الانبیاء: ۸۳

تکلیف اور پریشانی کے وقت، بیماری میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہو جائے تو سمجھ لو کہ الحمد للہ یہ بیماری یہ پریشانی، یہ تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے، اس صورت میں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ تکلیف بالآخر انشاء اللہ دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے خیر کا ذریعہ بنے گی۔ بس شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی توفیق ہو جائے۔ اس لئے کہ اگر یہ تکلیف اللہ تعالیٰ کی طرف سے قہر اور غضب ہوتا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اس تکلیف کے اندر اپنا نام لینے اور اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہی نہ دیتے۔ جب وہ اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق دے رہے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ تکلیف ان کی طرف سے رحمت ہے۔

دعا کی قبولیت کی علامت

البتہ یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات جب تکلیف کے اندر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس کے باوجود وہ تکلیف اور پریشانی نہیں جاتی اور دعا قبول نہیں ہوتی، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرنے اور عرض معروض پیش کرنے کی توفیق مل جانا ہی اس بات کی علامت ہے کہ ہماری دعا قبول ہوگئی۔ ورنہ دعا کرنے کی بھی توفیق نہ ملتی۔ اور اب اس صورت میں تکلیف پر الگ انعام ملے گا، اور اس دعا کرنے پر الگ انعام حاصل ہوگا، اور اس دعا کے بعد دوبارہ دعا کرنے کی جو توفیق ہوگی، اس پر الگ انعام ملے گا۔ لہٰذا یہ تکلیف رفع درجات کا ذریعہ بن رہی ہے۔ اسی کے بارے میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"گفت آں "اللہ" تو لبیک ماست"

یعنی جس وقت تو ہمارا نام لیتا ہے اور "اللہ" کہتا ہے تو یہ تیرا "اللہ" کہنا ہی ہماری طرف سے "لبیک" کہنا ہے، اور تمہارا اللہ کہنا ہی اس بات کی علامت ہے کہ ہم نے تمہاری پکار کو سن لیا اور اس کو قبول بھی کر لیا۔ لہٰذا دعا کی توفیق ہو جانا ہی ہماری طرف سے دعا کی قبولیت کی علامت ہے۔ البتہ یہ ہماری حکمت کا تقاضا ہے کہ کب اس پریشانی کو تم سے دور کرنا ہے اور کب تک اس کو باقی رکھنا ہے۔ تم جلد باز ہو، اس لئے جلدی اس تکلیف کو دور کرانا چاہتے ہو، لیکن اگر اس تکلیف کو کچھ دیر کے بعد دور کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں تمہارے درجات بہت زیادہ بلند ہو جائیں گے۔ لہٰذا تکلیف میں یہ گلہ شکوہ نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ یہ دعا ضرور کرنی چاہئے کہ یا اللہ، میں کمزور ہوں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ مجھ سے یہ تکلیف دور فرما دیجئے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

تکلیف مانگنے کی چیز نہیں کہ آدمی یہ دعا کرے کہ یا اللہ، مجھے تکلیف دے دیں۔ لیکن جب تکلیف آجائے تو وہ صبر کرنے کی چیز ہے۔ اور صبر کا مطلب یہ ہے کہ اس پر گلہ شکوہ نہ کرے۔ چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تکالیف سے پناہ مانگی ہے۔ ایک دعا میں آپ نے فرمایا: یا اللہ، میں آپ سے بُری بُری بیماریوں سے اور بُرے بُرے امراض سے پناہ مانگتا ہوں۔ لیکن جب کبھی تکلیف آگئی تو اس کو اپنے حق میں رحمت سمجھا، اور اس کے ازالے کی بھی دعا مانگی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں یہ قصہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں یہ مضمون بیان فرمارہے تھے کہ جتنی تکالیف ہوتی ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور انعام ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ بندہ اس کی قدر پہچانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اس بیان کے دوران ایک شخص مجلس میں آیا، جو کوڑھ کا مریض تھا، اور اس بیماری کی وجہ سے اس کا سارا جسم گلا ہوا تھا۔ مجلس میں آکر حضرت حاجی صاحب سے کہا کہ حضرت، دعا فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری یہ تکلیف دور فرمادے، حاضرین یہ سوچنے لگے کہ ابھی تو حضرت یہ بیان فرمارہے تھے کہ جتنی تکالیف ہوتی ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام اور رحمت ہوتی ہیں، اور یہ شخص اس بیماری کے ازالے کی دعا کرارہا ہے، اب کیا حضرت حاجی صاحب یہ دعا فرمائیں گے کہ یا اللہ اس رحمت کو دور کردیجئے؟ حضرت حاجی صاحب نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور فرمایا: یا اللہ، یہ بیماری اور تکلیف جو اس بندے کو ہے، اگرچہ یہ بھی آپ کی رحمت کا عنوان ہے، لیکن ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے اس رحمت اور نعمت کے متحمل نہیں ہیں۔ لہٰذا اے اللہ، اس بیماری کی نعمت کو صحت کی نعمت سے تبدیل فرمادیجئے، یہ ہے دین کی فہم جو بزرگوں کی صحبت سے حاصل کی جاتی ہے۔

خلاصۂ حدیث

بہرحال، اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس کو کسی آزمائش میں مبتلا فرمادیتے ہیں۔ اور یہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بندے کا رونا اور اس کا پکارنا، اور اس کا گریہ وزاری کرنا اچھا لگتا ہے۔ اس لئے ہم اس کو تکلیف دے رہے ہیں، تاکہ یہ اس تکلیف کے اندر ہمیں پکارے۔ اور پھر ہم اس پکار کے نتیجے میں اس کے درجات بلند کریں۔ اور اس کو اعلیٰ مقام تک پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بیماری اور تکلیف سے اپنی پناہ میں رکھے۔ اور اگر تکلیف آئے تو اس پر صبر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس تکلیف میں اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تکالیف میں عاجزی کا اظہار کرنا چاہئے

بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ وہ تکلیف میں ہائے ہائے کرتے تھے، اور اس تکلیف کا اظہار کرتے تھے۔ اب بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تکلیف پر ہائے ہائے کرنا اور اس تکلیف کا اظہار کرنا تو بے صبری ہے، اور اس تکلیف پر شکوہ ہے کہ ہمیں یہ تکلیف کیوں دی گئی اور تکلیف پر بے صبری یا شکوہ کرنا درست نہیں، اس کا جواب بھی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو اللہ کے نیک اور مقبول بندے ہوتے ہیں وہ شکایت کی وجہ سے تکلیف کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے تکلیف اسی وجہ سے دی گئی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی شکستگی اور بندگی کا اظہار کروں، اور اپنی عاجزی کا اظہار کروں اور اس تکلیف پر ہائے ہائے بھی کروں۔ یہ تکلیف مجھے اسی لئے دی گئی ہے کہ میری آہیں سننا مقصود ہے۔ میری گریہ وزاری سننا مقصود ہے۔ اس لئے اس موقع پر بہادری کا مظاہرہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک مرتبہ ایک بزرگ بیمار پڑ گئے، ایک دوسرے بزرگ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ انہوں نے جا کر دیکھا کہ وہ بیمار بزرگ ''الحمد للہ، الحمد للہ'' کا وِرد کر رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ کا یہ عمل تو بہت اچھا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہیں، لیکن اس موقع پر تھوڑی سی ہائے ہائے بھی کرو۔ اور جب تک ہائے ہائے نہیں کرو گے، شفا نہیں ہوگی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ تکلیف اس لئے دی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری بھی کریں اور بندگی کا تقاضا بھی یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادر نہ بنے، بلکہ شکستگی اور کمزوری کا اظہار کرے، اور یہ کہے کہ یا اللہ، میں عاجز اور کمزور ہوں، اس بیماری کا متحمل نہیں ہوں، میری یہ بیماری دور فرما دیجئے۔

میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی صاحب مرحوم، بڑے اچھے شعر کہا کرتے تھے، ایک شعر میں انہوں نے اس مضمون کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ ؎

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں
توڑنا ہے حسن کا پندار کیا

یعنی جب اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی تکلیف دے رہے ہیں تو اس تکلیف پر اس قدر ضبط کرنا کہ آدمی کے منہ سے آہ بھی نہ نکلے اور تکلیف کا ذرّہ برابر بھی اظہار نہ ہو، یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں۔ کیا اس کے

ذریعہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری دکھانا مقصود ہے کہ آپ کو جو کرنا ہے کرلیں، ہم تو ویسے کے ویسے ہی رہیں گے ۔۔۔ العیاذ باللہ اس لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرنا چاہئے۔

ایک عبرت آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی حال میں ان کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔ جس میں اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ۔

لَيْسَ لِيْ فِيْ سِوَاكَ حَظٌّ
فَكَيْفَ مَا شِئْتَ فَاخْتَبِرْنِيْ

"اے اللہ! آپ کے علاوہ مجھے کسی کی ذات میں کسی کام میں کوئی مزہ نہیں ہے۔
آپ جس طرح چاہیں، مجھے آزما کر دیکھ لیں" (العیاذ باللہ)

گویا کہ اللہ تعالیٰ کو آزمانے کی دعوت دے دی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا پیشاب بند ہوگیا، اب مثانہ پیشاب سے بھرا ہوا ہے، لیکن خارج ہونے کا راستہ نہیں۔ کئی دن اس حالت میں گزر گئے۔ بالآخر تنبہ ہوا کہ کتنی غلط بات میرے منہ سے نکل گئی تھی۔ ان بزرگ کے پاس چھوٹے چھوٹے بچے پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس حالت میں وہ ان بچوں سے کہتے کہ "اپنے جھوٹے چچا کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ مجھے اس بیماری سے نکال دے"۔

اس لئے کہ اس نے جھوٹا دعویٰ کردیا تھا ۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے دکھادیا کہ تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ کسی چیز میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ ارے تم کو تو پیشاب کے اندر مزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری نہیں چلا کرتی۔

تکالیف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ

لہٰذا نہ تو تکلیف پر شکوہ ہو، اور نہ تکلیف پر بہادری کا اظہار ہو، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال اور سنت کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب مرض وفات کی تکلیف میں تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس موقع پر آپ بار بار اپنا دست مبارک پانی میں بھگوتے اور چہرے پر ملتے تھے اور اس تکلیف کا اظہار فرماتے۔ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس موقع پر فرمایا:

"وَاكَرْبَ اَبَاهُ"

"میرے والد کو کتنی تکلیف ہورہی ہے"

جواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا كَرْبَ اَبِيْكَ بَعْدَ الْيَوْمِ))
''آج کے دن کے بعد تیرے باپ پر کوئی تکلیف نہیں ہوگی''(۱)
دیکھئے اس میں آپ نے اس تکلیف کا اظہار فرمایا۔ لیکن شکوہ نہیں فرمایا۔ بلکہ اگلی منزل کے راحت و آرام کی طرف اشارہ فرمادیا۔ یہ ہے سنت طریقہ۔

جب حضور اقدس ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:
((اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمَ لَمَحْزُوْنُوْنَ)) (۲)
''اے ابراہیم ہمیں تمہاری جدائی پر بڑا صدمہ ہے''

آپ کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بچہ آپ کی گود میں ہے۔ آپ کی گود میں اس کی جان نکل رہی ہے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اس میں اظہار عبدیت اور اظہار بندگی ہے کہ اے اللہ! فیصلہ تو آپ کا برحق ہے، لیکن آپ نے یہ تکلیف اسی لئے دی ہے کہ میں آپ کے سامنے عاجزی کا اظہار کروں اور آنسو بہاؤں، گریہ وزاری کروں۔ (۳)

لہٰذا سنت یہ ہے کہ گلہ شکوہ بھی نہ ہو اور بہادری کا اظہار بھی نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر یہ کہے کہ یا اللہ! میری اس تکلیف کو دور فرمادے۔ یہی مسنون طریقہ ہے اور یہی اس حدیث کا مفہوم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی صحیح فہم ہم کو عطا فرمائے۔ اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب المغازی، باب مرض النبی ووفاته، رقم: ۴۱۰۳، سنن ابن ماجه، كتاب ما جاء فی الجنائز، باب ذكر وفاته ودفنه، رقم: ۱۶۱۸

(۲) صحيح البخاری، كتاب الجنائز، باب قول النبی انا بك لمحزونون، رقم: ۱۲۲۰، صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب رحمة الصبيان والعيال وتواضعه وفضل ذلك، رقم: ۴۲۷۹

(۳) سنن ابن ماجه، كتاب ما جاء فی الجنائز، ما جاء فی البكاء علی الميت، رقم: ۱۵۷۷

نفاق کی علامتیں ☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے:

"عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((أَرْبَعٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا، إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) (۱)

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چار عادتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ چاروں جمع ہوجائیں تو وہ خالص منافق ہے، اور جس شخص میں ان چار خصلتوں میں سے کوئی ایک خصلت پائی جاتی ہوتو جب تک وہ اسے چھوڑ نہ دے گا اس وقت تک اس میں نفاق کی ایک خصلت موجود رہے گی۔(وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ) جب اس کو کسی امانت کا امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے، اور جب باتیں کرے تو جھوٹ بولے، اور جب کوئی معاہدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، اور جب کسی سے جھگڑا ہوتو بدزبانی پر اُتر آئے''

اس حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے چار بُری خصلتیں بیان فرما کر انہیں منافق کی نشانی قرار دیا ہے، یعنی کسی مسلمان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ان خصلتوں کو اختیار کرے، بلکہ جو شخص ان میں مبتلا ہوگا، وہ قانونی اور لفظی اعتبار سے خواہ مسلمان کہلاتا ہو، لیکن عملی اعتبار سے وہ منافق ہے۔

☆ نشری تقریریں، ص:۹۳۔۹۶

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب علامة المنافق، رقم: ۳۳، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال المنافق، رقم: ۸۸، سنن الترمذی، کتاب الایمان عن رسول اللہ، باب ما جاء فی علامة المنافق

ان میں سے پہلی خصلت امانت میں خیانت ہے۔ اس خیانت کی ایک صورت تو وہ ہے جسے سب جانتے ہیں، یعنی یہ کہ کوئی شخص اپنا کوئی مال و متاع یا سامان کسی کے پاس امانت کے طور پر رکھوائے اور وہ اس امانت کو بحفاظت واپس کرنے کے بجائے اس میں خرد برد شروع کردے، یہ تو خیانت کی واضح ترین اور بدترین صورت ہے جسے سبھی گناہ سمجھتے ہیں، لیکن اسلامی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خیانت صرف اسی حد تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ خیانت کی بعض صورتیں اور بھی ہیں، مثلاً کسی شرعی عذر کے بغیر کسی شخص کا راز فاش کردینا بھی خیانت ہے۔ ایک حدیث میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ))(۱)

''مجلسیں امانت ہوتی ہیں''

مطلب یہ ہے کہ کسی مجلس میں جو بات کہی جاتی ہے وہ آپ کے پاس امانت ہے، اور شرکاء مجلس کی مرضی کے بغیر وہ بات دوسروں تک پہنچانا اس امانت میں خیانت ہے جو کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں۔

اسی طرح جب کوئی شخص کسی جگہ ملازمت کرتا ہے تو اس کی ڈیوٹی کے اوقات اس کے پاس امانت ہیں۔ اب اگر وہ ان ڈیوٹی کے اوقات کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں صرف کرنے کے بجائے اپنے ذاتی کاموں میں صرف کرے تو شرعی اعتبار سے یہ شخص بھی امانت میں خیانت کر رہا ہے، اور اس خیانت کو عادت بنالینا کسی مسلمان کا نہیں، بلکہ منافق کا کام ہے۔

حدیث میں نفاق کی دوسری خصلت ''جھوٹ'' بیان کی گئی ہے، جس کی مذمت سے قرآن و حدیث لبریز ہیں، اور ''ایمان'' اور ''جھوٹ'' میں اس قدر زبردست تضاد ہے کہ مؤطا امام مالک میں حضرت صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ''کیا مسلمان بزدل ہوسکتا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں'' (مسلمان میں یہ کمزوری ہوسکتی ہے)۔ پھر پوچھا کہ ''کیا مسلمان بخیل ہوسکتا ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں'' (مسلمان میں اس کمزوری کا وجود بھی ممکن ہے)۔ آخر میں پوچھا کہ ''کیا مسلمان جھوٹا ہوسکتا ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''نہیں!'' (یعنی ایمان کے ساتھ بے باکانہ جھوٹ کی ناپاک عادت جمع نہیں ہوسکتی)۔(۲)

پھر بعض اوقات تو انسان کے جھوٹ کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے، اور بعض

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی نقل الحدیث، رقم: ۴۲۲۶، مسند أحمد، مسند جابر بن عبداللہ، رقم: ۱۴۱۶۶

(۲) مؤطا مالك، باب ما جاء فی الصدق والكذب، ص: ۱۵۷۱

اوقات اس کے جھوٹ سے پورے خاندان، برادری، یا ملک وملت کو نقصان پہنچتا ہے۔ پہلی صورت میں تو یہ محض ایک گناہِ کبیرہ ہے، لیکن دوسری صورت میں بعض اوقات صرف ایک مرتبہ کا جھوٹ کئی کئی سنگین گناہوں کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ جھوٹ تو وہ چیز ہے جسے اسلام نے مذاق میں بھی گوارا نہیں کیا، چہ جائیکہ سنجیدگی کے ساتھ اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا جائے، اور اس کے ذریعے دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اسے منافق کی نشانی قرار دیا ہے۔

نفاق کی تیسری علامت حدیث میں ''عہد شکنی'' بیان کی گئی ہے۔ مسلمان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ کوئی عہد معاہدہ کرلے تو جب تک وہ معاہدہ باقی ہے، اس وقت تک ہر قیمت پر اس کی پابندی کرتا ہے، اور اس معاملے میں بڑے سے بڑے نقصان کی بھی پروا نہیں کرتا۔ تاریخِ اسلام ایسے واقعات سے لبریز ہے جن میں مسلمانوں نے صرف اپنا عہد نبھانے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تو صرف عہد شکنی کے خطرے کے پیشِ نظر ایک مرتبہ اپنا ایک مفتوحہ علاقہ رومیوں کو واپس کردیا تھا۔ (۱)

نفاق کی چوتھی نشانی حدیث میں یہ بتائی گئی ہے کہ جب کبھی اختلاف اور جھگڑے کی نوبت آجائے تو ایسا شخص بدزبانی اور گالم گلوچ پر اُتر آتا ہے۔ زندگی میں بہت سے لوگوں سے اختلاف پیش آتا ہے، کبھی نوبت جھگڑے تک بھی پہنچتی ہے، لیکن ایک سچے مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اختلافات اور جھگڑوں کے موقع پر بھی شرافت واخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ اختلاف خواہ نظریاتی ہو، یا سیاسی، یا خاندانی یا تجارتی، کسی بھی حال میں بدزبانی اور دشنام طرازی مسلمان کا شیوہ نہیں، بلکہ اس حدیث کی رو سے عملی نفاق کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفاق کی ان خصوصیات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب السیر عن رسول اللہ، باب ما جاء فی الغدر، رقم: ۱۵۰۶، سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، رقم: ۲۵۷۸، مسند أحمد، مسند الشامیین، رقم: ۱٦٤٠

ہماری روز مرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۲

عبادات کی حقیقت اور احکام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات
پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی

فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۳۴۸۵ فون ۳۷۳۵۳۲۵۵، ۳۷۲۲۳۹۹۱ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۳

اسلام اور حسنِ معاملات

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات
پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون: ۳۷۲۴۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۴

اسلام اور حُسنِ معاشرت

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات

★ ۱۳ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲، فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۵

اسلام اور خاندانی نظام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

اِدارۂ اسلامیات
پبلشرز بکسیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۳ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور — فون ۳۷۳۲۳۴۱۲، فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲
★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور، پاکستان — فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵
★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی — فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خطبات وتحریرات)

جلد نمبر ۲

عبادات کی حقیقت اور احکام

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

ہماری روزمرہ زندگی اوراس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

عبادات کی حقیقت اور احکام

جلد ۲

ہماری روز مرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۲

عبادات کی حقیقت اور احکام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور پاکستان ★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی

فون ۳۷۳۲۴۴۱۲، فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۵۴۷۸۵ فون ۳۷۲۲۴۳۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات و تحریرات

جلد ۲

معاملات کی حیثیت اور احکام

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴۔ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۳۷۲۳۳۱۲ فیکس ۳۷۲۳۲۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰۔ انارکلی، لاہور۔ پاکستان ـــــ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی۔ پاکستان ـــــ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

''بسم اللہ''	۱۹
ہر کام سے پہلے ''بسم اللہ''	۱۹
ہر کام کے پیچھے نظامِ ربوبیت	۲۰
ایک گلاس پانی پر نظامِ ربوبیت کارفرما ہے	۲۰
زندگی پانی پر موقوف ہے	۲۰
پانی صرف سمندر میں ہوتا تو کیا ہوتا؟	۲۱
پانی کو میٹھا کرنے اور سپلائی کرنے کا خدائی نظام	۲۱
بادل ''مفت کارگو سروس'' مہیا کرتے ہیں	۲۱
پانی کی ذخیرہ اندوزی ہمارے بس میں نہیں	۲۲
یہ برفانی پہاڑ کولڈ اسٹوریج ہیں	۲۲
دریاؤں اور ندیوں کے ذریعہ پانی کی فراہمی	۲۲
یہ پانی اللہ تعالیٰ نے پہنچایا ہے	۲۳
جسم کے ہر ہر عضو کو پانی کی ضرورت ہے	۲۳
ضرورت سے زائد پانی نقصان دہ ہے	۲۴
جسم میں خودکار میٹر نصب ہے	۲۴
جسم کے اندر پانی کیا کام کر رہا ہے؟	۲۴
ہارون رشید کا ایک واقعہ	۲۵
پوری سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی سے بھی کم ہے	۲۵
''بسم اللہ'' کے ذریعہ اعتراف بندگی	۲۶
انسانی گردے کی قیمت	۲۶
جسم کے اندر کارخانۂ ربوبیت	۲۷
محبت اور خشیت کے حصول کا ذریعہ	۲۷
کافر اور مسلمان کے پانی پینے میں فرق	۲۸
عبادت کی اہمیت	۲۹
عبادات کی کیفیت اور آداب	۳۲
اللہ تعالیٰ کی محبت میں بے چین	۳۲
انوکھے خط کا انوکھا جواب	۳۲
ہر مریض کے لئے علیحدہ نسخہ	۳۳
نیکی کا خیال اللہ کا مہمان ہوتا ہے	۳۳
شریعت میں تو چین مطلوب ہے	۳۳
عجیب وغریب جواب	۳۴
''خلافت'' اس طرح سستی نہیں بنتی	۳۵
ڈاکٹر بننے کے لئے صحت مند ہونا کافی نہیں	۳۵
''خلافت'' ایک شہادت اور گواہی ہے	۳۶
ہمارے حضرات یہ خطرہ مول نہیں لیتے	۳۶
''خلافت'' کا خیال بدترین حجاب ہے	۳۶
عبادت میں شوق، ولولہ، لذت مطلوب نہیں	۳۷

ذوق و شوق محمود ہیں، اخلاص مطلوب ہے	۳۸
میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے	۳۸
بلاشوق والا عمل ثواب میں بڑھ جاتا ہے	۳۹
جس کو نماز میں مزہ نہ آئے اس کو مبارک باد	۴۰
ریٹائرڈ شخص کی نماز	۴۰
ٹھیلے پر سامان بیچنے والے کی نماز	۴۱
روحانیت کس کی نماز میں زیادہ ہے؟	۴۱
وہاں تعمیلِ حکم کا جذبہ دیکھا جاتا ہے	۴۲
ساقی جیسے پلادے وہ اس کی مہربانی ہے	۴۲
خلاصہ	۴۳
اعمال کے دنیاوی ثمرات	۴۴
اعمال کا ثمرہ نقد بھی، اُدھار بھی	۴۴
نیک عمل کا پہلا نقد فائدہ	۴۴
اپنے عمل پر نظر خود پسندی ہے	۴۵
خود پسندی اور رجا میں فرق	۴۵
جنت فضل پر ملے گی عمل پر نہیں	۴۶
حضور ﷺ کا عمل اور جنت	۴۷
نیک اعمال فضل کی علامت ہیں	۴۷
عمل سے جنت کا مستحق نہیں ہوتا	۴۸
حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا حکیمانہ ارشاد	۴۸
نیک عمل کی توفیق ان کی طرف سے جواب ہے	۴۹
ایک نیک عمل کے بعد دوسرے نیک عمل کی توفیق	۴۹
نیک عمل کا دوسرا نقد فائدہ	۵۰
تم ہی اُکتا جاؤ گے	۵۰
نیک عمل کا تیسرا نقد فائدہ	۵۱
حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کا مقولہ	۵۲
نیک عمل کا چوتھا فائدہ	۵۲
گناہوں کا پہلا نقصان	۵۲
گناہوں کی لذت کی مثال	۵۲
جب فطرت ہی بگڑ جائے تو!	۵۳
جب تقویٰ کی حس مٹ جائے	۵۳
گناہوں کا دوسرا نقد نقصان	۵۴
عمل کے بعد مدد آئے گی	۵۵
نیکی اور بدی کی جزا	۵۵
ہر نیکی کا ثواب دس گنا	۵۵
رمضان اور شوال کے روزوں کا ثواب	۵۶
برائی کا بدلہ ایک گنا	۵۷
کراماً کاتبین میں ایک امیر دوسرا مامور	۵۷
اللہ تعالیٰ عذاب دینا نہیں چاہتے	۵۷
بندوں کو معاف کرنے کا قاعدہ	۵۸
گناہوں سے توبہ و استغفار کریں	۵۹
اللہ تعالیٰ کی رحمت	۵۹
قربِ خداوندی کی مثال	۶۰
نوازش کا ایک بہانہ	۶۰
ایک بہت بڑا دھوکہ	۶۰
عمل خود کرنا پڑے گا	۶۱
طلب اور کوشش شرط ہے	۶۱
معجزہ میں نبی کے عمل کا دخل	۶۲

کھانا تم پکاؤ، برکت ہم ڈالیں گے ۶۳
پانی میں برکت کا واقعہ ۶۳
ید بیضاء کا معجزہ ۶۴
جب چلو گے تو راستہ کھلتا چلا جائے گا ۶۴
گناہ چھوڑنے کی کوشش کیجئے ۶۵
صبح سے شام تک کے کاموں کا جائزہ لیں ۶۵
قدم بڑھاؤ اور پھر دعا کرو ۶۵
حضرت یوسف علیہ السلام کا دروازے کی طرف بھاگنا ۶۶
رات کو سونے سے پہلے یہ عمل کیجئے ۶۷
صبح اُٹھ کر یہ عہد کر لیں ۶۷
صبح یہ دعا کر لیا کرو ۶۸
آج کو گذشتہ کل سے اچھا بناؤ ۶۸

نیک کام میں دیر نہ کیجئے ۷۰

نیکی کے کاموں میں دوڑ لگاؤ ۷۰
شیطان کا ایک داؤ ۷۱
عمرِ عزیز سے فائدہ اُٹھایئے ۷۱
نیکی کا داعیہ اللہ تعالیٰ کا مہمان ہے ۷۲
فرصت کے انتظار میں مت رہیں ۷۲
کام کرنے کا بہترین گُر ۷۲
نیک کاموں میں مقابلہ بُرا نہیں ۷۳
دُنیاوی اسباب میں مقابلہ درست نہیں ۷۳
غزوۂ تبوک کے موقع کا ایمان افروز واقعہ ۷۴
ایک مثالی معاملہ ۷۵
ہمارے لئے نسخۂ اکسیر ۷۶
حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے راحت کیسے حاصل کی؟ ۷۶
قناعت کے حصول کا ذریعہ ۷۷
مال و دولت کے ذریعہ راحت نہیں خریدی جاسکتی ۷۷
وہ دولت کس کام کی جو سکون نہ دے سکے! ۷۸
پیسے سے ہر چیز نہیں خریدی جاسکتی ۷۹
سکون حاصل کرنے کا راستہ ۷۹
فتنے کا زمانہ آنے والا ہے ۸۰
''ابھی تو جوان ہیں'' ایک شیطانی دھوکہ ۸۱
نفس کو بہلا کر اس سے کام لو ۸۱
کہاں سربراہِ مملکت، کہاں شانِ الٰہی ۸۲
جنت کا سچا طلب گار ۸۳
اذان کی آواز سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت ۸۳
اعلیٰ درجے کا صدقہ ۸۴
وصیت ایک تہائی مال کی حد تک نافذ ہوتی ہے ۸۵
اپنی آمدنی کا ایک حصہ صدقہ کے لئے علیحدہ کر دیجئے ۸۵
اللہ تعالیٰ کے یہاں گنتی نہیں دیکھی جاتی ۸۶
میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کا معمول ۸۶
ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ کرے ۸۷
کس کا انتظار کر رہے ہو؟ ۸۷
کیا فقر کا انتظار ہے؟ ۸۸
کیا مالداری کا انتظار ہے؟ ۸۸

کیا بیماری کا انتظار ہے؟	۸۹
کیا بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو؟	۸۹
کیا موت کا انتظار ہے؟	۹۰
ملک الموت سے ملاقات	۹۰
کیا دجال کا انتظار ہے؟	۹۲
کیا قیامت کا انتظار ہے؟	۹۲
نفلی عبادت کی اہمیت	۹۳
عشرہ ذی الحجہ میں عبادت	۹۳
عبادت، تخلیق کا بنیادی مقصد	۹۳
فرشتے اور انسان کی عبادت کا فرق	۹۴
عبادات کی دو قسمیں	۹۵
نوافل، اللہ تعالیٰ کی محبت کا حق	۹۶
نوافل کی کثرت کرنے والا اللہ کا قریبی ہے	۹۶
عبادت کی کثرت، محمود ہے	۹۷
عبادت میں مشغول شخص کے پاس رک جاؤ	۹۷
مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ	۹۸
ایک جملہ نے زندگی بدل ڈالی	۹۸
مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت	۹۹
موت سے پہلے عبادت کر لیجئے	۹۹
نوافل کی کثرت نے جنتی کا درجہ بڑھا دیا	۱۰۰
حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ کی نفلی عبادت	۱۰۱
حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا کثرت اہتمام نوافل	۱۰۲
ساری عمر عشاء کے وضو سے فجر کی نماز	۱۰۲
حضرت معاذہ عدویہ رحمۃ اللہ علیہا کی نماز	۱۰۳
حضرت محمد بن سیرینؒ کی گریہ وزاری	۱۰۳
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تہجد	۱۰۳
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل نماز	۱۰۴
عبادت میں کون سی صورت بہتر ہے؟	۱۰۵
امامت کی نماز میں تخفیف کا حکم	۱۰۶
تہجد کی عبادت ایک سلطنت ہے	۱۰۷
تہجد کی لذت، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں	۱۰۷
نماز تہجد کا عادی بننے کا سہل ترین نسخہ	۱۰۷
نماز کی اہمیت	۱۰۹
خشوع اور خضوع کا مفہوم	۱۰۹
''خضوع'' کی حقیقت	۱۰۹
حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور نماز کی تعلیم	۱۱۰
نماز میں خیالات آنے کی ایک وجہ	۱۱۱
حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور نماز کا اہتمام	۱۱۱
قیام کا صحیح طریقہ	۱۱۲
نیت کرنے کا مطلب	۱۱۲
تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اُٹھانے کا طریقہ	۱۱۲
ہاتھ باندھنے کا صحیح طریقہ	۱۱۳
قرأت کا صحیح طریقہ	۱۱۳
خلاصہ	۱۱۴

نماز ایک عاجزانہ عبادت ۱۱۵

رکوع اور سجدہ میں ہاتھوں کی انگلیاں ۱۱۵
التحیات میں بیٹھنے کا طریقہ ۱۱۶
سلام پھیرنے کا طریقہ ۱۱۶
خشوع کی حقیقت ۱۱۶
وجود کے یقین کے لئے نظر آنا ضروری نہیں ۱۱۷
ہوائی جہاز کی مثال ۱۱۷
روشنی سورج پر دلالت کرتی ہے ۱۱۸
ہر چیز اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کر رہی ہے ۱۱۸
الفاظ کی طرف دھیان، پہلی سیڑھی ۱۱۸
خشوع کی پہلی سیڑھی ۱۱۹
معنی کی طرف دھیان دوسری سیڑھی ۱۱۹
نماز میں خیالات آنے کی بڑی وجہ ۱۲۰
اگر دھیان بھٹک جائے واپس آجاؤ ۱۲۰
خشوع حاصل کرنے کے لئے مشق اور محنت ۱۲۰
تیسری سیڑھی اللہ تعالیٰ کا دھیان ۱۲۱

نماز کی حفاظت کیجئے ۱۲۲

تمام صفات ایک نظر میں ۱۲۳
پہلی اور آخری صفت میں یکسانیت ۱۲۳
نماز کی پابندی اور وقت کا خیال ۱۲۴
یہ منافق کی نماز ہے ۱۲۴
اللہ کی اطاعت کا نام دین ہے ۱۲۵
جماعت سے نماز ادا کیجئے ۱۲۵
نماز کے انتظار کا ثواب ۱۲۶
ان کے گھروں کو آگ لگا دوں ۱۲۶
جماعت سے نماز پڑھنے کے فائدے ۱۲۷
عیسائیت کی تقلید نہ کریں ۱۲۷
خواتین اوّل وقت میں نماز ادا کریں ۱۲۸
نماز کی اہمیت دیکھئے ۱۲۸
جنت الفردوس کے وارث ۱۲۹

نماز اور انفرادی اصلاح ۱۳۰

ارکانِ نماز، ایک نظر میں ۱۳۲

قیام کا مسنون طریقہ ۱۳۲
بے حرکت کھڑے ہوں ۱۳۳
تم احکم الحاکمین کے دربار میں کھڑے ہو ۱۳۳
رکوع کا مسنون طریقہ ۱۳۳
''قومہ'' کا مسنون طریقہ ۱۳۴
''قومہ'' کی دعائیں ۱۳۴
ایک صاحب کی نماز کا واقعہ ۱۳۵
ابتداءً نماز کا طریقہ بیان نہ کرنے کی وجہ ۱۳۶
اطمینان سے نماز ادا کرو ۱۳۶
نماز واجب الاعادہ ہوگی ۱۳۷
قومہ کا ایک ادب ۱۳۷
سجدہ میں جانے کا طریقہ ۱۳۷
سجدہ میں جانے کی ترتیب ۱۳۸
پاؤں کی انگلیاں زمین پر ٹیکنا ۱۳۸
سجدہ میں سب سے زیادہ قربِ خداوندی ۱۳۸

خواتین بالوں کا جوڑا کھول دیں	۱۳۹
نماز مؤمن کی معراج ہے	۱۳۹
سجدہ کی فضیلت	۱۴۰
سجدہ میں کیفیت	۱۴۰
سجدہ میں کہنیاں کھولنا	۱۴۰
جلسہ کی کیفیت و دعا	۱۴۱
نمازیں سنت کے مطابق پڑھئے	۱۴۲
نماز شروع کرنے سے پہلے	
نماز شروع کرتے وقت	۱۴۴
کھڑے ہونے کی حالت میں	۱۴۴
رکوع میں	۱۴۵
رکوع سے کھڑے ہوتے وقت	۱۴۶
سجدے میں جاتے وقت	۱۴۶
سجدے میں	۱۴۶
دونوں سجدوں کے درمیان	۱۴۷
دوسرا سجدہ اور اس سے اُٹھنا	۱۴۸
قعدے میں	۱۴۸
سلام پھیرتے وقت	۱۴۹
دُعا کا طریقہ	۱۴۹
خواتین کی نماز	۱۴۹
مسجد کے چند ضروری آداب	۱۵۱
نماز میں آنے والے خیالات سے بچنے کا طریقہ	۱۵۳
خشوع کے تین درجے	۱۵۳
خیالات آنے کی شکایت	۱۵۴
نماز کے مقدمات	۱۵۴
نماز کا پہلا مقدمہ ''طہارت''	۱۵۴
طہارت کی ابتداء استنجاء سے	۱۵۵
ناپاکی خیالات کا سبب ہے	۱۵۵
نماز کا دوسرا مقدمہ ''وضو''	۱۵۵
وضو سے گناہ دھل جاتے ہیں	۱۵۵
کون سے وضو سے گناہ دھل جاتے ہیں؟	۱۵۶
وضو کی طرف دھیان	۱۵۶
وضو کے دوران کی دعائیں	۱۵۶
وضو میں بات چیت کرنا	۱۵۷
نماز کا تیسرا مقدمہ ''تحیۃ الوضوء والمسجد''	۱۵۷
تحیۃ المسجد کس وقت پڑھے؟	۱۵۸
نماز کا چوتھا مقدمہ: قبلیہ سنتیں	۱۵۸
چاروں مقدمات کے جاننے پر خشوع کا حصول	۱۵۹
خیالات کی پرواہ مت کرو	۱۵۹
ان سجدوں کی قدر کرو	۱۵۹
نماز کے بعد کے کلمات	۱۶۰
خلاصہ	۱۶۰
نماز میں آنکھیں بند کرنا	۱۶۱
آنکھیں کھول کر نماز پڑھنا سنت ہے	۱۶۱
حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور اتباع سنت	۱۶۲
مقتدی کو آنکھیں بند کرنے کی اجازت	۱۶۳
زیادہ قیود وحشت کا باعث ہوتی ہیں	۱۶۳
ایک خان صاحب کو راستے پر لانے کا واقعہ	۱۶۴

بے وضو نماز کی اجازت دینے کا اعتراض ۱۶۵

صلوٰۃ الحاجۃ ـــــ

پریشانیوں کا علاج ۱۶۷

ایک مسلمان اور کافر میں فرق ۱۶۸
ملازمت کے لئے کوشش ۱۶۸
بیمار آدمی کی تدابیر ۱۶۹
تدبیر کے ساتھ دعا ۱۶۹
زاویہ نگاہ بدل دو ۱۷۰
''ھوالشافی'' نسخہ پر لکھنا ۱۷۰
مغربی تہذیب کی لعنت کا اثر ۱۷۰
اسلامی شعائر کی حفاظت ۱۷۱
تدبیر کے خلاف کام کا نام ''اتفاق'' ۱۷۱
کوئی کام ''اتفاق'' نہیں ۱۷۱
ہر وقت مسبب الاسباب پر نظر ہو ۱۷۲
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر پینا ۱۷۲
ہر کام میں مشیتِ خداوندی کارفرما ہے ۱۷۳
حضورِ اقدس ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا ایک واقعہ ۱۷۴
پہلے اسباب پھر توکل ۱۷۴
اسباب کی یقینی موجودگی میں بھی توکل کیجئے ۱۷۵
توکل کا اصل موقع یہی ہے ۱۷۶
دونوں صورتوں میں اللہ سے مانگئے ۱۷۶
اطمینان سے وضو کریں ۱۷۷
وضو سے گناہ دُھل جاتے ہیں ۱۷۷
وضو کے دوران کی دعائیں ۱۷۸
''صلوٰۃ الحاجۃ'' کے لئے خاص طریقہ مقرر نہیں ۱۷۸
نماز کے لئے نیت کس طرح کی جائے؟ ۱۷۹
دعا سے پہلے اللہ کی حمد و ثناء ۱۷۹
حمد و ثناء کی کیا ضرورت ہے؟ ۱۸۰
غم اور تکالیف بھی نعمت ہیں ۱۸۱
حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب دعا ۱۸۱
تکلیف کے وقت دوسری نعمتوں کا استحضار ۱۸۲
حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شکرِ نعمت ۱۸۲
حاصل شدہ نعمتوں پر شکر ۱۸۲
حمد و ثناء کے بعد درود شریف کیوں؟ ۱۸۳
درود شریف بھی قبول اور دعا بھی قبول ۱۸۳
حضور ﷺ اور ہدیہ کا بدلہ ۱۸۳
دعائے حاجت کے الفاظ ۱۸۴
ہر ضرورت کے لئے صلوٰۃ الحاجۃ پڑھیں ۱۸۶
اگر وقت تنگ ہو تو صرف دعا کرے ۱۸۶
یہ پریشانیاں اور ہمارا حال ۱۸۷
تبصرہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ۱۸۸
تبصرہ کے بجائے دعا کریں ۱۸۸
اللہ کی طرف رجوع کریں ۱۸۹
پھر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں ۱۸۹
اپنی جانوں پر رحم کرتے ہوئے یہ کام کرلو ۱۸۹

روزہ ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے ۱۹۱

برکت والا مہینہ ۱۹۱
''کیا فرشتے کافی نہیں تھے؟'' ۱۹۲

فرشتوں کا کوئی کمال نہیں	۱۹۲
نابینا کا بچنا کمال نہیں	۱۹۳
یہ عبادت فرشتوں کے بس میں نہیں ہے	۱۹۳
حضرت یوسف علیہ السلام کا کمال	۱۹۴
ہماری جانوں کا سودا ہو چکا ہے	۱۹۴
ایسے خریدار پر قربان جایئے	۱۹۵
اس ماہ میں اصل مقصد کی طرف آجاؤ	۱۹۵
رمضان کے معنی	۱۹۶
اپنے گناہ معاف کرالو	۱۹۶
اس ماہ کو فارغ کرلیں	۱۹۷
استقبالِ رمضان کا صحیح طریقہ	۱۹۷
روزہ اور تراویح سے ایک قدم آگے	۱۹۸
ایک مہینہ اس طرح گزارلو	۱۹۸
یہ کیسا روزہ ہوا؟	۱۹۹
روزہ کا ثواب ملیامیٹ ہوگیا	۱۹۹
روزہ کا مقصد تقویٰ کی شمع روشن کرنا	۲۰۰
روزہ تقویٰ کی سیڑھی ہے	۲۰۰
میرا مالک مجھے دیکھ رہا ہے	۲۰۱
میں ہی اس کا بدلہ دوں گا	۲۰۱
ورنہ یہ تربیتی کورس مکمل نہیں ہوگا	۲۰۲
روزہ کا ایئر کنڈیشنر لگا دیا، لیکن!	۲۰۲
اصل مقصد ''حکم کی اتباع''	۲۰۳
افطار میں جلدی کرو	۲۰۳
سحری میں تاخیر افضل ہے	۲۰۴
ایک مہینہ بغیر گناہ کے گزارلو	۲۰۴
اس ماہ میں رزقِ حلال	۲۰۵
حرام آمدنی سے بچیں	۲۰۵
اگر آمدنی مکمل حرام ہے تو پھر؟	۲۰۵
گناہوں سے بچنا آسان ہے	۲۰۶
روزے میں غصے سے پرہیز	۲۰۶
رمضان میں نفلی عبادات زیادہ کریں	۲۰۶
حج کی اہمیت	۲۰۸
حج ایک عاشقانہ عبادت	۲۱۴
ماہِ شوال کی فضیلت	۲۱۴
ماہِ شوال اور امورِ خیر	۲۱۵
ماہِ ذیقعدہ کی فضیلت	۲۱۵
ماہِ ذیقعدہ منحوس نہیں	۲۱۵
حج اسلام کا اہم رکن ہے	۲۱۶
عبادات کی تین اقسام	۲۱۶
اِحرام کا مطلب	۲۱۶
اے اللہ! میں حاضر ہوں	۲۱۷
احرام کفن یاددلاتا ہے	۲۱۷
''طواف'' ایک لذیذ عبادت	۲۱۸
اظہارِ محبت کے مختلف انداز	۲۱۸
دینِ اسلام میں انسانی فطرت کا خیال	۲۱۹
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حجرِ اسود سے خطاب	۲۱۹
ہرے ستونوں کے درمیان دوڑنا	۲۱۹
اب مسجدِ حرام کو چھوڑ دو	۲۲۰
اب عرفات چلے جاؤ	۲۲۰
اب مزدلفہ چلے جاؤ	۲۲۰
مغرب کو عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھو	۲۲۰

کنکریاں مارنا عقل کے خلاف ہے	۲۲۱
حکمِ الٰہی، ہر چیز پر مقدم	۲۲۱
حج کس پر فرض ہے؟	۲۲۲
حج میں تاخیر کیوں؟	۲۲۳
ہم نے مختلف شرائط عائد کر لی ہیں	۲۲۳
حج مال میں برکت کا ذریعہ ہے	۲۲۴
آج تک حج کی وجہ سے کوئی فقیر نہیں ہوا	۲۲۴
والدین کو پہلے حج کرانا ضروری نہیں	۲۲۵
حج نہ کرنے پر شدید وعید	۲۲۵
بیٹیوں کی شادی کے عذر سے حج مؤخر کرنا	۲۲۵
حج سے پہلے قرض ادا کریں	۲۲۶
حج کے لئے بڑھاپے کا انتظار کرنا	۲۲۶
حج فرض ادا نہ کرنے کی صورت میں وصیت کر دیں	۲۲۶
حج صرف ایک تہائی مال سے ادا کیا جائے گا	۲۲۷
تمام عبادات کا فدیہ ایک تہائی سے ادا ہوگا	۲۲۷
حجِ بدل مرنے والے کے شہر سے ہوگا	۲۲۷
عذرِ معقول کی وجہ سے مکہ سے حج کرانا	۲۲۸
قانونی پابندی عذر ہے	۲۲۸
حج کی لذت حج ادا کرنے سے معلوم ہوگی	۲۲۸
حجِ نفل کیلئے گناہ کا ارتکاب جائز نہیں	۲۲۹
حج کے لئے سودی معاملہ کرنا جائز نہیں	۲۲۹
حجِ نفل کے بجائے قرض ادا کریں	۲۲۹
حجِ نفل کے بجائے نان و نفقہ ادا کریں	۲۲۹
حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا حجِ نفل چھوڑنا	۲۳۰
تمام عبادات میں اعتدال اختیار کریں	۲۳۰
حج کے بارے میں کچھ گذارشات	۲۳۱
زکوٰۃ کی اہمیت اور اس کا نصاب	۲۳۵
زکوٰۃ کے دو معنی	۲۳۵
زکوٰۃ کی اہمیت	۲۳۶
زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر وعید	۲۳۶
زکوٰۃ، مال کی محبت کم کرنے کا مؤثر ذریعہ	۲۳۷
زکوٰۃ کے ذریعے غربت کا خاتمہ	۲۳۷
زکوٰۃ ادا نہ کرنے کے اسباب	۲۳۸
مسائل سے ناواقفیت	۲۳۸
زکوٰۃ کا نصاب	۲۳۸
ضرورت سے کیا مراد ہے؟	۲۳۹
زکوٰۃ سے مال کم نہیں ہوتا	۲۳۹
مال جمع کرنے اور گننے کی اہمیت	۲۴۰
فرشتے کی دعا کے مستحق کون؟	۲۴۰
زکوٰۃ کی وجہ سے کوئی شخص فقیر نہیں ہوتا	۲۴۱
زیور پر زکوٰۃ فرض ہے	۲۴۱
شاید آپ پر زکوٰۃ فرض ہو	۲۴۱
زکوٰۃ کے چند اہم مسائل	۲۴۲
مالکِ نصاب پر زکوٰۃ واجب ہے	۲۴۲
باپ کی زکوٰۃ بیٹے کے لئے کافی نہیں	۲۴۳
مال پر سال گزرنے کا مسئلہ	۲۴۳

دو دن پہلے آنے والے مال میں زکوٰۃ	۲۴۳
زکوٰۃ کن چیزوں میں فرض ہوتی ہے؟	۲۴۴
زیور کس کی ملکیت ہوگا؟	۲۴۴
زیور کی زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ	۲۴۴
مالِ تجارت میں زکوٰۃ	۲۴۵
کمپنی کے شیئرز میں زکوٰۃ	۲۴۵
مکان یا پلاٹ میں زکوٰۃ	۲۴۵
خام مال میں زکوٰۃ	۲۴۶
بیٹے کی طرف سے باپ کا زکوٰۃ ادا کرنا	۲۴۶
بیوی کی طرف سے شوہر کا زکوٰۃ ادا کرنا	۲۴۶
زیور کی زکوٰۃ نہ نکالنے پر وعید	۲۴۷
آپ زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟	۲۴۹
زکوٰۃ نہ نکالنے پر وعید	۲۴۹
یہ مال کہاں سے آرہا ہے؟	۲۵۱
گاہک کون بھیج رہا ہے؟	۲۵۱
ایک سبق آموز واقعہ	۲۵۱
کاموں کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے	۲۵۲
زمین سے اُگانے والا کون ہے؟	۲۵۳
انسان میں پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں	۲۵۳
مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں	۲۵۳
صرف اڑھائی فیصد ادا کرو	۲۵۴
زکوٰۃ کی تاکید	۲۵۴
زکوٰۃ حساب کرکے نکالو	۲۵۵
وہ مال تباہی کا سبب ہے	۲۵۵
زکوٰۃ کے دنیاوی فوائد	۲۵۶
مال میں بے برکتی کا انجام	۲۵۷
زکوٰۃ کا نصاب	۲۵۷
ہر ہر روپے پر سال کا گزرنا ضروری نہیں	۲۵۷
تاریخ زکوٰۃ میں جو رقم ہو اس پر زکوٰۃ ہے	۲۵۸
اموالِ زکوٰۃ کون کون سے ہیں؟	۲۵۸
اموالِ زکوٰۃ میں عقل نہ چلائیں	۲۵۹
عبادت کرنا اللہ کا حکم ہے	۲۵۹
سامانِ تجارت کی قیمت کے تعین کا طریقہ	۲۶۰
مالِ تجارت میں کیا کیا داخل ہے؟	۲۶۰
کس دن کی مالیت معتبر ہوگی؟	۲۶۱
کمپنیوں کے شیئرز پر زکوٰۃ کا حکم	۲۶۱
کارخانہ کی کن اشیاء پر زکوٰۃ ہے	۲۶۲
واجب الوصول قرضوں پر زکوٰۃ	۲۶۳
قرضوں کی منہائی	۲۶۳
قرضوں کی دو قسمیں	۲۶۳
تجارتی قرضے کب منہا کیے جائیں	۲۶۴
قرض کی مثال	۲۶۴
زکوٰۃ مستحق کو ادا کریں	۲۶۴
مستحق کون؟	۲۶۵
مستحق کو مالک بنادیں	۲۶۵
کن رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے	۲۶۵
بیوہ اور یتیم کو زکوٰۃ دینے کا حکم	۲۶۶
بینکوں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا حکم	۲۶۶
اکاؤنٹ کی رقم سے قرض کس طرح منہا کریں؟	۲۶۷
کمپنی کے شیئرز کی زکوٰۃ کا ثا	۲۶۷
زکوٰۃ کی تاریخ کیا ہونی چاہیے؟	۲۶۸

کیا رمضان المبارک کی تاریخ مقرر کر سکتے ہیں؟ ۲۶۸

ذکر اللہ کی اہمیت ۲۷۰

رمضان کے آخری عشرہ میں آپ ﷺ کی کیفیت ۲۷۰
عام دنوں میں تہجد کے وقت کیفیت ۲۷۱
آخری عشرہ کس طرح گزارا جائے؟ ۲۷۱
ایمان والوں سے خطاب ۲۷۲
ذکر میں کثرت مطلوب ہے ۲۷۲
دھیان کے بغیر ذکر کرنا ۲۷۳
زبان پر ذکر ہو، دل میں خیالات ہوں ۲۷۳
ذکر اللہ ایک توانائی ہے ۲۷۴
اللہ کے ذکر نے گناہ سے روک دیا ۲۷۴
ذکر رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا ۲۷۴
ذکرِ مسنون کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں ۲۷۵
ذکر میں مشقت خود نافع ہے ۲۷۵
ذکر میں زبردستی لگے رہو ۲۷۶
دل گھبرانے کا کوئی علاج نہیں ۲۷۶
یہ مشقت اور بار فائدے سے خالی نہیں ۲۷۷
ایسے ذکر میں نورانیت زیادہ ہوتی ہے ۲۷۷
روحانیت اور نورانیت کی حقیقت ۲۷۷
ان کی کوئی حقیقت نہیں ۲۷۸
اللہ سے رابطہ استوار کر لو ۲۷۸
تمہیں یہاں پر ''حرم'' حاصل ہو جائے گا ۲۷۸
ہر حالت میں ذکر میں مشغول رہو ۲۷۹

ذکر کے مختلف طریقے ۲۸۰

مشقت کے باوجود ذکر میں لگا رہے ۲۸۰
نماز پڑھنے میں ابتداءً مشقت ہوتی ہے ۲۸۰
ذکر جزوِ زندگی بن جاتا ہے ۲۸۱
حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور ذکر اللہ ۲۸۱
ذکر کا ایک طریقہ ''ذکر جہری'' ۲۸۱
ذکر کا ایک طریقہ ''ضرب'' لگانا ۲۸۲
''رگ کیاس'' پکڑ کر ذکر کرنا ۲۸۲
ذکر کا ایک طریقہ ''پاس انفاس'' ۲۸۲
ذکر کے وقت ہر چیز کے ذکر کرنے کا تصور ۲۸۳
حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کا ذکر کرنا ۲۸۳
پہاڑوں اور پرندوں کے ذکر سے حضرت داؤد علیہ السلام کا فائدہ ۲۸۳
ذکر کے یہ طریقے علاج ہیں ۲۸۴
''ضرب'' لگا کر ذکر کرنے پر اعتراض ۲۸۴
پھر جوشاندہ پینا بدعت ہوگا ۲۸۵
یہ طریقے بدعت ہو جائیں گے ۲۸۵
افضل طریقہ صرف سنت کا طریقہ ہے ۲۸۵
ذکر خفی افضل ہے ۲۸۶
ذکر جہری جائز ہے افضل نہیں ۲۸۶
یہ احداث فی الدین اور بدعت ہے ۲۸۶
ذکر میں ضرب لگانا مقصود نہیں ۲۸۷
اصل مقصود ان کا نام لینا ہے ۲۸۷
ایک قوم ان طریقوں کو بدعت کہتی ہے ۲۸۸

دوسری انتہا	۲۸۸
فکر سے اُنس ہو جانا ذکر ہی کی برکت ہے	۲۸۸
فکر ذکر کا نتیجہ ہے	۲۸۸
ذکر مت چھوڑنا	۲۸۹
ذکرِ قلبی کے باوجود ذکر لسانی نہ چھوڑے	۲۸۹
جاہل پیروں کا یہ خیال گمراہی ہے	۲۹۰
شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۲۹۰
ذکر لسانی کو جاری رکھنا چاہئے	۲۹۱

ذکر الٰہی کے چند آداب

	۲۹۲
باوضو ذکر کرنا	۲۹۲
ذکر کے لئے تیمم بھی کر سکتے ہیں	۲۹۳
کن اعمال میں تیمم کرنا جائز ہے	۲۹۳
نماز سے جی چرانے کا علاج	۲۹۴
ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ کا تصور کرے	۲۹۴
ابتداءً ذکر کے الفاظ کا تصور بھی کر سکتے ہیں	۲۹۵
ذکر کے وقت دوسرے تصورات	۲۹۵
ذکر میں لذت نہ آنا زیادہ نافع ہے	۲۹۶
ذکر کے فوائد دو چیزوں پر موقوف ہیں	۲۹۶
بولنے پر پابندی کے ذریعہ ایک صاحب کا علاج	۲۹۶
تعلقات کم کرو	۲۹۷
آنکھ، کان، زبان بند کرلو	۲۹۸
تعلقات کی طرف التفات زیادہ نہ ہو	۲۹۸
ان تین چیزوں کو حاصل کرنے کا طریقہ	۲۹۹
''مثنوی'' کلام وہبی ہے	۲۹۹

تبلیغ و دعوت کے اصول

	۳۰۰
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے درجات	۳۰۰
دعوت و تبلیغ کے دو طریقے	۳۰۱
اجتماعی تبلیغ فرضِ کفایہ ہے	۳۰۱
انفرادی تبلیغ فرضِ عین ہے	۳۰۲
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ عین ہے	۳۰۲
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کب فرض ہے؟	۳۰۳
کس وقت نہی عن المنکر فرض نہیں	۳۰۳
گناہ میں مبتلا شخص کو موقع پر روکنا	۳۰۴
اگر ماننے اور نہ ماننے کے احتمال برابر ہوں	۳۰۴
اگر تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو	۳۰۴
ٹوکتے وقت نیت درست ہونی چاہئے	۳۰۵
بات کہنے کا طریقہ درست ہونا چاہئے	۳۰۵
نرمی سے سمجھانا چاہئے	۳۰۶
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے کا انداز	۳۰۶
انبیاء علیہم السلام کا اندازِ تبلیغ	۳۰۷
حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۳۰۸
بات میں تاثیر کیسے پیدا ہو؟	۳۰۹
اجتماعی تبلیغ کا حق کس کو ہے؟	۳۰۹
درسِ قرآن اور درسِ حدیث دینا	۳۱۰
حضرت مفتی صاحبؒ اور تفسیرِ قرآن کریم	۳۱۰

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور تشریح حدیث	۳۱۱
کیا بے عمل شخص وعظ ونصیحت نہ کرے؟	۳۱۱
دوسروں کو نصیحت کرنے والا خود بھی عمل کرے	۳۱۲
مستحب کے ترک پر نکیر درست نہیں	۳۱۳
اذان کے بعد دعا پڑھنا	۳۱۴
آداب کے ترک پر نکیر جائز نہیں	۳۱۴
چارزانو بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے	۳۱۵
میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے	۳۱۵
زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت ہے	۳۱۵
بشرطیکہ اس سنت کا مذاق نہ اُڑایا جائے	۳۱۶
ہوٹل میں زمین پر کھانا کھانا	۳۱۶
ایک سبق آموز واقعہ	۳۱۷
حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد	۳۱۸
مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۳۱۸
خلاصہ	۳۱۹

جہاد اور دعوت وتبلیغ

جہاد اور دعوت وتبلیغ	۳۲۰
جہاد کی تعریف	۳۲۰
عیسائیوں کو شکستِ فاش	۳۲۰
صلیبی جنگیں	۳۲۰
بایزید یلدرم کا عجیب واقعہ	۳۲۱
بایزید یلدرم کی گرفتاری اور انتقال	۳۲۱
مسلمانوں نے میدانِ جنگ میں کبھی شکست نہیں کھائی	۳۲۲
کیا اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے؟	۳۲۲
جہاد کا مقصد کیا ہے؟	۳۲۳
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے؟	۳۲۳
متجددین کے نزدیک جہاد صرف دفاعی ہے	۳۲۴
جہاد کے احکام تدریجاً آئے ہیں	۳۲۵
ابتداءً جہاد بھی جائز ہے	۳۲۵
دیندار حلقوں میں ایک اور غلط فہمی اور اس کا جواب	۳۲۶
مطلق جہاد کا منکر کافر ہے	۳۲۷
اسلام پر خونخوار مذہب ہونے کا الزام کیوں؟	۳۲۸
جہاد کے لئے تین شرطیں	۳۲۹
جہاد کے بارے میں تبلیغی جماعت کا موقف	۳۳۰
تبلیغی جماعت اور دین کی عظیم خدمت	۳۳۱
تعاون اور تنبیہ دونوں کی ضرورت ہے	۳۳۱
حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۳۳۱
مجھے اس وقت دو فکریں اور دو اندیشے لاحق ہیں	۳۳۲
یہ استدراج نہیں ہے	۳۳۳
دوسری فکر	۳۳۳
تبلیغی جماعت کی مخالفت ہرگز جائز نہیں	۳۳۴
طلبہ تبلیغی جماعت میں شرکت کریں	۳۳۴
آج کل کا جہاد اقدامی ہے یا دفاعی ہے؟	۳۳۵
ان باتوں سے غلط نتیجہ نہ نکالا جائے	۳۳۵
علماء دین کے چوکیدار ہیں	۳۳۶

"بسم اللہ"☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!

فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((كُلُّ اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَقْطَعُ))(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! پچھلے جمعہ کو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بارے میں کچھ گزارشات عرض کی تھیں۔ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر کوئی اہم کام جو اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع نہ کیا جائے، وہ ادھورا اور ناقص ہے۔ اس حدیث کے ذریعہ حضور اقدس ﷺ نے ہر مسلمان کو یہ تلقین فرمائی کہ اپنی زندگی کا ہر اہم کام اللہ کے نام سے شروع کرے۔

ہر کام سے پہلے "بسم اللہ"

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ایک ایسا کلمہ ہے جو ہمیں ہر کام سے پہلے پڑھنے کا حکم دیا گیا، صبح کو بستر سے بیدار ہوتے وقت، غسل خانے میں جاتے وقت، غسل خانے سے نکلتے وقت، کھانا کھانے سے پہلے، پانی پینے سے پہلے، بازار میں جانے سے پہلے، مسجد میں داخل ہونے سے پہلے، مسجد سے باہر نکلتے وقت، کپڑے پہنتے وقت، گاڑی چلاتے وقت، سوار ہوتے وقت، سواری سے اُترتے وقت، گھر میں داخل ہوتے وقت، تمام اوقات میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا کلمہ ہم سے کہلوایا جا رہا ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/ ۸۵ تا ۱۰۰) قبل از نماز جمعہ، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی اہمیت پر ایک اثر انگیز بیان "اصلاحی مواعظ" کی جلد سوم کے صفحہ ۲۶ تا ۴۶ پر بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کنز العمال، رقم: ۲۴۹۱

ہر کام کے پیچھے نظامِ ربوبیت

جیسا کہ پچھلے جمعہ بھی عرض کیا تھا کہ یہ کوئی منتر نہیں ہے جو ہم سے پڑھوایا جارہا ہو، بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم الشان فلسفہ ہے اور ایک عظیم الشان حقیقت کی طرف اس کے ذریعہ متوجہ کیا جارہا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا جو بھی کام انسان کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں، دیکھنے میں چاہے یہ نظر آرہا ہو کہ جو کام میں کر رہا ہوں وہ میری کوشش اور محنت کا نتیجہ ہے، لیکن اگر انسان گہری نظر سے دیکھے تو اس کو اپنی کوشش اور محنت کا عمل دخل اس میں بہت تھوڑا نظر آئے گا اور اس کے پیچھے اللہ جل شانہ کا بنایا ہوا عظیم الشان نظامِ ربوبیت کام کرتا دکھائی دے گا۔

ایک گلاس پانی پر نظامِ ربوبیت کارفرما ہے

مثال کے طور پر دیکھئے! ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب پانی پیو تو پانی پینے سے پہلے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھو۔ دیکھنے میں تو یہ نظر آتا ہے کہ پانی پینا معمولی بات ہے۔ گھر میں پانی مہیا کرنے کے لئے ہم نے پائپ لائن لے رکھی ہے اور پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کولر اور فرج موجود ہے، چنانچہ آپ نے فرج سے ٹھنڈا پانی نکالا، گلاس میں بھرا اور پی لیا۔ اب بظاہر یہ نظر آرہا ہے کہ اس ٹھنڈے پانی کا حصول ہماری اپنی محنت، کوشش اور پیسہ خرچ کرنے کا نتیجہ ہے، لیکن یہ خیال بہت کم لوگوں کو آتا ہے کہ یہ ایک گلاس ٹھنڈا پانی جو ہم نے ایک لمحے میں حلق سے نیچے اُتار لیا، اس پانی کو ہمارے حلق تک پہنچانے کے لئے اللہ جل شانہ کی نظامِ ربوبیت کا عظیم کارخانہ کس طرح کام کر رہا ہے۔

زندگی پانی پر موقوف ہے

دیکھئے! پانی ایسی چیز ہے کہ اس پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (۱)

یعنی ہم نے ہر جاندار کو پانی ہی سے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا پانی صرف انسان کا ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کا اصل مبدأ بھی ہے اور اس کی زندگی کا دارومدار بھی اسی پر ہے، اسی لئے اللہ جل شانہ نے اس کائنات میں پانی اتنی وافر مقدار میں پیدا فرمایا کہ اگر اس روئے زمین پر ایک تہائی خشکی ہے تو دو تہائی سمندر کی شکل میں پانی ہے، اور اس سمندر میں بھی بے شمار مخلوقات کا جہان آباد ہے جو ہر روز پیدا

---

(۱) الأنبياء: ۳۰

ہو رہے ہیں اور مر رہے ہیں، اگر سمندر کا یہ پانی میٹھا ہوتا تو جو جانور اس پانی میں مر کر سڑتے ہیں، ان کی وجہ سے وہ پانی خراب ہو جاتا، اس لئے اللہ جل جلالہ کی حکمتِ بالغہ نے اس پانی کو کھارا اور نمکین بلکہ کڑوا بنایا، تاکہ اس کے نمکین اجزاء اس پانی کو خراب ہونے اور سڑنے سے محفوظ رکھیں۔

پانی صرف سمندر میں ہوتا تو کیا ہوتا؟

پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرما دیتے کہ ہم نے تمہارے لئے سمندر کی شکل میں پانی پیدا کر دیا ہے اور اس کو خراب ہونے اور سڑنے سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے اندر نمکیات بھی پیدا کر دی ہیں، اب تم جانو تمہارا کام جانے، تمہیں اگر پانی کی ضرورت ہو تو جا کر سمندر سے پانی بھرو اور اس کو میٹھا کرو اور پیو اور اس کو اپنے استعمال میں لاؤ۔ اگر یہ حکم دے دیا جاتا تو کیا کسی انسان کے بس میں تھا کہ وہ سمندر سے پانی لے کر آئے اور اس سے اپنی ضروریات پوری کرے؟ چلیں! اگر سمندر سے پانی لے بھی آئے تو پھر اس کو میٹھا کیسے کرے؟

پانی کو میٹھا کرنے اور سپلائی کرنے کا خدائی نظام

سعودی عرب میں سمندر کے پانی کو میٹھا کرنے کے لئے ایک زبردست پلانٹ کروڑوں اور اربوں روپے کے خرچ سے نصب کیا گیا ہے، اس وجہ سے جگہ جگہ یہ اعلان لگایا گیا ہے کہ اس پانی کو میٹھا کرنے کے لئے بہت بڑی رقم خرچ ہوئی ہے، اس لئے اس کو احتیاط سے استعمال کیا جائے۔ لیکن اللہ جل شانہ نے انسان کی خاطر سمندر کا پانی میٹھا کرنے کے لئے یہ نظام بنایا کہ سمندر سے ''مون سون'' کے بادل اُٹھائے اور اس بادل میں ایسا خودکار پلانٹ نصب کر دیا کہ وہ پانی جو سمندر کے اندر کڑوا اور کھارا تھا، جب وہ بادل کی شکل میں اُوپر اُٹھتا ہے تو اس کی کڑواہٹ دور ہو جاتی ہے اور وہ پانی میٹھا بن جاتا ہے، اور پھر وہ لوگ جو سمندر سے ہزاروں میل دور آباد ہیں اور ان کے لئے سمندر سے پانی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے، ان لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے بادلوں کی شکل میں مفت ''کارگو سروس'' مہیا فرما دی۔

بادل ''مفت کارگو سروس'' مہیا کرتے ہیں

پچھلے دنوں میں ناروے گیا، وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ چونکہ یہاں کا پانی بہت اچھا اور صحت بخش سمجھا جاتا ہے، لہٰذا بہت سے ممالک یہ پانی یہاں سے امپورٹ کرتے ہیں، چنانچہ وہ پانی بڑے بڑے کنٹینرز میں پانی کے جہازوں کے ذریعہ دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے، اس کے نتیجے میں

ایک لیٹر پانی پر ایک ڈالر خرچ آتا ہے جو ہمارے حساب سے ۶۲/ روپے بنتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ساری انسانیت کے لئے، اس میں مسلمان اور کافر کی بھی قید نہیں، بادلوں کی شکل میں یہ کار گو سروس مفت مہیا کر دی ہے، یہ بادل سمندر سے پانی اُٹھا کر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لے جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام بنادیا کہ روئے زمین کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جو اس ''کار گو سروس'' سے فیض یاب نہ ہوتا ہو، بادل آتے ہیں، گرجتے ہیں، پانی برساتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

پانی کی ذخیرہ اندوزی ہمارے بس میں نہیں

جب بادلوں کے ذریعہ ہمارے گھر تک پانی پہنچادیا تو اب اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ ہم نے تو تمہارے گھر تک پانی پہنچادیا، اب تم خود ذخیرہ کر کے سال بھر کا پانی جمع کر لو اور حوض اور ٹینکیاں بنا کر اس کے اندر محفوظ رکھو، کیا انسان کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ بارش کے موقع پر سال بھر کے لئے پانی کا ذخیرہ کر لیتا؟ کیا انسان کے پاس ایسا اسٹوریج نظام ہے کہ سال بھر کا پانی اس کے اندر جمع کر لے اور پھر پورے سال اس میں سے پانی لے لے کر استعمال کیا کرے۔ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ اس کمزور اور ضعیف انسان کے بس میں یہ بھی نہیں ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بارش کو جتنا تم جمع کر سکتے ہو اور استعمال کر سکتے ہو کر لو، باقی سارے سال کے لئے ذخیرہ کرنے کی ذمہ داری بھی ہم ہی لیتے ہیں۔

یہ برفانی پہاڑ کولڈ اسٹوریج ہیں

چنانچہ ان بادلوں کا پانی پہاڑوں پر برسایا اور ان پہاڑوں کو اس پانی کے لئے ''کولڈ اسٹوریج'' بنادیا اور ان پہاڑوں پر وہ پانی برف کی شکل میں محفوظ کر دیا اور اتنی بلندی پر اس پانی کو محفوظ کر دیا کہ کوئی خراب کرنے والا اس پانی کو خراب کرنے کے لئے وہاں تک نہ پہنچ سکے اور اتنے ٹمپریچر پر رکھا کہ وہاں سے پگھل بھی نہ سکے۔ یہ بلند پہاڑ ایک طرف انسان کو خوشنما نظارہ مہیا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انسان کے لئے زندگی بھر کے لئے پانی کے ذخیرہ کو محفوظ کر رہے ہیں۔

دریاؤں اور ندیوں کے ذریعہ پانی کی فراہمی

اگر اس مرحلے پر انسان سے یہ کہہ دیا جاتا کہ ہم نے تمہارے لئے پہاڑوں پر پانی کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، اب جس کو ضرورت ہو وہاں سے جا کر لے آیا کرے۔ کیا انسان کے لئے یہ ممکن تھا کہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں سے اس برف کو پگھلا کر اس پانی کو اپنی ضرورت میں استعمال کرے؟ یہ بھی

انسان کے بس میں نہیں تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ذمہ داری بھی ہم ہی پوری کر دیتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورج کو حکم دیا کہ تم اپنی کرنیں اس برف پر ڈالو اور اس برف کو پگھلاؤ، اور پھر اس پانی کے لئے دریاؤں اور ندیوں کی شکل میں راستے بھی اللہ پاک نے بنا دیئے، چنانچہ وہ برف پانی کی شکل میں پہاڑوں سے نیچے اُترتی ہے اور دریاؤں اور ندیوں کی شکل میں بہتا ہوا پوری دنیا کے اندر سپلائی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تہہ میں پانی کی سوتیں اور رگیں اس طرح بچھادیں جس طرح پائپ لائنیں بچھائی جاتی ہیں، اب تم دنیا کے جس خطے میں چاہو زمین کھودو اور پانی برآمد کرلو۔

یہ پانی اللہ تعالیٰ نے پہنچایا ہے

بس انسان کا صرف اتنا کام ہے کہ جو پانی اللہ تعالیٰ نے سمندر سے اُٹھا کر پہاڑوں پر برسایا اور پھر پہاڑوں سے پگھلا کر زمین کے ایک ایک گوشے میں پہنچایا ہے، اس پانی کو ذرا سی محنت کر کے اپنے گھر تک لے آئے۔ لہٰذا جو پانی تم اپنے حلق سے اُتار رہے ہو، اگر غور کرو تو یہ نظر آئے گا کہ اس تھوڑے سے پانی پر کائنات کی ساری طاقتیں صرف ہوئی ہیں، تب جا کر یہ پانی تمہارے منہ تک پہنچا۔ اس لئے یہ جو کہا جارہا ہے کہ پانی پیتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لو اور ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھو، اس کے ذریعہ انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ تمہارے حلق تک اس پانی کا پہنچنا تمہارے زور بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے جس کے ذریعہ انسان اس پانی سے سیراب ہورہا ہے۔

جسم کے ہر ہر عضو کو پانی کی ضرورت ہے

پھر ہم نے گلاس میں پانی بھرا اور اس کو حلق سے نیچے اُتار لیا، اب آگے کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم کہ وہ پانی کہاں جارہا ہے اور جسم کے کس حصے کو کیا فائدہ پہنچارہا ہے؟ اس غریب انسان کو اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں، بس وہ تو اتنا جانتا ہے کہ مجھے پیاس لگی تھی، پانی پیا وہ پیاس بجھ گئی، اس کو یہ معلوم نہیں کہ وہ پیاس کیوں لگی تھی؟ اور پیاس لگنے کے بعد جب پانی پیا تو اس پانی کا انجام کیا ہوا؟ اس کو کچھ نہیں معلوم۔ ارے تمہیں پیاس اس لئے لگی تھی کہ تمہارے جسم کے ایک ایک عضو کو پانی کی ضرورت تھی، صرف منہ کو اور حلق کو ہی ضرورت نہیں تھی، بلکہ جسم کے تمام اعضاء کو پانی کی ضرورت تھی۔ اگر جسم میں پانی نہ ہو تو انسان کی موت واقع ہو جائے۔ ذرا کسی کو دست لگ جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں جسم کے اندر پانی کی کمی ہو جاتی ہے تو اس وقت کمزوری کی وجہ سے انسان کے لئے چلنا

پھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ضرورت سے زائد پانی نقصان دہ ہے

لہٰذا ایک طرف تو انسان کے جسم کے ہر ہر عضو کو پانی کی ضرورت ہے، اس لئے انسان کو پیاس لگتی ہے اور وہ پانی پیتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پانی جسم کے اندر ضرورت سے زیادہ نہ ہو جائے، کیونکہ اگر ضرورت سے زیادہ پانی جسم کے اندر جمع ہو جائے تو جسم پر ورم آجاتا ہے اور سوج جاتا ہے، یا یہ پانی اگر جسم کے اندر کسی ایسی جگہ پر رک جائے جہاں رکنا نہیں چاہئے تو اس کے نتیجے میں بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، مثلاً اگر وہ پانی پھیپھڑوں میں رک جائے تو انسان کو ٹی بی ہو جاتی ہے، پسلیوں میں پانی رک جائے تو دمہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر ضرورت سے زیادہ پانی جمع ہو جائے تو وہ بھی انسان کے لئے خطرہ ہے، اور اگر پانی کم ہو جائے یا ختم ہو جائے تو بھی انسان کے لئے خطرہ ہے، انسان کے جسم کے اندر پانی ایک خاص حد تک رہنا ضروری ہے۔

جسم میں خودکار میٹر نصب ہے

پانی کی وہ حد کیا ہے؟ ایک انسان جو اَن پڑھ ہے، جس کو ایک حرف پڑھنا نہیں آتا، وہ کیسے پہچانے کہ کتنا پانی میرے جسم میں ہونا چاہئے اور کتنا نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے جسم میں ایک خودکار میٹر نصب کر دیا ہے۔ جس وقت انسان کے جسم کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو پیاس لگ جاتی ہے۔ پیاس کیوں لگ رہی ہے؟ اس وجہ سے نہیں لگ رہی ہے کہ حلق خشک ہے اور ہونٹ خشک ہیں، بلکہ اس وجہ سے لگ رہی ہے کہ تمہارے جسم کو پانی کی ضرورت ہے، انسان کو اس ضرورت کا احساس دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیاس کو پیدا کر دیا۔ ایک بچہ جو کچھ نہیں جانتا، لیکن یہ ضرور جانتا ہے کہ مجھے پیاس لگ رہی ہے، اس کو بجھانا چاہئے۔

جسم کے اندر پانی کیا کام کر رہا ہے؟

پھر جسم کے اندر پہنچنے کے بعد وہ پانی جسم کے اندر کی پائپ لائن کے ذریعہ ان تمام مقامات تک پہنچ رہا ہے جہاں اس کی ضرورت ہے، اور جو پانی ضرورت سے زائد ہے، وہ جسم کی صفائی کرنے کے بعد پیشاب کے ذریعہ باہر آجاتا ہے، تاکہ وہ گندا پانی جسم کے اندر باقی نہ رہے۔

ہم اور آپ ایک لمحہ کے اندر پانی پی لیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ وہ پانی کہاں سے آیا تھا اور کس طرح ہمارے منہ تک پہنچا اور نہ یہ سوچا کہ اندر جانے کے بعد اس کا کیا انجام ہونے والا ہے اور

کون اس پانی کی نگرانی کر رہا ہے؟ لہٰذا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کا کلمہ درحقیقت ہمیں ان سارے حقائق کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

ہارون رشید کا ایک واقعہ

ہارون رشید ایک مرتبہ اپنے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے، پینے کے لئے پانی منگوایا، قریب میں مجذوب صفت بزرگ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے تھے، جب ہارون رشید پانی پینے لگے تو انہوں نے ہارون رشید سے کہا کہ امیر المؤمنین! ذرا ایک منٹ کے لئے رک جائیں، وہ رک گئے اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ امیر المؤمنین! میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ آپ کو اس وقت پیاس لگ رہی ہے اور پانی کا گلاس آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ بتائیں کہ اگر آپ کو ایسی ہی پیاس لگ رہی ہو اور آپ کسی صحراء یا جنگل میں ہوں اور وہاں پانی موجود نہ ہو اور پیاس شدت کی لگ رہی ہو، تو آپ ایک گلاس پانی حاصل کرنے کے لئے کتنی دولت خرچ کر دیں گے؟ ہارون رشید نے جواب دیا کہ اگر شدید پیاس کے عالم میں پانی نہ ملے تو چونکہ پانی نہ ملنے کی صورت میں موت ہے، تو اپنی جان بچانے کے لئے میرے پاس جتنی دولت ہوگی، خرچ کر دوں گا تاکہ جان بچ جائے۔ یہ جواب سننے کے بعد حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب آپ ''بسم اللہ'' پڑھ کر پانی پی لیجئے۔

پوری سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی سے بھی کم ہے

جب بادشاہ پانی پی چکے تو حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! میں ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا سوال ہے؟ بہلول مجذوبؒ نے فرمایا کہ سوال یہ ہے کہ یہ پانی جو آپ نے ابھی پیا ہے، اگر یہ پانی آپ کے جسم کے اندر ہی رہ جائے اور باہر نہ نکلے اور پیشاب بند ہو جائے، اب مثانے کے اندر پیشاب بھرا ہوا ہے اور باہر نکالنے کی کوئی صورت نہیں تو اس کو باہر نکالنے کے لئے کتنی دولت خرچ کر دیں گے؟ ہارون رشید نے جواب دیا کہ اگر پیشاب نہ آئے بلکہ پیشاب آنا بند ہو جائے اور مثانہ پیشاب سے بھر جائے تو یہ صورت بھی ناقابلِ برداشت ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اس کے علاج کے لئے جتنی دولت مانگے گا، میں اس کو دے دوں گا، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص پوری سلطنت بھی مانگے گا تو میں دے دوں گا۔ بہلولؒ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! اس کے ذریعہ میں یہ حقیقت بتانا چاہتا تھا کہ آپ کی پوری سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی پینے اور اس کو باہر نکالنے کے برابر بھی نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو سارا نظام مفت میں دے رکھا ہے، مفت میں پانی مل رہا ہے اور مفت میں خارج ہو رہا ہے، اس کے خارج کرنے کے لئے کوئی قیمت اور کوئی پریشانی اُٹھانی نہیں پڑتی۔

’’بسم اللہ‘‘ کے ذریعہ اعترافِ بندگی

بہر حال! اللہ جل شانہ نے ہر انسان کو یہ نظام مفت میں دے رکھا ہے، کیونکہ اس نے نہ کوئی پیسہ خرچ کیا اور نہ ہی محنت اُٹھائی۔ اس لئے یہ جو حکم دیا جا رہا ہے کہ پانی پینے سے پہلے ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم‘‘ پڑھو، اس کے ذریعہ اس طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نظامِ ربوبیت کا کرشمہ ہے اور اس کے ذریعہ یہ اعتراف بھی ہو رہا ہے کہ یا اللہ! ہمارے بس میں یہ نہیں تھا کہ ہم یہ پانی پی سکتے، اگر آپ کا بنایا ہوا یہ کارخانہ ربوبیت نہ ہوتا تو ہم تک یہ پانی کیسے پہنچتا، آپ نے محض اپنے فضل و کرم سے ہم تک یہ پانی پہنچایا، اور جب یہ پانی آپ نے ہی پہنچایا ہے تو اے اللہ! ہم آپ ہی سے یہ درخواست اور دعا کرتے ہیں کہ جو پانی ہم پی رہے ہیں، یہ پانی جسم کے اندر جانے کے بعد خیر کا سبب بنے اور کوئی فساد نہ پھیلائے، کیونکہ اگر اس پانی میں بیماریاں اور خرابیاں ہوں گی تو یہ پانی جسم میں فساد مچائے گا، اسی طرح اگر جسم کے اندر کے نظام میں خرابی پیدا ہو جائے، مثلاً جگر اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو وہ پانی جسم کے اندر تو جائے گا لیکن اس پانی کو صاف کرنے کا اور گندگی کو باہر پھینکنے کا جو نظام ہے وہ خراب ہو جائے گا، اس لئے ہم پانی پیتے وقت دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! اس پانی کا انجام بھی بخیر فرما دے۔

انسانی گردے کی قیمت

کراچی میں گردے کے ایک اسپیشلسٹ ہیں، ان سے ایک مرتبہ میرے بھائی صاحب نے پوچھا کہ آپ انسانی گردہ ایک انسان کے جسم سے نکال کر دوسرے انسان کے جسم میں منتقل کر دیتے ہیں، لیکن اب تو سائنس نے بڑی ترقی کر لی ہے تو کوئی مصنوعی گردہ کیوں نہیں بنا لیا جاتا، تاکہ دوسرے انسان کے گردے کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے؟ وہ ہنس کر جواب دینے لگے کہ اول تو سائنس کی اس ترقی کے باوجود مصنوعی گردہ بنانا بڑا مشکل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گردے کے اندر جو چھلنی لگائی ہے، وہ اتنی لطیف اور باریک ہے کہ ابھی کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو اتنی لطیف چھلنی بنا سکے، اگر بالفرض ایسی مشین ایجاد بھی کر لی جائے جو ایسی چھلنی بنا سکے تو اس کی تیاری پر اربوں روپے خرچ ہوں گے، اور اگر اربوں روپے خرچ کر کے ایسی چھلنی بنا بھی لی جائے تب بھی گردے کے اندر ایک چیز ایسی ہے جس کو بنانا ہماری قدرت سے باہر ہے، وہ یہ کہ گردے کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک دماغ بنایا ہے جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس آدمی کے جسم میں کتنا پانی رکھنا چاہئے اور کتنا پانی باہر پھینکنا چاہئے۔ ہر انسان کا گردہ اس انسان کے حالات کے مطابق، اس کی جسامت کے مطابق اور اس کے

وزن کے مطابق یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کتنا پانی اس کے جسم میں رہنا چاہئے اور کتنا پانی باہر پھینکنا چاہئے، اور اس کا یہ فیصلہ سو فیصد درست ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں وہ اتنا پانی جسم روکتا ہے جتنے پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور ضرورت سے زائد پانی کو پیشاب کی شکل میں باہر پھینک دیتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم اربوں روپیہ خرچ کر کے ربر کا مصنوعی گردہ بنا بھی لیں، تب بھی ہم اس میں دماغ نہیں بنا سکتے جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے گردے میں پیدا فرمایا ہے۔

جسم کے اندر کارخانۂ ربوبیت

قرآن کریم بار بار اس طرف توجہ دلا رہا ہے:

﴿وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (۱)

تم اپنی جانوں میں غور کیا کرو کہ تمہارے جسم میں ہماری قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا کیا کارخانہ کام کر رہا ہے، اس پر کبھی غور کیا کرو۔ اور اس گردے کا انجام بھی اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے کہ کب تک یہ گردہ کام کرے اور کب یہ کام کرنا بند کر دے۔ لہٰذا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کا یہ پیغام ہے کہ ایک طرف یہ یاد کرو کہ یہ پانی تمہارے پاس کیسے پہنچا اور دوسری طرف یہ خیال کرو کہ یہ پانی تمہارے جسم کے اندر جا کر فساد نہ پھیلائے بلکہ یہ پانی صحت اور برکت کا سبب بنے، اور اس بسم اللہ کے پڑھنے میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا اعتراف ہے اور دوسری طرف یہ دعا اور درخواست ہے کہ ہم اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے دعا اور درخواست کر رہے ہیں کہ یا اللہ! ہم یہ پانی پی تو رہے ہیں لیکن یا اللہ! یہ پانی اندر جا کر کہیں فساد کا سبب نہ بن جائے، بلکہ یہ پانی صحت اور صلاح و فلاح کا سبب بنے۔ پانی پینے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کا یہ فلسفہ ہے، لہٰذا پانی پیتے وقت اس فلسفہ کو سامنے رکھو پھر دیکھو کہ پانی پینے میں کیا لطف ہے اور کیا برکت ہے اور اس طرح پانی پینے کو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے عبادت بھی بنا دیں گے اور اس پر اجر و ثواب بھی عطا فرمائیں گے۔

محبت اور خشیت کے حصول کا ذریعہ

اور جب پانی پیتے وقت یہ فلسفہ سامنے رکھو گے تو کیا اس کے نتیجہ میں اس ذات سے محبت پیدا نہیں ہوگی؟ جب تم اس تصور کے ساتھ پانی پیو گے تو یہ چیز تمہارے دل میں اللہ جل شانہ کی محبت میں اضافہ کرے گی اور اللہ تعالیٰ کی عظمت میں اضافہ کرے گی اور اس محبت کے نتیجے میں تمہارے دل میں خشیت پیدا ہوگی اور پھر یہ خشیت تمہیں گناہوں سے بھی روک دے گی۔

(۱) الذاریات: ۲۱، ترجمہ: اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی! کیا پھر بھی تمہیں دکھائی نہیں دیتا

کافر اور مسلمان کے پانی پینے میں فرق

ایک کافر بھی پانی پیتا ہے، لیکن وہ غفلت کی حالت میں پانی پیتا ہے، اپنے خالق اور مالک کو یاد نہیں کرتا، ایک مومن بھی پانی پیتا ہے، لیکن اس تصور اور دھیان کے ساتھ پیتا ہے، اگرچہ پانی کی نعمت اللہ تعالیٰ نے کافر کو بھی دے رکھی ہے اور مومن کو بھی دے رکھی ہے، لیکن ایک ایسے شخص کے پانی پینے کی کیفیت میں جو ناشکرا ہے اور ایک ایسے شخص کے پانی پینے میں جو شکر گزار ہے، ان دونوں میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے، وہ فرق یہ ہے کہ مومن کو چاہئے کہ وہ دھیان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے پانی پیئے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس اور اعتراف کرتے ہوئے پانی پیئے اور برکت کی دعا کرتے ہوئے پانی پیئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان حقائق کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

عبادت کی اہمیت ☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

انسان کی زندگی میں عبادت کیا اہمیت رکھتی ہے؟ یہ بات اس وقت تک ٹھیک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کائنات میں انسان کو ایک غیر معمولی مقام حاصل ہے، وہ اپنے کمزور اور ناتواں وجود کے ساتھ آسمان اور زمین کی ہر چیز پر حکومت کرتا ہے، اور اس وسیع دعریض کائنات کا ہر ذرّہ اس کی خدمت میں مصروف ہے، انسان کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے فصلیں اُگانے کی ضرورت ہوتی ہے تو کائنات کی مشینری کا ہر ہر پرزہ اس کی مدد کے لئے حرکت میں آجاتا ہے، وہ جانور جو انسان سے کئی گنی زیادہ طاقت کے مالک ہیں اس کے آگے رام ہو کر زمین ہموار کرتے ہیں، زمین اپنی تمام توانائیاں صرف کر کے بیج میں سے کونپل نکالتی ہے، اس کونپل کو پودا، اور پودے کو درخت بننے کے لئے گرمی کی ضرورت ہوتی ہے، تو سورج اپنی کرنیں نچھاور کرتا ہے، پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو بادل اس پر اپنی پونجی لٹاتے ہیں، ہوا کی ضرورت ہوتی ہے تو ہوائیں اسے لہلہا کر پروان چڑھاتی ہیں، غرض کائنات کی تمام قوتیں اپنا سارا زور اس لئے صرف کرتی ہیں کہ انسان کی بھوک مٹے اور اس کی زندگی کا سامان مہیا ہو۔

یہ تو ایک مثال تھی، آپ اپنے گردوپیش پر نظر ڈال کر دیکھئے آپ کو نظر آئے گا کہ آسمان سے لے کر زمین تک تمام خدائی کارندے آپ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ آپ میں وہ کیا خصوصیت ہے جس کی بناء پر کائنات آپ کی خدمت کرتی ہے، اور آپ سے اپنی کوئی خدمت نہیں لیتی؟

اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ کائنات کے ہر ذرّے کا پیدا کرنے والا خدا ہے، اور اسی نے اس جہاں کو آپ کا خادم بنایا ہے تو آپ کو ان سوالات کا جواب سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی، تمام

☆ نشری تقریریں، ص: ۳۷ تا ۴۰، فرد کی اصلاح، ص: ۳۵

کائنات کو آپ کی خدمت پر اس لئے مامور کیا گیا ہے کہ آپ ایک بہت بلند اور اعلیٰ کام پر مامور ہیں اور وہ کام ہے "عبادت" اور "بندگی"، یہی کام ہماری زندگی کا مقصد ہے، اور اسی کے لئے ہم اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (۱)

"اور میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں"

قرآن کریم کے اس ارشاد اور اس کی مذکورہ بالا تشریح سے عبادت کی اہمیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے، عبادت اس لئے اہم ہے کہ وہ ہماری زندگی کا مقصد ہے، عبادت اس لئے اہم ہے کہ اسی کے لئے ہم دنیا میں آئے ہیں، عبادت اس لئے اہم ہے کہ وہ ہمارے اشرف المخلوقات بننے کی وجہِ جواز ہے، اور اسی کے بل پر ہم کائنات کی ہر چیز سے خدمت لیتے ہیں، اگر ہم عبادت کے اس فریضے کو انجام نہ دیں تو ہماری مثال اس ملازم کی سی ہوگی جو اپنے مالک سے تنخواہ پوری وصول کرے، اس کی مہیا کی ہوئی تمام سہولتوں سے فائدہ اُٹھائے، لیکن جب وہی مالک اسے کسی بات کا حکم دے تو وہ تعمیل کرنے سے صاف انکار کردے۔ جس طرح یہ ملازم سزا کے لائق ہے اسی طرح وہ شخص عذاب کا مستحق ہے، جو دنیا کی تمام نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے، لیکن عبادت کے فریضے کو ادا نہیں کرتا۔

دوسری طرف وہ شخص جو عبادت کو ٹھیک ٹھیک انجام دیتا ہے، اس کی مثال اس فرمانبردار ملازم کی سی ہے جس کے آرام اور تفریح سے بھی مالک خوش ہوتا ہے۔ جس طرح خالی اوقات میں اس ملازم کا خالی بیٹھنا، اور آرام اور تفریح کرنا بھی ملازمت میں شمار ہوتا ہے، اسی طرح ایک فرمانبردار بندے کی عبادت صرف نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ میں منحصر نہیں رہتی، بلکہ اس کی زندگی کا ہر قدم عبادت بن جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایسا شخص اپنے بیوی بچوں کے لئے جو روزی کماتا ہے، اس پر بھی اسے ثواب ملتا ہے، اس کا سونا جاگنا، اُٹھنا بیٹھنا، یہاں تک کہ ہنسنا بولنا بھی بندگی میں شمار ہوتا ہے۔

بندگی کا مطلب ہی اصل میں یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کا تابع فرمان سمجھ کر اپنی پوری زندگی اسی کے احکام کے مطابق بنالے، لہٰذا عبادت کسی خاص جگہ، کسی خاص وقت یا کسی خاص کام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اگر اپنی زندگی کو خدا کے احکام کے مطابق بنائے ہوئے ہیں تو آپ کی زندگی کا ہر کام عبادت، آپ کی تجارت، آپ کی ملازمت یہاں تک کہ آپ کی جائز تفریحات بھی عبادت ہیں، بشرطیکہ وہ خدا کے احکام کے مطابق ہوں، اور نیک نیتی کے ساتھ ہوں۔

اور جب کسی قوم کے بیشتر افراد اپنی اجتماعی زندگی اس طرح عبادت بنالیتے ہیں تو زندگی کی

---

(۱) الذاریات: ۵٦

تمام کامرانیاں ان کے قدم چومتی ہیں، اور اللہ کا وہ وعدہ پورا ہوتا ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا﴾ (۱)

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے، اور انہوں نے نیک عمل کیے، ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو یقیناً زمین کی خلافت عطا کرے گا، جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو عطا کی ہے، اور ضرور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا مضبوطی کے ساتھ قائم کرے گا، اور بالیقین ان کی حالتِ خوف امن سے بدل دے گا، (بس) وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں''

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

❖❖❖

---

(۱) النور: ۵۵

عبادات کی کیفیت اور آداب ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ، اَمَّا بَعْدُ!

اللہ تعالیٰ کی محبت میں بے چین

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو خط میں لکھا:

''مجھے اس کا بڑا شوق ہے کہ کسی طرح ہو، اللہ تعالیٰ کی محبت میں ''بے چین'' رہوں۔''

اس خط کے جواب میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے یہ جملہ تحریر فرمایا:

''مگر اس کے ساتھ یہ بھی دعا کرو کہ اس ''بے چینی'' میں چین رہے''(۱)

انوکھے خط کا انوکھا جواب

یہ جواب جو حضرت والا نے تحریر فرمایا اگر غور کریں تو بڑا عجیب وغریب جواب ہے۔ اگر کسی نے یہ جواب نہ پڑھا ہو، اور صرف سوال اس کے سامنے آئے تو جن حضرات نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے مواعظ اور ملفوظات پڑھے ہوئے ہیں، اور جو لوگ حضرت کے مزاج سے کچھ واقف ہیں، ان کا گمان یہ ہوگا کہ حضرت والا جواب میں یہ فرمائیں گے کہ یہ کیا تمہیں ''بے چینی'' کا شوق پیدا ہو گیا؟ اس لئے کہ ''بے چینی'' تو ایک غیر اختیاری کیفیت ہے، وہ حاصل ہو کہ نہ ہو، اس کے پیچھے کیوں پڑتے ہو؟ کیونکہ حضرت والا کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا اصول یہ ہے کہ آدمی ''اختیاری'' امور کا اہتمام کرے، اور ''غیر اختیاری'' کی فکر میں نہ پڑے، یہ بڑا زرین اصول ہے، اس لئے کہ یہ غیر اختیاری کیفیات کہ کسی وقت عبادت کا ذوق وشوق ہو رہا ہے، کسی وقت ذوق وشوق نہیں ہو رہا، کسی وقت عبادت میں دل لگ رہا ہے، کسی وقت دل نہیں لگ رہا، یہ سب کیفیات آنی جانی ہیں، ان کے پیچھے

☆ اصلاحی مجالس (۶/۱۹۹ تا ۲۱۶)، رمضان المبارک، بعد از نماز ظہر، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) انفاس عیسیٰ، ص: ۱۹۴

پڑنے کی ضرورت نہیں، اصل مقصود "عمل" ہے، یہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اس لئے جو لوگ "کیفیات" کے بہت پیچھے پڑتے ہیں، حضرت والا عام طور پر ان کی ہمت افزائی نہیں کیا کرتے۔

ہر مریض کے لئے علیحدہ نسخہ

بہر حال، اگر حضرت والا کا یہ جواب نہ پڑھا ہوتا تو ذہن اس طرف جاتا کہ حضرت والا جواب میں یہ تحریر فرمائیں گے کہ شرعاً یہ کوئی مطلوب بات نہیں کہ آدمی "بے چین" رہے۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں پر ان صاحب کو یہ جواب نہیں دیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ طبیب کا کام ہوتا ہے کہ وہ آنے والے مریض کی حالت کے مناسب نسخہ تجویز کرے، یہ نہیں کہ بس ایک ہی نسخہ سب مریضوں کو گھوٹ کر پلا رہا ہے، اس لئے کہ مریض کے حالات کے مناسب ہر مریض کی دوا اور علاج میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مرشدِ کامل کا کام بھی یہی ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اس آدمی کے موجودہ حالات میں یہ بات اس کے مناسب ہوگی یا نہیں؟ یہی ملکہ اللہ تعالیٰ مرشدِ کامل کو عطا فرماتے ہیں، اور ہم جب اس مرشدِ کامل کے پاس جاتے ہیں تو وہ ہمارے حالات کے لحاظ سے جواب دیتا ہے۔

نیکی کا خیال اللہ کا مہمان ہوتا ہے

یہاں پر حضرت والا نے اس خط کے جواب میں یہ نہیں لکھا کہ "تمہیں یہ بے چین ہونے کا شوق کیوں پیدا ہوا؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟" یہ جواب کیوں نہیں لکھا؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہے ۔ واللہ سبحانہ اعلم ۔ کہ حضرت والا نے یہ محسوس فرمایا کہ اس آدمی کے دل میں جو یہ شوق پیدا ہوا ہے، یہ بھی اس شخص کے حق میں ایک "واردِ قلبی" ہے، اور حضرات صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم یہ فرماتے ہیں کہ من جانب اللہ قلب پر جو "واردات" ہوتے ہیں، ان "واردات" کی ناقدری نہ کرو، اس لئے کہ یہ "واردات" اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے مہمان ہوتے ہیں، اگر اس مہمان کی خاطر تواضع کرو گے تو یہ مہمان بار بار آئے گا، اور اگر تم نے اس مہمان کی خاطر تواضع نہ کی، بلکہ ناقدری کر دی تو یہ مہمان روٹھ کر بھاگ جائے گا، پھر نہیں آئے گا۔

شریعت میں تو چین مطلوب ہے

اب اگر اس شخص کو جواب میں یہ لکھ دیتے کہ تیرا اس بے چین رہنے کا خیال درست نہیں ہے، تو اس صورت میں یہ "وارد" جو اس کے قلب پر وارد ہو رہا ہے، اس کی مخالفت کرنے سے اس کا نقصان

ہوتا، اور آئندہ یہ ''واردات'' بند ہو جاتے، اور اگر جواب میں اس کی ہمت افزائی فرماتے کہ یہ ''بے چینی'' کا حاصل ہونا تو بڑی اچھی بات ہے، ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں یہ ''بے چینی'' عطا فرمادے، تو یہ جواب شریعت کے خلاف ہوتا، اس لئے کہ شریعت میں ''بے چینی'' مطلوب نہیں، شریعت میں تو ''چین'' اور ''اطمینان'' کا حصول مطلوب ہے، قرآن کریم میں ہے:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (۱)

یعنی اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا شریعت میں یہ مطلوب نہیں کہ کوئی آدمی ''بے چینی'' کو اپنا مقصود بنالے، بلکہ شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ''اطمینان'' اور ''چین'' کو مقصود بنائے، اسی لئے خود حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِكَ تَجْمَعُ بِهَا اَمْرِیْ وَتَلُمُّ بِهَا شَعْثِیْ)) (۲)

''اے اللہ! میں آپ سے آپ کی رحمت کا سوال کرتا ہوں، جس کے نتیجے میں مجھے جمعیتِ خاطر اور سکون حاصل ہو جائے، اور میری پراگندگی کو جمعیت سے بدل دیجئے''

معلوم ہوا کہ شریعت میں اطمینان اور چین مقصود ہے، بذاتِ خود ''بے چینی'' مقصود نہیں۔

عجیب وغریب جواب

بہر حال، اگر اس خط کے جواب میں پہلی بات لکھ دیتے تو ''طریقت'' کی خلاف ورزی لازم آتی، اور اگر دوسری بات لکھ دیتے تو ''شریعت'' کی خلاف ورزی لازم آتی، اس لئے حضرت والا نے بڑا عجیب جواب یہ دیا کہ ''مگر اس کے ساتھ یہ بھی دعا کرو کہ اس ''بے چینی'' میں چین رہے''۔ اس لئے کہ ''بے چینی'' بذاتِ خود مطلوب نہیں، بلکہ ''چین'' مطلوب ہے، لیکن وہ ''چین'' اللہ تعالیٰ کی محبت کی ''بے چینی'' کے ذریعہ حاصل ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضطراب ہو، اور اس اضطراب ہی میں اسے ''چین'' مل جائے۔

ہم اضطراب سے حاصل ''قرار'' کرلیں گے
یہ ''جبر'' ہے تو اسے اختیار کرلیں گے

یہ ''اضطراب'' بذاتِ خود مقصود نہیں لیکن یہ اضطراب بعض اوقات ''قرار'' پر منتج ہوتا ہے، اور

(۱) الرعد: ۲۸

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، رقم: ۳۳۴۱

جو آدمی اس راستے سے گزرا نہ ہو، اس کو پوری طرح اس کا ادراک اور احساس اور فہم نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ابتداءِ محبت میں تو جوش و خروش، اُبال اور بے چینی ہوتی ہے، پھر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اس بے چینی کے اندر ''چین'' آ جاتا ہے، اس لئے حضرت والا نے یہ جواب تحریر فرمایا۔

''خلافت'' اس طرح سستی نہیں بٹتی

اس سے پتہ چلا کہ دونوں کی اصلاح کا کام ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ بس چند اصطلاحات یاد کرلیں، اور لوگوں کی اصلاح کرنی شروع کر دی۔

ہزار نکتۂ باریک تر زمو ایں جاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

اس لئے یہ بڑا نازک کام ہے، کسی شخص کے لئے یہ فیصلہ کرنا اس کے لئے کیا بات اس وقت فائدہ مند ہوگی، بڑا مشکل کام ہے۔ اسی واسطے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں یہ ''خلافت'' اس طرح سستی نہیں بٹتی تھی، جیسا کہ بعض مشائخ کے یہاں رواج ہے کہ جو آرہا ہے، اس کو ''خلافت'' دے رہے ہیں، جو آرہا ہے، اس کو ''خلافت'' دے رہے ہیں، کسی کو دیکھا کہ وہ نماز وغیرہ پڑھنے لگا ہے، اور اس کے اندر کچھ خشوع و خضوع پیدا ہو گیا ہے، اور کچھ ذکر واذکار کرنے لگا ہے، بس جا تو بھی ''خلیفہ'' ہمارے حضرات کا یہ مزاج نہیں تھا۔

ڈاکٹر بننے کے لئے صحت مند ہونا کافی نہیں

یہ مزاج کیوں نہیں تھا؟ اس لئے کہ خود درست ہو جانا اور بات ہے، اور دوسرے کا علاج کرنا اور بات ہے۔ ہر صحت مند شخص ''ڈاکٹر'' نہیں ہوتا۔ صحت مند شخص کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اس کے اندر کوئی بیماری نہیں ہے، کوئی خرابی نہیں ہے، بہت تندرست ہے، لیکن وہ صحت مند دوسرے بیمار کا علاج کر دے، یہ ضروری نہیں۔ اس لئے کہ ''ڈاکٹر'' بننے کے لئے بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے، پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، تب جا کر اس کو ''مطب'' کھولنے کی اجازت ملتی ہے، اب کوئی شخص یہ کہے کہ میں تو بالکل تندرست ہوں، میری ساری رپوٹیں درست ہیں، میرا سارا جسمانی نظام درست ہے، لہٰذا میں ''ڈاکٹر'' بننے کے لائق ہوں، یا کوئی شخص ڈاکٹر کے پاس علاج کے لئے آئے، ڈاکٹر اس کا علاج کرے، اور جب وہ شخص سو فیصد بالکل تندرست ہو جائے تو ڈاکٹر اس کو سرٹیفکیٹ دے دیں کہ تم بھی ڈاکٹر بن جاؤ، اس لئے کہ تم اب تندرست ہو گئے ہو۔

''خلافت'' ایک شہادت اور گواہی ہے

یہی حال یہاں ہے کہ شیخ کے پاس ایک آدمی اپنی اصلاح کے لئے آیا، شیخ نے اس کے حالات کی اصلاح کی، وہ اتباع سنت پر آگیا، اس کی نماز درست ہوگئی، اس کا روزہ درست ہوگیا، تو محض ان اعمال کے درست ہونے سے وہ ''خلافت'' کا اہل نہیں بن جاتا، اور ''خلافت'' کا مطلب دوسرے کے علاج کرنے کی صلاحیت پیدا ہونا، اور دوسروں کا علاج کرنا، یہ ہر ایک کی بس کی بات نہیں۔

اس لئے ہمارے حضرات کے یہاں ''خلافت'' بہت دیکھ بھال کے بعد جب پورا اطمینان ہوجائے اس وقت دی جاتی ہے، اس لئے کہ ''خلافت'' دینے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق خدا کے سامنے یہ شہادت اور سرٹیفکیٹ دینا ہے کہ ''ہم نے اس کو اچھی طرح پرکھ لیا ہے، اور جانچ لیا ہے، اور اب یہ شخص تمہارا روحانی علاج یعنی تمہارے امراضِ باطنی کا علاج کرنے کا اہل ہے۔'' پس ''خلافت'' اس بات کا سرٹیفکیٹ دینا نہیں ہے کہ یہ ''تندرست'' ہے یا متبع سنت ہے، لہٰذا جب تک یہ اطمینان نہ ہوجائے کہ یہ شخص دوسروں کے علاج کے لائق ہے اور یہ شخص طالبین اور اصلاح کے لئے آنے والوں کو ان کے مزاج اور ان کی ضرورت کے مطابق ان کی حاجت کے مطابق نسخہ تجویز کرسکتا ہے، اس وقت تک یہ ''شہادت'' دینا جائز نہیں۔

ہمارے حضرات یہ خطرہ مول نہیں لیتے

بزرگوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، بعض بزرگوں کا یہ رنگ اور مزاج ہوتا ہے کہ جب اس شخص کو ہم ''خلافت'' دیدیں گے تو اللہ تعالیٰ اس کو قابل بھی بنادیں گے، لیکن ہمارے حضرات یہ خطرہ مول نہیں لیتے، ہمارے حضرات یہ کہتے ہیں کہ جب تک یہ اطمینان نہیں ہوجائے گا، اس وقت تک یہ خطرہ مول نہیں لیتے، اس لئے کہ اگر کسی نے یہ اصول تو یاد کرلیا کہ ''فلاں چیز محمود ہے، اور فلاں چیز مذموم ہے'' تو بس وہ ہر جگہ یہ اصول چلائے گا، حالانکہ اتنی بات کافی نہیں، بلکہ ایک آنے والے کو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے لئے کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں؟ لہٰذا دوسروں کی اصلاح کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

''خلافت'' کا خیال بدترین حجاب ہے

حضرت والا نے یہ بھی فرمایا کہ جب کسی شیخ کے پاس علاج کے لئے جاؤ تو بس اپنے علاج کی

طرف متوجہ رہو، اس فکر میں مت رہو کہ فلاں درجہ مجھے حاصل ہو جائے، فلاں مقام حاصل ہو جائے، بلکہ شیخ کے حکم کی تعمیل میں اور اس کی نگرانی میں نتائج اور ثمرات سے بے فکر ہو کر عمل کرتے رہو۔ بعض لوگ جب کسی شیخ کے پاس اپنی اصلاح کے لئے جاتے ہیں تو ان کے حاشیہ خیال میں یہ بات رہتی ہے کہ یہ شیخ مجھے کسی وقت ''خلافت'' دیدے گا، یہ ''خیال'' اصلاح کے راستے میں بدترین حجاب ہے، اس خیال کے ہوتے ہوئے کبھی اصلاح مکمل ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ ''اصلاح'' کا امکان ہی نہیں۔ اس لئے کہ اس صورت میں اپنی اصلاح کرانے کی نیت میں اخلاص ہی نہیں، بلکہ نیت یہ ہے کہ خاص منصب حاصل ہو جائے، گویا کہ اللہ کے لئے شیخ سے تعلق قائم نہیں کیا، اور اپنی اصلاح میں طلب صادق نہیں تھی، اور جب طلب صادق نہیں ہوتی اور اللہ کے لئے شیخ سے تعلق قائم نہیں کرتا تو شیخ کے پاس جانے کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔

لہٰذا جب کبھی شیخ کے پاس جاؤ اس خیال سے ذہن کو خالی کر کے جاؤ، صرف اپنی اصلاح کی غرض سے جاؤ، کوئی خاص درجہ حاصل کرنا مقصود ہو اور نہ کوئی مقام حاصل کرنا مقصود ہو۔

عبادت میں شوق، ولولہ، لذت مطلوب نہیں

آگے حضرت والا ایک اور ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں:

''شوق'' بمعنی ''ولولہ'' نہ بالذات مطلوب ہے، نہ شرائطِ قبول سے ہے، اخلاص کے ساتھ عمل ہونا کافی ہے، گو ''ولولہ'' نہ ہو، بلکہ طبیعت پر گرانی ہو، حدیث: اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلَى الْمَكَارِهِ،(۱) اس کی نقلی دلیل ہے، جس سے دعاء مذکورہ سے زائد یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ ایسے ''مکارہ'' سے اجر و فضل بڑھ جاتا ہے، اور عقلی حقیقت اس کی یہ ہے کہ طاعات بعض کے لئے مثل ''غذا'' کے ہیں، اور بعض کے لئے مثل ''دوا'' کے، اور ظاہر ہے کہ ''دوا'' کا نافع ہونا اس کی رغبت پر موقوف نہیں ہے، نیز ایسی حالت میں اس کا استعمال اور زیادہ ہمت اور مجاہدہ ہے، اور اس میں حکمتیں بھی ہوتی ہیں، جیسے عجب سے حفاظت، اور اپنے نقص کا مشاہدہ وغیرہا، پس عبدِ کامل کا مذہب یہ ہونا چاہئے''(۲)

---

(۱) صحیح مسلم، كتاب الطهارة، باب فضل اسباغ الوضوء على المكاره، رقم: ۳۶۹، سنن الترمذي، كتاب الطهارة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء في اسباغ الوضوء، رقم: ٤٧، سنن النسائي، كتاب الطهارة، باب الفضل في ذلك، رقم: ١٤٣

(۲) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۱۹۳

ذوق وشوق محمود ہیں، اخلاص مطلوب ہے

اس ملفوظ میں حضرت والا نے بڑا عجیب اصول بیان فرمادیا ہے، اس میں بہت سے لوگ گمراہ اور پریشان ہوجاتے ہیں، وہ یہ کہ: عبادت میں ذوق وشوق اور ولولہ، یہ نہ تو مطلوب ہے کہ آدمی اس کو اپنا مقصود بنالے کہ میرے اندر شوق اور ولولہ پیدا ہوجائے، اور جوش پیدا ہوجائے، اور نہ ہی اعمال کی قبولیت کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ جب تم جوش کے ساتھ، شوق کے ساتھ عمل کروگے تب یہ عمل قبول ہوگا، ورنہ قبول نہیں ہوگا۔ شوق کا مطلب یہ کہ نماز کے اندر آپ کو مزہ آنے لگے، اور یہ شوق پیدا ہوجائے کہ جلدی جاکر نماز پڑھو، اگر یہ شوق وذوق پیدا ہوجائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اور اچھی بات ہے، اور محمود ہے، لیکن یہ شوق مقصود بالذات نہیں، اور نہ ہی عمل کی قبولیت کے لئے شرط ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرمائیں گے کہ تو نے جو نماز پڑھی تھی وہ ذوق وشوق کے بغیر پڑھی تھی، لہٰذا تیری نماز قبول نہیں۔ اس لئے کہ نماز کی قبولیت کے لئے ''اخلاص'' شرط ہے، لہٰذا اگر عمل ''اخلاص'' کے ساتھ ہو، اور سنت کے مطابق ہو، بس یہ دو چیزیں اگر عمل کے اندر پائی جائیں گی تو مقصود حاصل ہوجائے گا، اور انشاء اللہ وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوگا، چاہے وہ عمل کتنی ہی مشقت کے ساتھ کیا تھا، اور اس عمل کے کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، سستی ہورہی تھی، لیکن آپ نے یہ سوچا نماز تو فرض ہے، جو مجھے پڑھنی ہے۔ یہ سوچ کر بلاشوق اور ذوق کے زبردستی اپنے اُوپر جبر کرکے نماز سنت کے مطابق پڑھ لی، چونکہ ''اخلاص'' تھا، اور سنت کے مطابق وہ نماز تھی، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوگی۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرمائیں گے کہ چونکہ تم نے طبیعت کی گرانی اور بدشوقی کے ساتھ نماز پڑھی، اس لئے تمہیں سزا ملنی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ چیز نہ مقصود ہے، اور نہ ہی شرائطِ قبول میں سے ہے۔

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے

البتہ نماز کے اندر ذوق وشوق اور ولولہ مطلوب ہے، اور اس کی دلیل حضورِ اقدس ﷺ کی وہ حدیث ہے کہ جس میں آپ نے فرمایا:

((جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلَاةِ)) (۱)

''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''

مطلب یہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کو نماز کے اندر وہ لطف اور وہ کیف محسوس ہوتا تھا جو دنیا

(۱) سنن النسائي، كتاب عشرة النساء، باب حب النساء، رقم: ۳۸۷۸، مسند أحمد، مسند انس بن مالك، رقم: ۱۱۸٤۵

کی کسی اور چیز میں محسوس نہیں ہوتا تھا، یہ بات آپ کو حاصل تھی، لیکن آپ نے دوسروں سے یہ نہیں فرمایا کہ جب تک نماز کے اندر تمہیں وہ کیفیت حاصل نہیں ہوگی جو کیفیت مجھے حاصل ہوتی ہے، اس وقت تک تمہاری نماز قبول نہیں ہوگی، بلکہ آپ نے دوسروں سے فرمایا:

((صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ)) (۱)

جس طرح تم مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھتے ہو اس طرح نماز پڑھ لو، بس تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

بلاشوق والا عمل ثواب میں بڑھ جاتا ہے

بعض لوگ اس فکر میں بہت زیادہ پڑے رہتے ہیں کہ نماز میں مزہ نہیں آتا، ذوق وشوق پیدا نہیں ہوتا۔ تو بھائی! مزہ مطلوب ہی کہاں ہے؟ مطلوب اور مقصود تو اللہ کی رضا ہے، اگر وہ حاصل ہو رہی ہے تو پھر مطمئن ہو جاؤ، بلکہ حضرت فرماتے ہیں کہ: بعض اوقات اجر کے اعتبار سے وہ شخص بڑھ جاتا ہے جس نے عبادت کا کوئی عمل ناگواری اور مشقت کے ساتھ کیا، اور اس کو اس عمل میں مزہ بالکل نہیں آیا، دوسرے شخص کے مقابلے میں جس کو عبادت میں بہت مزہ آیا، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اِسْبَاغُ الْوَضُوْءِ عَلَى الْمَكَارِهِ........ فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ)) (۲)

یعنی جو شخص اس وقت اچھی طرح وضو کرے جس وقت وضو کرنا طبیعت پر بہت شاق اور گراں ہو رہا ہو، اس کو جہاد کا ثواب ملتا ہے، مثلاً سخت سردی اور جاڑے کا موسم ہے، برف گر رہی ہے، پانی بہت ٹھنڈا ہے، گرم پانی کا کوئی انتظام نہیں، نماز کا وقت آ چکا ہے، اس وقت میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن جو شخص اس مشکل کے باوجود اللہ کا حکم سمجھ کر وضو کرے تو یہ ایسا عمل ہے جیسے جہاد میں رات کو سرحد پر پہرا دینا۔

اب بتایئے! اس وضو کے اندر اس کو کب مزہ آیا؟ معلوم ہوا کہ دل کی گرانی کے ساتھ عمل

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب الأذان، باب الأذان للمسافر اذا كانوا جماعة والاقامة وكذلك، رقم: ۵۹۵، سنن الدارمی، كتاب الصلاة، باب من أحق بالإمامة، رقم: ۱۲۲۵

(۲) صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب فضل اسباغ الوضوء على المكاره، رقم: ۳۶۹، سنن الترمذی، كتاب الطهارة عن رسول الله ﷺ، باب ما جاء في اسباغ الوضوء، رقم: ۴۷، سنن النسائی، كتاب الطهارة، باب الفضل في ذلك، رقم: ۱۴۳، سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ما جاء في اسباغ الوضوء، رقم: ۴۲۱

کرنے میں بعض اوقات ثواب بڑھ جاتا ہے، اس عمل کے مقابلہ میں جس کو شوق اور ذوق کے ساتھ کیا ہو، اس لئے کہ ذوق وشوق والے عمل میں تکلیف اور مشقت نہیں ہوتی۔

جس کو نماز میں مزہ نہ آئے اس کو مبارک باد

اسی لئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ "میں اس شخص کو مبارک باد دیتا ہوں جس کو ساری عمر نماز پڑھنے میں مزہ نہیں آیا، لیکن پھر بھی اللہ کا حکم بجالانے کی خاطر نماز پڑھتا رہا" اس لئے کہ اگر نماز میں مزہ آجائے، یہ اچھی بات تو ہے، لیکن اس میں خطرہ بھی ہے، وہ یہ کہ ہوسکتا ہے کہ وہ مزہ کی خاطر نماز پڑھ رہا ہو، اللہ کی رضا کے لئے نماز نہ پڑھ رہا ہو۔ لہٰذا اس بات کا اندیشہ ہے کہ "اخلاص" مفقود ہوجائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب نماز کے اندر مزہ زیادہ آنے لگتا ہے تو آدمی کے اندر عجب پیدا ہونے لگتا ہے، اور یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ "میں تو اس مقام تک پہنچ گیا" اور خود پسندی کے اندر مبتلا ہوجاتا ہے کہ میں تو اب بزرگی کے اعلیٰ مقام تک پہنچ گیا ہوں، اور اللہ والا بن گیا ہوں کہ یہ عبادات اب میری طبیعتِ ثانیہ بن گئی ہیں۔ یہ برائیاں انسان کے اندر اس مزہ کی وجہ سے پیدا ہوجاتی ہیں، اور جس بیچارے کو نماز میں مزہ ہی نہیں آرہا ہے اس کے دل میں یہ خیالات کہاں سے آئیں گے، اس کو تو یہ فکر ہوگی کہ کہیں میری نماز میرے منہ پر نہ ماردی جائے۔

ریٹائرڈ شخص کی نماز

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑی پیاری مثال دیا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ لوگ "کیفیات" کو "روحانیت" سمجھتے ہیں، یعنی عبادت میں شوق، ذوق، لطف اور مزہ آرہا ہو تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ "روحانیت" زیادہ ہے۔ یہ سب باتیں غلط ہیں، بلکہ جس عبادت میں جتنی زیادہ سنت کی اتباع ہوگی، اتنی ہی روحانیت زیادہ ہوگی۔ ان کیفیات کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر ایک مثال دیتے ہوئے فرماتے تھے کہ دو آدمی ہیں، ان میں سے ایک ریٹائرڈ ہے، اور ملازمت سے بالکل فارغ ہے، فارغ زندگی گزار رہا ہے، اور پنشن جاری ہے، اور اس پنشن سے اچھی طرح گزارا ہو رہا ہے، اولاد بھی کما رہی ہے، بچوں اور بچیوں کی شادی کر کے فارغ ہوگیا ہے، اب اس کو کسی چیز کی کوئی فکر نہیں ہے، آرام سے گھر میں فراغت کی زندگی گزار رہا ہے، وہ شخص یہ کرتا ہے کہ اذان سے پہلے ہی وضو کر کے تیار ہوگیا، اور اذان ہوتے ہی مسجد کی طرف روانہ ہوگیا، اور صف اوّل میں پہنچ گیا، اور وہاں پہنچ کر اس نے تحیۃ المسجد کے نوافل ادا کیے، اور پھر سنتیں ادا کیں، اور نماز کے انتظار میں بیٹھا ذکر کرتا رہا، اور جب

جماعت کھڑی ہوئی تو بڑے اطمینان کے ساتھ خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کی، اور پھر اطمینان سے گھر واپس آ گیا، اور دوسری نماز کے انتظار اور اس کی تیاری میں لگ گیا۔

ٹھیلے پر سامان بیچنے والے کی نماز

دوسرا آدمی ٹھیلے پر اپنا سامان بیچ کر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے، سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر آواز لگا کر اپنا سامان فروخت کرتا رہتا ہے، گھر میں دس افراد کھانے والے ہیں، ہر وقت اسی فکر میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح میرا سامان فروخت ہو جائے تو کچھ پیسے کما کر بچوں کی روٹی کا بندوبست کروں۔ اسی حالت میں اذان ہو گئی، اب گاہک اس سے سامان خرید رہے ہیں، ایک کو کچھ دے رہا ہے، دوسرے کو کچھ دے رہا ہے، لیکن اس کا دماغ اس طرف لگا ہوا ہے کہ اذان ہو چکی ہے، اور مجھے نماز پڑھنی ہے، اب وہ اپنے گاہکوں کو جلدی جلدی نمٹا رہا ہے، جب بالکل عین جماعت کا وقت ہو گیا تو اس وقت اس نے جلدی سے ٹھیلے کو ایک طرف کھڑا کیا، اور اس کے اُوپر کپڑا ڈالا، اور بھاگتا ہوا مسجد میں پہنچا، اور جلدی جلدی وضو کیا، اور جماعت میں شامل ہو گیا، اب اس وقت اس کا دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے، اور یہ خیال آ رہا ہے کہ کہیں کوئی چور ٹھیلا نہ لے جائے، کوئی سامان چوری نہ کر لے، اب اپنی طرف سے اس نے نماز کے اندر دل لگانے کی کوشش کر لی، لیکن ایسے حالات میں نماز پڑھ رہا ہے کہ ان خیالات کی طرف سے دماغ کو خالی کرنا مشکل ہے، لیکن بہرصورت، اس نے سنت کے مطابق نماز پڑھ لی، اور پھر جلدی سے سنتیں ادا کیں، اور سلام پھیر کر سیدھا اپنے ٹھیلے پر پہنچ گیا، اور کپڑا ہٹایا، اور پھر آوازیں لگانا شروع کر دیں، اور سامان بیچنا شروع کر دیا۔

روحانیت کس کی نماز میں زیادہ ہے؟

حضرت فرماتے ہیں کہ بتاؤ! ان دونوں میں سے کس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے؟ بظاہر تو یہ نظر آ رہا ہے کہ پہلا آدمی جو ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہے، جس نے بڑے اطمینان اور سکون سے نماز ادا کی تھی، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے، لیکن حقیقت میں دوسرا آدمی جو ٹھیلا لگا کر اپنا سامان فروخت کرتا تھا، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے۔ اس لئے کہ پہلے آدمی کو تو کوئی کام ہی نہیں تھا، اس لئے اس نے اپنے آپ کو نماز کے لئے اور عبادت کے لئے فارغ کر لیا تھا، لہٰذا نماز پڑھنا اس کا کوئی کمال نہیں تھا، بلکہ کمال تو اس ٹھیلے والے کا ہے کہ اس کے گھر میں دس افراد کھانے والے تھے، ان کے لئے روزی کمانی تھی، اور ٹھیلے پر گاہک سامان خریدنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے، ایسی حالت میں اذان کی آواز سن کر ٹھیلے کو ایک طرف کر کے مسجد کی طرف نماز کے لئے چلا گیا، اس کی نماز میں

زیادہ روحانیت ہے، اس لئے کہ اس نے نماز کے لئے جسمانی اور ذہنی مشقت زیادہ اٹھائی، اس مشقت کی وجہ سے اس کے عمل میں روحانیت زیادہ ہے، اور اس پر اس کو اجر بھی زیادہ ملے گا۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ اگر ذوق وشوق و ولولہ اور جذبہ ہوگا تب عبادت قبول ہوگی، ورنہ نہیں، یہ بات درست نہیں ہے۔

وہاں تعمیلِ حکم کا جذبہ دیکھا جاتا ہے

اللہ تعالیٰ کے یہاں اصل چیز جو دیکھی جاتی ہے، وہ تعمیلِ حکم کا جذبہ ہے کہ ہم نے بندے کو عبادت کا حکم دیا تھا، یہ بندہ عبادت ادا کرنے کے لئے ہمارے حکم کی تعمیل میں آگیا، اگرچہ حالات نے اس کے دل و دماغ کو منتشر کر رکھا ہے، لیکن چونکہ یہ اخلاص کے ساتھ آگیا، اور اس نے ہمارے حبیب جناب رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق عبادت انجام دے لی، بس اس کی عبادت قبول ہے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ اس ذوق وشوق کے حصول کی فکر میں مت پڑو۔

ساقی جیسے پلا دے وہ اس کی مہربانی ہے

ہاں! اگر کسی کو ذوق وشوق کی یہ نعمت میسر آجائے تو اس پر بھی وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ یا اللہ! آپ نے میری اس عبادت کو آسان فرما دیا، اور مجھے عبادت میں لطف اور مزہ بھی آنے لگا، لیکن اس لطف اور مزہ کی طلب میں بہت زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں، چنانچہ آخر میں حضرت والا نے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر لکھا ہے کہ۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم در کش
کہ آنچہ ساقیِ ما ریخت عین الطاف ست

یعنی تجھ کو یہ حق نہیں کہ تو ساقی سے یہ مطالبہ کرے کہ مجھے صاف صاف شراب دینا، اور تلچھٹ مت دینا، بلکہ ساقی جیسی شراب بھی تجھ کو دیدے، یہ اس کی عین مہربانی ہے، اب چاہے وہ صاف صاف شراب دیدے، یا تلچھٹ دیدے، لیکن دیدے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سے "عمل" کی توفیق مانگتے رہو، جب ان کی طرف سے "عمل" کی توفیق ہو جائے تو یہ ان کا کرم ہے، چاہے اس "عمل" میں مزہ آئے یا نہ آئے، لطف آئے یا نہ آئے، بس! اس پر راضی رہو کہ عمل کی توفیق ہو رہی ہے، اس سے آگے بڑھنے کی فکر مت کرو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ عبادت کے اندر شوق، ولولہ اور مزہ کا آنا مطلوب نہیں، اور عبادت کی قبولیت کی شرائط میں سے نہیں، لہٰذا اس فکر میں پڑے بغیر عبادت کو اخلاص کے ساتھ اور سنت کے مطابق کرنے کی فکر کرو، پھر اگر وہ حاصل ہو جائے تو بہت اچھا، نہ ملے تو کوئی غم نہیں۔ آج بہت بڑی مخلوق اس فکر میں پریشان رہتی ہے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں، مگر نماز میں مزہ ہی نہیں آتا۔ اس کی وجہ سے پھر اپنے اعمال کی اور اپنی عبادات کی ناقدری شروع کر دیتے ہیں، ایسا نہیں کرنا چاہئے، عبادت کے اندر دو باتوں کا ہونا کافی ہے، ایک یہ کہ اخلاص ہو، دوسرے یہ کہ سنت کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

اعمال کے دنیاوی ثمرات ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ. اَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا:

''اعمالِ صالحہ میں نفع نقد بھی ہے، صرف اُدھار ہی نہیں، ہاں! ایک اُدھار بھی ہے، یعنی ثواب، اور اس کے ساتھ ایک چیز نقد بھی ہے یعنی رَجا اور اُمید، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا وابستہ ہو جانا، جو بدون اعمالِ صالحہ کے حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح اعمالِ سیئہ کا ایک ثمرہ اُدھار ہے، اور ایک نقد ہے، اُدھار تو عذابِ جہنم ہے، اور نقد وہ وحشت، ظلمت اور بے چینی ہے، جو گناہوں کو لازم ہے''(۱)

اعمال کا ثمرہ نقد بھی، اُدھار بھی

اس ارشاد کا مقصود ایک غلط فہمی کا ازالہ ہے، وہ یہ کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ اعمال اس دنیا میں کرتے ہیں، چاہے وہ نیک اعمال ہوں یا برے اعمال ہوں، ان کا نتیجہ اور ثمرہ، اور ان کا فائدہ اور نقصان آخرت میں ظاہر ہوگا۔ اگر اعمال اچھے ہیں تو ثواب ملے گا انشاء اللہ، اگر اعمال خراب ہیں تو عذاب ہوگا۔ گویا کہ جو کچھ بھی ہے وہ اُدھار ہے، یہاں دنیا میں نقد کچھ نہیں۔

حضرت والا اس ملفوظ میں اس غلط فہمی کی تردید فرما رہے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے کہ اعمال کے تمام ثمرات اور ان کے تمام نفع نقصان اُدھار ہی ہوں، بلکہ اعمال کے کچھ ثمرات انسان کو اس دنیا میں بھی مل جاتے ہیں۔

نیک عمل کا پہلا نقد فائدہ

وہ نقد ثمرات کیا ہیں؟ اس پر فرمایا کہ نیک اعمال کا سب سے پہلا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ نیک عمل

☆ اصلاحی مجالس (۶/ ۳۰۸ تا ۳۲۰)

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۲۰۵

کرنے کے بعد انسان کو یہ اُمید ہو جاتی ہے کہ شاید اللہ تبارک وتعالیٰ اس عمل کی بدولت اپنے فضل وکرم سے اس عمل کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرما کر مجھے نواز دیں، اس کا نام "رجا" اور "اُمید" ہے، یہ نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو انسان کو حاصل ہوتا ہے۔

اپنے عمل پر نظر خود پسندی ہے

یہاں ایک باریک بات کا سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نیک عمل کرنے کی توفیق دی ہے، اگر انسان کی نگاہ اس عمل کی طرف ہو جائے، اور وہ یہ سوچے کہ مجھ سے یہ بڑا اچھا کام ہو گیا، اور اس کے نتیجے میں آدمی عجب کے اندر مبتلا ہو جائے، یا یہ سمجھے کہ بس یہ میرا نیک عمل مجھے نجات دلائے گا، اور مجھے جنت میں لے جائے گا تو یہ بڑی خطرناک بات ہے، اور اسی کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں "رؤیتِ عمل" اور "خود پسندی" کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص نماز پڑھے، اور یہ سوچے کہ میں بڑی اچھی نماز پڑھتا ہوں، اور چونکہ میں اچھی نماز پڑھتا ہوں، اس لئے میں بڑا اچھا ہوں، یا یہ سوچے کہ میری یہ نماز مجھے جنت میں لے جائے گی، یہ سوچ بڑی خطرناک ہے۔ اب ایک طرف تو حضرت والا یہ فرما رہے ہیں کہ عمل کا نقد ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ اس نیک عمل سے اُمید پیدا ہو جاتی ہے، اور دوسری طرف صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ "رؤیتِ عمل" اور "خود پسندی" ناجائز ہے، بقول کسی کے:

ہزار نکتۂ باریک تر زمو ایں جاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

یہ بہت خطرناک وادیاں اور گھاٹیاں ہیں، جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے۔

خود پسندی اور رجا میں فرق

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق کس طرح کیا جائے؟ آیا کہ یہ سوچ "خود پسندی" میں داخل ہے یا یہ "رجا" اور "اُمید" میں داخل ہے؟

دونوں کے درمیان فرق اس طرح ہے کہ اگر کسی عمل کے کرنے کے بعد طبیعت میں بشاشت اور خوشی پیدا ہوئی، اور اس بشاشت کے نتیجے میں شکر ادا کیا کہ الحمد للہ مجھے اس نیک عمل کی توفیق ہو گئی، اور یہ اُمید بندھ گئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اس عمل کی توفیق دی ہے تو اس بات کی اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے مجھے نواز دیں گے، بس اس حد تک تو یہ "رجا" ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ)) (۱)

''جب تمہیں اپنے اچھے عمل سے خوشی ہو، اور برے کام سے رنج اور تکلیف ہو تو یہ تمہارے ایمان کی علامت ہے''

ایک صحابی نے حضور اقدس ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ! بعض اوقات میں کوئی اچھا عمل کرتا ہوں، تو عمل کرنے کے بعد مجھے خوشی ہوتی ہے کہ الحمدللہ میں نے ایک اچھا عمل کیا، کیا یہ خوشی ''عجب'' اور ''تکبر'' تو نہیں ہے؟ جواب میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ)) (۲)

یعنی نیک عمل کر کے تمہیں جو خوشی حاصل ہوئی، یہ مومن کے لئے نقد خوشخبری ہے، لہٰذا گھبرانے کی بات نہیں۔

جنت فضل پر ملے گی، عمل پر نہیں

صوفیاء کرام جس کو ''رویتِ عمل'' اور ''خود پسندی'' کہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ آدمی کو نیک عمل کرنے کے بعد اپنے عمل پر یہ گھمنڈ ہو جائے کہ یہ میرا عمل اتنا اچھا ہے کہ یہ مجھے سیدھا جنت میں لے جائے گا۔ اور میرا جنت میں جانا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بنیاد پر نہیں، بلکہ میرے عمل کی ذاتی خاصیت کی بنیاد پر میں اس بات کا مستحق ہو چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کر دیں۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ ارے استحقاق کوئی چیز نہیں، تم کتنا ہی عمل کرتے رہو، مگر جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جنت کی نعمتیں غیر متناہی ہیں، اس کے آگے تمہارے عمل کی کیا حقیقت ہے؟ تم نے تو دو منٹ میں ایک عمل کر لیا، یا پانچ منٹ میں ایک عمل انجام دے دیا، اور پھر کہنے لگے کہ مجھے اس عمل کے بدلے جنت چاہئے، وہ جنت جو غیر متناہی ہے، اور جس کی نعمتیں ابدی ہیں، جن کی کوئی حد و نہایت نہیں، چار رکعات کے بدلے ایسی جنت مانگتے ہو؟ تم کتنا ہی عمل کرتے رہو پھر بھی جنت کا استحقاق نہیں ہوگا، فرض کرو کہ تم کو اسی سال کی زندگی ملی، اور تم نے اپنی پوری زندگی سجدے میں پڑے پڑے گزار دی، تو اس کا مطلب یہ ہوا تم نے زیادہ سے زیادہ اسی سال عبادت کی، اور دوسری طرف جنت کی نعمتیں، نہ سو سال، نہ ہزار سال، نہ لاکھ سال، بلکہ دائمی اور ابدی ہیں، اگر انسان ساری عمر بھی عبادت کرتا رہے تو جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوگا، لہٰذا انسان کا کوئی عمل ایسا نہیں جو انسان کو جنت کا

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، حديث أبي أمامة الباهلي، رقم: ٢١١٤٥

(۲) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب اذا أثني على الصالح فهي بشرى ولا تضره، رقم: ٤٧٨٠، مسند أحمد، حديث أبي ذر الغفاري، رقم: ٢٠٤١٦

مستحق بنادے، یہ ان کا کرم ہے کہ بعض مرتبہ وہ کہہ دیتے ہیں کہ اے بندے! تو نے چونکہ یہ عمل کیا تھا، اس لئے ہم تمہیں جنت کا مستحق بنادیتے ہیں۔

قرآن کریم کی بعض آیات میں استحقاق کی طرف اشارہ بھی فرمایا، مگر وہ استحقاق بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے پیدا کیا ہوا ہے، ورنہ عمل کے اندر اپنی ذات میں یہ طاقت نہیں کہ وہ جنت کا مستحق بناتا، ساری زندگی روزے میں گزار دو، ساری زندگی عبادت میں گزار دو، ذکر و تسبیح میں گزار دو، تب بھی استحقاق پیدا نہیں ہوگا۔

حضور ﷺ کا عمل اور جنت

اسی لئے حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ کسی انسان کا کوئی عمل اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ آپ کا بھی عمل آپ کو جنت میں نہیں لے جائے گا؟ آپ نے جواب میں فرمایا:

((لَا، إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهِ)) (۱)

"نہیں، میرا عمل بھی مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ نہ لیں"

آپ دیکھیں کہ ساری کائنات میں کسی کا بھی عمل کما اور کیفاً نبی کریم ﷺ کے عمل کے برابر تو کجا اس کا پاسنگ بھی نہیں ہوسکتا، آپ یہ فرمارہے ہیں کہ میرا عمل بھی مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ نہ لے، اس سے پتہ چلا کہ عمل سے جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا۔

نیک اعمال فضل کی علامت ہیں

البتہ اللہ تعالیٰ نے ان نیک اعمال کو اپنے فضل و کرم کی علامت بنایا ہے، یعنی اگر کوئی شخص یہ اعمال کررہا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان شاء اللہ، اللہ کا فضل اس شخص پر ہوگا، اور اس نیک عمل کے انجام پانے پر خوشی اس بات کی ہے کہ جب مجھے اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تو الحمدللہ میرے اندر وہ علامت پائی گئی جس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل، رقم: ۵۹۸۲، صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، رقم: ۵۰۳۶، سنن النسائی، کتاب الایمان، رقم: ۴۹۴۸، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، رقم: ۴۱۹۱۔

نواز دیں گے۔ لہٰذا یہ مسرت، علامت پائے جانے کی مسرت ہے، یہ اس بات کی مسرت نہیں کہ مجھ سے کوئی بہت بڑا کام انجام پا گیا ہے، جو مجھے جنت کا مستحق بنا دے گا۔

یہ باریک بات ہے، جو ذہن میں رہنی چاہئے۔

عمل سے جنت کا مستحق نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی بندہ نیک عمل کرتا ہے تو اس کو نواز دیتے ہیں، اور اس کو اپنے فضل و کرم کا مورد بنا دیتے ہیں، اور بغیر عمل کے عادۃً فضل و کرم کا مورد نہیں بناتے، اب اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ جب میرا عمل مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا تو پھر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ عمل سے جنت کا استحقاق تو پیدا ہوتا نہیں ہے، بس اللہ تعالیٰ سے بیٹھ کر مانگتے رہو کہ یا اللہ! مجھے اپنی رحمت کا مورد بنا دیجئے۔

یاد رکھیں کہ اللہ کی رحمت کا مورد بننے کے لئے اور جنت کا مستحق بننے کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی شخص عمل کرے گا تو اس کو نوازا جائے گا، لہٰذا عمل ضروری بھی ہے، اور جنت میں جانے کے لئے علتِ تامہ بھی نہیں، اور جنت کے استحقاق کے لئے بھی علتِ تامہ نہیں، بلکہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کے فضل کی ایک علامت ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا حکیمانہ ارشاد

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی حکیمانہ بات ارشاد فرمائی، فرمایا:

> ”جو شخص عمل کرتا ہے اور اس عمل کی بنیاد پر جنت کی آس لگائے بیٹھا ہے کہ اس کا یہ عمل اس کو جنت میں لے جائے گا تو وہ شخص خواہ مخواہ فضول محنت کر رہا ہے، اور جو شخص یہ آرزو کر رہا ہے کہ میں عمل کے بغیر جنت میں چلا جاؤں گا تو وہ شخص اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے“

اس لئے کہ دونوں باتیں غلط ہیں، کیونکہ کوئی بھی شخص عمل کے بغیر جنت میں نہیں جائے گا، اور تنہا عمل بھی اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک اس عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت شامل نہ ہو۔ لہٰذا عمل بھی کرنا ہے اور اس عمل کو علامتِ نجات بھی سمجھنا ہے، لیکن اس عمل کو جنت کے استحقاق کا سبب نہیں سمجھنا ہے، لہٰذا جب اللہ جل شانہ کی طرف سے نیک عمل کی توفیق ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو کہ اے اللہ! آپ کا فضل و کرم ہے کہ آپ نے مجھے اس عمل کی توفیق عطا فرما دی۔ اور یہ اُمید رکھو کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی ہے تو اس نے ہمیں

نوازنے کا ارادہ فرمایا ہے، اگر نوازنا نہ ہوتا تو نیک عمل کی توفیق نہ دیتے۔

نیک عمل کی توفیق ان کی طرف سے جواب ہے

حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں اللہ میاں کو اتنا پکارتا ہوں لیکن ان کی طرف سے کبھی جواب ہی نہیں آتا، کبھی تو جواب آتا، ہم دعا کر رہے ہیں تو انہیں پکار رہے ہیں، کبھی ذکر کے ذریعہ انہیں پکار رہے ہیں، کبھی نماز کے ذریعہ، کبھی تلاوت کے ذریعہ انہیں پکار رہے ہیں، لیکن کبھی جواب ہی نہیں آتا، یک طرفہ کاروبار ہو رہا ہے، یہ احمقانہ خیال بعض اوقات دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس خیال کا جواب دے رہے ہیں کہ ؏

گفت اے اللہ تو لبیک ما است

یعنی تجھے ہمارا نام لینے کی جو توفیق ہو رہی ہے، یہی ہماری طرف سے جواب ہے، جب تم نے ایک مرتبہ ہمارا ذکر کیا، اس کے بعد دوبارہ تمہیں ہمارا نام لینے کی توفیق ہوگئی تو یہ خود ہماری طرف سے جواب اور لبیک ہے، اگر یہ جواب نہ ہوتا تو پھر دوبارہ تمہیں ہماری بارگاہ میں آنے کی توفیق ہی نہ ہوتی، تیرا ''اللہ'' کہنا ہی ہماری طرف سے ''لبیک'' ہے، اور تمہارے پہلے ذکر کی قبولیت کی علامت ہے۔

ایک نیک عمل کے بعد دوسرے نیک عمل کی توفیق

اسی لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ایک نیک عمل کے بعد دوبارہ اسی نیک عمل کی توفیق ہو جائے تو سمجھ لو کہ پہلا عمل قبول ہو گیا، اگر پہلا عمل قبول نہ ہوتا دوسری بار عمل کی توفیق نہ ملتی۔ مثلاً ظہر کی نماز آپ نے پڑھی، اور پھر عصر کی نماز پڑھنے کی توفیق ہوگئی تو سمجھ لو کہ ظہر کی نماز قبول ہوگئی، اگر ظہر کی نماز قبول نہ ہوتی تو عصر کی نماز پڑھنے کی توفیق نہ ملتی۔ گذشتہ کل آپ نے روزہ رکھا تھا، آج پھر رکھ لیا تو سمجھ لو کہ گذشتہ کل کا روزہ قبول ہو گیا، اگر وہ روزہ قبول نہ ہوتا تو دوبارہ روزہ رکھنے کی توفیق نہ ملتی۔

بہر حال! انسان عمل کرتا رہے، عمل کرنا نہ چھوڑے، اور عمل کر کے اس بات پر خوش ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی، اور جب توفیق عطا فرمائی ہے تو انشاء اللہ نوازنے کا ارادہ بھی فرمایا ہے، بس اس سے آگے مت بڑھنا، اور یہ مت سوچنا کہ مجھ سے یہ بہت بڑا عمل ہو گیا، میں نے بڑا تیر مار لیا، اور اب میں جنت کا مستحق ہو گیا ہوں، اس لئے کہ یہ سوچنا ''رؤیتِ عمل'' اور ''خود پسندی'' ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔

بہرحال! نیک عمل کا ایک نقد فائدہ تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے ''رجا'' اور ''اُمید'' بندھ جاتی ہے۔

نیک عمل کا دوسرا نقد فائدہ

نیک عمل کا دوسرا نقد فائدہ ''تعلق مع اللہ'' کا پیدا ہونا ہے، تم جو بھی نیک عمل کرو گے، وہ نیک عمل اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ کرے گا، اور اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھائے گا، اور تمام کامیابیوں کی جڑ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا مضبوط ہونا ہے۔ مثلاً آپ نے فجر کی نماز پڑھی، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہوگیا، پھر ظہر کی نماز پڑھی تو اب تعلق میں اضافہ ہوگیا، پھر عصر کی نماز پڑھی، پھر مغرب اور عشاء پڑھی، تو ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر ایک انسان دوسرے انسان سے ملاقات کرے تو ایک حد تک تو ملاقات کرنے سے محبت بڑھتی ہے، اور تعلق میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن ایک حد ایسی آجاتی ہے کہ انسان زیادہ ملاقات کرنے سے زچ ہو جاتا ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ یہ شخص تو ہر وقت سر پر کھڑا رہتا ہے، آخر کار اس کو جھڑک دے گا کہ تو نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ لہٰذا زیادہ ملنے سے بعض اوقات ملال پیدا ہو جاتا ہے، اور اُکتاہٹ ہو جاتی ہے، اور آدمی زچ ہو جاتا ہے۔

اسی لئے حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا)) (۱)

''وقفے سے ملاقات کرو تو محبت میں اضافہ ہوگا''

تم ہی اُکتا جاؤ گے

لیکن اللہ جل شانہ کا معاملہ یہ ہے کہ جتنی مرتبہ ملاقات کرو گے، اتنا ہی تعلق میں اضافہ ہوگا، ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((إنَّ اللّٰهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوا)) (۲)

---

(۱) المعجم الكبير للطبراني (٤/٢٦)، مختار الأحاديث النبويه، ص: ٩٧

(۲) صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب أحب الدين الى الله عزوجل......الخ، رقم: ٤١، صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، رقم: ١٣٠٨، سنن النسائي، كتاب القبلة، رقم: ٧٥٤، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، رقم: ١١٦١، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، رقم: ٤٢٢٨، مسند أحمد، رقم: ٢٣١١١

''اللہ تعالیٰ تمہاری بار بار ملاقات کرنے سے نہیں اُکتاتے، حتیٰ کہ تم خود ہی اُکتا جاؤ''

لہٰذا جتنی عبادت چاہو کرو، جتنا چاہو اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھاؤ، وہ تعلق بڑھتا چلا جائے گا، اس میں ملال پیدا نہیں ہوگا، لہٰذا ہر نیک عمل اللہ تعالیٰ سے تعلق میں اضافہ کا سبب ہے، اور جتنا اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھتا جائے گا، اتنا ہی سرور اور کیف حاصل ہوگا، اتنا ہی سکون حاصل ہوگا، اور اتنا ہی گناہوں سے بچنے کی قوت پیدا ہوگی، اتنی ہی شیطان کے حملوں سے حفاظت ہوگی۔ نفس و شیطان اس وقت حملہ آور ہوتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ سے تعلق میں کمی ہوتی ہے، ایسی صورت میں کبھی نفس بہکا دیتا ہے، اور کبھی شیطان بہکا دیتا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہوگیا تو اب شیطان کمزور ہوجائے گا، اور وہ حملہ آور نہیں ہوگا۔ لہٰذا ہر نیک عمل کا نقد فائدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ کرتا ہے، دو نقد فائدے تو یہ ہوئے۔

نیک عمل کا تیسرا نقد فائدہ

تیسرے نقد فائدے کا حضرت والا نے یہاں ذکر نہیں فرمایا، لیکن دوسری جگہوں پر اس کا ذکر آیا ہے، اور خود قرآن کریم نے اس فائدے کو ذکر کیا ہے، وہ یہ کہ نیک عمل انسان کے قلب کو اطمینان، سکون اور طمانیت عطا کرتا ہے۔

((أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ)) (۱)

''اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے''

یہ اطمینان اور سکون ایسی متاع ہے کہ لاکھوں، کروڑوں خرچ کرنے سے بھی حاصل نہیں ہوتی، کہیں بازار میں یہ نہیں ملتی۔ البتہ نیک اعمال کی یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کے قلب کو سکون و طمانیت عطا کرتے ہیں، اور یہ طمانیت وہ دولت ہے کہ شاید دنیا میں اس کے برابر کوئی دولت نہ ہو۔ ایک آدمی کے پاس مال و دولت ہے، کوٹھی ہے، بنگلے ہیں، نوکر چاکر ہیں، لیکن دل میں سکون و طمانیت نہیں تو اس کے لئے یہ سب دولتیں بیکار ہیں۔ لیکن ایک دوسرا شخص ہے اس کے پاس مٹی کا گھر ہے، جھونپڑی ہے، لیکن دل میں اطمینان اور سکون ہے، تو یہ دوسرا شخص پہلے والے شخص سے ہزار درجہ بہتر ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر میں اپنی عبادت میں سکون کی خاصیت رکھی ہے، اور یہ نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو اس دنیا میں حاصل ہوتا ہے۔

---

(۱) الرعد: ۲۸

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ

چنانچہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اگر دنیا کے بادشاہوں کو پتہ لگ جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیسی لذت اور سکون والی زندگی عطا فرما رکھی ہے تو وہ بادشاہ تلواریں سونت کر ہم سے یہ دولت چھیننے کے لئے آجائیں کہ یہ ہمیں دو، لیکن ان بیوقوفوں کو یہ پتہ نہیں کہ یہ دولت اس طرح تلواروں کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ دولت تو اللہ جل شانہ کی بارگاہ سے حاصل ہوتی ہے، اس کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے حاصل ہوتی ہے''

بہر حال! یہ سکون کا حاصل ہونا نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو دنیا ہی میں حاصل ہو جاتا ہے۔

نیک عمل کا چوتھا فائدہ

نیک عمل کا چوتھا فائدہ یہ ہے کہ ایک نیک عمل دوسرے نیک عمل کا ذریعہ بنتا ہے، جب تم ایک نیک عمل کرو گے تو وہ تمہیں دوسرے نیک عمل کی طرف کھینچے گا۔ گناہ کی خاصیت یہ ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کی طرف کھینچتا ہے، اسی طرح جب تم نے ایک نیک عمل کیا تو تمہیں دوسرے نیک عمل کی توفیق ہو جائے گی۔

بہر حال! نیک عمل کے یہ چار نقد فائدے ہیں، جو انسان کو دنیا ہی میں مل جاتے ہیں۔

گناہوں کا پہلا نقصان

آگے فرمایا کہ اسی طرح اعمالِ سیئہ کا ایک ثمرہ اُدھار ہے، اور ایک نقد۔ یعنی گناہوں کا ایک نتیجہ تو اُدھار ہے، جو آخرت میں ملے گا، وہ ہے عذابِ جہنم، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، اور گناہوں کا نقد نتیجہ وحشت، ظلمت اور بے چینی ہے، جو گناہوں کو لازم ہے، یعنی گناہوں کے اندر بے چینی اور ظلمت اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہے، کسی کا مذاق ہی بگڑ جائے، اور ذائقہ ہی خراب ہو جائے تو اس کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ ظلمت ہے اور بے چینی ہے، بلکہ وہ اس کو مزیدار سمجھتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ ظلمت اور بے چینی ہے، اور اس کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

گناہوں کی لذت کی مثال

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے گناہوں کی لذت کی ایک بہترین مثال بیان فرمائی کہ گناہوں کی لذت

ایسی ہے جیسے کسی کو خارش کی بیماری ہو تو اس کو کھجانے میں مزہ آئے گا، یہاں تک کہ لوگوں نے کہہ دیا کہ دنیا میں دو ہی چیزوں میں مزہ ہے ''یا کھاج میں یا راج میں''

یعنی یا تو کھجانے میں مزہ آتا ہے، یا راج اور حکومت کرنے میں مزہ آتا ہے، کھجانے میں اتنی لذت ہے کہ اس کو حکومت کے ساتھ ملا کر ذکر کیا، اور واقعۃً جب انسان کو خارش ہو تو کھجانے میں اتنا مزہ آتا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں، اس سے بچنا مشکل ہوتا ہے، لیکن جب کھجانا چھوڑا تو اب اس جگہ پر مرچیں لگنی شروع ہو گئیں، اور وہ بیماری اور بڑھ گئی، پھر دوبارہ کھجایا تو پھر مزہ آیا، لیکن بیماری اور بڑھ گئی، اس طرح کھجانے کے نتیجے میں بیماری بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہی معاملہ گناہوں کا ہے کہ گناہ کرنے سے لذت آتی تو ہے لیکن وہ لذت بالآخر ٹیسیں، ظلمت اور بے چینی چھوڑ جاتی ہے۔

جب فطرت ہی بگڑ جائے تو!

ہاں! اگر کسی کی فطرت ہی بگڑ جائے تو پھر اس کو گناہ کے بعد بے چینی اور ظلمت محسوس نہیں ہوتی، جیسے اگر کسی کو بدبو کا احساس ہی ختم ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو بدبو کے اندر کھڑا ہونے میں مزہ آتا ہے، میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک جگہ پر کوڑے کا ڈھیر تھا، اور اس کوڑے میں سے شدید بدبو اُٹھ رہی تھی، کہ قریب سے گزرنا مشکل تھا۔ لیکن ایک آدمی جو پاگل تھا، وہ اس کوڑے کے ڈھیر کے درمیان میں کھڑا ہے، اور ایک کتا جو ایک بوٹی اُٹھا کر لے جا رہا تھا، اس شخص نے اس کتے سے وہ بوٹی چھین لی، اور اس پر فاتحانہ خوشی کا اظہار کر رہا تھا کہ میں کامیاب ہو گیا، اور فاتحانہ انداز میں قہقہے لگا رہا تھا، اس شخص کو کوئی بدبو نہیں آ رہی تھی، کیوں؟ اس لئے کہ اس کی حس مٹ چکی تھی، اور اس کی حس خراب ہو گئی تھی، اس نتیجے میں یہ مردار اور یہ گندگی اس کو دولت معلوم ہو رہی تھی۔

جب تقویٰ کی حس مٹ جائے

اسی طرح جب انسان کے اندر سے ایمان کی اور تقویٰ کی حس مٹ جاتی ہے تو مذاق خراب ہو جاتا ہے، اور پھر آدمی گناہوں کو بھی لذت کی چیز سمجھتا ہے، اور پھر اس کو گناہوں کے اندر نہ ظلمت محسوس ہوتی ہے اور نہ وحشت محسوس ہوتی ہے، اور اللہ بچائے، یہ بڑی خطرناک بات ہے، اس لئے کہ حقیقت یہ ہے کہ گناہوں کے اندر ظلمت اور بے چینی ہے، اور وحشت ہے، لہٰذا گناہوں کا نقد نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گناہ کرنے کے بعد سکونِ قلب حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان لوگوں کو دیکھو جن کو دنیا کے اندر دولت، عزت، شہرت اور آرام کے اسباب میسر ہیں، اس کے باوجود وہ خودکشی کر رہے ہیں، کیوں خودکشی کر رہے ہیں؟ اگر پیسے نہ ہوتے اور پھر خودکشی کرتے تو ایک بات تھی، سب کچھ ہونے کے

باوجود جو خودکشی کررہے ہیں، وہ اس لئے کہ دل میں سکون میسر نہیں۔

گناہوں کا دوسرا نقد نقصان

گناہوں کا دوسرا نقد نقصان یہ ہے کہ یہ انسان کی عقل خراب کردیتا ہے، گناہ انسان کے سامنے اچھائی کو برائی، اور برائی کو اچھائی بنا کر پیش کرتا ہے، یہ بھی ظلمت ہی کا ایک حصہ ہے، اور یہ بھی گناہ کا نقد نقصان ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں گناہوں سے بھی اور گناہوں کے نقصانات سے بھی محفوظ فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

عمل کے بعد مدد آئے گی☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

عَنْ أَبِيْ ذَرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى مَنْ عَمِلَ حَسَنَةً فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا، وَمَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَجَزَآءُ مِثْلِهَا أَوْ أَغْفِرُهُ، وَمَنْ عَمِلَ قُرَابَ الْأَرْضِ خَطِيْئَةً ثُمَّ لَقِيَنِيْ لَا يُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا جَعَلْتُ لَهُ مِثْلَهَا مَغْفِرَةً، وَمَنِ اقْتَرَبَ إِلَيَّ شِبْرًا اقْتَرَبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا، وَمَنِ اقْتَرَبَ إِلَيَّ ذِرَاعًا اقْتَرَبْتُ إِلَيْهِ بَاعًا، وَمَنْ أَتَانِيْ يَمْشِيْ أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً)) (۱)

نیکی اور بدی کی جزا

یہ حدیث حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہ درویش صفت صحابی تھے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ یہ حدیث قدسی ہے، ''حدیث قدسی'' اس کو کہتے ہیں کہ جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی کوئی بات نقل فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

> ''جو شخص اس دنیا میں کوئی نیک عمل کرتا ہے تو میں اس کو اس نیک عمل پر دس گنا اجر و ثواب دیتا ہوں، اور جو شخص برائی یا گناہ کرتا ہے تو اس کی سزا اتنی ہی دیتا ہوں جتنا اس نے ناجائز کام کیا، گناہ کی سزا دوگنی بھی نہیں کرتا، بلکہ گناہ کے برابر سزا دیتا ہوں یا معاف کر دیتا ہوں''

ہر نیکی کا ثواب دس گنا

اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ تم کوئی بھی نیکی کرو تو اس کا دس گنا ثواب میرے پاس تیار ہے، اور

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۱۲۱ تا ۱۴۵) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) كتاب الزهد، عبدالله بن مبارك، (۱/۳٦٦)، شعب الايمان للبيهقي، رقم: ۱۰٤۳ (۲/۱۷)، مسند أحمد، رقم: ۲۰۳۹۸

نیکی کے اس ثواب کا وعدہ کسی مخلوق کی طرف سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے، اور اس ثواب کو کسی خاص نیکی کے ساتھ مخصوص نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا کہ وہ کسی بھی قسم کی نیکی ہو، چاہے وہ عبادت فرض ہو یا نفل ہو، یا ایک مرتبہ ''سبحان اللہ'' کہنا ہو، یا ایک مرتبہ ''الحمد للہ'' کہنا ہو، ان سب کا ثواب دس گنا دینا لازم ہے۔

رمضان اور شوال کے روزوں کا ثواب

یہ شوال کا مہینہ ہے اور اس مہینے میں ''شش عید'' کے روزے رکھے جاتے ہیں۔

حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص رمضان کے بعد ماہِ شوال میں چھ روزے رکھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کو سارے سال روزے رکھنے کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ (۱)

یہ سارے سال روزے رکھنے کا ثواب اسی اصول پر مبنی ہے کہ ہر نیکی کا ثواب دس گنا دیا جائے گا، لہٰذا رمضان المبارک کے تیس روزے ہوئے، چاہے رمضان انتیس دن کا ہوا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں تیس ہی شمار ہوتے ہیں، کیونکہ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((شَهْرَا عِيْدٍ لَا يَنْقُصَانِ رَمَضَانُ وَ ذُوْ الْحَجَّةِ)) (۲)

یعنی عید کے دونوں مہینے کم نہیں ہوتے، اگر انتیس ہوں تب بھی تیس ہی شمار ہوتے ہیں۔

بہرحال! رمضان کے تیس روزے ہوئے اور چھ روزے شوال کے ہوئے، اس طرح کل چھتیس روزے ہو گئے، چھتیس کو دس سے ضرب دیا جائے تو تین سو ساٹھ ہو جائیں گے، اور سال کے تین سو ساٹھ دن ہوتے ہیں، اس طرح ان چھتیس روزوں کے بدلے اللہ تعالیٰ سارے سال روزے رکھنے کا ثواب عطا فرما دیتے ہیں۔ ہر نیکی کا یہی حال ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نیکی کا دس گنا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب استحباب صوم ستة أيام من شوال اتباعا لرمضان، رقم: ۱۹۸٤، سنن الترمذى، كتاب الصوم عن رسول الله، باب ما جاء فى صيام ستة أيام من شوال، رقم: ٦٩٠، سنن أبى داؤد، كتاب الصوم، باب فى صوم ستة أيام من شوال، رقم: ۲۰۷۸، سنن ابن ماجه، كتاب الصيام، باب صيام ستة أيام من شوال، رقم: ۱۷۰۵، مسند أحمد، رقم: ۱۳۷۸۳

(۲) صحيح البخارى، كتاب الصوم، باب شهرا عيد لا ينقصان، رقم: ۱۷۷۹، صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب بيان معنى قوله شهرا عيد لا ينقصان، رقم: ۱۸۲۲، سنن الترمذى، كتاب الصوم عن رسول الله، باب ما جاء شهرا عيد لا ينقصان، رقم: ٦٢٨، سنن أبى داؤد، كتاب الصوم، باب الشهر يكون تسعا وعشرين، رقم: ۱۹۸۷، سنن ابن ماجه، كتاب الصيام، باب ما جاء فى شهرى العيد، رقم: ١٦٤٩

برائی کا بدلہ ایک گنا

برائی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اتنی ہی سزا دوں گا جتنی اس نے برائی کی ہے (اس کو بڑھایا نہیں جاتا) یا معاف ہی کر دوں گا۔ یعنی اگر بندہ نے توبہ کر لی، استغفار کر لیا، اور اللہ تعالیٰ کے حضور ندامت کا اظہار کر لیا کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف فرما، تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما دے گا۔ اس طرح اس برائی کی ایک گنا سزا بھی ختم ہو جائے گی۔

کراماً کاتبین میں ایک امیر دوسرا مامور

میں نے اپنے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس اللہ سرہ سے ایک حدیث سنی، البتہ کسی کتاب میں یہ حدیث نہیں دیکھی، کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے مقرر فرمائے ہیں، ایک نیکیاں لکھتا ہے اور دوسرا گناہ لکھتا ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں فرشتوں میں یہ انتظام فرمایا ہے کہ نیکی لکھنے والے فرشتے کو بدی لکھنے والے فرشتے کا امیر مقرر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ جب دو آدمی کسی کام پر جائیں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں، اس لئے ایک فرشتے کو دوسرے کا امیر بنادیا، اور جب انسان کوئی نیکی کرتا ہے تو نیکی لکھنے والا فرشتہ فوراً اس نیکی کو اس کے نامۂ اعمال میں لکھ لیتا ہے، لیکن جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو بدی لکھنے والا فرشتہ فوراً اس بدی کو نہیں لکھتا، بلکہ وہ اپنے امیر سے یعنی نیکی لکھنے والے فرشتے سے پوچھتا ہے کہ اس بندے نے یہ بدی کی ہے، اس کو لکھوں یا نہ لکھوں؟ وہ فرشتہ کہتا ہے کہ ذرا ٹھہر جاؤ، ہوسکتا ہے کہ یہ توبہ کر لے، استغفار کر لے، اگر اس نے توبہ کر لی تو پھر لکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر پوچھتا ہے کہ اب لکھوں؟ وہ فرشتہ کہتا ہے کہ ذرا ٹھہر جاؤ، شاید یہ توبہ کر لے۔ پھر جب تیسری مرتبہ وہ فرشتہ پوچھتا ہے اور بندہ توبہ نہیں کرتا تو اس وقت نیکی والا فرشتہ کہتا ہے کہ اب توبہ کی اُمید نہیں ہے، اب لکھ لو، چنانچہ وہ بدی والا فرشتہ اس گناہ کو اس کے نامۂ اعمال میں لکھ لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ عذاب دینا نہیں چاہتے

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتے کہ کسی بندے کو عذاب دیں، قرآن کریم میں عجیب انداز سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ﴾ (۱)

(۱) النسآء: ۱۴۷

''یعنی اگر ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟''

لہٰذا اللہ تعالیٰ تو عذاب دینا نہیں چاہتے، لیکن کوئی بندہ نافرمانی پر کمر ہی باندھ لے اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے پر تل جائے تو اس کے بعد اس کو عذاب دیا جاتا ہے۔ اور پھر آخر وقت تک اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے کہ موت سے پہلے جب بھی توبہ کرلوگے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔

بندوں کو معاف کرنے کا قاعدہ

بہر حال! فرمایا کہ جو کوئی نیکی کرے گا اس کو دس گنا اجر و ثواب دیا جائے گا اور جو برائی کرے گا اس کو صرف ایک گنا سزا دی جائے گی یا میں اس کو بھی معاف کر دوں گا۔ پھر اس حدیثِ قدسی میں معاف کرنے کا قاعدہ بیان فرمایا:

((وَمَنْ عَمِلَ قُرَابَ الْأَرْضِ خَطِيئَةً ثُمَّ لَقِيَنِي لَا يُشْرِكُ بِي شَيْئًا جَعَلْتُ لَهُ مِثْلَهَا مَغْفِرَةً))

''یعنی جو شخص ساری زمین بھر کر گناہ کرلے اور پھر میرے پاس آجائے بشرطیکہ اس نے میرے ساتھ شرک نہ کیا ہو تو میں اس کو اتنی ہی مغفرت عطا کر دوں گا جتنے اس کے گناہ تھے''

یعنی ایک شخص گناہوں سے ساری زمین بھر دے اور پھر میرے سامنے ندامت اور شرمندگی کے ساتھ توبہ کرنے اور استغفار کرنے کے لئے آجائے تو میں اس کو معاف کر دوں گا۔ اس کے ذریعہ معاف کرنے کا قاعدہ بتا دیا کہ معافی کا یہ دروازہ ہم نے کھول رکھا ہے اور مرتے دم تک جب تک نزع کی حالت طاری نہیں ہوتی، اس وقت تک یہ دروازہ کھلا رہے گا، آجاؤ آجاؤ! کتنے بھی دور چلے گئے ہو، تب بھی ہمارے پاس آجاؤ،، ایک مرتبہ سچے دل سے اپنے گناہوں سے تائب ہو جاؤ، توبہ کرلو، تو ہم تمہیں معاف کر دیں گے، اور صرف یہ نہیں کہ ان گناہوں پر سزا نہیں ملے گی بلکہ نامۂ اعمال سے مٹا دیئے جائیں گے گویا کہ وہ گناہ کیے ہی نہیں تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھئے۔

اسی لئے ایک حدیثِ قدسی میں حضورِ اقدس ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ غَضَبِيْ)) (۱)

''میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی''

پھر اسی کو اللہ تعالیٰ نے قانون بنا دیا۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالی بَلْ هُوَ قُرْآنٌ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

گناہوں سے توبہ واستغفار کریں

اور یہ قانون اس لئے بنادیا کہ ہم اسی قانون سے فائدہ اُٹھالیں اور توبہ واستغفار کرلیں۔ توبہ و استغفار کی اہمیت کو سمجھیں!

حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اِنِّیْ لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ کُلَّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّةً))

''میں اللہ تعالیٰ سے روزانہ ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں''(۱)

حالانکہ آپ ﷺ گناہ سے معصوم ہیں، آپ ﷺ سے گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا، پھر بھی استغفار فرما رہے ہیں، کیوں؟ تاکہ ہمیں توبہ اور استغفار کا سبق سکھائیں کہ جب میں استغفار کررہا ہوں تو تم بھی استغفار کرو، صبح وشام کثرت سے استغفار کرو۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت

اس حدیث قدسی کا اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((مَنِ اقْتَرَبَ اِلَیَّ شِبْرًا اقْتَرَبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا، وَمَنِ اقْتَرَبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا اقْتَرَبْتُ اِلَیْهِ بَاعًا، وَمَنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً))

''یعنی جو بندہ میرے قریب ایک بالشت آتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب چلا جاتا ہوں اور جو بندہ ایک ہاتھ میرے قریب آتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب چلا جاتا ہوں، اور جو بندہ میری طرف پیدل چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں''

اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اندازہ لگائیں! گویا کہ فرمایا کہ تم میرے جتنا قریب آنے کی کوشش کروگے تو میں اس سے کئی گنا زیادہ تمہارے قریب آجاؤں گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مَجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ، رقم: ٦٩٩٨، صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی رحمة اللّٰه ...... الخ، رقم: ٤٩٤٠، مسند أحمد، مسند أبی هریرة، رقم: ٦٩٩٨

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب استغفار النبی فی الیوم واللیلة، رقم: ٥٨٣٢، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والأستغفار، باب استحباب الاستغفار والاستکثار منه، رقم: ٤٨٧٠، سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللّٰه، باب ومن سورة محمد، رقم: ٣١٨٢، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب فی الاستغفار، رقم: ١٢٩٤

قربِ خداوندی کی مثال

اس حدیث میں فرمایا کہ جو بندہ میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ اس بات کو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی پیاری مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے، فرمایا کہ اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک چھوٹا بچہ ہے جس کو چلنا نہیں آتا، باپ یہ چاہتا ہے کہ میں اس کو چلنا سکھاؤں، تو باپ دور کھڑے ہو کر اس بیٹے کو اپنی طرف بلاتا ہے کہ بیٹا میرے پاس آؤ، اب اگر وہ بچہ دور ہی کھڑا رہے گا اور ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھائے گا تو باپ اس سے دور ہی رہے گا، لیکن اگر وہ بچہ ایک قدم بڑھاتا ہے اور چلنا نہ جاننے کی وجہ سے جب وہ گرنے لگتا ہے تو باپ اس کو گرنے نہیں دیتا بلکہ باپ دوڑ کر اس کے قریب جاتا ہے اور اس کو گود میں اُٹھا لیتا ہے تاکہ وہ گرنے نہ پائے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور گرنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم اس کو گرنے نہیں دیں گے، بلکہ آگے بڑھ کر اس کو اُٹھا لیں گے، لہٰذا یہ اللہ کے راستے میں چلنے والوں کے لئے بشارت ہے۔

نوازش کا ایک بہانہ

یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بہانہ ہے، اللہ تعالیٰ تو یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ بندہ ہماری طرف چلنا چاہ رہا ہے یا نہیں؟ یہ بندہ اپنے حصے کا کام کر رہا ہے یا نہیں؟ اگر وہ بندہ اپنے حصے کا اتنا کام کر رہا ہے جو اس کی قدرت اور استطاعت میں ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کی تکمیل خود فرما دیتے ہیں اور پھر اللہ کے راستے میں چلتے ہوئے بندہ لڑکھڑا جائے اور گر جائے تو اس کی بھی پرواہ نہ کرے۔

ایک بہت بڑا دھوکہ

لہٰذا جو بات اس حدیث میں دیکھنے کی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کونسا بندہ میری طرف بڑھتا ہے اور میری طرف آنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اگر کوئی بندہ کوشش ہی نہ کرے تو اس کے لئے پھر کوئی وعدہ نہیں ہے۔

قوم اس غفلت میں اور اس انتظار میں پڑی ہوئی ہے کہ کوئی لطیفۂ غیبی سامنے آئے اور وہ ہمیں زبردستی نیکی اور تقویٰ کے مقام تک پہنچا دے، چنانچہ بعض لوگ جب کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے ہیں اور اس سے اصلاحی تعلق قائم کر لیتے ہیں تو وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اب ہمیں کچھ کرنا نہیں

پڑے گا، بلکہ اس شیخ کے پاس ایسی غیبی طاقت ہے جس کے ذریعہ وہ ہمیں اُٹھا کر جنت میں پہنچا دے گا۔

عمل خود کرنا پڑے گا

یاد رکھئے! یہ بہت بڑا دھوکہ ہے، کوئی بھی کسی کو اُٹھا کر جنت میں نہیں پہنچائے گا، بلکہ ہر انسان کو خود ہی چل کر جنت میں جانا ہوگا اور جنت میں لے جانے والے اعمال خود ہی کرنے پڑیں گے، البتہ اللہ تعالیٰ نے اتنا وعدہ فرمالیا کہ اگر تم تھوڑا سا چلو گے تو میں تمہیں اس سے کہیں زیادہ اپنا قرب عطا کروں گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۱)

''جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں تو ہم ان کے ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے جاتے ہیں''

اس لئے یہ سمجھنا کہ کچھ کیے بغیر بیٹھے بیٹھے کام بن جائے گا، یا کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھنے سے کام بن جائے گا، یا یہ سمجھنا کہ صرف تمناؤں اور آرزوؤں سے جنت مل جائے گی، یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔ لہٰذا تم عمل کرو، چاہے تمہارا وہ عمل نامکمل اور ادھورا ہی سہی، ناقص ہی سہی، لیکن عمل کرو اور اس عمل کو جاری رکھو، پھر اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی وقت تمہیں کھینچ لیں گے۔ اور اس ناقص عمل کی بے قدری مت کرو، اگر ناقص عمل کی بھی توفیق ہوگئی ہے تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اس لئے کہ انشاء اللہ یہ ناقص عمل بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھینچ لینے کا ذریعہ بن جائے گا۔

طلب اور کوشش شرط ہے

لہٰذا اس حدیث سے یہ سبق ملا کہ ہمت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ اپنے شیخ سے جا کر کہتے ہیں کہ حضرت! کوئی ایسا طریقہ بتا دیجئے جس کے ذریعہ عمل ہو جایا کریں اور گناہ چھوٹ جایا کریں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یاد رکھئے! ایسا طریقہ کسی شیخ کے پاس نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو آج دنیا میں کوئی کافر نہ ہوتا، انبیاء علیہم السلام جب دنیا میں تشریف لاتے تھے تو ان کی عین خواہش ہوتی تھی کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں اور سب لوگوں کی اصلاح ہو جائے، تو اگر کوئی ایسا نسخہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام اس نسخے کو ضرور استعمال کرتے اور ایک چھومنتر کرتے یا ایک نظر ڈالتے اور سب لوگ مسلمان ہو جاتے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اگر کسی شخص

(۱) العنکبوت: ٦٩

سے جب تک کچھ نہ کچھ عمل نہ ہو اس وقت تک نبی کی زیارت بھی فائدہ نہیں دیتی، دیکھئے ابوجہل نے اور ابولہب نے بھی حضور اقدس ﷺ کی زیارت کی، لیکن چونکہ اندر طلب نہیں تھی، عمل اور عزم نہیں تھا، اس لئے اس زیارت نے بھی فائدہ نہیں دیا۔

معجزہ میں نبی کے عمل کا دخل

اور یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر معجزات ظاہر فرماتے ہیں، یہ معجزات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں، لیکن ہر معجزہ میں یہ نظر آئے گا کہ کچھ نہ کچھ عمل اس نبی سے ضرور کروایا گیا، مثلاً احادیث شریف میں کئی واقعات ایسے آئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معجزہ کے طور پر آپ ﷺ کی برکت سے کھانے میں یا پانی میں برکت ہوگئی۔

غزوۂ احزاب کے موقع پر ایک صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے چہرے پر بھوک کے آثار دیکھے تو وہ گھر گئے اور بیوی سے کہا "میں نے حضور اقدس ﷺ کے چہرۂ انور پر بھوک کے آثار دیکھے ہیں، کچھ کھانا ہو تو تیار کرلو"

بیوی نے کہا "تھوڑا کھانا ہے، دو چار آدمیوں کے لئے کافی ہو جائے گا، اس لئے آپ چپکے سے حضور اقدس ﷺ کو اور آپ کے ساتھ ایک دو حضرات کو دعوت دیں، مجمع میں سب کے سامنے دعوت نہ دیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادہ افراد آجائیں اور یہ کھانا ناکافی ہو جائے"

چنانچہ خاتون نے کھانے کی ہانڈی پکانے کے لئے چولہے پر رکھ دی، اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور چپکے سے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ! گھر پر آپ کے لئے کچھ کھانا تیار کیا ہے، آپ اور آپ کے ساتھ دو چار حضرات تشریف لے آئیں"

جب آپ نے یہ سنا تو آپ نے پورے لشکر کو دعوت دے دی کہ چلو، جابر کے یہاں دعوت ہے۔

اب حضرت جابر رضی اللہ عنہ پریشان ہوئے کہ کھانا تو صرف دو چار آدمیوں کا ہے اور آپ نے سارے لشکر کو دعوت دے دی، اور بیوی نے کہا تھا کہ چپکے سے دعوت دینا، اب پورا لشکر چلا آرہا ہے۔ جب گھر کے اندر گئے تو بیوی کو بتایا کہ یہ تو پورا لشکر آگیا ہے۔ ان کی بیوی پہلے تو ناراض ہوئیں اور ان کو کہا "بِكَ وَبِكَ" تمہارا ایسا ہو اور ویسا ہو! تم نے چپکے سے حضور ﷺ سے نہیں کہا ہوگا۔

انہوں نے کہا کہ میں نے چپکے سے کہا تھا، لیکن حضور اقدس ﷺ نے سب کو دعوت دے دی، وہ خاتون بھی تو آخر صحابیہ تھیں، چنانچہ ان خاتون نے کہا کہ اگر تم نے حضور ﷺ سے یہ کہہ دیا تھا کہ چند آدمیوں کا کھانا ہے، پھر بھی آپ ﷺ نے سارے لشکر کو دعوت دیدی تو پھر مجھے کوئی خوف نہیں،

اس لئے کہ پھر حضور ﷺ ذمہ دار ہیں۔

جب حضور ﷺ تشریف لائے تو آپ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جاؤ بیوی سے کہہ دو کہ ہانڈی سے کھانا نکال کر دیتی جائیں اور ہانڈی کو چولہے پر چڑھی رہنے دیں۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سارا لشکر کھانے کے لئے بیٹھ گیا اور میں کھانا لا کر ان کو کھلاتا رہا، لیکن وہ ہانڈی ختم ہی نہیں ہوتی تھی، یہاں تک کہ پورے لشکر نے سیر ہو کر کھانا کھالیا۔ یہ صرف تین چار آدمیوں کا کھانا تھا لیکن پورے لشکر کو کافی ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ کے دستِ مبارک پر یہ معجزہ ظاہر فرمایا۔ (۱)

کھانا تم پکاؤ، برکت ہم ڈالیں گے

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ معجزہ اس طرح بھی تو ظاہر ہو سکتا تھا کہ کوئی ہانڈی ہی نہ ہوتی، کوئی سالن ہی نہ ہوتا، اور اللہ تعالیٰ غیب سے کھانا بھیج دیتے۔ لیکن اس طرح معجزہ ظاہر نہیں کیا گیا، بلکہ اس طرح ظاہر کیا گیا کہ کھانا تم پکاؤ، اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو، پھر ہم اس تھوڑے کھانے میں برکت ڈال دیں گے اور اس کے اندر اضافہ کر دیں گے۔ اس کے ذریعہ یہ سبق دے دیا کہ اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ عمل کرنا ہے، تبھی معجزہ ظاہر ہوگا، تمہارے عمل کے بغیر معجزہ بھی ظاہر نہیں ہوگا۔

پانی میں برکت کا واقعہ

غزوۂ تبوک میں آپ ﷺ تشریف لے جا رہے تھے، پانی کی قلت تھی، لشکر بڑا تھا، پیاس لگی ہوئی تھی اور پانی نہیں مل رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ فلاں مقام پر راستے میں ایک چشمہ آئے گا، جب وہ چشمہ آجائے تو مجھے اطلاع کریں اور میری اجازت کے بعد لشکر اس چشمے سے پانی پی لے۔ چنانچہ راستے میں چشمہ آیا، اس چشمہ میں تھوڑا سا پانی تھا جس کو چند افراد پی سکتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اس چشمہ کے پانی میں ڈالا اور پھر فرمایا کہ اب لشکر اس پانی کو استعمال کرے، چنانچہ سارا لشکر اس پانی سے سیراب ہوگیا۔ (۲)

یہاں بھی اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو ویسے ہی آسمان سے پانی نازل فرما دیتے، یا کوئی اور ایسا طریقہ ہو جاتا جس کے ذریعے سب سیراب ہو جاتے، لیکن ایسا نہیں کیا، بلکہ پہلے یہ حکم دیا کہ چشمہ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب، رقم: ۳۷۹۰۔ البداية والنهاية (۹۷/۴)، حياة الصحابة (۲۵۲/۲ تا ۲۵۳)

(۲) البداية والنهاية (۱۰۰/۱)

تلاش کرو اور اس کے ذریعہ تھوڑا سا پانی تم اپنے عمل سے حاصل کرو اور پھر اپنا ہاتھ اس کے اندر داخل کرو، اس کے بعد اس کے اندر ہم برکت ڈالیں گے۔ اس واقعہ کے ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ نے یہ سبق دیدیا کہ اپنا عمل کرنا شرط ہے، جب تک آدمی اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلائے گا اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی مدد کا وعدہ نہیں۔

یدِ بیضاء کا معجزہ

انبیاء علیہم السلام کے تمام معجزات میں یہ نظر آتا ہے کہ ہر نبی سے تھوڑا عمل ضرور کرایا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ''یدِ بیضاء'' کا معجزہ دیا گیا، ان سے فرمایا کہ اپنا ہاتھ بغل میں داخل کر کے پھر نکالو، جب نکالا تو وہ ہاتھ چمکنے لگا۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ بغل میں ہاتھ داخل کیے بغیر چمکنے لگتا، لیکن فرمایا کہ تھوڑا سا عمل تم کرو کہ اس ہاتھ کو بغل میں لے جاؤ، جب تم اس کو نکالو گے تو ہم اس کو چمک دار بنادیں گے۔

جب معجزات میں یہ بات ہے کہ نبی سے کچھ نہ کچھ عمل ضرور کرایا گیا تو دوسری چیزوں میں یہ اصول بطریق اولیٰ پایا جانا ضروری ہے کہ اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ عمل ضرور کرنا ہے، جب اپنا عمل کرلو گے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت اور مدد آئے گی۔ اس لئے قدم بڑھانے کی ضرورت ہے، اگر آدمی دور ہی سے اپنے اوپر ہوا سوار کر کے بیٹھ جائے اور یہ کہنے لگے کہ آج تو زمانہ خراب ہے، حالات خراب ہیں، ماحول خراب ہے، اور اس کی وجہ سے آدمی پھر ہاتھ پاؤں ہلانا چھوڑ دے تو پھر کچھ نہیں ہوسکتا۔

جب چلو گے تو راستہ کھلتا چلا جائے گا

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس کی ایک مثال دیا کرتے تھے جو یاد رکھنے کی ہے۔ فرماتے تھے کہ اگر تم کسی لمبی اور سیدھی سڑک پر کھڑے ہو اور اس سڑک کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں ہوں، اب اگر یہاں کھڑے کھڑے سڑک کو دیکھو گے تو یہ نظر آئے گا کہ آگے چل کر درخت کی قطاریں آپس میں مل گئی ہیں اور آگے راستہ بند ہے۔ اب اگر کوئی احمق یہاں کھڑے ہو کر کہے کہ آگے چونکہ راستہ بند ہے، اس لئے اس راستے پر چلنا فضول ہے، اور وہ آگے قدم نہ بڑھائے تو وہ احمق ساری عمر وہیں کھڑا رہے گا اور کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ لیکن اگر وہ چلنا شروع کرے گا تب اس کو پتہ چلے گا کہ درحقیقت راستہ بند نہیں تھا بلکہ میری نگاہ دھوکہ دے رہی تھی۔

گناہ چھوڑنے کی کوشش کیجئے

اللہ تعالیٰ کے دین کا معاملہ بھی یہی ہے، اگر آدمی دور دور سے یہ سوچ کر بیٹھ جائے کہ آج کل کے دور میں دین پر عمل کرنا بڑا مشکل ہے، یہ تو بیسویں صدی ہے، اس میں گناہوں سے بچنا بڑا مشکل ہے، اس زمانے میں ہم کیسے اپنا ماحول تبدیل کریں؟ ٹی وی کیسے چھوڑیں؟ وی سی آر کیسے چھوڑیں؟ بے پردگی کیسے چھوڑیں؟ بدنگاہی کیسے چھوڑیں؟ جھوٹ کیسے چھوڑیں؟ رشوت کیسے چھوڑیں؟ اگر ان کاموں کو مشکل سمجھ کر انسان بیٹھا رہے تو وہ انسان کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ لیکن اگر انسان یہ سوچے کہ پہلے میں یہ گناہ سو مرتبہ کرتا تھا اور اب میں اس میں کچھ تو کمی کروں، سو میں سے پچاس مرتبہ کم کروں، جب انسان کمی کرنے کا اقدام خود سے کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس میں تمہاری مدد فرمائیں گے، اگر تم نے سو میں سے پچاس کرلیا تو اللہ تعالیٰ پھر پچاس کے پچیس بھی کرادیں گے انشاء اللہ، اور اگر تم نے پچاس سے پچیس کرلیے تو اللہ تعالیٰ صفر بھی کرادیں گے۔

صبح سے شام تک کے کاموں کا جائزہ لیں

ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ ہر شخص اپنی صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کا جائزہ لے کہ میں کیا کیا کرتا ہوں؟ کتنے فرائض و واجبات میں ادا نہیں کرتا؟ کتنی سنتیں میں ترک کرتا ہوں؟ کتنے نیک اعمال ایسے ہیں جو میں نہیں کرتا؟ اور کتنی برائیاں، کتنی غلطیاں اور کتنے گناہ ایسے ہیں جو میں کرتا ہوں؟ ان سب کی ایک فہرست بناؤ، پھر اس فہرست میں غور کرکے دیکھو کہ کتنے گناہ ایسے ہیں جو تم کسی تکلیف کے بغیر فوراً چھوڑ سکتے ہو، ان کو تو فوراً چھوڑ دو، اور جن گناہوں کے چھوڑنے میں تھوڑا سا وقت درکار ہے، ان کو چھوڑنے کے لئے کوشش شروع کردو، اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتے رہو کہ یا اللہ! جتنے گناہ چھوڑنا میرے بس میں تھا، ان کو تو میں نے چھوڑ دیا، اے اللہ! بقیہ گناہوں کو چھوڑنا میرے بس میں نہیں ہے، آپ اپنے فضل سے ان کو چھڑا دیجئے۔

یہ کام کرو، پھر اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے۔

قدم بڑھاؤ اور پھر دعا کرو

دو کام ہمیشہ یاد رکھو! ایک یہ کہ اپنی طرف سے قدم بڑھانا اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے تکمیل کی دعا کرنا۔ ساری عمر یہ دو کام کرتے رہو، پھر انشاء اللہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے باتیں کیا کرو، اور کہو:

"یا اللہ! میں فلاں فلاں گناہوں کے اندر مبتلا تھا، میں نے قدم بڑھایا اور اتنے گناہ چھوڑ دیئے، البتہ باقی گناہوں کے چھوڑنے میں نفس و شیطان سے مغلوب ہو رہا ہوں، حالات اور ماحول سے مغلوب ہو رہا ہوں، اس لئے وہ گناہ میں نہیں چھوڑ پا رہا ہوں، اور آپ اس مغلوبیت کو ختم کر سکتے ہیں، میرے بس میں نہیں ہے۔ اے اللہ! آپ اس رکاوٹ کو اور مغلوبیت کو دور فرما دیجئے، یا مجھ سے رکاوٹ کو دور فرما دیجئے یا مجھے پھر آخرت میں عذاب نہ دیجئے گا"

اس طرح باتیں کرو، پھر دیکھو کیسے کام بنتا ہے اور کس طرح اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ لہٰذا اپنے حصے کا کام کرو جتنا تم کر سکتے ہو، باقی کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا دروازے کی طرف بھاگنا

حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھئے! زلیخا نے ان کو گناہ کی دعوت دی اور دعوت دیتے وقت تمام دروازوں پر تالے ڈال دیئے تاکہ بھاگنے کا راستہ باقی نہ ہو، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دروازوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں، لیکن پھر بھی آپ دروازے کی طرف دوڑے، دروازے تک اس لئے بھاگے تاکہ اللہ میاں سے کہہ سکیں کہ یا اللہ! دروازے تک بھاگنا میرا کام تھا اور آگے دروازے کھولنا آپ کا کام ہے۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام دروازے تک نہ بھاگتے تو دروازوں کے تالے کھلنے کی کوئی گارنٹی نہیں تھی، لیکن چونکہ دروازے تک بھاگے اور وہاں پہنچ کر یہ کہہ دیا کہ یا اللہ! اتنا میرے بس میں تھا جو میں نے کر دیا، آگے دروازے کھولنا میرے بس کا کام نہیں۔ فرمایا:

﴿وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَکُنْ مِّنَ الْجَاهِلِیْنَ﴾ (۱)

"اگر آپ نے مجھ سے ان کے فتنوں کو دور نہ فرمایا تو میں اس میں مبتلا ہو جاؤں گا اور اس کے نتیجے میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا"

جب اللہ تعالیٰ نے یہ دیکھا کہ میرے بندے نے اپنے حصے کا کام کر لیا، تو اب ہم اپنے حصے کا کام کریں گے۔ چنانچہ دروازوں کے تالے ٹوٹ گئے اور دروازے کھل گئے۔ اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

(۱) یوسف: ۳۳

یعنی اگرچہ اس عالم میں بھی تمہیں بھاگنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے، اور گناہوں سے، فحاشی سے، عریانی سے، بددینی سے بھاگنے کا راستہ نظر نہیں آرہا ہے، لیکن جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام دروازے تک بھاگے تھے، تم بھی دروازے تک تو بھاگ کر دکھاؤ، اور پھر اللہ میاں سے کہو کہ یا اللہ! آگے بچانا آپ کا کام ہے۔ اس وقت انشاء اللہ دروازے کھل جائیں گے اور اللہ کی مدد آئے گی۔ یہی مضمون ہے اس حدیثِ قدسی کا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو بندہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں۔

رات کو سونے سے پہلے یہ عمل کیجئے

لہٰذا جب رات کو سونے لگو تو اللہ تعالیٰ سے کچھ باتیں کرلو، اور اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ یا اللہ! آج کا دن گزر گیا، آج کے دن میں اتنے گناہوں سے بچ سکا اور اتنے گناہوں سے نہیں بچ سکا، اتنا کام کرسکا اور اتنا کام نہیں کرسکا اور میں مغلوب ہوگیا، یا اللہ! اپنی رحمت سے اس مغلوبیت کو دور فرمادیجئے، میں آپ کے راستے پر چلنا چاہتا ہوں، لیکن یہ نفس و شیطان اور میرا یہ ماحول مجھے آپ کے راستے سے بہکاتے ہیں، اے اللہ! مجھے ان کے اُوپر غلبہ عطا فرما۔ یہ دعا رات کو کرلو۔

صبح اُٹھ کر یہ عہد کرلیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ روزانہ صبح کو بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان کرلیا کرو:

> ''یا اللہ! آج کا دن شروع ہو رہا ہے اور آج جب میں اپنے کاروبارِ زندگی میں نکلوں گا تو خدا جانے گناہوں کے کیا کیا دواعی اور محرکات سامنے آئیں گے اور کیسے کیسے حالات گزریں گے، میں اس وقت آپ کی بارگاہ میں بیٹھ کر عزم کررہا ہوں اور ارادہ کررہا ہوں کہ آپ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق چلوں گا اور آپ کی رضا کے راستے پر چلنے کی کوشش کروں گا، لیکن اے اللہ! مجھے اپنی طاقت اور ہمت پر بھروسہ نہیں ہے، چلنا تو چاہ رہا ہوں، لیکن ہوسکتا ہے کہ گر پڑوں، لڑکھڑا جاؤں، اے اللہ! میں جہاں گرنے لگوں، اپنی رحمت سے مجھے تھام لیجئے گا اور مجھے اس غلط راستے سے بچا لیجئے گا۔ یا اللہ! میں بے ہمت ہوں، بے حوصلہ ہوں، ہمت دینے والے بھی آپ ہیں، حوصلہ دینے والے بھی آپ ہیں، اپنی رحمت سے ہمت اور حوصلہ بھی عطا فرمادیجئے۔ اور اگر اس کے بعد بھی میں گرا تو پھر آپ مجھ سے

قیامت کے روز مواخذہ نہ فرمایئے گا، پھر میری گرفت نہ فرمایئے گا، اس لئے کہ میں چلنا چاہتا ہوں، اگر آپ نہیں تھامیں گے تو میں گمراہ ہوجاؤں گا، اب اگر میں گمراہ ہوگیا تو آپ کی ذمہ داری ہے، پھر آپ مجھ سے مواخذہ نہ فرمایئے گا''

روزانہ صبح کے وقت اللہ تعالیٰ سے یہ عہد و پیمان کرو، اور پھر حتی الامکان اپنے عمل کے وقت کوشش کرلو، پھر بھی اگر بالفرض بھول چوک سے بتقاضائے بشریت کہیں لڑکھڑا گئے اور اس پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرلیا اور توبہ کرلی تو انشاء اللہ پھر راستے پر آجاؤ گے۔ لیکن صبح کے وقت یہ عہد و پیمان کرلو۔

صبح یہ دعا کرلیا کرو

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ صبح فجر کی نماز کے بعد وظائف اور ذکر و اذکار سے فارغ ہوکر یہ پڑھ لیا کرو:

﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ﴾(۱)

''اے اللہ! میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، میرا مرنا، سب آپ کے لئے ہے''

میں اس وقت ارادہ کررہا ہوں کہ جو کچھ کروں گا سب آپ کی رضا کے لئے کروں گا، لیکن مجھے اپنی ذات پر بھروسہ نہیں، خدا جانے کہاں لڑکھڑا جاؤں، آپ میری مدد فرمایئے۔ یہ کرنے کے بعد پھر کاروبارِ زندگی کے اندر نکلو، انشاء اللہ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوگی۔ روزانہ یہ کام کرلو، پھر دیکھو گے کیا سے کیا ہوجائے گا۔ اور اگر پھر کسی جگہ پر لڑکھڑا بھی گئے تو اللہ تعالیٰ سے بات تو کرلی ہے کہ یا اللہ! میرا ثابت قدم رہنا میرے بس سے باہر ہے، تو اُمید ہے کہ معافی کا سامان ہو ہی جائے گا، اس کے بعد جب دوبارہ اگلے روز صبح بیٹھو تو پہلے استغفار کرلو اور پھر دوبارہ اس عزم کو تازہ کرلو۔

آج کو گذشتہ کل سے اچھا بناؤ

اور یہ تہیہ کرلو کہ آج میں کل کے مقابلے میں زیادہ بہتر عمل کروں گا، اور آج میں گناہوں سے زیادہ بچنے کی کوشش کروں گا۔

حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا آج اور کل برابر ہوگا وہ شخص بڑے خسارے میں ہے۔(۲)

---

(۱) الأنعام: ۱۶۲

(۲) احیاء علوم الدین (۴۱۱/۶)، الدر المنتشرة فی الأحادیث المشتهرة (۴۰/۱)، کشف الخفاء ومزیل الالباس للعجلونی (۲۳۳/۲)، رقم: ۲۴۰۵، حلیة الأولیاء (۳۶۲/۳)

اس لئے کہ اس نے کوئی ترقی نہیں کی، کل کے مقابلے میں آج اس نے کچھ تو ترقی کی ہوتی، کچھ تو آگے بڑھا ہوتا۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا تلقین فرمائی کہ یہ دعا کرلیا کرو:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ يَوْمَنَا خَيْرًا مِّنْ اَمْسِنَا وَغَدَنَا خَيْرًا مِّنْ يَّوْمِنَا))

''اے اللہ! ہمارے آج کو گزشتہ کل سے بہتر بنادیجئے اور ہمارے آئندہ کل کو آج سے بہتر بنادیجئے''

یہ دعا کرو اور عزم اور تہیہ کرکے کام کرو، اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو تو پھر اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے اور انشاء اللہ رفتہ رفتہ گرتے پڑتے منزل تک پہنچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

نیک کام میں دیر نہ کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۱)

علامہ نووی رحمہ اللہ نے آگے جو باب قائم کیا ہے، وہ یہ ہے:

"بَابُ الْمُبَادَرَةِ اِلَى الْخَيْرَاتِ" (۲)

اس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسان اپنی حقیقت پر غور کرے گا، اور اللہ جل جلالہٗ کی عظمتِ شان، اس کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ پر غور کرے گا، اور اس کی شانِ ربوبیت پر غور کرے گا، تو اس غور وفکر کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کی طرف دل مائل ہوگا اور خود بخود دل میں داعیہ پیدا ہوگا کہ جس مالک نے یہ ساری کائنات بنائی ہے اور جس مالک نے یہ نعمتیں مجھ پر نازل فرمائی ہیں اور جس مالک نے مجھے رحمتوں کی بارش میں رکھا ہے، اس مالک کا بھی مجھ پر کوئی حق ہوگا؟ جب یہ داعیہ اور میلان پیدا ہو، اس وقت کیا کرنا چاہئے؟

اس سوال کے جواب کے لئے علامہ نووی رحمہ اللہ نے یہ باب قائم فرمایا ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کا داعیہ پیدا ہو، اور نیک کام کے کرنے کا محرک سامنے آئے، تو اس وقت ایک مومن کا کام یہ ہے کہ جلد از جلد اس نیک کام کو کرلے۔ اس میں دیر نہ لگائے۔ یہی معنی ہیں "مبادرۃ" کے، یعنی کسی کام کو جلدی سے کرلینا، ٹال مٹول نہ کرنا، اور آئندہ کل پر نہ ٹالنا۔

نیکی کے کاموں میں دوڑ لگاؤ

علامہ نووی رحمہ اللہ سب سے پہلے یہ آیتِ کریمہ لائے ہیں:

☆ اصلاحی خطبات (۱/۵۹تا۹۱)، درسِ ریاض الصالحین، باب المبادرۃ الی الخیرات، ص: ۵۸

(۱) آل عمران: ۱۳۳

(۲) ریاض الصالحین، ص: ۵۸

﴿وَسَارِعُوْا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۱)

تمام انسانیت کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جلدی سے دوڑو، جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے اور وہ متقی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

''مسارعت'' کے معنی ہیں، جلد سے جلد کوئی کام کرنا، دوسرں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا۔

ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (۲)

یعنی بھلائی اور نیکی کے کاموں میں ریس اور دوڑ لگاؤ۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جب کسی نیک کام کا ارادہ اور داعیہ دل میں پیدا ہو تو اس کو ٹلاؤ نہیں۔

شیطان کا ایک داؤ

اس لئے کہ شیطان کے داؤ اور اس کے حربے ہر ایک کے ساتھ الگ الگ ہوتے ہیں، کافر کے لئے اور ہیں، مومن کے لئے اور ہیں۔ مومن کے دل میں شیطان یہ بات نہیں ڈالے گا کہ یہ نیکی کا کام مت کیا کرو، یہ بُرے کام ہیں۔ یہ بات براہِ راست اس کے دل میں نہیں ڈالے گا، اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ صاحبِ ایمان ہونے کی وجہ سے نیکی کے کام کو بُرا نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن مومن کے ساتھ اس کا یہ حربہ ہوتا ہے کہ اس سے یہ کہتا ہے کہ یہ نماز پڑھنا، یہ فلاں نیک کام کرنا تو اچھا ہے، اس کو کرنا چاہئے، لیکن انشاء اللہ کل سے شروع کریں گے۔ اب جب کل آئے گی تو پھر یہ کہے گا: اچھا بھائی! کل سے شروع کروں گا، تو وہ کل کبھی زندگی بھر نہیں آئے گی۔ یا کسی اللہ والے کی بات دل میں اثر کر گئی کہ یہ بات تو صحیح ہے، عمل کرنا چاہئے، اپنی زندگی میں تبدیلی لانی چاہئے، گناہوں کو چھوڑنا چاہئے، نیکیوں کو اختیار کرنا چاہئے، لیکن انشاء اللہ اس پر جلد از جلد عمل کریں گے، جب اس کو ٹلا دیا تو پھر کبھی اس پر عمل کی نوبت نہیں آئے گی۔

عمرِ عزیز سے فائدہ اُٹھایئے

اسی طرح زندگی کے اوقات گزرتے جا رہے ہیں۔ عمرِ عزیز گزرتی جارہی ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ کتنی عمر باقی ہے؟ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے کہ کل پر مت ٹالو، جو داعیہ اس وقت پیدا ہوا ہے، اس پر اسی وقت عمل کرو، کیا معلوم کہ کل تک یہ داعیہ رہے یا نہ رہے، اول تو یہ بھی نہیں پتہ کہ تم خود زندہ رہو یا

(۱) آلِ عمران: ۱۳۳ (۲) البقرة: ۱۴۸

نہ رہو اور اگر تم خود زندہ رہو تو یہ پتہ نہیں کہ یہ داعیہ باقی رہے گا یا نہیں؟ اور اگر داعیہ باقی رہا تو کیا معلوم کہ اس وقت حالات موافق ہوں یا نہ ہوں۔ بس! اس وقت جو داعیہ پیدا ہوا ہے اس پر عمل کر کے فائدہ حاصل کرلو۔

نیکی کا داعیہ اللہ تعالیٰ کا مہمان ہے

یہ داعیہ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے مہمان ہے، اس مہمان کی خاطر مدارات کرلو، اس کی خاطر مدارات یہ ہے کہ اس پر عمل کرلو، اگر نفل نماز پڑھنے کا داعیہ پیدا ہوا، اور یہ سوچا کہ یہ فرض و واجب تو ہے نہیں، اگر نہیں پڑھیں گے تو کوئی گناہ تو ہوگا نہیں، چلو چھوڑو۔ یہ تم نے اس مہمان کی ناقدری کردی جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری اصلاح کی خاطر بھیجا تھا۔ اگر تم نے اسی وقت فوراً عمل نہ کیا تو پیچھے رہ جاؤ گے، پھر معلوم نہیں کہ دوبارہ مہمان آئے، یا نہ آئے، بلکہ وہ آنا بند کردے گا، کیونکہ وہ مہمان یہ سوچے گا کہ یہ شخص میری بات تو مانتا نہیں، اور میری ناقدری کرتا ہے، میری خاطر مدارات نہیں کرتا، میں اب اس کے پاس نہیں جاتا، اس طرح دل میں نیکی کا داعیہ پیدا ہونا ہی بند ہو جائے گا۔ بہر حال ویسے تو ہر کام میں جلدی اور عجلت کرنا بُرا ہے، لیکن جب دل میں کسی نیک کام کے کرنے کا داعیہ پیدا ہو تو اس پر جلدی عمل کرلینا ہی اچھا ہے۔

فرصت کے انتظار میں مت رہیں

اگر اپنی اصلاح کی فکر کا دل میں خیال آیا کہ زندگی ویسے ہی گزری جارہی ہے، نفس کی اصلاح ہونی چاہئے، اور اپنے اخلاق اور اعمال کی اصلاح ہونی چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ سوچا کہ جب فلاں کام سے فارغ ہو جائیں گے، پھر اصلاح شروع کریں گے، یہ فرصت کے انتظار میں عمر عزیز کے جو لمحات گزر رہے ہیں، وہ فرصت کبھی آنے والی نہیں ہے۔

کام کرنے کا بہترین گر

ہمارے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے:

''جو کام فرصت کے انتظار میں ٹال دیا، وہ ٹل گیا، وہ پھر نہیں ہوگا۔ اس واسطے کہ تم نے اس کو ٹال دیا۔ کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دو کاموں کے درمیان تیسرے کام کو گھسا دو، یعنی وہ دو کام جو تم پہلے سے کر رہے ہو، اب تیسرا کام کرنے کا خیال آیا، تو ان دو کاموں کے درمیان تیسرے کام کو زبردستی گھسا دو، وہ تیسرا کام بھی ہو جائے

گا، اور اگر یہ سوچا کہ ان دو کاموں سے فارغ ہو کر پھر تیسرا کام کریں گے تو پھر وہ کام نہیں ہوگا۔ یہ منصوبے اور پلان بنانا کہ جب یہ کام ہو جائے گا تو پھر کام کریں گے، یہ سب ٹالنے والی باتیں ہیں، شیطان عموماً اسی طرح دھوکہ میں رکھتا ہے''

نیک کاموں میں مقابلہ بُرا نہیں

اس لئے ''مبادرۃ الی الخیرات'' یعنی نیک کاموں میں جلدی کرنا اور آگے بڑھنا قرآن و سنت کا تقاضا ہے۔ اور علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کے لئے یہ باب قائم فرمایا ہے ''باب المبادرۃ الی الخیرات'' یعنی بھلائیوں کی طرف جلدی سے سبقت کرنا۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں دو لفظ استعمال کیے ہیں: ایک ''مبادرۃ'' یعنی جلدی کرنا، دوسرا ''مسابقۃ'' یعنی مقابلہ کرنا، ریس لگانا، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا۔ اور یہ مقابلہ کرنا اور ریس لگانا نیکی کے معاملے میں محبوب ہے، لیکن دوسری چیزوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا بُرا ہے، جیسے مال کے حصول میں، عزت کے حصول میں، شہرت کے معاملے میں، دنیا کے حصول میں، جاہ طلبی کے معاملے میں، ان سب میں یہ بات بُری ہے کہ انسان دوسرے سے آگے بڑھنے کی حرص میں لگ جائے۔ لیکن نیکیوں کے معاملے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ ایک محمود اور قابلِ تعریف جذبہ ہے۔

قرآن کریم خود کہہ رہا ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ ایک شخص کو تم دیکھ رہے ہو کہ ماشاء اللہ عبادت میں لگا ہوا ہے، طاعات میں لگا ہوا ہے، گناہوں سے بچ رہا ہے، اب کوشش کرو کہ میں اس سے بھی زیادہ آگے بڑھ جاؤں، اس میں ریس لگانا بُرا نہیں۔

دُنیاوی اسباب میں مقابلہ درست نہیں

یہاں معاملہ اُلٹا ہو گیا ہے، اس وقت ہماری پوری زندگی ریس لگانے میں گزر رہی ہے۔ لیکن ریس اس میں لگ رہی ہے کہ پیسہ زیادہ سے زیادہ کہاں سے آجائے۔ دوسرے نے اتنا کما لیا، میں اس سے زیادہ کما لوں، دوسرے نے ایسا بنگلہ بنالیا، میں اس سے اعلیٰ درجے کا بنالوں، دوسرے نے ایسی کار خریدی، میں اس سے اعلیٰ درجے کی خریدلوں، دوسرے نے ایسا ساز و سامان جمع کرلیا، میں اس سے اعلیٰ درجے کا جمع کرلوں۔ پوری قوم اسی ریس کے اندر مبتلا ہے، اور اس ریس میں حلال و حرام کی فکر مٹ گئی ہے، اس لئے کہ جب دماغ پر یہ جذبہ سوار ہو گیا کہ دنیاوی ساز و سامان میں دوسرے سے

آگے بڑھنا ہے، تو حلال مال کے ذریعہ آگے نکلنا تو بڑا مشکل ہے، تو پھر حرام کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح اب حلال وحرام ایک ہو رہے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جس چیز میں ریس لگانا اور مقابلہ کرنا شرعاً بُرا تھا وہاں سب مقابلے پر لگے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے ہیں، اور جس چیز میں مقابلہ کرنا، ریس لگانا، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر کرنا مطلوب تھا، اس میں پیچھے رہ گئے ہیں۔

غزوۂ تبوک کے موقع کا ایمان افروز واقعہ

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھئے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر انہوں نے کیا کِیا۔ غزوۂ تبوک بڑا کٹھن غزوہ تھا۔ ایسا صبر آزما غزوہ اور ایسی صبر آزما مہم شاید کوئی اور پیش نہیں آئی جیسی غزوۂ تبوک کے موقع پر پیش آئی۔ سخت گرمی کا موسم، وہ موسم جس میں آسمان سے شعلے برستے ہیں، زمین آگ اُگلتی ہے، اور تقریباً بارہ سو کلومیٹر کا صحرائی سفر، اور کھجوریں پکنے کا زمانہ، جس پر سارے سال کی معیشت کا دارومدار ہوتا ہے، سواریاں میسر نہیں، پیسے موجود نہیں، اور اس وقت میں یہ حکم دیا جارہا ہے کہ ہر مسلمان کے لئے نفیرِ عام ہے کہ وہ اس غزوہ میں چلے، اور اس میں شریک ہو۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدِ نبوی میں کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ یہ غزوہ کا موقع ہے، اور سواریوں کی ضرورت ہے، اُونٹنیاں چاہئیں، پیسوں کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ بڑھ چڑھ کر اس میں چندہ دیں، اور جو شخص اس میں چندہ دے گا، میں اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ اب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کہاں پیچھے رہنے والے تھے، جبکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ جملہ سن لیں کہ ان کے لئے جنت کی ضمانت ہے، اب ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق چندہ دے رہا ہے، کوئی کچھ لا رہا ہے، کوئی کچھ لا رہا ہے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے گھر گیا، اور میں نے اپنے گھر کا جتنا کچھ ساز و سامان اور روپیہ پیسہ تھا وہ آدھا آدھا تقسیم کر دیا، اور پھر آدھا حصہ لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلا گیا، اور دل میں خیال آنے لگا کہ آج وہ دن ہے کہ شاید میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آگے نکل جاؤں۔ یہ جو جذبہ پیدا ہو رہا ہے کہ میں ان سے آگے بڑھ جاؤں، یہ ہے "مسابقۃ الی الخیرات" مگر کبھی ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوا کہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے پیسے میں آگے بڑھ جاؤں، کبھی یہ جذبہ پیدا نہیں ہوا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پاس بہت پیسے ہیں، ان سے زیادہ پیسے مجھے حاصل ہو جائیں، لیکن یہ جذبہ پیدا ہوا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے نیکی کا جو مقام بخشا ہے، ان سے آگے بڑھ جاؤں، تھوڑی دیر میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی تشریف لائے، اور جو کچھ تھا حاضر کر دیا۔

سرکارِ دو عالم ﷺ نے پوچھا ''اے عمر! گھر میں کیا چھوڑ آئے ہو؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ! آدھا مال گھر والوں کے لئے چھوڑ دیا، اور آدھا غزوہ کے لئے اور جہاد کے لئے لے آیا ہوں''

آپ ﷺ نے ان کو دعائیں دیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے مال میں برکت دے۔

اس کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا ''تم نے اپنے گھر میں کیا چھوڑا؟''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ! گھر میں اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں، جو کچھ گھر میں تھا سارے کا سارا سمیٹ کر یہاں لے آیا ہوں''

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس دن مجھے پتہ چلا کہ میں چاہے ساری عمر کوشش کرتا رہوں لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ (۱)

ایک مثالی معاملہ

ایک مرتبہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ میرے ساتھ ایک معاملہ کریں تو میں بڑا احسان مند ہوں گا۔

انہوں نے پوچھا: کیا معاملہ؟

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری ساری عمر کی جتنی نیکیاں ہیں، جتنے اعمالِ صالحہ ہیں، وہ سب مجھ سے لے لیں، اور وہ ایک رات جو آپ نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ غارِ ثور میں گزاری، اس کا ثواب مجھے دے دیں، یعنی وہ ایک رات جو آپ نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ غارِ ثور میں گزاری، وہ میرے سارے اعمال پر بھاری ہے۔ (۲)

غرض یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کو دیکھیں تو کہیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ یہ سوچیں کہ فلاں نے اتنے پیسے جمع کر لیے، میں بھی جمع کر لوں، فلاں کا مکان بڑا شاندار ہے، میرا بھی ویسا ہو جاتا، فلاں کی سواری بہت اچھی ہے، ویسی مجھے بھی مل جاتی۔ لیکن اعمالِ صالحہ میں مسابقت نظر آتی ہے۔ اور آج ہمارا معاملہ بالکل اُلٹا چل رہا ہے، اعمالِ صالحہ میں آگے بڑھنے کی کوئی فکر نہیں، اور مال کے اندر صبح سے لے کر شام تک دوڑ ہو رہی ہے، اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں ہیں۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول الله، باب فی مناقب أبی بکر وعمر کلیهما، رقم: ۳۶۰۸، سنن أبی داؤد، کتاب الزکاة، باب فی الرخصة فی ذلك، رقم: ۱٤۲۹، سنن الدارمی، کتاب الزکاة، رقم: ۱۶۰۱

(۲) البدایة والنهایة (۱۸۰/۳)، حلیة الأولیاء (۳۳/۱)

ہمارے لئے نسخۂ اکسیر

نبی کریم ﷺ نے ایک عجیب ارشاد فرمایا، جو ہمارے لئے نسخۂ اکسیر ہے، فرمایا:

''دنیا کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھو، اور اپنے سے کمتر حیثیت والوں کے ساتھ رہو، اُن کی صحبت اختیار کرو، اور ان کے حالات کو دیکھو۔ اور دین کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے اُونچے آدمی کو دیکھو، اور ان کی صحبت اختیار کرو''(۱)

اس لئے کہ جب دنیا کے معاملے میں اپنے سے کمتر لوگوں کو دیکھو گے تو جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہیں، ان نعمتوں کی قدر ہوگی کہ یہ نعمت اس کے پاس نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے دے رکھی ہے، اور اس سے قناعت پیدا ہوگی، شکر پیدا ہوگا اور دنیا طلبی کی دوڑ کا جذبہ ختم ہوگا۔ اور دین کے معاملے میں جب اُوپر والوں کو دیکھو گے کہ یہ شخص تو دین کے معاملے میں مجھ سے آگے بڑھ گیا تو اس وقت اپنی کمی کا احساس پیدا ہوگا، اور آگے بڑھنے کی فکر پیدا ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے راحت کیسے حاصل کی؟

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ جو محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، صوفی بھی ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''میں نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ مالداروں کے ساتھ گزارا (خود بھی مالدار تھے) صبح سے شام تک مالداروں کے ساتھ رہتا تھا، لیکن جب تک مالداروں کی صحبت میں رہا، مجھ سے زیادہ غمگین انسان کوئی نہیں تھا، کیونکہ جہاں جاتا، یہ دیکھتا کہ اس کا گھر میرے گھر سے اچھا ہے، اس کی سواری میری سواری سے اچھی ہے، اس کا کپڑا میرے کپڑے سے اچھا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ دیکھ کر میرے دل میں کڑھن پیدا ہوتی تھی کہ مجھے تو ملا نہیں اور اس کو مل گیا۔ لیکن بعد میں دنیاوی حیثیت سے جو کم مال والے تھے، اُن کی صحبت اختیار کی، اور ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگا، تو میں راحت میں آگیا، اس واسطے کہ جس کو بھی دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں تو بہت خوشحال ہوں، میرا کھانا بھی اس کے کھانے سے اچھا ہے، میرا کپڑا بھی اس کے کپڑے سے اچھا ہے، میرا گھر بھی اس کے گھر سے اچھا ہے، میری سواری بھی اس کی سواری سے اچھی ہے، اس واسطے میں اب الحمدللہ راحت میں آگیا ہوں''(۲)

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، مسند الأنصار، مسند أبي ذر الغفاري، رقم: ۲۰۴۴۷، ۲۰۵۴۰

(۲) سنن الترمذي، كتاب اللباس عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

قناعت کے حصول کا ذریعہ

یہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد پر عمل کرنے کی برکت ہے، کوئی شخص تجربہ کرکے دیکھ لے۔ دنیا کے معاملے میں اپنے سے اُونچے کو دیکھتے رہو گے تو کبھی پیٹ نہیں بھرے گا، کبھی قناعت حاصل نہیں ہوگی، کبھی آنکھوں کو سیری نصیب نہیں ہوگی، ہر وقت یہی فکر ذہن پر سوار رہے گی جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَادِيَانِ))(۱)

''اگر ابنِ آدم کو ایک وادی سونے کی بھر کر مل جائے تو وہ یہ چاہے گا کہ دو وادیاں مل جائیں''

اور جب دو مل جائیں گی تو چاہے گا کہ تین مل جائیں۔ اور اسی طرح پوری زندگی اسی دوڑ میں صرف ہو جائے گی، اور کبھی راحت کی منزل پر، قناعت اور سکون کی منزل پر پہنچ نہیں پائے گا۔

مال و دولت کے ذریعہ راحت نہیں خریدی جاسکتی

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کیا اچھی بات فرمایا کرتے تھے، لوحِ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے۔ فرمایا کرتے تھے:

''راحت اور آرام اور چیز ہے اور اسبابِ راحت اور چیز ہیں۔ اسبابِ راحت سے راحت حاصل ہونا کوئی ضروری نہیں، ''راحت'' اللہ جل جلالہٗ کا عطیہ ہے، اور ہم نے آج اسبابِ راحت کا نام راحت رکھ دیا ہے۔ بہت سارا روپیہ رکھا ہو تو کیا بھوک کے وقت وہ اس کو کھالے گا؟ کیا اگر کپڑے کی ضرورت ہوگی تو اسی کو پہن لے گا؟ کیا گرمی لگنے کے وقت وہ پیسہ اس کو ٹھنڈک پہنچا سکے گا؟ بذاتِ خود نہ تو یہ پیسہ راحت ہے اور نہ ہی اس کے ذریعہ تم راحت خرید سکتے ہو۔ اور اگر اس کے ذریعے تم نے اسبابِ راحت خرید بھی لیے، مثلاً تم نے اس کے ذریعے کھانے پینے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) باب ماجاء في ترقيع الثوب، رقم:١٧٠٢، حلية الأولياء (١٨٩/٢)، فيض القدير (٩٣/٢)، تفسير ابن كثير (٦٤٥/١)، صفة الصفوة (١١٠/٣)، واضح رہے کہ مذکورہ تمام مراجع میں یہ قول عبداللہ بن المبارک کے بجائے عون بن عبداللہ بن عتبہ کی طرف منسوب ہے۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب ما يتقى من فتنة المال، رقم: ٥٩٥٦، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب لو أن لابن آدم الخ، رقم: ١٧٣٧، سنن الترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله، رقم: ٣٧٢٦

کی چیزیں خرید لیں، اچھے کپڑے خرید لیے، گھر کی سجاوٹ کا سامان خرید لیا، لیکن کیا راحت حاصل ہوگئی؟ یاد رکھو! محض ان اسباب کو جمع کر لینے سے راحت کا مل جانا کوئی ضروری نہیں، اس لئے کہ ایک شخص کے پاس راحت کے تمام اسباب موجود ہیں، لیکن صاحب بہادر کو گولی کھائے بغیر نیند نہیں آتی، بستر آرام دہ، ایئر کنڈیشنڈ کمرہ اور نوکر چاکر سبھی کچھ موجود ہے، لیکن نیند نہیں آرہی ہے۔ اب بتاؤ! اسبابِ راحت سارے موجود، لیکن نیند ملی؟ راحت ملی؟ اور ایک وہ شخص ہے جس کے گھر پر نہ تو پکی چھت ہے، بلکہ ٹین کی چادر ہے، نہ چارپائی ہے، بلکہ فرش پر سو رہا ہے، لیکن بس ایک ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھا، اور سیدھا نیند کی آغوش میں چلا گیا، اور آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لے کر صبح کو بیدار ہوا۔ بتاؤ! راحت اُس کو ملی یا اِس کو ملی؟ اُس کے پاس اسبابِ راحت موجود تھے، لیکن راحت نہیں ملی، اور اِس مزدور کے پاس اسبابِ راحت موجود نہیں تھے، لیکن راحت مل گئی۔ یاد رکھو! اگر دنیا کے اسباب جمع کرنے کی فکر میں لگ گئے، اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی فکر میں لگ گئے، تو خوب سمجھ لو کہ اسبابِ راحت تو جمع ہو جائیں گے، لیکن راحت پھر بھی حاصل نہ ہوگی''

وہ دولت کس کام کی جو سکون نہ دے سکے!

حضرت والد ماجد قدس اللہ سرہ کے زمانے میں ایک صاحب تھے، بہت بڑے مل اونر، اور ان کا کاروبار یہاں صرف پاکستان میں ہی نہیں تھا، بلکہ مختلف ممالک میں ان کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ ایک دن ویسے ہی والد صاحب نے پوچھا کہ ''آپ کی اولاد کتنی ہے؟''

انہوں نے جواب دیا ''ایک لڑکا سنگاپور میں ہے، ایک لڑکا فلاں ملک میں ہے، سب دوسرے ملکوں میں ہیں''

دوبارہ پوچھا ''آپ کی لڑکوں سے ملاقات تو ہوتی رہتی ہوگی، وہ آتے جاتے رہتے ہوں گے؟''

انہوں نے بتایا ''ایک لڑکے سے ملاقات ہوئے ۱۵ سال ہوگئے ہیں''

۱۵ سال سے باپ نے بیٹے کی شکل نہیں دیکھی، اور بیٹے نے باپ کی شکل نہیں دیکھی۔ تو اب بتاؤ ایسا روپیہ اور ایسی دولت کس کام کی جو اولاد کو باپ کی شکل بھی نہ دکھا سکے، اور باپ کو اولاد کی شکل نہ دکھا سکے۔ یہ ساری دوڑ دھوپ اسبابِ راحت کے لئے ہو رہی ہے، لیکن راحت مفقود ہے۔ اس لئے یاد رکھو کہ راحت پیسے کے ذریعہ نہیں خریدی جاسکتی۔

پیسے سے ہر چیز نہیں خریدی جاسکتی

ابھی چند روز پہلے ایک صاحب نے ذکر کیا کہ وہ رمضان میں عمرے کو تشریف لے گئے، اور ایک اور صاحب دولت مند بھی عمرے کو جارہے تھے تو میں نے ان سے کہا کہ عمرے کو جارہے ہو، پہلے سے ذرا انتظام کر لینا، تاکہ رہنے کے لئے اور کھانے پینے کے لئے صحیح انتظام ہو جائے۔ وہ اپنی دولت کے گھمنڈ میں تھے، کہنے لگے: ارے میاں! چھوڑو انتظام وغیرہ اللہ کا شکر ہے، پیسے بہت موجود ہیں، پیسے سے دنیا کی ہر چیز مل جاتی ہے، آرام دہ رہائش بھی مل جاتی ہے، کھانا بھی مل جاتا ہے، کوئی فکر کی بات نہیں، ہمارے پاس پیسہ خوب ہے، دس ریال کی جگہ بیس ریال خرچ کر دیں گے۔ وہی صاحب بتارہے تھے کہ میں نے دو دن کے بعد دیکھا تو حرم شریف کے دروازے پر سر جھکائے بیٹھے ہیں، میں نے پوچھا: بھائی کیا ہوا؟ کہنے لگے: سحری میں اُٹھے تھے، لیکن ہوٹل میں کھانا نہیں ملا، کھانا ختم ہو گیا تھا۔ دماغ میں گھمنڈ تھا کہ پیسے سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں دکھا دیا کہ دیکھو! پیسہ تمہاری جیب میں رکھا رہ گیا، اور روزہ بغیر سحری کے رکھا۔

سکون حاصل کرنے کا راستہ

یہ پیسہ، یہ ساز و سامان، یہ مال و دولت جو کچھ تم جمع کر رہے ہو، یہ بذاتِ خود راحت دینے والی چیز نہیں ہے، راحت پیسے سے خریدی نہیں جاسکتی، وہ محض اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، جب تک قناعت پیدا نہیں ہوگی، اور جب تک یہ خیال پیدا نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ حلال طریقے سے جتنا مجھے دے رہے ہیں، اسی سے میرا کام چل رہا ہے، اس وقت تک تمہیں سکون حاصل نہیں ہوگا۔ ورنہ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس دولت بے حد حساب ہے لیکن ایک لمحے کا سکون نہیں، ایک لمحے کا قرار نہیں، رات کو نیند نہیں آتی، اور بھوک اُڑی ہوئی ہے۔ یہ سب اس دنیا کی دوڑ کا نتیجہ ہے۔ اسی لئے اللہ کے رسول ﷺ یہ فرماتے ہیں کہ ”دنیا کے معاملے میں اپنے سے اُونچے آدمی کو نہ دیکھو کہ وہ کہاں جارہا ہے، بلکہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھو کہ ان کے مقابلے میں تمہیں اللہ تعالیٰ نے کیا کچھ دے رکھا ہے، اس کے ذریعے تمہیں قرار آئے گا، تمہیں راحت ملے گی اور سکون حاصل ہوگا۔ لیکن دین کے معاملے میں اپنے سے اُونچے کو دیکھو۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے ذریعے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوگا، اور آگے بڑھنے کی بے تابی ہوگی۔ لیکن یہ بے تابی بڑی لذیذ بے تابی ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں دنیا جمع کرنے کی بے تابی اور بے چینی تکلیف دہ ہے، وہ پریشان کن ہے، وہ راتوں کی نیند اُڑا دیتی ہے۔ لیکن دین کے لئے جو بے تابی ہوتی ہے وہ بڑی مزیدار ہے، بڑی لذیذ ہے۔ اگر انسان ساری عمر اسی بے تابی میں

رہے، تب بھی وہ لذت میں رہے گا، راحت اور سکون میں رہے گا۔ لیکن ہماری ساری زندگی کا پہیہ اُلٹا چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری فکر کو درست فرمائے، ہمارے دلوں کو درست فرمائے، اور جو راستہ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ ہمیں چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اسی سلسلے میں آگے یہ حدیثیں آرہی ہیں۔

فتنے کا زمانہ آنے والا ہے

یہ پہلی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((انَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ الصَّالِحَةِ فَتَكُوْنُ فِتَنٌ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِيْ كَافِرًا وَيُمْسِيْ مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا يَبِيْعُ دِيْنَهُ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنْيَا)) (۱)

''نیک عمل جلدی جلدی کرلو، جتنا وقت مل رہا ہے، اس کو غنیمت جانو، اس لئے کہ بڑے فتنے آنے والے ہیں، ایسے فتنے جیسے اندھیری رات کے ٹکڑے''

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اندھیری رات شروع ہوتی ہے، اور اس کا ایک حصہ گزر جاتا ہے تو اس کے بعد آنے والا دوسرا حصہ بھی رات ہی کا حصہ ہوتا ہے، اور اس میں تاریکی اور بڑھتی چلی جاتی ہے، اور پھر تیسرے حصے میں اندھیرا اور بڑھ جاتا ہے۔ اب اگر آدمی اس انتظار میں رہے کہ ابھی مغرب کا وقت ہے، تھوڑی سی تاریکی ہے، کچھ وقت گزرنے کے بعد روشنی ہوجائے گی، اس وقت کام کروں گا تو وہ شخص احمق ہے۔ اس واسطے کہ اب جو وقت گزرے گا تو اور زیادہ تاریکی کا وقت آئے گا۔ لہٰذا سرکار دو عالم ﷺ فرما رہے ہیں کہ اگر تمہارے دل میں یہ خیال ہے کہ اور تھوڑا سا وقت گزر جائے پھر کام شروع کروں گا تو یاد رکھو کہ اور وقت جو آنے والا ہے، وہ زیادہ تاریکی والا ہے، آئندہ جو فتنے آنے والے ہیں، وہ بھی اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح ہیں کہ ہر فتنے کے بعد بڑا فتنہ آنے والا ہے۔ پھر آگے فرمایا کہ صبح کو انسان مومن ہوگا اور شام کو کافر ہوجائے گا یعنی ایسے فتنے آنے والے ہیں جو انسان کے ایمان کو سلب کرلیں گے، صبح کو مومن بیدار ہوا تھا، لیکن فتنے کا شکار ہو کر شام کے وقت کافر ہوگیا، اور شام کو مومن تھا، صبح کو کافر ہوگیا، اور یہ کافر اس طرح ہوجائے گا کہ اپنے دین کو دنیا کے تھوڑے سے ساز و سامان کے بدلے میں بیچ ڈالے گا۔ صبح کو مومن اُٹھا تھا اور جب کاروبارِ زندگی میں

(۱) صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب الحث على المبادرة بالأعمال قبل تظاهر الفتن، رقم: ۱۶۹، سنن الترمذي، كتاب الفتن عن رسول الله، رقم: ۲۱۲۱، مسند أحمد، رقم: ۷۶۸۷، رياض الصالحين، ص: ۵۹

پہنچا تو فکر لگی ہوئی تھی دنیا جمع کرنے کی، مال و دولت جمع کرنے کی، اور اس دوران مال حاصل کرنے کا ایک ایسا موقع سامنے آیا جس کے ساتھ شرط یہ تھی کہ دین چھوڑ و تو تمہیں دنیا مل جائے گی۔ اب اس وقت دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ اپنے دین کو چھوڑ کر یہ مال حاصل کرلوں، یا اس مال پر لات مار کر دین کو اختیار کرلوں۔ لیکن چونکہ وہ شخص پہلے سے ٹلانے کا عادی بنا ہوا تھا، اس لئے اس نے سوچا کہ دین کے بارے میں باز پرس معلوم نہیں کب ہوگی؟ کب مریں گے؟ اور کب حشر ہوگا؟ کب ہمارا حساب و کتاب ہوگا؟ وہ تو بعد کی بات ہے، ابھی فوری معاملہ تو یہ ہے کہ یہ مال حاصل کرلو۔ اب وہ دنیا کا سازوسامان حاصل کرنے کے لئے اپنا دین بیچ ڈالے گا۔ اس لئے فرمایا کہ صبح کو مومن اُٹھا تھا، شام کو کافر ہو کر سویا۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ بچائے، آمین۔

''ابھی تو جوان ہیں'' ایک شیطانی دھوکہ

لہٰذا کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ اگر نیک عمل کرنا ہے اور مسلمان کی طرح زندہ رہنا ہے تو انتظار کس چیز کا؟ جو عمل کرنا ہے بس جلدی کرلو۔ اب ہم سب اپنے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لیں کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کر رہے ہیں یا نہیں؟ ہمارے دلوں میں دن رات یہ خیال آتا رہتا ہے کہ اچھا اب نیک عمل کریں گے، اور شیطان یہ دھوکہ دیتا رہتا ہے کہ ابھی تو بہت عمر پڑی ہے، ابھی تو نوجوان ہیں، ابھی تو اُدھیڑ عمر کو پہنچیں گے، اور پھر بوڑھے ہوں گے، پھر اس وقت نیک اعمال شروع کردیں گے۔ نبی کریم سرکارِ دو عالم ﷺ جو حکیم ہیں، اور ہماری رگوں سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ شیطان ان کو اس طرح بہکائے گا۔ اس لئے فرمادیا کہ جلدی جلدی نیکیاں کرلو، اور جو نیک کاموں کی باتیں سن رہے ہو، اس پر عمل کرتے چلے جاؤ۔ کل کا انتظار مت کرو، اس لئے کہ کل آنے والا فتنہ معلوم نہیں تمہیں کہاں پہنچائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

نفس کو بہلا کر اس سے کام لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ نفس کو ذرا دھوکہ دے کر اس سے کام لیا کرو۔ اپنا واقعہ بیان فرمایا کہ روزانہ تہجد پڑھنے کا معمول تھا۔ آخر عمر اور ضعف کے زمانے میں ایک دن بحمد اللہ تہجد کے وقت جب آنکھ کھلی تو طبیعت میں بڑی سستی اور کسل تھا، دل میں خیال آیا کہ آج تو طبیعت بھی پوری طرح ٹھیک نہیں، کسل بھی ہے، اور عمر بھی تمہاری زیادہ ہے، اور تہجد کی نماز کوئی فرض و واجب بھی نہیں ہے، پڑے رہو، اور آج اگر تہجد چھوڑ دو گے تو کیا ہو جائے گا؟ فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ بات تو ٹھیک ہے کہ تہجد فرض واجب بھی نہیں ہے، اور طبیعت بھی ٹھیک

نہیں ہے، باقی یہ وقت تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کا وقت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب رات کا تہائی حصہ گزر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتیں اہلِ زمین پر متوجہ ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منادی پکارتا ہے کہ کوئی مغفرت مانگنے والا ہے کہ اس کی مغفرت کی جائے۔ (۱)

ایسے وقت کو بیکار گزارنا بھی ٹھیک نہیں ہے، نفس کو بہلادیا کہ اچھا ایسا کرو کہ اُٹھ کر بیٹھ جاؤ اور بیٹھ کر تھوڑی سی دعا کرلو اور دعا کر کے سو جانا، چنانچہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور دعا کرنی شروع کردی، دعا کرتے کرتے میں نے نفس سے کہا کہ میاں! جب تم اُٹھ کر بیٹھ گئے تو نیند تو تمہاری چلی گئی، اب غسل خانے تک چلے جاؤ، اور استنجاء وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ، پھر آرام سے آکر لیٹ جانا۔ پھر جب غسل خانے پہنچا اور استنجاء وغیرہ سے فارغ ہوگیا تو سوچا کہ چلو وضو بھی کرلو، اس لئے کہ وضو کر کے دعا کرنے میں قبولیت کی توقع زیادہ ہے، چنانچہ وضو کرلیا اور بستر پر واپس آکر بیٹھ گیا، اور دعا شروع کردی، پھر نفس کو بہلایا کہ بستر پر بیٹھ کر کیا دعا ہورہی ہے، دعا کرنے کی جو تمہاری جگہ ہے، وہیں جاکر دعا کرلو، اور نفس کو جائے نماز تک کھینچ کر لے گیا، اور جاکر جلدی سے دو رکعت تہجد کی نیت باندھ لی۔

پھر فرمایا کہ اس نفس کو تھوڑا سا دھوکہ دے دے کر بھی لانا پڑتا ہے، جس طرح یہ نفس تمہارے ساتھ نیک کام کو ٹلانے کا معاملہ کرتا ہے، اسی طرح تم بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا کرو، اور اس کو کھینچ کھینچ کر لے جایا کرو، انشاء اللہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ پھر اس عمل کی توفیق عطا فرمادیں گے۔

کہاں سربراہِ مملکت، کہاں شانِ الٰہی

ایک مرتبہ فرمایا کہ صبح فجر کی نماز کے بعد ۲ گھنٹے تک اپنے معمولات، تلاوت، ذکر و اذکار اور تسبیح میں گزارتا ہوں۔ ایک دن طبیعت میں کچھ سستی تھی، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ آج تو یہ کہہ رہے ہو کہ طبیعت میں کسل ہے، سستی ہے، اُٹھا نہیں جاتا، اچھا یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص اس وقت سربراہِ مملکت کا پیغام لے کر آئے کہ آپ کو کوئی انعام دینے کے لئے بلایا گیا ہے تو کیا پھر بھی سستی باقی رہے گی؟ پھر بھی یہ کسل باقی رہے گا؟ نفس نے جواب دیا کہ نہیں، اس وقت تو کسل اور سستی باقی

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء نصف اللیل، رقم:۵۸۴۶، صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل، رقم:۱۲۶۱، سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ماجاء فی نزول الرب عزوجل الی السماء، رقم:۴۰۸، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب أی اللیل أفضل، رقم:۱۱۲۰، سنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاة والسنة فیها، باب ماجاء فی أی ساعات اللیل أفضل، رقم:۱۳۵۶، مسند أحمد، رقم:۷۱۹۶

نہیں رہے گی، بلکہ دوڑے دوڑے جائیں گے، اور جاکر انعام وصول کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور پھر اپنے نفس کو مخاطب کرکے کہیں کہ یہ وقت بھی اللہ جل جلالہ کے دربار میں حضوری کا وقت ہے، اور حضوری کی برکت سے اللہ تعالیٰ سے انعامات وصول کرنے کا وقت ہے، پھر کہاں کی سستی اور کہاں کا کسل، چھوڑو اس کسل اور سستی کو، بس یہ سوچ کر اپنے دل کو بہلایا، اور اپنے معمولات میں مشغول ہوگیا۔ بہر حال یہ نفس اور شیطان تو انسان کے بہکانے میں لگے ہوئے ہیں، لیکن ان کو بھی بہلایا کرو، اور جلدی سے ان اعمال کو کرنے کی فکر کیا کرو۔

جنت کا سچا طلب گار

دوسری حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

''غزوۂ اُحد کی لڑائی کے دوران جبکہ معرکہ گرم ہے، مسلمان اور کافروں کی لڑائی ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قیادت فرمارہے ہیں، مسلمان کم ہیں اور کافر زیادہ ہیں، مسلمان بے سروسامان ہیں، اور کافر مسلح ہیں، اور ہر لحاظ سے معرکہ سخت ہے۔ اس وقت میں ایک دیہاتی قسم کا آدمی کھجوریں کھاتا جارہا تھا، اس نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ لڑائی جو آپ کروا رہے ہیں اس میں اگر ہم قتل ہوگئے تو ہمارا انجام کیا ہوگا؟ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اس کا انجام جنت ہے، سیدھے جنت میں جاؤ گے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو دیکھا کہ وہ کھجوریں کھاتا جارہا تھا، لیکن جب اس نے یہ سنا کہ اس کا انجام جنت ہے تو کھجوریں پھینک کر سیدھا لڑائی میں گھس گیا، یہاں تک کہ اسی میں شہید ہوگیا''(۱)

اس لئے کہ جب اس نے سن لیا کہ اس جہاد کا انجام جنت ہے تو پھر اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کہ وہ ان کھجوروں کو پورا کرکے پھر جہاد میں شریک ہو۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو جنت کے مقام تک پہنچا دیا۔ یہ اسی کی برکت تھی کہ نیکی کا جو داعیہ پیدا ہوا، اس پر عمل کرنے میں تاخیر نہیں کی، بلکہ فوراً آگے بڑھ کر اس پر عمل کرلیا۔

اذان کی آواز سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت

حضرت عائشہ علیہا السلام سے ایک صحابی نے پوچھا کہ اُمّ المؤمنین! سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة أحد، رقم: ۳۷٤۰، صحیح مسلم، کتاب الإمارة، رقم: ۳۵۱۸، سنن النسائی، کتاب الجهاد، رقم: ۳۱۰۳، مسند أحمد، رقم: ۱۳۷۹٤

باہر جو ارشادات فرماتے ہیں، اور گھر کے باہر جیسی زندگی گزارتے ہیں وہ تو ہم سب کو پتہ ہے، لیکن یہ بتایئے کہ گھر میں کیا عمل کرتے ہیں؟ (ان کے ذہن میں یہ ہوگا کہ گھر میں جا کر مصلّی بچھاتے ہوں گے، اور نماز اور ذکر واذکار اور تسبیح وغیرہ میں مشغول رہتے ہوں گے) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''جب آپ گھر میں تشریف لاتے ہیں تو ہمارے ساتھ ہمارے گھر کے کاموں میں ہاتھ بھی بٹاتے ہیں، اور ہمارا دکھ درد بھی سنتے ہیں، ہمارے ساتھ خوش طبعی کی باتیں بھی کرتے ہیں، ہمارے ساتھ گھلے ملے رہتے ہیں۔ البتہ ایک بات ہے کہ جب اذان کی آواز کان میں پڑتی ہے تو اس طرح اُٹھ کر چلے جاتے ہیں جس طرح ہمیں پہچانتے بھی نہیں''(۱)

اعلیٰ درجے کا صدقہ

تیسری حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

"جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيُّ الصَّدَقَةِ أَعْظَمُ أَجْرًا؟ قَالَ((أَنْ تَصَدَّقَ وَأَنْتَ صَحِيْحٌ شَحِيْحٌ تَخْشَى الْفَقْرَ وَتَأْمُلُ الْغِنٰى وَلَا تُمْهِلَ حَتّٰى إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ قُلْتَ: لِفُلَانٍ كَذَا وَلِفُلَانٍ كَذَا وَقَدْ كَانَ لِفُلَانٍ)) (۲)

ایک صاحب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور پوچھا کہ سب سے زیادہ ثواب والا صدقہ کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ سب سے اعلیٰ درجہ کا صدقہ یہ ہے کہ تم اپنی صحت کی حالت میں صدقہ کرو، اور ایسے وقت میں صدقہ کرو جب تمہارے دل میں مال کی محبت ہو، اور دل میں یہ خیال ہو کہ یہ مال ایسی چیز نہیں ہے کہ اسے یونہی لٹا دیا جائے، اور مال خرچ کرنے میں تکلیف بھی ہو رہی ہو اور یہ بھی اندیشہ ہو کہ اس صدقہ کرنے کے نتیجے میں بعد میں فقر کا شکار ہو جاؤں گا، اور بعد میں معلوم نہیں کیا حالات ہوں گے؟ اس وقت جو صدقہ کرو گے وہ بڑا اجر والا ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا کہ صدقہ دینے کا دل میں خیال آیا ہے تو اس کو ٹلاؤ نہیں۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النفقات، باب خدمة الرجل فی أهله، رقم: ٤٩٤٤، سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق، رقم: ٢٤١٣، مسند أحمد، رقم: ٢٣٠٩٣

(۲) صحیح البخاری، کتاب الوصایا، باب الصدقة عند الموت، رقم: ٢٥٤٣، صحیح مسلم، کتاب الزکاة، رقم: ١٧١٣، سنن النسائی، کتاب الزکاة، رقم: ٢٤٩٥، سنن أبی داود، کتاب الوصایا، رقم: ٢٤٨١، ریاض الصالحین، ص: ٥٩

اس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض لوگ صدقہ کرنے کو ٹلاتے رہتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جب مرنے کا وقت بالکل قریب آجائے گا تو اس وقت کچھ وصیت کر جائیں گے کہ مرنے کے بعد میرا اتنا مال فلاں کو دے دینا، اور اتنا مال فلاں کو دینا، اور اتنا مال فلاں کام میں لگا دینا وغیرہ۔ تو حضور ﷺ فرمارہے ہیں کہ تم تو یہ کہہ رہے ہو کہ اتنا مال فلاں کو دے دینا، ارے اب تو وہ تمہارا مال رہا ہی نہیں، وہ تو کسی اور کا ہوگیا۔ اس لئے کہ شرعی مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بیماری کی حالت میں کوئی صدقہ کرے، یا صدقہ کرنے کی وصیت کرے کہ اتنا مال فلاں کو دے دیا جائے، یا کسی شخص کو ہبہ کرے، اور اسی بیماری میں اس کا انتقال ہو جائے تو اس صورت میں صرف ایک تہائی مال کی حد تک صدقہ نافذ ہوگا، اور باقی دو تہائی مال ورثاء کو ملے گا، اس لئے کہ وہ وارثوں کا حق ہے۔ کیونکہ مرنے سے پہلے بیماری ہی میں اس مال کے ساتھ ورثاء کا حق متعلق ہو جاتا ہے۔

سوچا یہ تھا کہ آخری عمر میں جاکر سارا مال کسی صدقہ جاریہ میں لگادیں گے تو ساری عمر ثواب ملتا رہے گا۔ حالانکہ وہ تو حالتِ مجبوری کا صدقہ ہے، اور اجر وثواب والا صدقہ تو وہ ہے جو صحت کے وقت میں مال کی ضرورت اور محبت اور اس کے جمع کرنے کے خیال کے وقت میں کیا جائے۔

وصیت ایک تہائی مال کی حد تک نافذ ہوتی ہے

یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ بعض لوگ وصیت کے خواہشمند تو ہوتے ہیں کہ صدقہ جاریہ میں کوئی چیز لگ جائے، اور مرنے کے بعد بھی اس کا ثواب ملتا رہے لیکن اگر وہ اپنی زندگی میں صحت کی حالت میں یہ وصیت لکھ گئے کہ میرے مرنے کے بعد اتنا مال فلاں ضرورت مند کو دے دیا جائے، تو یہ وصیت صرف ایک تہائی کی حد تک نافذ ہوگی، ایک تہائی سے زیادہ میں نافذ نہیں ہوگی، اسی لئے نبی کریم ﷺ فرمارہے ہیں:

''صدقہ کرنے کا داعیہ دل میں پیدا ہوا ہے اس پر ابھی عمل کرلو''

اپنی آمدنی کا ایک حصہ صدقہ کے لئے علیحدہ کر دیجئے

اور اس کا ایک طریقہ میں آپ کے سامنے پہلے بھی بیان کرچکا ہوں، جس کا بزرگوں نے تجربہ بھی کیا ہے۔ اس پر اگر انسان عمل کرلے تو پھر صدقہ کرنے کی توفیق ہو جاتی ہے، ورنہ ہم لوگ تو نیک کام کو ٹلانے کے عادی بن چکے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ آپ کی جو آمدنی ہے اس کا ایک حصہ مقرر کرلیں کہ یہ حصہ اللہ کی راہ میں صدقہ کریں گے اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے، چاہے وہ دسواں حصہ مقرر کریں یا بیسواں حصہ وغیرہ۔ اور پھر جب آمدنی آئے تو اس میں سے وہ مقرر حصہ نکال کر علیحدہ رکھ

دیں اور اس کے لئے کوئی لفافہ بنالیں، اس میں ڈالتے جائیں۔ اب وہ لفافہ خود یاد دلاتا رہے گا کہ مجھے خرچ کرو۔ کسی صحیح مصرف پر لگاؤ، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ خرچ کرنے کی توفیق دے دیتے ہیں۔ ورنہ اگر خرچ کرنے کا موقع سامنے آتا ہے تو آدمی سوچتا رہتا ہے کہ خرچ کروں یا نہ کروں۔ لیکن جب وہ لفافہ موجود ہوگا، اور پہلے سے اس کے اندر پیسے موجود ہوں گے، تو وہ خود یاد دلائے گا، اور موقع سامنے آنے کی صورت میں سوچنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اگر ہر انسان اپنی حیثیت کے مطابق یہ معمول بنالے تو اس کے لئے خرچ کرنا آسان ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں گنتی نہیں دیکھی جاتی

یاد رکھو! اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں گنتی اور تعداد نہیں دیکھی جاتی، بلکہ جذبہ اور اخلاص دیکھا جاتا ہے، ایک آدمی جس کی آمدنی سو روپے ہے، وہ اگر ایک روپیہ اللہ کی راہ میں دیتا ہے، وہ اس آدمی کے برابر ہے جس کی آمدنی ایک لاکھ روپے ہے، اور ایک ہزار روپے اللہ کی راہ میں دیتا ہے، اور کچھ پتہ نہیں کہ وہ ایک روپیہ دینے والا اپنے اخلاص کی وجہ سے اس سے بھی آگے بڑھ جائے۔ اس واسطے گنتی کو نہ دیکھو۔ بلکہ یہ دیکھو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں صدقہ کرنے کی فضیلت حاصل کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنی ہے تو پھر اپنی آمدنی کا تھوڑا سا حصہ اللہ کی راہ میں ضرور خرچ کردو۔

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کا معمول

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ہمیشہ محنت سے حاصل ہونے والی آمدنی کا بیسواں حصہ اور بغیر محنت کے حاصل ہونے والی آمدنی کا دسواں حصہ علیحدہ لفافے میں رکھ دیا کرتے تھے۔ اور آپ کا یہ ساری زندگی کا معمول تھا، اگر ایک روپیہ بھی کہیں سے آیا تو اسی وقت اس کا دسواں حصہ نکال کر اس کی ریزگاری کرا کر اس لفافے میں ڈال دیتے، اور اگر سو روپے آئے ہیں تو دس روپے ڈال دیتے، وقتی طور پر اگرچہ اس عمل میں تھوڑی سی دشواری ہوتی تھی کہ فی الحال ٹوٹے ہوئے پیسے موجود نہیں ہیں، اب کیا کریں، اس کے لئے مستقل انتظام کرنا پڑتا تھا، لیکن ساری عمر کبھی اس عمل سے تخلف نہیں دیکھا اور میں نے وہ تھیلا کبھی ساری عمر بھی خالی نہیں دیکھا — الحمد للہ — اس عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب آدمی اس طرح نکال نکال کر الگ کرتا رہتا ہے تو وہ تھیلا خود یاد دلاتا رہتا ہے کہ مجھے خرچ کرو، اور کسی صحیح مصرف پر لگاؤ۔ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں۔

ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ کرے

ایک صاحب ایک مرتبہ کہنے لگے کہ صاحب! ہمارے پاس تو کچھ ہے نہیں، ہم کہاں سے خرچ کریں؟ میں نے عرض کیا کہ ایک روپیہ ہے؟ اور ایک روپیہ میں سے ایک پائی نکال سکتے ہو؟ فقیر سے فقیر آدمی کے پاس بھی ایک روپیہ ضرور ہوتا ہے، اور ایک روپیہ میں سے ایک پیسہ نکالنے میں کوئی بڑی کمی نہیں ہو جائے گی؟ بس ایک پیسہ نکال دو۔ تو اس شخص کے ایک پیسہ نکالنے میں اور دوسرے شخص کے ایک لاکھ میں سے ایک ہزار نکالنے میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے مقدار کو نہ دیکھو، بلکہ جس وقت جو جذبہ پیدا ہوا، اس پر عمل کر لو۔

یہ ہے اپنی اصلاح کا نسخۂ اکسیر۔ بس اپنے آپ کو ٹلانے سے بچاؤ۔ اگر انسان اس پر عمل کرلے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس کے لئے صحیح راہ پر مال خرچ کرنے کے بڑے راستے پیدا ہو جاتے ہیں، اور مال خرچ کرنے کے فضائل حاصل ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

کس کا انتظار کر رہے ہو؟

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، انَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ سَبْعًا، هَلْ تَنْتَظِرُوْنَ إِلَّا فَقْرًا مُنْسِيًا، أَوْ غِنًى مُطْغِيًا، أَوْ مَرَضًا مُفْسِدًا، اَوْ هَرَمًا مُفَنِّدًا، اَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا، اَوِ الدَّجَّالَ فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ، أَوِ السَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَأَمَرُّ)) أَوْ كَمَا قَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.(۱)

یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں "مبادرة الى الخيرات" یعنی نیک کاموں کی طرف بڑھنے کی جلدی سے فکر کرنے کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ سَبْعًا))

سات چیزوں کے آنے سے پہلے جلد از جلد اچھے اعمال کرلو، جس کے بعد اچھا عمل کرنے کا موقع نہ ملے گا، اور پھر ان سات چیزوں کو ایک دوسرے انداز سے بیان فرمایا۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء فی المبادرة بالعمل، رقم: ۲۲۲۸، مسند أحمد، باقی مسند المكثرين، رقم: ۷۹۵۲، رياض الصالحين، ص: ۵۹

کیا فقر کا انتظار ہے؟

((هَلْ تَنْتَظِرُوْنَ إِلَّا فَقْرًا مُّنْسِيًا))

''کیا تم نیک اعمال کرنے کے لئے ایسے فقر و فاقے کا انتظار کر رہے ہو جو بھلا دینے والا ہو؟''

جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس وقت تمہیں خوش حالی میسر ہے، روپیہ پیسہ پاس ہے، کھانے پینے کی تنگی نہیں ہے، اور عیش و آرام سے زندگی بسر ہو رہی ہے، ان حالات میں اگر تم نیک اعمال کو ٹال رہے ہو تو کیا تم اس بات کا انتظار کر رہے ہو کہ جب موجودہ خوش حالی دور ہو جائے گی، اور خدانہ کرے فقر و فاقہ آ جائے گا، اور اس فقر و فاقے کے نتیجے میں تم اور چیزوں کو بھول جاؤ گے تو اس وقت نیک اعمال کرو گے۔ اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ اس خوش حالی کے زمانے میں تو عیش ہے، اور مزے ہیں، اور پھر جب دوسرا وقت آئے گا، تو اس میں نیک عمل کریں گے، تو اس کے جواب میں حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ جب مالی تنگی آ جائے گی تو اس وقت نیک اعمال سے اور دور ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس وقت انسان اتنا پریشان ہوتا ہے کہ ضروری کام بھی بھول جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ وقت آئے اور تمہیں مالی پریشانی لاحق ہو، معاشی طور پر تنگی کا سامنا ہو، اس سے پہلے پہلے جو کچھ تمہیں خوش حالی میسر ہے، اس کو غنیمت سمجھ کر اس کو نیک عمل میں صرف کرو۔

کیا مالداری کا انتظار ہے؟

آگے فرمایا:

((أَوْ غِنًى مُّطْغِيًا))

''یا تم ایسی مالداری کا انتظار کر رہے ہو جو انسان کو سرکش بنا دے؟''

یعنی اگر اس وقت بہت زیادہ مالدار نہیں ہو اور یہ خیال کر رہے ہو کہ ابھی ذرا مالی تنگی ہے، یا یہ کہ مالی تنگی تو نہیں ہے لیکن دل یہ چاہ رہا ہے کہ ذرا اور پیسے آ جائیں، اور دولت مل جائے، تب نیک اعمال کریں گے۔ یاد رکھو! اگر مالداری زیادہ ہو گئی، اور پیسے بہت زیادہ آ گئے، اور دولت کے انبار جمع ہو گئے تو اس کے نتیجے میں اندیشہ یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مال و دولت تمہیں اور زیادہ سرکشی میں مبتلا کر دے۔ اس لئے کہ انسان کے پاس جب مال زیادہ ہو جاتا ہے، اور عیش و آرام زیادہ میسر آ جاتا ہے وہ خدا کو بھلا بیٹھتا ہے۔ لہٰذا جو کچھ کرنا ہے ابھی کر لو۔

کیا بیماری کا انتظار ہے؟

((أَوْ مَرَضًا مُفْسِدًا))

''یا ایسی بیماری کا انتظار کر رہے ہو جو تمہاری صحت کو خراب کر دے؟''

یعنی اِس وقت تو صحت ہے، طبیعت ٹھیک ہے، جسم میں طاقت اور قوت ہے۔ اگر اس وقت کوئی عمل کرنا چاہو گے تو آسانی کے ساتھ کر سکو گے، تو کیا نیک عمل کو اِس لئے ٹلا رہے ہو کہ جب یہ صحت رخصت ہو جائے گی اور خدا نہ کرے جب بیماری آ جائے گی تو پھر نیک عمل کریں گے۔ ارے جب صحت کی حالت میں نیک عمل نہیں کر پائے تو بیماری کی حالت میں کیا کرو گے؟ اور پھر بیماری خدا جانے کیسی آ جائے، اور کس وقت آ جائے، تو قبل اس کے کہ وہ بیماری آئے، نیک عمل کر لو۔

کیا بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو؟

((أَوْ هَرَمًا مُفَنِّدًا))

''یا تم سٹھیا دینے والے بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو؟''

اور یہ خیال کر رہے ہو کہ ابھی تو ہم جوان ہیں، ابھی تو ہماری عمر ہی کیا ہے، ابھی تو دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔ اس جوانی کے زمانے کو ذرا عیش اور لذتوں کے ساتھ گزر جانے دو، پھر نیک عمل کر لیں گے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ فرما رہے ہیں کہ کیا تم بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو؟ حالانکہ بعض اوقات بڑھاپے میں انسان کے حواس خراب ہو جاتے ہیں، اور اگر کوئی کام کرنا بھی چاہے تو نہیں کر پاتا، تو قبل اس کے کہ بڑھاپے کا دور آئے اس سے پہلے نیک عمل کر لو۔ بڑھاپے میں تو یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ منہ میں دانت اور نہ پیٹ میں آنت، اور اب گناہ کرنے کی طاقت ہی نہ رہی، اس وقت اگر گناہ سے بچ بھی گئے تو کیا کمال کر لیا؟ جب جوانی ہو، طاقت موجود ہو، گناہ کرنے کے سامان موجود ہوں، گناہ کرنے کے اسباب موجود ہوں، گناہ کرنے کا جذبہ دل میں موجود ہو، اس وقت اگر انسان گناہ سے بچ جائے تو درحقیقت یہ ہے پیغمبرانہ طریقہ۔ چنانچہ اسی کے بارے میں شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

وقت پیری گرگ ظالم میشود پرہیزگار
در جوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبری

ارے بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی پرہیزگار بن جاتا ہے۔ وہ اس لئے پرہیزگار نہیں بنا کہ اس کو کسی اخلاقی فلسفے نے پرہیزگار بنا دیا، یا اس کے دل میں خدا کا خوف آ گیا، بلکہ اس لئے پرہیزگار بن گیا کہ اب کچھ کر ہی نہیں سکتا، کسی کو چیر پھاڑ کر کھا نہیں سکتا، اب وہ طاقت ہی باقی نہیں رہی، اس

لئے ایک گوشہ کے اندر پرہیزگار بنا بیٹھا ہے۔ یاد رکھو! جوانی کے اندر توبہ کرنا، یہ ہے پیغمبری کا شیوہ، یہ ہے پیغمبروں کا شِعار۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھئے کہ بھرپور جوانی ہے، طاقت ہے، قوت ہے، حالات میسر ہیں، اور گناہ کی دعوت دی جارہی ہے۔ لیکن اس وقت زبان پر یہ کلمہ آتا ہے:

﴿مَعَاذَ اللّٰهِ إِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ﴾(۱)

''میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، بے شک میرا رب بہترین آسرا ہے''

یہ ہے پیغمبری کا شیوہ، کہ انسان جوانی کے اندر گناہ سے تائب ہوجائے، جوانی کے اندر انسان نیک عمل کرے۔ بڑھاپے میں تو اور کوئی کام بن نہیں پڑتا، ہاتھ پاؤں چلانے کی سکت ہی نہیں۔ اب گناہ کیا کرے؟ گناہ کے مواقع ہی ختم ہوگئے۔

اس لئے حضورِ اقدس ﷺ فرماتے ہیں کہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جب بوڑھے ہوجائیں گے تب نیک عمل کریں گے، تب نماز شروع کریں گے، اس وقت اللہ کو یاد کریں گے۔ اگر حج فرض ہوگیا تو یہ سوچتے ہیں کہ جب عمر زیادہ ہوجائے گی، تب جائیں گے۔ خدا جانے کتنے دن کی زندگی باقی ہے؟ کتنی مہلت ملی ہوئی ہے؟ بڑھاپا آتا ہے یا نہیں، اگر بڑھاپا آ بھی گیا تو معلوم نہیں اس وقت حالات سازگار ہوں، یا نہ ہوں۔ اس لئے اسی وقت کر گزرو۔

کیا موت کا انتظار ہے؟

((أَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا))

''یا تم اس موت کا انتظار کررہے ہو جو اچانک آجائے''

ابھی تو تم نیک اعمال کو ٹلا رہے ہو کہ کل کرلیں گے، پرسوں کرلیں گے، کچھ اور وقت گزر جائے تو شروع کردیں گے، کیا تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ موت اچانک بھی آسکتی ہے۔ بعض اوقات تو موت پیغام دیتی ہے، الٹی میٹم دیتی ہے۔ لیکن بعض اوقات بغیر الٹی میٹم کے بھی آجاتی ہے اور آج کی دنیا میں تو حادثات کا یہ عالم ہے کہ کچھ معلوم نہیں، کس وقت انسان کے ساتھ کیا ہوجائے؟ ویسے تو اللہ تعالیٰ نوٹس بھیجتے رہتے ہیں۔

ملک الموت سے ملاقات

ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص کی ایک مرتبہ ملک الموت سے ملاقات ہوگئی (خدا معلوم کیسی حکایت ہے، لیکن بہرحال عبرت کی حکایت ہے) تو اس نے حضرت عزرائیل علیہ السلام سے کہا کہ

(۱) یوسف: ۲۳

جناب! آپ کا بھی عجیب معاملہ ہے، جب آپ کی مرضی ہوتی ہے آدھمکتے ہیں۔ دنیا کا قاعدہ تو یہ ہے کہ اگر کسی کو کوئی سزا دینی ہو تو پہلے سے اس کو نوٹس دیا جاتا ہے کہ فلاں وقت تمہارے ساتھ یہ معاملہ ہونے والا ہے، اس کے لئے تیار ہو جانا۔ اور آپ تو نوٹس کے بغیر چلے آتے ہیں۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: ارے بھائی! میں تو اتنے نوٹس دیتا ہوں کہ دنیا میں کوئی بھی نہیں دیتا ہوگا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ کوئی نوٹس سنتا ہی نہیں؟ تمہیں معلوم نہیں کہ جب بخار آتا ہے تو وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، جب سر میں درد ہوتا ہے وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، جب بڑھاپا آتا ہے وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، جب سفید بال آجاتے ہیں وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، جب آدمی کے پوتے پیدا ہو جاتے ہیں وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، تو میں تو مسلسل نوٹس بھیجتا رہتا ہوں، یہ اور بات ہے کہ تم سنتے ہی نہیں۔ یہ ساری بیماریاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوٹس ہیں کہ دیکھو! وقت آنے والا ہے، قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

﴿أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ﴾ (۱)

''یعنی آخرت میں ہم تم سے پوچھیں گے کہ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی جس میں اگر کوئی نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کر لیتا، اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آگیا تھا''

یہ کون ڈرانے والا آیا تھا؟ اس کی تفسیر میں بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد حضور اقدس ﷺ ہیں، اس لئے کہ آپ ﷺ نے آکر لوگوں کو ڈرایا کہ موت کا وقت جب آئے گا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہوگا۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ''نذیر'' سے مراد سفید بال ہیں، جب سر میں یا داڑھی میں سفید بال آگئے تو یہ ''نذیر'' ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا آیا ہے کہ اب وقت قریب آرہا ہے، تیار ہو جاؤ۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ''نذیر'' سے مراد ''پوتا'' ہے کہ جب کسی کے یہاں پوتا پیدا ہو جائے تو یہ پوتا ''نذیر'' ہے، ڈرانے والا ہے کہ اب وقت آنے والا ہے، تیار ہو جاؤ۔ اسی کو کسی عربی شاعر نے ایک شعر میں نظم کر دیا ہے کہ۔

إِذَا الرِّجَالُ وَلَدَتْ أَوْلَادُهَا
وَبَلِيَتْ مِنْ كِبَرٍ أَجْسَادُهَا
وَجَعَلَتْ أَسْقَامُهَا تَعْتَادُهَا
تِلْكَ زُرُوْعٌ قَدْ دَنَا حِصَادُهَا

(۱) الفاطر: ۳۷

یعنی جب انسان کی اولاد کی اولاد پیدا ہوجائے اور بڑھاپے کی وجہ سے اس کا بدن پرانا ہوجائے، اور بیماریاں یکے بعد دیگرے آنے لگیں، کبھی ایک بیماری، کبھی دوسری بیماری، ایک بیماری ٹھیک ہوئی تو دوسری آگئی، تو سمجھ لو کہ یہ وہ کھیتیاں ہیں جن کی کٹائی کا وقت آگیا ہے۔

بہر حال! سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نوٹس ہیں۔ اگرچہ عادت اللہ یہی ہے کہ یہ نوٹس آتے رہتے ہیں، لیکن بعض اوقات موت اچانک بغیر نوٹس کے بھی آجاتی ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ فرمارہے ہیں کہ تم ایسی موت کا انتظار کررہے ہو جو نوٹس دیئے بغیر اچانک آجائے۔ کیا معلوم کہ کتنے سانس ابھی باقی ہیں۔ اس کا انتظار کیوں کررہے ہو؟ اس کے بعد فرمایا:

کیا دجال کا انتظار ہے؟

((أَوِ الدَّجَّالَ))

کیا تم دجال کا انتظار کررہے ہو؟

اور یہ سوچ رہے ہو کہ ابھی تو زمانہ نیک عمل کے لئے سازگار نہیں ہے۔ تو کیا دجال کا زمانہ سازگار ہوگا؟ جب دجال ظاہر ہوگا تو کیا اس فتنے کے عالم میں نیک عمل کرسکو گے؟ خدا جانے اس وقت کیا عالم ہوگا، گمراہی کے کیسے محرکات اور دواعی پیدا ہوجائیں گے، تو کیا تم اس وقت کا انتظار کررہے ہو؟

((فَشَرُّ غَائِبٍ يُّنْتَظَرُ))

یعنی دجال ان دیکھی چیزوں میں بدترین چیز ہے جس کا انتظار کیا جائے، بلکہ اس کے آنے سے پہلے پہلے نیک عمل کرلو، اور آخر میں فرمایا:

کیا قیامت کا انتظار ہے؟

((أَوِ السَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ))

یا پھر قیامت کا انتظار کررہے ہو؟ تو سن رکھو کہ قیامت جب آئے گی تو اتنی مصیبت کی چیز ہوگی کہ اس مصیبت کا کوئی علاج انسان کے پاس نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس کے آنے سے پہلے پہلے نیک عمل کرلو۔

ساری حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی نیک عمل کو ٹلاؤ نہیں، اور آج کے نیک عمل کو کل پر مت چھوڑو، بلکہ جب نیک عمل کا جذبہ پیدا ہو، اس پر فوراً عمل بھی کرلو۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

نفلی عبادت کی اہمیت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

عشرہ ذی الحجہ میں عبادت

اس سے پچھلے باب میں گناہوں کے برے انجام کو بیان کیا گیا تھا جس پر الحمد للہ بقدر ضرورت بیان ہو چکا اور اب یہ باب اللہ تعالیٰ کی عبادت کی فضیلت کے بیان میں ہے اور حسنِ اتفاق سے یہ باب آج ذی الحجہ کی پہلی تاریخ کو شروع ہو رہا ہے۔ اور ذی الحجہ کا پہلا عشرہ ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے دنوں کے مقابلے میں اسے خصوصی امتیاز عطا فرمایا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''رمضان کے بعد کوئی دن ایسا نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو عبادت اتنی پسند ہو جتنی اس عشرہ ذی الحجہ میں ہوتی ہے''

اور پھر اس کی تفصیل یوں بیان فرمائی:

''اس کے ایک دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر ہے اور ایک رات کی عبادت (اجر و ثواب کے اعتبار سے) شب قدر کی عبادت کے برابر ہے''(۱)

چونکہ حدیث کے الفاظ عام ہیں اس لئے علماء نے فرمایا ہے کہ خواہ کسی بھی قسم کی عبادت ہو وہ ان دنوں میں جتنی زیادہ انجام دی جائے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر و ثواب کی امید ہے۔

عبادت، تخلیق کا بنیادی مقصد

گذشتہ بیانات میں، میں دو باتوں پر کثرت سے زور دیتا رہا ہوں:

☆ اصلاحی مواعظ (۲/۲۳ تا ۴۶) جامعہ دار العلوم، کراچی۔ یہ بیان عبداللہ بن المبارک کی مایہ ناز کتاب ''کتاب الزھد'' کے ایک حصے کا درس ہے، جس میں مفتی تقی عثانی صاحب مدظلہ نے اس کتاب کے ایک باب ''باب ماجاء فی فضل العبادۃ'' پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصوم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء في العمل في أيام العشر، رقم: ۶۸۹، سنن ابن ماجه، كتاب الصيام، باب صيام العشر، رقم: ۱۷۱۸

(۱) نفلی عبادات کے مقابلے میں گناہوں سے بچنے کی فکر زیادہ اہم ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرے۔

(۲) حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام کیا جائے کیونکہ لوگوں نے حقوق العباد کو دین ہی سے خارج قرار دے دیا ہے۔

میں متعدد بار عرض کر چکا ہوں کہ دین کے پانچ شعبے ہیں:

(۱) عقائد (۲) عبادت (۳) معاملات (۴) معاشرت (۵) اخلاقیات

لیکن آج کے دور میں لوگوں نے عقائد اور عبادات کی حد تک دین کو محدود کر دیا ہے اور بقیہ تینوں شعبوں کو دین سے بالکل خارج سمجھ لیا ہے۔ اور ان میں بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہونے کے باوجود اس کے گناہ ہونے کا خیال بھی دل میں نہیں کرتے۔ حالانکہ حقوق العباد کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، محض توبہ واستغفار سے وہ گناہ معاف نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عبادات فی نفسہ اہمیت نہیں رکھتیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت خواہ کسی بھی مشروع شکل میں ہو، درحقیقت وہی تخلیق انسانی کا بنیادی مقصد ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (۱)

''اور میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے''

فرشتے اور انسان کی عبادت کا فرق

یوں تو تخلیق انسانی سے پہلے فرشتے بھی عبادت کیا کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو محض اپنی عبادت کے لئے اس وجہ سے پیدا فرمایا کہ فرشتوں کی عبادت درحقیقت فرشتوں کی طرف سے کسی کمال پر مبنی نہیں، اس لئے کہ ان کے اندر نفسانی خواہشات رکھی ہی نہیں گئیں۔ وہ اگر گناہ کرنا بھی چاہیں تو ان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں ہے نہ انہیں بھوک پیاس لگتی ہے، نہ انہیں نیند اور اونگھ آتی ہے اور نہ کوئی دوسری نفسانی خواہش ان کے دل میں آتی ہے۔ جس کام کے لئے انہیں متعین کر دیا گیا وہ اسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بخلاف انسان کے، کیونکہ اس کی تخلیق کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا میں ایسی مخلوق پیدا کر رہا ہوں جس میں ہر قسم کے تقاضے ہوں گے، نیکی کے بھی اور بدی کے بھی، بھوک اور پیاس کے بھی اور جنسی خواہشات کے بھی، لیکن اس مخلوق کا کمال یہ ہوگا کہ وہ اپنی ان خواہشات اور جذبات کو قابو میں رکھ کر جب میری عبادت کرے گی تو پھر یہ مخلوق تم سے بھی آگے بڑھ جائے گی۔ تم اگرچہ ہر وقت تسبیح وتقدیس اور عبادت میں لگے ہوئے لیکن یہ انسان ایسا ہوگا کہ اس کی

(۱) الذاریات: ۵٦

آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہوگا اور آرام دہ بستر اس کو خواب راحت کے مزے دینے کی دعوت دے رہا ہوگا اس کے باوجود جب یہ اس بستر کو چھوڑ کر میری یاد اور ذکر و عبادت کی خاطر کھڑا ہو کر مجھے پکارے گا تو اس وقت یہ تم سے بھی بازی لے جائے گا۔ انہی لوگوں کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَّطَمَعاً﴾ (۱)

''ان کے پہلوں اپنے بستروں سے جدا ہوتے ہیں وہ اپنے پروردگار کو خوف اور طمع کی حالت میں پکارتے ہیں''

انہیں خوف تو اس بات کا ہوتا ہے کہ پتہ نہیں یہ عمل اللہ کے یہاں مقبول بھی ہے یا نہیں، اور امید اس بات کی کہ شاید اللہ تعالیٰ اس عمل کی برکت سے مجھ پر فضل فرمادیں۔

ایک اور مقام پر اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿كَانُوْا قَلِيْلاً مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ٥ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (۲)

''رات کے حصے میں یہ لوگ کم سوتے ہیں اور صبح کے وقت میں استغفار کرتے ہیں''

پس اصل مقصد یہ ہوا کہ خواہشات کا یہ پتلا اپنے پروردگار کی بندگی کے لئے تیار ہو اور دیگر احکامات کی بجا آوری بھی کرتا رہے۔ اس لئے عبادت کی اہمیت کو کسی طرح کم نہیں کہا جاسکتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ ان عبادات کو صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمادیں تو یہی عبادات نہ صرف یہ کہ انسان کی زندگی کے مقصد کو پورا کرتی ہیں بلکہ انسان کو نفس اور شیطان سے مقابلہ کرنے کی توانائی بھی بخشتی ہیں۔

عبادات کی دو قسمیں

اب یہ بات بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ عبادات کی دو قسمیں ہیں ایک وہ کہ جنہیں انجام دینا ضروری ہے جیسے فرائض اور واجبات، اور کسی درجے میں اس کے اندر سنن مؤکدہ بھی داخل ہیں۔ اور دوسری قسم نفلی عبادت کی ہے یعنی اگر کوئی ان عبادات کو انجام دے رہا ہے تو ثواب پائے اور نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں۔

یہ باب اسی دوسری قسم کی عبادات کے بیان میں ہے کہ نوافل بھی انسان کو اپنے معمولات میں کسی حد تک شامل کرنے چاہئیں۔ اور تجربہ ہے کہ نوافل کو اپنے معمولات میں داخل کئے بغیر انسان کو نفس اور شیطان سے مقابلہ کرنے کی پوری قوت حاصل نہیں ہوتی۔

---

(۱) السجدة:۱٦ (۲) الذاریات:۱۷۔۱۸

نوافل، اللہ تعالیٰ کی محبت کا حق

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ فرائض اللہ کی عظمت کا حق ہیں جنہیں انجام دینا ضروری ہے اور نوافل اللہ تعالیٰ کی محبت کا حق ہیں۔ جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو انسان صرف قانونی تعلقات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس سے آگے بھی بڑھ کر ملتا ہے۔ مثلاً شوہر اور بیوی کا ایک تعلق ہے، اگر خاوند صرف قانونی تعلقات پورے کرے، مثلاً مہر ادا کر دے اور نفقہ دے دیا کرے لیکن میاں بیوی جس طرح رہتے ہیں اس طرح نہیں رہتا تو وہ شخص اگرچہ قانونی تقاضا پورا کر رہا ہے لیکن محبت کا تقاضا پورا نہیں کر رہا جو اصل درکار ہے۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

کچھ اور ہے درکار میری تشنہ لبی کو
ساقی سے میرا واسطہٗ جام نہیں ہے

اسی طرح ایک شخص صرف فرائض و واجبات ادا کرتا ہے تو اس کا اگرچہ اللہ تعالیٰ سے قانونی تعلق ہے لیکن یہ تعلق خشک اور کھردرا ہے۔ بخلاف اس شخص کے جو اپنے معمولات میں نوافل کو بھی شامل کر لیتا ہے کہ وہ محبت کے تقاضے کو بھی پورا کرنے والا ہے۔

نوافل کی کثرت کرنے والا اللہ کا قریبی ہے

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میرا بندہ نوافل کی جتنی کثرت کرتا جاتا ہے اتنا ہی میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ میں ہی اس کی زبان بن جاتا ہوں، جس سے وہ بولتا ہے اور میں ہی اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے''(۱)

یعنی بندہ کی زبان پر وہی بات جاری ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تم جس شخص کو نوافل کی کثرت کرتے دیکھو تو اس کے قریب ہو جاؤ (یعنی اس کی صحبت اختیار کرو) کیونکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت کی باتیں القاء کی جاتی ہیں''(۲)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، رقم: ۶۰۲۱

(۲) مشکوۃ المصابیح (۲/۴۴۶)

عبادت کی کثرت، محمود ہے

اس باب کی پہلی حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ہیں، فرماتے ہیں:
"عَنِ الْحَسَنِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((رَحِمَ اللّٰهُ قَوْمًا يَحْسَبُهُمُ النَّاسُ بِمَرْضٰى وَمَا هُمْ بِمَرْضٰى)) قَالَ الْحَسَنُ: جَهَدَتْهُمُ الْعِبَادَةُ"(۱)

''حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اپنی رحمت نازل فرمائے جنہیں دیکھ کر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بیمار ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ بیمار نہیں ہوتے'' حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ''عبادت کی کثرت نے ان کے جسموں پر ایسا اثر ڈالا ہے''

نیز ایک اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
((أَكْثِرُوْا ذِكْرَ اللّٰهِ حَتّٰى يَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ)) (۲)
''اللہ تعالیٰ کی اتنی عبادت کرو کہ لوگ تمہیں مجنون اور دیوانہ کہنے لگیں''

آج کل طعنہ دیا جاتا ہے کہ مولویوں کی عقلیں خراب ہوگئی ہیں کہ دنیا کے مال و دولت اور شان و شوکت کو چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات میں لگے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں انسان کو یہ طعنے اپنے لئے خوشخبری سمجھنے چاہئیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت میں جب تمہیں دیوانہ کہا جانے لگے تو یہ اللہ کے یہاں مقبولیت کی علامت ہے۔ اس لئے ان طعنوں سے گھبرانا نہیں چاہئے۔

عبادت میں مشغول شخص کے پاس رک جاؤ

حضرت کعب رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ کہیں سے گذر رہے تھے تو دیکھا کہ ایک شخص قرآن کی تلاوت کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے میں مشغول ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت کعب رضی اللہ عنہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گئے اور اس کی تلاوت اور دعاؤں کو سننے لگے۔ اب بظاہر تو اس شخص کے پاس ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اس لئے کہ وہ اپنی عبادت میں مشغول تھا اور یہ اپنے سفر پر جا رہے تھے، انہیں یہاں رک کر

---

(۱) كتاب الزهد لابن المبارك، رقم:۹۲(۳۱/۱)، جامع الأحاديث، رقم:۱۲۷۲۲(۱۲٤/۱۳)، كنز العمال، رقم:۱٦٥۹۱ (٤۷۰/٦) (۲) مسند أحمد، رقم:۱۱۲۲٦

اپنی منزل کھوٹی کرنے کی کیا ضرورت؟ لیکن وہ یہ سوچ کر رک گئے کہ جو انسان اللہ کی عبادت میں مشغول ہو، اس کے پاس تھوڑی دیر کھڑے ہو کر اس کی بات سن لینا بھی بعض اوقات انسان کے لئے فائدہ مند ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں یہ اللہ کا کیسا مقبول بندہ ہو اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بارش کیسے برس رہی ہو، میں بھی اگر تھوڑی دیر کے لئے رک گیا تو ہو سکتا ہے کہ رحمت کی اس بارش کا ایک چھینٹا مجھ پر بھی پڑ جائے، یہی سبق دینے کے لئے حضرت کعب رضی اللہ عنہ اس شخص کے پاس رکے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہٗ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ جب میں کہیں سے گذر رہا ہوتا ہوں اور اس جگہ کسی کا وعظ ہو رہا ہو خواہ وہ واعظ کتنا ہی معمولی آدمی ہو لیکن میں تھوڑی دیر کے لئے اس کے پاس ضرور رک جاتا ہوں تاکہ اس کی بات اس نیت سے سن لوں کہ شاید اس کے منہ سے کوئی کلمہ ایسا نکل جائے جو میرے دل پر اثر انداز ہو جائے اور اللہ تعالیٰ مجھے اس سے فائدہ پہنچا دے۔ جیسا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک جملہ انسان کی زندگی کی کایا پلٹنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

ایک جملہ نے زندگی بدل ڈالی

حضرت محمد بن مسلمہ قعنبی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ بڑے درجے کے محدثین میں سے ہیں اور سنن ابو داؤد میں ان کی بہت سی روایات موجود ہیں۔ وہ ایک مرتبہ کہیں جا رہے تھے، راستے میں ایک شخص جس کا نام شعبہ تھا جو بعد کے بہت بڑے محدث ہوئے لیکن ابتدائی دور میں ایک آوارہ قسم کے اور فسق و فجور میں مبتلا آدمی تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک محدث گھوڑے پر سوار آ رہا ہے۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا داعیہ پیدا ہوا کہ اس نے آگے بڑھ کر ان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور بدتمیزی سے کہنے لگا "یا شیخ! مجھے کوئی حدیث سنا دیجئے!"

انہوں نے کہا "حدیث سننے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا، پھر کسی وقت سن لینا"

اس نے کہا "نہیں، میں ابھی سنوں گا چاہے صرف ایک حدیث سنا دو"

حضرت محمد بن مسلمہ رحمۃ اللہ علیہ کو غصہ تو بہت آیا لیکن سوچا کہ ایک ایسی حدیث سنا دوں جو اس کے موقع کے لحاظ سے مناسب ہو چنانچہ انہوں نے یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ))(۱)

"جب تیرے اندر سے حیا نکل جائے تو جو چاہے کر"

(۱) صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، حدیث الغار، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

شعبہ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ حدیث میرے کانوں میں پڑی، اس کا میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ حدیث حضور ﷺ نے میرے ہی بارے میں ارشاد فرمائی ہے۔ اور ایسی چوٹ لگی کہ دل میں اپنی سابقہ زندگی سے توبہ کرنے کا عزم کرلیا اور توبہ کرلی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ مقام بخشا کہ آج شعبہ بن حجاج کو ''امیر المؤمنین فی الحدیث'' کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بعض اوقات ایک جملہ بھی انسان کی زندگی کو بدلنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت

اس لئے میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ نے اس بات کے ساتھ ساتھ یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جب کوئی شخص مولوی اور واعظ بن جاتا ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ میں تو وعظ کہنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہوں۔ وعظ سننے کے لئے تو پیدا نہیں ہوا۔ اس لئے وہ کسی کا وعظ سننے میں کسرِ شان سمجھتا ہے۔ اس لئے تم اپنے دل سے یہ بات نکال دو اور جہاں کہیں نیکی کی بات ہو رہی ہو اور اسے سننے کا موقع بھی ہو تو اسے اس نیت سے سنو کہ شاید اللہ کی رحمت سے کوئی بات میرے دل میں اتر کر اثر انداز ہو جائے اور میری زندگی کی تبدیلی کا سبب بن جائے۔

آج ایسی مثال ملنا مشکل ہے کہ پاکستان کا مفتی اعظم (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ) ایک معمولی واعظ کا وعظ سن رہا ہے کہ شاید خیر کا کوئی کلمہ اثر کر جائے۔ یہی وہ مقام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے خاص اور مقبول بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔

موت سے پہلے عبادت کرلیجئے

غرض یہ کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ اس کی تلاوت اور دعاؤں کو سننے کے بعد جب آگے بڑھے تو فرمایا:

> ''شاباش ہے ان لوگوں کو جو اپنے اوپر قیامت کے دن سے پہلے رولیں کیونکہ اگر پہلے نہ رو سکے تو قیامت کے دن رونا پڑے گا جو کوئی کام نہ دے گا''(۱)

مطلب یہ کہ یہ بندہ جو اللہ کے سامنے خشوع وخضوع کا بہترین عمل کر رہا ہے اور وقت آنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رقم: ۳۲۲٤، سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في الحياء، رقم: ٤١٦٤، مسند أحمد، رقم: ١٦٤٨٥، موطا امام مالك، كتاب النداء للصلاة، باب وضع اليدين احدهما على الأخرى في الصلاة، رقم: ٣٣٩

(۱) كتاب الزهد لابن المبارك، رقم: ٩٦ (٣٢/١)

سے پہلے اللہ کے سامنے مناجات کر رہا ہے کامیاب شخص ہے۔

قرآن حکیم میں بھی بار بار تاکید کی گئی ہے کہ موت کا وقت آنے سے پہلے عمل صالح کرلو، چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿وَأَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنَاكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَّأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِيْ إِلٰى أَجَلٍ قَرِيْبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِّنَ الصَّالِحِيْنَ﴾ (۱)

''اور ہمارے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم پر موت آجائے اور تم کہو کہ اے اللہ! مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دیجئے کہ دوبارہ دنیا میں جا کر صدقہ خیرات کر کے اور اعمال صالحہ اپنا کر نیکوں میں شمار کیا جاؤں''

﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا إِذَا جَآءَ أَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (۲)

''جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی میعاد میں توسیع نہیں فرماتے''

لہٰذا پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے رو رو کر توبہ کرلے اور عبادات میں مشغولیت اختیار کرلے تو یہ قابل تعریف ہے۔

نوافل کی کثرت نے جنتی کا درجہ بڑھا دیا

اس باب کی اگلی حدیث یہ ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ الدَّرَجَةَ فِي الْجَنَّةِ فَوْقَ الدَّرَجَةِ كَمَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ وَإِنَّ الْعَبْدَ لَيَرْفَعُ بَصَرَهُ فَيَلْمَعُ لَهُ بَرْقٌ يَكَادُ وَيَخْطَفُ بَصَرَهُ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَا؟ فَيُقَالُ لَهُ هٰذَا نُوْرُ أَخِيْكَ فَيَقُوْلُ أَخِيْ فُلَانٌ كُنَّا نَعْمَلُ فِي الدُّنْيَا جَمِيْعًا وَقَدْ فُضِّلَ عَلَيَّ هٰكَذَا قَالَ فَيُقَالُ لَهُ إِنَّهُ كَانَ أَفْضَلَ مِنْكَ عَمَلًا ثُمَّ يُجْعَلُ فِيْ قَلْبِهِ الرِّضَا حَتّٰى يَرْضٰى)) (۳)

''جنت میں اللہ تعالیٰ نے مختلف لوگوں کے لئے جو درجات رکھے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ ایک درجے سے دوسرے درجے کے درمیان زمین و آسمان کے مابین جتنا فاصلہ ہے۔ جنت میں ایک شخص اپنے درجے کے اندر بیٹھا ہوگا، وہ اپنی نگاہ اوپر کی

(۱) المنافقون: ۱۰ (۲) المنافقون: ۱۱

(۳) کتاب الزھد، رقم: ۱۰۰ (۱/۳۳)، اصل نسخہ میں "أَفْضَلُ مِنْكَ عَمَلًا" کی جگہ "أَفْضَلُ عَمَلًا" پرنٹ ہوا تھا جو کہ درست نہیں، درست الفاظ وہ ہیں جو یہاں ذکر کئے گئے۔

طرف اٹھائے گا تو اسے ایسا لگے گا جیسے بجلی چمکی اس سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ وہ گھبرا کر پوچھے گا کہ یہ کیا چیز ہے؟ تو اسے جواب دیا جائے گا کہ یہ تمہارے فلاں بھائی کا نور ہے (جس بھائی کا درجہ تم سے بلند ہے) تو وہ حیران ہو کر کہے گا کہ ہم تو دنیا میں اکٹھے رہتے تھے اور ہمارا عمل بھی ایک جیسا تھا پھر کیا وجہ ہوئی کہ وہ اتنے بلند درجے پر پہنچ گیا۔ تو اسے جواب دیا جائے گا کہ اس کا عمل تیرے عمل سے افضل تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے، پھر اس شخص کے دل میں اسی درجے پر رہنے کے لئے رضامندی ڈال دی جائے گی یہاں تک کہ وہ راضی ہو جائے گا''

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اپنے عمل کو بڑھانا مقدار اور کیفیت دونوں اعتبار سے مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اسی لئے بنائی ہے کہ انسان اعمال صالحہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾(۱)

''اور حرص کرنے والوں کو اسی میں حرص کرنی چاہئے''

یعنی یہ جو تم دنیاوی ساز و سامان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں ہو، یہ چیزیں اس لائق نہیں کہ ان میں ایک دوسرے سے مقابلہ کیا جائے بلکہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا مقابلہ تو آخرت کی نعمتوں میں ہونا چاہئے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوَاتُ وَالْأَرْضُ﴾(۲)

''اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف دوڑ لگاؤ جس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہے''

حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ کی نفلی عبادت

اس باب کی اگلی حدیث ایک تابعی رحمہ اللہ کی حالت سے متعلق ہے:

''عَنِ امْرَأَةِ مَسْرُوقٍ قَالَتْ مَا كَانَ مَسْرُوقٌ يُوجَدُ إِلَّا وَسَاقَاهُ قَدِ انْتَفَخَتَا مِنْ طُولِ الصَّلَاةِ قَالَتْ وَاللّٰهِ إِنْ كُنْتُ لَأَجْلِسُ خَلْفَهُ فَأَبْكِي رَحْمَةً لَهُ''(۳)

''حضرت مسروق رحمہ اللہ کی اہلیہ فرماتی ہیں کہ میں نے ساری زندگی مسروق کی

(۱) المطففین: ۲۶ (۲) آل عمران: ۱۳۳

(۳) کتاب الزهد لابن المبارك، رقم: ۹۵ (۱/۳۱)

پنڈلیوں پر ورم ہی دیکھا۔ اور فرماتی تھیں کہ جب وہ رات کو تہجد کی نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو میں بعض اوقات ان کے پیچھے بیٹھی ہوتی تھی، ان کے قیام کو دیکھ کر مجھے رونا آجاتا تھا"

حضرت مسروق بن اجدع رحمۃ اللہ علیہ کوفہ کے مشہور فقہاء ومحدثین تابعین میں سے ہیں۔ عربی میں مسروق کا معنی ہے چوری کیا ہوا، چونکہ انہیں بچپن میں کوئی اغوا کر کے لے گیا تھا، اس لئے ان کا لقب مسروق ہوگیا اور وہ اسی نام سے مشہور ہو گئے اور اصلی نام کو سب لوگ بھول گئے۔ ان کی اہلیہ صاحبہ نے ان کی عبادت کا یہ نقشہ کھینچا ہے جو نوافل میں کثرت اہتمام کا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا کثرت اہتمام نوافل

اس باب کی اگلی حدیث میں ایک مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی کثرت اہتمام نوافل سے متعلق ہے جس کے راوی ان کے بیٹے ہیں وہ فرماتے ہیں:

"اِذَا هَدَأَتِ الْعُيُوْنُ قَامَ فَسَمِعْتُ لَهُ دَوِيًّا كَدَوِيِّ النَّحْلِ حَتّٰى يُصْبِحَ"(۱)

"جب لوگ سونے کے لئے بستروں پر جا کر لیٹ جاتے، میں ان کے بستر کے قریب ہونے کی وجہ سے ان کی آواز سنتا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے اور یہ آواز ساری رات آتی رہتی تھی یہاں تک کہ صبح ہو جاتی"

(گویا ساری رات اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑے رہتے)

آج آپ اور ہم ان احادیث اور فقہ سے تو واقف ہیں اور انہیں "أفقہ الصحابۃ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور انہیں کے فتاویٰ پر مذہب حنفی کی بنیاد ہے۔ لیکن ان کی عبادت سے بہت کم لوگ واقف ہیں حالانکہ وہ تو آیت قرآنی ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ کے پورے مصداق ہیں۔

ساری عمر عشاء کے وضو سے فجر کی نماز

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا کہ وہ تہجد کی نماز باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ کہیں سے گذر رہے تھے کہ ایک بڑھیا نے ان کے بارے میں کہا یہ وہ شخص ہے جو عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتا ہے۔ حالانکہ امام صاحب اس وقت عشاء کے وضو سے فجر کی نماز نہیں پڑھتے تھے لیکن جب اس بڑھیا سے سنا تو غیرت آگئی کہ اللہ کی یہ بندی میرے بارے میں یہ گمان

(۱) کتاب الزهد لابن المبارك، رقم: ۹۷ (۱/۳۲)، اصل مرجع میں یہاں "دَوِيًّا كَدَوِيِّ النَّحْلِ" کی جگہ "دَمًا كَدَمِ النَّحْرِ" پرنٹ ہوا ہے جو کہ درست نہیں، درست الفاظ وہ ہیں جو یہاں ذکر کیے گئے۔

رکھتی ہے کہ میں عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتا ہوں ۔ چنانچہ اسی دن سے یہ عہد کرلیا کہ آئندہ اب میں عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھا کروں گا پھر اس کے بعد ساری عمر یہی معمول رہا۔ (۱)

حضرت معاذہ عدویہ رحمۃ اللہ علیہا کی نماز

اور یہ بھی یاد رکھیں ! کہ ایسا اہتمام صرف مردوں ہی میں نہیں پایا جاتا تھا بلکہ اس سلسلے میں عورتوں کا بھی کچھ کردار ہے۔ چنانچہ حضرت معاذہ عدویہ رحمہا اللہ جو بڑے درجے کی اولیاء اللہ تابعین خواتین میں سے ہیں ان کا ایک مقولہ مشہور ہے:

"اِنِّیْ اَعْجَبُ مِنْ اَعْیُنٍ تَنَامُ عَلَی الْمَرْجِعِ وَتَعْلَمُ دُوْنَ رِکَابِھَا فِی الْقُبُوْرِ"

''مجھے ان آنکھوں پر تعجب ہے جو رات کو سو جاتی ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ قبر میں جا کر سونا ہی سونا ہے''

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی گریہ وزاری

حضرت محمد بن سیرینؒ جو بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے یہ بڑے ظریف المزاج اور شگفتہ آدمی تھے۔ ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ دن کے وقت تو ہم ان کے ہنسنے کی آواز سنتے تھے لیکن رات کے وقت ان کے رونے کی آواز سنتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تہجد

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز میں اتنی دیر تک کھڑے رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک تھک گئے اور ان سے خون رسنے لگا۔ لوگوں نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! اللہ نے تو آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرمادیے ہیں پھر آپ اتنی مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''(۲)

---

(۱) الخیرات الحسان فی مناقب الامام ابی حنیفة النعمان، ص: ۸۳

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب قیام النبی اللیل حتی ترم قدماہ، رقم: ۱۰۶۲، صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، باب اکثار الاعمال (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

جب اس نے میرے سارے گناہ معاف کر دیئے تو پھر محبت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ میں بھی اتنی ہی زیادہ محنت اور عبادت کروں۔

حضرت عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"أَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُصَلِّيْ وَلِجَوْفِهِ أَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ الْمِرْجَلِ "(۱)

''ایک مرتبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بطن مبارک سے ہانڈی پکنے کی طرح آواز آ رہی تھی''

مطلب یہ کہ نماز کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے رونے اور گریہ وزاری کی وجہ سے اس قسم کی آواز نکلتی تھی۔ اس کے بعد صحابہ کرام اور تابعین عظام نے اس طریقے کو اپنانے کی بھرپور کوشش کی اور امت کو عمل کر کے دکھایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل نماز

اس باب کی اگلی حدیث چونکہ طویل ہے اس لئے میں اس کا خلاصہ عرض کر دیتا ہوں:

''حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ رات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر کہی تو یہ کلمات بھی فرمائے:

((ذُو الْمَلَكُوْتِ وَالْجَبَرُوْتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ))

اس کے بعد قرآن مجید کی تلاوت شروع کی اور ایک رکعت میں پوری سورۂ بقرہ پڑھی۔ اس کے بعد اتنا ہی طویل رکوع کیا جتنی طویل قرأت کی تھی اور رکوع میں ''سبحان ربی العظیم'' پڑھتے رہے، پھر رکوع سے سر اٹھایا اور رکوع کے برابر طویل قومہ کیا اور اس میں ''لربی الحمد'' پڑھتے رہے۔ پھر اتنا ہی طویل سجدہ کیا اور اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) والاجتهاد في العبادة، رقم: ٥٠٤٤، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في الاجتهاد في الصلاة، رقم: ٣٧٧، سنن النسائي، كتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب الاختلاف على عائشة في احياء الليل، رقم: ١٦٢٦، سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء في طول القيام في الصلاة، رقم: ١٤٠٩، مسند أحمد، رقم: ١٧٤٨٨

(١) سنن النسائي، كتاب السهو، باب البكاء في الصلاة، رقم: ١١٩٩، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب البكاء في الصلاة، رقم: ٧٦٩، مسند أحمد، رقم: ١٥٧٢٢ شمائل الترمذي، باب في بكاء رسول الله صلى الله عليه وسلم، ص: ٢٣

میں ''سبحان ربی الاعلیٰ'' پڑھتے رہے۔ پھر جلسہ میں اتنی دیر بیٹھے رہے جتنی دیر میں سجدہ کیا تھا اور اس میں ''رب اغفرلی'' پڑھتے رہے، یہاں تک کہ ایک رکعت اسی طرح پوری فرمائی پھر دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران، تیسری میں سورۂ نساء اور چوتھی میں سورۂ مائدہ پڑھی، یعنی چار رکعتوں میں سوا چھ پارے اس طرح تلاوت فرمائے کہ ان میں رکوع، قیام، سجدہ، جلسہ اور قرأت وغیرہ یکساں طویل تھے''(۱)

اس حدیث کو سن کر بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ ایسا کرنا تو ہمارے بس سے باہر ہے، یاد رکھیں! کہ یہ مسلمانوں کو غیرت دلانے کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بھی انسان بنا کر بھیجا تھا اور ہماری طرح انسانی تقاضے آپ ﷺ کے ساتھ بھی وابستہ تھے لیکن سب سے بلند مقام پر فائز ہونے کے باوجود اتنی طویل عبادت فرماتے تھے۔ تو اگر ہم اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے تو کچھ نہ کچھ تو کر ہی لیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث میں رات کی نماز کا ادب بیان کر دیا گیا ہے کہ قیام، قرأت، رکوع، سجدے وغیرہ طویل کئے جائیں۔

عبادت میں کون سی صورت بہتر ہے؟

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص کو تہجد کی نماز کے لئے مثلاً ایک گھنٹہ ملتا ہے تو اب اس میں وہ رکعتیں کثیر پڑھے یا رکعتیں کم پڑھے اور قرأت طویل کرے، ان میں سے کون سی صورت زیادہ بہتر ہے؟

یاد رکھیں! اس پر قول فیصل یہ ہے کہ اپنا معمول تو پورا کرنا ضروری ہے اور اس میں یہ نہ سوچے کہ وقت ابھی زیادہ ہے اس لئے میں زیادہ رکعتیں پڑھ لوں، بلکہ قیام و قرأت وغیرہ طویل کرے۔ تہجد کی نماز میں لمبی لمبی سورتیں پڑھنا زیادہ بہتر ہے لیکن اگر وہ یاد نہ ہوں تو ایک ہی رکعت میں چھوٹی دس سورتیں یا اس سے زائد بھی پڑھی جاسکتی ہیں۔ نیز یہ بھی گنجائش ہے کہ ایک رکعت میں ایک ہی آیت یا سورت کو بار بار پڑھ لیا جائے۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ساری رات ایک آیت پڑھتے ہوئے گزار دی جو یہ تھی:

---

(۱) سنن النسائی، کتاب التطبیق، باب الدعاء بین السجدتین، رقم: ۱۱۳۳، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب مایقول الرجل فی رکوعه وسجوده، رقم: ۷۴۰، مسند أحمد، رقم: ۲۲۲۸۶، کتاب الزهد، رقم: ۱۰۱ (۱/ ۳۳)

﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾(۱)

''(اے اللہ!) اگر آپ انہیں عذاب دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ معاف کر دیں تو آپ ہی زبردست حکمت والے ہیں''(۲)

نیز رکوع اور سجدہ کو بھی قیام کے برابر طویل کرے اور رکوع و سجود میں یہ بھی جائز ہے کہ سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلی کی ایک مقدار پڑھنے کے بعد ادعیہ ماثورہ مانگ لے جیسے:

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾(۳)

اسی طرح آٹھ رکعتیں پڑھنا زیادہ رکعتوں کے پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے جب کہ مندرجہ بالا ہدایات کی پیروی کی جائے۔

امامت کی نماز میں تخفیف کا حکم

جب کہ عام نمازوں کے بارے میں حضور ﷺ کا یہ معمول نقل کیا گیا ہے کہ اتنی ہلکی پھلکی نماز پڑھاتے تھے کہ ضعیف ترین شخص کو بھی مشقت کا احساس نہیں ہوتا تھا، اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِذَا أَمَّ أَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ))(۴)

''تم میں سے جو کوئی امامت کرائے وہ اپنی نماز کو ہلکا کر دے''

کیونکہ نماز میں ضعیف، بیمار اور بوڑھے وغیرہ ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اب اگر وہاں سورۂ بقرہ شروع کر دی جائے تو لوگوں کو کتنی تکلیف ہوگی۔ اسی لئے آپ ﷺ نے یہاں تک فرمادیا:

---

(۱) المائدة:۱۱۸

(۲) سنن النسائي، كتاب الافتتاح، باب ترديد الآية، رقم:۱۰۰۰، سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء في القراءة في صلاة الليل، رقم:۱۳۴۰

(۳) البقرة:۲۰۱، اس قرآنی دعا کا ترجمہ یہ ہے:''اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی، اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے''

(۴) صحيح البخاري، كتاب الاذان، باب اذا صلى لنفسه فليطول ماشاء، رقم:۶۶۲، صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب أمر الأئمة بتخفيف الصلاة في تمام، رقم:۷۱۴، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء اذا أم أحدكم الناس فليخفف، رقم:۲۱۹، سنن النسائي، كتاب الامامة، باب ماعلى الامام من التخفيف، رقم:۸۱۴، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في تخفيف الصلاة، رقم:۶۷۳، مسند أحمد، رقم:۷۱۶۲

((اِنِّیْ لَاَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ وَاَنَا فِي الصَّلَاةِ فَأُخَفِّفُ مَخَافَةَ أَنْ تُفْتَتَنَ أُمُّهُ))(۱)

"بعض اوقات نماز پڑھتے ہوئے مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو میں اپنی نماز کو ہلکا کر دیتا ہوں، تاکہ اس کی ماں پریشان نہ ہو جائے"

حاصل یہ ہے کہ نبی پاک ﷺ تنہائی میں نماز کو طویل فرماتے تھے اور امامت میں نماز کے اندر تخفیف فرماتے، جب کہ آج معاملہ بالکل برعکس ہے کہ لوگوں کے سامنے تو لمبی چوڑی نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور تنہائی میں جلد از جلد فارغ ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تہجد کی عبادت ایک سلطنت ہے

تہجد کی نماز کے بارے میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

آزانکہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب
من ملک نیم روز بیک جو نمی خرم

"جب سے مجھے رات کی یہ بادشاہت ملی ہے اس وقت سے میں نیم روز کی سلطنت ایک دمڑی میں خریدنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں"

تہجد کی لذت، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رات کی نماز میں جو لذت اور کیف عطا فرمایا ہے اگر دنیا کے بادشاہوں کو پتہ لگ جائے کہ یہ مزے اڑا رہے ہیں تو وہ ہمارے پاس تلواریں سونت کر آئیں اور ہم سے یہ مزہ چھین کر خود حاصل کرنے کی کوشش کریں، لیکن انہیں اس مزے کی ہوا بھی نہیں لگی۔

نمازِ تہجد کا عادی بننے کا سہل ترین نسخہ

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "جس شخص کو اللہ تعالیٰ تہجد کی نماز کا عادی بنا دیتے ہیں وہ تو اللہ کے فضل سے اس وقت کی برکات حاصل کر لیتے ہیں، لیکن ہم میں سے بہت سے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ماجاء أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال انی لأسمع بکاء الصبی……، رقم: ۳۴، سنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاة والسنة فیها، باب الامام یخفف الصلاة اذا حدث أمر، رقم: ۹۷۹

کمزور لوگ وہ بھی ہیں جو نفل نماز کے عادی نہیں ہیں اور رات کے وقت اٹھنا انہیں کسی وجہ سے بھاری معلوم ہوتا ہے، اگرچہ دل چاہتا ہے لیکن عادت نہ ہونے کی وجہ سے اٹھ نہیں پاتے، ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ دو کام کرے، اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے یا تو تہجد کی توفیق عطا فرما دیں گے یا اس کی کچھ نہ کچھ برکت ضرور عطا فرمائیں گے:

(۱) عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سنتوں اور وتر کے درمیان چار رکعت نماز تہجد کی نیت سے پڑھ لیا کرے۔

(۲) طے کر لے کہ رات کے جس حصے میں بھی میری آنکھ کھلے گی تھوڑی دیر کے لئے بستر سے اٹھ جاؤں گا۔

کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ جب رات کا ایک تہائی حصہ گذر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت دنیا پر نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا منادی پکار پکار کر کہتا ہے کہ ہے کوئی مغفرت مانگنے والا، میں اس کی مغفرت کر دوں، کوئی رزق مانگنے والا ہے کہ میں اسے رزق دے دوں، ہے کوئی مبتلائے آزار کہ میں اس کی مصیبت دور کر دوں۔ (۱)

پھر یہ نداء ساری رات ہوتی رہتی ہے۔ بس وہ یہ سوچ کر اٹھے کہ میں اس منادی کو جواب دوں گا اور بستر پر اٹھ کر بیٹھ جائے اور خواہ وضو اور نماز کے بغیر ہی اپنی قضائے حاجات کی دعا مانگ لیا کرے، اور اسی میں یہ دعا بھی مانگ لیا کرے کہ یا اللہ! مجھے صلاۃ اللیل کی توفیق بھی عطا فرما دیجئے، اس کے بعد سو جائے۔

اگر اس عمل کو کوئی شخص باقاعدگی سے کرتا رہے کہ ان شاء اللہ صلاۃ اللیل سے محروم نہیں ہوگا اور کبھی نہ کبھی اس کو توفیق ہو ہی جائے گی۔ اور اگر بالفرض توفیق نہ ہوئی تب بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ اسے صلاۃ اللیل کی برکات سے محروم نہیں فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الدعوات، باب الدعاء نصف الليل، رقم:٥٨٤٦، صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب الترغيب في الدعاء والذكر في آخر الليل، رقم:١٢٦١، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في نزول الرب عزوجل الى السماء،رقم:٤٠٨، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب أي الليل أفضل، رقم:١١٢٠، سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء في أي ساعات الليل أفضل، رقم:١٣٥٦، مسند أحمد، رقم:٧١٩٦

نماز کی اہمیت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ۝﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! جو آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں، یہ سورۃ مؤمنون کی آیات ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان مؤمنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں جن سے فلاح کا وعدہ کیا گیا ہے، اگر یہ صفات کسی کو حاصل ہو جائیں تو اس کو فلاح حاصل ہوگی یعنی اس کو دنیا میں بھی کامیابی حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی کامیابی حاصل ہوگی۔

خشوع اور خضوع کا مفہوم

اللہ تعالیٰ نے پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ فلاح پانے والے مؤمن بندے وہ ہیں جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ مؤمن کے تمام کاموں میں سب سے زیادہ اہم کام نماز کی ادائیگی ہے، اسی لئے یہاں پر اللہ تعالیٰ نے مؤمن کی صفات میں سب سے پہلے ''نماز میں خشوع'' کی صفت ذکر فرمائی ہے۔ عام طور پر دو لفظ نماز کے اوصاف کے سلسلے میں بولے جاتے ہیں۔ ایک خضوع اور دوسرا خشوع، ''خضوع'' ضاد سے ہے اور ''خشوع'' شین سے ہے۔ ''خضوع'' کے معنی ہیں: انسان کا اپنے ظاہری اعضاء کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دینا۔ اور ''خشوع'' کے معنی ہیں: انسان کا اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دینا۔ نماز میں دونوں چیزیں مطلوب ہیں یعنی نماز میں خضوع بھی ہونا چاہئے اور خشوع بھی ہونا چاہئے۔

''خضوع'' کی حقیقت

''خضوع'' کے لفظی معنی ہیں ''جھک جانا'' یعنی اپنے آپ کو نماز میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۱۹۲ تا ۲۰۲)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱ تا ٤

طرح کھڑا کرنا کہ تمام اعضاء اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکے ہوئے ہوں، غفلت اور لاپرواہی کا عالم نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے باادب کھڑا ہو۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ نماز میں کھڑے ہونے کا کونسا طریقہ باادب ہے اور کونسا طریقہ بے ادب ہے؟ اس کا فیصلہ ہم اپنی عقل سے نہیں کر سکتے بلکہ اس کی تفصیل خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمادی ہے۔ لہٰذا نماز پڑھنے کا ہر وہ طریقہ جو نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو، وہ باادب ہے اور جو طریقہ آپ کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف ہو، وہ بے ادب ہے۔ اس لئے نماز اس طریقے سے پڑھنی چاہئے جس طریقے سے رسولِ کریم ﷺ نے سکھائی۔ ایک مرتبہ نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

((صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِىْ أُصَلِّىْ))(۱)

''یعنی تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے''

لہٰذا جو طریقہ نماز پڑھنے کا خود نبی کریم ﷺ نے اختیار فرمایا اور جس طریقے کی آپ نے تلقین فرمائی، وہ طریقہ باادب ہے، کوئی دوسرا شخص اپنی عقل سے اس میں کمی اور اضافہ نہیں کر سکتا۔

حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور نماز کی تعلیم

یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ جو طریقہ حضورِ اقدس ﷺ نے بتادیا، اس کو یاد رکھیں، اس کو محفوظ رکھیں اور اس کو دوسروں تک پہنچائیں اور اپنی نمازوں کو اس کے مطابق بنائیں۔ چنانچہ حضرات خلفاء راشدین حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم جن کی آدھی دنیا سے زیادہ پر حکومت تھی، لیکن جہاں کہیں جاتے، وہاں پر لوگوں کو بتاتے کہ نماز اس طرح پڑھا کرو اور خود نماز پڑھ کر بتاتے کہ آؤ، میں تمہیں بتاؤں کہ حضورِ اقدس ﷺ کس طرح نماز پڑھا کرتے تھے تاکہ تمہارا طریقہ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں سے فرماتے:

"أَلَا أُصَلِّىْ بِكُمْ صَلَاةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟"(۲)

کیا میں تمہیں وہ نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں جو رسول اللہ ﷺ پڑھا کرتے تھے۔ لہٰذا نماز میں

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب الأذان للمسافر الخ، رقم: ۵۹۵، سنن الدارمی، کتاب الصلاة، باب من أحق بالإمامة، رقم: ۱۲۲۵

(۲) سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ما جاء أن النبی لم یرفع الافی أول مرة، رقم: ۲۳۸، سنن النسائی، کتاب التطبیق، باب الرخصة فی ترك ذلك، رقم: ۱۰۴۸، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب من لم یذکر الرفع عند الرکوع، رقم: ۶۳۹

خضوع بھی مطلوب ہے کہ اس نمازی کے سارے ارکان سنت کے مطابق انجام پائیں، نمازی کے ظاہری اعضا کا سنت کے مطابق بنالینا یہ خشوع کی طرف جانے کی پہلی سیڑھی ہے، اور جب آدمی اپنے اعضاء کو درست کر لے گا اور کھڑے ہونے، رکوع کرنے، سجدہ کرنے اور بیٹھنے میں وہ طریقہ اختیار کر لے گا جو رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف دل متوجہ کرنے کی پہلی سیڑھی ہے۔

نماز میں خیالات آنے کی ایک وجہ

آج ہمیں اکثر و بیشتر یہ شکوہ رہتا ہے کہ نماز میں خیالات منتشر رہتے ہیں، کبھی کوئی خیال آرہا ہے، کبھی کوئی خیال آرہا ہے اور نماز میں دل نہیں لگتا، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے نماز کا ظاہری طریقہ سنت کے مطابق نہیں بنایا اور نہ ہی اس کا اہتمام کیا، بس جس طرح بچپن میں نماز پڑھنا سیکھ لی تھی، اسی طرح پڑھتے چلے آرہے ہیں، یہ فکر نہیں کہ واقعۃً یہ نماز سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ یہ نماز اتنا اہم فریضہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں اس پر سینکڑوں صفحات لکھے ہوئے ہیں جن میں نماز کے ایک ایک رکن کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے لئے ہاتھ کیسے اُٹھائیں، قیام کس طرح کریں، رکوع کس طرح کیا جائے، سجدہ کس طرح کیا جائے، قعدہ کس طرح کیا جائے، ان سب کی تفصیلات کتابوں میں موجود ہے، لیکن ان طریقوں کے سیکھنے کی طرف دھیان نہیں، بس جس طرح قیام کرتے چلے آرہے ہیں، اسی طرح قیام کرلیا، جس طرح اب تک رکوع سجدہ کرتے چلے آرہے ہیں، اسی طرح رکوع سجدہ کرلیا، لیکن ان کو ٹھیک ٹھیک سنت کے مطابق انجام دینے کی فکر نہیں۔

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور نماز کا اہتمام

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی عمر کے آخری دور میں فرمایا کرتے تھے کہ آج مجھے قرآن و حدیث اور فقہ پڑھتے پڑھاتے ہوئے اور فتاویٰ لکھتے ہوئے ساٹھ سال ہو گئے ہیں اور ان کاموں کے علاوہ کوئی اور مشغلہ نہیں ہے لیکن ساٹھ سال گزرنے کے بعد اب بھی بعض اوقات نماز میں ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ مجھے پتہ نہیں چلتا کہ اب میں کیا کروں؟ پھر نماز کی کتاب اُٹھا کر دیکھنی پڑتی ہے کہ میری نماز درست ہوئی یا نہیں؟ میرا تو یہ حال ہے، لیکن میں لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ ساری عمر نماز پڑھتے چلے جارہے ہیں اور کبھی کسی وقت دل میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میری نماز سنت کے مطابق ہوئی یا نہیں؟ حضور اقدس ﷺ کے طریقے کے مطابق ہوئی یا نہیں؟ کبھی ذہن میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں اس بات کی اہمیت ہی نہیں کہ اپنی نمازوں کو سنت کے مطابق بنائیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی سب سے پہلے نماز کا طریقہ درست کرے۔

قیام کا صحیح طریقہ

اب میں مختصراً نماز کا صحیح طریقہ عرض کردیتا ہوں، ان آیات کی تفسیر انشاء اللہ آئندہ جمعوں میں عرض کروں گا۔ جب آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو تو اس میں سنت یہ ہے کہ آدمی کا پورا جسم قبلہ رُخ ہو، لہٰذا جب کھڑے ہوں تو سب سے پہلے قبلہ رُخ ہونے کا اہتمام کرلیں، سینہ بھی قبلہ رُخ ہو، اگر کسی وجہ سے سینہ تھوڑی دیر کے لئے قبلہ سے ہٹ گیا تو نماز تو ہوجائے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کرم فرمایا ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے یہ نہیں کہتے کہ جاؤ ہم تمہاری نماز قبول نہیں کرتے، لہٰذا نماز تو ہوجائے گی لیکن اس نماز میں سنت کا نور حاصل نہ ہوگا، سنت کی برکت حاصل نہ ہوگی، کیونکہ اس طرح کھڑا ہونا سنت کے خلاف ہے۔ اسی طرح پاؤں کی انگلیوں کا رُخ اگر قبلہ کی طرف ہوجائے تو جسم کا ایک ایک حصہ قبلہ رُخ ہوجائے گا، اب بتایئے کہ اگر انسان اس طرح سنت کے مطابق پاؤں رکھے تو اس میں کیا تکلیف ہوجائے گی؟ کوئی پریشانی لاحق ہوجائے گی؟ یا کوئی بیماری لاحق ہوجائے گی؟ کچھ بھی نہیں، صرف توجہ اور دھیان کی بات ہے، کیونکہ توجہ، دھیان اور اہتمام نہیں ہے، اس لئے یہ غلطی ہوتی ہے، اگر ذرا دھیان کرلیں تو سنت کے مطابق قیام ہوجائے گا اور اس کے نتیجے میں وہ نماز خضوع کے دائرے میں آجائے گی اور اس نماز میں سنت کے انوار و برکات حاصل ہوجائیں گے۔

نیت کرنے کا مطلب

یہاں ایک مسئلہ کی وضاحت کردوں۔ وہ یہ کہ نیت نام ہے دل کے ارادہ کرنے کا، بس آگے زبان سے نیت کرنا کوئی ضروری نہیں۔ چنانچہ آج بہت سے لوگ نیت کے خاص الفاظ زبان سے ادا کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں مثلاً چار رکعت نماز فرض، وقت ظہر کا، منہ میرا کعبہ شریف کی طرف، پیچھے پیش امام کے، واسطے اللہ تعالیٰ کے اللہ اکبر۔ زبان سے یہ نیت کرنے کو لوگوں نے فرض و واجب سمجھ لیا ہے، گویا اگر کسی نے یہ الفاظ نہ کہے تو اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔ یہاں تک دیکھا گیا کہ امام صاحب رکوع میں ہیں، مگر وہ صاحب اپنی نیت کے تمام الفاظ ادا کرنے میں مصروف ہیں اور اس کے نتیجے میں رکعت بھی چلی جاتی ہے، حالانکہ یہ الفاظ زبان سے ادا کرنا کوئی ضروری اور فرض و واجب نہیں، جب دل میں یہ ارادہ ہے کہ فلاں نماز امام صاحب کے پیچھے پڑھ رہا ہوں، بس یہ ارادہ کافی ہے۔

تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اُٹھانے کا طریقہ

اسی طرح جب تکبیر تحریمہ کہتے وقت ہاتھ کانوں تک اُٹھاتے ہیں تو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی

کہ ان کو سنت کے مطابق اُٹھائیں، بلکہ جس طرح چاہتے ہیں ہاتھ اُٹھا کر ''اللہ اکبر'' کہہ کر نماز شروع کر دیتے ہیں۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ ہتھیلی کا رُخ قبلہ کی طرف ہو اور انگوٹھوں کے سرے کانوں کی لو کے برابر آجائیں، یہ صحیح طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے طریقے ہیں، مثلاً بعض لوگ ہتھیلیوں کا رُخ کانوں کی طرف کر دیتے ہیں، بعض لوگ آسمان کی طرف کر دیتے ہیں، یہ سنت طریقہ نہیں، اگر اس طریقے سے ہاتھ اُٹھا کر نماز شروع کر دی تو نماز تو ادا ہو جائے گی لیکن سنت کی برکت اور سنت کا نور حاصل نہ ہوگا، صرف دھیان اور توجہ کی بات ہے، اس توجہ کی وجہ سے یہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

ہاتھ باندھنے کا صحیح طریقہ

اسی طرح ہاتھ باندھنے کا معاملہ ہے، کوئی سینے پر باندھ لیتا ہے، کوئی بالکل نیچے کر دیتا ہے اور کوئی کلائی پر ہتھیلی رکھ دیتا ہے۔ یہ سب طریقے سنت کے خلاف ہیں۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور انگوٹھے کا حلقہ بنا کر کلائی کو پکڑ لے اور درمیان کی تین انگلیاں بائیں ہاتھ کی کلائی پر رکھ لے اور ناف کے ذرا نیچے ہاتھ باندھ لے۔ یہ ہے مسنون طریقہ۔ اس طریقے پر عمل کرنے سے سنت کی برکت بھی حاصل ہوگی اور نور بھی حاصل ہوگا۔ اگر اس طریقے کے خلاف ویسے ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھ دو گے تو کوئی مفتی یہ نہیں کہے گا کہ نماز نہیں ہوئی، نماز درست ہو جائے گی، لیکن سنت کے طریقے پر عمل نہ ہوگا، بس ذرا سی توجہ اور دھیان کی بات ہے۔

قرأت کا صحیح طریقہ

ہاتھ باندھنے کے بعد ثنا ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ'' پڑھے، پھر سورۃ فاتحہ پڑھے اور سورۃ پڑھے۔ ایک نمازی یہ سب چیزیں نماز میں پڑھ تو لیتا ہے لیکن اُردو لہجہ میں پڑھتا ہے، یعنی اس کا لب ولہجہ اور اس کی ادائیگی سنت کے مطابق نہیں ہوتی اور پڑھنے کا جو صحیح طریقہ ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم کو تجوید کے ساتھ اور اس کے ہر حرف کو اس کے صحیح مخرج سے ادا کیا جائے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تجوید اور قرأت سیکھنا بڑا مشکل کام ہے، حالانکہ اس کا سیکھنا کچھ مشکل نہیں، کیونکہ قرآن کریم میں جو حروف استعمال ہوئے ہیں، وہ کل ۲۹ حروف ہیں اور ان میں سے اکثر حروف ایسے ہیں جو اُردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں، ان کو صحیح طور پر ادا کرنا تو بہت آسان ہے، البتہ صرف آٹھ دس حروف ایسے ہیں جن کی مشق کرنی ہوگی، مثلاً یہ کہ ''ث'' کس طرح ادا کیا جائے۔ ''ح'' کس طرح ادا کی جائے اور ''ض'' اور ''ظ'' میں کیا فرق ہے۔ اگر آدمی ان چند حروف کی کسی اچھے قاری سے مشق کر لے کہ جب ''ح'' ادا کرے تو ''ہ'' زبان سے نہ نکلے، کیونکہ ہمارے یہاں ''ح'' اور ''ہ'' کی ادائیگی میں

فرق نہیں کیا جاتا، لیکن عربی زبان میں دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے، بعض اوقات ایک کو دوسرے کی جگہ پڑھ لینے سے معنی بدل جاتے ہیں۔ اس لئے ان حروف کی مشق کرنا ضروری ہے، یہ کوئی مشکل کام نہیں، لیکن چونکہ ہمیں اس کی فکر نہیں ہے، اس لئے اس کی طرف توجہ اور التفات نہیں ہے۔

خلاصہ

اپنے محلے کی مسجد کے امام صاحب یا قاری صاحب کے پاس جا کر چند دن تک مشق کر لیں گے تو انشاء اللہ تمام حروف کی ادائیگی درست ہو جائے گی اور نماز سنت کے مطابق ہو جائے گی۔ آج یہ چند باتیں قیام اور تکبیر تحریمہ سے لے کر سورۃ فاتحہ تک کی عرض کر دیں، باقی باتیں زندگی رہی تو انشاء اللہ آئندہ جمعہ کو عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

نماز ایک عاجزانہ عبادت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ۝ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾ (۱)

گزشتہ سے پیوستہ جمعہ کو میں نے اس آیت کی تفسیر میں عرض کیا تھا کہ نماز میں خضوع بھی مطلوب ہے اور خشوع بھی مطلوب ہے۔ خضوع کا تعلق انسان کے ظاہری اعضاء سے ہے اور خشوع کا تعلق انسان کے دل سے ہے۔ خضوع کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں اعضاء اس طرح ہوں جس طرح رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے نماز کے مختلف ارکان کی ہیئت آپ حضرات کے سامنے بیان کی تھی۔ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اُٹھانے کا طریقہ، کھڑے ہونے کا طریقہ، رکوع، قومہ، سجدہ، جلسہ کا طریقہ عرض کر دیا تھا۔ اب دو تین باتیں اس سلسلے میں باقی ہیں اس کے بعد ''خشوع'' کا مطلب اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ عرض کرنا ہے۔

رکوع اور سجدہ میں ہاتھوں کی انگلیاں

ایک بات یہ ہے کہ جب آدمی رکوع میں ہو تو ہاتھ کی انگلیاں کھلی ہونی چاہئیں، اور گھٹنوں کو انگلیوں سے پکڑ لینا چاہئے اور سجدہ کی حالت میں مسنون یہ ہے کہ ہاتھوں کی انگلیاں بند ہوں اور ہاتھ اس طرح رکھے جائیں کہ چہرہ ہاتھوں کے درمیان آجائے اور ہتھیلیاں کندھوں کے قریب ہوں، انگوٹھے کانوں کی لو کے سامنے ہوں اور کہنیاں پہلو سے علیحدہ ہوں، ملی ہوئی نہ ہوں۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۲۳۹ تا ۲۵۰)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱ تا ۷

التحیات میں بیٹھنے کا طریقہ

جب آدمی التحیات میں بیٹھے تو التحیات میں بیٹھتے وقت دایاں پاؤں کھڑا ہو اور اس پاؤں کی انگلیوں کا رُخ قبلے کی طرف ہو، اور بایاں پاؤں بچھا کر آدمی اس کے اوپر بیٹھ جائے۔ اور ہاتھ کی انگلیاں رانوں پر اس طرح رکھی ہوئی ہوں کہ ان کا آخری سرا گھٹنوں پر آرہا ہو۔ انگلیوں کو گھٹنوں سے نیچے لٹکانا اچھا نہیں ہے۔

سلام پھیرنے کا طریقہ

اور جب سلام پھیرے تو سلام پھیرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب دائیں طرف سلام پھیرے تو پوری گردن دائیں طرف موڑ لی جائے اور اپنے کندھوں کی طرف نظر کی جائے اور بائیں طرف سلام پھیرتے وقت پوری گردن بائیں طرف پھیر دی جائے اور بائیں کندھوں کی طرف نظر کی جائے۔ یہ چند چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ اگر ان باتوں کا خیال کرلیا جائے تو نماز سنت کے مطابق ہوجاتی ہے اور نبی کریم ﷺ کی سنت کی اتباع کا نور حاصل ہوجاتا ہے۔ اس کی برکات حاصل ہوتی ہیں اور اس کے ذریعہ نماز کے اندر خشوع حاصل ہونے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اور ان باتوں میں نہ زیادہ وقت لگتا ہے نہ زیادہ محنت صرف ہوتی ہے، نہ پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں نماز سنت کے مطابق ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

خشوع کی حقیقت

دوسری چیز جس کا آج بیان کرنا ہے وہ ہے ''خشوع''، اس کے معنی ہیں دل کا اللہ تعالیٰ کے حضور جھکنا، یعنی انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور اس کو اس بات کا احساس ہو کہ میں اللہ جل شانہ کے سامنے کھڑا ہوں۔ اس کا اعلیٰ ترین درجہ وہ ہے جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ)) (۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل النبی الخ، رقم: ٤٨، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الإیمان والإسلام والإحسان، رقم: ٩، سنن الترمذی، کتاب الإیمان، باب ما جاء فی وصف جبریل الخ، رقم: ٢٥٣٥، سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب نعت الإسلام، رقم: ٤٩٠٤، سنن أبی داؤد، کتاب السنة، باب فی القدر، رقم: ٤٠٧٥

یعنی تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو جیسے تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اور اللہ تعالیٰ سامنے نظر آ رہے ہوں اور اگر یہ تصور جمانا ممکن نہ ہو تو پھر کم از کم یہ تصور جماؤ کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یہ خشوع کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔

وجود کے یقین کے لئے نظر آنا ضروری نہیں

سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ رہے ہیں، اور نہ ہم یہ بات دیکھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے، آنکھوں سے یہ بات نظر نہیں آ رہی ہے، لہٰذا ان باتوں کا تصور کیسے باندھیں؟ ——— اس کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز آنکھوں سے دیکھ کر معلوم نہیں ہوتی، بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو انسان آنکھوں سے نہیں دیکھ رہا ہے۔ لیکن دل میں اس کے موجود ہونے کا اتنا یقین ہوتا ہے جیسے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ مثلاً یہ میری آواز لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ مسجد سے باہر بھی جارہی ہے۔ اب جو لوگ مسجد سے باہر ہیں وہ مجھے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن میری آواز سن کر ان کو اس بات کا یقین حاصل ہے کہ میں مسجد کے اندر موجود ہوں اور ان کو اتنا ہی یقین حاصل ہے جتنا آنکھ سے دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی آدمی کے موجود ہونے کا علم دیکھے بغیر صرف آواز سن کر ہو رہا ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ تم نے بولنے والے کو آنکھ سے دیکھا نہیں ہے پھر تمہیں اس کے موجود ہونے کا یقین کیوں ہو رہا ہے تو وہ یہ جواب دے گا کہ میں اپنے کانوں سے اس کی آواز سن رہا ہوں، جس سے پتہ چل رہا ہے کہ وہ آدمی موجود ہے۔

ہوائی جہاز کی مثال

آپ صبح شام ہوائی جہاز اُڑتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس جہاز میں بیٹھا ہوا کوئی آدمی نظر نہیں آتا، نہ چلانے والا نظر آ رہا ہے، لیکن آپ کو سو فیصد یقین ہے کہ اس جہاز میں آدمی بیٹھے ہوئے ہیں اور کوئی پائلٹ اس جہاز کو چلا رہا ہے حالانکہ اس پائلٹ اور اس کے اندر بیٹھنے والے انسانوں کو آپ نے آنکھوں سے نہیں دیکھا، کیونکہ جہاز بغیر پائلٹ کے نہیں چلتا اور یہ ممکن نہیں ہے کہ جہاز چل رہا ہو اور اس کے اندر پائلٹ موجود نہ ہو، اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ یہ جہاز بغیر پائلٹ کے خود بخود ہوا میں اُڑتا جارہا ہے تو آپ اس کو بیوقوف اور احمق قرار دیں گے۔ (۱)

(۱) یہ بات اپنی جگہ بجا، لیکن سائنس کی حیران کن ترقی کے بعد اب ایسے جہاز دریافت کیے جاچکے ہیں جو بغیر پائلٹ کے اڑائے جاسکتے ہیں۔ البتہ زمین پر بیٹھا ہوا شخص اس جہاز کو کنٹرول کر رہا ہوتا ہے جو کہ پائلٹ کے قائم مقام ہے۔ حضرت کی یہاں مراد عمومی مشاہدے سے ہے۔ (مرتب)

روشنی سورج پر دلالت کرتی ہے

مسجد کے اندر باہر سے روشنی آرہی ہے اور سورج نظر نہیں آرہا ہے، لیکن ہر انسان کو سو فیصد یقین ہے کہ اس روشنی کے پیچھے سورج موجود ہے، حالانکہ سورج آنکھوں سے نظر نہیں آرہا ہے، لہٰذا جس طرح روشنی کو دیکھ کر سورج کا پتہ لگالیتے ہو اور جس طرح ہوائی جہاز کو دیکھ کر اس کے چلانے والے کا پتہ لگاتے ہو، اسی طرح یہ سارا عالم جو پھیلا ہوا ہے، یہ پہاڑ یہ جنگل، یہ ہوائیں، یہ پانی، یہ سمندر، یہ دریا، یہ مٹی، یہ آب و ہوا، یہ سب کچھ کسی بنانے والے پر دلالت کر رہا ہے۔

ہر چیز اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کر رہی ہے

لہٰذا جب آدمی نماز کے لئے کھڑا ہوا ہو تو اس وقت اس بات کا تصور کرے کہ میرے سامنے جتنی چیزیں ہیں وہ سب اللہ جل شانہ کی ذات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ یہ روشنی جو نظر آرہی ہے اس کے پیچھے سورج ہے، لیکن سورج کے پیچھے کون ہے؟ سورج کس نے پیدا کیا؟ اور اس کے اندر روشنی کس نے رکھی؟ یہ سب اللہ تعالیٰ کی خالقیت اور وجود پر دلالت کر رہی ہے۔ لہٰذا نماز کے اندر آدمی یہ تصور باندھے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں، اور اللہ جل جلالہ مجھے دیکھ رہے ہیں اور اللہ جل جلالہ کے میرے سامنے ہونے کا ایسا یقین ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، یہ تصور جما کر نماز پڑھ کر دیکھو کہ کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو یہ کیفیت عطا فرمادے۔ آمین۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح نماز پڑھو کہ گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اللہ کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

الفاظ کی طرف دھیان، پہلی سیڑھی

یہ نماز پڑھنے کا اعلیٰ درجہ ہے۔ اس اعلیٰ درجے تک پہنچنے کے لئے کچھ ابتدائی سیڑھیاں ہیں، ان سیڑھیوں کو اگر آدمی رفتہ رفتہ قطع کرتا جائے تو اللہ تعالیٰ اس اعلیٰ مقام تک پہنچا دیتے ہیں، وہ سیڑھی کیا ہے؟ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ آپ نماز میں جو الفاظ زبان سے نکالیں ان کی طرف دھیان رہے۔ مثلاً آپ زبان سے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ادا کریں۔ اس وقت آپ کو پتہ ہونا چاہئے کہ میں "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ادا کر رہا ہوں۔ لیکن آج کل ہماری نماز کے اندر یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جس وقت "اللہ اکبر" کہہ کر نیت باندھی تو بس ایک سوئچ آن ہو گیا اور مشین چل پڑی چونکہ نماز پڑھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس لئے زبان

سے الفاظ خود بخود نکلنے لگے، اور مشین چل رہی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات یہ بھی یاد نہیں ہوتا کہ میں نے پہلی رکعت میں کونسی سورت پڑھی تھی اور دوسری رکعت میں کونسی سورت پڑھی تھی یہ صورتِ حال اکثر و بیشتر پیش آتی ہے۔

خشوع کی پہلی سیڑھی

اگر خشوع حاصل کرنا ہے تو پہلا کام یہ کرو کہ جب نماز پڑھنا شروع کرو تو زبان سے جو الفاظ ادا کر رہے ہو دھیان اس کی طرف ہو ـــــ انسان کی خاصیت یہ ہے کہ ایک غیر مرئی چیز جو آنکھوں سے نظر نہیں آرہی ہے اس کی طرف دھیان جمانا شروع میں دشوار ہوتا ہے لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خشوع حاصل کرنے کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ ان الفاظ کی طرف دھیان جماؤ۔

معنی کی طرف دھیان دوسری سیڑھی

دوسری سیڑھی یہ ہے کہ ان الفاظ کے معنی کی طرف دھیان کرو، جس وقت زبان سے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ادا کیا تو اس کے معنی کی طرف دھیان کرو کہ تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو رب العالمین ہے اور ان الفاظ کے ذریعہ میں اللہ جل شانہ کی تعریف کر رہا ہوں۔ جب "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" ادا کرو تو اس وقت دل میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا تصور دل میں ہو کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن بھی ہیں اور رحیم بھی ہیں۔ جس وقت "مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ" ادا کرو اس وقت یہ دھیان کرو کہ میں اللہ جل شانہ کو قیامت کے دن کا مالک قرار دے رہا ہوں۔ جس وقت "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" زبان سے ادا کرو اس وقت اس کے معنی کو ذہن میں لائے کہ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ اور جس وقت "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کہا اس وقت یہ معنی ذہن میں مستحضر کرے کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا ہوں کہ اے اللہ! مجھے صراطِ مستقیم عطا فرما دے، جس وقت "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ لَا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ" کہے اس وقت یہ معنی ذہن میں لائے کہ اے اللہ! مجھے ان لوگوں کا راستہ دکھا دے جن پر آپ نے انعام فرمایا، اور ان لوگوں کا راستہ مجھے نہیں چاہئے جن پر آپ کا غضب ہوا۔ اور جو گمراہ ہوئے۔

لہٰذا پہلے الفاظ کی طرف دھیان کرے، پھر معنی کی طرف دھیان کرے۔ بہر حال! اپنی طرف سے نماز کے اندر اس بات کی کوشش کی جائے کہ دھیان ان چیزوں کی طرف رہے۔ جب ان چیزوں کی طرف دھیان رہے گا تو پھر جو اِدھر اُدھر کے خیالات آتے ہیں وہ انشاء اللہ ختم ہو جائیں گے۔

نماز میں خیالات آنے کی بڑی وجہ

پھر یہ بھی عرض کردوں کہ یہ جو دوسرے خیالات آتے ہیں اس کی بہت بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ہم وضو ڈھنگ سے نہیں کرتے، سنت کے مطابق نہیں کرتے، حواس باختہ حالت میں اِدھر اُدھر باتیں کرتے ہوئے وضو کرلیا۔ حالانکہ وضو کے آداب میں سے یہ ہے کہ وضو کے دوران باتیں نہ کی جائیں۔ بلکہ وضو کے دوران وہ دعائیں پڑھی جائیں جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں اور آدمی اطمینان سے وضو کرکے ایسے وقت میں مسجد میں آئے جبکہ نماز کھڑی ہونے میں کچھ وقت ہو اور مسجد میں آکر آدمی پہلے سنت اور نفل ادا کرلے کیونکہ یہ سنت اور نفل جو نماز سے پہلے رکھی گئی ہیں یہ درحقیقت فرض نماز کی تمہید ہیں تاکہ فرض نماز سے پہلے ہی اس کا دھیان اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جائے اور اِدھر اُدھر کے خیالات آنا بند ہو جائیں۔ ان سب آداب کا لحاظ کرکے جب آدمی نماز پڑھے گا تو پھر دوسرے خیالات نہیں آئیں گے۔

اگر دھیان بھٹک جائے واپس آجاؤ

لیکن انسان کا دماغ چونکہ بھٹکتا رہتا ہے اس لئے ان تدابیر کے اختیار کرنے کے باوجود غیر اختیاری طور پر کوئی خیال آجائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت نہیں، جب دوبارہ تنبہ ہو جائے تو پھر دوبارہ ان الفاظ کی طرف دھیان لے آئیں۔ مثلاً جس وقت "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" پڑھا اس وقت تک دھیان حاضر تھا، لیکن جب "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" پڑھا اس وقت دھیان غیر اختیاری طور پر کہیں اور بھٹک گیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن جب "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کہا اس وقت خیال آیا کہ میں تو کہیں اور بھٹک گیا تھا۔ تو اب دوبارہ دھیان کو واپس لے آؤ۔ اسی طرح جتنی مرتبہ دھیان بھٹکے واپس آجاؤ۔ یہی کام کرتے چلے جاؤ۔

خشوع حاصل کرنے کے لئے مشق اور محنت

یاد رکھئے اس دنیا کے اندر کوئی بھی مقصد بغیر محنت اور مشق کے حاصل نہیں ہوسکتا، جو کام بھی کرنا ہو اس کے لئے مشق کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح خشوع حاصل کرنے کے لئے کچھ محنت اور مشق کرنی پڑتی ہے۔ وہ مشق یہ ہے کہ انسان یہ ارادہ کرلے کہ جب نماز پڑھیں گے تو اپنا دھیان ان الفاظ کی طرف رکھیں گے جو الفاظ زبان سے ادا کر رہے ہیں اور اگر ذہن بھٹکے گا تو دوبارہ ان الفاظ کی طرف واپس آجائیں گے، پھر بھٹکے گا تو پھر واپس آجائیں گے۔ جتنی مرتبہ بھٹکے گا اتنی مرتبہ واپس آئیں گے۔

جب اس پر عمل کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج اگر ذہن دس مرتبہ بھٹکا تھا تو آئندہ کل انشاء اللہ آٹھ مرتبہ بھٹکے گا۔ اگلے دن انشاء اللہ چھ مرتبہ بھٹکے گا۔ اس طرح یہ تناسب انشاء اللہ کم ہوتا چلا جائے گا۔ بس انسان یہ سوچ کر چھوڑے نہیں کہ یہ کام میرے بس سے باہر ہے اور میرا کوشش کرنا فضول ہے بلکہ لگا رہے، کوشش کرتا رہے، ساری عمر کوشش کرتا رہے چھوڑے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ایک دن ایسا وقت آئے گا جب تمہارا زیادہ ذہن نماز ہی کی طرف اور الفاظ کی طرف ہوگا۔

تیسری سیڑھی اللہ تعالیٰ کا دھیان

جب یہ بات حاصل ہو جائے تو اس کے بعد تیسری سیڑھی پر قدم رکھنا ہے، وہ تیسری سیڑھی یہ ہے کہ نماز کے اندر اس بات کا دھیان ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں، اور جب یہ دھیان حاصل ہو جائے گا تو بس مقصد حاصل ہے انشاء اللہ ـــــ یہ ہے خلاصہ خشوع حاصل کرنے کا جس کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿"قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ○﴾

یعنی وہ مؤمن جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں، وہ فلاح یافتہ ہیں۔ ہم نے ان کو دنیا و آخرت میں فلاح دیدی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی رحمت سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری نمازوں میں خشوع پیدا فرمادے، اور اللہ تعالیٰ ہمارے دھیان کو مجتمع فرمادے، اور نبی کریم ﷺ کی سنت کے مطابق نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

نماز کی حفاظت کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ٥ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ٥
﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ٥هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ٥ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ٥ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ٥ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ٥ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ٥﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! یہ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات ہیں، جن کا بیان کافی عرصہ سے چل رہا ہے، ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مؤمنوں کی صلاح وفلاح کے لئے جو صفات ضروری ہیں، ان صفات کا ذکر فرمایا ہے، الحمد للہ، ان تمام صفات کا بیان تفصیل سے ہو چکا ہے، آج اس سلسلے کا آخری بیان ہے، یہ بیان اس آخری آیت کے بارے میں ہے جو مؤمنوں کی صفات کے بیان میں ہے، وہ آیت یہ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ٥ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ٥ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ط هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ٥﴾

یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی نمازوں کی پابندی اور حفاظت کرنے والے ہیں، اور یہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ جنت الفردوس جنت کے اندر اعلیٰ مقام ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۲۸۳ تا ۲۹۷)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱ تا ۱۱

تمام صفات ایک نظر میں

یادداشت کو تازہ کرنے کے لئے آخر میں پھر ایک مرتبہ ان اوصاف پر نظر ڈال لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان آیاتِ کریمہ میں بیان فرمائے ہیں۔ فرمایا کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جن کی صفات یہ ہیں:

(۱) وہ اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔

(۲) وہ مؤمن جو لغو، فضول اور بے فائدہ کاموں سے اعراض کرنے والے ہیں۔

(۳) وہ مؤمن جو زکوٰۃ پر عمل کرنے والے ہیں، اس سلسلے میں میں نے بتایا تھا کہ اس کے دو معنیٰ ہیں، ایک یہ کہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں جو ان کے ذمے فرض ہے، دوسرے معنیٰ ہیں کہ وہ اپنے اخلاق کو برائیوں سے پاک کرتے ہیں۔

(۴) یہ ہوا کہ وہ اپنے اخلاق کو بری عادتوں سے پاک کرنے والے ہیں۔

(۵) یہ ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور اپنی زرخیز کنیزوں کے، پہلے زمانے میں کنیزیں ہوتی تھیں، ان سے جنسی خواہش پوری کرنا جائز تھا، ان کا ذکر ہے۔ یعنی وہ لوگ اپنی جنسی خواہش کو قابو میں رکھتے ہیں، اور صرف اپنی بیویوں کے ساتھ یا اللہ تعالیٰ نے جن کنیزوں کے ساتھ یہ تعلق قائم کرنے کو حلال قرار دیا ہے، صرف ان کے ساتھ قائم کرتے ہیں، ایسے لوگوں پر کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو شخص ان کے علاوہ جنسی خواہش کو پورا کرنے کا کوئی راستہ تلاش کرے گا، وہ حد سے گزرنے والا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں مجرم ہے۔

(۶) یہ ہے کہ وہ مؤمن اپنی امانتوں کا پاس کرنے والے ہیں، یعنی جو امانت ان کے پاس رکھوا دی گئی ہے اس میں خیانت نہیں کرتے۔

(۷) یہ ہے کہ وہ ''عہد'' کا پاس کرنے والے ہیں، جو عہد کسی سے کرلیا وہ اس کی عہد شکنی نہیں کرتے۔

ان سب صفات کا بیان تفصیل سے الحمدللہ ہو چکا ہے۔

پہلی اور آخری صفت میں یکسانیت

آخر میں اللہ تعالیٰ نے آٹھویں صفت یہ بیان فرمائی:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾

وہ مؤمن کامیاب ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

قرآن کریم نے یہ آٹھ صفات بیان فرمائی ہیں جو مؤمنوں کی فلاح کے لئے ضروری ہیں۔ ان صفات کو شروع بھی نماز سے کیا گیا، اور نماز ہی پر ختم کیا گیا، چنانچہ سب سے پہلی صفت یہ بیان فرمائی تھی کہ جو لوگ اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں، اور آخری صفت یہ بیان فرمائی کہ جو لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مؤمن کے لئے فلاح حاصل کرنے کا سب سے اہم راستہ ''نماز'' ہے۔ نماز میں خشوع اختیار کرنے کا مطلب پہلے تفصیل سے عرض کر دیا تھا۔

نماز کی پابندی اور وقت کا خیال

نماز کی حفاظت میں بہت سی چیزیں داخل ہیں، ایک یہ کہ انسان نماز کی پابندی کرے، یہ نہ ہو کہ آدمی گنڈے دار نماز پڑھے، کبھی پڑھے اور کبھی چھوڑ دے، بلکہ پابندی کے ساتھ آدمی نماز کا اہتمام کرے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نماز کے اوقات کا پورا خیال رکھے، اللہ تعالیٰ نے یہ نمازیں اوقات کے ساتھ مشروط رکھی ہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا﴾ (۱)

یعنی نماز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا فریضہ ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر کیا ہے کہ فلاں نماز کا وقت اتنے بجے شروع ہوتا ہے، اور اتنے بجے ختم ہوتا ہے، جیسے نمازِ فجر کا وقت صبح صادق سے شروع ہوتا ہے، اور طلوعِ آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے، ظہر کا وقت زوالِ آفتاب سے شروع ہوتا ہے، اور ہر چیز کا سایہ دو مثل ہونے پر ختم ہو جاتا ہے، عصر کا وقت دو مثل پر شروع ہوتا ہے، اور غروبِ آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر نماز کا ایک خاص وقت مقرر ہے۔ لہٰذا صرف نماز کی پابندی نہیں، بلکہ نمازوں کے اوقات کی بھی پابندی ہے کہ وقت پر انسان نماز پڑھے۔

یہ منافق کی نماز ہے

ایک حدیث شریف میں رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ منافق کی نماز ہوتی ہے کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا، اور ایک آدمی بے پرواہ ہو کر بیٹھا رہا، یہاں تک کہ جب سورج کنارے آ گیا (جب سورج کنارے پر آ جائے اور پیلا پڑ جائے اس طرح کہ انسان اس سورج کو کسی تکلیف کے بغیر آنکھ سے دیکھ سکے تو ایسے وقت میں عصر کی نماز مکروہ ہو جاتی ہے) تو اس وقت اُٹھ کر اس نے جلدی سے چار ٹھونگیں ماریں، اور نماز ختم کر دی، یہ منافق کی نماز ہے۔ (۲)

(۱) النساء: ۱۰۳ (۲) حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

لہٰذا بات صرف یہ نہیں کہ نماز پڑھنی ہے، فریضہ سر سے ٹالنا ہے، بلکہ اس کے اوقات کا بھی لحاظ رکھنا ہے کہ وہ صحیح وقت پر ادا ہو۔ اب فجر کی نماز کا وقت طلوعِ آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے، لہٰذا اس بات کا اہتمام ضروری ہے کہ طلوعِ آفتاب سے پہلے فجر کی نماز پڑھ لی جائے۔ اگر ایک آدمی بے پرواہ ہو کر پڑا سوتا رہا، اور پھر طلوعِ آفتاب کے بعد اُٹھ کر نماز پڑھے تو اس شخص نے قضا نماز تو پڑھ لی، لیکن یہ نماز کی حفاظت نہ ہوئی، اس لئے کہ اس میں وقت کا لحاظ نہیں رکھا گیا، جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا اس وقت نماز ادا نہیں کی گئی۔

اللہ کی اطاعت کا نام دین ہے

بار بار آپ حضرات سے عرض کرتا رہتا ہوں کہ دین نام ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کا، کسی وقت کے اندر کچھ نہیں رکھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ایک حکم دے دیا کہ فلاں نماز کو فلاں وقت سے پہلے پہلے ادا کرو، تو اب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہوئے اس وقت سے پہلے ادا کرنا ضروری ہے۔ اگر آفتاب طلوع ہو رہا ہے، اور اس وقت کوئی شخص نماز پڑھنے کی نیت باندھ لے تو ایسا کرنا حرام ہے۔ لہٰذا وقت کے اندر نماز پڑھنا اور اوقات کی پابندی کرنا نماز کی محافظت کے مفہوم میں داخل ہے۔

جماعت سے نماز ادا کیجئے

تیسری بات جو نماز کی محافظت کے مفہوم میں داخل ہے، وہ یہ ہے کہ نماز کو اس کے مکمل طریقے سے ادا کیا جائے، اور مکمل طریقے سے ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر نماز ادا کرنے والا مرد ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرے۔ مرد کے لئے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا سنتِ مؤکدہ ہے، جو واجب کے قریب ہے، بلکہ بعض علماء کرام نے جماعت سے نماز پڑھنے کو واجب کہا ہے، البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سنتِ مؤکدہ قریب بواجب ہے۔ ایک مرد گھر میں اکیلا نماز پڑھے تو یہ ناقص ادائیگی ہے، فقہاء کرام اس کو اداءِ قاصر کہتے ہیں، اداءِ کامل یہ ہے کہ آدمی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے۔ فضیلت اور ثواب کے لحاظ سے بھی جماعت سے نماز ادا کرنے کا درجہ زیادہ ہے۔

چنانچہ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تنہا نماز پڑھنے کے مقابلے میں جماعت سے

حاشیہ صفحہ گزشتہ) سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ماجاء فی تعجیل العصر، رقم: ۱۴۸، سنن أبی داود، کتاب الصلاة، باب فی وقت صلاة العصر، رقم: ۳۵۰، سنن النسائی، کتاب المواقیت، باب التشدید فی تاخیر العصر، رقم: ۵۰۷، مسند أحمد، رقم: ۱۱۵۶۱

نماز پڑھنے پر ستائیس گنا ثواب زیادہ دیا جاتا ہے۔[1]

اب مسجد میں جا کر جماعت سے نماز ادا کرنے میں چند منٹ زیادہ خرچ ہوں گے، اس کی خاطر اتنا بڑا ثواب چھوڑ دینا، اور نماز کی ادائیگی کو ادھورا اور ناقص بنالینا کتنے بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ لہٰذا مردوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسجد میں آ کر نماز ادا کریں۔

نماز کے انتظار کا ثواب

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسجد کو اپنا گھر بنایا ہے، اس لئے انسان نماز کے انتظار میں جتنی دیر مسجد میں بیٹھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نماز کا ثواب دیتے رہتے ہیں۔ مثلاً آپ حضرات اس وقت یہاں مسجد میں بیٹھے ہیں، اور اس لئے بیٹھے ہیں کہ نماز کا انتظار ہے، جتنی دیر آپ بیٹھے ہیں، چاہے خاموش ہی بیٹھے ہیں، کوئی کام بھی نہیں کر رہے ہیں، نہ نماز پڑھ رہے ہیں، نہ تلاوت کر رہے ہیں، نہ ذکر کر رہے ہیں، بلکہ خالی بیٹھے ہیں، لیکن چونکہ نماز کے انتظار میں بیٹھے ہیں، اس لئے اس پر وہی ثواب ملے گا جو نماز پڑھنے پر ثواب ملتا ہے۔ لہٰذا اگر آدمی پہلے سے مسجد میں پہنچ جائے تو اس کو مسلسل نماز کا ثواب ملتا رہے گا، اس کے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ بہر حال! نماز کی حفاظت میں یہ بات بھی داخل ہے کہ نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کیا جائے۔

ان کے گھروں کو آگ لگا دوں

حضور اقدس ﷺ کے زمانۂ مبارک میں جب آپ مسجد نبوی میں امامت فرما رہے ہوتے تھے تو تمام صحابہ کرام حضور اقدس ﷺ کے پیچھے جماعت سے نماز ادا کرتے تھے، لیکن کچھ منافق قسم کے لوگ جماعت سے نماز ادا نہیں کرتے تھے، اور جماعت میں حاضر نہیں ہوتے تھے، چونکہ منافق تھے، ان کے دل میں ایمان تو تھا نہیں، صرف زبان سے کہہ دیا تھا کہ ہم مسلمان ہیں، اس لئے وہ لوگ بہانے بناتے، اور جماعت میں حاضر نہ ہوتے، البتہ کسی صحابی سے یہ تصور نہیں ہوتا تھا کہ وہ جماعت کی نماز چھوڑے گا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کبھی اس طرح

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب فضل صلاة الجماعة، رقم:۶۰۹، صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب فضل صلاة الجماعة، رقم:۱۰۳۴، سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ماجاء فی فضل الصلاة، رقم:۱۹۹، سنن النسائی، کتاب الامامة، باب فضل الجماعة، رقم:۸۲۸، مسند أحمد، رقم:۵۰۸۰، مؤطا مالك، کتاب النداء للصلاة، باب فضل صلاة الجماعة علی صلاة الفذ، رقم:۲۶۴

کروں کہ نماز کی امامت کے لئے مصلی پر کسی اور کو کھڑا کردوں، اور ان سے کہوں کہ نماز شروع کردو، اور پھر میں لوگوں کے گھروں پر جاکر دیکھوں کہ کون کون بیٹھا ہے جو جماعت میں نہیں آیا، اور جن لوگوں کو میں دیکھوں کہ وہ جماعت میں شامل نہیں ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ ان کے گھروں کو آگ لگادوں۔(۱)

جماعت سے نماز پڑھنے کے فائدے

آپ رسول اللہ ﷺ کے صدمے اور غصے کا اندازہ لگایئے، اس لئے کہ مسجد کے میناروں سے آواز بلند ہو رہی ہے کہ حیّ علی الصلٰوۃ، حیّ علی الفلاح، نماز کی طرف آؤ، فلاح کی طرف آؤ، لیکن یہ شخص گھر میں بیٹھا ہے، اور اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو رسول کریم ﷺ کے غصے سے محفوظ رکھے، آمین۔ اگر ہم لوگ گھر میں بیٹھے ہیں، اور جماعت میں نہیں آرہے ہیں، اس وقت اس حدیث کا تصور کرلیا کریں کہ حضور ﷺ کا دل چاہتا ہوگا کہ ہمارے گھروں کو آگ لگادیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسجد کو اپنا گھر بنایا ہے، اور اس کو اُمتِ مسلمہ کے لئے مرکز بنایا ہے، وہ یہاں جمع ہوکر اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اور پھر اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جب مسلمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے حالات سے بھی واقفیت ہوتی ہے، پھر مل جل کر کوئی کام بھی کرسکتے ہیں، بے شمار فائدے حاصل ہوتے ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں مسجد کے اندر آؤ۔

عیسائیت کی تقلید نہ کریں

یہ جو ہمارے یہاں تصور پھیل گیا ہے کہ جب جمعہ کا دن آئے گا تو جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں آئیں گے، اور سارے ہفتے میں مسجد کے اندر آنے کا خیال نہیں آتا، یہ درحقیقت ہم نے اسلام کو عیسائی مذہب پر قیاس کرلیا ہے۔ عیسائی مذہب والے صرف اتوار کے دن اپنی عبادت گاہ میں جمع ہوتے ہیں، باقی دنوں میں چھٹی، اور اب تو اتوار بھی ختم ہوگیا، یورپ اور امریکہ میں جاکر دیکھو کہ کلیسا

(۱) صحیح البخاری، کتاب الخصومات، باب اخراج أھل المعاصی الخ، رقم: ۲۲۴۲، صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، رقم: ۱۰۴۰، سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، رقم: ۲۰۱، سنن النسائی، کتاب الإمامۃ، رقم: ۸۳۹، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، رقم: ۴۶۱، مؤطا مالک، کتاب النداء للصلاۃ، رقم: ۲۶۶، سنن الدارمی، کتاب الصلاۃ، رقم: ۱۱۸۶

ویران پڑے ہوئے ہیں، اور پادری صاحبان بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہیں، عبادت کے لئے وہاں کوئی آتا ہی نہیں، بہر حال! ایک عرصہ دراز تک اتوار کے دن آیا کرتے تھے۔ اللہ بچائے، ہم نے یہی سمجھ لیا کہ صرف جمعہ کے دن مسجد میں جانا چاہئے، حالانکہ جس طرح جمعہ کی نماز فرض ہے، اسی طرح پانچ وقت کی نماز بھی فرض ہے، اور جس طرح جمعہ کے دن مسجد میں نماز ادا کرنا ضروری ہے، اسی طرح عام دنوں میں بھی مسجد میں جا کر نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔ اس لئے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا سنتِ مؤکدہ قریب بواجب ہے۔ بہر حال! جماعت سے مسجد میں نماز ادا کرنا نماز کی حفاظت کے مفہوم میں داخل ہے۔

خواتین اوّل وقت میں نماز ادا کریں

خواتین کے لئے حکم یہ ہے کہ نماز کا وقت داخل ہونے کے فوراً بعد جلد از جلد نماز ادا کرلیں، خواتین اس سلسلے میں بڑی کوتاہی کرتی ہیں کہ نماز کو ٹلاتی رہتی ہیں، اور ایسے وقت میں نماز پڑھتی ہیں جب وقت مکروہ ہو جاتا ہے، ان کے لئے افضل یہ ہے کہ اول وقت میں نماز ادا کریں، اور مردوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسجد میں جا کر نماز ادا کریں۔

نماز کی اہمیت دیکھئے

اور اللہ تعالیٰ نے فلاح یافتہ بندوں کی صفات کا بیان شروع بھی نماز سے کیا تھا، اور ختم بھی نماز پر کیا، یہ بتانے کے لئے کہ ایک مؤمن کا سب سے اہم کام نماز ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی جب آدھی سے زیادہ دنیا پر حکومت تھی ـــــ آجکل تو لوگ چھوٹی چھوٹی حکومتیں لیے بیٹھے ہیں، اور اپنے آپ کو بادشاہ اور سربراہ اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی زیرنگیں ان کے دورِ خلافت میں جتنا رقبہ تھا، آج اس وقت اس رقبے میں تقریباً ۱۵ خودمختار ملک بنے ہوئے ہیں، جبکہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تنہا اس کے حکمران تھے ـــــ اس وقت ان کی قلمرو میں ان کے ماتحت جتنے گورنر تھے، ان کے نام خط لکھا جو ''مؤطا امام مالک'' میں موجود ہے، اس خط میں فرمایا:

"إِنَّ اَهَمَّ اَمْرِكُمْ عِنْدِیَ الصَّلَاةُ، فَمَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَهُ، وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا اَضْيَعُ"(۱)

''یاد رکھو کہ تمہارے سب کاموں میں میرے نزدیک سب سے اہم کام نماز ہے، جس شخص نے نماز کی حفاظت کی، اور اس پر مداومت کی اس نے اپنے دین کی

(۱) مؤطا الإمام مالك، كتاب وقوت الصلاة، باب وقوت الصلاة، رقم: ٥

حفاظت کی، اور جس شخص نے نماز کو ضائع کیا، وہ اور چیزوں کو اور زیادہ ضائع کرے گا''

جنت الفردوس کے وارث

بہر حال! اس لئے قرآنِ کریم نے ان صفات کے بیان کو شروع بھی نماز سے کیا، اور ختم بھی نماز پر کیا، ان صفات کے بعد فرمایا کہ جن لوگوں میں یہ صفات پائی جائیں گی:

(۱) نماز میں خشوع
(۲) فضول کاموں سے بچنا
(۳) زکوٰۃ کی ادائیگی
(۴) اخلاق کی درستی
(۵) عفت و عصمت کی حفاظت
(۶) امانتوں اور عہد کی پابندی
(۷) نمازوں کی حفاظت

یہ ہیں وہ لوگ جو جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، اور ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے، اپنی رحمت سے ہم سب کو یہ ساری صفات عطا فرمائے، اور یہ ساری صفات عطا فرما کر اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت سے جنت میں داخل ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

نماز اور انفرادی اصلاح ☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

نماز کے بارے میں اتنی بات تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ وہ دینی فرائض میں ایک اہم ترین فریضہ ہے، ایک عظیم الشان عبادت ہے، اور دین کا ستون ہے، لیکن اس کے ساتھ نماز کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انسان کی انفرادی اصلاح اور اخلاقی تربیت کے لئے نسخۂ اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾(۱)

''جو کتاب آپ پر بذریعہ وحی نازل کی گئی ہے آپ اس کو پڑھا کیجئے، اور نماز کو قائم کیجئے، بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے''

اس آیت میں بڑے واضح انداز سے نماز کی یہ خاصیت بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ انسان کو ہر بدی اور ناشائستگی سے روک کر اخلاقی طور پر اس کی اصلاح کرتی ہے، متعدد مستند احادیث کی رُو سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اقامتِ صلاۃ میں بالخاصہ یہ تاثیر ہے کہ جو اس کو ادا کرتا ہے اس سے گناہ اور بُری عادتیں رفتہ رفتہ چھوٹتی جاتی ہیں، ہاں شرط یہ ہے کہ نماز کو محض ایک بوجھ سمجھ کر ٹالا نہ جائے، بلکہ قرآن کے الفاظ میں اقامتِ صلاۃ کی جائے۔

اقامتِ صلاۃ کے لفظی معنی نماز کو سیدھا کرنے کے ہیں، اور مراد یہ ہے کہ اس کے تمام ظاہری و باطنی آداب ٹھیک اسی طرح ادا کرنے کی کوشش کی جائے جس طرح آنحضرت ﷺ نے ادا فرمائے، مثلاً ایک تو نماز کی تمام شرائط، سنتوں اور آداب کا صحیح علم حاصل کر کے ان سب کی حتی الوسع رعایت کی جائے، دوسرے یہ کہ جس قدر خضوع وخشوع پیدا کرنا انسان کے بس میں ہے وہ پیدا کر کے اس طرح

☆ نشری تقریریں، ص:۴۱ تا ۴۳، فرد کی اصلاح، ص:۳۹
(۱) العنکبوت: ٤٥

نماز میں کھڑا ہو کہ گویا اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کر رہا ہے، اس طرح نماز قائم کرنے والے کو منجانب اللہ خود بخود نیک کاموں کی توفیق ہوتی ہے، اور بدی سے بچنے کا جذبہ بڑھتا چلا جاتا ہے، اور جو شخص نماز پڑھنے کے باوجود بداخلاقیوں اور بداعمالیوں میں مبتلا رہے تو اس کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی نماز ہی میں قصور ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ لَمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ فَلَا صَلَاةَ لَهُ))

''جس شخص کی نماز نے اسے بے حیائی اور بدی سے نہ روکا تو اس کی نماز کچھ نہیں''۔(۱)

واقعہ یہ ہے کہ جب نماز اپنے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کی جائے تو وہ نمازی کا اللہ تعالیٰ سے ایک خاص تعلق پیدا کر دیتی ہے، اور جس شخص کو یہ تعلق حاصل ہو گیا اس کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ رفتہ رفتہ دوسرے گناہوں سے باز نہ رہے۔

آنحضرت ﷺ کو ایک شخص کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہ رات کو تہجد پڑھتا ہے اور جب صبح ہوتی ہے تو چوری کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ عنقریب نماز اس کو چوری سے روک دے گی، چنانچہ کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ شخص چوری سے تائب ہو گیا۔(۲)

آج کل ہم میں سے بعض لوگ جو بظاہر پابندِ نماز ہونے کے باوجود طرح طرح کے گناہوں یا بداعمالیوں میں مبتلا رہتے ہیں تو حدیثِ نبوی ﷺ کے مطابق ان کی نماز میں کہیں نہ کہیں نقص ہے، اگر اس نقص کو دور کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کے مطابق نماز یقیناً برائیوں سے روکے گی، اور اس طرح یہ عبادت اس کی اخلاقی اصلاح کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ نماز کو اس کے تمام ظاہری اور باطنی آداب کے ساتھ ادا کریں، اور دنیا و آخرت میں اس کے بہترین ثمرات سے مستفید ہوں۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) تفسیر ابن کثیر (۳/ ۵۴۵) سورۃ العنکبوت، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی

(۲) تفسیر ابن کثیر (۳/۵۴۶)

ارکانِ نماز، ایک نظر میں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

"أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِىْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۃ مؤمنون کی ابتدائی چند آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں، جن کی تشریح کا سلسلہ میں نے دو ہفتے پہلے شروع کیا ہے۔ ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان مؤمنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا کہ وہ فلاح یافتہ ہیں اور جن کو دنیا و آخرت میں فلاح نصیب ہوگی۔ ان میں سے سب سے پہلی صفت جس کا ان آیات میں بیان کیا گیا، وہ نماز میں خشوع اختیار کرنا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ عام طور پر دو لفظ استعمال ہوتے ہیں، ایک "خشوع" اور دوسرا "خضوع" —— "خشوع" کے معنی ہیں "دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنا" اور "خضوع" کے معنی ہیں، اعضاء کو سنت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے آگے جھکا دینا۔ گزشتہ جمعہ یہ بیان شروع کیا تھا کہ نماز میں اعضاء کس طرح رکھنے چاہئیں جس کے نتیجے میں "خضوع" حاصل ہو، تکبیر تحریمہ کا طریقہ اور ہاتھ باندھنے کا مسنون طریقہ اور قرأت کا صحیح طریقہ عرض کر دیا تھا۔

قیام کا مسنون طریقہ

قیام یعنی نماز میں کھڑے ہونے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ آدمی بالکل سیدھا کھڑا ہو اور نگاہیں

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۲۰۴ تا ۲۲۰) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون ۱ تا ۷

سجدے کی جگہ پر ہوں، سجدے کی جگہ کی طرف نظر ہونے کی وجہ سے انسان کے جسم کا اوپر والا تھوڑا سا حصہ آگے کی طرف جھکا ہوا ہوگا، اس سے زیادہ جھکنا پسندیدہ نہیں، چنانچہ بعض لوگ نماز میں بہت زیادہ جھک جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں کمر میں خم آجاتا ہے، یہ طریقہ پسندیدہ نہیں بلکہ سنت کے خلاف ہے۔ لہٰذا قیام کے وقت اس طرح سیدھا کھڑا ہونا چاہئے کہ کمر میں خم نہ آئے البتہ سر تھوڑا سا جھکا ہوا ہوتا کہ نظریں سجدے کی جگہ پر ہو جائیں۔ یہ کھڑے ہونے کا مسنون طریقہ ہے۔

بے حرکت کھڑے ہوں

اور جب کھڑا ہو تو آدمی یہ کوشش کرے کہ بے حس وحرکت کھڑا ہو اور جسم میں حرکت نہ ہو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے نماز میں کھڑے ہوں تو بے حرکت کھڑے ہوں۔ اکثر لوگ اس کا خیال نہیں کرتے، جب کھڑے ہوتے ہیں تو جسم کو آگے پیچھے حرکت دیتے رہتے ہیں، بلاوجہ کبھی اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہیں، کبھی پسینہ پونچھتے ہیں، کبھی کپڑے ٹھیک کرتے ہیں، یہ ساری باتیں اس ''قنوت'' کے خلاف ہیں جس کا قرآن کریم نے ہمیں اور آپ کو حکم دیا ہے۔

احکم الحاکمین کے دربار میں کھڑے ہو

جب نماز میں کھڑے ہو تو یہ تصور کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہو، جب آدمی دنیا کے کسی معمولی حکمران کے سامنے بھی کھڑا ہوتا ہے تو ادب کا مظاہرہ کرتا ہے، کوئی بدتمیزی نہیں کرتا، لاپرواہی سے کھڑا نہیں ہوتا، تو جب تم احکم الحاکمین کے سامنے پہنچے ہو تو وہاں پر لاپرواہی کا مظاہرہ کرنا اور ڈھیلا ڈھالا کھڑا ہونا اور اپنے ہاتھ پاؤں کو بلاوجہ حرکت دینا، یہ سب نماز کے آداب کے بالکل خلاف ہے اور سنت کے بھی خلاف ہے۔ فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک رکن میں بلاضرورت ہاتھ کو تین مرتبہ حرکت دے گا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ اس کی تفصیل میں نے گزشتہ جمعوں میں عرض کر دی تھی۔

رکوع کا مسنون طریقہ

قیام کے بعد رکوع کا مرحلہ آتا ہے جب آدمی رکوع میں جائے تو اس کی کمر سیدھی ہو جائے،

(۱) البقرة: ۲۳۸

بعض لوگ رکوع میں اپنی کمر کو بالکل سیدھا نہیں کرتے، یہ سنت کے خلاف ہے، بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک اس کی وجہ سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کمر بالکل سیدھی ہو اور ہاتھ کی انگلیوں کو کھول کر گھٹنے پکڑ لینے چاہئیں، اور گھٹنے بھی سیدھے ہونے چاہئیں اس میں بھی خم نہ ہو، اور ڈھیلے ڈھالے نہ ہوں، بلکہ کسے ہوئے ہوں، یہ رکوع کا سنت طریقہ ہے، اس طریقے میں جتنی کمی آئے گی اتنی ہی سنت سے دوری ہوگی، اور نماز کے انوار و برکات میں کمی آئے گی۔

''قومہ'' کا مسنون طریقہ

رکوع کے بعد جب آدمی "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہتے ہوئے کھڑا ہوتا ہے، اس کو ''قومہ'' کہا جاتا ہے، اس قومہ کی ایک سنت آج کل متروک ہوگئی ہے، وہ یہ کہ اس قومہ میں بھی آدمی کو کچھ دیر کھڑا ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ ابھی پوری طرح کھڑے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ سجدے میں چلے گئے۔ ایک حدیث میں ایک صحابی بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جتنی دیر آپ رکوع میں رہتے، اتنی ہی دیر قومہ میں بھی رہتے، مثلاً اگر رکوع میں پانچ مرتبہ "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ" کہا تو جتنا وقت پانچ مرتبہ "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ" کہنے میں لگا اور وہ وقت آپ نے رکوع میں گزارا، تقریباً اتنا ہی وقت آپ قومہ میں گزارتے تھے، اس کے بعد سجدہ میں تشریف لے جاتے، آج ہم لوگ رکوع سے اُٹھتے ہوئے ذرا سی دیر میں "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہتے ہیں اور پھر فوراً سجدے میں چلے جاتے ہیں، یہ طریقہ سنت کے مطابق نہیں۔

''قومہ'' کی دعائیں

اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ ﷺ قومہ میں یہ الفاظ پڑھا کرتے تھے:

((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ، مِلْأَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمِلْأَ مَا بَيْنَهُمَا وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ)) (۱)

بعض احادیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

(۱) سنن البیهقی الکبری، رقم: ۲۴۳۶ (۹۴/۲)، مصنف ابن أبی شیبة، رقم: ۲۹۰۶ (۱۶۵/۲)، مسند الطیالسی، رقم: ۱۵۲ (۲۳/۱)، اس دعا کا ترجمہ یہ ہے ''اے ہمارے رب! سب تعریفیں تیرے لئے ہیں ایسی تعریفیں جو زمین و آسمان کو بھر دینے والی، ان کے درمیان کو بھر دینے والی اور ان کے بعد جو تو چاہے اس چیز کو بھر دینے والی ہیں''

((رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ كَمَا يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضَى))(۱)

اس سے پتہ چلا آپ ﷺ اتنی دیر قومہ میں کھڑے رہتے جتنی دیر میں یہ الفاظ ادا فرماتے۔ لہٰذا قومہ میں صرف قیام کا اشارہ کر کے سجدہ میں چلے جانا درست نہیں۔ بلکہ اگر کوئی آدمی سیدھا کھڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہیں سے سجدے میں چلا گیا تو نماز واجب الاعادہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا سیدھا کھڑا ہونا ضروری ہے۔

ایک صاحب کی نماز کا واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ مسجدِ نبوی میں تشریف فرما تھے، ایک صاحب آئے اور مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنی شروع کر دی، لیکن نماز اس طرح پڑھی کہ رکوع میں گئے تو ذرا سا اشارہ کر کے کھڑے ہو گئے اور قومہ میں ذرا سا اشارہ کر کے سجدہ میں چلے گئے اور سجدہ میں گئے تو ذرا سی دیر میں سجدہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے جلد جلد ارکان ادا کر کے نماز مکمل کر لی، اور پھر حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا، جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ، قُمْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ))

یعنی سلام کا جواب دینے کے بعد فرمایا کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اس لئے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ وہ صاحب اُٹھ کر گئے اور دوبارہ نماز پڑھی، لیکن دوبارہ بھی اسی طرح نماز پڑھی جس طرح پہلی مرتبہ پڑھی تھی، اس لئے کہ ان کو اسی طرح پڑھنے کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد پھر حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آ کر سلام کیا، آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا:

((قُمْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ))

جاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ تیسری مرتبہ پھر انہوں نے جا کر اسی طرح پڑھی اور واپس آئے تو پھر آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب فضل اللّٰهم ربنا لك الحمد، رقم: ۷۵۷ سنن النسائي، كتاب التطبيق، باب مايقول المأموم، رقم: ۱۰۵۲، اس دعا کا ترجمہ یہ ہے "اے ہمارے رب! تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں ایسی تعریفیں جو مقدار میں زیادہ، پاکیزہ اور بابرکت ہیں، یہ تعریفیں ایسے ہیں جیسے ہمارے رب چاہے اور راضی ہو"

((قُمْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ))

جاؤ نماز پڑھو، کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ جب تیسری مرتبہ آپ ﷺ نے ان سے یہی بات ارشاد فرمائی تو ان صاحب نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ مجھے بتا دیجئے کہ میں نے کیا غلطی کی ہے، اور مجھے کس طرح نماز پڑھنی چاہئے؟ اس کے بعد حضور اقدس ﷺ نے ان کو نماز کا صحیح طریقہ بتایا۔(۱)

ابتداءً نماز کا طریقہ بیان نہ کرنے کی وجہ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ان سے یہ تو فرمادیا کہ جاؤ نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی، پہلی مرتبہ میں ان کو نماز کا صحیح طریقہ کیوں نہیں بتایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت ان صاحب کو خود پوچھنا چاہئے تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نماز پڑھ کر آرہا ہوں، آپ فرمارہے ہیں کہ نماز نہیں پڑھی، مجھ سے کیا غلطی ہوئی؟ جب انہوں نے نہیں پوچھا تو حضورِ اقدس ﷺ نے بھی نہیں بتایا، اس کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ اصول بتلادیا کہ جب تک انسان کے دل میں خود طلب پیدا نہ ہو، اس کو تعلیم دینا بعض اوقات بیکار ہو جاتا ہے، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ اس انتظار میں تھے کہ ان کے اندر خود طلب پیدا ہو، جب تیسری مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نے ان کو واپس لوٹا دیا، اس وقت انہوں نے کہا:

"يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَرِنِيْ وَعَلِّمْنِيْ"

یا رسول اللہ ﷺ! آپ مجھے سکھائیے کہ کس طرح نماز پڑھنی چاہئے۔ اس وقت پھر آپ ﷺ نے ان کو نماز پڑھنا سکھایا۔

اطمینان سے نماز ادا کرو

بہر حال! ایک طرف حضورِ اقدس ﷺ کو ان کی طلب کا انتظار تھا کہ جب ان کے اندر طلب پیدا ہو تو ان کو بتایا جائے، دوسری طرف یہ بات تھی کہ آپ نے سوچا کہ جب یہ دو تین مرتبہ نماز دہرائیں گے، اور اس کے بعد نماز کا صحیح طریقہ سیکھیں گے تو وہ طریقہ دل میں زیادہ پیوست ہوگا اور اس بتانے کی اہمیت زیادہ ہوگی۔ اس لئے آپ ﷺ نے تین مرتبہ ان کو نماز پڑھنے کا حکم دیا، اس کے بعد حضورِ اقدس ﷺ نے بتایا کہ جب تم نماز پڑھو تو ہر رکن کو اس کے صحیح طریقے پر ادا کرو، جب قرأت

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب وجوب القراءة...... الخ، رقم: ۷۱۵، صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة، رقم: ۶۰۲، سنن الترمذی، کتاب الصلاة، رقم: ۲۷۹

کرو تو اطمینان سے تلاوت کرو، جب کھڑے ہو تو اطمینان کے ساتھ کھڑے ہو، اور جب رکوع میں جاؤ تو اطمینان کے ساتھ رکوع کرو، یہاں تک کہ تمہاری کمر سیدھی ہو جائے، جب رکوع سے کھڑے ہو تو اطمینان کے ساتھ اس طرح سیدھے کھڑے ہو جاؤ کہ کمر میں خم باقی نہ رہے، اس کے بعد جب سجدہ میں جاؤ تو اطمینان کے ساتھ سجدہ کرو اور جب سجدہ سے اُٹھو تو اطمینان کے ساتھ اُٹھو، اس طرح نماز کی پوری تفصیل حضور اقدس ﷺ نے ان کو بتلائی، اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ تفصیل سنی۔ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نماز کے بارے میں یہ تفصیل سنی تو انہوں نے فرمایا کہ ان صاحب کی وجہ سے ہمیں رسول کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے نماز کے شروع سے لے کر آخر تک پورا طریقہ سننا اور سیکھنا نصیب ہو گیا۔

نماز واجب الاعادہ ہو گی

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ان صاحب سے فرمایا کہ جاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر رکوع میں یا قومہ میں یا سجدہ میں اس قسم کی کوتاہی رہ جائے تو نماز واجب الاعادہ ہو گی۔ لہٰذا اگر رکوع کے اندر کمر سیدھی نہیں ہوئی، یا قومہ کے اندر کمر سیدھی نہیں ہوئی اور بس اشارہ کر کے آدمی اگلے رکن میں چلا گیا جیسا کہ بہت سے لوگ کرتے ہیں تو اس حدیث کی رُو سے نماز واجب الاعادہ ہے۔ اس لئے اس کا بہت اہتمام کرنا چاہئے اور بہتر یہ ہے کہ قومہ میں بھی اتنا ہی وقت لگائے جتنا وقت رکوع میں لگایا ہے۔

قومہ کا ایک ادب

ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بعض مرتبہ رسول کریم ﷺ کو ہم نے دیکھا کہ آپ ﷺ رکوع سے قومہ میں کھڑے ہوئے تو اتنی آپ دیر کھڑے رہے کہ ہمیں یہ خیال ہونے لگا کہ کہیں آپ بھول تو نہیں گئے کیونکہ آپ ﷺ نے رکوع لمبا فرمایا تھا اس لئے قومہ بھی لمبا فرمایا اور اس کے بعد آپ سجدے میں تشریف لے گئے۔ یہ قومہ کا ادب ہے۔

سجدہ میں جانے کا طریقہ

قومہ کے بعد آدمی سجدہ کرتا ہے۔ سجدہ میں جانے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی سیدھا سجدے میں جائے، یعنی سجدے میں جاتے وقت کمر کو پہلے سے نہ جھکائے، جب تک گھٹنے زمین پر نہ ٹکیں اس وقت تک اُوپر کا بدن بالکل سیدھا رہے، البتہ جب گھٹنے زمین پر رکھ دے اس کے بعد اُوپر کا بدن آگے کی

طرف جھکاتے ہوئے سجدے میں چلا جائے، یہ طریقہ زیادہ بہتر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص پہلے سے جھک جائے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ لیکن فقہاء کرام نے اس طریقے کو زیادہ پسند فرمایا ہے۔

سجدہ میں جانے کی ترتیب

سجدہ میں جانے کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے گھٹنے زمین پر لگنے چاہئیں، اس کے بعد ہتھیلیاں، اس کے بعد ناک اس کے بعد پیشانی زمین پر ٹکنی چاہئے اور اس کو آسانی سے یاد رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو عضو زمین سے جتنا قریب ہے وہ اتنا ہی پہلے جائے گا، چنانچہ گھٹنے زمین سے زیادہ قریب ہیں اس لئے پہلے گھٹنے جائیں گے پھر ہاتھ قریب ہیں تو ہاتھ پہلے ٹکیں گے۔ اس کے بعد ناک قریب ہے اس کے بعد آخر میں پیشانی زمین پر ٹکے گی۔ سجدہ میں جانے کی یہ ترتیب ہے، اس ترتیب سے سجدے میں جائے۔

پاؤں کی انگلیاں زمین پر ٹیکنا

اور سجدہ کرتے وقت یہ سب اعضاء بھی سجدے میں جاتے ہیں، لہٰذا سجدہ دو ہاتھ، دو گھٹنے، دو پاؤں، ناک اور پیشانی یہ سب اعضاء سجدے میں جانے چاہئیں اور زمین پر ٹکنے چاہئیں۔ اکثر لوگ سجدے میں پاؤں زمین پر نہیں ٹیکتے، پاؤں کی انگلیاں اُوپر رہتی ہیں، اگر پورے سجدے میں ایک لمحہ کے لئے بھی انگلیاں زمین پر نہ ٹکیں تو سجدہ ہی نہیں ہوگا اور نماز فاسد ہو جائے گی، البتہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی ''سبحان اللہ'' کہنے کے بقدر انگلیاں زمین پر ٹک گئیں تو سجدہ اور نماز ہو جائے گی، لیکن سنت کے خلاف ہوگی۔ کیونکہ سنت یہ ہے کہ پورے سجدے میں دونوں پاؤں کی انگلیاں زمین پر ٹکی ہوئی ہوں، اور ان انگلیوں کا رخ بھی قبلہ کی طرف ہونا چاہئے۔ لہٰذا اگر انگلیاں زمین پر ٹک تو گئیں لیکن ان کا رُخ قبلہ کی طرف نہ ہوا تو بھی سنت کے خلاف ہے۔

سجدہ میں سب سے زیادہ قربِ خداوندی

یہ سجدہ ایسی چیز ہے کہ اس سے زیادہ لذیذ عبادت دنیا میں کوئی اور نہیں، اور سجدہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا کوئی اور ذریعہ نہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے کسی حال میں اتنا قریب نہیں ہوتا جتنا سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ (۱)

(۱) صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود، رقم:۷۴۴، سنن النسائی، کتاب التطبیق، باب أقرب مایکون العبد من اللہ عز وجل، رقم:۱۱۲۵، سنن أبی داود، کتاب الصلاۃ، باب فی الدعاء فی الرکوع والسجود، رقم:۷۴۱، مسند أحمد، رقم:۹۰۸۳

کیونکہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ کررہا ہوتا ہے اس وقت اس کا پورا جسم پورا وجود اللہ تعالیٰ کے آگے جھکا ہوا ہوتا ہے، لہٰذا تمام اعضاء کو جھکا ہوا ہونا چاہئے اور اسی طریقے پر جھکا ہونا چاہئے جو طریقہ رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمایا اور جس پر آپ نے عمل فرمایا۔

خواتین بالوں کا جوڑا کھول دیں

اس لئے فرمایا گیا کہ عورتوں کے لئے بالوں کا جوڑا باندھ کر نماز پڑھنا کراہت سے خالی نہیں، اگرچہ نماز ہو جائے گی اس لئے کہ علماء کرام نے فرمایا کہ اگر بالوں کا جوڑا بندھا ہوا ہوگا تو بال سجدے میں نہیں جائیں گے کیونکہ اس صورت میں بال اُوپر کی طرف کھڑے ہوں گے، اور سجدے کی پوری کیفیت حاصل نہ ہوگی، اس لئے عورتوں کو چاہئے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے اپنے جوڑے کو کھول لیں، تاکہ بال بھی سجدے میں نیچے کی طرف گریں اُوپر کی طرف کھڑے نہ رہیں اور ان کو بھی سجدے کے انوار و برکات حاصل ہو جائیں، کیونکہ سجدے کے علاوہ کسی اور حالت میں اللہ تعالیٰ کا اتنا قرب حاصل نہیں ہوتا۔

نماز مؤمن کی معراج ہے

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو معراج کا ایسا عظیم مرتبہ عطا فرمایا جو کائنات میں کسی اور کو عطا نہیں ہوا۔ اس مقام پر پہنچے جہاں جبرئیل امین علیہ السلام بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنا قربِ خاص عطا فرمایا، جس کا ہم اور آپ تصور بھی نہیں کرسکتے، معراج کے موقع پر آپ ﷺ نے زبانِ حال سے یہ عرض کیا کہ یا اللہ! آپ نے مجھے تو قرب کا اتنا بڑا مقام عطا فرمادیا، میرے اُمتیوں کو یہ مقام کیسے حاصل ہو؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جواب میں نماز کا تحفہ دیدیا، اور فرمایا کہ جاؤ اپنی اُمت سے کہنا کہ پانچ نمازیں پڑھا کرے اور جب آپ کی اُمت نماز پڑھے گی تو اس میں سجدہ بھی کرے گی اور جب سجدہ کرے گی تو ان کو میرا قرب حاصل ہو جائے گا، اسی لئے فرمایا گیا:

((اَلصَّلَاةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ))(۱)

''نماز مؤمنین کی معراج ہے''

کیونکہ ہمارے اور آپ کے بس میں یہ تو نہیں ہے کہ ساتوں آسمانوں کو عبور کر کے ملأ اعلیٰ میں پہنچ جائیں اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچیں، لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ کے صدقے میں ہر مؤمن کو یہ معراج عطا ہوگئی کہ سجدے میں جاؤ اور اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاؤ۔ لہٰذا یہ سجدہ معمولی چیز نہیں۔ اس لئے اس کو قدر سے کرو۔

---

(۱) تفسیر حقی (۴۵۳/۸)، روح المعانی (۸۹/۱)

سجدہ کی فضیلت

جس وقت تم اپنے سارے وجود کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا رہے ہوتے ہو اس وقت ساری کائنات تمہارے آگے جھکی ہوئی ہوتی ہے۔

سر بر قدم حسن، قدم بر کلاہ و تاج

جس وقت تمہارا قدم حسن پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتا ہے تو اس وقت تمہارا پاؤں سارے کلاہ و تاج پر ہوتا ہے۔ ساری کائنات اس کے نیچے ہوتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ ایک سجدہ ہزار سجدوں سے نجات دے دیتا ہے، کیونکہ اگر یہ سجدہ انسان نہ کرے تو ہر جگہ سجدہ کرنا پڑتا ہے، کبھی حاکم کے سامنے، کبھی افسر کے سامنے، کبھی امیر کے سامنے۔ لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ کر رہا ہے، وہ کسی اور کے آگے سجدہ نہیں کرتا۔ لہٰذا اس سجدے کو قدر اور محبت سے کرو پیار سے کرو۔

سجدہ میں کیفیت

حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے، ایک مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ان کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے، وہ عجیب شان کے بزرگ تھے، جب واپس آنے لگے تو چپکے سے ان سے کہنے لگے:

''میاں اشرف علی! ایک بات کہتا ہوں وہ یہ کہ جب میں سجدے میں جاتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیار کر لیا''

بہر حال! یہ سجدہ محبت سے کرو، پیار سے کرو، کیونکہ یہ سجدہ تمہیں ہزار سجدوں سے نجات دے رہا ہے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کر رہا ہے جو اور کسی ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

سجدہ میں کہنیاں کھولنا

لہٰذا جب سجدہ کرو تو اس کو صحیح طریقے سے کرو، سجدہ میں تمہارے اعضاء اسی طرح ہونے چاہئیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوا کرتے تھے، وہ اس طرح کہ کہنیاں پہلو سے جدا ہوں۔ البتہ کہنیاں پہلو سے الگ ہونے کے نتیجے میں برابر والے نمازی کو تکلیف نہ ہو، بعض لوگ اپنی کہنیاں اتنی

زیادہ دور کر دیتے ہیں کہ دائیں بائیں والے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے، یہ طریقہ بھی سنت کے خلاف ہے، جائز نہیں، اس لئے کہ کسی انسان کو تکلیف پہنچانا کبیرہ گناہ ہے۔ ــــ اور سجدہ میں کم از کم تین مرتبہ "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" کہے، زیادہ کی توفیق ہو تو پانچ مرتبہ، سات مرتبہ، گیارہ مرتبہ کہے، اور محبت، عظمت اور قدر سے یہ تسبیح پڑھے۔

جلسہ کی کیفیت و دعا

جب پہلا سجدہ کر کے آدمی بیٹھتا ہے تو اس کو جلسہ کہتے ہیں۔ جلسہ میں کچھ دیر اطمینان سے بیٹھنا چاہئے، یہ نہ کریں کہ بیٹھتے ہی فوراً دوبارہ سجدے میں چلے گئے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جلسے میں بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً اتنی دیر بیٹھا کرتے تھے جتنی دیر سجدے میں، جتنا وقت سجدے میں گزرتا، تقریباً اتنا ہی وقت جلسے میں بھی گزرتا تھا، یہ سنت بھی متروک ہوتی جا رہی ہے، اور جلسے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا پڑھنا ثابت ہے:

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَاسْتُرْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَاهْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ))(۱)

لہٰذا اتنا وقت جلسے میں گزرنا چاہئے جس میں یہ دعا پڑھی جا سکے۔ اور پھر دوسرے سجدے میں جائے۔

بہر حال! یہ ایک رکعت کا بیان تکبیر تحریمہ سے لے کر سجدہ تک کا ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو باقی بیان اگلے جمعہ کو عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سنت کے مطابق نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

❁❁❁

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ما یقول بین السجدتین، رقم: ۲۶۲ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، رقم: ۸۸۸، اس دعا کا ترجمہ یہ ہے "اے اللہ! میرے گناہوں کو معاف فرما، اے اللہ! میری مغفرت فرما، میرا پردہ فرما، مجھے سلامتی عطا فرما، مجھے ہدایت دے اور مجھے رزق عطا فرما"

نمازیں سنت کے مطابق پڑھئے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی، وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

نماز دین کا ستون ہے، اس کو ٹھیک ٹھیک سنت کے مطابق ادا کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ ہم لوگ بے فکری کے ساتھ نماز کے ارکان جس طرح سمجھ میں آتا ہے، ادا کرتے رہتے ہیں، اور اس بات کی فکر نہیں کرتے کہ وہ ارکان مسنون طریقے سے ادا ہوں، اس وجہ سے ہماری نمازیں سنت کے انوار و برکات سے محروم رہتی ہیں، حالانکہ ان ارکان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے سے نہ وقت زیادہ خرچ ہوتا ہے، نہ محنت زیادہ ہوتی ہے، بس ذرا سی توجہ کی بات ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی توجہ دے کر صحیح طریقہ سیکھ لیں اور اس کی عادت ڈال لیں تو جتنے وقت میں ہم آج نماز پڑھتے ہیں، اُتنے ہی وقت میں وہ نماز سنت کے مطابق ادا ہو جائے گی، اور اس کا اجر و ثواب بھی اور انوار و برکات بھی آج سے کہیں زیادہ ہوں گے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز کا ایک ایک عمل خوب توجہ کے ساتھ سنت کے مطابق انجام دینے کا بڑا اہتمام تھا، اور وہ ایک دوسرے سے سنتیں سیکھتے بھی رہتے تھے۔

اسی ضرورت کے پیشِ نظر احقر نے اپنی ایک مجلس میں نماز کا مسنون طریقہ اور اس سلسلے میں جو غلطیاں رواج پا گئی ہیں، اُن کی تفصیل بیان کی تھی جس سے بفضلہٖ تعالیٰ سامعین کو بہت فائدہ ہوا۔ بعض احباب نے خیال ظاہر کیا کہ یہ باتیں ایک مختصر سے رسالے کی شکل میں آجائیں تو ہر شخص اس سے فائدہ اُٹھا سکے گا۔ چنانچہ اس مختصر سے رسالے میں نماز کا مسنون طریقہ اور اس کو آداب کے ساتھ ادا کرنے کی ترکیب بیان کرنی مقصود ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ہم سب کے لئے مفید بنائیں، اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

نماز کے مسائل پر بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں بحمد اللہ شائع ہو چکی ہیں، یہاں نماز کے تمام مسائل بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف نماز کے ارکان کی ہیئت سنت کے مطابق بنانے کے لئے چند ضروری باتیں بیان کرنی ہیں، اور ان غلطیوں اور کوتاہیوں پر تنبیہ کرنی ہے جو آج کل بہت زیادہ رواج پا گئی ہیں۔

☆ ''نمازیں سنت کے مطابق پڑھئے'' (مختصر رسالہ) مطبوعہ ادارہ اسلامیات، لاہور

ان چند مختصر باتوں پر عمل کرنے سے انشاء اللہ نماز کی کم از کم ظاہری صورت سنت کے مطابق ہو جائے گی، اور ایک مسلمان اپنے پروردگار کے حضور کم از کم یہ عرضداشت پیش کر سکے گا کہ

ترے محبوب کی یا رب! شباہت لے کے آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کر دے، میں صورت لے کے آیا ہوں

نماز شروع کرنے سے پہلے

یہ باتیں یاد رکھئے، اور ان پر عمل کا اطمینان کر لیجئے:

(۱) آپ کا رُخ قبلے کی طرف ہونا ضروری ہے۔

(۲) آپ کو سیدھا کھڑے ہونا چاہئے اور آپ کی نظر سجدے کی جگہ پر ہونی چاہئے۔ گردن کو جھکا کر ٹھوڑی سینے سے لگا لینا بھی مکروہ، اور بلاوجہ سینے کو جھکا کر کھڑا ہونا بھی درست نہیں۔ اِس طرح سیدھے کھڑے ہوں کہ نظر سجدے کی جگہ پر رہے۔

(۳) آپ کے پاؤں کی اُنگلیوں کا رُخ بھی قبلے کی جانب ہو، اور دونوں پاؤں سیدھے قبلہ رُخ ہوں (پاؤں کو دائیں بائیں ترچھا رکھنا خلافِ سنت ہے) دونوں پاؤں قبلہ رُخ ہونے چاہئیں:

غلط طریقہ



صحیح طریقہ



(۴) دونوں پاؤں کے درمیان کم از کم چار اُنگل کا فاصلہ ہونا چاہئے۔

(۵) اگر جماعت سے نماز پڑھ رہے ہیں تو آپ کی صف سیدھی رہے، صف سیدھی کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی دونوں ایڑھیوں کے آخری سرے صف یا اس کے نشان کے آخری کنارے پر رکھ لے، اس طرح:



(۶) جماعت کی صورت میں اس بات کا بھی اطمینان کرلیں کہ دائیں بائیں کھڑے ہونے والوں کے بازوؤں کے ساتھ آپ کے بازو ملے ہوئے ہیں، اور بیچ میں کوئی خلا نہیں ہے۔

(۷) پاجامے کو ٹخنے سے نیچے لٹکانا ہر حالت میں ناجائز ہے، ظاہر ہے کہ نماز میں اس کی شناعت اور بڑھ جاتی ہے، لہٰذا اس کا اطمینان کرلیں کہ پاجامہ ٹخنے سے اُونچا ہے۔

(۸) ہاتھ کی آستینیں پوری طرح ڈھکی ہوئی ہونی چاہئیں، صرف ہاتھ کھلے رہیں، بعض لوگ آستینیں چڑھا کر نماز پڑھتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔

(۹) ایسے کپڑے پہن کر نماز میں کھڑے ہونا مکروہ ہے جنہیں پہن کر انسان لوگوں کے سامنے نہ جاتا ہو۔

نماز شروع کرتے وقت

(۱) دِل میں نیت کرلیں کہ میں فلاں نماز پڑھ رہا ہوں، زبان سے نیت کے الفاظ کہنا ضروری نہیں۔

(۲) ہاتھ کانوں تک اس طرح اُٹھائیں کہ ہتھیلیوں کا رُخ قبلے کی طرف ہو، اور انگوٹھوں کے سرے کان کی لو سے یا تو بالکل مل جائیں، یا اُس کے برابر آجائیں، اور باقی اُنگلیاں اُوپر کی طرف سیدھی ہوں۔ بعض لوگ ہتھیلیوں کا رُخ قبلے کی طرف کرنے کے بجائے کانوں کی طرف کرلیتے ہیں۔ بعض لوگ کانوں کو ہاتھوں سے بالکل ڈھک لیتے ہیں۔ بعض لوگ ہاتھ پوری طرح کانوں تک اُٹھائے بغیر ہلکا سا اشارہ کردیتے ہیں۔ بعض لوگ کان کی لو کو ہاتھوں سے پکڑ لیتے ہیں۔ یہ سب طریقے غلط اور خلافِ سنت ہیں۔ ان کو چھوڑنا چاہئے۔

(۳) مذکورہ بالا طریقے پر ہاتھ اُٹھاتے وقت اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہیں، پھر دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور چھوٹی اُنگلی سے بائیں پہنچے کے گرد حلقہ بنا کر اسے پکڑلیں اور باقی تین اُنگلیوں کو بائیں ہاتھ کی پشت پر اس طرح پھیلا دیں کہ تینوں اُنگلیوں کا رُخ کہنی کی طرف ہو۔

(۴) دونوں ہاتھوں کو ناف سے ذرا سا نیچے رکھ کر مذکورہ بالا طریقے سے باندھ لیں۔

کھڑے ہونے کی حالت میں

(۱) اگر اکیلے نماز پڑھ رہے ہوں، یا امامت کررہے ہوں تو پہلے سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ الخ، پھر سورۂ فاتحہ، پھر کوئی اور سورت پڑھیں اور اگر کسی امام کے پیچھے ہوں تو صرف سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ پڑھ کر خاموش ہوجائیں، اور امام کی قرأت کو دھیان لگا کر سنیں۔ اگر امام زور سے نہ پڑھ رہا ہو تو زبان ہلائے بغیر دل ہی دل میں سورۂ فاتحہ کا دھیان کیے رکھیں۔

(۲) جب خود قرأت کر رہے ہوں تو سورۂ فاتحہ پڑھتے وقت بہتر یہ ہے کہ ہر آیت پر رُک کر سانس توڑ دیں، پھر دوسری آیت پڑھیں، کئی کئی آیتیں ایک سانس میں نہ پڑھیں۔ مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ پر سانس توڑ دیں، پھر اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پر، پھر مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پر، اس طرح پوری سورۂ فاتحہ پڑھیں، لیکن اس کے بعد کی قرأت میں ایک سانس میں ایک سے زیادہ آیتیں بھی پڑھ لیں تو کوئی حرج نہیں۔

(۳) بغیر کسی ضرورت کے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہ دیں، جتنے سکون کے ساتھ کھڑے ہوں، اُتنا ہی بہتر ہے۔ اگر کھجلی وغیرہ کی ضرورت ہو تو صرف ایک ہاتھ استعمال کریں، اور وہ بھی صرف سخت ضرورت کے وقت اور کم سے کم۔

(۴) جسم کا سارا زور ایک پاؤں پر دے کر دوسرے پاؤں کو اس طرح ڈھیلا چھوڑ دینا کہ اس میں خم آجائے نماز کے ادب کے خلاف ہے۔ اس سے پرہیز کریں۔ یا تو دونوں پاؤں پر برابر زور دیں، یا ایک پاؤں پر زور دیں تو اس طرح کہ دوسرے پاؤں میں خم پیدا نہ ہو۔

(۵) جمائی آنے لگے تو اس کو روکنے کی پوری کوشش کریں۔

(۶) کھڑے ہونے کی حالت میں نظریں سجدے کی جگہ پر رکھیں، اِدھر اُدھر یا سامنے دیکھنے سے پرہیز کریں۔

رکوع میں

رکوع میں جاتے وقت اِن باتوں کا خاص خیال رکھیں:

(۱) اپنے اُوپر کے دھڑ کو اس حد تک جھکائیں کہ گردن اور پشت تقریباً ایک سطح پر آجائے، نہ اس سے زیادہ جھکیں نہ اس سے کم۔

(۲) رکوع کی حالت میں گردن کو اتنا نہ جھکائیں کہ ٹھوڑی سینے سے ملنے لگے، اور نہ اتنا اُوپر رکھیں کہ گردن کمر سے بلند ہوجائے، بلکہ گردن اور کمر ایک سطح پر ہونی چاہئیں۔

(۳) رکوع میں پاؤں سیدھے رکھیں، ان میں خم نہ ہونا چاہئے۔

(۴) دونوں ہاتھ گھٹنوں پر اس طرح رکھیں کہ دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں کھلی ہوئی ہوں یعنی ہر دو اُنگلیوں کے درمیان فاصلہ ہو۔ اور اس طرح دائیں ہاتھ سے دائیں گھٹنے کو اور بائیں ہاتھ سے بائیں گھٹنے کو پکڑ لیں۔

(۵) رکوع کی حالت میں کلائیاں اور بازو سیدھے تنے ہوئے رہنے چاہئیں، ان میں خم نہیں آنا چاہئے۔

(۶) کم از کم اتنی دیر رکوع میں رُکیں کہ اطمینان سے تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ کہا جاسکے۔
(۷) رکوع کی حالت میں نظریں پاؤں کی طرف ہونی چاہئیں۔
(۸) دونوں پاؤں پر زور برابر رہنا چاہئے، اور دونوں پاؤں کے ٹخنے ایک دوسرے کے بالمقابل رہنے چاہئیں۔

رکوع سے کھڑے ہوتے وقت

(۱) رکوع سے کھڑے ہوتے وقت اتنے سیدھے ہوجائیں کہ جسم میں کوئی خم باقی نہ رہے۔
(۲) اِس حالت میں بھی نظر سجدے کی جگہ پر رہنی چاہئے۔
(۳) جو لوگ کھڑے ہوتے وقت کھڑے ہونے کے بجائے کھڑے ہونے کا صرف اشارہ کرتے ہیں، اور جسم کے جھکاؤ کی حالت ہی میں سجدے کے لئے چلے جاتے ہیں، ان کے ذمے نماز کا لوٹانا واجب ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اس سے سختی کے ساتھ پرہیز کریں۔ جب تک سیدھے ہونے کا اطمینان نہ ہوجائے، سجدے میں نہ جائیں۔

سجدے میں جاتے وقت

سجدے میں جاتے وقت اس طریقے کا خیال رکھیں کہ:
(۱) سب سے پہلے گھٹنوں کو خم دے کر انہیں زمین کی طرف اس طرح لے جائیں کہ سینہ آگے کو نہ جھکے۔ جب گھٹنے زمین پر ٹک جائیں، اُس کے بعد سینے کو جھکائیں۔
(۲) جب تک گھٹنے زمین پر نہ ٹکیں، اس وقت تک اُوپر کے دھڑ کو جھکانے سے حتی الامکان پرہیز کریں۔
آج کل سجدے میں جانے کے اس مخصوص ادب سے بے پرواہی بہت عام ہوگئی ہے، اکثر لوگ شروع ہی سے سینہ آگے کو جھکا کر سجدے میں جاتے ہیں، لیکن صحیح طریقہ وہی ہے جو نمبر ا اور نمبر ۲ میں بیان کیا گیا، بغیر کسی عذر کے اس کو نہ چھوڑنا چاہئے۔
(۳) گھٹنوں کے بعد پہلے ہاتھ زمین پر رکھیں، پھر ناک، پھر پیشانی۔

سجدے میں

(۱) سجدے میں سر کو دونوں ہاتھوں کے درمیان اس طرح رکھیں کہ دونوں انگوٹھوں کے سرے کانوں کی لو کے سامنے ہوجائیں۔

(۲) سجدے میں دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں بند ہونی چاہئیں، یعنی اُنگلیاں بالکل ملی ملی ہوں، اور ان کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔

(۳) اُنگلیوں کا رُخ قبلے کی طرف ہونا چاہئے۔

(۴) کہنیاں زمین سے اُٹھی ہونی چاہئیں، کہنیوں کو زمین پر ٹیکنا درست نہیں۔

(۵) دونوں بازو پہلوؤں سے الگ ہٹے ہوئے ہونے چاہئیں، اُنہیں پہلوؤں سے بالکل ملا کر نہ رکھیں۔

(۶) کہنیوں کو دائیں بائیں اتنی دور تک بھی نہ پھیلائیں جس سے برابر کے نماز پڑھنے والوں کو تکلیف ہو۔

(۷) رانیں پیٹ سے ملی ہوئی نہیں ہونی چاہئیں، پیٹ اور رانیں الگ الگ رکھی جائیں۔

(۸) پورے سجدے کے دوران ناک زمین پر ٹکی رہے، زمین سے نہ اُٹھے۔

(۹) دونوں پاؤں اس طرح کھڑے رکھے جائیں کہ ایڑھیاں اُوپر ہوں، اور تمام اُنگلیاں اچھی طرح مڑکر قبلہ رُخ ہوگئی ہوں۔ جو لوگ اپنے پاؤں کی بناوٹ کی وجہ سے تمام اُنگلیاں موڑنے پر قادر نہ ہوں، وہ جتنی موڑ سکیں، اُتنی موڑنے کا اہتمام کریں، بلا وجہ اُنگلیوں کو سیدھا زمین پر ٹیکنا درست نہیں۔

(۱۰) اِس بات کا خیال رکھیں کہ سجدے کے دوران پاؤں زمین سے اُٹھنے نہ پائیں، بعض لوگ اس طرح سجدہ کرتے ہیں کہ پاؤں کی کوئی اُنگلی ایک لمحہ کے لئے بھی زمین پر نہیں ٹکتی، اس طرح سجدہ ادا نہیں ہوتا، اور نتیجتاً نماز بھی نہیں ہوتی۔ اس سے اہتمام کے ساتھ پرہیز کریں۔

(۱۱) سجدے کی حالت میں کم از کم اتنی دیر گزاریں کہ تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی اطمینان کے ساتھ کہہ سکیں۔ پیشانی ٹیکتے ہی فوراً اُٹھا لینا منع ہے۔

دونوں سجدوں کے درمیان

(۱) ایک سجدے سے اُٹھ کر اطمینان سے دوزانو سیدھے بیٹھ جائیں، پھر دوسرا سجدہ کریں۔ ذرا سا سر اُٹھا کر سیدھے ہوئے بغیر دوسرا سجدہ کر لینا گناہ ہے اور اس طرح کرنے سے نماز کا لوٹانا واجب ہو جاتا ہے۔

(۲) بایاں پاؤں بچھا کر اُس پر بیٹھیں، اور دایاں پاؤں اس طرح کھڑا کرلیں کہ اس کی اُنگلیاں مڑکر قبلہ رُخ ہو جائیں۔ بعض لوگ دونوں پاؤں کھڑے کرکے ان کی ایڑھیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں۔

(۳) بیٹھنے کے وقت دونوں ہاتھ رانوں پر رکھے ہونے چاہئیں، مگر انگلیاں گھٹنوں کی طرف لٹکی ہوئی نہ ہوں، بلکہ انگلیوں کے آخری سرے گھٹنے کے ابتدائی کنارے تک پہنچ جائیں۔

(۴) بیٹھنے کے وقت نظریں اپنی گود کی طرف ہونی چاہئیں۔

(۵) اتنی دیر بیٹھیں کہ اس میں کم از کم ایک مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہ کہا جا سکے، اور اگر اتنی دیر بیٹھیں کہ اس میں اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاسْتُرْنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَاھْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ پڑھا جا سکے تو بہتر ہے لیکن فرض نمازوں میں یہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، نفلوں میں پڑھ لینا بہتر ہے۔

دوسرا سجدہ اور اس سے اُٹھنا

(۱) دوسرے سجدے میں بھی اس طرح جائیں کہ پہلے دونوں ہاتھ زمین پر رکھیں، پھر ناک، پھر پیشانی۔

(۲) سجدے کی ہیئت وہی ہونی چاہئے جو پہلے سجدے میں بیان کی گئی۔

(۳) سجدے سے اُٹھتے وقت پہلے پیشانی زمین سے اُٹھائیں، پھر ناک، پھر ہاتھ، پھر گھٹنے۔

(۴) اُٹھتے وقت زمین کا سہارا نہ لینا بہتر ہے، لیکن اگر جسم بھاری ہو یا بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے مشکل ہو تو سہارا لینا بھی جائز ہے۔

(۵) اُٹھنے کے بعد ہر رکعت کے شروع میں سورۃ فاتحہ سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھیں۔

قعدے میں

(۱) قعدے میں بیٹھنے کا طریقہ وہی ہوگا جو سجدوں کے بیچ میں بیٹھنے کا ذکر کیا گیا۔

(۲) التحیات پڑھتے وقت جب "أَشْھَدُ أَنْ لَّا" پر پہنچیں تو شہادت کی انگلی اُٹھا کر اشارہ کریں، اور "إِلَّا اللّٰہُ" پر گرادیں۔

(۳) اشارے کا طریقہ یہ ہے کہ بیچ کی اُنگلی اور انگوٹھے کو ملا کر حلقہ بنائیں، چھنگلی اور اس کے برابر والی اُنگلی کو بند کرلیں، اور شہادت کی اُنگلی کو اس طرح اُٹھائیں کہ اُنگلی قبلے کی طرف جھکی ہوئی ہو۔ بالکل سیدھی آسمان کی طرف نہ اُٹھانی چاہئے۔

(۴) "إِلَّا اللّٰہُ" کہتے وقت شہادت کی اُنگلی تو نیچے کرلیں، لیکن باقی اُنگلیوں کی جو ہیئت اشارے کے وقت بنائی تھی، اس کو آخر تک برقرار رکھیں۔

سلام پھیرتے وقت

(۱) دونوں طرف سلام پھیرتے وقت گردن کو اتنا موڑیں کہ پیچھے بیٹھے آدمی کو آپ کے رخسار نظر آجائیں۔

(۲) سلام پھیرتے وقت نظریں کندھے کی طرف ہونی چاہئیں۔

(۳) جب دائیں طرف گردن پھیر کر "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ" کہیں تو یہ نیت کریں کہ دائیں طرف جو انسان اور فرشتے ہیں، ان کو سلام کر رہے ہیں، اور بائیں طرف سلام پھیرتے وقت بائیں طرف موجود انسانوں اور فرشتوں کو سلام کرنے کی نیت کریں۔

دُعا کا طریقہ

(۱) دُعا کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ اتنے اُٹھائے جائیں کہ وہ سینے کے سامنے آجائیں، دونوں ہاتھوں کے درمیان معمولی فاصلہ ہو، نہ ہاتھوں کو بالکل ملائیں، اور نہ دونوں کے درمیان زیادہ فاصلہ رکھیں۔

(۲) دُعا کرتے وقت ہاتھوں کے اندرونی حصے کو چہرے کے سامنے رکھیں۔

خواتین کی نماز

اُوپر نماز کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے، وہ مردوں کے لئے ہے۔ عورتوں کی نماز مندرجہ ذیل معاملات میں مردوں سے مختلف ہے، لہٰذا خواتین کو ان مسائل کا خیال رکھنا چاہئے:

(۱) خواتین کو نماز شروع کرنے سے پہلے اس بات کا اطمینان کر لینا چاہئے کہ اُن کے چہرے، ہاتھوں اور پاؤں کے سوا تمام جسم کپڑے سے ڈھکا ہوا ہے۔ بعض خواتین اس طرح نماز پڑھتی ہیں کہ ان کے بال کھلے رہتے ہیں۔ بعض خواتین کی کلائیاں کھلی رہتی ہیں۔ بعض خواتین کے کان کھلے رہتے ہیں۔ بعض خواتین اتنا چھوٹا دوپٹہ استعمال کرتی ہیں کہ اس کے نیچے بال لٹکے نظر آتے ہیں۔ یہ سب طریقے ناجائز ہیں اور اگر نماز کے دوران چہرے، ہاتھ اور پاؤں کے سوا جسم کا کوئی عضو بھی چوتھائی کے برابر اتنی دیر کھلا رہ گیا جس میں تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم کہا جا سکے تو نماز ہی نہیں ہوگی اور اس سے کم کھلا رہ گیا تو نماز ہو جائے گی مگر گناہ ہوگا۔

(۲) خواتین کے لئے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے سے افضل ہے، اور برآمدے میں پڑھنا صحن سے افضل ہے۔

(۳) عورتوں کو نماز شروع کرتے وقت ہاتھ کانوں تک نہیں، بلکہ کندھوں تک اُٹھانے چاہئیں اور وہ بھی دوپٹے کے اندر ہی سے اُٹھانے چاہئیں، دوپٹے سے باہر نہ نکالے جائیں۔ (بہشتی زیور)

(۴) عورتیں ہاتھ سینے پر اس طرح باندھیں کہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھیں۔ انہیں مردوں کی طرح ناف پر ہاتھ نہ باندھنے چاہئیں۔

(۵) رکوع میں عورتوں کے لئے مردوں کی طرح کمر کو بالکل سیدھا کرنا ضروری نہیں، عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کم جھکنا چاہئے۔ (طحطاوی علی المراقی، ص:۱۴۱)

(۶) رکوع کی حالت میں مردوں کو اُنگلیاں گھٹنوں پر کھول کر رکھنی چاہئیں لیکن عورتوں کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ اُنگلیاں ملا کر رکھیں، یعنی اُنگلیوں کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔ (درمختار)

(۷) عورتوں کو رکوع میں اپنے پاؤں بالکل سیدھے نہ رکھنے چاہئیں، بلکہ گھٹنوں کو آگے کی طرف ذرا سا خم دے کر کھڑا ہونا چاہئے۔ (درمختار)

(۸) مردوں کو حکم یہ ہے کہ رکوع میں ان کے بازو پہلوؤں سے جدا اور تنے ہوئے ہوں، لیکن عورتوں کو اس طرح کھڑا ہونا چاہئے کہ ان کے بازو پہلوؤں سے ملے ہوئے ہوں۔ (ایضاً)

(۹) عورتوں کو دونوں پاؤں ملا کر کھڑا ہونا چاہئے، خاص طور دونوں ٹخنے تقریباً مل جانے چاہئیں۔ پاؤں کے درمیان فاصلہ نہ ہونا چاہئے۔ (بہشتی زیور)

(۱۰) سجدے میں جاتے وقت مردوں کے لئے یہ طریقہ بیان کیا گیا ہے کہ جب تک گھٹنے زمین پر نہ ٹکیں، اُس وقت تک وہ سینہ نہ جھکائیں، لیکن عورتوں کے لئے یہ طریقہ نہیں ہے، وہ شروع ہی سے سینہ جھکا کر سجدے میں جا سکتی ہیں۔

(۱۱) عورتوں کو سجدہ اس طرح کرنا چاہئے کہ ان کا پیٹ رانوں سے بالکل مل جائے اور بازو بھی پہلوؤں سے ملے ہوئے ہوں۔ نیز عورت پاؤں کو کھڑا کرنے کے بجائے انہیں دائیں طرف نکال کر بچھا دے۔

(۱۲) مردوں کے لئے سجدے میں کہنیاں زمین پر رکھنا منع ہے، لیکن عورتوں کو کہنیوں سمیت پوری باہیں زمین پر رکھ دینی چاہئیں۔ (درمختار)

(۱۳) سجدوں کے درمیان اور التحیات پڑھنے کے لئے جب بیٹھنا ہو تو بائیں کولہے پر بیٹھیں، اور دونوں پاؤں دائیں طرف نکال دیں، اور دائیں پنڈلی پر رکھیں۔ (طحطاوی)

(۱۴) مردوں کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ رکوع میں اُنگلیاں کھول کر رکھنے کا اہتمام کریں، اور سجدے میں بند رکھنے کا، اور نماز کے باقی افعال میں انہیں اپنی حالت پر چھوڑ دیں، نہ بند کرنے کا اہتمام کریں، نہ کھولنے کا۔ لیکن عورت کے لئے ہر حالت میں حکم یہ ہے کہ وہ اُنگلیوں کو بند

رکھے، یعنی ان کے درمیان فاصلہ نہ چھوڑے، رکوع میں بھی، سجدے میں بھی، دو سجدوں کے درمیان بھی، اور قعدوں میں بھی۔

(۱۵) عورتوں کا جماعت کرنا مکروہ ہے۔ اُن کے لئے اکیلے نماز پڑھنا ہی بہتر ہے، البتہ اگر گھر کے محرم افراد گھر میں جماعت کر رہے ہوں تو ان کے ساتھ جماعت میں شامل ہو جانے میں کچھ حرج نہیں لیکن ایسے میں مردوں کے بالکل پیچھے کھڑا ہونا ضروری ہے۔ برابر میں ہرگز کھڑی نہ ہوں۔

مسجد کے چند ضروری آداب

(۱) مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دُعا پڑھیں:

"بِسْمِ اللّٰهِ وَالصَّلٰوةُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ"(۱)

(۲) مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ نیت کر لیں کہ جتنی دیر مسجد میں رہوں گا اعتکاف میں رہوں گا، اس طرح انشاء اللہ اعتکاف کا ثواب بھی ملے گا۔

(۳) داخل ہونے کے بعد اگلی صف میں بیٹھنا افضل ہے، لیکن اگر جگہ بھر گئی ہو تو جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جائیں۔ لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنا جائز نہیں۔

(۴) جو لوگ مسجد میں پہلے سے بیٹھے ذکر یا تلاوت میں مشغول ہوں، اُن کو سلام نہیں کرنا چاہئے، البتہ اگر اُن میں سے کوئی از خود متوجہ ہو، اور ذکر وغیرہ میں مشغول نہ ہو، تو اس کو سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

(۵) مسجد میں سنتیں یا نفلیں پڑھنی ہوں تو اس کے لئے ایسی جگہ کا انتخاب کریں جہاں سامنے سے لوگوں کے گزرنے کا احتمال نہ ہو۔ بعض لوگ پچھلی صفوں میں نماز شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ ان کے سامنے اگلی صفوں میں جگہ خالی ہوتی ہے۔ چنانچہ اُن کی وجہ سے دور تک لوگوں کے لئے گزرنا مشکل ہو جاتا ہے، اور انہیں لمبا چکر کاٹ کر جانا پڑتا ہے۔ ایسا کرنا گناہ ہے،

---

(۱) صحیح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب ما يقول اذا دخل المسجد، رقم: ۱۱٦۵، سنن النسائي، كتاب المساجد، باب القول عند دخول المسجد وعند الخروج منه، رقم: ۷۲۱، سنن النسائي، كتاب الصلاة، باب ما يقوله الرجل عند دخوله المسجد، رقم: ۳۹۳، دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ کے نام ساتھ، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت نازل ہو، اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے''

اور اگر کوئی شخص ایسی حالت میں نمازی کے سامنے سے گزر گیا تو اس گزرنے کا گناہ بھی نماز پڑھنے والے پر ہوگا۔

(۶) مسجد میں داخل ہونے کے بعد اگر نماز میں کچھ دیر ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں تحیۃ المسجد کی نیت سے پڑھ لیں، اس کا بہت ثواب ہے۔ اگر وقت نہ ہو تو سنتوں ہی میں تحیۃ المسجد کی نیت کرلیں، اور اگر سنتیں پڑھنے کا بھی وقت نہیں ہے اور جماعت کھڑی ہے تو فرض میں بھی یہ نیت کی جاسکتی ہے۔

(۷) جب تک مسجد میں بیٹھیں، ذکر کرتے رہیں، خاص طور پر اس کلمے کا ورد کرتے رہیں:

"سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ"

(۸) مسجد میں بیٹھنے کے دوران بلاضرورت باتیں نہ کریں، نہ کوئی ایسا کام کریں جس سے نماز پڑھنے والوں یا ذکر کرنے والوں کی عبادت میں خلل آئے۔

(۹) نماز کھڑی ہو تو اگلی صفوں کو پہلے پُر کریں، اگر اگلی صفوں میں جگہ خالی ہو تو پچھلی صف میں کھڑا ہونا جائز نہیں ہے۔

(۱۰) جمعہ کا خطبہ دینے کے لئے جب امام منبر پر آجائے تو اُس وقت سے نماز ختم ہونے تک بولنا یا نماز پڑھنا یا کسی کو سلام کرنا یا سلام کا جواب دینا جائز نہیں ہے۔ اِس دوران اگر کوئی شخص بولنے لگے تو اُسے چپ رہنے کی تاکید کرنا بھی جائز نہیں۔

(۱۱) خطبہ کے دوران اس طرح بیٹھنا چاہئے جیسے التحیات میں بیٹھتے ہیں۔ بعض لوگ پہلے خطبہ میں ہاتھ باندھ کر بیٹھتے ہیں، اور دوسرے خطبے میں ہاتھ زانو پر رکھ لیتے ہیں۔ یہ طریقہ بے اصل ہے، دونوں خطبوں میں ہاتھ زانو پر رکھ کر بیٹھنا چاہئے۔

(۱۲) ہر ایسے کام سے پرہیز کریں جس سے مسجد میں گندگی ہو، بدبو پھیلے یا کسی دوسرے کو تکلیف پہنچے۔

(۱۳) کسی دوسرے شخص کو کوئی غلط کام کرتے دیکھیں تو چپکے سے نرمی کے ساتھ سمجھا دیں، اُس کو برسرِ عام رُسوا کرنے، ڈانٹ ڈپٹ یا لڑائی جھگڑے سے مکمل پرہیز کریں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

نماز میں آنے والے خیالات سے بچنے کا طریقہ ☆

"أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○
﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! یہ سورۃ مؤمنون کی ابتدائی چند آیات ہیں۔ جن کی تفسیر کا سلسلہ میں نے چند ہفتے پہلے شروع کیا تھا۔ ان آیات میں باری تعالیٰ نے مؤمنین کی وہ صفات بیان فرمائی ہیں، جو ان کے لئے فلاح کا سبب ہیں اور "فلاح" ایسا جامع لفظ ہے جس میں دین اور دنیا دونوں کی کامیابی آجاتی ہے۔ فلاح یافتہ مؤمنوں کا پہلا وصف یہ بیان فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ○﴾

یعنی وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ اس کی کچھ تفصیل پچھلے بیانات میں عرض کر چکا ہوں۔

خشوع کے تین درجے

گذشتہ جمعہ کو عرض کیا تھا کہ "خشوع" حاصل کرنے کے تین درجے اور تین سیڑھیاں ہیں، پہلی سیڑھی یہ ہے کہ جو الفاظ زبان سے ادا کر رہے ہو ان الفاظ کی طرف توجہ ہو، دوسری سیڑھی یہ ہے کہ ان الفاظ کے معانی کی طرف توجہ ہو، تیسری سیڑھی یہ ہے کہ انسان نماز اس دھیان کے ساتھ پڑھے جیسے وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے یا کم از کم یہ تصور باندھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں —— ان آیات میں یہ جو فرمایا کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں، اس سے اس بات کی تنبیہ کی گئی ہے کہ صرف نماز پڑھنے پر اکتفا نہ کرو بلکہ نماز پڑھنے کے اندر خشوع پیدا کرنے کی بھی کوشش کرو۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۲۲۲ تا ۲۳۶)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱ تا ٦

خیالات آنے کی شکایت

اکثر لوگ بکثرت یہ شکایت کرتے ہیں کہ جب میں نماز پڑھتا ہوں تو مجھے خیالات بکثرت آتے ہیں۔ بھائی! ان خیالات کی وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس صورتِ حال کا مداوا کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہیے، پریشان ہونے سے کوئی کام نہیں بنتا۔ اصل بات یہ ہے کہ جو تکلیف اور نقص ہے اس کو دور کرنے کے راستے اختیار کیے جائیں۔ اس تکلیف اور نقص کو دور کرنے کے راستے کیا ہیں؟

نماز کے مقدمات

پہلا راستہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے نماز سے پہلے کئی مقدمات قائم کیے ہیں۔ یعنی نماز تو اصل مقصود ہے، لیکن اس نماز سے پہلے ایسے مقدمات اور کچھ ایسی تمہیدات رکھی ہیں جن کے واسطے سے انسان اصل نماز تک پہنچتا ہے۔ وہ سب مقدمات اور تمہیدی کام ہیں، اگر ان کو انسان ٹھیک ٹھیک انجام دیدے تو اس کی وجہ سے خیالات میں کمی آئے گی۔

نماز کا پہلا مقدمہ ''طہارت''

نماز کے مقدمات میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ''طہارت'' رکھی ہے کیونکہ ہر نماز کے لئے طہارت اور پاکی حاصل کرنا ضروری ہے، ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُوْرُ))(۱)

''نماز کی کنجی طہارت ہے''

دوسری حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا تُقْبَلُ الصَّلَاةُ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ))(۲)

''کوئی نماز طہارت کے بغیر اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں''

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب ما جاء أن مفتاح الصلاة الطهور، رقم: ۳، سنن أبی داؤد، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، رقم: ۵۶، سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب مفتاح الصلاة الطهور، رقم: ۲۷۱، مسند أحمد، رقم: ۹۵۷

(۲) صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب وجوب الطهارة للصلاة، رقم: ۳۲۹، سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب ما جاء لا تقبل صلاة بغير طهور، رقم: ۱، سنن النسائی، کتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، رقم: ۱۳۹، سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب لا يقبل الله صلاة بغير طهور، رقم: ۲۶۹

طہارت کی ابتداء استنجاء سے

طہارت کا سلسلہ ''استنجاء'' سے شروع ہوتا ہے اور استنجاء کرنے کو واجب قرار دیا گیا ہے اور اس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ انسان استنجاء کے وقت طہارت حاصل کرنے کا اچھی طرح اطمینان حاصل کرے اور اگر پیشاب کے بعد قطرے آنے کا خطرہ ہو تو اس وقت تک انسان فارغ نہ ہو جب تک قطرہ آنے کا خطرہ ہو، فقہ کی اصطلاح میں اس کو ''استبراء'' کہا جاتا ہے کیونکہ اگر پاکی صحیح نہیں ہوئی اور کپڑوں پر یا جسم پر نجاست کے اثرات باقی رہ گئے تو اس کے نتیجے میں انسان کے خیالات مشوش ہوتے ہیں۔

ناپاکی خیالات کا سبب ہے

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے کچھ خواص بنائے ہیں۔ ناپاکی کا ایک خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں ناپاک اور گندے خیالات اور شیطانی وساوس پیدا کرتا ہے، لہٰذا نماز کا سب سے پہلا تمہیدی کام یہ ہے کہ ناپاکی دور کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

نماز کا دوسرا مقدمہ ''وضو''

اس کے بعد دوسرا تمہیدی کام ''وضو'' رکھا ہے، یہ وضو بھی بڑی عجیب وغریب چیز ہے، حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب انسان وضو کرتا ہے اور وضو میں اپنا چہرہ دھوتا ہے تو اس کے نتیجے میں آنکھوں سے کیے ہوئے تمام صغیرہ گناہ اللہ تعالیٰ دھودیتے ہیں، اسی طرح جس وقت انسان ہاتھ دھوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہاتھوں سے کیے ہوئے صغیرہ گناہ دھودیتے ہیں اور جس وقت وہ پاؤں دھوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پاؤں سے کیے ہوئے گناہ معاف فرمادیتے ہیں ـــــ اور جو چار اعضاء وضوء میں دھوئے جاتے ہیں عام طور پر یہی چار اعضاء انسان کو گناہ کی طرف لے جاتے ہیں، انہی اعضاء کے ذریعہ گناہ سرزد ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ جب بندہ نماز کے لئے میرے دربار میں حاضر ہو تو اس سے پہلے وہ گناہوں سے پاک ہو چکا ہو، اس کے ہاتھ، اس کا چہرہ، اس کا پاؤں گناہوں سے پاک ہو گیا ہو۔ البتہ گناہ سے مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔

وضو سے گناہ دھل جاتے ہیں

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب کوئی وضو کر رہا ہوتا تھا تو اس کے وضو کے بہتے ہوئے پانی میں آپ کو گناہوں کی شکلیں نظر آتی تھیں کہ فلاں گناہ دھل کر جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے آپ کو یہ کشف عطا فرمایا تھا ـــــ بہر حال! اللہ تعالیٰ نے نماز سے پہلے وضو اس لئے رکھا ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ ظاہری صفائی حاصل ہو، بلکہ باطنی صفائی اور گناہوں کی صفائی بھی حاصل ہو جائے۔

کون سے وضو سے گناہ دھل جاتے ہیں؟

لیکن وضو سے یہ فائدہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب آدمی سنت کے مطابق وضو کرے اور اس طرح وضو کرے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا۔ حضورِ اقدس ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب وضو فرماتے تو قبلہ کی طرف منہ کر کے وضو فرماتے۔

یہ وضو کے آداب میں سے ہے، اسی طرح وضو شروع کرتے وقت ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھا کرتے تھے اور وضو کے دوران باتیں نہیں کرتے تھے وضو کی طرف دھیان فرماتے۔

وضو کی طرف دھیان

وضو کی طرف دھیان ہونے میں سب سے اعلیٰ بات یہ ہے کہ جب آدمی اپنا چہرہ دھوئے تو اس طرف دھیان کرے کہ میرے چہرے کے گناہ دھل رہے ہیں۔ جب آدمی ہاتھ دھوئے تو یہ دھیان کرے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ وضو میں ہاتھ دھوتے وقت ہاتھ کے گناہ معاف ہوتے ہیں تو اس وقت میرے ہاتھ کے گناہ دھل رہے ہیں۔ اسی طرح پانی استعمال کرنے میں اسراف نہ کرے، فضول پانی نہ بہائے۔ جتنے پانی کی ضرورت ہے، بس اتنے پانی سے وضو کرے۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِيَّاكَ وَالسَّرَفَ وَإِنْ كُنْتَ عَلَى نَهْرٍ جَارٍ))(۱)

''پانی کو فضول بہانے سے بچو، چاہے تم کسی بہتے دریا پر کیوں نہ کھڑے ہو''

اگر پانی کا دریا بہہ رہا ہے، تم اس دریا سے جتنے پانی سے بھی وضو کرو گے تو اس کے نتیجے میں دریا کے پانی میں کوئی کمی نہیں آئے گی، اس کے باوجود فرمایا کہ اس موقع پر اسراف سے بچو اور فضول پانی مت بہاؤ۔

وضو کے دوران کی دعائیں

اور وضو کے دوران دعائیں کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب وضو

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ما جاء في القصد في الوضوء وكراهة التعدي فيه، رقم: ٤١٩، مسند أحمد، رقم: ٦٨٦٨

فرماتے تو آپ ﷺ کثرت سے:

((أَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ)) (۱)

پڑھا کرتے تھے، اور دوسری یہ دعا پڑھتے:

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْ رِزْقِیْ)) (۲)

اور وضو کے بعد آپ ﷺ یہ پڑھتے:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِیْنَ)) (۳)

اگر آدمی ان آداب کے ساتھ وضو کرے تو ایسے وضو کا خاصہ یہ ہے کہ وہ طرح طرح کے خیالات جو آپ کے دل و دماغ میں بسے ہوئے ہیں، ان سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف دماغ کو متوجہ کر دیتا ہے۔

وضو میں بات چیت کرنا

لیکن ہماری غلطی سب سے پہلے وضو سے شروع ہوتی ہے، جب ہم وضو کرنے بیٹھے تو دنیا کے سارے خرافات وضو کے دوران چلتے رہتے ہیں۔ بات چیت ہو رہی ہے، گپ شپ ہو رہی ہے، حواس باختہ حالت میں وضو کر رہے ہیں، بس جلد جلد اپنا فرض ساقط کیا، اور فارغ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس وضو کے فوائد و ثمرات حاصل نہیں ہوتے۔ اس کے بجائے اگر دھیان کے ساتھ اور آداب کے ساتھ وضو کرے اور وضو کے دوران دعائیں پڑھتا رہے تو اس سے نماز کی پہلی تمہید اور پہلا مقدمہ درست ہو جائے گا۔

نماز کا تیسرا مقدمہ "تحیۃ الوضوء والمسجد"

نماز کا تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب وضو کر کے مسجد میں آؤ تو مسجد میں جماعت سے کچھ دیر پہلے پہنچ جاؤ اور تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضوء کی نیت سے دو رکعت ادا کرو، یہ دو رکعت واجب یا سنتِ مؤکدہ

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب فیما یقال بعد الوضوء، رقم: ۵۰۔ سنن النسائی، کتاب الطهارة، رقم: ۱۴۸۔ سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب ما یقال بعد الوضوء، رقم: ۴۶۳

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید، رقم: ۳۴۲۲، مسند أحمد، أول مسند المدنیین أجمعین، رقم: ۱۶۰۰۴

(۳) سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب فیما یقال بعد الوضوء، رقم: ۵۰

نہیں ہیں، لیکن بڑی فضیلت والی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے بلال! جب میں معراج پر گیا، اور وہاں اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت کی سیر کرائی تو میں نے تمہارے قدموں کی چاپ اپنے سے آگے سنی، جیسے کوئی بادشاہ سے آگے کوئی باڈی گارڈ چلا کرتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا کونسا عمل ہے جو تم خاص طور پر کرتے ہو، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ مقام بخشا کہ جنت میں تمہیں میرا باڈی گارڈ بنا دیا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اور کوئی عمل تو مجھے یاد نہیں آرہا ہے البتہ ایک بات ہے وہ یہ ہے کہ جب سے اسلام لایا ہوں اس وقت سے میں نے یہ تہیہ کیا تھا کہ جب بھی وضو کروں گا تو دو رکعت اس وضو سے ضرور ادا کروں گا۔ چنانچہ جب سے اسلام لایا ہوں جب بھی وضو کرتا ہوں تو دو رکعت نفل تحیۃ الوضوء ضرور ادا کرتا ہوں، چاہے نماز کا وقت ہو یا نہ ہو۔

یہ سن کر جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''یہی وہ عمل ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ مقام عطا فرمایا''(۱)

تحیۃ المسجد کس وقت پڑھے؟

بہرحال! ہر وضو کے بعد دو رکعت نفل پڑھنے میں دو منٹ خرچ ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ سے اتنی بڑی فضیلت عطا فرمائی، اور مسجد میں داخل ہونے کے بعد بیٹھنے سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنا افضل ہے، البتہ اگر آدمی بھول کر بیٹھ گیا اور بعد میں یاد آیا تو اس وقت پڑھ لے، اس میں بھی کوئی حرج نہیں، لیکن افضل یہ ہے کہ بیٹھنے سے پہلے پڑھے۔ یہ نماز کی تیسری تمہید ہے۔

نماز کا چوتھا مقدمہ: قبلیہ سنتیں

نماز کا چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ہر فرض نماز سے پہلے کچھ رکعتیں سنتِ مؤکدہ یا غیر مؤکدہ رکھی گئی ہیں۔ مثلاً فجر سے پہلے دو رکعتیں، ظہر سے پہلے چار رکعتیں سنتِ مؤکدہ ہیں اور عصر سے پہلے اور عشاء سے پہلے چار رکعت سنتِ غیر مؤکدہ رکھی گئی ہیں۔ مغرب کی نماز کو چونکہ جلدی پڑھنے کا حکم ہے اس لئے مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھنے کی اتنی فضیلت نہیں ہے۔ لیکن بعض روایات میں اس وقت بھی دو

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب فضل الطهور بالليل والنهار وفضل الصلاة بعد الوضوء، رقم: ۱۰۸۱، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل بلال، رقم: ٤٤٩٧، سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول الله، باب فی مناقب عمر بن الخطاب، رقم: ۳٦۲۲، مسند أحمد، رقم: ۸۰۵۲

رکعتیں ثابت ہیں۔ لہٰذا فرض نماز سے پہلے جو نمازیں پڑھی جارہی ہیں وہ تیسری تمہید ہیں۔

چاروں مقدمات کے جاننے پر خشوع کا حصول

ان چاروں مقدمات سے گزرنے کے بعد جب فرض نماز میں شامل ہوگا تو اس کو وہ شکایت پیش نہیں آئے گی جو عام طور پر لوگوں کو پیش آتی ہے کہ جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو ہمارا دل کہیں ہوتا ہے اور دماغ کہیں ہوتا ہے اور حواس باختہ حالت میں نماز ادا ہوتی ہے۔ ـــــ اذان اور فرض نماز کے درمیان جو پندرہ منٹ یا زیادہ کا وقفہ رکھا جاتا ہے یہ وقفہ اس لئے رکھا جاتا ہے تاکہ اس وقفہ کے دوران انسان یہ تمہیدات پوری کرے، یعنی اطمینان سے وضو کرے، پھر تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد اطمینان سے ادا کرے اور پھر سنتیں ادا کرے۔ ان سب تمہیدات کے بعد جب فرض نماز کے لئے کھڑا ہوگا تو انشاء اللہ تعالیٰ خشوع، یکسوئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ حاصل ہوگی۔ ان تمہیدات میں چند منٹ صرف ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی وجہ سے ہماری نمازیں درست ہوجائیں گی اور اس کے نتیجے میں صلاح فلاح حاصل ہوجائے گی۔

خیالات کی پرواہ مت کرو

اس کے بعد یہ بھی عرض کردوں کہ ان تمہیدات کو انجام دینے کے بعد پھر بھی فرض نماز میں خیالات آتے ہیں تو اس صورت میں بالکل گھبرانا نہیں چاہئے۔ اگر وہ خیالات غیر اختیاری طور پر آرہے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں معاف ہیں۔ بعض لوگ ان خیالات کی وجہ سے اس نماز کی ناقدری کرنا شروع کردیتے ہیں، چنانچہ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہماری نماز کیا ہے؟ ہم تو ٹکریں مارتے ہیں، بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہماری نماز بالکل بیکار ہے۔ اس لئے کہ اس میں تو خیالات بہت آتے ہیں اور خشوع بالکل نہیں ہوتا۔

ان سجدوں کی قدر کرو

یاد رکھئے! یہ سب ناقدری کی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہ باتیں پسند نہیں۔ ارے یہ تو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نماز پڑھنے کی توفیق تو ہوئی، بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہونے کی توفیق تو ملی، پہلے اس توفیق اور نعمت پر شکر ادا کرو کہ ان کے دربار میں آکر نماز ادا کرلی، نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو اس نعمت سے محروم ہیں، اگر ہم بھی محروم ہوگئے ہوتے تو کتنی بڑی محرومی کی بات ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے حاضری کی جو توفیق عطا فرمادی یہ کوئی معمولی نعمت نہیں۔

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جس کو ترے آستاں سے نسبت ہے

تیرے آستانے پر سر ٹیکنے کا ایک ظاہری موقع جو مل گیا یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے، لہٰذا اس پر شکر ادا کرو۔ ـــ البتہ اپنی طرف سے جو کوتاہی ہوئی ہے اور خشوع حاصل نہیں ہوا، خیالات آتے رہے، اس پر استغفار کرو۔

نماز کے بعد کے کلمات

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انسان ہر فرض نماز کے بعد دو کام کر لے۔ ایک یہ کہ ''الحمدللہ'' کہے اور دوسرے ''استغفر اللہ'' کہے۔

الحمد للہ کے ذریعہ اس بات پر شکر کہ یا اللہ! آپ نے اپنے دربار میں حاضری کی اور نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمادی۔ اور ''استغفر اللہ'' اس بات پر کہ یا اللہ! آپ نے توفیق عطا فرمادی تھی، لیکن میں اس نماز کا حق ادا نہیں کرسکا اور جیسی نماز پڑھنی چاہیے تھی ویسی نماز نہ پڑھ سکا میں اس پر استغفار کرتا ہوں ـــ حدیث میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ ''استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ'' پڑھا کرتے تھے۔ (۱)

حالانکہ نماز پڑھی ہے، کوئی گناہ نہیں کیا۔ لیکن اس بات پر استغفار کیا کرتے تھے کہ یا اللہ! جیسی نماز آپ کی شایانِ شان پڑھنی چاہیے تھی ویسی نماز ہم نہیں پڑھ سکے۔ اس وجہ سے استغفار کر رہے ہیں۔

خلاصہ

بہرحال! اس نماز کی ناقدری بھی نہ کرو اور خود پسندی اور عجب میں بھی مبتلا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو توفیق دی ہے اس پر شکر ادا کرو، اور جو کوتاہی ہوئی ہے اس پر استغفار کرو اور اپنی طاقت کی حد تک اس نماز کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر جاری رکھو، اور ساری عمر ایسا کرتے رہو تو اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے قبول فرمالیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(۱) صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب الذكر بعد الصلاة وبيان صفته، رقم: ٩٣١، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ما يقول اذا سلم من الصلاة، رقم: ٢٧٦، سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب مايقال بعد التسليم، رقم: ٩١٨، سنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب القول بعد السلام، رقم: ١٣١٤

نماز میں آنکھیں بند کرنا☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ. وَعَلٰى آلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِيْنَ.

اَمَّا بَعْدُ!

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''مبتدی کو اجازت ہے کہ خواہ آنکھ کھول کر نماز پڑھے یا بند کر کے نماز پڑھے، اکثر صفراوی یا سوداوی قیود سے متوحش ہوتے ہیں، بالخصوص جبکہ اس کے ساتھ ضعف بھی منضم ہو جائے اور ضعف مقتضی تکثیر قیود کو نہیں بلکہ مقتضی تقلیل قیود کو ہے، قیود سے جو اصل مقصود ہے ''تأثر'' خود ہی کام ضعف دیتا ہے''(۱)

آنکھیں کھول کر نماز پڑھنا سنت ہے

نماز کے بارے میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ نماز آنکھیں کھول کر پڑھنی چاہئے۔ نماز پڑھنے کا مسنون طریقہ بھی یہی ہے کہ جب آدمی نماز پڑھے تو آنکھیں بند نہ کرے بلکہ کھلی رکھے۔ اگرچہ فقہاء نے یہ بھی فرمادیا ہے کہ اگر کسی شخص کو آنکھیں بند کیے بغیر خشوع حاصل نہ ہوتا ہو تو اس صورت میں آنکھیں بند کر لینا بھی جائز ہے، لیکن افضل ہر حالت میں یہی ہے کہ آنکھیں کھلی رکھے۔ اسی لئے بعض بزرگوں نے یہ فرمایا کہ چونکہ حضورِ اقدس ﷺ نماز میں آنکھیں بند نہیں فرماتے تھے بلکہ آنکھیں کھول کر نماز پڑھا کرتے تھے، اس لئے اتباعِ سنت کی برکت آنکھیں کھول کر نماز پڑھنے میں ہے، چاہے نماز میں دل لگے یا نہ لگے، اس درجے کا خشوع حاصل ہو یا حاصل نہ ہو، خیالات آئیں یا نہ آئیں، اتباعِ سنت کا ثواب اسی میں ہے کہ آدمی آنکھیں کھول کر نماز پڑھے، اگرچہ آنکھیں بند کر کے بھی نماز پڑھنا جائز ہے مگر افضل نہیں۔

بزرگوں نے فرمایا کہ اصل بات تو اتباعِ سنت کی ہے، جو نور اتباعِ سنت میں ہے، وہ نور

☆ اصلاحی مجالس (۳/۴/۷ تا ۷۵) بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

(۱) انفاس عیسیٰ، ص: ۶۳

دوسرے کاموں میں نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا چاہے نماز میں دل لگے یا نہ لگے، خشوع پیدا ہو یا نہ ہو، اتباع سنت چونکہ آنکھیں کھول کر نماز پڑھنے میں ہے، اس لئے ہم تو آنکھیں کھول کر نماز پڑھیں گے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور اتباع سنت

حتیٰ کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ وتر کے بعد کی دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، کھڑے ہوکر نہیں پڑھتے تھے، حالانکہ فقہاء کرام نے صاف صاف لکھا ہے کہ اگر نوافل کھڑے ہوکر پڑھیں تو پورا ثواب ہے، اگر بیٹھ کر پڑھیں تو آدھا ثواب ہے، اور وتر کے بعد کی دو رکعتوں کے بارے میں فقہاء یہی لکھتے ہیں کہ بیٹھ کر پڑھنے میں آدھا ثواب ہے۔ لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ یہ جو دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے، کھڑے ہوکر کیوں نہیں پڑھتے؟

جواب میں حضرت نے فرمایا کہ روایات میں کثرت سے یہ آیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد کی دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، اس لئے میں بھی بیٹھ کر پڑھ لیتا ہوں۔

کسی نے پھر پوچھا کہ حضرت! ثواب کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس لئے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر بیٹھ کر نماز پڑھیں تو آدھا ثواب ملتا ہے اور کھڑے ہوکر نماز پڑھیں تو پورا ثواب ملتا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ ثواب تو آدھا ہی ملتا ہے، اس لئے کہ قاعدہ یہی ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی قاعدہ بیان فرمایا ہے، اور فقہاء نے بھی یہی قاعدہ بیان فرمایا ہے۔

پھر سوال کیا کہ حضرت! جب بیٹھ کر پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے تو آپ پورا ثواب لینے کے لئے کھڑے ہوکر کیوں نہیں پڑھتے؟ جواب میں ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ:

''بھائی بات یہ ہے کہ اتباع سنت کے کام میں جی زیادہ لگے، بڑے ثواب کم ہو''

یعنی اگر ثواب کم ملے تو اس میں کچھ حرج نہیں، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کام جس طرح کیا ہے، اس طرح کرنے میں طبیعت زیادہ لگتی ہے اور وتر کے بعد کی نفلوں کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بیٹھ کر پڑھنا ثابت ہے، اس واسطے بیٹھ کر پڑھنے میں طبیعت زیادہ لگتی ہے، ٹھیک ہے ثواب کم ملتا ہے تو کم ملے۔

بہرحال! ہمارے بزرگوں کا یہ مزاج ہے کہ جس کام میں اتباع سنت ہو اس کو پکڑلو، اور آنکھوں کو کھلا رکھ کر نماز پڑھنا سنت ہے، چاہے اس درجے کا خشوع حاصل نہ ہو، لیکن پھر بھی اتباع سنت کا جو نور اس میں ہے وہ آنکھیں بند کرنے میں نہیں ہے، یہ تو عام اصول ہے۔

مبتدی کو آنکھیں بند کرنے کی اجازت

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں فرماتے ہیں کہ ایک شخص نیا نیا دین کی طرف آیا اور اس نے نماز پڑھنی شروع کی، اب اگر تم اس پر بہت زیادہ قیدیں اور شرطیں لگادو گے اور اس سے کہو گے کہ دیکھ بھائی! آنکھ بند کر کے نماز نہ پڑھنا، آنکھیں کھول کر نماز پڑھنا، چونکہ وہ شخص مبتدی ہے، اس لئے اگر تم اس پر زیادہ قیدیں شرطیں لگادو گے تو وہ بھاگ جائے گا اور اس کی طبیعت میں دین سے توحش پیدا ہو جائے گا۔ لہٰذا مبتدی پر زیادہ قیدیں شرطیں نہیں لگانی چاہئیں، اور اس کو اس بات کی پابندی نہیں کرنا چاہئے کہ وہ آنکھیں کھول کر ہی نماز پڑھے۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا:

''مبتدی کو اجازت ہے، خواہ آنکھ کھولے ہوئے نماز پڑھے یا بند کر کے''

زیادہ قیود وحشت کا باعث ہوتی ہیں

پھر آگے اس کی وجہ بیان فرمائی:

''اکثر صفراوی یا سوداوی قیود سے متوحش ہوتے ہیں''

یعنی جس شخص کا مزاج سوداوی یا صفراوی ہے، اگر اس کے اُوپر زیادہ پابندی عائد کی جائے کہ یہ کام اس طرح کرو اس طرح نہ کرو، اور یہ کام اس طرح نہ کرو، اس طرح کرو تو اس پابندی کے نتیجے میں اس کی طبیعت میں وحشت پیدا ہو جاتی ہے، اور جو کام وہ پہلے اچھا خاصا کر رہا تھا، اس کو بھی چھوڑ بیٹھتا ہے، اس لئے مبتدی پر زیادہ قیود نہیں لگانی چاہئیں، خاص طور پر اگر اس شخص کی طبیعت میں ضعف اور کمزوری بھی ہو، جیسے آج کل لوگوں کے اندر سو فیصد ضعف موجود ہے، تو ایسی صورت میں قیود انسان کے لئے پریشان کن بن جاتی ہیں اور طبیعت میں دل جمعی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے جو انسان ضعیف اور کمزور ہو، اس پر سے قیود کم کرنی چاہئیں نہ یہ کہ قیود اور زیادہ بڑھادی جائیں، کیونکہ قید لگانے سے جو فائدہ اس کو حاصل ہوتا، مثلاً یہ قید اس پر لگادی جائے کہ تم آنکھیں کھول کر ہی نماز پڑھا کرو، تو اس صورت میں آنکھیں کھول کر نماز پڑھنے سے اتباع سنت کا جو فائدہ اس کو حاصل ہوتا، وہی فائدہ اس کو جسمانی کمزوری کے باوجود عبادت کرنے میں حاصل ہو جائے گا، اور وہ جسمانی کمزوری اس فائدے کی تلافی کر دیتی ہے، اس لئے مبتدی پر زیادہ قیود لگانے کی فکر نہیں کرنی چاہئے، اس کو ذرا عبادت کی طرف گھیر گھار کر لے آؤ، جب عبادت کا عادی بن جائے، اس وقت قیود لگا دینا۔

دراصل ابتدائی حالات میں کسی قسم کی رعایت دینا اس عمل کی طرف لانے کیلئے ہی ہوتا ہے، ان آداب و شرائط کی نفی کر دینا یا ان کی اہمیت ختم کر دینا مقصود نہیں ہوتا، تربیت کرنے والے اسے خوب سمجھتے ہیں

ایک خان صاحب کو راستے پر لانے کا واقعہ

چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ کسی گاؤں میں گزر رہے تھے، وہاں دیکھا کہ ایک مسجد ویران پڑی ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ مسجد ویران پڑی ہے، تم لوگ اس کو آباد کیوں نہیں کرتے؟ لوگوں نے کہا کہ یہاں ایک خان صاحب رہتے ہیں، وہ اس علاقے کے سردار ہیں، ان کو دین سے کوئی تعلق نہیں، نہ نماز سے کوئی تعلق، نہ روزے سے کوئی تعلق، ہر وقت شراب و کباب کا مشغلہ رہتا ہے اور نشہ میں دھت پڑے رہتے ہیں، بازاری عورتوں کا آنا جانا ہے، نماز کی طرف دھیان نہیں، ان کی وجہ سے پوری بستی خراب ہوگئی ہے، اگر خان صاحب نماز کے لئے مسجد میں آجائیں تو ساری بستی نماز پڑھنا شروع کر دے گی۔

مولانا صاحب نے فرمایا کہ مجھے ان کا پتہ بتاؤ اور ان سے میری ملاقات کراؤ۔ لوگوں نے خان صاحب کا مکان بتا دیا کہ فلاں مکان ہے۔ چنانچہ مولانا صاحب ان کے گھر دعوت دینے پہنچے اور ملاقات ہوئی تو مولانا صاحب نے فرمایا کہ بھائی خان صاحب! آپ ماشاء اللہ مسلمان ہیں، یہاں آپ کے محلّے کی مسجد ویران پڑی ہے، اگر آپ مسجد میں نماز کے لئے چلے جایا کریں تو لوگ بھی آپ کو دیکھ کر مسجد میں آجایا کریں گے اور مسجد آباد ہو جائے گی، اور آپ کے نامہ اعمال میں بڑا خزانہ جمع ہو جائے گا۔ مولانا صاحب نے بات جو اس انداز سے کہی کہ خان صاحب کی طبیعت پر کچھ اثر ہوا، لیکن خان صاحب کہنے لگے کہ میں نماز پڑھنے کو تیار ہوں، البتہ مجھ سے وضو نہیں ہو سکتا، وضو کرنا میرے بس کا کام نہیں۔ دوسرے یہ کہ مجھ سے شراب نہیں چھوٹتی۔ تیسرے یہ کہ یہ عورتوں کے آنے جانے کا مشغلہ یہ مجھ سے نہیں چھوٹتا۔ اب ایسی حالت میں میں کیا نماز پڑھوں!! اس لئے میں نماز کے لئے نہیں جاتا۔ مولانا صاحب پہلے تو بڑے سٹپٹائے، کہ ان کو کیا جواب دوں، پھر کہنے لگے اچھا یہ بتاؤ کہ تم نماز پڑھنے کو تیار ہو؟ خان صاحب نے کہا کہ ہاں! میں نماز پڑھنے کو تیار ہوں، لیکن مجھ سے وضو نہیں ہو سکتا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ اچھا بغیر وضو کے نماز پڑھ لیا کرو، اور دوسرے مشغلے بھی اس کے ساتھ چلتے رہیں تب بھی کوئی بات نہیں۔ خان صاحب نے تعجب سے پوچھا کہ بغیر وضو کے نماز!! مولانا صاحب نے فرمایا کہ ہاں! بغیر وضو کے نماز پڑھ لیا کرو، لیکن نماز کے لئے مسجد میں چلے جایا کرو۔ خان صاحب نے کہا کہ اگر اتنا آسان معاملہ ہے تو ٹھیک ہے، میں چلا جایا کروں گا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ وعدہ کرو کہ نماز کے لئے مسجد جاؤ گے۔ خان صاحب نے وعدہ کر لیا کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جاؤں گا۔

مولانا صاحب نے یہاں تو خان صاحب سے وعدہ لے لیا اور بلا وضو نماز پڑھنے کی اجازت

بھی دیدی، لیکن ان کے گھر سے باہر نکل کر سیدھے اسی مسجد میں پہنچے اور جاکر دو رکعتیں پڑھیں، اور پھر نماز کے بعد سجدے میں جاکر خوب روئے اور گڑگڑائے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی تھا کہ میں اس سے یہ کہہ دیتا، آگے آپ کا کام ہے۔

جب نماز کا وقت آیا تو خان صاحب کو یاد آیا کہ میں نے وعدہ کرلیا ہے، اس لئے مجھے نماز کے لئے مسجد میں جانا چاہئے، چنانچہ جانے کا ارادہ کرلیا، اور جب گھر سے نکلنے لگے تو دل میں خیال آیا کہ آج تو پہلی بار نماز کے لئے جارہا ہے، اگرچہ مولوی صاحب نے تو اجازت دیدی کہ بغیر وضو کے پڑھ لینا، لیکن تم پہلی مرتبہ اتنے عرصے کے بعد جارہے ہو، کم از کم آج تو وضو کرہی لو، اور صرف وضو ہی نہیں بلکہ آج پہلے دن غسل کرکے جاؤ، پھر بعد میں چاہو تو بغیر وضو کے پڑھتے رہنا۔ چنانچہ غسل کیا، اچھے پاک صاف کپڑے پہنے، خوشبو لگائی اور گھر سے نکل کر مسجد پہنچے، اور جب نماز پڑھی تو بس دل کی کایا ہی پلٹ گئی، اور جب واپس آئے تو شراب و کباب کے جو مشغلے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی نفرت دل میں ڈال دی، اس کے بعد خان صاحب ایسے پکے نمازی بنے کہ باوضو پنج وقتہ نماز پڑھنے لگے۔

بے وضو نماز کی اجازت دینے کا اعتراض

اب زاہد خشک اس پر اعتراض کرے گا کہ مولانا صاحب نے خان صاحب کو بغیر وضو کے نماز پڑھنے کی اجازت دیدی، حالانکہ بعض اوقات بے وضو کے نماز پڑھنا کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن اعتراض کرنے والوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ان مولانا صاحب نے ایک طرف تو خان صاحب کو بلا وضو کے نماز پڑھنے کی اجازت دی، تو دوسری طرف انہوں نے مسجد میں آکر سجدہ میں گر کر اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ یا اللہ! یہاں تک تو میں لے آیا، آگے آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

بات دراصل یہ تھی کہ بعض اوقات مبتدی پر سے قیدیں اور شرطیں ہٹادینا اس کو صحیح راستے پر لانے کے لئے مفید ہوتا ہے، البتہ یہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں کہ تم بھی بغیر وضو کے نماز پڑھنے کا فتویٰ دیدو، بلکہ وہ اللہ کے بندے جس کے قول اور فعل میں اللہ تعالیٰ تاثیر پیدا فرما دیتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ فہم اور بصیرت بھی عطا فرماتے ہیں اور درد اور فکر بھی عطا فرماتے ہیں، انہی کو ایسی بات زبان سے نکالنے کا حق ہوتا ہے، جیسے حافظ شیرازی کا مشہور شعر ہے۔

بمے سجادہ رنگین کن گرد پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

یعنی لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مصلے کو شراب سے رنگ دو، کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن یہ شعر درحقیقت اسی قسم کے مواقع کے بارے میں کہا گیا ہے۔

بہرحال! مبتدی جو ابھی ابھی اس راستے پر آیا ہے، اس پر زیادہ قیدیں شرطیں لگانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہوا ہے اور خیالات کو منتشر ہونے سے بچانے کے لئے اور یکسوئی پیدا کرنے کے لئے کسی وقت آنکھیں بند کرکے نماز پڑھنے کو اس کا دل چاہے تو وہ آنکھیں بند کرکے نماز پڑھ لے، اس کی اجازت ہے۔ انشاء اللہ ایسا شخص جب یکسوئی کا عادی ہو جائے گا تو آنکھیں کھلی رکھ کر بھی یکسوئی کے ساتھ نماز کی ادائیگی کرنے لگے گا، البتہ سنت اور افضل ہر حالت میں اسی کیفیت کو سمجھتا رہے جو آنحضرت ﷺ سے منقول ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا فہم عطا فرمائے اور سنت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

صلوٰۃ الحاجۃ، پریشانیوں کا علاج☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ((مَنْ کَانَتْ لَهٗ اِلَی اللّٰهِ حَاجَةٌ اَوْ اِلٰی اَحَدٍ مِّنْ بَنِیْ آدَمَ فَلْیَتَوَضَّأْ وَلْیُحْسِنِ الْوُضُوْءَ ثُمَّ لِیُصَلِّ رَکْعَتَیْنِ ثُمَّ لِیُثْنِ عَلَی اللّٰهِ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی وَلْیُصَلِّ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ لِیَقُلْ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِیْمُ الْکَرِیْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، اَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِیْمَةَ مِنْ کُلِّ بِرٍّ وَالسَّلَامَةَ مِنْ کُلِّ اِثْمٍ لَا تَدَعْ لَنَا ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ، وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَلَاحَاجَةً هِیَ لَكَ رِضًی اِلَّا قَضَیْتَهَا یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ)) (۱)

یہ حدیث حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فقہاء صحابہ میں سے ہیں۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو اللہ تعالیٰ سے کوئی ضرورت پیش آئے یا کسی آدمی سے کوئی کام پیش آجائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اچھی طرح سنت کے مطابق تمام آداب کے ساتھ وضو کرے، پھر دو رکعتیں پڑھے اور پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرے اور پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور پھر دعا کے یہ کلمات کہے۔ (کلمات اُوپر حدیث میں موجود ہیں)

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس نماز کا طریقہ بیان فرمایا ہے جس کو عرفِ عام میں ''صلوٰۃ الحاجۃ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی ''نمازِ حاجت'' جب بھی کسی شخص کو کوئی ضرورت پیش آئے یا کوئی پریشانی لاحق ہو جائے یا کوئی کام کرنا چاہتا ہو لیکن وہ کام ہوتا نظر نہ آرہا ہو یا اس کام کے ہونے میں

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/۲۶۔۵۷) بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ما جاء فی صلاة الحاجة، رقم: ٤٤١، سنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاة والسنة فیها، باب ما جاء فی صلاة الحاجة، رقم: ١٣٧٤

رکاوٹیں ہوں تو اس صورت میں نبی کریم ﷺ نے ایک مسلمان کو یہ تلقین فرمائی کہ وہ ''نمازِ حاجت'' پڑھے، اور نمازِ حاجت پڑھنے کے بعد ''دعائے حاجت'' پڑھے، اور پھر اپنا جو مقصد ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں پیش کرے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ اُمید ہے کہ اگر اس کام میں خیر ہوگی تو انشاء اللہ وہ کام ضرور انجام پا جائے گا۔ لہٰذا حضورِ اقدس ﷺ کی سنت یہ ہے کہ ضرورت کے وقت نمازِ حاجت پڑھی جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

ایک مسلمان اور کافر میں فرق

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان کو جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ ظاہری اسباب اور دنیاوی اسباب تو اختیار کرتا ہے اور شرعاً ان اسباب کو اختیار کرنے کی اجازت بھی ہے، لیکن ایک مسلمان اور ایک کافر کے درمیان یہی فرق ہے کہ جب ایک کافر دنیا کے ظاہری اسباب اختیار کرتا ہے تو وہ انہی اسباب پر بھروسہ کرتا ہے کہ جو اسباب میں اختیار کر رہا ہوں، انہی اسباب کے ذریعہ میرا کام بن جائے گا۔

ملازمت کے لئے کوشش

مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص بے روزگار ہے اور اس بات کے لئے کوشش کر رہا ہے کہ مجھے اچھی ملازمت مل جائے، اب ملازمت حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ جگہیں تلاش کرے، اور جہاں کہیں ملازمت ملنے کا امکان ہو وہاں درخواست دے، اور اگر کوئی جاننے والا ہے تو اس سے اپنے حق میں سفارش کروائے وغیرہ۔ یہ سب ظاہری اسباب ہیں۔ اب ایک کافر سارا بھروسہ انہی ظاہری اسباب پر کرتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ درخواست ٹھیک طریقے سے لکھ دوں، سفارش اچھی کرادوں اور تمام ظاہری اسباب اختیار کرلوں اور بس۔ اس کی پوری نگاہ اور پورا بھروسہ انہی اسباب پر ہے۔ یہ کام کافر کا ہے۔

اور مسلمان کا کام یہ ہے کہ اسباب تو وہ بھی اختیار کرتا ہے، درخواست وہ بھی دیتا ہے، اور اگر سفارش کی ضرورت ہے تو جائز طریقے سے وہ سفارش بھی کراتا ہے، لیکن اس کی نگاہ ان اسباب پر نہیں ہوتی، وہ جانتا ہے کہ نہ یہ درخواست کچھ کر سکتی ہے اور نہ یہ سفارش کچھ کر سکتی ہے، کسی مخلوق کی قدرت اور اختیار میں کوئی چیز نہیں، ان اسباب کے اندر تاثیر پیدا کرنے والی ذات اللہ جل جلالہ کی ذات ہے، وہ مسلمان تمام اسباب اختیار کرنے کے بعد اسی ذات سے مانگتا ہے کہ یا اللہ! ان اسباب کو اختیار کرنا آپ کا حکم تھا، میں نے یہ اسباب اختیار کر لیے، لیکن ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والے آپ ہیں،

میں آپ ہی سے مانگتا ہوں کہ آپ میری یہ مراد پوری فرما دیجئے۔

بیمار آدمی کی تدابیر

مثلاً ایک شخص بیمار ہوگیا، اب ظاہری اسباب یہ ہیں کہ وہ ڈاکٹر کے پاس جائے اور جو دوا وہ تجویز کرے وہ دوا استعمال کرے، جو تدبیر وہ بتائے وہ تدبیر اختیار کرے، یہ سب ظاہری اسباب ہیں۔ لیکن ایک کافر شخص جس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں ہے، وہ سارا بھروسہ ان دواؤں اور تدبیروں پر کرے گا، ڈاکٹر پر کرے گا، البتہ ایک مؤمن بندے کو حضور اقدس ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ تم دوا اور تدبیر ضرور کرو، لیکن تمہارا بھروسہ ان دواؤں اور تدبیروں پر نہ ہونا چاہئے بلکہ تمہارا بھروسہ اللہ جل شانہ کی ذات پر ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ کی ذات شفا دینے والی ہے۔ اگر وہ ذات ان دواؤں اور تدبیروں میں تاثیر نہ ڈالیں تو پھر ان دواؤں اور تدبیروں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ ایک ہی دوا، ایک ہی بیماری میں ایک انسان کو فائدہ پہنچا رہی ہے، لیکن وہی دوا اسی بیماری میں دوسرے انسان کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ اس لئے کہ درحقیقت دوا میں تاثیر پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو مٹی کی ایک چٹکی میں تاثیر عطا فرما دیں، اگر وہ تاثیر عطا نہ فرمائیں تو بڑی سے بڑی دوا اور مہنگی سے مہنگی دوا میں تاثیر عطا نہ فرمائیں۔

لہٰذا حضور اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ اسباب ضرور اختیار کرو لیکن تمہارا بھروسہ ان اسباب پر نہ ہونا چاہئے، بلکہ بھروسہ اللہ جل شانہ کی ذات پر ہونا چاہئے، اور ان اسباب کو اختیار کرنے کے بعد یہ دعا کرو کہ یا اللہ! جو کچھ میرے بس میں تھا اور جو ظاہری تدابیر اختیار کرنا میرے اختیار میں تھا وہ میں نے کرلیا، لیکن یا اللہ! ان تدابیر میں تاثیر پیدا کرنے والے آپ ہیں، ان تدابیر کو کامیاب بنانے والے آپ ہیں، آپ ہی ان میں تاثیر عطا فرمائیے اور آپ ہی ان کو کامیاب بنائیے۔

تدبیر کے ساتھ دعا

حضور اقدس ﷺ سے دعا کا ایک عجیب اور خوبصورت جملہ منقول ہے کہ جب بھی آپ کسی کام کی کوئی تدبیر فرماتے، چاہے دعا کی ہی تدبیر فرماتے تو اس تدبیر کے بعد یہ جملہ ارشاد فرماتے:

((اَللّٰهُمَّ هٰذَا الْجُهْدُ وَعَلَيْكَ التُّكْلَانُ)) (۱)

یا اللہ! میری طاقت میں جو کچھ تھا وہ میں نے اختیار کرلیا، لیکن بھروسہ آپ کی ذات پر ہے، آپ ہی اپنی رحمت سے اس مقصد کو پورا فرما دیجئے۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب منہ، رقم: ۳۳۴۱

زاویۂ نگاہ بدل دو

یہ وہ بات ہے جو ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ دین درحقیقت زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے، بس ذرا سا زاویۂ نگاہ بدل لو تو دین ہوگیا، اور اگر زاویۂ نگاہ نہ بدلو تو وہی دنیا ہے، مثلاً ہر مذہب یہ کہتا ہے کہ جب بیماری آئے تو علاج کرو، اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ بیمار ہونے پر علاج کرو، لیکن بس زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کا فرق ہے، وہ یہ کہ علاج ضرور کرو لیکن بھروسہ اس علاج پر مت کرو بلکہ بھروسہ اللہ جل جلالہ کی ذات پر کرو۔

''ھوالشافی'' نسخہ پر لکھنا

اسی وجہ سے اس زمانہ میں مسلمان اطباء کا یہ طریقہ تھا کہ جب وہ کسی مریض کا نسخہ لکھتے تو سب سے پہلے نسخہ کے اُوپر ''ھوالشافی'' لکھا کرتے تھے یعنی شفاء دینے والا اللہ ہے۔ یہ ''ھوالشافی'' لکھنا ایک اسلامی طریقۂ کار تھا۔ اس زمانے میں انسان کے ہر ہر نقل و حرکت اور ہر ہر قول و فعل میں اسلامی ذہنیت، اسلامی عقیدہ اور اسلامی تعلیمات منعکس ہوتی تھیں۔ ایک طبیب ہے جو علاج کر رہا ہے لیکن نسخہ لکھنے سے پہلے اس نے ''ھوالشافی'' لکھ دیا، یہ لکھ کر اس نے اس بات کا اعلان کر دیا کہ میں اس بیماری کا نسخہ تو لکھ رہا ہوں لیکن یہ نسخہ اس وقت تک کارآمد نہیں ہوگا جب تک وہ شفا دینے والا شفا نہیں دے گا۔ ایک مؤمن ڈاکٹر اور طبیب پہلے ہی قدم پر اس کا اعتراف کر لیتا تھا، اور جب ''ھوالشافی'' کا اعتراف کر کے نسخہ لکھتا تو اس کا نسخہ لکھنا بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کا ایک حصہ بن جاتا تھا۔

مغربی تہذیب کی لعنت کا اثر

لیکن جب سے ہمارے اُوپر مغربی تہذیب کی لعنت مسلط ہوئی ہے، اس وقت سے اس نے ہمارے اسلامی شعائر کا ملیامیٹ کر ڈالا۔ اب آج کل کے ڈاکٹر کو نسخہ لکھتے وقت نہ ''بسم اللہ'' لکھنے کی ضرورت ہے اور نہ ''ھوالشافی'' لکھنے کی ضرورت ہے، بس اس نے تو مریض کا معائنہ کیا اور نسخہ لکھنا شروع کر دیا، اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ سائنس ہمارے پاس ایسے کافروں کے واسطے سے پہنچی ہے جن کے دماغ میں اللہ تعالیٰ کے شافی ہونے کا کوئی تصور موجود نہیں۔ ان کا سارا بھروسہ اور اعتماد انہی اسباب اور انہی تدابیر پر ہے، اس لئے وہ صرف تدابیر اختیار کرتے ہیں۔

اسلامی شعائر کی حفاظت

اللہ تعالیٰ نے سائنس کو حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی، سائنس کسی قوم کی میراث نہیں ہوا کرتی، علم کسی قوم اور مذہب کی میراث نہیں ہوتی، مسلمان بھی سائنس ضرور حاصل کرے، لیکن اپنے اسلامی شعائر کو تو محفوظ رکھے اور اپنے دین و ایمان کی تو حفاظت کرے، اپنے عقیدہ کی کوئی جھلک تو اس کے اندر داخل کرے۔ یہ تو نہیں ہے کہ جو شخص ڈاکٹر بن گیا اس کے لئے ''ھوالشافی'' لکھنا حرام ہوگیا، اب اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے ''شافی'' ہونے کے عقیدے کا اعلان کرنا ناجائز ہوگیا، اور وہ ڈاکٹر یہ سوچنے لگے کہ اگر میں نے نسخہ کے اُوپر ''ھوالشافی'' لکھ دیا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ ''بیک ورڈ'' آدمی ہے، بہت پسماندہ ہے، اور یہ لکھنا تو ڈاکٹری کے اصول کے خلاف ہے۔ ارے بھائی! اگر تم ڈاکٹر ہو تو ایک مسلمان ڈاکٹر ہو، اللہ جل جلالہ پر ایمان رکھنے والے ہو، لہٰذا تم اس بات کا پہلے ہی اعلان کردو کہ جو کچھ تدبیر ہم کر رہے ہیں یہ ساری تدبیر اللہ جل جلالہ کی تاثیر کے بغیر بیکار ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

تدبیر کے خلاف کام کا نام ''اتفاق''

بڑے بڑے ڈاکٹر، اطباء اور معالجین روزانہ اللہ جل جلالہ کی تاثیر اور فیصلوں کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہم تدبیر کچھ کر رہے تھے مگر اچانک کیا سے کیا ہوگیا، اور اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ ہماری ظاہری سائنس سب بیکار ہوگئی۔ لیکن اس اچانک اور ان کی ظاہری سائنس کے خلاف پیش آنے والے واقعہ کو ''اتفاق'' کا نام دے دیتے ہیں کہ اتفاقاً ایسا ہوگیا۔

کوئی کام ''اتفاقی'' نہیں

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کی دنیا جس کو ''اتفاق'' کا نام دیتی ہے کہ اتفاقاً یہ کام اس طرح ہوگیا، یہ سب غلط ہے۔ اس لئے کہ اس کائنات میں کوئی کام اتفاقاً نہیں ہوتا بلکہ اس کائنات کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی حکمت، مشیت اور نظم کے ماتحت ہوتا ہے۔ جب کسی کام کی علت اور سبب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کام کن اسباب کی وجہ سے ہوا تو بس ہم کہہ دیتے ہیں کہ اتفاقاً یہ کام اس طرح ہوگیا۔ ارے جو اس کائنات کا مالک اور خالق ہے وہی اس پورے نظام کو چلا رہا ہے اور ہر کام پورے مستحکم نظام کے تحت ہو رہا ہے، کوئی ذرہ اس کی مشیت کے بغیر ہل نہیں سکتا، اس لئے سیدھی سی بات یہ ہے کہ اس دوا میں بذاتِ خود کوئی تاثیر نہیں تھی،

جب اللہ تعالیٰ نے اس دوا میں تاثیر پیدا فرمائی تھی تو فائدہ ہوگیا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے تاثیر پیدا نہیں فرمائی، تو اس دوا سے فائدہ نہیں ہوا۔ بس یہ سیدھی سی بات ہے "اتفاق" کا کیا مطلب؟

ہر وقت مسبّب الاسباب پر نظر ہو

بس انسان یہی زاویہ نگاہ بدل لے کہ تدبیروں اور اسباب پر بھروسہ نہ ہو، بلکہ مسبّب الاسباب پر بھروسہ ہو کہ وہ سب کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف تدبیر اختیار کرنے کی اجازت دی بلکہ تدبیر اختیار کرنے کا حکم دیا کہ تدبیر اختیار کرو اور ان اسباب کو اختیار کرو، اس لئے کہ ہم نے ہی یہ اسباب تمہارے لئے پیدا کیے ہیں۔ لیکن تمہارا امتحان یہ ہے کہ آیا تمہاری نگاہ ان اسباب کی حد تک محدود رہ جاتی ہے یا ان اسباب کے پیدا کرنے والے پر بھی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ عقیدہ اس طرح پیوست فرما دیا تھا کہ ان کی نگاہ ہمیشہ مسبّب الاسباب پر رہتی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسباب کو صرف اس وجہ سے اختیار کرتے تھے کہ ہمیں اسباب اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین اور بھروسہ حاصل ہو جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے عجیب و غریب کرشمے بندے کو دکھاتے ہیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر پینا

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ شام کے ایک قلعے کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ قلعہ کے لوگ محاصرہ سے تنگ آگئے تھے، وہ چاہتے تھے کہ صلح ہو جائے۔ لہٰذا ان لوگوں نے قلعے کے سردار کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس صلح کی بات چیت کے لئے بھیجا۔ چنانچہ ان کا سردار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی شیشی ہے، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ یہ شیشی میں کیا ہے اور کیوں لے کر آئے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ اس شیشی میں زہر بھرا ہوا ہے اور یہ سوچ کر آیا ہوں کہ اگر آپ سے صلح کی بات چیت کامیاب ہوگئی تو ٹھیک، اور اگر بات چیت ناکام ہوگئی اور صلح نہ ہوسکی تو ناکامی کا منہ لے کر اپنی قوم کے پاس واپس نہیں جاؤں گا بلکہ یہ زہر پی کر خودکشی کرلوں گا۔

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اصل کام تو لوگوں کو دین کی دعوت دینا ہوتا تھا، اس لئے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ اس کو اس وقت دین کی دعوت دینے کا اچھا موقع ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سردار سے پوچھا: کیا تمہیں اس زہر پر اتنا بھروسہ ہے کہ جیسے ہی تم یہ زہر پیو گے تو فوراً موت واقع ہو جائے گی؟ اس سردار نے جواب دیا کہ ہاں مجھے اس پر بھروسہ ہے، اس لئے کہ یہ ایسا سخت زہر ہے

کہ اس کے بارے میں معالجین کا کہنا یہ ہے کہ آج تک کوئی شخص اس زہر کا ذائقہ نہیں بتا سکا، کیونکہ جیسے ہی کوئی شخص یہ زہر کھاتا ہے تو فوراً اس کی موت واقع ہو جاتی ہے، اس کو اتنی مہلت نہیں ملتی کہ وہ اس کا ذائقہ بتا سکے۔ اس وجہ سے مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس کو پی لوں گا تو فوراً مر جاؤں گا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس سردار سے کہا کہ یہ زہر کی شیشی جس پر تمہیں اتنا یقین ہے، یہ ذرا مجھے دو۔ اس نے وہ شیشی آپ کو دے دی۔ آپ نے وہ شیشی اپنے ہاتھ میں لی اور پھر فرمایا کہ اس کائنات کی کسی چیز میں کوئی تاثیر نہیں، جب تک اللہ تعالیٰ اس کے اندر اثر نہ پیدا فرما دیں، میں اللہ کا نام لیتا ہوں اور یہ دعا پڑھتا ہوں:

((بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ))

”اس اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جس کے نام کے ساتھ کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی، نہ آسمان میں اور نہ زمین میں، وہی سننے اور جاننے والا ہے“

میں اس زہر کو پیتا ہوں، آپ دیکھنا کہ مجھے موت آتی ہے یا نہیں۔ اس سردار نے کہا کہ جناب! یہ آپ اپنے اُوپر ظلم کر رہے ہیں، یہ زہر تو اتنا سخت ہے کہ اگر انسان تھوڑا سا بھی منہ میں ڈال لے تو ختم ہو جاتا ہے اور آپ نے پوری شیشی پینے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انشاء اللہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ دعا پڑھ کر وہ زہر کی پوری شیشی پی گئے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت کا کرشمہ دکھانا تھا۔ اس سردار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پوری شیشی پی گئے لیکن ان پر موت کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے، وہ سردار یہ کرشمہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ (۱)

ہر کام میں مشیتِ خداوندی کارفرما ہے

بہرحال، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ عقیدہ جما ہوا تھا کہ جو کچھ اس کائنات میں ہو رہا ہے وہ اللہ جل شانہ کی مشیت سے ہو رہا ہے، ان کی مشیت کے بغیر کوئی ذرّہ حرکت نہیں کر سکتا۔ یہ عقیدہ ان کے دلوں میں اس طرح پیوست ہو چکا تھا کہ اس کے بعد یہ تمام اسباب بے حقیقت نظر آ رہے تھے۔ اور جب آدمی اس ایمان و یقین کے ساتھ کام کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی قدرت کے کرشمے بھی دکھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ تم اسباب پر جتنا بھروسہ کرو گے، اتنا ہی ہم تمہیں اسباب کے ساتھ باندھ دیں گے، اور جتنا تم اس کی ذات پر بھروسہ کرو گے تو اتنا ہی اللہ تعالیٰ تم

(۱) دلائل النبوة، ص: ۱۵۹، الإصابة (۴۱۴/۱)، تاريخ الطبرى (۵۶۷/۲)، حياة الصحابة (۷۳۰/۳)

کو اسباب سے بے نیاز کر کے تمہیں اپنی قدرت کے کرشمے دکھائیں گے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں قدم قدم پر یہ چیز نظر آتی ہے۔

حضورِ اقدس ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا ایک واقعہ

ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ ایک غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے، راستے میں ایک منزل پر قیام فرمایا اور وہاں ایک درخت کے نیچے آپ تن تنہا سو گئے، آپ کے قریب کوئی محافظ اور کوئی نگہبان نہیں تھا، کسی کافر نے آپ کو تنہا دیکھا تو تلوار سونت کر آ گیا اور بالکل آپ کے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا، جب آپ کی آنکھ کھلی تو آپ نے دیکھا کہ اس کافر کے ہاتھ میں تلوار ہے اور آپ نہتے ہیں اور وہ کافر یہ کہہ رہا ہے کہ اے محمد (ﷺ) اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ اس شخص کو یہ خیال تھا کہ جب حضور اقدس ﷺ یہ دیکھیں گے کہ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور میں نہتا ہوں اور اچانک یہ شخص میرے سر پر آ کھڑا ہوا ہے تو آپ گھبرا جائیں گے اور پریشان ہو جائیں گے، لیکن آپ کے چہرہ مبارک پر دور دور تک پریشانی کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے۔ آپ نے اطمینان سے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ بچائیں گے۔ جب اس شخص نے دیکھا کہ آپ کے اُوپر پریشانی اور گھبراہٹ کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر ایسا رعب مسلط فرما دیا کہ اس کے ہاتھوں میں لرزہ آ گیا اور اس لرزہ کی وجہ سے تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ اب سرکارِ دو عالم ﷺ نے وہ تلوار ہاتھ میں اُٹھالی اور فرمایا کہ اب بتاؤ تمہیں کون بچائے گا؟(۱)

اس واقعہ کے ذریعہ اس شخص کو یہ دعوت دینی تھی کہ در حقیقت تم اس تلوار پر بھروسہ کر رہے تھے اور میں اس تلوار کے پیدا کرنے والے پر بھروسہ کر رہا تھا اور اس تلوار میں تاثیر دینے والے پر بھروسہ کر رہا تھا۔ یہی اُسوہ حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش فرمایا، اور اس کے نتیجے میں ایک ایک صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ اسباب بھی اختیار کرتے تھے مگر ساتھ میں بھروسہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کرتے تھے۔

پہلے اسباب پھر توکل

ایک صحابی حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں جنگل میں

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، باب من علق سيفه بالشجر في السفر عند القائلة، رقم: ۲۶۹۴؛ صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب صلاة الخوف، رقم: ۱۳۹۱؛ مسند أحمد، رقم: ۱۳۸۱۶

اُونٹنی لے کر جاتا ہوں اور وہاں نماز کا وقت آجاتا ہے، تو جب نماز کا وقت آجائے اور اس وقت جنگل میں نماز کی نیت باندھنے کا ارادہ کروں تو اس وقت اپنی اُونٹنی کا پاؤں کسی درخت کے ساتھ باندھ کر نماز پڑھوں یا اس اُونٹنی کو نماز کے وقت کھلا چھوڑ دوں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کروں؟ جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِعْقِلْ سَاقَهَا وَتَوَكَّلْ))

''اس اُونٹنی کی پنڈلی رسّی سے باندھ دو، لیکن باندھنے کے بعد پھر بھروسہ اسی رسّی پر مت کرو بلکہ بھروسہ اللہ تعالیٰ پر کرو''

اس لئے کہ وہ رسّی ٹوٹ بھی سکتی ہے، وہ رسّی دھوکہ بھی دے سکتی ہے۔(۱)

اسی حدیث کے مضمون کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک مصرعہ کے اندر بیان فرماتے ہیں کہ ؎

بہ توکل پایۂ اشتر بہ بند

یعنی توکل پر اُونٹنی کا پاؤں باندھو۔ لہٰذا توکل اور اسباب کا اختیار کرنا یہ دونوں چیزیں ایک مؤمن کے ساتھ اس کی زندگی میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، پہلے اسباب اختیار کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے کہہ دے:

((اَللّٰهُمَّ هٰذَا الْجُهْدُ وَعَلَيْكَ التُّكْلَانُ))

''یا اللہ جو تدبیر اور جو کوشش میرے اختیار میں تھی وہ میں نے اختیار کرلی، اب آگے بھروسہ آپ کی ذات پر ہے''(۲)

اسباب کی یقینی موجودگی میں بھی توکل کیجئے

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک لطیف بات یاد آگئی، وہ فرماتے ہیں کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ توکل صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب ظاہری اسباب کے ذریعہ کسی کام کے ہونے یا نہ ہونے دونوں کا احتمال موجود ہو، ہوسکتا ہے کہ یہ کام ہوجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کام نہ ہو، اس وقت تو توکل کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہئے، لیکن جہاں پر کسی کام کے ہوجانے کی یقینی صورت موجود ہو، وہاں پر اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں، وہ نہ توکل کا موقع ہے اور نہ ہی دعا کا موقع ہے۔

مثلاً ہم دسترخوان پر کھانا کھانے کے لئے بیٹھے ہیں، کھانا سامنے چنا ہوا، ہے، بھوک لگی ہوئی

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲٤٤۱

(۲) سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب منه، رقم: ۳۳٤۱

ہے، یہ بات بالکل یقینی ہے کہ ہم یہ اُٹھا کر کھالیں گے، اب ایسے موقع پر کوئی شخص بھی نہ توکل کرتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! یہ کھانا مجھے کھلا دیجئے۔ اور نہ ہی کوئی شخص توکل اور دعا کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

توکل کا اصل موقع یہی ہے

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توکل کا اصل موقع تو یہی ہے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا اصل موقع یہی ہے۔ اس لئے کہ اگر اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے مانگے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے اس ظاہری سبب پر بھروسہ نہیں ہے جو میرے سامنے رکھا ہے، بلکہ مجھے آپ کے رزق دینے پر، آپ کی تخلیق پر، آپ کی قدرت اور رحمت پر بھروسہ ہے۔ اس لئے جب کھانا سامنے دستر خوان پر آجائے تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! یہ کھانا عافیت کے ساتھ کھلا دیجئے۔ کیونکہ اگر چہ غالب گمان یہ ہے کہ کھانا سامنے رکھا ہے، صرف ہاتھ بڑھا کر کھانے کی دیر ہے، لیکن یہ مت بھولو کہ یہ کھانا بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہیں ہوگا۔ کتنے واقعات ایسے پیش آچکے ہیں کہ کھانا دستر خوان پر رکھا تھا، صرف ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی لیکن کوئی ایسا عارض پیش آگیا یا کوئی ایسی پریشانی کھڑی ہوگئی یا کوئی ایسا حادثہ پیش آگیا کہ آدمی وہ کھانا نہیں کھا سکا، وہ کھانا رکھا کا رکھا رہ گیا۔ لہٰذا اگر کھانا سامنے موجود ہو تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! یہ کھانا مجھے کھلا دیجئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس جگہ پر تمہیں یقینی طور پر معلوم ہو کہ یہ کام ہو جائے گا، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! مجھے تو بظاہر نظر آرہا ہے کہ یہ کام ہو جائے گا، لیکن مجھے پتہ نہیں کہ حقیقت میں یہ کام ہو جائے گا یا نہیں، کیونکہ حقیقت میں تو آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اے اللہ! اس کام کو ٹھیک انجام تک پہنچا دیجئے۔

دونوں صورتوں میں اللہ سے مانگے

جو حدیث میں نے شروع میں بیان کی تھی، اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دو لفظ ارشاد فرمائے، وہ یہ کہ تمہیں یا تو اللہ تعالیٰ سے کوئی ضرورت پیش آئے یا کسی آدمی سے کوئی ضرورت پیش آئے۔ یہ دو لفظ اس لئے ارشاد فرمائے کہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جس میں کسی آدمی کی مدد یا اس کی مداخلت کا کوئی راستہ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کو اولاد کی خواہش ہے، اب ظاہری اسباب میں بھی کسی انسان سے اولاد نہیں مانگی جاسکتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگی جاسکتی ہے۔ بہر حال، وہ خواہش اور ضرورت خواہ ایسی ہو جو براہِ راست اللہ تعالیٰ دینے والے

ہیں یا ایسی ضرورت ہو جو آدمی کے واسطے سے اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں، جیسے ملازمت اور روزی وغیرہ، دونوں صورتوں میں حقیقت میں تمہارا مانگنا اللہ تعالیٰ سے ہونا چاہئے۔

اطمینان سے وضو کریں

بہرحال، اب اگر تمہارے پاس وقت میں گنجائش ہے اور وہ کام بہت جلدی اور ایمرجنسی کا کام نہیں ہے تو اس کام کے لئے پہلے صلوٰۃ الحاجۃ پڑھو۔ اور صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کا طریقہ اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے وضو کرو اور اچھی طرح وضو کرو۔ یعنی وہ وضو محض فرض ٹالنے کے انداز میں نہ کرو بلکہ یہ سمجھ کر کرو کہ یہ وضو درحقیقت ایک عظیم الشان عبادت کی تمہید ہے، اس وضو کے کچھ آداب اور کچھ سنتیں ہیں جو نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائی ہیں، ان سب کا اہتمام کر کے وضو کرو۔ ہم لوگ دن رات بے خیالی میں جلدی جلدی وضو کر کے فارغ ہو جاتے ہیں، بیشک اس طرح وضو کرنے سے وضو ہو تو جاتا ہے لیکن اس وضو کے انوار و برکات حاصل نہیں ہوتیں۔

وضو سے گناہ دُھل جاتے ہیں

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس وقت بندہ وضو کرتا ہے اور وضو کے دوران اپنا چہرہ دھوتا ہے تو چہرے سے جتنے گناہ کیے ہیں وہ سب چہرہ کے پانی کے ساتھ دُھل جاتے ہیں، اور جب دایاں ہاتھ دھوتا ہے تو دائیں ہاتھ کے جتنے گناہ ہوتے ہیں وہ سب دُھل جاتے ہیں، اور جب بایاں ہاتھ دھوتا ہے تو بائیں ہاتھ کے تمام گناہ دُھل جاتے ہیں۔ اس طرح جو جو عضو وہ دھوتا ہے اس عضو کے گناہِ صغیرہ معاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (۱)

میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب وضو کیا کرو تو ذرا یہ تصور کیا کرو کہ میں اپنا چہرہ دھو رہا ہوں تو حضور اقدس ﷺ کی بشارت کے مطابق میرے چہرے کے گناہ دُھل رہے ہیں، اب ہاتھ دھو رہا ہوں تو ہاتھ کے گناہ دُھل رہے ہیں، اسی تصور کے ساتھ مسح کرو اور اسی تصور کے ساتھ پاؤں دھوؤ۔ وہ وضو جو اس تصور کے ساتھ کیا جائے اور وہ وضو جو اس تصور کے بغیر کیا جائے، دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا اور اس وضو کا لطف محسوس ہوگا۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب خروج الخطايا مع ماء الوضوء، رقم: ۳٦۰، سنن الترمذي، كتاب الطهارة عن رسول الله، رقم: ۲، مسند أحمد، رقم: ۷٦۷۷، مؤطا مالك، كتاب الطهارة، رقم: ٥٦

وضو کے دوران کی دعائیں

بہرحال، ذرا دھیان کے ساتھ وضو کرو اور وضو کے جو آداب اور سنتیں ہیں، ان کو ٹھیک ٹھیک بجالاؤ۔ مثلاً قبلہ رُو ہوکر بیٹھو، اور ہر ہر عضو کو تین تین مرتبہ اطمینان سے دھوؤ، اور وضو کی جو مسنون دعائیں ہیں وہ وضو کے دوران پڑھو۔ مثلاً یہ دعا پڑھو:

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ وَوَسِّعْ لِيْ فِيْ دَارِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ))(۱)

اور کلمہ شہادت پڑھے:

((أَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ)) (۲)

اور وضو کے بعد یہ دعا پڑھے:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ))(۳)

بس اچھی طرح وضو کرنے کا یہی مطلب ہے۔

''صلوٰۃ الحاجۃ'' کے لئے خاص طریقہ مقرر نہیں

پھر دو رکعت ''صلوٰۃ الحاجۃ'' کی نیت سے پڑھو، اور اس صلوٰۃ الحاجۃ کے طریقے میں کوئی فرق نہیں ہے، جس طرح عام نماز پڑھی جاتی ہے اسی طرح سے یہ دو رکعتیں پڑھی جائیں گی۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ''صلوٰۃ الحاجۃ'' پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ ہے، لوگوں نے اپنی طرف سے اس کے خاص خاص طریقے گھڑ رکھے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے لئے خاص خاص سورتیں بھی متعین کر رکھی ہیں کہ پہلی رکعت میں فلاں سورۃ پڑھے اور دوسری رکعت میں فلاں سورۃ پڑھے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے ''صلوٰۃ الحاجۃ'' کا جو طریقہ بیان فرمایا ہے اس میں نماز پڑھنے کا کوئی الگ طریقہ بیان نہیں فرمایا اور نہ کسی سورۃ کی تعیین فرمائی۔

البتہ بعض بزرگوں کے تجربات ہیں کہ اگر ''صلوٰۃ الحاجۃ'' میں فلاں فلاں سورتیں پڑھ لی

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما جاء في عقد التسبيح باليد، رقم: ۳٤۲۲، مسند أحمد، أول مسند المدنيين أجمعين، رقم: ۱٦۰۰٤

(۲) سنن الترمذي، كتاب الطهارة عن رسول الله، باب فيما يقال بعد الوضوء، رقم: ۵۰، سنن النسائي، كتاب الطهارة، رقم: ۱٤۸، سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ما يقال بعد الوضوء، رقم: ٤٦۳

(۳) سنن الترمذي، كتاب الطهارة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب فيما يقال بعد الوضوء، رقم: ۵۰، والنسائي، كتاب الطهارة، رقم: ۱٤۸، وابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، رقم: ٤٦۳

جائیں تو بعض اوقات اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے، تو اس کو سنت سمجھ کر انسان اختیار نہ کرے، اس لئے کہ اگر سنت سمجھ کر اختیار کرے گا تو وہ بدعت ہو جائے گا۔ چنانچہ میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنی ہو تو پہلی رکعت میں سورۃ الم نشرح اور دوسری رکعت میں سورۃ ''اذا جاء نصر اللہ'' پڑھ لیا کرو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان سورتوں کے پڑھنے سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص سنت سمجھے بغیر ان سورتوں کو پڑھے تو بھی ٹھیک ہے اور اگر ان کے علاوہ کوئی دوسری سورت پڑھ لے تو اس میں سنت کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی۔ بہر حال، صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ نہیں ہے بلکہ جس طرح عام نمازیں پڑھی جاتی ہیں، اسی طرح صلوٰۃ الحاجۃ کی دو رکعتیں پڑھی جائیں گی۔ بس نماز شروع کرتے وقت دل میں یہ نیت کر لے کہ میں یہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ کے طور پر پڑھتا ہوں۔

نماز کے لئے نیت کس طرح کی جائے؟

یہاں پر یہ بھی عرض کر دوں کہ آج کل لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ ہر نماز کی نیت کے الفاظ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور جب تک وہ الفاظ نہ کہے جائیں اس وقت تک نماز نہیں ہوتی، اسی وجہ سے لوگ بار بار یہ پوچھتے بھی رہتے ہیں کہ فلاں نماز کی نیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور فلاں نماز کی نیت کس طرح ہوگی؟ اور لوگوں نے نیت کے الفاظ کو باقاعدہ نماز کا حصہ بنا رکھا ہے۔ مثلاً یہ الفاظ کہ ''نیت کرتا ہوں دو رکعت نماز کی، پیچھے اس امام کے، واسطے اللہ تعالیٰ کے، منہ میرا کعبہ شریف کی طرف وغیرہ وغیرہ''، خوب سمجھ لیں کہ نیت ان الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ نیت تو دل کے ارادے کا نام ہے، جب آپ نے گھر سے نکلتے وقت دل میں یہ نیت کر لی کہ میں ظہر کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں، بس نیت ہو گئی۔ میں نمازِ جنازہ پڑھنے جا رہا ہوں، بس نیت ہو گئی۔ میں نمازِ عید پڑھنے جا رہا ہوں، بس نیت ہو گئی۔ میں نمازِ حاجت پڑھنے جا رہا ہوں، بس نیت ہو گئی۔ اب یہ الفاظ زبان سے کہنا نہ تو واجب ہیں نہ ضروری ہیں، نہ سنت ہیں، نہ مستحب ہیں، زیادہ سے زیادہ جائز ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لہٰذا صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کا نہ کوئی مخصوص طریقہ ہے اور نہ ہی نیت کے لئے الفاظ مخصوص ہیں، بلکہ عام نمازوں کی طرح دو رکعتیں پڑھ لو۔

دعا سے پہلے اللہ کی حمد و ثناء

پھر جب دو رکعتیں پڑھ لیں تو اب دعا کرو۔ اور یہ دعا کس طرح کرو، اس کے آداب بھی خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیئے۔ یہ نہیں کہ بس سلام پھیرتے ہی دعا شروع کر دو، بلکہ سب سے پہلے تو

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرو اور یہ کہو: یا اللہ! تمام تعریفیں آپ کے لئے ہیں، آپ کا شکر اور احسان ہے۔

حمد و ثناء کی کیا ضرورت ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کیوں کی جائے؟ اور اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی ایک وجہ تو علماء کرام رحمہم اللہ نے یہ بتائی ہے کہ جب آدمی کسی دنیاوی حاکم کے پاس اپنی غرض لے کر جاتا ہے تو پہلے اس کی تعظیم اور تکریم کے لئے کچھ الفاظ زبان سے ادا کرتا ہے تاکہ یہ خوش ہو کر میری مراد پوری کر دے۔ لہٰذا جب دنیا کے ایک معمولی سے حاکم کے سامنے پیش ہوتے وقت اس کے لئے تعریفی کلمات استعمال کرتے ہو تو جب تم احکم الحاکمین کے دربار میں جا رہے ہو تو اس کے لئے بھی تعریف کے الفاظ زبان سے کہو کہ یا اللہ! تمام تعریفیں آپ کے لئے ہیں اور آپ کا شکر و احسان ہے، آپ میری یہ ضرورت پوری فرما دیجئے۔

دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرنے کی دوسری وجہ بھی ہے اور مجھے ذوقی طور پر اس دوسری وجہ کی طرف زیادہ رجحان ہوتا ہے، وہ وجہ یہ ہے کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی حاجت پیش کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو چونکہ انسان اپنی ضرورت کا غلام ہے اور غرض کا بندہ ہے، اور جب اس کو کسی چیز کی ضرورت اور غرض پیش آتی ہے تو وہ ضرورت اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی ہے، اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! میری فلاں ضرورت پوری فرما دیجئے۔ اس دعا کے وقت اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس دعا میں ناشکری کا پہلو شامل نہ ہو جائے کہ یا اللہ! آپ میری ضرورت پوری نہیں فرما رہے ہیں، میری حاجتیں آپ پوری نہیں فرما رہے ہیں۔ حالانکہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں بارش کی طرح برس رہی ہیں، دعا کے وقت ان نعمتوں کی طرف انسان کا دھیان نہیں جاتا اور بس اپنی ضرورت اور غرض کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔

بہرحال، حضور اقدس ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ جب تم اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی حاجت اور ضرورت لے کر جاؤ تو اس حاجت اور ضرورت کو اللہ تعالیٰ سے ضرور مانگو، لیکن پہلے اس بات کا استحضار کر لو کہ اس حاجت اور ضرورت کے ابھی تک پورا نہ ہونے کے باوجود تمہارے اُوپر اللہ تعالیٰ کی کتنی بے شمار نعمتیں بارش کی طرح برس رہی ہیں۔ پہلے ان کا تو شکر ادا کر لو کہ یا اللہ! یہ نعمتیں جو آپ نے اپنی رحمت سے مجھے دے رکھی ہیں، اس پر آپ کا شکر ہے اور آپ کی حمد ہے، آپ کی ثناء ہے، البتہ ایک حاجت اور ضرورت اور ہے، یا اللہ! اس کو بھی اپنے فضل سے پورا فرما دیجئے ــــ تاکہ انسان کی دعا میں ناشکری کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو۔

غم اور تکالیف بھی نعمت ہیں

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مجلس میں یہ مضمون بیان فرما رہے تھے کہ انسان کو زندگی میں جو غم، صدمے اور تکلیفیں پیش آتی ہیں، اگر انسان غور کرے تو یہ تکلیفیں بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، بیماری بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، فقر و فاقہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اگر انسان کو حقیقت شناس نگاہ مل جائے تو وہ یہ دیکھے کہ یہ سب چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ چیزیں کس طرح سے نعمت ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آخرت میں اللہ تعالیٰ تکالیف اور مصیبتوں پر صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے، تو جن لوگوں پر دنیا میں زیادہ تکالیف اور مصیبتیں نہیں گزری ہوں گی، وہ تمنا کریں گے کہ کاش! دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں اور پھر ہم اس پر صبر کرتے۔ (۱)

اور اس صبر پر وہ اجر ملتا جو آج ان صبر کرنے والوں کو مل رہا ہے۔ بہر حال، حقیقت میں یہ تکالیف بھی نعمت ہیں، مگر چونکہ ہم کمزور ہیں اس وجہ سے ہمیں ان کے نعمت ہونے کا استحضار نہیں ہوتا۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب دعا

جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ مضمون بیان فرما رہے تھے کہ اسی دوران مجلس میں ایک شخص آ گیا جو معذور تھا اور مختلف بیماریوں میں مبتلا تھا۔ وہ آ کر حضرت حاجی صاحبؒ سے کہنے لگا کہ حضرت! میرے لئے دعا فرما دیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس تکلیف سے نجات دے دیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جو حاضرینِ مجلس تھے، حیران ہو گئے کہ ابھی تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے تھے کہ ساری تکلیفیں اور مصیبتیں نعمت ہوتی ہیں اور اب یہ شخص تکلیف کے ازالے کی دعا کرا رہا ہے، اب اگر حضرت حاجی صاحب اس شخص کے لئے تکلیف کے ازالے کی دعا کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نعمت کے ازالے کی دعا کریں گے؟ حضرت حاجی صاحب نے اسی وقت ہاتھ اُٹھا کر یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ! حقیقت میں یہ ساری تکلیفیں اور مصیبتیں نعمت ہیں، لیکن اے اللہ! ہم کمزور ہیں، آپ ہماری کمزوری پر نظر فرماتے ہوئے اس تکلیف کی نعمت کو صحت کی نعمت سے بدل دیجئے۔

---

(۱) کنز العمال، رقم: ٦٦٦٠(٣/٣٠٣)، المعجم الكبير للطبراني، رقم: ٨٦٨٩(٨/٦٦)، الزواجر عن اقتراف الكبائر (١/٤٢٧)

تکلیف کے وقت دوسری نعمتوں کا استحضار

اور پھر عین تکلیف کے وقت انسان کو جو بیشمار نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، انسان ان کو بھول جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے، تو اب وہ اس پیٹ کے درد کو لے کر بیٹھ جاتا ہے، لیکن وہ یہ نہیں دیکھتا کہ آنکھ جو اتنی بڑی نعمت اس کو ملی ہوئی ہے، اس میں کوئی تکلیف نہیں۔ زبان میں کوئی تکلیف نہیں۔ دانتوں میں کوئی تکلیف نہیں۔ سارے جسم میں اور کسی جگہ تکلیف نہیں۔ بس صرف پیٹ میں معمولی تکلیف ہو رہی ہے۔ اب یہ دعا ضرور کرو کہ یا اللہ! پیٹ کی تکلیف دور کر دیجئے، لیکن دعا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی اس پر حمد و ثناء کرو کہ یا اللہ! جو اور بیشمار نعمتیں آپ نے عطا کی ہوئی ہیں، اے اللہ! ہم اس پر آپ کا شکر ادا کرتے ہیں، البتہ اس وقت جو یہ تکلیف آ گئی ہے اس کے لئے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اس تکلیف کو دور کر دیجئے۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شکرِ نعمت

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے استاد تھے حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، یہ مادرزاد ولی اللہ تھے اور عجیب و غریب بزرگ تھے۔ حضرت والد صاحب ان کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ حضرت میاں صاحب بیمار ہیں اور ان کو بخار ہے۔ میں عیادت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ شدید بخار میں تپ رہے ہیں اور بخار کی کرب اور بے چینی کی تکلیف میں ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا اور پوچھا کہ حضرت! کیسے مزاج ہیں؟ طبیعت کیسی ہے؟ جواب میں فرمایا:

> ''الحمدللہ میری آنکھیں صحیح کام کر رہی ہیں۔ الحمدللہ میرے کان صحیح کام کر رہے ہیں۔ الحمدللہ میری زبان صحیح کام کر رہی ہے۔ جتنی تکلیفیں نہیں تھیں ان سب کا ایک ایک کر کے ذکر کیا کہ ان سب میں کوئی بیماری نہیں ہے، البتہ بخار ہے، دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دور فرما دے''

یہ ہے ایک شکر گزار بندے کا عمل جو عین تکلیف میں بھی ان راحتوں اور نعمتوں کا استحضار کر رہا ہے جو اس وقت حاصل ہیں، جس کی وجہ سے اس تکلیف کی شدت میں بھی کمی آتی ہے۔

حاصل شدہ نعمتوں پر شکر

بہر حال، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ جو تلقین فرما رہے ہیں کہ دعا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء

کرو، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس وقت جو حاجت اور ضرورت پیش کرنے جا رہے ہو، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں اس وقت تمہیں حاصل ہیں، پہلے ان کا استحضار کر کے ان پر شکر ادا کرو اور اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرو۔

حمد و ثناء کے بعد درود شریف کیوں؟

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد کیا کرے؟ اس کے لئے ارشاد فرمایا:

((وَلْيُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ))

''حمد و ثناء کے بعد اور اپنی حاجت پیش کرنے سے پہلے نبی کریم ﷺ پر درود بھیجو''

اب سوال یہ ہے کہ اس وقت درود بھیجنے کا کیا موقع ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ اپنی اُمت پر بہت ہی زیادہ شفیق اور مہربان ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جب میرا اُمتی اللہ تعالیٰ کے حضور دعا مانگے تو اس کی وہ دعا رد نہ ہو۔ پوری کائنات میں درود شریف کے علاوہ کسی دعا کے بارے میں یہ گارنٹی نہیں ہے کہ وہ ضرور قبول ہوگی، لیکن اگر نبی کریم ﷺ پر درود بھیجا جائے تو اس کے بارے میں یہ گارنٹی یقینی ہے کہ وہ ضرور قبول ہوگا۔ جب ہم درود بھیجتے ہیں اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ اسکا کیا مطلب ہے؟ اسکا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! محمد رسول اللہ ﷺ پر رحمتیں نازل فرمایئے۔ یہ ایسی دعا ہے کہ اس کے رد ہونے کا کوئی امکان نہیں، اس کی قبولیت کا وعدہ ہے، اس کی قبولیت کی گارنٹی ہے کہ یہ دعا ضرور قبول ہوگی۔ اسلئے کہ حضور اقدس ﷺ پر تو پہلے سے رحمتیں نازل ہو رہی ہیں اور مزید نازل ہوتی رہیں گی، وہ ہمارے درود بھیجنے کے محتاج نہیں ہیں۔

درود شریف بھی قبول اور دعا بھی قبول

لیکن حضور اقدس ﷺ یہ چاہتے ہیں کہ میرے اُمتی اپنی مراد اور ضرورت مانگنے سے پہلے مجھ پر درود بھیج دیں تو اللہ تعالیٰ اس درود کو ضرور قبول فرمائیں گے، اور جب درود شریف کو قبول فرمائیں گے تو اس حاجت اور ضرورت کی دعا کو بھی ضرور قبول فرمائیں گے، اس لئے کہ ان کی رحمت سے یہ بات بعید ہے کہ ایک دعا کو تو قبول فرمالیں اور دوسری دعا کو رد فرمادیں۔ اس لئے درود شریف کے بعد کی جانے والی دعا کی قبولیت کی زیادہ اُمید ہے۔

حضور ﷺ اور ہدیہ کا بدلہ

ایک دوسری وجہ میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ

حضورِ اقدس ﷺ کا عمر بھر کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ لے کر آتا تو آپ اس ہدیہ کا کچھ نہ کچھ بدلہ ضرور دیا کرتے تھے اور ہدیہ کی مکافات فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ درود شریف بھی ایک ہدیہ ہے، اس لئے کہ حدیث شریف میں صراحت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص دور سے درود شریف بھیجتا ہے تو وہ درود مجھ تک پہنچایا جاتا ہے، اور جو شخص قبر پر آ کر مجھ کو سلام کرے اور درود بھیجے تو میں خود اس کو سنتا ہوں۔ (۱)

یہ درود شریف ایک اُمتی کا تحفہ اور ہدیہ ہے جو آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔ لہٰذا جب دنیا میں اور زندگی میں آپ کی سنت یہ تھی کہ جب آپ کے پاس کوئی شخص ہدیہ لے کر آتا تو آپ اس کی مکافات فرمایا کرتے تھے اور اس ہدیہ کے بدلے ہدیہ دیا کرتے تھے، تو اُمید یہ ہے کہ عالمِ برزخ میں جب ایک اُمتی کی طرف سے حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں درود شریف کا یہ ہدیہ پہنچے گا تو آپ اس ہدیہ کا بھی بدلہ عطا فرمائیں گے، وہ بدلہ یہ ہوگا کہ آپ ﷺ اس اُمتی کے حق میں دعائیں کریں گے کہ یا اللہ! اس اُمتی نے میرے لئے یہ تحفہ بھیجا ہے اور میرے لئے دعا کی ہے، اے اللہ! میں اس کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اس کی مراد پوری فرما دیں۔ لہٰذا جو اُمتی درود بھیجنے کے بعد دعا کرے گا تو حضور اکرم ﷺ اس کے لئے وہاں دعا فرمائیں گے۔ اس لئے جب دعا کرنے بیٹھو تو پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرو اور پھر حضورِ اقدس ﷺ پر درود بھیجو۔

دعائے حاجت کے الفاظ

اس کے بعد دعا کے یہ الفاظ کہو:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ))

اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ کے اندر کیا کیا انوارات اور کیا کیا خواص پوشیدہ ہیں یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں یا اللہ کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں، ہم لوگ اس کی تہہ تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ان اسماءِ حسنیٰ میں اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود خاصیتیں رکھی ہیں اس لئے جب خود حضورِ اقدس ﷺ یہ تلقین فرمائیں کہ ان اسماءِ حسنیٰ کا ذکر کرو تو اس کے پیچھے ضرور کوئی راز ہوتا ہے۔ لہٰذا خاص طور پر وہی کلمات کہنے چاہئیں تا کہ وہ مقصد حاصل ہو۔ چنانچہ فرمایا:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ))

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اللہ جو حلیم ہیں اور کریم ہیں''

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب المناسك، باب زيارة القبور، رقم: ۱۷٤٥، سنن النسائي، كتاب السهو، باب السلام على النبي، رقم: ۱۲٦٥، مسند أحمد، رقم: ۳٤۸٤

''حلم'' بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور ''کرم'' بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ ان دونوں صفتوں کو خاص طور پر بظاہر اس لئے ذکر فرمایا کہ بندہ پہلے مرحلے پر ہی یہ اعتراف کرے کہ یا اللہ! میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ آپ میری دعا قبول کریں، اپنی ذات کے لحاظ سے میں اس لائق نہیں ہوں کہ آپ کی بارگاہ میں کوئی درخواست پیش کرسکوں، اس وجہ سے کہ میرے گناہ بیشمار ہیں، میری خطائیں بیشمار ہیں، میری بداعمالیاں اتنی ہیں کہ آپ کے حضور درخواست پیش کرنے کی لیاقت مجھ میں نہیں ہے، لیکن چونکہ آپ حلیم ہیں، بردباری آپ کی صفت ہے، اور اس کی وجہ سے کوئی بندہ چاہے وہ کتنا ہی خطاکار ہو، اس خطاکار کی خطاؤں کی وجہ سے جذبات میں آکر آپ کوئی فیصلہ نہیں فرماتے، بلکہ اپنی صفتِ ''حلم'' کے تحت فیصلہ فرماتے ہیں، اس لئے میں صفتِ ''حلم'' کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہوں، اور آپ کی صفتِ ''حلم'' کا تقاضا یہ ہے کہ آپ میرے گناہوں سے درگزر فرمائیں۔ اور پھر صفتِ ''کرم'' کا معاملہ فرمائیں یعنی صرف یہ نہ ہو کہ گناہوں سے درگزر فرمائیں بلکہ اُوپر سے مزید نوازشیں عطا فرمائیں، مزید اپنا کرم میرے اُوپر فرمائیں۔ صفتِ کرم اور صفتِ حلم کا واسطہ دے کر دعا کرو۔

اس کے بعد فرمایا:

((سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ))

''اللہ تعالیٰ پاک ہے جو عرشِ عظیم کا مالک ہے''

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ))

''اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے''

پہلے یہ تعریفی کلمات کہے اور اس کے بعد ان الفاظ کے ساتھ دعا کرے:

((اَللّٰهُمَّ اَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ))

''اے اللہ میں آپ سے ان چیزوں کا سوال کرتا ہوں جو آپ کی رحمت کا موجب ہوں''

((وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ))

''اور آپ کی پختہ مغفرت کا سوال کرتا ہوں''

((وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ))

''اور اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ مجھے ہر نیکی سے حصہ عطا فرمایئے''

((وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ))

''اور مجھے ہر گناہ سے محفوظ رکھئے''

((لَا تَدَعْ لَنَا ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ))

''ہمارا کوئی گناہ ایسا نہ چھوڑیئے جس کو آپ نے معاف نہ فرمایا ہو۔ یعنی ہر گناہ کو معاف فرمادیجئے''

((وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ))

''اور کوئی تکلیف ایسی نہ چھوڑیئے جس کو آپ نے دور نہ فرمادیا ہو''

((وَلَا حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًى اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ))

''اور کوئی حاجت جس میں آپ کی رضامندی ہو ایسی نہ چھوڑیئے کہ اس کو آپ نے پورا نہ فرمایا ہو''

یہ دعا کے الفاظ اور اس کا ترجمہ ہے اور مسنون دعاؤں کی کتابوں میں بھی یہ دعا موجود ہے، یہ دعا ہر مسلمان کو یاد کرلینی چاہئے۔ اس کے بعد پھر اپنے الفاظ میں جو حاجت مانگنا چاہتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ اُمید ہے اللہ تعالیٰ اس دعا کو ضرور قبول فرمائیں گے۔

ہر ضرورت کے لئے صلوٰۃ الحاجۃ پڑھیں

ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ کی یہ سنت بیان کی گئی ہے:

"كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا حَزَبَهٗ اَمْرٌ صَلّٰى"(۱)

''جب بھی حضورِ اقدس ﷺ کو کوئی تشویش کا معاملہ پیش آتا تو آپ سب سے پہلے نماز کی طرف دوڑتے''

اور یہی صلوٰۃ الحاجۃ پڑھتے اور دعا کرتے کہ یا اللہ! یہ مشکل پیش آگئی ہے، آپ اس کو دور فرمادیجئے۔ اس لئے ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے لئے صلوٰۃ الحاجۃ کی کثرت کرے۔

اگر وقت تنگ ہو تو صرف دعا کرے

یہ تفصیل تو اس صورت میں ہے جب انسان کے پاس فیصلہ کرنے کے لئے وقت ہے اور دو رکعت پڑھنے کی گنجائش ہے، لیکن اگر جلدی کا موقع ہے اور اتنی مہلت نہیں ہے کہ وہ دو رکعت پڑھ کر دعا کرے، تو اس صورت میں دو رکعت پڑھے بغیر ہی دعا کے یہ الفاظ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ لیکن

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب قيام النبي من الليل، رقم: ۱۱۲٤، مسند أحمد، حديث حذيفة بن اليمان، رقم: ۲۲۲۱۰

اپنی ہر حاجت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ضرور پیش کردے، چاہے وہ چھوٹی حاجت ہو یا بڑی حاجت ہو۔ حتیٰ کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

لہٰذا جب چھوٹی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا حکم دیا جارہا ہے تو بڑی چیز اور زیادہ اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہئے۔ اور درحقیقت یہ چھوٹی اور بڑی ہماری نسبت سے ہے، جوتے کے تسمہ کا درست ہوجانا یہ چھوٹی بات ہے اور سلطنت کا مل جانا بڑی بات ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں چھوٹے بڑے کا کوئی فرق نہیں، ان کے نزدیک سب کام چھوٹے ہیں، ہماری بڑی سے بڑی حاجت، بڑے سے بڑا مقصد اللہ تعالیٰ کے نزدیک چھوٹا ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (۱)

''اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''

ان کی قدرت ہر چیز پر یکساں ہے، اس کے لئے کوئی کام مشکل نہیں، اس کے لئے کوئی کام بڑا نہیں۔ اس لئے بڑی حاجت ہو یا چھوٹی حاجت ہو، بس اللہ ہی سے مانگو۔

یہ پریشانیاں اور ہمارا حال

آج کل ہمارے شہر میں ہر شخص پریشان ہے، ہمارے شہر کی کیا حالت بنی ہوئی ہے۔ العیاذ باللہ۔ کوئی گھرانہ ایسا نہیں ہے جو ان حالات کی وجہ سے بے چینی اور بے تابی کا شکار نہ ہو، کوئی براہِ راست مبتلا ہے اور کوئی بالواسطہ مبتلا ہے، کوئی اندیشوں کا شکار ہے، کسی کی جان مال عزت آبرو محفوظ نہیں، سب کا بُرا حال ہے۔ لیکن دوسری طرف ہمارا حال یہ ہے کہ صبح سے لے کر شام تک اس صورتِ حال پر تبصرے تو بہت کرتے ہیں، جہاں چار آدمی بیٹھے اور تبصرے شروع ہوگئے، فلاں جگہ یہ ہوگیا، فلاں جگہ یہ ہوگیا، فلاں نے یہ غلطی کی، فلاں نے یہ غلطی کی، حکومت نے یہ غلطی کی وغیرہ۔ لیکن ہم میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو تڑپ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کی توفیق ہوئی، کہ یا اللہ! یہ مصیبت ہم پر مسلط ہے، ہمارے گناہوں کا وبال ہم پر مسلط ہے، ہماری شامتِ اعمال ہم پر مسلط ہے، یا اللہ! اپنی رحمت سے اس کو دور فرمادیں۔ بتایئے کہ ہم میں سے کتنوں کو اس کی توفیق ہوئی؟

---

(۱) البقرة: ۲۰

تبصرہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں

۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان کے سقوط کا واقعہ پیش آیا اور مسلمانوں کی تاریخ میں ذلت کا ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا جو اس موقع پر پیش آیا کہ نوّے ہزار مسلمانوں کی فوج ہندوؤں کے آگے ہتھیار ڈال کر ذلیل ہوگئی۔ تمام مسلمانوں پر اس کے صدمے کا اثر تھا، سب لوگ پریشان تھے۔ اسی دوران میری حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ کے یہاں حاضری ہوئی، میرے ساتھ میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم بھی تھے، جب وہاں پہنچے تو کچھ خاص خاص لوگ وہاں موجود تھے۔ اب وہاں پر تبصرے شروع ہوگئے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ کون اس کا سبب بنا؟ کس کی غلطی ہے؟ کسی نے کہا کہ فلاں پارٹی کی غلطی ہے، کسی نے کہا کہ فلاں پارٹی کی غلطی ہے، کسی نے کہا کہ فوج کی غلطی ہے۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ تھوڑی دیر تک سب کی باتیں سنتے رہے، اس کے بعد حضرت والا فرمانے لگے کہ اچھا بھائی! آپ لوگوں نے کوئی فیصلہ کرلیا کہ کون مجرم ہے؟ اور کون بے گناہ ہے؟ اور اس فیصلے کے نتائج کیا نکلے؟ جو مجرم ہے کیا اس کو سزا دو گے؟ اور جو بے گناہ ہے اس کی برأت کا اظہار کردو گے؟ یہ بتاؤ کہ اتنی دیر تک تم جو تبصرے کرتے رہے اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ کیا دنیا یا آخرت کا کوئی فائدہ تمہیں حاصل ہوا؟

تبصرہ کے بجائے دعا کریں

اگر اتنی دیر تم اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیتے اور اللہ تعالیٰ سے کہتے کہ یا اللہ! ہماری شامتِ اعمال کے نتیجے میں ہم پر یہ مصیبت آگئی ہے، اے اللہ! ہمیں معاف فرما اور ہم سے اس مصیبت کو دور فرما اور ہماری شامتِ اعمال کو رفع فرما اور اس ذلت کو عزت سے بدل دیجئے۔ اگر یہ دعا کرلی ہوتی تو کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دعا کو قبول فرمالیتے اور اگر بالفرض وہ دعا قبول نہ ہوتی تب بھی اس دعا کے کرنے کا ثواب تو حاصل ہو جاتا اور آخرت کی نعمت تمہیں حاصل ہو جاتی۔ اب یہ تم نے بیٹھ کر جو فضول تبصرے کیے اس سے نہ کوئی دنیا کا فائدہ ہوا اور نہ ہی آخرت کا کوئی فائدہ ہوا۔

اس وقت ہماری آنکھیں کھلیں کہ واقعۃً ہم دن رات اس مرض میں مبتلا ہیں کہ دن رات بس ان باتوں پر تبصرے ہو رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوکر مانگنے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ہم میں کتنے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ان حالات سے بیتاب ہوکر اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں کیں اور صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر دعا کی ہو، کہ یا اللہ! میں صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ رہا ہوں، اے اللہ! اپنی رحمت سے یہ عذاب ہم سے دور فرما دیجئے۔ یہ کام شاذ و نادر ہی کسی اللہ کے بندے نے کیا ہوگا، لیکن صبح سے لے کر

شام تک تبصرے ہو رہے ہیں، وقت ان تبصروں میں صرف ہو رہا ہے، اور پھر ان تبصروں میں معلوم نہیں کتنی غیبت ہو رہی ہے، کتنے بہتان باندھے جارہے ہیں، اور ان کے ذریعہ اُلٹا اپنے سر گناہ لے رہے ہیں۔

اللہ کی طرف رجوع کریں

تمام حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ان حالات میں دعا کی طرف توجہ کریں۔ اگر کسی کے بس میں کوئی تدبیر ہے تو وہ تدبیر اختیار کرے اور اگر تدبیر اختیار میں نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا تو ہر ایک کے اختیار میں ہے۔ ہمارے اندر سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا سلسلہ اب ختم ہوتا جارہا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب پاکستان بن رہا تھا، اس وقت ملک میں فسادات ہو رہے تھے، اس وقت دیوبند اور دوسرے شہروں میں گھر گھر آیتِ کریمہ کا ختم ہو رہا تھا، کسی کی طرف سے اپیل نہیں تھی، بلکہ مسلمان اپنی تحریک سے اور اپنے شوق سے اور ضرورت محسوس کر کے گھر گھر اور محلّہ محلّہ آیتِ کریمہ کا ختم کر رہے تھے، عورتیں اپنے گھروں میں بیٹھی ہوئی آیتِ کریمہ کا ختم کر رہی تھیں اور دعائیں ہو رہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس مصیبت سے نکال دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس مصیبت سے نجات دیدی۔

پھر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں

آج ہمارے شہر میں سب کچھ ہو رہا ہے، آنکھوں کے سامنے لاشیں تڑپ رہی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ کیا آپ نے کہیں سنا کہ محلّوں میں یا گھروں میں آیتِ کریمہ کا ختم کیا جارہا ہو اور دعا کرنے کا اہتمام ہو رہا ہو۔ بلکہ یہ ہو رہا ہے کہ آنکھوں کے سامنے لاشیں تڑپ رہی ہیں، موت آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہے، اور لوگ گھروں میں بیٹھ کر وی سی آر دیکھ رہے ہیں۔ اب بتایئے ان حالات میں اللہ تعالیٰ کا قہر اور عذاب نازل نہ ہو تو کیا ہو۔ تمہارے سامنے اچھا خاصا آدمی ذرا سی دیر میں دنیا سے چل بسا، لیکن پھر بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں، پھر بھی تم گناہوں کو نہیں چھوڑتے، پھر بھی اللہ کی نافرمانی پر کمر باندھے ہوئے ہو۔

اپنی جانوں پر رحم کرتے ہوئے یہ کام کرلو

خدا کے لئے اپنی جانوں پر رحم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا سلسلہ شروع کردو۔ اور کون مسلمان ایسا ہے جو یہ نہیں کرسکتا کہ وہ اس مقصد کے لئے دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ کی نیت

سے پڑھ لیا کرے۔ دو رکعتیں پڑھنے میں کتنی دیر لگتی ہے، اوسطاً دو رکعت پڑھنے میں دو منٹ لگتے ہیں، اور دو رکعت کے بعد دعا کرنے میں تین منٹ مزید لگ جائیں گے۔ اپنی اس قوم اور اس ملت کے لئے پانچ منٹ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوکر دعا مانگنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی تو پھر کس منہ سے کہتے ہو کہ ہمیں قوم میں ہونے والے ان فسادات کی وجہ سے صدمہ اور رنج اور تکلیف ہو رہی ہے۔ لہٰذا جب تک ان فسادات کا سلسلہ جاری ہے، اس وقت تک روزانہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ اور خدا کے لئے اپنے جانوں پر رحم کرتے ہوئے اپنے گھروں سے نافرمانی کے ذرائع اور آلے کو نکال دو اور نافرمانی اور گناہ کے سلسلے کو بند کردو، اور اللہ تعالیٰ کے حضور رو رو کر اور گڑگڑا کر دعا کرو۔ آیتِ کریمہ:

﴿لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾(۱)

کا ختم کرو اور "یَا سَلَامُ" کا ورد کرو اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ فضول تبصروں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس کام میں لگو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) الأنبياء: ۸۷

روزہ
ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ٥ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ٥
﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (۱)

برکت والا مہینہ

انشاء اللہ چند روز کے بعد رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہونے والا ہے، اور کون مسلمان ایسا ہوگا جو اس مہینے کی عظمت اور برکت سے واقف نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مہینہ اپنی عبادت کے لئے بنایا ہے۔ اور نہ معلوم کیا کیا رحمتیں اللہ تعالیٰ اس مہینے میں اپنے بندوں کی طرف مبذول فرماتے ہیں۔ ہم اور آپ ان رحمتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس مہینے کے اندر بعض اعمال ایسے ہیں جن کو ہر مسلمان جانتا ہے، اور اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ مثلاً اس ماہ میں روزے فرض ہیں۔ الحمد للہ مسلمانوں کو روزہ رکھنے کی توفیق ہو جاتی ہے۔ اور تراویح کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ سنت ہے، مسلمانوں کو اس میں شرکت کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے، لیکن اس وقت ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ رمضان المبارک کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ اس میں روزے رکھے جاتے ہیں، اور رات کے وقت تراویح پڑھی جاتی ہے، اور بس، اس کے علاوہ اور کوئی خصوصیت نہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ یہ دونوں عبادتیں اس مہینے کی بڑی اہم عبادات میں سے ہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۱/۱۱۵ تا ۱۳۶)، رمضان المبارک اور روزے کے بارے میں مزید بیانات جلد (۱۱) میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) البقرة: ۱۸۵

لیکن بات صرف یہاں تک ختم نہیں ہوتی، بلکہ درحقیقت رمضان المبارک ہم سے اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور قرآن کریم میں اللہ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (۱)

یعنی میں نے جنات اور انسانوں کو صرف ایک کام کے لئے پیدا کیا، وہ یہ کہ میری عبادت کریں، اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد یہ بتایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے۔

''کیا فرشتے کافی نہیں تھے؟''

یہاں بعض لوگوں کو خاص کر نئی روشنی کے لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر انسان کی تخلیق کا مقصد صرف عبادت تھا، تو اس کام کے لئے انسان کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کام تو فرشتے پہلے سے بہت اچھی طرح انجام دے رہے تھے؟ اور وہ اللہ کی عبادت تسبیح اور تقدیس میں لگے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمانے کا ارادہ کیا اور فرشتوں کو بتایا کہ میں اس طرح کا ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں تو فرشتوں نے بے ساختہ یہ کہا کہ آپ ایک ایسے انسان کو پیدا کر رہے ہیں جو زمین میں فساد مچائے گا، اور خون ریزی کرے گا، اور عبادت، تسبیح و تقدیس ہم انجام دے رہے ہیں ـــــ اسی طرح آج بھی اعتراض کرنے والے یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ اگر انسان کی تخلیق کا مقصد صرف عبادت ہوتا تو اس کے لئے انسان کو پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کام تو فرشتے پہلے ہی انجام دے رہے تھے۔

فرشتوں کا کوئی کمال نہیں

بیشک اللہ تعالیٰ کے فرشتے اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہے تھے۔ لیکن ان کی عبادت بالکل مختلف نوعیت کی تھی۔ اور انسان کے سپرد جو عبادت کی گئی وہ بالکل مختلف نوعیت کی تھی۔ اس لئے کہ فرشتے جو عبادت کر رہے تھے، ان کے مزاج میں اس کے خلاف کرنے کا امکان ہی نہیں تھا۔ وہ اگر چاہیں کہ عبادت نہ کریں تو ان کے اندر عبادت چھوڑنے کی صلاحیت نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر سے گناہ کرنے کا امکان ہی ختم فرما دیا اور نہ انہیں بھوک لگتی ہے، نہ ان کو پیاس لگتی ہے، اور نہ ان کے اندر شہوانی تقاضا پیدا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے دل میں گناہ کا وسوسہ بھی نہیں گزرتا، گناہ کی خواہش اور گناہ پر اقدام تو دور کی بات ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت پر کوئی اجر و ثواب بھی نہیں رکھا۔ کیونکہ اگر

(۱) الذاریات: ۵٦

فرشتے گناہ نہیں کر رہے ہیں تو اس میں ان کا کوئی کمال نہیں۔ اور جب کوئی کمال نہیں تو پھر جنت والا اجر و ثواب بھی مرتب نہیں ہوگا۔

نابینا کا بچنا کمال نہیں

مثلاً ایک شخص بینائی سے محروم ہے، جس کی وجہ سے ساری عمر اس نے نہ کبھی فلم دیکھی، نہ کبھی ٹی وی دیکھا، اور نہ کبھی غیر محرم پر نگاہ ڈالی۔ بتایئے کہ ان گناہوں کے نہ کرنے میں اس کا کیا کمال ظاہر ہوا؟ اس لئے کہ اس کے اندر ان گناہوں کے کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ لیکن ایک دوسرا شخص جس کی بینائی بالکل ٹھیک ہے، جو چیز چاہے دیکھ سکتا ہے، لیکن دیکھنے کی صلاحیت موجود ہونے کے باوجود جب کسی غیر محرم کی طرف دیکھنے کا تقاضا دل میں پیدا ہوتا ہے، وہ فوراً صرف اللہ تعالیٰ کے خوف سے نگاہ نیچے کر لیتا ہے۔ اب بظاہر دونوں گناہوں سے بچ رہے ہیں۔ لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلا شخص بھی گناہ سے بچ رہا ہے، اور دوسرا شخص بھی گناہ سے بچ رہا ہے۔ لیکن پہلے شخص کا گناہ سے بچنا کوئی کمال نہیں۔ اور دوسرے شخص کا گناہ سے بچنا کمال ہے۔

یہ عبادت فرشتوں کے بس میں نہیں ہے

لہٰذا اگر ملائکہ صبح سے شام تک کھانا نہ کھائیں تو یہ کوئی کمال نہیں۔ اس لئے کہ انہیں بھوک ہی نہیں لگتی۔ اور انہیں کھانے کی حاجت ہی نہیں۔ لہٰذا اُن کے نہ کھانے پر کوئی اجر و ثواب بھی نہیں۔ لیکن انسان ان تمام حاجتوں کو لے کر پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا کوئی انسان کتنے ہی بڑے سے بڑے مقام پر پہنچ جائے، حتیٰ کہ سب سے اعلیٰ مقام یعنی نبوت پر پہنچ جائے، تب بھی وہ کھانے پینے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کفار نے انبیاء پر یہی اعتراض کیا کہ:

﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ﴾(1)

یعنی یہ رسول کیسے ہیں جو کھانا بھی کھاتے ہیں اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ تو کھانے کا تقاضا انبیاء کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ اب اگر انسان کو بھوک لگ رہی ہے، لیکن اللہ کے حکم کی وجہ سے کھانا نہیں کھا رہا ہے، تو یہ کمال کی بات ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں ایک ایسی مخلوق پیدا کر رہا ہوں، جس کو بھوک بھی لگے گی، پیاس بھی لگے گی، اور اس کے اندر شہوانی تقاضے بھی پیدا ہوں گے۔ اور گناہ کرنے کے دواعی بھی ان کے اندر پیدا ہوں گے، لیکن جب گناہ کا داعیہ پیدا ہوگا، اس وقت وہ مجھے یاد کر لے گا۔ اور مجھے یاد کر کے اپنے نفس کو اس گناہ سے بچا لے گا۔ اس کی

(۱) الفرقان: ۷

یہ عبادت اور گناہ سے بچنا ہمارے یہاں قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اور جس کا اجر و ثواب اور بدلہ دینے کے لئے ہم نے ایسی جنت تیار کر رکھی ہے، جس کی صفت عرضھا السموت والارض (جس کی چوڑائی زمین و آسمان کے برابر ہے) ہے۔ اس لئے کہ اس کے دل میں داعیہ اور تقاضا ہو رہا ہے، اور خواہشات پیدا ہو رہی ہیں، اور گناہ کے محرکات سامنے آرہے ہیں، لیکن یہ انسان ہمارے خوف اور ہماری عظمت کے تصور سے اپنی آنکھ کو گناہ سے بچالیتا ہے۔ اپنے کان کو گناہ سے بچالیتا ہے۔ اپنی زبان کو گناہ سے بچالیتا ہے۔ اور گناہوں کی طرف اُٹھتے ہوئے قدموں کو روک لیتا ہے۔ تاکہ میرا اللہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے۔ یہ عبادت فرشتوں کے بس میں نہیں تھی۔ اس عبادت کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا کمال

حضرت یوسف علیہ السلام کو جو فتنہ زلیخا کے مقابلے میں پیش آیا، کون مسلمان ایسا ہے جو اس کو نہیں جانتا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت دی۔ اس وقت زلیخا کے دل میں بھی گناہ کا خیال پیدا ہوا، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی گناہ کا خیال آگیا۔ عام لوگ تو اس سے حضرت یوسف علیہ السلام پر اعتراض اور ان کی تنقیص بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم یہ بتلانا چاہتا ہے کہ گناہ کا خیال آجانے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے خوف اور ان کی عظمت کے استحضار سے اس گناہ کے خیال پر عمل نہیں کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر لیا۔ لیکن اگر گناہ کا خیال بھی دل میں نہ آتا، اور گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہوتی، اور گناہ کا تقاضا ہی پیدا نہ ہوتا، تو پھر ہزار مرتبہ زلیخا گناہ کی دعوت دے، پھر تو کمال کی کوئی بات نہیں تھی۔ کمال تو یہی تھا کہ گناہ کی دعوت دی جارہی ہے، اور ماحول بھی موجود، حالات بھی سازگار، اور دل میں خیال بھی آرہا ہے، لیکن ان سب چیزوں کے باوجود اللہ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے فرمایا:

﴿قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ﴾ (۱)

''میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں''

یہ عبادت ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا۔

ہماری جانوں کا سودا ہو چکا ہے

جب انسان کا مقصدِ تخلیق عبادت ہے تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ جب انسان دنیا میں آئے تو صبح

---

(۱) یوسف: ۲٤

سے لے کر شام تک عبادت کے علاوہ کوئی اور کام نہ کرے، اور اس کو دوسرے کام کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہئے۔ چنانچہ دوسری جگہ قرآن کریم نے فرمایا کہ:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے۔ اور اس کا معاوضہ یہ مقرر فرمایا کہ آخرت میں ان کو جنت ملے گی۔ جب ہماری جانیں بک چکی ہیں، تو یہ جانیں جو ہم لیے بیٹھے ہیں، وہ ہماری نہیں ہیں۔ بلکہ بکا ہوا مال ہے۔ اس کی قیمت لگ چکی ہے۔ جب یہ جان اپنی نہیں ہے تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس جان اور جسم کو سوائے اللہ کی عبادت کے دوسرے کام میں نہ لگایا جائے۔ لہٰذا اگر ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تمہیں صبح سے شام تک دوسرے کام کرنے کی اجازت نہیں، بس صرف سجدے میں پڑے رہا کرو اور اللہ اللہ کیا کرو، دوسرے کاموں کی اجازت نہیں، نہ کمانے کی اجازت ہے، نہ کھانے کی اجازت ہے، تو یہ حکم انصاف کے خلاف نہ ہوتا، اس لئے کہ پیدا ہی عبادت کے لئے کیا گیا ہے۔

ایسے خریدار پر قربان جایئے

لیکن قربان جایئے ایسے خریدار پر کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری جان و مال کو خرید بھی لیا، اور اس کی قیمت بھی پوری لگا دی، یعنی جنت، پھر وہ جان و مال ہمیں واپس بھی لوٹا دیا کہ یہ جان و مال تم اپنے پاس رکھ لو۔ اور ہمیں اس بات کی اجازت دیدی کہ کھاؤ، پیو، کماؤ، اور دنیا کے کاروبار کرو۔ بس پانچ وقت کی نماز پڑھ لیا کرو۔ اور فلاں فلاں چیزوں سے پرہیز کرو۔ باقی جس طرح چاہو، کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت اور عنایت ہے۔

اس ماہ میں اصل مقصد کی طرف آجاؤ

لیکن جائز کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی جانتے تھے کہ جب یہ انسان دنیا کے کاروبار اور کام دھندوں میں لگے گا تو رفتہ رفتہ اس کے دل پر غفلت کے پردے پڑ جایا کریں گے۔ اور دنیا کے کاروبار اور دھندوں میں کھو جائے گا۔ تو اس غفلت کو دور کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً کچھ اوقات مقرر فرما دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ اس لئے کہ سال کے گیارہ مہینے تو آپ تجارت میں، زراعت میں، مزدوری میں اور دنیا کے کاروبار اور دھندوں میں، کھانے کمانے اور ہنسنے بولنے میں لگے رہے۔ اور اس کے نتیجے میں دلوں پر غفلت کا پردہ پڑنے لگتا ہے۔ اس لئے ایک

(۱) التوبہ: ۱۱۱

مہینہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے مقرر فرمادیا کہ اس مہینے میں تم اپنے اصل مقصدِ تخلیق یعنی عبادت کی طرف لوٹ کر آؤ۔ جس کے لئے تمہیں دنیا میں بھیجا گیا، اور جس کے لئے تمہیں پیدا کیا گیا۔ اس ماہ میں اللہ کی عبادت میں لگو، اور گیارہ مہینے تک تم سے جو گناہ سرزد ہوئے ہیں، ان کو بخشواؤ، اور دل کی صلاحیتوں پر جو میل آچکا ہے، اس کو دھلواؤ، اور دل میں جو غفلت کے پردے پڑ چکے ہیں، ان کو اُٹھواؤ۔ اس کام کے لئے ہم نے یہ مہینہ مقرر کیا ہے۔

رَمَضان کے معنی

لفظ "رَمْضان" میم کے سکون کے ساتھ ہم غلط استعمال کرتے ہیں۔ صحیح لفظ "رَمَضان" میم کے زبر کے ساتھ ہے۔ اور "رمضان" کے لوگوں نے بہت سے معنی بیان کیے ہیں۔ لیکن اصل عربی زبان میں "رمضان" کے معنی ہیں "جھلسا دینے والا اور جلا دینے والا" اور اس ماہ کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ سب سے پہلے جب اس ماہ کا نام رکھا جارہا تھا، اس سال یہ مہینہ شدید جھلسا دینے والی گرمی میں آیا تھا۔ اس لئے لوگوں نے اس کا نام "رمضان" رکھ دیا۔

اپنے گناہ معاف کرالو

لیکن علماء نے فرمایا کہ اس ماہ کو "رمضان" اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل و کرم سے بندوں کے گناہوں کو جھلسا دیتے ہیں، اور جلا دیتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ مہینہ مقرر فرمایا۔ گیارہ مہینے دنیاوی کاروبار، دنیاوی دھندوں میں لگے رہنے کے نتیجے میں غفلتیں دل پر چھا گئیں، اور اس عرصہ میں جن گناہوں اور خطاؤں کا ارتکاب ہوا، ان کو اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر بخشوا لو۔ اور غفلت کے پردوں کو دل سے اُٹھا دو، تا کہ زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو جائے۔ اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾(۱)

یعنی یہ روزے تم پر اس لئے فرض کیے گئے ہیں تا کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔ تو رمضان کے مہینے کا اصل مقصد یہ ہے کہ سال بھر کے گناہوں کو بخشوانا، اور غفلت کے حجاب دل سے اُٹھانا، اور دلوں میں تقویٰ پیدا کرنا۔ جیسے کسی مشین کو جب کچھ عرصہ استعمال کیا جائے تو اس کے بعد اس کی سروس کرانی پڑتی ہے۔ اس کی صفائی کرانی ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی سروس

(۱) البقرة:۱۸۳

اور اوور ہالنگ کے لئے یہ رمضان المبارک کا مہینہ مقرر فرمایا ہے۔ تاکہ اس مہینے میں اپنی صفائی کراؤ، اور اپنی زندگی کو ایک نئی شکل دو۔

اس ماہ کو فارغ کرلیں

لہٰذا صرف روزہ رکھنے اور تراویح پڑھنے کی حد تک بات ختم نہیں ہوتی، بلکہ اس مہینے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس مہینے میں دوسرے کاموں سے فارغ کرلے۔ اس لئے کہ گیارہ مہینے تک زندگی کے دوسرے کام دھندوں میں لگے رہے۔ لیکن یہ مہینہ انسان کے لئے اس کی اصل مقصدِ تخلیق کی طرف لوٹنے کا مہینہ ہے۔ اس لئے اس مہینے کے تمام اوقات، ورنہ کم از کم اکثر اوقات یا جتنا زیادہ سے زیادہ ہوسکے، اللہ کی عبادت میں صرف کرے۔ اور اس کے لئے انسان کو پہلے سے تیار ہونا چاہئے۔ اور اس کا پہلے سے پروگرام بنانا چاہئے۔

استقبالِ رمضان کا صحیح طریقہ

آج کل عالمِ اسلام میں ایک بات چل پڑی ہے۔ جس کی ابتداء عرب ممالک خاص کر مصر اور شام سے ہوئی۔ اور پھر دوسرے ملکوں میں بھی رائج ہوگئی۔ اور ہمارے یہاں بھی آگئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ رمضان شروع ہونے سے پہلے کچھ محفلیں منعقد ہوتی ہیں جس کا نام "محفلِ استقبالِ رمضان" رکھا جاتا ہے۔ جس میں رمضان سے ایک دو دن پہلے ایک اجتماع منعقد کیا جاتا ہے اور اس میں قرآن کریم اور تقریر اور وعظ رکھا جاتا ہے۔ جس کا مقصد لوگوں کو یہ بتلانا ہوتا ہے کہ ہم رمضان المبارک کا استقبال کر رہے ہیں اور اس کو "خوش آمدید" کہہ رہے ہیں ـــــ رمضان المبارک کے استقبال کا یہ جذبہ بہت اچھا ہے، لیکن یہی اچھا جذبہ جب آگے بڑھتا ہے تو کچھ عرصہ کے بعد بدعت کی شکل اختیار کرلیتا ہے، چنانچہ بعض جگہوں پر اس استقبال کی محفل نے بدعت کی شکل اختیار کرلی ـــــ لیکن رمضان المبارک کا اصل استقبال یہ ہے کہ رمضان آنے سے پہلے اپنے نظام الاوقات بدل کر ایسا بنانے کی کوشش کرو کہ اس میں زیادہ سے زیادہ وقت اللہ جل شانہ کی عبادت میں صرف ہو، رمضان کا مہینہ آنے سے پہلے یہ سوچو کہ یہ مہینہ آرہا ہے، کس طرح میں اپنی مصروفیات کم کرسکتا ہوں۔ اس مہینے میں اگر کوئی شخص اپنے آپ کو بالکلیہ عبادت کے لئے فارغ کرلے تو سبحان اللہ، اور اگر کوئی شخص بالکلیہ اپنے آپ کو فارغ نہیں کرسکتا تو پھر یہ دیکھے کہ کون کون سے کام ایک ماہ کے لئے چھوڑ سکتا ہوں، ان کو چھوڑے۔ اور کن مصروفیات کو کم کرسکتا ہوں، ان کو کم کرے، اور جن کاموں کو رمضان کے بعد تک مؤخر کرسکتا ہے، ان کو مؤخر کرے۔ اور رمضان کے زیادہ سے زیادہ اوقات کو عبادت میں لانے کی فکر

کرے۔ میرے نزدیک استقبالِ رمضان کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ اگر یہ کام کرلیا تو انشاء اللہ رمضان المبارک کی صحیح روح اور اس کے انوار و برکات حاصل ہوں گے ــــــ ورنہ یہ ہوگا کہ رمضان المبارک آئے گا اور چلا جائے گا۔ اور اس سے صحیح طور پر فائدہ ہم نہیں اٹھا سکیں گے۔

روزہ اور تراویح سے ایک قدم آگے

جب رمضان المبارک کو دوسرے مشاغل سے فارغ کرلیا، تو اب اس فارغ وقت کو کس کام میں صرف کرے؟ جہاں تک روزوں کا تعلق ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ روزہ رکھنا فرض ہے۔ اور جہاں تک تراویح کا معاملہ ہے، اس سے بھی ہر شخص واقف ہے۔ لیکن ایک پہلو کی طرف خاص طور پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

وہ یہ کہ الحمدللہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے، اس کے دل میں رمضان المبارک کا ایک احترام اور اس کا تقدس ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس ماہِ مبارک میں اللہ کی عبادت کچھ زیادہ کرے۔ اور کچھ نوافل زیادہ پڑھے۔ جو لوگ عام دنوں میں پانچ وقت کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد میں آنے سے کتراتے ہیں، وہ لوگ بھی تراویح جیسی لمبی نماز میں بھی روزانہ شریک ہوتے ہیں۔ یہ سب الحمدللہ اس ماہ کی برکت ہے کہ لوگ عبادت میں، نماز میں، ذکر و اذکار اور تلاوتِ قرآن میں مشغول ہوتے ہیں۔

ایک مہینہ اس طرح گزار لو

لیکن ان سب نفلی نمازوں، نفلی عبادات، نفلی ذکر و اذکار، اور نفلی تلاوتِ قرآن کریم سے زیادہ مقدم ایک اور چیز ہے۔ جس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس مہینے کو گناہوں سے پاک کرکے گزارنا کہ اس ماہ میں ہم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔ اس مبارک مہینے میں آنکھ نہ بہکے، نظر غلط جگہ پر نہ پڑے، کان غلط چیز نہ سنیں۔ زبان سے کوئی غلط کلمہ نہ نکلے۔ اور اللہ تبارک کی معصیت سے مکمل اجتناب ہو، یہ مبارک مہینہ اگر اس طرح گزار لیا، پھر چاہے ایک نفلی رکعت نہ پڑھی ہو، اور تلاوت زیادہ نہ کی ہو، اور نہ ذکر و اذکار کیا ہو، لیکن گناہوں سے بچتے ہوئے اللہ کی معصیت اور نافرمانی سے بچتے ہوئے یہ مہینہ گزار دیا تو آپ قابلِ مبارک باد ہیں۔ اور یہ مہینہ آپ کے لئے مبارک ہے۔ گیارہ مہینے تک ہر قسم کے کام میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور یہ اللہ تبارک کا ایک مہینہ آرہا ہے۔ کم از کم اس کو تو گناہوں سے پاک کرلو۔ اس میں تو اللہ کی نافرمانی نہ کرو۔ اس میں تو کم از کم جھوٹ نہ بولو۔ اس میں تو غیبت نہ کرو۔ اس میں تو بدنگاہی کے اندر مبتلا نہ ہو۔ اس مبارک مہینے میں تو کانوں کو غلط جگہ پر استعمال نہ کرو۔

اس میں تو رشوت نہ کھاؤ، اس میں سود نہ کھاؤ، کم از کم یہ ایک مہینہ اس طرح گزار لو۔

یہ کیسا روزہ ہوا؟

اس لئے کہ آپ روزے تو ماشاء اللہ بڑے ذوق وشوق سے رکھ رہے ہیں، لیکن روزے کے کیا معنی ہیں؟ روزے کے معنی یہ ہیں کہ کھانے سے اجتناب کرنا، پینے سے اجتناب اور نفسانی خواہشات کی تکمیل سے اجتناب کرنا، روزے میں ان تینوں چیزوں سے اجتناب ضروری ہے۔ اب یہ دیکھیں کہ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جو فی نفسہ حلال ہیں، کھانا حلال، پینا حلال اور جائز طریقے سے زوجین کا نفسانی خواہشات کی تکمیل کرنا حلال، اب روزے کے دوران آپ ان حلال چیزوں سے تو پرہیز کر رہے ہیں۔ نہ کھا رہے ہیں اور نہ پی رہے ہیں۔ لیکن جو چیزیں پہلے سے حرام تھیں، مثلاً جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، بدنگاہی کرنا، جو ہر حال میں حرام تھیں، روزے میں یہ سب چیزیں ہو رہی ہیں۔ اب روزہ رکھا ہوا ہے۔ اور جھوٹ بول رہے ہیں۔ روزہ رکھا ہوا ہے اور غیبت کر رہے ہیں۔ روزہ رکھا ہوا ہے اور بدنگاہی کر رہے ہیں۔ اور روزہ رکھا ہوا ہے لیکن وقت پاس کرنے کے لئے گندی گندی فلمیں دیکھ رہے ہیں۔ یہ کیا روزہ ہوا کہ حلال چیز تو چھوڑ دی اور حرام چیز نہیں چھوڑی۔ اس لئے حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا نہ چھوڑے تو مجھے اس کے بھوکا اور پیاسا رہنے کی کوئی حاجت نہیں'' (۱)

اس لئے جب جھوٹ بولنا نہیں چھوڑا جو پہلے سے حرام تھا تو کھانا چھوڑ کر اس نے کونسا بڑا عمل کیا۔

روزہ کا ثواب ملیامیٹ ہو گیا

اگرچہ فقہی اعتبار سے روزہ درست ہو گیا۔ اگر کسی مفتی سے پوچھو گے کہ میں نے روزہ بھی رکھا تھا، اور جھوٹ بھی بولا تھا، تو وہ مفتی یہی جواب دے گا کہ روزہ درست ہو گیا۔ اس کی قضا واجب نہیں۔ لیکن اس کی قضا واجب نہ ہونے کے باوجود اس روزے کا ثواب اور برکات ملیامیٹ ہو گئیں، اس واسطے کہ تم نے اس روزے کی روح حاصل نہیں کی۔

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب الصوم، باب من لم يدع قول الزور والعمل به في الصوم، رقم: ۱۷۷۰، سنن الترمذی، كتاب الصوم عن رسول الله، رقم: ٦٤١، سنن أبي داؤد، كتاب الصوم، رقم: ۲۰۱۵، سنن ابن ماجه، كتاب الصيام، رقم: ۱٦۷۹، مسند أحمد، رقم: ۹٤٦۳

روزہ کا مقصد تقویٰ کی شمع روشن کرنا

میں نے آپ کے سامنے جو یہ آیت تلاوت کی:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ﴾(۱)

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے پچھلی اُمتوں پر فرض کیے گئے۔ کیوں روزے فرض کیے گئے؟ تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو، یعنی روزہ اصل میں اس لئے تمہارے ذمہ مشروع کیا گیا تاکہ اس کے ذریعہ تمہارے دل میں تقویٰ کی شمع روشن ہو۔ روزے سے تقویٰ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

روزہ تقویٰ کی سیڑھی ہے

بعض علماء کرام نے فرمایا کہ روزے سے تقویٰ اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ روزہ انسان کی قوتِ حیوانیہ اور قوتِ بہیمیہ کو توڑتا ہے۔ جب آدمی بھوکا رہے گا تو اس کی وجہ سے اس کی حیوانی خواہشات اور حیوانی تقاضے کچلے جائیں گے۔ جس کے نتیجے میں گناہ پر اقدام کرنے کا داعیہ اور جذبہ سست پڑ جائے گا۔

لیکن ہمارے حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ ـــ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین ـــ نے فرمایا کہ صرف قوتِ بہیمیہ توڑنے کی بات نہیں ہے، بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ جب آدمی صحیح طریقے سے روزہ رکھے گا تو یہ روزہ خود تقویٰ کی ایک عظیم الشان سیڑھی ہے۔ اس لئے کہ تقویٰ کے کیا معنی ہیں؟ تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ جل جلالہ کی عظمت کے استحضار کی بنا پر گناہوں سے بچنا، یعنی یہ سوچ کر کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، اور اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر مجھے جواب دینا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، اس تصور کے بعد جب انسان گناہوں کو چھوڑتا ہے تو اسی کا نام تقویٰ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی﴾(۲)

یعنی جو شخص اس بات سے ڈرتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہونا ہے، اور کھڑا ہونا ہے، اور اس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو ہوائے نفس اور خواہشات سے روکتا ہے، یہی تقویٰ ہے۔

(۱) البقرة: ۱۸۳ (۲) النازعات: ۴۰

میرا مالک مجھے دیکھ رہا ہے

لہٰذا ''روزہ'' حصولِ تقویٰ کے لئے بہترین ٹریننگ اور بہترین تربیت ہے، جب روزہ رکھ لیا تو آدمی پھر کیسا ہی گنہگار، خطا کار اور فاسق و فاجر ہو، جیسا بھی ہو، لیکن روزہ رکھنے کے بعد اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ سخت گرمی کا دن ہے، اور سخت پیاس لگی ہوئی ہے، اور کمرہ میں اکیلا ہے، کوئی دوسرا پاس موجود نہیں، اور دروازے پر کنڈی لگی ہوئی ہے، اور کمرہ میں فریج موجود ہے، اور اس فریج میں ٹھنڈا پانی موجود ہے۔ اس وقت انسان کا نفس یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس شدید گرمی کے عالم میں ٹھنڈا پانی پی لوں، لیکن کیا وہ شخص فریج سے ٹھنڈا پانی نکال کر پی لے گا؟ ہرگز نہیں پیئے گا۔ حالانکہ اگر وہ پانی پی لے تو کسی بھی انسان کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ کوئی لعنت اور ملامت کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور دنیا والوں کے سامنے وہ روزہ دار ہی رہے گا، اور شام کو باہر نکل کر آرام سے لوگوں کے ساتھ افطاری کھالے تو کسی شخص کو بھی پتہ نہیں چلے گا کہ اس نے روزہ توڑ دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ پانی نہیں پیتا ہے، کیوں نہیں پیتا؟ پانی نہ پینے کی اس کے علاوہ کوئی اور وجہ نہیں ہے کہ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگرچہ کوئی مجھے نہیں دیکھ رہا ہے، لیکن میرا مالک جس کے لئے میں نے روزہ رکھا ہے، وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں ہی اس کا بدلہ دوں گا

اسی لئے اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزِیْ بِهٖ))(۱)

''روزہ میرے لئے ہے۔ لہٰذا میں ہی اس کی جزا دوں گا''

اور اعمال کے بارے میں تو یہ فرمایا کہ کسی عمل کا دس گنا اجر، کسی عمل کا ستر گنا اجر، اور کسی عمل کا سو گنا اجر ہے۔ حتیٰ کہ صدقہ کا اجر سات سو گنا ہے، لیکن روزے کے بارے میں فرمایا کہ روزے کا اجر میں دوں گا۔ کیونکہ روزہ اس نے صرف میرے لئے رکھا تھا۔ اس لئے کہ شدید گرمی کی وجہ سے جب حلق میں کانٹے لگ رہے ہیں۔ اور زبان پیاس سے خشک ہے۔ اور فریج میں ٹھنڈا پانی موجود ہے۔ اور تنہائی ہے۔ اور کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود میرا بندہ صرف اس لئے پانی نہیں پی رہا

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللّٰه تعالی یریدون أن یبدلوا کلام اللّٰه، رقم: ۶۹۳۸، صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام، رقم: ۱۹۴۶، سنن الترمذی، کتاب الصیام عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فی فضل الصوم، رقم: ۶۹۵، سنن النسائی، کتاب الصیام، باب فضل الصیام، رقم: ۲۱۸۱، مسند أحمد، رقم: ۴۰۳۶

ہے کہ اس کے دل میں میرے سامنے کھڑا ہونے اور جواب دہی کا ڈر اور احساس ہے۔ اس احساس کا نام تقویٰ ہے۔ اگر یہ احساس پیدا ہوگیا تو تقویٰ بھی پیدا ہوگیا۔ لہٰذا تقویٰ روزے کی ایک شکل بھی ہے۔ اور اس کے حصول کی ایک سیڑھی بھی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے روزے اس لئے فرض کیے تاکہ تقویٰ کی عملی تربیت دیں۔

ورنہ یہ تربیتی کورس مکمل نہیں ہوگا

اور جب تم روزے کے ذریعہ یہ عملی تربیت حاصل کر رہے ہو، تو پھر اس کو اور ترقی دو، اور آگے بڑھاؤ، لہٰذا جس طرح روزے کی حالت میں شدتِ پیاس کے باوجود پانی پینے سے رک گئے تھے، اور اللہ کے خوف سے کھانا کھانے سے رک گئے تھے، اسی طرح جب کاروبارِ زندگی میں نکلو، اور وہاں پر اللہ کی معصیت اور نافرمانی کا تقاضا اور داعیہ پیدا ہو تو یہاں بھی اللہ کے خوف سے اس معصیت سے رک جاؤ، لہٰذا ایک مہینے کے لئے ہم تمہیں ایک تربیتی کورس سے گزار رہے ہیں۔ اور یہ تربیتی کورس اس وقت مکمل ہوگا جب کاروبارِ زندگی میں ہر موقع پر اس پر عمل کرو، ورنہ اس طرح یہ تربیتی کورس مکمل نہیں ہوگا کہ اللہ کے خوف سے پانی پینے سے تو رک گئے، اور جب کاروبارِ زندگی میں نکلے تو پھر آنکھ غلط جگہ پر پڑ رہی ہے۔ کان بھی غلط باتیں سن رہے ہیں۔ زبان سے بھی غلط باتیں نکل رہی ہیں۔ اس طرح تو یہ کورس مکمل نہیں ہوگا۔

روزہ کا ایئر کنڈیشنر لگا دیا، لیکن!

جس طرح علاج ضروری ہے، اسی طرح پرہیز بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ اس لئے رکھوایا تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو، لیکن تقویٰ اس وقت پیدا ہوگا جب اللہ کی نافرمانیوں اور معصیتوں سے پرہیز کرو گے۔ مثلاً کمرہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے آپ نے اس میں ایئر کنڈیشنر لگایا، اور ایئر کنڈیشنر کا تقاضا یہ ہے کہ وہ پورے کمرے کو ٹھنڈا کر دے، اب آپ نے اس کو آن کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے۔ اِدھر سے ٹھنڈک آ رہی ہے، اور اُدھر سے نکل رہی ہے۔ لہٰذا کمرہ ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ بالکل اسی طرح یہ سوچئے کہ روزہ کا ایئر کنڈیشنر تو آپ نے لگا دیا، لیکن ساتھ ہی دوسری طرف اللہ کی نافرمانی اور معاصی کے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں۔ اب بتایئے ایسے روزے سے کوئی فائدہ حاصل ہوگا؟

اصل مقصد ''حکم کی اتباع''

اسی طرح روزے کے اندر یہ حکمت کہ اس کا مقصد قوتِ بہیمیہ توڑنا ہے، یہ بعد کی حکمت ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ ان کے حکم کی اتباع ہو۔ اور سارے دین کا مدار اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کی اتباع ہے۔ وہ جب کہیں کہ کھاؤ، اس وقت کھانا دین ہے۔ اور جب وہ کہیں کہ مت کھاؤ، اس وقت نہ کھانا دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور اپنی اتباع کا عجیب نظام بنایا ہے کہ سارا دن تو روزہ رکھنے کا حکم دیا، اور اس پر بڑا اجر وثواب رکھا، لیکن ادھر آفتاب غروب ہوا، ادھر یہ حکم آگیا کہ اب جلدی افطار کرو، اور افطار میں جلدی کرنے کو مستحب قرار دیا۔ اور بلاوجہ افطار میں تاخیر کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ کیوں ناپسندیدہ ہے؟ اس لئے کہ جب آفتاب غروب ہوگیا تو اب ہمارا یہ حکم آگیا کہ اب بھی اگر نہیں کھاؤ گے، اور بھوکے رہو گے تو یہ بھوک کی حالت ہمیں پسند نہیں۔ اس لئے کہ اصل کام ہماری اتباع کرنا ہے۔ اپنا شوق پورا نہیں کرنا ہے۔

عام حالات میں دنیا کی کسی چیز کی حرص اور ہوس بہت بری چیز ہے۔ لیکن جب وہ کہیں کہ حرص کرو، تو پھر حرص ہی میں لطف اور مزہ ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ۔

چوں طمع خواہد ز من سلطان دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

جب سلطانِ دین یہ چاہ رہے ہیں کہ میں حرص اور طمع کروں تو پھر قناعت کے سر پر خاک، پھر قناعت میں مزہ نہیں ہے۔ پھر تو طمع اور حرص میں مزہ ہے، یہ افطار میں جلدی کرنے کا حکم اسی وجہ سے ہے۔ غروبِ آفتاب سے پہلے تو یہ حکم تھا ایک ذرہ بھی اگر منہ میں چلا گیا تو گناہ بھی لازم اور کفارہ بھی لازم، مثلاً سات بجے آفتاب غروب ہورہا تھا۔ اب اگر کسی شخص نے چھ بج کر انسٹھ منٹ پر ایک چنے کا دانہ کھالیا۔ اب بتایئے کہ روزہ میں کتنی کمی آئی؟ صرف ایک منٹ کی کمی آئی، ایک منٹ کا روزہ توڑا، لیکن اس ایک منٹ کے روزے کے کفارے میں ساٹھ دن کے روزے رکھنے واجب ہیں، اس لئے کہ بات صرف ایک چنے اور ایک منٹ کی نہیں ہے، بات دراصل یہ ہے کہ اس نے ہمارا حکم توڑا، ہمارا حکم یہ تھا کہ جب تک آفتاب غروب نہ ہوجائے اس وقت تک کھانا جائز نہیں، لیکن تم نے یہ حکم توڑ دیا، لہٰذا اب ایک منٹ کے بدلے میں ساٹھ دن کے روزے رکھو۔

افطار میں جلدی کرو

اور پھر جیسے ہی آفتاب غروب ہوگیا تو یہ حکم آگیا کہ اب جلدی کھاؤ، اگر بلاوجہ تاخیر کردی تو

گناہ ہوگا، کیوں؟ اس واسطے کہ ہم نے حکم دیا تھا کہ کھاؤ، اب کھانا ضروری ہے۔

سحری میں تاخیر افضل ہے

سحری کے بارے میں حکم یہ ہے کہ سحری تاخیر سے کھانا افضل ہے۔ جلدی کھانا خلاف سنت ہے، بعض لوگ رات کو بارہ بجے سحری کھا کر سو جاتے ہیں، یہ خلاف سنت ہے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہی معمول تھا کہ بالکل آخری وقت تک کھاتے تھے۔ اس واسطے کہ یہ وہ وقت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ صرف یہ کہ کھانے کی اجازت ہے بلکہ کھانے کا حکم ہے، اس لئے جب تک وہ وقت باقی رہے گا، ہم کھاتے رہیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع اور اطاعت اسی میں ہے، اب اگر کوئی شخص پہلے سحری کھالے تو گویا کہ اس نے روزے کے وقت میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا، اس لئے پہلے سے سحری کھانے کو ممنوع قرار دیا۔ پورے دین میں سارا کھیل اتباع کا ہے، جب ہم نے کہا کہ کھاؤ تو کھانا ثواب ہے، اور جب ہم نے کہا کہ مت کھاؤ تو نہ کھانا ثواب ہے۔ اس لئے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جب اللہ میاں کہہ رہے ہیں کہ کھاؤ، اور بندہ کہے کہ میں تو نہیں کھاتا، یا میں کم کھاتا ہوں، یہ تو بندگی اور اطاعت نہ ہوئی۔ ارے بھائی! نہ تو کھانے میں کچھ رکھا ہے اور نہ ہی نہ کھانے میں کچھ رکھا ہے۔ سب کچھ ان کی اطاعت میں ہے، اس لئے جب انہوں نے کہہ دیا کہ کھاؤ، تو پھر کھاؤ، اس میں اپنی طرف سے زیادہ پابندی کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک مہینہ بغیر گناہ کے گزار لو

البتہ اہتمام کرنے کی چیز یہ ہے کہ جب روزہ رکھ لیا تو اب اپنے آپ کو گناہوں سے بچاؤ۔ آنکھوں کو بچاؤ، کانوں کو بچاؤ، زبانوں کو بچاؤ۔ ایک رمضان کے موقع پر ہمارے حضرت قدس اللہ سرہ نے یہاں تک فرمایا کہ میں ایک ایسی بات کہتا ہوں جو کوئی اور نہیں کہے گا۔ وہ یہ کہ اپنے نفس کو اس طرح بہلاؤ، اور اس سے عہد کرلو کہ ایک مہینہ بغیر گناہ کے گزار لو۔ جب یہ ایک مہینہ گزر جائے تو پھر تیرا جو جی چاہے کرنا۔ چنانچہ حضرت والا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ جب یہ ایک مہینہ بغیر گناہ کے گزر جائے گا، تو پھر اللہ تعالیٰ خود اس کے دل میں گناہ چھوڑنے کا داعیہ پیدا فرما دیں گے۔ لیکن یہ عہد کرلو کہ یہ اللہ کا مہینہ آرہا ہے۔ یہ عبادت کا مہینہ ہے۔ یہ تقویٰ پیدا کرنے کا مہینہ ہے۔ ہم اس میں گناہ نہیں کریں گے۔ اور ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ وہ کن گناہوں میں مبتلا ہے۔ پھر ان سب کے بارے میں یہ عہد کرلے کہ میں ان میں مبتلا نہیں ہوں گا۔ مثلاً یہ عہد کرلے کہ رمضان المبارک میں آنکھ غلط جگہ پر نہیں اُٹھے گی۔ کان غلط بات نہیں سنیں گے۔ زبان سے غلط

بات نہیں نکلے گی۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ روزہ بھی رکھا ہوا ہے اور فواحشات کو بھی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں، اور اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اس ماہ میں رزقِ حلال

دوسری اہم بات جو ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کم از کم اس ایک مہینے میں تو رزقِ حلال کا اہتمام کرلو، جو لقمہ آئے، وہ حلال کا آئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ روزہ تو اللہ کے لئے رکھا، اور اس کو حرام چیز سے افطار کررہے ہیں۔ سود پر افطار ہو رہا ہے۔ یا رشوت پر افطار ہو رہا ہے۔ یا حرام آمدنی پر افطار ہو رہا ہے۔ یہ کیسا روزہ ہوا کہ سحری بھی حرام اور افطاری بھی حرام، اور درمیان میں روزہ۔ اس لئے خاص طور پر اس مہینے میں حرام روزی سے بچو۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! میں رزقِ حلال کھانا چاہتا ہوں۔ مجھے رزقِ حرام سے بچالیجئے۔

حرام آمدنی سے بچیں

بعض حضرات وہ ہیں جن کا بنیادی ذریعۂ معاش۔ الحمدللہ۔ حرام نہیں ہے، بلکہ حلال ہے، البتہ اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے کچھ حرام آمدنی کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ایسے حضرات کے لئے حرام سے بچنا کوئی دشوار کام نہیں ہے، وہ کم از کم اس ماہ میں تھوڑا سا اہتمام کرلیں، اور حرام آمدنی سے بچیں۔ یہ عجیب قصہ ہے کہ اس ماہ کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ یہ صبر کا مہینہ ہے۔ یہ مواسات اور غم خواری کا مہینہ ہے۔ ایک دوسرے سے ہمدردی کا مہینہ ہے۔ لیکن اس ماہ میں مواسات کے بجائے لوگ اُلٹا کھال کھینچنے کی فکر کرتے ہیں۔ اِدھر رمضان المبارک کا مہینہ آیا، اور اُدھر چیزوں کی ذخیرہ اندوزی شروع کردی۔ لہٰذا کم از کم اس ماہ میں اپنے آپ کو ایسے حرام کاموں سے ضرور بچالیں۔

اگر آمدنی مکمل حرام ہے تو پھر؟

بعض حضرات وہ ہیں جن کا ذریعہ آمدنی مکمل طور پر حرام ہے، مثلاً وہ کسی سودی ادارے میں ملازم ہیں، ایسے حضرات اس ماہ میں کیا کریں؟ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ ـــــ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ ـــــ ہر آدمی کے لئے راستہ بتا گئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں ایسے آدمی کو جس کی مکمل آمدنی حرام ہے، یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اگر ہوسکے تو رمضان میں چھٹی لے لے، اور کم از کم اس ماہ کے خرچ کے لئے جائز اور حلال ذریعہ سے انتظام کرلے۔ کوئی جائز آمدنی کا ذریعہ اختیار کرلے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو اس ماہ کے خرچ کے لئے کسی سے قرض لے لے۔ اور

یہ سوچ کہ میں اس مہینہ میں حلال آمدنی سے کھاؤں گا۔ اور اپنے بچوں کو بھی حلال کھلاؤں گا، کم از کم اتنا تو کرلے۔

گناہوں سے بچنا آسان ہے

بہرحال! میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ لوگ اس مہینے میں نوافل وغیرہ کا تو اہتمام بہت کرتے ہیں، لیکن گناہوں سے بچنے کا اتنا اہتمام نہیں کرتے۔ حالانکہ اس ماہ میں شیطان کو بیڑیاں پہنادی جاتی ہیں۔ اور ان کو قید کردیا جاتا ہے۔ لہٰذا شیطان کی طرف سے گناہ کرنے کے وسوسے اور تقاضے ختم ہوجاتے ہیں۔ اس لئے گناہوں سے بچنا آسان ہوجاتا ہے۔

روزے میں غصے سے پرہیز

تیسری بات جس کا روزے سے خاص تعلق ہے، وہ ہے غصے سے اجتناب اور پرہیز، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ مواسات کا مہینہ ہے۔ ایک دوسرے سے غمخواری کا مہینہ ہے۔ لہٰذا غصہ اور غصہ کی وجہ سے سرزد ہونے والے جرائم اور گناہ، مثلاً جھگڑا، مار پٹائی اور تو تکار، ان چیزوں سے پرہیز کا اہتمام کریں۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے یہاں تک فرمادیا:

((وَإِنْ جَهِلَ عَلٰى اَحَدِكُمْ جَاهِلٌ وَهُوَ صَائِمٌ، فَلْيَقُلْ إِنِّي صَائِمٌ))(۱)

''اگر کوئی شخص تم سے جہالت اور لڑائی کی بات کرے تو تم کہہ دو کہ میرا روزہ ہے''

میں لڑنے کے لئے تیار نہیں۔ نہ زبان سے لڑنے کے لئے تیار ہوں، اور نہ ہاتھ سے۔ اس سے پرہیز کریں۔ یہ سب بنیادی کام ہیں۔

رمضان میں نفلی عبادات زیادہ کریں

جہاں تک عبادات کا تعلق ہے، تمام مسلمان ماشاء اللہ جانتے ہی ہیں کہ روزہ رکھنا، تراویح پڑھنا ضروری ہے، اور تلاوتِ قرآن کو چونکہ اس مہینے سے خاص مناسبت ہے، چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ رمضان کے مہینے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ پورے قرآن کریم کا دور فرمایا کرتے تھے۔ اس

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصوم عن رسول الله، باب ما جاء فی فضل الصوم، رقم: ۶۹۵، سنن ابن ماجه، کتاب الصیام، باب ما جاء فی الغیبة والرفث الصائم، رقم: ۱۶۸۱، مسند أحمد، مسند أبي هريرة، رقم: ۷۵۰۴

لئے جتنا زیادہ سے زیادہ ہو سکے، اس مہینے میں تلاوت کریں۔ اور اس کے علاوہ چلتے، پھرتے، اُٹھتے، بیٹھتے زبان پر اللہ کا ذکر کریں۔ اور تیسرا کلمہ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ، اور درود شریف اور استغفار کا چلتے پھرتے اس کی کثرت کا اہتمام کریں۔ اور نوافل کی جتنی کثرت ہو سکے، کریں۔ اور عام دنوں میں رات کو اُٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنے کا موقع نہیں ملتا، لیکن رمضان المبارک میں چونکہ انسان سحری کے لئے اُٹھتا ہے، تھوڑا پہلے اُٹھ جائے، اور سحری سے پہلے تہجد پڑھنے کا معمول بنالے۔ اور اس ماہ میں نماز خشوع کے ساتھ اور مرد با جماعت نماز پڑھنے کا اہتمام کرلیں۔

یہ سب کام تو اس ماہ میں کرنے ہی چاہئیں۔ یہ رمضان المبارک کی خصوصیات میں سے ہیں۔ لیکن ان سب چیزوں سے زیادہ اہم گناہوں سے بچنے کی فکر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور رمضان المبارک کے انوار و برکات سے صحیح طور پر مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

حج کی اہمیت ☆

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

آج عرفہ کا دن ہے، یہ دن ایک مسلمان کی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، عرفہ کے دن ہزار ہا مسلمانوں کی ایک ایسی عبادت تکمیل پاتی ہے جو نہ صرف یہ کہ بذاتِ خود ایک اعلیٰ عبادت ہے بلکہ بہت سی عبادتوں کا مجموعہ اور بہت سی پاکیزہ صفات کا سرچشمہ ہے، آج کے دن لاکھوں فرزندانِ توحید محض خدا کو یاد کرنے کے لئے ایک ایسے میدان میں جمع ہوتے ہیں جس پر خدا کی رحمتوں کے سوا کسی چیز کا سایہ نہیں ہے۔ اس حدِ نظر تک پھیلے ہوئے خشک ریگستان میں کالے اور گورے، عربی اور عجمی، امیر اور غریب اور حاکم اور محکوم کے درمیان ہر امتیاز مٹ جاتا ہے۔ یہاں ایک جاہ وجلال والا بادشاہ بھی اپنے مالک کے حضور جیسے ایک بے کس اور بے سہارا مزدور۔

یہاں سینکڑوں ملکوں سے آئے ہوئے لاکھوں انسان ایک ہی لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں۔
یہ سب ایک ہی خدا کو پکارتے ہیں اور ان سب کی زبان پر ایک ہی روح پرور نعرہ ہوتا ہے:

"لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ"

حج کی یہ دلآویز عبادت جو سرزمینِ حجاز کی مقدس وادیوں میں ادا کی جاتی ہے تمام عبادتوں میں ایک منفرد اور نرالی شان رکھتی ہے۔ اس عبادت نے عشق کے اس جذبے کو ایک صحیح رُخ مہیا کیا ہے جو انسان کی فطرت میں داخل ہے، اور جس کی وجہ سے وہ کبھی کبھی "پاسبانِ عقل" کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یہ عبادت ہمیں یہ سکھلاتی ہے کہ عشق ومحبت کی صحیح حقدار صرف وہ ذات ہے جس نے تمہیں اور اس کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے، اگر پوجنا ہے تو اسی کو پوجو، چاہنا ہے تو اسی کو چاہو، پکارنا ہے تو اسی کو پکارو، مانگنا ہے تو اسی سے مانگو، کسی کے کوچے میں چکر کاٹنے کو جی چاہتا ہے تو اسی کے گھر کا طواف کرو، اور کسی کی یاد میں سرگرداں پھرنا چاہتے ہو تو اسی کی یاد میں سرگرداں پھرو۔

قرآن کریم نے بہت سے مواقع پر حج کی اہمیت اور فضیلت کو واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے،

☆ نشری تقریریں، ص: ۵۱-۵۸، فرد کی اصلاح، ص: ۱۷

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾(۱)

''اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو شخص اس کے گھر تک آنے کی قدرت رکھتا ہو وہ حج کے لئے آئے''

اسلام نے اس عبادت کی کس قدر تاکید کی ہے اس کا اندازہ رسول کریم ﷺ کے اس ارشاد سے ہوگا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ لَمْ يَمْنَعْهُ عَنِ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ أَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ أَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ فَمَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ إِنْ شَاءَ يَهُوْدِيًّا وَإِنْ شَاءَ نَصْرَانِيًّا)) (۲)

''جس شخص کو نہ کسی کھلی ضرورت نے حج سے روکا ہو، نہ کسی ظالم سلطان نے، اور نہ کسی روکنے والے مرض نے، اور اس کے باوجود وہ حج کیے بغیر مرجائے تو اسے اختیار ہے خواہ یہودی بن کر مرے یا نصرانی بن کر''

دوسری طرف اس عبادت کی طرف ترغیب دیتے ہوئے بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں ارشاد ہے:

((اَلْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ)) (۳)

''جو حج اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے اس کا صلہ جنت کے سوا کچھ نہیں''

صحیح مسلم کی ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ يَوْمٍ أَكْثَرَ مِنْ أَنْ يُعْتِقَ اللّٰهُ فِيْهِ عَبْدًا مِنَ النَّارِ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ)) (٤)

---

(۱) آل عمران: ۹۷

(۲) سنن الدارمی، کتاب المناسك، باب من مات ولم یحج، رقم: ۱۷۱۹

(۳) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب وجوب العمرة وفضلها، رقم: ۱٦۵۰، صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فی فضل الحج والعمرة ویوم عرفة، رقم: ۲٤۰۳، سنن الترمذی، کتاب الحج عن رسول اللّٰہ، باب ما ذکر فی فضل العمرة، رقم: ۸۵۵، سنن النسائی، کتاب مناسك الحج، باب فضل العمرة، رقم: ۲۵۸۲، سنن ابن ماجه، کتاب المناسك، باب فضل الحج والعمرة، رقم: ۲۸۷۹

(٤) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فی فضل الحج والعمرة ویوم عرفة، رقم: ۲٤۰۲، سنن النسائی، کتاب مناسك الحج، باب ما ذکر فی یوم عرفة، رقم: ۲۹۵۳، سنن ابن ماجه، کتاب المناسك، باب الدعاء بعرفة، رقم: ۳۰۰۵

''اللہ تعالیٰ جتنے بندوں کو عرفہ کے دن آگ کے عذاب سے آزاد کرتا ہے اتنا کسی اور دن نہیں کرتا''

سوال یہ ہے کہ اس عاشقانہ عبادت کو اسلام میں اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ قرآن کریم نے صرف ایک مختصر جملے میں حج کی حکمتوں کو سمیٹ دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ (۱)

(یعنی حج کی حکمت یہ ہے) کہ لوگ یہاں آکر کھلی آنکھوں دیکھیں کہ اس حج میں ان کے لئے کیسے کیسے فائدے ہیں۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ حج کے فوائد اور حکمتوں کا تھوڑا بہت اندازہ اسی خوش نصیب کو ہوتا ہے جسے اللہ نے اس عظیم سعادت کی توفیق بخشی ہو، وہاں پہنچ کر بلاشبہ وہ کھلی آنکھوں ان فوائد کا مشاہدہ کرتا ہے جنہیں دیکھنا تصور کی نگاہ کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔

تاہم آیئے! اس عبادت کے اعمال وافعال پر ایک سرسری نظر ڈال کر ان بعض حکمتوں کا ایک معمولی سا اندازہ کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے تصور کے دائرے میں آسکتی ہیں۔

حج کی عبادت میں سب سے پہلی بات جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سے انسان کو بے شمار پاکیزہ صفات سے آراستہ ہونے اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھارنے کا خوب موقع ملتا ہے، ذرا تصور کیجئے کہ جو شخص حجِ بیت اللہ کا عزم کر کے اپنے گھر سے نکل رہا ہے، اسے کس چیز نے اس سفر پر آمادہ کیا ہے؟ اس کے سر میں کونسا سودا سمایا ہوا ہے جو اسے مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑے، مال و دولت، اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خیر باد کہے، اپنے وطن کی راحت و آرام کو قربان کرے، اور سینکڑوں میل کا کٹھن راستہ طے کر کے ان صحراؤں کی خاک چھانے جن میں ظاہری اعتبار سے کوئی دلکشی نہیں؟

آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ایک عازمِ حج کو اس سفر پر اُبھارنے والی چیز خدا کی محبت کے سوا کچھ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس سفر پر کوئی شخص اس وقت تک آمادہ ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کے دل میں خدا کی محبت نہ ہو، اس کے رسول ﷺ کا عشق نہ ہو، آخرت کی فکر نہ ہو، اور اپنے فرض کو فرض سمجھنے کا خیال نہ ہو۔

جب یہ شخص اس نیک ارادے کے ساتھ اپنے گھر سے قدم نکالتا ہے تو اس کے دل کی دنیا بالکل بدل جاتی ہے، اب وہ خدا کے راستے کا راہی ہے جسے ہر قدم پر یہ خیال رہتا ہے کہ اس کی کوئی حرکت اس مالک کی مرضی کے خلاف نہ ہو جس کا مہمان بن کر وہ جارہا ہے، یہ تصور اس کے دل میں نیکی کی اُمنگ، بھلائی کی لگن اور بدی کی نفرت پیدا کرتا ہے، اسے ہر آن اپنے مالک کا یہ ارشاد آنکھوں

(۱) الحج:۲۷

کے سامنے نظر آتا ہے کہ:

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ (۱)

''حج (کے سفر) میں کسی فحش بات کی گنجائش نہیں، کسی گناہ کی گنجائش نہیں اور کسی جھگڑے کی گنجائش نہیں''

راستے میں اسے اپنے جیسے بہت سے ہم سفر ملتے ہیں۔ جب وہ یہ تصور کرتا ہے کہ یہ لوگ بھی اسی لگن کو لے کر جارہے ہیں جو میرے دل میں موجزن ہے، تو اسے ان لوگوں میں اپنائیت محسوس ہوتی ہے، وہ ان سے محبت کرتا ہے، ان کی طرف سے کوئی ناگوار بات پیش آتی ہے تو حتی الامکان اس پر صبر کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور یہ چیز اس کے دل میں دوسروں کے لئے ایثار، اخوت اور عفو درگزر کے قیمتی جذبات پیدا کرتی ہے۔

پھر سفر کے دوران ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جہاں سے احرام کے بغیر گزرنا جائز نہیں، یہاں پہنچ کر حج کا یہ مسافر اپنی ظاہری زیب و زینت اور لباس کی تمام سج دھج بھی قربان کرڈالتا ہے، اسے خوشبو لگانے کی اجازت نہیں، وہ سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا، اس کے لئے اپنے سر اور منہ کو ڈھکنا بھی ناجائز ہے، وہ کسی جانور کا شکار نہیں کرسکتا، اور نہ اسے زن و شو کے تعلقات قائم کرنے کا اختیار ہے، وہ صرف دو سادہ چادروں میں ملبوس ہے جو اس بات کا اعلان کررہی ہیں کہ اب تک وہ خواہ کچھ رہا ہو اب وہ تمام رشتے ناطے توڑ کر صرف خدا کے در کا ایک بھکاری ہے جس کی زبان پر ایک ہی آواز ہے:

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ (۲)

یہ آواز درحقیقت اس پکار کا جواب ہے جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لگائی تھی، اللہ کے اس منادی نے اس وقت پکار کر کہا تھا کہ اللہ کے بندو! اللہ کے گھر کی طرف آؤ، زمین کے ہر گوشے سے آؤ۔ اس پکار کے جواب میں دیارِ حبیب کا ہر مسافر بلند آواز سے لبیک کہتا ہے، یعنی میں حاضر ہوں، بارالٰہا، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں صرف تیری طلبی پر حاضر ہوں، تعریف تیری ہے، نعمت تیری ہے، ملک تیرا ہے، اور تیرا کوئی شریک نہیں۔

---

(۱) البقرة:۱۹۷

(۲) ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے: ''میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں بے شک تعریف تیرے لئے ہے اور نعمتیں تیری طرف سے ہیں بادشاہت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں ہے''

احرام کا یہ فقیرانہ ماحول اس مسافر کے دل میں عاجزی اور انکساری، تواضع اور مسکنت پیدا کرتا ہے اور غرور و تکبر اور نخوت و ریاکاری کے تمام گھناؤنے جذبات کو کچل ڈالتا ہے، یہاں تک کہ جب اللہ کا یہ بندہ اس کے مقدس گھر میں پہنچتا ہے تو اسے اپنی بندگی کے سوا کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا، یہاں اپنی ہستی کے ہر غرور کو خاک میں ملا کر وہ اس گھر کے گرد دیوانہ وار چکر کاٹتا ہے، اس کے پتھروں کو چومتا ہے، اس کی چوکھٹ تھام کر روتا اور گڑگڑاتا ہے۔

اس مقدس زمین کا ایک ایک ذرّہ اس کا رشتہ انبیاء اور صحابہ کے مقدس گروہ کے ساتھ جوڑ دیتا ہے اور اس مسافر کے دل میں اسی گروہ کی سی صفات اپنے آپ میں پیدا کرنے کا داعیہ جنم لیتا ہے۔ طواف سے فارغ ہو کر وہ مقامِ ابراہیم پر پہنچتا ہے تو کعبے کے مقدس معماروں کا تصور اس کے دل میں عقیدت و محبت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ پھر وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتا ہے تو ایک طرف اسے حضرت ہاجرہ کی وہ آزمائش یاد آتی ہے جو انہوں نے اللہ کی خوشنودی کے لئے برداشت کی تھی، دوسری طرف اس کے دل میں خدا کے دین کے لئے سعی و عمل کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔

یہاں تک کہ پھر ایک دن وہ مسجدِ حرام کو بھی خیرباد کہہ کر ان صحراؤں کا رخ کرتا ہے جہاں کے ہر ہر چپے سے اسلامی تاریخ کے بیشمار واقعات وابستہ ہیں، وہ اللہ کے حکم کے مطابق کبھی منیٰ میں پڑاؤ ڈالتا ہے، کبھی عرفات میں خیمہ زن ہوتا ہے، کبھی مزدلفہ میں رات گزارتا ہے، اور بالآخر منیٰ کے تین جمرات پر بار بار کنکریاں مار کر وہ شیطانی وساوس اور نفسانی خواہشات کے ساتھ جنگ کرنے کا عملی مظاہرہ پیش کرتا ہے، یہیں پر کسی جانور کی قربانی پیش کر کے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم الشان قربانی کی یاد تازہ کرتا ہے، اور گویا ان تمام عبادتوں کے آخر میں اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وقت آنے پر خدا کے دین کے لئے اپنی جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔

آپ نے دیکھا کہ افعالِ حج کی ایک ایک نقل و حرکت اس کے اندر اعلیٰ ترین اوصاف اور پاکیزہ ترین خصلتیں پیدا کرنے میں کتنی مدد کرتی ہے؟

حج کے یہ تمام فائدے انفرادی نوعیت رکھتے ہیں، یہ وہ فوائد ہیں جو تنہا حج کرنے والے کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن حج کے فوائد کی فہرست یہاں ختم نہیں ہو جاتی، اب ایک طائرانہ نظر ان فوائد پر ڈال کر دیکھئے جو حج کی وجہ سے مسلمانوں کے پورے معاشرے کو حاصل ہوتے ہیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ حج کے زمانے میں عالمِ اسلام کا ہر گوشہ سفرِ حج کی سرگرمیوں سے معمور ہو جاتا ہے، رمضان سے لے کر ربیع الاول تک چھ مہینوں میں عازمینِ حج کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس عرصے میں جو لوگ حج کو نہیں جاتے وہ بھی حاجیوں کو سفر کے لئے تیار کر کے انہیں رخصت کر کے، اور پھر واپسی پر ان کا استقبال کر کے اور ان سے دیارِ حبیب کے پُرکیف احوال سن کر

کسی نہ کسی درجے میں ان صفات کا ایک حصہ حاصل کر لیتے ہیں جو حج کا سفر انسان میں پیدا کرتا ہے، اور اس طرح پوری دنیا میں ایک اسلامی روح بیدار ہوتی ہے۔

حج کے مسافروں کا یہ قافلہ جس کے دل میں خدا کی رضا جوئی کے سوا کوئی لگن نہیں، جس بستی سے گزرتا ہے، اس کو اپنے اخلاق واعمال سے متاثر کرتا ہے، اور ان کے دلوں میں بھی اس پُر کیف سفر کے ولولے پیدا ہوتے ہیں۔

پھر عرفات کے میدان میں کوئی حاجی تنہا نہیں پہنچتا، یہاں لاکھوں فرزندانِ توحید کا ایک دل آویز اجتماع ہوتا ہے، ان کی زبانیں مختلف ہیں، ان کے رنگ مختلف ہیں، ان کی نسلیں جدا ہیں، مگر یہ آپس کے ہر فرق کو مٹا کر اس طرح ایک ہو جاتے ہیں کہ ان کا خدا ایک، ان کا رسول ایک، ان کی کتاب ایک، ان کا کعبہ ایک، ان کے لبوں پر پکار ایک، ان کے دلوں میں لگن ایک، یہاں تک کہ ان کے بدن پر لباس ایک ہوتا ہے، اس طرح آسمان کی نگاہیں انسانی اتحاد کا وہ عظیم ترین مظاہرہ دیکھتی ہیں جس کی نظیر دنیا کے کسی گوشے میں نظر نہیں آسکتی۔

یہاں ہر مسلمان کو اپنے بھائی کے حالات سننے، اس کے دکھ سکھ میں شریک ہونے اور پوری ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے طریقے سوچنے کا موقع ملتا ہے، یہاں مسلمانوں کو اتحاد کے ساتھ تنظیم کی تربیت ملتی ہے، یہاں لاکھوں انسانوں کا لشکر ایک امیر الحج کی پیروی کرتا ہے، اسی کے پیچھے نماز پڑھتا ہے، اسی کی تقریریں سن کر ان پر عمل کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ روحانی تربیت کی اس عظیم عبادت سے فارغ ہو کر انسان چاہے تو وہ اپنے آپ کو انسانیت کا ایک ایسا مکمل نمونہ بنا سکتا ہے جو اس کے معاشرے کے ہر فرد کے لئے باعثِ رشک ہو، اسی لئے سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ حَجَّ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ)) (۱)

''جو شخص اس طرح حج کرے کہ اس نے کوئی بے حیائی کا کام نہ کیا ہو، اور نہ کسی فسق و فجور میں مبتلا ہوا ہو، وہ اس طرح پاک صاف ہو کر لوٹتا ہے جیسے آج اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے''

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الحج عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فی ثواب الحج والعمرة، رقم: ۷۳۹، مسند أحمد، رقم: ۶۸۰۹

حج ایک عاشقانہ عبادت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾(۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! رمضان المبارک گزر جانے کے بعد شوال کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ شوال کا مہینہ ان مہینوں میں شمار ہوتا ہے جن کو اللہ جل شانہ نے ''اشہر الحج'' یعنی حج کے مہینے کہا ہے، کیونکہ شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ کے دس دن کو اللہ تعالیٰ نے حج کے مہینے قرار دیا ہے۔

رمضان المبارک سے لے کر ذی الحجہ تک کے ایام اللہ تعالیٰ نے ایسی عبادتوں کے لئے مخصوص فرمائے ہیں جو خاص انہی ایام میں انجام دی جاسکتی ہیں، چنانچہ رمضان کا مہینہ اللہ تعالیٰ نے روزے کے لئے اور تراویح کے لئے مقرر فرمایا اور شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ کے مہینے حج کے لئے اور قربانی کے لئے مقرر فرمائے، حج اور قربانی ایسی عبادتیں ہیں جو ان ایام کے علاوہ دوسرے ایام میں نہیں انجام دی جاسکتیں، گویا کہ عبادات کا ایک سلسلہ ہے جو رمضان المبارک سے شروع ہوتا ہے اور ذی الحجہ پر جاکر ختم ہوتا ہے، اس لئے ان مہینوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑا تقدس حاصل ہے۔

ماہِ شوال کی فضیلت

رمضان المبارک تو تمام مہینوں میں مبارک مہینہ ہے، شوال کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص شوال کے مہینے میں چھ روزے رکھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کو سارے سال روزے رکھنے کا ثواب عطا فرماتے ہیں''(۲)

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۴۵ تا ۵۸) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) آل عمران: ۹۷　　(۲) حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

کیونکہ ہر نیکی کا ثواب اللہ تعالیٰ دس گنا عطا فرماتے ہیں، لہٰذا جب ایک شخص نے رمضان المبارک میں تیس روزے رکھے تو اس کا دس گنا تین سو ہوگیا اور چھ روزے جب شوال میں رکھے تو ان کا دس گنا ساٹھ ہوگیا، اس طرح تمام روزوں کا ثواب مل کر تین سو ساٹھ روزوں کے برابر ہوگیا اور سال کے تین سو ساٹھ دن ہوتے ہیں، اس لئے فرمایا کہ اگر کسی شخص نے رمضان کے ساتھ شوال میں چھ روزے رکھ لیے تو گویا اس نے پورے سال روزے رکھے۔ شوال کے چھ روزوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ یہ ثواب عطا فرماتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ یہ چھ روزے عیدالفطر کے فوراً بعد رکھ لیے جائیں، لیکن اگر فوراً نہ رکھ سکیں تو شوال کے مہینے کے اندر اندر پورے کرلیں۔

ماہِ شوال اور امورِ خیر

اسی شوال کے مہینے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا اور اسی مہینے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی ہوئی۔ لہٰذا اس ماہ میں برکتوں کے بہت سارے اسباب جمع ہیں۔

ماہِ ذیقعدہ کی فضیلت

اسی طرح ذیقعدہ کا اگلا مہینہ بھی ''اشہرالحج'' میں شامل ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں مدینہ طیبہ کے قیام کے دوران حج کے علاوہ چار عمرے ادا فرمائے، یہ چاروں عمرے ذیقعدہ کے مہینے میں ادا فرمائے۔ اس لحاظ سے بھی اس ماہ کو تقدس حاصل ہے۔

ماہِ ذیقعدہ منحوس نہیں

ہمارے معاشرے میں ''ذیقعدہ'' کے مہینے کو جو منحوس سمجھا جاتا ہے اور اس کو ''خالی'' کا مہینہ کہا جاتا ہے یعنی یہ مہینہ ہر برکت سے خالی ہے، چنانچہ اس ماہ میں نکاح اور شادی نہیں کرتے اور کوئی خوشی کی تقریب نہیں کرتے، یہ سب فضولیات اور توہم پرستی ہے، شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔ بہرحال! یہ تین مہینے حج کے مہینے ہیں، اس لئے خیال ہوا کہ آج حج کے بارے میں تھوڑا سا بیان ہوجائے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب استحباب صوم ستة أيام من شوال اتباعًا لرمضان، رقم: ١٩٨٤، سنن الترمذی، کتاب الصوم عن رسول الله، باب ما جاء في صيام ستة أيام من شوال، رقم: ٦٩٠، سنن أبي داؤد، كتاب الصوم، باب في صوم ستة أيام من شوال، رقم: ٢٠٧٨، سنن ابن ماجه، كتاب الصيام، باب صيام ستة أيام من شوال، رقم: ١٧٠٥، مسند أحمد، رقم: ١٣٧٨٣

حج اسلام کا اہم رکن ہے

یہ حج اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ اسلام کے چار ارکان ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، ان چاروں ارکان پر اسلام کی بنیاد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے عبادت کے جو مختلف طریقے تجویز فرمائے ہیں، ان میں سے ہر طریقہ نرالی شان رکھتا ہے، مثلاً نماز کی الگ شان ہے، روزہ کی ایک الگ شان ہے، زکوٰۃ کی الگ شان ہے، حج کی الگ شان ہے۔

عبادات کی تین اقسام

عام طور پر عبادتوں کو تین حصوں پر تقسیم کیا جاتا ہے، ایک ''عباداتِ بدنیہ'' جو انسان کے بدن سے تعلق رکھتی ہیں اور بدن کے ذریعہ ان کی ادائیگی ہوتی ہے، جیسے نماز بدنی عبادت ہے۔ دوسری ''عباداتِ مالیہ'' جس میں بدن کو دخل نہیں ہوتا بلکہ اس میں پیسے خرچ ہوتے ہیں، جیسے زکوٰۃ اور قربانی۔

تیسری عبادات وہ ہیں جو بدنی بھی ہیں اور مالی بھی ہیں، ان کے ادا کرنے میں انسان کے بدن کو بھی دخل ہوتا ہے اور مال کو بھی دخل ہوتا ہے، جیسے حج کی عبادت۔ حج کی عبادت میں انسان کا بدن بھی خرچ ہوتا ہے اور اس کا مال بھی خرچ ہوتا ہے، اس لئے یہ عبادت بدن اور مال دونوں سے مرکب ہے۔ اور اس حج کی عبادت میں عاشقانہ شان پائی جاتی ہے، کیونکہ حج میں اللہ تعالیٰ نے ایسے ارکان رکھے ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے عشق و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اِحرام کا مطلب

جب یہ حج کی عبادت شروع ہوتی ہے تو سب سے پہلے احرام باندھا جاتا ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چادریں باندھنا ہی احرام ہے، حالانکہ محض ان چادروں کا نام احرام نہیں بلکہ ''اِحرام'' کے معنی ہیں ''بہت سی چیزوں کو اپنے اُوپر حرام کر لینا''

جب انسان حج یا عمرہ کی نیت کرنے کے بعد تلبیہ پڑھ لیتا ہے تو اس کے بعد اس کے اُوپر بہت سی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں۔ مثلاً سلا ہوا کپڑا پہننا حرام، خوشبو لگانا حرام، جسم کے کسی بھی حصے کے بال کاٹنا حرام، ناخن کاٹنا حرام اور اپنی بیوی کے ساتھ جائز نفسانی خواہشات پوری کرنا حرام۔ اسی وجہ سے اس کا نام ''احرام'' رکھا گیا ہے۔

اے اللہ! میں حاضر ہوں

اور جب انسان حج یا عمرہ کی نیت کر کے یہ تلبیہ پڑھتا ہے:

"لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ"

جس کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ! میں حاضر ہوں ــــ کیوں حاضر ہوں؟ اس لئے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کی تعمیر فرمائی تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم فرمایا:

﴿وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ﴾(۱)

"(اے ابراہیم!) لوگوں میں یہ اعلان فرمادیں کہ وہ اس بیت اللہ کے حج کے لئے آئیں، پیدل آئیں اور سوار ہو کر آئیں، دور دراز سے اور دنیا کے چپے چپے سے یہاں پہنچیں"

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر یہ اعلان فرمایا تھا کہ اے لوگو! یہ اللہ کا گھر ہے، اللہ کی عبادت کے لئے یہاں آؤ۔ یہ اعلان آپ نے پانچ ہزار سال پہلے کیا تھا، آج جب کوئی عمرہ کرنے والا یا حج کرنے والا حج یا عمرہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ درحقیقت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اعلان کا جواب دیتے ہوئے یہ کہتا ہے:

لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ

اے اللہ! میں حاضر ہوں اور بار بار حاضر ہوں۔ اور جس وقت بندہ نے یہ کہہ دیا کہ میں حاضر ہوں، بس اسی وقت سے احرام کی پابندیاں شروع ہوگئیں، چنانچہ اب وہ سلا ہوا کپڑا نہیں پہن سکتا، خوشبو نہیں لگا سکتا، بال نہیں کاٹ سکتا، ناخن نہیں کاٹ سکتا اور اپنی جائز نفسانی خواہشات بھی پوری نہیں کر سکتا۔

احرام کفن یاد دلاتا ہے

گویا اللہ جل شانہ کی پکار پر ایک عاشق بندے نے اپنے پروردگار کے عشق میں دنیا کی آسائشیں اور راحتیں سب چھوڑ دیں، اب تک وہ سلے ہوئے کپڑے پہنے ہوا تھا، وہ سب اُتار دیئے، اب وہ دو چادریں پہنے ہوا ہے جو اسے اس کے کفن کی یاد دلا رہی ہیں کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے

(۱) الحج: ۲۷

کہ جب تو دنیا سے رخصت ہو رہا ہوگا تو اس وقت تیرا یہی لباس ہوگا، چاہے وہ بادشاہ ہو، چاہے سرمایہ دار ہو، چاہے فقیر ہو، سب آج دو چادر پہنے ہوئے ہیں اور انسانی مساوات کا ایک منظر پیش کر رہے ہیں، جس شخص کو دیکھو وہ آج دو چادروں میں ملبوس نظر آرہا ہے۔

''طواف'' ایک لذیذ عبادت

پھر وہاں بیت اللہ کے پاس پہنچ کر بیت اللہ کا طواف کررہے ہیں، اس ''طواف'' میں ایک عاشقانہ شان ہے، جس طرح ایک عاشق اپنے محبوب کے گھر کے گرد چکر لگاتا ہے، اسی طرح یہ اللہ کا بندہ اللہ تعالیٰ کے گھر کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ اور یہ چکر لگانا اللہ تعالیٰ کو اتنا محبوب ہے کہ اس طواف میں ایک ایک قدم پر ایک ایک گناہ معاف ہو رہا ہے اور ایک ایک درجہ بلند ہو رہا ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے طواف کرنے کا موقع عطا فرمایا ہے وہ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ شاید روئے زمین پر طواف سے زیادہ لذیذ عبادت کوئی اور نہ ہو۔

اظہارِ محبت کے مختلف انداز

انسان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنے مالک کے ساتھ عشق و محبت کا اظہار کرے، اس کے گھر کا چکر لگائے، اس کے دروازے کو چومے اور اس سے لپٹ جائے، اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اس تقاضے کی تکمیل کے سارے اسباب اس بیت اللہ میں جمع فرمادیے ہیں۔ جب آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو آپ کا دل چاہتا ہے کہ اس کو گلے لگاؤں، اس کے پاس رہوں، اب اللہ تعالیٰ سے محبت تو ہے لیکن اس کو گلے سے نہیں لگا سکتے، براہِ راست اللہ تعالیٰ کی قدم بوسی نہیں کرسکتے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے بندو! تم یہ کام براہِ راست تو نہیں کرسکتے، اس لئے تم ایسا کرو کہ یہ میرا گھر ہے، تم اس گھر کے چکر لگاؤ اور اس کے اندر میں نے ایک حجرِ اسود رکھ دیا ہے، تم اس حجرِ اسود کو چومو، یہ تمہارا حجرِ اسود کو چومنا یہ تمہارے عشق و محبت کا اظہار ہوگا، اور اگر مجھ سے لپٹنے کو دل چاہتا ہے تو میرے اس گھر کے دروازے اور حجرِ اسود کے درمیان جو دیوار ہے جس کو ملتزم کہتے ہیں، اس دیوار سے لپٹ جاؤ اور یہاں لپٹ کر تم جو کچھ مجھ سے مانگو گے میرا وعدہ ہے کہ تمہیں دوں گا۔ یہ عاشقانہ شان اللہ تعالیٰ نے اس حج کی عبادت میں رکھی ہے، آدمی کو اپنے جذبات کے اظہار کا اس سے بہتر موقع کہیں اور نہیں مل سکتا جیسا موقع وہاں ملتا ہے۔

دینِ اسلام میں انسانی فطرت کا خیال

ہمارے دینِ اسلام کی بھی عجیب شان ہے کہ ایک طرف بت پرستی کو منع کر دیا اور اس کو شرک اور حرام قرار دے دیا اور یہ کہہ دیا کہ جو شخص بت پرستی کرے گا وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہے، اس لئے کہ یہ بت تو بے جان پتھر ہیں، نہ ان کے اندر نفع پہنچانے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی نقصان پہنچانے کی صلاحیت ہے، لیکن دوسری طرف چونکہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرے، اس محبت کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو ایک نشان بنا دیا اور ساتھ میں یہ بتا دیا کہ بیت اللہ کی ذات میں کچھ نہیں رکھا، لیکن چونکہ ہم نے اس کو اپنی طرف منسوب کر کے یہ کہہ دیا کہ یہ ہمارا گھر ہے اور ہم نے ہی اس کے اندر پتھر رکھ دیا ہے تاکہ تمہارے جذبات کی تسکین ہو جائے، اب نسبت کے بعد اس گھر کے چکر لگانا اور اس پتھر کو چومنا عبادت ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حجرِ اسود سے خطاب

اسی وجہ سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جب حج کے لئے تشریف لے گئے اور حجرِ اسود کے پاس جا کر اس کو بوسہ دینے لگے تو اس حجرِ اسود کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے حجرِ اسود! میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ تو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے، اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا۔ (۱)

چونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ سنت جاری فرما دی، اس لئے اس کا چومنا اور بوسہ دینا عبادت بن گیا۔

ہرے ستونوں کے درمیان دوڑنا

طواف کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگائے جا رہے ہیں اور جب سبز ستون کے پاس پہنچے تو دوڑنا شروع کر دیا، جسے دیکھو دوڑا جا رہا ہے، بھاگا جا رہا ہے، اچھے خاصے سنجیدہ آدمی، پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ، جن کو کبھی بھاگ کر چلنے کی عادت نہیں، مگر ہر ایک دوڑا جا رہا ہے، چاہے بوڑھا ہو، جوان ہو، بچہ ہو، یہ کیا ہے؟ یہ اس لئے دوڑا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سنت قرار دیا ہے۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے یہاں دوڑ لگائی تھی، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ

---

(۱) البداية والنهاية (۱۵۳/۵)، حياة الصحابة (۴۷۷/۲)

قیامِ قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کے لئے یہ ضروری قرار دیدیا کہ جو حج کرنے آئے گا، وہ صفا مروہ کے درمیان چکر لگائے گا اور دوڑے گا۔

اب مسجدِ حرام کو چھوڑ دو

جب ۸/ ذی الحجہ کی تاریخ آگئی تو اب یہ حکم آیا کہ مسجدِ حرام کو چھوڑ دو اور منیٰ میں جا کر پانچ نمازیں ادا کرو، حالانکہ اطمینان سے مکہ میں رہ رہے تھے اور مسجدِ حرام میں نمازیں ادا کر رہے تھے، جہاں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر مل رہا تھا، لیکن اب یہ حکم آگیا کہ اب مکہ سے نکل جاؤ اور منیٰ میں جا کر قیام کرو اور پانچ نمازیں وہاں ادا کرو۔ کیوں؟ اس حکم کے ذریعہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ نہ مسجدِ حرام میں اپنی ذات کے اعتبار سے کچھ رکھا ہے اور نہ بیت اللہ میں اپنی ذات کے اعتبار سے کچھ رکھا ہے۔ جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے۔ جب تک ہمارا حکم تھا کہ مکہ مکرمہ میں رہو، اس وقت تک مسجدِ حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر مل رہا تھا اور اب ہمارا حکم یہ ہے کہ یہاں سے جاؤ تو اب اس کے لئے یہاں رہنا جائز نہیں۔

اب عرفات چلے جاؤ

منیٰ کے قیام کے بعد اب ایسی جگہ تمہیں لے جائیں گے جہاں حدِ نگاہ تک میدان پھیلا ہوا ہے، کوئی عمارت نہیں اور کوئی سایہ نہیں، ایک دن تمہیں یہاں گزارنا ہوگا۔ یہ دن اس طرح گزارنا کہ ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کر لینا اور پھر اس کے بعد سے لے کر مغرب تک کھڑے ہو کر ہمیں پکارتے رہنا اور ہمارا ذکر کرتے رہنا، ہم سے دعائیں کرنا اور تلاوت کرنا اور مغرب تک یہاں رہنا۔

اب مزدلفہ چلے جاؤ

اور عرفات میں تو تمہیں خیمے لگانے کی اجازت تھی، اب ہم تمہیں ایسے میدان میں لے جائیں گے جہاں تم خیمہ بھی نہیں لگا سکتے، وہ ہے ''مزدلفہ''، لہٰذا غروبِ آفتاب کے بعد مزدلفہ کی طرف روانہ ہو جاؤ اور رات وہاں گزارو۔

مغرب کو عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھو

عام دنوں میں تو یہ حکم ہے کہ جیسے ہی غروبِ آفتاب ہو جائے تو فوراً مغرب کی نماز ادا کرو، لیکن آج یہ حکم ہے کہ مزدلفہ جاؤ اور وہاں پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نماز ایک ساتھ ادا کرو۔ ان احکام

کے ذریعہ یہ بتایا جارہا ہے کہ جب تک ہم نے کہا تھا کہ مغرب کی نماز جلدی پڑھو، اس وقت تک جلدی پڑھنا تمہارے ذمّے واجب تھا، اور جب ہم نے کہا کہ تاخیر سے پڑھو تو اب تاخیر سے پڑھنا تمہارے ذمّے ضروری ہے، لہٰذا کسی وقت کے اندر کچھ نہیں رکھا جب تک ہمارا حکم نہ ہو۔

کنکریاں مارنا عقل کے خلاف ہے

قدم قدم پر اللہ تعالیٰ عام قوانین کو توڑ کر بندے کو یہ بتارہے ہیں کہ تیرا کام تو ہماری عبادت کرنا اور ہمارا حکم ماننا ہے، اور کوئی چیز اپنی ذات میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی جب تک ہمارا حکم نہ ہو۔ اب مزدلفہ سے پھر واپس منیٰ آؤ اور تین دن یہاں گزارو۔ اب یہاں تین دن کیوں گزاریں؟ یہاں کیا کام ہے؟ یہاں تمہارا کام یہ ہے کہ یہاں منیٰ میں تین ستون ہیں جن کو جمرات کہا جاتا ہے، ہر آدمی روزانہ تین دن تک ان کو سات سات کنکریاں مارے۔ ذرا اس عمل کو عقل وخرد کی ترازو میں تول کر دیکھو تو یہ عمل فضول اور بیکار نظر آئے گا۔ گذشتہ سال پچیس لاکھ مسلمانوں نے حج کیا اور یہ پچیس لاکھ انسان تین دن تک منیٰ میں پڑے ہوئے ہیں جن پر کروڑوں اور اربوں روپے خرچ ہورہے ہیں اور ان میں ہر ایک کو یہ دھن ہے کہ میں ان جمرات کو سات سات کنکریاں ماروں۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ، معقول آدمی ہیں، مگر جس کو دیکھو وہ کنکریاں ڈھونڈتا پھر رہا ہے اور پھر ان جمرات کو مار کر خوش ہورہا ہے کہ میں نے یہ عمل پورا کرلیا۔

حکم الٰہی، ہر چیز پر مقدم

کیا یہ کنکریاں مارنے کا عمل ایسا ہے جس پر اربوں روپیہ خرچ کیا جائے؟ بات یہ ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی کام میں عقل وخرد کی بات نہیں، جب ہمارا حکم آجائے تو وہی کام جس کو تم دیوانگی سمجھ رہے تھے، وہی عقل کا کام بن جاتا ہے، جب ہمارا حکم آگیا کہ ان پتھروں کو مارو تو تمہارا کام یہ ہے کہ مارو، اسی میں تمہارے لئے اجر وثواب ہے، اسی عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تمہارے درجات بلند کررہے ہیں۔ لہٰذا ہم نے اپنے دلوں میں عقل وخرد کے جو بت تعمیر کیے ہوئے ہیں، اس حج کی عبادت کے ذریعہ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ ان بتوں کو توڑ رہے ہیں اور یہ بتارہے ہیں کہ ان بتوں کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ بتارہے ہیں کہ اس کائنات میں کوئی چیز قابلِ تعمیل ہے تو وہ ہمارا حکم ہے۔ جب ہمارا حکم آجائے تو وہ حکم عقل میں آئے تو، عقل میں نہ آئے تو، تمہیں اس حکم کے آگے سر جھکانا ہے اور اس پر عمل کرنا ہے، پورے حج کے اندر یہی تربیت دی جارہی ہے۔

اسی وجہ سے حضورِ اقدس ﷺ نے اس حج کی بڑی فضیلت بیان فرمائی کہ اگر کوئی شخص حجِ مبرور

کر کے آتا ہے تو وہ ایسا گناہوں سے پاک صاف ہوتا ہے جیسے آج وہ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔(۱)

اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کا یہ مقام رکھا ہے۔

حج کس پر فرض ہے؟

یہ حج کس پر فرض ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾(۲)

یعنی اللہ کے لئے لوگوں پر فرض ہے کہ وہ بیت اللہ کا حج کریں اور یہ ہر اس شخص پر فرض ہے جو وہاں جانے کی استطاعت اور صلاحیت رکھتا ہو، یعنی اس کے پاس اتنے پیسے ہوں کہ وہ سواری کا انتظام کر سکے۔ فقہاء کرام نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ جس کے پاس اتنا مال ہو کہ اس کے ذریعہ وہ حج پر جا سکے اور وہاں حج کے دوران اپنے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام کر سکے اور اپنے پیچھے جو اہل وعیال ہیں، واپس آنے تک ان کے کھانے پینے کا انتظام کر سکے، ایسے شخص پر حج فرض ہو جاتا ہے۔

لیکن آج کل لوگوں نے حج کرنے کے لئے اپنے اُوپر بہت سی شرطیں عائد کر رکھی ہیں جن کی شریعت میں کوئی بنیاد نہیں۔ ان کے بارے میں آئندہ جمعہ انشاء اللہ تفصیل سے عرض کروں گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الحج عن رسول اللہ، باب ما جاء فی ثواب الحج والعمرة، رقم: ۷۳۹، مسند أحمد، رقم: ۶۸۳۹

(۲) آل عمران: ۹۷

حج میں تاخیر کیوں؟ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گذشتہ جمعہ کو اسی آیت پر بیان کیا تھا، اس آیت میں اللہ جل شانہ نے حج کی فرضیت کا ذکر فرمایا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے لوگوں پر واجب ہے کہ جو شخص بیت اللہ تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ حج کرے۔ یہ حج ارکانِ اسلام میں سے چوتھا رکن ہے اور صاحبِ استطاعت پر اللہ تعالیٰ نے عمر بھر میں ایک مرتبہ فرض قرار دیا ہے۔ اور جب یہ حج فرض ہو جائے تو اب حکم یہ ہے کہ اس فریضے کو جلد از جلد ادا کیا جائے، بلاوجہ اس حج کو مؤخر کرنا درست نہیں، کیونکہ انسان کی موت اور زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ اگر حج فرض ہونے کے بعد اور ادائیگی سے پہلے انسان دنیا سے چلا جائے تو یہ بہت بڑا فریضہ اس کے ذمے باقی رہ جاتا ہے، اس لئے حج فرض ہو جانے کے بعد جلد از جلد اس کی ادائیگی کی فکر کرنی چاہئے۔

ہم نے مختلف شرائط عائد کر لی ہیں

لیکن آجکل ہم لوگوں نے حج کرنے کے لئے اپنے اُوپر بہت سی شرطیں عائد کر لی ہیں، بہت سی ایسی پابندیاں عائد کر لی ہیں جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک ان کے دنیوی مقاصد پورے نہ ہو جائیں مثلاً جب تک مکان نہ بن جائے یا جب تک بیٹیوں کی شادیاں نہ ہو جائیں، اس وقت تک حج نہیں کرنا چاہئے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے، بلکہ جب انسان کے پاس اتنا مال ہو جائے کہ اس کے ذریعہ حج ادا کر سکے یا اس کی ملکیت میں سونا اور زیور ہے اور وہ اتنا ہے کہ اگر اس کو وہ فروخت کر دے تو اس کی رقم اتنی وصول ہو جائے گی جس کے ذریعہ حج ادا ہو جائے گا، تب بھی حج فرض ہو جائے گا، لہٰذا حج فرض ہو جانے کے بعد اس کو کسی چیز کے انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۶۰ تا ۷۴) بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی (۱) آل عمران: ۹۷

حج مال میں برکت کا ذریعہ ہے

لہٰذا یہ سوچنا کہ ہمارے ذمے بہت سارے کام ہیں، ہمیں مکان بنانا ہے، ہمیں اپنی بیٹیوں یا بیٹوں کی شادی کرنی ہے، اگر یہ رقم ہم حج میں صرف کردیں گے تو ان کاموں کے لئے رقم کہاں سے آئے گی؟ یہ سب فضول خیالات اور فضول سوچ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حج کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حج ادا کرنے کے نتیجے میں آج تک کوئی شخص مفلس نہیں ہوا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ (۱)

یعنی ہم نے حج فرض کیا ہے، تاکہ اپنی آنکھوں سے وہ فائدے دیکھیں جو ہم نے ان کے لئے حج کے اندر رکھے ہیں۔ حج کے بے شمار فائدے ہیں، ان کا احاطہ کرنا بھی ممکن نہیں ہے، ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رزق میں برکت عطا فرما دیتے ہیں۔

آج تک حج کی وجہ سے کوئی فقیر نہیں ہوا

حجِ بیت اللہ کا سلسلہ ہزاروں سال سے جاری ہے، آج تک کوئی ایک انسان بھی ایسا نہیں ملے گا جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ اس شخص نے چونکہ اپنے پیسے حج پر خرچ کردیئے تھے، اس وجہ سے یہ مفلس اور فقیر ہوگیا۔ البتہ ایسے بے شمار لوگ آپ کو ملیں گے کہ حج کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کے رزق میں برکت عطا فرمائی اور وسعت اور خوشحالی عطا فرمائی، لہٰذا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جب تک دنیا کے فلاں فلاں کام سے فارغ نہ ہوجائیں، اس وقت تک حج نہیں کریں گے۔

چونکہ مدینہ منورہ کا سفر حج کے ارکان میں سے نہیں ہے اور فرض وواجب بھی نہیں ہے، اگر کوئی شخص مکہ مکرمہ جاکر حج کرلے اور مدینہ منورہ نہ جائے تو اس کے حج میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مدینہ منورہ کی حاضری عظیم سعادت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مؤمن کو عطا فرمائے اور سرکارِ دو عالم ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر سلام عرض کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ لہٰذا چونکہ مدینہ منورہ کا سفر حج کے ارکان میں سے نہیں ہے، اس لئے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ وہ مکہ مکرمہ جاکر حج تو ادا کرسکتا ہے لیکن مدینہ منورہ جانے کے پیسے نہیں ہیں، تب بھی اس کے ذمے حج فرض ہے۔ اس کو چاہئے کہ حج کرکے مکہ مکرمہ ہی سے واپس آجائے۔ حالانکہ حضورِ اقدس ﷺ کے روضۂ اقدس کی حاضری ایسی عظیم نعمت ہے کہ انسان ساری عمر اس کی تمنا کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا یہ خیال کہ اس حج کو فلاں کام ہونے تک مؤخر کردیا جائے، یہ خیال درست نہیں۔

---

(۱) الحج: ۲۸

والدین کو پہلے حج کرانا ضروری نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم والدین کو حج نہیں کرادیں گے، اس وقت تک ہمارا حج کرنا درست نہیں ہوگا۔ یہ خیال اتنا عام ہوگیا ہے کہ کئی لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں حج پر جانا چاہتا ہوں لیکن میرے والدین نے حج نہیں کیا، لوگ مجھے یہ کہتے ہیں کہ اگر والدین کے حج سے پہلے تم حج کرلو گے تو تمہارا حج قبول نہیں ہوگا۔ یہ محض جہالت کی بات ہے۔ ہر انسان پر اس کا فریضہ الگ ہے۔ جیسے والدین نے اگر نماز نہیں پڑھی تو بیٹے سے نماز ساقط نہیں ہوتی۔ بیٹے سے اس کی نماز کے بارے میں الگ سوال ہوگا اور ماں باپ سے ان کی نمازوں کے بارے میں الگ سوال ہوگا۔ یہی معاملہ حج کا ہے، اگر ماں باپ پر حج فرض نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں، اگر وہ حج پر نہیں گئے تو کوئی بات نہیں، لیکن اگر آپ پر حج فرض ہے تو آپ کے لئے حج پر جانا ضروری ہے، اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ پہلے والدین کو حج کرائے اور پھر خود کرے، یہ سب خیالات غلط ہیں، ہر انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے اعمال کا مکلف ہے، اس کو اپنے اعمال کی فکر کرنی چاہئے۔

حج نہ کرنے پر شدید وعید

ہم میں سے بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو ذاتی ضروریات اور ذاتی کاموں کی خاطر لمبے لمبے سفر کرتے ہیں، یورپ کا سفر کرتے ہیں، امریکہ اور فرانس اور جاپان کا سفر کرتے ہیں، لیکن اس بات کی توفیق نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کے گھر پر حاضری دیدیں، یہ بڑی محرومی کی بات ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس شخص کے لئے بڑی سخت وعید بیان فرمائی ہے جو صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود حج نہ کرے، چنانچہ آپ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جس شخص پر حج فرض ہوگیا ہو اور پھر بھی وہ حج کیے بغیر مرجائے تو ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ (۱)

لہٰذا یہ معاملہ اتنا معمولی نہیں ہے کہ انسان اس حج کے فریضے کو ٹلاتا رہے اور یہ سوچتا رہے کہ جب فرصت اور موقع ہوگا تو حج کرلیں گے۔

بیٹیوں کی شادی کے عذر سے حج مؤخر کرنا

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیٹیوں کی شادیاں کرنی ہیں، جب تک بیٹیوں کی شادیاں نہ ہوجائیں،

(۱) سنن الدارمی، کتاب المناسك، باب من مات ولم يحج، رقم: ۱۷۱۹

اس وقت تک حج نہیں کرنا، لہٰذا پہلے بیٹیوں کی شادی کریں گے پھر حج کریں گے۔ یہ بھی بیکار بات ہے، یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ جب بیٹی کی شادی ہو جائے گی تو اس کے بعد نماز پڑھوں گا۔ بھائی! اللہ تعالیٰ نے جو فریضہ عائد کیا ہے وہ فریضہ ادا کرنا ہے، وہ کسی اور بات پر موقوف نہیں۔

حج سے پہلے قرض ادا کریں

البتہ حج ایک چیز پر موقوف ہے، وہ یہ کہ اگر کسی شخص پر قرضہ ہے تو قرض کو ادا کرنا حج پر مقدم ہے۔ قرض کو ادا کرنے کی اللہ تعالیٰ نے بڑی سخت تاکید فرمائی ہے کہ انسان کے اُوپر قرض نہیں رہنا چاہئے، جلد از جلد قرض کو ادا کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ لوگوں نے اپنی طرف سے بہت سے کام حج پر مقدم کر رکھے ہیں، مثلاً پہلے میں اپنا مکان بنالوں یا پہلے مکان خرید لوں، یا پہلے گاڑی خرید لوں، پھر جا کر حج کرلوں گا، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

حج کے لئے بڑھاپے کا انتظار کرنا

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ جب بڑھاپا آجائے گا تو اس وقت حج کریں گے، جوانی میں حج کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ حج کرنا تو بوڑھوں کا کام ہے، جب بوڑھے ہو جائیں گے اور مرنے کا وقت قریب آئے گا تو اس وقت حج کرلیں گے۔

یاد رکھئے! یہ شیطانی دھوکہ ہے۔ ہر وہ شخص جو بالغ ہو جائے اور اس کے پاس اتنی استطاعت ہو کہ وہ حج ادا کر سکے تو اس پر حج فرض ہو گیا اور جب حج فرض ہو گیا تو اب جلد از جلد اس فریضے کو انجام دینا واجب ہے، بلاوجہ تاخیر کرنا جائز نہیں، کیا پتہ کہ بڑھاپے تک وہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں۔ بلکہ درحقیقت حج تو جوانی کی عبادت ہے، جوانی میں آدمی کے قویٰ مضبوط ہوتے ہیں، وہ تندرست ہوتا ہے، اس وقت وہ حج کی مشقت کو آسانی کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے، لہٰذا یہ سمجھنا کہ بڑھاپے میں حج کریں گے، یہ بات درست نہیں۔

حج فرض ادا نہ کرنے کی صورت میں وصیت کردیں

یہاں یہ مسئلہ بھی عرض کردوں کہ اگر بالفرض کوئی شخص حج فرض ہو جانے کے باوجود اپنی زندگی میں حج ادا نہ کرسکا تو اس پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی میں یہ وصیت کرے کہ اگر میں زندگی میں حج فرض ادا نہ کرسکوں تو میرے مرنے کے بعد میرے ترکے سے کسی کو میری طرف سے حج بدل کے لئے بھیجا جائے۔ کیونکہ اگر آپ یہ وصیت کردیں گے تب تو آپ کے وارثین پر لازم ہوگا کہ وہ آپ کی

طرف سے حجِ بدل کرائیں ورنہ نہیں۔

حج صرف ایک تہائی مال سے ادا کیا جائے گا

اور وارثین پر بھی آپ کی طرف سے حجِ بدل کرنا اس وقت لازم ہوگا جب حج کا پورا خرچہ آپ کے پورے ترکے کے ایک تہائی کے اندر آتا ہو۔ مثلاً فرض کریں کہ حج کا خرچ ایک لاکھ روپے ہے اور آپ کا ترکہ تین لاکھ روپے بنتا ہے یا اس سے زیادہ، تو اس صورت میں یہ وصیت نافذ ہوگی اور ورثاء پر لازم ہوگا کہ آپ کی طرف سے حجِ بدل کرائیں، لیکن اگر حج کا خرچ ایک لاکھ روپے ہے اور آپ کا پورا ترکہ تین لاکھ سے کم ہے تو اس صورت میں ورثاء پر یہ لازم نہیں ہوگا کہ آپ کی طرف سے حجِ بدل ضرور کرائیں، کیونکہ شریعت کا یہ اُصول ہے کہ یہ مال جو ہمارے پاس موجود ہے، اس مال پر ہمارا اختیار اس وقت تک ہے جب تک ہم پر مرض الموت طاری نہیں ہو جاتا، ہم اس مال کو جس طرح چاہیں استعمال کریں، لیکن جیسے ہی مرض الموت شروع ہو جاتا ہے، اس وقت اس مال پر سے ہمارا اختیار ختم ہو جاتا ہے اور یہ مال وارثوں کا ہو جاتا ہے، البتہ اس وقت صرف ایک تہائی مال کی حد تک ہمارا اختیار باقی رہ جاتا ہے۔

تمام عبادات کا فدیہ ایک تہائی سے ادا ہوگا

لہٰذا اگر ہمارے ذمّے نمازیں رہ گئی ہیں تو ان نمازوں کا فدیہ اس ایک تہائی سے ادا ہوگا، اگر روزے چھوٹ گئے ہیں تو ان روزوں کا فدیہ بھی اسی ایک تہائی سے ادا ہوگا، اگر زکوٰۃ باقی رہ گئی ہے تو اس کی ادائیگی بھی اسی ایک تہائی سے ہوگی، اگر حج رہ گیا ہے تو وہ بھی اسی ایک تہائی سے ادا ہوگا اور ایک تہائی سے باہر کی وصیت وارثوں کے ذمہ لازم نہیں ہوگی۔ اس لئے زندگی میں حج ادا نہ کرنا بڑا خطرناک ہے، کیونکہ اگر ہم وصیت بھی کر جائیں کہ ہمارے مال سے حج ادا کرا دیا جائے لیکن ترکہ اتنا نہ ہو جس کے ایک تہائی سے حج ادا ہو سکے تو ان کے ذمّے اس وصیت کو پورا کرنا لازم نہیں ہوگا، اگر حج کرا دیں تو یہ ان کا ہم پر احسان ہوگا اور اگر حج نہ کرائیں تو ان پر آخرت میں کوئی گرفت نہیں ہوگی۔

حجِ بدل مرنے والے کے شہر سے ہوگا

بعض لوگ حجِ بدل کراتے وقت یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم یہاں کراچی سے حجِ بدل کرائیں گے تو ایک لاکھ کا خرچ ہوگا، اس لئے ہم مکہ مکرمہ میں ہی کسی کو پیسے دیدیں گے، وہ وہیں سے حج ادا کرلے گا۔ یاد رکھئے! اس بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ شدید مجبوری کے بغیر اس طرح حجِ بدل ادا نہیں ہوتا۔ اگر

میں کراچی میں رہتا ہوں اور میرے ذمے حج فرض ہے تو اگر میں کسی کو اپنی طرف سے حجِ بدل کے لئے بھیجوں تو وہ بھی کراچی سے جانا چاہئے، یہ نہیں کرسکتا کہ مکہ مکرمہ سے کسی کو پکڑ کر دو سو روپے میں حج کرالیا، چونکہ میں کراچی میں رہتا ہوں، اسلئے میرے وطن سے ہی حجِ بدل ہوگا، مکہ مکرمہ سے نہیں ہوگا۔

عذرِ معقول کی وجہ سے مکہ سے حج کرانا

یہ اور بات ہے کہ ایک آدمی دنیا سے چلا گیا اور اس نے ترکہ بالکل نہیں چھوڑا، اب اس کے ورثاء نے سوچا کہ اور کچھ نہیں ہوسکتا تو کم از کم اتنا ہوجائے کہ کسی کو مکہ مکرمہ ہی سے بھیج کر اس کی طرف سے حج کرادیں۔ تو قانون کے اعتبار سے تو وہ حجِ بدل نہیں ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے قبول کرلیں تو یہ ان کا کرم ہے اور نہ ہونے سے یہ صورت بہر حال بہتر ہے۔ لیکن اصول اور قانون وہی ہے کہ جس شخص کے ذمے حج واجب ہے، حجِ بدل والے کو اسی شخص کے شہر سے جانا چاہئے۔

قانونی پابندی عذر ہے

آج کل یہ حال ہے کہ حج کرنا اپنے اختیار میں نہیں رہا، کیونکہ حج کرنے پر بہت ساری قانونی اور سرکاری پابندیاں عائد ہیں، مثلاً پہلے درخواست دو، پھر قرعہ اندازی میں نام آئے وغیرہ۔ لہٰذا جب کسی شخص پر حج فرض ہوگیا اور اس نے حج پر جانے کی قانونی کوشش کرلی اور پھر بھی نہ جاسکا تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معذور ہے، لیکن اپنی طرف سے کوشش کرے اور حج پر جانے کے جتنے قانونی ذرائع ہوسکتے ہیں ان کو اختیار کرے، لیکن آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور جانے کی فکر ہی نہ کرے تو یہ گناہ کی بات ہے۔

حج کی لذت حج ادا کرنے سے معلوم ہوگی

جب آپ ایک مرتبہ حج کر کے آئیں گے تو اس وقت آپ کو پتہ چلے گا کہ اس عبادت میں کیا چاشنی ہے؟ کیسی لذت ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت میں عجیب ہی کیف رکھا ہے۔ حج کے اندر سارے کام عقل کے خلاف ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس عبادت میں عشق کی جو شان رکھی ہے، اس کی وجہ سے اس عبادت کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی عظمت، اس کے ساتھ عشق انسان کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے اور جب وہ حج سے واپس آتا ہے تو ایسا ہوجاتا ہے جیسے وہ آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔

حجِ نفل کے لئے گناہ کا ارتکاب جائز نہیں

اور جب آدمی ایک مرتبہ حج کر کے واپس آتا ہے تو اس کی پیاس اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور پھر بار بار جانے کو دل چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بار بار جانے پر کوئی پابندی بھی نہیں لگائی، فرض تو زندگی میں ایک مرتبہ کیا ہے، لیکن دوبارہ جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے، جب بھی موقع ہو، آدمی نفلی حج پر جاسکتا ہے۔ مگر اس میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ نفلی عبادتوں کی وجہ سے کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، کیونکہ نفلی عبادت کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کو نہ کریں تو کوئی گناہ نہیں اور دوسری طرف گناہ سے بچنا واجب تھا، مثلاً جب حج کی درخواست دی جاتی ہے تو اس میں یہ لکھنا پڑتا ہے کہ میں نے اس سے پہلے حج نہیں کیا، اب آپ نے نفلی حج کے لئے یہ لکھ کر دے دیا کہ میں نے اس سے پہلے حج نہیں کیا، یہ آپ نے جھوٹ بولنے کا گناہ کرلیا اور جھوٹ بولنا حرام ہے، جھوٹ سے بچنا فرض ہے، گویا کہ آپ نے نفلی عبادت کے لئے جھوٹ کا ارتکاب کرلیا اور شریعت میں نفلی عبادت کے لئے جھوٹ کے ارتکاب کی کوئی گنجائش نہیں، ایسا جھوٹ بولنا ناجائز اور حرام ہے۔

حج کے لئے سودی معاملہ کرنا جائز نہیں

اسی طرح اگر اسپانسر شپ کے تحت حج کی درخواست دینی ہو تو اس کے لئے باہر سے ڈرافٹ منگوایا جاتا ہے، بعض لوگ یہاں سے خرید لیتے ہیں جس کے نتیجے میں سودی معاملہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ اب حجِ نفل کے لئے سودی معاملہ کر کے جانا، شرعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

حجِ نفل کے بجائے قرض ادا کریں

اسی طرح ایک شخص کے ذمے دوسروں کا قرض ہے تو قرض کی ادائیگی انسان پر مقدم ہے، اب وہ شخص قرض تو ادا نہیں کر رہا ہے لیکن ہر سال حج پر جا رہا ہے، گویا کہ فرض کام کو چھوڑ کر نفل کام کی طرف جا رہا ہے، یہ حرام اور ناجائز ہے۔

حجِ نفل کے بجائے نان ونفقہ ادا کریں

اسی طرح ایک شخص خود تو نفلی حج اور نفلی عمرے کر رہا ہے، جبکہ گھر والوں کو اور جن کا نفقہ اس شخص پر واجب ہے ان کو نفقہ کی تنگی ہو رہی ہے، یہ سب کام ناجائز ہیں یہ افراط ہے۔

بلکہ اگر کسی شخص کو یہ محسوس ہو کہ فلاں کام میں اس وقت خرچ کی زیادہ ضرورت ہے تو ایسی

صورت میں نفلی حج اور نفلی عمرے کے مقابلے میں اس کام پر خرچ کرنا زیادہ باعثِ ثواب ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا حجِ نفل چھوڑنا

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بڑے اُونچے درجے کے محدثین اور فقہاء میں سے ہیں اور صوفی بزرگ ہیں، یہ ہر سال حج کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ اپنے قافلے کے ساتھ حج پر جارہے تھے تو راستے میں ایک بستی کے پاس سے گزر ہوا، بستی کے قریب ایک کوڑے کا ڈھیر تھا، ایک بچی بستی سے نکل کر آئی اور اس کوڑے میں ایک مردار مرغی پڑی ہوئی تھی، اس بچی نے اس مردار مرغی کو اُٹھایا اور جلدی سے اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ یہ بچی ایک مردار مرغی کو اُٹھا کر لے جارہی ہے، چنانچہ آپ نے آدمی بھیج کر اس بچی کو بلوایا کہ تم اس مردار مرغی کو کیوں اُٹھا کر لے گئی ہو؟ اس بچی نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے گھر میں کئی روز سے فاقہ ہے اور ہمارے پاس اپنی جان بچانے کا کوئی راستہ اس کے سوانہیں ہے کہ ہم اس مردار مرغی کو کھالیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر بڑا اثر ہوا اور آپ نے فرمایا کہ ہم حج کا یہ سفر ملتوی کرتے ہیں اور تمام ساتھیوں سے فرمایا کہ اب ہم حج پر نہیں جائیں گے، جو پیسہ ہم حج پر خرچ کرتے، وہ پیسہ ہم اس بستی کے لوگوں پر خرچ کریں گے، تاکہ ان کی بھوک پیاس اور ان کی فاقہ کشی کا سدباب ہوسکے۔

تمام عبادات میں اعتدال اختیار کریں

لہٰذا یہ نہیں کہ ہمیں حج کرنے اور عمرہ کرنے کا شوق ہوگیا ہے، اب ہمیں اپنا یہ شوق پورا کرنا ہے، چاہے اس کے نتیجے میں شریعت کے دوسرے تقاضے نظر انداز ہوجائیں۔ بلکہ شریعت نام ہے توازن کا، کہ جس وقت میں اور جس جگہ میں جو ہم سے مطالبہ ہے، اس مطالبے کو پورا کریں اور یہ دیکھیں کہ اس وقت میرے مال کا زیادہ صحیح مصرف کیا ہوسکتا ہے جس کی اس وقت میں زیادہ ضرورت ہے؟ نفلی عبادتوں میں ان باتوں کا لحاظ رکھنا زیادہ ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے مجھے اور آپ کو حج کے انوار و برکات عطا فرمائے اور اپنی رضا کے مطابق اس کو قبول فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

حج کے بارے میں کچھ گذارشات ☆

آج کل حج پر جانے کے خواہش مند حضرات سے درخواستیں وصول کی جارہی ہیں، اس سلسلے میں حج پالیسی کا اعلان ہو چکا ہے، اور قواعد وضوابط مشتہر کردیئے گئے ہیں، غالباً ۳۰/ نومبر تک حج کی درخواستیں وصول کی جائیں گی، اس موقع پر بعض قارئین نے خط کے ذریعے توجہ دلائی ہے کہ حج کی فرضیت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، اگر ایک مضمون کے ذریعے ان کا ازلہ کردیا جائے تو مفید ہوگا، اس فرمائش کی تعمیل میں چند گذارشات پیش خدمت ہیں:

(۱) حج کے بارے میں بہت سے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بڑھاپے میں کرنے کا کام ہے، لہٰذا جب تک اچھی خاصی عمر نہ گزر جائے، لوگوں کو دھیان ہی نہیں ہوتا کہ اس فریضے کی ادائیگی کرنی چاہئے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حج کا کسی خاص عمر سے کوئی تعلق نہیں ہے، جس طرح نماز اور روزہ بالغ ہوتے ہی انسان کے ذمے فرض ہوجاتے ہیں، اور اگر انسان صاحبِ نصاب ہو تو زکوٰۃ بھی فرض ہوجاتی ہے، اسی طرح بالغ ہونے کے بعد جب بھی کسی شخص کو اتنی استطاعت حاصل ہو کہ وہ حج کرسکے، اس پر فوراً حج فرض ہوجاتا ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ حج ہر اس شخص پر فرض ہے جو بیت اللہ تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو، اس استطاعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے پاس مکہ مکرمہ آنے جانے اور وہاں قیام و طعام وغیرہ کا ضروری خرچ موجود ہو، نیز اگر وہ اہل وعیال کو وطن میں چھوڑ کر جارہا ہے تو ان کے ضروری اخراجات انہیں دے کر جاسکے، جب بھی کسی شخص کے پاس اتنی رقم موجود ہو کہ وہ یہ ضروریات پوری کرسکے، تو اس پر حج کی ادائیگی فرض ہے، اگر اتنا خرچ نقد موجود نہ ہو، لیکن اپنی ملکیت میں اتنا زیور ہو، یا فوری ضرورت سے زائد اتنا سامان (مثلاً سامانِ تجارت) ہو کہ اس کی مالیت سے یہ خرچ پورے ہوسکتے ہوں تو اس پر بھی حج فرض ہوجاتا ہے۔

(۲) جب ایک مرتبہ حج فرض ہوجائے تو پھر اسے کسی شدید عذر کے بغیر ٹلانا یا مؤخر کرنا جائز نہیں، بلاوجہ مؤخر کرنے سے انسان گناہگار ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہے کہ وہ کتنا عرصہ زندہ رہے گا، لہٰذا حج فرض ہونے کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو، یہ فریضہ ادا کرلینا

☆ ذکر وفکر، ص:۲۱۴ تا ۲۱۹، ۶ نومبر ۱۹۹۴ء

چاہئے، آج کل چونکہ اس کام کے لئے درخواست دے کر منظوری لینی پڑتی ہے، اس لئے جس شخص کے ذمے بھی اُوپر بیان کیے ہوئے معیار کے مطابق حج فرض ہو، اس پر حج کے لئے درخواست دینا شرعاً ضروری ہے، اگر قرعہ اندازی میں نام نہ آئے، یا سرکار کی طرف سے اجازت نہ ملے تو ایک مجبوری ہے، اور انشاء اللہ اس صورت میں درخواست دینے والا حج کو مؤخر کرنے سے گناہگار نہیں ہوگا، اور جب تک وہ ہر سال درخواست دیتا رہے گا، اس کی ذمہ داری پوری ہوتی رہے گی، یہاں تک کہ اسے اجازت مل جائے، اور وہ باقاعدہ حج کرے۔ لیکن یہ تصور قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد تصور ہے کہ جب عمر بڑی ہو جائے گی اس وقت حج کے لئے درخواست بھیجی جائے گی۔

بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ حج کا اصل لطف درحقیقت جوانی ہی میں ہے۔ اول تو اس لئے کہ حج میں جسمانی محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے، اور حج کے افعال اسی وقت نشاط اور ذوق وشوق کے ساتھ انجام دیئے جاسکتے ہیں جب انسان کے قویٰ اچھے ہوں، اور وہ اطمینان کے ساتھ یہ محنت برداشت کرسکتا ہو، ورنہ بڑھاپے میں اگرچہ انسان جوں توں کر کے حج کر لیتا ہے، لیکن کتنے کام ایسے ہیں جنہیں نشاط، چستی اور حضورِ قلب کے ساتھ انجام دینے کی حسرت ہی دل میں رہ جاتی ہے۔ دوسرے اس لئے کہ حج اگر اخلاص اور نیک نیتی سے صحیح طور پر انجام دیا جائے تو تجربہ یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں ایک انقلاب ضرور لے کر آتا ہے۔ اس سے انسان کے دل میں نرمی، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے جو بالآخر اسے گناہوں، جرائم اور بدعنوانیوں سے روکتی ہے، قلب وذہن کی اس تبدیلی کی سب سے زیادہ ضرورت انسان کو جوانی میں ہوتی ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ جوانی کی رو میں غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے۔

وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار
در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری

''بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی ''پرہیزگار'' بن جاتا ہے، پیغمبروں کا شیوہ یہ ہے کہ جوانی میں ظلم اور گناہ سے توبہ کی جائے''

(۳) یہ غلط فہمی بھی بہت سے لوگوں کے ذہن میں پائی جاتی ہے کہ جب تک تمام اولاد کی شادیاں نہ ہو جائیں، اس وقت تک حج نہیں کرنا چاہئے، یہ خیال بھی سراسر غلط ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حج کی فرضیت کا اولاد کی شادیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس شخص کو بھی مذکورہ بالا معیار کے مطابق استطاعت ہو، اس کے ذمے حج فرض ہو جاتا ہے، خواہ اولاد کی شادیاں ہوئی ہوں، یا نہ ہوئی ہوں۔

(۴) بعض گھرانوں میں یہ رواج بھی دیکھنے میں آیا کہ جب تک گھر کا بڑا فرد حج نہ کرلے اس وقت تک چھوٹے حج کرنا ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ بعض گھرانوں میں اس کو ایک عیب سمجھا جاتا ہے کہ چھوٹا بڑے سے پہلے حج کر آئے، حالانکہ دوسری عبادتوں یعنی نماز، روزے اور زکوٰۃ کی طرح حج بھی ایک ایسا فریضہ ہے جو ہر شخص پر انفرادی طور سے عائد ہوتا ہے، خواہ کسی دوسرے نے حج کیا ہو، یا نہ کیا ہو، اگر گھر کے کسی چھوٹے فرد کے پاس حج کی استطاعت ہے تو اس پر حج فرض ہے، اگر بڑے کے پاس استطاعت نہ ہو، یا استطاعت کے باوجود وہ حج نہ کر رہا ہو تو نہ اس سے چھوٹے کا فریضہ ساقط ہوتا ہے، نہ اسے مؤخر کرنے کا کوئی جواز پیدا ہوتا ہے۔

(۵) بہت سے گھرانوں میں یہ صورت دیکھنے میں آئی کہ باپ صاحب استطاعت نہیں ہے مگر بیٹا صاحب استطاعت ہے، اس کے باوجود وہ یہ سمجھتا ہے کہ پہلے میں باپ کو حج کراؤں، پھر خود حج کروں، یا اس وقت کا انتظار کروں جب میں باپ کو اپنے ساتھ حج کو لے جاسکوں، یہ طرزِ عمل بھی درست نہیں ہے۔ اگرچہ باپ کو حج کرانا ایک بڑی سعادت مندی ہے، لیکن اس سعادت کے حصول کے لئے اپنے فریضہ کو مؤخر کرنا درست نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے رمضان کے مہینے میں باپ بیماری یا ضعیفی کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکے تو بیٹے کے لئے اس بات کا جواز پیدا نہیں ہوتا کہ وہ باپ کی وجہ سے خود اپنے روزے بھی چھوڑ دے، اور یہ طے کرلے کہ جب تک باپ روزے رکھنے کے لائق نہ ہو، میں بھی روزے نہیں رکھوں گا۔ جس طرح یہ طرزِ عمل غلط ہے، اسی طرح اپنے حج کو باپ کے حج پر موقوف رکھنا بھی غلط ہے۔ اپنا فرض ادا کرلینا چاہئے، پھر جب بھی استطاعت ہو، اس وقت باپ کو حج کرانے کی بھی کوشش کرلینی چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حج ایک عبادت ہے، اور وہ اسی طرح ہر شخص پر انفرادی طور سے فرض ہوتی ہے، جیسے نماز روزہ، اور کسی کے ذمے دوسرے کو نہ حج کرانا فرض ہے، نہ اپنے حج کی ادائیگی دوسرے کے حج پر موقوف ہے، لہٰذا جن حضرات کے ذمے مذکورہ بالا معیار کے مطابق حج فرض ہو چکا ہے، انہیں حج کی درخواست ضرور دینی چاہئے۔

(۶) جن حضرات کی درخواستیں منظور ہو جائیں، انہیں جانے سے پہلے حج کے مکمل احکام و آداب سیکھنے چاہئیں۔ اس کے لئے ہر زبان میں کتابیں بھی موجود ہیں، اور ہمارے ملک میں مختلف حلقوں کی طرف سے حج کے تربیتی کورس بھی منعقد ہوتے ہیں ان میں شرکت کرنی چاہئے۔ عموماً درخواست کی منظوری اور حج کے لئے روانگی کے درمیان خاصا طویل وقفہ ہوتا ہے جو حج

کے احکام و آداب سیکھنے کے لئے بہت کافی ہے، بہت سے حضرات اس طرف توجہ دیئے بغیر حج کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں، اور اتنا خرچ اور مشقت اُٹھا کر بھی صحیح طریقے کے مطابق حج کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ بعض حضرات اپنی اس لاعلمی کو اپنی من گھڑت آراء کے پردے میں چھپانے کی بھی کوشش کرتے ہیں، اور اپنی رائے سے حج کے طریقوں میں خود ساختہ تبدیلیاں بھی کر لیتے ہیں۔

دنیا میں ہر کام کے لئے کچھ ادب آداب ہیں، اور تو اور کھیلوں تک کے آداب اور قواعد مقرر ہیں، اور اب تو کھیلوں کے آداب و قواعد مستقل فن کی صورت اختیار کر گئے ہیں، اور کوئی شخص کھیل بھی کھیلنا چاہے تو اسے یہ قواعد سیکھنے پڑتے ہیں، اور دل مانے یا نہ مانے، ان کی پابندی کرنی پڑتی ہے، حج تو پھر ایک عبادت ہے، بڑی مقدس اور عظیم الشان عبادت، لہٰذا اس کے آداب و احکام سیکھنا اور ان کی پابندی کرنا ضروری ہے، محض اپنی رائے کے بل پر ان قواعد و آداب میں تبدیلی کرنا اپنی محنت اور پیسے کو ضائع کرنے کے مرادف ہے، اگر اپنی من مانی کرنی ہے تو حج کے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔

(۷) حج چونکہ تمام مسلمان اکٹھے ہو کر انجام دیتے ہیں اور حج کے موقع پر انسانوں کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے، اس لئے اس میں ایک دوسرے سے تکلیف پہنچنے کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں، اسی لئے اسلام نے حج کے احکام میں اس بات کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا ہے کہ کوئی شخص کسی کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنے، قدم قدم پر ایسی ہدایات دی گئی ہیں جن کا مقصد لوگوں کو تکلیف سے بچانا ہے، اس غرض کے لئے بہت سے ایسے کاموں کو ترک کرنے کی ہدایت دی گئی ہے جو بذاتِ خود بہت فضیلت رکھتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ صحیح معلومات اور مناسب تربیت نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ان احکام کو پسِ پشت ڈال کر دوسروں کے لئے جان تک کا خطرہ پیدا کر دیتے ہیں، جو کام تھوڑا صبر و تحمل پیدا کر کے آرام و سکون کے ساتھ ہو سکتے ہیں ان میں دھکم پیل کی جاتی ہے، اور بلاوجہ حج جیسی عبادت کو دھینگا مشتی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بات اسلامی احکام کے قطعی خلاف اور سراسر ناجائز ہے جس سے عبادت کی روح پامال ہوتی ہے، لہٰذا حج کے تربیتی کورسوں اور حج سے متعلق ہدایات میں یہ پہلو خاص طور سے نمایاں کر کے اس پر زور دینے کی ضرورت ہے، وزارتِ مذہبی امور کو بطورِ خاص اس کام پر توجہ دینی چاہئے، حج کی پروازوں میں تمام راستے ایسی تقریریں نشر کی جانی چاہئیں جو عوام کو ان احکام و آداب سے نہ صرف واقف کرائیں، بلکہ ان کی اہمیت ان کے ذہن میں اچھی طرح بٹھا دیں۔

یکم جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ، ۶/ نومبر ۱۹۹۴ء

زکوٰۃ کی اہمیت اور اس کا نصاب☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ٥ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ٥

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ٥ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ٥﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گزشتہ چند جمعوں سے فلاح یافتہ مؤمنوں کی صفات کا بیان چل رہا ہے، ان میں سے پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ فلاح یافتہ مؤمن وہ ہیں جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں، دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ جو لغو کاموں سے اعراض کرنے والے ہیں۔ ان دونوں صفات کا تفصیلی بیان گزشتہ جمعوں میں ہو چکا۔ فلاح یافتہ مؤمنوں کا تیسرا وصف یہ بیان فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ٥﴾

''فلاح یافتہ مؤمن وہ ہیں جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں''

زکوٰۃ کے دو معنی

مفسرین نے اس آیتِ کریمہ کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس سے مراد فریضۂ زکوٰۃ کی ادائیگی ہے اور دوسرا مطلب بعض مفسرین نے یہ بیان فرمایا ہے کہ یہاں ''زکوٰۃ'' کے وہ مشہور معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی ہیں ''اپنے اخلاق کو پاک صاف کرنا''

عربی زبان میں ''زکوٰۃ'' کے معنی ہیں ''کسی بھی چیز کو گندگی سے، آلائشوں سے، اور نجاست سے پاک کرنا''، زکوٰۃ کو بھی زکوٰۃ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کے مال کو پاک کر دیتی ہے، جس مال کی زکوٰۃ نہ دی جائے وہ مال گندا ہے اور ناپاک ہے۔

بہرحال، بعض حضرات نے فرمایا کہ اس آیت میں زکوٰۃ کے معنی ہیں ''اپنے اخلاق کو پاک کرنا'' برے اخلاق سے اپنے آپ کو بچانا، لیکن یہ کام کہ اپنے آپ کو اچھے اخلاق سے مزین کیا جائے

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۲۸۶ تا ۲۹۸)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱ تا ٤

اور برے اخلاق سے بچایا جائے، یہ ایک عمل چاہتا ہے، اسی وجہ سے اس آیت میں فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝﴾

یعنی جو لوگ اپنے آپ کو بُرے اخلاق سے بچانے کے عمل سے گزرتے ہیں اور اپنے اخلاق کو پاک کر لیتے ہیں۔ بہر حال اس آیتِ کریمہ کی یہ دو تفسیریں ہیں۔

زکوٰۃ کی اہمیت

آج اس آیت کے مشہور معنی کے اعتبار سے تفسیر عرض کرتا ہوں، یعنی وہ لوگ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ ''زکوٰۃ'' اسلام کے پانچ ستونوں میں سے ایک ستون ہے اور ارکان اور فرائض میں سے ہے اور جس طرح نماز فرض ہے، اسی طرح زکوٰۃ بھی فرض ہے۔ قرآن کریم نے بیشمار مواقع پر زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (۱)

''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''

ان آیات کے ذریعہ اس طرف اشارہ فرمایا کہ جس طرح نماز کی ادائیگی انسان کے لئے فرض اور ضروری ہے، اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی بھی انسان کے لئے اتنے ہی درجے میں فرض اور ضروری ہے، نماز اگر بدنی عبادت ہے جس کو انسان اپنے جسم کے ذریعہ ادا کرتا ہے تو زکوٰۃ ایک مالی عبادت ہے جس کو انسان اپنے مال سے ادا کرتا ہے۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر وعید

اس کے چھوڑنے پر قرآن و حدیث میں بے شمار وعیدیں آئی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝﴾ (۲)

یعنی جو لوگ سونے اور چاندی کا ذخیرہ کر کے جمع کر کے رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اس کو خرچ نہیں کرتے یعنی جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں خرچ نہیں کرتے، مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی اور صدقۃ الفطر کی ادائیگی اور قربانی کرنے کا جو حکم دیا ہے اور اسی طرح غریبوں اور

---

(۱) البقرۃ: ۴۳ (۲) التوبۃ: ۳۴-۳۵

مسکینوں کی مدد کرنے کا جو حکم دیا ہے، ان احکام پر عمل نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کو دردناک عذاب ہونے والا ہے۔ پھر اگلی آیت میں اس عذاب کی تفصیل بیان فرمائی کہ جس مال کو اور سونے چاندی کو انہوں نے جمع کیا تھا، اس کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور پھر ان کی پیشانیاں اس مال سے داغی جائیں گی۔ جیسے لوہے کو آگ پر گرم کیا جاتا ہے اور وہ انگارہ بن جاتا ہے، اسی طرح ان کے مال اور سونے چاندی کو جہنم کی آگ پر گرم کیا جائے گا اور جب وہ آگ پر انگارہ کی طرح بن جائے گا تو اس کے بعد ان کی پیشانیاں اس سے داغی جائیں گی اور ان کے پہلو اور پشتیں داغی جائیں گی اور ان سے یہ کہا جائے گا کہ یہ وہ مال ہے جو تم نے اپنے پاس جمع کر کے رکھا تھا، آج تم اس مال کا مزہ چکھو جو تم نے جمع کر کے رکھا تھا۔ یہ کتنی سخت وعید ہے جو اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لئے بیان فرمائی، اس سے پتہ چلا کہ زکوٰۃ کتنا عظیم فریضہ ہے۔

زکوٰۃ، مال کی محبت کم کرنے کا مؤثر ذریعہ

اللہ تعالیٰ نے یہ زکوٰۃ کا فریضہ ایسا رکھا ہے کہ اس کا اصل مقصد تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے، لیکن اس کے فائدے بھی بے شمار ہیں، ایک فائدہ یہ ہے کہ جو بندہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مال کی محبت سے محفوظ رکھتا ہے، چنانچہ جس کے دل میں مال کی محبت ہوگی، وہ کبھی زکوٰۃ نہیں نکالے گا، کیونکہ بخل اور مال کی محبت انسان کی بدترین کمزوری ہے اور اس کا علاج اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے ذریعہ فرمایا ہے۔

زکوٰۃ کے ذریعے غربت کا خاتمہ

زکوٰۃ کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ بے شمار غریبوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اندازہ لگایا کہ اگر پاکستان کے تمام لوگ ٹھیک ٹھیک زکوٰۃ نکالیں اور اس زکوٰۃ کو صحیح مصرف پر خرچ کریں تو یقیناً پاکستان سے غربت کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ بہت سے لوگ تو زکوٰۃ نکالتے ہی نہیں اور جو بہت سے لوگ زکوٰۃ نکالتے ہیں تو وہ ٹھیک ٹھیک نہیں نکالتے بلکہ اندازے سے حساب کتاب کے بغیر نکال دیتے ہیں، اور پھر وہ اس کو صحیح مصرف پر خرچ کرنے کا اہتمام بھی نہیں کرتے۔ اس زکوٰۃ کا مصرف براہِ راست غریب لوگ ہیں، اس لئے شریعت نے زکوٰۃ کو بڑے بڑے رفاہی کاموں پر خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی، لیکن لوگ اس مسئلے کی پرواہ نہیں کرتے اور زکوٰۃ کو مختلف مصارف پر خرچ کر لیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ سے غریبوں کو جو فائدہ پہنچنا چاہئے تھا وہ فائدہ ان کو نہیں پہنچ رہا، اگر ٹھیک ٹھیک حساب کر کے صحیح مصرف پر زکوٰۃ خرچ کی جائے تو چند ہی سال میں ملک کی کایا پلٹ سکتی ہے۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے کے اسباب

لیکن یہ زکوٰۃ جتنا بڑا فریضہ ہے اور جتنے بے شمار اس کے فائدے ہیں، اتنی ہی اس کی طرف سے ہمارے معاشرے میں غفلت برتی جارہی ہے، چنانچہ بہت سے لوگ اس وجہ سے زکوٰۃ ادا نہیں کرتے کہ ان کے دلوں میں اسلام کے فرائض، واجبات اور ارکان کی اہمیت ہی نہیں ہے، جو پیسہ آرہا ہے آنے دو، غنیمت ہے، اور اس کو اپنے الٹے تللّے میں خرچ کرتے رہو، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسا بننے سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ ہم تو دینی کاموں کے لئے پیسے دیتے رہتے ہیں، کبھی کسی کام کے لئے اور کبھی کسی کام کے لئے، لہٰذا ہماری زکوٰۃ تو خود بخود نکل رہی ہے، اب الگ سے زکوٰۃ نکالنے کی کیا ضرورت ہے؟

مسائل سے ناواقفیت

بعض لوگ وہ ہیں جن کو پتہ ہی نہیں کہ زکوٰۃ کس وقت فرض ہوتی ہے، وہ لوگ زکوٰۃ کے احکام سے ناواقف ہیں، ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ زکوٰۃ کس شخص پر فرض ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ذمے زکوٰۃ فرض ہی نہیں ہے، حالانکہ ان پر زکوٰۃ فرض ہے۔ وہ ایسا اس لئے سمجھ رہے ہیں کہ ان کو صحیح مسئلہ معلوم نہیں کہ کس شخص پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں وہ لوگ زندگی بھر زکوٰۃ کی ادائیگی سے محروم رہتے ہیں۔

زکوٰۃ کا نصاب

خوب سمجھ لیں کہ شریعت نے زکوٰۃ کا ایک نصاب مقرر کیا ہے، جس شخص کے پاس وہ نصاب موجود ہوگا اس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی، اور وہ نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی ہے۔ بازار میں ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت معلوم کرلی جائے، آج کل کے لحاظ سے اس کی قیمت تقریباً چھ ہزار روپے بنتی ہے۔ لہٰذا شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس چھ ہزار روپے نقد ہوں یا سونے کی شکل میں ہوں یا چاندی کی شکل میں ہوں یا مالِ تجارت کی شکل میں ہوں، اس شخص پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، بشرطیکہ یہ روپے اس کی ضروریاتِ اصلیہ سے زائد ہوں یعنی روزمرہ کی ضروریات اور اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرنے کی ضرورت سے زائد ہوں، البتہ اگر کسی شخص پر قرض ہے تو جتنا قرض ہے، وہ اس زکوٰۃ کے نصاب سے منہا کرلیا جائے گا، مثلاً یہ دیکھا جائے کہ یہ رقم جو ہمارے پاس ہے، اگر اس کو قرض ادا کرنے میں صرف کردیا جائے تو باقی کتنی رقم بچے گی، اگر باقی چھ ہزار روپے یا اس سے زائد نہ

بچے تو پھر زکوٰۃ واجب نہیں، اور اگر چھ ہزار روپے یا اس سے زائد بچے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ضرورت سے کیا مراد ہے؟

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس چھ ہزار روپے تو ہیں، مگر وہ ہم نے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے رکھے ہیں اور شادی کرنا ضرورت میں داخل ہے، لہٰذا اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ یہ خیال غلط ہے، اس لئے کہ ضرورت سے مراد زندگی کی روزمرہ کی کھانے پینے کی ضرورتیں ہیں، یعنی اگر وہ ان روپوں کو خرچ کردے گا تو اس کے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ نہیں بچے گا، اپنے بیوی بچوں کو کھلانے کے لئے کچھ باقی نہیں رہے گا، لیکن جو رقم دوسرے منصوبوں کے لئے رکھی ہے مثلاً بیٹیوں کی شادی کرنی ہے یا مکان بنانا ہے یا گاڑی خریدنی ہے اور اس کے واسطے رقم جمع کر کے رکھی ہے تو وہ رقم ضرورت سے زائد ہے، اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

زکوٰۃ سے مال کم نہیں ہوتا

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو یہ پیسے بیٹی کی شادی کے لئے رکھے ہیں، اب اگر اس میں سے زکوٰۃ ادا کریں گے تو وہ رقم ختم ہو جائے گی۔ یہ کہنا درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ زکوٰۃ تو بہت معمولی سی یعنی اڑھائی فیصد اللہ تعالیٰ نے فرض فرمائی ہے یعنی ایک ہزار پر پچیس روپے فرض کیے ہیں، لہٰذا اگر کسی کے پاس چھ ہزار روپے ہیں تو اس پر صرف ڈیڑھ سو روپے زکوٰۃ فرض ہوگی جو بہت معمولی مقدار ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ نظام ایسا بنایا ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں وہ مفلس نہیں ہوتا، بلکہ زکوٰۃ ادا کرنے کے نتیجے میں اس کے مال میں برکت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو اور زیادہ عطا فرماتے ہیں۔ حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا ہے:

((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ))(۱)

''کوئی صدقہ اور کوئی زکوٰۃ کسی مال میں کمی نہیں کرتی''

مطلب یہ ہے کہ انسان زکوٰۃ کی مد میں جتنا خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اتنا ہی مال اور عطا فرماتے ہیں اور کم از کم یہ تو ہوتا ہی ہے کہ جتنا مال موجود ہے، اس میں اللہ تعالیٰ اتنی برکت عطا فرماتے

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع، رقم: ٤٦٨٩، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في التواضع، رقم: ١٩٥٢، مسند أحمد، رقم: ٦٩٠٨، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب ما جاء في التعفف عن المسألة، رقم: ١٥٩٠

ہیں کہ وہ کام جو ہزاروں میں نکلنا چاہئے تھا، سینکڑوں میں نکل جاتا ہے۔

مال جمع کرنے اور گننے کی اہمیت

آج ہماری دنیا مادہ پرستی کی دنیا ہے، اس مادہ پرستی کی دنیا میں ہر کام کا فیصلہ گنتی سے کیا جاتا ہے۔ ہر وقت انسان یہ گنتا رہتا ہے کہ میرے پاس کتنے پیسے ہیں، کتنے پیسے آئے اور کتنے پیسے چلے گئے۔ جس کو قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ﴾(۱) ''مال جمع کرتا ہے اور گنتا رہتا ہے''

لہٰذا آج گنتی کا دور ہے۔ یہ دیکھتے ہیں کہ کتنی گنتی بڑھی اور کتنی گھٹ گئی۔ لیکن کوئی اللہ کا بندہ یہ نہیں دیکھتا کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے نتیجے میں گنتی گھٹنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس تھوڑے مال میں کتنا کام نکال دیا اور اگر زکوٰۃ ادا نہ کرنے کے نتیجے میں گنتی بڑھ گئی تو اس بڑھے ہوئے مال کے نتیجے میں کتنی بے برکتی آگئی، کتنے مسائل کھڑے ہوگئے اور کتنی مصیبتوں کا سامنا ہوگیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ جو بندہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے، اس کے مال میں کمی نہیں ہوتی۔

فرشتے کی دعا کے مستحق کون؟

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ مقرر ہے جو مسلسل یہ دعا کرتا رہتا ہے:

((اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَأَعْطِ مُمْسِكًا مَالًا تَلَفًا))(۲)

''اے اللہ! جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا ہو اور جو صدقہ خیرات کرنے والا ہو، اس کو اس کے مال کا دنیا ہی میں بدلہ عطا فرمایئے''

آخرت میں اس کو عظیم ثواب ملنا ہی ہے لیکن وہ فرشتہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! اس کو دنیا میں بھی بدلہ عطا فرمایئے اور جو شخص اپنا مال کھینچ کر اور چھپا کر رکھتا ہے تاکہ مجھے خرچ نہ کرنا پڑے، اے اللہ! اس کے مال پر بربادی ڈال دیجئے اور اس کے مال کو ہلاک فرمایئے۔ لہٰذا یہ سوچنا کہ ہم نے تو فلاں مقصد کے لئے یہ پیسے رکھے ہیں اور وہ مقصد بھی ضروری ہے، وہ مقصد بیٹی کی شادی ہے، گھر بنانا ہے، گاڑی خریدنی ہے، اگر ہم نے زکوٰۃ دیدی تو وہ پیسے کم ہو جائیں گے، یہ خیال درست نہیں، بلکہ اگر تم

(۱) الهمزة:۲ (۲) صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب قول الله تعالى فأما من أعطى......الخ، رقم: ۱۳۵۱، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب في المنفق والممسك، رقم: ۱۶۷۸، مسند أحمد، رقم: ۷۷۰۹

نے زکوٰۃ دیدی اور اس کے ذریعہ ظاہری طور پر کچھ کمی بھی آگئی تو یہ کمی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی بلکہ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اور دیدیں گے اور جو مال بچا ہے، اس میں برکت عطا فرمائیں گے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے انشاء اللہ تمہارا کام نہیں رکے گا۔

زکوٰۃ کی وجہ سے کوئی شخص فقیر نہیں ہوتا

آج تک کسی شخص کا کام زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے نہیں رکا بلکہ میں چیلنج کر کے کہتا ہوں کہ کوئی شخص آج تک زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے مفلس نہیں ہوا، کوئی شخص ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے مفلس ہو گیا ہو، لہٰذا یہ جو لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ جو رقم حج کے لئے رکھی ہوئی ہو، اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، یہ بات غلط ہے، کوئی رقم کسی بھی مقصد کے لئے رکھی ہے اور وہ رقم تمہاری روزمرہ کی ضروریات سے فاضل ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

زیور پر زکوٰۃ فرض ہے

اگر کسی شخص کے پاس نقد رقم تو نہیں ہے لیکن اس کے پاس زیور کی شکل میں سونا یا چاندی ہے تو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ اکثر و بیشتر گھروں میں اتنا زیور ہوتا ہے جو نصابِ زکوٰۃ کی مقدار کو پہنچ جاتا ہے، لہٰذا جس کی ملکیت میں وہ زیور ہے، چاہے وہ شوہر ہو یا بیوی ہو یا بیٹا اور بیٹی ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر شوہر کی ملکیت میں ہے تو شوہر پر زکوٰۃ واجب ہے اور اگر بیوی کی ملکیت میں ہے تو بیوی پر زکوٰۃ واجب ہے۔ آجکل ملکیت کا معاملہ بھی صاف نہیں ہوتا اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ زیور کس کی ملکیت ہے؟ شریعت نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ ہر بات صاف اور واضح ہونی چاہئے۔ لہٰذا یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ یہ زیور کس کی ملکیت ہے؟ شوہر کی ملکیت ہے یا بیوی کی ملکیت ہے؟ اگر اب تک واضح نہیں تھی تو اب واضح کر لو کہ کس کی ملکیت ہے؟ جس کی ملکیت ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

شاید آپ پر زکوٰۃ فرض ہو

بہر حال نصابِ زکوٰۃ کے بارے میں یہ شریعت کا دستور ہے، اگر اس کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ بہت سے لوگوں پر زکوٰۃ فرض ہے، مگر وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، اس وجہ سے وہ لوگ زکوٰۃ کے فریضے کی ادائیگی سے محروم رہتے ہیں۔ یہ نصابِ زکوٰۃ سے متعلق مختصر مسئلہ تھا، اگر زندگی باقی رہی تو تفصیل انشاء اللہ آئندہ جمعہ میں عرض کروں گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

زکوٰۃ کے چند اہم مسائل ☆

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○
﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ○﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گذشتہ چند جمعوں سے ان آیات پر بیان ہو رہا ہے، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے فلاح یافتہ مؤمنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں، ان میں سے دو صفات کا تفصیلی بیان ہو چکا، تیسری صفت کا بیان چل رہا ہے کہ فلاح یافتہ مؤمن وہ ہیں جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ کی اہمیت اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر وعید اور زکوٰۃ کے نصاب کے بارے میں گزشتہ جمعہ کو تفصیل سے عرض کر دیا تھا، آج زکوٰۃ کے بارے میں چند مسائل بیان کرنے کا ارادہ ہے جن سے ناواقفیت کی وجہ سے ہم لوگ اس فریضے کو صحیح طریقے پر ادا نہیں کر رہے ہیں۔

مالکِ نصاب پر زکوٰۃ واجب ہے

یہاں یہ مسئلہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس کی ملکیت کا مکلّف بنایا ہے، ہر انسان پر اس کی ملکیت کے حساب سے احکام جاری ہوتے ہیں، مثلاً اگر باپ صاحبِ نصاب ہے تو اس پر زکوٰۃ اس کی ملکیت کے حساب سے واجب ہے، اگر بیٹا بھی صاحبِ نصاب ہے تو بیٹے پر اس کے مال کی زکوٰۃ واجب ہے، اگر شوہر صاحبِ نصاب ہے اور بیوی بھی صاحبِ نصاب ہے تو شوہر پر اس کے مال کی زکوٰۃ واجب ہے اور بیوی پر اس کے مال کی زکوٰۃ واجب ہے، ہر ایک کی ملکیت کا الگ الگ اعتبار ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۳۰۱ تا ۳۱۲) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) المؤمنون: ۱۔۴

باپ کی زکوٰۃ بیٹے کے لئے کافی نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ گھر کا جو بڑا اور سربراہ ہے، چاہے وہ باپ ہو یا شوہر ہو، اگر اس نے زکوٰۃ نکال دی تو سب کی طرف سے زکوٰۃ ادا ہوگئی، اب گھر کے دوسرے افراد کو زکوٰۃ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات درست نہیں، اس لئے کہ جس طرح باپ کے نماز پڑھ لینے سے بیٹے کی نماز ادا نہیں ہوتی بلکہ بیٹے کو اپنی نماز الگ پڑھنی ہوگی اور جس طرح شوہر کے نماز پڑھ لینے سے بیوی کی نماز ادا نہیں ہوتی بلکہ بیوی کو اپنی نماز الگ پڑھنی ہوگی، اسی طرح زکوٰۃ کا حکم یہ ہے کہ گھر کے اندر جو شخص بھی صاحبِ نصاب ہے، چاہے وہ باپ ہے، بیٹا ہے، بیٹی ہے، بیوی ہے، شوہر ہے، سب پر اپنی اپنی ملکیت کے حساب سے الگ الگ زکوٰۃ واجب ہوگی۔

مال پر سال گزرنے کا مسئلہ

ایک اور مسئلہ جس میں لوگوں کو بکثرت غلط فہمی رہتی ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ زکوٰۃ اس وقت فرض ہوتی ہے جب مال پر سال گزر جائے، سال گزرنے سے پہلے زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی۔ عام طور پر لوگ اس مسئلہ کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ ہر ہر مال پر الگ الگ سال گزرنا ضروری ہے، حالانکہ یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ سال گزرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سارے سال صاحبِ نصاب رہے۔ مثلاً کسی شخص کے پاس یکم رمضان المبارک کو دس ہزار روپے آگئے، اب یہ شخص صاحبِ نصاب ہوگیا، اب اگر سال کے اکثر حصے میں اس کے پاس ان میں سے چھ ہزار روپے موجود رہے ہیں یا چھ ہزار روپے کی مالیت کا زیور رہا ہے، یا مالِ تجارت رہا ہے تو وہ صاحبِ نصاب ہے، اگر درمیانِ سال میں اس کے پاس اور روپے آگئے تو اس پر علیحدہ سے مکمل سال کا گزرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگلے رمضان کی پہلی تاریخ کو جتنی رقم یا زیور یا مالِ تجارت ہوگا، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

دو دن پہلے آنے والے مال میں زکوٰۃ

مثلاً یکم رمضان سے دو دن پہلے اس کے پاس دس ہزار روپے مزید آگئے تو اب یکم رمضان کو اس دس ہزار روپے میں بھی زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، اس پر علیحدہ سے سال گزرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ وہ شخص پورے سال صاحبِ نصاب رہا ہے، اس لئے اگر درمیان میں کوئی اضافہ ہو جائے تو اس پر الگ سے سال گزرنا ضروری نہیں۔

زکوٰۃ کن چیزوں میں فرض ہوتی ہے؟

ایک مسئلہ یہ ہے کہ کن چیزوں میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے؟ زکوٰۃ ان چیزوں میں فرض ہوتی ہے:

(۱) نقد روپیہ، چاہے بینک میں ہو یا گھر پر ہو، اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

(۲) سونے چاندی اور زیور پر بھی زکوٰۃ فرض ہے، چاہے زیور استعمال ہو رہا ہو یا یونہی رکھا ہوا ہو، اور وہ زیور جس کی ملکیت میں ہوگا اسی پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔

اس معاملے میں بھی ہمارے معاشرے میں بڑی بدنظمی پائی جاتی ہے، گھر میں خاتون کے پاس جو زیور ہوتا ہے، اس کے بارے میں یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ کس کی ملکیت ہے؟ کیا وہ عورت کی ملکیت ہے یا شوہر کی ملکیت ہے؟ شرعی اعتبار سے اس کو واضح کرنا ضروری ہے۔

زیور کس کی ملکیت ہوگا؟

مثلاً شادی کے موقع پر عورت کو جو زیور چڑھایا جاتا ہے، اس میں سے کچھ زیور لڑکی والوں کی طرف سے چڑھایا جاتا ہے اور کچھ زیور لڑکے والوں کی طرف سے چڑھایا جاتا ہے۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ جو زیور لڑکی والوں کی طرف سے چڑھایا جاتا ہے، وہ سو فیصد لڑکی کی ملکیت ہوتا ہے اور لڑکی ہی پر اس کی زکوٰۃ فرض ہے اور جو زیور لڑکے والوں کی طرف سے چڑھایا جاتا ہے، وہ دلہن کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک طرح سے عاریتاً دیا جاتا ہے، اس کا مالک لڑکا ہوتا ہے، لہٰذا اس زیور کی زکوٰۃ بھی اسی پر فرض ہوگی، البتہ اگر لڑکا اپنی بیوی سے یہ کہہ دے کہ میں نے تمہیں یہ زیور دے دیا، تم اس کی مالک ہو، تو اب زیور عورت کی ملکیت میں آجائے گا اور اس کی زکوٰۃ عورت ہی پر فرض ہوگی۔ لہٰذا اس کو واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ گھر میں جو زیور ہے، وہ کس کی ملکیت ہے؟ اس کی وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے بعد میں جھگڑے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو زیور شوہر کی ملکیت ہے، اس کی زکوٰۃ شوہر پر فرض ہوگی اور جو زیور عورت کی ملکیت ہے، اس کی زکوٰۃ عورت پر فرض ہے۔

زیور کی زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ

زیور کی زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ زیور کا وزن کر لیا جائے، چونکہ زکوٰۃ سونے کے وزن پر فرض ہوتی ہے، اس لئے اگر زیور میں موتی لگے ہوئے ہیں یا کوئی اور دھات اس کے اندر شامل

ہے تو وہ وزن میں شامل نہیں ہوں گے، لہٰذا خالص سونا دیکھا جائے کہ اس زیور میں کتنا سونا ہے؟ پھر اس وزن کو کسی جگہ لکھ کر محفوظ کرلیا جائے کہ فلاں زیور کا اتنا وزن ہے۔ پھر جس تاریخ میں زکوٰۃ کا حساب کیا جائے مثلاً یکم رمضان کو زکوٰۃ کی تاریخ مقرر کی ہوئی ہے تو اب یکم رمضان کو بازار سے سونے کی قیمت معلوم کی جائے کہ آج بازار میں سونے کی کیا قیمت ہے؟ قیمت معلوم کرنے کے بعد اس کا حساب نکالا جائے کہ اس زیور میں کتنی مالیت کا سونا ہے، اس مالیت پر اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائے، مثلاً اگر اس سونے کی مالیت ایک ہزار روپے ہے تو اس پر ۲۵ روپے زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر دو ہزار ہے تو ۵۰ روپے واجب ہوگی اور اگر چار ہزار روپے ہے تو سو روپے زکوٰۃ واجب ہوگی، اس طرح حساب کر کے اڑھائی فیصد زکوٰۃ ادا کردی جائے۔ سونے کی قیمت اس دن کی معتبر ہوگی جس دن آپ زکوٰۃ کا حساب کر رہے ہیں، جس دن آپ نے سونا خریدا تھا، اس دن کی قیمتِ خرید معتبر نہیں ہوگی۔

مالِ تجارت میں زکوٰۃ

(۳) تیسری چیز جس میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، وہ مالِ تجارت ہے۔

مثلاً کسی شخص نے کوئی دکان کھولی ہوئی ہے، اب اس دکان میں جتنا مال رکھا ہے، اس کی قیمت لگائی جائے گی اور قیمت اس طرح لگائی جائے گی کہ اگر اس کا پورا سامان آج ایک ساتھ فروخت کیا جائے تو اس کی کیا قیمت لگے گی، بس قیمت کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ میں ادا کرنا ہوگا۔

کمپنی کے شیئرز میں زکوٰۃ

اگر کسی شخص نے کسی کمپنی کے شیئرز خریدے ہوئے ہیں تو وہ شیئرز بھی مالِ تجارت میں داخل ہیں، لہٰذا ان شیئرز کی جو بازاری قیمت ہے، اس قیمت کا اڑھائی فیصد زکوٰۃ کے طور پر ادا کرنا ہوگا۔ آجکل کمپنیاں خود شیئرز کی زکوٰۃ کاٹ لیتی ہیں، لیکن وہ کمپنیاں شیئرز کی اصل قیمت پر زکوٰۃ کاٹتی ہیں، بازاری قیمت پر نہیں کاٹتیں، مثلاً ایک کمپنی کے شیئرز کی اصل قیمت دس روپے ہے اور بازار میں اس کی قیمت پچاس روپے ہے، اب کمپنی تو دس روپے کے حساب سے زکوٰۃ کاٹ لے گی لیکن درمیان میں چالیس روپے کا جو فرق ہے، اس کی زکوٰۃ شیئرز ہولڈر کو خود ادا کرنی ضروری ہے۔

مکان یا پلاٹ میں زکوٰۃ

اگر کسی شخص نے کوئی مکان یا پلاٹ فروخت کرنے کی نیت سے خریدا ہے، اس میں بھی زکوٰۃ

واجب ہے۔ یعنی اس نیت سے خریدا ہے کہ میں اس پلاٹ کو فروخت کر کے اس سے نفع کماؤں گا، تو اس مکان اور پلاٹ کی مالیت میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اگر کسی شخص نے کوئی مکان یا پلاٹ فروخت کرنے کی نیت سے نہیں خریدا بلکہ رہائش کی نیت سے خریدا ہے یا اس نیت سے خریدا ہے کہ میں اس مکان کو کرایہ پر دے کر اس سے آمدنی حاصل کروں گا تو اس صورت میں مکان کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ جو کرایہ آئے گا وہ نقدی میں شامل ہو کر اس پر اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

خام مال میں زکوٰۃ

بہرحال بنیادی طور پر تین چیزوں میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے: (۱) نقدی (۲) زیور (۳) مالِ تجارت

مالِ تجارت میں خام مال بھی شامل ہوگا، مثلاً اگر کسی کمپنی کے اندر خام مال پڑا ہوا ہے تو زکوٰۃ کا حساب جس دن کیا جائے گا، اس دن اس خام مال کی قیمت لگا کر اس کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ضروری ہوگی اور جو مال تیار ہے، اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بیٹے کی طرف سے باپ کا زکوٰۃ ادا کرنا

لیکن اگر زکوٰۃ گھر کے تین افراد پر الگ الگ فرض ہے اور ان میں کوئی ایک دوسرے کو اجازت دیدے کہ میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ آپ میری طرف سے زکوٰۃ ادا کر دیں، پھر وہ دوسرا شخص اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر دے، چاہے اپنے پیسوں سے ادا کر دے تب بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ مثلاً ایک شخص کے تین بیٹے بالغ ہیں اور تینوں صاحبِ نصاب ہیں، یعنی تینوں بیٹوں کی ملکیت میں ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر قابلِ زکوٰۃ اثاثے موجود ہیں، لہٰذا تینوں بیٹوں میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ زکوٰۃ فرض ہے اور باپ پر صاحبِ نصاب ہونے کی وجہ سے علیحدہ زکوٰۃ فرض ہے، لیکن اگر باپ اپنے بیٹوں کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، بشرطیکہ بیٹوں کی طرف سے اجازت ہو، اجازت کے بعد اگر باپ ان کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر دے تو ان کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

بیوی کی طرف سے شوہر کا زکوٰۃ ادا کرنا

اسی طرح اگر شوہر بھی صاحبِ نصاب ہے اور بیوی بھی صاحبِ نصاب ہے، کیونکہ اس کے

پاس اتنا زیور ہے جو نصابِ زکوٰۃ کے برابر یا اس سے زیادہ ہے، لیکن بیوی کے پاس زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں، اب وہ بیوی شوہر کو زکوٰۃ ادا کرنے پر مجبور تو نہیں کرسکتی لیکن اگر شوہر یہ کہے کہ تمہاری زکوٰۃ میں ادا کردیتا ہوں اور بیوی اس کو اجازت دیدے اور پھر شوہر اپنے پیسوں سے اس کی زکوٰۃ ادا کردے تو بیوی کی زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے گی۔ البتہ اگر شوہر بخیل ہے اور بیوی کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، تب بھی بیوی پر اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہوگا، چاہے زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے اس کو اپنا زیور ہی کیوں نہ فروخت کرنا پڑے۔

زیور کی زکوٰۃ نہ نکالنے پر وعید

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ گھر میں تشریف لائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا تو ان کے ہاتھ کی اُنگلیوں میں چاندی کی انگوٹھیاں نظر آئیں۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ یہ انگوٹھیاں کہاں سے آئیں؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں نے یہ کہیں سے حاصل کی ہیں، اس لئے کہ یہ مجھے اچھی لگ رہی تھیں۔

حضور اقدس ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم اس کی زکوٰۃ نکالتی ہو؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اس کی زکوٰۃ نہیں نکالی۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ اس کے بدلے تمہیں آخرت میں آگ کی انگوٹھیاں پہنائی جائیں تو بیشک اس کی زکوٰۃ نہ نکالو، لیکن اگر آگ کی انگوٹھیاں پہننے سے بچنا ہے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرو۔ (۱)

حضور اقدس ﷺ نے زیور کی زکوٰۃ کے بارے میں اتنی تاکید فرمائی ہے، لہٰذا خواتین کو زیور کی زکوٰۃ ادا کرنے کا بہت اہتمام کرنا چاہئے بشرطیکہ وہ زیور ان کی ملکیت ہو۔

عورت کی ملکیت میں زیور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ زیور یا تو اس نے اپنے پیسوں سے خریدا ہو یا کسی نے اس کو ہدیہ میں دیا ہو یا وہ شادی کے موقع پر اپنی ماں کے گھر سے لائی ہو یا شوہر وہ زیور مہر کے طور پر بیوی کی ملکیت میں دیدے، مثلاً مہر پچاس ہزار روپے تھا اور شادی کے موقع پر شوہر کی طرف سے زیور چڑھایا گیا، لیکن چونکہ اس وقت کوئی وضاحت شوہر نے نہیں کی تھی، اس لئے وہ زیور شوہر کی ملکیت میں تھا، اب اگر وہ شوہر یہ کہہ دے کہ میں نے شادی کے موقع پر جو زیور چڑھایا ہے، وہ میں تمہیں مہر کے طور پر دیتا ہوں، یہ تمہارا مہر کا حصہ ہے تو اس صورت میں اس زیور کے ذریعہ

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الزكاة، باب الكنز ما هو وزكاة الحلي، رقم: ۱۳۳۸

مہر ادا ہو جائے گا اور بیوی اس زیور کی مالک بن جائے گی، اب اس زیور کی زکوٰۃ بیوی پر فرض ہوگی، شوہر پر فرض نہیں ہوگی، اب بیوی کو اختیار ہے کہ جو چاہے کرے، چاہے خود پہنے یا فروخت کر دے یا کسی کو دیدے، شوہر کو اجازت نہیں کہ وہ بیوی کو ان کاموں سے روکے، اس لئے کہ وہ زیور اب اس کی ملکیت میں آچکا ہے۔

بہر حال ہر چیز کا یہی حکم ہے کہ جو شخص جس چیز کا مالک ہے، اس کی زکوٰۃ بھی اسی پر فرض ہوگی، البتہ اگر دوسرا شخص اس کی اجازت سے رضا کارانہ طور پر اس کی طرف سے زکوٰۃ دیدے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، مثلاً بیوی کی طرف سے شوہر دیدے یا اولاد کی طرف سے باپ دیدے، بشرطیکہ اجازت ہو، بغیر اجازت کے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اس لئے کہ یہ اس کا اپنا فریضہ ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں زکوٰۃ کے مسائل سے ناواقفیت بہت پھیلی ہوئی ہے، اس کی وجہ سے یہ ہو رہا ہے کہ بہت سے لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، لیکن بسا اوقات وہ زکوٰۃ صحیح طریقے سے ادا نہیں ہوتی اور اس کے نتیجے میں زکوٰۃ ادا نہ ہونے کا وبال سر پر رہتا ہے۔ اس لئے خدا کے لئے زکوٰۃ کے بنیادی مسائل کو سیکھ لیں۔ یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں، کیونکہ انسان کے پاس جتنے اثاثے ہیں، ان میں سے صرف تین چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، ایک سونا چاندی پر دوسرے نقد روپے پر اور تیسرے سامانِ تجارت پر، یعنی ہر وہ چیز جو فروخت کرنے کی نیت سے خریدی گئی ہو، اس پر زکوٰۃ واجب ہے، ان کے علاوہ گھر کے اندر جو استعمال کی اشیاء ہیں مثلاً گھر کا فرنیچر، گاڑی، رہائشی مکان، استعمال کے برتن وغیرہ ان پر زکوٰۃ نہیں، البتہ گھر میں یا بینک میں جو رقم رکھی ہے یا گھر میں جو زیور اور سونا چاندی ہے یا کوئی مکان یا پلاٹ فروخت کرنے کی نیت سے خریدا ہے تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے، لیکن اگر رہنے کے لئے مکان خریدا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ بہر حال زکوٰۃ کی ادائیگی کا عمل آسان ہے، زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن ذرا سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کے اس ستون کو صحیح سمجھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے اور اس کو ٹھیک ادائیگی کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

آپ زکوۃ کس طرح ادا کریں؟ ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِo بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِo
﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ o يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ o﴾ (۱)

بزرگان محترم اور برادران عزیز! آج کا یہ اجتماع اسلام کے ایک اہم رکن یعنی زکوۃ کے موضوع پر منعقد کیا گیا ہے، اور رمضان کے مبارک مہینے سے چند روز پہلے یہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ عام طور پر لوگ رمضان المبارک کے مہینے میں زکوۃ نکالتے ہیں۔ لہٰذا اس اجتماع کا مقصد یہ ہے کہ زکوۃ کی اہمیت، اس کے فضائل اور اس کے ضروری احکام اس اجتماع کے ذریعہ ہمارے علم میں آجائیں تاکہ اس کے مطابق زکوۃ نکالنے کا اہتمام کریں۔

زکوۃ نہ نکالنے پر وعید

اس مقصد کے لئے میں نے قرآن کریم کی دو آیتیں آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر بڑی سخت وعید بیان فرمائی ہے جو اپنے مال کی کماحقہ زکوۃ نہیں نکالتے، ان کے لئے بڑے سخت الفاظ میں عذاب کی خبر دی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ جو لوگ اپنے پاس سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے تو (اے نبی ﷺ) آپ ان کو ایک دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے۔ یعنی جو لوگ اپنا پیسہ، اپنا روپیہ، اپنا سونا چاندی جمع کرتے جارہے ہیں اور ان کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، ان پر اللہ تعالیٰ نے جو فریضہ عائد کیا

☆ اصلاحی خطبات (۹/۱۲۹ تا ۱۵۳) ۲۸ دسمبر ۱۹۹۷ء، بعد از نماز ظہر، عالمگیر مسجد، کراچی

(۱) التوبة: ۳۴-۳۵

ہے اس کو ادا نہیں کرتے، ان کو یہ خبر سنا دیجئے کہ ایک دردناک عذاب ان کا انتظار کر رہا ہے۔ پھر دوسری آیت میں اس دردناک عذاب کی تفصیل بیان فرمائی کہ یہ دردناک عذاب اس دن ہوگا جس دن اس سونے اور چاندی کو آگ میں تپایا جائے گا اور پھر اس آدمی کی پیشانی، اس کے پہلو اور اس کی پشت کو داغا جائے گا اور اس کو یہ کہا جائے گا:

﴿هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ﴾

''یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، آج تم خزانے کا مزہ چکھو جو تم اپنے لئے جمع کر رہے تھے''

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس انجام سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو روپیہ پیسہ جمع کر رہے ہیں لیکن اس پر اللہ تعالیٰ نے جو فرائض عائد کیے ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک بجا نہیں لاتے۔ صرف ان آیات میں نہیں بلکہ دوسری آیات میں بھی وعیدیں بیان فرمائی گئی ہیں، چنانچہ سورۃ ہمزہ میں فرمایا:

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ ۝ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۝﴾(1)

''اس شخص کے لئے دردناک عذاب ہے جو عیب نکالنے والا ہے اور طعنہ دینے والا ہے، جو مال جمع کر رہا ہے اور گن گن کر رکھ رہا ہے (ہر روز گنتا ہے کہ آج میرے مال میں کتنا اضافہ ہوگیا ہے اور اس کی گنتی کر کے خوش ہو رہا ہے) اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ مال مجھے ہمیشہ کی زندگی عطا کر دے گا، ہرگز نہیں۔ (یاد رکھو! یہ مال جس کو وہ گن گن کر رکھ رہا ہے اور اس پر جو واجبات ہیں ان کو ادا نہیں کر رہا ہے، اس کی وجہ سے) اس کو روندنے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ تمہیں کیا پتہ کہ ''حطمۃ'' کیا چیز ہوتی ہے؟ (یہ حطمۃ جس میں اس کو ڈالا جائے گا) یہ ایسی آگ ہے جو اللہ کی سلگائی ہوئی ہے (یہ کسی انسان کی سلگائی ہوئی آگ نہیں ہے جو پانی سے بجھ جائے یا مٹی سے بجھ جائے یا جس کو فائر بریگیڈ بجھا دے بلکہ یہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے) جو انسان کے قلب و جگر تک جھانکتی ہوگی (یعنی انسان کے قلب و جگر تک پہنچ جائے گی)

اتنی شدید وعید اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

(۱) الھمزۃ: ۱۔۷

یہ مال کہاں سے آرہا ہے؟

زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر ایسی شدید وعید کیوں بیان فرمائی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ مال تم اس دنیا میں حاصل کرتے ہو، چاہے تجارت کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، چاہے ملازمت کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، چاہے کاشت کاری کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، یا کسی اور ذریعہ سے حاصل کرتے ہو، ذرا غور کرو کہ وہ مال کہاں سے آرہا ہے؟ کیا تمہارے اندر طاقت تھی کہ تم اپنے زور بازو سے وہ مال جمع کرسکتے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا حکیمانہ نظام ہے، وہ اپنے اس نظام کے ذریعہ تمہیں رزق پہنچا رہا ہے۔

گاہک کون بھیج رہا ہے؟

تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے مال جمع کرلیا اور دکان کھول کر بیٹھ گیا اور اس مال کو فروخت کردیا تو اس کے نتیجے میں مجھے پیسہ مل گیا، یہ نہ دیکھا کہ جب دکان کھول کر بیٹھ گئے تو تمہارے پاس گاہک کس نے بھیجا؟ اگر تم دکان کھول کر بیٹھے ہوتے اور کوئی گاہک نہ آتا تو اس وقت کوئی بکری ہوتی؟ کوئی آمدنی ہوتی؟ یہ کون ہے جو تمہارے پاس گاہک بھیج رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ ایک دوسرے کی حاجتیں، ایک دوسرے کی ضرورتیں ایک دوسرے کے ذریعہ پوری کی جاتی ہیں۔ ایک شخص کے دل میں ڈال دیا کہ تم جاکر دکان کھول کر بیٹھو اور دوسرے کے دل میں یہ ڈال دیا کہ اس دکان والے سے خریدو۔

ایک سبق آموز واقعہ

میرے ایک بڑے بھائی تھے جناب محمد ذکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے، آمین، لاہور میں ان کی دینی کتابوں کی ایک دکان ''ادارۂ اسلامیات'' کے نام سے تھی، اب بھی وہ دکان موجود ہے، وہ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ تجارت میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور قدرت کے عجیب کرشمے دکھلاتا ہے، ایک دن میں صبح بیدار ہوا تو پورے شہر میں موسلا دھار بارش ہورہی تھی اور بازاروں میں کئی کئی انچ پانی کھڑا تھا، میرے دل میں خیال آیا کہ آج بارش کا دن ہے، لوگ گھر سے نکلتے ہوئے ڈر رہے ہیں، سڑکوں پر پانی کھڑا ہے، ایسے حالات میں کون کتاب خریدنے آئے گا اور کتاب بھی کوئی دنیاوی یا کورس اور نصاب کی نہیں بلکہ دینی کتاب جس کے بارے میں ہمارا حال یہ ہے کہ جب دنیا کی ساری ضرورتیں پوری ہوجائیں تب جاکر یہ خیال آتا ہے کہ چلو کوئی دینی کتاب خرید کر پڑھ لیں، ان

کتابوں سے نہ تو بھوک مٹتی ہے نہ پیاس بجھتی ہے نہ اس سے کوئی دنیا کی ضرورت پوری ہوتی ہے، اور آج کل کے حساب سے دینی کتاب ایک فالتو مد ہے، خیال یہ ہوتا ہے کہ فالتو وقت ملے گا تو دینی کتاب پڑھ لیں گے۔ تو ایسی موسلا دھار بارش میں کون دینی کتاب خریدنے آئے گا، لہٰذا آج دکان پر نہ جاؤں اور چھٹی کر لیتا ہوں۔

لیکن چونکہ بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے، حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اُٹھائی تھی، فرمانے لگے کہ اس کے ساتھ ساتھ میرے دل میں دوسرا خیال یہ آیا کہ ٹھیک ہے کوئی شخص کتاب خریدنے آئے یا نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ نے میرے لئے رزق کا یہ ذریعہ مقرر فرمایا ہے، اب میرا کام یہ ہے کہ میں جاؤں، جا کر دکان کھول کر بیٹھ جاؤں، گاہک بھیجنا میرا کام نہیں، کسی اور کا کام ہے، لہٰذا مجھے اپنے کام میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے، چاہے بارش ہو رہی ہو یا سیلاب آرہا ہو، مجھے اپنی دکان کھولنی چاہئے۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے چھتری اُٹھائی اور پانی سے گزرتا ہوا چلا گیا اور بازار جا کر دکان کھول کر بیٹھ گیا اور یہ سوچا کہ آج کوئی گاہک تو آئے گا نہیں، چلو بیٹھ کر تلاوت ہی کر لیں، چنانچہ ابھی میں قرآن شریف کھول کر تلاوت کرنے بیٹھا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ برساتیاں ڈال کر اور چھتریاں تان کر کتابیں خریدنے آرہے ہیں، میں حیران تھا کہ ان لوگوں کو ایسی کونسی ضرورت پیش آگئی ہے کہ اس طوفانی بارش میں اور بہتے ہوئے سیلاب میں میرے پاس آکر ایسی کتابیں خرید رہے ہیں جن کی کوئی فوری ضرورت نہیں۔ لیکن لوگ آئے اور جتنی بکری روزانہ ہوتی تھی اس دن بھی اتنی بکری ہوئی۔ اس وقت دل میں یہ بات آئی کہ یہ گاہک خود نہیں آرہے ہیں، حقیقت میں کوئی اور بھیج رہا ہے، اور یہ اس لئے بھیج رہا ہے کہ اس نے میرے لئے رزق کا سامان ان گاہکوں کو بنایا ہے۔

کاموں کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

بہر حال، یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا بنایا ہوا نظام ہے جو تمہارے پاس گاہک بھیج رہا ہے، جو گاہک کے دل میں ڈال رہا ہے کہ تم اس دکان سے جا کر سامان خریدو۔ کیا کسی شخص نے یہ کانفرنس بلائی تھی اور اس کانفرنس میں یہ طے ہوا تھا کہ اتنے لوگ کپڑا فروخت کریں گے، اتنے لوگ جوتے فروخت کریں گے، اتنے لوگ چاول فروخت کریں گے، اتنے لوگ برتن فروخت کریں گے، اور اس طرح لوگوں کی ضروریات پوری کی جائیں گی۔ دنیا میں ایسی کوئی کانفرنس آج تک نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے کسی کے دل میں یہ ڈالا کہ تم کپڑا فروخت کرو، کسی کے دل میں ڈالا کہ تم جوتے فروخت کرو، کسی کے دل میں ڈالا کہ تم روٹی فروخت کرو، کسی کے دل میں یہ ڈالا کہ تم گوشت فروخت کرو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے جو بازار میں نہ ملتی ہو۔ دوسری طرف

خریداروں کے دل میں یہ ڈالا کہ تم جا کر ان سے ضروریات خریدو اور ان کے لئے رزق کا سامان فراہم کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے کہ وہ تمام انسانوں کو اس طرح سے رزق عطا کر رہا ہے۔

زمین سے اُگانے والا کون ہے؟

خواہ تجارت ہو یا زراعت ہو یا ملازمت ہو، دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ زراعت کو دیکھئے! زراعت میں آدمی کا کام یہ ہے کہ زمین کو نرم کر کے اس میں بیج ڈال دے اور اس میں پانی دیدے، لیکن اس بیج کو کونپل بنانا، وہ بیج جو بالکل بے حقیقت ہے، جو گنتی میں بھی نہ آئے، جو بے وزن ہے، لیکن اتنی سخت زمین کا پیٹ پھاڑ کر نمودار ہوتا ہے اور کونپل بن جاتا ہے، پھر وہ کونپل بھی ایسی نرم اور نازک ہوتی ہے کہ اگر بچہ بھی اس کو اُنگلی سے مسل دے تو وہ ختم ہو جائے، لیکن وہی کونپل سارے موسموں کی سختیاں برداشت کرتی ہے، گرم اور سرد اور تیز ہواؤں کو سہتی ہے، پھر کونپل سے پودا بنتا ہے، پھر اس پودے سے پھول نکلتے ہیں، پھول سے پھل بنتے ہیں اور اس طرح وہ ساری دنیا کے انسانوں تک پہنچ جاتا ہے، کون ذات ہے جو یہ کام کر رہی ہے؟ اللہ جل شانہ ہی یہ سارے کام کرنے والے ہیں۔

انسان میں پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں

لہٰذا آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ ہو، چاہے وہ تجارت ہو یا زراعت ہو یا ملازمت ہو، حقیقت میں تو انسان ایک محدود کام کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے، بس انسان وہ محدود کام کر دیتا ہے لیکن اس محدود کام کے اندر کسی چیز کو پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ جل شانہ ہیں جو ضرورت کی اشیاء پیدا کرتے ہیں اور تمہیں عطا کرتے ہیں، لہٰذا جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے وہ سب اسی کی عطا ہے:

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ (۱)

''زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ اسی کی ملکیت ہے''

مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں

اور اللہ تعالیٰ نے وہ چیز تمہیں عطا کر کے یہ بھی کہہ دیا کہ چلو تم ہی اس کے مالک ہو۔ چنانچہ سورۃ یٰسٓ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

(۱) البقرہ: ۲۸٤

﴿ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ ﴾ (۱)

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے بنادیئے ان کے واسطے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں سے چوپائے، پھر وہ ان کے مالک ہیں''

مالک حقیقی تو ہم تھے، ہم نے تمہیں مالک بنایا۔ تو حقیقت میں وہ مال جو تمہارے پاس آیا ہے اس میں سب سے بڑا حق تو ہمارا ہے، جب ہمارا حق ہے تو پھر اس میں سے اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرو، اگر اس کے حکم کے مطابق خرچ کرو گے تو باقی جتنا مال تمہارے پاس ہے وہ تمہارے لئے حلال اور طیب ہے، وہ مال اللہ کا فضل ہے، اللہ کی نعمت ہے، وہ مال برکت والا ہے۔ اور اگر تم نے اس مال میں سے وہ چیز نہ نکالی جو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کی ہے تو پھر یہ سارا مال تمہارے لئے آگ کے انگارے ہیں اور قیامت کے دن ان انگاروں کو دیکھ لوگے جب ان انگاروں سے تمہارے جسموں کو داغا جائے گا اور تم سے یہ کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ خزانہ جس کو تم جمع کیا کرتے تھے۔

صرف اڑھائی فیصد ادا کرو

اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتے کہ یہ مال ہماری عطا کی ہوئی چیز ہے، لہٰذا اس میں سے اڑھائی فیصد تم رکھو اور ساڑھے ستانوے فیصد اللہ کی راہ میں خرچ کر دو تو بھی انصاف کے خلاف نہیں تھا، کیونکہ یہ سارا مال اسی کا دیا ہوا ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ لیکن اس نے اپنے بندوں پر فضل فرمایا اور یہ فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تم کمزور ہو اور تمہیں اس مال کی ضرورت ہے، میں جانتا ہوں کہ تمہاری طبیعت اس مال کی طرف راغب ہے، لہٰذا چلو اس مال میں سے ساڑھے ستانوے فیصد تمہارا، صرف اڑھائی فیصد کا مطالبہ ہے، جب یہ اڑھائی فیصد اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے تو باقی ساڑھے ستانوے فیصد تمہارے لئے حلال ہے اور طیب ہے اور برکت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنا معمولی مطالبہ کر کے سارا مال ہمارے حوالے کر دیا کہ اس کو جس طرح چاہو اپنی جائز ضروریات میں خرچ کرو۔

زکوٰۃ کی تاکید

یہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ ہے، یہ وہ زکوٰۃ ہے جس کے بارے میں قرآن کریم میں بار بار ارشاد فرمایا:

﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ﴾ (۲)

''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''

جہاں نماز کا ذکر فرمایا ہے وہاں ساتھ میں زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے، اس زکوٰۃ کی اتنی تاکید وارد

(۱) یٰس:۷۱ (۲) البقرة:۴۳

ہوئی ہے۔ جب اس زکوٰۃ کی اتنی تاکید ہے اور دوسری طرف اللہ جل شانہ نے اتنا بڑا احسان فرمایا ہے کہ ہمیں مال عطا کیا اور اس کا مالک بنایا اور پھر صرف ڈھائی فیصد کا مطالبہ کیا تو مسلمان کم از کم اتنا کرلے کہ وہ ڈھائی فیصد ٹھیک ٹھیک اللہ کے مطالبے کے مطابق ادا کردے تو اس پر کوئی آسمان نہیں ٹوٹ جائے گا، کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔

زکوٰۃ حساب کر کے نکالو

بہت سے لوگ تو وہ ہیں جو زکوٰۃ سے بالکل بے پرواہ ہیں، العیاذ باللہ، وہ تو زکوٰۃ نکالتے ہی نہیں ہیں۔ ان کی سوچ تو یہ ہے کہ یہ ڈھائی فیصد کیوں دیں؟ بس جو مال آرہا ہے وہ آئے۔ دوسری طرف بعض لوگ وہ ہیں جن کو زکوٰۃ کا کچھ نہ کچھ احساس ہے اور وہ زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں لیکن زکوٰۃ نکالنے کا جو صحیح طریقہ ہے وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ جب ڈھائی فیصد زکوٰۃ فرض کی گئی تو اب اس کا تقاضا یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک حساب لگا کر زکوٰۃ نکالی جائے۔

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ کون حساب کتاب کرے، کون سارے اسٹاک کو چیک کرے، لہٰذا بس ایک اندازہ کر کے زکوٰۃ نکال دیتے ہیں، اب اس اندازے میں غلطی بھی واقع ہوسکتی ہے اور زکوٰۃ نکالنے میں کمی بھی ہوسکتی ہے۔ اگر زکوٰۃ زیادہ نکال دی جائے تو انشاء اللہ مؤاخذہ نہیں ہوگا، لیکن اگر ایک روپیہ بھی کم ہو جائے یعنی جتنی زکوٰۃ واجب ہوئی ہے اس سے ایک روپیہ کم زکوٰۃ نکالی تو یاد رکھئے! وہ ایک روپیہ جو آپ نے حرام طریقے سے اپنے پاس روک لیا ہے، وہ ایک روپیہ تمہارے سارے مال کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔

وہ مال تباہی کا سبب ہے

ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب مال میں زکوٰۃ کی رقم شامل ہو جائے یعنی پوری زکوٰۃ نہیں نکالی بلکہ کچھ زکوٰۃ نکالی اور کچھ باقی رہ گئی تو وہ مال انسان کے لئے تباہی اور ہلاکت کا سبب ہے۔

اس وجہ سے اس بات کا اہتمام کریں کہ ایک ایک پائی کا صحیح حساب کر کے زکوٰۃ نکالی جائے، اس کے بغیر زکوٰۃ کا فریضہ کما حقہٗ ادا نہیں ہوتا۔ الحمد للہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد وہ ہے جو زکوٰۃ ضرور نکالتی ہے لیکن اس بات کا اہتمام نہیں کرتی کہ ٹھیک ٹھیک حساب کر کے زکوٰۃ نکالے۔ اس کی وجہ سے زکوٰۃ کی رقم ان کے مال میں شامل رہتی ہے اور اس کے نتیجے میں ہلاکت اور بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔

زکوٰۃ کے دنیاوی فوائد

ویسے زکوٰۃ اس نیت سے نکالنی چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اس کی رضا کا تقاضا ہے اور ایک عبادت ہے۔ اس زکوٰۃ نکالنے سے ہمیں کوئی منفعت حاصل ہو یا نہ ہو، کوئی فائدہ ملے یا نہ ملے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت بذاتِ خود مقصود ہے۔ اصل مقصد تو زکوٰۃ کا یہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جب کوئی بندہ زکوٰۃ نکالتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فوائد بھی عطا فرماتے ہیں۔ وہ فائدہ یہ ہے کہ اس کے مال میں برکت ہوتی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ (۱)

''یعنی اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور زکوٰۃ اور صدقات کو بڑھاتے ہیں''

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی بندہ زکوٰۃ نکالتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کے حق میں یہ دعا فرماتے ہیں کہ:

((اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَأَعْطِ مُمْسِكًا مَالًا تَلَفًا)) (۲)

''اے اللہ! جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر رہا ہے اس کو اور زیادہ عطا فرمایئے، اور اے اللہ! جو شخص اپنے مال کو روک کر رکھ رہا ہے اور زکوٰۃ ادا نہیں کر رہا ہے تو اے اللہ! اس کے مال پر ہلاکت ڈالئے''

اس لئے فرمایا:

((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ)) (۳)

''کوئی صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا''

چنانچہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ اِدھر ایک مسلمان نے زکوٰۃ نکالی دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اس کی آمدنی کے دوسرے ذرائع پیدا کر دیئے اور اس کے ذریعہ اس زکوٰۃ سے زیادہ پیسہ اس کے پاس آ گیا۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ زکوٰۃ نکالنے سے اگرچہ گنتی کے اعتبار سے پیسے کم ہو جاتے ہیں لیکن

---

(۱) البقرة: ۲۷٦

(۲) صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب قول الله تعالى فأما من أعطى...... الخ، رقم: ۱۳۵۱، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب في المنفق والممسك، رقم: ۱٦۷۸، مسند أحمد، رقم: ۷۷۰۹

(۳) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع، رقم: ٤٦٨٩، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في التواضع، رقم: ۱۹۵۲، مسند أحمد، رقم: ٦۹۰۸، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب ما جاء في التعفف عن المسألة، رقم: ۱۵۹۰

بقیہ مال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی برکت ہوتی ہے کہ اس برکت کے نتیجے میں تھوڑے مال سے زیادہ فوائد حاصل ہو جاتے ہیں۔

مال میں بے برکتی کا انجام

آج کی دنیا گنتی کی دنیا ہے۔ برکت کا مفہوم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ برکت اس چیز کو کہتے ہیں کہ تھوڑی سی چیز میں زیادہ فائدہ حاصل ہو جائے، مثلاً آج آپ نے پیسے تو بہت کمائے لیکن جب گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ بچہ بیمار ہے، اس کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے اور ایک ہی طبی معائنہ میں وہ سارے پیسے خرچ ہو گئے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو پیسے کمائے تھے اس میں برکت نہ ہوئی۔ یا مثلاً آپ پیسے کما کر گھر جا رہے تھے کہ راستہ میں ڈاکو مل گیا اور اس نے پستول دکھا کر سارے پیسے چھین لیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پیسے تو حاصل ہوئے لیکن اس میں برکت نہیں ہوئی۔ یا مثلاً آپ نے پیسہ کما کر کھانا کھایا اور اس کھانے کے نتیجے میں آپ کو بدہضمی ہو گئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مال میں برکت نہ ہوئی۔ یہ سب بے برکتی کی نشانیاں ہیں۔ برکت یہ ہے کہ آپ نے پیسے تو کم کمائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان تھوڑے پیسوں میں زیادہ کام بنا دیئے اور تمہارے بہت سے کام نکل گئے، اس کا نام ہے برکت۔ یہ برکت اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتا ہے۔ لہٰذا ہم اپنے مال کی زکوٰۃ نکالیں اور اس طرح نکالیں جس طرح اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا ہے اور اس کو حساب کتاب کے ساتھ نکالیں۔ صرف اندازہ سے نہ نکالیں۔

زکوٰۃ کا نصاب

اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا ایک نصاب مقرر کیا ہے کہ اس نصاب سے کم اگر کوئی شخص مالک ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، اگر اس نصاب کا مالک ہوگا تو زکوٰۃ فرض ہوگی۔ وہ نصاب یہ ہے: ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ، یا زیور، یا سامانِ تجارت وغیرہ، جس شخص کے پاس یہ مال اتنی مقدار میں موجود ہو تو اس کو ''صاحبِ نصاب'' کہا جاتا ہے۔

ہر ہر روپے پر سال کا گزرنا ضروری نہیں

پھر اس نصاب پر ایک سال گزرنا چاہئے، یعنی ایک سال تک اگر کوئی شخص صاحبِ نصاب رہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ہر روپے پر مستقل پورا سال گزرے، تب اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، یہ بات درست

نہیں۔ بلکہ جب ایک مرتبہ سال کے شروع میں ایک شخص صاحبِ نصاب بن جائے مثلاً فرض کریں کہ یکم رمضان کو اگر کوئی شخص صاحبِ نصاب بن گیا، پھر آئندہ سال جب یکم رمضان آیا تو اس وقت بھی وہ صاحبِ نصاب ہے تو ایسے شخص کو صاحبِ نصاب سمجھا جائے گا، درمیان سال میں جو رقم آتی جاتی رہی اس کا کوئی اعتبار نہیں، بس یکم رمضان کو دیکھ لو کہ تمہارے پاس کتنی رقم موجود ہے، اس رقم پر زکوٰۃ نکالی جائے گی، چاہے اس میں سے کچھ رقم صرف ایک دن پہلے ہی کیوں نہ آئی ہو۔

تاریخِ زکوٰۃ میں جو رقم ہو اس پر زکوٰۃ ہے

مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص کے پاس یکم رمضان کو ایک لاکھ روپیہ تھا، اگلے سال یکم رمضان سے دو دن پہلے پچاس ہزار روپے اس کے پاس اور آگئے اور اس کے نتیجے میں یکم رمضان کو اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے ہو گئے، اب اس ڈیڑھ لاکھ روپے پر زکوٰۃ فرض ہوگی، یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں پچاس ہزار روپے تو صرف دو دن پہلے آئے ہیں اور اس پر ایک سال نہیں گزرا، لہٰذا اس پر زکوٰۃ نہ ہونی چاہئے، یہ درست نہیں بلکہ زکوٰۃ نکالنے کی جو تاریخ ہے اور جس تاریخ کو آپ صاحبِ نصاب بنے ہیں اس تاریخ میں جتنا مال آپ کے پاس موجود ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے، چاہے یہ رقم پچھلے سال یکم رمضان کی رقم سے زیادہ ہو یا کم ہو، مثلاً اگر پچھلے سال ایک لاکھ روپے تھے، اب ڈیڑھ لاکھ ہیں تو ڈیڑھ لاکھ پر زکوٰۃ ادا کرو، اور اگر اس سال پچاس ہزار رہ گئے تو اب پچاس ہزار پر زکوٰۃ ادا کرو، درمیان سال میں جو رقم خرچ ہو گئی، اس کا کوئی حساب کتاب نہیں اور اس خرچ شدہ رقم پر زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حساب کتاب کی اُلجھن سے بچانے کے لئے یہ آسان طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ درمیان سال میں جو کچھ تم نے کھایا پیا اور وہ رقم تمہارے پاس سے چلی گئی تو اس کا کوئی حساب کتاب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح درمیان سال میں جو رقم آگئی اس کا الگ سے حساب رکھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس تاریخ میں آئی اور کب اس پر سال پورا ہوگا؟ بلکہ زکوٰۃ نکالنے کی تاریخ میں جو رقم تمہارے پاس ہے، اس پر زکوٰۃ ادا کرو۔ سال گزرنے کا مطلب یہ ہے۔

اموالِ زکوٰۃ کون کون سے ہیں؟

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہم پر فضل ہے کہ اس نے ہر ہر چیز پر زکوٰۃ فرض نہیں فرمائی، ورنہ مال کی تو بہت سی قسمیں ہیں۔ جن چیزوں پر زکوٰۃ فرض ہے وہ یہ ہیں: (۱) نقد روپیہ، چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو، چاہے وہ نوٹ ہوں یا سکے ہوں، (۲) سونا چاندی، چاہے وہ زیور کی شکل میں ہو، یا سکے کی شکل میں ہو، بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ رہتا ہے کہ جو خواتین کا استعمالی زیور ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے،

یہ بات درست نہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ استعمالی زیور پر بھی زکوٰۃ واجب ہے البتہ صرف سونے چاندی کے زیور پر زکوٰۃ واجب ہے، لیکن اگر سونے چاندی کے علاوہ کسی اور دھات کا زیور ہے، چاہے پلاٹینم ہی کیوں نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، اسی طرح ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ نہیں جب تک تجارت کے لئے نہ ہوں بلکہ ذاتی استعمال کے لئے ہوں۔

اموالِ زکوٰۃ میں عقل نہ چلائیں

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینا چاہئے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے، اللہ تعالیٰ کا عائد کیا ہوا فریضہ ہے۔ اب بعض لوگ زکوٰۃ کے اندر اپنی عقل دوڑاتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں کہ اس پر زکوٰۃ کیوں واجب ہے اور فلاں چیز پر زکوٰۃ کیوں واجب نہیں؟

یاد رکھئے کہ یہ زکوٰۃ ادا کرنا عبادت ہے اور عبادت کے معنی ہی یہ ہیں کہ چاہے وہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اللہ کا حکم ماننا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کہے کہ سونے چاندی پر زکوٰۃ واجب ہے تو ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ کیوں واجب نہیں؟ اور پلاٹینم پر کیوں زکوٰۃ نہیں؟ یہ سوال بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ حالتِ سفر میں ظہر اور عصر اور عشاء کی نماز میں قصر ہے اور چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھی جاتی ہے تو پھر مغرب میں قصر کیوں نہیں؟ یا مثلاً کوئی شخص کہے کہ ایک آدمی ہوائی جہاز میں فرسٹ کلاس کے اندر سفر کرتا ہے اور اس سفر میں اس کو کوئی مشقت بھی نہیں ہوتی مگر اس کی نماز آدھی ہو جاتی ہے اور میں کراچی میں بس کے اندر بڑی مشقت کے ساتھ سفر کرتا ہوں، میری نماز آدھی کیوں نہیں ہوتی؟ ان سب کا ایک ہی جواب ہے، وہ یہ کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے عبادت کے احکام ہیں، عبادات میں ان احکام کی پابندی کرنا ضروری ہے ورنہ وہ کام عبادت نہیں رہے گا۔

عبادت کرنا اللہ کا حکم ہے

یا مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ۹ ذی الحجہ ہی کو حج ہوتا ہے؟ مجھے تو آسانی یہ ہے کہ آج جا کر حج کر آؤں اور ایک دن کے بجائے میں عرفات تین دن قیام کروں گا، اب اگر وہ شخص ایک دن کے بجائے تین دن بھی وہاں بیٹھا رہے گا، تب بھی اس کا حج نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عبادت کا جو طریقہ بتایا تھا اس کے مطابق نہیں کیا۔ یا مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ حج کے تین دنوں میں جمرات کی رمی کرنے میں بہت ہجوم ہوتا ہے اس لئے میں چوتھے دن اکٹھی سارے دنوں کی رمی کرلوں گا۔ یہ رمی درست نہیں ہوگی اس لئے کہ یہ عبادت ہے اور عبادت کے اندر یہ ضروری ہے کہ جو طریقہ

بتایا گیا ہے اور جس طرح بتایا گیا ہے اس کے مطابق وہ عبادت انجام دی جائے گی تو وہ عبادت درست ہوگی ورنہ درست نہ ہوگی۔ لہٰذا یہ اعتراض کرنا کہ سونے اور چاندی پر زکوٰۃ کیوں ہے اور ہیرے پر کیوں نہیں، یہ عبادت کے فلسفے کے خلاف ہے۔ بہرحال، اللہ تعالیٰ نے سونے چاندی پر زکوٰۃ رکھی ہے، چاہے وہ استعمال کا ہو، اور نقد روپیہ پر زکوٰۃ رکھی ہے۔

سامانِ تجارت کی قیمت کے تعین کا طریقہ

دوسری چیز جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ ہے ''سامانِ تجارت''، مثلاً کسی کی دکان میں جو سامان برائے فروخت رکھا ہوا ہے، اس سارے اسٹاک پر زکوٰۃ واجب ہے، البتہ اسٹاک کی قیمت لگاتے ہوئے اس بات کی گنجائش ہے کہ آدمی زکوٰۃ نکالتے وقت یہ حساب لگائے کہ اگر میں پورا اسٹاک اکٹھا فروخت کردوں تو بازار میں اس کی کیا قیمت لگے گی۔ دیکھئے ایک ''ریٹیل پرائس'' ہوتی ہے اور دوسری ''ہول سیل پرائس'' تیسری صورت یہ ہے کہ پورا اسٹاک اکٹھا فروخت کرنے کی صورت میں کیا قیمت لگے گی، لہٰذا جب دکان کے اندر جو مال ہے اس کی زکوٰۃ کا حساب لگایا جارہا ہو تو اس کی گنجائش ہے کہ تیسری قسم کی قیمت لگائی جائے، وہ قیمت نکال کر پھر اس کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ میں نکالنا ہوگا، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ عام ''ہول سیل قیمت'' سے حساب لگا کر اس پر زکوٰۃ ادا کردی جائے۔

مالِ تجارت میں کیا کیا داخل ہے؟

اس کے علاوہ مالِ تجارت میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کو آدمی نے بیچنے کی غرض سے خریدا ہو، لہٰذا اگر کسی شخص نے بیچنے کی غرض سے کوئی پلاٹ خریدا یا زمین خریدی یا کوئی مکان خریدا یا گاڑی خریدی اور اس مقصد سے خریدی کہ اس کو بیچ کر نفع کماؤں گا تو یہ سب چیزیں مالِ تجارت میں داخل ہیں، لہٰذا اگر کوئی پلاٹ، کوئی زمین، کوئی مکان خریدتے وقت شروع ہی میں یہ نیت تھی کہ میں اس کو فروخت کروں گا تو اس کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جو ''انوسٹمنٹ'' کی غرض سے پلاٹ خرید لیتے ہیں اور شروع ہی سے یہ نیت ہوتی ہے کہ جب اس پر اچھے پیسے ملیں گے تو اس کو فروخت کردوں گا اور فروخت کرکے اس سے نفع کماؤں گا، تو اس پلاٹ کی مالیت پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ لیکن اگر پلاٹ اس نیت سے خریدا کہ اگر موقع ہوا تو اس پر رہائش کے لئے مکان بنالیں گے، یا موقع ہوگا تو اس کو کرائے پر چڑھادیں گے یا کبھی موقع ہوگا تو اس کو فروخت کردیں گے، کوئی ایک واضح نیت نہیں ہے بلکہ ویسے ہی خرید کر ڈال دیا ہے، اب اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آئندہ کسی وقت اس کو مکان بنا کر وہاں رہائش اختیار کرلیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ کرائے پر چڑھادیں گے اور یہ

احتمال بھی ہے کہ فروخت کر دیں گے تو اس صورت میں اس پلاٹ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، لہٰذا زکوٰۃ صرف اس صورت میں واجب ہوتی ہے جب خریدتے وقت ہی اس کو دوبارہ فروخت کرنے کی نیت ہو، یہاں تک کہ اگر پلاٹ خریدتے وقت شروع میں یہ نیت تھی کہ اس پر مکان بنا کر رہائش اختیار کریں گے، بعد میں ارادہ بدل گیا اور یہ ارادہ کر لیا کہ اب اس کو فروخت کر کے پیسے حاصل کر لیں گے تو محض نیت اور ارادہ کی تبدیلی سے فرق نہیں پڑتا، جب تک آپ اس پلاٹ کو واقعۃً فروخت نہیں کر دیں گے اور اس کے پیسے آپ کے پاس نہیں آجائیں گے اس وقت تک اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

بہرحال، ہر وہ چیز جسے خریدتے وقت ہی اس کو فروخت کرنے کی نیت ہو، وہ مالِ تجارت ہے اور اس کی مالیت پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہے۔

کس دن کی مالیت معتبر ہوگی؟

یہ بات بھی یاد رکھیں کہ مالیت اس دن کی معتبر ہوگی جس دن آپ زکوٰۃ کا حساب کر رہے ہیں، مثلاً ایک پلاٹ آپ نے ایک لاکھ روپے میں خریدا تھا اور آج اس پلاٹ کی قیمت دس لاکھ ہوگئی، اب دس لاکھ پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائے گی، ایک لاکھ پر نہیں نکالی جائے گی۔

کمپنیوں کے شیئرز پر زکوٰۃ کا حکم

اسی طرح کمپنیوں کے ''شیئرز'' بھی سامانِ تجارت میں داخل ہیں۔ اور ان کی دو صورتیں ہیں:

ایک صورت یہ ہے کہ آپ نے کسی کمپنی کے شیئرز اس مقصد کے لئے خریدے ہیں کہ اس کے ذریعہ کمپنی کا منافع (Dividend) حاصل کریں گے اور اس پر ہمیں سالانہ منافع کمپنی کی طرف سے ملتا رہے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نے کسی کمپنی کے شیئرز ''کیپٹل گین'' کے لئے خریدے ہیں، یعنی نیت یہ ہے کہ جب بازار میں ان کی قیمت بڑھ جائے گی تو ان کو فروخت کر کے نفع کمائیں گے۔ اگر یہ دوسری صورت ہے یعنی شیئرز خریدتے وقت شروع ہی میں ان کو فروخت کرنے کی نیت تھی تو اس صورت میں پورے شیئرز کی پوری بازاری قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً آپ نے پچاس روپے کے حساب سے شیئرز خریدے اور مقصد یہ تھا کہ جب ان کی قیمت بڑھ جائے گی تو ان کو فروخت کر کے نفع حاصل کریں گے، اس کے بعد جس دن آپ نے زکوٰۃ کا حساب نکالا، اس دن شیئرز کی قیمت ساٹھ روپے ہوگئی تو اب ساٹھ روپے کے حساب سے ان شیئرز کی مالیت نکالی جائے گی اور اس پر اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

لیکن اگر پہلی صورت ہے یعنی آپ نے کمپنی کے شیئرز اس نیت سے خریدے کہ کمپنی کی طرف سے اس پر سالانہ منافع ملتا رہے گا اور فروخت کرنے کی نیت نہیں تھی تو اس صورت میں آپ کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ یہ دیکھیں کہ جس کمپنی کے یہ شیئرز ہیں اس کمپنی کے کتنے اثاثے جامد ہیں، مثلاً بلڈنگ، مشینری، کاریں وغیرہ، اور کتنے اثاثے نقد، سامانِ تجارت اور خام مال کی شکل میں ہیں، یہ معلومات کمپنی ہی سے حاصل کی جاسکتی ہیں، مثلاً فرض کریں کہ کسی کمپنی کے ساٹھ فیصد اثاثے نقد، سامانِ تجارت، خام مال، اور تیار مال کی صورت میں ہیں اور چالیس فیصد اثاثے بلڈنگ، مشینری اور کار وغیرہ کی صورت میں ہیں تو اس صورت میں آپ ان شیئرز کی بازاری قیمت لگا کر اس کی ساٹھ فیصد قیمت پر زکوٰۃ ادا کریں، مثلاً شیئرز کی بازاری قیمت ساٹھ روپے تھی اور کمپنی کے ساٹھ فیصد اثاثے قابلِ زکوٰۃ تھے اور چالیس فیصد اثاثے ناقابلِ زکوٰۃ تھے تو اس صورت میں آپ اس شیئرز کی پوری قیمت یعنی ساٹھ روپے کے بجائے =/۳۶ روپے پر زکوٰۃ ادا کریں۔ اور اگر کسی کمپنی کے اثاثوں کی تفصیل معلوم نہ ہوسکے تو اس صورت میں احتیاطاً ان شیئرز کی پوری بازاری قیمت پر زکوٰۃ ادا کردی جائے۔

شیئرز کے علاوہ اور جتنے فائنانشل انسٹرومنٹس ہیں چاہے وہ بونڈز ہوں یا سرٹیفکیٹس ہوں، یہ سب نقد کے حکم میں ہیں، ان کی اصل قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے۔

کارخانہ کی کن اشیاء پر زکوٰۃ ہے

اگر کوئی شخص فیکٹری کا مالک ہے تو اس فیکٹری میں جو تیار شدہ مال ہے اس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اسی طرح جو مال تیاری کے مختلف مراحل میں ہے یا خام مال کی شکل میں ہے اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ البتہ فیکٹری کی مشینری، بلڈنگ، گاڑیاں وغیرہ پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

اس طرح اگر کسی شخص نے کسی کاروبار میں شرکت کے لئے روپیہ لگایا ہوا ہے، اور اس کاروبار کا کوئی متناسب حصہ اس کی ملکیت ہے تو جتنا حصہ اس کی ملکیت ہے اس حصے کی بازاری قیمت کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بہرحال، خلاصہ یہ کہ نقد روپیہ جس میں بینک بیلنس اور فائنانشل انسٹرومنٹس بھی داخل ہیں، ان پر زکوٰۃ واجب ہے، اور سامانِ تجارت، جس میں تیار مال، خام مال، اور جو مال تیاری کے مراحل میں ہیں وہ سب سامانِ تجارت میں داخل ہیں، اور کمپنی کے شیئرز بھی سامانِ تجارت میں داخل ہیں، اس کے علاوہ ہر چیز جو آدمی نے فروخت کرنے کی غرض سے خریدی ہو وہ بھی سامانِ تجارت میں داخل ہے، زکوٰۃ نکالتے وقت ان سب کی مجموعی مالیت نکالیں اور اس پر زکوٰۃ ادا کریں۔

واجب الوصول قرضوں پر زکوٰۃ

ان کے علاوہ بہت سی رقمیں وہ ہوتی ہیں جو دوسروں سے واجب الوصول ہوتی ہیں۔ مثلاً دوسروں کو قرض دے رکھا ہے، یا مثلاً مال اُدھار فروخت کر رکھا ہے اور اس کی قیمت ابھی وصول ہونی ہے، تو جب آپ زکوٰۃ کا حساب لگائیں اور اپنی مجموعی مالیت نکالیں تو بہتر یہ ہے کہ ان قرضوں کو اور واجب الوصول رقموں کو آج ہی آپ اپنی مجموعی مالیت میں شامل کرلیں۔ اگرچہ شرعی حکم یہ ہے کہ جو قرضے ابھی وصول نہیں ہوئے تو جب تک وہ وصول نہ ہوجائیں اس وقت تک شرعاً ان پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں ہوتی، لیکن جب وصول ہوجائیں تو جتنے سال گزر چکے ہیں ان تمام پچھلے سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ مثلاً فرض کریں کہ آپ نے ایک شخص کو ایک لاکھ روپیہ قرضہ دے رکھا تھا، اور پانچ سال کے بعد وہ قرضہ آپ کو واپس ملا، تو اگرچہ اس ایک لاکھ روپے پر ان پانچ سالوں کے دوران تو زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں تھی، لیکن جب وہ ایک لاکھ روپے وصول ہوگئے تو اب گزشتہ پانچ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ تو چونکہ گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ یکمشت ادا کرنے میں بعض اوقات دشواری ہوتی ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ہر سال اس قرض کی زکوٰۃ کی ادائیگی بھی کردی جایا کرے۔ لہٰذا جب زکوٰۃ کا حساب لگائیں تو ان قرضوں کو بھی مجموعی مالیت میں شامل کرلیا کریں۔

قرضوں کی منہائی

پھر دوسری طرف یہ دیکھیں کہ آپ کے ذمے دوسرے لوگوں کے کتنے قرضے ہیں۔ اور پھر مجموعی مالیت میں سے ان قرضوں کو منہا کردیں، منہا کرنے کے بعد جو باقی بچے وہ قابلِ زکوٰۃ رقم ہے۔ اس کا پھر ڈھائی فیصد نکال کر زکوٰۃ کی نیت سے ادا کردیں۔ بہتر یہ ہے کہ جو رقم زکوٰۃ کی بنے اتنی رقم الگ نکال کر محفوظ کرلیں، پھر وقتاً فوقتاً اس کو مستحقین میں خرچ کرتے رہیں۔ بہرحال زکوٰۃ کا حساب لگانے کا یہ طریقہ ہے۔

قرضوں کی دو قسمیں

قرضوں کے سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے، وہ یہ کہ قرضوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو معمولی قرضے ہیں جن کو انسان اپنی ذاتی ضروریات اور ہنگامی ضروریات کے لئے مجبوراً لیتا ہے۔ دوسری قسم کے قرضے وہ ہیں جو بڑے بڑے سرمایہ دار پیداواری اغراض کے لئے لیتے ہیں مثلاً فیکٹریاں لگانے، یا مشینریاں خریدنے، یا مالِ تجارت امپورٹ کرنے کے لئے قرضے لیتے ہیں، یا مثلاً

ایک سرمایہ دار کے پاس پہلے سے دو فیکٹریاں موجود ہیں لیکن اس نے بینک سے قرض لے کر تیسری فیکٹری لگالی۔ اب اگر اس دوسری قسم کے قرضوں کو مجموعی مالیت سے منہا کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ان سرمایہ داروں پر ایک پیسے کی بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ وہ لوگ اُلٹے مستحقِ زکوٰۃ بن جائیں گے، اس لئے کہ ان کے پاس جتنی مالیت کا مال موجود ہے، اس سے زیادہ مالیت کے قرضے بینک سے لے رکھے ہیں، وہ بظاہر فقیر اور مسکین نظر آرہا ہے۔ لہٰذا ان قرضوں کے منہا کرنے میں بھی شریعت نے فرق رکھا ہے۔

تجارتی قرضے کب منہا کیے جائیں

اس میں تفصیل یہ ہے کہ پہلی قسم کے قرضے تو مجموعی مالیت سے منہا ہو جائیں گے اور ان کو منہا کرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اور دوسری قسم کے قرضوں میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کسی شخص نے تجارت کی غرض سے قرض لیا، اور اس قرض کو ایسی اشیاء خریدنے میں استعمال کیا جو قابلِ زکوٰۃ ہیں، مثلاً اس قرض سے خام مال خریدلیا، یا مالِ تجارت خریدلیا، تو اس قرض کو مجموعی مالیت سے منہا کریں گے۔ لیکن اگر اس قرض کو ایسے اثاثے خریدنے میں استعمال کیا جو ناقابلِ زکوٰۃ ہیں تو اس قرض کو مجموعی مالیت سے منہا نہیں کریں گے۔

قرض کی مثال

مثلاً ایک شخص نے بینک سے ایک کروڑ روپے قرض لیے اور اس رقم سے اس نے ایک پلانٹ (مشینری) باہر سے امپورٹ کرلیا ــــــ چونکہ یہ پلانٹ قابلِ زکوٰۃ نہیں ہے اس لئے کہ یہ مشینری ہے تو اس صورت میں یہ قرضہ منہا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس نے اس قرض سے خام مال خریدلیا تو چونکہ خام مال قابلِ زکوٰۃ ہے اس لئے یہ قرض منہا کیا جائے گا، کیونکہ دوسری طرف یہ خام مال ادا کی جانے والی زکوٰۃ کی مجموعی مالیت میں پہلے سے شامل ہو چکا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نارمل قسم کے قرض تو پورے کے پورے مجموعی مالیت سے منہا ہو جائیں گے، اور جو قرضے پیداواری اغراض کے لئے لیے گئے ہیں، اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس سے ناقابلِ زکوٰۃ اثاثے خریدے ہیں تو وہ قرض منہا نہیں ہوگا، اور اگر قابلِ زکوٰۃ اثاثے خریدے ہیں تو وہ قرض منہا ہوگا۔ یہ تو زکوٰۃ نکالنے کے بارے میں احکام تھے۔

زکوٰۃ مستحق کو ادا کریں

دوسری طرف زکوٰۃ کی ادائیگی کے بارے میں بھی شریعت نے احکام بتائے ہیں۔ میرے

والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ زکوٰۃ نکالو، نہ یہ فرمایا کہ زکوٰۃ پھینکو، بلکہ فرمایا: اٰتوا الزکاۃ، زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی یہ دیکھو کہ اس جگہ پر زکوٰۃ جائے جہاں شرعاً زکوٰۃ جانی چاہئے۔ بعض لوگ زکوٰۃ نکالتے تو ہیں لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ صحیح مصرف پر خرچ ہو رہی ہے یا نہیں؟ زکوٰۃ نکال کر کسی کے حوالے کر دی اور اس کی تحقیق نہیں کی کہ یہ صحیح مصرف پر خرچ کرے گا یا نہیں؟ آج بے شمار ادارے دنیا میں کام کر رہے ہیں، ان میں بہت سے ادارے ایسے بھی ہوں گے جن میں بسا اوقات اس بات کا لحاظ نہیں ہوتا ہوگا کہ زکوٰۃ کی رقم صحیح مصرف پر خرچ ہو رہی ہے یا نہیں؟ اس لئے فرمایا کہ زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی جو مستحقِ زکوٰۃ ہے اس کو ادا کرو۔

مستحق کون؟

اس کے لئے شریعت نے یہ اصول مقرر فرمایا کہ زکوٰۃ صرف انہی اشخاص کو دی جاسکتی ہے جو صاحبِ نصاب نہ ہوں۔ یہاں تک کہ اگر ان کی ملکیت میں ضرورت سے زائد ایسا سامان موجود ہے جو ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت تک پہنچ جاتا ہے تو بھی وہ مستحقِ زکوٰۃ نہیں رہتا۔ مستحقِ زکوٰۃ وہ ہے جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کی رقم یا اتنی مالیت کا کوئی سامان ضرورت سے زائد نہ ہو۔

مستحق کو مالک بنادیں

اس میں بھی شریعت کا یہ حکم ہے کہ اس مستحقِ زکوٰۃ کو مالک بنادو۔ یعنی وہ مستحقِ زکوٰۃ اپنی ملکیت میں خودمختار ہو کہ جو چاہے کرے۔ اسی وجہ سے کسی بلڈنگ کی تعمیر پر زکوٰۃ نہیں لگ سکتی، کسی ادارے کے ملازمین کی تنخواہوں پر زکوٰۃ نہیں لگ سکتی۔ اس لئے کہ اگر زکوٰۃ کے ذریعہ تعمیرات کرنے اور ادارے قائم کرنے کی اجازت دیدی جاتی تو زکوٰۃ کی رقم سب لوگ کھا پی کر ختم کر جاتے، کیونکہ اداروں کے اندر تنخواہیں بے شمار ہوتی ہیں، تعمیرات پر خرچ لاکھوں کا ہوتا ہے، اس لئے یہ حکم دیا گیا کہ غیر صاحبِ نصاب کو مالک بنا کر زکوٰۃ دو، یہ زکوٰۃ فقراء اور غرباء اور کمزوروں کا حق ہے، لہٰذا یہ زکوٰۃ انہی تک پہنچنی چاہئے، جب ان کو مالک بنا کر دیدو گے تو تمہاری زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

کن رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے

یہ زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم انسان کے اندر یہ طلب اور جستجو خود بخود پیدا کرتا ہے کہ میرے پاس زکوٰۃ کے اتنے پیسے موجود ہیں، ان کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا ہے۔ اس لئے وہ مستحقین کو تلاش کرتا

ہے کہ کون کون لوگ مستحقین ہیں اور ان مستحقین کی فہرست بناتا ہے، پھر ان کو زکوٰۃ پہنچاتا ہے، یہ بھی انسان کی ذمہ داری ہے۔ آپ کے محلے میں، ملنے جلنے والوں میں، عزیز و اقارب اور رشتہ داروں میں، دوست احباب میں جو مستحقِ زکوٰۃ ہوں، ان کو زکوٰۃ ادا کریں۔ اور ان میں سے سب سے افضل یہ ہے کہ اپنے رشتہ داروں کو زکوٰۃ ادا کریں اس میں ڈبل ثواب ہے، زکوٰۃ ادا کرنے کا ثواب بھی ہے اور صلہ رحمی کرنے کا ثواب بھی ہے۔ اور تمام رشتہ داروں کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، صرف دو رشتے ایسے ہیں جن کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی، ایک ولادت کا رشتہ ہے، لہٰذا باپ بیٹے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا اور بیٹا باپ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا، دوسرا نکاح کا رشتہ ہے، لہٰذا شوہر بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا اور بیوی شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی، ان کے علاوہ باقی تمام رشتوں میں زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ مثلاً بھائی کو، بہن کو، چچا کو، خالہ کو، پھوپھی کو، ماموں کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ البتہ یہ ضرور دیکھ لیں کہ وہ مستحقِ زکوٰۃ ہوں اور صاحبِ نصاب نہ ہو۔

بیوہ اور یتیم کو زکوٰۃ دینے کا حکم

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی خاتون بیوہ ہے تو اس کو زکوٰۃ ضرور دینی چاہئے حالانکہ یہاں بھی شرط یہ ہے کہ وہ مستحقِ زکوٰۃ ہو اور صاحبِ نصاب نہ ہو۔ اگر بیوہ مستحقِ زکوٰۃ ہے تو اس کی مدد کرنا بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن اگر ایک خاتون بیوہ ہے اور مستحقِ زکوٰۃ نہیں ہے تو محض بیوہ ہونے کی وجہ سے وہ مصرفِ زکوٰۃ نہیں بن سکتی۔ اسی طرح یتیم کو زکوٰۃ دینا اور اس کی مدد کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن یہ دیکھ کر زکوٰۃ دینی چاہئے کہ وہ مستحقِ زکوٰۃ ہے۔ لیکن اگر کوئی یتیم ہے مگر وہ مستحقِ زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ صاحبِ نصاب ہے تو یتیم ہونے کے باوجود اس کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔ ان احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے زکوٰۃ نکالنی چاہئے۔

بینکوں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا حکم

کچھ عرصے سے ہمارے ملک میں سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنے کا نظام قائم ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سے مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، کمپنیاں بھی زکوٰۃ کاٹ کر حکومت کو ادا کرتی ہیں۔ اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل عرض کر دیتا ہوں۔

جہاں تک بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا تعلق ہے تو اس کٹوتی سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ احتیاطاً ایسا کر لیں کہ یکم رمضان آنے سے پہلے دل میں یہ نیت کر لیں کہ میری رقم سے جو زکوٰۃ کٹے گی وہ میں ادا کرتا ہوں، اس سے اس کی زکوٰۃ

ادا ہو جاتی ہے دوبارہ زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہیں۔

اس میں بعض لوگوں کو یہ شبہ رہتا ہے کہ ہماری پوری رقم پر سال نہیں گزرا جب کہ پوری رقم پر زکوٰۃ کٹ گئی۔ اس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہر ہر رقم پر سال گزرنا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ اگر آپ صاحبِ نصاب ہیں تو اس صورت میں سال پورا ہونے سے ایک دن پہلے بھی جو رقم آپ کے پاس آئی ہے اس پر جو زکوٰۃ کٹی ہے وہ بھی بالکل صحیح کٹی ہے کیونکہ اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگئی تھی۔

اکاؤنٹ کی رقم سے قرض کس طرح منہا کریں؟

البتہ اگر کسی شخص کا سارا اثاثہ بینک ہی میں ہے، خود اس کے پاس کچھ بھی موجود نہیں، اور دوسری طرف اس کے اُوپر لوگوں کے قرضے ہیں تو اس صورت میں بینک تو تاریخ آنے پر زکوٰۃ کاٹ لیتا ہے حالانکہ اس رقم سے قرضے منہا نہیں ہوتے، جس کے نتیجے میں زیادہ زکوٰۃ کٹ جاتی ہے۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ یا تو آدمی وہ تاریخ آنے سے پہلے اپنی رقم بینک سے نکال لے یا کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھ دے۔ بلکہ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی رقم کرنٹ اکاؤنٹ ہی میں رکھے، سیونگ اکاؤنٹ میں بالکل نہ رکھے، اس لئے کہ وہ تو سودی اکاؤنٹ ہے اور کرنٹ اکاؤنٹ میں زکوٰۃ نہیں کٹتی۔ بہر حال زکوٰۃ کی تاریخ آنے سے پہلے وہ رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں منتقل کر دے، جب کرنٹ اکاؤنٹ سے زکوٰۃ نہیں کٹے گی تو آپ اپنے طور پر حساب کر کے قرض منہا کر کے زکوٰۃ ادا کریں۔ دوسرا حل یہ ہے کہ وہ شخص بینک کو لکھ کر دیدے کہ میں صاحبِ نصاب نہیں ہوں اور صاحبِ نصاب نہ ہونے کی وجہ سے میرے اُوپر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اگر یہ لکھ کر دیدے تو قانوناً اس کی رقم سے زکوٰۃ نہیں کاٹی جائے گی۔

کمپنی کے شیئرز کی زکوٰۃ کاٹنا

ایک مسئلہ کمپنی کے شیئرز کا ہے۔ جب کمپنی شیئرز پر سالانہ منافع تقسیم کرتی ہے تو اس وقت وہ کمپنی زکوٰۃ کاٹ لیتی ہے، لیکن کمپنی ان شیئرز کی جو زکوٰۃ کاٹتی ہے وہ اس شیئرز کی فیس ویلیو (Face Value) کی بنیاد پر زکوٰۃ کاٹتی ہے، حالانکہ شرعاً ان شیئرز کی مارکیٹ قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے، لہٰذا فیس ویلیو پر جو زکوٰۃ کاٹ لی گئی ہے وہ تو ادا ہوگئی البتہ فیس ویلیو اور مارکیٹ ویلیو کے درمیان جو فرق ہے، اس کا آپ کو اس بنیاد پر حساب کرنا ہوگا جس کی تفصیل شیئرز کی زکوٰۃ کے بارے میں بیان کی گئی ہے۔ مثلاً ایک شیئر کی فیس ویلیو پچاس روپے تھی اور اس کی مارکیٹ ویلیو ساٹھ روپے ہے، تو اب کمپنی والوں نے پچاس روپے کی زکوٰۃ ادا کر دی، لہٰذا دس روپے کی زکوٰۃ آپ کو الگ سے نکالنی ہوگی۔ کمپنی

کے شیئرز اور این آئی ٹی یونٹ دونوں کے اندر یہی صورت ہے، لہٰذا جہاں کہیں فیس ویلیو پر زکوٰۃ کٹتی ہے وہاں مارکیٹ ویلیو کا حساب کر کے دونوں کے درمیان جو فرق ہے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

زکوٰۃ کی تاریخ کیا ہونی چاہئے؟

ایک بات یہ سمجھ لیں کہ زکوٰۃ کے لئے شرعاً کوئی تاریخ مقرر نہیں ہے اور نہ کوئی زمانہ مقرر ہے کہ اس زمانے میں یا اس تاریخ میں زکوٰۃ ادا کی جائے، بلکہ ہر آدمی کی زکوٰۃ کی تاریخ جدا ہوتی ہے۔ شرعاً زکوٰۃ کی اصل تاریخ وہ ہے جس تاریخ اور جس دن آدمی پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنا۔ مثلاً ایک شخص یکم محرام الحرام کو پہلی مرتبہ صاحبِ نصاب بنا تو اس کی زکوٰۃ کی تاریخ یکم محرم الحرام ہوگئی، اب آئندہ ہر سال اس کو یکم محرم الحرام کو اپنی زکوٰۃ کا حساب کرنا چاہئے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو یہ یاد نہیں رہتا کہ ہم کس تاریخ کو پہلی مرتبہ صاحبِ نصاب بنے تھے، اس لئے اس مجبوری کی وجہ سے وہ اپنے لئے کوئی ایسی تاریخ زکوٰۃ کے حساب کی مقرر کر لے جس میں اس کے لئے حساب لگانا آسان ہو، پھر آئندہ ہر سال اسی تاریخ کو زکوٰۃ کا حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرے، البتہ احتیاطاً کچھ زیادہ ادا کر دیں۔

کیا رمضان المبارک کی تاریخ مقرر کر سکتے ہیں؟

عام طور پر لوگ رمضان المبارک میں زکوٰۃ نکالتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ رمضان المبارک میں ایک فرض کا ثواب ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔

لہٰذا زکوٰۃ بھی چونکہ فرض ہے اگر رمضان المبارک میں ادا کریں گے تو اس کا ثواب بھی ستر گنا ملے گا۔ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے اور یہ جذبہ بہت اچھا ہے، لیکن اگر کسی شخص کو اپنے صاحبِ نصاب بننے کی تاریخ معلوم ہے تو محض اس ثواب کی وجہ سے وہ شخص رمضان کی تاریخ مقرر نہیں کر سکتا، لہٰذا اس کو چاہئے کہ اسی تاریخ پر اپنی زکوٰۃ کا حساب کرے۔ البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں یہ کر سکتا ہے کہ اگر تھوڑی تھوڑی زکوٰۃ ادا کر رہا ہے تو اس طرح ادا کرتا رہے اور باقی جو بچے اس کو رمضان المبارک میں ادا کر دے۔ البتہ اگر تاریخ یاد نہیں ہے تو پھر گنجائش ہے کہ رمضان المبارک کی کوئی تاریخ مقرر کر لے، البتہ احتیاطاً زیادہ ادا کر دے تاکہ اگر تاریخ کے آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے جو فرق ہو گیا ہو وہ فرق بھی پورا ہو جائے۔

پھر جب ایک مرتبہ جو تاریخ مقرر کر لے تو پھر ہر سال اسی تاریخ کو اپنا حساب لگائے اور یہ

دیکھے کہ اس تاریخ میں میرے کیا کیا اثاثے موجود ہیں، اس تاریخ میں نقد رقم کتنی ہے، اگر سونا موجود ہے تو اسی تاریخ کی سونے کی قیمت لگائے، اگر شیئرز ہیں تو اسی تاریخ کی ان شیئرز کی قیمت لگائے، اگر اسٹاک کی قیمت لگانی ہے تو اسی تاریخ کی اسٹاک کی قیمت لگائے اور پھر ہر سال اسی تاریخ کو حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے، اس تاریخ سے آگے پیچھے نہیں کرنا چاہئے۔

بہر حال، زکوٰۃ کے بارے میں یہ تھوڑی سی تفصیل عرض کر دی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

ذکر اللہ کی اہمیت ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ. وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ.

ہر سال رمضان المبارک میں ظہر کی نماز کے بعد حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''انفاسِ عیسیٰ'' سے ملفوظات سنانے کا معمول ہے، لیکن اس سال اسفار کی وجہ سے یہ سلسلہ اب تک شروع نہ ہوسکا، اور اب صرف چند روز باقی ہیں، اس لئے خیال آیا کہ اس کتاب کا کوئی ایک حصہ لے لیا جائے اور اس پر کچھ بیان ہو جائے۔ میرا ذہن اس طرف گیا کہ یہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ چل رہا ہے۔

یہ عشرہ پورے رمضان کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، اللہ جل جلالہ نے اس عشرے میں رحمتوں کے دروازے کھولے ہوئے ہیں، ہر طرف سے رحمتوں کی بارش برس رہی ہے، طاق راتوں میں شبِ قدر ہونے کا احتمال ہے، اور حدیث شریف میں اس عشرے کو ''عِتْقٌ مِّنَ النِّیْرَانِ'' قرار دیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اس عشرے میں بندوں کو جہنم سے رہائی کا پروانہ عطا فرماتے ہیں۔ (۱)

رمضان کے آخری عشرہ میں آپ ﷺ کی کیفیت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ داخل ہوتا تو حضورِ اقدس ﷺ کا یہ حال ہوتا:

''شَدَّ مِئْزَرَهٗ وَاَحْیَا لَیْلَهٗ وَاَیْقَظَ اَهْلَهٗ'' (۲)

اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ آپ اپنی ازار باندھ لیتے تھے، لیکن اس سے ایک محاورہ کی طرف

☆ اصلاحی مجالس (۳/۳۰ تا ۴۷) بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، دار العلوم، کراچی، اصلاحی مواعظ (۲/۷۱ تا ۹۲)

(۱) کنز العمال، رقم: ۲۳٦٦٨ (٨/٤٦٣)، الترغیب والترھیب، رقم: ١٤٨٣ (٢/٥٧)، مجمع الزوائد (٤/٣٦٨)

(۲) صحیح البخاری، کتاب صلاۃ التراویح، باب العمل فی العشر الأواخر من رمضان، رقم: ١٨٨٤، صحیح مسلم، کتاب الاعتکاف، باب الاجتهاد فی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اشارہ ہے، اور وہ ہے کسی کام کے لئے کمر کس لینا، یعنی آپ کمر کس لیتے تھے، اور عبادت میں زیادہ سے زیادہ محنت اور مشقت اُٹھانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ وَأَحْيَىٰ لَيْلَهُ، اور اپنی رات کو زندہ رکھتے، یعنی رات کے وقت جاگتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں جاگ کر رات گزارتے۔ وَأَيْقَضَ أَهْلَهُ، اور اپنے گھر والوں کو بھی عبادت کے لئے بیدار کرتے۔

عام دنوں میں تہجد کے وقت کیفیت

عام دنوں میں حضور اقدس ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب رات کو تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو اس بات کا اہتمام فرماتے کہ گھر والوں کی نیند میں خلل نہ آئے، چنانچہ حدیث شریف میں یہ الفاظ ہیں:

"قَامَ رُوَيْدًا وَفَتَحَ الْبَابَ رُوَيْدًا"(۱)

جب آپ بستر سے کھڑے ہوتے تو آہستہ سے کھڑے ہوتے، کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آنکھ کھل جائے، اور جب دروازہ کھولتے تو بہت آہستہ سے کھولتے تاکہ ان کی نیند میں خلل نہ آئے۔

اپنے گھر والوں کی نیند کا اتنا احساس تھا، لیکن جب رمضان المبارک کا عشرہ اخیرہ داخل ہوتا تو اپنے گھر والوں کو اہتمام سے بیدار فرماتے کہ یہ عبادت کا وقت ہے، اس وقت میں اللہ کی عبادت کرو۔

بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ وَكَثُرَ صَلَاتَهُ یعنی ان ایام میں آپ ﷺ نماز کی کثرت فرماتے۔ اور عبادت کا یہ اہتمام صرف طاق راتوں میں نہیں ہوتا تھا بلکہ پورے عشرے کی تمام راتوں میں یہ اہتمام فرماتے۔

آخری عشرہ کس طرح گزارا جائے؟

بہر حال! یہ عشرہ اخیرہ اسی کام کے لئے ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں گزارا جائے، نماز بھی ذکر کا ایک شعبہ ہے، عبادات بھی ذکر کا شعبہ ہیں، اور مقصد یہ ہے کہ رمضان المبارک کا یہ عشرہ اخیرہ اللہ جل شانہ کی یاد میں گزرے اور ذکرِ قلبی اور ذکرِ لسانی میں یہ وقت گزرے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس آخری عشرہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) العشر الأواخر من شهر رمضان، رقم: ۲۰۰۸، سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب في قيام شهر رمضان، رقم: ۱۱۶۸، سنن ابن ماجه، كتاب الصيام، باب في فضل العشر الأواخر من شهر رمضان، رقم: ۱۷۵۸، مسند أحمد، رقم: ۲۳۰۰۱

(۱) سنن النسائي، كتاب الجنائز، باب الأمر بالاستغفار للمؤمنين، رقم: ۲۰۱۰

کی راتوں کو جلسوں میں، تقریروں میں اور تقریبات اور دعوتوں میں ضائع کرنا بڑی خطرناک بات ہے، یہ راتیں جلسے اور تقریروں کی نہیں ہیں، بلکہ یہ محض عمل کرنے کی راتیں ہیں، بس انسان ہو اور گوشۂ تنہائی ہو، اور اپنے مالک کے ساتھ رابطہ قائم ہو، وہ ہو اور اس کا اللہ ہو، تیسرا کوئی نہ ہو، اس طریقے سے اس عشرے کو گزارو، اور ذکر میں گزارو، زبان سے ذکر ہو، دل سے ذکر ہو، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، ہر حالت میں اللہ کا ذکر ہو، بلکہ بازار میں، دفتر میں، گھر کے کام کاج میں مصروف ہو، تب بھی زبان پر اور دل میں اللہ کا ذکر ہو اور یہ کیفیت ہو کہ

دل بیار دست بکار

یعنی ہاتھ تو کام کاج میں لگا ہو اور دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو۔

ایمان والوں سے خطاب

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ (۱)

''اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو''

بعض طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ ذکر کرنا تو صوفیوں کا کام ہے، مولویوں کو اور علماء کو ذکر سے کیا کام؟ علماء کرام کا کام تو یہ ہے کہ وہ وعظ کریں، تبلیغ کریں، تدریس کریں، سبق پڑھیں پڑھائیں، مطالعہ کریں، تکرار کریں وغیرہ، ذکر سے مولوی کا کیا کام؟ ذکر کرنا تو صوفیوں کا کام ہے، لہٰذا جب خانقاہ میں جائیں گے تو وہاں ذکر کریں گے۔ ارے بھائی! یہ آیت جو میں نے پڑھی اس میں تو تمام ایمان والوں سے خطاب ہو رہا ہے، اب یہ بتائیں کہ مولوی ایمان والوں میں داخل ہے یا نہیں؟ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا کے عموم کے اندر سب داخل ہیں، لہٰذا یہ سمجھنا کہ ہم تو طالب علم ہیں، ہم تو کتاب پڑھیں گے، مطالعہ کریں گے، تکرار کریں گے، ذکر نہیں کریں گے، یاد رکھئے! یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

ذکر میں کثرت مطلوب ہے

اور پھر اس آیت میں فرمایا کہ اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو، جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک دو مرتبہ ذکر کر لینا کافی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے نام کی رٹ لگاؤ۔ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت تمہاری زبان پر ذکر جاری رہے۔ ایک صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! قیامت کے روز درجہ کے اعتبار سے افضل درجہ کس بندے کا ہوگا؟ آپ ﷺ نے

---

(۱) الاحزاب: ۴۱

جواب میں فرمایا:

((اَلذَّاکِرُوْنَ اللّٰهَ کَثِیْرًا وَّالذَّاکِرَاتُ)) (۱)

''جو کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں ہیں''

دھیان کے بغیر ذکر کرنا

بعض لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ کیسا ذکر ہے کہ دل و دماغ تو کہیں اور مشغول ہیں اور زبان سے ذکر کر رہا ہے، سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ کی تسبیحات پڑھ رہا ہے، لیکن دھیان کہیں، فکر کہیں، دل کہیں، دماغ کہیں، تو ایسے ذکر سے کیا فائدہ؟ یاد رکھئے! یہ شیطان کا دھوکہ ہے، ارے اگر صرف زبان کو اللہ کے ذکر کی توفیق ہو رہی ہے، چاہے دل و دماغ کہیں اور مشغول ہیں، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، یہ بھی بڑی دولت ہے۔ ارے یہ دولت کیا کم ہے کہ جسم کے تمام اعضاء میں سے ایک عضو تو ان کی یاد میں مشغول ہے۔

زبان پر ذکر ہو، دل میں خیالات ہوں

چنانچہ اس پر لوگوں کے درمیان ایک شعر مشہور ہے کہ۔

بر زبان تسبیح و در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

یعنی زبان پر تسبیح جاری ہو اور دل میں گائے اور گدھے کا خیال آرہا ہو، ایسی تسبیح کا کیا اثر اور کیا فائدہ؟ کسی شاعر نے یہ شعر کہہ دیا، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے یہ شعر کہا ہے وہ حقیقت شناس نہیں ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ۔

بر زبان تسبیح و در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر

یعنی اگر زبان پر تسبیح جاری ہے، اور دل میں گائے اور گدھے کا خیال آرہا ہے، اللہ کے فضل سے ایسی تسبیح بھی اپنا اثر رکھتی ہے۔ زبان کا ذکر اس راہ کی پہلی سیڑھی ہے۔ اگر زبان اللہ کے ذکر سے تر نہیں ہوگی تو پھر دل کبھی اللہ کے ذکر سے آباد نہیں ہوگا۔ جو شخص اس پہلی سیڑھی کو قطع نہیں کرے گا، اس

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب الحث علی ذکر الله تعالی، رقم: ٤٨٣٤، سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، رقم: ٣٢٩٨، مسند أحمد، رقم: ٨٩٦٤

کے دل میں اللہ کی یاد کیسے سمائے گی؟ اس لئے زبان سے ذکر کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے کا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ استوار کرنے کا پہلا زینہ ہے۔ اگر زبان سے ذکر نہیں ہے تو گویا پہلی سیڑھی ہی موجود نہیں، اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ زبان سے ذکر کا کیا فائدہ جب دل ہی متوجہ نہیں ہے۔ بلکہ زبان سے ذکر کرتے رہو چاہے دل لگے یا نہ لگے، جمعیتِ خاطر پیدا ہو یا نہ ہو، لیکن تم ذکر کرتے رہو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ کے نام کی رٹ لگاؤ۔ رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ اسی کے ذریعہ دل کو بھی متوجہ فرما دیں گے۔ اگر فرض کریں کہ ساری عمر دل اس طرف متوجہ نہیں ہوا، تب بھی زبان سے ذکر فائدے سے خالی نہیں۔

ذکر اللہ ایک توانائی ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ذکر ایک انرجی اور توانائی ہے، لہٰذا صبح اُٹھنے کے بعد ناشتہ کرنے سے پہلے یہ انرجی اور توانائی حاصل کرلو، اس لئے کہ اللہ کا ذکر دلوں میں توانائی پیدا کرتا ہے، ارادوں میں توانائی پیدا کرتا ہے، ہمت میں طاقت عطا کرتا ہے، اور اس کے نتیجے میں انسان کے اندر شیطان اور نفس سے مقابلے کے لئے ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا نفس و شیطان کو شکست دینے میں ذکر کو بڑا دخل ہے، پھر یہ ذکر کرنے والا شیطان سے مغلوب نہیں ہوتا، اور اسی زبانی ذکر ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اللہ کے ذکر نے گناہ سے روک دیا

جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے گناہ کا موقع آیا اور تمام اسباب جمع ہوئے، تو اس وقت اس گناہ سے ذکر نے روک دیا، اس لئے کہ جب زلیخا نے کہا: ''هَيْتَ لَكَ'' تو جواب میں انہوں نے فرمایا: ''معاذ اللہ'' اللہ کی پناہ۔ (۱)

اس موقع پر اللہ کی پناہ کے احساس نے یہ طاقت دی اور اتنے دلربا ماحول میں جس میں انسان کے پھسل جانے کا ننانوے فیصد احتمال موجود تھا، اس اللہ کے ذکر نے ان کو گناہ سے روک دیا۔

ذکر رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا

اس کے بعد اگلا جملہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ فرمایا:

﴿إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾ (۲)

(۱) یوسف: ۲۳　　(۲) یوسف: ۲۳

حضرات مفسرین نے اس جملہ کی دو تفسیریں کی ہیں۔ بعض حضرات نے تو فرمایا کہ ''رَبِّی'' سے مراد عزیز مصر ہیں، زلیخا جس کی بیوی تھی، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ''رَبِّی'' سے مراد ''اللہ جل شانہ'' ہیں، اور اشارہ اس جملے سے اس طرف فرمایا کہ اگرچہ تم نے دروازے بند کر دیئے ہیں اور دروازوں پر تالے ڈال دیے ہیں اس خیال سے کہ اس عمل کا کسی کو پتہ نہ چلے، لیکن میرا ایک پروردگار ہے جو مجھے اس حالت میں بھی دیکھ رہا ہے، جس نے مجھے بہترین ٹھکانہ دیا ہے۔ تو "إِنَّهُ رَبِّي" کا خیال ذکر کی برکت سے آرہا ہے، وہ ذکر جوان کی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی یاد ان کے دل و دماغ میں پیوست ہو چکی تھی، اس کے نتیجے میں وہ اس گناہ سے بچ گئے۔ بہر حال! یہ ذکر ایک توانائی اور انرجی ہے جس کو صبح کے وقت کاروبارِ زندگی میں داخل ہونے سے پہلے حاصل کر لینا چاہئے۔

ذکرِ مسنون کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں

عام طریقہ تو یہ ہے کہ جب انسان کسی شیخ کی طرف رجوع کرتا ہے تو شیخ اس کو کچھ ذکر اور تسبیحات بتاتا ہے کہ صبح کے وقت یہ ذکر کر لیا کرو اور شام کے وقت یہ ذکر کر لیا کرو۔ لیکن بعض تسبیحات وہ ہیں جو حضورِ اقدس ﷺ نے بتادی ہیں، ان تسبیحات کو پڑھنے کے لئے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں، مثلاً روزانہ ایک تسبیح "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ" ایک تسبیح "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ" ایک تسبیح ''استغفار'' کی اور ایک تسبیح ''درود شریف'' کی۔ یہ چار تسبیحات ہر انسان روزانہ پڑھ سکتا ہے، لہٰذا جن حضرات کے معمولات میں یہ تسبیحات شامل نہیں ہیں، وہ اپنے معمولات میں ان کو شامل کر لیں۔

بہر حال! اس کتاب ''انفاسِ عیسیٰ'' میں حضرت والا نے ''ذکر'' کے بارے میں چند ملفوظات ذکر فرمائے ہیں، اس لئے خیال آیا کہ اس رمضان میں ''ذکر'' کے بارے میں ملفوظات پڑھ کر اس کی کچھ تشریح عرض کر دی جائے۔

ذکر میں مشقت خود نافع ہے

ایک شخص نے حضرت والا کو خط میں اپنا حال لکھا:

''ذکر طبیعت پر بہت بار معلوم ہوتا ہے، جب کرنے بیٹھے جی گھبرا اُٹھتا ہے''

جواب میں حضرت والا نے لکھا:

''بار'' ایک مشقت ہے، مشقت میں اگر جی نہ لگے تو سمجھ لو کہ خود مشقت بھی نفع میں جی لگنے سے کم نہیں، جس طرح سے بھی ہو حتی الوسع پورا کر لیا کیجئے، شدہ شدہ سب

دشواری مبدل بآسانی ہو جائے گی‘‘(۱)

جب آدمی ذکر کرنا شروع کرتا ہے تو پہلے مرحلے میں اس کا دل بہت اُلجھتا ہے اور اس کو مشقت معلوم ہوتی ہے، اور جب ذکر کرنے بیٹھتا ہے تو دل گھبرانے لگتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب ذکر کرنے بیٹھے تو دل گھبرا گیا اور طبیعت اس میں نہیں چلی اور دل نہیں لگا، تو وہ لوگ ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور ذکر چھوڑ بیٹھتے ہیں، ایسے لوگ محروم رہ جاتے ہیں۔

ذکر میں زبردستی لگے رہو

ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ جب ذکر کرنے بیٹھے تو اب دل لگے یا نہ لگے، دل چاہے یا نہ چاہے، دل گھبرائے یا وحشت ہو، لیکن پھر بھی ذکر میں لگا رہے، اور دل سے کہہ دے کہ چاہے تو گھبرائے یا پریشان ہو، مجھے تو یہ کام کرنا ہے۔ ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ اپنے نفس سے یہ کہہ دیا کرو کہ:

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں برباد ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے

ایک مرتبہ اس دل سے یہ کہہ دو کہ تو اس سے بھاگ رہا ہے اور گھبرا رہا ہے، مجھے کوئی پرواہ نہیں، میں تو یہ کام کروں گا۔ جس دن آدمی نے یہ عزم کر لیا تو پھر انشاء اللہ چند ہی روز میں یہ گھبراہٹ اور پریشانی ختم ہو جائے گی، لیکن اگر اس گھبراہٹ کی وجہ سے بھاگ کھڑا ہوا اور ذکر چھوڑ بیٹھا تو پھر دوبارہ ذکر کی طرف لوٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔

دل گھبرانے کا کوئی علاج نہیں

لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ حضرت! اس کا کوئی علاج بتایئے کہ ذکر میں دل گھبرائے نہیں اور دل ذکر میں لگ جایا کرے۔ یاد رکھئے! اس کا کوئی علاج نہیں، کوئی ایسی گولی اور سفوف نہیں ہے اور کوئی ایسا معجون نہیں ہے کہ وہ اگر کھلا دیا جائے تو اس کے نتیجے میں ذکر میں دل لگ جایا کرے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ دل لگے یا نہ لگے، لیکن اپنی ہمت کو استعمال کر کے انسان لگا رہے۔ دیکھئے! اس ملفوظ میں حضرت والا نے ذکر میں دل نہ لگنے کے بارے میں اور ذکر میں بار محسوس ہونے کے بارے میں کیا جواب ارشاد فرمایا ہے۔

---

(۱) انفاس عیسیٰ، ص:۶۳

یہ مشقت اور بار فائدے سے خالی نہیں

فرمایا کہ ''بار'' ایک مشقت ہے، یعنی طبیعت پر ذکر کرنے سے جو بار ہوتا ہے وہ ایک مشقت ہے، اور مشقت میں اگر جی نہ لگے تو سمجھ لو کہ خود مشقت بھی نفع میں جی لگنے سے کم نہیں، یعنی اگر ذکر کرنے میں مشقت ہو رہی ہے اور اس میں جی نہیں لگ رہا ہے تو اس دل نہ لگنے کی صورت میں یہ سوچو کہ یہ جو مشقت ہو رہی ہے، یہ بھی فائدہ دینے میں دل لگنے سے کم نہیں۔ کیونکہ اگر ذکر میں دل لگتا اور خوب خشوع اور خضوع کے ساتھ دل لگا کر ذکر کرتے اور اس سے جو فائدہ حاصل ہوتا، اس مشقت کا فائدہ بھی اس سے کم نہیں۔

ایسے ذکر میں نورانیت زیادہ ہوتی ہے

بلکہ حضرت والا نے بعض جگہ لکھا ہے کہ اس مشقت والے ذکر کا فائدہ دل لگا کر ذکر کرنے کے فائدے سے بڑھ جاتا ہے، کیونکہ جس شخص کو ذکر میں لطف اور مزہ آرہا ہے اور دل لگ رہا ہے، اس کے ذکر کے اندر تو یہ احتمال موجود ہے کہ شاید یہ حظِ نفس کے لئے ذکر کر رہا ہو اور مزہ اور لطف کی خاطر ذکر کر رہا ہو، بخلاف اس شخص کے جس کو ذکر کرنے میں مشقت ہو رہی ہے، اس کو ذکر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے علاوہ اور کچھ مقصود نہیں، اس لئے ہوسکتا ہے کہ مشقت کے ساتھ ذکر کرنے والا نفع اور ثواب میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے۔ اس لئے کبھی یہ نہ سوچو کہ مشقت کے ساتھ ذکر کرنے میں کیا فائدہ؟ ارے اس میں بھی بڑا فائدہ ہے، یہ جو تم اس حال میں ذکر کر رہے ہو کہ تمہارا دل کہیں ہے اور دماغ کہیں ہے اور ذکر میں دل نہیں لگ رہا ہے پھر بھی زبردستی دل لگا رہے ہو، یہ ذکر اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ بعض اوقات ایسے ذکر میں نورانیت اور روحانیت کیف اور مزے والے ذکر سے زیادہ ہوتی ہے۔

روحانیت اور نورانیت کی حقیقت

ایک مرتبہ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں تفصیل سے بیان فرمایا کہ یہ روحانیت اور نورانیت کیا چیز ہے؟ چنانچہ فرمایا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی اچھا خواب نظر آجائے، اور کوئی کشف ہوجائے، اور عبادات میں مزہ آنے لگے تو یہ نورانیت اور روحانیت کی دلیل ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کا نورانیت اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ نورانیت اللہ کے حکم کی اتباع میں ہے، جس دن اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا، اس دن نورانیت حاصل ہوگئی، چاہے ساری عمر

نماز پڑھنے میں مزہ نہ آیا ہو، لیکن اس شخص کو نورانیت مکمل حاصل ہے۔

ان کی کوئی حقیقت نہیں

ہمارے یہاں ایک صاحب جو شیخ طریقت کہلاتے ہیں، جن کے مریدوں کی تعداد بھی بیشمار بتائی جاتی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ: ''جو شیخ اپنے مرید کو مسجدِ حرام میں نماز نہ پڑھوا سکے وہ شیخ بننے کے لائق نہیں'' یعنی وہ شیخ مرید کے سامنے ''مسجدِ حرام'' منکشف کرائے اور اس مرید کو اس میں نماز پڑھوادے، جو پیر ایسا نہ کر سکے وہ پیر بننے کے لائق نہیں۔ چنانچہ ان باتوں کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ یہ مراقبات، یہ مکاشفات وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے انسان کو تقربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں، اگر کسی کو یہ چیزیں حاصل ہو جائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، مگر یہ بہت نازک نعمت ہے، بسااوقات یہ ایک امتحان بھی ہوتی ہے، اس کے حاصل ہونے کے بعد گمراہی کے راستے پر پڑ جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے، بہت سے لوگوں کو شیطان نے انہی چیزوں سے بہکا دیا۔ اس لئے کبھی ان کے حاصل کرنے کی فکر میں نہ پڑو، یہ مقصود چیزوں میں سے نہیں، زیادہ سے زیادہ محمود ہے، طبیعت کی پسندیدہ کیفیت ہے۔

اللہ سے رابطہ استوار کر لو

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رابطہ استوار کر لو، کیا اللہ تعالیٰ وہاں حرم میں بیٹھے ہوئے ہیں؟ یا بیت اللہ شریف میں بیٹھے ہوئے ہیں؟ ارے اللہ تعالیٰ تو جس طرح حرم میں موجود ہیں، اسی طرح یہاں بھی موجود ہیں، جس دن تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رابطہ استوار کر لیا، بس اسی دن تمہیں تمہارا حرم حاصل ہو گیا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؏

ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

تم شبِ قدر تلاش کرتے ہو، ارے ہر رات شبِ قدر ہے اگر تم اس کی قدر پہچانو، جس رات تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رابطہ استوار کر لیا، وہ رات تمہاری شبِ قدر ہو گئی۔

تمہیں یہاں پر ''حرم'' حاصل ہو جائے گا

اس لئے یہ سمجھنا کہ اگر ہم حرم نہ گئے اور حرم میں نماز نہ پڑھی تو ہمیں کچھ حاصل نہ ہوا، یہ بات ٹھیک نہیں۔ ارے بھائی! اگر اللہ تعالیٰ حرم لے جائے تو یہ اس کا کرم اور احسان ہے، اور اگر تم وہاں نہ

جاسکے، اس لئے کہ قانونی پیچیدگیاں ہیں یا اخراجات کا انتظام نہیں ہے یا اس کے اندر سفر کی طاقت نہیں ہے، تو کیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہیں محروم فرمادیں گے؟ ارے وہ جذبہ جو تمہیں حرم لے کر جارہا تھا، اگر اس جذبے کو صدق و اخلاص سے یہاں بیٹھ کر استعمال کرو تو تمہیں یہاں پر ہی حرم حاصل ہو جائے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی صاحب ایمان کو محروم نہیں فرماتے۔

ہر حالت میں ذکر میں مشغول رہو

خوب سمجھ لیجئے! ان کشف و کرامات کا براہ راست دینداری سے کوئی تعلق نہیں، حق تعالیٰ کا قرب اس پر موقوف نہیں، اصل دین یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہو، اسی کی تعمیل میں اس کا ذکر ہو، اور اللہ تعالیٰ سے رابطہ اور تعلق ہو، اس تعلق کو استوار کرنے کی فکر ہو۔ خواہ ذکر کرنے میں مشقت ہو، طبیعت پر بار ہو، دل نہ لگے، پھر بھی بیٹھ جاؤ اور اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جاؤ، اس اطاعت کے نتیجے میں دیکھو کہ اللہ تعالیٰ ایسی نورانیت اور برکت عطا فرماتے ہیں کہ رفتہ رفتہ یہ ذکر واذکار بھی سہولت سے پورے ہونے لگیں گے اور اس کا اصل فائدہ رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس کی توفیق عطا فرمائے اور آپ حضرات کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

ذکر کے مختلف طریقے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ. وَعَلٰى اٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

مشقت کے باوجود ذکر میں لگا رہے

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ جب انسان ابتداءً ذکر کرنا شروع کرتا ہے تو طبیعت پر مشقت ہوتی ہے اور بار ہوتا ہے۔ یہ کیفیت صرف ذکر کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ہر نئے کام کو شروع کرنے کے بعد ابتداءً اس کام کو کرتے ہوئے مشقت معلوم ہوتی ہے، اسی طرح ذکر اللہ کے آغاز میں بھی جب انسان اپنے آپ کو ذکر اللہ کا عادی بنانا چاہتا ہے تو بعض اوقات ذکر کرنے سے دل اُلجھتا ہے اور طبیعت پر بار محسوس ہوتا ہے۔

لیکن اس کا علاج یہ ہے کہ اس مشقت کو برداشت کیا جائے، اس بار کو اُٹھایا جائے، اور گھبرا کر ذکر کو نہ چھوڑا جائے، بلکہ دل لگے یا نہ لگے، طبیعت اُلجھے یا سلجھے، ہر حالت میں ذکر کے اندر انسان مشغول رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ دل لگنے لگے گا۔

نماز پڑھنے میں ابتداءً مشقت ہوتی ہے

دیکھئے! بچپن میں جب ماں باپ نے کہا تھا کہ نماز پڑھو، اور ان کے کہنے پر نماز شروع کر دی تھی، کیا اس وقت نماز میں تمہارا دل لگتا تھا؟ نہیں! اس وقت تمہارا دل نہیں لگتا تھا، بلکہ دل بھاگتا تھا اور طبیعت نماز پڑھنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ جب ماں باپ نماز پڑھنے پر اصرار کرتے تو دل میں یہ خیال آتا کہ یہ ہم پر ظلم کر رہے ہیں، تو اس وقت نماز پڑھنا مشقت معلوم ہوتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ وہ مشقت جزوِ زندگی بن گئی، اور اب یہ حالت ہوگئی کہ اگر کوئی شخص کسی نمازی سے یہ کہے کہ تو ایک لاکھ روپے لے لے اور ایک وقت کی نماز چھوڑ دے، تو وہ نمازی ایک نماز بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہوگا، اب اسے نماز پڑھے بغیر چین نہیں آتا۔

☆ اصلاحی مجالس (۳/۵۰ تا ۷) بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، دارالعلوم، کراچی

ذکر جزوِ زندگی بن جاتا ہے

اسی طرح ''ذکر'' کا حال ہے کہ ابتداءً ذکر میں مشقت ہوتی ہے، وہ بوجھ معلوم ہوتا ہے، لیکن جب رفتہ رفتہ وہ ذکر معمول کے اندر شامل ہوجاتا ہے اور اس کی عادت پڑ جاتی ہے تو وہ ذکر جزوِ زندگی بن جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس ذکر کو زندگی کا ایسا حصہ بنادیتے ہیں کہ اس کے بغیر چین نہیں آتا۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور ذکر اللہ

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ جو جلیل القدر محدث اور عالم تھے، اور علم و فضل کا بہت اُونچا مقام رکھتے تھے اور صحیح بخاری کی شرح ''فتح الباری'' کے مصنف تھے، ان کا یہ حال تھا کہ جس وقت وہ فتح الباری لکھتے اور لکھنے کے دوران قلم پر قط لگانے کی ضرورت پیش آتی — چونکہ اس زمانے میں لکڑی کے قلم ہوتے تھے، لکھتے لکھتے جب ان کی نوک خراب ہوجاتی تو چاقو سے اس پر قط لگانا پڑتا تھا — تو جب حافظ ابن حجرؒ کو کتاب لکھنے کے دوران قلم پر قط لگانے کی ضرورت پیش آتی تو جتنا وقت قلم پر قط لگانے میں گزرتا، اتنا وقت بھی خالی گزارنا گوارا نہیں تھا، اس لئے اس وقت کو ذکر اللہ میں گزارتے۔(۱)

لہٰذا جب ذکر انسان کا جزوِ زندگی بن جاتا ہے تو اس کے بغیر انسان کو چین نہیں آتا۔

ذکر کا ایک طریقہ ''ذکر جہری''

بعض حضرات صوفیاء نے اس مبتدی کے لئے جس کی طبیعت ابھی ذکر اللہ سے مشقت محسوس کررہی ہے، ذکر کے کچھ خاص طریقے بیان فرمائے ہیں کہ اس طرح ذکر کیا کرو، اس طرح ذکر کرنے سے ذکر میں دل لگے گا اور گھبراہٹ نہیں ہوگی، ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ گھبراہٹ کے نتیجے میں وہ ذکر کرنا چھوڑ دے گا۔

ان طریقوں میں سے ایک طریقہ ''ذکر جہری'' ہے، کیونکہ اگر وہ اکیلا چپکے چپکے ذکر کرے گا تو اس سے دل اُلجھے گا اور دل گھبرائے گا، اس لئے اس سے کہا کہ تو ذرا بلند آواز سے ذکر کرلے اور تھوڑا سا لحن بھی اس میں شامل کرلے، اس کے نتیجے میں ذکر کے اندر اس کا دل لگ جائے گا۔ مثلاً اگر آہستہ آواز میں ''لا الٰہ الا اللہ'' کا ذکر کرتا ہے تو اس کا دل نہیں لگتا، لیکن جب بلند آواز سے اور لحن سے ذکر کرے گا تو اس کا دل لگ جائے گا۔ دل لگانے کی خاطر بزرگوں نے یہ تجویز کیا کہ ذکر جہری کرو اور لحن سے کرو۔

(۱) ابن حجر العسقلانی، شاکر عبدالمنعم، ص: ۱۸۵

ذکر کا ایک طریقہ ''ضرب'' لگانا

کسی کو ''ضرب'' کا طریقہ بتادیا کہ ذکر کرتے وقت ''ضرب'' لگاؤ۔ ضرب لگانے کا مطلب ہے مارنا، چوٹ لگانا، یعنی ذکر کرتے وقت کسی جگہ پر زور ڈالنا اور اس پر چوٹ مارنا۔ عملی طور پر اس کی بہت سی شکلیں اپنے تجربات سے مفید سمجھ کر اہلِ تربیت نے اختیار کی ہیں، انہیں میں ایک یہ ہے کہ جس وقت تم "لَا اِلٰہَ" کہو، اس وقت گردن اور چہرہ کو دل کے قریب لے جاؤ، اور پھر گردن کو داہنی طرف سے پیچھے کی طرف کرو، اور اس وقت یہ تصور کرو کہ دل میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ جتنی چیزوں کی محبت ہے، اس محبت کو دل سے نکال کر پیچھے کی طرف پھینک رہا ہوں۔ اور پھر "اِلَّا اللّٰہ" کہتے وقت گردن اور چہرے کو دوبارہ دِل کے قریب لاکر جھکادو، اور اس وقت یہ تصور کرو کہ میں اللہ کی محبت کو دل میں داخل کررہا ہوں۔ یہ طریقہ بزرگوں نے اس لئے تجویز کیا کہ جب ذاکر اس ''ضرب'' کے اندر مشغول ہوگا تو اس کا دل ذکر میں لگ جائے گا، اور جب بار بار اور روزانہ یہ تصور کرکے ذکر کرے گا اور اس طرح ضرب لگائے گا تو انشاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ دل سے غیر اللہ کی محبت نکل جائے گی اور اللہ کی محبت دل میں داخل ہوجائے گی۔

''رگِ کیماس'' پکڑ کر ذکر کرنا

بہرحال! بزرگوں اور مشائخ نے ذکر کے جو خاص طریقے تجویز کیے ہیں یہ بطور علاج کے ہیں، یہ طریقے نہ تو حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت ہیں اور نہ ہی ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض حضرات نے اور طریقے بھی تجویز کیے ہیں، مثلاً بعض مشائخ نے فرمایا کہ جب ذکر کرنے بیٹھو تو چار زانو ہوکر بیٹھ جاؤ، اور پھر داہنے پاؤں کے انگوٹھے اور ساتھ والی اُنگلی سے بائیں طرف کے گھٹنے کے اندر کی رگ جس کو ''رگِ کیماس'' کہتے ہیں، اس کو پکڑلو، اس رگ کو پکڑنے سے دل جمعی پیدا ہوجائے گی اور فضول خیالات اور وساوس نہیں آئیں گے۔ اب یہ بات تجربہ کی ہے اور تجربہ کی بنیاد پر یہ طریقہ بتادیا۔

ذکر کا ایک طریقہ ''پاس انفاس''

اسی طرح ذکر کا ایک خاص طریقہ ''پاس انفاس'' کہلاتا ہے، اس طریقے میں یہ ہوتا ہے کہ ہر سانس کی آمد و رفت میں ذکر اللہ کو اس طرح جذب کرلیا جاتا ہے کہ ہر سانس کے ساتھ اللہ کا ذکر زبان سے جاری ہوجاتا ہے، سانس آرہا ہے تو اللہ کا ذکر ہو رہا ہے، سانس جارہا ہے تو اللہ کا ذکر ہو رہا ہے، ہر

سانس کی رفتار کے ساتھ اللہ کا نام نکل رہا ہے۔ اس طریقے کی مشائخ کے یہاں مشق کرائی جاتی تھی جس کے نتیجے میں یہ چیز حاصل ہو جاتی تھی۔

ذکر کے وقت ہر چیز کے ذکر کرنے کا تصور

اسی طرح ''سلطان الاذکار'' کا نام آپ نے سنا ہوگا، یہ بھی ذکر کا ایک خاص طریقہ ہے، جس میں تمام لطائف کے ساتھ ذکر کی آواز نکلتی ہے، واللہ اعلم۔ اسی طرح حضرات صوفیاء کرام نے ایک طریقہ یہ نکالا کہ جب ذکر کرنے بیٹھو تو یہ تصور کرو کہ یہ دیوار بھی میرے ساتھ ذکر کر رہی ہے، یہ چھت بھی ذکر کر رہی ہے، یہ دروازہ بھی ذکر کر رہا ہے، یہ پنکھا بھی ذکر کر رہا ہے، یہ زمین بھی ذکر کر رہی ہے، یہ آسمان بھی ذکر کر رہا ہے، یہ ساری کائنات ذکر کر رہی ہے۔ اس تصور سے ذکر کے اندر ایک خاص نشاط اور کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کا ذکر کرنا

قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر کا واقعہ آتا ہے کہ جب وہ ذکر کرتے تھے تو پہاڑ اور پرندے بھی ساتھ میں ذکر کرتے تھے، فرمایا:

﴿وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ﴾ (۱)

یعنی ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو ان کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام جب ''سُبْحَانَ اللهِ، سُبْحَانَ اللهِ'' کی تسبیح پڑھتے تو پہاڑ بھی اور پرندے بھی ان کے ساتھ ''سُبْحَانَ اللهِ، سُبْحَانَ اللهِ'' کہتے۔

پہاڑوں اور پرندوں کے ذکر سے حضرت داؤد علیہ السلام کا فائدہ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسائل السلوک'' میں لکھا ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کے ذکر کرنے کو اللہ تعالیٰ نے ان انعامات میں شمار فرمایا ہے جو انعامات اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر فرمائے تھے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پہاڑ اور پرندے ذکر کرتے تھے تو اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو کیا فائدہ پہنچتا ہے جس کی وجہ سے ان چیزوں کو بطور انعام کے ذکر فرمایا:

﴿وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ﴾

پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ یوں تو ذکر بڑی نعمت ہے، چاہے وہ ذکر کسی

---

(۱) الانبیاء: ۷۹

حالت میں بھی ہو، چاہے تنہائی میں ذکر ہو، لیکن اگر ذکر کرنے والے کے ساتھ کوئی جماعت بھی ذکر کرنے میں شامل ہو جائے تو اس کے ذکر میں نشاط پیدا ہو جاتا ہے، کیف پیدا ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کا دل ذکر میں خوب لگنے لگتا ہے۔ لہٰذا یہ جو پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا گیا اور ان سے یہ کہہ دیا گیا کہ تم بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ ذکر کرو، اس میں حضرت داؤد علیہ السلام پر انعام یہ ہے کہ ان کو ذکر میں نشاط پیدا ہو جائے۔ اسی لئے صوفیاء کرام نے حضرت داؤد علیہ السلام کے اس واقعے سے ذکر کا ایک طریقہ یہ نکالا کہ جب تم ذکر کرو تو یہ تصور کرو کہ یہ در و دیوار، یہ پہاڑ، یہ پرندے، یہ درخت بھی میرے ساتھ ذکر کر رہے ہیں اور اس تصور کی مشق کرو، اور مشق کی کثرت کے بعد یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ واقعۃً یہ سب چیزیں میرے ساتھ ذکر کر رہی ہیں، اس کے نتیجے میں اپنی طبیعت ذکر کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

ذکر کے یہ طریقے علاج ہیں

بہر حال! حضرات صوفیاء کرام نے ذکر کے جو خاص طریقے بیان فرمائے ہیں، ان کا مقصد یہ تھا کہ ذکر میں انسان کا دل لگ جائے، اور یہ طریقے بطور علاج کے بیان فرمائے ہیں۔ اس لئے یاد رکھئے کہ یہ خاص طریقے نہ مقصود ہیں، نہ مسنون ہیں، اور نہ ان طریقوں کو مسنون سمجھنا جائز ہے، مثلاً ہمارے تمام مشائخ کے یہاں دوازدہ تسبیح (بارہ تسبیح) بہت معروف ہے، یہ دوازدہ تسبیح ضرب لگا کر کی جاتی ہے، مگر یہ خاص طریقہ نہ مقصود ہے اور نہ مسنون ہے، اگر کوئی شخص اس کو مسنون سمجھ لے تو یہ طریقہ بدعت ہو جائے گا، بلکہ اس کے جائز ہونے کی شرط یہی ہے کہ اس کے بارے میں یہ تصور رکھا جائے کہ یہ طریقہ مبتدی کو صرف علاج کے طور پر بتایا جاتا ہے، تا کہ اس کا دل ذکر میں لگ جائے اور خیالات میں یکسوئی پیدا ہو جائے۔

''ضرب'' لگا کر ذکر کرنے پر اعتراض

آج کل لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، چنانچہ بعض لوگ ضرب لگا کر ذکر کرنے کو بدعت کہتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ سے یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح ضرب لگا کر ذکر فرمایا ہو اور نہ کسی صحابی سے ضرب لگا کر ذکر کرنا ثابت ہے، اور جب ایسا ذکر ثابت نہیں ہے اور تم لوگ ایسا ذکر کر رہے ہو، لہٰذا یہ ذکر بدعت ہے۔

پھر جوشاندہ پینا بدعت ہوگا

چنانچہ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کے تمام مشائخ بدعتی ہیں (معاذ اللہ) اس لئے کہ یہ مشائخ ضرب لگا کر ذکر کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اور اس طرح ذکر کرنا حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت نہیں۔ میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ جب تمہیں نزلہ زکام ہوتا ہے تو تم ''جوشاندہ'' پیتے ہو؟ کہنے لگے کہ ہاں پیتا ہوں، میں نے پوچھا کہ کیا حضورِ اقدس ﷺ سے جوشاندہ پینا ثابت ہے؟ یا حضورِ اقدس ﷺ نے کبھی جوشاندہ پیا؟ یا کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے جوشاندہ پینا ثابت ہے؟ کہنے لگے کہ جوشاندہ پینا تو ثابت نہیں، میں نے کہا کہ جب ثابت نہیں تو آپ کا جوشاندہ پینا بدعت ہوگیا، اس لئے کہ آپ کا دعویٰ اس کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتا کہ یوں کہا جائے کہ جو چیز حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت نہ ہو وہ بدعت ہے، تو چونکہ جوشاندہ پینا بھی ثابت نہیں، لہٰذا یہ بھی بدعت ہے۔

درحقیقت صحیح بات یہ ہے کہ ذکر کرنے کے یہ سارے طریقے، علاج ہیں، یعنی جس شخص کا ذکر میں دل نہیں لگتا اور ذکر میں اس کی طبیعت مائل نہیں ہوتی، تو اس کے علاج کے لئے یہ طریقہ بتایا گیا کہ تم اس طریقے سے ذکر کرلو، تاکہ ذکر میں تمہارا دل لگ جائے، گویا کہ جوشاندہ پلایا جارہا ہے۔

یہ طریقے بدعت ہوجائیں گے

ہاں! اگر کوئی شخص ذکر کے کسی خاص طریقے کے بارے میں یہ کہہ دے کہ یہ طریقہ سنت ہے، یا یہ طریقہ مستحب ہے، یا یہ طریقہ زیادہ افضل ہے تو پھر وہ طریقہ بدعت ہوجائے گا، کیونکہ افضلیت کا مدار، استحباب کا مدار، اور سنیت کا مدار حضورِ اقدس ﷺ سے ثبوت پر ہے، جو چیز حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت نہیں، وہ سنت نہیں ہوسکتی، وہ افضل نہیں ہوسکتی، البتہ نافع ہوسکتی ہے۔

افضل طریقہ صرف سنت کا طریقہ ہے

یعنی جو چیز حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت نہیں، وہ ''نافع'' ہوسکتی ہے، اور ''انفع'' بھی ہوسکتی ہے، لیکن جو چیز حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت نہیں وہ ''افضل'' نہیں ہوسکتی، ہمارے بزرگوں نے افراط اور تفریط سے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ اس لئے ذکر کے ان خاص طریقوں کے بارے میں نہ تو یہ کہا کہ یہ بدعت ہیں، ان کو اختیار نہ کرو، اور نہ یہ کہا کہ یہ طریقہ ''افضل'' ہے۔

ذکر خفی افضل ہے

یاد رکھئے! ذکر کے اندر افضل طریقہ ہمیشہ ہر حالت میں قیامِ قیامت تک ذکر خفی ہے، اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، ذکر جتنا آہستہ آواز سے ہوگا اتنا ہی افضل ہوگا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ (۱)

''اپنے رب کو عاجزی سے اور چپکے چپکے پکارو''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ﴾ (۲)

''اپنے رب کو اپنے دل میں پکارو، عاجزی کے ساتھ اور ڈرتے ہوئے، اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ''

اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ زور سے ذکر کرنا پسندیدہ نہیں، پسندیدہ ذکر وہ ہے جو آہستہ آواز کے ساتھ ہو۔

ذکر جہری جائز ہے افضل نہیں

یہ اصول ہمیشہ کا ہے، ابدی ہے اور قیامِ قیامت تک کبھی نہیں ٹوٹ سکتا کہ افضل ذکر ''ذکر خفی'' ہے، ذکر جتنا آہستہ کیا جائے گا اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا، البتہ ''ذکر جہری'' جائز ہے، ناجائز نہیں۔ لہٰذا ''ذکر جہری'' کبھی ''ذکر خفی'' سے افضل نہیں ہوسکتا، البتہ علاج کے طور پر ذکر جہری کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ذکر جہری کو افضل سمجھنے لگے یا کوئی شخص ذکر جہری کو مقصود سمجھ لے، یا ذکر جہری کو مسنون سمجھ لے، یا ذکر جہری نہ کرنے والے پر نکیر کرنے لگے، تو پھر یہی چیز بدعت بن جاتی ہے، اسی کا نام بدعت ہے۔ اس راستے میں اسی افراط اور تفریط سے بچ کر گزرنا ہے، اس لئے ہمارے اس آخری دور کے بزرگ ذکر جہری کی زیادہ ہمت افزائی نہیں کرتے بلکہ ذکر خفی کی تلقین فرماتے ہیں۔

یہ احداث فی الدین اور بدعت ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جب کام آگے بڑھتا ہے تو اپنی حد پر نہیں رہتا، اب ذکر کے مندرجہ بالا طریقے صوفیاء کرام نے بطور علاج بتائے تھے، لیکن رفتہ رفتہ یہ طریقے خود مقصود بن گئے، اب ہر سلسلہ

---

(۱) الاعراف: ۵۵ (۲) الاعراف: ۲۰۵

والوں نے اپنے لئے ذکر کا ایک طریقہ مقرر کرلیا ہے کہ فلاں سلسلے میں ''پاس انفاس'' کے طریقے سے ذکر ہوتا ہے اور فلاں سلسلے میں ''سلطان الاذکار'' ہوتا ہے، اور فلاں سلسلے میں فلاں طریقے سے ذکر ہوتا ہے، یہ اس سلسلے کی خصوصیات بن گئیں، اب اس سلسلے سے وابستہ لوگ باہر کے لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ آپ جس طریقے سے ذکر کرتے ہیں وہ طریقہ صحیح نہیں یا افضل نہیں، صحیح اور افضل طریقہ وہ ہے جو ہمارے شیخ نے بتایا ہے۔ اس طرح سے جو چیز مقصود نہیں تھی وہ مقصود قرار پاگئی، اسی کا نام ''احداث فی الدین'' ہے، اسی کا نام ''بدعت'' ہے، اس کی جڑ کاٹنی ہے۔

ذکر میں ضرب لگانا مقصود نہیں

چنانچہ حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''طریقِ خاص سے ضرب نہ مقصود ہے اور نہ موقوف علیہ مقصود، جس طرح بے تکلف بن جائے کافی ہے''(۱)

یعنی ضرب لگا کر ذکر کرنے کا جو طریقہ ہے، یہ نہ تو خود مقصود ہے اور نہ ہی ذکر کا جو مقصود ہے وہ اس ضرب پر موقوف ہے کہ اس ضرب کے بغیر وہ مقصود حاصل نہ ہوتا ہو، بلکہ ضرب کے بغیر بھی مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ ارے مقصود تو ان کا ذکر ہے اور ان کا نام لینا ہے جس طرح بھی بن پڑے، چاہے ضرب سے ہو یا بغیر ضرب کے ہو، لہٰذا ان قیود میں زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں۔

اصل مقصود ان کا نام لینا ہے

ایک صاحب میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور کہا کہ حضرت! تسبیحات تو پڑھتا ہوں، لیکن دوازدہ تسبیح نہیں ہو پاتیں، اس کو اس خاص طریقے سے پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔ حضرت نے ان صاحب سے پوچھا کہ طریقہ مقصود ہے یا ذکر مقصود ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت! اصل مقصد تو ذکر ہے، طریقہ مقصود نہیں، آپ نے فرمایا کہ تم دوازدہ تسبیح خاص طریقے کے بغیر پڑھا کرو۔ پھر فرمایا کہ میں بعض اوقات خاص طریقہ کے بغیر دوازدہ تسبیح پڑھ لیتا ہوں جو اطمینان سے ۱۵ منٹ میں پوری ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اگر خاص طریقے سے ضرب لگا کر پڑھا جائے تو اس کے لئے چالیس منٹ چاہئیں۔ بہرحال! ضرب لگا کر ذکر کرنا نہ تو مقصود ہے نہ مسنون ہے، اگر موقع ہو تو کرلو ورنہ سیدھے سادھے طریقے سے جس طرح بن پڑے ذکر کرلو اور اللہ کا نام لو، اس لئے اصل مقصود تو ان کا نام لینا ہے۔

---

(۱) انفاس عیسیٰ، ص:۶۳

ایک قوم ان طریقوں کو بدعت کہتی ہے

یہ تفصیل اس لئے عرض کردی کہ ہمارے دور میں افراط وتفریط چل رہی ہے، ایک قوم وہ ہے جو صوفیاء کرام کے ان طریقوں کو علی الاطلاق بدعت کہتی ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ تصوف بھی بدعت ہے اور یہ خانقاہیں بھی بدعت ہیں اور یہ چلہ کشی بھی بدعت ہے اور ذکر کرنے کے یہ خاص طریقے بھی بدعت ہیں۔

دوسری انتہا

دوسری طرف ایک گروہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جس نے ذکر کے ان خاص طریقوں کو ہی مقصود بالذات بنادیا، چنانچہ یہ جاہل پیر اپنی خانقاہیں بھی کھول کر بیٹھ گئے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ جس نے ''پاس انفاس'' کے طریقے سے ذکر نہیں کیا وہ تصوف کے حروف ابجد سے بھی واقف نہیں، گویا کہ ''پاس انفاس'' ہی مقصود بالذات ہے۔ یہ دوسری انتہا ہے۔

ہمارے بزرگوں نے تو اللہ کے فضل وکرم سے ہمیں اعتدال کا راستہ دکھادیا اور اس پر ہمیں چلادیا، اس اعتدال کے راستے میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط ہے۔ اور یہ بتادیا کہ یہ راستہ جائز ہے لیکن بذاتِ خود مقصود نہیں، اس پر عمل کرو۔

فکر سے اُنس ہوجانا ذکر ہی کی برکت ہے

ایک شخص نے حضرت والا کو اپنا حال لکھا:

''دل چاہتا ہے کہ ذکر چھوڑ دوں اور بیٹھ کر سوچتا رہوں، اور ذکر میں طبیعت کم لگتی ہے''

حضرت والا نے جواب میں لکھا:

''یہ جو لکھا ہے کہ ذکر چھوڑ دوں اور بیٹھ کر سوچتا رہوں، سو یہ برکت ذکر ہی کی ہے کہ ''فکر'' سے اُنس ہوگیا، ذکر کو ہرگز نہ چھوڑنا ورنہ بناء کے انہدام سے مبنیٰ کا انہدام ہوجائے گا، خواہ دل لگے یا نہ لگے، معمولات پر استقامت رکھیں''(۱)

فکر ذکر کا نتیجہ ہے

''ذکر'' ہی کا ایک نتیجہ ''فکر'' ہے، جیسے قرآن کریم میں فرمایا:

---

(۱) انفاس عیسیٰ، ص:۶۳

﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾(۱)

وہ لوگ جو کھڑے اور بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹنے کی حالت میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اور آسمان وزمین کے پیدا کرنے میں فکر کرتے رہتے ہیں۔ اس آیت میں نیک لوگوں کی ایک صفت ''ذکر'' بیان فرمائی اور دوسری صفت ''فکر'' بیان فرمائی، جس سے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ''ذکر'' کے ساتھ ساتھ فکر بھی ہونی چاہئے، ذکر کا لازمی نتیجہ ''فکر'' ہونی چاہئے، یعنی کثرتِ ذکر کے نتیجے میں انسان اللہ جل شانہ کی عظمت، اس کی قدرت، اس کے جلال اور اس کی محبت کے خیالات میں گم ہوجاتا ہے، اسی کا نام ''فکر'' ہے، یہ ''فکر'' ذکر کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتا ہے۔

حضرت والا نے فرمایا کہ تمہیں جو یہ خیال آرہا ہے کہ ذکر چھوڑ دوں اور بیٹھ کر سوچتا رہوں، یہ بھی درحقیقت ذکر ہی کی برکت ہے کہ اس ذکر کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کی عظمت کا، اس کے جلال کا، اس کی قدرت کا اور اس کی محبت کا جو خیال دل میں پیدا ہوگیا، یہ ذکر ہی کا ثمرہ ہے، لیکن چونکہ یہ برکت ذکر ہی کی ہے، اس لئے ذکر کو ہرگز نہ چھوڑنا، ورنہ بناء یعنی بنیاد کے انہدام سے مبنیٰ کا یعنی اس بنیاد پر قائم عمارت کا انہدام ہوجائے گا۔

ذکر مت چھوڑنا

یعنی دل میں یہ جو خیال آرہا ہے کہ دن رات بیٹھے بیٹھے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور جلال اور محبت کو سوچتا رہوں اور یہ حالت ہوجائے کہ۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

یہ کیفیت بڑی اچھی ہے، لیکن یہ کیفیت ''ذکر'' ہی کی برکت سے حاصل ہوئی ہے، اب اگر تم نے ذکر چھوڑ دیا تو رفتہ رفتہ ''فکر'' کی یہ کیفیت بھی ختم ہوجائے گی۔ لہٰذا یہ مت سوچنا کہ میں چونکہ ''فکر'' کی کیفیت تک پہنچ گیا ہوں، اس لئے اب ذکر کی ضرورت نہیں، اس کو چھوڑ دوں

ذکر قلبی کے باوجود ذکر لسانی نہ چھوڑے

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ''ذکر'' سے مراد ''ذکر لسانی'' ہے اور ''فکر'' سے مراد ''ذکر قلبی'' ہے، جب انسان اللہ جل جلالہ کی قدرت، اس کی عظمتِ شان اور اس کے جلال میں گم ہوتا

---

(۱) آل عمران: ۱۹۱

ہے تو اسی کا نام ذکر قلبی ہے، گویا کہ دل سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ جب ذکر لسانی کرتے کرتے دل میں اللہ تعالیٰ کا خیال جم گیا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت، عظمت اور محبت کا خیال دل میں جم گیا تو مقصود حاصل ہو گیا، اور مقصود کے حاصل کرنے کا جو زینہ اور ذریعہ تھا یعنی ذکر لسانی، اب اس کی ضرورت نہ رہی، لہٰذا انہوں نے ذکر لسانی چھوڑ دیا۔ یاد رکھئے! یہ شیطان کا دھوکہ ہے، کیونکہ جب ذکر لسانی چھوڑ دیا تو رفتہ رفتہ ذکر قلبی بھی چھوٹ جائے گا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت والا نے فرمایا کہ "بناء کے انہدام سے مبنیٰ کا انہدام ہو جائے گا۔"

جاہل پیروں کا یہ خیال گمراہی ہے

چنانچہ جاہل پیروں کا ایک طبقہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہم تو اب درویش اور فقیر ہو گئے ہیں اور اب تو ہم ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں گم ہیں، لہٰذا اب ہمیں نہ نماز کی ضرورت، نہ روزے کی ضرورت، نہ تلاوت کی ضرورت، نہ تسبیحات کی ضرورت۔ اس لئے کہ نماز کا مقصود تو "وصول الی اللہ" تھا، یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچ جانا، اب جب ہمارے دل میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اللہ تعالیٰ کا خیال جم گیا، تو اب ہمیں نماز کی ضرورت نہیں، اب ہم مسجد جائیں یا نہ جائیں، نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یاد رکھئے! یہ گمراہی ہے، اور یہ گمراہی یہاں سے پیدا ہوئی کہ "ذکر قلبی" کو اس درجہ کا مقصود قرار دیدیا کہ اس کے نتیجے میں ظاہری عبادات کو بیکار سمجھا جانے لگا، یہی گمراہی ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ سے بارہا سنا، انہوں نے یہ واقعہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا تھا، وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، اس دوران کمرے میں ایک زبردست قسم کا نور چمکا، اور اس نور نے حضرت کو اور آس پاس کی تمام اشیاء اور پورے کمرے کو اپنے گھیرے میں لے لیا، اور اس نور میں سے آواز آئی کہ اے عبدالقادر! تو ہمارے ساتھ تعلق کے اس مقام تک پہنچ گیا کہ اب تیرے ذمے نہ نماز فرض ہے اور نہ روزہ فرض ہے، اب تو جو چاہے کر، اب تو ہمارے قرب کے مقام تک پہنچ گیا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ مردود دور ہو جا، ہمارے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قرب کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے باوجود ان سے تو نماز ساقط نہیں ہوئی، مجھ سے کیسے ساقط ہو جائے گی؟ اس سے پتہ چلا کہ تو شیطان ہے اور مجھے بہکانے آیا ہے۔ بس یہ کہنا تھا کہ وہ نور غائب ہو گیا۔

اس کے بعد دوسرا نور ظاہر ہوا، اس میں سے آواز آئی: اے عبدالقادر! آج تجھے تیرے علم نے بچالیا، ورنہ یہ وہ داؤ ہے جس کے ذریعہ میں نے بڑے بڑے صوفیاء کو شکست دیدی اور ان کو گمراہ کردیا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مردود! دور ہوجا، مجھے میرے علم نے نہیں بچایا بلکہ مجھے میرے اللہ نے بچایا ہے، مجھے پھر دھوکہ دیتا ہے۔ یہ دوسرا داؤ پہلے داؤ سے زیادہ خطرناک اور نازک تھا، اس لئے کہ اس کے ذریعہ ان کو اپنے علم پر ناز میں مبتلا کرنا مقصود تھا، لیکن آپ اس داؤ سے بچ گئے، اور آپ نے فرمایا کہ مجھے اللہ کے فضل وکرم نے بچایا ہے۔

ذکر لسانی کو جاری رکھنا چاہئے

بہرحال! یہ بات کہ چونکہ ذکر قلبی ہمارے دل ودماغ میں پیوست ہوچکا ہے، لہٰذا اب ذکر لسانی سے مستغنی ہوگئے، اب ہم نماز سے مستغنی ہوگئے، یہ سب گمراہی ہے۔ اسی لئے حضرت والا نے فرمایا کہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ ہر وقت دل میں فکر رہنے لگی، اللہ جل شانہ کی طرف دھیان رہنے لگا، جس کو صوفیاء کرام "تعلق مع اللہ" اور "نسبت" اور "ملکہ یادداشت" سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن یہ سب چیزیں ذکر لسانی کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہیں، اس لئے یہ نہ ہو کہ اب ذکر لسانی چھوڑ بیٹھو، بلکہ ذکر لسانی کو ہرگز مت چھوڑنا، ورنہ بناء کے انہدام سے مبنیٰ کا انہدام ہوجائے گا، خواہ دل لگے یا نہ لگے، لیکن پھر بھی زبردستی بیٹھ کر ذکر کرتے رہو اور معمولات پر استقامت رکھو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

❀❀❀

ذکر الٰہی کے چند آداب ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ. وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ. اَمَّا بَعْدُ!

باوضو ذکر کرنا

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''باوضو ذکر کرنے سے برکت زیادہ ضرور ہوتی ہے لیکن وضو رکھنا ضروری نہیں، اس لئے کہ اگر کسی کا وضو نہ ٹھیرتا ہو اور بار بار وضو کرنے سے تکلیف ہو تو تیمم کر لیا کرے، مگر اس تیمم سے نماز و مسِ مصحف جائز نہیں''(۱)

اس ملفوظ میں کئی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ مسئلہ یہ ہے کہ بغیر وضو کے ذکر کرنا جائز ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کے لئے کوئی شرط اور کوئی قید نہیں لگائی، اس کو اتنا آسان کر دیا کہ انسان جب بھی اور جس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کا نام لینا چاہے تو اس کو نام لینے کی اجازت ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی اجازت ہی نہ ہوتی، وضو کر کے کیا، اگر اپنے منہ کو مشک و عنبر سے بھی دھو لیتے تب بھی اجازت نہ ہوتی۔

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی ست

''اگر میں ہزار بار بھی اپنے منہ کو مشک و گلاب سے دھولوں، پھر بھی آپ کا نام لینا بے ادبی اور گستاخی ہے''

اصل بات تو یہ ہے، لیکن ان کا کرم یہ ہے کہ نام لینے کی نہ صرف اجازت دیدی بلکہ اس کے ساتھ کوئی قید و شرط بھی نہیں لگائی، نہ مسجد میں آنے کی قید، نہ مصلے پر بیٹھنے کی قید، نہ وضو کرنا ضروری، نہ غسل کرنا ضروری، حتیٰ کہ اگر انسان ناپاکی کی حالت میں ہے یا کوئی عورت حیض و نفاس کی حالت میں

☆ اصلاحی مجالس (۳/۱۱۶ تا ۱۳۰) بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، دارالعلوم کراچی

(۱) انفاس عیسیٰ، ص: ۶۴

ہے تو اگرچہ نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے کی اس حالت میں اجازت نہیں ہے لیکن ذکر کی اس حالت میں بھی اجازت ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ﴾ (۱)

"کھڑے ہونے کی حالت میں، بیٹھنے کی حالت میں، اور بستر پر لیٹے ہونے کی حالت میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں"

تم کھڑے ہو یا لیٹے ہو یا بیٹھے ہو، جس حالت میں بھی ہو، ہمیں پکارلو، اتنا آسان فرمادیا۔

لہٰذا ذکر کے لئے وضو کرنا کوئی شرط تو نہیں لیکن محبت کا تقاضا تو ہے، جب انسان اس ذات کا ذکر کرے تو باوضو ہو کر کرے، اس لئے کہ باوضو ہو کر ذکر کرنے میں برکت زیادہ ہوگی، اس میں انوار زیادہ ہوں گے، اس کا فائدہ زیادہ ہوگا، اس لئے حتی الامکان وضو کر کے ذکر کرے۔

ذکر کے لئے تیمم بھی کر سکتے ہیں

ہاں البتہ اگر کوئی عذر ہے اور اس عذر کی وجہ سے وضو نہیں ٹھیرتا، تو ایسے شخص کے لئے حضرت فرماتے ہیں کہ وضو نہ ٹھیرنے کی وجہ سے ذکر کو نہ چھوڑے بلکہ ذکر کرتا رہے، البتہ چونکہ باوضو ذکر کرنے سے انوار و برکات زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے جب وضو ٹوٹ جائے دوبارہ کرلے، پھر ٹوٹ جائے تو پھر وضو کرلے، اور اگر بار بار وضو کرنے میں تکلیف ہوتی ہو تو ذکر کرنے کے لئے تیمم کرلے، لیکن ایسے تیمم سے نماز پڑھنا اور قرآن شریف چھونا جائز نہیں ہوگا۔

کن اعمال میں تیمم کرنا جائز ہے

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ اعمال جن کو بلا وضو ادا کرنا جائز ہے، لیکن ادب کے خیال سے وہ اعمال وضو کے ساتھ کیے جاتے ہیں، ان اعمال میں اگر انسان کسی وجہ سے بجائے وضو کے تیمم کرلے تو انشاء اللہ وضو کے بجائے تیمم بھی کافی ہو جائے گا۔ مثلاً آپ درسی کتاب کا سبق پڑھتے ہیں تو قرآن کریم کے علاوہ دوسری کتاب کا سبق بلا وضو پڑھنا اصلاً جائز ہے اور ان کتابوں کو چھونا بھی جائز ہے، لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ تمام درسی کتابوں کا سبق بھی وضو کے ساتھ پڑھے، اور اگر کسی وقت وضو کا موقع نہیں ہے تو اس کے لئے تیمم کرلے تو یہ تیمم بھی انشاء اللہ کافی ہو جائے گا۔ البتہ اگر کوئی یہ چاہے کہ میں اس تیمم سے نماز پڑھ لوں، تو یاد رکھئے کہ اس تیمم سے نماز نہیں ہوگی۔ یہی معاملہ ذکر کا ہے کہ اگر بار بار وضو ٹوٹ رہا ہے اور وضو کرنے میں تکلیف ہو رہی ہے تو ذکر کرنے کے لئے تیمم

(۱) آل عمران: ۱۹۱

کر لے، اس لئے کہ بار بار تیمم کرنے میں کوئی مشقت نہیں ہے، البتہ اس تیمم سے نماز پڑھنا اور قرآن شریف چھونا جائز نہیں ہوگا۔

نماز سے جی چرانے کا علاج

ایک شخص نے حضرت والا کو لکھا:

''نماز پڑھنے میں جی بہت جان چراتا ہے''

یعنی دل نہیں مانتا اور دل نماز پڑھنا نہیں چاہتا۔ جواب میں حضرت والا نے لکھا:

''اس کا تو کچھ حرج نہیں مگر جی چرانے پر عمل نہ کیا جائے، نفس کی مخالفت کر کے نماز کو اہتمام سے پڑھا جائے اور کچھ نوافل بھی معمول کر لیا جائے۔ جتنے میں کسی ضروری کام کا حرج نہ ہو''(۱)

یعنی جی چرانے میں تو کوئی حرج نہیں، وہ تو اسی کام کے لئے ہے کہ ہر اچھے عمل سے جان چرائے، اور غلط کاموں کی طرف انسان کو مائل کرے، اس لئے اس میں تو کچھ حرج نہیں، باقی اس کے جی چرانے پر عمل نہ کیا جائے، بلکہ نفس کی مخالفت کر کے نماز کو اہتمام سے پڑھے، جی لگنے کی زیادہ فکر میں نہ پڑے۔

ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ کا تصور کرے

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا:

''تسبیح کے وقت اَولیٰ تو تصور مذکور کا ہے یعنی حق تعالیٰ شانہ کا، لیکن اگر یہ خیال نہ جمے تو پھر ذکر کرے اس طرح سے کہ یہ قلب سے ادا ہو رہا ہے''(۲)

اس ملفوظ میں ذکر کا طریقہ بیان فرمایا کہ جب انسان ذکر کرے تو اصل تو یہ ہے کہ ذکر کے وقت اس ذات کا تصور کرے جس کا ذکر کر رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا، جیسا کہ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ))(۳)

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص:۶۴ (۲) انفاسِ عیسیٰ، ص:۶۴

(۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل النبی الخ، رقم: ٤٨، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان والاسلام والاحسان، رقم: ٩، سنن الترمذی، کتاب الایمان، باب ما جاء فی وصف جبریل الخ، رقم: ٢٥٣٥، سنن النسائی، کتاب الایمان وشرائعه، باب نعت الاسلام، رقم: ٤٩٠٤، سنن أبی داؤد، کتاب السنة، باب فی القدر، رقم: ٤٠٧٥

یعنی اس طرح ذکر کرے گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، اور اگر یہ تصور نہ آسکے تو کم از کم یہ تصور جمائے کہ وہ ذات جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ ذات مجھے دیکھ رہی ہے۔

تو اصل یہ ہے کہ جس کا ذکر ہو رہا ہے یعنی اللہ جل شانہ، اس کا تصور جمائے، جب ''اللہ، اللہ'' کہہ رہے ہو تو اس وقت ذہن اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، جب ''سبحان اللہ'' کہہ رہے ہو تو توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، جب ''الحمد للہ'' کہہ رہے ہو تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تصور ہو۔

ابتداءً ذکر کے الفاظ کا تصور بھی کر سکتے ہیں

لیکن ابتداء میں ہم جیسے مبتدیوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ تصور جمانا بسا اوقات مشکل ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا تصور کیسے جم سکتا ہے جب کہ وہ ذات "لَا یُحَدُّ وَلَا یُتَصَوَّرُ" ہے، وہ ذات تو تصور میں آہی نہیں سکتی، اس لئے شروع شروع میں ذکر کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اور اس کی قدرت کا اور اس کی عظمت کا تصور بھی نہیں جمتا۔

اس لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ شروع میں مبتدی کو چاہئے کہ وہ ''ذکر'' ہی کا تصور کرے، یعنی جو الفاظ زبان سے نکال رہا ہے، ان الفاظ کی طرف دھیان لگائے۔ مثلاً جب وہ ''اللہ اللہ، سبحان اللہ سبحان اللہ'' زبان سے نکال رہا ہے تو اس کو یہ پتہ ہو کہ میں یہ الفاظ زبان سے نکال رہا ہوں۔ جب ابتداء میں وہ ''ذکر'' کے الفاظ کا تصور قائم کرے گا تو رفتہ رفتہ بالآخر انشاء اللہ ''مذکور'' یعنی اللہ تعالیٰ کا تصور بھی قائم ہو جائے گا۔

ذکر کے وقت دوسرے تصورات

بعض صوفیاء کرام نے بعض اذکار کے ساتھ علیحدہ علیحدہ تصورات قائم فرمائے ہیں، جیسے دوازدہ تسبیح میں بزرگوں سے منقول ہے کہ ''اِلا اللہ'' کی چار تسبیحات اس طرح پڑھے کہ پہلی تسبیح میں "لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہ" کا تصور کرے، اور دوسری تسبیح میں "لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ" کا تصور کرے۔ تیسری تسبیح میں "لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ" کا تصور کرے، اور چوتھی تسبیح میں "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ" کا تصور کرے۔

لیکن ان کے بارے میں ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی کرلے تو ٹھیک ہے، لیکن ان تصورات کا زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں، ان تصورات کے بغیر بھی تسبیح پڑھ لی جائے تب بھی کافی ہے، اصل مقصود یہ ہے کہ جب انسان ذکر کرے تو ذرا دھیان سے ذکر کرے، اس سے انشاء اللہ رفتہ رفتہ مقصود حاصل ہو جائے گا۔

ذکر میں لذت نہ آنا زیادہ نافع ہے

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''ذکر میں لطف و لذت کا حاصل ہونا ایک نعمت ہے، اور نہ ہونا دوسری نعمت ہے، جس کا نام ''مجاہدہ'' ہے، یہ دوسری نعمت ''انفع'' ہے گو ''الذ'' نہ ہو''(۱)

یعنی اگر ذکر کے دوران آدمی کو لذت حاصل ہو رہی ہے تو یہ نعمت ہے، اگرچہ مقصود نہیں ہے، اور اگر لذت حاصل نہیں ہو رہی ہے تو یہ دوسری نعمت ہے، اس کا نام ''مجاہدہ'' ہے، یہ بھی ایک نعمت ہے، بلکہ یہ نعمت زیادہ نافع ہے، اس لئے کہ جب مزہ نہیں آرہا ہے اور اس کے باوجود ذکر کر رہا ہے، تو اس کے نتیجے میں وہ مشقت اُٹھا رہا ہے، اس لئے اس کو ذکر کا ثواب الگ مل رہا ہے اور ''مجاہدہ'' کا فائدہ الگ ہو رہا ہے، کیونکہ نفس کے تقاضے کے خلاف کوئی کام کرنا ''مجاہدہ'' ہے، اور نفس کے تقاضے کے خلاف کام کرنے کی عادت ڈالنے سے انسان کو اپنے نفس پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا جب مزے کے بغیر ذکر کرنے میں یہ تین فائدے ہیں تو یہ ذکر زیادہ نافع ہے، لہٰذا ایسے ذکر کو بیکار نہیں سمجھنا چاہئے، ذکر میں مزہ اور لطف آئے تو نعمت، نہ آئے تو نعمت۔

ذکر کے فوائد دو چیزوں پر موقوف ہیں

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''ذکر کا اثر موقوف ہے تقلیلِ کلام، تقلیلِ اختلاط مع الانام و قلتِ التفات الی المتعلقات پر۔ ان چیزوں کے حصول کے لئے مواعظ کا مطالعہ اور مثنوی کا مطالعہ (گو سمجھ میں نہ آئے) کرنا چاہئے''(۲)

حضرت فرما رہے ہیں کہ ''ذکر'' کے جو فوائد اور ثمرات بزرگ بتاتے ہیں، وہ اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب انسان ''ذکر'' کے ساتھ ساتھ دو کام اور کرے، ایک تقلیلِ کلام، یعنی گفتگو کم کرے اور فضول باتوں سے اجتناب کرے، ضرورت کے مطابق بولے، زیادہ نہ بولے۔ اور بعض مرتبہ اسی سے نفس کی آزادروش کا علاج ہو جاتا ہے۔

بولنے پر پابندی کے ذریعہ ایک صاحب کا علاج

مجھے یاد ہے کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، جو بہت

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص:۶۵ (۲) انفاسِ عیسیٰ، ص:۶۵

بولتے تھے، جب باتیں شروع کردیں تو اب رکنے کا نام نہیں ہے، ایک سوال کے بعد دوسرا سوال کرلیا، پھر تیسرا سوال کرلیا، مسلسل بولتے رہتے تھے۔ حضرت والد صاحب چونکہ بہت متواضع اور مسکین آدمی تھے، اسلئے بہت زیادہ روک ٹوک نہیں کرتے تھے، چنانچہ ان صاحب کی باتوں کو برداشت کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ان صاحب نے حضرت والد صاحب سے بیعت اور اصلاحی تعلق قائم کرنے کی درخواست کردی کہ حضرت! میرا دل چاہتا ہے کہ آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرلوں اور آپ سے بیعت ہوجاؤں، اور آپ مجھے کچھ ذکر اور نوافل بتادیا کریں۔ حضرت والد صاحب نے ان سے فرمایا کہ اگر تم تعلق قائم کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے، لیکن تمہارے لئے نفل اور ذکر وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ پھر میں کیا کروں؟ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنی زبان پر تالہ ڈال لو، یہ تمہاری زبان جو ہر وقت قینچی کی طرح چلتی رہتی ہے، اس کو بند کرو، اور ضرورت کے مطابق بات کرو، ضرورت سے زائد ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالو، یہی تمہارا علاج ہے، یہی تمہارا وظیفہ ہے، اور یہی تمہاری تسبیح ہے۔ بس ان صاحب پر یہ پابندی لگنی تھی کہ ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس لئے کہ جو شخص ساری عمر زیادہ بولنے کا عادی رہا ہو، اس پر ایک دم سے بریک لگادیا جائے تو اس کے لئے یہ بڑا سخت مجاہدہ ہوگا۔

چنانچہ اس شخص کے لئے تنہا کم بولنے کا یہی ''مجاہدہ'' کام کرگیا۔ لہٰذا اس راہ میں ''تقلیلِ کلام'' کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ)) (۱)

''انسان کے اسلام کے حسن میں سے ہے کہ وہ لایعنی اور فضول باتوں سے بچے''

بس بوقتِ ضرورت بولے۔

فرمایا کہ جب تک ذکر کے ساتھ ''تقلیلِ کلام'' کی صفت نہیں ہوگی، اس وقت تک دنیا میں ذکر کے فوائد کماحقہ حاصل نہیں ہوں گے، البتہ آخرت کا اجر انشاء اللہ مل جائے گا۔

تعلقات کم کرو

دوسری چیز ہے ''تقلیلِ اختلاط مع الأنام'' یعنی لوگوں سے تعلقات کم کرے۔ لوگوں سے بہت

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب فيمن تكلم بكلمة يضحك بها الناس، رقم: ۲۲٤۰، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب كف اللسان في الفتنة، رقم: ۳۹٦٦، مسند أحمد، رقم: ۱٦٤۲، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب ما جاء في حسن الخلق، رقم: ۱٤۰۲

زیادہ تعلقات بڑھانا، لوگوں کے ساتھ مجلس آرائی کرنا، ہر وقت ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، جو آج کل ایک مستقل فن بن گیا ہے، جس کو ''پبلک ریلیشن'' کہا جاتا ہے، اس فن میں یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگوں سے کس طرح زیادہ سے زیادہ تعلقات بڑھائے جائیں؟ لیکن اصلاحِ اعمال واخلاق کی اس راہ میں لوگوں سے تعلقات بڑھانا مضر ہے، بالخصوص ضبطِ نفس کی مشق کے ابتدائی دور میں۔

ہاں! اگر کسی سے تعلق ہو تو وہ صرف اللہ کے لئے ہو، گھر والوں سے تعلق ہو تو وہ اللہ کے لئے ہو، دوستوں سے تعلق ہو تو وہ اللہ کے لئے ہو، عام مسلمانوں سے تعلق ہو تو وہ اللہ کے لئے ہو، باقی اپنے ذاتی مفاد کے لئے لوگوں سے زیادہ تعلق بڑھانے سے اور ان سے میل جول رکھنے سے ذکر کے فوائد کما حقہ حاصل نہیں ہوتے۔

آنکھ، کان، زبان بند کرلو

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چشم بند و گوش بند و لب ببند گر نہ بینی نورِ حق بر من بخند

یعنی تین کام کرلو، ایک یہ کہ آنکھ کو بند کرلو، کس چیز سے بند کرلو؟ ناجائز جگہ پر نظر پڑنے سے بند کرلو، اور دوسرے یہ کہ کان کو بند کرلو، کس چیز سے؟ ناجائز، حرام اور فضول باتیں سننے سے بند کرلو۔ اور تیسرے یہ کہ ہونٹ یعنی زبان کو بند کرلو، کس چیز سے؟ فضول اور ناجائز باتیں کرنے سے بند کرلو۔ اس کے بعد بھی اگر نورِ حق نظر نہ آئے تو میرے اُوپر ہنس دینا، یعنی ان تین چیزوں کے بند کرنے کے نتیجے میں لازماً نورِ حق نظر آئے گا۔

بہر حال! ذکر کے جو فوائد ہیں، مثلاً نورِ حق کا نظر آنا، یہ اس لئے حاصل نہ ہوا کہ ذکر کے ساتھ جو کام کرنا چاہئے تھا یعنی ''تقلیلِ کلام'' اور ''تقلیلِ اختلاط مع الانام'' وہ نہیں ہوا، اس کے نتیجے میں ذکر کے فوائد بھی حاصل نہ ہوئے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ اگر ذکر کے فوائد حاصل کرنے ہیں تو ذکر کے ساتھ ساتھ ان چیزوں پر بھی عمل کرنا ہوگا۔

تعلقات کی طرف التفات زیادہ نہ ہو

تیسری چیز ہے ''قلۃ التفات الی التعلقات'' یعنی ایک طرف تو لوگوں سے تعلقات ہی کم رکھو، اور اگر کسی سے تعلق ہو بھی تو اس تعلق کی طرف التفات زیادہ نہ ہو، مثلاً یہ نہ سوچے کہ اس کام کو کرنے سے فلاں ناراض ہوجائے گا، یا فلاں راضی ہوجائے گا، اس فکر میں مت پڑو، ارے مخلوق کے راضی ہونے یا ناراض ہونے کی فکر میں مت پڑو، فکر اس کی کرو کہ خالق راضی ہوجائے۔ اگر یہ تین باتیں

حاصل ہو جائیں تو پھر انشاء اللہ ذکر کے فوائد حاصل ہو جائیں گے۔

ان تین چیزوں کو حاصل کرنے کا طریقہ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تین چیزیں، یعنی "تقلیلِ کلام" (کم گوئی) اور "تقلیلِ اختلاط مع الانام" (کم آمیزی) اور "قلۃ التفات الی التعلقات" (تعلقات سے قدرے بے توجہی) یہ سب چیزیں کس طرح حاصل ہوں گی؟ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ بیان فرمایا کہ مواعظ کا مطالعہ کیا جائے اور مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی "مثنوی" کا مطالعہ کیا جائے، ساتھ میں یہ بھی فرمادیا کہ چاہے وہ "مثنوی" سمجھ میں بھی نہ آئے، تب بھی اس کا مطالعہ کیا جائے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بعض بندوں کے کلام میں تاثیر رکھ دیتے ہیں۔

"مثنوی" کلام وہبی ہے

کہا جاتا ہے کہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر و شاعری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ خواجہ شمس الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! آپ نے میرے دل پر جو علوم وارد فرمائے ہیں، اس کے لئے کوئی زبان عطا فرمایئے، چنانچہ اس دعا کے نتیجے میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ان کے مرید ہوئے، اور پھر ان کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے "مثنوی" جاری فرمادی۔ حالانکہ اس سے پہلے کبھی شعر نہیں کہے تھے لیکن شیخ کی دعا کے بعد ان کی زبان پر یہ اشعار جاری ہو گئے اور مثنوی کے دفتر کے دفتر لکھ دیئے، اور جب اللہ تعالیٰ کو منظور نہ ہوا شعر آنا بند ہو گئے، یہاں تک کہ آخر میں انہوں نے ایک حکایت لکھنی شروع کی تھی، وہ حکایت بھی پوری نہیں ہوئی، اور درمیان میں ہی شعر آنا بند ہو گئے، اور اس حکایت کو ادھورا ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر کئی صدیوں کے بعد ہندوستان کے مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے یہ اشعار جاری فرمادیئے۔ چنانچہ اسی جگہ سے آگے انہوں نے اشعار کہنا شروع کیے، اور اس آخری دفتر کو پورا فرمایا، اسی وجہ سے وہ "خاتمِ مثنوی" کہلاتے ہیں۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے اس کلام کو ان کی زبان پر جاری فرمایا تو جاری ہو گیا اور جب بند کیا تو بند ہو گیا۔ بہر حال یہ الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہیں، اس میں ایک خاص برکت اور اثر ہے، یہ تاثیر بھی اللہ تعالیٰ ہی ڈالتے ہیں۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مثنوی کا مطالعہ کرو، چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، کیونکہ اس کو پڑھنا فائدے سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

تبلیغ و دعوت کے اصول ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ٥ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ٥
﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ أُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (۱)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے درجات

اس آیت کا تعلق "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" سے ہے۔ نیک بندوں کا وصف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ لوگ دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ "امر" کے معنی ہیں "حکم دینا" اور "معروف" کے معنی ہیں "نیکی"، "نہی" کے معنی ہیں "روکنا" اور "منکر" کے معنی ہیں "برائی"۔

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ جس طرح ہر مسلمان پر نماز روزہ فرضِ عین ہے، اسی طرح یہ بھی فرضِ عین ہے کہ اگر وہ دوسرے کو کسی برائی میں مبتلا دیکھے تو اپنی استطاعت کے مطابق اس کو روکے اور منع کرے کہ یہ کام گناہ ہے اس کو نہ کرو۔ لوگوں کو اتنی بات تو معلوم ہے کہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" فرضِ عین ہے، لیکن عام طور پر اس کی تفصیل معلوم نہیں کہ یہ کس وقت فرض ہے اور کس وقت فرض نہیں۔ اور معلوم نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ تو اس فریضہ سے ہی بالکل غافل ہیں۔ وہ لوگ اپنی آنکھوں سے اپنے بیوی بچوں کو اور اپنے دوستوں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ حرام کاموں میں مبتلا ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کو روکنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ان کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہے ہیں، لیکن ان کو کہنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اور بعض لوگ اس حکم کو اتنا عام سمجھتے ہیں کہ صبح سے لے کر شام تک انہوں نے دوسروں کو روکنے ٹوکنے کو اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے۔ اس طرح

☆ اصلاحی خطبات (۸/۲۶ تا ۵۳) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) التوبة: ۷۱

اس آیت پر عمل کرنے میں لوگ افراط وتفریط میں مبتلا ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس آیت کا صحیح مطلب معلوم نہیں، اس لئے اس کی تفصیل سمجھنا ضروری ہے۔

دعوت وتبلیغ کے دو طریقے

پہلی بات یہ سمجھ لیں کہ دعوت وتبلیغ کرنے اور دین کی بات دوسروں تک پہنچانے کے دو طریقے ہیں۔

(۱) انفرادی دعوت وتبلیغ (۲) اجتماعی دعوت وتبلیغ

انفرادی دعوت وتبلیغ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اپنی آنکھوں سے دوسرے شخص کو دیکھ رہا ہے کہ وہ فلاں گناہ اور فلاں برائی کے اندر مبتلا ہے، یا وہ شخص فلاں فرض واجب کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہا ہے۔ اب انفرادی طور پر اس شخص کو اس طرف متوجہ کرنا کہ وہ اس برائی کو چھوڑ دے، اور نیکی پر عمل کرے، اس کو انفرادی تبلیغ ودعوت کہتے ہیں۔

دوسری اجتماعی دعوت اور تبلیغ ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ایک بڑے مجمع کے سامنے دین کی بات کہے، ان کے سامنے وعظ وتقریر کرے، یا ان کو درس دے، یا اس بات کا ارادہ کرے کہ میں کسی فوری سبب کے بغیر دوسروں کے پاس جا جا کر ان کو دین کی بات سناؤں گا، اور دین پھیلاؤں گا، جیسے ماشاء اللہ ہمارے تبلیغی جماعت کے حضرات کرتے ہیں کہ لوگوں کے پاس ان کے گھروں پر ان کی دکانوں پر جا کر ان کو دین کی بات پہنچاتے ہیں۔ یہ اجتماعی تبلیغ ہے۔ دعوت وتبلیغ کے ان دونوں طریقوں کے احکام الگ الگ ہیں اور دونوں کے آداب الگ الگ ہیں۔

اجتماعی تبلیغ فرضِ کفایہ ہے

''اجتماعی تبلیغ'' فرضِ عین نہیں ہے، بلکہ فرضِ کفایہ ہے، لہٰذا ہر ہر مسلمان پر فرض نہیں ہے کہ دوسروں کے پاس جا کر وعظ کہے، یا دوسروں کے گھر پر جا کر تبلیغ کرے، کیونکہ یہ فرضِ کفایہ ہے، اور فرضِ کفایہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ وہ کام کر رہے ہوں تو باقی لوگوں سے وہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی شخص بھی انجام نہ دے تو سب گناہگار ہوں گے۔ جیسے نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے، اب ہر شخص کے ذمے ضروری نہیں ہے کہ وہ نمازِ جنازہ میں شامل ہو، اگر شامل ہوگا تو ثواب ملے گا، اور اگر شامل نہیں ہوگا تو گناہ نہیں ہوگا، جب تک کہ کچھ پڑھنے والے لوگ موجود ہوں، لیکن اگر ایک بھی شخص پڑھنے والا نہیں ہوگا تو اس وقت سب مسلمان گناہ گار ہوں گے، اس کو فرضِ کفایہ کہا جاتا ہے، اسی طرح یہ اجتماعی دعوت فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین نہیں ہے۔

انفرادی تبلیغ فرضِ عین ہے

''انفرادی دعوت و تبلیغ'' یہ ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے ایک برائی ہوتی ہوئی دیکھ رہے ہیں، یا ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کوئی شخص کسی فرض کو چھوڑ رہا ہے تو اس وقت اپنی استطاعت کی حد تک اس برائی کو روکنا فرضِ کفایہ نہیں، بلکہ فرضِ عین ہے، اور فرضِ عین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ سوچ کر نہ بیٹھ جائے کہ یہ کام دوسرے لوگ کرلیں گے، یا یہ تو مولویوں کا کام ہے، یا تبلیغی جماعت والوں کے کرنے کا کام ہے، یہ درست نہیں، اس حدیث کی رو سے یہ کام ہر ہر مسلمان کے ذمے فرضِ عین ہے۔ لہٰذا یہ انفرادی دعوت و تبلیغ فرضِ عین ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ عین ہے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بیشمار آیتوں میں نیک بندوں کے بنیادی اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾(۱)

''وہ نیک بندے دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، اور برائی سے لوگوں کو منع کرتے ہیں''

لہٰذا یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان کے ذمے فرضِ عین ہے۔ آج ہم لوگ اس کی فرضیت ہی سے غافل ہیں، اپنی آنکھوں سے اپنی اولاد کو اپنے گھر والوں کو غلط راستے پر جاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اپنے ملنے جلنے والوں کو غلط کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں، لیکن پھر بھی اس برائی پر ان کو متنبہ کرنے کا کوئی جذبہ اور کوئی داعیہ ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ ایک مستقل فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا ہے۔ جس طرح ہر مسلمان پر پانچ وقت کی نماز فرض ہے، جس طرح رمضان کے روزے ہر مسلمان پر فرض ہیں، زکوٰۃ اور حج فرض ہے، بالکل اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرض ہے، اس لئے سب سے پہلے اس کام کی اہمیت کو سمجھنا چاہئے۔ اگر کسی نے ساری عمر نیکیوں میں گزار دی، ایک نماز نہیں چھوڑی، روزہ ایک بھی نہیں چھوڑا، زکوٰۃ اور حج ادا کرتا رہا، اور اپنی طرف سے کسی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب نہیں کیا، لیکن اس شخص نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام بھی انجام نہیں دیا، اور دوسروں کو برائیوں سے بچانے کی فکر بھی نہیں کی، یاد رکھئے، اپنی ذاتی نیکیوں کے باوجود آخرت میں اس شخص کی پکڑ ہو جائے گی کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ برائیاں ہو رہی تھیں، اور ان

---

(۱) التوبة: ۷۱

منکرات کا سیلاب اُمڈ رہا تھا، تم نے اس کو روکنے کا کیا اقدام کیا؟ لہٰذا اپنے آپ کو سدھار لینا کافی نہیں، بلکہ دوسروں کی فکر کرنا بھی ضروری ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کب فرض ہے؟

دوسری بات یہ سمجھ لیجئے کہ عبادات کی دو قسمیں ہیں:

ایک عبادت وہ ہے جو فرض یا واجب ہے، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔

دوسری عبادت وہ ہے جو سنت یا مستحب ہے، جیسے مسواک کرنا، کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا، تین سانس میں پانی پینا وغیرہ، اس میں حضورِ اقدس ﷺ کی تمام سنتیں داخل ہیں۔

اسی طرح برائیوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک برائی وہ ہے جو حرام اور گناہ ہے اور قطعی طور پر شریعت میں ممنوع ہے۔ دوسری برائی وہ ہے جو حرام اور ناجائز نہیں، بلکہ خلافِ سنت ہے۔ یا خلافِ اولیٰ ہے۔ یا ادب کے خلاف ہے۔

اگر کوئی شخص فرائض یا واجبات کو چھوڑ رہا ہو یا حرام اور ناجائز کام کا ارتکاب کر رہا ہو تو وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ عین ہے۔ مثلاً کوئی شخص شراب پی رہا ہے، یا بدکاری کے اندر مبتلا ہے، یا غیبت کر رہا ہے، یا جھوٹ بول رہا ہے، چونکہ یہ سب صریح گناہ ہیں، یہاں نہی عن المنکر فرض ہے۔ یا مثلاً کوئی شخص فرض نماز چھوڑ رہا ہے، یا زکوٰۃ نہیں دے رہا ہے، رمضان کے روزے نہیں رکھ رہا ہے تو اس کو اس کی ادائیگی کے لئے کہنا فرض ہے۔

کس وقت نہی عن المنکر فرض نہیں

اور پھر اس میں بھی تفصیل ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ اس وقت فرض ہوتا ہے جب اس کو بتانے یا اس کو روکنے کے نتیجے میں اس کے مان لینے کا احتمال ہو۔ اور اس کو بتانے کے نتیجے میں بتانے والے کو کوئی تکلیف پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ لہٰذا اگر کوئی شخص گناہ کے اندر مبتلا ہے، اور آپ کو یہ خیال ہے کہ اگر میں اس کو اس گناہ سے روکوں گا تو یقین ہے کہ یہ شخص مانے گا نہیں، بلکہ یہ شخص اُلٹا شریعت کے حکم کا مذاق اُڑائے گا، اور اس کی توہین کرے گا، اور اس توہین کے نتیجے میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں کفر میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لئے کہ شریعت کے کسی حکم کی توہین کرنا صرف گناہ نہیں، بلکہ یہ عمل انسان کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے اور کافر بنا دیتا ہے، لہٰذا اگر اس بات کا غالب گمان ہو کہ اگر میں اس شخص کو اس وقت اس گناہ سے روکوں گا تو یہ شریعت کے حکم کی توہین کرے گا تو ایسی صورت میں اس وقت نہی عن المنکر کا فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایسے موقع پر اس کو اس گناہ سے نہیں روکنا چاہئے، بلکہ اپنے آپ کو

اس گناہ کے کام سے الگ کر لینا چاہئے۔ اور اس شخص کے حق میں دعا کرنا چاہئے کہ یا اللہ! آپ کا یہ بندہ ایک بیماری میں مبتلا ہے، اپنے فضل و کرم سے اس کو اس بیماری سے نکال دیجئے۔

گناہ میں مبتلا شخص کو موقع پر روکنا

ایک شخص پورے ذوق و شوق کے ساتھ کسی گناہ کی طرف متوجہ ہے، اس وقت اس بات کا دور دور تک کوئی احتمال نہیں ہے کہ وہ کسی کی بات سنے گا اور مان لے گا۔ اب عین اس وقت ایک شخص اس کے پاس تبلیغ کے لئے اور امر بالمعروف کے لئے پہنچ گیا، اور یہ نہیں سوچا کہ اس وقت تبلیغ کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ چنانچہ اس نے تبلیغ کی، اس نے سامنے سے شریعت کے اس حکم کا مذاق اُڑا دیا اور اس کے نتیجے میں کفر کے اندر مبتلا ہوگیا۔ اس کے کفر میں مبتلا ہونے کا سبب یہ شخص بنا جس نے جا کر اس کو تبلیغ کی۔ لہٰذا عین اس وقت جب کوئی شخص گناہ کے اندر مبتلا ہو، اس وقت روکنا ٹوکنا بعض اوقات نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس وقت روکنا ٹوکنا ٹھیک نہیں، بلکہ بعد میں مناسب موقع پر اس کو بتا دینا اور سمجھا دینا چاہئے کہ جو عمل تم کر رہے تھے وہ درست نہیں تھا۔

اگر ماننے اور نہ ماننے کے احتمال برابر ہوں

اور اگر دونوں احتمال برابر ہوں یعنی یہ احتمال بھی ہو کہ شاید یہ میری بات سن کر مان لے اور اس گناہ سے باز آجائے، اور یہ احتمال بھی ہو کہ شاید یہ میری بات نہ مانے، تو ایسے موقع میں بات کہہ دینا ضروری ہے۔ اس لئے کہ کیا پتہ کہ تمہارے کہنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں یہ بات اُتار دے اور اس کے نتیجے میں اس کی اصلاح ہو جائے، اور اگر تمہارے کہنے کے نتیجے میں اس کی اصلاح ہوگئی تو پھر اس کی آئندہ ساری عمر کی نیکیاں تمہارے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔

اگر تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو

اور اگر یہ خیال ہے کہ یہ شخص جو گناہ کے اندر مبتلا ہے، اگر میں اس کو روکوں گا تو یہ شخص اگرچہ شریعت کے حکم کی توہین تو نہیں کرے گا، لیکن مجھے تکلیف پہنچائے گا، تو اس صورت میں اپنے آپ کو اس تکلیف سے بچانے کے لئے اس کو گناہ سے نہ روکنا جائز ہے، اور اس وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض نہیں رہے گا۔ البتہ افضل پھر بھی یہ ہے کہ اس سے کہہ دے، اور یہ سوچے کہ اگرچہ مجھے تکلیف پہنچائے گا اور میرے پیچھے پڑ جائے گا، لیکن میں حق بات اس کو کہہ دوں۔ لہٰذا اس وقت بات کہہ دینا افضل ہے، اور جو تکلیف پہنچے اس کو برداشت کرنا چاہئے۔ بہرحال، مندرجہ بالا تین صورتیں یاد

رکھنے کی ہیں ۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس جگہ یہ اندیشہ ہو کہ سامنے والا شخص میری بات سننے اور ماننے کے بجائے شریعت کے حکم کی توہین کرے گا، وہاں امر بالمعروف نہ کرے، بلکہ خاموش رہے ۔ اور جس جگہ دونوں احتمال برابر ہوں کہ شاید میری بات مان لے گا، یا شاید توہین پر اُتر آئے گا، اس جگہ پر بات کہنا ضروری ہے ۔ اور جس جگہ یہ اندیشہ ہو کہ وہ مجھے تکلیف پہنچائے گا تو وہاں شریعت کی بات کہنا ضروری نہیں، البتہ افضل یہ ہے کہ شریعت کی بات کہہ دے اور اس تکلیف کو برداشت کرے ۔ یہ خلاصہ ہے جسے ہر شخص کو یاد رکھنا چاہئے ۔

ٹوکتے وقت نیت درست ہونی چاہئے

پھر شریعت کی بات کہتے وقت ہمیشہ نیت درست رکھنی چاہئے ۔ اور یہ سمجھنا نہیں چاہئے کہ ہم مصلح اور بڑے ہیں ۔ اور ہم دیندار اور متقی ہیں، دوسرا شخص فاسق اور فاجر ہے، اور ہم اس کی اصلاح کے لئے کھڑے ہوئے ہیں، ہم خدائی فوجدار اور داروغہ ہیں ۔ اس لئے کہ اس نیت کے ساتھ اگر شریعت کی بات کہی جائے گی تو اس کا فائدہ نہ سننے والے کو پہنچے گا اور نہ تمہیں فائدہ ہوگا، اس لئے کہ اس نیت کے ساتھ تمہارے دل میں تکبر اور عجب پیدا ہو گیا جس کے نتیجے میں یہ عمل اللہ تعالیٰ کے پاس مقبول نہیں رہا اور تمہارا یہ عمل بیکار اور اکارت ہو گیا اور ساری محنت ضائع ہو گئی ۔ اور سننے والے کے دل میں بھی تمہاری بات کہنے کا اثر نہیں ہوگا ۔ اس لئے روکتے وقت نیت کا درست ہونا ضروری ہے ۔

بات کہنے کا طریقہ درست ہونا چاہئے

اسی طرح جب بھی دوسرے سے شریعت کی بات کہنی ہو تو صحیح طریقے سے بات کہو ۔ پیار و محبت اور خیر خواہی کے ساتھ بات کہو، تاکہ اس کی دل شکنی کم سے کم ہو ۔ اور اس انداز سے بات کہو کہ اس کی سبکی نہ ہو، اور لوگوں کے سامنے اس کی بے عزتی نہ ہو ۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ایک جملہ فرمایا کرتے تھے جو میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کئی بار ہم نے سنا، وہ یہ کہ حق بات حق طریقے اور حق نیت سے جب بھی کہی جائے گی وہ کبھی نقصان دہ نہیں ہوگی، لہٰذا جب بھی تم یہ دیکھو کہ حق بات کہنے کے نتیجے میں کہیں لڑائی جھگڑا ہو گیا یا نقصان ہو گیا یا فساد ہو گیا تو سمجھ لو کہ ان تین باتوں میں سے ضرور کوئی بات ہو گی ۔ یا تو بات حق نہیں تھی اور خواہ مخواہ اس کو حق سمجھ لیا تھا، یا بات تو حق تھی لیکن نیت درست نہیں تھی اور بات کہنے کا مقصد دوسرے کی اصلاح نہیں تھی بلکہ اپنی بڑائی جتانی مقصود تھا، یا دوسرے کو ذلیل کرنا مقصود تھا جس کی وجہ سے بات کے اندر اثر نہیں تھا، یا یہ کہ بات بھی حق تھی، نیت بھی درست تھی لیکن طریقہ حق نہیں تھا، اور بات ایسے طریقے سے کہی جیسے

دوسرے کولٹھ مار دیا۔ کلمۂ حق کوئی لٹھ نہیں ہے کہ اُٹھا کر کسی کو مار دو، بلکہ حق کلمہ کہنا محبت اور خیر خواہی والا کام ہے جو حق طریقے سے انجام پائے گا۔ جب خیر خواہی میں کمی ہو جاتی ہے تو پھر حق بات سے بھی نقصان پہنچ جاتا ہے۔

نرمی سے سمجھانا چاہئے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کوفرعون کی اصلاح کے لئے بھیجا اور فرعون کون تھا؟ خدائی کا دعویدار تھا، جو یہ کہتا تھا:

﴿أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ﴾(۱)

''میں تمہارا بڑا پروردگار ہوں''

گویا کہ وہ فرعون بدترین کافر تھا۔ لیکن جب یہ دونوں پیغمبر فرعون کے پاس جانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ﴾(۲)

''تم دونوں فرعون کے پاس جا کر نرم بات کہنا، شاید کہ وہ نصیحت مان لے یا ڈر جائے''

یہ واقعہ سنانے کے بعد والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آج تم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے مصلح نہیں ہو سکتے، اور تمہارا مقابل فرعون سے بڑا گمراہ نہیں ہو سکتا، چاہے وہ کتنا ہی بڑا فاسق و فاجر اور مشرک ہو، اس لئے کہ وہ تو خدائی کا دعویدار تھا۔ اس کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا جا رہا ہے کہ جب فرعون کے پاس جاؤ تو ذرا نرمی سے بات کرنا۔ سختی سے بات مت کرنا۔ اس کے ذریعہ ہمارے لئے قیامت تک یہ پیغمبرانہ طریقہ کار مقرر فرما دیا کہ جب بھی کسی سے دین کی بات کہیں تو نرمی سے کہیں، سختی سے نہ کہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے کا انداز

ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ نبوی میں تشریف فرما تھے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے۔ اتنے میں ایک دیہاتی شخص مسجدِ نبوی میں داخل ہوا، اور آ کر جلدی جلدی اس نے نماز پڑھی اور نماز کے بعد عجیب و غریب دعا کی:

''اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَمُحَمَّدًا وَّلَا تَرْحَمْ مَعَنَا أَحَدًا''

''اے اللہ! مجھ پر رحم فرما اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما اور ہمارے علاوہ کسی پر رحم نہ فرما''

(۱) النازعات: ۲٤ (۲) طٰہٰ: ٤٤

جب حضورِ اقدس ﷺ نے اس کی یہ دعا سنی تو فرمایا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو بہت تنگ اور محدود کر دیا کہ صرف دو آدمیوں پر رحم فرما، اور کسی پر رحم نہ فرما، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اسی دیہاتی نے مسجد کے صحن میں بیٹھ کر پیشاب کر دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ دیکھا کہ وہ مسجد میں پیشاب کر رہا ہے تو صحابہ کرام جلدی سے اس کی طرف دوڑے، اور قریب تھا کہ اس پر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتے، اتنے میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا تُزْرِمُوْهُ))

''اس کا پیشاب بند مت کرو''

جو کام کرنا تھا، وہ اس نے کر لیا۔ اور پورا پیشاب کرنے دو، اس کو مت ڈانٹو۔ اور فرمایا:

((إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ))

''تمہیں لوگوں کے لئے خیر خواہی کرنے والا اور آسانی کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے، دشواری کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا''

لہٰذا اب جا کر مسجد کو پانی کے ذریعہ صاف کر دو۔ پھر آپ نے اس کو بلا کر سمجھایا کہ یہ مسجد اللہ کا گھر ہے، اس قسم کے کاموں کے لئے نہیں ہے۔ لہٰذا تمہارا یہ عمل درست نہیں، آئندہ ایسا مت کرنا۔(۱)

انبیاء علیہم السلام کا اندازِ تبلیغ

اگر ہمارے سامنے کوئی شخص اس طرح مسجد میں پیشاب کر دے تو شاید ہم لوگ تو اس کی تکہ بوٹی کر دیں۔ لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے دیکھا کہ یہ شخص دیہاتی ہے اور ناواقف ہے، لاعلمی اور ناواقفی کی وجہ سے اس نے یہ حرکت کی ہے، لہٰذا اس کو ڈانٹنے کا یہ موقع نہیں ہے بلکہ نرمی سے سمجھانے کا موقع ہے۔ چنانچہ آپ نے نرمی سے اس کو سمجھا دیا۔ انبیاء علیہم السلام کی یہی تعلیم ہے۔ اگر کوئی مخالف گالی بھی دیتا ہے تو انبیاء علیہم السلام اس کے جواب میں گالی نہیں دیتے۔ قرآن کریم میں مشرکین کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام سے مخاطب ہو کر کہا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب رحمة الناس والبهائم، رقم: ٥٥٥١، سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب ما جاء فی البول یصیب الأرض، رقم: ١٣٧، سنن النسائی، کتاب السهو، باب الکلام فی الصلاة، رقم: ١٢٠١، سنن أبی داؤد، کتاب الطهارة، باب الأرض یصیبها البول، رقم: ٣٢٤، سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب الأرض یصیبها البول کیف تغسل، رقم: ٥٢٣

﴿إِنَّا لَنَرَىٰكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَٰذِبِينَ﴾ (۱)

یعنی ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ بیوقوف ہیں اور ہمارے خیال میں آپ جھوٹے ہیں۔ آج اگر کوئی شخص کسی عالم یا مقرر یا خطیب کو یہ کہہ دے کہ تم بیوقوف اور جھوٹے ہو، تو جواب میں اس کو یہ کہہ دے گا کہ تو بیوقوف، تیرا باپ بیوقوف، لیکن پیغمبر نے جواب میں فرمایا:

﴿يَٰقَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَٰلَمِينَ﴾ (۲)

اے میری قوم، میں بیوقوف نہیں ہوں، بلکہ میں تو رب العالمین کا پیغمبر ہوں۔

دیکھئے! گالی کا جواب گالی سے نہیں دیا جا رہا ہے، بلکہ محبت اور پیار کا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ ایک اور قوم نے اپنے پیغمبر سے کہا:

﴿إِنَّا لَنَرَىٰكَ فِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ﴾ (۳)

تم تو کھلے گمراہ نظر آ رہے ہو۔ جواب میں وہ پیغمبر فرماتے ہیں: اے میری قوم! میں گمراہ نہیں ہوں، بلکہ میں تو اللہ کا رسول ہوں۔

یہ پیغمبروں کی اصلاح و دعوت کا طریقہ ہے۔ لہٰذا ہماری باتیں جو بے اثر ہو رہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو بات حق نہیں ہے یا طریقہ حق نہیں ہے یا نیت حق نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ سے یہ ساری خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا ہے۔ ان کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ دہلی کی جامع مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے، وعظ کے دوران ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا: مولانا! میرے ایک سوال کا جواب دیدیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: کیا سوال ہے؟ اس نے کہا: میں نے سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں۔ العیاذ باللہ۔ عین وعظ کے دوران بھرے مجمع میں یہ بات اس نے ایسے شخص سے کہی جو نہ صرف یہ کہ بڑے عالم تھے بلکہ شاہی خاندان کے شہزادے تھے۔ ہم جیسا کوئی ہوتا تو فوراً غصہ آ جاتا اور نہ جانے اس کا کیا حشر کرتا۔ اور ہم نہ کرتے تو ہمارے معتقدین اس کی تکہ بوٹی کر ڈالتے کہ یہ ہمارے شیخ کو ایسا کہتا ہے۔ لیکن حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ بھائی! آپ کو غلط اطلاع ملی ہے، میری والدہ کے نکاح کے گواہ تو اب بھی دہلی میں موجود ہیں۔ اس کی گالی کا اس طرح جواب دیا اور اس کو مسئلہ نہیں بنایا۔

---

(۱) الاعراف: ٦٦ (۲) الأعراف: ٦٧ (۳) الاعراف: ٦٠

بات میں تاثیر کیسے پیدا ہو؟

لہٰذا جب کوئی اللہ کا بندہ اپنی نفسانیت کو فنا کر کے اپنے آپ کو مٹا کر اللہ کے لئے بات کرتا ہے اور اس وقت دنیا والوں کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کے سامنے اس کا اپنا کوئی مفاد نہیں ہے اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اللہ کے لئے کہہ رہا ہے تو پھر اس کی بات میں اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ایک وعظ میں ہزارہا افراد ان کے ہاتھ پر توبہ کرتے تھے۔ آج ہم لوگوں نے اول تو تبلیغ و دعوت چھوڑ دی، اور اگر کوئی کرتا بھی ہے تو ایسے طریقے سے کرتا ہے جو لوگوں کو برانگیختہ کرنے کا ہوتا ہے، جس سے صحیح معنی میں فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس لئے یہ تین باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ اول بات حق ہو۔ دوسرے نیت حق ہو۔ تیسرے طریقہ حق ہو۔ لہٰذا حق بات حق طریقے سے حق نیت سے کہی جائے گی تو وہ کبھی نقصان دہ نہیں ہوگی، بلکہ اس کا فائدہ ہی پہنچے گا۔

اجتماعی تبلیغ کا حق کس کو ہے؟

تبلیغ کی دوسری قسم ہے ''اجتماعی تبلیغ'' یعنی لوگوں کو جمع کر کے کوئی وعظ کرنا، تقریر کرنا، یا ان کو نصیحت کرنا۔ اس کو اجتماعی دعوت و تبلیغ کہتے ہیں۔ یہ اجتماعی تبلیغ و دعوت فرضِ عین نہیں ہے، بلکہ فرضِ کفایہ ہے، لہٰذا اگر کچھ لوگ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے کام کریں تو باقی لوگوں سے یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ''اجتماعی تبلیغ'' کرنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے کہ جس کا دل چاہے کھڑا ہو جائے، اور وعظ کرنا شروع کر دے، بلکہ اس کے لئے مطلوب علم کی ضرورت ہے۔ اگر اتنا علم نہیں ہے تو اس صورت میں اجتماعی تبلیغ کا انسان مکلف نہیں ہے۔ اور کم از کم اتنا علم ہونا ضروری ہے، جس کے نتیجے میں وعظ کے دوران غلط بات کہنے کا اندیشہ نہ ہو، تب وعظ کہنے کی اجازت ہے، ورنہ اجازت نہیں۔ یہ وعظ و تبلیغ کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ جب آدمی یہ دیکھتا ہے کہ اتنے سارے لوگ بیٹھ کر میری باتیں سن رہے ہیں تو خود اس کے دماغ میں بڑائی آجاتی ہے۔ اب خود ہی تقریر اور وعظ کے ذریعہ لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگ اس دھوکہ میں آجاتے ہیں کہ یہ شخص علم جاننے والا ہے اور بڑا نیک آدمی ہے۔ اور جب لوگ دھوکے میں آگئے اب خود بھی دھوکے میں آگیا کہ اتنی ساری مخلوق، اتنے سارے لوگ مجھے عالم کہہ رہے ہیں، اور مجھے اچھا اور نیک کہہ رہے ہیں، تو ضرور میں کچھ ہوں گا، تبھی تو یہ ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ یہ سارے لوگ پاگل تو نہیں ہیں۔ بہر حال، وعظ اور تقریر کے نتیجے میں آدمی اس فتنہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس لئے ہر شخص کو تقریر اور وعظ نہیں کرنا چاہئے۔ ہاں اگر وعظ کہنے کے لئے کوئی بڑا کسی جگہ

بٹھا دے تو اس وقت بڑوں کی سرپرستی میں اگر کام کرے، اور اللہ تعالیٰ سے مدد بھی مانگتا رہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس فتنے سے محفوظ رکھتے ہیں۔

درسِ قرآن اور درسِ حدیث دینا

وعظ اور تقریر پھر بھی ذرا ہلکی بات ہے، لیکن اب تو درسِ قرآن اور درسِ حدیث دینے تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ جس کے دل میں بھی درسِ قرآن دینے کا خیال آیا، بس اس نے درسِ قرآن دینا شروع کر دیا۔ حالانکہ قرآن کریم وہ چیز ہے جس کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)) (۱)

''جو شخص قرآن کریم کی تفسیر میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ شخص اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے''

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ بِرَأْيِهٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَأَ)) (۲)

''جو شخص اللہ جل شانہ کی کتاب میں اپنی رائے سے تفسیر کرے، اگر صحیح بھی کرے تو بھی اس نے غلط کام کیا''

اتنی سنگین وعید حضور ﷺ نے بیان فرمائی ہے اس کے باوجود آج یہ حال ہے کہ اگر کسی شخص کو کتابوں کے مطالعے کے ذریعہ دین کی کچھ باتیں معلوم ہوگئیں تو اب وہ عالم بن گیا، اور اس نے درسِ قرآن دینا شروع کر دیا، حالانکہ یہ درسِ قرآن اور درسِ حدیث ایسا عمل ہے کہ بڑے بڑے علماء اس سے کانپتے ہیں کہ چہ جائیکہ عام آدمی قرآن کریم کا درس دے اور اس کی تفسیر بیان کرے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور تفسیرِ قرآنِ کریم

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عمر کے ستر پچھتر سال دین کے علوم پڑھنے پڑھانے میں گزارے، آخر عمر میں جا کر ''معارف القرآن'' کے نام سے تفسیر تالیف فرمائی، اس کے بارے میں آپ مجھ سے بار بار فرماتے تھے کہ معلوم نہیں کہ میں اس قابل تھا کہ تفسیر پر

(۱) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله، باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برأیه، رقم: ۲۸۷۴، مسند أحمد، من سند بنی هاشم، بداية مسند عبدالله بن العباس، رقم: ۱۹٦٥

(۲) سنن أبی داؤد، کتاب العلم، باب الکلام فی کتاب الله بغیر علم، رقم: ۳۱٦۷، سنن الترمزی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله، رقم: ۲۸۷٦

قلم اُٹھاتا، میں تو حقیقت میں تفسیر کا اہل نہیں ہوں۔ لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کو میں نے آسان الفاظ میں تعبیر کر دیا ہے ــــ ساری عمر یہ فرماتے رہے، بڑے بڑے علماء تفسیر پر کلام کرتے ہوئے تھراتے رہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور تشریح حدیث

حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ، جنہوں نے ''صحیح مسلم'' کے نام سے صحیح احادیث کا ایک مجموعہ جمع فرمادیا ہے، اس کتاب میں صحیح احادیث تو جمع کر دیں، لیکن حدیث کی تشریح میں ایک لفظ کہنا بھی گوارہ نہیں کیا، حتیٰ کہ اپنی کتاب میں ''باب'' بھی نہیں قائم کیے، جیسے دوسرے محدثین نے ''نماز کا باب''، ''طہارت کا باب'' وغیرہ کے عنوان سے باب قائم فرمائے ہیں۔ صرف اس خیال سے باب قائم نہیں فرمائے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تشریح میں کوئی بات کہہ دوں، اس میں مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے، پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر میری پکڑ ہو جائے۔ بس یہ فرمادیا کہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں جمع کر رہا ہوں۔ اب علماء ان احادیث سے جو مسئلے چاہیں مستنبط کرلیں ــــ اس سے اندازہ لگائیے کہ یہ کتنا نازک کام ہے، لیکن آج کل جس کا دل چاہتا ہے درس دینا شروع کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ فلاں جگہ فلاں صاحب نے درسِ قرآن دینا شروع کر دیا ہے۔ فلاں صاحب نے درسِ حدیث دینا شروع کر دیا۔ حالانکہ نہ علم ہے، اور نہ درس دینے کی شرائط ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج طرح طرح کے فتنے پھیل رہے ہیں، فتنوں کا بازار گرم ہے۔

لہٰذا کسی کے درسِ قرآن اور درسِ حدیث میں شریک ہونے سے پہلے اس بات کا اطمینان کرلینا چاہئے کہ جو شخص درس دے رہا ہے وہ واقعۃً درس دینے کا اہل ہے یا نہیں؟ اس کے پاس علم مکمل ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ درس دینا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ بہر حال، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جس شخص کے پاس کماحقہ علم نہ ہو، اس کو اجتماعی تبلیغ اور وعظ و تقریر نہیں کرنی چاہئے، البتہ ایسے شخص کو انفرادی تبلیغ میں حصہ لینا چاہئے۔

کیا بے عمل شخص وعظ و نصیحت نہ کرے؟

ایک یہ بات مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص خود کسی غلطی کے اندر مبتلا ہے تو اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو اس غلطی سے روکے۔ مثلاً ایک شخص نماز باجماعت کا پوری طرح پابند نہیں ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ایسا شخص دوسروں کو بھی نماز باجماعت کی تلقین نہ کرے، جب تک کہ خود نماز باجماعت کا پابند نہ ہو جائے۔ یہ بات درست نہیں ــــ بلکہ حقیقت میں بات اُلٹی ہے، وہ یہ کہ جو شخص دوسروں کو نماز

باجماعت کی تلقین کرتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ خود بھی نماز باجماعت کی پابندی کرے، نہ یہ کہ جو شخص نماز باجماعت کا پابند نہیں، وہ دوسروں کو بھی تلقین نہ کرے۔ عام طور پر لوگوں میں یہ آیت مشہور ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (۱)

''اے ایمان والو، وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو''

بعض لوگ اس آیت کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کوئی کام نہیں کرتا تو وہ شخص دوسروں کو بھی اس کی تلقین نہ کرے۔ مثلاً ایک شخص صدقہ نہیں دیتا تو وہ دوسروں کو بھی صدقہ کی تلقین نہ کرے۔ یا مثلاً ایک شخص سچ نہیں بولتا تو وہ دوسروں کو بھی سچ بولنے کی تلقین نہ کرے۔ آیت کا یہ مطلب لینا درست نہیں۔ بلکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو بات اور جو چیز تمہارے اندر موجود نہیں ہے، تم اس کا دعویٰ مت کرو کہ یہ بات میرے اندر موجود ہے۔ مثلاً اگر تم نماز باجماعت کے پابند نہیں ہو تو دوسروں سے یہ مت کہو کہ میں نماز باجماعت کا پابند ہوں۔ یا تم اگر نیک اور متقی نہیں ہو تو دوسروں کے سامنے یہ دعویٰ مت کرو کہ میں نیک اور متقی ہوں۔ یا مثلاً تم نے حج نہیں کیا تو یہ مت کہو کہ میں نے حج کر لیا ہے۔ اس آیت کے یہ معنی ہیں۔ یعنی جو کام تم کرتے نہیں ہو، دوسروں کے سامنے اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہو؟ آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کام تم نہیں کرتے تو دوسروں سے اس کی تلقین بھی مت کرو، اس لئے کہ بعض اوقات دوسروں کو کہنے سے انسان کو خود فائدہ ہو جاتا ہے، جب انسان دوسروں کو کہتا ہے، اور خود عمل نہیں کرتا تو انسان کو شرم آتی ہے، اور اس شرم کی وجہ سے انسان خود بھی عمل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دوسروں کو نصیحت کرنے والا خود بھی عمل کرے

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے یہودی علماء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (۲)

''کیا تم دوسروں کو تو نیکی کی تلقین کرتے ہو، اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو''

اور خود اس نصیحت پر عمل نہیں کرتے، لہٰذا جب تم دوسروں کو کسی عمل کی نصیحت کر رہے ہو تو خود بھی عمل کرو، نہ یہ کہ چونکہ خود عمل نہیں کر رہے ہو، لہٰذا دوسروں کو بھی نصیحت نہ کرو، یہ مطلب نہیں ہے، بہر حال، دوسروں کو نصیحت کرنے میں اس بات کی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے کہ میں خود اس پر کاربند نہیں ہوں، بلکہ بزرگوں نے تو یہ فرمایا ہے کہ: من نکردم شما حذر بکنید، میں نے پرہیز نہیں کیا، لیکن تم پرہیز کر لو۔

(۱) الصف: ۲ (۲) البقرۃ: ۴۴

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات جب مجھے اپنے اندر کوئی عیب محسوس ہوتا ہے تو میں اس عیب کے بارے میں وعظ کہہ دیتا ہوں، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ میری اصلاح فرما دیتے ہیں۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ایک شخص وہ ہے جو خود تو عمل نہیں کرتا، لیکن دوسروں کو نصیحت کرتا ہے، اور ایک آدمی وہ ہے جو خود بھی عمل کرتا ہے، اور دوسروں کو بھی اس کی نصیحت کرتا ہے، دونوں کی نصیحت کی تاثیر میں فرق ہے،، جو شخص عمل کر کے نصیحت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی بات میں اثر پیدا فرما دیتے ہیں، وہ بات دلوں میں اُتر جاتی ہے، اس سے انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب آتا ہے، اور بے عملی کے ساتھ جو نصیحت کی جاتی ہے، اس کا اثر سننے والوں پر بھی کما حقہ نہیں ہوتا، زبان سے بات نکلتی ہے، اور کانوں سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے، دلوں میں نہیں اُترتی، لہٰذا عمل کی کوشش ضرور کرنی چاہئے، مگر یہ چیز نصیحت کی بات کہنے سے مانع نہیں ہونی چاہئے۔

مستحب کے ترک پر نکیر درست نہیں

بہر حال، اگر کوئی شخص فرائض اور واجبات میں کوتاہی کر رہا ہو، یا کسی واضح گناہ میں مبتلا ہو تو اس کو تبلیغ کرنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا فرض ہے۔ جس کی تفصیل اُوپر عرض کر دی۔ شریعت کے بعض احکام ایسے ہیں جو فرض وواجب نہیں ہیں، بلکہ مستحب ہیں۔ مستحب کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اس کو کرے گا تو ثواب ملے گا، نہیں کرے گا تو کوئی گناہ نہیں۔ یا شریعت کے آداب ہیں جو علماء کرامؒ بتاتے ہیں۔ ان مستحبات اور آداب کے بارے میں حکم یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی ترغیب تو دی جائے گی کہ اس طرح کر لو تو اچھی بات ہے، لیکن اس کے نہ کرنے پر نکیر نہیں کی جائے گی۔ اگر کوئی شخص اس مستحب کو انجام نہیں دے رہا ہے تو آپ کے لئے اس کو طعنہ دینے یا ملامت کرنے کا کوئی جواز نہیں کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا؟ ہاں! اگر کوئی تمہارا شاگرد ہے، یا بیٹا ہے، یا تمہارے زیر تربیت ہے مثلاً تمہارا مرید ہے تو بیشک اس کو کہہ دینا چاہئے کہ فلاں وقت میں تم نے فلاں مستحب عمل چھوڑ دیا تھا، یا فلاں ادب کا لحاظ نہیں کیا تھا، اس کو کرنا چاہئے۔ لیکن اگر ایک عام آدمی کوئی مستحب عمل چھوڑ رہا ہے تو اس صورت میں آپ کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ بعض لوگ مستحبات کو واجبات کا درجہ دے کر لوگوں پر اعتراض شروع کر دیتے ہیں کہ تم نے یہ کام کیوں چھوڑا؟ حالانکہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تو یہ نہیں پوچھیں گے کہ تم نے فلاں مستحب کام کیوں نہیں کیا تھا؟ نہ فرشتے سوال کریں گے، لیکن تم خدائی فوجدار بن کر اعتراض کر دیتے ہو کہ یہ مستحب کام تم نے کیوں چھوڑ دیا؟ یہ عمل کسی طرح بھی درست نہیں۔

اذان کے بعد دعا پڑھنا

نبی پاک ﷺ نے اذان کے بعد پڑھنے کے لئے یہ دعا سکھائی ہے:

((اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّامَّۃِ وَالصَّلٰوۃِ الْقَائِمَۃِ اٰتِ مُحَمَّدَا نِ الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَابْعَثْہُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَا نِ الَّذِیْ وَعَدتَّہٗ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَاد))(۱)

حضور اقدس ﷺ کی طرف سے اس دعا کی ترغیب ہے کہ ہر مسلمان کو اذان کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہئے۔ یہ بڑی برکت کی دعا ہے۔ اس لئے اپنے بچوں کو اور اپنے گھر والوں کو اس کی تعلیم دینی چاہئے کہ یہ دعا پڑھا کریں۔ اسی طرح دوسرے مسلمانوں کو بھی اس دعا کے پڑھنے کی ترغیب دینی چاہئے۔ لیکن اگر ایک شخص نے اذان کے بعد یہ دعا نہیں پڑھی، اب آپ اس پر اعتراض شروع کر دیں کہ تم نے یہ دعا کیوں نہیں پڑھی؟ اور اس پر نکیر شروع کر دیں، یہ درست نہیں۔ اس لئے کہ نکیر ہمیشہ فرض کے چھوڑنے پر یا گناہ کے ارتکاب پر کی جاتی ہے، مستحب کام کے ترک پر کوئی نکیر نہیں ہو سکتی۔

آداب کے ترک پر نکیر جائز نہیں

بعض اعمال ایسے ہیں جو شرعی اعتبار سے مستحب بھی نہیں ہیں، اور قرآن و حدیث میں ان کو مستحب قرار نہیں دیا گیا۔ البتہ بعض علماء نے اس کو آداب میں شمار کیا ہے۔ مثلاً بعض علماء نے یہ ادب بتایا ہے کہ جب کھانا کھانے کے لئے ہاتھ دھوئے جائیں تو ان کو تولیہ یا رومال وغیرہ سے پونچھا نہ جائے۔ اسی طرح یہ ادب بتایا کہ دسترخوان پر پہلے تم بیٹھ جاؤ، کھانا بعد میں رکھا جائے، اگر کھانا پہلے لگا دیا گیا، تم بعد میں پہنچے تو یہ کھانے کے ادب کے خلاف ہے۔ قرآن و حدیث میں یہ آداب کہیں بھی موجود نہیں ہیں، لیکن علماء کرامؒ نے یہ کھانے کے آداب بتائے ہیں، ان کو مستحب کہنا بھی مشکل ہے۔ اب اگر ایک شخص نے ان آداب کا لحاظ نہ کیا مثلاً اس نے کھانے کے لئے ہاتھ دھو کر تولیہ سے پونچھ لیے، یا دسترخوان پر کھانا پہلے لگا دیا گیا اور وہ شخص بعد میں جا کر بیٹھا تو اب اس شخص پر اعتراض کرنا اور

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب الدعاء عند الأذان، رقم: ۵۷۹، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب منه آخر، رقم: ۱۹۵، سنن النسائي، كتاب الأذان، باب الدعاء عند الأذان، رقم: ٦۷۳، سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب ما جاء في الدعاء عند الأذان، رقم: ٤٤۵، سنن ابن ماجه، كتاب الأذان والسنة فيه، باب ما يقال اذا أذن المؤذن، رقم: ۷۱٤، مسند أحمد، مسند جابر بن عبدالله، رقم: ۱٤۰۹۲، دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اے اللہ! اس مکمل دعوت اور اس کے بعد کھڑی ہونے والی نماز کے رب تو حضرت محمد ﷺ کو وسیلہ اور فضیلت اور بلند درجہ عطا فرما اور انہیں اس مقام محمود پر پہنچا دے جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے اور بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا''

اس کو یہ کہنا کہ تم نے شریعت کے خلاف یا سنت کے خلاف کام کیا، یہ بات درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ آداب نہ تو شرعاً سنت ہیں اور نہ مستحب ہیں۔ اس لئے ان آداب کے ترک کرنے والے پر اعتراض اور نکیر کرنا درست نہیں۔ ان معاملات کے اندر ہمارے معاشرے میں بہت افراط اور تفریط پائی جاتی ہے اور بعض اوقات چھوٹی چھوٹی بات پر بڑی نکیر کی جاتی ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں۔

چارزانو بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے

کھانے کے وقت چارزانو ہو کر بیٹھنا بھی جائز ہے، ناجائز نہیں، اس میں کوئی گناہ نہیں، لیکن یہ نشست تواضع کے اتنے قریب نہیں ہے، جتنی دوزانو بیٹھ کر کھانے یا ایک ٹانگ کھڑی کر کے کھانے کی نشست تواضع کے قریب ہے۔ لہٰذا عادت تو اس بات کی ڈالنی چاہئے کہ آدمی دوزانو بیٹھ کر کھائے، یا ایک ٹانگ کھڑی کر کے کھائے، چارزانو نہ بیٹھے، لیکن اگر کسی سے اس طرح نہیں بیٹھا جاتا، یا کوئی شخص اپنے آرام کے لئے چارزانو بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے تو یہ کوئی گناہ نہیں۔ یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ چارزانو بیٹھ کر کھانا ناجائز ہے، یہ خیال درست نہیں۔ لہٰذا جب چارزانو بیٹھ کر کھانا جائز ہے تو اس طرح بیٹھ کر کھانے والے پر نکیر کرنا بھی درست نہیں۔

میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے

میز کرسی پر کھانا بھی کوئی گناہ اور ناجائز نہیں۔ لیکن زمین پر بیٹھ کر کھانے میں سنت کی اتباع کا ثواب بھی ہے، اور سنت سے زیادہ قریب بھی ہے۔ اس لئے حتی الامکان انسان کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھائے۔ اس لئے کہ جتنا سنت سے زیادہ قریب ہوگا اتنی ہی برکت زیادہ ہوگی اور اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔ اتنے ہی فوائد زیادہ حاصل ہوں گے۔ بہرحال، میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے، گناہ نہیں ہے۔ لہٰذا میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے والے پر نکیر کرنا درست نہیں۔

زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت ہے

حضور اقدس ﷺ دو وجہ سے زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، ایک تو یہ کہ اس زمانہ میں زندگی سادہ تھی، میز کرسی کا رواج ہی نہیں تھا۔ اس لئے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نیچے بیٹھ کر کھانے میں تواضع زیادہ ہے، اور کھانے کی توقیر بھی زیادہ ہے۔ آپ اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے میں دل کی کیفیت اور ہوگی اور زمین پر بیٹھ کر کھانے میں دل کی کیفیت اور ہوگی،

دونوں میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا۔ اس لئے کہ زمین پر بیٹھ کر کھانے کی صورت میں طبیعت کے اندر تواضع زیادہ ہوگی، عاجزی ہوگی، مسکنت ہوگی، عبدیت ہوگی۔ اور میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کی صورت میں یہ باتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ اس لئے حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ آدمی زمین پر بیٹھ کر کھانا کھائے۔ لیکن اگر کہیں میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کا موقع آجائے تو اس طرح کھانے میں کوئی حرج اور گناہ بھی نہیں ہے۔ لہٰذا اس پر اتنا تشدد کرنا بھی ٹھیک نہیں، جیسا کہ بعض لوگ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو حرام اور ناجائز ہی سمجھتے ہیں اور اس پر بہت زیادہ نکیر کرتے ہیں۔ یہ عمل بھی درست نہیں۔

بشرطیکہ اس سنت کا مذاق نہ اُڑایا جائے

اور یہ جو میں نے کہا کہ زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت سے زیادہ قریب ہے اور زیادہ افضل ہے اور زیادہ ثواب کا باعث ہے، یہ بھی اس وقت ہے جب اس سنت کو معاذ اللہ مذاق نہ بنایا جائے، لہٰذا اگر کسی جگہ پر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر نیچے زمین پر بیٹھ کر کھانا کھایا گیا تو لوگ اس سنت کا مذاق اُڑائیں گے تو ایسی جگہ زمین پر کھانے کا اصرار بھی درست نہیں۔

ہوٹل میں زمین پر کھانا کھانا

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن سبق میں ہمیں ایک واقعہ سنایا کہ ایک دن میں اور میرے کچھ رفقاء دیو بند سے دہلی گئے۔ جب دہلی پہنچے تو وہاں کھانا کھانے کی ضرورت پیش آئی۔ چونکہ کوئی اور جگہ کھانے کی نہیں تھی اسلئے ایک ہوٹل میں کھانے کے لئے چلے گئے۔ اب ظاہر ہے کہ ہوٹل میں میز کرسی پر کھانے کا انتظام ہوتا ہے، اسلئے ہمارے دو ساتھیوں نے کہا کہ ہم تو میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھائیں گے، کیونکہ زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ چاہا کہ ہوٹل کے اندر زمین پر اپنا رومال بچھا کر وہاں بیرے سے کھانا منگوائیں۔ حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو منع کیا کہ ایسا نہ کریں بلکہ میز کرسی ہی پر بیٹھ کر کھانا کھالیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم میز کرسی پر کھانا کیوں کھائیں؟ جب زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت کے زیادہ قریب ہے تو پھر زمین پر بیٹھ کر کھانے سے کیوں ڈریں اور کیوں شرمائیں۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ شرمانے اور ڈرنے کی بات نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب تم لوگ یہاں اس طرح زمین پر اپنا رومال بچھا کر بیٹھو گے تو لوگوں کے سامنے اس سنت کا تم مذاق بناؤ گے، اور لوگ اس سنت کی توہین کے مرتکب ہوں گے۔ اور سنت کی توہین کا ارتکاب کرنا صرف گناہ ہی نہیں بلکہ بعض اوقات انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے ــــ اللہ تعالیٰ بچائے۔

ایک سبق آموز واقعہ

پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو ایک قصہ سناتا ہوں۔ ایک بہت بڑے محدث اور بزرگ گزرے ہیں، جو "سلیمان اعمش" کے نام سے مشہور ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ بھی ہیں۔ تمام احادیث کی کتابیں ان کی روایتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ عربی زبان میں "اعمش" چندھے کو کہا جاتا ہے، جس کی آنکھوں میں چندھیاہٹ ہو، جس میں پلکیں گر جاتی ہیں اور روشنی کی وجہ سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ چونکہ ان کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں، اس وجہ سے "اعمش" کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے پاس ایک شاگرد آ گئے۔ وہ شاگرد اعرج یعنی لنگڑے تھے، پاؤں سے معذور تھے۔ شاگرد بھی ایسے تھے جو ہر وقت استاذ سے چمٹے رہنے والے تھے۔ جیسے بعض شاگردوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر وقت استاذ سے چمٹے رہتے ہیں۔ جہاں استاذ جا رہے ہیں وہاں شاگرد بھی ساتھ ساتھ جا رہے ہیں، یہ بھی ایسے تھے۔ چنانچہ امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ جب بازار جاتے تو یہ "اعرج" شاگرد بھی ساتھ ہو جاتے، بازار میں لوگ فقرے کستے کہ دیکھو استاذ "چندھا" ہے اور شاگرد "لنگڑا" ہے، چنانچہ امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد سے فرمایا کہ جب ہم بازار جایا کریں تو تم ہمارے ساتھ مت جایا کرو۔ شاگرد نے کہا: کیوں؟ میں آپ کا ساتھ کیوں چھوڑ دوں؟ امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب ہم بازار جاتے ہیں تو لوگ ہمارا مذاق اُڑاتے ہیں کہ استاذ چندھا ہے اور شاگرد لنگڑا ہے۔ شاگرد نے کہا:

"مَا لَنَا نُؤْجَرُ وَيَأْثَمُوْنَ"

حضرت! جو لوگ مذاق اُڑاتے ہیں، ان کو مذاق اُڑانے دیں۔ اس لئے کہ اس مذاق اُڑانے کے نتیجے میں ہمیں ثواب ملتا ہے اور ان کو گناہ ہوتا ہے۔ اس میں ہمارا تو کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہے۔ حضرت امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا:

"نَسْلَمُ وَيَسْلَمُوْنَ خَيْرًا مِنْ اَنْ نُؤْجَرَ وَيَأْثَمُوْنَ"

ارے بھائی! وہ بھی گناہ سے بچ جائیں اور ہم بھی گناہ سے بچ جائیں، یہ بہتر ہے اس سے کہ ہمیں ثواب ملے اور ان کو گناہ ہو۔ میرے ساتھ جانا کوئی فرض و واجب تو ہے نہیں، اور نہ جانے میں کوئی نقصان بھی نہیں، البتہ فائدہ یہ ہے کہ لوگ اس گناہ سے بچ جائیں گے۔ اس لئے آئندہ میرے ساتھ بازار مت جایا کرو۔

یہ ہے دین کی فہم، اب بظاہر تو شاگرد کی بات صحیح معلوم ہو رہی تھی کہ اگر لوگ مذاق اُڑاتے ہیں تو اُڑایا کریں لیکن جس شخص کی مخلوقِ خدا پر شفقت کی نگاہ ہوتی ہے، وہ مخلوق کی غلطیوں پر اتنی نظر

نہیں ڈالتا، بلکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ جتنا ہو سکے میں مخلوق کو گناہ سے بچالوں، یہ بہتر ہے، اس لئے انہوں نے بازار جانا چھوڑ دیا۔ بہرحال، جس جگہ یہ اندیشہ ہو کہ لوگ اور زیادہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کریں گے تو اس صورت میں کچھ نہ کہنا بہتر ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد یاد رکھنے کے لائق ہے، آپ نے فرمایا:

"كَلِّمُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُوْنَ، أَتُحِبُّوْنَ أَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ"(۱)

یعنی جب لوگوں کے سامنے دین کی بات کہو تو ایسے انداز سے کہو جس سے لوگوں کے اندر بغاوت پیدا نہ ہو، کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے؟ مثلاً دین کی کوئی بات بے موقع کہہ دی جس کے نتیجے میں تکذیب کی نوبت آگئی، ایسے موقع پر دین کی بات کہنا ٹھیک نہیں۔

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے آج کونسا مسلمان ناواقف ہوگا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے تبلیغ اور دین کی دعوت کا جذبہ آگ کی طرح ان کے سینے میں بھر دیا تھا، جہاں بیٹھتے بس دین کی بات شروع کر دیتے، اور دین کا پیغام پہنچاتے ـــــ ان کا واقعہ کسی نے سنایا کہ ایک صاحب ان کی خدمت میں آیا کرتے تھے، کافی دن تک آتے رہے، ان صاحب کی داڑھی نہیں تھی، جب ان کو آتے ہوئے کافی دن ہو گئے تو حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوچا کہ اب یہ مانوس ہو گئے ہیں، چنانچہ ایک دن حضرت نے ان سے کہہ دیا کہ بھائی صاحب، ہمارا دل چاہتا ہے کہ تم بھی اس داڑھی کی سنت پر عمل کرلو، وہ صاحب ان کی یہ بات سن کر کچھ شرمندہ سے ہو گئے، اور دوسرے دن سے آنا چھوڑ دیا، جب کئی دن گزر گئے تو حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں سے ان کے بارے پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے آنا چھوڑ دیا ہے۔ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بہت افسوس ہوا، اور لوگوں سے فرمایا کہ مجھ سے بڑی سخت غلطی ہوگئی، کہ میں نے کچے توے پر روٹی ڈال دی، یعنی ابھی توا گرم نہیں ہوا تھا، اور اس قابل نہیں ہوا تھا کہ اس پر روٹی ڈالی جائے، میں نے پہلے ہی روٹی ڈال

(۱) المرتضی، ص: ۲۸۷، بحوالۂ نہج البلاغہ، بعض کتابوں میں اس جملہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو: احیاء العلوم للغزالی (۱/۳۹)، روح المعانی (۲۲/۱۶۰)، مناھل العرفان (۲/۶۶)

دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان صاحب نے آنا ہی چھوڑ دیا۔ اگر وہ آتے رہتے تو کم از کم دین کی باتیں کان میں پڑتی رہتیں، اور اس کا فائدہ ہوتا۔ اب ایک ظاہر بین آدمی تو یہ کہے گا کہ اگر ایک شخص غلط کام کے اندر مبتلا ہے تو اس سے زبان سے کہہ دو، اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر ہاتھ سے برائی کو نہیں روک سکتے تو کم از کم زبان سے کہہ دو[1] لیکن آپ نے دیکھا کہ زبان سے کہنا اُلٹا مضر اور نقصان دہ ہوگیا۔ کیونکہ ابھی تک ذہن اس کے لئے سازگار اور تیار نہیں تھا، یہ باتیں حکمت کی ہوتی ہیں کہ کس وقت کیا بات کہنی ہے، اور کس انداز سے کہنی ہے، اور کتنی بات کہنی ہے۔ دین کی بات کوئی پتھر نہیں ہے کہ اس کو اُٹھا کر پھینک دیا جائے، یا ایسا فریضہ نہیں ہے کہ اس کو سر سے ٹال دیا جائے، بلکہ یہ دیکھو اس بات کے کہنے سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ اس کا نتیجہ خراب تو نہیں ہوگا؟ اگر بات کہنے سے خراب اور برا نتیجہ نکلنے کا اندیشہ ہو تو اس وقت دین کی بات کہنے سے رک جانا چاہئے، اس وقت بات نہیں کہنی چاہئے۔ یہ بات بھی استطاعت نہ ہونے میں داخل ہے۔

خلاصہ

بہرحال، یہ بات کہ کس موقع پر کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے؟ کس موقع پر آدمی سختی کرے؟ اور کس موقع پر نرمی کرے؟ یہ بات صحبت کے بغیر صرف کتابیں پڑھنے سے حاصل نہیں ہوسکتی، جب تک کسی اللہ والے متقی بزرگ کے ساتھ رہ کر انسان نے رگڑے نہ کھائے ہوں، لہٰذا دوسرا انسان جب کوئی غلطی کرے تو اس کو ضرور ٹوکنا اور بتانا تو چاہئے لیکن اس کا لحاظ رکھنا اور جاننا ضروری ہے کہ کس موقع پر ٹوکنا فرض ہے اور کس موقع پر فرض نہیں؟ اور کس موقع پر کس طرح بات کرنی چاہئے؟ یہ سارے تبلیغ و دعوت کے احکام کا خلاصہ ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی صحیح فہم عطا فرمائے۔ اور اس کے ذریعہ ہماری اور سب مسلمان بہن بھائیوں کی اصلاح فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب کون النھی عن المنکر من الایمان، رقم: ۷۰، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب الأمر بالمعروف والنھی عن المنکر، رقم: ٤٠٠٣، مسند أحمد، رقم: ١٠٦٥١

جہاد اور دعوت و تبلیغ ☆

جہاد کی تعریف

''جہاد'' کے لفظی معنی تو اگرچہ کوشش اور ''محنت'' کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے جو کوئی محنت اور کوشش کی جائے وہ سب لغت کے اعتبار سے ''جہاد'' میں داخل ہے۔ لیکن اصطلاح میں ''جہاد'' اس عمل کو کہا جاتا ہے جس میں کسی دشمن یا کافر کا مقابلہ کیا جائے، چاہے مقابلے کی یہ صورت ہو کہ دشمن نے ہم پر حملہ کر دیا اور ہم اس کے حملے کا دفاع کر رہے ہیں یا ہم خود کسی دشمن پر جا کر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ دونوں صورتیں جہاد میں داخل ہیں اور یہ دونوں صورتیں مشروع ہیں۔

عیسائیوں کو شکستِ فاش

آپ کو معلوم ہے کہ ایک عرصہ دراز تک عیسائی دنیا مسلمانوں سے برسرپیکار رہی ہے۔ جب مسلمان عرب سے باہر نکلے تو ان کا سب سے پہلا مقابلہ قیصر روم سے ہوا، اور روم کی سلطنت کو مسلمانوں کے ہاتھوں بڑا نقصان پہنچا، جس کے نتیجے میں یہ عیسائی مسلمانوں کے دشمن ہو گئے اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صلیبی جنگیں ہوتی رہیں۔ چنانچہ سلطان صلاح الدین ایوبی، نور الدین زنگی اور عماد الدین زنگی رحمہم اللہ ان سب نے عیسائیوں کو مار مار کر ان کو شکست دی۔

صلیبی جنگیں

ہمارے ہاں ''جہاد'' ایک عبادت ہے۔ اور جہاد میں شہید ہونے یا اس جہاد میں شریک ہونے پر قرآن و حدیث میں اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس عظیم اجر و ثواب کے حصول کے لئے مسلمان عیسائیوں سے مقابلے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن عیسائیوں کے ہاں جہاد کی کوئی عبادت نہیں تھی بلکہ ان کے ہاں انجیل میں جو تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اس کے سامنے پیش کر دو، اس لئے ان کے مذہب میں جہاد اور لڑائی کا کوئی تصور نہیں تھا، لیکن جب مسلمانوں کے ساتھ مقابلہ پیش آیا تو انہوں نے بھی اپنے یہاں جہاد کے

☆ تقریر ترمذی (۲/۱۹۹ تا ۲۱۶)

مقابلے میں ''کروسیٹ'' یعنی ''صلیبی جنگ'' اور ''مقدس جنگ'' کی اصطلاح مقرر کرلی۔ چنانچہ عیسائیوں کے مذہبی رہنما ''پوپ'' نے عیسائی دنیا میں یہ اعلان کرایا کہ اب تک تو ہم یہ کہتے رہے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال پیش کردو لیکن اب مسلمانوں کے مقابلے میں جو جنگ لڑیں گے وہ بھی مذہبی اور مقدس جنگ ہوگی اور ساتھ اس نے یہ اعلان کردیا کہ جو شخص اس جنگ میں شرکت کرے گا وہ تو مقدس ہوگا ہی، لیکن اگر کوئی شخص اس جنگ میں چندہ دے گا تو چندے کی صندوقچی میں اس کا سکہ گرنے سے پہلے وہ جنت کا مستحق ہوجائے گا۔ اس قسم کے اعلانات کے بعد صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا اور عرصہ دراز تک انہوں نے مسلمانوں پر حملے کیے۔ لیکن کبھی کھلے میدان میں انہوں نے نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی بلکہ جب کبھی مقابلے پر آئے تو ہمیشہ شکست کھائی۔

بایزید یلدرم کا عجیب واقعہ

انہی صلیبی جنگوں کے زمانے کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ترکی کا ایک بادشاہ بایزید یلدرم تھا۔ ترکی زبان میں یلدرم ''صاعقہ'' اور ''بجلی'' کو کہتے ہیں اور وہ واقعی دشمنوں کے لئے صاعقۂ آسمانی سے کم نہیں تھا۔ ایک مرتبہ اس پر یورپ کی ساٹھ ریاستوں نے متحد ہوکر حملہ کردیا اور جن ساٹھ ریاستوں نے حملہ کیا تھا ہر ریاست کے بادشاہ نے اس جنگ میں اپنا شہزادہ بھیجا تھا، گویا یورپ کے ساٹھ شہزادے اپنا اپنا لشکر لے کر اس کے مقابلے پر آئے اور بایزید یلدرم پر حملہ کردیا۔ بایزید یلدرم نے نہ صرف یہ کہ ان کو شکست دی بلکہ ساٹھوں شہزادوں کو زندہ قید کرلیا اور پھر ان شہزادوں کو اعزاز و اکرام کے ساتھ خیموں میں رکھا۔ چند روز کے بعد ان کو بلا کر پوچھا کہ بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کی قید میں ہیں، آپ فاتح ہیں ہم مفتوح ہیں، آپ کو اختیار ہے کہ جو چاہیں کریں، چاہیں قتل کریں، چاہیں غلام بنالیں۔ بایزید یلدرم نے کہا کہ میں تمہیں ایک شرط پر چھوڑ دوں گا، وہ شرط یہ ہے کہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم سب اپنے وطن واپس جاکر پورے سال جنگ کی تیاری کروگے اور پھر آئندہ سال تم سب دوبارہ مجھ پر حملہ کروگے۔ اگر تم یہ وعدہ کرتے ہو تو میں تم کو چھوڑتا ہوں، ورنہ نہیں چھوڑوں گا۔

بایزید یلدرم کی گرفتاری اور انتقال

یہ ایسا مجاہد آدمی تھا اور اس نے یورپ کے عیسائیوں کے دانت کھٹے کر رکھے تھے۔ یہی وہ شخص ہے جس نے بہت مؤثر طریقے سے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے محاصرہ ڈال دیا تھا اور قریب تھا کہ یہ قسطنطنیہ فتح کرلے لیکن پیچھے سے تیمور لنگ آگیا جس کے نتیجے میں اس کو قسطنطنیہ کا محاصرہ اُٹھانا پڑا اور تیمور لنگ نے حملہ کرکے بایزید یلدرم کو شکست دی اور اس کو گرفتار کرکے پنجرے میں بند کرکے لے گیا

اور بالآخر اسی پنجرے میں بایزید کا انتقال ہو گیا۔

مسلمانوں نے میدانِ جنگ میں کبھی شکست نہیں کھائی

بہر حال، ان صلیبی جنگوں کے نتیجے میں ان عیسائیوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں بہت مار کھائی اور بہت نقصان اُٹھایا۔ اس کے نتیجے میں ان کو مسلمانوں سے زبردست دشمنی پیدا ہو گئی اور چونکہ صلیبی جنگوں میں تو ان کو کامیابی نہیں ہوئی تھی، بلکہ بعد میں اپنے مکروفریب اور سازشوں کے ذریعہ عالمِ اسلام پر قابض ہوئے، اور انہوں نے یہ دیکھ لیا کہ میدانِ جنگ میں تو مسلمانوں کو شکست دینا مشکل ہے۔ اس لئے انہوں نے دوسرے طریقے سے مسلمانوں کو شکست دینے کی کوشش کی اور مسلمانوں میں جو تعلیمی نظام جاری کیا اس کے اندر اپنے افکار داخل کیے۔

کیا اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے؟

اس موقع پر انہوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ مسلمانوں میں جہاد اس لئے شروع کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو زبردستی بزورِ شمشیر مسلمان بنایا جائے کہ یا تو مسلمان ہو جاؤ ورنہ تمہیں مار دیں گے۔ اور یہ جہاد درحقیقت اسلام کو پھیلانے کے لئے ایک زبردستی کا ذریعہ ہے۔ اور اسی بات کو یہ کہہ کر تعبیر کیا گیا کہ "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا" ورنہ عقیدے کو مان کر لوگ مسلمان نہیں ہوئے۔ بڑی شدومد سے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا گیا۔

حالانکہ اس پروپیگنڈے کی کوئی حقیقت نہیں، اس لئے کہ خود قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ﴾(۱)

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾(۲)

اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر جہاد کا منشا لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا ہوتا تو پھر جزیہ ادا کرنے اور غلام بنانے کی شق کیوں ہوتی؟ کہ اگر تم مسلمان نہیں ہوتے تو جزیہ ادا کرو، اس صورت میں بھی ہم تم سے لڑائی نہیں کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جزیہ ادا کرنے کی شق خود یہ ظاہر کر رہی ہے کہ جہاد کے ذریعہ لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا مقصود نہیں۔ اور مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ مسلمانوں نے کسی علاقے کو فتح کرنے کے بعد وہاں کے لوگوں کو زبردستی مسلمان بننے پر مجبور کیا

(۱) البقرة: ۲۵۶، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے"

(۲) الکھف: ۲۹، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "اب جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر اختیار کر لے"

ہو بلکہ ان کو ان کے دین پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ان کو اسلام کی دعوت دی گئی۔ جو لوگ مسلمان ہوئے وہ اسی دعوت کے نتیجے میں مسلمان ہوئے اور جو مسلمان نہیں ہوئے ان کو بھی وہی حقوق دیئے گئے جو ایک مسلمان کو دیئے گئے۔ اس لئے یہ کہنا کہ تلوار کے ذریعہ اسلام پھیلا، یا یہ کہنا کہ جہاد کا مقصد زبردستی لوگوں کو مسلمان بنانا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

جہاد کا مقصد کیا ہے؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر جہاد کا مقصد کیا ہے؟ خوب سمجھ لیں، جہاد کا مقصد یہ ہے کہ کفر کی شوکت کو توڑا جائے اور اسلام کی شوکت قائم کی جائے اور اللہ کا کلمہ بلند کیا جائے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بات کو تو برداشت کرلیں گے کہ اگر تم اسلام نہیں لاتے ٹھیک ہے اسلام قبول نہ کرو، تم جانو اور تمہارا اللہ جانے۔ آخرت میں تم سزا بھگتنا۔ لیکن تم اپنے کفر اور ظلم کے قوانین کو اللہ کی زمین پر نافذ کرو اور اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بناؤ اور ان کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بناؤ اور ان پر ایسے قوانین نافذ کرو جو اللہ کے قوانین کے خلاف ہیں اور جن قوانین کے ذریعہ فساد پھیلتا ہے، تو اس کی ہم تمہیں اجازت نہیں دیں گے۔ لہٰذا یا تو تم اسلام لے آؤ اور اگر اسلام نہیں لاتے تو پھر اپنے دین پر رہو لیکن جزیہ ادا کرو۔ اور جزیہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری اور ہمارے قانون کی بالادستی تسلیم کرو۔ اس لئے کہ جو قانون تم نے جاری کیا ہوا ہے وہ بندوں کو بندوں کا غلام بنانے والا قانون ہے۔ ہم ایسے قانون کو جاری نہیں رہنے دیں گے۔ اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون نافذ ہوگا اور اللہ ہی کا کلمہ بلند ہوگا۔ یہ ہے جہاد کا مقصود۔

یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے؟

اکبر الہ آبادی مشہور شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے اہلِ مغرب کے اعتراضات کے جواب میں بڑے اچھے اچھے شعر کہے ہیں۔ اہلِ مغرب یہ جو اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، اس پر انہوں نے ایک قطعہ کہا ہے کہ۔

اپنے عیبوں کی کہاں آپ کو کچھ پروا ہے
غلط الزام بھی اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے؟

یعنی یہ تو اعتراض کرتے رہے کہ تیغ سے اسلام پھیلا لیکن تم نے توپ سے دنیا میں کیا پھیلایا اس کو بیان نہیں کیا۔ حالانکہ تم نے دنیا میں بداخلاقی، فحاشی، عریانی توپ کے بل بوتے پر پھیلائی۔ اگر

بالفرض اسلام تلوار ہی سے پھیلا تو اس کے ذریعہ نیکی اور تقویٰ، عفت و عصمت ہی پھیلائی اور تم نے تو فحاشی اور عریانی ہی پھیلائی۔

متجددین کے نزدیک جہاد صرف دفاعی ہے

لیکن ہمارے ہاں انگریزوں کے تسلط کے وقت سے ایک ایسا طبقہ موجود رہا ہے کہ جب کبھی اہلِ مغرب نے اسلام پر یا مسلمانوں پر کوئی اعتراض کیا تو اس کے جواب میں وہ طبقہ اہلِ مغرب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ حضور! آپ کو غلط فہمی ہوئی، ہمارے دین میں یہ بات نہیں ہے، اور اس پر وہ معذرت خواہی کا انداز اختیار کرتا ہے۔

چنانچہ جس وقت اہلِ مغرب کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ ہوا اور یہ شور مچا کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا ہے تو اس خاص طبقے نے اس اعتراض کے جواب میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسلام میں جو جہاد مشروع ہے وہ درحقیقت صرف مدافعت کے لئے ہے یعنی جب کوئی دشمن ہم پر حملہ آور ہو جائے تو ہم اپنے دفاع کے لئے جہاد کرتے ہیں۔ باقی ابتداءً کسی قوم پر حملہ کرنا، یہ ہمارے اسلام میں مشروع نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ اگر دوسرا ہم پر حملہ آور ہوگا تو ہم ماریں گے لیکن اگر دوسرا ہم پر حملہ آور نہیں ہے تو اس صورت میں دوسرے پر جہاد کرنے اور حملہ کرنے کو ہم جائز نہیں سمجھتے۔ گویا کہ جہادِ مدافعت جائز ہے، جہادِ ابتداء مشروع اور جائز نہیں۔

اور اپنے اس موقف کو ثابت کرنے کے لئے قرآنی آیات سے غلط استدلال شروع کر دیا مثلاً یہ آیت پیش کی:

﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا﴾ (۱)

کہ دیکھو اس میں یہ کہا جا رہا ہے کہ جن کے ساتھ دوسرے لوگ قتال کریں اور ان پر ظلم کریں تو ان کے لئے قتال اور جہاد کی اجازت ہے، دوسرے لوگوں کو قتال اور جہاد کی اجازت نہیں۔ اسی طرح یہ آیت پیش کی:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ﴾ (۲)

''اللہ کی راہ میں تم ان سے قتال کرو جو تم سے قتال کریں''

---

(۱) الحج: ۳۹، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے انہیں اجازت دی جاتی ہے (کہ وہ اپنے دفاع میں لڑیں)''

(۲) البقرۃ: ۱۹۰، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اور ان لوگوں سے اللہ کے راستے میں جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں''

ان آیات میں ابتداءً حملہ کرنے اور جہاد کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ لہٰذا ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ''جہاد'' درحقیقت مدافعت کے لئے مشروع ہوا کہ جب مشرکین تم پر حملہ کریں یا ظلم کریں اس کے جواب میں تم جہاد اور قتال کرو، لیکن اگر مشرکین تم پر حملہ نہ کریں یا تم پر ظلم نہ کریں تو پھر جہاد کی اجازت نہیں۔

جہاد کے احکام تدریجاً آئے ہیں

لیکن یہ ایک ایسا قول ہے جس کو چودہ سو سال سے آج تک فقہاءِ اُمت میں سے کسی نے بھی اس کو اختیار نہیں کیا کہ جہاد مدافعت کے طور پر جائز ہے، ابتداءً جہاد کرنا جائز نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جہاد کے احکام تدریجاً کئی مرحلوں میں آئے ہیں۔ سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ مکی زندگی میں حضورِ اقدس ﷺ کو تلوار اُٹھانے سے بالکل منع کر دیا گیا تھا بلکہ حکم یہ تھا کہ صبر کرو، اور یہ حکم تھا کہ اگر کوئی شخص تمہیں تکلیف پہنچا رہا ہے تو اس کے جواب میں تم کوئی کارروائی نہ کرو۔ اور اس وقت مکی زندگی میں کسی بھی قسم کا جہاد مشروع نہیں ہوا تھا۔ پھر دوسرا مرحلہ آیا جس میں جہاد کی اجازت دے دی گئی لیکن جہاد ان پر فرض نہیں کیا گیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی:

﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا﴾ (۱)

اس آیت میں جہاد اور قتال کی اجازت دی گئی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جب دوسرا شخص تم پر ظلم کرے یا قتل کرے، اس کے جواب میں تمہارے لئے قتال جائز ہے۔

ابتداءً جہاد بھی جائز ہے

پھر تیسرا مرحلہ آیا جس میں مدافعت کے لئے جہاد کی اجازت دی گئی اور یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ﴾ (۲)

''اللہ تعالیٰ کے راستے میں ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے قتال کریں''

پھر چوتھے مرحلے میں یہ حکم آیا:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾ (۳)

(۱) الحج: ۳۹، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے انہیں اجازت دی جاتی ہے (کہ وہ اپنے دفاع میں لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے''

(۲) البقرۃ: ۱۹۰، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں''

(۳) البقرۃ: ۲۱۶، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''تم پر (دشمنوں سے) جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے اور وہ تم پر گراں ہے''

اس آیت کے ذریعہ یہ حکم دے دیا کہ اب ابتداءً بھی قتال کرنا ہے، اب صرف دفاع کی حد تک قتال محدود نہیں۔ اس کے بعد سورہ توبہ کی یہ آیاتِ جہاد نازل ہوئیں:

﴿فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ﴾(۱)

تو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام لوگوں کو پہنچایا کہ جن کے ساتھ مسلمانوں کے معاہدے ہیں، ان کو معاہدوں کی حد تک مہلت دیتے ہیں اور جن کے ساتھ معاہدے نہیں ہیں ان کو چار مہینے کی مہلت دیتے ہیں۔ وہ لوگ چار مہینے کے اندر جزیرہ عرب خالی کر دیں ورنہ ان سے اعلانِ جنگ ہے۔

بہرحال، ان آیات کے نازل ہونے کے بعد ابتدائی جہاد بھی جائز ہوگیا۔ اب اگر کوئی شخص ابتدائے اسلام میں نازل ہونے والی آیات لے کر یہ فیصلہ کر دے کہ جہاد تو جائز ہی نہیں ہے، مسلمانوں کو تو صبر کا حکم ہے کہ جب مشرکین تکلیف پہنچائیں تو صبر کرو، ظاہر ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص صرف مدافعت والی آیات لے کر بیٹھ جائے اور یہ کہے کہ مسلمانوں کے لئے مدافعت کرنا تو جائز ہے، ابتدائی جہاد کرنا جائز نہیں، یہ بھی درست نہیں ہے، بالکل غلط بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتداءً جہاد جائز ہے۔

دیندار حلقوں میں ایک اور غلط فہمی اور اس کا جواب

یہ تو ان متجددین کے قول کا تفصیلی جواب تھا جو اہلِ مغرب سے مرعوب ہو کر یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں صرف مدافعتی جہاد ہے، ابتداءً جہاد جائز نہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور غلط فہمی ان متجددین کے علاوہ اچھے خاصے دیندار حلقوں میں بھی پائی جاتی ہے اور اب وہ غلط فہمی رفتہ رفتہ بہت پھیل رہی ہے اور ہماری تبلیغی جماعت کے حضرات بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس لئے اس کی بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

وہ غلط فہمی یہ ہے کہ جہاد صرف اس وقت اور اس قوم سے مشروع ہے جب کوئی قوم دعوت کے راستے میں آڑے آئے اور رکاوٹ بنے۔ گویا کہ اصل مقصود "دعوت" ہے اور اس دعوت کے پھیلانے کے راستے میں اگر کوئی ملک آڑے آئے اور اپنے ملک میں دعوت و تبلیغ کی اجازت نہ دے تب جہاد مشروع ہے، لیکن اگر کوئی ملک اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہمارے یہاں آکر دعوت کا کام کرو، تبلیغ

(۱) التوبۃ: ۵، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "پھر جب گزر جائیں مہینے پناہ کے تو مارو مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو اور گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی تاک میں"

کرو تو پھر ان کے ساتھ جہاد مشروع نہیں۔ یہ وہ بات ہے جس کو پہلے صرف متجددین کہا کرتے تھے، اب اچھے خاصے پڑھے لکھے دیندار حضرات اور تبلیغی جماعت کے حضرات نے بھی کہنی شروع کر دی ہے۔ اور اب سے پہلے تو لوگوں سے صرف زبانی سنا تھا، لیکن باقاعدہ اس بارے میں تحریر دیکھ لی ہے، تب یہ بات کہہ رہا ہوں۔ یہ بات جہاد کی حقیقت نہ سمجھنے کے نتیجے میں کہی گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ صرف اتنی بات کہ کسی کافر حکومت نے اپنے ملک میں ہمیں تبلیغ کی اجازت دیدی ہے اس لئے اب ہمیں اس کے خلاف جہاد نہیں کرنا چاہئے، یہ بڑی خطرناک بات ہے اس لئے کہ محض تبلیغ کی اجازت دے دینے سے جہاد کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جہاد کا مقصد کفر کی شوکت کو توڑنا ہے اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنا ہے، اور جب تک کفر کی شوکت برقرار رہے گی اس وقت تک حق کو قبول کرنے کے لئے لوگوں کے دل و دماغ نہیں کھلیں گے۔ اس لئے کہ یہ اصول ہے کہ جب کسی قوم کی سیاسی طاقت اور اس کا اقتدار لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہوتا ہے، اس قوم کی بات لوگوں کو جلدی سمجھ میں آجاتی ہے اور اس کی مخالف بات لوگوں کے دلوں میں آسانی سے نہیں اُترتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے۔ چنانچہ آج مغربی دنیا کی بالکل بدیہی البطلان بات لوگ نہ صرف یہ کہ سنتے ہیں بلکہ اس کو قبول کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ آج دنیا میں ان کا سکہ چلا ہوا ہے، ان کا اقتدار ہے، ان کے افکار دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر ان حالات میں کسی مغربی ملک میں تبلیغی جماعت چلی گئی اور اس ملک نے ان کو ویزا دے دیا اور تبلیغ کی اجازت دے دی تو صرف اتنی بات سے جہاد کا مقصد حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ ان کی شوکت نہ ٹوٹے اور جب تک ان کا اقتدار ختم نہ ہو اور جب تک لوگوں کے دلوں پر چھایا ہوا رعب ختم نہ ہو۔ اور یہ شوکت، یہ اقتدار، یہ رعب اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک کہ ان کا مقابلہ نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اگر کسی ملک نے تبلیغ کی اجازت دے دی تو اب جہاد کی ضرورت نہیں رہی اور اب جہاد کا مقصود حاصل ہو گیا، تو یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔

مطلق جہاد کا منکر کافر ہے

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی فرد یا جماعت جہاد کی ابتدائی فرضیت سے انکار کر دے جبکہ وہ نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے اور وہ جماعت صرف دفاعی جہاد کی قائل ہو، تو شریعت میں ایسی جماعت کی کیا حیثیت ہے؟ کیا ایسی جماعت کی طرف کفر یا ضلالت کی نسبت کرنا درست ہے؟

یہ تو میں نے عرض کر دیا کہ یہ نقطۂ نظر بالکل غلط ہے کہ جہاد صرف دفاع کے لئے مشروع ہوا ہے، لیکن جو شخص یا جماعت اس نقطۂ نظر کی قائل ہو اس پر کفر کا فتویٰ لگانا بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ

تکفیر ایک ایسی چیز ہے جس میں بہت احتیاط لازم ہے۔ اس لئے جو شخص یا جماعت مطلق جہاد کی منکر ہو اس پر بے شک کفر کا فتویٰ لگایا جائے گا، کیونکہ جہاد کی مشروعیت ضروریاتِ دین میں سے ہے، لیکن جو شخص یا جماعت دفاعی جہاد کی قائل ہے اور ابتدائی جہاد کی مشروعیت سے انکار کرتی ہے تو وہ جماعت مأول ہے (تاویل کرنے والی ہے) اور مأول کو کافر نہیں کہا جاتا۔ اس لئے اس جماعت کو کافر نہیں کہیں گے۔ البتہ یہ نقطۂ نظر بالکل غلط اور باطل ہے اور یہ صرف اجتہادی اختلاف نہیں ہے بلکہ حق و باطل کا اختلاف ہے، اور ابتدائی جہاد سے انکار کرنے والے کو یہ کہا جائے گا کہ یہ باطل پر ہے، حق پر نہیں ہے، لیکن کفر کا فتویٰ نہیں لگائیں گے۔

اسلام پر خونخوار مذہب ہونے کا الزام کیوں؟

ایک صاحب نے یہ سوال کیا ہے کہ اہلِ مغرب نے جہاد کے حوالے سے اسلام پر سب سے بڑا بہتان یہ تراشا ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے۔ یہ اشکال اور بہتان اس وقت پیدا ہونا چاہئے تھا جب مسلمانوں نے جہاد کے ذریعہ دنیا میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا اور اس وقت فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کے فاتحانہ اقدامات شاید کسی خونریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ لیکن آج جب مسلمان ہر اعتبار سے مغلوب اور روبہ انحطاط ہیں، ایسے وقت میں اس بہتان تراشی کے پیچھے لادین عناصر کا کون سا جذبہ کارفرما ہے؟

بات دراصل یہ ہے کہ اگرچہ مسلمان اس وقت کمزور ہیں، لیکن مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ نے ان کو ذرا اُبھرنے کا موقع دیا اور ان میں اتحاد پیدا ہوا تو اس کے نتیجے میں انہوں نے دشمنوں کا ناک میں دم کر دیا اور ان کے عزائم کو چلنے نہیں دیا۔ جو طاقتیں اس وقت دنیا پر غالب ہیں وہ اگرچہ یہ دیکھ رہی ہیں کہ مسلمان اس وقت کمزور ہیں، لیکن ان کو ڈراؤنے خواب آتے رہتے ہیں کہ یہ سویا ہوا شیر اگر کسی وقت بیدار ہو گیا تو یہ ہمیں تباہ کر دے گا۔ ان مغربی طاقتوں نے اگرچہ مسلمانوں کو دبا رکھا ہے لیکن ان کے دبانے کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک لطیفہ ہے کہ ایک کمزور آدمی کچھ داؤ پیچ کے ذریعہ ایک پہلوان کو گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو کر بیٹھ گیا اور اُوپر بیٹھ کر رونے لگا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تو کیوں رو رہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس لئے رو رہا ہوں کہ اب یہ پہلوان اُٹھ کر مجھے مارے گا، اس کے تصور سے رو رہا ہوں۔ بس یہی حال ان اہلِ مغرب کا ہے، طاقت کے بل بوتے پر تو یہ مسلمانوں کو نہیں گرا سکے لیکن داؤ پیچ کے ذریعہ اس طرح گرا دیا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈال دیا، ان کے اندر فرقہ بندیاں کر دیں، اور اس سازش میں لگے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان اتحاد نہ ہونے پائے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ساتھ ہی یہ اہلِ مغرب اس بات سے پریشان بھی ہیں کہ اگر کسی وقت

مسلمانوں کو ہوش آگیا اور یہ متحد ہو گئے تو اس وقت ہمارا حشر خراب کر دیں گے۔

جہاد کے لئے تین شرطیں

ایک طالب علم نے یہ سوال کیا ہے کہ عہدِ نبوت میں ابتدائی تیرہ سال اس طرح گزرے ہیں کہ ان میں جہاد بالمعنی الاصطلاحی موجود نہیں تھا۔ صبر اور مجاہدۂ نفس کے بعد جب صحابہ کرام کے اعمال و اخلاق صیقل ہو گئے تو اس کے بعد مدنی زندگی میں جہاد و قتال کا سلسلہ شروع ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان چونکہ تزکیۂ نفس کے اس معیار پر نہیں اُتریں گے، لہٰذا ایسی حالت میں جہاد سے پہلے اصلاحِ نفس پر توجہ دینی چاہئے۔

یہ بہت اچھا سوال کیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ جہاد ابتدائی جو شروع ہے وہ اصولی اعتبار سے ہے، لیکن اس جہاد ابتدائی کی کچھ شرائط ہیں۔ جب تک وہ شرائط نہ پائی جائیں اس وقت تک وہ جہاد نہ صرف یہ کہ مشروع نہیں بلکہ مضر بھی ہو سکتا ہے۔ ان شرائط میں یہ شرط بھی داخل ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ ہو، فی سبیل النفس نہ ہو۔ یعنی مقصود اعلاءِ کلمۃ اللہ ہو اور اللہ کے دین کی سربلندی ہو، لیکن اگر کوئی شخص اس لئے جہاد کر رہا ہے تاکہ میری شہرت ہو جائے، مجھے لوگ مجاہد اور بہادر کہیں اور میری تعریف ہو، ظاہر ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے بلکہ فی سبیل النفس ہے۔ اس لئے جہاد کی ایک ناگزیر شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی اصلاح کیے ہوئے ہو۔ اصلاحِ نفس کے بعد اگر جہاد کرے گا تو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہوگا۔

جہاد شرعی کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ان کا ایک امیر ہو اور اس امیر پر سب لوگ متفق ہوں۔ اگر ایک متفقہ امیر نہیں ہوگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاد کے بعد آپس ہی میں لڑائی شروع ہو جائے گی۔ جیسے آج افغانستان میں ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ امیر نہ ہونے کی وجہ سے جہاد کے نتائج حاصل نہیں ہو پاتے۔ اس لئے ایک متفقہ امیر کا ہونا ضروری ہے۔

جہاد کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ جہاد کرنے اور لڑنے کی قوت بھی ہو کیونکہ قوت کے بغیر جہاد کرنا ایسا ہی ہے جیسے خود اپنا سر پھوڑ لینا۔ اس لئے قوت کے حصول کے بغیر جہاد کرنا جائز نہیں۔ لہٰذا جب تک یہ تین چیزیں موجود ہیں اس وقت تک جہاد یہی ہے کہ ان تین چیزوں کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یعنی اصلاحِ نفس بھی ہو، امیر کو تلاش کیا جائے اور قوت کو جمع کیا جائے، جب یہ تین چیزیں پائی جائیں اس کے بعد جہاد شروع کیا جائے۔

جہاد کے بارے میں تبلیغی جماعت کا موقف

ایک طالب علم نے سوال کیا ہے کہ تبلیغی جماعت کی کون سی کتاب یا تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاد کی ابتدائی فرضیت سے انکار کرتے ہیں؟ کیا علماء کرام نے تبلیغی جماعت کے علماء اور امراء کو اس بات پر متنبہ کیا ہے؟

بات دراصل یہ ہے کہ تبلیغی جماعت کے مختلف حضرات کی طرف سے لوگ میرے پاس آکر بہت کچھ نقل کرتے رہتے تھے کہ تبلیغی جماعت کے فلاں صاحب نے تقریر میں یہ کہا، اور یہ کہا کہ اس وقت جہاں کہیں جہاد ہو رہا ہے، چاہے وہ کشمیر ہو، یا بوسینیا ہو وہ جہاد شرعی نہیں ہے، اصل چیز تو دعوت ہے۔ اس قسم کی باتیں لوگ میرے پاس آکر نقل کرتے تھے لیکن چونکہ نقل کے اندر غلطی اور غلط فہمی کا امکان رہتا ہے جب تک خود براہِ راست نہ سن لیا جائے۔ اس لئے ان باتوں کو میں نے کبھی جماعت یا جماعت کے بزرگوں کی طرف منسوب نہیں کیا، لیکن جماعت کے بزرگوں سے جب کبھی ملاقات کا موقع ملا، ان کو ان باتوں کی طرف متنبہ ضرور کیا کہ یہ باتیں سننے میں آتی رہتی ہیں، آپ حضرات تحقیق کریں۔ اگر یہ باتیں صحیح ثابت ہوں تو ان کا سدِ باب کریں۔

لیکن اب جماعت کے ایک سرکردہ اور بڑے مقتدر بزرگ جن کا میں بہت احترام کرتا ہوں، ان کا ایک خط پڑھنے کا اتفاق ہوا جو انہوں نے ایک صاحب کے نام لکھا تھا، جن کے نام وہ خط تھا انہوں نے وہ خط مجھے بھیج دیا۔ اس خط کے اندر تحریر کا سارا رخ اس طرف ہے کہ گویا اس وقت جہاد کی طرف توجہ کرنا یا جہاد کی بات کرنا، جہاد کے بارے میں سوچنا یا جہاد کے بارے میں کوئی اقدام کرنا کسی طرح بھی درست نہیں، بلکہ جہاد تو اصل میں دعوت کے لئے ہے۔ اگر دعوت کی آزادی ہو تو اس صورت میں نہ صرف یہ کہ جہاد کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ وہ مضر ہے۔ ساتھ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابھی یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے لیکن رفتہ رفتہ علماء کی سمجھ میں بھی آجائے گی۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جو باتیں تبلیغی جماعت کے حضرات کی طرف منسوب کرکے نقل کی گئی ہیں وہ اتنی بے بنیاد نہیں ہیں بلکہ یہ فکر رفتہ رفتہ پیدا ہو رہی ہے۔ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ اس پر خاموش رہا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پھر ہم نے جماعت کے ان حضرات سے زبانی گزارش بھی کی جن سے رابطے ہیں اور بڑوں تک یہ بات پہنچانے کا اہتمام کیا کہ یہ بات جو پیدا ہو رہی ہے یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ یہ خط میرے پاس موجود ہے اگر کوئی پڑھنا چاہے تو پڑھ لے۔

تبلیغی جماعت اور دین کی عظیم خدمت

الحمدللہ، ان باتوں کو بیان کرنے کا منشاء اصلاح ہی ہے۔ تبلیغی جماعت تنہا ایک ایسی جماعت ہے جس کے کام سے الحمدللہ دل ہمیشہ خوش ہوتا ہے اور اس جماعت نے ایسی بڑی عظیم خدمت انجام دی ہے جو کسی اور جماعت نے انجام نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کے ذریعہ دین کا کلمہ کہاں سے کہاں پہنچایا۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب قدس اللہ سرہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین، ان کے اخلاص اور ان کے سچے جذبے نے اس جماعت کو اب تک باقی رکھا ہوا ہے، اور اس جماعت کے پیغام اور دعوت کو اللہ تعالیٰ نے چار دانگ عالم میں پھیلا دیا ہے۔

تعاون اور تنبیہ دونوں کی ضرورت ہے

لیکن ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کسی بھی جماعت کا پھیل جانا اور اس کے پیغام کا دور دور تک پہنچ جانا اگر صحیح طریقے سے ہو تو یہ قابلِ خیر مقدم ہے اور اس صورت میں اس جماعت کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔ لیکن اگر اس جماعت میں خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں یا اس کے اندر غلط فکر پیدا ہو رہی ہے تو پھر تعاون کے ساتھ ساتھ اس کی غلطی پر اس کو متنبہ کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ ایسا نہ ہو کہ یہ بہترین جماعت جس سے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا کام لیا، کہیں غلط راستے پر نہ پڑ جائے۔ بالخصوص ایسے وقت میں متنبہ کرنا اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے جبکہ اس کی قیادت پختہ اہلِ علم کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس جماعت میں زیادہ عنصر عوام کا ہے جو پورا علم نہیں رکھتے، اور اس جماعت کے اندر جو علماء شامل ہیں ان علماء کا مشغلہ علم نہیں ہے۔ اس لئے کہ علماء کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض علماء وہ ہوتے ہیں جن کا مشغلہ درس و تدریس اور فتویٰ نویسی ہوتا ہے۔ اس قسم کے علماء کو علم سے مناسبت رہتی ہے۔ اور دوسرے علماء وہ ہیں جن کا مشغلہ درس و تدریس اور فتویٰ وغیرہ نہیں رہتا۔ ان حضرات علماء کے پاس الحمدللہ علم تو ہے لیکن اس علم کو صیقل نہیں کیا گیا، اس لئے ایسے علماء کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

میں آپ کو حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک مرتبہ آپ بیمار ہو گئے۔ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس زمانے میں دیوبند سے دہلی کسی کام سے تشریف لے گئے۔ دہلی میں آپ کو یہ خبر ملی کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیمار ہیں۔

چنانچہ آپ ان کی عیادت کے لئے نظام الدین تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ معالجین نے ملاقات کرنے سے منع کیا ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت والد صاحب نے وہاں پر موجود لوگوں سے عرض کر دیا کہ میں تو عیادت کے لئے حاضر ہوا تھا، حالات معلوم ہو گئے۔ اور معالجین نے چونکہ ملاقات سے منع کیا ہوا ہے اس لئے ملاقات کا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس جب حضرت کی طبیعت ٹھیک ہو تو حضرت کو بتا دیں کہ میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا اور میرا سلام عرض کر دیں۔ یہ کہہ کر حضرت والد صاحب رخصت ہو گئے۔

کسی نے اندر جا کر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بتا دیا کہ حضرت مفتی صاحب آئے تھے۔ حضرت مولانا نے فوراً ایک آدمی پیچھے دوڑایا کہ مفتی صاحب کو بلا کر لائیں۔ جب وہ شخص حضرت مفتی صاحب کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ حضرت مولانا آپ کو بلا رہے ہیں تو حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ چونکہ معالجین نے ملاقت سے منع کیا ہوا ہے، ایسے میں ملاقات کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس شخص نے کہا کہ حضرت مولانا نے سختی سے حکم دیا ہے کہ ان کو بلا کر لاؤ۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ میں ان صاحب کے ساتھ واپس گیا اور حضرت کے پاس جا کر بیٹھا اور آپ کی مزاج پرسی کی، تو حضرت مولانا الیاس صاحب میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بے ساختہ رو پڑے اور زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے خیال ہوا کہ بہر حال، اس وقت تکلیف اور بیماری میں ہیں، اس کا طبیعت پر تأثر ہے۔ اس لئے میں نے تسلی کے کچھ کلمات کہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے فرمایا کہ میں تکلیف اور بیماری کی وجہ سے نہیں رو رہا ہوں۔

مجھے اس وقت دو فکریں اور دو اندیشے لاحق ہیں

بلکہ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ مجھے اس وقت دو فکریں اور دو اندیشے لاحق ہیں اور انہی کی وجہ سے میں پریشان ہوں اور اسی وجہ سے رونا آ رہا ہے۔ حضرت والد صاحب نے پوچھا کہ کونسی فکریں لاحق ہیں؟ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پہلی بات یہ ہے کہ جماعت کا کام اب روز بروز پھیل رہا ہے۔ الحمد للہ اس کے نتائج اچھے نظر آ رہے ہیں اور لوگ جوق در جوق جماعت کے اندر آ رہے ہیں۔ اب مجھے ڈر یہ لگتا ہے کہ جماعت کی یہ کامیابی کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے استدراج ہو؟ استدراج اسے کہتے ہیں کہ کسی باطل آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل دے دی جاتی ہے اور اس کو ظاہری کامیابیاں حاصل ہو جاتی ہیں اور حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا کام نہیں ہوتا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کس مقام کے بزرگ تھے کہ ان کو یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ یہ کہیں استدراج تو نہیں ہے۔

یہ استدراج نہیں ہے

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے فوراً عرض کیا کہ حضرت! آپ کو میں اطمینان دلا سکتا ہوں کہ یہ استدراج نہیں ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ تمہارے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ استدراج نہیں ہے؟ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب کسی کے ساتھ استدراج کا معاملہ ہوتا ہے تو اس شخص کے دل ودماغ پر یہ واہمہ بھی نہیں گزرتا کہ یہ استدراج ہے اور اس کو استدراج کا شبہ بھی نہیں ہوتا۔ اور آپ کو چونکہ استدراج کا شبہ ہو رہا ہے، تو یہ شبہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ استدراج نہیں ہے، اگر یہ استدراج ہوتا تو کبھی آپ کے دل میں اس کا خیال بھی پیدا نہ ہوتا۔ اس لئے میں آپ کو اس بات کا اطمینان دلاتا ہوں کہ یہ استدراج نہیں ہے بلکہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اور نصرت ہے۔ حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ میرا یہ جواب سن کر حضرت مولانا کے چہرے پر بشاشت آگئی کہ الحمد للہ تمہاری اس بات سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔

دوسری فکر

پھر حضرت مولانا نے فرمایا کہ مجھے دوسری فکر یہ لاحق ہے کہ اس جماعت میں عوام بہت کثرت سے آرہے ہیں، اور اہلِ علم کی تعداد کم ہے۔ مجھے اندیشہ یہ ہے کہ جب عوام کے ہاتھ میں قیادت آتی ہے تو بعض اوقات آگے چل کر وہ اس کام کو غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جماعت کسی غلط راستے پر پڑ جائے اور اس کا وبال میرے سر پر آجائے۔ اس لئے میرا دل چاہتا ہے کہ اہلِ علم کثرت سے اس جماعت میں داخل ہوں اور وہ اس جماعت کی قیادت سنبھالیں۔

حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ آپ کی یہ فکر بالکل صحیح ہے لیکن آپ نے تو نیک نیتی سے اور صحیح طریقے پر کام شروع کیا ہے، اگر آگے چل کر اس کو کوئی خراب کردے تو انشاء اللہ آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ بہر حال یہ بات صحیح ہے کہ اہلِ علم کو چاہئے کہ وہ آگے آئیں اور اس کی قیادت سنبھالیں۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے بار بار سنا۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص کا کیا عالم تھا اور ان کے جذبات کیا تھے۔

تبلیغی جماعت کی مخالفت ہرگز جائز نہیں

لیکن اب واقعۃً صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ قیادت زیادہ تر ایسے حضرات کے ہاتھ میں ہے جو علم میں رسوخ نہیں رکھتے۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات کچھ بے اعتدالیاں سامنے آتی رہتی ہیں۔ ان بے اعتدالیوں کے نتیجے میں جماعت کی مخالفت ہرگز جائز نہیں۔ اس لئے کہ بحیثیتِ مجموعی الحمدللہ جماعت نے بہت بہترین کام کیا ہے اور اب بھی اچھا کام کررہی ہے۔ لہٰذا اس جماعت کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے اور جتنا ہوسکے اہلِ علم کو اس جماعت کے اندر شامل ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ تعاون کا سلسلہ برقرار رکھنا چاہئے۔

لیکن ساتھ ساتھ اہلِ علم کے داخل ہونے کا یہ فائدہ ہونا چاہئے کہ جو بے اعتدالیاں پیدا ہورہی ہیں ان کا سدباب ہو۔ لہٰذا جو اہلِ علم جائیں وہ یہ فکر اور سوچ لے کر جائیں کہ ہم ایک مقصد سے جارہے ہیں۔ وہ مقصد یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ حتی الامکان اس مبارک جماعت کو غلط راستے پر پڑنے سے روکیں، یہ نہ ہو کہ اہلِ علم خود بھی جماعت کے بہاؤ میں بہہ جائیں۔

مثلاً ایک اہم بے اعتدالی یہ ہے کہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ فتویٰ کے معاملے میں تبلیغی جماعت کے حضرات اور ان سے منسلک عوام اہلِ افتاء کی طرف رجوع کرتے تھے، لیکن اب وہاں فتویٰ دینے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے، اور مسائل میں عام فقہاءِ اُمت سے اختلاف کا ایک رجحان پیدا ہونے لگا ہے۔ اور بعض حضرات تفریق کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ مثلاً یہ بات چل پڑی ہے کہ اب تبلیغ کرنے والے کو اس مفتی سے فتویٰ پوچھنا چاہئے جو تبلیغ میں لگا ہوا ہو، دوسرے علماء سے پوچھنا ٹھیک نہیں۔

اور بعض اوقات امراءِ جماعت ایسے فیصلے کرلیتے ہیں جو شریعت کے مطابق نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ بات کہ تبلیغ و دعوت فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ ہے؟ اس بارے میں باقاعدہ ایک موقف اختیار کرلیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت نہ صرف یہ کہ فرضِ عین ہے بلکہ اس خاص طریقے سے کرنا فرضِ عین ہے، جو شخص اس خاص طریقے سے نہ کرے وہ فرضِ عین کا تارک ہے۔ یہ بھی بہت بے اعتدالی کی بات ہے۔ اسی طرح جہاد کے بارے میں بھی بے اعتدالیاں سننے میں آتی رہتی ہیں۔

طلبہ تبلیغی جماعت میں شرکت کریں

الحمدللہ، ہم تو اپنے طلبہ کو یہ ترغیب دیتے رہتے ہیں کہ وہ تبلیغی جماعت میں جائیں، کیونکہ جماعت میں جانا خود اپنی اصلاح کے لئے بہت مفید ہے، اس لئے کہ نیک لوگوں کی صحبت میسر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے اپنی کوتاہیاں دور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اصلاحِ نفس کا موقع حاصل ہوتا ہے۔

بلکہ دیکھا یہ ہے کہ یہاں مدرسے میں آٹھ سال پڑھنے سے بھی فضائلِ اعمال کی اتنی اہمیت دل میں پیدا نہیں ہوتی جتنی ایک چلہ لگانے سے وہ اہمیت پیدا ہو جاتی ہے اور اعمال کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اس لئے ہم طلبہ کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اس جماعت میں وقت لگائیں۔

لیکن وقت لگانے والے طلبہ ساتھ ساتھ یہ بھی مدِنظر رکھیں کہ اس جماعت میں مندرجہ بالا بے اعتدالیاں بھی پائی جاتی ہیں، ان بے اعتدالیوں سے خود متأثر ہونے کے بجائے ان کو دور کرنے کی فکر کرنی چاہئے، یہ نہ ہو کہ وہاں جا کر خود بھی بہہ گئے اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگ گئے۔ ہر چہ در کانِ نمک رفت، نمک شد۔ یہ نہ ہونا چاہئے۔

یہ اس جماعت کی صحیح صورتِ حال ہے۔ اور الحمدللہ اب بھی ان بے اعتدالیوں کے باوجود بحیثیتِ مجموعی اس جماعت پر خیر غالب ہے اور بحیثیتِ مجموعی اس جماعت سے بہت فائدہ پہنچ رہا ہے، اور اس جماعت میں شرکت کرنی چاہئے اور اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے، لیکن ان بے اعتدالیوں کی طرف بھی نگاہ رکھنی چاہئے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جب کبھی کوئی شخص ان بے اعتدالیوں پر ذرا سی تنقید کرتا ہے تو اس کے خلاف یہ پروپیگنڈہ شروع ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جماعت کا مخالف ہے، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

آج کل کا جہاد اقدامی ہے یا دفاعی ہے؟

ایک طالب علم نے پوچھا ہے کہ آج کل جو جہاد ہو رہا ہے یہ اقدامی ہے یا دفاعی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب جہاد جو بوسینیا یا کشمیر میں ہو رہے ہیں، یہ سب حقیقت میں دفاعی جہاد ہیں۔ بوسینیا کے مسلمانوں پر خود کفار نے حملہ کر کے ان پر ظلم کیا تھا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے ان کے خلاف ہتھیار اُٹھائے۔ جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے تو ہندوستان نے زبردستی اس پر قبضہ کیا ہوا ہے، اس لئے کہ تقسیم کے وقت یہ طے ہو گیا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی وہ علاقے پاکستان کے ساتھ شامل ہوں گے۔ اس اصول کے اعتبار سے کشمیر پاکستان کا حصہ تھا لیکن ہندوستان نے زبردستی اس پر قبضہ کر لیا، اس لئے وہ مقبوضہ علاقہ کہلاتا ہے، اب اگر وہاں کے لوگ اپنے علاقے کو کافروں کے تسلط سے آزاد کرانا چاہ رہے ہیں تو یہ دفاعی جہاد ہے۔

ان باتوں سے غلط نتیجہ نہ نکالا جائے

تبلیغی جماعت کے بارے میں جو بات میں نے بتائی اس کو ایک تو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ اس لئے کہ بعض اوقات جب کوئی بات مجمع میں کہی جاتی ہے تو اس کو غلط سمجھ کر پھر غلط طریقے

سے آگے نقل کر دیا جاتا ہے اور نقل کرنے میں احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی، اور بعض اوقات بات کا ایک حصہ نقل کر دیا جاتا ہے اور دوسرا حصہ نقل نہیں کیا جاتا، جس کے نتیجے میں اصلاح نہیں ہوتی بلکہ اُلٹا فساد پھیلتا ہے۔ آپ حضرات کو بتلانے کا منشا یہ ہے کہ چونکہ آپ حضرات اب درسِ نظامی سے فارغ ہونے والے ہیں، آپ حضرات کو ہر چیز کی حقیقت اس کے محل میں معلوم ہونی چاہئے اور اس کے مطابق اپنا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے، اس لئے یہ ساری باتیں آپ کو بتائی جارہی ہیں۔ لہٰذا اس سے کوئی شخص یہ نتیجہ نہ نکالے کہ میں تبلیغی جماعت کے خلاف ہوں۔

بہر حال، میں نے آپ حضرات کو کھول کر بتادیا کہ تبلیغی جماعت میں خیر غالب ہے، لہٰذا اس جماعت کو غنیمت سمجھنا چاہئے اور اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔ لیکن خیر غالب ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ جماعت معصوم ہے اور اس میں کوئی غلطی نہیں ہے یا کوئی بے اعتدالی نہیں ہے۔

علماء دین کے چوکیدار ہیں

اہلِ علم دین کے چوکیدار ہیں، ہم تو طالب علم ہیں۔ اہلِ علم کو اللہ تعالیٰ نے دین کا چوکیدار بنایا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب سے میں نے اس قسم کی کچھ باتیں عرض کیں تو جواب میں وہ صاحب کہنے لگے کہ یہ مولوی تو اسلام کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ جس چیز کے بارے میں کہہ دیں کہ یہ اسلام ہے تو وہ اسلام ہے اور جس کو یہ لوگ کہہ دیں کہ یہ اسلام نہیں تو وہ اسلام میں داخل نہیں۔ میں نے ان سے جواب میں کہا کہ اسلام کا ٹھیکیدار تو کوئی نہیں بن سکتا لیکن ہم چوکیدار ضرور ہیں، اور چوکیدار کا فریضہ یہ ہے کہ اگر شہزادہ بھی دربارِ شاہی میں داخل ہونا چاہے اور اس کے پاس پاس نہیں ہوگا تو وہ چوکیدار اس شہزادے کو بھی روک دے گا، حالانکہ چوکیدار جانتا ہے کہ میں چوکیدار ہوں اور یہ شہزادہ ہے لیکن چوکیدار کے فرائضِ منصبی میں یہ بات داخل ہے کہ وہ شہزادے کو روکے۔ اسی طرح ہم دین کے ٹھیکیدار نہیں البتہ چوکیدار ضرور ہیں۔ ہمارا کام جھاڑ دینا ہے۔ آپ کی تعظیم اور تکریم ہمارے سر آنکھوں پر، لیکن بحیثیت چوکیدار کے ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ آپ کا یہ کام صحیح نہیں۔

اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خطبات وتحریرات)

جلد نمبر ۳

اسلام اور حسنِ معاملات

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ”اسلام اور ہماری زندگی“ انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

اسلام اور حُسنِ معاملات

جلد ۳

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۳

اسلام اور حُسنِ معاملات

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اُردو بازار کراچی ★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور
فون ۳۷۳۵۳۲۵۵، ۳۷۲۲۳۵۹۱ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱ فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۳۷۸۵

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعۂ خطبات و تحریرات

جلد ۳

اسلام اور حسن معاملات

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان ___ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان ___ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

تجارت دین بھی، دنیا بھی ۱۷

مسلمان کی زندگی کا بنیادی پتھر ۱۷
تاجروں کا حشر، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ۱۸
تاجروں کا حشر، فاجروں کے ساتھ ۱۸
تاجروں کی دو قسمیں ۱۹
تجارت جنت کا سبب یا جہنم کا سبب ۱۹
ہر کام میں دو زاویے ۲۲
زاویہ نگاہ بدل دیں ۲۲
کھانا کھانا عبادت ہے ۲۲
حضرت ایوب علیہ السلام اور سونے کی تتلیاں ۲۲
نگاہ نعمت دینے والے کی طرف ہو ۲۱
اسی کا نام تقویٰ ہے ۲۱
صحبت سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے ۲۱
ہدایت کے لئے صرف کتاب کافی نہ تھی ۲۳
صرف کتابیں پڑھ کر ڈاکٹر بننے کا نتیجہ ۲۴
متقی کی صحبت اختیار کریں ۲۴

تجارت کی فضیلت ۲۵

قرآن میں مال و دولت کا ذکر ۲۵
دنیا میں مال واسباب کی مثال ۲۶
مسلمان تاجر کا خاصہ ۲۷
آیت کا شان نزول ۲۹
''لہو'' کی وضاحت ۲۹
''الیہا'' کی ضمیر مفرد ہونے کی وجہ ۲۹
سودے کے صحیح ہونے کے لئے تنہا رضامندی کافی نہیں ۳۰

تدبیر اور روزگار ۳۱

حضرت محمد ﷺ کی معاشی زندگی ۳۱
ضروریات کا اہتمام توکل کے منافی نہیں ۳۲
توکل کی اصل حقیقت ۳۳
انسانی مزاج کا فرق ۳۳
ایک بزرگ کا انوکھا واقعہ ۳۳
انسانی دل کی دو حالتیں ۳۵
ہر اطاعت، ذکر اللہ کے مترادف ہے ۳۵
دل کو اللہ کے لئے فارغ کیجئے! ۳۵
دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے ۳۶
حصول رزق کی فکر ممنوع نہیں ۳۷
مولانا مسیح اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ارشاد ۳۸
حصول روزگار میں افراط سے بچنا ضروری ہے ۳۹
اسلام کی معتدل تعلیم ۴۰
نبی کریم ﷺ کا زہد ۴۰

خلاصۂ کلام ۴۱

تجارت کے کچھ آداب ۴۲

دکاندار سے زبردستی پیسے کم کرا کے کوئی چیز خریدنا ۴۳
یہ بھی دین کے مقاصد میں داخل ہے ۴۴
دنیا میں تاجروں کے ذریعے اشاعت اسلام ۴۵
دنیا میں تاجروں کے ذریعے اشاعت اسلام ۴۵
اپنی نوعیت کا ایک عجیب واقعہ ۴۶
حق میں سرنگوں اور باطل میں ابھرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے ۴۸
معاشرے کی اصلاح فرد سے ہوتی ہے ۵۰

گناہ کا انجام، رزق سے محرومی ۵۱

استغفار کے ساتھ گناہ پر اصرار مضر ہے ۵۱
اللہ کے نیک بندوں کی ایک صفت ۵۲
توبہ کی شرائط ۵۳
''استغفار'' کو حرز جان بنائیے ۵۴
گناہ کی نحوست، رزق سے محرومی ۵۵
رزق کا وسیع مفہوم ۵۶
تمام کمالاتِ انسانیہ رزق ہیں ۵۷
علم وہنر بھی رزق ہیں ۵۷
گناہ سے دل پر زنگ لگ جاتا ہے ۵۸
نیکی کا شوق بھی رزق ہے ۵۹
صوفیائے کرام کی دو حالتیں، بسط اور قبض ۶۰
استغفار، رزق کا دروازہ کھولتا ہے ۶۰
گناہ اور خوشحالی کا اجتماع خطرناک ہے ۶۱
''استدراج'' کی حقیقت ۶۲
زمانے کے تازیانوں سے سبق سیکھو ۶۲
مصیبتیں گناہوں کا کفارہ بھی ہوتی ہیں ۶۳
مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ۶۴

موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض ۶۶

دین صرف مسجد تک محدود نہیں ۶۷
تلاوت قرآن کریم سے آغاز ۶۷
قرآن کریم ہم سے فریاد کر رہا ہے ۶۷
اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ ۶۸
دو معاشی نظریے ۶۸
اشتراکیت کے وجود میں آنے کے اسباب ۶۹
سرمایہ دارانہ نظام میں خرابیاں موجود ہیں ۶۹
سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ ۷۰
سرمایہ دارانہ نظام کی اصل خرابی ۷۰
ایک امریکی افسر سے ملاقات ۷۱
صرف اسلام کا نظام معیشت منصفانہ ہے ۷۲
قارون اور اس کی دولت ۷۲
قارون کو چار ہدایات ۷۳
پہلی ہدایت، آخرت کی بہبود کی فکر ۷۳

قوم شعیب علیہ السلام اور سرمایہ دارانہ ذہنیت	۷۴
مال و دولت اللہ کی عطا ہے	۷۵
مسلم اور غیر مسلم میں تین فرق	۷۵
تاجروں کی دو قسمیں	۷۶
دوسری ہدایت، دنیاوی ضروریات کا خیال	۷۷
یہ دنیا ہی سب کچھ نہیں	۷۷
کیا انسان ایک معاشی جانور ہے؟	۷۸
تیسری ہدایت، مال کو امورِ خیر میں خرچ کیجئے	۷۹
چوتھی ہدایت، زمین پر فساد مت پھیلاؤ	۷۹
دنیا کے سامنے نمونہ پیش کریں	۷۹
کیا ایک آدمی معاشرے میں تبدیلی لاسکتا ہے؟	۸۰
حضور ﷺ کس طرح تبدیلی لائے	۸۰
ہر شخص اپنے اندر تبدیلی لائے	۸۰

جدید معاشی مسائل اور نظریات ایک نظر میں

دین کا ایک اہم شعبہ ”معاملات“	۸۲
معاملات کے میدان میں دین سے دوری کی وجہ	۸۳
معاملات کی اصلاح کا آغاز	۸۴
ایک اہم کوشش	۸۵
نظامہائے معیشت	۸۵
سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کیا ہیں؟	۸۶
بنیادی معاشی مسائل	۸۶

سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism)

	۸۹
قانونِ قدرت	۸۹
آمدنی کی تقسیم (Distribution of Income)	۹۰
چوتھا مسئلہ، ترقی (Development)	۹۳
سرمایہ دارانہ نظام کے اصول	۹۴

اشتراکیت (Socialism)

	۹۴
سرمایہ دارانہ نظام پر تنقیدیں	۹۵
اشتراکی نظام پر تبصرہ	۹۸
الجزائر کا ایک چشم دید واقعہ	۱۰۰
سرمایہ دارانہ نظام پر تبصرہ	۱۰۱
ماڈل گرل (Model Girl) کی کارکردگی	۱۰۳
عصمت فروشی کا قانونی تحفظ	۱۰۳
دنیا کا مہنگا ترین بازار	۱۰۴
امیر ترین ملک میں دولت و غربت کا امتزاج	۱۰۵
معیشت کے اسلامی احکام	۱۰۵
خدائی پابندیاں	۱۰۶
حکومتی پابندیاں	۱۰۶

اصول فقہ کا ایک حکم امتناعی (سدِّ ذرائع)	۱۰۶
ایک اشکال اور اس کا جواب	۱۰۸
مخلوط معیشت کا نظام (Mixed Economy)	۱۰۹

سودی نظام کی خرابیاں اور اس کا متبادل

۱۱۱

سودی معاملہ کرنے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ	۱۱۱
سود کس کو کہتے ہیں؟	۱۱۲
معاہدہ کے بغیر زیادہ دینا سود نہیں	۱۱۲
قرض کی واپسی کی عمدہ شکل	۱۱۳
قرآن کریم نے کس ''سود'' کو حرام قرار دیا؟	۱۱۳
تجارتی قرض (Commercial Loan) ابتدائی زمانے میں بھی تھے	۱۱۴
صورت بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی	۱۱۴
ایک لطیفہ	۱۱۵
آج کل کا مزاج	۱۱۵
شریعت کا ایک اصول	۱۱۶
زمانہ نبوت کے بارے میں ایک غلط فہمی	۱۱۶
ہر قبیلہ جائنٹ اسٹاک کمپنی ہوتا تھا	۱۱۶
سب سے پہلے چھوڑا جانے والا سود	۱۱۷
عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں بینکاری کی ایک مثال	۱۱۸
سود مرکب اور سود مفرد دونوں حرام ہیں	۱۱۸
موجودہ بینکنگ انٹرسٹ بالاتفاق حرام ہے	۱۱۹
کمرشل لون پر انٹرسٹ میں کیا خرابی ہے؟	۱۲۰
آپ کو نقصان کا خطرہ (Risk) بھی برداشت کرنا ہوگا	۱۲۰
آج کل کے انٹرسٹ کے نظام کی خرابی	۱۲۱
ڈیپازیٹر ہر حال میں نقصان میں ہے	۱۲۱
سود کی رقم مصارف میں شامل ہوتی ہے	۱۲۲
شرکت کا فائدہ	۱۲۲
نفع کسی کا اور نقصان کسی اور کا	۱۲۲
بیمہ کمپنی سے کون فائدہ اٹھا رہا ہے	۱۲۳
سود کی عالمی تباہ کاری	۱۲۳
سودی طریقہ کار کا متبادل	۱۲۴
ناگزیر چیزوں کو شریعت میں ممنوع قرار نہیں دیا گیا	۱۲۴
سودی قرض کا متبادل قرض حسنہ ہی نہیں ہے	۱۲۵
سودی قرض کا متبادل ''مشارکت'' ہے	۱۲۵
مشارکت کے بہترین نتائج	۱۲۶
''مشارکت'' میں عملی دشواری	۱۲۷
اس دشواری کا حل	۱۲۷
دوسری متبادل صورت ''اجارہ''	۱۲۸
تیسری متبادل صورت ''مرابحہ''	۱۲۸
پسندیدہ متبادل کونسا ہے؟	۱۲۹

عصر حاضر میں اسلامی معیشت کے ادارے	۱۳۰

سود کی حرمت اور موجودہ نظام بینکاری ۱۳۱

کاتب سود کا حکم شرعی	۱۳۱
بینک کی ملازمت کیوں جائز نہیں؟	۱۳۲
ربوا القرآن اور ربوا الحدیث	۱۳۲
سود مفرد اور سود مرکب دونوں حرام ہیں	۱۳۳
سود خور سے اللہ تعالیٰ کا اعلان جنگ	۱۳۴
کیا موجودہ بینکوں کا سود حرام نہیں؟	۱۳۴
تجارتی قرضوں پر سود کی حقیقت	۱۳۵
سود کے جواز پر استدلال	۱۳۶
سود کے جواز کے قائلین	۱۳۷
حکم حقیقت پر لگتا ہے، صورت پر نہیں	۱۳۷
ایک لطیفہ، گانا بجانا حرام نہ ہوتا	۱۳۸
پھر تو خنزیر بھی حلال ہونا چاہئے!	۱۳۸
''سود'' کی حقیقت	۱۳۹
قرض کی واپسی کی عمدہ شکل	۱۳۹
حضور ﷺ کے زمانے میں تجارتی پھیلاؤ	۱۴۰
حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ	۱۴۱
سب سے پہلے چھوڑا جانے والا سود	۱۴۱
عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں بینک کاری کی مثالیں	۱۴۲
سود کو جائز کہنے والوں کا ایک اور استدلال	۱۴۳
علت اور حکم میں فرق	۱۴۴
شراب حرام ہونے کی حرمت	۱۴۴
شرعی احکام میں غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں	۱۴۵
نفع اور نقصان دونوں میں شرکت کریں	۱۴۶
قرض دینے والے پر زیادہ ظلم ہے	۱۴۷
سود کا ادنیٰ شعبہ اپنی ماں سے زنا کے برابر ہے	۱۴۹

سود لینے سے بخل بڑھتا ہے ۱۵۰

ایک سوداگر کا عجیب واقعہ	۱۵۱
ایک بڑے سرمایہ دار کا قول	۱۵۱
غریب اور امیر کے خرچ کرنے میں فرق	۱۵۲
سود کی ذہنیت بخل پیدا کرتی ہے	۱۵۲
یہودی ''شائی لاک'' کا قصہ	۱۵۳
ہندو، سود خور قوم	۱۵۴
مالیاتی گناہ بخل پیدا کرتے ہیں	۱۵۴
یہ دعا کثرت سے کریں	۱۵۵
حلال طریقے سے مال میں اضافے کی کوشش کرنا جائز ہے	۱۵۵

اشیاء کی حلت وحرمت ۱۵۷

اگر مشروع اور غیر مشروع دو سبب پائے جائیں تو جانور حلال نہیں	۱۵۸
حلت اور حرمت کے بارے میں بنیادی اصول	۱۵۰

صرف احتمال کی بنیاد پر اشیاء کو حرام نہیں کہا جائے گا	۱۵۹
ڈبوں میں پیک شدہ گوشت	۱۶۰
گوشت اور دوسری اشیاء میں فرق کی وجہ	۱۶۱
صرف شک وشبہ کی وجہ سے حرمت نہیں آتی	۱۶۱
زیادہ تحقیق میں بھی نہیں پڑنا چاہئے	۱۶۲
حرام مال سے بچیں اور ہمیشہ سچ بولیں	۱۶۴
مال کی پاکیزگی سے کیا مراد ہے؟	۱۶۴
حرام مال کی دنیاوی بے برکتی	۱۶۵
حرام مال کا سب سے بڑا نقصان	۱۶۶
مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۱۶۶
حرام مال بے حسی پیدا کرتا ہے	۱۶۷
حرام کھانے والے کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں	۱۶۷
رزق کے حرام ہونے کی مختلف صورتیں	۱۶۸
جھوٹ بول کر چیز بیچنا حرام ہے	۱۶۸
ملازمت میں کام چوری حرام ہے	۱۶۸
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے کا اصول	۱۶۹
بے برکتی اور بدعنوانی کا عذاب	۱۷۰
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدتِ احتیاط	۱۷۱
کسی کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں	۱۷۲
چند معاشرتی برائیوں پر تبصرہ	۱۷۲
حلال وحرام کی تمیز مٹتی جارہی ہے	۱۷۴
سچائی کو اپنا شعار بنائیے	۱۷۵
حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صداقت	۱۷۵
جھوٹے سرٹیفکیٹ جھوٹی گواہی ہیں	۱۷۶
دوسروں کے راز کی حفاظت کیجئے	۱۷۷
حرام مال سے بچاؤ	۱۷۹
ناپ تول میں کمی اور اس کا وبال	۱۸۳
کم تولنا، ایک عظیم گناہ	۱۸۳
حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا جرم	۱۸۴
حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب	۱۸۵
یہ آگ کے انگارے ہیں	۱۸۶
اجرت کم دینا گناہ ہے	۱۸۶
مزدور کو مزدوری فوراً دے دو!	۱۸۷
نوکر کو کھانا کیسا دیا جائے؟	۱۸۷
ملازمت کے اوقات میں ڈنڈی مارنا	۱۸۷
ایک ایک منٹ کا حساب ہوگا	۱۸۸
دار العلوم دیوبند کے اساتذہ کا حال	۱۸۸
کہیں تنخواہ حرام نہ ہو جائے	۱۸۹
سرکاری دفاتر کا حال	۱۸۹
اللہ تعالیٰ کے حقوق میں کوتاہی	۱۹۰
ملاوٹ کرنا حق تلفی ہے	۱۹۰

اگر تھوک فروش ملاوٹ کرے؟	۱۹۱
خریدار کے سامنے وضاحت کر دے	۱۹۱
عیب کے بارے میں گاہک کو بتا دے	۱۹۱
دھوکہ دینے والا ہم میں سے نہیں	۱۹۲
امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دیانتداری	۱۹۲
آج ہمارا حال	۱۹۳
بیوی کے حقوق میں کوتاہی گناہ ہے	۱۹۳
مہر معاف کرانا حق تلفی ہے	۱۹۴
نفقہ میں کمی حق تلفی ہے	۱۹۵
یہ ہمارے گناہوں کا وبال ہے	۱۹۵
حرام کے پیسوں کا نتیجہ	۱۹۶
عذاب کا سبب گناہ ہیں	۱۹۶
یہ عذاب سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا	۱۹۷
غیر مسلموں کی ترقی کا سبب	۱۹۷
مسلمانوں کا طرۂ امتیاز	۱۹۸
''تطفیف'' سے متعلق تحقیق کا خلاصہ	۱۹۸
دوہرے پیمانے	۲۰۰
حلال روزگار نہ چھوڑیں	۲۰۵
رزق کا ذریعہ، اللہ کی جانب سے ہے	۲۰۵
روزگار اور معیشت کا نظام خداوندی	۲۰۶
تقسیم رزق کا حیرت ناک واقعہ	۲۰۷
رات کو سونے اور دن میں کام کرنے کا فطری نظام	۲۰۸
رزق کا دروازہ بند مت کرو	۲۰۸
یہ عطاء خداوندی ہے	۲۰۹
ہر معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے	۲۰۹
حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے خلافت کیوں نہیں چھوڑی؟	۲۱۰
خدمت خلق کا منصب عطاء خداوندی ہے	۲۱۰
حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ	۲۱۱
عیدی زیادہ طلب کرنے کا واقعہ	۲۱۲
خلاصہ	۲۱۳
رزق حلال کی طلب، ایک دینی فریضہ	۲۱۵
رزق حلال کی طلب دوسرے درجے کا فریضہ	۲۱۵
رزق حلال کی طلب دین کا حصہ ہے	۲۱۶
اسلام میں ''رہبانیت'' نہیں	۲۱۶
حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور رزق حلال کے طریقے	۲۱۷
مومن کی دنیا بھی دین ہے	۲۱۷
بعض صوفیاء کرام کا توکل کر کے بیٹھ جانا	۲۱۸
طلب ''حلال'' کی ہو	۲۱۹
محنت کی ہر کمائی حلال نہیں ہوتی	۲۱۹
یہ روزگار حلال ہے یا حرام؟	۲۲۰
بینک کا ملازم کیا کرے؟	۲۲۰
حلال روزی کی برکت	۲۲۰
برکت خریدی نہیں جا سکتی	۲۲۱
تنخواہ کا یہ حصہ حرام ہو گیا	۲۲۱

تھانہ بھون کے مدرسہ کے اساتذہ کا تنخواہ کٹوانا	۲۲۲
ٹرین کے سفر میں پیسے بچانا	۲۲۲
زائد سامان کا کرایہ	۲۲۳
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سفر	۲۲۳
یہ حرام پیسے رزق حلال میں شامل ہو گئے	۲۲۴
یہ بے برکتی کیوں نہ ہو	۲۲۴
ٹیلیفون اور بجلی کی چوری	۲۲۵
حلال و حرام کی فکر پیدا کریں	۲۲۵
یہاں تو آدمی بنائے جاتے ہیں	۲۲۵
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خلیفہ کا سبق آموز واقعہ	۲۲۶
حرام مال حلال مال کو بھی تباہ کر دیتا ہے	۲۲۷
رزق کی طلب مقصودِ زندگی نہیں	۲۲۷
رزق کی طلب میں فرائض کا ترک جائز نہیں	۲۲۸
ایک ڈاکٹر صاحب کا استدلال	۲۲۸
ایک لوہار کا قصہ	۲۲۹
نماز کے وقت کام بند	۲۳۰
ٹکراؤ کے وقت یہ فریضہ چھوڑ دو	۲۳۰
ایک جامع دعا	۲۳۱
خلاصہ	۲۳۱
اپنے معاملات صاف رکھیں!	۲۳۲
تین چوتھائی دین معاملات میں ہے	۲۳۲
معاملات کی خرابی کا عبادت پر اثر	۲۳۳
معاملات کی تلافی بہت مشکل ہے	۲۳۳
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور معاملات	۲۳۴
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سبق آموز واقعہ	۲۳۴
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ	۲۳۵
مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا چند مشکوک لقمے کھانا	۲۳۶
حرام کی دو قسمیں	۲۳۷
ملکیت متعین ہونی چاہئے	۲۳۷
باپ بیٹوں کے مشترک کاروبار	۲۳۷
باپ کے انتقال پر میراث کی تقسیم فوراً کریں	۲۳۸
مشترک مکان کی تعمیر میں حصہ داروں کا حصہ	۲۳۸
حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ملکیت کی وضاحت	۲۳۹
حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط	۲۴۰
حساب اسی دن کرلیں	۲۴۰
امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور تصوف پر کتاب	۲۴۱
دوسروں کی چیز اپنے استعمال میں لانا	۲۴۱
ایسا چندہ حلال نہیں	۲۴۲
ہر ایک کی ملکیت واضح ہونی چاہئے	۲۴۲
مسجد نبوی کے لئے زمین مفت قبول نہ کی	۲۴۳
تعمیر مسجد کے لئے دباؤ ڈالنا	۲۴۳
پورے سال کا نفقہ دینا	۲۴۴

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے برابر کا معاملہ کرنا ۲۴۴
خلاصہ ۲۴۵

معاملات کی صفائی اور تنازعات ۲۴۶

ہمارا معاشی نظام ۲۵۱

امت مسلمہ کی معیشت اور اسلامی خطوط پر اس کا اتحاد ۲۵۹

(۱) خودساختہ انحصار ۲۶۰
(۲) اپنے معاشی نظام کی تعمیر نو ۲۶۴

اسلام اور جدید اقتصادی مسائل ۲۶۸

اسلام ایک نظام زندگی ۲۶۹
''معیشت'' زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ۲۷۰
اصل منزل آخرت ہے ۲۷۰
دنیا کی بہترین مثال ۲۷۱
''معیشت'' کا مفہوم ۲۷۲
(۱) ''ترجیحات کا تعین'' (Determination of Priorities) ۲۷۲
(۲) ''وسائل کی تخصیص'' ۲۷۳
(۳) آمدنی کی تقسیم ۲۷۳
(۴) ترقی ۲۷۳
سرمایہ دارانہ نظام میں ان کا حل ۲۷۴
اشتراکیت میں ان کا حل ۲۷۶
سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی اصول ۲۷۷
اشتراکیت کے بنیادی اصول ۲۷۷
اشتراکیت کے نتائج ۲۷۸
''اشتراکیت'' ایک غیر فطری نظام تھا ۲۷۸
سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں ۲۷۹
اسلام کے معاشی احکام ۲۸۱
(۱) دینی پابندی ۲۸۲
شرکت اور مضاربت کے فوائد ۲۸۴
قمار حرام ہے ۲۸۴
ذخیرہ اندوزی ۲۸۵
(۲) اخلاقی پابندی ۲۸۶
(۳) قانونی پابندی ۲۸۷

موجودہ جاگیری نظام کی تاریخ اور ابتداء ۲۸۹

یورپ کے جاگیری نظام کی حقیقت ۲۹۰
اسلام میں عطاء جاگیر کا مطلب ۲۹۲
انگریزوں کی عطاء جاگیریں ۲۹۵
غداری کے نتیجے میں دی گئیں جاگیروں کا حکم؟ ۲۹۵

انگریز کی طرف سے کسی خدمت کے صلے میں دی گئی جاگیر کا حکم	۲۹۵
سرحد اور پنجاب کے شاملات کا حکم	۲۹۶
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۲۹۶
کیا انگریزوں کی عطا کردہ سب جاگیریں غلط ہیں؟	۲۹۶
مزارعت کا حکم	۲۹۷
سودی رہن رکھنا	۲۹۸
زمین میں وراثت جاری ہونے کا مسئلہ	۲۹۸
اسلام، جمہوریت اور سوشلزم	۳۰۱
حقوق و فرائض	۳۰۶
چوری یہ بھی ہے	۳۱۱
مال میں برکت	۳۱۷
ایک عبرتناک واقعہ	۳۱۹
حصول برکت کا طریقہ	۳۱۹
حضور ﷺ کا حصول برکت کے لئے دعا کی تلقین کرنا	۳۱۹
ظاہری چمک دمک پر نہیں جانا چاہئے	۳۲۰
ظاہری چمک دمک والوں کے لئے عبرتناک واقعہ	۳۲۱
رشوت کا گناہ شراب نوشی اور بدکاری سے بھی زیادہ سنگین ہے	۳۲۳
آپ زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟	۳۲۹
زکوٰۃ نہ نکالنے پر وعید	۳۲۹
یہ مال کہاں سے آرہا ہے؟	۳۳۰
گاہک کون بھیج رہا ہے؟	۳۳۱
ایک سبق آموز واقعہ	۳۳۱
کاموں کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے	۳۳۲
زمین سے اُگانے والا کون ہے؟	۳۳۳
انسان میں پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں	۳۳۳
مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں	۳۳۳
صرف اڑھائی فیصد ادا کرو	۳۳۴
زکوٰۃ کی تاکید	۳۳۴
زکوٰۃ حساب کر کے نکالو	۳۳۵
وہ مال تباہی کا سبب ہے	۳۳۵
زکوٰۃ کے دنیاوی فوائد	۳۳۶
مال میں بے برکتی کا انجام	۳۳۷
زکوٰۃ کا نصاب	۳۳۷
ہر ہر روپے پر سال کا گزرنا ضروری نہیں	۳۳۷
تاریخ زکوٰۃ میں جو رقم ہو اس پر زکوٰۃ ہے	۳۳۸
اموالِ زکوٰۃ کون کون سے ہیں؟	۳۳۸

اموالِ زکوٰۃ میں عقل نہ چلائیں	۳۳۹
عبادت کرنا اللہ کا حکم ہے	۳۳۹
سامانِ تجارت کی قیمت کے تعین کا طریقہ	۳۴۰
مالِ تجارت میں کیا کیا داخل ہے؟	۳۴۰
کس دن کی مالیت معتبر ہوگی؟	۳۴۱
کمپنیوں کے شیئرز پر زکوٰۃ کا حکم	۳۴۱
کارخانہ کی کن اشیاء پر زکوٰۃ ہے	۳۴۲
واجب الوصول قرضوں پر زکوٰۃ	۳۴۳
قرضوں کی منہائی	۳۴۳
قرضوں کی دو قسمیں	۳۴۴
تجارتی قرضے کب منہا کیے جائیں	۳۴۴
قرض کی مثال	۳۴۴
زکوٰۃ مستحق کو ادا کریں	۳۴۵
مستحق کون؟	۳۴۵
مستحق کو مالک بنا کر دیں	۳۴۶
کن رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے	۳۴۶
بیوہ اور یتیم کو زکوٰۃ دینے کا حکم	۳۴۶
بینکوں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا حکم	۳۴۷
اکاؤنٹ کی رقم سے قرض کس طرح منہا کریں؟	۳۴۷
کمپنی کے شیئرز کی زکوٰۃ کاٹنا	۳۴۸
زکوٰۃ کی تاریخ کیا ہونی چاہئے؟	۳۴۸
کیا رمضان المبارک کی تاریخ مقرر کرسکتے ہیں؟	۳۴۹
زکوٰۃ کی ادائیگی سے متعلق اہم سوالات	۳۵۰
چاند کی تاریخ مقرر کرنا	۳۵۰
زیور کی زکوٰۃ کس کے ذمہ ہے؟	۳۵۰
مالک بنا کر دینا ضروری ہے	۳۵۱
پبلسٹی پر زکوٰۃ کی رقم لگانا	۳۵۱
مدارس کے طلبہ کو زکوٰۃ دینا	۳۵۱
تاریخ زکوٰۃ پر نصاب سے کم مال ہونا	۳۵۲
ضرورت سے زائد مال کا مطلب	۳۵۲
ٹیلیویژن ضرورت سے زائد ہے	۳۵۳
تعمیرات پر زکوٰۃ کا حکم	۳۵۳
زکوٰۃ میں کھانا کھلانا	۳۵۳
زکوٰۃ میں کتابیں دینا	۳۵۳
مال تجارت کی قیمت کا تعین	۳۵۳
مالِ تجارت ہی کو زکوٰۃ میں دینے کا حکم	۳۵۴
امپورٹ کئے ہوئے مال پر زکوٰۃ کا حکم	۳۵۴
شمسی تاریخ سے قمری تاریخ کی طرف تبدیلی کس طرح ہوگی؟	۳۵۵
خالص سونے پر زکوٰۃ ہے؟	۳۵۵
مجاہدین کو زکوٰۃ دینا	۳۵۵
تھوڑی تھوڑی کرکے زکوٰۃ دینا	۳۵۵
ایک سے زائد گاڑی پر زکوٰۃ	۳۵۶
کرایہ کے مکان پر زکوٰۃ	۳۵۶
قرض مانگنے والے کو زکوٰۃ	۳۵۶

اگر بینک صحیح مصرف پر زکوٰۃ خرچ نہ کرے؟	۳۵۶
زکوٰۃ کی تاریخ بدلنے کا حکم	۳۵۷
اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے لئے ہوئے قرض کا حکم	۳۵۷
زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے نیت ضروری ہے	۳۵۷
اپنے ملازم کو زکوٰۃ دینا	۳۵۸
طلبہ کو وظیفے کے طور پر زکوٰۃ دینا	۳۵۸
شیئرز پر ملنے والا سالانہ منافع پر زکوٰۃ کا حکم	۳۵۸
شیئرز کی کون سی قیمت معتبر ہوگی؟	۳۵۸
ضرورت سے زائد سامان کے ہوتے ہوئے زکوٰۃ دینا	۳۵۹
مریضوں کو زکوٰۃ کی مد سے دوا دینا	۳۵۹
بوں کے زیور پر زکوٰۃ کا حکم	۳۵۹
کیا زیور فروخت کرکے زکوٰۃ ادا کریں؟	۳۶۰
تاریخ زکوٰۃ پر حساب ضرور کرلیں	۳۶۰
پگڑی کی رقم پر زکوٰۃ کا حکم	۳۶۰
گڈول پر فروخت کی ہوئی بلڈنگ پر زکوٰۃ	۳۶۱
جس قرضے کی واپسی کی امید نہ ہو اس کا حکم	۳۶۱

تجارت دین بھی، دنیا بھی ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ، وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِیَّنَا وَحَبِیْبَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (۱)

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ)) (۲)

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ((اَلتُّجَّارُ یُحْشَرُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقٰی وَبَرَّ وَصَدَقَ)) (۳)

مسلمان کی زندگی کا بنیادی پتھر

بزرگان محترم و برادران عزیز! پہلے بھی ایک مرتبہ بھائی امان اللہ صاحب کی دعوت پر میری یہاں حاضری ہو چکی ہے، اور یہ ان کی اور دوستوں کی محبت کی بات ہے کہ دوبارہ ایک ایسا اجتماع

☆ اصلاحی خطبات (۳/۲۳۶ تا ۲۴۵) بمقام مکان یوسف غنی صاحب، کلفٹن، کراچی

(۱) التوبۃ: ۱۱۹

(۲) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء فی التجار وتسمیۃ النبی إیاھم، رقم: ۱۱۳۰، سنن الدارمی، کتاب البیوع، باب فی التاجر الصدوق، رقم: ۲٤۲۷

(۳) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء فی التجار وتسمیۃ النبی إیاھم، رقم: ۱۱۳۱، سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، رقم: ۲۱۳۷، سنن الدارمی، کتاب البیوع، رقم: ۲٤۲٦

انہوں نے منعقد فرمایا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ پچھلی مرتبہ جس طرح کچھ سوالات کئے گئے تھے، جن کا میری اپنی ناقص معلومات کی حد تک جو جواب بن پڑا، وہ دے دیا تھا، خیال یہ تھا کہ آج بھی اسی قسم کی مجلس ہوگی، کوئی تقریر یا بیان پیش نظر نہیں تھا، لیکن بھائی صاحب فرما رہے ہیں کہ ابتداء میں دین کی اور ایمان ویقین کی باتیں ہو جائیں، تو دین کی بات بیان کرنے سے تو کبھی انکار نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ دین ایک مسلمان کی زندگی کا بنیادی پتھر ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس پتھر کو مضبوطی سے تھامنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تاجروں کا حشر، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ

اس مجمع میں جو دوست واحباب موجود ہیں، ان میں سے اکثر کا تعلق چونکہ تجارت سے ہے، اس لئے اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں میرے ذہن میں آئیں، اور پھر قرآن کریم کی ایک آیت بھی میں نے تلاوت کی، جس سے ان دونوں حدیثوں کے مضمون کی وضاحت ہوتی ہے، اور یہ دونوں حدیثیں بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں متضاد نہیں ہیں، ایک حدیث میں نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ))(۱)

''جو تاجر تجارت کے اندر سچائی اور امانت کو اختیار کرے تو وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا''

یہ تجارت جس کو ہم اور آپ دنیا کا ایک کام سمجھتے ہیں، اور دل میں یہ خیال رہتا ہے کہ یہ تجارت ہم اپنے پیٹ کی خاطر کر رہے ہیں، اور اس کا بظاہر دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تاجر میں دو باتیں پائی جائیں، ایک یہ کہ وہ صدوق ہو، اور امین ہو، صدوق کے لفظی معنی ہیں ''سچا'' اور امین کے معنی ہیں ''امانت دار'' اگر یہ دو صفتیں اس میں پائی جائیں تو قیامت کے دن وہ انبیاء کے ساتھ اٹھایا جائے گا، ایک سچائی اور ایک امانت۔

تاجروں کا حشر، فاجروں کے ساتھ

اور دوسری حدیث جو بظاہر اس کے متضاد ہے وہ یہ ہے:

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء فی التجار وتسمیة النبی إیاھم، رقم: ۱۱۳۰، سنن الدارمی، کتاب البیوع، باب فی التاجر الصدوق، رقم: ۲٤۲۷

((اَلتُّجَّارُ يُحْشَرُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقٰى وَبَرَّ وَصَدَقَ))(۱)

''تجار'' قیامت کے دن فجار بنا کر اٹھائے جائیں گے،'' فجار'' فاجر کی جمع ہے، یعنی فاسق وفاجر اور گناہگار، جو اللہ تعالیٰ کی معصیتوں کا ارتکاب کرنے والا ہے، سوائے اس شخص کے جو تقویٰ اختیار کرے، اور نیکی اختیار کرے، اور سچائی اختیار کرے۔

تاجروں کی دو قسمیں

یہ دونوں حدیثیں انجام کے لحاظ سے بظاہر متضاد نظر آتی ہیں کہ پہلی حدیث میں فرمایا کہ نبیوں کے ساتھ ہوں گے، صدیق اور شہداء کے ساتھ ہوں گے، اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ فساق اور فجار کے ساتھ ہوں گے، لیکن الفاظ کے ترجمہ ہی سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ حقیقت میں دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ تاجروں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ایک قسم وہ ہے جو انبیاء اور صدیقین کے ساتھ ہوگی اور ایک قسم وہ ہے جو فاجروں اور فاسقوں کے ساتھ ہوگی۔

اور دونوں قسموں میں فرق بیان کرنے کے لئے جو شرائط بیان فرمائیں وہ یہ ہیں کہ سچائی ہو، امانت ہو، تقویٰ ہو، نیکی ہو تو پھر وہ تاجر پہلی قسم میں داخل ہے اور اس کو انبیاء کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور اگر یہ شرائط اس کے اندر نہ ہوں، بلکہ صرف پیسہ حاصل کرنا مقصود ہو، جس طرح بھی ممکن ہو، چاہے دوسرے کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر ہو، دھوکے دے کر ہو، فریب دے کر ہو، جھوٹ بول کر ہو، دغا دے کر ہو، کسی بھی ناجائز طریقے سے ہو تو پھر وہ تاجر دوسری قسم میں داخل ہے کہ اس کو فاسقوں اور فاجروں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

تجارت جنت کا سبب یا جہنم کا سبب

اگر ان دونوں حدیثوں کو ہم ملا کر دیکھیں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو تجارت ہم کر رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم چاہیں تو اس تجارت کو جنت تک پہنچنے کا راستہ بنالیں، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ حشر ہونے کا ذریعہ بنالیں، اور اگر چاہیں تو اسی تجارت کو جہنم کا راستہ بنالیں اور فساق فجار کے ساتھ حشر ہونے کا ذریعہ بنالیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس دوسرے انجام سے ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله، باب ماجاء فی التجار وتسمیة النبی إیاهم، رقم: ۱۱۳۱، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، رقم: ۲۱۳۷، سنن الدارمی، کتاب البیوع، رقم: ۲٤۲٦

ہر کام میں دو زاویئے

اور یہ بات صرف تجارت کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ دنیا کے جتنے کام ہیں، خواہ وہ ملازمت ہو، خواہ وہ تجارت ہو، خواہ وہ زراعت ہو، یا کوئی اور دنیا کا کام ہو، ان سب میں یہی بات ہے کہ اگر اس کو انسان ایک زاویئے سے دیکھے تو وہ دنیا ہے، اور اگر دوسرے زاویئے سے دیکھے تو وہی دین بھی ہے۔

زاویہ نگاہ بدل دیں

یہ دین درحقیقت صرف زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے، اگر آپ وہی کام دوسرے زاویہ سے کریں، دوسری نیت سے کریں، دوسرے ارادے سے کریں، دوسرے نقطہ نظر سے کریں تو وہی چیز جو بظاہر خالص دنیاوی چیز نظر آرہی تھی دین بن جاتی ہے۔

کھانا کھانا عبادت ہے

اگر انسان کھانا کھا رہا ہے، تو بظاہر انسان اپنی بھوک دور کرنے کے لئے کھانا کھا رہا ہے، لیکن اگر کھانا کھاتے وقت یہ نیت ہو کہ میرے نفس کا مجھ پر حق ہے، میری ذات کا، میرے وجود کا مجھ پر حق ہے، اور اس حق کی ادائیگی کے لئے میں یہ کھانا کھا رہا ہوں، اور اس لئے کھا رہا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور اس نعمت کا حق یہ ہے کہ میں اس کی طرف اشتیاق کا اظہار کروں، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اس کو استعمال کروں۔ تو وہی کھانا جو بظاہر لذت حاصل کرنے کا ذریعہ تھا اور بظاہر بھوک دور کرنے کا ذریعہ تھا، پورا کھانا دین اور عبادت بن جائے گا۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور سونے کی تتلیاں

لوگ سمجھتے ہیں کہ دین یہ ہے کہ دنیا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاؤ، اور اللہ اللہ کرو، بس یہی دین ہے، حضرت ایوب علیہ السلام کا نام آپ نے سنا ہوگا، کون مسلمان ہے جو ان کے نام سے واقف نہیں ہے۔ بڑے جلیل القدر پیغمبر ہیں اور بڑی ابتلا اور آزمائش سے گزرے ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا ایک واقعہ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ وہ غسل کر رہے تھے، اور غسل کے دوران آسمان سے ان پر سونے کی تتلیوں کی بارش شروع ہوگئی،

تو حضرت ایوب علیہ السلام غسل چھوڑ چھاڑ کر ان تتلیوں کو پکڑنے اور جمع کرنے میں لگ گئے۔ اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام سے پوچھا کہ اے ایوب! کیا ہم نے تم کو پہلے ہی بے شمار نعمتیں نہیں دے رکھی ہیں؟ تمہاری ضروریات کا سارا انتظام کر رکھا ہے، ساری کفالت کر رکھی ہے، پھر بھی تمہیں حرص ہے، اور تتلیوں کو جمع کرنے کی طرف بھاگ رہے ہو؟ حضرت ایوب علیہ السلام نے کیا عجیب جواب دیا کہ اے پروردگار!

((لَا غِنٰی بِیْ عَنْ بَرَکَتِكَ))(۱)

''میں تیری عطا کردہ برکت سے تو مستغنی نہیں ہو سکتا''

جب آپ میرے اوپر کوئی نعمت نازل فرمائیں تو یہ بات ادب کے خلاف ہے کہ میں اس سے بے نیازی کا اظہار کروں۔

جب آپ خود اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرما رہے ہیں تو اب اگر میں بیٹھا رہوں اور یہ کہوں کہ مجھے یہ سونا چاندی نہیں چاہئے میں تو اس پر ٹھوکر مارتا ہوں تو یہ بے ادبی کی بات ہے۔ جب آپ دے رہے ہیں تو میرا یہ فرض ہے کہ میں اشتیاق کے ساتھ اس کو لوں اس کی قدر پہچانوں اور اس کا شکر یہ ادا کروں۔ اس لئے میں آگے بڑھ کر جمع کر رہا ہوں، یہ ایک پیغمبر کی آزمائش تھی۔ ورنہ اگر کوئی عام قسم کا خشک دین دار ہوتا تو وہ یہ کہتا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، میں تو اس دنیا کو ٹھوکر مارتا ہوں۔ لیکن وہ چونکہ حقیقت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہی چیز اگر اس نقطہ نظر سے حاصل کی جائے کہ میرے پروردگار کی دی ہوئی ہے، اور اس کی نعمت ہے، میں اس کی قدر پہچانوں، اس کا شکر ادا کروں تو پھر یہ دنیا نہیں ہے بلکہ یہ دین ہے۔

نگاہ نعمت دینے والے کی طرف ہو

ہم لوگ پانچ بھائی تھے، اور سب برسر روزگار اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے، کبھی کبھی عید وغیرہ کے موقع پر جب ہم اکٹھے ہوتے تو حضرت والد صاحب ہمیں بعض اوقات عیدی دیا کرتے تھے، وہ عیدی کبھی ۲۰ روپے کبھی ۲۵ روپے اور کبھی ۳۰ روپے ہوتی، مجھے یاد ہے کہ جب والد صاحب ۲۵ روپے دیتے تو ہم کہتے کہ نہیں ہم ۳۰ روپے لیں گے، اور جب وہ ۳۰ روپے دیتے تو ہم کہتے کہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الغسل، باب من اغتسل عریانا وحده فی الخلوة ومن تستر، رقم: ۲۷۰، سنن النسائی، کتاب الغسل والتیمم، باب الاستتار عن الاغتسال، رقم: ٤٠٦، مسند أحمد، مسند ابی هريرة، رقم: ۷۸۱۲

نہیں ہم ۳۵ روپے لیں گے، اور تقریباً یہ صورت ہر گھر میں ہوتی ہے کہ اولاد چاہے جوان ہوگئی ہو، برسر روزگار ہوگئی ہو، کمارہی ہو لیکن اگر باپ دے رہا ہے تو اس سے مچل مچل کر مانگتے ہیں کہ اور دے دیں، حالانکہ وہ باپ کی طرف سے جو ۳۰ روپے دیئے گئے اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اس لئے کہ ہم میں سے ہر بھائی ہزاروں روپے کمانے والا تھا، لیکن پھر اس ۳۰ روپے کا شوق، رغبت، اشتیاق اور اس کو حاصل کرنے کے لئے بار بار مچلنا یہ سب کیوں تھا؟

بات دراصل یہ ہے کہ نگاہ اس روپے پر نہیں تھی کہ ۳۰ روپے مل رہے ہیں، بلکہ نگاہ اس دینے والے کے ہاتھ کی طرف تھی، کہ وہ ۳۰ روپے کس دینے والے ہاتھ سے مل رہے ہیں۔ یہ ایک باپ کی طرف سے مل رہے ہیں، اور یہ ایک محبت کا اظہار ہے یہ ایک شفقت کا اظہار ہے، یہ ایک نعمت کا اظہار ہے لہٰذا اس کا ادب یہ ہے کہ اس کو اشتیاق کے ساتھ لیا جائے، اس کی قدر پہچانی جائے، چنانچہ اس کو خرچ نہیں کرتے تھے، بلکہ اٹھا کر لفافے میں بند کر کے رکھ دیتے کہ یہ میرے باپ کے دیئے ہوئے ہیں۔ اگر وہی ۳۰ روپے کسی دوسرے آدمی کی طرف سے ملیں، اور انسان اس میں لالچ اور رغبت کا اظہار کرے، اور اس سے کہے کہ مجھے ۳۰ روپے کے بجائے ۳۵ روپے دو، تو یہ شرافت اور مروت کے خلاف ہے۔

اسی کا نام تقویٰ ہے

دین درحقیقت زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے، اور یہی زاویہ نگاہ جب بدل جاتا ہے تو قرآن کی اصطلاح میں اسی کا نام تقویٰ ہے یعنی میں دنیا کے اندر جو کچھ کر رہا ہوں، چاہے کھا رہا ہوں، چاہے سو رہا ہوں، چاہے کما رہا ہوں اللہ کے لئے کر رہا ہوں، اللہ کے احکام کے مطابق کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ کی مرضی پیش نظر رکھ کر کر رہا ہوں، اور پھر اس تقویٰ کے ساتھ تجارت کریں، تو یہ تجارت دنیا نہیں بلکہ یہ دین ہے، اور یہ جنت تک پہنچانے والی ہے، اور نبیوں کے ساتھ حشر کرانے والی ہے۔

صحبت سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے

عموماً دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ کس طرح حاصل ہو؟ یہ زاویہ نگاہ کس طرح بدلا جائے؟ تو اس کے جواب کے لئے میں نے شروع میں یہ آیت تلاوت کی تھی:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (۱)

(۱) التوبة: ۱۱۹

اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو۔ قرآن کریم کا اصول یہ ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس پر عمل کرنے کا راستہ بھی بتاتا ہے اور ایسا راستہ بتاتا ہے جو ہمارے اور آپ کے لئے آسان ہوتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ محض کسی کام کا حکم نہیں دیتے بلکہ ساتھ میں ہماری ضروریات، ہماری حاجتیں اور ہماری کمزوریوں کا احساس فرما کر ہمارے لئے آسان راستہ بھی بتاتے ہیں، تو تقویٰ حاصل کرنے کا آسان راستہ بتادیا:

﴿وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾

''سچے لوگوں کی صحبت اختیار کرو''

یہ صحبت جب تمہیں حاصل ہوگی تو اس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اندر بھی تقویٰ پیدا ہوجائے گا۔ ویسے کتاب میں تقویٰ کی شرائط پڑھ کر تقویٰ اختیار کرنے کی کوشش کروگے تو یہ راستہ بہت مشکل نظر آئے گا، لیکن قرآن نے اس کے حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ بتلادیا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی دولت عطا فرمائی ہو دوسرے لفظوں میں جس کو صدق کی دولت حاصل ہو، اس کی صحبت اختیار کرلو، کیونکہ صحبت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کی صحبت اختیار کی جاتی ہے، اس کا رنگ رفتہ رفتہ انسان پر چڑھ جاتا ہے۔

ہدایت کے لئے صرف کتاب کافی نہ تھی

اور دین کو حاصل کرنے اور دین کو سمجھنے کا بھی یہی راستہ ہے، نبی کریم سرور دو عالم ﷺ اسی لئے تشریف لائے، ورنہ سیدھی بات تو یہ تھی کہ صرف قرآن کریم نازل کردیا جاتا، اور مشرکین مکہ کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ ہمارے اوپر قرآن کریم کیوں نازل نہیں ہوتا؟ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ کتاب اس طرح نازل کردیتے کہ جب لوگ صبح بیدار ہوتے تو ہر شخص بہت اچھا اور خوبصورت بائنڈنگ شدہ قرآن کریم اپنے سرہانے موجود پاتا، اور آسمان سے آواز آجاتی کہ یہ کتاب تمہارے لئے بھیج دی گئی ہے اس پر عمل کرو۔ تو یہ کام اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب رسول کے بغیر نہیں بھیجی، ہر کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجا ہے، رسول تو کتاب کے بغیر آئے ہیں، لیکن کتاب بغیر رسول کے نہیں آئی، کیوں؟ اس لئے کہ انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے اور اس کو کسی خاص رنگ پر ڈھالنے کے لئے صرف کتاب کبھی کافی نہیں ہوتی۔

صرف کتابیں پڑھ کر ڈاکٹر بننے کا نتیجہ

اگر کوئی شخص چاہے کہ میں میڈیکل سائنس کی کتاب پڑھ کر ڈاکٹر بن جاؤں، اور پھر اس نے وہ کتاب پڑھ لی، اور اس کو سمجھ بھی لیا اور اس کے بعد اس نے ڈاکٹری اور علاج شروع کر دیا تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے وہ کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا، جب تک وہ کسی ڈاکٹر کی صحبت اختیار نہ کرے اور اس کے ساتھ کچھ مدت تک رہ کر کام نہ کرے، اس وقت تک وہ ڈاکٹر نہیں بن سکتا، اور میں تو آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ بازار میں کھانا پکانے کی کتابیں موجود ہیں، جس میں کھانا پکانے کی ترکیبیں لکھی ہوئی ہیں، پلاؤ اس طرح بنتا ہے، بریانی اس طرح بنتی ہے، قورمہ ایسے بنتا ہے، اب اگر ایک شخص صرف وہ کتاب اپنے سامنے رکھ کر بریانی بنانا چاہے گا تو خدا جانے وہ کیا ملغوبہ تیار کرے گا، جب تک کہ کسی ماہر کے ساتھ رہ کر اس کی ٹریننگ حاصل نہ کی، اور اس کو سمجھا نہ ہو، اس وقت تک وہ بریانی تیار نہیں کر سکتا۔

متقی کی صحبت اختیار کریں

یہی معاملہ دین کا ہے کہ صرف کتاب انسان کو کسی دینی رنگ میں ڈھالنے کے لئے کافی نہیں ہوتی جب تک کہ کوئی معلم اور مربی اس کے ساتھ نہ ہو، اس واسطے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا گیا اور انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ مرتبہ حاصل ہوا، صحابہ کے کیا معنی ہیں؟ صحابہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی، انہوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے حاصل کیا، پھر اسی طرح تابعین نے صحابہ کی صحبت سے اور تبع تابعین نے تابعین کی صحبت سے حاصل کیا تو کچھ دین ہم تک پہنچا ہے وہ صحبت کے ذریعہ پہنچا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی تقویٰ حاصل کرنے کا راستہ یہ بتا دیا کہ اگر تقویٰ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ کسی متقی کی صحبت اختیار کرو، اور پھر اس صحبت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہارے اندر بھی وہ تقویٰ پیدا فرما دیں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی حقیقت سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

تجارت کی فضیلت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (۱)

قرآن کریم میں بکثرت یہ تعبیر آئی ہے کہ اللہ کا فضل تلاش کرو، اس تعبیر کی تفسیر اکثر حضرات مفسرین نے یہ کی ہے کہ اس سے مراد تجارت ہے گویا تجارت کو "ابتغاء فضل اللہ" سے تعبیر کیا ہے، اللہ کا فضل تلاش کرو، اس سے تجارت کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے، تجارت کو محض دنیاوی کام نہ سمجھو بلکہ یہ اللہ کے فضل کو تلاش کرنے کے مترادف ہے۔

قرآن میں مال ودولت کا ذکر

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں دنیا اور مال ودولت کے لئے بعض جگہ پر ایسے کلمات استعمال کئے گئے ہیں جو ان کی قباحت اور شناعت پر دلالت کرتے ہیں مثلاً:

﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (۲)

﴿وَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (۳)

اور ان کے لئے تعریفی کلمات بھی ہیں، جیسے:

﴿وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (۴)

☆ انعام الباری (۶/۱۷ تا ۷۵)، زیرِ نظر بیان صحیح بخاری شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے طلبہ کے سامنے تجارت کی فضیلت اور اس کے اسلامی نقطۂ نظر پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) الجمعة: ۱۰، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ، اور اللہ کا فضل تلاش کرو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو"

(۲) التغابن: ۱۵، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "بے شک تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے ایک آزمائش ہے"

(۳) الحدید: ۲۰، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے"

(۴) الجمعة: ۱۰، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "اور ڈھونڈو فضل اللہ کا"

اس آیت میں تجارتی نفع کو فضل اللہ سے تعبیر کیا جا رہا ہے، اور بعض جگہ مال کے لئے خیر کا لفظ استعمال کیا گیا، جیسے:

﴿وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ﴾(۱)

''اور آدمی محبت پر مال کی بہت پکا ہے''

"الخیر" یہاں مال کے معنی میں ہے تو ایک ظاہر بین انسان کو بعض اوقات ان دونوں قسم کی تعبیرات میں تعارض و تضاد محسوس ہوتا ہے کہ ابھی تو کہہ رہے تھے کہ متاع الغرور یعنی دھوکہ کا سامان ہے اور ابھی کہہ رہے ہیں کہ فضل اللہ اور خیر ہے۔

حقیقت میں یہ تعارض نہیں بلکہ یہ بتانا منظور ہے کہ دنیاوی مال و اسباب جتنے بھی ہیں یہ انسان کی حقیقی منزل اور منزل مقصود نہیں، بلکہ منزل مقصود آخرت اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا ہے۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے ان اسباب کی ضرورت ہے ان کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، لہٰذا جب تک انسان ان اسباب کو محض راستہ کا ایک مرحلہ سمجھ کر استعمال کرے منزل مقصود قرار نہ دے تو اس وقت تک یہ خیر ہے، اور جب انسان ان کو منزل مقصود بنالے تو جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس منزل مقصود کو حاصل کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرنا شروع کردے، تو یہ فتنہ اور متاع الغرور ہے۔ لہٰذا جب تک دنیا اور اس کا مال و اسباب محض وسائل کے طور پر استعمال ہو اور جائز حدود میں استعمال کیا جائے تو اس وقت تک اللہ کا فضل اور خیر ہے۔ اور جب اس کی محبت دل میں گھر کر جائے اور انسان اس کو منزل مقصود بنالے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے ہر جائز اور ناجائز طریقہ اختیار کرنا شروع کردے تو وہ فتنہ اور متاع الغرور یعنی دھوکہ کا سامان ہے۔

دنیا میں مال و اسباب کی مثال

علامہ جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی پیاری مثال دی ہے، وہ کہتے ہیں کہ دیکھو دنیا کے مال و اسباب جتنے بھی ہیں ان کی مثال پانی کی سی ہے اور تیری مثال اے انسان! کشتی کی سی ہے، کشتی بغیر پانی کے نہیں چل سکتی، کشتی کے لئے پانی اس وقت تک فائدہ مند ہے جب تک کشتی کے چاروں طرف ہو، نیچے ہو دائیں ہو بائیں ہو، لیکن اگر پانی اندر آجائے تو اس کو ڈبو دے گا اور غرق کردے گا:

آب اندر زیر کشتی پشتی است

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است

(۱) العادیات: ۸

''جب تک پانی کشتی کے نیچے ہو تو اس کو سہارا دیتا ہے، اس کو آگے بڑھاتا ہے اگر کشتی کے اندر گھس جائے تو کشتی کی ہلاکت کا باعث ہو جاتا ہے''

حدیث میں ہے:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ)) (۱)

اور دوسری حدیث میں ہے:

((اَلتُّجَّارُ یُحْشَرُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقٰی وَبَرَّ وَصَدَقَ)) (۲)

تو جو آدمی اس کو راستے کا مرحلہ سمجھے اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود میں اس کو استعمال کرے تو وہ نعمت اور فضل اللہ ہے، اور جہاں آدمی اس کی محبت میں مبتلا ہو جائے اور اسکی وجہ سے حرام وحلال کی حدود کو پامال کردے تو وہ متاع الغرور ہے۔ قرآن وحدیث نے اس حقیقت کو سمجھایا ہے۔

مسلمان تاجر کا خاصہ

اللہ رب العزت قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ﴾(۳)

''پھر جب تمام ہو چکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا''

یعنی اللہ کا فضل تلاش کرو، تجارت کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تجارت کر رہے ہو تو بھی ذکر اللہ جاری رہنا چاہئے، کیونکہ اگر تجارت میں اللہ کی یاد فراموش ہوگئی اللہ کا ذکر نہ رہا تو وہ تجارت تمہارے دل میں گھس کر تمہاری کشتی کو ڈبو دے گی، اس واسطے "وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللّٰہِ" کے ساتھ "وَاذْكُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا" کا لاحقہ لگا دیا کہ تجارت کے ساتھ بھی اللہ کی یاد ہونی چاہئے۔ یہ نہ ہو:

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء فی التجار وتسمیة النبی ایاھم، رقم: ۱۱۳۰، سنن الدارمی، کتاب البیوع، باب فی التاجر الصدوق، رقم: ۲٤۲۷، حدیث کا ترجمہ یہ ہے ''سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا''

(۲) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء فی التجار وتسمیة النبی ایا ھم، رقم: ۱۱۳۱، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، رقم: ۲۱۳۷، سنن الدارمی، کتاب البیوع، رقم: ۲٤۲٦، حدیث کا ترجمہ یہ ہے ''تاجر قیامت کے دن اس حال میں جمع کئے جائیں گے کہ وہ گناہ گاروں کی حالت میں ہوں گے لیکن وہ تاجر اس میں شامل نہیں جو تقویٰ اختیار کریں، نیکی سے تجارت کریں اور سچ سے کام لیں''

(۳) الجمعة: ۱۰

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾(۱)

''یعنی مال و دولت اور اہل و عیال تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہ کردیں''

مسلمان تاجر کا خاصا یہ ہے کہ وہ تجارت بھی کر رہا ہے لیکن ع

دست بکار و دل بیار

یعنی ہاتھ تو کام میں لگ رہا ہے لیکن دل اللہ کی یاد میں لگا ہوا ہے۔

اسی کی صوفیائے کرام مشق کراتے ہیں۔ اور تصوف اسی کا نام ہے کہ تجارت بھی کرو، اور زیادہ سے زیادہ ذکر اللہ بھی کرو۔ اب یہ کیسے کریں اور اس کی عادت کیسے ڈالیں؟ تو صوفیائے کرام اسی فن کو سکھاتے ہیں کہ تم تجارت بھی کر رہے ہوگے اور اللہ کا ذکر بھی جاری رکھو گے۔

میرے دادا حضرت مولانا محمد یاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کے ہم عمر تھے، یعنی جس سال دار العلوم دیوبند قائم ہوا اسی سال ان کی ولادت ہوئی، ساری عمر دار العلوم دیوبند میں گزاری، وہیں پڑھا اور وہیں پڑھایا، وہ فرماتے تھے:

''ہم نے دار العلوم دیوبند میں وہ زمانہ دیکھا کہ جب اس کے شیخ الحدیث سے لے کر اس کے دربان اور چپراسی تک سب صاحب نسبت ولی اللہ تھے''

چوکیدار چوکیداری کر رہا ہے دروازے پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے لطائف ستہ جاری ہیں۔

دادا جی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ہی دورہ حدیث پڑھا تھا، فرماتے ہیں کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ ہم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے منطق کی کتاب ملاحسن کا سبق پڑھتے تھے، حضرت سبق پڑھا رہے ہوتے تھے تقریر کر رہے ہوتے تھے، تو ہمیں ان کے دل سے اللہ اللہ کی آواز آتی ہوئی سنائی دیتی تھی۔

آیت کریمہ کا یہی مطالبہ ہے اور یہی کچھ حضرات صوفیائے کرام سکھاتے ہیں کہ کسی طرح تمہارا کام بھی چل رہا ہو اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ بھی تم مشغول ہو۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بدعت نکال لی ہے، یہ کوئی بدعت وغیرہ نہیں بلکہ قرآن مجید کی اس آیت پر عمل ہے:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝﴾(۲)

---

(۱) المنافقون: ۹ (۲) الجمعۃ: ۱۰۔۱۱

''اور یاد کرو اللہ کو بہت سا تا کہ تمہارا بھلا ہو، اور جب دیکھیں سودا بکتا یا کچھ تماشا متفرق ہو جائیں اس کی طرف اور تجھ کو چھوڑ جائیں کھڑا، تو کہہ جو اللہ کے پاس ہے سو بہتر ہے تماشے سے اور سوداگری سے اور اللہ بہتر ہے روزی دینے والا''

آیت کا شان نزول

اس آیت کا شان نزول بخاری میں کتاب الجمعہ میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ جمعہ کے روز خطبہ فرما رہے تھے کہ اس وقت کچھ لوگ اونٹوں پر کچھ سامان تجارت لے کر آ گئے تو بعض حضرات اس کو دیکھنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے کہ کیا سامان لے کر آئے ہیں، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ جب وہ کوئی تجارت دیکھتے ہیں یا لہو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ کے چلے جاتے ہیں اور آپ ﷺ کو کھڑا ہوا چھوڑ دیتے ہیں، تو یہاں تجارت بھی ہے اور لہو بھی ہے۔(۱)

''لہو'' کی وضاحت

بعض حضرات نے فرمایا کہ ''لہو'' کا لفظ تجارت کے لئے ہی استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ تجارت انسان کو ذکر اللہ سے غافل کر دیتی ہے اس لئے وہ ''لہو'' بن جاتی ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ ''لہو'' سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ سامان تجارت لے کر آئے تھے ان کے ساتھ ڈھول ڈھما کا بھی تھا تو وہ تجارت بھی تھی اور ساتھ ''لہو'' بھی تھا۔ اس لئے دونوں کا ذکر فرمایا۔(۲)

''الیھا'' کی ضمیر مفرد ہونے کی وجہ

" الیھا " میں ضمیر صرف تجارت کی طرف لوٹائی ہے ورنہ " الیھما " کہتے، لیکن ضمیر مفرد کی لائے اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ ان کا مقصود اصلی تجارت کے لئے جانا تھا نہ کہ ''لہو'' کے واسطے تھا، بلکہ ''لہو'' ضمنی طور پر تھا۔

﴿وَتَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ﴾

ابھی تو کہہ رہے تھے "مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ" اور اب فرما رہے ہیں:

(۱) تفسیر ابن کثیر (۴/۳۷۰)، قدیمی کتب خانہ، کراچی

(۲) عمدۃ القاری (۵/۱۲۲)

﴿عِندَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ﴾

وہی بات آ گئی کہ جب تک وہ تجارت تمہیں اللہ کے ذکر اور اس کے حکم سے غافل نہیں کر رہی تھی تو وہ فضل اللہ تھا لیکن جب اس نے غافل کر دیا تو پھر وہی تجارت اللہ سے دوری کا ذریعہ بن گئی۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ اگر اللہ کے فلاں حکم پر عمل کریں گے والعیاذ باللہ اس سے ہمارا نقصان ہو جائے گا، تو یہ وہم شیطان کا ہے، یہ دل سے نکال دو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (۱)

''نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی میں''

یہ آیت کریمہ بھی تجارت کے اصول بیان کر رہی ہے کہ باطل طریقہ سے اموال کمانا حرام ہے اور صرف اس طرح حلال ہے کہ جس میں دو شرطیں پائی جا رہی ہوں، ایک یہ ہے کہ تجارت ہو دوسرا یہ کہ باہمی رضامندی سے ہو۔

سودے کے صحیح ہونے کے لئے تنہا رضامندی کافی نہیں

معلوم ہوا کہ تنہا باہمی رضامندی کسی سودے کے حلت کے لئے کافی نہیں، باہمی رضامندی سے ایک سودا ہو گیا تو تنہا باہمی رضامندی کافی نہیں:

﴿إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾

(مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے) جب تک تجارت نہ ہو اور تجارت سے مراد وہ معاملہ جو اللہ کے نزدیک تجارت ہے۔ لہٰذا سود کا جو لین دین ہوتا ہے اس میں باہمی رضامندی سے وعدہ ہوتا ہے، باہمی رضامندی سے جوے کا معاملہ بھی ہوتا ہے اور سٹہ کا معاملہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب ممنوع ہے، اس واسطے کہ یہ اگرچہ باہمی رضامندی تو ہے لیکن تجارت نہیں ہے، اور اگر تجارت ہو لیکن باہمی رضامندی نہ ہو تو یہ بھی حرام ہے۔ تو بیک وقت دو شرطیں ہیں، تجارت بھی ہو اور باہمی رضامندی بھی ہو۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

(۱) النساء: ۲۹

تدبیر اور روزگار ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"كَانَ يَعْزِلُ نَفَقَةَ أَهْلِهٖ سَنَةً"(۱)

نبی کریم ﷺ اپنے اہل وعیال کا ایک سال کا نفقہ جدا کر کے الگ رکھ لیا کرتے تھے کہ یہ سال بھر اہل وعیال کے نفقہ میں خرچ کیا جائے گا۔

یہ عادت بیان فرمائی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی کہ تمام ازواج مطہرات کا سال بھر کا نفقہ ان کے گھروں میں پہنچا دیا جاتا تھا اور خود آپ کا نفقہ بھی اس میں شامل ہوتا تھا۔ البتہ وہ ازواج مطہرات بھی تو نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات تھیں، سال بھر کا نفقہ یا خرچہ پہنچ تو جاتا تھا لیکن صدقہ خیرات کثرت سے کرنے کا معمول تھا، اس لئے ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ حضور ﷺ کے گھر میں بعض اوقات تین تین مہینوں تک آگ نہیں جلتی تھی۔

حضرت محمد ﷺ کی معاشی زندگی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ہم تین متواتر چاند دیکھتے تھے اور اس پورے عرصے میں گھر کے اندر آگ نہیں جلی ہوتی تھی۔ جن صاحب سے یہ بیان فرما رہی تھیں انہوں نے پوچھا کہ پھر آپ کا گزارہ کس چیز پر ہوتا تھا؟ تو آپ نے فرمایا:

"اَلْأَسْوَدَانِ: اَلتَّمْرُ وَالْمَاءُ"(۲)

☆ ضبط وتحریر: محمد اویس سرور، تاریخ ضبط: ۲ اپریل ۲۰۱۰ء

(۱) إحياء علوم الدين (۱/ ۲۲٤)

(۲) صحيح البخاري، كتاب الهبة وفضلها والتحريض عليها، باب، رقم: ۲۳۷۹، صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب، رقم: ٥۲۸۲، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب معيشة آل محمد، رقم: ٤۱۳٥، مسند أحمد، رقم: ۲۳۲۸٤

’’دو ہی چیزوں پر گزارہ ہوتا تھا، ایک کھجور ایک پانی‘‘

لیکن تین تین مہینے تک آگ نہیں جلتی تھی، یہ بھی واقعات پیش آئے۔ یہ واقعات بھی پیش آئے کہ نبی کریم ﷺ نے پیٹ پر پتھر باندھے، یہ واقعات بھی پیش آئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اور کبھی گندم تناول نہیں فرمایا، آپ کا کھانا جو کی روٹی کا ہوتا تھا۔ (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے لئے کبھی کھانے کی چوکی نہیں بچھائی گئی، کبھی آپ کے لئے چپاتی نہیں بنائی گئی۔ (۲)

چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں جو چٹنی اچار وغیرہ ہوتے ہیں جو بھوک بڑھانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں وہ ساری عمر نہیں ہوئے۔ یہ سارے واقعات پیش آئے۔ اس کے باوجود یہ فرمایا جارہا ہے کہ سارے سال کا نفقہ اٹھا کر ایک طرف کرلیا جاتا تھا۔ وہ اس وجہ سے کہ نفقہ تو سال بھر کا اکٹھا ہوگیا۔ لیکن صدقہ خیرات کرنے کا معمول کثرت سے تھا خود آپ کا بھی اور آپ کی ازواج مطہرات کا بھی۔ اس کی وجہ سے یہ حالات بھی پیش آتے تھے۔ تو اس طرح حضور ﷺ نے دو مختلف اور متضاد پہلوؤں کو اپنی سنت قرار دے دیا۔

ضروریات کا اہتمام توکل کے منافی نہیں

ایک طرف یہ تعلیم دے دی اپنے عمل سے کہ سال بھر کا نفقہ سال بھر کا خرچہ اکٹھا کر لینا یہ کوئی شریعت کے خلاف یا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ یہ سمجھنا کہ سال بھر کا اگر خرچہ اکٹھا جمع کریں گے تو یہ توکل کے خلاف ہوجائے گا اللہ پر بھروسہ نہیں رہے گا یہ بات صحیح نہیں۔ اگر سال بھر کا خرچہ اکٹھا جمع کرلے انسان تو اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ کسی مصلحت سے بقدر ضرورت ذخیرہ رکھ لینا نہ توکل

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأطعمة، باب ما کان النبی صلی الله علیه وسلم وأصحابه یأکلون، رقم: ٤٩٩٦، صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب، رقم: ٥٢٧٤، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ماجاء فی معشیة النبی وأهله، رقم: ٢٢٨٠، مسند أحمد، رقم: ٢٣٠٢٢

(۲) صحیح البخاری، کتاب الأطعمة، باب الخبز المرقق والأکل علی الخوان والسفرة، رقم: ٤٩٦٧، سنن الترمذی، کتاب الأطعمة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ماجاء علام ما کان یأکل رسول الله صلی الله علیه وسلم، رقم: ١٧١٠، سنن ابن ماجه، کتاب الأطعمة، باب الأکل علی الخوان والسفرة، رقم: ٣٢٨٣، مسند أحمد، رقم: ١١٨٤٨

کے منافی ہے اور نہ کمال توکل کے۔ کیونکہ حضور ﷺ کے کامل ہونے میں کسی کو بھی کلام نہیں۔ اگر کمال توکل کے خلاف ہوتا تو سرکار دو عالم ﷺ یہ کبھی نہ کرتے۔ آپ سے زیادہ کامل توکل رکھنے والا کون ہوگا۔ تو اس واسطے نہ توکل کے خلاف ہے نہ کمال توکل کے خلاف ہے۔ اور وہ مصلحت عام ہے خواہ عیال کی مصلحت ہو خواہ نفس کی مصلحت ہو، اس کے لئے اگر ذخیرہ کر کے رکھ لیا سال بھر کا تو یہ کوئی توکل کے خلاف نہیں۔

توکل کی اصل حقیقت

توکل درحقیقت یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ پر بھروسہ ہو اگرچہ میں اسباب اختیار کر رہا ہوں، اس واسطے کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے عالم اسباب بنایا ہے۔ اس لئے اسباب اختیار کر رہا ہوں لیکن اسباب میں کچھ نہیں رکھا بلکہ یہ اسباب اس وقت تک کارآمد نہیں جب تک مسبب یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اس میں تاثیر پیدا نہ کریں۔ سال بھر کا نفقہ اٹھا کر رکھ لیا پھر بھی بھروسہ اس سال بھر کے جمع شدہ اندوختے پر نہیں بھروسہ اللہ ہی پر ہے۔ اپنی طرف سے جو تدبیر تھی وہ کرلی سال بھر کا اکٹھا کر لیا لیکن کچھ بھروسہ نہیں سال بھر میں یہ کہیں ضائع ہو جائے ہلاک ہو جائے کیڑا لگ جائے نقصان ہو جائے چوری ہو جائے ڈاکہ پڑ جائے ہزار احتمال ہے۔ تو اپنی طرف سے تدبیر کرلی لیکن بھروسہ اللہ پر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی رزق دینے والا ہے وہی کفالت کرنے والا ہے۔ تو اسباب کو اختیار کرنے کے ساتھ صرف اللہ پر بھروسہ رکھا جائے۔

انسانی مزاج کا فرق

یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض اوقات دین کے اندر یہ بھی مطلوب ہے کہ انسان کے دل کو اطمینان حاصل ہو اور جمعیت خاطر ہو۔ تشویش نہ ہو اور پریشانی نہ ہو۔ لہٰذا طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں، بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو کچھ پرواہ نہ ہوتی، جمع ہے کچھ نہیں ہے ذخیرہ ہے کہ نہیں ہے ان کے روزمرہ کے معمولات میں کام میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو ضرورت ہوتی ہے اس بات کی کہ جب تک ظاہری اسباب نظر نہ آجائیں اس وقت تک پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا۔ جمعیت خاطر نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کا انوکھا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد قدس سرہ سے سنا کہ ایک بزرگ کا واقعہ بیان فرماتے تھے کہ وہ ایک

دن بیٹھے ہوئے دعا کر رہے تھے:

''یا اللہ مجھے تو آپ سال بھر کا خرچہ اکٹھا ایک مرتبہ دے دیجئے''

یہ دعا وہ بہت گڑگڑا کر مانگ رہے تھے۔ وہ بزرگ انتہائی صاحب کشف وکرامات تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی وقت الہام ہوا کہ کیا تمہیں ہمارے اوپر بھروسہ نہیں جو سال بھر کا اکٹھا مانگ رہے ہو آج کا مانگو کل کا کل کو دیکھا جائے گا۔

جواب میں کہنے لگے کہ یا اللہ! بھروسہ تو ہے آپ کی ذات پر لیکن یہ کم بخت شیطان ہر وقت مجھے بہکاتا رہتا ہے کہ کل کو کیا کھائے گا؟ پرسوں کو کیا کھائے گا؟ اور اولاد کو کیا کھلائے گا؟ یہ دل میں تشویش پیدا کرتا رہتا ہے، پریشانی پیدا کرتا رہتا ہے۔ تو میں چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ یہ تشویش رفع ہوجائے، جب وہ دل میں بات ڈالے گا کہ کل کو کیا کھلائے گا تو اشارہ کردوں گا دیکھ یہ رکھا ہے۔ تو جب اشارہ کردوں گا تو اب اس کے بعد تشویش کرنے کی عقوبت ختم ہوجائے گی، اس واسطے سے اکٹھے مانگ رہا ہوں۔

ان کی اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور انہیں سال بھر کا نفقہ عطا فرمادیا۔

چونکہ نیت درست تھی، نیت یہ کہ جمعیت خاطر اور ہو دل مطمئن رہے۔ جب انسان کو اطمینان ہوجائے تو اس کو اپنے کام کے اندر شرحِ صدر بھی حاصل ہوتا ہے، تقویت بھی ہوتی ہے، جمعیت خاطر بھی ہوتی ہے۔ اور یہ جمعیت خاطر اس طریق میں بڑی نعمت ہے دل کا پرسکون رہنا، تشویش سے محفوظ رہنا یہ اس طریق میں بڑی نعمت ہے۔ اس لئے کے اس طریق کا حاصل ہے اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق قائم ہوجانا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی یاد کا دل میں بس جانا کہ ہر وقت دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہے۔ یہ ہے جمعیت خاطر اور یہ جو تشویشات آتی رہی ہیں یہ ہم جیسے کمزور لوگوں کی جمعیت خاطر کو خراب کرتی ہیں، پھر عبادت میں بھی آدمی کو اطمینان حاصل نہیں ہوتا، ذکر میں بھی اطمینان حاصل نہیں ہوتا جبکہ طریق کا حاصل اور مقصد ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ دل کا جڑ جانا کہ جب خاموش بیٹھا ہے انسان تنہائی میں بیٹھا ہے اس وقت بھی دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہے، قلب ذکر میں مشغول ہے، کیونکہ ایک حدیث ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''شیطان، انسان کے قلب کی تاک میں رہتا ہے''(۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب فضل التأذین، رقم:۵۷۳، صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب فضل الأذان وهرب الشیطان عند سماعه، رقم:۵۸۵، سنن أبي داود، کتاب الصلاة، باب رفع الصوت بالأذان، رقم:۴۳۳، مسند أحمد، رقم:۷۷۹۲

جب اللہ تبارک وتعالیٰ کو یاد کر رہا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہوتا ہے اللہ کی طرف دھیان ہوتا ہے تو یہ شیطان بھاگ جاتا ہے۔ اور جب غفلت میں ہوتا ہے تو غفلت کی حالت میں وسوسے ڈالتا ہے۔

انسانی دل کی دو حالتیں

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا یا تو اس کا دل مشغول ہوگا اللہ تعالیٰ کے ذکر میں یا پھر مشغول ہوگا شیطانی وساوس میں تیسرا حال نہیں۔ اگر اللہ کے ذکر میں مشغول نہیں ہے تو شیطان طرح طرح کے وسوسے دل میں ڈالتا رہے گا۔ لہٰذا شیطانی وساوس سے بچنے کا راستہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر، اور ذکر یہ عام ہے، چاہے زبان سے ہو، چاہے دل سے ہو، چاہے تسبیح کی شکل میں ہو، چاہے نماز کی شکل میں چاہے، صدقہ خیرات کی شکل میں ہو، چاہے کسی اور اطاعت کی شکل میں ہو۔ جو بھی اطاعت کا کام انسان کر رہا ہے وہ ذکر کے اندر داخل ہے۔

ہر اطاعت، ذکر اللہ کے مترادف ہے

علامہ جزری رحمۃ اللہ علیہ حصن حصین میں فرماتے ہیں:

"كُلُّ مُطِيعٍ لِلّٰهِ فَهُوَ ذَاكِرٌ"

"جو بھی اللہ کی اطاعت کا کام کر رہا ہو، وہ ذاکر ہے"

یعنی جو بھی اطاعت کا کام کر رہا ہے ذکر کرنے والے میں داخل ہے، یہاں تک کہ کسب رزق میں مشغول ہے لیکن صحیح نیت کے ساتھ ہے کہ اپنے حق کو ادا کرنا مقصود ہے اور صحیح طریقے کے ساتھ ہے کہ حلال طریقے سے حاصل کرنا مقصود ہے حرام سے بچنا مقصود ہے تو وہ بھی ذکر کا ایک فرد ہے۔

پس جتنی بھی اطاعات ہیں وہ ساری کی ساری ذکر کا فرد ہیں یا تو انسان اس میں مشغول رہے گا یا پھر اگر اس میں مشغول نہیں رہتا اپنے قلب کو اس میں مشغول نہیں کرتا تو پھر شیطانی وساوس کا شکار ہوگا۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دل کو اللہ کے لئے فارغ رکھو۔

دل کو اللہ کے لئے فارغ کیجئے!

میرے والد ماجد ایک مرتبہ سنا رہے تھے کہ میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خانقاہ سے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جب خانقاہ سے گھر کی طرف تشریف لے جاتے تھے تو

عوام کو یہ ہدایت تھی کہ کوئی آدمی ساتھ نہ چلے، ساتھ چلنا منع تھا، اس واسطے کہ یہ جو پیروں کی ہیئت ہوتی ہے کہ پیر صاحب جارہے ہیں تو ایک خلقت دائیں اور بائیں اور آگے اور پیچھے ان کے ساتھ چل رہی ہے۔ اس ادا کو حضرت پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے عام طور سے ممانعت تھی کہ جب میں اٹھ کر جاؤں، جتنی بات کرنی ہے پہلے کرلو، پھر جب میں جانے لگوں تو میرے ساتھ دائیں بائیں نہ چلو مجھے تنہا جانے دو۔ اور یہ بھی ہدایت تھی کہ کوئی میرا سامان نہ اٹھائے جو میں لے کر جارہا ہوں، جو سامان میرے ہاتھ میں ہے میں خود لے کر جاؤں گا کوئی آدمی آگے بڑھ کر اس کو نہ اٹھائے۔

وجہ یہ ہے کہ حضرت فرماتے تھے کہ بھائی میں تو خادم ہوں مخدومیت سے مجھے کیا کام؟ میں تو خادم ہوں اس واسطے یہ بات کہ کچھ مریدین آگے چل رہے ہیں کچھ پیچھے چل رہے ہیں کچھ دائیں چل رہے ہیں کچھ بائیں چل رہے ہیں کوئی سامان اٹھا رہا ہے۔ یہ بات حضرت کو پسند نہیں تھی، بس عام آدمی جس طرح جاتے ہیں اس طریقے سے جایا کرتے تھے۔ لیکن کبھی حضرت کے کچھ خاص مزاج شناس خدام کسی ضرورت کی وجہ سے ساتھ ہو جائیں تو ایسے موقع پر منع بھی نہیں فرماتے تھے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاص تعلق تھا تو فرمانے لگے میں ایک دن حضرت کے ساتھ خانقاہ سے گھر کی طرف چلا، چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ اچانک حضرت نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور کاغذ نکال کر اس پر کچھ لکھا اور لکھ کر پھر جیب میں ڈال لیا۔ پھر فرمانے لگے" تم نے دیکھا مولوی شفیع میں نے یہ کیا کیا؟"

> والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا" حضرت بیان فرمادیں، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی"
>
> اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:
>
> " مجھے ایک کام یاد آیا کہ وہ کام کرنا ہے تو اس کا دل پر بوجھ تھا، میں نے وہ کاغذ پر لکھ لیا۔ دل کا بوجھ کاغذ پر منتقل کر دیا۔ اب الحمد للہ دل فارغ ہے۔ یہ دل تو حقیقت میں ایک ہی چیز کے لئے ہے اور وہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر۔ جب کوئی تشویش آئے اور کوئی بوجھ آئے تو حتی الامکان اس تشویش اور بوجھ کو جلدی سے ختم کرنے کی کوشش کروتا کہ دل فارغ ہو جائے اس ذات کے لئے جس ذات کے لئے یہ بنایا گیا ہے"

دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے

یہ دل تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلی گاہ ہے، لہٰذا ہونا یہ چاہیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ ہی کا ذکر ہو،

تو دل کو فارغ کرلیا دل کا بوجھ کاغذ پر منتقل کر کے۔ اور پھر فرمایا کہ بس کوشش یہ کرو کہ دل میں ادھر اُدھر کے جو تشویشات ہیں وہ نہ ہوں بس وہ ایک کام میں مشغول رہے، جس کام کے لئے وہ پیدا کیا گیا۔ تو یہ ہے جمعیت خاطر کا حصول!

میں نے اپنے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے سنا (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے) حضرت مرض الوفات میں بستر پر لیٹے ہوئے ہیں اور آنکھیں بند کی ہوئی ہیں، معالجین نے لوگوں سے ملاقات منع کر رکھی ہے کہ کوئی ملاقات نہ کرے بیماری کی وجہ سے اس حالت میں کوئی آتا اور آ کر کہتا کہ حضرت فلاں دوا کا وقت ہوگیا ہے دوا پی لیجئے۔ خیر دوا پی لی۔ کوئی اور آ گیا ان سے طبیعت پوچھ لی کہ حضرت کیسے مزاج ہیں؟ اس طرح مختلف لوگ آ آ کر باتیں کرتے رہتے۔ ایک دن مولانا شبیر علی صاحب جو حضرت کی خانقاہ کے ناظم تھے ان سے فرمایا:

"بھائی مولوی شبیر علی صاحب جو ضرورت کی بات ہو وہ پوچھ لیا کرو، باقی اور زیادہ آ کر سوالات کرنے سے کچھ حاصل نہیں اور کیوں ایک مشغول آدمی کو پریشان کر رہے ہو"

مطلب یہ کہ دل تو لگا ہوا ہے کسی اور طرف اور اس وقت میں آ کر آپ باتیں کر رہے ہو مختلف قسم کے مسائل میرے سامنے چھیڑ دیتے ہو اس سے دل کسی اور طرف منتقل ہو جاتا ہے تو مشغول آدمی کو کیوں پریشان کرتے ہو۔

اصل یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کے ذکر میں اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہے، ورنہ پھر وہ شیطانی وساوس کا محل بن جاتا ہے، اس لئے جمعیت خاطر اس طریق میں بہت مطلوب ہے، اور جس شخص کو جمعیت خاطر اسباب کے حصول کے بغیر حاصل نہ ہو اس کو چاہئے کہ اسباب حاصل کرے، تاکہ اطمینان ہو، تکلیف رفع ہو اور جمعیت خاطر حاصل ہو، اور ان اسباب کو یہ سمجھنا کہ توکل کے منافی ہوگئے یہ بالکل غلط بات ہے۔ یہ توکل کے منافی نہیں۔ اس لئے کہ اسباب کو درجہ اسباب میں اختیار کیا جا رہا ہے حقیقی بھروسہ اللہ پر ہے کہ ان اسباب میں تاثیر پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اللہ تعالیٰ پیدا نہ کریں۔

حصولِ رزق کی فکر ممنوع نہیں

رزق کے حاصل کرنے کی فکر اور رزق حلال حاصل کرنے کی فکر میں چاہے وہ ذخیرہ کرنے کی ہی شکل میں ہو تو یہ نہ ممنوع بات ہے نہ مکروہ ہے نہ بری بات ہے، اور نہ توکل اور تقویٰ کے منافی

ہے بلکہ جمعیت خاطر کے حصول کے لئے ایسا کرنا اور زیادہ بہتر ہے۔ لیکن جو چیز بری ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اس کے اندر اتنا منہمک ہو جائے کہ لگا تو تھا اس کام کے لئے کہ اپنے دل کو فارغ کرے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذکر کے لئے اور اپنے اسباب کو تدبیر کے درجے میں اختیار کرلے۔ اور باقی وقت کو اللہ تعالیٰ کے کام میں لگائے۔ لیکن جب لگا تو اتنا منہمک ہوا کہ صبح سے لے کر شام تک شام سے لے کر صبح تک اور کوئی خیال آتا ہی نہیں۔ سوائے اس کے کہ پیسے سے پیسہ کس طرح بناؤں اور دولت میں کیسے اضافہ کروں اسباب راحت مزید سے مزید جمع کروں دن رات اسی میں لگا ہوا ہے۔ یہ انہماک توکل کے خلاف ہے۔ یہ انہماک ہے بری بات ہے لیکن بقدر ضرورت اور ضرورت میں راحت بھی داخل ہے یہ بھی سمجھ لیں۔ یعنی ضرورت تو اس طرح بھی پوری ہوسکتی ہے کہ آدمی سال بھر کا اتنا نفقہ جمع کرلے جس میں دال روٹی سال بھر کی ہو جائے، خشک چاول اور دال کا حساب کر کے انسان جب جمع کرے تو ضرورت ویسے ہی پوری ہو جاتی ہے لیکن اتنا بھی شریعت نے کوئی ضروری قرار نہیں دیا بلکہ اپنی راحت کے حساب سے جتنا اس کو مطلوب ہے اتنا اگر جمع کرلے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

مولانا مسیح اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ارشاد

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک دن فرمانے لگے:

> ''دیکھو بھائی ہر شخص کی ضرورت اور ہر شخص کی حاجت اور راحت مختلف ہوتی ہے۔ ایک آدمی ہے وہ بیچارہ اکیلا رہتا ہے تو اس کے لئے تھوڑی چیز کافی ہو جائے گی، اور تھوڑی چیز سے اس کی ضرورت رفع ہو جائے گی۔ لیکن اس واسطے فقہاء کرام نے فرمایا کہ حاجات اصلیہ میں یہ ہے کہ تین جوڑے ہوں سال بھر کا راشن ہو تو حاجات اصلیہ پوری ہو جاتی ہیں۔ اور ایک پیالہ یا پلیٹ ہو تو برتن کی ضرورت پوری ہوئی۔ لیکن ایک شخص ہے کہ جس کے پاس مہمان آتے ہیں تو اس کی حاجات پہلے شخص کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں تو اس واسطے وہ اگر اپنی حاجت کے مطابق جمع کر رہا ہے اپنی حاجت کے مطابق تدبیر کر رہا ہے تو اس میں کوئی شریعت کے خلاف بات نہیں''

میں نے ایک مرحلہ پر حضرت کو لکھا کہ میری اتنی آمدنی ہے اور اب میں چاہتا ہوں کہ مدرسے سے تنخواہ لینا بند کردوں۔ وہ اس واسطے کہ دوسرے ذریعہ سے جو آمدنی ہے ضرورت کے

مطابق پوری ہوجاتی ہے۔ تو حضرت نے اس کے اوپر لکیر کھینچ کر لکھا کہ یہ آپ کی ضرورت کو پورا کرنے والی مقدار نہیں ہے۔ لہٰذا لیں البتہ جو بچ جائے اس کو مدرسے میں اپنی طرف سے داخل کردیں۔

حصولِ روزگار میں افراط سے بچنا ضروری ہے

بات یہ چل رہی تھی کہ اپنی ضرورت کے مطابق ہر انسان جو کچھ جمع کرے وہ شریعت میں ناپسندیدہ بھی نہیں مکروہ بھی نہیں تصوف کے بھی خلاف نہیں، طریقت کے بھی خلاف نہیں، تقویٰ کے بھی خلاف نہیں۔

لیکن تقویٰ کے خلاف اور طریقت کے خلاف بات یہ ہے کہ دن رات ذہن پر بس اسی کی چکی چل رہی ہے اور کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح میری دولت میں اضافہ ہوجائے، کس طرح سے میرا ایک کارخانہ ہے تو دو لگ جائیں، اور دو ہیں تو تین ہوجائیں اور کس طرح میرے بینک بیلنس میں اضافہ ہوجائے، اور کس طرح مجھے تعیشات حاصل ہوجائیں دن رات اسی فکر میں لگا ہوا ہے یہ ہے بری بات۔ اس سے بچنے کی ضرورت ہے اب یہ کہ کس طرح بچیں؟ کس طرح حد فاصل قائم کریں؟ کہ کہاں ضرورت کی حد ختم ہوگئی اور کہاں تعیشات کی حد شروع ہوگئی۔ تو یہ وہی بات ہے جو آپ سے بار بار عرض کرتا رہتا ہوں کہ دو اور دو چار کرکے اس کا کوئی فارمولا نہیں بتایا جاسکتا، یہ چیز تو محض صحبت ہی سے حاصل ہوسکتی ہے، کسی کامل شیخ کی رہنمائی سے پتہ چلتا ہے کہ اب آگے بڑھوں یا نہ بڑھوں اپنے آپ کو دن رات ہر وقت اسی فکر میں لگائے رکھنا اس سے پناہ مانگی گئی ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا))(۱)

یا اللہ! ایسا نہ ہو کہ دنیا ہی کا خیال ہمارے تمام خیالات پر غالب آجائے، سب سے بڑی فکر سب سے بڑی دھن یہ دنیا بن جائے کہ دنیا کس طرح حاصل ہو اور پیسے کہاں سے حاصل ہوں، اور نہ ایسا ہو کہ ساری معلومات جو ہیں وہ دنیا کے اندر محدود ہوکر رہ گئی ہیں، اور ہماری پسند ہماری رغبت اور ہمارے شوق کا مرکز دنیا ہی بن جائے۔ ہر وقت اسی کے خیال آرہے ہیں، ہر وقت اسی کی فکر میں پڑا ہوا ہے۔ یہ ہے بری بات اور اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔

(۱) روضة المحدثين، رقم:٣٣١٦ (٤١/٨)، الجامع الصغير وزيادته رقم:٢١٤٨ (١/٢١٦) دعا کا ترجمہ یہ ہے: اے اللہ! دنیا کو ہمارا بڑا غم نہ بنا، سارے علم کا مبلغ دنیا کو نہ بنا اور نہ ہی اسے ہماری رغبت کی انتہاء بنا۔

اسلام کی معتدل تعلیم

آپ دیکھیں کیسی معتدل تعلیم ہے شریعت کی کہ ہماری ضرورت کو کہیں روکا نہیں اور ضرورت ہی نہیں راحت کو بھی نہیں روکا۔ لیکن ساتھ میں یہ کہہ رہے ہیں کہ اس کو آگے بڑھا کر اپنے اوپر مسلط مت ہونے دو، تدبیر اس لئے کرو تا کہ ذہن فارغ ہو جائے، دل فارغ ہو جائے اللہ کے لئے فارغ ہو جائے، الحمدللہ سال بھر کا اکٹھا کر لیا اب چلو اپنے کام میں متوجہ ہو جاؤ اللہ کی طرف یہ ہے مقصود۔ تو اس مقصود کو حاصل کرنے کے لئے، جمعیت خاطر کو پیدا کرنے کے لئے جتنی تدبیر کرنی ہے وہ کر لے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے دونوں باتیں کر کے دکھادیں، ایک طرف سال بھر کا نفقہ جمع کر کے دے دیا تاکہ پتہ چل جائے کہ یہ صورت جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں، اور دوسری طرف اتنی خیرات کی اتنی خیرات کی کہ تین مہینے تک گھر میں آگ نہیں جل رہی ہے۔ دونوں باتیں کر کے دکھا دیں۔

نبی کریم ﷺ کا زہد

فرشتہ آتا ہے آ کر کہتا ہے اگر آپ چاہیں تو اس احد پہاڑ کو سونے کے پہاڑ میں تبدیل کر دیں سارا سونے کا بنا دیں، یہ پیشکش ہوتی ہے فرشتے کی طرف سے۔ تو جواب میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"نہیں مجھے تو یہ پسند ہے کہ ایک دن بھوکا رہوں ایک دن کھاؤں"(۱)

اگر نبی کریم ﷺ یہ عمل نہ فرماتے تو یہ غریب فاقہ کش کہاں جاتے، ان غریب فاقہ کشوں کے لئے نبی کریم ﷺ نے خود عمل کر کے پیٹ پر باندھ کر مشکلیں سہہ کر پریشانیاں اٹھا کر اور ان کے واسطے تسلی کا سامان کر دیا کہ اے غریبو تم جن حالات سے گزر رہے ہو گھبراؤ نہیں محمد ﷺ کے اوپر بھی یہ حالات گزرے چکے ہیں۔ تم اگر غیر اختیاری طور پر ان حالات سے گزر رہے ہو تو آپ ﷺ اختیاری طور پر ان حالات سے گزرے۔ ان کے لئے تسلی کا سامان پیدا فرما دیا نبی کریم ﷺ نے۔ ہم جیسے کمزوروں کے لئے تسلی کا یہ سامان پیدا فرما دیا کہ سال بھر کا نفقہ اکٹھا جمع کر کے اپنا اسوہ بتا دیا کہ یہ بھی میری سنت ہے۔ ہم جیسے کمزوروں کے لئے یہ بتا دیا اور دوسرے لوگوں کے لئے جو فاقہ میں مبتلا ہوں ان کے لئے سنت یہ بتا دی کہ دیکھو میری سنت یہ ہے تین مہینے تک میرے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الكفاف والصبر عليه، رقم: ۲۲۷۰، مسند أحمد، رقم: ۲۱۱۶۶

قربان جائیں نبی کریم ﷺ کی ایک ایک ادا پر کہ آپ ﷺ نے امت کے کسی طبقے کو اپنی سنت سے اپنے اسوہ سے محروم نہیں فرمایا۔ ایک مرتبہ ایک جبہ زیب تن فرمایا تو دس ہزار دینار تقریباً اس کی قیمت تھی، اتنی قیمت کا جبہ بھی زیب تن فرمایا، اور عام حالات میں پیوند لگے ہوئے کپڑے بھی پہنے اپنے دست مبارک سے کپڑے بھی دھوئے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے بھی زیب تن فرمائے۔ تو ساری امت کے لئے امت کے ہر طبقہ کے لئے اپنا اسوہ چھوڑ گئے کہ کسی کے لئے بھی رہنمائی میں کوئی دشواری پیدا نہ ہو۔

خلاصہ کلام

خلاصہ اس حدیث کا یہ نکلا کہ اپنے دل کی تشویش کو زائل کرنے کے لئے اور اطمینان پیدا کرنے کے لئے اگر کوئی آدمی ذخیرہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن نیت یہی ہونی چاہئے۔ نیت یہ نہیں کہ میں مالدار کہلاؤں، نیت یہ نہیں کہ میں اس کو مزید بڑھاؤں ایک وادی سونے کی مل جائے تو ایک ایک اور مل جائے۔ بلکہ نیت یہ ہو کہ تشویش سے میں بچ جاؤں اور میرے دل میں جمعیت پیدا ہو جائے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف اپنے دل کو لگانے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے یہ حقیقت ہمارے دلوں میں مرکوز فرمادے اور اس کے اوپر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

تجارت کے کچھ آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا اِذَا بَاعَ، وَاِذَا اشْتَرٰى، وَاِذَا اقْتَضٰى))(۱)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ رحم فرماتے ہیں اس شخص پر جو بیچتے وقت بھی اور خریدتے وقت بھی اور اپنا حق وصول کرتے وقت بھی نرم ہو''

یعنی اللہ کو یہ بات پسند نہیں کہ آدمی پیسے پر جان دے، کوئی خریدار خریداری کے لئے آیا ہے آپ نے اس کی قیمت بتائی اور وہ اس قیمت کو ادا کرنے کا اہل نہیں ہے، تو آپ اس کے ساتھ کچھ نرمی کر دیں۔ یعنی اپنا نقصان نہ کریں لیکن اپنے منافع میں سے کچھ کم کر دیں تو یہ '' سمحا اذا باع'' ہے، یہ نہیں کہ صاحب قسم کھا کے بیٹھ گیا کہ میں تو اتنے ہی میں دوں گا چاہے کچھ ہو جائے تو اگر حالات ایسے ہیں کہ دیکھ رہا ہے کہ یہ خریدار ضرورت مند ہے اور پیسے اس کے پاس نہیں ہیں تو اس کے لئے نرمی کا معاملہ کرو۔ آگے فرمایا:

((وَاِذَا اشْتَرٰى))

اور اسی طرح چاہئے کہ خریداری کے وقت میں بھی نرم ہو، یعنی یہ نہیں کہ پیسے پر جان دے رہا

☆ انعام الباری (۶/۱۲۵ تا ۱۳۱) زیر نظر بیان صحیح بخاری شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے طلبہ کے سامنے شریعت اسلامیہ کی روشنی میں تجارت کے کچھ آداب و احکام کا تذکرہ کیا ہے۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب السهولة والسماحة في الشراء والبيع ومن طلب حقا، رقم: ١٩٣٤، سنن الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء في استقراض البعير أو الشيء من الحيوان، رقم: ١٢٤١، سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب السماحة في البيع، رقم: ٢١٩٤، مسند أحمد، باقي مسند المكثرين، رقم: ١٤١٣١

ہو اور پیسے کم کرانے میں شام تک حجت بازی کر رہا ہے اور اڑا ہوا ہے کہ نہیں کم ضرور کم کرو، بائع کے سر پر سوار ہو گیا تو یہ طریقہ مومن کا طریقہ نہیں۔ اگر آپ کرانا چاہتے ہیں تو ایک دو مرتبہ اس سے کہہ دو کہ بھائی اگر اس میں دے سکتے ہو تو دے دو مان لے تو ٹھیک اور نہ مانے تو بھی ٹھیک ہے، اگر اتنے پیسے دے سکتے ہو تو دے دو اگر نہیں تو خریداری نہ کرو، اس کے اوپر لڑائی کرنا یا مسلط ہو جانا یہ صحیح نہیں ہے۔

دکاندار سے زبردستی پیسے کم کرا کے کوئی چیز خریدنا

آج کل رواج ہے کہ زبردستی پیسے کم کروائے جاتے ہیں، مثلاً فرض کریں کہ آدمی دوسرے کے سر پر سوار ہو کر اس کو بالکل ہی زچ کر دے، یہاں تک کہ اس کے پاس چارہ ہی نہ رہا تو اس نے کہا کہ چلو بھئی اس بلا کو دفع کرو چاہے پیسوں کا کچھ نقصان ہی ہو جائے یہ کہہ کر اگر دکاندار مال دیدے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ چیز آپ کے لئے حلال بھی نہیں ہوگی، اس لئے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسِهِ مِنْهُ))(۱)

لہٰذا آپ نے تو اس سے زبردستی کم کرایا ہے طیب نفس اس کا نہیں تھا، لہٰذا حلال بھی نہیں ہوا اس لئے کم کرانے کے لئے زیادہ اصرار کرنا اور زیادہ پیچھے پڑنا مومن کی شان نہیں۔

یہ بھی دین کے مقاصد میں داخل ہے

فرض کریں کسی سواری کا کرایہ ہے تو دوسرے لوگ جتنے دیتے ہیں اس سے کچھ زیادہ دے دیں تاکہ ان کی قدر و منزلت دل میں قائم رہے، اہل علم کی قدر و منزلت قائم رہنا یہ بھی دین کے مقاصد میں سے ہے اور اگر تم دوسروں سے کم دو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مولوی کی شکل دیکھ کر وہ بھاگے گا کہ یہ مولوی آ گیا ہے میرے اوپر مصیبت بنے گا اور مجھے پیسے پورے نہیں دے گا، اس کے برخلاف دوسروں سے زائد دے دو گے تو تمہاری قدر و منزلت پیدا ہوگی۔

یہ سب دین کی باتیں ہیں یہ اخلاق نبوی ہیں جن کو حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہئے کہ اپنے عام معاملات میں آدمی نرمی کا برتاؤ کرے، اگر پیسے ہیں اور ضرورت کی چیز نہیں ہے تو مت خریدیں

(۱) مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۷۷٤، حدیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''کسی مسلمان کا مال دوسرے کے لئے اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں''

لیکن زبردستی کرنا یا لڑنا جھگڑنا یہ مومن کا شیوہ نہیں ہے۔ آگے فرمایا:

((وَاِذَا اقْتَضٰی))

یعنی جب اپنا حق کسی سے مانگے تو اس میں بھی نرم ہو، یعنی تمہارا حق ہے وہ مانگ رہے ہو تو جیسا ابھی عرض کیا کہ مانگو لیکن نرمی کے ساتھ، اگر دوسرے آدمی کا کوئی عذر ہے، تو اس عذر کا لحاظ کرو۔

اس کا بہترین اصول نبی کریم ﷺ نے بیان فرمادیا کہ جب بھی کسی شخص سے معاملہ کرو تو معاملہ کرتے وقت اس کو اپنی جگہ بٹھا لو اور اپنے آپ کو اس کی جگہ بٹھا لو اور یہ سوچو کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کیا پسند کرتا تو جو معاملہ تم اپنے حق میں پسند کرتے ہو وہی معاملہ اس کے ساتھ کرو۔ نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَحِبَّ لِأَخِيكَ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ))(۱)

یہ نہیں کہ دو پیمانے بنالئے ہیں ایک پیمانہ اپنے لئے اور ایک پیمانہ دوسروں کے لئے بلکہ ایک ہی پیمانے سے اپنے عمل کو بھی اور دوسرے کے عمل کو بھی ناپو۔

یہ ایسا زریں اصول ہے کہ اگر آدمی اپنی زندگی میں اس کو اختیار کرے تو نہ جانے کتنی لڑائیاں، جھگڑے، طوفانِ بدتمیزیاں ختم ہو جائیں یعنی معاملات کے وقت اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو جتنا اصرار میں کر رہا ہوں اگر یہ مجھ سے اتنا اصرار کرتا تو کیا میں اس کو پسند کرتا اگر نہ کرتا تو مجھے بھی اس کے ساتھ نہیں کرنا چاہئے۔

زیرِ نظر حدیث کا بھی یہی مطلب ہے:

((رَجُلًا سَمْحًا اِذَا بَاعَ، وَاِذَا اشْتَرٰی، وَاِذَا اقْتَضٰی))

مومنوں کی تجارت، کاروبار اور ان کے معاملات غیر مسلموں سے کچھ تو ممتاز ہوں پتہ چلے کہ ہاں یہ مومن کا کام ہے، یہ بھی معلوم ہو کہ میں کسی مسلمان سے معاملہ کر رہا ہوں اور مسلمان بھی اگر اہل علم ہو تو اس کا تو اور زیادہ بڑا مرتبہ ہے، اس واسطے اس کو دوسروں کی بہ نسبت اور زیادہ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہئے۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب من الايمان أن يحب لأخيه ما يحب لنفسه، رقم:۱۲، سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب منه، رقم:۲۴۳۹، سنن النسائي، كتاب الايمان وشرائعه، باب علامة الايمان، رقم:۴۹۳۰، مسند أحمد، رقم:۱۲۶۷۱، حدیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اپنے بھائی کے لئے بھی وہی بات پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو"

دنیا میں تاجروں کے ذریعے اشاعت اسلام

دنیا کے بہت سے حصوں میں تاجروں کے ذریعے اسلام پھیلا۔ کیونکہ اس کے لئے باقاعدہ کوئی جماعت نہیں گئی تھی کہ جو جا کے لوگوں کو دعوت دے، تاجر تھے، تجارت کرنے گئے تھے لوگوں نے ان کے تجارتی معاملات کو دیکھا اور مشاہدہ کیا کہ یہ کیسے بااخلاق لوگ ہیں ان کو دیکھ کر مسلمان ہوئے۔

آج مسلمان چلا جائے تو لوگ ڈرتے ہیں کہ اس کے ساتھ معاملہ کیسے کریں، دھوکہ یہ دے گا، فریب یہ کرے گا، جھوٹ یہ بولے گا، بدعنوانیوں کا ارتکاب یہ کرے گا اور جو باتیں ہماری تھیں وہ غیر مسلموں نے اپنالیں۔ تو اس کے نتیجے میں اللہ نے دنیا میں ان کو کم از کم فروغ دے دیا، اب بھی امریکہ میں یہ صورتحال ہے کہ آپ ایک دوکان سے کوئی سوداخریدنے کے لئے گئے، ہفتہ گزر گیا ایک ہفتہ گزرنے کے بعد آپ دکاندار کے پاس جائیں اور اس سے کہیں کہ بھائی یہ جو سیٹ میں نے لیا تھا یہ میرے گھر والوں کو پسند نہیں آیا اگر اس چیز میں کوئی نقص پیدا نہ ہوا ہو تو کہتے ہیں لاؤ کوئی بات نہیں، واپس کرلیں گے۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ أَقَالَ نَادِمًا بَيْعَتَهُ أَقَالَ اللّٰهُ عَثْرَتَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))(۱)

ہمارے ہاں اگر واپس کرنے کے لئے جائے تو جھگڑا ہو جائے گا جبکہ وہ واپس کر لیتے ہیں۔

ان اصولوں کی پابندی غیر مسلم تاجروں کے ہاں ہے

امریکہ سے پاکستان ٹیلی فون کیا اور آپ نے ایک ڈیڑھ منٹ بات کی اس کے بعد ایکسچینج کو فون کر دیں کہ میں نے فلاں نمبر پر فون کرنا چاہا تھا مجھے رانگ نمبر مل گیا جس نمبر کو میں چاہ رہا تھا وہ نمبر نہیں ملا تو کہتے ہیں کوئی بات نہیں ہم آپ کے بل سے یہ کال کاٹ دیں گے۔

اب ہمارے پاکستانی بھائی پہنچ گئے تو انہوں نے ٹائپ رائٹر خریدا مہینے بھر اس کو استعمال کیا اس سے اپنا کام نکالا ایک مہینے کے بعد جا کر کہا کہ پسند نہیں آیا لہٰذا واپس لے لیں۔ شروع شروع میں انہوں نے واپس لے لیا لیکن دیکھا کہ لوگوں نے یہ کاروبار ہی بنالیا تو اب یہ معاملہ ختم کر دیا۔

---

(۱) کشف الخفاء، رقم:۲۳۸۳ (۲/۲۲۸)، جامع الأحادیث، رقم:۲۱۴۲۳ (۲۰/۳۳)، جمع الجوامع للسیوطی، رقم:۴۱۵۴ (۱/۲۲۰۵۵)، صحیح ابن حبان، رقم:۵۰۲۷ (۱۱/۳۸۱)، اعلاء السنن، باب جواز الاقالة وفضلها، (۱۴/۲۲۰)، اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے ''جو شخص بیع پر نادم ہونے والے شخص سے کیا جانے والا معاہدہ ختم کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی لغزشات سے درگذر فرمائے گا''

اپنی نوعیت کا ایک عجیب واقعہ

میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا، میں لندن سے کراچی واپس آرہا تھا اور لندن کا جو ہیتھرو ائیرپورٹ ہے وہاں ائیرپورٹ پر بہت بڑا بازار ہے مختلف اسٹال وغیرہ لگے رہتے ہیں، اس میں دنیا کی مشہور کتاب ''انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا'' کا اسٹال لگا ہوا تھا، میں وہاں کتابیں دیکھنے لگا تو مجھے ایک کتاب نظر آئی جس کی بہت عرصے سے میں تلاش میں تھا اس کا نام ''گریٹ بکس'' ہے، انگریزی میں ۶۵ جلدوں میں ہے اس کتاب میں ''ارسطو'' سے لے کر ''برٹرینڈرسل'' تک جو بھی قریب میں فلسفی گزرا ہے یعنی تمام فلسفیوں اور تمام بڑے بڑے مفکرین کی اہم ترین کتابیں جمع کردیں اور سب کے انگریزی ترجمے اس کتاب میں موجود ہیں۔ میں وہ کتاب اسٹال پر دیکھنے لگا اسٹال پر جو آدمی (Shope Keeper) یعنی دکاندار کھڑا تھا، کہنے لگا ''کیا آپ یہ کتاب لینا چاہتے ہیں اور کیا آپ کے پاس ''انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا'' پہلے موجود ہے؟''

میں نے کہا ''جی ہاں لینا چاہتا ہوں اور پہلے سے موجود بھی ہے''

اس نے کہا ''اگر آپ کے پاس پہلے سے ''انسائیکلو پیڈیا'' موجود ہے تو آپ کو ہم یہ پچاس فیصد رعایت میں دے دیں گے یعنی جو اصل قیمت ہے اس کی آدھی قیمت پر دے دیں گے''

میں نے کہا'' میرے پاس ہے تو سہی لیکن کوئی ثبوت نہیں ہے، جس سے ثابت کروں کہ میرے پاس ہے''

دکاندار نے کہا'' ثبوت کو چھوڑیں! بس آپ نے کہہ دیا ہے کہ'' ہے'' تو بس آپ پچاس فیصد کے حق دار ہیں''

اب میں نے حساب لگایا کہ پچاس فیصد رعایت کے ساتھ کتنے پیسے بنیں گے تو پچاس فیصد رعایت کے ساتھ وہ تقریباً پاکستانی چالیس ہزار روپے بن رہے تھے۔ مجھے اپنے دارالعلوم کے لئے خریدنی تھی، دارالعلوم ہی کے لئے'' بریٹانیکا'' پہلے بھی موجود تھی۔

میں نے کہا'' میں تو اب جارہا ہوں یہ کتاب میرے پاس کیسے آئے گی؟''

دکاندار نے کہا'' آپ فارم بھر دیجئے ہم یہ کتاب آپ کو جہاز سے بھیج دیں گے، جب میں نے وہ فارم بھر دیا تو دکاندار کہنے لگا کہ آپ اپنا کریڈٹ کارڈ کا نمبر دے کر دستخط کردیجئے''

تو میں ذرا کھٹکا کہ دستخط کروں یا نہ کروں اس لئے کہ دستخط کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ادائیگی ہوگئی وہ چاہے تو اسی وقت جاکر فوراً پیسے نکلوا سکتا ہے، مگر مجھے غیرت آئی کہ اس نے میری زبان پر

اعتبار کیا اور میں یہ کہوں کہ نہیں میں نہیں کرتا۔ لہٰذا میں نے دستخط کر دیئے، دستخط کرنے کے بعد میرے دل میں ایک خیال آیا اور میں نے کہا کہ دیکھو یہاں آپ مجھے پچاس فیصد رعایت پر دے رہے ہیں، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے بلکہ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ میں نے یہاں سے کتابیں بہت رعایت سے خریدیں اور پاکستان جا کر مجھے اس سے بھی سستی مل گئیں، لوگ پتہ نہیں کس کس طرح منگوا لیتے ہیں اور سستی بیچ دیتے ہیں، تو مجھے اس بات کا احتمال ہے کہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں مجھے اس سے سستی مل جائے۔

دکاندار نے کہا "اچھا کوئی بات نہیں، آپ جا کے پاکستان میں معلوم کر لیجئے اگر آپ کو سستی مل رہی ہوں گی تو ہمارا یہ آرڈر کینسل کر دیجئے اور اگر نہ ملے تو ہم آپ کو بھیج دیں گے"

میں نے کہا "آپ کو کیسے بتاؤں گا؟"

دکاندار کہنے لگا "آپ کو تحقیق کرنے میں کتنے دن لگیں گے، کیا آپ چار پانچ دن یعنی بدھ کے دن تک پتہ لگا سکیں گے؟"

میں نے کہا "ہاں! انشاء اللہ"

دکاندار نے کہا "میں بدھ کے دن بارہ بجے آپ کو فون کر کے پوچھوں گا کہ آپ کو سستی مل گئی کہ نہیں، اگر مل گئی تو میں آرڈر کینسل کر دوں گا اور اگر نہیں ملی ہوگی تو پھر روانہ کر دوں گا"

تو اس نے حجت ہی نہیں چھوڑی۔ لہٰذا میں نے کہا کہ اچھا بھائی ٹھیک ہے اور میں نے دستخط کر دیئے اور فارم ان کو دے دیا، لیکن سارے راستے میرے دل میں دغدغا لگا رہا کہ میں دستخط کر کے آ گیا ہوں وہ اب چاہے تو اسی وقت جا کر بلا تاخیر چالیس ہزار روپے بینک سے وصول کر لے، اس میں تاخیر ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے، لہٰذا یہاں کراچی پہنچ کر میں نے دو کام کیے۔

ایک کام یہ کیا کہ امریکن ایکسپریس جو کریڈٹ کارڈ کی کمپنی تھی اس کو خط لکھا کہ میں اس طرح دستخط کر کے آیا ہوں لیکن اس کی پیمنٹ (ادائیگی) اس وقت تک نہ کریں جب تک میں دوبارہ آپ سے نہ کہوں۔ اور دوسرا کام یہ کیا کہ ایک آدمی کو بھیجا کہ یہ کتاب دیکھ کر آؤ، اگر مل جائے تو لے آؤ، میں پہلے یہاں تلاش کر رہا تھا لیکن مجھے ملتی نہیں تھی ایسا ہوا کہ اس نے جا کر تلاش کی تو صدر کی ایک دوکان میں یہ کتاب مل گئی اور سستی مل گئی یعنی وہاں چالیس ہزار میں پڑ رہی تھی یہاں تیس ہزار میں مل گئی جبکہ وہ پچاس فیصد رعایت کرنے کے بعد تھی، اب میرا دل اور پریشان ہوا، اللہ کا کرنا کہ یہاں سستی مل رہی ہے اور اس نے کہا تھا کہ بدھ کے دن میں فون کروں گا خدا جانے فون کرے نہ کرے۔

لہٰذا میں نے احتیاطاً خط بھی لکھ دیا کہ بھائی یہاں مل گئی ہے ٹھیک بدھ کا دن تھا اور بارہ بجے دوپہر کا

وقت تھا اس کا فون آیا۔

دکاندار نے فون پر کہا کہ بتایئے آپ نے کتاب دیکھ لی، معلومات کرلیں؟ میں نے کہا جی ہاں کر لی ہیں اور مجھے یہاں سستی مل گئی ہے۔ تو وہ کہنے لگا کہ آپ کو سستی مل گئی میں آپ کا آرڈر کینسل کر دوں؟ میں نے کہا جی ہاں، اس پر دکاندار نے کہا میں آرڈر کینسل کر رہا ہوں اور آپ نے جو فارم پر کیا تھا اس کو پھاڑ رہا ہوں اچھا ہوا کہ آپ کو سستی مل گئی ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

چار پانچ دن بعد اس کا خط آیا کہ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ وہ کتاب آپ کو کم قیمت پر مل گئی لیکن افسوس ضرور ہے کہ ہمیں آپ کی خدمت کا موقع نہیں مل سکا لیکن وہ کتاب آپ کو مل گئی، آپ کا مقصد حاصل ہو گیا آپ کو مبارکباد دیتے ہیں اور اس بات کو توقع رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی آپ ہمارے ساتھ رابطہ قائم رکھیں گے۔ ایک پیسے کا اس کو فائدہ نہیں ہوا فون لندن سے کراچی اپنے خرچ پر کیا، پھر خط بھی بھیج رہا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم گالیاں والیاں بہت دیتے ہیں، یہ ان اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے جنہیں ہم چھوڑ چکے ہیں، بہر حال کفر کی وجہ سے ان سے نفرت ہونی چاہئے لیکن انہوں نے بعض وہ اعمال اپنا لئے ہیں جو درحقیقت ہمارے اپنے اسلامی تعلیمات کے اعمال تھے اس کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو فروغ دیا۔

حق میں سرنگوں اور باطل میں ابھرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے) ایک بڑی یاد رکھنے کی اور بڑی زریں بات فرمایا کرتے تھے کہ باطل کے اندر تو ابھرنے کی صلاحیت نہیں ہے:

﴿إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾(۱)

لیکن اگر کبھی دیکھو کہ کوئی باطل پرست ابھر رہے ہیں تو سمجھو کہ کوئی حق والی چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے جس نے اس کو ابھار دیا ہے کیونکہ باطل میں تو ابھرنے کی طاقت تھی ہی نہیں، حق چیز لگ گئی اس نے ابھار دیا۔ اور حق میں صلاحیت سرنگوں ہونے کی نہیں:

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾(۲)

تو جب حق اور باطل کا مقابلہ ہو تو ہمیشہ حق کو غالب ہونا ہے، اس میں صلاحیت نیچے جانے کی

---

(۱) بنی إسرائیل: ۸۱، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور یقیناً باطل ایسی ہی چیز ہے جو مٹنے والی ہے''

(۲) بنی إسرائیل: ۸۱، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور کہو کہ: ''حق آن پہنچا اور باطل مٹ گیا''

نہیں ہے، اگر کبھی دیکھو کہ حق والی قوم نیچے جارہی ہے تو سمجھ لو کہ کوئی باطل چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے جس نے اس کو گرایا ہے یہ بڑی کام کی بات ہے۔

ہمارے ساتھ ان کے یہ سب باطل طریقے لگ گئے اور ان اقوام نے ان حق باتوں کو اپنا لیا ہے تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے کم از کم دنیا میں تو اس کا بدلہ ان کو دیا کہ دنیا کے اندر ان کو فروغ حاصل ہوا، ترقی ملی، عزت ملی، لیکن آخرت میں معاملہ تو اور ہی معیار پر ہونا ہے۔ یعنی وہاں کا معاملہ دوسرے معیار کا ہے لہٰذا وہاں کا معاملہ تو وہاں ہوگا لیکن دنیا کے اندر ان کو جو ترقی مل رہی ہے اور ہم جو نیچے گر رہے ہیں اس کے اسباب یہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا دار الاسباب بنائی، انہوں نے یہ اخلاق اختیار کیے تو ان اخلاق کے اختیار کرنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے تجارت کو فروغ دیا، صنعت کو فروغ دیا اور سیاست میں فروغ دیا اور تم نے یہ چیزیں اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات چھوڑ دیے لہٰذا اللہ تعالیٰ جب چاہتے ہیں ہماری پٹائی کرا دیتے ہیں، روز پٹائی ہوتی ہے۔

برطانیہ میں ایک بے روزگاری الاؤنس ہوتا ہے یعنی کوئی آدمی بے روزگار ہو گیا اور حکومت کو پتہ چل گیا کہ یہ بے روزگار ہے تو اس کا ایک الاؤنس جاری کر دیتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ جب تک وہ بے روزگار ہے تو بھوکا نہ مرے بلکہ اس کو ایک وظیفہ ملتا رہے اور اگر وہ معذور نہیں ہے تو روزگار کی تلاش میں لگا رہے کوشش کرتا رہے اور جب روزگار مل جائے تو اپنا روزگار خود سنبھالے اور اگر معذور ہے تو وظیفہ ملتا رہتا ہے۔

اب ہمارے مسلمان بھائیوں کی ایک بڑی تعداد وہاں پر ہے اس نے اپنے آپ کو بیروزگار ظاہر کر کے وہ ایک الاؤنس جاری کر وا رکھا ہے اور بہت سیوں کہتے ہیں جب آرام سے گھر پر مل رہا ہے تو کمانے کی کیا ضرورت ہے اور بعض ایسے ہیں کہ جن کو روزگار ملا ہوا ہے یعنی چوری چھپے روزگار بھی کر رہے ہیں اور وہ الاؤنس بھی لے رہے ہیں، اور حد تو یہ ہے کہ ائمہ مساجد یہ کام کر رہے ہیں اور اس کی دلیل یہ بنائی ہے کہ یہ تو کافر لوگ ہیں ان سے پیسے وصول کرنا ثواب ہے۔ لہٰذا ہم یہ پیسے وصول کریں گے۔ امامت کے پیسے بھی مل رہے ہیں اور ٹیوشن بھی چلا رہے ہیں اور ساتھ میں بے روزگای الاؤنس بھی لے رہے ہیں۔

ہم اس عذاب میں مبتلا ہیں تو پھر کیسے رحمت نازل ہو؟ اور جب ہمارا حال یہ ہو گیا تو کیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت شامل حال ہو۔

معاشرے کی اصلاح فرد سے ہوتی ہے

کسی معاشرے کی اصلاح فرد سے ہوتی ہے، یہ سوچنا کہ چونکہ سب یہ کر رہے ہیں تو میں اکیلا کر کے کیا کروں گا یہ شیطان کا دوسرا دھوکہ ہے، دوسرے خواہ کچھ کر رہے ہیں۔ اللہ رب العزت قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

﴿لَا يَضُرُّكُم مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾(۱)

اپنے طور پر اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ سے درست کرلو اور جو اخلاق نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائے ہیں ان کے اوپر عمل کرلو تو اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب ایک چراغ جلتا ہے تو اس ایک سے دوسرا چراغ جلتا ہے اور جلے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

(۱) المائدة: ۱۰۵، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ”تو جو لوگ گمراہ ہیں وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے“

گناہ کا انجام، رزق سے محرومی ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((اَلْمُسْتَغْفِرُ مِنَ الذَّنْبِ وَهُوَ مُصِرٌّ عَلَيْهِ كَالْمُسْتَهْزِئِ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ)) (۱)

''جو شخص کسی گناہ سے استغفار بھی کرتا رہے اور اس پر مصر بھی ہو یعنی چھوڑتا نہیں گناہ پر گناہ کئے جا رہا ہے اور ساتھ ساتھ استغفار بھی کرتا رہتا ہے۔ تو وہ ایسا ہے جیسا کہ اللہ کی آیتوں کے ساتھ مذاق کر رہا ہے''

استغفار کے ساتھ گناہ پر اصرار مضر ہے

یہ تو بہت بری بات ہوئی کہ استغفار بھی کر رہا ہے اور گناہ چھوڑتا بھی نہیں بلکہ مسلسل گناہ میں لگا ہوا ہے۔ اسی لئے پہلے بار بار یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ توبہ کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی کے اندر ندامت ہو اور اس کام کو فی الوقت چھوڑ دے اور آئندہ کے لئے عزم کرے کہ دوبارہ نہیں کرے گا تب توبہ کامل ہوگی۔ پس جو آدمی گناہ بھی کئے جا رہا ہے نہ اس کے اوپر ندامت ہے نہ اس کو چھوڑنے کو تیار ہے اور پھر ساتھ ساتھ ''استغفر اللہ'' بھی کہہ رہا ہے تو گویا یہ شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ محض مذاق کر رہا ہے۔ اسی کو ملا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''ہاتھ میں تسبیح ہے زبان پر توبہ کے الفاظ ہیں لیکن دل گناہ کے ذوق وشوق سے بھرا ہوا ہے تو ایسے استغفار سے ہمارے گناہ کو بھی ہنسی آتی ہے کہ یہ کیسا آدمی ہے کہ گناہ کو چھوڑتا بھی نہیں ہے اور ساتھ ساتھ اپنے آپ کو توبہ واستغفار کرنے والا بھی

☆ ضبط وتحریر: محمد اویس سرور، تاریخ ضبط: ۳۱ مارچ ۲۰۰۹ء

(۱) شعب الإيمان، رقم: ۷۱۷۸ (۵/۴۳۶)، الزواجر عن اقتراف الكبائر (۳/۳٤۸)، تفسير حقي (۱/۷۲)، إحياء علوم الدين (۵/۳۵۹)

سمجھ رہا ہے"

یہ حدیث اگر چہ سند کے اعتبار سے کمزور ہے لیکن معنی کے اعتبار سے بڑی حد تک صحیح ہے کہ آدمی اصرار کرتا رہے گناہ پر اور ساتھ ساتھ استغفار کرتا رہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں۔

ایک دوسری حدیث ہے اور وہ حدیث اس حدیث کے مقابلے میں سند کے اعتبار سے زیادہ قوی بھی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

((مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ)) (۱)

"جو آدمی استغفار کرتا رہے وہ گناہ پر اصرار کرنے والوں میں شمار نہیں ہوگا"

اللہ کے نیک بندوں کی ایک صفت

ان دونوں حدیثوں کا تعلق دراصل قرآن کریم کی ایک آیت سے ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَمْ يُصِرُّوا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (۲)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اول تو کوشش کرتے ہیں کہ گناہ سے بچیں لیکن اگر کبھی کوئی بے حیائی کی بات ان سے سرزد ہوگئی یا انہوں نے اپنی جان پر ظلم کر لیا یعنی کسی گناہ کا ارتکاب کر لیا فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت اللہ سے طلب کرتے ہیں استغفار کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا گناہ کون معاف کرے گا؟ اس لئے وہ اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں جب کوئی غلطی ہوئی تو اللہ کو یاد کیا اور اس سے استغفار کیا، اور جو کچھ کیا تھا اس پر اصرار نہیں کرتے جانتے بوجھتے ہوئے۔

اس آیت میں بتا دیا گیا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسا بنایا ہے کہ اس کے اندر گناہ کا مادہ موجود ہے تو کبھی نہ کبھی کوئی غلطی، کوئی کوتاہی انسان سے ہو ہی جاتی ہے لیکن یہ اللہ کے بندے ایسے ہیں جب کبھی ان سے غلطی اور کوتاہی ہو تو فوراً اللہ کو یاد کر کے توبہ استغفار کرتے ہیں اور اپنے اس فعل پر اصرار نہیں کرتے بلکہ اس کو چھوڑنے کی فکر کرتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کریم کا ارشاد، اس میں اصرار کا لفظ آیا ہے کہ اس میں گناہ کرنے والے اصرار نہیں کرتے کہ میں ضرور کروں گا۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب فی دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم، رقم: ۳۴۸۲، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب فی الإستغفار، رقم: ۱۲۹۳

(۲) آل عمران: ۱۳۵

ایک حدیث میں نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ)) (۱)

''جو آدمی گناہوں پر استغفار کرتا رہے وہ اصرار کرنے والا شمار نہیں ہوگا''

توبہ کی شرائط

اگر استغفار کرتا رہے اگرچہ گناہ ایک سے زائد دفعہ بھی ہوجائیں لیکن استغفار کرتا رہے تو وہ اصرار کرنے والوں میں شمار نہیں ہوگا۔ یہ وہ حدیث تھی جو پیچھے گزری ہے۔ اور اب یہ حدیث کہہ رہی ہے کہ اگر کوئی شخص گناہوں کو چھوڑے نہیں بلکہ ان پر اصرار کرتا رہے اور ساتھ ساتھ استغفار بھی کرتا رہے تو ایسا ہے جیسے اللہ کی آیات سے مذاق کر رہا ہو۔ تو اب بظاہر یہ حدیث جو ہے پچھلی حدیث سے ذرا مختلف نظر آرہی ہے۔ کہ وہاں تو یہ کہا تھا کہ اگر کوئی آدمی استغفار کرتا رہے تو استغفار کرنے کے نتیجے میں اس کو اصرار کرنے والا نہیں سمجھا جائے گا۔ اور یہاں یہ کہا جارہا ہے کہ استغفار کرتا رہے اصرار کرتا رہے تو گویا وہ مذاق کر رہا ہے۔ اب دونوں کا مطلب سمجھ لیجئے معاملے کی حقیقت جو ہے وہ یہ کہ اصل میں توبہ اور استغفار وہ ہے جس میں تین باتیں پائی جائیں:

(۱) جو گناہ پہلے ہوچکے ان پر نادم اور شرمندہ ہو، پریشان ہو اور ان گناہوں کی برائی اور نحوست اس کے دل میں بیٹھ چکی ہو۔

(۲) اس کام کو فوری طور سے چھوڑ دے۔

(۳) آئندہ کے لئے پکا ارادہ کرے کہ پھر دوبارہ یہ عمل نہیں کروں گا۔

جب یہ تین باتیں پائی جائیں گی تو توبہ و استغفار کامل ہوگا۔ اور اس پر وعدہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہ جو ایسی توبہ کرلے گا وہ ایسا ہوجائے گا جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمالیا، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ)) (۲)

''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں''

اس کا گناہ نامہ اعمال سے مٹادیا جائے گا، اصل توبہ یہ ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب في دعاء النبي صلى الله عليه وسلم، رقم: ۳٤۸۲، سنن أبي داود، کتاب الصلاة، باب في الإستغفار، رقم: ۱۲۹۳

(۲) سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر التوبة، رقم: ٤۲٤۰

دوسری ایک قسم ہم جیسے کمزوروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی گنجائش رکھی ہے۔ مثلاً ایک آدمی کسی گناہ میں مبتلا ہے کسی مجبوری اور ضرورت کی وجہ سے اس پر نادم بھی ہے شرمسار بھی ہے پشیمان بھی ہے چھوڑنا بھی چاہتا ہے کوشش میں بھی لگا ہوا ہے، لیکن کسی وجہ سے چھوڑا نہیں جارہا۔ مثلاً ایک آدمی کسی ناجائز ملازمت میں مبتلا ہوگیا جو شرعاً جائز نہیں۔ اب دل میں پشیمان بھی ہے کہ یہ جو آمدنی میری آرہی ہے یہ حلال نہیں ہے حرام ہے۔ اور ندامت بھی ہے شرمساری بھی ہے اور ساتھ ساتھ کوشش بھی ہے کہ چاہتا ہے اس کو چھوڑ کر کوئی اور حلال ذریعہ معاش اختیار کرلوں اور فوراً چھوڑ بھی نہیں سکتا کہ اگر چھوڑتا ہوں تو بچوں کو فاقے آئیں گے، اور کوئی دوسرا حلال ذریعہ معاش مل نہیں رہا تو اس مجبوری میں گھرا ہوا ہے اس وقت میں ایسی مجبوری ایسے حالات میں وہ حدیث کہی گئی:

((مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ))

''استغفار کرنے والے نے گناہ پر اصرار نہیں کیا''

''استغفار'' کو حرزِ جان بنائیے

اگر ایسے حالات میں وہ استغفار کرتا رہے، اللہ تعالیٰ کے حضور یہ کہتا رہے کہ یا اللہ ہے تو یہ غلط کام جو میں کررہا ہوں اور میں اس وقت نادم بھی ہوں شرمسار بھی ہوں پشیمان بھی ہوں اور چھوڑنا بھی چاہ رہا ہوں لیکن کسی مجبوری کی بنا پر مجھ سے چھوڑا نہیں جارہا۔ اس واسطے اے اللہ میں آپ سے استغفار کرتا ہوں، تو ایسے آدمی کے لئے نبی کریم ﷺ نے مایوس ہونے کے راستے کے بجائے یہ بشارت دے دی جو آدمی اس طرح استغفار کرتا رہے اگرچہ ابھی تک چھوڑ نہیں پایا کوشش میں لگا ہوا ہے پھر بھی انشاء اللہ اس کو اصرار کرنے والوں میں نہیں لکھا جائے گا۔ کیونکہ یہ جو کررہا ہے یہ دھڑلے سے نہیں کررہا بے حیائی سے نہیں کررہا ہے۔ ندامت، پشیمانی اور شرمساری کے ساتھ کررہا ہے اور چھوڑنے کی کوشش میں بھی لگا ہوا ہے۔ جو استغفار کررہا ہے اس استغفار کے بدلے میں کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف بھی فرمادیں۔

یہ جو حدیث ہے اس میں جو کہا گیا ہے یہ تیسری قسم ہے کہ ایک آدمی ہے گناہ میں لگا ہوا ہے کوئی مجبوری نہیں اپنے اختیار میں ہے جب چاہے چھوڑ سکتا ہے اور اس کے باوجود دل میں کوئی ندامت بھی نہیں شرمساری بھی نہیں اور چھوڑنے کی کوشش بھی نہیں اور کہتا ہے کہ میں تو کرتا رہوں گا اور ساتھ ساتھ زبان سے کہہ رہا ہے ''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ'' تو نہ ندامت ہے نہ کوشش ہے چھوڑنے کی اور زبان سے کہہ رہا ہے ''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ

اِلَیْہِ" اس کے بارے میں حدیث میں فرمایا کہ یہ ایسا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ مذاق کرنے والا ہے، یہ استغفار نہیں یہ تو مذاق ہے۔ کسی آدمی کو آپ پکڑ کے مارنا شروع کرو اور ایک تھپڑ مارو اور کہنا بھائی معاف کرنا تو یہ مذاق ہے کہ نہیں؟ تو جس طرح وہ مذاق ہے وہ چاہے گا کہ تم مجھ سے معافی مانگ رہے ہو یا میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو تو ایک آدمی اگر ایک انسان کے ساتھ یہ معاملہ کرے تو وہ اس کو مذاق سمجھے گا تو اللہ کی نافرمانی بھی کیے جا رہے ہو دھڑلے سے کوئی ندامت نہیں کوئی شرمساری نہیں اور چھوڑنے کی کوشش بھی نہیں کوئی مجبوری بھی نہیں اور پھر بھی کہہ رہے ہو "اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ" تو یہ اللہ کے ساتھ مذاق کرنا ہوا اور اللہ بچائے، اللہ کے ساتھ مذاق کرنا بڑی سنگین بات ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔

خلاصہ یہ کہ یہ حدیث ثابت آتی ہے ان لوگوں پر جو یہ کہتے ہیں کہ گناہ کے بارے میں کبھی چھوڑنے کا تصور بھی نہیں آتا ندامت بھی پیدا نہیں ہوتی بلکہ الٹا اس پر سینہ زوری کرتے ہیں، اس کو صحیح، جائز اور حلال قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور باوجود اختیار کے نہیں چھوڑتے۔ تو گناہ پر اصرار کے ساتھ استغفار کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔

البتہ جہاں آدمی کے دل میں ندامت ہو، شرمساری ہو، اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہو کر اللہ کو یاد کرے اور استغفار کرے اور یہ کہے یا اللہ میں چھوڑنا چاہتا ہوں مگر فلاں وجہ سے چھوڑ نہیں پا رہا ہوں، اے اللہ! مجھے طاقت بھی دے دیجئے، توفیق بھی دے دیجئے۔ یا اللہ! مجھے اس گناہ سے چھڑا دیجئے توفیق عطا فرما دیجئے اور میں اس پر نادم ہوں، شرمسار ہوں اور پھر استغفار کرے تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ استغفار مقبول ہے۔ یہ ہے دونوں حدیثوں کا فرق۔

گناہ کی نحوست، رزق سے محرومی

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ الْعَبْدَ لَیُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ یُصِیْبُہٗ)) (۱)

"بعض اوقات بندے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے کسی گناہ کی وجہ سے جس کا وہ ارتکاب کرے"

یعنی گناہ کا نتیجہ بعض اوقات دنیا میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ

(۱) سنن ابن ماجہ، المقدمۃ، باب فی القدر، رقم: ۸۷، مسند أحمد، ومن حدیث ثوبان، رقم: ۲۱۳۷۹، ۲۱۴۰۲

انسان کو رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہو بلکہ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ گناہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ یعنی گناہ کا جو اصل نقصان ہے اور اس کی جو اصل سزا ہے وہ تو آخرت میں ہوگی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾(۱)

کبھی کبھی ہم اس آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا میں بھی کچھ عذاب کی جھلک دکھا دیتے ہیں تاکہ ان کے اندر اگر کوئی ہوش عقل وغیرہ ہے تو شاید یہ لوٹ آئیں اور ان گناہوں سے بعض آجائیں دنیا ہی کے اندر تو آخرت میں ان کو عذاب دینے کی ضرورت نہ پڑے۔ اللہ تو بڑا رحیم و کریم ہیں قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

﴿مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ﴾(۲)

اگر تم اللہ کے شکر گزار بندے بنو اور صحیح معنی میں مومن بنو تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کریں گے۔ اس واسطے دنیا میں بھی کبھی کبھی ایک عذاب کی شکل دکھا دی جاتی ہے تاکہ یہ لوگ واپس آجائیں تو اسی عذاب کی ایک شکل یہ بھی ہے۔

جب کبھی آدمی کو رزق میں کمی ہو صبر و فاقے کی نوبت آئے یا رزق میں تنگی ہو تو اس واسطے بزرگ کہتے ہیں کہ ایسے وقت میں انسان کو استغفار کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہئے کہ یا اللہ یہ جو تنگی پیش آ رہی ہے یقیناً میری کسی بدعملی کا نتیجہ ہے۔ اے اللہ اپنی رحمت سے میری اس بدعملی کو معاف فرما دیجئے۔ تو جب کبھی کوئی تکلیف پیش آئے تو توبہ و استغفار کرے۔

رزق کا وسیع مفہوم

لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضور ﷺ نے لفظ یہ استعمال فرمایا کہ کبھی کبھی انسان کو گناہ کی وجہ سے رزق محروم کر دیا جاتا ہے۔ رزق کو عام طور پر صرف کھانے پینے کی اشیاء روپیہ پیسے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا ظاہری مفہوم ہم یہ سمجھیں گے کہ گناہ کے نتیجے میں پیسے کی آمدنی کم ہو جائے گی، لیکن عربی زبان میں رزق کا مفہوم صرف کھانے پینے روپے پیسے کے ساتھ خاص نہیں۔

عربی زبان میں رزق کہتے ہیں عطاء کو، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو کوئی بھی چیز دے اس کو رزق کہتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت ہو تو اس میں ساری عطائیں آجاتی ہیں، اس

(۱) السجدة: ۲۱ (۲) النساء: ۱۴۷

میں صرف روپیہ پیسہ، کھانا پینا نہیں بلکہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی علم ہے وہ بھی اللہ کا رزق ہے، کسی کے پاس کوئی ہنر ہے وہ بھی اللہ کا رزق ہے، کسی کے پاس صحت ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کا رزق ہے، کسی کے پاس خوشحالی ہے وہ بھی اللہ کا ذکر ہے۔

تمام کمالاتِ انسانیہ رزق ہیں

رزق صرف کھانے پینے روپے پیسے کے ساتھ خاص نہیں۔ جتنے بھی کمالات انسان کے اندر پائے جاتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی عطاء ہے اس کا رزق ہے۔ اگر کوئی آدمی ذہین ہے تو یہ ذہن بھی اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی عطاء ہے لہٰذا اللہ کا رزق ہے۔ اس کے اندر عقل ہے وہ عقل بھی اللہ تعالیٰ کی عطاء ہے لہٰذا عقل اللہ تعالیٰ کا رزق ہے۔ تو جب یہ کہا گیا کہ گناہ سے بعض اوقات انسان کو رزق سے محرومی ہو جاتی ہے تو اس میں صرف روپے پیسے کی بات نہیں کھانے پینے کی بات نہیں بلکہ ہر طرح کے رزق کی بات ہے۔

کبھی اللہ تعالیٰ ایسا کرتے ہیں کہ گناہ کی وجہ سے کھانے پینے میں تو کوئی کمی نہیں کرتے، کھانے پینے میں آدمی مست ہے خوب کھا پی رہا ہے، آمدنی پہلے سے بھی زیادہ ہو رہی ہے، لیکن اور کوئی چیز جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کی تھی وہ واپس لے لیتے ہیں چھین لیتے ہیں۔ صحت چھین لی بیماری آ گئی، فراغت چھین لی بے فکری چھین لی فکر اور پریشانی میں مبتلا ہو گیا، علم دیا تھا علم چھین لیا، ہنر دیا تھا ہنر چھین لیا، عقل اور سمجھ دی تھی وہ چھین لی، تو دنیا کے اندر گناہ کی جو سزا ملتی ہے ان میں یہ مختلف شکلیں ہوتی ہیں مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

لہٰذا گناہ کا نقصان جو آخرت میں ظاہر ہوگا وہ تو اپنی جگہ ایک بہت بڑا نقصان دنیا میں جو ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بعض اوقات انسان سے اس گناہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ ان دولتوں میں سے کوئی دولت چھین لیتے ہیں۔ صحت چلی گئی روپیہ پیسے کی کمی نہیں محل قائم کئے ہوئے ہیں فیکٹریاں لگی ہوئی ہیں گاڑیاں ہیں بینک بیلنس ہے سب کچھ موجود ہے، لیکن صحت نہیں رہی۔ اس صحت کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ ساری چیزیں بیکار ہو کر رہ گئیں ان کا کوئی فائدہ نہ رہا برکت چلی گئی یہ نقصان ہوا۔

علم و ہنر بھی رزق ہیں

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ علم اور ہنر دیا تھا کوئی کمال دیا تھا، وہ علم و ہنر اور کمال چلا گیا اور کوئی بات پہلے جیسی نہ رہی، اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ بجائے گناہ کے نتیجے میں سمجھ الٹی

ہو جاتی ہے، سمجھ اور عقل اللہ تعالیٰ چھین لیتے ہیں، ہم نے تمہیں عقل دی تھی اس کام کے لئے کہ بھلے برے کو پہچانو اور بھلے برے کو پہچان کر بھلے کو اختیار کرو برے کو چھوڑو۔ لیکن تم نے اپنی عقل کو صحیح استعمال نہیں کیا اور برے میں ہی اس کو استعمال کرتے رہے تو اب ہم نے بھلے برے کی تمیز اور پہچان چھین لیتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں کیا ہوتا ہے کہ یہ جو بری باتیں ہیں وہ بھی اچھی لگنے لگتی ہیں برے کام بھی اچھے لگنے لگتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں انسان گناہ پر گناہ کئے جاتا ہے، اسی کو قرآن کریم میں فرمایا:

﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (۱)

ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ زنگ لگا دیتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو محفوظ رکھے، زنگ لگا دیتا ہے کہ دل میں اچھی بات آتی ہی نہیں، برائی کا تصور ذہن سے مٹ جاتا ہے سمجھ الٹی ہو جاتی ہے، اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، اب دیکھیں آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ پہلے زمانے میں جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے لوگوں میں دینداری کا غلبہ تھا تو گناہ کو کس طرح سے برا سمجھا جاتا تھا، اگر کوئی سود خور ہے تو سارے معاشرے میں ہے کہ بھائی یہ تو سود کھاتا ہے، اگر کوئی آدمی گانے بجانے کا کام کرتا ہے تو ساری دنیا میں بدنام کہ یہ تو گویا ہے۔ اور اب یہ ساری چیزیں ہنر بن گئیں اب تو وہ آدمی فنکار ہے بڑا تعلیم یافتہ ہے اور بڑا خوشحال ہے، اور لوگ تمنا کرتے ہیں کہ کسی طرح سود سے آمدنی مل جائے، اس واسطے کہ اس میں سہولیات بہت ملتی ہیں، تو وہ گناہ کے گناہ ہونے کا تصور اس کی برائی کا احساس وہ مٹ جاتا ہے، اس واسطے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عقل سلب کر لی، عقلیں الٹی ہوگئیں اس گناہ کی وجہ سے، تو گناہ کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے۔

گناہ سے دل پر زنگ لگ جاتا ہے

اس اثر سے بچنے کا راستہ بھی یہ ہے کہ آدمی گناہ سے توبہ کرے اور استغفار، جب توبہ واستغفار کرے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ اللہ پاک اس کو سمجھ واپس لوٹا دیں گے، ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> ''انسان جب ایمان لاتا ہے یا مومن ہے بالغ ہوتا ہے تو اس کا دل ایک آئینے کی طرح صاف ہوتا ہے، اس کے اندر کوئی نجاست نہیں ہوتی کوئی گندگی نہیں ہوتی کوئی میلا پن نہیں ہوتا، جب پہلی بار گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگ

(۱) المطففین: ۱٤

جاتا ہے، اگر اس نے اس گناہ کے بعد توبہ واستغفار کرلیا ندامت کا اظہار کرلیا تو وہ نکتہ مٹ جاتا ہے، لیکن اگر اس گناہ کے کرنے کے بعد توبہ نہ کی اور دوسرا گناہ کرلیا تو ایک نکتہ اور لگ جاتا ہے، پھر گناہ کیا تو تیسرا نکتہ لگ جاتا ہے، اور اگر اسی طرح سے گناہ کرتا چلا گیا تو وہ نکتہ بڑھ بڑھ کر پورے دل کو گھیر لیتا ہے، اور گھیرنے کے بعد وہ زنگ کی شکل اختیار کرلیتا ہے، اس کے نتیجے میں اس کے دل کے اندر برائی کے برائی ہونے کا احساس ہی ختم ہوجاتا ہے‘‘ (۱)

اب آپ کو کیا بتاؤں، کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے یعنی ایسی باتیں جو آج بھی اس معاشرے میں بھی مسلمان جو ہیں وہ اس کو انتہائی برا غلیظ اور بدنامی کا ذریعہ سمجھتے ہیں میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے لوگوں کو کہتے ہوئے کہ یہ تو باعث فخر ہے، اس کے اوپر تو ہم لوگوں کے سامنے فخر کرتے ہیں کہ ہم نے ایسا گناہ کیا۔ یہ ہے ’’رَانَ‘‘ جس کو قرآن کریم نے ’’رَانَ‘‘ سے تعبیر کیا ہے کہ نکتہ بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ گیا کہ پورے قلب کو کالا کردیا اور وہ زنگ کی شکل اختیار کرگیا۔

لہٰذا جو بات ہمیشہ کہتا رہتا ہوں کہ غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں، لیکن اگر کبھی غلطیاں ہوجائیں تو فوراً اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور توبہ واستغفار کرو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ دنیا کے اندر بھی انسان کو گناہ کی وجہ سے رزق کی وجہ سے محروم کرتے ہیں، اور ظاہری بھی ہوسکتا ہے اور باطنی بھی ہوسکتا ہے، یہ جو میں نے بیان کیا یہ باطنی رزق ہے۔

نیکی کا شوق بھی رزق ہے

صوفیاء کرام اس کا ایک اور معنی بیان کرتے ہیں کہ جب کسی کو نیکی کی طرف عبادت اور اطاعت کی طرف ذوق وشوق ہوا منگ ہو کہ میں نیک کام کروں عبادت کروں، یہ بھی اللہ کی عطا ہے اور اس کا رزق ہے، بعض اوقات گناہ کی وجہ سے یہ عطا بھی چھن جاتی ہے، نیکی کا شوق نہیں رہتا، نیکی کی طرف ابھار پیدا نہیں ہوتا، اس کی امنگ نہیں ہوتی، اور اس کے بعد جو نیکیاں آدمی پہلے کرتا تھا اس سے محروم ہوجاتا ہے، یہ بھی گناہ کا ایک سبب ہے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان أن الإسلام بدأ غریبا وسیعود غریبا......الخ، رقم: ۲۰۷، سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ومن سورة ویل للمطففین، رقم: ۳۲۵۷، سنن ابن ماجه، کتاب الزھد، باب ذکر الذنوب، رقم: ٤٢٣٤، مسند أحمد، مسند أبی ھریرة، رقم: ٧٦١١

صوفیائے کرام کی دو حالتیں، بسط اور قبض

یہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ دو حالتیں ہوتی ہیں ایک کو بسط کہا جاتا ہے ایک کو قبض کہا جاتا ہے، بسط کا معنی طبیعت میں ایک امنگ ہے نشاط ہے ابھار ہے۔ اور قبض کے معنی دل تنگ ہوگیا اور تنگی کی وجہ سے نیکی کا کام نہیں کیا جاتا، یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ تو بعض اوقات قبض کی جو حالت ہوتی ہے یعنی مقصود کا تعین نہیں ہورہا، سستی ہورہی ہے، نشاط پیدا نہیں ہوتا، طبیعت اٹھتی نہیں۔ یہ حالت بھی بعض اوقات گناہ ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کسی نیک کام کے کرنے میں سستی آئی تو پہلا کام یہ کرو کہ استغفار کرو "اَسْتَغْفِرُاللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ" اے اللہ مجھے معاف فرمادیجئے یہ جو سستی آرہی ہے یہ یقیناً میرے کسی گناہ کا نتیجہ ہے، اے اللہ اس گناہ کو معاف فرمادیجئے تاکہ میری یہ سستی دور ہوجائے۔

بہت سے لوگ دیکھتے ہیں کہ طبیعت میں سستی آرہی ہے مختلف نیکیوں کے کام کرنے کے اندر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی، تو جب کبھی ایسا ہو تو فوراً کہو "اَسْتَغْفِرُاللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ" اے اللہ مجھے معاف فرمادیجئے یہ جو سستی آرہی ہے یہ میرے کسی کرتوت کا نتیجہ ہے۔ تو یہ قبض کی حالت انشاء اللہ بسط میں تبدیل ہوسکتی ہے اگر کوئی انسان تو بہ واستغفار پر عمل کرے، اسی لئے صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ قبض کی حالت میں استغفار کی کثرت کرنی چاہئے، اللہ تعالیٰ سے خوب مانگنا چاہئے۔

استغفار، رزق کا دروازہ کھولتا ہے

میں نے ایک کتاب میں دیکھا کہ جو علماء کرام، محدثین اور فقہاء ہیں۔ ان کے سامنے کوئی مسئلہ آگیا اور مسئلہ بڑا مشکل ہے حل نہیں ہورہا طبیعت میں ایک بند سا لگ گیا ہے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس کا حل کیا ہو، جواب کیا ہو؟

ایسے موقع پر بزرگان دین فرماتے تھے کہ پہلا کام کرو "اَسْتَغْفِرُاللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ" استغفار کرو کیوں؟ اس واسطے کہ جو بات سمجھ میں نہیں آرہی اس کے معنی یہ ہیں کہ جو سمجھ کی طاقت اللہ نے دی تھی وہ چھن رہی ہے، تو کسی بدعملی کی وجہ سے چھن رہی ہے، کسی گناہ کی وجہ سے چھن رہی ہے، پہلے استغفار کرلو تو پھر انشاء اللہ بند کھل جائے گا۔ تو یہ صرف علم دین کے اندر خاص نہیں اور علوم کے اندر بھی اور میدانوں میں بھی۔

مثلاً ایک آدمی ڈاکٹر ہے ایک مریض آ گیا اور سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کا کیا علاج کروں اس کا مرض کیا ہے سوچ رہا ہے سمجھ میں نہیں آ رہا مسئلہ حل نہیں ہو رہا، اس موقع پر بھی استغفار کرے ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ'' اے اللہ میں استغفار کرتا ہوں کیونکہ یہ جو بند لگ رہا ہے یہ میری کسی بدعملی کا نتیجہ ہے، استغفار کرے گا تو کوئی بعید نہیں اللہ تعالیٰ بند کھول دے گا، اور بھی دنیا کے کاروبار میں جہاں کہیں کوئی رکاوٹ کا سامنا ہو کوئی بند لگے، فیصلہ نہیں ہو رہا یہ کروں کہ وہ کروں کشمکش میں مبتلا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار کرے۔ ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ'' اے اللہ یہ جو بند لگا ہے یہ میری کسی بدعملی کی وجہ سے لگا ہے اس کے اوپر استغفار کرتا ہوں معافی مانگتا ہوں کچھ بعید نہیں کہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ وہ بند کھول دے۔

یہ تجربے کی بات کر رہا ہوں جو اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی ہے اور الحمد للہ تجربہ خود بھی کیا جب کبھی اس پر عمل کیا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بند کھول دیتے ہیں۔

گناہ اور خوشحالی کا اجتماع خطرناک ہے

تو یہ گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے بند کا لگ جانا رزق سے محرومی، استغفار کی کثرت کرو، تو انشاء اللہ یہ بند کھل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

((اِذَا رَأَیْتُمُ الرَّجُلَ یُعْطِیْهِ اللّٰهُ مَا یُحِبُّ وَهُوَ مُقِیْمٌ عَلٰی مَعْصِیَتِهٖ فَاعْلَمُوْا اَنَّ ذٰلِكَ اسْتِدْرَاجٌ)) (۱)

جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کر رہا ہے کہ جس چیز کی خواہش ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کو دے دیتا ہے، جو چاہتا ہے مل رہا ہے، حالانکہ وہ مسلسل گناہ کیے جا رہا ہے، گناہ پر کمر بستہ ہے، گناہ چھوڑ نہیں رہا، نہ گناہ پر ندامت کا اظہار ہوتا ہے، نہ توبہ واستغفار کرتا ہے، گناہوں میں لگا ہوا ہے گناہوں کے اندر لت پت ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو جو وہ چاہتا ہے، دے دیتے ہیں، دولت چاہتا ہے دولت ملتی ہے، شہرت چاہتا ہے شہرت ملتی ہے، عزت چاہتا ہے عزت ملتی ہے، پیسہ چاہتا ہے پیسہ ملتا ہے، مقبولیت چاہتا ہے مقبولیت ملتی ہے، جو کچھ چاہتا ہے مل رہا ہے، حالانکہ وہ اپنی معصیت پر کمر بستہ ہے، گناہ پر کمر بستہ ہے، تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ اس کو ڈھیل دے رہا ہے۔ وہ استدراج ہے۔ استدراج قرآن کریم کی اصطلاح ہے، قرآن کریم میں

(۱) إحياء علوم الدين (۶/۱۹)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ مِّنۡ حَيۡثُ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝ وَاُمۡلِىۡ لَهُمۡ ؕ اِنَّ كَيۡدِىۡ مَتِيۡنٌ﴾(۱)

اصل میں کافروں کے بارے میں فرمایا کہ ہم ان کو ڈھیل دیتے جائیں گے اس انداز میں کہ ان کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کوئی ڈھیل دے رہا ہے، اور ان کو مہلت دیں گے کہ یہ گناہ کرتے رہیں اللہ کی نافرمانی میں مبتلا رہیں پھر اچانک ان کو پکڑ لیں گے "اِنَّ كَيۡدِىۡ مَتِيۡنٌ" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہماری جو تقدیر ہے بڑی مضبوط ہے، تو اس کو کہتے ہیں استدراج۔

"استدراج" کی حقیقت

استدراج کا معنی ہے کہ ایک آدمی اللہ کا نافرمان ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو ظاہری دنیا کی نعمتوں سے نواز رہے ہیں، پیسے کی اس پر بارش ہو رہی ہے، شہرت اس کو مل رہی ہے، ترقی دنیا میں اس کو ہو رہی ہے، تو حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ سمجھ لو کہ اس کو استدراج ہو رہا ہے، ڈھیل مل رہی ہے، اللہ تعالیٰ ڈھیل دے رہے ہیں، قرآن کریم میں جگہ جگہ فرمایا کہ اگر تم کافروں کو دیکھتے ہو کہ وہ ترقی کر رہے ہیں دنیا میں مال و دولت کے انبار ان کے پاس لگے ہوئے ہیں اور ترقی پہ ترقی کئے جا رہے ہیں تو یاد رکھو یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب دنیاوی زندگی کے اندر ہم نے ان کو تھوڑا سا موقع دے رکھا ہے، جب آنکھ بند ہوگی اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچیں گے تو پتہ چل جائے گا یہ سارے عیش و عشرت اور یہ آرام و آسائش ختم ہو جائیں گے اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ تو جس طرح کافروں کے ساتھ استدراج ہوتا ہے مسلمان کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔

زمانے کے تازیانوں سے سبق سیکھو

اگر مسلمان معصیت پر کمر بستہ ہو، گناہوں پر کمر بستہ ہو، سینہ زوری کرے، اور ندامت کبھی پیدا نہ کرے تو اس کے باوجود بعض اوقات اللہ تبارک و تعالیٰ ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔ ابھی میں نے وہ حدیث بیان کی تھی جس میں فرمایا کہ گناہ کی وجہ سے رزق میں کمی کر دیتے ہیں دنیا میں سزا مل جاتی ہے لیکن وہیں پر میں نے کہا تھا کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جب کسی پر انعام فرمانا چاہتے ہیں تو دنیا کے اندر مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں تاکہ اس کو ہوش آ جائے، اگر ہوش آ جائے لوٹ آئے تو اللہ

(۱) القلم: ۴۴، ۴۵

تبارک وتعالیٰ کے ہاں بڑی خیر ہوگئی، لیکن اگر باوجود بار بار تازیانوں کے ایک آدمی کمر بستہ رہا چھوڑتا ہی نہیں کسی قیمت پر اللہ کی طرف آتا ہی نہیں، اللہ کو یاد کرتا ہی نہیں، ندامت پشیمانی کا اظہار نہیں کرتا تو بعض اوقات پھر حال یہ ہو جاتا ہے کہ جو تم کہتے ہو سب دیں گے تمہیں، اس دنیا میں سب کچھ دے دیں گے دولت بھی دے دیں گے مال بھی دے دیں گے شہرت بھی دے دیں گے عزت بھی دے دیں گے سبھی کچھ دے دیں گے۔ لیکن جب آخرت میں پکڑیں گے تو ایسی پکڑ ہوگی یاد رکھو۔

پس نبی کریم ﷺ نے فرمادیا کہ اگر کسی کو دیکھو کہ معصیت میں مبتلا ہے اور معصیتیں کئے جارہا ہے اس کے باوجود نعمتیں مل رہی ہیں۔ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتے ہیں کہ بھائی ایک آدمی ہے آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ نافرمان ہے اور ظالم ہے جابر ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کمر بستہ ہے اس کے باوجود مزے اڑا رہا ہے، عیش وعشرت میں مصروف ہے کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ تو آدمی کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو عجیب معاملہ ہو رہا ہے، وہ جو کہا:

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے بیچارے مسلمانوں پر

تو دوسروں کے اوپر یہ رحمتیں نازل ہو رہی ہیں اور مسلمان کے اوپر برق گر رہی ہے، آفتیں آرہی ہیں مصیبتیں آرہی ہیں یہ جو دل میں خیال پیدا ہوتا ہے سرکار دوعالم ﷺ اس کا جواب دے رہے ہیں:

> ''اگر دیکھو کہ کسی نافرمان پر یہ آرہی ہیں تو یہ کوئی قابل رشک مقام نہیں ہے ڈرنے کی چیز ہے کہ ڈھیل دی جارہی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے''

مصیبتیں گناہوں کا کفارہ بھی ہوتیں ہیں

بعض اوقات اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں آپ کو جو کچھ مشکلات دیتے ہیں مصیبتیں دیتے ہیں وہ بھی مصیبتیں کفارہ ذنوب ہوتی ہیں، گناہوں کا کفارہ ہوتی ہیں تاکہ ہمارے پاس آئے تو حساب صاف کر کے آئے۔ صاف ہو کر آئے عذاب دینے کی ضرورت نہ پڑے، یہ تو ان کا کارخانہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم اپنے دوست کو بعض اوقات مار ڈالتے ہیں اور دشمن کو پالتے ہیں سامری جادوگر کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ پلوایا وہ کافر جو بت پرستی کا نشان بننے والا تھا اس کو جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے پہاڑوں کے اندر غذا پہنچائی اور پلوایا جبکہ زکریا علیہ السلام کو آروں سے چروادیا۔ یہ جو دنیا کے اندر دیکھتے ہو کہ بعض اوقات کسی نیک آدمی پر آزمائشیں آرہی ہیں اور غلط آدمی پھل پھول رہا ہے تو یہ

سب اس دنیا کا دھوکہ ہے۔

حقیقت میں وہ شخص جو ہے اسے اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ابدی زندگی میں راحتیں ملیں اس واسطے اس کو دنیا کے اندر کچھ تھوڑی سی تکالیف دے دی ہیں۔ اور جو شخص کافر ہے تو اس کے لئے آخرت میں تو کوئی حصہ ہے نہیں لہٰذا دنیا کے اندر اس کو نواز دیا۔

تو میرے بھائی استدراج سے ڈرتے رہنا چاہئے، کہ اگر آدمی کوئی گناہ کر رہا ہو اور ساتھ میں اگر بظاہر کوئی مصیبت نہیں آرہی تو یہ ڈرنے کی چیز ہے کہ میں دنیا کے اندر گناہ بھی کر رہا ہوں اور اللہ کی طرف سے کوئی عذاب بھی نہیں آرہا تو ڈر ہے کہ کہیں اللہ کی طرف سے ڈھیل تو نہیں دی جارہی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

میرے والد قدس سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ انہوں نے کئی مرتبہ ایک واقعہ سنایا کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، تبلیغی جماعت کے بانی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پتہ نہیں ان کے سینے کے اندر کیا آگ بھری تھی امت مسلمہ کو دعوت دینے کی کہ اسی آگ کا ثمرہ ماشاء اللہ ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ تو وہ بیمار ہوئے، میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت کی عیادت کے لئے اس وقت دہلی گیا، جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ معالجین نے ملاقات سے روکا ہوا ہے پابندی لگائی ہوئی ہے، تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے حضرت کی خیریت معلوم کرنی تھی معلوم ہوگئی تو میں واپس دعا کر کے جانے لگا، کسی طرح حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کو پتہ چل گیا حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ عیادت کے لئے تشریف لائے تھے، تو انہوں نے فوراً آدمی کو دوڑایا کہ نہیں جاکر واپس بلا کر لاؤ، تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں وہ آدمی آیا تو میں نے کہا کہ ایسے ملنا مناسب نہیں ہے، کہا کہ نہیں حضرت کا حکم ہے کہ واپس بلایا جائے تاکہ ملاقات ہو سکے۔ جب خدمت میں پہنچے تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے آپ کو واپس اس لئے بلایا کہ بعض آدمیوں کی ملاقات سے راحت ہوتی ہے، اور پھر ہاتھ میں ہاتھ لے کر بے تحاشا رونا شروع ہوگئے، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سمجھے کہ تکلیف میں ہیں اس واسطے طبیعت پر گریہ طاری ہوگیا پھر فرمایا:

”اصل میں میں نے آپ کو اس لئے بلایا کہ میرے دل میں ایک بے چینی ہے وہ آپ کے ذریعہ دور کرنا چاہتا ہوں، بے چینی یہ ہے کہ ماشاء اللہ یہ جماعت کا کام روز بروز پھیلتا جارہا ہے اور ہر قدم پر الحمد للہ اس میں کامیابیاں ہورہی ہیں، اللہ

تعالیٰ کی طرف سے نصرت ہو رہی ہے، تو مجھے کبھی کبھی یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ جماعت کا کام جو اتنا پھیل رہا ہے اور اتنی کامیابیاں ہو رہی ہیں یہ کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے استدراج تو نہیں، یہ میرے ساتھ استدراج تو نہیں، اللہ نے ڈھیل تو نہیں دی"

آپ اندازہ کیجئے کہ جس آدمی کا لمحہ لمحہ دین کے لئے وقف ہے اور جو ہر وقت اللہ کے دین کے لئے اور امت کے لئے فکرمند ہے۔ اس کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ یہ کامیابیاں یہ کہیں استدراج تو نہیں، اس وجہ سے رو رہے ہیں۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ایک بات ڈال دی، میں نے عرض کیا "حضرت میں آپ کو پورے اطمینان اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ استدراج نہیں"

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کہا "کیسے کیا دلیل ہے تمہارے پاس کہ استدراج نہیں؟"

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "دلیل یہ ہے کہ جب کسی بندے کے ساتھ استدراج ہوتا ہے تو اس کے دل پر خیال بھی نہیں گزرتا کہ میرے ساتھ استدراج ہو رہا ہے کبھی اس کے دل میں اندیشہ پیدا ہی نہیں ہوتا کہ میرے ساتھ ڈھیل دی جارہی ہے اور اگر دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا اور اندیشہ پیدا ہوتو یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ استدراج نہیں ہے۔ آپ کے دل میں جو خیال پیدا ہوا ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ استدراج نہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہے جو ہو رہی ہے تو استدراج نہیں"

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس پر حضرت کو بڑا ہی سکون اور اطمینان ہوا۔ اور فرمایا کہ میرا ذہن پہلے اس طرف نہیں گیا تھا۔

تو یہ بات صحیح ہے کہ بزرگوں نے فرمایا کہ جب استدراج ہوتا ہے تو کبھی دل میں واہمہ بھی نہیں گزرتا ہے جب ڈھیل دی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ لیکن اگر دل میں یہ خیال اتر آئے تب تو آدمی یہ سوچتا رہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے کہیں استدراج نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا رہے رجوع کرتا رہے انشاء اللہ وہ استدراج کی بلا سے محفوظ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ:

﴿وَابْتَغِ فِيْمَآ آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَآ أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ﴾(۱)

معزز حاضرین کرام! یہ میرے لئے خوشی اور افتخار کا باعث ہے کہ آج آپ حضرات سے ایک دینی موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ آپ کا یہ ادارہ جس کو "ایوان صنعت وتجارت" کہا جاتا ہے یہاں عام طور پر جن لوگوں کو خطاب کرنے کی دعوت دی جاتی ہے وہ لوگ یہاں آ کر یا تو تجارت کے موضوع پر خطاب کرتے ہیں یا سیاست کے موضوع پر خطاب کرتے ہیں۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میرا سیاست سے بھی عملی طور پر کوئی تعلق نہیں ہے اور تجارت سے بھی کوئی عملی رابطہ نہیں ہے۔ میں دین کا طالب علم ہوں، اور جہاں کہیں کوئی بات کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس کا موضوع دین ہی سے متعلق ہوتا ہے، لہٰذا آج کی اس نشست میں اسی موضوع پر چند گزارشات آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور دین ایسی چیز ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں اس میں کوئی بات نہ کہی گئی ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے وہ صرف مسجد اور عبادت گاہوں کی حد تک محدود نہیں بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے پر حاوی ہے۔ چنانچہ آج کی گفتگو کے لئے مجھ سے یہ فرمائش کی گئی ہے کہ میں "موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض" کے موضوع پر گفتگو کروں۔ چنانچہ اسی موضوع پر چند گزارشات آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اخلاص کے ساتھ صحیح بات، حق طریقے سے، حق نیت سے کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆ اصلاحی خطبات (۹/۵۰ تا ۷۱) ۲۰ جولائی ۱۹۹۳ء، ایوانِ صنعت وتجارت، کراچی

(۱) القصص: ۷۷

دین صرف مسجد تک محدود نہیں

بات دراصل یہ ہے کہ جب سے ہماری امت پر سیاسی اور سماجی زوال کا آغاز ہوا اس وقت سے یہ عجیب وغریب فضا بن گئی کہ دین کو ہم نے دوسرے مذاہب کی طرح صرف چند عبادتوں کی حد تک محدود کر دیا ہے، جب تک ہم مسجد میں ہیں یا اپنے گھر میں عبادت انجام دے رہے ہیں اس وقت تو ہمیں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام یاد آجاتے ہیں، لیکن جب ہم زندگی کی عملی کشاکشی میں داخل ہوتے ہیں اور بازار میں پہنچتے ہیں، یا سیاست کے ایوانوں میں پہنچتے ہیں، یا معاشرے کے دوسرے عملی گوشوں میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت دین کے احکام اور دین کی تعلیمات ہمارے ذہنوں میں نہیں رہتیں۔

تلاوت قرآن کریم سے آغاز

ہمارے درمیان یہ بڑا اچھا رواج جاری ہے کہ ہماری امت مسلمہ میں ہر مجلس کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے ہوتا ہے، وہ چاہے اسمبلی کی محفل ہو، یا اقتدار کی کوئی تقریب ہو، یا ایوان وصنعت وتجارت کی کوئی تقریب ہو، الحمد للہ سب سے پہلے اللہ کا کلام پڑھا جاتا ہے۔ لیکن یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ جس وقت وہ کلام پڑھا جا رہا ہے اس وقت تک تو اس کے احترام اور اس کی تعظیم وتکریم کا خیال ذہن میں آتا ہے، لیکن جونہی اس قرآن کریم کی تلاوت ختم ہوتی ہے اور اس کے بعد عملی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے اس مرحلے پر وہ قرآن کریم یاد نہیں رہتا۔

قرآن کریم ہم سے فریاد کر رہا ہے

ہمارے دور کے ایک شاعر گزرے ہیں ''ماہر القادری صاحب مرحوم'' انہوں نے قرآن کریم کی فریاد پر ایک نظم کہی ہے، اس نظم میں انہوں نے قرآن کریم کو ایک فریادی کی شکل میں دکھایا ہے، وہ اس طرح فریاد کر رہا ہے:

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں
خوشبو میں بسایا جاتا ہوں
جب قول وقسم لینے کے لئے
تکرار کی نوبت آتی ہے

پھر میری ضرورت پڑتی ہے
ہاتھوں میں اٹھایا جاتا ہوں

یعنی مجھے ہر وقت طاقوں میں سجا کر رکھا ہوا ہے، خوشبو میں بسا کر رکھا ہوا ہے، اور ہر مجلس کا آغاز میری تلاوت سے ہوتا ہے، مجھ سے برکت حاصل کی جاتی ہے، اور جب لوگوں کے درمیان جھگڑے پیش آتے ہیں تو پھر مجھے ہاتھوں میں اٹھا کر قسمیں دی جاتی ہیں، میرے ساتھ یہ سب سلوک ہو رہا ہے، اور زبان سے میری محبت اور تعظیم کے دعوے کئے جا رہے ہیں، لیکن جس قانون پر لوگ چل رہے ہیں اور جس انداز زندگی کو اختیار کیا ہوا ہے، وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے اے قرآن! ''معاذ اللہ'' تیری ہدایت کی ہمیں ضرورت نہیں۔

اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ

جن صاحب نے اس وقت جن آیات کی تلاوت فرمائی ہے وہ بہ موقع تلاوت کی ہیں ان آیات میں ارشاد ہے:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾(۱)

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''

یہ نہ ہو کہ مسجد میں جب تک ہو، اس وقت تو تم مسلمان ہو اور بازار میں مسلمان نہ ہو، اور اقتدار کے ایوان میں مسلمان نہ ہو، بلکہ تم ہر جگہ مسلمان ہو۔

بہر حال آج کی نشست کا موضوع یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ''موجودہ دور میں مسلمان تاجر کے فرائض کیا ہیں'' اس موضوع کے سلسلے میں میں نے آپ کے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت تلاوت کی ہے، اس کی تھوڑی تشریح پیش کرنا چاہتا ہوں، لیکن تشریح کرنے سے پہلے موجودہ دور کا ایک تمہیدی جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ اگر موجودہ حالات کے پس منظر میں جب اس آیت کی تشریح سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو شاید زیادہ فائدہ ہوگا۔

دو معاشی نظریے

ہم اور آپ اس وقت ایسے دور میں جی رہے ہیں جس میں یہ کہا اور سمجھایا جا رہا ہے کہ انسان کی زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ ''معاش کا مسئلہ'' ہے، اور اسی بنیاد پر اس دور میں دو معاشی نظریوں

(۱) البقرة:۲۰۸

کے درمیان پہلے فکری اور پھر عملی تصادم رونما ہوا۔ ایک ''سرمایہ دارانہ معیشت'' کا نظریہ۔ اور دوسرا ''اشتراکی معیشت کا نظریہ'' ان دونوں نظریوں کے درمیان پچھلی نصف صدی سے زیادہ عرصے تک زبردست ٹکراؤ رہا، اور فکری اور عملی دونوں سطح پر یہ دونوں نظریے برسرِ پیکار رہے۔ دونوں کے پیچھے ایک فلسفہ اور ایک نظریہ تھا، ۷۴ سال گزرنے کے بعد ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اشتراکی معیشت کا جو نظر فریب ایوان تھا وہ بیٹھ گیا۔ اور دنیا نے پُر فریب نظریہ کی حقیقت کو عملی تجربہ گاہ میں پہچان لیا، اور اشتراکیت بحیثیت ایک انقلابی نظام کے فیل ہوگئی۔

اشتراکیت کے وجود میں آنے کے اسباب

لیکن یہ بات سوچنے کی ہے کہ اشتراکیت کیوں وجود میں آئی تھی؟ اور اس کے پیچھے کیا اسباب اور کیا عوامل کارفرما تھے؟ جن لوگوں نے دنیا کے مختلف معاشی نظاموں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ درحقیقت اشتراکیت ایک ردّعمل تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر جو امیر اور غریب کے درمیان زبردست دیواریں حائل ہیں اور اس میں دولت کی تقسیم کا نظام غیر منصفانہ ہے، اس غیر منصفانہ نظام کے ردّعمل کے طور پر اشتراکیت وجود میں آئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر فرد کو اتنی آزادی دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے نفع کمائے، اس پر کسی طرح کی قید اور پابندی نہیں، آزاد معیشت اور آزاد تجارت کے نظریہ کے تحت اس کو کھلی چھٹی فراہم کی گئی، اور اس کھلی چھٹی کے نتیجے میں دولت کی تقسیم کا نظام ناہموار ہوگیا، اور امیر و غریب کے درمیان دیواریں کھڑی ہوگئیں، غریب کے حقوق پامال ہوئے، اس کے ردّعمل کے طور پر اشتراکیت کا نظام وجود میں آیا، جس نے یہ کہا کہ ''فرد کو کوئی آزادی نہیں ہونی چاہئے اور سرکاری منصوبہ بندی کے تحت معیشت کو کام کرنا چاہئے''

سرمایہ دارانہ نظام میں خرابیاں موجود ہیں

یہ بات ٹھیک ہے کہ اشتراکی نظام ناکام اور فیل ہوگیا، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی جن خرابیوں کی وجہ سے اشتراکی نظام وجود میں آیا تھا، کیا وہ خرابیاں دور ہوگئیں؟ وہ ناانصافیاں جو سرمایہ دارانہ نظام کے اندر پائی جاتی تھیں کیا ان کا کوئی مناسب حل نکل آیا؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے، سرمایہ دارانہ نظام میں جو خرابیاں تھیں وہ اپنی جگہ پر برقرار ہیں۔

سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ

اور یہ مقام عبرت ہے کہ جس تاریخ میں سوویت یونین کا شیرازہ بکھرا، اور امریکی رسالے ''ٹائم'' (Time) کے جس شمارے میں یہ خبر اور اس پر تبصرے شائع ہوئے کہ سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا اور اشتراکیت کا بت پاش پاش ہوگیا، ٹھیک اسی شمارے میں امریکی نظام حیات کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اسی بات پر تبصرہ کیا گیا تھا کہ اس وقت امریکی نظام زندگی میں اپنی خدمات کے عوض سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ کون سا ہے؟

اس مضمون میں یہ کہا گیا تھا کہ ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ ''ماڈل گرلز'' کا طبقہ ہے، جو موڈلنگ کر کے پیسے کماتی ہیں۔ اور اس مضمون میں لکھا تھا کہ بعض ماڈل گرل ایسی ہیں جو ایک دن کی خدمات کا معاوضہ ۲۵ ملین ڈالر وصول کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ کمانے والا طبقہ کوئی اور نہیں ہے۔ یہ ۲۵ ملین ڈالر جو ایک ماڈل گرل کو دیئے جا رہے ہیں، یہ کون ادا کر رہا ہے؟ اور کس کی جیب سے یہ رقم جا رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ۲۵ ملین ڈالر آخر کار صارفین سے وصول کئے جائیں گے، ایک ہی شمارے میں یہ دونوں باتیں پڑھ کر مجھے عبرت ہو رہی تھی کہ ایک طرف تو یہ دعویٰ کر کے بغلیں بجائی جا رہی ہیں کہ ہم نے اشتراکیت کے بت کو پاش پاش کر دیا، لیکن جس چیز نے اشتراکیت کو جنم دیا تھا اس چیز کی طرف کسی کی نظر اور کسی کو فکر نہیں۔ آج آپ نے اشتراکیت کے ایک بت کو تو پاش پاش کر دیا، لیکن اس کے اصل سبب اور محرک کو ختم نہیں کیا تو کل کو ایک اور اشتراکیت ابھر کر سامنے آجائے گی، پہلی اشتراکیت نے انسانیت کو زخم دیئے۔ پھر دوسری اشتراکیت آکر اس سے زیادہ زخم لگائے گی۔

سرمایہ دارانہ نظام کی اصل خرابی

صحیح بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں نہ تو اس وجہ سے خرابی تھی کہ اس میں فرد کو منافع کمانے کی مکمل آزادی دی گئی ہے اور نہ تو اس وجہ سے خرابی تھی کہ اس میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ درحقیقت خرابی اس وجہ سے تھی کہ اس نظام معیشت میں حلال و حرام کی کوئی تقسیم نہیں تھی، جائز اور ناجائز کی کوئی تقسیم نہیں تھی، حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ جو دین اور معیشت کا جو نظام ہمیں عطا فرمایا ہے اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اگرچہ انسان اپنی معیشت اور تجارت میں آزاد ضرور ہے، لیکن اپنے خالق اور مالک کے بتائے ہوئے احکام کا پابند بھی ہے، لہٰذا

اس کی تجارت، اس کی صنعت اور اس کی معیشت حلال وحرام کے اصولوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اور جب تک حلال وحرام کے ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تجارت ومعیشت کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہوگا اس وقت تک اسی قسم کی بے اعتدالیوں اور ناکامیوں کا راستہ کھلا رہے گا۔

ایک امریکی افسر سے ملاقات

جس زمانے میں سود کے بارے میں ''فیڈرل شریعت کورٹ'' کا فیصلہ منظر عام پر آیا، اس وقت پاکستان میں امریکی سفارت خانے کے معاشی امور کے انچارج میرے پاس آئے اور اس فیصلے کے بارے میں کچھ تفصیلات معلوم کیں۔ اس وقت اشتراکیت کی ناکامی کا تازہ تازہ واقعہ پیش آیا تھا، میں نے آخر میں ان سے گزارش کی کہ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ آج امریکہ کا ڈنکا بج رہا ہے، اور بلاشبہ آپ لوگوں نے عالمی سطح پر اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے کہ آج یہ کہا جارہا ہے کہ پوری دنیا میں اس وقت صرف ایک سپر طاقت ہے، دوسری کوئی طاقت نہیں۔ لیکن میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اشتراکیت کی اس ناکامی کے بعد کیا آپ نے کبھی اس پہلو پر غور کیا کہ جن اسباب کے نتیجے میں یہ اشتراکیت ابھری تھی، کیا وہ اسباب ختم ہوگئے ہیں؟ اور کیا اب دوبارہ ان اسباب پر غور کرنے کی ضرورت نہیں؟ لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ اگر اس وقت کوئی شخص کھڑا ہوکر یہ کہتا ہے کہ اشتراکیت کی ناکامی اپنی جگہ پر ہے، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کا ایک حل ہمارے پاس موجود ہے، اور وہ یہ کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے لائے ہوئے حلال وحرام کے اصولوں کی بنیاد پر کوئی اپنی معیشت کے اصولوں کو استوار کرتا ہے تو آپ کی طرف سے اس کو بنیاد پرستی کے طعنے دیئے جاتے ہیں، اس کو فنڈ امینٹلسٹ (Fundamentalist) کہا جاتا ہے، اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، اور اس کو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے، آپ یہ بتایئے کہ آپ کے خیال میں کیا کوئی تیسرا تصور وجود ہی میں نہیں آسکتا؟ آپ اس پر غور کرنے کے لئے کیوں تیار نہیں؟

وہ کافی دیر توجہ سے میری بات سنتے رہے بعد میں انہوں نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے جو ذرائع ابلاغ ہیں انہوں نے بلاشبہ اسلامی احکام اور تعلیمات کو بڑا مسخ کرکے پیش کرنا شروع کردیا ہے، میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں۔ اور سود کے بارے میں جس طرح آپ نے وضاحت سے بتایا، اس طرح وضاحت کے ساتھ میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے، اور یہ سمجھتا ہوں کہ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ پروپیگنڈہ کے خوگر

ہیں۔ اس وجہ سے جب بھی اس قسم کی کوئی بات سامنے آتی ہے تو وہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا شروع کردیتے ہیں۔ اور یہ ان کا اچھا طرز عمل نہیں ہے۔

صرف اسلام کا نظام معیشت منصفانہ ہے

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر دوسرے لوگ اسلامی تعلیمات اور اسلامی احکام کے بارے میں ایسی باتیں کریں تو انکو معذور سمجھا جاسکتا ہے، اس لئے کہ انہوں نے ''اسلام'' کو سمجھا ہی نہیں۔ اسلام کو پڑھا ہی نہیں، اسلام پر ان کو اعتقاد ہی نہیں، اسلام ان کو کیا سکھاتا ہے اس سے ان کو کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ لیکن ہم اور آپ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور اپنی ہر مجلس کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کرتے ہیں، ہمارے پاس اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ ہم اسلام کے اس عظیم پہلو سے اپنے آپ کو غافل اور بے خبر رکھیں، اور اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں کہ ہمارے دین اسلام نے معیشت کے میدان میں ہمیں کیا تعلیم دی ہے؟ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں اشتراکیت ناکام ہوچکی ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں اپنی جگہ جوں کی توں باقی ہیں، ایسے معاشرے میں اگر کوئی نظام انسانیت کے لئے ایک اعتدال کی راہ پیش کرسکتا ہے، تو وہ صرف اور صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کا نظام ہے۔

اس یقین کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر اس آیت کریمہ پر غور کیا جائے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے تو اس میں ہماری اور آپ کی رہنمائی کے لئے بہت بڑا سامان ہے۔

قارون اور اس کی دولت

یہ آیت کریمہ سورۃ قصص کی آیت ہے، اس آیت میں قارون کو خطاب کیا گیا ہے، یہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بہت دولت مند شخص تھا، چنانچہ قارون کا خزانہ بہت مشہور ہے، یہ اتنا بڑا دولت مند تھا کہ اس کی دولت کی کثرت کو بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے فرمایا:

﴿إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ﴾(۱)

''اس خزانوں کی چابیاں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ ایک بڑی جماعت مل کر ان چابیوں کو اٹھا پاتی تھی''

---

(۱) القصص: ۷٦

اس زمانے میں چابیاں بھی بڑی وزنی ہوا کرتی تھیں، پھر اس کے خزانے بہت پھیلے ہوئے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے اللہ تعالیٰ نے اس کو جو ہدایات دیں وہ اس آیت کریمہ میں بیان کی گئی ہیں جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے، اگرچہ اس آیت میں براہ راست خطاب قارون کو ہے، لیکن اس کے واسطے سے ہر اس شخص کو خطاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دولت سے نوازا ہے۔

قارون کو چار ہدایات

چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ﴾(۱)

یہ چار جملے ہیں، پہلے جملے میں فرمایا کہ جو کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم کو (دولت) عطا فرمائی ہے اس کے ذریعہ آخرت کی فلاح و بہبود کو طلب کرو۔

دوسرے جملے میں فرمایا کہ (یہ نہ ہو کہ آخرت کی فلاح طلب کرنے کے لئے ساری دولت لٹا دو اور دنیا میں اپنے پاس دولت بالکل نہ رکھو) بلکہ دنیا کا جو حصہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقرر فرمایا ہے اس کو مت بھولو (اس کو اپنے پاس رکھو، اس کا حق ادا کرو)

تیسرے جملے میں ارشاد فرمایا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے تم پر (یہ دولت عطا کر کے) احسان کیا ہے، اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان اور اچھائی کا معاملہ کرو۔

چوتھے جملے میں ارشاد فرمایا کہ اپنی اس دولت کے بل بوتے پر زمین میں فساد مت مچاؤ۔ (اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش مت کرو) اس آیت میں یہ چار ہدایات قارون کو دیں۔

لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ چار ہدایات ایک تاجر کے لئے، ایک صنعت کار کے لئے اور ایک ایسے مسلمان کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے اندر کچھ بھی عطا فرمایا ہو، ایک پورا نظام عمل پیش کر رہی ہیں۔

پہلی ہدایت، آخرت کی بہبود کی فکر

سب سے پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ تم میں اور ایک غیر مسلم میں فرق یہ ہے کہ غیر مسلم جو اللہ پر

(۱) القصص: ۷۷

ایمان نہیں رکھتا، اس کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ دولت مجھے حاصل ہے یہ سب میری قوت بازو کا کرشمہ ہے، میں نے اپنی محنت سے، اپنی صلاحیت سے اور اپنی جدوجہد سے اس کو کمایا اور حاصل کیا ہے، لہٰذا میں اس دولت کا بلاشرکت غیر مالک ہوں۔ اور کسی شخص کو میری دولت میں مداخلت کرنے کا حق حاصل نہیں، یہ دولت میری ہے، یہ مال میرا ہے، میں نے اپنی قوت بازو کے بل پر اسے کمایا ہے، اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر اس کو کمایا ہے۔ لہٰذا میں اس دولت کو کمانے کے طریقے میں بھی آزاد ہوں، اور اس کو خرچ کرنے کے طریقے میں بھی آزاد ہوں، کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ میرے معاملات میں دخل اندازی کرے۔

قوم شعیب علیہ السلام اور سرمایہ دارانہ ذہنیت

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے حضرت شعیب علیہ السلام سے کہا تھا:

﴿أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ﴾(۱)

یعنی یہ جو آپ ہمیں منع کر رہے ہیں کہ کم مت ناپو، کم مت تولو، انصاف سے کام لو، حلال وحرام کی فکر کرو، تو یہ آپ نے ہمارے معاشی مسائل میں کہاں سے دخل اندازی شروع کردی، تم اگر نماز پڑھنا چاہو تو اپنے گھر جا کر نماز پڑھو، کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے آباء واجداد عبادت کیا کرتے تھے، یا ہمارا جو مال ہے اس میں ہم جو چاہیں کریں۔

حقیقت میں یہ سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے کہ یہ مال ہمارا ہے، یہ دولت ہماری ہے، اس پر ہمارا سکہ چلے گا، تصرف ہمارا ہے، ہم جس طرح چاہیں گے کریں گے، جس طرح چاہیں گے کمائیں گے، اور جس طرح چاہیں گے خرچ کریں گے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی بھی یہی ذہنیت تھی، اس کی تردید میں یہ بات کہی گئی کہ جو دولت تمہارے پاس ہے یہ کلی طور پر تمہاری نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾(۲)

آسمان وزمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمادی ہے، اس لئے فرمایا:

(۱) هود: ۸۷　　(۲) النساء: ۱۳۱

﴿وَابْتَغِ فِيمَآ آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ﴾
''جو مال اللہ نے تمہیں دیا ہے اس کے ذریعہ آخرت طلب کرو''
یہ نہیں فرمایا اپنے مال کے ذریعہ آخرت طلب کرو۔

مال و دولت اللہ کی عطا ہے

لہٰذا پہلی بات یہ سمجھ لو کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے چاہے وہ نقد روپیہ ہو، چاہے وہ بینک بیلنس ہو، چاہے وہ صنعت ہو یا تجارت ہو، یہ سب اللہ کی عطا ہے۔ بیشک اس کو حاصل کرنے میں تمہاری جدوجہد اور کوشش کو بھی دخل ہے، لیکن تمہاری یہ کوشش دولت حاصل کرنے کے لئے علت حقیقی کا درجہ نہیں رکھتی، اس لئے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس دولت ہے، لیکن محنت کے ذریعہ مزید دولت حاصل نہیں کر پاتے۔ یہ دولت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، لہٰذا یہ تصور ذہن سے نکال دو کہ یہ دولت تمہاری ہے، بلکہ یہ دولت اللہ کی ہے، اور اللہ نے اپنے فضل و کرم سے تمہیں عطا فرمائی ہے۔ اس آیت سے ایک ہدایت تو یہ دے دی۔

مسلم اور غیر مسلم میں تین فرق

مسلم اور غیر مسلم میں تین فرق ہیں:

(۱) پہلا فرق یہ ہے کہ مسلمان اپنی دولت کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھتا ہے، جبکہ غیر مسلم اس دولت کو اللہ تعالیٰ کی عطا نہیں سمجھتا، بلکہ اس دولت کو اپنی قوت بازو کا کرشمہ سمجھتا ہے۔

(۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اس دولت کو آخرت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنائے اور دولت کو حاصل کرنے اور اس کو خرچ کرنے میں ایسا طرز عمل اختیار کرے کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ تاکہ یہ دنیا اس کے لئے دین کا ذریعہ بن جائے اور آخرت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بن جائے۔ یہی دنیا ہے کہ اگر اس کے حصول میں انسان کی نیت درست ہو اور اللہ تعالیٰ کے عائد کئے ہوئے حلال و حرام کے احکام کی پابندی ہو تو یہی دنیا دین بن جاتی ہے اور یہی دنیا آخرت میں نجات کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

(۳) تیسرا فرق یہ ہے کہ ایک مسلمان بھی کھاتا ہے اور کماتا ہے، اور ایک غیر مسلم بھی کھاتا ہے اور کماتا ہے، لیکن غیر مسلم کے دل میں نہ تو اللہ تعالیٰ کا تصور ہوتا ہے اور نہ اس کے احکام کی

پابندی کا خیال ہوتا ہے، اور مسلمان کے دل میں یہ چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے یہ دنیا دین بنادی۔

اگر ایک تاجر اس نیت کے ساتھ تجارت کرے کہ میں دو وجہ سے تجارت کر رہا ہوں، ایک تو اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے ذمے کچھ حقوق عائد کئے ہوئے ہیں، میرے نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں، میرے بچوں کے میرے ذمے کچھ حقوق ہیں، میری بیوی کے میرے ذمے کچھ حقوق ہیں، ان حقوق کی ادائیگی کے لئے یہ تجارت کر رہا ہوں۔ دوسرے اس لئے میں تجارت کر رہا ہوں کہ اس تجارت کے ذریعہ میں معاشرے میں ایک چیز فراہم کرنے کا ذریعہ بن جاؤں، اور مناسب طریقے سے ان کی اشیاء ضرورت ان تک پہنچاؤں۔

اگر تجارت کرتے وقت دل میں یہ دونیتیں موجود ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ حلال طریقے کو اختیار کرے اور حرام طریقے سے بچے تو پھر یہ ساری تجارت عبادت ہے۔

تاجروں کی دو قسمیں

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ)) (۱)

''ایک امانت دار اور سچا تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا''

لیکن اگر تجارت کے اندر نیت صحیح نہ ہو اور حلال وحرام کی فکر نہ ہو تو پھر ایسے تاجر کے بارے میں پہلی حدیث کے برخلاف دوسری حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلتُّجَّارُ یُحْشَرُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقٰی وَبَرَّ وَصَدَقَ)) (۲)

یعنی تجار قیامت کے دن فجار بنا کر اٹھائے جائیں گے، ''فجار'' کے معنی ہیں فاسق وفاجر، نافرمان، گناہگار، سوائے اس تاجر کے جو تقویٰ اختیار کرے، نیکی اختیار کرے، اور سچائی اختیار کرے، اگر یہ تین شرطیں موجود نہیں ہیں تو وہ تاجر فجار میں شامل ہے، اور اگر یہ تین شرطیں موجود ہیں تو پھر وہ

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله، باب ماجاء فی التجار وتسمیة النبی إیاهم، رقم: ۱۱۳۰، سنن الدارمی، کتاب البیوع، باب فی التاجر الصدوق، رقم: ۲٤۲۷

(۲) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله، باب ماجاء فی التجار وتسمیة النبی إیاهم، رقم: ۱۱۳۱، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، رقم: ۲۱۳۷، سنن الدارمی، کتاب البیوع، رقم: ۲٤۲٦

انبیاء اور صدیقین اور شہداء کی صف میں شامل ہے، ایسے تاجر کو اللہ تعالیٰ نے یہ مقام بخشا ہے۔

بہر حال، پہلا مرحلہ نیت کی درستی ہے، اور دوسرا مرحلہ عمل کے اندر حلال و حرام کا امتیاز ہے، یہ نہ ہو کہ مسجد کی حد تک تو وہ مسلمان ہے، لیکن مسجد سے باہر نکلنے کے بعد اس کو اس بات کی کوئی پرواہ نہ ہو کہ میں جو کاروبار کرنے جا رہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس دوسرے مرحلے پر مسلمان اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں۔ ایک غیر مسلم سودی کاروبار کر رہا ہے تو مسلمان بھی سودی کاروبار کر رہا ہے، غیر مسلم قمار کا کام کر رہا ہے تو مسلمان بھی کر رہا ہے، اگر کسی مسلمان تاجر کے اندر یہ بات ہے تو پھر ایسا تاجر اس وعید کے اندر داخل ہے۔ جو دوسری حدیث میں اوپر عرض کی۔ اور اگر یہ بات نہیں تو پھر وہ تاجر پہلی حدیث میں بیان کی گئی بشارت کا مستحق ہے۔

دوسری ہدایت، دنیاوی ضروریات کا خیال

اب دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ اسلام نے ہماری تجارت کا راستہ بھی بند کر دیا اور یہ فرما دیا کہ بس آخرت ہی کو دیکھو، دنیا کو مت دیکھو، اور دنیا کے اندر اپنی ضروریات کا خیال نہ کرو۔ اس خیال کی تردید کے لئے قرآن کریم نے فوراً دوسرے جملے میں دوسری ہدایت یہ فرمائی:

﴿وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ (۱)

یعنی ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم دنیا کو بالکل چھوڑ کر بیٹھ جاؤ۔ بلکہ تمہارا دنیا کا جو حصہ ہے اس کو مت بھولو، اسکے لئے جائز اور حلال طریقے اختیار کرنے کی کوشش کرو۔

یہ دنیا ہی سب کچھ نہیں

لیکن قرآن کریم کے انداز بیان نے ایک بات اور واضح کر دی کہ تمہارا بنیادی مسئلہ اس زندگی کے اندر "معاش کا مسئلہ" نہیں، بیشک قرآن وحدیث میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے معاش کے مسئلے کو تسلیم کیا ہے، لیکن یہ معاش کا مسئلہ تمہاری زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ ایک کافر اور مومن میں یہی فرق ہے کہ کافر اپنی ساری زندگی کا بنیادی مسئلہ اس کو سمجھتا ہے کہ میری پیدائش سے لے کر مرتے دم تک میرے کھانے کمانے کا کیا انتظام ہے، اس سے آگے اس کی سوچ اور فکر نہیں جاتی۔ لیکن ایک مسلمان کو قرآن وحدیث یہ تعلیم دیتے ہیں کہ بیشک معاشی سرگرمیوں کی تمہیں اجازت

---

(۱) القصص: ۷۷

ہے، لیکن یہ تمہاری زندگی کا بنیادی مقصد نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ زندگی تو خدا جانے کتنے دنوں کی ہے، آج بھی ختم ہوسکتی ہے، کل بھی ختم ہوسکتی ہے، ہر لمحے اس زندگی کے ختم ہونے کا امکان موجود ہے، آج تک کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے موت سے انکار کیا ہو، خدا کا انکار کرنے والے دنیا میں موجود ہیں لیکن موت سے انکار کرنے والا کوئی نہیں۔ اس دنیا سے ضرور جانا ہے، اور اگر تم مسلمان ہو تو یقیناً تمہارا یہ اعتقاد ہوگا کہ مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے، وہ زندگی کبھی ختم ہونے والی نہیں، وہ ہمیشہ کی زندگی ہوگی۔

کیا انسان ایک معاشی جانور ہے؟

ذرا سی عقل رکھنے والے انسان کو بھی یہ بات سوچنی چاہئے کہ اس کو اپنی جدوجہد اور اپنی زندگی کا بنیادی مقصد اس چند روزہ زندگی کو بنانا چاہئے، یا اس آنے والی دائمی زندگی کو اپنا مقصد بنانا چاہئے؟ ایک مسلمان جو اللہ اور اللہ رسول ﷺ کے احکام پر ایمان رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کی زندگی کا بنیادی مقصد صرف کھا پی کر پورا نہیں ہوجاتا، صرف زیادہ سے زیادہ روپیہ پیسہ جمع کر کے پورا نہیں ہوجاتا، کیونکہ اگر ایسا ہوجائے تو پھر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا

انسان کی تعریف میں یہ جو کہا گیا ہے کہ انسان ایک معاشی جانور Economi Animal) ہے۔ یہ تعریف درست نہیں، اس لئے کہ اگر انسان صرف (Econ .mi . Animal) ہوتا تو پھر انسان میں اور بیل، گدھے، کتے میں کوئی فرق نہ ہوتا۔

اس لئے کہ یہ جانور کھانے پینے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، اگر انسان بھی صرف کمانے پینے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو انسان میں اور جانور میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے سارے جانوروں کے لئے رزق کے دروازے کھولے ہیں۔ وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، لیکن انسان کو جانوروں سے جو امتیاز عطا فرمایا ہے وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے، اور اس عقل کے ذریعہ وہ یہ سوچے کہ آئندہ آنے والی زندگی ایک دائمی زندگی ہے، اور وہ زندگی اس موجودہ زندگی پر فوقیت رکھتی ہے۔

بہرحال اس دوسرے جملے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ دنیا سے اپنا حصہ مت بھولو، لیکن یہ یاد رکھو کہ زندگی کا اصل مقصود دار آخرت ہے، اور یہ جتنی معاشی سرگرمیاں ہیں یہ راستے کی منزل ہیں یہ خود منزل مقصود نہیں۔

تیسری ہدایت، مال کو امورِ خیر میں خرچ کیجئے

پھر تیسرے جملے میں یہ ہدایت دی:

﴿وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ﴾(۱)

''جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ دولت عطا کر کے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی دوسروں پر احسان کرو''

اس آیت میں ایک طرف تو یہ بتا دیا کہ حلال وحرام میں فرق کرو اور حرام کے ذریعہ مال حاصل نہ کرو۔ اور دوسری طرف یہ بھی بتا دیا کہ جو چیز حلال طریقے سے حاصل کی ہے اس کے بارے میں بھی یہ مت سمجھو کہ میں اس کا بلا شرکتِ غیر مالک ہوں۔ بلکہ اس کے ذریعہ تم دوسروں پر احسان کا معاملہ کرو۔ اور احسان کرنے کے لئے زکوٰۃ اور صدقات وخیرات کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

چوتھی ہدایت، زمین پر فساد مت پھیلاؤ

چوتھے جملے میں یہ ہدایت دی:

﴿وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ﴾

زمین میں فساد مت پھیلاؤ، یعنی دولت کے بل بوتے پر دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ مت ڈالو، دوسروں کے حقوق غصب مت کرو، اگر تم نے ان چار ہدایات پر عمل کرلیا تو تمہاری یہ دولت، تمہارا یہ سرمایہ اور تمہاری یہ معاشی سرگرمیاں تمہارے لئے مبارک ہیں۔ اور تم انبیاء، صدیقین اور شہداء کی فہرست میں شامل ہو۔ اور اگر تم نے ان ہدایات پر عمل نہ کیا تو پھر تمہاری ساری معاشی سرگرمیاں بیکار ہیں، اور آخرت میں اس کا نتیجہ سزا اور عذاب کی صورت میں سامنے آجائے گا۔

دنیا کے سامنے نمونہ پیش کریں

بہرحال اس وقت ہمارے مسلمان تاجروں کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کی ان چار ہدایتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دنیا کے سامنے ایک عملی نمونہ پیش کریں۔ اس دنیا کے سامنے جو نظامِ سرمایہ داری سے بھی زخم کھائی ہوئی ہے، اور اشتراکیت سے بھی زخم کھائی ہوئی ہے۔ اور ایسا نمونہ پیش کریں جو دوسروں کے لئے باعث کشش ہو، جو شخص ایسا کرے گا تو وہ اس دور کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کرے گا۔

(۱) القصص: ۷۷

کیا ایک آدمی معاشرے میں تبدیلی لاسکتا ہے؟

آج کل یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ جب تک نظام نہ بدلے، اور جب تک سب لوگ نہ بدلیں، اس وقت تک اکیلا آدمی کیسے تبدیلی لاسکتا ہے؟ اور اکیلا آدمی ان چار ہدایتوں پر کس طرح عمل کرسکتا ہے؟ یاد رکھئے! نظام اور معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے، اگر ہر فرد اپنی جگہ یہ سوچتا رہے کہ جب تک معاشرہ نہیں بدلے گا اس وقت تک میں بھی نہیں بدلوں گا، تو پھر معاشرے میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی۔ تبدیلی ہمیشہ اس طرح آیا کرتی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ فرد بن کر اپنی زندگی میں تبدیلی لاتا ہے، پھر اس چراغ کو دیکھ کر دوسرا چراغ جلتا ہے اور پھر دوسرے سے تیسرا چراغ جلتا ہے، اس طرح افراد کے سنورنے سے معاشرہ سنورتا ہے، اور افراد سے قوموں کی تعمیر ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ عذر کہ میں تنہا کچھ نہیں کرسکتا، یہ معقول عذر نہیں۔

حضور ﷺ کس طرح تبدیلی لائے

جب نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت معاشرے کی خرابیاں اور برائیاں اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھیں، اس وقت اگر آپ ﷺ یہ سوچتے کہ اتنا بڑا معاشرہ الٹی سمت کی طرف جارہا ہے میں تنہا کیا کرسکوں گا، اور یہ سوچ کر آپ ﷺ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے تو آج ہم اور آپ یہاں پر مسلمان بیٹھے ہوئے نہ ہوتے۔ آپ نے دنیا کی مخالفتوں کے سیلاب کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک راہ ڈالی، نیا راستہ نکالا، اور اس راستے پر گامزن ہوئے، یہ بات ٹھیک ہے کہ آپ کو اس راستے میں قربانیاں بھی دینی پڑیں، آپ کو پریشانیاں بھی پیش آئیں۔ مشکلات بھی سامنے آئیں، لیکن آپ نے ان سب کو گوارہ کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا کی ایک تہائی آبادی محمد رسول اللہ ﷺ کی نام لیوا اور ان کی غلام ہے۔ لیکن اگر آپ یہ سوچ کر بیٹھ جاتے کہ جب تک معاشرہ نہیں بدلے گا، اس وقت تک تنہا میں کیا کرسکتا ہوں تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔

ہر شخص اپنے اندر تبدیلی لائے

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی ذمہ داری اس کے اپنے اوپر ڈالی ہے، لہٰذا اس بات کو دیکھے بغیر کہ دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں، ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اپنے طرز عمل کو درست کرے، اور کم از کم اس بات کی طلب ہمارے دلوں میں پیدا ہوجائے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں معیشت

کے میدان میں اور تجارت وصنعت کے میدان میں کن احکامات کا پابند کیا ہے؟ ان احکام پر ہم کس طرح عمل کر سکتے ہیں، اس کی معلومات حاصل کر کے اس پر عمل کرنے کا جذبہ اور عزم پیدا ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مجلس انشاء اللہ بڑی مبارک اور مفید ہے۔ ورنہ نشستن وگفتن وبرخاستن والی مجلسیں تو بہت ہوتی رہتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ جذبہ اور یہ تصور اور یہ خیال اور یہ عزم ہمارے دلوں کے اندر پیدا فرمادے جو اس وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ ہماری دنیا وآخرت دونوں سنوار دے۔ اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

جدید معاشی مسائل اور نظریات ایک نظر میں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى:

﴿وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (۱)

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى:

﴿إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ﴾ (۲)

دین کا ایک اہم شعبہ ''معاملات''

کتاب البیوع سے دین کا ایک شعبہ یعنی معاملات کا شعبہ شروع ہو رہا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں چند اصولی باتیں پہلے ذکر کر دی جائیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ معاملات، دین کا ایک بہت ہی اہم شعبہ ہے اور جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں عبادات کا مکلّف بنایا ہے اسی طرح معاملات میں بھی کچھ احکام کا مکلف بنایا ہے۔ اور جس طرح ہمیں عبادات میں رہنمائی عطا فرمائی ہے اسی طرح معاملات میں بھی رہنمائی عطا فرمائی ہے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لین دین کے وقت کن باتوں کا خیال رکھیں، کون سی چیزیں حلال ہیں اور کون سی چیزیں حرام ہیں، افسوس یہ ہے کہ ایک عرصہ دراز سے مسلمانوں کے درمیان معاملات سے متعلق جو شرعی احکام ہیں ان کی اہمیت دلوں سے مٹ گئی ہے، دین صرف

☆ انعام الباری (۶/ ۴۱ تا ۶۷) زیر نظر بیان صحیح بخاری شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے معاملاتِ جدیدہ پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) البقرة: ۲۷۵ (۲) البقرة: ۲۸۲

عقائد اور عبادات کا نام رکھ دیا ہے، معاملات کی صفائی، معاملات میں جائز و ناجائز کی فکر اور حلال وحرام کی فکر رفتہ رفتہ ختم ہوگئی ہے، اس لئے بھی اس کی اہمیت زیادہ ہے کہ ان کے بارے میں غفلت بڑھتی جارہی ہے۔

معاملات کے میدان میں دین سے دوری کی وجہ

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چند سو سالوں سے مسلمانوں پر غیر ملکی اور غیر مسلم سیاسی اقتدار مسلط رہا اور غیر مسلم سیاسی اقتدار نے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ اس بات کی تو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے عقائد پر قائم رہیں اور مسجدوں میں عبادات انجام دیتے رہیں، اپنی انفرادی زندگی میں عبادات کا اہتمام کریں لیکن زندگی میں تجارت (Business) ومعیشت (Economy) کے جو عام کام ہیں وہ سارے کے سارے ان کے اپنے قوانین کے تحت چلائے گئے اور دین کے معاملات کے احکام کو زندگی سے خارج کردیا گیا، چنانچہ مسجد و مدرسہ میں تو دین کا تذکرہ ہے لیکن بازاروں میں، حکومت کے ایوانوں میں اور انصاف کی عدالتوں میں دین کا ذکر اور اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔

یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب سے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوا اور غیر مسلموں نے اقتدار پر قبضہ کیا۔ چونکہ اسلام کے جو معاملات سے متعلق احکام ہیں وہ عمل میں نہیں آرہے تھے، اور ان کا عملی چلن دنیا میں نہیں رہا، اس لئے لوگوں کے دلوں میں ان کی اہمیت گھٹ گئی اور ان پر بحث ومباحثہ اور ان کے اندر تحقیق واستنباط کا میدان بھی بہت محدود ہو کر رہ گیا۔

فطری نظام ایسا ہے کہ جیسی جیسی ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ اس کے حساب سے اسباب پیدا فرماتے رہتے ہیں، معاملات کا شعبہ بھی ایسا ہی ہے کہ جب اس پر عمل ہو رہا ہو تو نئے نئے معاملات سامنے آتے ہیں، نئی نئی صورتحال کا سامنا ہوتا ہے اس میں حلال وحرام کی فکر ہوتی ہے، فقہاء کرام ان پر غور کرتے ہیں، ان کے بارے میں استنباط کرتے ہیں اور نئی نئی صورتحال کے حل بتاتے ہیں، ان کے بارے میں شریعت کے احکام سے لوگوں کو باخبر کرتے ہیں۔

لیکن جب ایک چیز کا دنیا میں چلن ہی نہیں رہا تو اس کے بارے میں فقہاء سے پوچھنے والے بھی کم ہوگئے، اس کے نتیجے میں فقہاء کرام کی طرف سے استنباط کا جو سلسلہ چل رہا تھا وہ بھی دھیما پڑ گیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ رک گیا بلکہ دھیما پڑ گیا، اس واسطے کہ اللہ کے کچھ بندے ہر دور میں ایسے رہے ہیں کہ جو اپنی تجارت اور معیشت میں حلال وحرام کی فکر رکھتے تھے، وہ کبھی کبھی علماء کی طرف رجوع کرتے اور علماء ان کے بارے میں کچھ جوابات دیتے جو ہمارے ہاں فتاویٰ کی کتابوں میں

موجود ہیں، لیکن چونکہ پورا نظام غیر اسلامی تھا اس واسطے غور وتحقیق اور استنباط کے اندر وسعت نہ رہی اور اس کا دائرہ محدود ہوگیا اور اس کی وجہ سے معاملات کے سلسلے میں فقہ کا جو ایک طبعی ارتقاء تھا وہ سست پڑ گیا، اور اس کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ جب ہم دینی مدارس میں فقہ اور حدیث وغیرہ پڑھتے پڑھاتے ہیں تو سارا زور عبادات پر صَرف کر لیتے ہیں اور جب معاملات کا باب آتا ہے تو چونکہ ذہن میں اس کی اہمیت کم ہوگئی ہے اور بازار میں اس کا چلن کم ہوگیا ہے، اس لئے اس پر کچھ زیادہ توجہ اور اہمیت کے ساتھ بحث ومباحثہ کی ضرورت بھی نہیں سمجھی جاتی، عام طور سے معاملات کے ابواب بھاگتے دوڑتے گزر جاتے ہیں، اس وجہ سے معاملات کی فقہ کو جاننے والے کم ہوگئے ہیں اور جب وہ کم ہوگئے ہیں تو ایک طرف بازار میں نئے نئے معاملات پیدا ہورہے ہیں اور نئی نئی صورتیں وجود میں آرہی ہیں، دوسری طرف ان صورتوں کو سمجھنے اور ان کے حکم کا استنباط کرنے والوں کی کمی ہوگئی ہے۔

اب اگر ایک تاجر تجارت کر رہا ہے اور اس کو اس کے اندر روز مرہ نئے نئے حالات پیش آتے ہیں وہ کسی عالم کے پاس جاتا ہے کہ بھائی میری یہ صورت حال ہے اس کا حکم بتائیں؟ اب صورتحال یہ ہوگئی ہے کہ تاجر عالم کی بات نہیں سمجھتا اور عالم تاجر کی بات نہیں سمجھتا کیونکہ دونوں کے درمیان ایک ایسا فاصلہ قائم ہوگیا ہے کہ ان کی بہت سی اصطلاحات اور بہت سے معاملات میں ان کے عرف اور ان کے طریق کار سے عالم ناواقف ہے۔ تاجر اگر مسئلہ پوچھے گا تو وہ اپنی زبان میں پوچھے گا اور عالم نے وہ زبان نہ سنی، نہ پڑھی، لہٰذا وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ پاتا، عالم جواب دے گا تو اپنی زبان میں جواب دے گا، جس سے تاجر محروم ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ علماء کے پاس جا کر ہمیں اپنے سوالات کا پورا جواب نہیں ملتا تو انہوں نے علماء کی طرف رجوع کرنا ہی چھوڑ دیا۔

اس کی وجہ سے علماء اور کاروبار کرنے والوں کے درمیان اور معاملات کے اندر بہت بڑا فاصلہ پیدا ہوگیا اور اس کے نتیجے میں خرابی در خرابی پیدا ہوتی چلی گئی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ''فقہ المعاملات'' کو سمجھا جائے اور پڑھا جائے۔

معاملات کی اصلاح کا آغاز

اس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سارے عالم میں ایک شعور پیدا ہورہا ہے اور وہ شعور یہ ہے کہ جس طرح ہم اپنی عبادتیں شریعت کے مطابق انجام دینا چاہتے ہیں اسی طرح اپنے معاملات کو بھی شریعت کے سانچے میں ڈھالیں، یہ قدرت کی طرف سے ایک شعور ہے جو ساری دنیا کے

مسلمانوں میں رفتہ رفتہ پیدا ہونا شروع ہوا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض ایسے لوگ جن کی ظاہری شکل وصورت اور ظاہری وضع قطع کو دیکھ کر دور دور تک یہ گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ متدین ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حرام مال کی نفرت اور حلال مال کی طرف رغبت پیدا فرمادی ہے۔ اب وہ اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح ہمارے معاملات شریعت کے مطابق ہو جائیں وہ اس تلاش میں ہیں کہ کوئی ہماری رہنمائی کرے، لیکن اس میدان میں رہنمائی کرنے والے کم ہوگئے، ان کے مزاج ومزاق کو سمجھ کر ان کے معاملات اور اصطلاحات کو سمجھ کر جواب دینے والے بہت کم ہوگئے اس وقت ضرورت تو بہت بڑی ہے لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے والے افراد بہت کم ہیں۔

ایک اہم کوشش

اس لئے میں عرصہ دراز سے اس فکر میں ہوں کہ دینی مدارس کے تعلیمی نصاب میں ''فقہ المعاملات'' کو خصوصی اہمیت دی جائے اور اس غرض کے لئے بہت سے اقدامات بھی کئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

بہرحال یہ بہت ہی اہمیت والا باب ہے اس لئے خیال یہ ہے کہ ''کتاب البیوع'' سے متعلقہ جو مسائل سامنے آئیں انہیں ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کردیا جائے تاکہ کم از کم ان سے واقفیت ہو جائے۔

نظامہائے معیشت

پہلی بحث اس سلسلے میں یہ ہے کہ آپ نے یہ نام بہت سنے ہوں گے کہ سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) اور اشتراکی نظام (Socialism) اس وقت دنیا میں یہی دو نظام رائج ہیں اور ساری دنیا ان دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، اگرچہ اشتراکیت بحیثیت سیاسی طاقت کے بفضلہٖ تعالیٰ ختم ہوگئی ہے، روس کے زوال اور سویت یونین کے سقوط کے بعد اس کو وہ سیاسی طاقت تو حاصل نہیں جو پہلے تھی لیکن ایک نظریہ کے طور پر وہ اب بھی زندہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی جو ریاستیں آزاد ہوئی ہیں ان میں امریکی اثرات پھیلنے کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں بھی پھیلی ہیں جس کی وجہ سے لوگوں میں دوبارہ اشتراکی نظام کی طرف رغبت پیدا ہورہی ہے۔ ابھی سقوط کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کی بے اعتدالیاں سامنے آنا شروع ہوگئی ہیں اس لئے لوگ پھر اشتراکی نظریہ کو زندہ کرنے کی فکر میں لگ گئے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ روس کی بعض آزاد شدہ ریاستوں میں کمیونسٹ پارٹی (Comunist Party) الیکشن کے اندر بڑے بھاری ووٹ لے کر کامیاب ہوئی، لہٰذا اگرچہ اشتراکیت کا سیاسی اقتدار ختم ہوگیا ہے لیکن بطور ایک نظریہ کے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ اشتراکیت ختم ہوگئی ہے بلکہ وہ اب بھی زندہ ہے۔

دنیا میں یہ دو متخالف نظریات (اشتراکیت اور سرمایہ داری) رائج رہے ہیں اور دنیا ان کے درمیان سیاسی سطح پر باہمی جنگ وجدال کی پلیٹ میں رہی ہے، فکری سطح پر دونوں کے درمیان بحث ومناظرہ کا بازار بھی گرم رہا اور دونوں طرف سے ایک دوسرے پر تنقیدیں ہوتی رہی ہیں اور اس موضوع پر بے شمار کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ تو ایک سرمایہ دارانہ نظام ہے اور دوسرا اشتراکی نظام ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کیا ہیں؟

آج کل لوگ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت پر تبصرے تو بہت کرتے ہیں لیکن سرمایہ دارانہ نظام کیا ہے؟ اشتراکی نظام کیا ہے؟ ان کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ ان میں کہاں غلطی ہے؟ اور ان کے مقابلے میں اسلامی معیشت کے احکام کس طرح ممتاز ہیں؟ یہ بات دو اور دو چار کر کے واضح طور پر ذہنوں میں نہیں ہے، عام طور پر مجمل باتیں کی جاتی ہیں۔

بنیادی معاشی مسائل

اس لئے میں مختصراً اس کو ذکر کرتا ہوں کہ اس طرح سمجھنا چاہئے کہ آج معاشیات (Economics) ایک مستقل فن بن گیا ہے، معیشت ایک مستقل مسئلہ بن گیا ہے اور کسی بھی نظام معیشت کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کا حل تلاش کرنا پڑتا ہے وہ بنیادی طور پر چار ہیں۔

1۔ترجیحات کا تعین: (Determination of Priorites)

پہلا مسئلہ جس سے معیشت کو واسطہ پڑتا ہے اس کو معاشی اصطلاح میں ترجیحات کا تعین کہتے ہیں۔ معنی ہے کہ یہ بات واضح اور مسلم ہے کہ انسان کی خواہشات زیادہ ہیں (یہاں ضروریات کا لفظ استعمال نہیں کر رہا ہوں بلکہ خواہشات کا لفظ استعمال کر رہا ہوں) اور ان خواہشات کو پورا کرنے کے وسائل ان کے مقابلے میں کم ہیں۔

ہر انسان کے دل میں بے شمار خواہشات ہوتی ہیں کہ میرے پاس اتنا پیسہ آجائے، میرے

پاس اچھی سواری ہو، میں ایسا مکان بنالوں، مجھے کھانے کو فلاں چیز ملے وغیرہ وغیرہ تو خواہشات تو بہت ہیں لیکن ان خواہشات کو پورا کرنے کے وسائل کم ہیں۔(۱)

ایک لطیفہ ہے کہ ایک دیہاتی تھا، ایک دن کہنے لگا کہ ''یوں جی کرے کہ ڈھیر سارا دودھ ہو اور اس میں ڈھیر سارا گڑ ڈالوں اور اس گڑ کو انگلی سے چلا کے خوب پیوں'' کسی نے کہا کہ بھائی تیرا جی تو کرے لیکن تیرے پاس کچھ ہے بھی؟ کہنے لگا انگلی ہے اور تو کچھ بھی نہیں، تو خواہشات تو بہت ہیں لیکن ان کو پورا کرنے کے وسائل محدود ہیں، ایک انسان کی انفرادی سطح پر بھی یہی معاملہ ہے اور کسی ملک اور معاشرہ کی اجتماعی سطح پر بھی یہی معاملہ ہے۔

فرض کریں ایک انسان کا معاملہ دیکھ لیں اس میں بھی یہی صورتحال ہے کہ اس کی خواہشات بہت ہیں اور ایک ملک کی سطح پر دیکھ لیں کہ ملک کی خواہشات بہت ہیں۔ خواہشات کیا ضروریات بھی بہت ہیں، ہمارا ملک ہے تو اس کی ضرورت یہ بھی ہے کہ اس کی سڑکیں اچھی بنیں، اس کے ہسپتال اچھے تعمیر ہوں، اس کی تعلیم گاہیں اچھی ہوں، اس کا دفاع مضبوط ہو، یہ بے شمار ضروریات ہیں، لیکن ان ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے جو وسائل ہیں وہ کم اور محدود ہیں۔ لہٰذا اس کے بغیر چارہ نہیں کہ انسان کچھ ضروریات اور خواہشات کو مقدم رکھے اور کچھ کو مؤخر رکھے، اسی کا نام ترجیح ہے کہ ایک خواہش کو دوسری خواہش پر ترجیح دے کہ میں کون سی خواہش پہلے پوری کروں اور کون سی خواہش بعد میں پوری کروں۔

اب مثلاً ہماری خواہش یہ بھی ہے کہ کراچی سے لے کر پشاور تک موٹروے بنے اور ایک خواہش یہ بھی ہے کہ ایٹم بم بنے، اب ہمیں ترتیب قائم کرنی پڑتی ہے کہ اتنا پیسہ تو نہیں ہے کہ دونوں کام کریں، لہٰذا جس چیز کی زیادہ ضرورت ہے اس کو مقدم کریں گے اور دوسرے پر ترجیح دیں گے کہ اس وقت بھارت نے ایٹم بم بنالیا ہے اگر اس نے کسی وقت بھی چلالیا تو ہمارے لئے مصیبت بن جائے گی، اس لئے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ایٹم بم بنائیں۔ تو موٹروے کو مؤخر کردیا، اس کو ترجیحات کا تعین کہتے ہیں اور ہر معاشی نظام میں یہ پہلا مسئلہ ہوتا ہے کہ ترجیحات کا تعین کیا جائے کہ کون سی چیز مقدم ہو اور کون سی چیز مؤخر ہو۔

2۔ وسائل کی تخصیص:(Allocation of Resources)

یعنی کچھ وسائل ہمارے پاس ہیں، زمینیں ہیں، روپیہ ہے، کارخانے ہیں، یہ سب وسائل ہیں ان میں سے کتنے وسائل کو کس کام میں خرچ کیا جائے، مثلاً ترجیحات کا تعین کرلیا کہ ہمیں گندم اگانی

(۱) راجع لتفصیل المباحث: تكملة فتح الملهم (۳۱۲/۱ - ۳۳۰)

چاہئے وہ بھی ضروریات میں داخل ہے، چاول اگانے چاہئیں وہ بھی ضروریات میں داخل ہیں، کپڑا بنانا چاہئے وہ بھی ضروریات میں داخل ہے، لیکن کتنی زمینوں میں گندم اگائیں، کتنی زمینوں میں چاول اگائیں اور کتنی زمینوں میں روئی (کپاس) اگائیں، کتنی زمینوں میں چائے اور کتنی میں تمباکو اگائیں؟ اسی طرح کتنے کارخانے کپڑے کے قائم کریں، کتنے جوتے کے قائم کریں اور کتنے اسلحہ کے قائم کریں؟ اس کو وسائل کی تخصیص کہتے ہیں کہ وسائل کو مختلف معاشی سرگرمیوں میں کس طرح مخصوص کیا جائے؟

3۔آمدنی کی تقسیم:(Distribution of Income)

تیسرا مسئلہ آمدنی کی تقسیم کا ہے، کہ ترجیحات کا تعین بھی کر لیا، وسائل کی تخصیص بھی کر دی گئی، اب زمینیں کام میں لگی ہوئی ہیں کہ ان کے اندر چاول اگ رہے ہیں، گندم اگ رہی ہے وغیرہ وغیرہ، کارخانے کام میں لگے ہوئے ہیں کہ ان میں کپڑا بن رہا ہے، ان میں جوتے بن رہے ہیں، ضرورت کی دوسری اشیاء بن رہی ہیں۔ اس تمام عمل پیداوار کے نتیجے میں جو آمدنی یا پیداوار حاصل ہوئی اس کو وسائل پیداوار میں کس طرح تقسیم کیا جائے؟ اس کو دولت کی تقسیم بھی کہتے ہیں اور آمدنی کی تقسیم بھی کہتے ہیں۔

4۔ترقی:(Development)

چوتھا مسئلہ ترقی کا ہے "کمًّا" اور "کیفاً" بھی ترقی حاصل ہو، مثلاً انسان کی فطری خواہش ہے کہ وہ ایک حالت پر قائم نہ رہے بلکہ آگے بڑھے، اسی خواہش کا نتیجہ ہے کہ آدمی پہلے گدھے پر سفر کرتا تھا، پھر گھوڑے پر سفر کرنے لگا، پھر اونٹ پر سفر، پھر سائیکل بنائی، پھر موٹر سائیکل بنالی، پھر کار بنالی، پھر ہوائی جہاز بنالیا اور اب ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہے۔

تو ترقی انسانی فطرت کا ایک تقاضا ہے، ہم کس طرح اپنی معیشت میں ترقی کر سکتے ہیں، اس کے لئے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے کہ ہم ایک حالت پر نہ رہیں بلکہ آگے بڑھتے چلے جائیں۔

یہ وہ چار بنیادی مسائل ہیں جن سے ہر نظام معیشت کو سابقہ پڑتا ہے، ترجیحات کا تعین (Dwtermination of Priorities) وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources) آمدنی کی تقسیم (Distribution of Income) اور ترقی (Development)

ہم جب تک کسی بھی نظام معیشت کے بارے میں بات کریں تو سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نظام نے ان چار مسائل کا حل کس طرح تلاش کیا ہے، اور ان چار مسائل میں اس نے

کیا طریقہ کار تجویز کیا جائے۔

ان مسائل کے حل میں ایک راستہ سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) نے اختیار کیا ہے اور دوسرا راستہ اشتراکیت (Socialism) نے اختیار کیا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism)

سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ ہے کہ ان چاروں مسائل کو حل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہر انسان کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی آزادی دے دی جائے، یعنی ہر ایک کو یہ آزادی دے دی جائے کہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی کوشش کرے، جس طرح معقول حدود میں رہ کر منافع کمائے، اور منافع کمانے کی جدوجہد کرے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ ہے کہ جب منافع کمانے کے لئے ہر شخص کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو قدرت کی طرف سے دو طاقتیں ایسی مقرر ہیں جو اس منافع کمانے کی جدوجہد کو اس طرح استعمال کریں گی کہ اس سے یہ چاروں مسائل خود بخود حل ہوتے چلے جائیں گے وہ دو طاقتیں کیا ہیں؟

کہتے ہیں کہ ایک رسد (Supply) ہے اور ایک طلب (Demand) ہے، بازار میں جن اشیاء کی مانگ ہوتی ہے ان کو طلب (Demand) کہتے ہیں اور جو سامان بیچنے کے لئے بازار میں لایا جاتا ہے اس کو رسد (Supply) کہتے ہیں۔

قانونِ قدرت

قدرت کا قانون یہ ہے کہ جب کسی چیز کی رسد بڑھ جائے اور طلب کم ہو تو قیمتیں کم ہو جاتی ہیں اور اگر کسی چیز کی طلب بڑھ جائے اور رسد کم ہو تو قیمت بڑھ جاتی ہے، یہ عام مشاہدہ ہے کہ گرمی میں برف کی بہت ضرورت پڑتی ہے اور بازار میں ضرورت کے بقدر مہیا نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے قیمت بڑھ جاتی ہے اور برف مہنگی ہو جاتی ہے، اس کے برعکس سردی میں برف کی رسد زیادہ ہوتی ہے اور طلب کم ہوتی ہے، جس کی وجہ سے قیمت گھٹ جاتی ہے، تو رسد و طلب یہ قدرت کا ایک قانون ہے جس کا انہوں نے نام رکھا ہے "بازار کی قوتیں" یعنی مارکیٹ فورسز (Market Forces) یہ قدرتی طاقتیں ہیں جو بازار میں کارفرما ہیں۔

اب ایک طرف قدرتی طاقتیں بازار میں کام کر رہی ہیں، دوسری طرف آدمی سے یہ کہہ دیا کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی جدوجہد کرو۔

اب وہ شخص جب بازار آئے گا تو لازماً وہی چیز لائے گا جس کی طلب زیادہ ہوگی اور رسد کم ہوگی، اسے کہا گیا کہ زیادہ منافع کماؤ! اب وہ سوچے گا کہ بازار میں کس چیز کی طلب زیادہ ہے اور رسد کم ہے، کیونکہ جب وہ چیز لائے گا تو بازار میں زیادہ قیمت وصول ہوگی اور زیادہ منافع کما سکے گا اگر وہ ایسی چیز بازار میں لے آئے جس کی پہلے ہی رسد زیادہ اور طلب کم ہے تو اس سے نقصان ہوگا۔

جب ہر شخص کو آزادی دے دی گئی کہ تم منافع کماؤ تو اب وہ وہی چیز بازار میں لے کر آئے گا جس کی طلب زیادہ ہو اور رسد کم ہو اور اس وقت تک لاتا رہے گا جب تک رسد طلب کے برابر نہ ہو جائے، جس مرحلہ پر رسد اور طلب برابر ہوگی اب اگر اور بھی لے کر آئے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیمت گر جائے گی اور اس کا نقصان ہوگا۔

اگر کوئی کپڑے کا تاجر ہے تو وہ دیکھے گا کہ بازار میں کپڑا کتنا ہے؟ اگر وہ محسوس کرے گا کہ طلب زیادہ ہے اور بازار میں جو پیداوار ہو رہی ہے وہ کم ہے، قیمتیں بڑھ رہی ہیں تو وہ کپڑا بازار میں لائے گا، کپڑے کا کارخانہ لگائے گا لیکن جب رسد اور طلب برابر ہو جائے گی جس کو معاشی اصطلاح میں ''نقطۂ توازن'' کہتے ہیں، جب نقطۂ توازن قائم ہو جائے گا تو اس وقت بازار میں کپڑا لانا بند کر دے گا کیونکہ اس وقت نقصان ہوگا۔

تو سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ کہتا ہے کہ اس طرح خود بخود ترجیحات کا تعین ہو جائے گا، ہر آدمی سوچے گا کہ بازار میں کس چیز کی ضرورت ہے؟ کپڑے کی ضرورت ہوگی تو کپڑا بنائے گا کسی اور چیز کی ضرورت ہوگی تو وہ لے کر آئے گا۔ جب آدمی نفع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا تو وہ بازار کی قوتوں کو بروئے کار لائے گا کہ کون سی چیز بنائی جائے اور کون سی نہ بنائی جائے۔

ایک زمیندار ہے وہ زمین کے اندر چاول بھی اگا سکتا ہے، گندم بھی اگا سکتا ہے، کپاس بھی اگا سکتا ہے، تمباکو اور چائے بھی اگا سکتا ہے، لیکن وہ اگانے سے پہلے یہ سوچے گا کہ اسے کس چیز میں زیادہ فائدہ ہوگا، بازار میں جس کی طلب اور ضرورت زیادہ ہوگی وہ اسے ہی اگائے گا، اگر لوگوں کو آٹا نہیں مل رہا ہے اور وہ افیون کی کاشت کرنے لگے تو وہ احمق ہوگا۔ اس وقت اس کو افیون کا خریدار کوئی نہیں ملے گا وہ سوچے گا کہ آٹے کا ملک میں قحط ہے لہٰذا گندم اگانی چاہئے۔ اسی سے ترجیحات کا تعین بھی ہو رہا ہے اور وسائل کی تخصیص بھی ہو رہی ہے۔

آمدنی کی تقسیم (Distribution of Income)

سرمایہ دارانہ نظام یہ کہتا ہے کہ پیداوار کے چار عوامل ہوتے ہیں، یعنی کوئی بھی پیداواری عمل

ہو اس میں چار چیزیں مل کر کام کرتی ہیں تب کوئی پیداوار وجود میں آتی ہے، مثلاً کپڑے کا کارخانہ ہے اس میں کام کرنے والے چار عوامل ہیں۔

(۱) زمین (Land) ایسی جگہ جہاں کام کیا جائے یہ ایک عامل پیداوار ہے۔

(۲) سرمایہ (Capital) سرمایہ سے مراد روپیہ ہے، آدمی کے پاس روپیہ ہوگا تو وہ اس سے تعمیر کرے گا، مشینری خریدے گا وغیرہ وغیرہ۔

(۳) محنت (Labour) یعنی اگر زمین بھی ہو سرمایہ بھی ہو لیکن محنت نہ ہو تو کام نہیں ہوسکتا لہٰذا محنت کرنے کے لئے مزدور لانے پڑتے ہیں۔

(۴) آجر یا تنظیم: چوتھی چیز جس کا اردو میں ترجمہ بڑا مشکل ہے یعنی اس کو آجر کہتے ہیں اور بعض اس کو تنظیم کہتے ہیں ایسا آدمی جو ان تینوں عوامل کو اکٹھا کر کے ان کی تنظیم کرے اور ان سے کام لے اس کو انگریزی میں (Entrepreneur) کہتے ہیں۔ یہ اصل میں فرانسیسی لفظ ہے اس کا اردو میں صحیح ترجمہ ''مہم جو'' ہے۔ یعنی جو یہ بیڑا اٹھائے کہ مجھے یہ کام کرنا ہے اور اس میں اپنے مستقبل کو داؤ پر لگائے کہ میں یہ کام کروں گا، رسک خطرہ مول لیتا ہے، پھر ان چیزوں کو جمع کرتا ہے، زمین لیتا ہے، سرمائے مہیا کرتا ہے، مزدور مہیا کرتا ہے، آگے جا کر یہ خطرہ مول لینا پڑتا ہے کہ جو سامان تیار ہوگا نہ معلوم وہ فروخت ہو یا نہ ہو۔

تو یہ چاروں عوامل پیداوار (Factors of Production) ہوتے ہیں: زمین، سرمایہ، محنت اور آجر یا تنظیم۔

سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ ہے کہ ان چاروں عوامل نے مل کر آمدنی پیدا کی ہے اس لئے ان چاروں عوامل کا آمدنی میں حصہ ہے۔

زمین کا حصہ کرایہ ہے، یعنی جس آدمی نے کاروبار کے لئے زمین دی ہے وہ اس بات کا حق دار ہے کہ اس کو زمین کا کرایہ دیا جائے۔

سرمایہ کا حصہ سود ہے، یعنی جس نے سرمایہ مہیا کیا اس کو اس بات کا حق ہے کہ وہ سود کا مطالبہ کرے کہ میں نے اتنا سرمایہ، اتنے پیسے دیئے تھے مثلاً میں نے تمہیں ایک لاکھ روپیہ دیا تھا، اس میں سے مجھے دس فیصد سود دو۔

محنت یعنی مزدور کا حق ہے کہ وہ اجرت یعنی اپنی مزدوری وصول کرے۔

یہ تین چیزیں دینے کے بعد یعنی زمین کا کرایہ (Rent) سرمایہ کا سود (Interest) اور مزدوری کی اجرت (Wages) جو کچھ بچے وہ آجر یا تنظیم کا منافع (Profit) ہے کیونکہ اس نے ان

سب کو لگانے کا بیڑہ اٹھایا تھا اور خطرہ بھی مول لیا تھا، لہٰذا جو کچھ بچے وہ سارا آجر کا منافع ہے۔

سوال: اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے یہ تو کہہ دیا کہ زمین کا کرایہ ملے گا، سرمایہ کو سود اور مزدور کو اجرت ملے گی، لیکن زمین کو کتنا کرایہ، سرمایہ کو کتنا سود اور مزدور کو کتنی اجرت ملے گی؟ اس کا تعین کیسے ہوگا؟

جواب: سرمایہ دارانہ نظام کا کہنا ہے کہ اس کا تعین بھی وہی رسد وطلب کرے گی، زمین کا کرایہ، مزدور کی اجرت اور سرمایہ کا سود ان کی مقدار کا تعین بازار کی قوتیں رسد اور طلب ہی کریں گی، مثلاً زید کو ایک کارخانہ لگانا ہے اس کے لئے زمین چاہئے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ زمین کی کتنی رسد ہے اور طلب کتنی ہے؟ آیا زمین کرایہ پر لینے والا زید تنہا ہی ہے یا اور لوگ بھی اس فکر میں ہیں کہ زمین کرایہ پر لیں، اگر زید تنہا ہی زمین کا لینے والا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ زمین کی طلب کم اور رسد زیادہ ہے، لہٰذا زمین کا کرایہ بھی کم ہوگا، اور اگر ساری قوم زمین کی تلاش میں ہے اور زمینیں گنی چنی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی رسد کم ہے اور طلب زیادہ ہے، لہٰذا زمین کا کرایہ بھی زیادہ ہوگا تو رسد اور طلب کی طاقتیں جہاں مل جائیں گی وہاں کرایہ کا تعین ہوگا۔

فرض کریں زید کو زمین کی ضرورت ہے اور وہ ایک ہزار سے زیادہ کرایہ نہیں دے سکتا اب وہ ایک ہزار ماہانہ کے حساب سے زمین کی تلاش میں نکلا، بازار میں جا کر دیکھا کہ وہاں پوری قوم زمین کی تلاش میں پھر رہی ہے، کوئی پانچ ہزار ماہانہ دینے کو تیار ہے، کوئی سات ہزار دینے کو تیار ہے اور زمینیں کم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زید کو ایک ہزار میں زمین نہیں ملے گی، لہٰذا اسے چاروناچار پانچ ہزار میں کسی سے بات کرنا ہوگی۔

اسی طرح اگر زمین والا دل میں یہ ارادہ بٹھالیتا ہے کہ میں اپنی زمین دس ہزار ماہانہ سے کم پر نہیں دوں گا۔ بازار میں جا کر دیکھتا ہے کوئی پانچ ہزار دینے کو تیار نہیں کہ زمین کی رسد زیادہ ہوگئی ہے اور طلب کم ہے، لہٰذا وہ لازماً پانچ ہزار میں دینے پر مجبور ہوگا۔

تو پانچ ہزار کا نکتہ ایسا ہے جس پر طلب ورسد جا کر مل جائیں گے اور کرایہ متعین ہوجائے گا، تو زمین کا کرایہ متعین کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ رسد وطلب کی طاقتیں متعین کریں گے۔

سود میں بھی یہی طریقہ ہے کہ آدمی کاروبار کے لئے روپیہ چاہتا ہے، وہ بینک کے پاس جاتا ہے کہ مجھے کاروبار کے لئے پیسے چاہئیں، بینک اس کو کہتا ہے کہ میں اتنے سود پر مہیا کروں گا، اب اگر روپے کی طلب زیادہ ہے اور روپیہ کم ہے تو سود کی شرح بڑھ جائے گی، اور اگر اس کے برعکس روپے کی

طلب تو کم ہے رسد زیادہ ہے تو سود شرح گھٹ جائے گی، تو یہاں بھی رسد وطلب مل کر سود کی شرح متعین کریں گے۔

یہی معاملہ مزدور کا بھی ہے کہ اگر بازار میں مزدوروں کی رسد زیادہ ہے، ہزاروں جوتے چٹخاتے پھر رہے ہیں کہ کہیں سے روزگار ملے، کارخانے کم ہیں، تو اجرت بھی کم ہوگی اس واسطے کہ رسد زیادہ ہے۔

کارخانے دار کے پاس مزدور جاتا ہے کہ مجھے رکھ لو، وہ کہتا ہے کہ میں نہیں رکھتا، مزدور کہتا ہے کہ مجھے ایک روپیہ یومیہ پر رکھ لو، مگر رکھ لو، اب کارخانے دار سوچتا ہے کہ دوسرا آدمی دو روپے یومیہ پر کام کر رہا ہے یہ اس سے سستا پڑتا ہے اس لئے دوسرے آدمی کی چھٹی کرادی اور اس سے کہا کہ تم آجاؤ۔

اس کے برعکس اگر مزدوری کرنے والے کم ہوں اور محنت طلب کرنے والے زیادہ ہوں تو اس صورت میں اجرت بڑھ جائے گی۔

یہاں ہمارے ملک میں چونکہ بے روزگار زیادہ ہیں اس لئے اجرتیں کم ہیں۔ انگلینڈ میں جاکر دیکھ لیں وہاں اجرتیں آسمانوں پر پہنچی ہوئی ہیں، ہم لوگ عیش کرتے ہیں، گھروں میں کام کے لئے نوکر موجود ہیں۔ لیکن وہاں اگر گھر میں کام کرنے کے لئے نوکر رکھنا پڑ جائے تو دیوالیہ نکل جائے اس لئے کہ نوکر اتنا مہنگا ملتا ہے۔ اجرتیں بڑھی ہوئی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مزدوروں کی رسد کم اور طلب زیادہ ہے، چنانچہ مزدور کی اجرت بھی رسد اور طلب کے نتیجے میں متعین ہوگی۔

چوتھا مسئلہ، ترقی (Development)

جب آپ نے ہر انسان کو منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا تو وہ بازار میں ایسی چیز لانے کی کوشش کرے گا جو زیادہ دلکش اور مفید و پائیدار ہو، اور لوگ اس کی طرف زیادہ رغبت کریں۔

اگر ایک آدمی کار بنا رہا ہے اور سالہا سال سے ایک ہی طرح کی کار بنائے جا رہا ہے تو اس سے لوگ اکتا جائیں گے، تو وہ چاہے گا کہ میں کار کو ایسا بناؤں کہ اس کے نتیجے میں لوگوں سے زیادہ پیسے مانگ سکوں، اس لئے وہ اس کے اندر کوئی نہ کوئی نئی چیز لگادے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختراع کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اس کو بروئے کار لاکر انسان نئی سے نئی چیزیں پیدا کرتا ہے تو ترقی خود بخود ہوتی چلی جائے گی۔ جب انسان کو زیادہ منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا تو اب انسان ایک سے ایک چیز پیدا کرے گا۔ بازار میں دیکھ لیں یہی ہو رہا ہے، ہر روز نئی پیداوار سامنے آتی ہے اس لئے کہ آدمی سوچتا ہے کہ میں ہر روز نئی چیز لے کر آؤں، جس کی طرف لوگ مائل ہوں اور جس کی

طرف لوگ بھاگیں، اس طرح سے دن بدن ترقی ہو رہی ہے۔

تو خلاصہ یہ نکلا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے میں معیشت کے تمام مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک ہی جادو کی چھڑی ہے یعنی رسد اور طلب کی بازاری قوتیں۔ اس کو مارکیٹ (Market Mechnism) بھی کہتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اصول

سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اصول تین ہیں۔

(۱) انفرادی ملکیت کا احترام، کہ ہر شخص کی ملکیت کا احترام کیا جائے،

(۲) منافع کمانے کے لئے لوگوں کو آزاد چھوڑنا۔

(۳) اور حکومت کی طرف سے عدم مداخلت، یعنی حکومت بیچ میں مداخلت نہ کرے کہ تاجروں پر پابندی لگا رہی ہے، یہ کر رہی ہے، وہ کر رہی ہے بلکہ انہیں آزاد چھوڑ دو۔

سوال: مہم جو یعنی آجر یا تنظیم کا منافع تو طلب ورسد سے تعین نہیں ہوا؟

جواب: وہ اس طرح سے متعین ہوا کہ جب طلب ورسد سے اجرت بھی متعین ہوئی، سود بھی متعین ہوا، کرایہ بھی متعین ہوا، اور جو چیز باقی بچے اس کا نام منافع ہے، اور باقی بچنے والی مقدار کتنی ہے؟ وہ موقوف ہے ان تینوں چیزوں کے تعین پر اور یہ تینوں چیزیں رسد وطلب سے متعین ہوتی ہیں، لہٰذا وہ بھی بالواسطہ رسد وطلب سے متعین ہو رہا ہے۔

دوسرا یہ کہ جب وہ اپنی چیز اپنی پیداوار بازار میں لے کر گیا تو وہاں جتنی قیمت ملے گی وہ طلب ورسد کی حیثیت سے حاصل ہوگی، پھر اس قیمت میں سے ان تینوں کو جو ادائیگی ہوگی وہ بھی طلب ورسد کی بنیاد پر ہوگی، لہٰذا جو باقی بچے وہ بھی درحقیقت طلب ورسد کا ہی کرشمہ ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے کا خلاصہ ہے۔

اشتراکیت (Socialism)

اشتراکیت میدان میں آئی، اس نے کہا کہ جناب آپ نے معیشت کے اتنے اہم اور بنیادی مسئلے کو طلب ورسد کی اندھی اور بہری طاقتوں کے حوالے کر دیا ہے، آپ نے کہا کہ ہر کام اسی سے ہوگا یہ تو بڑا خطرناک معاملہ ہے اس پر اشتراکیت نے دو بنیادی تنقیدیں کیں۔

سرمایہ دارانہ نظام پر تنقیدیں

اشتراکیت کی طرف سے یہ تنقید کی گئی کہ آپ یہ فرماتے ہیں کہ ہر آدمی بازار میں وہی چیز لائے گا جس کی بازار میں زیادہ طلب ہوگی اور جب طلب، رسد کے برابر ہوجائے گی تو بنانا چھوڑ دے گا اس واسطے کہ اگر مزید بنائے گا تو نفع کم ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا نکتہ ہے جس پر پہنچ کر طلب اور رسد برابر ہوں گے، کیا ہر انسان کے پاس خودکار میٹر موجود ہے جس سے وہ اندازہ کرے کہ اب طلب ورسد برابر ہوگئے ہیں، لہٰذا اب مزید نہیں بنانا چاہئے یا کوئی فرشتہ غیب سے آکر اس کو بتلائے گا کہ اب رسد وطلب برابر ہوگئی ہے اب مزید مت بنانا، نہ کوئی ایسا میٹر موجود ہے، نہ کوئی ایسی غیبی طاقت موجود ہے جو آکر تاجر کو بتادے کہ اب چیزیں بنانا بیکار ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عملاً ایسا ہوتا ہے کہ تاجر اپنی مصنوعات بناتا چلا جاتا ہے، اس گمان پر کہ ابھی تک طلب رسد کے برابر نہیں ہوئی، لیکن حقیقت میں طلب رسد کے برابر ہوچکی ہوتی ہے، اور تاجر اس زعم باطل میں مبتلا ہے، دوسرا بھی اسی میں مبتلا ہے، تیسرا بھی اسی میں مبتلا ہے، اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زعم باطل کے واشگاف ہوتے ہوتے کروڑوں ٹن سامان ضرورت سے زیادہ بن گیا، تب آنکھیں کھلیں کہ یہ تو بہت زیادہ ہوگیا، بازار میں قیمتیں گرنے لگیں، کساد بازاری آگئی، کارخانے بند ہونا شروع ہوگئے، اس واسطے کہ سامان ضرورت سے زیادہ ہوگیا، بازار میں قیمتیں اتنی گرگئیں کہ لاگت بھی وصول نہیں ہورہی ہے، کارخانے بیکار ہورہے ہیں، انہوں نے کہا کہ انہیں بند کرو۔ چنانچہ کارخانے بند ہوئے، کارخانے بند ہونے کا مطلب ہے کہ ہزارہا مزدور بے کار، نتیجہ یہ ہوا کہ بیروزگاری پھیل گئی، اس کو "کساد بازاری" کہتے ہیں۔ اور یہ اتنی بڑی بلا ہے کہ معاشی بیماریوں میں شاید اس سے زیادہ خطرناک بیماری اور کوئی نہیں ہے۔

آج لوگ سمجھتے ہیں کہ افراط زر بہت بڑی بلا ہے، یعنی قیمتوں کا چڑھ جانا، لیکن قیمتوں کے چڑھ جانے سے کساد بازاری زیادہ خطرناک چیز ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں ملک معاشی طور پر تباہ ہوجاتا ہے، کارخانے بند اور لوگ بیروزگار ہوجاتے ہیں۔

اب چونکہ کساد بازاری ہے لوگوں نے کہا کہ کارخانے مت لگانا جو سامان بنا تھا وہ سستے داموں بک گیا، لوگ ڈر اور خوف میں مبتلا ہیں کہ کارخانے مت لگانا کیونکہ اس میں نقصان ہے، یہاں تک کہ رسد کم پڑگئی اور طلب بڑھ گئی، اب مزید کوئی سامان بنانے کے لئے تیار نہیں کیونکہ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک کر پیتا ہے، تاجر کہتا ہے کہ مثلاً میں کپڑے کا کارخانہ نہیں لگاؤں گا کیونکہ میں اس

سے تباہ ہو چکا ہوں لوگ کپڑے مانگ رہے ہیں اور وہ نہیں مل رہے ہیں، پھر اچانک کچھ لوگ آتے ہیں کہ اب حالات بدل گئے ہیں، اب طلب بڑھ گئی ہے، چلو اب کارخانے لگاتے ہیں، لیکن یہ جو درمیانی وقفہ تھا یہ انتہائی عدم توازن کا تھا، جس میں دس بیس سال گزر جاتے ہیں، اس میں معاشی طور پر ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں، کساد بازاری آتی ہے، بعض اوقات بے روزگاری پھیلتی ہے اور خدا جانے کیا کچھ ہوتا ہے۔

اور یہ جو آپ نے کہا کہ طلب و رسد کی طاقتیں متعین کر دیتی ہیں تو متعین کر دینے کے کیا معنی؟ کہ بیچ میں ایک عرصہ ایسا گزرتا ہے جس میں بے انتہا ناہمواری رہتی ہے، اب پھر اگلی مرتبہ بھی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں نے دوبارہ بنانا شروع کیا اور ویسے ہی زیادہ بناتے چلے گئے، لہٰذا آپ کا یہ فلسفہ کہ طلب و رسد کی طاقتیں خود متعین کر دیتی ہیں، یہ صحیح نہیں رہا۔

دوسری بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں آدمی کو بھی سامان اور بھیڑ بکری تصور کر لیا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ اس کی اجرت بھی رسد و طلب سے متعین ہوگی، جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر بازار میں مزدور زیادہ ہیں تو اس کی اجرت کم ہوگی، آپ کو اس سے بحث نہیں کہ اگر مزدور ایک روپیہ یومیہ پر راضی ہوگیا ہے تو اس ایک روپے میں خود کیا کھائے گا اور اپنے بچوں کو کیا کھلائے گا، اور کس خستہ حال مکان میں رہے گا، فٹ پاتھ پر سوئے گا لیکن (آپ کی نظر میں) آپ کہتے ہیں کہ رسد و طلب نے اجرت کا تعین کر لیا تو بات ٹھیک ہوگئی، لیکن وہ بے چارہ سارا دن اپنے گاڑھے پسینے کی محنت کرتا ہے اور شام کو اس کو ایک روپیہ مزدوری ملتی ہے جس سے ایک روٹی بھی مشکل سے آتی ہے، وہ ایک روٹی خود کھائے یا اپنے بچوں کو کھلائے اور رات کو فٹ پاتھ پر جا کر سوئے، آپ کہتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح ہے، یہ غیر انسانی فلسفہ ہے کہ مزدور کی اجرت کو آپ نے بھیڑ بکریوں کی طرح رسد و طلب کا تابع بنا دیا۔

اشتراکیت والوں کی تیسری تنقید یہ ہے کہ آپ نے عوامل پیداوار چار مقرر فرمائے ہیں۔ زمین، سرمایہ، محنت اور آجر یا تنظیم جبکہ ہماری نظر میں عوامل پیداوار صرف دو ہیں۔ زمین اور محنت

زمین کسی انسان کی ملکیت نہیں، یہ عطیہ قدرت ہے، جب انسان دنیا میں آیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لئے زمین دے دی تھی، پوری زمین مشترک ہے، اس لئے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ یہ کہے کہ یہ میری زمین ہے میں اس کا اتنا کرایہ لوں گا، زمین تو عطیہ قدرت ہے اور اس زمین پر انسان محنت کرتا ہے تو اس سے پیداوار وجود میں آتی ہے۔

یہ سرمایہ کہاں سے آیا؟ یہ تنظیم کہاں سے آ گئی؟ جب سب سے پہلے انسان زمین پر اترا تھا

اس وقت اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، صرف زمین تھی اس نے زمین پر محنت کی، محنت سے گندم اگائی، تو گندم محنت اور زمین سے پیدا ہوئی، نہ کوئی سرمایہ تھا، نہ تنظیم تھی، اس واسطے ہمارے نزدیک عوامل پیداوار صرف دو ہیں۔ ایک زمین اور دوسری محنت۔ زمین کرایہ کی حق دار اس لئے نہیں کہ وہ عطیہ قدرت ہے کسی کی ملکیت نہیں، البتہ محنت اجرت کی حق دار ہے، لہٰذا آپ نے جو یہ تین، چار مزید آمدنی کی مدیں بنا رکھی ہیں کہ زمین کا کرایہ، سرمایہ کا سود اور آجر کا منافع ان کے قول کے مطابق سب ناجائز ہے، نہ کرایہ جائز، نہ سود جائز اور نہ منافع جائز ہے۔

البتہ جائز اگر ہے تو وہ محنت کی مزدوری ہے اور جو حقیقت میں آمدنی کی مستحق تھی، اس کو آپ نے رسد اور طلب کے تابع کر دیا اور وہ جتنی چاہے کم ہو کوئی حرج نہیں ہے حالانکہ حقیقی مستحق تو وہی تھا، لہٰذا آپ کا فلسفہ بالکل بیوقوفی کا فلسفہ ہے، لغویت ہے اور ناانصافی ہے، پھر صحیح بات کیا ہے؟

کہتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ ساری زمین اور سارے وسائل و پیداوار کسی کی بھی شخصی ملکیت میں نہیں ہونی چاہئے، نہ زمین کسی کی شخصی ملکیت میں ہو، نہ کارخانہ کسی کی شخصی ملکیت میں ہو، بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ سب کو سرکار کی تحویل میں دے دیا جائے، جو نمائندہ حکومت ہے جمہوری حکومت ہے، اس کی تحویل میں دے دیئے جائیں کہ زمینیں بھی تمہاری ملکیت میں اور کارخانے بھی تمہاری ملکیت میں اور آپ چاروں مسائل یعنی ترجیحات کا تعین (Determination of Priorities) وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources) آمدنی کی تقسیم (Distribution of Income) اور ترقی (Development) ان کو منصوبہ بندی کے ذریعہ حل کریں، یعنی منصوبہ بنائیں کہ ہمارے ملک میں کتنی آبادی ہے، فی کس کتنی گندم چاہئے، فی کس کتنے چاول چاہئے، فی کس کتنے گز کپڑا چاہئے اور فی کس کتنی چائے چاہئے؟

اس حساب سے یہ دیکھیں کہ ہمارے پاس کتنی زمینیں ہیں؟ اب منصوبہ بندی کر کے جتنی ضرورت ہو اس منصوبہ کے مطابق اتنی زمین میں گندم لگاؤ، اتنی زمین میں چاول لگاؤ اور اتنے ہی کارخانے لگاؤ، جتنے معاشی فیصلے کرو، وہ منصوبہ بندی سے کرو، اور پھر اس طرح جو پیداوار حاصل ہو وہ جو مزدور کام کر رہے ہیں ان میں تقسیم کر دو، نہ سود، نہ سرمایہ، نہ کرایہ، نہ منافع۔

تو ساری زمین، سارے کارخانے سب کچھ قومی ملکیت میں لے لیں اور منصوبہ بندی کر کے ترجیحات کا تعین کریں وسائل کی تخصیص کریں، آمدنی کی تقسیم کریں اور ترقی کے مسائل کو منصوبہ بندی سے حل کریں، یہ اشتراکیت کا فلسفہ ہے۔

اسی واسطے اشتراکیت کا دوسرا نام منصوبہ بند معیشت ہے، جسے پلینڈ اکانومی (Planned

(Market Economy) کہتے ہیں، اور سرمایہ دارانہ معیشت کا دوسرا نام مارکیٹ اکانومی (Market Economy) ہے یعنی بازار کی معیشت، کیونکہ وہاں بازار کا تصور ہے اور اشتراکیت میں بازار کا تصور نہیں وہ محض نام نہاد بازار ہے کیونکہ کارخانے سب حکومت کے ہیں، جو پیداوار ہورہی ہے اس کی قیمت حکومت نے مقرر کردی، بازار میں جو بیچنے کے لئے بیٹھا ہے وہ اس کا مالک نہیں ہے، حکومت کا کارندہ ہے، قیمت متعین ہے بھاؤ تاؤ کا سوال نہیں بلکہ گورنمنٹ نے جو قیمت مقرر کردی اسی قیمت پر چیز ملے گی، لینا ہو لے لو، ورنہ بھاگو، لہٰذا بازار کا وہ تصور جس سے ہم متعارف ہیں کہ کمپیٹیشن (Competition) ہورہا ہے، مقابلہ ہورہا ہے، یہ نہیں ہے اس لئے اس معیشت کو منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) کہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں سرمایہ دارانہ نظام ہوتا ہے وہاں ہر آدمی اپنی پیداوار کو رواج دینے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کرتا ہے، پبلسٹی کرتا ہے، اشتہار چھاپتا ہے، شہر کے اندر اشتہارات کے بورڈ نظر آتے ہیں، اشتراکی ملک میں ان چیزوں میں سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا، نہ وہاں بورڈ ہے، نہ وہاں اشتہار ہے، اس لئے کہ کسی کو اس کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ کوئی چیز ذاتی ملکیت نہیں ہے، بازار میں جو کچھ فروخت ہورہا ہے جا کر بازار میں دیکھیں اگر پسند آ جائے تو قیمت لکھی ہوئی ہے لے لیں، اگر نہیں پسند تو نہ لیں، اس لئے اس میں بازار کا تصور نہیں ہے، اس لئے کو پلینڈ اکانومی (Planned Economy) یعنی منصوبہ بند معیشت کہتے ہیں اور اس کو مارکیٹ اکانومی (Market Economy) بازار کی معیشت کہتے ہیں۔

اشتراکی نظام پر تبصرہ

جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے اس نے جو فلسفہ پیش کیا اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ ان کے بنیادی فلسفے کے مطابق معیشت کے جتنے مسائل ہیں ان کے نزدیک سب کا حل یہ ہے کہ تمام وسائل پیداوار قومی ملکیت میں لے کر ان کی منصوبہ بندی کی جائے، درحقیقت یہ ایک مصنوعی اور استبدادی طریقہ ہے۔

معیشت وہ بھی معاشرت کے بے شمار مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ اس میں پسند اور ناپسند کے فیصلے منصوبہ بندی کی بنیاد پر نہیں ہوسکتے۔

مثال کے طور پر شادی بیاہ کا معاملہ ہے، اس میں مرد کو اپنے لئے مناسب عورت چاہئے اور

عورت کو اپنے لئے مناسب مرد چاہئے، اور ہوتا یہ ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی تلاش میں رہتے ہیں اور پھر آپس میں بات چیت ہو کر معاملہ طے پاتا ہے، اب اس معاملہ میں بعض اوقات فیصلوں میں غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں اور جوڑ صحیح نہیں بیٹھتا آپس میں نا اتفاقی اور نا چاقی بھی پیش آتی ہے۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ نا چاقیاں اس لئے ہو رہی ہیں کہ یہ باہمی پسند و ناپسند سے فیصلے ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اب منصوبہ بندی کرو کہ ملک میں کتنے مرد ہیں اور کتنی عورتیں؟ اس حساب سے منصوبہ بندی کی بنیاد پر ان کی شادیاں کرائی جائیں تو ظاہر ہے یہ چلنے والی بات نہیں ہے۔ یہی معاملہ معیشت کا بھی ہے کہ اس میں ہر ایک آدمی کی افتادہ طبع ہوتی ہے، اس افتادہ طبعی کو معیشت کے معاملات میں استعمال کرنا پڑتا ہے۔

اب اگر اس کی منصوبہ بندی کر دی جائے کہ تم فلاں کارخانے میں کام کرو گے یا فلاں زمین پر کام کرو گے اور اس کو اس سے مناسبت نہیں تو اس طرح اس کی صلاحیتیں ضائع ہوں گی اور اس کی صلاحیتوں سے صحیح کام نہیں لیا جا سکے گا۔ اور یہ نظام شدید قسم کے استبداد کے بغیر چل بھی نہیں سکتا۔

مثلاً ایک شخص کی ڈیوٹی روئی کے کارخانے میں لگا دی جائے کہ جا کر روئی کے کارخانے میں کام کرو، اس کا دل وہاں کام کرنے کو نہیں چاہ رہا ہے، وہ بھاگنا چاہتا ہے تو اسے استبداد کے ذریعے ہی روکا جا سکتا ہے۔ لہٰذا شدید قسم کی جکڑ بند اور شدید قسم کا استبداد جب تک نہ ہو اس وقت تک یہ نظام نہیں چل سکتا۔ چنانچہ دنیا میں یوں تو استبداد کے بہت سے نظام آئے لیکن جتنا استبداد اشتراکیت میں تھا اتنا کسی اور نظام میں مشکل سے ملے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اشتراکی نظام میں فرد کی آزادی بالکل سلب ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب آزادی سلب ہو جائے گی اور آدمی کو مجبور کر دیا جائے گا تو وہ اپنے ذوق و شوق سے محنت کرنے سے کترائے گا۔ اور یہ قدرتی بات ہے کہ جب کسی شخص کا ذاتی مفاد کسی چیز سے وابستہ ہوتا ہے تو اس سے اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور اگر ذاتی مفاد وابستہ نہ ہو تو دلچسپی اس درجہ برقرار نہیں رہتی۔ تو وہاں اشتراکی نظام کے اندر چونکہ صنعتیں اور کارخانے ہیں وہ کسی انسان کے ذاتی ملکیت میں تو ہوتے نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جتنے لوگ کام کرتے ہیں ان کو ہر صورت میں تنخواہ ملتی ہے، اس صنعت کو ترقی ہو یا نہ ہو، فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے، فروغ ہو یا نہ ہو۔ اب کیوں اس کے اندر زیادہ محنت کرے، کیوں زیادہ وقت صرف کرے، نتیجہ یہ کہ دلچسپی برقرار نہیں رہتی۔ ڈیوٹی تو ان کو آٹھ گھنٹے ادا کرنی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ خود اپنے ملک پاکستان میں دیکھ لیجئے کہ بھٹو صاحب کے ابتدائی دور کے

اندر انہوں نے بہت سی صنعتیں قومی ملکیت میں لیں۔ جتنی صنعتیں قومی ملکیت میں گئیں سب ڈوبیں، اور اس کا انجام بالآخر یہ ہوا کہ وہ نقصان میں گئیں، انہوں نے خسارہ اٹھایا۔ اور اب آخر کار سب مجبور ہورہے ہیں کہ دوبارہ ان کو نیلام کر کے شخصی ملکیت میں دیا جائے تا کہ وہ صنعتیں صحیح طریقہ سے کام کرسکیں۔

آجکل یونائیٹڈ بینک کا بہت بڑا سکینڈل چل رہا ہے (جو حبیب بینک کے بعد ملک کے دوسرے نمبر کا بینک ہے) اب اس کا حال یہ ہورہا ہے کہ دیوالیہ نکلنے کے قریب ہے اور اب اس کو بالآخر افراد کے حوالے کرنے کی فکر کی جارہی ہے۔ اشتراکی ممالک میں ہم نے خود اس کا مشاہدہ کیا۔ کیونکہ دکاندار کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ سامان زیادہ بک رہا ہے یا کم بک رہا ہے۔ دونوں حالتوں میں ان کو وہ تنخواہ ملنی ہے جو مقرر ہے۔ تو اس واسطے وہ گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے یا گاہکوں کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لئے فکر نہیں کرتا۔

الجزائر کا ایک چشم دید واقعہ

الجزائر میں ایک دوکان میں خود میرا ایک واقعہ پیش آیا کہ مجھے ایک تفسیر جو (التنویر والتحریر) علامہ طاہر بن عاشور کی ہے وہ خریدنی تھی، تو شام کے وقت پانچ بجنے کا وقت قریب تھا، میں نے اس سے کہا کہ بھئی میں یہ تفسیر خریدنا چاہتا ہوں اور تفسیر خریدنے کے معنی یہ تھے کہ وہ بارہ سو (الجزائری) دینار کی تھی، لیکن میرے پاس الجزائری دینار نہیں تھے امریکی ڈالر تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ بھئی میں جا کر اس کو کھلوا کر لاتا ہوں آپ براہِ کرم اتنی دیر میرا انتظار کیجئے تو اس نے جواب دیا کہ نہیں پانچ بجے دوکان بند ہوجائے گی۔ میں نے کہا مجھے صرف پانچ منٹ مہلت دیجئے میں جلدی سے جا کر اس کو الجزائری دینار میں تبدیل کرا کے دوڑتا ہوا پہنچا۔ اور پانچ بجکر ایک یا دو منٹ ہوئے تھے کہ دوکان بند ہوگئی تھی اور دکاندار غائب، نتیجہ یہ کہ وہ الجزئری دینار آج تک میرے پاس پڑے ہوئے ہیں، کہیں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، اور کبھی الجزائر جانا ہوا تو استعمال ہوں گے ورنہ دنیا میں کوئی اس کو لینے کو تیار نہیں۔

یہ ایک واقعہ ہے جو میں نے آپ کو بتایا، اور یہ عام ہے کہ گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے اشتراکی ملک میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا، اس لئے کہ سامان زیادہ بکے یا نہ بکے اس سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ کہ چوہتر سال تک اشتراکی نظام نے جس ملک کے اندر اپنا تسلط قائم رکھا بالآخر وہیں اس کا برا حال ہوگیا اور لوگ اسے چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔

دوسری طرف یہ کہا گیا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں لوگوں نے وسائل پیداوار پر قبضہ کر رکھا ہے، زمینوں پر، کارخانوں پر اور لوگوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں، اگر دیکھا جائے تو پہلے ظلم ڈھانے والے ہزاروں کی تعداد میں تھے لیکن اب جب ساری دولت سمٹ کر حکومت کے ہاتھوں میں آ گئی جس کا مطلب ہے چند سو افسران کے ہاتھوں میں، تو جب یہ افراد دولت کے اتنے بڑے تالاب پر قابض ہو گئے تو ان کی بدعنوانیاں، ان کی نوکر شاہی اور ان کی بدکرداریاں بہت زیادہ ہونے لگیں، کیونکہ اگر ایک آدمی ایک کارخانہ کا مالک ہے اور وہ لوگوں پر ظلم ڈھاتا ہے تو جو گروپ ملک کی تمام دولت پر قابض ہو وہ اس سے زیادہ ظلم کا ارتکاب کرے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سارے چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہو جائیں گے اور ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آ جائے گا۔ جو دولت کے سارے وسائل کو من مانی طریقے سے استعمال کرے گا۔

چونکہ اشتراکی نظام میں فرد کی آزادی سلب کر لی گئی تھی اور اس کی طبعی افتاد کو مدنظر نہیں رکھا گیا تھا اس لئے یہ نظام ۷۴ سال چلنے کے بعد زمین پر منہ کے بل گر پڑا۔ اس نظام کا تجربہ بھی ہو گیا اور تجربہ سے بھی یہ پتہ چل گیا ہے کہ یہ غلط نظام تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام پر تبصرہ

سرمایہ دارانہ نظام کی غلطی کو سمجھنے کے لئے ذرا وقت نظر کی ضرورت ہے، کیونکہ جہاں تک سرمایہ دارانہ نظام کے اس نکتے کا تعلق ہے کہ معیشت کے فیصلے منصوبہ بندی کی بنیاد پر نہیں بلکہ بازار کی قوتوں کی بنیاد پر ہیں، رسد وطلب کی طاقتوں کی بنیاد پر ہیں۔ یہ فلسفہ بنیادی طور پر غلط نہیں اور قرآن وسنت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾(۱)

''ہم نے بانٹ دی ہے ان میں روزی ان کی دنیا کی زندگانی میں اور بلند کر دیئے درجے بعض کے بعض پر کہ ٹھہراتا ہے ایک دوسرے کو خدمت گار۔''

کہ ہم نے ان کے درمیان معیشت کی تقسیم کی ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کی فوقیت عطا کی ہے تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے ایسا نظام بنایا ہے کہ بازار میں پہنچنے کے بعد مختلف لوگ اپنی

---

(۱) الزخرف: ۳۲

افتادِ طبع کے مطابق لوگوں کی طلب پوری کرتے ہیں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بازار میں رسد وطلب کا نظام ہم نے قائم کیا ہے۔ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَلَا يَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ))(۱)

''کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے''

وہاں ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((دَعُوا النَّاسَ يَرْزُقُ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَنْ بَعْضٍ))(۲)

''لوگوں کو چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ رزق عطا فرمائیں یعنی بیچ میں مداخلت نہ کرو''

اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام نے بازار کی قوتوں کو تسلیم کیا ہے، انفرادی ملکیت کو بھی تسلیم کیا ہے، منافع کے محرک کو بھی تسلیم کیا ہے، کہ آدمی اپنے منافع کے لئے کام کرے، تو بظاہر یہ بنیادی فلسفہ غلط نہیں ہے، لیکن غلطی یہاں سے لگی کہ یہ کہہ دیا کہ ذاتی منافع کو حاصل کرنے کے لئے انسان کو اس طرح آزاد چھوڑ دو کہ وہ جس طرح چاہے نفع کمائے اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں عائد کی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب منافع حاصل کرنا مقصود ہو تو جو بھی طریقہ چاہو استعمال کرو، چاہے سود کے ذریعے ہو، چاہے قمار کے ذریعہ ہو، چاہے سٹہ بازی کے ذریعہ ہو، حلال وحرام کی کوئی تفریق نہیں، بلکہ یہ کہا کہ جس طرح بھی تمہیں منافع ملے، کماؤ نہ تو کوئی اخلاقی پابندی ہے۔لہٰذا ننگی فلمیں تیار کرو، اس میں منافع مل رہا ہے، عریاں رسالے اور عریاں فلمیں مغربی ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب البيوع، هل يبيع حاضر لباد بغير اجر وهل يعينه أو ينصحه، رقم: ٢٠١٣، صحيح مسلم، كتاب البيوع، باب تحريم بيع الرجل على بيع أخيه وسومه على سومه، رقم: ٢٧٩٠، سنن الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء لا يبيع حاضر لباد، رقم: ١١٤٣، سنن النسائي، كتاب البيوع، باب بيع الحاضر للبادي، رقم: ٤٤١٩، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في النهي أن يبيع حاضر لباد، رقم: ٢٩٨٣، سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب النهي أن يبيع حاضر لباد، رقم: ٢١٦٦، مسند أحمد، رقم: ٧٠١١

(۲) صحيح مسلم، كتاب البيوع، باب تحريم بيع الرجل على بيع أخيه وسومه على سومه، رقم: ٢٧٩٩، سنن الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء لا يبيع حاضر لباد، رقم: ١١٤٣، سنن النسائي، كتاب البيوع، باب بيع الحاضر للبادي، رقم: ٤٤١٩، سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب النهي أن يبيع حاضر لباد، رقم: ٢١٦٧، مسند أحمد، رقم: ١٠٣٢٧

ماڈل گرل (Model Girl) کی کارکردگی

کچھ عرصہ پہلے ایک امریکی رسالہ ٹائمز (Times) میں اطلاع آئی تھی کہ امریکہ میں خدمات کے میدان میں جو سب سے زیادہ کمانے والا طبقہ ہے وہ ماڈل گرل (Model Girl) ہے۔ کئی ملین ڈالر یومیہ کماتی ہیں تو جب منافع کمانے کا ہر طریقہ جائز ہوگیا تو اس میں حلال وحرام کی کوئی تفریق نہیں رہی۔ جائز وناجائز، اخلاقی وغیر اخلاقی مناسب اور نامناسب کی کوئی تفریق نہیں رہی۔

عصمت فروشی کا قانونی تحفظ

عصمت فروشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے کاروبار کو بہت سے مغربی ملکوں میں قانونی تحفظ حاصل ہے اگرچہ بہت سے ملکوں میں اب بھی قانوناً منع ہے، لیکن بہت سے ملکوں نے اس کو قانوناً تحفظ فراہم کردیا ہے۔ پچھلے دنوں لاس اینجلس میں عصمت فروش عورتوں کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ جن ملکوں نے ابھی تک لائسنس نہیں دیا وہ بھی لائسنس دے دیں، تو جب منافع کمانے کے لئے ہر شخص آزاد ہے اور اس پر کوئی پابندی، کوئی رکاوٹ نہیں ہے تو وہ ہر طریقہ اختیار کرے گا۔

ایک انٹرنیشنل ماڈل گرل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی کمپنیوں کے ساتھ بھی ماڈلنگ کرتی ہے اس کی فیس اس کے لگ بھگ ہوتی ہے وہ تو علیحدہ، اور دوسرے ملکوں میں جانے کا فرسٹ کلاس ٹکٹ کا کرایہ الگ، فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرنے کا خرچہ الگ اور معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ تین سال تک وہ کمپنی جتنی مصنوعات بنائے گی اس کی منہ مانگی مقدار اس کو مفت فراہم کرے گی۔ اس طرح کی شرائط عائد ہوتی ہیں اور اس کے نتیجہ میں اشیاء کی لاگت میں اضافہ ہوتا ہے اور عوام اس کو برداشت کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں یہ جو کہا گیا کہ ہر ایک آدمی کو آزاد چھوڑ دو اس سے اخلاقی خرابیاں بے انتہا پیدا ہوتی ہیں، اور عوام سے پیسے سمیٹنے کا ہر طریقہ جائز قرار دے دیا، وہ سمیٹ سمیٹ کر امیروں اور طاقتوروں کے پاس جارہا ہے، بیچارہ غریب آدمی پس رہا ہے اس لئے کہ وہ جو بھی چیز خریدنے جائے گا اس کے اندر ساری لاگتیں، ساری عیاشیاں شامل ہیں اور غریب آدمی ساری برداشت کرتا اور ادا کرتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں کتنی ناہمواریاں پھیلتی ہیں، اسی طرح قمار (جوا) جو نئی نئی شکلوں میں پھیل رہا ہے، یا سٹہ بازی ہو، اسٹاک ایکسچینج میں سٹہ بازی کا بازار گرم ہے، اور اس

کے نتیجے میں پوری دنیا میں ایک طوفان برپا ہے۔

تو جب لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا تو انہوں نے سود، قمار اور سٹہ کے ذریعہ اپنی اجارہ داریاں (Monopolies) قائم کرلیں، اجارہ داری کا مطلب ہے کہ کوئی شخص کسی خاص صنعت پر اس طرح قابض ہوگیا کہ لوگ مجبور ہوگئے ہوں کہ جب بھی اس صنعت کی چیز کو خریدیں تو اسی سے خریدیں اور رسد وطلب کی قوتیں وہاں کام کرتی ہیں جہاں بازار میں آزاد مسابقت (Free Competition) ہو، آزاد مقابلہ ہو، ایک شئے دس آدمیوں کے پاس مل رہی ہے، اگر ایک آدمی زیادہ پیسے وصول کرے گا تو لوگ اس کے پاس جانے کے بجائے دوسرے تاجر کے پاس چلے جائیں گے، لیکن جہاں لوگ مجبور ہوکر ایک ہی سے خریدیں تو وہاں رسد وطلب کی قوتیں مفلوج ہوجاتی ہیں، کام نہیں کرتیں اور اجارہ داریاں قائم ہوجاتی ہیں۔

لہٰذا جب لوگوں کو ہر قسم کے منافع کے حصول کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا تو انہوں نے اجارہ داریاں قائم کرلیں، اور ان اجارہ داریوں کے نتیجے میں بازار کی قوتیں مفلوج ہوگئیں اور چند لوگ سارے سرمایہ کی جھیل پر قابض ہوگئے، جو امیر ہے وہ امیر سے امیر تر ہوتا چلا جارہا ہے اور جو غریب ہے وہ غریب سے غریب تر ہوتا چلا جارہا ہے۔

دنیا کا مہنگا ترین بازار

امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں ایک دنیا کا مہنگا گرین بازار کہلاتا، بیورلے ھلز کے علاقہ میں وہاں مجھے ہمارے کچھ ساتھی لے گئے ایک دوکان دکھائی اور کہا کہ یہ دنیا کی مہنگی ترین دوکانوں میں سے ہے، اس میں دیکھا کہ وہاں موزے ہیں، پہننے کی جرابیں ہیں، معلوم کیا قیمت کیا ہے؟ تو پتہ چلا کہ موزوں کی قیمت دوسو ڈالر ہے، دوسو ڈالر کا مطلب تقریباً بارہ ہزار روپے کے موزے۔ آگے سوٹ لٹکا ہوا تھا، پوچھا یہ کتنے کا ہے؟ معلوم ہوا کہ کوئی سوٹ دس ہزار ڈالر کا ہے کوئی پندرہ ہزار ڈالر کا ہے۔

اس کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ دوکان کا جو نیچے کا طبقہ ہے اس میں تو آپ گھوم پھر کر دیکھ لیں لیکن اوپر کے طبقہ میں اس وقت تک نہیں جاسکتے جب تک مالک آپ کے ساتھ نہ ہو۔

مالک کو ساتھ لے کر اس لئے جاتے ہیں کہ وہ آپ کو مشورہ دے گا کہ آپ کے قد وقامت آپ کی جسامت اور آپ کے رنگ وروپ کے حساب سے فلاں سوٹ آپ کے لئے مناسب ہوگا۔ وہ مشورہ دیتا ہے اور اس مشورہ کے دس ہزار ڈالر وصول کرتا ہے، صرف مشورہ دینے کے دس ہزار ڈالر

اور مشورہ لینے کے لئے بھی پہلے اس سے وقت (اپائنٹمنٹAppointment) لینا پڑتا ہے، اور اگر کوئی آدمی اپائنٹمنٹ لے تو چھ چھ مہینے کے بعد اپائنٹمنٹ ملتا ہے۔

برطانیہ کا شہزادہ چارلس جب امریکہ جانے والا تھا، اس نے جانے سے پہلے اپائنٹمنٹ لیا تو اس کو ایک مہینہ بعد کا اپائنٹمنٹ ملا کہ آپ ایک مہینہ بعد تشریف لائیں تو آپ کو مشورہ دیں گے، تو دس ہزار ڈالر تو صرف مشورہ کے ہیں باقی سوٹ کی قیمت اس کے علاوہ ہے یہ اس دوکان کا حال ہے۔

امیر ترین ملک میں دولت وغربت کا امتزاج

وہاں سے صرف ایک میل کے فاصلے پر پہنچے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ٹرالیاں لئے پھر رہے ہیں ان ٹرالیوں کے اندر کوکا کولا (Cocacola) سیون اپ (7-up) پیپسی کولا (Pepsi Cola) کے خالی ڈبے بھرے ہوئے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو پتہ چلا کہ یہ بیروزگار لوگ ہیں اور یہ ایسا کرتے ہیں کہ شہر میں جو "سلۃ الضوائع" ہوتی ہیں، یعنی کوڑا کرکٹ کی جو ٹوکریاں لگی ہوتی ہیں یہ ان میں سے ڈبے نکال کر علاقے کے کسی کباڑیے کے ہاں فروخت کرتے ہیں اور اسی پر گزارہ کرتے ہیں، ان کا کوئی گھر نہیں ہے، رات کو سڑک کے کنارے ٹرالی کھڑی کر کے اس کے نیچے سو جاتے ہیں۔ اور جب سردی کا موسم آتا ہے اس وقت ان کے پاس سر چھپانے کی جگہ نہیں ہوتی، اس واسطے زیر زمین چلنے والی ٹرین کے اسٹیشنوں پر راتیں گزارتے ہیں۔ تو ایک میل کے فاصلے پر دولت کی ریل پیل اور اس کے ضیاع کا یہ حال ہے اور دوسری طرف غربت کی انتہاء کا یہ حال ہے۔

یہی حال فرانس کے دارالحکومت پیرس کا ہے، وہ فرانس اس وقت تجارت وصنعت وٹیکنالوجی کے اعتبار سے امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہا ہے، اس ملک میں بھی ہزار ہا آدمیوں کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ہے، یہ خرابی درحقیقت اس طریقے سے ہوئی ہے کہ منافع کمانے کے لئے ایسا آزاد چھوڑا کہ جیسا مادر پدر آزاد چھوڑا جاتا ہے، اور اسی سے امیر وغریب کے درمیان دیواریں کھڑی ہوئیں۔ تقسیم دولت کا نظام ناہموار ہوا تو وہاں سرمایہ دارانہ نظام کی پوری تصویر نظر آتی ہے۔ تو یہ فلسفہ تو ٹھیک تھا کہ ذاتی منافع کے لئے لوگ کام کریں لیکن اس طرح بے مہار چھوڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے اجارہ داریاں قائم کرلیں۔

معیشت کے اسلامی احکام

اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ بلاشبہ بازار کی قوتیں بھی درست، انفرادی ملکیت بھی درست،

ذاتی منافع کا محرک بھی درست، لیکن ان سب کو حرام وحلال کا پابند کئے بغیر معاشرہ میں انصاف قائم نہیں ہوسکتا۔ اسلام کا اصل امتیاز یہ ہے کہ اس نے حلال وحرام کی تفریق قائم کی کہ نفع کمانے کا یہ طریقہ حلال ہے اور یہ طریقہ حرام ہے۔

اسلامی نظام نے دو قسم کی پابندیاں عائد کی ہیں:

خدائی پابندیاں

پہلی قسم کو میں خدائی پابندیوں کا نام دیتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں، حلال وحرام کی پابندیاں مثلاً سود حرام ہے، قمار حرام ہے، سٹہ حرام ہے، بیع قبل القبض حرام ہے اور اس کے علاوہ دیگر صورتیں جن کی تفصیلات ان شاء اللہ تعالیٰ بیوع کے اندر آئیں گی وہ حرام ہیں۔ یہ پابندیاں لگادیں اور اگر ان پابندیوں پر غور کیا جائے، تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت یہ پابندیاں عائد فرمائی ہیں اور ایسے ایسے چور دروازوں پر پہرہ بٹھایا ہے جہاں سے سرمایہ دارانہ نظام کی لعنتیں شروع ہوتی ہیں اور اس سے فساد کے دروازے بند کردیئے، یہ خدائی پابندیاں ہیں۔

حکومتی پابندیاں

دوسری قسم کی پابندیاں وہ ہیں کہ بعض مرحلوں پر ایسا ہوتا ہے کہ جو خدائی پابندیاں عائد کی گئی ہیں بعض لوگوں نے ان کی پرواہ نہ کی ہو اور ان کے خلاف کام کیا ہو، یا معاشرہ میں کچھ غیر معمولی قسم کے حالات پیدا کئے جس کے نتیجے میں وہ پابندیاں کافی نہ ہوسکیں تو معاشرے میں توازن برقرار رکھنے کے لئے اسلامی حکومت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ کچھ مباحات پر بھی پابندیاں عائد کردی جائیں تاکہ معاشرہ میں توازن برقرار رہے، یہ حکومتی پابندیاں ہیں۔

اصول فقہ کا ایک حکم امتناعی (سدِّ ذرائع)

اصول فقہ میں "سدِ ذرائع" کے نام سے ایک مستقل باب ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کام فی نفسہٖ جائز ہو لیکن اس کی کثرت کسی معصیت یا مفسدے کا سبب بن رہی ہو تو حکومت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ جائز کام کو بھی وقتی مصلحت کے تابع ہوکر وقتی حکم کے طور پر ممنوع قرار دیدے۔(۱)

اور اس قسم کی پابندیوں کے واجب التعمیل ہونے کا ماخذ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾(۲)

''اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہو''

مثلاً عام حالات میں بازار میں اشیاء کا نرخ مقرر کرنے کے لئے رسد وطلب کی قوتوں کو کام میں لانا چاہئے لیکن جہاں کسی وجہ سے اجارہ داریاں قائم ہوگئی ہوں تو وہاں تسعیر (Control) کی بھی اجازت ہے۔ یعنی حکومت نرخ مقرر کرے اور یہ پابندی لگادے کہ فلاں چیز اس قیمت پر ملے گی، اس سے کم یا زیادہ پر نہیں۔

اس اصول کے تحت حکومت تمام معاشی سرگرمیوں کی نگرانی کرسکتی ہے، اور جن سرگرمیوں سے معیشت میں ناہمواری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ان پر مناسب پابندی عائد کرسکتی ہے۔

''کنز العمال'' میں روایت منقول ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ بازار میں آئے تو دیکھا کہ ایک شخص کوئی چیز اس کے معروف نرخ سے بہت کم داموں میں فروخت کر رہا ہے، آپ نے اس سے فرمایا:

''اِمَّا اَنْ تَزِيْدَ فِى السِّعْرِ وَاِمَّا اَنْ تَرْفَعَ مِنْ سُوْقِنَا''(۳)

''یا تو دام میں اضافہ کرو، ورنہ ہمارے بازار سے اٹھ جاؤ''

روایت میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کس وجہ سے اس پر پابندی لگائی، ہوسکتا ہے کہ وجہ یہ ہو کہ وہ متوازن قیمت سے بہت کم قیمت لگا کر دوسرے تاجروں کے لئے جائز منافع کا راستہ بند کر رہا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پابندی کی وجہ یہ ہو کہ کم قیمت پر مہیا ہونے کی صورت میں لوگ اسے ضرورت سے زیادہ خرید رہے ہوں۔ جس سے اسراف کا دروازہ کھلتا ہو، یا لوگوں کے لئے ذخیرہ اندوزی کی گنجائش نکلتی ہو۔ بہرصورت قابل غور بات یہ ہے کہ اصل شرعی حکم یہ ہے کہ ایک شخص اپنی ملکیت کی چیز جس دام پر چاہے فروخت کرسکتا ہے۔ لہٰذا کم قیمت پر بیچنا فی نفسہ جائز تھا، لیکن کسی اجتماعی مصلحت کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر پابندی عائد کی۔ لہٰذا یہ وہ پابندیاں ہیں جو حکومت عائد کرسکتی ہے۔(۱)

ان دو پابندیوں کے دائرے میں رہتے ہوئے بازار میں جو مقابلہ ہوگا وہ آزاد مقابلہ ہوگا (Free Cometition) آزاد مقابلے کے نتیجے میں واقعۃً رسد وطلب کی قوتیں کام کریں گی اور

(۱) أعلام الموقعين(۲/ ۱٦٠)

(۲) النساء:۵۹

(۳) كنز العمال، باب الاحتكار(٤/ ٦٥)، جامع الأصول من أحاديث الرسول، لابن أثير رقم:٤٣٤(١/ ٤٣٧)، السنن الصغرى للبيهقي، رقم:٢١٠٨(٢/ ١٠٥)، معرفة السنن ... رقم:٣٦٦٨(٩/ ٤٧٦)، مصنف عبد الرزاق، رقم:٤٩٠٥(٨/ ٢٠٧)

اس کے نتیجے میں درست فیصلے ہوں گے۔

تو سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی فلسفہ اگرچہ غلط نہیں تھا لیکن اس پر عمل کرنے کے لئے دو بنیادی اصول مقرر کئے گئے۔

ایک یہ کہ ذاتی منافع کمانے کے لئے لوگوں کو بالکل آزاد چھوڑ دو، دوسرا یہ کہ حکومت کی عدم مداخلت (حکومت بالکل مداخلت نہ کرے) اگرچہ اب سرمایہ دارانہ نظام کے بیشتر ممالک میں حکومت کی عدم مداخلت والے اصول پر عمل نہیں ہے، ہر ملک نے کچھ نہ کچھ پابندیاں لگائی ہوئی ہیں، لیکن چونکہ وہ پابندیاں اپنے دماغ سے گھڑی ہوئی ہیں اس لئے ان کا وہ اثر نہیں ہے جو خدائی پابندیوں کا ہوتا ہے، یہ بنیادی فرق ہے جو اسلام کو سرمایہ دارانہ نظام سے ممتاز کرتا ہے۔

یہ تینوں نظاموں کے مابہ الامتیاز کا خلاصہ ہے، اگر یہ ذہن میں رہے تو کم از کم بنیادی اصول ذہن میں واضح رہیں گے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اشتراکیت نے ۷۴ سال میں دم توڑا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ نظام بذات خود غلط تھا یا خراب تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ پیش آئی کہ جو اصل نظام تھا اس پر عمل میں کوتاہی کی گئی جس کے نتیجے میں وہ تباہ ہوا۔ بعض لوگ اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان ایک عرصہ تک دنیا میں حکمران رہے اور بعد میں ان پر زوال آیا۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے معاذ اللہ کہ اسلام ناکام ہو گیا، تو یہ غلط ہے اس لئے کہ حقیقت میں اسلام ناکام نہیں ہوا بلکہ اسلام کی تعلیمات کو چھوڑنے پر زوال آیا، تو اشتراکیت والے بھی یہ کہتے ہیں کہ جو اصل نظام تھا اس کو چھوڑنے کے نتیجے میں یہ زوال آیا ورنہ فی نفسہ وہ نظام غلط نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات آیا کہ یہ زوال اصل نظام کو چھوڑنے سے آیا یا اصل نظام کو اختیار کرنے کے باوجود آیا، اس کا فیصلہ بڑا آسان ہے۔

اشتراکیت ایک معاشی نظام ہے، سوال یہ ہے کہ اشتراکیت کے جو بنیادی اصول تھے ان کو کس مرحلہ پر اور کہاں چھوڑا گیا تھا؟ اشتراکیت کے دو اصول قومی ملکیت اور منصوبہ بندی یہ کسی دور میں نہیں چھوٹے، چاہے وہ لینن کا دور ہو، اسٹالن کا دور ہو یا گورباچوف کا دور ہو۔ یہ دو اصول ہر جگہ برقرار رہے ہیں کہ ساری پیداوار قومی ملکیت میں اور معیشت کے فیصلے منصوبہ بندی کے ذریعہ طے ہوں۔

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: تکملۃ فتح الملہم (۱/۳۱۰ تا ۳۱۲۲)

اب زوال جو آیا وہ اس بناء پر کہ اس کے نتیجے میں جو ملکی پیداوار گھٹی، پیداوار گھٹنے کے نتیجے میں لوگوں کے اندر بے روزگاری پھیلی اور لوگوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

گورباچوف جو سویت یونین کا آخری سربراہ تھا، اس نے تعمیر نو کے نام سے ایک تحریک چلائی اس کی کتاب بھی چھپی ہوئی ہے، اس نے تھوڑی سی یہ کوشش کی کہ قوم تباہ ہو رہی ہے اور اس تباہی سے بچنے کے لئے تھوڑی سی لچک دکھانے کی کوشش کی کہ لوگوں کو تھوڑا سا تجارت کی طرف لایا جائے تاکہ معاشی سرگرمیوں میں دوبارہ جان پیدا ہو، لیکن اس کو اس کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اس کو بروئے کار لاتا، اگر اصولوں سے انحراف ہوتا تو وہ گورباچوف کے زمانے میں ہوتا کہ جب اس کا اس طرف میلان ہوتا تھا کہ ہم بازار کی قوتوں کو بروئے کار لائیں، لیکن ابھی وہ یہ نہیں کرسکا تھا کہ خود لوگوں نے ہی بغاوت کردی یہاں تک کہ قصہ ہی ختم ہوگیا۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اصل اصولوں کو چھوڑنے کی وجہ سے زوال آیا یہ اس وجہ سے درست نہیں کہ جو بنیادی اصول تھے ان پر وہ اول سے آخر تک کاربند رہے اور انہی کے نتیجے میں جو دیکھا وہ دیکھا۔

رہی یہ بات کہ وہ استبداد کا نظام تھا اور ہم نے جمہوریت لانے کی کوشش کی، ایسا کبھی نہیں ہوا، وہ بھی جمہوریت کا تابعدار تھا، وہ بھی جمہوریت چاہتا تھا، لیکن وہ کہتا تھا کہ جمہوریت یعنی مزدوروں کی قائم کردہ جمہوریت لینن کے دور میں بھی تھی، اسٹالن کے دور میں بھی تھی اور گورباچوف کے دور میں بھی تھی، کسی کے دور میں بھی سیاسی نظام میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، لینن کے دور میں بھی ایک جماعتی نظام تھا جو آخر تک رہا۔

لہٰذا یہ کہنا کہ ہم اپنے اصولوں کو چھوڑنے کے نتیجے میں زوال کا شکار ہوئے ہیں یہ غلط ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اصولوں کو اپناتے رہے اور اسی کے نتیجے میں زوال آیا۔

مخلوط معیشت کا نظام (Mixed Economy)

بعض ممالک میں ایک تصور پیدا ہوا ہے جس کا نام مخلوط معیشت ہے، جس میں ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کی بازار کی قوتوں کو برقرار رکھا گیا ہے اور دوسری طرف اس میں کچھ منصوبہ بندی بھی شامل کی گئی، مثلاً کچھ چیزیں ایسی ہیں جو قومی ملکیت میں ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو آزاد ملکیت میں ہیں۔ جو قومی ملکیت میں ہوتی ہیں ان کو پبلک سیکٹر (Public Sector) کہتے ہیں، مثلاً پانی، بجلی، ٹیلیفون اور ایئر لائنز وغیرہ، ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی ہے کہ یہ سب قومی ملکیت ہیں بعض ذاتی ملکیت (Private Sector)، تو بہت سے ملکوں میں مخلوط معیشت کا نظام چل رہا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا جو بنیادی اصول تھا یعنی عدم مداخلت، اس پر تو اب شاید کوئی بھی سرمایہ دارانہ ملک قائم نہیں رہا، ہر ایک نے کچھ نہ کچھ مداخلت کی ہے، کسی نے کم کسی نے زیادہ، اسی کو مخلوط معیشت (Mixed Economy) کہا جاتا ہے، اور وہ مداخلت اپنی عقل کی بنیاد پر ہے، وہ مداخلت کیا ہے؟ کہ پارلیمنٹ (Parlement) جو پابندی عائد کرے وہ عائد کی جائے گی، یعنی پارلیمنٹ کی اکثریت جس کے حق میں ووٹ دیدے وہ پابندی عائد کردی جائے گی، اور پارلیمنٹ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو خود سرمایہ دار ہیں۔ لہٰذا وہ پابندیاں عائد تو ضرور کرتے ہیں لیکن وہ پابندیاں متعصبانہ ہوتی ہیں اور کوئی غیر جانبدار نہ پابندی عائد نہیں ہوتی، اور اس کے نتیجے میں جو خرابیاں اور ناہمواریاں ہوتی ہیں وہ برقرار رہتی ہیں۔ کسی خدائی پابندی کو تسلیم نہیں کیا گیا جو انسانی سوچ سے ماوراء ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی عقل محدود ہے اور اس کے تحت پابندی عائد کی گئی ان میں سے خرابیاں زائل نہیں کیں۔

اگر خدائی پابندی کو تسلیم نہیں کیا جائے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کو جب تک تسلیم نہیں کیا جائے گا تو اس وقت تک افراط وتفریط میں مبتلا رہیں گے، اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کو تسلیم کر کے اس کے تحت کاروبار کو چلایا جائے۔(۱)

یہ مختصر سا خلاصہ ہے جس میں تینوں نظاموں کا فرق بتایا گیا ہے اور آجکل کی معاشیات کے متعلق کتابیں لمبی چوڑی ہوتی ہیں اور ان سے خلاصہ نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن ہزار ہا صفحات کی ورق گردانی کے نتیجے میں جو خلاصہ اور مغز حاصل ہوتا ہے وہ میں نے آپ کو ان تقریروں میں عرض کردیا ہے، جس سے کم از کم کچھ تھوڑے سے بنیادی معالم تینوں نظاموں کے سمجھ میں آجائیں، باقی تفصیل مختلف ابواب واحادیث کے ماتحت آجائے گی، اپنے اپنے مقام پر بیان ہوگا۔ اس کے اندر اور زیادہ وضاحت وتفصیل کے ساتھ ذکر ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

☆☆☆

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: تکملة فتح الملهم (۱/ ۳۱۰تا۳۱۳)

سودی نظام کی خرابیاں اور اس کا متبادل ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾(۱)

میرے محترم بھائیو اور بہنو! آج کی اس نشست کے لئے جو موضوع تجویز کیا گیا ہے وہ ''ربا'' سے متعلق ہے۔ جس کو اردو میں ''سود'' اور انگریزی میں Usury یا Interest کہا جاتا ہے، اور غالباً اس موضوع کو اختیار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یوں تو ساری دنیا میں اس وقت سود کا نظام چلا ہوا ہے۔ لیکن بالخصوص مغربی دنیا میں جہاں آپ حضرات قیام پذیر ہیں وہاں بیشتر معاشی سرگرمیاں سود کی بنیاد پر چل رہی ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو قدم قدم پر یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ وہ کس طرح معاملات کریں اور سود سے کس طرح چھٹکارا حاصل کریں۔ اور آج کل مختلف قسم کی غلط فہمیاں بھی لوگوں کے درمیان پھیلائی جارہی ہیں، کہ آج کل معاشی زندگی میں جو Intersest چل رہا ہے وہ در حقیقت حرام نہیں ہے اس لئے کہ یہ اس ''ربا'' کی تعریف میں داخل نہیں ہوتا جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا تھا۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے اس وقت یہ موضوع دیا گیا ہے کہ میں Interset کے موضوع پر جو بنیادی معلومات ہیں وہ قرآن وسنت اور موجودہ حالات کی روشنی میں آپ کے سامنے پیش کروں۔

سودی معاملہ کرنے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ

سب سے پہلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ ''سود'' کو قرآن کریم نے اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ شاید کسی اور گناہ کو اتنا بڑا گناہ قرار نہیں دیا۔ مثلاً شراب نوشی، خنزیر کھانا، زنا کاری، بدکاری وغیرہ کے لئے قرآن کریم میں وہ الفاظ استعمال نہیں کیے گئے جو ''سود'' کے لئے استعمال کئے گئے ہیں

☆ اصلاحی خطبات (۷/۱۴۷ تا ۱۷۰) ۲۴ اپریل ۱۹۹۲ء، جامع مسجد اور لینڈو، فلوریڈا، امریکہ۔

(۱) البقرة: ۲۷٦

چنانچہ فرمایا:

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِه﴾(۱)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور ''سود'' کا جو حصہ بھی رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو اگر تمہارے اندر ایمان ہے، اگر تم ''سود'' کو نہیں چھوڑو گے، یعنی سود کے معاملات کرتے رہو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو''

یعنی ان کے لئے اللہ کی طرف سے لڑائی کا اعلان ہے، یہ اعلان جنگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بھی گناہ پر نہیں کیا گیا۔ چنانچہ جو لوگ شراب پیتے ہیں، ان کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا کہ ان کے خلاف اعلان جنگ ہے یا جو خنزیر کھاتے ہیں ان کے خلاف اعلان جنگ ہے، اور نہ یہ کہا گیا کہ جو ''زنا'' کرتے ہیں ان کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ لیکن ''سود'' کے بارے میں فرمایا کہ جو لوگ سود کے معاملات کو نہیں چھوڑتے ان کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے اتنی سخت اور سنگین وعید اس پر وارد ہوئی ہے اب سوال یہ ہے کہ اس پر اتنی سنگین اور سخت وعید کیوں ہے؟ اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے معلوم ہو جائے گی۔

سود کس کو کہتے ہیں؟

لیکن اس سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ''سود'' کس کو کہتے ہیں؟ ''سود'' کیا چیز ہے اس کی تعریف کیا ہے؟ جس وقت قرآن کریم نے ''سود'' کو حرام قرار دیا اس وقت اہل عرب میں ''سود'' کا لین دین متعارف اور مشہور تھا۔ اور اس وقت ''سود'' اسے کہا جاتا تھا کہ کسی شخص کو دیئے ہوئے قرض پر طے کر کے کسی بھی قسم کی زیادہ رقم کا مطالبہ کیا جائے اسے ''سود'' کہا جاتا تھا۔ مثلاً میں نے آج ایک شخص کو سو روپے بطور قرض دیئے۔ اور میں اس سے کہوں کہ میں ایک مہینے کے بعد یہ رقم واپس لوں گا اور تم مجھے ایک سو دو روپے واپس کرنا اور یہ پہلے سے میں نے طے کر دیا کہ ایک ماہ بعد ایک سو دو روپے واپس لوں گا۔ تو یہ ''سود'' ہے۔

معاہدہ کے بغیر زیادہ دینا سود نہیں

پہلے سے طے کرنے کی شرط اس لئے لگائی کہ اگر پہلے سے کچھ طے نہیں کیا ہے، مثلاً میں نے

(۱) البقرة:۲۷۶

کسی کو سو روپے قرض دے دیئے۔ اور میں نے اس سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ تم مجھے ایک سو دو روپے واپس کرو گے۔ لیکن واپسی کے وقت اس نے اپنی خوشی سے مجھے ایک سو دو روپے دے دیئے۔ اور ہمارے درمیان یہ ایک سو دو روپے واپس کرنے کی بات طے شدہ نہیں تھی، تو یہ سود نہیں ہے اور حرام نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔

قرض کی واپسی کی عمدہ شکل

خود حضور ﷺ سے ثابت ہے کہ جب آپ کسی کے مقروض ہوتے تو وہ قرض خواہ قرض کا مطالبہ کرتا تو آپ وہ قرض کچھ زیادتی کے ساتھ بڑھتا ہوا واپس فرماتے، تاکہ اس کی دلجوئی ہو جائے، لیکن یہ زیادتی چونکہ پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی تھی اس لئے وہ "سود" نہیں ہوتی تھی، اور حدیث کی اصطلاح میں اس کو "حسن القضاء" کہا جاتا ہے، یعنی اچھے طریقے سے قرض کی ادائیگی کرنا، اور ادائیگی کے وقت اچھا معاملہ کرنا، اور کچھ زیادہ دے دینا یہ "سود" نہیں ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ نے یہاں تک فرمایا:

((اِنَّ خِیَارَکُمْ اَحْسَنُکُمْ قَضَاءً))(۱)

یعنی تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرض کی ادائیگی میں اچھا معاملہ کرنے والے ہوں، لیکن اگر کوئی شخص قرض دیتے وقت یہ طے کر لے کہ میں جب واپس لوں گا تو زیادتی کے ساتھ لوں گا، اس کو "سود" کہتے ہیں۔ اور قرآن کریم نے اسی کو سخت اور سنگین الفاظ کے ساتھ حرام قرار دیا، اور سورہ بقرہ کے تقریباً پورے دو رکوع اس "سود" کی حرمت پر نازل ہوئے ہیں۔

قرآن کریم نے کس "سود" کو حرام قرار دیا؟

بعض اوقات ہمارے معاشرے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جس "سود" کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا تھا، وہ درحقیقت یہ تھا کہ اس زمانے میں قرض لینے والا غریب ہوتا تھا، اور اس کے پاس روٹی اور کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے تھے اگر وہ بیمار ہے تو اس کے پاس علاج کے لئے پیسے نہیں ہوتے تھے، اگر گھر میں کوئی میت ہوگئی ہے تو اس کے پاس اس کو کفنانے اور دفنانے کے پیسے نہیں ہوتے

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب فی الاستقراض واداء الدیون والحجر والتفلیس، باب حسن القضاء، رقم: ۲۲۱۸، سنن النسائی، کتاب البیوع، باب استسلاف الحیوان واستقراضه، رقم: ۴۵۳۹، مسند أحمد، رقم: ۸۷۴۳

تھے، ایسے موقع پر وہ غریب بیچارہ کسی سے پیسے مانگتا تو وہ قرض دینے والا اس سے کہتا کہ میں اس وقت تک قرض نہیں دوں گا جب تک تم مجھے اتنا فیصد زیادہ واپس نہیں دو گے، تو چونکہ یہ ایک انسانیت کے خلاف بات تھی کہ ایک شخص کو ایک ذاتی ضرورت ہے اور وہ بھوکا اور ننگا ہے ایسی حالت میں اس کو سود کے بغیر پیسے فراہم نہ کرنا ظلم اور زیادتی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا، اور سود لینے والے خلاف اعلان جنگ کیا۔

لیکن ہمارے دور میں اور خاص طور پر بینکوں میں جو سود کے ساتھ روپے کا لین دین ہوتا ہے اس میں قرض لینے والا کوئی غریب اور فقیر نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات وہ بڑا دولت مند اور سرمایہ دار ہوتا ہے اور وہ قرض اس لئے نہیں لیتا کہ اس کے پاس کھانے کو نہیں ہے، یا اس کے پاس پہننے کے لئے کپڑا نہیں ہے، یا وہ کسی بیمارے کے علاج کے لئے قرض نہیں لے رہا ہے، بلکہ وہ اس لئے قرض لے رہا ہے تا کہ ان پیسوں کو اپنی تجارت اور کاروبار میں لگائے اور اس سے نفع کمائے۔ اب اگر قرض دینے والا شخص یہ کہے کہ تم میرے پیسے اپنے کاروبار میں لگاؤ گے اور نفع کماؤ گے تو اس نفع کا دس فیصد بطور نفع کے مجھے دو۔ تو اس میں کیا قباحت اور برائی ہے؟ اور یہ وہ "سود" نہیں ہے جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، یہ اعتراض دنیا کے مختلف خطوں میں اٹھایا جاتا ہے۔

تجارتی قرض (Commercial Loan) ابتدائی زمانے میں بھی تھے

ایک اعتراض یہ اٹھایا ہے کہ یہ کاروباری سود (Commercial Interset) اور یہ تجارتی قرض (Commerical Loan) حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں نہیں تھے، بلکہ اس زمانے میں ذاتی اخراجات اور ذاتی استعمال کے لئے قرضے لئے جاتے تھے، لہٰذا قرآن کریم اس کو کیسے حرام قرار دے سکتا ہے جس کا اس زمانے میں وجود ہی نہیں تھا۔ اس لئے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے جس "سود" کو حرام قرار دیا ہے وہ غریبوں اور فقیروں والا "سود" تھا، اور یہ کاروباری سود حرام نہیں ہے۔

صورت بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی چیز کے حرام ہونے کے لئے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ وہ اس خاص صورت میں حضور ﷺ کے زمانے میں بھی پائی جائے اور حضور ﷺ کے زمانے میں اس انداز سے اس کا وجود بھی ہو۔ قرآن کریم جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی ایک حقیقت اس کے

سامنے ہوتی ہے اور اس حقیقت کو وہ حرام قرار دیتا ہے، چاہے اس کی کوئی خاص صورت حضور ﷺ کے زمانے میں موجود ہو یا نہ ہو اس کی مثال یوں سمجھئے کہ قرآن کریم نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ اور شراب کی حقیقت یہ ہے کہ ایسا مشروب جس میں نشہ ہو اب آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ صاحب! آجکل کی یہ وہسکی (Whisky) بیئر (Beer) اور برانڈی (Brandy) حضور ﷺ کے زمانے میں تو پائی نہیں جاتی تھی، لہٰذا یہ حرام نہیں ہے۔ تو یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں اگرچہ یہ اس خاص شکل میں موجود نہیں تھی، لیکن اس کی حقیقت یعنی ''ایسا مشروب جو نشہ آور ہو'' موجود تھی اور آنحضرت ﷺ نے اس کو حرار قرار دے دیا تھا، لہٰذا اب وہ ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی، اب چاہے شراب کی نئی شکل آجائے، اور اس کا نام چاہے وہسکی (Whisky) رکھ دیا جائے یا برانڈی رکھ لو یا بیئر رکھ لو یا کوک (Coke) رکھ لو، نشہ آور مشروب ہر شکل اور ہر نام کے ساتھ حرام ہے۔

اس لئے یہ کہنا کہ ''کمرشل لون'' چونکہ اس زمانے میں نہیں تھے بلکہ آج پیدا ہوئے ہیں اس لئے حرام نہیں ہیں، یہ خیال درست نہیں۔

ایک لطیفہ

ایک لطیفہ یاد آیا ہندوستان کے اندر ایک گویا (گانے والا) تھا، وہ ایک مرتبہ حج کرنے چلا گیا، حج کے بعد وہ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ جا رہا تھا کہ راستے میں ایک منزل پر اس نے قیام کیا اس زمانے میں مختلف منزلیں ہوتی تھیں، لوگ ان منزلوں پر رات گزارتے اور اگلے دن صبح آگے کا سفر کرتے، اس لئے گویے نے راستے میں ایک منزل پر رات گزارنے کے لئے قیام کیا اور اس منزل پر ایک عرب گویا بھی آگیا، اور اس نے وہاں بیٹھ کر عربی میں گانا بجانا شروع کر دیا، عرب گویے کی آواز بھدی اور خراب تھی، کریہہ الصوت تھا، اب ہندوستانی گویے کو اس کی آواز بہت بری لگی، اور اس نے اٹھ کر کہا کہ آج یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ حضور ﷺ نے گانا بجانا کیوں حرار قرار دیا تھا اس لئے کہ آپ ﷺ نے ان بدوؤں کا گانا سنا تھا اس لئے حرام قرار دے دیا اگر آپ میرا گانا سن لیتے تو آپ ﷺ گانا بجانا حرام قرار نہ دیتے۔

آج کل کا مزاج

آجکل یہ مزاج بن گیا ہے کہ ہر چیز کے بارے میں لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! حضور ﷺ

کے زمانے میں یہ عمل اس طرح ہوتا تھا، اس لئے آپ ﷺ نے اس کو حرام قرار دے دیا۔ آج چونکہ یہ عمل اس طرح نہیں ہو رہا ہے لہٰذا وہ حرام نہیں ہے کہنے والے یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ خنزیروں کو اس لئے حرام قرار دیا گیا تھا کہ وہ گندے ماحول میں پڑے رہتے تھے غلاظت کھاتے تھے گندے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی تھی اب تو بہت صاف ستھرے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے اور ان کے لئے اعلیٰ درجے کے فارم قائم کر دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا اب ان کو حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

شریعت کا ایک اصول

یاد رکھئے! قرآن کریم جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی ایک حقیقت ہوتی ہے اس کی صورتیں چاہے کتنی بدل جائیں اور اس کو بنانے اور تیار کرنے کے طریقے چاہے کتنے بدلتے رہیں، لیکن اس کی حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے، اور وہ حقیقت حرام ہوتی ہے یہ شریعت کا اصول ہے۔

زمانہ نبوت کے بارے میں ایک غلط فہمی

پھر یہ کہنا بھی درست نہیں کہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں تجارتی قرضوں (Commercial Loan) کا رواج نہیں تھا۔ اور سارے قرضے صرف ذاتی ضرورت کے لئے لئے جاتے تھے اس موضوع پر میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے ''مسئلہ سود'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس کا دوسرا حصہ میں نے لکھا ہے۔ اس حصہ میں میں نے کچھ مثالیں پیش کی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کے زمانے میں بھی تجارتی قرضوں کا لین دین ہوتا تھا۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ عرب صحرا نشین تھے تو اس کے ساتھ ہی لوگوں کے ذہن میں یہ تصور آتا ہے کہ وہ معاشرہ جس میں حضور ﷺ تشریف لائے تھے، وہ ایسا سادہ اور معمولی معاشرہ ہوگا جس میں تجارت وغیرہ تو ہوتی نہیں ہوگی اور اگر تجارت ہوتی بھی ہوگی تو صرف گندم اور جو وغیرہ کی ہوتی ہوگی، اور وہ بھی دس بیس روپے سے زیادہ کی نہیں ہوگی اس کے علاوہ کوئی بڑی تجارت نہیں ہوتی ہوگی عام طور پر ذہن میں یہ تصور بیٹھا ہوا ہے۔

ہر قبیلہ جائنٹ اسٹاک کمپنی ہوتا تھا

لیکن یاد رکھئے یہ بات درست نہیں عرب کا وہ معاشرہ جس میں حضور ﷺ تشریف لائے

اس میں بھی آج کی جدید تجارت کی تقریباً ساری بنیادیں موجود تھیں، مثلاً آج کل ''جائنٹ اسٹاک کمپنیاں'' ہیں۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ چودھویں صدی کی پیداوار ہے اس سے پہلے ''جائنٹ اسٹاک کمپنی'' کا تصور نہیں تھا، لیکن جب ہم عرب کی تاریخ پڑھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ عرب کا ہر قبیلہ ایک مستقل ''جائنٹ اسٹاک کمپنی'' ہوتا تھا اس لئے کہ ہر قبیلے میں تجارت کا طریقہ یہ تھا کہ قبیلہ کے تمام آدمی ایک روپیہ دو روپیہ لاکر ایک جگہ جمع کرتے اور وہ رقم ''شام'' بھیج کر وہاں سے سامان تجارت منگواتے آپ نے تجارتی قافلوں (Commercial Caravan) کا نام سنا ہوگا۔ وہ ''کاروان'' یہی ہوتے تھے کہ سارے قبیلے نے ایک ایک روپیہ جمع کر کے دوسری جگہ بھیجا اور وہاں سے سامان تجارت منگوا کر یہاں فروخت کر دیا چنانچہ قرآن کریم میں یہ جو فرمایا:

﴿لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ o اِیْلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ o﴾ (۱)

وہ بھی اسی بناء پر کہ یہ عرب کے لوگ سردیوں میں یمن کی طرف سفر کرتے تھے اور گرمیوں میں شام کی طرف سفر کرتے تھے اور گرمیوں اور سردیوں کے یہ سفر محض تجارت کے لئے ہوتے تھے یہاں سے سامان لے جا کر وہاں اور وہاں سے سامان لا کر یہاں بیچ دیتے، اور بعض اوقات ایک ایک آدمی اپنے قبیلے سے دس لاکھ دینار قرض لیتا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس لئے قرض لیتا تھا کہ اس کے گھر میں کھانے کو نہیں تھا؟ یا اس کے پاس میت کو کفن دینے کے لئے کپڑا نہیں تھا؟ ظاہر ہے کہ جب وہ اتنا بڑا قرض لیتا تھا تو وہ کسی کمرشل مقصد کے لئے لیتا تھا۔

سب سے پہلے چھوڑا جانے والا سود

جب حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سود کی حرمت کا اعلان فرمایا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

((وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ فَاِنَّهُ مَوْضُوْعٌ كُلُّهُ)) (۲)

''یعنی (آج کے دن) جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ ہمارے چچا حضرت عباس کا سود ہے، وہ سب کا سب ختم کر دیا گیا''

(۱) القریش: ۱۔۲

(۲) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجة النبی، رقم: ۲۱۳۷، سنن ابی داود، کتاب المناسك، باب صفة حجة النبی رقم: ۱٦۲۸، سنن ابن ماجه، کتاب المناسك، باب الخطبة یوم النحر، رقم: ۳۰٤٦، سنن الدارمی کتاب المناسك، باب فی سنة الحج، رقم: ۱۷۷٤

چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ لوگوں کو سود پر قرض دیا کرتے تھے، اس لئے آپ نے فرمایا کہ آج کے دن میں ان کا سود جو دوسرے لوگوں کے ذمے ہیں وہ ختم کرتا ہوں اور روایات میں آتا ہے کہ وہ دس ہزار مثقال سونا تھا، اور تقریباً 4 ماشے کا ایک مثقال ہوتا ہے، اور یہ دس ہزار مثقال کوئی سرمایہ (Principal) نہیں تھا۔ بلکہ یہ سود تھا جو لوگوں کے ذمے اصل رقوم پر واجب ہوا تھا۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ وہ قرض جس پر دس ہزار سود لگ گیا ہو، کیا وہ قرض صرف کھانے کی ضرورت کے لئے لیا گیا تھا؟ ظاہر ہے کہ وہ قرض تجارت کے لئے لیا گیا ہوگا۔

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں بینکاری کی ایک مثال

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، انہوں نے اپنے پاس بالکل ایسا نظام قائم کیا ہوا تھا جیسے آجکل بینکنگ کا نظام ہوتا ہے، لوگ جب ان کے پاس اپنی امانتیں لاکر رکھواتے تو یہ ان سے کہتے کہ میں یہ امانت کی رقوم بطور قرض لیتا ہوں یہ رقم میرے ذمے قرض ہے، اور پھر آپ اس رقم کو تجارت میں لگاتے، چنانچہ جس وقت آپ کا انتقال ہوا تو اس وقت جو قرض ان کے ذمہ تھا، اس کے بارے میں ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"فَحَسِبْتُ مَا عَلَيْهِ مِنَ الدَّيْنِ فَوَجَدْتُهُ أَلْفَيْ أَلْفٍ وَمِائَتَيْ أَلْفٍ"(۱)

''یعنی میں نے ان کے ذمہ واجب الاداء قرضوں کا حساب لگایا تو وہ بائیس لاکھ دینار نکلے''

لہٰذا یہ کہنا کہ اس زمانے میں تجارتی قرض نہیں ہوتے تھے، یہ بالکل خلاف واقعہ بات ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تجارتی قرض بھی ہوتے تھے، اور اس پر ''سود'' کا لین دین بھی ہوتا تھا، اور قرآن کریم نے ہر قرض پر جو بھی زیادتی وصول کی جائے اس کو حرام قرار دیا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ کمرشل لون پر انٹرسٹ لینا جائز ہے اور ذاتی قرضوں پر انٹرسٹ لینا جائز نہیں، یہ بالکل غلط ہے۔

سود مرکب اور سود مفرد دونوں حرام ہیں

اس کے علاوہ ایک اور غلط فہمی پھیلائی جا رہی ہے، وہ یہ کہ ایک سود مفرد (Simple

(۱) صحيح البخاري، كتاب فرض الخمس، باب بركة الغازي في ماله حيا وميتا مع النبي وولاة الأمر، رقم: ۲۸۹۷، شرح ابن بطال، رقم: ۳۱۲۹ (۹/۳۶۳)، حلية الأولياء (۱/۹۱)، السنن الكبرى للبيهقي (۶/۲۸۶)، الطبقات لابن سعد (۳/۱۹)

Interest) ہوتا ہے اور ایک سود مرکب (Compound Interset) ہوتا ہے، یعنی سود پر بھی سود لگتا چلا جائے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مرکب سود ہوتا تھا اور قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا ہے لہٰذا وہ تو حرام ہے، لیکن سود مفرد جائز ہے، اس لئے کہ وہ اس زمانے میں نہیں تھا اور نہ ہی قرآن نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ابھی قرآن کریم کی جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی اس میں فرمایا:

﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا﴾(۱)

''یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور ربا کو جو حصہ بھی رہ گیا ہو، اس کو چھوڑ دو''

یعنی اس کے کم یا زیادہ ہونے کا کوئی سوال نہیں یا Rate of Interest کے کم یا زیادہ ہونے کی بحث نہیں جو کچھ بھی ہو اس کو چھوڑ دو۔ اور اس کے بعد آگے فرمایا:

﴿وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ﴾(۲)

یعنی اگر تم ربا سے توبہ کرلو تو پھر تمہارا جو راس المال (Principal) ہے وہ تمہارا حق ہے اور خود قرآن کریم نے واضح طور پر فرمادیا کہ Principal تو تمہارا حق ہے لیکن اس کے علاوہ تھوڑی سی زیادتی بھی ناجائز ہے لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سود مرکب حرام ہے اور سود مفرد حرام نہیں، بلکہ سود کم ہو یا زیادہ سب حرام ہے اور قرض لینے والا غریب ہو تب بھی حرام ہے اور قرض لینے والا امیر اور مالدار ہو تب بھی حرام ہے، اگر کوئی شخص ذاتی ضرورت کے لئے قرض لے رہا ہو تو بھی حرام ہے اور اگر تجارت کے لئے قرض لے رہا ہو تو بھی حرام ہے اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

موجودہ بینکنگ انٹرسٹ بالاتفاق حرام ہے

یہاں یہ بات بھی عرض کردوں کہ تقریباً 60,50 سال تک عالم اسلام میں بینکنگ انٹرسٹ (Banking Interest) کے بارے میں سوالات اٹھائے جاتے رہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ Compound Interest حرام ہے۔ Simple Interest نہیں ہے یا یہ کہنا کہ Commercial Loan حرام نہیں ہے وغیرہ۔ یہ اشکالات اور اعتراضات عالم اسلام میں تقریباً 50 سال تک ہوتے رہے ہیں لیکن اب یہ بحث ختم ہوگئی ہے، اب ساری دنیا کے نہ صرف علماء بلکہ ماہرین معاشیات اور مسلم بینکرز بھی اس بات پر متفق ہیں کہ بینکنگ انٹرسٹ بھی اسی طرح حرام ہے، جس طرح عام قرض کے لین دین پر سود حرام ہوتا ہے اور اب اس پر اجماع ہو چکا ہے کسی

(۱) البقرة:۲۷۸ (۲) البقرة:۲۷۹

قابل ذکر شخص کا اس میں اختلاف نہیں اس کے بارے میں آخری فیصلہ آج سے تقریباً 4 سال پہلے جدہ میں مجمع الفقہ الاسلامی (Islamic Fiqh Academy) جس میں تقریباً 45 مسلم ملکوں کے سرکردہ علماء کا اجتماع ہوا، اور جس میں، میں بھی شامل تھا۔ اور ان تمام ملکوں کے تقریباً 200 علماء نے بالاتفاق یہ فتویٰ دیا کہ بینکنگ انٹرسٹ بالکل حرام ہے، اور اس کے جائز ہونے کا کوئی راستہ نہیں لہٰذا یہ مسئلہ تو اب ختم ہو چکا ہے کہ حرام ہے یا نہیں؟

کمرشل لون پر انٹرسٹ میں کیا خرابی ہے؟

اب ایک بات باقی رہ گئی ہے اس کو بھی سمجھ لینا چاہئے، وہ یہ کہ شروع میں جیسا کہ عرض کیا تھا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں صرف ذاتی ضرورت کے لئے قرضے لئے جاتے تھے، اب اگر ایک شخص ذاتی ضرورت کے لئے قرض لے رہا ہے مثلاً اس کے پاس کھانے کو روٹی نہیں ہے یا میت کو دفنانے کے لئے کفن نہیں ہے اس کے لئے وہ قرض لے رہا ہے اور آپ اس سے سود کا مطالبہ کر رہے ہیں یہ تو ایک غیر انسانی حرکت اور ناانصافی کی بات ہے، لیکن جو شخص میرے پیسے کو تجارت میں لگا کر نفع کمائے گا اگر میں نفع میں اس سے تھوڑا حصہ لے لوں گا تو اس میں کیا خرابی ہے؟

آپ کو نقصان کا خطرہ (Risk) بھی برداشت کرنا ہوگا

پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک مسلمان کو اللہ کے کسی حکم میں چوں چراں کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے، اگر کسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا، وہ حرام ہوگئی لیکن زیادہ اطمینان کے لئے یہ بات عرض کرتا ہوں تاکہ یہ بات اچھی طرح دل میں اتر جائے وہ یہ کہ اگر آپ کسی شخص کو قرض دے رہے ہیں تو اس کے بارے میں اسلام یہ کہتا ہے کہ دو باتوں میں سے ایک بات متعین کر لو، کیا تم اس کی کچھ امداد کرنا چاہتے ہو؟ یا اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہو؟ اگر قرض کے ذریعہ اس کی امداد کرنا چاہتے ہو تو وہ پھر آپ کی طرف سے صرف امداد ہی ہوگی۔ پھر آپ کو اس قرض پر زیادتی کے مطالبے کا کوئی حق نہیں، اور اگر اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہو تو پھر جس طرح نفع میں حصہ دار بنو گے اسی طرح نقصان میں بھی اس کے حصہ دار بننا ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم صرف نفع میں حصہ دار بن جاؤ، نفع ہو تو تمہارا، اور اگر نقصان ہو تو وہ اس کا، لہٰذا جس صورت میں آپ اس کو کاروبار کے لئے پیسے دے رہے ہیں تو پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ کاروبار میں نقصان کا خطرہ (Risk) تو وہ برداشت کرے اور نفع آپ کو مل جائے بلکہ اس صورت میں آپ اس کو قرض نہ دیں بلکہ اس کے ساتھ ایک جوئنٹ

انٹر پرائز (Joint Enterprise) کیجئے۔ یعنی اس سے معاہدہ کریں کہ جس کاروبار کے لئے تم قرض لے رہے ہو، اس میں اتنا فیصد نفع میرا ہوگا، اور اتنا تمہارا ہوگا۔ اگر اس کاروبار میں نقصان ہوگا تو وہ نقصان بھی اسی نفع کے تناسب سے ہوگا لیکن یہ بالکل درست نہیں ہے کہ آپ تو اس سے یہ کہیں کہ اس قرض پر 15 فیصد نفع آپ سے لوں گا۔ چاہے تمہیں کاروبار میں نفع ہو، یا نقصان ہو، یہ بالکل حرام ہے اور سود ہے۔

آج کل کے انٹرسٹ کے نظام کی خرابی

آج کل انٹرسٹ (Interest) کا جو نظام رائج ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اوقات قرض لینے والے کو نقصان ہو گیا، تو اس صورت میں قرض دینے والا فائدہ میں رہا، اور قرض لینے والا نقصان میں رہا، اور بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ قرض لینے والے نے زیادہ شرح سے نفع کمایا اور قرض دینے والے کو اس نے معمولی شرح سے نفع دیا۔ اب قرض دینے والا نقصان میں رہا۔ اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھئے۔

ڈیپازیٹر ہر حال میں نقصان میں ہے

مثلاً ایک شخص ایک کروڑ روپیہ قرض لے کر اس سے تجارت شروع کرتا ہے، اب وہ ایک کروڑ روپیہ کہاں سے اس کے پاس آیا؟ وہ ایک کروڑ روپیہ کس کا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ روپیہ اس نے بینک سے لیا۔ اور بینک کے پاس وہ روپیہ ڈیپازیٹرس کا ہے۔ گویا کہ وہ ایک کروڑ روپیہ پوری قوم کا ہے۔ اور اب اس نے قوم کے اس ایک کروڑ روپے سے تجارت شروع کی اور اس تجارت کے اندر اس کو سو فیصد نفع ہوا، اور اب اس کے پاس دو کروڑ ہو گئے، جس میں سے 15 فیصد یعنی 15 لاکھ روپے اس نے بینک کو دیئے۔ اور پھر بینک نے اس میں سے اپنا کمیشن اور اپنے اخراجات نکال کر باقی 7 فیصد یا دس فیصد کھاتہ دار (Depoditors) کو دے دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کا پیسہ تجارت میں لگا تھا، جس سے اتنا نفع ہوا ان کو تو سو روپے پر صرف دس روپے نفع ملا، اور یہ بیچارہ ڈیپازیٹر بڑا خوش ہے کہ میرے سو روپے اب ایک سو دس ہو گئے۔ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ حقیقت میں اس کے پیسوں سے جو نفع کمایا گیا اس کے لحاظ سے ایک سو کے دو سو ہونے چاہئے تھے، اور پھر دوسری طرف یہ دس روپے جو نفع اس کو ملا، قرض لینے والا اس کو دوبارہ اس سے واپس وصول کر لیتا ہے، وہ کس طرح واپس وصول کرتا ہے؟

سود کی رقم مصارف میں شامل ہوتی ہے

وہ اس طرح وصول کرتا ہے کہ قرض لینے والا ان دس روپوں کو پیداواری اخراجات اور مصارف (Cost of Production) میں شامل کرلیتا ہے، مثلاً فرض کرو کہ اس نے ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر کوئی فیکٹری لگائی، یا کوئی چیز تیار کی تو تیاری کے مصارف (Cost) میں 15 فیصد بھی شامل کردیئے جو اس نے بینک کو ادا کیے۔ لہٰذا جب وہ پندرہ فیصد بھی شامل ہوگئے تو اب وہ چیز تیار (Producer) ہوگی، اس کی قیمت پندرہ فیصد بڑھ جائے گی۔ مثلاً اس نے کپڑا تیار کیا تھا، تو اب انٹرسٹ کی وجہ سے اس کپڑے کی قیمت پندرہ فیصد بڑھ گئی، لہٰذا ڈیپازیٹر جس کو ایک سو کے ایک سو دس روپے ملے تھے، جب بازار سے کپڑا خریدے گا تو اس کو اس کپڑے کی قیمت پندرہ فیصد زیادہ دینی ہوگی۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ ڈیپازیٹر کو جو دس فیصد منافع دیا گیا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے اس سے زیادہ کرکے پندرہ فیصد وصول کرلیا گیا۔ یہ تو خوب نفع کا سودا ہوا، وہ ڈیپازیٹر خوش ہے کہ مجھے سو روپے کے ایک سو دس روپے مل گئے۔ لیکن حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو اس کو سو روپے کے بدلے 95 روپے ملے۔ اس لئے کہ وہ پندرہ فیصد کپڑے کی کوسٹ میں چلے گئے اور دوسری طرف 85 فیصد منافع اس قرض لینے والے کی جیب میں چلے گئے۔

شرکت کا فائدہ

اور اگر شرکت پر معاملہ ہوتا، اور یہ طے پاتا کہ مثلاً 50 فیصد نفع سرمایہ لگانے والے (Financier) کا ہوگا۔ اور 50 فیصد کام کرنے والے تاجر کا ہوگا۔ تو اس صورت میں عوام کو 15 فیصد کے بجائے 50 فیصد نفع ملتا اور اس صورت میں یہ 50 فیصد اس چیز کی لاگت (Cost) میں بھی شامل نہ ہوتا اس لئے کہ نفع تو اس پیداوار کی فروخت کے بعد سامنے آئے گا، اور پھر اس کو تقسیم کیا جائے گا۔ اس لئے کہ سود (Interest) تو لاگت (Cost) میں شامل کیا جاتا ہے، لیکن نفع (Profit) لاگت (Cost) میں شامل نہیں کیا جاتا، تو یہ صورت اجتماعی نفع کی تھی۔

نفع کسی کا اور نقصان کسی اور کا

اور اگر فرض کرو کہ ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر جو تجارت کی اس تجارت میں اس کو نقصان ہوگیا وہ بینک اس نقصان کے نتیجے میں دیوالیہ ہوگیا، اب اس بینک کے دیوالیہ ہونے کے نتیجے

میں کس کا روپیہ گیا؟ ظاہر ہے کہ عوام کا گیا۔ تو اس نظام میں نقصان ہونے کی صورت میں سارا نقصان عوام پر ہے۔ اور اگر نفع ہے تو سارا کا سارا قرض لینے والے کا۔

بیمہ کمپنی سے کون فائدہ اٹھا رہا ہے

قرض لینے والے تاجر کا اگر نقصان ہو جائے تو اس نے اس نقصان کی تلافی کے لئے ایک اور راستہ تلاش کر لیا ہے، وہ ہے انشورنس (Insurance) مثلاً فرض کرو کہ روئی کے گودام میں آگ لگ گئی تو اس نقصان کو پورا کرنے کا فریضہ انشورنس کمپنی پر عائد ہوتا ہے اور انشورنس کمپنی میں کس کا پیسہ ہے؟ وہ غریب عوام کا پیسہ ہے اس عوام کا پیسہ ہے جو اپنی گاڑی اس وقت تک سڑک پر نہیں لا سکتے جب تک اس کو انشورڈ (Insured) نہ کرالیں۔ اور عوام کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوتا، اس کو آگ نہیں لگتی لیکن وہ بیمہ کی قسطیں (Premium) ادا کرنے پر مجبور ہیں۔

ان غریب عوام کے بیمہ کی قسطوں سے انشورنس کمپنی کی عمارت تعمیر کی گئی، اور غریب عوام کے ڈیپازیٹ کے ذریعہ تاجر کے نقصان کی تلافی کرتے ہیں، لہٰذا یہ سارا گورکھ دھندا اس لئے کیا جارہا ہے تاکہ اگر نفع ہو تو سرمایہ دار تاجر کا ہو، اور اگر نقصان ہو تو عوام کا ہو، اس کے نتیجے میں یہ صورت حال ہو رہی ہے، بینک میں جو پوری قوم کا روپیہ ہے اگر اس کو صحیح طریقے پر استعمال کیا جاتا تو اس کے تمام منافع بھی عوام کو حاصل ہوتے۔ اور اب موجودہ نظام میں تقسیم دولت (Distribition of Wealth) کا جو سسٹم ہے۔ اس کے نتیجے میں دولت نیچے کی طرف جانے کے بجائے اوپر کی طرف جا رہی ہے۔ انہی خرابیوں کی وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ سود کھانا ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے زنا کاری کرنا(۱)۔ اتنا سنگین گناہ اس لئے ہے کہ اس کی وجہ سے پوری قوم کو تباہی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

سود کی عالمی تباہ کاری

آج سے پہلے ہم ''سود'' کو صرف اس لئے حرام مانتے تھے کہ قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا ہے، ہمیں اس کے عقلی دلائل سے زیادہ بحث نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جب حرام قرار دے دیا ہے، بس حرام ہے۔ لیکن آج اس کے نتائج کا آپ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں، آج پوری دنیا میں انٹرسٹ کا نظام جاری ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے اس ملک (امریکہ) کا دنیا میں

---

(۱) شعب الإيمان، رقم: ٥٥١٥ (٣٩٣/٤)، كنز العمال، رقم: ٩٧٧٤ (١٠٨/٤)، جامع الأحاديث، رقم: ١٢٨٢٧ (١٦٤/١٣)

طوطی بول رہا ہے۔ اور اب تو اس کا دوسرا حریف بھی دنیا سے رخصت ہوگیا، اور اب کوئی اس سے ٹکر لینے والا موجود نہیں۔ لیکن پھر بھی اقتصادی ابتری کا شکار ہے، اس کی بنیاد بھی انٹرسٹ ہے، اس لئے یہ کہنا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں غریب فقیر قسم کے لوگ سود پر قرض لیا کرتے تھے۔ ان سے سود کا مطالبہ کرنا حرام تھا، لیکن آج اگر کوئی شخص کمرشل لون پر سود لے رہا ہے تو اس کو حرام نہیں ہونا چاہئے عقلی اور معاشی اعتبار سے یہ بات درست نہیں ہے۔ اگر کوئی غیر جانبداری سے اس نظام کا مطالعہ کرے تو اس کو پتہ چل جائے گا کہ اس نظام نے دنیا کو تباہی کے آخری کنارے تک پہنچا دیا ہے۔ اور انشاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کے سامنے اس کی حقیقت کھل جائے گی، اور ان کو پتہ چل جائے گا کہ قرآن کریم نے سود کے خلاف اعلان جنگ کیوں کیا تھا؟ یہ تو سود کی حرمت کا ایک پہلو تھا جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا۔

سودی طریقہ کار کا متبادل

ایک دوسرا سوال بھی بہت اہم ہے جو آجکل لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم یہ تو مانتے ہیں کہ انٹرسٹ حرام ہے۔ لیکن اگر انٹرسٹ کو ختم کر دیا جائے تو پھر اس کا متبادل طریقہ کیا ہوگا جس کے ذریعہ معیشت کو چلایا جائے؟ اس واسطے کہ آج پوری دنیا میں معیشت کی روح انٹرسٹ پر قائم ہے۔ اور اگر اس کی روح کو نکال دیا جائے تو اس کو چلانے کا دوسرا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا۔ اس لئے لوگ کہتے ہیں کہ انٹرسٹ کے سوا کوئی دوسرا نظام موجود ہی نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو ممکن اور قابل عمل (Practicable) نہیں ہے۔ اور اگر کسی کے پاس قابل عمل طریقہ موجود ہے تو وہ بتائے کہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب تفصیل طلب ہے، اور ایک مجلس میں اس موضوع کا پورا حق ادا ہونا ممکن بھی نہیں ہے۔ اور اس کا جواب تھوڑا سا ٹیکنیکل بھی ہے، اور اس کو عام فہم اور عام الفاظ میں بیان کرنا آسان بھی نہیں ہے۔ لیکن میں اس کو عام فہم انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تاکہ آپ حضرات کی سمجھ میں آجائے۔

ناگزیر چیزوں کو شریعت میں ممنوع قرار نہیں دیا گیا

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو حرام قرار دے دیا کہ یہ چیز حرام ہے تو پھر ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ چیز ناگزیر ہو، اس لئے کہ اگر وہ چیز ناگزیر ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو

حرام قرار نہ دیتے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾(۱)

"یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایسی چیز کا حکم نہیں دیتے جو اس کی وسعت سے باہر ہو"

لہٰذا ایک مومن کے لئے تو اتنی بات بھی کافی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک چیز کو حرام قرار دے دیا تو چونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے کہ کون سی چیز انسان کے لئے ضروری ہے اور کون سی چیز ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا جب اس چیز کو حرام قرار دے دیا تو یقیناً وہ چیز ضروری اور ناگزیر نہیں ہے۔ اس چیز میں کہیں خرابی ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ ضروری اور ناگزیر معلوم ہو رہی ہے۔ تو اب اس خرابی کو دور کرنے کی ضرورت ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا اور یہ چیز ناگزیر ہے۔

سودی قرض کا متبادل قرض حسنہ ہی نہیں ہے

دوسری بات یہ ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں انٹرسٹ (Interest) جس کو قرآن کریم حرام قرار دیتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ جب کسی کو قرض دیا جائے تو ان کو غیر سودی قرض (Interest Free Loan) دینا چاہئے۔ اور اس پر کسی منافع کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب انٹرسٹ ختم ہو جائے گا ہمیں پھر غیر سودی قرضے ملا کریں گے، پھر جتنا قرض چاہیں حاصل کریں، اور اس سے کوٹھیاں بنگلے بنائیں۔ اور اس سے فیکٹریاں قائم کریں، اور ہم سے کسی انٹرسٹ کا مطالبہ نہیں ہوگا۔ اور اسی سوچ کی بنا پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ صورت قابل عمل (Practicable) نہیں ہے اس لئے کہ جب ہر شخص کو سود کے بغیر قرض دیا جائے گا تو پھر اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا کہ سب لوگوں کو بغیر سود کے قرضہ دے دیا جائے؟

سودی قرض کا متبادل "مشارکت" ہے

یاد رکھئے کہ انٹرسٹ کا متبادل (Alternative) قرض حسنہ نہیں ہے کہ کسی کو ویسے ہی قرض دے دیا جائے بلکہ اس کا متبادل "مشارکت" ہے یعنی جب کوئی شخص کاروبار کے لئے قرضہ لے رہا ہے تو وہ قرض دینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ میں تمہارے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہوں، اگر تمہیں نفع ہوگا تو اس نفع کا کچھ حصہ مجھے دینا پڑے گا اور اگر نقصان تو اس نقصان میں بھی شامل ہوں گا، تو اس

---

(۱) البقرة:۲۸٦

کاروبار کے نفع اور نقصان دونوں میں قرض دینے والا شریک ہو جائے گا، اور یہ مشارکت ہو جائے گی اور یہ انٹرسٹ کا متبادل طریقہ کار (Alternative System) ہے۔

اور ''مشارکت'' کا نظریاتی پہلو تو میں آپ کے سامنے پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ انٹرسٹ کی صورت میں تو دولت کا بہت معمولی حصہ کھاتہ دار (Depositor) کو ملتا ہے، لیکن اگر ''مشارکت'' کی بنیاد پر کاروبار کیا جائے اور سرمایہ کاری (Financing) ''مشارکت'' کی بنیاد پر ہو تو اس صورت میں تجارت کے اندر جتنا نفع ہوگا اس کا ایک متناسب (Proportionate) حصہ کھاتہ داروں کی طرف بھی منتقل ہوگا اور اس صورت میں تقسیم دولت (Distribution of Wealth) کا اوپر کی طرف جانے کے بجائے نیچے کی طرف آئے گا۔ لہٰذا اسلام نے جو متبادل نظام پیش کیا وہ ''مشارکت'' کا نظام ہے۔

مشارکت کے بہترین نتائج

لیکن یہ ''مشارکت'' کا نظام چونکہ موجودہ دنیا میں ابھی تک کہیں جاری نہیں ہے اور اس پر عمل نہیں ہوا اس لئے اس کی برکات بھی لوگوں کے سامنے نہیں آرہی ہیں، ابھی گذشتہ بیس پچیس سال کے دوران مسلمانوں نے مختلف مقامات پر اس کی کوششیں کی ہیں کہ وہ ایسے مالیاتی ادارے اور بینک قائم کریں جو انٹرسٹ کی بنیاد پر نہ ہوں بلکہ ان کو اسلامی اصولوں کی بنیاد پر چلایا جائے اور شاید آپ کے علم میں بھی یہ بات ہوگی کہ اس وقت پوری دنیا میں کم از کم ۸۰ سے لے کر ۱۰۰ تک ایسے بینک اور سرمایہ کاری کے ادارے قائم ہو چکے ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اسلامی اصولوں پر اپنے کاروبار کو چلا رہے ہیں اور انٹرسٹ سے پاک کاروبار کر رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا یہ دعویٰ سو فیصد صحیح ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں بھی ہوں۔ لیکن بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں تقریباً ایک سو ادارے اور بینک غیر سودی نظام پر کام کر رہے ہیں، اور یہ صرف اسلامی ملکوں میں نہیں بلکہ بعض مغربی اور یورپین ممالک میں بھی کام کر رہے ہیں۔ ان بینکوں اور اداروں نے ''مشارکہ'' کے طریقے پر عمل کرنا شروع کیا ہے، اور جہاں کہیں ''مشارکہ'' کے طریقے کو اپنایا گیا وہاں اس کے بہتر نتائج نکلے ہیں۔ ہم نے پاکستان میں ایک بینک میں اس کا تجربہ کیا اور میں نے خود اس کی ''مذہبی نگراں کمیٹی'' کے ممبر ہونے کی حیثیت سے اس کا معائنہ کیا، اور اس میں ''مشارکہ'' کے اندر بعض اوقات کھاتہ داروں کو بیس فیصد نفع بھی دیا گیا لہٰذا اگر ''مشارکہ'' کو وسیع پیمانے پر کیا جائے تو اس کے نتائج اور بھی زیادہ بہتر نکل سکتے ہیں۔

''مشارکت'' میں عملی دشواری

لیکن اس میں ایک عملی دشواری ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص مشارکہ کی بنیاد پر بینک سے پیسے لے گیا اور ''مشارکہ'' کے معنی نفع اور نقصان میں شرکت (Profit and Loss Sharing) کے ہیں کہ اگر نفع ہوگا تو اس میں بھی شرکت ہوگی اور اگر نقصان ہوگا تو اس میں بھی شرکت ہوگی تو افسوس ناک بات یہ ہے کہ خود ہمارے عالم اسلام میں بددیانتی اتنی عام ہے، اور بگاڑ اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اب اگر کوئی شخص اس بنیاد پر بینک سے پیسے لے کر گیا کہ اگر نفع ہوا تو نفع لاکر دوں گا، اور اگر نقصان ہوا تو نقصان بینک کو بھی برداشت کرنا پڑے گا تو وہ پیسے لے کر جانے والا شخص کبھی پلٹ کر نفع لے کر نہیں آئے گا۔ بلکہ وہ ہمیشہ یہ ظاہر کرے گا کہ مجھے نقصان ہوا ہے، اور وہ بینک سے کہے گا کہ بجائے اس کے کہ آپ مجھ سے نفع کا مطالبہ کریں بلکہ اس نقصان کی تلافی کے لئے مجھے مزید رقم دیں۔

عملی پہلو کا یہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے، مگر اس کا تعلق اس ''مشارکہ'' کے نظام کی خرابی سے نہیں ہے اور اس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ ''مشارکہ'' کا نظام خراب ہے۔ بلکہ اس مسئلہ کا تعلق انسانوں کی خرابی سے ہے جو اس نظام پر عمل کر رہے ہیں، ان عمل کرنے والوں کے اندر اچھے اخلاق دیانت اور امانت نہیں ہے، اور اس کی وجہ سے ''مشارکہ'' کے نظام میں یہ خطرات موجود ہیں کہ لوگ بینک سے ''مشارکہ'' کی بنیاد پر پیسے لے جائیں گے اور پھر کاروبار میں نقصان دکھا کر بینک کے ذریعہ ڈیپازیٹر کو نقصان پہنچائیں گے۔

اس دشواری کا حل

لیکن یہ مسئلہ کوئی ناقابل حل مسئلہ نہیں ہے اور ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کا حل نہ نکالا جاسکے، اگر کوئی ملک اس ''مشارکہ'' کے نظام کو اختیار کرے تو وہ بآسانی یہ حل نکال سکتا ہے کہ جس کے بارے میں یہ ثابت ہو کہ اس نے بددیانتی سے کام لیا ہے اور اپنے اکاؤنٹس صحیح بیان (Declare) نہیں کئے تو حکومت ایک مدت دراز کے لئے اس کو بلیک لسٹ (Black List) کردے، اور آئندہ کوئی بینک اس کو فنانسنگ کی کوئی سہولت فراہم نہ کرے۔ اسی صورت میں لوگ بددیانتی کرتے ہوئے ڈریں گے۔ آج بھی جائنٹ اسٹاک کمپنیاں کام کر رہی ہیں، اور وہ اپنے بیلنس شیٹ (Balance Sheet) شائع کرتی ہیں، اور اس بیلنس شیٹ میں اگرچہ بددیانتی بھی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود

اس میں وہ اپنا نفع ظاہر کرتی ہیں۔ اس لئے اگر ''مشارکہ'' کو پورے ملکی سطح پر اختیار کریں تو اس حل کو اختیار کیا جاسکتا ہے البتہ جب تک '' مشارکہ'' کو ملکی سطح پر اختیار نہیں کیا جاتا۔ اس وقت تک انفرادی (Individual) اداروں کو'' مشارکہ'' پر عمل کرنا دشوار ہے۔ لیکن ایسے انفرادی ادارے سلیکٹڈ (Selected) بات چیت کے ذریعہ مشارکہ کر سکتے ہیں۔

دوسری متبادل صورت ''اجارہ''

اس کے علاوہ اسلام کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسا دین عطا فرمایا ہے کہ اس میں ''مشارکہ'' کے علاوہ بینکنگ اور فائینانسنگ کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ مثلاً ایک طریقہ اجارہ (Leasing) کا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک شخص بینک سے پیسہ مانگنے آیا اور بینک نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کس ضرورت کے لئے پیسہ چاہئے؟ اس نے بتایا کہ مجھے اپنے کارخانے میں ایک مشینری باہر سے منگوا کر لگانی ہے، تو اب بینک اس شخص کو پیسے نہ دے۔ بلکہ خود اس مشینری کو خرید کر اس شخص کو کرایہ پر دیدے۔ اس عمل کو اجارہ (Leasing) کہا جاتا ہے، البتہ آجکل فائینانسنگ اداروں اور بینک میں فائینانشل لیزنگ کا جو طریقہ رائج ہے وہ شریعت کے مطابق نہیں ہے، اس ایگریمنٹ میں بہت سی شقیں (Clauses) شریعت کے خلاف ہیں۔ لیکن اس کو شریعت کے مطابق آسانی کے ساتھ بنایا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں متعدد فائینانشل ادارے قائم ہیں جن میں لیزنگ ایگریمنٹ شریعت کے مطابق ہیں، اس کو اختیار کرنا چاہئے۔

تیسری متبادل صورت ''مرابحہ''

اسی طرح ایک اور طریقہ ہے۔ جس کا آپ نے نام سنا ہوگا، وہ ہے'' مرابحہ فائینانسنگ'' یہ بھی کسی شخص سے معاملہ کرنے کا ایک طریقہ ہے جس میں نفع پر وہ چیز بیچ دی جاتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص بینک سے اس لئے قرض لے رہا ہے کہ وہ خام مال (Raw Material) خریدنا چاہتا ہے، وہ بینک اس کو خام مال خریدنے کے لئے پیسے دینے کے بجائے وہ خود خام مال خرید کر اس کو نفع پر بیچ دے یہ طریقہ بھی شرعاً جائز ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مرابحہ کی یہ صورت تو ہاتھ گھما کر کان پکڑنے والی بات ہوگئی، کیونکہ اس میں بینک سے نفع لینے کے بجائے دوسرے طریقے سے نفع وصول کرلیا۔ یہ کہنا درست نہیں، اس لئے کہ قرآن کریم نے فرمایا کہ:

﴿وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾(۱)
یعنی اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام کیا ہے اور مشرکین مکہ بھی تو یہی کہا کرتے تھے کہ بیع بھی تو ربا جیسی ہے، اس میں بھی انسان نفع کماتا ہے اور ربا میں بھی انسان نفع کماتا ہے، پھر دونوں میں فرق کیا ہے؟ قرآن کریم نے انکا ایک ہی جواب دیا کہ یہ ہمارا حکم ہے کہ ربا حرام ہے اور بیع حلال ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ روپیہ کے اوپر روپیہ نہیں لیا جاسکتا، اور روپیہ پر منافع نہیں لیا جاسکتا۔ لیکن اگر درمیان میں کوئی چیز یا مالک تجارت آجائے اور اس کو فروخت کر کے نفع حاصل کرے اس کو ہم نے حلال قرار دیا ہے۔ اور مرابحہ کے اندر درمیان میں مال آجاتا ہے اس لئے شریعت کے اعتبار سے وہ سودا (Transaction) جائز ہو جاتا ہے۔

پسندیدہ متبادل کونسا ہے؟

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ مرابحہ اور لیزنگ (Leasing) مطلوبہ اور پسندیدہ متبادل (Ideal Alternative) نہیں ہیں، اور اس سے تقسیم دولت (Distribution of Wealth) پر کوئی بنیادی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ پسندیدہ متبادل ''مشارکہ'' ہے، لیکن آئندہ جو منفرد (Indicidual) ادارے قائم کئے جائیں ان کے لئے آزمائشی اور تجرباتی مدت (Transitory Period) میں مرابحہ اور لیزنگ پر بھی عمل کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ اور اس وقت بھی کچھ فائنانشل انسٹیٹوشن ان بنیادوں پر کام کر رہے ہیں۔

بہر حال! یہ تو ''سود'' اور اس کے متعلقات کے بارے میں عام باتیں تھیں جو میں نے عرض کر دیں۔

''سود'' سے متعلق ایک مسئلہ اور ہے جس کی صدائے بازگشت بار بار سنائی دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ دار الحرب جہاں غیر مسلم حکومت ہو وہاں سود کے لین دین میں کوئی قباحت نہیں، وہاں غیر مسلم حکومت سے سود لے سکتے ہیں، اس مسئلہ پر بھی بہت لمبی چوڑی بحثیں ہوئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ چاہے دار الحرب ہو یا دار السلام، جس طرح سود دار السلام میں حرام ہے اسی طرح دار الحرب میں بھی حرام ہے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ عام آدمی کو چاہئے کہ اپنا پیسہ بینک کے اندر کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھے، جہاں پیسوں پر سود نہیں لگتا، لیکن اگر کسی شخص نے غلطی سے سیونگ اکاؤنٹ (Saving Account) میں پیسے رکھ دیئے ہیں اور اس رقم پر سود مل رہا ہے تو پاکستان میں

---

(۱) البقرة: ۲۷۵

تو ہم لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ سود کی رقم بینک میں چھوڑ دو، لیکن ایسے ملکوں میں جہاں ایسی رقم اسلام کے خلاف کام پر خرچ ہوتی ہے، وہاں اس شخص کو چاہئے کہ وہ سود کی رقم بینک سے وصول کر کے کسی مستحق زکوٰۃ شخص کو ثواب کی نیت کے بغیر صرف اپنی جان چھڑانے کے لئے صدقہ کر دے اور خود اپنے استعمال میں نہ لائے۔

عصر حاضر میں اسلامی معیشت کے ادارے

ایک بات اور عرض کردوں وہ یہ کہ یہ کام نسبتاً ذرا مشکل لگتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہم مسلمانوں کو اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہئے کہ ہم خود ایسے مالیاتی ادارے قائم کریں جو اسلامی بنیادوں پر کام کریں اور جیسا کہ میں نے ابھی آپ کے سامنے عرض کیا کہ ''مشارکہ'' ''مرابحہ'' اور ''لیزنگ'' کی مکمل اسکیمیں موجود ہیں، اور ان بنیادوں پر مسلمان اپنے ادارے قائم کر سکتے ہیں، اور یہاں کے مسلمان ماشاء اللہ اس بات کو سمجھتے ہیں اور اس میں خود ان کے مسائل کا بھی حل ہے، ان کو چاہئے کہ یہاں رہ کر فائنانشیل انسٹیٹوٹ قائم کریں۔ امریکہ میں میرے علم کے مطابق کم از کم ہاؤسنگ کی حد تک دو ادارے موجود ہیں اور وہ صحیح اسلامی بنیادوں پر کام کر رہے ہیں۔ ایک ٹورنٹو میں اور ایک لاس اینجلس میں ہے، اب ان اداروں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہئے اور مسلمانوں کو اپنے طور پر ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں، لیکن اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ماہر فقہاء اور مفتی حضرات سے مشورہ کر کے اس کا نظام قائم کریں۔ اور اس سلسلے میں اگر آپ مجھ سے بھی خدمات لینا چاہیں تو میں ہر قسم کی خدمت کے لئے حاضر ہوں جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس وقت دنیا میں تقریباً 100 ادارے کام کر رہے ہیں، اور تقریباً 50 سال سے میں ان اداروں میں خدمت کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو اس کی توفیق عطا فرمائے اور مسلمانوں کے لئے کوئی بہتر راستہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

☆☆☆

سود کی حرمت اور موجودہ نظام بینکاری ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ "لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهُ وَشَاهِدَيْهِ وَكَاتِبَهُ" (۲)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، سودی معاملے میں گواہ بننے والے اور سود کا معاملہ لکھنے والے پر لعنت فرمائی ہے''

اس حدیث سے پتہ چلا کہ جس طرح سود کا معاملہ کرنا ناجائز اور حرام ہے اسی طرح سود کے معاملے میں دلالی کرنا یا سود کا حساب کتاب لکھنا بھی ناجائز ہے۔ اسی حدیث کی بنیاد پر یہ فتویٰ دیا جاتا ہے کہ آج کل بینکوں کی ملازمت جائز نہیں کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی کسی نہ کسی درجے میں سود کے معاملات میں ملوث ہو جاتا ہے۔

کاتبِ سود کا حکمِ شرعی

اس کی تفصیل میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھا ہے کہ کاتب سود سے مراد وہ شخص جو کہ عقد سود کے وقت سود وغیرہ کا حساب لکھ کر عاقدین کی اس عقد میں معاونت کرتا ہے، وہ اس وعید میں داخل ہے لیکن اگر کوئی شخص عقد سود کے انعقاد کے وقت یہ حساب و کتاب نہیں لکھتا بلکہ عقد کے بعد جب وہ پچھلے عرصہ کے تمام حسابات اور کارگزاری اور رپورٹیں وغیرہ لکھتا ہے گو اس کے ذیل میں سود کے

☆ تقریر ترمذی (۱/۳۸ تا ۵۷)، زیر نظر بیان سنن ترمذی شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے طلبہ کے سامنے سود کی حرمت اور موجودہ نظام بینکاری پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی آکل الربا، رقم: ۱۱۲۷، سنن أبی داود، کتاب البیوع، باب فی آکل الربا وموکلہ، رقم: ۲۸۹۵، سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب التغلیظ فی الربا، رقم: ۲۲۶۸

حسابات بھی اسے لکھنے پڑھتے ہیں، غرض یہ کہ اس حساب و کتاب سے عقد سود میں معاونت نہیں ملتی تو وہ شخص اس وعید میں داخل نہیں ہوگا۔ اگر اس تفصیل کو پیش نظر رکھا جائے تو اس سے ان حضرات کی الجھن دور ہوسکتی ہے جن کا کام اکاؤنٹس اور آڈٹ وغیرہ کا ہے، ان لوگوں کو مختلف فرموں، اداروں اور کمپنیوں کے پورے سال کے حسابات لکھنے پڑتے ہیں اور اس کی چیکنگ کرنی ہوتی ہے، اس میں انہیں سود وغیرہ جس کا کمپنی نے عقد کیا ہوتا ہے اسے بھی لکھنا پڑتا ہے، لیکن ان کا یہ لکھنا محض ایک سالانہ رپورٹ اور کارگزاری کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے کمپنی کی سودی لین دین میں کوئی معاونت نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ حضرات اس وعید میں داخل نہیں ہوں گے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

بینک کی ملازمت کیوں جائز نہیں؟

البتہ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ بینک کی ملازمت کیوں حرام ہے؟ اس لئے کہ آجکل تو ہر جگہ سے پیسہ بینک ہی کے واسطے سے آتا ہے، کوئی بھی چیز سود سے پاک نہیں، لہٰذا پھر تو ہر چیز حرام ہونی چاہئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے ہر چیز کی حد مقرر کردی ہے کہ اس حد تک جائز ہے اور اس حد کے آگے ناجائز ہے۔ لہٰذا بینک کی ملازمت ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بینک کے اندر سودی لین دین ہوتا ہے، اور جو شخص بھی بینک میں ملازم ہے وہ کسی نہ کسی درجے میں سودی لین دین میں تعاون کر رہا ہے۔ اور کسی بھی گناہ کے کام میں تعاون کرنا قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق حرام ہے؟ فرمایا:

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾(۱)

اس وجہ سے بینک کی ملازمت حرام ہے۔ جہاں تک اس اشکال کا تعلق ہے کہ ہر پیسہ بینک ہی کے واسطے سے ہم تک پہنچتا ہے لہٰذا ہر پیسہ حرام ہونا چاہئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بینک سے پیسے جائز اور حلال طریقے سے آرہے ہیں تو ان پیسوں کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں اور اگر ناجائز اور حرام طریقے سے آرہے ہیں تو ان کا استعمال بھی حرام ہوگا۔

ربوا القرآن اور ربوا الحدیث

لفظ "الربوا" لغت میں زیادتی کے معنی میں آتا ہے، اور شریعت کی اصطلاح میں اس کا اطلاق پانچ قسم کے معانی کے لئے ہوا ہے۔ لیکن زیادہ تر اس کا استعمال دو معنوں کے لئے ہوتا ہے۔

(۱) المائدۃ: ۲، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو"

ایک ''ربوا النسیہ'' کے لئے اور دوسرے ''ربوا الفضل'' کے لئے۔ ''ربوا النسیہ'' کی تعریف یہ ہے:

''هو القرض المشروط فيه الاجل وزيادة مال على المستقرض''

اس کو ''ربوا القرآن'' بھی کہتے ہیں، اور ''ربوا الفضل'' کی تعریف یہ ہے کہ دو ہم جنس چیزوں میں آپس کے تبادلے کے وقت کمی زیادتی کرنا۔ اس کو ''ربوالحدیث'' بھی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ پہلی قسم کے ربا کو قرآن کریم نے اور دوسری قسم کے ربا کو حدیث نے حرام قرار دیا ہے۔

سود مفرد اور سود مرکب دونوں حرام ہیں

بعض لوگ یہ اشکال کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے صرف سود مرکب کو حرام قرار دیا ہے، سود مفرد کو حرام نہیں کہا۔ اور قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً﴾(۱)

اس آیت میں ربا کے ساتھ ''أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً'' کی قید لگی ہوئی ہے، اور نہی قید پر داخل ہوئی ہے، لہٰذا صرف وہ ربا ممنوع ہوگا جس میں سود کی رقم راس المال سے کم از کم دوگنی ہو جائے۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں، کیونکہ ''أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً'' کی قید باجماع امت احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے، اور یہ قید بالکل ایسی ہے جیسے قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَناً قَلِيلاً﴾(۲)

اس آیت میں اگرچہ ''ثمن قلیل'' کی قید لگی ہوئی ہے، لیکن کوئی بھی عقلمند انسان اس آیت کا یہ مطلب نہیں لیتا کہ آیات قرآنی کو ''ثمن قلیل'' کے ساتھ فروخت کرنا تو جائز نہیں لیکن ''ثمن کثیر'' کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے۔ اور اس قید کے اتفاقی ہونے کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

1- قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ﴾(۳)

اس آیت میں لفظ ''ما'' عام ہے، جو ربا کی ہر قلیل اور کثیر مقدار کو شامل ہے۔

2- خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے یہ اعلان فرما دیا:

---

(۱) آل عمران: ۱۳۰

(۲) البقرۃ: ۴۱، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''میری آیات کو تھوڑے سے عوض کے بدلے مت بیچو''

(۳) البقرۃ: ۲۷۸، آیت کا ترجمہ یہ ہے: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود کو چھوڑ دو، اگر تم ایمان رکھتے ہو''

((وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ فَاِنَّهُ مَوْضُوعٌ كُلُّهُ))(۱)

''یعنی (آج کے دن) جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ ہمارے چچا حضرت عباس کا سود ہے، وہ سب کا سب ختم کر دیا گیا''

اس حدیث میں لفظ ''کلہ'' ہر مقدار ربا کی حرمت پر صریح ہے۔

3- حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبًا))(۲)

اس حدیث میں لفظ ''نفعا'' اس بات پر دال ہے کہ نفع کی ہر مقدار حرام ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آیت میں "أضعافا مضعفة" کی قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے۔

سود خور سے اللہ تعالیٰ کا اعلان جنگ

حرمت ربا کی آیات قطعی الدلالت ہیں، اور ربا کا معاملہ کرنے والوں کے بارے میں جو شدید وعید قرآن کریم میں آئی ہے ایسی شدید وعید شاید کسی دوسرے گناہ پر نہیں آئی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾(۳)

اس آیت میں صاف اعلان فرمادیا کہ اگر تم سودی لین دین نہیں چھوڑو گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔

کیا موجودہ بینکوں کا سود حرام نہیں؟

آج پوری دنیا سود کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام کی تو بنیاد ہی سود پر

(۱) صحيح مسلم، كتاب الحج، باب حجة النبى، رقم: ۲۱۳۷، سنن ابى داؤد، كتاب المناسك، باب صفة حجة النبى رقم: ۱۶۲۸، سنن ابن ماجه، كتاب المناسك، باب الخطبة يوم النحر، رقم: ۳۰۴۶، سنن الدارمى كتاب المناسك، باب فى سنة الحج، رقم: ۱۷۷۴

(۲) كشف الخفاء، رقم: ۱۹۹۱ (۱۲۵/۲)، بريقة محمودية فى شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية (۲۲۵/۶)، الكبائر للذهبى (۶۱/۱)

(۳) البقرة: ۲۷۸-۲۷۹

قائم ہے۔ سارے بینک سود کی بنیاد پر چل رہے ہیں، ساری تجارتیں سود کی بنیاد پر ہو رہی ہیں، بڑے بڑے سرمایہ دار اور بڑی بڑی کمپنیاں سودی بنیادوں پر بینک سے قرضہ لیتی ہیں اور اس سے اپنا کاروبار چلاتی ہیں۔

چنانچہ عالم اسلام میں بعض عناصر ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ موجودہ بینکوں کا سود وہ سود نہیں ہے جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔ اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اس زمانے میں لوگ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے قرض لیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک آدمی کے پاس کھانے کے پیسے نہ ہوتے تو وہ بھوک کی حالت میں کسی صاحب استطاعت کے پاس جاتا اور اس کو جا کر کہتا کہ میں بھوکا ہوں، مجھے کچھ پیسے قرض دے دو تاکہ بیوی بچوں کو کھانا کھلا سکوں۔ جواب میں صاحب استطاعت کہتا کہ میں سود پر قرض دوں گا، لہٰذا تم یہ وعدہ کرو کہ اس قرض کے ساتھ اتنا سود ادا کرو گے۔ ظاہر ہے کہ یہ ظلم کی بات تھی کہ ایک آدمی بھوکا ہے اور اس بھوک کو مٹانے کے لئے آپ سے قرض مانگ رہا ہے تو آپ اس سے سود کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کا اصل فرض تو یہ تھا کہ آپ اپنی طرف سے اس کی بھوک مٹانے کا انتظام کرتے، نہ یہ کہ اس کو قرض دے کر الٹا اس سے سود کا مطالبہ کریں۔ ایسے سود کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا کہ اگر تم اس کو نہیں چھوڑو گے تو تمہارے خلاف اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔

یا مثلاً ایک شخص کے گھر میں میت ہوگئی، اور اس کے پاس کفن دفن کے لئے پیسے نہیں ہیں وہ دوسرے شخص کے پاس جاتا ہے اور اس سے قرض مانگتا ہے تاکہ میت کے کفن دفن کا انتظام کر سکے، اس موقع پر قرض دینے والا یہ مطالبہ کرے کہ میں اس وقت تک تمہیں قرض نہیں دوں گا جب تک تم اتنا سود ادا نہیں کرو گے۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر سود کا مطالبہ کرنا انسانیت اور مروّت کے خلاف بات تھی، اس لئے اس قسم کے سود کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔

تجارتی قرضوں پر سود کی حقیقت

لیکن جہاں تک موجودہ دور کے بینکوں کے سود کا تعلق ہے، اس میں قرض لینے والے غریب غرباء نہیں ہوتے جن کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا، اور جن کے پاس میت کے کفن دفن کے انتظام کے لئے پیسے نہیں ہوتے، ایسے غریب غرباء کو تو بینک قرض دیتا ہی نہیں۔ اگر ہم اور آپ میں سے کوئی بینک سے قرض لینے جائیں گے تو بینک والے ہمیں مار کر باہر نکال دیں گے۔ بلکہ بینک سے قرض لینے والے بڑے بڑے سرمایہ دار اور دولت مند ہوتے ہیں جو بھوک مٹانے اور کفن دفن کے

لئے قرض نہیں لیتے بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بینک سے قرض لے کر اس رقم کو اپنی تجارت میں لگا کر اس کو اور زیادہ ترقی دیں گے اور زیادہ نفع کمائیں گے۔ مثلاً ایک لاکھ روپیہ بینک سے قرض لے کر اس سے دو لاکھ بنائیں گے۔

دوسری طرف وہ روپیہ جو سرمایہ دار بینک سے بطور قرض لیتا ہے وہ عوام کا روپیہ ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی کمائی سے بچا بچا کر یہ روپیہ بینک میں بطور امانت کے رکھوایا ہے۔ لہٰذا جو سرمایہ دار بینک سے قرض لے رہا ہے اگر اس سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ اس قرض کے ذریعہ تجارت کر کے جو نفع کماؤ گے اس نفع میں سے اتنا فیصد تم بینک کو بطور سود ادا کرو تو اس میں کون سا ظلم ہو جائے گا؟ اور اس زمانے میں جو سود رائج تھا اس میں قرض لینے والے پر ظلم ہوتا تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے اس سود کو حرام قرار دے دیا۔ لہٰذا موجودہ دور کے بینکوں کا سود حرام نہیں۔

دوسرے لفظوں میں اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک قرض وہ ہے جس کو انسان اپنی ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لئے لیتا ہے، ایسے قرض کو ''صرفی'' کہتے ہیں، دوسرا قرض وہ ہے جس کو انسان تجارت کرنے اور نفع کمانے کے لئے لیتا ہے۔ ایسے قرض کو ''تجارتی قرض'' یا ''پیداواری قرض'' کہتے ہیں۔ سود کے جواز کے قائلین کا کہنا ہے کہ قرآن کریم نے ''صرفی قرض'' پر لئے جانے والے سود کو حرام کہا ہے۔ ''تجارتی قرض'' پر لیا جانے والا سود اس حرمت میں داخل نہیں۔

سود کے جواز پر استدلال

سود کے جواز کے قائلین قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾(۱)

اس آیت میں لفظ ''الربوا'' معرف باللام ہے اور الف لام میں اصل یہ ہے کہ وہ عہد کے لئے ہو۔ لہٰذا لفظ ''ربا'' سے وہ مخصوص ''ربا'' مراد ہوگا جو زمانہ جاہلیت میں اور حضور ﷺ کے ابتدائی دور میں رائج تھا۔ اور اس زمانے میں صرف ''صرفی قرض'' اور اس پر سود لینے کا رواج تھا۔ ''تجارتی قرض'' اور اس پر سود لینے کا اس وقت رواج نہیں تھا۔ اور جو چیز اس زمانے میں رائج ہی نہیں تھی قرآن کریم اس کو کیسے حرام قرار دے سکتا ہے؟ لہٰذا حرمت سود کا اطلاق صرف ''صرفی قرض'' پر لئے جانے والے سود پر ہوگا۔ ''تجارتی قرض'' پر لئے جانے والے سود پر نہیں ہوگا۔

(۱) البقرة: ۲۷۵، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام''

سود کے جواز کے قائلین

یہ وہ استدلال ہے جو اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے کیا گیا۔ اور جس کی بنیاد پر یہ کہا گیا کہ بینکوں کا سود جائز ہے۔ یہاں تک کہ مصر کے موجودہ مفتی اعظم نے بھی بینکوں کے سود کے حلال ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے۔ اور اس فتویٰ کی وجہ سے پوری عالم عرب میں ایک غلغلہ برپا ہے اور اس کا چرچا ہے۔ ان کے علاوہ عالم اسلام کے ہر خطے میں کوئی نہ کوئی اس موقف کا حامل کھڑا ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں سرسید احمد خان، عرب میں مفتی عبدہ، رشید رضا بھی اس موقف کے حامل گزرے ہیں۔ پاکستان میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کا موقف بھی یہی تھا۔ اور جسٹس قدیر الدین نے اس کے جواز پر ایک رسالہ لکھا تھا۔ اگر آدمی غور سے نہ دیکھے تو بظاہر جواز کے قائلین کا استدلال دل کو اپیل کرتا ہے کہ اگر ایک سرمایہ دار بینک سے قرض لے کر نفع کمار ہا ہے تو اس سے سود کا مطالبہ کرنے میں کون سے ظلم اور جرم کی بات ہے؟ چنانچہ تعلیم یافتہ طبقہ اس استدلال سے مرعوب ہو کر ان کا حامی بن جاتا ہے۔

حکم حقیقت پر لگتا ہے، صورت پر نہیں

حقیقت یہ ہے کہ جواز کے قائلین کا استدلال زبردست مغالطے پر مبنی ہے، ان کے استدلال کا صغریٰ اور کبریٰ دونوں غلط ہیں۔ ان کے استدلال کا صغریٰ یہ ہے کہ عہد رسالت میں تجارتی سود رائج نہیں تھا۔ اور کبریٰ یہ ہے کہ جو چیز عہد رسالت میں رائج نہ ہو اس پر حرمت کا اطلاق نہیں ہوسکتا یہ صغریٰ اور کبریٰ دونوں غلط ہیں، لہٰذا ان کا استدلال درست نہیں۔

پہلے کبریٰ کو سمجھ لیں کہ یہ کبریٰ غلط ہے۔ دیکھئے اصول یہ ہے کہ قرآن یا حدیث جب کسی چیز پر حلت یا حرمت کا حکم لاتے ہیں تو وہ حکم اس چیز کی کسی خاص شکل یا صورت پر نہیں لگاتے بلکہ اس چیز کی حقیقت پر لگاتے ہیں۔ لہٰذا جہاں وہ حقیقت پائی جائے گی وہاں وہ حکم آجائے گا۔

مثلاً شراب کو لے لیں، جس زمانے میں شراب حرام ہوئی، اس زمانے میں اس زمانے کے لوگ اپنے گھروں میں انگور کا شیرہ اپنے ہاتھوں سے نکال کر اس کو سڑا کر شراب بناتے تھے، لہٰذا اب موجودہ دور میں کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ چونکہ اس زمانے میں لوگ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں میں شراب بناتے تھے اور اس میں حفظان صحت کے اصولوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا، اس لئے شراب حرام قرار دے دی گئی تھی۔ اب چونکہ موجودہ دور میں شاندار مشینوں کے ذریعہ حفظان صحت کے تمام

اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی صفائی ستھرائی کے ساتھ شراب بنائی جاتی ہے اس لئے شراب کی حرمت کا اطلاق موجودہ دور کی شراب پر نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال بالکل احمقانہ ہے اس لئے کہ شریعت نے شراب کی کسی خاص شکل اور صورت کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ اس کی حقیقت کو حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا جس چیز میں شراب کی وہ حقیقت پائی جائے گی اس پر حرمت کا اطلاق ہوجائے گا۔ چاہے اس کی وہ مخصوص صورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہسکی، بیئر اور برانڈی نہیں تھی، اس لئے یہ حرام نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات درست نہیں، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اگرچہ اس نام سے اور اس شکل میں موجود نہیں تھی، مگر اس کی حقیقت یعنی ''ایسا مشروب جو نشہ آور ہو'' موجود تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو حرام قرار دیا تھا، اب یہ حقیقت ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی، چاہے کسی زمانے میں بھی ہو، اور کسی بھی نام سے پائی جائے۔

ایک لطیفہ، گانا بجانا حرام نہ ہوتا

ہندوستان کا ایک گویا (گانے والا) ایک مرتبہ حج کرنے گیا، حج سے فارغ ہونے کے بعد مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جارہا تھا تو اس زمانے میں راستے میں قیام کے لئے منزلیں ہوتی تھیں، اس نے بھی رات گزارنے کے لئے ایک منزل پر قیام کیا، تھوڑی دیر کے بعد اسی منزل پر ایک عرب گویا آگیا، اور عرب گویے نے وہاں بیٹھ کر عربی میں گانا بجانا شروع کردیا۔ اس عرب گویے کی آواز بہت خراب اور بھدی تھی۔ ہندوستانی گویے کو اس کی آواز سے بہت کراہیت اور وحشت ہوئی جب اس نے گانا بجانا بند کیا تو ہندوستانی گویے نے کہا کہ آج یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گانا بجانا کیوں حرام قرار دیا تھا۔ اس لئے کہ آپ نے اس جیسے بدوؤں کا گانا سنا تھا، اگر آپ میرا گانا سن لیتے تو کبھی حرام قرار نہ دیتے۔

پھر تو خنزیر بھی حلال ہونا چاہئے!

آج کل یہ مزاج بن گیا ہے کہ ہر چیز کے بارے میں لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ چیز یا یہ عمل اس طرح ہوتا تھا، اس لئے آپ نے اس کو حرام قرار دیا تھا، لیکن آج کل چونکہ یہ عمل اس طرح نہیں ہورہا ہے اس لئے یہ حرام نہیں۔ حتیٰ کہ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ شریعت نے خنزیر کو اس لئے حرام قرار دیا تھا کہ اس زمانے میں خنزیر گندے رہتے تھے،

غلاظت کھاتے تھے، گندے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی تھی، لیکن آجکل تو بہت صاف ستھرے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے، اور ان کی پرورش کے لئے اعلیٰ درجے کے فارم قائم کر دیئے گئے ہیں، لہٰذا اب ان کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لئے حلال ہونے چاہئیں۔

بالکل اسی طرح سود کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ "تجارتی سود" حضور ﷺ کے زمانے میں ہوتا تو حضور ﷺ اس کو حرام قرار نہ دیتے، اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے کہ شریعت جس چیز کو حرام قرار دیتی ہے اس کی حقیقت کو حرام قرار دیتی ہے، اس کی خاص شکل اور صورت کو حرام قرار نہیں دیتی، اسی طرح سود کی بھی حقیقت کو حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں وہ حقیقت پائی جائے گی وہاں حرمت آجائے گی، چاہے اس "سود" کی مخصوص شکل حضور ﷺ کے زمانے میں موجود ہو یا نہ ہو۔

"سود" کی حقیقت

اب دیکھنا یہ ہے کہ "سود" کی حقیقت کیا ہے جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ اور یہ حقیقت موجودہ دور کے "تجارتی سود" میں پائی جاتی ہے یا نہیں؟ سود کی حقیقت یہ ہے کہ "کسی شخص کو دیئے ہوئے قرض پر طے کر کے کسی بھی قسم کی زیادتی کا مطالبہ کرنا" مثلاً میں نے ایک شخص کو سو روپے بطور قرض دیئے، اور اس کے ساتھ یہ طے کر لیا کہ ایک ماہ بعد تم سے ایک سو پانچ روپے واپس لوں گا تو یہ سود ہے، البتہ اگر طے نہیں کیا بلکہ میں نے اس کو ویسے ہی سو روپے قرض دیدئے لیکن قرض واپس کرتے وقت اپنی خوشی سے ایک سو پانچ روپے واپس کئے تو یہ سود اور حرام نہیں۔

قرض کی واپسی کی عمدہ شکل

خود حضور ﷺ سے ثابت ہے کہ جب آپ کسی کے مقروض ہوتے اور قرض خواہ قرض کا مطالبہ کرتا تو آپ اس کا قرض کچھ زیادتی کے ساتھ واپس کرتے تاکہ اس کی دل جوئی ہو جائے، لیکن چونکہ یہ زیادتی پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی تھی، اس لئے وہ سود نہیں ہوتی تھی، حدیث کی اصطلاح میں اس کو "حسن القضاء" کہا جاتا ہے، یعنی اچھے طریقے سے قرض کی ادائیگی کرنا، بلکہ حضور ﷺ نے یہاں تک فرمایا:

((اِنَّ خِیَارَکُمْ اَحْسَنُکُمْ قَضَاءً))(۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب فی الاستقراض واداء الدیون والحجر والتفلیس، باب حسن القضاء، رقم: ۲۲۱۸، سنن النسائی، کتاب البیوع، باب استسلاف الحیوان واستقراضه، رقم: ۴۵۳۹، مسند أحمد، رقم: ۸۷۴۳

''یعنی تم سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرض کی ادائیگی میں اچھا معاملہ کرنے والے ہوں''

اس سے معلوم ہوا کہ طے کر کے زیادہ ادا کرنا تو سود ہے اور طے کئے بغیر زیادہ ادا کرنا سود نہیں، بلکہ ''حسن قضاء'' ہے۔ بہرحال چونکہ ''سود'' کی مندرجہ بالا حقیقت موجودہ بینکوں کے ''تجارتی سود'' میں پائی جاتی ہے، اس لئے تجارتی سود بھی حرام ہوگا۔ مندرجہ بالا تفصیل سے تجارتی سود کے جواز کے قائلین کی دلیل کا کبریٰ غلط ثابت ہو گیا۔

حضور ﷺ کے زمانے میں تجارتی پھیلاؤ

ان کی دلیل کا صغریٰ یہ تھا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تجارتی سود موجود نہیں تھا، یہ صغریٰ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ عرب کا وہ معاشرہ جس میں حضور ﷺ تشریف لائے اس میں بھی آج کے دور کی جدید تجارت کی تقریباً ساری بنیادیں موجود تھیں۔

مثلاً آج کل مشترکہ کمپنیاں قائم ہوتی ہیں، جن کو ''جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں'' کہا جاتا ہے، اس کے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہ چودھویں صدی کی پیداوار ہے، اس سے پہلے اس کا وجود نہیں تھا لیکن جب ہم عرب کی تاریخ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ عرب کا ہر قبیلہ ایک مستقل ''جوائنٹ اسٹاک کمپنی'' ہوتا تھا۔ اس لئے کہ ہر قبیلے میں تجارت کا طریقہ یہ تھا کہ قبیلے کے تمام افراد اپنا ایک ایک درہم اور ایک ایک دینار لا کر ایک جگہ جمع کر دیتے پھر اس رقم کو قافلے والے شام لے جا کر اس سے مال تجارت لا کر فروخت کرتے۔ چنانچہ آپ نے ''تجارتی قافلوں'' کا نام سنا ہوگا وہ یہی کام کیا کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ جو آیت ہے:

﴿لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ٥ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ﴾(۱)

اس آیت میں گرمیوں اور سردیوں کے جن سفروں کا ذکر ہے اس سے مراد یہی تجارتی قافلے ہیں جو سردیوں میں یمن کی طرف اور گرمیوں میں شام کی طرف سفر کیا کرتے تھے۔ اور ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ یہاں مکہ مکرمہ سے سامان لے جا کر وہاں فروخت کر دیتے اور وہاں سے سامان تجارت لا کر مکہ مکرمہ میں فروخت کر دیتے، ان قافلوں میں بعض اوقات ایک ایک آدمی اپنے قبیلے سے دس دس لاکھ دینار قرض لیتا تھا۔ ظاہر ہے وہ یہ قرض کھانے پینے کی ضرورت کے لئے یا کفن دفن کے انتظام کے لئے نہیں لیتا تھا۔ بلکہ وہ تجارتی مقصد ہی کے لئے لیتا تھا۔

---

(۱) القریش: ۱

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ جس تجارتی قافلے کے ساتھ شامل مکہ مکرمہ سے آرہے تھے، جس پر مسلمانوں نے حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا جس کے نتیجے میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگ بدر پیش آئی، اس قافلے کے بارے میں محدثین اور اصحاب السیر نے لکھا ہے:

"لَمْ یَبْقَ قُرَشِیٌّ وَلَا قُرَشِیَّۃٌ عِنْدَہٗ دِرْھَمٌ اِلَّا وَبَعَثَ بِہٖ فِی الْبَعِیْرِ"

''جس قریش مرد یا عورت کے پاس ایک درہم بھی تھا وہ اس نے اس تجارتی قافلے میں بھیج دیا تھا''

اس سے معلوم ہوا کہ یہ قبیلے اس طرح مشترک سرمائے سے تجارت کرتے تھے۔

روایات میں آتا ہے کہ بنومغیرہ اور بنوثقیف کے درمیان آپس میں قبائلی سطح پر سود کا لین دین ہوتا تھا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے سود پر قرض لیتا اور دوسرا قرض دیتا تھا۔ ایک قبیلہ سود کا مطالبہ کرتا اور دوسرا قبیلہ اس سود کو ادا کرتا تھا۔ اور یہ سب تجارتی قرض ہوتے تھے۔

سب سے پہلے چھوڑا جانے والا سود

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سود کی حرمت کا اعلان فرمایا تو اس وقت آپ نے یہ ارشاد فرمایا:

((وَرِبَا الْجَاھِلِیَّۃِ وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ فَاِنَّہٗ مَوْضُوْعٌ کُلُّہٗ))(۱)

''یعنی آج کے دن جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا، اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ حضرت عباس کا سود ہے، وہ سب کا سب ختم کر دیا گیا''

چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ لوگوں کو سود پر قرض دیا کرتے تھے اس لئے آپ نے فرمایا کہ میں آج کے دن ان کا وہ سود جو دوسرے لوگوں کے ذمے ہے وہ ختم کرتا ہوں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ سود دس ہزار مثقال سونا تھا۔ اور ایک مثقال تقریباً ۴ ماشے کا ہوتا ہے۔ اور یہ دس ہزار مثقال سونا کوئی سرمایہ اور راس المال نہیں تھا بلکہ یہ وہ سود تھا جو اصل رقم پر واجب ہوا تھا۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ وہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی، رقم: ۱۲۳۷، سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب صفۃ حجۃ النبی رقم: ۱۶۲۸، سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب الخطبۃ یوم النحر، رقم: ۳۰۴۶، سنن الدارمی کتاب المناسک، باب فی سنۃ الحج، رقم: ۱۷۷۴

قرض جس پر دس ہزار مثقال سونے کا سود لگ گیا ہو کیا وہ صرف کھانے پینے کی ضرورت پوری کرنے کے لئے لیا گیا تھا؟ ظاہر ہے کہ وہ قرض تجارت کی غرض سے لیا گیا ہوگا۔

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں بینک کاری کی مثالیں

صحیح بخاری کی کتاب الجہاد میں ہے کہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس بالکل ایسا نظام قائم کیا ہوا تھا جیسے آج کل بینکنگ کا نظام ہوتا ہے، لوگ ان کے پاس بطور امانت بڑی بڑی رقمیں رکھوانے کے لئے آتے تو وہ ان سے کہتے:

"لٰکِنَّهُ سَلَفٌ"(۱)

''یہ امانت نہیں بلکہ یہ قرض ہے''

یعنی میں یہ رقم تم سے بطور قرض لیتا ہوں، یہ میرے ذمے قرض ہے، لیکن وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ قرض کی صورت میں طرفین کا فائدہ تھا، امانت رکھوانے والوں کا تو یہ فائدہ تھا کہ اگر یہ رقم امانت کے طور پر رکھی ہوتی تو اس صورت میں حفاظت کے باوجود اگر ہلاکت ہو جاتی یا چوری ہو جاتی تو اس کا ضمان حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پر نہ آتا۔ کیونکہ امانت کا ضمان نہیں ہوتا، اس کے برخلاف قرض کی رقم اگر ہلاک ہو جائے یا چوری ہو جائے تو اس کا ضمان قرض لینے والے پر آتا ہے۔ لہٰذا امانت رکھوانے والوں کا یہ فائدہ ہوا کہ ان کی رقم محفوظ اور مضمون ہو گئی۔ اور دوسری طرف حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا یہ فائدہ ہوا کہ ان کو اس بات کا اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ اس رقم کو جہاں چاہیں صرف کریں یا تجارت میں لگائیں۔ اس لئے کہ اگر وہ رقم امانت ہوتی تو امانت محضہ کو تجارت میں لگانا جائز نہیں۔

جب حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کے قرضوں کا حساب لگایا، چنانچہ فرماتے ہیں:

"فَحَسِبْتُ مَا عَلَيْهِ مِنَ الدُّيُوْنِ فَوَجَدْتُهُ أَلْفَيْ أَلْفٍ وَمِائَتَيْ أَلْفٍ"(۲)

(۱) صحیح البخاری، کتاب فرض الخمس، باب برکة الغازی فی ماله حیا ومیتا مع النبی وولاة الأمر، رقم: ۲۸۹۷

(۲) صحیح البخاری، کتاب فرض الخمس، باب برکة الغازی فی ماله حیا ومیتا مع النبی وولاة الأمر، رقم: ۲۸۹۷، شرح ابن بطال، رقم: ۳۱۲۹ (۳۶۳/۹)، حلیة الأولیاء (۹۱/۱)، السنن الکبری للبیهقی (۲۸۶/۶)، الطبقات لابن سعد (۱۹/۳)

''یعنی جب میں نے اپنے والد کے ذمے واجب الاداء قرضوں کا حساب لگایا تو وہ بائیس لاکھ دینار نکلے''

ظاہر ہے کہ اتنا بڑا قرض ''تجارتی قرض'' ہی تھا، صرفی قرض نہیں تھا، اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تجارتی قرضوں کا رواج تھا۔

تاریخ طبری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے حالات میں لکھا ہے کہ ہند بنت عتبہ جو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں اور بیت المال سے قرض دیئے جانے کی اجازت طلب کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرض کی اجازت دے دی۔ انہوں نے اس قرض کی رقم سے ''بلاد کلب'' میں جا کر تجارت کی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ قرض بھوک مٹانے کے لئے یا میت کی تدفین کے لئے نہیں لیا گیا تھا، بلکہ تجارت کے لئے گیا تھا، اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں عہد رسالت اور عہد صحابہ میں موجود ہیں جو میں نے ''تکملہ فتح الملہم'' میں تفصیل کے ساتھ لکھ دی ہیں وہاں دیکھ لیا جائے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوا کہ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ عہد رسالت میں تجارتی قرضے نہیں لئے جاتے تھے بلکہ تجارتی قرضوں کا رواج تھا، البتہ حضور ﷺ کے ''ربا'' کی حرمت کے اعلان کے بعد ان پر سود کا لین دین موقوف ہو گیا تھا۔ لہٰذا تجارتی سود کو جائز کہنے والوں نے جو دلیل پیش کی تھی اس کے صغریٰ اور کبریٰ دونوں غلط ثابت ہو گئے۔

سود کو جائز کہنے والوں کا ایک اور استدلال

''سود'' کو جائز قرار دینے والوں کی طرف ایک اور استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی ذاتی ضرورت کے لئے یا کھانے پینے کی ضرورت کے لئے قرض مانگتا ہے اور قرض دینے والا شخص قرض دینے سے پہلے اس سے ''سود'' کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ ظلم اور ناانصافی کی بات ہے اور ایک غیر انسانی حرکت ہے، لیکن جو شخص تجارت کی غرض سے قرض مانگتا ہے تاکہ اس قرض کی رقم کو تجارت میں لگا کر زیادہ سے زیادہ نفع کمائے اگر اس سے ''سود'' کا مطالبہ کیا جائے تو اس میں ظلم کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس استدلال کی تائید میں قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

﴿وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾(۱)

''یعنی اگر تم ''سود'' سے توبہ کر لو تو پھر تمہارا جو راس المال ہے وہ تمہارا حق ہے نہ تم

(۱) البقرۃ:۲۷۸

ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے''

اس آیت سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ''سود'' کی حرمت کی علت ''ظلم'' ہے اور یہ ظلم صرفی سود میں تو پایا جاتا ہے لیکن تجارتی سود میں نہیں پایا جاتا، اس لئے ''تجارتی سود'' حرام نہ ہونا چاہئے۔

علت اور حکم میں فرق

اس دلیل کے اندر چند در چند مغالطے ہیں۔ پہلا مغالطہ یہ ہے کہ اس دلیل میں ''ظلم'' کو ربا کی حرمت کے لئے علت قرار دیا ہے، حالانکہ ظلم دور کرنا ربا کی حرمت کی علت نہیں ہے بلکہ اس کی حکمت ہے۔ اور حکم کا دارومدار ''علت'' پر ہوتا ہے حکمت پر نہیں ہوتا۔ اس کی سادی سی مثال یہ سمجھئے کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سڑکوں پر سگنل لگے ہوتے ہیں اس میں تین رنگ کی بتیاں ہوتی ہیں، سرخ، پیلی، سبز جس وقت سرخ بتی جل رہی ہو اس وقت حکم یہ ہے کہ رک جاؤ۔ اور جس وقت سبز بتی جلے اس وقت چل پڑو۔ اور سگنل کا یہ نظام اس لئے قائم کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ ٹریفک میں نظم وضبط قائم کیا جائے اور حادثات کی روک تھام کی جائے اور تصادم کا خطرہ کم سے کم کیا جائے۔ اس میں یہ جو کہا گیا کہ ''سرخ بتی پر رک جاؤ'' یہ حکم ہے اور ''سرخ بتی'' اس حکم کی ''علت'' ہے۔ اور اس کے ذریعے حادثات کی روک تھام، اس حکم کی ''حکمت'' ہے۔ اب ایک شخص رات کے بارہ بجے گاڑی چلاتا ہوا سگنل کے پاس پہنچا تو سرخ بتی جل رہی تھی، لیکن چاروں طرف سے کوئی گاڑی اور ٹریفک نہیں آرہی تھی۔ اور تصادم اور حادثے کا کوئی خطرہ نہیں تھا اس وقت میں اگرچہ اس حکم کی ''حکمت'' نہیں پائی جا رہی تھی لیکن پھر بھی اس ڈرائیور کے لئے گاڑی روکنا ضروری ہے اس لئے کہ رکنے کے حکم کی جو علت ہے، یعنی ''سرخ بتی کا جلنا'' وہ پائی جا رہی ہے لہٰذا اگر وہ نہیں رکے گا تو قانون کی خلاف ورزی کے جرم میں پکڑا جائے گا۔

شراب حرام ہونے کی حرمت

اس طرح شریعت کے جتنے احکام ہیں ان سب میں حکم کا مدار ''علت'' پر ہوتا ہے، ''حکمت'' پر نہیں ہوتا، دنیا کے قوانین میں بھی یہی اصول کارفرما ہے، اور شریعت کے قانون میں بھی یہی اصول جاری ہے، قرآن کریم نے شراب کے بارے میں فرمایا:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ﴾(۱)

(۱) المائدة:۹۱

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کی حرمت کی ایک حکمت یہ بیان فرمائی کہ اس کے نتیجے میں آپس میں بغض اور عداوت پیدا ہوتی ہے، اور انسان اس کی وجہ سے اللہ کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے، اب اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ شراب اور جوا اسی وقت حرام ہے جب اس کے نتیجے میں عداوت اور بغض پیدا ہو، اور اگر عداوت اور بغض پیدا نہ ہو تو حرام نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال درست نہیں، اس لئے کہ عداوت اور بغض کا پیدا ہونا شراب اور جوئے کی حرمت کی ''حکمت'' ہے ''علت'' نہیں۔

ورنہ آجکل تو لوگ کہتے ہیں کہ شراب عداوت پیدا کرنے کے بجائے محبت اور دوستی پیدا کرتی ہے، چنانچہ آجکل جب دو دوست آپس میں ملتے ہیں تو شراب کے جام ایک دوسرے کے جام سے ٹکراتے ہیں، اور یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ ہم دونوں کے درمیان دوستی قائم ہوگئی ہے۔ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے ایک شاعر کہتا ہے:

پیمانہ وفا بر سر پیمانہ ہوا تھا

پہلے ''پیمانہ'' سے مراد ''عہد'' اور دوسرے پیمانہ سے مراد ''جام شراب'' یعنی جام شراب پر عہد وفا ہوا تھا، سوال یہ ہے کہ اگر شراب بغض اور عداوت پیدا کرنے کے بجائے دوستی کا ذریعہ بن رہی ہو تو اس صورت میں شراب حلال ہو جائے گی؟ یا کوئی شخص یہ کہے کہ میں شراب تو پیتا ہوں لیکن اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتا، اس لئے میرے لئے شراب حلال ہے، تو کیا اس شخص کے لئے شراب حلال ہو جائے گی؟ ظاہر ہے کہ حلال نہیں ہوگی، اس لئے کہ اللہ کے ذکر سے غفلت شراب کی حرمت کی ''حکمت'' ہے علت نہیں، اور حکم کا دار و مدار ''علت'' پر ہوتا ہے ''حکمت'' پر نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح سود کی حرمت کے بارے میں قرآن کریم نے یہ جو فرمایا:

﴿لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾(۱)

یہ بطور حکمت کے بیان فرمایا ہے، بطور ''علت'' کے بیان نہیں فرمایا۔ لہٰذا ''ربا'' کے حرام ہونے کا دار و مدار ظلم کے ہونے یا نہ ہونے پر نہیں بلکہ ''ربا'' کی حقیقت پائے جانے پر ہے۔ جہاں ربا کی حقیقت پائی جائے گی وہاں حرمت آجائے گی، چاہے وہاں ظلم پایا جائے یا نہ پایا جائے۔ یہ تو پہلا مغالطہ تھا۔

شرعی احکام میں غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں

دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ سود کو جائز کہنے والے کہتے ہیں کہ ''صرفی قرضوں'' میں اگر کوئی شخص

(۱) البقرة: ۲۷۹

سود کا مطالبہ کر رہا ہے تو چونکہ صرفی قرض طلب کرنے والا غریب ہوتا ہے، اس لئے اس سے سود کا مطالبہ کرنا ظلم ہے، بخلاف تجارتی قرضوں کے کیونکہ اس میں قرض طلب کرنے والا سرمایہ دار اور امیر ہوتا ہے، اور اس سے سود کا مطالبہ کرنا ظلم نہیں۔ یہ بھی ایک مغالطہ ہے کہ ایک جگہ سود لینا ظلم ہے اور دوسری جگہ ظلم نہیں، حالانکہ اصل سوال یہ ہے کہ قرض پر سود کا مطالبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ قرض پر سود کا مطالبہ کرنا جائز نہیں تو پھر اس میں غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں کہ جیسے ایک نان بائی روٹی فروخت کر رہا ہے ایک روٹی کی لاگت بارہ آنے آتی ہے۔ اور چار آنے وہ اپنے نفع کے رکھ کر ایک روپیہ کی روٹی فروخت کر رہا ہے اور اس نے غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں رکھا کہ غریب کو کم قیمت پر روٹی دے اور امیر کو زیادہ قیمت پر روٹی دے، بلکہ سب کو ایک ہی قیمت پر دے رہا ہے، لیکن کوئی بھی شخص اس سے یہ نہیں کہتا کہ تم غریب آدمی کو ایک روپے کی روٹی فروخت کر کے ظلم کر رہے ہو اس لئے کہ وہ اپنا حق وصول کر رہا ہے اور امیر اور غریب دونوں سے نفع کا مطالبہ کرنا درست ہے کوئی ظلم نہیں۔

بالکل اسی طرح ایک غریب شخص دوسرے سے قرض کا مطالبہ کرتا ہے اور دوسرا شخص اس قرض پر سود کا مطالبہ کرتا ہے تو آپ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ قرض لینے والا غریب ہے اس لئے اس سے سود کا مطالبہ کرنا ظلم ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص غریب آدمی کو ایک روپے کی روٹی فروخت کر رہا ہے تو یہ ظلم نہیں اور دوسرا شخص اس غریب سے قرض پر سود کا مطالبہ کر رہا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ یہ ظلم ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ظلم کی علت معاملہ کرنے والی ''غربت'' نہیں بلکہ ظلم کی اصل علت ''روپیہ'' ہے اور یہ علت غریب کے قرض میں جس طرح پائی جارہی ہے امیر کے قرض میں بھی موجود ہے۔ حاصل یہ ہے کہ روٹی پر نفع کا مطالبہ کرنا لاگت پر زیادتی کر کے فروخت کرنا ظلم نہیں بلکہ جائز ہے اور انصاف کے مطابق ہے۔ لیکن ''روپے'' پر زیادتی کا مطالبہ کرنا انصاف کے بھی خلاف ہے اور شریعت کے بھی خلاف ہے، کیونکہ ''روپیہ'' ایسی چیز نہیں کہ جس پر منافع کا مطالبہ کیا جائے لہٰذا روپیہ قرض لینے والا امیر ہو یا غریب ہو، دونوں صورتوں میں حرمت کا حکم عائد ہوگا۔

نفع اور نقصان دونوں میں شرکت کریں

تجارتی سود کو جائز کہنے والے ایک بات یہ بھی کہتے ہیں کہ تجارتی سود میں ظلم نہیں۔ یہ بھی بالکل غلط بات ہے، اس کو ذرا تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دیکھئے! شریعت نے یہ اصول بتایا ہے کہ اگر تم کسی شخص کو کوئی رقم قرض دے رہے ہو تو تم پہلے یہ فیصلہ کرلو کہ اس رقم کے ذریعہ اس کی

امداد کرنا چاہتے ہو یا اس کے کاروبار میں شریک ہونا چاہتے ہو؟ اگر قرض دینے سے تمہارا مقصد اس کی امداد کرنا ہے تو پھر وہ محض امداد ہی رہنی چاہئے۔ اس پر پھر تمہیں کسی زیادتی کے مطالبہ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اور اگر اس رقم کے ذریعہ اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہو تو پھر اس صورت میں تمہیں اس کاروبار کے نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہونا پڑے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ یہ کہہ دیں کہ منافع میں تو ہم حصہ دار بنیں گے اور نقصان میں حصہ دار نہیں بنیں گے۔

تجارتی سود میں قرض دینے والا بینک سرمایہ دار سے کہتا ہے کہ میں اس قرض پر تم سے پندرہ فیصد سود لوں گا، چاہے تمہیں اس تجارت میں نفع ہو یا نقصان ہو۔ مجھے تمہارے نفع ونقصان سے کوئی سروکار نہیں مجھے تو اپنے سود سے مطلب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات شریعت کے اصول کے خلاف ہے۔

قرض دینے والے پر زیادہ ظلم ہے

اس تجارتی سود کا ایسا گورکھ دھندا ہے کہ اس کی ہر صورت میں ظلم ہے، اگر سرمایہ دار تاجر کو نفع ہو تب بھی ظلم ہے، اگر نقصان ہو تب بھی ظلم ہے، نفع کی صورت میں قرض دینے والے پر ظلم ہے اور نقصان کی صورت میں قرض لینے والے پر ظلم ہے آج کی دنیا میں بینکوں کے اندر جس طرح کا مالیاتی نظام جاری ہے اس میں قرض دینے والے پر زیادہ ظلم ہو رہا ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات سمجھ لیں کہ عام طور پر بینکوں کے اندر عوام کی رکھی ہوئی امانتیں ہوتی ہیں، گویا عوام کی رقم سے بینک وجود میں آتے ہیں۔ لیکن اگر یہی عوام بینک سے قرضہ لینے جائیں تو بینک ان کو قرض نہیں دے گا۔ بلکہ بینک ان سرمایہ داروں کو قرض دیتا ہے جن کے پاس پہلے سے سرمایہ موجود ہو۔ لیکن بینک سے قرضہ لے کر بہت بڑے بڑے پیمانے پر تجارت کرنا چاہتے ہیں، یا وہ سرمایہ دار جن کی فیکٹریاں اور ملیں قائم ہیں وہ ان میں مزید اضافہ کرنے کے لئے بینک سے قرض لیتے ہیں۔

اب ہوتا یہ ہے کہ مثلاً ایک سرمایہ دار نے بینک سے ایک لاکھ روپیہ پندرہ فیصد سود کی بنیاد پر قرض لیا، اور اس میں کچھ رقم اپنی طرف سے ملا کر کاروبار شروع کیا، بعض اوقات کاروبار میں سو فیصد نفع بھی ہو جاتا ہے اور بعض اوقات کم بھی ہوتا ہے۔ اب فرض کریں کہ اس سرمایہ دار کو اس کاروبار میں سو فیصد نفع ہوا، جس کے نتیجے میں ایک لاکھ کے دو لاکھ ہوئے، ایک لاکھ اصل سرمایہ اور ایک لاکھ نفع کے۔ اس نفع میں سے اس نے پندرہ ہزار روپے بینک کو بطور سود ادا کئے اور باقی ۸۵ ہزار روپے اپنی جیب میں رکھ لئے۔ اور پھر بینک نے ان ۱۵ ہزار روپے میں سے اپنے اخراجات اور مصارف نکالنے

کے بعد صرف سات ہزار روپے ان عوام کو دیئے جن کے پیسوں سے تاجر نے تجارت کر کے ایک لاکھ روپے کمائے تھے، اور اس میں سے خود تاجر نے ۸۵ ہزار روپے رکھ لئے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ اس عوام پر کتنا بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ لیکن وہ عوام بہت خوش ہے کہ اس کو ایک لاکھ روپے پر سات ہزار روپے نفع کے مل گئے۔ حالانکہ اس کے ایک لاکھ روپے پر ایک لاکھ روپے کا نفع ہوا تھا۔

پھر دوسری طرف عوام کو جو سات ہزار روپے ملے، سرمایہ دار وہ سات ہزار روپے بھی دوسری طرف سے وصول کر لیتا ہے، وہ اس طرح کہ تاجروں کا اصول یہ ہے کہ تاجر جو سود بینک کو ادا کرتا ہے وہ اس سود کو اپنی تیار کردہ اشیاء کی لاگت اور مصارف میں شامل کر دیتا ہے۔ مثلاً فرض کریں کہ اس تاجر نے اس ایک لاکھ روپے سے کپڑا تیار کیا، اس کپڑے کی قیمت مقرر کرنے سے پہلے وہ اس کپڑے کی تیاری پر آنے والی لاگت کا حساب لگائے گا۔ اور اس لاگت میں اس پندرہ ہزار کو بھی شامل کرے گا جو اس نے بطور سود کے بینک کو ادا کیے تھے، اور پھر اس پر اپنا نفع رکھ کر اس کپڑے کی قیمت مقرر کرے گا، اس طرح کپڑے کی قیمت میں خود بخود پندرہ فیصد کا اضافہ ہو جائے گا، اور بازار میں جب عوام اس کپڑے کو خریدیں گے تو پندرہ فیصد سود کی رقم ادا کر کے کریں گے جو پندرہ فیصد تاجر نے بینک کو ادا کیے تھے۔ اس طرح سرمایہ دار ایک طرف تو عوام کو صرف سات فیصد منافع دے رہا ہے، لیکن دوسری طرف وہ ان عوام سے پندرہ فیصد وصول بھی کر رہا ہے، لیکن وہ عوام خوش ہیں کہ مجھے سات فیصد نفع مل گیا، حالانکہ حقیقت میں اس کو ایک لاکھ روپے کے ۹۲ ہزار روپے وصول ہوئے۔

یہ تفصیل تو اس صورت میں تھی جب تاجر کو نفع ہو، اور اگر نقصان ہو جائے تو نقصان کی صورت میں وہ نقصان کی تلافی کے لئے مزید قرض بینک سے وصول کرتا ہے، اور قرض کی رقم میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ بینک دیوالیہ ہو جاتا ہے، اور بینک کے دیوالیہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس بینک میں رقمیں رکھوائی تھیں وہ اب واپس نہیں ملیں گی۔ جیسے گذشتہ چند سال پہلے ''بی سی سی آئی'' بینک میں ہوا۔ گویا کہ اس صورت میں نقصان سارا عوام کا ہوا، تاجر کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ ''تجارتی سود'' کے نتیجے میں جو ظلم ہوتا ہے اس نے ''صرفی سود'' کے ظلم کو بھی مات کر دیا ہے۔ اس لئے کہ تجارت میں پیسہ سارا عوام کا استعمال ہو رہا ہے، پھر اگر نفع ہو تو سرمایہ دار کا اور اگر نقصان ہو تو عوام کا۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہ تو نقصان کی وہ صورت تھی جس میں بینک ہی دیوالیہ ہو جائے، لیکن اگر اس تجارت کے دوران سرمایہ دار کا جزوی نقصان ہو جائے۔ مثلاً اس نے کپڑا بنانے کے لئے روئی خریدی تھی اس روئی میں آگ لگ گئی تو اس نقصان کی تلافی کے لئے اس سرمایہ دار نے ایک دوسرا راستہ نکالا ہے۔ وہ

ہے ''انشورنس کمپنی'' وہ انشورنس کمپنی اس نقصان کی تلافی کرے گی، اور انشورنس کمپنی میں جو روپیہ ہے وہ بھی غریب عوام کا ہے۔ وہ عوام جو اپنی گاڑی اس وقت تک روڈ پر نہیں چلا سکتے جب تک انشورنس نہ کرالیں۔ عوام کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، لیکن وہ بیمہ کی قسطیں ہر ماہ جمع کرانے پر مجبور ہیں۔ لہٰذا وہ سرمایہ دار انہی عوام کے پیسوں سے اپنے نقصان کی تلافی کرتا ہے۔

سود کا ادنیٰ شعبہ اپنی ماں سے زنا کے برابر ہے

یہ سارا گورکھ دھندا اس لئے کیا جارہا ہے تا کہ اگر نفع ہو تو سرمایہ دار کا ہو، اور اگر نقصان ہو تو عوام کا ہو، اور اس کے نتیجے میں دولت نیچے کی طرف جانے کے بجائے اوپر کی طرف جارہی ہے، جو مالدار ہے وہ مالدار تر ہوتا جارہا ہے، اور جو غریب ہے وہ غریب تر بنتا جارہا ہے، انہی خرابیوں کی وجہ سے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ بَابًا أَدْنَاهَا كَالَّذِيْ يَقَعُ عَلٰى أُمِّهٖ))(۱)

''یعنی ربا کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں، اور اس کا ادنیٰ ترین شعبہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے زنا کرنا''

اَلْعِيَاذُ بِاللّٰهِ، لہٰذا یہ کہنا کہ تجارتی سود میں ظلم نہیں یہ بالکل غلط ہے، اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہوسکتا ہے کہ اجتماعی طور پر پوری قوم کو معاشی بدحالی کے اندر مبتلا کیا جارہا ہے، آج پوری دنیا میں سودی نظام جاری ہے اور اس نظام نے پوری دنیا کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے، اور انشاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کے سامنے اس کی حقیقت کھل جائے گی، اور ان کو پتہ چل جائے گا کہ قرآن کریم نے سود کے خلاف اعلان جنگ کیوں کیا تھا؟

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

(۱) الترغیب والترهیب، رقم: ۲۸۴۷ (۳/۵)، شعب الإیمان، رقم: ۵۵۲۰ (۴/۳۹۴)

سود لینے سے بخل بڑھتا ہے☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''سود لینے سے بخل بڑھتا ہے، کیونکہ سود لینے کا سبب ہی بخل ہے، جتنا سود لیتا ہے بخل اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے تن پر بھی خرچ نہیں کرسکتا'' (۱)

''بخل'' کی خاصیت یہ ہے کہ جتنا مال بڑھتا جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ مال کے بڑھنے سے اس سے استغناء پیدا ہو، اس کی حرص اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور مال کی محبت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے۔ یعنی انسان کو کتنا ہی مال مل جائے وہ اس مال پر قناعت کرنے کے بجائے اور زیادہ مال حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اور قاعدہ کا تقاضا یہ ہے کہ جب مال بڑھ جائے تو طبیعت میں استغناء پیدا ہوجائے لیکن استغناء بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی خرچ کرنے کا داعیہ زیادہ ہوتا ہے بلکہ مال کی محبت اور بڑھ جاتی ہے۔ ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ لَابْتَغٰى أَنْ يَكُوْنَ لَهُ وَادِيَانِ، وَلَوْ كَانَ لَهُ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُوْنَ لَهُ ثَالِثًا، وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ))(۲)

''اگر ابن آدم کو سونے کی بھری ایک وادی مل جائے تو وہ چاہے گا کہ دو وادیاں مل جائیں، اور اگر دو وادیاں سونے کی بھری مل جائیں تو اس کی خواہش ہوگی کہ تین مل جائیں'' پھر آخر

☆ اصلاحی مجالس (۵/۱۱۰ تا ۱۲۱)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی۔

(۱) انفاس عیسی: ص ۱۹۱

(۲) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب ما يتقى من فتنة المال، رقم: ۵۹۵۹، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب لو أن لابن آدم واديين لابتغى ثالثا، رقم: ۱۷۳۸، سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء لو كان لابن آدم واديان من مال، رقم: ۲۲۵۹، مسند أحمد، رقم: ۱۲۲۵۶

میں خوبصورت حکیمانہ جملہ ارشاد فرمایا:

((وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ))

یعنی آدم کا پیٹ قبر کی مٹی کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں بھر سکتی۔ انسان کا پیٹ اسی وقت بھرے گا جب اس کے اندر مٹی بھرے گی، جب تک انسان قناعت پیدا نہ کرے اور مال کی محبت اس کے دل میں ترقی کرتی چلی جائے تو اس کے نتیجے میں اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔

ایک سوداگر کا عجیب واقعہ

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

آں شنیدہ استی کہ در صحرائے غور
رختِ سالار افتادہ اسپ طور
گفت چشم تنگ دنیادار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

"میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں کہ غور کے صحراء میں ایک بہت بڑے سوداگر کا سامان خچر سے گراپڑا تھا اور وہ خچر بھی مرا ہوا پڑا تھا اور خود وہ سوداگر بھی مرا ہوتھا۔ اور وہ سامان جو بکھرا پڑا تھا، وہ زبان حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا دار کی تنگ نگاہ کو صرف دو چیزیں بھر سکتی ہیں، یا قناعت یا قبر کی مٹی، تیسری کوئی چیز اس کو پر نہیں کرسکتی"

بہر حال! بخل کی خاصیت یہ ہے کہ جتنا مال بڑھتا چلا جاتا ہے، اتنی ہی حرص بڑھتی چلی جاتی ہے اور اتنی مال ہی مال کی محبت بڑھتی چلی جاتی ہے اور خرچ کرنے میں اور زیادہ رکاوٹ پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

ایک بڑے سرمایہ دار کا قول

کراچی میں ایک بہت بڑے سرمایہ دار ہیں اور پاکستان کے مشہور دو چار سرمایہ داروں میں سے ایک ہیں، ارب پتی اور کھرب پتی ہوں گے، ایک دن وہ میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت پیسہ دیا ہے، آپ نے بہت سے کارخانے بنائے، فیکٹریاں لگائیں، سب کچھ کرلیا، اب کچھ کام نفع کی خاطر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاطر کرلو، وہ یہ کہ تم ایک ایسا بینک قائم کرد جو سود

کے بغیر کام کرے، تمہارے پاس چونکہ پیسہ ہے، اس لئے تم یہ کام کرسکتے ہو، وہ کہنے لگے کہ مولانا صاحب! وہ بینک پھر کیسے چلے گا؟ میں نے کہا ان شاء اللہ چلے گا، لیکن تم یہ سوچ کر قائم کرو کہ جو پیسہ تم نے اس بینک میں لگا دیا وہ گیا، جب اللہ کے فضل سے تمہارے پاس اربوں کھربوں روپیہ موجود ہے، تو اگر اس بینک کے قیام پر چند کروڑ روپے لگا دو گے تو کیا فرق پڑے گا اور چند کروڑ روپے لگا کر ان کو بھول جاؤ۔ کہنے لگے کہ میں ان کو پھر بھول جاؤں؟ میں نے کہا کہ تم تو بھول جاؤ کہ وہ چند کروڑ روپے کہاں گئے، البتہ اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو اس میں نفع بھی عطا فرمادیں گے لیکن تم اس کو بھول جاؤ۔ وہ آخر میں کہنے لگے کہ مولانا صاحب! بات تو آپ صحیح کہتے ہو مگر ہاتھ کی کھجلی کو میں کیا کروں!!

غریب اور امیر کے خرچ کرنے میں فرق

یہ ہے مال کو بڑھانے کی کھجلی، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ یہ ''بخل'' بھی پھر رفتہ رفتہ کھجلی کی شکل اختیار کرلیتا ہے، پھر انسان کے پاس کتنا ہی پیسہ آجائے مگر اس کی حرص نہیں مٹتی، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جتنا غریب آدمی دو پانچ روپے اطمینان اور خوش دلی سے چندہ دیتا ہے، وہ مالدار جس کے پاس اربوں کھربوں روپیہ ہے، وہ اتنی خوش دلی سے نہیں دیتا، حالانکہ اس مالدار کے پاس گنجائش زیادہ ہے اور اس غریب کے پاس گنجائش بالکل نہیں، یہ سب حبِّ مال کا نتیجہ ہے۔

سود کی ذہنیت بخل پیدا کرتی ہے

اس ''بخل'' کا سب سے بڑا ذریعہ سود ہے، کیونکہ سود کا مطلب یہ ہے کہ کام کچھ نہ کرو اور نہ کوئی خطرہ مول لو اور پیسے کے اوپر پیسہ بناؤ۔ یہ بخیل کا کام ہے اور سود کی ذہنیت خود انسان کے اندر بخل پیدا کرتی ہے، دنیا میں جتنی سود خور قومیں گذری ہیں، سب سے زیادہ کنجوس بھی وہی قومیں ہیں، دنیا میں سب سے زیادہ سود خور قوم ''یہودی'' ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ﴾(۱)

''اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیتے تھے، حالانکہ ان کو اس سے ممانعت کی گئی تھی''

آج بھی دنیا کا سارا سودی کاروبار ان یہودیوں کے ہاتھ میں ہے اور یہی سب سے زیادہ کنجوس قوم ہے اور ساری دنیا میں ان کی کنجوسی کی شہرت ہے۔

(۱) النساء: ۱۶۱

یہودی ''شائی لاک'' کا قصہ

آپ نے ''شائی لاک'' کا قصہ سنا ہوگا، یہ روم کے بادشاہ کے زمانے کا قصہ ہے، ایک شخص یہودی تھا، اس کا نام ''شائی لاک'' تھا، ایک ضرورت منداس کے پاس پیسے لینے آیا، شائی لاک نے کہا کہ میں سود پر قرض دوں گا، چنانچہ اس نے سود پر اس سے کہا کہ اتنے دنوں کے اندر ادا کر دینا۔ قرض لینے والا غریب آدمی تھا، وہ اپنے کھانے پینے کی ضرورت کے لئے قرض لے رہا تھا، جب وہ دن پورے ہوگئے اور ادئیگی کی تاریخ آگئی تو شائی لاک اس کے گھر پیسے وصول کرنے کے لئے پہنچ گیا۔ اس غریب نے کہا کہ میرے پاس تو اس وقت تھوڑے پیسے ہیں، چنانچہ اس نے اس کو کچھ پیسے دے دیئے اور کہا کہ اور نہیں ہیں ورنہ میں تمہیں دے دیتا، شائی لاک نے کہا کہ اچھا وہ سود اب ڈبل ہوگیا اور ادا کرنے کی تاریخ مقرر کر دی۔ جب دوبارہ وہ تاریخ آئی تو شائی لاک پھر اس کے گھر پہنچ گیا، اس غریب نے کہا کہ تم نے تو سود ڈبل کر دیا، اس لئے اصل رقم لے لو، اس نے کہا کہ نہیں، میں تو پورا سود لوں گا اور اب میں تمہاری مدت نہیں بڑھاؤں گا، اس غریب نے کہا کہ میرے پاس ادا کرنے کے لئے رقم ہی نہیں ہے تو میں کیا کروں، شائی لاک نے کہا کہ میں ایک اور تاریخ مقرر کرتا ہوں، اگر اس تاریخ پر تم نے روپیہ ادا نہ کیا تو تمہارے جسم کا ایک پونڈ گوشت نکالوں گا اور اس کو کھاؤں گا اور پیسے الگ لوں گا، جب وہ تاریخ آگئی اور وہ غریب سود ادا نہیں کر سکا تو شائی لاک اس کے گھر پر چھری چاقو لے کر پہنچ گیا۔

وہ غریب آدمی پریشان ہوگیا اور کسی طرح بچتے بچاتے روم کے بادشاہ کے دربار میں پہنچ گیا اور بادشاہ سے کہا کہ شائی لاک میرا گوشت کاٹنے آرہا ہے، چنانچہ اس کے بعد عدالت میں مقدمہ چلا اور اس کو جیل میں بند کر دیا گیا، شائی لاک نے عدالت میں بڑی زوردار تقریر کی، اور اس تقریر میں اس نے کہا کہ میرے ساتھ آپ انصاف کریں، یہ شخص اتنے دنوں سے ٹال مٹول کر رہا ہے اور میرے پیسے نہیں دے رہا ہے، اور پھر اس نے آخر میں خود اپنی رضامندی سے اپنا گوشت کاٹنے کے لئے کہا تھا، اب عدالت کو چاہئے کہ وہ مجھے اس بات کی ڈگری دے کہ اس کا گوشت نکال لوں، اس لئے کہ انصاف کا تقاضا یہی ہے۔

وہ غریب مقروض تو جیل میں بند تھا اور عدالت میں نہیں آسکتا تھا، اس لئے اس کی بیوی عدالت میں آئی اور اس نے عدالت میں تقریر کی، اس تقریر میں اس نے کہا کہ شائی لاک یہ کہتا ہے کہ انصاف دلاؤ اور اس کے کہنے کے مطابق انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مقروض کا گوشت نکال کر کھایا

جائے، میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ اگر ہم سب لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے لگیں تو ہمارا کہاں ٹھکانہ ہوگا، اس دنیا میں انصاف ہی سب کچھ نہیں، بلکہ ایک چیز رحم بھی ہے، اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائیں گے تو تب ہم نجات پائیں گے، اس کے بغیر نجات نہیں پائیں گے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس غریب کے حق میں رحم کی بنیاد پر فیصلہ دیا۔ بہر حال! شائی لاک کی طرح یہودی قوم ساری دنیا میں بخیل مشہور رہی ہے۔

ہندو، سودخور قوم

دنیا میں دوسری سب سے بڑی سود خور قوم ''ہندو'' ہے۔ ہندو ''بنیا'' مشہور ہے، ہندوستان کے ہندو تاجر ''بنیا'' کہا جاتا ہے، ان کو ''مہاجن'' بھی کہتے ہیں، یہ سود لے کر کھانے والے ہیں، ان کی کنجوسی ضرب المثل ہے، ان کے ہاں ایک ایک پائی کا حساب و کتاب ہوتا ہے۔

ہندی زبان کی ایک ضرب المثل

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندی زبان کی ایک بڑے مزے کی ''ضرب المثل'' سنایا کرتے تھے، وہ یہ کہ:

> ''لالہ جی گئے پاؤنے، چار دن میں آئے، لالہ جی کے گھر آ گئے چار پاؤنے، لالہ جی نہ گئے نہ آئے''

ہندو بنیے کو ''لالہ جی'' کہا جاتا تھا، ''پاؤنے'' کے معنی ہیں ''مہمان''۔ یعنی لالہ جی کسی کے گھر مہمان بن کر چلے گئے اور چار دن اس کے گھر قیام فرمایا اور چار دن کے بعد واپس آئے، اس طرح چار دن کے کھانے کا خرچ بچ گیا، پھر ایک دن لالہ کے گھر چار مہمان آ گئے، اب جو کچھ چار دن کے کھانے کی بچت ہوئی تھی وہ برابر گئی، اس لئے لالہ جی نہ گئے اور نہ آئے۔

بہر حال! ان کے ہاں اس طرح کنجوسی کا حساب و کتاب رہتا ہے کہ ایک پائی نہ جانے پائے، درحقیقت سود کی ذہنیت یہ کنجوسی پیدا کرتی ہے۔

مالیاتی گناہ بخل پیدا کرتے ہیں

یاد رکھئے! جس شخص کو اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پرواہ نہیں، اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کے پاس جتنا پیسہ بڑھتا چلا جائے گا، اتنا ہی اس کا بخل بڑھتا چلا جائے گا، اتنی ہی کی

اس کی حرص بڑھے گی اور پیسے خرچ کرتے ہوئے اس کی اتنی ہی جان نکلے گی۔ غریب آدمی اطمینان سے پیسہ خرچ کردے گا، لیکن بڑا سرمایہ دار جو سرمایہ پر سانپ بن کر بیٹھا ہے، وہ خرچ کرنے پر تیار نہیں ہوگا۔ یاد رکھئے! یہ مالیاتی گناہ بخل پیدا کرتے ہیں اور بخل کے نتیجے "حب مال" اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ دعا کثرت سے کریں

اس سے بچنے کا راستہ صرف ایک ہے، وہ یہ کہ آدمی اپنے آپ کو شریعت کا تابع بنائے اور قناعت دل میں پیدا کرے اور یہ دعا کرے کہ اے اللہ! جائز اور حلال طریقے سے آپ مجھے جتنا عطا فرمادیں گے، میرے لئے وہی نعمت ہے اور یہ دعا کرے جو حضور اقدس ﷺ نے فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْهِ وَاخْلُفْ عَلٰی كُلِّ غَائِبَةٍ لِیْ مِنْكَ بِخَیْرٍ))(۱)

نبی کریم ﷺ کے ایک ایک لفظ پر آدمی قربان ہوجائے، فرمایا کہ اے اللہ! جو کچھ رزق آپ نے عطا فرمایا ہے، مجھے اس پر قناعت عطا فرمائیے اور مجھے اس میں برکت دے دیجئے، جب تھوڑے مال میں اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمادیتے ہیں تو پھر وہ لاکھوں کروڑوں سے زیادہ فائدہ پہنچا دیتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق میں برکت نہ ہوتو پھر کروڑوں اور لاکھوں بھی بیکار ہوجاتے ہیں، ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ آگے فرمایا کہ اے اللہ! جو مال میرے پاس موجود نہیں ہے، اس کے بدلے میں مجھے وہ چیز عطا فرما جو آپ کے نزدیک خیر ہو، یعنی میں کتنا بھی غور وفکر کرلوں کہ میرے لئے کیا چیز اچھی ہے اور کیا چیز بری ہے، لیکن میری محدود فکر اور میری محدود سوچ کبھی بھی حقیقت حال تک پہنچنے کے لئے کافی نہیں ہوسکتی، لہٰذا اے اللہ! یہ معاملہ میں آپ کے اوپر چھوڑتا ہوں، یا اللہ! جو چیز میرے پاس نہیں ہے، اس کے بدلے میں مجھے وہ چیز عطا فرما جو آپ کے نزدیک خیر ہو۔

حلال طریقے سے مال میں اضافے کی کوشش کرنا جائز ہے

لیکن یہ بھی سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ سے قناعت کی دعا تو کریں لیکن جائز اور حلال طریقے سے اس مال میں اضافے کی کوشش کرنا قناعت کے منافی نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ خود حضور ﷺ نے

---

(۱) مصنف ابن أبی شیبة(۱۰۳/۷)، کنز العمال، رقم:۵۰۹۴(۶۹۰/۲)، المستدرك علی الصحیحین، رقم:۱۸۳۱(۴۲۴/۴)، الأدب المفرد، رقم:۷۰۲(۴۹۲/۲)

تجارت کی ترغیب بھی عطا فرمائی، اگر حلال طریقے سے مال بڑھانا قناعت کے خلاف ہوتا تو آپ تجارت کی ترغیب نہ دیتے، اس سے پتہ چلا کہ حلال طریقے سے مال کو بڑھانے کی اجازت ہے۔ مگر یہ سوچتے ہوئے کہ جائز اور حلال طریقے سے اللہ تعالیٰ جتنا عطا فرمائیں گے وہ نعمت ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے استعمال کریں گے اور ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے کی فکر دل میں کبھی بھی پیدا نہیں کریں گے اور اس مال کی محبت کو دل پر غالب نہیں ہونے دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

اشیاء کی حلت وحرمت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ.

عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّا نُرْسِلُ كِلَابًا لَنَا مُعَلَّمَةً قَالَ((كُلْ مَا أَمْسَكْنَ عَلَيْكَ)) قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَإِنْ قَتَلْنَ؟ قَالَ((وَإِنْ قَتَلْنَ مَا لَمْ يَشْرَكْهَا كَلْبٌ مِنْ غَيْرِهَا)) قَالَ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّا نَرْمِيْ بِالْمِعْرَاضِ قَالَ((مَا خَزَقَ فَكُلْ وَمَا أَصَابَ بِعَرْضِهٖ فَلَا تَأْكُلْ))(۱)

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، یہ حاتم طائی کے بیٹے ہیں جو اپنی سخاوت میں مشہور ہیں، یہ پہلے نصرانی تھے بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شکار کا مشغلہ زیادہ رہتا تھا، اس وجہ سے صید کے باب میں ان سے کثرت سے روایات مروی ہیں۔

فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! ہم اپنے سدھائے ہوئے کتے جن کو شکار کی تربیت دی ہوئی ہوتی ہے شکار کرنے کے لئے چھوڑتے ہیں جب وہ کتے اس شکار کے جانور کو ہمارے پاس لاتے ہیں تو بعض اوقات وہ جانور اس وقت تک مر چکا ہوتا ہے تو اب شکار کو ہمارے لئے کھانا جائز ہے یا نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

☆ تقریر ترمذی (۱۲۵/۲ تا ۱۳۰) زیر نظر بیان سنن ترمذی شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے طلبہ کے سامنے اشیاء کی حلت وحرمت کے اسلامی نظریہ پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصید عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ماجاء ما یؤکل من صید الکلب وما لا یؤکل، رقم: ۱۳۸۵، صحیح البخاری، کتاب الذبائح والصید، رقم: ۵۰۵۳، صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح وما یؤکل...... ، رقم: ۳۵۱۰، سنن النسائی، کتاب الصید والذبائح، رقم: ۴۱۹۰، سنن أبی داود، کتاب الصید، رقم: ۲۴۶۴، سنن ابن ماجه، کتاب الصید، رقم: ۳۱۹۹، مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۱۷۵۳۴، سنن الدارمی، کتاب الصید، رقم: ۱۹۱۸

جس جانور کو وہ کتے تمہارے لئے روک کر لائے ہوں ان کو تم کھا سکتے ہو، یعنی کتے نے شکار کرنے کے بعد شکار کے جانور کھایا نہیں بلکہ اس کو تمہارے لئے روک کر رکھا ہے وہ تم کھا سکتے ہو، لیکن اگر کتے نے اس جانور میں سے خود کچھ کھالیا ہے تو اب اس شکار کو تم نہیں کھا سکتے''

اس لئے کہ اس صورت میں وہ جانور وَمَـا اَکَـلَ السَّبُعُ میں داخل ہو جائے گا۔ جس کے کھانے کی ممانعت قرآن میں آچکی ہے، اور اس کتے کا خود کھالینا اس بات کی علامت ہے کہ وہ تمہارے لئے شکار نہیں کر رہا تھا بلکہ اس نے اپنے لئے شکار کیا تھا، اس لئے اس کا کھانا تمہارے لئے جائز نہیں۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! چاہے ان کتوں نے اس جانور کو قتل ہی کر دیا ہو اور ہمیں ذبح کرنے کا موقع نہ ملا ہو تب بھی یہی حکم ہے، کہ اس جانور کا کھانا ہمارے لئے حلال ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اگرچہ ان کتوں نے جان سے مار دیا ہو تب بھی تمہارے لئے کھانا جائز ہے، جب تک ان کتوں کے ساتھ کوئی اور کتا شریک نہ ہو گیا ہو''

یعنی تم نے اپنا کتا ''بسم اللہ'' پڑھ کر شکار کی طرف چھوڑا اور جب اس نے جانور پر حملہ کیا تو اس وقت ایک دوسرا کتا بھی حملہ کرنے میں شریک ہو گیا اور دونوں نے ملکر شکار کو ہلاک کیا تو اس صورت میں وہ جانور کھانا تمہارے لئے جائز نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ تم نے اپنے کتے پر تو ''بسم اللہ'' پڑھی تھی لیکن دوسرے کتے پر نہیں پڑھی تھی، جبکہ جانور دونوں کے مشترکہ حملے سے ہلاک ہوا اس لئے یہ جانور تمہارے لئے حلال نہیں۔

اگر مشروع اور غیر مشروع دو سبب پائے جائیں تو جانور حلال نہیں

اس حدیث سے فقہاء کرام نے یہ مسئلہ مستنبط فرمایا ہے کہ اگر کسی جانور کی ہلاکت میں دو سبب جمع ہو گئے ہوں جس میں سے ایک سبب مشروع ہو اور دوسرا سبب غیر مشروع ہو تو اس صورت میں وہ جانور حلال نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک پرندے کو تیر مارا اور تیر کے لگنے کے بعد وہ پرندہ پانی میں گر گیا اور پانی کے اندر وہ مردہ ملا تو اب یہ معلوم نہیں کہ اس کی موت تیر لگنے کی وجہ سے واقع ہوئی یا پانی میں ڈوبنے کی وجہ سے موت ہوئی۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ اگر تیر لگنے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی تھی تو وہ جانور حلال ہوگا اور اگر پانی کی وجہ سے موت واقع ہوئی تھی تو وہ پرندہ حرام ہوگا لیکن چونکہ یہاں دو

سبب ہلاکت ایک ساتھ جمع ہوگئے تھے اس لئے وہ جانور حرام ہوگا اور اس کا کھانا جائز نہیں ہوگا۔

حلت اور حرمت کے بارے میں بنیادی اصول

اس مسئلہ کی بنیاد ایک بنیادی اصول پر ہے، وہ یہ کہ گوشت میں اصل حرمت ہے اور گوشت کے علاوہ دوسری اشیاء میں اصل حلت اور اباحت ہے، لہٰذا دوسری اشیاء اس وقت تک جائز اور مباح سمجھی جائیں گی جب تک ان میں دلیل حرمت یقینی طور پر نہ پائی جائے۔ مثلاً روٹی کے اندر اصل حلت اور اباحت ہے، چاہے وہ روٹی تم نے کسی کافر سے خریدی ہو اس روٹی کو کھانا تمہارے لئے حلال ہے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس میں کوئی نجس اور حرام چیز شامل کی گئی ہے، البتہ جب یہ ثابت ہو جائے کہ اس میں فلاں حرام یا نجس چیز شامل کی گئی ہے تو اس وقت وہ روٹی حرام ہو جائے گی، لیکن گوشت میں اصل حرمت ہے، جب تک اس بات پر دلیل قائم نہ ہو جائے کہ یہ جانور مشروع طریقے سے ذبح کیا گیا ہے اس وقت تک اس جانور کے گوشت کو حرام سمجھا جائے گا، لہٰذا اگر کوئی کافر گوشت فروخت کر رہا ہو تو جب تک دلیل شرعی سے ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ جانور مشروع طریقے سے ذبح کیا گیا ہے اس وقت تک اس گوشت کو خرید کر کھانا ہمارے لئے جائز نہیں، لہٰذا گوشت کو حلال کہنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے اور دوسری اشیاء کو حرام قرار دینے کے لئے دلیل کی ضرورت ہوگی، حلت اور حرمت کے بارے میں یہ بہت اہم اصول ہے جو ذہن میں رہنا چاہئے۔

صرف احتمال کی بنیاد پر اشیاء کو حرام نہیں کہا جائے گا

آج کل غیر مسلم ممالک میں خاص طور پر یہ بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے اور اللہ بچائے اب تو مسلم ملکوں میں بھی مسئلہ پیدا ہوگیا ہے، وہ یہ کہ غیر مسلم ممالک میں بہت سی ایسی چیزیں فروخت ہوتی ہیں جن کے اندر کسی نجس یا حرام چیز کے شامل ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ لہٰذا ان اشیاء میں مندرجہ بالا اصول سے یہ مسئلہ نکل آئے گا کہ اگر گوشت کے علاوہ کوئی چیز ہے اور اس چیز کے بارے میں شک ہو رہا ہے کہ اس میں کوئی ناجائز چیز تو نہیں ملی ہوئی، تو جب تک اس میں حرام یا ناجائز چیز شامل ہونے کا یقین حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک اس چیز کو کھانا جائز ہے۔ مثلاً ڈبل روٹی ہے، بعض ڈبل روٹیوں کے بارے میں یہ سننے میں آیا ہے کہ اس میں کوئی نجس یا حرام چیز شامل ہوتی ہے، مثلاً بعض اوقات ڈبل روٹی پر مردار کی چربی لگا دیتے ہیں، لیکن ڈبل روٹی میں چونکہ اصل حلت ہے لہٰذا جب

تک ہمیں یقین سے یہ معلوم نہیں ہوجائے گا کہ اس ڈبل روٹی میں فلاں حرام اور نجس چیز شامل ہے اس وقت تک ڈبل روٹی کھانے کی گنجائش ہے اور ناواقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ڈبل روٹی کو کھاسکتے ہیں، اور بہت زیادہ کھوج کاؤ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر یقین سے یہ معلوم ہوجائے کہ بازار میں کوئی بھی ڈبل روٹی ایسی نہیں ہے جو کسی نہ کسی نجس اور حرام چیز کی آمیزش سے خالی ہو تو اس صورت میں ڈبل روٹی کھانا جائز نہیں ہوگا۔

ڈبوں میں پیک شدہ گوشت

لیکن گوشت کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس لئے کہ جب تک یقین سے معلوم نہ ہوجائے کہ یہ گوشت مشروع طریقے پر ذبح کئے ہوئے جانور کا ہے اس وقت تک اس گوشت کو کھانا جائز نہیں۔ لہٰذا آجکل ڈبوں میں جو پیک شدہ گوشت آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ سے آتے ہیں افسوس یہ کہ آجکل سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں میں بھی ان کا بہت رواج ہے، ان ڈبوں پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہوتی ہے:

"مذبوح علی الطریقة الاسلامیة"

اس عبارت سے دھوکہ کھا کر مسلمان اس گوشت کو استعمال کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اس ڈبے کے اوپر صرف اس عبارت کے لکھے ہونے سے یہ یقین حاصل نہیں ہوتا کہ واقعۃً اس کو اسلامی طریقے سے ذبح کیا گیا ہے۔ جب تک یہ تحقیق نہ کر لی جائے کہ یہ عبارت لکھنے والا کون ہے؟ اور کس بنیاد پر اس نے یہ لکھا ہے اور واقعۃً اس کو شرعی طریقے پر ذبح کیا گیا ہے یا نہیں؟ اس وقت تک اس ڈبے میں پیک شدہ گوشت کو کھانا جائز نہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے بتایا کہ یہ ایک مہر ہوتی ہے جو ڈبے پر لگا دیتے ہیں، حتیٰ کہ مچھلی کے ڈبے پر بھی "مذبوح علی الطریقة الاسلامیة" کی مہر لگی ہوئی دیکھی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی مہر کا کیا اعتبار ہے۔

اب مندرجہ بالا مسئلہ غیر مسلم ممالک کے گوشت کا ہے لیکن جہاں مسلمان ہوں تو چونکہ مسلمانوں کے ظاہر حال کے مشروع طریقے پر ہی محمول کیا جاتا ہے، اس لئے وہاں ظاہر حال سے یہی سمجھا جائے گا کہ یہ مذبوح گوشت ہے، لہٰذا اس کی تحقیق کرنا واجب نہیں۔ البتہ ایسے شہر میں جہاں زیادہ تر غیر مشروع گوشت کا رواج ہے اور وہ مسلمانوں کا شہر ہے اس صورت میں بھی تحقیق کرنا واجب ہے، بغیر تحقیق کے کھانا جائز نہیں۔

گوشت اور دوسری اشیاء میں فرق کی وجہ

یہ جو اصول میں نے بتایا کہ دوسری اشیاء میں اصل حلت ہے اور گوشت ہی اصل حرمت ہے، ان دونوں میں فرق کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ گوشت جانور کا ہوتا ہے اور زندہ جانور یا جماع حرام ہے اور جانور اس وقت حلال ہوتا ہے جب وہ مشروع طریقے پر ذبح کرلیا جائے، لہٰذا جانور میں اصل حرمت ہے۔ اس حرمت کو زائل کرنے کے لئے شریعت نے ذبح کا ایک مخصوص طریقہ بتادیا کہ یہ طریقہ اختیار کروگے تو جانور حلال ہوجائے گا، اور یہ طریقہ اختیار نہیں کروگے تو جانور حلال نہیں ہوگا بلکہ حرمت باقی رہے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جانور میں اصل حرمت ہے، جب تک اس کو صحیح طریقے پر ذبح کئے جانے کا علم نہ ہوجائے۔

بہرحال! حدیث باب میں حضور ﷺ نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے یہ جو فرمایا کہ تم اپنے کتے کے شکار کیے ہوئے جانور کو کھا سکتے ہو جب تک اس کتے کے ساتھ کوئی دوسرا کتا شریک نہ ہوگیا ہو۔

اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ چونکہ جانور میں اصل حرمت ہے اور جب شکار کے وقت دوسرا کتا بھی شامل ہوگا تو اب یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ اس جانور کی ہلاکت آپ کے بھیجے ہوئے کتے کے حملہ کرنے سے ہوئی یا کسی دوسرے کتے کی وجہ سے ہلاکت واقع ہوئی تو اب شبہ پیدا ہوگیا کہ وہ جانور مشروع طریقے سے ہلاک ہوا یا غیر مشروط طریقے سے ہلاک ہوا۔ اس شبہ کی وجہ سے یہ نہیں ہوگا کہ جانور میں حرمت آجائے گی اس لئے کہ وہ تو پہلے سے حرام تھا بلکہ حلت آنا بند ہوجائے گی۔

صرف شک وشبہ کی وجہ سے حرمت نہیں آتی

اور جن اشیاء میں اصلاً اباحت ہوتی ہے ان میں صرف شک وشبہ کی وجہ سے حرمت نہیں آتی جب تک کہ حرمت کا یقین نہ ہوجائے، چنانچہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا موطا امام مالک رحمہ اللہ میں مشہور واقعہ آیا ہے کہ آپ ایک جنگل اور بیابان سے گزر رہے تھے، راستے میں وضو کے لئے پانی کی ضرورت پیش آئی تو ایک حوض راستے میں نظر آیا، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ سامنے سے حوض کا مالک آرہا ہے، اس سے آپ نے یہ پوچھنا شروع کردیا:

"يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ هَلْ تَرِدُ حَوْضَكَ السِّبَاعُ؟"

''کیا تمہارے حوض پر درندے پانی پینے کے لئے آتے ہیں؟''

ان کے سوال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر درندے پانی پینے کے لئے آتے ہوں گے تو ان کا جھوٹا اس حوض کے پانی میں گرتا ہوگا اور اس کی وجہ سے حوض کا پانی ناپاک ہوگا تو اس سے وضو کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اس سے پہلے کہ حوض والا کچھ جواب دیتا، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا:

" يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ، لَا تُخْبِرْنَا"

''ہمیں یہ مت بتانا کہ اس حوض پر درندے آتے ہیں یا نہیں؟''(۱)

آپ نے اس کو بتانے سے اس لئے منع فرمادیا کہ پانی کے اندر اصل طہارت ہے اور اصلاً اس پانی سے وضو کرنا جائز ہے، لیکن یہ حوض کھلا ہوا تھا اس لئے شک پیدا ہوگیا کہ اس پر درندے پانی پینے کے لئے آتے ہوں، اس شک کی وجہ سے طہارت اصلیہ زائل نہیں ہوگی، اس لئے اس پانی کو نجس نہیں کہا جائے گا جب تک کہ نجس ہونے کا یقین حاصل نہ ہوجائے۔ لہٰذا اگر حضرت عمرو بن العاصؓ کے سوال کے جواب میں صاحب حوض یہ کہہ دیتا کہ ہاں کبھی کبھار درندے حوض پر آتے ہیں تو اس کی وجہ سے بھی شک پیدا ہوجاتا اور شک کی بنیاد پر پانی تو ناپاک نہ ہوتا لیکن خواہ مخواہ دل میں وسوسے پیدا ہوتے کہ معلوم نہیں وضو درست ہوا یا نہیں؟ اس لئے حضرت فاروق اعظمؓ نے "يَا صَاحِبَ الْحَوْضِ، لَا تُخْبِرْنَا" کہہ کر اس شک اور وسوسے کی جڑ ہی کاٹ دی۔

زیادہ تحقیق میں بھی نہیں پڑنا چاہئے

اس سے معلوم ہوا کہ اشیاء مباحہ میں اگر شک پیدا ہوجائے تو اس شک کی وجہ سے وہ چیز حرام نہیں ہوتی، اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے پتہ چلا کہ کسی چیز کی بہت زیادہ تحقیق اور کاوش کرنا بھی ضروری نہیں کہ انسان ہر چیز کی کھود کرید میں لگ جائے کہ اس چیز کے اندر کیا حرام چیز شامل ہے؟ فلاں چیز میں کیا اجزاء ہیں؟ اس لئے کہ جب شریعت نے تمہیں شک کے باوجود اس چیز کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہے تو پھر یہ ناواقفیت بھی ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کو تحقیق کر کے زائل کرنے کی کوشش مت کرو۔

بعض لوگوں کو اس کا ذوق ہوتا ہے کہ ہر چیز کی بال کی کھال نکالنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، مثلاً یہ کہ ڈالڈا گھی میں فلاں چیز شامل ہے اور اب اس کی تحقیق کے پیچھے پڑ گئے، حضرت والد

(۱) موطا امام مالك، كتاب الطهارة، باب لا بأس به الا أن يرى على فمها نجاسة، رقم: ٣٩

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، وہ اس تحقیق میں لگے ہوئے تھے کہ ڈالڈا گھی میں ایسی چیز شامل ہے جو نجس یا حرام ہے۔ روزانہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کبھی اخبار لا کر دکھاتے، کبھی کچھ لا کر دکھاتے اور بتاتے کہ دیکھئے اخبار میں یہ آیا ہے، فلاں رسالے میں یہ آیا ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ میں اس کو نہیں پڑھتا، اس کو واپس لے جاؤ، تم خود پڑھ لینا۔

بہر حال ان اشیاء میں عموم بلوی ہے، ساری قوم اس کے اندر مبتلا ہے اور ہم اس کے مامور بھی نہیں کہ بلاوجہ بہت زیادہ کھود کرید کریں اس لئے کہ اگر بہت زیادہ کھود کرید کی جائے گی تو دنیا میں کوئی چیز حلال نہیں رہے گی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

☆☆☆

حرام مال سے بچیں اور ہمیشہ سچ بولیں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((أَرْبَعٌ إِذَا كُنَّ فِيْكَ فَلَا عَلَيْكَ مَا فَاتَكَ مِنَ الدُّنْيَا حُسْنُ خَلِيْقَةٍ وَعِفَّةٌ فِيْ طُعْمَةٍ وَصِدْقُ حَدِيْثٍ وَحِفْظُ أَمَانَةٍ))(۱)

''حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص میں یہ چار صفات موجود ہوں اسے دنیا کی کسی چیز کی محرومی نقصان نہیں پہنچا سکتی، پہلی چیز امانت کی حفاظت، دوسری بات کی سچائی، تیسری اچھے اخلاق اور چوتھی حلال کھانا''

یہ چار خصلتیں جو بیان فرمائیں کہ اگر عطا ہو جائیں تو دنیا کی اور کوئی نعمت نہ ملے تب بھی تمہاری بھلائی کے لئے یہ چار چیزیں کافی ہیں۔

ان میں سے پہلی چیز یعنی حسن اخلاق اس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دوسری چیز جو بیان فرمائی گئی وہ ہے لقمہ کی پاکیزگی، آدمی جو کچھ کھا رہا ہے جو رزق اس کو ملا ہوا ہے وہ پاکیزہ ہو۔

مال کی پاکیزگی سے کیا مراد ہے؟

پاکیزہ ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ محض دیکھنے میں صاف ستھرا ہو جراثیم سے پاک ہو یہ چیز

☆ ضبط و تحریر: محمد اویس سرور تاریخ ضبط: ۲۳ مارچ ۲۰۰۹ء

(۱) مسند أحمد بن حنبل، مسند عبد الله بن عمرو بن العاص، رقم: ٦٣٦٥، كنز العمال، رقم: ٤٣٤١٣ (١٥/٨٥٨)، الزواجر عن اقتراف الكبائر (١٠٧/٢)، مجمع الزوائد و منبع الفوائد، رقم: ١٨١٢٣ (٢٠٥/١١)، شعب الإيمان، رقم: ٤٨٠١ (٢٠٥/٤)، الترغيب والترهيب، رقم: ٤٤٣٩ (٣٦٥/٣)، الدر المنثور (٥٧٢/٢)

تو ہونی ہی چاہئے کہ انسان صاف ستھرا کھانا کھائے۔ لیکن یہاں مراد یہ ہے کہ وہ حلال ہونا جائز اور حرام کھانے سے انسان پرہیز کرے۔ اور رزق حلال کو حاصل کرنا اور اپنے رزق میں حلال ہونے کا اہتمام کرنا یہ ایمان کے بنیادی ستونوں میں سے ہے۔ کہ آدمی اس بات کا پورا لحاظ رکھے کہ جو لقمہ میں کھا رہا ہوں وہ حلال لقمہ ہو، کیونکہ حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّهُ لَا يَرْبُوْ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ إِلَّا كَانَتِ النَّارُ أَوْلَىٰ بِهِ)) (۱)

''انسان کے جسم پر جو گوشت حرام کھا کر بنا ہوگا ہو وہ جہنم کا ایندھن ہے''

ظاہر ہے کہ انسان جب حرام کھاتا ہے تو اس سے اس کے جسم کی بڑھوتی ہوتی ہے، نشوونما ہوتی ہے۔ اسی سے گوشت بنے گا، جسم کے دوسرے اعضاء بنیں گے، اس سے جسم کے اندر قوت آئے گی۔ تو جو کوئی گوشت حرام مال سے اور حرام کھانے سے بنا گا ہو تو جہنم اس کی زیادہ مستحق ہے وہ جہنم کا ایندھن بنے گا، اس واسطے ہر مومن کو اس بات کا اہتمام لازم ہے کہ جو کچھ وہ کھا رہا ہے اس کے حلال ہونے کا پورا اطمینان حاصل ہو کہ کوئی حرام چیز اپنے حلق سے پیٹ میں نہ جائے۔

حرام مال کی دنیاوی بے برکتی

حرام رزق کا جو وبال آخرت میں ہے وہ تو ہے، جس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ گوشت جہنم کا ایندھن بنے گا۔ لیکن اس دنیا میں بھی حرام کی بے برکتی اللہ تبارک وتعالیٰ دکھا دیتے ہیں۔ حرام طریقے سے کمایا ہوا پیسہ اور حرام کھانا دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اس کو ایک عذاب بنا دیتے ہیں۔ بظاہر انسان کے پیسے بہت اکٹھے ہوگئے، بینک بیلنس بہت ہوگیا لیکن مصیبتیں آرہی ہیں، آفتیں آرہی ہیں، کبھی چوریاں ہورہی ہیں، کبھی ڈاکے پڑ رہے ہیں، کبھی کوئی اغوا ہورہا ہے، کبھی بیماریاں کھڑی ہوگئی ہیں اور کبھی کوئی پریشانیاں کھڑی ہورہی ہیں تو یہ ساری بے برکتیاں پیدا ہورہی ہیں حرام رزق سے اور حرام مال سے۔

تو ایک نقصان دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ انسان کے مال میں برکت نہیں ہوتی، پیسے گنتی میں تو بہت ہوگئے لیکن برکت نہیں۔ آج کل اچھے بڑے کھاتے پیتے لوگ جن کی آمدنیاں بہت ہیں مگر یہ شکوہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ پورا نہیں ہوتا، پورا اس لئے نہیں ہوتا کہ اس بات کا دھیان نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق رزق حاصل ہو اس کے خلاف جو حاصل ہوگا وہ تو پورا نہیں ہوگا اس میں تو برکت نہیں ہوگی۔

(۱) سنن الترمذي، كتاب الجمعة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، كتاب ما ذكر في فضل الصلاة، رقم: ۵۵۸، مسند أحمد، رقم: ۱۳۹۱۹، ۱۴۷۴۶

حرام مال کا سب سے بڑا نقصان

دوسری اس سے بھی خطرناک بے برکتی یہ ہے کہ حرام گوشت حرام کھانا حرام رزق انسان کے اندر سے ایمان کی حس سلب کرلیتا ہے، اللہ بچائے۔ ایمان کا جو شعور ہے جو حس ہے وہ چھن جاتی ہے، اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی، عقل خراب ہوجاتی ہے عقل الٹی ہوجاتی ہے، برے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، اچھے کو برا سمجھنے لگتا ہے، اور اس کا احساس ان حضرات کو ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کا شعور عطا اور نور عطا فرمایا، ان کو پتہ ہوتا ہے کہ ہم سے کیا چیز چھن گئی۔ اگر حرام کا ذرا سا بھی غبار آجائے تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ دل کے اندر ایک تاریکی اور ظلمت چھاگئی، اندھیرا چھا گیا۔

مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے ان کا واقعہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

وہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں ایک دعوت میں چلا گیا اور وہاں جاکر کھانا کھالیا، بعد میں پتہ چلا کہ اس شخص کی آمدنی مشکوک ہے، فرماتے ہیں کہ میں مہینوں تک ان چند لقموں کی ظلمت اپنے دل میں محسوس کرتا رہا، اور مہینوں تک میرے دل میں گناہ کرنے کے جذبات پیدا ہوتے رہے، اور طبیعت میں یہ داعیہ بار بار پیدا ہوتا تھا کہ فلاں گناہ کرلوں فلاں گناہ کرلوں، حرام مال سے یہ ظلمت پیدا ہوجاتی ہے۔

قرآن کریم میں بہترین انداز میں فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً﴾ (۱)

''اے رسولو پاکیزہ اور حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو''

مفسرین فرماتے ہیں کہ جب انسان حلال کھانے کا اہتمام کرتا ہے تو اس میں نیک کام کرنے کے جذبے اور شوق پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر حرام رزق کھا رہا ہے تو اس سے انسان کے دل میں برائیوں کے اور گناہ کے تقاضے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک کام کو برا سمجھ رہے ہیں کہ یہ کام اچھا نہیں ہے پھر بھی چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوتی حوصلہ نہیں ہوتا، وہ اس لئے نہیں ہوتا کہ اپنے رزق اور لقمہ کو حلال کرنے کی فکر نہیں اور نہ جانے کن کن طریقوں سے ناجائز رزق منہ میں جاتا ہے اور پیٹ میں

(۱) المومنون: ۵۱

جاتا ہے، تو وہ گناہ کے تقاضے پیدا کرتا ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک کنکشن رکھا ہے رزق حلال میں اور نیکیوں میں اور رزق حرام میں اور گناہوں میں۔ جب رابطہ جوڑ لیا رزق حرام سے تو گویا کہ گناہوں سے رابطہ جوڑ لیا، گناہوں کے ساتھ رشتہ لگ گیا گناہ کے تقاضے پیدا ہوگئے چھوڑنا آسان نہیں رہتا۔

تو دنیا کے اندر رزق حرام کے جو نقصانات ہیں ان میں تو ایک ہے بے برکتی، روپیہ تو بہت جمع ہوگیا لیکن کام پورے نہیں ہورہے، اور دوسرا خطرناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں گناہوں کے تقاضے پیدا ہوتے ہیں ظلمت اور تاریکی آتی ہے اور ظلمت کا احساس شروع میں ہوتا ہے ان لوگوں کو جن کے دل پاک صاف ہوتے ہیں ذرہ سی بھی ظلمت آگئی تاریکی آگئی تو پتہ چلتا ہے، لیکن اللہ بچائے جب حس ہی مٹ جائے بے حس ہوجائے تو اس ظلمت کا تاریکی کا پتہ ہی نہیں چلتا، آدمی کے گناہ کے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اسے احساس ہی نہیں ہوتا۔

حرام مال بے حسی پیدا کرتا ہے

صاحب ایمان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر کبھی صاحب ایمان سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے، انسان ہے کبھی کوئی گناہ ہوگیا، تو اس کے دل میں اتنی ندامت ہوتی ہے شرمندگی ہوتی ہے کہ اس کو وہ اپنا کیا ہوا گناہ ایک پہاڑ معلوم ہوتا ہے، اور ندامت وشرمندگی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے روتا ہے گڑگڑاتا ہے، یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ لیکن جب بے حسی پیدا ہوجائے غفلت پیدا ہوجائے تو اسوقت حالت یہ ہوتی ہے کہ گناہ کرتا ہے دل میں یہ خیال آیا کہ بھائی تم نے یہ گناہ کا کام کیا فوراً اس خیال کو جھٹک دیا جیسے ایک مکھی ناک پر آکر بیٹھی اور اس کو اڑا دیا۔ تو پھر رفتہ رفتہ بے پرواہ ہوجاتا ہے غافل ہوجاتا ہے، اور گناہ کرتا چلا جاتا ہے اور ذرا سا بھی احساس باقی نہیں رہتا۔

حرام کھانے والے کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں

تیسرا نقصان حرام رزق کا نبی کریم ﷺ نے یہ بیان فرمایا کہ جب آدمی کا رزق حلال نہ ہوتو دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> ”بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے بال پراگندہ اور جسم غبار آلود اور بڑی لجاجت سے اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہیں کہ یا اللہ یہ کام کردیجئے یا رب یہ کام کردیجئے، لیکن ان کا حال یہ ہے کہ ان کا کھانا حرام کا ہے، ان کا لباس حرام کا اور ان کا جسم حرام

روپے سے پرورش پایا ہوا تو بتاؤ ایسے لوگوں کی دعا کیسے قبول ہو؟"(۱)

تو تیسرا نقصان دنیا ہی میں یہ ہے کہ دعائیں مانگ رہا ہے لیکن قبول نہیں ہو رہیں، اب کتنے لوگوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ دعائیں تو بہت کیں لیکن قبول نہیں ہوتیں کسی بھی طرح، تو بتاؤ قبول نہ ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دھیان نہیں ہے کہ رزق جو کھا رہا ہے اس کے اندر حرام کی آمیزش ہے، تو اس کی وجہ سے دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ تو دنیا ہی میں بے برکتی تاریکی اور گناہوں کا جذبہ پیدا ہونا اور تیسرا دعاؤں کا قبول نہ ہونا دنیا ہی کے اندر یہ انجام ظاہر ہو جاتے ہیں آخرت میں جو عذاب ہوگا وہ علیحدہ ہے۔

رزق کے حرام ہونے کی مختلف صورتیں

رزق کے حرام ہونے کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض حرام تو ایسے ہیں جو ہر انسان جانتا ہے۔ مثلاً چوری کر کے مال حاصل کرے ڈاکہ ڈال کے کرے، سود کھائے جوا کھیلے یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر مسلمان جانتا ہے کہ حرام ہیں۔ لیکن بہت سے شعبے ایسے ہیں جن میں ہمیں اندازہ نہیں خیال نہیں توجہ نہیں دھیان نہیں کہ یہ رزق حرام کا آرہا ہے، ہے حرام مگر دھیان نہیں توجہ نہیں۔

جھوٹ بول کر چیز بیچنا حرام ہے

مثلاً تاجر ہے تجارت کر رہا ہے سامان بیچ رہا ہے اور اس میں غلط بیانی کر کے ملاوٹ کی اور غلط قسم کا سامان دھوکہ دیکر بیچ دیا، تو دھوکہ دیکر جو سامان بیچا تو اس سے جو پیسے حاصل ہوئے جو آمدنی آئی وہ حرام کی ہوئی، کیونکہ دھوکہ دیکر حاصل کی گئی۔ ایک چیز کسی ملک کی بنی ہوئی نہیں ہے اور آپ نے یہ جھوٹ بولا کہ یہ فلاں ملک کی بنی ہوئی ہے اور وہ سامان بیچ دیا، تو جھوٹ بولا دھوکہ دیا تو اس کے نتیجے میں جو آمدنی حاصل ہوئی ہو حلال نہ ہوئی، تو اب جو کھانا کھا رہے ہیں وہ حلال نہیں کھا رہے ہیں تو رزق حرام ہوگیا۔ اس کی طرف بھی دھیان نہیں۔

ملازمت میں کام چوری حرام ہے

مثلاً ایک شخص کسی جگہ ملازم ہے تو جو ڈیوٹی کے جو اوقات ہیں آٹھ گھنٹے ہیں وہ پورے کے

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتھا، رقم: ۱٦٨٦، سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب من سورۃ البقرۃ، رقم: ۲۹۱۵، مسند أحمد، رقم: ۷۹۹۸، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب فی أکل الطیب، رقم: ۲٦۰۱

پورے ملازمت کے کام میں صَرف کرے، اب کوئی آدمی ان آٹھ گھنٹوں میں سے وقت بچاتا ہے، دیر سے جاتا ہے اور جلدی واپس آجاتا ہے اور بیچ میں بھی اپنے ذاتی کام کر رہا ہے محکمے کے کام کرنے کے بجائے یا ملاقات کرنے کے لئے اٹھ کر چلا گیا چاہے نفل پڑھنے کے لئے چلا گیا تو اس کے لئے یہ ناجائز ہے حرام ہے۔ فرض نماز تو ٹھیک ہے لیکن نوافل پڑھنے کے لئے یا اگر کوئی تلاوت کرنے کے لئے آگیا ڈیوٹی کے اوقات میں تو یہ اس کے لئے حرام ہے۔ اتنی مدت کی جو تنخواہ ہوئی وہ حرام ہے ناجائز ہے۔ جب وہ تنخواہ میں شامل ہوگیا تو آپ کو پتہ ہے اگر ایک بالٹی رکھی ہوئی ہو پانی کی اور اس میں ایک قطرہ پیشاب کا ڈال دیا جائے تو وہ ایک چھوٹا سا قطرہ لیکن پوری بالٹی کو گندا کرے گا کہ نہیں؟ پوری بالٹی کو ناپاک بنادے گا تو یہ حرام مال چاہے تھوڑا سا ہی ہو لیکن جب انسان کے رزق میں شامل ہوگیا تو اس نے حرام ہونے کی نجاست پھیلا دی اور نجاست کے پھیلانے کے نتیجے میں انسان جو رزق کھا رہا ہے وہ حرام ہوگیا اور حرام کی بے برکتی شامل ہوگئی۔

اب دیکھیں کہ ہم لوگ کتنے اس میں مبتلا ہیں کہ نوکری کی ہوئی ہے اور نوکری کے اندر وقت پورا نہیں دیتے۔ اپنے ذمے جو فرائض ہیں ان کو پوری طرح ادا نہیں کرتے، تو وہ جو تنخواہ مل رہی ہے وہ تنخواہ حلال نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، لیکن کتنے مسلمان اس میں مبتلا ہیں۔ ہم لوگوں کو یہ خیال بھی نہیں آتا ہے کہ ہم یہ غلط کر رہے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے کا اصول

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مدرسہ تھا جس میں اساتذہ تھے اور ان کو تنخواہیں ملتی تھیں، تو وہاں پہلے دن سے یہ قاعدہ تھا کہ ہر استاد جس کے ذمے کوئی ڈیوٹی لگی ہوئی ہے کہ وہ ایک گھنٹہ سبق پڑھائے گا، تو اگر کوئی مدرسے کے اوقات میں ملنے کے لئے آگیا تو اسی وقت ٹائم نوٹ کرلیا کہ اتنے وقت سے لے کر اتنے وقت تک میں اپنے مہمان کے ساتھ ذاتی گفتگو میں مصروف رہا، اور مدرسے کا کام چھوڑ دیا اور اپنے ذاتی کام میں لگا رہا۔ تو جب تنخواہ لینے کا وقت آتا تو پورا حساب کر کے تنخواہ دینے والے کو دیتے تھے کہ اتنے دن میں نے اپنے کام میں صَرف کئے تھے، لہٰذا اتنے پیسے میری تنخواہ میں سے کاٹ لئے جائیں۔ کیونکہ یہ میری تنخواہ حلال نہیں ہوگی۔ یہ کام حضرت کے ہاں مستقل تھا ہر شخص یہ کام کرتا تھا۔

الحمد للہ ہمارے ہاں دار العلوم میں بھی یہ کام ہے کہ جو استاد ہے وہ اپنا آنے کا وقت رجسٹر میں درج کرتا ہے کہ فلاں وقت میں حاضر ہوا اتنی دیر ہوگئی، تو پورے مہینے کا حساب لگا کر اتنے وقت

کی تنخواہ کاٹی جاتی ہے۔ تو یہ اس لئے کہ اگر اس وقت یہ تنخواہ آدمی وصول کرلے تو وہ تنخواہ حرام ہوگئی۔ اور حرام ہونے کے نتیجے میں یہ ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

آج زمانہ ایسا آ گیا کہ ہر شخص اپنے فائدے کی چیز حاصل کرنے کی فکر میں ہے حقوق مانگتا ہے کہ ہمارے حقوق ملنے چاہئے لیکن یہ پتہ نہیں کہ اس کے ذمے جو دوسروں کے حقوق ہیں وہ پورے کر رہا ہے کہ نہیں۔ آج لوگوں کو یہ حدیث تو بڑی یاد ہے:

((أَعْطُوا الْاَجِيْرَ أَجْرَهُ قَبْلَ أَنْ يَّجِفَّ عَرَقُهُ)) (۱)

''یعنی مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو''

تو کوئی کہیں مزدوری کرتا ہے نوکری کرتا ہے تو یہ حدیث خوب یاد ہے کہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے میری مزدوری ملنی چاہئے۔ تو ایک صاحب نے مجھ سے یہ ذکر کیا تو میں نے کہا ٹھیک ہے بھائی کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو لیکن تم یہ دیکھو کہ پسینہ نکلا بھی ہے کہ نہیں اگر پسینہ نکلا ہی نہیں تو خشک ہونے سے پہلے کہاں سے ادا کرو، تو جتنی تمہاری ذمہ داری ہے وہ تو پوری کرو، اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے بعد اجرت کا مطالبہ کرو تمہیں حق پہنچتا ہے، لیکن یہ کہ اپنے فرائض میں تو بے کوتاہی، اپنے فرائض تو صحیح طور سے ادا نہیں کر رہے دیر سے پہنچ رہے ہیں وقت ضائع ہو رہا ہے اور مطالبہ یہ ہے کہ ہمیں ہمارے حقوق ملنے چاہئے، تو قرآن اور حدیث اس طریق کار کی اجازت نہیں دیتے یہ حرام راستہ ہے۔ تو اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے آدمی یہ دیکھے کہ جو بھی میرا ذریعہ آمدنی ہے چاہے وہ تجارت ہو چاہے ملازمت ہو یا کسی خدمت کے ذریعے ہو کسی ڈیوٹی کے ذریعے ہو میں اس کا حق ادا کر رہا ہوں کہ نہیں؟ اگر کر رہا ہے تو بیشک رزق حلال ہے اور اگر نہیں کر رہا ہے تو رزق کے اندر حرام شامل ہو رہا ہے، اور یہ ساری بے برکتیاں پیدا ہو رہی ہیں جو معاشرے کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔

بے برکتی اور بدعنوانی کا عذاب

اب کئی مرتبہ لوگ آ کر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ جی ہمارے محکمے میں لوگ ہیں وہ آتے ہیں اور دو تین گھنٹے گزارتے ہیں اور ہم سے کہتے ہیں کہ حاضری پوری لگاؤ اور وقت پورا درج کرو۔ تو ہمیں حاضری لگانے پر مجبور کرتے ہیں، تو جب میں نے ان کو بتایا کہ یہ جائز نہیں کہ کام کچھ ہوتا نہیں اور تنخواہ لینے کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ساری حرام آمدنی ہے اور یہ جو بے برکتی آپ دیکھ رہے ہیں یہ

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الأحكام، باب أجر الأجراء، رقم: ۲۴۳۴

سب اس حرام آمدنی کی وجہ سے ہے۔ یہ جو لوٹ مار مچی ہوئی ہے کسی کی جان مال آبرو محفوظ نہیں یہ ویسے تو نہیں آتے یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان دیکھے اسباب ہوتے ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں وہ اسباب نظر نہیں آرہے لیکن حقیقت میں یہ عذاب ہے جو ہمارے اوپر مسلط ہے اس حرام خوری کا۔ قوم کی قوم کرپشن میں مبتلا ہوگئی ہے، قوم کی قوم رشوت خور ہوگئی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں ساری قوم سزا بھگت رہی ہے اور یاد رکھو اس حرام آمدنی کا فائدہ حقیقت میں دیکھو تو کسی کو نہیں پہنچتا سب مصیبت کا شکار رہتے ہیں۔ جو آدمی ایک جگہ سے رشوت لیتا ہے اسے دس جگہ پر رشوت دینی بھی پڑتی ہے، اگر حساب لگا کہ دیکھو تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ کچھ بھی نہیں ملا، یہاں ایک جگہ کسی نے رشوت لی ہے اور دس جگہ دینی پڑی، نتیجہ بے برکتی اور ظلمت علیحدہ گناہ کا ایک سیلاب امڈا ہوا ہے اس کی وجہ سے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل وکرم سے اس کی اہمیت ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے۔ لقمہ ہمارے منہ میں جارہا ہے کم از کم اس کی فکر ہو کہ وہ حلال کا ہو حرام نہ ہو۔

نبی کریم ﷺ کی شدتِ احتیاط

ایک مرتبہ حضور ﷺ ایک جنازے کی نماز پڑھانے کے لئے تشریف لے گئے، وہاں سے واپس آرہے تھے تو قریب میں ایک خاتون کا گھر پڑتا تھا، اس خاتون کے دل میں یہ بات آئی کہ حضور ﷺ یہاں قریب میں تشریف لائے ہوئے ہیں، ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ حضور ﷺ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کردوں کہ آپ کچھ دیر کے لئے میرے گھر میں تشریف لے آئیں اور کچھ تناول فرمالیں، تو حضور ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے گھر میں تشریف لے آیئے، حضور ﷺ نے قبول فرمالیا۔ تو اب اس خاتون نے چاہا کہ میں حضور ﷺ کی کچھ خاطر تواضع کروں کچھ کھانا وغیرہ پیش کروں۔ چنانچہ اس نے حضور ﷺ کی خدمت میں کھانا پیش کیا۔ آپ ﷺ نے پہلا لقمہ لیا تو ابھی منہ میں ڈالا تھا کہ ایک دم سے آپ نے روک دیا چھوڑ دیا اور فرمایا کہ یہ بکری جو ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر اجازت کے حاصل کی گئی ہے، لہٰذا اس خاتون کو بلایا گیا اور اس سارے واقعے کی تفصیل دریافت کی گئی، اس پر اس نے بتایا کہ میں نے بکری منگوانے کے لئے کسی کو بھیجا تھا لیکن بکری نہ ملی، پھر میں نے اپنے پڑوسی سے بکری خریدنا چاہی، اس نے تو انکار کردیا لیکن میں نے اس کی بیوی سے کہا کہ مجھے بکری بیچ دو، اس کی بیوی نے شوہر کی اجازت کے بغیر بکری بیچ دی تھی، اس بکری کا گوشت آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس بکری کا گوشت قیدیوں کو کھلادو۔ (۱)

نبی پاک ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ))(۲)

''کسی مسلمان کا مال تمہارے لئے حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے نہ دے''

کسی کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں

غور سے سمجھئے کہ کسی کا مال خوش دلی کے بغیر حلال نہیں، کہ اگر آپ نے زبردستی اصرار کر کر کے لے بھی لیا کسی طرح لیکن وہ دل سے راضی نہیں تھا، تو بھی آپ کے لئے حلال نہیں چاہے اس نے آپ کو دے دیا۔ کسی کے سر پہ جا کے سوار ہو گئے آپ اور کہہ رہے ہو دو، اب وہ دینا نہیں چاہ رہا مگر آپ اصرار کر رہے ہیں، اور اصرار کرنے کے نتیجے میں اس نے کہا کہ بھائی دے دو اس کو جان چھوٹے اس سے۔ تو اگر اس طرح کسی سے لیا آپ نے اور اس نے بظاہر آپ کو دے بھی دیا لیکن چونکہ خوش دلی نہیں ہے اس واسطے وہ حلال نہیں۔ اسی طرح بعض اوقات خرید وفروخت کے اندر یہ معاملہ ہو جاتا ہے، مثلاً آپ کچھ خریدنے گئے اور اس نے آپ کو قیمت بتائی آپ نے اس میں کمی کروائی، اور کمی اتنی کروائی کہ وہ بیچارہ اس کمی پر دینے کو تیار نہیں اور آپ کہتے ہیں کہ نہیں جی آپ کو تو دینا ہی ہوگا، اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا اتنی کم قیمت پر دینے کا لیکن آخر میں مجبور ہو کر کسی طرح اس نے آپ کو دے دیا کم قیمت پر، لیکن اس نے یہ کمی خوش دلی سے نہیں کی مجبوراً کی، تو یہ جو مجبوری میں کمی کرائی گئی یہ آپ کے لئے حلال اور پاکیزہ نہیں۔ کیونکہ اس آدمی کی خوش دلی کے بغیر آپ نے یہ حاصل کی، اسی طرح چندہ وغیرہ جمع کیا جاتا ہے۔

چند معاشرتی برائیوں پر تبصرہ

چندے میں بعض اوقات آدمی محض لوگوں کے اس خطرے سے کہ اگر میں نہیں دوں گا تو لوگوں میں میری بدنامی ہوگی دل نہیں چاہ رہا دینے کو لیکن اس ڈر سے دے دیا تو لینے والے کے لئے وہ حلال نہیں۔

شادی بیاہ کے موقع پر ہدیہ تحفہ دیا جاتا ہے، اندر سے دل نہیں چاہ رہا تھا دینے کو لیکن اس

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في اجتناب الشبهات، رقم: ۲۸۹٤، مسند أحمد، رقم: ۲۱٤۷۱

(۲) كنز العمال، رقم: ۳۹۷ (۹۱/۱)، مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۷۷٤، جامع الأحاديث، رقم: ۱۷٦۱٥ (۸۰/۱۷)، كشف الخفاء، رقم: ۳۱۰۱ (۳۷۰/۲)

واسطے دے دیا کہ اگر نہیں دوں گا تو یہ برا مانے گا اور میری ناک کٹ جائے گی، تو وہ خوش دلی سے نہیں دیا جارہا ہے۔ تو خوش دلی سے نہیں دیا جارہا اس واسطے وہ حلال نہیں پاکیزہ نہیں ہے۔

صرف یہ بات نہیں کہ اجازت ہو بلکہ اجازت بھی خوش دلی کے ساتھ ہو، اگر خوش دلی کے بغیر ہے تو وہ حلال نہیں کسی طرح سے، یہ وہ چیزیں ہیں جن کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حرام وہ ہے جو چوری سے لیا جائے ڈاکے سے لیا جائے اور جوا کھیل کے لیا جائے، لیکن یہ جو باتیں ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں کثرت سے خوش دلی کے بغیر۔

ایک اور وبا جو ہمارے ہاں کثرت سے پھیلی ہوئی ہے کہ کسی سے کرائے پر مکان لیا اب مالک مکان یہ چاہتا ہے کہ تم یہ مکان خالی کرو مجھے اس کی ضرورت ہے یا کوئی اور وجہ ہے، آپ کہتے ہیں کہ جی میں خالی نہیں کرتا، تو اب جتنے دن مالک کی اجازت کے بغیر اس مکان میں رہ رہے ہو وہ رہائش حرام اور ناجائز ہے۔ اس واسطے کہ مالک کی اجازت اور خوش دلی کے بغیر اس کو استعمال کر رہے ہیں۔

اب یہ چیز سارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ میں یہ حرام کام کر رہا ہوں صبح سے شام تک حرام ہو رہی ہے، جاگنے کے وقت سے لے کر سونے کے وقت تک سارا کا سارا حرام گزر رہا ہے۔ لیکن کسی کو اس کا خیال نہیں آتا اور کر رہے ہیں۔ تو رزق حرام میں صرف یہ چوری ڈاکے داخل نہیں یہ سب چیزیں داخل ہیں، کسی کی چیز اٹھالی اور اس کو اس کی اجازت کے بغیر خوش دلی کے بغیر استعمال کرلیا تو اس کا استعمال حرام اور ناجائز ہے۔ چاہے تھوڑی دیر کے لئے ہو، تو کسی کی خوش دلی کے بغیر اس کی چیز کو استعمال کرنا جائز نہیں۔ چاہے آپس میں قریبی تعلقات ہی کیوں نہ ہوں، لیکن جس چیز کے بارے میں سو فیصد یقین نہ ہو کہ یہ خوش دلی سے میرے استعمال کرنے پر راضی ہوگا اس وقت تک استعمال کرنا جائز نہیں۔

عام طور پر لوگوں کے اندر یہ بیماری ہے، کسی کے گھر گئے ٹیلی فون رکھا ہوا ہے اور اٹھا کر فون کرنا شروع کر دیا پوچھا تک نہیں کہ میں کر سکتا ہوں کہ نہیں کروں یا نہ کروں۔ اور ٹیلی فون کر کرا کے اپنا الوسیدھا کرتے ہوئے چل دیئے، یہ کام اجازت کے بغیر ہو رہا ہے اس واسطے حرام ہے ناجائز ہے۔ تو ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں دھیان نہیں تو یہ سب کام حرام ہو رہے ہیں۔ تو یہ سارا کا سارا وبال اسی کا پھیلا ہوا ہے۔

تو بھائی خدا کے لئے ہم اپنی جانوں پر رحم کریں کم از کم اتنا تو ہو کہ جو کھا رہے ہیں وہ حلال ہو، جو برت رہے ہیں وہ حلال ہو اور اس میں کوئی ظلم کا پہلو نہ ہو اللہ تبارک وتعالیٰ کو ناراض کرنے کا پہلو نہ ہو۔ اطمینان کرلو کہ جو لقمہ پیٹ میں جارہا ہے وہ حلال ہے۔

حلال وحرام کی تمیز مٹتی جارہی ہے

ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کے اندر حلال وحرام کی تمیز ہوتی تھی کہ یہ جولقمہ پیٹ میں جارہا ہے کہیں حرام کا تو نہیں، لوگوں کو اگر پتہ چل جائے کہ صدقہ کا گوشت کھایا ہے تو اسے ایک بدنامی کی بات سمجھی جاتی تھی کہ کوئی مسلمان صدقہ کا گوشت کھائے۔ اب سارے مسلم ملکوں کے اندر امپورٹڈ (Imported) گوشت آرہا ہے، کوئی آسٹریلیا سے کوئی نیوزی لینڈ سے کوئی برازیل سے کوئی کہیں سے کوئی کہیں سے اور گوشت کے بارے میں کوئی تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی کو پرواہ نہیں کہ حلال طریقے سے ذبح ہوا کہ نہیں اور حرام کھا رہے ہیں۔

جب یہاں پر کراچی میں مکڈونلڈ کھلا تو معلوم ہوا کہ ایک طوفان ہے انسانوں کا جو کھانے کے لئے پہنچ گیا اور ایسے افراد جو یہ پوچھ رہے ہیں کہ آخر یہ ایک یہودی کمپنی ہے تو اس نے جو گوشت رکھا ہے حلال ہے یا حرام ہے، اس کو پوچھنے والا شاید ہزار میں کوئی ایک ہوا کا دکا کسی نے پوچھ لیا تو ہم نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ الحمدللہ ایسا کھلا حرام نہیں ہے کیونکہ جہاں سے منگوایا جارہا ہے تو میں نے پتہ کیا کہ حرام نہیں حلال ہے۔ لیکن میں کہہ رہا ہوں کہ فکر لیکن وہاں جانے سے پہلے ہجوم لگانے سے پہلے ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ تو معلوم کیا ہوتا کہ آیا یہ ہمارے لئے کھانا حلال ہے کہ نہیں، مگر وہ حلال وحرام کی فکر مٹ گئی اس کے نتیجے میں کسی کو دھیان ہی نہیں یہ پتہ نہیں کہ حرام چیز ہمارے حلق میں جائے گی تو اندر جا کر کیا فساد پھیلائے گی، ہماری زندگیوں میں ہمارے اخلاق میں ہمارے اعمال میں ہماری ہر چیز میں فساد مچائے گی۔

تو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ روایت فرمارہے ہیں کہ اگر یہ خصلت تمہارے دل میں پیدا ہوگئی کہ حلال کھانے کا اہتمام کہ میرے منہ میں کوئی حرام چیز نہ جائے، جس دن یہ مل گیا تو سمجھ لو کہ دنیا کی ساری نعمتیں تمہارے لئے جمع ہوگئیں، سب سے پہلے دیکھو کہ وہ چیز حلال ہے کہ نہیں، حلال طریقے سے حاصل ہوئی ہے کہ نہیں، جن پیسوں سے وہ چیز خریدی گئی ہے وہ پیسے حلال کے تھے یا حرام کے، اس کی فکر پیدا کرلیں۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی برکات اور انوارات تمہیں دکھائیں گے، ایک ایک پیسے کے اندر نور معلوم ہوگا، ایک ایک پیسے میں برکت معلوم ہوگی، اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

سچائی کو اپنا شعار بنائیے

تیسری صفت یہ بتائی کہ بات میں سچائی ہو، کہ جو بات منہ سے نکلے قلم سے نکلے وہ پُنی ہو اس میں جھوٹ کا شائبہ نہ ہو، اور یہ جھوٹ اتنی بری بلا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مشرکین اور کافر بھی جھوٹ بولنے کو برا سمجھتے تھے۔ ابوسفیان کہتے ہیں جو اس وقت حضور ﷺ کے دشمن تھے، ہرقل کے دربار میں گئے اس نے حضور ﷺ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنی چاہیں تو ان کو بلایا، تو کہتے ہیں کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی ایسی بات حضور ﷺ کے خلاف ان کے سامنے کہہ دوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی بات حضور ﷺ کے خلاف کہتا ہوں تو وہ جھوٹ ہوتی۔ اور مجھے یہ بات پسند نہیں تھی کہ لوگ یہ کہیں کہ ابوسفیان نے جھوٹ بولا۔(۱)

کفر کی حالت میں یہ بات کہہ رہے ہیں۔ تو جھوٹ بولنے کو کافر بھی اور مشرک بھی برا سمجھتے ہیں۔ اور آج معاشرے کے اندر جھوٹ عام ہوگیا، زبان سے بات نکالتے ہوئے اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ واقعہ کے مطابق بات نکل رہی ہے یا واقعہ کے خلاف، جھوٹ پھیلا ہوا ہے جبکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

((اَلصِّدْقُ يُنْجِىْ وَالْكِذْبُ يُهْلِكُ))(۲)

''سچائی نجات دینے والی چیز ہے اور جھوٹ بربادی لانے والی چیز ہے''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صداقت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سخت سے سخت حالات میں بھی زبان سے جھوٹ نکالنے سے پرہیز کیا۔ جب حضور ﷺ ہجرت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ساتھ ہیں اور مکہ کے مشرکین نے ہرکارے دوڑائے ہوئے ہیں کہ کسی طرح حضور ﷺ کو پکڑ کر لے آئیں، اور آپ کے سر کی قیمت لگی ہوئی ہے کہ جو شخص حضور ﷺ کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو سو اونٹ کا انعام ملے گا۔ تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مشرکین کو پتہ چل جائے کہ حضور ﷺ کہاں ہیں اور آکر پکڑ لیں تو راستہ میں ایک

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب بدء الوحي، باب بدء الوحي، رقم:٦، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب كتاب النبي إلى هرقل يدعوه إلى الإسلام، رقم:٣٣٢٢، مسند أحمد، رقم:٢٢٥٢

(۲) "الصدق ينجى" کے لئے دیکھئے: كنز العمال، رقم:٧٢٩٤ (٤٢٩/٣)، كشف الخفاء، رقم: ١٣٠٧(٤٠٧/١)، الكذب يهلك کے الفاظ احادیث کی کتابوں میں نہیں مل سکے۔ البتہ بہت سی احادیث میں الكذب ريبة کے الفاظ آئے ہیں۔

شخص ملا جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جانتا تھا حضور ﷺ کو نہیں جانتا تھا، تو اس نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟ اب اگر حضور ﷺ کا نام بتاتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ جاکر راز فاش نہ کردے، اور اگر لوگوں کو پتہ چل گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوجائیں، اور اگر نہیں بتاتے غلط بتاتے ہیں تو غلط بیانی ہوتی ہے، ایسے مواقع میں اللہ تعالیٰ ایمان والے کی مدد فرماتے ہیں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا یہ میرے راہنما ہیں مجھے راستہ دکھاتے ہیں، اس وقت بھی جبکہ جان پر بنی ہوئی ہے صریح جھوٹ نہیں بولا۔ وہ شخص مطمئن ہوکر چلا گیا کہ ساتھ میں راہنما لے کر جارہے ہیں۔(۱)

ان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے دین کا راستہ دکھاتے ہیں دین میں میری راہنمائی کرتے ہیں۔

تو زبان سے جھوٹ کا کلمہ نکالنا یہ مسلمان کا شیوہ نہیں ہے۔ حالانکہ بعض حالات میں جب انسان کی جان پر بن جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی بھی ہے، لیکن مسلمان حتی الامکان جھوٹ نہیں بولے گا، نہ بولے یہ مومن کا کام نہیں، اور جھوٹ یہ نہیں ہوتا کہ جان بوجھ کر جھوٹ کی غرض سے بولا جائے بلکہ وہ تمام باتیں جو خلاف واقعہ ہیں وہ سب جھوٹ میں آتی ہیں۔ چھٹیاں لینے کے لئے یہ جو جھوٹے میڈیکل سرٹیفکیٹ چلتے ہیں یہ سب جھوٹ ہے۔ اور یہ بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح زبان سے جان بوجھ کر جھوٹ بولنا۔ جھوٹے سرٹیفکیٹ چل رہے ہیں، جھوٹی شہادتیں دی جارہی ہیں، یہ جو سرٹیفکیٹ ہوتا ہے یہ درحقیقت شہادت اور گواہی ہوتا ہے۔ اور قرآن نے جھوٹی گواہی کو شرک کے ہم پلہ قرار دیا ہے:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾(۲)

''بت پرستی سے بچو اور جھوٹی گواہی سے بچو''

جھوٹے سرٹیفکیٹ جھوٹی گواہی ہیں

یہ جو جھوٹے سرٹیفکیٹ جاری ہوتے ہیں جھوٹے غلط یہ جھوٹی گواہی ہیں۔ اور جھوٹی گواہی کے اوپر اتنا زبردست وبال ہے کہ العیاذ باللہ۔ پھر بھی ہم لوگ شکوے کرتے ہیں کہ پیچھے جارہے ہیں، قومیں آگے بڑھ رہی ہیں روز ہماری پٹائی ہورہی ہے، اس کا شکوہ کرتے ہیں جبکہ یہ ساری چیزیں معاشرے کے اندر ہم نے اپنے اوپر مسلط کی ہوئی ہیں، تو بتائیں ذلت نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا، پٹائی

---

(۱) حياة الصحابة(۱/۴۵۱)

(۲) الحج:۳۰

نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا، جب اللہ تعالیٰ کے احکام کی اس طرح کھلم کھلا خلاف ورزی ہو۔ تو جھوٹ بولنا جھوٹی شہادتیں دینا جھوٹے گواہ لانا جھوٹے سرٹیفکیٹ جاری کرنا یہ سب اس کے اندر داخل ہیں۔ انسان کی زبان سے قلم سے قدم سے کوئی بات خلاف واقعہ نہیں نکلنی چاہئے۔ اچھے اچھے بڑے دیندار لوگ نمازوں کے پابند تہجد کے پابند جب یہاں معاملہ آتا ہے تو اس میں سب پھسل جاتے ہیں۔ کہ جھوٹے سرٹیفکیٹ بنوالو کوئی بات نہیں، جھوٹ بول دو کوئی بات نہیں۔ مسلمان کا یہ کام نہیں۔

دوسروں کے راز کی حفاظت کیجئے

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں کہ دوسری صفت جو انسان کے اندر ہونی چاہئے وہ ہے سچائی۔ اور آخری بات فرمائی:

((حِفظُ اَمَانَۃٍ))

''امانت کی حفاظت''

کسی کے پاس کوئی چیز امانت ہے تو اس میں خیانت نہ ہو، اس میں انسان ناجائز تصرف نہ کرے، مثلاً آپ کے پاس کسی شخص نے پیسے رکھوائے تو اس کی حفاظت کرو یہ بھی امانت میں داخل ہے۔ لیکن بہت سی امانتیں ایسی ہیں کہ جن کے امانت ہونے کا ہمیں خیال نہیں ہوتا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ))(۱)

''مجلسیں امانت ہوتی ہیں''

اگر کسی نے آپ کو اپنے کسی راز کی بات بتائی ہے تو وہ راز بھی آپ کے پاس امانت ہے، اور اگر آپ اس راز کو دوسرے لوگوں کے سامنے ظاہر کریں گے تو یہ بھی امانت میں خیانت ہوگی۔ کسی شخص نے آپ پر اعتماد کر کے آپ سے کوئی بات کہہ دی اور ذہن میں یہ خیال ہے کہ یہ اسی حد تک رہے گی تو جب آپ اس سے اجازت نہ لے لیں کہ دوسروں سے کہہ سکتا ہوں کہ نہیں اس وقت تک آپ کے لئے دوسری جگہ کہنا جائز نہیں۔ یہ بھی امانت میں شامل ہے۔ مثلاً کسی شخص سے آپ نے کوئی چیز عاریتاً لی ہے تو وہ اس کی امانت ہے اس کو واپس پہنچانا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾(۲)

---

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی نقل الحدیث، رقم: ٤٢٢٦، مسند أحمد، رقم: ١٤١٦٦

(۲) النساء: ٥٨

''امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچاؤ یہ تمہارا فریضہ ہے''

لوگ قرضے لیتے ہیں ادائیگی کے اندر ٹال مٹول کرتے ہیں، امانتیں لیتے ہیں اس کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں یہ سب خیانت کے اندر داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو ان بداعمالیوں سے نجات عطا فرمائے اور جو چار صفتیں حضرت عبداللہ عمرو رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی ہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کے اندر پیدا فرمادے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

☆☆☆

حرام مال سے بچاؤ☆

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّيۡ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ
سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَتُدۡلُوۡا بِهَاۤ اِلَى الۡحُكَّامِ لِتَاۡكُلُوۡا فَرِيۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾(۱)

''اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ، اور ان (کے جھوٹے مقدمے) کو حکام کے پاس اس غرض سے مت لے جاؤ کہ اس کے ذریعہ لوگوں کے مال کا کوئی حصہ گناہ کے طریقے پر کھا جاؤ، جبکہ تم کو اپنے جھوٹ اور ظلم کا علم بھی ہو''

قرآن کریم کی اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت بڑے جامع انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یوں تو ہر قوم اور ہر مذہب وملت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مال حاصل کرنے کے کچھ طریقے پسندیدہ اور جائز ہیں، اور کچھ ناپسندیدہ اور ممنوع ہیں، مثلاً چوری، ڈاکہ، دھوکہ فریب کو ساری ہی دنیا برا سمجھتی ہے۔ لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی ایسا معیار نہ کسی قوم کے پاس ہے اور نہ ہوسکتا ہے جو پوری دنیا کے لئے معقول اور قابل قبول ہو، اس کا صحیح اور معقول معیار صرف وہی ہوسکتا ہے جو رب العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہو، کیونکہ خالقِ کائنات ہی اپنے بندوں کی حقیقی مصلحتوں سے باخبر ہوسکتا ہے، چنانچہ اسلام نے حلال اور حرام اور جائز وناجائز کا جو قانون بنایا ہے وہ صراحۃً وحی الٰہی سے ماخوذ یا مستفاد ہے، اس قانون میں ہر قدم پر اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کوئی بھی انسان اپنی جدوجہد کے مطابق ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی انسان دوسروں کے حقوق غصب کر کے یا دوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایہ کو محدود افراد میں مقید نہ کردے، بلکہ جو بھی ملکیت کسی کو حاصل ہے وہ قانون الٰہی کے مطابق ہے۔

☆ نشری تقریریں، ص ۱۰۹ تا ۱۱۲، فرد کی اصلاح، ص ۱۰۲ تا ۱۰۴

(۱) البقرۃ: ۱۸۸

آیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں کو شامل ہے ان میں سود، قمار، رشوت خوری، ملاوٹ، دھوکہ فریب، جھوٹے مقدمات، غرض ان تمام ناجائز ذرائع آمدنی کو شامل ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ناجائز قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾

''یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے پر''

اس میں ایک بات تو قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے ''اموالکم'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے اصل معنی یہ ہیں کہ ''نہ کھاؤ اپنے مال'' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم جو کسی دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہو تو یہ غور کرو کہ دوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت ہوگی جیسی تمہیں اپنے مال سے محبت ہے۔ اگر وہ تمہارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمہیں جو دکھ پہنچتا ایسا ہی دکھ دوسرے کو بھی پہنچے گا۔ اس بات کا احساس اس وقت بھی اسی طرح کرو جیسے کہ وہ تمہارا مال ہے۔

اس کے علاوہ آیت کے ان الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتا ہے اور یہ رسم چل پڑی ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کے مال میں ایسا ہی ناجائز تصرف کرتے ہیں۔ اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف درحقیقت اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے۔

غور کیجئے کہ جب اشیاء ضرورت میں ملاوٹ کی رسم چل جائے تو ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص گھی میں تیل یا چربی ملا کر زائد پیسے حاصل کرتا ہے لیکن جب اس کو دودھ خریدنے کی ضرورت پڑتی ہے تو دودھ والا اس میں پانی ملا کر دیتا ہے، مسالے کی ضرورت ہوتی ہے تو اس میں ملاوٹ ملتی ہے، دوا لینے جاتا ہے تو وہاں کھوٹ ملتا ہے، اس طرح جتنے زائد پیسے اس نے ایک جگہ ملاوٹ کر کے حاصل کئے دوسرے افراد دسیوں جگہ ملاوٹ کر کے اس کی جیب سے نکال لیتے ہیں، یہ بے چارہ اپنی جگہ پیسوں کی زیادتی شمار کر کے خوش ہوتا ہے، مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کیا رہا؟ اور حقیقت میں جو کوئی شخص دوسرے کا مال غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے درحقیقت وہ خود اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

یوں تو ناجائز ذرائع آمدنی ہر وقت اور ہر زمانے میں ناجائز ہیں، لیکن کسی مقدس زمانے میں یا مقدس مقام پر ان کا ارتکاب کیا جائے تو ان کی قباحت اور بڑھ جاتی ہے خاص طور سے رمضان کے مبارک مہینے میں کیونکہ اس مہینے میں ایک مسلمان اللہ کے حکم کی خاطر ناجائز اور مباح چیزوں (مثلاً

کھانے پینے) کو چھوڑ دیتا ہے تو یہ بات بڑی شرم کی ہے کہ جو چیزیں ہمیشہ سے حرام تھیں انہیں ترک نہ کرے، لہٰذا اس مبارک مہینے میں اکل حلال کا زیادہ اہتمام لازمی ہے۔

حرام سے بچنے اور حلال کے حاصل کرنے کے لئے قرآن وسنت میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں کی گئی ہیں، ایک آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کے اعمال واخلاق میں بہت بڑا دخل حلال کھانے کو ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اچھے اخلاق واعمال کی توقع مشکل ہے، ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ (۱)

''اے گروہ انبیاء! حلال اور پاک چیزیں کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں تمہارے اعمال کی حقیقت سے باخبر ہوں''

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ عمل صالح کا حکم فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ اعمال صالحہ کا صدور اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ انسان کا کھانا پینا حلال ہو۔

آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی، فرمایا کہ بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اٹھاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دعا کے لئے پھیلاتے ہیں اور یارب یارب پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام تو ان کی دعا کیسے قبول ہوسکتی ہے؟ (۲)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ میرے لئے یہ دعا فرمادیجئے کہ میری ہر دعا قبول ہوا کرے، آپ نے فرمایا:

''اے سعد! اپنا کھانا حلال اور پاک بنالو، تمہاری دعائیں قبول ہونے لگیں گی، اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے، بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لئے تو جہنم کی آگ ہی

(۱) المؤمنون: ۵۱

(۲) صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتها، رقم: ۱۶۸۶، سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب من سورۃ البقرۃ، رقم: ۲۹۱۵، مسند أحمد، رقم: ۷۹۹۸، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب فی أکل الطیب، رقم: ۲۶۰۱

زیادہ لائق ہے"(۱)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حرام مال سے اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے محفوظ رکھے اور رزق حلال کی توفیق کامل عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

☆☆☆

(۱) جامع العلوم والحکم (۱/۱۰۰)

ناپ تول میں کمی اور اس کا وبال ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ o الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ o وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ o أَلَا يَظُنُّ أُولٰٓئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ o يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ o﴾ (۱)

کم تولنا، ایک عظیم گناہ

بزرگان محترم اور برادران عزیز! میں نے آپ حضرات کے سامنے سورۃ مطففین کی ابتدائی آیات تلاوت کیں، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بہت بڑے گناہ اور معصیت کی طرف متوجہ فرمایا ہے، وہ گناہ ہے ''کم ناپنا اور کم تولنا'' یعنی جب کوئی چیز کسی کو بیچی جائے تو جتنا اس خریدنے والے کا حق ہے اس سے کم تول کر دے، عربی میں کم ناپنے اور کم تولنے کو ''مطففین'' کہا جاتا ہے، اور یہ ''تطفیف'' صرف تجارت اور لین دین کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ''تطفیف'' کا مفہوم بہت وسیع ہے، وہ یہ کہ دوسرے کا جو بھی حق ہمارے ذمے واجب ہے اس کو اگر اس کا حق کم کر کے دیں تو یہ ''تطفیف'' کے اندر داخل ہے۔

آیات کا ترجمہ یہ ہے کہ کم ناپنے اور کم تولنے والوں کے لئے افسوس ہے (اللہ تعالیٰ نے ''ویل'' کا لفظ استعمال فرمایا ''ویل'' کے ایک معنی تو ''افسوس'' کے آتے ہیں دوسرے معنی اس کے ہیں ''دردناک عذاب'' اس دوسرے معنی کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا'' کہ ان لوگوں پر دردناک

☆ اصلاحی خطبات (۱۱۴/۶ تا ۱۳۷) ۶ اگست ۱۹۹۳ء، قبل از نماز جمعہ، جامع مسجد نعمان، لسبیلہ چوک، کراچی

() المطففین: ۱-۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ لوگوں سے خود کوئی چیز ناپ کر لیتے ہیں تو پوری پوری لیتے ہیں، اور جب وہ کسی کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سوچتے کہ انہیں ایک بڑے زبردست دن میں زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟ جس دن سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے''

عذاب ہے جو دوسروں کا حق کم دیتے ہیں۔ اور کم ناپتے اور تولتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ جب دوسروں سے اپنا حق وصول کرنے کا موقع آتا ہے تو اس وقت اپنا حق پورا لیتے ہیں۔ (اس وقت تو ایک دمڑی بھی کر دینے کا موقع مل جائے تو اس وقت (ڈنڈی مار دیتے ہیں) کم کر دیتے ہیں، (جتنا حق دینا چاہئے تھا اتنا نہیں دیتے) (آگے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ) ''کیا ان لوگوں کو یہ خیال نہیں کہ ایک عظیم دن میں دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، جس دن سارے انسان رب العالمین کے سامنے پیش ہوں گے'' (اور اس وقت انسان کو اپنے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی پوشیدہ رکھنا ممکن نہیں ہوگا، اور اس دن ہمارا اعمال نامہ ہمارے سامنے آجائے گا، تو کیا ان لوگوں کو یہ خیال نہیں کہ اس وقت کم ناپ کر اور کم تول کر دنیا کے چند ٹکوں کا جو تھوڑا سا فائدہ اور نفع حاصل کر رہے ہیں یہ چند ٹکوں کا فائدہ ان کے لئے جہنم کے عذاب کا سبب بن جائے گا۔ اس لئے قرآن کریم نے بار بار کم ناپنے اور کم تولنے کی برائی بیان فرمائی۔ اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی، اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا واقعہ بھی بیان فرمایا)

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا جرم

حضرت شعیب علیہ السلام جب اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے اس وقت ان کی قوم بہت سی معصیتوں اور نافرمانیوں میں مبتلا تھی، کفر، شرک اور بت پرستی میں تو مبتلا تھی، اس کے علاوہ پوری قوم کم ناپنے اور کم تولنے میں مشہور تھی۔ تجارت کرتے تھے لیکن اس میں لوگوں کا حق پورا نہیں دیتے تھے، دوسری طرف وہ ایک انسانیت سوز حرکت یہ کرتے تھے کہ مسافروں کو راستے میں ڈرایا کرتے اور ان پر حملہ کر کے لوٹ لیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو کفر، شرک اور بت پرستی سے منع کیا۔ اور توحید کی دعوت دی، اور کم ناپنے کم تولنے اور مسافروں کو راستے میں ڈرانے اور ان پر حملہ کرنے سے بچنے کا حکم دیا۔ لیکن وہ قوم اپنی بداعمالیوں میں مست تھی، اس لئے حضرت شعیبؑ کی بات ماننے کے بجائے ان سے یہ پوچھا:

﴿أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ﴾(۱)

''یعنی کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دے رہی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے آباء واجداد عبادت کرتے تھے، یا ہم اپنے مال میں جس طرح

(۱) ھود: ۸۷

چاہیں تصرف کرنا چھوڑ دیں''

یہ ہمارا مال ہے ہم اسے جس طرح چاہیں حاصل کریں، چاہے کم تول کر حاصل کریں یا کم ناپ کر حاصل کریں، یا دھوکہ دے کر حاصل کریں۔ تم ہمیں روکنے والے کون ہو؟ ان باتوں کے جواب میں حضرت شعیب علیہ السلام ان کو محبت اور شفقت کے ساتھ سمجھاتے رہے اور اللہ کے عذاب سے اور آخرت کے عذاب سے ڈراتے رہے، لیکن یہ لوگ باز نہ آئے۔ اور بالآخر ان کا وہی انجام ہوا جو نبی کی بات نہ ماننے والوں کا ہوتا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسا عذاب بھیجا جو شاید کسی اور قوم کی طرف نہیں بھیجا گیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب

وہ عذاب ان پر اس طرح آیا کہ پہلے تین دن متواتر پوری بستی میں سخت گرمی پڑی، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آسمان سے انگارے برس رہے ہیں، اور زمین آگ اگل رہی ہے، حبس اور تپش نے ساری بستی والوں کو پریشان کر دیا، تین دن کے بعد بستی والوں نے دیکھا کہ اچانک ایک بادل کا ٹکڑا بستی کی طرف آرہا ہے اور اس بادل کے نیچے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، چونکہ بستی کے لوگ تین دن سے سخت گرمی کی وجہ سے بلبلائے ہوئے تھے، اس لئے سارے بستی والے بہت اشتیاق کے ساتھ بستی چھوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہوئے، تاکہ یہاں ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھائیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بادل کے نیچے اس لئے جمع کرنا چاہتے تھے کہ سب پر ایک ساتھ عذاب نازل کر دیا جائے، چنانچہ جب وہ سب وہاں جمع ہوگئے تو وہی بادل جس میں سے ٹھنڈی ہوائیں آرہی تھیں اس میں سے آگ کے انگارے برسنا شروع ہوگئے، اور ساری قوم ان انگاروں کا نشانہ بن کر جھلس کر ختم ہوگئی، اسی واقعہ کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ سے اشارہ فرمایا:

﴿فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾(۱)

''یعنی انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا اس کے نتیجے میں ان کو سائبان والے دن کے عذاب نے پکڑ لیا''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ﴾(۲)

''یعنی یہ ان کی بستیاں دیکھو، جو ان کی ہلاکت کے بعد آباد بھی نہیں ہو سکیں مگر

(۱) الشعراء:۱۸۹ (۲) القصص:۵۸

بہت کم، ہم ہی ان کے سارے مال و دولت اور جائیداد کے وارث بن گئے"

وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ کم ناپ کر، کم تول کر، ملاوٹ کر کے، دھوکہ دے کر ہم اپنے مال و دولت میں اضافہ کریں گے، لیکن وہ ساری دولت دھری کی دھری رہ گئی۔

یہ آگ کے انگارے ہیں

اگر تم نے ڈنڈی مار کر ایک تولہ، یا دو تولہ، ایک چھٹانک یا دو چھٹانک مال خریدار کو کم دے دیا اور چند پیسے کمالئے دیکھنے میں تو یہ پیسے ہیں لیکن حقیقت میں آگ کے انگارے ہیں۔ جس کو تم اپنے پیٹ میں ڈال رہے ہو، حرام مال اور حرام کھانے کے بارے میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا﴾(۱)

"یعنی جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، جو لقمے حلق سے نیچے اتر رہے ہیں یہ حقیقت میں آگ کے انگارے ہیں"

اگرچہ دیکھنے میں وہ روپیہ پیسہ اور مال و دولت نظر آرہا ہے، کیونکہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے اور اللہ کی معصیت اور نافرمانی کر کے یہ پیسے حاصل کئے گئے ہیں، یہ پیسے اور یہ مال و دولت دنیا میں بھی تباہی کا سبب ہے اور آخرت میں بھی تباہی کا ذریعہ ہے۔

اجرت کم دینا گناہ ہے

اور یہ کم ناپنا اور کم تولنا صرف تجارت کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، بلکہ کم ناپنا اور کم تولنا اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو امام المفسرین ہیں سورۃ مطففین کی ابتدائی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"شِدَّةُ الْعَذَابِ يَوْمَئِذٍ لِلْمُطَفِّفِينَ مِنَ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَالصِّيَامِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ مِنَ الْعِبَادَاتِ"(۲)

"یعنی قیامت کے روز سخت عذاب ان لوگوں کو بھی ہوگا جو اپنی نماز، زکوٰۃ اور

(۱) النساء: ۱۰

(۲) تنوير المقباس من تفسير ابن عباس، سورة المطففين (۲/۱۳۲)

روزے اور دوسری عبادات میں کمی کرتے ہیں''

اس سے معلوم ہوا کہ عبادات میں کوتاہی کرنا اس کو پورے آداب کے ساتھ ادا نہ کرنا بھی تطفیف کے اندر داخل ہے۔

مزدور کو مزدوری فوراً دے دو!

ایک آقا مزدور سے پورا پورا کام لیتا ہے، اس کو ذرا سی بھی سہولت دینے کو تیار نہیں ہے، لیکن تنخواہ دینے کے وقت اس کی جان نکلتی ہے، اور پوری تنخواہ نہیں دیتا، یا صحیح وقت پر نہیں دیتا، ٹال مٹول کرتا ہے، یہ بھی ناجائز ہے حرام ہے۔ اور تطفیف میں داخل ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

((أَعْطُوا الْاَجِيْرَ أَجْرَهٗ قَبْلَ أَنْ يَّجُفَّ عَرَقُهٗ))(۱)

''یعنی مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو''

اس لئے کہ جب تم نے اس سے مزدوری کرالی کام لے لیا تو اب مزدوری دینے میں تاخیر کرنا جائز نہیں۔

نوکر کو کھانا کیسا دیا جائے؟

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ صاحب فرماتے ہیں کہ آپ نے ایک نوکر رکھا اور نوکر سے یہ طے کیا کہ تمہیں ماہانہ اتنی تنخواہ دی جائے گی، اور روزانہ دو وقت کا کھانا دیا جائے گا، لیکن جب کھانے کا وقت آیا تو خود خوب پلاؤ زردے اڑائے، اعلیٰ درجے کا کھانا کھایا، اور بچا کچا کھانا جس کو ایک معقول اور شریف آدمی پسند نہ کرے وہ نوکر کے حوالے کر دیا تو یہ بھی ''تطفیف'' ہے اسلئے کہ جب تم نے اس کے ساتھ دو وقت کا کھانا طے کرلیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کو اتنی مقدار میں ایسا کھانا دو گے جو ایک معقول آدمی پیٹ بھر کر کھا سکے، لہٰذا اب اس کو بچا کچا کھانا دینا اس کی حق تلفی اور اس کے ساتھ ناانصافی ہے، لہٰذا یہ بھی ''تطفیف'' کے اندر داخل ہے۔

ملازمت کے اوقات میں ڈنڈی مارنا

ایک شخص کسی محکمے میں، کسی دفتر میں آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے، تو گویا کہ اس نے یہ آٹھ گھنٹے اس محکمے کے ہاتھ فروخت کر دیئے ہیں، اور یہ معاہدہ کرلیا ہے کہ میں آٹھ گھنٹے آپ کے پاس کام کروں

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الأحكام، باب أجر الأجراء، رقم: ٢٤٣٤

گا، اور اس کے عوض اس کو اجرت اور تنخواہ ملے گی، اب اگر وہ اجرت تو پوری لیتا ہے لیکن اس آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میں کمی کر لیتا ہے، اور اس میں سے کچھ وقت اپنے ذاتی کاموں میں صَرف کر لیتا ہے تو اس کا یہ عمل بھی "تطفیف" کے اندر داخل ہے، حرام ہے، گناہ کبیرہ ہے، یہ بھی اسی طرح گناہگار ہے جس طرح کم ناپنے اور کم تولنے والا گناہگار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے اگر آٹھ گھنٹے کے بجائے سات گھنٹے کام کیا، تو ایک گھنٹے کی ڈیوٹی ماردی، گویا کہ اجرت کے وقت اپنا حق اجرت تو پورا لے رہا ہے، اور جب دوسروں کا حق دینے کا وقت آیا تو کم دے رہا ہے۔ لہٰذا تنخواہ کا وہ حصہ حرام ہوگا جو اس وقت کے بدلے میں ہوگا جو اس نے اپنے ذاتی کاموں میں صَرف کیا۔

ایک ایک منٹ کا حساب ہوگا

کسی زمانے میں تو دفتروں میں ذاتی کام چوری چھپے ہوا کرتے تھے، مگر آج کل دفتروں کا یہ حال ہے کہ ذاتی کام چوری چھپے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ کھلم کھلا، اعلانیہ، ڈنکے کی چوٹ پر کیا جاتا ہے، اپنے مطالبات پیش کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں کہ تنخواہیں بڑھاؤ، الاؤنس بڑھاؤ، فلاں فلاں مراعات ہمیں دو، اور اس مقصد کے لئے احتجاج کرنے، جلسے جلوس کرنے اور نعرے لگانے کے لئے، ہڑتال کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے ذمے کیا حقوق عائد ہو رہے ہیں؟ ہم ان کو ادا کر رہے ہیں یا نہیں؟ ہم نے آٹھ گھنٹے ملازمت اختیار کی تھی ان آٹھ گھنٹوں کو کتنی دیانت اور امانت کے ساتھ خرچ کیا، اس کی طرف بالکل دھیان نہیں جاتا۔

یاد رکھو! ایسے ہی لوگوں کے لئے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ جو دوسرے کے حقوق میں کمی کرتے ہیں، اور جب دوسروں سے حق وصول کرنے کا وقت آتا ہے تو اس وقت پورا پورا لیتے ہیں۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک ایک منٹ کا حساب ہوگا، اس میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کا حال

آپ حضرات نے دارالعلوم دیوبند کا نام سنا ہوگا، اس آخری دور میں اللہ تعالیٰ نے اس ادارے کو اس امت کے لئے رحمت بنا دیا، اور یہاں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے صحابہ کرام کی یادیں تازہ کر دیں، میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ سے سنا کہ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دور میں اساتذہ کا یہ معمول تھا کہ دارالعلوم کے وقت میں اگر کوئی مہمان ملنے کے

لئے آجاتا تو جس وقت وہ مہمان آتا اس وقت گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ کر لیتے، اور یہ نوٹ کر لیتے کہ یہ مہمان مدرسہ کے اوقات میں سے اتنا وقت میرے پاس رہا، پورا مہینہ اسی طرح کرتے اور جب مہینہ ختم ہوجاتا تو استاذ ایک درخواست پیش کرتے کہ چونکہ فلاں فلاں ایام میں اتنی دیر تک میں مہمان کے ساتھ مشغول رہا اس وقت کو دارالعلوم کے کام میں صَرف نہیں کر سکا، لہٰذا میری تنخواہ میں سے اتنے وقت کی تنخواہ کاٹ لی جائے۔

کہیں تنخواہ حرام نہ ہوجائے

آج تنخواہ بڑھانے کی درخواست دینے کے بارے میں تو آپ روزانہ سنتے ہیں، لیکن یہ کہیں سننے میں نہیں آتا کہ کسی نے یہ درخواست دی ہو کہ میں نے دفتری اوقات میں اتنا وقت ذاتی کام میں صَرف کیا تھا، لہٰذا میری اتنی تنخواہ کاٹ لی جائے۔ یہ عمل وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کی فکر ہو۔ آج ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے مزدوری کرنے والے، ملازمت کرنے والے لوگ کتنا وقت دیانت داری کے ساتھ اپنی ڈیوٹی پر صَرف کر رہے ہیں؟ آج ہر جگہ فساد برپا ہے، خلق خدا پریشان ہے، اور دفتر کے باہر دھوپ میں کھڑی ہے اور صاحب بہادر اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں مہمانوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہیں، چائے پی جارہی ہے، ناشتہ ہو رہا ہے، اس طرز عمل میں ایک طرف تو تنخواہ حرام ہو رہی ہے اور دوسری طرف خلق خدا کو پریشان کرنے کا گناہ الگ ہو رہا ہے۔

سرکاری دفاتر کا حال

ایک سرکاری محکمے کے ذمہ دار افسر نے مجھے بتایا کہ میرے ذمے یہ ڈیوٹی ہے کہ میں ملازموں کی حاضری لگاؤں، ایک ہفتہ کے بعد ہفتہ بھر کا چٹھہ تیار کر کے افسر بالا کو پیش کرتا ہوں، تاکہ اس کے مطابق تنخواہیں تیار کی جائیں اور میرے محکمے میں نوجوانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو مار پیٹ والے نوجوان ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ اولاً تو دفتر میں آتے ہی نہیں ہیں، اور اگر کبھی آتے بھی ہیں تو ایک دو گھنٹے کے لئے آتے ہیں اور یہاں آکر بھی یہ کرتے ہیں کہ دوستوں سے ملاقات کرتے ہیں، کینٹین میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں، اور مشکل سے آدھا گھنٹہ دفتری کام کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ میں نے حاضری کے رجسٹر میں لکھ دیا کہ یہ حاضر نہیں ہوئے تو وہ لوگ پستول اور ریوالور لے کر مجھے مارنے کے لئے آگئے، اور کہا کہ ہماری حاضری کیوں نہیں لگائی؟ فوراً ہماری حاضری لگاؤ۔ اب مجھے

بتائیں کہ میں کیا کروں؟ اگر حاضری لگاتا ہوں تو جھوٹ ہوتا ہے، اور اگر نہیں لگاتا تو ان لوگوں کے انتقام وغضب کا نشانہ بنتا ہوں، میں کیا کروں؟ آج ہمارے دفتروں کا یہ حال ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حقوق میں کوتاہی

اور سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے، اس حق کی ادائیگی میں کمی کرنا بھی کم ناپنے اور کم تولنے میں داخل ہے، مثلاً نماز اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اور نماز کا طریقہ بتادیا گیا کہ اس طرح قیام کرو، اس طرح رکوع کرو، اس طرح سجدہ کرو، اس طرح اطمینان کے ساتھ اور اس طرح اطمینان کے سارے ارکان ادا کرو۔ اب آپ نے جلدی جلدی بغیر اطمینان کے ایک منٹ کے اندر نماز پڑھ لی، نہ سجدہ اطمینان سے کیا، نہ رکوع اطمینان سے کیا، تو آپ نے اللہ کے حق میں کوتاہی کردی۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صاحب نے جلدی جلدی نماز ادا کرلی، نہ رکوع اطمینان سے کیا، نہ سجدہ اطمینان سے کیا، تو ایک صحابی نے ان کی نماز دیکھ کر فرمایا:

"لَقَدْ طَفَّفْتَ"(۱)

''تم نے نماز کے اندر ''تطفیف'' کی، یعنی اللہ تعالیٰ کا پورا حق ادا نہیں کیا''

یاد رکھئے! کسی کا بھی حق ہو، چاہے اللہ تعالیٰ کا حق ہو، یا بندے کا حق ہو، اس میں جب کمی اور کوتاہی کی جائے گی تو یہ بھی ناپ تول میں کمی کے حکم میں داخل ہوگی، اور اس پر وہ ساری وعیدیں صادق آئیں گی جو قرآن کریم نے ناپ تول کی کمی پر بیان کی ہیں۔

ملاوٹ کرنا حق تلفی ہے

اسی طرح ''تطفیف'' کے وسیع مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جو چیز فروخت کی وہ خالص نہیں، بلکہ اس کے اندر ملاوٹ کردی، یہ ملاوٹ کرنا کم ناپنے اور کم تولنے میں اس لحاظ سے داخل ہے کہ مثلاً آپ نے ایک سیر آٹا فروخت کیا، لیکن اس ایک سیر آٹے میں خالص آٹا تو آدھا سیر ہے اور آدھا سیر کوئی اور چیز ملادی ہے، اس ملاوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ خریدار کا جو حق تھا کہ اس کو ایک سیر آٹا ملتا وہ حق اس کو پورا نہیں ملا، اس لئے یہ بھی حق تلفی میں داخل ہے۔

---

(۱) یہ جملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''ابن حدیدہ'' نامی ایک صاحب سے کہا تھا جنہوں نے عصر کی نماز میں سستی سے کام لیا تھا۔ موطا امام مالك، كتاب وقوت الصلاة، باب جامع الوقوت، رقم: ۱۹، كنز العمال، رقم: ۲۱۷۷۸ (۴۲/۸)، جامع الأصول من أحاديث الرسول، رقم: ۳۲۶۹، (۱/۳۳۱۱)

اگر تھوک فروش ملاوٹ کرے؟

بعض لوگ یہ اشکال پیش کرتے ہیں کہ ہم خوردہ فروش ہیں ہمارے پاس تھوک فروشوں کی طرف سے جیسا مال آتا ہے وہ ہم آگے فروخت کر دیتے ہیں، لہٰذا اس صورت میں ہم ملاوٹ نہیں کرتے، ملاوٹ تو تھوک فروش کرتے ہیں، لیکن ہمیں لامحالہ وہ چیز ویسی ہی آگے فروخت کرنی پڑتی ہے، اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک شخص خود مال نہیں بناتا اور نہ ملاوٹ کرتا ہے بلکہ دوسرے سے مال لے کر آگے فروخت کرتا ہے تو اس صورت میں خریدار کے سامنے یہ بات واضح کر دے کہ میں اس بات کا ذمہ دار نہیں کہ اس میں کتنی اصلیت ہے اور کتنی ملاوٹ ہے۔ البتہ میری معلومات کے مطابق اتنی اصلیت ہے اور اتنی ملاوٹ ہے۔

خریدار کے سامنے وضاحت کر دے

لیکن ہمارے بازاروں میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو اصلی اور خالص ملتی ہی نہیں ہیں، بلکہ جہاں سے بھی لو گے وہ ملاوٹ شدہ ہی ملے گی، اور سب لوگوں کو یہ بات معلوم بھی ہے کہ یہ چیز اصلی نہیں ہے، بلکہ اس میں ملاوٹ ہے ایسی صورت میں وہ تاجر جو اس چیز کو دوسرے سے خرید کر لایا ہے اس کے ذمے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر ہر شخص کو اس چیز کے بارے میں بتائے، اس لئے کہ ہر شخص کو اس کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ خالص نہیں ہے، لیکن اگر یہ خیال ہو کہ خریدنے والا اس چیز کی حقیقت سے بے خبر ہے تو اس صورت میں اس کو بتانا چاہئے کہ یہ چیز خالص نہیں ہے، بلکہ اس میں ملاوٹ ہے۔

عیب کے بارے میں گاہک کو بتا دے

اسی طرح اگر بیچے جانے والے سامان میں کوئی عیب ہو وہ عیب خریدار کو بتا دینا چاہئے، تاکہ اگر وہ شخص اس عیب کے ساتھ اس کو خریدنا چاہتا ہے تو خرید لے ورنہ چھوڑ دے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُبَيِّنْهُ لَمْ يَزَلْ فِيْ مَقْتِ اللّٰهِ وَلَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ تَلْعَنُهُ))(۱)

"یعنی جو شخص عیب دار چیز فروخت کرے اور اس عیب کے بارے میں وہ خریدار کو نہ بتائے کہ اس کے اندر یہ خرابی ہے تو ایسا شخص مسلسل اللہ کے غضب میں رہے گا اور ملائکہ ایسے آدمی پر مسلسل لعنت بھیجتے رہتے ہیں"

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب ما باع عيبا فليبينه، رقم: ۲۲۳۸

دھوکہ دینے والا ہم میں سے نہیں

ایک مرتبہ حضور ﷺ بازار تشریف لے گئے وہاں آپ نے دیکھا کہ ایک شخص گندم بیچ رہا ہے، آپ اس کے قریب تشریف لے گئے اور گندم کی ڈھیری میں اپنا ہاتھ ڈال کر اس کو اوپر نیچے کیا تو یہ نظر آیا کہ اوپر تو اچھا گندم ہے اور نیچے بارش اور پانی کے اندر گیلا ہو کر خراب ہو جانے والا گندم ہے، اب دیکھنے والا جب اوپر سے دیکھتا ہے تو اس کو یہ نظر آتا ہے کہ گندم بہت اچھا ہے، حضور ﷺ نے اس شخص سے فرمایا کہ تم نے یہ بہت خراب والا گندم اوپر کیوں نہیں رکھا تاکہ خریدار کو معلوم ہو جائے کہ یہ گندم ایسا ہے، وہ لینا چاہے تو لے لے، نہ لینا چاہے تو چھوڑ دے، اس شخص نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ بارش کی وجہ سے کچھ گندم خراب ہو گئی تھی اس لئے میں نے اس کو نیچے کر دیا، آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، بلکہ اس کو اوپر کر دو اور پھر آپ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا))(۱)

''جو شخص دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں''

یعنی جو شخص ملاوٹ کر کے دھوکہ دے کر بظاہر تو خالص چیز بیچ رہا ہے لیکن حقیقت میں اس میں کوئی دوسری چیز ملا دی گئی ہے یا بظاہر تو پوری چیز دے رہا ہے لیکن حقیقت میں اس سے کم دے رہا ہے تو یہ غش اور دھوکہ ہے۔ اور جو شخص یہ کام کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، یعنی مسلمانوں میں سے نہیں ہے، دیکھئے ایسے شخص کے بارے میں حضور ﷺ کتنی سخت بات فرما رہے ہیں، لہٰذا جو چیز بیچ رہے ہو اس کی حقیقت خریدار کو بتا دو کہ اس کی یہ حقیقت ہے لیکن خریدار کو دھوکے میں اور اندھیرے میں رکھنا منافقت ہے، مسلمان اور مومن کا شیوہ نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دیانتداری

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے ہم اور آپ سب مقلد ہیں، بہت بڑے تاجر تھے، کپڑے کی تجارت کرتے تھے، لیکن بڑے سے بڑے نفع کو اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے قربان کر دیا کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ان کے پاس کپڑے کا ایک تھان آیا جس میں کوئی عیب تھا، چنانچہ آپ نے

(۱) صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب قول النبي من غشنا فليس منا، رقم: ۱٤٧، سنن الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله، باب ما جاء في كراهية الغش في البيوع رقم: ١٢٣٦، سنن ابن ماجه كتاب التجارات، باب النهي عن الغش رقم: ٢٢١٦، مسند أحمد، رقم: ٤٨٦٧، سنن الدارمي كتاب البيوع، باب في النهي عن الغش، رقم: ٢٤٢٩

اپنے ملازموں کو جو دوکان پر کام کرتے تھے کہہ دیا کہ یہ تھان فروخت کرتے وقت گاہک کو بتا دیا جائے کہ اس کے اندر یہ عیب ہے، چند روز کے بعد ایک ملازم نے وہ تھان فروخت کر دیا، اور عیب بتانا بھول گیا، جب امام صاحب نے پوچھا کہ اس عیب دار تھان کا کیا ہوا؟ اس ملازم نے بتایا کہ حضرت میں نے اس کو فروخت کر دیا، اب اگر کوئی اور مالک ہوتا تو وہ ملازم کو شاباش دیتا کہ تم نے عیب دار تھان فروخت کر دیا، مگر امام صاحب نے پوچھا کہ کیا تم نے اس کو اس کا عیب بتا دیا تھا؟ ملازم نے جواب دیا کہ میں عیب بتانا بھول گیا، آپ نے پورے شہر کے اندر اس گاہک کی تلاش شروع کر دی جو وہ عیب دار تھان خرید کر لے گیا تھا، کافی تلاش کے بعد وہ گاہک مل گیا تو آپ نے اس کو بتایا کہ جو تھان آپ میری دوکان سے خرید کر لائے ہیں اس میں فلاں عیب ہے اس لئے آپ وہ تھان مجھے واپس کر دیں اور اگر اسی عیب کے ساتھ رکھنا چاہیں تو آپ کی خوشی۔

آج ہمارا حال

آج ہم لوگوں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ عیب نہیں بتاتے، بلکہ جانتے ہیں کہ یہ عیب دار سامان ہے اس میں فلاں خرابی ہے اس کے باوجود قسمیں کھا کر یہ باور کراتے ہیں کہ یہ بہت اچھی چیز ہے اعلیٰ درجے کی ہے اس کو خرید لیں۔ ہمارے اوپر یہ جو اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو رہا ہے کہ پورا معاشرہ عذاب میں مبتلا ہے، ہر شخص بدامنی اور بے چینی اور پریشانی میں ہے، کسی شخص کی بھی جان، مال، آبرو محفوظ نہیں ہے، یہ عذاب ہمارے انہیں گناہوں کا نتیجہ اور وبال ہے کہ ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں کو چھوڑ دیا، سامان فروخت کرتے وقت اس کی حقیقت لوگوں کے سامنے واضح نہیں کرتے، ملاوٹ، دھوکہ، فریب عام ہو چکا ہے۔

بیوی کے حقوق میں کوتاہی گناہ ہے

اسی طرح آج شوہر بیوی سے تو سارے حقوق وصول کرنے کو تیار ہے، وہ ہر بات میں میری اطاعت بھی کرے، کھانا بھی پکائے، گھر کا انتظام بھی کرے، بچوں کی پرورش بھی کرے، ان کی تربیت بھی کرے، اور میرے ماتھے پر شکن بھی نہ آنے دے، اور چشم و آبرو کے اشارے کی منتظر رہے یہ سارے حقوق وصول کرنے کو شوہر تیار ہے، لیکن جب بیوی کے حقوق ادا کرنے کا وقت آئے اس وقت ڈنڈی مار جائے، اور ان کو ادا نہ کرے، حالانکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے شوہروں کو حکم فرما دیا ہے:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾(۱)
''یعنی بیویوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرو''
اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:
((خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ))(۲)
''یعنی تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہو''
ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:
((اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا))(۳)
''یعنی عورتوں کے حق میں بھلائی کرنے کی نصیحت کو قبول کرلو''

یعنی ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو۔ اللہ اور اللہ کے رسول تو ان کے حقوق کی ادائیگی کی اتنی تاکید فرمارہے ہیں، لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اپنی عورتوں کے پورے حقوق ادا کرنے کو تیار نہیں یہ سب کم ناپنے اور کم تولنے کے اندر داخل ہے، اور شرعاً حرام ہے۔

مہر معاف کرانا حق تلفی ہے

ساری زندگی میں بے چاری عورت کا ایک ہی مال حق شوہر کے ذمے واجب ہوتا ہے، وہ ہے مہر، وہ بھی شوہر ادا نہیں کرتا، ہوتا یہ ہے کہ ساری زندگی تو مہر ادا نہیں کیا، جب مرنے کا وقت قریب آیا تو بستر مرگ پر پڑے ہیں دنیا سے جانے والے ہیں، رخصتی کا منظر ہے اس وقت بیوی سے کہتے ہیں کہ مہر معاف کردو، اب اس موقع پر بیوی کیا کرے؟ کیا رخصت ہونے والے شوہر سے یہ کہہ دے کہ میں معاف نہیں کرتی، چنانچہ اس کو مہر معاف کرنا پڑتا ہے، ساری عمر اس سے فائدہ اٹھایا، ساری عمر تو اس سے حقوق طلب کیے، لیکن اس کا حق دینے کا وقت آیا تو اس میں ڈنڈی مار گئے۔

---

(۱) النساء:۱۹

(۲) سنن الترمذی، كتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة على زوجها، رقم:۱۰۸۲، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حسن المعاشرة، رقم:۱۹۶۸، مسند أحمد، مسند ابی هريره، رقم:۷۰۹۵

(۳) صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب الوصاة بالنساء، رقم:۴۷۸۷، صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، رقم:۲۶۷۱، سنن الترمذی، كتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة على زوجها، رقم:۱۰۸۳، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق المرأة على الزوج، رقم:۱۸۴۱

نفقہ میں کمی حق تلفی ہے

یہ تو مہر کی بات تھی، نفقہ کے اندر شریعت کا یہ حکم ہے کہ اس کو اتنا نفقہ دیا جائے کہ وہ آزادی اور اطمینان کے ساتھ گزارہ کر سکے، اگر اس میں کمی کرے گا تو یہ بھی کم ناپنے اور کم تولنے کے اندر داخل ہے، اور حرام ہے، خلاصہ یہ کہ جس کسی کا کوئی حق دوسرے کے ذمے واجب ہو وہ اس کو پورا ادا کرے، اس میں کمی نہ کرے، ورنہ اس عذاب کا مستحق ہوگا جس عذاب کی وعید اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بیان فرمائی ہے۔

یہ ہمارے گناہوں کا وبال ہے

ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب ہم مجلس جما کر بیٹھتے ہیں تو حالات پر تبصرہ کرتے ہیں کہ بہت حالات خراب ہو رہے ہیں، بدامنی ہے، بے چینی ہے، ڈاکے پڑ رہے ہیں، جان محفوظ نہیں، مال محفوظ نہیں، معاشی بدحال کے اندر مبتلا ہیں، یہ سب تبصرے ہوتے ہیں، لیکن کوئی شخص ان تمام پریشانیوں کا حل تلاش کر کے اس کا علاج کرنے کو تیار نہیں ہوتا، مجلس کے بعد دامن جھاڑ کر اٹھ جاتے ہیں۔

یہ دیکھو کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خود سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ کوئی کرنے والا کر رہا ہے، اس کائنات کا کوئی ذرہ اور کوئی پتہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا، لہٰذا اگر بدامنی اور بے چینی آرہی ہے تو اس کی مشیت سے آرہی ہے، اگر سیاسی بحران پیدا ہو رہا ہے تو وہ بھی اللہ کی مشیت سے ہو رہا ہے، اگر چوریاں اور ڈکیتیاں ہو رہی ہیں تو اسی کی مشیت سے ہو رہی ہیں، یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ﴾(۱)

”یعنی جو کچھ تمہیں برائی یا مصیبت پہنچ رہی ہے وہ سب تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے، اور بہت سے گناہ تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں“

دوسری جگہ قرآن کریم کا ارشاد ہ:

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ﴾(۲)

”یعنی اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ہر گناہ پر پکڑ کرنے پر آجائیں تو روئے زمین پر کوئی چلنے والا جانور باقی نہ رہے“

(۱) الشوریٰ:۳۰ (۲) الفاطر:۴۵

سب ہلاک و برباد ہو جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے اور اپنی رحمت سے بہت سے گناہ معاف کرتے رہتے ہیں، لیکن جب تم حد سے بڑھ جاتے ہو اس وقت اس دنیا کے اندر بھی تم پر عذاب نازل کئے جاتے ہیں تاکہ تم سنبھل جاؤ، اگر اب بھی سنبھل گئے تو تمہاری باقی زندگی بھی درست ہو جائے گی، اور آخرت بھی درست ہو جائے گی، لیکن اگر اب بھی نہ سنبھلے تو یاد رکھو دنیا کے اندر تو تم پر عذاب آ ہی رہا ہے، اللہ بچائے آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔

حرام کے پیسوں کا نتیجہ

آج ہر شخص اس فکر میں ہے کہ کسی طرح دو پیسے جلدی سے ہاتھ آ جائیں، کل کے بجائے آج ہی مل جائیں، چاہے حلال طریقے سے ملیں یا حرام طریقے سے ملیں، دھوکہ دے کر ملیں یا فریب دے کر ملیں، یا دوسرے کی جیب کاٹ کر ملیں، لیکن مل جائیں۔ یاد رکھو! اس فکر کے نتیجے میں تمہیں دو پیسے مل جائیں گے لیکن یہ دو پیسے نہ جانے کتنی بڑی رقم تمہاری جیب سے نکال کر لے جائیں گے، یہ دو پیسے دنیا میں تمہیں کبھی امن اور سکون نہیں دے سکتے، یہ دو پیسے تمہیں چین کی زندگی نہیں دے سکتے، اس لئے کہ یہ دو پیسے تم نے حرام طریقے سے اور دوسرے کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر، دوسرے انسان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر حاصل کئے ہیں، لہٰذا گنتی میں تو یہ پیسے شاید اضافہ کر دیں لیکن تمہیں چین لینے نہیں دیں گے، اور کوئی دوسرا شخص تمہاری جیب پر ڈاکہ ڈال دے گا، اور اس سے زیادہ نکال کر لے جائے گا، آج بازاروں میں یہی ہو رہا ہے کہ آپ نے ملاوٹ کر کے دھوکہ دے کر پیسے کمائے، دوسری طرف دو مسلح افراد آپ کی دوکان میں داخل ہوئے اور اسلحہ کے زور پر آپ کا سارا اثاثہ اٹھا کر لے گئے، اب بتائیے! جو پیسے آپ نے حرام طریقے سے کمائے تھے وہ فائدہ مند ثابت ہوئے یا نقصان دہ ثابت ہوئے؟ لیکن اگر تم حرام طریقہ اختیار نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست رکھتے تو اس صورت میں یہ پیسے اگرچہ گنتی میں کچھ کم ہوتے لیکن تمہارے لئے آرام اور سکون اور چین کا ذریعہ بنتے۔

عذاب کا سبب گناہ ہیں

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو بہت امانت اور دیانت کے ساتھ پیسے کمائے تھے، اس کے باوجود ہماری دوکان پر بھی ڈاکو آ گئے، اور لوٹ کر لے گئے، بات یہ ہے کہ ذرا غور کرو کہ اگرچہ تم نے امانت اور دیانت سے کمائے تھے، لیکن یقین کرو کہ تم سے کوئی نہ کوئی گناہ ضرور سرزد ہوا ہوگا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ یہی فرمارہے ہیں کہ جو کچھ تمہیں مصیبت پہنچ رہی یہ وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی

وجہ سے پہنچ رہی ہے، ہوسکتا ہے کہ تم نے کوئی گناہ کیا ہو، لیکن اس کا خیال اور دھیان نہیں کیا، ہوسکتا ہے کہ تم نے زکوۃ پوری ادا نہ کی ہو، یا زکوۃ کا حساب صحیح نہ کیا ہو، یا اور کوئی گناہ کیا ہو اس کے نتیجے میں یہ عذاب تم پر آیا ہو۔

یہ عذاب سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا

دوسرے یہ کہ جب کوئی گناہ معاشرے میں پھیل جاتا ہے اور اس گناہ سے کوئی روکنے والا بھی نہیں ہوتا تو اس وقت جب اللہ تعالیٰ کا کوئی عذاب آتا ہے تو عذاب یہ نہیں دیکھتا کہ کس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا تھا اور کس نے نہیں کیا تھا، بلکہ وہ عذاب عام ہوتا ہے تمام لوگ اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً﴾ (۱)

یعنی اس عذاب سے ڈرو، جو صرف ظالموں ہی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا بلکہ جو لوگ ظلم سے علیحدہ تھے وہ بھی اس عذاب میں پکڑے جائیں گے، اس لئے کہ اگرچہ یہ لوگ خود تو ظالم نہیں تھے لیکن کبھی ظالم کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کی، کبھی ظلم کو مٹانے کی جدوجہد نہیں کی، اس ظلم کے خلاف ان کی پیشانی پر بل نہیں آیا، اس لئے گویا کہ وہ بھی اس ظلم میں ان کے ساتھ شامل تھے، لہٰذا یہ کہنا کہ ہم تو بڑی امانت اور دیانت کے ساتھ تجارت کر رہے تھے اس کے باوجود ہمارے ہاں چوری ہوگئی اور ڈاکہ پڑ گیا، اتنی بات کہہ دینا کافی نہیں، اس لئے کہ اس امانت اور چوری کو دوسروں تک پہنچانے کا کام تم نے انجام نہیں دیا اس کو چھوڑ دیا، اس لئے اس عذاب میں تم بھی گرفتار ہوگئے۔

غیر مسلموں کی ترقی کا سبب

ایک زمانہ وہ تھا جب مسلمانوں کا یہ شیوہ تھا کہ تجارت بالکل صاف ستھری ہو، اس میں دیانت اور امانت ہو، دھوکہ اور فریب نہ ہو، آج مسلمانوں نے تو ان چیزوں کو چھوڑ دیا اور انگریزوں اور امریکیوں اور دوسری مغربی اقوام نے ان چیزوں کو اپنی تجارت میں اختیار کرلیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تجارت کو فروغ ہو رہا ہے، دنیا پر چھا گئے ہیں۔ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یاد رکھو! باطل کے اندر کبھی ابھرنے اور ترقی کرنے کی طاقت ہی نہیں اس لئے کہ قرآن کریم کا صاف ارشاد ہے:

---

(۱) الأنفال: ۲۵

﴿إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾(۱)

''یعنی باطل تو مٹنے کے لئے آیا ہے''

لیکن اگر کبھی تمہیں یہ نظر آئے کہ کوئی باطل ترقی کر رہا ہے، ابھر رہا ہے، تو سمجھ لو کہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے، اور اس حق چیز نے اس کو ابھار دیا ہے، لہٰذا یہ باطل لوگ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے، آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کو دنیا کے اندر بھی ذلیل اور رسوا کر دیا جاتا، لیکن کچھ حق چیزیں ان کے ساتھ لگ گئیں وہ امانت اور دیانت جو حضور ﷺ نے ہمیں سکھائی تھیں وہ انہوں نے اختیار کر لی، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت کو ترقی عطا فرمائی، آج وہ پوری دنیا پر چھا گئے، اور ہم نے تھوڑے سے نفع کے خاطر امانت اور دیانت کو چھوڑ دیا اور دھوکہ، فریب کو اختیار کر لیا اور یہ نہ سوچا کہ یہ دھوکہ، فریب آگے چل کر ہماری اپنی تجارت کو تباہ و برباد کر دے گا۔

مسلمانوں کا طرۂ امتیاز

مسلمان کا ایک طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ تجارت میں کبھی دھوکہ اور فریب نہیں دیتا، ناپ تول میں کبھی کمی نہیں کرتا، کبھی ملاوٹ نہیں کرتا، امانت اور دیانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، حضور ﷺ نے دنیا کے سامنے ایسا ہی معاشرہ پیش کیا اور صحابہ کرام کی شکل میں ایسے ہی لوگ تیار کئے جنہوں نے تجارت میں بڑے سے بڑے نقصان کو گوارہ کر لیا، لیکن دھوکہ اور فریب دینے کو گوارہ نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت بھی چمکائی اور ان کی سیاست بھی چمکائی، ان کا بول بالا کیا، اور انہوں نے دنیا سے اپنی طاقت اور قوت کا لوہا منوایا۔ آج ہمارا حال یہ ہے کہ عام مسلمان نہیں بلکہ وہ مسلمان جو پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتے ہیں لیکن جب وہ بازار میں جاتے ہیں تو سب احکام بھول جاتے ہیں، گویا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام صرف مسجد تک کے لئے ہیں بازار کے لئے نہیں، خدا کے لئے اس فرق کو ختم کریں، اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کے تمام احکامات کو بجالائیں۔

''تطفیف'' سے متعلق تحقیق کا خلاصہ

خلاصہ یہ کہ ''تطفیف'' کے اندر وہ تمام صورتیں داخل ہیں جس میں ایک شخص اپنا حق تو پورا

(۱) الاسراء:۸۱

پورا وصول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے لیکن اپنے ذمے جو دوسروں کے حقوق واجب ہیں وہ اس کو ادا نہ کرے، ایک حدیث شریف میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ))(۱)

''یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے''

یہ نہ ہو کہ اپنے لئے تو پیمانہ کچھ اور ہے اور دوسروں کے لئے پیمانہ کچھ اور ہے، جب تم دوسروں کے ساتھ کوئی معاملہ کرو تو اس وقت یہ سوچو کہ اگر یہی معاملہ کوئی دوسرا شخص میرے ساتھ کرتا تو مجھے ناگوار ہوتا، میں اس کو اپنے اوپر ظلم تصور کرتا، تو اگر میں بھی یہ معاملہ جب دوسروں کے ساتھ کروں گا تو وہ بھی آخر انسان ہیں، ان کو بھی اس سے ناگواری اور پریشانی ہوگی، ان پر ظلم ہوگا، اس لئے مجھے یہ کام نہیں کرنا چاہئے۔

لہٰذا ہم سب اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اور صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کا جائزہ لیں کہ کہاں کہاں ہم سے حق تلفیاں ہو رہی ہیں، کم ناپنا، کم تولنا، دھوکہ دینا، ملاوٹ کرنا، فریب دینا، عیب دار چیز فروخت کرنا، یہ تجارت کے اندر حرام ہے۔ جس کی وجہ سے تجارت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وبال آرہا ہے۔ یہ سب حق تلفی اور ''تطفیف'' کے اندر داخل ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس حقیقت کا فہم اور ادراک عطا فرمائے اور حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ''تطفیف'' کے وبال اور عذاب سے ہمیں نجات عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

☆☆☆

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه، رقم:۱۲، صحیح مسلم، کتاب الایمان، رقم:٦٤، سنن الترمذی کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول الله، رقم:۲٤۳۹، سنن النسائی، الایمان وشرائعه، رقم:٤۹۳۰، سنن ابن ماجه المقدمة، رقم:٦٥

دوہرے پیمانے ☆

قرآن کریم نے ناپ تول میں کمی کرنے کو جرم عظیم قرار دے کر جس طرح صحیح صحیح ناپنے اور تولنے کا حکم دیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ حکم ایک جگہ بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسے بار بار مختلف انداز اور اسلوب سے انتہائی تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات کریمہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

''اور انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپو اور تولو'' (۱)

''پس پورا پورا ناپو اور تولو، اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو'' (۲)

''اور ناپ تول میں کمی نہ کرو'' (۳)

''اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا رکھو'' (۴)

''جب کوئی چیز ناپ کر دو تو پورا پورا ناپو، اور ٹھیک ٹھیک ترازو سے تولو'' (۵)

''پورا پورا ناپو، اور (دوسروں) کو نقصان پہنچانے والے نہ بنو، اور ٹھیک ٹھیک ترازو سے تولو'' (۶)

''اور اللہ نے آسمان کو بلند کیا، اور ترازو بنائی، تاکہ تم تولنے میں حد سے تجاوز نہ کرو، اور وزن کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو، اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں'' (۷)

قرآن کریم نے جس صراحت اور جس تاکید کے ساتھ بار بار ناپ تول میں انصاف سے کام لینے پر زور دیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناپ تول میں بے انصافی قرآن کریم کے نزدیک ان بنیادی بیماریوں میں سے ہے جو معاشرتی خرابیوں کی جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں، اور جنہیں مٹانے کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ناپ تول میں کمی کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو شخص ترازو سے تول کر یا پیمانے

☆ ذکر وفکر، ص:۹۷

(۱) الأنعام:۱۵۲ (۲) الاعراف:۸۵
(۳) هود:۸٤ (٤) هود:۸۵
(۵) بنی اسرائیل:۳۵ (٦) الشعراء:۱۸۱
(۷) الرحمٰن:۷

سے ناپ کر کوئی چیز بیچ رہا ہو وہ ڈنڈی مار کر سودا کم دے؟ یقیناً ناپ تول میں کمی کرنے کا براہ راست مفہوم یہی ہے لیکن جس اسلوب و انداز سے قرآن کریم نے اس برائی کا ذکر فرمایا ہے اس پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ برائی صرف اسی ایک صورت میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس میں ہر وہ قدم شامل ہے جس کے ذریعے کوئی شخص دوسرے کا کسی بھی قسم کا حق پامال کرے یا انصاف کے مطابق اس کا حق پورا پورا نہ دے۔

دراصل قرآن کریم نے ''ترازو'' کا لفظ عدل و انصاف اور ایفائے حقوق کی ایک علامت (Symbol) کے طور پر استعمال فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ سورۃ شوریٰ اور سوہ حدید میں ''ترازو'' کو آسمانی کتاب کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے، سورہ شوریٰ میں ہے:

''اللہ وہی ہے جس نے حق پر مشتمل کتاب اتاری اور ترازو (نازل کی)''(۱)

اور سورہ حدید میں اسی بات کو مزید واضح کر کے فرمایا گیا:

''اور ہم نے ان (پیغمبروں) کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری تاکہ لوگ انصاف قائم کریں''(۲)

اب ظاہر ہے کہ کوئی بھی پیغمبر اپنے ہاتھ میں ترازو لے کر نہیں آئے جس سے سودا تولا جاتا ہے لہٰذا یہاں ''ترازو'' کا واضح مطلب ''عدل و انصاف'' اور ''اداء حقوق'' کی معنوی ترازو ہے، اور کتاب کے ساتھ ملا کر ترازو کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر آسمانی کتاب نظریاتی ہدایت فراہم کرتی ہے تو پیغمبر کا قول و فعل لوگوں کے سامنے وہ جچا تلا پیمانہ پیش کرتا ہے جو حق اور ناحق کے درمیان واضح خطِ امتیاز کھینچ دیتا ہے، اور جس کی روشنی میں حقوق کی رتی رتی کا حساب رکھا جا سکتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ناپ تول میں کمی کا لفظ ایک بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر قسم کی حق تلفی داخل ہے، جب بھی کوئی شخص دوسرے کا کوئی حق ٹھیک ٹھیک ادا نہ کرے تو وہ ناپ تول میں کمی کا مرتکب ہے اور اس کا یہ فعل اتنا ہی قابل نفرت و ملامت ہے جتنا سودا بیچتے وقت ڈنڈی مارنے کا عمل۔ جسے ہر شخص ذلالت اور کمینگی کی علامت سمجھتا ہے، لہٰذا ناپ تول کے سلسلے میں قرآن کریم کے جو ارشادات اوپر بیان کئے گئے ہیں ان کا مخاطب ہر وہ شخص ہے جس کے ذمے دوسرے کا کوئی حق ہو، شوہر کے لئے ان ارشادات کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کا حق پورا پورا ادا کرو، اور بیوی کے لئے ان کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کا حق پورا پورا ادا کرو، حکومت کے لئے ان کا مطلب یہ ہے

(۱) الشوریٰ:۱۷ (۲) الحدید:۲۵

کہ عوام کا حق پورا پورا ادا کرو، اور عوام کے لئے ان کا تقاضا یہ ہے کہ حکومت کا حق پورا پورا ادا کرو، ملازم کے لئے ان ارشادات میں یہ ہدایت ہے کہ انتظامیہ کی طرف سے جو فرائض تمہارے سپرد کئے گئے ہیں اور جن کے معاوضے میں تمہیں تنخواہ یا اجرت دی جارہی ہے وہ ٹھیک ٹھیک دیانت داری کے ساتھ بجا لاؤ، اور انتظامیہ کے لئے ان ارشادات میں یہ تاکید ہے کہ ملازم کے وہ تمام حقوق اسے پورے پورے پہنچاؤ جن کے معاوضے میں تم اس کی محنت سے استفادہ کر رہے ہو، غرض دنیا میں دو طرفہ تعلقات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے لئے ان آیات کریمہ میں جامع رہنمائی موجود نہ ہو۔

پھر قرآن کریم نے مزید آگے بڑھ کر یہ بھی واضح کیا ہے کہ ناپ تول میں کمی کی بدترین شکل یہ ہے کہ انسان اپنے اور دوسرے کے لئے الگ الگ پیمانے بنالے، یعنی جب کسی کو دینے کا وقت آئے تو ناپ تول میں ڈنڈی مار جائے، لیکن جب خود اپنا حق وصول کرنے کا وقت آئے تو ایک رتی چھوڑنے کو تیار نہ ہو، ایسے لوگوں کے لئے قرآن کریم نے انتہائی مؤثر انداز میں یہ وعید بیان فرمائی ہے:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ o الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ o وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ o أَلَا يَظُنُّ أُولٰٓئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ o يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ o﴾ (۱)

''برا ہو ان ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا جو لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کرتے ہیں کیا ایسے لوگوں کو ذرا خیال نہیں کہ وہ ایک زبردست دن میں اٹھائے جائیں گے اس دن جب تمام انسان رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے''

یہاں پھر اگرچہ لفظ ناپ تول میں کمی کا استعمال کیا گیا ہے لیکن اس کے وسیع مفہوم میں ہر قسم کی حق تلفی داخل ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''پورا تولنا اور کم تولنا ہر کام میں ہوسکتا ہے''

لہٰذا اس آیت میں اصولی مذمت ان لوگوں کی بیان کی گئی ہے جنہوں نے زندگی کے معاملات میں دوہرے پیمانے بنا رکھے ہیں، جن کے لینے کا پیمانہ کچھ اور ہے اور دینے کا کچھ اور، جو اپنا مفاد حاصل کرنے میں بڑے تیز طرار اور دوسرے کا حق دینے میں بڑے بخیل اور خسیس ہیں، اور جو دن رات عدل وانصاف کا خون کر کے اپنی دولت کی گنتی میں اضافہ کرتے ہیں، لیکن اس بات کی ذرا پروا نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی کے وقت دولت کا یہ ظاہری اضافہ ان کے لئے کس

(۱) المطففین: ۱ تا ٦

ذلت ورسوائی اور کس عذاب کا سبب بنے گا؟

مقام حسرت ہے کہ آج ہم نے حقوق وفرائض کی ناپ تول میں اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی ترازو کے بجائے زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں ان خود ساختہ، دوھرے پیمانوں کو اختیار کیا ہوا ہے، اور اپنے آپ کو قرآن کریم کی اس سنگین وعید کا مستحق بنا رکھا ہے۔

اگر ایک آجر اپنے مزدور سے اس کی آزاد مرضی کے بغیر مقررہ وقت سے زیادہ کام لیتا ہے اور اس اضافی محنت کا اسے الگ معاوضہ دینے کو تیار نہیں ہوتا تو وہ اپنے اس دوھرے پیمانے کی وجہ سے قرآن کریم کی اس وعید میں داخل ہے اور اس طرح اس نے مزدور سے زائد خدمت لے کر جو فائدہ حاصل کیا ہے وہ اس کے لئے حرام ہے۔

اسی طرح اگر ایک مزدور یا ملازم اپنی ڈیوٹی کے مقررہ اوقات میں اپنے فرائض انجام دینے کے بجائے کام چوری کا مظاہرہ کرتا ہے یا اس وقت میں کوئی ذاتی کام انجام دیتا ہے لیکن تنخواہ پوری وصول کرتا ہے تو وہ بھی اس قرآنی وعید کا مصداق ہے، اور اس کی تنخواہ کا وہ حصہ حرام ہے جو ذاتی کام میں خرچ کئے ہوئے وقت کے مقابل ہو۔ یہاں تک کہ ایک ملازم کے لئے اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں جبکہ اس کے پاس اپنی ڈیوٹی سے متعلق کرنے کا کام موجود ہو کوئی نفلی عبادت، مثلاً نفلی نماز یا تلاوت وغیرہ بھی جائز نہیں، اس کے ذمے اس وقت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی تندہی اور دیانت داری سے ادا کرے۔

یہ بات قلم پر آئی تو یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ اس معاملے میں بھی ہمارے یہاں افراط وتفریط پائی جاتی ہے، بعض ملازمین ڈیوٹی کے اوقات میں نفلی عبادتیں شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ ان کے ذمے کام پڑا ہوا ہوتا ہے لیکن دوسری طرف انتظامیہ کے بعض افراد اپنے ملازمین کو پانچ وقت کی فرض نمازوں کی ادائیگی کا بھی موقع نہیں دیتے۔ حالانکہ فرض نماز کی ادائیگی بہر صورت ضروری ہے، اور انتظامیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ملازمین کے لئے اس کا انتظام کرے، یہ درست ہے کہ ملازم آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینے کا پابند ہے، لیکن طبعی ضروریات کی انجام دہی خود بخود اس مدت سے مستثنیٰ ہے، فرض نماز بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسان کی طبعی ضروریات، لہٰذا اس کی ادائیگی کا وقت بھی ڈیوٹی سے خود بخود مستثنیٰ ہوگا، البتہ ملازم کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اعتدال کے ساتھ نماز فرض (سنتوں سمیت) ادا کرنے پر اکتفا کرے اور اس میں ناواجبی دیر نہ لگائے، نہ کسی اور نفلی عبادت میں مشغول ہو۔

یہ بات تو ضمنی طور پر بیچ میں آگئی، کہنا یہ تھا کہ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے حالات کا جائزہ

لے کر یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم اپنا حق پورا لے کر دوسرے کے حق میں کوتاہی کرنے کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟ ہم نے اپنے اور دوسروں کے لئے الگ الگ پیمانے تو نہیں بنا رکھے؟ ہم دوسروں سے اس چیز کا مطالبہ تو نہیں کر رہے جو ان کی جگہ ہونے کی صورت میں انہیں دینے کے لئے تیار نہ ہوتے؟ جب تک یہ فکر ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوگی اور ہم قرآن کریم کی اس وعید میں داخل ہونے سے ڈرنے نہیں لگیں گے اس وقت تک ان حق تلفیوں اور بدعنوانیوں میں کمی نہیں آئے گی جنہوں نے زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے، اور جن کی وجہ سے ہر انسان خوف دہراس، تشویش اور بے چینی کا شکار ہے، کیونکہ جب معاشرے میں حق تلفیوں کا بازار گرم ہوتا ہے تو اس کا صافی نتیجہ (Net result) سب کی پریشانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، ایک شخص اگر دس آدمیوں کی حق تلفی کرتا ہے تو دوسرے دس آدمی اس کا حق اڑا لے جاتے ہیں اور آخر میں فتح صرف شیطان کی ہوتی ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

حلال روزگار نہ چھوڑیں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ رُزِقَ فِيْ شَيْءٍ فَلْيَلْزَمْهُ))(۱)

''حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو جس کام کے ذریعہ رزق مل رہا ہو اس کو چاہئے کہ وہ اس کام میں لگا رہے اپنے اختیار اور مرضی سے بلا وجہ اس کو نہ چھوڑے''

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ جُعِلَتْ مَعِيْشَتُهُ فِيْ شَيْءٍ فَلَا يَنْتَقِلُ عَنْهُ حَتّٰى يَتَغَيَّرَ عَلَيْهِ)) (۲)

''جس شخص کا روزگار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہو تو وہ شخص اس روزگار کو چھوڑ کر دوسری طرف منتقل نہ ہو، جب تک کہ وہ روزگار خود سے بدل جائے یا اس روزگار میں خود سے ناموافقت پیدا ہو جائے''

رزق کا ذریعہ، اللہ کی جانب سے ہے

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی شخص کے لئے حصول رزق کا ایک ذریعہ مقرر فرما دیا وہ شخص اس میں لگا ہوا ہے اور اس کے ذریعے اس کو رزق مل رہا ہے تو اب بلا وجہ اس روزگار کو چھوڑ کر الگ نہ ہو، بلکہ اس میں لگا رہے تاوقتیکہ وہ خود اس کے ہاتھ سے نکل جائے یا ایسی ناموافقت پیدا ہو جائے کہ اب آئندہ اس کو جاری رکھنا پریشانی کا سبب ہوگا، اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی ذریعہ سے رزق

☆ اصلاحی خطبات (۷/۱۳۰ تا ۱۴۴) ۷ امئی ۱۹۹۶ء، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم کراچی

(۱) كشف الخفاء، رقم: ۲۵۸۱ (۲/۱۵۷۸)، فيض القدير، رقم: ۸۰۷۲ (۶/۱۳۷)، الجامع الصغير وزيادته، رقم: ۱۲۳۷۳ (۱/۱۲۳۸)، شعب الإيمان، رقم: ۱۲۴۱ (۲/۸۹)، كنز العمال، رقم: ۲۹۸۶، إتحاف السادة المتقين (۴/۲۸۷)

(۲) كشف الخفاء (۲/۱۳۷۳)، كنز العمال، رقم: ۲۹۸۶، إتحاف السادة المتقين (۴/۲۸۷)

وابستہ کر دیا ہے تو یہ اللہ جل شانہ کی عطا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو اس کام میں لگایا گیا ہے اور اس سے وابستہ کیا گیا ہے، کیونکہ ویسے تو رزق کے حصول کے ہزاروں راستے اور طریقے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے لئے کسی خاص طریقے کو رزق حاصل کرنے کا سبب بنا دیا تو یہ منجانب اللہ ہے اب اس منجانب اللہ طریقے کو اپنی طرف سے بلاوجہ نہ چھوڑے۔

روزگار اور معیشت کا نظام خداوندی

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں روزگار اور معیشت کا ایک عجیب نظام بنایا ہے جس کو ہماری عقل نہیں پہنچ سکتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾(۱)

''یعنی ہم نے دنیاوی زندگی میں ان کی معیشت تقسیم کی ہے''

وہ اس طرح کہ کسی انسان کے دل میں حاجت پیدا کی اور دوسرے انسان کے دل میں اس حاجت کو پورا کرنے کا طریقہ ڈال دیا، ذرا غور کریں کہ انسان کی حاجتیں اور ضرورتیں کتنی ہیں؟ روٹی کی اسے ضرورت ہے، کپڑے کی اسے ضرورت ہے، مکان کی اسے ضرورت ہے، گھر کا ساز و سامان اور برتنوں کی اسے ضرورت ہے، گویا کہ انسان کو زندگی گزارنے کے لئے بے شمار اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا پوری دنیا کے انسانوں نے مل کر کوئی کانفرنس کی تھی اور اس کانفرنس میں انسان کو پیش آنے والی ضروریات کو شمار کیا تھا، اور پھر آپس میں فیصلہ کیا تھا کہ اتنے لوگ کپڑا بنائیں، اتنے انسان برتن بنائیں، اتنے انسان جوتے بنائیں، اتنے انسان گندم پیدا کریں اور اتنے انسان چاول پیدا کریں وغیرہ۔ اگر تمام انسان ملکر کانفرنس کر کے یہ طے کرنا چاہتے تب بھی یہ انسان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ انسانوں کی تمام ضروریات کا احاطہ کرلیں، اور پھر آپس میں تقسیم کار بھی کریں کہ تم یہ کام کرنا، تم فلاں چیز کی دوکان کرنا، اور تم فلاں چیز کی دوکان کرنا، یہ تو اللہ تعالیٰ کا قائم کیا ہوا نظام ہے کہ اس نے ایک انسان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم گندم اگاؤ، دوسرے انسان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم آٹے کی چکی لگاؤ، ایک کے دل میں ڈال دیا کہ چاول پیدا کرو، ایک انسان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم گھی کی دوکان لگاؤ، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے دل میں ان حاجات کو ڈال دیا جو تمام انسانوں کی حاجتیں ہیں، چنانچہ جب آپ کسی ضرورت کو پورا کرنا چاہیں اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے آپ کے پاس پیسے بھی ہوں تو بازار میں آپ کی وہ حاجت انشاء اللہ ضرور پوری ہو جائے گی۔

---

(۱) الزخرف: ۳۲

تقسیم رزق کا حیرت ناک واقعہ

میرے بڑے بھائی جناب زکی کیفی صاحب اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے، ایک دن انہوں نے فرمایا کہ تجارت میں بعض اوقات اللہ تعالیٰ ایسے ایسے منظر دکھاتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رزاقیت کے آگے سجدہ ریز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لاہور میں ان کی دینی کتابوں کی دوکان ''ادارۂ اسلامیات'' کے نام سے ہے، وہاں بیٹھا کرتے تھے، فرمایا کہ ایک دن جب میں نے صبح کو گھر سے دوکان جانے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ شدید بارش شروع ہوگئی، اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ ایسی شدید بارش ہو رہی ہے، اس وقت سارا نظام زندگی تلپٹ ہے، ایسے میں دوکان جا کر کیا کروں گا؟ کتاب خریدنے کے لئے کون دوکان پر آئیگا، اس لئے کہ ایسے وقت میں اول تو لوگ گھر سے باہر نہیں نکلتے، اگر نکلتے بھی ہیں تو شدید ضرورت کے لئے نکلتے ہیں، کتاب اور خاص طور پر دینی کتاب تو ایسی چیز ہے کہ جس سے نہ تو بھوک مٹ سکتی ہے نہ کوئی دوسری ضرورت پوری ہوسکتی ہے، اور جب انسان کی دنیاوی تمام ضروریات پوری ہوجائیں تو اس کے بعد کتاب کا خیال آتا ہے، لہٰذا ایسے میں کون گاہک کتاب خریدنے آئے گا؟ اور میں دوکان پر جا کر کیا کروں گا؟ لیکن ساتھ ہی دل میں یہ خیال آیا کہ میں نے تو اپنے روزگار کے لئے ایک طریقہ اختیار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس طریقے کو میرے لئے رزق کے حصول کا ایک ذریعہ بنایا ہے، اس لئے میرا کام یہ ہے کہ میں جا کر دوکان کھول کر بیٹھ جاؤں، چاہے کوئی گاہک آئے یا نہ آئے، بس میں نے چھتری اٹھائی اور دوکان کی طرف روانہ ہوگیا، جا کر دوکان کھولی اور قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی، اس خیال سے کہ گاہک تو کوئی آئے گا نہیں تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ لوگ اپنے اوپر برساتی ڈال کر آرہے ہیں، اور کتابیں خرید رہے ہیں اور ایسی کتابیں خرید رہے ہیں کہ جن کی بظاہر وقتی ضرورت بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ چنانچہ جتنی بکری اور دنوں میں ہوتی تھی تقریباً اتنی ہی بکری اس بارش میں بھی ہوئی۔ میں سوچنے لگا کہ یا اللہ! اگر کوئی انسان عقل سے سوچے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس آندھی اور طوفان والی تیز بارش میں کون دینی کتاب خریدنے آئے گا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ وہ جا کر کتاب خریدیں، اور میرے دل میں یہ ڈالا کہ تم جا کر دوکان کھولو۔ مجھے پیسوں کی ضرورت تھی اور ان کو کتاب کی ضرورت تھی، اور دونوں کو دوکان پر جمع کر دیا، ان کو کتاب مل گئی مجھے پیسے مل گئے۔ یہ نظام صرف اللہ تعالیٰ بنا سکتے ہیں، کوئی شخص یہ چاہے کہ

میں منصوبے کے ذریعہ اور کانفرنس کر کے یہ نظام بنالوں؟ باہمی منصوبہ بندی کر کے بنالوں تو کبھی ساری عمر نہیں بنا سکتا۔

رات کو سونے اور دن میں کام کرنے کا فطری نظام

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ذرا اس بات میں غور کرو کہ سارے انسان رات کے وقت سوتے ہیں اور دن کے وقت کام کرتے ہیں۔ اور رات کے وقت نیند آتی ہے اور دن کے وقت نیند بھی نہیں آتی، تو کیا ساری دنیا کے انسانوں نے مل کر کوئی انٹرنیشنل کانفرنس کی تھی جس میں سب انسانوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دن کے وقت کام کریں گے اور رات کے وقت سویا کریں گے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ رات کے وقت سو جاؤ اور دن کے وقت کام کرو۔

﴿وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًاo وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًاo﴾(۱)

اگر یہ چیز انسان کے اختیار میں دے دی جاتی کہ وہ جب چاہے کام کرے اور جس وقت چاہے سو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کوئی شخص کہتا کہ میں دن کو سوؤں گا اور رات کو کام کروں گا، کوئی کہتا کہ میں شام کو سوؤں گا اور صبح کے وقت کام کروں گا، کوئی کہتا کہ میں صبح کے وقت سوؤں گا اور شام کے وقت کام کروں گا، پھر اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک وقت میں ایک شخص سونا چاہ رہا ہے اور دوسرا شخص اسی وقت کھٹ کھٹ کر رہا ہے اور اپنا کام کر رہا ہے، اور اس کی وجہ سے دوسرے کی نیند خراب ہوتی، اس طرح دنیا کا نظام خراب ہو جاتا، یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہر انسان کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ دن کے وقت کام کرو اور رات کے وقت آرام کرو۔ اور اس کو فطرت کا ایک تقاضا بنا دیا۔

رزق کا دروازہ بند مت کرو

بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی معیشت کا نظام بھی خود بنایا ہے اور ہر ایک کے دل میں یہ ڈال دیا ہے کہ تم یہ کام کرو اور تم یہ کام کرو، لہٰذا جب تم کو کسی کام پر لگا دیا گیا اور تمہارا رزق ایک ذریعہ سے وابستہ کر دیا گیا تو یہ کام خود سے نہیں ہو گیا بلکہ کسی کرنے والے نے کیا، اور کسی مصلحت سے کیا، لہٰذا اب بلاوجہ اس حلال ذریعہ رزق کو چھوڑ کر کوئی اور ذریعہ اختیار کرنے کی فکر مت کرو، کیا معلوم

(۱) النبأ: ۱۰ تا ۱۱، مذکورہ آیات کا ترجمہ یہ ہے "اور ہم نے رات کو لباس اور دن کو روزگار کا ذریعہ بنایا ہے"

کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اسی ذریعہ میں کوئی مصلحت رکھی ہو، اور تمہارے اس کام میں لگنے کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگوں کے کام نکل رہے ہوں، اور تم اس وقت پورے نظام معیشت کا ایک حصہ اور پرزہ بنے ہوئے ہو، اس لئے اپنی طرف سے اس ذریعہ کو مت چھوڑو، البتہ اگر کسی وجہ سے وہ ملازمت یا وہ تجارت خود ہی چھوٹ جائے یا اس کے اندر ناموافقت پیدا ہو جائے۔ مثلاً دوکان پر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہے اور کوشش کے باوجود آمدنی بالکل نہیں ہو رہی ہے تو اس صورت میں بیشک اس ذریعہ کو چھوڑ کر دوسرا ذریعہ اختیار کرلے، لیکن جب تک کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو اس وقت تک خود سے رزق کا دروازہ بند نہ کرے۔

یہ عطاء خداوندی ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

چیز یکہ بے طلب رسد آں دادہ خدا است
اورا تو رد مکن کہ فرستادہ خدا است

''یعنی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز طلب کے بغیر مل جائے تو اس کو منجانب اللہ سمجھ کر اس کو رد نہ کرو، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے''

بہر حال! اللہ تعالیٰ نے جس ذریعہ سے تمہارا رزق وابستہ کیا ہے اس سے لگے رہو، جب تک کہ خود ہی حالات نہ بدل جائیں۔

ہر معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

اس حدیث کے تحت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اہل طریق نے اسی پر تمام معاملات کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کے ساتھ واقع ہوتے ہیں قیاس کیا ہے، جن کی معرفت، بصیرت اور فراست خصوصاً واقعات سے ہو جاتی ہے، اس معرفت کے بعد وہ ان میں تغیر اور تبدل از خود نہیں کرتے، اور یہ امر قوم کے نزدیک مثل بدیہیات کے بلکہ مثل محسوسات کے ہے جس کی وہ اپنے احوال میں رعایت رکھتے ہیں''

مطلب یہ ہے کہ اس حدیث میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ اگرچہ براہ راست رزق سے متعلق ہے لیکن صوفیاء کرام اس حدیث سے یہ مسئلہ بھی نکالتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کے

ساتھ جو بھی معاملہ کر رکھا ہے، مثلاً علم میں، خلق کے ساتھ تعلقات میں یا کسی اور چیز میں اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کر رکھا ہے تو وہ شخص اس کو اپنی طرف سے بدلنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اس پر قائم رہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے خلافت کیوں نہیں چھوڑی؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا جو مشہور واقعہ ہے کہ ان کی خلافت کے آخری دور میں ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہوگیا، اور اس کی وجہ بھی خود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائیں گے اور تم اپنے اختیار سے اس قمیص کو مت اتارنا۔ (۱)

لہٰذا یہ خلافت جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہے یہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خلافت کی قمیص پہنائی ہے میں اپنے اختیار سے اس کو نہیں اتاروں گا، چنانچہ آپ نے نہ تو خلافت چھوڑی اور نہ ہی باغیوں کے خلاف تلوار اٹھائی، اور نہ ان کا قلع قمع کرنے کا حکم دیا، حالانکہ آپ امیر المومنین اور خلیفۂ وقت تھے آپ کے پاس لشکر اور فوج تھی، آپ چاہتے تو باغیوں کے خلاف مقابلہ کر سکتے تھے، لیکن آپ نے فرمایا کہ چونکہ یہ باغی اور مجھ پر حملہ کرنے والے بھی مسلمان ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے والا پہلا شخص میں ہو جاؤں۔ چنانچہ آپ نے نہ تو خلافت چھوڑی اور نہ ہی باغیوں کا مقابلہ کیا، بلکہ اپنے گھر کے اندر ہی محصور ہو کر بیٹھ گئے، حتیٰ کہ اپنی جان قربان کردی اور جام شہادت نوش فرمایا۔ شہادت قبول کرلی لیکن خلافت نہیں چھوڑی۔

یہ وہی بات ہے جس کی طرف حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے ذمے ایک کام سپرد کردیا تو اس میں لگے رہو، اپنی طرف سے اس کو مت چھوڑو۔

خدمت خلق کا منصب عطاء خداوندی ہے

بہرحال اللہ تعالیٰ نے جب خدمت دین کا کوئی راستہ تمہارے لئے تجویز فرمادیا اور وہ تمہاری طلب کے بغیر ملا ہے تو اب بلاوجہ اس کو ترک نہ کرو، تمہارے لئے اسی میں نور اور برکت ہے، اسی طرح اہل طریق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جتنے احوال اور معاملات ہوتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ ان

(۱) سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللہ، باب فی مناقب عثمان بن عفان، رقم: ۳۶۳۸، سنن ابن ماجہ، المقدمہ، رقم: ۱۰۹، مسند أحمد، باقی مسند الانصار، رقم: ۲۳۳۲۶

احوال کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر قبول کرلیں، اسی طرح بعض اوقات کسی شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ہوتا ہے، مثلاً ایک شخص کی طرف لوگ اپنی مدد اور اس کے تعاون کے لئے رجوع کرتے ہیں یا دین کے معاملات میں اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، یا دنیاوی معاملات میں اس سے مشورہ لینے کے لئے رجوع کرتے ہیں، تو حقیقت میں یہ ایک ایسا منصب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمایا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ آپس کے معاملات میں اس شخص سے مشورہ کرو، یا ضرورت کے موقع پر اس شخص سے مدد لو، اور جھگڑے ہوں تو اس شخص سے جاکر فیصلہ کراؤ، لوگوں کے دلوں میں یہ بات از خود پیدا نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں یہ باتیں ڈال دیں، تو یہ منصب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملا ہے، اب اپنی طرف سے اس کو ختم نہ کرے، اس لئے کہ یہ منجانب اللہ ہے اور اس خدمت خلق کو منجانب اللہ سمجھ کر کرتا رہے۔

مثلاً بعض اوقات اللہ تعالیٰ خاندان میں سے کسی شخص کو یہ مقام اور منصب عطا فرما دیتے ہیں کہ جہاں خاندان میں کوئی جھگڑا ہو یا کوئی اہم معاملہ کرنا ہے تو لوگ فوراً اس شخص کے پاس جاتے ہیں اور اس سے مشورہ کرتے ہیں، اب بعض اوقات وہ شخص اس بات سے گھبراتا ہے کہ دنیا کی ساری باتیں اور سارے جھگڑے میرے سر ڈالے جاتے ہیں، حقیقت میں یہ گھبرانے کی چیز نہیں ہے اس لئے کہ لوگوں کا آپ کی طرف رجوع کرنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ منجانب اللہ لوگوں کے دلوں میں ڈالا گیا ہے کہ اس کی طرف رجوع کرو، اور یہ منصب منجانب اللہ عطا ہوا ہے۔

بجا کہے جسے عالَم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

لہٰذا اس منصب سے بے نیازی مت برتو، بلکہ اس کو خوشی سے قبول کرلو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے یہ خدمت سونپی گئی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ

حضرت ایوب علیہ السلام کو دیکھئے کہ ایک مرتبہ آپ غسل فرما رہے تھے، غسل کے دوران آپ کے اوپر سونے کی تتلیاں گرنی شروع ہوگئیں، چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام نے غسل کرنا چھوڑ دیا اور تتلیاں جمع کرنی شروع کردیں۔

اللہ تعالیٰ نے پوچھا "اے ایوب! کیا ہم نے تم کو غنی نہیں کیا، اور تمہیں مال و دولت نہیں دی؟

پھر بھی تم اس سونے کو جمع کرنے کی طرف دوڑ رہے ہو"

جواب میں حضرت ایوب علیہ السلام نے عرض کیا "یا اللہ! بیشک آپ نے اتنا مال و دولت عطا فرمایا ہے کہ میں اس کا شکر ادا نہیں کرسکتا، لیکن جو دولت آپ اپنی طرف سے میری طلب کے بغیر عطا فرمارہے ہیں اس سے میں کبھی بے نیازی کا اظہار بھی نہیں کرسکتا، آپ میرے اوپر سونے کی تتلیاں برسارہے ہیں تو میرا کام یہ ہے کہ میں محتاج بن کر ان کی طرف جاؤں اور ان کو حاصل کروں" (۱)

بات دراصل یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی نظر میں وہ تتلیاں مقصود نہیں تھیں اور نہ وہ سونا مقصود تھا جو آسمان سے گر رہا تھا بلکہ ان کی نظر اس دینے والی ذات پر تھی کہ کس ہاتھ سے یہ دولت مل رہی ہے، اور جب دینے والی ذات اتنی عظیم ہو تو انسان کو آگے بڑھ کر اور محتاج بن کر لینا چاہئے، ورنہ اس سونے کی طلب نہیں تھی۔

عیدی زیادہ طلب کرنے کا واقعہ

اس کی مثال میں یہ دیا کرتا ہوں کہ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سب اولادوں کو عید کے موقع پر عیدی دیا کرتے تھے، ہم سب بھائی ہر سال عید کے موقع پر جاکر ان سے مطالبہ کرتے تھے کہ پچھلی عید پر آپ نے بیس روپے دیئے تھے، اس سال گرانی میں اضافہ ہوگیا ہے، لہٰذا اس سال پچیس روپے دیجئے، تو ہر سال بڑھا کر مانگتے کہ بیس کی جگہ پچیس، اور پچیس کی جگہ تیس روپے اور تیس کے پینتیس روپے مانگتے، جواب میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ تم چور ڈاکو لوگ ہو اور ہر سال تم زیادہ مانگتے ہو، دیکھئے! اس وقت ہم سب بھائی برسر روزگار اور ہزاروں کمانے والے تھے، لیکن جب باپ کے پاس جاتے تو رغبت کا اظہار کرکے ان سے مانگتے، کیوں؟ بات درحقیقت یہ تھی کہ نظر ان پیسوں کی طرف نہیں تھی جو بیس، پچیس اور تیس روپے کی شکل میں مل رہے تھے بلکہ نظر اس دینے والے ہاتھ کی طرف تھی کہ اس ہاتھ سے جو کچھ ملے گا اس میں جو برکت اور نور ہوگا ہزاروں اور لاکھوں میں وہ برکت اور نور حاصل نہیں ہوسکتا، جب دنیا کے معمولی تعلقات میں انسان کا یہ حال ہوسکتا ہے تو اللہ تعالیٰ جو احکم الحاکمین ہیں، ان کے ساتھ تعلق میں کیا حال ہوگا؟

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ سے مانگے تو محتاج بن کر مانگے، اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو تو محتاج بن کر اس کو لے لے، اس وقت بے نیازی اختیار نہ کرے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الغسل، باب من اغتسل عریانا وحده فی الخلوة ومن تستر، رقم: ۲۷۰، سنن النسائی، کتاب الغسل والتیمم، باب الاستتار عند الاغتسال، رقم: ٤٠٦، مسند أحمد، مسند ابی هریره، رقم: ۷۸۱۲

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

''جب وہ یہ چاہ رہے ہیں کہ میں ان کے سامنے طمع ظاہر کروں تو ایسے میں قناعت کے سر پر خاک''

اس وقت تو اس میں لذت اور مزہ ہے کہ آدمی لالچی بن کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر مانگے اور جو ملے اس کو قبول کرلے۔ لہٰذا جس کام پر اللہ تعالیٰ نے لگا دیا یا جو منصب اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیا یہ ان کی طرف سے عطا ہے، اس کو اپنی طرف سے مت چھوڑو، ہاں اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں جن کی وجہ سے آدمی چھوڑنے پر مجبور ہو جائے یا کوئی اپنا بڑا کہہ دے۔ مثلاً چھوڑنے کے لئے کسی بڑے سے مشورہ کیا اور اس نے یہ کہہ دیا کہ اب تمہارے لئے اس کو چھوڑ دینا ہی مناسب ہے تو اس وقت اس کو چھوڑ دو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی خاص طلب کے بغیر جو چیز ملے وہ منجانب اللہ ہے اس کی ناقدری مت کرو۔

چیز یکہ بے طلب رسد آں دادہ خدا ست
او را تو رد مکن کہ فرستادہ خدا ست

وہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے اس کو رد مت کرو، اللہ تعالیٰ بچائے، بعض اوقات اس رد کرنے اور بے نیازی کا اظہار کرنے سے انجام بہت خراب ہو جاتا ہے، العیاذ باللہ۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وبال آجاتا ہے، لہٰذا جو چیز طلب کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آجائے یا ایسے خدا ساز کے اسباب کے ذریعہ یعنی ایسے اسباب کے ذریعہ کوئی چیز مل گئی جس کا پہلے وہم وگمان بھی نہیں تھا، بشرطیکہ وہ حلال اور جائز ہو تو منجانب اللہ سمجھ کر اس کو قبول کر لینا چاہئے۔

اسی طرح جس خدمت پر اللہ تعالیٰ کسی کو لگا دے تو اس کو اس خدمت پر لگا رہنا چاہئے، اس خدمت سے اپنے طور پر دست بردار ہونے کی کوشش نہ کرے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس خدمت پر لگا دیا ہے اور تم سے وہ خدمت لے رہے ہیں، اسی طرح اگر تمہیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری طلب کے بغیر کوئی مقام اور منصب عطا فرما دیا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے تمہیں سردار بنا دیا اور لوگ تمہیں اپنا قائد سمجھتے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ اللہ تعالیٰ نے ایک خدمت تمہارے ذمے سپرد کی ہے، تمہیں اس خدمت کا

حق ادا کرنا ہے، لیکن اپنے بارے میں یہ خیال کرو کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میں نہ تو قائد بننے کے لائق ہوں اور نہ سردار بننے کے لائق ہوں۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس خدمت پر لگا دیا ہے اس لئے اس خدمت پر لگا ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح فہم عطا فرمائے اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

☆☆☆

رزق حلال کی طلب، ایک دینی فریضہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ))(١)

رزق حلال کی طلب دوسرے درجے کا فریضہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''رزق حلال کو طلب کرنا دین کے اولین فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے''

اگرچہ سند کے اعتبار سے محدثین نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے لیکن علماء امت نے اس حدیث کو معنی کے اعتبار سے قبول کیا ہے، اور اس بات پر ساری امت کے علماء کا اتفاق ہے کہ معنی کے اعتبار سے حدیث صحیح ہے، اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم اصول بیان فرمایا ہے وہ یہ کہ رزق حلال کو طلب کرنا دین کے اولین فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے، یعنی دین کے اولین فرائض تو وہ ہیں جو ارکان اسلام کہلاتے ہیں اور جن کے بارے میں ہر مسلمان جانتا ہے کہ یہ چیزیں دین میں فرض ہیں۔ مثلاً نماز پڑھنا، زکوۃ ادا کرنا، روزہ رکھنا، حج کرنا وغیرہ۔

یہ سب دین کے اولین فرائض ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان دینی فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ''رزق حلال کو طلب کرنا اور رزق حلال کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہے'' یہ ایک مختصر سا ارشاد اور مختصری تعلیم ہے لیکن اس حدیث میں بڑے عظیم علوم بیان فرمائے گئے ہیں، اگر

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/۱۸۴ تا ۲۰۶)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم کراچی

(١) كنز العمال، رقم: ٩٢٣١ (١٦/٤)، كشف الخفاء، رقم: ١٦٧١ (٤٦/٢)، سنن البيهقي، رقم: ١٢٠٣٠ (٢٤/٢)، الجامع الكبير للسيوطي، رقم: ٣٥ (١٤٠٨٥/١)، جامع الأحاديث، رقم: ١٣٩٣٧ (١٢٨/١٤)، مشكوة المصابيح، رقم: ٢٧٨١ (١٢٩/٢)، شعب الإيمان، رقم: ٨٧٤١ (٤٢١/٦)

آدمی اس حدیث میں غور کرے تو دین کی فہم عطا کرنے کے لئے اس میں بڑا سامان ہے۔

رزق حلال کی طلب دین کا حصہ ہے

اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ ہم اور آپ رزق حلال کی طلب میں جو کچھ کارروائی کرتے ہیں، چاہے وہ تجارت ہو، چاہے وہ کاشت کاری ہو، چاہے وہ ملازمت ہو، چاہے وہ مزدوری ہو، یہ سب کام دین سے خارج نہیں ہیں بلکہ یہ سب بھی دین کا حصہ ہیں اور نہ صرف یہ کہ یہ کام جائز اور مباح ہیں بلکہ ان کو فریضہ قرار دیا گیا ہے، اور نماز، روزے کے فرائض کے بعد اس کو بھی دوسرے درجے کا فریضہ قرار دیا گیا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کام نہ کرے اور رزق حلال کی طلب نہ کرے بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر میں بیٹھ جائے تو وہ شخص فریضہ کے ترک کرنے کا گناہگار ہوگا، اس لئے کہ اس نے ایک فرض اور واجب کام کو چھوڑ رکھا ہے کیونکہ شریعت کا مطالبہ ہے کہ انسان ست ہوکر اور بیکار ہوکر نہ بیٹھ جائے اور کسی دوسرے کا دست نگر نہ بنے، اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے، اور ان چیزوں سے بچنے کا راستہ حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ آدمی اپنی وسعت اور کوشش کے مطابق رزق حلال طلب کرتا رہے تا کہ کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے، کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق ہمارے اوپر واجب فرمائے ہیں اسی طرح کچھ حقوق ہمارے اوپر ہمارے نفس سے متعلق اور ہماری ذات سے متعلق ہمارے گھر والوں سے متعلق بھی واجب فرمائے ہیں، اور رزق حلال کی طلب کے بغیر یہ حقوق ادا نہیں ہو سکتے، اس لئے ان حقوق کی ادائیگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی رزق حلال طلب کرے۔

اسلام میں ''رہبانیت'' نہیں

اس حدیث کے ذریعہ اسلام نے ''رہبانیت'' کی جڑ کاٹ دی، عیسائی مذہب میں رہبانیت کا جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا راستہ اور طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے دنیاوی کاروبار کو چھوڑے اور اپنے نفس اور ذات کے مطالبوں کو ختم کرے اور جنگل میں جاکر بیٹھ جائے اور وہاں پر اللہ اللہ کیا کرے۔ بس اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے اندر نفسانی تقاضے رکھے، بھوک اس کو لگتی ہے، پیاس اس کو لگتی ہے، جسم ڈھانپنے کے لئے اس کو کپڑے کی بھی ضرورت ہے، سر چھپانے کے لئے اس کو مکان کی بھی ضرورت ہے، یہ سارے تقاضے

ہم نے اس کے اندر پیدا کیے، اب ہمارا مطالبہ اس انسان سے یہ ہے کہ وہ ان تقاضوں کو بھی پورا کرے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے حقوق بھی ادا کرے، تب وہ انسان کامل بنے گا۔ اور اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا تو ایسا انسان چاہے کتنا ہی ذکر و عبادت میں مشغول ہو لیکن ایسا شخص ہمارے یہاں قبولیت کا اور قرب کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

حضور ﷺ اور رزق حلال کے طریقے

دیکھیے! جتنے انبیاء علیہم السلام اس دنیا میں تشریف لائے ہر ایک سے اللہ تعالیٰ نے کسب حلال کا کام ضرور کرایا اور حلال رزق کے حصول کے لئے ہر نبی نے جدوجہد کی، کوئی نبی مزدوری کرتے تھے، کوئی نبی بڑھئی کا کام کرتے تھے، کوئی نبی بکریاں چرایا کرتے تھے، خود حضور ﷺ نے مکہ مکرمہ میں پہاڑوں پر اجرت پر بکریاں چرائیں، بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یاد ہے کہ میں اجیاد کے پہاڑ پر لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔(۱)

بہر حال! بکریاں آپ نے چرائیں، مزدوری آپ نے کی، تجارت آپ نے کی، چنانچہ تجارت کے سلسلے میں آپ نے شام کے دو سفر کیے، جس میں آپ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا سامان تجارت لیکر شام تشریف لے گئے، زراعت آپ نے کی، مدینہ طیبہ سے کچھ فاصلے پر مقام جُرف تھا، وہاں پر آپ نے زراعت کا کام کیا، لہٰذا کسب حلال کے جتنے طریقے ہیں ان سب میں آپ ﷺ کا حصہ اور آپ کی سنت موجود ہے، اگر کوئی شخص ملازمت کر رہا ہے تو یہ نیت کر لے کہ میں حضور ﷺ کی سنت کی اتباع میں یہ ملازمت کر رہا ہوں، اگر کوئی شخص تجارت کر رہا ہے تو وہ یہ نیت کر لے کہ میں حضور ﷺ کی اتباع میں تجارت کر رہا ہوں اور اگر کوئی زراعت کر رہا ہے تو وہ یہ نیت کر لے کہ میں نبی کریم ﷺ کی اتباع میں زراعت کر رہا ہوں تو اس صورت میں یہ سب کام دین کا حصہ بن جائیں گے۔

مومن کی دنیا بھی دین ہے

اس حدیث نے ایک غلط فہمی یہ دور کر دی ہے کہ دین اور چیز کا نام ہے اور دنیا کسی الگ چیز کا

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاجارة، باب رعی الغنم علی قراریط، رقم:۲۱۰۲، صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، باب فضیلة الاسود من الکباث، رقم:۳۸۲۲، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، باب الصناعات، رقم:۲۱۴۰، مسند أحمد، رقم:۱۱۴۸۲، سنن الدارمی، کتاب المشرمة، باب کیف کان اول شان النبی، رقم:۱۳

نام ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان غور سے دیکھے تو ایک مومن کی دنیا بھی دین ہے، جس کام کو وہ دنیا کا کام سمجھ رہا ہے یعنی رزق حاصل کرنے کی فکر اور کوشش، یہ بھی درحقیقت دین ہی کا حصہ ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طریقے سے کرے اور نبی کریم ﷺ کی تعلیم کی اتباع میں کرے، بہرحال ایک بات تو اس سے یہ معلوم ہوئی کہ رزق حلال کی طلب بھی دین کا حصہ ہے، اگر یہ بات ایک مرتبہ ذہن میں بیٹھ جائے تو پھر بے شمار گمراہیوں کا راستہ بند ہوجائے۔

بعض صوفیاء کرام کا توکّل کر کے بیٹھ جانا

بعض صوفیاء کرام کی طرف یہ منسوب ہے اور ان سے یہ طرز عمل منقول ہے کہ انہوں نے کوئی پیشہ اختیار نہیں کیا اور رزق کی طلب میں کوئی کام نہیں کیا بلکہ توکل کی زندگی اس طرح گزاردی کہ بس اپنی جگہ پر بیٹھے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ غیب سے بھیج دیا اس پر شکر کیا اور قناعت کرلی، اگر نہیں بھیجا تو صبر کرلیا، بعض صوفیاء کرام سے یہ طرز عمل منقول ہے۔ اس بارے میں یہ سمجھ لیں کہ صوفیاء کرام سے اس قسم کا جو طرز عمل منقول ہے وہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ صوفیاء کرام ایسے تھے جن پر غلبہ حال کی کیفیت طاری ہوئی اور وہ استغراق کے عالم میں تھے اور اپنے عام ہوش وحواس کے عالم میں نہیں تھے، اور جب انسان اپنے ہوش وحواس میں نہ ہو تو وہ احکام شریعت کا مکلّف نہیں ہوتا، اس وجہ سے اگر ان صوفیاء کرام نے یہ طرز عمل اختیار کیا تو یہ ان کا اپنا مخصوص معاملہ تھا، تمام امت کے لئے وہ عام حکم نہیں تھا۔

یا پھر ان صوفیاء کرام کا توکل اتنا زبردست اور کامل تھا کہ وہ اس بات پر راضی تھے کہ اگر ہم پر مہینوں فاقہ بھی گزرتا ہے تو ہمیں کوئی فکر نہیں، ہم نہ تو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے نہ کسی کے سامنے شکوہ کریں گے، یہ صوفیاء بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے، بڑے اعلیٰ درجے کے مقامات پر فائز تھے، انہوں نے اسی پر اکتفا کیا کہ ہم اپنے ذکر واذکار میں مشغول رہیں گے اور اس کے نتیجے میں فاقے کی نوبت آتی ہے تو کوئی بات نہیں، اور ان کے ساتھ دوسروں کے حقوق وابستہ نہیں تھے، نہ بیوی بچے تھے، کہ ان کو کھانا کھلانا ہو، لہٰذا یہ ان صوفیاء کرام کے مخصوص حالات تھے اور ان کا خاص طرز عمل تھا جو عام لوگوں کے لئے اور ہم جیسے کمزوروں کے لئے قابل تقلید نہیں ہے۔ ہمارے لئے نبی کریم ﷺ نے سنت کا جو راستہ بتایا وہ یہ ہے کہ رزق حلال کی طلب دوسرے دینی فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے۔

طلب ''حلال'' کی ہو

دوسری بات یہ ہے کہ رزق طلب کرنا فریضہ اس وقت ہے جب طلب حلال کی ہو، روٹی، کپڑا اور پیسہ بذات خود مقصود نہیں ہے، یہ نیت نہ ہو کہ بس پیسہ حاصل کرنا ہے چاہے جس طرح بھی حاصل ہو، چاہے جائز طریقے سے حاصل ہو یا ناجائز طریقے سے حاصل ہو، حلال طریقے سے حاصل ہو یا حرام طریقے سے حاصل ہو، اس صورت میں یہ طلب، طلب حلال نہ ہوئی جس کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور جس کو فریضہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ مومن کا یہ عمل اس وقت دین بنتا ہے جب وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق اس کو حاصل کرے، اب گر اس نے حلال وحرام کی تمیز ہٹادی اور جائز وناجائز کا سوال ذہن سے مٹادیا تو پھر ایک مسلمان میں اور کافر میں رزق حاصل کرنے کے اعتبار سے کوئی فرق نہ رہا۔ بات تو جبھی بنے گی جب وہ رزق تو ضرور طلب کرے لیکن اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود کے اندر کرے، اس کو ایک ایک پیسے کے بارے میں فکر لاحق ہو کہ یہ پیسہ حلال طریقے سے آرہا ہے یا حرام طریقے سے آرہا ہے، یہ پیسہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق آرہا ہے یا اس کے خلاف آرہا ہے، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف آرہا ہے تو اس کو جہنم کا انگارہ سمجھ کر چھوڑ دے، کتنی بڑی سے بڑی دولت ہو، لیکن اگر وہ حرام طریقے سے آرہی ہے تو اس کو لات مار دے اور کسی قیمت پر بھی اس حرام کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے پر راضی نہ ہو۔

محنت کی ہر کمائی حلال نہیں ہوتی

بعض لوگوں نے وہ ذریعہ معاش اختیار کر رکھا ہے جو حرام ہے اور شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی، مثلاً سود کا ذریعہ معاش اختیار کیا ہوا ہے، اب اگر کہا جائے کہ یہ تو ناجائز اور حرام ہے اس طریقے سے پیسے نہیں کمانے چاہئیں تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہم تو اپنی محنت کا کھا رہے ہیں اپنی محنت لگا رہے ہیں اپنا وقت صرف کر رہے ہیں، اب اگر وہ کام حرام اور ناجائز ہے تو ہمارا اس سے کیا تعلق؟

خوب سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر محنت جائز نہیں ہوتی، بلکہ وہ محنت جائز ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو، اگر اس طریقے کے خلاف انسان ہزار محنت کر لے لیکن اس کے ذریعہ جو پیسہ کمائے گا وہ پیسے حلال کے نہیں ہوں گے بلکہ حرام ہوں گے۔ اب کہنے کو تو ایک ''طوائف'' بھی محنت کرتی ہے وہ بھی کہہ سکتی ہے کہ میں اپنی محنت کے ذریعہ پیسے کما رہی ہوں،

لہٰذا میری آمدنی حلال ہونی چاہئے، اسی طرح آمدنی کے جو ذرائع حرام ہیں ان کو یہ کہہ کر حلال کرنے کی کوشش کرنا کہ یہ ہماری محنت کی آمدنی ہے، شرعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہ روزگار حلال ہے یا حرام؟

لہٰذا جب روزگار کا کوئی ذریعہ سامنے آئے تو پہلے یہ دیکھو کہ وہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ شریعت نے اس کو حلال قرار دیا ہے یا حرام؟ اگر شریعت نے حرام قرار دیا ہے تو پھر اس ذریعہ آمدنی سے خواہ کتنی ہی دنیاوی فائدے حاصل ہو رہے ہوں انسان اس کو چھوڑ دے، اور اس ذریعہ کو اختیار کرے جو اللہ کو راضی کرنے والا ہو، چاہے اس میں آمدنی اور منافع کم ہو۔

بینک کا ملازم کیا کرے؟

چنانچہ بہت سے لوگ بینک کی ملازمت کے اندر مبتلا ہیں اور بینک کے اندر بہت سارا کاروبار سود پر ہوتا ہے، اب جو شخص وہاں ملازم ہے اگر وہ سود کے کاروبار میں ان کے ساتھ معاون بن رہا ہے تو یہ ملازمت ناجائز اور حرام ہے۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بینک کی ایسی ملازمت میں مبتلا ہے اور بعد میں اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دیں اور اس کو بینک کی ملازمت چھوڑنے کی فکر ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ کوئی جائز ذریعہ آمدنی تلاش کرے اور جب دوسرا ذریعہ آمدنی مل جائے تو اس کو چھوڑ دے، لیکن جائز ذریعہ آمدنی اس طرح تلاش کرے جس طرح ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے، یہ نہ ہو کہ بے فکری کے ساتھ بینک کی ناجائز ملازمت میں لگا ہو اور ذہن میں یہ بٹھا رکھا ہے کہ جب دوسری ملازمت مل جائے گی تو اس کو چھوڑ دوں گا، بلکہ اس طرح تلاش کرے جس طرح ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے۔ اور جب دوسری ملازمت مل جائے تو موجودہ ملازمت کو ترک کر دے اور اس کو اختیار کر لے چاہے اس میں آمدنی کم ہو۔

حلال روزی کی برکت

اللہ تعالیٰ نے حلال روزی کے اندر جو برکت رکھی ہے وہ حرام کے اندر نہیں رکھی، حرام کی بہت بڑی رقم سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو حلال کی تھوڑی سی رقم میں حاصل ہو جاتا ہے، حضور ﷺ ہر وضو کے بعد یہ دعا فرمایا کرتے تھے

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ وَ وَسِّعْ لِيْ فِيْ دَارِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ))(۱)

''اے اللہ میرے گناہ کی مغفرت فرما اور میرے گھر میں وسعت فرما اور میرے رزق میں برکت عطا فرما''

آج کل لوگ برکت کی قدر و قیمت کو نہیں جانتے بلکہ روپے پیسے کی گنتی کو جانتے ہیں، یہ دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہمارا بینک بیلنس بہت زیادہ ہو گیا، روپے کی گنتی زیادہ ہو گئی، لیکن اس روپے سے کیا فائدہ حاصل ہوا، ان روپوں سے کتنی راحت ملی، کتنا سکون حاصل ہوا؟ اس کا حساب نہیں کرتے، لاکھوں کا بینک بیلنس ہے، لیکن سکون میسر نہیں، راحت میسر نہیں، بتایئے وہ لاکھوں کا بینک بیلنس کس کام کا؟ اور اگر پیسے تو تھوڑے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے راحت اور سکون عطا فرمایا ہوا ہے تو یہ درحقیقت ''برکت'' ہے۔

برکت خریدی نہیں جاسکتی

یہ برکت وہ چیز ہے جو بازار سے خرید کر نہیں لائی جاسکتی، لاکھوں اور کروڑوں خرچ کر کے بھی حاصل نہیں کی جاسکتی، بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی دین اور اس کی عطا ہے، اللہ تعالیٰ جس کو عطا فرمادیں اسی کو یہ برکت نصیب ہوتی ہے دوسرے کو نصیب نہیں ہوتی۔ اور یہ برکت حلال رزق میں ہوتی ہے، حرام مال کے اندر یہ برکت نہیں ہوتی چاہے وہ حرام مال کتنا زیادہ حاصل ہو جائے۔ اس لئے انسان جو کما رہا ہے وہ اس کی فکر کرے کہ یہ لقمہ جو میرے اور بیوی بچوں کے حلق میں جا رہا ہے اور یہ پیسہ جو میرے پاس آ رہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہے یا نہیں؟ شریعت کے احکام کے مطابق ہے یا نہیں؟ ہر انسان اپنے اندر یہ فکر پیدا کرے۔

تنخواہ کا یہ حصہ حرام ہو گیا

پھر بعض حرام مال وہ ہیں جن کا علم سب کو ہے، مثلاً سب جانتے ہیں کہ سود حرام ہے، رشوت لینا حرام ہے وغیرہ۔ لیکن ہماری زندگی میں ان کے علاوہ بھی بہت سی آمدنیاں اس طرح داخل ہو گئی ہیں کہ ہمیں ان کے بارے میں یہ احساس بھی نہیں کہ یہ آمدنیاں حرام ہیں۔ مثلاً آپ نے کسی جگہ پر جائز اور شریعت کے مطابق ملازمت اختیار کر رکھی ہے لیکن ملازمت کا جو وقت طے ہو چکا ہے اس وقت میں آپ کمی کر رہے ہیں اور پورا وقت نہیں دے رہے ہیں بلکہ ڈنڈی مار رہے ہیں۔ جیسے ایک

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید، رقم: ۳۴۲۲، مسند احمد، رقم: ۱۶۰۰۴

شخص کی آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہے مگر وہ ان میں سے ایک گھنٹہ چوری چھپے دوسرے کاموں میں ضائع کردیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مہینے کے ختم پر جو تنخواہ ملے گی اس کا آٹھواں حصہ حرام ہوگیا وہ آٹھواں حصہ رزق حلال نہ رہا بلکہ وہ رزق حرام ہوگیا۔ لیکن ہمیں اس کا احساس ہی نہیں کہ یہ حرام مال ہماری آمدنی میں شامل ہو رہا ہے۔

تھانہ بھون کے مدرسہ کے اساتذہ کا تنخواہ کٹوانا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں جو مدرسہ تھا اس مدرسہ کے ہر استاد اور ہر ملازم کے پاس ایک روزنامچہ رکھا رہتا تھا، مثلاً ایک استاد ہے اور اس کو چھ گھنٹے پڑھانا ہے اب سبق پڑھانے کے دوران اس کے پاس کوئی مہمان ملنے کے لئے آگیا تو جس وقت مہمان آتا وہ استاد اس کے آنے کا وقت اس روزنامچے میں لکھ لیتا، اور پھر جب وہ مہمان رخصت ہوکر واپس جاتا تو اس کے جانے کا وقت بھی نوٹ کرلیتا، سارا مہینہ اسی طرح کرتا اور جب مہینے کے آخر میں تنخواہ ملنے کا وقت آتا تو وہ استاد دفتر میں ایک درخواست دیتا کہ اس ماہ کے دوران میرا اتنا وقت مہمانوں کے ساتھ صرف ہوا ہے لہٰذا اتنی دیر کی تنخواہ میری تنخواہ میں سے کم کرلی جائے۔ اس طرح ہر استاد اور ہر ملازم درخواست دے کر اپنی تنخواہ کٹواتا، صرف مہمان کے آنے کی حد تک نہیں بلکہ مدرسہ کا وہ وقت کسی بھی ذاتی کام میں صرف ہوتا تو وہ وقت نوٹ کرکے اس کی تنخواہ کٹواتا، وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ وقت بکا ہوا ہے، اب یہ وقت ہمارا نہیں ہے جس ادارے میں آپ نے ملازمت کی ہے وہ وقت اس ادارے کی ملکیت بن گیا، اب اگر آپ نے اس وقت کے اندر کمی کی تو اتنے وقت کی تنخواہ آپ کے لئے حرام ہوگئی، آج ہم لوگوں کو اس طرف دھیان نہیں ہے، ہم لوگ تو صرف سود کھانے اور رشوت لینے کو حرام سمجھتے ہیں لیکن ان مختلف طریقوں سے ہماری آمدنیوں میں جو حرام کی آمیزش ہو رہی ہے اس کی طرف ہمارا ذہن نہیں جاتا۔

ٹرین کے سفر میں پیسے بچانا

یا مثلاً آپ ٹرین میں سفر کر رہے ہیں اور جس درجے کا آپ نے ٹکٹ خریدا ہے اس سے اونچے درجے کے ڈبے میں سفر کرلیا، اور دونوں درجوں کے درمیان کرایہ کا جو فرق ہے اتنے پیسے آپ نے بچالئے، تو جو پیسے بچے وہ آپ کے لئے حرام ہوگئے، اور وہ حرام مال آپ کی حلال آمدنی میں شامل ہوگیا اور آپ کو پتہ بھی نہ چلا کہ یہ حرام مال شامل ہوگیا۔

زائد سامان کا کرایہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں یہ بات مشہور و معروف تھی کہ جب وہ ریل کا سفر کرتے تو اپنے سامان کا وزن ضرور کرایا کرتے تھے، اور ایک مسافر کو جتنا سامان لے جانے کی اجازت ہوتی اگر سامان اس وزن سے زیادہ ہوتا تو وہ زائد سامان کا کرایہ ریلوے کو ادا کرتے اور پھر سفر شروع کرتے، یہ کارروائی کئے بغیر سفر کرنے کا ان کے یہاں تصور ہی نہیں تھا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سفر

ایک مرتبہ خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک مرتبہ سفر کرنے کے لئے اسٹیشن پہنچے اور سیدھے اس دفتر میں تشریف لے گئے جہاں سامان کا وزن کرایا جاتا تھا، وہاں اتفاق سے ریلوے کا گارڈ کھڑا ہوا تھا جو حضرت والا کو پہچانتا تھا، وہ پوچھنے لگا "حضرت کیسے تشریف لائے؟"

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "میں اپنے سامان کا وزن کرانے آیا ہوں تاکہ اگر زیادہ ہو تو اس کا کرایہ ادا کر دوں"

اس گارڈ نے کہا "حضرت آپ وزن کرانے کے چکر میں کیوں پڑ رہے ہیں آپ سامان کو وزن کرائے بغیر سفر کرلیں، میں آپ کے ساتھ ہوں اور میں اس ٹرین کا گارڈ ہوں آپ کو راستے میں کوئی نہیں پکڑے گا اور اگر سامان زیادہ ہوا تو آپ سے کوئی شخص بھی جرمانے کا مطالبہ نہیں کرے گا"

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس گارڈ سے پوچھا "آپ کہاں تک میرے ساتھ جائیں گے؟"

اس نے جواب دیا "میں فلاں اسٹیشن تک جاؤں گا"

حضرت والا نے پوچھا "اس کے بعد پھر کیا ہوگا؟"

اس نے کہا "اس کے بعد جو گارڈ آئے گا میں اس سے کہہ دوں گا کہ ان کے سامان کا ذرا خیال رکھنا"

حضرت والا نے پھر پوچھا "وہ گارڈ کہاں تک جائے گا؟"

گارڈ نے جواب دیا "وہ گارڈ تو جہاں تک آپ کی منزل ہے وہاں تک آپ کے ساتھ ہی سفر کرے گا، اس لئے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے"

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "مجھے اور بھی آگے جانا ہے"

اس نے پوچھا ''آگے کہاں جانا ہے؟''

حضرت والا نے فرمایا ''مجھے تو اس منزل سے آگے اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاس جانا ہے، وہاں کون گارڈ میرے ساتھ جائے گا جو مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے سوال وجواب سے بچائے گا؟''

پھر حضرت والا نے فرمایا ''یہ ٹرین تمہاری ملکیت نہیں ہے اس کے اوپر تمہارا اختیار نہیں ہے تمہیں محکمے کی طرف سے اجازت نہیں ہے کہ تم کسی شخص کے زیادہ سامان کو کرایہ کے بغیر چھوڑ دو، لہذا میں تمہاری وجہ سے دنیاوی پکڑ سے تو بچ جاؤں گا، لیکن اس وقت جو چند پیسے میں بچالوں گا اور وہ چند پیسے میرے لئے حرام ہو جائیں گے، ان حرام پیسوں کے بارے میں جب اللہ تعالیٰ کے سامنے سوال ہوگا تو وہاں پر کون سا گارڈ مجھے بچائے گا اور کون جواب دہی کرے گا؟''

یہ باتیں سن کر اس گارڈ کی آنکھیں کھل گئیں اور پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سامان کا وزن کرا کر اس کے زائد پیسے ادا کر کے سفر پر روانہ ہوئے۔

یہ حرام پیسے رزق حلال میں شامل ہو گئے

لہذا اگر کسی نے اس طرح ریل گاڑی میں یا ہوائی جہاز میں سفر کے دوران اجازت سے زیادہ سامان کے ساتھ سفر کر لیا اور اس سامان کا وزن کرا کر اس کا کرایہ علیحدہ سے ادا نہیں کیا تو اس کے نتیجے میں جو پیسے بچے وہ حرام بچے اور یہ حرام پیسے ہمارے رزق حلال کے اندر شامل ہو گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا اچھا خاص حلال پیسہ تھا اس میں حرام کی آمیزش ہو گئی۔

یہ بے برکتی کیوں نہ ہو

آج ہم لوگ جو بے برکتی کی وجہ سے پریشان ہیں اور ہر شخص رونا رو رہا ہے، جو لکھ پتی ہے وہ بھی رو رہا ہے اور جو کروڑ پتی ہے وہ بھی رو رہا ہے، کہ صاحب خرچہ پورا نہیں ہوتا اور مسائل حل نہیں ہوتے، درحقیقت یہ بے برکتی اس لئے ہے کہ حلال وحرام کی تمیز اور اس کی فکر اٹھ گئی ہے، بس چند مخصوص چیزوں کے بارے میں تو یہ ذہن میں بٹھا لیا ہے کہ یہ حرام ہیں، ان سے تو کسی نہ کسی طریقے سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مختلف ذرائع سے جو یہ حرام پیسے ہماری آمدنیوں میں داخل ہو رہے ہیں ان کی فکر نہیں۔

ٹیلیفون اور بجلی کی چوری

یا مثلاً ٹیلیفون کے محکمے والوں سے دوستی کرلی اور اب اس کے ذریعہ ملکی اور غیر ملکی کالیں ہورہی ہیں دنیا بھر میں باتیں ہورہی ہیں اور ان کالوں پر ایک پیسہ ادا نہیں کیا جارہا ہے، یہ درحقیقت محکمے کی چوری ہورہی ہے اور اس چوری کے نتیجے میں جو پیسے بچے وہ مال حرام ہے، اور وہ مال حرام ہمارے مال حلال کے اندر شامل ہورہا ہے، یا مثلاً بجلی کی چوری ہورہی ہے کہ بجلی کا میٹر بند پڑا ہے لیکن بجلی استعمال ہورہی ہے، اس طرح جو پیسے بچے وہ مال حرام ہے اور وہ حرام مال ہمارے حلال مال کے اندر شامل ہورہا ہے، اور حرام کے مال کی آمیزش ہورہی ہے، لہٰذا نہ جانے کتنے شعبے ایسے ہیں جن میں ہم نے اپنے لئے حرام کے راستے کھول رکھے ہیں، اور حرام مال ہمارے حلال مال میں داخل ہورہاے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم بے برکتی کے عذاب کے اندر مبتلا ہیں۔

حلال وحرام کی فکر پیدا کریں

لہٰذا ہر کام کرتے وقت یہ دیکھو کہ جو کام میں کررہا ہوں یہ حق ہے یا ناحق ہے۔ اگر انسان اس فکر کے ساتھ زندگی گزارے کہ ناحق کوئی پیسہ اس کے مال کے اندر شامل نہ ہو تو یقین رکھئے پھر اگر ساری عمر نوافل نہ پڑھیں اور ذکر وتسبیح نہ کی لیکن اپنے آپ کو حرام سے بچا کر قبر تک لے گیا تو انشاء اللہ سیدھا جنت میں جائے گا، اور اگر حلال وحرام کی فکر تو نہیں کی مگر تہجد کی نماز بھی پڑھ رہا ہے اشراق کی نماز بھی پڑھ رہا، ذکر وتسبیح بھی کررہا ہے تو یہ نوافل اور یہ ذکر انسان کو حرام مال کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے۔ آمین

یہاں تو آدمی بنائے جاتے ہیں

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ خانقاہوں میں ذکر وشغل سیکھنے کے لئے جاتے ہیں اگر ذکر وشغل سیکھنا ہے تو بہت ساری خانقاہیں کھلی ہیں وہاں چلا جائے، لیکن ہمارے یہاں تو آدمی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور شریعت کے جو احکام ہیں ان پر عمل پیرا ہونے کی فکر پیدا کی جاتی ہے۔ چنانچہ ریلوے اسٹیشن پر اگر کوئی ڈاڑھی والا آدمی اپنا سامان وزن کرانے کے لئے بکنگ آفس پہنچتا ہے تو وہ دفتر والے اس کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں کہ اس کا تعلق تھانہ بھون سے ہے، لہٰذا اس سے خود پوچھ لیتے ہیں کہ آپ تھانہ بھون جارہے ہیں؟ چنانچہ حضرت

تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے اپنے تعلق رکھنے والوں میں سے کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے معمولات چھوٹ گئے ہیں تو مجھے زیادہ دکھ اور شکایت نہیں ہوتی لیکن اگر کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے حلال وحرام کو ایک کر رکھا ہے اور اس کو معاملات کے اندر حلال وحرام کی فکر نہیں ہے تو مجھے اس شخص سے نفرت ہو جاتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خلیفہ کا سبق آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بڑے خلیفہ تھے جن کو آپ نے باقاعدہ خلافت عطا فرمائی تھی، ایک مرتبہ وہ ایک سفر سے تشریف لائے تو ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا، حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام دعا ہوئی، خیریت معلوم کی، حضرت والا نے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟

انہوں نے جواب دیا ''فلاں جگہ سے آ رہا ہوں''

حضرت نے پوچھا ''ریل گاڑی سے آ رہے ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا ''جی ہاں''

حضرت نے پوچھا ''یہ بچہ جو تمہارے ساتھ ہے اس کا ٹکٹ پورا لیا تھا یا آدھا لیا تھا؟''

اب آپ اندازہ لگائیں کہ خانقاہ کے اندر پیر صاحب اپنے مرید سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ بچے کا ٹکٹ پورا لیا تھا یا آدھا لیا تھا؟ جبکہ دوسری خانقاہوں میں یہ سوال کرنے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، دوسری خانقاہوں میں تو یہ سوال ہوتا ہے کہ معمولات پورے کئے تھے یا نہیں؟ تہجد کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ اشراق کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ لیکن یہاں یہ سوال ہو رہا ہے کہ یہ بچہ جو آپ کے ساتھ ہے اس کا ٹکٹ آدھا لیا تھا یا پورا لیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا ''حضرت آدھا لیا تھا''

حضرت نے پھر سوال کیا ''اس بچے کی عمر کیا ہے؟''

انہوں نے جواب دیا ''حضرت یہ بچہ ویسے تو تیرہ سال کا ہے لیکن دیکھنے میں بارہ سال کا لگتا ہے اس لئے آدھا ٹکٹ لیا تھا''

یہ جواب سن کر حضرت والا کو سخت رنج ہوا اور ان سے خلافت واپس لے لی اور فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہوئی تم اس لائق نہیں ہو کہ تمہیں خلافت دی جائے اور تمہیں مجاز بنایا جائے، اس لئے کہ تمہیں حلال وحرام کی فکر نہیں۔ جب بچے کی عمر بارہ سال سے زیادہ ہو گئی چاہے ایک دن ہی زیادہ کیوں نہ ہوئی ہو تو اس وقت تم پر واجب تھا کہ تم بچے کا پورا ٹکٹ لیتے، تم نے آدھا ٹکٹ لیکر جو پیسے

بجائے وہ حرام کے پیسے بچائے اور جس کو حرام سے بچنے کی فکر نہ ہو وہ خلیفہ بننے کا اہل نہیں، چنانچہ خلافت واپس لے لی۔

اگر کوئی شخص حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے آ کر کہتا کہ حضرت معمولات ترک ہو گئے، تو حضرت والا فرماتے کہ معمولات ترک ہو گئے تو استغفار کرو اور دوبارہ شروع کر دو اور ہمت سے کام لو اور اس بات کا دوبارہ عزم کرو کہ آئندہ ترک نہیں کریں گے۔ اور معمولات ترک کرنے کی بناء پر کبھی خلافت واپس نہیں لی لیکن حلال وحرام کی فکر نہ کرنے پر خلافت واپس لے لی، اس لئے کہ جب حلال وحرام کی فکر نہ ہو تو وہ انسان انسان نہیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ))(۱)

''حلال کی طلب دوسرے فرائض کے بعد یہ بھی فرض ہے''

حرام مال حلال مال کو بھی تباہ کر دیتا ہے

لہٰذا ہم سے ہر شخص اپنا جائزہ لے کہ جو پیسے اس کے پاس آ رہے ہیں اور جو کام وہ کر رہا ہے ان میں کہیں حرام مال کی آمیزش تو نہیں ہے، حرام مال کی آمیزش کی چند مثالیں میں نے آپ کے سامنے سمجھانے کے لئے پیش کر دیں، ورنہ نہ جانے کتنے کام ایسے ہیں جن کے ذریعہ نادانستہ طور پر غیر شعوری طور پر ہمارے حلال مال میں حرام کی آمیزش ہو جاتی ہے، اور بزرگوں کا مقولہ ہے کہ جب کبھی کسی حلال مال کے ساتھ حرام مال لگ جاتا ہے تو وہ حرام حلال کو بھی تباہ کر کے چھوڑتا ہے، یعنی اس حرام مال کے شامل ہونے کے نتیجے میں حلال مال کی برکت، اس کا سکون اور راحت تباہ ہو جاتا ہے، اس لئے ہر شخص اس کی فکر کرے اور ہر شخص اپنے ایک ایک عمل کا جائزہ لے اور اپنی آمدنی کا جائزہ لے کہ ہمارے حلال مال میں کہیں کوئی حرام مال تو شامل نہیں ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس فکر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

رزق کی طلب مقصودِ زندگی نہیں

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس حدیث نے جہاں ایک طرف رزق حلال کی اہمیت بتائی کہ

(۱) كنز العمال، رقم: ۹۲۳۱ (۱٦/٤)، كشف الخفاء، رقم: ۱٦۷۱ (٤٦/۲)، سنن البيهقي، رقم: ۱۲۰۳۰ (۲٤/۲)، الجامع الكبير للسيوطي، رقم: ۳۵ (۱٤۰۸۵/۱)، جامع الأحاديث، رقم: ۱۳۹۳۷ (۱۲۸/۱٤)، مشكوة المصابيح، رقم: ۲۷۸۱ (۱۲۹/۲)، شعب الإيمان، رقم: ۸۷٤۱ (٤۲۱/٦).

رزق حلال کی طلب دین سے خارج کوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے، وہاں اس حدیث نے ہمیں رزق کی طلب کا درجہ بھی بتادیا کہ اس کا کتنا درجہ اور کتنی اہمیت ہے، آج کی دنیا نے معاش کو، معیشت کو اور روپے پیسے کمانے کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی قرار دے رکھا ہے، آج ہماری ساری دوڑ دھوپ اسی کے گرد گھوم رہی ہے کہ پیسہ کس طرح حاصل ہو، کس طرح پیسوں میں اضافہ کیا جائے اور کس طرح اپنی معیشت کو ترقی دی جائے، اور اسی کو ہم نے اپنی زندگی کی آخری منزل قرار دے رکھا ہے۔

سرکار دوعالم ﷺ نے اس حدیث میں بتادیا کہ رزق حلال کی طلب فریضہ تو ہے لیکن دوسرے فرائض دینیہ کے بعد اس کا درجہ آتا ہے، یہ انسان کی زندگی کا مقصد اصلی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ضرورت ہے اور اس ضرورت کے تحت انسان کو نہ صرف یہ کہ رزق حلال کے طلب کی اجازت دی گئی ہے بلکہ اس کی ترغیب اور تاکید کی گئی ہے کہ تم رزق حلال طلب کرو، لیکن یہ رزق حلال کی طلب تمہارا مقصد زندگی نہیں ہے بلکہ مقصد زندگی کچھ اور ہے اور وہ اللہ جل جلالہ کے ساتھ تعلق قائم کرنا، اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت کرنا ہے، یہ انسان کا اصل مقصد زندگی ہے اور معیشت کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔

رزق کی طلب میں فرائض کا ترک جائز نہیں

لہٰذا جس جگہ پر معیشت میں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے عائد کردہ فرائض کے درمیان ٹکراؤ ہوجائے وہاں پر اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے فرائض کو ترجیح ہوگی، بعض لوگ افراط کے اندر مبتلا ہوجاتے ہیں جب انہوں نے یہ سنا کہ طلب حلال بھی دین کا ایک حصہ ہے تو اس کو اتنا آگے بڑھایا کہ اس طلب حلال کے نتیجے میں اگر نمازیں ضائع ہورہی ہیں تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، روزے چھوٹ رہے ہیں تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، حلال وحرام ایک ہورہا ہے تو ان کو اس کی پرواہ نہیں۔ اگر ان سے کہا جائے کہ نماز پڑھو تو جواب دیتے ہیں کہ یہ کام جو ہم کررہے ہیں یہ بھی تو دین کا ایک حصہ ہے ہمارے دین میں دین ودنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے لہٰذا جو کام ہم کررہے ہیں یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے۔

ایک ڈاکٹر صاحب کا استدلال

کچھ عرصہ پہلے ایک خاتون نے مجھے بتایا کہ ان کے شوہر ڈاکٹر ہیں، وہ مطب کے اوقات

میں نماز نہیں پڑھتے اور جب مطب بند کر کے گھر واپس آتے ہیں تو گھر آ کر تینوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے ہیں، میں ان سے کہتی ہوں کہ آپ نماز کو قضا کر دیتے ہیں یہ اچھا نہیں ہے آپ وقت پر نماز پڑھ لیا کریں، تو جواب میں شوہر کہتے ہیں کہ اسلام نے خدمت خلق سکھائی ہے اور یہ ڈاکٹری اور مطب جو کر رہے ہیں یہ بھی خدمت خلق کر رہے ہیں اور یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے اب اگر ہم نے خدمت خلق کی خاطر نماز کو چھوڑ دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اب دیکھئے حلال کمانے کے لئے انہوں نے اولین دینی فریضے کو چھوڑ دیا، حالانکہ حضور ﷺ یہ فرما رہے ہیں:

((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ))(۱)

یہ فریضہ تو ہے لیکن بعد الفرائض ہے، لہٰذا اگر کسب معاش کے فریضے میں اور اولین دینی فرائض کے درمیان ٹکراؤ ہو جائے تو اس وقت دینی فریضہ غالب رہے گا۔

ایک لوہار کا قصہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے ولی اللہ، فقیہ اور محدث اور صوفی تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے درجات عطا فرمائے تھے، جب ان کا انتقال ہو گیا تو کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ جواب میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم فرمایا اور بہت کچھ نوازشیں فرمائیں لیکن میرے گھر کے سامنے ایک لوہار رہتا تھا اس لوہار کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام بخشا وہ ہمیں نصیب نہ ہو سکا، جب اس شخص کی آنکھ کھلی تو اسکے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ پتہ کرنا چاہئے کہ وہ کون لوہار تھا اور وہ کیا عمل کرتا تھا کہ اس کا درجہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آگے بڑھ گیا۔ چنانچہ وہ شخص حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے محلے میں گیا اور معلومات کیں تو پتہ چلا کہ واقعۃً ان کے گھر کے سامنے ایک لوہار رہتا تھا اور اس کا بھی انتقال ہو چکا ہے، اس کے گھر جا کر اس کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارا شوہر کیا کام کرتا تھا؟ اس نے بتایا کہ وہ تو لوہار تھا اور سارا دن لوہا کوٹتا رہتا تھا، اس شخص نے کہا کہ اس کا کوئی خاص عمل اور خاص نیکی بتاؤ جو وہ کیا کرتا تھا، اس لئے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن

(۱) كنز العمال، رقم: ۹۲۳۱ (۱٦/٤)، كشف الخفاء، رقم: ۱٦۷۱ (۲/٤٦)، سنن البيهقي، رقم: ۱۲۰۳۰ (۲/٢٤)، الجامع الكبير للسيوطي، رقم: ۳۵ (۱/۱٤۰۸۵)، جامع الأحاديث، رقم: ۱۳۹۳۷ (۱٤/۱۲۸)، مشكوة المصابيح، رقم: ۲۷۸۱ (۲/۱۲۹)، شعب الإيمان، رقم: ۸۷٤۱ (٦/٤۲۱)

مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اس کا مقام ہم سے بھی آگے بڑھ گیا۔

اس کی بیوی نے کہا کہ وہ سارا دن تو لوہا کوٹتا رہتا تھا، لیکن ایک بات اس کے اندر یہ تھی کہ چونکہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ہمارے گھر کے سامنے رہتے تھے، رات کو جس وقت وہ تہجد کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے تو اپنے گھر کی چھت پر اس طرح کھڑے ہو جاتے جس طرح کوئی لکڑی کھڑی ہوتی ہے اور کوئی حرکت نہیں کرتے تھے، جب میرا شوہر ان کو دیکھتا تو یہ کہا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فراغت عطا فرمائی ہوئی ہے یہ ساری رات کیسی عبادت کرتے ہیں ان کو دیکھ کر رشک آتا ہے اگر ہمیں بھی اپنے مشغلے سے فراغت نصیب ہوتی تو ہمیں بھی اس طرح تہجد پڑھنے کی توفیق ہو جاتی۔ چنانچہ وہ حسرت کیا کرتا تھا کہ میں چونکہ دن بھر لوہا کوٹتا ہوں پھر رات کو تھک کر سو جاتا ہوں اس لئے اس طرح تہجد پڑھنے کی نوبت نہیں آتی۔

نماز کے وقت کام بند

دوسری بات اس کے اندر یہ تھی کہ جب وہ لوہا کوٹ رہا ہوتا تھا اور اس وقت اس کے کان میں آذان کی آواز "اللہ اکبر" آجاتی تو اگر اس وقت اس نے اپنا ہتھوڑا سر سے اونچا ہاتھ میں اٹھایا ہوا ہوتا تو اس وقت یہ گوارا نہ کرتا تھا کہ اس ہتھوڑے سے ایک مرتبہ اور لوہے پر مار دے، بلکہ اس ہتھوڑے کو پیچھے کی طرف پھینک دیتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ اب آذان کی آواز سننے کے بعد اس ہتھوڑے سے ضرب لگانا میرے لئے درست نہیں، پھر نماز کے لئے مسجد کی طرف چلا جاتا تھا، جس شخص نے یہ خواب دیکھا تھا اس نے یہ باتیں سن کر کہا کہ بس یہی وجہ ہے جس نے ان کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ان پر رشک آرہا ہے۔

ٹکراؤ کے وقت یہ فریضہ چھوڑ دو

آپ نے دیکھا کہ وہ لوہار جو لوہا کوٹنے کا کام کر رہا تھا، یہ بھی کسب حلال کا فریضہ تھا اور جب آذان کی آواز آئی تو وہ اولین فریضے کی پکار تھی جس وقت دونوں میں ٹکراؤ ہوا تو اس نے اللہ والے اور اولین فریضے کو ترجیح دی اور دوسرے فریضے کو چھوڑ دیا، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بلند مقام عطا فرما دیا۔ لہٰذا جہاں ٹکراؤ ہو جائے وہاں اولین فریضے کو اختیار کر لو اور کسب حلال کے فریضے کو چھوڑ دو۔

ایک جامع دعا

اسی لئے نبی کریم ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا))(۱)

اے اللہ ہمارا سب سے بڑا غم دنیا کو نہ بنایئے کہ ہمارے دماغ پر سب سے بڑا غم دنیا کا مسلط ہو کہ پیسے کہاں سے آئیں، بنگلہ کیسے بن جائے اور کار کیسے حاصل ہو جائے، اور اے اللہ! ہمارے سارے علم کا مبلغ دنیا کو نہ بنایئے کہ جو کچھ علم ہے وہ بس دنیا کا علم ہے، اور اے اللہ! نہ ہماری رغبت کی انتہا دنیا کو بنایئے کہ جو کچھ دل میں رغبت پیدا ہو وہ دنیا ہی کی ہو اور آخرت کی رغبت پیدا نہ ہو۔

بہر حال اس حدیث نے تیسرا سبق یہ دیدیا کہ کسب حلال کا درجہ دوسرے فرائض دینیہ کے بعد ہے، یہ دنیا ضرورت کی چیز تو ہے لیکن مقصد بنانے کی چیز نہیں ہے، یہ دنیا انہماک کی چیز نہیں ہے کہ دن رات آدمی اسی دنیا کی فکر میں منہمک رہے اور اس کے علاوہ کوئی اور فکر اور دھیان انسان کے دماغ پر نہ رہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے تین سبق معلوم ہوئے، ایک یہ کہ طلب حلال بھی دین کا ایک حصہ ہے، دوسرا یہ کہ انسان طلب حلال کی کرے اور حرام سے بچنے کی فکر کرے، اور تیسرا یہ کہ انسان اس معیشت کی سرگرمی کو صحیح مقام پر رکھے اور اس کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائے اس لئے کہ اولین فرائض دینیہ کے بعد یہ دوسرے درجے کا فریضہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل وکرم سے اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

(۱) روضة المحدثين، رقم:٣٣١٦ (٤١/٨)، الجامع الصغير وزيادته رقم:٢١٤٨ (٢١٦/١) دعا کا ترجمہ یہ ہے: اے اللہ! دنیا کو ہمارا بڑا غم نہ بنا، سارے علم کا مبلغ دنیا کو نہ بنا اور نہ ہی اسے ہماری رغبت کی انتہاء بنا۔

اپنے معاملات صاف رکھیں!☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّآ أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (۱)

یہ آیت جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے یہ دین کے ایک بہت اہم رکن سے متعلق ہے، وہ دین کا اہم رکن ''معاملات کی درستی اور اس کی صفائی'' ہے۔ یعنی انسان کا معاملات میں اچھا ہونا اور خوش معاملہ ہونا یہ دین کا بہت اہم باب ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ دین کا جتنا اہم باب ہے ہم لوگوں نے اتنا ہی اس کو اپنی زندگی سے خارج کر رکھا ہے، ہم نے دین کو صرف چند عبادات مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوۃ، عمرہ، وظائف اور اوراد میں منحصر کر لیا ہے، لیکن روپے پیسے کے لین دین کا جو باب ہے اس کو ہم نے بالکل آزاد چھوڑا ہوا ہے گویا کہ دین سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں، حالانکہ اسلامی شریعت کے احکام کا جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ عبادات سے متعلق جو احکام ہیں وہ ایک چوتھائی ہیں اور تین چوتھائی احکام معاملات اور معاشرت سے متعلق ہیں۔

تین چوتھائی دین معاملات میں ہے

فقہ کی ایک مشہور کتاب ہے جو ہمارے تمام مدارس میں پڑھائی جاتی ہے اور اس کتاب کو پڑھ کر لوگ عالم بنتے ہیں، اس کا نام ہے ''ھدایہ'' اس کتاب میں طہارت سے لیکر میراث تک شریعت کے جتنے احکام ہیں وہ سب اس کتاب میں جمع ہیں، اس کتاب کی چار جلدیں ہیں، پہلی جلد عبادات سے متعلق ہے جس میں طہارت کے احکام، نماز کے احکام، زکوۃ، روزے اور حج کے احکام بیان کیے گئے ہیں، اور باقی تین جلدیں معاملات یا معاشرت کے احکام سے متعلق ہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۹/۷۴ تا ۹۲)، ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۶ء، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) النساء: ۲۹

اس سے اندازہ لگائیں کہ دین کے احکام کا ایک چوتھائی حصہ عبادات سے متعلق ہے اور تین چوتھائی حصہ معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کی خرابی کا عبادت پر اثر

پھر اللہ تعالیٰ نے ان معاملات کا یہ مقام رکھا ہے کہ اگر انسان روپے پیسے کے معاملات میں حلال وحرام کا، اور جائز وناجائز کا امتیاز نہ رکھے تو عبادات پر بھی اس کا اثر یہ واقع ہوتا ہے کہ چاہے وہ عبادات ادا ہو جائیں لیکن ان کا اجر وثواب اور ان کی قبولیت موقوف ہو جاتی ہے، دعائیں قبول نہیں ہوتیں، ایک حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑی عاجزی کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں اس حال میں ان کے بال بکھرے ہوئے ہیں، گڑگڑا کر اور رو رو کر پکارتے ہیں کہ یا اللہ! میرا یہ مقصد پورا کر دیجئے، فلاں مقصد پورا کر دیجئے، بڑی عاجزی سے، الحاح وزاری کے ساتھ یہ دعائیں کر رہے ہوتے ہیں، لیکن کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام اور ان کا جسم حرام آمدنی سے پرورش پایا ہوا۔ ایسے آدمی کی دعا کیسے قبول ہو؟ ایسے آدمی کی دعا قبول نہیں ہوتی'' (۱)

معاملات کی تلافی بہت مشکل ہے

دوسری جتنی عبادات ہیں اگر ان میں کوتاہی ہو جائے تو اس کی تلافی آسان ہے مثلاً نمازیں چھوٹ گئیں تو اب اپنی زندگی میں قضا نمازیں ادا کر لو، اور اگر زندگی میں ادا نہ کر سکے تو وصیت کر جاؤ کہ اگر میں مر جاؤں اور میری نمازیں ادا نہ ہوئی ہوں تو میرے مال میں سے اس کا فدیہ ادا کر دیا جائے اور توبہ کر لو۔ انشاء اللہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تلافی ہو جائے گی، لیکن اگر کسی دوسرے کا مال ناجائز طریقے پر کھا لیا تو اس کی تلافی اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، چاہے تم ہزار توبہ کرتے رہو، ہزار نفلیں پڑھتے رہو، اسی لئے معاملات کا باب بہت اہمیت رکھتا ہے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب قبول الصدقة من الکسب الطیب وتربیتها، رقم: ۱٦۸۷، سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ومن سورة البقرة، رقم: ۲۹۱۵، مسند أحمد، رقم: ۷۹۹۸، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب فی أکل الطیب، رقم: ۲٦۰۱

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور معاملات

اسی وجہ سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تصوف اور طریقت کی تعلیمات میں معاملات کو سب سے زیادہ اولیت حاصل تھی، فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے اپنے مریدین میں سے کسی کے بارے میں یہ پتہ چلے کہ اس نے اپنے معمولات، نوافل اور اوراد و وظائف پورے نہیں کیے تو اس کی وجہ سے رنج ہوتا ہے اور اس مرید سے کہہ دیتا ہوں کہ ان کو پورا کرلو، لیکن اگر کسی مرید کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ اس نے روپے پیسے کے معاملات میں گڑ بڑ کی ہے تو مجھے اس مرید سے نفرت ہو جاتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سبق آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے، جن کو آپ نے خلافت بھی عطا فرمادی تھی، اور ان کو بیعت اور تلقین کرنے کی اجازت دیدی تھی، ایک مرتبہ وہ سفر کر کے حضرت والا کی خدمت میں تشریف لائے ان کے ساتھ ان کا بچہ بھی تھا، انہوں نے آکر سلام کیا اور ملاقات کی، اور بچے کو بھی ملوایا کہ حضرت یہ میرا بچہ ہے اس کے لئے دعا فرمادیجئے، حضرت والا نے بچے کے لئے فرمائی اور پھر ویسے ہی پوچھ لیا کہ اس بچے کی عمر کیا ہے؟

انہوں نے جواب دیا ''حضرت اس کی عمر تیرہ سال ہے''

حضرت نے پوچھا ''آپ نے ریل گاڑی کا سفر کیا ہے تو اس بچے کا آدھا ٹکٹ لیا تھا یا پورا ٹکٹ لیا تھا؟''

انہوں نے جواب دیا ''حضرت آدھا ٹکٹ لیا تھا''

حضرت نے فرمایا ''آپ نے آدھا ٹکٹ کیسے لیا جب کہ بارہ سال سے زائد عمر کے بچے کا تو پورا ٹکٹ لگتا ہے''

انہوں نے عرض کیا ''قانون تو یہی ہے کہ بارہ سال کے بعد ٹکٹ پورا لینا چاہئے اور یہ بچہ اگرچہ تیرہ سال کا ہے لیکن دیکھنے میں بارہ سال کا لگتا ہے، اس وجہ سے میں نے آدھا ٹکٹ لے لیا''

حضرت نے فرمایا ''انا للہ وانا الیہ راجعون، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو تصوف اور طریقے کی ہوا بھی نہیں لگی، آپ کو ابھی تک اس بات کا احساس اور ادراک نہیں کہ بچے کو جو سفر آپ نے کرایا یہ حرام کرایا، جب قانون یہ ہے کہ بارہ سال سے زائد عمر کے بچے کا ٹکٹ پورا لگتا ہے اور آپ نے آدھا

ٹکٹ لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ریلوے کے آدھے ٹکٹ کے پیسے غصب کر لئے اور آپ نے چوری کر لی، اور جو شخص چوری اور غصب کرے ایسا شخص تصوف اور طریقے میں کوئی مقام نہیں رکھ سکتا''

لہٰذا ان سے آپ کی خلافت اور اجازت بیعت واپس لی جاتی ہے۔ چنانچہ اس بات پر ان کی خلافت سلب فرمالی، حالانکہ اپنے اوراد و وظائف میں، عبادات اور نوافل میں، تہجد اور اشراق میں ان میں سے ہر چیز میں بالکل اپنے طریقے پر مکمل تھے، لیکن یہ غلطی کی کہ بچے کا ٹکٹ پورا نہیں لیا صرف اس غلطی کی بناء پر خلافت سلب فرمالی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اپنے سارے مریدین اور متعلقین کو یہ ہدایت تھی کہ جب کبھی ریلوے میں سفر کرو، اور تمہارا سامان اس مقدار سے زائد ہو جتنا ریلوے نے تمہیں مفت لے جانے کی اجازت دی ہے تو اس صورت میں اپنے سامان کا وزن کراؤ اور زائد سامان کا کرایہ ادا کرو، پھر سفر کرو۔

خود حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا اپنا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ریلوے میں سفر کے ارادے سے اسٹیشن پہنچے گاڑی کے آنے کا وقت قریب تھا، آپ اپنا سامان لیکر اس دفتر میں پہنچے جہاں پر سامان کا وزن کرایا جاتا تھا اور جا کر لائن میں لگ گئے۔ اتفاق سے گاڑی میں ساتھ جانے والا گارڈ وہاں آ گیا اور حضرت والا کو دیکھ کر پہچان لیا اور پوچھا ''حضرت آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں؟''

حضرت نے فرمایا ''میں سامان کا وزن کرانے آیا ہوں''

گارڈ نے کہا ''آپ کو سامان کا وزن کرانے کی ضرورت نہیں آپ کے لئے کوئی مسئلہ نہیں میں آپ کے ساتھ گاڑی میں جا رہا ہوں، آپ کو زائد سامان کا کرایہ دینے کی ضرورت نہیں''

حضرت نے پوچھا ''تم میرے ساتھ کہاں تک جاؤ گے؟''

گارڈ نے کہا ''میں فلاں اسٹیشن تک جاؤں گا''

حضرت نے پوچھا ''اس اسٹیشن کے بعد کیا ہوگا؟''

گارڈ نے کہا ''اس اسٹیشن پر دوسرا گارڈ آئے گا میں اس کو بتادوں گا کہ یہ حضرت کا سامان ہے اس کے بارے میں کچھ پوچھ گچھ مت کرنا''

حضرت نے پوچھا ''وہ گارڈ میرے ساتھ کہاں تک جائے گا؟''

گارڈ نے کہا ''وہ تو اور آگے جائے گا اس سے پہلے ہی آپ کا اسٹیشن آ جائے گا''

حضرت نے فرمایا ''میں تو اور آگے جاؤں گا یعنی آخرت کی طرف جاؤں گا اور اپنی قبر میں جاؤں گا وہاں پر کون سا گارڈ میرے ساتھ جائے گا؟ جب وہاں آخرت میں مجھ سے سوال ہوگا کہ ایک سرکاری گاڑی میں سامان کا کرایہ ادا کئے بغیر جو سفر کیا اور جو چوری کی اس کا حساب دو، تو وہاں پر کون سا گارڈ میری مدد کرے گا؟''

چنانچہ وہاں یہ بات مشہور تھی کہ جب کوئی شخص ریلوے کے دفتر میں اپنے سامان کا وزن کرا رہا ہوتا تو لوگ سمجھ جاتے تھے کہ یہ شخص تھانہ بھون جانے والا ہے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں سے ہے، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی بہت سی باتیں لوگوں نے لیکر مشہور کردیں، لیکن یہ پہلو کہ ایک پیسہ بھی شریعت کے خلاف کسی ذریعہ سے ہمارے پاس نہ آئے یہ پہلو نظروں سے اوجھل ہوگیا، آج کتنے لوگ اس قسم کے معاملات کے اندر مبتلا ہیں اور ان کو خیال بھی نہیں آتا کہ ہم یہ معاملات شریعت کے خلاف اور ناجائز کر رہے ہیں، اگر ہم نے غلط کام کر کے چند پیسے بچالئے تو وہ چند پیسے حرام ہوگئے اور وہ حرام مال ہمارے دوسرے مال کے ساتھ ملنے کے نتیجے میں اس کے برے اثرات ہمارے مال میں پھیل گئے، پھر اسی مال سے ہم کھانا کھا رہے ہیں، اسی سے کپڑے بنا رہے ہیں، اسی سے لباس تیار ہو رہا ہے، جس کے نتیجے میں ہماری پوری زندگی حرام ہو رہی ہے، اور ہم چونکہ بے حس ہوگئے ہیں اس لئے حرام مال اور حرام آمدنی کے برے نتائج کا ہمیں ادراک بھی نہیں۔

یہ حرام مال ہماری زندگی میں کیا فساد مچا رہا ہے، اس کا ہمیں احساس نہیں جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ احساس عطا فرماتے ہیں ان کو پتہ لگتا ہے کہ حرام چیز کیا ہوتی ہے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا چند مشکوک لقمے کھانا

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر استاذ تھے اور دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے، وہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں ایک دعوت میں چلا گیا اور وہاں جا کر کھانا کھالیا، بعد میں پتہ چلا کہ اس شخص کی آمدنی مشکوک ہے، فرماتے ہیں کہ میں مہینوں تک ان چند لقموں کی ظلمت اپنے دل میں محسوس کرتا رہا، اور مہینوں تک میرے دل میں گناہ کرنے کے جذبات پیدا ہوتے رہے، اور طبیعت میں یہ داعیہ بار بار پیدا ہوتا تھا کہ فلاں گناہ کرلوں فلاں گناہ کرلوں، حرام مال سے یہ ظلمت پیدا ہوجاتی ہے۔

حرام کی دو قسمیں

یہ جو آج ہمارے دلوں سے گناہوں کی نفرت مٹتی جارہی ہے اور گناہ کے گناہ ہونے کا احساس ختم ہورہا ہے اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے مال میں حرام مال کی ملاوٹ ہوچکی ہے پھر ایک تو وہ حرام ہے جو کھلا حرام ہے، جس کو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ حرام ہے، جیسے رشوت کا مال، سود کا مال، جوا کا مال، دھوکے کا مال، چوری کا مال وغیرہ۔ لیکن حرام کی دوسری قسم وہ حرام ہے جس کے حرام ہونے کا ہمیں احساس ہی نہیں ہے حالانکہ وہ بھی حرام ہے اور وہ حرام چیز ہمارے کاروبار میں مل رہی ہے اس دوسری قسم کی تفصیل سنئے۔

ملکیت متعین ہونی چاہئے

حضور ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ معاملات چاہے بھائیوں کے درمیان ہوں باپ بیٹے کے درمیان ہوں، شوہر اور بیوی کے درمیان ہوں، وہ معاملات بالکل صاف اور بے غبار ہونے چاہئیں اور ان میں کوئی غبار نہ ہونا چاہئے، اور ملکیتیں آپس میں متعین ہونی چاہئیں کہ کون سی چیز باپ کی ملکیت ہے اور کون سی چیز بیٹے کی ملکیت ہے، کون سی چیز شوہر کی ملکیت ہے اور کون سی چیز بیوی کی ملکیت ہے، کون سی چیز ایک بھائی کی ہے اور کون چیز دوسرے بھائی کی ہے، یہ ساری بات واضح اور صاف ہونی چاہئے، یہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:

((تَعَاشَرُوْا کَالْاَخْوَانِ تَعَامَلُوْا کَالْاَجَانِبِ))(۱)

''یعنی بھائیوں کی طرح رہو، لیکن آپس میں معاملات اجنبیوں کی طرح کرو''

مثلاً اگر قرض کا لین دین کیا جارہا ہے تو اس کو لکھ لو کہ یہ قرض کا معاملہ ہے اتنے دن کے بعد اس کی واپسی ہوگی۔

باپ بیٹوں کے مشترک کاروبار

آج ہمارا سارا معاشرہ اس بات سے بھرا ہوا ہے کہ کوئی بات صاف ہی نہیں۔ اگر باپ بیٹوں کے درمیان کاروبار ویسے ہی چل رہا ہے، اس کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی کہ بیٹے باپ کے ساتھ جو کام کررہے ہیں وہ آیا شریک کی حیثیت میں کررہے ہیں یا ملازم کی حیثیت میں کررہے ہیں،

(۱) یہ جملہ تلاش بسیار کے باوجود احادیث کی کتابوں میں نہیں مل سکا، البتہ عربی ضرب الامثال میں یہ جملہ موجود ہے، اس لئے اس کا ضرب المثل ہونا زیادہ راجح محسوس ہوتا ہے۔

یا ویسے ہی باپ کی مفت مدد کر رہے ہیں، اس کا کچھ پتہ نہیں، مگر تجارت ہو رہی ہے ملیں قائم ہو رہی ہیں، دوکانیں بڑھتی جارہی ہیں مال اور جائیداد بڑھتا جارہا ہے، لیکن یہ پتہ نہیں ہے کہ کس کا کتنا حصہ ہے اگر ان سے کہا بھی جائے کہ اپنے معاملات کو صاف کرو، تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو غیرت کی بات ہے، بھائیوں بھائیوں میں صفائی کی کیا ضرورت ہے؟ یا باپ بیٹوں میں صفائی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب شادیاں ہوجاتی ہیں اور بچے ہوجاتے ہیں اور شادی میں کسی نے زیادہ خرچ کرلیا اور کسی نے کم خرچ کیا، یا ایک بھائی نے مکان بنالیا اور دوسرے نے ابھی تک مکان نہیں بنایا، بس اب دل میں شکایتیں اور ایک دوسرے کی طرف سے کینہ پیدا ہونا شروع ہوگیا اور اب آپس میں جھگڑے شروع ہوگئے کہ فلاں زیادہ کھا گیا اور مجھے کم ملا، اور اگر اس دوران باپ کا انتقال ہوجائے تو اس کے بعد بھائیوں کے درمیان جو لڑائی اور جھگڑے ہوتے ہیں وہ لامتناہی ہوتے ہیں پھر ان کے حل کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

باپ کے انتقال پر میراث کی تقسیم فوراً کریں

جب باپ کا انتقال ہوجائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ فوراً میراث تقسیم کرو، میراث تقسیم کرنے میں تاخیر کرنا حرام ہے، لیکن آج کل یہ ہوتا ہے کہ باپ کے انتقال پر میراث تقسیم نہیں ہوتی اور جو بڑا بیٹا ہوتا ہے وہ کاروبار پر قابض ہوجاتا ہے، اور بیٹیاں خاموش بیٹھی رہتی ہیں، ان کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ ہمارا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے؟

یہاں تک کہ اسی حالت میں دس سال اور بیس سال گزر گئے اور پھر اس دوران کسی اور کا بھی انتقال ہوگیا یا کسی بھائی نے اس کاروبار میں اپنا پیسہ ملادیا پھر سالہا سال گزرنے کے بعد جب ان کی اولاد بڑی ہوئی تو اب جھگڑے کھڑے ہوگئے، اور جھگڑے ایسے وقت میں کھڑے ہوئے جب ڈور الجھی ہوئی ہے اور جب وہ جھگڑے انتہاء کی حد تک پہنچے تو اب مفتی صاحب کے پاس چلے آرہے ہیں کہ اب آپ بتائیں کہ ہم کیا کریں۔ مفتی صاحب بیچارے ایسے وقت میں کیا کریں گے اب اس وقت یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ جس وقت کاروبار کے اندر شرکت تھی اور بیٹے اپنے باپ کے ساتھ ملکر کاروبار کررہے تھے اس وقت بیٹے کس حیثیت میں کام کررہے تھے؟

مشترک مکان کی تعمیر میں حصہ داروں کا حصہ

یا مثلاً ایک مکان بن رہا ہے، تعمیر کے دوران کچھ پیسے باپ نے لگادیئے کچھ پیسے ایک بیٹے

نے لگادیئے کچھ دوسرے بیٹے نے لگادیئے کچھ تیسرے بیٹے نے لگادیئے لیکن یہ پتہ نہیں کہ کون کس حساب سے کس طرح سے کس تناسب سے لگارہا ہے، اور یہ بھی پتہ نہیں کہ جو پیسے تم لگارہے ہو وہ آیا بطور قرض کے دے رہے ہو اور اس کو واپس لوگے یا مکان میں حصہ دار بن رہے ہو، یا بطور امداد اور تعاون کے پیسے دے رہے ہو، اس کا کچھ پتہ نہیں۔ اب مکان تیار ہوگیا اور اس میں رہنا شروع کردیا، اب جب باپ کا انتقال ہوا یا آپس میں دوسرے مسائل پیدا ہوئے تو اب مکان پر جھگڑے کھڑے ہوگئے، اب مفتی صاحب کے پاس چلے آرہے ہیں کہ فلاں بھائی یہ کہتا ہے کہ میرا اتنا حصہ ہے مجھے اتنا ملنا چاہئے، دوسرا کہتا کہ مجھے اتنا ملنا چاہئے، جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ بھائی جب تم نے اس مکان کی تعمیر میں پیسے دیئے تھے، اس وقت تمہاری کیا نیت تھی؟ کیا تم نے بطور قرض دیئے تھے؟ یا تم مکان میں حصہ دار بننا چاہتے تھے؟ یا باپ کی مدد کرنا چاہتے تھے؟ اس وقت کیا بات تھی؟ تو یہ جواب ملتا ہے کہ ہم نے تو پیسے دیتے وقت کچھ سوچا ہی نہیں تھا نہ تو ہم نے مدد کے بارے میں سوچا تھا اور نہ حصہ داری کے بارے میں سوچا تھا، اب آپ کوئی حل نکالیں، جب ڈور الجھ گئی اور سرا ہاتھ نہیں آرہا ہے تو اب مفتی صاحب کی مصیبت آئی کہ وہ اس کا حل نکالیں کہ کس کا کتنا حصہ بنتا ہے، یہ سب اس لئے ہوا کہ معاملات کے بارے میں حضور ﷺ کی تعلیم پر عمل نہیں کیا۔ نفلیں ہورہی ہیں، تہجد کی نماز ہورہی ہے، اشراق کی نماز ہورہی ہے، لیکن معاملات میں سب الم غلم ہورہا ہے، کسی چیز کا کچھ پتہ نہیں، یہ سب کام حرام ہورہا ہے، جب یہ معلوم نہیں کہ میرا حق کتنا ہے اور دوسرے کا حق کتنا ہے تو اس صورت میں جو کچھ اس میں سے کھا رہے ہو اس کے حلال ہونے میں بھی شبہ ہے جائز نہیں۔

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ملکیت کی وضاحت

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، ان کا ایک مخصوص کمرہ تھا اس میں آرام فرمایا کرتے تھے، ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی اسی پر آرام کیا کرتے تھے، اسی پر لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتے تھے، وہیں پر لوگ آکر ملاقات کیا کرتے تھے، میں یہ دیکھتا تھا کہ جب اس کمرے میں کوئی سامان باہر سے آتا تو فوراً واپس بھجوادیتے تھے، مثلاً حضرت والد صاحب نے پانی منگوایا میں گلاس میں پانی بھر کر پلانے چلا گیا جب آپ پانی پی لیتے تو فوراً فرماتے کہ یہ گلاس واپس رکھ آؤ جہاں سے لائے تھے، جب گلاس واپس لیجانے میں دیر ہوجاتی تو ناراض ہوجاتے، اگر پلیٹ آجاتی تو فوراً فرماتے کہ یہ پلیٹ واپس باورچی خانے میں رکھ آؤ، ایک دن میں نے کہا کہ حضرت! اگر سامان واپس لیجانے میں تھوڑی دیر ہوجایا کرے تو معاف فرمادیا

کریں، فرمانے لگے تم بات سمجھتے نہیں ہو، بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنے وصیت نامہ میں لکھا ہوا ہے کہ اس کمرے میں جو سامان بھی ہے وہ میری ملکیت ہے، اور باقی کمروں میں اور گھر میں جو سامان ہے وہ تمہاری والدہ کی ملکیت ہے، اس لئے میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کبھی دوسرے کمروں کا سامان یہاں پر آجائے اور اسی حالت میں میرا انتقال ہوجائے تو اس وصیت نامہ کے مطابق تم یہ سمجھو گے کہ یہ میری ملکیت ہے حالانکہ وہ میری ملکیت نہیں، اس وجہ سے میں کوئی چیز دوسروں کی اپنے کمرے میں نہیں رکھتا واپس کروا دیتا ہوں۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط

جب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوگئی تو میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تعزیت کے لئے تشریف لائے، حضرت والد صاحب سے ڈاکٹر صاحب کو بہت ہی والہانہ تعلق تھا، جس کا ہم اور آپ تصور نہیں کرسکتے، چونکہ آپ ضعیف تھے اس وجہ سے اس وقت آپ پر کمزوری کے آثار نمایاں تھے، مجھے اس وقت خیال آیا کہ حضرت والا پر اس وقت یہ ضعف اور غم ہے تو اندر سے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خمیرہ لے آیا جو آپ تناول فرمایا کرتے تھے، اور حضرت والا کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ خمیرہ کا ایک چمچہ تناول فرمالیں، حضرت والا نے اس خمیرہ کو دیکھتے ہی کہا کہ تم یہ خمیرہ کیسے لے آئے یہ خمیرہ تو اب میراث کا اور ترکہ کا ایک حصہ بن گیا ہے اب تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ اس طرح یہ خمیرہ اٹھا کر کسی کو دیدو، اگرچہ وہ ایک چمچہ کے برابر ہی کیوں نہ ہو، میں نے کہا کہ حضرت! حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جتنے ورثاء ہیں وہ سب الحمدللہ بالغ ہیں اور وہ سب یہاں موجود ہیں اور سب اس بات پر راضی ہیں کہ آپ یہ خمیرہ تناول فرمالیں، تب حضرت نے وہ خمیرہ تناول فرمایا۔

حساب اسی دن کرلیں

اس کے ذریعہ حضرت والا نے یہ سبق دیدیا کہ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ آدمی رواداری میں زندگی گذار دے اور کوئی حساب نہ کرے۔ فرض کریں کہ اگر تمام ورثاء میں ایک وارث بھی نابالغ ہوتا یا موجود نہ ہوتا اور اس کی رضامندی شامل نہ ہوتی تو اس خمیرہ کا ایک چمچہ بھی حرام ہوجاتا۔ اس لئے شریعت کا یہ حکم ہے کہ جونہی کسی کا انتقال ہوجائے تو جلد از جلد اس کی میراث تقسیم کردو، یا کم از کم حساب کرکے رکھ لو کہ فلاں کا اتنا حصہ ہے اور فلاں کا اتنا حصہ ہے، اسلئے کہ بعض اوقات تقسیم میں کچھ

تاخیر ہو جاتی ہے، بعض اشیاء کی قیمت لگانی پڑتی ہے اور بعض اشیاء کو فروخت کرنا پڑتا ہے، لیکن حساب اسی دن ہو جانا چاہئے، آج اس وقت ہمارے معاشرے میں جتنے جھگڑے پھیلے ہوئے ہیں ان جھگڑوں کا ایک بڑا بنیادی سبب حساب کتاب کا صاف نہ ہونا اور معاملات کا صاف نہ ہونا ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور تصوف پر کتاب

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سارے فقہی احکام اپنی تصانیف کے ذریعہ ہم تک پہنچائے، ان کا احسان ہمارے سروں پر اتنا ہے کہ ساری عمر تک ہم ان کے احسان کا صلہ نہیں دے سکتے، ان کی لکھی ہوئی کتابیں کئی اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھیں، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت آپ نے بہت ساری کتابیں لکھیں ہیں لیکن تصوف اور زہد کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی؟ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا "تم کیسے کہتے ہو کہ میں نے تصوف پر کتاب نہیں لکھی، میں نے جو "کتاب البیوع" لکھی ہے وہ تصوف ہی کی تو کتاب ہے"

مطلب یہ تھا کہ خرید و فروخت کے احکام اور لین دین کے احکام حقیقت میں تصوف ہی کے احکام ہیں، اس لئے کہ زہد اور تصوف درحقیقت شریعت کی ٹھیک ٹھیک پیروی کا نام ہے، اور شریعت کی ٹھیک ٹھیک پیروی خرید و فروخت اور لین دین کے احکام پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔

دوسروں کی چیز اپنے استعمال میں لانا

اسی طرح دوسرے کی چیز استعمال کرنا حرام ہے۔ مثلاً کوئی دوست ہے یا بھائی ہے، اس کی چیز اس کی اجازت کے بغیر استعمال کر لی تو یہ جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔ البتہ اگر آپ کو یہ یقین ہے کہ اس کی چیز استعمال کرنے سے وہ خوش ہوگا اور خوشی سے اس کی اجازت دیدے گا تب تو استعمال کرنا جائز ہے، لیکن جہاں ذرا بھی اس کی اجازت میں شک ہو چاہے وہ حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو، یا چاہے وہ بیٹا ہو اور اپنے باپ کی چیز استعمال کر رہا ہو، جب تک اس بات کا اطمینان نہ ہو کہ خوش دلی سے وہ اجازت دیدے گا یا میرے استعمال کرنے سے وہ خوش ہوگا اس وقت تک اس کا استعمال جائز نہیں۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِىءٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ))(۱)

---

(۱) کنز العمال، رقم: ۳۹۷ (۱/۹۱)، مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۷۷٤، جامع الأحاديث، رقم: ۱۷٦۱۵ (۱۷/۸۰)، كشف الخفاء، رقم: ۳۱۰۱ (۲/۳۷۰)

"کسی مسلمان کا مال تمہارے لئے حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے نہ دے"

اس حدیث میں "اجازت" کا لفظ استعمال نہیں فرمایا بلکہ "خوش دلی" کا لفظ استعمال فرمایا، مطلب یہ ہے کہ صرف اجازت کافی نہیں بلکہ وہ اس طرح اجازت دے کہ اس کا دل خوش ہو تب تو وہ چیز حلال ہے۔ اگر آپ دوسرے کی چیز استعمال کر رہے ہیں لیکن آپ کو اس کی خوش دلی کا یقین نہیں ہے تو آپ کے لئے وہ چیز استعمال کرنا جائز نہیں۔

ایسا چندہ حلال نہیں

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مدرسوں کے چندے اور انجمنوں کے چندے کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ چندے اس طرح وصول کرنا کہ دوسرا شخص دباؤ کے تحت چندہ دیدے ایسا چندہ حلال نہیں۔ مثلاً آپ نے مجمع عام میں چندہ لینا شروع کر دیا اس مجمع میں ایک آدمی شرما شرمی میں یہ سوچ کر چندہ دے رہا ہے کہ اتنے سارے لوگ چندہ دے رہے ہیں اور میں چندہ نہ دوں تو میری ناک کٹ جائے گی اور دل کے اندر چندہ دینے کی خواہش نہیں تھی، تو یہ چندہ خوش دلی کے بغیر دیا گیا یہ "چندہ" لینے والے کے لئے حلال نہیں۔

اس موضوع پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور اس میں یہ احکام لکھے ہیں کہ کس حالت میں چندہ لینا جائز ہے اور کس حالت میں چندہ لینا جائز نہیں۔

ہر ایک کی ملکیت واضح ہونی چاہئے

بہرحال! یہ اصول ذہن میں رکھو کہ جب تک دوسرے کی خوش دلی کا اطمینان نہ ہو اس وقت تک دوسرے کی چیز استعمال کرنا حلال نہیں، چاہے وہ بیٹا کیوں نہ ہو، باپ کیوں نہ ہو، بھائی اور بہن کیوں نہ ہو، چاہے بیوی اور شوہر کیوں نہ ہو، اس اصول کو فراموش کرنے کی وجہ سے ہمارے مال میں حرام کی آمیزش ہو جاتی ہے، اگر کوئی شخص کہے کہ میں تو کوئی غلط کام نہیں کرتا، رشوت میں نہیں لیتا، سود میں نہیں کھاتا، چوری میں نہیں کرتا، ڈاکہ میں نہیں ڈالتا، اس لئے میرا مال تو حلال ہے لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ اس اصول کا لحاظ نہ رکھنے کی وجہ سے مال حرام کی آمیزش ہو جاتی ہے اور مال میں حرام کی آمیزش حلال مال کو بھی تباہ کر دیتی ہے، اور اس کی برکتیں زائل ہو جاتی ہیں، اس کا نفع ختم ہو جاتا ہے، اور الٹا اس حرام مال کے نتیجے میں انسان کی طبیعت گناہوں کی طرف چلتی ہے، روحانیت کو نقصان ہوتا ہے، اس لئے معاملات کو صاف رکھنے کی فکر کریں کہ کسی معاملے میں کوئی الجھاؤ نہ

رہے، ہر چیز صاف اور واضح ہونی چاہئے، ہر چیز کی ملکیت واضح ہونی چاہئے کہ یہ چیز میری ملکیت ہے یہ فلاں کی ملکیت ہے، البتہ ملکیت واضح ہوجانے کے بعد آپس میں بھائیوں کی طرح رہو، دوسرے شخص کو تمہاری چیز استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو دیدو، لیکن ملکیت واضح ہونی چاہئے تاکہ کل کو کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہوجائے۔

مسجد نبوی کے لئے زمین مفت قبول نہ کی

جب حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کے پیش نظر سب سے پہلا کام یہ تھا کہ یہاں پر کوئی مسجد بنائی جائے، وہ مسجد نبوی جس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے، چنانچہ ایک جگہ آپ کو پسند آگئی جو خالی پڑی ہوئی تھی، آپ نے اس جگہ کے بارے میں معلوم کرایا کہ یہ کس کی جگہ ہے؟ تو پتہ چلا کہ یہ بنی نجار کے لوگوں کی جگہ ہے، جب بنو نجار کے لوگوں کو پتہ چلا کہ آپ اس جگہ پر مسجد بنانا چاہتے ہیں تو انہوں نے آکر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! یہ تو ہماری بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہماری جگہ پر مسجد بنائی جائے، ہم یہ جگہ مسجد کے لئے مفت دیتے ہیں تاکہ آپ یہاں پر مسجد نبوی کی تعمیر فرمائیں، آپ نے فرمایا کہ نہیں میں مفت نہیں لوں گا، تم اس کی قیمت بتاؤ قیمت کے ذریعہ لوں گا۔(۱)

حالانکہ بظاہر یہ معلوم ہورہا تھا کہ وہ لوگ اپنی سعادت اور خوش نصیبی سمجھ کر یہ چاہ رہے تھے کہ ان کی جگہ مسجد نبوی کی تعمیر میں استعمال ہوجائے لیکن اس کے باوجود آپ نے مفت لینا گوارہ نہیں کیا۔

تعمیر مسجد کے لئے دباؤ ڈالنا

علماء کرام نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ویسے تو جب بنی نجار کے لوگ مسجد کے لئے چندہ کے طور پر مفت زمین دے رہے تھے تو یہ زمین لینا جائز تھا، اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں تھی۔ لیکن چونکہ مدینہ منورہ میں اسلام کی یہ پہلی مسجد تعمیر ہورہی تھی اگرچہ قبا میں ایک مسجد تعمیر ہوچکی تھی اور یہ وہ مسجد تھی جس کو آئندہ حرم مکہ کے بعد دوسرا مقام حاصل ہونا تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب هل تنبش قبور مشركي الجاهلية ويتخذ مكانها مساجد، رقم: ٤١٠، صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب ابتناء مسجد النبی، رقم: ٨١٦، سنن النسائي، كتاب المساجد، باب نبش القبور واتخاذ أرضها مسجدا، رقم: ٦٩٥، مسند أحمد رقم: ١١٨٨٥

بات کو پسند نہیں فرمایا کہ یہ زمین اس طرح مفت قیمت کے بغیر لے لی جائے۔ ورنہ آئندہ کے لئے لوگوں کے سامنے یہ نظیر بن جائے گی کہ جب مسجد بنانی ہو تو مسجد کے لئے زمین قیمتاً خریدنے کے بجائے لوگ مفت اپنی زمینیں دیں، اور اس لئے یہ زمین مفت قبول نہیں کی تاکہ لوگوں پر یہ واضح فرمادیں کہ یہ بات درست نہیں کہ مسجد کی تعمیر کی خاطر دوسروں پر دباؤ ڈالا جائے، یا دوسروں کی املاک پر نظر رکھی جائے، اس وجہ سے حضور ﷺ نے پیسے دے کر وہ زمین خریدی اور پھر مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی تاکہ معاملہ صاف رہے اور کسی قسم کی کوئی الجھن برقرار نہ رہے۔

پورے سال کا نفقہ دینا

آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات، جو حقیقت میں آنحضرت ﷺ کی شریک حیات بننے کی وہی مستحق تھیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت نکالی ہوئی تھی اور آخرت کی محبت ان کے دلوں میں بھری ہوئی تھی، لیکن حضور ﷺ کا معاملہ یہ تھا کہ سال کے شروع میں اپنی تمام ازواج مطہرات کا نفقہ اکٹھا دیدیا کرتے تھے اور ان سے فرمادیتے کہ یہ تمہارا نفقہ ہے تم جو چاہو کرو۔(۱)

اب وہ ازواج مطہرات بھی حضور ﷺ کی ازواج مطہرات تھیں ان کے یہاں تو ہر وقت صدقہ خیرات کا سلسلہ جاری رہتا تھا، چنانچہ وہ ازواج مطہرات بقدر ضرورت اپنے پاس رکھتیں باقی سب خیرات کردیتی تھیں، لیکن حضور ﷺ نے یہ مثال قائم فرمائی کہ پورے سال کا نفقہ اکٹھا دیدیا۔

ازواج مطہرات سے برابر کا معاملہ کرنا

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے پابندی اٹھائی تھی کہ وہ اپنی ازواج مطہرات میں برابری کریں، بلکہ آپ کو یہ اختیار دیدیا تھا کہ جس کو چاہیں زیادہ دیں اور جس کو چاہیں کم دیں، اس معاملے میں ہم آپ سے مواخذہ نہیں کریں گے، اس اختیار کے نتیجے میں ازواج مطہرات کے درمیان برابری کرنا آپ کے ذمہ فرض نہیں رہا تھا، جب کہ امت کے تمام افراد کے لئے برابری کرنا فرض ہے، لیکن حضور ﷺ نے ساری عمر اس اختیار اور اجازت پر عمل نہیں فرمایا بلکہ ہر چیز میں برابری فرمائی، اور ان کی ملکیت کو واضح اور نمایاں فرمادیا تھا، اور ان کے حقوق پوری طرح زندگی بھر ادا فرمائے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب المساقاۃ والمعاملۃ بجزء من الثمر والزرع، رقم: ۲۸۹۷

خلاصہ

بہرحال! ان احادیث اور آیات میں جو بنیادی اصول بیان فرمایا جس کو ہم فراموش کرتے جارہے ہیں وہ ''معاملات کی صفائی'' اور معاملات کی درستی ہے یعنی معاملہ صاف اور واضح ہو، اس میں کوئی اجمال اور ابہام نہ رہے، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک اپنے معاملات کو صاف رکھے، اس کے بغیر آمدنی اور اخراجات شریعت کی حدود میں نہیں رہتے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل وکرم سے اس حقیقت اور اس حکم کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

معاملات کی صفائی اور تنازعات ☆

ہمارے معاشرے میں آپس کے جھگڑوں اور تنازعات کا جو سیلاب امڈا ہوا ہے اس کا تھوڑا سا اندازہ عدالت میں دائر ہونے والے مقدمات سے ضرور ہوسکتا ہے، لیکن یہ اندازہ یقیناً ناکافی اور حقیقت سے بہت کم ہوگا، کیونکہ بے شمار تنازعات وہ ہیں جن کے عدالت تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی، عدالت سے رجوع کرنے میں وقت اور پیسے کا جو بے تحاشا صرفہ ہوتا ہے اس کی وجہ سے بہت سے لوگ عدالت سے رجوع نہیں کرپاتے، اس کے بجائے فریقین میں سے ہر ایک اپنی اپنی بساط کی حد تک دوسرے کو زک پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اور اس طرح عداوت کی آگ بھڑکتے بھڑکتے کئی کئی پشتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

ان تنازعات کی تہہ میں اگر دیکھا جائے تو وہی زر اور زمین کے معروف اسباب کارفرما نظر آتے ہیں، روپیہ پیسہ اور زمین جائیداد کا جھگڑا بڑے بڑے پرانے تعلقات کو دیکھتے ہی دیکھتے بھسم کرڈالتا ہے، اور اس کی وجہ سے بڑی بڑی مثالی دوستیاں آن کی آن میں دشمنیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔

اس صورت حال کے بہت سے اسباب ہیں لیکن ایک بہت بڑا سبب ''معاملات'' کو صاف نہ رکھنا ہے ہمارے دین کی ایک انتہائی زریں تعلیم یہ ہے کہ:

> ''آپس میں رہو بھائیوں کی طرح لیکن لین دین کے معاملات اجنبیوں کی طرح کرو''

مطلب یہ ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ ایسا کرو جیسے ایک بھائی کو دوسرے کے ساتھ کرنا چاہئے، اس میں ایثار، مروت، رواداری، تحمل اور اپنائیت کا مظاہرہ کرو، لیکن جب روپے پیسے کے لین دین، جائیداد کے معاملات اور شرکت وحصہ داری کا مسئلہ آجائے تو بہتر تعلقات کی حالت میں بھی انہیں اس طرح انجام دو جیسے دو اجنبی شخص انہیں انجام دیتے ہیں، یعنی معاملے کی ہر بات صاف ہونی چاہئے نہ کوئی بات ابہام میں رہے اور نہ معاملے کی حقیقت میں کوئی اشتباہ باقی رہے۔

☆ ذکر وفکر، ص:۸۳

اگر محبت، اتفاق اور خوشگوار تعلقات کی حالت میں دین کی اس گراں قدر تعلیم پر عمل کر لیا جائے تو بعد میں پیدا ہونے والے بہت سے فتنوں اور جھگڑوں کا سدباب ہو جاتا ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں اس اہم اصول کو جس طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے اس کے چند مظاہر یہ ہیں:

(۱) بسا اوقات ایک کاروبار میں کئی بھائی یا باپ بیٹے مشترک طور پر ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور کسی حساب وکتاب کے بغیر سب لوگ مشترک کاروبار سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کرتے رہتے ہیں، نہ یہ بات طے ہوتی ہے کہ کاروبار میں کس کی کیا حیثیت ہے؟ آیا وہ کاروبار میں تنخواہ پر کام کر رہے ہیں؟ یا کاروبار کے حصہ دار ہیں؟ تنخواہ ہے تو کتنی؟ اور حصہ ہے تو کس قدر؟ بس ہر شخص اپنی خواہش یا ضرورت کے مطابق کاروبار کی آمدنی استعمال کرتا رہتا ہے، اور اگر کبھی کوئی شخص یہ تجویز پیش کرے کہ کاروبار میں حصے یا تنخواہ وغیرہ متعین کر لینی چاہئے تو اسے محبت اور اتفاق کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اس طرح کے کاروبار کا انجام اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ دل ہی دل میں ایک دوسرے کے خلاف رنجشیں پرورش پاتی رہتی ہیں، بالخصوص جب حصہ داروں کے یہاں شادیاں ہو جاتی ہیں تو ہر شخص یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دوسرے نے کاروبار سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے اور مجھ پر ظلم ہوا ہے، اگرچہ ظاہری سطح پر باہم رورعایت کا وہی انداز باقی نظر آتا ہے لیکن اندر ہی اندر رنجشوں کا لاوا پکتا رہتا ہے، اور بالآخر جب یہ رنجشیں بدگمانیوں کے ساتھ ملکر پہاڑ بن جاتی ہیں تو یہ آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے، اور محبت واتفاق کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، زبانی تو تکار سے لیکر لڑائی جھگڑے اور مقدمہ بازی تک کسی کام سے دریغ نہیں ہوتا، بھائی بھائی کی بول چال بند ہو جاتی ہے، ایک بھائی دوسرے کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں رہتا، جس کے قابو میں کاروبار کا جتنا حصہ آتا ہے وہ اس پر قابض ہو کر عدل وانصاف کا بے دریغ خون کرتا ہے، اور پھر اپنی نجی مجلسوں میں ایک دوسرے کے خلاف بدزبانی اور بدگمانی کا وہ طوفان کھڑا کرتا ہے کہ الامان!

پھر چونکہ سالہا سال تک مشترک کاروبار کا نہ کوئی اصول طے شدہ تھا نہ کوئی حساب وکتاب رکھا گیا اس لئے اگر اختلافات پیش آنے کی صورت میں افہام وتفہیم سے کام لینے کی کوشش کی بھی جاتی ہے تو معاملات کی ڈور الجھ کر اتنی پیچیدہ ہو چکی ہوتی ہے کہ منصفانہ تصفیہ کے لئے اس کا سرا پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے، ہر شخص واقعات کو اپنے مفاد کی عینک سے دیکھتا ہے، اور مصالحت کا کوئی ایسا فارمولا وضع کرنا بھی سخت مشکل ہو جاتا ہے جو تمام متعلقہ فریقوں کے لئے قابل قبول ہو۔

یہ سارا فساد اکثر اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ کاروبار کے آغاز میں یا اس میں مختلف افراد کی

شمولیت کے وقت معاملے کو معاملے کی طرح طے نہیں کیا جاتا، اگر شروع ہی سے یہ بات واضح ہو کہ کس شخص کی کیا حیثیت ہے؟ اور کس کے کیا حقوق وفرائض ہیں؟ اور یہ ساری باتیں تحریری شکل میں محفوظ ہوں تو بہت سے جھگڑوں اور بعد میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کا شروع ہی میں سد باب ہو جائے۔

قرآن کریم میں جو آیت سب سے طویل آیت ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ جب تم کوئی ادھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو جب معمولی رقم ادھار دینے پر یہ تاکید ہے تو کاروبار کے پیچیدہ معاملات کو تحریر میں لانے کی اہمیت کتنی زیادہ ہوگی؟(۱)

یہ حکم اسی لئے دیا گیا ہے تاکہ بعد میں تنازعات اور اختلافات پیدا نہ ہوں، اور اگر ہوں تو انہیں حق وانصاف کے مطابق نمٹانا آسان ہو۔

لہٰذا اگر کسی کاروبار میں ایک سے زیادہ افراد کام کر رہے ہیں تو پہلے ہی قدم پر ان میں سے ہر شخص کی حیثیت کا تعین ضروری ہے، یہاں تک کہ اگر باپ کے کاروبار میں کوئی بیٹا شامل ہوا ہے تو اس کے بارے میں بھی پہلے ہی دن سے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ وہ تنخواہ پر کام کریگا؟ یا کاروبار میں باقاعدہ حصہ دار ہوگا؟ یا محض اپنے باپ کی مدد کرے گا؟ پہلی صورت میں اس کی تنخواہ متعین ہونی چاہئے اور یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ وہ کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار نہیں ہے اور دوسری صورت میں اگر اسے کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار بنانا ہے تو شرعاً اس کی پہلی شرط تو یہ ہے کہ اس کی طرف سے کاروبار میں کچھ سرمایہ ضرور شامل ہونا چاہئے (جس کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ باپ اسے کچھ نقد رقم ہبہ کردے اور وہ اس رقم سے کاروبار کا ایک متعین فیصد حصہ خرید لے) دوسرے یہ بات تحریری طور پر ایک معاہدہ شرکت کی شکل میں محفوظ کر لینی چاہئے اور اس معاہدے میں یہ بھی صراحت ہونی چاہئے کہ نفع میں کتنا فیصد حصہ کس کا ہوگا؟ تاکہ بعد میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو؟

اگر کسی ایک حصہ دار کو کاروبار میں کام زیادہ کرنا پڑتا ہو تو یہ بات بھی طے ہونی چاہئے کہ آیا وہ یہ زیادہ کام رضا کارانہ طور پر کرے گا یا اس زیادہ کام کا کوئی معاوضہ اسے دیا جائے گا، اگر کوئی معاوضہ دیا جائیگا تو وہ نفع کے کتنے فیصد حصے میں اضافہ کر کے دیا جائے گا، یا متعین تنخواہ کی صورت میں؟ غرض ہر فریق کے حقوق وفرائض اتنے واضح ہونے ضروری ہیں کہ ان میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

اگر بالفرض کسی کاروبار میں اب تک ان باتوں پر عمل نہیں کیا گیا تو جتنی جلد ہو سکے ان امور کو

---

(۱) البقرة: ۲۸۲، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ... الخ

طے کرلینا ضروری ہے اور اس معاملے میں کسی شرم، مروت اور طعن وتشنیع کو آڑے نہ آنے دینا چاہئے، معاملات کی اس صفائی کو محبت واخوت اور اتحاد واتفاق کے خلاف سمجھنا بہت بڑا دھوکہ ہے، بلکہ درحقیقت محبت اور اتفاق کی پائیداری ان امور پر منحصر ہے ورنہ آگے چل کر یہ سطحی محبت دلوں میں عداوت کو جنم دے سکتی ہے، اور اسی لئے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ ''رہو بھائیوں کی طرح لیکن معاملات اجنبیوں کی طرح کرو''

(۲) اسی طرح ہمارے معاشرے میں بالخصوص متوسط آمدنی والے طبقے میں اپنے ملکیتی مکان کا حصول ایک بڑا مسئلہ ہے اور عموماً کسی مکان کی تعمیر یا اس کی خریداری خاندان کے کئی افراد ملکر کرتے ہیں، اگر باپ نے کوئی مکان بنانا شروع کیا ہے تو بیٹے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اس میں اپنی رقمیں لگاتے ہیں، لیکن عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ یہ رقمیں کچھ سوچے سمجھے بغیر اور بسا اوقات کوئی حساب رکھے بغیر لگادی جاتی ہیں، یعنی یہ بات طے نہیں ہوتی کہ بیٹا جو رقم مکان کی تعمیر کے لئے دے رہا ہے آیا یہ باپ کی خدمت میں ہدیہ ہے؟ یا قرض ہے؟ یا وہ مکان کی ملکیت میں حصہ دار بننے کے لئے یہ رقم خرچ کررہا ہے؟ پہلی صورت میں نہ وہ مکان کی ملکیت کا حصہ دار ہوگا نہ باپ سے یہ رقم کسی وقت واپس لینے کا حق دار ہوگا، دوسری صورت میں مکان تو تنہا باپ کی ملکیت ہوگا لیکن دی ہوئی رقم اس کے ذمے قرض سمجھی جائے گی، تیسری صورت میں اپنی لگائی ہوئی رقم کے بقدر وہ مکان کی ملکیت میں بھی شریک ہوگا اور مکان کی قیمت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے حصے کی مالیت میں بھی اضافہ ہوگا۔ غرض ہر صورت کے تقاضے اور نتائج مختلف ہیں، لیکن چونکہ رقم لگاتے وقت ان تینوں میں سے کوئی صورت طے نہیں ہوئی، نہ رقموں کا پورا حساب رکھا جاتا ہے اس لئے آگے چل کر جب مکان کی قیمت بڑھتی ہے تو آپس میں اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں اور خاص طور پر باپ کے انتقال کے بعد جب ترکے کی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے تو یہ اختلافات ایک لاینحل مسئلے کی صورت اختیار کرلیتے ہیں، ان کی وجہ سے بھائیوں میں چھوٹ چھٹاؤ کی نوبت آجاتی ہے اور لڑائی جھگڑوں سے خاندان کا خاندان متاثر ہوتا ہے۔

اگر اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے تعمیر کے شروع ہی میں یہ ساری باتیں طے کرلی جائیں اور انہیں تحریری طور پر قلمبند کرلیا جائے تو اس خاندانی فساد کا راستہ بند ہوجائے۔

(۳) جب خاندان کے کسی بڑے کا انتقال ہوتا ہے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ جلد از جلد اس کا ترکہ اس کے شرعی وارثوں کے درمیان تقسیم کیا جائے، لیکن ہمارے معاشرے میں شریعت کے اس حکم سے شدید غفلت برتی جاتی ہے، بعض اوقات تو جس کے جو ہاتھ لگتا ہے لے اڑتا ہے، اور حلال وحرام ہی

کی پرواہ نہیں کی جاتی، اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے پیش نظر بددیانتی نہیں ہوتی، لیکن ناواقفیت یا لاپروائی کی وجہ سے میراث تقسیم نہیں ہوتی، اور اگر مرحوم نے کوئی کاروبار چھوڑا ہے تو اس پر وہی بیٹا کام کرتا رہتا ہے جو مرحوم کی زندگی میں کرتا تھا، لیکن یہ طے نہیں کیا جاتا کہ اب کاروبار کی ملکیت کس تناسب سے ہوگی؟ شرعی ورثاء کے حصوں کی ادائیگی کس طرح ہوگی؟ کام کرنے والے کو اس کی خدمات کا معاوضہ کس طرح ادا کیا جائے گا؟ ترکے میں کون سی چیز کس کے حصے میں آئے گی؟ بلکہ اگر کوئی شخص ترکے کی تقسیم کی طرف توجہ دلائے بھی تو اس کی تجویز کو ایک معیوب تجویز سمجھا جاتا ہے، کہ ابھی مرنے والے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ لوگوں کو بٹوارے کی فکر پڑ گئی ہے۔

حالانکہ یہ بٹوارہ شریعت کا حکم بھی ہے، معاملات کی صفائی کا تقاضا بھی اور اسے نظر انداز کرنے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد ورثاء کو اپنے اپنے حقوق کا خیال آتا ہے رنجشیں پیدا ہوتی ہیں، ترکے کی اشیاء کی قیمتوں میں زمین وآسمان کا فرق پڑ جاتا ہے، اور چونکہ کوئی بات پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی اس لئے اب معاملات الجھ جاتے ہیں ان کے مناسب تصفیہ میں سخت مشکلات پیدا ہوجاتی ہیں، اور ان سب باتوں کا نتیجہ لڑائی جھگڑے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

اگر شریعت کے حکم کے مطابق وقت پر ترکے کی تقسیم عمل میں آجائے اور باہمی رضامندی اور اتحاد واتفاق کے ساتھ تمام ضروری باتیں طے پاجائیں تو آئندہ تنازعات پیدا ہونے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے، اور باہمی محبت واخوت کو فروغ ملتا ہے۔

یہ تو میں نے صرف تین سادہ سی مثالیں پیش کی ہیں، ورنہ معاشرے میں پھیلے ہوئے جھگڑوں کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ معاملات کو صاف نہ رکھنا ہمارے معاشرے کا ایک ایسا روگ بن چکا ہے جس نے فتنہ وفساد کی آگ بھڑکا رکھی ہے، معاملہ، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، صاف ستھرا ہونا چاہئے اس کی شرائط واضح اور غیر مبہم ہونی چاہئیں، اور اس سلسلے میں کوئی شرم وحیا اور لحاظ ومروت آڑے نہیں آنی چاہئے، جب ایک مرتبہ معاملے کی شرائط اس طرح طے پاجائیں تو اس کے بعد باہمی برتاؤ میں جو شخص جس سے جتنا حسن سلوک کرسکے بہتر ہی بہتر ہے، اور یہی مطلب ہے اس ارشاد کا کہ "رہو بھائیوں کی طرح اور معاملات اجنبیوں کی طرح کرو"

☆☆☆

ہمارا معاشی نظام☆

کسی قوم کی معاشی حالت کو بہتر اس وقت کہا جاسکتا ہے جب اس کے تمام افراد کو زندگی کی تمام ضروریات فارغ البالی اور سکون واطمینان کے ساتھ میسر ہوں، ملک کی پیداوار اور آمدنی اگر زیادہ ہوتو ملک کے تمام باشندے اس کی برکات سے مستفید ہوں، اور کسی کو تقسیم دولت کے معاملے میں کسی ناانصافی کی جائز شکایت نہ ہو، اس کے برخلاف اگر ملک کی ساری دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے اور قوم کی اکثریت بھوک اور افلاس کا رونا رو رہی ہو، امیروں کے خزانے میں دولت کے انبار پر انبار لگتے چلے جائیں اور محنت کش عوام کی جیب سے ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا ایک ایک پیسہ سرک کر ختم ہوجائے تو خواہ ملک کی زمینیں سونا اگل رہی ہوں، یا مشینوں سے لعل وجواہر برآمد ہورہے ہوں، اسے ملک کی معاشی ترقی نہیں کہا جاسکتا، یہ وہ اجتماعی دیوالیہ پن ہے جس کی موجودگی میں کسی قوم کے پنپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ ہماری شومیٔ اعمال ہے کہ ہمارے ملک کی معاشی صورت حال کچھ ایسی ہی بن کر رہ گئی ہے کہ اوپر اوپر سے دیکھئے تو ہم نے گذشتہ ۲۶ سالوں میں زراعت صنعت اور تجارت کے ہر میدان میں خاصی ترقی کی ہے جب پاکستان بنا تھا تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا، اور آج خدا کے فضل سے بہت کچھ ہے، لیکن افراد کی نجی زندگی کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ملک کی دولت صرف چند خاندانوں میں محدود ہوکر رہ گئی، اس سے عام آدمی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے پہلے سے زیادہ سرگرداں ہے، دولت کی یہ چمک دمک اس کے غم کدے میں کوئی اجالا نہیں کرسکی، اس کے شب وروز پہلے سے زیادہ سختیوں کا شکار ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے، ہمارے یہاں عرصہ دراز سے نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ نظام اپنی بدترین صورت میں رائج ہے، مغرب کی دوسو سالہ محکومی نے ہمارے دل ودماغ کو کچھ ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے کہ ہم اپنے مسائل کو آزادی کے ساتھ سوچنے کے بجائے آنکھیں بند کرکے اسی ڈگر پر چل رہے ہیں جو مغرب نے ہمیں دکھادی تھی، زندگی کے دوسرے گوشوں کی طرح ہم نے اپنی معیشت کو بھی ان ہی بنیادوں پر تعمیر کیا ہے جن پر ہمارے سرمایہ دار

☆ ہمارا معاشی نظام، ص:۹

''حاکم'' نے اپنے معاشرے کو تعمیر کیا تھا ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمیں اس بے چینی کے سوا کیا مل سکتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

سالہا سال تک اس طرز معیشت کو آزمانے کے بعد اب یہ شعور تو بحمد للہ پیدا ہونے لگا ہے کہ یہ راستہ ترقی کا نہیں تباہی کا ہے، ہم میں سے بیشتر لوگ اب یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ ہماری معاشی ناہمواریوں کی ذمہ داری موجودہ سرمایہ دارانہ اور جاگیری نظام پر عائد ہوتی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ابھی ذہن مغرب کے فکری تسلط سے اتنے آزاد نہیں ہوئے کہ اس کی فکری کج روی کو آزما کر خود اپنے ذہن سے کوئی متبادل راستہ تلاش کرنے کی کوشش کریں، اس کے بجائے وہ یہ رہا ہے کہ سرمایہ داری کی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے بھی ہم مغرب ہی کا رخ کرتے ہیں اور کسی ایسے حل کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جو مغرب کی فکری مشینری میں نہ ڈھلا ہو۔

چنانچہ آج ہم میں سے ایک طبقہ بڑے زور شور سے ''سوشلزم'' اور ''اشتراکیت'' کے نعرے لگا رہا ہے، حالانکہ اشتراکیت بھی مغرب کی اسی مادی تہذیب کی پیداوار ہے جس نے سرمایہ داری کو جنم دیا تھا، حقیقت میں انسان کی معاشی مشکلات کا حل نہ اس کے پاس تھا نہ اس کے پاس ہے وہ اگر افراط تھی تو یہ تفریط ہے، مزدور اور کسان اگر سرمایہ داری نظام میں مظلوم اور مقہور تھے تو اشتراکی نظام میں بھی وہ کچھ کم بے بس نہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ انسان ''سرمایہ'' کا خود مختار مالک ہے روزمرہ کی ضروریات کے علاوہ ذرائع پیداوار پر بھی اس کی ملکیت بے قید اور آزاد ہے، وہ جس طرح چاہے انہیں استعمال کرے، جس کام میں چاہے انہیں لگائے جس طریقے سے چاہے ان سے نفع حاصل کرے، اپنے تیار شدہ مال کی جو قیمت چاہے مقرر کرے، جتنے آدمیوں سے جن شرائط پر چاہے کام لے، غرض اپنے کاروبار کے بارے میں اسے کھلی آزادی ہے، اور ریاست اس کی ملکیت میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتی، اگرچہ رفتہ رفتہ مختلف تجربات سے دوچار ہونے کے بعد اس آزاد ملکیت پر تھوڑی تھوڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں، لیکن یہ تصور اب بھی پوری طرح برقرار ہے کہ انسان سرمایہ کا ''مالک'' ہے اور چند قانونی حد بندیوں سے قطع نظر سرمایہ سے سرمایہ پیدا کرنے کا ہر طبقہ اس کے لئے جائز ہے، اسی تصور کی بنیاد پر سود، قمار، سٹہ اور اکتناز کو اس نظام میں شیر مادر سمجھ لیا گیا ہے، اور یہ چیزیں اس نظام کے عناصر اربعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس نظام کے جو نتائج بد دنیا نے دیکھے اور اب تک دیکھ رہی ہے، وہ یہ ہیں کہ معاشرے میں دولت کی گردش نہایت ناہموار اور غیر متوازن ہوتی چلی جاتی ہے، سرمایہ دار سود، قمار، سٹہ اور اکتناز کے

ذریعہ چاروں طرف ہاتھ مار کر روپیہ اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور دولت کے اس ذخیرے کے بل پر پورے بازاروں کا حکمراں بن بیٹھتا ہے، قیمتوں کو مصنوعی طور پر چڑھایا اور گرایا جاتا ہے، اور غیر ضروری بلکہ مضر اشیاء کو زبردستی معاشرے پر ٹھونسنے کے لئے ان کی فراوانی کردی جاتی ہے اور قوم کی حقیقی ضروریات کا مصنوعی قحط پیدا کردیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس نظام میں بارہا یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عین اس وقت جب کہ معاشرے کے سینکڑوں افراد بھوک سے بے تاب ہوتے ہیں غلے اور اشیائے خورونوش کے لدے ہوئے جہاز جان بوجھ کر غرق کردیئے جاتے ہیں، ان کے ذخیروں کو آگ لگادی جاتی ہے تاکہ یہ اشیاء افراط کے ساتھ بازار میں آکر سستے داموں ضرورت مند افراد تک نہ پہنچ سکیں اور قیمتوں کا جو معیار سرمایہ دار نے مقرر کرلیا ہے اس میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔

ظاہر ہے کہ سرمایہ دار کی اس کاروباری آنکھ مچولی میں ایک عام آدمی کو پنپنے کا موقع نہیں مل سکتا، اس کی آمدنی محدود اور خراجات زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کی زندگی چند گنے چنے افراد کے ذاتی مفادات کے تابع ہوکر رہ جاتی ہے، دولت کے اس سمٹاؤ کا اثر پوری قوم کی صرف معیشت ہی پر نہیں بلکہ اخلاق و کردار اور طرز فکر و عمل پر بھی پڑتا ہے، اور ملکی و بین الاقوامی سیاست بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

اشتراکیت میدان میں آئی تو اس نے سرمایہ دارانہ نظام کی ان خرابیوں کو تو دیکھا لیکن مرض کے اسباب کی ٹھنڈے دل و دماغ سے تشخیص نہ کرسکی اور معاملہ کی دوسری انتہا پر جا کھڑی ہوئی، سرمایہ داری نے کہا تھا کہ انسان بحیثیت فرد ذرائع پیداوار کا ''مالک'' ہے اشتراکیت نے کہا کہ کوئی فرد کسی ذریعہ پیداوار کا مالک نہیں زمینوں اور کارخانوں کو جاگیردار اور سرمایہ دار کے تصرف سے نکال دو تو وہ بانس ہی نہ رہے گا جس سے ظلم کی بانسری بجتی ہے، اس کی عملی شکل یہ تجویز کی گئی کہ محنت کش عوام کے انتخاب سے ایک کمیٹی بناؤ، اور ملک کی تمام زمینیں اور ساری بنیادی صنعتیں انفرادی ملکیت سے نکال کر اس کے حوالے کردو، یہ پارٹی ایک حکومت کی تشکیل کر کے ایک منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) کی بنیاد ڈالے گی وہی یہ فیصلہ کرے گی کہ کیا چیز پیدا کرنی ہے؟ پھر وہی محنت کش عوام کو مختلف کاموں میں لگا کر پیداوار حاصل کرے گی اور وہی اس حاصل شدہ پیداوار کو محنت کرنے والوں کے درمیان ایک خاص تناسب سے تقسیم کرے گی۔

یہ تجویز بڑی زور شور کے ساتھ پیش کی گئی اور کہا گیا کہ اس طریق کار میں مزدور اور کسان کے ہر دکھ کا علاج ہے، لیکن نتائج پر غور کیجئے تو اس نظام معیشت نے نہ صرف یہ کہ کچھ نئی مشکلات کھڑی کردیں بلکہ مزدور کی پرانی مصیبتیں بھی تقریباً اسی طرح برقرار ہیں، تھوڑی دیر کے لئے اس

بات سے قطع نظر کر لیجئے کہ اس تجویز کو عملی طور سے نافذ کرنے میں کتنی مشکلات ہیں؟ اس بحث کو بھی جانے دیجئے کہ یہ نظام شدید ترین ڈکٹیٹر شپ کے بغیر نہیں چل سکتا، اس پہلو کو بھی کچھ دیر کے لئے چھوڑ دیجئے کہ اس سے بسا اوقات مزدور اور کسان کو اس کام پر مجبور ہونا پڑتا ہے جو وہ اپنی افتادِ طبع کے تحت نہیں کرنا چاہتا، اس واقعہ کو بھی بالائے طاق رکھئے کہ اس نظام میں ''جبری محنت'' اور ''بیگار کیمپ'' مزدور پر کیا ظلم ڈھاتے ہیں؟ اس بات کو بھی مت سوچئے کہ اس نظام میں مذہب و اخلاق کا کیا حشر ہوتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس نظام میں بھی جو خالص مزدور اور کسان ہی کے نام پر ابھرا ہے ملک کی دولت سے عام آدمی کو کتنا حصہ مل سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ حکومت کرنے والی یہ پارٹی جس میں محنت کش عوام کے بمشکل پانچ فیصد افراد شریک ہوتے ہیں کوئی فرشتوں کی جماعت تو نہیں ہوتی، اگر سرمایہ دارانہ نظام میں ایک انفرادی سرمایہ دار کی نیت مزدور کے حق میں خراب ہوسکتی ہے تو اس پارٹی کی نیت کیوں خراب نہیں ہوسکتی؟ اگر ایک شخص بڑے کارخانے کا صرف مالک ہو کر اپنے زیر دستوں پر ظلم ڈھا سکتا ہے تو یہ پارٹی ملک کی ساری زمینوں، سارے کارخانوں اور ساری دولت پر قابض ہو کر اپنے زیر دستوں کے حقوق پر کیوں ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس صورت میں چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار تو بیشک ختم ہو جاتے ہیں لیکن ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آجاتا ہے جو دولت کی اس وسیع جھیل کو من مانے طریقے سے استعمال کر سکتا ہے، چنانچہ پیداوار کا بہت تھوڑا حصہ محنت کش عوام میں تقسیم ہوتا ہے اور باقی ساری دولت حکمراں جماعت کے رحم و کرم پر ہوتی ہے، بیرونی دنیا تو یہی دیکھتی ہے کہ اشتراکی ملک کی صنعت و تجارت دنیا پر چھا رہی ہے وہاں مصنوعات اور ایجادات کی بہتات ہے اور وہاں کے مصنوعی سیارے ستاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں، لیکن اس بات کو سوچنے والے کم ہوتے ہیں کہ وہاں محنت کش عوام کو ان ترقیات کی کیا قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے او دولت کے عظیم الشان ذخیروں میں سے انہیں کتنا حصہ مل رہا ہے؟ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ جس طرح سرمایہ دار ممالک میں ''ترقی'' کا مطلب چند سرمایہ داروں کی ترقی ہے اسی طرح اشتراکی نظام میں بھی ''ترقی'' ایک خاص طبقے کی ترقی سے عبارت ہے، رہا بے چارہ عام مزدور اور کسان سو وہ دونوں جگہ صرف اتنی اجرت کا مستحق ہوتا ہے جتنی اس کے ''آقا'' اسے دینا چاہیں، فرق اتنا ہے کہ وہاں اگر اسے اجرت کم محسوس ہوتی تھی تو وہ ہڑتال احتجاج اور پیشے کی تبدیلی کے ذریعہ اپنے آنسو دھونے کی کوشش کر لیتا تھا، لیکن یہاں اسے اپنی کسی حق تلفی پر کراہنے کی بھی اجازت نہیں، شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم نے اسی لئے کہا تھا:

زمامِ کار گر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اس کے برعکس اسلام کے عدل عمرانی کی شاہراہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے بیچ سے گزرتی ہے، اسلام کا کہنا یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز خواہ زمین اور کارخانے کی شکل میں ہو، یا روپے پیسے اور اشیائے صرف کی شکل میں، اصل میں اس کائنات کے پیدا کرنے والے کی ملکیت میں ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾(۱)

''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے''

ہاں وہ اپنی یہ ملکیت نفع اٹھانے کے لئے اپنے بندوں کو دے دیتا ہے۔

﴿إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾(۳)

''بلاشبہ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بنادیتا ہے''

جب انسان کے ہاتھ میں ہر چیز اللہ کی دی ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا استعمال بھی اللہ کی مرضی کا پابند ہوگا، اس کے ذریعہ دوسروں پر ظلم ڈھا کر زمین میں فساد برپا کردینا اللہ کو کسی طرح گوارہ نہیں، انسان کا کام یہ ہے کہ وہ دسروں کا خون چوسنے کے بجائے اپنی اصل منزل مقصود یعنی آخرت کو پیش نظر رکھ کر دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

﴿وَابْتَغِ فِيْمَآ آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَآ أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ﴾(۳)

''اور اللہ نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اس کے ذریعے تم دار آخرت (کی بھلائی) تلاش کرو، اور دنیا سے جو حصہ تمہیں ملا ہے اسے نہ بھولو اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تم دوسروں پر احسان کرو اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش نہ کرو''

ان ہدایات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے انفرادی طور سے ملکیت عطا تو کی ہے لیکن یہ ملکیت آزاد خود مختار خود غرض اور بے لگام نہیں ہے، بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے احکام کی پابند ہے، اس کو انسان اپنے جائز نفع کے لئے تو استعمال کرسکتا ہے لیکن اس کے ذریعہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔

سرمایہ دارانہ نظام کی جتنی خرابیوں اور اس کی جتنی ناانصافیوں پر آپ نظر ڈالیں گے بنیادی

(۱) البقرة:۲۸٤ (۲) الاعراف:۱۲۸

(۳) القصص:۷۷

طور سے ان کے چار ہی سبب نظر آئیں گے، سود، قمار، سٹہ اور اکتناز، سرمایہ دار ایک طرف تو سود، قمار اور سٹہ کے ذریعہ ساری قوم کی دولت کھینچ کھینچ کر اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے دوسری طرف اس کے کھانے میں کسی غریب، مفلس، اپاہج یا بے سہارا انسان پر لازمی سے کچھ خرچ کرنے کی کوئی مد نہیں، وہ خود اپنی شرافت سے کسی کو کچھ دیدے تو اس کا احسان ہے ورنہ ایسے اخراجات کی کوئی پابندی اس پر نہیں ہے۔

اسلام نے اولاً تو آمدنی کے ناجائز ذرائع کا دروازہ بالکل بند کر دیا، سود، قمار، سٹہ کے ذریعہ دولت حاصل کرنے کو بدترین جرم قرار دے کر صاف صاف اعلان کر دیا کہ:

﴿لَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ﴾ (۱)

"اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقے سے مت کھاؤ الا یہ کہ تمہاری باہمی رضامندی سے کوئی تجارت ہو"

سود میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کاروبار کرنے والے کو نقصان ہوجائے تو سارا نقصان اس پر پڑتا ہے اور قرض دینے والے کا سود ہر حال میں کھرا رہتا ہے، اور اگر نفع ہوجائے تو سارا نفع وہ لے اڑتا ہے اور قرض دینے والے کو اس کا چالیسواں حصہ بھی مشکل سے ہاتھ آتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح دولت پھیلنے کے بجائے سکڑتی ہے اور ہموار طریقے سے گردش نہیں کرسکتی، اسلام نے اس کے بجائے شرکت ومضاربت کی صورت تجویز کی ہے جس میں نفع ہو تو فریقین کا ہو اور نقصان ہو تو دونوں اسے برداشت کریں۔

قمار اور سٹہ میں بھی ساری قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ ایک جگہ جمع ہوجاتا ہے پھر ایک عام آدمی کا ایک روپیہ یا تو اس جیسے ہزاروں غریب آدمیوں کی جیب سے ایک ایک روپیہ کھینچ کر اس کے پاس جمع کر دیتا ہے یا خود بھی کسی سرمایہ دار کی جیب میں جا کر گرتا ہے، غرض دونوں ہی صورتوں میں روپیہ سمٹتا ہے اور اس کی فطری گردش رک جاتی ہے، اسلام نے اس پر اور کاروبار کے ایسے تمام طریقوں پر پابندی بٹھادی ہے جن میں ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہو یا جس سے پورے معاشرے کی دولت ایک جگہ سمٹنے لگے۔

آمدنی کے ناجائز ذرائع پر پابندی لگانے کے علاوہ سرمایہ داروں سے غریبوں تک دولت پہنچانے کے لئے اسلام نے سرمایہ دار پر زکوٰۃ جیسے بہت سے اخراجات واجب کر دیئے ہیں جو اس کا

---

(۱) النساء: ۲۹

احتساب نہیں بلکہ اس مال پر واجب ہونے والا حق ہے، جسے بزور قانون وصول کیا جا سکتا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ عشر، خراج، صدقہ فطر، قربانی، کفارات، نفقات، وصیت اور وراثت وہ چھوٹی بڑی مدات ہیں جن کے ذریعہ دولت کے تالاب سے چاروں طرف نہریں نکلتی ہیں اور ان سے پورے معاشرے کی کھیتی سرسبز وشاداب ہوتی ہے۔

ان قانونی پابندیوں کے ساتھ اسلام بحیثیت مجموعی جس ذہنیت کی تعمیر کرتا ہے اس کی بنیاد سنگدلی، کنجوسی، بے رحمی اور خودغرضی کے بجائے ہمدردی، فراخ حوصلگی، سخاوت اور سب سے بڑھ کر خوف خدا اور فکر آخرت پر استوار ہوئی ہے، اس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے ذمے عائد ہونے والے قانونی فرائض کی ادائیگی پر بس کر لے اور اس کے بعد دوسروں کے دکھ درد سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے، اس کو زندگی کے ہر مرحلہ پر تعلیم ہی یہ دی گئی ہے کہ یہ دنیا چند دنوں کی بہار ہے، عیش ومسرت روپے اور پیسے کے اس ڈھیر کا نام نہیں ہے جو یہاں جمع کر لیا جائے، بلکہ روح کے اس سکون اور ضمیر کے اس اطمینان کا نام ہے جو اپنے کسی بھائی کے چہرے پر خوش حالی کی مسکراہٹ دیکھ کر پیدا ہوتا ہے، اور جس سے آخرت کی آنے والی زندگی میں مسرتوں کے سدا بہار پھول کھلتے ہیں۔ چنانچہ قرآن وحدیث کو دیکھئے، ان کی تعلیمات ''انفاق فی سبیل اللہ'' کی ہدایت سے بھری پڑی ہیں اور ان میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ:

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾(۱)

''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، آپ فرما دیجئے جو ضرورت سے زائد ہو''

غرض ایک طرف سرمایہ دار کی آمدنی کی ناجائز مدات کو ختم کر کے اور دوسری طرف اس کے اخراجات میں اضافہ کر کے اسلام نے دولت کے بہاؤ کا رخ عام معاشرے کی طرف پھیر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ آج کی دنیا میں یہ ساری باتیں نرا ''نظریہ'' ہو کر رہ گئی ہیں، اور عملی طور سے معیشت کا یہ بے داغ اور صاف ستھرا نظام دنیا میں کہیں نافذ نہیں ہے، لیکن اگر اس نظام کے عملی نتائج دیکھنے ہوں تو تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کا مطالعہ کیجئے جب صدقہ دینے والا ہاتھ میں روپیہ لیکر نکلا کرتا تھا تو کوئی اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔

اب ہماری شومیٔ اعمال ہے کہ اتنا پر امن وسکون معاشی نظام رکھنے کے باوجود شروع میں تو ہم نے اپنی معیشت کا نظام سرمایہ داری کے اصولوں پر بنایا، اب جب کہ اس کے نقصانات سامنے

(۱) البقرۃ: ۲۱۹

آ رہے ہیں تو ہم میں سے بعض لوگوں نے ''اشتراکیت'' اور ''سوشلزم'' کی آوازیں بلند کرنی شروع کردی ہیں پہلے سرمایہ داری کی بدترین لعنتوں اور سود اور قمار وغیرہ کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش میں قرآن وسنت کی تحریف کی جاتی تھی، اب سوشلزم کو ''اسلامی'' بنانے کے لئے آیات واحادیث کی الٹی سیدھی تاویلیں کی جارہی ہیں اور ذہن اگر نہیں چلتا تو اس طرح کہ مغربی افکار کی غلامی کو ایک مرتبہ دل سے نکال کر سیدھے سچے طریقے سے اسلامی اصولوں پر غور کرلیا جائے کہ وہ موجودہ معاشی مشکلات کا واقعی طور سے کیا حل پیش کرتے ہیں۔

جو حضرات غلط فہمی سے سرمایہ داری یا اشتراکیت کو اپنے لئے راہ نجات سمجھ بیٹھے ہیں ہم نہایت دردمندی کے ساتھ ان سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ کسی غیر اسلامی نظام میں اسلام کا پیوند لگانے کے بجائے ٹھنڈے دل ودماغ سے معقولیت کے ساتھ اسلامی احکام کو سمجھنے کی کوشش کریں، ایک آزاد اسلامی مملکت میں مسلمانوں کا حقیقی منصب یہ ہے کہ وہ پرائے شگون پر اپنی ناک کٹوانے کے بجائے نہ صرف خود اسلام کا عملی نمونہ بنے بلکہ دنیا بھر کو دعوت دے کہ تم افراط وتفریط کی کسی بھول بھلیوں میں پھنس گئے ہو، انسانیت کی فلاح کی منزل اس راستے پر چلے بغیر ہاتھ نہیں آسکتی جو چودہ سو سال پہلے انسانیت کے محسن اعظم محمد مصطفیٰ ﷺ نے دکھایا تھا۔

بمصطفیٰ برساں خویش راہ کہ دیں ہمہ اوست
اگر باد نہ رسیدی تمام بولہبی است

☆☆☆

امت مسلمہ کی معیشت اور اسلامی خطوط پر اس کا اتحاد ☆

''اکیسویں صدی اور مسلم امہ'' کے موضوع پر "مؤتمر العالم الإسلامی" نے اسلام آباد میں ۲۳ ستمبر کو ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جس میں شیخ الاسلام جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ کو مذکورہ بالا موضوع پر خطاب کی دعوت دی گئی۔ موصوف نے اس موقع پر انگریزی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس مقالے کا اردو ترجمہ ذیل میں پیش خدمت ہے۔

محترم چیئرمین اور معزز مہمانان گرامی!

یہ میرے لئے ایک بڑا اعزاز ہے کہ مجھے ایسی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا موقع مل رہا ہے جو مؤتمر العالم الاسلامی مسلمانوں کی تاریخ کے ایک انتہائی نازک وقت میں منعقد کر رہی ہے، نئی صدی کا ظہور پورے عالم میں فکر وعمل کے نئے افق کھول رہا ہے، ہمارے لئے مسلم امہ ہونے کی حیثیت سے اپنے اہم مسائل اور مشکلات پر غور کرنا، ان کے رخ متعین کرنا اور آنے والے وقتوں کے بین الاقوامی مسائل کے حل کرنے کے لئے اپنی حکمت عملی وضع کرنا ایک لائق تحسین عمل ہے، میں مؤتمر العالم الاسلامی کا شکر گذار ہوں کہ مجھے ایسا پر وقار فورم (Forum) مہیا کیا جس میں، میں ان مسائل پر گفتگو کر سکتا ہوں۔

انیسویں صدی سیاسی استبداد کی صدی تھی، جس میں یورپی طاقت ور اقوام نے ایشیائی اور افریقی ممالک بشمول اسلامی ممالک پر اپنا تسلط جمایا ہوا تھا، موجودہ صدی نے جواب اپنے آخری سانس لے رہی ہے مغربی استعمار کی طرف سے آزادی کے تدریجی عمل کا مشاہدہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہی وہ صدی تھی جس میں بہت سے اسلامی ممالک نے یا تو طاقت کے بل بوتے پر یا پرامن طریقوں سے آزادی حاصل کی، تاہم اپنی سیاسی آزادی کے حصول میں واضح کامیابی کے

☆ اصلاحی مواعظ (۳/۲۱۹ تا ۲۲۲)، یہ دراصل انگریزی زبان میں تھا جو حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے مؤتمر العالم الاسلامی کی دعوت پر اسلام آباد میں ۲۳ ستمبر ۱۹۹۷ء کو فرمایا، ڈاکٹر مولانا محمد عمران اشرف عثمانی صاحب نے اس مقالہ کا اردو میں ترجمہ کیا جو بیت العلوم، لاہور سے طبع ہوا۔

باوجود ہم اب تک علمی، معاشی اور منصوبہ سازی کے میدانوں میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کرسکے، یہی وجہ ہے کہ اب تک مسلم امہ سیاسی آزادی کے صحیح ثمرات سے لطف اندوز نہیں ہوسکی۔

اب مسلم دنیا نئی صدی کو اس امید کے ساتھ دیکھ رہی ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ یہ اس کے لئے مکمل اور حقیقی آزادی لے کر آئے گی، جس میں مسلمان دنیا کی مختلف اقوام کے درمیان اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کریں اور قرآن کریم اور حضور ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں وضع کردہ اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزارنے میں آزاد ہوں۔

تاہم یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ امید صرف خوابوں اور خواہشات سے پوری نہیں ہوسکتی، اپنے اس محبوب مقصد کے حصول کے لئے ہمیں اجتماعی زندگی کے تمام میدانوں میں اپنے رویہ کو بدلنا ہوگا، اور جس قدر ہم نے سیاسی آزادی کے حصول کے لئے کوششیں کیں اس سے زیادہ ہمیں اپنی مکمل آزادی کے حصول کی کوششیں کرنی ہوں گی، ہمیں اپنے لائحہ عمل اور منصوبوں پر از سر نو غور کرنا ہوگا، ہمیں خوب غور وفکر کے ساتھ مرتب کردہ پلاننگ اور منصوبہ سازی کی ضرورت ہوگی، ہمیں اپنے متعین اور واضح مقاصد کے لئے اجتماعی قوت ارادی، انقلابی اقدامات اور ایک پر جوش پروگرام کی ضرورت ہوگی، اور اس طرح کے بین الاقوامی سیمیناروں سے اگر بھرپور فائدہ اٹھایا جائے تو اس مقصد کی طرف سنجیدہ فکر کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکتی ہے۔

جس موضوع کے بارے میں مجھ سے اس عظیم فورم میں چند الفاظ پیش کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہ موضوع ''امت مسلمہ کی معیشت کا اسلامی خطوط پر اتحاد'' ہے، اس مختصر مضمون میں جو ایک مختصر نوٹس پر تیار کیا گیا ہے، احقر اپنے آپ کو ایسے دو نکات تک محدود رکھے گا جو ہمارے لئے امت مسلمہ ہونے کی حیثیت سے بہت زیادا اہم ہیں۔

(۱) خودساختہ انحصار

یہ بات ہر کس وناکس جانتا ہے کہ تقریباً تمام مسلم ممالک کا سماجی اور معاشی میدانوں میں دوسروں پر انحصار اس امت کا ایسا معاشی مسئلہ بن چکا ہے اور جس سے آج تمام مسلم امت دوچار ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اکثر مسلمان ممالک، مغربی ممالک یا بین الاقوامی (بلکہ حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو مغربی) مالیاتی یا تمویلی اداروں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لے رہے ہیں، اور بعض ممالک یہ بھاری مقدار میں سودی قرضے کسی ترقیاتی منصوبوں کے بجائے اپنے روزمرہ کے اخراجات کے لئے لے رہے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ تشویش ناک امر یہ ہے کہ اپنے سابقہ سود کی

ادائیگی کے لئے حاصل کر رہے ہیں، جس سے ان کے حاصل کردہ قرضوں کا سائز خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔

بیرونی قرضوں پر انحصار ہماری ایک ایسی بنیادی بیماری ہے جس کی وجہ سے ہماری اقتصادی زندگی اس درجہ متاثر ہو چکی ہے کہ قومی خود اعتمادی تقریباً مفقود ہوتی جارہی ہے، اور اس نے ہمیں اس بات پر مجبور کر رکھا ہے کہ ہم اپنے قرض دہندوں کے مطالبات کے آگے بلکہ بعض اوقات ایسے مطالبات کے آگے سرتسلیم خم کر دیں جو ہمارے اجتماعی مفادات کے خلاف ہیں، یہ بات بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ قرض دہندہ قرضے دینے سے قبل مقروض پر اپنی شرائط عائد کر دیتے ہیں، یہ شرائط ہمیں مستقل غیر ملکی دباؤ میں رکھتی ہیں اور اکثر ہمیں اپنے حقیقی مقاصد کے حصول سے روکتی ہیں، اور اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ ہم اغیار کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں، خلاصہ یہ کہ غیر ملکی قرضوں کے برے نتائج اتنے واضح ہیں کہ محتاج بیان نہیں ہیں۔

قرضہ لینا اسلامی تعلیمات کی رو سے اس قدر ناپسند فعل ہے کہ اس میں شدید مجبوری اور سخت ضرورت کے بغیر مبتلا نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کے اس عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایسے شخص کی نماز جنازہ ادا کرنے سے انکار فرما دیا جو اپنا قرض ادا کئے بغیر وفات پا گیا تھا۔(١)

مزید برآں مسلمان فقہاء کرام نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آیا کسی مسلمان ملک کے حکمران کے لئے جائز ہے کہ وہ غیر مسلموں کی طرف سے پیش کردہ تحفے قبول کرے؟

اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ صرف اس صورت میں جائز ہے کہ جب ان تحفوں کی وجہ سے امت مسلمہ کے مفاد کے خلاف کسی قسم کا دباؤ نہ ہو، یہ جواب تحفے قبول کرنے کے بارے میں دیا گیا ہے، اب آپ اس سے خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرضے لینے کا جواب کیا ہوگا؟

اسلامی اصولوں کے مطابق بیان کردہ یہ ہدایات اس بات کا مطالبہ کرتی ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے سختی اور تنگی کے زمانہ میں بھی غیر ملکی قرضے لینے سے انکار کرنا چاہئے، لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ موجودہ قرضے ہمارے وسائل (Resources) کی قلت کے باعث پیدا نہیں ہوئے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی جتنے مالدار آج ہیں اس سے قبل کی پوری تاریخ میں اتنے مال دار کبھی نہیں رہے، آج ان کے پاس قدرتی وسائل کے عظیم خزانے موجود ہیں، دنیا کے اہم دفاعی واقتصادی اہمیت

(١) صحیح البخاری، کتاب الحوالات، باب إن أحال دین المیت علی رجل جاز، رقم:٢١٢٧، مسند أحمد، رقم:١٣٦٤٣

کے حامل مقامات ان کے قبضے میں ہیں، وہ دنیا کے بیچوں بیچ واقع ہیں، وہ مراکش سے انڈونیشیا تک ایسی جغرافیائی زنجیر میں جڑے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان سوائے اسرائیل اور ہندوستان کے کوئی ملک حائل نہیں ہے وہ دنیا کا تقریباً پچاس فیصد تیل پیدا کرتے ہیں، دنیا کی خام مال کی برآمدات میں تقریباً چالیس فیصد حصہ مسلمانوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ ان تمام حقائق کے علاوہ مسلمانوں کی وہ تمام نقد رقوم جو مغربی ممالک میں امانت یا سرمایہ کاری کی غرض سے رکھی گئی ہیں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ خود اپنے اوپر عائد تمام دیون (Loans) اور واجبات (Payables and dues) کی ادائیگی کے لئے مکمل کافی ہیں۔

اسلامی ترقیاتی بنک کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اسلامی ترقیاتی بنک (IDB) کے رکن ممالک کے بیرونی قرضہ جات کا مجموعہ 618.8 بلین ڈالر ہے، جب کہ دوسری طرف مسلمانوں کے مغربی ممالک میں رکھے ہوئے اثاثے اور امانتیں (Deposits) اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ان اثاثوں اور امانتوں کا کوئی ٹھوس ریکارڈ نہیں ہے، کیونکہ ان کے مالکان متعدد وجوہات کی بنا پر انہیں ظاہر نہیں کرتے، البتہ معاشی ماہرین کا خیال ہے کہ خلیج کی جنگ (Gulf War) کے بعد عرب مسلمانوں نے اپنے 250 بلین ڈالر نکال کر اپنے ممالک میں جمع کرائے تھے، ان کے علاوہ مسلمانوں کے مغربی ممالک میں جمع شدہ اثاثوں اور امانتوں کا تخمینہ تقریباً 800 سے لے کر 1000 بلین ڈالر کے درمیان ہے۔ اس بات کا عملاً مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی ہی جمع کردہ رقم کا ایک حصہ خود ہی زیادہ سودی قیمت پر قرض لے رہے ہیں۔

اور اگر بالفرض ان تخمینی اعداد وشمار کو مبالغہ آمیز سمجھا جائے تب بھی اس حقیقت سے شاید ہی کوئی منکر ہوسکتا ہے کہ اتنی بڑی رقموں کو اگر اپنے پاس ہی رکھ کر صحیح طریقے سے مسلمان دنیا پر استعمال کیا جاتا تو امت مسلمہ کبھی چھ سو بلین یا اس سے زائد قرضے لینے پر مجبور نہ ہوتی۔

اس زاویہ سے اگر جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ غیر ملکی قرضوں پر انحصار درحقیقت ہمارا خود ساختہ ہی ہے، جس کے بارے میں ہم کسی دوسرے پر الزام نہیں لگا سکتے، ہم نے کبھی بھی ان عوامل کو دور نہیں کیا جو ہمارے سرمائے کی باہر منتقلی کے ذمہ دار ہیں۔ ہم نے اپنے لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، ہم نے اپنے آپ کو موجودہ ظالمانہ اور بدعنوان (Corrupt) نظام محصولات سے چھٹکارا نہیں دیا، ہم کبھی سرمایہ کاری کے لئے ایک پرامن فضا قائم کرنے کے قابل نہیں ہوئے، ہم نے کبھی اپنے ممالک کو ایک مضبوط سیاسی نظام عطا نہ کیا، ہم نے کبھی بھی اپنے مجموعی سرمایہ سے بہترین طریقوں سے استفادہ کرنے کے موقع پر غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی، مزید برآں مجموعی

طور پر ہم اسلامی اتحاد کے جذبات کو سرگرم اور امت مسلمہ کی طاقت کو متحرک کرنے میں ناکام رہے۔

یہ افسوس ناک صورت حال نئی صدی کی خوشی میں مہنگی تقاریب منعقد کر لینے سے ٹھیک نہیں ہوسکتی، ہمیں سنجیدگی کے ساتھ وقت کے چیلنج کو قبول کرنا ہوگا، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے ہمارے معاشی اور سیاسی قائدین کو غیر ملکی انحصار سے نجات دلانے کے لئے ایسے ذرائع اور طریقے تلاش کرنے ہوں گے جو ہمارے پاس پہلے ہی سے دستیاب ہیں، جس چیز کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلم امہ کے باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لئے نئی پالیسیاں وضع کریں، قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (۱)

''تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے''

قرآن وسنت کی تعلیمات اور احکام اس اصول کی تاکید کرتے ہیں کہ تمام مسلم امہ کو یک جان ہوکر کام کرنا چاہئے، جغرافیائی حدود انہیں مختلف مقاصد اور مختلف اقوام کے اندر منقسم نہیں کرسکتیں، سیاسی وجغرافیائی حدود صرف کسی ملک کے انتظامی وداخلی امور نمٹانے کے لئے برداشت کی جاسکتی ہیں، لیکن تمام مسلم ممالک کو خصوصاً ان کے اپنے مشترک مقاصد کے لئے بقیہ دنیا کے مقابلے میں یک جان اور یک رخ ہوکر سوچنا چاہئے۔

اب وہ دن چلے گئے جب تکنیکی مہارت پر صرف چند مغربی ممالک کی اجارہ داری تھی، اب مسلمانوں کی مہارت وقابلیت (Talent) کم از کم مسلمانوں کی فوری ضروریات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس امت کی خدمت کے لئے مذہبی جذبہ کے ساتھ اس قابلیت کو تلاش کریں، لیکن یہ مقصد ہمارے ممالک کے قائدین اور زعماء کی متحدہ کوششوں کا طلب گار ہے۔ یہی اس کا سب سے بڑا چیلنج ہے، جس کا مقابلہ ان کے لئے نہ صرف امت کی بھلائی کی خاطر بلکہ خود اپنی بقاء اور حیات کے لئے ضروری ہے، اس بارے میں ایک عظیم ذمہ داری آرگنائزیشن آف اسلام کانفرنس (OIC) کے کاندھوں پر ہے، کہ اسے خود آگے بڑھ کر مسلمان قابلیت کا ایک متحدہ تالاب (Pool) بنانا ہے۔

---

(۱) الحجرات: ۱۰

(۲) اپنے معاشی نظام کی تعمیر نو

دوسرا اہم نکتہ جس کی طرف احقر حاضرین مجلس کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے، وہ ہمارے نظام کو اسلامی خطوط پر استوار کرنا ہے۔

بیسویں صدی سوشلزم کا ظہور، سرمایہ دار اور سوشلسٹ ممالک کے درمیان محاذ آرائی اور آخر میں سوشلزم کے سقوط کا مظاہرہ دیکھ چکی ہے، مغربی سرمایہ دار ممالک سوشلزم کے سقوط کی اس طرح خوشیاں منا رہے ہیں گویا یہ ان کی نہ صرف سیاسی بلکہ ان کے فکر ونظر کی فتح کا حقیقی ثبوت ہے، اسی طرح وہ کمیونسٹ تصورات کے سقوط کو بھی سرمایہ داری نظریہ کی حقانیت کا بیّن ثبوت قرار دے رہے ہیں، اور یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ہی اب انسانیت کے لئے ایسا واحد نظام ہے جسے اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے ظالمانہ اصولوں اور خصوصاً دولت کی غیر مساوی تقسیم کے ردعمل کے طور پر ابھرا تھا جو گذشتہ کئی صدیوں سے سرمایہ دار ممالک میں نظر آرہی تھی۔ سوشلزم ان برائیوں کی نشاندہی کرنے اور معاشرے پر ان کے برے اثرات کی تنقید کرنے میں حق بجانب تھا، سوشلزم کی ناکامی کی وجہ سرمایہ دارانہ نظام پر صحیح تنقید نہ تھی، بلکہ اس کی وجہ خود اس کے پیش کردہ متبادل نظام کے اندر موجود خرابیاں تھیں، لہٰذا سوشلزم کی ناکامی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے اندر کوئی خرابی نہیں رکھتا تھا، بلکہ وہ خرابیاں ابھی تک موجود ہیں اور ان کی اصلاح بھی نہیں کی گئی ہے، جو ممالک سرمایہ دارانہ نظام کی اتباع کررہے ہیں وہ ابھی تک دولت کی غیر مساوی تقسیم میں مبتلا ہیں، مالداروں اور غیر مالداروں کے درمیان عظیم فرق اور دولت کے عین درمیان غربت (Poverty in the midst of plenty) ان کے نظام معیشت میں ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، یہی سرمایہ دارانہ نظام کے حقیقی مسائل ہیں، جنہیں اگر صحیح طرح حل نہیں کیا گیا تو یہ ایک اور ردعمل کو جنم دے سکتے ہیں، جو سوشلزم سے کہیں زیادہ سخت اور ظالم ہوگا، سوویت یونین کے سقوط اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ بعض وسط ایشیائی ریاستیں دوبارہ کمیونزم کی طرف رخ کررہی ہیں، یہ حقیقت اس پارلیمانی انتخابات کے نتائج سے اچھی طرح محسوس کی جاسکتی ہے جس میں کمیونسٹ پارٹیوں نے اپنی اپنی پارلیمنٹ میں بھاری اکثریت سے سیٹیں حاصل کی ہیں، یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ کمیونزم یا سوشلزم کے پاس واقعتا کوئی فضیلت یا اچھائی موجود ہے بلکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے تسلط کے برے نتائج اور غیر مساویانہ تقسیم

دولت کا دوبارہ ردعمل ہے۔

اسی لئے اب دنیا ایک ایسے تیسرے نظام کی شدید محتاج ہے جو اسے ان دونوں نظامہائے معیشت کی ان خرابیوں سے نجات دلائے، جن سے انسانیت گذشتہ چند صدیوں سے دوچار رہی ہے، اسی تیسرے نظام کے لئے مسلم امہ کی طرف سے اسلامی خطوط پر کام کیا جاسکتا ہے، وہ معاشی اصول جو قرآن پاک اور احادیث نبویہ ﷺ سے ماخوذ ہیں، آج کی دنیا کے تمام معاشی مسائل کو حل کرنے میں مکمل کافی وشافی ہیں، کیونکہ اسلام جہاں ذاتی ملکیت اور بازاری معیشت کی اجازت دیتا ہے وہاں وہ ایک منصفانہ تقسیم دولت کا ایک سوچا سمجھا نظریہ بھی پیش کرتا ہے، جو معاشی زندگی کی ناہمواریوں سے نجات بھی دلاتا ہے اور ایک ایسا نظام پیدا کرتا ہے جس میں ذاتی منافع کا محرک (Motive of personal profit) معاشرے کے مجموعی مفاد کے ساتھ سیر وشکر ہوکر چلتا ہے، سوشلزم کی ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ناہمواریوں اور غیر مساویانہ تقسیم سے مایوس لوگوں نے ذاتی ملکیت کے حقیقی تصور اور بازاری قوتوں پر حملہ کرکے ایک ایسے معاشی نظام کا مفروضہ پیش کیا جو بالکل غیر حقیقی، مصنوعی اور جابرانہ تھا، ذاتی ملکیت کی آزادی کے انکار نے پیداواری جذبہ کو نہ صرف ختم کردیا بلکہ وسیع ریاستی طاقت نے عوام کی قسمت حکمران طبقہ کے ہاتھوں میں دے دی۔

تجربات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نہ ذاتی ملکیت سرمایہ دارانہ نظام کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کی بنیادی وجہ تھی نہ بازار کی قوتیں، بلکہ سرمایہ دار ممالک میں معاشی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کی بنیادی وجہ ذاتی منافع کے بے لگام استعمال اور جائز وناجائز کمائی کے درمیان امتیاز کرنے والے معیار کا فقدان تھا، جس نے تمام دولت کو چند مال دار لوگوں تک محدود کردیا، سود، قمار، جوئے اور غیر اخلاقی خواہشات کی تکمیل جیسے طریقوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی سرمایہ دارانہ نظام میں اجازت دی گئی، جس نے مارکیٹ میں اجارہ داری (Monopoly) کا رجحان پیدا کردیا، جس کے نتیجہ میں طلب اور رسد کی طاقتیں یا تو بالکل مفلوج ہوکر رہ گئیں یا ان کے عمل کو اپنے بھرپور اثر سے روک دیا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظریہ ایک طرف تو طلب اور رسد کو سرگرم کرنے کے لئے اصول عدم مداخلت (Laisez fair) کا اعلان کرتا ہے تو دوسری طرف مندرجہ بالا غلط ذرائع کاروبار کی اجازت دے کر ان کے قدرتی عمل میں مداخلت کرتا ہے، سرمایہ دار ایسی اجارہ داریاں (Monopolies) پیدا کرکے اپنے جابرانہ فیصلے عوام الناس کی کثرت پر مسلط کردیتے ہیں، جس کی وجہ سے بازاری طاقتوں کو ان کا حقیقی کردار ادا کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ سود کا مستقل رجحان یہ

ہے کہ وہ مال دار صنعت کاروں کے مفاد کے لئے کام کرے، کیونکہ یہ صنعت کار ہی اس دولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو غریب عوام بنکوں میں اپنی بچتوں کی صورت میں جمع کراتے ہیں اور جب انہیں عظیم فائدہ ہوتا ہے تو وہ عوام الناس کو اس میں شریک کرنے کے بجائے ایک متعین شرح سے سود دیتے ہیں اور پھر اس سود کو بھی وہ دوبارہ اپنی پیداوار کے اخراجات کی مد میں قیمتوں میں اضافہ کرکے واپس وصول کر لیتے ہیں، مجموعی سطح پر اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مال دار لوگ کھاتہ داروں (Despositors) کی رقموں کو اپنے نفع کے لئے استعمال کرتے ہیں اور حقیقت میں ان (Despositors) کو کچھ ادا نہیں کرتے، کیونکہ وہ سود جو وہ مالیاتی اداروں کو ادا کرتے ہیں وہ صارفین جیسے عوام الناس سے ان کی پیداواری قیمت میں اضافہ کرکے واپس وصول کر لیتے ہیں۔

اسی طرح ''جوا'' ہزاروں لوگوں کی دولت چند ہاتھوں میں مرتکز کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ اور کمائے بغیر دولت کے حصول کی لالچ اور طمع کو بڑھانے کا ایک تباہ کن محرک ہے، ''سٹے'' کے معاملات بھی فطری بازاری عمل کو متاثر کرنے اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، خلاصہ یہ کہ حلال اور حرام کا امتیاز نہ رکھنے والا نظام معاشرے پر پڑنے والے برے اثرات سے لاپرواہ ہوکر ہر قسم کی تجارتی سرگرمیوں کے لئے کھلا ہوا ہے۔

اسلام نہ صرف بازاری طاقتوں کو قبول کرتا ہے، بلکہ ان کو ایک ایسی میکانیت (Mechamism) مہیا کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اجارہ داریوں کی رکاوٹوں کے بغیر اپنی طاقت کے ساتھ عمل جاری رکھتے ہیں، صحت مند پیداوار اور مساویانہ تقسیم کی فضا برقرار رکھنے کے لئے اسلام معاشی سرگرمیوں پر دو قسم کے کنٹرول عائد کرتا ہے۔

پہلی قسم کے کنٹرول سے اسلام نے تجارت اور کمائی کے عمل کو کچھ ایسے مخصوص اور پروقار طریق ہائے کار کے ساتھ متعین کر دیا ہے جو بالکل وضاحت کے ساتھ حلال وحرام کے درمیان امتیاز کرتے ہیں، یہ طریقے اجارہ داریوں کو روکنے اور غلط اور غیر اخلاقی کمائی اور معاشرے کے اجتماعی مفادات کے خلاف تجارتی سرگرمیوں کو ختم کرنے کا سبب بنتے ہیں، جدید اقتصادی ضروریات کے سیاق میں جہاں عام لوگوں کی بچتیں ترقی کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اسلامی طریق ہائے تمویل مثلاً سود کے بجائے مشارکہ اور مضاربہ کا استعمال عوام کو ترقی کے پھل میں بلاواسطہ شریک اور حصہ دار بناتے ہیں، جس کی وجہ سے معاشرے میں ایک متوازن طریقے سے خوشحالی آتی ہے اور امیر وغریب کے درمیان فرق کم سے کم ہو جاتا ہے۔

دوسرے قسم کا کنٹرول زکوٰۃ وصدقات اور کچھ دوسری مالیاتی ذمہ داریاں عائد کرنے کے

ذریعہ عمل میں لایا گیا اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حلال آمدنی بھی دوبارہ ایسے لوگوں میں تقسیم کی جائے جو تجارت کے بھرپور مواقع میسر نہ آنے کی وجہ سے اپنی ضروریات کے لئے نہیں کما سکتے، خلاصہ یہ کہ دولت کو مستقل گردش اور پھیلاؤ میں رکھنے کے لئے اور دولت کو محدود و مرکوز کرنے کے مواقع ختم کرنے کے لئے غلط اور ناجائز آمدنی کے راستے مسدود کردیئے گئے، اور زکوٰۃ، صدقات اور وراثت کے ضابطے وضع کئے گئے۔

چونکہ موجودہ صدی میں دنیا سوشلزم کا زوال اور سقوط بھی دیکھ چکی ہے، اور سرمایہ دارانہ نظام کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کے زخم بھی ابھی تک مندمل نہیں کر پائی ہے، لہٰذا اب مسلمانوں کے لئے یہ بہترین موقعہ ہے کہ دنیا کو قرآن وسنت سے مستنبط اصول واحکام کی طرف دعوت دے، جو دو انتہاؤں کے درمیان ایک پرامن اعتدال فراہم کرتے ہیں، لیکن ہمارے لئے ایک پریشان کن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اسلامی نظام کے اصول ابھی تک صرف نظریاتی ہیں، جو ابھی تک عملی شکل میں ہمارے سامنے نافذ نہیں، یہاں تک کہ مسلمان ممالک بھی ابھی تک اپنی معیشت کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کی سعی نہیں کی ہے، ان میں سے اکثر اب تک سرمایہ دارانہ نظام کی اتباع کر رہے ہیں اور وہ بھی ایسے ناپختہ اور ادھورے طریقوں پر جن کی وجہ سے ان کی اقتصادی حالت ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے اور بدقسمتی سے واضح اسلامی اصولوں کی موجودگی کے باوجود مسلمان ممالک میں معاشی ناہمواری اور عدم مساوات مغربی ممالک کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔

یہ افسوس ناک صورت حال ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتی، اگر ہم اپنے راستوں اور طریقہ کار کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیں گے تو انقلاب اور ردعمل کی جانب فطری عمل اپنے راستے ڈھونڈنے پر مجبور ہو جائے گا، اگر ہم ایسے انقلاب کے تباہ کن اثرات سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے معاشی نظام کو قرآن وسنت سے مستنبط اور ماخوذ واضح معاشی نظام پر از سرنو استوار کرنا پڑے گا، اگر ہم اسلامی اصولوں کے مطابق کوئی نظام نافذ کرنے کے قابل ہوگئے تو نئی صدی کی آمد کے موقع پر یہ ہماری طرف سے انسانی برادری کے لئے ایک بہترین اور عظیم تحفہ ہوگا، مجھے امید ہے کہ اگر ہم اسلامی معیشت کے اصولوں کو اخلاص کے ساتھ ٹھیک ٹھیک نافذ کردیں تو آج ہم بقیہ دنیا کو بھی پہلے کی بہ نسبت اسے قبول کرنے پر زیادہ آمادہ پائیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائیں اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

اسلام اور جدید اقتصادی مسائل ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلاَۃُ وَالسَّلاَمُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلاَنَا مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ

اَمَّا بَعْدُ!

جناب صدر و معزز خواتین و حضرات! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آج کی اس نشست کا موضوع اسلام اور جدید اقتصادی مسائل مقرر کیا گیا ہے اور اس پر گفتگو کے لئے مجھ ناکارہ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں اس موضوع کے بنیادی خدوخال آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں۔ یہ موضوع درحقیقت بڑا طویل الذیل اور تفصیل طلب موضوع ہے جس کے لئے ایک گھنٹے کی وسعت نہایت ناکافی ہے بلکہ مجھے یہاں ''ناکافی'' کا لفظ بھی ناکافی معلوم ہو رہا ہے، اس لئے تمہید سے قطع نظر کر کے براہ راست اصل موضوع کی طرف آنا چاہتا ہوں کہ اس مختصر وقت میں اپنی بساط کے مطابق اس موضوع کے چند خدوخال آپ حضرات کی خدمت میں عرض کر دوں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ موضوع نہ صرف یہ کہ ایک گھنٹے کا موضوع نہیں ہے بلکہ ایک نشست کا موضوع بھی نہیں ہے اس پر بڑی طویل کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں، اور ایک مختصر سی نشست میں اس کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔

جدید اقتصادی مسائل اتنے زیادہ اور اتنے متنوع ہیں کہ اگر ان میں سے ایک کا انتخاب کر کے اس پر بات کی جائے اور دوسرے مسائل کو چھوڑ دیا جائے تو یہ بھی ایک مشکل آزمائش ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ بجائے اس کے کہ جزوی اقتصادی مسائل پر گفتگو کی جائے میں اسلام کی اقتصادی اور معاشی تعلیمات کا بنیادی اور اصولی خاکہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ کم از کم اسلامی معیشت کے بنیادی تصورات ذہن نشین ہو جائیں، کیونکہ جتنے جزوی اقتصادی مسائل ہیں جن کی طرف مجھ سے پہلے ڈاکٹر اختر سعید صاحب نے اشارہ فرمایا ہے، وہ سارے کے سارے اقتصادی مسائل درحقیقت بنیادی تصورات پر مبنی ہوں گے اور ان کا جو حل بھی تلاش کیا جائے

☆ اصلاحی خطبات (۳/۲۲ تا ۴۷) ۵ جولائی ۱۹۹۲ء، دن گیارہ بجے، سیمینار ہال جامعہ کراچی، کراچی

گا وہ انہی بنیادی تصورات کے ڈھانچے میں تلاش کیا جائے گا۔لہٰذا سب سے پہلی اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے ذہن میں اسلامی معیشت کا تصور واضح ہو اور یہ بات معلوم ہو کہ اسلامی معیشت کس چیز کا نام ہے؟ اس کی کیا بنیادی خصوصیات ہیں؟ وہ کس طرح دوسری معیشتوں سے ممتاز ہے؟

جب تک یہ بات واضح نہ ہو اس وقت تک اقتصادی مسائل پر گفتگو یا بحث یا ان کا کوئی حل منطقی طور پر درست نہیں ہوگا اس لئے میں اس وقت مختصراً اسلامی معیشت کے بنیادی تصورات اور آج کی دنیا میں جاری معیشت کے نظام کے ساتھ اس کا تقابل اور موازنہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مدد فرمائیں اور اس مختصر وقت میں اس اہم موضوع کو صحیح طور پر بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اسلام ایک نظام زندگی

سب سے پہلی بات جو اسلامی معیشت کے حوالے سے یاد رکھنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلام درحقیقت ان ٹھیٹھ معنوں میں ایک ''معاشی نظام'' نہیں جن معنوں میں آج کل ''معاشی نظام'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور جو اس کے معنی سمجھے جاتے ہیں بلکہ اسلام کو ایک معاشی نظام کی حیثیت میں متعارف کرنا یا اسلام کو ایک معاشی نظام سمجھنا درست نہیں جیسے کیپٹل ازم ہے یا سوشلزم ہے لہٰذا جب ہم اسلام کی معیشت کا نام لیتے ہیں یا اسلامی معیشت کے تصورات اور اس کی بنیادوں کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ قرآن کریم میں اور سنت رسول اللہ ﷺ میں معیشت کے اسی طرح کے نظریات ہوں گے، جو آدم سمتھ اور مارشل اور دوسرے ماہرین معاشیات کی کتابوں میں موجود ہیں کیونکہ اسلام اپنی ذات اور اصل میں معاشی نظام نہیں، بلکہ وہ ایک نظام زندگی ہے جس کا ایک چھوٹا سا شعبہ معیشت بھی ہے اس پر اسلام نے اہمیت ضرور دی ہے لیکن اس کو مقصد زندگی قرار نہیں دیا، اس لئے جب میں آگے آپ حضرات کی خدمت میں معیشت کی بات کروں گا تو یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ قرآن اور سنت میں اگر کوئی شخص اس طرح کے معاشی نظریات، ان اصطلاحوں اور ان تصورات کے تحت تلاش کرے گا، جن تصورات اور اصطلاحات کے ساتھ معیشت کی عام کتابوں میں ملتے ہیں تو اس طرح کے تصورات ان میں نہیں ملیں گے البتہ اسلام کے اندر وہ بنیادی تصورات انسان کو ملیں گے جن پر بنیاد رکھ کر ایک معیشت کی تعمیر کی جاسکتی ہے، اس لئے میں اپنی ذاتی گفتگو اور تحریروں میں بھی ''اسلام کا معاشی نظام'' کے بجائے ''اسلام کی معاشی تعلیمات'' کا لفظ استعمال کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں، اسلام کی ان معاشی تعلیمات کی روشنی میں معیشت کی کیا شکل ابھرتی ہے؟ اور کیا ڈھانچہ

سامنے آتا ہے؟ یہ سوال ایک معیشت کے طالب عالم کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

''معیشت'' زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں

دوسری بات یہ ہے کہ معیشت بے شک اسلامی تعلیمات کا ایک بہت اہم شعبہ ہے اور معاشی تعلیمات کی وسعت کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ اگر اسلامی فقہ کی کسی بھی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کے دو حصے معیشت سے متعلق ہوں گے آپ نے فقہ کی مشہور کتاب ''ہدایہ'' کا نام ضرور سنا ہوگا اس کی چار جلدیں ہیں جس میں سے آخری دو جلدیں تمام تر معیشت کی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ اس سے آپ اسلامی معاشی تعلیمات کی وسعت کا اندازہ کر سکتے ہیں، لیکن یہ بات ہر وقت ذہن نشین رہنی چاہئے کہ دوسرے معاشی نظاموں کی طرح اسلام میں معیشت انسان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے، جتنی سکولر معیشتیں ہیں، ان میں معیشت کو انسان کی زندگی کا سب سے بڑا بنیادی مسئلہ قرار دیا گیا ہے، اور اس بنیاد پر تمام نظام کی تعمیر کی گئی ہے لیکن اسلام میں معیشت اہمیت ضرور رکھتی ہے لیکن وہ انسان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔

اصل منزل آخرت ہے

اسلام کی نظر میں بنیادی مسئلہ درحقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا جس کے اندر انسان آیا ہے یہ اس کی آخری منزل اور آخری مطمح نظر نہیں ہے، بلکہ یہ آخری منزل تک پہنچانے کے لئے ایک مرحلہ ہے اور ایک عبوری دور ہے اس عبوری دور کو بھی یقیناً اچھی حالت میں گزارنا چاہئے لیکن یہ سمجھنا کہ میری ساری کوششوں، ساری توانائیوں اور ساری جدوجہد کا محور یہ دنیاوی زندگی کی معیشت ہو جائے یہ بات اسلام کے بنیادی مزاج سے میل کھانے والی نہیں۔

اسلام نے ایک طرف دنیا کو اس درجہ اہمیت دی کہ دنیاوی منافع کو قرآن کریم میں ''خیر'' اور اللہ کا ''فضل'' کہا گیا، اور حضور ﷺ نے فرمایا:

((طَلَبُ کَسْبِ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ))(۱)

یعنی معیشت کو حلال طریقے سے حاصل کرنا یہ انسان کے فرائض کے بعد دوسرے درجہ کا اہم

(۱) کنز العمال، رقم: ۹۲۳۱ (۱۶/۴)، کشف الخفاء، رقم: ۱۶۷۱ (۴۶/۲)، سنن البیهقی، رقم: ۱۲۰۳۰ (۲۴/۲)، الجامع الکبیر للسیوطی، رقم: ۳۵ (۱۴۰۸۵/۱)، جامع الأحادیث، رقم: ۱۳۹۳۷ (۱۲۸/۱۴)، مشکوۃ المصابیح، رقم: ۲۷۸۱ (۱۲۹/۲)، شعب الإیمان، رقم: ۸۷۴۱ (۴۲۱/۶)

فریضہ ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ اپنی تمام جدوجہد کا محور اس دنیا کو نہ بنانا، کیونکہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری ابدی زندگی آخرت کی شکل میں آنے والی ہے، اس کی بہبود درحقیقت انسان کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے۔

دنیا کی بہترین مثال

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کے اس نقطہ نظر کو ایک خوبصورت مثال کے ذریعہ واضح فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

آب اندر زیر کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاک کشتی است

دنیا کی مثال پانی جیسی ہے اور انسان کی مثال کشتی جیسی ہے، جس طرح کشتی بغیر پانی کے نہیں چل سکتی اسی طرح انسان دنیا اور اس کے سازوسامان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن یہ پانی کشتی کے لئے اس وقت تک فائدہ مند ہے جب تک وہ کشتی کے چاروں طرف اور اردگرد ہو، لیکن اگر یہ پانی کشتی کے اندر داخل ہوجائے تو اس وقت وہ پانی کشتی کو سہارا دینے کے بجائے اسے ڈبو دے گا۔ اسی طرح دنیا کے یہ سارے سازوسامان انسان کے لئے بڑے فائدہ مند ہیں اور اس کے بغیر انسان کی زندگی نہیں گزر سکتی، لیکن یہ اس وقت تک فائدہ مند ہیں جب تک یہ دل کی کشتی کے چاروں طرف اور اردگرد رہیں لیکن اگر یہ سازوسامان انسان کی دل کی کشتی میں سوار ہوجائیں تو پھر وہ انسان کو ڈبو دیں گے اور ہلاک کردیں گے۔

اسلام کا معیشت کے بارے میں یہی نقطہ نظر ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معیشت فضول چیز ہے اس لئے کہ اسلام رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ معیشت بڑی کارآمد چیز ہے، بشرطیکہ اس کو اس کی حدود میں استعمال کیا جائے، اور اس کو اپنا بنیادی مطمح اور آخری مقصد زندگی قرار نہ دیا جائے۔

ان دو بنیادی نکتوں کی تشریح کے بعد سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ کسی معیشت کے بنیادی مسائل کیا ہوتے ہیں؟ اور ان بنیادی معاشی مسائل کو موجودہ معاشی نظاموں یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت نے کس طرح حل کیا ہے؟ اور پھر تیسرے نمبر پر یہ کہ اسلام نے ان کو کس طرح حل کیا ہے؟

''معیشت'' کا مفہوم

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ کسی معیشت کے بنیادی مسائل کیا ہوتے ہیں؟ معاشیات کا ایک مبتدی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ کسی معیشت کے بنیادی مسائل چار ہیں ان چار مسائل کو سمجھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ ہم جس چیز کو اکنامکس (Economics) کہتے ہیں اور عربی میں جس کا ترجمہ ''اقتصاد'' سے کیا جاتا ہے اگر ڈکشنری میں اس کے لغوی معنی دیکھے جائیں تو ''اکنامکس'' کے معنی یہ ملیں گے کہ انسان اپنی ضرورت کو کفایت کے ساتھ پورا کر لے، اکنامکس کے اندر بھی کفایت کا تصور موجود ہے، ور عربی میں اس کا جو ترجمہ ''اقتصاد'' سے کیا جاتا ہے اس میں بھی کفایت کا تصور موجود ہے، لہٰذا اکنامکس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی ضروریات، بلکہ خواہشات غیر متناہی ہیں، اور ان ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے وسائل کم اور محدود ہیں اگر وسائل بھی اتنے ہی ہوتے جتنی ضروریات اور خواہشات ہیں تو پھر کسی علم معاشیات کی ضرورت نہ ہوتی، علم معاشیات کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ انسان کی ضروریات اور خواہشات زیادہ ہیں اور اس کے مقابلے میں وسائل کم ہیں تو اب اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ کس طرح ان دونوں کے درمیان مطابقت پیدا کی جائے؟ جس کے ذریعہ کفایت کے ساتھ اپنی ضروریات اور خواہشات پوری ہو سکیں، اور یہی درحقیقت علم معاشیات کا موضوع ہے اور اس نقطہ نظر سے کسی معیشت کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ چار بنیادی مسائل ہیں:

(۱) ''ترجیحات کا تعین'' (Determination of Priorities)

پہلا مسئلہ جس کو معیشت کی اصطلاح میں ''ترجیحات کا تعین'' کہا جاتا ہے، یعنی ایک انسان کے پاس وسائل تو تھوڑے سے ہیں اور ضروریات اور خواہشات بہت زیادہ ہیں اب کون سی خواہش کو مقدم کرے اور کون سی خواہش کو موخر کرے، یہ معاشیات کا سب سے پہلا مسئلہ ہے، مثلاً میرے پاس پچاس روپے ہیں اب ان پچاس روپے سے میں خوراک کے لئے بازار سے آٹا بھی خرید سکتا ہوں اور اس پچاس روپے سے کپڑا بھی خرید سکتا ہوں، اور کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ریفریشمنٹ کھانے میں بھی خرچ کر سکتا ہوں، اور ان پچاس روپے سے کوئی فلم بھی دیکھ سکتا ہوں اب یہ چار پانچ ضرورتیں میرے سامنے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ ان چار پانچ اختیارات میں سے کس کو ترجیح دوں؟ اور وہ پچاس روپے کس طرح استعمال کروں؟ اس مسئلہ کا نام ''ترجیحات کا تعین'' ہے۔

یہ مسئلہ جس طرح ایک انسان کو پیش آتا ہے اسی طرح پورے ملک، پوری ریاست اور پوری معیشت کو بھی پیش آتا ہے، مثلاً پاکستان کے کچھ قدرتی وسائل ہیں کچھ انسانی وسائل ہیں کچھ معدنی وسائل ہیں کچھ نقدی وسائل ہیں یہ سارے وسائل محدود ہیں، اور ہماری ضروریات اور خواہشات لامتناہی ہیں، اب جو وسائل ہمارے پاس موجود ہیں ان کے ذریعہ ہم کھیت میں گندم بھی اگا سکتے ہیں، چاول بھی اگا سکتے ہیں، اور تمبا کو بھی اگا سکتے ہیں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سارے وسائل عیاشی پر خرچ کردیں، یہ مختلف اختیارات (Options) ہمارے سامنے موجود ہیں تو کسی معیشت کا سب سے پہلا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ترجیحات کا تعین کس طرح کریں؟ اور کس کام کو فوقیت دی جائے؟

(۲) ”وسائل کی تخصیص“

دوسرا مسئلہ جسے معاشیات کی اصطلاح میں ”وسائل کی تخصیص“ (Allocation of Resources) کہا جاتا ہے، یعنی جو وسائل ہمارے پاس موجود ہیں ان کو کس کام میں کس مقدار میں لگایا جائے؟ مثلاً ہمارے پاس زمینیں بھی ہیں اور ہمارے پاس کارخانے بھی ہیں، ہمارے پاس انسانی وسائل بھی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کتنی زمین پر گندم اگائیں؟ اور کتنی زمین پر روئی اگائیں؟ کتنی زمین پر چاول اگائیں؟ اس کو معیشت کی اصطلاح میں ”وسائل کی تخصیص“ کہا جاتا ہے، کہ کون سے وسیلے کو کس کام کے لئے اور کس مقدار میں مخصوص کیا جائے؟

(۳) آمدنی کی تقسیم

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جب پیداوار (Production) شروع ہو تو اس پیداوار کو کس طرح معاشرے اور سوسائٹی میں تقسیم کیا جائے؟ اس کو معیشت کی اصطلاح میں ”تقسیم آمدنی“ (Distribution of Income) کہا جاتا ہے۔

(۴) ترقی

چوتھا مسئلہ جس کو معیشت کی اصطلاح ”ترقی“ (Development) کہا جاتا ہے، وہ یہ کہ ہماری جو معاشی سرگرمیاں ہیں ان کو کس طرح ترقی دی جائے؟ تاکہ جو پیداوار حاصل ہو رہی ہے وہ معیار کے اعتبار سے اور زیادہ اچھی ہوجائے اور مقدار کے لحاظ سے زیادہ ہوجائے؟ اور اس میں ترقی ہو اور نئی مصنوعات وجود میں آئیں تاکہ مزید اسباب معیشت لوگوں کے سامنے آئیں۔

یہ چار اسباب ہوتے ہیں جن کا ہر معیشت کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان چار مسائل کے تعین کے بعد ایک نظر اس پر ڈالنی ہوگی کہ موجودہ رائج الوقت معیشت کے نظاموں نے ان چار مسائل کو کس طرح حل کیا ہے؟ پھر یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ اسلام ان مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے کیونکہ عربی کا یہ مصرعہ آپ نے سنا ہوگا کہ:

"وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ"

جب تک کسی چیز کی ضد سامنے نہ آئے اس وقت تک کسی چیز کے حقیقی محاسن سامنے نہیں آتے، اگر رات کا اندھیرا نہ ہوتو دن کی روشنی کی قدر نہ ہوتی، اگر حبس اور گرمی نہ ہوتو بارش کا رحمت ہونا معلوم نہ ہوتا، اس لئے مختصراً پہلے یہ جائزہ لینا ہوگا کہ رائج الوقت معاشی نظاموں نے ان چار مسائل کو کس طرح حل کیا ہے؟

سرمایہ دارانہ نظام میں ان کا حل

سب سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کو لیا جاتا ہے، سرمایہ دارانہ نظام نے ان چار مسائل کو حل کرنے کے لئے جو فلسفہ پیش کیا وہ یہ ہے کہ ان چار مسائل کو حل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، ایک ہی جادو کی چھڑی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر انسان کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دو اور پھر جب ہر شخص اپنا منافع کمانے کی فکر کرے گا اور آزاد جدوجہد کرے گا تو اس وقت یہ چاروں مسائل خود بخود (Automatically) حل ہوتے چلے جائیں گے، اب سوال یہ ہے کہ یہ چار مسائل خود بخود کس طرح حل ہوں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت اس کائنات میں قدرتی قوانین کارفرما ہیں، جن کو رسد اور طلب (Supply and Demand) کے قوانین کہا جاتا ہے، معاشیات کے طالب علم کے علاوہ ہر آدمی بھی ان قوانین کے بارے میں اتنا جانتا ہے کہ جس چیز کی طلب اس کی رسد کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے، اور اگر طلب رسد کے مقابلے میں کم ہوجائے تو اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ بازار میں آم موجود ہیں اور آم کے خریدار اور شوقین زیادہ ہیں، اس کے مقابلے میں اس کی سپلائی کم ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بازار میں آم کی قیمت بڑھ جائے گی، لیکن اگر وہ آم ایسے علاقے میں پہنچا دیئے جائیں جہاں لوگ آم کھانا پسند نہیں کرتے اور ان کے اندر آم کھانے کی طلب اور رغبت نہیں ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آم کی قیمت گھٹ جائے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ طلب کے بڑھنے سے قیمت بڑھتی ہے اور طلب کے گھٹنے سے قیمت گھٹتی ہے، یہ ایک عام

اصول اور قانون ہے جسے ہر انسان جانتا ہے۔

سرمایہ دارانہ (Capitalism) نظریہ کہتا ہے کہ یہی قانون جو درحقیقت اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کیا چیز پیدا کی جائے اور کس مقدار میں پیدا کی جائے اور کس طرح وسائل کی تخصیص کی جائے ان سب چیزوں کا تعین درحقیقت طلب اور رسد کے قانون سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب ہم نے ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا تو اب ہر شخص اپنے منافع کے خاطر وہی چیز پیدا کرنے کی کوشش کرے گا جس کی مارکیٹ میں طلب زیادہ ہے۔

میں آج اگر ایک کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں تو پہلے یہ معلوم کروں گا کہ بازار میں کس چیز کی طلب زیادہ ہے، تاکہ جب وہ چیز میں مارکیٹ میں لاؤں تو اس کو زیادہ قیمت میں فروخت کر کے اپنا منافع کما سکوں۔

لہٰذا لوگ جب اپنے منافع کے محرک کے تحت کام کریں گے تو وہی چیز بازار میں لائیں گے جس کی طلب زیادہ ہوگی، اور جب بازار میں اس چیز کی طلب کم ہو جائے گی تو لوگ اس پیداوار کو بازار میں مزید لانے سے اس لئے رک جائیں گے کہ مزید لانے کی صورت میں اس کی قیمت گھٹے گی اور قیمت گھٹنے سے ان کا نقصان ہوگا۔ یا کم از کم اس کے منافع پورے نہیں کما سکیں گے، اس لئے کہا جاتا ہے کہ طلب و رسد کے قوانین مارکیٹ میں اس طرح جاری ہیں کہ اس کے ذریعہ ترجیحات کا تعین بھی خود بخود ہو جاتا ہے کہ کیا چیز پیدا کی جائے اور کتنی مقدار میں پیدا کی جائے اور وسائل کی تخصیص بھی اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ انسان اپنی زمین اور اپنے کارخانے کو اس چیز کے پیدا کرنے میں استعمال کریں گے، جس کی طلب ملک میں زیادہ ہے تاکہ اس سے زیادہ منافع حاصل کر سکیں، لہٰذا منافع کے حصول کے محرک کے ذریعہ ان چاروں مسائل کو حل کیا جاتا ہے۔ ان کی بنیاد رسد اور طلب کے بنیادی قوانین ہوتے ہیں، اور اس سسٹم کو پرائز میکنزم (Price Mechanism) کہا جاتا ہے، اور اسی پرائز میکنزم کے تحت یہ سارے وسائل انجام پاتے ہیں۔

اسی طرح آمدنی کی تقسیم کا نظام ہے، اس کے بارے میں سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ یہ ہے کہ رسد اور طلب کے قوانین ہی کے تحت آمدنی کی تقسیم ہوتی ہے، مثلاً ایک کارخانہ دار نے ایک کارخانہ لگایا اور اس میں ایک مزدور کو کام پر لگایا، اب سوال یہ ہے کہ کارخانے سے ہونے والی آمدنی کا کتنا حصہ مزدور وصول کرے اور کتنا کارخانے دار حاصل کرے؟ اس کا تعین بھی درحقیقت رسد اور طلب کے قوانین کے تحت ہوگا، یعنی مزدور کی طلب جتنی زیادہ ہوگی اس کی اجرت بھی اتنی زیادہ ہوگی اور جتنی اس کی طلب کم ہوگی اس کی اجرت بھی کم ہو جائے گی۔ تو اسی اصول پر آمدنی کی تقسیم ہوگی۔

آخری مسئلہ یعنی ترقی (Development) کا مسئلہ بھی اسی بنیاد پر حل ہوگا کہ جب ہر شخص زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی فکر میں ہے تو اب وہ منافع کے حصول کے لئے نت نئی ایجادات سامنے لائے گا، اور ایسی چیزیں پیدا کرے گا جس کے ذریعہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف راغب کر سکے۔

لہٰذا جب ہر شخص کو کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے ذریعہ چاروں مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں، انہی کے ذریعہ ترجیحات کا تعین ہوتا ہے، انہی کے ذریعہ وسائل کی تقسیم ہوتی ہے انہی کے ذریعہ آمدنی کی تقسیم ہوتی ہے اور انہی کے ذریعہ معاشی ترقی عمل میں آتی ہے، یہ سرمایہ دارانہ نظریہ ہے۔

اشتراکیت میں ان کا حل

جب اشتراکیت میدان میں آئی تو اس نے یہ کہا کہ جناب! آپ نے معیشت کے سارے اہم اور بنیادی مسائل کو بازار کی اندھی اور بہری قوتوں کے حوالے کر دیا ہے، اس لئے کہ رسد اور طلب کی قوتیں اندھی بہری قوتیں ہیں اور یہ جو آپ نے کہا کہ انسان وہی چیز پیدا کرے گا جس کی مارکیٹ میں طلب ہے، اور اس وقت تک پیدا کرے گا جب تک طلب ہوگی، یہ بات نظریاتی طور پر تو چاہے درست ہو لیکن عملی میدان میں جب انسان قدم اٹھاتا ہے تو اس کو اس بات کا علم بہت مدت کے بعد ہوتا ہے کہ اس چیز کی طلب کم ہوگئی یا زیادہ ہوگئی، ایک مدت ایسی آتی ہے جس میں طلب حقیقتاً گھٹی ہوئی ہوتی ہے لیکن پیدا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ طلب بڑھی ہوئی ہے، اس لئے وہ پیداوار میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں بالآخر کساد بازاری پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر کساد بازاری کے مہلک نتائج معیشت کو بھگتنے پڑتے ہیں، لہٰذا ان مسائل کو ان اندھی بہری قوتوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔

سرمایہ دارانہ نظام نے ایک جادو کی چھڑی پیش کی تھی، اور اشتراکیت نے دوسری جادو کی چھڑی پیش کر دی کہ ان چاروں مسائل کا ایک ہی حل ہے، وہ یہ کہ سارے وسائل پیداوار انفرادی ملکیت میں رکھنے کے بجائے اجتماعی ملکیت میں لائے جائیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ سارے وسائل پیداوار حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں اور پھر حکومت ان وسائل کی منصوبہ بندی کرے گی کہ کتنی زمین پر گندم پیدا کی جائے، کتنی زمین پر چاول پیدا کیا جائے، کتنی زمین پر روئی پیدا کی جائے، کتنے کارخانوں میں کپڑا بنے گا، اور کتنے کارخانوں میں جوتے بنیں گے، یہ ساری پلاننگ حکومت

کرے گی، اور جو انسان زمین یا کارخانے میں کام کریں گے ان کی بحیثیت محنت کار کے اجرت مہیا کی جائے گی اور اس اجرت کی مقدار بھی پلاننگ کے ذریعے طے کی جائے گی، لہٰذا ترجیحات کا تعین بھی حکومت کرے گی، وسائل کی تخصیص بھی حکومت کرے گی آمدنی کی تقسیم بھی حکومت کرے گی اور ترقی کی منصوبہ بندی بھی حکومت کرے گی۔

چونکہ اشتراکی معیشت میں یہ سارے کام حکومت اور منصوبہ بندی کے حوالے کئے گئے ہیں اس لئے اشتراکی معیشت کو منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) بھی کہتے ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ معیشت نے چونکہ اپنے وسائل کو مارکیٹ کی رسد اور طلب کی قوتوں پر چھوڑ دیا ہے اس لئے اس کو ''بازاری معیشت'' (Market Economy) اور عدم مداخلت معیشت (Laisscz Faire Economy) بھی کہتے ہیں۔

یہ دو مختلف نظریات ہیں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں اور دنیا میں رائج ہیں۔

سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی اصول

سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی اصول جو اس کے فلسفے سے نکلتے ہیں، ان میں سے پہلا اصول ''انفرادی ملکیت'' (Private Ownership) ہے، یعنی تمام وسائل پیداوار کا ہر شخص انفرادی طور پر مالک بن سکتا ہے۔ دوسرا اصول ''حکومت کی عدم مداخلت'' (Laissez Faire Policy of State) ہے، یعنی انسان کو منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے، حکومت کی طرف سے مداخلت نہ کی جائے، اور اس پر کوئی پابندی اور کوئی روک عائد نہ کی جائے۔ تیسرا اصول ''ذاتی منافع کا محرک'' ہے۔ کہ انسان کے اپنے ذاتی منافع کو ایک محرک کے طور پر استعمال کیا جائے معاشی سرگرمیوں میں تیزی لانے کے لئے اس کی ترغیب دی جائے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اصول ہیں۔

اشتراکیت کے بنیادی اصول

اس کے برخلاف اشتراکیت کے بنیادی اصول یہ ہے کہ وسائل کی پیداوار کی حد تک ''انفرادی ملکیت'' کی بالکلیہ نفی کی جائے، یعنی وسائل پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتے، یعنی نہ کوئی زمین کسی کی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے، اور نہ کارخانہ کسی کی ذاتی ملکیت ہو سکتا ہے۔ دوسرا اصول ہے ''منصوبہ بندی'' یعنی ہر کام پلاننگ اور منصوبہ بندی کے تحت کیا جائے، یہ دو مختلف نظریات ہیں جو اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔

اشتراکیت کے نتائج

اس وقت دنیا میں ان دونوں نظاموں کے تجربات اور نتائج سامنے آچکے ہیں، اور اشتراکیت کے نتائج آپ حضرات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، کہ ۷۲ سال کے تجربے کے بعد پورے نظام کی عمارت زمین پر اس طرح گری کہ بڑے بڑے سورما بچھڑے ہوئے نظر آئے۔ حالانکہ ایک زمانے میں نیشنلائزیشن ایک فیشن کے طور پر دنیا میں رائج تھا، اور اگر کوئی شخص اس کے خلاف زبان کھولتا تو اس کو سرمایہ دار کا ایجنٹ اور رجعت پسند کہا جاتا تھا۔ لیکن آج خود روس کا سربراہ یہ کہہ رہا ہے کہ:

> ''کاش! یہ اشتراکیت کے نظریہ کا تجربہ روس کے بجائے افریقہ کے کسی چھوٹے ملک میں کرلیا گیا ہوتا، تاکہ کم از کم ہم اس کی تباہ کاریوں سے بچ جاتے''

''اشتراکیت'' ایک غیر فطری نظام تھا

بہرحال! طبعی طور پر یہ ایک غیر فطری نظام تھا، اس لئے کہ دنیا میں بے شمار معاشرتی مسائل ہیں، صرف ایک معیشت ہی کا مسئلہ نہیں ہے اب اگر ان مسائل کو منصوبہ بندی کے ذریعہ حل کرنے بیٹھ جائیں تو یقین کیجئے کبھی حل نہیں ہوسکیں گے، آخر یہ بھی تو ایک معاشرتی مسئلہ ہے کہ ایک مرد کو ایک عورت سے شادی کرنی ہے اور شادی کے لئے مرد کو مناسب بیوی درکار ہے اور بیوی کو مناسب شوہر چاہئے، اب آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ چونکہ شادی کا نظام لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں بڑی خرابیاں پیدا ہورہی ہیں، طلاقیں ہورہی ہیں گھر اجڑ رہے ہیں اور دونوں کے درمیان ناچاقیاں پیدا ہورہی ہیں لہٰذا اس نظام کو چلانے کے لئے بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ اس نظام کو حکومت کے حوالے کردیا جائے، اور پلاننگ کے ذریعہ یہ طے کیا جائے کہ کون سا مرد کس عورت کے لئے زیادہ مناسب ہے، اور کون سی عورت کس مرد کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ ظاہر ہے کہ پلاننگ کے ذریعہ اگر کوئی شخص اس مسئلے کو حل کرنا چاہے تو وہ ایک غیر فطری اور مصنوعی نظام ہوگا، جس سے بہتر نتائج کی کوئی امید نہیں ہوسکتی۔

یہی صورت حال اشتراکیت میں پیش آئی اس میں چونکہ یہ سارے مسائل پلاننگ اور منصوبہ بندی کے حوالے کئے ہیں تو اب سوال یہ ہے کہ پلاننگ کون کرے گا؟ ظاہر ہے کہ حکومت کرے گی اور حکومت کیا چیز ہے؟ وہ چند فرشتوں کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ وہ بھی انسانوں ہی کے اندر سے وجود

میں آنے والے گروپ کا نام ہے، اشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ سرمایہ دار دولت کے بہت بڑے وسائل پر قبضہ کر کے من مانی کرتا ہے، لیکن اس نے یہ نہیں دیکھا کہ اشتراکیت کے نتیجے میں اگرچہ بہت سارے سرمایہ دار تو ختم ہوئے لیکن ایک بہت بڑا سرمایہ دار وجود میں آ گیا جس کا نام بیوروکریسی، افسر شاہی، اور نوکر شاہی ہے اور اب سارے وسائل پیداوار اور ساری معیشت اور بیروکریس (افسر شاہی) کے ہاتھ میں آ گئے، لہٰذا اب اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ ناانصافی نہیں کریں گے وہ کون سے آسمان سے اترنے والے فرشتے ہیں، یا وہ کون سا معصومیت کا پروانہ اپنے ساتھ لائے ہیں؟ یقیناً اس نظام میں بھی خرابیاں ہوں گی اور وہ خرابیاں پیدا ہوئیں اور آپ حضرات نے اس کو دیکھ لیا، اور یہ نظام اپنے انجام کو پہنچ گیا اور آج اس کا نام لینے والے بھی شرما شرما کر اس کا نام لیتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں

اب اشتراکیت کے فیل ہونے کے بعد آج سرمایہ دار مغربی ممالک بڑے زور وشور کے ساتھ بغلیں بجا رہے ہیں کہ چونکہ اب اشتراکیت فیل ہوگئی ہے لہٰذا اب سرمایہ دارانہ نظام کی حقانیت ثابت ہوگئی، اب انسان کے لئے سرمایہ دارانہ نظام کے علاوہ کوئی نظام کارآمد نہیں ہوسکتا اور اب یہ بات بالکل طے ہوچکی ہے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ سرمایہ دارانہ معیشت کا جو بنیادی فلسفہ ہے وہ یہ کہ آزاد بازار کا وجود، اور لوگوں کو منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑنا اگرچہ نظریاتی طور پر ایک معقول فلسفہ ہے، لیکن جب اس فلسفے پر حد سے زیادہ عمل کیا گیا تو اس فلسفہ نے آگے چل کر خود اپنی جڑ کاٹ لی، یہ بات درست ہے کہ جب لوگوں کو منافع کمانے کے لئے آزاد چھوڑا جائے گا تو رسد وطلب کی قوتیں برسرکار آئیں گی اور وہ ان مسائل کو حل کردیں گی، لیکن یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ رسد وطلب کی یہ قوتیں اس وقت تک کارآمد ہوتی ہیں جب بازار میں مسابقت کی فضا ہو اور آزاد مقابلہ ہو اور اجارہ داری نہ ہو۔

مثلاً میں بازار سے ایک چھڑی خریدنا چاہتا ہوں اور بازار میں بہت سے لوگ چھڑی بیچنے والے موجود ہیں جو مختلف قیمتوں پر چھڑی بیچ رہے ہیں، ایک دوکاندار 500 روپے میں بیچ رہا ہے اور دوسرا دوکاندار 450 روپے کی بیچ رہا ہے، اب مجھے اختیار ہے کہ چاہے وہ چھڑی 500 روپے کی خریدوں یا 450 روپے کی خریدوں، اس صورت میں تو رسد اور طلب کی قوتیں صحیح طور پر کام کرتی ہیں اور ان کا صحیح عمل ظاہر ہوتا ہے، لیکن اگر بازار میں چھڑی بیچنے والا صرف ایک دوکاندار ہے اور میرے پاس کوئی چوائس اور انتخاب نہیں ہے اگر مجھے چھڑی خریدنی ہے تو اسی سے خریدنی ہوگی، تو اب وہ اپنی

من مانی قیمت میں چھری نیچے گا، اور اس کے اندر مجھے کوئی اختیار نہیں ہوگا، اور اب رسد وطلب کی قوتیں یہاں ختم ہوگئیں، اس لئے اب تو صرف یک طرفہ قیمت کا تعین ہے، جو اس اجارہ دار نے مقرر کردی اور مجھے کوئی اختیار نہیں رہا۔ لہٰذا یہ رسد اور طلب کی قوتیں وہاں کام کرتی ہیں جہاں آزاد مقابلہ ہو اور اگر اجارہ داری ہو تو وہاں یہ قوتیں کام نہیں دیتیں۔

پھر جب انسان کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لئے بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا کہ جو طریقہ تم اختیار کرنا چاہو اختیار کرلو، تو اس نے ایسے ایسے طریقے اختیار کئے جس کے ذریعہ بازار میں اجارہ داری قائم ہوگئی اور دوسری طرف سرمایہ داری نظام میں انسان کو سود کے ذریعہ منافع کمانا بھی جائز، قمار کے ذریعہ منافع کمانا بھی جائز، سٹے کے ذریعہ نفع کمانا جائز، اور ان تمام طریقوں سے بھی نفع کمانا جائز ہے جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ جو طریقہ چاہے اختیار کرے، انسان کو اس کی بالکل کھلی اجازت ہے اور اس کی کھلی چھوٹ کی وجہ سے بسا اوقات اجارہ داریاں قائم ہوجاتی ہیں جس کے نتیجے میں رسد وطلب کی قوتیں کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں اور مفلوج ہوکر رہ جاتی ہیں، جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ عملی طور پر وجود میں نہیں آتا۔

منافع کمانے کے لئے بالکل آزادی دینے کے نتیجے میں دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ کوئی اخلاقی قدر ایسی باقی نہیں رہی جو اس بات کا خیال کرے کہ معاشرے کو کون سی چیز مفید ہوگی، اور کون سی چیز مضر ہوگی، ابھی چند روز پہلے امریکی رسالے ٹائم میں میں نے پڑھا کہ ایک موڈل گرل مصنوعات کے اشتہار پر اپنی تصویر دینے کے لئے ایک دن میں 25 ملین ڈالر وصول کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ تاجر اور کارخانہ دار یہ 25 ملین ڈالر کہاں سے حاصل کرے گا؟ ظاہر ہے کہ وہ غریب عوام سے وصول کرے گا، اس لئے کہ جب وہ چیز اور وہ پیداوار بازار میں آئے گی تو یہ 35 ملین ڈالر اس کی لاگت اور کوسٹ میں شامل ہوکر میری اور آپ کی جیب سے وصول کریں گے۔

یہ فائیو اسٹار ہوٹل جن میں ایک دن کا کرایہ 2500 روپے یا 3000 روپے ہے، ایک متوسط درجے کا آدمی ان ہوٹلوں کی طرف رخ کرتے ہوئے ڈرتا ہے، لیکن وہ تمام فائیو اسٹار ہوٹل ان غریب عوام کی آمدنیوں سے وجود میں آئے، کہ آپ یہ دیکھیں ان ہوٹلوں میں کون جاکر ٹھیرتا ہے؟ یا تو سرکاری ملازمین اور سرکاری افسران گورنمنٹ کے اخراجات پر ٹھیرے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ان کا خرچ گورنمنٹ ادا کرتی ہے اور گورنمنٹ کا مطلب ہے ٹیکس ادا کرنے والوں کا روپیہ اور یا پھر دوسرا طبقہ ان ہوٹلوں میں آکر ٹھیرتا ہے وہ تاجر، صنعتکار ہوتے ہیں، جو اپنے تجارت کے سفروں کے دوران ہوٹلوں میں ٹھیرتے ہیں۔ لیکن وہ ان ہوٹلوں کا خرچ کہاں سے وصول کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ وہ

سرمایہ دار اپنی جیب سے خرچ نہیں کرتے بلکہ درحقیقت وہ اخراجات اس چیز کی لاگت (Cost) میں شامل ہوں گے جو چیز وہ بازار میں فروخت کررہا ہے۔ اور اس کی لاگت میں شامل ہو کر اس کی قیمت میں اضافہ کریں گے، اور پھر وہ قیمت عوام سے وصول کی جائے گی۔

لہٰذا کوئی اخلاقی قدر اور کوئی اخلاقی پیمانہ اس بات کا موجود نہیں ہے کہ منافع کمانے کا کون سا طریقہ درست اور معاشرے کے لئے مفید ہے، اور کون سا طریقہ معاشرے کے لئے مضر اور مہلک ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بداخلاقیاں، ناانصافیاں اور مظالم وجود میں آرہے ہیں۔

اسلام کے معاشی احکام

اب میں اسلام کی معاشی تعلیمات کی طرف آتا ہوں تاکہ مندرجہ بالا پس منظر میں اس کو اچھی طرح سمجھا جا سکے، اسلام کے نقطہ نظر سے یہ فلسفہ کہ معاشی وسائل کا تصفیہ پلاننگ کے بجائے مارکیٹ کی قوتوں کے تحت ہونا چاہئے اس بنیادی فلسفہ کو اسلام تسلیم کرتا ہے قرآن کریم کہتا ہے:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضاً سُخْرِيّاً﴾(۱)

یعنی ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت تقسیم کر دی ہے اور ایک کو دوسرے پر درجات کے اعتبار سے فوقیت عطا کیا ہے، اور اس کے بعد کتنا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا:

﴿لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضاً سُخْرِيّاً﴾

تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام بنایا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی معیشت تقسیم کی ہے، یعنی وسائل کی تقسیم اور قیمتوں کا تعین اور تقسیم دولت کے اصول یہ سارے کے سارے کسی انسانی پلاننگ کی بنیاد پر وجود میں نہیں آتے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس بازار اور اسی دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ معیشت خود بخود تقسیم ہو جائے۔

یہ جو فرمایا کہ ہم نے تقسیم کیا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آکر خود دولت تقسیم فرمادی کہ اتنا تم لے لو اور اتنا تم لے لو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے فطرت کے ایسے قوانین بنادیئے ہیں جن کی روشنی میں انسانوں کے درمیان معیشت کی تقسیم کا عمل خود بخود ہو جائے۔

اور ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اعلیٰ درجے کا معاشی اصول یہ بیان فرمایا:

---

(۱) الزخرف: ۳۲

((دَعُوْا النَّاسَ يَرْزُقِ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ مِنْ بَعْضٍ))(۱)

''لوگوں کو آزاد چھوڑ دو، کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرماتے ہیں''

یعنی ان پر بلاوجہ پابندیاں نہ لگاؤ بلکہ آزاد چھوڑو، اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا عجیب وغریب نظام بنایا ہے، مثلاً میرے دل میں اس وقت یہ خیال آیا کہ بازار جاکر ''پیچی'' خریدوں، اور بازار میں جو شخص پھل بیچنے والا ہے اس کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ تم جاکر ''پیچی'' فروخت کرو، اور اب جب میں بازار گیا تو دیکھا کہ ایک شخص ''پیچی'' بیچ رہا ہے، اس کے پاس گیا اور اس سے بھاؤ تاؤ کر کے اس سے ''پیچی'' لے لی، اور اس کو پیسے دے دیئے، تو یہ مطلب اس حدیث کا کہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دو اللہ تعالیٰ بعض کو بعض کے ذریعہ رزق عطا فرماتے ہیں۔

بہرحال! یہ بنیادی اصول کہ مارکیٹ کی قوتیں ان بنیادی مسائل کا تعین کرتی ہیں یہ اصول تو اسلام کو تسلیم ہے، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کا یہ بنیادی امتیاز کہ معیشت کو مارکیٹ کی قوتوں پر بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے اس کو اسلام تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ انسانوں کو منافع کمانے کے لئے اتنا آزاد نہ چھوڑو کہ ایک کی آزادی دوسرے کی آزادی کو سلب کرلے، یعنی ایک کو اتنا آزاد چھوڑا کہ وہ اجارہ دار بن گیا اور بازار میں اس کی اجارہ داری قائم ہوگئی، اور اسکے نتیجے میں دوسروں کی آزادی سلب ہوگئی، لہٰذا اسلام نے اس آزادی پر کچھ پابندیاں عائد کی ہیں وہ پابندیاں کیا ہیں؟ ان کو میں تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ نمبر ایک، شرعی اور الٰہی پابندی، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی عائد کردی ہے کہ تم اپنا منافع کماؤ، لیکن تمہیں فلاں کام نہیں کرنا، اس کو دینی پابندی بھی کہتے ہیں۔ دوسری قسم ہے ''اخلاقی پابندی'' تیسری قسم ''قانونی پابندی'' ہے۔

یہ تین قسم کی پابندیاں ہیں جو انسان پر شریعت نے عائد کی ہیں۔

(۱) دینی پابندی

پہلی قسم کی پابندی ''دینی پابندی'' ہے یہ بہت اہمیت کی حامل ہے، جو اسلام کو دوسرے معاشی نظریات سے ممتاز کرتی ہے، اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام اب اپنے بنیادی اصولوں کو چھوڑ کر اتنا نیچے آ گیا

(۱) صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب تحریم بیع الحاضر للبادی، رقم: ۲۷۹۹، سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء لا یبیع حاضر لباد، رقم: ۱۱۴۴، سنن النسائی، کتاب البیوع، باب بیع الحاضر للبادی، رقم: ۴۴۱۹، سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب النهی ان یبیع حاضر لباد، رقم: ۲۱۶۷، مسند احمد، رقم: ۱۰۲۳۷

ہے کہ اب اس میں حکومت کی کچھ نہ کچھ مداخلت ہوتی ہے، لیکن حکومت کی یہ مداخلت ذاتی عقل اور سیکولر تصورات کی بنیاد پر ہوتی ہے، اور اسلام جو پابندی عائد کرتا ہے وہ ''دینی پابندی'' ہوتی ہے، وہ دینی پابندیاں کیا ہیں؟ وہ یہ ہیں کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ تم بازار میں منافع کماؤ لیکن تمہارے لئے سود کے ذریعے آمدنی حاصل کرنا جائز نہیں، اگر ایسا کرو گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے، اسی طرح قمار کو ممنوع قرار دیدیا، ''قمار'' کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنا جائز نہیں اور احتکار ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دیدیا۔ ''سٹہ'' کو ممنوع قرار دیدیا، ویسے تو شریعت نے یہ کہہ دیا ہے کہ جب دو آدمی اگر کوئی معاملہ کرنے پر راضی ہو جائیں تو پھر وہ قانونی معاملہ ہو جاتا ہے، لیکن وہ دونوں اگر کسی ایسے معاملہ پر راضی ہو جائیں جو معاشرے کی تباہی کا سبب ہو، اس معاملے کی اجازت نہیں۔ مثلاً ''سود'' کے معاملے پر دو آدمی رضامندی سے معاملہ کرلیں تو چونکہ ''سود'' کے ذریعہ معاشی طور پر نقصانات پیدا ہوتے ہیں، تباہ کاریاں پیدا ہوتی ہیں، اس لئے شرعاً اس کی اجازت نہیں۔ اب ''سود'' کے ذریعہ معاشی طور پر کیا تباہ کاریاں پیدا ہوتی ہیں؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ لیکن میں آپ کے سامنے ایک سادہ سی مثال پیش کرتا ہوں جس سے ان تباہ کاریوں کا ذرا سا اشارہ ہو جائیگا۔

سود کے نظریئے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ایک شخص کی آمدنی یقینی اور دوسرے کی آمدنی خطرے میں ہے اور غیر یقینی ہے، مثلاً ایک شخص نے کسی سے سود پر قرض لیا، تو اب اس نے جس سے قرض لیا اس کو تو ایک متعین رقم بطور سود کے ضرور ادا کرنی ہے۔ اور جس نے قرض لیا ہے وہ اس قرض کی رقم سے جب کاروبار کرے گا تو ہوسکتا ہے اس کو کاروبار میں نفع ہو، اور ہوسکتا ہے کہ اس کو کاروبار میں نقصان ہو جائے۔ دونوں باتیں ہوسکتی ہیں اور اب جس صورت میں قرض لینے والا نقصان میں رہا، اس صورت میں بھی ۱۶ فیصد قرض دینے والے بینک یا ادارے کو ادا کرنا اس کے ذمہ ضروری اور لازم ہے، لہٰذا قرض لینے والا نقصان میں رہا، اور بعض مرتبہ اس کے برعکس قرض دینے والا نقصان میں ہوتا ہے اور قرض لینے والا فائدہ میں رہتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے بینک سے سود پر دس کروڑ روپیہ قرض لیا اور اس سے کاروبار شروع کیا بہت سی تجارتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں سو فیصد بھی نفع ہوتا ہے، فرض کریں کہ اس شخص کو دس کروڑ پر پچاس فیصد نفع ہوا، اب وہ بینک کو صرف سود کی متعین شرح مثلاً 15% اس نفع میں سے بینک کو ادا کرے گا اور باقی پورا 35 فیصد خود اس کی جیب میں چلا گیا، اب یہ دیکھئے کہ جو اس نے تجارت کی وہ پیسہ کس کا تھا؟ وہ تو عوام کا تھا اور اس کے ذریعہ جو نفع کمایا اس کا 35% نفع صرف ایک شخص کی جیب

میں چلا گیا جس نے تجارت کی اور صرف 15% بینک کے پاس پہنچا اور پھر بینک نے اس میں سے اپنا حصہ نکالنے کے بعد بقیہ تھوڑا سا حصہ مثلاً دس فیصد تمام ڈیپازیٹر کے درمیان تقسیم کر دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کے پیسے سے جو 50% نفع ہوا تھا اس کا صرف دس فیصد عوام میں تقسیم ہوا اور 35% صرف ایک آدمی کی جیب میں چلا گیا اور عوام وہ دس فیصد لیکر بہت خوش ہے کہ ہم نے بینک میں سو روپے رکھوائے تھے اور اب سال بھر کے بعد ایک سو دس ہو گئے لیکن اس بچارے کو یہ معلوم نہیں کہ یہ دس روپے پھر واپس اس سرمایہ دار تاجر کے پاس چلے جاتے ہیں، اس لئے کہ اس تاجر نے 15% بینک کو جو سود کی شکل میں دیا تھا وہ اس کو اپنی پروڈکشن کی لاگت میں شامل کرے گا اور لاگت میں شامل ہو کر اس کی قیمت کا حصہ بن جائے گا اور وہ قیمت پھر عوام سے وصول کرے گا۔ لہٰذا ہر اعتبار سے وہ فائدے میں رہا پھر اس کو نقصان کا بھی خطرہ نہیں اور اگر بالفرض اس کو نقصان ہو بھی جائے تو اس کی تلافی کے لئے انشورنس کمپنیاں موجود ہیں وہ انشورنس کمپنیاں جس میں ان عوام کے پیسے رکھے ہیں جو اپنی گاڑی اس وقت تک سڑک پر نہیں لا سکتے جب تک وہ انشورنس کی قسط (Premium) ادا نہ کرے۔ ان عوام کے پیسوں سے اس سرمایہ دار کے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے۔

بہر حال سودی نظام کے ظالمانہ طریقے کی طرف میں نے تھوڑا سا اشارہ کر دیا لہٰذا سود کے ذریعہ معیشت میں ناانصافی، ناہمواری پیدا ہونا لازمی ہے اس لئے شریعت نے اس کو منع کیا ہے۔

شرکت اور مضاربت کے فوائد

اب اگر یہی تجارت سود کے بجائے ''شرکت'' اور ''مضاربت'' کی بنیاد پر ہو تو اس صورت میں بینک اور سرمایہ لینے والے کے درمیان یہ معاہدہ نہیں ہوگا کہ یہ بینک کو 15% ادا کرے گا، بلکہ یہ معاہدہ ہوگا کہ یہ سرمایہ لینے والا جو کچھ نفع کمائے گا اس کا آدھا مثلاً بینک کو ادا کرے گا اور آدھا تجارت کرنے والے کا ہوگا، اب اگر پچاس فیصد نفع ہوا ہے تو پچیس فیصد بینک کو ملے گا اور پچیس فیصد اس کو ملے گا، اس طرح دولت کا رخ اوپر کے بجائے نیچے کی طرف ہوگا، اس لئے کہ بینک کے واسطے سے وہ پچیس فیصد ڈیپازیٹر کو ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''سود'' کا برا اثر تقسیم دولت پر بھی پڑتا ہے اور اس کے نتائج معیشت کی پشت پر نظر آتے ہیں۔

قمار حرام ہے

اسی طرح اسلام نے ''قمار'' کو حرام قرار دیا ہے، ''قمار'' کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص نے تو اپنا

پیسہ لگا دیا اب دو صورتیں ہوں گی یا تو جو پیسہ اس نے لگایا وہ بھی ڈوب گیا، یا اپنے ساتھ بہت بڑی دولت لے آیا، اس کو ''قمار'' کہتے ہیں، اس کی بے شمار شکلیں ہیں عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے اس مغربی نظام زندگی میں ''جوا'' (Gambling) کو بہت سے جگہوں پر قانون کے اندر ممنوع قرار دیا گیا ہے، لیکن جب (Gambling) مہذب شکل اختیار کر لیتی ہے تو پھر وہ جائز ہو جاتی ہے اور خلاف قانون نہیں رہتی، مثلاً ایک غریب آدمی سڑک کے کنارے ''جوا'' کھیل رہا ہے تو پولیس اس کو پکڑ کر لے جائے گی لیکن اگر ''جوا'' کو مہذب شکل دیدی جائے اور اس کے لئے کوئی ادارہ قائم کر لیا جائے اور اس کا کوئی دوسرا نام رکھ دیا جائے تو اس کو جائز سمجھا جاتا ہے، اس قسم کا ''قمار'' ہمارے سرمایہ دارانہ معاشرے میں پھیلا ہوا ہے، جس کے نتیجے میں بے شمار انسانوں سے پیسے جوڑ جوڑ کر ایک انسان پر اس کی بارش برسادی جاتی ہے، اس لئے یہ ''جوا'' شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

ذخیرہ اندوزی

اسی طرح ''احتکار'' (Hoarding) یعنی ذخیرہ اندوزی شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے، چونکہ ہر انسان اس کو جانتا ہے اس لئے اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح ''اکتناز'' یعنی انسان اپنا پیسہ اس طرح جوڑ جوڑ کر رکھے کہ اس پر جو شرعی فرائض ہیں ان کو ادا نہ کرے۔ مثلاً زکوٰۃ اور دیگر مالی حقوق ادا نہیں کرتا اس کو شریعت میں اکتناز کہتے ہیں اور شرعاً یہ بھی حرام اور ناجائز ہے۔

اور سنئے حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ)) (۱)

''کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے''

یعنی دیہاتی اپنا مال دیہات سے شہر میں بیچنے کے لئے لا رہا ہے اس وقت میں کسی شہری کے لئے جائز نہیں کہ وہ جا کر اس سے کہے کہ میں تمہارا مال فروخت کر دوں گا، بظاہر تو اس میں کوئی خرابی

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب النهی للبائع ان لا یحفل الابل والبقر ...... الخ، رقم: ۲۰۰۶، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم الخطبة علی خطبة اخیہ ..... الخ، رقم: ۲۵۳۳، سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله، باب ماجاء لا یبیع حاضر لباد، رقم: ۱۱۴۳، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب النهی ان یخطب الرجل علی خطبة اخیہ، رقم: ۳۱۸۷، سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی النهی ان یبیع حاضر لباد، رقم: ۲۹۸۳

نظر نہیں آتی، اس لئے کہ اس معاملے میں شہری بھی راضی اور دیہاتی بھی راضی، لیکن سرکار دو عالم ﷺ نے اس سے منع فرمادیا، اس لئے کہ شہری جب دیہاتی کا مال اپنے قبضہ میں کرلے گا تو وہ اس مال کو اس وقت تک روکے رکھے گا جب تک کہ بازار میں اس کی قیمت زیادہ نہ ہوجائے، اس لئے عام گرانی پیدا کرنے کا سبب بنے گا، اس کے برخلاف اگر دیہاتی خود اپنا مال شہر میں لاکر فروخت کرے گا تو ظاہر ہے کہ وہ بھی اپنے نقصان پر تو فروخت نہیں کرے گا لیکن اس کی خواہش یہ ہوگی کہ جلدی سے اپنا مال فروخت کرکے واپس اپنے گھر چلا جاؤں، تو اس طرح حقیقی طلب اور حقیقی رسد کے ذریعہ قیمتوں کا تعین ہوجائے گا اور اگر درمیان میں (Middleman) آگیا تو اس کی وجہ سے رسد اور طلب کی قوتوں کو آزادنہ کام کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور اس (Middleman) کی وجہ سے قیمت بڑھ جائے گی۔

اس لئے وہ تمام ذرائع اور تمام راستے جن کے ذریعہ معاشرے کو گرانی کا شکار ہونا پڑے اور جن کے ذریعے معاشرے کو ناانصافی کا شکار ہونا پڑے ان پر شرعی اعتبار سے پابندی عائد کی گئی ہے۔ بہرحال یہ پابندیوں کی پہلی قسم ہے جو اس آزاد معیشت پر شرعاً عائد کی گئی ہے۔

(۲) اخلاقی پابندی

آزاد معیشت پر شرعاً دوسری پابندی جو عائد کی گئی ہے اس کو ''اخلاقی پابندی'' کہتے ہیں، اس لئے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو شرعاً حرام تو نہیں اور نہ ان کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے، البتہ ان کی ترغیب ضرور دی ہے اور جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ اسلام ایک معاشی نظام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک دین ہے اور ایک نظام زندگی ہے جس میں سے پہلے یہ بات سکھائی جاتی ہے کہ انسان کا بنیادی مقصد آخرت کی بہبود ہے، لہٰذا اسلام یہ ترغیب دیتا ہے کہ اگر تم فلاں کام کروگے تو آخرت میں تمہیں بہت بڑا اجر ملے گا، اسلام ذاتی منافع کا محرک تو ہے لیکن وہ صرف دنیاوی منافع کمانے کی حد تک محدود نہیں، بلکہ ذاتی منافع میں آخرت کے منافع کو بھی لازماً شامل سمجھتا ہے، لہٰذا اسلام نے بہت سے احکام ہمیں اس بات کے دیئے ہیں کہ تمہیں دنیا میں اگرچہ نفع کچھ کم ملے لیکن آخرت میں اس کا نفع بہت ملے گا، مثلاً شرعاً یہ کہا گیا ہے کہ ہر وہ انسان جو اپنی معیشت کو کمانے کے لئے بازار میں نکلتا ہے اگر یہ نیت کرے کہ وہ اس لئے بازار میں نکلا ہے کہ معاشرے کی فلاں ضرورت کو پورا کروں گا تو اس کی اس نیت کی وجہ سے اس کا یہ سارا عمل عبادت بن جائے گا اور باعث اجر ہوجائے گا، اور پھر اس نقطہ نظر سے انسان اس چیز کا انتخاب کرے گا جس کی معاشرے کو ضرورت ہوگی، اور حقیقت میں

معاشرے کو دینی اعتبار سے ضرورت ہونی چاہئے، مثلاً فرض کریں کہ لوگ اگر رقص وسرور کے زیادہ شائق ہیں تو اس صورت میں کیپٹل ازم کا تصور تو یہ ہے کہ لوگ زیادہ منافع کمانے کے لئے ناچ گھر قائم کریں چونکہ طلب اس کی زیادہ ہے، لیکن اسلام کی اس دینی پابندی کے تحت اس کے لئے ناچ گھر قائم کرنا جائز نہیں، یا مثلاً ایک شخص یہ دیکھتا ہے کہ اگر میں فلاں کارخانہ میں لگاؤں گا تو اس میں مجھے منافع تو بہت ہوگا، لیکن اس وقت چونکہ رہائشی ضرورت کے لئے لوگوں کو مکانات کی ضرورت ہے اور اس میں منافع تو زیادہ نہیں ہوگا، لیکن لوگوں کی ضرورت تو پوری ہوگی تو اس وقت شریعت کی اس اخلاقی پابندی پر عمل کرنے کی وجہ سے آخرت کے منافع کا حق دار ہوگا۔

(۳) قانونی پابندی

تیسری پابندی ''قانونی پابندی'' ہے یعنی اسلام نے اسلامی حکومت کو یہ اختیار دیا ہے کہ جس مرحلے پر حکومت یہ محسوس کرے کہ معاشرے کو کسی خاص سمت پر ڈالنے کے لئے کوئی خاص پابندی عائد کرنے کی ضرورت ہے تو ایسے وقت میں حکومت کوئی حکم جاری کرسکتی ہے، اور پھر وہ حکم تمام انسانوں کے لئے قابل احترام ہے، چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ﴾(۱)

''یعنی اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی بھی اطاعت کرو اور اولی الامر یعنی اہل ریاست کی بھی اطاعت کرو''

اسی لئے فقہاء کرام نے فرمایا کہ اگر حاکم وقت جو صحیح معنی میں اسلامی حکومت کا سربراہ ہو اگر کسی مصلحت کی بنیاد پر یہ حکم دیدے کہ فلاں دن تمام لوگ روزہ رکھیں تو اس دن روزہ رکھنا پوری رعایا پر عملاً واجب ہوجائے گا اور اگر کوئی شخص روزہ نہیں رکھے تو عملی طور پر اس کو ایسا ہی گناہ ہوگا جیسے رمضان کا روزہ چھوڑنے کا گناہ ہوتا ہے اس لئے کہ اولی الامر کی اطاعت فرض ہے۔(۲)

اسی طرح فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر اولی الامر یہ حکم جاری کردے کہ لوگوں کے لئے خربوزہ کھانا منع ہے تو اب رعایا کے لئے خربوزہ کھانا حرام ہوجائے گا، بہرحال اولی الامر کو ان چیزوں کا اختیار دیا گیا ہے، بشرطیکہ وہ یہ احکام عام لوگوں کی مصلحت کے تحت جاری کرے، اب اس میں جزوی منصوبہ بندی بھی داخل ہے، مثلاً حکومت یہ کہہ دے کہ فلاں چیز میں لوگ سرمایہ کاری کریں اور فلاں چیز میں

---

(۱) النساء: ۵۹

(۲) فتاوی شامی (۴/۴۶۳) وروح المعانی (۵/۶۶)

سرمایہ کاری نہ کریں، تو حکومت حدود شرعیہ میں قانونی طور پر اس قسم کی پابندی عائد کرسکتی ہے۔

بہرحال کیپٹل ازم کے مقابلے میں اسلام کے معاشی نظام میں یہ بنیادی امتیاز اور فرق ہے اور یاد رکھئے کہ جہاں تک قانونی پابندی کا تعلق ہے یہ پابندی کیپٹل ازم میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن یہ پابندیاں انسانی ذہن کی پیداوار ہیں اور اسلام میں اصل امتیاز دینی پابندیوں کا ہے جو ''وحی'' کے ذریعہ مستفاد ہوتی ہیں، اور جس میں اللہ تعالیٰ جو پوری کائنات کا خالق اور مالک ہے وہ یہ ہدایت کرتا ہے کہ فلاں چیز تمہارے لئے مضر ہے اور منع ہے۔ درحقیقت یہ چیز ایسی ہے کہ جب تک انسانیت اس راستے پر نہیں آئے گی اس وقت تک انسانیت افراط وتفریط کا شکار رہے گی۔

بیشک اشتراکیت میدان میں شکست کھا گئی، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی جو خرابیاں تھیں یا اس کی جو ناانصافیاں اور ناہمواریاں تھیں کیا وہ ختم ہوگئیں؟ وہ یقیناً آج بھی اسی طرح برقرار ہیں اور ان کا حل اگر ہے تو وہ ان الٰہی پابندیوں میں ہے، اور ان الٰہی پابندیوں کی طرف آئے بغیر انسان کو سکون حاصل نہیں ہوسکتا، بس ہماری شامت اعمال یہ ہے کہ ابھی تک ان ''الٰہی پابندیوں'' پر مبنی معیشت کا کوئی عملی ڈھانچہ اور عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش نہیں کرسکے اور ہمارے ملک پاکستان کے سامنے یہی سب سے بڑا چیلنج ہے کہ وہ ان معاشی تعلیمات کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر کے دکھائے تاکہ دنیا کو پتہ چلے کہ حقیقت میں اسلامی معیشت کن بنیادی خصوصیات کی حامل ہے اور کس طرح ان کو اپنایا جاسکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے استحقاق سے زیادہ آپ حضرات کا وقت لے لیا اور اس بات کا بھی احساس ہے کہ ایک خشک موضوع کے اندر میں نے آپ کو مشغول رکھا اور میں آپ حضرات کے حسن سماعت کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے بڑے صبر وضبط اور تحمل کے ساتھ اس گفتگو کو سنا، اللہ تعالیٰ اس کو میرے لئے بھی اور سننے والوں کے لئے بھی مفید بنائے اور اس کے بہتر نتائج پیدا کرے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

☆☆☆

موجودہ جاگیری نظام کی تاریخ اور ابتداء ☆

پچھلی چند صدیوں سے پہلے یورپ میں اور پھر بعد میں ایشائی ممالک میں بھی ایک خاص قسم کا معاشی اور سیاسی نظام جاری رہا ہے جس کو جاگیردارانہ نظام کہتے ہیں۔

اس جاگیری نظام میں طرح طرح کے معاشی اور سیاسی مفاسد لوگوں کے سامنے آئے اس کی بنا پر جاگیردارانہ نظام بہت بدنام ہوا اور جاگیری نظام کے خلاف پورا علم بغاوت بلند ہوا اور زمین کی ملکیت کا سرے سے ہی انکار کر دیا۔

اس موقع پر اشتراکیت نے جاگیردارانہ نظام کو اور زیادہ بدنام کر دیا تھا، تو جب یہ ذکر آیا کہ اسلام میں عطاء جاگیر کی کوئی حیثیت ہے یا نہیں؟ تو لوگوں نے سوچا کہ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام میں عطاء جاگیر کی کوئی گنجائش ہے تو یہ جاگیردارانہ نظام کی حمایت ہوگی اور اسلام کی طرف جاگیردارانہ نظام کی حمایت منسوب کرنا خود اسلام کو بدنام کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا انہوں نے دعویٰ کیا کہ اسلام میں جاگیردارانہ نظام کا کوئی تصور نہیں ہے اور عطاء جاگیر اسلام میں نہیں ہے۔

بعض لوگوں کی یہ ذہنیت ہے کہ جب کوئی نظریہ ایک دم بہت زور وشور کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو وہ یہ دیکھے بغیر کہ اسلام کی کیا تعلیمات ہیں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ نہیں جناب اسلام اس نظریہ کا قائل نہیں ہے۔ اور اس طرح اپنے ذہن اور خیال کے مطابق اسلام کی خدمت کرتے ہیں تاکہ اسلام کی بدنامی نہ ہو اور اس کے ماتھے پر داغ لگا ہوا ہے وہ دور کر دیا جائے، اس لئے یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ عطائے جاگیر اسلام میں ہے ہی نہیں، حالانکہ یہ تصور بالکل غلط ہے ابھی آپ نے احادیث میں دیکھا کہ انصار کو جاگیر دینے کا ذکر ہے، اسی طرح بے شمار جاگیریں مختلف زمانوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عطا فرمائی گئیں۔

مثلاً حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا بیت اللحم کا علاقہ دیدیا تھا، حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو یمن کا بہت بڑا علاقہ بطور جاگیر عطا فرمایا تھا، حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ اور حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو بہت بڑی جاگیر عطا کی، اور اسی طرح حضرات شیخین کو بھی عطا کی تھی، تو عطاء جاگیر کے بے شمار واقعات کتابوں میں موجود ہیں اور خاص طور سے امام ابو عبید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الاحوال، امام

☆ انعام الباری (۷/ ۶۱ تا ۷۲)، زیر نظر بیان صحیح بخاری شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے طلبہ کے سامنے موجودہ جاگیری نظام کی تاریخ اور ابتداء پر روشنی ڈالی ہے۔

یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الخراج، اور ابن آدم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الخراج میں عطاء جاگیر کے بے شمار واقعات موجود ہیں۔(۱)

یورپ کے جاگیری نظام کی حقیقت

اصل بات یہ ہے کہ لوگ صرف جاگیر کے لفظ کو پکڑ کر بیٹھ گئے اور یہ نہیں سمجھا کہ وہ جاگیری نظام جو یورپ سے شروع ہوا تھا اور جس کے بے شمار مفاسد سامنے آئے اس میں اور اسلام کی عطائے جاگیر میں کیا فرق ہے؟ لہٰذا یہ سمجھے بغیر انکار کر دیا کہ اسلام میں جاگیر کا کوئی تصور نہیں ہے۔

لہٰذا پہلے یہ سمجھئے کہ یورپ کا جاگیری نظام کیا تھا؟ وہ یہ تھا کہ جس شخص کو جاگیر دی جاتی تھی جاگیر دار بنایا جاتا تھا اس کو زمین بطور ملکیت نہیں دی جاتی تھی کہ یہ تمہاری زمین ہے بلکہ عام طور پر جاگیر دار سے یہ مطالبہ ہوتا تھا کہ ایک مخصوص علاقے کے لوگوں کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ سارے علاقے کی زمینوں کی لگان، خراج لینے کا آپ کو حق حاصل ہے، مثلاً یہ کہہ دیا کہ کراچی کے آس پاس جتنے دیہات ہیں ان پر جتنی زمینیں ہیں ان پر جو لوگ کاشت کاری کرتے ہیں ان سے حکومت کے بجائے آپ خراج وصول کریں اور اس خراج کی تعین بھی وہی کرتے تھے اور انہی کو یہ حق حاصل تھا کہ کون سی زمین سے کتنا خراج وصول کرنا ہے اور عام طور سے یہ ہوتا تھا کہ یہ جاگیریں اس وقت اس کو دی جاتی تھیں جس نے حکومت کے لئے کوئی خدمات انجام دی ہوں، اس وقت بادشاہت کا دور تھا عموماً بادشاہ اپنے دوستوں اور بڑے بڑے فوجی افسروں کو یہ جاگیریں دیتے تھے، بادشاہ نے جس کو نواز دیا کہ اتنی جاگیر ہم نے تم کو دیدی ہے لہٰذا یہاں کے علاقے کا خراج تم وصول کرو، لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کی جاتی تھی کہ جب کبھی حکومت کو جنگ وغیرہ کے موقع پر لڑنے والوں کی ضرورت پیش آئے گی تو اپنی جاگیر کے علاقے میں سے آپ اتنے افراد حکومت کو جنگ کے لئے فراہم کریں گے۔ مثلاً کسی کو کہہ دیا کہ ہم نے تم کو اپنی جاگیر فراہم کی ہے لیکن جب ہمیں ضرورت پیش آئے گی تو دس ہزار آدمی یا پانچ ہزار آدمی تم لیکر آؤ گے، باقی جس طرح چاہو تم ان لوگوں سے خراج وصول کرو، جتنا چاہو وصول کرو اور جو تم وصول کرو گے وہ تمہاری ملکیت ہوگا۔

ہمارے ہاں یہ اصطلاحات مشہور تھیں یہ دس ہزاری جاگیر دار ہے، یہ پانچ ہزاری جاگیر دار ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ جو جنگ کے موقع پر دس ہزار آدمی فراہم کرتا ہے وہ دس ہزاری جاگیر دار ہے اور جو پانچ ہزار آدمی فراہم کرتا ہے وہ پانچ ہزاری جاگیر دار ہے۔ اس میں یہ ہوتا تھا کہ خراج کی

---

(۱) كتاب الخراج للقاضي ابي يوسف يعقوب بن ابراهيم، ص: ٦٢ تا ٧١

مقدار کے تعین کے حقوق بھی ان کو حاصل تھے تو بسااوقات اپنے مفاد کی خاطر کاشتکاروں کے اوپر زیادہ خراج عائد کردیتے تھے اور چونکہ کاشتکار یہ سمجھتے تھے کہ خراج عائد کرنا ان لوگوں کا کام ہے اور اگر ہم نے ذرا سا بھی ان کے چشم ابرو کے خلاف کام کیا تو ہمارا خراج بڑھادیں گے اور خراج بڑھنے کے نتیجے میں ہمارے لئے زندہ رہنا مشکل ہوجائے گا اور زندگی دوبھر ہوجائے گی۔ لہٰذا وہ ان کے ہر حکم کی اطاعت کرتے تھے اور وہ ان کے اوپر طرح طرح کے بیگار عائد کرتے تھے یہ کرو وہ کرو۔ اگر وہ نہ کریں تو یہ خراج بڑھادیتے تھے، درحقیقت ان کی حیثیت غلاموں جیسی ہوگئی تھی اس واسطے ان کو اصطلاح میں رعیت کہا جاتا تھا، وہ بیچارے کاشتکار ان کا ہر حکم ماننے کے پابند ہوتے تھے اور یہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہتے تھے کام لیتے اور ان سے خراج وصول کرتے۔

اس کا نقصان یہ ہوا کہ جب ان کے قبضے میں اتنی بڑی مخلوق آگئی جو ان کی رعیت ہے اور وہ غلاموں جیسی ہے تو گویا یہ ان کا لشکر ہے، اور ان کا بادشاہ سے وعدہ بھی ہوتا تھا کہ جنگ کے موقع پر ضرورت کے وقت بادشاہ کو دس ہزار آدمی فراہم کریں گے، تو اس طرح ایک آدمی دس ہزار کے لشکر کا مالک ہے، کوئی بیس ہزار کے لشکر کا مالک ہے تو ان کی حیثیت اپنے علاقے میں بادشاہ جیسی ہوتی تھی، جب بادشاہ جیسی حیثیت ہوگئی تو گویا اندرون ملک ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں اور ان کی دفاعی اور سیاسی قوت بھی بہت زیادہ مضبوط ہوگئی، تو اب یہ چونکہ بڑے مستحکم اور مضبوط ہوگئے اور سیاسی اعتبار سے ان کا مرتبہ ہوگیا اب یہ بادشاہ کو بھی آنکھیں دکھانے لگے کہ اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو ہم تم سے بغاوت کردیں گے، اتنا لشکر ہمارے پاس موجود ہے اور بغاوت کرکے ہم اپنی الگ سلطنت بنالیں گے۔

لہٰذا یہ جاگیردار بادشاہ کے اوپر مسلط ہوگئے اور اگر آٹھ دس جاگیردار آپس میں مل جاتے تھے تو بادشاہ ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا تھا، اور ان کی ہر خواہش پوری کرنے اور ہر حکم ماننے پر مجبور ہوجاتا تھا وہ جو چاہتے بادشاہ سے منوالیتے تھے تو بادشاہ گویا ان کا تابع ہوگیا۔ لہٰذا ان جاگیرداروں نے ایک طرف تو اپنے زیر جاگیر لوگوں کو رعیت اور غلام بنایا ہوا ہے اور دوسری طرف بادشاہ کو بھی آنکھیں دکھارہے ہیں اور اس کے ساتھ من مانی کررہے ہیں اس سے اپنے مفادات اور مرضی کے خلاف فیصلے کرارہے ہیں تو یہ ہے یورپ کا وہ جاگیرداری نظام جو ایک عرصہ تک یورپ میں رہا۔

اور اس کے اثرات ہمارے ہندوستان اور پاکستان میں بھی آئے اور اس کا باقی ماندہ اثر بلوچستان میں سرداری نظام کی صورت میں ہے کہ جو سردار ہوتا ہے وہ ایک طرح سے (اللہ بچائے) اپنے زیر جاگیر لوگوں کے لئے خدا بنا بیٹھا ہے کہ ان سے خراج وصول کرتا ہے، آج بھی بلوچستان میں کاشتکار اپنی پیداوار کا چھٹا حصہ جاگیردار کو بطور خراج دیتا ہے جسے وہ ''ششک'' کہتے ہیں۔ اور تمام

لوگ جاگیر کے تحت ہیں وہ اس کے غلام ہیں اور سرداروں نے یہ کام کر رکھا ہے کہ ہمارے زیر جاگیر لوگ کسی طرح تعلیم حاصل نہ کر پائیں، کیونکہ انہوں نے اگر تعلیم حاصل کر لی تو یہ ہمارے مطیع اور ہمارے فرمانبردار نہیں رہیں گے، اس لئے ان کی پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ یہاں کوئی تعلیمی ادارہ نہ بنے اور کوئی سڑک نہ بنے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں تعلیم وتمدن آجائے اور یہ دونوں چیزیں آنے کی صورت میں یہ اپنے آپ کو غلام سمجھنا چھوڑ دیں گے۔ یہ سارے فسادات اس سے پھیلے۔

یہ وہ جاگیرداری نظام تھا جس کے خلاف مزاحمت کا رویہ پیدا ہوا اور بالآخر یورپ میں ختم ہوا اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی ختم ہوا۔ اس کے خلاف بڑی نفرت پیدا ہوئی، اور بعض جگہوں میں ابھی تک باقی ہے اور نفرت بھی باقی ہے۔

اسلام میں عطاء جاگیر کا مطلب

اس کے برخلاف اسلام میں عطاء جاگیر کا معنی یہ ہے کہ تین صورتوں میں کسی کو جاگیر دی جاسکتی ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو ارض موات دیدی گئی یعنی بنجر زمین دی گئی اور کہا گیا کہ تم اس کو آباد کر کے اپنی ملکیت میں لے آؤ۔ اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ اس کو تین سال کے اندر اندر آباد کریں، اگر اس نے تین سال کے اندر آباد کر لیا تب تو وہ اس کا مالک بن جائے گا اور اگر وہ تین سال کے اندر اندر اس کو آباد نہ کر سکا تو جاگیر ختم، پھر وہ اس کو نہیں لے سکتا۔

آپ دیکھیں گے کہ اگر اس شرط پر کسی کو جاگیر دی جائے کہ تم اس کو تین سال کے اندر اندر آباد کرلو تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بنجر زمینیں آباد ہوں گی اور ملک کی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ آدمی خود تنہا اس کو آباد نہیں کرسکتا، اس کو کچھ مزدور رکھنے پڑیں گے تو لوگوں کو روزگار ملے گا اور اگر تین سال میں یہ فوائد حاصل نہ ہوئے تو جاگیر ختم واپس لیکر کسی اور کو دی جائے گی۔ تو اس میں مفاسد ہونے کا احتمال ہی نہیں۔

حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاگیر عطا فرمائی، انہوں نے کچھ حصہ تو آباد کیا اور زیادہ تر حصہ آباد نہ کر سکے، لہٰذا بعد میں وہ جاگیر ان سے واپس لے لی گئی۔

بعض لوگ تحدید ملکیت والے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جاگیر واپس لے لی تو وہ اس لئے واپس لی کہ انہوں نے تین سال تک انہیں آباد نہیں کیا اگر آباد کی ہوتی تو واپس نہ لیتے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی زمین جو سرکاری ملکیت ہے بطور حصہ دیدی جائے،

اسلام میں بنجر زمین سرکاری ملکیت نہیں ہوتی، سرکاری زمین وہ ہوتی ہے جس بنجر زمین کو سرکار نے آباد کیا، ان زمینوں میں سے کوئی زمین کسی کو بطور مالکانہ حقوق کے ساتھ دیدی جائے کہ ہم تمہیں یہ زمین مالکانہ حقوق کے ساتھ دیدیتے ہیں تم اس کو استعمال کرو اس میں یہ قید نہیں ہوتی کہ تین سال تک آباد نہ کی تو واپس لے لی جائے گی۔ لیکن اس قسم کی جاگیر صرف اراضی سلطانیہ میں ہوسکتی ہے جس کی مالک صرف حکومت ہو، لیکن ایسی اراضی سلطانیہ جو حکومت نے پہلے سے آباد کر کے اپنی ملکیت بنا رکھی ہیں ان کی مقدار اتنی کم ہوتی ہے کہ ان کو بڑے پیمانہ پر کسی کو بطور جاگیر دینا ممکن نہیں ہوتا، کیونکہ ملکیت جس زمین کو آباد کرتی ہے تو وہ اپنے کس مقصد کے تحت کرتی ہے اور وہ زمین اس مقصد میں لگی ہوتی ہے تو ایسی اراضی جو حکومت نے آباد کی ہوں اور وہ حکومت کی ضرورت سے زائد ہوں، فالتو ہوں، ایسا بہت کم ہوتا ہے بلکہ اکثر نہیں ہوتا۔ اگر ہوں گی تو بہت کم ہوں گی اور اگر کسی کو دی جائے گی تو بہت تھوڑی سی زمین دی جائے گی اور اس میں بھی امام اس بات کا پابند ہے کہ مصلحت عامہ کو مدنظر رکھے یہ نہیں کہ کسی کو رشوت میں دیدی، یا کسی کو نواز دیا بلکہ جہاں واقعی کوئی شخص حاجت مند ہے اس کو دیں۔ غریب لوگوں کو یا کسی کی خدمات کے صلے میں دیں، ویسے ہی بغیر کسی مصلحت کے دے دینا امام کے لئے جائز نہیں۔ اور جو دے گا اس کی مقدار بھی کم ہوگی کیونکہ اراضی سلطانیہ کی مقدار کم ہوتی ہے، غلطی یہاں سے لگتی ہے کہ لوگ اراضی سلطانیہ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ جو بھی غیر آباد زمین پڑی ہوئی ہے وہ حکومت کی ملکیت ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ زمین کی ملکیت اور مالکانہ حقوق تو نہیں دیئے لیکن زمین کی منفعت دیدی کہ زمین تو سرکار کی ہے تم اس میں معین مدت تک کاشت کر کے پیسے حاصل کر سکتے ہو، یہ دوسری قسم سے بھی اضعف ہے، اس پر بھی وہ ساری حدود وقیود عائد ہیں جو دوسری قسم پر تھیں اور یہ کام بھی بڑے پیمانہ پر نہیں ہوسکتا اس کی تعداد بھی محدود رہے گی۔

اور چوتھی صورت جو یورپ وغیرہ میں تھی کہ خراج وصول کرنے کا مالک بنادیا، اسلام میں یہ جائز نہیں جب تک مقطع لہ یعنی جاگیردار مستحق زکوٰۃ نہ ہو، اگر وہ مستحق زکوٰۃ ہے تب یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم فلاں زمین کا عشر وصول کرنا، لیکن اگر وہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہے تب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تم فلاں زمین کا عشر وصول کرنا کیونکہ عشر کا مصرف مستحقین زکوٰۃ اور فقراء ہیں۔

فرض کریں اگر کسی کو کہہ دیا کہ تم وہاں کا عشر وصول کرو اور وہ مستحق زکوٰۃ تھا، جونہی وہ عشر وصول کرنے کے بعد صاحب نصاب بنا، اگلے سال اس کو عشر وصول کرنے کا حق نہیں رہے گا تو یہ جاگیر چل ہی نہیں سکتی۔

پہلی تین قسمیں ہوسکتی ہیں ان میں سے دو قسمیں بڑی محدود ہیں، اگر زیادہ بڑے پیمانے پر

ہوسکتی ہے تو پہلی قسم ہے یعنی ارض موات۔ لہٰذا اسلام میں جو زیادہ تر زمین دی گئی وہ ارض موات ہی تھی اور اس میں اس بات کی پابندی تھی کہ تین سال کے اندر اندر خود آباد کریں۔

یہاں ایک بات اور سمجھ لیں کہ ارض موات کو یا آدمی خود کاشت کر کے آباد کرے یا مزدوری کے ذریعہ اجرت پر کرائے پر دے تو ٹھیک ہے، لیکن اگر کسی ایسے شخص نے جس کو ارض موات دی گئی تھی اس نے خود کاشت کرنے یا اپنے مزدوروں سے کاشت کرانے کے بجائے وہ زمین مزارعت پر دیدی، بٹائی پر دیدی اور کاشتکاروں سے کہا تم اس کو آباد کرو جو کچھ پیداوار ہوگی وہ میرے اور تمہارے درمیان تقسیم ہوگی تو یہ عقد مزارعت فاسد ہے۔ اس لئے کہ یہ عقد مزارعت کے لئے ضروری ہے کہ آدمی زمین کا مالک ہو پھر کاشتکار سے عقد مزارعت کرسکتا ہے، ابھی جبکہ زمین آباد نہیں ہوئی تو وہ اس کا مالک نہیں بنا اور جب مالک نہیں بنا تو عقد مزارعت کیسا؟

لہٰذا اس صورت میں جو کاشتکار کام کر کے آباد کرے گا وہی اس کا مالک بن جائے گا، جاگیردار مالک نہیں بنے گا جو کاشتکار عملاً کام کرے گا "مَنْ أَحْيٰى أَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهُ" (۱) کے اصول کے مطابق وہی مالک بنے گا، جاگیردار اس صورت میں فائدہ اٹھا سکتا ہے جب وہ خود آباد کرے یا اجرت دے کر مزدوروں سے آباد کرائے ورنہ مالک نہیں بنے گا۔

اس نظام کے تحت جو صدیوں سے مسلمانوں کے اندر جاری رہا اور اس کے نتیجے میں بڑی بڑی زمینیں لوگوں کے پاس آئیں، لیکن اس قسم کا کوئی مفسدہ پیدا نہیں ہوا جو جاگیرداری نظام کے مفاسد میں شمار کیا جاتا ہے، بلکہ اس سے فائدہ ہوا ہے کہ غیر آباد زمینیں آباد ہوئیں، ملکی پیداوار میں اضافہ ہوا، لوگوں کے روزگار اور عشر وخراج کی مقدار زیادہ ہوئی جس سے فقراء اور مساکین کو فائدہ پہنچا۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان جاگیرداروں نے کوئی ایسا تسلط حاصل کرلیا ہو جس کی بنیاد پر وہ امراء اور خلفاء کو اپنے فیصلوں کا تابع بنائیں، نہ سیاسی مفاسد پیدا ہوئے اور نہ معاشی مفاسد پیدا ہوئے۔

اس لئے اسلام میں عطاء جاگیر کا جو تصور ہے وہ اس عطاء جاگیر سے بالکل مختلف ہے جو یورپ میں شروع ہوا اور بعد میں ایشیاء میں پھیلا، البتہ پاکستان، ہندوستان اور برصغیر میں چونکہ مدتوں تک انگریز کا تسلط اور انگریز کے اثرات رہے اس وجہ سے اس میں کوئی شک نہیں، یہاں بعض علاقوں میں اس قسم کا جاگیرداری نظام رائج رہا جو یورپ میں تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ سرداری نظام اسی قسم کے نظام کے باقی ماندہ اثرات ہیں جن کو ختم کرنا ضروری ہے۔

(۱) سنن الترمذي، كتاب الأحكام عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما ذكر في إحياء أرض الموات، رقم: ۱۲۹۹؛ سنن أبي داؤد، كتاب الخراج والإمارة والفيء، رقم: ۲٦۷۱، مسند أحمد، رقم: ۱٤۱۰۹، مؤطا امام مالك، كتاب الأقضية، باب القضاء في عمارة الموات، رقم: ۱۲۲۹

انگریزوں کی عطاء جاگیریں

انگریز کے زمانے میں لوگوں کو بہت سی ایسی جاگیریں عطا کی گئی جو اسلام میں پہلی قسم کی ہیں یعنی بنجر زمین کے مالکانہ حقوق کے ساتھ دی گئیں۔اس کے دو پہلو ہیں:

بعض مرتبہ وہ اراضی بطور رشوت دی گئیں اور رشوت بھی مسلمانوں سے غداری کرنے پر مسلمان انگریز کو ملک سے نکالنے کے لئے جدوجہد میں مصروف تھے، انگریز نے مسلمانوں میں ہی کچھ لوگوں کو ان کا جاسوس مقرر رکھا تھا وہ مسلمانوں سے غداری کر کے انگریز کو خبریں پہنچایا کرتے تھے کہ فلاں لوگ آپ کے خلاف یہ سازش کر رہے ہیں، انگریز کے ہاں اس جاسوسی کی بڑی قیمت تھی، اس غداری کے نتیجے میں بطور رشوت یا بطور اجرت (اسلامی نقطہ نظر سے وہ رشوت ہی ہے کیونکہ وہ مسلمانوں سے غداری کی اجرت ہے) ان کی زمینیں اور جاگیریں دی گئیں۔

غداری کے نتیجے میں دی گئیں جاگیروں کا حکم؟

اس طرح غداری کے عوض جو زمینیں یا جاگیریں دی گئیں شرعاً ان کا جاگیرداروں کو اپنے پاس رکھنا جائز ہی نہیں، اس لئے کہ معقود علیہ غداری ہے لہٰذا اس کی اجرت میں جو کچھ ملا وہ بھی حرام ہے ان کے لئے ان کو اپنے پاس رکھنا بھی حرام ہے۔البتہ اگر انہوں نے ان زمینوں کو آباد کرلیا ہو تو ان پر ان کی ملکیت ثابت ہو جائے گی یا نہیں؟ یہ بات محل نظر ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک احیاء سے مِلک تب آتی ہے جب حکومت نے اس کی اجازت دی ہو اور یہاں جو اجازت دی گئی وہ چونکہ غداری کے صلے میں ملی تھی اس لئے اس کا معتبر ہونا محل نظر ہے۔

انگریز کی طرف سے کسی خدمت کے صلے میں دی گئی جاگیر کا حکم

جو جاگیریں غداری کے نتیجے میں نہیں دی گئیں بلکہ انگریز کی حکومت تھی، حکومت کے بہت سے کام کرنے پڑتے تھے ضروری نہیں کہ غداری کے کام ہوں بلکہ مصلحت عامہ کے کام بھی ہوتے تھے، ان مصلحت عامہ کے کاموں کے صلے میں لوگوں کو جاگیریں دی گئیں۔اس طرح جو جاگیریں دی گئیں وہ صحیح ہیں لیکن اس میں اسلامی اعتبار سے شرط یہ ہے کہ جاگیردار نے اس کو اسلامی طریقہ سے آباد کرلیا ہو، اگر اس نے آباد کرلیا چاہے خود کیا ہو یا مزدوروں سے آباد کرالیا تو اس کی ملکیت صحیح ہوگئی، لیکن اگر آباد نہیں کیا تو جتنے حصے کو آباد نہیں کیا وہ اس کی ملکیت میں نہیں آیا۔

سرحد اور پنجاب کے شاملات کا حکم

آپ کو بتایا گیا ہے کہ سرحد اور پنجاب کے شاملات کے علاقے اسی قسم کے ہیں، انگریز نے نام لکھ دیئے کہ فلاں کے لئے ہے لیکن ان لوگوں نے اس میں آبادکاری کا کوئی کام نہیں کیا، اس لئے وہ ان کی ملکیت میں نہیں آئی لیکن جن کو آباد کرلیا وہ ان کی ملکیت میں آگئیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے دور میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ دوسری قسم بھی ملکیت میں نہیں آتی (جن کو آباد کرلیا ہو) اور اس کے لئے دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ ساری زمینیں مسلمانوں کی تھیں، انگریز کے قبضے سے پہلے مسلمانوں کی حکومت تھی اس لئے ساری زمینیں مسلمانوں کی تھیں، انگریز نے جو قبضہ کیا وہ ناحق تھا، جب قبضہ ناحق تھا تو کسی کو جاگیر دینے کا بھی کوئی حق نہ تھا، اگر کسی کو دے گا تو وہ اس کا مالک نہیں بنے گا۔

لیکن درحقیقت یہ دلیل درست نہیں، یہ جذباتی دلیل ہے فقہی دلیل نہیں، اس لئے کہ فقہ کا مسلمہ اصول ہے، اس طور پر حنفیہ کے نزدیک کہ اگر مسلمانوں کی زمینوں پر کافروں کا استیلاء ہوجائے تو کافر اس کا مالک بن جاتے ہیں، استیلاء کفار موجب ملک ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے ان فقراء کو جو مکہ مکرمہ میں بڑی بڑی جائیدادیں چھوڑ کر آئے تھے فقراء قرار دیا، اس واسطے کہ ان کی ملکیت میں کچھ بھی نہیں حالانکہ وہاں بڑی بڑی جائیدادیں چھوڑ کے آئے تھے جن پر مشرکین قابض ہوگئے تھے۔

معلوم ہوا کہ مشرکین کے اس قبضے کو اسلام نے تسلیم کر کے یہ کہہ دیا کہ یہ ان کی ملکیت سے نکل گئیں، تو استیلاء کفار موجب ملک ہوتا ہے، انگریز جب پاکستان اور ہندوستان کی اراضی پر قابض ہوا تو وہ اراضی اس کی ملکیت میں آگئیں، اب وہ جس کو دیں وہ اس کا ملک ہوجائے گا جبکہ مشروع طریقہ سے دینا ہو، بطور رشوت یا غداری کی اجرت کے طور پر نہ ہو اور یہ جو زمین اور جاگیریں ہیں ان میں دونوں قسم کی ہیں، بعض وہ ہیں جو غداری کے صلے میں دی گئی ہیں اور بعض وہ ہیں جو صحیح خدمات کے صلے میں دی گئی ہیں۔

کیا انگریزوں کی عطا کردہ سب جاگیریں غلط ہیں؟

لہٰذا یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ انگریزوں نے جتنی جاگیریں دی ہیں سب غلط ہیں سب سے

واپس لینی چاہئے، یہ بات شرعی اعتبار سے بھی درست نہیں، اس کا مطلب ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پیس دیا جائے جو جائز طریقے سے مالک بنے ہیں ان کو محروم کر دیا جائے یہ بات درست نہیں۔

ہمارے ملک میں جتنی سیاسی پارٹیاں ہیں وہ ان احکام کو مدنظر رکھے بغیر سب نے بلا استثناء کہہ دیا کہ سب سے واپس لے لی جائیں گی، چاہے یہ بات دینی جماعتوں نے لکھی ہے تو یہ بات شرعی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے بلکہ اس تفصیل کے مطابق درست ہوگی کہ جن کے بارے میں یہ بات ثابت ہو جائے کہ انہوں نے غداری کر کے حاصل کی ہیں ان سے ساری واپس لے لو۔

یہ عجیب قصہ ہے کہتے ہیں کہ سو ایکڑ چھوڑ دیں گے باقی واپس لے لیں گے، پچاس ایکڑ چھوڑ دیں گے اور باقی واپس لے لیں گے۔ اگر حرام ہے تو پوری حرام ہے اور اگر حلال ہے تو پوری حلال ہے، اس میں سو ایکڑ اور پچاس ایکڑ کا کوئی معنی نہیں، اگر کسی نے غداری کے عوض لی ہے تو سو ایکڑ کیا ایک انچ زمین بھی اس کے پاس چھوڑنا حرام ہے، اور اگر کسی نے حلال طریقے سے حاصل کی ہے تو وہ ہزار ایکڑ ہو تب بھی اس کے لئے جائز ہے۔ اس واسطے جو سیاسی پروپیگنڈہ ہے اس کا فقہی اور شرعی احکام سے کوئی تعلق نہیں، حقیقت حال وہ ہے جو عرض کر دی گئی۔

مزارعت کا حکم

بعض لوگ جاگیری نظام کے مفاسد کا ذکر کرتے ہوئے مزارعت کو بھی لپیٹ میں لیکر یہ کہتے ہیں کہ زمیندارانہ نظام بھی ختم کرنا چاہئے۔ حالانکہ زمیندارانہ نظام کی جو خرابیاں ہیں وہ درحقیقت زمیندارانہ نظام کی خرابیاں نہیں ہیں بلکہ افراد کے غیر شرعی طرز عمل کی خرابیاں ہیں۔

ہمارے بعض معاشروں میں خاص طور سے پنجاب یا سرحد کے بعض علاقوں میں ہوتا ہے کہ زمیندار ناجائز شرطیں عائد کرتا ہے کہ ہم تمہیں زمین کاشت کے لئے مزارعت پر دے رہے ہیں لیکن تمہیں فلاں فلاں شرطوں کی پابندی کرنی ہوگی، ہماری بیٹی کی شادی ہوگی تو تمہیں اتنا غلہ فراہم ہوگا، ہمارے بچے کی ختنہ ہوگی تو تمہیں اتنا گھی لا کر دینا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اور بیگار یعنی ایسی محنت جس کا کوئی صلہ نہیں وہ ان پر عائد کی جاتی ہے، مثلاً ہم کوٹھی بنا رہے ہیں ہمارے گھر کی تعمیر کرو، کوئی صلہ یا اجرت نہیں، تو اس قسم کی باتیں ہیں جو ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں اور زمیندارانہ نظام کو خراب کر دیا ہے۔

دوسرا یہ کہ مزارع کا سماجی رتبہ بہت فروتر بنایا ہوا ہے، یہاں تک کہ پنجاب میں اس کو "کمی" کہتے ہیں، کمی کے معنی ہیں کمینہ تو کاشت کار کا نام کمی ہے کہا جاتا ہے کہ یہ تو ہمارا کمی ہے، اس کو حقیر

اور ذلیل سمجھ کر اس کی بے عزتی کی جاتی ہے یہ سب باتیں ناجائز اور حرام ہیں، نفس مزارعت کے اندر کوئی خرابی نہیں اگر دو آدمیوں کے درمیان برادری کی بنیاد پر معاملہ ہو جیسا کہ دو شریکوں کے درمیان معاملہ ہوتا ہے، خرابی ان شرائط فاسدہ کی وجہ سے ہے ان شرائط فاسدہ کو دور کرنا چاہئے۔

سودی رہن رکھنا

ایک بہت بڑا رواج سودی رہن کا ہے، قرضہ لیا اور زمین رہن رکھ لی، قرض دینے والا اس میں کاشت کر رہا ہے اور قرضے سے کئی گنا زیادہ اس زمین سے وصول کر چکا لیکن پھر بھی زمین نہیں چھوڑ رہا۔ اس قسم کے مسائل ہیں جنہوں نے ہمارے نظام اراضی کو خراب کیا ہے اور اشتراکیت کا پروپیگنڈہ ہے کہ زمین داری نظام ہی غلط ہے، اس سے مرعوب ہونے کے بجائے نظام اراضی کی اصلاح کا جو صحیح طریقہ شریعت نے مقرر کیا ہے اختیار کرنا چاہئے۔

اس موقع پر ایک سوال ہے کہ اندرون سندھ میں حکومت پاکستان کی طرف سے ہاریوں میں زمینیں تقسیم کی جاتی ہیں جب حکومت بدلتی ہے تو نئی حکومت ان زمینوں کو دوبارہ ضبط کر لیتی ہے اور اپنے بعض حامیوں کو دے دیتی ہے، نیز بعض دفعہ بنجر زمینیں بھی ہوتی ہیں جن کو سلطان نے آباد نہیں کیا ایسی زمینیں دینا جائز ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب حکومت بنجر زمین دے رہی ہے تو اس کو لینا اور آباد کرنا جائز ہے اور آباد کرنے سے وہ مالک ہو جائے گا، اس کے بعد اگر دوسری حکومت واپس لے گی تو اس کے لئے وہ لینا شرعاً جائز نہیں ہم نے سپریم کورٹ میں یہ فیصلہ دیدیا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے تو وہ عدالت میں دعویٰ کر کے واپس لے سکتا ہے۔ (۱)

زمین میں وراثت جاری ہونے کا مسئلہ

ایک اہم بات یہ ہے کہ ہمارے نظام اراضی میں ایک بہت بڑا فساد وراثت کے جاری نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، خاص طور پر پنجاب میں وراثت کے شرعی احکام زمینوں پر جاری نہیں کرتے، بیٹیوں کو زمینوں میں کبھی حصہ نہیں ملتا۔

تو زمینوں میں وراثت کے جاری نہ ہونے کے نتیجے میں زمینوں میں ارتکاز پیدا ہو گیا ہے، اگر وراثت کے شرعی احکام جاری ہوتے تو کبھی بھی اتنے بڑے بڑے رقبے ایک آدمی کی ملکیت نہ

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں ''عدالتی فیصلے'' (۲/۱۵تا۲۰۱)

رہتے، سوڈیڑھ سوسال کا عرصہ گزر چکا ہے، اگر اس میں وراثت جاری ہوئی ہوتی تو آج کسی کے پاس ایک ہزار ایکڑ زمین کا تصور بھی نہیں ہوتا بلکہ وہ خود بخود تقسیم ہو جاتی۔

آج بھی اگر کوئی اسلامی حکومت آئی تو اس پر واجب ہے کہ اس دن سے وراثت کے احکام جاری کرے اس لئے کہ جن لوگوں کے حقوق ختم کئے گئے، زائل کئے گئے یا مارے گئے ان کے حقوق مرور ایام سے ضائع نہیں ہوئے، اس لئے اس دن سے وراثت جاری ہوگی، اگر ایسا ہو جائے تو آپ دیکھیں کہ آج کسی کے پاس ایک ہزار ایکڑ تو درکنار، پانچ سو ایکڑ بھی نہیں ہوگی۔

اسلام نے گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تحدید ملکیت نہیں کی، اس واسطے کہ گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے جو تحدید کی جاتی ہے وہ کبھی نہیں چلتی، ایوب خان نے کی، پھر بھٹو صاحب نے کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرنے والوں نے یہ کیا کہ ٹھیک ہے بھائی پہلے یہ ہوا تھا کہ ایک ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں ہو سکتی تھی، اب جس کے پاس پانچ ہزار ایکڑ ہے اس نے چار ہزار ایکڑ اپنے ان چار ہاریوں کے نام کر دیں جن بے چاروں کو پتہ تک نہیں کہ یہ ان کے نام ہے، ان سے کہا گیا کہ یہاں انگوٹھا لگا دیں انہوں نے انگوٹھا لگا دیا کہ میں نے ایک ہزار ایکڑ وصول کر لی، اب وہ اس کے نام پر آ گئی، نام بدل گئے لیکن ہے وہ پانچ ہزار اسی کی۔

بھٹو صاحب مرحوم نے سو ایکڑ تک کی تحدید کر دی، اس نے دس ہاریوں کے نام کر دی، تو اس کے پاس تو پانچ ہزار ایکڑ ہی رہی لیکن نام بدل گئے، تو گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے جو تحدید ہوتی ہے وہ سوائے فراڈ کے اور کچھ نہیں ہوتا، اسلام نے گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تحدید نہیں کی لیکن نظام ایسا بنایا ہے کہ مآل کار کوئی آدمی زیادہ رقبہ کا مالک نہیں رہ سکتا۔

جب میراث جاری ہوگی تو ایک آدمی کے انتقال سے ایک رقبہ زمین آٹھ دس حصوں میں تقسیم ہو جائے گی اور اس کا بھی انتقال ہو گیا تو اور زیادہ تقسیم ہو جائے گی تو اس طرح کبھی بڑا رقبہ ایک آدمی کی ملکیت نہیں رہ سکتا، جس کے نتیجے میں مفاسد جو آج پیدا ہو رہے ہیں یہ پیدا نہیں ہوں گے۔

آج شریعت کے احکام پر کوئی عمل نہیں کرتا اور کہتے ہیں کہ گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تقسیم کردو اور باقی چھین لو جس کا نہ شرعی جواز ہے اور نہ ہی یہ مسئلہ کا صحیح حل ہے۔

اس موقع پر سوال اٹھتا ہے کہ اگر ایک حکومت سے کم قیمت میں یا ناجائز طریقہ سے کوئی زمین حاصل کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ ہر زمین کی سرکاری طور پر کچھ قیمت متعین ہوتی ہے، اگر امام سرکاری قیمت کے مطابق دے تو یہ جائز ہے، بشرطیکہ وہ بازار کی زمینوں سے غبن فاحش نہ ہو، لیکن اگر غبن فاحش کے ساتھ سستی قیمت پر دیدے، اگر دے گا تو وہ

ناجائز ہوگا اور اگر کسی نے رشوت کے طور پر لی ہے تو وہ بطریق اولیٰ ناجائز ہے جائز نہیں۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ انگریز نے لوگوں کو جو زمین دی ہے یہ تقریباً ایک صدی قبل کا واقعہ ہے اور انگریز رخصت ہو چکا ہے، آج کے دور میں اس عطاء کے گواہ اور ریکارڈ بھی نہیں ہیں؟

اس کے جواب میں کہوں گا کہ میں نے ذاتی طور پر اس کی تحقیق کی ہے ایک ایک زمین اور ایک ایک چپہ کا ریکارڈ موجود ہے، لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ ریکارڈ نہیں ہے، کس کو دی گئی؟ اصلاً کس کے نام ہے اور کس کو منتقل ہوئی؟ سب کچھ موجود ہے، ویسے انگریز کا نظام حکومت بڑا زبردست تھا، ہمارے ہاں ہندوستان و پاکستان میں جو زمینیں تھیں مغلیہ دور میں ان کا باقاعدہ منظم ریکارڈ نہیں تھا، انگریز نے آ کر اس کے ایک ایک چپہ کا ریکارڈ بنا دیا اس کے ریکارڈ کے دو طریقے ہیں۔

ایک طریقہ تو یہ ہے کہ بندوبست کے دفاتر میں ریکارڈ موجود ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس نے کتابیں لکھ کر چھاپ دیں، ہر ضلع اور ڈویژن کا ریکارڈ لکھ دیا، یہ چھپی ہوئی کتابیں موجود ہیں، میں جس زمانے میں اس کی تحقیق کر رہا تھا ہزارہ کے ایک گاؤں کا مسئلہ تھا اس موضوع پر مجھے فیصلہ لکھنا تھا، اس لئے مجھے تحقیق کرنی پڑی اس وقت دیکھا کہ انگریز نے انتظام کے اندر کیا کمال دکھایا ہے اس نے ایک ایک گاؤں، ایک ایک گلی، ایک ایک رقبہ کا ریکارڈ بنایا ہے نہ یہ کہ صرف دفتروں میں ہے بلکہ کتابوں کی شکل میں چھاپ کے رکھ دیا ہے اور وہاں جو رسم و رواج تھے سارے تفصیل سے لکھ کر چلا گیا ہے کہ فلاں علاقہ میں یہ رواج تھا، فلاں علاقہ میں یہ رواج تھا وغیرہ۔

پہلے یہ تھا اور اب یہ ہے کہ فلاں تاریخ سے فلاں تک یہ رواج رہا، یہ ہوا وہ ہوا، وہ سب لکھ کر چلا گیا۔ اس واسطے یہ ریکارڈ نکالنا مشکل نہیں ہے، اگر حکومت ایک اراضی کمیشن بنا دے کہ بھائی تم چھان بین کر دو تو کوئی دشواری نہیں ہے، بڑے آرام سے نکل آئے گا، اور اطمینان سے اس کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

اور میں کہتا ہوں کہ ان باتوں کو بھی چھوڑ دو، صرف وراثت کے احکام جاری کر دو، پھر دیکھو ان بڑے بڑے رقبوں کا کیا بنتا ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

اسلام، جمہوریت اور سوشلزم ☆

''اسلام ہمارا مذہب ہے
جمہوریت ہماری سیاست ہے
اور سوشلزم ہماری معیشت ہے''

یہ وہ نعرہ ہے جسے پچھلے دنوں ہمارے ملک کی بعض سیاسی جماعتوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ پھیلایا ہے۔ اس نعرہ کی پہلی ہی سطر میں ''اسلام'' کا لفظ بظاہر یہ تاثر دیتا ہے کہ اس میں ''اسلام'' کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی گئی ہے، لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ اس نعرے میں ''اسلام'' کی مثال بالکل اسی شخص کی سی ہے جس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے تخت سلطنت پر بٹھا دیا گیا ہو۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تین جملوں کو پڑھ کر ''اسلام'' کا جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ معاذ اللہ اسلام بھی عیسائیت، یہودیت یا ہندومت کی طرح پوجا پاٹ کی چند رسموں یا اخلاق کے چند مجمل اصولوں کا نام ہے اور زندگی کے دوسرے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اگر کوئی شخص عبادت کے چند خاص طریقوں کو اپنا لے تو اس کے بعد وہ اپنی حکومت اور اپنی معیشت کو جس نظام کے ساتھ بھی وابستہ کرنا چاہے کر سکتا ہے، وہ مسجد میں بیٹھ کر اسلام کی تعلیمات کا پابند ہے، لیکن اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد یا اپنے لئے رزق کی تلاش کے وقت اسلام نے یا تو اسے رہنمائی دی ہی نہیں ہے، یا اگر دی ہے تو وہ (معاذ اللہ) اتنی ناقص اور بیکار ہے کہ اس کے ذریعہ اس کے سیاسی اور معاشی مسائل حل نہیں ہوتے، لہٰذا وہ اس بات کا محتاج ہے کہ اپنی سیاست میں جمہوریت سے اور اپنی معیشت میں سوشلزم سے ''روشنی'' حاصل کرے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسلام کا مفہوم یہی کچھ ہے تو پھر یہ دعوے آپ فضول کرتے ہیں کہ ''اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور اس میں انسان کی تمام موجودہ پریشانیوں کا حل موجود ہے'' پھر تو کھل کر آپ کو کہنا چاہئے کہ اسلام نے عبادات وعقائد کے علاوہ زندگی کے کسی مسئلہ میں ہمیں کوئی ہدایت نہیں دی اور (معاذ اللہ) ہم اپنے سینوں میں قرآن رکھتے ہوئے بھی کارل مارکس اور ماؤزے

☆ ہمارا معاشی نظام، ص: ۸۳

تنگ سے بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔

اگر آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات صرف عبادات وعقائد تک محدود نہیں ہیں بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل نظام ہے، تو پھر مسجد ہو یا بازار، حکومت کا ایوان ہو یا تفریح کا میدان، آپ کو ہر مقام پر صرف اور صرف اسلام ہی کی پیروی کرنی پڑے گی، پھر اس طرز عمل کا کوئی مطلب نہیں ہے کہ مسجد میں پہنچ کر تو آپ بیت اللہ کی طرف رخ کریں اور دفتر و بازار میں پہنچ کر ماسکو اور پیکنگ کو اپنا قبلہ وکعبہ بنالیں۔ آپ کو ہر زمانے میں اور ہر جگہ پر انسانیت کے صرف اس محسن اعظم ﷺ کے چشم وابرو کو دیکھنا ہوگا جس کی تعلیمات نے صرف مسجدوں میں اجالا نہیں کیا بلکہ اس کے نور ہدایت سے حکومت کے ایوانوں اور معیشت کے بازار بھی یکساں طور پر جگمگائے ہیں۔

بعض حضرات اس نعرے کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں جس سوشلزم کو اپنایا گیا ہے وہ لادینی سوشلزم نہیں بلکہ ''اسلامی سوشلزم'' ہے اور جس طرح ''جمہوریت'' اسلامی ہوسکتی ہے اسی طرح ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح بھی درست ہے۔

اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ جہاں اصطلاح کا تعلق ہے ہمارے نزدیک نہ اسلامی جمہوریت کی اصطلاح درست ہے اور نہ اسلامی سوشلزم کی۔ یہ دونوں نظام مغرب کی لادینی فکر کی پیداوار ہیں، اور ان کے ساتھ اسلام کا پیوند لگانا ایک طرف اسلام کی توہین ہے اور دوسری طرف اس سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں نظام جوں کے توں اسلام کے مطابق ہیں لہٰذا لفظوں کی حد تک تو یہ دونوں اصطلاحیں ہماری نظر میں غلط اور مغالطہ انگیز ہیں اور مسلمانوں کو دونوں ہی سے پرہیز کرنا چاہئے۔

لیکن معنویت کے لحاظ سے ''اسلامی جمہوریت'' اور ''اسلامی سوشلزم'' میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، جمہوریت کے فلسفے میں کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جو اسلام کے خلاف ہیں۔ (مثلاً عوام کے اقتدار اعلیٰ کا تصور، لیجلیز کا خدائی احکام کی پابندی کے بغیر خود مختار واضع قانون ہونا، اور امیدوار حکومت کا از خود اقتدار کی طلب کرنا) لیکن جمہوریت کی وہ بہت سی باتیں اسلام کے مطابق بھی ہیں جنہیں عرف عام میں جمہوریت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، یعنی شورائی حکومت تقسیم اختیارات، آزادی اظہار رائے اور عوام کے سامنے حکومت کی جواب دہی وغیرہ اب جو لوگ ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد نظام جمہوریت کی صرف وہ باتیں ہیں جو اسلام کے خلاف نہیں ہیں، ان کو نکال کر جو باقی بچتا ہے وہ ''اسلامی جمہوریت'' ہے انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اگر توحید رسالت اور آخرت پر ایمان لاکر جمہوری نظام حکومت کو جوں کا توں قبول کرلیا

جائے تو وہی لادینی جمہوریت اسلامی بن جاتی ہے۔ دوسری الفاظ میں ان کے نزدیک لادینی جمہوریت کی خرابی صرف اس قدر نہیں ہے اس کا نظریہ پیش کرنے والے مادہ پرست اور غیر مسلم تھے جنہوں نے اپنی مادہ پرستی کا جوڑ جمہوریت کے ساتھ ملا دیا تھا، اور اگر توحید پر ایمان رکھنے والے لوگ اسے بعینہ اختیار کرلیں گے تو اس کی خرابی دور ہو جائے گی، بلکہ ان کے نزدیک کچھ خرابیاں خود جمہوریت میں پائی جاتی ہیں، اور ان خرابیوں کو نکال کر باقی ماندہ حصے کو وہ ''اسلامی جمہوریت'' قرار دیتے ہیں۔

اس کے برعکس ''اسلامی سوشلزم'' کا نعرہ بلند کرنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ سوشلزم کے معاشی نظام میں بذاتہ خود کوئی خرابی نہیں، اس کی خرابی صرف یہ ہے کہ اس کے پیش کرنے والے منکر خدا تھے اور انہوں نے اس انکار خدا کا جوڑ سوشلزم کے ساتھ ملا دیا تھا، اب اگر اسی معاشی نظام کو مسلمان اختیار کرلیں تو اس کی خرابی دور ہو جاتی ہے، گویا سوشلزم کے معاشی نظام کو جوں کا توں لیکر اس میں خدا اور رسول اور آخرت کے عقائد کو شامل کر لیجئے تو وہی لادینی سوشلزم اسلامی بن جاتا ہے۔

اور اگر یہ حضرات یہ کہتے بھی ہیں کہ ہم نے سوشلزم سے غیر اسلامی اجزاء کو نکال کر اس کا نام ''اسلامی سوشلزم'' رکھا ہے تو اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے، ورنہ ان کا یہ دعویٰ دو وجہ سے غلط ہے ایک تو اس لئے کہ انہوں نے اپنے تجویز کردہ معاشی نظام میں سوشلزم کے معاشی نظام کی تمام وہ باتیں باقی رکھی ہیں جو صریحی طور پر خلاف اسلام ہیں۔ سوشلزم کی بنیاد وسائل پیداوار پر جو جبر قبضہ کر لینے پر ہے، اور یہ بات جوں کی توں ان کے ''اسلامی سوشلزم'' میں بھی موجود ہے، جس کی صراحت ان کے رہنما اپنی تحریر وتقریر میں ہمیشہ کرتے رہے، دوسرے اس لئے کہ سوشلزم کا صرف مادی فلسفہ نہیں بلکہ اس کا معاشی نظام بھی سر سے لیکر پاؤں تک اسلام کے خلاف ہے، لہٰذا اگر اس میں سے غیر اسلامی اشیاء کو نکال دیا جائے تو حاصل تفریق کچھ بچتا ہی نہیں ہے جسے ''اسلامی سوشلزم'' کہا جاسکے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح بالکل ایسی ہی ہے جیسے ''اسلامی بنکاری'' کی اصطلاح موجودہ بنکاری کا سارا نظام سود پر چل رہا ہے۔ اس لئے یہ نظام بلاشبہ غیر اسلامی ہے، لیکن اگر اسی نظام سے سود کی گندگی کو خارج کر کے اسے مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے تو یہی نظام اسلام کے مطابق ہو جائے گا، اب اگر کوئی شخص ایسے نظام کا نام ''اسلامی بنکاری'' رکھ دے تو اس کی اس اصطلاح پر تو اعتراض کیا جاسکتا ہے لیکن معنویت کے لحاظ سے اس کی بات غلط نہیں ہے۔

اس کے برخلاف ''اسلامی سوشلزم'' کی مثال ایسی ہے جیسے ''اسلامی سود'' اور ''اسلامی قمار''

اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ ''سود'' اور ''قمار'' کی خرابی صرف یہ تھی کہ اس کے موجد اسلام کے بنیادی عقائد کے قائل نہیں تھے اب ہم ان کے نظریات میں سے تمام غیر اسلامی اشیاء کو نکال دیتے ہیں اور توحید اور رسالت اور آخرت کو مان کر سود کھاتے اور قمار کھیلتے ہیں، لہٰذا ہمارے سود و قمار کا نام اسلامی سود وقمار ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ بات حد درجہ مضحکہ خیز ہوگی، اس لئے کہ سود وقمار سرتاپا خلاف اسلام چیزیں ہیں اور ان میں سے خلاف اسلام اشیاء کو نکال دیا جائے تو کوئی ایسی چیز باقی ہی نہیں رہتی جس کا نام ''اسلامی سود'' یا ''اسلامی قمار'' رکھا جائے۔

لہٰذا اسلامی جمہوریت کی اصطلاح لفظی طور پر غلط سہی، لیکن معنی کے اعتبار سے ''اسلامی سوشلزم'' کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، بعض حضرات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم نے ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح اس لئے اختیار کی ہے کہ ماضی میں بہت سے لوگوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس اصطلاح سے صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ اسلام سرمایہ دارانہ نظام کا حامی نہیں، لیکن یہ دلیل بھی انتہائی بودی اور کمزور ہے، کیونکہ ایک غلط فہمی کو رفع کر کے دوسری غلط فہمی پیدا کر دینا عقل وخرد کی کون سی منطق کا تقاضا ہوسکتا ہے؟ اگر واقعۃً مقصد یہی واضح کرنا ہے کہ اسلام سرمایہ دارانہ ظلم وستم کا حامی نہیں تو پھر اس کے لئے ''اسلامی سوشلزم'' کے بجائے ''اسلامی عدل عمرانی'' (Islamic Social Justice) کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے۔

پھر اس نعرہ میں اسلام اور جمہوریت کو سوشلزم کے ساتھ معصومیت سے شیر وشکر کر کے پیش کیا گیا ہے، گویا ان دونوں چیزوں کا سوشلزم کے ساتھ کوئی تصادم نہیں ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اشتراکیت نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ نہ تو کسی مرحلے پر اسلام سے میل کھاتا ہے اور نہ کسی مقام پر جمہوریت اسے چھو کر گزری ہے، اسلام بلاشبہ یہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں دولت کی منصفانہ طریقے پر تقسیم ہو اور سرمایہ دارانہ نظام میں جو دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ وسیع دائروں میں گردش کرے، لیکن اس مقصد کے لئے جو ظالمانہ طریق کار سوشلزم نے تجویز کیا ہے اسلام اس کا بھی کسی طرح روادار نہیں۔ اس لئے کہ وسائل پیداوار کو لوگوں سے چھین کر حکومت کے چند افراد کے ہاتھوں میں تھما دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا کہ ملک کی ساری دولت ایک بڑی سرمایہ دار جماعت کے حوالے ہوجائے، اور عام آدمی اپنا پیٹ بھرنے کے لئے پہلے سے زیادہ اس کے رحم وکرم کا محتاج ہو کر رہ جائے، لہٰذا انفرادی ملکیت کی جس نفی پر سوشلزم کی بنیاد ہے اسلام چند قدم بھی اس کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

اسی طرح سوشلزم کی تاریخ گواہ ہے کہ جمہوریت بھی کبھی اس کا ساتھ نہیں دے سکی،

جمہوریت کی روح ''آزادی اظہار رائے'' پر قائم ہے۔ اور سوشلزم نظام زندگی میں یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کا واقعات کی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے، سوشلزم جس جگہ بھی قائم ہوا ہے جبر و تشدد کے ذریعہ قائم ہوا ہے۔ اس نے ہمیشہ فکر و رائے کا گلا گھونٹ کر اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کی ہے، اس کے خود پسند مزاج نے اس آواز کو کبھی گوارا نہیں کیا جو اس پر تنقید کرنے کے لئے اٹھی ہو۔ اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ اشترا کی نظام میں جو ''منصوبہ بند معیشت'' قائم کی جاتی ہے وہ شدید ترین آمریت کے بغیر نہ قائم ہوسکتی ہے نہ باقی رہ سکتی ہے، یقین نہ آئے تو ان ملکوں کے حالات پڑھ کر دیکھئے جہاں سوشلزم کے نظام کو نافذ کیا گیا ہے کیا وہاں اشترا کی پارٹی کے سوا کوئی اور سیاسی جماعت پنپ سکتی ہے ؟ کیا وہاں مزدور کو حق ہے کہ وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے کوئی چھوٹی سی انجمن ہی بنا لے؟ کیا وہاں کا مزدور حکومت کے کسی فیصلے کے خلاف ہڑتال کرسکتا ہے؟ کیا وہاں کے پریس کو آزادی ہے کہ وہ برسر اقتدار جماعت کے خلاف چوں بھی کر سکے؟ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو پھر آخر وہ کون سی جمہوریت ہے جس کا جوڑ سوشلزم کے ساتھ ملایا گیا ہے؟

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

☆☆☆

حقوق و فرائض ☆

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ ہمارے ماضی قریب کی ان شخصیتوں میں سے تھے جن کی مثالیں ہر دور میں گنی چنی ہوا کرتی ہیں، ان کا اردو ترجمہ قرآن اور تفسیر مشہور و معروف ہے، اس کے علاوہ آزادی ہند کے سلسلے میں ان کی تحریک ریشمی رومال اور تحریک خلافت میں ان کی سرگرم خدمات ہماری تاریخ کا روشن باب ہیں، وہ دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے اور پھر تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں عمر بھر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے اور ماضی قریب کے بے شمار مشاہیر نے ان کی شاگردی کا اعزاز حاصل کیا۔

جب وہ دارالعلوم دیوبند میں ''شیخ الحدیث'' کے طور پر تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے محسوس کیا کہ ان کی تنخواہ ان کے منصب ان کے علم و فضل اور ان کی خدمات کے لحاظ سے بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے ان کا کوئی اور ذریعہ آمدنی بھی نہیں ہے اور ضروریات بڑھتی جارہی ہیں۔ چنانچہ مجلس شوریٰ نے باتفاق رائے فیصلہ کیا کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے اور اس مضمون کا ایک حکم نامہ مجلس شوریٰ کی طرف سے جاری کردیا گیا۔

جو صاحب مولانا کے پاس مجلس شوریٰ کے فیصلے کی خبر لیکر گئے انہیں یقیناً یہ امید ہوگی کہ مولانا یہ خبر سن کر خوش ہوں گے، لیکن معاملہ برعکس ہوا، مولانا یہ خبر سن کر پریشان ہوگئے اور فوراً مجلس شوریٰ کے ارکان کے نام ایک درخواست لکھی جس کا مضمون یہ تھا:

> ''میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ دارالعلوم کی طرف سے میری تنخواہ میں اضافہ کیا جارہا ہے یہ اطلاع میرے لئے سخت تشویش کا موجب ہے، اس لئے کہ میری عمر کی زیادتی اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے اب دارالعلوم میں میرے ذمے پڑھانے کے گھنٹے کم رکھے گئے ہیں، جبکہ اس سے پہلے میرے ذمے زیادہ گھنٹے ہوا کرتے تھے، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مجلس شوریٰ میری تنخواہ کم کرنے پر غور کرتی، چہ جائیکہ میری تنخواہ میں اضافے پر سوچا جائے، لہٰذا میری درخواست ہے کہ میری

☆ ذکر و فکر، ص: ۹۰

تنخواہ بڑھانے کا فیصلہ واپس لیا جائے اور اوقات کے لحاظ سے تنخواہ کم کرنے پر غور کیا جائے''

آج ہم جس ماحول میں جی رہے ہیں اس میں اگر کوئی ملازم اس مضمون کی درخواست اپنی انتظامیہ کے نام تحریر کرے تو اغلب گمان یہی ہوگا کہ اس درخواست کے ذریعہ ملازم نے اپنی انتظامیہ پر بھرپور طنز کیا ہے، وہ اپنی تنخواہ میں اضافے کی مقدار سے نہ صرف یہ کہ مطمئن نہیں ہے بلکہ اسے انتظامیہ پر یہ سنگین اعتراض ہے کہ اس نے یہ معمولی اضافہ کر کے اس کی توہین کی ہے، لہٰذا اس نے جلے کٹے لہجے میں یہ طنز آمیز خط تحریر کیا ہے۔

لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جو درخواست لکھی تھی اس میں دور دور تک طنز کا کوئی شائبہ نہیں تھا وہ واقعۃً یہ سمجھتے تھے کہ تنخواہ میں جو اضافہ ہوگا شاید وہ ان کے کام کے لحاظ سے دیانۃً درست نہ ہو، اس لئے کہ اس ماحول میں ایسے حضرات کی اچھی خاصی تعداد تھی جو اپنے تدریسی اوقات کے ایک ایک منٹ کا حساب رکھتے تھے کہ یہ ان کا بکا ہوا وقت ہے جو کسی اور کام میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) میں جو مدرسہ قائم کیا تھا اس میں ہر استاد کا معمول تھا کہ اگر اسے مدرسے کے اوقات میں اپنا کوئی ضروری ذاتی کام پیش آ جاتا یا ملازمت کے اوقات میں ان کے پاس کوئی ذاتی مہمان ملنے کے لئے آ جاتا تو وہ گھڑی دیکھ کر اپنے پاس نوٹ کر لیا کرتے تھے کہ اتنا وقت اپنے ذاتی کام میں صرف ہوا اور مہینے کے ختم پر ان اوقات کا مجموعہ بنا کر انتظامیہ کو از خود درخواست پیش کرتے تھے کہ اس ماہ ہماری تنخواہ سے اتنے روپے کاٹ لئے جائیں کیونکہ اتنا وقت ہم نے دوسرے کام میں خرچ کیا ہے۔

یہ ہے اس فرض شناس معاشرے کی ایک ہلکی سی تصویر جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے، آج ہمارے معاشرے میں ہر طرف ''حقوق'' حاصل کرنے کی صدائیں گونج رہی ہیں، اسی مقصد کے تحت بے شمار ادارے، انجمنیں اور جماعتیں قائم ہیں اور ہر شخص اپنے حقوق کے نام پر زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کرنے کی فکر میں منہمک ہے، لیکن اس پہلو کی طرف توجہ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے کہ حقوق (Rights) ہمیشہ فرائض (Obligations) سے وابستہ ہوتے ہیں، بلکہ درحقیقت انہی سے پیدا ہوتے ہیں اور جو شخص اپنے فرائض کماحقہ ادا نہ کرے اس کے لئے متعلقہ حقوق کے مطالبے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات کا مزاج یہ ہے کہ وہ نہ صرف ہر فرد کو اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرتی ہیں بلکہ دل میں اصل فکر ہی یہ پیدا کرتی ہے کہ کہیں مجھ سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی تو

نہیں ہو رہی؟ اس لئے کہ ہوسکتا ہے میں اپنی ترکیبوں سے اس کوتاہی کو چھپالوں اور اس کے دنیوی نتائج سے محفوظ ہو جاؤں، لیکن ظاہر ہے کہ کوئی کوتاہی، خواہ وہ کتنی معمولی کیوں نہ اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپا سکتا۔ جب یہ فکر کسی شخص میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا اصل مسئلہ حقوق کے حصول کے بجائے فرائض کی ادائیگی بن جاتا ہے، پھر وہ اپنے جائز حقوق بھی پھونک پھونک کر وصول کرتا ہے، کہ کہیں وصول شدہ حق کا وزن ادا کردہ فریضے سے زیادہ نہ ہو جائے، یہی فکر تھی جس نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو وہ درخواست دینے پر مجبور کیا۔

اگر یہ فکر معاشرے میں عام ہو جائے تو سب کے حقوق خود بخود ادا ہونے شروع ہو جائیں، اور حق تلفیوں کی شرح گھٹتی چلی جائے، اس لئے کہ ایک شخص کا فریضہ دوسرے کا حق ہے اور جب پہلا شخص اپنا فریضہ ادا کرے گا تو دوسرے کا حق خود بخود ادا ہو جائے گا۔ شوہر اپنے فرائض ادا کرے تو بیوی کے حقوق ادا ہوں گے، بیوی اپنے فرائض ادا کرے تو شوہر کے حقوق ادا ہوں گے، افسر اپنے فرائض بجا لائے تو ماتحت کو اس کے حقوق ملیں گے، اور ماتحت اپنے فرائض بجالائے تو افسر کو اس کے حقوق ملیں گے، غرض دوطرفہ تعلقات کی خوشگواری کا اصل راز یہی ہے کہ ہر فریق اپنی ذمہ داری محسوس کر کے اس سے ٹھیک ٹھیک عہدہ برآ ہو، تو دونوں میں سے کسی کو حق تلفی کی کوئی جائز شکایت پیدا نہیں ہوسکتی۔

لیکن یہ فکر معاشرے میں اس وقت تک عام نہیں ہوسکتی جب تک اس میں فکر آخرت کی آبیاری نہ کی جائے، آج ہم عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھنے کا زبان سے خواہ کتنا اعلان کرتے ہوں لیکن ہماری عملی زندگی میں اس عقیدے کا کوئی پرتو عموماً نظر نہیں آتا، ہماری ساری دوڑ دھوپ کا محور یہ ہے کہ روپے پیسے اور مال و اسباب کی گنتی میں اضافہ کس طرح ہو؟ یہی بات زندگی کا اصل مقصد بن چکی ہے اور یہی ہماری ساری معاشی سرگرمیوں کا آخری مطمح نظر ہے۔

چنانچہ اگر ہم کہیں ملازمت کر رہے ہیں تو ہماری سوچ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اپنی تنخواہ اور اپنے گریڈ میں اضافہ کس طرح کیا جائے؟ اور ملازم کو حاصل ہونے والی دوسری سہولتیں زیادہ سے زیادہ کس طرح حاصل کی جاسکتی ہیں؟ اس کے لئے ہم انفرادی درخواستوں سے لیکر اجتماعی سودا کاری تک اور چاپلوسی سے لیکر دھونس دھاندلی تک ہر حربہ استعمال کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن ہم میں یہ فکر رکھنے والے بہت کم ہیں (گو بحمد اللہ نایاب نہیں) کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ ہماری کارکردگی کے لحاظ سے حلال بھی ہے کہ نہیں؟ جب اپنے لئے کچھ وصول کرنے کا وقت آئے تو ہمیں یہ حدیث نبوی خوب یاد ہوتی ہے کہ "مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو" (۱) لیکن یہ دیکھنے

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الأحكام، باب أجر الأجراء، رقم: ۲۴۳۴، حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ((أعطوا الاجير أجرهٗ قبل أن يجف عرقهٗ))

کی ضرورت ہم میں سے بہت کم لوگ محسوس کرتے ہیں کہ پسینہ واقعی نکلا بھی ہے کہ نہیں؟

اس صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقوق کے معاملے میں تو بہت حساس ہیں، لیکن فرائض کے معاملے میں حساس نہیں اور جب کسی بھی فریق کو اپنے فرائض کی فکر نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ سب کے حقوق پامال ہوتے ہیں، معاشرے میں جھگڑوں، تنازعات اور مطالبوں کی چیخ و پکار کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا، لوگوں کی زبانیں کھل جاتی ہیں اور کان بند ہو جاتے ہیں، اور جب ضمیر کو موت کی نیند سلانے کے بعد کوئی کسی کی نہیں سنتا تو لوگ آخری چارۂ کار اسی کو سمجھتے ہیں کہ جس کے جو چیز ہاتھ لگ جائے لے بھاگے، چنانچہ نوبت چھینا جھپٹی تک اور لوٹ کھسوٹ تک پہنچ کر رہتی ہے۔

اپنے گردو پیش میں نظر دوڑا کر دیکھیں تو یہی منظر دکھائی دیتا ہے اس سے پریشان ہر شخص ہے لیکن افراتفری کے اس عالم میں یہ سوچنے سمجھنے کی فرصت بہت کم لوگوں کو ہے کہ یہ صورتحال اس وقت تک تبدیل نہیں ہوگی جب تک ہم میں سے ہر شخص فرائض کے احساس کو مقدم نہ رکھے یا کم از کم فرائض کو اتنی اہمیت تو دے جتنی اپنے حقوق کو دیتا ہے۔

اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ کا ایک اور ارشاد گرامی ہمارے لئے بہترین رہنمائی فراہم کرتا ہے، بشرطیکہ ہم اس پر عمل کے لئے تیار ہوں ارشاد ہے:

''اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور اپنے بھائی کے لئے بھی اس بات کو برا سمجھو جسے اپنے لئے برا سمجھتے ہو''(۱)

اس حدیث مبارک نے ہمیں یہ سنہرا اصول بتایا ہے کہ جب بھی کسی دوسرے شخص سے کوئی معاملہ کرنے کی نوبت آئے تو پہلے اپنے آپ کو اس دوسرے شخص کی جگہ کھڑا کر کے دیکھ لو کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کس قسم کے معاملے کی توقع کرتا؟ کون سی بات میرے لئے ناگواری کا موجب ہوتی؟ اور کس بات سے مجھے اطمینان ہوتا؟ بس اب دوسرے شخص کے ساتھ وہی برتاؤ کرو جو اس وقت تمہارے لئے موجب اطمینان ہو سکتا تھا اور ہر اس بات سے پرہیز کرو جو تمہیں ناگوار ہو سکتی تھی۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب من الإیمان أن یحب لأخیه ما یحب لنفسه، رقم:۱۲، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الدلیل علی أن من خصال الفطرة أن یحب لأخیه، رقم:٦٤، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب من اتقی المحارم فهو أعبد الناس، رقم:۲۲۲۷، سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب علامة الإیمان، رقم:٤٩٣٠، سنن ابن ماجه، کتاب المقدمة، باب فی الإیمان، رقم:٦٥، مسند أحمد، رقم:۲۱۱۱۳، حدیث معاذ بن جبل رضی الله عنه، سنن الدارمی، رقم:۲٦۲۳

اگر ایک افسر اپنے ماتحت کے ساتھ اپنا رویہ متعین کرتے وقت یہ معیار اپنا لے کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کس قسم کے رویے کو انصاف کے مطابق سمجھتا؟ تو اس کے ماتحت کو بھی اس سے کوئی جائز شکایت پیدا نہیں ہوسکتی، اسی طرح اگر ماتحت اپنے کام کی نوعیت اور مقدار متعین کرتے وقت اس بات کو فیصلہ کن قرار دے کہ اگر میں اپنے افسر کی جگہ ہوتا تو میں انصاف کے ساتھ کتنے اور کیسے کام کی توقع کرتا؟ تو افسر کو اپنے ماتحت سے کوئی جائز شکایت نہیں ہوسکتی۔

یہ اصول صرف ماتحت اور افسر ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ دنیا کے ہر تعلق میں اتنا ہی مفید اور کارآمد ہے، باپ بیٹے، بہن بھائی، میاں بیوی، ساس بہو، دوست احباب، عزیز رشتہ دار، تاجر اور خریدار، حکومت اور عوام، غرض ہر قسم کے باہمی رشتوں میں خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم نے زندگی گزارنے کے لئے دُہرے معیار اپنائے ہوئے ہیں، اپنے لئے ہم کسی اور معیار کی توقع رکھتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر دوسروں سے مطالبے کرتے ہیں، اور دوسروں کے لئے ہم نے کوئی اور معیار بنا رکھا ہے، اور ان کے ساتھ معاملہ اسی معیار کے مطابق کرتے ہیں، اگر ہمارے لینے اور دینے کے پیمانے الگ الگ نہ ہوں بلکہ دونوں صورتوں میں ہماری سوچ ایک جیسی ہو تو حق تلفیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لہٰذا ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ دلوں میں فرائض کا احساس کس طرح پیدا کیا جائے؟ یہ درست ہے کہ کوئی ایک شخص تن تنہا معاشرے کے مزاج کو ایک دم نہیں بدل سکتا لیکن وہ خود اپنے مزاج کو ضرور تبدیل کرسکتا ہے، اور اپنے حلقۂ اثر میں اس مزاج کو فروغ دینے کی ممکنہ تدابیر بھی اختیار کرسکتا ہے، کم از کم اپنی اولاد اور اپنے گھر والوں میں فرض شناسی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش بھی کرسکتا ہے، اور اگر وہ ایسا کرے تو کم از کم ایک گھرانے کو بھٹکنے سے بچا کر سیدھے راستے پر لانے کا کارنامہ اس کے نامہ اعمال کو جگمگانے کے لئے کافی ہوسکتا ہے، پھر تجربہ یہ ہے کہ نیک نیتی سے انجام دیا ہوا یہ کارنامہ دوسروں پر بھی اپنے اثرات لازماً چھوڑتا ہے، اور اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو اسی طرح رفتہ رفتہ فرد سے گھرانہ، گھرانے سے خاندان، خاندان سے برادری، برادری سے پوری قوم تعمیر وترقی کی راہ پر لگ جاتی ہے، قومیں ہمیشہ اسی طرح بنی ہیں اور آج بھی ان کے بننے کا یہی طریقہ ہے۔

میں تو تنہا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ کچھ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

☆☆☆

چوری یہ بھی ہے ☆

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ سہارنپور سے کانپور جارہے تھے، جب ریل میں سوار ہونے کے لئے اسٹیشن پہنچے تو محسوس کیا کہ ان کے ساتھ سامان اس مقررہ حد سے زیادہ ہے جو ایک مسافر کو بک کرائے بغیر اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے، چنانچہ وہ اس کھڑکی پر پہنچے جہاں سامان کا وزن کر کے زائد سامان کا کرایہ وصول کیا جاتا ہے تاکہ سامان بک کراسکیں، کھڑکی پر ریلوے کا جو اہلکار موجود تھا، وہ غیر مسلم ہونے کے باوجود حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو جانتا تھا، اور ان کی بڑی عزت کرتا تھا، جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سامان بک کرنے کی فرمائش کی تو اس نے کہا کہ مولانا! رہنے بھی دیجئے، آپ سے سامان کا کیا کرایہ وصول کیا جائے؟ آپ کو سامان بک کرانے کی ضرورت نہیں میں ابھی گارڈ سے کہہ دیتا ہوں وہ آپ کو زائد سامان کی وجہ سے کچھ نہیں کہے گا۔

مولانا نے فرمایا یہ گارڈ میرے ساتھ کہاں تک جائے گا؟ ''غازی آباد تک'' ریلوے افسر نے جواب دیا، پھر غازی آباد کے بعد کیا ہوگا؟ مولانا نے پوچھا۔ یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے بھی کہہ دے گا، اس نے کہا مولانا نے پوچھا وہ دوسرا گارڈ کہاں تک جائے گا؟ افسر نے کہا وہ کانپور تک آپ کے ساتھ جائیگا۔ پھر کانپور کے بعد کیا ہوگا؟ مولانا نے پوچھا، افسر نے کہا کانپور کے بعد کیا ہوتا ہے؟ وہاں آپ کا سفر ختم ہوجائے گا۔ حضرت نے فرمایا نہیں، میرا سفر تو بہت لمبا ہے کانپور ختم نہیں ہوگا اس لمبے سفر کی انتہاء تو آخرت میں ہوگی، یہ بتایئے کہ جب اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ اپنا سامان تم کرایہ دیئے بغیر کیوں اور کس طرح لے گئے؟ تو یہ گارڈ صاحبان میری کیا مدد کرسکیں گے؟

پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو سمجھایا کہ یہ ریل آپ کی یا گارڈ صاحب کی ملکیت نہیں ہے، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے ریلوے کے محکمے کی طرف سے آپ کو یا گارڈ صاحب کو یہ اختیار بھی نہیں دیا گیا کہ وہ جس مسافر کو چاہیں ٹکٹ کے بغیر یا اس کے سامان کو کرائے کے بغیر ریل میں سوار کردیا کریں، لہٰذا اگر میں آپ کی رعایت سے فائدہ اٹھا کر بغیر کرائے کے سامان لے بھی جاؤں تو یہ میرے دین کے لحاظ سے چوری میں داخل ہوگا، اور مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اس گناہ کا جواب

☆ ذکر فکر، ص: ۱۱۸

دینا پڑے گا، اور آپ کی یہ رعایت مجھے بہت مہنگی پڑے گی، لہٰذا براہ کرم مجھ سے پورا پورا کرایہ وصول کر لیجئے۔ ریلوے کا وہ اہلکار مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھتا رہ گیا، لیکن پھر اس نے تسلیم کیا کہ بات آپ ہی کی درست ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ میرے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے ساتھ پیش آیا، وہ ایک مرتبہ ریل میں سوار ہونے کے لئے اسٹیشن پہنچے لیکن دیکھا کہ جس درجے کا ٹکٹ لیا ہوا ہے اس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں، گاڑی روانہ ہونے والی تھی اور اتنا وقت بھی نہ تھا کہ جا کر ٹکٹ تبدیل کروالیں، مجبوراً اوپر کے درجے کے ایک ڈبے میں سوار ہوگئے، خیال یہ تھا کہ ٹکٹ چیک کرنے والا آئے گا تو ٹکٹ تبدیل کرالیں گے لیکن اتفاق سے پورے راستے میں کوئی ٹکٹ چیک کرنے والا نہ آیا، یہاں تک کہ منزل آگئی منزل پر اتر کر وہ سیدھے گھر پہنچے وہاں جا کر معلومات کیں کہ دونوں درجوں کے کرائے میں کتنا فرق ہے؟ پھر اتنی ہی قیمت کا ایک ٹکٹ وہاں سے خرید لیا اور وہیں پر پھاڑ کر پھینک دیا، ریلوے کے جس ہندو افسر نے ٹکٹ دیا تھا جب اس نے دیکھا کہ انہوں نے ٹکٹ پھاڑ کر پھینک دیا ہے تو اسے سخت حیرانی ہوئی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دماغی حالت پر بھی شبہ ہوا ہو، اس لئے اس نے باہر آ کر ان سے پوچھ گچھ شروع کردی کہ آپ نے ٹکٹ کیوں پھاڑا؟

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسے پورا واقعہ بتایا اور کہا کہ اوپر کے درجے میں سفر کرنے کی وجہ سے یہ پیسے میرے ذمے رہ گئے تھے، ٹکٹ خرید کر میں نے یہ پیسے ریلوے کو پہنچا دیئے، اب یہ ٹکٹ بیکار تھا اس لئے پھاڑ دیا، وہ شخص کہنے لگا کہ مگر آپ تو اسٹیشن سے نکل آئے تھے اب آپ سے کون زائد کرائے کا مطالبہ کرسکتا تھا، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ جی ہاں، انسانوں میں تو اب کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں تھا لیکن جس حقدار کے حق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ ہو اس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ ضرور کرتے ہیں، مجھے ایک دن ان کو منہ دکھانا ہے اس لئے یہ کام ضروری تھا۔

یہ دونوں واقعات قیام پاکستان سے پہلے اس دور کے ہیں جب برصغیر پر انگریزوں کی حکومت تھی اور مسلمانوں کے دل میں اس حکومت کے خلاف جو نفرت تھی وہ محتاج بیان نہیں، چنانچہ ملک کو انگریزوں کی حکومت سے آزاد کرانے کی تحریکیں شروع ہوچکی تھیں، خود حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ برملا اپنی اس خواہش کا اظہار فرما چکے تھے کہ مسلمانوں کی کوئی الگ حکومت ہونی چاہئے جس میں وہ غیر مسلموں کے تسلط سے آزاد ہوکر شریعت کے مطابق اپنا کاروبار زندگی چلا سکیں، لیکن انگریز کی حکومت سے متنفر ہونے کے باوجود اس کے قائم کئے ہوئے محکمے سے تھوڑا سا فائدہ بھی

معاوضہ ادا کئے بغیر حاصل کرنا انہیں منظور نہ تھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ چوری کی قانونی تعریف خواہ کچھ ہو لیکن گناہ وثواب کے نقطۂ نظر سے کسی دوسرے کی چیز اس کی آزادمرضی کے بغیر استعمال کرنا چوری ہی میں داخل ہے۔

آنحضرت ﷺ نے دسیوں احادیث میں مختلف انداز سے یہ حقیقت بیان فرمائی ہے، چند ارشادات ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہے کہ:

((حُرْمَةُ مَالِ الْمُسْلِمِ كَحُرْمَةِ دَمِه))(۱)

''مسلمان کے مال کی حرمت بھی ایسی ہی ہے جیسے ان کے خون کی حرمت''

واضح رہے کہ حدیث میں اگرچہ ''مسلمان'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن دوسری احادیث کی روشنی میں مسلمان حکومت کے غیر مسلم باشندے جو امن کے معاہدے کے ساتھ رہتے ہوں یا اس غیر مسلم حکومت کے غیر مسلم باشندے جس کے تحت مسلمان پرامن طور پر رہتے ہوں، ان کے جان ومال کا احترام بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا مسلمان کے جان ومال کا احترام۔ لہٰذا اس لفظ سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ غیر مسلموں کی جان ومال قابل احترام نہیں ہے۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ))(۲)

''کسی مسلمان شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے''

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے منیٰ میں جو خطبہ دیا اس میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

((لَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ مِنْ مَالِ أَخِيْهِ إِلَّا مَا طَابَتْ بِهِ نَفْسُهُ))(۳)

''کسی شخص کے لئے اپنے بھائی کا کوئی مال حلال نہیں ہے سوائے اس مال کے جو اس نے خوش دلی سے دیا ہو''

حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَأْخُذَ مَالَ أَخِيْهِ بِغَيْرِ حَقٍّ، وَذٰلِكَ لِمَا حَرَّمَ اللّٰهُ مَالَ

---

(۱) كنز العمال، رقم: ۴۰۴ (۱/۱۴۴)، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (۲/۱۳۱)، حلية الأولياء (۷/۳۳۴)، جامع الأحاديث، رقم: ۱۱۵۷۰ (۱۲/۱۱۶)، جمع الجوامع للسيوطي، رقم: ۱۲۰۲۷ (۱/۱۱۷۰۲)

(۲) كنز العمال، رقم: ۳۹۷ (۱/۹۱)، مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۷۷۴، جامع الأحاديث، رقم: ۱۷۶۱۵ (۱۷/۸۰)، كشف الخفاء، رقم: ۳۱۰۱ (۲/۳۷۰)

(۳) كنز العمال، رقم: ۳۹۷ (۱/۹۱)، مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۷۷۴، جامع الأحاديث، رقم: ۱۷۶۱۵ (۱۷/۸۰)، كشف الخفاء، رقم: ۳۱۰۱ (۲/۳۷۰)

اَلْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ، وَاَنْ يَّاْخُذَ عَصَا اَخِيْهِ بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسٍ))(۱)

''کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا کوئی مال ناحق طور پر لے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کا مال مسلمان پر حرام کیا ہے، اور اس کو بھی حرام قرار دیا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کی لاٹھی بھی اس کی خوش دلی کے بغیر لے''

ان تمام احادیث میں آنحضرت ﷺ نے یہ بات بھی واضح فرمادی ہے کہ دوسرے کی کوئی چیز لینے یا استعمال کرنے کے لئے اس کا خوشی سے راضی ہونا ضروری ہے، لہٰذا اگر کسی وقت حالات سے یہ معلوم ہوجائے کہ کسی شخص نے اپنی ملکیت استعمال کرنے کی اجازت کسی دباؤ کے تحت یا شرما شرمی میں دیدی ہے اور وہ دل سے اس پر راضی نہیں ہے تو ایسی اجازت کو اجازت نہیں سمجھا جائے گا بلکہ اس کا استعمال بھی دوسرے شخص کے لئے جائز نہیں ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کے ان ارشادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں تو نظر آئے گا کہ نہ جانے کتنے شعبوں میں ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر ان احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، ہم چوری اور غصب بس یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کے گھر میں چھپ کر داخل ہو اور اس کا سامان چرائے، یا طاقت کا باقاعدہ استعمال کر کے اس کا مال چھینے، حالانکہ کسی کی مرضی کے خلاف اس کی ملکیت کا استعمال کسی بھی صورت میں ہو، وہ چوری یا غصب کے گناہ میں داخل ہے۔ اس قسم کی چوری اور غصب کی جو مختلف صورتیں ہمارے معاشرے میں عام ہوگئی ہیں اور اچھے خاصے پڑھے لکھے اور بظاہر مہذب افراد بھی ان میں مبتلا ہیں، ان کا شمار مشکل ہے، تاہم مثال کے طور پر اس کی چند صورتیں درج ذیل ہیں:

(۱) ایک صورت تو وہی ہے جس کی طرف حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ واقعے میں ارشاد کیا گیا ہے، آج یہ بات بڑے فخر سے بیان کی جاتی ہے کہ ہم اپنا سامان ریل یا جہاز میں کرایہ دیئے بغیر نکال لائے، حالانکہ اگر یہ کام متعلقہ افسروں کی آنکھ بچا کر کیا گیا تو اس میں اور چوری میں کوئی فرق نہیں، اور اگر ان کی رضامندی سے کیا گیا، جبکہ وہ اجازت دینے کے مجاز نہ تھے، تو ان کا بھی اس گناہ میں شریک ہونا لازم آیا، ہاں اگر کسی افسر کو ریلوے یا ایئر لائنز کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ زیادہ سامان بغیر کرائے کے چھوڑ دے تو بات دوسری ہے۔

(۲) ٹیلی فون ایکسچینج کے کسی ملازم سے دوستی گانٹھ کر دوسرے شہروں میں فون پر مفت بات چیت نہ

---

(۱) مجمع الزوائد ومنبع الزوائد (۱۳۱/۲)

صرف یہ کہ کوئی عیب نہیں سمجھی جاتی بلکہ اسے اپنے وسیع تعلقات کا ثبوت قرار دیکر فخریہ بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بھی ایک گھٹیا درجے کی چوری ہے اور اس کے گناہ عظیم ہونے میں کوئی شک نہیں۔

(۳) بجلی کے سرکاری کھمبے سے کنکشن لیکر مفت بجلی استعمال چوری کی ایک اور قسم ہے، جس کا رواج بھی عام ہوتا جارہا ہے، اور یہ گناہ بھی ڈنکے کی چوٹ پر کیا جاتا ہے۔

(۴) اگر ہم کسی شخص سے اس کی کوئی چیز مانگتے ہیں جبکہ ہمیں غالب گمان یہ ہے کہ وہ زبان سے تو انکار نہیں کر سکے گا، لیکن دینے پر دل سے راضی بھی نہ ہوگا اور دے گا تو محض شرما شرمی اور بادل ناخواستہ دے گا، تو یہ بھی غصب میں داخل ہے اور ایسی چیز کا استعمال حلال نہیں، کیونکہ دینے والے نے خوش دلی کے بجائے وہ چیز دباؤ میں آ کر دی ہے۔

(۵) اگر کسی شخص سے کوئی چیز عارضی استعمال کے لئے مستعار لی گئی اور وعدہ کرلیا گیا کہ فلاں وقت لوٹا دی جائے گی، لیکن وقت پر لوٹانے کے بجائے اسے کسی عذر کے بغیر اپنے استعمال میں باقی رکھا تو اس میں وعدہ خلافی کا بھی گناہ ہے اور اگر وہ مقررہ وقت کے بعد اس کے بعد استعمال پر دل سے راضی نہ ہو تو غصب کا گناہ بھی ہے، یہی حال قرض کا ہے کہ واپسی کی مقررہ تاریخ کے بعد قرض واپس نہ کرنا (جبکہ کوئی شدید عذر نہ ہو) وعدہ خلافی اور غصب دونوں گناہوں کا مجموعہ ہے۔

(۶) اگر کسی شخص سے کوئی مکان، زمین یا دوکان ایک خاص وقت تک کے لئے کرائے پر لی گئی تو وقت گزر جانے کے بعد مالک کی اجازت کے بغیر اسے اپنے استعمال میں رکھنا بھی اسی وعدہ خلافی اور غصب میں داخل ہے۔

(۷) اگر مستعار لی ہوئی چیز کو ایسی بے دردی سے استعمال کیا جائے جس پر مالک راضی نہ ہو تو یہ بھی غصب کی مذکورہ تعریف میں داخل ہے۔ مثلاً کسی بھلے مانس نے اگر اپنی گاڑی دوسرے کو استعمال کرنے کی اجازت دیدی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ مال مفت دل بے رحم کا معاملے کرے، اور اسے خراب راستوں پر اس طرح دوڑائے پھرے کہ اس کے کل پرزے پناہ مانگنے لگیں، اگر کسی نے اپنا فون استعمال کرنے کی اجازت دی ہے تو اس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس پر طویل فاصلے کی کالیں دیر دیر تک کرتے رہنا یقیناً غصب میں داخل اور حرام ہے۔

(۸) بک اسٹالوں میں کتابیں، رسالے اور اخبارات اس لئے رکھے جاتے ہیں کہ ان میں سے جو

پسند ہوں لوگ انہیں خرید سکیں، پسند کے تعین کے لئے ان کی معمولی ورق گردانی کی بھی عام طور سے اجازت ہوتی ہے، لیکن اگر بک اسٹال پر کھڑے ہو کر کتابوں، اخبارات یا رسالوں کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا جائے، جبکہ خریدنے کی نیت نہ ہو تو یہ بھی ان کا غاصبانہ استعمال ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

یہ چند سرسری مثالیں ہیں جو بے ساختہ قلم پر آ گئیں، مقصد یہ ہے کہ ہم سب ملکر سوچیں کہ ہم کہاں کہاں چوری اور غصب کے گھٹیا جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں؟

☆☆☆

مال میں برکت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا))(۱)

''بیع کرنے والے کو اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہو جائیں، اگر وہ سچ بولیں اور ہر چیز واضح کر دیں تو انہیں ان کی بیع میں برکت دی جاتی ہے اور اگر وہ حقیقت کو چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو ان سے برکت کھینچ لی جاتی ہے''

یہاں مقصود دوسرا جملہ ہے:

((فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا))

''اگر وہ سچ بولے اور ساتھ ساتھ حقیقت بتادے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بیع میں برکت ہوتی ہے اور اگر جھوٹ بولے اور عیب چھپائے تو ان کی بیع کی برکت فنا کر دی جاتی ہے، مٹا دی جاتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سچ بولنے پر برکت ہوتی ہے اور جھوٹ بولنے سے برکت مٹا دی جاتی ہے''

اب مسئلہ ایسا ہو گیا ہے کہ برکت کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے، جو قدر و قیمت ہے وہ گنتی کی ہے یعنی جس طرح بھی ہو پیسہ زیادہ آنا چاہئے، برکت کا مفہوم ذہن سے مٹ گیا ہے جانتے ہی نہیں کہ برکت ہوتی کیا ہے۔

برکت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے پاس جو بھی چیز ہے اس کے اندر جو اس کا مقصود یعنی اس کی

☆ انعام الباری (۶/ ۱۳۵ تا ۱۳۹)، زیر نظر بیان صحیح بخاری شریف کا ایک درس ہے، جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے طلبہ کے سامنے مال میں برکت کے اسلامی نقطۂ نظر پر روشنی ڈالی ہے۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب إذا بين البيعان ولم يكتما ونصحا، رقم: ۱۹۳۷

منفعت ہے وہ بھرپور طریقے سے حاصل ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا کے جتنے بھی مال واسباب ہیں ان میں سے کوئی بھی بذات خود راحت پہنچانے والا نہیں ہے۔ مثلاً روپیہ ہے اگر تم بھوک میں کھانا چاہو تو بھوک نہیں مٹا سکتا، کچھ حاصل نہیں ہوگا، پیاس لگی ہے تو وہ پیاس نہیں مٹا سکتے، اس کے اندر بھی بذات خود بھوک مٹانے کی صلاحیت نہیں، اگر بیماری ہو تو بیماری کے اندر ایسی بیماریاں بھی ہوتی ہیں کہ کھاتے جاؤ اور بھوک نہیں مٹتی، ایسی بیماریاں بھی ہوتی ہیں کہ پانی پیتے جاؤ اور پیاس نہیں مٹتی۔ تو اصل مقصود راحت ہے، لیکن راحت ان اسباب کا لازمہ نہیں ہے کہ جب بھی پیسے زیادہ ہوں گے تو راحت ضرور ہوگی یا جب بھی مال واسباب زیادہ ہوگا تو راحت ضرور ہوگی، بلکہ راحت تو کسی اور ہی چیز سے آتی ہے وہ چاہے تو ایک روپیہ میں راحت دیدے اور نہ چاہے تو ایک کروڑ میں نہ دے، اس واسطے راحت جو کہ مقصود اصلی ہے اس کا نام برکت ہے، اور یہ محض عطائے الٰہی سے آتی ہے اس کا اسباب کی گنتی سے کوئی تعلق نہیں۔

مثلاً ایک کروڑ پتی ہے جس کی ملیں کھڑی ہوئی ہیں، کاریں ہیں، کارخانے ہیں، مال ودولت ہے، بینک بیلنس ہے، لیکن جب رات کو بستر پر لیٹتا ہے نیند نہیں آتی اور کروٹیں بدلتا رہتا ہے، ائیر کنڈیشن چل رہا ہے نرم وگداز گدا نیچے ہے اور صاحب بہادر کو نیند نہیں آ رہی تو یہ مسہری، یہ گدا، یہ ائیر کنڈیشنڈ کمرہ اس کے لئے راحت کا سبب نہیں بن سکے، بے چینی کے عالم میں رات گزاری صبح ڈاکٹر کو بلایا ڈاکٹر گولیاں دیتا ہے کہ یہ کھاؤ تو نیند آئے گی۔

اور اگر مزدور ہے آٹھ گھنٹے کی محنت کر کے پسینے میں شرابور ہو کے اور ساگ سے روٹی کھا کے آٹھ گھنٹے جو بھرپور نیند لی صبح کو جا کر اس نے دم لیا۔ اب بتائیں کہ کس کو راحت حاصل ہوئی؟ حالانکہ وہ کروڑ پتی تھا اور یہ بیچارہ مفلس ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے افلاس میں راحت فرمادی اور اس کروڑ پتی کو راحت نہیں ملی، تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔

آج لوگ اس حقیقت کو فراموش کر گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ گنتی ہونی چاہئے، بینک بیلنس ہونا چاہئے، بینک میں پیسے زیادہ ہونے چاہئیں، یہ پتہ نہیں کہ جس رشوت سے پیسہ کمایا، دھوکہ سے یا جھوٹ سے کمایا، اس کی گنتی تو بہت ہوگئی لیکن اس نے ان کو نفع نہیں پہنچایا اس سے راحت نہیں ملتی۔

مثلاً کما کر لائے معلوم ہوا کہ گھر میں کوئی بیمار ہوگیا ہے تو جو پیسے آئے تھے وہ ڈاکٹروں اور لیبارٹری کی نذر ہوگئے، سونا چاہا تو نیند نہیں آتی، کھانے بیٹھے انواع واقسام کے کھانے مہیا ہیں، انواع واقسام کی نعمتیں موجود ہیں مگر معدہ اس قابل نہیں کہ کوئی چیز کھا سکے۔

ایک عبرتناک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وعظ میں فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو نواب تھا، نواب ایک ریاست کے سربراہ کو کہتے ہیں، دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہیں تھی جو اس کے گھر میں موجود نہ ہو مگر ڈاکٹر نے کہہ رکھا تھا کہ آپ کی غذا ایک ہی چیز ہے، ساری عمر اسی پر گزارہ کریں گے، اگر ایسا کریں گے تو زندہ رہیں گے ورنہ مرجائیں گے، اور وہ یہ کہ بکری کا قیمہ ایک ململ کے کپڑے میں رکھ کر اور اس میں پانی ڈال کر اس کو نچوڑو، اب وہ جو پانی نکلا ہے بس آپ وہ پی سکتے ہیں، اگر دنیا کی اور کوئی چیز کھاؤ گے تو مرجاؤ گے۔ لہٰذا ساری عمر اسی قیمہ کے پانی پر گزاری، نہ روٹی، نہ گوشت، نہ سبزی، نہ ساگ، نہ دال، نہ اور کچھ کھا سکا۔

تو اب بتائیں وہ کروڑ پتی پن کس کام کا جو آدمی کو ایک وقت میں کھانے کی لذت بھی فراہم نہ کرسکے، یہ وہ مقام ہے جہاں برکت سلب ہوگئی اور یہ برکت پیسوں سے خریدی نہیں جاسکتی کہ بازار میں جاؤ اور برکت خرید لاؤ، اتنے پیسے دو اور خرید لو۔

حصول برکت کا طریقہ

برکت اللہ جل جلالہ کی عطا ہے اور یہ عطا کس بنیاد پر ہوتی ہے، میں نے بتادیا کہ اگر امانت سے کام کرو گے، دیانت سے کام کرو اور حلال طریقے پر کام کرو گے تو برکت ہوگی، اور اگر حرام طریقے سے کرو گے ناجائز اور دھوکہ بازی سے کرو گے تو برکت سلب ہوجائے گی۔ لہٰذا چاہے تمہاری گنتی میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن اس کا فائدہ تمہیں نہیں حاصل ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حصول برکت کے لئے دعا کی تلقین کرنا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمائی ہے کہ جب کسی کو دعا دو:

((بَارَكَ اللّٰهُ))(۱)

یہ معمولی دعا نہیں ہے۔ یہ بڑی زبردست دعا ہے، اور ہمارے ہاں جو مشہور ہے کہ بھائی مبارک ہو آپ نے مکان بنایا، مبارک ہو آپ نے نکاح کیا، مبارک ہو آپ نے گاڑی خریدی، یعنی ہر چیز میں مبارک کی دعا دیتے ہیں یہ بڑی پیاری دعا ہے، اگر اس کو سوچ سمجھ کر دیا جائے اور لیا جائے

(۱) یہ دعا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مواقع پر اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دی۔ دعا کا ترجمہ یہ ہے: "اللہ تعالیٰ آپ کو برکت عطا فرمائے"

تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز جو آپ کو ملی ہے اس کی برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو، یہ درحقیقت ایک حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ چیز کچھ بھی نہیں ہے جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس میں برکت نہ ڈالی جائے۔ مکان بیشک عالی شان بنالیا لیکن عالی شان مکان کوئی حقیقت نہیں رکھتا، جب تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے برکت عطا نہ ہو اور برکت عطا ہوگی تو اس کو راحت ملے گی، مکان تو ہے مگر مکان کی برکت نہیں ہے تو یہ مکان تمہارے لئے عذاب ہو جائے گا، یہ بڑی کانٹے کی بات ہے دنیا آج گنتی کے پیچھے بھاگ رہی ہے لیکن برکت کو نہیں دیکھتے، اور جب کسی مالدار کو دیکھا کہ اس کے پاس عالی شان کوٹھی ہے، بنگلہ ہے، مل ہے، کار ہے اور کارخانے ہیں تو وہی بات دل میں آتی ہے۔ لیکن تمہیں پتہ نہیں کہ یہ جو ظاہری چمک دمک اور شان وشوکت ہے ذرا اس کے دل میں جھانک کر دیکھو کہ ان تمام اسباب کے جمع کرنے کے باوجود وہ کن اندھیروں میں گرفتار ہے۔

ظاہری چمک دمک پر نہیں جانا چاہئے

میرے پاس پچاسیوں بڑے بڑے سرمایہ دار دولت مند آتے رہتے ہیں ایسے ایسے لوگ آتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر آدمی یہی کہے کہ کاش مجھے ایسی دولت مل جائے لیکن جب وہ اپنے دکھڑے بیان کرتے ہیں کہ وہ کن دکھوں میں مبتلا ہیں تو واقعی مجھے عبرت ہوتی ہے کہ اس مال ہی کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے عذاب بنا رکھا ہے۔

میرے پاس اکثر ایک خاتون مسئلہ وغیرہ پوچھنے کے لئے آتی رہتی ہیں، ان کے شوہر کے لئے ارب پتی کا لفظ بھی کم ہے اور اس عورت کو جب دوسری عورتیں دیکھتی ہیں کہ کیسا لباس پہنی ہوئی ہے، کیسی گاڑی میں آرہی ہے، کیسے مکان میں رہ رہی ہے تو ان کی آنکھیں چکاچوند ہوتی ہیں کہ کیسی زبردست عورت ہے۔ لیکن وہ جو آکر میرے سامنے بلک بلک کر بچوں کی طرح روتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ دولت نکال دے اور مجھے وہ سکون نصیب ہو جائے کہ جو ایک جھونپڑی والے کو حاصل ہوتا ہے، دیکھنے والے تو اس کی چکاچوند دیکھ رہے ہیں لیکن میرے سوا یا اس کے سوا کسی کو پتہ نہیں کہ وہ کس اذیت میں مبتلا ہے، اس واسطے کبھی یہ ظاہری شان وشوکت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے چکر میں مت آؤ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ دل کا سکون عطا فرمائے، وہ راحت عطا فرمائے جسے برکت کہتے ہیں۔

ظاہری چمک دمک والوں کے لئے عبرتناک واقعہ

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک غریب آدمی تھا وہ ایک مستجاب الدعوات بزرگ کے پاس گیا اور جا کر ان سے کہا کہ حضرت میرے لئے دعا فرما دیجئے کہ میں بھی دولت مند ہو جاؤں مشکلوں میں گرفتار رہوں اور دل یوں چاہتا ہے کہ بس سب سے امیر ترین ہو جاؤں۔ پہلے تو انہوں نے سمجھایا کہ کس چکر میں پڑ گئے ہو اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو لیکن وہ نہ مانا، تو بزرگ نے کہا کہ تم یہاں شہر میں کوئی دولت مند آدمی تلاش کرو جو بہت ہی امیر ترین ہو تو اس کا مجھے بتا دینا میں دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا بنا دے۔ اس نے شہر میں چکر لگا کر ایک سنار کو منتخب کیا جس کی دوکان زیورات سے بھری ہوئی تھی، پانچ چھ لڑکے ایک سے ایک خوبصورت ہیں اور کام میں اس کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، ہنسی مذاق ہو رہا ہے، کھانے پینے کا ساز و سامان ہے، سب کچھ ہے غرض دنیا کی ساری نعمت ہے، اس نے کہا کہ بس یہی ہے۔

چنانچہ غریب آدمی نے حاضر ہو کر عرض کیا ''حضرت! میں دیکھ کر آیا ہوں، ایک سنار بہت اعلیٰ درجہ کا ہے دعا کر دیجئے کہ ایسا ہو جاؤں''

بزرگ نے حتی الامکان سمجھایا کہ پہلے معلومات کر لو پھر دعا کر دوں گا۔

بزرگ نے کہا ''بھائی ظاہری حالت تو دیکھ آئے ہو کسی وقت تنہائی میں اس سے پوچھ لو کہ تم خوش ہو کہ نہیں؟''

تو یہ شخص ان بزرگ کے کہنے پر پھر گیا اور سنار سے تنہائی کا وقت لیا اور اس سے پوچھا کہ بھائی تمہاری دوکان دیکھی ہے بڑی شان دار ہے یہ بتاؤ کہ تمہاری زندگی جو کہ بڑی قابل رشک معلوم ہوتی ہے کیسے گزرتی ہے؟

سنار نے کہا ''میاں کس چکر میں پڑے ہو، میں تو اس روئے زمین پر ایسا مصیبت زدہ شخص ہوں کہ زمین پر مجھ سے زیادہ کوئی اور شخص مصیبت زدہ ہو ہی نہیں سکتا، بات دراصل یہ ہے کہ میں یہ سونے کا کاروبار کرتا تھا اور اس میں خوب آمدنی تھی، بیوی بیمار ہوگئی بہت علاج کرایا صحیح نہیں ہوئی، پریشانی رہی آخر میں بیوی بالکل مایوس ہوگئی، مجھے بیوی سے بہت محبت تھی بیماری کے عالم میں بیوی مجھ سے کہنے لگی کہ مجھے تو یہ خیال ہے کہ جب میں مرجاؤں گی تو تم دوسری شادی کر لو گے اور مجھے بھول جاؤ گے، میں نے کہا کہ نہیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ دوسری شادی نہیں کروں گا۔ اس نے کہا کہ کوئی یقین دلاؤ میں نے کہا کہ میں قسم کھانے کو تیار ہوں، کہا کہ قسم کا مجھے بھروسہ نہیں آخر کار اس کو یقین

والانے کی خاطر میں نے اپنا عضو تناسل کاٹ دیا، اس کے بعد اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ تندرست ہوگئی مگر میں قوت مردانہ سے محروم ہو چکا تھا ایک عرصہ اس طرح گزارہ وہ بھی آخر جوان تھی تو اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ اس نے جب یہ دیکھا کہ شوہر کے ساتھ تو کوئی راستہ اب ہے نہیں تو اس نے گناہ کا راستہ اختیار کرنا شروع کیا اور یہ جو خوبصورت بچے دوکان میں نظر آرہے ہیں ناجائز اولاد ہے، میں دیکھتا رہتا ہوں اور کڑھتا ہوں، ساری زندگی میری اس گھٹن میں گزر رہی ہے تو مجھ سے زیادہ تو کوئی مغموم اس دنیا میں ملے گا نہیں''

لہٰذا یہ جتنے چمک دمک والے نظر آتے ہیں ان کی زندگیوں کے اندر جھانک کر دیکھو تو پتہ لگے گا کہ کیا اندھیرے ہیں۔ لہٰذا اللہ سے مانگنے کی چیز صرف عافیت ہے اور راحت ہے۔ اللہ تعالیٰ عافیت اور راحت عطا فرمائے جو کچھ عطا فرمائے اس میں برکت عطا فرمائے۔

اب دیکھیں حدیث میں ہر جگہ جہاں بھی دیکھیں گے بار بار یہ دعا ہے:

((بَارِكْ لَنَا فِيمَا أَعْطَيْتَنَا)) (۱)

لیکن اس کی قدر و قیمت آج دنیا سے مٹ گئی ہے اور گنتی کی ہوگئی ہے، ہمارے پیسے زیادہ ہونے چاہئیں حالانکہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اصل چیز کو دیکھو وہ برکت ہے۔

☆☆☆

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ماجاء فی القنوت فی الوتر، رقم: ۴۲۵، سنن النسائی، کتاب قیام اللیل وتطوع النهار، باب الدعاء فی الوتر، رقم: ۱۷۲۵، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب القنوت فی الوتر، رقم: ۱۲۱۴، سنن ابن ماجه، کتاب إقامة الصلاة والسنة فیها، باب ماجاء فی القنوت فی الوتر، رقم: ۱۱۶۸، مسند أحمد، رقم: ۱۶۲۵

رشوت کا گناہ

شراب نوشی اور بدکاری سے بھی زیادہ سنگین ہے ☆

بعض برائیاں تو ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں لوگوں کی رائے مختلف ہو سکتی ہے ایک شخص کے نزدیک وہ برائی ہے، اور دوسرا اسے کوئی عیب نہیں سمجھتا، لیکن رشوت ایسی برائی ہے جس کے برا ہونے پر ساری دنیا متفق ہے کوئی مذہب وملت کوئی مکتب فکر یا انسانوں کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ملے گا جو رشوت کو بدترین گناہ یا جرم نہ سمجھتا ہو، حد یہ ہے کہ جو لوگ دن کے وقت دفتروں میں بیٹھ کر دھڑلے سے رشوت کا لین دین کرتے ہیں وہ بھی جب شام کو کسی محفل میں معاشرے کی خرابیوں پر تبصرہ کریں تو ان کی زبان پر سب سے پہلے رشوت کی گرم بازاری ہی کا شکوہ آئے گا اور اس کی تائید میں وہ (اپنے نہیں) اپنے رفقائے کار کے دو چار واقعات سنادیں گے، سننے والے یا تو ان واقعات پر ہنسی مذاق میں کچھ فقرے چست کردیں گے یا پھر کوئی بہت سنجیدہ محفل ہوئی تو اس میں غم وغصہ کا اظہار کیا جائے گا لیکن اگلی ہی صبح یہی شرکائے مجلس پورے اطمینان کے ساتھ اسی کاروبار میں مشغول ہوجائیں گے۔

غرض رشوت کی خرابیوں سے پوری طرح متفق ہونے کے باوجود کوئی شخص جو اس انسانیت سوز حرکت کا عادی ہو چکا ہے وہ اسے چھوڑنے کے لئے تیار نظر نہیں آتا، اور اگر اس بارے میں کسی سے کچھ کہا جائے تو مختصر سا جواب یہ ہے کہ ساری دنیا رشوت لے رہی ہے تو ہم کیا کریں؟ گویا ان کے نزدیک رشوت چھوڑنے کی شرط یہ ہے کہ پہلے دوسرے تمام لوگ اس برائی سے تائب ہو جائیں تب ہی چھوڑنے پر غور کرسکتا ہوں اسکے بغیر نہیں، اور چونکہ رشوت لینے والے کے پاس یہی بہانہ ہے لہٰذا یہ تباہ کن بیماری ایک وبا کی شکل اختیار کر چکی ہے، فرق یہ ہے کہ جب کوئی وبا پھیلتی ہے تو وہاں کوئی مریض یہ استدلال نہیں کرتا کہ جب تک تمام دوسرے لوگ تندرست نہ ہوجائیں میں بھی صحت کی تدابیر نہیں کروں گا، لیکن رشوت کے بارے میں یہ استدلال ناقابل تردید سمجھ کر پیش کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی استدلال نہیں ایک بہانہ ہے اور بات صرف یہ ہے کہ رشوت لینے والے کو اپنے اس عمل میں فوری طور سے مالی فائدہ ہوتا نظر آتا ہے اس لئے نفس اس فائدے کو حاصل کرنے

☆ فردکی اصلاح ص ۹۷

کے لئے ہزار جیسے بہانے تراش لیتا ہے، لیکن آیئے ذرا یہ دیکھیں کہ رشوت لینے میں واقعتاً کوئی فائدہ ہے بھی یا نہیں؟ بظاہر تو رشوت لینے میں یہ کھلا فائدہ نظر آتا ہے کہ ایک شخص کی آمدنی کسی زائد محنت کے بغیر بڑھتی جاتی ہے، لیکن اگر ذرا باریک بینی سے کام لیا جائے تو اس وقتی فائدے کی مثال بالکل ایسے ہے جیسے ایک ٹائیفائڈ میں مبتلا بچے کو چٹ پٹی غذاؤں میں بڑا لطف آتا ہے لیکن بچے کے ماں باپ یا اس کے معالج جانتے ہیں کہ یہ چند لمحوں کا فائدہ نہ صرف اس کی تندرستی کو دور سے دور تر کردے گا بلکہ انجام کار اسے زیادہ طویل عرصہ تک لذیذ غذاؤں سے محروم ہوجانا پڑے گا۔

یہ مثال صرف رشوت کے اخروی نقصانات پر ہی صادق نہیں آتی بلکہ ذرا انصاف سے کام لیا جائے تو رشوت کے دنیوی نقصانات کے بارے میں بھی اتنی ہی سچی ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب معاشرے میں یہ لعنت پھیل جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی ایک جگہ سے کوئی رشوت وصول کرتا ہے تو اسے دسیوں جگہ خود رشوت دینی پڑتی ہے، بظاہر تو وہ ممکن ہے کہ اسے آج سو روپے زیادہ ہاتھ آگئے، لیکن کل جب اسے خود دوسرے لوگوں سے کام پڑے گا تو یہ سو روپے نہ جانے کتنے سو ہو کر خود اس کی جیب سے نکل جائیں گے۔

پھر رشوت کا یہ نقد نقصان کیا کم ہے کہ اس کی بدولت پورا معاشرہ بدامنی اور بے چینی کا جہنم بن جاتا ہے کیونکہ کسی بھی ملک میں باشندوں کے امن وسکون کی سب سے بڑی ضمانت اس ملک کا قانون اور اس قانون کے محافظ ادارے ہی ہوسکتے ہیں، لیکن جس جگہ رشوت کا بازار گرم ہو وہاں بہتر سے بہتر قانون بھی بالکل مفلوج اور ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

آج جب ہم معاشرے کی بدامنی کو ختم کرنے کے لئے کوئی قانون بنانے بیٹھتے ہیں تو سب سے بڑا مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ اس قانون کو رشوت کے زہر سے کیسے بچایا جائے؟ چوری، ڈاکے، قتل، اغوا، بدکاری اور دھوکے فریب کے انسانیت کش حادثات سے آج ہر شخص سہما ہوا ہے، لیکن یہ نہیں سوچتا کہ ان حادثات کے روز افزوں ہونے کا سبب اور حقیقت وہ رشوت ہے جو ہر اچھے سے اچھے قانون کو چند نوٹوں کے عوض بیچ کر اس کی ساری افادیت کو خاک میں ملا دیتی ہے اور جسے ہم نے اپنے روزمرہ کے طرز عمل سے شیر مادر بنا کر رکھ دیا ہے۔

ہم نے اگر کسی مجرم سے رشوت لیکر اسے قانون کی گرفت سے بچالیا ہے تو درحقیقت ہم نے جرم کی اہمیت قانون کے احترام اور سزا کی ہیبت کو دلوں سے نکالنے میں مدد دی ہے، اور ان مجرموں کا حوصلہ بڑھایا ہے جو کل خود ہمارے گھر پر ڈاکہ ڈال سکتے ہیں۔

ایک سرکاری افسر کسی سرکاری ٹھیکہ دار سے رشوت لیکر اس کے ناقص تعمیری کام کو منظور کرا دیتا

ہے اور مگن ہے کہ آج آمدنی زیادہ ہوگئی، لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ جس ناقص پل کی تعمیر پر اس نے صاد کرادیا ہے کل جب گرے گا تو اس کی زد میں خود وہ اور اس کے بچے بھی آسکتے ہیں، جس ناقص مال کی بنی ہوئی سڑک اس نے منظور کرادی ہے وہ ہزار ہا دوسرے افراد کی طرح خود اس کے لئے بھی عذاب جان بنے گی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرکاری کاموں کے سلسلے میں رشوت کے عام لین دین سے ہم نے سرکاری خزانے کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا بار کوئی حکمراں ہی نہیں اٹھائے گا بلکہ اس کے نتائج زائد ٹیکسوں کی شکل میں ملک کے تمام باشندوں کو بھگتنے پڑیں گے جن میں ہم خود بھی داخل ہیں، اس سے ملک میں گرانی بھی پیدا ہوگی، خزانہ بھی کمزور پڑے گا، ملک کے ترقیاتی کام بھی رکیں گے، اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی منزل بھی دور ہوگی، اور دوسری اقوام ہمیں بدستور لقمہ تر سمجھتی رہیں گی۔

یہ تو چند سرسری سی مثالیں تھیں، لیکن اگر ہم ذرا اس رخ سے مزید سوچیں تو اندازہ ہوگا کہ رشوت کے لین دین کی بدولت ہم خود دنیا میں مستقل طور پر کن پیچیدہ مصائب اور سنگین مشکلات میں مبتلا ہوگئے ہیں؟

رشوت کے یہ دنیوی نقصانات تو اجتماعی نوعیت کے ہیں اور بالکل سامنے کے ہیں، لیکن اگر ذرا اور گہری نظر سے دیکھئے تو خاص رشوت لینے والے کی انفرادی زندگی بھی رشوت کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں رہتی، حدیث میں ہے:

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ وَالرَّائِشَ يَعْنِيَ الَّذِيْ يَمْشِيْ بَيْنَهُمَا))(۱)

"رسول کریم ﷺ نے لعنت بھیجی ہے رشوت دینے والے پر بھی، رشوت لینے والے پر بھی اور رشوت کے دلال پر بھی"

جس ذات اقدس ﷺ نے دشمنوں کے حق میں بھی دعائے خیر ہی کی ہو اس ذات اقدس کا کسی شخص پر لعنت بھیجنا معمولی بات نہیں، اس کا اثر آخرت میں ظاہر ہوگا ہی لیکن دنیا میں بھی یہ لوگ اس لعنت کے اثر سے بچ نہیں سکتے، چنانچہ جو لوگ معاشرے کو تباہی کے راستے پر ڈال کر حق داروں کا

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الاحکام عن رسول اللہ، باب ماجاء فی الراشی والمرتشی فی الحکم، رقم: ۱۲۵٦، سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیة، باب فی کراهیة الرشوة، رقم: ۳۱۰۹، سنن ابن ماجه، کتاب الاحکام، باب التغلیظ فی الحیف والرشوة، رقم: ۲۳۰٤، مسند احمد، رقم: ٦٢٤٦

دل دکھا کر غریبوں کا حق چھین کر اور ملت کی کشتی میں سوراخ کر کے رشوت لیتے ہیں، بظاہر ان کی آمدنی میں خواہ کتنا اضافہ ہو جاتا ہو لیکن خوشحالی اور راحت و آسائش روپے پیسے کے ڈھیر، عالی شان کوٹھیوں، شاندار کاروں اور اپ ٹو ڈیٹ فرنیچر کا نام نہیں ہے بلکہ دل کے اس سکون، روح کے اس اقرار اور ضمیر کے اس اطمینان کا نام ہے جسے کسی بازار سے کوئی بڑی سے بڑی قیمت دے کر بھی نہیں خریدا جا سکتا، یہ صرف اور صرف اللہ کی دین ہوتی ہے، جب اللہ تعالیٰ کسی کو یہ دولت دیتا ہے تو ٹوٹے جھونپڑے، کھجور کی چٹائی اور ساگ کی روٹی میں بھی دے دیتا ہے اور کسی کو نہیں دیتا تو شاندار بنگلوں، کاروں اور کارخانوں میں بھی نصیب نہیں ہوتی۔

آج اگر آپ کو رشوت کے ذریعے کچھ زائد آمدنی ہوگئی ہے لیکن ساتھ ہی کوئی بچہ بیمار پڑ گیا ہے تو کیا یہ زائد آمدنی آپ کو کوئی سکون دے سکے گی؟ آپ کی ماہانہ آمدنی کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے لیکن اگر اسی تناسب سے گھر میں ڈاکٹر اور دوائیں آنے لگی ہیں تو آپ کو کیا ملا؟ اور اگر فرض کیجئے کہ کسی نے رشوت کے روپے سے تجوریاں بھر بھی لیں، لیکن اولاد نے باغی ہو کر زندگی اجیرن بنادی، داماد نے جینا دوبھر کر دیا، یا اسی قسم کی کوئی اور پریشانی کھڑی ہوگئی تو کیا یہ ساری آمدنی اسے کوئی راحت پہنچا سکے گی؟

واقعہ یہ ہے کہ ایک مسلمان اللہ اور رسول کے احکام سے باغی ہو کر روپیہ تو جمع کر سکتا ہے لیکن اس روپے کے ذریعے راحت و سکون حاصل کرنا اس کے بس کی بات نہیں، عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ حرام طریقے سے کمائی ہوئی دولت پریشانیوں اور آفتوں کا ایسا چکر لیکر آتی ہے جو عمر بھر انسان کو گردش میں رکھتا ہے۔

قرآن کریم نے کھلے الفاظ میں بتایا کہ ''جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً'' کھاتے ہیں وہ ایسے مصائب کا شکار کر دیئے جاتے ہیں جن کی موجودگی میں لذیذ سے لذیذ غذا بھی آگ معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا رشوت خوروں کے اونچے مکان اور شاندار اسباب دیکھ کر اس دھوکے میں نہ آنا چاہیے کہ انہوں نے رشوت سے خوش حالی حاصل کر لی، بلکہ ان کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بیشتر افراد کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ حرام سے اجتناب کر کے اللہ کے دیئے ہوئے حلال رزق پر قناعت کرتے ہیں، ابتداء میں انہیں کچھ مشکلات پیش آسکتی ہیں لیکن مآل کار دنیا میں بھی وہی فائدے میں رہتے ہیں، ان کی تھوڑی آمدنی میں بھی زیادہ کام نکلتے ہیں، ان کے اوقات اور کاموں میں بھی

برکت ہوتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دل کے سکون اور ضمیر کے اطمینان کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔

اوپر رشوت کے جو نقصان بیان کئے گئے وہ تمام تر دنیوی نقصانات تھے، اور اس لعنت کا سب سے بڑا نقصان آخرت کا نقصان ہے، دنیا میں اور ہزار چیزوں میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس بارے میں کسی مذہب اور کسی مکتب فکر کا اختلاف نہیں کہ ہر انسان کو ایک نہ ایک دن موت ضرور آئے گی، اگر بالفرض رشوتیں لے لیکر کسی شخص نے چند روز مزے اڑا بھی لئے تو بالآخر اس کا انجام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں یہ ہے:

''رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنم میں ہوں گے''(۱)

اور اس لحاظ سے رشوت کا گناہ شراب نوشی اور بدکاری سے بھی زیادہ سنگین ہے کہ شراب نوشی اور بدکاری سے اگر کوئی شخص صدق دل کے ساتھ توبہ کرلے تو وہ اسی لمحے معاف ہوسکتا ہے لیکن رشوت کا تعلق چونکہ حقوق العباد سے ہے اس لئے جب تک ایک ایک حقدار کو اس کی رقم نہ چکائے یا اس سے معافی نہ مانگے اس گناہ کی معافی کا کوئی راستہ نہیں۔ عام طور سے جب انسان کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اسے اپنی آخرت کی فکر لاحق ہو ہی جاتی ہے، اگر اس وقت عارضی دنیوی مفاد کے لالچ میں ہم یہ گناہ کرتے رہے تو یقین رکھئے کہ موت سے پہلے ہی جب آخرت کی منزل سامنے ہوگی تو یہ اعمال دنیا کے ہر آرام وراحت کو مستقل عذاب جان بنا کر رکھ دیں گے اور اس عذاب سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر تنہا میں نے رشوت ترک کردی تو اس سے پورے معاشرے پر کیا اثر پڑے گا؟ لیکن یہی وہ شیطان کا دھوکہ ہے جو معاشرے سے اس لعنت کے خاتمے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جب ہر شخص دوسرے کا انتظار کرے گا تو معاشرہ کبھی اس لعنت سے پاک نہ ہوسکے گا۔ آپ رشوت کو ترک کر کے کم از کم خود اس کے دنیا اور آخرت کے نقصانات سے محفوظ ہوسکیں گے، اس کے بعد آپ کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ بنے گی، کیا بعید ہے کہ آپ کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اس لعنت سے تائب ہوجائیں، تاریکی میں ایک چراغ جل اٹھے تو پھر چراغ سے

(۱) حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ((الراشی والمرتشی فی النار)) المعجم الأوسط، رقم: ۲۰۲۶ (۲/۲۹۵) المعجم الصغیر، رقم: ۵۸ (۱/۵۷)، مسند البزار، رقم: ۱۰۳۷ (۳/۲۴۷)، المطالب العالیہ، رقم: ۲۱۸۵ (۱۰/۱۸۷)، مجمع الزوائد (۴/۱۹۸)، عام طور پر اس حدیث کے یہ الفاظ مشہور ہیں: ((الراشی والمرتشی کلاھما فی النار)) تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت میں ''کلاھما'' کا لفظ موجود نہیں۔

چراغ جلنے کا سلسلہ اتنا دراز ہوسکتا ہے کہ اس سے پورا ماحول بقعۂ نور بن جائے، پھر جب کوئی شخص اللہ کے لئے اپنے نفس کے کسی تقاضے کو چھوڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال ہوتی ہے، دور دور سے ایک کام کو مشکل سمجھنے کے بجائے اسے کر کے دیکھئے، اللہ تعالیٰ سے اس کی آسانی کی دعا مانگئے۔ انشاء اللہ اس کی مدد ہوگی ضرور ہوگی بالضرور ہوگی۔

کیا عجب ہے کہ معاشرے کو اس لعنت سے پاک کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کو منتخب کیا ہو۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

آپ زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِo بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِo

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍo يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَo﴾(۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! آج کا یہ اجتماع اسلام کے ایک اہم رکن یعنی زکوٰۃ کے موضوع پر منعقد کیا گیا ہے، اور رمضان کے مبارک مہینے سے چند روز پہلے یہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ عام طور پر لوگ رمضان المبارک کے مہینے میں زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ لہٰذا اس اجتماع کا مقصد یہ ہے کہ زکوٰۃ کی اہمیت، اس کے فضائل اور اس کے ضروری احکام اس اجتماع کے ذریعہ ہمارے علم میں آجائیں تاکہ اس کے مطابق زکوٰۃ نکالنے کا اہتمام کریں۔

زکوٰۃ نہ نکالنے پر وعید

اس مقصد کے لئے میں نے قرآن کریم کی دو آیتیں آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر بڑی سخت وعید بیان فرمائی ہے جو اپنے مال کی کماحقہ زکوٰۃ نہیں نکالتے، ان کے لئے بڑے سخت الفاظ میں عذاب کی خبر دی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ جو لوگ اپنے پاس سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے تو اے نبی ﷺ آپ ان کو ایک دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے۔ یعنی جو لوگ اپنا پیسہ، اپنا روپیہ، اپنا سونا چاندی جمع کرتے جارہے ہیں اور ان کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، ان پر اللہ تعالیٰ نے جو فریضہ عائد کیا ہے اس کو ادا نہیں کرتے، ان کو یہ خوشخبری سنا دیجئے کہ ایک دردناک عذاب ان کا انتظار کر رہا ہے۔ پھر دوسری آیت میں اس دردناک عذاب کی تفصیل بیان فرمائی کہ یہ دردناک عذاب اس دن ہوگا جس دن اس سونے اور چاندی کو آگ میں تپایا جائے گا اور پھر اس آدمی کی

☆ آپ زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟ رسالہ مطبوعہ ''مرکز الاقتصاد الاسلامی'' کراچی

(۱) التوبة: ۳۴-۳۵

پیشانی، اس کے پہلو اور اس کی پشت کو داغا جائے گا اور اس کو یہ کہا جائے گا:

﴿هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ﴾

''یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، آج تم خزانے کا مزہ چکھو جو تم اپنے لئے جمع کر رہے تھے''

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس انجام سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو روپیہ پیسہ جمع کر رہے ہیں لیکن اس پر اللہ تعالیٰ نے جو فرائض عائد کیے ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک بجا نہیں لاتے۔ صرف ان آیات میں نہیں بلکہ دوسری آیات میں بھی وعیدیں بیان فرمائی گئی ہیں، چنانچہ سورۃ ہمزہ میں فرمایا:

﴿وَيْلٌ لِكُلِّ هُمَزَةٍ لُمَزَةٍ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ﴾(۱)

(۱) الھمزۃ: ۱-۷

اس شخص کے لئے دردناک عذاب ہے جو عیب نکالنے والا ہے اور طعنہ دینے والا ہے، جو مال جمع کر رہا ہے اور گن گن کر رکھ رہا ہے (ہر روز گنتا ہے کہ آج میرے مال میں کتنا اضافہ ہو گیا ہے اور اس کی گنتی کر کے خوش ہو رہا ہے) اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ مال مجھے ہمیشہ کی زندگی عطا کر دے گا، ہرگز نہیں۔ (یاد رکھو! یہ مال جس کو وہ گن گن کر رکھ رہا ہے اور اس پر جو واجبات ہیں ان کو ادا نہیں کر رہا ہے، اس کی وجہ سے) اس کو روندنے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ تمہیں کیا پتہ کہ ''حطمہ'' کیا چیز ہوتی ہے؟ (یہ حطمہ جس میں اس کو ڈالا جائے گا) یہ ایسی آگ ہے جو اللہ کی سلگائی ہوئی ہے (یہ کسی انسان کی سلگائی ہوئی آگ نہیں ہے جو پانی سے بجھ جائے یا مٹی سے بجھ جائے یا جس کو فائر بریگیڈ بجھا دے بلکہ یہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے) جو انسان کے قلب و جگر تک جھانکتی ہوگی (یعنی انسان کے قلب و جگر تک پہنچ جائے گی)

اتنی شدید وعید اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔

یہ مال کہاں سے آ رہا ہے؟

زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر ایسی شدید وعید کیوں بیان فرمائی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ مال تم اس دنیا میں حاصل کرتے ہو، چاہے تجارت کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، چاہے ملازمت کے ذریعہ حاصل

کرتے ہو، چاہے کاشت کاری کے ذریعہ حاصل کرتے ہو، یا کسی اور ذریعہ سے حاصل کرتے ہو، ذرا غور کرو کہ وہ مال کہاں سے آرہا ہے؟ کیا تمہارے اندر طاقت تھی کہ تم اپنے زورِ بازو سے وہ مال جمع کرسکتے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا حکیمانہ نظام ہے، وہ اپنے اس نظام کے ذریعہ تمہیں رزق پہنچارہا ہے۔

گاہک کون بھیج رہا ہے؟

تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے مال جمع کرلیا اور دکان کھول کر بیٹھ گیا اور اس مال کو فروخت کردیا تو اس کے نتیجے میں مجھے پیسہ مل گیا، یہ نہ دیکھا کہ جب دکان کھول کر بیٹھ گئے تو تمہارے پاس گاہک کس نے بھیجا؟ اگر تم دکان کھول کر بیٹھے ہوتے اور کوئی گاہک نہ آتا تو اس وقت کوئی بکری ہوتی؟ کوئی آمدنی ہوتی؟ یہ کون ہے جو تمہارے پاس گاہک بھیج رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ ایک دوسرے کی حاجتیں، ایک دوسرے کی ضرورتیں ایک دوسرے کے ذریعہ پوری کی جاتی ہیں۔ ایک شخص کے دل میں ڈال دیا کہ تم جا کر دکان کھول کر بیٹھو اور دوسرے کے دل میں یہ ڈال دیا کہ اس دکان والے سے خریدو۔

ایک سبق آموز واقعہ

میرے ایک بڑے بھائی تھے جناب محمد ذکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے، آمین، لاہور میں ان کی دینی کتابوں کی ایک دکان ''ادارۂ اسلامیات'' کے نام سے تھی، اب بھی وہ دکان موجود ہے، وہ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ تجارت میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور قدرت کے عجیب کرشمے دکھلاتا ہے، ایک دن میں صبح بیدار ہوا تو پورے شہر میں موسلا دھار بارش ہورہی تھی اور بازاروں میں کئی کئی انچ پانی کھڑا تھا، میرے دل میں خیال آیا کہ آج بارش کا دن ہے، لوگ گھر سے نکلتے ہوئے ڈر رہے ہیں، سڑکوں پر پانی کھڑا ہے، ایسے حالات میں کون کتاب خریدنے آئے گا اور کتاب بھی کوئی دنیاوی یا کورس اور نصاب کی نہیں بلکہ دینی کتاب جس کے بارے میں ہمارا حال یہ ہے کہ جب دنیا کی ساری ضرورتیں پوری ہوجائیں تب جا کر یہ خیال آتا ہے کہ چلو کوئی دینی کتاب خرید کر پڑھ لیں، ان کتابوں سے نہ تو بھوک مٹتی ہے نہ پیاس بجھتی ہے نہ اس سے کوئی دنیا کی ضرورت پوری ہوتی ہے، اور آج کل کے حساب سے دینی کتاب ایک فالتو مد ہے، خیال یہ ہوتا ہے کہ فالتو وقت ملے گا تو دینی کتاب پڑھ لیں گے۔ تو ایسی موسلا دھار بارش میں کون دینی کتاب خریدنے آئے گا، لہٰذا آج دکان پر نہ جاؤں اور چھٹی کرلیتا ہوں۔

لیکن چونکہ بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے، حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اُٹھائی تھی، فرمانے لگے کہ اس کے ساتھ ساتھ میرے دل میں دوسرا خیال یہ آیا کہ ٹھیک ہے کوئی شخص کتاب خریدنے آئے یا نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ نے میرے لئے رزق کا یہ ذریعہ مقرر فرمایا ہے، اب میرا کام یہ ہے کہ میں جاؤں، جاکر دکان کھول کر بیٹھ جاؤں، گاہک بھیجنا میرا کام نہیں، کسی اور کا کام ہے، لہٰذا مجھے اپنے کام میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے، چاہے بارش ہورہی ہو یا سیلاب آرہا ہو، مجھے اپنی دکان کھولنی چاہئے۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے چھتری اُٹھائی اور پانی سے گزرتا ہوا چلا گیا اور بازار جاکر دکان کھول کر بیٹھ گیا اور یہ سوچا کہ آج کوئی گاہک تو آئے گا نہیں، چلو بیٹھ کر تلاوت ہی کرلیں، چنانچہ ابھی میں قرآن شریف کھول کر تلاوت کرنے بیٹھا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ برساتیاں ڈال کر اور چھتریاں تان کر کتابیں خریدنے آرہے ہیں، میں حیران تھا کہ ان لوگوں کو ایسی کونسی ضرورت پیش آگئی ہے کہ اس طوفانی بارش میں اور بہتے ہوئے سیلاب میں میرے پاس آکر ایسی کتابیں خرید رہے ہیں جن کی کوئی فوری ضرورت نہیں۔ لیکن لوگ آئے اور جتنی بکری روزانہ ہوتی تھی اس دن بھی اتنی بکری ہوئی۔ اس وقت دل میں یہ بات آئی کہ یہ گاہک خود نہیں آرہے ہیں، حقیقت میں کوئی اور بھیج رہا ہے، اور یہ اس لئے بھیج رہا ہے کہ اس نے میرے لئے رزق کا سامان ان گاہک کو بنایا ہے۔

کاموں کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

بہرحال، یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا بنایا ہوا نظام ہے جو تمہارے پاس گاہک بھیج رہا ہے، جو گاہک کے دل میں ڈال رہا ہے کہ تم اس دکان سے جاکر سامان خریدو۔ کیا کسی شخص نے یہ کانفرنس بلائی تھی اور اس کانفرنس میں یہ طے ہوا تھا کہ اتنے لوگ کپڑا فروخت کریں گے، اتنے لوگ جوتے فروخت کریں گے، اتنے لوگ چاول فروخت کریں گے، اتنے لوگ برتن فروخت کریں گے، اور اس طرح لوگوں کی ضروریات پوری کی جائیں گی۔ دنیا میں ایسی کوئی کانفرنس آج تک نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے کسی کے دل میں یہ ڈالا کہ تم کپڑا فروخت کرو، کسی کے دل میں ڈالا کہ تم جوتے فروخت کرو، کسی کے دل میں ڈالا کہ تم روٹی فروخت کرو، کسی کے دل میں یہ ڈالا کہ تم گوشت فروخت کرو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے جو بازار میں نہ ملتی ہو۔ دوسری طرف خریداروں کے دل میں یہ ڈالا کہ تم جاکر ان سے ضروریات خریدو اور ان کے لئے رزق کا سامان فراہم کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے کہ وہ تمام انسانوں کو اس طرح سے رزق عطا کر رہا ہے۔

زمین سے اُگانے والا کون ہے؟

خواہ تجارت ہو یا زراعت ہو یا ملازمت ہو، دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ زراعت کو دیکھئے! زراعت میں آدمی کا کام یہ ہے کہ زمین کو نرم کرکے اس میں بیج ڈال دے اور اس میں پانی دیدے، لیکن اس بیج کو کونپل بنانا، وہ بیج جو بالکل بے حقیقت ہے، جو گنتی میں بھی نہ آئے، جو بے وزن ہے، لیکن اتنی سخت زمین کا پیٹ پھاڑ کر نمودار ہوتا ہے اور کونپل بن جاتا ہے، پھر وہ کونپل بھی ایسی نرم اور نازک ہوتی ہے کہ اگر بچہ بھی اس کو اُنگلی سے مسل دے تو وہ ختم ہو جائے، لیکن وہی کونپل سارے موسموں کی سختیاں برداشت کرتی ہے، گرم اور سرد اور تیز ہواؤں کو سہتی ہے، پھر کونپل سے پودا بنتا ہے، پھر اس پودے سے پھول نکلتے ہیں، پھول سے پھل بنتے ہیں اور اس طرح وہ ساری دنیا کے انسانوں تک پہنچ جاتا ہے، کون ذات ہے جو یہ کام کر رہی ہے؟ اللہ جل شانہ ہی یہ سارے کام کرنے والے ہیں۔

انسان میں پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں

لہٰذا آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ ہو، چاہے وہ تجارت ہو یا زراعت ہو یا ملازمت ہو، حقیقت میں تو انسان ایک محدود کام کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے، بس انسان وہ محدود کام کر دیتا ہے لیکن اس محدود کام کے اندر کسی چیز کو پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ جل شانہ ہیں جو ضرورت کی اشیاء پیدا کرتے ہیں اور تمہیں عطا کرتے ہیں، لہٰذا جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے وہ سب اسی کی عطا ہے:

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ (۱)

''زمین وآسمان میں جو کچھ ہے وہ اسی کی ملکیت ہے''

مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں

اور اللہ تعالیٰ نے وہ چیز تمہیں عطا کرکے یہ بھی کہہ دیا کہ چلو تم ہی اس کے مالک ہو۔ چنانچہ سورۃ یٰسٓ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ﴾ (۲)

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے بنادیئے ان کے واسطے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں سے چوپائے، پھر وہ ان کے مالک ہیں''

(۱) البقرہ: ۲۸۴ (۲) یٰسٓ: ۷۱

مالک حقیقی تو ہم تھے، ہم نے تمہیں مالک بنایا۔ تو حقیقت میں وہ مال جو تمہارے پاس آیا ہے اس میں سب سے بڑا حق تو ہمارا ہے، جب ہمارا حق ہے تو پھر اس میں سے اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرو، اگر اس کے حکم کے مطابق خرچ کرو گے تو باقی جتنا مال تمہارے پاس ہے وہ تمہارے لئے حلال اور طیب ہے، وہ مال اللہ کا فضل ہے، اللہ کی نعمت ہے، وہ مال برکت والا ہے۔ اور اگر تم نے اس مال میں سے وہ چیز نہ نکالی جو اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کی ہے تو پھر یہ سارا مال تمہارے لئے آگ کے انگارے ہیں اور قیامت کے دن ان انگاروں کو دیکھ لوگے جب ان انگاروں سے تمہارے جسموں کو داغا جائے گا اور تم سے یہ کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ خزانہ جس کو تم جمع کیا کرتے تھے۔

صرف اڑھائی فیصد ادا کرو

اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتے کہ یہ مال ہماری عطا کی ہوئی چیز ہے، لہٰذا اس میں سے ڈھائی فیصد تم رکھو اور ساڑھے ستانوے فیصد اللہ کی راہ میں خرچ کردو تو بھی انصاف کے خلاف نہیں تھا، کیونکہ یہ سارا مال اسی کا دیا ہوا ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ لیکن اس نے اپنے بندوں پر فضل فرمایا اور یہ فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تم کمزور ہو اور تمہیں اس مال کی ضرورت ہے، میں جانتا ہوں کہ تمہاری طبیعت اس مال کی طرف راغب ہے، لہٰذا چلو اس مال میں سے ساڑھے ستانوے فیصد تمہارا، صرف ڈھائی فیصد کا مطالبہ ہے، جب یہ ڈھائی فیصد اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے تو باقی ساڑھے ستانوے فیصد تمہارے لئے حلال ہے اور طیب ہے اور برکت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنا معمولی مطالبہ کر کے سارا مال ہمارے حوالے کردیا کہ اس کو جس طرح چاہو اپنی جائز ضروریات میں خرچ کرو۔

زکوۃ کی تاکید

یہ ڈھائی فیصد زکوۃ ہے، یہ وہ زکوۃ ہے جس کے بارے میں قرآن کریم میں بار بار ارشاد فرمایا:

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (۳)

''نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو''

جہاں نماز کا ذکر فرمایا ہے وہاں ساتھ میں زکوۃ کا بھی ذکر ہے، اس زکوۃ کی اتنی تاکید وارد ہوئی ہے۔ جب اس زکوۃ کی اتنی تاکید ہے اور دوسری طرف اللہ جل شانہ نے اتنا بڑا احسان فرمایا ہے کہ ہمیں مال عطا کیا اور اس کا مالک بنایا اور پھر صرف ڈھائی فیصد کا مطالبہ کیا تو مسلمان کم از کم اتنا

---

(۳) البقرۃ: ۴۳

کرلے کہ وہ ڈھائی فیصد ٹھیک ٹھیک اللہ کے مطالبے کے مطابق ادا کردے تو اس پر کوئی آسمان نہیں ٹوٹ جائے گا، کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔

زکوٰۃ حساب کرکے نکالو

بہت سے لوگ تو وہ ہیں جو زکوٰۃ سے بالکل بے پرواہ ہیں، العیاذ باللہ، وہ تو زکوٰۃ نکالتے ہی نہیں ہیں۔ ان کی سوچ تو یہ ہے کہ یہ ڈھائی فیصد کیوں دیں؟ بس جو مال آرہا ہے وہ آئے۔ دوسری طرف بعض لوگ وہ ہیں جن کو زکوٰۃ کا کچھ نہ کچھ احساس ہے اور وہ زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں لیکن زکوٰۃ نکالنے کا جو صحیح طریقہ ہے وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ جب ڈھائی فیصد زکوٰۃ فرض کی گئی تو اب اس کا تقاضا یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک حساب لگا کر زکوٰۃ نکالی جائے۔

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ کون حساب کتاب کرے، کون سارے اسٹاک کو چیک کرے، لہٰذا بس ایک اندازہ کرکے زکوٰۃ نکال دیتے ہیں، اب اس اندازے میں غلطی بھی واقع ہوسکتی ہے اور زکوٰۃ نکالنے میں کمی بھی ہوسکتی ہے۔ اگر زکوٰۃ زیادہ نکال دی جائے تو انشاء اللہ مؤاخذہ نہیں ہوگا، لیکن اگر ایک روپیہ بھی کم ہوجائے یعنی جتنی زکوٰۃ واجب ہوئی ہے اس سے ایک روپیہ کم زکوٰۃ نکالی تو یاد رکھئے! وہ ایک روپیہ جو آپ نے حرام طریقے سے اپنے پاس روک لیا ہے، وہ ایک روپیہ تمہارے سارے مال کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔

وہ مال تباہی کا سبب ہے

ایک حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب مال میں زکوٰۃ کی رقم شامل ہوجائے یعنی پوری زکوٰۃ نہیں نکالی بلکہ کچھ زکوٰۃ نکالی اور کچھ باقی رہ گئی تو وہ مال انسان کے لئے تباہی اور ہلاکت کا سبب ہے۔

اس وجہ سے اس بات کا اہتمام کریں کہ ایک ایک پائی کا صحیح حساب کرکے زکوٰۃ نکالی جائے، اس کے بغیر زکوٰۃ کا فریضہ کماحقہٗ ادا نہیں ہوتا۔ الحمدللہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد وہ ہے جو زکوٰۃ ضرور نکالتی ہے لیکن اس بات کا اہتمام نہیں کرتی کہ ٹھیک ٹھیک حساب کرکے زکوٰۃ نکالے۔ اس کی وجہ سے زکوٰۃ کی رقم ان کے مال میں شامل رہتی ہے اور اس کے نتیجے میں ہلاکت اور بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔

زکوٰۃ کے دنیاوی فوائد

ویسے زکوٰۃ اس نیت سے نکالنی چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اس کی رضا کا تقاضا ہے اور ایک عبادت ہے۔ اس زکوٰۃ نکالنے سے ہمیں کوئی منفعت حاصل ہو یا نہ ہو، کوئی فائدہ ملے یا نہ ملے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت بذاتِ خود مقصود ہے۔ اصل مقصد تو زکوٰۃ کا یہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جب کوئی بندہ زکوٰۃ نکالتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فوائد بھی عطا فرماتے ہیں۔ وہ فائدہ یہ ہے کہ اس کے مال میں برکت ہوتی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾(۱)

''یعنی اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور زکوٰۃ اور صدقات کو بڑھاتے ہیں''

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی بندہ زکوٰۃ نکالتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کے حق میں یہ دعا فرماتے ہیں کہ:

((اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَأَعْطِ مُمْسِكًا مَالًا تَلَفًا)) (۲)

''اے اللہ! جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر رہا ہے اس کو اور زیادہ عطا فرمایئے، اور اے اللہ! جو شخص اپنے مال کو روک کر رکھ رہا ہے اور زکوٰۃ ادا نہیں کر رہا ہے تو اے اللہ! اس کے مال پر ہلاکت ڈالئے''

اس لئے فرمایا:

((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ))(۳)

''کوئی صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا''

چنانچہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ادھر ایک مسلمان نے زکوٰۃ نکالی دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اس کی آمدنی کے دوسرے ذرائع پیدا کر دیئے اور اس کے ذریعہ اس زکوٰۃ سے زیادہ پیسہ اس کے پاس آ گیا۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ زکوٰۃ نکالنے سے اگرچہ گنتی کے اعتبار سے پیسے کم ہو جاتے ہیں

---

(۱) البقرة: ۲۷٦

(۲) صحیح البخاری، کتاب الزكاة، باب قول الله تعالى فأما من أعطى... الخ، رقم: ۱۳۵۱، صحیح مسلم، کتاب الزكاة، باب في المنفق والممسك، رقم: ۱٦۷۸، مسند أحمد، رقم: ۷۷۰۹

(۳) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع، رقم: ٤٦۸۹، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في التواضع، رقم: ۱۹۵۲، مسند أحمد، رقم: ٦۹۰۸، مؤطا مالك، کتاب الجامع، باب ما جاء في التعفف عن المسألة، رقم: ۱۵۹۰

لیکن بقیہ مال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی برکت ہوتی ہے کہ اس برکت کے نتیجے میں تھوڑے مال سے زیادہ فوائد حاصل ہو جاتے ہیں۔

مال میں بے برکتی کا انجام

آج کی دنیا گنتی کی دنیا ہے۔ برکت کا مفہوم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ برکت اس چیز کو کہتے ہیں کہ تھوڑی سی چیز میں زیادہ فائدہ حاصل ہو جائے، مثلاً آج آپ نے پیسے تو بہت کمائے لیکن جب گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ بچہ بیمار ہے، اس کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے اور ایک ہی طبی معائنہ میں وہ سارے پیسے خرچ ہو گئے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو پیسے کمائے تھے اس میں برکت نہ ہوئی۔ یا مثلاً آپ پیسے کما کر گھر جا رہے تھے کہ راستہ میں ڈاکو مل گیا اور اس نے پستول دکھا کر سارے پیسے چھین لیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پیسے تو حاصل ہوئے لیکن اس میں برکت نہیں ہوئی۔ یا مثلاً آپ نے پیسہ کما کر کھانا کھایا اور اس کھانے کے نتیجے میں آپ کو بدہضمی ہو گئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مال میں برکت نہ ہوئی۔ یہ سب بے برکتی کی نشانیاں ہیں۔ برکت یہ ہے کہ آپ نے پیسے تو کم کمائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان تھوڑے پیسوں میں زیادہ کام بنا دیئے اور تمہارے بہت سے کام نکل گئے، اس کا نام ہے برکت۔ یہ برکت اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتا ہے۔ لہٰذا ہم اپنے مال کی زکوٰۃ نکالیں اور اس طرح نکالیں جس طرح اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا ہے اور اس کو حساب کتاب کے ساتھ نکالیں۔ صرف اندازہ سے نہ نکالیں۔

زکوٰۃ کا نصاب

اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا ایک نصاب مقرر کیا ہے کہ اس نصاب سے کم اگر کوئی شخص مالک ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، اگر اس نصاب کا مالک ہوگا تو زکوٰۃ فرض ہوگی۔ وہ نصاب یہ ہے: ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ، یا زیور، یا سامانِ تجارت وغیرہ، جس شخص کے پاس یہ مال اتنی مقدار میں موجود ہو تو اس کو "صاحبِ نصاب" کہا جاتا ہے۔

ہر ہر روپے پر سال کا گزرنا ضروری نہیں

پھر اس نصاب پر ایک سال گزرنا چاہئے، یعنی ایک سال تک اگر کوئی شخص صاحبِ نصاب رہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ لوگ یہ سمجھتے

ہیں کہ ہر ہر روپے پر مستقل پورا سال گزرے، تب اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، یہ بات درست نہیں۔ بلکہ جب ایک مرتبہ سال کے شروع میں ایک شخص صاحبِ نصاب بن جائے مثلاً فرض کریں کہ یکم رمضان کو اگر کوئی شخص صاحبِ نصاب بن گیا، پھر آئندہ سال جب یکم رمضان آیا تو اس وقت بھی وہ صاحبِ نصاب ہے تو ایسے شخص کو صاحبِ نصاب سمجھا جائے گا، درمیان سال میں جو رقم آتی جاتی رہی اس کا کوئی اعتبار نہیں، بس یکم رمضان کو دیکھ لو کہ تمہارے پاس کتنی رقم موجود ہے، اس رقم پر زکوٰۃ نکالی جائے گی، چاہے اس میں سے کچھ رقم صرف ایک دن پہلے ہی کیوں نہ آئی ہو۔

تاریخِ زکوٰۃ میں جو رقم ہو اس پر زکوٰۃ ہے

مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص کے پاس یکم رمضان کو ایک لاکھ روپیہ تھا، اگلے سال یکم رمضان سے دو دن پہلے پچاس ہزار روپے اس کے پاس اور آگئے اور اس کے نتیجے میں یکم رمضان کو اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے ہوگئے، اب اس ڈیڑھ لاکھ روپے پر زکوٰۃ فرض ہوگی، یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں پچاس ہزار روپے تو صرف دو دن پہلے آئے ہیں اور اس پر ایک سال نہیں گزرا، لہٰذا اس پر زکوٰۃ نہ ہونی چاہئے، یہ درست نہیں بلکہ زکوٰۃ نکالنے کی جو تاریخ ہے اور جس تاریخ کو آپ صاحبِ نصاب بنے ہیں اس تاریخ میں جتنا مال آپ کے پاس موجود ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے، چاہے یہ رقم پچھلے سال یکم رمضان کی رقم سے زیادہ ہو یا کم ہو، مثلاً اگر پچھلے سال ایک لاکھ روپے تھے، اب ڈیڑھ لاکھ ہیں تو ڈیڑھ لاکھ پر زکوٰۃ ادا کرو، اور اگر اس سال پچاس ہزار رہ گئے تو اب پچاس ہزار پر زکوٰۃ ادا کرو، درمیان سال میں جو رقم خرچ ہوگئی، اس کا کوئی حساب کتاب نہیں اور اس خرچ شدہ رقم پر زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حساب کتاب کی اُلجھن سے بچانے کے لئے یہ آسان طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ درمیان سال میں جو کچھ تم نے کھایا پیا اور وہ رقم تمہارے پاس سے چلی گئی تو اس کا کوئی حساب کتاب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح درمیان سال میں جو رقم آگئی اس کا الگ سے حساب رکھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس تاریخ میں آئی اور کب اس پر سال پورا ہوگا؟ بلکہ زکوٰۃ نکالنے کی تاریخ میں جو رقم تمہارے پاس ہے، اس پر زکوٰۃ ادا کرو۔ سال گزرنے کا مطلب یہ ہے۔

اموالِ زکوٰۃ کون کون سے ہیں؟

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہم پر فضل ہے کہ اس نے ہر ہر چیز پر زکوٰۃ فرض نہیں فرمائی، ورنہ مال کی تو بہت سی قسمیں ہیں۔ جن چیزوں پر زکوٰۃ فرض ہے وہ یہ ہیں: (۱) نقد روپیہ، چاہے وہ کسی بھی شکل میں

ہو، چاہے وہ نوٹ ہوں یا سکے ہوں، (۲) سونا چاندی، چاہے وہ زیور کی شکل میں ہو، یا سکے کی شکل میں ہو، بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ رہتا ہے کہ جو خواتین کا استعمالی زیور ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے، یہ بات درست نہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ استعمالی زیور پر بھی زکوٰۃ واجب ہے البتہ صرف سونے چاندی کے زیور پر زکوٰۃ واجب ہے، لیکن اگر سونے چاندی کے علاوہ کسی اور دھات کا زیور ہے، چاہے پلاٹینم ہی کیوں نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، اسی طرح ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ نہیں جب تک تجارت کے لئے نہ ہوں بلکہ ذاتی استعمال کے لئے ہوں۔

اموالِ زکوٰۃ میں عقل نہ چلائیں

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینا چاہئے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے، اللہ تعالیٰ کا عائد کیا ہوا فریضہ ہے۔ اب بعض لوگ زکوٰۃ کے اندر اپنی عقل دوڑاتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں کہ اس پر زکوٰۃ کیوں واجب ہے اور فلاں چیز پر زکوٰۃ کیوں واجب نہیں؟

یاد رکھئے کہ یہ زکوٰۃ ادا کرنا عبادت ہے اور عبادت کے معنی ہی یہ ہیں کہ چاہے وہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اللہ کا حکم ماننا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کہے کہ سونے چاندی پر زکوٰۃ واجب ہے تو ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ کیوں واجب نہیں؟ اور پلاٹینم پر کیوں زکوٰۃ نہیں؟ یہ سوال بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ حالتِ سفر میں ظہر اور عصر اور عشاء کی نماز میں قصر ہے اور چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھی جاتی ہے تو پھر مغرب میں قصر کیوں نہیں؟ یا مثلاً کوئی شخص کہے کہ ایک آدمی ہوائی جہاز میں فرسٹ کلاس کے اندر سفر کرتا ہے اور اس سفر میں اس کو کوئی مشقت بھی نہیں ہوتی مگر اس کی نماز آدھی ہو جاتی ہے اور میں کراچی میں بس کے اندر بڑی مشقت کے ساتھ سفر کرتا ہوں، میری نماز آدھی کیوں نہیں ہوتی؟ ان سب کا ایک ہی جواب ہے، وہ یہ کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے عبادت کے احکام ہیں، عبادات میں ان احکام کی پابندی کرنا ضروری ہے ورنہ وہ کام عبادت نہیں رہے گا۔

عبادت کرنا اللہ کا حکم ہے

یا مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ۹ ذی الحجہ ہی کو حج ہوتا ہے؟ مجھے تو آسانی یہ ہے کہ آج جا کر حج کر آؤں اور ایک دن کے بجائے میں عرفات تین دن قیام کروں گا، اب اگر وہ شخص ایک دن کے بجائے تین دن بھی وہاں بیٹھا رہے گا، تب بھی اس کا حج نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ

نے عبادت کا جو طریقہ بتایا تھا اس کے مطابق نہیں کیا۔ یا مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ حج کے تین دنوں میں جمرات کی رمی کرنے میں بہت ہجوم ہوتا ہے اس لئے میں چوتھے دن اکٹھی سارے دنوں کی رمی کرلوں گا۔ یہ رمی درست نہیں ہوگی اس لئے کہ یہ عبادت ہے اور عبادت کے اندر یہ ضروری ہے کہ جو طریقہ بتایا گیا ہے اور جس طرح بتایا گیا ہے اس کے مطابق وہ عبادت انجام دی جائے گی تو وہ عبادت درست ہوگی ورنہ درست نہ ہوگی۔ لہٰذا یہ اعتراض کرنا کہ سونے اور چاندی پر زکوٰۃ کیوں ہے اور ہیرے پر کیوں نہیں، یہ عبادت کے فلسفے کے خلاف ہے۔ بہرحال، اللہ تعالیٰ نے سونے چاندی پر زکوٰۃ رکھی ہے، چاہے وہ استعمال کا ہو، اور نقد روپیہ پر زکوٰۃ رکھی ہے۔

سامانِ تجارت کی قیمت کے تعین کا طریقہ

دوسری چیز جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ ہے ''سامانِ تجارت'' مثلاً کسی کی دکان میں جو سامان برائے فروخت رکھا ہوا ہے، اس سارے اسٹاک پر زکوٰۃ واجب ہے، البتہ اسٹاک کی قیمت لگاتے ہوئے اس بات کی گنجائش ہے کہ آدمی زکوٰۃ نکالتے وقت یہ حساب لگائے کہ اگر میں پورا اسٹاک اکٹھا فروخت کروں تو بازار میں اس کی کیا قیمت لگے گی۔ دیکھئے ایک ''ریٹیل پرائس'' ہوتی ہے اور دوسری ''ہول سیل پرائس''، تیسری صورت یہ ہے کہ پورا اسٹاک اکٹھا فروخت کرنے کی صورت میں کیا قیمت لگے گی، لہٰذا جب دکان کے اندر جو مال ہے اس کی زکوٰۃ کا حساب لگایا جا رہا ہو تو اس کی گنجائش ہے کہ تیسری قسم کی قیمت لگائی جائے، وہ قیمت نکال کر پھر اس کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ میں نکالنا ہوگا، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ عام ''ہول سیل قیمت'' سے حساب لگا کر اس پر زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔

مالِ تجارت میں کیا کیا داخل ہے؟

اس کے علاوہ مالِ تجارت میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کو آدمی نے بیچنے کی غرض سے خریدا ہو، لہٰذا اگر کسی شخص نے بیچنے کی غرض سے کوئی پلاٹ خریدا یا زمین خریدی یا کوئی مکان خریدا یا گاڑی خریدی اور اس مقصد سے خریدی کہ اس کو بیچ کر نفع کماؤں گا تو یہ سب چیزیں مالِ تجارت میں داخل ہیں، لہٰذا اگر کوئی پلاٹ، کوئی زمین، کوئی مکان خریدتے وقت شروع ہی میں یہ نیت تھی کہ میں اس کو فروخت کروں گا تو اس کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جو ''انوسٹمنٹ'' کی غرض سے پلاٹ خرید لیتے ہیں اور شروع ہی سے یہ نیت ہوتی ہے کہ جب اس پر اچھے پیسے ملیں گے تو اس کو فروخت کر دوں گا اور فروخت کر کے اس سے نفع کماؤں گا، تو اس پلاٹ کی مالیت پر بھی

زکوٰۃ واجب ہے۔ لیکن اگر پلاٹ اس نیت سے خریدا کہ اگر موقع ہوا تو اس پر رہائش کے لئے مکان بنالیں گے، یا موقع ہوگا تو اس کو کرائے پر چڑھادیں گے یا کبھی موقع ہوگا تو اس کو فروخت کردیں گے، کوئی ایک واضح نیت نہیں ہے بلکہ ویسے ہی خرید کر ڈال دیا ہے، اب اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آئندہ کسی وقت اس کو مکان بنا کر وہاں رہائش اختیار کرلیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ کرائے پر چڑھادیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ فروخت کردیں گے تو اس صورت میں اس پلاٹ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، لہٰذا زکوٰۃ صرف اس صورت میں واجب ہوتی ہے جب خریدتے وقت ہی اس کو دوبارہ فروخت کرنے کی نیت ہو، یہاں تک کہ اگر پلاٹ خریدتے وقت شروع میں یہ نیت تھی کہ اس پر مکان بنا کر رہائش اختیار کریں گے، بعد میں ارادہ بدل گیا اور یہ ارادہ کرلیا کہ اب اس کو فروخت کر کے پیسے حاصل کرلیں گے تو محض نیت اور ارادہ کی تبدیلی سے فرق نہیں پڑتا، جب تک آپ اس پلاٹ کو واقعۃً فروخت نہیں کردیں گے اور اس کے پیسے آپ کے پاس نہیں آجائیں گے اس وقت تک اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

بہرحال، ہر وہ چیز جسے خریدتے وقت ہی اس کو فروخت کرنے کی نیت ہو، وہ مالِ تجارت ہے اور اس کی مالیت پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہے۔

کس دن کی مالیت معتبر ہوگی؟

یہ بات بھی یاد رکھیں کہ مالیت اس دن کی معتبر ہوگی جس دن آپ زکوٰۃ کا حساب کر رہے ہیں، مثلاً ایک پلاٹ آپ نے ایک لاکھ روپے میں خریدا تھا اور آج اس پلاٹ کی قیمت دس لاکھ ہوگئی، اب دس لاکھ پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائے گی، ایک لاکھ پر نہیں نکالی جائے گی۔

کمپنیوں کے شیئرز پر زکوٰۃ کا حکم

اسی طرح کمپنیوں کے ''شیئرز'' بھی سامانِ تجارت میں داخل ہیں۔ اور ان کی دو صورتیں ہیں:

ایک صورت یہ ہے کہ آپ نے کسی کمپنی کے شیئرز اس مقصد کے لئے خریدے ہیں کہ اس کے ذریعہ کمپنی کا منافع (Dividend) حاصل کریں گے اور اس پر ہمیں سالانہ منافع کمپنی کی طرف سے ملتا رہے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نے کسی کمپنی کے شیئرز ''کیپٹل گین'' کے لئے خریدے ہیں،

یعنی نیت یہ ہے کہ جب بازار میں ان کی قیمت بڑھ جائے گی تو ان کو فروخت کر کے نفع کمائیں گے۔ اگر یہ دوسری صورت ہے یعنی شیئرز خریدتے وقت شروع ہی میں ان کو فروخت کرنے کی نیت تھی تو اس صورت میں پورے شیئرز کی پوری بازاری قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً آپ نے پچاس روپے کے حساب سے شیئرز خریدے اور مقصد یہ تھا کہ جب ان کی قیمت بڑھ جائے گی تو ان کو فروخت کر کے نفع حاصل کریں گے، اس کے بعد جس دن آپ نے زکوٰۃ کا حساب نکالا، اس دن شیئرز کی قیمت ساٹھ روپے ہوگئی تو اب ساٹھ روپے کے حساب سے ان شیئرز کی مالیت نکالی جائے گی اور اس پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

لیکن اگر پہلی صورت ہے یعنی آپ نے کمپنی کے شیئرز اس نیت سے خریدے کہ کمپنی کی طرف سے اس پر سالانہ منافع ملتا رہے گا اور فروخت کرنے کی نیت نہیں تھی تو اس صورت میں آپ کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ یہ دیکھیں کہ جس کمپنی کے یہ شیئرز ہیں اس کمپنی کے کتنے اثاثے جامد ہیں، مثلاً بلڈنگ، مشینری، کاریں وغیرہ، اور کتنے اثاثے نقد، سامانِ تجارت اور خام مال کی شکل میں ہیں یہ معلومات کمپنی ہی سے حاصل کی جاسکتی ہیں، مثلاً فرض کریں کہ کسی کمپنی کے ساٹھ فیصد اثاثے نقد سامانِ تجارت، خام مال، اور تیار مال کی صورت میں ہیں اور چالیس فیصد اثاثے بلڈنگ،، مشینری اور کار وغیرہ کی صورت میں ہیں تو اس صورت میں آپ ان شیئرز کی بازاری قیمت لگا کر اس کی ساٹھ فیصد قیمت پر زکوٰۃ ادا کریں، مثلاً شیئرز کی بازاری قیمت ساٹھ روپے تھی اور کمپنی کے ساٹھ فیصد اثاثے قابلِ زکوٰۃ تھے اور چالیس فیصد اثاثے ناقابلِ زکوٰۃ تھے تو اس صورت میں آپ اس شیئرز کی پوری قیمت یعنی ساٹھ روپے کے بجائے =/۳۶ روپے پر زکوٰۃ ادا کریں۔ اور اگر کسی کمپنی کے اثاثوں کی تفصیل معلوم نہ ہوسکے تو اس صورت میں احتیاطاً ان شیئرز کی پوری بازاری قیمت پر زکوٰۃ ادا کردی جائے۔

شیئرز کے علاوہ اور جتنے فائنانشل انسٹرومنٹس ہیں چاہے وہ بونڈز ہوں یا سرٹیفکیٹس ہوں، یہ سب نقد کے حکم میں ہیں، ان کی اصل قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے۔

کارخانہ کی کن اشیاء پر زکوٰۃ ہے

اگر کوئی شخص فیکٹری کا مالک ہے تو اس فیکٹری میں جو تیار شدہ مال ہے اس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اسی طرح جو مال تیاری کے مختلف مراحل میں ہے یا خام مال کی شکل میں ہے اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ البتہ فیکٹری کی مشینری، بلڈنگ، گاڑیاں وغیرہ پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

اس طرح اگر کسی شخص نے کسی کاروبار میں شرکت کے لئے روپیہ لگایا ہوا ہے، اور اس کاروبار کا کوئی متناسب حصہ اس کی ملکیت ہے تو جتنا حصہ اس کی ملکیت ہے اس حصے کی بازاری قیمت کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بہرحال، خلاصہ یہ کہ نقد روپیہ جس میں بینک بیلنس اور فائنانشل انسٹرومنٹس بھی داخل ہیں، ان پر زکوٰۃ واجب ہے، اور سامانِ تجارت، جس میں تیار مال، خام مال، اور جو مال تیاری کے مراحل میں ہیں وہ سب سامانِ تجارت میں داخل ہیں، اور کمپنی کے شیئرز بھی سامانِ تجارت میں داخل ہیں، اس کے علاوہ ہر چیز جو آدمی نے فروخت کرنے کی غرض سے خریدی ہو وہ بھی سامانِ تجارت میں داخل ہے، زکوٰۃ نکالتے وقت ان سب کی مجموعی مالیت نکالیں اور اس پر زکوٰۃ ادا کریں۔

واجب الوصول قرضوں پر زکوٰۃ

ان کے علاوہ بہت سی رقمیں وہ ہوتی ہیں جو دوسروں سے واجب الوصول ہوتی ہیں۔ مثلاً دوسروں کو قرض دے رکھا ہے، یا مثلاً مال اُدھار فروخت کر رکھا ہے اور اس کی قیمت ابھی وصول ہونی ہے، تو جب آپ زکوٰۃ کا حساب لگائیں اور اپنی مجموعی مالیت نکالیں تو بہتر یہ ہے کہ ان قرضوں کو اور واجب الوصول رقموں کو آج ہی آپ اپنی مجموعی مالیت میں شامل کرلیں۔ اگرچہ شرعی حکم یہ ہے کہ جو قرضے ابھی وصول نہیں ہوئے تو جب تک وہ وصول نہ ہوجائیں اس وقت تک شرعاً ان پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں ہوتی، لیکن جب وصول ہوجائیں تو جتنے سال گزر چکے ہیں ان تمام پچھلے سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ مثلاً فرض کریں کہ آپ نے ایک شخص کو ایک لاکھ روپیہ قرضہ دے رکھا تھا، اور پانچ سال کے بعد وہ قرضہ آپ کو واپس ملا، تو اگرچہ اس ایک لاکھ روپے پر ان پانچ سالوں کے دوران تو زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں تھی، لیکن جب وہ ایک لاکھ روپے وصول ہوگئے تو اب گزشتہ پانچ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ تو چونکہ گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ یک مشت ادا کرنے میں بعض اوقات دشواری ہوتی ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ہر سال اس قرض کی زکوٰۃ کی ادائیگی بھی کردی جایا کرے۔ لہٰذا جب زکوٰۃ کا حساب لگائیں تو ان قرضوں کو بھی مجموعی مالیت میں شامل کرلیا کریں۔

قرضوں کی منہائی

پھر دوسری طرف یہ دیکھیں کہ آپ کے ذمے دوسرے لوگوں کے کتنے قرضے ہیں۔ اور پھر مجموعی مالیت میں سے ان قرضوں کو منہا کردیں، منہا کرنے کے بعد جو باقی بچے وہ قابلِ زکوٰۃ رقم

ہے۔ اس کا ڈھائی فیصد نکال کر زکوٰۃ کی نیت سے ادا کردیں۔ بہتر یہ ہے کہ جو رقم زکوٰۃ کی بنے اتنی رقم الگ نکال کر محفوظ کرلیں، پھر وقتاً فوقتاً اس کو مستحقین میں خرچ کرتے رہیں۔ بہر حال زکوٰۃ کا حساب لگانے کا یہ طریقہ ہے۔

قرضوں کی دو قسمیں

قرضوں کے سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے، وہ یہ کہ قرضوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو معمولی قرضے ہیں جن کو انسان اپنی ذاتی ضروریات اور ہنگامی ضروریات کے لئے مجبوراً لیتا ہے۔ دوسری قسم کے قرضے وہ ہیں جو بڑے بڑے سرمایہ دار پیداواری اغراض کے لئے لیتے ہیں مثلاً فیکٹریاں لگانے، یا مشینریاں خریدنے، یا مالِ تجارت امپورٹ کرنے کے لئے قرضے لیتے ہیں، یا مثلاً ایک سرمایہ دار کے پاس پہلے سے دو فیکٹریاں موجود ہیں لیکن اس نے بینک سے قرض لے کر تیسری فیکٹری لگالی۔ اب اگر اس دوسری قسم کے قرضوں کو مجموعی مالیت سے منہا کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ان سرمایہ داروں پر ایک پیسے کی بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ وہ لوگ اُلٹے مستحقِ زکوٰۃ بن جائیں گے، اس لئے کہ ان کے پاس جتنی مالیت کا مال موجود ہے، اس سے زیادہ مالیت کے قرضے بینک سے لے رکھے ہیں، وہ بظاہر فقیر اور مسکین نظر آرہا ہے۔ لہٰذا ان قرضوں کے منہا کرنے میں بھی شریعت نے فرق رکھا ہے۔

تجارتی قرضے کب منہا کیے جائیں

اس میں تفصیل یہ ہے کہ پہلی قسم کے قرضے تو مجموعی مالیت سے منہا ہوجائیں گے اور ان کو منہا کرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اور دوسری قسم کے قرضوں میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کسی شخص نے تجارت کی غرض سے قرض لیا، اور اس قرض کو ایسی اشیاء خریدنے میں استعمال کیا جو قابلِ زکوٰۃ ہیں، مثلاً اس قرض سے خام مال خرید لیا، یا مالِ تجارت خرید لیا، تو اس قرض کو مجموعی مالیت سے منہا کریں گے۔ لیکن اگر اس قرض کو ایسے اثاثے خریدنے میں استعمال کیا جو ناقابلِ زکوٰۃ ہیں تو اس قرض کو مجموعی مالیت سے منہا نہیں کریں گے۔

قرض کی مثال

مثلاً ایک شخص نے بینک سے ایک کروڑ روپے قرض لیے اور اس رقم سے اس نے ایک پلانٹ

(مشینری) باہر سے امپورٹ کرلیا ـــــ چونکہ یہ پلانٹ قابلِ زکوٰۃ نہیں ہے اس لئے کہ یہ مشینری ہے تو اس صورت میں یہ قرضہ منہا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس نے اس قرض سے خام مال خرید لیا تو چونکہ خام مال قابلِ زکوٰۃ ہے اس لئے یہ قرض منہا کیا جائے گا، کیونکہ دوسری طرف یہ خام مال ادا کی جانے والی زکوٰۃ کی مجموعی مالیت میں پہلے سے شامل ہو چکا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نارمل قسم کے قرض تو پورے کے پورے مجموعی مالیت سے منہا ہو جائیں گے، اور جو قرضے پیداواری اغراض کے لئے لیے گئے ہیں، اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس سے ناقابلِ زکوٰۃ اثاثے خریدے ہیں تو وہ قرض منہا نہیں ہوگا، اور اگر قابلِ زکوٰۃ اثاثے خریدے ہیں تو وہ قرض منہا ہوگا۔ یہ تو زکوٰۃ نکالنے کے بارے میں احکام تھے۔

زکوٰۃ مستحق کو ادا کریں

دوسری طرف زکوٰۃ کی ادائیگی کے بارے میں بھی شریعت نے احکام بتائے ہیں۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ زکوٰۃ نکالو، نہ یہ فرمایا کہ زکوٰۃ پھینکو، بلکہ فرمایا: اٰتوا الزکاۃ، زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی یہ دیکھو کہ اس جگہ پر زکوٰۃ جائے جہاں شرعاً زکوٰۃ جانی چاہئے۔ بعض لوگ زکوٰۃ نکالتے تو ہیں لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ صحیح مصرف پر خرچ ہو رہی ہے یا نہیں؟ زکوٰۃ نکال کر کسی کے حوالے کر دی اور اس کی تحقیق نہیں کی کہ یہ صحیح مصرف پر خرچ کرے گا یا نہیں؟ آج بے شمار ادارے دنیا میں کام کر رہے ہیں، ان میں بہت سے ادارے ایسے بھی ہوں گے جن میں بسا اوقات اس بات کا لحاظ نہیں ہوتا ہوگا کہ زکوٰۃ کی رقم صحیح مصرف پر خرچ ہو رہی ہے یا نہیں؟ اس لئے فرمایا کہ زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی جو مستحقِ زکوٰۃ ہے اس کو ادا کرو۔

مستحق کون؟

اس کے لئے شریعت نے یہ اصول مقرر فرمایا کہ زکوٰۃ صرف انہی اشخاص کو دی جاسکتی ہے جو صاحبِ نصاب نہ ہوں۔ یہاں تک کہ اگر ان کی ملکیت میں ضرورت سے زائد ایسا سامان موجود ہے جو ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت تک پہنچ جاتا ہے تو بھی وہ مستحقِ زکوٰۃ نہیں رہتا۔ مستحقِ زکوٰۃ وہ ہے جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کی رقم یا اتنی مالیت کا کوئی سامان ضرورت سے زائد نہ ہو۔

مستحق کو مالک بنا کر دیں

اس میں بھی شریعت کا یہ حکم ہے کہ اس مستحقِ زکوٰۃ کو مالک بنا کر دو۔ یعنی وہ مستحقِ زکوٰۃ اپنی ملکیت میں خود مختار ہو کہ جو چاہے کرے۔ اسی وجہ سے کسی بلڈنگ کی تعمیر پر زکوٰۃ نہیں لگ سکتی، کسی ادارے کے ملازمین کی تنخواہوں پر زکوٰۃ نہیں لگ سکتی۔ اس لئے کہ اگر زکوٰۃ کے ذریعہ تعمیرات کرنے اور ادارے قائم کرنے کی اجازت دیدی جاتی تو زکوٰۃ کی رقم سب لوگ کھا پی کر ختم کر جاتے، کیونکہ اداروں کے اندر تنخواہیں بے شمار ہوتی ہیں، تعمیرات پر خرچ لاکھوں کا ہوتا ہے، اس لئے یہ حکم دیا گیا کہ غیر صاحبِ نصاب کو مالک بنا کر زکوٰۃ دو، یہ زکوٰۃ فقراء اور غرباء اور کمزوروں کا حق ہے، لہٰذا یہ زکوٰۃ انہی تک پہنچنی چاہئے، جب ان کو مالک بنا کر دیدو گے تو تمہاری زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

کن رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے

یہ زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم انسان کے اندر یہ طلب اور جستجو خود بخود پیدا کرتا ہے کہ میرے پاس زکوٰۃ کے اتنے پیسے موجود ہیں، ان کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا ہے۔ اس لئے وہ مستحقین کو تلاش کرتا ہے کہ کون کون لوگ مستحقین ہیں اور ان مستحقین کی فہرست بناتا ہے، پھر ان کو زکوٰۃ پہنچاتا ہے، یہ بھی انسان کی ذمہ داری ہے۔ آپ کے محلے میں، ملنے جلنے والوں میں، عزیز و اقارب اور رشتہ داروں میں، دوست احباب میں جو مستحقِ زکوٰۃ ہوں، ان کو زکوٰۃ ادا کریں۔ اور ان میں سے سب سے افضل یہ ہے کہ اپنے رشتہ داروں کو زکوٰۃ ادا کریں اس میں ڈبل ثواب ہے، زکوٰۃ ادا کرنے کا ثواب بھی ہے اور صلہ رحمی کرنے کا ثواب بھی ہے۔ اور تمام رشتہ داروں کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں، صرف دو رشتے ایسے ہیں جن کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، ایک ولادت کا رشتہ ہے، لہٰذا باپ بیٹے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا اور بیٹا باپ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا، دوسرا نکاح کا رشتہ ہے، لہٰذا شوہر بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا اور بیوی شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی، ان کے علاوہ باقی تمام رشتوں میں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ مثلاً بھائی کو، بہن کو، چچا کو، خالہ کو، پھوپھی کو، ماموں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ البتہ یہ ضرور دیکھ لیں کہ وہ مستحقِ زکوٰۃ ہوں اور صاحبِ نصاب نہ ہو۔

بیوہ اور یتیم کو زکوٰۃ دینے کا حکم

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی خاتون بیوہ ہے تو اس کو زکوٰۃ ضرور دینی چاہئے حالانکہ

یہاں بھی شرط یہ ہے کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہو اور صاحبِ نصاب نہ ہو۔ اگر بیوہ مستحق زکوٰۃ ہے تو اس کی مدد کرنا بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن اگر ایک خاتون بیوہ ہے اور مستحقِ زکوٰۃ نہیں ہے تو محض بیوہ ہونے کی وجہ سے وہ مصرفِ زکوٰۃ نہیں بن سکتی۔ اسی طرح یتیم کو زکوٰۃ دینا اور اس کی مدد کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن یہ دیکھ کر زکوٰۃ دینی چاہئے کہ وہ مستحقِ زکوٰۃ ہے۔ لیکن اگر کوئی یتیم ہے مگر وہ مستحقِ زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ صاحبِ نصاب ہے تو یتیم ہونے کے باوجود اس کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ ان احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے زکوٰۃ نکالنی چاہئے۔

بینکوں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا حکم

کچھ عرصے سے ہمارے ملک میں سرکاری سطح پر زکوٰۃ وصول کرنے کا نظام قائم ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سے مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، کمپنیاں بھی زکوٰۃ کاٹ کر حکومت کو ادا کرتی ہیں۔ اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل عرض کر دیتا ہوں۔

جہاں تک بینکوں اور مالیاتی اداروں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا تعلق ہے تو اس کٹوتی سے زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے، دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ احتیاطاً ایسا کرلیں کہ یکم رمضان آنے سے پہلے دل میں یہ نیت کرلیں کہ میری رقم سے جو زکوٰۃ کٹے گی وہ میں ادا کرتا ہوں، اس سے اس کی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے دوبارہ زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہیں۔

اس میں بعض لوگوں کو یہ شبہ رہتا ہے کہ ہماری پوری رقم پر سال نہیں گزرا جب کہ پوری رقم پر زکوٰۃ کٹ گئی۔ اس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہر ہر رقم پر سال گزرنا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ اگر آپ صاحبِ نصاب ہیں تو اس صورت میں سال پورا ہونے سے ایک دن پہلے بھی جو رقم آپ کے پاس آئی ہے اس پر جو زکوٰۃ کٹی ہے وہ بھی بالکل صحیح کٹی ہے کیونکہ اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگئی تھی۔

اکاؤنٹ کی رقم سے قرض کس طرح منہا کریں؟

البتہ اگر کسی شخص کا سارا اثاثہ بینک ہی میں ہے، خود اس کے پاس کچھ بھی موجود نہیں، اور دوسری طرف اس کے اوپر لوگوں کے قرضے ہیں تو اس صورت میں بینک تو تاریخ آنے پر زکوٰۃ کاٹ لیتا ہے حالانکہ اس رقم سے قرضے منہا نہیں ہوتے، جس کے نتیجے میں زیادہ زکوٰۃ کٹ جاتی ہے۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ یا تو آدمی وہ تاریخ آنے سے پہلے اپنی رقم بینک سے نکال لے یا کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھ دے۔ بلکہ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی رقم کرنٹ اکاؤنٹ ہی میں رکھے، سیونگ اکاؤنٹ میں

بالکل نہ رکھے، اس لئے کہ وہ تو سودی اکاؤنٹ ہے اور کرنٹ اکاؤنٹ میں زکوٰۃ نہیں کٹتی۔ بہرحال زکوٰۃ کی تاریخ آنے سے پہلے وہ رقم کرنٹ اکاؤنٹ میں منتقل کردے، جب کرنٹ اکاؤنٹ سے زکوٰۃ نہیں کٹے گی تو آپ اپنے طور پر حساب کرکے قرض منہا کرکے زکوٰۃ ادا کریں۔ دوسرا حل یہ ہے کہ وہ شخص بینک کو لکھ کر دیدے کہ میں صاحبِ نصاب نہیں ہوں اور صاحبِ نصاب نہ ہونے کی وجہ سے میرے اُوپر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اگر یہ لکھ کر دیدے تو قانوناً اس کی رقم سے زکوٰۃ نہیں کاٹی جائے گی۔

کمپنی کے شیئرز کی زکوٰۃ کاٹنا

ایک مسئلہ کمپنی کے شیئرز کا ہے۔ جب کمپنی شیئرز پر سالانہ منافع تقسیم کرتی ہے تو اس وقت وہ کمپنی زکوٰۃ کاٹ لیتی ہے، لیکن کمپنی ان شیئرز کی جو زکوٰۃ کاٹتی ہے وہ اس شیئرز کی فیس ویلیو (Face Valuc) کی بنیاد پر زکوٰۃ کاٹتی ہے، حالانکہ شرعاً ان شیئرز کی مارکیٹ قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے، لہٰذا فیس ویلیو پر جو زکوٰۃ کاٹ لی گئی ہے وہ تو ادا ہوگئی البتہ فیس ویلیو اور مارکیٹ ویلیو کے درمیان جو فرق ہے، اس کا آپ کو اس بنیاد پر حساب کرنا ہوگا جس کی تفصیل شیئرز کی زکوٰۃ کے بارے میں بیان کی گئی ہے۔ مثلاً ایک شیئرز کی فیس ویلیو پچاس روپے تھی اور اس کی مارکیٹ ویلیو ساٹھ روپے ہے، تو اب کمپنی والوں نے پچاس روپے کی زکوٰۃ ادا کردی، لہٰذا دس روپے کی زکوٰۃ آپ کو الگ سے نکالنی ہوگی۔ کمپنی کے شیئرز اور این آئی ٹی یونٹ دونوں کے اندر یہی صورت ہے، لہٰذا جہاں کہیں فیس ویلیو پر زکوٰۃ کٹتی ہے وہاں مارکیٹ ویلیو کا حساب کرکے دونوں کے درمیان جو فرق ہے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

زکوٰۃ کی تاریخ کیا ہونی چاہئے؟

ایک بات یہ سمجھ لیں کہ زکوٰۃ کے لئے شرعاً کوئی تاریخ مقرر نہیں ہے اور نہ کوئی زمانہ مقرر ہے کہ اس زمانے میں یا اس تاریخ میں زکوٰۃ ادا کی جائے، بلکہ ہر آدمی کی زکوٰۃ کی تاریخ جدا ہوتی ہے۔ شرعاً زکوٰۃ کی اصل تاریخ وہ ہے جس تاریخ اور جس دن آدمی پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنا۔ مثلاً ایک شخص یکم محرام الحرام کو پہلی مرتبہ صاحبِ نصاب بنا تو اس کی زکوٰۃ کی تاریخ یکم محرم الحرام ہوگئی، اب آئندہ ہر سال اس کو یکم محرم الحرام کو اپنی زکوٰۃ کا حساب کرنا چاہئے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو یہ یاد نہیں رہتا کہ ہم کس تاریخ کو پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنے تھے، اس لئے اس مجبوری کی وجہ سے وہ اپنے لئے کوئی ایسی تاریخ زکوٰۃ کے حساب کی مقرر کرلے جس میں اس کے لئے حساب لگانا آسان ہو، پھر آئندہ ہر سال اسی تاریخ کو زکوٰۃ کا حساب کرکے زکوٰۃ ادا کرے، البتہ احتیاطاً کچھ زیادہ ادا کردیں۔

کیا رمضان المبارک کی تاریخ مقرر کر سکتے ہیں؟

عام طور پر لوگ رمضان المبارک میں زکوٰۃ نکالتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ رمضان المبارک میں ایک فرض کا ثواب ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔(۱)

لہٰذا زکوٰۃ بھی چونکہ فرض ہے اگر رمضان المبارک میں ادا کریں گے تو اس کا ثواب بھی ستر گنا ملے گا۔ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے اور یہ جذبہ بہت اچھا ہے، لیکن اگر کسی شخص کو اپنے صاحبِ نصاب بننے کی تاریخ معلوم ہے تو محض اس ثواب کی وجہ سے وہ شخص رمضان کی تاریخ مقرر نہیں کر سکتا، لہٰذا اس کو چاہئے کہ اسی تاریخ پر اپنی زکوٰۃ کا حساب کرے۔ البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں یہ کر سکتا ہے کہ اگر تھوڑی تھوڑی زکوٰۃ ادا کر رہا ہے تو اس طرح ادا کرتا رہے اور باقی جو بچے اس کو رمضان المبارک میں ادا کر دے۔ البتہ اگر تاریخ یاد نہیں ہے تو پھر گنجائش ہے کہ رمضان المبارک کی کوئی تاریخ مقرر کر لے، البتہ احتیاطاً زیادہ ادا کر دے تاکہ اگر تاریخ کے آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے جو فرق ہو گیا ہو وہ فرق بھی پورا ہو جائے۔

پھر جب ایک مرتبہ جو تاریخ مقرر کر لے تو پھر ہر سال اسی تاریخ کو اپنا حساب لگائے اور یہ دیکھے کہ اس تاریخ میں میرے کیا کیا اثاثے موجود ہیں، اس تاریخ میں نقد رقم کتنی ہے، اگر سونا موجود ہے تو اسی تاریخ کی سونے کی قیمت لگائے، اگر شیئرز ہیں تو اسی تاریخ کی ان شیئرز کی قیمت لگائے، اگر اسٹاک کی قیمت لگانی ہے تو اسی تاریخ کی اسٹاک کی قیمت لگائے اور پھر ہر سال اسی تاریخ کو حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے، اس تاریخ سے آگے پیچھے نہیں کرنا چاہئے۔

بہرحال، زکوٰۃ کے بارے میں یہ تھوڑی سی تفصیل عرض کر دی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

---

(۱) کنز العمال، رقم: ۲۳۷۱٤ (۷٥۷/۸)، شعب الإيمان للبيهقي، رقم: ۳٤٥٥ (۱۲۰/۸)، صحيح ابن خزيمة، رقم: ۱۷۸۰ (۱۱٥/۷)

زکوٰۃ کی ادائیگی سے متعلق اہل سوالات

چاند کی تاریخ مقرر کرنا

سوال: ۔کیا زکوٰۃ کا حساب کرنے کے لئے انگریزی تاریخ مقرر کر سکتے ہیں یا چاند ہی کی تاریخ مقرر کرنا ضروری ہے؟

جواب: چاند ہی کی تاریخ مقرر کرنا ضروری ہے، انگریزی تاریخ مقرر کرنا درست نہیں۔

زیور کی زکوٰۃ کس کے ذمہ ہے؟

سوال: بہت سی خواتین اپنے شوہروں کو کہتی ہیں کہ ہمارے زیور کی زکوٰۃ آپ ادا کریں، کیوں کہ ہمارے پاس زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں، ایسی صورت میں اگر شوہر زکوٰۃ ادا کردے تو زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

جواب: یہ بات پہلے سمجھ لیں کہ جو شخص صاحب نصاب ہے اور اس پر زکوٰۃ فرض ہے، وہ اپنی زکوٰۃ کا خود ذمہ دار ہے، جس طرح ہر شخص اپنی نماز کا خود ذمہ دار ہے، جس طرح شوہر کے ذمے بیوی کی نماز نہیں، اسی طرح شوہر کے ذمے بیوی کی زکوٰۃ نہیں، اگر بیوی خود صاحبِ نصاب ہے تو زکوٰۃ ادا کرنا اسی کے ذمے فرض ہے، اور بیوی کا یہ کہنا کہ میرے پاس پیسے نہیں، یہ بات اس لئے درست نہیں کہ اگر پیسے نہ ہوتے تو زکوٰۃ واجب ہی کیوں ہوتی، اگر بیوی کے پاس صرف زیور ہے اور زیور کی وجہ سے وہ صاحبِ نصاب بن گئی اور اس کے پاس الگ سے پیسے نہیں ہیں، تو وہ اپنے زیور بیچ کر زکوٰۃ ادا کرے، لیکن اگر شوہر خوش دلی سے اس کی یہ درخواست قبول کرلے اور اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کردے تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔البتہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بیوی کے ذمے اسی زیور کی زکوٰۃ فرض ہے جو اس کی ملکیت میں ہو، لیکن اگر وہ زیور شوہر کی ملکیت میں ہے خواہ بیوی ہی پہنتی ہو تو اس کی زکوٰۃ بیوی پر فرض نہیں، شوہر کو دینی ہوگی۔

مالک بنا کر دینا ضروری ہے

سوال: بہت سے مالدار ایسے ہیں جن کے علاقوں میں سینکڑوں غریب ہوتے ہیں مگر وہ مالدار لوگ زکوٰۃ صرف اپنی برادری کی انجمن میں دیتے ہیں اور پھر وہ انجمن قبرستان کی زمین اور شادی ہال وغیرہ پر حیلۂ تملیک کا ذریعہ اختیار کر کے ان پر خرچ کرتی ہے، اور غریب لوگوں کو وہ زکوٰۃ نہیں ملتی، کیا یہ طریقہ درست ہے؟

جواب: اس کا جواب پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جو غریب صاحبِ نصاب نہیں ہے، اس کو مالک بنا کر زکوٰۃ دینا ضروری ہے، کوئی بھی ایسا کام جس میں تملیک نہ پائی جائے مثلاً کوئی عمارت تعمیر کرنا ہو یا قبرستان خرید کر وقف کرنا ہو یا مسجد ہو، ان پر زکوٰۃ صرف نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ جو تملیک کا حیلہ عام طور پر کیا جاتا ہے کہ کسی غریب کو زکوٰۃ دے دی اور اس سے کہا کہ تم فلاں کام پر خرچ کر دو وہ غریب بھی جانتا ہے کہ یہ میرے ساتھ کھیل ہو رہا ہے اور حقیقت میں مجھے اس زکوٰۃ کی رقم میں سے ایک پیسے کا بھی اختیار نہیں ہے، تو یہ محض ایک حیلہ ہے اور اس وجہ سے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

پبلسٹی پر زکوٰۃ کی رقم لگانا

سوال: آج کل بہت سے ادارے زکوٰۃ اور دوسرے عطیات جمع کرنے کے لئے بہت سی رقمیں پبلسٹی پر خرچ کر دیتے ہیں، تو کیا زکوٰۃ کی رقم اس طرح خرچ کرنا جائز ہے؟

جواب: پبلسٹی پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا جائز نہیں۔

مدارس کے طلبہ کو زکوٰۃ دینا

سوال: زکوۃ کا بہترین مصرف تو غرباء اور مساکین ہیں لیکن ہمارے ہاں دینی مدارس والے زکوٰۃ لے جاتے ہیں اور پھر وہ لوگ مسجد پر بھی زکوٰۃ خرچ کرنے کے لئے تملیک کرالیتے ہیں، وہ غریب لوگ جو سارا سال زکوٰۃ کی آس میں اپنے بچوں کی شادیاں اور دیگر امور التواء میں رکھتے ہیں وہ کیا کریں؟

جواب: جن اداروں میں زکوٰۃ کو صحیح طور پر ان کے شرعی مصرف میں خرچ کرنے کا انتظام موجود نہیں ہے، ان اداروں کو زکوٰۃ نہ دینی چاہئے بلکہ غریبوں کو مالک بنا کر زکوٰۃ دینی چاہئے، البتہ اگر

کسی ادارے میں باقاعدہ شرعی طریقے پر زکوٰۃ خرچ کرنے کا انتظام موجود ہے، وہاں زکوٰۃ دینی چاہئے، اس لئے کہ جس طرح اور فقراء اور غرباء زکوٰۃ کے حقدار ہیں اسی طرح وہ طلبہ جو دین کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور وہ غریب بھی ہیں تو وہ طلبہ اور زیادہ حقدار ہیں، کیوں کہ انہوں نے دین کی تعلیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے، اس لئے جن اداروں میں صحیح انتظام موجود ہو وہاں بے کھٹک زکوٰۃ دے سکتے ہیں، البتہ اگر اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں میں مستحقین زکوٰۃ موجود ہیں تو ان کو مقدم رکھنا چاہئے، ان کو دینے کے بعد ان اداروں کو دینی چاہئے۔

تاریخ زکوٰۃ پر نصاب سے کم مال ہونا

سوال: اگر زکوٰۃ کی تاریخ مقرر ہے، اب سال گزرنے کے بعد جب وہ تاریخ آئی تو اس وقت نصاب سے کم مال تھا تو کیا اس صورت میں زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے یا نہیں؟

جواب: اگر زکوٰۃ کا حساب کرنے کے لئے آپ نے جو تاریخ مقرر کی ہے، اس تاریخ میں آپ کے پاس نصاب کے بقدر مال نہیں ہے تو آپ کے ذمے زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

ضرورت سے زائد مال کا مطلب

سوال: ضرورت سے زائد مال کی کیا تعریف ہے؟ کیوں کہ یہ ضروریات ہر ایک کی مختلف ہوتی ہیں؟

جواب: ضرورت سے زائد مال سے مراد یہ ہے کہ گھر میں جو اشیاء کھانے پینے کی ہیں یا استعمال ہونے والے برتن وغیرہ ہیں، اسی طرح پہننے کے کپڑے ہیں اور گھر کا اثاثہ جو گھر میں استعمال ہوتا رہتا ہے، وہ سب ضروریات میں داخل ہیں، اور پھر ہر آدمی کی ضروریات بھی مختلف ہوتی ہیں، بعض لوگ وہ ہیں جن کے پاس مہمان بہت کثرت سے آتے ہیں تو اب ان کو ان کے لئے بہت سارے سامان بستر وغیرہ رکھنے پڑتے ہیں، بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے پاس اس طرح مہمان نہیں آتے، بہر حال یوں سمجھ لیں کہ وہ سامان جن کو کبھی استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی، ایسا سامان ضرورت سے زائد سمجھا جائے گا۔

ٹیلیویژن ضرورت سے زائد ہے

سوال: کیا ٹیلیویژن ضرورت سے زائد ہے؟

جواب: جی ہاں ٹیلیویژن یقیناً ضرورت سے زائد ہے۔

تعمیرات پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: ہسپتالوں کی تعمیر اور مدارس کی تعمیر پر زکوٰۃ خرچ کرنا چاہیں تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: حقیقت میں تو تعمیرات پر زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں ہو سکتی، اور آج کل جو حیلۂ تملیک کیا جاتا ہے جس میں جانبین کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقت میں تملیک نہیں ہے، ایسا حیلہ تو کسی طرح بھی معتبر نہیں، لیکن یہ صورت ہو سکتی ہے کہ جن لوگوں کے لئے تعمیر کی جارہی ہے، واقعۃً ان کو وہ رقم مالک بنا کر دے دی جائے اور چونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ رقم ہمارے لئے اور ہمارے مصرف میں استعمال ہوگی، لہٰذا پھر وہ لوگ وہ رقم اپنے طور پر خوش دلی سے اس تعمیر کے لئے دے دیں تو اس کی گنجائش ہے۔

زکوٰۃ میں کھانا کھلانا

سوال: زکوٰۃ کے طور پر کھانا پکا کر دینا درست ہے یا نہیں؟

جواب: کھانا پکا کر مستحقین زکوٰۃ کو مالک بنا دینا درست ہے۔

زکوٰۃ میں کتابیں دینا

سوال: کتابوں کی اشاعت میں زکوٰۃ کی رقم لگ سکتی ہے یا نہیں؟

جواب: کتابوں کی اشاعت میں زکوٰۃ کی رقم نہیں لگ سکتی البتہ اگر وہ کتابیں زکوٰۃ کے طور پر مستحقین زکوٰۃ کو مالک بنا کر دی جائیں گی تو اس سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

مال تجارت کی قیمت کا تعین

سوال: اگر کسی مال تجارت کا ریٹ کنفرم نہ ہو اور وہ مال بازار میں عام فروخت نہ ہوتا ہو، اس کے ریٹ اپنی صوابدید کے مطابق مقرر کر کے اس پر مخصوص نفع رکھ کر فروخت کرنا چاہیں لیکن وہ

مال ابھی تک فروخت نہیں ہوا اور نہ اب فروخت ہونے کا امکان ہے تو اس کی قیمت کا تعین کس طرح کریں؟

جواب: مال تجارت کی قیمت کے تعین کرنے کا تعلق تجربہ سے ہے، تجربہ سے اس کا فیصلہ کریں اور انصاف اور احتیاط کے ساتھ اس کی تخمینی قیمت لگائیں کہ جب یہ سامان فروخت ہوگا تو ہمیں اس کے اتنے پیسے ملیں گے، اس طرح قیمت کا تعین کر کے اس کے حساب سے زکوٰۃ ادا کریں۔

مالِ تجارت ہی کو زکوٰۃ میں دینے کا حکم

سوال: ایک مال تجارت ہمارے پاس موجود ہے مگر وہ فروخت نہیں ہو رہا ہے تو اسی مال کا ہم بطور زکوٰۃ کے مستحق کو دے سکتے ہیں؟

جواب: جی ہاں! زکوٰۃ میں خود وہ چیز بھی دی جا سکتی ہے جس پر زکوٰۃ عائد ہے، لہٰذا سامان تجارت کی زکوٰۃ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ نقد روپیہ ہی دیا جائے، بلکہ وہ سامان تجارت جس کی زکوٰۃ نکالی جا رہی ہے، اسی سامان تجارت کا کچھ حصہ بطور زکوٰۃ کے دے سکتے ہیں، البتہ اگر وہ سامان عام استعمال کا سامان نہیں ہے اور خیال یہ ہے کہ غریب اور فقیر کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو اس صورت میں انصاف کے ساتھ اندازہ اور تخمینہ سے اس کی قیمت لگا کر پھر اس کی قیمت پر زکوٰۃ ادا کی جائے۔

امپورٹ کئے ہوئے مال پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: ہم نے ایک مال تجارت باہر ملک سے خریدا ہے اور ابھی ہمارے قبضہ میں نہیں آیا، اس مال کی قیمت کس حساب سے لگائی جائے؟

جواب: اس میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر وہ سامان آپ کی ملکیت میں آ چکا ہے، چاہے وہ ابھی تک آپ کے قبضہ میں نہیں آیا تب تو اس سامان کی قیمت لگائی جائے گی، لیکن اگر وہ سامان آپ کی ملکیت میں نہیں آیا تو اس صورت میں جتنے پیسے آپ نے اس کی خریداری میں لگائے ہیں، صرف ان پیسوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً فرض کریں کہ آپ نے ایک سامان امپورٹ کیا اور وہ سامان آپ کی ملکیت میں آ گیا ہے، اگرچہ وہ سامان ابھی راستہ میں ہے ابھی تک آپ کے قبضہ میں نہیں آیا، تب تو اس سامان کی قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے

گی، لیکن اگر وہ سامان ابھی تک آپ کی ملکیت ہی میں نہیں آیا، اس لئے کہ سودا ہی مکمل نہیں ہوا تو اس صورت میں اس مال کی خریداری میں جتنی رقم لگائی ہے، اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

شمسی تاریخ سے قمری تاریخ کی طرف تبدیلی کس طرح ہوگی؟

سوال: شروع ہی سے میں انگریزی تاریخ کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرتا ہوں، اب میں قمری تاریخ کا تعین کس طرح کروں؟

جواب: آئندہ کے لئے تو آپ کسی قمری تاریخ کا تعین کرلیں اور اب تک آپ جو شمسی تاریخ کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرتے چلے آئے ہیں، تو اس میں ہر سال جو تقریباً چند دنوں کا فرق چلا گیا ہے، اس کی تلافی کے لئے آپ شمسی سال کے لئے 2.60 کا حساب کریں اور جو فرق نکلتا ہو اس کی مزید زکوٰۃ ادا کریں۔

خالص سونے پر زکوٰۃ ہے؟

سوال: سونے کے زیور میں کھوٹ اور نگینوں کی قیمت اور وزن شامل ہوتا ہے تو کیا زیور کے پورے وزن پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا کھوٹ کا وزن اور اس کی قیمت الگ کرنی ہوگی؟

جواب: زکوٰۃ ادا کرتے وقت زیور میں نگینوں کی قیمت اور کھوٹ کو نکالا جائے گا، صرف خالص سونے پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

مجاہدین کو زکوٰۃ دینا

سوال: کیا جہاد میں کافروں سے برسرپیکار مجاہدین کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

جواب: جی ہاں! دی جاسکتی ہے جب کہ وہ جہاد میں لگے ہوئے ہوں، اس لئے کہ مجاہدین بھی زکوٰۃ کا ایک مصرف ہیں۔

تھوڑی تھوڑی کر کے زکوٰۃ دینا

سوال: بعض تاجر زکوٰۃ کا حساب لگا کر یکمشت ادا نہیں کرتے بلکہ اس زکوٰۃ کی رقم کو قابل ادا کھاتے میں درج کردیتے ہیں اور پر تھوڑی تھوڑی کر کے زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور زکوٰۃ کی

مکمل ادائیگی تک وہ رقم کاروبار میں لگی رہتی ہے، کیا یہ صورت جائز ہے؟

جواب: زکوٰۃ تھوڑی تھوڑی ادا کرنا جائز ہے مگر کوشش یہ کرنی چاہئے کہ زکوٰۃ جتنی جلد ادا ہو جائے تو بہتر ہے۔

ایک سے زائد گاڑی پر زکوٰۃ

سوال: اگر کسی شخص کے پاس ایک سے زائد گاڑیاں ہوں تو ان پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب: اگر ایک سے زائد گاڑیاں استعمال ہی کے لئے ہیں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے، لیکن اگر کوئی بیچنے کی نیت سے خریدی ہو تو اس گاڑی پر زکوٰۃ واجب ہے۔

کرایہ کے مکان پر زکوٰۃ

سوال: کیا کرایہ پر دیے ہوئے مکان پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب: کرایہ پر دیے ہوئے مکان کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے البتہ جو کرایہ ہر ماہ آئے گا وہ کرایہ آپ کی نقد رقم میں شامل ہوگا اور سال کے ختم ہونے پر صاحبِ نصاب ہونے کی صورت میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

قرض مانگنے والے کو زکوٰۃ

سوال: اگر کوئی شخص قرض مانگے اور احتمال یہ ہے کہ یہ شخص قرض واپس نہیں کرے گا، تو اس کو قرض بتا کر دل میں زکوٰۃ کی نیت کر کے رقم دیدیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب: جی ہاں! اس طرح دینے سے بھی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے بشرطیکہ شروع میں رقم دیتے وقت ہی زکوٰۃ کی نیت ہو اور یہ نیت ہو کہ اگر یہ واپس لائے گا تو اس سے واپس نہیں لوں گا، تو اس طرح بھی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔

اگر بینک صحیح مصرف پر زکوٰۃ خرچ نہ کرے؟

سوال: جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ اگر بینک زکوٰۃ کاٹ لے تو زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے لیکن ہمیں اس کا پتہ نہیں کہ وہ صحیح مصرف پر خرچ کرتا ہے یا نہیں، للہذا اگر بینک صحیح مصرف پر زکوٰۃ نہ لگائے تو کیا ہماری زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟ ہمارے ذمے پر زکوٰۃ باقی تو نہیں رہ جائے گی؟

جواب: حکومت جو زکوٰۃ وصول کرتی ہے تو حکومت کے وصول کرتے ہی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، اب حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ صحیح مصرف پر خرچ کرے، اگر حکومت صحیح مصرف پر خرچ کرے گی تو اس کی ذمہ داری ادا ہو جائے گی، اگر صحیح مصرف پر خرچ نہیں کرے گی تو وہ گناہ گار ہوگی لیکن آپ کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

زکوٰۃ کی تاریخ بدلنے کا حکم

سوال: اگر کوئی شخص اپنی زکوٰۃ کی تاریخ بدلنا چاہتا ہے تو وہ بدل سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: جیسا کہ پہلے بتایا تھا کہ ہر شخص کی زکوٰۃ کی تاریخ وہ ہے جب وہ پہلی بار صاحب نصاب بنا، لیکن جب ایک تاریخ بن گئی تو پھر آئندہ اس کو وہی تاریخ رکھنی چاہئے اس کو بدلنا درست نہیں۔

اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے لئے ہوئے قرض کا حکم

سوال: اگر کسی شخص نے کمپنی سے اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لیا ہے تو وہ قرض میں شمار ہوگا یا نہیں؟

جواب: اگر کسی شخص نے اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لیا ہے چونکہ وہ اس کی اپنی ہی رقم ہے اس لئے اس قرض کو اپنی مجموعی رقم سے قرض کے طور پر منہا نہیں کیا جائے گا۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے نیت ضروری ہے

سوال: میں نے اپنے ملازم کو شادی کی مد میں ۲۵ ہزار روپے دیے اور اس سے کہا کہ اس میں دس ہزار روپے تمہارے ہیں اور پندرہ ہزار روپے قرض ہیں جو تمہیں واپس کرنا ہے، یہ پندرہ ہزار روپے اگرچہ زکوٰۃ ہی کے تھے لیکن یہ سوچا کہ اس سے واپس لے کر کسی اور کو یہ زکوٰۃ میں دے دوں گا کیا میرا یہ فیصلہ درست ہے؟

جواب: جی ہاں اگر آپ نے شروع ہی میں یہ نیت کر لی کہ اس میں سے دس ہزار روپے تو اس زکوٰۃ کے طور پر دیے ہیں اور باقی قرض ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، آپ کے دس ہزار روپے بطور زکوٰۃ ادا ہو جائیں گے، باقی پندرہ ہزار روپے بطور زکوٰۃ کے ادا نہیں ہوئے، وہ جب وصول ہونے کے بعد دوبارہ زکوٰۃ کی نیت سے ادا کریں گے تو اس وقت ادا ہو جائیں گے۔

اپنے ملازم کو زکوٰۃ دینا

سوال: کیا ہم اپنے ملازم کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں اور کیا اس کا صاحب نصاب نہ ہونا ضروری ہے؟

جواب: ملازم ہو یا نہ ہو، جس کو زکوٰۃ دے رہے ہیں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحب نصاب نہ ہو، کسی بھی صاحب نصاب کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔ چاہے وہ ملازم ہی کیوں نہ ہو البتہ ملازم کو دی ہوئی زکوٰۃ اجرت میں ہرگز نہ لگائیں بلکہ اگر کسی وقت وہ اجرت میں اضافے کا مطالبہ کرے تو اضافہ بھی اس بنا پر نہ روکیں کہ تمہیں ہم زکوٰۃ بھی دیتے ہیں یعنی زکوٰۃ کا کوئی اثر اس کی تنخواہ پر نہ پڑنا چاہئے۔

طلبہ کو وظیفے کے طور پر زکوٰۃ دینا

سوال: مدارس میں طالب علم کو کھانے کے وظیفے کے طور پر مثلاً پانچ سو روپے فی طالب علم زکوٰۃ کی رقم سے دیے جائیں اور پھر ان طلبہ سے فیس کے طور پر وہ رقم اہل مدارس وصول کریں تو اس طرح کرنے سے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب: جی ہاں زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، اور اس طرح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

شیئرز پر ملنے والا سالانہ منافع پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: کیا شیئرز پر ملنے والے سالانہ منافع پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

جواب: جو نقد رقم تاریخ زکوٰۃ میں آپ کے پاس موجود ہے چاہے وہ رقم کسی بھی ذریعہ سے آئی ہو چاہے شیئرز پر ملنے والا سالانہ نفع کے طور پر آپ کو ملی ہو، یا کسی نے ہدیہ میں آپ کو دی ہو یا دکان کی آمدنی سے حاصل ہوئی ہو ان سب پر زکوٰۃ واجب ہے۔

شیئرز کی کون سی قیمت معتبر ہوگی؟

سوال: اگر شیئرز فروخت کرنے کی نیت سے خریدے لیکن بازار میں ان کی قیمت بہت زیادہ گر جانے کی وجہ سے ان کو فروخت نہ کریں تو کیا زکوٰۃ کی تاریخ آنے پر ان شیئرز کی زکوٰۃ مارکیٹ ریٹ پر دی جائے گی یا اس کی خریداری کی قیمت پر دی جائے گی؟

جواب: مارکیٹ ریٹ پر زکوٰۃ دی جائے گی، چاہے مارکیٹ میں نرخ گر گیا ہو یا بڑھ گیا ہو۔

ضرورت سے زائد سامان کے ہوتے ہوئے زکوٰۃ دینا

سوال: اگر ایک شخص کے گھر میں بظاہر ضرورت کا سامان ٹی وی، وی سی آر وغیرہ موجود ہیں، مگر وہ ضرورت مند ہے، مثلاً علاج کے لئے اور بچوں کی تعلیم اور شادی وغیرہ کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے لیکن شرم کے مارے کھلے عام لوگوں سے نہیں مانگ سکتا، کیا ایسے شخص کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں؟

جواب: اگر اس شخص کو واقعۃً ان کاموں کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے تو سب سے پہلے ٹی وی، وی سی آر وغیرہ فروخت کر کے پیسے حاصل کرے جب اس قسم کی اشیاء فروخت کر دے اور ضرورت سے زائد سامان اس کے پاس نہ رہے تو پھر ایسے مستحق شخص کو زکوٰۃ دینے کی گنجائش ہوگی اس سے پہلے نہیں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں ٹی وی، وی سی آر ہے اسے زکوٰۃ نہیں دے سکتے لیکن اگر اس کی بیوی یا بالغ اولاد میں کوئی غیر صاحبِ نصاب مستحق زکوٰۃ ہے تو اسے زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

مریضوں کو زکوٰۃ کی مد سے دوا دینا

سوال: ایسا مریض جو غریب ہو اور سید نہ ہو، ایک ڈاکٹر اس کو دوائی زکوٰۃ کی مد سے دے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: ایسے مریض کو ڈاکٹر سے زکوٰۃ کی مد سے دوا دے سکتا ہے۔

بچیوں کے زیور پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: بعض اوقات والدین اپنی غیر شادی شدہ بچیوں کو زیور دے دیتے ہیں اور ان بچیوں کا کوئی ذریعہ آمدنی بھی نہیں ہوتا، لیکن وہ بچیاں اس زیور کی مالک ہوتی ہیں اب وہ بچیاں اس زیور کی زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟

جواب: اگر بچیاں نابالغ ہیں اور والدین نے وہ زیور ان کی ملکیت میں اس طرح دیدیا ہے کہ اب وہ زیور بچیوں سے لیا جائے گا اور نہ دوسروں کو دیا جائے گا، تو اس صورت میں تو اس زیور پر زکوٰۃ نہیں۔ اس لئے کہ نابالغ پر زکوٰۃ واجب نہیں، لیکن اگر بچیاں بالغ ہیں اور والدین نے زیور کا مالک ان کو بنادیا ہے، تو اس صورت میں خود اس بچی پر اس زیور کی زکوٰۃ فرض ہے،

اگر اس کے پاس کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے تو پھر یا تو والدین اس کی طرف سے اس کی اجازت سے زکوٰۃ ادا کر دیں، اور اگر یہ ممکن نہ تو زیور فروخت کر کے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

کیا زیور فروخت کر کے زکوٰۃ ادا کریں؟

سوال: اگر اس طرح ہر سال زیور فروخت کر کے زکوٰۃ ادا کرتے رہیں تو پھر ایک وقت آئے گا کہ سارا زیور ختم ہو جائے گا؟

جواب: سارا زیور ختم نہیں ہوگا، بلکہ ساڑھے باون تولہ چاندی کے بقدر ضرور باقی رہے گا، اس لئے جب ساڑھے باون تولہ چاندی کی مقدار سے کم ہوگا تو نصاب زکوٰۃ ختم ہو جائے گا اور زکوٰۃ ہی واجب نہیں رہے گی۔

تاریخ زکوٰۃ پر حساب ضرور کر لیں

سوال: ایک شخص کو شادی کے موقع پر جو تحفے ملے اور منہ دکھائیاں ملیں اس کے نتیجے میں وہ صاحب نصاب ہو گیا اگر اگلے سال بھی صاحبِ نصاب رہے تو اگلے سال اسی تاریخ کو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اب اگر آئندہ سال وہ بھی تاریخ تو آ گئی لیکن رمضان کے آنے میں ابھی پانچ ماہ باقی ہیں، تو کیا رمضان آنے پر ایک سال پانچ ماہ کی زکوٰۃ ادا کرے یا وہ کوئی اور طریقہ اختیار کرے؟

جواب: وہ یہ کرے کہ جس تاریخ کو سال پورا ہو جائے اس تاریخ کو زکوٰۃ کا حساب تو لگا لے کہ میرے ذمہ اتنی زکوٰۃ واجب ہوئی، پھر حسب ضرورت ادا کرتا رہے، اگر رمضان تک کوئی مناسب مصرف نہ ملے تو جو زکوٰۃ بچی ہوئی ہو وہ رمضان میں ادا کر دے، لیکن اگر فوری مصرف موجود ہے اور ضرورت مند موجود ہے تو زکوٰۃ رمضان تک ہرگز مؤخر نہ کرنی چاہئے ہر صورت میں ان شاء اللہ ضرورت مند کو فوراً دینے میں زیادہ ثواب ہے۔

پگڑی کی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: پگڑی پر مکان خریدا اور پھر مزید آگے کرایہ پر دے دیا، اس کی زکوٰۃ کس طرح دی جائے گی؟

جواب: پگڑی پر مکان خریدا نہیں جاتا بلکہ کرایہ پر لیا جاتا ہے، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ پگڑی کوئی قابل

زکوٰۃ چیز نہیں، بلکہ جو مکان کرایہ پر دیا ہوا ہے اور اس کو جو کرایہ آرہا ہے وہ جب آمدنی کی شکل میں جمع ہو، اور پھر وہ سال کے آخر میں تاریخ زکوٰۃ پر جو باقی رہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اصل میں اس پر واجب ہے کہ وہ رقم کرایہ دار کو واپس کرے چاہے کرایہ بڑھادے۔

گڈول پر فروخت کی ہوئی بلڈنگ پر زکوٰۃ

سوال: اگر ایک شخص کے پاس ایک بلڈنگ ہے جو اس نے گڈول پر فروخت کردی ہے، کیا وہ اس پر زکوٰۃ دے گا یا نہیں؟

جواب: اگر عمارت یا بلڈنگ گڈول پر فروخت کی ہو یا کسی اور ذریعہ سے فروخت کی ہو جب آپ کے پاس اس کی نقد رقم آگئی تو نقد رقم کا جو حکم ہے وہی حکم اس پر جاری ہوگا، یعنی سال کے ختم پر تاریخ زکوٰۃ آنے پر جو رقم باقی ہوگی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

جس قرضے کی واپسی کی امید نہ ہو اس کا حکم

سوال: اگر ایک شخص نے اپنا مال ادھار فروخت کیا ہوا ہے اور پارٹی رقم ادا نہیں کر رہی ہے تو اس کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہے، اس میں بھی پھر دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ ادھار مال لینے والا مسلسل یہ کہتا رہے کہ میں ادا کردوں گا، مگر وہ ادا نہیں کرتا، اور دوسری صورت یہ کہ وہ ادھار لینے والا واپس دینے سے صاف انکار کر دیتا ہے یا غائب ہی ہو جاتا ہے، یا اس کا انتقال ہو جاتا ہے تو ان صورتوں میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

جواب: اگر کسی شخص کے ذمے آپ کی رقم تھی مگر وہ اب واپس ادا کرنے سے مکر گیا ہے یا غائب ہو گیا ہے اور پتہ نہیں چل سکا کہ کہاں گیا، اور اب اس رقم کے واپس ملنے کی امید نہیں ہے، تو اس رقم پر زکوٰۃ نہیں، لیکن اگر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میں تمہاری رقم ادا کروں گا بظاہر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ وہ نیک نیتی سے کہہ رہا ہے، اگرچہ اس وقت گنجائش نہیں ہے لیکن گنجائش ہونے پر وہ واقعی دیدے گا تو اس صورت میں اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہے اس کی زکوٰۃ نکالنی چاہئے، البتہ اس رقم پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ فوری واجب نہیں، قرض کی رقم وصول ہونے پر ادا کرسکتا ہے۔ مگر جب رقم مل جائے گی، تو پچھلے ان سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی، جن میں وہ رقم وصول نہیں ہوئی تھی، اور زکوٰۃ بھی ادا نہیں کی گئی تھی۔

☆☆☆

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۴

اسلام اور حُسنِ معاشرت

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۳ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور پاکستان ★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار کراچی
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۴۸۵ فون ۳۷۳۵۳۲۵۵ / ۳۷۲۲۳۹۹۱ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۵

اسلام اور خاندانی نظام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۳ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی
فون ۳۷۳۵۳۲۵۵-۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۴۸۵ فون ۳۶۳۴۹۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۶

اصلاح وتصوّف

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

اِدارۂ اسلامیات
پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۳ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی

فون ۳۷۲۳۱۱۱۹۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۲۲۴۲۸۵ فون ۳۷۳۵۳۲۵۵، ۳۷۲۴۴۳۹۹ فون ۳۲۷۲۲۲۰

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۷

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات
پبلشرز بکسیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۳ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور، پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار، کراچی
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲۰۴۲۰۳۷۲۲۴۸۵ فون ۳۷۲۴۳۹۹۱۔۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۸

اخلاق سیئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰ انار کلی، لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی
فون ۳۷۳۴۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۲۳۴۷۸۵ فون ۳۷۲۳۲۹۹۱ - ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۹

اخلاق حسنہ اور ان کے فضائل

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲، فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵

★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن و سنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین و دنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات و تحریرات

جلد ۱۰

روزمرہ کی سُنتیں اور اعمال

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۹۰ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اُردو بازار کراچی
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۳۷۲۳۲۲۸۵-۴۲-۹۲ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خطبات و تحریرات)

جلد نمبر ۴

اسلام اور حُسنِ معاشرت

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

اسلام اور حُسنِ معاشرت

جلد ۴

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین و دنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۴

اسلام اور حسنِ معاشرت

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات

★ [illegible] مال روڈ، لاہور ★ [illegible] انارکلی، لاہور پاکستان ★ [illegible]

فون [illegible] فیکس [illegible] فون [illegible] فون [illegible]

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات و تحریرات

جلد ۴

اسلام اور حسن معاشرت

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴۔ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان ___ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان ___ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

اللہ کی مخلوق سے محبت کیجئے	۱۷
حضور ﷺ کے جامع کلمات	۱۷
کسی کی پریشانی دور کرنے پر اجر وثواب	۱۸
تنگدست کو مہلت دینے کی فضیلت	۱۸
نرمی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے	۱۹
مسلمان کی حاجت پوری کرنے کی فضیلت	۱۹
مخلوقِ خدا پر رحم کرو	۲۰
مجنوں کو لیلیٰ کے درودیوار سے محبت	۲۱
کیا اللہ کی محبت لیلیٰ کی محبت سے کم ہو جائے؟	۲۱
کتے کو پانی پلانے کا اجر	۲۲
رحم کا اعلیٰ مقام	۲۲
ایک مکھی پر ترس کھانا	۲۳
تصوف اور خدمتِ خلق	۲۳
اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے محبت ہے	۲۴
حضرت نوح علیہ السلام کا عجیب واقعہ	۲۴
حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات	۲۵
اولیاء کرام کی حالت	۲۵
حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۲۶
حضور ﷺ کی اپنی اُمت پر شفقت	۲۶
گناہ گار سے نفرت مت کرو	۲۷
ایک تاجر کی مغفرت کا عجیب قصہ	۲۷
یہ رحمت کا معاملہ تھا، قانون کا نہیں	۲۸
ایک بچے کا نواب کو گالی دینا	۲۹
کسی نیک کام کو حقیر مت سمجھو	۳۰
بندوں پر نرمی کرنے پر مغفرت	۳۰
حضور اقدس ﷺ کا معمول	۳۱
امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت	۳۲
پیسے جوڑ جوڑ کر رکھنے والوں کے لئے بددعا	۳۲
پیسے خرچ کرنے والوں کے لئے دعا	۳۳
دوسروں کی پردہ پوشی کیجئے	۳۳
دوسروں کو گناہ پر عار مت دلائیں	۳۴
اپنی فکر کریں	۳۵
علمِ دین سیکھنے کی فضیلت اور اس پر بشارت	۳۵
یہ علم ہمارے اسلاف نے محنت سے جمع کر دیا	۳۵
ایک حدیث کے لئے پندرہ سو کلومیٹر کا سفر	۳۶
مجلس دین آتے وقت سیکھنے کی نیت کر لیا کریں	۳۷
اللہ کے گھر میں جمع ہونے والوں کے لئے عظیم بشارت	۳۷
تم اللہ کا ذکر کرو، اللہ تمہارا ذکر کریں گے	۳۸

حضرت اُبیؓ بن کعب سے قرآن پاک سنانے کی فرمائش ۳۸
اللہ کا ذکر کرنے پر عظیم بشارت ۳۹
اُونچا خاندان ہونا نجات کے لئے کافی نہیں ۴۰
خلاصہ ۴۱

دوسروں کو خوش کیجئے ۴۲

اللہ کے بندوں کو خوش رکھو ۴۲
دل بدست آور کہ حج اکبراست ۴۲
دوسروں کو خوش کرنے کا اجر ۴۳
خندہ پیشانی سے ملاقات کرنا ''صدقہ'' ہے ۴۳
گناہ کے ذریعے دوسروں کو خوش نہ کریں ۴۴
فیضی شاعر کا واقعہ ۴۴
دوسروں کو خوش کرنے کی حدود ۴۵
خود گناہ میں مبتلا نہ ہوں ۴۵
اچھے کام کا حکم دینا نہ چھوڑے ۴۶
برائی سے نرم انداز میں روکے ۴۶

دوسروں کے مزاج کی رعایت ۴۷

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مزاج کی رعایت ۴۷
حیاء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا وصفِ خاص ۴۸
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مزاج کی رعایت ۴۹
اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے مزاج کی رعایت ۵۰
اس سال ہم بھی اعتکاف نہیں کریں گے ۵۱
اعتکاف کی تلافی ۵۱
یہ بھی سنت ہے ۵۱
حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحبؒ کا معمول ۵۲
تمہیں اس پر پورا ثواب ملے گا ۵۳
عیادت کرنا بھی دین ہے ۵۳
وقت کا تقاضا دیکھئے ۵۳
رمضان کی برکات سمیٹنے کا طریقہ ۵۴
بے جا اصرار نہ کریں ۵۴
سفارش کا ایک ادب ۵۵
تعلق رسمیات کا نام ہوگیا ہے ۵۶
حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت ۵۶
محبت نام ہے محبوب کو راحت پہنچانے کا ۵۷

خندہ پیشانی سے ملنا سنت ہے ۵۹

خندہ پیشانی سے پیش آنا انسانیت کا حق ہے ۵۹
اس سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر کافروں کا اعتراض ۶۰
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملنساری کا نرالا انداز ۶۱
مفتی اعظم پاکستان ہے یا عام راہگیر؟ ۶۱
مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد قباء کی طرف عاجزانہ چال ۶۲
شاید یہ مشکل ترین سنت ہو ۶۲
مخلوق سے محبت کرنا، حقیقتاً اللہ سے محبت کرنا ہے ۶۳
حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی امتیازی خصوصیت ۶۴

تورات میں اب بھی کتاب اللہ کا نور جھلکتا ہے	۶۴
بائبل سے قرآن تک	۶۵
آپ ﷺ کی صفات تورات میں بھی موجود ہیں	۶۵
تورات کی عبرانی زبان میں آپ علیہ السلام کی صفات	۶۷
حدیثِ مذکورہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی غرض	۶۷
برائی کا جواب حسنِ سلوک سے دینا	۶۸
حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عجیب واقعہ	۶۹
مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۶۹
آپ ﷺ کی ساری سنتوں پر عمل ضروری ہے	۷۰
اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ گھونٹ	۷۱
اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں صابرین کا اجر	۷۱
عفو وصبر کا مثالی واقعہ	۷۱
ہم میں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں فرق	۷۲
مذکورہ حدیث کا آخری ٹکڑا	۷۳
غریبوں کی تحقیر نہ کیجئے	۷۴
اللہ کے محبوب کون؟	۷۵
محبوبانہ عتاب	۷۵
طالب کو ترجیح دینی چاہئے	۷۷
جنتی اور جہنمی لوگوں کا ذکر	۷۷
اولیاء اللہ کی شان	۷۸
سخت مزاجی سخت نقصان دہ ہے	۷۹
یہ بڑی فضیلت والے ہیں	۷۹
یہ فاقہ مست لوگ	۸۰
انبیاء کرام علیہم السلام کے متبعین نادار ہوتے ہیں	۸۰
حضرت زاہر رضی اللہ عنہ _ حضور ﷺ کے ایک دوست	۸۱
ملازم کا بھی احترام کیجئے	۸۲
مساکین کی فضیلت	۸۳
جنت اور دوزخ کے درمیان مناظرہ	۸۳
جنت اور دوزخ کیسے کلام کریں گی؟	۸۴
قیامت کے روز اعضاء کس طرح بولیں گے؟	۸۴
متکبرین جہنم میں جائیں گے	۸۵
کمزور اور مسکین لوگ جنت میں جائیں گے	۸۵
تکبر اللہ کو ناپسند ہے	۸۵
متکبر کی مثال	۸۶
کافر کو بھی حقارت سے مت دیکھو	۸۶
حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع	۸۶
''تکبر'' اور ''ایمان'' جمع نہیں ہو سکتے	۸۷
''تکبر'' ایک خفیہ مرض ہے	۸۷
تصوف کا مقصد	۸۷
روحانی علاج کی حقیقت	۸۸
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طریقۂ علاج	۸۸
تکبر کا راستہ جہنم کی طرف	۸۸
جنت میں ضعفاء اور مساکین کی کثرت	۸۹

ضعفاء اور مساکین کون ہیں؟ ۸۹
مسکنت اور مالداری جمع ہو سکتے ہیں ۹۰
فقر اور مسکینی الگ الگ چیزیں ہیں ۹۰
جنت اور جہنم کے درمیان اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ۹۰
ایک بزرگ کو آخرت کا خوف ۹۱
مؤمن کی آنکھیں کیسے سو سکتی ہیں؟ ۹۱
روح قبض ہوتے ہی مسکراہٹ آ گئی ۹۱
غفلت کی زندگی بری ہے ۹۲
ظاہری صحت وقوت، حسن و جمال پر مت اتراؤ ۹۲
مسجد نبوی میں جھاڑو دینے والی خاتون ۹۳
قبر پر نمازِ جنازہ کا حکم ۹۴
کسی کو حقیر مت سمجھیں ۹۴
یہ پراگندہ بالوں والے ۹۵
ناداروں کے ساتھ ہمارا سلوک ۹۵
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے خادم کے ساتھ برتاؤ ۹۵
اللہ تعالیٰ کی حدود پر رک جانے والے ۹۶
جنت اور دوزخ میں جانے والے ۹۷
مساکین جنت میں ہوں گے ۹۸
عورتیں دوزخ میں زیادہ کیوں ہوں گی؟ ۹۸
شوہر کی ناشکری، ایک عظیم گناہ ۹۹
شوہر کا مقام ۹۹
جہنم سے بچنے کے دو گُر ۱۰۰
اس عورت پر فرشتے لعنت کرتے ہیں ۱۰۰
زبان پر قابو رکھیں ۱۰۰
حقوق العباد کی اہمیت ۱۰۱

گناہ گار کو طعنہ مت دیجئے ۱۰۲

کسی کو گناہ پر عار دلانے کا وبال ۱۰۲
گناہ گار ایک بیمار کی طرح ہے ۱۰۲
کفر قابل نفرت ہے، نہ کہ کافر ۱۰۳
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا دوسروں کو افضل سمجھنا ۱۰۴
یہ مرض کن لوگوں میں پایا جاتا ہے ۱۰۴
کسی کو بیمار دیکھے تو یہ دعا پڑھے ۱۰۵
کسی کو گناہ میں مبتلا دیکھے تو یہی دعا پڑھے ۱۰۵
حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا چور کے پاؤں چومنا ۱۰۶
ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے ۱۰۷
کسی کے عیب دوسروں کو مت بتاؤ ۱۰۷

گناہ گار کی تحقیر نہ کیجئے ۱۰۸

برے کام کرنے والے کو کم نہ سمجھو ۱۰۸
نفرت گناہ سے، نہ کہ گناہ گار سے ۱۰۸
گناہ گار ترس کھانے کے لائق ۱۰۹
شیطان کس طرح راہ مارتا ہے ۱۰۹
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اندازِ تربیت ۱۰۹
تم بیل ہو تو میں قصائی ہوں ۱۱۰
ایک لطیفہ ۱۱۰
میری مثال ۱۱۰
عین ڈانٹ ڈپٹ کے وقت دعا کرنا ۱۱۱
سالکین کے کبر اور تواضع مفرط کا علاج ۱۱۱

دین کے راستے سے بہکانا	۱۱۱
تکبر کے ذریعہ بہکانا	۱۱۲
جولاہے کی مثال	۱۱۲
بلعم باعور کا قصہ	۱۱۳
دل کب پلٹے جاتے ہیں؟	۱۱۵
شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت	۱۱۵
شیطان کا دوسرا حملہ	۱۱۶
دوسرے حملے کی سنگینی	۱۱۶
دل سے گھمنڈ نکال دو	۱۱۷
تکبر کا علاج، رجوع الی اللہ	۱۱۷
''تواضع مفرط'' کا پیدا ہونا	۱۱۸
''تواضع مفرط'' کا ایک قصہ	۱۱۸
اپنی نماز کو ''ٹکریں مارنا'' مت کہو	۱۱۸
کوتاہیوں پر استغفار کرو	۱۱۹
حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۱۱۹
عبادات چھڑانے کا طریقہ	۱۲۰
عبادات پر شکر ادا کرو	۱۲۰
شیطان کی کمر توڑنے والے الفاظ	۱۲۱
بڑوں کی اطاعت اور ادب کے تقاضے	۱۲۲
لوگوں کے درمیان صلح کرانا	۱۲۲
امام کو متنبہ کرنے کا طریقہ	۱۲۴
ابو قحافہ کے بیٹے کی یہ مجال نہیں تھی	۱۲۴
حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام	۱۲۵
ادب کی اہمیت زیادہ یا امر کی؟	۱۲۵
بڑے کے حکم پر عمل کرے	۱۲۵
دین کا خلاصہ ''اتباع'' ہے	۱۲۶
حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں میری حاضری	۱۲۶
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حاضری	۱۲۶
عالمگیر اور دارا شکوہ کے درمیان تخت نشینی کا فیصلہ	۱۲۷
حیل و حجت نہ کرنا چاہئے	۱۲۷
بزرگوں کے جوتے اُٹھانا	۱۲۸
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دو واقعات	۱۲۸
خدا کی قسم! انہیں مٹاؤں گا	۱۲۸
اگر حکم کی تعمیل اختیار سے باہر ہو جائے	۱۲۹
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے	۱۳۰
بڑوں کا اکرام کیجئے	۱۳۱
اکرام کا ایک انداز	۱۳۱
اکرام کے لئے کھڑا ہو جانا	۱۳۱
حدیث سے کھڑے ہونے کا ثبوت	۱۳۲
مسلمان کا اکرام ''ایمان'' کا اکرام ہے	۱۳۲
ایک نوجوان کا سبق آموز واقعہ	۱۳۳
انشورنس کا ملازم کیا کرے؟	۱۳۴
میں مشورہ لینے نہیں آیا	۱۳۴
ظاہری شکل پر مت جاؤ	۱۳۵
معزز کافر کا اکرام	۱۳۵
کافروں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل	۱۳۶
ایک کافر شخص کا واقعہ	۱۳۶
یہ غیبت جائز ہے	۱۳۶

بُرے آدمی کا آپ نے اکرام کیوں کیا؟	۱۳۷
وہ آدمی بہت بُرا ہے	۱۳۷
سرسیّد احمد خان کا ایک واقعہ	۱۳۸
آپ نے اس کی خاطر مدارات کیوں کی؟	۱۳۹
دین کی نسبت کا احترام	۱۳۹
عام جلسہ میں معزز کا اکرام	۱۴۰
یہ حدیث پر عمل ہو رہا ہے	۱۴۰
معزز کا اکرام باعثِ اجر ہے	۱۴۱

بڑوں سے آگے مت بڑھو ۱۴۲

سورۃ الحجرات دو حصوں پر مشتمل ہے	۱۴۲
قبیلہ بنو تمیم کے وفد کی آمد	۱۴۲
حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا اپنے طور پر امیر مقرر کرنا	۱۴۳
دو غلطیاں سرزد ہوئیں	۱۴۳
پہلی غلطی پر تنبیہ	۱۴۳
یہ قرآن قیامت تک رہنمائی کرتا رہے گا	۱۴۴
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر گفتگو جائز نہیں	۱۴۴
عالم سے پہلے گفتگو کرنا جائز نہیں	۱۴۴
راستے میں نبی یا علماء سے آگے بڑھنا	۱۴۵
سنت کی اتباع میں کامیابی ہے	۱۴۶
تین صحابہ رضی اللہ عنہم کے عبادت کے ارادے	۱۴۶
کوئی شخص نبی سے آگے نہیں بڑھ سکتا	۱۴۶
حقوق کی ادائیگی اتباع سنت ہے	۱۴۷
دین ''اتباع'' کا نام ہے	۱۴۸
بارش میں گھر میں نماز پڑھنے کی رخصت	۱۴۸
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا واقعہ	۱۴۸
اللہ سے ڈرو	۱۴۹

اخوت، ایک اسلامی رشتہ ۱۵۰

آیت کا مفہوم	۱۵۰
جھگڑے دین کو مونڈنے والے ہیں	۱۵۰
باطن کو تباہ کرنے والی چیز	۱۵۱
اللہ کی بارگاہ میں اعمال کی پیشی	۱۵۱
وہ شخص روک لیا جائے	۱۵۲
بغض سے کفر کا اندیشہ	۱۵۲
شب برات میں بھی مغفرت نہیں ہوگی	۱۵۳
بغض کی حقیقت	۱۵۳
حسد اور کینہ کا بہترین علاج	۱۵۴
دشمنوں پر رحم۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت	۱۵۴
جھگڑا علم کا نور زائل کر دیتا ہے	۱۵۵
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی قوتِ کلام	۱۵۶
مناظرہ سے عموماً فائدہ نہیں ہوتا	۱۵۶
جنت میں گھر کی ضمانت	۱۵۶
جھگڑوں کے نتائج	۱۵۷
جھگڑے کس طرح ختم ہوں؟	۱۵۷
توقعات مت رکھو، جھگڑے ختم ہو جائیں گے	۱۵۸
بدلہ لینے کی نیت مت کرو	۱۵۸
حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم قربانی	۱۵۹
مجھے اس میں برکت نظر نہیں آتی	۱۶۰
صلح کرانا صدقہ ہے	۱۶۰
اسلام کا کرشمہ	۱۶۲

ایسا شخص جھوٹا نہیں	۱۶۲
صریح جھوٹ جائز نہیں	۱۶۳
زبان سے اچھی بات نکالو	۱۶۳
صلح کرانے کی اہمیت	۱۶۳
ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۱۶۴
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت	۱۶۴
دوسروں کو تکلیف مت دیجئے	۱۶۶
وہ حقیقی مسلمان نہیں	۱۶۶
''معاشرت'' کا مطلب	۱۶۷
معاشرت کے احکام کی اہمیت	۱۶۷
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معاشرت کے احکام کو زندہ کرنا	۱۶۸
پہلے انسان تو بن جاؤ	۱۶۸
جانوروں کی تین قسمیں	۱۶۸
ہم نے انسان دیکھے ہیں	۱۶۹
دوسروں کو تکلیف سے بچالو	۱۷۰
نماز باجماعت کی اہمیت	۱۷۰
ایسے شخص کے لئے مسجد میں آنا جائز نہیں	۱۷۰
حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت تکلیف دینا	۱۷۱
بلند آواز سے تلاوت کرنا	۱۷۱
تہجد کے وقت آپ ﷺ کے اُٹھنے کا انداز	۱۷۱
لوگوں کی گزرگاہ میں نماز پڑھنا	۱۷۲
''مسلم'' میں سلامتی داخل ہے	۱۷۲
السلام علیکم کا مفہوم	۱۷۳
زبان سے تکلیف نہ دینے کا مطلب	۱۷۳
طنز کا ایک عجیب واقعہ	۱۷۴

زبان کے ڈنک کا ایک قصہ	۱۷۵
پہلے سوچو پھر بولو	۱۷۶
زبان ایک عظیم نعمت	۱۷۶
سوچ کر بولنے کی عادت ڈالیں	۱۷۷
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۱۷۷
غیر مسلموں کو بھی تکلیف پہنچانا جائز نہیں	۱۷۸
ناجائز ہونے کی دلیل	۱۷۹
وعدہ خلافی کرنا زبان سے تکلیف دینا ہے	۱۷۹
تلاوتِ قرآن کے وقت سلام کرنا	۱۸۰
مجلس کے دوران سلام کرنا	۱۸۰
کھانا کھانے والے کو سلام کرنا	۱۸۱
ٹیلیفون پر لمبی بات کرنا	۱۸۱
باہر کے لاؤڈ اسپیکر پر تقریر کرنا	۱۸۱
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے کا ایک واقعہ	۱۸۲
آج ہماری حالت	۱۸۲
وہ عورت دوزخی ہے	۱۸۳
ہاتھ سے تکلیف مت دیجئے	۱۸۳
کسی چیز کو بے جگہ رکھنا	۱۸۴
یہ گناہِ کبیرہ ہے	۱۸۴
اپنے عزیز اور بیوی بچوں کو تکلیف دینا	۱۸۴
اطلاع کیے بغیر کھانے کے وقت غائب رہنا	۱۸۵
راستے کو گندہ کرنا حرام ہے	۱۸۵
ذہنی تکلیف میں مبتلا کرنا حرام ہے	۱۸۶
ملازم پر ذہنی بوجھ ڈالنا	۱۸۶
نماز پڑھنے والے کا انتظار کس جگہ کیا جائے؟	۱۸۷

"آداب المعاشرت" پڑھیے ۱۸۸

مسلمان اور ایذا رسانی ۱۸۹

دوستی اور دشمنی میں اعتدال ۱۹۲

دوستی کرنے کا زرّین اصول ۱۹۲
ہماری دوستی کا حال ۱۹۳
دوستی کے لائق ایک ذات ۱۹۳
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایک سچے دوست ۱۹۳
غارِ ثور کا واقعہ ۱۹۴
ہجرت کا ایک واقعہ ۱۹۴
دوستی اللہ کے ساتھ خاص ہے ۱۹۴
دوستی اللہ کی دوستی کے تابع ہونی چاہیے ۱۹۵
مخلص دوستوں کا فقدان ۱۹۵
دشمنی میں اعتدال ۱۹۶
حجاج بن یوسف کی غیبت ۱۹۶
ہمارے ملک کی سیاسی فضا کا حال ۱۹۷
قاضی بکار بن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کا سبق آموز واقعہ ۱۹۷
یہ دعا کرتے رہو ۱۹۸
اگر محبت حد سے بڑھ جائے تو یہ دعا کرو ۱۹۹
دوستی کے نتیجے میں گناہ ۱۹۹
اعتدال کا راستہ اختیار کیجیے ۲۰۰

برائی کا بدلہ اچھائی سے دیجیے ۲۰۱

مؤمنوں کی دوسری صفت ۲۰۱
حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ۲۰۲
ترکی بہ ترکی جواب مت دو ۲۰۲
انتقام کے بجائے معاف کر دو ۲۰۲
بزرگوں کی مختلف شانیں ۲۰۳
میں اپنا وقت بدلہ لینے میں کیوں ضائع کروں ۲۰۳
پہلے بزرگ کی مثال ۲۰۴
دوسرے بزرگ کا انداز ۲۰۴
بدلہ لینا بھی خیر خواہی ہے ۲۰۴
اللہ تعالیٰ کیوں بدلہ لیتے ہیں؟ ۲۰۵
تیسرے بزرگ کا انداز ۲۰۵
پہلے بزرگ کا طریقہ سنت تھا ۲۰۵
معاف کرنا باعثِ اجر و ثواب ہے ۲۰۶
حضرات انبیاء علیہم السلام کے اندازِ جواب ۲۰۶
رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز ۲۰۷
عام معافی کا اعلان ۲۰۸
ان سنتوں پر بھی عمل کرو ۲۰۸
اس سنت پر عمل کرنے سے دنیا جنت بن جائے ۲۰۹
جب تکلیف پہنچے تو یہ سوچ لو ۲۰۹
چالیس سالہ جنگ کا سبب ۲۱۰

دوسروں کی چیزوں کا استعمال ۲۱۱

دوسروں کو تکلیف دے کر اپنا مفاد حاصل کرنا ۲۱۱
دوسروں کو تکلیف دے کر لباس یا شہرت حاصل کرنا ۲۱۲
دوسرے کی چیز لینا ۲۱۲

خوشدلی کے بغیر دوسرے کی چیز حلال نہیں	۲۱۳
''مولویت'' بیچنے کی چیز نہیں	۲۱۳
امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت	۲۱۴
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاط کا ایک واقعہ	۲۱۴
اُمت کے لئے سبق	۲۱۵
سلام کے جواب کے لئے تیمم کرنا	۲۱۵
علماء کا احادیث سے مسائل کا نکالنا	۲۱۶
بلبل والی حدیث سے ۱۱۰ مسائل کا استنباط	۲۱۶
سلام کے جواب کیلئے تیمم کرنا جائز ہے	۲۱۷
ذکر کے لئے تیمم کرنا	۲۱۷
دوسرے کی دیوار سے تیمم کرنا	۲۱۷
کسی قوم کی کوڑی کو استعمال کرنا	۲۱۸
میزبان کے گھر کی چیز استعمال کرنا	۲۱۸
بیٹے کے کمرے میں داخل ہونے کے لئے اجازت	۲۱۹
اطلاع کے بغیر دوسرے کے گھر جانا	۲۱۹
خوش دلی کے بغیر چندہ لینا	۲۲۰
عام مجمع میں چندہ کرنا	۲۲۱
غزوۂ تبوک کے واقعہ سے اشکال اور اس کا جواب	۲۲۱
چندہ کرنے کا صحیح طریقہ	۲۲۲
عاریت کی چیز جلدی واپس نہ کرنا	۲۲۲
کتاب لے کر واپس نہ کرنا	۲۲۳
دوسروں کیلئے پسندیدگی کا معیار	۲۲۴
جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو	۲۲۴
مجھے اس سے نفرت ہو جاتی ہے	۲۲۵
مجھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے	۲۲۵
ہر کام کو اس معیار پر تو لو	۲۲۶
کھانے کے بعد پان کھانا	۲۲۶
پڑھنے والے کو تکلیف نہ ہو	۲۲۷
مخلوق کی خدمت کے بغیر تصوف حاصل نہیں ہو سکتا	۲۲۷
اگر میرے ساتھ یہ معاملہ ہوتا تو!	۲۲۸
فرائض کی پرواہ نہیں، حقوق کا مطالبہ پہلے	۲۲۸
ملازمت میں یہ طریقہ کار ہو	۲۲۹
تنخواہ گھٹانے کی درخواست	۲۲۹
دو پیمانے بنا رکھے ہیں	۲۳۰
میاں بیوی کا باہمی تعلق	۲۳۰
ساس بہو کے جھگڑے کی وجہ	۲۳۰
اس طریقے کو ختم کرو	۲۳۱
میری مخلوق سے محبت کرو	۲۳۱
ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۲۳۱
حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا ہر ایک کے لئے دعا کرنا	۲۳۲
پانچویں نصیحت	۲۳۳
پڑوسی	۲۳۴
پڑوسیوں کے حقوق ادا کیجئے	۲۳۸
پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک	۲۳۸
جبرائیل علیہ السلام کا مسلسل تاکید کرنا	۲۳۹
پڑوسیوں کی تین قسمیں	۲۳۹
تھوڑی دیر کا ساتھی	۲۴۰

اللہ کو وہ بندہ بڑا پسند ہے	۲۴۰
یہ نئی تہذیب ہے	۲۴۰
آگ لگنے کا واقعہ	۲۴۱
جھونپڑی والا بھی پڑوسی ہے	۲۴۲
مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۲۴۲
یہ کیسے لوگ تھے؟	۲۴۳
ساری زندگی کچے مکان میں گزار دی	۲۴۳
تا کہ پڑوسیوں کو حسرت نہ ہو	۲۴۴
ساتھ کی دکان والا پڑوسی ہے	۲۴۵
سبق آموز واقعہ	۲۴۵
آج طلبِ دنیا کی دوڑ لگی ہوئی ہے	۲۴۶
برصغیر میں اسلام کی ابتداء کس طرح ہوئی؟	۲۴۶
دیوار پر شہتیر رکھنے کی اجازت	۲۴۷
پڑوسی کے حقوق میں غیر مسلم بھی داخل ہے	۲۴۷
تھوڑی دیر کا ساتھی	۲۴۸
اہل مغرب کی ایک اچھی صفت	۲۴۸
ہماری ''خود غرضی'' کا واقعہ	۲۴۹
مصافحہ کرنے پر ایک واقعہ	۲۴۹
حجر اسود پر دھکم پیل	۲۵۰
ایک سنہری بات	۲۵۰
اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ	۲۵۱
تھوڑی دیر کا ساتھی	**۲۵۲**
ہر خبر کی تحقیق ضروری ہے	**۲۵۷**
آیت کا شانِ نزول	۲۵۷
قاصد کے استقبال کیلئے بستی سے باہر نکلنا	۲۵۸
حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا واپس جانا	۲۵۸
تحقیق کرنے پر حقیقت واضح ہوئی	۲۵۹
سنی سنائی بات پر یقین نہیں کرنا چاہئے	۲۵۹
افواہ پھیلانا حرام ہے	۲۵۹
آج کل کی سیاست	۲۶۰
حجاج بن یوسف کی غیبت جائز نہیں	۲۶۰
سنی ہوئی بات آگے پھیلانا جھوٹ میں داخل ہے	۲۶۰
پہلے تحقیق کرو، پھر زبان سے نکالو	۲۶۱
افواہوں پر کان نہ دھریں	۲۶۱
جس سے شکایت پہنچی ہو اس سے پوچھ لیں	۲۶۲
باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا	۲۶۲
تلی ہوئی بات زبان سے نکلے	۲۶۳
حضرات محدثین رحمہم اللہ کی احتیاط	۲۶۳
ایک محدث رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۲۶۴
حدیث کے بارے میں ہمارا حال	۲۶۴
حکومت پر بہتان لگانا	۲۶۴
دینی مدارس کے خلاف دہشت گرد ہونے کا پروپیگنڈا!	۲۶۵
دینی مدارس کا معائنہ کرلو	۲۶۵
غلط مفروضے قائم کر کے بہتان لگانا	۲۶۶
پہلے خبر کی تحقیق کرلو	۲۶۶
حق کی بنیاد پر دوسرے کا ساتھ دو	**۲۶۷**
ورنہ مظلوم کا ساتھ دو	۲۶۷

نسل یا زبان کی بنیاد پر ساتھ مت دو	۲۶۸
ایسے معاہدے کی اجازت نہیں	۲۶۸
ظالم کو ظلم سے روکو	۲۶۹
دونوں کے درمیان صلح کرادو	۲۶۹
اسلامی اخوت کی بنیاد ایمان پر ہے	۲۷۰
مسلمان کو بے یار و مددگار مت چھوڑو	۲۷۱
دولت مند معاشرے کا حال	۲۷۱
کلمہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کا رشتہ	۲۷۲
قرآنی تعلیمات سے دوری کا نتیجہ	۲۷۲
مسلمان کو قتل کرنے کی سزا	۲۷۳
اس وقت کسی کا ساتھ مت دو	۲۷۳
فتنہ کے وقت اپنے گھر میں بیٹھ جاؤ	۲۷۴
حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ	۲۷۵
گناہِ صغیرہ سے معافی کا طریقہ	۲۷۵
عبادات سے گناہِ صغیرہ معاف ہو جاتے ہیں	۲۷۵
گناہِ کبیرہ کے لئے توبہ ضروری ہے	۲۷۶
حقوق العباد اور بعض حقوق اللہ محض توبہ سے معاف نہیں ہوتے	۲۷۶
تمام سابقہ حقوقِ واجبہ کی ادائیگی شروع کردیں	۲۷۷
اگر تمام حقوق کی ادائیگی سے پہلے موت آگئی	۲۷۷
حقوق کی معافی کا راستہ	۲۷۸
مایوس ہونا ٹھیک نہیں	۲۷۸
سو انسانوں کے قاتل کا واقعہ	۲۷۸
سو کا عدد پورا کر دیا	۲۷۹
رحمت اور عذاب کے فرشتوں میں جھگڑا	۲۷۹
اللہ تعالیٰ کا فیصلہ	۲۸۰
اس واقعہ سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال	۲۸۰
پیائش کرانے کی کیا ضرورت تھی؟	۲۸۰
حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے قدم بڑھانا شرط ہے	۲۸۱
خلاصہ	۲۸۱
گناہ کا تقاضا گناہ نہیں	۲۸۱
غصہ کا علاج سب سے مقدم	۲۸۲
غصہ اور شہوت کے تقاضے پر عمل کرنا گناہ ہے	۲۸۲
حسد کے تقاضے پر عمل کا گناہ ہے	۲۸۲
حسد کے دو علاج	۲۸۳
طبعی ناگواری سے مغلوب ہو کر زبان سے نکلنے والے کلمات	۲۸۴
ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو غصہ نہ کرنے کی نصیحت	۲۸۴
ابتداءً بالکل غصہ کرنا چھوڑ دو	۲۸۵
معافی مانگنے سے شرم مت کرو	۲۸۵
مسلمان پر مسلمان کے حقوق	۲۸۶
مؤمن ایک آئینہ ہے	۲۸۹
تمہاری غلطی بتانے والا تمہارا محسن ہے	۲۸۹
غلطی بتانے والے علماء پر اعتراض کیوں؟	۲۹۰
ڈاکٹر بیماری بتاتا ہے، بیمار نہیں بناتا	۲۹۱

ایک نصیحت آموز واقعہ	۲۹۱
بیماری بتانے والے پر ناراض نہیں ہونا چاہئے	۲۹۲
غلطی بتانے والا لعنت ملامت نہ کرے	۲۹۲
غلطی کرنے والے پر ترس کھاؤ	۲۹۳
غلطی کرنے والے کو ذلیل مت کرو	۲۹۳
حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ	۲۹۳
ایک کا عیب دوسرے کو نہ بتایا جائے	۲۹۴
ہمارا طرزِ عمل	۲۹۵
غلطی بتانے کے بعد مایوس ہو کر مت بیٹھو	۲۹۵
انبیاء علیہم السلام کا طرزِ عمل	۲۹۶
یہ کام کس کے لئے کیا تھا؟	۲۹۶
ماحول کی اصلاح کا بہترین طریقہ	۲۹۷
خلاصہ	۲۹۷
مرنے والوں کو بُرا مت کہو	۲۹۸
مرنے والوں کو بُرا مت کہو	۲۹۸
مرنے والے سے معافی مانگنا ممکن نہیں	۲۹۹
اللہ کے فیصلے پر اعتراض	۲۹۹
زندہ اور مُردہ میں فرق	۲۹۹
اس کی غیبت سے زندوں کو تکلیف	۳۰۰
مُردہ کی غیبت جائز ہونے کی صورت	۳۰۰
اچھے تذکرہ سے مُردے کا فائدہ	۳۰۱
مرنے والوں کے لئے دعائیں کرو	۳۰۱

اللہ کی مخلوق سے محبت کیجئے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ، وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِیَّنَا وَحَبِیْبَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ:((مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ کُرْبَۃً مِنْ کُرَبِ الدُّنْیَا نَفَّسَ اللّٰہُ عَنْہُ کُرْبَۃً مِنْ کُرَبِ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ، وَمَنْ یَسَّرَ عَلٰی مُعْسِرٍ یَسَّرَ اللّٰہُ عَلَیْہِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَہُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ، وَاللّٰہُ فِیْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا کَانَ الْعَبْدُ فِیْ عَوْنِ اَخِیْہِ، وَمَنْ سَلَکَ طَرِیْقًا یَلْتَمِسُ فِیْہِ عِلْمًا سَھَّلَ اللّٰہُ بِہٖ طَرِیْقًا اِلَی الْجَنَّۃِ وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ تَعَالٰی یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ یَتَدَارَسُوْنَہٗ بَیْنَھُمْ، اِلَّا نَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ وَغَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ، وَحَفَّتْھُمُ الْمَلَائِکَۃُ، وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْمَنْ عِنْدَہٗ، وَمَنْ بَطَّأَ بِہٖ عَمَلُہٗ لَمْ یُسْرِعْ بِہٖ نَسَبُہٗ)) (۱)

حضور ﷺ کے جامع کلمات

اس حدیث کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، اور اس میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد فرمودہ

☆ اصلاحی خطبات (۸/۲۱۲ تا ۲۲۴) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن...... الخ، رقم: ۴۸۶۷، سنن الترمذی، کتاب الحدود عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی الستر علی المسلم، رقم: ۱۳۴۵، مسند أحمد، مسند أبی ہریرۃ، رقم: ۷۱۱۸

بہت سے جملے روایت فرمائے ہیں۔ان میں سے ہر جملہ اپنے معنی اور مفہوم کے لحاظ سے بڑا جامع جملہ ہے۔ایک اور روایت میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ)) (۱)

''مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے کلمات عطا کیے گئے ہیں جو جامع ہیں''

یعنی جن کے الفاظ تو تھوڑے ہیں، اور بولنے میں مختصر ہیں، لیکن اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے اور عمل کے اعتبار سے وہ بڑے جامع کلمات ہیں۔حضورِ اقدس ﷺ کے ایسے ارشادات جو چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہیں، اور معنی کے اعتبار سے بڑے حاوی ہیں، ان کو ''جوامع الکلم'' کہا جاتا ہے۔اس حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بہت سے ''جوامع الکلم'' روایت فرمائے ہیں جو مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔

کسی کی پریشانی دور کرنے پر اجر و ثواب

پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی مؤمن کی دنیا کی بے چینیوں میں سے کوئی بے چینی دور کرے، مثلاً وہ مؤمن کسی پریشانی میں گھرا ہوا ہے، یا کسی مشکل میں مبتلا ہے، اور کوئی مسلمان اس کی اس پریشانی اور مشکل کو کسی عمل کے ذریعہ، یا کسی مدد کے ذریعے دور کر دے تو اس کا یہ عمل اتنے بڑے اجر و ثواب کا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں قیامت کی سختیوں اور بے چینیوں میں سے ایک بے چینی کو اس سے دور فرما دیں گے۔

تنگدست کو مہلت دینے کی فضیلت

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی تنگدست آدمی کے لئے کوئی آسانی پیدا کر دے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا و آخرت دونوں میں آسانی پیدا فرما دیں گے۔مثلاً ایک شخص مقروض ہے اور اس نے اپنی کسی ضرورت کی خاطر قرض لیا، اور کسی خاص وقت پر واپس کرنے کا وعدہ کر لیا۔لیکن جب قرض واپس کرنے کا وقت آیا تو قرض واپس کرنے کے قابل نہیں ہے بلکہ تنگدست ہے۔اب وہ قرض

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب،رقم: ۸۱٤، مسند أحمد، مسند أبي هريرة، رقم: ۷۰۹٦، ترمذی، میں "أعطيت جوامع الكلم" کے الفاظ ہیں، سنن الترمذي، كتاب السير عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم: ۱٤۷٤، بخاری اور نسائی میں "بعثتُ بجوامع الكلم" کے الفاظ ہیں، صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، رقم: ۲۷۵۵، سنن النسائي، كتاب الجهاد، رقم: ۳۰۳۷

واپس کرنا چاہتا ہے، لیکن تنگدستی کی وجہ سے نہیں دے سکتا، اب اگرچہ قرض لینے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ مطالبہ کرے کہ میرا قرض مجھے واپس کرو۔ لیکن اگر یہ شخص اس کی تنگدستی کو دیکھتے ہوئے اس کو مہلت دے دے، اور اس سے یہ کہہ دے کہ اچھا جب تمہارے پاس پیسے آجائیں اس وقت دے دینا، ایسے شخص کے لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں آسانی پیدا فرمائیں گے۔ اسی کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا:

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ (۱)

یعنی تمہارا مقروض شخص اگر تنگدست ہے تو پھر ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ اس کو اس وقت تک مہلت دے جب تک اس کا ہاتھ کھل جائے، اور اس کی تنگدستی دور ہو جائے، اور اس میں قرض کی ادائیگی کی طاقت پیدا ہو جائے۔

نرمی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ کو نرم خوئی بہت پسند ہے۔ اللہ کے بندوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت محبوب عمل ہے۔ جس شخص نے قرض کے طور پر پیسے دیئے ہیں، اس کو قانونی طور پر ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ مطالبہ کر کے اپنا قرض وصول کر لے۔ یہاں تک کہ قانونی طور پر اس کو قید بھی کرا سکتا ہے۔ لیکن اسلام کا ایک مسلمان سے یہ مطالبہ ہے کہ صرف پیسوں ہی کو نہ دیکھو کہ کتنا پیسہ چلا گیا، اور کتنا پیسہ آگیا، بلکہ یہ دیکھو کہ کسی اللہ کے بندے کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا یہ اللہ تعالیٰ کو اتنا محبوب ہے جس کی کوئی حد وانتہا نہیں۔ اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ قیامت کے روز نرمی کا معاملہ فرمائیں گے۔

مسلمان کی حاجت پوری کرنے کی فضیلت

ایک اور حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ)) (۲)

(۱) البقرة: ۲۸۰

(۲) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه، رقم: ۲۲۶۲، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظلم، رقم: ۴٦۷۷، سنن الترمذی، کتاب الحدود عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ما جاء فی الستر علی المسلم، رقم: ۱۳٤٦

''جو شخص جتنی دیر اپنے بھائی کے کام بنانے اور حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا اللہ تعالیٰ اس کے کام بناتے رہیں گے اور اس کی حاجت پوری کرتے رہیں گے''

تم میرے بندوں کے کام میں لگے رہو، میں تمہارے کام میں لگا ہوا ہوں۔

کار ساز ما بساز کار ما فکر ما درکار ما آزار ما

ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((مَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ))(۱)

''اگر کسی نے کسی مسلمان کی مصیبت کو دور کر دیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی مصیبت اور پریشانی کو دور فرمائیں گے''

مخلوقِ خدا پر رحم کرو

در حقیقت یہ دونوں کام یعنی دوسروں کی حاجت پوری کرنا، اور دوسروں کی مصیبت اور پریشانی کو دور کرنا اسی وقت ہو سکتا ہے جب دل میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی طرف سے رحم ہو اور ان کی محبت ہو۔ اگر یہی دونوں کام دکھاوے کے لئے کر لیے تو ان کاموں کی کوئی قیمت نہیں۔ لیکن اگر یہ سوچا کہ یہ میرے اللہ کے بندے ہیں۔ اس کی مخلوق ہیں۔ میں ان کے ساتھ کوئی بھلائی اور اچھائی کروں گا تو اس پر مجھے اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرمائیں گے۔ تب یہ کام قیمتی بن جائیں گے۔ اللہ کی محبت کا یہ حق ہے کہ اس کے بندوں سے محبت کی جائے۔ اگر بندوں سے محبت نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں۔ ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ))(۲)

''جو دوسروں پر رحم کرنے والے ہیں، رحمٰن ان پر رحم کرتا ہے۔ زمین والوں پر تم رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا''

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه، رقم: ۲۲۶۲، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظلم، رقم: ٤٦٧٧، سنن الترمذی، کتاب الحدود عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ما جاء فی الستر علی المسلم، رقم: ١٣٤٦۔

(۲) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ما جاء فی رحمة الناس، رقم: ١٨٤٧، سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الرحمة، رقم: ٤٢٩٠، مسند أحمد، رقم: ٦٢٠٦

لہٰذا جب تک اللہ کی مخلوق کے لئے تمہارے دل میں رحم نہیں ہوگا، اس وقت تک تم مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں۔ تم اللہ کی رحمت کے امیدوار کیسے ہوگے، جب اللہ کی مخلوق پر رحم نہیں کرتے۔ ایمان کا ایک تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے بندوں اور اللہ کی مخلوق کے ساتھ محبت کرو۔

مجنوں کو لیلیٰ کے در و دیوار سے محبت

جب کسی محبوب سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر اس محبوب کی ہر چیز سے محبت ہوتی ہے۔ مجنوں لیلیٰ کی محبت میں کہتا ہے:

أَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلٰى
أُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارَ وَ ذَا الْجِدَارَا

''جب میں لیلیٰ کے وطن سے گزرتا ہوں جہاں وہ رہتی ہے تو میں کبھی اس دیوار کو پیار کرتا ہوں، اور کبھی اس دیوار کو پیار کرتا ہوں، کیوں؟''

وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِيْ
وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَا

''ان دیواروں سے مجھے کیا تعلق؟ میں ان کو کیوں پیار کروں؟ لیکن چونکہ یہ دیواریں میرے محبوب کے شہر کی دیواریں ہیں، اس وجہ سے مجھے ان دیواروں سے محبت ہے، اور جب میں ان کے پاس سے گزرتا ہوں تو ان دیواروں کو چومتا پھرتا ہوں''(۱)

جب ایک مجنوں کو لیلیٰ کے شہر کی دیواروں سے عشق ہو جائے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہو، لیکن اللہ کی پیدا کی ہوئی مخلوق سے محبت نہ ہو۔ اللہ کے پیدا کیے ہوئے بندوں سے تعلق نہ ہو؟ ان پر رحم نہ ہو؟ یہ کیسی محبت ہے؟

کیا اللہ کی محبت لیلیٰ کی محبت سے کم ہو جائے؟

مثنوی شریف میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجنوں کو تو لیلیٰ کے شہر کے کتے سے بھی محبت تھی، اس لئے کہ یہ میرے محبوب کے شہر کا کتا ہے، مجھے اس سے بھی محبت ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

ارے مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے بھی کم ہو گیا۔ جب ایک ناپائیدار اور فنا ہو جانے والے وجود

(۱) روضة المحبين ونزهة المشتاقين، ص: ٢٦٤

سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ اس کے کتے سے محبت ہونے لگی تو اللہ تبارک وتعالیٰ جو مالک الملک ہیں اور سارے محبوبوں کے محبوب ہیں، اُن کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ساری مخلوق سے بھی محبت ہو جائے۔ چاہے وہ جانور ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ وہ میرے اللہ کی مخلوق ہے۔ اسی وجہ سے شریعت نے حیوانات کے بھی حقوق رکھے ہیں کہ ان پر بھی ترس کا معاملہ کرو۔ اور ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔

کتے کو پانی پلانے کا اجر

بخاری شریف میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک طوائف اور فاحشہ عورت تھی۔ ساری زندگی طوائفی کا کام کیا۔ ایک مرتبہ وہ کہیں سے گزر رہی تھی۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت کی وجہ سے زمین کی مٹی چاٹ رہا ہے۔ قریب میں ایک کنواں تھا۔ اس عورت نے اپنے پاؤں سے چمڑے کا موزہ اُتارا، اور اس موزے میں کنویں سے پانی نکالا، اور اس کتے کو پلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ عمل اتنا پسند آیا کہ اس کی مغفرت فرما دی کہ میری مخلوق کے ساتھ تم نے محبت اور رحم کا معاملہ کیا، تو ہم تمہارے ساتھ رحم کا معاملہ کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ (۱)

لہٰذا اللہ کی مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کرنا چاہئے، چاہے وہ حیوان ہی کیوں نہ ہو۔

رحم کا اعلیٰ مقام

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر رحم کا عجیب حال عطا فرمایا تھا کہ کبھی کسی جانور کو مارنا تو دور کی بات ہے، کسی جانور کو اس کی جگہ سے ہٹانے کے لئے بھی ہاتھ نہیں اُٹھتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ یہ اللہ کی مخلوق ہے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ پاؤں پر زخم ہو گیا۔ اس زخم پر مکھیاں آکر بیٹھنے لگیں۔ ظاہر کہ زخم پر مکھیوں کے بیٹھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن حضرت والا ان مکھیوں کو اُڑاتے نہیں تھے۔ بلکہ اپنے کام میں لگے رہتے تھے۔ اس وقت ایک صاحب آپ کے پاس آگئے۔ انہوں نے جب یہ صورت دیکھی تو عرض کیا کہ حضرت! اجازت دیں تو میں ان مکھیوں کو اُڑا دوں؟ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ بھائی! یہ مکھیاں اپنا کام کر رہی ہیں۔ مجھے اپنا کام کرنے دو۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ دل میں یہ خیال جما ہوا تھا کہ یہ میرے اللہ کی مخلوق ہے۔ ان کو یہاں سے اُڑا کر کیوں پریشان کروں؟ بہر حال، اللہ تعالیٰ کی محبت صحیح معنی میں اس وقت ہو گی جب اللہ کی مخلوق

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب فی شراب أحدکم..... ۳۰۷۴، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب فضل سقی البهائم المحترمة واطعامها، رقم: ۴۱۶۳، مسند أحمد، رقم: ۱۰۱۷۸

سے بھی محبت ہو جائے۔ اس پر بھی رحم کرے۔

ایک مکھی پر ترس کھانا

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب قدس اللہ سرہ سے بارہا یہ واقعہ سنا کہ ایک بزرگ تھے جو بہت بڑے عالم، فاضل، محدث اور مفسر تھے۔ ساری عمر درس و تدریس اور تالیف و تصنیف میں گزری، اور علوم کے دریا بہادیئے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو خواب میں کسی نے ان کو دیکھا تو ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ کے ساتھ کیسا معاملہ ہوا؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ مجھ پر اپنا فضل فرمایا۔ لیکن معاملہ بڑا عجیب ہوا، وہ یہ کہ ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ ہم نے الحمدللہ زندگی میں دین کی بڑی خدمت کی ہے، درس و تدریس کی خدمت انجام دی، وعظ اور تقریریں کیں، تالیفات اور تصنیفات کیں، دین کی تبلیغ کی، حساب و کتاب کے وقت ان خدمات کا ذکر سامنے آئے گا، اور ان خدمات کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم فرمائیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمہیں بخشتے ہیں، لیکن معلوم بھی ہے کہ کس وجہ سے بخش رہے ہیں؟ ذہن میں یہ آیا کہ ہم نے دین کی جو خدمات انجام دیں تھیں، ان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں۔ ہم تمہیں ایک اور وجہ سے بخشتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک دن تم کچھ لکھ رہے تھے۔ اس زمانے میں لکڑی کے قلم ہوتے تھے۔ اس قلم کو روشنائی میں ڈبو کر پھر لکھا جاتا تھا۔ تم نے لکھنے کے لئے اپنا قلم روشنائی میں ڈبویا۔ اس وقت ایک مکھی اس قلم پر بیٹھ گئی۔ اور وہ مکھی قلم کی سیاہی چوسنے لگی۔ تم اس مکھی کو دیکھ کر کچھ دیر کے لئے رک گئے، اور یہ سوچا کہ یہ مکھی پیاسی ہے، اس کو روشنائی پی لینے دو، میں بعد میں لکھ لوں گا۔ تم نے یہ اس وقت قلم کو روکا تھا، وہ خالصۃً میری محبت اور میری مخلوق کی محبت میں اخلاص کے ساتھ روکا تھا۔ اس وقت تمہارے دل میں کوئی اور جذبہ نہیں تھا۔ جاؤ، اس عمل کے بدلے میں آج ہم نے تمہاری مغفرت کر دی۔

تصوف اور خدمتِ خلق

بہر حال، یہ بڑا نازک راستہ ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ محبت نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا دعویٰ سچا نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ تصوف کے بارے میں فرماتے ہیں۔

زتسبیح و سجادہ و دلق نیست
طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

یعنی لوگوں نے تصوف اس کا نام رکھ لیا ہے کہ ہاتھ میں تسبیح ہو۔ مصلی بچھا ہوا ہو۔ گدڑی ہو۔

درویشانہ لباس پہنا ہوا ہو۔ ان چیزوں کا نام تصوف اور طریقت نہیں ہے۔ بلکہ تصوف اور طریقت اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ مخلوق کی خدمت ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں ہمارے ساتھ محبت کا دعویٰ ہے تو پھر ہماری مخلوق کے ساتھ محبت کرو۔ ان کی خدمت کرو۔

اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق سے محبت ہے

ارے، اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے ساتھ بڑا پیار ہے۔ آپ اس کا تجربہ کرلیں کہ کسی نے اپنے ہاتھوں سے محنت کرکے کوئی چیز بنائی، وہ چیز پتھر ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس بنانے والے کو اس بنائے ہوئے پتھر سے محبت ہو جاتی ہے کہ اس پتھر کے بنانے میں وقت لگایا ہے۔ میں نے محنت کی ہے۔ یہ میری دولت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بنایا اور ان کو پیدا کیا ہے۔ اس لئے ان کو اپنی مخلوق سے محبت ہے، لہٰذا اگر ان سے محبت کا دعویٰ ہے تو ان کی مخلوق سے بھی محبت کرنی ہوگی۔

حضرت نوح علیہ السلام کا عجیب واقعہ

جب حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر طوفان آ چکا، ساری قوم اس طوفان کے نتیجے میں ہلاک ہوگئی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ اب تمہارا کام یہ ہے کہ تم مٹی کے برتن بناؤ، چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں مٹی کے برتن بنانا شروع کردیئے۔ اور دن رات اس میں لگے رہے۔ جب کئی دن گزر گئے، اور برتنوں کا ڈھیر لگ گیا تو دوسرا حکم یہ دیا کہ اب سب برتنوں کو ایک ایک کرکے توڑو۔ حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا اللہ! میں نے بڑی محنت سے اور آپ کے حکم پر بنائے تھے، اب آپ ان کو توڑنے کا حکم دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمارا حکم یہ ہے کہ اب ان کو توڑ دو۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو توڑ دیا۔ لیکن دل دکھا کہ اتنی محنت سے بنائے اور ان کو تڑوا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے نوح! تم نے اپنے ہاتھوں سے یہ برتن بنائے، اور میرے حکم سے بنائے، ان برتنوں سے تمہیں اتنی محبت ہوگئی کہ جب میں نے تمہیں ان کو توڑنے کا حکم دیا تو تم سے توڑا نہیں جا رہا تھا۔ دل یہ چاہ رہا تھا کہ یہ برتن جو میری محنت اور میرے ہاتھ سے بنے ہوئے ہیں، کسی طرح بچ جائیں تو بہتر ہے، اس لئے کہ تمہیں ان برتنوں سے محبت ہوگئی تھی۔ لیکن تم نے ہمیں نہیں دیکھا کہ ساری مخلوق ہم نے اپنے ہاتھ سے بنائی۔ اور تم نے ایک مرتبہ کہہ دیا:

﴿رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا﴾ (۱)

”اے اللہ! زمین میں بسنے والے سب کافروں کو ہلاک کردے، اور ان میں سے کوئی باقی نہ رہے“

(۱) نوح: ۲۶

تمہارے اس کہنے پر ہم نے اپنی مخلوق کو ہلاک کر دیا۔ اشارہ اس بات کی طرف فرمایا کہ جس مٹی سے تم برتن بنا رہے تھے، باوجودیکہ وہ مٹی تمہاری پیدا کی ہوئی نہیں تھی۔ اور اپنی خواہش سے وہ برتن نہیں بنا رہے تھے، بلکہ میرے حکم سے بنا رہے تھے۔ پھر بھی تمہیں ان سے محبت ہوگئی تھی تو کیا ہمیں اپنی مخلوق سے محبت نہیں ہوگی؟ جب محبت ہے تو پھر تمہیں بھی میری مخلوق کے ساتھ محبت کرنی پڑے گی۔ اگر تمہیں میرے ساتھ محبت ہے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

''جب ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، اور اس سے محبت کی دعائیں مانگتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اپنی محبت عطا فرما۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرما رہے ہیں کہ تم مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہو؟ حالانکہ تم نے مجھے دیکھا تو ہے نہیں کہ براہ راست تم مجھ سے محبت کرسکو، اور مجھ سے اسی طرح کا تعلق قائم کرسکو جیسے کسی چیز کو دیکھتے ہوئے کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر تمہیں مجھ سے تعلق قائم کرنا ہے تو میں نے دنیا میں اپنی محبت کا مظہر ان بندوں کو بنایا ہے۔ لہٰذا تم میرے بندوں سے محبت کرو۔ اور میرے بندوں پر رحم کھاؤ۔ اور ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو، اس سے میری محبت پیدا ہوگی۔ اور مجھ سے محبت کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے''

لہٰذا یہ سمجھنا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ یہ بندے کیا چیز ہیں؟ یہ مخلوق کیا چیز ہیں؟ یہ تو حقیر ہیں۔ اور پھر ان مخلوق کی طرف حقارت کی نگاہ ڈالنا، ان کو برا سمجھنا، اور ان کو کمتر جاننا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ سے جو محبت ہے، وہ جھوٹی محبت ہے، اس لئے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت ہوگی، اس کو اللہ کی مخلوق سے ضرور محبت ہوگی۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے کسی بھائی کے کام میں اور اس کی حاجت پوری کرنے میں لگا ہوا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے کام بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ اور جو شخص کسی مسلمان بھائی کی بے چینی کو دور کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی بے چینی کو دور فرمائیں گے۔

اولیاء کرام کی حالت

جتنے اولیاء کرام رحمہم اللہ گزرے ہیں، ان سب کا حال یہ تھا کہ وہ اگر مخلوق کو برے حال میں دیکھتے، یا فسق و فجور میں اور گناہوں کے اندر مبتلا دیکھتے تو وہ اولیاء ان گناہوں سے تو نفرت کرتے

تھے، اس لئے کہ گناہوں سے نفرت کرنا واجب ہے، ان کے فسق و فجور سے اور ان کے اعمال سے نفرت کرنا واجب ہے، لیکن دل میں اس آدمی سے نفرت نہیں ہوتی تھی، اس کی حقارت دل میں نہیں ہوتی تھی۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ دریائے دجلہ کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے جارہے تھے، قریب سے دریا میں ایک کشتی گزری۔ اس کشتی میں اوباش قسم کے نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ اور گاتے بجاتے ہوئے جارہے تھے۔ اور جب گانا بجانا ہو رہا ہو، اور ہنسی مذاق کی محفل ہو، اس موقع پر اگر کوئی مُلا پاس سے گزرے تو اس مُلا کا مذاق اُڑانا بھی تفریح کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان اوباش لوگوں نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق اُڑایا۔ اور آپ پر کچھ فقرے کسے۔ حضرت کے ساتھ ایک صاحب اور تھے۔ انہوں نے یہ صورتِ حال دیکھ کر فرمایا کہ حضرت! آپ ان کے حق میں بددعا فرمادیں، کیونکہ یہ لوگ اتنے گستاخ ہیں کہ ایک طرف تو خود فسق و فجور اور گناہوں میں مبتلا ہیں، اور دوسری طرف اللہ والوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے، اور فرمایا:

> ''اے اللہ، آپ نے ان نوجوانوں کو جس طرح یہاں دنیا میں خوشیاں عطا فرمائی ہیں ان کے اعمال ایسے کر دیجئے کہ وہاں آخرت میں بھی ان کو خوشیاں نصیب ہوں''

دیکھئے، ان کی ذات سے نفرت نہیں فرمائی، اس لئے کہ یہ تو میرے اللہ کی مخلوق ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی اُمت پر شفقت

حضورِ اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام دنیا کے لئے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے، جب آپ پر کفار کی طرف سے اینٹیں برسائی جارہی تھیں، آپ کو پتھر مارے جارہے تھے، آپ کے پاؤں زخم سے لہولہان تھے، لیکن اس وقت بھی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:

> ((اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ))
>
> ''اے اللہ، میری قوم کو ہدایت عطا فرما، ان کو علم نہیں ہے، یہ مجھے جانتے نہیں ہیں، یہ نادان ہیں، اور نادانی میں یہ حرکت کر رہے ہیں، اے اللہ، ان کو ہدایت عطا فرما''(۱)

زبان پر یہ الفاظ اس لئے جاری ہوئے کہ کفار کے ان اعمال سے تو نفرت اور بغض ہے، لیکن

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب استتابة المرتدین والمعاندین وقتالهم، باب اذا عرض الذمی وغیره بسب النبی ولم یصرح...... الخ، رقم: ٦٤١٧، صحیح مسلم، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

ان کی ذات سے نفرت نہیں۔ اور ذات بحیثیت ذات کے میرے اللہ کی مخلوق ہے۔ اور میرے اللہ کی مخلوق سے مجھے محبت ہے۔

گناہ گار سے نفرت مت کرو

یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ فسق و فجور سے اور گناہوں سے نفرت نہ کرنا بھی گناہ ہے۔ گناہوں سے ضرور نفرت کرنی چاہئے۔ اور ان کو برا سمجھنا چاہئے۔ لیکن جو شخص ان گناہوں کے اندر مبتلا ہے، اس کی ذات کی حقارت دل میں نہ آنی چاہئے۔ اس سے نفرت نہ ہو۔ بلکہ اس پر ترس کھانا چاہئے۔ جس طرح ایک شخص بیمار ہو جائے اور علاج کے لئے ڈاکٹر کے پاس جائے تو اب ڈاکٹر کا یہ کام نہیں ہے کہ اس پر ناراض ہو جائے کہ تم کیوں بیمار پڑے؟ بلکہ وہ ڈاکٹر اس بیمار کے اوپر ترس کھاتا ہے کہ بیچارہ اس بیماری میں مبتلا ہو گیا، اور اس کا علاج کرتا ہے۔ اور اس کے لئے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! اس کی بیماری کو دور فرما دے۔ اسی طرح گناہ گار، فاسق و فاجر کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہونا چاہئے کہ ان کے فسق و فجور سے بغض اور نفرت ہو۔ لیکن ان کی ذات سے بغض اور نفرت نہ ہو۔ بلکہ اس کی ذات کے ساتھ اس لحاظ سے محبت ہو کہ یہ میرے اللہ کی مخلوق ہے۔ اور اس کے لئے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو راہِ راست پر لے آئے۔

ایک تاجر کی مغفرت کا عجیب قصہ

ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز جب حساب کتاب ہوگا تو اس وقت وہ پیش ہوگا، لیکن اس کا کوئی نمونہ ہو سکتا ہے کہ پہلے بھی کسی وقت دکھا دیا جاتا ہو۔

بہر حال، جب وہ پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ اس کا اعمال نامہ دیکھو کہ اس نے کیا کیا اعمال کیے ہیں۔ جب فرشتوں نے دیکھا تو یہ معلوم ہوا کہ اس کا اعمال نامہ نیکیوں سے تقریباً خالی ہے۔ نہ نماز ہے نہ روزہ ہے، نہ کوئی اور عبادت ہے، بس دن رات تجارت کرتا رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ تمام بندوں کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ لیکن دوسروں کے سامنے ظاہر کرانے کے لئے فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ ذرا اچھی طرح دیکھو کہ کوئی اور نیک عمل اعمال نامے میں ہے یا نہیں؟ اس وقت فرشتے عرض کریں گے کہ ہاں! اس کا ایک نیک عمل ہے، وہ یہ کہ یہ شخص اگرچہ کوئی خاص نیک عمل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) كتاب الجهاد والسير، باب غزوة أحد، رقم: ٣٣٤٧، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، رقم: ٤٠١٥، مسند أحمد، رقم: ٣٤٢٩۔

تو نہیں کرتا تھا، لیکن یہ تجارت کرتا تھا۔ اور اپنے غلاموں کو تجارت کا سامان دے کر بھیجتا کہ جا کر یہ سامان بیچ کر اس کے پیسے لا کر دیں۔

اس شخص نے اپنے غلاموں کو یہ تاکید کر رکھی تھی کہ جب کسی کو کوئی سامان فروخت کرو اور تم یہ دیکھو کہ وہ شخص تنگدست اور مفلس ہے تو اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا۔ اگر اس کو ادھار دیا ہے تو اس سے ادھار وصول کرنے میں بہت سختی سے کام مت لینا، اور کبھی کسی کو معاف بھی کر دیا کرنا۔ چنانچہ ساری عمر تجارت کے اندر اس کا یہ معمول رہا کہ جب کسی تنگدست سے معاملہ کیا تو یا تو اس کو مہلت دیدی۔ اگر موقع ہوا تو اس کو معاف ہی کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا یہ میرے بندوں کو معاف کرتا تھا۔ تو میں اس بات کا زیادہ مستحق ہوں کہ اس کو معاف کردوں، چنانچہ پھر فرشتوں کو حکم دیں گے کہ اس سے درگزر کا معاملہ کرو۔ اور اس کو جنت میں بھیج دو۔ (۱)

بہرحال بندوں کے ساتھ معافی کا معاملہ کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

یہ رحمت کا معاملہ تھا، قانون کا نہیں

لیکن ایک بات یاد رکھئے کہ یہ اوپر کا معاملہ یہ رحمت کا معاملہ ہے، یہ کوئی قانون نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی شخص یہ نہ سوچے کہ یہ اچھا نسخہ ہاتھ آ گیا کہ نہ نماز پڑھو، نہ روزہ رکھو، نہ زکوٰۃ دو، نہ دوسرے فرائض انجام دو، نہ گناہوں سے بچو، بس میں بھی اسی طرح لوگوں کو معاف کر دیا کروں گا تو قیامت کے روز میری بھی معافی ہو جائے گی۔ یہ درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ معاملہ رحمت کا ہے۔ اور اللہ کی رحمت کسی قاعدے اور قانون کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ جس کو چاہیں، اپنی رحمت سے بخش دیں۔ لیکن قانون یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی ضرور کرنی ہے، گناہوں سے بچنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص فرائض کی ادائیگی نہیں کرتا، یا گناہوں سے نہیں بچتا تو محض کسی ایک عمل کی بنیاد پر تکیہ کر کے بیٹھ جائے کہ بس اس ایک عمل کے ذریعہ میری چھٹی ہو جائے گی، یہ بات درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون نہیں ہے۔ جس شخص کی صرف ایک عمل کی بنیاد پر بخشش ہو گئی، معلوم نہیں اس نے وہ عمل کس جذبہ کے ساتھ کیا ہوگا۔ اور اس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آ گئی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف کر دیا۔ ہمارے اور آپ کے لئے یہ کوئی ہمیشہ کا دستور العمل نہیں ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب في الاستقراض واداء الدیون والحجر والتفلیس، باب حسن التقاضی، رقم: ۲۲۱۶، صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب فضل انظار المعسر، رقم: ۲۹۲۱، سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ما جاء فی انظار المعسر والرفق به، رقم: ۱۲۲۸، مسند أحمد، رقم: ۱٦٤٦٤

ایک بچے کا نواب کو گالی دینا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کے واقعات کی صحیح حقیقت سمجھانے کے لئے ایک واقعہ بیان فرمایا کہ نظام حیدرآباد دکن کے ایک نواب صاحب تھے۔ ان کے وزیر نے ایک مرتبہ ان کی دعوت کردی، اور ان کو اپنے گھر بلایا۔ جب نواب صاحب گھر میں داخل ہوئے تو وزیر صاحب کا بچہ وہاں پر کھیل رہا تھا۔ نواب صاحب کو بچوں سے چھیڑ خوانی کرنے کی عادت تھی۔ انہوں نے وزیر کے بچے کو چھیڑنے کے لئے اس کا کان پکڑ لیا۔ وہ بہت تیز طرار تھا۔ وہ کیا جانے کہ نواب کون ہے، اور بادشاہ کون ہے۔ بچے نے پلٹ کر نواب صاحب کو گالی دیدی۔ جب وزیر صاحب نے بچے کے منہ سے نواب صاحب کے لئے گالی سنی تو ان کی جان نکل گئی کہ میرے بچے نے نواب صاحب کو گالی دیدی۔ اور نواب صاحب کی تو زبان قانون ہوتی ہے۔ اب پتہ نہیں بچے کا کیا حشر کرے گا۔ اس لئے وزیر نے اپنی وفاداری جتانے کے لئے تلوار نکال لی، اور کہا کہ میں ابھی اس کا سر قلم کرتا ہوں، اس نے نواب صاحب کی شان میں گستاخی کی ہے۔ نواب صاحب نے روکا کہ نہیں۔ چھوڑو، یہ بچہ ہی تو ہے۔ باقی یہ بچہ ذہین لگتا ہے۔ اور اس میں اتنی خودداری ہے کہ اگر کوئی شخص اس کا کان مروڑ دے تو یہ بچہ فوراً اس کے آگے ہتھیار ڈالنے والا نہیں ہے۔ بلکہ بڑا ذہین اور خوددار ہے۔ اپنا بدلہ خود لینے والا ہے۔ اور اپنے اوپر اعتماد رکھنے والا ہے۔ ایسا کرو کہ اس کا ماہانہ وظیفہ جاری کردو۔ چنانچہ اس کا وظیفہ جاری ہوا۔ اس وظیفہ کا نام تھا ''وظیفہ دشنام'' یعنی گالی دینے کا وظیفہ۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اب تم بھی یہ سوچ کر کہ گالی دینے سے وظیفہ جاری ہوتا ہے لہٰذا تم بھی جا کر نواب صاحب کو گالی دے آؤ۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی ایسا نہیں کرے گا۔ کیونکہ یہ خاص طور پر اس بچے کے خاص حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بادشاہ کی سخاوت کا ایک مظاہرہ تھا کہ گالی دینے کے باوجود بچے کو نواز دیا۔ لیکن یہ کوئی عام قانون نہیں تھا کہ جو کوئی نواب صاحب کو گالی دے گا تو اس کو وظیفہ ملے گا۔ بلکہ اب کوئی گالی دے گا تو پٹائی ہوگی۔ جیل میں بند کردیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ سر قلم کردیا جائے۔

یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کی نکتہ نوازی کا ہے کہ کسی کو کسی نکتے سے نواز دیا، اور کسی کو کسی نکتے سے نواز دیا، کسی کا کوئی عمل قبول فرمالیا، اور کسی کا کوئی عمل قبول فرمالیا، ان کی رحمت کسی قید کسی شرط اور کسی قانون کی پابند نہیں۔ وَسِعَتْ رَحْمَتِیْ كُلَّ شَیْءٍ، میری رحمت تو ہر چیز پر وسیع ہے۔ اس لئے کسی کے ساتھ ناانصافی کبھی نہیں ہوتی، لیکن بعض اوقات کسی کو کسی عمل پر نواز دیا جاتا ہے۔ جب وہ عمل اللہ تعالیٰ کو پسند آجائے۔

کسی نیک کام کو حقیر مت سمجھو

اس سے یہ نتیجہ تو ضرور نکالا جاتا ہے کہ کوئی نیکی کا کام حقیر نہیں ہوتا، کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ کس نیک کام کو قبول فرمالیں، اور اس سے بیڑا پار ہو جائے، اس لئے کسی نیکی کے کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے، لیکن یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ چونکہ یہ واقعات سننے میں آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں نیک کام پر بخش دیا، لہٰذا اب نہ تو نماز پڑھنے کی ضرورت ہے اور نہ فرائض ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ بس آدمی اللہ کی رحمت پر تکیہ کر کے بیٹھ جائے۔ چنانچہ یہ حدیث آپ نے سنی ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ عاجز شخص وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کے پیچھے چھوڑ دے۔[1]

اور جو دل میں آرہا ہے، وہ کام کر رہا ہے۔ یہ نہیں دیکھ رہا ہے کہ یہ کام حلال ہے یا حرام ہے۔ جائز ہے یا ناجائز۔ لیکن اللہ تعالیٰ پر تمنا اور آرزو لگائے بیٹھا ہے کہ اللہ میاں تو بڑے غفور رحیم ہیں، سب معاف فرمادیں گے۔ بہرحال، ان واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں۔

بندوں پر نرمی کرنے پر مغفرت

اسی طرح ایک اور حدیث میں جناب رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں، ان میں ایک شخص ایسا تھا کہ جب وہ کوئی چیز فروخت کرتا، تو اس میں نرمی سے کام لیتا، یہ نہیں کہ پیسے پیسے پر لڑ رہا ہے۔ بلکہ گاہک کو ایک قیمت بتادی، اب گاہک کہہ رہا ہے کہ تھوڑی سی کمی کر دو تو اس نے یہ سوچ کر کہ چلو تھوڑا منافع کم سہی، چلو اس کو دے دو۔ اسی طرح جب وہ کوئی چیز خریدتا، تب بھی نرمی کا معاملہ کرتا۔ جب دکاندار نے چیز کی قیمت بتادی، اس نے بس ایک مرتبہ اس سے کہہ دیا کہ بھائی تھوڑی سی کم کر دو۔ یہ نہیں کہ قیمت کم کرانے کے لئے اس سے لڑ رہا ہے۔ اور اس سے زبردستی کم کرا رہا ہے۔ بلکہ ایک آدھ مرتبہ کہہ دینے کے بعد قیمت ادا کر کے چیز لے لی۔ اسی طرح جب دوسرے سے اپنا حق وصول کرنے کا وقت آتا، مثلاً کسی سے پیسے وصول کرنے ہیں، یا قرض وصول کرنا ہے۔ تب بھی نرمی کا معاملہ کرتا، اور اس سے کہتا کہ چلو ابھی پیسے نہیں ہیں تو بعد میں ادا کر دینا۔ تمہیں مہلت دیتا ہوں۔ جب آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی پیشی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ چونکہ یہ میرے بندوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرتا تھا، اس لئے میں بھی اس کے ساتھ نرمی

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب منه، رقم: ۲۳۸۳، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر الموت والاستعداد له، رقم: ۴۲۵۰، مسند أحمد، رقم: ۱۶۵۰۱

کا معاملہ کرتا ہوں۔ اور پھر اس کی مغفرت فرما دی۔ بہر حال، اللہ تعالیٰ کو بندوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا، اور تنگدست کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرنا بہت ہی زیادہ پسند ہے۔

حضورِ اقدس ﷺ کا معمول

حضورِ اقدس ﷺ کی ساری زندگی کا یہ معمول تھا کہ جب بھی کسی کے ساتھ بیع و شراء کا معاملہ فرماتے تو اپنے ذمے جتنا واجب ہوتا اس سے زیادہ ہی دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں سونے چاندی کے سکے رائج تھے۔ اور وہ سکے بھی مختلف مالیتوں کے ہوتے تھے۔ اس لئے ان کی گنتی کے بجائے ان کا وزن دیکھا جاتا تھا کہ کتنے وزن کا ہے۔ اس کے ذریعہ قیمت ادا کی جاتی تھی۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک چیز بازار سے خریدی۔ دراہم کے ذریعہ جب اس کی قیمت ادا فرمانے لگے تو آپ نے وزن کرنے والے سے فرمایا:

((زِنْ وَارْجَعْ))(۱)

جھکتا ہوا تولو، یعنی میرے ذمے جتنے درہم واجب ہیں، اس سے کچھ زیادہ دیدو۔

ایک روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ خِيَارَكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً))

''تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جو جب دوسرے کا حق ادا کریں تو اچھی طرح ادا کریں''(۲)

یعنی کچھ زیادہ ہی ادا کریں۔ کم نہ کریں۔ مثلاً آپ کے ذمے سو روپے قرض تھے۔ آپ نے سو کے بجائے ایک سو دس ادا کر دیئے۔ اور یہ کہ دیتے وقت پریشان نہ کریں، چکر نہ کٹوائیں، ٹال مٹول نہ کریں۔ یہ سب باتیں اچھی طرح ادا کرنے اور حسنِ سلوک کے ساتھ ادا کرنے میں داخل ہیں۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ما جاء فی الرجحان فی الوزن، رقم: ۱۲۲٦، سنن النسائی، کتاب البیوع، باب الرجحان فی الوزن، رقم: ٤٥١٥، سنن أبی داؤد، کتاب البیوع، باب فی الرجحان فی الوزن والوزن بالأجر، رقم: ۲۸۹۸، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، باب الرجحان فی الوزن، رقم: ۲۲۱۱۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب الوکالة، باب وکالة الشاهد والغائب جائزة، رقم: ۲۱٤۰، سنن النسائی، کتاب البیوع، باب استسلاف الحیوان واستقراضه، رقم: ٤٥۳۹، مسند أحمد، رقم: ۸۷٤۳۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، جو فقہ کے اندر ہمارے مقتدی ہیں، جن کی فقہ پر ہم عمل کرتے ہیں، انہوں نے اپنے شاگردوں کے نام ایک وصیت نامہ لکھا ہے۔اس وصیت نامہ میں لکھتے ہیں:

''جب کسی کے ساتھ بیع وشراء کا معاملہ ہو تو اس کو اس کے حق سے کچھ زیادہ ہی دیدیا کرو، کم نہ کیا کرو''

یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے۔ہم لوگوں نے صرف چند خاص خاص سنتیں یاد کرلی ہیں، اور اس پر عمل کرلیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب حضور اقدس ﷺ کی سنت کا حصہ ہے۔ ہمیں ان پر بھی عمل کرنا چاہئے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔اس حدیث میں اسی سنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

((وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ))

''یعنی جو شخص کسی تنگ دست کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں میں اس کے ساتھ آسانی کا معاملہ فرمائیں گے''

اصل آسانی تو آخرت کی آسانی ہے۔لیکن تجربہ یہ ہے کہ ایسا شخص دنیا میں بھی پریشان نہیں ہوتا۔

پیسے جوڑ جوڑ کر رکھنے والوں کے لئے بددعا

ایک حدیث میں ہے کہ ایک فرشتہ روزانہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہے:

((اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا وَاعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا)) (۱)

''اے اللہ، جو شخص پیسوں کو جوڑ جوڑ کر رکھتا ہو، یعنی ہر وقت گنتا رہتا ہے کہ اب کتنے ہوگئے، اور اب کتنے ہوگئے، اور خرچ کرتے ہوئے جان نکل رہی ہے، اے اللہ، اس کے مال پر ہلاکت ڈال دے''

چنانچہ اس دعا کے نتیجہ میں اس کے مال پر اس طرح ہلاکت پڑتی ہے کہ کبھی اس کے پیسے چوری ہوگئے۔کبھی ڈاکہ پڑگیا۔کبھی کوئی نقصان ہوگیا۔اور کچھ نہ ہو تو بے برکتی ضرور ہوجاتی ہے۔وہ پیسے اگرچہ گنتی میں تو زیادہ ہوگئے۔لیکن ان پیسوں سے جو فائدہ حاصل ہونا چاہئے تھا، اور ان پیسوں

(۱) صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب قول الله تعالى فأما من أعطى...... الخ، رقم: ۱۳۵۱، صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فی المنفق والممسك، رقم: ۱۶۷۸

میں جو برکت ہونی چاہئے تھی وہ فائدہ اور برکت حاصل نہ ہوئی۔ مثلاً پیسے تو زیادہ ہو گئے، لیکن گھر میں بیماریاں پیدا ہوگئیں، اور اب وہ پیسے ہسپتال اور ڈاکٹر کی نذر ہو رہے ہیں۔ بتایئے یہ کیسی برکت ہوئی؟ یا پیسے تو بہت جمع ہو گئے۔ لیکن گھر کے اندر ناچاقی ہوگئی اور اس کے نتیجے میں زندگی کا لطف جاتا رہا۔

پیسے خرچ کرنے والوں کے لئے دعا

پیسے خرچ کرنے والوں کے لئے فرشتہ یہ دعا کرتا ہے:

"وَاَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا"

اے اللہ، جو شخص اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہو، صدقہ خیرات کرتا ہو، لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہو، کسی کو پیسے دے رہا ہے، کسی کو پیسے معاف کر رہا ہے، اے اللہ، ایسے خرچ کرنے والے کو خرچ کا بدل دنیا میں ہی عطا فرما۔ بہر حال، جو شخص اس طرح لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنے والا ہو، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں اس کے پیسے زیادہ خرچ ہو رہے ہیں، لیکن جو پیسہ خرچ ہو رہا ہے، وہ حقیقت میں جا نہیں رہا ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت لا رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کو بدل عطا فرما دیتے ہیں۔ آج تک کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا گیا جو صرف اس وجہ سے مفلس ہوگیا کہ وہ صدقہ خیرات زیادہ کرتا تھا۔ یا لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنے کی وجہ سے مفلس ہوگیا ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو بدل ضرور عطا فرماتے ہیں۔ اسی لئے حدیث میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کے لئے آسانی پیدا فرماتے ہیں۔ اور آخرت میں بھی آسانی پیدا فرمائیں گے۔

دوسروں کی پردہ پوشی کیجئے

تیسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا، سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

"جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے"

مثلاً کسی مسلمان کا کوئی عیب یا غلطی سامنے آگئی کہ اس نے فلاں کام غلط اور ناجائز کیا ہے، اب ہر جگہ اس کے بارے میں چرچا کرتے پھرو کہ وہ تو یہ کام کر رہا تھا۔ اس کے بجائے اس کی پردہ پوشی کرو، اس کو چھپا دو، کسی اور کو مت بتاؤ۔ یہ طریقہ اس وقت اختیار کرنا چاہئے کہ جب اس کے عمل سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ لیکن اگر اس کا ایسا عمل سامنے آیا، جس سے دوسرے کو

نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، مثلاً کسی کے قتل کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ اس وقت پردہ پوشی کرنا جائز نہیں، بلکہ دوسروں کو بتانا ضروری ہے۔ لیکن اگر اس کے عمل سے دوسرے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو تو پھر حکم یہ ہے کہ اس کی پردہ پوشی کرو۔ اور اس کے لئے دعا کرو کہ یا اللہ! یہ شخص اس گناہ کے اندر مبتلا ہو گیا ہے۔ آپ اپنی رحمت سے اس کو اس گناہ سے نکال دیجئے۔

بہر حال، دوسروں کے عیب نہ تو تلاش کرو، اور نہ ان کو پھیلانے کی کوشش کرو۔ آج کل اس بارے میں بڑی کوتاہی ہو رہی ہے۔ ایک آدمی کے بارے میں آپ کو پتہ چل گیا کہ وہ فلاں کام کرتا ہے۔ اب آپ کے پیٹ میں یہ بات نہیں رکتی، اور دوسروں سے کہے بغیر آپ کو چین نہیں آتا۔ دوسروں کو بتانا ضروری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ بلاوجہ دوسروں کے عیب تلاش کرنا ان کو پھیلانا گناہ ہے۔

دوسروں کو گناہ پر عار مت دلائیں

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ عَيَّرَ اَخَاهُ بِذَنْبٍ قَدْ تَابَ مِنْهُ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَعْمَلَهُ))(۱)

''اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو ایسے گناہ پر عار دلائے جس گناہ سے وہ توبہ کر چکا تھا، تو یہ شخص اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک خود اس گناہ میں مبتلا نہیں ہو جائے گا''

اگر ایک شخص سے کوئی گناہ ہو گیا، پھر اس نے اس گناہ سے توبہ کر لی۔ اب آپ اس کو بار بار اس گناہ پر عار دلا رہے ہیں کہ تو تو وہی ہے جس نے یہ حرکت کی تھی، اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت ناپسند ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا، اور اس کے گناہ کو معاف کر دیا، میں نے اس کے نامہ اعمال سے اس گناہ کو مٹا دیا، اب تو کون ہے اس گناہ پر اعتراض کرنے والا، اور اس گناہ پر عار دلانے والا؟ اگر تو عار دلائے گا تو ہم تمہیں اس گناہ کے اندر مبتلا کر دیں گے۔ اس لئے کسی مسلمان کی عیب جوئی کرنا، یا کسی مسلمان کے عیب کو بیان کرنا، اس کی تشہیر کرنا بڑا سخت گناہ کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس دنیا کے اندر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا کہ دوسروں کے عیوب کو اچھالتے پھرو۔ بلکہ تمہیں تو بندہ بنا کر بھیجا ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، رقم: ۲٤۲۹، سنن الترمذی کی روایت میں ''قد تاب منہ'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ البتہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے تشریح میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

اپنی فکر کریں

اس لئے تم اپنی فکر کرو، اپنے عیوب کو دیکھو، اپنے گریباں میں منہ ڈال کر دیکھو۔ اللہ تعالیٰ جس شخص کو اپنے عیوب کی فکر عطا فرما دیتے ہیں، اس کو دوسروں کے عیوب نظر ہی نہیں آتے۔ دوسروں کے عیوب اسی کو نظر آتے ہیں جو اپنے عیوب سے بے پرواہ ہو۔ جو اپنی اصلاح سے غافل ہو۔ جو شخص خود بیمار ہو، وہ دوسروں کے نزلہ وزکام کی کہاں فکر کرے گا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ احمق اور بیوقوف ہے۔ اس لئے دوسروں کے عیوب کے پیچھے پڑنا، تجسس کرنا، ان کی تشہیر کرنا بڑا سخت جرم ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا۔ لہٰذا ایک مسلمان کا شیوہ نہیں ہے کہ وہ یہ کام کرے۔ مسلمان کو ان تمام برائیوں سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ اس کے بغیر وہ صحیح معنی میں مسلمان نہیں بن سکتا۔

علم دین سیکھنے کی فضیلت اور اس پر بشارت

چوتھا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ بِهٖ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ))

اس جملے میں ہم سب کے لئے بڑی خوشخبری اور بشارت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا مصداق بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ فرمایا کہ جو شخص کوئی فاصلہ طے کرے یا کوئی راستہ چلے، اور راستہ چلنے اور فاصلہ طے کرنے سے اس کا مقصد یہ ہو کہ دین کی کوئی بات معلوم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس چلنے کی بدولت اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیں گے۔ دین کی ایک بات معلوم کرنے کی خاطر جو سفر کیا جائے گا۔ مثلاً کوئی معاملہ پیش آیا، اور آپ کو اس کے بارے میں مسئلہ معلوم نہیں ہے، آپ مسئلہ معلوم کرنے کے لئے کسی کے پاس جا رہے ہیں کہ مجھے اس بارے میں کیا کرنا چاہئے؟ اب مفتی کے پاس جو چل کر گئے تو اس سے آپ کو یہ فضیلت حاصل ہو گئی۔

یہ علم ہمارے اسلاف نے محنت سے جمع کر دیا

ہم لوگ علم حاصل کرنے کے لئے وہ محنت کہاں کر سکتے ہیں جو محنت ہمارے اسلاف کر گئے۔ آج ہم لوگ آرام سے بیٹھ کر کتاب کھول کر یہ حدیث پڑھ رہے ہیں، اور اس پر وعظ کر رہے ہیں۔ ہمارے اسلاف فاقے کر کے، روکھی سوکھی کھا کر، موٹا جھوٹا پہن کر، مشقت اُٹھا کر، قربانیاں دے کر یہ علم ہمارے لئے اس شکل میں تیار کر کے چلے گئے۔ اگر وہ لوگ اس طرح محنت نہ

کرتے تو نبی کریم ﷺ کے یہ ارشادات اس طرح ہمارے پاس محفوظ نہ ہوتے، سرکارِ دو عالم ﷺ کی ایک ایک ادا محفوظ کر کے چلے گئے۔ قیامِ قیامت تک آنے والوں کے لئے لائحۂ عمل بتا گئے۔ ایک مشعلِ راہ بتا گئے۔

ایک حدیث کے لئے پندرہ سو کلومیٹر کا سفر

بخاری شریف میں ایک روایت ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ جو حضورِ اقدس ﷺ کے بڑے قریبی صحابی تھے، اور انصاری تھے، حضورِ اقدس ﷺ کی وصال کے بعد ایک دن بیٹھے ہوئے تھے، ان کو معلوم ہوا کہ تہجد کی نماز کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث ایسی ہے، جو میں نے نہیں سنی، بلکہ ایک دوسرے صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست سنی ہے۔ جو اس وقت شام کے شہر دمشق میں مقیم ہیں۔ ان کے دل میں خیال آیا کہ یہ حدیث بالواسطہ اپنے پاس کیوں رکھوں۔ بلکہ جن صحابی نے یہ حدیث حضورِ اقدس ﷺ سے سنی ہے، میں ان سے براہِ راست کیوں نہ حاصل کرلوں۔ اب انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ وہ صحابی کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ شام کے شہر دمشق میں مقیم ہیں، (جبکہ خود مدینہ منورہ میں مقیم تھے) اور مدینہ منورہ طیبہ سے دمشق کا فاصلہ تقریباً پندرہ سو کلومیٹر کا ہے۔ میں نے خود اس راستے پر سفر کیا ہے۔ وہ پورا راستہ لق و دق صحرا ہے۔ نہ اس میں کوئی ٹیلہ ہے، نہ کوئی درخت ہے، نہ پانی ہے، چنانچہ اسی وقت حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اُونٹ منگوایا، اور اس پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے، اور پندرہ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے دمشق پہنچ گئے۔ وہاں جا کر ان کے گھر کا پتہ لگایا۔ دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ ان صحابی نے دروازہ کھولا۔ اور پوچھا: کیسے آنا ہوا؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ تہجد کی فضیلت پر آپ نے ایک حدیث حضورِ اقدس ﷺ سے براہِ راست سنی ہے۔ میں وہ حدیث آپ کی زبان سے سننے کے لئے آیا ہوں۔ ان صحابی نے پوچھا کہ آپ مدینہ طیبہ سے صرف اسی کام کے لئے آئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں! صرف اسی کام کے لئے آیا ہوں۔ ان صحابی نے کہا کہ وہ حدیث تو میں بعد میں سناؤں گا، لیکن پہلے ایک اور حدیث سن لو جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی۔ پھر یہی حدیث سنائی کہ جو شخص کوئی راستہ قطع کرے، جس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کا علم حاصل کرنا چاہتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمادیتے ہیں۔ پہلے یہ حدیث سنائی اور پھر تہجد کی فضیلت والی حدیث سنائی۔ حدیث سنانے کے بعد ان صحابی نے فرمایا کہ اب تھوڑی دیر اندر بیٹھیں، اور کھانا کھائیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اس لئے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ پورا سفر صرف رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی خاطر ہو۔ اس سفر میں کسی اور کام کا ذرہ برابر بھی دخل نہ ہو، اب میں کوئی اور کام کرنا نہیں چاہتا۔ یہ

حدیث مجھے مل گئی۔ اور میرا مقصد حاصل ہو گیا۔ میں مدینہ طیبہ واپس جا رہا ہوں۔ السلام علیکم۔ (۱)

مجلس دین آتے وقت سیکھنے کی نیت کر لیا کریں

دیکھئے! ایک حدیث کی خاطر اتنا لمبا سفر کیا۔ اور یہ میں نے آپ کو صرف ایک مثال بتائی۔ ورنہ صحابہ کرام کے حالات اور تابعین اور تبع تابعین کے حالات اُٹھا کر دیکھئے تو یہ نظر آئے گا کہ ان میں سے ایک ایک نے دین کا علم حاصل کرنے کی خاطر اور احادیث جمع کرنے کی خاطر لمبے لمبے سفر کیے۔ آج احادیث کا یہ مجموعہ پکی پکائی روٹی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ ان اللہ کے بندوں نے اپنے مال قربان کیے، اور اپنی جانیں قربان کیں، اور مشقتیں اُٹھائیں، تب جا کر یہ علم ہم تک پہنچا ہے۔ یہ محنت وہ حضرات کر گئے۔ اگر ہمارے ذمے یہ کام ہوتا تو یہ دین کا علم ضائع ہو چکا ہوتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ اس نے اس کام کے لئے وہ قوم پیدا کر دی تھی جنہوں نے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے دین کو محفوظ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ یہ دین محفوظ ہے، کتابیں چھپی ہوئی ہیں۔ اور ہر دور میں دین کو پڑھنے پڑھانے والے، جاننے والے ہر جگہ موجود رہے ہیں۔ بس اب تمہارا اتنا کام ہے کہ ان کے پاس جا کر علم سیکھ لو، اور مسئلہ معلوم کر لو، بہر حال، اس حدیث میں علم سیکھنے والے کے لئے یہ عظیم بشارت بیان فرمائی۔ ہم لوگ جو یہاں جمع ہوتے ہیں، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ دین کی بات سنیں اور سنائیں، اور دین کا علم حاصل کریں، اس لئے گھر سے چلتے وقت اس حدیث کو ذہن میں لے آیا کریں کہ ہم دین کا علم حاصل کرنے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث کی بشارت ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین۔

اللہ کے گھر میں جمع ہونے والوں کے لئے عظیم بشارت

حدیث کے اگلے جملے میں ایک اور بشارت بیان فرمائی، فرمایا کہ کوئی جماعت اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر یعنی مسجد میں جمع ہو کر بیٹھ جائے، اللہ کی کتاب کی تلاوت کے لئے، یا اللہ کی کتاب کی درس و تدریس کے لئے، یعنی اللہ کے دین کی باتوں کو سننے سنانے کے لئے بیٹھ جائے تو جس وقت وہ لوگ اس مقصد کے لئے جمع ہوتے ہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر سکینت نازل ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اور چاروں طرف سے ملائکہ اس مجلس اور مجمع کو گھیر لیتے ہیں، ملائکہ کے گھیرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کی طرف متوجہ ہے، اور ملائکہ

(۱) مسند أحمد، حدیث عبداللہ بن أنیس، رقم: ١٥٤٦٤۔ امام بخاری نے اس واقعہ کو ترجمۃ الباب میں ذکر کیا ہے۔

رحمت ان بندوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اور ان کے لئے استغفار اور التجاء کرتے ہیں کہ یا اللہ! یہ لوگ آپ کے دین کی خاطر جمع ہوئے ہیں۔ یا اللہ! آپ اپنی رحمت سے ان کی مغفرت فرما دیجئے۔ ان پر رحمتیں نازل فرمایئے۔ ان کے گناہ معاف فرمایئے۔ ان کو دین کی توفیق عطا فرمایئے۔

تم اللہ کا ذکر کرو، اللہ تمہارا ذکر کریں گے

اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ))

یعنی اللہ تعالیٰ اپنی محفل میں ان اہل مجلس کا ذکر فرماتے ہیں کہ یہ میرے بندے اپنے سارے کام چھوڑ کر صرف میری خاطر اور میرا ذکر کرنے کے لئے، میرا ذکر سننے کے لئے، میرے دین کی باتیں سننے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اور اپنے اردگرد کے ملائکہ کے سامنے اس محفل کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات ہے! ارے یہ بہت بڑی بات ہے۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

یہ کوئی معمولی بات ہے کہ محبوبِ حقیقی ہمارا ذکر کرے۔ ارے یہ کام تو ہمارا تھا کہ ہم ان کا ذکر کرتے، ہمیں پہلے حکم دیا کہ "فَاذْكُرُوْنِيْ" تم میرا ذکر کرو، لیکن ساتھ ہی اس ذکر کا صلہ اور بدلہ بھی عطا فرما دیا کہ "اَذْكُرْكُمْ" تم میرا ذکر کرو گے میں تمہارا ذکر کروں گا۔ تم مجھے یاد کرو گے میں تمہیں یاد کروں گا۔ حالانکہ ہمارا ذکر کیا حقیقت رکھتا ہے۔ ذکر کرلیں تو کیا، نہ کریں تو کیا۔ ہمارے ذکر کرنے سے ان کی عظمت اور جلال میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ اور اگر ہم ان کا ذکر چھوڑ دیں، بلکہ ساری دنیا ان کا ذکر کرنا چھوڑ دے تو بھی ان کی عظمت اور جلال میں ذرہ برابر کمی نہیں آئے گی۔ ہماری مثال تو ایک تنکے جیسی ہے۔ ایک تنکے نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرلیا تو کیا کمال کیا۔ لیکن وہ بندے کا ذکر کریں، یہ معمولی بات نہیں۔

حضرت اُبیّ بن کعب سے قرآن پاک سنانے کی فرمائش

حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ ہر صحابی میں اللہ تعالیٰ نے الگ الگ خصوصیات رکھی تھیں۔ حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ کی خصوصیت یہ تھی کہ قرآن کریم بہترین پڑھا کرتے تھے۔ اسی لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا:

((اَقْرَؤُهُمْ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ))(۱)

"سارے صحابہ میں سب سے بہتر قرآن کریم پڑھنے والے اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں"

(۱) سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللہ، باب مناقب (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

ایک دن حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل امین کے واسطے سے یہ پیغام بھیجا ہے کہ تم اُبیّ بن کعب سے کہو کہ وہ تمہیں قرآن شریف سنائیں۔ جب حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو فوراً یہ سوال کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر فرمایا ہے کہ اُبیّ بن کعب سے ایسا کہو؟ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! تمہارا نام لے کر فرمایا ہے۔ بس اسی وقت حضرت اُبیّ بن کعب رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری ہو گیا، اور روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں، اور فرمایا کہ میں اس قابل کہاں کہ اللہ تعالیٰ میرا ذکر فرمائیں، اور میرا نام لیں۔ (۱)

اللہ کا ذکر کرنے پر عظیم بشارت

بہرحال، اللہ تعالیٰ کسی بندے کا ذکر فرمائیں، یہ اتنی بڑی دولت اور نعمت ہے کہ ساری دنیا کی نعمتیں اور دولتیں ایک طرف، یہ نعمت ایک طرف۔ اس حدیث میں اسی عظیم نعمت کے بارے میں فرمایا کہ جب اللہ کا دین سیکھنے کی خاطر، اور دین کے پڑھنے پڑھانے کی خاطر لوگ کسی جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ کے مجمع میں ان کا ذکر فرماتے ہیں۔ ایک حدیث قدسی ہے۔ ''حدیث قدسی'' اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ جل شانہ کا کلام نقل فرمائیں، ایک حدیث قدسی میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ جل شانہ نے فرمایا:

((مَنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِيْ ذَكَرْتُهُ فِيْ نَفْسِيْ، وَمَنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِيْ مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُ))(۲)

''جو شخص میرا ذکر تنہائی میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر تنہائی میں کرتا ہوں، اور اس کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) معاذ بن جبل و زيد بن ثابت و أبی بن كعب، رقم: ۳۷۲۳، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضائل خباب، رقم: ۱۵۱، مسند أحمد، مسند انس بن مالك، رقم: ۱۲۴۳۷۔

(۱) صحيح البخاری، كتاب المناقب، باب مناقب أبی بن كعب، رقم: ۳۵۲۵، صحيح مسلم، باب فضائل أبی بن كعب وجماعة من الأنصار، رقم: ۴۵۰۹، سنن الترمذی، كتاب المناقب عن رسول الله، باب مناقب معاذ بن جبل وزيد بن ثابت وأبی بن كعب، رقم: ۳۷۲۵، مسند أحمد، مسند انس بن مالك، رقم: ۱۱۸۔

(۲) صحيح البخاری، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالى ويحذركم الله نفسه، رقم: ۶۸۵۶، صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والاستغفار، رقم: ۴۸۳۲، سنن الترمذی، كتاب الزهد عن رسول الله، رقم: ۲۳۱۰، سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، رقم: ۳۸۱۲، مسند أحمد، رقم: ۷۱۱۵۔

یاد کرتا ہوں۔ اور جو شخص میرا ذکر کسی مجمع میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر اس سے بہتر مجمع میں کرتا ہوں۔ یعنی وہ میرا ذکر انسانوں کے مجمع میں کرتا ہے، میں اس کا ذکر ملائکہ کے مجمع میں کرتا ہوں"

ذکر کی کتنی بڑی فضیلت بیان فرمادی۔ اس میں وہ سب لوگ داخل ہیں جو دین کی درس و تدریس کے لئے، یا دین کے افہام و تفہیم کے لئے کسی جگہ جمع ہو جائیں۔ وہ سب اس فضیلت کے اندر داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو اس کا مصداق بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ہم لوگ جو یہاں ہفتے میں ایک دن جمع ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، اور دین کی باتوں کا تذکرہ کر لیتے ہیں، یہ معمولی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بڑی فضیلت اور ثواب اور اجر کی چیز ہے، بشرطیکہ دل میں اخلاص ہو۔ اور اللہ کے دین کی طلب ہو۔

اُونچا خاندان ہونا نجات کے لئے کافی نہیں

اس حدیث میں آخری جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((مَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ تُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ))

یہ جملہ بھی جوامع الکلم میں سے ہے، معنی اس کے یہ ہیں کہ جس شخص کے عمل نے اس کو پیچھے چھوڑ دیا، یا جو شخص اپنے عمل کی وجہ سے پیچھے رہ گیا، تو محض اس کا نسب اس کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کا عمل خراب ہے، اور اس خراب عمل کی وجہ سے جنت تک نہیں پہنچ سکا، بلکہ پیچھے رہ گیا۔ جبکہ دوسرے لوگ جلدی جلدی قدم بڑھا کر جنت میں پہنچ گئے۔ بقول کسی کے۔

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محوِ نالہ جرسِ کارواں رہے

وہ لوگ آگے چلے گئے۔ اور یہ اپنے عمل کی خرابی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا۔ اور عمل کی اصلاح نہ کر پایا تو اب صرف نسب کی وجہ سے کہ چونکہ یہ فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہے، یا فلاں بزرگ کا یا فلاں عالم کا بیٹا ہے، محض اس بنیاد پر وہ جلدی نہیں پہنچ سکے گا۔ اشارہ اس طرف فرمادیا کہ محض اس پر بھروسہ اور تکیہ کر کے مت بیٹھ جاؤ کہ میں فلاں کا صاحب زادہ ہوں، فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہوں، بلکہ اپنا عمل صحیح کرنے کی فکر کرو۔ اگر یہ چیز کارآمد ہوتی تو حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا جہنم میں نہ جاتا۔ جبکہ حضرت نوح علیہ السلام اتنے بڑے جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ اور اپنے بیٹے کی مغفرت کے لئے دعا بھی فرمارہے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمادیا:

﴿إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾(۱)

اس نے جو عمل کیا ہے وہ صالح عمل نہیں ہے، اس لئے اس کے حق میں آپ کی دعا قبول نہیں کی جائے گی۔ تو اصل چیز عمل ہے۔ البتہ عمل کے ساتھ اگر کسی بزرگ سے تعلق بھی ہوتا ہے تو ان بزرگ کے تعلق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کچھ سہارا فرما دیتے ہیں۔ لیکن اپنی طرف سے عمل اور توجہ اور فکر شرط ہے۔ اب اگر کسی کو توجہ فکر اور طلب ہی نہیں ہے، بلکہ غفلت کے اندر مبتلا ہے تو محض اُونچے خاندان سے تعلق کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا عمل درست کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

خلاصہ

آج کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا تقاضا بھی یہ ہے، اور اللہ تعالیٰ سے محبت کی لازمی شرط یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق سے محبت کرو۔ اور اللہ کی مخلوق پر شفقت اور رحم کرو، جب تک یہ چیز حاصل نہیں ہوگی اس وقت تک اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ جھوٹا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں اپنی محبت اور اپنی مخلوق کی محبت پیدا فرمادے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) هود: ٤٦

دوسروں کو خوش کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

"عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ الله عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((أَحَبُّ الْاَعْمَالِ إِلَى اللهِ سُرُوْرٌ يَدْخُلُهُ عَلَى مُسْلِمٍ)) (۱)

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو اعمال اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، ان اعمال میں سے ایک عمل کسی مؤمن کے دل میں خوشی داخل کرنا اور اس کو خوشی سے ہم کنار کرنا ہے"

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں اور اپنے قول و فعل کے ذریعہ یہ بات واضح فرمائی ہے کہ کسی بھی صاحبِ ایمان کو خوش کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

اللہ کے بندوں کو خوش رکھو

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے تو اللہ جل جلالہ جواب میں زبانِ حال سے گویا یوں فرماتے ہیں کہ اگر مجھ سے محبت کرتے ہو تو میں تو تمہارے ساتھ دنیا میں ملنے والا نہیں ہوں کہ تم کسی وقت مجھ سے ملاقات کر کے اپنی محبت کا اظہار کرو۔ لیکن اگر تم کو میرے ساتھ محبت ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ میرے بندوں کے ساتھ محبت کرو، میری مخلوق سے محبت کرو۔ اور میری مخلوق سے محبت کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو حتی الامکان خوش کرنے کی اور خوش رکھنے کی کوشش کرو۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

اس بارے میں ہمارے معاشرے میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے، اعتدال نہیں ہے۔ کچھ

☆ اصلاحی خطبات (۹/۲۸۰ تا ۲۸۸) ۳۰ مارچ ۱۹۹۷ء، بروز اتوار، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المعجم الکبیر، رقم: ۱۳۶٤٦

لوگ تو وہ ہیں جو کسی دوسرے مسلمان کو خوش کرنے کی کوئی اہمیت ہی نہیں سمجھتے اور ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ کتنی بڑی عبادت ہے۔ کسی بھی مسلمان کو خوش کر دیا یا کسی انسان کو خوش کر دیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر کتنا اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں، اس کا ہمیں احساس ہی نہیں۔ بزرگوں نے فرمایا کہ ؏

دل بدست آور کہ حج اکبر است

یعنی کسی مسلمان کے دل کو خوش کر دینا یہ حجِ اکبر ہے۔ بزرگوں نے ویسے ہی اس کو حجِ اکبر نہیں کہہ دیا بلکہ کسی مسلمان کے دل کو خوش کر دینا واقعی اللہ تعالیٰ کے محبوب اعمال میں سے ہے۔

دوسروں کو خوش کرنے کا اجر

ذرا اس بات کو سوچیں کہ اگر اس حدیث کی تعلیم پر ہم سب عمل کرنے لگیں اور ہر انسان اس بات کی فکر کرے کہ میں کسی دوسرے کو خوش کروں تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے، کوئی جھگڑا باقی نہ رہے، پھر کوئی حسد باقی نہ رہے اور کسی بھی شخص کو دوسرے سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ لہٰذا اہتمام کر کے دوسرے کو خوش کرو، تھوڑی سی تکلیف اُٹھا کر اور قربانی دے کر دوسروں کو خوش کرو۔

اگر تم تھوڑی سی تکلیف اُٹھا لو گے اور اس کے نتیجے میں دوسرے کو راحت اور خوشی مل جائے گی تو دنیا میں چند لمحوں اور چند منٹوں کی جو تکلیف اُٹھائی ہے اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ آخرت میں جو ثواب تمہیں عطا فرمائیں گے وہ دنیا کی اس معمولی سی تکلیف کے مقابلے میں کہیں زیادہ عظیم ہے۔

خندہ پیشانی سے ملاقات کرنا ''صدقہ'' ہے

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے صدقہ کی بہت سی قسمیں بیان فرمائی ہیں کہ یہ عمل بھی صدقہ ہے، فلاں عمل بھی صدقہ ہے، فلاں عمل بھی صدقہ ہے، اور صدقہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس عمل پر ایسا ہی ثواب ہے جیسے صدقہ کرنے کا ثواب ہے، پھر اسی حدیث کے آخر میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((وَاَنْ تَلْقٰی اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ)) (۱)

یعنی ایک صدقہ یہ ہے کہ اپنے بھائی کے ساتھ شگفتہ اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ملو۔ جب تم کسی سے ملاقات کرو تو اس کو یہ احساس ہو کہ تمہاری ملاقات سے اس کو خوشی ہوئی ہے اور اس

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب طلاقة الوجه عند اللقاء، رقم: ۴۷۶۰، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی طلاقة الوجه وحسن البشر، رقم: ۱۸۹۳، مسند أحمد، رقم: ۱۴۱۸۲

ملاقات سے اس کے دل میں ٹھنڈک محسوس ہو۔ اس کو صدقہ کرنے میں شمار فرمایا ہے۔

لہٰذا جو لوگ دوسروں سے ملاقات کے وقت اور برتاؤ کے وقت لیے دیے رہتے ہیں اور وقار کے پردے میں اپنے آپ کو ریزرو رکھتے ہیں، وہ لوگ سنت طریقہ پر عمل نہیں کرتے۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ جب اپنے مسلمان بھائی سے ملے تو خوش خلقی کے ساتھ اور شگفتگی کے ساتھ ملے اور اس کو خوش کرنے کی کوشش کرے۔

گناہ کے ذریعے دوسروں کو خوش نہ کریں

دوسری طرف بعض لوگوں میں یہ بے اعتدالی پائی جاتی ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ دوسرے مسلمان کو خوش کرنا بڑی عبادت ہے، لہٰذا ہم تو یہ عبادت کرتے ہیں کہ دوسروں کو خوش کرتے ہیں، چاہے وہ خوش کرنا کسی گناہ کے ذریعہ ہو یا کسی ناجائز کام کے ذریعہ ہو، جب اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ دوسروں کو خوش کرو تو ہم یہ عبادت انجام دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ گمراہی کی بات ہے، اس لئے کہ دوسروں کو خوش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مباح اور جائز طریقے سے خوش کرو، اگر ناجائز طریقے سے دوسروں کو خوش کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ گناہ کر کے اللہ تعالیٰ کو تو ناراض کر دیا اور بندے کو خوش کر دیا، یہ کوئی عبادت نہیں۔ لہٰذا اگر دوسرے کی مروّت میں آ کر یا اس کے تعلقات سے مرعوب ہو کر گناہ کا ارتکاب کر لیا تو یہ کوئی دین نہیں، یہ کوئی عبادت نہیں۔

فیضی شاعر کا واقعہ

اکبر بادشاہ کے زمانے میں ''فیضی'' بہت بڑے ادیب اور شاعر گزرے ہیں، ایک مرتبہ وہ حجام سے داڑھی منڈوا رہے تھے، ایک صاحب ان کے پاس سے گزرے، انہوں نے جب دیکھا کہ فیضی صاحب داڑھی منڈوا رہے ہیں تو ان سے کہا:

آغا! ریش می تراشی؟

''جناب! آپ یہ داڑھی منڈوا رہے ہیں؟''

جواب میں فیضی نے کہا:

بلے! ریش می تراشم، ولے دلے کسے نمی خراشم''

''جی ہاں! داڑھی تو منڈوا رہا ہوں لیکن کسی کا دل نہیں دکھا رہا ہوں''

مطلب یہ تھا کہ میرا عمل میرے ساتھ ہے اور میں کسی کی دل آزاری نہیں کر رہا ہوں، اور تم نے جو میرے اس عمل پر مجھے ٹوکا تو اس کے ذریعہ تم نے میرا دل دکھایا۔

اس پر ان صاحب نے جواب میں کہا:

''دلے کسے نمی خراشی، ولے دلے رسول اللہ می خراشی (ﷺ)''

جو یہ کہہ رہے ہو کہ میں کسی کا دل نہیں دکھار ہا ہوں، ارے اس عمل کے ذریعہ تم رسول اللہ ﷺ کا دل دکھا رہے ہو۔

دوسروں کو خوش کرنے کی حدود

لہٰذا بعض لوگوں کے ذہن میں بھی اور زبان پر بھی یہ بات رہتی ہے کہ ہم تو دوسرے لوگوں کا دل خوش کرتے ہیں، اور اب دوسروں کا دل خوش کرنے کے لئے کسی گناہ کا ارتکاب بھی کرنا پڑا تو کر گزریں گے۔

بھائی! اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو پامال کر کے کسی انسان کا دل خوش کیا تو کیا خوش کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو ناراض کر دیا، یہ تو کوئی عبادت نہیں ہے۔ اس حدیث کا منشا یہ ہے جو جائز امور ہیں، ان میں مسلمانوں کو خوش کرنے کی فکر کرو۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

''یہ معمول صوفیاء کا مثل طبعی کے ہے''

یعنی صوفیاء کرام جو اللہ کے دوست اور اللہ کے ولی ہوتے ہیں، ہر مسلمان کو خوش کرنے کی فکر ان کی طبیعت بن جاتی ہے، ان کے پاس آ کر آدمی ہمیشہ خوش ہو کر جاتا ہے، ملول ہو کر نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل سے ان کو اس سنت پر عمل کی توفیق ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو خوش کرتے ہیں۔ پھر آگے فرمایا:

خود گناہ میں مبتلا نہ ہوں

''اس کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ اس سرور کو داخل کرنے سے خود شرور میں داخل نہ ہو جائے''

یعنی دوسروں کا تو دل خوش کر رہا ہے اور اس کو سرور دینے کی فکر میں ہے لیکن اس کے نتیجے میں خود شرور میں یعنی معاصی اور گناہ میں داخل ہو گیا، یہ نہ کرے۔ آگے فرمایا:

''جیسا ان لوگوں کا طریقہ ہے جنہوں نے اپنے مسلک کا لقب ''صلح کل'' رکھا ہوا ہے''

یعنی بعض لوگوں نے اپنا مسلک ''صلح کل'' بنایا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ ہم تو ''صلح کل'' ہیں،

لہٰذا کوئی کچھ بھی کرے، ہم کسی کو بھی کسی غلطی پر نہیں ٹوکیں گے، کسی بُرائی کو برائی نہیں کہیں گے، کسی بُرائی کی تردید نہیں کریں گے، ہم تو ''صلح کُل'' ہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، چنانچہ آگے حضرت والا فرماتے ہیں:

اچھے کام کا حکم دینا نہ چھوڑے

''بعض لوگ تو اسی وجہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے''

مثلاً اگر فلاں کو نماز پڑھنے کے لئے کہیں گے تو اس کا دل بُرا ہوگا، اگر فلاں کو کسی گناہ پر ٹوکیں گے تو اس کا دل برا ہوگا، اور ہم سے کسی کا جی برا نہ ہو۔ پھر فرمایا:

''کیا ان کو قرآن پاک کا یہ حکم نظر نہیں آیا کہ ﴿وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ﴾(۱) کہ تم کو اللہ کے دین کے بارے میں ان پر ترس نہ آئے''

یعنی ایک شخص دین کی خلاف ورزی کر رہا ہے، گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، اس کے بارے میں تمہارے دل میں یہ شفقت پیدا نہ ہو کہ اگر میں اس کو گناہ کرنے پر ٹوکوں گا تو اس کا دل دکھے گا۔

برائی سے نرم انداز میں روکے

البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کو کہنے کے لئے طریقہ ایسا اختیار کرے جس سے اس کا دل کم سے کم دُکھے، دل آزار اسلوب اختیار نہ کرے بلکہ نرمی کا انداز ہو، اس میں ہمدردی ہو، محبت ہو، شفقت ہو، خیر خواہی ہو، اخلاص ہو، غصہ نکالنا مقصود نہ ہو۔ لیکن یہ سوچنا کہ اگر میں اس کو ٹوکوں گا تو اس کا دل دکھے گا، چاہے کتنے بھی نرم انداز میں کہوں تو یہ سوچ درست نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تمام مخلوق کو راضی کرنے سے مقدم ہے۔ لہٰذا دونوں انتہائیں غلط ہیں، افراط بھی اور تفریط بھی۔ بس اپنی طرف سے ہر مسلمان کو خوش کرنے کی کوشش کرو، لیکن جہاں اللہ کی حدود آجائیں، حرام اور ناجائز امور آجائیں تو پھر کسی کا دل دکھے یا خوش ہو اس وقت بس اللہ ہی کا حکم ماننا ہے، اس وقت اطاعت صرف اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ ہی کی کرنی ہے، کسی اور کی پروا نہیں کرنی ہے۔ البتہ حتی الامکان نرمی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

---

(۱) النور: ۲

دوسروں کے مزاج کی رعایت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اما بعد!

"عَنْ اَبِی ذَرٍّ الْغِفَارِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((خَالِقُوا النَّاسَ بِاَخْلَاقِهِمْ))...... اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ."(۱)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

''لوگوں کے ساتھ ان کے مزاج و مذاق اور اخلاق کے مطابق برتاؤ کرو''

یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے کہ انسان کو جن لوگوں سے واسطہ پڑے، ان کے مزاج اور مذاق کی رعایت کرے اور وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جو ان کے مزاج و مذاق کے خلاف ہو اور جس سے ان کو تکلیف پہنچے، چاہے وہ کام فی نفسہ جائز ہو، حرام اور ناجائز کام نہ ہو، لیکن یہ خیال کر کے کہ اس کام کے کرنے سے ان کے مزاج پر بار ہوگا تو وہ کام نہ کیا جائے تاکہ اس سے ان کی طبیعت پر کوئی گرانی پیدا نہ ہو۔

''دوسرے کے مزاج و مذاق کی رعایت'' دینی معاشرت کے ابواب میں ایک بڑا عظیم باب ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ انہوں نے اس باب کو واضح کیا ہے، اس لئے کہ یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا بڑا عظیم پہلو ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مزاج کی رعایت

حدیث شریف میں واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں تشریف فرما تھے اور آپ اس حالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے ایک تہبند پہنا ہوا تھا اور وہ تہبند کافی اُوپر تک چڑھا ہوا تھا، اور بعض روایات میں آتا ہے کہ گھٹنے تک چڑھا ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہو جب

☆ اصلاحی خطبات (۹/۲۹۱ تا ۳۰۷)، ۳۰ مارچ ۱۹۹۷ء، بروز اتوار، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) اتحاف السادة المتقين (٦/ ٣٥٤)

گھٹنے کا حصہ ستر میں داخل قرار نہیں دیا گیا تھا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ گھٹنے ڈھکے ہوئے تھے۔ اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ معلوم ہوا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں۔ آپ نے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ اندر آ کر آپ کے پاس بیٹھ گئے اور آپ جس انداز میں بیٹھے ہوئے تھے اسی انداز میں بیٹھے رہے اور آپ کے پاؤں مبارک کھلے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر دروازے پر دستک دی۔ پتہ چلا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں۔ آپ نے ان کو بھی اندر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ بھی آ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ اسی حالت میں بیٹھے رہے اور اپنی ہیئت میں آپ نے کوئی تبدیلی نہیں فرمائی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ آپ نے پوچھا کہ کون ہیں؟ پتہ چلا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں۔ آپ نے فوراً اپنا تہبند نیچے کر کے اپنے پاؤں مبارک اچھی طرح ڈھک لیے۔ پھر فرمایا کہ ان کو اندر بلالو۔ چنانچہ وہ بھی اندر آ کر بیٹھ گئے۔

ایک صاحب یہ سب منظر دیکھ رہے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ نے اپنا تہبند نیچے نہیں کیا بلکہ ویسے ہی بیٹھے رہے، جب حضرت فاروق اعظم تشریف لائے تب بھی آپ اسی طرح بیٹھے رہے، لیکن جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ نے اپنی ہیئت میں تبدیلی پیدا فرمائی، اس کی کیا وجہ ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: میں اس شخص سے کیوں حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔ (۱)

حیاء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا وصفِ خاص

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا خاص وصف ''حیاء'' تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ''حیاء'' میں ان کو بہت اونچا مقام عطا فرمایا تھا، اور آپ کا لقب ''کامل الحیاء والایمان'' تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام صحابہ کے مزاجوں سے واقف تھے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جانتے تھے کہ ان کے اندر حیاء بہت ہے۔ اگرچہ گھٹنے تک پاؤں کھلا ہونا کوئی ناجائز بات نہیں تھی اس لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے آنے پر بھی کھلا رکھا اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آنے پر بھی کھلا رکھا لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آنے پر یہ سوچا کہ چونکہ ان کی طبیعت میں حیاء زیادہ ہے، اگر ان کے سامنے اسی طرح بیٹھا رہوں گا تو ان کی طبیعت پر ناگوار ہوگا اور ان کی طبیعت پر بار ہوگا۔ اس وجہ سے ان کے اندر آنے سے پہلے پاؤں کو

(۱) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عثمان بن عفان، رقم: ٤٤١٤، مسند أحمد، مسند العشرة المبشرة بالجنة، رقم: ٤٨٤۔

ڈھک لیا اور تہبند کو نیچے کر لیا۔

وہ حضرات صحابہ جو حضورِ اقدس ﷺ کے ایک اشارے پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھے، ان کے مزاجوں کی آپ نے اتنی رعایت فرمائی۔ فرض کریں کہ اگر حضورِ اقدس ﷺ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آنے پر اسی طرح بیٹھے رہتے جس طرح بیٹھے ہوئے تھے تو ان کو حضورِ اقدس ﷺ سے کیا شکوہ ہو سکتا تھا، لیکن آپ نے اس بات کی تعلیم دے دی کہ تمہارے تعلق والوں میں جو شخص جیسا مزاج رکھتا ہو اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو۔ دیکھئے حضورِ اقدس ﷺ کتنی باریک بینی سے اپنے رفقاء کے مزاجوں کا خیال فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مزاج کی رعایت

ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عمر! میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ میں نے خواب میں جنت دیکھی اور اس جنت میں ایک بڑا عالیشان محل بنا ہوا دیکھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ محل کس کا ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ یہ عمر کا محل ہے، ان کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ وہ محل مجھے اتنا اچھا لگا کہ میرا دل چاہا کہ اندر چلا جاؤں اور اندر جا کر دیکھوں کہ عمر کا محل کیسا ہے، لیکن پھر اے عمر! تمہاری غیرت یاد آ گئی کہ تمہاری طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے غیرت بہت رکھی ہے، مجھے یہ خیال ہوا کہ عمر سے پہلے ان کے محل میں داخل ہو جانا اور اس کو دیکھنا ان کی غیرت کے مطابق نہیں ہوگا، اس وجہ سے میں اس محل میں داخل نہیں ہوا۔ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو رو پڑے اور عرض کیا:

"أوَ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ أغَارُ"

"یارسول اللہ! کیا میں آپ پر غیرت کروں گا"

اگر غیرت ہے بھی تو وہ دوسروں کے حق میں ہے، کیا آپ پر غیرت کروں گا کہ حضورِ اقدس ﷺ مجھ سے پہلے محل میں کیوں داخل ہوئے۔ (۱)

آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے کیسے کیسے لطیف پیرائے میں اپنے اصحاب کے مزاجوں کی رعایت کی۔ یہ نہیں تھا کہ چونکہ ہم امام ہیں اور یہ ہمارے مقتدی ہیں، ہم پیر ہیں اور یہ ہمارے مرید ہیں، ہم استاد ہیں اور یہ ہمارے شاگرد ہیں، لہٰذا سارے حقوق ہمارے ہو گئے

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب المناقب، باب مناقب عمر بن الخطاب أبي حفص القرشي العدوی، رقم: ٣٤٠٣، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر، رقم: ٤٤٠٨، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل عمر، رقم: ١٠٤، مسند أحمد، رقم: ٨١١٥۔

اور ان کا کوئی حق نہ رہا۔ بلکہ حضور اقدس ﷺ نے ایک ایک صحابی کے مزاج کی رعایت کر کے دکھائی۔

اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے مزاج کی رعایت

ایک مرتبہ جب حضور اقدس ﷺ نے اعتکاف کا ارادہ فرمایا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا دل بھی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ اعتکاف میں بیٹھوں۔ ویسے تو خواتین کے لئے مسجد میں اعتکاف کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے، خواتین کو اعتکاف کرنا ہو تو اپنے گھر میں کریں، لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ اس لحاظ سے مختلف تھا کہ ان کے گھر کا دروازہ مسجد میں کھلتا تھا، اب اگر ان کے گھر کے دروازے کے ساتھ ہی ان کی اعتکاف کی جگہ بنا دی جاتی، اور اس کے ساتھ ہی حضور اقدس ﷺ کے اعتکاف کی جگہ ہوتی تو کسی بے پردگی کا احتمال نہ ہوتا، جب ضرورت ہوتی تو گھر میں چلی جاتیں اور پھر واپس آ کر اپنے اعتکاف میں بیٹھ جاتیں، اس لئے اگر وہ مسجد میں اعتکاف فرماتیں تو کوئی خرابی لازم نہ آتی۔ اسی وجہ سے جب حضور اقدس ﷺ سے اجازت طلب کی کہ میں آپ کے ساتھ اعتکاف کرنا چاہتی ہوں تو آپ نے اجازت دے دی۔

لیکن جب ۲۰/ رمضان المبارک کی تاریخ آئی تو اس دن آپ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے، جب واپس تشریف لائے اور مسجد نبوی میں پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ مسجد نبوی میں بہت سارے خیمے لگے ہوئے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ خیمے کس کے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ اُمہات المؤمنین کے خیمے ہیں۔ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اعتکاف کرنے کی اجازت مل گئی تو دوسری ازواج مطہرات نے چاہا کہ ہم بھی یہ سعادت حاصل کر لیں، لہٰذا انہوں نے اب اعتکاف کے لئے اپنے اپنے خیمے لگا دیئے۔ اس وقت حضور اقدس ﷺ کو یہ احساس ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ تو مختلف تھا اس لئے کہ ان کا گھر تو مسجد نبوی سے بالکل متصل تھا اور دوسری ازواج مطہرات کے مکان تو مسجد نبوی سے دور ہیں، اگر انہوں نے بھی اعتکاف کیا تو ان کا بار بار آنا جانا رہے گا، اس میں بے پردگی کا احتمال ہے اور اس طرح خواتین کا مسجد کے اندر اعتکاف کرنا مناسب بھی نہیں ہے۔ اس لئے آپ نے ان کے خیمے دیکھ کر ارشاد فرمایا:

(("البر یردن؟))

''کیا یہ خواتین کوئی نیکی کرنا چاہتی ہیں؟''

مطلب یہ تھا کہ اس طرح خواتین کا مسجد میں اعتکاف کرنا کوئی نیکی کی بات نہیں۔

اس سال ہم بھی اعتکاف نہیں کریں گے

لیکن اب مشکل یہ تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ اعتکاف کی اجازت دے چکے تھے، اگر چہ ان کو اجازت دینے کی وجہ واضح تھی اور دوسری اُمہات المؤمنین میں وہ وجہ موجود نہیں تھی، لیکن آپ نے سوچا کہ اگر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیمہ باقی رکھوں گا اور دوسری اُمہات المؤمنین کو منع کر دوں گا تو ان کے مزاج پر بار ہوگا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تو اجازت دے دی اور ہمیں اجازت نہ ملی، لہٰذا جب آپ نے دوسری اُمہات المؤمنین کے خیمے اُٹھوائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تم بھی اپنا خیمہ اُٹھالو۔ لیکن پھر خیال آیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو چونکہ پہلے صراحۃً اجازت دیدی گئی تھی، اب اگر اچانک ان سے خیمہ اُٹھانے کو کہا جائے گا تو ان کی طبیعت پر بار ہوگا، اس لئے ان کا خیال کرتے ہوئے آپ نے یہ اعلان فرمادیا کہ اس سال ہم بھی اعتکاف نہیں کریں گے۔ چنانچہ اس سال آپ نے اعتکاف ہی نہیں فرمایا۔ (۱)

اعتکاف کی تلافی

بہرحال، اُمہات المؤمنین کے مزاجوں کی رعایت کے نتیجے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیمہ اُٹھوادیا اور پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مزاج کی رعایت کرتے ہوئے اپنے ساتھ یہ معاملہ فرمایا کہ وہ معمول جو ساری عمر کا چلا آرہا تھا کہ ہر رمضان المبارک میں آپ اعتکاف کیا کرتے تھے، محض حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دل شکنی کے اندیشہ میں اس معمول کو توڑ دیا۔ پوری حیاتِ طیبہ میں یہ سال ایسا تھا جس میں آپ نے اعتکاف نہیں فرمایا لیکن بعد میں اس کی تلافی اس طرح فرمائی کہ اس سے اگلے سال دس دن کے بجائے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔

یہ بھی سنت ہے

اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے کیسی کیسی رعایتیں اپنے چھوٹوں کے ساتھ بھی فرمائیں اور ایک شرعی حکم کی وضاحت کے معاملے میں بھی ایسا طریقہ اختیار فرمایا جس سے

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الاعتکاف، باب متی یدخل من أراد الاعتکاف فی معتکفہ، رقم: ۲۰۰۷، سنن النسائی، کتاب المساجد، باب ضرب الخباء فی المساجد، رقم: ۷۰۲، سنن أبی داؤد، کتاب الصوم، باب الاعتکاف، رقم: ۲۱۰۸، سنن ابن ماجہ، کتاب الصیام، باب ما جاء فیمن یبتدئ الاعتکاف وقضاء الاعتکاف، رقم: ۱۷۶۱۔

دوسرے کی طبیعت پر بار نہ ہو۔ حکم کی وضاحت بھی فرمادی، اس پر عمل بھی کرلیا اور دوسروں کی دل شکنی سے بھی بچ گئے۔ اور ساتھ میں آپ نے اپنے عمل سے یہ تعلیم بھی دے دی کہ جو عمل فرض یا واجب نہیں ہے بلکہ مستحب ہے، اگر آدمی کسی کی دل شکنی سے بچنے کے لئے اس مستحب کام کو مؤخر کردے یا چھوڑ دے تو یہ عمل بھی نبی کریم ﷺ کی سنت کا حصہ ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہر رمضان میں یہ معمول تھا کہ جب عصر کی نماز کے لئے مسجد میں تشریف لے جاتے تو مغرب تک اعتکاف کی نیت سے مسجد ہی میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ وہاں تلاوت، ذکر واذکار، تسبیحات اور مناجات میں مشغول رہتے تھے اور جو باقی وقت ملتا تو آخر میں لمبی دعا فرمایا کرتے تھے اور وہ دعا افطار کے وقت تک جاری رہتی تھی۔

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ اپنے متوسلین کو بھی یہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ وہ بھی اپنا یہ معمول بنالیں، کیونکہ اس کے اندر آدمی کا وقت مسجد میں گذر جاتا ہے، اعتکاف کی فضیلت بھی حاصل ہوجاتی ہے اور معمولات بھی پورے ہوجاتے ہیں اور آخر میں دعا کی توفیق بھی ہوجاتی ہے۔ اور یہ دعا تو رمضان المبارک کا حاصل ہے اس لئے کہ اس وقت دن ختم ہورہا ہوتا ہے اور افطار کا وقت قریب ہوتا ہے اور اس وقت آدمی کی طبیعت میں شکستگی ہوتی ہے اور اس شکستگی کی حالت میں جو دعائیں کی جاتی ہیں وہ بڑی ہی قبول ہوتی ہیں۔ حضرت والا اکثر اپنے متوسلین کو مشورہ دیا کرتے تھے بلکہ تاکید فرمایا کرتے تھے کہ ایسا کرلیا کرو، چنانچہ حضرت والا کے متوسلین میں اس طریقہ پر عمل اب بھی جاری ہے۔

ایک مرتبہ حضرت والا کے متوسلین میں سے ایک صاحب نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق اپنا یہ معمول بنایا ہوا تھا کہ عصر سے لے کر مغرب تک کا وقت مسجد میں گزارتا اور وہاں بیٹھ کر تلاوت، ذکر واذکار اور تسبیحات اور دعا میں مشغول رہتا، ایک دن میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ آپ سارا دن ویسے بھی باہر رہتے ہیں، لے دے کر عصر کے بعد کا وقت ہوتا تھا، اس میں ہم بیٹھ کر کچھ باتیں کرلیا کرتے تھے اور افطار کے وقت ایک ساتھ افطار کرنے کی راحت حاصل ہوتی تھی، اب آپ نے چند روز سے یہ طریقہ اختیار کرلیا ہے کہ عصر کی نماز کے بعد آپ مسجد میں جاکر بیٹھ جاتے ہیں اور مغرب تک آپ وہیں رہتے ہیں اور عصر کے بعد اکٹھے بیٹھ کر بات چیت کرنے اور ایک ساتھ افطار کرنے کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ حضرت! اب کشمکش میں مبتلا ہوگیا ہوں کہ عصر کے بعد کا وقت مسجد میں گزارنے کا یہ معمول جاری رکھوں یا بیوی کے کہنے کے مطابق اس معمول کو چھوڑ دوں اور گھر پر وقت گزاروں۔ حضرت والا نے ان کی بات سنتے ہی فرمایا کہ آپ کی بیوی

ٹھیک کہتی ہیں، لہٰذا آپ ان کے کہنے کے مطابق مسجد میں وقت گزارنے کے بجائے گھر پر ہی وقت گزارا کریں اور گھر میں ان کے پاس بیٹھ کر جو تلاوت، ذکر واذکار کر سکتے ہیں کرلیا کریں اور پھر ایک ساتھ روزہ افطار کیا کریں۔

تمہیں اس پر پورا ثواب ملے گا

پھر خود ہی ارشاد فرمایا کہ میں نے جو معمول بنایا تھا وہ زیادہ سے زیادہ مستحب عمل ہے، اور جو بات ان کی بیوی نے کہی تو اس کے حقوق میں یہ بات داخل ہے کہ شوہر جائز حدود میں رہتے ہوئے اس کی دلداری کرے، اور بعض اوقات یہ دلداری واجب ہو جاتی ہے، لہٰذا اگر اس کا دل خوش کرنے کے لئے تم اپنا یہ معمول چھوڑ دو گے تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس معمول کی برکات سے محروم نہیں فرمائیں گے، اس لئے کہ اس کا دل رکھنے کے لئے اور اس کے مزاج کی رعایت کرنے کے لئے یہ معمول چھوڑا ہے، انشاء اللہ تمہیں وہی اجر وثواب حاصل ہوگا جو اس معمول کے پورا کرنے پر حاصل ہوتا۔

عیادت کرنا بھی دین ہے

ایک مرتبہ ہمارے حضرت والا نے فرمایا کہ ایک شخص نے اپنے معمولات پورے کرنے کے لئے ایک خاص وقت مقرر کیا ہوا تھا۔ اس وقت میں وہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کیا کرتا تھا، ذکر وتسبیح کیا کرتا تھا۔ اب اچانک گھر میں کوئی بیمار ہوگیا، والد بیمار ہوگئے یا والدہ بیمار ہوگئیں یا بیوی بچے بیمار ہوگئے۔ اب یہ شخص ان کی تیمارداری اور خدمت میں لگا ہوا ہے جس کے نتیجے میں اس کے ذکر واذکار اور تسبیحات کا معمول پورا نہیں ہو رہا ہے اور اس کی وجہ سے اس کا دل دکھ رہا ہے کہ یہ وقت اب تک تو عبادت اور ذکر واذکار میں گزر رہا تھا اور اب یہ تیمارداری اور خدمت میں گزر رہا ہے۔

فرمایا کہ یہ دل دکھانے کی بات نہیں، کیونکہ اس وقت ان لوگوں کی تیمارداری اور خدمت کرنا یہی عبادت ہے اور ذکر واذکار سے زیادہ افضل ہے۔

وقت کا تقاضا دیکھئے

فرمایا کہ دین دراصل وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام ہے، دیکھو اس وقت تم سے کیا مطالبہ ہے؟ اس وقت تم سے مطالبہ یہ ہے کہ اس ذکر کو چھوڑو اور بیمار کی خدمت کرو، اور یہ کام کرتے وقت یہ مت خیال کرو کہ جو ذکر وتسبیح کیا کرتے تھے اس سے محرومی ہوگئی ہے، اللہ تعالیٰ محروم نہیں فرمائیں گے، کیونکہ ایک صحیح داعیے کے تحت تم نے ذکر واذکار کو چھوڑا ہے۔

رمضان کی برکات سمیٹنے کا طریقہ

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت والا نے فرمایا کہ فرض کریں کہ ایک شخص رمضان میں بیمار ہو گیا یا سفر پر چلا گیا اور اس بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کا روزہ نہ رکھ سکا، تو اس کے لئے حکم یہ ہے کہ اگر بیماری اور سفر کے عذر کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے تو بعد میں قضا کر لے، چنانچہ بعد میں اس نے اس روزے کی قضا کر لی، تو چونکہ عذر شرعی تھا اس لئے جب وہ شخص عام دنوں میں رمضان کے اس روزے کی قضا کرے گا، تو جس دن میں وہ قضا روزہ رکھے گا اس شخص کے حق میں اس دن رمضان ہی کا دن واپس آ گیا، وہ سارے انوار و برکات جو رمضان کے دنوں میں تھے وہ سب اس دن اس کے حق میں لوٹ آئیں گے، اس لئے کہ عذر کی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ نے اس کو رخصت عطا کی تھی تو کیا اس کو رمضان کی برکات سے محروم کر دیں گے؟ نہیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ بات بعید ہے کہ اس کو رمضان کی برکات سے محروم کر دیں۔

لہٰذا اگر کوئی شخص جائز عذر کی بنا پر اپنا کوئی معمول چھوڑ رہا ہے یا مؤخر کر رہا ہے تو انشاء اللہ اس کام کے اندر بھی اس کو وہ سارے انوار و برکات حاصل ہو جائیں گے۔ بس وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام دین ہے۔ یہ نہ ہو کہ آپ یہ کہہ دیں کہ یہ وقت تو ہمارے ذکر و اذکار کا ہے یا تلاوت کا ہے، کوئی اگر مر رہا ہے تو مرے یا اگر کوئی بیمار پڑا ہے تو پڑا رہے۔ یہ کوئی دین کی بات نہیں ہے بلکہ وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام دین ہے۔

بے جا اصرار نہ کریں

لہٰذا مزاجوں کی رعایت کرو اور کسی شخص کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت یہ دیکھو کہ میرے اس عمل سے اس شخص کے مزاج کے پیشِ نظر اس کی طبیعت پر کوئی گرانی تو نہیں ہو گی، کوئی بار تو نہیں ہو گا، اس کی رعایت رکھو۔ اور یہ اصلاحِ معاشرت کی تعلیم کا بڑا عظیم باب ہے۔ آج کل لوگ اس کا خیال نہیں کرتے، مثلاً کسی کی طبیعت پر کوئی کام بہت بوجھ ہوتا ہے، اب اگر آپ اس کو اس کام پر اصرار کریں گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ بیچارہ اصرار سے مغلوب ہو کر آپ کی بات مان لے، لیکن آپ نے اس کی طبیعت پر جو بوجھ ڈالا اور جو گرانی آپ نے پیدا کی اور اس سے جو تکلیف اس کو پہنچی اس کا سبب آپ بنے، کیا معلوم اس کے سبب آپ گناہ میں مبتلا ہو گئے ہوں۔ العیاذ باللہ

سفارش کا ایک ادب

آج کل سفارش کرانے کا سلسلہ چل پڑا ہے، کسی دوسرے سے تعلقات کا ایک لازمی حصہ یہ ہے کہ ضرور وہ میری سفارش کرے، اور سفارش کرنے کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت بہت یاد رہتی ہے:

﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا﴾(۱)

یعنی جو شخص اچھی سفارش کرے تو اللہ تعالیٰ اس کام میں اس کا حصہ بھی لگا دیتے ہیں۔ اور اچھی سفارش کرنے کی بڑی فضیلت ہے اور واقعۃً بڑی فضیلت ہے، لیکن لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سفارش اس وقت باعثِ فضیلت ہے جب اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے سفارش کی جائے کہ جس سے سفارش کی جارہی ہے اس کی طبیعت پر بار نہ ہو۔ اب اگر آپ نے ایک شخص کی رعایت اور اس کی دلداری کی خاطر اس کی سفارش تو کردی لیکن جس کے پاس سفارش کی اس کی طبیعت پر ایک پہاڑ ڈال دیا، وہ تو یہ سوچے گا کہ اتنا بڑا شخص مجھ سے سفارش کر رہا ہے، اب اگر میں اس سفارش کو قبول کروں تو مشکل، اس لئے کہ اس کی وجہ سے اپنے اصول اور قاعدے توڑنے پڑتے ہیں، اور اگر سفارش قبول نہ کروں تو اس کی دل شکنی ہوتی ہے۔ یہ سفارش نہ ہوئی، یہ تو دباؤ ڈالنا ہوا۔ لہٰذا دوسرے کے مزاج کی رعایت رکھتے ہوئے سفارش کرنی چاہئے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہمیشہ کا معمول یہ تھا کہ جب بھی کسی کی سفارش کرتے تو یہ عبارت ضرور لکھتے کہ "اگر آپ کی مصلحت اور اصول کے خلاف نہ ہو تو آپ ان کا یہ کام کردیجئے" بعض اوقات یہ عبارت بھی بڑھا دیتے کہ "اگر آپ کی کسی مصلحت کے خلاف ہو اور آپ یہ کام نہ کریں تو مجھے ادنیٰ ناگواری نہیں ہوگی"

یہ عبارت اس لئے لکھ دیتے تا کہ اس کے دل پر بوجھ نہ ہو۔ یہ ہے سفارش کا طریقہ۔

ایک صاحب میرے پاس آئے اور تعلقات کی مد میں کہنے لگے کہ دیکھو بھائی! میں تم سے ایک کام کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ کیا کام ہے؟ کہنے لگے کہ ایسے نہیں، بلکہ پہلے یہ وعدہ کرو کہ یہ کام کرو گے۔ میں نے کہا کہ جب تک مجھے پتہ نہیں کہ وہ کام کیا ہے، میں کیسے وعدہ کرلوں کہ میں یہ کام کروں گا۔ وہ کہنے لگے کہ نہیں، پہلے وعدہ کرو کہ میرا وہ کام کرو گے۔ میں نے کہا کہ اگر وہ کام ایسا ہوا جو میرے بس میں نہ ہو تو پھر کیا کروں گا۔ کہنے لگے کہ وہ کام آپ کے بس میں ہے۔ میں نے کہا، بتا تو دیں کہ وہ کیا کام ہے؟ کہنے لگے کہ میں اس وقت تک نہیں بتاؤں گا جب تک آپ یہ وعدہ نہ کریں

(۱) النساء: ۸۵، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "جو شخص کوئی اچھی سفارش کرتا ہے، اس کو اس میں سے حصہ ملتا ہے"

کہ میں یہ کام کروں گا۔

میں نے ان کو ہزار سمجھایا کہ پہلے اس کام کی کچھ تفصیل معلوم ہو تو وعدہ کروں، ایسے کیسے وعدہ کرلوں۔ کہنے لگے کہ اگر آپ انکار کررہے ہیں تو یہ تعلقات کے خلاف بات ہوگی۔

اب آپ بتائیے کہ کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ یہ تو ایک شخص کو دباؤ میں ڈالنا ہے کہ جب تک اس کام کو کرنے کا وعدہ نہیں کروگے اس وقت تک بتائیں گے بھی نہیں۔ چنانچہ آج کے تعلقات کا یہ لازمی حصہ ہے کہ آدمی دوسرے کی سفارش کرے۔ حالانکہ یہ بات اسلامی آدابِ معاشرت کے قطعی خلاف ہے۔ اس لئے کہ آپ نے ایک آدمی کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کردیا اور بلاوجہ ایک آدمی کو کشمکش اور ذہنی پریشانی میں ڈالنا گناہ ہے۔

تعلق رسمیات کا نام ہوگیا ہے

آج کل تعلق اور محبت صرف ''رسمیات'' کا نام ہوگیا ہے، اب اگر وہ ''رسمیات'' پوری ہورہی ہیں تو تعلقات کا حق ادا ہورہا ہے، اور اگر ''رسمیات'' پوری نہیں ہورہی ہیں تو تعلقات کا حق ہی ادا نہ ہوا۔ مثلاً اگر کسی کو دعوت دی تو بس اب اس کے سر پر بیٹھے ہوئے ہیں کہ ضرور اس دعوت کو قبول کریں۔ اس کا احساس نہیں کہ اس دعوت کی وجہ سے وہ کتنی دور سے آئے گا، کتنی تکلیف اٹھا کر اس دعوت میں شرکت کرے گا، اس کے حالات دعوت قبول کرنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں، اس سے اس دعوت دینے والے کو کوئی بحث نہیں، اس کو تو دعوت ضرور دینی ہے اور اس کو بلانا ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، یہ بزرگ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بچپن کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ایک مرتبہ لاہور سے کراچی تشریف لائے اور والد صاحب سے ملاقات کے لئے دارالعلوم تشریف لائے اور ایسے وقت تشریف لائے کہ وہ کھانے کا وقت نہیں تھا۔ ان کے آنے پر حضرت والد صاحب بہت خوش ہوئے اور بڑے شاندار طریقے سے ان کا استقبال کیا۔ جب وہ رخصت ہونے لگے تو حضرت والد صاحب نے عرض کیا کہ ''بھائی مولانا ادریس صاحب! میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایک وقت کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھالیتے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ آپ کا قیام بہت دور ہے اور آپ کے پاس وقت کم ہے، ایک دن کے بعد آپ واپس لاہور جارہے ہیں، اب اگر میں آپ پر یہ اصرار کروں کہ آپ ایک وقت کا کھانا میرے ساتھ کھائیں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ دعوت نہ

ہوگی بلکہ عداوت ہو جائے گی، اس لئے کہ آپ کے پاس وقت کم ہے، آپ اتنی دور سے دعوت کھانے کے لئے آئیں گے تو اس میں چار پانچ گھنٹے آپ کے صرف ہو جائیں گے، اس میں آپ کو مشقت اور تکلیف ہوگی، اس لئے میں آپ کی دعوت تو نہیں کرتا اگرچہ میرا دل دعوت کرنے کو چاہ رہا ہے، لیکن دعوت کے بغیر بھی دل نہیں مانتا، اس لئے میں آپ کی خدمت میں تھوڑا سا ہدیہ پیش کرتا ہوں اور جتنے پیسے میں دعوت میں خرچ کرتا اتنے پیسے آپ میری طرف سے ہدیہ میں قبول کر لیجئے۔ حضرت مولانا ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وہ پیسے ان سے لیے اور اپنے سر پر رکھ لیے اور فرمایا کہ یہ میرے لئے بڑی عظیم نعمت ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ میرا دل بھی یہ چاہ رہا تھا کہ آپ کے پاس حاضر ہو کر آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں لیکن وقت میرے پاس اتنا کم ہے کہ اس کے اندر گنجائش نظر نہیں آرہی تھی اور آپ نے پہلے ہی میرے لئے یہ راستہ آسان کر دیا۔

اب بتایئے! اگر والد صاحب ان سے یہ کہتے کہ نہیں، ایک وقت کا کھانا آپ کو میرے ساتھ ضرور کھانا پڑے گا اور وہ جواب میں یہ کہتے کہ میرے پاس تو وقت نہیں ہے، والد صاحب کہتے کہ نہیں بھائی! دوستی کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک وقت کا کھانا آپ ضرور میرے ساتھ آکر کھائیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جس کام کے لئے وہ اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہیں وہ کام چھوڑتے اور دعوت کھانے کے لئے پانچ گھنٹے قربان کرتے۔ یہ دعوت نہ ہوتی بلکہ عداوت ہوتی۔

محبت نام ہے محبوب کو راحت پہنچانے کا

آج ان رسمیات نے نہ صرف ہمارے معاشرے کو تباہ کر رکھا ہے بلکہ دین کے اخلاق و آداب سے بھی ہمیں دور کر دیا ہے۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوبصورت بات ارشاد فرمائی ہے، اگر اللہ تعالیٰ یہ بات ہمارے دلوں میں اتار دے تو ہمارے سارے کام سنور جائیں، فرمایا کہ ''محبت نام ہے محبوب کو راحت پہنچانے کا''، جس سے محبت ہے اس کو آرام پہنچاؤ، اپنی من مانی کرنے اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا نام محبت نہیں، اگر محبت کرنے والا عاشق نادان اور بیوقوف ہو تو اس کی محبت سے محبوب کو تکلیف پہنچ جاتی ہے، لیکن ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق یہ ہے کہ محبت سے تکلیف پہنچنے کے کوئی معنی نہیں ہیں، اگر تم کو کسی سے محبت ہے تو اس کو تکلیف مت پہنچاؤ بلکہ راحت پہنچاؤ، چاہے اپنے جذبات کو قربان کرنا پڑے لیکن راحت پہنچاؤ۔

یہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تشریح ہو رہی ہے کہ خالقوا الناس باخلاقھم، لوگوں کے ساتھ ان کے مزاج کے مطابق معاملہ کرو، جس سے معاملہ کرنے جا رہے ہو پہلے یہ دیکھ لو کہ اس کا مزاج کیا ہے، اس کے مزاج پر یہ بات بار تو نہیں ہوگی، ناگوار تو نہیں ہوگی۔ اور یہ چیز بزرگوں

کی صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، ہمارا تو یہی تجربہ ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خانقاہ میں لوگوں کی اس طرح تربیت فرمائی کہ لوگوں کے مزاج کی کس طرح رعایت رکھی جاتی ہے۔ لوگوں کے ایک ایک عمل پر نگاہ رکھی اور ان کو یہ تعلیم دی کہ کس موقع پر انسان کو کیا عمل کرنا چاہئے۔

یہ آداب المعاشرت کے سلسلے کی آخری حدیث تھی، اس حدیث میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے آداب کی بنیادیں بیان فرمادی ہیں کہ اپنی ذات سے دوسروں کو ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے، اس بات کا آدمی اہتمام اور دھیان کرے۔ ہر کام کرنے سے پہلے آدمی یہ سوچے کہ اس کام سے دوسروں کو تکلیف تو نہیں پہنچے گی، اور دوسروں کے مزاج کی رعایت کرے۔

ایک شاعر گزرے ہیں جن کا نام ہے "جگر مراد آبادی مرحوم" یہ بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں پہنچ گئے تھے، ان کا ایک شعر بڑے کام کا ہے، اگر یہ شعر ہمارا لائحۂ عمل بن جائے تو یہ سارے اسلامی آدابِ معاشرت کا خلاصہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ

اس نفع وضرر کی دنیا میں یہ ہم نے لیا ہے درسِ جنوں
اپنا تو زیاں منظور سہی، اوروں کا زیاں منظور نہیں

یعنی اس دنیا میں سارے کام اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق نہیں ہوتے لیکن اس دنیا کے کام اپنی طبیعت کے خلاف ہو جائیں اور اپنے اوپر مشقت اُٹھالیں اور اپنی طرف سے قربانی دیدیں، تو یہ ہمیں منظور ہے لیکن دوسروں کو ہم سے کوئی مالی، جانی، ذہنی، نفسیاتی نقصان پہنچ جائے تو یہ ہمیں منظور نہیں۔ یہی سارے دین کی تعلیم ہے اور یہی آدابِ معاشرت کا خلاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

خندہ پیشانی سے ملنا سنت ہے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى قَالَ: لَقِيْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، فَقُلْتُ اَخْبِرْنِيْ عَنْ صِفَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي التَّوْرَاةِ قَالَ فَقَالَ" أَجَلْ وَاللّٰهِ إِنَّهُ لَمَوْصُوْفٌ فِي التَّوْرَاةِ بِبَعْضِ صِفَتِهٖ فِي الْقُرْآنِ يٰأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّحِرْزًا لِّلْأُمِّيِّيْنَ أَنْتَ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفَظٍّ وَّلَا غَلِيْظٍ وَّلَاسَخَّابٍ فِي الْأَسْوَاقِ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَةَ بِالسَّيِّئَةِ وَلٰكِنْ يَّعْفُوْ وَ يَصْفَحُ وَلَنْ يَّقْبِضَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى حَتّٰى يُقِيْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِأَنْ يَّقُوْلُوْا لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَيَفْتَحُ بِهَا اَعْيُنًا عُمْيًا وَآذَانًا صُمًّا وَقُلُوْبًا غُلْفًا"(۱)

خندہ پیشانی سے پیش آنا انسانیت کا حق ہے

یہ ایک طویل حدیث ہے اور اس پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "باب الانبساط الی الناس" کا عنوان قائم فرمایا ہے۔ یعنی لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا اور لوگوں میں گھلے ملے رہنا۔

یہ کتاب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "الأدب المفرد" کے نام سے لکھی ہے، اور اس میں حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث جمع کی ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی آداب سے متعلق ہیں، اور ان آداب کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے تلقین فرمائی ہے۔ ان میں سے ایک ادب اور ایک سنت یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ گھلے ملے رہو اور ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آؤ۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۲/ ۱۳۰ تا ۱۵۶)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، زیر نظر بیان امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الادب المفرد" کے ایک حصے کا درس ہے۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب كراهية السخب في السوق، رقم: ۱۹۸۱، مسند أحمد، مسند عبدالله بن عمرو بن العاص، رقم: ۲۳۳۳، الأدب المفرد، ص: ۸۴-۸۵

اور یہ خلقِ خدا کا حق ہے کہ جب اللہ کے کسی بندے سے ملاقات ہو تو اس سے آدمی خندہ پیشانی سے ملے، اپنے آپ کو بہ تکلف تند خو اور سخت مزاج نہ بنائے کہ لوگ قریب آتے ہوئے وحشت کریں، خواہ اللہ پاک نے دین کا یا دنیا کا بڑے سے بڑا مقام یا منصب عطا فرمایا ہو، وہ اس مقام کی وجہ سے اپنے آپ کو لوگوں سے الگ کر کے سخت مزاج بن کر نہ بیٹھے بلکہ گھلا ملا رہے، یہ انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے۔

اس سنتِ نبوی ﷺ پر کافروں کا اعتراض

بلکہ یہ وہ سنت ہے جس پر بعض کافروں نے اعتراض کیا تھا۔ قرآن پاک میں آتا ہے:

﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾(۱)

''اور کفار کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی پھرتا ہے''

کفار سمجھتے تھے کہ بازاروں میں پھرنا منصبِ پیغمبری کے خلاف ہے۔ یہ اس وجہ سے سمجھتے تھے کہ انہوں نے اپنے بادشاہوں اور سرداروں کو دیکھا تھا کہ جب وہ بادشاہت کے منصب پر فائز ہو جاتے تھے تو عوام سے کٹ کر بیٹھ جاتے تھے، عام آدمی کی طرح بازاروں میں نہیں آتے تھے، بلکہ خاص شاہانہ شان و شوکت سے آتے تھے۔ تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ پیغمبری اتنا بڑا اور اونچا مقام ہے کہ بادشاہت تو اس کے مقابلے میں گرد ہے۔

لیکن قرآن کریم نے ان کے اس خیالِ باطل کی تردید کی، اس لئے کہ پیغمبر تو آتے ہی تمہاری اصلاح کے لئے ہیں، لہٰذا دنیا کا بھی ہر کام عام انسانوں میں گھل مل کر کر کے دکھاتے ہیں، اور اس کے آداب اور اس کی شرائط بتاتے ہیں، نہ یہ کہ اپنے آپ کو عوام سے کاٹ کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ لہٰذا پیغمبروں کا بازاروں میں چلنا پھرنا اور ملنسار ہونا کوئی عیب کی بات نہیں۔

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ جو شخص مقتدیٰ (مقتدیٰ کا مطلب ہوتا ہے جس کو دیکھ کر لوگ اطاعت کرتے ہوں) بننے کے بعد لوگوں سے کٹ کر بیٹھ گیا اور اپنی شان بنالی تو اس کو اس طریق کی ہوا بھی نہیں لگی۔

اور یہ بھی فرمایا کہ ایک عام آدمی کی طرح رہو جس طرح نبی کریم ﷺ رہا کرتے تھے۔

(۱) الفرقان: ۲

حضور ﷺ کی ملنساری کا نرالا انداز

شمائل ترمذی میں روایت ہے:

''حضورِ اقدس ﷺ ایک مرتبہ مدینہ منورہ کے سوق مناقہ (سوق مناقہ مدینہ منورہ کا ایک بازار تھا جواب حرم شریف کی توسیع والے حصے میں شامل ہوگیا ہے، میں نے بھی کسی زمانے میں اس کی زیارت کی تھی) میں تشریف لے گئے، تو وہاں ایک دیہاتی تھے حضرت زاہر رضی اللہ عنہ، دیہات سے سامان لاکر شہر میں بیچا کرتے تھے، سیاہ رنگ تھا اور غریب آدمی تھے، حضورِ اقدس ﷺ ان سے بہت محبت فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ چپکے سے ان کے پیچھے گئے اور ان کی کولی بھر لی اور ان کو پیچھے سے کمر سے پکڑ لیا، پھر آواز لگائی کہ مَنْ يَّشْتَرِيْ هٰذَا الْعَبْدَ مِنِّيْ، کون ہے جو مجھ سے یہ غلام خریدے گا، آپ ﷺ نے مزاح فرمایا۔ جب حضرت زاہر رضی اللہ عنہ نے آواز پہچان لی تو ان کی خوشی کی انتہاء نہ رہی۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی پشت نبی کریم ﷺ کے جسد اطہر کے ساتھ اور ملانے کی کوشش کی اور میں نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ اس غلام کو فروخت کریں گے تو بہت کم پیسے ملیں گے، اس لئے کہ سیاہ فام ہے اور معمولی درجے کا آدمی ہے۔ تو سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں اے زاہر! اللہ کے ہاں تمہاری قیمت بہت زیادہ ہے۔''(۱)

اس واقعہ سے اندازہ لگائیں کہ آنحضرت ﷺ بازار میں تشریف لے جارہے ہیں اور کس طرح ایک معمولی درجے کے آدمی کے ساتھ مزاح فرمارہے ہیں۔ دیکھنے والا یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ کتنا اولوالعزم پیغمبر ہے کہ جس کے سامنے جبرئیل امین کے بھی پر جلتے ہیں۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

مفتی اعظم پاکستان ہے یا عام راہگیر؟

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبد الحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے مطب میں بیٹھا ہوا تھا (حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا مطب اس وقت برنس روڈ پر ہوتا تھا اور ہمارا گھر بھی اس زمانے میں اس کے قریب ہی ہوا کرتا تھا) دیکھا کہ مطب کے سامنے فٹ پاتھ پر مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہاتھ میں تھیلی لیے ہوئے ایک عام آدمی کی طرح جارہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مفتی اعظم پاکستان جس

(۱) مسند أحمد، رقم: ۱۲۱۸۷، الشمائل الترمذی، ص: ۱۶

کے چار دانگ عالم میں علم وفضل اور تقویٰ کے گن گائے جاتے ہیں، وہ اس طرح ایک عام آدمی کی طرح ہاتھ میں پتیلی لے کر پھر رہا ہے۔ تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کیا ان کو دیکھ کر کوئی پہچان سکتا ہے کہ یہ مفتی اعظم پاکستان ہیں؟

پھر حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ خاص تعلق عطاء فرمادیتے ہیں، وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں کے ساتھ اس طرح گھلا ملا کر رکھتا ہے کہ کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ کس مقام کے آدمی ہیں۔

اور یہی سنت ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی، نہ یہ کہ آدمی اپنی شان بنا کر رکھے اور لوگوں کے ساتھ معاملات کرنے میں تکلف سے کام لے۔

مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد قباء کی طرف عاجزانہ چال

ایک مرتبہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی سے پیدل چل کر ایسے ہی دوستانہ ملاقات کے لئے حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے جو مسجد قباء کے قریب رہتے تھے، تقریباً تین میل کا فاصلہ ہے۔ ان کے گھر کے دروازے پر جا کر تین دفعہ آواز دی، شاید وہ صحابی کسی ایسی حالت میں تھے کہ جواب نہیں دے سکتے تھے، تو قرآن پاک کے حکم کے مطابق:

﴿وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَى لَكُمْ﴾(۱)

''جب تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ''

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ کوئی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا۔ دوست سے ملنے گئے تھے، اپنی طرف سے دوستی کا حق ادا کیا، ملاقات نہیں ہوئی، واپس تشریف لے آئے۔

بعد میں حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو وہ دوڑتے ہوئے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور فداء ہونے لگے کہ میری کیا حیثیت کہ آپ میرے در پہ تشریف لائے۔

شاید یہ مشکل ترین سنت ہو

ویسے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری سنتیں ایسی ہیں کہ ہر سنت پہ انسان قربان ہو جائے۔ لیکن ایک سنت ترمذی شریف کی ایک روایت میں آئی ہے، میں سمجھتا ہوں شاید اس پر عمل کرنا مشکل ترین کام ہے، لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔

---

(۱) النور: ۲۸

روایت میں آتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ سے کوئی بات کرتا تو آپ ﷺ اس وقت تک اس سے چہرہ نہیں پھیرتے تھے جب تک کہ وہ خود ہی چہرہ نہ پھیر لے، اپنی طرف سے بات کاٹتے نہیں تھے۔ (۱)

کہنے کو آسان بات ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب سینکڑوں آدمی رجوع کرتے ہوں، کوئی مسئلہ پوچھ رہا ہے، کوئی اپنی مشکل بیان کر رہا ہے، تو آدمی کا دل چاہتا ہے کہ میں جلدی جلدی ان سے نمٹ جاؤں۔

اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ جب بولنے پر آجائیں تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتے، تو ان کے ساتھ یہ معاملہ کرنا کہ جب تک وہ نہ رک جائے اس وقت تک اس سے نہ ہٹے، یہ بہت زیادہ مشکل کام ہے۔

لیکن جناب نبی کریم ﷺ جو جہاد میں بھی مشغول ہیں، تبلیغ میں بھی مصروف ہیں، تعلیم میں بھی مصروف ہیں، جو پوری دنیا کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، ایک بوڑھیا بھی راستہ میں پکڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے تو اس وقت تک اس سے نہیں پھرتے جب تک کہ پوری طرح اس کو مطمئن نہیں کر دیتے۔

مخلوق سے محبت کرنا، حقیقتاً اللہ سے محبت کرنا ہے

یہ صفت انسان کے اندر اس وقت پیدا ہو سکتی ہے کہ جب مخلوق کے ساتھ اس وجہ سے محبت ہو کہ یہ میرے اللہ کی مخلوق ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تمہیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو تم اللہ تعالیٰ سے کیا محبت کرو گے، اللہ کی ذات کو نہ دیکھا، نہ سمجھا، نہ اس کو تم تصور میں لا سکتے ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر مجھ سے محبت ہے تو میری مخلوق سے محبت کرو اور میری مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرو تو اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایک عکس تمہاری زندگی میں آئے گا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اسی لئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ باب قائم کر رہے ہیں "باب الانبساط إلى الناس" کہ لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا اور ان کے ساتھ گھلا ملا رہنا اور اس طرح رہنا "کأحد من الناس" جیسے ایک عام آدمی ہوتا ہے، یعنی اپنا کوئی امتیاز پیدا نہ کرنا، یہ مقصود ہے اس باب کا۔ اس میں حدیث نقل کی ہے حضرت عطاء ابن یسار تابعی رحمۃ اللہ علیہ کی، وہ کہتے ہیں کہ میری ملاقات ہوئی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے۔

---

(۱) شعب الایمان للبیھقی، فصل فی لین الجانب وسلامۃ الصدر، رقم: ۸۱۳۲ (۲۷۳/۶)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی امتیازی خصوصیت

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی ہیں، اور ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جو اپنی کثرتِ عبادت میں مشہور تھے، بہت عابد و زاہد بزرگ تھے، اور انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بھی کثیر تعداد میں روایت کی ہیں۔

ایک خصوصیت ان کی یہ ہے کہ انہوں نے تورات، زبور، انجیل کا علم بھی کسی ذریعہ سے حاصل کیا ہوا تھا، حالانکہ یہ کتابیں ایسی ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اس میں بہت تحریفیں کردی ہیں اور اپنی اصلی حالت میں برقرار نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کو اس نکتۂ نظر سے پڑھنا تاکہ ان کی حقیقت معلوم ہو اور یہودیوں اور عیسائیوں کو تبلیغ کرنے میں مدد ملے تو پڑھنے کی اجازت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کچھ تورات یہودیوں سے پڑھی ہوئی تھی۔

تورات میں اب بھی کتاب اللہ کا نور جھلکتا ہے

تورات اگرچہ مکمل طور پر پہلے کی طرح نہیں ہے، یہودیوں نے اس میں بہت زیادہ تحریفات کردی ہیں، بہت سے حصے حذف کردیئے ہیں، نئے اضافے کردیئے، الفاظ کو بدل دیا، لیکن اس کے باوجود کہیں کہیں پھر بھی کتاب اللہ کا نور جھلکتا ہے۔

اسی وجہ سے اس میں اب بھی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات موجود ہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو اور زیادہ واضح تھیں، اسی وجہ سے قرآن کریم کہتا ہے:

"یہ یہودی آپ کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں"(۱)

اس لئے کہ تورات میں جو علامتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان ہوئی تھیں کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ایسی ایسی صفات کے حامل ہوں گے، ایسا ان کا حلیہ ہوگا، اس خاندان کے ہوں گے، اس شہر میں ہوں گے، یہ ساری تفصیل مذکور تھی۔ تو جو یہودی ان کتابوں کے عالم تھے وہ اپنی آنکھوں سے وہ علامتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھتے تھے کہ پائی جارہی ہیں، مگر اپنی ضد اور ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے مانتے نہیں تھے۔ حضرت عطاء بن یسار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میری ملاقات حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ نے تورات پڑھی ہے، تورات میں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صفات مذکور ہیں وہ ہمیں بتلائیں۔

---

(۱) البقرة: ١٤٦

بائبل سے قرآن تک

یہ کتابیں ان لوگوں نے اتنی بگاڑ دی ہیں، اس کے باوجود اس میں بعض ٹکڑے ایسے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قرآن کریم کا ترجمہ ہے۔ ان کی مشہور کتاب بائبل جس کو ''کتاب مقدس'' بھی کہتے ہیں، اس کو یہودی بھی مانتے ہیں اور عیسائی بھی مانتے ہیں، اس میں حضور ﷺ کی بشارتیں آج بھی موجود ہیں۔ مجھے تورات کا ایک جملہ یاد آگیا جس میں حضور ﷺ کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا گیا:

''جو فاران سے طلوع ہوگا۔ سلاح میں بسنے والے گیت گائیں گے، قیدار کی بستیاں حمد کریں گی''

فاران نام ہے اس پہاڑ کا جس پر غارِ حرا واقع ہے۔ ''سلاح'' نام ہے اس پہاڑ کا جس کا ایک حصہ ثنیۃ الوداع ہے، جب حضورِ اقدس ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس پر بچیوں نے کھڑے ہوکر یہ ترانے پڑھے تھے:

"طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ"(۱)

اور قیدار نام ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صاحبزادے کا، اور ان کی بستیاں عرب میں آباد ہیں، ان کی طرف اشارہ ہے کہ جب ان کی اولاد میں نبی آخر الزماں پیدا ہوں گے تو ان کی بستیاں حمد کریں گی۔

آپ ﷺ کی صفات تورات میں بھی موجود ہیں

بہرحال، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہاں میں بتاتا ہوں۔

"وَاللّٰهِ إِنَّهُ لَمَوْصُوْفٌ فِي التَّوْرَاةِ بِبَعْضِ صِفَتِهٖ فِي الْقُرْآنِ"

''اللہ کی قسم حضور علیہ السلام کی بعض صفات تورات میں ایسی مذکور ہیں جو کہ قرآن پاک میں بھی مذکور ہیں''

پھر انہوں نے قرآن پاک کی آیت تلاوت فرمائی:

﴿ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴾(۲)

''اے نبی! ہم نے آپ کو گواہ بنا کر اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا''

(۱) الرياض النضرة في مناقب العشرة (۵۶/۱)، دلائل النبوة (۳۶۳/۲)، رقم: ۷۵۲، السيرة النبوية، لابن كثير (۲۶۹/۲) (۲) الاحزاب: ۴۵

گواہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن آپ ﷺ گواہی دیں گے کہ اس اُمت کو اللہ تعالیٰ کی توحید کا پیغام دیا گیا تھا تو کس نے اس پر عمل کیا اور کس نے نہیں کیا، اس بات کی گواہی دیں گے۔

وَّمُبَشِّرًا: اور نبی کریم ﷺ لوگوں کو جنت کی خوشخبری دینے والے ہوں گے۔

وَّنَذِيرًا: اور جہنم سے ڈرانے والے ہوں گے۔

یہ آیت قرآن کریم کی تلاوت فرمائی، پھر آگے تورات کی عبارت پڑھ کر سنائی:

"وَحِرْزًا لِّلْاُمِّيِّيْنَ"

یعنی حضور اقدس ﷺ اَن پڑھ لوگوں کے واسطے نجات دہندہ بن کر آئیں گے۔ اُمی کا لفظ خاص طور سے لقب کے طور پر عربوں کے لئے بولا جاتا تھا، اس لئے کہ ان کے ہاں لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا، تو یہ تورات میں تھا کہ امیوں کے لئے نجات دہندہ بن کر آئیں گے۔ آگے فرمایا:

"أَنْتَ عَبْدِیْ وَرَسُوْلِیْ"

''اللہ تعالیٰ اس وقت تورات میں فرمارہے ہیں کہ اے نبی محمد ﷺ! تم میرے بندے ہو اور پیغمبر ہو''

"سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ"

''میں نے تمہارا نام متوکل رکھا ہے'' یعنی اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے والا۔

آگے صفات بیان فرمائیں کہ وہ نبی کیسا ہوگا؟ فرمایا:

"لَيْسَ بِفَظٍّ وَّلَا غَلِيْظٍ"

''وہ نہ تو سخت گو ہوگا اور نہ سخت طبیعت والا ہوگا''

فظ کے معنی ہیں جس کی باتوں میں سختی ہو، کرختگی ہو۔

"وَّلَا سَخَّابٍ فِي الْاَسْوَاقِ"

''اور نہ بازاروں میں شور مچانے والا ہوگا''

"وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَةَ بِالسَّيِّئَةِ"

''اور وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دے گا''

"وَلٰكِنْ يَّعْفُوْ وَ يَصْفَحُ"

''لیکن وہ معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہوگا''

"وَلَنْ يَّقْبِضَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى حَتّٰى يُقِيْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَآءَ بِاَنْ يَّقُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"

''اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس کو اپنے پاس نہیں بلائیں گے جب تک کہ اس ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کردے، اس طرح کہ وہ کہہ دیں: لا إله إلا الله''

" فَيَفْتَحُ بِهَا أَعْيُنًا عُمْيًا وَآذَانًا صُمًّا وَقُلُوبًا غُلْفًا"

''اور اس کلمہ توحید کے ذریعے ان کی اندھی آنکھیں کھول دے گا اور بہرے کان کھول دے گا، اور وہ دل جن کے اُوپر پردے پڑے ہوئے ہیں وہ ان کے ذریعے کھل جائیں گے''

اور یہ صفات تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ تورات میں آج بھی موجود ہیں۔

تورات کی عبرانی زبان میں آپ علیہ السلام کی صفات

چونکہ محاورے ہر زبان کے مختلف ہوتے ہیں، تو اصل تورات عبرانی زبان میں تھی، اس کا ترجمہ جب اردو میں کرتے ہیں تو اس طرح کرتے ہیں:

''وہ مسلے ہوئے سرکنڈے کو نہ توڑے گا، ٹمٹماتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا''

اور عبرانی زبان کے محاورے میں ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

''وہ کسی برائی کا بدلہ برائی سے نہ دے گا اور عفو و درگزر سے کام لے گا اور اس کے آگے پتھر کے بت اوندھے منہ گریں گے''

اور یہ واقعہ اس وقت پیش آیا کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ فتح کیا تو پتھر کے بت جو خانہ کعبہ میں نصب تھے وہ اوندھے منہ گرے، یہ ساری تفصیل آئی ہے۔ میں نے جو ''اظہار الحق'' کا ترجمہ ''بائبل سے قرآن تک'' کے نام سے کیا ہے، اس کی تیسری جلد کا چھٹا باب انہی بشارتوں پر مشتمل ہے۔ میں نے دو کالم بنا کر ایک کالم میں بائبل کی عبارت دوسرے کالم میں وہ احادیث لکھی ہیں جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات آئی ہیں، پھر ان کو موازنہ کرکے دکھایا کہ بائبل میں یہ آیا ہے اور قرآن کریم میں یا حدیث میں یہ آیا ہے۔ تو اتنی تحریفات کے باوجود آج بھی یہ صفات بائبل میں باقی ہیں۔

حدیث مذکورہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی غرض

لیکن جس غرض سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث لے کر آئے ہیں، وہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حالات پچھلی کتابوں میں بیان ہوئے وہ کیا تھے، اور اس پیشگوئی میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی صفات ہیں اور سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں وہ کیا ہیں؟

وہ یہ ہیں کہ آپ کرخت نہیں ہیں اور ترش مزاج نہیں ہیں اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے۔

یہ سنت ہے نبی کریم ﷺ کی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے شریعت میں اجازت دی ہے کہ اگر کسی شخص نے تمہارے ساتھ برائی کی ہے تو جتنی برائی کی ہے اتنا بدلہ لے سکتے ہو، ایک تماچہ مارا ہے تو تم بھی اتنے ہی زور سے ایک طمانچہ مار سکتے ہو جتنا زور سے اس نے مارا، اس سے کم وبیش نہ ہو، اس کی اجازت ہے۔ لیکن اجازت ہونا اور بات ہے اور آپ ﷺ کی سنت ہونا اور بات ہے۔ آپ نے ساری عمر کبھی کسی شخص سے اپنی ذات کا بدلہ نہیں لیا۔

برائی کا جواب حسنِ سلوک سے دینا

یہ بھی نبی کریم ﷺ کی بڑی عظیم الشان سنت ہے۔ ہم نے سنتوں کو چند ظاہری سنتوں کی حد تک محدود کرلیا ہے، مثلاً سنت ہے کہ مسواک کرنا چاہئے، داڑھی رکھنی چاہئے، اور ظاہری وضع قطع سنت کے مطابق کرنی چاہئے، یہ سب سنتیں ہیں، ان کی اہمیت سے بھی جو انکار کرے وہ سنتوں سے ناواقف ہے، لیکن سنتیں اس حد تک محدود نہیں، عام تعلقات اور معاملات میں نبی کریم ﷺ کا جو طرزِ عمل تھا، وہ بھی آپ ﷺ کی سنت کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ اور جس اہتمام کے ساتھ دوسری سنتوں پر عمل کرنے کا دل میں داعیہ پیدا ہوتا ہے، اس سے بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ اس سنت پر عمل کرنے کی فکر کرنی چاہئے کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیں بلکہ برائی کا بدلہ حسنِ سلوک سے دیں، سنت کے مطابق اچھائی سے دیں۔ اب ذرا ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم اس سنت پہ کتنا عمل کررہے ہیں؟ ہمارے ساتھ اگر کسی نے برائی کی ہے تو کتنا انتقام کا جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے اور کتنی اس کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں؟ اگر غور کرو تو معاشرے کے فساد کا بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کی اس سنت کو چھوڑ دیا ہے۔ ہماری سوچ یہ ہوتی ہے کہ اس نے چونکہ میرے ساتھ برائی کی ہے، میں بھی اس سے برائی کروں گا، اس نے مجھے گالی دی ہے، میں بھی دوں گا، اس نے مجھے میری شادی پر کیا تحفہ دیا تھا تو میں بھی اتنا ہی دوں گا، اور اس نے شادی پر تحفہ نہیں دیا تھا تو میں بھی نہیں دوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سب کچھ بدلہ کرنے کے لئے ہو رہا ہے، بدلہ کرنے والا درحقیقت صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہوتا۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا ہے:

((لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ، وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ مَنْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهُ وَصَلَهَا))(۱)

یعنی حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص ہے کہ دوسرا تو قطع رحمی کر رہا ہے اور رشتہ داری

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب لیس الواصل بالمکافیء، رقم: ۵۵۳۲، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی صلة الرحم، رقم: ۱۸۳۱، سنن أبی داؤد، کتاب الزکاة، باب فی صلة الرحم، رقم: ۱۴۴۶، مسند أحمد، ۶۲۳۸۔

کے حقوق ادا نہیں کر رہا ہے، اور یہ جواب میں قطع رحمی کرنے کی بجائے اس کے ساتھ اچھا معاملہ کر رہا ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عجیب واقعہ

ایک دن حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھر پر متوسلین اور خدام وغیرہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اچانک ایک صاحب آئے جو حضرت کے کوئی رشتہ دار تھے، داڑھی مونچھ صاف، عام آدمیوں کی طرح تھے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ انتہائی بے ادبانہ لہجے میں جتنے الفاظ برائی کے ان کے منہ میں آئے کہتے ہی گئے۔ آگے سے حضرت ان کی ہر بات پہ کہہ رہے ہیں کہ بھائی ہم سے غلطی ہوگئی ہے، تم ہمیں معاف کر دو، ہم انشاء اللہ تلافی کر دیں گے، تمہارے پاؤں پکڑتے ہیں، معاف کر دو۔ بہر حال، ان صاحب کا اس قدر شدید غصے کا عالم کہ دیکھنے والے کو بھی برداشت نہ ہو، بالآخر ٹھنڈے ہو گئے۔

بعد میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ اس اللہ کے بندے کو کوئی غلط اطلاع مل گئی تھی، اس وجہ سے ان کو غصہ آ گیا تھا، اگر میں چاہتا تو ان کو جواب دے سکتا تھا اور بدلہ لے سکتا تھا، لیکن اس واسطے میں نے اس کو ٹھنڈا کیا کہ بہر حال یہ رشتہ دار ہے اور رشتہ داروں کے بھی حقوق ہوتے ہیں۔ رشتہ داروں کے ساتھ قطع تعلق کر لینا آسان ہے، لیکن تعلق جوڑ کر رکھنا یہ ہے درحقیقت تعلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور یہ ہے لا یدفع السیئة بالسیئة کہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں بلکہ پیار سے، محبت سے، شفقت سے اور خیر خواہی سے دو۔

مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، عجیب ولی اللہ بزرگ تھے۔ دارالعلوم میں مہتمم کے معنی گویا کہ سب سے بڑے عہدے پر فائز۔ حضرت نے ایک گائے پال رکھی تھی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اس کو لے کر آ رہے تھے کہ راستے میں مدرسہ کا کوئی کام آ گیا، اسی طرح مدرسہ آئے اور گائے مدرسے کے صحن میں درخت کے ساتھ باندھ کر دفتر میں چلے گئے۔ وہاں دیوبند کے ایک صاحب آئے اور چیخنا شروع کر دیا "یہ گائے کس کی بندھی ہے؟" لوگوں نے بتایا "مہتمم صاحب کی ہے" تو کہنے لگے "اچھا! مدرسہ مہتمم کا کمیلا بن گیا، ان کی گائے کا باڑا بن گیا، اور مہتمم صاحب مدرسے کو اس طرح کھا رہے ہیں کہ مدرسے کے صحن کو انہوں نے اپنی گائے کا باڑا بنا لیا ہے"

شور سن کر وہاں ایک مجمع اکٹھا ہوگیا، اب سراسر الزام سراسر ناانصافی۔ حضرت وہاں کام کرر ہے تھے، اندر آواز آئی تو باہر نکلے کہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ صاحب ناراض ہورہے ہیں کہ مہتمم صاحب نے یہاں گائے باندھ دی۔ کہنے لگے "ہاں واقعی یہ مدرسہ ہے اللہ کا، مجھے گائے یہاں نہیں باندھنی چاہئے تھی، یہ گائے میری ذاتی ہے اور یہ صحن مدرسہ کا ہے، مجھ سے غلطی ہوگئی، میں اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں، اس غلطی کا کفارہ یہ ہے کہ میرا دل چاہ رہا ہے کہ یہ گائے آپ ہی لے جاؤ" وہ بھی اللہ کا بندہ ایسا تھا کہ لے کر چلتا بنا۔

اب آپ دیکھئے کہ سراسر ناانصافی اور ظلم ہے، اتنے بڑے ولی اللہ اور اتنے بڑے خادمِ دین کے اوپر ایک معمولی آدمی اتنی گرمی دکھا رہا ہے سب لوگوں کے سامنے، بجائے اس کے کہ اس کو بدلہ دیا جاتا، گائے بھی اسی کو دے دی، یہ ہے نبی کریم ﷺ کی سنت اور لا یدفع السیئة بالسیئة پر عمل۔

آپ ﷺ کی ساری سنتوں پر عمل ضروری ہے

درحقیقت سنت صرف یہ نہیں ہے کہ آسان آسان سنتوں پر عمل کرلیا جائے، بلکہ ہر ایک سنت پر عمل کی فکر کرنی چاہئے، اور انسان اس سنت کے جتنا قریب ہوگا، اتنا ہی معاشرے کا فساد ختم ہوگا۔ غور کرکے دیکھ لو اور تجربہ کرکے دیکھ لو کہ جو بگاڑ پھیلا ہوا ہے وہ جناب نبی کریم ﷺ کی سنتوں سے دور ہونے کا نتیجہ ہے۔

"وَلٰكِنْ يَّعْفُوْ وَ يَصْفَحُ"

لیکن وہ معاف فرمادیتے ہیں اور درگزر سے کام لیتے ہیں۔ کوئی کچھ بھی کہہ دے لیکن حضورِ اقدس ﷺ جواب نہیں دیتے۔ اور جو اللہ کے ولی ہوتے ہیں، وہ نبی کریم ﷺ کے متبع ہوتے ہیں اور ان کا طریقہ بھی یہی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کا کچھ حصہ ہم کو بھی عطا فرمادے۔

یہ سب کچھ اس لئے عرض کیا جاتا ہے کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ معلوم نہیں ہم کہاں چلے گئے ہیں، کس وادی میں بھٹک رہے ہیں۔ یہاں بیٹھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی سنتوں کا کم از کم تھوڑی دیر دھیان ہو تو شاید دلوں میں کچھ داعیہ پیدا ہوجائے اور اللہ تبارک وتعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمادے۔ اس کی عادت ڈالو، اس کے لئے خون کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں، اس کے لئے مشق کرنی پڑتی ہے، دل پر جبر کرنا پڑتا ہے، دل پر پتھر رکھنے پڑتے ہیں۔ اگر نبی کریم ﷺ کی سنت کی منزل کی طرف جانا ہے تو یہ کڑوے گھونٹ پینے پڑیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ گھونٹ

حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کوئی گھونٹ جو انسان پیتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کو اتنا پسند نہیں جتنا کہ غصے کا گھونٹ پینا۔ (۱)

یعنی جب غصہ آرہا ہو اور غصے میں آدمی آپے سے باہر ہو رہا ہو اور اس میں اندیشہ ہو کہ وہ کسی کو کوئی نقصان پہنچادے گا، اس وقت غصے کے گھونٹ کو محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے پی جانا اور اس کے تقاضے پر عمل نہ کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کو بہت ہی پسند ہے۔

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾ (۲)

قرآن کریم نے ایسی ہی مدح فرمائی ہے ایسے لوگوں کی کہ جب بھی غصہ آئے اور انتقام کے جذبات پیدا ہوں، تو ٹھیک ہے تمہیں شریعت نے جائز حدود میں بدلہ لینے کا حق دیا ہے، لیکن یہ دیکھو کہ بدلہ لینے سے تمہیں کیا فائدہ؟ فرض کرو کہ ایک شخص نے تمہیں طمانچہ ماردیا تو اگر تم بدلہ لینے کے لئے ایک طمانچہ اس کے ماردو تو تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوا؟ اگر تم نے اس کو معاف کردیا اور یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اس کو معاف کرتا ہوں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں صابرین کا اجر

اس کا نتیجہ یہ ہوگا:

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۳)

''بے شک صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بے حساب اجر عطا فرمائیں گے''

اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے بندوں کو معاف کرنے کا عادی ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب اس نے میرے بندوں کو معاف کیا تھا، تو میں اس کو معاف کرنے کا زیادہ حقدار ہوں، تو اس کی خطائیں بھی اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتے ہیں۔

عفو وصبر کا مثالی واقعہ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دو آدمی آپس میں لڑے، لڑائی میں ایک کا دانت ٹوٹ

(۱) مسند أحمد بن حنبل، ومن سند بني هاشم، رقم: ۲۸٦۰

(۲) آل عمران: ۱۳٤، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جو غصے کو پی جانے اور لوگوں کو معاف کردینے کے عادی ہیں''

(۳) الزمر: ۱۰

گیا۔ جس کا دانت ٹوٹا وہ شخص اس کو پکڑ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے گیا اور کہا کہ دانت کا بدلہ دانت ہوتا ہے، لہٰذا قصاص دلوایئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے تمہیں حق ہے، لیکن کیا فائدہ، تمہارا دانت تو ٹوٹ ہی گیا، اس کا بھی توڑیں، اس کی بجائے تم دانت کی دیت لے لو، دیت پر صلح کر لو۔ وہ شخص کہنے لگا کہ میں دانت ہی توڑوں گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اس کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ نہ مانا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر چلو، اس کا بھی دانت توڑتے ہیں۔

راستے میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے، بڑے درجے کے مشہور صحابی ہیں، انہوں نے کہا کہ بھئی دیکھو! تم قصاص تو لے رہے ہو مگر ایک بات تو سنتے جاؤ، میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو تکلیف پہنچائے اور پھر جس کو تکلیف پہنچی ہے وہ اس کو معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس وقت معاف فرمائیں گے جبکہ اس کو معافی کی سب سے زیادہ حاجت ہوگی، یعنی آخرت میں۔

تو یہ شخص یا تو اتنے غصے میں آیا تھا کہ پیسے لینے پر بھی راضی نہیں تھا، جب یہ بات سنی تو کہا:

"آاَنْتَ سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"

کیا آپ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں میں نے سنی ہے اور میرے ان کانوں نے سنی ہے۔ وہ شخص کہنے لگا کہ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی ہے تو جاؤ اس کو بغیر کسی پیسے کے معاف کرتا ہوں، چنانچہ معاف کر دیا۔ (۱)

ہم میں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں فرق

احادیث ہم بھی سنتے ہیں اور وہ حضرات بھی سنتے تھے، لیکن ان کا حال یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد کان میں پڑا تو بڑے سے بڑا قصد و ارادہ اور بڑے سے بڑا منصوبہ اس ارشاد کے آگے ایک پل میں ڈھیر کر دیا۔

ہم صبح سے شام تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں لیکن ان پر عمل کا داعیہ پیدا نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اس پڑھنے اور سننے کے نتیجے میں ہماری زندگی میں کوئی انقلاب نہیں آتا، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں بھی عزت دی تھی اور آخرت میں بھی انشاء اللہ ان کا عظیم مقام ہوگا۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدیات عن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی العفو، رقم: ۱۳۱۳، سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات، باب العفو فی القصاص، رقم: ۲۶۸۳

مذکورہ حدیث کا آخری ٹکڑا

اس میں دوسری بات آگے یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ حضور اقدس ﷺ کو اس وقت تک اپنے پاس نہیں بلائیں گے جب تک کہ اس ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کرلیں۔ ٹیڑھی قوم سے مراد بت پرستوں والی عرب قوم، کہ ان کے اندر شرک تو تھا ہی اور دماغ میں یہ خناس بھی تھا کہ ہم ساری مخلوق سے برتر ہیں، اپنے آپ کو خدا جانے کیا کچھ سمجھتے تھے، ان کو سیدھا کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کو بھیجا۔

چنانچہ ۲۳ سال کی مدت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ کے ذریعے پورے جزیرہ عرب پر لا الہ الا اللہ کی حکومت قائم فرمادی۔ اور آگے فرمایا:

"فَیَفْتَحُ بِهَا اَعْیُنًا عُمْیًا وَآذَانًا صُمًّا وَقُلُوْبًا غُلْفًا"

اس کلمہ توحید کے ذریعے ان کی اندھی آنکھوں کو کھولے گا اور ان کے دلوں کے پردوں کو ہٹائے گا۔ یہ سب الفاظ تورات کے ہیں جو حضور اقدس ﷺ کی صفات کے بارے میں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

غریبوں کی تحقیر نہ کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،
﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ﴾ (۱)

یہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسرا باب قائم فرمایا:

"باب فضل ضعفة المسلمين والفقراء والخاملين"

یعنی کمزور مسلمانوں کی فضیلت کے بیان میں یعنی ایسے مسلمان جو مالی اعتبار سے کمزور، منصب اور عہدہ کے اعتبار سے کمزور، جسمانی اعتبار سے کمزور ہیں، ان کے فضائل کے بیان میں یہ باب قائم فرمایا ہے۔ (۲)

اس باب کے قائم کرنے کا مقصد درحقیقت اس بات کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہے کہ بعض لوگ جن کو اللہ تعالیٰ دنیاوی اعتبار سے کوئی مقام عطا فرما دیتے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے پیسے زیادہ دے دیئے، یا بڑا منصب دے دیا، عہدہ دے دیا، یا شہرت دیدی، یہ لوگ عام طور پر کمزور قسم کے لوگوں کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں، اور ان کے ساتھ تحقیر آمیز برتاؤ کرتے ہیں، ان کو متنبہ کرنے کے لئے یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایک آدمی جو بظاہر کمزور نظر آ رہا ہے، چاہے وہ مالی اعتبار سے کمزور ہو، یا جسمانی اعتبار سے کمزور ہو، اس کے بارے میں یہ خیال مت کرو کہ وہ حقیر ہے۔ کیا پتہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں یہ شخص تم سے کہیں زیادہ آگے نکل جائے۔ چنانچہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کے شروع میں پہلے قرآن کریم کی آیت نقل کی ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

☆ اصلاحی خطبات (۲/۱۹۰۔۲۰۱)، ۲۱ فروری ۱۹۹۲ء، بروز جمعۃ المبارک، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم کراچی۔ زیر نظر بیان علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ریاض الصالحین" کے ایک حصے کا درس ہے۔

(۱) الكهف: ۲۸

(۲) رياض الصالحين، باب فضل ضعفة المسلمين والفقراء والخاملين، باب نمبر ۲۸، ص: ۱۱۵

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾(۱)

اس آیت میں حضور نبی کریم ﷺ کو خطاب کیا جارہا ہے کہ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھیں جو صبح وشام اپنے پروردگار کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی آنکھیں ان سے تجاوز کرکے دنیاوی زندگی کی رونق کی طرف بڑھنے لگیں ــــ یعنی آپ کہیں نہ سوچیں کہ یہ تو غریب، فقیر اور معمولی قسم کے لوگ ہیں، اور معمولی حیثیت کے آدمی ہیں، ان کی طرف دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور آپ مالداروں کی طرف دیکھنا شروع کردیں۔

اللہ کے محبوب کون؟

آنحضرت ﷺ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو رابطہ اور تعلق ہے، کون مسلمان اس سے ناواقف ہوگا، اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات میں سب سے زیادہ محبوب حضور اقدس ﷺ ہیں، آپ ﷺ سے زیادہ محبوب اس کائنات میں کوئی ہو نہیں سکتا، ایسے محبوب ہیں کہ سارا قرآن کریم آپ ﷺ کی وصف وثنا میں آپ ﷺ کی تعریف میں آپ ﷺ کے اوصاف کے بیان میں بھرا ہوا ہے، فرمایا:

﴿إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾(۲)

جب اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کی تعریف کرنے پر آتے ہیں تو الفاظ کے ڈھیر لگادیتے ہیں.

محبوبانہ عتاب

لیکن سارے قرآن کریم میں دو یا تین جگہیں ایسی ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ کو تھوڑا سا محبوبانہ عتاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کا یہ عمل ہمیں پسند نہیں آیا۔ان میں سے ایک ”سورہ عبس“ میں ہے، جس کا واقعہ یہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس مشرکین کے کچھ سردار آئے ہوئے تھے۔آپ نے یہ محسوس کیا کہ چونکہ یہ بااثر اور سردار لوگ ہیں، اگر ان کی اصلاح ہوجائے تو ان کے ذریعہ پوری قوم کی اصلاح کا راستہ کھل سکتا ہے، اس لئے آپ کے دل میں ان کو تبلیغ کرنے اور

---

(۱) الکھف: ۲۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور اپنے آپ کو استقامت سے ان لوگوں کے ساتھ ساتھ رکھو جو صبح وشام اپنے رب کو اس لئے پکارتے ہیں کہ وہ اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں۔ اور تمہاری آنکھیں دنیوی زندگی کی خوبصورتی کی تلاش میں ایسے لوگوں سے ہٹنے نہ پائیں“

(۲) الاحزاب: ۴۵، ۴۶

دعوتِ اسلام دینے کی زیادہ اہمیت پیدا ہوگئی، اس لئے آپ ان کی طرف زیادہ متوجہ ہوگئے۔ اسی دوران حضرت عبداللہ ابن اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ جو نابینا صحابی تھے، جنہیں حضور ﷺ نے مسجد نبوی میں مؤذن بھی مقرر فرمایا تھا، وہ حضور کی خدمت میں آگئے، اور حضور سے کوئی مسئلہ پوچھنے لگے۔ آنحضرت ﷺ نے محسوس کیا کہ یہ تو اپنے ہی آدمی ہیں، روزانہ ملاقات ہوتی ہے، اگر ان کو اس وقت مسئلہ نہ بتایا تو بعد میں بتادیں گے اس لئے آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم ذرا سا ٹھہر جاؤ، اور مشرکین کے جو سردار تھے، ان کے ساتھ گفتگو میں مشغول رہے، تاکہ ان کو اسلام کی توفیق ہوجائے، اس لئے کہ اگر یہ مسلمان ہوجائیں گے تو پوری قوم کے مسلمان ہونے کا راستہ کھل جائے گا۔ بس اتنا ہی واقعہ پیش آیا، لیکن اللہ جل جلالہ نے اس پر بھی تنبیہ فرمائی، اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ (۱)

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی o اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی o﴾

ان آیات میں حضورِ اقدس ﷺ کو غائب کے صیغے سے خطاب فرمایا:

''انہوں نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا، اس لئے کہ ان کے پاس ایک نابینا شخص آگیا'' (گویا کہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آیا)

﴿وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰی o اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی o﴾

''تمہیں کیا پتہ شاید وہ نابینا شخص سنور جاتا۔ اور نصیحت حاصل کرلیتا تو آپ کی نصیحت اس کو فائدہ پہنچادیتی''

﴿اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی o فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی o﴾

''جو شخص بے پروائی کرتا ہے (اور طلب لے کر آپ کے پاس نہیں آئے، بلکہ دینِ حق کی طرف سے استغناء کا اظہار کرتے ہیں) آپ ان کی فکر میں پڑتے ہیں''

﴿وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی o﴾

''حالانکہ (یاد رکھو) اگر وہ ٹھیک نہ ہوں تو آپ پر کوئی وبال نہیں (جب ان کے اندر خود طلب نہیں، بلکہ ان کے اندر استغناء ہے تو پھر آپ پر کوئی گرفت نہیں۔ اور آپ سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا)

﴿وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی o وَهُوَ یَخْشٰی o فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی o﴾

''اور جو شخص دوڑ کر آپ کے پاس آیا ہے اور دل میں اللہ کا خوف لیے ہوئے ہے، تو آپ اس سے اعراض کرتے ہیں'' (۲)

---

(۱) تفسیر ابن کثیر (٤/ ٦٠٦- ٦٠٥)

(۲) عبس: ۱ تا ۱۰

طالب کو ترجیح دینی چاہئے

یہ حضور نبی کریم ﷺ کو ایک محبوبانہ عتاب فرمایا گیا۔ ظاہر ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ یہ کمزور آدمی ہے، اور وہ طاقتور ہیں، لہٰذا ان سے اعراض کریں، اور طاقتور کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ بلکہ آپ کے ذہن میں یہ مصلحت تھی کہ یہ تو اپنا آدمی ہے، ان سے تو بعد میں بھی بات ہو سکتی ہے، اور یہ لوگ پتہ نہیں پھر دوبارہ آئیں یا نہ آئیں، لہٰذا ان کو حق کا کلمہ پہنچا دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی گوارہ نہیں فرمایا، اور فرمایا کہ یہ شخص جو طلب لے کر آیا ہے وہ اس شخص پر مقدم ہے جو طلب کے بغیر بیٹھا ہے، اور استغناء کا اظہار کرتا ہے، اس کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں، جو طلب لے کر آیا ہے اس کی طرف توجہ کریں۔

ان آیات میں اگرچہ حضور ﷺ کو خطاب ہے، لیکن آپ کے واسطے سے پوری اُمت کو یہ تاکید فرمائی گئی ہے کہ بظاہر معمولی حیثیت کے آدمی کو حقیقت میں معمولی مت سمجھو۔ کیا پتہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کا کیا درجہ ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ عزت واکرام سے پیش آؤ۔

جنتی اور جہنمی لوگوں کا ذکر

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں پہلی حدیث یہ نقل کی ہے:

عَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ ((أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ الْجَنَّةِ؟ كُلُّ ضَعِيْفٍ مُتَضَعِّفٍ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ، أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ؟ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ))(۱)

حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ پھر فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کمزور ہے اور لوگ بھی اس کو کمزور سمجھتے ہیں، یا تو جسمانی اعتبار سے کمزور ہو، یا مالی اعتبار سے کمزور ہو، یا حیثیت اور رتبے کے اعتبار سے کمزور ہو یعنی دنیا والے اس کو کم حیثیت اور کم رتبہ والا سمجھتے ہیں، لیکن وہ کمزور شخص اللہ کے یہاں اتنا محبوب ہے کہ اگر وہ اللہ کے اوپر کوئی قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں، یعنی اگر وہ شخص یہ قسم کھالے کہ فلاں

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب تفسير القرآن، باب عتل بعد ذلك زنيم، رقم: ٤٥٣٧، صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب النار يدخلها الجبارون والجنة يدخلها الضعفاء، رقم: ٥٠٩٢، سنن الترمذی، كتاب صفة جهنم عن رسول الله، باب ما جاء أن أكثر أهل النار النساء، رقم: ٢٥٣٠، مسند أحمد، مسند أنس بن مالك، رقم: ١٢٠١٩

کام اس طرح ہوگا تو اللہ تعالیٰ وہ کام اسی طرح فرما دیتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کی محبت اور قدر کی بنا پر ایسا ہی کر دیتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی شان

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ دو عورتوں میں جھگڑا ہو گیا، اور جھگڑے میں ایک عورت نے دوسری عورت کا دانت توڑ دیا، اور اسلامی قانون یہ ہے کہ دانت کے بدلے دانت۔ جب یہ سزا سنائی گئی تو وہ عورت قصاص میں جس کا دانت توڑنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس کے سرپرست نے کھڑے ہو کر حضور اقدس ﷺ کے سامنے یہ کہہ دیا ''یا رسول اللہ! میں قسم کھاتا ہوں کہ اس کا دانت نہیں ٹوٹے گا۔ اس کا مقصد (معاذ اللہ) حضور ﷺ کے فیصلے پر اعتراض کرنا نہیں تھا، اور نہ عناد تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس نے کہا کہ حالات ایسے پیدا ہو جائیں گے کہ انشاء اللہ اس کا دانت نہیں ٹوٹے گا۔ چونکہ اس کا جذبہ معاندانہ نہیں تھا، اور نہ آپ کے فیصلے پر اعتراض مقصود تھا، اس لئے آپ نے اس کی بات کا برا نہیں مانا۔

جہاں اسلام میں یہ قاعدہ ہے کہ دانت کے بدلے دانت، آنکھ کے بدلے آنکھ، وہاں اسلام نے یہ بھی رکھا ہے کہ اگر ورثاء معاف کر دیں، یا صاحبِ حق معاف کر دے تو پھر قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔ اور پھر بدلہ لینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جس عورت کا دانت ٹوٹا تھا اس کے دل میں بات آ گئی اور اس نے کہا کہ میں معاف کرتی ہوں، اور اس کا دانت نہیں تڑوانا چاہتی۔ چنانچہ اس کے معاف کرنے سے قصاص ختم ہو گیا۔ اس وقت حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بعض لوگ اللہ کے یہاں بڑے محبوب ہوتے ہیں۔ اور ظاہری حالت ان کی یہ ہوتی ہے کہ ان کے بال پراگندہ، دیکھنے میں کمزور، اور اگر لوگوں کے دروازے پر جائیں تو لوگ دھکا دے کر نکال دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی ایسی عزت ہوتی ہے کہ اللہ پر اگر کوئی قسم کھا لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیں۔ اور یہ بھی ایسا شخص ہے کہ اس نے قسم کھائی تھی کہ اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم پوری کر دی۔ اور وارثوں نے خود ہی معاف کر دیا۔ (۱)

اس حدیث شریف میں حضور ﷺ اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ ایسا شخص جو دیکھنے میں

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب الصلح فی الدیة، رقم: ۲۵۰٤، سنن النسائی، کتاب القسامة، باب القصاص فی الثنیة، رقم: ٤٦٧٥، سنن أبی داود، کتاب الدیات، باب القصاص من السن، رقم: ۳۹۷۹، سنن ابن ماجه، کتاب الدیات، باب القصاص فی السن، رقم: ۲٦۳۹، مسند أحمد، رقم: ۱۱۸٥٤

کمزور ہے، اور لوگ اسے کمزور سمجھتے ہیں، لیکن اپنے تقویٰ کے لحاظ سے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے لحاظ سے، اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لحاظ سے وہ اللہ تعالیٰ کو ایسا محبوب ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کردیتے ہیں، ایسے لوگ جنت والے ہیں۔

سخت مزاجی سخت نقصان دہ ہے

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو اہل جہنم کے بارے میں نہ بتلاؤں کہ اہل جہنم کون لوگ ہیں؟ پھر آپ نے فرمایا:

((كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ))

ہر وہ شخص جو سخت مزاج ہو، لفظ "عتل" کے معنی ہیں، درشت مزاج، اور کھردرا آدمی جو بات کرے تو لٹھ مارے، اور بات کرتے وقت نرمی سے بات نہ کرے، سختی سے بات کرے، غصہ سے بات کرے، اور دوسروں کو حقیر سمجھے، ایسے شخص کو "عتل" کہا جاتا ہے، دوسرا لفظ فرمایا "جواظ"، اس کے معنی ہیں "نک چڑھا" جس کی پیشانی پر ہر وقت بل پڑے رہتے ہوں، اور معمولی قسم کے آدمی سے بات کرنے کو تیار نہیں، اور کمزور، کم حیثیت اور کم رتبہ آدمی سے بات کرنے میں اپنی توہین سمجھتا ہو، اور ہر وقت اکڑتا ہو، شیخی باز ہو۔ تیسرا لفظ فرمایا "مستکبر" جو تکبر کرنے والا ہو، اور اپنے کو بڑا سمجھنے والا ہو، اور دوسروں کو چھوٹا سمجھنے والا ہو۔ ان صفات والوں کے بارے میں فرمایا کہ جہنم والے ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ عتل، جواظ اور مستکبر ہیں، اور اپنے کو بڑا سمجھنے والے ہیں۔

یہ بڑی فضیلت والے ہیں

اس حدیث سے اس طرح اشارہ فرمادیا کہ غریب اور مسکین لوگوں کو کم حیثیت اور کم رتبہ سمجھ کر ان کی حقارت دل میں مت لاؤ، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں ان کی بڑی فضیلت ہے۔ حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ایمان لانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ہر طرح کے لوگ تھے، بلکہ زیادہ تعداد ایسے حضرات کی تھی جو مالی اعتبار سے بڑی حیثیت نہیں رکھتے تھے، اور حضور اقدس ﷺ کی مجلس میں سب مل کر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک طرف حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں، جو بڑے صاحب ثروت اور دولت مند تھے، اور دوسری طرف حضرت بلال حبشی، سلمان فارسی اور صہیب رومی رضی اللہ عنہم بھی بیٹھے ہیں، جو کبھی دو دو تین تین وقت کے فاقے سے ہوتے تھے۔

یہ فاقہ مست لوگ

چنانچہ ایک دن کفار مکہ نے حضور اقدس ﷺ سے کہا کہ ہم آپ کے پاس آنے کو تیار ہیں، اور آپ کی بات سننے کو تیار ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ کے پاس ہر وقت معمولی قسم کے فاقہ مست لوگ بیٹھے رہتے ہیں، اور ان کے ساتھ بیٹھنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ اس سے ہماری شان میں فرق آتا ہے۔ اس لئے آپ ان کی مجلس الگ کر دیں اور ہمارے لئے علیحدہ مجلس منعقد کریں۔ اس وقت ہم آپ کے پاس آکر آپ کی باتیں سننے کے لئے تیار ہیں۔ بظاہر اس میں کوئی خرابی نہیں تھی کہ ان کے لئے علیحدہ وقت مقرر کر دیا جاتا۔ تاکہ اس وقت میں آکر آپ کی باتیں سن لیتے۔ اور ہوسکتا ہے دین کی باتیں سن کر ان کی اصلاح ہو جائے۔ ہم جیسا کوئی ہوتا تو ان کی بات مان بھی لیتا۔ لیکن بات اصول کی تھی۔ اس لئے فوراً قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾(۱)

"اور ان لوگوں کو مت دور کیجئے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام اس کی رضا کا قصد کرتے ہوئے پکارتے ہیں"

چنانچہ آپ نے اعلان فرمایا کہ حق کی طلب لے کر آنا چاہتے ہو تو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنا ہوگا۔ اور اگر نہیں بیٹھنا چاہتے تو اللہ تعالیٰ تم سے بے نیاز ہے۔ اور اللہ کا رسول تم سے بے نیاز ہے۔ لیکن تمہارے لئے الگ مجلس منعقد نہیں کی جائے گی۔(۲)

انبیاء کرام علیہم السلام کے متبعین نادار ہوتے ہیں

دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا کہ اس وقت کے کفار نے بھی ان سے یہی کہا:

﴿مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ﴾(۳)

"ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی اتباع انہی لوگوں نے کی ہے، جو ہم میں بالکل رذیل قسم کے لوگ ہیں، وہ بھی محض سرسری رائے سے"

مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کے پیچھے کس طرح آسکتے ہیں، اس لئے کہ ہم تو بڑے عقل مند اور

---

(۱) الانعام: ۵۲

(۲) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضل سعد بن أبی وقاص، رقم: ٤٤٣٤، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، رقم: ٤١١٨

(۳) هود: ۲۷

بڑی شان والے لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ جن کو تم رذیل کہہ رہے ہو، کمزور غریب اور فقیر سمجھ رہے ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں یہ لوگ بڑے رتبے والے ہیں، لہٰذا ان کو حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو۔ یہاں اصول کا معاملہ ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ تمہاری امارت اور تمہاری سرداری اور دولت مندی کے بل بوتے پر تمہیں فوقیت دے دی جائے اور یہ وہ اصول ہے جس پر اللہ اور اللہ کے رسول نے کبھی مصالحت نہیں کی، وہ ہمارے بندے دیکھنے میں چاہے کتنے کمزور ہوں اور کتنے برے لگتے ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا بہت اونچا مقام ہے۔

حضرت زاہر رضی اللہ عنہ ــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دوست

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کبھی کبھی گاؤں سے ایک صاحب آیا کرتے تھے، اور ان کا نام زاہر تھا، اور بالکل سیاہ فام آدمی اور دیہاتی تھے، اور روپے پیسے کے اعتبار سے کم حیثیت تھے۔ اور لوگوں کے دلوں میں ان کی کوئی حیثیت اور کوئی وقعت نہیں تھی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ بڑی محبت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ زاہر بازار میں کھڑے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ بازار میں ایک دیہاتی، سیاہ فام، کم حیثیت، کم رتبہ والا شخص کھڑا ہو تو اس کی طرف کون دھیان کرے گا۔ اور لباس بھی پھٹا پرانا اس کی طرف کوئی التفات بھی نہ کرے، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب اس بازار سے گزرے تو سارے بازار والوں کو چھوڑ کر حضرت زاہر کے پاس پیچھے سے تشریف لے گئے۔ اور پیچھے سے کولی بھر کر اس کی آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے کہ ایک دوست دوسرے دوست کی مذاق میں پیچھے سے آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ جب آپ نے آنکھیں بند کرلیں تو حضرت زاہر اپنے آپ کو چھڑانے لگے کہ معلوم نہیں کس نے آکر پکڑ لیا۔ اور پھر آپ نے اس طرح آواز لگائی جس طرح سامان بیچنے والا آواز لگاتا ہے کہ

((مَنْ يَّشْتَرِىْ هٰذَا الْعَبْدَ؟)) ”غلام کون خریدے گا؟

اب تک تو حضرت زاہر رضی اللہ عنہ کو معلوم نہیں تھا کہ مجھے کس نے پکڑ لیا ہے۔ اس لئے چھڑانے کی کوشش کررہے تھے۔ لیکن جب یہ الفاظ سنے تو فوراً پہچان گئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور اب اپنے آپ کو چھڑانے کے بجائے اپنی کمر کو زیادہ سے زیادہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک سے متصل کرنے لگے۔ اور بے ساختہ ان کی زبان پر یہ جملہ آیا:

> ”یا رسول اللہ! اگر آپ مجھے غلام بنا کر بیچیں گے تو میری قیمت بہت کم لگے گی۔ اس لئے کہ میری قیمت لگانے والا کوئی بڑی قیمت نہیں لگائے گا، اس لئے کہ میری حیثیت تو معمولی ہے۔“

سبحان اللہ! نبی کریم ﷺ نے جواب میں کیا عجیب جملہ ارشاد فرمایا:

((لٰكِنْ عِنْدَ اللّٰهِ لَسْتَ بِكَاسِدٍ))

اے زاہر، لوگ تمہاری قیمت کچھ لگائیں یا نہ لگائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمہاری قیمت کم نہیں۔ بلکہ بہت زیادہ ہے۔ اب دیکھئے کہ سارے بازار میں بڑے بڑے تاجر بیٹھے تجارت کر رہے ہوں گے، اور وہ روپے پیسے والے ہوں گے، لیکن حضور نبی کریم ﷺ سارے بازار والوں کو چھوڑ کر ان کا دل رکھنے اور بشارت سنانے کے لئے ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اور ان کے ساتھ اس طرح پیش آئے جس طرح بے تکلف دوست کے ساتھ انسان پیش آتا ہے۔ (۱)

اور ساری عمر حضور اقدس ﷺ یہ دعا فرماتے رہے:

((اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِیْ مِسْكِيْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْكِيْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ)) (۲)

''اے اللہ! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھئے، مسکینی کی حالت میں مجھے موت دیجئے، اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرمایئے''

ملازم کا بھی احترام کیجئے

آج قدریں بدل گئیں، تصورات بدل گئے، اب دنیا کے اندر جو باوقعت ہے، اونچے مقام اور منصب والا ہے، روپے پیسے والا ہے تو اس کی عزت بھی ہے، اس کا اکرام بھی ہے، اس کی طرف توجہ بھی ہے۔ اور جو شخص دنیاوی اعتبار سے کمزور ہے، اس کی عزت دل میں نہیں، اس کی طرف توجہ نہیں، اس کے ساتھ حقارت کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ یاد رکھئے، اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں، بعض اوقات ہم زبان سے تو کہہ دیتے ہیں: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (۳)

جو شخص جتنا زیادہ متقی ہے، اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک مکرم اور معزز ہے۔ لیکن عملاً ہمارا ان کے ساتھ برتاؤ کیسا ہے۔ تمہارے گھر میں جو نوکر کام کر رہے ہیں یا تمہارے پاس جو فقیر لوگ آتے ہیں ان کے ساتھ کس طرح بات کرتے ہو؟ ان کا دل ٹھنڈا کرتے ہو؟ یا ان کی تحقیر کرتے ہو؟ کیا ان احادیث پر عمل کرتے ہو؟ (اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے) ان کے ساتھ حقارت آمیز معاملہ کرنا بڑی خطرناک بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، مسند أنس بن مالك، رقم: ۱۲۱۸۷، الشمائل الترمذی، ص: ۱٦

(۲) سنن الترمذی، كتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء أن فقراء المهاجرين......، رقم: ۲۲۷۵، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب مجالسة الفقراء، رقم: ٤١١٦

(۳) الحجرات: ۱۳

مساکین کی فضیلت ☆

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِحْتَجَّتِ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ، فَقَالَتِ النَّارُ: فِیَّ الْجَبَّارُوْنَ وَالْمُتَكَبِّرُوْنَ، وَقَالَتِ الْجَنَّةُ: فِیَّ ضُعَفَاءُ النَّاسِ وَمَسَاكِیْنُهُمْ، فَقَضَی اللّٰهُ بَیْنَهُمَا: اِنَّكِ الْجَنَّةُ رَحْمَتِیْ اَرْحَمُ بِكِ مَنْ اَشَاءُ، وَاِنَّكِ النَّارُ عَذَابِیْ اُعَذِّبُ بِكِ مَنْ اَشَاءُ، وَلِكِلَیْكُمَا عَلَیَّ مِلْؤُهَا)) (۱)

جنت اور دوزخ کے درمیان مناظرہ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت اور دوزخ کے درمیان آپس میں مناظرہ اور مباحثہ ہو گیا کہ دونوں میں سے کون بہتر ہے۔ دوزخ نے کہا کہ میری شان اونچی ہے۔ اس لئے کہ میرے اندر بڑے بڑے جبار اور متکبر لوگ آکر آباد ہوں گے۔ یعنی جتنے جابر اور متکبر لوگ ہیں، بڑے منصب والے، بہت زیادہ مال و دولت والے، اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والے، بڑا کہنے والے، وہ سب میرے اندر گئے۔ اور اس بات پر اس نے فخر کیا۔ اس کے مقابلے میں جنت نے کہا کہ میرے اندر کمزور اور مسکین قسم کے لوگ آباد ہوں گے، اور جنت نے اس بات پر فخر کیا، پھر ان دونوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا اور جنت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تو جنت ہے اور میری رحمت کا نشان اور علامت اور اس کا مورد ہے۔ تیرے ذریعہ سے میں جس پر چاہوں گا، اپنی رحمت نازل فرمادوں گا، اور دوزخ سے خطاب کر کے فرمایا کہ تو دوزخ ہے، جو میرے عذاب کا نشان اور علامت اور اس کا مورد ہے۔ اور تیرے ذریعہ سے میں جس کو چاہوں گا، عذاب دوں گا، اور

☆ اصلاحی خطبات (۲/۲۰۲-۲۲۳) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم کراچی۔ زیر نظر بیان علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ریاض الصالحین" کے ایک حصے کا درس ہے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، باب النار یدخلها الجبارون...... الخ، رقم: ۵۰۸۲، سنن الترمذی، کتاب صفة الجنة عن رسول الله، باب ما جاء فی احتجاج الجنة والنار، رقم: ۲٤۸٤، مسند أحمد، رقم: ۷۳۹۳

دونوں سے میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں تم دونوں کو بھروں گا، جنت کو ایسے لوگوں سے بھروں گا جن کے اوپر میری رحمت نازل ہوئی، اور دوزخ کو ایسے لوگوں سے بھروں گا جن کے اوپر میرا عذاب نازل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے آمین۔

جنت اور دوزخ کیسے کلام کریں گی؟

نبی کریم ﷺ نے جنت اور دوزخ کے درمیان یہ ایک مباحثہ اور مناظرہ بیان فرمایا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے حقیقی معنی مراد ہوں کہ جنت اور دوزخ کے درمیان واقعی یہ مکالمہ ہوا ہو، کیونکہ جنت اور دوزخ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ ان دونوں کو زبان عطا فرمادیں، ان کو بولنے کی صلاحیت دیدیں، ان کے درمیان آپس میں بات چیت ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں کہ ایسی چیز کیسے بول دے گی جس کے پاس زبان نہیں ہے۔ جنت تو ایک علاقے، زمین اور باغات کا نام ہے۔ اور دوزخ آگ کا نام ہے۔ وہ کیسے بولیں گی؟ تو یہ دیکھئے کہ انسان کیسے بولتا ہے؟ انسان کے پاس بولنے کی قدرت کہاں سے آگئی ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت عطا فرمائی، تب انسان بولنے لگا۔ اگر اللہ تعالیٰ نہ دیتے تو انسان کے پاس بولنے کی طاقت کہاں سے آتی، اگر یہ طاقت اللہ تعالیٰ کسی پتھر کو دے دے تو وہ بول پڑے گا۔ اگر کسی درخت کو دے دے تو وہ بول پڑے گا، کسی زمین کو دیدی تو وہ بول پڑے گی۔

قیامت کے روز اعضاء کس طرح بولیں گے؟

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کہیں سفر پر تشریف لے جارہے تھے۔ راستے میں نئی تعلیم کے دلدادہ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کسی حدیث یا آیت پر یہ شبہ پیش کیا کہ حضرت! قرآن شریف میں آتا ہے کہ قیامت میں انسان کے اعضاء بولیں گے، قرآن کریم میں ہے کہ یہ اعضاء گواہی دیں گے، ہاتھ گواہی دے گا کہ مجھ سے یہ گناہ کیا گیا تھا۔ ٹانگ بول پڑے گی کہ میرے ذریعہ سے یہ گناہ کیا گیا تھا۔ ان صاحب نے کہا کہ حضرت! یہ عجیب بات ہے کہ ہاتھ بول پڑے گا، ٹانگ بول پڑے گی، یہ کیسے بول پڑے گی؟ حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہے، گویائی دیدیں، بولنے کی طاقت دیدیں۔ ان صاحب نے کہا کہ ایسا کبھی ہوا بھی ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ تم دلیل پوچھ رہے تھے یا نظیر پوچھ رہے تھے؟ یہ ایک منطق کی اصطلاح ہے۔ دلیل تو اتنی بھی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، جس کو چاہے گویائی عطا فرمادیں، اور ہر چیز کی نظیر ہونا ضروری نہیں ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی مثال بھی ہو۔ وہ صاحب کہنے

لگے: ویسے اطمینان کے لئے کوئی نظیر بتادیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ: یہ زبان کیسے بولتی ہے؟ چونکہ اس نے پوچھا کہ ہاتھ بغیر زبان کے کیسے بولے گا؟ حضرت نے فرمایا کہ زبان بغیر زبان کے کیسے بولتی ہے؟ یہ بھی تو ایک گوشت کا لوتھڑا ہی ہے، اس کے اندر گویائی کی قوت کہاں سے آ گئی؟ بس اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمادی، تو جو اللہ تعالیٰ اس گوشت کے اس لوتھڑے کو زبان عطا فرماسکتا ہے، وہ ہاتھ کو بھی عطا فرماسکتا ہے۔ اس لئے اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

بہرحال! نبی کریم سرورِ دوعالم ﷺ نے جنت اور دوزخ کے درمیان جو یہ مکالمہ بیان فرمایا، اس کے بالکل ٹھیک ٹھیک حقیقی معنی بھی مراد ہوسکتے ہیں کہ جنت اور دوزخ کو اللہ تعالیٰ بولنے کی طاقت دیدیں، اور ان کے درمیان مکالمہ ہو، تو یہ کوئی بعید بات نہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ایک تمثیل ہو۔

متکبرین جہنم میں جائیں گے

بہرحال! جہنم جبار اور متکبر لوگوں سے بھری ہوگی، جو لوگوں پر اپنی بڑائی جتاتے ہیں، اور تکبر کا معاملہ کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لوگوں کے ساتھ بڑائی جتاتے اور شیخیاں بھگارتے ہیں، ایسے لوگوں سے جہنم بھری ہوگی۔

کمزور اور مسکین لوگ جنت میں جائیں گے

اور جنت ضعفاء اور مساکین سے بھری ہوگی، جو بظاہر دیکھنے میں کمزور معلوم ہوں، جو متواضع اور مسکین طبع ہوں، جو دوسروں کے ساتھ نرمی کے ساتھ پیش آئیں، تواضع کے ساتھ پیش آئیں، اپنے آپ کو کمتر سمجھیں، ایسے لوگوں سے جنت بھری ہوگی۔

تکبر اللہ کو ناپسند ہے

جہنم اللہ تعالیٰ نے متکبرین سے بھردی ہے۔ اس واسطے کہ متکبر وہ شخص ہے جو دوسروں پر اپنی بڑائی جتائے، اپنے آپ کو بڑا سمجھے، اور دوسروں کو چھوٹا سمجھے، اپنے آپ کو عظیم سمجھے، دوسروں کو حقیر سمجھے، اور اللہ تعالیٰ کو یہ تکبر اور بڑائی ایک لمحے کے لئے بھی پسند نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِیْهِ قَذَفْتُهُ فِی النَّارِ)) (۱)

بڑائی تو درحقیقت میری چادر ہے، میری صفت ہے، اللہ اکبر، اللہ بڑا ہے، جو شخص مجھ سے اس

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب اللباس، باب ما جاء في الكبر، رقم: ۳۵٦٧، مسند أحمد، رقم: ۷۰۷۸

چادر میں جھگڑا کرے گا، میں اس کو آگ میں ڈال دوں گا۔ حقیقت میں یہ تکبر جہنم کی طرف لے جانے والا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس گناہ سے بچائے۔ اور یہ اتنا شدید گناہ ہے کہ یہ اُم الامراض ہے، گناہوں کی جڑ ہے۔ اس ایک تکبر سے نہ جانے کتنے گناہ نکلتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب انسان کے دل میں تکبر آ گیا، اور اپنی بڑائی کا خیال آ گیا تو اس کے بعد وہ انسان کو طرح طرح کے گناہوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

متکبر کی مثال

عربی زبان کی ایک بڑی عجیب اور حکیمانہ مثل ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ متکبر کی مثال اس شخص کی سی ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو، اور وہ بلند ہونے کی وجہ سے دوسروں کو چھوٹا سمجھتا ہے، اور دوسرے اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں، تو متکبر جب کبھی وہ دوسرے پر نگاہ ڈالے گا تو اس کے دل میں دوسروں کی حقارت آئے گی۔ اور کسی بھی مؤمن کے اوپر، مؤمن تو کجا، کافر کے اوپر بھی حقارت کی نگاہ ڈالنا گناہِ کبیرہ ہے، اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین۔ اب جو شخص متکبر ہو گا وہ دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ اور جتنے انسانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا، اتنے ہی گناہِ کبیرہ اس کے نامۂ اعمال میں بڑھتے چلے جائیں گے۔

پھر متکبر جب دوسروں سے بات کرے گا تو ایسے کرخت انداز میں بات کرے گا جس سے دوسرے کا دل ٹوٹے۔ اور کسی مسلمان کا دل توڑنا بھی گناہ ہے۔

کافر کو بھی حقارت سے مت دیکھو

اور یہ جو میں نے کہا کہ کسی کافر کو بھی حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو، یہ بھی گناہ ہے۔ اس لئے کہ کیا پتہ کہ کسی وقت اللہ تعالیٰ اس کافر کو ایمان کی توفیق دیدیں، اور وہ تم سے آگے بڑھ جائے۔ لہٰذا کافر کی حقارت نہیں ہونی چاہئے۔ البتہ کفر کی حقارت ہونی چاہئے۔ فسق اور گناہ کی حقارت تو دل میں ہو، لیکن گناہ گار کی ذات سے حقارت نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن یہ فرق کہ کس وقت دل میں گناہ اور کفر کی حقارت ہے، اور کس وقت اس آدمی کی حقارت دل میں ہے جو اس کفر اور گناہ میں مبتلا ہے، آدمی کو بسا اوقات اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ چیز بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

ہم اور آپ تو کس شمار میں ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:

''میں اپنے آپ کو ہر مسلمان سے فی الحال اور کافر سے فی المآل واﻻحتمال کمتر سمجھتا ہوں۔ یعنی اپنے آپ کو ہر مسلمان سے اس وقت اور کسی کافر کو اس احتمال پر کہ شاید یہ کسی وقت مسلمان ہو جائے، اور مجھ سے آگے بڑھ جائے، اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہوں''

''تکبر'' اور ''ایمان'' جمع نہیں ہو سکتے

اور تکبر ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا، جب انسان کے دل میں تکبر آ جاتا ہے ـــــ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ تو بعض اوقات ایمان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ آخر یہ تکبر ہی تو تھا جو شیطان اور ابلیس کو لے ڈوبا۔ اس سے کہا گیا کہ سجدہ کر، بس دماغ میں یہ تکبر آ گیا کہ میں تو آگ سے بنا ہوا ہوں، اور یہ مٹی سے بنا ہوا ہے، دل میں اس کی حقارت آ گئی، اور اپنی بڑائی آ گئی۔ ساری عمر کے لئے راندۂ درگاہ اور متروک اور مردود ہو گیا، یہ تکبر اتنی خطرناک چیز ہے۔

''تکبر'' ایک خفیہ مرض ہے

اس لئے حضور اقدس ﷺ جو ہم اور آپ پر کہیں زیادہ مہربان ہیں، وہ اس حدیث کے ذریعہ یہ سبق دے رہے ہیں کہ دیکھو، تکبر قریب پھٹکنے نہ پائے۔ یہ ایسی بیماری ہے کہ بسا اوقات بیمار کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ میں اس بیماری میں مبتلا ہوں۔ حقیقت میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، لیکن حقیقت میں اس کے اندر تکبر ہوتا ہے، اس کا پتہ چلانا بھی آسان نہیں، اسی لئے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ کسی اللہ والے سے کسی شیخ کامل سے تعلق قائم کرو۔

تصوف کا مقصد

یہ پیری مریدی کا جو رواج ہے کہ کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تو برکت ہو گی، اور وہ کچھ وظیفے بتا دیں گے تو وظیفہ پڑھ لیں گے، وغیرہ۔ خوب یاد رکھئے کہ یہ اس کا اصل مقصد نہیں ہے۔ کسی شیخ کے پاس جانے یا کسی مصلح کے پاس جانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ جو دل کی بیماریاں ہیں، جن میں سرِ فہرست یہ تکبر کی بیماری ہے، ان کا علاج کرائیں۔ جیسے بیمار کو پتہ نہیں ہوتا کہ میں کس بیماری میں مبتلا ہوں۔ طبیب اسے اس کی بیماری سے مطلع کرتا ہے اور پھر اس کا علاج تجویز کرتا ہے، اسی طرح شیخ روحانی بیماریوں کا علاج کرتا ہے۔ اسی تشخیص کے لئے شیخ سے رجوع کیا جاتا ہے، ہاتھ میں ہاتھ دیدینا معالج سے رابطہ قائم کرنے کی ایک صورت ہے۔

روحانی علاج کی حقیقت

آج کل ایک مصیبت یہ آگئی ہے کہ تعویذ گنڈوں کا نام ''روحانی علاج'' رکھ دیا ہے، تعویذ لکھوالیے، گنڈے لکھوالیے، دم درود کرالیا، بس اس کا نام ''روحانی علاج'' رکھ لیا۔ خوب سمجھ لیجئے۔ یہ روحانی علاج نہیں، بلکہ روحانی علاج یہ ہے کہ اپنے دل کی جو بیماریاں ہیں، مثلاً تکبر، حسد، بغض، عداوت وغیرہ جوانسان کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، ان کے علاج کے لئے کسی شیخ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور شیخ پھر پتہ لگاتا ہے کہ اس کے دل میں تکبر تو نہیں ہے، اگر ہے تو اس کا آسان علاج اس شخص کے لئے کیا ہے؟ پھر وہ اپنے تجربہ سے مناسبِ حال علاج تجویز کرتا ہے۔ اس کی بتائی ہوئی تجویز پر عمل کرنا یہ بیعت کی حقیقت ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طریقۂ علاج

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کے یہاں سب سے زیادہ زور اس بات پر تھا کہ ان بیماریوں میں مبتلا لوگ آتے، اور آپ ان کا علاج فرماتے۔ ان کا علاج بھی کوئی دوا پلا کر نہیں ہوتا تھا۔ وظیفے پڑھوا کر نہیں ہوتا تھا، بلکہ عمل سے ہوتا تھا۔ بہت سے لوگوں کا علاج اس طرح کیا گیا کہ ایک تکبر میں مبتلا شخص آیا۔ بس اس کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ جو لوگ مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آئیں، تم ان کے جوتے سیدھے کیا کرو، بس اس کام پر لگادیا، نہ کوئی وظیفہ، نہ کوئی تسبیح، نہ کوئی ورد۔ اس کو دیکھ کر پہچان لیا کہ اس کے اندر تکبر کی بیماری ہے، اور اس کا یہ علاج اس کے لئے مناسب ہوگا۔

تکبر کا راستہ جہنم کی طرف

اللہ تعالیٰ اس بیماری سے ہمیں بچائے۔ غرض یہ بیماری انسان کے قلب کے اندر اس طرح داخل ہوتی ہے کہ بسا اوقات اس کو پتہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں ٹھیک ٹھاک آدمی ہوں۔ لیکن حقیقت میں وہ تکبر کی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور پھر اس کا سیدھا راستہ جہنم کی طرف جارہا ہے۔ اور ایمان حقیقی تکبر کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا، اس واسطے اس کے علاج کی فکر کی ضرورت ہے۔ اور اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تنبیہ فرمائی ہے۔

جنت میں ضعفاء اور مساکین کی کثرت

اس حدیث کے دوسرے حصے میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جنت ضعفاء اور مساکین سے بھری ہوئی ہے، یعنی جن کو تم دنیا کے اندر بے حقیقت سمجھتے ہو، غریب، غرباء، فقیر فقراء، معمولی حیثیت والے، معمولی کپڑے پہننے والے، ایسے لوگ جن کی طرف لوگ التفات بھی نہیں کرتے، ایسے لوگ اکثر و بیشتر اللہ جل جلالہ سے قریب ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اللہ کی عظمت اور محبت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ان پر نازل ہوتی ہیں۔ اور جنت کے اندر اکثر لوگ ایسے ہوں گے۔

قرآن کریم کے اندر انبیاء علیہم السلام کے واقعات دیکھ لیجئے کہ دنیا میں جتنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے، ان سب کی اتباع کرنے والے اور پیچھے چلنے والے، یہ غریب غرباء اور کمزور مسکین قسم کے لوگ تھے۔ اور یہی وجہ کہ تمام مشرکین یہ اعتراض کرتے تھے ہم ان کے ساتھ کیسے بیٹھیں؟ ان میں تو کوئی ماہی گیر ہے۔ کوئی مچھیرا ہے۔ کوئی بڑھئی ہے۔ کوئی دوسرا معمولی پیشے والا ہے۔ یہ سب آپ کے پاس آکر بیٹھتے ہیں۔ اور ہم تو بڑے سردار ہیں۔ ہم ان کے ساتھ کیسے بیٹھیں؟ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں کے اوپر فضل فرمایا۔ اور ان کو وہ مقام بخشا کہ دوسرے اس مقام کو ترستے رہے۔ لہٰذا ظاہری اعتبار سے جو لوگ کمزور نظر آتے ہیں ان کو کبھی یہ نہ سمجھو کہ معاذ اللہ یہ حقیر ہیں۔ ان کی تحقیر کبھی دل میں نہ لاؤ۔ اور ان کے ساتھ معاملہ اور برتاؤ ایسا نہ کرو۔

ضعفاء اور مساکین کون ہیں؟

اس حدیث میں دوسری بات جو خاص طور پر عرض کرنے کی ہے، وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ نے دو لفظ استعمال فرمائے۔ ایک ''ضعفاء''، اور دوسرے ''مساکین''۔ ضعفاء کے معنی یہ ہیں کہ جسمانی اعتبار سے کمزور، مالی اعتبار سے کمزور، رتبے کے اعتبار سے کمزور، منصب کے اعتبار سے کمزور، اور لفظ ''مساکین'' جمع ہے ''مسکین'' کی۔ اور ''مسکین'' کے دو معنی آتے ہیں، ایک تو مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس پیسے نہ ہوں، اور جو مفلس ہو، دوسرے مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس پیسے ہوں یا نہ ہوں لیکن اس کے مزاج میں مسکینی ہو، اس کی طبیعت میں مسکینی ہو، چاہے اس کے پاس پیسے ہوں، اور وہ مالدار بھی ہو، لیکن طبیعت میں تکبر پاس سے نہیں گزرا، وہ مسکینوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے، مسکینوں کو اپنے قریب رکھتا ہے، اس کی طبیعت میں عاجزی ہے، تکبر کی بات کبھی نہیں کرتا، ایسا شخص مسکین کے زمرے میں داخل ہے۔

مسکنت اور مالداری جمع ہو سکتے ہیں

لہٰذا یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ صاحب! اگر کسی کے پاس مال ہے، اور وہ خوشحال ہے تو وہ ضرور جہنم میں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ مراد یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو مال دیا ہے، دولت عطا فرمائی ہے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت ہے۔ لیکن اگر طبیعت میں مسکینی اور عاجزی ہے، تکبر نہیں ہے، اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ اچھا ہے، اللہ تعالیٰ کے حقوق اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کے حقوق پوری طرح ادا کرتا ہے تو وہ بھی انشاء اللہ مسکین کے زمرے میں داخل ہے۔

فقر اور مسکینی الگ الگ چیزیں ہیں

اور ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ دعا فرمائی ہے:

((اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ))(۱)

اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھیو، اور مسکینی کی حالت میں مجھے موت دیجئے، اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرمایئے۔ اور ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے یہ دعا فرمائی ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْفَقْرِ)) (۲)

اے اللہ! میں فقر سے مفلسی سے اور دوسروں کی احتیاج سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ آپ نے فقر سے تو پناہ مانگی اور مسکینی کی دعا فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ مسکینی کوئی اور چیز ہے۔ یہ فقر و فاقہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ مسکینی سے مراد طبیعت کی مسکینی، مزاج کی مسکینی، تواضع، خاکساری اور مسکینوں کے ساتھ اچھا معاملہ وغیرہ ہے۔ اگر یہ خاکساری دلوں میں پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس بشارت میں داخل ہو سکتے ہیں جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہے۔

جنت اور جہنم کے درمیان اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

پھر حدیث کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کے درمیان اس طرح فیصلہ فرما دیا کہ جنت سے تو یہ کہہ دیا کہ تم تو میری رحمت کا نشان ہو، لہٰذا جس پر مجھے رحمت کرنی ہوگی، تمہارے ذریعے رحمت

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللہ، باب ما جاء أن فقراء المھاجرین...... الخ، رقم: ۲۲۷۵، سنن ابن ماجه، کتاب الزھد، باب مجالسة الفقراء، رقم: ۴۱۱۶۔

(۲) سنن النسائی، کتاب الاستعاذة، باب الاستعاذة من الذلة، رقم: ۵۳۶۵، سنن أبی داؤد، باب فی الاستعاذة، رقم: ۱۳۲۰، مسند أحمد، مسند أبی ھریرة، رقم: ۷۷۰۸۔

کروں گا۔ اور جہنم سے فرمادیا کہ تم میرے عذاب کا نشان ہو۔ جس کو عذاب دینا ہوگا، تمہارے ذریعے دوں گا۔ اور دونوں کو بھر کے رہوں گا، جنت کو بھی انسانوں سے بھروں گا اور جہنم کو بھی بھروں گا، اس واسطے کہ دنیا میں دونوں قسم کے انسان پائے جائیں گے، وہ بھی جو جنت کے حقدار ہیں، جنت کے اعمال کرنے والے ہیں، اور وہ بھی جو جہنم کے اعمال کرنے والے ہیں۔ بس! اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمادے جن کو اللہ تعالیٰ نے جنت کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ آمین ثم آمین۔

ایک بزرگ کو آخرت کا خوف

ایک بزرگ تھے، ان کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ ساری زندگی میں ساری عمر میں کبھی نہیں ہنسے، ان کے منہ پر کبھی تبسم بھی نہیں دیکھا گیا۔ ہر وقت فکرمند رہتے تھے۔ کسی شخص نے ان سے پوچھا کہ حضرت! ہم نے آپ کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ آپ کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نظر آئی۔ آپ ہمیشہ فکرمند نظر آتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ بھائی! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے حدیث شریف میں پڑھا ہے کہ کچھ مخلوق تو ایسی ہے جو اللہ تعالیٰ نے جنت کے لئے پیدا فرمائی ہے، اور کچھ مخلوق ایسی ہے جو جہنم کے لئے پیدا فرمائی ہے، مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں کونسے زمرے میں داخل ہوں۔ جب تک مجھے یہ پتہ نہ چل جائے کہ میں جنت والے زمرے میں داخل ہوں، اس وقت تک ہنسی کیسے آئے؟ بس اس فکر کے اندر ہر وقت مبتلاء رہتا ہوں۔

مؤمن کی آنکھیں کیسے سو سکتی ہیں؟

کسی بزرگ کا شعر ہے:

وَ كَيْفَ تَنَامُ الْعَيْنُ وَ هِيَ قَرِيْرَةٌ
وَ لَمْ تَدْرِ فِيْ اَيِّ الْمَحَلَّيْنِ تَنْزِلُ!

"مؤمن کی آنکھ اطمینان اور چین سے کیسے سو سکتی ہے، جب تک کہ اس کو یہ پتہ نہ چلے کہ دونوں مقامات میں سے کس مقام پر اس کا ٹھکانہ ہوگا"

روح قبض ہوتے ہی مسکراہٹ آگئی

لہٰذا ساری عمر ان بزرگ کو ہنسی نہیں آئی۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ جس وقت انتقال ہوا تو روح قبض ہوتے ہی چہرے پر مسکراہٹ آگئی کہ آج پتہ چل گیا کہ کس زمرے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا فرمایا ہے۔

غفلت کی زندگی بری ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ جن لوگوں کو یہ فکر عطا فرماتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے مقامِ رضا میں ہیں، یا معاذ اللہ، مقامِ غضب میں ہیں، ان کو ہنسی کیسے آسکتی ہے۔ لیکن یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہم اور آپ پر کرم ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ کیفیت طاری نہیں ہونے دیتے۔ اگر سارے انسانوں پر یہی کیفیت طاری ہو جائے تو دنیا کا کاروبار ٹھپ ہو جائے۔ دنیا کا کاروبار نہ چل سکے۔ اس واسطے یہ کیفیت طاری نہیں ہونے دیتے۔ لیکن حضورِ اقدس ﷺ جابجا احادیث میں متنبہ فرماتے رہتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ غفلت میں مبتلا ہو جاؤ، اور ساری عمر یہ خیال نہ آئے کہ کہاں جا رہے ہو۔ جنت کی طرف جا رہے ہو یا جہنم کی طرف جا رہے ہو۔ بلکہ آنکھیں کھول کر دیکھو کہ جس راستے پر تم جا رہے ہو وہ جنت کی طرف جانے والا ہے یا جہنم کی طرف جانے والا ہے، اور اپنے اعمال پر نظر رکھو کہ ہم کونسے اعمال کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو اس مخلوق میں شامل فرمادے جو اس نے جنت کے لئے پیدا فرمائی ہے۔ آمین

ظاہری صحت وقوت، حسن وجمال پر مت اتراؤ

اگلی حدیث ہے:

”عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((اِنَّهٗ لَیَاْتِیْ الرَّجُلُ الْعَظِیْمُ السَّمِیْنُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ، لَا یَزِنُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ایک ایسا شخص لایا جائے گا جو جسمانی اعتبار سے بڑا موٹا تازہ ہوگا اور بڑے مرتبے والا ہوگا لیکن اللہ کے نزدیک اس کا وزن ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا، یہ ساری دنیاوی عظمت اور یہ جسمانی صحت اور جسمانی حسن یہ سب دھرا رہ گیا، کیوں؟ اس لئے کہ اس شخص نے باوجود صحت وطاقت کے اللہ جل جلالہ کو راضی کرنے والے کام نہیں کیے، اس لئے اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی اس کی حیثیت نہیں۔

اس حدیث کا مقصود بھی یہی ہے کہ اپنے ظاہری حسن وجمال پر، اپنی صحت پر، اپنی قوت پر،

(۱) صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب اولئك الذین کفروا بآیات ربهم ولقائه فحبطت، رقم: ۴۳۶۰، صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، باب، رقم: ۴۹۹۱

اپنے مرتبے پر، اپنے مال و دولت پر بھی نہ اتراؤ، ہوسکتا ہے کہ یہ مال و دولت، یہ مرتبہ، یہ صحت و قوت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر سے بھی زیادہ بے حقیقت ہو، اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ اعمال کیسے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے راستے پر چل رہے ہو یا نہیں۔

مسجد نبوی میں جھاڑو دینے والی خاتون

وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ امْرَأَةً سَوْدَآءَ كَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ أَوْ شَابًّا فَفَقَدَهَا أَوْ فَقَدَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَ عَنْهَا أَوْ عَنْهُ، فَقَالُوْا: مَاتَ، قَالَ: أَفَلَا كُنْتُمْ آذَنْتُمُوْنِيْ بِهٖ. فَإِنَّهُمْ صَغَّرُوْا أَمْرَهَا أَوْ أَمْرَهُ، فَقَالَ: دُلُّوْنِيْ عَلٰى قَبْرِهٖ، فَدَلُّوْهُ فَصَلّٰى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّ هٰذِهِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوْءَةٌ ظُلْمَةً عَلٰى أَهْلِهَا وَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلَاتِيْ عَلَيْهِمْ))(۱)

اس حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ایک واقعہ بیان فرمارہے ہیں فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک خاتون تھیں، جو کبھی کبھی مسجد نبوی میں آکر جھاڑو دیا کرتی تھیں، اور وہ خاتون سیاہ فام تھیں، لیکن وہ خاتون چند روز تک آپ کو نظر نہیں آئیں، اور مسجد نبوی کی جھاڑو اور صفائی کے لئے نہ آئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاتون کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ کافی دن سے وہ خاتون نظر نہیں آرہی ہیں، اور مسجد کی جھاڑو لگانے نہیں آرہی ہیں۔ آپ اس سے اندازہ لگایئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایک فرد کے ساتھ کس درجہ کا تعلق تھا۔ وہ خاتون آتیں، جھاڑو لگا کر چلی جاتیں۔ لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حافظہ اور یادداشت میں وہ محفوظ تھیں، اس لئے صحابہ کرام سے آپ نے پوچھا کہ کیوں نہیں آئیں" کیا بات ہے؟"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ان کا تو انتقال ہوگیا"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ان کے انتقال کے بارے میں آپ نے مجھے بتایا تک نہیں"

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے زبان سے کچھ نہ کہا لیکن انداز ایسا اختیار فرمایا جس سے یہ بتانا مقصود ہو کہ حضور! وہ تو ایک معمولی قسم کی خاتون تھیں، اگر انتقال ہوگیا تو اتنی بڑی اہم بات نہیں تھی کہ آپ جیسی ہستی کو اس کے بارے میں بتایا جاتا، تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے بتاؤ کہ اس کی قبر کہاں

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب الصلاة على القبر بعد ما يدفن، رقم: ۱۲۵۱، صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب الصلاة على القبر، رقم: ۱۵۸۸، سنن أبي داود، كتاب الجنائز، باب الصلاة على القبر، رقم: ۲۷۸۸، سنن ابن ماجه، كتاب ما جاء في الجنائز، باب ما جاء في الصلاة على القبر، رقم: ۱۵۱٦، مسند أحمد، رقم: ۸۲۸۰۔

ہے؟ کس جگہ ان کو دفن کیا ہے؟''

آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر اس کی قبر پر تشریف لے گئے۔ اور جا کر ان کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھی۔

قبر پر نمازِ جنازہ کا حکم

عام طور سے نمازِ جنازہ کا حکم یہ ہے کہ اگر کسی کی نمازِ جنازہ پڑھ لی گئی ہو تو اس کے بعد قبر پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں۔ اور اگر کسی کو نمازِ جنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا گیا ہو تب بھی شرعی حکم یہ ہے کہ جب تک میت کے پھولنے پھٹنے کا احتمال نہ ہو اس وقت تک تو اس کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھ سکتے ہیں، اگر اندیشہ ہو کہ اتنے دن گزرنے کی وجہ سے لاش پھول پھٹ گئی ہو گی تو اس کے بعد قبر پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ نے اس خاتون کی خصوصیت کے طور پر، اس کے امتیاز کے طور پر اور صحابہ کرام کو جتانے کے لئے آپ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور نمازِ جنازہ پڑھی اور نماز پڑھنے کے بعد فرمایا کہ یہ قبریں ظلمتوں اور اندھیروں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ میری نماز کی برکت سے ان قبروں میں نور پیدا فرما دیتے ہیں۔

کسی کو حقیر مت سمجھیں

یہ عمل آپ نے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے فرمایا کہ کسی بھی شخص کو، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، وہ اگر دنیاوی اعتبار سے معمولی رتبے کا ہے، اس کو یہ نہ سمجھو کہ یہ حقیقت میں بھی معمولی رتبے کا ہے اس کو اہمیت دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ پتہ نہیں کہ وہ اللہ جل شانہ کے نزدیک کیا مقام رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا کیا مرتبہ ہو۔

ہر بیشہ گماں مبر کر خالی است
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

لہٰذا کسی بھی انسان کو معمولی ہیئت میں دیکھ کر یہ نہ سمجھو کہ یہ ایک بے حقیقت انسان ہے، کیا پتہ کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کتنا مقبول ہے۔

یہ پراگندہ بالوں والے

وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰہِ لَاَبَرَّهُ)) (۱)

سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا کہ بہت سے ایسے لوگ جو پراگندہ بال والے ہیں، ان کے بالوں میں کنگھی نہیں کی گئی ہے، اور غبار آلود جسم اور چہرہ والے، محنت اور مزدوری کر کے کماتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے جسم پر اور چہرہ پر گرد کی تہہ جمی ہوئی ہے اور یہ لوگ اگر کسی کے دروازے پر جائیں تو لوگ ان کو دھکا دے کر ان کو نکال دیں، یہ لوگ دنیاوی اعتبار سے تو بے حقیقت ہیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں ان کی یہ قدر و قیمت ہوتی ہے کہ اگر اللہ جل جلالہ پر کوئی قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیں۔ یعنی اگر یہ لوگ قسم کھا کر کہہ دیں کہ فلاں کام ہوگا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ وہی کام کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ کہہ دیں کہ یہ کام نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ وہ کام روک دیتے ہیں۔

ناداروں کے ساتھ ہمارا سلوک

ان تمام حدیثوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ظاہری اعتبار سے کسی انسان کو دیکھ کر اس کو معمولی اور بے حقیقت نہ سمجھو۔ زبان سے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں، اور اللہ کے نزدیک امیر غریب برابر ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں غریب کی بڑی قیمت ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جب ہم ان کے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں، اور جب ان کے ساتھ سلوک کرتے ہیں، کیا اس وقت واقعی یہ باتیں ہمارے ذہن میں رہتی ہیں؟ اپنے نوکروں کے ساتھ، اپنے خادموں کے ساتھ، اپنے ماتحتوں کے ساتھ، اور دنیا میں جو غریب غرباء نظر آتے ہیں، ان کے ساتھ معاملہ کرتے وقت یہ حقیقت ہمارے ذہن میں رہتی ہے یا نہیں؟ ہوتا یہ ہے کہ زبان سے تو میں تقریر کرلوں گا۔ اور آپ تقریر سن لیں گے۔ لیکن جب کرنے کا معاملہ آتا ہے تو اس وقت سب بھول جائیں گے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے خادم کے ساتھ برتاؤ

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ ان حقائق کو مدنظر رکھنے کی توفیق دیتے ہیں، ان کا قصہ سن لیجئے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے بھائی نیاز۔ خانقاہ میں آنے جانے والے تمام حضرات انہیں ''بھائی نیاز'' کہہ کر پکارتے تھے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص منہ چڑھے خادم تھے،

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الضعفاء والخاملین، رقم: ۴۷۵۴

اور چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت کرتے تھے اور حضرت والا کی صحبت بھی حاصل تھی، تو ایسے لوگوں میں کبھی ناز بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ تھے تو "نیاز" لیکن تھوڑا سا "ناز" بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے خانقاہ میں آنے جانے والوں سے کبھی سخت ہو جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی صاحب نے حضرت والا سے بھائی نیاز کی شکایت کی حضرت یہ لوگوں کے ساتھ لڑتے جھگڑتے ہیں، اور مجھے بھی انہوں نے برا بھلا کہا ہے۔ چونکہ حضرت والا کو پہلے بھی ان کی کئی شکایتیں پہنچ چکی تھیں، اس لئے حضرت والا کو بہت تکلیف ہوئی کہ یہ دوسروں کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے ہیں۔ حضرت والا نے ان کو بلایا، اور ڈانٹ کر فرمایا کہ میاں نیاز! یہ تم کیا ہر آدمی سے لڑتے جھگڑتے پھرتے ہو۔ انہوں نے سن کر چھوٹتے ہی جواب میں کہا کہ حضرت! جھوٹ نہ بولو اللہ سے ڈرو۔ اب یہ الفاظ ایک نوکر اپنے آقا سے کہہ رہا ہے۔ آقا بھی کونسے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ حقیقت میں ان کا مقصد بھی یہ نہیں تھا کہ حضرت! آپ جھوٹ نہ بولیں۔ بلکہ اصل میں ان کا مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے آپ تک شکایت پہنچائی ہے، انہوں نے جھوٹی شکایت پہنچائی ہے۔ ان کو چاہئے کہ جھوٹ نہ بولیں، اللہ سے ڈریں۔ لیکن جذبات میں بے اختیار لفظ زبان سے یہ نکلا کہ حضرت! جھوٹ نہ بولو اللہ سے ڈرو۔ اب دیکھئے کہ اگر ایک آقا اپنے نوکر کو ڈانٹ رہا ہو، اور نوکر یہ کہہ دے کہ جھوٹ نہ بولو تو اور زیادہ غصہ آئے گا اور زیادہ اشتعال پیدا ہوگا۔ لیکن یہ حضرت حکیم الامت تھے۔ ادھر انہوں نے کہا کہ جھوٹ نہ بولو اللہ سے ڈرو، ادھر حضرت والا نے فوراً گردن جھکالی اور فرمایا: "استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ"

اللہ تعالیٰ کی حدود پر رک جانے والے

اور پھر بعد میں فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، وہ یہ کہ میں نے ایک طرفہ بات سن کر ان کو ڈانٹنا شروع کر دیا، اور حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ کسی ایک کی بات سن کر فوراً فیصلہ نہ کریں، جب تک دوسری طرف کی بات بھی نہ سن لیں۔ پہلے مجھے ان سے پوچھنا چاہئے تھا کہ کیا قصہ ہوا؟ وہ اپنا موقف پہلے بیان کر دیتا، پھر اس کے بعد کوئی فیصلہ کرتے، لیکن میں نے پہلے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا۔ تو غلطی مجھ سے ہوئی، اور جب اس نے کہا کہ اللہ سے ڈرو تو میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا، معلوم ہوا کہ واقعۃً مجھ سے غلطی ہوئی، اور میں نے استغفر اللہ استغفر اللہ پڑھا۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے کہا گیا کہ

"کان وقافًا عند حدود الله"

اللہ کے حدود کے آگے رک جانے والے۔ بھائی نوکروں کے ساتھ اور خادموں کے ساتھ اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ بھی حسن سلوک اور اچھا برتاؤ کرنا چاہئے، ان کے ساتھ کسی وقت تحقیر کا معاملہ نہ

کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ فرمائیں۔ آمین۔

جنت اور دوزخ میں جانے والے

"وَعَنْ أُسَامَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((قُمْتُ عَلٰى بَابِ الْجَنَّةِ، فَكَانَ عَامَّةَ مَنْ دَخَلَهَا الْمَسَاكِيْنُ وَاَصْحَابُ الْجَدِّ مَحْبُوْسُوْنَ غَيْرَ أَنَّ اَصْحَابَ النَّارِ قَدْ أُمِرَ بِهِمْ إِلَى النَّارِ، وَقُمْتُ عَلٰى بَابِ النَّارِ، فَإِذَا عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا النِّسَآءُ))(۱)

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے چہیتے صحابی ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنٰی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں، گویا کہ یہ منہ بولے پوتے ہیں، وہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا، یہ شاید معراج کا واقعہ ہوگا، کیونکہ معراج کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت اور دوزخ دونوں کی سیر کرائی گئی، یا کسی اور موقع پر عالم رویت یا عالم کشف میں ایسا ہوا ہوگا، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، میں نے دیکھا کہ اکثر لوگ جو مجھے جنت میں نظر آئے، وہ مسکین قسم کے لوگ تھے، اور میں نے دیکھا کہ دنیا میں جن کو خوش بخت شمار کیا جاتا تھا کہ بڑے خوشحال ہیں، بڑے صاحبِ منصب ہیں، اور دولت مند ہیں، جن کو لوگ دنیا میں بڑی قسمت والے سمجھتے ہیں، وہ سب جنت کے دروازے پر رکے کھڑے ہیں، جیسا کہ ان کو کسی نے روکے رکھا ہے کہ داخل نہیں ہوسکتے۔

اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس لئے رکے کھڑے تھے کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے لائق تو تھے، لیکن حساب و کتاب اتنا لمبا چوڑا تھا کہ جب تک اس حساب کتاب کو صاف نہ کریں، اس وقت تک جنت میں داخلے کی اجازت نہیں، اس لئے وہ دروازے پر کھڑے ہیں ۔ اور ان میں جو جہنم والے تھے ان کے بارے میں حکم ہوگیا تھا کہ ان کو جہنم میں لے جایا جائے اور جہنم کے دروازے پر میں نے کھڑے ہو کر دیکھا تو اکثر اس میں داخل ہونے والی عورتیں ہیں، عورتوں کی تعداد جہنم کے اندر زیادہ نظر آئی۔

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب لا تأذن المرأة في بيت زوجها لأحد إلا بإذنه، رقم: ۴۷۹۷، صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والإستغفار، باب أكثر أهل الجنة الفقراء...... الخ، رقم: ۴۹۱۹، مسند أحمد، رقم: ۲۰۸۲۴

مساکین جنت میں ہوں گے

اس حدیث میں دو حصے بیان فرمائے، ایک یہ کہ جنت میں اکثر و بیشتر داخل ہونے والے لوگ مساکین نظر آئے، اس کی تفصیل پیچھے بھی آچکی ہے، اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ ضروری نہیں مساکین سے مفلس اور فقیر مراد ہوں، بلکہ وہ لوگ جو طبیعت کے اعتبار سے مسکین ہیں، وہ بھی انشاء اللہ اللہ کی رحمت سے مسکین کے اندر داخل ہیں۔

عورتیں دوزخ میں زیادہ کیوں ہوں گی؟

دوسرا حصہ یہ ہے کہ جہنم میں جو اکثر آبادی نظر آئی وہ عورتوں کی نظر آئی۔ ایک دوسری حدیث میں بھی حضور ﷺ نے عورتوں سے خطاب کر کے فرمایا:

((اِنِّیْ اُرِیْتُکُنَّ اَکْثَرَ اَھْلِ النَّارِ))

مجھے دکھایا گیا ہے کہ جہنم کے اکثر باشندے تم ہو، جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جہنم میں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوگی، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت بحیثیت عورت ہونے کے جہنم کی زیادہ مستحق ہے۔ بلکہ دوسری حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے اس کی وجہ بیان فرمائی وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جہنم کی آبادی میں اکثر حصہ عورتوں کا ہے۔ تو خواتین نے عرض کیا:

"بِمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟"

اس کی کیا وجہ ہے کہ جہنم میں خواتین کی تعداد زیادہ ہوگی؟ آپ نے اس کی دو وجہیں بنیادی طور پر بیان فرمائیں وہ یہ کہ

((تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ))

دو خرابیاں خواتین کے اندر ایسی ہیں جو جہنم کی طرف لے جانے والی ہیں، جو عورت ان سے بچ جائے گی وہ انشاء اللہ جہنم سے بھی بچ جائے گی۔ پہلی وجہ بیان فرمائی کہ "تکثرن اللعن" کہ لعن طعن بہت کرتی ہو، یعنی ایک دوسری کو لعنت دینے کا رواج تمہارے اندر بہت زیادہ ہے۔ (۱)

معمولی معمولی بات پر کسی کو بددعا دیدی، کسی کو کوسنا دیدیا، کسی کو برا بھلا کہہ دیا، اور طعنہ دینا

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحیض، باب ترك الحائض الصوم، رقم: ۲۹۳، صحیح مسلم، کتاب الایمان، رقم: ۱۱٤، سنن النسائی، کتاب صلاة العیدین، رقم: ۱۵۵۸، سنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاة والسنة فیها، رقم: ۱۲۷۸، مسند أحمد، رقم: ۱۰٦۳۷

بھی بہت ہے۔طعنہ اس بات کو کہتے ہیں کہ ایسا جملہ بول دیا جس سے دوسرے کے جسم میں آگ لگ گئی اس کا دل ٹوٹ گیا، اس کے نتیجے میں دوسرے کو پریشان کردیا اور یہ مشاہدہ ہے کہ اس میں خواتین بہت مبتلا ہوتی ہیں۔

شوہر کی ناشکری، ایک عظیم گناہ

دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ "تکفرن العشیر" یعنی تم شوہر کی ناشکری بہت کرتی ہو، یعنی اگر کوئی بیچارہ شریف سیدھا شوہر وہ جان مال اور محنت خرچ کرکے تمہیں راضی کرنے کی فکر کر رہا ہے، لیکن تمہاری زبان پر شکر کا کلمہ مشکل ہی سے آتا ہے بلکہ ناشکری کے کلمات زبان سے نکالتی ہو۔ یہ دو سبب ہیں جن کی وجہ سے تم جہنم میں زیادہ جاؤ گی۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ آمین۔

ناشکری یوں تو ہر حالت میں بری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو انتہائی ناپسند ہے، اور اس کی ناپسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ عربی زبان اور شریعت کی اصطلاح میں "ناشکری" کا نام "کفر" ہے، اس لئے "کفر" جس سے "کافر" بنا ہے، اس کے اصلی معنی ہیں "ناشکری"، اور کافر کو کافر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ناشکرا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اتنی نعمتوں سے نوازا، اس کو پیدا کیا، اس کی پرورش کی، اس پر نعمتوں کی بارش فرمائی اور وہ ناشکری کرکے اللہ کے ساتھ دوسرے کو شریک ٹھیرا دیتا ہے۔ یا ایسی محسن ذات کے وجود کا انکار کرتا ہے، اس لئے یہ اتنی خطرناک چیز ہے۔

شوہر کا مقام

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں دنیا میں اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کے آگے سجدہ کرے، لیکن سجدہ چونکہ کسی اور کے لئے حلال نہیں اس لئے یہ حکم نہیں دیتا۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ یہ عورت کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ شوہر کی اطاعت کرے اور اس کی ناشکری نہ کرے اور جب وہ اس کی ناشکری کرے گی تو وہ درحقیقت اللہ کی ناشکری ہوگی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کو شوہر کی ناشکری اتنی ناپسند ہے کہ خواتین کو بتلا دیا کہ اس کی وجہ سے تم جہنم میں جاؤ گی، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ (۱)

---

(۱) سنن أبی داود، کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المرأة، رقم: ۱۸۲۸، سنن الدارمی، کتاب الصلاة، باب النهی أن یسجد لأحد، رقم: ۱۴۲۷

جہنم سے بچنے کے دو گُر

اللہ تعالیٰ نے شوہر کے ذمے بیوی کے حقوق رکھے ہیں اور بیوی کے ذمے شوہر کے حقوق رکھے ہیں۔ خاص طور سے ہماری بہنوں کے لئے بڑی یاد رکھنے کی بات ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے باقاعدہ اہتمام کرکے خواتین کے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ تمہارے زیادہ جہنم میں جانے کا سبب یہ دو باتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ سے زیادہ کون اللہ تعالیٰ کے دین کا رمز شناس ہوگا اور اپنی اُمت کے افراد کا رمز شناس ہوگا؟ آپ سے زیادہ کوئی مرض کو پہچاننے والا نہیں ہوسکتا، اور مرض کی تشخیص کرنے والا اور علاج بتانے والا نہیں ہوسکتا۔ تو عورتوں کو جہنم سے بچانے کے لئے آپ نے دو گُر بتادیئے، ایک یہ کہ لعن طعن نہ کرو، اور دوسرے شوہر کی ناشکری نہ کرو۔

اس عورت پر فرشتے لعنت کرتے ہیں

حدیث شریف میں یہاں تک فرمایا کہ اگر شوہر عورت کو بستر پر بلائے اور وہ نہ جائے یا فرمایا کہ اگر عورت ایک رات اس طرح گزارے کہ اس کا شوہر اس سے خفا ہو اور اس کے حقوق اس عورت نے ادا نہ کیے ہوں ساری رات فرشتے اس عورت پر لعنت کرتے رہتے ہیں، اتنی خطرناک وعید حضورِ اقدس ﷺ نے بیان فرمائی۔

زبان پر قابو رکھیں

اس وقت یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ جو فرمایا جارہا ہے کہ عورتوں کی تعداد جہنم میں مردوں کی نسبت زیادہ ہوگی، آج کل یہ عورتوں کے حقوق کا بڑا چرچا ہے اور یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ عورت کو بہت نچلا مقام دیا گیا ہے، یہاں تک کہ جہنم میں بھی عورتیں زیادہ بھردی گئیں، لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ وہ عورتیں جہنم میں اس لئے نہیں بھری گئیں کہ وہ عورتیں ہیں بلکہ اس لئے بھردی گئیں کہ ان کے اندر بداعمالیوں کی کثرت ہوتی ہے۔ خاص طور پر زبان ان کو جہنم میں لے جانے والی ہے۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ انسان کو جہنم میں اوندھا گرانے والی چیز اس کی زبان ہے، اور عام طور پر جب یہ زبان قابو میں نہیں ہوتی تو اس سے بیشمار گناہ سرزد ہوجاتے ہیں۔ تجربہ کرکے دیکھ لیجئے کہ مرد کی زبان پھر بھی کچھ قابو میں ہوتی ہے۔ اور خواتین زبان کو قابو میں رکھنے کا عام طور پر اہتمام نہیں کرتیں۔ اس کے نتیجے میں یہ فساد پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اپنی زبانوں کو احتیاط سے استعمال کرنے کی کوشش کریں کہ زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکالیں جس سے دوسرے کا دل ٹوٹے، اور خاص طور پر

شوہر، جس کا دل رکھنا اللہ تعالیٰ نے بیوی کے فرائض میں شامل فرمایا ہے، لہٰذا یہ جو کہا گیا ہے کہ جہنم میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوگی اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ زبردستی جہنم میں عورتوں کی تعداد بڑھا دی گئی ہے بلکہ وہ تو درحقیقت ان اعمال کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو ان اعمال سے بچائیں۔ اور اگر یہ خود اہتمام سے بچنے کی کوشش کریں تو انشاء اللہ ضرور بچ جائیں گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ جنت کی خواتین کی سردار بھی اللہ تعالیٰ نے ایک خاتون کو بنایا ہے، وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، اور اللہ تعالیٰ نے خواتین کو جنت کا مستحق بھی قرار دیا۔ لیکن سارا مدار ان اعمال پر ہے۔

حقوق العباد کی اہمیت

دوسری ایک بات اور سمجھ لیں جو اسی حدیث سے نکلتی ہے وہ یہ ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے زیادہ جہنم میں جانے کا سبب یہ نہیں بیان فرمایا کہ وہ عبادت کم کرتی ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ نفلیں کم پڑھتی ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ تلاوت کم کرتی ہیں، وظیفے کم کرتی ہیں، بلکہ سبب کے اندر جو دو باتیں بتائیں لعنت اور شوہر کی ناشکری ان دونوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اس سے نفلی عبادات کے مقابلے میں حقوق العباد کی اہمیت معلوم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں اس کا صحیح فہم عطا فرمائے۔ اور اپنی رحمت سے ان تمام حقوق کو بجالانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه محمد وآله واصحابه اجمعین. آمین.

برحمتك یا ارحم الراحمین۔

گناہ گار کو طعنہ مت دیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَنْ عَيَّرَ أَخَاهُ بِذَنْبٍ قَدْ تَابَ مِنْهُ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَعْمَلَهُ))(۱)

کسی کو گناہ پر عار دلانے کا وبال

حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو ایسے گناہ پر عار دلائے اور اس گناہ کا طعنہ دے جس گناہ سے وہ توبہ کر چکا ہے تو یہ طعنہ دینے والا شخص اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ خود اس گناہ کے اندر مبتلا نہیں ہو جائے گا۔ مثلاً ایک شخص کے بارے میں آپ کو پتہ چل گیا کہ یہ فلاں گناہ کے اندر مبتلا تھا یا مبتلا ہوا ہے، اور آپ کو یہ بھی پتہ ہے کہ اس نے توبہ بھی کر لی ہے تو جس گناہ سے وہ توبہ کر چکا ہے اس گناہ کی وجہ سے اس کو حقیر سمجھنا یا اس کو عار دلانا یا اس کو طعنہ دینا کہ تم تو فلاں شخص ہو اور فلاں حرکت کیا کرتے تھے، ایسا طعنہ دینا خود گناہ کی بات ہے، اس لئے کہ جب اس شخص نے توبہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ صاف کر لیا، اور توبہ کرنے سے گناہ صرف معاف نہیں ہوتا بلکہ نامۂ اعمال سے وہ عمل مٹا دیا جاتا ہے تو اب اللہ تعالیٰ نے تو اس کا گناہ نامۂ اعمال سے مٹا دیا لیکن تم اس کو اس گناہ کی وجہ سے حقیر اور ذلیل سمجھ رہے ہو یا اس کو طعنہ دے رہے ہو اور اس کو برا بھلا کہہ رہے ہو، یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت سخت ناگوار ہے۔

گناہ گار ایک بیمار کی طرح ہے

یہ تو اس شخص کے بارے میں ہے جس کے بارے میں آپ کو معلوم ہے کہ اس نے گناہ سے توبہ کر لی ہے، اور اگر پتہ نہیں ہے کہ اس نے توبہ کی ہے یا نہیں، لیکن ایک مؤمن کے بارے میں احتمال تو ہے کہ اس نے توبہ کر لی ہوگی یا آئندہ کر لے گا، اس لئے اگر کسی نے گناہ کر لیا اور آپ کو توبہ کرنے کا

☆ اصلاحی خطبات (۷/۷۲ تا ۸۲)، ۶ دسمبر ۱۹۹۶ء، بروز جمعہ، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) ترمذی، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم ۲٤۲۹

علم بھی نہیں ہے، تب بھی اس کو حقیر سمجھنے کا کوئی حق نہیں ہے، کیا پتہ کہ اس نے توبہ کر لی ہو۔ یاد رکھئے، نفرت گناہ سے ہونی چاہئے، گناہ گار سے نہیں، نفرت معصیت اور نافرمانی سے ہے، لیکن جس شخص نے معصیت اور نافرمانی کی ہے اس سے نفرت کرنا حضورِ اقدس ﷺ نے نہیں سکھایا۔ بلکہ وہ گناہ گار ترس کھانے اور رحم کے قابل ہے کہ وہ بیچارہ ایک بیماری کے اندر مبتلا ہے، جیسے کوئی شخص کسی جسمانی بیماری کے اندر مبتلا ہو تو اب اس شخص کی بیماری سے تو نفرت ہوگی، لیکن کیا اس بیمار سے نفرت کرو گے کہ چونکہ یہ شخص بیمار ہے اس لئے نفرت کے قابل ہے۔ ظاہر ہے کہ بیمار کی ذات قابلِ نفرت نہیں ہے، بلکہ اس کی بیماری سے نفرت کرو، اس کو دور کرنے کی فکر کرو، اس کے لئے دعا کرو، لیکن بیمار نفرت کے لائق نہیں، وہ تو ترس کھانے کے لائق ہے کہ یہ بیچارہ اللہ کا بندہ کس مصیبت کے اندر مبتلا ہو گیا۔

کفر قابلِ نفرت ہے، نہ کہ کافر

حتیٰ کہ اگر کوئی شخص کافر ہے تو اس کے کفر سے نفرت کرو، اس کی ذات سے نفرت مت کرو، بلکہ اس کے حق میں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت عطا فرمائے، آمین۔ دیکھئے، حضورِ اقدس نبی کریم ﷺ کو کفار کتنی تکالیف پہنچایا کرتے تھے، آپ پر تیر اندازی ہو رہی ہے، پتھر برسائے جا رہے ہیں، آپ کے جسم کے کئی حصے خون سے لہولہان ہو رہے ہیں، اس کے باوجود اس وقت زبان پر جو کلمات آئے، وہ یہ تھے:

((اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ))(۱)

''اے اللہ، میری قوم کو ہدایت عطا فرما کہ ان کو حقیقت کا پتہ ہی نہیں ہے''

یہ دیکھئے کہ ان کی معصیت، کفر، شرک، ظلم اور زیادتی کے باوجود ان سے نفرت کا اظہار نہیں فرمایا۔ بلکہ شفقت کا اظہار فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ یا اللہ، یہ ناواقف لوگ ہیں، ان کو حقیقت حال کا پتہ نہیں ہے، اس لئے میرے ساتھ یہ لوگ ایسا برتاؤ کر رہے ہیں، اے اللہ ان کو ہدایت عطا فرما۔ لہٰذا جب کسی کو گناہ میں مبتلا دیکھو تو اس پر ترس کھاؤ اور اس کے لئے دعا کرو اور کوشش کرو کہ وہ اس گناہ سے بچ جائے۔ اس کو تبلیغ و دعوت کرو، لیکن اس کو حقیر نہ جانو۔ کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق دیدیں اور پھر وہ تم سے بھی آگے نکل جائے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب استتابة المرتدین والمعاندین وقتالهم، باب اذا عرض الذمی وغیره بسب النبی ولم یصرح..... الخ، رقم: ٦٤٠٠، صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب غزوة أحد، رقم ۳۳٤۷، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء، رقم ٤٠١٥، مسند أحمد، رقم: ۳٤۲۹

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا دوسروں کو افضل سمجھنا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کا یہ ارشاد میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سنا اور حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ سے بھی سنا ہے، وہ یہ کہ میں ہر مسلمان کو اپنے سے حالاً اور ہر کافر کو اپنے آپ سے احتمالاً افضل سمجھتا ہوں۔ ''احتمالاً'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر چہ وہ اس وقت کفر کے اندر مبتلا ہے، لیکن کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق عطا فرمادے اور وہ کفر کی مصیبت سے نکل جائے، اور پھر اللہ تعالیٰ اس کے درجات اتنے بلند کردے کہ وہ مجھ سے بھی آگے بڑھ جائے۔ اور جو شخص مسلمان ہے، صاحب ایمان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان کی دولت عطا فرمائی ہے، کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے کیا معاملات ہیں، کیونکہ ہر انسان کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختلف معاملات ہوتے ہیں، کسی کے بارے میں ہم کیا رائے ظاہر کریں کہ وہ ایسا ہے، اس لئے میں ہر مسلمان کو اپنے سے افضل سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس میں جھوٹ اور غلط بیانی کا احتمال تو نہیں ہے کہ ویسے ہی مروتاً یہ کہہ دیا کہ ''میں ہر مسلمان کو اپنے سے افضل سمجھتا ہوں''۔ یقیناً ایسا سمجھتے ہوں گے تبھی تو فرمایا۔ بہر حال، کسی کو بھی حقیر سمجھنا، چاہے وہ گناہ اور معصیت کی وجہ سے ہو، جائز نہیں۔

یہ مرض کن لوگوں میں پایا جاتا ہے

یہ حقیر سمجھنے کی بات ان لوگوں میں خاص طور پر پیدا ہوجاتی ہے جو لوگ دین کی طرف پلٹتے ہیں، مثلاً شروع میں ان کے حالات دین کے اعتبار سے ٹھیک نہیں تھے، بعد میں دین کی طرف آئے اور نماز روزے کے پابند ہوگئے، اور وضع قطع اور لباس پوشاک شریعت کے مطابق بنالیا، مسجد میں آنے لگے، نماز باجماعت کے پابند ہوگئے، ایسے لوگوں کے دلوں میں شیطان یہ بات ڈالتا ہے کہ تم تو اب سیدھے راستے پر آگئے، اور یہ سب مخلوق جو گناہوں میں منہمک ہیں یہ سب تباہ حال ہیں، اور پھر اس کے نتیجے میں یہ لوگ ان کو حقیر اور کمتر سمجھنے لگتے ہیں، اور حقارت سے ان کو دیکھتے ہیں، اور ان پر دلخراش انداز میں اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ پھر اس کے نتیجے میں شیطان ان کو عجب میں، بڑائی میں، تکبر میں اور خود پسندی میں مبتلا کردیتا ہے، اور جب انسان کے اندر اپنی بڑائی اور خود پسندی آجائے تو یہ چیز انسان کے سارے اعمال کو ضائع کرنے والی ہے، اس لئے کہ جب انسان کی نظر اس طرف جانے لگے کہ میں بڑا نیک ہوں اور دوسرے برے ہیں تو بس انسان عجب میں مبتلا ہوگیا، اور عجب کے نتیجے میں اس کے سارے اعمال اکارت ہوگئے۔ اس لئے کہ وہ عمل مقبول ہے جو اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے

کیا جائے اور جس عمل کے بعد انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے مجھے اس کی توفیق عطا فرمائی۔ اس لئے کسی کے ساتھ حقارت کا معاملہ نہیں کرنا چاہئے اور کسی کافر اور فاسق و فاجر کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔

کسی کو بیمار دیکھے تو یہ دعا پڑھے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب انسان دوسرے کو کسی بیماری کے اندر مبتلا دیکھے تو یہ دعا پڑھے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاهُ بِهٖ، وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا))(۱)

''اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے اس بیماری سے عافیت عطا فرمائی جس بیماری میں یہ مبتلا ہے، اور بہت سے لوگوں پر آپ نے مجھے فضیلت عطا فرمائی''

یعنی بہت سے لوگ بیماریوں میں مبتلا ہیں، لیکن آپ نے مجھے صحت عطا فرمائی ہے۔ کسی بیمار کو دیکھ کر یہ دعا پڑھنا سنت ہے۔ آپ ﷺ نے اس کی تلقین فرمائی ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی کسی ہسپتال کے پاس سے گزرتا ہوں تو الحمدللہ یہ دعا پڑھ لیتا ہوں، اور ساتھ میں یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ یا اللہ! ان بیماروں کو صحت عطا فرما دیجئے۔

کسی کو گناہ میں مبتلا دیکھے تو یہی دعا پڑھے

ہمارے ایک استاد فرمایا کرتے تھے کہ یہ دعا جو حضورِ اقدس ﷺ نے بیمار کو دیکھ کر پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے، میں تو جب کسی شخص کو کسی گناہ یا معصیت میں مبتلا دیکھتا ہوں تو اس وقت بھی یہی دعا پڑھ لیتا ہوں۔ مثلاً راستے میں گزرتے ہوئے بعض اوقات دیکھتا ہوں کہ لوگ سینما دیکھنے کے لئے یا اس کا ٹکٹ خریدنے کے لئے لائن میں کھڑے ہیں، ان کو دیکھ کر یہی دعا پڑھ لیتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس گناہ سے محفوظ رکھا۔

اس دعا کے پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح بیمار ترس کھانے کے قابل ہے، اسی طرح جو شخص گناہ میں مبتلا ہے وہ بھی ترس کھانے کے قابل ہے کہ وہ اس مصیبت میں مبتلا ہے، اور اس کے لئے بھی دعا کرنی چاہئے کہ یا اللہ! اس کو اس مصیبت سے نکال دیں۔ کیا معلوم کہ آج جو لوگ گناہ کی لائن میں لگے ہوئے ہیں اور آپ ان کو حقیر اور ذلیل سمجھ رہے ہیں، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ ان کو توبہ کی

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما یقول اذا رأى مبتلى، رقم: ۳۳۵۳، سنن ابن ماجه، کتاب الدعاء، باب ما یدعو به الرجل اذا نظر الى أهل البلاء، رقم: ۳۸۸۲۔

توفیق دیدیں اور پھر وہ تم سے آگے نکل جائیں۔ اس لئے کس بات پر تم اتراتے ہو؟ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے تم کو گناہوں سے بچنے کی توفیق دیدی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر ان کو گناہوں سے بچنے کی توفیق نہیں ہوئی تو تم ان کے حق میں دعا کرو، کہ یا اللہ! ان کو ہدایت عطا فرما دے اور ان کو اس بیماری سے نجات عطا فرما دے، آمین۔ بہر حال، کفر سے نفرت ہو، گناہ سے، معصیت اور نافرمانی سے نفرت ہو، لیکن آدمی سے نفرت مت کرو، بلکہ اس کے ساتھ محبت اور شفقت کا معاملہ کرو، اور جب اس سے کوئی بات کہنی ہو تو نرمی اور شفقت سے کہو، ہمدردی اور محبت سے کہو، تاکہ اس پر اثر انداز بھی ہو۔ ہمارے سارے بزرگوں کا یہی معمول رہا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا چور کے پاؤں چومنا

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنا کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کہیں سے گزر رہے تھے، ایک جگہ پر دیکھا کہ ایک آدمی کو سولی پر لٹکایا ہوا ہے اور اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے، اور ایک پاؤں کٹا ہوا ہے۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ شخص عادی قسم کا چور ہے۔ جب پہلی مرتبہ پکڑا گیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، اور جب دوسری مرتبہ پکڑا گیا تو پاؤں کاٹ دیا گیا اور اب جب تیسری مرتبہ پکڑا گیا تو اب اس کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے اور اس کے پاؤں چوم لیے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت! یہ اتنا بڑا چور ہے اور عادی چور ہے، آپ اس کا پاؤں چوم رہے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگرچہ اس نے بہت بڑا جرم اور گناہ کا کام کیا، جس کی وجہ سے اس کو سزا دی گئی۔ لیکن اس شخص کے اندر ایک بہترین وصف ہے، وہ ہے "استقامت"۔ اگرچہ اس وصف کو اس نے غلط جگہ پر استعمال کیا، اس لئے کہ جس کام کو اس نے اپنا مشغلہ بنایا اس پر ڈٹا رہا۔ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا پھر بھی اس کام کو نہیں چھوڑا۔ پاؤں کاٹ دیا گیا پھر بھی اس کام کو نہیں چھوڑا، حتیٰ کہ موت کی سزا ہو گئی لیکن اپنے کام پر لگا رہا، اس سے پتہ چلا کہ اس کے اندر استقامت کا وصف تھا اور اسی وصف کی وجہ سے میں نے اس کے پاؤں چوم لیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی عبادت اور طاعات کے اندر یہ وصف عطا فرما دے۔

بہر حال! جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں وہ آدمی سے نفرت نہیں کرتے، اس کی برائیوں سے نفرت کرتے ہیں، اور وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی برے آدمی کے اندر اچھائیاں ہیں تو وہ حاصل کرنے کے لائق ہیں، اور اس کے اندر جو برائیاں ہیں اس کو دور کرنے کی فکر کرو۔ اور اس کو محبت اور پیار سے سمجھاؤ، اور اسی سے جا کر بتاؤ، دوسروں سے اس کی برائیاں بیان کرتے مت پھرو۔

ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے

حدیث شریف میں آتا ہے:

((اَلْمُؤْمِنُ مِرْآۃُ الْمُؤْمِنِ))(۱) ''ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے''

اگر آدمی کے چہرے پر کوئی داغ دھبہ لگ جائے اور وہ آدمی جا کر آئینہ کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ آئینہ بتا دیتا ہے کہ تمہارے چہرے پر یہ داغ لگا ہوا ہے، گویا آئینہ انسان کے عیب بیان کر دیتا ہے، اسی طرح ایک مؤمن بھی دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے، یعنی جب ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے اندر کوئی عیب دیکھے تو اس کو پیار سے محبت سے بتا دے کہ یہ عیب تمہارے اندر موجود ہے، اس کو دور کر لو۔ جیسے اگر کسی انسان کے جسم پر کوئی کیڑا یا چیونٹا چل رہا ہو، اور آپ اس کیڑے کو اس کے جسم پر یا کپڑوں پر چلتا ہوا دیکھ رہے ہیں تو محبت کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس کو بتا دو کہ دیکھو بھائی! تمہارے جسم پر یہ کیڑا چل رہا ہے، اس کو دور کر لو۔ اسی طرح اگر کسی مسلمان بھائی کے اندر کوئی دینی خرابی ہے تو پیار و محبت سے اس کو بتا دینا چاہئے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے، اس لئے کہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے۔

کسی کے عیب دوسروں کو مت بتاؤ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب تم کسی دوسرے کے اندر کوئی عیب دیکھو تو صرف اسی کو بتاؤ کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے، دوسروں سے کہتے مت پھرو کہ فلاں کے اندر یہ عیب ہے۔ اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے، اور آئینہ صرف اس شخص کو چہرے کے داغ دھبے بتاتا ہے جو شخص اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ وہ آئینہ دوسروں کو نہیں بتاتا کہ فلاں شخص کے چہرے پر داغ دھبے لگے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ جس کے اندر کوئی برائی یا عیب دیکھے تو صرف اسی سے کہے، دوسروں سے اس کا تذکرہ نہ کرے کہ فلاں کے اندر یہ عیب اور یہ برائی ہے، کیونکہ اگر دوسروں کو اس کے عیوب کے بارے میں بتاؤ گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کام میں تمہاری نفسانیت شامل ہے، پھر وہ دین کا کام نہیں ہوگا۔ اور اگر صرف اسی سے تنہائی میں محبت اور شفقت سے اس کو اس کے عیب پر تنبیہ کرو گے تو یہ اخوت اور ایمان کا تقاضا ہے، لیکن اس کو حقیر اور ذلیل سمجھنا کسی حال میں بھی جائز نہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی النصیحۃ، رقم ۴۲۷۲

گناہ گار کی تحقیر نہ کیجئے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْدُ!

برے کام کرنے والے کو کم نہ سمجھو

فرمایا کہ یہ جائز ہے کہ برا کام کرنے والے پر غصہ کرو، اس سے بغض کرو، مگر اپنے سے کم نہ سمجھو، اور کبھی تم کو کسی کی سزا و تادیب کے واسطے مقرر کیا جائے تو خبردار! اپنے کو اس سے اچھا ہرگز نہ سمجھنا، ممکن ہے کہ وہ خطاوار شہزادے کے مثل ہو اور تم نوکر جلاد کے درجہ میں ہو، ظاہر ہے کہ خطاوار شہزادے کو بادشاہ جلاد کے ہاتھوں سزا دلوائے تو جلاد اس سے افضل نہیں ہوسکتا۔ (۱)

یعنی ایک آدمی برا کام کررہا ہے، اور وہ کسی ناجائز اور گناہ کے کام میں مبتلا ہے، تو اس پر غصہ کرسکتے ہو، اور اس سے بغض رکھ سکتے ہو یعنی اس کے اس عمل سے نفرت کرسکتے ہو، کیونکہ اس کا یہ عمل قابلِ نفرت ہے، لیکن اس کو اپنے سے کم نہ سمجھو۔ یعنی ایک طرف اس کی برائی کو برائی سمجھو، اور دوسری طرف اس کو اپنے سے کمتر بھی نہ سمجھو، یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوں؟

نفرت گناہ سے، نہ کہ گناہ گار سے

اس بات کو دو لفظوں میں یوں سمجھو! کہ ''فسق'' سے نفرت کرو، فاسق سے نفرت نہ کرو۔ یعنی فاسق کی ذات سے نفرت نہ کرو، بلکہ اس کے فعل سے نفرت کرو۔ کفر سے نفرت کرو، کافر کی ذات سے نفرت نہ کرو۔ اور فاسق اور فاجر کو یہ سمجھو کہ یہ بیمار ہے۔ جب کوئی بیمار ہوجاتا ہے تو کیا اس بیمار سے نفرت کی جاتی ہے؟ نہیں، بلکہ بیماری سے نفرت کی جاتی ہے کہ اس کو بڑی خراب بیماری لگ گئی ہے، لیکن بیمار پر انسان ترس کھاتا ہے کہ یہ بیچارہ اس بیماری کے اندر مبتلا ہوگیا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی گناہ کے اندر مبتلا ہے، یا کسی برے کام کے اندر مبتلا ہے تو اس کے برے کام سے نفرت کرو، لیکن اس کی ذات پر ترس کھاؤ۔

☆ اصلاحی مجالس (۱/۳۱۷۔۳۳۹) (۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۱۵۵

گناہ گار ترس کھانے کے لائق

میرے خسر صاحب (جناب بھائی شرافت اللہ صاحب) اللہ تعالیٰ ان کو عافیت اور سلامتی کے ساتھ رکھے۔ جب وہ کسی ایسے آدمی کا ذکر کرتے ہیں جو کسی گناہ یا برے کام میں مبتلا ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں، فلاں بیچارے بدعات میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس کے لئے "بیچارے" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ترس کھانے کے لائق ہے، کیونکہ وہ بیماری کے اندر مبتلا ہے۔ لہٰذا اس کا عمل قابلِ نفرت ہے، لیکن اس کی ذات ترس کھانے کے لائق ہے۔ اور جب اس کی ذات ترس کھانے کے لائق ہے تو پھر اس کو اپنے سے کمتر سمجھنے کا کوئی جواز نہیں۔ اور بالخصوص اس نقطۂ نظر سے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمادے، اور توبہ کی توفیق عطا فرمادے، اور اس کے نتیجے میں یہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے، اور میں یہیں پڑا رہ جاؤں۔ اس لئے کسی کو اپنے سے کمتر نہ سمجھو۔

شیطان کس طرح راہ مارتا ہے

جن کو اللہ تعالیٰ دین سے وابستگی عطا فرمادیتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری طلب اور استحقاق کے بغیر، الحمد للہ ایسے حلقے سے وابستہ کردیا جو دین سے تعلق رکھتا ہے، لیکن دین سے وابستگی رکھنے والے حضرات جب ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جو دین سے وابستہ نہیں ہیں، بلکہ گناہوں کے اندر مبتلا ہیں، تو بسا اوقات ان کو دیکھ کر ان کی ذات سے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے اور اپنی برتری کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ ہم ان سے برتر ہیں۔ بس یہیں سے شیطان راہ مارتا ہے۔ اس لئے اس بات کو یاد رکھیں کہ کسی کی ذات سے نفرت نہ ہو، اگر نفرت ہو تو اس کے عمل سے ہو، اور اس عمل کی وجہ سے اس پر ترس کھاؤ، اور ترس کھانے کے باوجود یہ سوچو کہ کیا معلوم اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق دے دیں اور یہ ہم سے آگے نکل جائے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اندازِ تربیت

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایسی پیری نہیں تھی کہ اصلاح کے لئے آنے والوں کو بس وظیفے بتادیے۔ اور اب وہ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے وظیفے گھونٹ رہے ہیں، اور وظیفے پڑھنے کے نتیجے میں نفس اندر سے پھول رہا ہے، بلکہ جب کوئی شخص ان کے یہاں تربیت کرانے کے لئے آتا تو اس کی واقعی تربیت کی جاتی تھی، اور تربیت ہی کے لئے کبھی ڈانٹنے کی اور کبھی غصہ کرنے کی اور کبھی سزا دینے کی ضرورت بھی پیش آتی تھی۔ اسی وجہ سے حضرت والا سخت مشہور تھے، اور حضرت والا کے پاس جہاں

اہلِ علم وفہم اپنی اصلاح کے لئے آتے تھے، وہیں ایک سے ایک اکھڑ اور غیر تہذیب یافتہ آدمی بھی آتا تھا، اور حضرت ہر ایک کی اخلاقی تربیت کرتے تھے اور معاشرت ومعاملات میں کسی قاعدے یا اصول کی خلاف ورزی پر روک ٹوک بھی فرماتے تھے، اس میں بھی ہر ایک کے ساتھ اسی کے انداز سے پیش آتے تھے۔

تم بیل ہو تو میں قصائی ہوں

چنانچہ ایک مرتبہ ایک دیہاتی آیا، اس نے کوئی خلافِ اصول بات کی، تو اس کو سمجھایا اور ڈانٹا، تو وہ دیہاتی کہنے لگا: اجی حضرت! ہم تو بیل ہیں۔ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ میں بھی تو قصائی ہوں۔ اس طرح ہر ایک کے ساتھ علیحدہ معاملہ ہوتا تھا۔

ایک لطیفہ

ایک مرتبہ آپ حوض پر وضو فرما رہے تھے، اتنے میں ایک دیہاتی ایک بڑا سا تربوز لے کر آ گیا اور کہا: لے مولوی تیرے واسطے لایا ہوں، اس کو کہاں دھر دوں؟ حضرت والا نے وضو کرتے ہوئے فرمایا کہ "میرے سر پر دھر دے"۔ اس دیہاتی نے وہ تربوز اُٹھا کر آپ کے سر پر رکھ دیا۔ لوگ جلدی سے دوڑے کہ یہ کیا حرکت کر رہا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ غلطی میری ہے، میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ سر پر دھر دے۔ ایسے ایسے لوگ آیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کی تربیت کے لئے کبھی آپ غصہ بھی فرمایا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میرا فرض ہے کہ میں غصہ کروں، اس لئے کہ دیانت کا تقاضا یہی ہے، اگر یہ نہ کروں تو بددیانتی ہوگی اور امانت میں خیانت ہوگی۔

میری مثال

لیکن فرمایا کہ میں جب بھی کسی پر غصہ کر رہا ہوتا ہوں تو الحمدللہ ذہن سے کبھی یہ بات غائب نہیں ہوتی کہ میری مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ جلاد کو حکم دے کہ شہزادے کو کوڑے مارو، اب وہ جلاد اس حکم پر شہزادے کو کوڑے لگائے گا، لیکن عین اس وقت بھی جس وقت وہ جلاد کوڑے لگا رہا ہوگا، اپنے آپ کو شہزادے سے افضل نہیں سمجھ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں جلاد ہوں، لیکن مارے گا اس لئے کہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ الحمدللہ، میں جس وقت کسی کو ڈانٹ رہا ہوتا ہوں اور کسی کام پر کسی کا مؤاخذہ کر رہا ہوتا ہوں تو الحمدللہ اس بات کا استحضار رہتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں جلاد ہوں، میں اس سے افضل نہیں ہوں۔

عین ڈانٹ ڈپٹ کے وقت دعا کرنا

دوسرے یہ کہ جس وقت ڈانٹ رہا ہوتا ہوں یا مؤاخذہ کر رہا ہوتا ہوں، اسی وقت دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ یا اللہ! مجھ سے ایسا مؤاخذہ نہ فرمایئے گا، آخرت میں میری اس طرح پکڑ نہ فرمایئے گا۔

اب دیکھئے! جو آدمی اس نیت سے ڈانٹ رہا ہو کہ منکر سے روکنا اور اس کی اصلاح کرنا ضروری ہے، اس کا ہمیں حکم ہے، اور ہر ڈانٹ پر اور ہر غصے پر ان دو باتوں کا استحضار رکھتا ہو، اس کا غصہ بھی عبادت نہیں تو اور کیا ہے۔ بہر حال، اس طرح یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ غصہ بھی ہو رہا ہے، برے عمل سے نفرت اور بغض بھی ہے، لیکن اپنے سے اس کو کمتر بھی نہیں سمجھ رہا ہے، اپنے کو اس سے افضل بھی نہیں سمجھ رہا ہے، لیکن یہ چیز مشق سے اور کسی کے آگے پامال ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل سے حاصل ہوتی ہے۔

سالکین کے کبر اور تواضع مفرط کا علاج

فرمایا کہ: کام کرنے والوں کو دین کا کام کرنے سے دو مرض پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک کبر اور دوسرا تواضع مفرط، کبر تو یہ ہے کہ وظیفہ پڑھ کر اپنے اوپر نگاہ کرنے لگے، نماز پڑھ کر بے نمازیوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ اس کا علاج یہ سمجھنا ہے کہ تکبر کی وجہ سے بڑے بڑے عابدوں کے قدم توڑ دیے گئے ہیں کہ منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکے، شیطان اور بلعم باعور کی حکایت اس کی نظیر ہے۔ ”تواضع مفرط“ یہ ہے کہ اس حد تک تواضع کرے کہ اپنے اعمالِ صالحہ کی بے قدری کرنے لگے، مثلاً اس طرح کہ اگرچہ ہم نماز پڑھتے ہیں مگر اس میں خشوع تو ہے نہیں، ذکر کرتے ہیں مگر انوار بالکل نہیں، گویا کہ در پردہ خدا کی شکایت کر رہے ہیں۔ اس کا علاج یہ کہنا ہے کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہم کو ذکر و نماز کی توفیق دی، ورنہ ہماری کیا مجال تھی جو آپ کی بندگی کر لیتے۔

دین کے راستے سے بہکانا

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو متضاد قسم کی بیماریوں کا ذکر فرمایا ہے۔ جو لوگ دین کے کام میں لگتے ہیں، شیطان ان کو دین کے ذریعہ بہکاتا ہے، شیطان کی اول کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ دین کے کام میں لگے ہی نہیں۔ بلکہ اس بندے کو نفسانی لذتوں اور معصیتوں میں اس طرح پھنسایا جائے کہ دین کے کسی کام کی طرف اس کی توجہ ہی نہ ہو، نہ نماز کی طرف اس کی توجہ ہو، نہ روزے کی

طرف، نہ زکوٰۃ اور حج کی طرف اس کی توجہ ہو، بلکہ نفسانیت کے اندر پھنسا رہے۔ اور اگر کوئی شخص دین کے کام میں لگ ہی گیا ہے تو اب اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ دین کا کام کر رہا ہے، اس کو برباد کردوں، چنانچہ شیطان اس کو برباد کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے، ان طریقوں میں سے دو طریقوں کا حضرت والا نے اس ملفوظ میں ذکر فرمایا ہے۔

تکبر کے ذریعہ بہکانا

پہلا طریقہ یہ ہے کہ شیطان دین کا کام کرنے والے کے دل میں کبر، عجب اور خود پسندی کے خیالات ڈالتا ہے۔ مثلاً اس سے یہ کہتا ہے کہ دیکھ! تو بہت پہنچا ہوا آدمی بن گیا ہے، تو بڑے خشوع اور خضوع سے نماز پڑھنے لگا ہے، تو نماز اور جماعت کا پابند ہوگیا ہے، بہت سے لوگ نماز نہیں پڑھتے اور فسق و فجور کے اندر مبتلا ہیں۔ اس کے نتیجے میں اپنی بڑائی اور بے نمازیوں کی حقارت دل میں آجاتی ہے۔ جو انسان بے ظرف ہوتا ہے، جب وہ ذرا نماز کی پابندی کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف ذرا رجوع کرتا ہے تو پھر اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

جولاہے کی مثال

عربی کی ایک مثل ہے:

"صَلَّى الحَائِكُ رَكْعَتَيْنِ وَانْتَظَرَ الْوَحْيَ"

ایک مرتبہ ایک جولاہے نے دو رکعت نماز پڑھیں اور نماز کے بعد وحی کا انتظار شروع کردیا کہ اب میرے اوپر وحی آئے گی۔ یہ ہم لوگوں کا حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ذرا سی عبادت کی توفیق ہوگئی تو بس دماغ عرش معلیٰ پر پہنچ گیا کہ ہم بڑے عابد، زاہد، متقی اور پارسا ہوگئے ہیں۔ یہ کبر ہے۔ اس کے علاج کے لئے حضرت والا فرماتے ہیں:

"اس کا علاج یہ سوچنا ہے کہ "تکبر" کی وجہ سے بڑے بڑے عابدوں کے قدم توڑ دیے گئے ہیں کہ منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ شیطان اور "بلعم باعور" کی حکایت اس کی نظیر ہے۔"

یعنی آدمی یہ سوچے کہ اگر میں نے تکبر کیا تو اس کے نتیجے میں یہ سب عمل جو میں کر رہا ہوں، یہ سب اکارت ہوجائے گا۔ اس کی نظیر "شیطان" ہے، اس لئے کہ شیطان پہلے بڑی عبادت کرتا تھا، یہاں تک کہ اس کا لقب "طاؤس الملائکہ" (فرشتوں کا مور) پڑ گیا تھا، لیکن اس عبادت کے نتیجے میں دماغ میں خلل اور تکبر آگیا، چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تو اس نے انکار کردیا، اور یہ عقلی دلیل پیش کی کہ اس کو آپ نے مٹی سے پیدا کیا اور مجھے آگ سے پیدا کیا، لہٰذا

میں اس سے افضل ہوں تو میں اس کو سجدہ کیوں کروں؟ بہرحال، اس تکبر کے نتیجے میں وہ راندۂ درگاہ ہوگیا۔ العیاذ باللہ۔

بلعم باعور کا قصہ

دوسری نظیر ''بلعم باعور'' کی بیان فرمائی، ''بلعم باعور'' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص گزرا ہے، یہ بڑا عابد وزاہد شخص تھا، بلکہ ''مستجاب الدعوۃ'' تھا، یعنی جو دعا کرتا وہ فوراً قبول ہو جاتی تھی۔ چنانچہ لوگ اس کے پاس آکر اس سے دعائیں کرایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مقام عطا فرمایا تھا۔ یہ ''عمالقہ'' کے علاقے میں رہتا تھا، چونکہ اس علاقے کے لوگ کافر تھے، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، جب علاقے کے کافروں کو پتہ چلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حملہ کرنے والے ہیں تو وہ لوگ ''بلعم باعور'' کے پاس گئے، اور جا کر اس سے کہا کہ تم بڑے عابد وزاہد ہو، اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں قبول فرماتے ہیں، آپ یہ دعا کریں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کو شکست ہو جائے اور ہم پر فتح نہ پاسکے۔

بلعم باعور نے کہا کہ میں یہ دعا تو نہیں کرسکتا، اس لئے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر ہیں، اور جو لوگ لشکر میں ان کے ساتھ ہیں وہ سب صاحبِ ایمان ہیں، میں ان کے حق میں شکست کی دعا تو نہیں کرسکتا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ آپ ضرور دعا کریں۔ تو اس نے کہا کہ اچھا! میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہوں۔ چنانچہ استخارہ کیا، اور استخارہ میں یہی جواب آیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، تم ان کے حق میں کیسے بددعا کروگے؟ چنانچہ اس نے لوگوں کو جواب دے دیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے بددعا کرنے سے منع فرما دیا۔

وہ لوگ دوسرے دن پھر اس کے پاس پہنچے، اور اس کے لئے رشوت کے طور پر کچھ ہدیے تحفے بھی لے گئے، اور اس سے کہا کہ یہ ہدیہ تحفہ لے لو اور دعا کردو۔ اب اس عابد کو چاہئے تو یہ تھا کہ جب استخارہ کے ذریعہ یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں ہے، تو بس ان سے انکار کر دیتا اور قصہ ختم ہو جاتا، لیکن جب ہدیہ تحفہ پہنچا تو ایک مرتبہ پھر استخارہ کرنے کی بات دماغ میں آگئی۔ چنانچہ ان سے کہا کہ اچھا میں ایک مرتبہ اور استخارہ کرلوں، جب دوبارہ استخارہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، تو اس نے لوگوں سے منع کر دیا کہ میں دعا نہیں کرتا۔ ان لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے جو استخارہ کیا تھا، اس کا کیا جواب آیا؟ اس نے کہا کہ جواب میں کچھ نہیں آیا۔ ان لوگوں نے کہا کہ بس پھر تو کام ہوگیا، اگر اللہ تعالیٰ کو آپ کو روکنے کی مرضی ہوتی تو اللہ تعالیٰ آپ کو منع کر دیتے، جب منع نہیں کیا اور جواب نہیں آیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اجازت مل گئی۔ یہ تاویل قوم نے بھی کرلی

اور اس کے ساتھ اس عابد نے بھی کرلی، اور بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کی ہلاکت کی بددعا کردی۔ العیاذ باللہ۔

چونکہ یہ بددعا ایک نبی کے بارے میں تھی، اس لئے قبول تو نہیں ہوئی، البتہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بعد میں کئی سال تک میدانِ تیہ میں پھرتے رہے، یہ ''بلعم باعور'' کی دعا کا نتیجہ تھا۔ پھر اس عابد نے قوم سے کہا کہ میں نے تمہارے کہنے سے دعا تو کردی تھی مگر اللہ تعالیٰ قبول نہیں کریں گے، کیونکہ میں نے پہلے ہی استخارہ کرلیا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ آپ نے جو گناہ کرنا تھا وہ تو کرلیا، اور اب دعا بھی قبول نہیں ہورہی ہے، اب کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے لشکر کو بربادی کا سامنا کرنا ہی پڑے۔

اب اس عابد نے غور کرنے کے بعد کہا کہ اب میں ایسی تدبیر بتاتا ہوں جس کے نتیجے میں یہ لوگ خود اپنے آپ کو ہلاک کردیں گے۔ وہ یہ کہ تم اپنی قوم کی نوجوان لڑکیوں کو تیار کرو اور ان کو بنا سنوار کر ان کے لشکر کے اندر داخل کردو، اس لئے کہ یہ لوگ کافی عرصے سے اپنے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں۔ جب لڑکیاں ان کے پاس پہنچیں گی تو ان میں سے کوئی نہ کوئی گناہ میں مبتلا ہوجائے گا۔ جب یہ گناہ میں مبتلا ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عذاب آجائے گا، اس طرح تم ان کو ہلاک کرسکتے ہو۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا، اور نوجوان لڑکیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر میں داخل کردیں، جس کے نتیجے میں بعض لوگ گناہ میں مبتلا ہوئے۔ بلکہ واقعات میں لکھا ہے کہ عمالقہ کی شہزادی بنی اسرائیل کے ایک بڑے سردار کے پاس پہنچ گئی۔ وہ سردار اس شہزادی کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کہ کیا یہ شہزادی میرے اوپر حرام ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ہاں! یہ تم پر حرام ہے۔ اس نے کہا کہ حرام ہونے کے باوجود میں اس کو آج اپنے ساتھ لے جاؤں گا ــــ چنانچہ وہ اس کو لے گیا اور پھر اس کے ساتھ بدعملی میں مبتلا ہوا۔ اس کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی نے جاکر ان دونوں کو نیزے سے قتل کردیا۔ اس واقعے کے بعد اس بدعملی کے عذاب کے طور پر بنی اسرائیل کے اندر ''طاعون'' کی بیماری پھوٹی۔ چنانچہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ:

((إِنَّهُ بَقِيَّةُ رِجْزٍ أُرْسِلَ إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ))

''یہ طاعون اس عذاب کا بقیہ حصہ ہے جو بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا تھا''(۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب حدیث الغار، رقم: ۳۲۱۴، صحیح مسلم، کتاب السلام، رقم: ۴۱۰۸، سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول الله، رقم: ۹۸۵، مسند أحمد، رقم: ۲۰۷۵۶۔

یہ سب کچھ "بلعم باعور" کی تجویز کی بنا پر ہوا۔اس نے عمالقہ کو یہ حیلہ سکھایا تھا۔اب دیکھئے کہ وہ بلعم باعور جو اتنا بڑا عابد، عالم اور مستجاب الدعوۃ تھا، لیکن جب اس کا دل پھرا تو اس انجام کو پہنچا جس کا ذکر ان آیاتِ قرآنی میں ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيْ آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِيْنَ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾(۱)

"ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے، جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں، پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا سو وہ گمراہ لوگوں میں داخل ہو گیا، اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے، لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا، اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا، سو اس کی حالت کتے جیسی ہو گئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے، یا اس کو چھوڑ دے تب بھی ہانپے"

دل کب پلٹے جاتے ہیں؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ "بلعم باعور" کی حکایت اس کی نظیر ہے۔حالانکہ وہ اتنا بڑا عالم اور عابد اور مستجاب الدعوۃ تھا، اور لوگ اس کے پاس جا کر اپنے لئے دعائیں کراتے تھے، لیکن اس کا یہ انجام ہوا۔دل پلٹتے دیر نہیں لگتی، لیکن اللہ تعالیٰ ظلمت کی طرف کسی کا دل ویسے ہی نہیں پلٹ دیتے کہ اچانک بیٹھے بیٹھے ایک مسلمان کافر بن جائے، بلکہ اس شخص کی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں جس کی بنیاد پر دل پلٹے جاتے ہیں۔وہ حرکت یہ ہوتی ہے کہ اپنی عبادت پر گھمنڈ ہو گیا اور تکبر ہو گیا۔اور تکبر کے نتیجے میں بڑوں بڑوں کے قدم توڑ دیے گئے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایک حکایت لکھی ہے۔یہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ایک مرتبہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تہجد پڑھ رہے تھے، اس دوران انہوں نے دیکھا کہ ایک نور چمکا، اور پوری فضا منور ہو گئی، اور اس نور میں سے آواز آئی:

(۱) الاعراف: ۱۷۵-۱۷۶

"اے عبدالقادر! تو نے ہماری عبادت کا حق ادا کر دیا، جو عبادت اب تک تم نے ادا کر لی وہ کافی ہے، آج کے بعد تم پر نماز فرض نہیں، روزہ فرض نہیں، تمام عبادات کی تکلیف تم سے اُٹھالی گئی"

یہ آواز نور میں سے آئی، گویا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ تیری عبادتیں اس درجہ میں قبول ہوگئیں کہ آئندہ کے لئے تجھے عبادتوں سے فارغ کر دیا گیا۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ نور دیکھا اور یہ آواز سنی تو فوراً جواب میں فرمایا:

"کمبخت! دور ہو، مجھے دھوکہ دیتا ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تو عبادتیں معاف نہیں ہوئیں اور ان پر سے عبادتوں کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، مجھ سے ختم ہو جائے گی؟ تو مجھے دھوکہ دینا چاہتا ہے؟"

دیکھئے: شیطان نے کتنا بڑا وار کیا، اگر ان کے دل میں عبادت کا ناز آجاتا تو وہیں پھسل جاتے۔ جو لوگ کشف و کرامات کے پیچھے بہت پڑے رہتے ہیں، ان کو ختم کرنے کے لئے تو شیطان کا یہ بہترین وار تھا، لیکن شیخ تو شیخ تھے، فوراً سمجھ گئے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر سے تو عبادت کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، میرے اوپر سے کیسے ختم ہو جائے گی؟

شیطان کا دوسرا حملہ

تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک اور نور چمکا اور فضا منور ہوئی اور اس نور میں سے آواز آئی:

"اے عبدالقادر! آج تیرے علم نے تجھے بچا لیا، ورنہ میں نے نہ جانے کتنے عابدوں کو اس وار کے ذریعہ تباہ کر دیا"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ فرمایا:

"کمبخت! دوبارہ مجھے دھوکہ دیتا ہے، میرے علم نے مجھے نہیں بچایا، مجھے اللہ کے فضل نے بچایا ہے"

یہ دوسرا حملہ پہلے حملے سے زیادہ خطرناک اور اس سے زیادہ سنگین تھا، کیونکہ اس کے ذریعہ ان کے اندر علم کی بڑائی اور اس کا ناز پیدا کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے حملے کی سنگینی

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ پہلا حملہ اتنا

سنگین نہیں تھا، کیونکہ جس شخص کے پاس ذرا بھی شریعت کا علم ہو، وہ اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ زندگی میں ہوش حواس کی حالت میں کسی انسان سے عبادات معاف نہیں ہوسکتیں، لیکن یہ دوسرا حملہ بڑا سنگین تھا، نہ جانے کتنے لوگ اس حملے میں بہک گئے، اس لئے کہ اس میں اپنے علم پر ناز پیدا کرنا مقصود تھا اور یہ باریک بات ہے۔

دل سے گھمنڈ نکال دو

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس تکبر کا علاج یہ ہے کہ آدمی یہ سوچتا رہے کہ کیسے کیسے بڑے صاحبانِ علم، صاحبانِ معرفت، عبادت گزار، متقی اور پارسا بھی جب گھمنڈ میں مبتلا ہوئے تو ان کا انجام کیا ہوا۔ العیاذ باللہ۔ لہٰذا دل سے گھمنڈ کو نکالو، اگر تم دین کے راستے میں لگے ہوئے ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خلقِ خدا کی تحقیر میں لگ جاؤ اور ساری دنیا کی مخلوق کو جہنمی سمجھنے لگو۔ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ قَالَ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ))(۱)

جو شخص یہ کہے کہ ساری دنیا تباہ ہوگئی تو سب سے زیادہ تباہ وہ کہنے والا شخص ہے۔ جس شخص کو اپنے عیوب نہیں نظر آرہے ہیں، اور ساری دنیا کے عیوب تلاش کرتا پھر رہا ہے، ان کی تحقیر کر رہا ہے، تو وہ شخص سب سے زیادہ تباہ اور سب سے زیادہ برباد ہے۔

تکبر کا علاج، رجوع الی اللہ

لہٰذا جب کبھی دل میں اپنی عبادت کا، اپنے علم کا، اپنے زہد کا، اپنے صدقہ خیرات کا خیال آنے لگے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، اور کہو کہ یا اللہ! آپ کی دی ہوئی توفیق کے نتیجے میں میں نے یہ کام انجام دیا، میں اس پر آپ کا شکر ادا کرتا ہوں، یہ کام کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اور شیطان کے شر سے پناہ صرف رجوع الی اللہ میں ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عیوب کا استحضار کرو، جب دونوں چیزیں یعنی رجوع الی اللہ اور اپنے عیوب کا استحضار جمع ہو جائیں گی تو پھر تکبر پیدا نہیں ہونے دیں گی۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب النهي عن قول هلك الناس، رقم: ٤٧٥٥، سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب لا يقال خبثت نفسي، رقم: ٤٣٣١، مسند أحمد، رقم: ٧٣٦٠، الموطا الإمام مالك، الكتاب الجامع، باب ما يكره من الكلام، رقم: ١٥٥٩

''تواضع مفرط'' کا پیدا ہونا

بہر حال، اس ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ دین کا کام کرنے والوں میں ایک تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات اس کے بالکل اُلٹ چیز یعنی ''تواضع مفرط'' (حد سے بڑھی ہوئی تواضع) پیدا ہو جاتی ہے۔ تواضع اچھی چیز ہے، لیکن یہ بھی اپنی حد کے اندر ہونی چاہئے، اگر حد سے آگے بڑھ جائے تو یہ بھی مضر ہے۔

''تواضع مفرط'' کا ایک قصہ

اس بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وعظ میں اپنے سامنے کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ میں ریل میں سفر کر رہا تھا، کچھ اور لوگ بھی میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ جب کھانے کا وقت آیا تو انہوں نے اپنا کھانا نکالا اور دستر خوان بچھایا، اور ساتھیوں کو جمع کر کے کھانا شروع کیا، تو جس طرح تواضعاً ہم کہتے ہیں کہ آیئے! دال روٹی آپ بھی کھالیجئے، اسی طرح انہوں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے شخص سے تواضعاً کہا کہ ''کچھ گوہ موت آپ بھی کھالیجئے''، انہوں نے تواضعاً اپنے کھانے کو گوہ موت کہہ دیا۔ العیاذ باللہ۔ تو اللہ تعالیٰ کے رزق کو گوہ موت کہنا یہ 'تواضع مفرط' ہے، اس لئے کہ تواضع کے نتیجے میں ایسا عمل کرنا جس سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری اور توہین اور تحقیر ہو جائے، یہ بری بات ہے، اور یہ تواضع کا حد سے بڑھ جانا ناشکری ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض ہے۔ اس لئے یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

اپنی نماز کو ''ٹکریں مارنا'' مت کہو

یہی تواضع مفرط انسان کو یاس تک پہنچا دیتی ہے اور انسان کے اندر مایوسی پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے آپ نے لوگوں سے یہ جملہ سنا ہوگا کہ ارے ہماری نماز کیا ہے، ہم تو ٹکریں مارتے ہیں۔ اب نماز کو ''ٹکریں مارنے'' سے تعبیر کرنا ''تواضع مفرط'' ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے اپنی بارگاہ میں حاضری کی توفیق دی۔ نہ جانے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو بارگاہ میں حاضری کی بھی توفیق نہیں ملی، اس لئے کیوں اس نماز کی ناقدری اور ناشکری کرتے ہو؟ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری نماز میں بہت ساری کوتاہیاں بھی ہیں، لیکن وہ کوتاہیاں تمہاری ہیں، اور توفیق ان کی ہے، لہٰذا پہلے توفیق پر شکر ادا کرو، اور پھر کوتاہیوں پر استغفار کر لو۔ اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ! آپ نے مجھے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی، لیکن میں نے اس نماز کا حق ادا نہیں کیا۔ استغفر اللہ۔ لہٰذا

پہلے اس عبادت کی توفیق پر شکر ادا کرو اور پھر اپنی کوتاہی پر استغفار کرو، یہ نہ کہو کہ ہماری نماز تو ٹکریں مارنا ہے، یہ بات کہنا کسی طرح بھی درست نہیں۔

کوتاہیوں پر استغفار کرو

اور جب تم اپنی کوتاہی پر استغفار کرو گے تو جس نے اس عبادت کے کرنے کی توفیق دی ہے وہ تمہارے استغفار کو قبول کر کے اس عبادت میں کمال بھی عطا فرما دے گا انشاء اللہ۔ ارے کوئی آدمی بھی ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کر سکے؟ ہم اور تم تو کس شمار میں ہیں، نبی کریم ﷺ جن کے پاؤں رات کو تہجد کی نماز میں کھڑے کھڑے سوج رہے ہیں، وہ یہ فرما رہے ہیں:

((مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ)) (۱)

ہم آپ کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکے، جب وہ یہ فرما رہے ہیں تو ہم کیسے اس کی عبادت کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ ارے! ہماری تو ہر عبادت ان کی نسبت سے ناقص ہی رہے گی۔ لیکن جب انہوں نے اپنے در پر آنے کی توفیق دی، اپنے آستانے پر سجدہ کرنے کی توفیق دی، تو پھر اس سے یہ کیسی بدگمانی کرتے ہو کہ وہ یہ سجدہ قبول نہیں فرمائیں گے، اور کیسے تم اس سجدہ کی ناقدری کرتے ہوئے کہتے ہو کہ یہ گندہ سجدہ ہے۔ جب تم اس کی دی ہوئی توفیق پر شکر ادا کرنے کے بعد استغفار کرو گے اور یہ کہو گے کہ یا اللہ! اس عبادت میں جو کوتاہی ہوئی ہے، اپنی رحمت سے اس کو معاف فرما دیجئے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کوتاہیوں کو ضرور معاف فرمائیں گے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب کوئی آکر یہ کہتا کہ میں نماز کیا پڑھتا ہوں، بس ٹکریں مارتا ہوں، تو آپ کو ان باتوں سے بہت توحش ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک صاحب نے آکر حضرت والا سے عرض کیا کہ حضرت! میری نماز کیا، میرا سجدہ کیا، جب میں سجدہ کرتا ہوں تو اس میں گندے گندے شہوانی اور نفسانی خیالات آتے ہیں، میری یہ نماز تو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کے لائق بھی نہیں ہے۔ حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ اچھا یہ تمہارا سجدہ جو نفسانی اور شہوانی خیالات والا ہے، یہ تو بڑا گندہ سجدہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں! بالکل گندہ سجدہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا یہ گندہ سجدہ تم مجھے کرو، کیونکہ یہ شہوانی اور نفسانی خیالات والا سجدہ اللہ تعالیٰ کے سامنے

(۱) مستدرك الحاكم، كتاب معرفة الصحابة، ومن مناقب عمر بن الخطاب، رقم: ۱۵۰۲، شعب الإيمان، رقم: ۱۶۶

کرنے کے لائق تو نہیں ہے، لہٰذا یہ سجدہ اللہ میاں کے بجائے تم مجھے کرو۔ انہوں نے کہا کہ حضرت! یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ میں آپ کو سجدہ کروں؟ حضرت نے فرمایا کہ جب یہ گندہ سجدہ ہے، اور اللہ میاں کو کرنے کے لائق نہیں ہے تو مجھے کر کے دیکھ لو۔ انہوں نے کہا کہ حضرت! یہ نہیں ہوسکتا، میں یہ سجدہ کسی اور کو نہیں کرسکتا۔ حضرت نے فرمایا کہ جب یہ سجدہ کہیں اور نہیں ہوسکتا تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ سجدہ انہی کے لئے ہے، یہ پیشانی کہیں اور ٹک نہیں سکتی، یہ سجدہ کہیں اور ہو نہیں سکتا، یہ سر کسی اور آستانے پر جھک نہیں سکتا، یہ سجدہ تو انہی کے لئے ہے اور ان کی توفیق سے ہے۔ البتہ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے اس سجدے میں خرابیاں داخل ہو گئی ہیں، اس کی طرف سے استغفار کرلو، لیکن یہ پیشانی وہیں ٹکے گی۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ۔

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جس کو تیرے آستاں سے نسبت ہے

یہ سجدہ معمولی چیز نہیں۔ لہٰذا اس سجدے کے بارے میں جو اُلٹی سیدھی باتیں کرتے ہو، ان کو چھوڑ دو اور اللہ جل شانہ کی توفیق پر شکر ادا کرو۔

عبادات چھڑانے کا طریقہ

ہوتا یہ ہے کہ شیطان ''تواضع مفرط'' پیدا کر کے اس کی راہ مارتا ہے اور اس کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ میں تکبر کی بیماری میں تو مبتلا نہیں ہوں، اس لئے کہ میں تو اپنی نماز کو کچھ سمجھتا ہی نہیں ہوں، اور ساتھ میں تواضع بھی اختیار کر رہا ہوں۔ لیکن یہ خیالات جب زیادہ ہو جاتے ہیں تو رفتہ رفتہ اس کے دل میں مایوسی پیدا کر دیتا ہے کہ یہ عبادت کرنا تیرے بس کی بات نہیں، تیری نماز کبھی قبول نہیں ہوسکتی، جب قبول ہی نہیں ہوگی تو پھر پڑھنے سے کیا فائدہ؟ لہٰذا چلو چھوڑو اور گھر بیٹھو۔ اس طرح یہ شیطان نماز چھڑا دیتا ہے۔

عبادات پر شکر ادا کرو

خوب یاد رکھو! جب بھی اللہ تعالیٰ کسی عمل کو کرنے کی توفیق دے، اس پر شکر ادا کرو، اور شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کہو کہ یا اللہ! آپ ہی کی توفیق سے میں نے یہ عبادت انجام دی، البتہ اس میں میری طرف سے جو کوتاہیاں شامل ہو گئی ہیں، اپنی رحمت سے ان کو معاف فرما دیجئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرمایا کرتے تھے:

لَوْ لَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا
وَ لَا تَصَدَّقْنَا وَ لَا صَلَّيْنَا (۱)

اے اللہ! اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہمیں ہدایت نہ ملتی، اور اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہم نہ صدقہ دے سکتے تھے اور نہ نماز پڑھ سکتے تھے۔ جو کچھ ہے وہ آپ کی توفیق سے ہے۔ اس لئے ہم اس توفیق پر شکرادا کرتے ہیں، اور اپنی کوتاہیوں سے استغفار کرتے ہیں۔ بس! اگر یہ دو باتیں پلے باندھ لو گے تو نہ کبر پیدا ہوگا اور نہ تواضع مفرط پیدا ہوگی، جو شیطان کے دو ہتھیار ہیں۔

شیطان کی کمر توڑنے والے الفاظ

میں نے اپنے شیخ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ مقولہ سنا کہ ''جو شخص کوئی بھی نیک عمل کرنے کے بعد یہ الفاظ کہہ دے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰه"(۲)

تو شیطان یہ الفاظ سن کر کہتا ہے کہ اس نے میری کمر توڑ دی۔ کیونکہ ''الحمدللہ'' کہنے سے توفیق پر شکرادا ہوگیا تو اس سے کبر کی جڑ کٹ گئی، اور ''استغفراللہ'' کہنے سے یہ ہوا کہ تواضع مفرط کے نتیجے میں جن کوتاہیوں پر نظر ہورہی تھی، ان کی جڑ کٹ گئی، دونوں کا علاج ہوگیا۔ اس لئے ہر نماز کے بعد اور ہر نیک عمل کے بعد کہو ''الحمدللہ، استغفراللہ''، اور یہ الفاظ کہتے وقت یہ کہو کہ یا اللہ! آپ نے مجھے نیک عمل کرنے کی توفیق دی، اس پر میں ''الحمدللہ'' کہہ رہا ہوں، اور اس عمل میں میری طرف سے جو کوتاہیاں ہوئیں اس میں میں ''استغفراللہ'' کہہ رہا ہوں کہ اے اللہ! مجھے معاف فرما دیجئے۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ہائے ہائے کرنے کی ضرورت نہیں، بس جو بھی عبادت کرو، اس کے بعد یہ پڑھ لو، انشاء اللہ شیطان کے عمل سے محفوظ رہو گے۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسير، باب حفر الخندق، رقم: ۲٦۲۵، صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، رقم: ۳۳٦۵، مسند أحمد، رقم: ۱۷۷۵۵

(۲) سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ما جاء فی الصلاة عند التوبة، رقم: ۳۷۱، سنن أبی داود، کتاب الصلاة، باب فی الاستغفار، رقم: ۱۳۰۰، سنن ابن ماجه، کتاب امامة الصلاة والسنة فيها، باب ما جاء فی الصلاة كفارة، رقم: ۱۳۸۵

بڑوں کی اطاعت
اور
ادب کے تقاضے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

عَنْ اَبِی الْعَبَّاسِ سَهْلِ بْنِ سَعْدِ نِ السَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلَغَهٗ، اَنَّ بَنِیْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ كَانَ بَيْنَهُمْ شَرٌّ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصْلِحُ بَيْنَهُمْ فِیْ اُنَاسٍ مَّعَهٗ فَحُبِسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَانَتِ الصَّلٰوةُ......(۱)

"باب الاصلاح بين الناس" لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے بیان میں چل رہا ہے اور اس باب کی تین حدیثیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اور یہ اس باب کی آخری حدیث ہے۔ جو ذرا طویل ہے، اس لئے اس کا ترجمہ اور تشریح عرض کیے دیتا ہوں۔

لوگوں کے درمیان صلح کرانا

حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے درمیان آپس میں جھگڑا کھڑا ہوگیا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان مصالحت کرانے کے لئے تشریف لے گئے۔ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی آپ نے ساتھ لے لیا، تاکہ اس مصالحت میں وہ مدد دیں۔ مصالحت کرانے کے دوران بات لمبی ہوگئی۔ اور اتنی دیر ہوگئی کہ نماز کا وقت آگیا، یعنی وہ وقت آگیا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں نماز پڑھایا کرتے تھے، لیکن چونکہ آپ ابھی تک فارغ نہیں ہوئے تھے اس لئے آپ مسجد نبوی میں تشریف نہ لا سکے۔

☆ اصلاحی خطبات (۲۲۲/۳ تا ۲۳۴)، ۷ فروری ۱۹۹۲ء، بروز جمعہ بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب الاشارة فی الصلاة، رقم: ۱۱۵۸، سنن النسائی، کتاب الامامة، باب اذا تقدم الرجل من الرعية ثم جاء الوالی هل يتأخر، رقم: ۷۷٦

یہاں اس حدیث کو لانے کا منشا یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کے درمیان جھگڑے کو ختم کرانے اور مصالحت کرانے کو اتنی اہمیت دی اور اس میں اتنے مصروف ہوئے کہ نماز کا مقرر وقت آ گیا، اور آپ مسجد نبوی میں تشریف نہ لا سکے۔

راوی فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کے مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے، اور حضور اقدس ﷺ تشریف نہیں لائے تو وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، اور ان سے جا کر عرض کیا کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ! آنحضرت ﷺ کو دیر ہو گئی ہے، اور نماز کا وقت آ گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو مزید کچھ دیر ہو جائے، اور لوگ نماز کے انتظار میں ہیں، کیا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ امامت کرا دیں؟ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو ایسا کر سکتے ہیں، ہم نماز پڑھ لیتے ہیں۔ حضور ﷺ کو دیر ہو گئی ہو گی۔ اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہی، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امامت کے لئے آگے بڑھ گئے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نماز شروع کرنے کے لئے ''اللہ اکبر'' کہا اور لوگوں نے تکبیر کہی۔ جب نماز شروع کر دی تو نماز کے دوران حضور نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے، اور صف میں ایک جگہ پر مقتدی کی حیثیت سے کھڑے ہو گئے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ تشریف لے آئے ہیں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو آپ کے آنے کے بارے میں پتہ نہیں ہے، اس لئے کہ وہ آگے امامت کر رہے ہیں تو لوگوں کو خیال ہوا کہ اب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو علم ہو جانا چاہئے کہ حضور اقدس ﷺ تشریف لا چکے ہیں، تاکہ وہ پیچھے ہٹ جائیں، اور آنحضرت ﷺ آگے ہو کر نماز پڑھائیں اور چونکہ اس وقت لوگوں کو مسئلہ معلوم نہیں تھا، اس لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اطلاع دینے کے لئے نماز کے اندر تالیاں بجانا شروع کر دیں، اور ان کو متنبہ کرنا شروع کیا، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ جب نماز شروع کر دیتے تو ان کو دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی، اور وہ کسی اور طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے کہ دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے۔ اس لئے شروع میں جب ایک دو آدمیوں نے تالی بجائی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پتہ بھی نہیں چلا۔ وہ اپنی نماز میں مصروف رہے، لیکن جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ دیکھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کچھ التفات نہیں فرما رہے ہیں تو اس وقت لوگوں نے زیادہ زور سے تالی بجانی شروع کر دی، اور جب کئی صحابہ نے تالی بجائی اور آواز بلند ہونے لگی تو اس وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کچھ تنبہ ہوا، اور کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھنا شروع کیا تو اچانک دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ صف میں تشریف فرما ہیں۔ حضور اقدس ﷺ کو صف میں دیکھ کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا، تو آنحضرت ﷺ نے ان کو ہاتھ کے اشارے سے منع فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر رہو، پیچھے ہٹنے کی ضرورت نہیں، نماز پوری کر لو۔

لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حضور اقدس ﷺ کو دیکھ لیا تو پھر ان کے بس میں نہ رہا کہ وہ اپنے مصلے پر کھڑے رہتے، اس لئے اُلٹے پاؤں پیچھے کی طرف ہٹنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ صف میں آکر کھڑے ہو گئے، اور حضور اقدس ﷺ آگے مصلے پر تشریف لے گئے۔ اور پھر باقی نماز آنحضرت ﷺ نے پڑھائی۔

امام کو متنبہ کرنے کا طریقہ

جب نماز ختم ہو گئی تو اس کے بعد آپ ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور خطاب فرمایا کہ یہ کیا طریقہ ہے کہ اگر نماز کے اندر کوئی واقعہ پیش آجائے تو تم تالیاں بجانا شروع کر دیتے ہو، یہ طریقہ نماز کے شایانِ شان اور مناسب نہیں، اور تالیاں بجانا تو عورتوں کے لئے مشروع ہے، یعنی بالفرض اگر خواتین کی جماعت ہو رہی ہو، ویسے خواتین کی جماعت اچھی اور پسندیدہ نہیں ہے، یا خواتین نماز میں شامل ہوں، اور وہ امام کو کسی بات کی طرف متوجہ کرنا چاہیں۔ تو ان کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالیں بجائیں۔ ان کے لئے نماز کے اندر زبان سے ''سبحان اللہ'' یا ''الحمدللہ'' کہنا اچھا نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح خاتون کی آواز مردوں کے کان میں جائے گی اور خاتون کی آواز کا بھی شریعت میں پردہ ہے، لہٰذا ان کے لئے حکم یہ ہے کہ اگر نماز کے اندر کوئی واقعہ پیش آئے تو ہاتھ پر ہاتھ مار کر امام کو متوجہ کریں، لیکن اگر مردوں کی جماعت میں کوئی واقعہ پیش آجائے جس کی وجہ سے امام کو کسی بات کی طرف متوجہ کرنا منظور ہو، تو اس میں مردوں کے لئے طریقہ یہ ہے کہ وہ سبحان اللہ کہیں، مثلاً امام کو بیٹھنا چاہئے تھا، اور مقتدیوں نے دیکھا کہ کھڑا ہو رہا ہے تو مقتدی کو چاہئے کہ وہ ''سبحان اللہ'' کہیں یا الحمد للہ کہیں یا امام کو کھڑا ہونا چاہئے تھا، لیکن وہ بیٹھ گیا تو اس وقت بھی سبحان اللہ کہہ دیں، یا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جہری نماز ہے، اور امام نے سراً قرات شروع کر دی، تو اس وقت بھی اس کو الحمدللہ وغیرہ سے متنبہ کر دے، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر نماز میں کوئی بھی ایسا عمل پیش آجائے، جس کی وجہ سے اس کو تنبیہ کرنا مقصود ہو تو مقتدی ''سبحان اللہ'' کہہ دیں۔ تالیاں نہیں بجانی چاہئیں۔

ابو قحافہ کے بیٹے کی یہ مجال نہیں تھی

اس کے بعد آپ ﷺ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے فرمایا کہ اے ابوبکر! میں نے تو آپ کو اشارہ کر دیا تھا کہ آپ اپنی نماز جاری رکھیں، اور پیچھے نہ ہٹیں، اس کے بعد پھر کیا وجہ ہوئی کہ آپ پیچھے ہٹ گئے، اور امامت کرنے سے آپ نے تردّد کیا، اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا عجیب جواب دیا، فرمایا:

"مَا كَانَ لِابْنِ اَبِیْ قُحَافَةَ اَنْ یُّصَلِّیَ بِالنَّاسِ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ"

یا رسول اللہ! ابو قحافہ کے بیٹے کی یہ مجال نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں لوگوں کی امامت کرے۔ ابو قحافہ ان کے والد کا نام ہے۔ یعنی میری یہ مجال نہیں تھی کہ آپ کی موجودگی میں مصلی پر کھڑا ہو کر امامت کرتا رہوں۔ جب تک آپ تشریف نہیں لائے تھے تو بات دوسری تھی، جب آپ کو دیکھ لیا تو میرے اندر یہ تاب نہیں تھی کہ میں امامت جاری رکھوں، اس واسطے میں پیچھے ہٹ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا، بلکہ خاموشی اختیار فرمائی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام

اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حضور اقدس ﷺ کی عظمت اس درجہ پیوست کر رکھی تھی کہ فرماتے ہیں کہ یہ بات میری برداشت سے باہر تھی کہ حضور ﷺ پیچھے کھڑے ہوں اور میں آگے کھڑا رہوں۔ اگرچہ یہ واقعہ حضور ﷺ کی غیر موجودگی میں پیش آیا اور حضور ﷺ کی موجودگی میں کھڑے نہیں ہوئے تھے لیکن جب پتہ لگ گیا کہ حضور پیچھے ہیں تو پھر آگے کھڑا رہنا برداشت سے باہر تھا اس لئے پیچھے ہٹ گئے۔

ادب کی اہمیت زیادہ یا امر کی؟

یہاں ایک مسئلہ اور ادب عرض کر دوں، جو مسنون ادب ہے، آپ نے وہ مشہور مقولہ سنا ہوگا:

"الأمر فوق الأدب"

یعنی تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ جب کوئی بڑا کسی بات کا حکم دے، چاہے اس بات پر عمل کرنا ادب کے خلاف معلوم ہو رہا ہو، اور ادب کا تقاضا یہ ہو کہ وہ عمل نہ کیا جائے، لیکن جب بڑے نے حکم دے دیا تو چھوٹے کا کام یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل کرے، یہ بڑی نازک بات ہے اور بعض اوقات اس پر عمل بھی مشکل ہوتا ہے لیکن دین پر عمل کرنے والے تمام بزرگوں کا ہمیشہ یہی معمول رہا ہے کہ جب کسی بڑے نے کسی کام کا حکم دیا تو ادب کے بجائے حکم کی تعمیل کو مقدم رکھا۔

بڑے کے حکم پر عمل کرے

مثلاً فرض کرو کہ ایک بڑا بزرگ شخص ہے اور وہ کسی امتیازی جگہ جیسے تخت وغیرہ پر بیٹھا ہے۔ اب ایک شخص اس کے پاس آیا جو اس سے چھوٹا ہے۔ ان بزرگ نے کہا کہ: بھائی! تم یہاں میرے

پاس آجاؤ۔ تو اس وقت اس کی بات مان لینی چاہئے اگرچہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ پاس نہ بیٹھے، دور ہو کر بیٹھے، اس کے پاس تخت پر جا کر بیٹھ جانا ادب کے خلاف ہے۔ لیکن جب بڑے نے حکم دے کر کہہ دیا کہ یہاں آجاؤ تو اس وقت تعظیم کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے حکم پر عمل کرے، چاہے دل میں یہ بات بری لگ رہی ہو کہ میں بڑے کے بالکل قریب جا کر بیٹھ جاؤں۔ اس لئے کہ ادب کے مقابلہ میں حکم کی تعمیل زیادہ مقدم ہے۔

دین کا خلاصہ "اتباع" ہے

میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ سارے دین کا خلاصہ ہے اتباع، بڑے کے حکم کو ماننا، اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا، اللہ کے حکم کی اتباع، اللہ کے رسول کے حکم کی اتباع، اور اللہ کے رسول کے وارثین کی اتباع، بس وہ جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرو، چاہے ظاہر میں وہ بات تمہیں ادب کے خلاف معلوم ہو۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں میری حاضری

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس اتوار کے دن ہوا کرتی تھی۔ اس لئے کہ اس زمانے میں اتوار کی سرکاری چھٹی ہوا کرتی تھی، یہ آخری مجلس کا واقعہ ہے، اس کے بعد حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی مجلس نہیں ہوئی، بلکہ اگلی مجلس کا دن آنے سے پہلے ہی حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا۔ چونکہ والد صاحب بیمار اور صاحبِ فراش تھے، اس لئے آپ کے کمرے میں ہی لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے۔ والد صاحب چارپائی پر ہوتے، لوگ سامنے نیچے اور صوفوں پر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اس روز لوگ بہت زیادہ آئے اور کمرہ پورا بھر گیا، حتیٰ کہ کچھ لوگ کھڑے بھی ہو گئے۔ اور مجھے حاضری میں تاخیر ہوئی۔ میں ذرا دیر سے پہنچا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب مجھے دیکھا تو فرمایا: تم یہاں میرے پاس آجاؤ۔ میں ذرا جھجکنے لگا کہ لوگوں کو پھلانگتا ہوا اور چیرتا ہوا جاؤں گا اور حضرت والد صاحب کے پاس جا کر بیٹھوں گا۔ اگرچہ یہ بات ذہن میں مستحضر تھی کہ جب بڑا کوئی بات کہے تو مان لینی چاہئے لیکن میں ذرا ہچکچا رہا تھا۔ حضرت والد صاحب نے جب میری ہچکچاہٹ دیکھی تو دوبارہ فرمایا: تم یہاں آجاؤ تو تمہیں ایک قصہ سناؤں۔ خیر میں کسی طرح وہاں پہنچ گیا اور حضرت والد صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حاضری

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس ہو رہی تھی۔ اور وہاں

اسی طرح کا قصہ پیش آیا کہ جگہ تنگ ہوگئی اور بھرگئی اور میں ذرا تاخیر سے پہنچا تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم یہاں میرے پاس آجاؤ۔ میں کچھ جھجکنے لگا کہ حضرت کے بالکل پاس جاکر بیٹھ جاؤں تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ فرمایا کہ تم یہاں آجاؤ، پھر میں تمہیں ایک قصہ سناؤں گا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پھر میں کسی طرح پہنچ گیا، اور حضرت والا کے پاس جاکر بیٹھ گیا، تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ سنایا۔

عالمگیر اور داراشکوہ کے درمیان تخت نشینی کا فیصلہ

قصہ یہ سنایا کہ مغل بادشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے والد کے انتقال کے بعد باپ کی جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہوگیا اور یہ دو بھائی تھے۔ ایک عالمگیر اور دوسرے داراشکوہ۔ آپس میں رقابت تھی۔ عالمگیر بھی اپنے باپ کے جانشین اور بادشاہ بننا چاہتے تھے اور ان کے بھائی داراشکوہ بھی تخت کے طالب تھے۔ ان کے زمانے میں ایک بزرگ تھے، دونوں نے ارادہ کیا کہ ان بزرگ سے جاکر اپنے حق میں دعا کرائی جائے۔ پہلے داراشکوہ ان بزرگ کے پاس زیارت اور دعا کے لئے پہنچے۔ اس وقت وہ بزرگ تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان بزرگ نے داراشکوہ سے کہا کہ یہاں میرے پاس آجاؤ، اور تخت پر بیٹھ جاؤ۔ داراشکوہ نے کہا کہ نہیں حضرت، میری مجال نہیں ہے کہ میں آپ کے پاس تخت پر بیٹھ جاؤں، میں تو یہاں نیچے ہی ٹھیک ہوں۔ ان بزرگ نے پھر کہا کہ میں تمہیں بلا رہا ہوں، یہاں آجاؤ۔ لیکن وہ نہیں مانے، اور ان کے پاس نہ گئے اور وہیں بیٹھے رہے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا تمہاری مرضی، پھر ان بزرگ نے ان کو جو نصیحت فرمانی تھی وہ فرمادی اور وہ واپس چلے گئے۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ آگئے۔ وہ جب سامنے نیچے بیٹھنے لگے تو ان بزرگ نے فرمایا کہ تم یہاں میرے پاس آجاؤ۔ وہ فوراً جلدی سے اُٹھے اور ان بزرگ کے پاس جاکر تخت پر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے ان کو جو نصیحت فرمانی تھی وہ فرمادی۔ جب عالمگیر واپس چلے گئے تو ان بزرگ نے اپنی مجلس کے لوگوں سے فرمایا کہ ان دونوں بھائیوں نے تو خود ہی اپنا فیصلہ کرلیا۔ داراشکوہ کو ہم نے تخت پیش کیا، اس نے انکار کردیا، اور عالمگیر کو پیش کیا تو انہوں نے لے لیا، اس واسطے دونوں کا فیصلہ ہوگیا۔ اب تختِ شاہی عالمگیر کو ملے گا، چنانچہ ان کو ہی مل گیا۔

یہ واقعہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد قدس اللہ سرہ کو سنایا۔

حیل و حجت نہ کرنا چاہئے

یہ تو ایک تاریخی واقعہ ہے۔ بہرحال! ادب یہ ہے کہ جب بڑا کہہ رہا ہے کہ یہ کام کرلو، تو اس

میں زیادہ حیل و حجت کرنا ٹھیک بات نہیں، اس وقت تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ جا کر بیٹھ جائے، اس لئے کہ بڑے کے حکم کی تعمیل ادب پر مقدم ہے۔

بزرگوں کے جوتے اُٹھانا

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ لوگ کسی بزرگ کے جوتے اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اب اگر وہ بزرگ زیادہ اصرار کے ساتھ یہ کہیں کہ یہ مجھے پسند نہیں تو اس صورت میں بھی تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ چھوڑ دے اور جوتے نہ اٹھائے۔ بعض اوقات لوگ اس میں چھینا جھپٹی شروع کر دیتے ہیں اور بر سر پیکار ہو جاتے ہیں، یہ تعظیم کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ مقولہ مشہور ہے:

"الأمر فوق الأدب"

حکم کی تعمیل ادب کے تقاضے پر مقدم ہے، بڑا جو کہے اس کو مان لو، ہاں! ایک دو مرتبہ بزرگ سے یہ کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ حضرت! مجھے اس خدمت کا موقع دیجئے، لیکن جب بڑے نے حکم ہی دے دیا تو اس صورت میں حکم کی تعمیل ہی واجب ہے۔ وہی کرنا چاہئے۔ عام حالات کا دستور یہی ہے جس کام کا حکم دیا جائے اس کے مطابق عمل کیا جائے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول بھی یہی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دو واقعات

البتہ اس واقعہ میں جو آپ نے دیکھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹ گئے اور ادب کے تقاضے پر عمل کیا اور حکم نہیں مانا تو اس قسم کے واقعات پورے عہدِ صحابہ میں صرف دو ملتے ہیں کہ جن میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم نے ادب کے تقاضے کو حکم کی تعمیل پر مقدم رکھا

خدا کی قسم! نہیں مٹاؤں گا

ایک تو یہ واقعہ ہے اور ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے درمیان صلح نامہ لکھا جا رہا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا اور فرمایا "تم لکھو" انہوں نے عرض کیا کہ ٹھیک ہے۔ جب معاہدے کی شرائط لکھنی شروع کیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح نامہ پر لکھا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تو جو شخص کفار کی طرف سے صلح کی شرائط طے کرنے آیا تھا، اس نے کہا کہ نہیں ہم تو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" نہیں لکھنے دیں گے اور چونکہ یہ صلح نامہ دونوں کی طرف سے ہوگا، اس لئے اس میں ایسی بات ہونی چاہئے جس پر دونوں متفق ہوں۔ ہم "بسم اللہ

الرحمٰن الرحیم'' سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتے، ہم تو "باسمك اللّٰھم" لکھتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے بجائے "باسمك اللّٰھم" یعنی ''اے اللہ! آپ کے نام سے ہم شروع کرتے ہیں'' لکھتے تھے۔ اس لئے اس نے کہا کہ اس کو مٹادیں اور باسمك اللّٰھم لکھیں۔ تو حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ہمارے لئے اس میں کیا فرق پڑتا ہے، "باسمك اللّٰھم" بھی اللہ تعالیٰ کا نام ہے، چلو وہ مٹادو اور یہ لکھ دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے "باسمك اللّٰھم" لکھ دیا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ لکھنا شروع کیا کہ ''یہ معاہدہ ہے جو محمد رَسُول اللّٰہِ ﷺ اور سردارانِ مکہ کے درمیان طے پایا۔'' کفار کی طرف سے جو نمائندہ تھا، اس نے پھر اعتراض کیا کہ آپ نے یہ لفظ ''محمد'' کے ساتھ ''رسول اللہ'' کیسے لکھ دیا؟ اگر ہم آپ کو ''رسول اللہ'' مان لیں تو پھر جھگڑا ہی کیسا، سارا جھگڑا تو اس بات پر ہے کہ ہم آپ کو رسول تسلیم نہیں کرتے، لہٰذا یہ معاہدہ جس پر آپ نے ''محمد'' کے ساتھ ''رسول اللہ'' بھی لکھا ہے، ہم اس پر دستخط نہیں کریں گے۔ آپ صرف یہ لکھیں کہ ''یہ معاہدہ جو محمد بن عبداللہ اور سردارانِ قریش کے درمیان طے پایا''۔ تو پھر حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''چلو، کوئی بات نہیں، تم تو مجھے اللہ کا رسول مانتے ہو اس لئے ''محمد'' کے ساتھ ''رسول اللہ'' کا لفظ مٹادو اور ''محمد بن عبداللہ'' لکھ دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلی بات تو مان لی تھی اور ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے بجائے "باسمك اللّٰھم" لکھ دیا تھا۔ لیکن جب حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ ''محمد رسول اللہ'' کاٹ کر ''محمد بن عبداللہ'' لکھ دو، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً بے ساختہ فرمایا کہ "واللّٰه لا امحوه"، خدا کی قسم میں لفظ ''رسول اللہ'' کو نہیں مٹاؤں گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مٹانے سے انکار کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے بھی ان کے جذبات کو محسوس فرمایا اور فرمایا: اچھا تم نہ مٹاؤ، مجھے دو میں اپنے ہاتھ سے مٹاؤں گا۔ چنانچہ وہ عہد نامہ آپ نے ان سے لے کر اپنے دستِ مبارک سے ''رسول اللہ'' کا لفظ مٹادیا۔(۱)

اگر حکم کی تعمیل اختیار سے باہر ہو جائے

یہاں بھی یہی واقعہ ہوا کہ حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو حکم دیا تھا انہوں نے اس کی تعمیل سے انکار فرمایا اور بظاہر یوں لگتا ہے کہ ادب کو حکم پر مقدم کرلیا۔ حالانکہ حکم ادب پر مقدم ہے۔ اس کی حقیقت سمجھ لیجئے کہ اصل قاعدہ تو وہی ہے کہ بڑا جو کہہ رہا ہے اس کو مانے، اور اس کی تعمیل کرے،

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب، رقم: ۲۵۲۹، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب صلح الحديبية في الحديبية، رقم: ۳۳۳۷، مسند أحمد، رقم: ۶۲۱۔

لیکن بعض اوقات انسان کسی حالت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے حکم کی تعمیل کرنا اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ گویا کہ اس کے اندر اس کام کی استطاعت اور طاقت ہی نہیں ہوتی۔ اس وقت اگر وہ اس کام سے پیچھے ہٹ جائے تو اس پر یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے نافرمانی کی بلکہ اس پر یہ حکم صادق آئے گا:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتے۔ تو پہلے واقعہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تو خود ہی فرمادیا کہ یہ بات میرے بس سے باہر تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں موجود ہوں اور ابو قحافہ کا بیٹا امامت کرتا رہے اور دوسرے واقعہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اتنے مغلوب الحال تھے کہ یہ بات ان کے بس سے باہر تھی کہ وہ ''محمد'' کے نام سے ''رسول اللہ'' کا لفظ مٹائیں، اس واسطے انہوں نے مٹانے سے انکار کر دیا۔

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

لیکن اصل حکم وہی ہے کہ محبوب جو بات کہے اس کو مانو، اپنی نہ چلاؤ، وہ جس طرح کہہ دے اسی کے مطابق عمل کرو۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے
عشق تسلیم و رضا کے ماسوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں تو پھر وفا کچھ بھی نہیں

اگر ان کی خوشی اس میں ہے کہ میں ایسا کام کروں جو بظاہر ادب کے خلاف لگ رہا ہے تو پھر وہی کام بہتر ہے جس کے اندر ان کی خوشی ہے اور ان کی رضا ہے۔

خلاصہ: بہر حال! امام نووی رحمۃ اللہ علیہ جو یہاں یہ حدیث لائے ہیں، وہ اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لائے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے جھگڑے نمٹانے کی اور ان کے درمیان آپس میں صلح کرانے کی اتنی اہمیت تھی کہ نماز کا جو وقت مقرر تھا، اس سے آپ کو کچھ دیر بھی ہو گئی، لیکن آپ اس کے اندر مشغول رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپس کے جھگڑوں سے محفوظ رکھے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) البقرة: ۲۸٦

بڑوں کا اکرام کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اما بعد!

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اِذَا اَتَاكُمْ كَرِيْمُ قَوْمٍ فَاَكْرِمُوْهُ))(۱)

''جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز مہمان آئے تو تم اس کا اکرام کرو''

یعنی اگر کوئی شخص کسی قوم کا سردار ہے یا صاحبِ منصب ہے، اور اس قوم کے اندر اس کو معزز سمجھا جاتا ہے، جب وہ تمہارے پاس آئے تو تم اس کا اکرام کرو۔

اکرام کا ایک انداز

ویسے تو شریعت میں ہر مسلمان کا اکرام کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کوئی مسلمان بھائی تمہارے پاس آئے تو اس کا حق ہے کہ اس کا اکرام کیا جائے اور اس کی عزت کی جائے۔ حدیث شریف میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر آپ کسی جگہ پر بیٹھے ہیں اور کوئی مسلمان تمہارے پاس ملنے آگیا تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہئے کہ اس کے آنے پر تم تھوڑی سی حرکت کرلو۔ یہ نہ ہو کہ ایک مسلمان بھائی تم سے ملنے کے لئے آیا لیکن تم اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے، بلکہ بت بنے بیٹھے رہے۔ یہ طریقہ اس کے اکرام کے خلاف ہے۔ لہٰذا کم از کم تھوڑی سی اپنی جگہ سے حرکت کرنی چاہئے تاکہ آنے والے کو یہ محسوس ہو کہ اس نے میرے آنے پر میری عزت کی ہے اور میرا اکرام کیا ہے۔

اکرام کے لئے کھڑا ہو جانا

ایک طریقہ ہے دوسرے کے اکرام کے لئے کھڑا ہو جانا، مثلاً کوئی شخص آپ کے پاس آئے تو آپ اس کی عزت اور اکرام کے لئے اپنی جگہ سے کھڑے ہو جائیں۔ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ جو شخص

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/۲۲۱ تا ۲۳۴)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب اذا أتاكم كريم قوم فاكرموه، رقم: ۳۷۰۲

آنے والا ہے، اگر وہ اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ لوگ میرے اکرام اور میری عزت کے لئے کھڑے ہوں، تو اس صورت میں کھڑا ہونا درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ خواہش اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ اس کے اندر تکبر اور بڑائی ہے، اور وہ دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھتا ہے، اس لئے وہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ میرے لئے کھڑے ہوں۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس کے لئے نہ کھڑے ہوں۔ لیکن اگر آنے والے شخص کے دل میں یہ خواہش نہیں ہے کہ لوگ میرے لئے کھڑے ہوں، اب آپ اس شخص کے علم یا اس کے تقویٰ یا اس کے منصب کی وجہ سے اس کا اکرام کرتے ہوئے اس کے لئے کھڑے ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، کوئی گناہ بھی نہیں، اور کھڑا ہونا واجب بھی نہیں۔

حدیث سے کھڑے ہونے کا ثبوت

خود حضور اقدس ﷺ نے بعض مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کھڑے ہونے کا حکم دیا، چنانچہ جب بنوقریظہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو آپ نے بلایا اور وہ تشریف لائے تو آپ نے اس وقت بنوقریظہ کے حضرات سے فرمایا:

((قُوْمُوْا لِسَيِّدِكُمْ))

''تمہارے سردار آ رہے ہیں، ان کے لئے تم کھڑے ہو جاؤ''(۱)

لہٰذا ایسے موقع پر کھڑے ہونا جائز ہے۔ اگر کھڑے نہ ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن حدیث میں اس بات کی تاکید ضرور آئی ہے کہ کسی کے آنے پر یہ نہ ہو کہ آپ بت بنے بیٹھے رہیں اور اپنی جگہ پر حرکت بھی نہ کریں، اور نہ اس کے آنے پر خوشی کا اظہار کریں۔ بلکہ آپ نے فرمایا کہ کم از کم اتنا تو کر لو کہ اپنی جگہ پر ذرا سی حرکت کر لو، تا کہ آنے والے کو یہ احساس ہو کہ میرا اکرام کیا ہے۔

مسلمان کا اکرام ''ایمان'' کا اکرام ہے

ایک مسلمان کا اکرام اور اس کی عزت درحقیقت اس ''ایمان'' کا اکرام ہے جو اس مسلمان کے دل میں ہے۔ جب ایک مسلمان کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پر ایمان رکھتا ہے، اور وہ ایمان

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب اذا نزل العدو علی حکم رجل، رقم: ۲۸۱۶، صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب جواز قتال من نقض العهد وجواز إنزال أهل الحصن، رقم: ۳۳۱۴، سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب ما جاء فی القیام، رقم: ۴۵۳۹، مسند أحمد، رقم: ۱۰۷۴۲۔

اس کے دل میں ہے، تو اس کا تقاضا اور اس کا حق یہ ہے کہ اس مسلمان کا اکرام کیا جائے، اگرچہ ظاہری حالت کے اعتبار سے وہ مسلمان تمہیں کمزور نظر آرہا ہو، اور اس کے اعمال اور اس کی ظاہری شکل و صورت پوری طرح دین کے مطابق نہ ہو، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ اس کے دل میں جو ایمان اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، اس ایمان کا کیا مقام ہے؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا ایمان کتنا مقبول ہے؟ محض ظاہری شکل وصورت سے اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ہر آنے والے مسلمان کا بحیثیت مسلمان ہونے کے اس کا اکرام کرنا چاہئے۔

ایک نوجوان کا سبق آموز واقعہ

ایک مرتبہ میں دارالعلوم میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا، اس وقت ایک نوجوان میرے پاس آیا۔ اس نوجوان میں سر سے لے کر پاؤں تک ظاہری اعتبار سے اسلامی وضع قطع کی کوئی بات نظر نہیں آرہی تھی۔ مغربی لباس میں ملبوس تھا۔ اس کی ظاہری شکل دیکھ کر بالکل اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کے اندر بھی دینداری کی کوئی بات موجود ہوگی۔ میرے پاس آکر کہنے لگا کہ میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ کیا مسئلہ ہے؟ وہ کہنے لگا کہ مسئلہ یہ ہے کہ میں ''ایکچوری'' ''ماہر شماریات'' (Actuary) ہوں، (انشورنس کمپنیوں میں جو حسابات وغیرہ لگائے جاتے ہیں کہ کتنا ''پریمیم'' ہونا چاہئے اور انشورنس کی کتنی رقم ہونی چاہئے، اس قسم کے حسابات کے لئے ''ایکچوری'' رکھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں پاکستان بھر میں کہیں بھی یہ علم نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ پھر اس نوجوان نے کہا کہ میں نے یہ علم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ کا سفر کیا اور وہاں سے یہ حاصل کرکے آیا ہوں۔ (اس وقت پورے پاکستان میں اس فن کو جاننے والے دو تین سے زیادہ نہیں تھے، اور جو شخص ''ماہر شماریات'' بن جاتا ہے وہ انشورنس کمپنی کے علاوہ کسی اور جگہ پر کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ بہر حال، اس نوجوان نے کہا کہ) اور میں نے یہاں آکر ایک انشورنس کمپنی میں ملازمت کرلی۔ اور چونکہ پاکستان بھر میں اس کے ماہر بہت کم تھے، اس لئے ان کی مانگ بھی بہت تھی، اور ان کی تنخواہ اور سہولتیں بھی بہت زیادہ تھیں، اس لئے میری تنخواہ اور سہولتیں بھی بہت زیادہ ہیں، لہٰذا میں نے یہ ملازمت اختیار کرلی۔ جب یہ سب کچھ ہوگیا، تعلیم حاصل کرلی، ملازمت اختیار کرلی، تو اب مجھے کسی نے بتایا کہ یہ انشورنس کا کام حرام ہے، جائز نہیں۔ اب میں آپ سے اس کی تصدیق کرنے آیا ہوں کہ واقعۃً یہ حرام ہے یا حلال ہے؟

انشورنس کا ملازم کیا کرے؟

میں نے اس سے کہا کہ اس وقت انشورنس کی جتنی صورتیں رائج ہیں، ان میں کسی میں سود ہے، کسی میں جوا ہے، اس لئے وہ سب حرام ہیں۔ اور اس وجہ سے انشورنس کمپنی میں ملازمت بھی جائز نہیں۔ البتہ ہمارے بزرگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بینک میں یا انشورنس کمپنی میں ملازم ہو، تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے دوسرا حلال اور جائز ذریعۂ معاش تلاش کرے، اور اہتمام اور کوشش کے ساتھ اس طرح تلاش کرے جیسے ایک بے روزگار تلاش کرتا ہے، اور جب اس کو دوسرا حلال ذریعۂ آمدنی مل جائے، تو اس وقت اس حرام ذریعہ کو چھوڑ دے۔ یہ بات ہمارے بزرگ اس لئے فرماتے ہیں کہ کچھ پتہ نہیں کہ کس کے حالات کیسے ہوں۔ اب اگر کوئی شخص فوراً اس حرام ذریعہ کو چھوڑ دے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائے، پھر شیطان آکر اس کو یہ بہکا دے کہ دیکھو تم دین پر عمل کرنے چلے تھے تو اس کے نتیجے میں تم پر یہ مصیبت آگئی۔ اس لئے ہمارے بزرگ فرماتے ہیں کہ اس حرام ملازمت کو فوراً مت چھوڑو، بلکہ دوسری جگہ ملازمت تلاش کرو، جب حلال روزگار مل جائے تو اس وقت اس کو چھوڑ دینا۔

میں مشورہ لینے نہیں آیا

میرا یہ جواب سن کر وہ نوجوان مجھ سے کہنے لگا کہ مولانا صاحب! میں آپ سے یہ مشورہ لینے نہیں آیا کہ ملازمت چھوڑ دوں یا نہ چھوڑوں، میں آپ سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ یہ کام حلال ہے یا حرام ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ حلال اور حرام ہونے کے بارے میں بھی میں نے تمہیں بتا دیا، اور ساتھ میں بزرگوں سے جو بات سنی تھی، وہ بھی آپ کو بتا دی۔ اس نوجوان نے کہا کہ آپ مجھے اس کا مشورہ نہ دیں کہ میں ملازمت چھوڑوں یا نہ چھوڑوں۔ بس! آپ مجھے صاف اور دو ٹوک لفظوں میں یہ بتا دیں کہ یہ ملازمت حلال ہے یا نہیں؟ میں نے کہا: حرام ہے۔ اس نوجوان نے کہا کہ یہ بتائیں کہ اس کو اللہ نے حرام کیا ہے یا آپ نے حرام کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ نے حرام کیا ہے۔ اس نوجوان نے کہا کہ جس اللہ نے اس کو حرام کیا ہے وہ مجھے رزق سے محروم نہیں کرے گا۔ لہٰذا اب میں یہاں سے اس دفتر میں واپس نہیں جاؤں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے تو وہ ایسا نہیں کرے گا کہ مجھ پر رزق کے دروازے بند کر دے۔ لہٰذا میں آج ہی سے اس کو چھوڑتا ہوں۔

ظاہری شکل پر مت جاؤ

اب دیکھئے! ظاہری شکل وصورت سے دور دور تک پتہ نہیں لگتا تھا کہ اس اللہ کے بندے کے دل میں ایسا پختہ ایمان ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایسا پختہ بھروسہ ہوگا اور توکل ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا پختہ توکل عطا فرمایا تھا۔ اور واقعۃً اس نوجوان نے وہ ملازمت اسی دن چھوڑ دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو خوب نوازا اور دوسرے حلال روزگار اس کو عطا فرمائے۔ وہ اب امریکہ میں ہے۔ آج تک اس نوجوان کی یہ بات میرے دل پر نقش ہے۔ بہرحال، کسی کی ظاہری حالت دیکھ کر ہم اس پر کیا حکم لگائیں، معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں ایمان کی کیسی شمع روشن کی ہوئی ہے، اور اس کو اپنی ذات پر کیسا بھروسہ اور کیسا توکل عطا فرمایا ہوا ہے۔ لہٰذا کسی بھی انسان کی تحقیر مت کرو، جو صاحبِ ایمان ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے "اشهد أن لا إله إلا الله، أشهد أن محمدًا رسول الله" کی دولت عطا فرمائی ہے، وہ قابلِ اکرام ہے۔ اسی وجہ سے ہر صاحبِ ایمان کے اکرام کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ہر بیشہ گمان مبر کہ خالی است
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

یعنی گمان مت کرو کہ ہر جنگل خالی ہوگا، پتہ نہیں کیسے کیسے شیر اور چیتے اس میں سوئے ہوئے ہوں گے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو ایمان کی دولت عطا فرمادیں تو اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس صاحبِ ایمان کی قدر کریں، اس کی عزت کریں اور اس ایمان کا اکرام کریں جو اس کے دل میں ہے۔

معزز کافر کا اکرام

ویسے تو ہر مسلمان کے اکرام کا حکم دیا گیا ہے، لیکن حدیث میں یہاں تک فرمایا کہ آنے والا کافر ہی کیوں نہ ہو، مگر وہ اپنی قوم میں معزز سمجھا جاتا ہے، اس کی عزت کی جاتی ہے، لوگ اس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کو اپنا بڑا مانتے ہیں، چاہے وہ کافر اور غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اس کے آنے پر تم بھی اس کا اکرام کرو اور اس کی عزت کرو۔ یہ اسلامی اخلاق کا ایک تقاضا ہے کہ اس کی عزت کی جائے۔ یہ عزت اس کے کفر کی نہیں ہے، کیونکہ اس کے کفر سے تو نفرت اور کراہیت کا معاملہ کریں گے، لیکن چونکہ اس کو اپنی قوم میں باعزت سمجھا جاتا ہے، اس لئے جب وہ تمہارے پاس آئے تو تم اس کی مدارات کے لئے اس کا اکرام کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے نفرت کرنے کے نتیجے میں تم اس کے ساتھ ایسا برتاؤ اختیار کرلو کہ وہ تم سے اور تمہارے دین ہی سے متنفر ہو جائے، اس لئے اس کا اکرام کرو۔

کافروں کے ساتھ آپ ﷺ کا طرزِ عمل

حضورِ اقدس نبی کریم ﷺ نے ایسا کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ کے پاس کافروں کے بڑے بڑے سردار آیا کرتے تھے، جب وہ سردار حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آتے تو ان کو کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ہمارے ساتھ بے عزتی ہوئی ہے، بلکہ آپ نے ان کی عزت کی، ان کا اکرام کیا، ان کو عزت سے بٹھایا، اور عزت کے ساتھ ان سے بات کی۔ یہ ہے نبی کریم ﷺ کی سنت کہ اگر کافر بھی ہمارے پاس آجائے تو اس کو بھی بے عزتی کا احساس نہ ہو۔

ایک کافر شخص کا واقعہ

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ اپنے گھر میں تشریف فرما تھے۔ سامنے سے ایک صاحب آتے ہوئے دکھائی دیے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کے قریب تشریف فرما تھیں، آپ نے فرمایا: اے عائشہ! یہ شخص جو سامنے سے آرہا ہے، یہ اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ پھر جب وہ شخص حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آیا تو آپ نے کھڑے ہو کر اس کا اکرام کیا، اور بڑی عزت کے ساتھ اس سے بات چیت کی۔ جب وہ شخص بات چیت کرنے کے بعد واپس چلا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یا رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ! آپ نے خود ہی تو فرمایا تھا کہ یہ شخص اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے، لیکن جب یہ شخص آگیا تو آپ نے اس کی بڑی عزت کی اور اس سے بڑی نرمی کے ساتھ پیش آئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہ آدمی بہت بُرا ہے جس کے شر سے بچنے کے لئے اس کا اکرام کیا جائے۔ (۱)

یہ غیبت جائز ہے

اس حدیث میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں: پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ شخص دور سے چلتا ہوا آرہا تھا تو اس کے آنے سے پہلے ہی اس کے پیٹھ پیچھے حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی بُرائی بیان کی کہ یہ شخص اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو غیبت ہے، اس لئے کہ پیٹھ پیچھے ایک آدمی کی بُرائی بیان کی جارہی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں یہ

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب لم يكن النبي فاحشا ولا متفحشا، رقم: ٥٥٧٢، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، رقم: ٤٦٩٣، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، رقم: ١٩١٩، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، رقم: ٤١٥٩۔

غیبت نہیں، اس لئے کہ اگر کسی شخص کو کسی دوسرے شخص کے شر سے بچانے کی نیت سے اس کی بُرائی بیان کی جائے تو یہ غیبت نہیں۔ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے کو متنبہ کرنے کے لئے اس سے کہے کہ تم فلاں شخص سے ذرا احتیاط رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں دھوکہ دے جائے، یا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں تکلیف پہنچائے، تو یہ غیبت میں داخل نہیں، حرام اور ناجائز نہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں یہ بتانا واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ کو یقینی طور پر معلوم ہے کہ فلاں شخص فلاں آدمی کو دھوکہ دے گا، اور اس دھوکے کے نتیجے میں اس دوسرے شخص کو مالی یا جانی سخت تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے، تو آپ پر واجب ہے کہ آپ اس دوسرے شخص کو بتادیں کہ دیکھو فلاں آدمی تمہیں دھوکہ دینا چاہتا ہے، تاکہ وہ اس سے محفوظ رہے۔ یہ غیبت میں داخل نہیں۔

لہٰذا جب حضور اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ بتایا کہ یہ شخص قبیلے کا بُرا آدمی ہے، تو اس بتانے کا منشا یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شخص حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کسی وقت دھوکہ دے جائے، یا کہیں اس شخص پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہوئے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یا کوئی دوسرا مسلمان کوئی ایسا کام کر گزرے جس کی وجہ سے بعد میں انہیں پچھتاوا ہو۔ اس لئے آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کے بارے میں پہلے سے بتادیا۔

بُرے آدمی کا آپ نے اکرام کیوں کیا؟

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو آپ نے اس کی بُرائی بیان فرمائی، اور دوسری طرف جب وہ شخص آگیا تو آپ نے اس کی بڑی عزت فرمائی، اور بڑی خاطر تواضع فرمائی۔ اس میں ظاہر اور باطن میں فرق ہوگیا کہ سامنے کا معاملہ کچھ ہے، اور پیچھے کچھ اور ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں، جنہوں نے ایک ایک چیز کی حد بیان فرمائی ہے، لہٰذا متنبہ کرنے کے لئے تو آپ نے اتنا بتادیا کہ یہ شخص بُرا آدمی ہے، لیکن جب وہ شخص ہمارے پاس مہمان بن کر آیا ہے تو مہمان ہونے کی حیثیت سے بھی اس کا کچھ حق ہے، وہ یہ کہ ہم اس کے ساتھ عزت سے پیش آئیں، اور اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں جو ایک مہمان کے ساتھ کرنا چاہئے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے یہی برتاؤ فرمایا۔

وہ آدمی بہت بُرا ہے

اس حدیث میں ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اگر بُرے آدمی کا اکرام نہ کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچادے، یا کسی مصیبت کے اندر مبتلا کردے، یا

تمہارے ساتھ وہ کوئی ایسا معاملہ کردے جس کے نتیجے میں تمہیں آئندہ پچھتانا پڑے، اس لئے اگر کسی بُرے آدمی سے ملاقات کی نوبت آجائے تو اس کا اکرام کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے شر سے اپنی جان کو اور اپنے مال کو اور اپنی آبرو کو بچانا بھی انسان کے فرائض میں داخل ہے۔ اسی لئے حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں صاف صاف ارشاد فرمادیا کہ وہ آدمی بہت بُرا ہے جس کے شر سے بچنے کے لئے لوگ اس کا اکرام کریں۔ لوگ اس کا اکرام اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ وہ آدمی اچھا ہے، بلکہ اس لئے اس کا اکرام کر رہے ہیں کہ اگر اس کا اکرام نہیں کریں گے تو یہ تکلیف پہنچائے گا۔ ایسی صورت میں بھی اکرام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ وہ اکرام جائز حدود کے اندر ہو اور اس کی وجہ سے کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

حضور اقدس ﷺ کے اُسوۂ مبارکہ کے ایک ایک جز میں نہ جانے کتنے بے شمار سبق ہمارے اور آپ کے لئے موجود ہیں۔ آپ نے غیبت کی حد بتادی کہ اتنی بات غیبت ہے، اور اتنی بات غیبت میں داخل نہیں۔ اور اکرام کرنا کوئی منافقت نہیں، بلکہ حکم یہ ہے کہ وہ آنے والا خواہ کیسا ہی کافر اور فاسق و فاجر ہو، لیکن جب وہ تمہارے پاس مہمان بن کر آئے تو اس کی عزت کرو، اس کا اکرام کرو۔ کیونکہ یہ بات منافقت میں داخل نہیں۔

سرسیّد احمد خان کا ایک واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سرسیّد کا یہ واقعہ سنا۔ اب تو وہ اللہ کے پاس چلے گئے، اب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی عقائد کے اندر جو گڑبڑ کی ہے، وہ بڑی خطرناک قسم کی ہے۔ مگر چونکہ ابتداءً وہ بزرگوں کی صحبت اُٹھائے ہوئے تھے اور باقاعدہ عالم بھی تھے، اس لئے ان کے اخلاق اچھے تھے۔ بہر حال، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے، اور ان کے ساتھ کچھ بے تکلف دوست بھی تھے، سامنے دور سے ان کو ایک آدمی آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ آنے والا عام ہندوستانی لباس پہنے ہوئے چلا آرہا تھا، لیکن جب وہ کچھ قریب آگیا تو باہر ہی ایک حوض کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا، اس تھیلے میں سے اس نے ایک عربی جبہ نکالا، اور عرب لوگ سر پر رومال کے اوپر جو ڈوری باندھتے ہیں، وہ نکالی، اور ان دونوں کو پہنا، اور پھر قریب آنے لگا۔ سرسیّد صاحب دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آپ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ یہ جو شخص آرہا ہے، یہ فراڈی آدمی معلوم ہو رہا ہے، اس لئے کہ یہ شخص اب تک تو سیدھے سادھے ہندوستانی لباس میں آرہا تھا، یہاں قریب آکر اس نے اپنا چولہ بدل لیا ہے اور عربی لباس پہن لیا ہے، اب یہاں آکر یہ اپنے

آپ کو عرب ظاہر کرے گا اور پھر پیسے وغیرہ مانگے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص ان کے پاس پہنچ گیا اور آ کر دروازے پر دستک دی۔ سرسیّد صاحب نے جا کر دروازہ کھولا اور عزت کے ساتھ اس کو اندر بلا لیا۔ سرسیّد نے پوچھا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میں حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوں۔ یہ حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے صوفیاء کرام میں سے تھے۔ اور پھر اس شخص نے کچھ اپنی ضرورت بیان کی کہ میں اس ضرورت سے آیا ہوں، آپ میری کچھ مدد کر دیں۔ چنانچہ سرسیّد صاحب نے پہلے اس کی خوب خاطر تواضع کی، اور پھر جتنے پیسوں کی اس کو ضرورت تھی، اس سے زیادہ لا کر اس کو دیدیئے۔ اور پھر بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کو رخصت کر دیا۔

آپ نے اس کی خاطر مدارات کیوں کی؟

جب وہ شخص واپس چلا گیا تو ان کے ساتھی نے سرسیّد صاحب سے کہا کہ آپ بھی عجیب انسان ہیں۔ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے اپنا چولہ بدلا اور اپنا عام لباس اُتار کر عرب لباس پہنا، پھر آپ نے خود کہا کہ یہ فراڈی ہے، آ کر دھوکہ دے گا اور پیسے مانگے گا، اس کے باوجود آپ نے اس کی اتنی خاطر مدارات کی اور اس کو اتنے پیسے بھی دیئے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

سرسیّد صاحب نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ مہمان بن کر آیا تھا، اس لئے میں نے اس کی خاطر تواضع کی۔ جہاں تک پیسے دینے کا تعلق ہے، اس کے دھوکہ کی وجہ سے میں اس کو پیسے نہ دیتا، لیکن چونکہ اس نے ایک ایسے بڑے بزرگ کا نام لے لیا جس کے بعد میری جرأت نہیں ہوئی کہ میں انکار کروں، کیونکہ حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان اولیاء کرام میں سے ہیں کہ اگر اس شخص کو ان سے دور دراز کی بھی نسبت تھی، تو اس نسبت کا احترام کرنا میرا فرض تھا، شاید اللہ تعالیٰ میرے اس نسبت کے احترام پر میری مغفرت فرما دیں۔ اس لئے میں نے اس کو پیسے بھی دیدیئے۔

دین کی نسبت کا احترام

یہ واقعہ میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا۔ اور انہوں نے یہ واقعہ اپنے شیخ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ایک طرف سرسیّد صاحب نے مہمان کا اکرام کیا، اور دوسری طرف بزرگانِ دین کی نسبت کا احترام کیا، کیونکہ جو شخص اللہ کا ولی ہے، اور اس کی طرف کسی شخص کو ذرا سی بھی نسبت ہوگئی ہے، اگر اس نسبت

کا احترام کرلیا تو کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ اس نسبت کے اکرام ہی کی بدولت نوازش فرمادے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔ بہرحال، حضورِ اقدس ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا کہ کسی بھی قوم کا معزز آدمی آئے تو اس کا اکرام کرو۔

عام جلسہ میں معزز کا اکرام

یہاں ایک بات اور عرض کردوں، وہ یہ کہ جو عام اجتماع گاہ یا مجلس یا مسجد ہوتی ہے، اس کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص مسجد میں یا کسی مجلس میں یا کسی اجتماع میں جس جگہ جا کر پہلے بیٹھ جائے، وہ اس جگہ کا زیادہ حقدار ہے۔ مثلاً مسجد کی اگلی صف میں جا کر اگر کوئی شخص پہلے بیٹھ جائے، وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔ اب دوسرے شخص کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس سے کہے کہ بھائی! تم اس جگہ سے ہٹ جاؤ، یہاں میں بیٹھوں گا۔ بلکہ جس شخص کو جہاں جگہ مل جائے، وہ وہاں بیٹھ جائے۔ لیکن اگر اسی مجلس میں یا عام اجتماع میں یا مسجد میں کوئی ایسا شخص آجائے جو اپنی قوم کا معزز فرد ہے، تو اس کو آگے بٹھانا اور دوسروں سے آگے جگہ دیدینا بھی اس حدیث کے مفہوم میں داخل ہے۔ ہمارے بزرگوں کا معمول یہ ہے کہ جب کسی مجلس میں سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوں اور اس وقت کوئی معزز مہمان آجائے تو اس معزز مہمان کو اپنے قریب بٹھاتے ہیں، اور اگر اس کو قریب بٹھانے کے لئے دوسروں سے یہ بھی کہنا پڑے کہ تھوڑا سا پیچھے ہوجائیں، تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ حدیث پر عمل ہو رہا ہے

یہ بات اس لئے عرض کردی کہ اس طرزِ عمل پر ہمارے بزرگوں کا معمول رہا ہے، جس کی وجہ سے لوگوں کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت کا تو حکم یہ ہے کہ جو شخص پہلے آجائے، اس کو جہاں جگہ مل جائے، وہ وہاں بیٹھ جائے، اب اگر کوئی شخص دیر سے آیا ہے، اور اس کو پیچھے جگہ مل رہی ہے، تو اس کو چاہئے کہ وہ وہیں پیچھے بیٹھے، لیکن یہ بزرگ صاحب دوسروں کا حق پامال کرکے دیر سے آنے والے کو آگے کیوں بلا رہے ہیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ وہ آگے بلانے والے بزرگ درحقیقت اس حدیث پر عمل فرماتے ہیں کہ "إذا اتاكم كريم قوم فاكرموه" یعنی جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز آدمی آجائے تو تم اس کا اکرام کرو۔

بلکہ ہمارے بزرگ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین) وہ اس بات کا بڑا خیال فرماتے تھے، یہاں تک کہ اگر کوئی بڑا آدمی مسجد میں آجاتا، اور اگلی صف کے لوگ اس کو جگہ نہ دیتے، تو حضرت والا اس طرزِ عمل پر لوگوں کو خاص طور پر متنبہ فرماتے کہ

بھائی یہ کیا انداز ہے؟ تمہیں چاہئے کہ اپنی جگہ سے ہٹ کر ایسے معزز آدمی کو جگہ دیں، اور اس کو یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ ناانصافی ہے، بلکہ یہ بھی اس حدیث کے ارشاد پر عمل کا ایک حصہ ہے۔

معزز کا اکرام باعثِ اجر ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر ایک جملہ یہ تحریر فرمایا ہے، وہ بھی یاد رکھنے کا ہے، وہ یہ کہ "کوئی شخص کافر ہو یا فاسق ہو، اگر اس کے آنے پر اس کا اکرام اس حدیث پر عمل کرنے کی نیت سے ہو تو انشاء اللہ باعثِ اجر ہے، کیونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل ہے۔ لیکن اگر اس کا اکرام اس نیت سے کرے کہ میں اگر اس کا اکرام کروں گا تو یہ فلاں موقع پر میرے کام آئے گا، یا فلاں موقع پر اس سے سفارش کراؤں گا، یا اس سے فلاں دنیاوی مقصد حاصل کروں گا، گویا کہ ایک فاسق یا کافر کے اکرام کا مقصد دنیاوی لالچ ہے اور اس سے پیسے بٹورنا مقصود ہے یا اپنے لئے کوئی منصب حاصل کرنا ہے، تو اس صورت میں یہ اکرام درست نہیں۔

لہٰذا اکرام کرتے وقت نیت درست ہونی چاہئے، یعنی یہ نیت ہونی چاہئے کہ چونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا ہے اس لئے اس حکم کی تعمیل میں یہ اکرام کررہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

بڑوں سے آگے مت بڑھو ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،
﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾(۱)

سورۃ الحجرات دو حصوں پر مشتمل ہے

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! میں نے آپ کے سامنے سورۃ الحجرات کی ابتدائی دو آیات تلاوت کیں۔ یہ سورۃ دو حصوں پر منقسم ہے، پہلا حصہ نبی اکرم ﷺ کی تعظیم وتکریم اور آپ کے ساتھ معاملات کرنے کے آداب پر مشتمل ہے، یعنی مسلمانوں کو حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ کس طرح معاملہ کرنا چاہئے، دوسرا حصہ مسلمانوں کے باہمی معاشرت اور تعلقات کے احکام اور آداب پر مشتمل ہے۔

قبیلہ بنو تمیم کے وفد کی آمد

اس سورۃ کا پہلا حصہ جس واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوا، وہ واقعہ یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں قبیلہ بنو تمیم کا ایک وفد مسلمان ہو کر آیا۔ اس زمانے میں مختلف قبائل کے وفود اسی غرض سے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آرہے تھے، اور حضور ﷺ سے اسلامی تعلیمات حاصل کر رہے تھے۔ جب کوئی وفد واپس جانے کا ارادہ کرتا تو اس وقت حضور ﷺ انہی میں سے ایک کو ان کا امیر مقرر فرما دیتے، تاکہ آئندہ وہ امیر حضورِ اقدس ﷺ سے رابطہ رکھے، اور آپ کے احکام اپنے قبیلے کے لوگوں تک پہنچانے میں معاون ثابت ہو۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/ ۲۰۸۔۲۲۰)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) الحجرات: ۱، ۲

حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا اپنے طور پر امیر مقرر کرنا

جب قبیلہ بنوتمیم کا وفد آیا اور اسلامی تعلیمات حاصل کر کے جانے کا ارادہ کیا تو اس وقت ان کے اندر بھی ایک کو امیر مقرر کرنا تھا، لیکن ابھی تک آپ نے کسی کو متعین فرما کر اعلان نہیں کیا تھا، صحابہ کرام حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ بھی تشریف فرما تھے، قبل اس کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود قبیلہ بنوتمیم کے لئے کسی امیر کا تعین فرمائیں، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے آپس میں یہ مشورہ شروع کر دیا کہ بنوتمیم میں سے کس کو امیر بنانا چاہئے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قعقاع ابن معبد رضی اللہ عنہ کو امیر بنانے کی تجویز پیش کی، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کو امیر بنانے کی تجویز پیش کی، اور ہر ایک نے اپنی تجویز کے حق میں دلائل دینے شروع کر دیئے۔ اس گفتگو کے دوران ان دونوں حضرات کی آوازیں بلند ہوگئیں، جبکہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس میں موجود تھے، اس موقع پر سورۃ الحجرات کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔(۱)

دو غلطیاں سرزد ہوئیں

ان آیات نے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو متنبہ فرمایا کہ اس خاص واقعہ میں دو باتیں غلط ہوئیں، ایک یہ کہ جب ابھی تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ موضوع چھیڑا نہیں تھا کہ کس کو امیر بنایا جائے، نہ آپ نے خود کوئی اعلان کیا تھا، نہ آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ طلب کیا تھا کہ بتاؤ کس کو امیر بنایا جائے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان سے پہلے اور مشورہ طلب کرنے سے پہلے یہ گفتگو جو شروع کی گئی یہ مناسب نہیں تھی، بلکہ غلط اور قابلِ اعتراض تھی۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ گفتگو کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان دونوں حضرات کی آوازیں بلند ہوگئیں، حالانکہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مجلس میں تشریف فرما ہوں تو کسی شخص کا بلند آواز سے بولنا آپ کی تعظیم اور تکریم کے مناسب نہیں تھا، اس لئے آئندہ اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

پہلی غلطی پر تنبیہ

بہرحال! سورۃ الحجرات میں سب سے پہلے ان دو غلطیوں پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو''

---

(۱) تفسير ابن كثير (٤ / ٢٦١)

یہ اس آیت کا لفظی ترجمہ ہے، اس آیت کا پس منظر وہی ہے کہ ابھی نبی کریم ﷺ نے بنو تمیم میں سے کسی کو امیر بنانے کا مسئلہ چھیڑا نہیں تھا، نہ خود آپ نے اعلان کیا تھا اور نہ ہی صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا تھا، اس سے پہلے اپنی طرف سے اس کی گفتگو چھیڑ دینا یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کے مرادف تھا، اس پر تنبیہ فرمائی۔

یہ قرآن قیامت تک رہنمائی کرتا رہے گا

لیکن قرآن کریم کا یہ عجیب وغریب معجزانہ اسلوب ہے کہ بسا اوقات ایک آیت کسی خاص واقعہ پر نازل ہوتی ہے کہ کوئی واقعہ پیش آیا، اور اس میں مسلمانوں کو تعلیم دینی مقصود تھی، کوئی ہدایت دینی مقصود تھی، اس پر آیت نازل فرمادی، لیکن یہ قرآن کریم قیامت تک کے انسانوں کی رہنمائی کے لئے آیا ہے، اس لئے الفاظ ایسے لاتے ہیں کہ جس سے وہ رہنمائی اس واقعہ کی حد تک محدود نہ رہے، بلکہ قیامِ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے ایک ابدی رہنمائی ثابت ہو۔ چنانچہ اس میں یہ نہیں فرمایا کہ بنو تمیم کے وفد میں سے کسی ایک کو امیر بنانے کے سلسلے میں تم لوگوں نے حضور ﷺ کے فرمانے سے پہلے کیوں بات شروع کردی، یہ نہیں فرمایا، بلکہ ایک عام حکم دے دیا کہ ''اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو''۔ اس ایک جملے سے بہت سارے احکام نکل رہے ہیں، کیا کیا احکام ہیں؟ آج کی محفل میں اسی کو بیان کرنا مقصود ہے۔

حضور ﷺ کی اجازت کے بغیر گفتگو جائز نہیں

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو''۔ اس حکم سے ایک براہِ راست مفہوم تو یہ نکل رہا ہے کہ جو موضوع حضور ﷺ نے ابھی چھیڑا نہیں، اس پر حضور ﷺ کے ارشاد اور اجازت کے بغیر گفتگو کرنا جائز نہیں۔ یہ تو ایک واقعہ تھا، لیکن ہوسکتا ہے کہ آئندہ بھی اس طرح کی صورت پیش آجائے، اس لئے یہ حکم دے دیا کہ جو معاملہ حضور ﷺ نے ابھی چھیڑا نہیں، اس پر اپنی طرف سے رائے زنی شروع نہ کرو۔

عالم سے پہلے گفتگو کرنا جائز نہیں

اسی آیت کے تحت علماء کرام نے فرمایا کہ چونکہ یہ قرآن کریم قیامت تک کے لئے ابدی ہدایت ہے، لہٰذا اگرچہ حضور ﷺ تو ہمارے درمیان تشریف فرما نہیں رہے، لیکن ان کے وارثین انشاء اللہ قیامت تک رہیں گے، حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

((اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ)) (۱)

یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں، اس لئے مفسرین نے فرمایا کہ یہی حکم ان مقتدا علماء کا بھی ہے، جن کی بات لوگ سنتے ہوں، اور مانتے ہوں، جن کو اللہ تعالیٰ نے دین اور شریعت کا علم عطا فرمایا ہو، ان کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر ان کی مجلس میں کوئی سوال کیا گیا ہو تو ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر کسی شخص کا ان عالم کی اجازت کے بغیر اپنی طرف سے بول پڑنا اس عالم کی تعظیم و تکریم کے بھی خلاف ہے، اور آدابِ مجلس کے بھی خلاف ہے، اور بے ادبی ہے، یا ابھی تک کسی موضوع پر گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دی، اس سے پہلے لوگوں نے خود سے آپس میں اس موضوع پر گفتگو شروع کر دی، یہ بھی آدابِ مجلس کے خلاف ہے، اور بے ادبی ہے، البتہ اگر خود صاحبِ مجلس مشورہ طلب کرے کہ فلاں مسئلہ ہے، آپ حضرات اپنی رائے دیں، تو اس صورت میں آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کریں۔ یا اگر کسی موضوع پر کوئی بات چھیڑنی ہے تو پہلے صاحبِ مجلس سے اجازت لے کہ کیا اس مسئلے پر گفتگو کر لی جائے؟ اگر وہ اجازت دیدے تو پھر بیشک اس پر گفتگو کریں، لیکن بغیر اجازت کے گفتگو شروع نہ کریں، کیونکہ اس کے نتیجے میں صاحبِ مجلس سے آگے بڑھنا لازم آئے گا، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے، اس آیت کا ایک براہِ راست مفہوم تو یہ تھا۔

راستے میں نبی یا علماء سے آگے بڑھنا

اس آیت سے دوسرا حکم یہ نکل رہا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کہیں تشریف لے جا رہے ہوں تو راستے میں چلنے کے دوران ان سے آگے بڑھنا بے ادبی ہے، آپ کی عظمت کا اور آپ کی تعظیم و تکریم کا تقاضا یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کے ساتھ چلیں تو ذرا سا پیچھے ہو کر چلیں، آگے آگے نہ چلیں، یہ بھی اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے، اس حکم کے بارے میں بھی مفسرین نے فرمایا کہ چونکہ یہ حکم بھی قیامِ قیامت تک کے لئے ہے، لہٰذا انبیاء کرام علیہم السلام کے وارثین کے بارے میں بھی یہ حکم ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اپنے کسی بڑے کے ساتھ، مثلاً کسی عالم کے ساتھ، شیخ کے ساتھ، استاد کے ساتھ چل رہا ہے تو اس کو ان سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے، یا تو ساتھ ساتھ چلے، یا ذرا سا پیچھے رہے، آگے بڑھنا بے ادبی ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے، یہ دوسرا حکم تھا۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب العلم عن رسول الله، باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة، رقم: ۲۶۰۶، سنن أبی داؤد، کتاب العلم، باب الحث علی طلب العلم، رقم: ۳۱۵۷، سنن ابن ماجه، المقدمة، ۲۱۹، مسند أحمد، رقم: ۲۰۷۲۳۔

سنت کی اتباع میں کامیابی ہے

تیسرا حکم جو اس آیت سے نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ تمہاری دنیا و آخرت کی صلاح اور فلاح اور کامیابی کا دارومدار نبی کریم ﷺ کی سنت کی اتباع میں ہے، لہٰذا جو آپ کی سنت ہو، اس پر عمل کرو، آپ سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو، یعنی آپ نے جس طرح زندگی گزاری ہے، جس میں آپ نے تمام اہل حقوق کو ان کا حق دیا، اپنے نفس کا حق ادا کیا، اپنے گھر والوں کا حق ادا کیا، اپنے ملنے جلنے والوں کا حق ادا کیا، اپنے دوست و احباب کا حق ادا کیا، اس طرح تم بھی حقوق ادا کرتے ہوئے زندگی گزارو، ایسا نہ ہو کہ حضور ﷺ سے آگے بڑھنے کا شائبہ پیدا ہو جائے، بس حضور ﷺ کی سنت پر عمل کرو۔

تین صحابہ رضی اللہ عنہم کے عبادت کے ارادے

ایک حدیث میں آتا ہے کہ چند صحابہ کرام تشریف فرما تھے، انہوں نے آپس میں یہ گفتگو شروع کی کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو اتنا اونچا مقام عطا فرمایا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتا، اور آپ گناہوں سے معصوم ہیں، آپ سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی، اور اگر کوئی بھول چوک ہو تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرما دیا ہے کہ:

﴿لَقَدْ غَفَرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾(۱)

اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام اگلی پچھلی بھول چوک بھی معاف کر دی ہیں، لہٰذا آپ کو زیادہ عبادت کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے آپ تو سو بھی جاتے ہیں، اور دن میں افطار بھی کر لیتے ہیں، لیکن ہمیں تو جنت کی بشارت نہیں ملی ہے، جیسے حضورِ اقدس ﷺ کو ملی ہوئی ہے، اس وجہ سے ہمیں حضورِ اقدس ﷺ سے زیادہ عبادت کرنی چاہئے۔ اس گفتگو کے بعد ان میں سے ایک صحابی نے یہ کہا کہ میں آج سے رات کو نہیں سوؤں گا، بلکہ ساری رات تہجد پڑھا کروں گا۔ دوسرے صحابی نے کہا کہ اب میں ساری زندگی روزے رکھوں گا، کوئی دن بھی روزے کے بغیر نہیں گزاروں گا۔ تیسرے صحابی نے کہا کہ زندگی بھر شادی نہیں کروں گا، تا کہ میں بیوی بچوں میں مشغول ہونے کے بجائے عبادت میں مشغول رہوں، اور عبادت سے غافل نہ ہوں۔

کوئی شخص نبی سے آگے نہیں بڑھ سکتا

اب آپ دیکھئے کہ ان تین صحابہ نے جو ارادے کیے وہ نیکی کے ارادے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی

---

(۱) الفتح: ۲

عبادت کا ارادہ کیا، جب حضور ﷺ کو پتہ چلا کہ ان صحابہ کرام نے یہ ارادے کیے ہیں، تو آپ نے ان تینوں کو بلوایا، اور ان سے فرمایا کہ:

((أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ أَنَا))

یعنی اللہ تعالیٰ کی جتنی معرفت مجھے حاصل ہے، اتنی معرفت کائنات میں کسی کو حاصل نہیں، اور اللہ کا خوف اور تقوی جتنا اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے، کائنات میں کسی کو اتنا تقوی حاصل نہیں، اس کے باوجود میں سوتا بھی ہوں اور رات کو اُٹھ کر نماز بھی پڑھتا ہوں، کسی دن روزہ رکھتا ہوں، کسی دن روزہ نہیں رکھتا، اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ یاد رکھو! اسی سنت میں تمہارے لئے نجات ہے۔

((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))

''اگر کوئی شخص میری سنت سے اعراض کرے گا، وہ مجھ سے نہیں ہوگا''

اس حدیث کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ بتادیا کہ دنیا وآخرت کی ساری صلاح اور فلاح نبی کریم ﷺ کی سنتوں کی اتباع میں ہے، کوئی شخص یہ چاہے کہ میں نبی سے آگے بڑھ جاؤں، یاد رکھئے! کوئی شخص بھی نبی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ (۱)

حقوق کی ادائیگی اتباعِ سنت ہے

ایک دوسری حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عبادت فرض کی ہے، اور عبادت کی ترغیب دی ہے، اسی طرح تم پر کچھ حقوق بھی عائد کیے ہیں، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے ملنے جلنے والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ (۲)

جب تم ان حقوق کی ادائیگی ایک ساتھ کروگے تو اتباعِ سنت ہوگا۔ لیکن اگر راہبوں کی طرح جنگل میں جا کر بیٹھ گئے اور یہ کہا کہ میں دنیا کو چھوڑ کر یہاں پر ''اللہ اللہ'' کروں گا، یہ حضورِ اقدس ﷺ کی سنت کی اتباع نہیں ہے۔ بہر حال! اس آیت کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو، بلکہ جس کام کو جس حد میں کرنے کا حکم دیا ہے، اس کام کو اسی حد میں رکھو، اس سے آگے نہ بڑھو۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح، رقم: ٤٦٧٥، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح، لمن تاقت نفسه اليه ووجد مؤنة، رقم: ٢٤٨٧، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب النهی عن التبتل، رقم: ٣١٦٥، مسند أحمد، رقم: ٦١٨٨

(۲) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب منه، رقم: ٢٣٣٧۔

دین ''اتباع'' کا نام ہے

یاد رکھئے! اپنی خواہش اور اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں، بلکہ دین نام ہے اتباع کا، اللہ کے حکم کی اتباع، اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کی اتباع کا نام ''دین'' ہے، لہٰذا جس وقت اللہ اور اللہ کے رسول کا جو حکم آجائے اور آپ کی اتباع کا جو تقاضا ہو، وہی خیر ہے اور وہی اطاعت ہے، اور اسی میں تمہاری دنیا و آخرت کی کامیابی ہے، اپنی طرف سے کوئی راستہ مقرر کر کے چل پڑنا کہ میں تو یہ کروں گا، یہ بات صحیح نہیں۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔ اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ جو کام حضورِ اقدس ﷺ نے کیا تھا، مجھے تو وہ کام کرتے ہوئے شرم آتی ہے، تو گویا وہ شخص یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میرا حضورِ اقدس ﷺ سے زیادہ اونچا مقام ہے، میں بڑا آدمی ہوں، اس لئے یہ کام میں نہیں کرتا۔ العیاذ باللہ۔ یہ بھی درحقیقت حضورِ اقدس ﷺ سے آگے بڑھنے میں داخل ہے، اس کی متعدد مثالیں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات میں ملتی ہیں۔

بارش میں گھر میں نماز پڑھنے کی رخصت

ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ حکم دیا کہ جب بارش ہو رہی ہو اور کیچڑ اتنا زیادہ ہو جائے کہ لوگوں کو اس میں چلنے میں بہت زیادہ دقت ہو، اور پھسلنے کا اندیشہ ہو، پاؤں لت پت ہو جائے، اور کپڑے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو تو شریعت نے ایسے موقع پر رخصت دی ہے کہ مسجد کے بجائے آدمی گھر میں نماز پڑھ لے۔ (۱)

اب آج کل ہم لوگ شہر میں رہتے ہیں، جہاں گلیاں اور سڑکیں پکی بنی ہوئی ہیں، اس لئے یہاں بارش ہونے سے یہ صورتِ حال پیدا نہیں ہوتی کہ اتنا کیچڑ ہو جائے کہ آدمی کے لئے چلنا دشوار ہو جائے۔ لیکن جہاں کچے مکانات اور کچی گلیاں ہوں، وہاں آج بھی یہ حکم موجود ہے کہ ایسی صورت میں جماعت معاف ہو جاتی ہے، اور آدمی کے لئے گھر میں نماز پڑھنا جائز ہو جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا واقعہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو حضورِ اقدس ﷺ کے چچا کے بیٹے ہیں، وہ ایک مرتبہ مسجد میں بیٹھے تھے، اذان کا وقت ہو گیا، اور ساتھ ہی تیز موسلا دھار بارش شروع ہو گئی، مؤذن نے اذان

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب الكلام في الأذان، رقم: ۵۸۱، سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب الجمعة في اليوم المطير، رقم: ۸۹۳، مسند أحمد، رقم: ۵۰۵۰

دی، اس کے بعد آپ نے مؤذن سے کہا کہ یہ اعلان کردو:

"الصلوة في الرحال"

یعنی سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھیں، اور حضورِ اقدس ﷺ سے بھی یہی الفاظ ثابت ہیں کہ ایسے موقع پر یہ اعلان کردینا چاہئے۔ اب لوگوں کے لئے یہ بات بڑی اجنبی تھی، اس لئے کہ ساری زندگی تو دیکھتے آرہے تھے کہ مسجد سے تو یہ اعلان ہوتا ہے:

"حي على الصلوة، حي على الفلاح"

نماز کے لئے آؤ، کامیابی کے لئے آؤ، لیکن یہاں اُلٹا اعلان ہو رہا ہے کہ اپنے گھروں میں نماز پڑھو، چنانچہ لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پر اعتراض کیا کہ حضرت! یہ آپ کیا کررہے ہیں؟ آپ لوگوں کو مسجد میں آنے سے منع کررہے ہیں؟ جواب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

"نعم افعل ذلك من هو خير مني ومنك"

''ہاں میں ایسا ہی اعلان کراؤں گا، کیونکہ یہ اعلان اس ذات نے بھی کرایا ہے جو مجھ سے بھی بہتر ہے، اور تم سے بھی بہتر ہے، یعنی حضورِ اقدس ﷺ''(۱)

لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مجھے تو اعلان کرنا بُرا لگتا ہے، اور مجھے ایسا اعلان کرتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم حضورِ اقدس ﷺ سے آگے بڑھنے کی کوشش کررہے ہو۔ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ اعلان فرمایا، اور یہ رخصت دی، اور تم کہتے ہو کہ میں یہ رخصت نہیں دیتا، مجھے یہ اعلان کرنا برا لگتا ہے۔

بہرحال! دین کے کسی بھی معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کی تعلیم سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے سے ممانعت بھی اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے۔

اللہ سے ڈرو

آگے فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾

اللہ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ سب کچھ سن رہے ہیں، اور سب کچھ جانتے ہیں۔ بہرحال! اللہ اور اللہ کے رسول سے آگے بڑھنے کی تین مثالیں تو میں نے آپ کے سامنے عرض کردیں، کچھ اور مثالیں ابھی بیان کرنا باقی ہیں، وقت ختم ہو رہا ہے، اللہ نے زندگی عطا فرمائی تو آئندہ جمعہ میں عرض کروں گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب هل يصلي الإمام بمن حضر وهل يخطب يوم الجمعة، رقم: ٦٢٨

اخوت، ایک اسلامی رشتہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾(۱)

آیت کا مفہوم

یہ آیت جو ابھی میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، لہٰذا تمہارے دو بھائیوں کے درمیان کوئی رنجش یا لڑائی ہو گئی ہو تو تمہیں چاہئے کہ ان کے درمیان صلح کراؤ اور صلح کرانے میں اللہ سے ڈرو تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سزاوار اور مستحق ہو جاؤ۔

جھگڑے دین کو مونڈنے والے ہیں

قرآن و سنت میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ﷺ کو مسلمانوں کے باہمی جھگڑے کسی قیمت پر پسند نہیں، مسلمانوں کے درمیان لڑائی ہو یا جھگڑا ہو یا ایک دوسرے سے کھچاؤ اور تناؤ کی صورت پیدا ہو یا رنجش ہو یہ اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ نہیں بلکہ حکم یہ ہے کہ حتی الامکان اس آپس کی رنجشوں اور جھگڑوں کو، باہمی نفرتوں اور عداوتوں کو کسی طرح ختم کرو۔ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا میں تم کو وہ چیز نہ بتاؤں جو نماز، روزے اور صدقہ سے بھی افضل ہے؟ ارشاد فرمایا:

☆ اصلاحی خطبات (۶/۱۴۰۔۱۶۱)، ۳۱ جنوری، ۱۹۹۲ء، بروز جمعۃ المبارک، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) الحجرات: ۱۰

((اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ فَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ الْحَالِقَةُ))(۱)

''لوگوں کے درمیان صلح کرانا۔ اور اس لئے کہ آپس کے جھگڑے مونڈنے والے ہیں''

یعنی مسلمانوں کے درمیان آپس میں جھگڑے کھڑے ہو جائیں، فساد برپا ہو جائے، ایک دوسرے کا نام لینے کے روادار نہ رہیں، ایک دوسرے سے بات نہ کریں بلکہ ایک دوسرے سے زبان اور ہاتھ سے لڑائی کریں یہ چیزیں انسان کے دین کو مونڈ دینے والی ہیں یعنی انسان کے اندر جو دین کا جذبہ ہے اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا جو جذبہ ہے وہ اس کے ذریعہ ختم ہو جاتا ہے، بالآخر انسان کا دین تباہ ہو جاتا ہے، اس لئے فرمایا کہ آپس کے جھگڑے اور فساد سے بچو۔

باطن کو تباہ کرنے والی چیز

بزرگوں نے فرمایا کہ آپس میں لڑائی جھگڑا کرنا، اور ایک دوسرے سے بغض اور عداوت رکھنا یہ انسان کے باطن کو اتنا زیادہ تباہ کرتا ہے کہ اس سے زیادہ تباہ کرنے والی چیز کوئی اور نہیں ہے۔ اب اگر انسان نماز بھی پڑھ رہا ہے، روزے بھی رکھ رہا ہے، تسبیحات بھی پڑھ رہا ہے، وظیفے اور نوافل کا بھی پابند ہے، ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اگر وہ انسان لڑائی جھگڑے میں لگ جاتا ہے تو یہ لڑائی جھگڑا اس کے باطن کو تباہ و برباد کر دے گا اور اس کو اندر سے کھوکھلا کر دے گا۔ اس لئے کہ اس لڑائی کے نتیجے میں آدمی کے دل میں دوسرے کی طرف سے بغض ہوگا اور اس بغض کی خاصیت یہ ہے کہ یہ انسان کو کبھی انصاف پر قائم نہیں رہنے دیتا لہٰذا وہ انسان دوسرے کے ساتھ کبھی ہاتھ سے زیادتی کرے گا، کبھی زبان سے زیادتی کرے گا، کبھی دوسرے کا مالی حق چھیننے کی کوشش کرے گا۔

اللہ کی بارگاہ میں اعمال کی پیشی

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ہر پیر کے دن اور جمعرات کے دن تمام انسانوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں''

یوں تو ہر وقت ساری مخلوق کے اعمال اللہ تعالیٰ کے سامنے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شخص کے عمل سے واقف ہیں، یہاں تک دلوں کے بھید کو جانتے ہیں کہ کس کے دل میں کس وقت کیا خیال آ رہا ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۴۳۳، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في اصلاح ذات البين، رقم: ۴۲۷۳، مسند أحمد، رقم: ۲۶۲۳۶

بات دراصل یہ ہے کہ ویسے تو اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہت کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ ان دو دنوں میں مخلوق کے اعمال پیش کیے جائیں تا کہ ان کی بنیاد پر ان کے جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔

وہ شخص روک لیا جائے

بہرحال اعمال پیش ہونے کے بعد جب کسی انسان کے بارے میں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ شخص اس ہفتے کے اندر ایمان کی حالت میں رہا اور اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں آج کے دن اس کی مغفرت کا اعلان کرتا ہوں۔ یعنی یہ شخص ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا بلکہ کسی نہ کسی وقت جنت میں ضرور داخل ہوجائے گا، لہٰذا اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں، لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ یہ اعلان بھی فرمادیتے ہیں:

((إِلَّا مَنْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَخِيهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ أَنْظِرُوا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا))(۱)

''لیکن جن دو شخصوں کے درمیان آپس میں کینہ اور بغض ہو ان کو روک لیا جائے۔ ان کے جنتی ہونے کا فیصلہ میں ابھی نہیں کرتا، یہاں تک کہ ان دونوں کے درمیان آپس میں صلح نہ ہوجائے''

بغض سے کفر کا اندیشہ

سوال یہ ہے کہ اس شخص کے جنتی ہونے کا اعلان کیوں روک دیا گیا؟ بات دراصل یہ ہے کہ یوں تو جو شخص بھی کوئی گناہ کرے گا، قاعدے کے اعتبار سے اس کو اس گناہ کا بدلہ ملے گا، اس کے بعد جنت میں جائے گا، لیکن اور جتنے گناہ ہیں ان کے بارے میں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ وہ گناہ اس کو کفر اور شرک میں مبتلا کردیں گے، اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ چونکہ صاحبِ ایمان ہے اس لئے اس کے جنتی ہونے کا اعلان ابھی کردو۔ جہاں تک اس کے گناہوں کا تعلق ہے تو اگر یہ ان سے توبہ کرلے گا تو معاف ہوجائیں گے اور اگر توبہ نہیں کرے گا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ان گناہوں کی سزا بھگت کر جنت میں چلا جائے گا۔ لیکن بغض اور عداوت ایسے گناہ ہیں کہ ان کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اس کو کفر اور شرک میں مبتلا نہ کردیں اور اس کا ایمان سلب نہ ہوجائے اس لئے ان کے جنتی ہونے کا

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب النهي عن الشحناء والتهاجر، رقم: ٤٦٥٢، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب فيمن يهجر أخاه المسلم، رقم: ٤٢٧٠، مسند أحمد، رقم: ٨٦٩٢، موطا امام مالك، كتاب الجامع، رقم: ١٤١٤

فیصلہ اس وقت تک کے لئے روک دو جب تک یہ دونوں آپس میں صلح نہ کرلیں۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو مسلمانوں میں آپس کا باہمی بغض اور نفرت کتنا ناپسند ہے۔

شبِ برات میں بھی مغفرت نہیں ہوگی

شبِ برات کے بارے میں یہ حدیث آپ حضرات نے سنی ہوگی کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی رحمت انسانوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے، اور اس رات میں اللہ تعالیٰ اتنے لوگوں کی مغفرت فرماتے ہیں جتنے قبیلہ کلب کی بکریوں کے جسم پر بال ہیں، لیکن دو آدمی ایسے ہیں کہ ان کی مغفرت اس رات میں بھی نہیں ہوتی، ایک وہ شخص جس کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے بغض ہو، کینہ ہو اور عداوت ہو۔ وہ رات جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، رحمت کی ہوائیں چل رہی ہیں، اس حالت میں بھی وہ شخص اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے محروم رہتا ہے۔ دوسرا وہ شخص جس نے اپنا زیر جامہ ٹخنوں سے نیچے لٹکایا ہوا ہو، اس کی بھی مغفرت نہیں ہوگی۔ (۱)

بغض کی حقیقت

اور "بغض" کی حقیقت یہ ہے کہ دوسرے شخص کی بدخواہی کی فکر کرنا کہ اس کو کسی طرح نقصان پہنچ جائے یا اس کی بدنامی ہو، لوگ اس کو برا سمجھیں، اس پر کوئی بیماری آجائے، اس کی تجارت بند ہوجائے، یا اس کو تکلیف پہنچ جائے، تو اگر دل میں دوسرے شخص کی طرف سے بدخواہی پیدا ہوجائے اس کو "بغض" کہتے ہیں، لیکن اگر ایک شخص مظلوم ہے، کسی دوسرے شخص نے اس پر ظلم کیا ہے تو ظاہر ہے کہ مظلوم کے دل میں ظالم کے خلاف جذبات پیدا ہوجاتے ہیں اور اس کا مقصد اپنے آپ سے اس ظلم کو دفع کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ ظلم نہ کرے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس ظالم سے ظلم کا بدلہ لینے کی اور اپنے سے ظلم کا دفاع کرنے کی بھی اجازت دی ہے چنانچہ اس وقت مظلوم اس ظالم کے اس ظلم کو تو اچھا نہ سمجھے بلکہ اس کو برا سمجھے لیکن اس وقت بھی اس ظالم کی ذات سے کوئی کینہ نہ رکھے، اس کی ذات سے بغض نہ کرے اور نہ بدخواہی کی فکر کرے تو مظلوم کا یہ عمل بغض میں داخل نہ ہوگا۔

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب ما جاء في ليلة النصف من شعبان، رقم: ۱۳۸۰، مسند أحمد، رقم: ٦٣٥٣

حسد اور کینہ کا بہترین علاج

یہ "بغض" حسد سے پیدا ہوتا ہے۔ دل میں پہلے دوسرے کی طرف سے حسد پیدا ہوتا ہے کہ وہ آگے بڑھ گیا، میں پیچھے رہ گیا، اور اب اس کے آگے بڑھ جانے کی وجہ سے دل میں جلن اور کڑھن ہو رہی ہے، گھٹن ہو رہی ہے، اور دل میں یہ خواہش ہو رہی ہے کہ میں اس کو کسی طرح کا نقصان پہنچاؤں اور نقصان پہنچانا قدرت اور اختیار میں نہیں ہے، اس کے نتیجے میں جو گھٹن پیدا ہو رہی ہے اس سے انسان کے دل میں "بغض" پیدا ہو جاتا ہے، لہٰذا "بغض" سے بچنے کا پہلا راستہ یہ ہے کہ اپنے دل سے پہلے حسد کو ختم کرے اور بزرگوں نے حسد دور کرنے کا طریقہ یہ بیان فرمایا کہ اگر کسی شخص کے دل میں یہ حسد پیدا ہو جائے کہ وہ مجھ سے آگے کیوں بڑھ گیا تو اس حسد کا علاج یہ ہے کہ وہ اس شخص کے حق میں یہ دعا کرے کہ یا اللہ اس کو اور ترقی عطا فرما۔ جس وقت اس کے حق میں یہ دعا کرے گا اس وقت دل پر آرے چل جائیں گے، اس کے بارے میں دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ اس کی ترقی نہ ہو بلکہ نقصان ہو جائے لیکن زبان سے وہ یہ دعا کر رہا ہے کہ یا اللہ اس کو اور ترقی عطا فرما۔ چاہے دل پر آرے چل جائیں لیکن بتکلف اور زبردستی اس کے حق میں دعا کرے۔ حسد دور کرنے کا یہ بہترین علاج ہے، اور جب حسد دور ہو جائے گا تو ان شاء اللہ بغض بھی دور ہو جائے گا، لہٰذا ہر شخص اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھ لے اور جس کے بارے میں بھی یہ خیال ہو کہ اس کی طرف سے دل میں بغض یا کینہ ہے تو اس شخص کو اپنی پنج وقت نمازوں کی دعاؤں میں شامل کرے، یہ حسد اور کینہ کا بہترین علاج ہے۔

دشمنوں پر رحم۔ نبی ﷺ کی سیرت

دیکھئے! مشرکینِ مکہ نے حضورِ اقدس ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ظلم کرنے اور آپ کو تکلیف دینے، ایذاء پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے خون کے پیاسے ہو گئے، اعلان کر دیا کہ جو شخص حضورِ اقدس ﷺ کو پکڑ کر لائے گا، اس کو سو اُونٹ انعام میں ملیں گے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر آپ ﷺ پر تیروں کی بارش کی حتیٰ کہ آپ کا چہرۂ انور زخمی ہو گیا، دندانِ مبارک شہید ہوئے لیکن اس موقع پر آپ ﷺ کی زبان پر یہ دعا تھی:

((اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ))(۱)

---

(۱) صحیح البخاری، كتاب استتابة المرتدين والمعاندين وقتالهم، باب اذا عرض الذمی وغيره بسب النبی ولم يصرح...... الخ، رقم: ٦٤١٧، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب غزوة أحد، رقم: ٣٣٤٧، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، رقم: ٤٠١٥، مسند أحمد، رقم: ٣٤٠٩

اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرمایئے ان کو علم نہیں ہے، یہ ناواقف اور جاہل ہیں، میری بات نہیں سمجھ رہے ہیں اس لئے میرے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔

اندازہ لگایئے کہ وہ لوگ ظالم تھے اور ان کے ظلم میں کوئی شک نہیں تھا لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کے دل میں ان کی طرف سے بغض اور کینہ کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا تو یہ بھی نبی کریم ﷺ کی عظیم سنت اور آپ کا اُسوہ ہے کہ بدخواہی کا بدلہ بدخواہی سے نہ دیں بلکہ اس کے حق میں دعا کریں اور یہی حسد اور بغض کو دور کرنے کا بہترین علاج ہے۔

بہر حال، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ آپس کے جھگڑے آخر کار دل میں بغض اور حسد پیدا کر دیتے ہیں، اس لئے کہ جب جھگڑا لمبا ہو تو دل میں بغض ضرور پیدا ہوگا۔ اور جب بغض پیدا ہوگا تو دل کی دنیا تباہ ہو جائے گی، اور باطن خراب ہوگا، اور اس کے نتیجے میں انسان اللہ کی رحمت سے محروم ہو جائے گا، اس لئے حکم یہ ہے کہ آپس کے جھگڑے سے بچو، اور ان سے دور رہو۔

جھگڑا علم کا نور زائل کر دیتا ہے

یہاں تک کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک جھگڑا تو جسمانی ہوتا ہے، جس میں ہاتھاپائی ہوتی ہے اور ایک جھگڑا پڑھے لکھوں کا اور علماء کا ہوتا ہے، وہ ہے مجادلہ، مناظرہ اور بحث ومباحثہ، ایک عالم نے ایک بات پیش کی، دوسرے نے اس کے خلاف بات کی، اس نے ایک دلیل دی، دوسرے نے اس کی دلیل کا رد لکھ دیا، سوال وجواب اور ردوقدح کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے، اس کو بھی بزرگوں نے کبھی پسند نہیں فرمایا، اس لئے کہ اس کی وجہ سے باطن کا نور زائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اَلْمِرَاءُ وَالْجِدَالُ فِي الْعِلْمِ يُذْهِبُ بِنُوْرِ الْعِلْمِ"(۱)

"علمی جھگڑے علم کے نور کو زائل کر دیتے ہیں"

دیکھئے، ایک تو ہوتا ہے "مذاکرہ" مثلاً ایک عالم نے ایک مسئلہ پیش کیا، دوسرے عالم نے کہا کہ اس مسئلے میں مجھے فلاں اشکال ہے، اب دونوں بیٹھ کر افہام وتفہیم کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، یہ ہے "مذاکرہ"، یہ بڑا اچھا عمل ہے، لیکن یہ جھگڑا کہ ایک عالم نے دوسرے کے خلاف ایک مسئلے کے سلسلے میں اشتہار شائع کر دیا، یا کوئی پمفلٹ یا کتاب شائع کر دی، اب دوسرے عالم نے اس کے خلاف کتاب شائع کر دی اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا، یا ایک عالم نے دوسرے کے خلاف تقریر کر دی، دوسرے عالم نے اس کے خلاف تقریر کر دی، اور یوں مخالفت برائے مخالفت کا سلسلہ قائم

(۱) ترتيب المدارك وتقريب المسالك

ہوگیا، یہ ہے ''مجادلہ اور جھگڑا'' جس کو ہمارے بزرگوں نے، ائمۂ دین نے بالکل پسند نہیں فرمایا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی قوتِ کلام

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے قوتِ کلام میں ایسا کمال عطا فرمایا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی بھی مسئلہ پر بحث و مباحثہ کے لئے آجاتا تو آپ چند منٹ میں اس کو لاجواب کر دیتے تھے، بلکہ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیّ صاحب قدس اللہ سرہ نے واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ آپ بیمار تھے اور بستر پر لیٹے ہوئے تھے، اس وقت آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

''الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بھروسے پر یہ بات کہتا ہوں کہ اگر ساری دنیا کے عقلمند لوگ جمع ہو کر آجائیں، اور اسلام کے کسی بھی معمولی سے مسئلے پر کوئی اعتراض کریں تو انشاء اللہ یہ ناکارہ دو منٹ میں ان کو لاجواب کر سکتا ہے ____ پھر فرمایا کہ ''میں تو ایک ادنیٰ طالب علم ہوں، علماء کی تو بڑی شان ہے۔''

چنانچہ واقعہ یہ تھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کوئی آدمی کسی مسئلہ پر بات چیت کرتا تو چند منٹ سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔

مناظرہ سے عموماً فائدہ نہیں ہوتا

خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں دارالعلوم دیوبند سے درسِ نظامی کر کے فارغ ہوا تو اس وقت مجھے باطل فرقوں سے مناظرہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ کبھی شیعوں سے مناظرہ ہو رہا ہے، کبھی غیر مقلدین سے تو کبھی بریلویوں سے، کبھی ہندوؤں سے، اور کبھی سکھوں سے مناظرہ ہو رہا ہے۔ چونکہ نیا نیا فارغ ہوا تھا، اس لئے شوق اور جوش میں یہ مناظرے کرتا رہا۔ لیکن بعد میں میں نے مناظرے سے توبہ کر لی، اس لئے کہ تجربہ یہ ہوا اس سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اپنی باطنی کیفیات پر اس کا اثر پڑتا ہے، اس لئے میں نے اس کو چھوڑ دیا۔

بہرحال، جب ہمارے بزرگوں نے حق و باطل کے درمیان بھی مناظرے کو پسند نہیں فرمایا تو پھر اپنی نفسانی خواہشات کی بنیاد پر، یا دنیاوی معاملات کی بنیاد پر مناظرہ کرنے اور لڑائی جھگڑا کرنے کو کیسے پسند فرما سکتے ہیں، یہ جھگڑا ہمارے باطن کو خراب کر دیتا ہے۔

جنت میں گھر کی ضمانت

ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((وَمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌّ بُنِيَ لَهُ فِيْ وَسَطِ الْجَنَّةِ))(۱)

''میں اس شخص کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے''

یعنی جو شخص حق پر ہونے کے باوجود یہ خیال کرتا ہے کہ اگر میں حق کا زیادہ مطالبہ کروں گا تو جھگڑا کھڑا ہو جائے گا، چلو اس حق کو چھوڑ دو، تاکہ جھگڑا ختم ہو جائے، اس کے لئے حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ میں اس کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کو جھگڑا ختم کرانے کی کتنی فکر تھی، تاکہ آپس کے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ ہاں، اگر کہیں معاملہ بہت آگے بڑھ جائے، اور قابلِ برداشت نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کی اجازت ہے کہ مظلوم ظالم کا دفاع بھی کرے، اور اس سے بدلہ لینا بھی جائز ہے، لیکن حتی الامکان یہ کوشش ہو کہ جھگڑا ختم ہو جائے۔

جھگڑوں کے نتائج

آج ہمارا معاشرہ جھگڑوں سے بھر گیا ہے، اس کی بے برکتی اور ظلمت پورے معاشرے میں اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ عبادتوں کے نور محسوس نہیں ہوتے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہو رہے ہیں، کہیں خاندانوں میں جھگڑے ہیں، تو کہیں میاں بیوی میں جھگڑا ہے، کہیں دوستوں میں جھگڑا ہے، کہیں بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہے، کہیں رشتہ داروں میں جھگڑا ہے، اور تو اور علماء کرام کے درمیان آپس میں جھگڑے ہو رہے ہیں، اہل دین میں جھگڑے ہو رہے ہیں، اور اس کے نتیجے میں دین کا نور ختم ہو چکا ہے۔

جھگڑے کس طرح ختم ہوں؟

اب سوال یہ ہے کہ یہ جھگڑے کس طرح ختم ہوں؟ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ آپ حضرات کو سناتا ہوں، جو بڑا زرین اصول ہے، اگر انسان اس اصول پر عمل کر لے تو امید ہے کہ پچھتر فیصد جھگڑے تو وہیں ختم ہو جائیں، چنانچہ فرمایا:

''ایک کام یہ کر لو کہ دنیا والوں سے اُمید باندھنا چھوڑ دو، جب امید چھوڑ دو گے تو انشاء اللہ پھر دل میں کبھی بغض اور جھگڑے کا خیال نہیں آئے گا''

(۱) سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في المراء، رقم: ۱۹۱۶، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب اجتناب البدع والجدل، رقم: ۵۰۔

دوسرے لوگوں سے جو شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں، مثلاً یہ کہ فلاں شخص کو ایسا کرنا چاہئے تھا، اس نے نہیں کیا، جیسی میری عزت کرنی چاہئے تھی، اس نے ایسی عزت نہیں کی، جیسی میری خاطر مدارات کرنی چاہئے تھی، اس نے ویسی نہیں کی، یا فلاں شخص کے ساتھ میں نے فلاں احسان کیا تھا، اس نے اس کا بدلہ نہیں دیا، وغیرہ وغیرہ، یہ شکایتیں اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ دوسروں سے توقعات وابستہ کر رکھی ہیں، اور جب وہ توقع پوری نہیں ہوئی تو اس کے نتیجے میں دل میں گرہ پڑ گئی کہ اس نے میرے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا، اور دل میں شکایت پیدا ہو گئی، ایسے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر تمہیں کسی سے کوئی شکایت پیدا ہو جائے تو اس سے جا کر کہہ دو کہ مجھے تم سے یہ شکایت ہے، تمہاری یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی، مجھے بری لگی، پسند نہیں آئی، یہ کہہ کر اپنا دل صاف کرلو، لیکن آجکل بات کہہ کر دل صاف کرنے کا دستور ختم ہو گیا، بلکہ اب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو اور اس شکایت کو دل میں لے کر بیٹھ جاتا ہے، اس کے بعد کسی اور موقع پر کوئی اور بات پیش آگئی، ایک گرہ اور پڑ گئی، چنانچہ آہستہ آہستہ دل میں گرہیں پڑتی چلی جاتی ہیں، وہ پھر بغض کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، اور بغض کے نتیجے میں آپس میں دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔

توقعات مت رکھو، جھگڑے ختم ہو جائیں گے

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جھگڑے کی جڑ اس طرح کاٹو کہ کسی سے کوئی توقع ہی مت رکھو۔ کیا مخلوق سے توقعات وابستہ کیے بیٹھے ہو کہ فلاں یہ دیدے گا، فلاں یہ کام کر دے گا۔ توقع تو صرف اس سے وابستہ کرو جو خالق اور مالک ہے۔ بلکہ دنیا والوں سے تو برائی کی توقع رکھو کہ ان سے تو ہمیشہ برائی ہی ملے گی، اور پھر برائی کی توقع رکھنے کے بعد اگر کبھی اچھائی مل جائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یا اللہ، آپ کا شکر اور احسان ہے ___ اور اگر برائی ملے تو پھر خیال کرلو کہ مجھے تو پہلے ہی برائی کی توقع تھی، تو اب اس کے نتیجے میں دل میں شکایت اور بغض پیدا نہیں ہوگا۔ اور پھر دشمنی بھی پیدا نہیں ہوگی، نہ جھگڑا ہوگا، لہٰذا کسی سے توقع ہی مت رکھو۔

بدلہ لینے کی نیت مت کرو

اسی طرح حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور اصول یہ بیان فرمایا کہ جب تم کسی دوسرے کے ساتھ کوئی نیکی کرو، یا اچھا سلوک کرو، تو صرف اللہ کو راضی کرنے کے لئے کرو، مثلاً کسی کی مدد کرو، یا کسی شخص کی سفارش کرو، یا کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو یا کسی کی عزت کرو، تو یہ سوچ کر کرو کہ میں اللہ کو راضی کرنے کے لئے یہ برتاؤ کر رہا ہوں، اپنی آخرت سنوارنے کے لئے یہ کام کر رہا ہوں، جب اس

نیت کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو گے تو اس صورت میں اس برتاؤ پر بدلہ کا انتظار نہیں کرو گے ـــــ اب اگر فرض کریں کہ آپ نے ایک شخص کے ساتھ اچھا سلوک کیا، مگر اس شخص نے تمہارے اچھے سلوک کا بدلہ اچھائی کے ساتھ نہیں دیا، اور اس نے تمہارے احسان کرنے کو کبھی تسلیم ہی نہیں کیا، تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ آپ کے دل میں ضرور یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں نے تو اس کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا، اور اس نے میرے ساتھ اُلٹا سلوک کیا، لیکن اگر آپ نے اس کے ساتھ اچھا سلوک صرف اللہ کو راضی کرنے کے لئے کیا تھا، تو اس صورت میں اس کی طرف سے برے سلوک پر کبھی شکایت پیدا نہیں ہوگی، اس لئے کہ آپ کا مقصد تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا تھی۔ اگر ان دو اصولوں پر ہم سب عمل کرلیں تو پھر آپس کے تمام جھگڑے ختم ہو جائیں۔ اور اس حدیث پر بھی عمل ہو جائے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، جس میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے تو میں اس شخص کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم قربانی

ہم نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کی پوری زندگی میں اس حدیث پر عمل کرنے کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔ جھگڑا ختم کرنے کی خاطر بڑے سے بڑا حق چھوڑ کر الگ ہوگئے۔ ان کا ایک واقعہ سناتا ہوں جس پر آج لوگوں کو یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے ـــــ یہ دارالعلوم جو اس وقت کورنگی میں قائم ہے، پہلے نانک واڑہ میں ایک چھوٹی سی عمارت میں قائم تھا۔ جب کام زیادہ ہوا تو اس کے لئے وہ جگہ تنگ پڑگئی، وسیع اور کشادہ جگہ کی ضرورت تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی ایسی مدد ہوئی کہ بالکل شہر کے وسط میں حکومت کی طرف سے ایک بہت بڑی اور کشادہ جگہ مل گئی، جہاں آجکل اسلامیہ کالج قائم ہے، جہاں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا مزار بھی ہے۔ یہ کشادہ جگہ دارالعلوم کراچی کے نام الاٹ ہوگئی، اس زمین کے کاغذات مل گئے، قبضہ مل گیا، اور ایک کمرہ بھی بنا دیا گیا، ٹیلیفون بھی لگ گیا، اس کے بعد دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھتے وقت ایک جلسہ تاسیس منعقد ہوا، جس میں پورے پاکستان کے بڑے بڑے علماء حضرات تشریف لائے۔ اس جلسہ کے موقع پر کچھ حضرات نے جھگڑا کھڑا کر دیا کہ یہ جگہ دارالعلوم کو نہیں ملنی چاہئے تھی، بلکہ فلاں کو ملنی چاہئے تھی۔ اتفاق سے جھگڑے میں ان لوگوں نے ایسی بعض بزرگ ہستیوں کو بھی شامل کرلیا جو حضرت والد صاحب کے لئے باعثِ احترام تھیں۔ والد صاحب نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ یہ جھگڑا کسی طرح ختم ہو جائے، لیکن وہ ختم نہیں ہوا۔ والد صاحب نے یہ سوچا کہ جس مدرسے کا آغاز ہی جھگڑے سے ہو رہا ہے، تو اس مدرسے میں کیا برکت ہوگی؟ چنانچہ والد صاحب نے اپنا یہ فیصلہ سنا دیا کہ میں اس زمین کو چھوڑتا ہوں۔

مجھے اس میں برکت نظر نہیں آتی

دارالعلوم کی مجلس منتظمہ نے یہ فیصلہ سنا تو انہوں نے حضرت والد صاحب سے کہا کہ حضرت! یہ آپ کیسا فیصلہ کررہے ہیں؟ اتنی بڑی زمین، وہ بھی شہر کے وسط میں، ایسی زمین ملنا بھی مشکل ہے، اب جبکہ یہ زمین آپ کو مل چکی ہے، آپ کا اس پر قبضہ ہے، آپ ایسی زمین کو چھوڑ کر الگ ہورہے ہیں؟ حضرت والد صاحب نے جواب میں فرمایا کہ میں مجلس منتظمہ کو اس زمین کے چھوڑنے پر مجبور نہیں کرتا، اس لئے کہ مجلس منتظمہ درحقیقت اس زمین کی مالک ہو چکی ہے، آپ حضرات اگر چاہیں تو مدرسہ بنالیں، میں اس میں شمولیت اختیار نہیں کروں گا، اس لئے کہ جس مدرسے کی بنیاد جھگڑے پر رکھی جارہی ہو، اس مدرسے میں مجھے برکت نظر نہیں آتی۔ پھر حدیث سنائی کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دے میں اس کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں، آپ حضرات یہ کہہ رہے ہیں کہ شہر کے بیچوں بیچ ایسی زمین کہاں ملے گی، لیکن سرکار دو عالم ﷺ فرمارہے ہیں کہ میں اس کو جنت کے بیچ میں گھر دلواؤں گا، یہ کہہ کر اس زمین کو چھوڑ دیا، آج کے دور میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ کوئی شخص اس طرح جھگڑے کی وجہ سے اتنی بڑی زمین چھوڑ دے، لیکن جس شخص کا نبی کریم ﷺ کے ارشاد پر کامل یقین ہے، وہی یہ کام کرسکتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ چند ہی مہینوں کے بعد اس زمین سے کئی گنا بڑی زمین عطا فرمادی، جہاں آج دارالعلوم قائم ہے۔ یہ تو میں نے آپ حضرات کے سامنے ایک مثال بیان کی، ورنہ حضرت والد صاحب کو ہم نے ساری زندگی حتی الامکان اس حدیث پر عمل کرتے دیکھا، ہاں، البتہ جس جگہ دوسرا شخص جھگڑے کے اندر پھانس ہی لے، اور دفاع کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو وہ الگ بات ہے۔ ہم لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں کہ فلاں موقع پر فلاں شخص نے یہ بات کہی تھی، فلاں نے ایسا کیا تھا، اب ہمیشہ کے لئے اس کو دل میں بٹھالیا، اور جھگڑا کھڑا ہو گیا، آج ہمارے پورے معاشرے کو اس چیز نے تباہ کردیا ہے، یہ جھگڑا انسان کے دین کو مونڈ دیتا ہے، اور انسان کے باطن کو تباہ کردیتا ہے، اس لئے خدا کے لئے آپس کے جھگڑوں کو ختم کردو، اور اگر دو مسلمان بھائیوں میں جھگڑا دیکھو تو ان کے درمیان صلح کرانے کی پوری کوشش کرو۔

صلح کرانا صدقہ ہے

"عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:
((کُلُّ سُلَامی مِنَ النَّاسِ عَلَیْهِ صَدَقَةٌ کُلَّ یَوْمٍ تَطْلُعُ فِیْهِ الشَّمْسُ، یعدل

بَيْنَ الْاِثْنَيْنِ صَدَقَةٌ، وَبَيْنَ الرَّجُلِ فِيْ دَابَّتِهٖ فَيَحْمِلُهٗ عَلَيْهَا اَوْ يَرْفَعُ لَهٗ عَلَيْهَا مَتَاعَهٗ صَدَقَةٌ، وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ، وَبِكُلِّ خُطْوَةٍ يَمْشِيْهَا اِلَى الصَّلَاةِ صَدَقَةٌ، وَيُمِيْطُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ))(۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے جسم میں جتنے جوڑ ہیں، ہر جوڑ کی طرف سے انسان کے ذمہ روزانہ ایک صدقہ کرنا واجب ہے۔ اس لئے کہ ہر جوڑ ایک مستقل نعمت ہے اور ہر نعمت پر شکر ادا کرنا واجب ہے، اور ایک انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہوتے ہیں، لہٰذا ہر انسان کے ذمے روزانہ تین سو ساٹھ صدقے واجب ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس صدقے کو اتنا آسان فرمایا کہ انسان کے چھوٹے چھوٹے عمل کو صدقہ کے اندر شمار فرمادیا ہے، تاکہ کسی طرح تین سو ساٹھ کی گنتی پوری ہو جائے، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا اور رنجش تھی، تم نے ان دونوں کے درمیان مصالحت کرادی، یہ مصالحت کرانا ایک صدقہ ہے، اسی طرح ایک شخص اپنے گھوڑے پر یا سواری پر سوار ہونا چاہ رہا تھا، لیکن کسی وجہ سے اس سے سوار نہیں ہوا جارہا تھا، اب تم نے سوار ہونے میں اس کی مدد کردی، اور اس کو سہارا دے دیا، یہ سہارا دیدینا اور سوار کرادینا ایک صدقہ ہے، یا ایک شخص اپنی سواری پر سامان لادنا چاہتا تھا، لیکن اس بیچارے سے لادا نہیں جارہا تھا، اب تم نے اس کی مدد کرتے ہوئے وہ سامان لدوادیا، اس کی سواری پر رکھ دیا، یہ بھی ایک صدقہ ہے۔ اس طرح کسی شخص سے کوئی اچھا کلمہ کہہ دیا، مثلاً کوئی غمزدہ آدمی تھا، تم نے اس کو کوئی تسلی کا کلمہ کہہ دیا، اور اس کی تسلی کردی، یا کسی سے کوئی بات ایسی کہہ دی جس سے اس مسلمان کا دل خوش ہوگیا، یہ بھی ایک صدقہ ہے۔ اسی طرح جب نماز کے لئے تم مسجد کی طرف جارہے ہو، تو ہر قدم جو مسجد کی طرف اُٹھ رہا ہے، وہ ایک صدقہ شمار ہو رہا ہے۔ اسی طرح راستے میں کوئی تکلیف دہ چیز پڑی ہے، جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے، آپ نے اس کو راستے سے ہٹادیا، یہ بھی ایک صدقہ ہے۔

بہرحال اس حدیث میں سب سے پہلی چیز جس کو صدقہ شمار کرایا ہے، وہ ہے دو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانا، اس سے معلوم ہوا کہ صلح کرانا اجر و ثواب کا موجب ہے۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الصلح، باب فضل الإصلاح بين الناس والعدل بينهم، رقم: ۲۵۰۸، كتب الجهاد والسير، باب من أخذ بالركاب ونحوه، رقم: ۲۷٦۷، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب بيان أن اسم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف، رقم: ۱٦۷۷، مسند أحمد، رقم: ۸۷۳٦

اسلام کا کرشمہ

"وَعَنْ أُمِّ كُلْثُوْمٍ بِنْتِ عُقْبَةَ بْنِ أَبِيْ مُعَيْطٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا، قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ((لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِيْ يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ فَيَنْمِيْ خَيْرًا أَوْ يَقُوْلُ خَيْرًا))(۱)

یہ حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ ہیں، اور عقبہ بن ابی معیط کی بیٹی ہیں، اور عقبہ بن ابی معیط حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا جانی دشمن تھا، انتہاء درجہ کا مشرک، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے والے، جیسے ابوجہل اور امیہ ابن ابی خلف تھے، جو کٹر قسم کے مشرک تھے، یہ بھی انہیں میں سے تھا ــــ اور یہ وہ شخص تھا جس کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا فرمائی، چنانچہ بددعا کرتے ہوئے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ سَلِّطْ عَلَيْهِ كَلْبًا مِنْ كِلَابِكَ))(۲)

اے اللہ، درندوں میں سے کسی درندے کو اس پر مسلط فرمادے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بددعا قبول ہوئی، بالآخر ایک شیر کے ذریعہ اس کا انتقال ہوا ــ تو ایک طرف باپ تو ایسا دشمنِ اسلام تھا، دوسری طرف اس کی بیٹی حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت عطا فرمائی، اور صحابیہ بن گئیں۔

ایسا شخص جھوٹا نہیں

بہرحال، حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص لوگوں کے درمیان مصالحت کی خاطر کوئی اچھی بات اِدھر سے اُدھر پہنچا دیتا ہے، یا ایک کی بات دوسرے کو اس انداز سے نقل کرتا ہے کہ اس کے دل میں دوسرے کی قدر پیدا ہو، اور نفرت دور ہو جائے، ایسا شخص کذاب اور جھوٹا نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ایسی بات کہہ رہا ہے جو بظاہر سچ نہیں ہے، لیکن وہ بات اس لئے کہہ رہا ہے تاکہ اس کے دل سے دوسرے مسلمان کی برائی نکل جائے، آپس کے دل کا غبار دور ہو جائے، اور نفرتیں ختم ہو جائیں، اس مقصد سے اگر وہ ایسی بات کہہ رہا ہے تو ایسا شخص جھوٹوں میں شمار نہیں ہوگا۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب لیس الکاذب الذی یصلح بین الناس، رقم: ۲٤۹٥، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الکذب وبیان المباح منه، رقم: ٤۷۱۷، مسند أحمد، رقم: ۲٦۰۱۱۔

(۲) فتح الباری (۳۹/٤)

صریح جھوٹ جائز نہیں

علماء کرام نے فرمایا کہ صریح جھوٹ بولنا تو جائز نہیں، البتہ ایسی گول مول بات کرنا جس کا ظاہری مفہوم تو واقعہ کے خلاف ہے، لیکن دل میں ایسے معنی مراد لے لیے جو واقعہ کے مطابق تھے، مثلاً دو آدمیوں کے درمیان نفرت اور لڑائی ہے، یہ اس کا نام سننے کا روادار نہیں، وہ اس کا نام سننے کا روادار نہیں، اب ایک شخص ان میں سے ایک کے پاس گیا تو اس نے دوسرے کی شکایت کرنی شروع کر دی کہ وہ تو میرا ایسا دشمن ہے، تو اس شخص نے کہا کہ تم تو اس کی برائیاں بیان کر رہے ہو، حالانکہ وہ تو تمہارا بڑا خیر خواہ ہے، اس لئے کہ میں نے خود سنا ہے کہ تمہارے حق میں دعا کر رہا تھا۔

اب دیکھئے کہ اس نے یہ دعا کرتے ہوئے نہیں سنا تھا، مگر اس نے دل میں یہ مراد لیا کہ اس نے یہ دعا کرتے ہوئے سنا تھا کہ "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ" اے اللہ، تمام مؤمنین کی مغفرت فرما۔ چونکہ یہ بھی مسلمان تھا، اس لئے یہ بھی اس دعا میں داخل ہو گیا تھا۔ اب سامنے والا یہ سمجھے گا کہ خاص طور پر میرا نام لے کر دعا کر رہا ہو گا۔ ایسی بات کہہ دینا جھوٹ میں داخل نہیں، بلکہ انشاء اللہ، اس پر بھی اجر و ثواب ملے گا۔

زبان سے اچھی بات نکالو

اور جب اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ اللہ کی رضا کی خاطر دو مسلمان بھائیوں کے درمیان صلح کرانے کے ارادے سے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایسی باتیں ڈال دیتے ہیں کہ جس سے اس کے دل سے دوسرے کی نفرت دور ہو جائے، ایسی بات نہ کہو کہ ان کے درمیان نفرت کی آگ تو پہلے سے لگی ہوئی ہے اور اب آپ نے جا کر ایسی بات سنا دی جس نے آگ پر تیل کا کام کیا، اور جس کے نتیجے میں نفرت دور ہونے کے بجائے نفرت کی آگ اور بھڑک گئی۔ یہ انتہائی درجے کی رذالت کا کام ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی ناپسند ہے۔

صلح کرانے کی اہمیت

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مقولہ آپ نے سنا ہو گا کہ "دروغ مصلحت آمیز، بہ از راستی فتنہ انگیز" یعنی ایسا جھوٹ جس کے ذریعہ دو مسلمانوں کے درمیان مصالحت مقصود ہو، اس سچ سے بہتر ہے جس سچ سے فتنہ پیدا ہو، لیکن اس جھوٹ سے مراد یہ نہیں کہ صریح جھوٹ بول دیا جائے، بلکہ ایسی بات کہہ دے جو دو معنی رکھتی ہو۔ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے جھوٹ کی اجازت دیدی تو

آپ اسی سے اندازہ لگایئے کہ دو مسلمانوں کے درمیان جھگڑا ختم کرانے کی کس قدر اہمیت ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

"عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَوْتَ خُصُوْمٍ بِالْبَابِ عَالِيَةٍ اَصْوَاتُهُمَا، وَإِذَا أَحَدُهُمَا يَسْتَوْضِعُ الْآخَرَ وَيَسْتَرْفِقُهُ فِيْ شَيْءٍ، وَهُوَ يَقُوْلُ: وَاللّٰهِ لَا اَفْعَلُ، فَخَرَجَ عَلَيْهِمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ((اَيْنَ الْمُتَأَلِّيْ عَلَى اللّٰهِ لَا يَفْعَلُ الْمَعْرُوْفَ)) فَقَالَ: أَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَلَهُ أَيُّ ذٰلِكَ أَحَبَّ.(۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف فرما تھے، اتنے میں باہر سے دو آدمیوں کے جھگڑنے کی آواز سنی، اور جھگڑا اس بات پر تھا کہ ان میں سے ایک نے دوسرے سے قرضہ لیا تھا، قرض خواہ دوسرے سے قرض کا مطالبہ کر رہا تھا کہ میرا قرضہ واپس کرو، مقروض یہ کہہ رہا تھا کہ اس وقت میرے اندر سارا قرضہ ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، تم کچھ قرضہ لے لو، کچھ چھوڑ دو۔ اس جھگڑنے کے اندران دونوں کی آوازیں بھی بلند ہو رہی تھیں، اور جھگڑنے کے دوران اس قرض خواہ نے یہ قسم کھالی کہ "واللہ لا افعل" خدا کی قسم میں قرضہ کم نہیں کروں گا۔ اس دوران حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی گھر سے باہر تشریف لے آئے، اور آکر آپ نے پوچھا کہ وہ شخص کہاں ہے جو اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ رہا ہے کہ میں نیک کام نہیں کروں گا؟ اسی وقت وہ شخص آگے بڑھا، اور کہا کہ میں ہوں یا رسول اللہ، اور پھر فوراً دوسرا جملہ یہ کہا کہ یہ شخص جتنا چاہے اس قرض میں سے کم دیدے، میں چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت

یہ تھے صحابہ کرام، کہاں تو جذبات کا یہ عالم تھا کہ آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ وہ کم کرانا چاہتے تھے تو یہ کم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، اور کم نہ کرنے پر قسم بھی کھالی کہ میں کم نہیں کروں گا، اس کے بعد نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی سے قرضہ چھوڑنے کا حکم فرمایا، اور نہ ہی چھوڑنے کا مشورہ دیا، بلکہ صرف اتنا فرمادیا کہ کہاں ہے وہ شخص جو یہ قسم کھا رہا ہے کہ میں نیک کام نہیں کروں گا۔ بس، اتنی بات

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلح، باب هل یشیر الامام بالصلح، رقم: ۲۵۰۶، صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب استحباب الوضع من الدین، رقم: ۲۹۱۱، مؤطا امام مالک، کتاب البیوع، رقم: ۱۱۳۳

سننے کے بعد وہیں ڈھیلے پڑ گئے، اور سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا، اور جھگڑا ختم ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے اس قدر رام تھے کہ جب آپ کی زبان سے ایک جملہ سن لیا تو اس کے بعد مجال نہیں تھی کہ آگے بڑھ جائیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس جذبہ کا کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرمادے، اور تمام مسلمانوں کے درمیان آپس کے اختلافات اور جھگڑے ختم فرمادے، اور تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

دوسروں کو تکلیف مت دیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"عَنْ أَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَیَدِهٖ))(۱)

وہ حقیقی مسلمان نہیں

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں"

یعنی نہ اس کی زبان سے کسی کو تکلیف پہنچے، اور نہ اس کے ہاتھ سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ گویا کہ اس حدیث میں مسلمان کی پہچان بتائی کہ مسلمان کہتے ہی اس کو ہیں جس میں یہ صفت پائی جائے۔ لہٰذا جس مسلمان کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے لوگ محفوظ نہ رہیں، حقیقت میں وہ شخص مسلمان کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ جیسے ایک شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے کوئی مفتی اس پر کفر کا فتویٰ تو نہیں لگائے گا کہ یہ شخص چونکہ نماز نہیں پڑھتا، لہٰذا یہ کافر ہوگیا۔ لیکن حقیقت میں وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ اس لئے کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے سب سے اہم فریضے کو انجام نہیں دے رہا ہے۔ اسی طرح جس شخص کے ہاتھ اور زبان سے لوگوں کو تکلیف پہنچے تو اس پر بھی اگرچہ مفتی کفر کا فتویٰ نہیں لگائے گا، لیکن وہ حقیقت میں مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ اس لئے کہ وہ مسلمانوں والا کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ اس حدیث کا مطلب ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۸/۱۰۲ تا ۱۳۳)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ۹، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان تفاضل الإسلام وأی أموره أفضل، رقم: ۵۸، سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول الله، باب ما جاء فی أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ۲۵۵۱، سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب صفة المسلم، رقم: ۴۹۱۰، سنن أبی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی الهجرة هل انقطعت، رقم: ۲۱۲۲

''معاشرت'' کا مطلب

اسلام کے پانچ شعبے ہیں:

(۱) عقائد (۲) عبادات (۳) معاملات (۴) اخلاق (۵) معاشرت

یہ حدیث درحقیقت اسلام کے ان پانچ شعبوں میں سے ایک شعبے یعنی ''معاشرت'' کی بنیاد ہے ''معاشرت'' کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی انسان تنہا نہیں رہتا، اور نہ ہی تنہا رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جب وہ دنیا میں رہتا ہے تو اس کو کسی نہ کسی سے واسطہ پڑتا ہے، گھر والوں سے واسطہ، دوستوں سے واسطہ، پڑوسیوں سے، بازار والوں سے، اور جس جگہ پر وہ کام کرتا ہے وہاں کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب دوسروں سے واسطہ پڑے تو ان کے ساتھ کس طرح معاملہ کرنا چاہئے؟ کیسا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ اس کو ''معاشرت'' کے احکام کہا جاتا ہے۔ یہ بھی دین کے پانچ بڑے شعبوں میں سے ایک بڑا شعبہ ہے، لیکن ہماری نادانی اور بے عملی کی وجہ سے دین کا یہ شعبہ بالکل نظر انداز ہو کر رہ گیا ہے، اور اس کو دین کا حصہ ہی نہیں سمجھا جاتا اور اس کے بارے میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے جو احکام عطا فرمائے ہیں ان کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔

معاشرت کے احکام کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے بھی ''معاشرت'' کے احکام بیان کرنے کا بہت اہتمام فرمایا ہے، مثلاً معاشرت کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی دوسرے شخص کے گھر میں جاؤ تو اندر داخل ہونے سے پہلے اس سے اجازت لو کہ میں اندر آ سکتا ہوں یا نہیں؟ اس اجازت لینے کو عربی زبان میں "استئذان" کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے "استئذان" کے احکام بیان کرنے کے لئے قرآن کریم میں پورے دو رکوع نازل فرمائے۔ جبکہ دوسری طرف قرآن کریم میں نماز پڑھنے کا حکم شاید باسٹھ جگہ آیا ہے۔ لیکن نماز کس طرح پڑھی جائے؟ اس کی تفصیل قرآن کریم نے نہیں بتائی۔ بلکہ اس کو حضور اقدس ﷺ کے بیان کرنے پر چھوڑ دیا۔ لیکن استئذان کی تفصیل کو قرآن کریم نے خود بیان فرمایا۔ حضور اقدس ﷺ کے بیان کرنے پر نہیں چھوڑا۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں سورۃ الحجرات کا ایک بہت بڑا حصہ معاشرتی احکام کے بیان پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ایک طرف تو معاشرتی احکام کی اتنی اہمیت ہے، لیکن دوسری طرف ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہم نے ان احکام پر عمل کو چھوڑ رکھا ہے اور ان احکام کا خیال نہیں کرتے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معاشرت کے احکام کو زندہ کرنا

اللہ تعالیٰ نے حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے اس دور میں دین کی تجدید کا کام لیا، دین کے وہ ابواب جو لوگوں نے پس پشت ڈال دیئے تھے، اور دین سے ان کو خارج ہی کر دیا تھا، آپ نے ان کی اہمیت بتائی، اور اس کے بارے میں لوگوں کو احکام بتائے، اور اپنی خانقاہ میں اس کی عملی تربیت کا اہتمام فرمایا۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ خانقاہ اس کو کہتے ہیں جس میں حجروں کے اندر بیٹھ کر لوگ اللہ اللہ کر رہے ہوں اور اپنے ذکر و تسبیح اور عبادات میں مشغول ہوں۔ اس کے آگے کچھ نہ ہو۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خانقاہ میں ذکر و تسبیح اور نوافل پر اتنا زور نہیں دیا، جتنا آپ نے معاشرت کے اس مسئلے پر زور دیا کہ اپنی ذات سے کسی دوسرے انسان کو تکلیف نہ پہنچے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جو طالبین اپنی اصلاح کے لئے آتے ہیں، اگر ان میں سے کسی بارے میں مجھے یہ اطلاع ملتی ہے کہ جو معمولات اس کو بتائے گئے تھے وہ ان میں کوتاہی کرتا ہے۔ مثلاً دس تسبیح کے بجائے وہ پانچ تسبیحات پڑھتا ہے تو اس اطلاع سے رنج تو ہوتا ہے کہ اس کو ایک طریقہ بتایا گیا تھا، اس نے اس پر کیوں عمل نہیں کیا، لیکن جب کسی کے بارے میں مجھے یہ اطلاع ملتی ہے کہ اس نے ''معاشرت'' کے احکام میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی کی ہے، اور اس نے اپنی ذات سے دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچائی ہے تو مجھے اس شخص سے نفرت ہو جاتی ہے۔

پہلے انسان تو بن جاؤ

اسی طرح حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مشہور جملہ ہے۔ وہ یہ کہ اگر تمہیں صوفی بننا ہے، یا عابد زاہد بننا ہے تو اس مقصد کے لئے بہت ساری خانقاہیں کھلی ہیں، وہاں چلے جاؤ، اگر انسان بننا ہے تو یہاں آجاؤ، اس لئے کہ یہاں تو انسان بنایا جاتا ہے۔ مسلمان بننا اور عالم بننا اور صوفی بننا تو بعد کی بات ہے، اونچے درجے کی بات ہے، ارے پہلے انسان تو بن جاؤ۔ اور پہلے جانوروں کی صف سے نکل جاؤ۔ اور انسان اس وقت تک انسان نہیں بنتا جب تک اس کو اسلامی معاشرت کے آداب نہ آتے ہوں، اور ان پر عمل نہ کرتا ہو۔

جانوروں کی تین قسمیں

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تین قسم کے جانور پیدا فرمائے ہیں۔

(۱) جانوروں کی ایک قسم وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ شاذ و نادر ہی کبھی ان سے نقصان پہنچتا ہو۔ مثلاً گائے، بکری وغیرہ ہے، یہ جانور ایسے ہیں جو دودھ کے ذریعہ تمہیں فائدہ پہنچاتے ہیں۔ جب دودھ دینا بند کر دے گی تو تم اس کو کاٹ کر اس کا گوشت کھالو گے۔ اور اس طرح تمہیں فائدہ پہنچانے کے لئے اپنی جان دے دیں گے۔ اور یہ جانور نقصان نہیں پہنچاتے۔

(۲) جانوروں کی دوسری قسم وہ ہے جو تکلیف ہی پہنچاتے ہیں۔ اور ان کا فائدہ بظاہر کچھ نہیں ہے۔ مثلاً سانپ، بچھو، درندے وغیرہ یہ سب موذی جانور ہیں۔ جب کسی انسان سے ملیں گے تو اس کو تکلیف دیں گے۔ ڈنگ ماریں گے۔

(۳) جانوروں کی تیسری قسم وہ ہے جو نہ تکلیف دیتے ہیں، اور نہ ہی فائدہ پہنچاتے ہیں، جیسے جنگل میں رہنے والے جانور لومڑی گیدڑ وغیرہ، نہ ان سے انسان کو کوئی خاص فائدہ پہنچتا ہے، اور نہ کوئی خاص نقصان پہنچتا ہے۔

جانوروں کی ان تین قسموں کو بیان کرنے کے بعد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ انسان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے انسان! تو اشرف المخلوقات ہے اور سارے حیوانات پر تجھے فضیلت دی گئی ہے۔ تو اگر انسان نہیں بنتا بلکہ جانور بننا چاہتا ہے تو کم از کم پہلی قسم کا جانور بن جا، جو دوسروں کو فائدہ تو پہنچاتے ہیں، اور نقصان نہیں پہنچاتے۔ جیسے گائے بکری وغیرہ۔ اور اگر تو اس سے بھی نیچے آنا چاہتا ہے تو تیسری قسم کا جانور بن جا، جو نہ نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اور اگر تو نے دوسروں کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچانا شروع کر دیا تو پھر سانپ بچھو اور درندوں کی قسم میں داخل ہو جائے گا۔

ہم نے انسان دیکھے ہیں

بہر حال! مسلمان غیر مسلم کی بات بعد کی ہے۔ عالم غیر عالم اور عابد غیر عابد کی بات تو بہت بعد کی ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ انسان انسان بن جائے۔ اور انسان بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی معاشرت کو اختیار کرے، اور اس کی ذات سے کسی دوسرے کو ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے، اس کے ہاتھ سے، نہ اس کی زبان سے، اور نہ اس کے کسی فعل سے کوئی تکلیف پہنچے۔ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے غایت تواضع سے فرمایا کہ پکے اور پورے سو فیصد انسان تو ہم بھی نہیں بن سکے، لیکن ــــ الحمد للہ ــــ انسانوں کو دیکھ لیا ہے کہ انسان کیسا ہوتا ہے، اور کوئی بیل آکر ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتا کہ میں انسان ہوں، لہٰذا اگر کبھی انسان بننا چاہیں گے، تو انشاء اللہ انسان ہی بنیں گے اور انسان کے دھوکے میں بیل نہیں بنیں گے۔

دوسروں کو تکلیف سے بچالو

دیکھئے، نوافل مستحبات، ذکر واذکار اور تسبیحات کا معاملہ یہ ہے کہ اگر کرو گے تو انشاء اللہ آخرت میں اس کا ثواب ملے گا، اور اگر نہیں کرو گے تو آخرت میں یہ پکڑ نہیں ہوگی کہ فلاں نفل کیوں نہیں پڑھی؟ ذکر واذکار کیوں نہیں کیا تھا؟ البتہ یہ سب فضیلت والے کام ہیں۔ ضرور کرنے چاہئیں، اور کرنے پر آخرت میں ثواب ملے گا۔ لیکن نہ کرنے پر گرفت نہیں ہوگی۔ دوسری طرف اگر تمہاری ذات سے دوسرے کو تکلیف پہنچ گئی تو یہ گناہ کبیرہ ہوگیا، اب اس کی آخرت میں پکڑ ہو جائے گی کہ ایسا کام کیوں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت نوافل میں اور اسلام کے معاشرتی احکام میں تعارض ہو جائے، یا تو نوافل پڑھ لو، یا اس معاشرتی حکم پر عمل کرتے ہوئے دوسرے کو تکلیف سے بچالو، تو اس صورت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ نوافل کو چھوڑ دو، اور اس معاشرتی حکم پر عمل کرلو۔

نماز باجماعت کی اہمیت

دیکھئے، مردوں کو مسجد میں جماعت کے ساتھ فرض نماز پڑھنے کی سخت تاکید فرمائی گئی ہے، یہاں تک کہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ کسی دن ایسا کروں کہ جب جماعت کا وقت آجائے تو کسی کو امام بنا کر خود باہر جاؤں، اور گھروں میں جا کر دیکھوں کہ کون کون لوگ مسجد میں نہیں آئے بلکہ گھر میں بیٹھے رہے، پھر ان کے گھروں کو آگ لگا دوں، اس لئے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس فریضے میں کوتاہی کر رہے ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ جماعت سے نماز پڑھنے کی کتنی تاکید ہے، چنانچہ بعض فقہاء نے جماعت سے نماز پڑھنے کو سنتِ مؤکدہ فرمایا ہے۔ لیکن دوسرے بعض فقہاء نے جماعت سے نماز پڑھنے کو واجب قرار دیا ہے، اور جماعت سے نماز ادا کرنا اداء کامل ہے اور تنہا ادا کرنا اداء ناقص ہے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے اپنے عمل سے اس کی تاکید اور اہمیت کا اس طرح اظہار فرمایا کہ مرضِ وفات میں جب کہ آپ کے لئے چلنا مشکل تھا، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو آپ نے امام بنا دیا تھا، اس وقت بھی آپ دو آدمیوں کا سہارا لے کر جماعت سے نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں تشریف لائے۔ اس سے جماعت سے نماز پڑھنے کی سخت تاکید معلوم ہوتی ہے۔

ایسے شخص کے لئے مسجد میں آنا جائز نہیں

لیکن دوسری طرف تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہے جو لوگوں کے لئے گھن کا باعث ہوتی ہے، جس کی وجہ سے بدبو آتی ہے، ایسے شخص کو مسجد میں جا کر

جماعت سے نماز پڑھنا جائز نہیں، اور صرف یہ نہیں کہ جماعت سے نماز پڑھنے کا حکم اس سے ساقط ہوگیا، بلکہ جماعت سے نماز پڑھنا جائز ہی نہیں، اگر جماعت سے نماز پڑھے گا تو گناہ گار ہوگا، اس لئے کہ اگر وہ مسجد میں جماعت سے نماز پڑھے گا تو اس کے پاس کھڑے ہونے والوں کو بدبو سے تکلیف ہوگی۔ دیکھئے جماعت جیسی اہم عبادت کو صرف لوگوں کو تکلیف سے بچانے کے لئے چھڑا دیا گیا۔

حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت تکلیف دینا

حجر اسود کی فضیلت اور اہمیت کون مسلمان نہیں جانتا، اور فرمایا گیا کہ حجر اسود کو بوسہ دینا ایسا ہے جیسے اللہ جل شانہ سے مصافحہ کرنا، اور حجر اسود کو بوسہ دینا انسان کے گناہوں کو جھاڑ دیتا ہے، اور خود حضور اقدس ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیا۔ یہ اس کی فضیلت کی بات ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ فرمادیا کہ حجر اسود کو بوسہ دینے کے لئے اگر دھکا دینا پڑے، اور اس کے نتیجے میں دوسرے کو تکلیف پہنچ جانے کا اندیشہ ہو تو پھر اس وقت حجر اسود کو بوسہ دینا جائز نہیں۔ بلکہ گناہ ہے۔ آپ دیکھتے جائیں کہ شریعت اس بات کا کتنا اہتمام کرتی ہے کہ دوسروں کو اپنی ذات سے ادنیٰ برابر بھی تکلیف پہنچنے سے بچایا جائے۔ جب اتنی اہم چیزوں کو صرف اس لئے چھڑایا جا رہا ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے تو پھر نوافل اور مستحبات کے ذریعہ دوسروں کو تکلیف پہنچانا کہاں سے جائز ہوگا؟

بلند آواز سے تلاوت کرنا

مثلاً تلاوتِ قرآن کریم ایک عبادت ہے، یہ اتنی اہم عبادت ہے کہ ایک حرف پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، گویا کہ تلاوت کے وقت نیکیوں کا خزانہ جمع ہوجاتا ہے، اور فرمایا کہ سارے اذکار اور تسبیحات میں سب سے افضل ترین قرآن کریم کی تلاوت ہے، اور تلاوت میں افضل یہ ہے کہ بلند آواز سے کی جائے۔ آہستہ آواز کے مقابلے میں بلند آواز سے تلاوت کرنے پر زیادہ ثواب ملتا ہے۔ لیکن اگر تمہاری تلاوت کی وجہ سے کسی کی نیند یا آرام میں خلل آ رہا ہو تو پھر بلند آواز سے تلاوت کرنا جائز نہیں۔

تہجد کے وقت آپ ﷺ کے اُٹھنے کا انداز

حضور نبی کریم ﷺ تہجد کی نماز کے لئے اُٹھتے، ساری عمر کبھی تہجد کی نماز نہیں چھوڑی، اللہ اور

اللہ کے رسول ﷺ نے ہم پر آسانی فرماتے ہوئے تہجد کی نماز واجب نہیں فرمائی۔ لیکن حضور اقدس ﷺ پر تہجد کی نماز واجب تھی۔ آپ نے کبھی تہجد کی نماز قضا نہیں فرمائی۔ لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آپ تہجد کی نماز کے لئے اُٹھتے، تو آہستہ سے اُٹھتے اور آہستگی سے دروازہ کھولتے کہ کہیں میرے اس عمل کی وجہ سے میری بیوی کی آنکھ نہ کھل جائے، اور ان کی نیند خراب نہ ہو جائے۔ (۱)

سارا قرآن اور حدیث اس بات سے بھرا ہوا ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچائے، اور قدم قدم پر شریعت نے اس کا اہتمام کیا ہے۔

لوگوں کی گزرگاہ میں نماز پڑھنا

ایسی جگہ پر نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہونا جو لوگوں کے گزرنے کی جگہ ہے، جائز نہیں۔ بعض لوگ اس کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ پوری مسجد خالی پڑی ہے، مگر پچھلی صف میں جا کر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، اور نیت باندھ لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گزرنے والا یا تو اس کے پیچھے سے لمبا چکر کاٹ کر جائے یا نمازی کے سامنے سے گزرنے کے گناہ کا ارتکاب کرے۔ اس طریقے سے نماز پڑھنا جائز نہیں، بلکہ گناہ ہے۔

''مسلم'' میں سلامتی داخل ہے

بہر حال! حدیث شریف میں فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ))(۲)

یعنی مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ اور سالم رہیں۔ لفظ ''مسلم'' کا مادہ ہے ''س ل م'' اور لفظ ''سلامتی'' بھی اسی مادے سے اور انہی حروف سے مل کر بنا ہے، گویا اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ ''مسلمان'' کے لفظ کے اندر سلامتی لفظ داخل ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب ما یقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، رقم:١٦١٩، مسند أحمد، رقم: ٢٤٦٧١

(۲) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ٩، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان تفاضل الإسلام وأی أموره أفضل، رقم: ٥٨، سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول الله، باب ما جاء فی أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده، رقم: ٢٥٥١، سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب صفة المسلم، رقم: ٤٩١٠، سنن أبی داود، کتاب الجهاد، باب فی الهجرة هل انقطعت، رقم: ٢١٢٢

السلام علیکم کا مفہوم

دوسرے مذاہب کے لوگ جب آپس میں ملاقات کرتے ہیں تو کوئی ''ہیلو'' کہتا ہے، کوئی گڈ نائٹ، اور کوئی گڈ مارننگ کہتا ہے اور کوئی ''نمستے'' کوئی ''آداب'' کہتا ہے۔مختلف لوگوں نے ملاقات کے وقت دوسرے کو مخاطب کرنے کے لئے مختلف الفاظ اختیار کرر کھے ہیں۔لیکن اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ جب دوسرے سے ملاقات کرو تو یہ کہو ''السلام علیکم''، جس کے معنی یہ ہیں کہ تم پر سلامتی ہو، ایک طرف تو اس میں سلامتی کی دعا ہے، جبکہ دوسرے کلمات کہنے میں کوئی دعا نہیں ہے۔ اس وجہ سے سننے والے کو مخاطب کو ان الفاظ کے ذریعہ کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔لیکن جب آپ نے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہا تو آپ نے مخاطب کو تین دعائیں دے دیں، یعنی تم پر اللہ کی سلامتی نازل ہو، تم پر اللہ کی رحمت نازل ہو، اور برکت نازل ہو۔اگر ایک مرتبہ کا سلام بھی دوسرے مسلمان کے حق میں اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے تو ساری زندگی کا بیڑہ پار ہو جائے، اور اس سلام کے ذریعہ دوسرا سبق یہ سکھا دیا کہ دو آدمیوں کے ملنے کے وقت جو چیز سب سے زیادہ مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اس کی طرف سے اس کے اوپر سلامتی ہو اور اس کی ذات سے اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔اور مسلمان ملاقات کے وقت سب سے پہلے یہ پیغام دیدے کہ میں تمہارے لئے سلامتی بن کر آیا ہوں، میں تمہارے لئے عذاب اور تکلیف بن کر نہیں آیا ہوں۔

زبان سے تکلیف نہ دینے کا مطلب

پھر اس حدیث میں دو لفظ استعمال فرمائے، ایک "من لسانه" اور ایک دوسرا "ویده" یعنی دوسرے مسلمان دو چیزوں سے محفوظ رہیں، ایک اس کی زبان سے، اور دوسرے اس کے ہاتھ سے۔ زبان سے محفوظ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا کلمہ نہ کہے جس سے سننے والے کا دل ٹوٹے، اور اس کو تکلیف پہنچے۔اس کی دل آزاری ہو، اگر بالفرض دوسرے مسلمان کی کسی بات پر تنقید کرنی ہے تو بھی ایسے الفاظ استعمال کرے جس سے اس کی دل آزاری بالکل نہ ہو، یا کم سے کم ہو۔مثلاً اس سے یہ کہہ دیں کہ آپ کی فلاں بات مجھے اچھی نہیں لگی یا آپ فلاں بات پر غور کر لیں، وہ بات اصلاح کے لائق ہے، اور شریعت کے مطابق نہیں ہے۔لیکن کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا جس سے اس کی بدگوئی ہو، مثلاً گالی گفتار اختیار کرنا، یا گالی گفتار سے بڑھ کر طعنہ دینا۔

''طعنہ'' کا مطلب یہ ہے کہ براہِ راست تو کوئی بات نہیں کی، لیکن لپیٹ کر بات کہہ دی، اور یہ طعنہ ایسی چیز ہے جو دلوں میں زخم ڈال دیتا ہے، عربی شاعر کا ایک شعر ہے:

جِرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامٌ
وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

یعنی نیزے کا زخم بھر جاتا ہے، لیکن زبان کا زخم نہیں بھرتا۔ اس لئے اگر کسی کی کوئی بات آپ کو ناگوار ہے تو صاف صاف اس سے کہہ دو کہ فلاں بات آپ کی مجھے پسند نہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا﴾(۱)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کرو۔ لپٹی ہوئی بات مطلوب اور پسندیدہ نہیں، آج کل فقرہ بازی ایک فن بن گیا ہے، فقرہ بازی کا مطلب یہ ہے کہ ایسی بات کی جائے کہ دوسرا شخص سن کر تلملاتا ہی رہ جائے۔ براہِ راست اس سے وہ بات نہیں کہی، بلکہ لپیٹ کر کہہ دی۔ ایسی باتیں کرنے والوں کی لوگ خوب تعریف بھی کرتے ہیں کہ یہ شخص تو بڑا زبردست انشاء پرداز ہے، اور بڑا لطیف مذاق کرنے والا ہے۔

طنز کا ایک عجیب واقعہ

ایک شخص نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کسی کتاب کے جواب میں ایک مقالہ لکھا۔ اور اس مقالے میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ العیاذ باللہ۔ حضرت والا کے ایک مخلص معتقد تھے، انہوں نے اس کے جواب میں فارسی میں دو شعر کہے، وہ اشعار ادبی اعتبار سے آجکل کے طنز کے مذاق کے لحاظ سے بہت اعلیٰ درجے کے اشعار تھے، وہ اشعار یہ تھے۔

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دروغے را جزا باشد دروغے

یعنی مجھے اگر تم نے کافر کہا ہے تو مجھے کوئی غم نہیں ہے، کیونکہ جھوٹ کا چراغ کبھی جلا نہیں کرتا۔ تم نے مجھے کافر کہا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہتا ہوں، اس لئے کہ جھوٹ کا بدلہ جھوٹ ہی ہوسکتا ہے، یعنی تم نے مجھے کافر کہہ کر جھوٹ بولا، اس کے جواب میں میں تمہیں مسلمان کہہ کر جھوٹ بول رہا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ درحقیقت تم مسلمان نہیں ہو۔ اگر یہ جواب کسی ادیب اور ذوق رکھنے والے شاعر کو سنایا جائے تو وہ اس پر خوب داد دے گا۔ اور اس کو پسند کرے گا۔ اس لئے کہ چبھتا ہوا جواب ہے۔ اس لئے کہ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں یہ کہہ دیا کہ میں تمہیں مسلمان کہتا ہوں۔

(۱) الاحزاب: ۷۰

لیکن دوسرے مصرعے نے اس بات کو بالکل اُلٹ دیا۔ یعنی جھوٹ کا بدلہ تو جھوٹ ہی ہوتا ہے، تم نے مجھے کافر کہہ کر جھوٹ بولا۔ میں تمہیں مسلمان کہہ کر جھوٹ بولتا ہوں، بہرحال یہ اشعار لکھ حضرت کے جو معتقد تھے وہ حضرت والا کی خدمت میں لائے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ اشعار سنے تو فرمایا کہ تم نے اشعار تو بہت غضب کے کہے اور بڑا چبھتا ہوا جواب دے دیا۔ لیکن میاں تم نے لپیٹ کر اس کو کافر کہہ تو دیا۔ اور ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے کہ دوسروں کو کافر کہیں، چنانچہ وہ اشعار نہیں بھیجے۔

پھر حضرت والا نے خود ان اشعار کی اصلاح فرمائی، اور ایک شعر کا اضافہ فرمایا، چنانچہ فرمایا:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دھم شکر بجائے تلخ دوغے
اگر تو مؤمنی فبہا والا
دروغے را جزا باشد دروغے

یعنی اگر تم نے مجھے کافر کہا ہے تو مجھے اس کا کوئی غم نہیں ہے، اس لئے کہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا۔ میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہتا ہوں، اور کڑوی دوا کے مقابلے میں تمہیں شکر کھلاتا ہوں۔ اگر تم مؤمن ہو تو بہت اچھا ہے، اور اگر نہیں ہو تو پھر جھوٹ کی جزا جھوٹ ہی ہوتی ہے۔

اب دیکھئے، وہ مخالف جو آپ پر کفر کا فتویٰ لگا رہا ہے۔ جہنمی ہونے کا فتویٰ لگا رہا ہے، اس کے خلاف بھی طنز کا ایسا فقرہ کہنا بھی پسند نہیں فرمایا جو حدود سے نکلا ہوا تھا، اس لئے کہ یہ طنز تو یہاں دنیا میں رہ جائے گا، لیکن جو لفظ زبان سے نکل رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ریکارڈ ہو رہا ہے، قیامت کے روز اس کے بارے میں جواب دینا ہوگا کہ فلاں کے حق میں یہ لفظ کس طرح استعمال کیا تھا؟ لہٰذا طنز کا یہ طریقہ جو حدود سے نکل جائے، کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں۔ لہٰذا جب کسی سے کوئی بات کہنی ہو تو صاف اور سیدھی بات کہہ دینی چاہئے۔ لپیٹ کر بات نہیں کہنی چاہئے۔

زبان کے ڈنک کا ایک قصہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض لوگوں کی زبان میں ڈنک ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ جب بھی کسی سے بات کریں گے، ڈنک ماریں گے، اور طعنہ اور طنز کی بات کریں گے۔ یا کسی پر اعتراض کی بات کریں گے۔ حالانکہ اس انداز سے بات کرنے سے دل میں گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ پھر ایک قصہ سنایا کہ ایک صاحب کسی عزیز کے گھر میں گئے تو دیکھا

ان کی بہو بہت غصے میں ہے، اور زبان سے اپنی ساس کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اور ساس بھی پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ ان صاحب نے اس کی ساس سے پوچھا کہ کیا بات ہوگئی؟ اتنا غصہ اس کو کیوں آرہا ہے؟ جواب میں ساس نے کہا: بات کچھ بھی نہیں تھی، میں نے صرف دو بول بولے تھے، اس کی خطاء میں پکڑی گئی۔ اور اس کے نتیجے میں یہ ناچی ناچی پھر رہی ہے، اور غصہ کررہی ہے۔ ان صاحب نے پوچھا کہ وہ دو بول کیا تھے؟ ساس نے کہا کہ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ باپ تیرا غلام اور ماں تیری لونڈی، بس اس کے بعد سے یہ ناچی ناچی پھر رہی ہے۔

اب دیکھئے، وہ صرف دو بول تھے۔ لیکن ایسے دو بول تھے جو انسان کے اندر آگ لگانے والے تھے۔ لہٰذا طعنہ کا انداز گھروں کو برباد کرنے والا ہے، دلوں میں بغض اور نفرتیں پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے بچنا چاہئے۔ اور ہمیشہ صاف اور سیدھی بات کہنی چاہئے۔

پہلے سوچو پھر بولو

زبان کو استعمال کرنے سے پہلے ذرا سوچ لیا کرو کہ جو بات میں کہنے جارہا ہوں، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور دوسرے پر اس کا کیا اثر پڑے گا، اور یہ سوچ لیا کرو کہ جو بات میں دوسرے سے کہنے جارہا ہوں، اگر دوسرا شخص مجھ سے یہ بات کہتا تو اس کا مجھ پر کیا اثر ہوتا، مجھے اچھا لگتا یا برا لگتا۔ حضورِ اقدس نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی اور یہ اصول بتادیا:

"اَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ"(۱)

یعنی دوسرے کے لئے وہی بات پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو اور یہ جو ہم نے دو پیمانے بنا رکھے ہیں کہ اپنے لئے الگ پیمانہ دوسرے کے لئے الگ پیمانہ، نبی کریم ﷺ نے اس کا خاتمہ فرمادیا۔ اگر یہ ترازو اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے تو پھر یہ سارے جھگڑے اور فسادات ختم ہوجائیں۔

زبان ایک عظیم نعمت

یہ زبان اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں مفت میں دے رکھی ہے، اس کی قیمت ہمیں ادا نہیں کرنی پڑی، اور پیدائش کے وقت سے لے کر موت تک یہ سرکاری مشین چلتی رہتی ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ نعمت چھن جائے تب اس نعمت کی قدر معلوم ہوگی کہ یہ کتنی عظیم نعمت ہے۔

(۱) سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس، رقم: ۲۲۲۷، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الورع والتقوى، رقم: ۴۲۰۷، مسند أحمد، رقم: ۷۷۴۸

اگر فالج ہو جائے، اور زبان بند ہو جائے تو اس وقت یہ حال ہوتا ہے کہ بولنا چاہتے ہیں، اور اپنے دل کی بات دوسروں سے کہنا چاہتے ہیں، لیکن زبان نہیں چلتی۔ اس وقت پتہ چلتا ہے کہ یہ گویائی کی طاقت کتنی عظیم نعمت ہے۔ لیکن ہم لوگ صبح سے لے کر شام اس زبان کو قینچی کی طرح چلا رہے ہیں، اور یہ نہیں سوچتے کہ زبان سے کیا لفظ نکل رہا ہے۔ یہ طریقہ ٹھیک نہیں، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے تو لو، پھر بولو۔ اگر اس طریقہ پر ہم نے عمل کر لیا تو پھر یہ زبان جو ہمارے لئے جہنم میں جانے کے اسباب پیدا کر رہی ہے، انشاء اللہ جنت میں جانے کے اسباب پیدا کرنے والی اور آخرت کا ذخیرہ جمع کرنے والی بن جائے گی۔

سوچ کر بولنے کی عادت ڈالیں

ایک حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ انسان کو سب سے زیادہ جہنم میں اوندھے منہ ڈالنے والی چیز زبان ہے۔ یعنی جہنم میں اوندھے منہ گرائے جانے کا سب سے بڑا سبب زبان ہے۔(۱)

اس لئے جب بھی اس زبان کو استعمال کرو، استعمال کرنے سے پہلے ذرا سا سوچ لیا کرو، کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو جب کوئی ایک جملہ بولنا ہو تو پہلے پانچ منٹ تک سوچے، پھر زبان سے وہ جملہ نکالے تو اس صورت میں بہت وقت خرچ ہو جائے گا؟ بات دراصل یہ ہے کہ اگر شروع شروع میں انسان بات سوچ سوچ کر کرنے کی عادت ڈال لے تو پھر آہستہ آہستہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور پھر سوچنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لمحہ میں انسان فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ بات زبان سے نکالوں یا نہ نکالوں۔ پھر اللہ تعالیٰ زبان کے اندر ہی ترازو پیدا فرما دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں زبان سے پھر صرف حق بات نکلتی ہے۔ غلط اور ایسی بات زبان سے نہیں نکلتی جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہو، اور دوسروں کو تکلیف پہنچانے والی ہو۔ بشرطیکہ یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اس سرکاری مشین کو آداب کے ساتھ استعمال کرنا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے۔ جن کو "بھائی نیاز" کہا کرتے تھے۔ بڑے ناز پروردہ خادم تھے، اس لئے آنے والے لوگ بھی ان سے محبت کرتے

(۱) سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول الله، باب ما جاء فی حرمة الصلاة، رقم: ۲٥٤۱، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب کف اللسان فی الفتنة، رقم: ۳۹٦۳، مسند أحمد، رقم: ۲۱۰۰۸

تھے۔ اور چونکہ خانقاہ کے اندر ہر چیز کا ایک نظم اور وقت ہوتا تھا، اس لئے آنے والوں پر روک ٹوک بھی کیا کرتے تھے کہ یہ کام مت کرو، یہ کام اس طرح کرو وغیرہ، کسی شخص نے حضرت والا کے پاس ان کی شکایت کی کہ آپ کے یہ خادم بھائی نیاز صاحب بہت سر چڑھ گئے ہیں، اور بہت سے لوگوں پر غصہ اور ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت والا کو یہ سن کر غصہ آیا کہ یہ ایسا کرتے ہیں، اور ان کو بلوایا، اور ان کو ڈانٹا کہ کیوں بھائی نیاز، یہ کیا تمہاری حرکت ہے۔ ہر ایک کو تم ڈانٹتے رہتے ہو، تمہیں ڈانٹنے کا حق کس نے دیا ہے؟ جواب میں بھائی نیاز نے کہا کہ حضرت! اللہ سے ڈرو، جھوٹ نہ بولو، ان کا مقصد حضرت والا کو کہنا نہیں تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ جو لوگ آپ سے شکایت کر رہے ہیں، ان کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور جھوٹ نہ بولیں، جس وقت حضرت والا نے بھائی نیاز کی زبان سے یہ جملہ سنا، اسی وقت گردن جھکائی اور "استغفر اللہ استغفر اللہ" کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے، دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ یہ کیا ہوا۔ ایک ادنیٰ خادم نے حضرت والا سے ایسی بات کہہ دی۔ لیکن حضرت بجائے ان کو کچھ کہنے کے استغفر اللہ کہتے ہوئے چلے گئے، بعد میں خود حضرت والا نے فرمایا کہ دراصل مجھ سے غلطی ہوگئی تھی کہ میں نے ایک طرف کی بات سن کر فوراً ڈانٹنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں پہلے ان سے پوچھتا کہ لوگ آپ کے بارے میں یہ شکایت کر رہے ہیں۔ آپ کیا کہتے ہیں کہ شکایت درست ہے یا غلط ہے۔ اور دوسرے فریق کی بات سنے بغیر ڈانٹنا شریعت کے خلاف ہے۔ چونکہ یہ بات شریعت کے خلاف تھی، اس لئے میں اس پر استغفار کرتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ حق و باطل کو جانچنے کی ترازو پیدا فرما دیتے ہیں، اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کا کوئی کلمہ حد سے متجاوز نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی فہم عطا فرما دے۔ آمین۔

غیر مسلموں کو بھی تکلیف پہنچانا جائز نہیں

اس حدیث میں فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، اس سے بعض اوقات لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس حدیث میں صرف مسلمانوں کو تکلیف سے محفوظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا غیر مسلم کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت اس حدیث میں موجود نہیں ــــــ یہ بات درست نہیں کیونکہ حدیث میں مسلمان کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ مسلمان جس ماحول میں رہتے ہیں وہاں پر عام طور پر مسلمانوں ہی سے ان کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس لئے خاص طور پر حدیث میں مسلمانوں کا ذکر کر دیا ہے۔ ورنہ یہ حکم مسلمان اور غیر مسلم سب کے لئے برابر ہے کہ اپنی ذات سے غیر مسلم کو بھی حالتِ امن میں تکلیف پہنچانا جائز نہیں۔ البتہ اگر کافروں کے ساتھ جہاد ہو رہا ہو، اور حالتِ جنگ ہو، تو چونکہ وہ تو کافروں کی شان و شوکت توڑنے کا ایک ذریعہ ہے، اس میں تکلیف پہنچانا

جائز ہے۔ لیکن جن کافروں کے ساتھ حالتِ جنگ نہیں ہے، ان کافروں کو تکلیف پہنچانا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

ناجائز ہونے کی دلیل

اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی حکومت میں مصر میں رہتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ پوری قوم کفر اور گمراہی میں مبتلا تھی۔ اس وقت یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک اسرائیلی اور قبطی میں جھگڑا ہوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو ایک مکا مار دیا، جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ وہ قبطی اگرچہ کافر تھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی موت کو اپنے لئے گناہ قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُوْنِ﴾(۱)

یعنی مجھ سے ان کا ایک گناہ ہوگیا ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں ان کے پاس جاؤں گا تو وہ مجھے قتل کردیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کافر کے قتل کو گناہ سے تعبیر کیا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تو کافر تھا۔ اور کافر کو قتل کرنا تو جہاد کا ایک حصہ ہے۔ پھر آپ نے اس کو گناہ کیوں قرار دیا، اور اس پر استغفار کیوں کیا؟

جواب یہ ہے کہ وہ قبطی اگرچہ کافر تھا، اور حالتِ امن تھی، اور اگر مسلمان اور کافر ایک ساتھ رہائش پزیر ہوں، اور حالتِ امن ہو، اس حالت میں کافر کا بھی دنیا کے اعتبار سے وہی حق ہے جو مسلمان کا ہے۔ یعنی جس طرح مسلمان کو تکلیف پہنچانا جائز نہیں، اسی طرح کافر کو بھی تکلیف پہنچانا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ انسانیت کا حق ہے، اور انسان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ آدمی بنے۔ مسلمان بننا اور صوفی بننا تو بعد کی بات ہے، پہلا کام یہ ہے کہ انسان آدمی بن جائے۔ اور آدمیت کا حق یہ ہے کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ دے۔ اس میں مسلمان اور غیر مسلم سب برابر ہیں۔

وعدہ خلافی کرنا زبان سے تکلیف دینا ہے

بعض کام ایسے ہیں جن کو لوگ زبان کے ذریعہ تکلیف دینے کے اندر شمار نہیں کرتے، حالانکہ وہ کام زبان سے تکلیف دینے کے حکم میں داخل ہیں، مثلاً وعدہ خلافی کرنا۔ آپ نے کسی سے یہ وعدہ کرلیا کہ فلاں وقت آپ کے پاس آؤں گا۔ یا فلاں وقت میں آپ کا کام کردوں گا۔ لیکن وقت پر وعدہ پورا نہیں کیا۔ جس کے نتیجے میں اس کو تکلیف پہنچی۔ اس میں ایک طرف تو وعدہ خلافی کا گناہ ہوا۔

(۱) الشعراء: ۱٤

دوسری طرف دوسرے شخص کو تکلیف پہنچانے کا بھی گناہ ہوا۔ یہ زبان سے تکلیف پہنچانے کے حکم میں داخل ہے۔

تلاوتِ قرآن کے وقت سلام کرنا

بعض اوقات انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ میں زبان سے تکلیف پہنچارہا ہوں، بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں تو ثواب کا کام کررہا ہوں، لیکن حقیقت میں وہ گناہ کا کام کررہا ہوتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ دوسرے کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ مثلاً سلام کرنا کتنی بڑی فضیلت اور ثواب کا کام ہے۔ لیکن شریعت نے دوسرے کی تکلیف کا اتنا خیال کیا ہے کہ سلام کرنے کے بھی احکام مقرر فرمادیئے کہ ہر وقت سلام کرنا جائز نہیں، بلکہ بعض مواقع پر سلام کرنے پر ثواب کے بجائے گناہ ہوگا۔ کیونکہ سلام کے ذریعہ تم نے دوسرے کو تکلیف پہنچائی ہے۔ مثلاً ایک شخص قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہے، اس کو سلام کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ ایک طرف تو تمہارے سلام کی وجہ سے اس کی تلاوت میں رخنہ ہوگا۔ اور دوسری طرف اس کو تلاوت چھوڑ کر تمہاری طرف مشغول ہونے میں تکلیف ہوگی۔ اب ایسے وقت کے اندر سلام کرنا زبان سے تکلیف پہنچانے میں داخل ہے۔ اسی طرح اگر لوگ مسجد میں بیٹھ کر ذکر میں مشغول ہوں، ان کو مسجد میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رشتہ جڑا ہوا ہے۔ اس کی زبان پر ذکر جاری ہے۔ تمہارے سلام کی وجہ سے اس کے ذکر میں خلل واقع ہوگا، اور اس کو توجہ ہٹانے میں تکلیف بھی ہوگی۔

مجلس کے دوران سلام کرنا

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ ایک شخص دوسرے لوگوں سے کوئی لمبی بات کررہا ہے۔ اور دوسرے لوگ توجہ سے اس کی بات سن رہے ہیں۔ اگرچہ وہ دنیاوی باتیں ہوں۔ اس حالت میں بھی اس مجلس میں جاکر سلام کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ وہ لوگ باتیں سننے میں مصروف تھے۔ آپ نے سلام کے ذریعہ ان کی باتوں میں خلل ڈال دیا۔ اور جس کی وجہ سے باتوں کے درمیان میں بدمزگی پیدا ہوگئی۔ اس لئے اس موقع پر سلام کرنا جائز نہیں ــــ اس لئے حکم ہے کہ جب تم کسی مجلس میں شرکت کے لئے جاؤ اور وہاں پر بات شروع ہوچکی ہو تو وہاں پر سلام کے بغیر بیٹھ جاؤ، اس وقت سلام کرنا زبان سے تکلیف پہنچانے کے مرادف ہوگا۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ شریعت اس بارے میں کتنی حساس ہے کہ دوسرے شخص کو ہماری ذات سے ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے۔

کھانا کھانے والے کو سلام کرنا

ایک شخص کھانا کھانے میں مشغول ہے، اس وقت اس کو سلام کرنا حرام تو نہیں، البتہ مکروہ ضرور ہے، جبکہ یہ اندیشہ ہو کہ تمہارے سلام کے نتیجے میں اس کو تشویش ہوگی۔ اب دیکھئے کہ وہ تو کھانا کھانے میں مشغول ہے، نہ تو وہ عبادت کررہا ہے، نہ ذکر کرنے میں مشغول ہے، اگر تم سلام کرلو گے تو اس پر پہاڑ نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ لیکن سلام کے نتیجے میں اس کو تشویش ہونے اور اس کو ناگوار ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے اس وقت سلام نہ کرے، اس طرح ایک شخص اپنے کسی کام کے لئے تیزی سے جارہا ہے، آپ کو اندازہ ہوا کہ یہ شخص بہت جلدی میں ہے، آپ نے آگے بڑھ کر اس کو سلام کرلیا، اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھادیا۔ یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اس لئے کہ آپ کو اس کی تیزی سے اندازہ لگانا چاہئے تھا کہ یہ شخص جلدی میں ہے۔ یہ سلام کرنے اور مصافحہ کرنے کا مناسب وقت نہیں ہے۔ ایسے وقت میں اس کو سلام نہ کرو، بلکہ اس کو جانے دو۔ یہ سب باتیں زبان کے ذریعہ تکلیف پہنچانے میں داخل ہیں۔

ٹیلیفون پر لمبی بات کرنا

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اب ایذاء رسانی کا ایک آلہ بھی ایجاد ہوچکا ہے۔ وہ ہے "ٹیلیفون"۔ یہ ایک ایسا آلہ ہے کہ اس کے ذریعہ جتنا چاہو دوسرے کو تکلیف پہنچادو۔ چنانچہ آپ نے کسی کو ٹیلیفون کیا اور اس سے لمبی گفتگو شروع کردی اور اس کا خیال نہیں کیا کہ وہ شخص اس وقت کسی کام کے اندر مصروف ہے۔ اس کے پاس وقت ہے یا نہیں، میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے "معارف القرآن" میں یہ بات لکھی ہے کہ ٹیلیفون کرنے کے آداب میں یہ بات داخل ہے کہ اگر کسی سے لمبی بات کرنی ہو تو پہلے اس سے پوچھ لو کہ مجھے ذرا لمبی بات کرنی ہے، چار پانچ منٹ لگیں گے۔ اگر آپ اس وقت فارغ ہوں تو ابھی بات کرلوں۔ اور اگر فارغ نہ ہوں تو کوئی مناسب وقت بتادیں، اس وقت بات کرلوں گا۔ سورۃ نور کی تفسیر میں یہ آداب لکھے ہیں، دیکھ لیا جائے، اور خود حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ان پر عمل فرمایا کرتے تھے۔

باہر کے لاؤڈ اسپیکر پر تقریر کرنا

یا مثلاً آپ کو مسجد کے اندر چند افراد سے کچھ بات کرنی ہے، اور ان تک آواز پہنچانے کے لئے مسجد کے اندر کا لاؤڈ اسپیکر بھی کافی ہوسکتا تھا۔ لیکن آپ نے باہر کا بھی لاؤڈ اسپیکر بھی کھول دیا۔

جس کے نتیجے میں پورے علاقے اور پورے محلے کے لوگوں تک آواز پہنچ رہی ہے۔ اب محلے میں کوئی شخص اپنے گھر کے اندر تلاوت کرنا چاہتا ہے، یا ذکر کرنا چاہتا ہے، یا سونا چاہتا ہے، یا کوئی شخص بیمار ہے۔ وہ آرام کرنا چاہتا ہے۔ مگر آپ نے زبردستی اپنا وعظ پورے محلے والوں پر مسلط کر دیا۔ یہ عمل بھی زبان کے ذریعہ تکلیف پہنچانے میں داخل ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے کا ایک واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک صاحب مسجد نبوی میں آکر وعظ کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ مسجد نبوی سے بالکل متصل تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر نہیں تھا، مگر وہ صاحب بلند آواز سے وعظ کرتے تھے۔ ان کی آواز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے اندر پہنچتی۔ آپ اپنی عبادات تلاوت ذکر واذکار یا دوسرے کاموں میں مشغول ہوتیں، اور ان صاحب کی آواز سے آپ کو تکلیف پہنچتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو پیغام بھجوایا کہ یہ ایک صاحب اس طرح میرے حجرے کے قریب آکر وعظ کرتے ہیں، مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ وعظ کسی اور جگہ پر جاکر کریں، یا آہستہ آواز سے کریں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان صاحب کو بلایا اور ان کو سمجھایا کہ آپ کی آواز سے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تکلیف ہوتی ہے، آپ اپنا وعظ اس جگہ پر بند کر دیں۔ چنانچہ وہ صاحب رک گئے۔ مگر وہ صاحب وعظ کے شوقین تھے۔ چند روز کے بعد دوبارہ وعظ کہنا شروع کر دیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ انہوں نے دوبارہ وعظ کہنا شروع کر دیا ہے۔ آپ نے دوبارہ ان کو بلایا اور فرمایا کہ اب میں تم کو آخری مرتبہ منع کر رہا ہوں۔ اب اگر آئندہ مجھے اطلاع ملی کہ تم نے یہاں آکر وعظ کہا ہے تو یہ لکڑی کی چھڑی تمہارے اوپر توڑ دوں گا۔ یعنی اتنا ماروں گا کہ تمہارے اوپر یہ لکڑی ٹوٹ جائے گی۔

آج ہماری حالت

آج ہم لوگ اس کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ مسجد میں وعظ ہو رہا ہے، اور سارے محلے والوں کو عذاب کے اندر مبتلا کر رکھا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر فل آواز میں کھلا ہوا ہے۔ محلے میں کوئی شخص سو نہیں سکتا۔ اگر کوئی شخص جاکر منع کرے تو اس کے اوپر طعن و تشنیع شروع ہو جاتی ہے کہ یہ دین کے کام میں رکاوٹ ڈالنے والا ہے۔ حالانکہ اس وعظ کے ذریعہ شریعت کے حکم کو پامال کیا جا رہا ہے۔ دوسروں کو تکلیف پہنچائی جا رہی ہے، حتیٰ کہ عالم کے آداب میں یہ لکھا ہے:

"یَنْبَغِیْ لِلْعَالِمِ اَنْ لَا یَعْدُوَ صَوْتُہٗ مَجْلِسَہٗ" (۱)

عالم کی آواز اس کی مجلس سے دور نہ جائے۔ یہ سب باتیں زبان سے تکلیف پہنچانے میں داخل ہیں، یہ زبان اللہ تعالیٰ نے اس لئے دی ہے کہ یہ اللہ کا ذکر کرے، یہ زبان سچائی کی باتیں کرے۔ یہ زبان اس لئے دی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ تم لوگوں کے دلوں پر مرہم رکھو۔ یہ زبان اس لئے نہیں دی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ تم لوگوں کو تکلیف پہنچاؤ۔

وہ عورت دوزخی ہے

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک خاتون کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ خاتون سارے دن روزہ رکھتی ہے۔ اور ساری رات عبادت کرتی ہے۔ لیکن وہ خاتون اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے، وہ خاتون کیسی ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ وہ عورت دوزخی ہے جہنم میں جائے گی۔ (۲)

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد اس کی تشریح میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اس حدیث میں اس کی شناعت ہے کہ لوگوں کو ناحق ایذا دی جاوے، اور اس سے معاملات کا عبادت پر مقدم ہونا بھی مذکور ہے"

یعنی لوگوں کے ساتھ برتاؤ میں درستگی عبادات کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ معاملات کا باب عملاً اتنا متروک ہوگیا ہے کہ آج کوئی شخص دوسرے کو یہ نہ سمجھاتا ہے اور نہ سکھاتا ہے کہ یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے۔

ہاتھ سے تکلیف مت دیجئے

دوسری چیز جس کا ذکر اس حدیث میں فرمایا، وہ ہے "ہاتھ" یعنی تمہارے ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اب ہاتھ سے تکلیف پہنچنے کی بعض صورتیں تو ظاہر ہیں۔ مثلاً کسی کو ماردیا۔ ہر شخص دیکھ کر یہ کہے گا کہ اس نے ہاتھ کے ذریعہ تکلیف پہنچائی، لیکن ہاتھ سے تکلیف پہنچانے کی بہت سی صورتیں ایسی ہیں کہ لوگ ان کو ایذا دینے کے اندر شمار نہیں کرتے۔ حالانکہ ہاتھ سے ایذا دینے کی بھی بے شمار صورتیں ہیں۔ اور حدیث شریف میں "ہاتھ" کا ذکر کرکے ہاتھ سے صادر ہونے والے افعال

---

(۱) الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع للخطیب البغدادی (۱۴۴/۳)، یہ قول حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے۔

(۲) مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۹۲۹۸

کی طرف اشارہ کیا ہے، کیونکہ زیادہ تر افعال انسان اپنے ہاتھ سے انجام دیتا ہے، اسی وجہ سے علماء نے ہاتھ کے ذکر میں تمام افعال داخل کیے ہیں۔ چاہے اس فعل میں براہِ راست ہاتھ ملوث نظر نہ آرہا ہو۔

کسی چیز کو بے جگہ رکھنا

مثلاً ایک مشترک رہائش میں آپ دوسرے لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس مکان میں کسی مشترکہ استعمال کی چیز کی ایک جگہ مقرر ہے۔ مثلاً تولیہ رکھنے کی ایک جگہ مقرر ہے۔ آپ نے تولیہ استعمال کرنے کے بعد اس کو بے جگہ ڈال دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب دوسرا شخص وضو کر کے آیا، اور تولیہ کو اس کی جگہ پر تلاش کیا اور اس کو نہ ملا، اب وہ تولیہ ڈھونڈ رہا ہے، اس کو تکلیف ہو رہی ہے۔ یہ جو تکلیف اس کو پہنچی، یہ آپ کے ہاتھ کی کرتوت کا نتیجہ ہے کہ آپ نے وہ تولیہ اس کی صحیح جگہ سے اُٹھا کر بے جگہ ڈال دیا۔ یہ اذیت رسانی ہوئی جو کہ اس حدیث کے تحت حرام ہے۔ یہ تولیہ کی ایک مثال دی، ورنہ چاہے مشترک لوٹا ہو، یا صابن ہو یا گلاس ہو یا جھاڑو وغیرہ ہو، ان کو اپنی مقرر جگہ سے اُٹھا کر بے جگہ رکھنا ایذا رسانی میں داخل ہے۔

یہ گناہِ کبیرہ ہے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ہمیں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں سکھا گئے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو ہم بھی یہ حرکت کرتے تھے کہ ایک چیز اس کی جگہ سے اُٹھا کر استعمال کی۔ اور دوسری جگہ لے جا کر ڈال دی۔ جب ان کو ضرورت ہوتی تو وہ گھر کے اندر تلاش کرتے رہتے۔ ایک دن ہم لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ جو حرکت کرتے ہو کہ ایک چیز اُٹھا کر دوسری جگہ ڈال دی، یہ بداخلاقی تو ہے ہی، اس کے ساتھ ساتھ یہ گناہِ کبیرہ بھی ہے، اس لئے کہ اس عمل کے ذریعہ مسلمان کو تکلیف پہنچتی ہے، اور ایذاءِ مسلم گناہِ کبیرہ ہے۔ اس دن ہمیں پتہ چلا کہ یہ بھی دین کا حکم ہے، اور یہ بھی گناہِ کبیرہ ہے، ورنہ اس سے پہلے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ یہ سب باتیں ہاتھ سے تکلیف پہنچانے میں داخل ہیں۔

اپنے عزیز اور بیوی بچوں کو تکلیف دینا

ایک بات یہ بھی سمجھ لیں کہ مشترک رہائش میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ رہائش پزیر ہیں وہ اجنبی ہوں۔ بلکہ اپنے قریبی رشتہ دار، بیوی، بچے، بہن بھائی سب اس میں داخل ہیں۔ آج ہم لوگ اپنے ان قریبی رشتہ داروں کو تکلیف پہنچنے کا احساس نہیں کرتے۔ بلکہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہمارے عمل سے بیوی کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو پہنچا کرے، یہ ہماری بیوی ہی تو ہے۔ یا اولاد کو یا

بہن بھائی کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو پہنچا کرے، ہماری اولاد ہی تو ہیں، ہمارے بہن بھائی تو ہیں ۔ ارے اگر وہ تمہاری بہن یا تمہارا بھائی بن گیا ہے تو اس نے آخر کیا خطا کرلی ہے؟ یا کوئی خاتون تمہاری بیوی بن گئی ہے، یا یہ بچے تمہاری اولاد بن گئے ہیں تو انہوں نے کیا خطا کرلی ہے کہ اب ان کو تم تکلیف پہنچا رہے ہو ۔ حالانکہ حضور اقدس ﷺ کا تو یہ حال تھا کہ تہجد کے وقت صرف اس خیال سے ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتے کہ کہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آنکھ نہ کھل جائے ۔ لہٰذا جس طرح غیروں کو تکلیف پہنچانا حرام ہے، اسی طرح اپنے گھر والوں کو اپنے بہن بھائیوں کو اپنے بیوی بچوں کو بھی تکلیف پہنچانا حرام ہے ۔

اطلاع کیے بغیر کھانے کے وقت غائب رہنا

مثلاً آپ گھر والوں کو بتا کر چلے گئے کہ فلاں وقت آ کر کھانا کھاؤں گا ۔ لیکن اس کے بعد اطلاع کیے بغیر کہیں اور چلے گئے ۔ اور کھانا بھی وہیں کھالیا ۔ اور وہاں پر گھنٹوں گزار دیئے ۔ اور وقت پر گھر واپس نہیں پہنچے ۔ اور گھر پر آپ کی بیوی کھانے پر آپ کا انتظار کر رہی ہے ۔ اور پریشان ہو رہی ہے کہ کیا وجہ پیش آگئی کہ واپس نہیں آئے ۔ کھانا لیے بیٹھی ہے، آپ کا یہ عمل گناہ کبیرہ ہے ۔ اس لئے کہ آپ نے اس عمل کے ذریعہ ایک ایسی ذات کو تکلیف پہنچائی جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات سے وابستہ کر دیا تھا ۔ آپ کو اگر کھانا کسی اور جگہ کھانا تھا تو آپ اس کو اطلاع کر کے اس کے ذہن کو فارغ کر دیتے ۔ اس کو انتظار اور پریشانی کی تکلیف میں مبتلا نہ کرتے ۔ لیکن آج ہم لوگ اس بات کا دھیان نہیں کرتے، اور یہ سوچتے ہیں کہ وہ تو ہماری بیوی ہی تو ہے، ہماری ماتحت ہے ۔ اگر انتظار کر رہی ہے تو کرے ۔ حالانکہ یہ عمل گناہ کبیرہ اور حرام ہے اور ایذاء مسلم ہے ۔

راستے کو گندہ کرنا حرام ہے

یا مثلاً سڑک پر چلتے ہوئے آپ نے چھلکا یا گندگی سڑک پر پھینک دی، اب اس کی وجہ سے کسی کا پاؤں پھسل جائے ۔ یا کسی کو تکلیف پہنچ جائے تو قیامت کے روز آپ کی پکڑ ہو جائے گی ۔ اور اگر اس سے تکلیف نہ بھی پہنچی، لیکن آپ نے کم از کم گندگی تو پھیلا دی ۔ اس گندگی پھیلانے کا گناہ آپ کو ہوگا ۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ سفر پر ہوتے اور سفر کے دوران آپ کو راستہ میں کہیں پیشاب کرنے کی ضرورت پیش آتی تو آپ پیشاب کرنے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش کے لئے آپ اتنی ہی جستجو فرماتے جتنا ایک آدمی مکان بنانے کے لئے مناسب جگہ تلاش کرتا

ہے۔ ایسا کیوں کرتے؟ اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگوں کی گزرگاہ ہو، اور وہاں گندگی کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف پہنچے۔

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ایمان کے ستر سے زیادہ شعبے ہیں، جن میں سے ایمان کا اعلیٰ ترین شعبہ کلمہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہنا اور ادنیٰ ترین شعبہ ایمان کا راستے سے گندگی کو اور تکلیف دینے والی چیز کو دور کر دینا ہے۔(۱)

مثلاً راستے میں کوئی کانٹا یا چھلکا پڑا ہوا ہے۔ آپ نے اٹھا کر اس کو دور کر دیا۔ تا کہ گزرنے والے کو تکلیف نہ ہو، یہ ایمان کا ادنیٰ درجے کا شعبہ ہے۔ لہٰذا جب راستے سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کرنا ایمان کا شعبہ ہو تو پھر راستے میں تکلیف دینے والی چیز ڈالنا کفر کا شعبہ ہوگا۔ ایمان کا شعبہ نہ ہوگا۔ یہ سب باتیں اس حدیث کے تحت داخل ہیں۔

ذہنی تکلیف میں مبتلا کرنا حرام ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں زبان اور ہاتھ کے ذریعہ ظاہری افعال کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ لیکن اگر آپ نے اپنی زبان یا ہاتھ سے کوئی ایسا کام کیا جس سے دوسرے کو ذہنی تکلیف ہوئی تو وہ بھی اس حدیث میں داخل ہے۔ مثلاً آپ نے کسی سے قرض لیا اور اس سے یہ وعدہ کر لیا کہ اتنے دنوں کے اندر ادائیگی کر دوں گا۔ اب اگر آپ وقت پر ادائیگی نہیں کر سکتے تو اس کو بتا دیں کہ میں فی الحال ادائیگی نہیں کر سکتا۔ اتنے دن کے بعد ادا کروں گا۔ پھر بھی ادا نہ کر سکو تو پھر بتا دو۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے کہ آپ اس کو لٹکا دیں۔ اور اس کا ذہن الجھا دیں۔ وہ بیچارہ انتظار میں ہے کہ آپ آج قرض ادا کر دیں گے یا کل دے دیں گے۔ لیکن آپ نہ تو اس کو اطلاع دیتے ہیں۔ اور نہ قرض واپس کرتے ہیں۔ اس طرح آپ نے اس کو ذہنی اذیت اور تکلیف میں مبتلا کر دیا۔ اب وہ نہ تو کوئی پلان بنا سکتا ہے، نہ وہ کوئی منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کو پتہ ہی نہیں ہے کہ اس کو قرض واپس ملے گا یا نہیں؟ اگر ملے گا تو کب تک ملے گا۔ آپ کا یہ طرز عمل بھی ناجائز اور حرام ہے۔

ملازم پر ذہنی بوجھ ڈالنا

حتیٰ کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک فرمایا کہ آپ کا ایک نوکر اور ملازم ہے۔ اب آپ

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان وأفضلها وأدناها......، رقم: ۵۱، سنن النسائی، کتاب الایمان وشرائعه، باب ذکر شعب الایمان، رقم: ۴۹۱۹، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فی الایمان، رقم: ۵۶، مسند أحمد، رقم: ۸۹۹۳

نے چار کام ایک ساتھ بتا دیئے کہ پہلے یہ کام کرو۔ پھر یہ کام، پھر یہ کام کرنا۔ پھر یہ کام کرنا۔ اس طرح آپ نے چار کاموں کو یاد رکھنے کا بوجھ اس کے ذہن پر ڈال دیا۔ اگر ایسا کرنا بہت ضروری نہیں ہے تو ایک ساتھ چار کاموں کا بوجھ اس کے ذہن پر نہیں ڈالنا چاہئے۔ بلکہ اس کو پہلے ایک کام بتا دو۔ جب وہ پہلا کام کر چکے تو اب دوسرا کام بتایا جائے۔ وہ اس کو کر چکے تو پھر تیسرا کام بتایا جائے۔ چنانچہ خود اپنا طریقہ بتایا کہ میں اپنے نوکر کو ایک وقت میں ایک کام بتاتا ہوں۔ اور دوسرے کام جو اس سے کرانے ہیں ان کو یاد رکھنے کا بوجھ اپنے سر پر رکھتا ہوں۔ نوکر کے سر پر نہیں رکھتا، تاکہ وہ ذہنی بوجھ میں مبتلا نہ ہو جائے۔ جب وہ ایک کام کر کے فارغ ہو جاتا ہے تو پھر دوسرا کام بتاتا ہوں۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ حضرت والاؒ کی نگاہ کتنی دوررس تھی۔

نماز پڑھنے والے کا انتظار کس جگہ کیا جائے؟

یا مثلاً ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے۔ آپ کو اس سے کچھ کام ہے۔ اب آپ اس کے بالکل قریب جا کر بیٹھ گئے۔ اور اس کے ذہن پر یہ فکر سوار کر دی کہ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم جلدی سے اپنی نماز پوری کرو تاکہ میں تم سے ملاقات کروں، اور کام کراؤں۔ چنانچہ آپ کے قریب بیٹھنے کی وجہ سے اس کی نماز میں خلل واقع ہو گیا۔ اور اس کے دماغ پر یہ بوجھ بیٹھ گیا کہ یہ شخص میرے انتظار میں ہے، اس کا انتظار ختم کرنا چاہئے۔ اور جلدی سے نماز ختم کر کے اس سے ملاقات کرنی چاہئے، حالانکہ یہ بات آداب میں داخل ہے کہ اگر آپ کو کسی ایسے شخص سے ملاقات کرنی ہے جو اس وقت نماز میں مصروف ہے تو تم دور بیٹھ کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرو۔ جب وہ خود سے فارغ ہو جائے تو پھر ملاقات کرو۔ لیکن اس کے بالکل قریب بیٹھ کر یہ تأثر دینا کہ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ لہٰذا تم جلدی نماز پوری کرو۔ ایسا تأثر دینا ادب کے خلاف ہے ــــ یہ سب باتیں دوسرے کو ذہنی تکلیف میں مبتلا کرنے میں داخل ہیں۔ الحمدللہ۔ جن بزرگوں کو ہم نے دیکھا، اور جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین سیکھنے کی توفیق عطاء فرمائی، اللہ تعالیٰ نے ان پر دین کے تمام شعبے برابر رکھے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ دین کے ایک یا دو شعبوں پر تو عمل ہے، اور باقی شعبے نظروں سے اوجھل ہیں۔ اور ان کی طرف سے غفلت ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾(۱)

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''

یہ نہ ہو کہ عبادت نماز روزہ وغیرہ تو کر لیے، لیکن معاشرت، معاملات اور اخلاق میں دین کے

(۱) البقرة: ۲۰۸

احکام کی پرواہ نہ کی، حالانکہ یہ سب دین کا حصہ ہے۔

''آداب المعاشرت'' پڑھئے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مختصر سی کتاب ہے ''آداب المعاشرت''، اس میں معاشرت کے آداب تحریر فرمائے ہیں، یہ کتاب ہر مسلمان کو ضرور پڑھنی چاہئے۔ اس کتاب کے شروع میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ میں اس کتاب میں معاشرت کے تمام آداب تو نہیں لکھ سکا، بلکہ متفرق طور پر جو آداب ذہن میں آئے وہ اس میں جمع کر دیئے ہیں تاکہ جب تم ان آداب کو پڑھو گے تو خود بخود تمہارا ذہن اس طرف منتقل ہوگا کہ جب یہ بات ادب میں داخل ہے تو فلاں جگہ پر بھی ہمیں اس طرح کرنا چاہئے، آہستہ آہستہ خود تمہارے ذہن میں وہ آداب آتے چلے جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ذہن کو کھول دیں گے۔ چنانچہ معاشرت ہی کا ایک ادب یہ ہے کہ گاڑی ایسی جگہ کھڑی کرو کہ اس کی وجہ سے دوسروں کا راستہ بند نہ ہو، اور دوسرے کو تکلیف نہ ہو، یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے۔ آج ہم نے ان چیزوں کو بھلا دیا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف ہم گناہ گار ہو رہے ہیں، بلکہ دین کی غلط نمائندگی کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہمیں دیکھ کر باہر سے آنے والا شخص یہ کہے گا کہ یہ لوگ نماز تو پڑھتے ہیں، لیکن گندگی بہت پھیلاتے ہیں۔ اور دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، اس سے اسلام کا کیا رخ سامنے آئے گا؟ اور وہ ان چیزوں سے اسلام کی طرف کشش محسوس کرے گا یا اسلام سے دور بھاگے گا؟ اللہ بچائے۔ ہم لوگ دین کا ایک اچھا نمونہ پیش کرکے لوگوں کے لئے کشش کا باعث بننے کے بجائے ہم دین سے رکاوٹ کا باعث بن رہے ہیں۔ معاشرت کے اس باب کو ہم نے خاص طور پر چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس کوتاہی سے جلد از جلد نجات عطا فرمائے۔ اور ہماری فہم کو درست فرمائے۔ اور ہمیں دین کے تمام شعبوں پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

مسلمان اور ایذا رسانی☆

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

"عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَہُ النَّاسُ عَلٰی دِمَائِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ))(۱)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، اور مؤمن وہ ہے کہ لوگوں کو اس کی طرف سے اپنے جان و مال کو کوئی خطرہ نہ ہو''

اس حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کی بعض امتیازی خصوصیات بیان فرما کر دین کے ایک بڑے وسیع شعبے کی طرف توجہ دلائی ہے جسے لوگ ناواقفیت کے سبب دین کا شعبہ نہیں سمجھتے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دین صرف چند عقائد، نماز روزے اور کچھ مخصوص عبادتوں کا نام ہے، اور ان عبادتوں کو بجالانے کے بعد انسان اپنے عام روزمرہ کی زندگی میں آزاد اور خودمختار ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے جہاں ہمیں نماز روزے اور دوسری عبادتوں کی تعلیم دی ہے، وہاں زندگی کے ہر شعبے میں ایسی تعلیمات عطا کی ہیں جن پر عمل کر کے ہم اپنے معاشرے کو جنت کا نمونہ بنا سکتے ہیں۔

☆ نشری تقریریں، ص: ۸۹۔۹۲، فرد کی اصلاح، ص: ۹۳۔۹۵

(۱) صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ٩، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان تفاضل الإسلام وأي أموره أفضل، رقم: ٥٨، سنن الترمذي، كتاب الإيمان عنْ رسول الله، باب ما جاء في أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ٢٥٥١، سنن النسائي، كتاب الإيمان وشرائعه، باب صفة المسلم، رقم: ٤٩١٠، سنن أبي داود، كتاب الجهاد، باب في الهجرة هل انقطعت، رقم: ٢١٢٢

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں صرف ایک چوتھائی حصہ عقائد اور عبادات پر مشتمل ہے، اور باقی تین چوتھائی تعلیمات معاملات، اخلاق اور معاشرت سے متعلق ہیں۔ دین کے ان اہم شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ معاشرت ہے، جس میں دوسرے انسانوں کے ساتھ میل جول اور باہم زندگی گزارنے کے آداب بتائے گئے ہیں۔

جو حدیث ابھی آپ کو سنائی گئی ہے اس میں آنحضرت ﷺ نے اسلام کی معاشرتی تعلیمات کا نہایت جامع خلاصہ بیان فرمادیا ہے، کیونکہ اسلام نے معاشرت سے متعلق جتنے احکام دیئے ہیں ان کا آخری مقصد یہ ہے کہ اپنی ذات سے کسی بھی مسلمان، بلکہ کسی بھی انسان کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے دی جائے۔ آنحضرت ﷺ نے اسلامی زندگی کے اس اصول کو انتہائی پُرزور طریقے سے ذہن نشین کرانے کے لئے فقرہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''مسلمان درحقیقت وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں''، یعنی دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے احتراز اسلام کا وہ بنیادی نشان ہے جس سے ایک مسلمان پہچانا جاتا ہے، لہٰذا جو شخص دوسروں کو تکلیف پہنچاتا ہو وہ قانونی اور لفظی اعتبار سے خواہ مسلمان ہی کہلائے، لیکن ایک سچے مسلمان کی حقیقی صفات اور بنیادی علامتوں سے کوسوں دور ہے۔

پھر اس حدیث کے پہلے جملے میں تو الفاظ یہ ارشاد فرمائے گئے ہیں کہ ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں'' لیکن اگلے ہی فقرے میں ارشاد ہے کہ ''لوگوں کی جان و مال کو اس سے کوئی خطرہ نہ ہو'' نیز صحیح ابن حبان کی روایت میں الفاظ یہ ہیں:

((مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ))(۱)

یعنی ''جس کے ہاتھ اور زبان سے تمام لوگ محفوظ رہیں''

جس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ کسی بھی انسان کو تکلیف نہ پہنچائے خواہ وہ انسان مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ لہٰذا جس طرح کسی مسلمان کی ایذا رسانی سے بچنا مسلمان کے لئے ضروری ہے، اسی طرح کسی غیر مسلم کو بھی بلاوجہ پریشان کرنا یا تکلیف پہنچانا حرام ہے۔

پھر اس حدیث میں ہاتھ اور زبان کا ذکر محض اس لئے کر دیا گیا ہے کہ عام طور سے ایذا رسانی انہی راستوں سے ہوتی ہے، ورنہ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو کسی بھی طرح کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے، نہ ہاتھ سے، نہ زبان سے اور نہ کسی اور طریقے سے۔

ہاتھ سے تکلیف پہنچانے کا مطلب تو ظاہر ہے کہ اس میں ناحق مار پیٹ، لڑائی جھگڑا وغیرہ داخل ہے، لیکن زبان سے تکلیف پہنچانے میں بے شمار گناہ آجاتے ہیں، مثلاً جھوٹ، دھوکہ فریب،

---

(۱) مسند أحمد، رقم: ۷۰٦٤، شعب الإيمان، السابع والسبعون من شعب الإيمان، وهو باب في أن يحب الرجل للأخ، رقم: ۱۱۱۲۳۔

بدعہدی، غیبت، چغل خوری، گالم گلوچ، یا کوئی بھی ایسی بات کہنا جس سے دوسرے کا دل ٹوٹے یا اسے ذہنی یا جسمانی اذیت میں مبتلا ہونا پڑے، اور ان کے علاوہ بھی دوسرے کو تکلیف پہنچانے کے جتنے طریقے تصور میں آسکتے ہیں ان سب کو اس حدیث میں ایسا ہی حرام قرار دیا گیا ہے جیسے چوری، ڈاکہ، شراب نوشی اور دوسرے کبیرہ گناہ حرام ہیں، چنانچہ اسلام نے اپنے ہر حکم میں دوسروں کو تکلیف سے بچانے کا خاص اہتمام کیا ہے، مثلاً حکم یہ ہے کہ جمعہ کے روز جب مسجد میں جاؤ تو لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ، نیز جمعہ کے لئے جاؤ تو نہا دھو کر جاؤ، کوئی بدبودار چیز کھا کر نہ جاؤ، تاکہ پاس بیٹھنے والوں کو تکلیف نہ پہنچے، نیز حکم ہے کہ نماز پڑھنے کے لئے ایسی جگہ نہ کھڑے ہو کہ دوسروں کے لئے گزرنے کا راستہ بند ہو جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو ہر کام اتنی آہستگی سے کرتے تھے کہ کسی کی آنکھ نہ کھلے۔ (۱)

اس لئے کہ اپنی نفلی عبادت کی خاطر دوسروں کو تکلیف پہنچانا اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔

پھر تکلیف پہنچانے کی بھی بعض صورتیں تو بالکل واضح ہوتی ہیں، مثلاً مار پیٹ، گالم گلوچ وغیرہ، لیکن بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ارتکاب ہم محض بے پروائی اور بے خیالی میں کر گزرتے ہیں، مثلاً سڑک پر پھل کا چھلکا پھینکتے وقت کسی کے خیال میں یہ بات نہیں ہوتی کہ یہ کسی گناہ کا ارتکاب ہو رہا ہے، حالانکہ اگر اس چھلکے کی وجہ سے کوئی انسان پھسل کر گر پڑے تو اس کی تکلیف کا سارا گناہ اس شخص پر ہے جس نے وہ چھلکا بے جگہ پھینکا تھا، اور اس سے جتنے آدمیوں کو تکلیف پہنچے گی ان سب کا گناہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔

اس طرح عام راستوں پر کوڑا کرکٹ ڈال دینا، سواری کو غلط جگہ کھڑا کرنا، بلاضرورت لاؤڈ اسپیکر استعمال کر کے لوگوں کے آرام و سکون میں خلل انداز ہونا، جس سے لوگوں کو سخت تکلیف پہنچتی ہے، محض بدتہذیبی اور ناشائستگی ہی نہیں ہے بلکہ اس حدیث کی رو سے شرعی گناہ بھی ہے۔ لہٰذا اس حدیث کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان کو اپنے ہر کام میں یہ سوچنا چاہئے کہ اس سے کوئی دوسرا شخص کسی ذہنی یا جسمانی تکلیف میں مبتلا تو نہیں ہوگا، اور جس کام سے کسی کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو اس سے مکمل احتراز کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب ما یقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، رقم:۱۶۱۹، مسند أحمد، رقم:۲٤٦٧١

دوستی اور دشمنی میں اعتدال ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

"عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((أَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰى أَنْ يَّكُوْنَ بَغِيْضَكَ يَوْمًا مَا وَأَبْغِضْ بَغِيْضَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰى أَنْ يَّكُوْنَ حَبِيْبَكَ يَوْمًا مَا))(۱)

دوستی کرنے کا زرّین اصول

یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور سند کے اعتبار سے صحیح حدیث ہے۔ یہ بڑی عجیب حدیث ہے اور اس میں بڑا عجیب سبق دیا ہے اور اس میں ہماری پوری زندگی کے لئے زرّین اصول بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے دوست سے دھیرے دھیرے محبت کرو۔ یعنی اعتدال سے کرو، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ تمہارا وہ دوست کسی دن تمہارا دشمن بن جائے اور مبغوض بن جائے۔ اور جس شخص سے تمہیں دشمنی اور بغض ہے، اس کے ساتھ بغض اور دشمنی بھی دھیرے دھیرے کرو، کیا پتہ کہ وہ دشمن کسی دن تمہارا محبوب اور دوست بن جائے۔

اس حدیث میں یہ عجیب تعلیم ارشاد فرمائی کہ دوست سے دوستی اور محبت بھی اعتدال کے ساتھ کرو اور جس سے دشمنی ہو تو اس کے ساتھ دشمنی بھی اعتدال کے ساتھ ہو۔ یاد رکھو، دنیا کی دوستیاں اور محبتیں بھی پائیدار نہیں ہوتیں اور دنیا کی دشمنیاں اور بغض بھی پائیدار نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت وہ دوستی دشمنی میں تبدیل ہو جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی وقت وہ دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے۔ اس لئے اعتدال سے آگے نہ بڑھو۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/۸۴ تا ۹۶)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فی الإقتصاد فی الحب والبغض، رقم: ۱۹۲۰

ہماری دوستی کا حال

اس حدیث میں ان لوگوں کو خاص طور پر زرّین تعلیم عطا فرمائی جن کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب ان کی دوستی کسی سے ہوجاتی ہے یا کسی سے تعلق ہوجاتا ہے اور محبت ہوجاتی ہے تو اس دوستی اور محبت میں بے دھڑک آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں کہ پھر ان کو کسی حد کی پرواہ نہیں ہوتی، بس جن سے محبت اور تعلق قائم ہوگیا اب ان کے اندر کوئی عیب نظر نہیں آتا اور اب دن رات کھانا پینا ان کے ساتھ ہے، اُٹھنا بیٹھنا ان کے ساتھ ہے، چلنا پھرنا ان کے ساتھ ہے، ہر کام ان کے ساتھ ہے، اور دن رات ان کی رفاقت اور صحبت حاصل ہے اور ان کی تعریف کے گن گائے جارہے ہیں۔ لیکن اچانک معلوم ہوا کہ دوستی ٹوٹ گئی، اب وہ دوستی ایسی ٹوٹی کہ اب ایک دوسرے کی شکل وصورت دیکھنے کے روادار نہیں، ایک دوسرے کا نام سننے کے روادار نہیں، اب ان کے اندر ایک اچھائی بھی نظر نہیں آتی بلکہ اب ان کی برائیاں شروع ہوگئیں۔ یہ انتہاپسندی اور یہ اعتدال سے باہر جانا شریعت کا تقاضا نہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، بلکہ یہ تعلیم دی ہے کہ محبت بھی اعتدال سے کرو اور اگر بغض ہے تو وہ بھی اعتدال سے رکھو، کسی بھی چیز کو حد سے آگے نہ بڑھاؤ۔

دوستی کے لائق ایک ذات

یاد رکھو، اول تو دوستی اور محبت جس چیز کا نام ہے، یہ دنیا کی مخلوق میں حقیقی اور صحیح معنی میں تو ہے ہی نہیں، اصل دوستی اور محبت کے لائق تو صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ اللہ جل جلالہ کی ذات ہے۔ دل میں بٹھانے کے لائق کہ جس کی محبت دل میں گھس جائے وہ تو ایک ہی ذات ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں جو دل بنایا ہے وہ صرف اپنے لئے ہی بنایا ہے، یہ انہی کی تجلی گاہ ہے اور انہی کے لئے بنا ہے۔ اب اس دل میں کسی اور کو اس طرح بٹھانا کہ وہ دل پر قبضہ جمالے، یہ کسی مؤمن کے لئے مناسب نہیں، کیونکہ دوستی کے لائق تو ایک ہی ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایک سچے دوست

اگر اس کائنات میں کوئی شخص کسی کا سچا دوست ہوسکتا تھا تو حضورِ اقدس ﷺ کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا تھا۔ حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ دوستی کا تعلق جس طرح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نبھایا اس کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔ کوئی دوسرا شخص یہ دعویٰ ہی نہیں کرسکتا کہ میں ان جیسی دوستی کرسکتا ہوں، ہر ہر مرحلے پر آپ کو آزمایا گیا مگر آپ کھرے نکلے۔ پہلے

دن سے جب آپ حضورِ اقدس ﷺ پر آمنّا وصدّقنا کہہ کر ایمان لائے تھے، ساری عمر اس تصدیق اور ایمان میں ذرّہ برابر بھی تزلزل نہیں آیا۔

غارِ ثور کا واقعہ

غارِ ثور میں آپ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، جس کو قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا:

﴿إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (۱)

وہ دونوں غار میں تھے تو وہ اپنے ساتھی سے فرمارہے تھے کہ آپ غم نہ کریں، بیشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں۔ جب غار کے اندر داخل ہونے لگے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہلے داخل ہوئے تاکہ غار کو صاف فرمائیں اور غار کے اندر سانپ بچھو اور زہریلے جانوروں کے جو بل ہیں ان کو بند فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے کپڑے کاٹ کر ان سوراخوں کو بند فرمایا اور جب کپڑے ختم ہوگئے اور سوراخ باقی رہ گئے تو آپ نے اپنے پاؤں کی ایڑی سے سوراخوں کو بند فرمایا۔ (۲)

ہجرت کا ایک واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضورِ اقدس ﷺ ہجرت کے سفر میں تھے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ کے چہرۂ انور پر بھوک کے آثار دیکھے، آپ کہیں سے دودھ لے آئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں لاکر پیش کیا، حالانکہ اس وقت آپ خود بھی بھوک سے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب حضورِ اقدس ﷺ نے دودھ پی لیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بعد میں اس کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضورِ اقدس ﷺ نے اس طرح دودھ پیا کہ میں سیراب ہوگیا۔ یعنی دودھ تو حضور ﷺ نے پیا لیکن سیراب میں ہوگیا۔ لہٰذا دوستی اور ایثار و قربانی کا جو مقام حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پیش کیا وہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص پیش نہیں کرسکتا۔ (۳)

دوستی اللہ کے ساتھ خاص ہے

لیکن اس کے باوجود سرکارِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں:

---

(۱) التوبة: ٤٠ (۲) البداية والنهاية (۳/ ۱۸۰)، كنز العمال (۸/ ۳۳۵)

(۳) صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام، رقم: ٣٣٤٦، صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب في حديث الهجرة ويقال له حديث الرحل، رقم: ٥٣٢٩، مسند أحمد، رقم: ٣

((لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَابَكْرٍ خَلِيْلًا))(۱)

یعنی اگر میں اس دنیا میں کسی کو سچا دوست بناتا تو "ابوبکر" کو بناتا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو بھی دوست بنایا نہیں، اس لئے کہ اس دنیا میں حقیقی معنی میں دوست بننے کے لائق کوئی نہیں ہے، یہ دوستی تو صرف اللہ جل شانہٗ کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ ایسی دوستی جو انسان کے دل پر قبضہ جمالے کہ جو وہ کہے وہ کرے اور پھر انسان کا دل اس کے تابع ہو جائے، یہ دوستی اللہ کے سوا کسی اور کے ساتھ زیبا نہیں۔

دوستی اللہ کی دوستی کے تابع ہونی چاہئے

البتہ دنیا کے اندر جو دوستی ہوگی وہ اللہ کی محبت اور دوستی کے تابع ہوگی۔ چنانچہ دوست کے کہنے کی وجہ سے گناہ نہیں کیا جائے گا، دوستی کی مد میں معصیت اور نافرمانی نہیں ہوگی۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ اس دنیا میں تمام دوستیاں اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے تابع ہونی چاہئیں۔

مخلص دوستوں کا فقدان

دوسری بات یہ ہے کہ اس دنیا میں ایسا دوست ملتا ہی کہاں ہے جس کی دوستی اللہ کی دوستی کے تابع ہو، تلاش کرنے اور ڈھونڈنے کے باوجود بھی ایسا دوست نہیں ملتا جس کو صحیح معنی میں دوست کہہ سکیں اور جس کی دوستی اللہ کی دوستی کے تابع ہو اور جو کڑی آزمائش کے وقت پکا نکلے۔ ایسا دوست بڑی مشکل سے ملتا ہے، قسمت والے کو ہی ایسا دوست ملتا ہے۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب میرے دوسرے بڑے بھائی صاحبان اپنے دوستوں کا ذکر کرتے تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُن سے فرماتے کہ تمہارے دنیا میں بہت دوست ہیں، ساٹھ سال عمر ہوگئی ہمیں تو کوئی دوست نہیں ملا، ساری عمر میں صرف ڈیڑھ دوست ملا، ایک پورا اور ایک آدھا، مگر تمہیں بہت دوست مل جاتے ہیں۔ لہٰذا دوستی کے معیار پر پورا اُترنے والا جو کٹھن آزمائش میں بھی پکا اور کھرا ثابت ہو، ایسا دوست بہت کم ملتا ہے۔

بہر حال، اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنا کر بھی دوست بناؤ تو اس دوستی کے اندر بھی کیا

(۱) صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب الخوخة والممر في المسجد، رقم: ٤٤٦، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل أبي بكر، رقم: ٤٣٩٠، سنن الترمذي، كتاب المناقب عَنْ رسول الله، باب مناقب أبي بكر الصديق، رقم: ٣٥٨٨، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل أبي بكر الصديق، رقم: ٩٠، مسند أحمد، رقم: ٣٣٩٩

اہتمام کرو کہ وہ دوستی حدود سے تجاوز نہ کرے، بس وہ دوستی ایک حد کے اندر رہے، یہ نہ ہو کہ جب دوستی ہوگئی تو اب صبح سے لے کر شام تک ہر وقت اسی کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہے اور اسی کے ساتھ کھانا پینا ہے، اور اب اپنے راز بھی اس پر ظاہر کیے جارہے ہیں، اپنی ہر بات اس سے کہی جارہی ہے، اگر کل کو دوستی ختم ہوگئی تو چونکہ تم نے اپنے سارے راز اس پر ظاہر کردیئے ہیں، اب وہ تمہارے راز ہر جگہ اُچھالے گا اور تمہارے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اس لئے دوستی اعتدال کے ساتھ ہونی چاہئے، یہ نہ ہو کہ آدمی حدود سے تجاوز کرجائے۔

دشمنی میں اعتدال

اسی طرح اگر کسی کے ساتھ دشمنی ہے اور کسی سے تعلقات اچھے نہیں ہیں تو یہ نہ ہو کہ اس کے ساتھ تعلقات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندر ہر وقت کیڑے نکالے جارہے ہیں، اس کے ہر کام میں عیب تلاش کیے جارہے ہیں۔ ارے بھائی! اگر کوئی آدمی برا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اچھائی بھی رکھی ہوگی، ایسا نہ ہو کہ عداوت کی وجہ سے تم اس کی اچھائیوں کو بھی نظر انداز کرتے چلے جاؤ۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا﴾(۱)

یعنی کسی قوم کے ساتھ عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ بیشک اس کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے، لیکن اس دشمنی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب اس کی اچھائی کا بھی اعتراف نہ کیا جائے، بلکہ اگر وہ کوئی اچھا کام کرے تو اس کی اچھائی کا اعتراف کرنا چاہئے۔ لیکن چونکہ حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد عام طور پر ہمارے پیشِ نظر نہیں رہتا، اس لئے محبتوں میں بھی حدود سے تجاوز ہو جاتا ہے اور بغض اور عداوت میں بھی حدود سے تجاوز ہو جاتا ہے۔

حجاج بن یوسف کی غیبت

آج حجاج بن یوسف کو کون مسلمان نہیں جانتا، جس نے بے شمار ظلم کیے، کتنے علماء کو شہید کیا، کتنے حافظوں کو قتل کیا، حتیٰ کہ اس نے کعبہ شریف پر حملہ کردیا۔ یہ سارے برے کام کیے اور جو مسلمان بھی اس کے ان برے افعال کو پڑھتا ہے تو اس کے دل میں اس کی طرف سے کراہیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے حجاج بن یوسف کی برائی شروع کردی اور اس برائی کے اندر اس کی غیبت کی، تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فوراً ٹوکا اور فرمایا کہ یہ

(۱) المائدہ: ۸

مت سمجھنا کہ اگر حجاج بن یوسف ظالم ہے تو اب اس کی غیبت حلال ہوگئی یا اس پر بہتان باندھنا حلال ہوگیا۔ یاد رکھو، جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حجاج بن یوسف سے اس کے ناحق قتل اور ظلم اور خون کا بدلہ لیں گے تو تم اس کی جو غیبت کر رہے ہو یا بہتان باندھ رہے ہو تو اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ تم سے لیں گے۔ یہ نہیں کہ جو شخص بدنام ہوگیا تو اس کی بدنامی کے نتیجے میں اس پر جو چاہو الزام عائد کرتے چلے جاؤ، اس پر بہتان باندھتے چلے جاؤ اور اس کی غیبت کرتے چلے جاؤ۔ لہٰذا عداوت اور دشمنی بھی اعتدال کے ساتھ کرو اور محبت بھی اعتدال کے ساتھ کرو۔

ہمارے ملک کی سیاسی فضا کا حال

آج کل ہمارے یہاں جو سیاسی فضا ہے، اس سیاسی فضا کا حال یہ ہے کہ اگر کسی کے ساتھ تعلق ہوگیا اور اس کے ساتھ سیاسی وابستگی ہوگئی تو اس کو اس طرح بانس پر چڑھاتے ہیں کہ اب اس کے اندر کوئی عیب نظر نہیں آتا، اور اگر دوسرا شخص کوئی عیب بیان کرے تو اس کا سننا گوارہ نہیں ہوتا، اور اس کے بارے میں یہ رائے قائم کرلی جاتی ہے کہ یہ غلطی سے پاک ہے۔ اور جب اس سے سیاسی دشمنی ہوجاتی ہے تو اب اس کے اندر کوئی اچھائی ہی نظر نہیں آتی۔ دونوں جگہ پر حدود سے تجاوز ہو رہا ہے۔ اس طریقے سے حضور اقدس ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

جیسا کہ بار بار عرض کرتا رہتا ہوں کہ صرف نماز روزے کا نام دین نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی دین کا حصہ ہے کہ محبت کرو تو اعتدال کے ساتھ کرو اور بغض رکھو تو اعتدال کے ساتھ رکھو۔ جو اللہ کے بندے ہیں وہ ان باتوں کو سمجھتے ہیں۔ یہ حکمران، یہ سیاسی لیڈر اور رہنما جو ہیں، ان کے ساتھ تعلق بھی باعزت فاصلے کے ساتھ ہو، یہ نہ ہو کہ جب ان کے ساتھ تعلق ہوگیا تو آدمی حد سے متجاوز ہو رہا ہے۔

قاضی بکّار بن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کا سبق آموز واقعہ

ایک قاضی گزرے ہیں قاضی بکّار بن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ، یہ بڑے درجے کے محدثین میں سے ہیں۔ دینی مدارس میں حدیث کی کتاب "طحاوی شریف" پڑھائی جاتی ہے اس کے مصنف ہیں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ، یہ ان کے استاذ ہیں۔ ان کے زمانے میں جو بادشاہ تھا وہ ان پر مہربان ہوگیا، اور ایسا مہربان ہوگیا کہ ہر معاملے میں ان سے صلاح اور مشورہ ہو رہا ہے، ہر معاملے میں ان کو بلایا جا رہا ہے، ہر دعوت میں ان کو بلایا جا رہا ہے، حتیٰ کہ ان کو پورے ملک کا قاضی بنا دیا۔ اور اب سارے فیصلے ان کے پاس آرہے ہیں، دن رات بادشاہ کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہے، جو سفارش کرتے ہیں بادشاہ ان کی سفارش کو قبول کرلیتا ہے۔ ایک عرصہ دراز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ اپنا قضا کا کام بھی کرتے ہے اور جو مناسب مشورہ ہوتا

وہ بادشاہ کو دے دیا کرتے تھے۔

چونکہ وہ تو عالم اور قاضی تھے، بادشاہ کے غلام تو نہیں تھے، تو ایک مرتبہ بادشاہ نے غلط کام کر دیا، قاضی صاحب نے فتویٰ دے دیا کہ بادشاہ کا یہ کام غلط ہے اور درست نہیں ہے، اور یہ کام شریعت کے خلاف ہے۔ اب بادشاہ سلامت ناراض ہوگئے کہ ہم اتنے عرصے تک ان کو کھلاتے پلاتے رہے، ان کو ہدیے تحفے دیتے رہے اور ان کی سفارش قبول کرتے رہے اور اب انہوں نے ہمارے خلاف ہی فتویٰ دے دیا۔ چنانچہ فوراً ان کو قاضی کے عہدے سے معزول کر دیا۔ یہ دنیاوی بادشاہ بڑے تنگ ظرف ہوتے ہیں، دیکھنے میں بڑے سخی نظر آتے ہیں لیکن کم ظرف ہوتے ہیں، تو صرف یہ نہیں کیا کہ ان کو قضا کے عہدے سے معزول کر دیا بلکہ ان کے پاس اپنا قاصد بھیجا کہ جا کر ان سے کہو کہ ہم نے آج تک تمہیں جتنے ہدیے تحفے دیئے ہیں وہ سب واپس کرو، اس لئے کہ اب تم نے ہماری مرضی کے خلاف کام شروع کر دیا ہے۔ اب آپ اندازہ کریں کہ کئی سالوں کے وہ ہدایا کبھی کچھ دیا ہوگا، کبھی کچھ بھیجا ہوگا، لیکن جب بادشاہ کا وہ آدمی آیا تو آپ اس آدمی کو اپنے گھر کے اندر ایک کمرے میں لے گئے اور ایک الماری کا تالہ کھولا تو وہ پوری الماری تھیلیوں سے بھری ہوئی تھی۔ آپ نے اس قاصد سے کہا کہ تمہارے بادشاہ کے پاس سے جو تحفے کی تھیلیاں آتی تھیں وہ سب اس الماری کے اندر رکھی ہوئی ہیں، اور ان تھیلیوں پر جو مہر لگی تھی وہ مہر بھی ابھی تک نہیں ٹوٹی، یہ ساری تھیلیاں اُٹھا کر لے جاؤ۔ اس لئے کہ جس دن بادشاہ سے تعلق قائم ہوا، الحمد للہ اسی دن حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد ذہن میں تھا:

((اَحْبِبْ حَبِيْبَكَ هَوْنًا مَّا عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ بَغِيْضَكَ يَوْمًا مَا))(۱)

اور مجھے اندازہ تھا کہ شاید کوئی وقت ایسا آئے گا کہ مجھے یہ سارے تحفے واپس کرنے پڑیں گے۔ الحمد للہ بادشاہ کے دیئے ہوئے ہدیے اور تحفوں میں سے ایک ذرّہ بھی آج تک اپنے استعمال میں نہیں لایا۔ یہ ہے حضور اقدس ﷺ کے ارشاد پر عمل کا صحیح نمونہ۔ یہ نہیں کہ جب دوستی ہوگئی تو اب ہر طرح کا فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے اور جب دشمنی ہوئی تو اب پریشانی اور شرمندگی ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

یہ دعا کرتے رہو

اول تو صحیح معنی میں محبت صرف اللہ جل شانہ سے ہونی چاہئے۔ اسی لئے حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا تلقین فرمائی جو ہر مسلمان کو ہمیشہ مانگنی چاہئے:

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عَنْ رسول الله، باب ما جاء فی الاقتصاد فی الحب والبغض، رقم: ۱۹۲۰

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْيَاءِ اِلَيَّ))[۱]

''اے اللہ! اپنی محبت کو تمام محبتوں پر غالب فرما''

اب انسان چونکہ کمزور ہے اور اس کے ساتھ بشری تقاضے لگے ہوئے ہیں، اس لئے انسان کو دوسروں سے بھی محبت ہوتی ہے۔ مثلاً بیوی سے محبت، اولاد سے محبت، دوستوں سے محبت، ماں باپ سے محبت، عزیز و رشتہ داروں سے محبت، یہ ساری محبتیں انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، یہ محبتیں انسان کے ساتھ رہیں گی اور کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ آدمی یہ دعا کرے کہ یا اللہ! یہ ساری محبتیں آپ کی محبت کے تابع ہو جائیں اور آپ کی محبت ان تمام محبتوں پر غالب آ جائے۔

اگر محبت حد سے بڑھ جائے تو یہ دعا کرو

اگر کسی سے محبت ہو اور یہ محسوس ہو کہ یہ محبت حد سے بڑھ رہی ہے تو فوراً اللہ کی طرف رجوع کرو کہ یا اللہ! یہ محبت آپ نے میرے دل میں ڈالی ہے لیکن یہ محبت حد سے بڑھتی جارہی ہے۔ اے اللہ! کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کسی فتنے میں مبتلا ہو جاؤں۔ اے اللہ! اپنی رحمت سے مجھے فتنے میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھئے۔ اور پھر اپنے اختیاری طرزِ عمل میں بھی ہمیشہ احتیاط سے کام لو۔ جو آج کا دوست ہے وہ کل کا دشمن بھی ہو سکتا ہے۔ کل تک تو ہر وقت ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تھا، ساتھ کھانا پینا تھا، اور آج یہ نوبت آگئی کہ صورت دیکھنے کے روادار نہیں۔ یہ نوبت نہیں آنی چاہئے، اور اگر آئے تو اس کی طرف سے آئے، تمہاری طرف سے نہ آئے۔

بہر حال، دوستی کے بارے میں یہ حضورِ اقدس ﷺ کی تلقین ہے، اور حضورِ اقدس ﷺ کی ایک ایک تلقین ایسی ہے کہ اگر ہم ان کو پلّے باندھ لیں تو ہماری دنیا اور آخرت سنور جائے۔

دوستی کے نتیجے میں گناہ

بسا اوقات ان دوستیوں کے نتیجے میں ہم گناہ کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں، اور یہ سوچتے ہیں کہ چونکہ یہ دوست ہے اگر اس کی بات ہم نے نہ مانی تو اس کا دل ٹوٹے گا، لیکن اگر اس کے دل ٹوٹنے کے نتیجے میں شریعت ٹوٹ جائے تو اس کی پرواہ نہیں۔ حالانکہ شریعت کو ٹوٹنے سے بچانا دل کو ٹوٹنے سے بچانے سے مقدم ہے بشرطیکہ شریعت میں گنجائش نہ ہو، لیکن اگر شریعت کے اندر گنجائش ہو تو اس صورت میں بیشک یہ حکم ہے کہ مسلمان کا دل رکھنا چاہئے اور حتی الامکان دل نہ توڑنا چاہئے، کیونکہ یہ بھی عبادت ہے۔

(۱) کنز العمال (۱۸۲/۲)

اعتدال کا راستہ اختیار کیجئے

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں معاملات کے اندر "غلو" کرنے کی ممانعت ہے۔ کسی بھی معاملے میں غلو نہ ہو، نہ تعلقات میں اور نہ ہی معاملات میں۔ اور غلو کے معنی ہیں "حد سے بڑھنا" کسی بھی معاملے میں انسان حد سے نہ بڑھے بلکہ مناسب حد کے اندر رہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس حدیث پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

برائی کا بدلہ اچھائی سے دیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ،
﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خٰشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ ۝ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُونَ﴾ (۱)

گزشتہ چند جمعوں سے سورۃ مؤمنون کی ابتدائی آیات کا بیان چل رہا ہے۔ ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مؤمنوں کی ان صفات کو بیان کیا ہے جو ان کی دنیا وآخرت کی فلاح اور کامیابی کی موجب ہیں، لہٰذا اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کو دنیا وآخرت کی کامیابی حاصل ہو تو ان کے لئے ان صفات کا اہتمام کرنا ضروری ہے جو ان آیات میں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے پہلی صفت جو ان آیات میں بیان کی گئی ہے وہ "نماز میں خشوع اختیار کرنا" ہے، اس کا مفصل بیان الحمدللہ ہو چکا ہے۔

مؤمنوں کی دوسری صفت

دوسری صفت یا دوسرا عمل جو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے وہ ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾

یعنی فلاح یافتہ مؤمن وہ ہیں جو لغو سے اعراض کرتے ہیں اور کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ اس آیت کریمہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ بیہودہ گفتگو کرے یا بیہودہ معاملہ کرے تو اس کا جواب ترکی بہ ترکی دینے کے بجائے اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو لغو باتوں سے اور لغو افعال سے بچاتے ہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۴/۲۵۲ تا ۲۶۸)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المومنون: ۱ تا ۷

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا۔ ایسی بزرگ ہستی کہ ماضی قریب میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، شاہی خاندن کے شہزادے تھے، اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لئے نکل پڑے اور قربانیاں دیں۔ ایک مرتبہ دہلی کی جامع مسجد میں خطاب فرما رہے تھے، خطاب کے دوران بھرے مجمع میں ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا (العیاذ باللہ) ہم نے سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں۔ اتنے بڑے عالم اور شہزادے کو ایک بڑے مجمع میں یہ گالی دی اور وہ مجمع بھی معتقدین کا تھا۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم جیسا کوئی آدمی ہوتا تو اس کو سزا دیتا، اگر وہ سزا نہ بھی دیتا تو اس کے معتقدین اس کی تکہ بوٹی کر دیتے، ورنہ کم از کم اس کو ترکی بہ ترکی یہ جواب تو دے ہی دیتے کہ تو حرام زادہ، تیرا باپ حرام زادہ، لیکن حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ جو پیغمبرانہ دعوت کے حامل تھے، جواب میں فرمایا:

''آپ کو غلط اطلاع ملی ہے، میری والدہ کے نکاح کے گواہ تو آج بھی دلی میں موجود ہیں''

اس گالی کو ایک مسئلہ بنا دیا لیکن گالی کا جواب گالی سے نہیں دیا۔

ترکی بہ ترکی جواب مت دو

لہٰذا طعنہ کا جواب طعنہ سے نہ دیا جائے۔ اگرچہ شرعاً تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ جیسی دوسرے شخص نے تمہیں گالی دی ہے، تم بھی ویسی ہی گالی اس کو دیدو، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے وارثین انتقام کا یہ حق استعمال نہیں کرتے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی یہ حق کبھی استعمال نہیں فرمایا بلکہ ہمیشہ معاف کر دینے اور درگزر کر دینے کا شیوہ رہا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے وارثین کا بھی یہی شیوہ رہا ہے۔

انتقام کے بجائے معاف کر دو

ارے بھائی! اگر کسی نے تمہیں گالی دیدی تو تمہارا کیا بگڑا؟ تمہاری کونسی آخرت خراب ہوئی؟ بلکہ تمہارے تو درجات میں اضافہ ہوا، اگر تم انتقام نہیں لوگے بلکہ درگزر کر دوگے اور معاف کر دوگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں معاف کر دیں گے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص دوسرے کی غلطی کو معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس دن معاف فرمائیں گے جس دن وہ معافی کا سب سے

زیادہ محتاج ہوگا یعنی قیامت کے دن۔ لہٰذا انتقام لینے کی فکر چھوڑ دو، اور معاف کر دو اور درگزر کر دو۔

بزرگوں کی مختلف شانیں

ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت ہم نے سنا ہے کہ اولیاء کرام رحمہم اللہ کی شانیں عجیب و غریب ہوتی ہیں، کسی کا کوئی رنگ ہے، کسی کا کوئی رنگ ہے، اور کسی کی کوئی شان ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ ان اولیاء کرام رحمہم اللہ کی مختلف شانیں دیکھوں کہ وہ کیا شانیں ہوتی ہیں۔ ان بزرگ نے ان سے فرمایا کہ تم کس چکر میں پڑ گئے، اولیاء اور بزرگوں کی شانیں دیکھنے کی فکر میں مت پڑو بلکہ اپنے کام میں لگو۔ ان صاحب نے اصرار کیا کہ نہیں! میں ذرا دیکھنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کیسے کیسے بزرگ ہوتے ہیں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر تم دیکھنا ہی چاہتے ہو تو ایسا کرو کہ دہلی کی فلاں مسجد میں چلے جاؤ، وہاں تمہیں تین بزرگ اپنے ذکر واذکار میں مشغول نظر آئیں گے، تم جا کر ہر ایک کی پشت پر ایک مُکا مار دینا، پھر دیکھنا کہ اولیاء کرام کی شانیں کیا ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ صاحب گئے، وہاں جا کر دیکھا تو واقعۃً تین بزرگ بیٹھے ہوئے ذکر میں مشغول ہیں۔ انہوں نے جا کر پہلے بزرگ کو پیچھے سے ایک مُکا مارا تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں بلکہ اپنے ذکر واذکار میں مشغول رہے۔ جب دوسرے بزرگ کو مُکا مارا تو انہوں نے بھی پلٹ کر ان کو مُکا مار دیا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ جب تیسرے بزرگ کو مُکا مارا تو انہوں نے پلٹ کر ان کا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا کہ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی۔

اس کے بعد یہ صاحب ان بزرگ کے پاس واپس آئے جنہوں نے ان کو بھیجا تھا۔ ان بزرگ نے ان سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے بتایا کہ بڑا عجیب قصہ ہوا۔ جب میں نے پہلے بزرگ کو مُکا مارا تو انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا بھی نہیں اور جب دوسرے بزرگ کو مُکا مارا تو انہوں نے بھی پلٹ کر مجھے مُکا مار دیا، اور جب تیسرے بزرگ کو مُکا مارا تو انہوں نے پلٹ کر میرا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا۔

ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ جنہوں نے تمہیں مُکا مارا تھا انہوں نے زبان سے کچھ کہا تھا؟ ان صاحب نے بتایا کہ زبان سے تو کچھ نہیں کہا، بس مُکا مارا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

میں اپنا وقت بدلہ لینے میں کیوں ضائع کروں

ان بزرگ نے فرمایا کہ اب سنو! پہلے بزرگ جنہوں نے بدلہ نہیں لیا، انہوں نے یہ سوچا کہ میں اپنا وقت بدلہ لینے میں کیوں ضائع کروں، اگر اس نے مجھے مُکا مارا تو میرا کیا بگڑ گیا، اب میں پیچھے مڑوں، اور یہ دیکھوں کہ کس نے مارا ہے اور پھر اس کا بدلہ لوں، جتنا وقت اس میں صرف ہوگا وہ وقت میں اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کیوں نہ صرف کر دوں۔

پہلے بزرگ کی مثال

ان پہلے بزرگ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو بادشاہ نے بلایا اور اس سے کہا کہ تم میرے پاس آؤ، میں تمہیں ایک عالیشان انعام دوں گا۔ اب وہ شخص اس انعام کے شوق میں دوڑتا ہوا بادشاہ کے محل کی طرف جارہا ہے، وقت کم رہ گیا ہے اور اس کو وقت پر پہنچنا ہے، راستے میں ایک شخص نے اس کو مُکّا مار دیا، اب یہ شخص اس مُکّا مارنے والے سے اُلجھے گا یا اپنا سفر جاری رکھے گا کہ میں جلد از جلد کسی طرح بادشاہ کے پاس پہنچ جاؤں۔ ظاہر ہے کہ اس مُکّا مارنے والے سے نہیں اُلجھے گا بلکہ وہ تو اس فکر میں رہے گا کہ میں کسی طرح جلد از جلد بادشاہ کے پاس پہنچ جاؤں اور جا کر اس سے انعام وصول کروں۔ اسی طرح یہ بزرگ اس مُکّا مارنے والے سے نہیں اُلجھے بلکہ اپنے ذکر میں مشغول رہے۔ تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔

دوسرے بزرگ کا انداز

دوسرے بزرگ جنہوں نے بدلہ لے لیا، انہوں نے یہ سوچا کہ شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ جتنی زیادتی کوئی شخص تمہارے ساتھ کرے، اتنی زیادتی تم بھی اس کے ساتھ کر سکتے ہو، اس سے زیادہ نہیں کر سکتے۔ اب تم نے ان کو ایک مُکّا مارا تو انہوں نے بھی تمہیں ایک مُکّا مار دیا، تم نے زبان سے کچھ نہیں کہا تو انہوں نے بھی زبان سے کچھ نہیں کہا۔

بدلہ لینا بھی خیر خواہی ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض بزرگوں سے یہ جو منقول ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لے لیا، یہ بدلہ لینا بھی درحقیقت اس شخص کی خیر خواہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اولیاء اللہ کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کو تکلیف پہنچائے یا ان کی شان میں کوئی گستاخی کرے اور وہ صبر کر جائیں تو ان کے صبر کے نتیجے میں وہ شخص تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

حدیث قدسی میں اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

((مَنْ عَادَى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ))

''جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی کرے، اس کیلئے میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔''(۱)

---

(۱) جامع العلوم والحکم، ابن رجب الحنبلی (۳۵۷/۱)، معارج القبول، حافظ بن احمد حکمی (۱۰۰۱/۳)

بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں کے ساتھ کی ہوئی زیادتی پر ایسا عذاب نازل فرماتے ہیں کہ ایسے عذاب سے اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، کیونکہ اس ولی کا صبر اس شخص پر واقع ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ والے بعض اوقات اپنے ساتھ کی ہوئی زیادتی کا بدلہ لے لیتے ہیں تاکہ اس کا معاملہ برابر ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کا عذاب اس پر نازل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کیوں بدلہ لیتے ہیں؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو اس بات پر اشکال ہو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ اولیاء اللہ تو اتنے شفیق ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اوپر کی ہوئی زیادتی کا بدلہ نہیں لیتے، لیکن اللہ تعالیٰ عذاب دینے پر تلے ہوئے ہیں کہ اگر بدلہ نہ لیا جائے تو وہ ضرور عذاب دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اولیاء اللہ کی شفقت اللہ تعالیٰ کی شفقت اور رحمت کے مقابلے میں زیادہ ہو گئی۔ پھر اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ شیرنی کو اگر کوئی جاکر چھیڑ دے تو وہ شیرنی طرح دے جاتی ہے اور بدلہ نہیں لیتی اور اس پر حملہ نہیں کرتی، لیکن اگر کوئی جاکر اس شیرنی کے بچوں کو چھیڑ دے تو پھر شیرنی اس کو برداشت نہیں کرتی بلکہ چھیڑنے والے پر حملہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی شان میں لوگ گستاخیاں کرتے ہیں، کوئی شرک کر رہا ہے، کوئی اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کر رہا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اپنے تحمل سے اس کو درگزر فرما دیتے ہیں، لیکن اولیاء اللہ جو اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں، ان کی شان میں گستاخی کرنا اللہ تعالیٰ کو برداشت نہیں ہوتا، اس لئے یہ گستاخی انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں یہ منقول ہے کہ کسی اللہ کے ولی نے بدلہ لے لیا، وہ بدلہ لینا اس کی خیر خواہی کے لئے ہوتا ہے، کیونکہ اگر بدلہ نہ لیا تو نہ معلوم اللہ تعالیٰ کا کیا عذاب اس پر نازل ہو جائے گا۔

تیسرے بزرگ کا انداز

جہاں تک تیسرے بزرگ کا تعلق ہے جنہوں نے تمہارا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا تھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے خلقِ خدا پر رحمت اور شفقت کا وصف عطا فرمایا تھا، اس لئے انہوں نے پلٹ کر ہاتھ سہلانا شروع کر دیا۔

پہلے بزرگ کا طریقہ سنت تھا

لیکن اصل طریقہ سنت کا وہ ہے جس کو پہلے بزرگ نے اختیار فرمایا۔ اس لئے کہ اگر کسی نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے تو میاں! کہاں تم اس سے بدلہ لینے کے چکر میں پڑ گئے، کیونکہ اگر تم بدلہ لے لو

گے تو تمہیں کیا فائدہ مل جائے گا؟ بس اتنا ہی تو ہوگا کہ سینے کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی، لیکن اگر تم اس کو معاف کر دو گے اور درگزر کر دو گے تو سینے کی آگ کیا بلکہ جہنم کی آگ بھی ٹھنڈی ہو جائے گی، انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ سے نجات عطا فرمائیں گے۔

معاف کرنا باعثِ اجر و ثواب ہے

آج کل ہمارے گھروں میں، خاندانوں میں، ملنے جلنے والوں میں، دن رات یہ مسائل پیش آتے رہتے ہیں کہ فلاں نے میرے ساتھ یہ کر دیا اور فلاں نے یہ کر دیا، اب اس سے بدلہ لینے کی سوچ رہے ہیں، دوسروں سے شکایت کرتے پھر رہے ہیں، اس کو طعنہ دے رہے ہیں، دوسروں سے اس کی برائی اور غیبت کر رہے ہیں، حالانکہ یہ سب گناہ کے کام ہیں۔ لیکن اگر تم معاف کر دو اور درگزر کر دو تو تم بڑی فضیلت اور ثواب کے مستحق بن جاؤ گے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾(۱)

''جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا بیشک یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾(۲)

دوسرے کی برائی کا بدلہ اچھائی سے دو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جن کے ساتھ عداوت ہے، وہ سب تمہارے گرویدہ ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا يُلَقّٰهَآ إِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ إِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ﴾(۳)

یعنی یہ عمل ان ہی کو نصیب ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ صبر کی توفیق عطا فرماتے ہیں اور یہ دولت بڑے نصیب والے کو حاصل ہوتی ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے اندازِ جواب

حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ طعنہ نہیں دیتے، حتیٰ کہ اگر کوئی سامنے والا شخص طعنہ بھی دے تو بھی جواب میں یہ حضرات طعنہ نہیں دیتے۔

غالباً حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کا واقعہ ہے کہ ان کی قوم نے ان سے کہا:

﴿إِنَّا لَنَرٰكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ﴾(۴)

(۱) الشوریٰ: ۴۳ (۲) حم السجدہ: ۳۴ (۳) حم السجدہ: ۳۵ (۴) الاعراف: ۶۶

نبی سے کہا جا رہا ہے کہ ہمارا یہ خیال ہے کہ تم انتہا درجے کے بیوقوف ہو، احمق ہو اور ہم تمہیں کاذبین میں سے سمجھتے ہیں، تم جھوٹے معلوم ہوتے ہو۔ وہ انبیاء علیہم السلام جن پر حکمت اور صدق قربان ہیں، ان کے بارے میں یہ الفاظ کہے جا رہے ہیں، لیکن دوسری طرف جواب میں پیغمبر فرماتے ہیں:

﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾(۱)

''اے قوم! میں بیوقوف نہیں ہوں بلکہ میں اللہ رب العالمین کی طرف سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں''

ایک اور پیغمبر سے کہا جا رہا ہے:

﴿إِنَّا لَنَرٰكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾(۲)

''ہم تمہیں دیکھ رہے ہیں کہ تم گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔''

جواب میں پیغمبر فرماتے ہیں:

﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾(۳)

''اے قوم! میں گمراہ نہیں ہوں بلکہ میں اللہ رب العالمین کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں''

آپ نے دیکھا کہ پیغمبر نے طعنہ کا جواب طعنہ سے نہیں دیا۔

رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا گیا، ان پر پتھروں کی بارش ہو رہی ہے، گھٹنے خون سے لہولہان ہو رہے ہیں، لیکن زبان پر یہ الفاظ جاری ہیں:

((اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ))

اے اللہ! میری اس قوم کو ہدایت عطا فرما، کیونکہ یہ جاہل ہے اور اس کو حقیقت کا پتہ نہیں ہے، اس وجہ سے میرے ساتھ یہ سلوک کر رہی ہے۔(۴)

انبیاء علیہم السلام کبھی کسی برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے، گالی کا بدلہ گالی سے نہیں دیتے، وہ

---

(۱) الاعراف: ٦٠ (۲) الاعراف: ٦٠ (۳) الاعراف: ٦١

(٤) صحيح البخاري، كتاب استتابة المرتدين والمعاندين وقتالهم، باب اذا عرض الذمي وغيره بسب النبي ولم يصرح...... الخ، رقم: ٦٤١٧، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب غزوة أحد، رقم: ٣٣٤٧، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، رقم: ٤٠١٥، مسند أحمد، رقم: ٣٤٢٩

اہل مکہ جنہوں نے مکہ میں رہنے والے صحابہ کرام کی زندگی عذاب کردی تھی، ان صحابہ کرام کو تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جارہا ہے، پتھر کی سلیں ان کے سینوں پر رکھی جارہی ہیں، ان کا بائیکاٹ کیا جارہا ہے، ان کا کھانا پانی بند کیا جارہا ہے، ان کے قتل کے منصوبے بنائے جارہے ہیں۔ ۱۳ سال تک حضور اقدس ﷺ اور صحابہ کرام کو ظلم کی چکی میں پیسا، لیکن اسی شہر مکہ میں فتح مکہ کے موقع پر جب حضور اقدس ﷺ فاتح بن کر داخل ہوئے تو اس موقع کا نقشہ کھینچتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ حضور اقدس ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر فاتح بن کر مکہ مکرمہ میں اس شان سے داخل ہو رہے ہیں کہ آپ کی گردن جھکی ہوئی ہے۔ کوئی دوسرا فاتح ہوتا تو اس کی گردن تنی ہوئی ہوتی، لیکن حضور اقدس ﷺ کی گردن جھکی ہوئی ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور زبان مبارک پر یہ آیات جاری ہیں:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾(۱)

''ہم نے آپ کو فتح مبین عطا فرمائی''(۲)

عام معافی کا اعلان

اور اس وقت آپ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کردیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے وہ مامون ہے، جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے اس کو بھی امن ہے، جو شخص حرم میں داخل ہوجائے اس کو بھی امن ہے، جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائے اس کو بھی امن ہے۔ پھر آپ نے تمام اہل مکہ کو جمع کر کے فرمایا:

((لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ))

''آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں اور تم سب آزاد ہو''(۳)

یہ سلوک آپ ﷺ نے ان لوگوں کے ساتھ کیا جو آپ کے خون کے پیاسے تھے۔

ان سنتوں پر بھی عمل کرو

بہرحال! انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ برائی کا جواب برائی سے مت دو، گالی کا جواب گالی سے مت دو، بلکہ اپنے مقابل کے ساتھ احسان کرو۔ حضور اقدس ﷺ کی زندگی کے جتنے طریقے ہیں وہ سب سنت ہیں۔ ہم نے صرف چند ظاہری چیزوں کا نام سنت رکھ لیا ہے، مثلاً داڑھی رکھ لینا، خاص طریقے کا لباس پہن لینا، جتنی سنتوں پر بھی عمل کی توفیق ہوجائے، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، لیکن سنتیں

(۱) الفتح: ۱ (۲) سيرة المصطفى (۳/ ۲٤) بحوالة ابن اسحاق و مستدرك الحاكم

(۳) البداية والنهاية (٤/ ۳۰۰-۳۰۱)

صرف ان کے اندر منحصر نہیں، بلکہ یہ بھی حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے کہ برائی کا جواب برائی سے نہ دو، گالی کا جواب گالی سے نہ دو، اگر اس سنت پر عمل ہو جائے تو ایسے شخص کے بارے میں قرآن شریف کا ارشاد ہے:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾(۱)

''جس شخص نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو البتہ یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے''

یہ بڑے ہمت کی بات ہے کہ آدمی کو غصہ آ رہا ہے اور خون کھول رہا ہے، اس وقت آدمی ضبط کر کے حدود پر قائم رہے اور سامنے والے کو معاف کر دے اور راستہ بدل دے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾(۲)

''جو لغو باتوں سے کنارہ کش رہنے والے ہیں''

اس سنت پر عمل کرنے سے دنیا جنت بن جائے

آپ حضرات ذرا سوچیں کہ اگر حضور اقدس ﷺ کی یہ سنت حاصل ہو جائے تو پھر دنیا میں کوئی جھگڑا باقی رہے گا؟ سارے جھگڑے، سارے فسادات، ساری عداوتیں، ساری دشمنیاں اس وجہ سے ہیں کہ آج اس سنت پر عمل نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس سنت پر عمل کی توفیق عطا فرمادیں تو یہ دنیا جو آج جھگڑوں کی وجہ سے جہنم بنی ہوئی ہے، جس میں عداوتوں کی آگ سلگ رہی ہے، نبی کریم ﷺ کی اس سنت پر عمل کرنے کے نتیجے میں جنت بن جائے، گل وگلزار بن جائے۔

جب تکلیف پہنچے تو یہ سوچ لو

جب بھی آپ کو کسی سے تکلیف پہنچے تو یہ سوچو کہ میں بدلہ لینے کے کس چکر میں پڑوں، ہٹاؤ اس کو اور اللہ اللہ کروں اور اس کو معاف کر دوں۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص نے آپ کے ساتھ زیادتی کر لی، آپ نے اس سے زیادہ زیادتی کر لی، اب دوسرا شخص اس زیادتی کا بدلہ لے گا اور پھر آپ اس سے بدلہ لیں گے، اس طرح عداوتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا جس کی کوئی انتہا نہیں، لیکن بالآخر تمہیں کسی مرحلے پر ہار ماننی پڑے گی اور اس جھگڑے کو ختم کرنا ہوگا، لہٰذا تم پہلے دن ہی معاف کر کے جھگڑا ختم کر دو۔

(۱) الشوریٰ: ۴۳ (۲) الفرقان: ۷۲

چالیس سالہ جنگ کا سبب

زمانۂ جاہلیت میں ایک طویل جنگ ہوئی ہے جو ''جنگِ بسوس'' کہلاتی ہے۔ اس جنگ کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ایک شخص کی مرغی کا بچہ تھا، وہ کسی دوسرے شخص کے کھیت میں چلا گیا اور وہاں جا کر اس نے پودے خراب کر دیئے، بس اس پر لڑائی شروع ہوگئی، ان دونوں کے قبیلے اور خاندان والے آگئے، پہلے لاٹھیاں نکلیں اور پھر تلواریں نکل آئیں، پھر یہ لڑائی چالیس سال تک جاری رہی، جب باپ کا انتقال ہوتا تو وہ اپنے بیٹے کو وصیت کر جاتا کہ بیٹا اور سب کام کر لینا لیکن میرے قاتلوں کو معاف نہ کرنا۔ صرف ایک مرغی کے بچے کی وجہ سے چالیس سال تک لڑائی چلتی رہی، اگر پہلے دن ہی قرآن کریم کی اس آیت:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾

پر عمل کر لیتے تو یہ لڑائی اسی دن ختم ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے یہ بات ہمارے دلوں میں اُتار دے اور ہمیں اس پر عمل کرنے کی ہمت اور حوصلہ عطا فرما دے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

دوسروں کی چیزوں کا استعمال ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ مُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَدَّثَهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((مَنْ أَكَلَ بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ أَكْلَةً فَإِنَّ اللّٰهَ يُطْعِمُهُ مِثْلَهَا مِنْ جَهَنَّمَ، وَمَنْ كُسِيَ ثَوْبًا بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَكْسُوْهُ مِثْلَهُ مِنْ جَهَنَّمَ، وَمَنْ قَامَ بِرَجُلٍ مَقَامَ سُمْعَةٍ وَرِيَاءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ يَقُوْمُ بِهِ مَقَامَ سُمْعَةٍ وَرِيَاءٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))(۱)

دوسروں کو تکلیف دے کر اپنا مفاد حاصل کرنا

حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کے ذریعہ کوئی لقمہ کھائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کی حق تلفی کر کے یا کسی مسلمان کو تکلیف پہنچا کر یا کسی مسلمان کو بدنام کر کے اپنا کوئی مفاد حاصل کرے، جیسے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی معیشت کا دارومدار اس پر ہے کہ دوسروں کو تکلیف پہنچا کر اپنے کھانے کا سامان کرتے ہیں، مثلاً رشوت لے کر کھانا کھایا، اب اس نے درحقیقت ایک مسلمان کو ناحق تکلیف پہنچا کر کھانا کھایا۔ اسی طرح اگر کسی کو دھوکہ دے کر اس سے پیسے حاصل کر لیے تو اس نے بھی ایک مسلمان کو تکلیف پہنچا کر کھانا کھایا۔

اسی طرح اگر کسی مسلمان کو بدنام کر کے پیسے حاصل کر لیے، جیسے آج کل نشر و اشاعت اور پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے نشر و اشاعت کے ذریعہ لوگوں کی بلیک میلنگ کو اپنا پیشہ اور ذریعہ آمدنی بنا رکھا ہے، اب ایسا شخص دوسرے کو بدنام کر کے پیسے حاصل کرتا ہے اور کھانا کھاتا ہے۔ یہ تمام صورتیں اس حدیث کے مفہوم کے اندر داخل ہیں کہ جو شخص کسی مسلمان کو تکلیف پہنچا کر

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/ ۱۴۸ تا ۱۶۷)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في الغيبة، رقم: ۴۲۳۷، مسند أحمد، رقم: ۱۷۳۲۵

کھانا کھائے تو جتنا کھانا اس نے اس طریقے سے حاصل کرکے کھایا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اس کھانے کے وزن کے برابر جہنم کے انگارے کھلائیں گے۔

دوسروں کو تکلیف دے کر لباس یا شہرت حاصل کرنا

اسی طرح جو شخص کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچا کر اور اس کی حق تلفی کرکے پیسے کمائے گا اور پھر ان پیسوں سے لباس بنائے گا تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کا اتنا ہی لباس پہنائیں گے یعنی آگ کے انگاروں کا لباس پہنائیں گے۔

اسی طرح جو شخص دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچا کر شہرت کے مقام تک پہنچے، جیسے بعض لوگ دوسروں کی برائی کرکے اپنی اچھائی ثابت کرتے ہیں، چنانچہ الیکشن کے دوران لوگ یہ کام کرتے ہیں کہ انتخابی جلسوں میں دوسروں کی خرابی بیان کرکے اپنی اچھائی بیان کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بدنامی کے مقام پر کھڑا کریں گے۔ یہاں دنیا میں تو اس نے نیک شہرت حاصل کرلی، لیکن اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ وہاں اس کو بری شہرت عطا فرمائیں گے، اور برسرِ عام اس کو رسوا کریں گے کہ یہ وہ شخص ہے جس نے مسلمان کو تکلیف پہنچا کر شہرت کا مقام حاصل کیا تھا۔

اس حدیث سے آپ اندازہ لگائیں کہ کسی مسلمان کو تکلیف پہنچانا اور اس کے حق کو پامال کرنا کتنا خطرناک کام ہے اور یہ کتنی بری بلا ہے۔ اس لئے میں بار بار یہ عرض کرتا ہوں کہ ہر شخص اپنے برتاؤ اور اپنے طرزِ عمل میں اس بات کو مدنظر رکھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے کا حق پامال ہو جائے اور پھر قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کا حساب ہم سے لے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

دوسرے کی چیز لینا

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے کسی ساتھی یا دوست کا سامان نہ مذاق میں لے اور نہ سنجیدگی میں لے۔ (۱)

ایک چیز دوسرے کی ملکیت ہے تو آپ کے لئے یہ جائز نہیں کہ اس کی اجازت بلکہ اس کی خوشدلی کے بغیر وہ چیز استعمال کریں یا اس کو قبضہ میں لیں، نہ تو سنجیدگی میں ایسا کرنا جائز ہے اور نہ ہی مذاق میں ایسا کرنا جائز ہے، چاہے وہ دوسرا شخص تمہارا قریبی دوست اور رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس کی چیز کو اس کی اجازت اور اس کی خوشدلی کے بغیر استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول اللّٰہ، ما جاء لا یحلّ لمسلم أن یروع مسلما، رقم: ۲۰۸٦، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، من یأخذ الشیء علی المزاح، رقم: ٤۳۵۰، مسند أحمد، رقم: ۱۷۲٦۱

خوش دلی کے بغیر دوسرے کی چیز حلال نہیں

ایک اور حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ))(۱)

کسی بھی مسلمان کا کوئی مال اس کی خوشدلی کے بغیر دوسرے کے لئے حلال نہیں۔ اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے اجازت کا لفظ استعمال نہیں فرمایا بلکہ خوشدلی کا لفظ استعمال فرمایا، مثلاً آپ نے کسی شخص سے ایسی چیز مانگ لی کہ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا ہے لیکن مروّت کے دباؤ میں آکر اس نے وہ چیز دیدی اور اندر سے اس کا دل خوش نہیں ہے، اس صورت میں اگر آپ اس کی چیز استعمال کریں گے تو آپ کے لئے اس کا استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ آپ نے اس کا مال اس کی خوشدلی کے بغیر لے لیا۔

''مولویت'' بیچنے کی چیز نہیں

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے کسی استاذ یا شیخ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ کسی دکان پر کوئی چیز خریدنے گئے، اور انہوں نے اس چیز کی قیمت پوچھی، دکاندار نے قیمت بتادی، جس وقت قیمت ادا کرنے لگے تو اس وقت ایک اور صاحب وہاں پہنچ گئے جو ان کے جاننے والے تھے، وہ دکاندار ان کو نہیں جانتا تھا کہ یہ فلاں مولانا صاحب ہیں، چنانچہ ان صاحب نے دکاندار سے کہا کہ یہ فلاں مولانا صاحب ہیں، لہٰذا ان کے ساتھ رعایت کریں۔ حضرت مولانا نے فرمایا:

> ''میں اپنے مولوی ہونے کی قیمت نہیں لینا چاہتا، اس چیز کی جو اصل قیمت ہے وہی مجھ سے لے لو۔ اس لئے کہ پہلے جو قیمت تم نے بتائی تھی، اس قیمت پر تم خوشدلی سے یہ چیز دینے کے لئے تیار تھے، اب اگر دوسرے آدمی کے کہنے سے تم نے رعایت کردی، اور دل اندر سے مطمئن نہیں ہے تو اس صورت میں وہ خوشدلی سے دینا نہیں ہوگا، اور پھر میرے لئے اس چیز میں برکت نہیں ہوگی اور اس کا لینا بھی میرے لئے حلال نہیں ہوگا، لہٰذا جتنی قیمت تم نے لگائی ہے اتنی قیمت لے لو''

اس واقعہ سے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ''یہ ''مولویت'' بیچنے کی چیز نہیں'' کہ بازار میں اس کو

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، رقم: ۳۰۱۲، مسند أحمد، حديث عم أبي حرة الرقاشي عن عمه، رقم: ۱۹۷۷٤

بیچا جائے کہ لوگ اس کی وجہ سے اشیاء کی قیمت کم کردیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت

بلکہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جن کے ہم سب مقلد ہیں، اپنے شاگرد حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو یہ وصیت فرمائی:

''جب تم کوئی چیز خریدو یا کرایہ پر لو تو جتنا کرایہ اور جتنی قیمت عام لوگ دیتے ہیں، تم اس سے کچھ زیادہ دیدو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے کم دینے کی وجہ سے علم اور دین کی بے عزتی اور بے توقیری ہو''

جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے احتیاط کا یہ مقام عطا فرمایا ہے وہ اس حد تک رعایت فرماتے ہیں کہ دوسرے کی چیز کہیں اس کی خوشدلی کے بغیر ہمارے پاس نہ آجائے۔ مثلاً آپ نے کسی سے کوئی چیز مانگ لی تو مانگنے سے پہلے ذرا یہ سوچو کہ اگر تم سے کوئی دوسرا شخص یہ چیز مانگتا تو کیا تم خوشدلی سے اس کو دینے پر راضی ہوجاتے؟ اگر تم خوشدلی سے راضی نہ ہوتے تو پھر وہ چیز دوسرے سے بھی مت مانگو۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ مروّت کے دباؤ میں آکر وہ شخص تمہیں وہ چیز دیدے لیکن اس کا دل اندر سے راضی نہ ہو، اور اس کے نتیجے میں تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق بن جاؤ کہ کسی مسلمان کا مال اس کی خوشدلی کے بغیر حلال نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احتیاط کا ایک واقعہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا عالی مقام تھا کہ آپ نے اس حد تک احتیاط فرمائی کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جو محل جنت میں بنایا ہے، وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور وہ محل اتنا شاندار تھا کہ میرا دل چاہا کہ میں اس محل کے اندر چلا جاؤں، لیکن جب میں نے اندر جانے کا ارادہ کیا تو مجھے تمہاری غیرت یاد آگئی، مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بڑی غیرت بخشی ہے، اگر کوئی دوسرا شخص تمہارے گھر کے اندر اجازت کے بغیر داخل ہو تو تمہیں غیرت آتی ہے، اس لئے میں نے یہ سوچا کہ تمہارے بغیر اس میں داخل نہیں ہونا چاہئے، لہٰذا میں داخل نہ ہو۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو پڑے اور عرض کیا:

''أَوَ عَلَيْكَ أَغَارُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟''

''یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کیا میں آپ سے غیرت کروں گا؟''(۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب مناقب عمر بن (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اُمت کے لئے سبق

اب آپ اندازہ لگائیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جانتے ہیں کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسا انسان وہ اپنی جان، اپنا مال، اپنی عزت و آبرو، اپنا سب کچھ آپ پر قربان کرنے کے لئے تیار ہیں، ان کے پاس اگر کوئی بڑی سے بڑی نعمت ہو اور وہ نعمت جناب رسول اللہ ﷺ کے استعمال میں آجائے تو وہ اس کو اپنے لئے باعث فخر سمجھیں گے، لیکن اس کے باوجود آپ ان کے محل میں داخل نہیں ہوئے، جبکہ وہ جگہ بھی جنت کی جگہ تھی جو تکلیف کی جگہ نہیں ہوتی۔ لیکن علماء کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے درحقیقت سرکار دو عالم ﷺ اُمت کو یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ دیکھو! میں بھی اپنے ایسے فداکار اور جانثار صحابی کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہوا، تو تم لوگوں کے لئے عام حالات میں دوسروں کی چیز اس کی خوشدلی اور اجازت کے بغیر استعمال کرنا کیسے جائز ہوگا؟

سلام کے جواب کے لئے تیمّم کرنا

اللہ تعالیٰ ہمارے محدثین عظام اور فقہاء کرام رحمہم اللہ کی قبروں کو نور سے بھر دے، آمین۔ یہ حضرات ہمارے لئے عجیب ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ چنانچہ ایک صحابی نے ایک حدیث بیان فرمائی کہ حضور اقدس ﷺ ایک مرتبہ ایک راستے میں گزر رہے تھے، ایک صحابی نے آپ کو دیکھ کر آپ کو سلام کیا۔ یہ ابتداء اسلام کا زمانہ تھا، اور اس وقت اللہ تعالیٰ کا نام وضو کے بغیر لینا مکروہ تھا، اور "سلام" بھی اللہ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے، اس وقت حضور اقدس ﷺ وضو سے نہیں تھے، اب اگر اس حالت میں "وعلیکم السلام" فرماتے تو اللہ تعالیٰ کا نام وضو کے بغیر لینا ہو جاتا، اس لئے آپ ﷺ نے وضو کے بغیر نام لینے سے بچنے کے لئے یہ کیا کہ قریب میں جو مکان تھا، اس کی دیوار سے تیمم فرمایا اور پھر آپ نے "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہہ کر جواب دیا۔ (۱)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) الخطاب أبي حفص القرشي العدوي، رقم: ۳۴۰۳، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر، رقم: ۴۴۰۸، مسند أحمد، رقم: ۱۳۸۰۱

(۱) صحيح البخاري، كتاب التيمم، باب التيمم في الحضر إذا لم يجد الماء وخاف فوت الصلاة، رقم: ۳۲۵، صحيح مسلم، كتاب الحيض، باب التيمم، رقم: ۵۵۴، سنن النسائي، كتاب الطهارة، باب التيمم في الحضر، رقم: ۳۰۹، سنن أبي داود، كتاب الطهارة، باب التيمم في الحضر، رقم: ۲۷۸، مسند أحمد، رقم: ۱۶۸۸۳۔

علماء کا احادیث سے مسائل کا نکالنا

ان صحابی نے یہ حدیث بیان فرمادی، لیکن فقہاء کرام رحمہم اللہ کا معاملہ ایسا ہے کہ ایک ایک حدیث سے اُمت کے لئے کیا کیا ہدایات نکل رہی ہیں، ان کے نکالنے میں لگ جاتے ہیں۔ احادیث سے احکام نکالنے کا جب میں تصور کرتا ہوں تو میرے سامنے یہ منظر آجاتا ہے کہ جب کوئی ہوائی جہاز کسی ایئرپورٹ پر اُترتا ہے تو جیسے ہی وہ اُترتا ہے فوراً تمام لوگ اپنی اپنی ڈیوٹیاں انجام دینا شروع کردیتے ہیں، کوئی اس کی صفائی کررہا ہے، کوئی اس میں پٹرول بھررہا ہے، کوئی مسافروں کو اُتاررہا ہے، کوئی کھانا چڑھا رہا ہے، سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب سرکار دو عالم ﷺ کی کوئی حدیث سامنے آتی ہے تو اُمت کے علماء بھی مختلف جہتوں سے اس حدیث پر کام کرنے میں لگ جاتے ہیں، کوئی اس حدیث کی سند کی چھان بین کررہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے یا نہیں؟ کوئی راویوں کی جانچ پڑتال کررہا ہے، کوئی اس حدیث سے نکلنے والے احکام بتارہا ہے کہ اس حدیث سے کیا کیا احکام نکل رہے ہیں، کیا کیا رہنمائی اس سے حاصل ہورہی ہے۔ تو حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کا کام یہ ہے کہ جب کوئی حدیث ان کے سامنے آتی ہے تو اس حدیث کے ایک ایک جز کی بال کی کھال نکال کر احکام مستنبط فرماتے ہیں۔

بلبل والی حدیث سے ۱۱۰ مسائل کا استنباط

یاد آیا کہ شمائل ترمذی میں حدیث ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ایک چھوٹے بھائی تھے، جو بچے تھے، انہوں نے ایک بلبل پال رکھا تھا، وہ بلبل مرگیا، حضور اقدس ﷺ ایک دن ان کے پاس تشریف لے گئے تو اس بچے سے آپ نے پوچھا:

((يَا أَبَا عُمَيْرٍ مَا فَعَلَ النُّغَيْرُ؟))

''اے ابوعمیر! تم نے وہ جو بلبل پال رکھا تھا، اس کا کیا ہوا؟''(۱)

صرف ایک اس حدیث سے حضرات فقہاء کرام نے ایک سو دس ۱۱۰ فقہی مسائل نکالے ہیں۔ اور ایک محدث نے اس ایک حدیث کی تشریح اور اس سے نکلنے والے احکام پر مستقل کتاب لکھی ہے۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب الإنبساط الى الناس......، رقم: ٥٦٦٤، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ما جاء في الصلاة على البسط، رقم: ٣٠٥، سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب ما جاء في الرجل يتكنى وليس له ولد، رقم: ٤٣١٨، سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب المزاح، رقم: ٣٧١٠، مسند أحمد، رقم: ١٠٦٧

سلام کے جواب کے لئے تیمّم کرنا جائز ہے

بہرحال، ان صحابی کے سلام کے جواب کے لئے آپ نے پہلے تیمم فرمایا پھر سلام کا جواب دیا۔ اس حدیث سے بھی فقہاء کرام نے بہت سے مسائل نکالے ہیں۔ چنانچہ اس حدیث سے فقہاء رحمہم اللہ نے ایک مسئلہ یہ نکالا ہے کہ جس کام کے لئے وضو کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے تو اس کام کے لئے وضو کے بجائے تیمم کرنا جائز ہے۔ مثلاً دعا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وضو کو ضروری اور واجب قرار نہیں دیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دروازہ کھٹکھٹانے اور دعا کرنے کو آسان کر دیا کہ اس کے لئے وضو کی شرط نہیں رکھی بلکہ پاکی کی شرط بھی نہیں رکھی، لہٰذا اگر کوئی شخص جنابت اور ناپاکی کی حالت میں بھی دعا کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ لیکن بہتر اور مستحب یہ ہے کہ آدمی دعا کرتے وقت باوضو ہو اور اگر وضو کا موقع نہ ہو تو تیمم کرلے، کیونکہ تیمم کرکے دعا کرنا بے وضو دعا کرنے سے بہتر ہے۔ اگرچہ اس تیمم سے نماز پڑھنا اور ایسے کام کرنا جائز نہیں ہوگا جن کے لئے وضو کرنا واجب ہے، لیکن اس تیمم سے دعا کرسکتا ہے۔

ذکر کے لئے تیمّم کرنا

مثلاً کوئی شخص ذکر کرنا چاہتا ہے یا تسبیح پڑھنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنا نام لینا اتنا آسان فرمادیا ہے کہ اس کے لئے وضو کی شرط نہیں، البتہ باوضو ہو کر ذکر کرنا مستحب ہے، لہٰذا اگر وضو کرنے کا موقع نہیں ہے اور ذکر کرنا چاہتا ہے تو کم از کم یہ کرے کہ تیمم کرکے ذکر کرلے، کیونکہ تیمم کرکے ذکر کرنا بے وضو ذکر کرنے سے بہتر ہے۔ البتہ اس تیمم سے کسی قسم کی نماز پڑھنا جائز نہیں ہوگا۔

دوسرے کی دیوار سے تیمّم کرنا

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس حدیث سے دوسرا مسئلہ یہ نکالا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دیوار سے تیمم فرمایا اور وہ کسی دوسرے شخص کے گھر کی دیوار تھی، تو اب سوال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے شخص کے گھر کی دیوار کو اس کی اجازت کے بغیر تیمم کے لئے کیسے استعمال فرمایا؟ اس لئے کہ دوسرے کی چیز اس کی اجازت اور اس کی خوشدلی کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ فقہاء کرام نے یہ سوال اُٹھایا، وہ بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اُٹھایا کہ آپ نے وہ دیوار کس طرح استعمال فرمائی۔

پھر فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس کا جواب بھی خود دیا، کہ بات دراصل یہ تھی کہ مکان کے باہر کی دیوار سے تیمم کرنے کی صورت میں یہ بات سو فیصد یقینی تھی کہ کوئی بھی آپ کو اس عمل سے منع نہ کرتا،

اس لئے آپ کے لئے اس دیوار سے تیمم کرنا جائز تھا۔ لہٰذا جہاں اس بات کا سو فیصد مکمل یقین ہو کہ دوسرا شخص نہ صرف یہ کہ اس کو استعمال کرنے کی اجازت دے گا بلکہ وہ خوش ہوگا تو اس صورت میں اس چیز کا استعمال کر لینا جائز ہے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ فقہاء کرام نے کتنی باریک بات کو پکڑ لیا۔

کسی قوم کی کوڑی کو استعمال کرنا

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے یہی سوال ایک اور حدیث پر بھی اُٹھایا ہے، وہ حدیث شریف یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جارہے تھے، آپ کو پیشاب کرنے کی حاجت ہوئی، ایک جگہ پر کسی قوم کی ''کوڑی'' تھی، جہاں لوگ اپنا کچرا ڈالتے تھے، اس ''کوڑی'' پر آپ نے پیشاب کیا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

''أتى سُبَاطَة قَوْمٍ''

''کسی قوم کے کوڑا ڈالنے کی جگہ پر آپ پہنچے''(۱)

اب فقہاء نے اس پر سوال اُٹھایا ہے کہ وہ کوڑا ڈالنے کی جگہ کسی قوم کی ملکیت تھی تو آپ نے اس کو ان کی اجازت کے بغیر کیسے استعمال فرمالیا؟

پھر خود ہی فقہاء نے اس کا جواب بھی دیا کہ دراصل وہ عام استعمال کی جگہ تھی اور اسی مقصد کے لئے وہ جگہ چھوڑی گئی تھی، لہٰذا کسی شخص کی ملکیت میں کوئی خلل ڈالنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

میزبان کے گھر کی چیز استعمال کرنا

اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ شریعت میں کسی دوسرے شخص کی چیز کو استعمال کرنے کے بارے میں کتنی حساسیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہم دوسرے شخص کے گھر مہمان بن کر گئے۔ اب اگر اس کے گھر کی کوئی چیز آپ کو استعمال کرنی ہے تو استعمال کرنے سے پہلے ذرا یہ سوچو کہ میرے لئے اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ سوچو کہ میرے استعمال کرنے سے میزبان خوش ہوگا یا اس کے دل میں تنگی پیدا ہوگی؟ اگر اس کے دل میں تنگی پیدا ہونے کا ذرا بھی اندیشہ ہو تو اس صورت میں اس چیز کو آپ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب البول قائما وقاعدا، رقم: ۲۱۷، صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب المسح علی الخفین، رقم: ۴۰۲، سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب الرخصة فی ذلك، رقم: ۱۳، سنن النسائی، کتاب الطهارة، باب الرخصة فی ترك ذلك، رقم: ۱۸، سنن أبی داود، کتاب الطهارة، باب البول قائما، رقم: ۲۱، سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب ما جاء فی البول قائما، رقم: ۳۰۱، مسند أحمد، رقم: ۲۲۱۵۷۔

کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں۔

ہمارے معاشرے میں اس بارے میں بہت بے احتیاطی پائی جاتی ہے، چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ دوست کے گھر میں چلے گئے اور سوچا کہ یہ تو ہمارا بے تکلف دوست ہے، اب دوستی اور بے تکلفی کی مد میں اس کو لوٹنا شروع کر دیا اور اس کی چیزوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ جائز نہیں، کیونکہ حضور اقدس ﷺ نے صاف صاف فرمادیا کہ مذاق میں بھی دوسرے کی چیز اٹھا کر استعمال کرنا جائز نہیں، تو پھر سنجیدگی میں کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ ہم بے تکلفی کی آڑ میں کہاں کہاں حضور اقدس ﷺ کے اس حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

بیٹے کے کمرے میں داخل ہونے کے لئے اجازت

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ساری عمر یہ معمول ہم نے دیکھا کہ جب کبھی آپ کسی کام سے اپنی اولاد کے کمرے میں داخل ہونے کا ارادہ فرماتے تو داخل ہونے سے پہلے اجازت لیتے، حالانکہ وہ کمرہ ہماری ملکیت نہیں ہوتا تھا، انہی کی ملکیت ہوتا تھا، اس کے باوجود پہلے اجازت لیتے کہ اندر آجائیں۔ اور اگر کبھی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو وہ چیز استعمال کرنے کی ضرورت پیش آتی جو ہمارے استعمال میں ہے، تو ہمیشہ پہلے پوچھ لیتے کہ یہ تمہاری چیز میں استعمال کرلوں؟ اب آپ اندازہ لگائیں کہ ایک باپ اپنے بیٹے سے پوچھ رہا ہے کہ میں تمہاری چیز استعمال کرلوں؟ حالانکہ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((أَنتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ))

''تم خود اور تمہارا مال سب تمہارے باپ کا ہے''(۱)

لیکن اس کے باوجود اس درجہ احتیاط تھی کہ بیٹے سے پوچھ کر اس کی چیز استعمال فرما رہے ہیں، تو جب اپنی اولاد کی چیز استعمال کرنے میں یہ احتیاط ہونی چاہئے تو جن کے ساتھ یہ رشتہ نہیں ہے، ان کی چیزوں کو ان کی اجازت کے بغیر استعمال کرنا کتنی سنگین بات ہے۔

اطلاع کے بغیر دوسرے کے گھر جانا

یہ تمام چیزیں ہم نے اپنے دین سے خارج کر دی ہیں، بس آج کل تو عبادات کا اور نماز روزے کا نام دین سمجھ لیا ہے، اور اس سے آگے جو معاملات ہیں ان کو ہم نے دین سے خارج کر دیا

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب ما للرجل من مال ولده، رقم: ۲۲۸۲، مسند أحمد، رقم: ٦٦٠٨

ہے۔ مثلاً کسی دوسرے کے گھر میں اطلاع کے بغیر کھانے کے وقت پہنچ جانا دین کے خلاف ہے۔ جیسے آج کل ہوتا ہے کہ پیر صاحب اپنے مریدوں کا لشکر لے کر کسی مرید پر حملہ آور ہوگئے۔ اور پیر صاحب کے ذہن میں یہ ہے کہ یہ تو ہمارا مرید ہے، لہٰذا اس کو تو ہر حال میں ہماری خاطر تواضع کرنی ہی کرنی ہے۔ یہ میں آپ کو آنکھوں دیکھا واقعہ بتارہا ہوں۔ اب وہ مرید بیچارہ پریشان کہ عین وقت پر میں کیا انتظام کروں، اتنی بڑی فوج آگئی ہے اس کے لئے کہاں سے تواضع کا انتظام کروں؟ ـــــ اب دیکھئے! نمازیں بھی ہورہی ہیں، تہجد، اشراق، چاشت، ذکرواذکار، سب عبادات ہورہی ہیں، اور پیر صاحب بنے ہوئے ہیں۔ لیکن بغیر اطلاع کے مرید کے گھر پہنچ گئے۔ یاد رکھئے! یہ اس حدیث کے اندر داخل ہے جس میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ))(۱)

لیکن پیر صاحب کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس سے مرید کو تکلیف ہورہی ہے یا پریشانی ہورہی ہے، یا اس کا مال اس کی خوشدلی کے بغیر حاصل کیا جارہا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں یہ باتیں پھیل گئی ہیں اور اس کو دین کا حصہ ہی نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح فہم عطا فرمائے اور ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھنے کا ذوق عطا فرمائے کہ جس چیز کا جو مقام ہے اسی کے مطابق اس پر عمل ہو۔

خوش دلی کے بغیر چندہ لینا

اسی طرح آج کل چندہ کا مسئلہ ہے، یہ چندہ خواہ کسی بھی نیک مقصد کے لئے ہو، چاہے مدرسے کے لئے ہو، چاہے مسجد کے لئے ہو، یا جہاد کے لئے ہو، یا تبلیغ کے لئے ہو، لیکن اگر چندہ کرتے وقت کسی موقع پر ذرا سا بھی دباؤ کا عنصر آجائے گا تو وہ چندہ حرام ہوجائے گا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اس موضوع پر مستقل رسالہ ہے، جس میں انہوں نے فرمایا کہ آج کل جو چندہ کا طریقہ ہے کہ بڑی شخصیات اپنی شخصیت کا دباؤ ڈال کر چندہ وصول کرتے ہیں، کیونکہ اگر مدرسے کے کسی معمولی سفیر کو چندہ کے لئے بھیجا جائے گا تو چندہ کم وصول ہوگا، لہٰذا کسی بڑے اور صاحبِ حیثیت کو چندہ کے لئے بھیجا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن کے پاس وہ صاحبِ حیثیت چندہ کے لئے پہنچے گا تو وہ یہ سوچے گا کہ اتنا بڑا آدمی میرے پاس آیا ہے تو اب تھوڑے پیسے کیا دوں، چنانچہ وہ زیادہ پیسے دے گا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ درحقیقت شخصیت کا باؤ ڈالنا ہے، اور

(۱) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ، رقم: ۳۰۱۲، مسند أحمد، حدیث عم أبی حرة الرقاشی عن عمه، رقم: ۱۹۷۷٤، حدیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''کسی انسان کا مال دوسرے کے لئے اس کی دلی خوشی کے بغیر جائز نہیں''

شخصیت کا دباؤ ڈال کر جو چندہ وصول کیا جائے گا وہ خوشدلی کا چندہ نہیں ہوگا، اور جب وہ چندہ خوشد... کا نہیں ہے تو وہ حرام ہے اور اس حدیث کے تحت داخل ہے جس میں آپ نے فرمایا:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ))(۱)

عام مجمع میں چندہ کرنا

اسی طرح عام مجمع کے اندر چندہ کا اعلان کر کے وہیں چندہ جمع کیا جارہا ہے، اب جو صاحب حیثیت اس مجمع کے اندر بیٹھا ہے، وہ سوچ رہا ہے کہ سب لوگ تو چندہ دے رہے ہیں، اگر میں چندہ نہیں دوں گا تو میری ناک کٹ جائے گی، اور اگر تھوڑا چندہ دوں گا تو بھی بے عزتی ہو جائے گی، لہٰذا مجھے زیادہ دینا چاہئے۔ اب اس دباؤ میں آکر اس نے زیادہ چندہ دیدیا۔

یاد رکھئے! اس دباؤ میں آکر جو چندہ دے گا وہ خوشدلی کا چندہ نہیں ہے اور اس حدیث کے تحت داخل ہے جس میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ))(۱)

اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے متعلقین کے لئے عام معمول یہ تھا کہ عام مجمع میں چندہ کرنے کی اجازت نہیں تھی، اس لئے کہ اس میں لوگ شرما حضوری میں اور مروّت میں آکر چندہ دیدیتے ہیں جو جائز اور حلال نہیں۔

غزوۂ تبوک کے واقعہ سے اشکال اور اس کا جواب

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات میں نے ایک مرتبہ بیان کی تو ایک صاحب نے کہا کہ حضور اقدس ﷺ نے بھی غزوۂ تبوک کے موقع پر مجمع میں چندہ کیا تھا۔ جب غزوۂ تبوک میں ضرورت پیش آئی تو آپ نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ اس وقت جہاد کے لئے سامان کی شدید ضرورت ہے، جو شخص بھی اس میں خرچ کرے گا اس کو یہ ثواب ملے گا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ اعلان سن کر گھر کا سارا مال لے کر آگئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس ﷺ نے بھی مجمع میں چندہ کا اعلان فرمایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ اسی وقت اور اسی جگہ پر چندہ

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، رقم: ۳۰۱۲، مسند أحمد، حديث عم أبي حرة الرقاشي عن عمه، رقم: ۱۹۷۷٤، حدیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''کسی انسان کا مال دوسرے کے لئے اس کی دلی خوشی کے بغیر جائز نہیں''

کرو، بلکہ آپ نے یہ اعلان فرمادیا تھا کہ اتنی ضرورت ہے، جو شخص بھی اپنی سہولت کے مطابق جس وقت جتنا چاہے لاکر دیدے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بعد میں اشیاء لالاکر جمع کراتے رہے۔ یہ اعلان نہیں تھا کہ ابھی اور یہیں جمع کرو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کو ہم اپنے حالات پر کہاں قیاس کرسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق ایسے مصفّٰی مزکّی اور مجلّٰی فرمادیئے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو محض دکھاوے کی خاطر چندہ دے۔ اللہ کے لئے چندہ دینا ہوتا دیتے، نہ دینا ہوتا تو نہ دیتے۔ ہمارے معاشرے کے لوگ دباؤ میں آجاتے ہیں، اور اس دباؤ کے نتیجے میں شرماشرمی میں دینے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا آج کل کے حالات کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عام مجمع میں اس طرح چندہ کرنا جس طرح عام دستور ہے، یہ جائز نہیں، کیونکہ ایسے چندے میں خوشدلی کا عنصر مفقود ہوتا ہے۔

چندہ کرنے کا صحیح طریقہ

چندہ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو متوجہ کردیں کہ یہ ایک ضرورت ہے اور دین کا صحیح مصرف ہے اور اس میں دینے میں ثواب ہے۔ لہٰذا جو چاہے اپنی خوشی کے ساتھ جب چاہے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اور ثواب کے حصول کے لئے چندہ دیدے۔ یہ تمام احکام اسی حدیث سے نکل رہے ہیں کہ کوئی شخص دوسرے کا مال اور دوسرے کا سامان نہ تو سنجیدگی میں لے اور نہ مذاق میں لے۔

عاریت کی چیز جلدی واپس نہ کرنا

پھر حدیث میں ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((فَإِذَا أَخَذَ أَحَدُكُمْ عَصَا صَاحِبِهِ فَلْيَرُدَّهَا إِلَيْهِ))(۱)

یعنی اگر تم نے کسی وقت دوسرے کی لاٹھی بھی لے لی ہے تو اس کو واپس کردے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے کوئی چیز عاریتاً استعمال کے لئے لے لی ہے اور اس نے خوشدلی سے تمہیں دیدی ہے، خوشدلی سے اس نے وہ چیز دے کر کوئی جرم نہیں کیا، لہٰذا جب تمہاری وہ ضرورت پوری ہوجائے جس

(۱) سنن الترمذي، كتاب الفتن عن رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، باب ما جاء لا يحلّ لمسلم أن يروع مسلما، رقم: ٢٠٨٦، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب من يأخذ الشيء على المزاح، رقم: ٤٣٥٠، مسند أحمد، رقم: ١٧٢٦١

ضرورت کے لئے تم نے وہ چیز لی تھی تو پھر اس چیز کو جلد از جلد واپس لوٹاؤ۔ اس بارے میں بھی ہمارے یہاں کوتاہیاں اور غفلتیں ہوتی ہیں۔ ایک چیز کسی ضرورت کی وجہ سے کسی سے لے لی تھی، اب وہ گھر میں پڑی ہے، واپس کرنے کی فکر نہیں۔ ارے بھائی! جب تمہاری ضرورت پوری ہوگئی تو اب واپس کرو۔ اب جس شخص کی وہ چیز ہے ہوسکتا ہے کہ اس کو استعمال کرنے کی ضرورت ہو، لیکن وہ مانگتے ہوئے شرماتا ہو کہ اس کے پاس جا کر وہ چیز کیا مانگوں۔ اب اگر تم اس چیز کو استعمال کرو گے تو تم اس کی خوشدلی کے بغیر استعمال کرو گے، لہٰذا یہ استعمال کرنا تمہارے لئے حرام ہے۔

کتاب لے کر واپس نہ کرنا

اسی طرح ہمارے معاشرے میں یہ مسئلہ باقاعدہ گھڑ لیا گیا ہے کہ کتاب کی چوری، یہ کوئی چوری نہیں ہوتی، یعنی اگر کسی دوسرے سے کتاب پڑھنے کے لئے لے لی تو اب اس کتاب کو واپس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لہٰذا مطالعے کے بعد کتاب گھر میں پڑی ہے، اس کی واپسی کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ جبکہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ جب تم نے دوسرے کی کوئی چیز لی ہو تو اس کو واپس کرنے کی فکر کرو اور جلد از جلد اس کو اصل مالک تک واپس پہنچاؤ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضور اقدس ﷺ کے ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

دوسروں کے لئے پسندیدگی کا معیار ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"أَمَّا بَعْدُ!

فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((وَأَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ))(۱)

ایک حدیث کا بیان کئی روز سے چل رہا ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے پانچ نصیحتیں فرمائیں، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ تاکید فرمائی کہ وہ خود ان باتوں کو سمجھیں اور عمل کریں، اور دوسروں تک بھی اس کو پہنچائیں۔ ان میں سے تین نصیحتوں کا بیان گذشتہ دنوں میں ہوا، اللہ تعالیٰ ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو

حضور اقدس ﷺ نے چوتھی نصیحت یہ فرمائی:

((وَأَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ))

"دوسروں کے لئے وہی بات پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو"

ان نصیحتوں میں سے ایک ایک نصیحت اتنی جامع، اتنی مانع اور ہمہ گیر ہے کہ اگر انسان کو ان پر عمل کی توفیق ہو جائے تو اس کی ساری زندگی سنور جائے۔ یہ نصیحت بھی انہی میں سے ہے کہ دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ نبی کریم ﷺ نے یہ ایک ایسا معیار عطا فرما دیا کہ اس کے ذریعے معاشرت کے جتنے اسلامی احکام ہیں، وہ سب اس ایک جملے کے اندر آجاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے وہ عقائد اور عبادات کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق معاملات سے بھی ہے، معاشرت سے بھی ہے، اخلاق سے بھی ہے، اور دین کا ایک بہت بڑا باب "معاشرت" ہے، یعنی آپس میں ملنے جلنے میں اور آپس میں رہنے سہنے میں کیا

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/ ۱۶۷۔۱۸۲) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس، رقم: ۲۲۲۷، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الورع والتقوى، رقم: ۴۲۰۷، مسند أحمد، رقم: ۷۷۴۸

آداب ہونے چاہئیں؟ کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزاری جائے؟ یہ معاشرت کا باب ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خاص طور پر اپنی مجددانہ تعلیمات میں "معاشرت" کو بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔

مجھے اس سے نفرت ہو جاتی ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں تک فرمایا کہ میرے مریدین اور متعلقین میں سے کسی کے بارے میں جب مجھے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے ذکر، تسبیح یا نوافل کے معمولات میں کوتاہی کی ہے تو اس سے رنج ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اگر مجھے یہ پتہ چلے کہ کسی نے معاشرتی احکام میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی کی ہے تو اس سے مجھے نفرت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ معاشرتی احکام کا تعلق حقوق العباد سے ہے، جن کے بارے میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان میں کوتاہی کا ارتکاب کر لے تو یہ گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا، جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، اس لئے معاشرتی احکام کی خلاف ورزی بڑا سنگین معاملہ ہے۔

مجھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے

بہر حال! معاشرتی احکام کا ایک بہت بڑا باب ہے، چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "آدابِ معاشرت" کے نام سے ایک پورا رسالہ لکھا ہے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جو لوگ تربیت کے لئے تھانہ بھون جایا کرتے تھے، ان کے لئے معاشرت کے احکام پر پابندی کا بہت اہتمام ہوتا تھا، اسی لئے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کو صوفی بننا ہو تو کہیں اور چلا جائے، (صوفی سے مراد جس کو عرف عام میں "صوفی" کہتے ہیں) اور اگر کسی کو "آدمی" بننا ہو تو وہ یہاں آ جائے، کیونکہ وہاں اس بات کو دیکھا جاتا تھا کہ اس کے نشست و برخاست کے انداز میں، اس کے ملنے جلنے کے طریقہ کار میں اسلامی احکام جھلک رہے ہیں یا نہیں؟ یا ان کی خلاف ورزی ہو رہی ہے؟ بہر حال! معاشرت دین کے احکام کا عظیم باب ہے۔ اب اگر معاشرت کے سارے احکام کا خلاصہ نکالنا چاہیں تو یہ حدیث:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ))(۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ، رقم: ۹، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان تفاضل الاسلام وأی أمورہ أفضل، رقم: ۵۸، سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول اللہ، باب ما جاء فی أن المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ، رقم: ۲۵۵۱، سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعہ، باب صفۃ المسلم، رقم: ۴۹۱۰، سنن أبی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی الہجرۃ ہل انقطعت، رقم: ۲۱۲۲

اس کا خلاصہ ہے، یعنی تمہاری ذات سے دوسرے مسلمان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے، نہ جسمانی تکلیف پہنچے، نہ روحانی تکلیف پہنچے، نہ نفسیاتی تکلیف پہنچے، نہ ذہنی تکلیف پہنچے، وہ ہے مسلمان، اور اس کی ذات کسی بھی طرح سے دوسروں کے لئے تکلیف کا سبب نہ بنے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ "معاشرت" کے سارے احکام اسی حدیث کے گرد گھومتے ہیں کہ آدمی اس کا اہتمام کرے کہ مجھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

ہر کام کو اس معیار پر تو لو

آدمی جو بھی کام کرے اس میں اس بات کا لحاظ کرے کہ میرے اس کام سے دوسرے کو تکلیف تو نہیں پہنچ رہی ہے؟ اگر اس کا لحاظ کرلیا تو سارے معاشرتی احکام کی پابندی ہوگئی، اور سارے حقوق العباد ادا ہوگئے، لیکن اس کا پتہ کیسے لگایا جائے کہ مجھ سے دوسرے کو تکلیف پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ اس کا معیار یہ حدیث ہے:

((أَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ))

دوسروں کے لئے وہی بات پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ ہر چیز کو اس معیار پر تول کر دیکھو تو پتہ چلے گا کہ دوسرے کو تکلیف پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ اگر دوسرے کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس کام کو چھوڑ دو۔

کھانے کے بعد پان کھانا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں تو اس قسم کا تصوف ہے، اگر مراقبے اور مجاہدے والا تصوف چاہتے ہو تو کہیں اور چلے جاؤ، ہمارے یہاں تو اسی کی تربیت دی جاتی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے لئے باعثِ تکلیف نہ بنے۔

میں نے یہ واقعہ آپ حضرات کو پہلے بھی سنایا تھا کہ میرے بھائی جناب محمد ذکی کیفی مرحوم، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ جب یہ بچے تھے تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ حضرت والا بچوں سے بہت پیار کیا کرتے تھے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہر سال رمضان تھانہ بھون میں بچوں کے ساتھ گزارتے تھے۔ بچے چونکہ قواعد وضوابط سے مستثنیٰ ہوتے ہیں، اس لئے بڑے بڑے لوگ تو خانقاہ میں قیام کے دوران اس بات سے ڈرتے تھے کہ کوئی بات حضرت والا کے مزاج کے خلاف نہ ہو جائے، لیکن بچے آزادی سے حضرت والا کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ حضرت والا کا معمول یہ تھا کہ

کھانا کھانے کے بعد چونا کتھا اور چھالیہ کے بغیر پان کا پتہ چبالیا کرتے تھے، اس لئے کہ یہ پتہ ہاضم ہوتا ہے، اور نقصان سے خالی ہے۔ میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی مرحوم کے ذمے یہ کام سپرد تھا کہ تم کھانے کے بعد گھر سے پان لایا کرو، اسی وجہ سے حضرت والا نے ان کا نام "پانی" رکھ دیا تھا۔

پڑھنے والے کو تکلیف نہ ہو

جب بھائی صاحب مرحوم نے لکھنا سیکھا تو حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ تم پہلا خط حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھو، چنانچہ والد صاحب نے ان سے خط لکھوا کر حضرت کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جو جواب دیا، اس میں علم کا ایک باب کھول دیا، جواب میں حضرت نے فرمایا:

> "تمہارا خط ملا، بڑا دل خوش ہوا کہ تم نے لکھنا سیکھ لیا، اب تم اپنے خط کو اور زیادہ اچھا بنانے کی کوشش کرو، اور نیت یہ کرو کہ پڑھنے والے کو تکلیف نہ ہو، دیکھو میں تمہیں ابھی سے "صوفی" بنا رہا ہوں"

جو بچہ ابھی لکھنا سیکھ رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ٹیڑھا سیدھا لکھے گا، اس وقت اس بچے سے یہ فرمارہے ہیں کہ خط کو درست بناؤ، تاکہ پڑھنے والے کو تکلیف نہ ہو، اور ساتھ میں یہ بھی فرمادیا کہ دیکھو! میں تمہیں ابھی سے "صوفی" بنا رہا ہوں۔ کوئی یہ پوچھے کہ خط درست ہونے سے صوفی کا کیا تعلق؟ اس لئے ہمارے دماغ میں تو یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ جو شخص جتنا بڑا بے ڈھنگا، اتنا بڑا صوفی، جو جتنا غلیظ اور میلا کچیلا، وہ اتنا ہی بڑا صوفی، اور جس کا کوئی کام ڈھنگ کا نہ ہو، وہ اتنا ہی بڑا صوفی۔

مخلوق کی خدمت کے بغیر تصوف حاصل نہیں ہوسکتا

اس جواب کے ذریعے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتادیا کہ درحقیقت صوفی وہ ہے جو اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت کرے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو تکلیف سے بچایا جائے، اور اللہ کے بندوں کو راحت پہنچائی جائے، اس لئے حضرت نے فرمایا کہ دیکھو! میں تمہیں ابھی سے صوفی بنا رہا ہوں۔

آجکل لوگوں نے خانقاہوں میں رہنے، ریاضتیں کرنے، مجاہدے کرنے، مراقبات، کشف و کرامات کا نام "تصوف" رکھ دیا ہے، لیکن حضرت والا نے حقیقت واضح فرمادی کہ اسکا نام "تصوف" نہیں

زتسبیح و سجادہ و دلق نیست
طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

یعنی محض تسبیح پڑھ لینے، اور مصلّے پر بیٹھ جانے اور گدڑی پہن لینے کا نام تصوف نہیں، بلکہ مخلوق کی خدمت کے بغیر تصوف حاصل نہیں ہوسکتا۔ بہر حال! اصل بات یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسرے کو ادنیٰ تکلیف بھی نہ پہنچے۔

اگر میرے ساتھ یہ معاملہ ہوتا تو!

اس کا معیار جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ بتادیا کہ جب بھی کسی کے ساتھ معاملہ کرو تو اس کو اپنی جگہ پر کھڑا کرو، اور اپنے آپ کو اس کی جگہ پر کھڑا کرو، اور دیکھو کہ اگر میرے ساتھ یہ معاملہ ہوتا تو مجھ پر کیا گزرتی، میں اس سے خوش ہوتا یا ناخوش ہوتا، مجھے اس سے راحت ملتی یا تکلیف ہوتی، یہ سوچ لو، اب اگر تمہیں اس معاملے سے تکلیف ہوتی تو پھر تم وہ معاملہ دوسرے کے ساتھ نہ کرو۔ یہ جو ہم نے دو پیمانے بنالیے ہیں کہ اپنے لئے کچھ اور دوسرے کے لئے کچھ اور، اس کا راستہ حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث کے ذریعے بند فرمادیا کہ بس! ایک پیمانہ ہونا چاہئے، اپنے لئے بھی وہی پیمانہ اور دوسرے کے لئے بھی وہی پیمانہ۔

فرائض کی پرواہ نہیں، حقوق کا مطالبہ پہلے

ایک شخص کہیں ملازم ہے، یا مزدور ہے، اس کو یہ حدیث تو خوب یاد رہتی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو، یہ حدیث تو خوب یاد رہتی ہے، لیکن اس کا خیال نہیں کہ پسینہ بھی نکلا یا نہیں؟ جس کام کے لئے اسے ملازم رکھا تھا، اس نے وہ کام صحیح طور پر انجام دیا یا نہیں؟ اس کی کوئی پرواہ اور فکر نہیں۔ آج کل مختلف انجمنیں قائم ہیں، پوری دنیا میں ایسی انجمنیں بنی ہوئی ہیں، مثلاً ''انجمن تحفظ حقوقِ مزدوراں''، ''تحفظ حقوقِ ملازمین''، تحفظ حقوقِ نسواں'' وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے حق کی وصولی کا مطالبہ کر رہا ہے کہ مجھے میرا حق ملنا چاہئے، اور میرے ذمے جو دوسرے کا حق ہے، اس کا کوئی خیال نہیں۔ جو ملازم ہے، وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے میری پوری مزدوری ملنی چاہئے، لیکن میرے ذمے جو آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہے، وہ پورا وقت ملازمت میں دیتا ہوں یا نہیں؟ یا اس میں ڈنڈی مار جاتا ہوں، اس کی طرف بالکل دھیان نہیں۔ دفتر میں تاخیر سے پہنچ رہے ہیں، اور تاخیر سے پہنچنے کے بعد بھی اپنے فرائضِ منصبی ادا نہیں کر رہے ہیں، ملازمت کے اوقات کے دوران اپنے ذاتی کاموں میں مصروف ہیں، یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ جو کچھ اپنے لئے پسند کیا، وہ دوسروں کے لئے پسند نہیں کر رہے ہیں۔ اپنے لئے کچھ اور معیار ہے، دوسروں کے لئے کچھ اور معیار ہے۔ اگر ان سے کہہ دیا جائے کہ چونکہ اس وقت تم نے وقت پورا

نہیں دیا، اس لئے تمہاری تنخواہ میں کٹوتی کی جائے گی تو اب اس کے خلاف لڑائی اور جھگڑا اور جلسے اور جلوس شروع ہو جائیں گے کہ ملازمین کے حقوق پامال کیے جارہے ہیں۔

ملازمت میں یہ طریقہ کار ہو

یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ اپنے لئے اور معیار ہے، اور دوسرے کے لئے اور معیار ہے۔ اپنے فرائض کی طرف تو نگاہ نہیں ہے، بس اپنے حقوق کی طرف نگاہ جارہی ہے۔ یہ صرف سرکاری ملازمین کے لئے نہیں، بلکہ جو حضرات علماء مدارس میں پڑھا رہے ہیں، یا مدارس میں ملازم ہیں، ان میں سے کسی اللہ کے بندے کے دل میں شاید ہی یہ خیال آتا ہوگا کہ میری یہ تنخواہ حلال ہو رہی ہے یا نہیں؟ ہمارے یہاں دارالعلوم کراچی میں تو یہ قانون ہے کہ تمام اساتذہ اور ملازمین اپنی آمد و رفت کا وقت لکھ دیتے ہیں۔ اگر درس میں زیادہ تاخیر ہو تو اس کی تنخواہ خود بخود وضع ہو جاتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تھانہ بھون میں جو مدرسہ تھا، وہاں اگرچہ اس قسم کا نظام نہیں تھا، لیکن استاذ خود مہینے کے آخر میں ایک درخواست لکھتا کہ اس ماہ کے دوران مجھے اتنی تاخیر ہوئی تھی، یا میرے اتنے ناغے ہوئے ہیں، اس لئے اتنی تنخواہ میری تنخواہ سے وضع کر لی جائے۔ آج ہر شخص اپنے حقوق کے مطالبے کے نعرے لگا رہا ہے، لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ میں فرائضِ منصبی میں کتنی کوتاہی کر رہا ہوں۔

تنخواہ گھٹانے کی درخواست

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے، پھر وہاں کے استاذ ہوئے، پھر شیخ الحدیث ہوئے۔ جب بخاری شریف پڑھاتے ہوئے ایک مدت گزر گئی تو مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت کی تنخواہ بڑھانی چاہئے، ایک مدت سے آپ پڑھا رہے ہیں۔ اس وقت آپ کی تنخواہ دس روپے ماہوار تھی، لہٰذا آپ کی تنخواہ پندرہ روپے ماہوار کی جاتی ہے۔ جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو اطلاع پہنچی تو آپ نے باقاعدہ ایک درخواست مجلس شوریٰ کے نام لکھی، اور اس میں لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مجلس شوریٰ نے میری تنخواہ بڑھادی ہے، لیکن مجھے اس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا، اس لئے کہ پہلے تو میرے قویٰ مضبوط تھے، وقت بھی زیادہ دیتا تھا، اب تو میرے قویٰ بھی کمزور ہو رہے ہیں، اور وقت بھی زیادہ نہیں دے پاتا، اس لئے اب میری تنخواہ بڑھانے کے بجائے گھٹائی جائے۔ تنخواہ بڑھانے کی درخواست تو آپ نے دیکھی ہوگی، لیکن وہاں تنخواہ گھٹانے کی درخواست دی جارہی ہے۔

دو پیمانے بنا رکھے ہیں

جن کے دل میں اللہ کا خوف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کی فکر ہوتی ہے، جو یہ جانتے ہیں کہ حقوق کے مطالبے سے پہلے اپنے فرائض کی ادائیگی کا دھیان رکھنا ہے، ان کا یہ مزاج ہوتا ہے۔ آج دنیا میں جھگڑے اس لئے ہو رہے ہیں کہ میں نے دو پیمانے مقرر کر رکھے ہیں، اگر میں نے دوسرے کو ملازم رکھا ہوا ہے تو میں یہ چاہوں گا کہ کس طرح اس کی کھال کھینچ لوں، اور اُجرت کم سے کم دوں، اور اگر میں ملازم ہوں تو میں یہ چاہوں گا کہ اُجرت مجھے زیادہ سے زیادہ مل جائے، اور کام کم سے کم کروں، اس لئے یہ سارے جھگڑے ہو رہے ہیں۔ اگر نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد پر عمل ہو جائے کہ اگر تم ملازم ہو تو یہ سوچو کہ اگر دوسرا شخص میرا ملازم ہوتا تو میں اس سے کیا چاہتا، اور اگر تم نے کسی کو ملازم رکھا ہوا ہے تو یہ سوچو کہ اگر میں ملازم ہوتا تو میں اپنے آجر سے کیا چاہتا، وہ ادا کرو۔

میاں بیوی کا باہمی تعلق

اسی طرح میاں بیوی کے جھگڑے ہیں، اس میں زیادہ دخل اس بات کا ہے کہ وہاں پر بھی دو پیمانے ہیں، وہاں پر اس حدیث پر عمل ضروری ہے کہ ان کے لئے بھی وہی پسند کرو، جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، یعنی اگر تم شوہر ہو تو تم یہ دیکھو کہ میں اپنی بیوی سے کس قسم کے سلوک کی توقع رکھتا ہوں، اور اس کی کس بات سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے؟ اور اس کی کس بات سے مجھے راحت پہنچتی ہے؟ پھر تم بھی اپنی بیوی کے ساتھ ایسا سلوک کرو، جو اس کو راحت پہنچانے والا ہو، تکلیف پہنچانے والا نہ ہو۔ اگر تم بیوی ہو تو تم یہ دیکھو کہ مجھے اپنے شوہر کی کس بات سے اور کس سلوک سے تکلیف پہنچتی ہے؟ اور کس بات سے اور کس سلوک سے راحت پہنچتی ہے؟ پھر بیوی اپنے شوہر کے ساتھ ایسا سلوک کرے جو اس کو راحت پہنچانے والا ہو۔

ساس بہو کے جھگڑے کی وجہ

ساس بہو کے جھگڑوں سے ہمارا پورا معاشرہ بھرا ہوا ہے، بیشمار گھرانے اس فساد کا شکار ہیں، یہ سب کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس حدیث پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ جب تک ساس صاحبہ بہو تھیں، اس وقت تک وہ اپنی ساس سے کیسے سلوک کی توقع رکھتی تھیں، اور جب خود ساس بن گئیں ہیں تو اب اپنی بہو کے ساتھ کیسا معاملہ کر رہی ہیں، یہ دو پیمانے الگ الگ بنائے ہوئے ہیں کہ اپنے لئے پیمانہ اور ہے، اور دوسرے کے لئے پیمانہ اور ہے۔ اگر ایک پیمانہ ہو جائے تو یہ سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔

اس طریقے کو ختم کرو

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾(۱)

فرمایا کہ افسوس ہے ان لوگوں پر کہ جب اپنا حق لینے کا موقع آئے تو پورا پورا لیں، کوئی کسر نہ چھوڑیں، اور جب دوسرے کو دینے کا وقت آئے تو اس میں ڈنڈی مار جائیں۔ بہرحال نبی کریم ﷺ نے اس حدیث کے ذریعے ایسا معیار بیان فرمادیا کہ جس کے ذریعے ہم اپنے معاشرتی طرز عمل کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ ہم سے کہاں غلطی ہورہی ہے؟ بس جہاں غلطی ہورہی ہے اس کو درست کرلو تو اللہ تعالیٰ اس کی برکات ایسی عطا فرمائیں گے کہ ہمارے دین و دنیا سنور جائیں گے۔

میری مخلوق سے محبت کرو

میرے شیخ حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے، تو میری مخلوق سے محبت کرو۔ تم مجھ سے کیا محبت کروگے، کیونکہ تم نے نہ مجھے دیکھا ہے، نہ تمہارے اندر دیکھنے کی طاقت ہے، اس لئے تم مجھ سے کیا محبت کروگے؟ میری محبت کا عنوان یہ ہے میری مخلوق سے محبت کرو، میرے بندوں سے محبت کرو۔

حضرت والا کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی محبت کسی کے دل میں ڈالتے ہیں تو پھر اس کا معاملہ یہ ہوجاتا ہے کہ ہر مخلوقِ خدا سے اس کو محبت ہوتی ہے، اس کے دل میں کسی کے خلاف کینہ نہیں ہوتا، اس کے دل میں کسی کے خلاف بغض نہیں ہوتا، جیسے کسی نے کہا کہ۔

کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن
آئینِ ما ست سینہ چوں آئینہ داشتن

اب کسی کے خلاف نہ تو غصہ ہے، نہ کینہ ہے، نہ بغض ہے، نہ عداوت ہے، بلکہ ہر حال میں دوسرے کے حق میں خیرخواہی ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

چنانچہ اپنے بزرگوں کو ہم نے ایسا پایا کہ ان سے تعلق رکھنے والے جتنے لوگ ہوتے تھے، ان

---

(۱) المطففین: ۱۔۳

میں سے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ ان بزرگ کو مجھ سے سب سے زیادہ محبت ہے، اور یہ درحقیقت نبی کریم ﷺ کی سنت چلی آرہی ہے، ہر صحابی یہ سمجھتا تھا کہ حضور ﷺ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے، یہاں تک کہ اس کو یہ خیال ہوتا تھا کہ سب سے محبوب ہی میں ہوں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جو بہت بعد میں مسلمان ہوئے، ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید میں حضور ﷺ کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب ہوں، اب سابقین اولین میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما تھے، لیکن حضور ﷺ کی شفقت و محبت کا انداز دیکھ کر دل میں یہ خیال آیا کہ شاید میں زیادہ محبوب ہوں۔ اب حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھ بیٹھے "یا رسول اللہ! آپ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے یا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبت ہے؟" حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا "ابوبکر سے"

اس وقت راز کھلا کہ ان کے مقابلے میں ابوبکر سے زیادہ محبت ہے۔ اب دل میں خیال آیا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو بہت اُونچی شخصیت ہیں، ان سے تو آپ کو بہت محبت ہوگی، اب دوسرے نمبر پر میں زیادہ محبوب ہوں گا، لہٰذا پھر سوال کرلیا "یا رسول اللہ! مجھ سے زیادہ محبت ہے یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبت ہے؟" حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا "عمر سے"

فرماتے ہیں کہ اب مزید سوال کرنے سے میں ڈر گیا کہ اب مزید سوال کروں گا تو پتہ نہیں کون سے نمبر پر جاؤں گا۔ بہرحال! ان کے دل میں خیال اس لئے آیا کہ حضورِ اقدس ﷺ کا طرزِ عمل ہر ایک صحابی کے ساتھ ایسا تھا کہ ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ حضور ﷺ کو مجھ سے زیادہ محبت ہے۔

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا ہر ایک کے لئے دعا کرنا

ہم نے اپنے بزرگوں میں بھی یہی طرزِ عمل دیکھا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو، حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کو، حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ جتنے متعلقین ہیں، ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ حضرت کو مجھ سے زیادہ محبت ہے۔ ایسا کیوں تھا؟ اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت دل میں ڈال دی تو اپنی مخلوق کی ایسی محبت دل میں ڈال دی کہ ہر ایک کی خیر خواہی، ہر ایک سے محبت، ہر ایک کا خیال۔ حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ جب کبھی کسی ملنے جلنے والے سے ملاقات ہو جاتی تو فرماتے، ارے بھائی! ہم تمہارے لئے بہت دعا کرتے ہیں، اور روزانہ دعا کرتے ہیں۔ اب اگر تو یہ کریں تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ جب عمومی طور پر تمام مسلمانوں کے لئے دعا کرتے ہوں گے تو تم بھی ان کے اندر داخل ہو جاتے ہوگے۔ لیکن حضرت والا کی یہ مراد نہیں تھی کہ عمومی طور پر اس طرح دعا کرتا ہوں، بلکہ واقعۃً خصوصی طور پر نام لے کر ہر ایک کے لئے دعا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھ لیا کہ حضرت! آپ روزانہ ہر ایک کے لئے کس طرح دعا کرتے ہیں؟

حضرت ﷺ نے فرمایا ''میں نے پانچ نمازوں کو تقسیم کر رکھا ہے، مثلاً فجر کی نماز کے لئے یہ طے کر رکھا ہے کہ اپنے جو بڑے ہیں، جیسے والدین، اساتذہ، مشائخ، ان سب کے لئے فجر کی نماز کے بعد دعا کروں گا، ظہر کی نماز کے لئے یہ طے کر رکھا ہے کہ اپنے برابر کے دوست و احباب ہیں، ہم سبق ہیں، ان کے لئے دعا کروں گا، اور عصر کی نماز کے بعد اپنے سے چھوٹوں کے لئے اور اپنے متعلقین کے لئے دعا کروں گا، مغرب کے بعد اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے لئے دعا کروں گا، اس طرح میں نے پانچ نمازوں کو اپنے ملنے جلنے والوں اور اہلِ خانہ کے لئے بانٹ رکھا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے اپنے وقت پر ہر ایک کے لئے دعا ہو جاتی ہے''

الحمدللہ، یہ دعائیں کیوں ہو رہی ہیں؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کی بدولت اپنی مخلوق کی محبت دل میں ڈال دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے دل میں بھی یہ محبت پیدا فرمادے۔

بہرحال! یہ چوتھی نصیحت تھی جو حضورِ اقدس ﷺ نے فرمائی کہ دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس نصیحت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

پانچویں نصیحت

پانچویں نصیحت حضورِ اقدس ﷺ نے یہ فرمائی:

((لا تکثر الضحك، فإن كثرة الضحك تميت القلب))(۱)

''بہت زیادہ ہنسا مت کرو، اس لئے کہ کثرت سے ہنسا دل کی موت کا باعث ہوتا ہے، اس سے انسان کا دل مر جاتا ہے''

یہاں ہنسنے سے قہقہہ مار کر ہنسنا مراد ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ کی سنتوں میں یہ ہے کہ آپ قہقہہ مار کر نہیں ہنستے تھے، زیادہ تر تو تبسم فرماتے تھے، مسکراتے تھے، بعض روایتوں میں آتا ہے کہ بعض اوقات ہنسنے کے دوران آپ کا منہ کھل جاتا تھا، اور داڑھیں ظاہر ہو جاتی تھیں، لیکن قہقہہ مار کر ہنسنا کہیں ثابت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر وقت ہنسنے ہنسانے میں لگا رہے، اور مسخرہ بن جائے تو یہ پسندیدہ نہیں، البتہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ہنسی مذاق بھی جائز ہے، اور حضورِ اقدس ﷺ نے ایسا مذاق کیا ہے۔ بہرحال! یہ اس حدیث کا حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اور اپنی رحمت سے ہمیں ان پانچوں نصیحتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب من اتقی المحارم فهو أعبد الناس، رقم: ۲۲۲۷، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب الورع والتقوی، رقم: ۴۲۰۷، مسند أحمد، رقم: ۷۷۴۸۔

پڑوسی☆

ابوحمزہ سکری رحمۃ اللہ علیہ حدیث کے ایک راوی گزرے ہیں۔ ''سُکّر'' عربی زبان میں چینی کو کہتے ہیں، اور ان کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انہیں 'سُکّری' اس لئے کہا جاتا تھا کہ ان کی باتیں ان کا لہجہ اور ان کا اندازِ گفتگو بڑا دلکش اور شیریں تھا۔ جب وہ بات کرتے تو سننے والا اُن کی باتوں میں محو ہو جاتا تھا۔ وہ بغداد شہر کے ایک محلے میں رہتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اپنا مکان بیچ کر کسی دوسرے محلے میں منتقل ہونے کا ارادہ کیا۔ خریدار سے معاملہ بھی تقریباً طے ہو گیا۔ اتنے میں ان کے پڑوسیوں اور محلہ داروں کو پتہ چلا کہ وہ اس محلے سے منتقل ہو کر کہیں اور بسنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ محلہ والوں کا ایک وفد ان کے پاس آیا، اور ان کی منت سماجت کی کہ وہ یہ محلہ نہ چھوڑیں۔ جب ابوحمزہ سکری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا عذر بیان کیا تو تمام محلہ والوں نے متفقہ طور پر انہیں یہ پیشکش کی کہ آپ کے مکان کی جو قیمت لگی ہے، ہم وہ قیمت آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرنے کو تیار ہیں، لیکن آپ ہمیں اپنے پڑوس سے محروم نہ کیجئے۔ جب انہوں نے محلہ والوں کا یہ خلوص دیکھا تو منتقل ہونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

ابوحمزہ سکری رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولیت کی ایک وجہ ان کی سحر انگیز شخصیت بھی ہوگی، لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے پڑوسی کے حقوق کے بارے میں اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے ایک مثال قائم کی تھی۔ قرآن کریم نے پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کی بار بار تاکید فرمائی ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بہت سے ارشادات میں پڑوسی کے حقوق کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں، یہاں تک کہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل امین علیہ السلام آئے، اور مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ شاید وہ پڑوسی کو ترکے میں وارث بھی قرار دیدیں گے۔ (۱)

☆ ذکر وفکر: ۲۵۵-۲۵۹

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الوصاة بالجار، رقم: ٥٥٥٥، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب الوصیة بالجار والإحسان الیه، رقم: ٤٧٥٦، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فی حق الجوار، رقم: ١٨٦٥، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی حق الجوار، رقم: ٤٤٨٤۔

قرآن وسنت کی ان تعلیمات کے سائے میں جو معاشرہ پروان چڑھا، اس میں پڑوسی کی حیثیت ایک قریبی رشتہ دار سے کم نہ تھی، ایک ساتھ رہنے والے نہ صرف ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک تھے، بلکہ ایک دوسرے کے لئے ایثار وقربانی کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔

۱۹۶۳ء میں جب میں سعودی عرب گیا تو وہاں کے ایک باشندے نے مجھے اپنا واقعہ خود سنایا کہ ایک مرتبہ میں کپڑا خریدنے کے لئے بازار گیا۔ ایک دکان میں داخل ہو کر بہت سے کپڑے دیکھے۔ دکاندار پوری خوش اخلاقی سے مجھے مختلف کپڑے دکھاتا رہا۔ بالآخر میں نے ایک کپڑا پسند کرلیا۔ دکاندار نے مجھے قیمت بتادی۔ میں نے دکاندار سے کہا کہ "مجھے یہ کپڑا اتنے گز کاٹ کر دیدو"۔ اس پر دکاندار ایک لمحے کے لئے رکا، اور اس نے مجھ سے کہا، آپ کو یہ کپڑا پسند ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ کہنے لگا: قیمت بھی آپ کی رائے میں مناسب ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ اس پر اس نے کہا کہ اب آپ میرے برابر والی دکان پر چلے جایئے، اور وہاں سے یہ کپڑا اسی قیمت پر لے لیجئے۔ میں بڑا حیران ہوا اور میں نے اس سے کہا کہ میں اس دکان پر کیوں جاؤں؟ میرا معاملہ تو آپ سے ہوا ہے۔ کہنے لگا: آپ کو اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں، آپ کو جو کپڑا چاہئے، وہ وہاں موجود ہے، اور آپ کو اسی قیمت میں مل جائے گا، جا کر وہاں سے لے لیجئے۔ میں نے کہا کہ پہلے مجھے وجہ بتایئے، کیا وہ آپ ہی کی دکان ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ اب میں بھی اڑ گیا، اور میں نے اصرار کیا کہ جب تک آپ مجھے وجہ نہیں بتائیں گے میں اس دکان پر نہیں جاؤں گا۔ آخر کار اس نے زچ ہو کر کہا کہ آپ خواہ مخواہ بات لمبی کر رہے ہیں، بات صرف اتنی ہے کہ میرے پاس صبح سے اب تک بہت سے گاہک آچکے ہیں، اور میری اتنی بکری ہو چکی ہے کہ میرے لئے آج کے دن کے حساب سے کافی ہو سکتی ہے، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ میرا پڑوسی دکاندار صبح سے خالی بیٹھا ہے، اس کے پاس کوئی گاہک نہیں آیا، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کی بھی کچھ بکری ہو جائے، آپ کے وہاں جانے سے اس کا بھلا ہو جائے گا، آپ کا اس میں کیا حرج ہے؟

یہ اس اسلامی معاشرے کی ایک بچی کھچی جھلک تھی جس میں مسرت اور کامیابی محض پیسوں کی گنتی کا نام نہیں تھا، بلکہ روح کے اس سکون اور قلب وضمیر کے اس اطمینان کا نام تھا جو اپنے کسی بھائی بہن کا دکھ دور کر کے یا اس کے چہرے پر مسکراہٹ لا کر حاصل ہوتا ہے۔ جب قرآن کریم نے انصارِ مدینہ کی تعریف کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ چاہے وہ خود مفلسی کا شکار ہوں، مگر دوسروں کے ساتھ ایثار کا معاملہ کر کے انہیں اپنے اُوپر ترجیح دیتے ہیں، تو درحقیقت ان کی اسی صفت کی مثال دے کر مسلمانوں کو ان کی پیروی کی ترغیب دی تھی۔ یوں تو ایثار کا یہ معاملہ ہر شخص کے ساتھ قابلِ تعریف ہے، لیکن خاص طور پر پڑوسی اس کا زیادہ حقدار ہے اسی لئے قرآن وسنت نے اس کی زیادہ ترغیب دی ہے۔

جدید شہری زندگی نے جہاں ہماری بہت سی قدریں بدل ڈالی ہیں وہاں پڑوس کی اہمیت کا تصور بھی بری طرح دھندلا دیا ہے۔ اول تو کوٹھی بنگلوں کے مکین پڑوس کا مفہوم ہی بھولتے جارہے ہیں، بعض دفعہ مدتوں پاس پاس رہنے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے ناواقف رہتے ہیں، اور اگر کہیں پڑوس کی اہمیت کا تصور موجود ہے تو عام طور سے اسے انہی پڑوسیوں کے ساتھ مخصوص کردیا گیا ہے جو رتبے یا معاشی حالت کے اعتبار سے اپنے برابر یا قریب قریب ہوں، چنانچہ کوٹھی بنگلے میں رہنے والا کسی دوسری کوٹھی کے مکین ہی کو اپنا پڑوسی سمجھتا ہے، اور اگر اس کے پاس کچھ لوگ جھونپڑیوں یا معمولی مکانات میں رہ رہے ہوں تو انہیں عام طور سے نہ پڑوسی سمجھا جاتا ہے، نہ پڑوسی جیسے حقوق دیئے جاتے ہیں۔ ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ کسی عالی شان بنگلے میں رہنے والا اپنے قریب کسی جھونپڑی والے کی خبرگیری، اس کی بیمار پرسی یا محض ملاقات کے لئے جاتا ہو، حالانکہ ایسے پڑوسی ایثار و محبت کے زیادہ مستحق ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ علمی اور دینی اعتبار سے تو بلند مقام کے حامل تھے ہی، اپنی خاندانی وجاہت کے اعتبار سے بھی ممتاز تھے، لیکن ان کا روزانہ معمول یہ تھا کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے دارالعلوم جانے سے پہلے اپنے قریب معمولی مکانات میں بسنے والی بیواؤں اور بے سہارا خواتین کے پاس جاتے، ہر ایک سے پوچھتے کہ انہیں بازار سے کیا سودا سلف منگانا ہے؟ اور بہت سی خواتین کے بتائے ہوئے سودے کی ایک فہرست لے کر خود بازار جاتے، ہر خاتون کا سودا خریدتے، اور ہر ایک کو پہنچاتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کوئی خاتون کہتی: مفتی صاحب! آپ یہ چیز غلط لے آئے، میں نے تو فلاں چیز منگائی تھی، یا اتنی تعداد میں منگائی تھی۔ مفتی صاحب خندہ پیشانی سے فرماتے: معاف کرنا بی بی مجھ سے غلطی ہوگئی، میں ابھی بدل کر وہ چیز لے آتا ہوں۔ اور اس طرح وہ نہ جانے کتنے ٹوٹے دلوں کی دعائیں سمیٹ کر اور ان کی خدمت کے سرور سے دل آباد کرکے اپنے دن کی مصروفیات کا آغاز کرتے تھے۔ آج تقریباً ہر شخص اسبابِ راحت کی فراوانی کے باوجود ایک انجانی سی بے چینی اور دل کی ایک بے نام سی کسک میں مبتلا ہے، اور بقول جناب نظر امروہوی۔

کوئی الجھن نہیں، لیکن کسی الجھن میں رہتا ہے
عجب دھڑکا سا ہر دم دل کی ہر دھڑکن میں رہتا ہے

اس انجانی بے چینی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے روپے پیسے کی گنتی ہی کو زندگی کا مقصد سمجھ لیا ہے، اور مال و دولت کی دوڑ سے آگے کچھ سوچنے کے لئے تیار نہیں، چنانچہ ہم روح کے اس اطمینان اور دل کے اس سرور سے محروم ہوتے جارہے ہیں جو اپنے کسی بھائی بہن کی خدمت کرکے اور

اس کے لئے کوئی قربانی دے کر حاصل ہوتا ہے، جو زندگی کو اپنے خالق و مالک کے تابع فرمان بنانے اور اس کے حکم کے آگے اپنی ناجائز خواہشات کو کچلنے کا نقد انعام ہوتا ہے۔ قلبی سکون کا یہ نقد انعام بسا اوقات کچے مکان اور دال روٹی کی معمولی معیشت میں بھی حاصل ہو جاتا ہے، اور اگر اس کی شرائط پوری نہ ہوں تو عالی شان کوٹھیوں اور چمکدار کاروں میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس صورت میں کوٹھی بنگلوں کی چمک دمک دل میں چھپی ہوئی بے چینیوں کا علاج نہیں کر سکتی۔

کوئی شک نہیں کہ آج کی شہری زندگی بہت مصروف ہو گئی ہے، لیکن یہ مصروفیت زیادہ تر روپے پیسے کی گنتی بڑھانے ہی کے لئے ہے، لہٰذا اگر سکونِ قلب بھی کوئی حقیقی نعمت ہے جسے حاصل کرنے کی فکر کی جائے تو انہی مصروفیتوں میں تھوڑا سا وقت اس کام کے لئے بھی نکالنا پڑے گا جس میں اپنے آس پاس بسنے والوں کی زندگی میں جھانک کر دیکھا جا سکے، اور ان کے دکھ دور کرنے کی کوئی امکانی سبیل تلاش کی جا سکے۔ چوبیس گھنٹے کی مصروفیات میں سے نکالے ہوئے یہ چند لمحات جو اس کام میں خرچ ہوں گے، انشاء اللہ وہ کام کر جائیں گے جو دن بھر کی بھاگ دوڑ سے حاصل ہونے والی روپے کی ریل پیل انجام نہیں دے سکتی۔

۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ
یکم اکتوبر ۱۹۹۵ء

❖❖❖

پڑوسیوں کے حقوق ادا کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

"أَمَّا بَعْدُ!

فَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:((وَأَحْسِنْ إِلٰى جَارِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا))(۱)

گزشتہ چار دن سے ایک حدیث کا بیان چل رہا ہے، جس میں نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو پانچ نصیحتیں فرمائیں، اور ساتھ میں یہ ہدایت فرمائی کہ یہ باتیں خود بھی یاد رکھنا، اور ان کو دوسروں تک بھی پہنچانا، خود بھی عمل کرنا، اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی ترغیب دینا۔ یہ پانچ نصیحتیں پانچ جملوں پر مشتمل ہیں۔ پہلا جملہ یہ تھا:

((إِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ))

''حرام چیزوں سے، ناجائز چیزوں سے اور گناہوں سے بچو، تو تم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے''

دوسرا جملہ یہ تھا:

((وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ))

''اللہ جل شانہ نے تمہیں جو کچھ دیدیا ہے، اس پر راضی ہو جاؤ، تو تم تمام انسانوں میں سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے''

ان دونوں جملوں کا بیان گذشتہ تین دنوں میں ہو گیا۔

پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

تیسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/۱۴۴-۱۶۴)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس، رقم: ۲۲۲۷، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الورع والتقوى، رقم: ۴۲۰۷، مسند أحمد، رقم: ۷۷۴۸

((وَأَحْسِنْ إِلَى جَارِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا))
''اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، تو تم مسلمان بن جاؤ گے''

اس جملے کے ذریعے حضور اقدس ﷺ نے بتا دیا کہ گویا کہ مسلمان کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے، اور اگر کوئی شخص مسلمان ہونے کا دعویدار تو ہو، لیکن اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک نہ کرے تو حقیقت میں وہ مسلمان نہیں، اس لئے آپ نے فرمایا کہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، تو مسلمان بن جاؤ گے۔ اس جملے میں اس قدر وزنی الفاظ میں نبی کریم ﷺ نے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی، اور قرآن و حدیث پڑوسی کے حقوق اور پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید سے بھرے ہوئے ہیں۔

جبرئیل علیہ السلام کا مسلسل تاکید کرنا

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام آکر مجھے مسلسل پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں تاکید کرتے رہے، کرتے رہے، کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہوا کہ شاید کوئی حکم ایسا آنے والا ہے کہ پڑوسی بھی وارثوں میں شمار ہو جائے گا۔(۱)

یعنی جس طرح کسی کے مرنے پر اس کی میراث عزیز و اقارب اور رشتہ داروں میں تقسیم ہوتی ہے، شاید کوئی حکم ایسا آنے والا ہے کہ اب پڑوسی کو بھی میراث میں سے حصہ دیا جائے گا۔

پڑوسیوں کی تین قسمیں

قرآن کریم نے پڑوسیوں کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک "الجار ذی القربی"، دوسرے "الجار الجنب"، تیسرے "صاحب بالجنب"(۲) اور تینوں کے حقوق ادا کرنے اور تینوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید فرمائی۔ پہلی قسم ہے "الجاری ذی القربی" یعنی وہ پڑوسی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الوصیة بالجار، رقم: ٥٥٥٥، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب الوصیة بالجار والإحسان إلیه، رقم: ٤٧٥٦، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله صلى الله علیه وسلم، باب ماجاء فی حق الجوار، رقم: ١٨٦٥، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی حق الجوار، رقم: ٤٤٨٤، سنن ابن ماجه، کتاب الأدب، باب حق الجوار، رقم: ٣٦٦٣، مسند أحمد، رقم: ٥٣٢٠

(۲) النساء: ٣٦

جس کے گھر کی دیوار آپ کے گھر کی دیوار سے ملی ہوئی ہو، دوسری قسم "الجار الجنب" یعنی وہ پڑوسی جس کی دیوار تو نہیں ملی ہوئی ہے، تھوڑا سا فاصلہ ہے، لیکن وہ بھی بالکل قریب ہے۔ دونوں الفاظ علیحدہ لا کر قرآن کریم نے یہ بتادیا کہ یہ مت سمجھنا کہ بس تمہارا پڑوسی وہی ہے جس کی دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے، بلکہ اگر تھوڑا فاصلہ ہو، لیکن تقریباً ایک ہی جگہ پر رہنے والے ہیں، صرف راستے اور دیواریں الگ ہیں تو وہ بھی تمہارا پڑوسی ہے، اس کا بھی خیال رکھو۔

تھوڑی دیر کا ساتھی

پڑوسی کی تیسری قسم یہ بیان فرمائی کہ "الصاحب بالجنب"، میں اس کا ترجمہ یہ کرتا ہوں "تھوڑی دیر کا ساتھی"، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کسی سواری میں مثلاً بس میں سفر کر رہے ہیں، اب برابر والی سیٹ پر کوئی آدمی آکر بیٹھ گیا، وہ "صاحب بالجنب" کہلائے گا، یا آپ ریل گاڑی میں یا ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہیں، برابر والی سیٹ پر دوسرا آدمی بیٹھا ہے، وہ "صاحب بالجنب" ہے، حالانکہ وہ شخص اجنبی ہے، اس سے پہلے کبھی اس کو نہیں دیکھا، نہ اس سے ملاقات ہوئی، اور نہ آئندہ ملاقات ہونے کی اُمید ہے، لیکن چونکہ وہ تھوڑی دیر کے لئے ہمارے ساتھ ہو گیا ہے، قرآن کریم نے فرمایا کہ اس کا بھی حق ہے، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ یا آپ کہیں لائن میں لگے ہوئے ہیں، اس قطار میں آپ سے آگے ایک آدمی کھڑا ہے، آپ کے پیچھے ایک آدمی کھڑا ہے، یہ دونوں آپ کے "صاحب بالجنب" ہیں، اس کے بھی حقوق ہیں، اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم ہے۔

اللہ کو وہ بندہ بڑا پسند ہے

قرآن کریم نے پڑوسیوں کی یہ تینوں قسمیں الگ الگ کر کے اس لئے بیان فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کو وہ بندہ بڑا پسند ہے جو اپنے ساتھ رہنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا ہو۔ اتنی بات تو ہر مسلمان جانتا اور مانتا ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہئے، لیکن عملاً چند غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جن کو دور کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ عمل کے وقت نفس و شیطان انسان کو مختلف تاویلیں سمجھا دیتا ہے، اور ساتھ میں دل میں کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دیتا ہے، جس کے نتیجے میں اس حکم پر عمل کرنے سے محرومی ہو جاتی ہے۔

یہ نئی تہذیب ہے

جب تک مکانات تسلسل کے ساتھ ہوا کرتے تھے، اس وقت لوگ اپنے پڑوسیوں کا لحاظ

رکھتے تھے، اس کے ساتھ تعلقات ہوتے تھے، بعض اوقات خون کے رشتوں سے زیادہ قوی تعلق پڑوسیوں کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ لیکن جب سے یہ کوٹھی، بنگلے بننے شروع ہوئے تو اس کے نتیجے میں یہ ہو رہا ہے کہ بسا اوقات رہتے رہتے سالہا سال گزر جاتے ہیں، لیکن یہ پتہ نہیں ہوتا کہ پڑوس میں کون رہ رہا ہے۔ اس نئی تہذیب نے پڑوسی ہونے کا مسئلہ ہی ختم کر دیا۔ ہم لوگ برنس روڈ پر ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے، اور جس دن اس فلیٹ میں جا کر آباد ہوئے تو آس پاس کے لوگ ملنے کے لئے آگئے، اور آپس میں ایسے تعلقات ہو گئے جیسے عزیزوں اور رشتہ داروں کے درمیان ہوتے ہیں۔ وہاں پانچ سال رہنے کے بعد لسبیلہ ہاؤس میں منتقل ہوئے تو وہاں پر ایک پلاٹ پر والد صاحب نے مکان بنوایا تھا، اس مکان کی چار دیواری تھی، اور چاروں طرف کوٹھی بنگلے والے تھے۔ اب ہفتوں گزر گئے، لیکن یہ پتہ نہیں چلا کہ داہنی طرف کے مکان میں کون رہتا ہے، بائیں طرف کے مکان میں کون رہتا ہے، آگے کون ہے، پیچھے کون ہے؟ نہ کسی سے ملاقات ہے، تو ایک دن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑا اہتمام کر کے برابر والوں کے پاس جا کر ملاقات کی، تا کہ تعلقات قائم ہو جائیں۔ پھر فرمانے لگے کہ دیکھو! جب ہم فلیٹ میں رہنے گئے تھے تو سارے محلے کے لوگ ملاقات کے لئے جمع ہو گئے، اور انہوں نے ہمارا استقبال کیا، اور تعلق اور محبت کا اظہار کیا، اور یہاں یہ صورتِ حال ہے، علاقوں کے درمیان یہ فرق ہے۔ بہر حال کوٹھی بنگلوں میں یہی ہوتا ہے کہ سالہا سال رہنے کے باوجود پتہ نہیں چلتا کہ ہمارے پڑوس میں کون رہتا ہے۔

آگ لگنے کا واقعہ

میں ایک مرتبہ اسلام آباد میں ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا، وہ ایک بنگلہ تھا، رات کے تین بجے اس میں آگ لگ گئی، اور اللہ تعالیٰ نے خاص فضل فرمایا، اور ہم لوگوں کی جان بچالی۔ فائر بریگیڈ والے آئے، اور انہوں نے آگ بجھائی، لیکن میں نے دیکھا کہ صبح آٹھ نو بجے تک کاروائی ہوتی رہی، لیکن برابر کے بنگلے والوں کو کوئی خبر نہیں تھی، کسی کو کوئی توفیق نہیں ہوئی کہ یہاں ہمارے پڑوس میں آگ لگ گئی تھی تو پتہ کریں کہ ان کا کیا حال ہے، کوئی مرا، کوئی زخمی ہوا۔ ان کو آنے کی فرصت ہی نہیں تھی، کیونکہ جو مصیبت آئی وہ دوسروں پر آئی، ہمارے اُوپر نہیں آئی۔ آج ہمارے معاشرے میں یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہ پڑوس کے ساتھ تعلقات اور حسنِ سلوک کی فضیلت جو قرآن و حدیث میں بیان فرمائی تھی، وہ ختم ہو چکی، اب تو نفسا نفسی کا عالم ہے، بس میں ہوں، میرا گھر ہے، میرا مکان ہے، میری فیملی ہے، اور بس آگے کسی اور کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

جھونپڑی والا بھی پڑوسی ہے

دوسرے اگر کسی کو پڑوسی کے حقوق اور اس کے ساتھ حسن سلوک کا کچھ خیال بھی ہے تو پڑوسی اس کو سمجھا جاتا ہے جو مالی اعتبار سے میرا ہم پلہ ہو۔ اگر میرے برابر میں کوئی جھونپڑی ہے، اور اس میں کوئی شخص رہتا ہے تو وہ پڑوسی نہیں۔ پڑوسی وہ ہے کہ اگر میرا بنگلہ ہے تو اس کا بھی بنگلہ ہو، اگر وہ جھونپڑی والا ہے تو اس کو پڑوسی کے حقوق دینے کو تیار نہیں۔ اس کے بارے میں تو خیال ہی نہیں آتا کہ یہ میرا پڑوسی ہے۔ کیا اس وجہ سے وہ تمہارا پڑوسی نہیں کہ وہ بیچارہ غریب ہے؟ اس کا بنگلہ نہیں، بلکہ اس کی جھونپڑی ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ جب تم آپس میں پڑوسیوں کا اجتماع کرو گے، اور دعوت کرو گے تو صرف بنگلے والوں کی دعوت کرو گے، جھونپڑی والوں کو دعوت میں شامل نہیں کرو گے، لہٰذا دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ پڑوسی وہ ہے جو مال کے اعتبار سے، منصب کے اعتبار سے، عہدہ کے اعتبار سے، معاشی اعتبار سے میرا ہم پلہ ہو، ورنہ وہ پڑوسی نہیں۔ حالانکہ حقیقت میں پڑوسی وہ ہے جو تمہارے گھر کے پاس رہتا ہو۔ اگر وہ تمہارے گھر کی دیوار کے ساتھ رہتا ہے تو پہلی قسم کا پڑوسی ہے، اور اگر تھوڑے فاصلے پر رہتا ہے تو دوسری قسم کا پڑوسی ہے، دونوں میں سے ایک میں ضرور داخل ہے، اگرچہ وہ جھونپڑی میں رہتا ہے۔ بلکہ جھونپڑی والے پڑوسی کے حقوق زیادہ ہیں، اس لئے کہ اگر کسی دن اس کے گھر میں کھانے کو نہ ہو تو اس کا پڑوسی گناہگار ہوگا، بلکہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ مسلمان نہیں جس کے پڑوس میں کوئی آدمی بھوکا سو جائے۔

مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات کئی بار سنی کہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کے فتاویٰ کی دس جلدیں "فتاویٰ دار العلوم دیوبند" کے نام سے چھپ چکی ہیں، دار العلوم دیوبند کے "مفتی اعظم" فتویٰ میں میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے، ان کے گھر کے قریب تین چار بیوہ خواتین رہا کرتی تھیں، ان کا معمول یہ تھا کہ جب دار العلوم جانے کے لئے اپنے گھر سے نکلتے تو پہلے ان تمام بیوہ خواتین کے گھر جاتے، اور ان سے پوچھتے کہ بی بی! تمہیں بازار سے کچھ سودا منگوانا ہو تو بتادو، میں لا دیتا ہوں۔ اب کوئی خاتون کہتیں کہ اتنا ہرا دھنیہ، اتنا پودینہ، اتنی سبزی اور اتنے ٹماٹر لے آنا۔ تمام خواتین سے سودا پوچھتے، پھر بازار جاتے، بازار سے سودا خریدتے، ہر بیوہ کے گھر میں وہ سودا پہنچاتے، پھر دار العلوم تشریف لے جاتے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا کہ کوئی خاتون یہ کہتی کہ مولوی جی! تم غلط سودا لے آئے، میں نے تو فلاں چیز منگوائی تھی، آپ فلاں چیز لے آئے، یا

میں نے تو اتنی مقدار میں منگوائی تھی، آپ اتنی لے آئے۔ فرماتے: اچھا بی بی، کوئی بات نہیں، میں واپس بازار چلا جاتا ہوں، اور ابھی بدلوا کر لے آتا ہوں۔ چنانچہ دوبارہ بازار جاتے، وہ چیز بدلواتے، پھر لا کر اس بیوہ کے حوالے کرتے، پھر دار العلوم تشریف لے جاتے۔ روزانہ کا یہ معمول تھا، ان کا سب سے پہلا کام اپنے پڑوسیوں کی خبر گیری کرنا تھا۔

یہ کیسے لوگ تھے؟

وہ شخص جس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے، وہ شخص جس کے فتاویٰ کو اتھارٹی تسلیم کر لیا گیا ہے، دنیا بھر سے لوگ اس کے پاس سوالات کرنے آ رہے ہیں، نہ جانے کتنے لوگ ان کے ہاتھ پاؤں چومنے والے موجود ہیں۔ لیکن ان کا یہ حال ہے کہ فتویٰ کا کام شروع کرنے سے پہلے بیوہ خواتین کی خبر گیری کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ویسے ہی بڑے نہیں بن گئے۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کے ذریعے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کی یادیں تازہ کر دیں، اور واقعہ بھی یہی ہے، جن علماء دیوبند کے ہم نام لیوا ہیں، یہ محض اس وجہ سے نہیں کہ بس ان سے عقیدت ہو گئی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا ایک ایک فرد سنتِ نبوی کا جیتا جاگتا پیکر تھا، اور یہ صرف نماز روزے میں نہیں، بلکہ زندگی کے ایک ایک شعبے میں سنتِ نبوی پر عامل تھا۔

ساری زندگی کچے مکان میں گزار دی

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیوبند کے استاذِ حدیث تھے، ساتھ میں کتابوں کی تجارت بھی کرتے تھے، مالی اعتبار سے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق تھا، خوشحال تھے، لیکن مکان کچا تھا۔ جب بارش ہوتی تو ہر بارش کے موقع پر یہ ہوتا کہ کبھی اس مکان کی چھت ٹوٹ جاتی، کبھی اس کی دیواریں کمزور ہو جاتیں، کبھی برآمدہ گر جاتا، اور جب برسات کا موسم ختم ہوتا تو دوبارہ اس کی مرمت کرواتے۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن حضرت سے عرض کیا کہ حضرت! ہر سال برسات میں مکان میں ٹوٹ پھوٹ ہو جاتی ہے، آپ مشقت اور تکلیف اٹھاتے ہیں، پھر دوبارہ مرمت کروانی پڑتی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو وسعت دے رکھی ہے، آپ ایک مرتبہ اپنے مکان کو پکا کروالیں تو یہ بار بار کی تکلیف سے نجات مل جائے گی۔ چونکہ طبیعت میں ظرافت بھی تھی، اس لئے جواب میں فرمایا: واہ مولوی شفیع صاحب! آپ نے کیا بہترین مشورہ دیا ہے، ہم تو بڈھے ہو گئے، ساری عمر گزر گئی، اور اتنی بات ہماری عقل میں نہیں آئی، واہ، سبحان اللہ! کیا عقلمندی کی بات کہی، ماشاء اللہ۔ اتنی بار انہوں نے یہ جملے دہرائے کہ میں شرم سے پانی پانی ہو گیا، اور

بہت شرمندہ ہوا۔ والد صاحب نے کہا کہ حضرت! میرے سوال کرنے کا مقصد آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ مکان پکا نہ بنانے میں کیا حکمت ہے؟ جب بہت زیادہ اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا کہ اچھا میرے ساتھ آؤ۔ میرا ہاتھ پکڑا، اور گھر کے دروازے پر لے گئے، اور پوچھا:

"یہ گلی جو تمہیں یہاں سے نظر آ رہی ہے، اس میں تمہیں کوئی پکا مکان نظر آ رہا ہے؟ کسی کا مکان پکا نہیں، اب ساری گلی کے تمام پڑوسیوں کے مکان تو کچے ہوں، اور میرا مکان پکا ہو تو پکا مکان بنا کر میاں صاحب کیا اچھا لگے گا؟ اور میرے اندر اتنی استطاعت نہیں کہ ساری گلی والوں کے مکان پکے کرادوں، لہٰذا جیسے میرے پڑوسی ہیں، میں بھی ویسا ہی سہی"

اس طرح ساری زندگی کچے مکان میں گزار دی، صرف اس لئے کہ پڑوسیوں کے دل میں یہ حسرت نہ ہو کہ میاں صاحب کا مکان پکا ہے، اور ہمارا مکان کچا ہے، حالانکہ مکان پکا بنالینا کوئی گناہ نہیں تھا، نہ شریعت نے منع کیا تھا، نہ حرام قرار دیا تھا، لیکن پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا ایک تقاضا یہ بھی تھا کہ ان کے دل میں یہ خیال اور یہ حسرت نہ ہو کہ میاں صاحب کا مکان پکا ہے، اور ہمارا مکان کچا ہے۔

تاکہ پڑوسیوں کو حسرت نہ ہو

میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی مرحوم اپنا واقعہ سنایا کرتے تھے کہ میں ایک مرتبہ حضرت میاں صاحب کے پاس گیا، آموں کا موسم تھا، میاں صاحب نے آم پیش کیے کہ آم کھاؤ، اور اس زمانے میں آم چوس کر کھائے جاتے تھے، جب چھلکے اور گٹھلیاں جمع ہو گئیں تو میں نے پوچھا کہ ان کو باہر پھینک دوں؟ اور اُٹھا کر دروازے کی طرف چلا۔ حضرت نے پوچھا کہ کہاں چلے؟ میں نے کہا: حضرت باہر پھینکنے کے لئے جا رہا ہوں۔ حضرت نے فرمایا: نہیں، اس کو باہر مت پھینکو۔ میں نے پوچھا: کیوں؟ انہوں نے فرمایا کہ جب باہر دروازے پر اتنے سارے چھلکے اور گٹھلیاں محلے کے بچوں کو نظر آئیں گی، ان میں سے بہت سے غریب ہیں، جو آم کھانے کی استطاعت نہیں رکھتے تو ہوسکتا ہے کہ اس کو دیکھ کر ان کے دل میں حسرت پیدا ہو، اور یہ حسرت پیدا ہونا اچھی بات نہیں، اس لئے ان کو باہر نہیں پھینکنا، بلکہ چھلکے بکریوں کو کھلا دیتا ہوں۔ یہ ہیں پڑوسیوں کے حقوق، جن کے بارے میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((وَأَحْسِنْ إِلَى جَارِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا))

جس میں پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کو مسلمان ہونے کی علامت قرار دیا ہے۔

ساتھ کی دکان والا پڑوسی ہے

یہ پڑوسی صرف گھر کی رہائش میں نہیں ہوتا، بلکہ دکان کا بھی پڑوسی ہوتا ہے۔ اگر آپ کی دکان کے ساتھ دوسرے کی دکان ہے تو وہ بھی آپ کا پڑوسی ہے، اس کے بھی حقوق ہیں۔ لیکن آج کل کمپٹیشن اور مقابلے کا دور ہے، اس لئے برابر کی دکان والے کے ہم پر کیسے حقوق؟ بس ہم کسی طرح اس سے آگے بڑھ جائیں۔ لیکن شریعت کی نظر میں وہ پڑوسی ہے، اور پڑوسی ہونے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی بنیاد پر وہ تمہارے حسن سلوک کا حقدار ہے۔ جس معاشرے میں اسلامی تعلیمات کا چلن تھا، جو معاشرہ نبی کریم ﷺ نے قائم فرمایا تھا، وہاں دکان کے برابر والا پڑوسی بھی حقوق رکھتا تھا، اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کا مظاہرہ غیر معمولی طریقے پر ہوتا تھا۔

سبق آموز واقعہ

آج سے تقریباً چالیس سال پہلے ۱۹۶۶ء کی بات ہے، مکہ مکرمہ میں عمرہ کے لئے میرا جانا ہوا۔ میرے بڑے بھائی جناب ولی رازی صاحب ساتھ تھے۔ اس وقت تک مکہ مکرمہ میں قدامت کے آثار باقی تھے، اور ایسی جدت ابھی نہیں آئی تھی۔ ہم نے وہاں تقریباً دو مہینے قیام کیا۔ اس وقت جوانی تھی، ہر جگہ جانے اور پرانی اور قدیم جگہیں دیکھنے کا شوق تھا۔ ایک بازار میں ہم گئے تو ایک صاحب جو وہاں جا کر مقیم ہو گئے تھے، انہوں نے بتایا کہ یہاں تو عجیب منظر ہے کہ جیسے ہی اذان ہوئی تو اپنی دکان کو کھلا چھوڑ کر اور سامان پر بس کپڑا ڈال کر نماز کے لئے چلے گئے۔ کوئی چوری اور ڈاکے کا خطرہ نہیں ہے۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ میں نے اس سے زیادہ عجیب حالت دیکھی کہ میں ایک مرتبہ اسی بازار میں ایک دکان والے کے پاس کپڑا خریدنے گیا۔ میں نے ایک کپڑا دیکھ کر اسے پسند کر لیا۔ دام پوچھے تو دام بھی مناسب تھے۔ میں نے کہا کہ اتنا کپڑا پھاڑ دو۔ دکاندار نے پوچھا کہ آپ کو یہ کپڑا پسند ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ دام بھی ٹھیک ہیں؟ میں نے کہا: ٹھیک ہیں۔ پھر دکاندار نے کہا کہ ایسا کریں کہ یہی کپڑا سامنے والی دکان سے لے لیں۔ میں نے کہا کہ وہاں سے کیوں لوں؟ سودا تو آپ سے ہوا ہے۔ دکاندار نے کہا کہ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں، آپ کو یہی کپڑا اسی دام میں وہاں سے مل جائے گا، وہاں سے لے لو۔ میں نے کہا: کیا وہ آپ کی دکان ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں، میری دکان نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ میرا سودا تو آپ سے ہوا ہے، میں تو آپ ہی سے لوں گا، اور میں نے کہا کہ جب تک آپ وجہ نہیں بتائیں گے اس وقت تک نہیں لوں گا۔ دکاندار نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میرے پاس صبح سے لے کر اب تک آٹھ دس گاہک آچکے ہیں، اور سامنے والی دکان

میں صبح سے لے کر اب تک کوئی گاہک نہیں آیا، اس لئے میں نے چاہا کہ اس کی بھی بکری ہو جائے، اس لئے تمہیں اس کے پاس بھیج رہا ہوں۔ یہ ہے مسلمان معاشرے کی ایک جھلک جو اس وقت تک باقی تھی۔

آج طلبِ دنیا کی دوڑ لگی ہوئی ہے

یہ جو آج مصیبت ہمارے اندر آگئی ہے کہ بس مجھے مل جائے، دوسرے کو ملے یا نہ ملے، بلکہ دوسرے سے چھین کر کھا جاؤں، دوسرے سے لوٹ کر کھا جاؤں، یہ آفت طلبِ دنیا کی دوڑ کی وجہ سے آگئی ہے۔ اب دیکھئے اوپر والے واقعے میں دکان کے پڑوسی کا خیال ہے، اس کے ساتھ حسن سلوک ہو رہا ہے۔ وہ مسلمان جس کے دل میں اللہ کا خوف ہو، جس کے دل میں اللہ کے رسول کی عظمت اور محبت ہو، وہی یہ سلوک کر سکتا ہے، دوسرا شخص یہ عمل نہیں کر سکتا، اس لئے کہ تاجر تو یہ کہتا ہے کہ میں تو یہاں نفع کھانے بیٹھا ہوں، میں اپنی دکان کی بکری کرنے کے لئے بیٹھا ہوں، دوسروں کی دکان کی بکری کرنے کے لئے نہیں بیٹھا ہوں۔ لیکن جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو، اور رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر ایمان رکھتا ہو کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرو تو تم مسلمان ہو جاؤ گے، وہی شخص اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کر سکتا ہے، دوسرا نہیں کر سکتا۔

برصغیر میں اسلام کی ابتداء کس طرح ہوئی؟

ہم اپنی برصغیر کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ اس علاقے میں اسلام کی جو روشنی آئی، اور یہاں اللہ تعالیٰ نے اسلام کا جو نور پھیلایا، درحقیقت حضورِ اقدس ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کا نتیجہ تھا۔ یہاں پر ابتداء میں کوئی اسلامی لشکر اس علاقے کو فتح کرنے کے لئے نہیں آیا تھا، اور یہاں کوئی تبلیغی جماعت نہیں آئی تھی، جس نے تبلیغ کر کے لوگوں کو مسلمان بنایا ہو، بلکہ یہاں پر سب سے پہلے مالابار کے علاقے میں بعض تابعین، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ صحابہ بھی مالابار کے ساحل پر اُترے، اور وہاں پر انہوں نے اپنی تجارت شروع کی، اور اس تجارت میں انہوں نے جس سچائی کا، اور جس امانت داری کا، دیانت داری کا اور انسان دوستی کا ثبوت دیا تو اس سے لوگوں کے دل ان کی طرف کھنچنا شروع ہو گئے، اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات آئی کہ جو دین ان کو یہ باتیں بتا رہا ہے، اس دین کو ہمیں بھی قبول کرنا چاہئے، چنانچہ ان تاجروں کو دیکھ دیکھ کر لوگ مسلمان ہوئے، اور اس طرح سب سے پہلے اسلام مالابار میں آیا، پھر مالابار سے پورے برصغیر میں اسلام پھیلا۔ تو حضورِ اقدس ﷺ یہ جو فرما رہے ہیں کہ پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرو تو تم مسلمان بن جاؤ گے، یعنی

تمہارے مسلمان ہونے کا ایک مظاہرہ دنیا کے سامنے آئے گا، تو اللہ تعالیٰ ان کو اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

دیوار پر شہتیر رکھنے کی اجازت

بہر حال! پہلی قسم کا پڑوسی وہ ہے جس کی دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہو، اور دوسری قسم کا پڑوسی وہ ہے جو ذرا فاصلے پر ہو، لیکن قریب ہی ہو، دونوں کے حقوق ہیں۔ ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارا پڑوسی اپنا شہتیر تمہاری دیوار پر رکھنا چاہے تو اس کو منع مت کرو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ حدیث لوگوں کو سنا رہے تھے تو لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ دیوار ہماری ہے، ہماری ملکیت ہے تو کیا یہ ہمارے اوپر فرض ہے کہ ہم پڑوسی کو اس کے اوپر شہتیر رکھنے سے منع نہ کریں۔ ان کی حیرانگی کو دیکھ کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! یہ حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے، چاہے تمہیں کتنا برا لگے، لیکن میں اس ارشاد کو تمہارے کندھوں کے درمیان پھینک کر رہوں گا۔ (۱)

مطلب یہ تھا کہ میں تمہیں یہ ارشاد سنا کر رہوں گا۔ حالانکہ اپنی دیوار پر پڑوسی کے شہتیر رکھنے کی اجازت دینا فرض و واجب نہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہ ترغیب دی کہ اگر تم مسلمان ہو تو تمہیں یہ کام کرنا چاہئے۔

پڑوسی کے حقوق میں غیر مسلم بھی داخل ہے

ایک بات اور سمجھ لیں کہ پڑوسی کے حقوق میں مسلم اور غیر مسلم سب برابر ہیں، یعنی پڑوسی ہونے کی حیثیت سے اگر غیر مسلم آپ کے مکان کے برابر میں رہتا ہے تو اس کا بھی یہی حق ہے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، لہٰذا بعض اوقات یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تو کافر ہے، اس کے ساتھ حسن سلوک کیوں کریں؟ یہ بات درست نہیں۔ اس لئے کہ پڑوسی ہونے کے ناطے اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا تمہارے لئے باعثِ اجر و ثواب ہے، اور اگر پڑوسی ہونے کی بنیاد پر تم نے اس کے ساتھ حسن سلوک کیا، اور اس کو ہدیہ تحفہ بھیج دیا، اس کی کوئی مدد اور تعاون کر دیا تو یہ سب اللہ جل شانہ کی رضا کے مطابق ہے، اور کیا بعید کہ تمہارے حسن سلوک کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کے دل میں

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب لا یمنع جار جاره أن یغرز خشبه فی جداره، رقم: ۲۲۸۳، صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب غرز الخشب فی جدار الجار، رقم: ۳۰۱۹، سنن الترمذی، کتاب الأحکام عن رسول الله، باب ما جاء فی الرجل یضع علی حائط جاره خشبا، رقم: ۱۲۷۳، سنن أبی داؤد، کتاب الأقضیة، باب من القضاء، رقم: ۳۱۵۰

ایمان ڈال دے۔ نہ جانے کتنے غیر مسلم تھے، مسلمانوں کے پڑوس ہونے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی توفیق عطا فرمادی۔ لہٰذا پڑوسی چاہے مسلمان ہو، یا غیر مسلم ہو، غریب ہو، یا امیر ہو، یا فاسق و فاجر ہو، وہ بھی اپنے فسق فجور کی وجہ سے پڑوسی ہونے کے حقوق سے محروم نہیں۔ ہاں! حسبِ موقع، مناسب وقت پر اس کو نیک باتوں کی تلقین کرتے رہو۔

تھوڑی دیر کا ساتھی

پڑوسی کی تیسری قسم ہے "صاحب بالجنب" یعنی تھوڑی دیر کا ساتھی، جیسے بس میں، جہاز میں، ریل گاڑی میں آپ کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے والا صاحب بالجنب ہے، یا کسی مجلس میں، مسجد میں، درسگاہ میں، کلاس میں، جلسہ گاہ میں تمہارے قریب بیٹھنے والے یہ سب صاحب بالجنب ہیں۔ ہم ذرا اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم اسلامی تعلیمات سے کتنی دور چلے گئے ہیں۔ ریل میں سفر کرتے وقت اور جہاز میں سفر کرتے وقت آپ کو یہ نظر آئے گا کہ ہر جگہ خود غرضی کا رجحان ہے۔ مجھے اچھی جگہ مل جائے، چاہے دوسرے کو ملے یا نہ ملے، مجھے راحت مل جائے، دوسرے کو راحت ملے یا نہ ملے، عام طور پر یہ مزاج بن گیا ہے۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ جو شخص صاحب بالجنب ہے، وہ تمہارا ساتھی ہے، چاہے تھوڑی دیر کے لئے ساتھی بنا ہو، لیکن اس ساتھی کا بھی تمہارے اوپر حق ہے۔

اہلِ مغرب کی ایک اچھی صفت

آج ہم لوگ اہل مغرب کو برا بھلا تو بہت کہتے رہتے ہیں، وہ ہیں بھی اسی لائق کہ ان کو ایسا کہا جائے، لیکن کچھ صفات ایسی ہیں، جو ان لوگوں نے مسلمانوں والی اپنائی ہیں۔ یہ دنیا دارالعمل اور دارالاسباب ہے۔ جو شخص بھی کوئی سبب اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں اچھا نتیجہ دیں گے۔ چنانچہ اہل مغرب کا ایک مزاج ہے کہ کسی ایک کام کے لئے اگر تین آدمی کسی ایک جگہ جمع ہو جائیں گے تو فوراً قطار اور لائن بنالیں گے۔ مثلاً اگر ٹکٹ خریدنا ہے، یا بس میں، یا ریل میں، یا جہاز میں سوار ہونا ہے، تو لائن بنا کر سوار ہوں گے۔ اگر تین آدمی جمع ہو گئے، تو خود بخود لائن بنالیں گے، اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کریں گے، یہ وہاں کا عام مزاج ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں کبھی ان کے درمیان لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا، نہ کبھی چھینا جھپٹی ہوتی ہے، نہ دھینگا مشتی ہوتی ہے، سب کام آرام سے ہو جاتے ہیں، پوری قوم کا یہ مزاج بن گیا ہے۔

ہماری ''خودغرضی'' کا واقعہ

میں اپنا واقعہ بتاتا ہوں، ایک مرتبہ مجھے پی آئی اے کے طیارے میں نیویارک سے کراچی آنا تھا، جس مرحلے تک گوروں کی حکمرانی تھی وہاں تو ہر جگہ لائن لگی ہوئی تھی، لائنوں سے گزرتے ہوئے سب کام ہوگئے، لیکن جب بس میں بیٹھنے کا موقع آیا تو وہ چونکہ ہمارے پاکستانی بھائیوں کے انتظام میں تھا، بارش ہورہی تھی، اور جہاز لیٹ ہوگیا تھا، اس لئے بسوں کے ذریعے ہوٹل جانا تھا۔ اب بس میں بیٹھنے کے لئے جو دھکم پیل ہوئی کہ الامان الحفیظ۔ کمزور آدمی کا تو بس میں داخل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر آدمی یہ چاہتا تھا کہ میں دوسروں کو پیچھے دھکیل کر پہلے بس میں سوار ہو جاؤں۔ میں نے دل میں کہا کہ وہ کافر تھے، اور یہ ماشاء اللہ مسلمان ہیں۔ یہ ہے ''خودغرضی'' کہ مجھے پہلے موقع مل جائے، میں سوار ہو جاؤں، میرا کام ہو جائے، میں آگے بڑھ جاؤں، دوسروں کو پیچھے چھوڑ دوں۔ یہ سب اس لئے ہورہا ہے کہ ہم نے ان باتوں کو دین سے خارج کردیا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دین صرف نفلیں پڑھنے اور تسبیح پڑھنے کا نام ہے۔

مصافحہ کرنے پر ایک واقعہ

اور دیکھئے! مصافحہ کرنا کوئی فرض واجب نہیں، زیادہ سے زیادہ سنت ہے، اس مصافحہ کے لئے کسی مسلمان کو تکلیف دینا، نقصان پہنچانا، دھکے دینا حرام ہے۔ ایک حرام کام کرکے ہم سنت پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک مرتبہ صوبہ سرحد کے ایک علاقے میں جانا ہوا۔ وہاں کی مسجد میں اجتماع ہوا، اور میرا بیان ہوا۔ دروازے اس مسجد کے چھوٹے تھے، دونوں طرف کھڑکیاں تھیں، برآمدہ بھی تھا، صحن بھی تھا۔ لوگ دور دور سے بیان سننے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ مسجد کا ہال، برآمدہ اور صحن سب لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب بیان ختم ہوا، اور مصافحے کی نوبت آئی، میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ برآمدے اور صحن کے لوگ کھڑکیوں کے ذریعے اندر آنے کی کوشش کررہے تھے، اور اس کے نتیجے میں مسجد کی کھڑکیاں ٹوٹ گئیں۔ مقصد ان کا صرف یہ تھا کہ مصافحہ کرنیکا موقع نہ نکل جائے۔ دماغ میں یہ بات تو بیٹھی ہوئی تھی کہ مصافحہ کرنا سنت ہے، اور مصافحہ کرنے کی فضیلت دل و دماغ میں تھی، لیکن یہ ذہن سے نکل گیا کہ مسجد میں دھکم پیل کرنا، اور دوسروں کو اذیت دینا حرام ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہماری قوم کی صحیح تربیت نہیں ہوئی، اس کے نتیجے میں یہ فساد پھیلا ہوا ہے۔

حجرِ اسود پر دھکم پیل

حجرِ اسود پر جا کر دیکھیں، کیا ہو رہا ہے، سارے علماء اور فقہاء یہ مسئلہ لکھ لکھ کر چلے گئے کہ حجرِ اسود کو بوسہ دینا بڑی فضیلت کی چیز ہے، لہٰذا کسی شخص کو تکلیف پہنچائے بغیر بوسہ دے سکتے ہو تو دیدو، ورنہ بوسہ دینا کوئی ضروری نہیں، فرض و واجب نہیں۔ مگر آج وہاں دھکم پیل ہو رہی ہے، دوسروں کو تکلیف دی جا رہی ہے، اور اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے گناہ کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ آج دین کے تصور میں یہ باتیں داخل ہی نہیں کہ دوسروں کو تکلیف دینا کوئی گناہ کا کام اور حرام ہے۔ بہر حال! اگر ہم سب مل کر ایک کام کے لئے گئے ہیں تو ہم سب ایک دوسرے کے لئے "صاحب بالجنب" ہیں، ہر ایک کے دوسرے پر حقوق ہیں۔ اگر لائن بنالو گے تو سب کو موقع مل جائے گا، مگر اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں۔

ایک سنہری بات

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایک سنہری بات فرمایا کرتے تھے، جو دل پر نقش کرنے کے قابل ہے، فرمایا کرتے تھے کہ باطل میں تو اُبھرنے کا دم ہی نہیں، قرآن کریم نے فرمادیا:

﴿إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾(۱)

باطل تو مٹنے کے لئے اور دبنے کے لئے آیا ہے، وہ کبھی اُبھر نہیں سکتا۔ اور اگر تم کسی باطل قوم کو دیکھو کہ وہ دنیا میں اُبھر رہی ہے، ترقی کر رہی ہے، تو سمجھ لو کہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے، اس حق چیز نے اس کو اُبھار دیا ہے، ورنہ باطل میں اُبھرنے کی طاقت نہیں تھی۔ آج ہم امریکہ کو، برطانیہ کو اور مغربی طاقتوں کو جتنا برا بھلا کہتے رہیں، ان پر لعنتیں بھیجتے رہیں، لیکن ان کی ترقی ان کی فحاشی اور عریانی کی وجہ سے نہیں، ان کے غلط عقائد کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کی ترقی ان صفات کی وجہ سے ہے جو درحقیقت اسلام کی بتائی ہوئی صفات تھیں، انہوں نے ان صفات کو اختیار کر لیا۔ مثلاً محنت، جفاکشی، دیانت داری، تجارت میں امانت داری، اور انسانوں کے حقوق کا خیال رکھنا، یہ سب باتیں وہ ہیں جس نے ان کو دنیا میں ترقی دیدی۔ آخرت میں تو ان کا کوئی حصہ نہیں۔ لیکن دنیا میں اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ یہ معاملہ فرماتے ہیں کہ جو شخص جیسا سبب اختیار کرے گا ویسا اس کو دنیا میں پھل مل جائے گا۔

---

(۱) بنی اسرائیل: ۸۱، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اور یقیناً باطل ایسی ہی چیز ہے جو مٹنے والی ہے"

اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ

بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے دین کو خانوں میں بانٹ رکھا ہے، ایک قوم نے ایک خانے کو لے لیا، اور اس کو دین سمجھ لیا، اور اس خانے سے باہر کی بات اس کے نزدیک دین نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾(۱)

''اے ایمان والو! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ''

یہ نہیں کہ رمضان المبارک میں تو خوب نفلیں بھی پڑھیں، اعتکاف بھی کیا، رات کو جاگ بھی لیا، تلاوت بھی کر لی، جب رمضان ختم ہوا اور مسجد سے باہر نکلے تو قصائی بن گئے، لوگوں کے ساتھ معاملات کرنے میں، معاشرت میں خیانت کرنے لگے۔ آج کی دنیا کرپشن سے بھری ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں ہم پر عذاب نہیں آئے گا تو کیا آئے گا؟ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، آمین۔ بہر حال! اس حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرما رہے ہیں کہ تم خود بھی ان باتوں کو سنو، اور دوسروں تک پہنچاؤ، اگر تم مسلمان بننا چاہتے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) البقرة: ۲۰۸

تھوڑی دیر کا ساتھی ☆

زندگی میں انسان کو قدم قدم پر دوسروں سے واسطہ پیش آتا ہے، بعض تعلقات دائمی نوعیت کے ہوتے ہیں، جیسے رشتہ دار، بعض دائمی نہ سہی لیکن لمبی مدت کے لئے ہوتے ہیں جیسے پڑوسی، اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ صرف چند گھنٹوں یا اس سے بھی کم مدت کے لئے کسی کا ساتھ ہو جاتا ہے، جیسے ہم کسی بس، ریل یا ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے کچھ دیر کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے نہایت باریک بینی سے ان تینوں قسم کے تعلقات کے کچھ حقوق رکھے ہیں، اور ان حقوق کی نگہداشت کی تاکید فرمائی ہے۔ پہلی دو قسموں یعنی رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق کو لوگ پھر بھی کچھ نہ کچھ اہمیت دیتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ بدسلوکی کے نتیجے میں انسان بدنام ہو جاتا ہے، اور چونکہ یہ تعلقات دیرپا قسم کے ہیں اس لئے یہ بدنامی بھی دیرپا ہو جاتی ہے، لیکن تیسری قسم یعنی وہ لوگ جو مختصر وقفے کے لئے ساتھ ہو گئے ہوں بہت کم انسان ان کے حقوق کا خیال رکھنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ عموماً اجنبی ہوتے ہیں، اور تھوڑی دیر کے بعد جب جدا ہوتے ہیں تو بعض اوقات تمام عمر ان سے کوئی واسطہ پیش نہیں آتا، اس لئے ان کے ساتھ اگر کوئی بداخلاقی یا بدسلوکی ہو جائے تو اس کی وجہ سے کسی دیرپا بدنامی کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ لوگ عموماً یہ سوچتے ہیں کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس شخص پر میرے بارے میں کوئی غلط تأثر قائم ہو بھی گیا تو کیا ہوا؟ بعد میں تو کبھی اس سے ملنا نہیں ہے، اس لئے اس تأثر سے میری زندگی پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ چنانچہ بسوں، ریلوں دوسری عوامی سواریوں، اور اب تو ہوائی جہازوں میں بھی جو دھکا پیل اور نفسی نفسی کا جو عالم نظر آتا ہے، کہ ہر شخص دوسرے کو کہنی مار کر آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا ہے، وہ درحقیقت اسی ذہنیت کا شاخسانہ ہے۔

اسی لئے قرآن کریم نے جہاں رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی،

☆ ذکر و فکر، ص: ۲۶۰ تا ۲۶۵

وہاں تھوڑی دیر کے ساتھیوں کے حقوق ادا کرنے کو بطور خاص ذکر فرمایا۔ تھوڑی دیر کے ساتھی کے لئے قرآن کریم نے "الصاحب بالجنب" کا لفظ استعمال کیا ہے۔(۱)

اس کا اردو ترجمہ "ہم پہلو" کے لفظ سے کیا جا سکتا ہے، اور اس سے مراد وہ شخص ہے جو مختصر مدت کے لئے کسی کے ساتھ ہو گیا ہو، خواہ کسی سفر میں، یا کسی عمومی مجلس میں، بس یا ریل میں سفر کرتے ہوئے جو شخص ہمارے قریب بیٹھا ہے، وہ ہمارا "صاحب بالجنب" ہے۔ کسی دعوت جلسے یا اجتماع عام میں جو شخص ہمارے پہلو میں ہے، وہ ہمارا "صاحب بالجنب" ہے، اور قرآن کریم نے خاص طور پر اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اس لئے فرمائی ہے کہ انسان کی شرافت اور خوش اخلاقی کا اصل امتحان ایسے ہی مواقع پر ہوتا ہے۔ بڑے بڑے تعلیم یافتہ، بظاہر مہذب اور شائستہ لوگوں کو دیکھا کہ اپنے روزمرہ کے حالات میں وہ بظاہر بڑے خوش اخلاق اور شائستہ نظر آتے ہیں، لیکن جب کبھی سفر کی نوبت آئی تو ان کی ساری تہذیب اور خوش اخلاقی دھری کی دھری رہ گئی، اور انہوں نے اپنے ہم سفروں کے ساتھ پرلے درجے کی خودغرضی اور سنگدلی کا برتاؤ شروع کر دیا۔

اسی لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ کسی شخص کی نیکی کی حتمی گواہی اس وقت دو جب یا تو تمہارا اس سے روپے پیسے کا کوئی لین دین ہو چکا ہو جس میں تم نے اسے کھرا پایا ہو، یا اس کے ساتھ تم نے کوئی سفر کیا ہو، اور اس سفر میں تم نے اسے واقعی خوش اخلاق دیکھا ہو۔

بات دراصل یہ ہے کہ خوش اخلاقی کا جو برتاؤ صرف بدنامی کے خوف سے کیا جائے، وہ خوش اخلاقی ہی کہاں ہے؟ وہ تو ایک دکھاوا ہے، چنانچہ جب بدنامی کا خوف ٹلے گا، انسان کی بداخلاق اصلیت ظاہر ہو جائے گی۔ خوش اخلاقی تو ایک اندرونی صفت کا نام ہے جو نیک نامی اور بدنامی سے بے نیاز ہو کر کوئی اچھا عمل اس لئے کرتی ہے کہ وہ اچھا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہے۔ جب یہ صفت کسی شخص کو حاصل ہو جائے تو اس کا رویہ ہر جگہ اس صفت کے مطابق ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس جگہ بھی جہاں اسے کوئی دیکھ نہ رہا ہو، وہ اپنی پاکیزہ فطرت کے تحت وہی طرز عمل اختیار کرتا ہے جو اسے کرنا چاہئے، اور یہ حقیقت اس کے سامنے رہتی ہے کہ کوئی اور دیکھے یا نہ دیکھے، وہ ضرور دیکھ رہا ہے جس کے دیکھنے پر جنت اور جہنم کے فیصلے ہوتے ہیں۔

اسلام نے "صاحب بالجنب" یعنی تھوڑی دیر کے ساتھی کے حقوق کی جس باریک بینی سے دیکھ بھال کی ہے، اس کا اندازہ چند مثالوں سے لگایئے:

(۱) جمعہ کے دن جب مسجد میں لوگ خطبے اور نماز کے لئے جمع ہوں تو نووارد کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ اجتماع کے آخری حصے میں جہاں جگہ ملے بیٹھ جائے، لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے

(۱) النساء: ۳۶

بڑھنے کی کوشش کو سختی سے منع فرمایا گیا ہے، آنحضرت ﷺ نے اس عمل پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

(۲) جمعہ کے دن نہا دھو کر، اچھے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر مسجد میں جانے کی ترغیب دی گئی ہے، تاکہ اس بڑے اجتماع میں ہر شخص دوسرے کے لئے تکلیف کے بجائے فرحت اور راحت کا سبب بنے۔

(۳) فقہاء کرام رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ جو شخص کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس سے کسی پاس والے کو تکلیف ہو سکتی ہو، یا گھن آسکتی ہو، اس کے لئے جماعت کی نماز معاف ہے، اور اسے اپنے گھر ہی میں نماز پڑھنے پر انشاء اللہ مسجد کی جماعت کا ثواب ملے گا۔

(۴) جب چند افراد ساتھ بیٹھ کر کوئی چیز کھا رہے ہوں تو حکم یہ ہے کہ دوسروں کا خیال رکھ کر کھاؤ۔ حدیث میں ہے کہ جب دوسرے لوگ ایک ایک کھجور لے کر کھا رہے ہوں تو تم دو دو کھجوریں مت لو۔ اس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ صرف اپنی اپنی فکر کرنا اور جو ہاتھ لگے لے اُڑنا ایک مؤمن کا شیوہ نہیں، یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کچھ اور لوگ بھی تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہیں، تمہارا حصہ پوری طرح ناپ تول کر نہ سہی، لیکن دوسروں کے ساتھ کسی توازن ہی میں ہونا چاہئے۔ (آج کل بوفے قسم کی دعوتوں میں بعض مرتبہ جو چھینا جھپٹی نظر آتی ہے، اور جس طرح بعض لوگ یکبارگی ضرورت سے زیادہ چیزیں اپنے برتن میں اُنڈیل لیتے ہیں وہ ان احکام کی صریح خلاف ورزی ہے)

یہ چند مثالیں میں نے صرف یہ بتانے کے لئے دی ہیں کہ اسلامی تعلیمات میں "صاحب بالجنب" یا تھوڑی دیر کے ساتھی کی کتنی اہمیت ہے، اس اہمیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے معاشرے کے چند جزوی مسائل پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

جہاں بہت سے لوگوں کو باری باری کوئی کام انجام دینا ہو، وہاں فطری طریقہ یہی ہے کہ آنے والوں کی ترتیب سے ایک قطار بنالی جائے، اور ہر شخص نمبروار اپنا کام انجام دیتا رہے۔ اس طرح سب کا فائدہ ہے، اور سب کا کام آسانی سے ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر (کسی معقول عذر کے بغیر) لائن توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرنا یا اس کے لئے دھینگا مشتی کرنا دوسروں کی شدید حق تلفی ہے، جو بداخلاقی اور ناشائستگی ہونے کے علاوہ گناہ بھی ہے۔

افسوس ہے کہ آج غیر مسلم تو میں اس بات کا لحاظ رکھتی ہیں، بلکہ ان کا مزاج ہی یہ بن چکا ہے کہ جہاں دو آدمی جمع ہوں گے فوراً آگے پیچھے ہو کر قطار بنالیں گے، لیکن ہم جو "صاحب بالجنب" کے بارے میں قرآن وسنت کی مذکورہ ہدایات کی روشنی رکھتے ہیں لائن توڑ کر آگے بڑھنے کو بہادری اور

جی داری کا ایک ہنر سمجھتے ہیں، اور یہ خیال تو شاید ہی کسی کو آتا ہو کہ میں کسی گناہ کا ارتکاب کر رہا ہوں۔

بس یا ریل میں ہر شخص نشست کا اتنا حصہ استعمال کرنے کا حقدار ہے جتنا ایک مسافر کیلئے گاڑی والوں کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے، اس میں ہمارے یہاں دو طرح کی شدید بے اعتدالیاں ہوتی ہیں۔

پہلی بے اعتدالی تو یہ ہے کہ جن گاڑیوں میں بکنگ نہیں ہوتی، ان میں جو شخص پہلے پہنچ گیا وہ بیک وقت کئی کئی نشستوں کی جگہ گھیر کر اس پر قبضہ جمالیتا ہے اور دوسرے مسافر کھڑے سفر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اب یہ کتنی بے انصافی کی بات ہے کہ آپ ایک ٹکٹ لے کر آرام سے لیٹے ہیں، اور دوسرا شخص اتنی ہی رقم کا ٹکٹ لے کر بیٹھنے سے بھی محروم ہے۔ میں نے اپنے بعض بزرگ علماء کے بارے میں تو یہاں تک سنا ہے کہ اگر گاڑی بالکل خالی پڑی ہوتی، اور دوسرے مسافر نہ ہوتے تب بھی وہ اپنی نشست سے زیادہ جگہ استعمال نہیں کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میں نے ایک نشست کا کرایہ دیا ہے، میں ایک ہی نشست کے استعمال کا حقدار ہوں، اس سے زیادہ کا نہیں۔ یقیناً یہ احتیاط و تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے، لیکن چونکہ گاڑی والوں کی طرف سے ایسے مواقع پر خالی جگہوں کے استعمال کی عموماً اجازت ہوتی ہے، اس لئے اس کو نا جائز نہیں کہا جا سکتا، مگر جہاں دوسرے مسافر کھڑے ہونے پر مجبور ہوں، وہاں زائد جگہ گھیرنے کا کوئی جواز نہیں۔

دوسری بے اعتدالی اس کے برعکس یہ ہوتی ہے کہ جو سیٹ چار آدمیوں کے بیٹھنے کے لئے مخصوص ہے اس میں پانچواں آدمی زبردستی اپنے آپ کو ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے، اور پہلے سے بیٹھے ہوئے آدمیوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ سمٹ کر اسے ضرور جگہ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ پہلے سے جائز اور بجا طور پر اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے، وہ تنگی اور دشواری کے ساتھ اپنا سفر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ایسے میں اگر وہ لوگ خود ایثار سے کام لیں، اور نووارد کو جگہ دیدیں تو بیشک یہ ان کی عالی ظرفی ہے، اور باعثِ ثواب ہے، لیکن کسی نووارد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انہیں اس عالی ظرفی پر مجبور کرے۔

چونکہ ہم نے دین کو صرف نماز روزے ہی کی حد تک محدود کر لیا ہے اس لئے اس قسم کی حرکتیں کرتے وقت یہ خیال بھی دل میں نہیں آتا کہ ہم کسی گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں، حالانکہ جس عمل سے بھی کسی دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہو، یا اسے بیجا تکلیف پہنچتی ہو، وہ حرام ہے، ایسا حرام کہ اس کا گناہ صرف توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا جب تک خود وہ شخص معاف نہ کرے جس کی حق تلفی کی گئی ہے۔

دیکھنے میں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن درحقیقت انہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے افراد اور قوموں کا مزاج بگڑتا ہے، اور جب کسی معاشرے کا مزاج بگڑ جائے تو وہی کچھ ہوتا ہے جس کا رونا آج ہم سب رو رہے ہیں۔ پھر فائدہ کسی کا نہیں ہوتا، نقصان سب کا ہوتا ہے۔ راحت کسی کو نصیب نہیں ہوتی، تکلیف میں سب مبتلا رہتے ہیں۔

اس کے برعکس اگر ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں یہ سوچ لیں کہ جس شخص کے ساتھ ہمیں کچھ دیر کی رفاقت میسر آئی ہے، اس کو آرام پہنچانے کی خاطر اگر ہم خود تھوڑی سی تکلیف اُٹھالیں تو یہ تکلیف تو زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں کی ہے، جو بہت جلد ختم ہو جائے گی، لیکن ہمارے ایثار کا نقش ہمارے ساتھی کے دل سے جلدی نہیں مٹے گا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا، اور ہماری یہ تھوڑی سی محنت انشاء اللہ وہاں جا کر کیش ہوگی، جہاں روپے پیسے کا کیش بیکار ہو چکا ہوگا، تو رفتہ رفتہ ہمارا معاشرے کا مزاج بھی بدل سکتا ہے، اور ہم ایک دوسرے کے لئے سراپا رحمت بن سکتے ہیں۔

۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ

۸/ اکتوبر ۱۹۹۵ء

ہر خبر کی تحقیق ضروری ہے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۃ حجرات کی تفسیر کا بیان کئی جمعوں سے چل رہا ہے، جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری معاشرتی زندگی سے متعلق بڑی اہم ہدایات عطا فرمائی ہیں، اسی سورۃ کی ایک آیت ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو! اگر کوئی گناہ گار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تم ذرا ہوشیاری سے کام لو، یعنی ہر شخص کی ہر بات پر اعتماد کر کے کوئی کاروائی نہ کرو، ہوشیاری سے کام لینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تحقیق کرو کہ یہ خبر واقعی سچی ہے یا نہیں؟ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو ہو سکتا ہے کہ نادانی میں کچھ لوگوں کو تم نقصان پہنچا دو، اور بعد میں تمہیں اپنے فعل پر ندامت اور شرمساری ہو کہ ہم نے یہ کیا کر دیا۔ یہ آیت کریمہ کا ترجمہ ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات پر بھروسہ کر کے کوئی کاروائی نہ کیا کرے، بلکہ جو خبر ملے جب تک اس خبر کی پوری تحقیق نہ ہو جائے، اور جب تک وہ خبر صحیح ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک اس خبر کی بنیاد پر نہ کوئی بات کہنا جائز ہے اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی کاروائی کرنا جائز ہے۔

آیت کا شانِ نزول

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتِ کریمہ ایک خاص واقعہ کے پسِ منظر میں نازل ہوئی تھی، جس کو اصطلاح میں ''شانِ نزول'' کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ عرب میں ایک قبیلہ ''بنو مصطلق'' کے نام سے آباد تھا۔ بنو مصطلق کے سردار حارث بن ضرار جن کی بیٹی جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/ ۲۶۸-۲۸۴)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) الحجرات: ٦

اُمہات المؤمنین میں سے ہیں، وہ خود اپنا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی، اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا۔ میں نے اسلام قبول کرلیا، اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اقرار کرلیا، اور میں نے عرض کیا کہ میں اپنی قوم میں واپس جا کر ان کو بھی اسلام کی اور ادائے زکوٰۃ کی دعوت دوں گا۔ جو لوگ میری بات مان لیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے، ان کی زکوٰۃ جمع کرلوں گا، آپ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ تک اپنا کوئی قاصد بھیج دیں تا کہ زکوٰۃ کی جو رقم میرے پاس جمع ہو جائے، وہ ان کے سپرد کردوں۔

قاصد کے استقبال کے لئے بستی سے باہر نکلنا

حسب وعدہ جب حضرت حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ نے ایمان لانے والوں کی زکوٰۃ جمع کرلی، اور وہ مہینہ اور وہ تاریخ جو قاصد بھیجنے کے لئے طے ہوئی تھی گزر گئی، اور آپ کا کوئی قاصد نہ پہنچا تو حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ شاید حضور اقدس ﷺ ہم سے کسی بات پر ناراض ہیں، ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ وعدے کے مطابق اپنا آدمی نہ بھیجتے۔ حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے اس خطرہ کا ذکر اسلام قبول کرنے والوں کے سرداروں سے کیا، اور ارادہ کیا کہ یہ سب حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ قبیلہ ''بنو مصطلق'' کے لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ فلاں تاریخ کو حضور ﷺ کا قاصد آئے گا، اس لئے اس تاریخ کو یہ حضرات تعظیماً بستی سے باہر نکلے کہ قاصد کا استقبال کریں۔

حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا واپس جانا

دوسری طرف یہ واقعہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے مقررہ تاریخ پر حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو اپنا قاصد بنا کر زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیج دیا تھا، مگر حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو راستے میں یہ خیال آیا کہ اس قبیلے کے لوگوں سے میری پرانی دشمنی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ مجھے قتل کرڈالیں۔ چونکہ وہ لوگ ان کے استقبال کے لئے بستی سے باہر بھی نکلے تھے، اس لئے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو اور زیادہ یقین ہوگیا کہ یہ لوگ شاید پرانی دشمنی کی وجہ سے مجھے قتل کرنے آئے ہیں، چنانچہ آپ راستے ہی سے واپس ہوگئے، اور حضور اقدس ﷺ سے جا کر کہا کہ ان لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا ہے، اور میرے قتل کا ارادہ کیا، اس لئے میں واپس چلا آیا۔

تحقیق کرنے پر حقیقت واضح ہوئی

حضور اقدس ﷺ کو یہ سن کر غصہ آیا، اور آپ نے مجاہدین کا ایک لشکر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ ادھر سے مجاہدین کا لشکر روانہ ہوا، ادھر حضرت حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضری کے لئے روانہ ہوئے۔ جب آمنا سامنا ہوا تو حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ لوگ ہمارے اوپر کیوں چڑھائی کرنے آئے ہو۔ اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ سے ہماری بات یہ ہوئی تھی کہ تم میں سے کوئی شخص زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے آئے گا۔ لشکر والوں نے جواب دیا کہ زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے ایک شخص آیا تھا، لیکن آپ لوگوں نے اس پر حملہ کرنے کے لئے لشکر اکٹھا کرلیا۔ بنوالمصطلق کے لوگوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس کوئی آدمی نہیں آیا، اور نہ ہم نے لشکر اکٹھا کیا، بلکہ ہم لوگ اس خیال میں تھے کہ حضور اقدس ﷺ کا قاصد آنے والا ہے، اس لئے ہم لوگ روزانہ استقبال کرنے کے ارادے سے باہر نکل کر جمع ہوجاتے تھے۔ تب حقیقتِ حال کھلی، اور پھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے واپس آکر حضور اقدس ﷺ کو سارا واقعہ سنایا کہ یہ غلط فہمی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے یہ سارا قصہ ہوا۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

سنی سنائی بات پر یقین نہیں کرنا چاہئے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ اے ایمان والو! جب تمہارے پاس کوئی غیر ذمہ دار آدمی کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے اس کی تحقیق کرو، تحقیق کے بغیر اس خبر کی بنیاد پر کوئی کاروائی نہ کرو۔ اس واقعہ میں ساری غلط فہمی جو پیدا ہوئی، اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو کسی نے آکر بتادیا ہوگا کہ یہ لوگ تم سے لڑنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، اس لئے وہ راستے ہی سے واپس آگئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو یہ ہدایت دیدی کہ ایسا نہ ہو کہ جو بات کسی سے سن لی، بس اس پر یقین کرلیا، اور اس بات کو آگے چلتا کردیا، اور اس خبر کی بنیاد پر کوئی کاروائی شروع کردی، ایسا کرنا حرام ہے۔

افواہ پھیلانا حرام ہے

اس کو آج کل کی اصطلاح میں ''افواہ سازی'' کہتے ہیں، یعنی افواہیں پھیلانا۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ برائی اس طرح پھیل گئی ہے کہ ''الامان الحفیظ''۔ کسی بات کو آگے نقل

(۱) تفسیر ابن کثیر (٤/ ٢٦٥ - ٢٦٦)

کرنے میں، بیان کرنے میں احتیاط اور تحقیق کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا۔ بس کوئی اڑتی ہوئی بات کان میں پڑ گئی، اس کو فوراً آگے چلتا کر دیا۔ خاص طور پر اگر کسی سے مخالفت ہو، کسی سے دشمنی ہو، کسی سے سیاسی یا مذہبی مخالفت ہو، یا ذاتی مخالفت ہو تو اگر اس کے بارے میں ذرا سی بھی کہیں سے کان میں کوئی بھنک پڑ جائے گی، تو اس پر یقین کر کے لوگوں کے اندر اس کو پھیلانا شروع کر دیں گے۔

آج کل کی سیاست

آج کل سیاست کے میدان میں جو گندگی ہے، اس گندی سیاست میں یہ صورتِ حال ہو رہی ہے کہ اگر سیاست میں ہمارا کوئی مدمقابل ہے تو اس کے بارے میں افواہ گھڑنا اور اس کو بغیر تحقیق کے آگے چلتا کر دینا، اس کا آج کل عام رواج ہو رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں شخص نے اتنے لاکھ روپے لے کر اپنا ضمیر بیچا ہے، بغیر تحقیق کے الزام عائد کر دیا۔ یاد رکھئے! کوئی شخص کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، لیکن اس پر جھوٹا الزام عائد کرنے کا کوئی جواز نہیں، شرعاً ایسا کرنا حرام ہے۔

حجاج بن یوسف کی غیبت جائز نہیں

ایک مجلس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تشریف فرما تھے، کسی شخص نے اس مجلس میں حجاج بن یوسف کی برائی شروع کر دی۔ حجاج بن یوسف ایک ظالم حکمران کے طور پر مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے سینکڑوں بڑے بڑے علماء کو قتل کیا۔ کسی شخص نے اس مجلس میں حجاج بن یوسف پر الزام عائد کیا کہ اس نے یہ کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سوچ سمجھ کر بات کرو، یہ مت سمجھنا کہ اگر حجاج بن یوسف ظالم و جابر ہے تو اس کی غیبت کرنا حلال ہو گیا، یا اس پر بہتان باندھنا حلال ہو گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ حجاج بن یوسف سے سینکڑوں انسانوں کے خون کا بدلہ لے گا جو اس کی گردن پر ہیں تو تم سے بھی اس کا بدلہ لے گا کہ تم نے اس کے بارے میں جھوٹی بات کہی۔ یہ مت سمجھنا کہ اگر وہ ظالم ہے تو جو چاہو اس کے بارے میں جھوٹ بولتے رہو، اس پر جو چاہو الزام تراشی کرتے رہو، تمہارے لئے یہ حلال نہیں۔

سنی ہوئی بات آگے پھیلانا جھوٹ میں داخل ہے

بہرحال! کسی بھی شخص کے بارے میں کوئی بات بغیر تحقیق کے کہہ دینا یہ اتنی بڑی بیماری ہے جس سے پورے معاشرے میں بگاڑ اور فساد پھیلتا ہے، دشمنیاں جنم لیتی ہیں، عداوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن کریم یہ کہہ رہا ہے کہ جب بھی تمہیں کوئی خبر ملے تو پہلے اس خبر کی تحقیق کر لو۔ ایک

حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ))(۱)

یعنی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو بات سنے اس کو آگے بیان کرنا شروع کردے۔ لہٰذا جو آدمی ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے آگے بیان کرنے لگے تو وہ بھی جھوٹا ہے، اس کو جھوٹ بولنے کا گناہ ہوگا۔ جب تک تحقیق نہ کرلو، بات کو آگے بیان نہ کرو۔

پہلے تحقیق کرو، پھر زبان سے نکالو

افسوس یہ ہے کہ آج ہمارا معاشرہ اس گناہ کے اندر ڈوبا ہوا ہے۔ ایک شخص کی بات آگے نقل کرنے میں کوئی احتیاط نہیں، بلکہ اپنی طرف سے اس میں نمک مرچ لگا کے اضافہ کر کے اس کو آگے بڑھا دیا۔ دوسرے شخص نے جب سنا تو اس نے اپنی طرف سے اور اضافہ کر کے آگے چلتا کردیا۔ بات ذرا سی تھی، مگر وہ پھیلتے پھیلتے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس کے نتیجے میں دشمنیاں، عداوتیں، لڑائیاں، قتل و غارت گری اور نفرتیں پھیل رہی ہیں۔ بہرحال! قرآن کریم ہمیں یہ سبق دے رہا ہے کہ یہ زبان جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہے، یہ اس لئے نہیں دی کہ اس کے ذریعہ تم جھوٹی افواہیں پھیلاؤ، اس لئے نہیں دی کہ اس کے ذریعہ تم لوگوں پر الزام اور بہتان عائد کیا کرو، بلکہ تمہارا فرض ہے کہ جب تک کسی بات کی مکمل تحقیق نہ ہوجائے، اس کو زبان سے نہ نکالو۔ افسوس ہے کہ آج ہم لوگ باری تعالیٰ کے اس حکم کو فراموش کیے ہوئے ہیں، اور اس کے نتیجے میں ہم طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس برائی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

افواہوں پر کان نہ دھریں

انسانوں کے کانوں میں مختلف اوقات میں مختلف باتیں پڑتی رہتی ہیں، کسی نے آکر کوئی خبر دیدی، کسی نے کوئی خبر سنادی، کسی نے کچھ کہہ دیا، اگر آدمی ہر بات کو سچ سمجھ کر اس پر کاروائی کرنا شروع کردے تو سوائے فتنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا، چنانچہ ایک اور موقع پر ایسا ہوا تھا کہ منافقین مختلف قسم کی افواہیں پھیلاتے رہتے تھے، چنانچہ مسلمان سادہ لوحی میں ان کی باتوں کو سچ سمجھ کر کوئی کاروائی شروع کردیتے تھے، اس پر قرآن کریم کی ایک اور آیت نازل ہوئی، جس میں فرمایا:

---

(۱) صحیح مسلم، المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع، رقم: ٦، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في التشديد في الكذب، رقم: ٤٣٤٠۔

﴿وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾(۱)

یعنی منافقین کا کام یہ ہے کہ ذرا سی کوئی افواہ کان میں پڑی، چاہے وہ حالتِ امن ہو، یا حالتِ جنگ ہو، بس فوراً اس کی نشر و اشاعت شروع کر دیتے ہیں، اور اپنی طرف سے اس میں نمک مرچ لگا کر اس کو روانہ کر دیتے ہیں، جس سے فتنہ پھیلتا ہے۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب اس قسم کی کوئی خبر آپ تک پہنچے تو اس پر بھروسہ کرنے کے بجائے اللہ کے رسول ﷺ کو اور دوسرے ذمہ دار افراد کو بتاؤ کہ یہ خبر پھیل رہی ہے، اس میں کون سی بات سچ ہے، اور کون سی بات غلط ہے، اس کی تحقیق کریں، اور تحقیق کے بعد کوئی فیصلہ کریں، نہ یہ کہ خود سے اس پر کارروائی شروع کر دیں۔ یہ ایک عظیم ہدایت ہے جو قرآن کریم نے عطا فرمائی ہے۔

جس سے شکایت پہنچی ہو اس سے پوچھ لیں

افسوس یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس ہدایت کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں فتنے پھیلے ہوئے ہیں، لڑائیاں ہیں، جھگڑے ہیں، عداوتیں ہیں، بغض اور کینہ ہے، ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی ہے۔ اگر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ان سب کی بنیاد غلط افواہیں ہوتی ہیں۔ خاندان والوں میں یا ملنے جلنے والوں میں سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ تمہارے بارے میں فلاں شخص یہ کہہ رہا تھا۔ اب آپ نے اس کی بات سن کر یقین کر لیا کہ اچھا فلاں شخص نے میرے بارے میں یہ کہا ہے۔ اب اس کی بنیاد پر اس کی طرف سے دل میں دشمنی، بغض، کینہ پیدا ہو گیا کہ وہ تو میرے بارے میں یہ کہہ رہا تھا۔ حالانکہ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اگر کسی بھائی کی طرف سے شکایت کی کوئی بات پہنچی ہے تو براہِ راست اس سے جا کر پوچھ لے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ نے میرے بارے میں یہ بات فرمائی تھی، کیا یہ بات صحیح ہے یا غلط ہے؟ اب صحیح بات کھل کر سامنے آ جائے گی۔

باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا

آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ لوگ ایک کی بات دوسرے تک پہنچانے میں بالکل احتیاط

---

(۱) النساء: ۸۳، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ”اور جب ان کو کوئی بھی خبر پہنچتی ہے، چاہے وہ امن کی ہو یا خوف پیدا کرنے والی، تو یہ لوگ اسے (تحقیق کے بغیر) پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ اس (خبر) کو رسول کے پاس یا اصحابِ اختیار کے پاس لے جاتے تو ان میں سے جو لوگ اس کی کھوج نکالنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے“

سے کام نہیں لیتے۔ اگر ذرا سی بات ہو تو اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے اس کے اندر اضافہ اور مبالغہ کر دیتے ہیں۔ میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک صاحب نے مجھ سے مسئلہ پوچھا کہ ٹیپ ریکارڈر پر قرآن کریم کی تلاوت سننے سے ثواب ملتا ہے یا نہیں؟ میں نے جواب دیا: چونکہ قرآن کریم کے الفاظ پڑھے جا رہے ہیں تو انشاء اللہ، اللہ کی رحمت سے اس کو سننے سے بھی ثواب ملے گا، البتہ براہِ راست پڑھنے اور سننے سے زیادہ ثواب ملے گا۔ اب اس شخص نے جا کر کسی اور کو بتایا ہوگا، دوسرے نے تیسرے کو بتایا ہوگا، تیسرے شخص نے چوتھے کو بتایا ہوگا، یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا، اس میں لکھا تھا کہ یہاں ہمارے محلہ میں ایک صاحب تقریر میں یہ بات کہہ رہے ہیں کہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ ٹیپ ریکارڈر پر تلاوت سننا ایسا ہے جیسے ٹیپ ریکارڈر پر گانا سننا۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ بات کیا تھی، اور ہوتے ہوتے کہاں تک پہنچی، اور پھر برملا تقریر کے اندر یہ بات میری طرف منسوب کر دی کہ میں نے ایسا کہا ہے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ میں نے یہ بات کہی ہے۔

تُلی ہوئی بات زبان سے نکلے

بہر حال! لوگوں میں بات نقل کرنے میں احتیاط ختم ہو چکی ہے، جبکہ مسلمان کا کام یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلے وہ ترازو میں تُلی ہوئی ہو، نہ ایک لفظ زیادہ ہو، نہ ایک لفظ کم ہو۔ خاص طور پر اگر آپ دوسرے کی کوئی بات نقل کر رہے ہوں تو اس میں تو اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اگر آپ اس کے اندر اپنی طرف سے کوئی بات بڑھائیں گے تو دوسرے پر بہتان ہوگا، جس میں دوہرا گناہ ہے۔

حضرات محدثین رحمۃ اللہ علیہم کی احتیاط

قرآن کریم یہ کہہ رہا ہے کہ جب تم نے کسی شخص سے کوئی بات سنی ہو، اور حالات ایسے ہیں کہ لوگ بات نقل کرنے میں احتیاط نہیں کر رہے ہیں تو ایسے حالات میں تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، یہ نہ ہو کہ جو بات سنی اس کو آگے چلتا کر دیا۔ حضرات محدثین جنہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث محفوظ کر کے ہم تک پہنچائی ہیں، انہوں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نقل کرنے میں اتنی احتیاط کی ہے کہ اگر ذرا سا بھی الفاظ میں فرق ہو جائے تو روایت نہیں کرتے تھے، بلکہ یہ فرماتے تھے کہ اتنی بات ہمیں یاد ہے، اتنی بات ہمیں یاد نہیں، حالانکہ معنی ایک ہی ہیں، لیکن پھر بھی فرماتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ کہا تھا، یا یہ لفظ کہا تھا۔

ایک محدث رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

آپ نے سنا ہوگا کہ محدثین رحمہم اللہ جب کوئی حدیث روایت کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "حَدَّثَنَا فُلَانٌ" یعنی ہمیں فلاں نے یہ حدیث سنائی۔ ایک مرتبہ ایک محدث رحمۃ اللہ علیہ جب حدیث بیان کر رہے تھے تو "حَدَّثَنَا فُلَانٌ" کے بجائے "ثَنَا فُلَانٌ" کہہ رہے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ "ثَنَا فُلَانٌ" کا کوئی مطلب اور معنی نہیں ہے، آپ "حَدَّثَنَا فُلَانٌ" کیوں نہیں کہتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں جب استاد کے درس میں پہنچا تو اس وقت میں نے استاد کی زبان سے "ثَنَا فُلَانٌ" کا لفظ سنا تھا، شروع کا لفظ "حَدَّ" میں نہیں سن سکا تھا، اس لئے میں "ثَنَا فُلَانٌ" کے الفاظ سے حدیث سنا رہا ہوں۔ حالانکہ یہ بات بالکل یقینی تھی کہ استاد نے "حَدَّثَنَا" ہی کہا تھا، صرف "ثَنَا" نہیں کہا تھا، لیکن چونکہ اپنے کانوں سے صرف "ثَنَا" سنا تھا، "حَدَّ" کا لفظ نہیں سنا تھا، اس لئے جب روایت کرتے تو "حَدَّثَنَا" نہیں کہتے، تاکہ جھوٹ نہ ہو جائے، بس جتنا سنا، اتنا ہی آگے بیان کروں گا۔ اس احتیاط کے ساتھ حضرات محدثین نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ احادیث ہم تک پہنچائی ہیں۔

حدیث کے بارے میں ہمارا حال

آج ہمارا یہ حال ہے کہ نہ صرف عام باتوں میں بلکہ حدیث کی روایت میں بھی احتیاط نہیں کرتے۔ حدیث کے الفاظ کچھ تھے، لیکن لوگ یہ کہہ کر بیان کر دیتے ہیں کہ ہم نے یہ سنا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا، حالانکہ اس حدیث کا کہیں سراغ نہیں ملتا، اور تحقیق کے بغیر آگے بیان کر دیتے ہیں۔

حکومت پر بہتان لگانا

آج سیاسی پارٹیوں میں اور مذہبی فرقہ داریوں میں یہ بات عام ہوگئی ہے کہ ایک دوسرے پر بہتان لگانے میں کوئی باک اور ڈر محسوس نہیں کرتے۔ بس ذرا سی کوئی بات سنی اور آگے چلتی کر دی۔ اگر حکومت سے ناراضگی ہے، اور حکومت کے خلاف چونکہ طبیعت میں اشتعال ہے، لہٰذا اس کے خلاف جو خبر آئے، اس کو آگے پھیلا دو، اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں کہ وہ صحیح ہے، یا غلط ہے۔
یاد رکھئے! حکمرانوں کے اندر ہزاروں برائیاں موجود ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس پر بہتان لگانا شروع کر دو۔ افسوس یہ ہے کہ یہی معاملہ آج حکومت عوام کے ساتھ کر رہی ہے۔ حکومت کے ایک بڑے ذمہ دار حکمران، جو پورے ملک کے ذمہ دار ہیں، ان کو لوگوں پر بہتان لگانے میں کوئی

باک محسوس نہیں ہوتی۔

دینی مدارس کے خلاف دہشت گرد ہونے کا پروپیگنڈا

آج پروپیگنڈا ایک مستقل فن اور ہنر بن چکا ہے۔ جرمنی کا ایک سیاسی فلسفی گزرا ہے، اس نے یہ فلسفہ پیش کیا تھا کہ جھوٹ کو اتنی شدت سے پھیلاؤ کہ دنیا اس کو سچ سمجھنے لگے۔ آج دنیا میں سارے پروپیگنڈے کا ہنر اس فلسفے کے گرد گھوم رہا ہے۔ جس پر جو چاہو بہتان لگا کر اس کے بارے میں پروپیگنڈا شروع کردو۔ آج دنیا میں یہ پروپیگنڈا شروع ہوگیا ہے کہ یہ دینی مدارس دہشت گرد ہیں، اور ان میں طلباء کو دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے، یہاں سے دہشت گرد پیدا ہوتے ہیں۔ آج اس پروپیگنڈے کو تین سال ہو چکے ہیں، اور عوام نہیں، بلکہ حکومت کے ذمہ دار لوگ برملا یہ کہتے ہیں کہ مدارس کے اندر دہشت گردی ہورہی ہے۔ مدارس کے حضرات نے ان سے کئی مرتبہ کہا کہ خدا کے لئے مدارس کے اندر آکر دیکھو، تمہارے پاس ہتھیاروں کو پکڑنے کے حساس ترین آلات موجود ہیں، اور دہشت گردی کے سراغ رسانی کے حساس ترین آلات موجود ہیں، وہ سب استعمال کر کے دیکھو کہ کسی مدرسے میں دہشت گردی کا سراغ ملتا ہے! اگر کسی مدرسے میں سراغ ملے تو ہماری طرف سے کھلی چھوٹ ہے کہ اس کے خلاف کاروائی کریں، اور ہم بھی تمہارے ساتھ اس کے خلاف کاروائی کرنے میں تعاون کریں گے۔ مگر یہ رٹ لگی ہوئی ہے کہ یہ مدارس دہشت گرد ہیں، اور پروپیگنڈے کی بنیاد پر سارے دینی مدارس کو جہاں اللہ اور اللہ کے رسول کے کلام کی تعلیم ہورہی ہے، ان کو دہشت گرد قرار دیدینا، اور مغرب کے پروپیگنڈے کو آگے بڑھانا کہاں کا انصاف اور کہاں کی دیانت ہے؟

دینی مدارس کا معائنہ کرلو

تعلیمی اداروں میں بھی جرائم پیشہ لوگ گھس آتے ہیں، کیا یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جرائم پیشہ لوگ نہیں ہوتے؟ ایسی صورت میں ان جرائم پیشہ افراد کے خلاف کاروائی کی جاتی ہے، یہ تو نہیں کہا جاتا کہ ساری یونیورسٹیاں دہشت گرد ہیں، اور سارے کالجز جرائم پیشہ ہیں۔ لیکن چونکہ مغرب کی طرف سے یہ پروپیگنڈا اس اصول کی بنیاد پر ہورہا ہے کہ جھوٹ اس شدت سے پھیلاؤ کہ دنیا اس کو سچ جاننے لگے، آج دینی مدارس اور دہشت گردی کو اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مرادف ہوگئے۔ قرآن کریم کا کہنا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ناواقفیت میں کسی قوم کو خواہ مخواہ نقصان پہنچادو، بعد میں تمہیں شرمندہ ہونا پڑے، اس لئے پہلے تحقیق کرلو۔ تحقیق کرنے کے تمام آلات اور وسائل تمہیں مہیا ہیں، آکر دیکھ لو۔ اور دینی مدارس پر الزام لگانے والے وہ ہیں جنہوں نے آج تک

دینی مدارس کی شکل نہیں دیکھی، آکر دیکھا نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے، وہاں کیا پڑھایا جارہا ہے؟ کس طرح تعلیم دی جارہی ہے، لیکن مدارس کے خلاف پروپیگنڈا جاری ہے، اور جو بند ہونے کا نام نہیں لیتا۔

غلط مفروضے قائم کر کے بہتان لگانا

لندن والوں نے کہہ دیا کہ یہاں جو دھماکے ہوئے ہیں، اس میں ایسا شخص ملوث ہے، جس نے یہاں کے مدارس میں کچھ دن قیام کیا تھا۔ ارے بھائی وہ شخص وہیں پلا بڑھا، اور وہیں پر برطانیہ میں کسی دینی مدرسے میں نہیں بلکہ برطانیہ کے ماڈرن تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کی، اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ چند روز کے لئے پاکستان آیا تھا، تو کیا پاکستان آنے سے یہ لازم ہو گیا کہ اس نے ضرور دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی ہوگی، اور اس نے یہاں ضرور دہشت گردی کی تربیت پائی ہوگی۔ اس بنیاد پر مفروضے قائم کر لینا، اور اس بنیاد پر یہ نادر شاہی حکم نافذ ہو گیا کہ جتنے غیر ملکی طلباء دینی مدارس میں پڑھتے ہیں، ان کو ملک سے رخصت کر دیا جائے۔

پہلے خبر کی تحقیق کرلو

میرے بھائیو! یہ ہمارے معاشرے کا ایک ایسا مسئلہ ہے کہ عوام ہو، یا حکومت ہو، سیاسی جماعتیں ہو، یا مذہبی فرقہ واریت ہو، سب اس میں مبتلا ہیں کہ ذرا افواہ کی کوئی بات کان میں پڑی، اس پر نہ صرف یہ کہ یقین کر لیا، بلکہ اس کو آگے پھیلایا، اور اس کی بنیاد پر کاروائی شروع کر دی، اور اس کے نتیجے میں ظلم وستم کی انتہاء کر دی گئی۔ جبکہ قرآن کریم نے اس آیت میں یہ پیغام دیا ہے کہ اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی غیر ذمہ دار شخص کوئی خبر لے کر آتا ہے تو پہلے اس کی تحقیق کرلو، ایسا نہ ہو کہ تم ناواقفیت سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچادو، بعد میں تم لوگوں کو ندامت اور شرمندگی اٹھانی پڑے۔ اگر ہم قرآن کریم کے اس حکم کو پلے باندھ لیں، اور زندگی کے ہر گوشے میں اس کو استعمال کریں تو یقیناً ہمارے معاشرے کے تو ے فیصد جھگڑے ختم ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں قرآن کریم کی اس ہدایت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

حق کی بنیاد پر دوسرے کا ساتھ دو ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ إِلَى أَمْرِ اللّٰهِ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ○ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ○﴾(۱)

بزرگانِ محترم وبرادرانِ عزیز! ابھی میں نے آپ حضرات کے سامنے سورۃ حجرات کی دو آیتیں تلاوت کیں۔ سورۃ حجرات کی تفسیر کا سلسلہ پچھلے چند ماہ سے چل رہا ہے۔ درمیان میں وقتی مسائل کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ دو آتیں میں نے تلاوت کیں، پہلے ان کا ترجمہ عرض کرتا ہوں، اس کے بعد اس کی تھوڑی سی تشریح عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رضا کے مطابق بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان لڑائی ہو جائے تو دوسرے مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ وہ ان کے درمیان صلح کرائیں۔ یعنی ایسی صورت میں جب مسلمانوں کے دو گروہ باہم ٹکرا گئے ہوں، اور ان کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی ہو تو پہلا کام جو دوسرے مسلمانوں کے ذمہ ضروری ہوتا ہے، وہ یہ کہ ان دونوں گروہوں کے درمیان بیچ بچاؤ کرا کر صلح کرائے، اور حتی الامکان ان کو لڑائی سے بچانے کی کوشش کرے۔ اگر اس طرح کام چل جائے تو بہت اچھا ہے، مقصود حاصل ہے۔

ورنہ مظلوم کا ساتھ دو

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِنْ بَغَتْ إِحْدٰهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ إِلَى أَمْرِ اللّٰهِ﴾(۲)

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/۳۰۸ تا ۳۱۸)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) الحجرات: ۹-۱۰ (۲) الحجرات: ۹

یعنی اگر کہنے سننے سے لڑائی بند نہ ہو، اور صلح کی کوئی صورت نظر نہ آرہی ہو تو پھر اس وقت یہ دیکھو کہ ان میں سے کون مظلوم ہے اور کون ظالم ہے؟ کون زیادتی کر رہا ہے اور کون زیادتی کا شکار ہو رہا ہے؟ اگر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے ایک گروہ زیادتی کر رہا ہے، اور ظلم کا ارتکاب کر رہا ہے تو ایسی صورت میں تمہارا فرض ہے کہ مظلوم کا ساتھ دو، اور ظالم کے خلاف تم بھی قتال کرو، اور اس سے لڑائی کرو۔ یعنی جب صلح کی کوشش کارگر نہ ہو تو ہر مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ ظالم کا ہاتھ پکڑے، اور مظلوم کا ساتھ دے، اور اس وقت تک ظالم سے لڑتے رہو جب تک وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ کر نہ آجائے۔

نسل یا زبان کی بنیاد پر ساتھ مت دو

یہاں پر دو باتیں احادیث کی روشنی میں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کریم نے سارا دارومدار اس پر رکھا ہے کہ یہ دیکھو کہ کون برحق ہے، اور کون ناحق ہے، اور کون ظالم ہے، کون مظلوم ہے۔ اس بنیاد پر کسی کا ساتھ مت دو کہ یہ میرا ہم وطن ہے، یا میرا ہم زبان ہے، یا میری جماعت سے تعلق رکھتا ہے، اس بنیاد پر ساتھ مت دو، بلکہ ساتھ دینا ہو، یا لڑائی کرنی ہو، یہ دونوں اس بنیاد پر ہونے چاہئیں کہ کون ظالم ہے، اور کون مظلوم ہے۔ زمانہ جاہلیت سے ذہنوں میں جو تصور چلا آتا ہے، اور افسوس یہ ہے کہ وہ آج بھی مسلمانوں کے درمیان موجود ہے، وہ یہ کہ جو شخص میرے قبیلے کا ہے، وہ میرا ہے، جو میری زبان بولتا ہے، وہ میرا ہے، مجھے ہر قیمت پر اس کا ساتھ دینا ہے، یہ دیکھے بغیر کہ ظالم ہے، یا مظلوم ہے، وہ حق پر ہے، یا ناحق ہے، یہ تصور جاہلیت کا تصور ہے، جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں نے آج اس تصور کو اپنے پاؤں کے نیچے روند دیا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ آج بھی ہماری صفوں میں یہ صورتِ حال موجود ہے کہ لوگوں نے اپنی زبان کے اعتبار سے، اپنی نسل کے اعتبار سے، اور اپنے وطن کے اعتبار سے گروہ بنائے ہوئے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہر قیمت پر اس کا ساتھ دینا ہے۔

ایسے معاہدے کی اجازت نہیں

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

((لَا حِلْفَ فِي الْإِسْلَامِ))(۱)

یعنی زمانہ جاہلیت میں مختلف قبائل کے درمیان جو معاہدے ہوتے تھے کہ ہم ہر قیمت پر تمہارا

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحوالات، باب قول اللہ تعالی والذین عاقدت أیمانکم فآتوهم، رقم: ۲۱۳۰، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب مؤاخاة النبی بین أصحابه، رقم: ۴۵۹۳، سنن أبی داؤد، کتاب الفرائض، باب فی الحلف، رقم: ۲۵۳۶، مسند أحمد، رقم: ۱۵۶۷۔

ساتھ دیں گے، اسلام میں ایسے معاہدوں کی کوئی گنجائش نہیں ۔ ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ حق اور ناحق کو دیکھے، اور ظالم اور مظلوم کو پہچانے ۔ اگر تم دیکھو کہ مسلمان ظلم کر رہا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اس ظلم سے اس کا ہاتھ روکنے کی کوشش کرو۔

ظالم کو ظلم سے روکو

ایک طرف تو یہ اصول بیان فرمایا کہ ظالم کا ساتھ مت دو، بلکہ مظلوم کا ساتھ دو، چاہے وہ ظالم تمہارے قبیلے کا ہو، تمہارے وطن کا ہو، تمہاری زبان بولنے والا ہو۔ لیکن یہ اصول بیان کرنے کے بعد ایک دن حضور ﷺ نے یہ عجیب جملہ ارشاد فرمایا:

((أُنصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا))(۱)

اپنے بھائی کی مدد کرو، اگر ظالم ہو تب بھی مدد کرو، اگر مظلوم ہو تب بھی مدد کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ سن کر بڑے حیران ہوئے، اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے کہ مظلوم کی مدد کریں، لیکن ظالم کی مدد کا کیا مطلب ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکو۔

چونکہ وہ ظلم کرنے کی وجہ سے جہنم کی طرف جا رہا ہے، اپنی آخرت برباد کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ کا غضب اپنے سر لے رہا ہے۔ اب اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکو، اور اس کو یہ بتاؤ کہ تم جس راستے کی طرف جا رہے ہو، یہ ظلم کا راستہ ہے، اور دوزخ کا راستہ ہے، اس سے بچو۔ اصل مدد یہی ہے کہ انسان کو جہنم میں جانے سے روکا جائے، اللہ کے عذاب اور غضب سے روکا جائے۔

دونوں کے درمیان صلح کرادو

اس آیت کریمہ نے جو اصول بیان فرمایا، وہ یہ ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ کون ظالم ہے، اور کون مظلوم ہے، اور اگر ظالم اپنے ظلم سے باز نہیں آتا تو تمہارا فرض ہے کہ اس سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ آگے فرمایا کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، یعنی تمہاری بات مان کر ظلم چھوڑ دے تو اس صورت میں ان دونوں فریقوں کے درمیان صلح کراؤ۔ جب

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغصب، باب أعن أخاك ظالمًا أو مظلومًا، رقم: ۲۲۶۳، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب نصر الأخ ظالمًا أو مظلومًا، رقم: ۴۶۸۱، سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول الله، باب ما جاء فی النهی عن سب الرياح، رقم: ۲۱۸۱، مسند أحمد، رقم: ۱۱۵۱۱

ظالم نے ہتھیار تو ڈال دیئے اور ظلم سے تو باز آ گیا، لیکن دونوں فریقوں کے دلوں میں ابھی تک کدورت باقی ہے، اس کدورت کو دور کرنے کے لئے انصاف کے ساتھ ان کے درمیان مصالحت کرا دو۔ اس لئے کہ جب دو فریقوں میں لڑائی ہوتی ہے، اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں تو اگرچہ مجموعی طور پر ایک گروہ برحق ہوتا ہے، اور دوسرا ناحق ہوتا ہے، لیکن لڑائی کے وقت دونوں کی طرف سے کچھ نہ کچھ زیادتیاں ہو جاتی ہیں، اس لئے کہ مثل مشہور ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ جو شخص مظلوم ہے اس کی طرف سے بھی کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہوئی ہوگی، جس کی وجہ سے لڑائی تک نوبت پہنچ گئی۔ لہٰذا جب ظالم اپنے ظلم سے باز آ گیا تو اب ہر ایک فریق کو انصاف کے ساتھ اس کی غلطی بتانے کی کوشش کرو کہ تمہارا یہ موقف درست تھا، لیکن فلاں بات غلط تھی، آئندہ کے لئے فلاں بات سے پرہیز کرنا، اس لئے آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صلح کرانے میں انصاف سے کام لو، بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ یہ اصول تو پہلی آیت میں بیان فرما دیا۔

اسلامی اخوت کی بنیاد ایمان پر ہے

اس کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس سے بڑا اصول بیان فرمایا:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ﴾

سارے مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں، جو شخص بھی اللہ پر اور اللہ کے رسول محمد ﷺ پر ایمان رکھتا ہے، اللہ کی کتابوں پر، اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ تمہارا بھائی ہے۔ اس کے ذریعے یہ اصول بتا دیا کہ اسلام میں جو اخوت اور بھائی چارہ ہے، وہ درحقیقت ایمان اور عقیدے کی بنیاد پر ہے، رنگ، نسل، وطن، قبیلے اور برادری کی بنیاد پر نہیں۔ حضورِ اقدس ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی نخوتیں اور فخر و غرور کے سامان سب ختم کر دیئے'' اور فرمایا:

((لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِأَبْيَضَ عَلٰى أَسْوَدَ إِلَّا بِالتَّقْوٰى))(۱)

کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فوقیت نہیں ہے، نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فوقیت حاصل ہے، اگر کسی کو فضیلت ہے تو وہ صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔

جو زیادہ متقی ہے، وہ افضل ہے، چاہے وہ ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتا ہو، اور جو متقی نہیں ہے، وہ دوسروں کے مقابلے میں کمتر ہے، چاہے بظاہر دیکھنے میں اس کی شان و شوکت زیادہ نظر آتی ہو۔ یہ اصول بیان فرما دیا۔

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۲۲۳۹۱

مسلمان کو بے یارومددگار مت چھوڑو

جب یہ اصول بیان فرمادیا کہ سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں، تو اس اصول کا نتیجہ خود حضور ﷺ نے بیان فرمایا:

((إِنَّ الْمُسْلِمَ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ))(۱)

یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، لہٰذا ایک مسلمان نہ تو دوسرے مسلمان بھائی پر ظلم کرے گا، اور نہ اس کو بے یارومددگار چھوڑے گا، یعنی اگر اس پر ظلم اور زیادتی ہورہی ہوگی تو مسلمان کا یہ کام نہیں کہ وہ اس کو ظالم کے رحم وکرم پر چھوڑ دے، بلکہ تمہارا فرض ہے کہ اس کا ساتھ دو، اس کی مدد کرو۔ یہ محض اخلاقی ہدایت نہیں، بلکہ تمہارا دینی فریضہ ہے کہ جب تک تمہاری استطاعت میں ہے، اس کو ظلم سے بچاؤ۔

دولت مند معاشرے کا حال

آج ہمارے معاشرے میں یہ منظر نظر آتا ہے کہ جو غریب قسم کے لوگ ہیں، وہ تو ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں، لیکن دولت مند معاشرے میں یہ منظر نظر آتا ہے کہ کسی کو اس کی پرواہ ہی نہیں ہے کہ میرے پڑوسی کا کیا حال بن رہا ہے، اس کے اوپر کیا گزر رہی ہے، بلکہ ہر شخص اپنے حال میں مگن ہے۔ ایک مرتبہ میں نے خود یہ منظر دیکھا کہ ایک کار نے ایک آدمی کو ٹکر ماردی، وہ شخص سڑک پر گر گیا، اور وہ کاروالا مارتا ہوا نکل گیا۔ اس کاروالے نے یہ نہیں سوچا کہ یہ مجھ سے زیادتی ہوئی ہے تو میرا فرض بنتا ہے کہ میں اس کو کچھ طبی امداد پہنچاؤں۔ نبی کریم ﷺ فرمارہے ہیں کہ ایک مؤمن کا یہ کام نہیں کہ وہ دوسرے مؤمن کو بے یارومددگار چھوڑ کر اس طرح چلا جائے، بلکہ جہاں موقع ہو، اور جتنی استطاعت ہو، وہ دوسرے مؤمن کی مدد کرے۔

بہرحال! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ" یعنی سارے مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں، چاہے وہ تمہاری زبان نہ بولتا ہو، چاہے وہ تمہاری نسل سے تعلق نہ رکھتا ہو، لیکن اگر وہ مؤمن ہے تو تمہارا بھائی ہے۔

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب المظالم والغصب، باب لا يظلم المسلم المسلم ولا يسلمه، رقم: ۲۲۶۲، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم..... الخ، رقم: ٤٦٥٠، سنن الترمذی، كتاب الحدود عن رسول الله، باب ما جاء فی الستر علی المسلم، رقم: ۱۳٤٦، سنن أبی داؤد، كتاب الأدب، باب المؤاخاة، رقم: ٤٢٤٨، مسند أحمد، رقم: ٥١٠٣

کلمہ ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ“ کا رشتہ

اللہ تعالیٰ نے یہ ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ“ کا رشتہ ایسا مضبوط بنایا ہے کہ یہ کسی زبان کا محتاج نہیں۔ مجھے وہ منظر کبھی نہیں بھولتا کہ آج سے تقریباً پندرہ بیس سال پہلے میرا چین جانا ہوا، اور اس زمانے میں چین کے اندر باہر کے لوگوں کے آنے کا سلسلہ نیا نیا شروع ہوا تھا، اب بھی وہاں بہت بڑی تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ مسلمانوں کے ایک علاقے میں میرا جانے کا اتفاق ہوا، اس وقت وہاں برف باری ہو رہی تھی، اور درجہ حرارت منفی ۱۶ ڈگری تھا، فجر کے وقت ہمیں ایک علاقے سے گزرنا تھا، جہاں مسلمانوں کی آبادی تھی، اس علاقے کے مسلمانوں کو یہ اطلاع ملی تھی کہ پاکستان کے مسلمانوں کا ایک وفد آرہا ہے، چنانچہ وہ لوگ کئی گھنٹے پہلے سے پہاڑی کے درمیان برف باری کے اندر صرف باہر کے مسلمانوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ جب ہمارا قافلہ ان کے قریب سے گزرا تو ان کی زبان پر صرف ایک نعرہ تھا ''السلام علیکم'' اور سلام کرتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اس لئے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے اپنے وطن سے باہر کے کسی مسلمان کی شکل دیکھی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ ہم ان کی زبان جانتے ہیں، نہ ان سے بات کر سکتے ہیں، نہ یہ ہماری بات سمجھیں گے، اور نہ ہم ان کی بات سمجھیں گے، خاندانی اعتبار سے، نسلی اعتبار سے، زبان کے اعتبار سے ان کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا، لیکن دل میں محبت کے دریا صرف اس لئے موجزن تھے کہ ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ“ پڑھنے والے تھے، ”اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ“ کا منظر اللہ تعالیٰ نے وہاں دکھا دیا۔

قرآنی تعلیمات سے دوری کا نتیجہ

اگر دماغ میں یہ بات بیٹھ جائے کہ ہر مسلمان ہمارا بھائی ہے تو نہ جانے کتنے جھگڑے، کتنے فساد، کتنے قتل و قتال ختم ہو جائیں۔ افسوس یہ ہے کہ آج یہ سبق ہم لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔ آج مسلمان مسلمان کا گلا کاٹ رہا ہے۔ آج مسلمان، مسلمان کے خلاف صف آرا ہے۔ آج مسلمان مسلمان کو قتل کرنے کی فکر میں ہے۔ مذہب کے نام پر، دین کے نام پر، عبادت کے نام پر یہ سب کام ہو رہے ہیں۔ عبادت گاہیں تک محفوظ نہیں رہیں، ان پر بھی حملے کیے جا رہے ہیں۔ یہ سارا فساد اس بات کا ہے کہ آج ہم قرآن کریم کی تعلیمات سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

مسلمان کو قتل کرنے کی سزا

آج ہم نے معمول کی چند عبادات کا نام دین رکھ لیا، لیکن دین کی وسیع تعلیمات جو قرآن کریم ہمیں بتلا رہا ہے، ان سے نہ صرف ہم غافل ہیں، بلکہ ان کو دین کا حصہ سمجھنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

﴿مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا﴾(۱)

یعنی جو شخص کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرے، اس کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾(۲)

یعنی اگر کوئی شخص کسی ایک آدمی کو قتل کردے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، یا اس نے زمین میں فساد پھیلایا ہو، تو وہ شخص ایسا ہے جیسے اس نے سارے انسانوں کو قتل کردیا۔ جس دین میں ایسی ہدایات موجود ہیں، اس دین کے نام لیوا، اور اس دین کے پیروکار ایک دوسرے کے قتل و قتال میں ملوث ہوں، یہ اتنا بڑا وبال ہے جو ہمارے اوپر مسلط ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اس وقت کسی کا ساتھ مت دو

ایک آخری بات اسی سلسلے میں یہ عرض کرنی ہے کہ ان آیاتِ کریمہ میں یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ ظالم کا ساتھ نہ دو، بلکہ مظلوم کا ساتھ دو، یہ حکم اس وقت ہے جبکہ واضح طور پر پتہ چل جائے کہ یہ شخص حق پر ہے، دوسرا ناحق ہے، اس وقت تو فرض بنتا ہے کہ حق والے کا ساتھ دیا جائے، لیکن بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ جہاں حق واضح نہیں ہوتا، مثلاً دو گروہ آپس میں لڑ رہے ہیں، اور یہ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ کون حق پر ہے، اور کون باطل پر ہے، ایسی صورت کے بارے میں خود نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ دو فریق آپس میں لڑ رہے ہوں گے، اور دونوں مسلمان کہلائیں گے، اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ کون حق پر ہے، اور کون باطل پر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ اندھے جھنڈے کے تحت لڑ رہے ہوں گے۔ ایسے وقت کے لئے آپ نے یہ ہدایت دی:

---

(۱) النساء: ۹۳

(۲) المائدہ: ۳۲

((فاعتزل تلك الفرق كلها))[1]

تم اس وقت ان سب سے کنارہ کشی اختیار کرلو، اور کسی کا ساتھ نہ دو، نہ کسی کی حمایت کرو، نہ کسی کی مخالفت کرو، بس خاموش ہو کر اپنے کام سے کام رکھو۔ اس لئے کہ اگر تم کسی کا ساتھ دو گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی مظلوم پر تمہاری طرف سے ظلم ہو جائے۔ بہر حال! حضورِ اقدس ﷺ نے ایسی صورت میں علیحدہ رہنے کا حکم دیا ہے، اور ایسی صورت کو ''فتنہ'' سے تعبیر کیا ہے۔

فتنہ کے وقت اپنے گھر میں بیٹھ جاؤ

''فتنہ'' اسی کا نام ہے کہ انسان پر حق واضح نہ ہو، یہ پتہ نہ ہو کہ کون حق پر ہے اور کون باطل ہے۔ اگر حق واضح ہو جائے تو وہ فتنہ نہیں، لیکن اگر حق واضح نہیں ہو رہا ہے تو وہ ''فتنہ'' ہے، اور فتنہ سے حضورِ اقدس ﷺ نے الگ رہنے کا حکم دیا ہے، بلکہ یہاں تک آپ نے فرمایا کہ ''اپنے گھر میں چپ چاپ بیٹھ جاؤ، اور باہر نکل کر لڑنے والے گروہوں کو دیکھو تک نہیں'' اس لئے کہ فتنہ ایسی چیز ہے کہ اگر تم اس کی طرف دیکھو گے تو وہ فتنہ تمہیں اُچک لے گا، اس لئے اس سے دور رہو۔ ہمارے یہاں بہت سی لڑائیاں، بہت سے جھگڑے، خاص طور پر سیاسی نوعیت کے جھگڑے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں عام طور پر یہ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یہی ہے کہ آدمی اس سے کنارہ کش رہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو ان احکام اور تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

❁❁❁

(۱) صحيح البخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الإسلام، رقم: ۳۳۳۸، صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب وجوب ملازمة جماعة المسلمين عند ظهور الفتن، رقم: ۳٤۳٤، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب العزلة، رقم: ۳۹٦۹

حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''اعمالِ صالحہ یا توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر حقوق معاف نہیں ہوتے، پس جس قدر ہو سکے ادا کرے اور سب کے ادا کا عزم رکھے۔ اگر کچھ باقی رہ گئے اور مر گیا تو اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ اس کو بری الذمہ کر دیں گے یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم کو خوش کر کے ظالم کی مغفرت فرما دیں گے''(۱)

گناہِ صغیرہ سے معافی کا طریقہ

اس ملفوظ میں حضرت والا نے پہلی بات تو یہ بیان فرمائی کہ اعمالِ صالحہ یعنی نیک اعمال سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور توبہ سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ نیک اعمال سے صرف گناہِ صغیرہ معاف ہوتے ہیں اور توبہ سے کبیرہ گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ گناہِ صغیرہ کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکیوں کی بدولت خود بخود ان کو معاف فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی وضو کرتا ہے تو وضو کے دوران جب وہ ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھ سے کیے ہوئے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جب چہرہ دھوتا ہے تو آنکھوں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں سے چل کر جس گناہ کی طرف گیا تھا، وہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان احادیث میں گناہوں سے مراد صغیرہ گناہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اس طرح معاف فرماتے رہتے ہیں۔

عبادات سے گناہِ صغیرہ معاف ہو جاتے ہیں

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آدمی نماز کے لئے مسجد کی طرف چلتا ہے تو ہر ہر قدم پر

☆ اصلاحی مجالس (۶/۵۲ تا ۷۰)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم کراچی۔

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۱۹۸

اللہ تعالیٰ گناہ معاف فرماتے ہیں۔ اس سے بھی مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ اسی طرح نماز پڑھنے سے بھی صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک صحابی حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھ سے بڑی سخت غلطی ہوگئی ہے، پھر ایک گناہِ صغیرہ کو بیان کیا کہ مجھ سے یہ گناہ ہوگیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے فرمایا کہ کیا تم نے اس گناہ کے بعد ہمارے ساتھ مسجد میں نماز نہیں پڑھی؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! نماز تو پڑھی ہے۔ فرمایا کہ بس تمہارا وہ گناہ اس نماز پڑھنے سے معاف ہوگیا۔ پھر آپ ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾(۱)

''نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں''(۲)

جب انسان کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے صغیرہ گناہ معاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا یہ خود کار نظام بنادیا ہے کہ صغیرہ گناہ خود بخود معاف ہوتے چلے جاتے ہیں، مگر یہ سب صغیرہ گناہوں کے بارے میں ہے۔

گناہِ کبیرہ کے لئے توبہ ضروری ہے

کبیرہ گناہ کے بارے میں قانون یہ ہے کہ وہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، یوں اللہ تعالیٰ کسی پر اپنا فضل فرمادیں اور بغیر توبہ کے معاف فرمادیں تو ان کو کون روکنے والا ہے لیکن قانون اور اصول یہ ہے کہ کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ اس ملفوظ میں حضرت والا نے یہ جو فرمایا کہ اعمالِ صالحہ یا توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ سے صغیرہ گناہ اور توبہ سے کبیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

حقوق العباد اور بعض حقوق اللہ محض توبہ سے معاف نہیں ہوتے

آگے فرمایا کہ ''مگر حقوق معاف نہیں ہوتے''، حقوق سے ایک تو حقوق العباد مراد ہیں اور

---

(۱) هود: ١١٤

(۲) صحيح البخاري، كتاب مواقيت الصلاة، باب الصلاة كفارة، رقم: ٤٩٥، صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب إن الحسنات يذهبن السيئات، رقم: ٤٩٦٣، سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة هود، رقم: ٣٠٣٧، سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة وسنة فيها، باب ما جاء في أن الصلاة كفارة، رقم: ١٣٨٨

دوسرے وہ حقوق اللہ مراد ہیں جن کی تلافی ممکن ہو، مثلاً نمازیں چھوٹ گئی ہیں اور آدمی تندرست ہے، ان نمازوں کی قضا کرسکتا ہے، لہٰذا نمازیں معاف نہیں ہوں گی۔ یا مثلاً زکوٰۃ واجب ہوئی اور اب تک زکوٰۃ ادا نہیں کی تو وہ زکوٰۃ معاف نہیں ہوگی۔ حج واجب ہوگیا تھا، ادا نہیں کیا تو وہ حج معاف نہیں ہوگا۔ روزے واجب ہوگئے تھے ادا نہیں کیے، وہ معاف نہیں ہوں گے۔ بہر حال! توبہ کے ذریعہ وہ حقوق اللہ جن کی تلافی ممکن ہے وہ معاف نہیں ہوتے اور توبہ کے ذریعہ حقوق العباد معاف نہیں ہوتے جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے یا اس کا حق ادا نہ کردیا جائے۔

تمام سابقہ حقوقِ واجبہ کی ادائیگی شروع کردیں

حضرت والا فرمارہے ہیں کہ اگر آدمی توبہ کرلینے کے بعد یہ سمجھ لے کہ بس، میرا مقصد حاصل ہوگیا، اب مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ خیال بالکل غلط اور دھوکہ ہے، بلکہ توبہ کرلینے کے بعد یہ دیکھو کہ کیا کیا حقوق میرے ذمے واجب ہیں، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ہوں یا بندوں کے حقوق ہوں، توبہ کرلینے کے بعد ان حقوق کو ادا کرنے کی فکر شروع کرو۔ جس کا طریقہ میں نے توبہ کا بیان شروع کرتے وقت عرض کیا تھا کہ آدمی ایک کاپی بنالے اور اس کاپی کے اندر یہ لکھے کہ میرے ذمے فلاں فلاں حقوق ہیں، میرے ذمے اتنی نمازیں باقی ہیں، اتنے روزے باقی ہیں، اتنی زکوٰۃ باقی ہے، فلاں فلاں لوگوں کے قرضے باقی ہیں، آج سے میں ان کی ادائیگی شروع کررہا ہوں، اگر مکمل ادائیگی سے پہلے میرا انتقال ہوجائے تو میرے ترکہ سے ان عبادات کا فدیہ اور میرے اوپر لازم قرضہ ادا کردیا جائے۔

اگر تمام حقوق کی ادائیگی سے پہلے موت آگئی

اب اگر اس شخص نے ان نمازوں کو ادا کرنا شروع کردیا، روزوں کو اور زکوٰۃ کو ادا کرنا شروع کردیا، لوگوں کے جو حقوق واجب تھے ان کی ادائیگی کی فکر شروع کردی اور کوشش شروع کردی تو اس شخص کے بارے میں حضرت والا فرمارہے ہیں کہ اگر وہ شخص اس کوشش کے دوران مرگیا یعنی ابھی ساری عباداتِ سابقہ ادا نہیں ہوئی تھیں ابھی تمام حقوق کی ادائیگی کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ اس سے پہلے ہی اس کا انتقال ہوگیا، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے اور معاف کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ جن بندوں کے حقوق اس کے ذمے واجب تھے، ان بندوں سے فرمائیں گے کہ یہ میرا بندہ ہے، اس نے حقوق ادا کرنے شروع کردیئے تھے اور اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی لیکن اس کی عمر ختم ہوگئی تھی جس کی وجہ سے پورے حقوق ادا نہیں کرسکا، لیکن چونکہ اس نے

اخلاص کے ساتھ ادائیگی شروع کردی تھی، اس لئے اب ہم اور بڑی نعمتیں دے کر تمہیں راضی کردیتے ہیں، لہٰذا اس کے حقوق معاف کردو۔

حقوق کی معافی کا راستہ

حضرت والا نے یہاں اس ملفوظ میں یہ بات اختصار کے ساتھ بیان فرمائی ہے، لیکن ایک وعظ میں حضرت والا نے یہ بات تفصیل سے بیان فرمائی ہے، چنانچہ آپ نے وہاں پر یہ بیان فرمایا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حقوق العباد کی معافی کا کوئی راستہ نہیں جب تک ان حقوق کو یا تو ادا نہ کردیا جائے یا صاحبِ حق سے معاف نہ کرالیا جائے۔ اس غلط فہمی کے نتیجے میں بعض اوقات لوگوں میں مایوسی پیدا ہوجاتی ہے کہ میرے ذمے اتنے سارے لوگوں کے حقوق واجب ہیں، اگر آج سے میں نے ان حقوق کو ادا کرنا شروع بھی کردیا تو بھی ساری عمر کھپادوں گا، تب بھی تمام حقوق ادا نہیں کرسکوں گا، اور جب دل میں مایوسی پیدا ہوجاتی ہے تو پھر جو کچھ تھوڑے بہت حقوق ادا کرسکتا تھا، اس سے بھی رک جاتا ہے۔

مایوس ہونا ٹھیک نہیں

اس لئے ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق تو یہ تھا کہ۔

سوئے نو امیدی مرو امید ہاست
سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

یعنی نا اُمیدی اور ظلمت و تاریکی کا کوئی راستہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُمید کے راستے رکھے ہیں۔ اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ حقوق العباد کی معافی کا کوئی راستہ نہیں، کیونکہ جب اللہ کا ایک بندہ حقوق العباد ادا کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا اور حقوق ادا کرنے شروع کردیئے، اپنی سی کوشش صرف کردی، اس دوران اس کا انتقال ہوگیا تو اللہ تعالیٰ اصحابِ حقوق کو راضی فرمادیں گے۔

سو انسانوں کے قاتل کا واقعہ

اس بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مشہور واقعہ سے استدلال فرمایا جو حدیث شریف میں آتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت میں ایک قاتل تھا۔ اس شخص نے ننانوے آدمیوں کو قتل کردیا۔ ننانوے آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا کہ یا اللہ! میں نے یہ کیا کردیا۔ ایک انسان کی جان لینا ایسا ہے جیسے پورے عالمِ انسانیت کی جان لے لینا

اور قتلِ نفس کی جو سزا قرآن کریم نے بیان کی ہے، دوسرے کسی گناہ کے لئے ایسی سزا بیان نہیں فرمائی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾(۱)

یعنی جو شخص جان بوجھ کر کسی مؤمن کو قتل کرے، تو اس کی سزا جہنم ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوگی اور اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یہ الفاظ کفر کے علاوہ اور قتلِ نفس کے علاوہ کسی اور گناہ کے لئے بیان نہیں فرمائے۔

سو کا عدد پورا کردیا

بہر حال! ننانوے آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد اس کو فکر ہوئی کہ اب میں کیا کروں، چنانچہ وہ ایک عیسائی پادری کے پاس چلا گیا اور اس سے جا کر کہا کہ میں نے ننانوے قتل کیے ہیں، میری نجات کا کوئی راستہ بتاؤ۔ پادری نے کہا کہ تیری نجات کا کوئی راستہ نہیں، کیونکہ ایک آدمی کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے، تو نے تو ننانوے انسانوں کو قتل کر دیا، لہٰذا تیری نجات کا تو کوئی راستہ نہیں، تو تو جہنمی ہے۔ اس شخص کو بڑا غصہ آیا کہ میں تو نجات کا راستہ پوچھنے آیا اور یہ کہتا ہے کہ کوئی راستہ نہیں۔ اس نے سوچا کہ ننانوے قتل تو کر دیئے ہیں، ایک اور سہی تا کہ سو کا عدد پورا ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اس پادری کو بھی قتل کر دیا۔

پھر کسی اور راہب کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں نے سو انسانوں کو قتل کر دیا ہے، میری نجات کا کوئی راستہ بتاؤ۔ اس راہب نے کہا کہ تم توبہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور ایسا کرو کہ فلاں بستی کے لوگ بہت نیک ہیں، تم اس بستی میں جا کر رہو۔ اس راہب کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ شخص اس بستی میں رہے گا تو نیک لوگوں کی صحبت حاصل ہوگی، اس کے ذریعہ اس کے حالات درست ہو جائیں گے اور جو گناہ اس نے کیے ہیں، اس کی تلافی کی کوشش کرے گا، چنانچہ یہ شخص اس بستی کی طرف چل پڑا۔

رحمت اور عذاب کے فرشتوں میں جھگڑا

ابھی راستے میں یہ تھا کہ اس کی موت آگئی اور اس کا انتقال ہو گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس کے بارے میں ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ ملائکہ عذاب نے کہا کہ

(۱) النساء: ۹۳

یہ شخص سو قتل کر کے آیا ہے، لہٰذا یہ ہمارا آدمی ہے، اس کو ہم جہنم میں لے جائیں گے۔ ملائکہ رحمت نے کہا کہ یہ شخص توبہ کر کے نیک بننے کے لئے چل پڑا تھا، لہٰذا یہ ہمارا آدمی ہے، ہم اس کو جنت میں لے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

جب یہ دونوں جھگڑنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ جہاں سے یہ شخص چلا تھا، اس کی پیمائش کرو اور جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس کی پیمائش کرو اور یہ دیکھو کہ موت کے وقت کونسی جگہ سے قریب تھا؟ جس بستی سے روانہ ہوا، اس سے قریب تھا یا جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس سے قریب تھا؟ پھر جس بستی سے یہ شخص قریب ہو، اسی کا معاملہ کرو۔

چنانچہ دونوں طرف کے راستوں کی پیمائش کی گئی تو وہ جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس طرف ایک گز زیادہ قریب تھا، گویا کہ آدھے راستے سے ایک گز آگے بڑھ گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اس شخص کو رحمت والے فرشتوں کے حوالے کر دیا جائے۔ (۱)

اس واقعہ سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے استدلال فرمایا کہ اس شخص نے جو سو قتل کیے تھے، وہ حقوق العباد سے متعلق تھے، لیکن چونکہ وہ شخص حقوق العباد کی ادائیگی کا عزم کر کے چل پڑا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی توبہ قبول فرمالی اور اس کو بخش دیا۔ اور جہاں تک تعلق ہے ان بندوں کا جن کو قتل کیا تھا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان مقتولین کے درجات بلند کر کے ان کو راضی کر دیں گے۔

پیمائش کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ جو حکم فرمایا کہ دونوں طرف کے راستوں کی پیمائش کرو اور دیکھو کہ کونسی بستی زیادہ قریب ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا تو پیمائش کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ فرض کرو کہ اگر اس شخص کی موت ایک دو گز پہلے آجاتی تب بھی تو اس نے توبہ کا ارادہ کر ہی لیا تھا اور اپنی سی کوشش شروع کر دی تھی، لہٰذا پیمائش کرانے اور

(۱) صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب حدیث الغار، رقم: ۳۲۱۱، صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب قبول توبة القاتل وان کثر قتله، رقم: ۴۹۶۷، سنن ابن ماجه، کتاب الدیات، باب هل لقاتل مؤمن توبة، رقم: ۲۶۱۲، مسند أحمد، رقم: ۱۰۷۲۷۔

قریب اور دور ہونے کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ اشکال میرے ذہن میں بہت عرصے سے تھا اور میں اس تلاش میں تھا کہ اس کا جواب کہیں مل جائے۔

حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے قدم بڑھانا شرط ہے

بعد میں اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اس کا یہ جواب ڈالا کہ اللہ تعالیٰ کے پیائش کرانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ پیائش کرانے کے بعد فیصلہ فرمائیں گے، بلکہ اس کی معافی کا فیصلہ تو پہلے ہی فرما چکے تھے، اس پر نوازش ہو چکی تھی، لیکن بندوں کو یہ بتانے کے لئے پیائش کی گئی کہ یہ معافی کا معاملہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی اصلاح کے راستے پر معتد بہ راستہ چل پڑا ہو، یہ نہیں کہ کسی نے اپنی اصلاح کا اور تبدیلی لانے کا جھوٹا موٹا ارادہ کر لیا، پھر سستی کے عالم میں پڑا رہا، اس کے ساتھ معافی کا معاملہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس واقعہ کے ذریعہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اصلاح کا ارادہ کرنے کے بعد معتد بہ قدم اُٹھنے چاہئیں، معتد بہ راستہ قطع ہونا چاہئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت آئے گی۔ یہ نہ ہو کہ کسی کے وعظ و تقریر میں نصیحت کی بات سن لی اور ارادہ کر لیا کہ اس نصیحت پر ضرور عمل کریں گے، لیکن کیا کچھ نہیں، تو ایسے ارادے کا کوئی اعتبار نہیں۔ لہٰذا بندوں پر یہ بات ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اس زمین کی پیائش کرو اور یہ دیکھو کہ اس نے معتد بہ راستہ قطع کر لیا تھا یا نہیں؟ جب پیائش کے بعد پتہ چل گیا کہ اس شخص نے معتد بہ راستہ طے کر لیا تھا، تب اس کی معافی کا فیصلہ فرمایا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ گناہِ صغیرہ کی معافی کا راستہ اللہ تعالیٰ نے اعمالِ صالحہ کو بنا دیا ہے اور وہ گناہِ کبیرہ جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور جن کی تلافی ممکن نہیں، ان کی معافی کے لئے توبہ ہے اور وہ گناہِ کبیرہ جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے یا ان حقوق اللہ سے ہے جن کی تلافی ممکن ہے، ان کی معافی کا راستہ یہ ہے کہ اہتمام کر کے ان کی ادائیگی شروع کر دے اور ساتھ میں وصیت بھی کر دے کہ اگر میں ان کو مکمل نہ کر سکا تو میرے ترکہ میں سے ان عبادات کا فدیہ اور قرضہ ادا کر دیا جائے۔ جب یہ سب کر لیا تو بندے نے اپنے حصے کا کام کر لیا، اب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ اس کا بیڑہ پار کر دیں گے۔

گناہ کا تقاضا گناہ نہیں

آگے ایک ملفوظ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''امور طبعیہ پر مؤاخذہ نہیں بلکہ ان کے مقتضاء پر عمل کرنے سے مؤاخذہ ہوتا ہے،

وہ بھی اس وقت جبکہ عمداً اس پر عمل کیا جائے، اور اگر طبعی ناگواری سے مغلوب ہوکر کسی وقت کوئی کلمہ بیجا زبان سے نکل جائے اور بعد میں اس سے معذرت کرلی جائے تو حق تعالیٰ اس کو معاف فرمائیں گے۔(۱)

اس ملفوظ میں حضرت والا ﷫ نے ایک بہت اہم اصول بیان فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ گناہوں کا صدور یا تو طبعی داعیہ اور محرکات کے ذریعہ ہوتا ہے یا نسان کے اندر جو اخلاق رذیلہ ہوتے ہیں وہ انسان کو گناہ پر آمادہ کرتے ہیں۔ اب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف گناہ کے داعیے اور تقاضے کا دل میں پیدا ہوجانا ہی گناہ ہے۔ حضرت والا اس غلط فہمی کو دور فرمارہے ہیں کہ محض تقاضا کا دل میں پیدا ہوجانا گناہ نہیں جب تک انسان اس تقاضے پر عمل نہ کرے۔

غصہ کا علاج سب سے مقدم

مثلاً غصہ کرنا بُرا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہے کہ تصوف اور طریقت میں سب سے پہلے اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ یہ غصہ انسان کے باطن کو بالکل تباہ کرنے والا ہے۔ اس لئے جب کوئی اللہ کا بندہ اپنی اصلاح کے لئے کسی شیخ کے پاس جاتا ہے تو پہلے قدم کے طور پر اس کے غصے کی اصلاح کی جاتی ہے تاکہ اس کا غصہ قابو میں آجائے۔

غصہ اور شہوت کے تقاضے پر عمل کرنا گناہ ہے

اب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غصے کا دل میں پیدا ہونا ہی گناہ ہے۔ حضرت والا فرمارہے ہیں کہ محض غصہ کا دل میں پیدا ہوجانا گناہ نہیں بلکہ گناہ اس وقت ہوگا جب اس غصہ کے تقاضے پر عمل کرکے کسی کے ساتھ زیادتی کروگے۔ اسی طرح شہوت ہے، شہوت کے خیال کا دل میں خودبخود پیدا ہوجانا گناہ نہیں، لیکن اگر اس خیال کو جان بوجھ کر پیدا کرے گا یا اس خیال کو جان بوجھ کر باقی رکھے گا یا اس شہوت کے تقاضے پر کوئی ایسا عمل کرگزرے گا جو شرعاً ناجائز ہے تو گناہگار ہوگا، مثلاً شہوت کا خیال آنے کے نتیجے میں نگاہ غلط جگہ پر ڈال دی تو اب وہ گناہگار ہوگا۔ سارے امراضِ باطنہ اور رذائل کا یہی معاملہ ہے۔

حسد کے تقاضے پر عمل کا گناہ ہے

مثلاً ''حسد'' ہے، آپ کے دل میں کسی شخص کی طرف سے حسد ہے، اب اس کے بارے میں

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۱۹۸

کسی اچھائی کی خبر سن کر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ کیوں آگے بڑھ گیا؟ اس کے پاس پیسے کیوں زیادہ آگئے؟ اس کے پاس دولت کیوں زیادہ ہوگئی؟ اس کی شہرت کیوں زیادہ ہوگئی؟ لوگ اس کو کیوں زیادہ ماننے لگے؟ وغیرہ۔ صرف دل میں اس خیال کا پیدا ہوجانا یہ گناہ نہیں، کیونکہ یہ خیال غیر اختیاری طور پر دل میں پیدا ہوا ہے۔ یہ خیال اس وقت گناہ بنے گا جب تم اس خیال کے آنے کے نتیجے میں اس شخص کے ساتھ کوئی بدسلوکی کروگے۔ مثلاً آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ فلاں شخص مجھ سے آگے بڑھ گیا، یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اب تم نے سوچا کہ کوئی ایسا کام کرو کہ اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا ہوجائے، مثلاً اس کی چغلی کرو، لوگوں کے سامنے اس کی بُرائی بیان کرو، اس کی غیبت کرو، تو ان کاموں کے کرنے کے نتیجے میں وہ حسد گناہ بن جائے گا، محض دل میں خیال آجانے سے گناہ نہیں بنتا۔

حسد کے دو علاج

البتہ ''حسد'' کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے دل میں دوسرے کی بُرائی کا خیال آرہا ہو، اس کو فوراً دو کام کرنے چاہئیں، ورنہ وہ حسد کے نتیجے میں گناہ کے اندر مبتلا ہوجائے گا۔ ایک کام یہ کرے کہ اس خیال کو دل میں بُرا سمجھے کہ میرے دل میں یہ جو خیال آرہا ہے، یہ بہت بُرا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرے کہ یا اللہ! یہ بُرا خیال میرے دل سے نکال دیجئے۔ دوسرا کام یہ کرے کہ جس شخص کی طرف سے یہ بُرا خیال آرہا ہے، اس کے حق میں دعائے خیر کرے۔ مثلاً آپ کے دل میں اس بات کا دکھ ہورہا ہے کہ فلاں شخص مجھ سے آگے کیوں نکل گیا، اس کے لئے یہ دعا کرے کہ یا اللہ! اس کو اور ترقی عطا فرما۔ جب تم یہ دعا کروگے تو دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن یہ آرے چلانے مقصود ہیں تاکہ اس بیماری کا علاج ہو۔ اگر اس کی دولت کی وجہ سے اس پر حسد ہورہا تھا تو اس کے لئے یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور دولت عطا فرما۔ اگر اس کے منصب کی وجہ سے حسد ہورہا تھا تو یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور بڑا منصب عطا فرما، اس کو اور زیادہ ترقی عطا فرما۔ لہٰذا جس چیز کی وجہ سے حسد ہورہا تھا، اس کی زیادتی کی دعا کرے۔ جب حسد پیدا ہو تو فوراً یہ دو کام کرے ورنہ یہ حسد کسی نہ کسی وقت آدمی کو تباہ کردے گا۔

بہرحال! جتنے بھی بُرے اخلاق ہیں، ان سب کا اصول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں بیان فرمایا کہ ''محض امور طبعیہ پر مؤاخذہ نہیں، بلکہ ان کے مقتضاء پر عمل کرنے سے مؤاخذہ ہوتا ہے''۔ پھر فرمایا کہ ''وہ بھی اس وقت جب کہ عمداً اس پر عمل کیا جائے۔''

طبعی ناگواری سے مغلوب ہوکر زبان سے نکلنے والے کلمات

آگے بڑی چھوٹ والی بات ارشاد فرمادی کہ ''اگر طبعی ناگواری سے مغلوب ہوکر کسی وقت کوئی کلمہ بیجا زبان سے نکل جائے اور بعد میں اس سے معذرت کرلی جائے تو حق تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے۔'' یعنی ویسے تو غصہ قابو میں آگیا ہے اور کسی شخص کی صحبت کے نتیجے میں اور اس کے آگے رگڑے کھانے کے نتیجے میں طبیعت میں ایک اعتدال پیدا ہونے لگا اور غصہ قابو میں آنے لگا، لیکن پھر بھی کسی کسی وقت وہ غصہ بے قابو ہوجاتا ہے، جیسے کسی بات پر ناگوری پیدا ہوئی، اس کے نتیجے میں ایک دم سے بھڑک اُٹھا اور اس کی وجہ سے زبان سے کوئی نازیبا کلمہ نکل گیا تو ایسا ہوجاتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی غیر معمولی اور ناقابلِ اصلاح بات ہوگئی۔ البتہ جب ایسا ہوجائے تو جس کے ساتھ اس قسم کا معاملہ ہوا تھا، اس سے معذرت کرلے لیکن یہ نہ سمجھے کہ اب میرا غصہ قابلِ اصلاح نہیں بلکہ اپنے غصہ کی اصلاح کی فکر کرے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو غصہ نہ کرنے کی نصیحت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے نصیحت فرمائیے اور مختصر نصیحت فرمائیے۔ ایک تو نصیحت کی درخواست کی اور ساتھ مختصر نصیحت کی درخواست کی۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برا نہیں مانا کہ تم نصیحت بھی طلب کرتے ہو اور ساتھ میں شرطیں بھی لگاتے ہو اور نہ اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا بلکہ آپ نے اس کی اس فرمائش کی تعمیل فرمائی۔ اس سے پتہ چلا کہ اگر کوئی شخص مختصر نصیحت طلب کرے تو اس کو مختصر نصیحت کردو۔ اس لئے کہ اس کے پاس وقت کم ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ایک منٹ میں مجھے کوئی دین کی بات حاصل ہوجائے، اس کی اس فرمائش کو پورا کردو۔ اس لئے کہ دین کی باتیں ایسی بھی ہیں جو ایک منٹ یا دو منٹ میں بھی ہوسکتی ہیں۔ بہرحال! ان صحابی کی فرمائش پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نصیحت فرمائی:

((لَا تَغْضَبْ))

''غصہ مت کرنا''(۱)

اس سے پتہ چلا کہ غصہ ان چیزوں میں سے ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اس کی اتنی اہمیت تھی کہ مختصر نصیحت کے وقت آپ نے اسی کا انتخاب فرمایا۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الحذر من الغضب، رقم: ۵٦۵۱، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی کثرة الغضب، رقم: ۱۹۴۳، مسند أحمد، رقم: ۸۳۸۹

ابتداءً بالکل غصہ کرنا چھوڑ دو

اسی لئے ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق میں غصہ ان چیزوں میں سے ہے جس کا سب سے پہلے علاج کیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی شیخ کی خدمت میں اپنی اصلاح کے لئے جاتا ہے تو شروع میں اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم غصہ بالکل مت کرو، نہ غصہ کے صحیح محل پر غصہ کرو اور نہ ہی بے محل غصہ کرو، جہاں غصہ کرنیکا حق ہے وہاں بھی غصہ نہ کرو تاکہ تمہاری طبیعت اعتدال پر آجائے۔ لیکن اس کے باوجود کسی وقت غیر اختیاری طور پر منہ سے نازیبا کلمات نکل جائیں تو جس کے خلاف وہ کلمات نکلے ہیں، اس سے معافی مانگ لو، معذرت کرلو کہ بھائی! میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے، غلطی ہوگئی، معاف کردو۔ جب یہ کرلو گے تو انشاء اللہ آئندہ کے لئے راستہ کھل جائے گا۔

معافی مانگنے سے شرم مت کرو

معافی مانگ لینے میں کوئی ذلت نہیں ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جان جائے مگر ناک نہ جائے، کسی طرح ناک نیچی نہ کرنی پڑے۔ یہ تصور اور خیال بہت خراب ہے، کیونکہ تکبر پر مبنی ہے، اس لئے جب کبھی ایسا ہوجائے، معافی مانگ لو، معافی مانگنے میں کیا رکھا ہے، اگر دنیا میں معافی مانگ لی تو یہاں معافی ہوجائے گی، اگر خدانخواستہ یہاں معاف نہیں کرایا اور آخرت میں جاکر حساب کتاب دینا پڑا تو اس کا بڑا خطرناک انجام ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ یہاں پر توبہ کا بیان ختم ہوگیا، اب آگے دوسرا باب شروع ہو رہا ہے، جس کا عنوان ہے "تعلق مع اللہ" انشاء اللہ کل اس کو شروع کریں گے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

مسلمان پر مسلمان کے حقوق ☆

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے:

"عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ((اِنَّ الْمُسْلِمَ اَخُو الْمُسْلِمِ، لَا یَظْلِمُہٗ وَلَایَخْذُلُہٗ وَلَا یَحْقِرُہٗ، اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا، وَیُشِیْرُ اِلٰی صَدْرِہٖ ثَلَاثَ مِرَارٍ((بِحَسْبِ امْرِیءٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ یَحْقِرَ اَخَاہُ الْمُسْلِمَ، کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُہٗ وَمَالُہٗ وَعِرْضُہٗ))(۱)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اس پر واجب ہے کہ وہ اس پر کوئی ظلم و زیادتی نہ کرے، اور اسے (جب مدد کی ضرورت ہو تو) بے یارو مددگار نہ چھوڑے، نہ اسے حقیر جانے اور نہ اس کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کرے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہوتا ہے، (یعنی ہوسکتا ہے کہ تم کسی شخص کو اس کے ظاہری حال سے معمولی آدمی سمجھو، لیکن وہ اپنے دل کے تقوے کی وجہ سے وہ اللہ کے نزدیک محترم ہو، اس لئے کبھی مسلمان کو حقیر نہ سمجھو) آدمی کے برا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے اور اس کے ساتھ حقارت سے پیش آئے، مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لئے قابلِ احترام ہے، اس کا خون بھی، اس کا مال بھی، اور اس کی آبرو بھی''

☆ نشری تقریریں، ص: ۸۵۔۸۸

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمہ، رقم: ۲۲٦۲، صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم...... الخ، رقم: ٤٦٥٠، سنن الترمذی، کتاب الحدود عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی الستر علی المسلم، رقم: ١٣٤٦، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب المؤاخاۃ، رقم: ٤٢٤٨، مسند أحمد، رقم: ٥١٠٣

اس حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دے کر اس کے کچھ معاشرتی حقوق بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلا حق یہ ہے کہ اس پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے۔ اس میں ہر قسم کا ظلم داخل ہے خواہ جسمانی ہو یا مالی، زبانی ہو یا نفسیاتی، یعنی جس طرح کسی مسلمان کو ناحق جسمانی اذیت پہنچانا یا مالی نقصان میں مبتلا کرنا حرام ہے، اسی طرح اسے زبان سے برا کہنا یا بھرے مجمع میں کسی اور طرح شرمندہ و رسوا کرنا بھی ناجائز ہے، اور یہ کسی مسلمان کے شایان شان نہیں۔

دوسرا حق سرکار دو عالم ﷺ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جب کسی مسلمان کو مدد کی ضرورت ہو تو دوسرے مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق اسکی مدد کرے، اور اسے بے یار و مددگار نہ چھوڑے بشرطیکہ وہ حق پر ہو اور مظلوم ہو، گویا جس طرح اپنے دوسرے بھائی پر ظلم کرنا حرام ہے، اسی طرح یہ بات بھی کسی مسلمان کے شایان شان نہیں کہ وہ ظلم ہوتا ہوا دیکھے، اور مدد کی قدرت کے باوجود مظلوم کی مدد نہ کرے، چنانچہ ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَخْذُلُ امْرَأً مُسْلِمًا فِيْ مَوْضِعٍ تُنْتَهَكُ فِيْهِ حُرْمَتُهُ وَيُنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهِ إِلَّا خَذَلَهُ اللّٰهُ فِيْ مَوْضِعٍ يُحِبُّ نُصْرَتَهُ))(۱)

''جو کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو کسی ایسی جگہ بے یار و مددگار چھوڑ دے جہاں اس کی بے حرمتی ہو رہی ہو، اور اس کی آبرو پر حملہ کیا جا رہا ہو، تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو ایسی جگہ بے یار و مددگار چھوڑ دے گا جہاں وہ اپنے لئے مدد چاہتا ہو''

تیسرا حق آنحضرت ﷺ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ کوئی مسلمان کسی دوسرے کو نہ حقیر سمجھے اور نہ اس کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کرے۔ کسی شخص کو غربت، ناداری یا کمزوری کی وجہ سے حقیر سمجھنا تو انتہائی گھٹیا حرکت ہے ہی، لیکن یہاں آنحضرت ﷺ نے جس چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ یہ کہ اگر کسی شخص کو دینی اعتبار سے معمولی حالت میں دیکھ رہے ہو اس شخص کو حقیر سمجھنا اس وقت بھی جائز نہیں، اور اس کی وجہ آپ نے یہ بیان فرمائی کہ ''تقویٰ'' دل میں ہوتا ہے، لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی ظاہری حالت کی وجہ سے معمولی نظر آتا ہو، لیکن اس کا دل تقویٰ کی دولت سے مالا مال ہو، بلکہ دوسری احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی گناہگار شخص کو بھی حقیر سمجھنا جائز نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق عطا فرمائے، اور وہ اپنے گناہوں سے نجات پا کر تم سے کہیں آگے نکل جائے۔ گناہ کے کاموں کو برا اور حقیر سمجھنا برحق ہے، لیکن ان کی وجہ سے کسی مسلمان کو حقیر سمجھنا خود بہت

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب من رد عن مسلم غيبة، رقم: ۴۲۴۰، مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۱۵۷۷۳، جمع الفوائد (۲/ ۵۵)

بڑا گناہ ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر انسان میں کچھ اور برائی نہ ہو تو یہی برائی کچھ کم نہیں کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو حقیر سمجھے۔

آخر میں آپ ﷺ نے ایک اصولی ہدایت یہ عطا فرمادی کہ مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لئے قابلِ احترام ہے، اس کی جان بھی، اس کا مال بھی، اور اس کی آبرو بھی، اور ایک دوسری حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک مسلمان کی حرمت کعبہ معظمہ کی حرمت سے بھی بڑھ کر ہے،[1]

لہٰذا جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کی جان، مال یا آبرو پر حملہ کرتا ہے تو اس کا گناہ اس شخص سے بھی زیادہ ہے جو (معاذ اللہ) کعبہ معظمہ کو ڈھانے کے لئے کعبے پر چڑھائی کر رہا ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھائیوں کی طرح رہنے اور ایک دوسرے کے حقوق پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب حرمة دم المؤمن وماله، رقم: ۳۹۲۲

مؤمن ایک آئینہ ہے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

"عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:
((اَلْمُؤْمِنُ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ))(۱)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے"

یہ حدیث اگرچہ بہت مختصر ہے اور صرف تین الفاظ پر مشتمل ہے، لیکن اس حدیث میں ہمارے اور آپ کے لئے تعلیمات کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ اس حدیث کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ جس طرح ایک انسان جب آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کو آئینہ کے اندر اپنی شکل نظر آتی ہے، اور وہ آئینہ شکل وصورت کی تمام اچھائیاں اور برائیاں اس انسان کو بتا دیتا ہے کہ کیا اچھائی ہے اور کیا برائی ہے۔ اس لئے کہ بہت سی برائیاں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کو خود معلوم نہیں ہوتیں، لیکن آئینہ بتا دیتا ہے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے۔ مثلاً اگر تمہارے چہرے پر سیاہ داغ لگا ہوا ہے تو وہ آئینہ بتا دے گا کہ تمہارے چہرے پر سیاہ داغ لگا ہوا ہے۔ اسی طرح ایک مؤمن بھی دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے کہ اگر ایک مؤمن میں کوئی خرابی یا برائی یا عیب ہے تو دوسرا مؤمن اس کو بتا دے گا کہ تمہارے اندر یہ خرابی یا یہ برائی ہے، تم اس کو دور کرلو، اس کی اصلاح کرلو۔ اس بتانے کے نتیجے میں وہ اس خرابی کو دور کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ یہ ہے اس حدیث کا مطلب کہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے۔

تمہاری غلطی بتانے والا تمہارا محسن ہے

اس حدیث شریف میں دونوں کے لئے سبق ہے، جو شخص دوسرے کے اندر خرابی دیکھ کر اس کو

☆ اصلاحی خطبات (۸/۲۹۴ تا ۳۰۶)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، بعد از نماز عصر

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في النصيحة والحياطة، رقم: ٤٢٧٢

بتاتا ہے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے، اس کے لئے بھی سبق ہے، اور جس شخص کو بتایا جارہا ہے اس کے لئے بھی اس حدیث میں سبق ہے۔ لہٰذا جس شخص کو یہ بتایا جارہا ہے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے اس کو دور کرلو، اس کے لئے اس حدیث میں یہ سبق ہے کہ وہ خرابی بتانے والے پر ناراض نہ ہو، کیونکہ حضور اقدس ﷺ نے مؤمن کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے کہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے۔ اگر کوئی شخص آئینہ کے سامنے کھڑا ہو جائے اور آئینہ یہ بتادے کہ تمہارے چہرے پر فلاں قسم کا داغ دھبہ لگا ہوا ہے اس کو دور کرلو تو وہ شخص اس آئینہ پر ناراض نہیں ہوتا، اور اس پر غصہ نہیں کرتا کہ تم نے مجھے یہ داغ دھبہ کیوں بتایا، بلکہ وہ اس آئینہ کا احسان مند ہوتا ہے کہ اچھا ہوا کہ تم نے میرے چہرے کا داغ بتادیا، اب میں اس کو صاف کرلوں گا۔ بالکل اسی طرح ایک مؤمن بھی دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے۔ اگر تمہارا ایک مؤمن بھائی تمہیں بتا رہا ہے کہ تمہارے اندر یہ برائی یا یہ عیب ہے، یا تمہاری نماز کے اندر یہ غلطی ہے، یا تمہارے معاملات میں یہ غلطی ہے تو تمہیں اس کے کہنے کا برا نہیں ماننا چاہئے، اور اس پر غصہ نہیں کرنا چاہئے کہ اس نے تمہیں یہ عیب کیوں بتایا، اور اس پر ناراض نہیں ہونا چاہئے، بلکہ اس کا احسان سمجھنا چاہئے کہ اس نے تمہیں تمہاری غلطی بتادی۔ اور یہ کہنا چاہئے کہ اب انشاء اللہ میں اپنی اصلاح کی فکر کروں گا اور اس عیب کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔

غلطی بتانے والے علماء پر اعتراض کیوں؟

آج کل لوگ علماء کرام پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ یہ علماء تو ہر ایک کو کافر اور فاسق بناتے رہتے ہیں۔ کسی پر کفر کا فتویٰ لگادیا۔ کسی پر فاسق ہونے کا فتویٰ لگادیا۔ کسی پر بدعتی ہونے کا فتویٰ لگادیا۔ ان کی ساری عمر اسی کام میں گزرتی ہے کہ دوسروں کو کافر بناتے رہتے ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت مولانا اشرف صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علماء لوگوں کو کافر بناتے نہیں ہیں بلکہ کافر بتاتے ہیں۔ جب کسی شخص نے کفر کا ارتکاب کرلیا تو اصل میں تو خود اس شخص نے کفر کا ارتکاب کیا۔ اس کے بعد علماء کرام یہ بتاتے ہیں کہ تمہارا یہ عمل کفر ہے۔ جس طرح آئینہ تمہیں بتاتا ہے کہ تم بدصورت ہو، تمہارے چہرے پر دھبہ لگا ہوا ہے، وہ آئینہ بناتا نہیں اور نہ داغ دھبہ لگاتا ہے۔ اسی طرح علماء کرام بھی یہ بتاتے ہیں کہ تم نے جو عمل کیا ہے وہ کفر کا عمل ہے، یا فسق کا عمل ہے، یا بدعت کا عمل ہے۔ لہٰذا جس طرح آئینہ کو برا بھلا نہیں کہا جاتا اور نہ آئینہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ آئینہ نے میرے چہرے پر داغ لگادیا، بالکل اسی طرح علماء پر بھی یہ الزام نہیں لگانا چاہئے کہ انہوں نے کافر یا فاسق بنادیا۔ اور ان پر ناراضگی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ ان کا احسان ماننا چاہئے کہ انہوں نے ہمارا عیب بتادیا۔ اب ہم اس کی اصلاح کریں گے۔

ڈاکٹر بیماری بتاتا ہے، بیمار نہیں بناتا

مثلاً بعض اوقات ایک انسان کو اپنی بیماری کا علم نہیں ہوتا کہ میرے اندر فلاں بیماری ہے۔ لیکن جب وہ کسی طبیب اور ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو وہ ڈاکٹر بتا دیتا ہے کہ تمہارے اندر یہ بیماری ہے۔ اب ڈاکٹر کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم نے اس شخص کو بیمار بنا دیا۔ بلکہ یہ کہا جائے گا جو بیماری خود تمہارے اندر پہلے سے موجود تھی اور تم اس کی طرف سے غافل تھے، ڈاکٹر نے بتا دیا کہ تمہارے اندر یہ بیماری ہے، اس کا علاج کر لو۔

ایک نصیحت آموز واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ نے اپنا یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ میرے والد ماجد یعنی (میرے دادا) بیمار تھے، دیوبند میں قیام تھا۔ اس وقت دہلی میں ایک حکیم نابینا بہت مشہور تھے۔ اور بہت حاذق اور ماہر حکیم تھے۔ ان کا علاج چل رہا تھا۔ میں دیوبند سے دہلی گیا تاکہ والد صاحب کا حال بتا کر دوا لے لوں۔ چنانچہ میں ان کے مطب میں پہنچا، اور حضرت والد صاحب کا حال بتایا اور کہا کہ ان کی دوا دیدیں۔ حکیم صاحب نابینا تھے۔ جب انہوں نے میری آواز سنی تو فرمایا کہ میں تمہارے والد صاحب کی دوا تو بعد میں دوں گا، پہلے تم اپنی دوا لو۔ میں نے کہا کہ میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں، کوئی بیماری نہیں ہے۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ نہیں، یہ تم اپنی دوا لو۔ صبح یہ کھانا، دوپہر یہ کھانا اور شام کو یہ کھانا۔ اور جب ایک ہفتہ کے بعد آؤ تو اپنا حال بیان کرنا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے میری دوا دی، اور پھر والد صاحب کی دوا دی۔ جب میں گھر واپس آیا تو والد صاحب کو بتایا کہ حکیم صاحب نے اس طرح مجھے بھی دوا دی ہے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ جس طرح حکیم صاحب نے فرمایا ہے، اسی طرح کرو اور ان کی دوا استعمال کرو۔ جب ایک ہفتہ کے بعد دوبارہ حکیم صاحب کے پاس گیا تو میں نے عرض کیا کہ حکیم صاحب! اب تک یہ فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا اور نہ کوئی بیماری معلوم ہوئی۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ گذشتہ ہفتہ جب تم آئے تھے تو تمہاری آواز سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ تمہارے پھیپھڑوں میں خرابی ہوگئی ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ کہیں آگے چل کر ٹی بی کی شکل اختیار نہ کر لے۔ اس لئے میں نے تمہیں دوا دی۔ اور اب الحمدللہ تم اس بیماری سے بچ گئے۔

دیکھئے! بیمار کو پتہ نہیں ہے کہ مجھے کیا بیماری ہے۔ اور معالج اور ڈاکٹر کا یہ بتانا کہ تمہارے اندر یہ بیماری ہے، یہ اس کا احسان ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جائے گا کہ ڈاکٹر نے بیمار بنا دیا، بلکہ اس نے بتا دیا کہ تمہارے اندر یہ بیماری پیدا ہو رہی ہے، تاکہ تم علاج کر لو۔ اب اس بتانے کی وجہ سے ڈاکٹر پر غصہ

کرنے اور اس سے ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔

بیماری بتانے والے پر ناراض نہیں ہونا چاہئے

البتہ بتانے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں، کسی نے آپ کے عیب اور آپ کی خرابی کو اچھے طریقے سے بتادیا۔ اور کسی نے بے ڈھنگے طریقے سے بتادیا۔ لیکن اگر کسی نے آپ کی برائیاں ایسے طریقے سے آپ کو بتائیں جو طریقہ مناسب نہیں تھا، تب بھی اس نے تمہاری ایک بیماری پر تمہیں مطلع کیا۔ اس لئے تمہیں اس کا احسان ماننا چاہئے۔ عربی کے ایک شعر کا مفہوم یہ ہے:

''میرا سب سے بڑا محسن وہ ہے جو میرے پاس میرے عیوب کا ہدیہ پیش کرے۔

جو مجھے بتائے کہ میرے اندر کیا عیب ہے''

اور جو شخص تعریف کر رہا ہے کہ تم ایسے اور ویسے ہو، اور اس کو بڑھا چڑھا رہا ہے، جس کے نتیجے میں دل میں کبر اور غرور پیدا ہو رہا ہے، یہ بظاہر تو دیکھنے میں اچھا معلوم ہو رہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ نقصان پہنچا رہا ہے۔ لیکن جو شخص تمہارے عیوب بیان کر رہا ہے اس کا احسان مانو۔ بہر حال، یہ حدیث ایک طرف تو یہ بتارہی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہیں تمہاری غلطی بتائے تو اس پر ناراض ہونے کے بجائے اس کے بتانے کو اپنے لئے غنیمت سمجھو، جس طرح آئینہ کے بتانے کو غنیمت سمجھتے ہو۔

غلطی بتانے والا لعنت ملامت نہ کرے

اس حدیث میں دوسرا سبق غلطی بتانے والے کے لئے ہے۔ اس میں غلطی بتانے والے کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔ اور آئینہ کا کام یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ یہ بتادیتا ہے کہ تمہارے چہرے پر اتنا بڑا داغ لگا ہوا ہے۔ اور اس بتانے میں نہ تو وہ کمی زیادتی کرتا ہے، اور نہ اس شخص پر لعنت ملامت کرتا ہے کہ یہ داغ کہاں سے لگالیا بلکہ صرف داغ بتادیتا ہے۔ اسی طرح غلطی بتانے والا مؤمن بھی آئینہ کی طرح صرف اتنی غلطی اور عیب بتائے جتنا اس کے اندر واقعۃً موجود ہے۔ اس کو بڑھا چڑھا کر نہ بتائے اور اس بتانے میں مبالغہ نہ کرے۔ اور اسی طرح صرف اس کو بتادے کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے۔ لیکن اس کو اس کے عیب پر لعنت اور ملامت شروع کردے اور لوگوں کے سامنے اس کو ذلیل کرنا شروع کردے، یہ مؤمن کا کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ مؤمن تو آئینہ کی طرح ہے۔ اس لئے اتنی ہی غلطی بتائے جتنی اس کے اندر ہے۔ اور اس پر لعنت ملامت نہ کرے۔

غلطی کرنے والے پر ترس کھاؤ

اور جب ایک مؤمن دوسرے مؤمن کو غلطی بتاتا ہے تو اس پر ترس کھاتا ہے کہ یہ بیچارہ اس غلطی کے اندر مبتلا ہو گیا۔ جس طرح ایک شخص بیمار ہے تو وہ بیمار ترس کھانے کے لائق ہے۔ وہ غصہ کا محل نہیں۔ کوئی شخص اس بیمار پر غصہ نہیں کرے گا کہ تو کیوں بیمار ہو گیا، بلکہ اس پر ترس کھائے گا اور اس کو علاج کرنے کا مشورہ دے گا۔ اسی طرح ایک مؤمن غلطی اور گناہ کے اندر مبتلا ہے تو وہ ترس کھانے کے لائق ہے۔ وہ غصہ کرنے کا محل نہیں ہے۔ اس کو پیار سے اور نرمی سے بتا دو کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے تاکہ وہ اس کی اصلاح کر لے۔ اس پر غصہ یا لعنت ملامت مت کرو۔

غلطی کرنے والے کو ذلیل مت کرو

آج کل ہم کو اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ دوسرے مؤمن کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنا بھی ایک فریضہ ہے۔ اگر ایک مسلمان غلط طریقے سے نماز پڑھ رہا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ طریقہ غلط ہے تو تم پر فرض ہے کہ اس کو اس غلطی کے بارے میں بتا دو۔ اس لئے کہ یہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اندر داخل ہے اور یہ ہر آدمی پر فرض ہے۔ آج کل کسی کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کو غلطی بتا دوں، بلکہ یہ سوچتا ہے کہ غلط پڑھ رہا ہے تو پڑھنے دو۔ اور اگر کسی کو غلطی بتانے کا احساس ہوتا بھی ہے تو یہ احساس اتنی شدت سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھ بیٹھتا ہے، چنانچہ جب وہ دوسروں کو ان کی غلطی بتاتا ہے تو ان پر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتا ہے۔ اور ان کو دوسروں کے سامنے ذلیل اور رسوا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تم آئینہ ہو۔ تم لعنت ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ مت کرو۔ نہ اس کو ذلیل اور رسوا کرو۔ بلکہ اس کو ایسے طریقے سے بتاؤ کہ اس کے دل میں تمہاری بات اُتر جائے۔

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ

واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما دونوں غالباً دریائے فرات کے کنارے سے گزر رہے تھے۔ ان دونوں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک بڑے میاں وضوء کر رہے ہیں۔ لیکن غلط طریقے سے کر رہے ہیں۔ ان کو خیال آیا کہ ان کو غلطی بتانی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ بھی ایک دینی فریضہ ہے کہ دوسروں کی غلطی کو بتایا جائے۔ لیکن وہ بڑے ہیں اور ہم چھوٹے ہیں، ان کو کس طریقے سے بتائیں کہ ان کا دل نہ ٹوٹے، اور ناراض نہ ہو جائیں۔ چنانچہ دونوں نے مشورہ کیا، اور پھر

دونوں مل کر بڑے میاں کے پاس گئے اور جا کر بیٹھ گئے۔ باتیں کرتے رہے۔ پھر کہا کہ آپ ہمارے بڑے ہیں۔ ہم جب وضوء کرتے ہیں تو ہمیں شبہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں کہ ہمارا وضوء سنت کے مطابق ہوا یا نہیں؟ اس لئے ہم آپ کے سامنے وضوء کرتے ہیں، آپ ذرا دیکھیں کہ ہمارے وضوء میں کوئی بات غلط اور خلافِ سنت تو نہیں ہے؟ اگر ہو تو بتا دیجئے گا۔ چنانچہ دونوں بھائیوں نے ان کے سامنے وضوء کیا۔ اور پھر وضوء کے بعد ان سے پوچھا کہ اب بتایئے کہ ہم نے اس میں کوئی غلطی تو نہیں کی؟ بڑے میاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ میں نے جس طریقے سے وضوء کیا تھا وہ غلط تھا، اور ان کا طریقہ صحیح ہے۔ بڑے میاں نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے ہی غلط طریقے سے وضوء کیا تھا، اب تمہارے بتانے سے بات واضح ہوگئی۔ اب انشاء اللہ صحیح طریقے سے وضوء کروں گا۔(۱)

یہ ہے وہ طریقہ جس کا اس آیت کریمہ میں حکم دیا ہے:

﴿ اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ ﴾(۲)

''اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت سے بلاؤ''

تم کوئی خدائی فوجدار نہیں ہو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے داروغہ بنا دیا ہو کہ لوگوں کو ڈانٹتے پھرو اور ان کو ذلیل کرتے پھرو، بلکہ تم آئینہ ہو، اور جس طرح آئینہ صرف حقیقتِ حال بتا دیتا ہے، ڈانٹ ڈپٹ اور سختی نہیں کرتا، اسی طرح تمہیں بھی کرنا چاہئے۔ یہ سبق بھی اس حدیث "ألمؤمن مراة المؤمن" سے نکل رہا ہے۔

ایک کا عیب دوسرے کو نہ بتایا جائے

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے تحت ایک نکتہ یہ بیان فرمایا ہے کہ آئینہ کا کام یہ ہے کہ جو شخص اس کے سامنے آئے گا اور اس کے اوپر کوئی عیب ہوگا تو وہ آئینہ صرف اسی شخص کو بتائے گا کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے۔ وہ آئینہ دوسروں سے نہیں کہے گا کہ فلاں شخص میں یہ عیب ہے۔ اور نہ اس عیب کا دوسروں کے سامنے تشہیر اور چرچا کرے گا۔ اسی طرح مؤمن بھی ایک آئینہ ہے۔ جب وہ دوسرے کے اندر کوئی عیب دیکھے تو صرف اسی کو خلوت میں خاموشی سے بتا دے کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے۔ باقی دوسروں سے جا کر کہنا کہ فلاں کے اندر یہ عیب اور یہ غلطی ہے، اور اس غلطی کا دوسروں کے سامنے چرچا کرنا، یہ مؤمن کا کام نہیں۔ بلکہ یہ تو نفسانیت کا کام ہے۔ اگر دل میں یہ خیال ہے کہ میں اللہ کو راضی کرنے کے لئے اس کا یہ عیب بتا رہا ہوں تو کبھی بھی وہ شخص دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ نہیں کرے گا۔ البتہ اگر دل میں نفسانیت ہوگی تو وہاں یہ خیال

(۱) مناقب الامام الاعظم للکردری (۱/ ۳۹۔ ۴۰)　　(۲) النحل: ۱۲۵

آئے گا کہ میں اس عیب کی وجہ سے اس کو ذلیل اور رسوا کروں۔ جبکہ مسلمانوں کو ذلیل اور رسوا کرنا حرام ہے۔

ہمارا طرزِ عمل

آج ہم اپنے معاشرے میں ذرا جائزہ لے کر دیکھیں تو ایسے لوگ بہت کم نظر آئیں گے جو دوسروں کی غلطی دیکھ کر اس کو خیر خواہی سے بتادیں کہ تمہاری یہ بات مجھے پسند نہیں آئی، یا یہ بات شریعت کے خلاف ہے۔ لیکن اس کی غلطی کا تذکرہ مجلسوں میں کرنے والے بیشار نظر آئیں گے۔ جس کے نتیجے میں غیبت کے گناہ میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ افتراء اور بہتان کے گناہ میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ مبالغہ اور جھوٹ کا گناہ ہو رہا ہے۔ اور ایک مسلمان کو بدنام کرنے کا گناہ ہو رہا ہے۔ اس کے بجائے بہتر طریقہ یہ تھا کہ تنہائی میں اس کو سمجھا دیتے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے، اس کو دور کرلو۔ لہٰذا جب کسی مسلمان بھائی کے اندر کوئی عیب دیکھو تو دوسروں سے مت کہو، بلکہ صرف اس سے کہو۔ یہ سبق بھی اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے:

((اَلْمُؤْمِنُ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ))(۱)

غلطی بتانے کے بعد مایوس ہو کر مت بیٹھو

اس حدیث سے ایک سبق یہ مل رہا ہے کہ آئینہ کا کام یہ ہے کہ جو شخص اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگا تو وہ آئینہ اس شخص کا عیب اور غلطی بتادے گا کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے۔ اگر دوسری مرتبہ وہ شخص آئینہ کے سامنے آئے گا تو دوسری مرتبہ بتادے گا۔ جب تیسری مرتبہ سامنے آئے گا تو تیسری مرتبہ بتادے گا۔ لیکن وہ آئینہ تمہارے پیچھے نہیں پڑے گا کہ اپنا یہ عیب ضرور دور کرو۔ اگر وہ شخص اپنا وہ عیب دور نہ کرے تو وہ آئینہ روٹھ کر اور تھک ہار کر الگ ہو کر نہیں بیٹھ جائے گا کہ تم اپنا یہ عیب دور نہیں کر رہے ہو، اس لئے اب میں نہیں بتاؤں گا۔ بلکہ وہ شخص جتنی مرتبہ بھی اس آئینہ کے سامنے آئے گا وہ آئینہ ضرور بتائے گا کہ یہ عیب اب بھی موجود ہے۔ وہ بتانے سے باز نہیں آئے گا اور بددل بھی نہیں ہوگا۔ اور داروغہ بن کر یہ نہیں کہے گا کہ یہ شخص جب تک اپنا عیب دور نہیں کرے گا اس وقت تک اس سے تعلقات نہیں رکھوں گا۔

---

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في النصيحة والحياطة، رقم: ٤٢٧٢

انبیاء علیہم السلام کا طرزِ عمل

یہی انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے کہ وہ بددل ہو کر اور ہار کر نہیں بیٹھ جاتے۔ بلکہ جب بھی موقع ملتا ہے اپنی بات کہے جاتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو داروغہ نہیں سمجھتے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾(۱)

یعنی آپ کو داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ بلکہ آپ کا کام صرف پہنچا دینا ہے۔ بس جو غلطی کرے اس کو بتادو اور اس کو متنبہ کردو۔ اب اس کا کام یہ ہے کہ وہ عمل کرے۔ اور اگر وہ عمل نہیں کرتا تو دوبارہ بتادو۔ تیسری مرتبہ بتادو۔ لیکن مایوس ہو کر اور ناراض ہو کر نہ بیٹھ جاؤ کہ یہ شخص مانتا ہی نہیں، اب اس کو کیا بتائیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اُمت پر بہت زیادہ مہربان تھے، اس لئے جب کفار اور مشرکین آپ کی بات نہیں مانتے تھے تو آپ کو شدید صدمہ ہوتا تھا۔ اس پر قرآن کریم میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾(۲)

کیا آپ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال دیں گے اس صدمہ کی وجہ سے کہ وہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ آپ کا یہ فریضہ نہیں ہے۔ آپ کا کام صرف بات کو پہنچا دینا ہے۔ ماننے یا نہ ماننے کی ذمہ داری آپ پر نہیں۔

یہ کام کس کے لئے کیا تھا؟

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دعوت و تبلیغ کرنے والے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے کام میں لگا رہے۔ لوگوں کے نہ ماننے کی وجہ سے چھوڑ کر نہ بیٹھ جائے۔ مایوس ہو کر، یا ناراض ہو کر یا غصہ ہو کر نہ بیٹھ جائے کہ میں نے تو بہت سمجھایا لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی، لہٰذا اب میں نہیں کہوں گا، ایسا نہ کرے۔ بلکہ یہ سوچے کہ میں نے یہ کام کس کے لئے کیا تھا؟ اللہ کو راضی کرنے کے لئے کیا تھا۔ آئندہ بھی جتنی مرتبہ کروں گا، اللہ کو راضی کرنے کے لئے کروں گا۔ اور ہر مرتبہ مجھے کہنے کا اجر و ثواب مل جائے گا۔ اس لئے میرا تو مقصد حاصل ہے۔ اب دوسرا مان رہا ہے یا نہیں مان رہا ہے، اس سے میرا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کس کو ہدایت دیتے ہیں اور کس کو ہدایت نہیں دیتے۔

---

(۱) الغاشیۃ: ۲۲ (۲) الشعراء: ۳

ماحول کی اصلاح کا بہترین طریقہ

حقیقت یہ ہے کہ ایک مؤمن اخلاص کے ساتھ بات کہتا ہے اور بار بار کہتا ہے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا ہے کہ یا اللہ! میرا فلاں بھائی اس گناہ کے اندر مبتلا ہے، اس کو ہدایت عطا فرما، اور اس کو سیدھے راستے پر لگا دے۔ جب یہ دو کام کرتا ہے تو عموماً اللہ تعالیٰ ایسے موقع پر ہدایت عطا فرما ہی دیتے ہیں۔ اگر ہم یہ کام کرتے رہیں تو یہ وہ کام ہے کہ اس کی برکت سے سارا ماحول خود بخود سدھر سکتا ہے۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ خودکار یعنی آٹومیٹک نظام ہے کہ اگر ایک مؤمن دوسرے مؤمن کو ان شرائط اور آداب کے ساتھ اس کی غلطیوں پر ٹوکتا رہے تو اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اصلاح فرما دیتے ہیں۔

خلاصہ

بہرحال! اس حدیث میں یہ جو فرمایا کہ ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے، اس سے یہ سبق ملا کہ مؤمن کا کام بار بار بتا دینا ہے۔ اور نہ ماننے کی صورت میں صدمہ اور غم کرنا یا ہار مان کر بیٹھ جانا مؤمن کا کام نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب ایک مؤمن اخلاص کے ساتھ بات کہتا ہے اور بار بار کہتا ہے تو ایک نہ ایک دن اس کا کہنا رنگ لاتا ہے۔ لہٰذا تم آئینہ بن کر کام کرو۔ اور جب دوسرا شخص آئینہ بن کر کام کرے اور تمہیں تمہاری کوئی غلطی بتائے تو تم رنجیدہ اور ناراض مت ہونا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

مرنے والوں کو بُرا مت کہو ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ فَتُؤْذُوا الْأَحْيَاءَ))(۱)

مرنے والوں کو بُرا مت کہو

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جن لوگوں کا انتقال ہو چکا ہے، ان کو بُرا مت کہو، اس لئے کہ مُردوں کو بُرا کہنے سے زندہ لوگوں کو تکلیف ہوگی"

ایک اور حدیث جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((أُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ وَكُفُّوْا عَنْ مَسَاوِيْهِمْ)) (۲)

"یعنی اپنے مُردوں کی اچھائیاں ذکر کرو، اور ان کی برائیاں ذکر کرنے سے باز رہو"

یہ دو حدیثیں ہیں، دونوں کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جائے تو انتقال کے بعد اگر اس کا ذکر کرنا ہے تو اچھائی سے ذکر کرو، بُرائی سے ذکر مت کرو۔ چاہے بظاہر اس کے اعمال کتنے بھی خراب رہے ہوں، لیکن تم اس کی اچھائی کا ذکر کرو اور بُرائی کا ذکر مت کرو۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکم تو زندوں کے لئے بھی ہے کہ زندوں کا ان کے پیچھے بُرائی سے تذکرہ کرنا جائز نہیں، بلکہ زندوں کا تذکرہ بھی اچھائی سے کرنا چاہئے، اگر بُرائی سے ذکر کریں گے

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/ ۱۰۸ تا ۱۱۴)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في الشتم، رقم: ۱۹۰۵، مسند أحمد، رقم: ۱۷۴۹۹

(۲) سنن الترمذي، كتاب الجنائز عن رسول الله، باب آخر، رقم: ۹۴۰، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في النهي عن سب الموتى، رقم: ۴۲۵۴

تو غیبت ہو جائے گی، اور غیبت حرام ہے۔ پھر ان احادیث میں خاص طور پر مُردوں کے بارے میں یہ کیوں فرمایا کہ مُردوں کا ذکر بُرائی سے مت کرو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ زندہ آدمی کی غیبت بھی حرام ہے، لیکن مردہ آدمی کی غیبت ڈبل حرام ہے، اس کی حرمت کہیں زیادہ ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں:

مرنے والے سے معافی مانگنا ممکن نہیں

ایک وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زندہ آدمی کی غیبت کرے تو اُمید یہ ہے کہ جب اس سے کسی وقت ملاقات ہوگی تو اس سے معافی مانگ لے گا اور وہ معاف کر دے گا، اس طرح غیبت کرنے کا گناہ ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ غیبت حقوق العباد میں سے ہے، اور حقوق العباد کا معاملہ یہ ہے کہ اگر صاحبِ حق معاف کر دے تو معاف ہو جاتا ہے۔ لیکن جس شخص کا انتقال ہو گیا، اس سے معافی مانگنے کا کوئی راستہ نہیں، وہ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں جا چکا، اس وجہ سے وہ گناہ معاف ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے یہ گناہ دوگنا ہو گیا۔

اللہ کے فیصلے پر اعتراض

مرنے والے کی غیبت منع ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اب تو وہ اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ چکا ہے، اور تم اس کی جس بُرائی کا ذکر کر رہے ہو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس بُرائی کو معاف کر دیا ہو اور اس کی مغفرت کر دی ہو۔ تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے تو معاف کر دیا، اور تم اس کی بُرائی لیے بیٹھے ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض ہو رہا ہے کہ یا اللہ! آپ نے تو اس بندے کو معاف کر دیا، لیکن میں معاف نہیں کرتا، وہ تو بہت بُرا تھا۔ استغفر اللہ، یہ اور بڑا گناہ ہے۔

زندہ اور مُردہ میں فرق

تیسری وجہ یہ ہے کہ زندہ آدمی کی ''غیبت'' میں بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جو جائز ہوتی ہیں، مثلاً ایک آدمی کی عادت خراب ہے، اس عادت کے خراب ہونے کی وجہ سے اندیشہ یہ ہے کہ لوگ اس سے دھوکہ میں مبتلا ہو جائیں گے یا وہ کسی کو تکلیف پہنچائے گا۔ اب اگر اس کے بارے میں کسی کو بتانا کہ دیکھو اس سے ہوشیار رہنا اس کی یہ عادت ہے، یہ غیبت جائز ہے۔ اس لئے کہ اس کا مقصد دوسرے کو نقصان سے بچانا ہے۔ لیکن جس آدمی کا انتقال ہو گیا ہے، وہ اب کسی دوسرے کو نہ تو تکلیف

پہنچا سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دھوکہ دے سکتا ہے، اسلئے اس کی غیبت کسی بھی وقت حلال نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے خاص طور پر فرمایا کہ مرنے والوں کی غیبت مت کرو، اور نہ بُرائی سے ان کا تذکرہ کرو۔

اس کی غیبت سے زندوں کو تکلیف

چوتھی وجہ خود حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمادی، وہ یہ کہ تم نے یہ سوچ کر مُردے کی غیبت کی کہ وہ مُردہ تو اب اللہ تعالیٰ کے یہاں جاچکا ہے، میری بُرائی کرنے سے اس کو نہ تو تکلیف پہنچے گی، اور نہ ہی اس کو اطلاع ہوگی۔ لیکن تم نے یہ نہ سوچا کہ آخر اس مُردے کے کچھ چاہنے والے بھی تو دنیا میں ہوں گے، جب ان کو یہ پتہ چلے گا کہ ہمارے فلاں مرنے والے قریبی عزیز کی بُرائی بیان کی گئی ہے تو اس کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوگی۔ فرض کریں کہ آپ نے کسی زندہ آدمی کی غیبت کرلی ہے تو آپ کے لئے یہ آسان ہے کہ جاکر اسی سے معافی مانگ لیں۔ وہ معاف کردے گا تو بات ختم ہوجائے گی۔ لیکن اگر آپ نے کسی مردہ آدمی کی غیبت کرلی تو اس غیبت سے اس کے جتنے عزیز و اقارب، دوست احباب ہیں، ان سب کو تکلیف ہوگی، اب تم کہاں کہاں جاکر اس کے عزیز و اقارب کو تلاش کروگے، اور یہ تحقیق کروگے کہ کس کس کو تکلیف پہنچی ہے، اور پھر کس کس سے جاکر معافی مانگو گے۔ اس لئے مردے کی غیبت کرنے کی برائی بہت زیادہ شدید ہے۔ لہٰذا زندہ آدمی کی غیبت تو حرام ہے ہی، لیکن مرنے والے کی غیبت اس کے مقابلہ میں زیادہ حرام ہے، اور اس کی معافی بھی بہت مشکل ہے۔ اس لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مُردوں کی بُرائی بیان نہ کرو، صرف اچھائی بیان کرو۔

مُردہ کی غیبت جائز ہونے کی صورت

صرف ایک صورت میں مردے کی بُرائی بیان کرنا جائز ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص گمراہی کی باتیں کتابوں میں لکھ کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اب اس کی کتابیں ہر جگہ پھیل رہی ہیں۔ ہر آدمی اس کی کتابیں پڑھ رہا ہے۔ لہٰذا اس شخص کے بارے میں لوگوں کو یہ بتانا کہ اس شخص نے عقائد کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں، وہ غلط ہیں اور گمراہی کی باتیں ہیں، تاکہ لوگ اس کی کتابیں پڑھ کر گمراہی میں مبتلا نہ ہوں۔ بس اس حد تک اس کی بُرائی بیان کرنے کی اجازت ہے۔ اس میں یہ بھی ضروری ہے کہ اس حد تک اس کے بارے میں لوگوں کو بتایا جائے جس حد تک ضرورت ہو۔ لیکن اس شخص کو بُرا بھلا کہنا یا اس کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرنا جو گالی میں داخل ہوجائیں، یہ عمل پھر بھی جائز نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اگرچہ وہ اپنی کتابوں میں گمراہی کی باتیں لکھ گیا، لیکن کیا معلوم کہ مرتے وقت اس کو اللہ تعالیٰ نے

توبہ کی توفیق دیدی ہو، اور اس توبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف فرمادیا ہو۔ لہٰذا اس کے لئے بُرے الفاظ استعمال کرنا مثلاً یہ کہنا کہ وہ تو جہنمی تھا، وغیرہ۔ العیاذ باللہ۔ یہ کسی طرح جائز نہیں۔ کیونکہ کسی کے جہنمی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ صرف ایک ذات کے اختیار میں ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی ہے۔ لہٰذا تم اس کے اوپر جہنمی ہونے کا فیصلہ کرنے والے کون ہو؟ اور تم نے اس کے بارے میں یہ کیسے فیصلہ کرلیا کہ وہ مردود تھا۔ اس قسم کے الفاظ اس کے بارے میں استعمال کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ البتہ اس نے جو گمراہی پھیلائی ہے، اس کی تردید کردو کہ یہ اس کے عقائد گمراہانہ تھے، اور کوئی شخص ان عقائد سے دھوکہ میں نہ آئے۔

اچھے تذکرہ سے مُردے کا فائدہ

لہٰذا جو بات حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمائی، یہ یاد رکھنے کی ہے کہ مرنے والوں کے محاسن ذکر کرو اور اس کی بُرائیوں کو ذکر کرنے سے پرہیز کرو۔ اس حدیث شریف میں صرف بُرائیوں سے پرہیز کرنے کا ذکر نہیں کیا، بلکہ ساتھ میں یہ بھی فرمادیا کہ اس کی اچھائیاں ذکر کرو، اس کی اچھائیاں ذکر کرنے کی ترغیب دی۔ میں نے اپنے بعض بزرگوں سے اس کی حکمت یہ سنی ہے کہ جب کوئی مسلمان کسی مرنے والے کی کوئی اچھائی ذکر کرتا ہے، یا اس کی نیکی کا تذکرہ کرتا ہے تو یہ اس مرنے والے کے حق میں ایک گواہی ہوتی ہے، اور اسی گواہی کی بنیاد پر بعض اوقات اللہ تعالیٰ اس مرنے والے پر فضل فرمادیتے ہیں کہ میرے نیک بندے تمہارے بارے میں اچھائی کی گواہی دے رہے ہیں، چلو ہم تمہیں معاف کرتے ہیں۔ لہٰذا اچھائی کا ذکر کرنا مرنے والے کے حق میں بھی فائدہ مند ہے۔ اور جب تمہاری گواہی کے نتیجے میں اس کو فائدہ پہنچ گیا، تو کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے نتیجے میں تمہاری بھی مغفرت فرمادیں، اور یہ فرمادیں کہ تم نے میرے ایک بندے کو فائدہ پہنچایا، لہٰذا ہم تمہیں بھی فائدہ پہنچاتے ہیں اور تمہیں بھی بخش دیتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ صرف یہ نہیں کہ مرنے والے کا بُرائی کے ساتھ تذکرہ مت کرو، بلکہ فرمایا کہ اس کی اچھائیاں ذکر کرو، اس سے انشاء اللہ ان کو بھی فائدہ پہنچے گا اور تمہیں بھی فائدہ پہنچے گا۔

مرنے والوں کے لئے دعائیں کرو

ایک اور حدیث بھی اسی مضمون کی ہے لیکن الفاظ دوسرے ہیں۔ وہ یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((لَا تَذْكُرُوْا هَلْكَاكُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ))(۱)

یعنی اپنے مرنے والوں کا ذکر مت کرو مگر اچھائی کے ساتھ۔ اور اچھائی کے ساتھ ذکر میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جب اس کی اچھائی ذکر کر رہے ہو تو اس کے حق میں یہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے اور اس پر اپنا فضل فرمائے، اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عذاب سے محفوظ فرمائے۔ یہ دعائیں دوگنا فائدہ دیں گی، ایک تو دعا کرنا بذاتِ خود عبادت اور ثواب ہے، چاہے وہ کسی کام کے لئے بھی کرے۔ دوسرے کسی مسلمان کو فائدہ پہنچانے کا اجر وثواب بھی حاصل ہو جائے گا۔ اس لئے اس کے حق میں دعا کرنے میں آپ کا بھی فائدہ ہے اور اس کا بھی فائدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب النهی عن ذکر الهلکی إلا بخیر، رقم: ۱۹۰۹

ہماری روز مرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۵

اسلام اور خاندانی نظام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینانا تھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰ انار کلی، لاہور، پاکستان ★ موہن روڈ چوک اُردو بازار کراچی

فون ۳۷۳۵۳۲۵۵۔۳۷۲۲۳۹۹۱ — فون ۳۲۷۲۲۴۰۱ — فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۲۷۸۵

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۶

اصلاح وتصوّف

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۹۰ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۲۴۸۵ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خطبات وتحریرات)

جلد نمبر ۵

اسلام اور خاندانی نظام

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

اسلام اور خاندانی نظام

جلد ۵

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۵

اسلام اور خاندانی نظام

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲-۳۷۲۳۲۴۳۴ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۲۷۸۵

★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۲۱۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۵

اسلام اور خاندانی نظام

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارہ اسلامیات پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۳۷۲۳۳۳۶۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۲۳۲۲۷۸۵+

۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان ___ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان ___ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

نکاح کے آداب واحکام ۱۷

عہد نبوی ﷺ میں نکاح کے وقت نصیحت ۱۷
نکاح کے وقت خطبہ ۱۸
نکاح ایک عبادت ۱۸
خطبہ نکاح میں تین آیات ۱۸
پہلی آیت ۱۹
دوسری آیت ۱۹
تیسری آیت ۲۰
تینوں آیتوں میں ''تقویٰ'' کا ذکر ۲۰
نکاح، فطری خواہش پوری کرنے کا آسان راستہ ۲۱
نکاح کے لیے خطبہ شرط نہیں ۲۱
برکت والا نکاح ۲۲
عہد نبوی ﷺ کی شادیاں ۲۲
یہ سادگی آپ بھی اختیار کریں ۲۳
حضرت جابر کو نوازنے کا واقعہ ۲۴
سادگی سے نکاح کا دوسرا واقعہ ۲۵
دوسروں کو بلانے کا اہتمام ۲۶
آج ہم نے حلال کو مشکل بنا دیا ۲۶
تین چیزوں میں تاخیر مت کرو ۲۶
ان فضول رسموں کو چھوڑ دو ۲۷
علی الاعلان نکاح کرو ۲۸
نکاح کے بعد مسجد میں شور وشغب ۲۸
عبادت میں گناہ کی آمیزش ۲۹
نکاح کی محفل گناہوں سے پاک ہو ۲۹
خوشگوار ازدواجی کے لیے تقویٰ کی ضرورت ۳۰
''اللہ کا خوف'' حقوق کی ادائیگی کرا سکتا ہے ۳۱
یہ تو درندے کا وصف ہے ۳۱
آج تک لہجہ بدل کر بات نہیں کی ۳۱
بیوی کا ہاتھ کون روک سکتا ہے؟ ۳۲
ہر کام کی درستی ''تقویٰ'' میں ہے ۳۲
نکاح کرنا سنت ہے ۳۳
نکاح خاندانوں کو جوڑنے کا ذریعہ ۳۳
دنیا کی بہترین چیز ''نیک خاتون'' ۳۴
تین چیزوں کا حصول نیک بختی کی علامت ۳۴
برکت والا نکاح ۳۵

نکاح جنسی تسکین کا جائز ذریعہ ۳۶

نکاح، اہل ایمان کا وصف خاص ۳۶
جنسی جذبہ فطری ہے ۳۷
دو حلال راستے ۳۷
اسلام کا اعتدال ۳۷

عیسائیت اور رہبانیت	۳۸
عیسائی راہبہ عورتیں	۳۹
یہ فطرت سے بغاوت تھی	۳۹
شیطان کی پہلی چال	۳۹
شیطان کی دوسری چال	۴۰
نکاح کرنا آسان کر دیا	۴۰
عیسائی مذہب میں نکاح کی مشکلات	۴۰
خطبہ واجب نہیں	۴۱
شادی کو عذاب بنالیا	۴۱
حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور شادی	۴۱
حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور نکاح	۴۲
جائز تعلقات پر اجر و ثواب	۴۳
نکاح میں تاخیر مت کرو	۴۳
ان کے علاوہ سب حرام راستے ہیں	۴۴
خطبہ نکاح کی اہمیت	۴۵
شادی کی تقریبات	۴۵
خطبہ نکاح کی تین آیات	۴۵
تینوں آیتوں میں مشترک چیز	۴۷
نئی زندگی کا آغاز	۴۷
خطبۂ نکاح کا پیغام	۴۸
نکاح اور برادری	۵۲
شادی بیاہ کی رسمیں	۵۵
مہرِ شرعی کی حقیقت	۵۹
کچھ جہیز کے بارے میں	۶۳
شادی کی دعوت اور بارات	۶۷
نکاح اور ولیمہ...... چند سوالات کا جواب	۷۱
طلاق کا صحیح طریقہ	۷۴
احسان اور ازدواجی زندگی	۷۹
بیوی کے حقوق اور اس کی حیثیت	۸۴
حقوق العباد کی اہمیت	۸۴
حقوق العباد سے غفلت	۸۵
غیبت حقوق العباد میں داخل ہے	۸۵
حالت ''احسان'' ہر وقت مطلوب ہے	۸۶
ایک جہنمی عورت کا ذکر	۸۷
ایک جنتی عورت کا ذکر	۸۷
مفلس کون؟	۸۷

حقوق العباد تین چوتھائی دین ہے	۸۸
اسلام سے پہلے عورت کی حالت	۸۸
خواتین کے ساتھ حسن سلوک	۸۹
قرآن کریم صرف اصول بیان کرتا ہے	۹۰
گھریلو زندگی، پورے تمدن کی بنیاد ہے	۹۰
عورت کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے ہونے کا مطلب	۹۱
عورت کا ٹیڑھا پن ایک فطری تقاضا	۹۲
''غفلت'' عورت کے لیے حسن ہے	۹۲
زبردستی سیدھا کرنے کی کوشش نہ کرو	۹۳
سارے جھگڑوں کی جڑ	۹۳
اس کی کوئی عادت پسندیدہ بھی ہوگی	۹۴
ہر چیز خیر وشر سے مخلوط ہے	۹۴
انگریزی کی ایک کہاوت اور حدیث نبوی	۹۵
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں	۹۵
عورت کے اچھے وصف کی طرف نگاہ کرو	۹۵
ایک بزرگ کا سبق آموز واقعہ	۹۶
حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ اور نازک مزاجی	۹۶
ہمارے معاشرے کی خواتین دنیا کی حوریں ہیں	۹۷
بیوی کو مارنا بداخلاقی ہے	۹۷
بیوی کی اصلاح کے تین درجات	۹۸
بیوی کو مارنے کی حد	۹۸
بیویوں کے ساتھ آپ کا سلوک	۹۹
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت	۹۹
حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت	۹۹
طریقت بجز خدمت خلق نیست	۱۰۰
صرف دعویٰ کافی نہیں	۱۰۰
خطبۃ حجۃ الوداع	۱۰۱
میاں بیوی کے تعلقات کی اہمیت	۱۰۲
عورتیں تمہارے پاس مقید ہیں	۱۰۲
ایک نادان لڑکی سے سبق لو	۱۰۳
عورت نے تمہارے لیے کتنی قربانیاں دی ہیں	۱۰۳
اس کے علاوہ تمہارا ان پر کوئی مطالبہ نہیں	۱۰۳
کھانا پکانا عورت کی شرعی ذمہ داری نہیں	۱۰۴
ساس، سسر کی خدمت واجب نہیں	۱۰۵
ساس سسر کی خدمت اس کی سعادت مندی ہے	۱۰۵
بہو کی خدمت کی قدر کریں	۱۰۵
ایک عجیب واقعہ	۱۰۶
ایسا شخص کھانے کی تعریف نہیں کرے گا	۱۰۶
شوہر اپنے ماں باپ کی خدمت خود کرے	۱۰۶
عورت کو اجازت کے بغیر باہر جانا جائز نہیں	۱۰۷
دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کو چلائیں	۱۰۷
اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں تو؟	۱۰۸
بیوی کو جیب خرچ الگ دیا جائے	۱۰۸
خرچہ میں فراخدلی سے کام لینا چاہیے	۱۰۹
رہائش جائز آسائش جائز	۱۰۹
آرائش بھی جائز	۱۱۰

نمائش جائز نہیں	۱۱۰
فضول خرچی کی حد	۱۱۰
یہ اسراف میں داخل نہیں	۱۱۰
ہر شخص کی کشادگی الگ الگ ہے	۱۱۱
اس محل میں خدا کو تلاش کرنے والا احمق ہے	۱۱۱
غلبہ حال کی کیفیت قابل تقلید نہیں	۱۱۲
آمدنی کے مطابق کشادگی ہونی چاہیے	۱۱۳
بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟	۱۱۳
اس کا بستر چھوڑ دو	۱۱۳
ایسی علیحدگی جائز نہیں	۱۱۴
چار ماہ سے زیادہ سفر میں بیوی کی اجازت	۱۱۴
بہتر لوگ کون ہیں؟	۱۱۴
آج کے دور میں ''خوش اخلاقی''	۱۱۵
''حسن اخلاق'' دل کی کیفیت کا نام ہے	۱۱۶
اخلاق پیدا کرنے کا طریقہ	۱۱۶
اللہ کی بندیوں کو نہ مارو	۱۱۶
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی اس لائق تھے	۱۱۷
یہ عورتیں شیر ہو گئیں ہیں	۱۱۸
یہ اچھے لوگ نہیں ہیں	۱۱۸
دنیا کی بہترین چیز ''نیک عورت''	۱۱۹
ٹھنڈا پانی عظیم نعمت ہے	۱۲۰
ٹھنڈا پانی پیا کرو	۱۲۰
بری عورت سے پناہ مانگو	۱۲۱
شوہر کے حقوق اور اس کی حیثیت	۱۲۲
آج ہر شخص اپنا حق مانگ رہا ہے	۱۲۲
ہر شخص اپنے فرائض ادا کرے	۱۲۳
پہلے اپنی فکر کرو	۱۲۳
حضور ﷺ کی تعلیم کا انداز	۱۲۴
زندگی استوار کرنے کا طریقہ	۱۲۵
ابلیس کا دربار	۱۲۵
مرد عورت پر حاکم ہے	۱۲۶
آج کی دنیا کا پروپیگنڈہ	۱۲۷
سفر کے دوران ایک کو امیر بنالو	۱۲۷
زندگی کے سفر کا امیر کون ہے؟	۱۲۸
اسلام میں امیر کا تصور	۱۲۸
امیر ہو تو ایسا	۱۲۹
امیر وہ جو خدمت کرے	۱۳۰
میاں بیوی میں دوستی کا تعلق ہے	۱۳۰
ایسا رعب مطلوب نہیں	۱۳۱
حضور ﷺ کی سنت دیکھیے:	۱۳۱
بیوی کے ناز کو برداشت کیا جائے	۱۳۲
بیوی کی دلجوئی سنت ہے	۱۳۳
بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق سنت ہے	۱۳۴
مقام ''حضوری''	۱۳۵
ورنہ گھر برباد ہو جائے گا	۱۳۵
عورت کی ذمہ داریاں	۱۳۵
زندگی قانون کے خشک تعلق سے نہیں گزر سکتی	۱۳۶
بیوی کے دل میں شوہر کے پیسے کا درد ہو	۱۳۷
ایسی عورت پر فرشتوں کی لعنت	۱۳۷
شوہر کی اجازت سے نفلی روزہ رکھے	۱۳۸

شوہر کی اطاعت نفلی عبادت پر مقدم ہے	۱۳۹
گھر کے کام کاج پر اجر وثواب	۱۳۹
جنسی خواہش کی تکمیل پر اجر وثواب	۱۳۹
اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں	۱۴۰
قضا روزوں میں شوہر کی رعایت	۱۴۰
بیوی گھر میں آنے کی اجازت نہ دے	۱۴۰
حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا اسلام لانا	۱۴۱
حضور ﷺ سے نکاح	۱۴۲
متعدد نکاح کی وجہ	۱۴۳
غیر مسلم کی زبان سے تعریف	۱۴۳
معاہدے کی عہد شکنی	۱۴۴
آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں	۱۴۴
بیوی فوراً آجائے	۱۴۵
نکاح جنسی تسکین کا حلال راستہ	۱۴۵
نکاح کرنا آسان ہے	۱۴۵
برکت والا نکاح	۱۴۶
حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا نکاح	۱۴۶
آج نکاح کو مشکل بنا دیا گیا ہے	۱۴۷
جہیز موجودہ معاشرے کی ایک لعنت	۱۴۸
عورت کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے	۱۴۹
یہ دو دلوں کا تعلق ہے	۱۴۹
سب سے زیادہ قابل محبت ہستی	۱۵۰
جدید تہذیب کی ہر چیز الٹی	۱۵۰
عورت کی ذمہ داری	۱۵۱
وہ عورت سیدھی جنت میں جائے گی	۱۵۱
وہ تمہارے پاس چند دن کا مہمان ہے	۱۵۲
مردوں کے لیے شدید ترین آزمائش	۱۵۲
عورت کس طرح آزمائش ہے؟	۱۵۳
ہر شخص نگہبان ہے	۱۵۴
''امیر'' رعایا کا نگہبان ہے	۱۵۵
''خلافت'' ذمہ داری کا ایک بوجھ	۱۵۵
مرد، بیوی بچوں کا نگہبان ہے	۱۵۶
''عورت'' شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے	۱۵۷
خواتین حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سنت اختیار کریں	۱۵۷
خواتین کے لیے نسخہ کیمیا ''تسبیح فاطمی''	۱۵۸
اولاد کی تربیت ماں کے ذمہ ہے	۱۵۸
بیوی سے محبت حبِّ دنیا نہیں	۱۶۰
بیوی سے محبت قابل تحسین ہے	۱۶۰
ہر وہ چیز جو گناہ پر آمادہ کرے دنیا ہے	۱۶۰
مباحات میں انہماک دنیا ہے	۱۶۱
کیا اہل دنیا سب کافر ہیں؟	۱۶۱
غفلت کا نام دنیا ہے	۱۶۳
بیوی سے محبت عین دین ہے	۱۶۳
تقویٰ بڑھنے سے بیوی سے محبت زیادہ	۱۶۳
ہماری اور ان کی محبت میں فرق	۱۶۳
ان کی محبت ادائے حقوق کے لیے	۱۶۴
حضور اقدس ﷺ کی ازواج مطہرات سے خوش طبعی پر تعجب	۱۶۴

یہ دونوں باتیں جمع ہو سکتی ہیں	۱۶۴
قطبی پڑھ کر ایصال ثواب کرنا	۱۶۵
ملا حسن کے درس میں دل سے اللہ اللہ جاری تھا	۱۶۵
اتباع سنت کو اختیار کر لو	۱۶۵
اس کے لیے مشق کی ضرورت ہے	۱۶۶
ہر عمل کو دین بنالیں	۱۶۶
خلاصہ	۱۶۶

والدین کی خدمت، جنت کا ذریعہ

والدین کی خدمت، جنت کا ذریعہ	۱۶۷
افضل عمل کون سا؟	۱۶۷
نیک کاموں کی حرص	۱۶۸
افسوس! میں نے تو بہت سے قیراط ضائع کر دیے	۱۶۹
سوال ایک، جواب مختلف	۱۶۹
ہر شخص کا افضل عمل جدا ہے	۱۷۰
نماز کی افضلیت	۱۷۱
جہاد کی افضلیت	۱۷۲
والدین کا حق	۱۷۳
اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں	۱۷۴
حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ	۱۷۶
صحابیت کا مقام	۱۷۷
ماں کی خدمت کرتے رہو	۱۷۷
ماں کی خدمت کا صلہ	۱۷۸
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جانثاری	۱۷۹
والدین کی خدمت گزاری کی اہمیت	۱۸۰
جب والدین بوڑھے ہو جائیں	۱۸۰
ڈائری کا ایک ورق	۱۸۱
والدین کے ساتھ حسن سلوک	۱۸۲
والدین کی نافرمانی کا وبال	۱۸۲
ایک عبرت ناک واقعہ	۱۸۳
علم کے لیے والدین کی اجازت	۱۸۳
جنت حاصل کرنے کا آسان راستہ	۱۸۴
والدین کی وفات کے بعد تلافی کی صورت	۱۸۴
ماں کے تین حق باپ کا ایک حق	۱۸۵
باپ کی تعظیم، ماں کی خدمت	۱۸۵
ماں کی خدمت کا نتیجہ	۱۸۶
واپس جا کر ان کے ساتھ حسن سلوک کرو	۱۸۶
دین حفظ حدود کا نام ہے	۱۸۷
اہل اللہ کی صحبت	۱۸۸
شریعت، سنت، طریقت	۱۸۸

اولاد کی اصلاح و تربیت

اولاد کی اصلاح و تربیت	۱۹۰
خطاب کا پیارا عنوان	۱۹۰
لفظ ”بیٹا“ ایک شفقت بھرا خطاب	۱۹۱
ذاتی عمل نجات کے لیے کافی نہیں	۱۹۲
اگر اولاد نہ مانے تو!	۱۹۳
دنیاوی آگ سے کس طرح بچاتے ہو؟	۱۹۳
آج دین کے علاوہ ہر چیز کی فکر ہے	۱۹۴
تھوڑا سا بے دین ہو گیا	۱۹۵

''جان'' تو نکل گئی ہے	۱۹۵
نئی نسل کی حالت	۱۹۵
آج اولاد ماں باپ کے سر پر سوار ہیں	۱۹۶
باپ ''نرسنگ ہوم'' میں	۱۹۷
جیسا کرو گے ویسا بھرو گے	۱۹۷
حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور اولاد کی فکر	۱۹۸
قیامت کے روز ماتحتوں کے بارے میں سوال ہوگا	۱۹۹
یہ گناہ حقیقت میں آگ ہیں	۱۹۹
حرام کے ایک لقمے کا نتیجہ	۲۰۰
اندھیرے کے عادی ہو گئے ہیں	۲۰۰
اللہ والوں کو گناہ نظر آتے ہیں	۲۰۱
یہ دنیا گناہوں کی آگ سے بھری ہوئی ہے	۲۰۲
پہلے خود نماز کی پابندی کرو	۲۰۲
بچوں کے ساتھ جھوٹ مت بولو	۲۰۳
بچوں کو تربیت دینے کا انداز	۲۰۳
بچوں سے محبت کی حد	۲۰۴
حضرت شیخ الحدیث کا ایک واقعہ	۲۰۵
کھانا کھانے کا ایک ادب	۲۰۵
یہ اسلامی آداب ہیں	۲۰۶
سات سال سے پہلے تعلیم	۲۰۷
قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۲۰۸
بچوں کو مارنے کی حد	۲۰۹
بچوں کو مارنے کا طریقہ	۲۰۹
بچوں کو تربیت دینے کا طریقہ	۲۱۰
تم میں سے ہر شخص نگران ہے	۲۱۰
اپنے ماتحتوں کی فکر کریں	۲۱۱
صرف دس منٹ نکال لیں	۲۱۲
چھوٹے پر زیادتی کی صورت میں معافی کا طریقہ	۲۱۳
چھوٹے پر زیادتی ہو جاتی ہے	۲۱۹
دو میں سے ایک بات کا فیصلہ کر لو	۲۲۱
ملازم کے ساتھ اچھا برتاؤ کیجیے	۲۲۱
یہ تکبر کی بیماری کا علاج ہے	۲۲۱
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معافی مانگنا	۲۲۲
ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینا	۲۲۲
معافی کا دروازہ بند ہونے سے پہلے معافی مانگ لو	۲۲۳
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مانگنا	۲۲۳
حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معافی مانگنا	۲۲۳
ہدیہ دے کر نوکر کو خوش کر دو	۲۲۴
نوکر اور ماتحت کے بارے میں اتنی تاکید کیوں؟	۲۲۴
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۲۲۴
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معمول	۲۲۵
بھائی نیاز کا واقعہ	۲۲۵
اللہ کی حدود کے آگے رک جانے والے	۲۲۶

بدلہ میں برابری آسان نہیں	۲۲۶
اولیاء کے مختلف الوان ہوتے ہیں	۲۲۷
ایک صاحب کے لٹنے کا واقعہ	۲۲۹
خاندانی نظام	۲۳۰
رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کیجیے	۲۳۵
صلہ رحمی کی تاکید	۲۳۵
قیامت کے دن صلہ رحمی کے بارے میں سوال ہوگا	۲۳۶
''شریعت'' حقوق کی ادائیگی کا نام ہے	۲۳۷
تمام انسان آپس میں رشتہ دار ہیں	۲۳۷
حقوق کی ادائیگی سکون کا ذریعہ ہے	۲۳۷
اللہ کے لیے اچھا سلوک کرو	۲۳۸
شکریہ اور بدلے کا انتظار مت کرو	۲۳۹
صلہ رحمی کرنے والا کون ہے؟	۲۳۹
ہمیں رسموں نے جکڑ لیا ہے	۲۴۰
تقریبات میں ''نیوتہ'' دینا حرام ہے	۲۴۰
تحفہ کس مقصد کے تحت دیا جائے؟	۲۴۱
مقصد جانچنے کا طریقہ	۲۴۱
''ہدیہ'' حلال طیب مال ہے	۲۴۲
ایک بزرگ کا واقعہ	۲۴۲
ہدیہ دو محبت بڑھاؤ	۲۴۳
نیکی کے تقاضے پر جلد عمل کرلو	۲۴۴
نیکی کا تقاضا اللہ کا مہمان ہے	۲۴۴
ہدیہ کی چیز مت دیکھو بلکہ جذبہ دیکھو	۲۴۵
ایک بزرگ کی حلال آمدنی کی دعوت	۲۴۶
ہدیہ میں رسمی چیز مت دو	۲۴۶
ایک بزرگ کے عجیب ہدایا؟	۲۴۷
ہدیہ دینے کے لیے عقل چاہیے	۲۴۷
ہر کام اللہ کے لیے کرو	۲۴۸
رشتہ دار بچھو کے مانند ہیں	۲۴۸
حضور ﷺ کا رشتہ داروں سے سلوک	۲۴۸
مخلوق سے اچھی توقعات ختم کردو	۲۴۹
دنیا دکھ ہی پہنچاتی ہے	۲۴۹
اللہ والوں کا حال	۲۵۰
ایک بزرگ کا واقعہ	۲۵۰
بزرگوں کا سکون اور اطمینان	۲۵۱
خلاصہ	۲۵۱
تعلقات کو نبھائیں	۲۵۲
تعلقات نبھانے کی کوشش کرے	۲۵۳
اپنے گزرے ہوئے عزیزوں کے متعلقین سے نباہ	۲۵۳
تعلق کو نبھانا سنت ہے	۲۵۴
خود میرا ایک واقعہ	۲۵۴
اپنی طرف سے تعلق مت توڑو	۲۵۵
تعلق توڑنا آسان ہے جوڑنا مشکل ہے	۲۵۵
عمارت ڈھانا آسان ہے	۲۵۶
اگر تعلقات سے تکلیف پہنچے تو	۲۵۶

تکالیف پر صبر کرنے کا بدلہ ۲۵۷
تعلق کو نباہنے کا مطلب ۲۵۷
یہ سنت چھوڑنے کا نتیجہ ہے ۲۵۸

خاندانی اختلافات کا پہلا حل
باہمی الفت و محبت ۲۵۹

سوال کے ذریعہ طلب پیدا کرنا ۲۵۹
دین کی طلب پیدا کریں ۲۶۰
"طلب" بے چینی پیدا کرتی ہے ۲۶۰
صحابہ رضی اللہ عنہم اور دین کی طلب ۲۶۱
حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو فکر آخرت ۲۶۱
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور فکر آخرت ۲۶۲
طلب کے بعد مدد آتی ہے ۲۶۲
نماز کے ذریعہ قرب خداوندی ۲۶۳
روزے کی فضیلت ۲۶۳
صدقہ کی فضیلت ۲۶۴
سب سے افضل عمل جھگڑے ختم کرانا ۲۶۴
صلح کرانا نفل نماز روزے سے افضل ہے ۲۶۴
آپس کے اختلافات دین کو مونڈنے والے ہیں ۲۶۵
جھگڑوں کی نحوست ۲۶۵
مصالحت کے لیے آپ ﷺ کا جماعت چھوڑ دینا ۲۶۶
جنت کے بیچ میں مکان دلانے کی ضمانت ۲۶۶
یہ ضمانت دوسرے اعمال پر نہیں ۲۶۷
قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں ۲۶۷
حبشی غلام حاکم کی اتباع کرو ۲۶۸
آج زندگی جہنم بنی ہوئی ہے ۲۶۸
لوگوں کے درمیان اختلاف ڈالنے والے کام کرنا ۲۶۹
ایسا شخص جھوٹا نہیں ۲۶۹
یہ ہر مسلمان کے لیے دعا ہے ۲۷۰
ابلیس کا صحیح جانشین کون؟ ۲۷۱
نفرتیں ڈالنے والا بڑا مجرم ہے ۲۷۱
جھگڑوں سے کیسے بچیں؟ ۲۷۲
جھگڑے ختم کرنے کی ایک شرط ۲۷۲
حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۲۷۲
اتحاد کے لیے دو شرطیں، تواضع اور ایثار ۲۷۳
اتحاد میں رکاوٹ "تکبر" ۲۷۳
راحت والی زندگی کے لیے بہترین نسخہ ۲۷۴
اچھے توقعات وابستہ نہ کرو ۲۷۴
دشمن سے شکایت نہیں ہوتی ۲۷۴
صرف ایک ذات سے توقع رکھو ۲۷۵
اتحاد کی پہلی بنیاد "تواضع" ۲۷۵
اتحاد کی دوسری بنیاد "ایثار" ۲۷۵
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ایثار ۲۷۶
ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا ایثار ۲۷۶
ایثار کا مطلب ۲۷۷
ایک شخص کی مغفرت کا واقعہ ۲۷۷
خود غرضی ختم کر دو ۲۷۸
پسندیدگی کا معیار ایک ہو ۲۷۸

دوہرے پیمانے ختم کردو	۲۷۹
خاندانی اختلافات کا دوسرا حل، صبر و برداشت	۲۸۰
اسلام میں رہبانیت نہیں	۲۸۱
ساتھ رہنے سے تکلیف پہنچے گی	۲۸۱
اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ انسان کے چہرے میں	۲۸۱
رنگوں کے اختلاف میں قدرت کا نظارہ	۲۸۲
انگلیوں کے پوروں میں اللہ کی قدرت	۲۸۲
انگوٹھے کی لکیروں کے ماہرین کا دعویٰ	۲۸۳
ہم انگوٹھے کے پورے کو دوبارہ بنانے پر قادر ہیں	۲۸۳
آیت سن کر مسلمان ہونا	۲۸۳
اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ	۲۸۴
دو انسانوں کے مزاج میں اختلاف	۲۸۴
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مزاج مختلف تھے	۲۸۵
ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور حضور ﷺ کے درمیان نا اتفاقی	۲۸۵
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حضور ﷺ سے ناراضگی	۲۸۵
میاں بیوی کے تعلق کی حیثیت سے ناراضگی	۲۸۶
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مزاجوں میں اختلاف	۲۸۶
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف کا ایک واقعہ	۲۸۷
مزاجوں کا اختلاف حق ہے	۲۸۸
صبر نہیں کروگے تو لڑائیاں ہوں گی	۲۸۸
تکالیف سے بچنے کا طریقہ	۲۸۹
صرف اچھائیوں کی طرف دیکھو	۲۹۰
ایک دلچسپ واقعہ	۲۹۰
برائیوں کی طرف دھیان کرنے کا نتیجہ	۲۹۱
ہوسکتا ہے کہ تم غلطی پر ہو	۲۹۱
دونوں اپنی جگہ پر درست ہوں	۲۹۱
سیدھا کرنا چاہوگے تو توڑ دوگے	۲۹۲
عورت کا حسن ٹیڑھے پن میں ہے	۲۹۲
ٹیڑھا ہونا ایک اضافی چیز ہے	۲۹۳
عورت کا ٹیڑھا پن فطری ہے	۲۹۳
بڑھیا اور عقاب کا واقعہ	۲۹۳
دوسروں کی تکالیف پر صبر	۲۹۴
تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوگا؟	۲۹۴
صبر کرنے کا اجر	۲۹۵
بدلہ لینے سے کیا فائدہ؟	۲۹۵
برابر کا بدلہ لو	۲۹۶
خلاصہ	۲۹۷
خاندانی اختلافات کا تیسرا حل...... عفو و درگزر	۲۸۹
دوسروں سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر	۲۹۸

سب سے زیادہ صبر کرنے والی ذات	۲۹۹
اللہ تعالیٰ کی بردباری دیکھئے	۲۹۹
جمہوریت کا فلسفہ ماننے کا نتیجہ	۳۰۰
کافروں کے ساتھ حسن سلوک	۳۰۰
اللہ تعالیٰ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو	۳۰۰
دنیا میں بدلہ نہ لو	۳۰۱
معاف کرنا بہتر ہے	۳۰۱
حضرت میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۳۰۲
کسی کی طرف سے ’’بغض‘‘ نہ رکھو	۳۰۳
بدلہ اللہ پر چھوڑ دو	۳۰۳
ہر انسان اپنے فرائض کو ادا کرے	۳۰۳
دوسروں کو تکلیف مت دو	۳۰۴
چیف جسٹس کا روزانہ دو سو رکعت نفل پڑھنا	۳۰۴
یہ ناانصافی مجھ سے ہوگئی	۳۰۴
حقیقی مسلمان کون؟	۳۰۵
حضور اقدس ﷺ کی تربیت کا انداز	۳۰۵
نئے مسلمانوں کے درمیان مال غنیمت کی تقسیم	۳۰۶
منافقین کا کام لڑائی کرانا	۳۰۶
آپ کا حکیمانہ خطاب	۳۰۷
حضور ﷺ کے خاص الخاص کون تھے؟	۳۰۷
انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کو صبر کرنے کی وصیت	۳۰۸
انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس وصیت پر عمل	۳۰۸
انصار کے حقوق کا خیال رکھنا	۳۰۹
ہر شخص اپنے حقوق بجالائے	۳۰۹
آج ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہا ہے	۳۰۹
ہر انسان اپنا جائزہ لے	۳۱۰
خاندانی اختلافات کا چوتھا حل، معاملات کی صفائی	۳۱۱
ملکیت ممتاز ہونی چاہیے	۳۱۱
باپ بیٹے کا مشترک کاروبار	۳۱۲
بعد میں جھگڑے کھڑے ہوگئے	۳۱۲
معاملات میں صاف ہوں	۳۱۳
میراث فوراً تقسیم کردو	۳۱۳
میراث جلد تقسیم نہ کرنے کا نتیجہ	۳۱۴
گھر کے سامان میں ملکیتوں کا امتیاز	۳۱۴
حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط	۳۱۴
بھائیوں کے درمیان بھی حساب صاف ہو	۳۱۵
مکان کی تعمیر اور حساب کی صفائی	۳۱۵
دوسرے کو مکان دینے کا صحیح طریقہ	۳۱۶
تمام مسائل کا حل، شریعت پر عمل	۳۱۶
خلاصہ	۳۱۷
خاندانی اختلافات کا پانچواں حل، جھگڑے اور بے تکلفی سے اجتناب	۳۱۸
اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کرو	۳۱۸
بحث و مباحثہ نہ کرو	۳۱۹

جھگڑے سے علم کا نور چلا جاتا ہے	۳۱۹
تمہاری ذمہ داری بات پہنچا دینا ہے	۳۲۰
شکوہ وشکایت نہ کریں	۳۲۰
اس کے عمل کی تاویل کرلو	۳۲۱
حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل	۳۲۱
اپنا دل صاف کرلو	۳۲۱
یہ دنیا چندروزہ ہے	۳۲۲
زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے	۳۲۲
کون سا مذاق جائز ہے؟	۳۲۲
مذاق اڑانا اور دل لگی کرنا جائز نہیں	۳۲۳
انسان کی عزت ''بیت اللہ'' سے زیادہ	۳۲۴
ایسا مذاق دل میں نفرت پیدا کرتا ہے	۳۲۴
وعدہ کو پورا کرو	۳۲۵
منافق کی تین علامتیں	۳۲۵
بچوں سے کیا ہوا وعدہ پورا کرو	۳۲۵
اصول اور ضوابط کی پابندی نہ کرنا وعدہ خلافی ہے	۳۲۶
جو قوانین شریعت کے خلاف نہ ہوں ان کی پابندی لازم ہے	۳۲۶
قوانین کی خلاف ورزی وعدہ خلافی ہے	۳۲۷
ٹریفک کے قوانین کی پابندی کریں	۳۲۷
بے روزگاری الاؤنس وصول کرنا	۳۲۷
خلاصہ	۳۲۸

خاندانی اختلافات کا چھٹا حل، جھوٹ سے پرہیز

خاندانی اختلافات کا چھٹا حل، جھوٹ سے پرہیز	۳۲۹
وہ امانت دار ہے	۳۳۰
جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ	۳۳۰
مدارس کی تصدیق کرنا	۳۳۱
جھوٹا کیرکٹر سرٹیفکیٹ	۳۳۱
آج سرٹیفکیٹ کی کوئی قیمت نہیں	۳۳۲
یہ بھی اختلافات کا سبب ہے	۳۳۲
گزشتہ کی تلافی کیسے کریں؟	۳۳۲
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معافی مانگنا	۳۳۳
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلیٰ مقام	۳۳۳
ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا بدلہ کے لیے آنا	۳۳۴
سب سے معافی تلافی کرالو	۳۳۴
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معافی مانگنا	۳۳۵
حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا معافی مانگنا	۳۳۵
اپنا کہا سنا معاف کرالو	۳۳۶
جن کا پتہ نہیں ان سے معافی کا طریقہ	۳۳۶
ان کے لیے یہ دعا کریں	۳۳۷
زندہ کو ایصال ثواب	۳۳۷
عمومی دعا کرلیں	۳۳۷
ایک غلط خیال کی تردید	۳۳۸

نکاح کے آداب واحکام ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَحَبِيْبَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

الحمدللہ ابھی ایک عزیز دوست کے نکاح کی تقریب میں ہم سب کو شمولیت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس نکاح کو مبارک فرمائے، آمین۔ اس نکاح کا خطبہ پڑھتے وقت خیال یہ ہوا کہ آج اس موقع کی مناسبت سے بھی اور معاشرے کی ضرورت کے لحاظ سے بھی آج کچھ باتیں نکاح کے خطبہ سے متعلق بیان ہو جائیں۔ کیونکہ یہ خطبہ جو ہر نکاح کے وقت پڑھا جاتا ہے، اس کا ایک بڑا عظیم مقصد ہے، اور ہم عام طور پر اس مقصد کو بھلائے ہوئے ہیں، بلکہ خطبہ نکاح کا پڑھنا ایک رسم بن کر رہ گیا ہے، جس میں نکاح کے وقت ایک نکاح خواں کو بلایا جاتا ہے۔ وہ خطبہ کے الفاظ پڑھ لیتا ہے۔ لوگ سن لیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سارے خطبہ کا اور جو آیات کریمہ اس خطبہ میں تلاوت کی جاتی ہیں، ان کا ایک عظیم مقصد ہے جس میں ہم سب کے لئے نکاح سے متعلق بھی اور عام زندگی کے بارے میں بھی بہت بڑا سبق اور بہت بڑا پیغام دیا گیا ہے۔

عہد نبوی ﷺ میں نکاح کے وقت نصیحت

حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ جب آپ ﷺ خطبہ نکاح دیتے، تو اس

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۵۲ تا ۸۱)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، حضرت شیخ الاسلام مدظلہ نے یہ بیان جناب حنیف کمال صاحب کے نکاح کی تقریب کے موقع پر فرمایا۔

وقت آپ کچھ نصیحت کی باتیں بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے، اب نصیحت کا وہ طریقہ متروک ہو گیا ہے، اور صرف خطبہ کی مسنون آیات تلاوت کرنے پر اکتفاء کر لیا جاتا ہے، لہٰذا اس خطبۂ نکاح کی روح کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

نکاح کے وقت خطبہ

نکاح دو افراد کے درمیان ایک سماجی معاہدہ ہے، جس میں طرفین سے ایجاب و قبول ہوتا ہے، مثلاً نکاح خواں جو بیوی کا وکیل اور نمائندہ ہوتا ہے، وہ شوہر سے کہتا ہے کہ میں نے فلاں خاتون کا نکاح تم سے کیا، شوہر کہتا ہے کہ میں نے قبول کیا۔ لہٰذا جیسے خرید و فروخت کے معاہدات میں ایجاب و قبول ہوتا ہے۔ اسی طرح نکاح کے اندر بھی ایجاب و قبول ہوتا ہے۔ لیکن خرید و فروخت میں ایجاب و قبول کرتے وقت خطبہ پڑھنے کی اور قاضی کی ضرورت نہیں، لیکن نکاح کے وقت ایجاب و قبول سے پہلے حضور اقدس ﷺ نے خطبہ پڑھنے کو مسنون قرار دیا۔ اگرچہ اس خطبہ کے بغیر بھی نکاح ہو جاتا ہے، لیکن خطبہ پڑھنا سنت ہے۔

نکاح ایک عبادت ہے

نکاح کے معاہدے میں اللہ تعالیٰ نے دو شانیں رکھی ہیں۔ ایک شان تو ''سماجی معاہدے'' کی ہے، اور دوسری شان ''عبادت'' کی ہے، کیونکہ نکاح بذات خود ایک عبادت ہے، بلکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نکاح میں معاملے کی شان مغلوب ہے، اور عبادت کی شان غالب ہے۔ بہر حال، اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو ایک عبادت قرار دیا، اور اس کے عبادت ہونے کی وجہ سے اس میں خطبہ پڑھنے کو حضور اقدس ﷺ نے مسنون قرار دیا۔

خطبہ نکاح کی تین جامع آیات

خطبۂ نکاح میں تین آیات پڑھنا مسنون ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ ان آیات میں براہ راست نکاح کا کوئی ذکر موجود نہیں، حالانکہ قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں، جن میں نکاح کا ذکر بھی ہے، اور نکاح کے الفاظ بھی ہیں۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے دوسری آیات کو چھوڑ کر ان تین آیات کا خاص طور پر کیوں انتخاب

فرمایا؟ اس کو سمجھنے کے لئے پہلے ان آیات کا ترجمہ دیکھنا مناسب ہے۔

پہلی آیت کا سبق: حقوق ادا کیجئے

پہلی آیت جو تلاوت کی جاتی ہے وہ سورۃ ''نساء'' کی پہلی آیت ہے:

﴿یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا﴾(۱)

اے لوگو! تم اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، ایک جان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور اسی ایک جان سے ان کی بیوی یعنی حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا کیا، اور ان دونوں کے باہمی تعلق سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلائے۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے حقوق کا مطالبہ کرتے ہو۔ اگر کسی کو دوسرے سے اپنا حق مانگنا ہوتا ہے، تو وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ کے واسطے مجھے میرا حق دے دو۔ اس لئے فرمایا کہ جس اللہ کا واسطہ دے کر تم اپنا حق مانگتے ہو، اس سے ڈرو کہ کہیں ان حقوق کی ادائیگی میں اس کے حکم کی کوئی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ اور پھر فرمایا کہ رشتہ داریوں کے باہمی حقوق سے ڈرو۔ تاکہ رشتہ داریوں کے حقوق پامال نہ ہوں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر نگہبان ہے، اور تمہاری ہر نقل و حرکت کو دیکھ رہا ہے۔

دوسری آیت کا سبق: اللہ کو راضی کیجئے

دوسری آیت سورۃ آل عمران کی آیت ہے:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾(۲)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسے اللہ سے ڈرنے کا حق ہے۔ اور تمہیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔''

اللہ کے فرمانبردار اور اطاعت گزار ہو۔ یعنی ساری زندگی اطاعت گزاری میں صرف کرو۔ تاکہ جب موت آئے تو اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار ہو۔

---

(۱) النساء: ۱

(۲) آل عمران: ۱۰۲

تیسری آیت کا سبق: باہمی معاملہ درست رکھئے

تیسری آیت سورہ احزاب کی ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا﴾(۱)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، تقویٰ اختیار کرو اور سیدھی بات کرو، اگر ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے تمہارے اعمال میں اصلاح کر دیں گے۔ اور تمہارے سب کام بنا دیں گے، اور تمہارے گناہ معاف فرما دیں گے، اور جو شخص اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی''

حضور اقدس ﷺ خطبۂ نکاح میں ان تین آیتوں کو پڑھنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ آپ نے خاص نکاح کے موقع پر ان تین آیات کا کیوں انتخاب فرمایا، جبکہ نکاح سے متعلق اور بہت سی آیات قرآن کریم میں موجود ہیں، اور ان تین آیات میں نکاح کا کہیں ذکر بھی نہیں ہے۔

تینوں آیات میں ''تقویٰ'' کا ذکر

لیکن ان تین آیات میں غور کیا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ ان تین آیتوں میں جو چیز قدرے مشترک ہے۔ جس کا تینوں آیتوں میں ذکر ہے۔ وہ ''تقویٰ'' ہے، اور تینوں آیتیں ''تقویٰ'' کے بیان سے شروع ہو رہی ہیں، نکاح کے موقع پر خاص طور پر ''تقویٰ'' کی تاکید اس لئے کی جا رہی ہے کہ لوگ عموماً نکاح کے معاملے کو دین سے خارج سمجھتے ہیں۔ اور اس بارے میں شریعت کے احکام کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ نکاح سے پہلے بھی اور نکاح کے وقت اور نکاح کے بعد بھی ان احکام کی طرف دھیان نہیں کرتے۔ اس وجہ سے نکاح کے موقع پر خاص طور پر اس بات کی تاکید کی جا رہی ہے کہ تقویٰ اختیار کرو۔ کیونکہ اگر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ درحقیقت یہ نکاح کا رشتہ اس وقت تک صحیح معنی میں خوشگوار نہیں ہو سکتا جب تک دلوں میں تقویٰ نہ ہو تقویٰ کے بغیر ایک دوسرے کے حقوق صحیح معنی میں ادا ہی نہیں کیے جا سکتے۔

ازدواجی زندگی کے تین مواقع، یعنی ایک نکاح سے پہلے، ایک نکاح کے وقت، ایک نکاح کے بعد۔ ان تینوں مواقع پر ہم نے دین کو پس پشت ڈالا ہوا ہے، بس اتنا ضرور کر لیتے ہیں کہ نکاح

(۱) الاحزاب: ۷۰۔۷۱

کے وقت کسی مولوی صاحب کو بلا کر ان سے آیتیں پڑھوالیں، خطبہ پڑھوا کر نکاح کر لیا۔ لیکن اس نکاح سے پہلے کیا کام کیا، اور عین اس نکاح کے وقت کیا عمل کر رہے ہیں؟ اور نکاح کے بعد کیا کریں گے؟ ان تمام اعمال سے نہ خدا کا کوئی تعلق، اور نہ خدا کے رسول کا کوئی تعلق۔ حالانکہ یہ نکاح ایک عبادت ہے، اور ایک ثواب کا کام ہے۔

نکاح، فطری خواہش پوری کرنے کا آسان راستہ

پھر اللہ تعالیٰ نے شریعت اسلامیہ میں نکاح کو اتنا آسان بنا دیا کہ اس سے زیادہ آسان کوئی دوسرا معاملہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جو دین اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا ہے اس میں ہماری نفسیات کی پوری رعایت ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کے دل میں عورت کی طرف اور عورت کے دل میں مرد کی طرف ایک کشش رکھی ہے، اس کشش کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت یہ تقاضا کرتی ہے کہ زندگی مرد اور عوت دونوں کے باہمی اشتراک سے بسر ہو۔ بعض مذہب وہ ہیں جنہوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ کشش شیطانی خواہش ہے، لہٰذا جب تک اس شیطانی خواہش کو نہیں مٹاؤ گے، اس وقت تک اللہ کا قرب حاصل نہیں ہوگا، چنانچہ ان مذاہب نے ''رہبانیت'' کی بنیاد ڈالی۔ اور یہ کہہ دیا کہ نکاح اور شادی نہ کرو، مجرد زندگی گزارو۔ لیکن اسلام جو دین فطرت ہے، وہ جانتا تھا کہ یہ کشش انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اگر فطرت سے بغاوت کی جائے گی تو یہ فطرت غلط اور ناجائز اور حرام راستے تلاش کرے گی۔ چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً﴾ (۱)

''اے نبی ﷺ ہم نے آپ سے پہلے بھی انبیاء بھیجے، اور ہم نے ان کو بیویاں بھی عطا کیں، اور اولاد بھی عطا کی''

لہٰذا بیوی بچوں سے الگ زندگی نہیں گزارنی، بلکہ بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اس لئے کہ یہ فطرت کا ایک تقاضہ ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس فطری تقاضے کو پورے کرنے کا جائز راستہ اتنا آسان کر دیا کہ اس میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں لگائی۔

خطبہ نکاح شرط نہیں، سنت ہے

چنانچہ نکاح کے وقت خطبہ پڑھنا بھی کوئی لازمی شرط نہیں، واجب اور فرض نہیں، البتہ سنت

(۱) الرعد: ۳۸

ضرور ہے۔ اگر دو مرد و عورت بیٹھ کر ایجاب و قبول کر لیں، اور دو گواہ اس مجلس میں موجود ہوں، یا تو دو مرد گواہ ہوں، یا ایک مرد اور دو عورتیں بطور گواہ موجود ہوں۔ تو بس نکاح ہو گیا، اور وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے حلال ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو اتنا آسان کر دیا، تاکہ انسان کی جو فطری خواہش ہے، اس کو پورا کرنے کا جائز راستہ اتنا آسان ہو جائے کہ اس میں کوئی دشواری نہ ہو۔ نکاح کے لئے نہ منگنی شرط ہے نہ مہندی شرط ہے، نہ تقریب شرط ہے، نہ اجتماع شرط ہے، نہ کسی کو بلانا شرط ہے۔

نکاح میں برکت کیسے آئے گی؟

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَعْظَمُ النِّکَاحِ بَرَکَۃً اَیْسَرُہٗ مُؤْنَۃً))(۱)

''یعنی سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں مشقت کم سے کم ہو''

زیادہ مشقت نہ اٹھائی گئی ہو، بلکہ سادگی کے ساتھ، بغیر کسی تکلیف کے نکاح کر لیا گیا ہو۔ ایسے نکاح میں اللہ تعالیٰ زیادہ برکت عطا فرماتے ہیں۔

عہد نبوی ﷺ کی شادیاں

شریعت نے اس نکاح کو جتنا آسان بنایا تھا، ہم نے اس کو اتنا ہی مشکل بنا دیا، آج نکاح کرنا ایک عذاب ہے سالوں اور مہینوں پہلے سے جب تک اس کی تیاری نہ کی جائے، اور اس پر لاکھوں روپیہ خرچ نہ کیا جائے، اس وقت تک نکاح نہیں ہوسکتا۔ دیکھئے کہ حضور اقدس ﷺ کے عہد مبارک میں کس طرح نکاح ہوتے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، یعنی ان دس خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں، جن کے بارے میں حضور اقدس ﷺ نے صراحت کے ساتھ خوشخبری دے دی ہے کہ یہ جنت میں جانے والے ہیں۔ یوں تو تمام صحابہ کرام کا حضور اقدس ﷺ سے بہت زیادہ تعلق تھا، لیکن عشرہ مبشرہ وہ دس صحابہ ہیں جو اخص الخواص ہیں، ان میں سے ایک حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ یہ حضور اقدس ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوئے، آپ

(۱) مسند أحمد بن حنبل، حديث سيدة عائشة رضي الله عنها، رقم: ۲۳۳۸۸

نے دیکھا کہ ان کی قمیص پر ایک زرد نشان لگا ہوا ہے، حضور اقدس ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہاری قمیص پر یہ پیلا نشان کیسے لگ گیا؟ جواب میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یا رسول اللہ! میں نے نکاح کیا ہے، نکاح کی وجہ سے میں نے خوشبو لگائی تھی، یہ اس خوشبو کا نشان ہے، آپ نے ان کو دعا دیتے ہوئے فرمایا:

((بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَعَلَيْكَ))

''اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے''

پھر فرمایا:

((أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ))

''ولیمہ کر لینا، چاہے ایک بکری کے ذریعہ ہو'' (۱)

یہ سادگی آپ بھی اختیار کیجئے

اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مہاجر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں، اور حضور اقدس ﷺ سے آپ کا دور کا رشتہ بھی ہے، عشرہ مبشرہ میں ہیں۔ لیکن اپنے نکاح میں حضور اقدس ﷺ کو بھی نہیں بلایا، بلکہ نکاح کے بعد آپ کے پوچھنے پر بتایا کہ میں نے نکاح کر لیا ہے۔ اور پھر خود حضور اقدس ﷺ نے بھی شکایۃً یہ نہیں کہا کہ تم نے اکیلے اکیلے نکاح کر لیا ہمیں بلایا بھی نہیں، بلکہ برکت کی دعا دی:

((بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَعَلَيْكَ))

البتہ یہ ضرور فرمایا کہ ولیمہ کر لینا، چاہے اس کے لئے ایک بکری ہی ذبح کرنی پڑے۔

اب دیکھئے کہ نکاح کی مجلس میں حضور اقدس ﷺ تک کو بھی دعوت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اتنی سادگی کے ساتھ نکاح فرمالیا۔

آج اگر کوئی شخص اس طرح نکاح کر لے کہ اپنے خاص لوگوں کو بھی نہ بلائے۔ تو پھر دیکھئے گا

(۱) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب ماجاء فی قول الله تعالیٰ فإذا قضیت الصلاة، رقم: ۱۹۰۷، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق وجواز و تعلیم القرآن و خاتم حدیث، رقم: ۲۵۵۶، سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول الله، باب ماجاء فی الولیمة، ۱۰۱٤، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب التزویج علی نواة من ذهب، رقم: ۳۲۹۰، سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب، قلمة الطهر، رقم: ۱۸۰٤، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب الولیمة، رقم ۱۸۹۷، مسند أحمد، رقم: ۱۲۲۲٤

کہ اس سے لوگوں کو کتنی شکایتیں ہوں گی، کتنے شکوے اور گلے ہوں گے کہ یہ صاحب تو اکیلے اکیلے نکاح کر کے بیٹھ گئے، ہمیں پوچھا تک نہیں، لیکن حضور اقدس ﷺ نے کوئی شکایت نہیں کی۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قصہ

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ انصاری صحابی ہیں، اور حضور اقدس ﷺ کے محبوب صحابی ہیں۔ حضور اقدس ﷺ کا ان کے ساتھ محبت کا بڑا خصوصی تعلق تھا۔ ان کا واقعہ روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ غزوہ بنی مصطلق سے جہاد کر کے واپس آرہے تھے، ان کا اونٹ بہت سست رفتار تھا اور اڑیل تھا۔ یہ اس کو تیز چلانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر وہ نہیں چلتا تھا۔ پورا قافلہ آگے نکل جاتا۔ اور یہ پیچھے رہ جاتے تھے، جب حضور اقدس ﷺ نے ان کو دیکھا کہ یہ بار بار پیچھے رہ جاتے ہیں تو آپ ان کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ تم قافلہ کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے؟ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ، یہ اونٹ چل کر نہیں دیتا، میں اس کو تیز چلانے کی کوشش کرتا ہوں مگر یہ پھر پیچھے رہ جاتا ہے۔ آپ نے قریب کی جھاڑی سے ایک لکڑی توڑی۔ اور ہلکی سے وہ لکڑی چابک کے طور پر اس اونٹ کو لگائی جیسے ہی آپ نے وہ لکڑی لگائی، بس وہ اونٹ تو ہوا ہو گیا، اور بہت تیزی سے دوڑنے لگا، یہاں تک کہ تمام قافلے سے آگے نکل گیا، آنحضرت ﷺ پھر ان کے قریب پہنچے، اور آپ نے ان سے فرمایا: اب تو تمہارا یہ اونٹ بہت تیز دوڑ رہا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ یہ آپ کی برکت سے اتنا تیز ہو گیا کہ سب سے آگے ہو رہا ہے۔

آپ نے ان سے فرمایا کہ یہ تو بہت شاندار اونٹ ہے، کیا تم یہ اونٹ مجھے بیچو گے؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یا رسول اللہ، بیچنے کی کیا بات ہے، اگر آپ کو پسند ہے تو آپ میری طرف سے ہدیہ قبول فرمالیں، آپ نے فرمایا: ہدیہ نہیں۔ بلکہ میں تو قیمتاً لوں گا، اگر بیچنا چاہتے ہو تو بیچ دو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر آپ خریدنا چاہتے ہیں تو آپ جس قیمت پر چاہیں خرید لیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں تم بتاؤ کہ کس قیمت پر بیچتے ہو؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں اس کو ایک اوقیہ چاندی کے عوض فروخت کرتا ہوں، (اوقیہ چاندی کا ایک وزن ہوتا تھا، جو تقریباً چالیس درہم کے برابر ہوتا تھا) آپ نے فرمایا: تم نے تو بہت زیادہ قیمت لگا دی۔ اس قیمت میں تو بڑے بڑے اونٹ آجاتے ہیں انہوں نے کہا: یا رسول اللہ۔ آپ جتنی قیمت لگانا چاہیں لگا دیں، آپ نے فرمایا: چلو میں ایک اوقیہ میں خریدتا ہوں۔ اور میں اس کے پیسے مدینہ منورہ پہنچ کر دوں گا۔

اس کے بعد حضرت جابر رضی اللہ عنہ اونٹ سے اتر کر کھڑے ہو گئے، حضور اقدس ﷺ نے ان سے

پوچھا کہ اونٹ سے کیوں اتر گئے؟ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ اونٹ تو آپ نے خرید لیا، اب یہ آپ کا ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: تم مدینہ منورہ تک پیدل جاؤ گے، ایسا کرو کہ تم اسی پر سواری کر کے مدینہ منورہ تک پہنچ جاؤ، وہاں جا کر تم سے یہ اونٹ لے لیں گے، اور پیسے ادا کر دیں گے۔

جب مدینہ منورہ پہنچے تو انہوں نے وہ اونٹ حضور اقدس ﷺ کے پاس بھیج دیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے وہ اونٹ بھی ان کو واپس کر دیا، اور ایک اوقیہ چاندی بھی ان کو دے دی۔ یہ درحقیقت ان کو نوازنے کا ایک بہانہ تھا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا نکاح

حدیث شریف میں ہے جس وقت وہ اونٹ تیز چل رہا تھا، اور حضور بھی ان کے ساتھ چل رہے تھے۔ اس وقت آپ نے ان سے پوچھا کہ بھائی تم نے شادی بھی کی یا نہیں؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ میں نے غزوہ میں آنے سے پہلے نکاح کر لیا تھا۔ آپ نے پھر سوال کیا کہ تم نے کسی کنواری سے نکاح کیا ہے یا ثیبہ (شادی شدہ) عورت سے نکاح کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک ثیبہ عورت سے نکاح کیا ہے، جو پہلے ایک شخص کے نکاح میں تھیں، جب ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تو میں نے ان سے نکاح کر لیا۔ آپ نے پھر سوال کیا کہ تم نے کنواری سے کیوں نکاح نہیں کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ دراصل میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا، اور میری چھوٹی چھوٹی بہنیں ہیں، اس لئے مجھے ایک ایسی عورت کی تلاش تھی جو ان کی بھی دیکھ بھال کر سکے، اس لئے اگر میں نوعمر لڑکی سے نکاح کرتا تو وہ ان کی صحیح دیکھ بھال نہ کر سکتی، اس لئے میں نے ثیبہ عورت سے نکاح کیا۔ چنانچہ یہ سن کر حضور اقدس ﷺ نے ان کو دعا دی اور فرمایا:

((بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَعَلَيْكَ وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا بِخَيْرٍ))

''اللہ تعالیٰ تمہیں برکت دے اور الفت ومحبت کے ساتھ دونوں کو جمع کرے''(۱)

اب آپ اندازہ لگائیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے غزوہ میں جانے سے پہلے مدینہ منورہ میں نکاح کیا، اور حضور اقدس ﷺ مدینہ منورہ میں ہی تشریف فرما ہیں، اور اس کے بعد غزوہ میں حضور اقدس ﷺ کے ساتھ رہے، پھر جب اس غزوہ سے واپس ہوئے تو آپ کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ میں نے ایک عورت سے نکاح کیا ہے۔ اور انہوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ حضور

(۱) صحیح البخاری، کتاب النفقات، باب اعون المرأة زوجها فی ولدها، رقم: ۴۹۴۸، صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب استحباب نکاح البکر، رقم: ۲۶۶۴، مسند أحمد، رقم: ۱۴۴۸۲

اقدس ﷺ کو مجلس نکاح میں بلائیں نہ ہی حضور اقدس ﷺ نے یہ شکایت کی کہ تم نے چپکے چپکے نکاح کرلیا، مجھے کیوں نہیں بلایا۔

دوسروں کو بلانے کا اہتمام

حضور اقدس ﷺ کی پوری سیرت طیبہ میں نکاح کی سادگی کا یہ انداز نظر آتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو آسان رکھا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو اتنا ہی آسان اور سادہ رکھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اپنے بڑوں کو اور رشتہ داروں کو نکاح کے موقع پر بلانا حرام اور ناجائز ہے، جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا تو آپ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا کہ ابوبکر وعمر کو بلالاؤ، نکاح ہونے والا ہے، اس طرح خاص خاص لوگوں کو آپ نے بلا لیا، لہٰذا بلانا بھی جائز ہے۔ لیکن نکاح کے اندر اہتمام کہ جب تک فلاں شخص نہیں آجائے گا اور جب تک فلاں شرائط پوری نہیں ہوں گی، اور جب تک فلاں فلاں رسمیں نہیں ہوں گی، اس وقت تک نکاح منعقد نہیں ہوگا، شریعت میں ایسے اہتمام کی گنجائش نہیں۔

آج ہم نے آسان کو مشکل بنا دیا

آج ہم نے نکاح کو مشکل بنا دیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب حلال کے دروازے بند کر دیئے تو حرام کے دروازے کھل رہے ہیں، آج اگر حلال کا راستہ کوئی شخص اختیار کرنا چاہے تو اس کے راستے میں پابندیاں اور رکاوٹیں ہیں، اور جب تک لاکھوں روپیہ نہ ہو وہ حلال راستہ اختیار نہیں کرسکتا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ حرام کی طرف جارہے ہیں، اور اس کے دروازے چوپٹ کھلے ہیں۔ اس کے ذریعہ معاشرے میں فساد پھیل رہا ہے۔

تین چیزوں میں تاخیر مت کیجیے

ایک حدیث جو یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

((ثَلَاثًا لَا تُؤَخِّرْهَا، اَلصَّلَاةُ إِذَا دَخَلَ وَقْتُهَا، اَلْجَنَازَةُ إِذَا حَضَرَتْ، وَالْاَيِّمُ إِذَا وَجَدْتَ لَهَا كُفُوًا))(۱)

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ما جاء في الوقت الأول من الفضل، رقم: ۱۵۶، مسند أحمد، رقم: ۷۸۷

تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے میں تاخیر اور دیر نہ کرو:

① جب جنازہ تیار ہو کر آ جائے تو نماز جنازہ پڑھنے میں دیر نہ کرو۔ نماز جنازہ کو جلدی پڑھنے کا حکم اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر ایسے وقت میں جنازہ آئے جب کہ جماعت تیار ہو، تو فرض تو پہلے ادا کر لئے جائیں، فرضوں کے بعد پہلے جنازہ کی نماز ادا کی جائے، اس کے بعد سنتیں ادا کی جائیں۔ بعض فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ فرضوں کے بعد سنتیں پڑھنا تو جائز ہے لیکن نفلیں پڑھنا جائز نہیں، جب تک نماز جنازہ نہ پڑھ لیں، فتویٰ بھی اسی قول پر ہے۔ عام لوگوں کو یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے، چنانچہ نماز جنازہ کا اعلان ہونے کے باوجود لوگ فرض نماز کے بعد نوافل پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ نفلوں کی وجہ سے نماز جنازہ میں تاخیر کرنا جائز نہیں۔

② دوسری چیز یہ بیان فرمائی کہ جب نماز کا وقت مستحب شروع ہو جائے تو اس کے بعد نماز میں تاخیر نہ کرو۔ بلکہ جتنی جلدی ہو سکے نماز پڑھ لو۔ بعد میں پھر وقت ملے یا نہ ملے۔ پھر حالات سازگار رہیں یا نہ رہیں۔

③ تیسری چیز یہ بیان فرمائی کہ جب بے شوہر کی لڑکی کا مناسب رشتہ مل جائے تو اس کے نکاح میں تاخیر نہ کرو۔

لہٰذا ان تینوں چیزوں میں تاخیر نہ کرنی چاہئے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا:

((إِذَا جَاءَكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِينَهُ وَخُلُقَهُ فَزَوِّجُوهُ إِلَّا تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ)) (۱)

"اگر تم ایسا نہیں کرو گے، یعنی مناسب رشتہ ملنے پر لڑکی کا رشتہ نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بہت فساد پھیلے گا۔ وہ فساد یہ ہوگا کہ جب آپ نے حلال کا راستہ روک دیا تو پھر حرام کا راستہ کھل جائے گا"

ان فضول رسموں کو چھوڑ دیجیے

لہٰذا شریعت نے نکاح کو جتنا آسان بنا دیا تھا آج ہم نے اس کو اتنا ہی مشکل بنا دیا، اور اس کو ایک عذاب بنا دیا، اور پر تکلف بنا دیا، خدا جانے کیا کیا رسمیں اس کے اندر ہم نے اپنی طرف سے

(۱) سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول اللہ، باب ماجاء اذا جاء کم من ترضون دینہ فزوجوہ، رقم: ۱۰۰۵

گھڑ لیں کہ پہلے منگنی ہونی چاہئے، اور منگنی کے اندر فلاں فلاں رسمیں ہونی چاہئیں، شادی سے پہلے مہندی ہونی چاہئے، ان رسموں کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا، یہ سب ہم نے اپنی طرف سے اضافے کر رکھے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج نکاحوں میں بے برکتی ہو رہی ہے۔

علی الاعلان نکاح کیجیے

دوسرے نکاح کے وقت انجام دیئے جانے والے امور ہیں، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ نکاح ایک عبادت ہے حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَعْلِنُوا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوهُ فِي الْمَسَاجِدِ)) (۱)

یعنی نکاح کا اعلان کرو، علی الاعلان نکاح ہونا چاہئے، حلال اور حرام میں یہی فرق ہے کہ حرام کام چوری چھپے ہوتا ہے، اور خفیہ طریقے سے ہوتا ہے، اس لئے نکاح میں شریعت نے یہ ضروری قرار دیا کہ علی الاعلان ہو، لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں کا نکاح فلاں کے ساتھ ہو گیا ہے۔ آگے فرمایا: اس نکاح کو مسجد میں انجام دو، اس کو بھی حضور اقدس ﷺ نے سنت قرار دیا۔ اس لئے کہ نکاح ایک عبادت ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے اور حضور اقدس ﷺ کی سنت پر عمل ہے، لہٰذا جس طرح نماز عبادت ہے۔ اسی طرح نکاح بھی عبادت ہے، اس لئے اس کو مسجد میں انجام دینے کی تاکید فرمائی ہے۔

نکاح کے بعد مسجد میں شور و شغب

لیکن یہاں ایک مسئلہ اور سن لیجیے۔ اور حضور اقدس ﷺ کے نبی ہونے کی حیثیت سے آپ ہی کی نگاہ وہاں تک پہنچ سکتی ہے، وہ یہ کہ ایک دوسری حدیث میں جہاں آپ نے یہ ارشاد فرمایا: نکاح مسجدوں میں انجام دو، وہاں ساتھ ہی آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

((وَإِيَّاكُمْ وَهَيْشَاتِ الْأَسْوَاقِ))(۲)

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول الله، باب ماجاء فی إعلان النکاح، رقم: ۱۰۰۹، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب إعلان النکاح، رقم: ۱۸۸۵، مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۱۵۵٤۵

(۲) صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب تسویة الصفوف وإقامتها وفضل الأول فالأول منها، رقم: ٦۵۵، سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ماجاء لیلینی منکم أولو الأحلام والنهی، رقم: ۲۱۱، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب من یستحب أن یلی الإمام فی الصف وکراهیة التأخر، رقم: ۵۷۷

یعنی بازاروں کی طرح کے شوروشغب سے بچو۔ اب ہمارے ہاں اس کا رواج تو ہو رہا ہے کہ نکاح مسجد میں ہوتے ہیں لیکن اس حدیث کے ذریعہ حضور اقدس ﷺ اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ نکاح تو مسجد میں کرلیا، لیکن نکاح کے نتیجے میں مسجد کے اندر شوروشغب شروع ہو گیا۔ آج کل اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا، بلکہ نکاح کی محفل کے بعد شوروشغب شروع ہو جاتا ہے۔ چونکہ حضور اقدس ﷺ کی نگاہ مبارک اس طرف دیکھ رہی تھی کہ جب لوگ اس حکم پر عمل کریں گے تو کہیں اس گناہ کے اندر مبتلا نہ ہو جائیں، اس لئے آپ نے پہلے ہی خبردار فرما دیا کہ مسجدوں کو بازاروں کی طرح کے شوروشغب سے بچاؤ۔

عبادت میں گناہ کی آمیزش

لہٰذا جب نکاح عبادت ہے تو عبادت کو گناہ کی آمیزش سے پاک ہونا چاہئے، یہ عجیب بات ہے کہ عبادت بھی ہو رہی ہے، اور ساتھ ساتھ حرام کام بھی ہو رہا ہے، گناہ بھی ہو رہا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص نماز بھی پڑھے، اور نماز کے دوران ریکارڈنگ بھی لگا دے، اب نماز بھی ہو رہی ہے، اور فلمی گانے بھی چل رہے ہیں۔ کوئی شخص کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو، لیکن وہ کم از کم نماز کے وقت گناہ سے پرہیز کرنے کی کوشش کرے گا، نماز پڑھتے وقت اگر سامنے تصویر ہوگی تو اس تصویر کو ہٹا دے گا، اگر موسیقی بج رہی ہوگی تو اس کو بند کر دے گا۔

ہندوستان میں یہ ہوتا تھا کہ اگر کسی کافر نے نماز کے وقت مسجد کے سامنے باجا بجا دیا تو اس پر فساد ہو جاتا تھا، اور مسلمان اس پر اپنی جان دے دیتے تھے۔ اور اب ماشاء اللہ مسجدوں کے سامنے خود گانے بجانے شروع کر دیئے۔ لہٰذا عین نماز کے وقت اور عین عبادت کے وقت کم از کم انسان اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ کوئی گناہ کا کام نہ ہو۔

نکاح کی محفل گناہوں سے پاک ہو

لہٰذا نکاح کے عبادت ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ نکاح کی محفل جو عبادت کی محفل ہے، جو سنت کی ادائیگی کی محفل ہے، اور جو ایک ثواب کی محفل ہے، اور جس محفل پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہو رہی ہیں، کم از کم اس محفل کو تو گناہوں سے پاک کیا جائے۔ آج ہم نے اس محفل کو ہر طرح کے گناہوں کا ملغوبہ بنا دیا ہے، مرد وعورت کا آزادانہ میل ہو رہا ہے، عورتیں بن سنور کے محفل کے اندر آرہی ہیں ساتھ میں نکاح کی عبادت بھی ہو رہی ہے، یہ کیسی عبادت ہو رہی ہے، یہ کیسی حضور

اقدس ﷺ کی سنت کی ادائیگی ہو رہی ہے۔

حکم تو یہ دیا جا رہا ہے کہ اللہ سے ڈرو، تو اگر اس نکاح کو انجام دیتے ہوئے نافرمانیوں کا ارتکاب کرو گے تو اس نکاح کے اندر برکت نہیں ہوگی۔ برکت اس وقت ہوگی جب نکاح کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، اور اس کو سادگی کے ساتھ انجام دیا جائے، اس میں کوئی گناہ کا کام نہ ہو۔ اگر لوگوں کا اجتماع بلا لیا، تو یہ کوئی ناجائز اور حرام کام نہیں ہے، دعوت بھی کر دی۔ لیکن گناہ کا کوئی کام نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ نکاح تو اس لئے کیا جا رہا ہے کہ انسان کی فطری خواہش کی تسکین کے لئے جائز طریقہ نکالا جائے۔ اگر گناہ کے کام اس کے اندر کیے جائیں گے تو نکاح کے مقصد کے خلاف ہے۔ اس لئے نکاح کی محفل میں گناہ کے کاموں سے پرہیز کیا جائے۔

خوشگوار ازدواجی تعلق کے لئے تقویٰ کی ضرورت

تیسری بات نکاح کے بعد تقویٰ اختیار کرنے کی ہے، میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں بیوی کے تعلقات اس وقت تک خوشگوار نہیں ہو سکتے، جب تک دونوں کے دل میں تقویٰ نہ ہو، اللہ کا خوف نہ ہو۔ دیکھئے دونوں میاں بیوی کے درمیان اتنا قریبی تعلق ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ قریبی تعلق کسی اور کے درمیان نہیں ہوسکتا، دونوں ایک دوسرے کے محرم راز ہوتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کے اتنے زیادہ قریب ہوتے ہیں اس سے زیادہ قرب کا تصور اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا، دونوں کے آپس کے تعلقات ایسے ہیں کہ وہ کبھی بھی دوسروں کے سامنے مکمل طور پر نہیں آ سکتے، لہٰذا تنہائی کے اس عالم میں جب کہ ایک دوسرے کے ساتھ خلوت ہے، اس وقت ایک دوسرے کو تکلیف پہنچائیں، یا حق تلفی کریں تو کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ بہت سے حقوق تو ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپ کی حق تلفی کرے تو پولیس کے ذریعہ وہ حق وصول کیا جا سکتا ہے۔ یا عدالت میں دعویٰ دائر کر کے عدالت کے ذریعہ وہ حق وصول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میاں بیوی کے بیشتر حقوق ایسے ہیں کہ ان کو نہ تو پولیس کے ذریعہ وصول کیا جا سکتا ہے، اور نہ عدالت کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے، عدالت زیادہ سے زیادہ یہ کرے گی کہ بیوی کو نان نفقہ دلا دے گی، اور مہر دلا دے گی، لیکن اگر شوہر گھر میں آ کر منہ چڑھا کر بیٹھ جاتا ہے، اور جب بات کرتا ہے تو جلی کٹی سناتا ہے، تو اب یہ جلی کٹی سنانے کا اور منہ چڑھا کر بیٹھ جانے کا جو دکھ ہے، اس کا ازالہ کون سی عدالت اور کون سی پولیس کرے گی؟

’’اللہ کا خوف‘‘ حقوق کی ادائیگی کرا سکتا ہے

اگر کوئی چیز اس دکھ کا ازالہ کر سکتی ہے تو وہ صرف ایک چیز ہے، وہ ہے ’’اللہ کا خوف‘‘ جب شوہر کے دل میں اس بات کا احساس ہو کہ بیوی کا وجود اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ وابستہ کر دیا ہے، اس کے میرے ذمہ کچھ حقوق ہیں جو مجھے ادا کرنے ہیں، اگر میں ادا نہیں کروں گا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں میری پکڑ ہوگی۔ جب تک یہ احساس دل میں نہ ہو، انسان اس کے تمام حقوق ادا نہیں کر سکتا۔ یہ حقوق نہ عدالت دلوا سکتی ہے نہ پولیس دلوا سکتی ہے۔

یہ تو درندے کا وصف ہے

میرے ایک ہم سبق تھے۔ ایک مرتبہ وہ فخریہ انداز میں یہ بیان کرنے لگے کہ جب میں گھر میں داخل ہوتا ہوں تو میری بیوی اور بچوں کی جرأت نہیں ہوتی کہ مجھ سے کوئی بات کریں، یا میرے حکم سے سرتابی کر سکیں۔ وہ اپنی مردانگی ظاہر کرنے کے لئے یہ بات بیان کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ جو آپ اپنا وصف بیان کر رہے ہیں یہ کسی درندے کا وصف تو ہو سکتا ہے انسان کا تو یہ وصف نہیں ہو سکتا۔

انسان کا وصف تو وہ ہے جو حضور اقدس ﷺ کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ جب کبھی آپ ﷺ گھر کے اندر تشریف لاتے تو اس طرح تشریف لاتے کہ آپ کا چہرہ انور کھلا ہوا تھا، اور آپ کے چہرہ مبارک پر تبسم ہوتا تھا، اور جتنا عرصہ میں نے حضور اقدس ﷺ کے ساتھ گزارا، اس عرصہ میں آپ نے مجھے کوئی بڑی سرزنش نہیں فرمائی۔ (۱)

آج تک لہجہ بدل کر بات نہیں کی

یہ ہے انسان کا کام، جو حضور اقدس ﷺ نے کر کے دکھایا۔ یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک دل میں تقویٰ نہ ہو، اللہ کا خوف نہ ہو۔ میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ اپنا معمول بیان فرماتے تھے کہ آج میری شادی کو پچپن سال ہو گئے، لیکن آج تک گھر والوں سے غصہ کی حالت میں لہجہ بدل کر بات کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

---

(۱) سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد، باب في ضحكه صلى الله عليه وسلم وتبسمه (۱۲۱/۷)، كنز العمال، رقم: ۱۸۷۱۹ (۲۲۲/۷)

لوگ کرامت اس کو سمجھتے ہیں کہ کوئی ہوا میں اڑنے لگے، یا جلتی ہوئی آگ میں سے گزر جائے۔ لیکن حقیقی کرامت یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان اتنا قریبی تعلق ہونے کے باوجود پچپن سال اس طرح گزارے کہ کبھی اہلیہ سے لہجہ بدل کر غصہ کی حالت میں بات کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

خود حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ فرمایا کرتی تھیں کہ ساری عمر حضرت نے مجھے کسی کام کے کرنے کا حکم نہیں دیا، مثلاً کبھی یہ نہیں کہا کہ پانی پلا دو، یا یہ کام کر دو، بلکہ میں نے اپنے شوق سے کوئی کام کر لیا تو کر لیا یہ اہتمام کہ کبھی بیوی سے لہجہ بدل کر بات نہ کروں، یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک دل میں خدا کے خوف کا پہرا نہ ہو، تقویٰ کا پہرا نہ ہو، اس لئے کہ یہ کام نہ تو پولیس کرا سکتی ہے، اور نہ عدالت کرا سکتی ہے۔

بیوی کا ہاتھ کون روک سکتا ہے؟

اسی طرح اگر بیوی شوہر کو تکلیف پہنچانے پر اتر آئے تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں، کوئی عدالت کوئی پولیس اس کو نہیں روک سکتی۔ بس ایک چیز بیوی کو اس چیز سے روک سکتی ہے۔ وہ ہے تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کا خوف۔ اس لئے اس نازک موقع پر جب زندگی کا دورا شروع ہو رہا ہے، اس وقت جو خطبہ مسنون قرار دیا، اس میں ایسی آیات کا انتخاب فرمایا جن میں اس بات کی تاکید فرمائی کہ تقویٰ اختیار کرو، اور اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا کرو اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس دل میں پیدا کرو، اس کے ذریعہ ہی تم ایک دوسرے کے حقوق ادا کر سکو گے، اس کے بغیر ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں ہو سکتے۔

ہر کام کی درستگی "تقویٰ" میں ہے

سچی بات یہ ہے کہ "تقویٰ" کے بغیر اور اللہ کے خوف کے بغیر دنیا کا کوئی کام صحیح نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر نکاح کے معاملات اور میاں بیوی کے باہمی حقوق تقویٰ کے بغیر درست نہیں ہو سکتے۔ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر انسان کی نگاہ ہو، اور اتباع سنت کا جذبہ دل میں ہو، اور اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں ہو، اور آخرت میں جواب دہی کا احساس دل میں ہو، تب ایک دوسرے کے حقوق ادا ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا کہ رشتہ داریوں کے حقوق ادا کرتے ہوئے اللہ سے ڈرو۔ ان میں سے ہر ہر چیز کے بارے میں تم سے سوال ہوگا کہ تم نے کس کے ساتھ کس قسم کا معاملہ کیا تھا۔

نکاح کرنا سنت ہے

نکاح کے خطبہ میں ان آیات کے علاوہ کچھ احادیث بھی تلاوت کی جاتی ہیں، چنانچہ میں نے ایک حدیث یہ تلاوت کی کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِىْ)) (۱)

یعنی نکاح میری سنت ہے، اس کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ محض دنیاداری کا کام نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ثواب کا کام بنایا ہے۔ اسی سے یہ بات نکلتی ہے کہ دنیا کے تمام کام جن کو ہم دنیا سمجھتے ہیں، اگر ذرا سی نیت بدل لو، ذرا سا زاویہ نگاہ بدل لو، اور اس کا طریقہ کار بدل لو تو حقیقت میں یہ سب دین ہیں۔ چنانچہ یہ نکاح بھی دین ہے بیع وشراء بھی دین ہے یہ تجارت بھی دین ہے، یہ زراعت بھی دین۔ یہ ملازمت بھی دین، بیوی بچوں کے ساتھ ہنسنا بولنا بھی دین ہے، بس شرط یہ ہے کہ ان سب کاموں میں تمہاری نیت اللہ کو راضی کرنا ہو، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت ہو تو پھر کھانا پینا، تجارت وصنعت سب چیزیں دین بن جاتی ہیں۔

نکاح خاندانوں کو جوڑنے کا ذریعہ

دوسری حدیث یہ تلاوت کی تھی کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَمْ نُرَ لِلْمُتَحَابَّيْنِ مِثْلُ النِّكَاحِ)) (۲)

یعنی اگر دو خاندانوں میں آپس میں محبت ہے، تو اس محبت کو پختہ کرنے والی نکاح سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہیں۔ لہٰذا اگر دو خاندانوں میں آپس میں محبت ہے تو اس محبت کو پائیدار کرنے کے لئے ان خاندانوں کے بعض افراد کے درمیان آپس میں رشتہ قائم ہو جائے تو اس محبت کو مزید تقویت حاصل ہو جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ اس محبت میں مزید برکت عطا فرماتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دونوں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں، اور دونوں ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کرنے والے ہوں۔ اور حضور اقدس ﷺ کا متعدد نکاح کرنے کا بہت بڑا سبب یہ تھا کہ بہت سے قبائل سے تعلقات قائم کرنے منظور تھے، اس لئے آپ نے ان قبائل کی خواتین سے نکاح فرمایا۔ اس زمانے

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب ماجاء في فضل النكاح، رقم: ۱۸۳٦

(۲) سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب ماجاء في فضل النكاح، رقم: ۱۸۳۷، مصنف ابن أبي شيبة (۱۲۸/٤)

میں بھی اس کا رواج تھا کہ جن کے درمیان باہمی قریبی تعلقات ہوتے تو ان تعلقات کو نکاح کے ذریعہ مزید پختہ بنادیا جاتا تھا۔

دنیا کی بہترین چیز ''نیک خاتون''

تیسری حدیث جو میں نے تلاوت کی اس میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلدُّنْیَا کُلُّھَا مَتَاعٌ، وَخَیْرُ مَتَاعِ الدُّنْیَا اَلْمَرْأَۃُ الصَّالِحَۃُ)) (۱)

یعنی یہ ساری دنیا متاع ہے، نفع اٹھانے کی چیز ہے، کیونکہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفع اٹھانے کے لئے بنائی ہے، تاکہ انسان اس سے جائز طریقے سے نفع اندوز ہو۔ اور دنیا کے اندر سب سے بہتر نفع اٹھانے کی چیز نیک خاتون ہے، نیک خاتون کو حضور ﷺ نے سب سے بڑی نعمت قرار دیا۔

خوشحال گھرانہ، زمین پہ جنت

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کی جنت یہ ہے کہ زوجین ایک ہوں اور نیک ہوں۔ یعنی اگر دو باتیں جمع ہو جائیں کہ دونوں کے درمیان اتحاد اور محبت بھی ہو، اور دونوں نیک بھی ہوں تو یہ دنیا کی جنت ہے۔ اگر ان میں سے ایک چیز بھی مفقود ہو جائے تو دنیا ہی جہنم ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں دنیا بے کیف اور بے مزہ ہو جاتی ہے، اور اس میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔

تین چیزوں کا حصول، نیک بختی کی علامت

اسی لئے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تین چیزیں انسان کو دنیا میں حاصل ہو جائیں تو اس کی سعادت کا حصہ ہے، اس کی نیک بختی کی علامت ہے:

① کشادہ گھر

② نیک بیوی

③ خوشگوار سواری

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب خیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ رقم: ۲٦٦۸، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب المرأۃ الصالحۃ، رقم: ۳۱۸۰، مسند أحمد، رقم: ٦۲۷۹

اگر یہی تین چیزیں خراب ہو جائیں تو پھر یہ شوم ہیں، یعنی پوری زندگی کے لئے نحوست اور وبال ہے۔ اس حدیث کے ذریعہ حضور اقدس ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ شوہر کو بیوی کا انتخاب کرتے ہوئے اور بیوی کو شوہر کا انتخاب کرتے ہوئے یہ بات مدنظر رکھنی چاہئے کہ اس میں خدا کا خوف کتنا ہے، اور دین پر چلنے کا جذبہ کتنا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نکاح کے فوائد حاصل نہیں ہوتے۔

برکت والا نکاح

چوتھی حدیث یہ تلاوت کی تھی کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَعْظَمُ النِّكَاحِ بَرَكَةً اَيْسَرُهُ مُؤْنَةً))(۱)

یعنی سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں محنت، مشقت اور خرچ کم ہو۔ نکاح جتنی سادگی سے کیا جائے گا اتنی زیادہ اس کی برکتیں حاصل ہوں گی۔

بہرحال! نکاح کے بارے میں حضور اقدس ﷺ کے یہ ارشادات ہیں، اگر حقیقت میں ان پر عمل ہو جائے تو دین و دنیا کی صلاح و فلاح حاصل ہو جائے۔ آج ہمارے معاشرے میں چاروں طرف جو خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں اور جو فساد پھیل رہا ہے، اس کی بنیادی وجہ ان ارشادات سے غفلت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

(۱) مسند أحمد بن حنبل، حديث سيدة عائشة رضي الله عنها، رقم: ۲۳۳۸۸

نکاح جنسی تسکین کا جائز ذریعہ ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادران عزیز! یہ سورۃ مؤمنون کی ابتدائی آیات ہیں جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان مؤمنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں جن کو فلاح نصیب ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک مؤمن کی فلاح کا دارومدار ان صفات پر ہے جو ان آیات میں بیان کی گئی ہیں، لہٰذا ہر مومن کو یہ صفات حاصل کرنے کی فکر اور کوشش کرنی چاہئے۔ ان صفات میں سے تین صفات کا بیان پچھلے جمعوں میں متفرق طور پر ہوا ہے:

① نماز میں خشوع اختیار کرنا۔

② لغو باتوں سے پرہیز کرنا۔

③ زکوٰۃ ادا کرنا اور اپنے اخلاق کو درست کرنا۔

ان تینوں کا بیان الحمد للہ بقدر ضرورت ہو چکا ہے۔

نکاح، اہل ایمان کا وصف خاص

چوتھی صفت قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی کہ فلاح یافتہ مومن وہ ہیں جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیوی اور سوائے کنیزوں کے کہ ان کے ذریعہ اگر لوگ اپنی خواہش پوری

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۱۳۶ تا ۲۵۳) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المومنون: ۱۔۸

کریں تو ان پر کوئی ملامت نہیں اور جو لوگ ان کے علاوہ کسی اور طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرنا چاہیں تو وہ حد سے گزرنے والے ہیں اور اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں۔ یہ آیات کا ترجمہ تھا۔

جنسی جذبہ انسان کی فطرت میں داخل ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک بہت اہم مسئلہ کی طرف تمام مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے، وہ مسئلہ ''انسان کی جنسی خواہش کی تسکین'' کا مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس طرح پیدا فرمایا کہ ہر انسان میں ایک جنسی جذبہ موجود ہے اور یہ جنسی جذبہ انسان کی فطرت کے اندر داخل ہے۔ یعنی ہر انسان کو اپنی مخالف سمت کی طرف رغبت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اپنی جنسی خواہش کی تسکین کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔

جنسی تسکین کے دو حلال راستے

اللہ تعالیٰ نے اس جذبے پر کوئی پابندی اور قدغن نہیں لگائی، لیکن اس کے لئے دو راستے قرآن کریم نے بیان فرمائے کہ یہ دو راستے تو حلال ہیں اور ان دو کے علاوہ جنسی خواہش پوری کرنے کے سارے راستے حرام ہیں اور ایک مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان سے پرہیز کرے۔ دو حلال راستوں میں سے ایک تو نکاح کا راستہ کہ انسان نکاح کر کے اپنی بیوی کے ذریعہ جنسی خواہش کی تسکین کرے، یہی راستہ اس کے لئے حلال ہے بلکہ باعث اجر و ثواب بھی ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ کسی زمانے میں کنیزیں ہوا کرتی تھیں جن کو باندی اور لونڈی بھی کہا جاتا ہے، پہلے زمانے میں جنگ کے دوران جو لوگ قیدی ہو جاتے تھے تو ان کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو کنیز اور باندی بنا لیا جاتا تھا۔ حضور اقدس ﷺ جب دنیا میں تشریف لائے تو ساری دنیا میں یہ طریقہ جاری تھا اور آپ کے بعد بھی صدیوں تک جاری رہا، ان کنیزوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کے آقاؤں کے لئے حلال کر دیا تھا، بشرطیکہ وہ کنیز مسلمان ہو یا اہل کتاب میں سے ہو۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ جنسی خواہش پوری کرنے کے یہ دو طریقے تو حلال ہیں، ان کے علاوہ انسان جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے جو بھی طریقہ اختیار کرے، وہ حرام ہے اور جو ان طریقوں کو اختیار کرے وہ حد سے گزرنے والا ہے اور اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے۔

اسلام اعتدال کا درس دیتا ہے

اللہ تعالیٰ نے جو دین عطا فرمایا ہے، اس کی ہر چیز میں اعتدال اور توازن کو مدنظر رکھا

ہے، ایک طرف انسان کی ایک فطری خواہش ہے اور کوئی انسان اس خواہش سے مستثنیٰ نہیں ہے، کوئی بڑے سے بڑا پیغمبر، بڑے سے بڑا بزرگ، بڑے سے بڑا ولی، اس خواہش سے مستثنیٰ نہیں، ہر ایک کے دل میں یہ خواہش پائی جاتی ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس انسانی خواہش کو نسل انسانی کی بڑھوتری کا ذریعہ بنایا ہے کہ انسان کی نسل اسی خواہش کے نتیجے میں بڑھتی ہے، لہٰذا یہ خواہش فطری ہے اور جب یہ خواہش فطری ہے تو شریعت نے یہ نہیں کہا کہ یہ جنسی جذبہ خراب ہے، یا گندہ ہے، یا ناپاک ہے، یا حرام ہے، اس جذبہ کو حرام قرار نہیں دیا، البتہ اس جذبہ کو تسکین دینے کے لئے ایک جائز راستہ مقرر کر دیا، اس جائز راستے سے اس جذبے کی جتنی تسکین چاہو کرو، وہ تمہارے لئے حلال ہے، لیکن اس کے علاوہ جو راستے ہیں، وہ چونکہ دنیا میں فساد پھیلانے والے ہیں، وہ انسان کو انسانیت کے جامے سے نکال دینے والے ہیں، اور حیوانیت کے راستے ہیں، اس لئے شریعت نے ان پر پابندی عائد کر دی ہے، ان کو ناجائز قرار دیا ہے اسلام میں یہ اعتدال اور توازن ہے۔

عیسائیت میں رہبانیت کا تصور

''عیسائیت'' کو آپ دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ عیسائی مذہب میں راہبوں اور تارک الدنیا لوگوں کا ایک نظام مشہور ہے جس کو ''رہبانیت'' کہا جاتا ہے۔

عیسائی راہبوں کا کہنا یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی حاصل کرنی ہے تو اس کا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ دنیا کی ساری لذتوں کو چھوڑ دو اور ان کو خیر باد کہہ دو، جب تک دنیا کی ساری لذتیں نہیں چھوڑو گے، اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوگا لہٰذا اگر کھانا کھانا ہے تو بس بقدر ضرورت روکھا پھیکا اور بدمزہ کھانا کھاؤ، مزے کی خاطر اور لذت کی خاطر کوئی اچھا کھانا مت کھاؤ، اور اگر کھانے میں لذت حاصل کرو گے تو پھر اللہ تعالیٰ نہیں مل سکتے، اسی طرح تمہیں اس جنسی خواہش کو بھی دبانا پڑے گا، اگر جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے نکاح کا راستہ اختیار کرو گے تو پھر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ اس وقت تک راضی نہیں ہوں گے جب تک تم شادی کو نہیں چھوڑو گے، بیوی بچوں کو نہیں چھوڑو گے اور دنیا کے سارے کاروبار کو نہیں چھوڑو گے، چنانچہ انہوں نے خانقاہیں بنائیں، ان خانقاہوں میں راہبوں کی کھیپ کی کھیپ آ کر مقیم ہوئی اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم دنیا کو چھوڑ کر آئے ہیں۔

عیسائی راہبہ عورتیں

آپ نے عیسائی ''نَن'' کا نام سنا ہوگا، ''نَن'' وہ عورتیں ہوتی تھیں جو اپنی زندگی خانقاہ کے لئے وقف کر دیتی تھیں اور شادی سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی تھیں کہ ساری عمر وہ شادی نہیں کریں گی۔ ایک طرف ''راہب'' مرد ہیں جنہوں نے یہ قسم کھا رکھی ہے کہ وہ شادی نہیں کریں گے اور کیونکہ اگر شادی کریں گے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں گے، دوسری طرف ''نَن'' خواتین ہیں جنہوں نے قسم کھائی ہے کہ شادی نہیں کریں گی، کیونکہ شادی کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں گے، اور ان کا کہنا یہ تھا کہ جب تک نفس کو نہیں کچلیں گے اور جب تک خواہشات کو نہیں دبائیں گے، اللہ تعالیٰ اپنا قرب عطا نہیں کریں گے۔ عیسائیت میں یہ نظام جاری تھا۔

رہبانیت فطرت سے بغاوت ہے

لیکن یہ نظام فطرت سے بغاوت کا نظام تھا، جب اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جنسی جذبہ رکھا ہے اور کوئی انسان اس جذبے سے مستثنیٰ نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ یہ کیسے کر سکتے ہیں کہ جذبہ تو رکھ دیں اور اس کی تسکین کا کوئی حلال اور جائز راستہ نہ بتائیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ان کی حکمت سے بعید ہے۔ چنانچہ فطرت سے بغاوت کا انجام یہ ہوا کہ وہ عیسائی خانقاہیں جن میں راہب مرد اور نن عورتیں رہتی تھیں رفتہ رفتہ یہ خانقاہیں فحاشی کے اڈے بن گئے، اس لئے کہ وہ مرد اور عورتیں انسان اور بشر تھے، ان کے دل میں جنسی خواہش کا جذبہ پیدا ہونا لازم تھا۔ اس جذبے کو پورا کرنے کے لئے شیطان نے ان کو راستے سجھائے۔

شیطان کی پہلی چال

چنانچہ شیطان نے ان کو یہ راستہ سمجھایا کہ اپنے نفس کو جتنا کچلو گے اور جتنا اپنے نفس پر ضبط کرو گے اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی، اور جب خواہش بہت زیادہ شدید ہو رہی ہو اس وقت میں اس نفس کو کچلو گے تو اللہ تعالیٰ بہت راضی اور خوش ہوں گے، لہٰذا ایسا کریں کہ راہب مرد اور راہب عورت دونوں ایک کمرے میں رہیں۔ ایک کمرے میں رہنے کے نتیجے میں خواہش زیادہ ابھرے گی، اور اس کو زیادہ سختی سے دبانا پڑے گا، اور زیادہ سختی سے دبائیں گے تو اللہ تعالیٰ اور زیادہ راضی ہوں گے، چنانچہ مرد عورتیں ایک کمرے میں رہنا شروع ہو گئے۔

شیطان کی دوسری چال

اس کے بعد شیطان نے یہ سمجھایا کہ ابھی اور زیادہ نفس کو کچلنے کی ضرورت ہے لہٰذا راہب مرد اور راہب عورت ایک چارپائی پر سوئیں، اس کے نتیجے میں جب خواہش زیادہ پیدا ہو تو ان کو دبائیں اور کچلیں تو اللہ تعالیٰ اس سے اور زیادہ خوش اور راضی ہوں گے۔ چنانچہ جب ایک ساتھ چارپائی پر سوئے تو نتیجہ ظاہر ہے اس کے نتیجے میں بالآخر یہ ساری خانقاہیں فحاشی کے اڈے بن گئے، عام زندگی میں اتنی بدکاری نہیں تھی جتنی بدکاری ان راہبوں کی خانقاہوں میں پیدا ہوئی۔ یہ سب فطرت سے بغاوت کا نتیجہ تھا۔

اسلامی نکاح سہولت بخش ہے

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو جو دین عطا فرمایا اس میں اس انسانی فطرت کی رعایت رکھی گئی ہے۔ چونکہ یہ جنسی خواہش انسان کی فطرت کا ایک جذبہ ہے لہٰذا اس تسکین کا ایک حلال راستہ ہونا چاہئے۔ اور وہ حلال راستہ ''نکاح'' ہے، پھر اس نکاح کو شریعت نے اتنا آسان کر دیا کہ اس میں کوئی پائی پیسے کا خرچ نہیں ہے، کسی تقریب کی ضرورت نہیں ہے، یہاں تک کہ مسجد جانا اور کسی سے نکاح پڑھوانا بھی شرط نہیں ہے۔ بلکہ نکاح کے لئے بس اتنی شرط ہے کہ میاں بیوی اور دو گواہ مجلس کے اندر موجود ہوں، اور اس مجلس میں دو گواہوں کے سامنے لڑکا یہ کہہ دے کہ میں نے تم سے نکاح کیا اور لڑکی جواب میں یہ کہے کہ میں نے قبول کیا یا لڑکی یہ کہے کہ میں نے تم سے نکاح کیا اور لڑکا جواب میں یہ کہے کہ میں نے قبول کیا، بس نکاح ہو گیا۔

عیسائی مذہب میں نکاح کی مشکلات

جبکہ عیسائیوں کے یہاں ''کلیسا'' کے باہر نکاح کرنا ممکن نہیں، لہٰذا اگر مرد عورت دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول کر لیں تو عیسائی مذہب میں وہ نکاح نہیں ہوگا، بلکہ عیسائی مذہب میں نکاح اس وقت منعقد ہوگا جب مرد و عورت کلیسا میں جائیں اور وہاں کے پادری کی خوشامد کریں اور اس پادری کو فیس ادا کریں، وہ پادری اپنی فیس وصول کرنے کے بعد نکاح پڑھنے کے لئے خاص وقت مقرر کرے گا، اس وقت میں جب پادری نکاح پڑھائے گا تب نکاح منعقد ہوگا ورنہ نکاح نہیں ہو سکتا۔ شریعت اسلامیہ نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی کہ نکاح کسی اور سے پڑھوایا جائے بلکہ دو مرد و عورت دو گواہوں کے سامنے ایجاب و قبول کر لیں اور مہر مقرر کر لیں بس نکاح منعقد ہو گیا۔

نکاح کا خطبہ واجب نہیں

البتہ سنت یہ ہے کہ نکاح سے پہلے خطبہ پڑھ لیا جائے اگر شوہر پڑھ سکتا ہے تو وہ خطبہ پڑھ لے، کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں، لیکن عام طور پر شوہر کو خطبہ نہیں آتا اس لئے قاضی صاحب کو بلا کر خطبہ پڑھوایا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ ایجاب و قبول کرایا جاتا ہے، تاکہ سنت کے مطابق نکاح ہو جائے، ورنہ اسلام میں نہ خطبہ پڑھنا شرط ہے نہ مسجد میں جانا شرط ہے، نہ کسی قاضی سے نکاح پڑھوانا شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو اتنا آسان کر دیا تاکہ انسان کی فطری خواہش غلط راستے تلاش نہ کرے اور جب فطری خواہش پیدا ہو تو انسان کے پاس اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے حلال راستہ موجود ہو۔

ہم نے شادی کو عذاب بنالیا

آج ہم نے نکاح کو معاشرے میں ایک طومار بنالیا ہے، شادی کو ایک عذاب بنالیا ہے، آج کوئی شخص اس وقت تک شادی نہیں کر سکتا جب تک اس کے پاس ہزاروں لاکھوں روپے موجود نہ ہوں، کیونکہ اس کو تقریب کے لئے پیسے چاہئیں، مہندی کی رسم کے لئے پیسے چاہئیں، منگنی کی رسم کے لئے پیسے چاہئیں اور ان تمام کاموں میں اتنے آدمی بلانا ضروری ہے اور شادی کے لئے اتنا زیور چاہئے اتنے کپڑے چاہئیں، ولیمہ کی دعوت ہونی چاہئے، اس طرح نکاح میں رسم و رواج نے ہزار طومار بنا دیئے ہیں، جس نے نکاح کو ایک عذاب بنا دیا ہے، جبکہ شریعت میں اس طرح کی کوئی پابندی نہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نکاح

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، اور سابقین اولین جو بالکل ابتداء اسلام میں ہی اسلام لے آئے یہ ان میں سے ہیں۔ اور ان دس خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوشخبری سنائی کہ یہ جنت میں جائیں گے۔ ایک دن یہ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے لئے آئے۔ یہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ آگئے ایک دن یہ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے لئے آئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو آپ نے دیکھا کہ ان کے کپڑوں پر زرد رنگ کی خوشبو لگی ہوئی ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ یہ تمہارے کپڑے پہ زرد رنگ کیسے لگا؟ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک خاتون

سے نکاح کیا ہے، اس نکاح کے وقت خوشبو لگائی تھی۔ یہ اس خوشبو کا نشان ہے۔ اب دیکھئے کہ نکاح کر لیا اور اس نکاح کی تقریب میں حضور اقدس ﷺ کو بلایا تک نہیں اور حضور اقدس ﷺ نے بھی ان سے کوئی شکایت نہیں کی کہ واہ بھائی! تم نے اکیلے اکیلے نکاح کر لیا، ہمیں بلایا بھی نہیں، کیوں؟(۱)

اس لئے کہ یہ ساری شرطیں اور قیدیں جو ہم نے لگا رکھی ہیں کہ جب تک ہزار آدمی نہ بلائے جائیں جب تک شامیانہ نہ لگایا جائے جب تک ہال بک نہ کرایا جائے اس وقت تک شادی نہیں ہو گی، اسلام میں اور حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں ان چیزوں کا تصور نہیں تھا، تاکہ نکاح کو اتنا آسان کر دیا جائے کہ انسان جنسی خواہش کی تسکین کے لئے غلط راستے تلاش نہ کرے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا نکاح

ایک اور انصاری صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ جو حضور اقدس ﷺ کے بے حد چہیتے صحابی اور لاڈلے صحابی تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ سے برسبیل تذکرہ ذکر کر دیا کہ یا رسول اللہ! میں نے نکاح کر لیا ہے، آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم نے کسی کنواری سے نکاح کیا یا بیوہ سے نکاح کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! میری چھوٹی چھوٹی ۶ بہنیں ہیں۔ ان کو ایسی عورت کی ضرورت تھی جو سمجھدار ہو، اور ان کی تربیت بھی کر سکے اب اگر میں کسی کنواری سے نکاح کرتا تو وہ ان کی پوری دیکھ بھال نہ کر سکتی، اس لئے میں نے ایک بیوہ سے نکاح کیا ہے، حضور ﷺ نے ان کو دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے نکاح میں برکت دے۔(۲)

یہاں بھی نہ تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس ﷺ کو بلایا، اور نہ ہی حضور اقدس ﷺ نے یہ شکایت کی کہ تم نے اکیلے اکیلے نکاح کر لیا اور ہمیں نہیں پوچھا۔ نکاح کے بارے میں اسلام کا یہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب ماجاء فی قول اللہ تعالیٰ فإذا قضیت الصلاۃ، رقم: ۱۹۰۷ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق وجواز تعلیم القرآن و خاتم حدیث، رقم: ۲۵۵۶، سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول اللہ، باب ماجاء فی الولیمۃ، ۱۰۱٤، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب التزویج علی نواۃ من ذھب، رقم: ۳۲۹، سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب قلۃ المھر، رقم: ۱۸۰٤، سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب الولیمۃ، رقم ۱۸۹۷، مسند أحمد، رقم: ۱۲۲۲٤

(۲) صحیح البخاری، کتاب النفقات، باب عون المرأۃ زوجھا فی ولدھا، رقم: ٤۹٤۸، صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب استحباب نکاح البکر، رقم: ۲٦٦٤، مسند أحمد، رقم: ۱٤٤۸۲

مزاج تھا جو حضور اقدس ﷺ نے ہمیں بتایا۔ آج ہم نے ہندوؤں اور غیر مسلموں کے ساتھ رہنے کے نتیجے میں اپنے نکاح اور شادی میں اتنی رسمیں بڑھالی ہیں کہ نکاح ایک عذاب بن کر رہ گیا ہے اور ایک عام آدمی کے لئے نکاح کرنا بڑا مشکل ہوگیا ہے۔

بہرحال! شریعت نے نکاح کا راستہ آسان کردیا کہ اس طرح نکاح کرلو اور اس نکاح کے ذریعے اپنی جنسی خواہش جائز ذریعہ سے پوری کرلو۔ اسلام نے رہبانیت کی دعوت نہیں دی کہ تم نکاح کو بالکل چھوڑ دو۔

جائز تعلقات پر اجر و ثواب

پھر نہ صرف یہ کہ نکاح کی اجازت دی بلکہ یہ بھی فرمایا کہ میاں بیوی کے درمیان جو باہمی تعلقات ہوتے ہیں وہ نہ صرف جائز ہیں بلکہ وہ تعلقات ثواب کا ذریعہ ہیں۔

ایک مرتبہ ایک صحابی نے حضور اقدس ﷺ سے پوچھا ''یا رسول اللہ! ہم اپنی بیوی کے ساتھ جو ازدواجی تعلق قائم کرتے ہیں وہ تو ہم اپنی ذاتی لذت حاصل کرنے کی خاطر کرتے ہیں۔ اس میں ثواب کیوں دیا جاتا ہے؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' اگر تم یہ لذت حرام طریقے سے حاصل کرتے تو گناہ ہوتا یا نہیں؟''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا'' بے شک گناہ ہوتا''

آپ نے فرمایا'' جب تم حرام طریقے کو چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر حلال طریقہ اختیار کر رہے ہو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس حلال طریقے پر ثواب عطا فرماتے ہیں، اور یہ عمل تمہارے لئے اجر کا سبب بنتا ہے''(۱)

نکاح میں تاخیر مت کیجیے

اور پھر اس حلال طریقے میں اللہ تعالیٰ نے اتنی آزادی دے دی کہ میاں بیوی پر اس بارے میں اوقات کی کوئی پابندی نہیں، مقدار کی اور عدد کی کوئی پابندی نہیں اور طریقوں کی بھی کوئی خاص پابندی نہیں، اس طرح سے اس میں آزادی دے دی تاکہ انسان ناجائز راستے تلاش نہ کرے۔ اسی لئے حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا'' اگر تمہارے پاس تمہاری لڑکی کا رشتہ آئے

---

(۱) مسند أحمد (۶۷/۵)

اور ایسے لڑکے کا رشتہ آئے جو تمہیں پسند ہو، تمہیں ظاہری اعتبار سے بھی اور دین کے اعتبار سے بھی اچھا لگتا ہو، اور تمہارا کفو بھی لگتا ہو تو اس رشتے کو قبول کر لو اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ اور فساد پھیلے گا'' (۱)

چنانچہ وہ فتنہ اس طرح پھیل رہا ہے کہ گھر میں لڑکیاں رشتوں کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہیں اور رشتے بھی موجود ہیں، لیکن جہیز کا انتظار ہے اور اس بات کا انتظار ہے کہ باپ کے پاس لاکھوں روپے آجائیں تو پھر وہ اپنی بیٹی کی شادی کر کے اس کو رخصت کرے۔ لیکن وہ لڑکیاں بھی تو انسان ہیں، ان کے دلوں میں بھی جذبات ہیں، ان کے دلوں میں بھی خواہشات ہیں۔ جب وہ خواہشات جائز طریقے سے پوری نہیں ہوں گی تو شیطان ان کو ناجائز طریقے کی طرف لے جائے گا، اور اس سے فتنہ وفساد پھیلے گا۔ معاشرے کے اندر آج دیکھ لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے روگردانی کے نتیجے میں کیسا فتنہ اور فساد پھیلا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ سب حرام راستے ہیں

بہرحال! شریعت نے ایک طرف اس خواہش کی تسکین کا جائز طریقہ بتادیا اور دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ اس کے علاوہ جو راستے ہیں وہ انسان کو تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ بربادی کی طرف لے جانے والے ہیں ان سے بچو اور جو لوگ ان راستوں کی طرف جائیں گے وہ لوگ اپنی حد سے گزرنے والے ہیں اور عذاب کو دعوت دینے والے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا کہ جو لوگ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یعنی عفت وعصمت کی زندگی گزاریں اور جنسی خواہش کو پورا کرنے کے جو حلال طریقے ہیں صرف ان پر اکتفا کریں ان پر عمل کیے بغیر ان کو نہ دنیا میں فلاح حاصل ہوسکتی ہے اور نہ آخرت میں فلاح حاصل ہوسکتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عفت اور عصمت کو حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ اور اس کے لئے قرآن وسنت نے کیا تفصیلی احکام عطا فرمائے ہیں، یہ ایک مستقل موضوع ہے، اب وقت ختم ہو چکا ہے ان شاء اللہ اگر زندگی رہی تو اگلے جمعہ کو اس کی تفصیل عرض کروں گا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل وکرم سے عفت وعصمت کی دولت عطا فرمائے، اپنی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول الله، باب ماجاء اذا جاء کم من ترضون دينه فزوجوه، رقم: ۱۰۰۵

خطبہ نکاح کی اہمیت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

ابھی ان شاء اللہ پرمسرت تقریب کا آغاز ہونے والا ہے، جس میں تقریب کے دولہا اور دلہن ان شاء اللہ نکاح مسنون کے رشتے میں منسلک ہونے والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے لئے اس رشتے کو مبارک فرمائے۔

شادی کی تقریبات

مجھ سے فرمائش کی گئی کہ نکاح پڑھانے سے پہلے کچھ گزارشات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں، اگرچہ شادی بیاہ کی تقریبات آج کل کے ماحول کے لحاظ سے کسی وعظ ونصیحت کی مجلس کے لئے موزوں نہیں، لیکن تقریب کو منعقد کرنے والے حضرات کی فرمائش ہے کہ اکثر حاضرین بھی اس موقع پر کوئی دین کی بات سننا چاہتے ہیں۔ اس لئے حکم کی خاطر چند کلمات آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

خطبہ نکاح کی تین آیات

ابھی ان شاء اللہ نکاح کے خطبے کا آغاز ہوگا، اور یہ خطبہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے، نکاح بھی حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے، آپ نے ارشاد فرمایا:

((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ)) (۱)

شرعی اعتبار سے تو نکاح دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول سے منعقد ہو جاتا ہے، لیکن

☆ اصلاحی خطبات (۱/۲۴۸-۲۵۳)، ۲۶ دسمبر ۱۹۹۱ء بروز جمعرات، بعد از نماز عشاء، فاران کلب، گلشن اقبال کراچی، حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے یہ بیان حاجی محمد نسیم انبالوی صاحب کے فرزند کی تقریب نکاح کے موقع پر فرمایا۔

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب ماجاء في فضل النكاح، رقم: ۱۸۳۶

حضور ﷺ نے اس کے لئے جو مسنون طریقہ مقرر فرمایا، وہ یہ ہے کہ ایجاب وقبول سے پہلے ایک خطبہ دیا جائے، اس خطبہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد ہوتی ہے، حضور نبی کریم ﷺ پر درود بھیجا جاتا ہے، اور عموماً قرآن کریم کی تین آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں، حضور اقدس ﷺ نے نکاح کے موقع پر یہ تین آیتیں تلقین فرمائیں کہ نکاح کے خطبہ میں ان آیات کی تلاوت کی جائے، سب سے پہلے سورۃ نساء کی پہلی آیت تلاوت کی جاتی ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا﴾(۱)

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو، اور تقویٰ اختیار کرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، (یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے) اور اسی جان سے اس کی بیوی کو پیدا کیا (یعنی حضرت حوا علیہا السلام کو) اور ان دونوں (آدم اور حوا) کے ذریعہ دنیا میں بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے (کہ ساری دنیا کی آبادی انہیں دو مقدس میاں بیوی کی اولاد ہیں) اور اس سے ڈرو جس کے نام کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے (اپنے حقوق کا) مطالبہ کرتے ہو (جب کسی کو دوسرے سے اپنا حق مانگنا ہوتا ہے تو وہ اکثر اللہ کا واسطہ دے کر مانگتا ہے کہ خدا کے واسطے میرا یہ حق دے دو) اور رشتہ داریوں (کے حقوق) سے بھی ڈرو (یعنی اس کا خیال رکھو کہ رشتہ داریوں کے حقوق پامال نہ ہونے پائیں) اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال وافعال پر نگراں ہے'' (وہ دیکھ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اور کیا کر رہے ہو)

یہ پہلی آیت جو خطبہ نکاح میں تلاوت کی جاتی ہے، دوسری آیت سورۃ آل عمران کی ہے، وہ یہ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾(۲)

اس کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو (جیسا کہ اس سے) ڈرنے کا حق ہے، اور تم نہ مرو

(۱) النساء: ۱

(۲) آل عمران: ۱۰۲

(موت نہ آئے) مگر اس حالت میں کہ تم اللہ کے فرماں بردار ہو"

تیسری آیت جو رسول اللہ ﷺ نے خطبہ نکاح میں تعلیم فرمائی، وہ یہ ہے:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾(۱)

اس کا ترجمہ یہ ہے:

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور (سیدھی) سچی بات کہو (اگر اللہ سے ڈرو گے، اور سیدھی سچی بات کہنے کی عادت ڈالو گے) تو اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال کو قبول فرمالیں گے، اور تمہارے گناہوں کو معاف فرمادیں گے، جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا تو وہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا"

تینوں آیتوں میں مشترک چیز

اس لئے خاص طور پر اس نکاح کی تقریب کے موقع پر جو خطبہ نبی کریم ﷺ نے مشروع فرمایا، اس میں ان تین آیتوں کو مقرر فرما کر تقویٰ کی تاکید فرمائی، یوں تو ہر انسان جب مسلمان ہوتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور تقویٰ کا عہد کرتا ہے۔

نئی زندگی کا آغاز

لیکن یہ موقع زندگی کا ایک دوراہا ہے، جس میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے، زندگی میں ایک انقلاب آرہا ہے، اس وقت میں تقویٰ کے اس عہد کو دوبارہ تازہ کریں، اور اس کی تجدید کریں، تو ان تین آیتوں کو تلاوت کرنے کا درحقیقت یہ مقصود ہے، اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو ہمیں صحیح طور پر سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس موقع پر تقویٰ حاصل کرنے کی فکر اور اس کی کوشش کو تازہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

(۱) الاحزاب: ۷۰۔۷۱

خطبۂ نکاح کا پیغام ☆

ہم میں سے شاید کوئی شخص بھی ایسا نہ ہو جس نے کبھی کسی نکاح کی تقریب میں حصہ نہ لیا ہو، آئے دن شادی کی تقریبات اور نکاح کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی ہیں، اور تقریباً ہر محفل میں سینکڑوں افراد شریک ہوتے ہیں، ان محفلوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایجاب وقبول سے پہلے نکاح خواں ایک خطبہ پڑھتا ہے، اس کے بعد نکاح کی کارروائی ہوتی ہے، اگرچہ نکاح کی صحت کے لئے خطبہ کوئی لازمی شرط نہیں ہے، اس کے بغیر بھی دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کرنے سے نکاح صحیح ہو جاتا ہے، لیکن یہ آنحضرت ﷺ کی سنت ہے کہ نکاح سے پہلے آپ ﷺ مختصر خطبہ دیتے تھے، اور اس کے ابتدائی الفاظ آپ ﷺ نے خود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو سکھائے تھے، یہی وہ الفاظ ہیں جو ہم تقریباً ہر نکاح کی محفل میں نکاح خواں کی زبانی سنتے ہیں، عام طور سے خطبے کے یہ الفاظ، ان کا مقصد اور ان کی معنویت شادی کے طربیہ ہنگاموں میں گم ہو کر رہ جاتی ہے، انہیں بے توجہی کے ساتھ سنا جاتا ہے، اور اگر نکاح کی محفل بڑی ہو، اور لاؤڈ اسپیکر کا انتظام نہ ہو تو اکثر لوگ انہیں سن بھی نہیں پاتے، اور عین خطبہ کے وقت بھی باتیں کرتے نظر آتے ہیں، (اور یہ بھی اس بے توجہی کا شاخسانہ ہے کہ جو لوگ نکاح کی تقریب پر ہزاروں، بلکہ بعض اوقات لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں، وہ بعض اوقات اتنا بھی خیال نہیں کرتے کہ تھوڑے سے پیسے مزید خرچ کر کے لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کر دیں، تاکہ خطبہ اور ایجاب وقبول جو پوری تقریب کی اصل روح ہے، وہ پرسکون اور باوقار طریقے سے انجام پاسکے اور حاضرین ان بابرکت کلمات کو ہاؤ ہو کے بجائے تقدس کی فضا میں سن سکیں)

بہرکیف! اگر خطبہ سننے میں آ بھی جائے تو عموماً اسے محض ایک تبرک سمجھا جاتا ہے، اور عام لوگوں کے ذہن میں اس کا مقصد صرف برکت کا حصول ہوتا ہے، اس سے آگے کچھ نہیں، لہٰذا شاید ہی کوئی صاحب ایسے ہوں جنہوں نے یہ جاننے سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟ وہ کیوں اس موقع پر پڑھے جاتے ہیں؟ اور ان کا نکاح سے کیا تعلق ہے؟ چونکہ خطبے کے یہ الفاظ خود آنحضرت ﷺ سے ثابت ہیں، بلکہ آپ نے باقاعدہ سکھائے ہیں، اس لئے ہمیں ان کا مفہوم، مقصد

☆ ذکر و فکر، ص: ۲۹۷

اور پس منظر ضرور سمجھنا چاہئے، تا کہ ہم اس بابرکت سنت کی معنویت سے واقعی آگاہ ہوسکیں۔

ان الفاظ کی ابتداء تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا سے ہوتی ہے، اور بحیثیت مسلمان ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے ہر اہم کام کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد سے کیا جائے، اس لئے کہ اس کائنات میں کوئی بھی کام اس کی توفیق کے بغیر انجام نہیں پاسکتا، نکاح دو افراد کی زندگی کا اہم ترین دوراہا ہے، جس کے ذریعہ یہ دو افراد زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز کرتے ہیں، اس موقع پر ہمیں بطور خاص یہ سکھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور دعا سے یہ سفر شروع کریں، حمد وثناء اور دعا کے لئے جو الفاظ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے تلقین فرمائے ہیں وہ کتنے خوبصورت اور کتنے جامع ہیں، اس کا اندازہ ان کے ترجمے سے ہوسکتا ہے، اصل عربی الفاظ تو یہ ہیں:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا))

اور ان کا ترجمہ یہ ہے:

''تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، ہم اس کی حمد کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اسی سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں، اسی پر ایمان لاتے اور اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں، ہم اپنی نفسانیت کے شر سے اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اسی کی پناہ مانگتے ہیں، جسے وہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا، اور جسے وہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور ہم یہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر اور ان کے تمام آل واصحاب پر اپنی رحمتیں اور سلامتی نازل فرمائے''

نکاح کے موقع پر دولہا دلہن ہی نہیں ان کے دونوں خاندان اپنی زندگی کے بڑے نازک دوراہے پر ہوتے ہیں، اگر دل مل جائیں تو زندگی جنت کا نمونہ بن جاتی ہے، اور اگر خدا نہ کرے دلوں میں ملاپ نہ ہو تو دونوں خاندانوں کے لئے ایک مستقل دردسر کھڑا ہو جاتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ اس سے مدد مانگنے کی تلقین کی گئی ہے، اور چونکہ بسا اوقات ازدواجی زندگی کے فتنے خود اپنی

بدطینتی یا بداعمالیوں سے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی بداعمالیوں کے شر سے اسی کی پناہ مانگی گئی ہے، اور اسی سے اس بات کی توفیق طلب کی گئی ہے کہ وہ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرمائے اور گمراہی سے محفوظ رکھے۔ اور یہ ساری حمد وثناء اور دعائیں چونکہ توحید و رسالت پر مستحکم ایمان کے بغیر بے معنی ہیں، اس لئے توحید اور آنحضرت ﷺ کی گواہی کی تجدید کرائی گئی ہے، اور آخر میں آنحضرت ﷺ پر درود وسلام بھیجا گیا ہے، کیونکہ آپ ﷺ ہی ہمارے لئے ہدایت کا یہ نور لے کر تشریف لائے۔

یہ ہیں خطبۂ نکاح کے تمہیدی الفاظ، اس کے بعد عموماً خطبے میں قرآن کریم کی تین آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے، پہلی آیت سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۲ ہے:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقْتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ (۱)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تمہیں موت اسلام ہی کی حالت میں آنی چاہئے''

دوسری آیت سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے:

﴿يَآأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً وَاتَّقُوا اللهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ (۲)

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان (یعنی آدم) سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیئے، اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو، اور رشتہ داریوں کا پاس کرو، بے شک اللہ تمہاری نگرانی کرنے والا ہے۔''

تیسری آیت سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۷۰، ۷۱ ہے:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا﴾ (۳)

---

(۱) آل عمران: ۱۰۲

(۲) النساء: ۱

(۳) الأحزاب: ۷۰-۷۱

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سیدھی بات کہا کرو، اللہ تمہارے کام سنوار دے گا، اور تمہارے گناہ معاف کردے گا، اور جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرلی اس نے بڑی عظیم کامیابی حاصل کی''

۱۷ رجب ۱۴۱۶ھ/۱۰ دسمبر ۱۹۹۵ء

☆☆☆

نکاح اور برادری ☆

شادی بیاہ کے معاملے میں لوگ ابھی تک اپنے خود ساختہ خیالات کے بندھن میں کس بری طرح جکڑے ہوئے ہیں، اور اس معاملے میں اسلامی تعلیمات سے غفلت اور ناواقفیت کتنی عام ہو چکی ہے؟ اس کا اندازہ ان مختلف قضیوں سے ہوتا رہتا ہے جو لوگ شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے بکثرت میرے سامنے لاتے رہتے ہیں، ابھی ایک خاتون نے امریکہ سے مجھے ایک طویل خط میں اپنی درد بھری داستان لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے والدین ایک کروڑ پتی آدمی ہیں، پڑھے لکھے ہیں، لیکن ان کو یہ اصرار تھا کہ وہ اپنی کسی بیٹی کی شادی اپنی برادری سے باہر نہیں کریں گے، خاتون نے لکھا ہے کہ میں ان کی بڑی بیٹی ہوں، اور شروع میں مجھ سے شادی کرنے کے لئے کئی رشتے آئے، لیکن میرے والد نے ہر رشتہ کو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ برادری سے باہر کا رشتہ ہے، اس لئے ان کے لئے قابل قبول نہیں۔ یہاں تک کہ میری عمر زیادہ ہوتی چلی گئی، اور بالآخر رشتے آنے بند ہو گئے۔

پھر ایک روز میرے والد نے مجھ سے یہ کہا کہ اب میرے لئے تمہارا کوئی رشتہ اپنی برادری سے حاصل کرنا ممکن نہیں رہا، لہٰذا اب تم میرے سامنے یہ حلف اٹھاؤ کہ عمر بھر شادی نہیں کرو گی، میں چونکہ مالدار آدمی ہوں، لہٰذا جیتے جی تمہاری کفالت کروں گا، لیکن مجھے یہ کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے کہ تمہاری شادی برادری سے باہر ہو، خاتون کہتی ہیں کہ والد صاحب نے مجھے یہ اقرار کرنے پر اتنا مجبور کیا کہ بالآخر میں نے یہ وعدہ کر لیا کہ تمام عمر شادی نہیں کروں گی، اور اس کے بعد واقعۃً میں نے یہ تہیہ بھی کر لیا کہ اپنے والد کی خواہش کے احترام میں زندگی اسی طرح گزاروں گی، لیکن میری چھوٹی بہن، ایک بھائی اور والدہ اس فیصلے پر راضی نہیں ہوئے، ایک صاحب جنہوں نے عرصہ دراز پہلے میرے لئے رشتہ مانگا تھا، اور والد صاحب نے انہیں سختی سے انکار کر دیا تھا، ابھی تک مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ تھے، میرے بھائی بہن نے ان سے بات کی، اور والد صاحب کو بھی آمادہ کرنے کی کوشش کی، آخر کار والد صاحب نے اتنا کہہ دیا کہ اس کے بعد لڑکی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، بہن

☆ ذکر و فکر، ص: ۳۱۵

نے مجھ سے والد صاحب کی یہ بات چھپائی اور صرف اتنا کہا کہ وہ ناراض تو ہیں، مگر نکاح پر آمادہ ہو گئے ہیں، چنانچہ یہ نکاح ہو گیا، اور میں اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی آئی، لیکن اب مجھے پتہ چلا ہے کہ والد صاحب نے عمر بھر کے لئے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے، نہ وہ مجھ سے فون پر بات کرنے کے لئے تیار ہیں نہ مجھے اپنی بیٹی تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔

یہ واقعہ تو انتہائی سنگین نوعیت کا ہے، لیکن یہ بات اکثر دیکھنے سننے میں آتی رہتی ہے کہ لوگ برادری میں نکاح کرنے کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہیں، یہ درست ہے کہ شریعت نے نکاح کے معاملے میں ایک حد تک کفو کی رعایت رکھی ہے، لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ نکاح چونکہ زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے اس لئے میاں بیوی اور دونوں خاندانوں کے درمیان طبعی ہم آہنگی ہو، ان کے رہن سہن، ان کے طرزِ فکر اور ان کے مزاج میں اتنی دوری نہ ہو کہ ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنے میں مشکل پیش آئے، لیکن اول تو کفو کی اس رعایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر کفو میں کوئی رشتہ نہ ملے تو یہ قسم کھالی جائے کہ اب زندگی بھر شادی ہی نہیں ہو سکے گی، دوسرے کفو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خاص اپنی برادری ہی میں رشتہ کیا جائے، اور برادری کے باہر سے جو بھی رشتے آئیں، انہیں غیر کفو قرار دیا جائے۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں جنہیں نظر انداز کرنے سے ہمارے معاشرے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں:

(۱) ہر وہ شخص کسی لڑکی کا کفو ہے جو اپنے خاندانی حسب نسب، دین داری اور پیشے کے لحاظ سے لڑکی اور اس کے خاندان کا ہم پلہ ہو، یعنی کفو میں ہونے کے لئے اپنی برادری کا فرد ہونا ضروری نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص کسی اور برادری کا ہے، لیکن اس کی برادری بھی لڑکی کی برادری کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہے، تو وہ بھی لڑکی کا کفو ہے، کفو سے باہر نہیں ہے، مثلاً سید، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی بلکہ تمام قریشی برادریاں آپس میں ایک دوسری کے لئے کفو ہیں، اسی طرح جو مختلف عجمی برادریاں ہمارے ملک میں پائی جاتی ہیں مثلاً راجپوت، خان وغیرہ وہ بھی اکثر ایک دوسری کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہیں، اور ایک دوسری کے لئے کفو ہیں۔

(۲) بعض احادیث و روایات میں یہ ترغیب ضرور دی گئی ہے کہ نکاح کفو میں کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ دونوں خاندانوں کے مزاج آپس میں میل کھا سکیں، لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ کفو سے باہر نکاح کرنا شرعاً بالکل ناجائز ہے، یا یہ کہ کفو سے باہر نکاح شرعاً درست نہیں ہوتا، حقیقت یہ ہے کہ اگر لڑکی اور اس کے اولیاء کفو سے باہر نکاح کرنے پر راضی ہوں، تو کفو سے باہر کیا ہوا نکاح بھی شرعاً منعقد ہو جاتا ہے، اور اس میں نہ کوئی گناہ ہے، نہ کوئی ناجائز

بات، لہٰذا اگر کسی لڑکی کا رشتہ کفو میں میسر نہ آ رہا ہو، اور کفو سے باہر کوئی مناسب رشتہ مل جائے تو وہاں شادی کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کفو میں رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے لڑکی کو عمر بھر بغیر شادی کے بٹھائے رکھنا کسی طرح جائز نہیں۔

(۳) شریعت نے یہ ہدایت ضرور دی ہے کہ لڑکی کو نکاح بغیر ولی کے نہیں کرنا چاہئے (خاص طور سے اگر کفو سے باہر نکاح کرنا ہو تو ایسا نکاح اکثر فقہاء کے نزدیک بغیر ولی کے درست نہیں ہوتا) لیکن ولی کو بھی یہ چاہئے کہ وہ کفو کی شرط پر اتنا زور نہ دے جس کے نتیجے میں لڑکی عمر بھر شادی سے محروم ہو جائے، اور برادری کی شرط پر اتنا زور دینا تو اور بھی زیادہ بے بنیاد اور لغو حرکت ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ایک حدیث میں حضور سرور کونین ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِذَا جَاءَكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِيْنَهُ وَخُلُقَهُ فَزَوِّجُوْهُ إِلَّا تَفْعَلُوْا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ)) (۱)

''جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص رشتہ لے کر آئے جس کی دینداری اور اخلاق تمہیں پسند ہوں تو اس سے (اپنی لڑکی کا) نکاح کر دو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ وفساد برپا ہوگا''

(۴) اسی ضمن میں یہ غلط فہمی بھی بہت سے لوگوں میں عام ہے کہ سید لڑکی کا نکاح غیر سید گھرانے میں نہیں ہو سکتا، یہ بات بھی شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے، ہمارے عرف میں ''سید'' ان حضرات کو کہتے ہیں جن کا نسب بنی ہاشم سے جا ملتا ہو، چونکہ حضور سرور کونین ﷺ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے بلاشبہ اس خاندان سے نسبی وابستگی ایک بہت بڑا اعزاز ہے، لیکن شریعت نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی کہ اس خاندان کی کسی لڑکی کا نکاح باہر نہیں ہو سکتا، بلکہ جیسا میں نے اوپر عرض کیا، نہ صرف شیوخ، بلکہ تمام قریشی نسب کے لوگ بھی شرعی اعتبار سے سادات کے کفو ہیں، اور ان کے درمیان نکاح کا رشتہ قائم کرنے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ قریش سے باہر کے خاندانوں میں بھی باہمی رضامندی کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔

۲۶ ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ / ۱۵ مئی ۱۹۹۶ء

(۱) سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول اللہ، باب ماجاء اذا جاء کم من ترضون دینه فزوجوه، رقم: ۱۰۰۵

شادی بیاہ کی رسمیں ☆

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ان دس خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی خوشخبری دی تھی، حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو ان کے کپڑوں پر ایک پیلا سا نشان نظر آیا، آپ نے پوچھا کہ یہ کیسا نشان ہے؟ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے ایک خاتون سے نکاح کیا ہے، (مطلب یہ تھا کہ نکاح کے موقع پر کپڑوں پر خوشبو لگائی تھی، اس کا یہ نشان باقی رہ گیا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں برکت کی دعا دی، اور فرمایا: ولیمہ کرنا چاہے ایک بکری ہی کا ہو۔(۱)

اندازہ لگایئے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے قریبی صحابی ہیں کہ دس منتخب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہوتا ہے، لیکن انہوں نے نکاح کیا تو نکاح کی مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کپڑوں پر لگی ہوئی خوشبو کا نشان دیکھ کر سوال کیا تو انہوں نے بتایا کہ میں نے نکاح کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کوئی شکایت نہیں فرمائی کہ تم اکیلے اکیلے نکاح کر بیٹھے اور ہمیں پوچھا بھی نہیں، شکایت کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دعا دی، البتہ ساتھ ہی یہ ترغیب بھی دی کہ ولیمہ کریں۔

دراصل اسلام نے نکاح کو اتنا آسان اور اتنا سادہ بنایا کہ جب دونوں فریق راضی ہوں، وہ کسی بے جا رکاوٹ کے بغیر یہ رشتہ قائم کرسکیں، شریعت نے یہ شرط بھی نہیں لگائی کہ کوئی قاضی یا عالم ہی نکاح پڑھائے، شریعت کی طرف سے شرط صرف اتنی ہے کہ نکاح کی مجلس میں دو گواہ موجود ہوں،

☆ ذکر و فکر، ص:۲۶۹

(۱) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب ماجاء فی قول الله تعالیٰ فإذا قضیت الصلاة، رقم: ۱۹۰۷ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق وجواز و تعلیم القرآن و خاتم حدیث، رقم: ۲۵۵٦، سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول الله، باب ماجاء فی الولیمة، ۱۰۱٤، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب التزویج علی نواة من ذهب، رقم: ۳۲۹، سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب قلة المهر، رقم: ۱۸۰٤، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب الولیمة، رقم: ۱۸۹۷، مسند أحمد، رقم: ۱۲۲۲٤

اگر دولہا دلہن عاقل و بالغ ہوں تو ان میں سے کوئی دوسرے سے کہہ دے کہ میں نے تم سے نکاح کیا، دوسرا جواب دے دے کہ میں نے قبول کیا، بس نکاح ہوگیا نہ اس کے لئے کسی عدالت میں جانے کی ضرورت ہے نہ کسی تقریب کی کوئی شرط ہے۔ نہ دعوت ضروری ہے، نہ جہیز لازمی ہے، ہاں! دلہن کے اکرام کے لئے مہر ضروری ہے، اور صحیح طریقہ یہی ہے کہ مہر کا تعین بھی نکاح ہی کے وقت کرلیا جائے، لیکن اگر بالفرض نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ آیا ہو تب بھی نکاح ہو جاتا ہے، اور مہر مثل لازم سمجھا جاتا ہے، نکاح کے وقت خطبہ بھی ایک سنت ہے، اور حتی الامکان اس سنت کی برکات ضرور حاصل کرنی چاہئیں، لیکن نکاح کی صحت اس پر موقوف نہیں، لہٰذا اگر خطبہ کے بغیر ہی ایجاب وقبول کرلیا جائے، تب بھی نکاح صحیح ہو جاتا ہے، نکاح میں کوئی نقص نہیں آتا۔

ولیمہ، جس کی ترغیب آنحضرت ﷺ نے مذکورہ بالا حدیث میں دی ہے وہ بھی سنت ہے، لیکن اول تو وہ بھی ایسا فرض یا واجب نہیں کہ اس کے بغیر نکاح نہ ہوسکتا ہو، دوسرے اس کی کوئی مقدار شریعت نے مقرر نہیں کی، نہ مہمانوں کی کوئی تعداد لازمی قرار دی ہے، ہر شخص اپنی مالی استطاعت کے اعتبار سے اس کا فیصلہ کرسکتا ہے، اس کے لیے قرض ادھار کرنے کی بھی نہ صرف کوئی حاجت نہیں، بلکہ ایسا کرنا شرعاً ناپسندیدہ ہے، کوئی شخص جتنے مختصر پیمانے پر ولیمہ کرسکتا ہے، اتنے ہی مختصر پیمانے پر کرلے، اور نہ کرسکے تب بھی اس سے نکاح میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔

اسلام نے نکاح کو اتنا آسان اس لئے کیا تھا کہ نکاح انسانی فطرت کا ایک ضروری تقاضا جائز طریقے سے پورا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، اور اگر اس جائز ذریعے پر رکاوٹیں عائد کی جائیں، یا اس کو مشکل بنایا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ بے راہ روی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، جب کوئی شخص اپنی فطری ضرورت پوری کرنے کے لئے جائز راستے بند پائے گا، تو اس کے دل میں ناجائز راستوں کی طلب پیدا ہوگی، اور اس طرح پورا معاشرہ بگاڑ کا شکار ہوگا۔

لیکن اسلام نے نکاح کو جتنا آسان بنایا تھا، ہمارے موجودہ معاشرتی ڈھانچے نے اسے اتنا ہی مشکل بنا ڈالا ہے، نکاح کے بابرکت معاہدے پر ہم نے لامتناہی رسموں، تقریبات اور فضول اخراجات کا ایسا بوجھ لاد رکھا ہے کہ ایک غریب، بلکہ متوسط آمدنی والے شخص کے لئے بھی وہ ایک ناقابل عبور پہاڑ بن کر رہ گیا ہے، اور کوئی شخص اس وقت تک نکاح کا تصور نہیں کرسکتا جب تک اس کے پاس (گری سے گری حالت میں بھی) لاکھ دو لاکھ روپے موجود نہ ہوں۔ یہ لاکھ دو لاکھ روپے کا نکاح حقیقی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے نہیں، بلکہ صرف فضول رسموں کا پیٹ بھرنے کے لئے درکار ہیں، جنہیں خرچ کرنے سے زندگی کی حقیقی ضروریات پوری کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

شریعت کی طرف سے نکاح کے موقع پر لے دے کر صرف ایک دعوت ولیمہ مسنون تھی، اور وہ بھی ہر شخص کی استطاعت کے مطابق، لیکن اب تقریبات اور دعوتوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا ہی جارہا ہے، منگنی کی تقریب ایک مستقل شادی کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے، اور عین نکاح کے موقع پر مہندی ابٹن سے لے کر چوتھی بھوڑے تک تقریباً ہر روز کسی نہ کسی تقریب کا اہتمام لازمی سمجھ لیا گیا ہے، جس کے بغیر شادی بیاہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پھر تقریبات میں بھی زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ نت نئے اخراجات کا اضافہ ہو رہا ہے، نئے نئے مطالبے سامنے آرہے ہیں، نئی نئی رسمیں وجود میں آرہی ہیں غرض فضولیات کا ایک طومار ہے جس نے شادی کو خاص طور سے غریب اور متوسط آدمی کے لئے ایک ایسی ذمہ داری میں تبدیل کر دیا ہے جو عام طور پر صرف حلال آمدنی سے پوری نہیں ہو سکتی، لہٰذا اسے پورا کرنے کے لئے کہیں نہ کہیں ناجائز ذرائع کا سہارا لینا پڑتا ہے، اور اس طرح نکاح کا یہ کار خیر نہ جانے کتنی بدعنوانیوں اور کتنے گناہوں کا ملغوبہ بن کر رہ جاتا ہے، اور جس نکاح کا آغاز ہی بدعنوانی یا گناہ سے ہو، اس میں خیر و برکت کہاں سے آئے گی؟

خوشی کے مواقع پر اعتدال کے ساتھ خوشی منانے پر شریعت نے کوئی پابندی نہیں لگائی، لیکن خوشی منانے کے نام پر ہم نے اپنے آپ کو جن بے شمار رسموں میں جکڑ لیا ہے، ان کا نتیجہ یہ ہے کہ خوشی، جو دل کی فرحت کا نام تھا، وہ تو پیچھے چلی گئی ہے، اور رسموں کے لگے بندھے قواعد آگے آگئے ہیں، جن کی ذرا خلاف ورزی ہو تو شکوے شکایتوں اور طعن و تشنیع کا طوفان کھڑا ہو جاتا ہے، لہٰذا شادی کی تقریبات رسموں کی خانہ پری کی نذر ہو جاتی ہیں، جس میں پیسہ تو پانی کی طرح بہتا ہی ہے، دل و دماغ ہر وقت رسمی قواعد کے بوجھ تلے دبے رہتے ہیں، شادی کے انتظامات کرنے والے تھک کر چور ہو جاتے ہیں پھر بھی کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی شکایت کا سامان پیدا ہو ہی جاتا ہے، جس کے نتیجے میں بعض اوقات لڑائی جھگڑوں تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

زبان سے اس صورت حال کو ہم سب قابل اصلاح سمجھتے ہیں، لیکن جب عمل کی نوبت آتی ہے تو عموماً پرنالہ وہیں گرتا ہے، اور ایک ایک کر کے ہم تمام رسموں کے آگے ہتھیار ڈالتے چلے جاتے ہیں۔

اس صورت حال کا کوئی حل اس کے سوا نہیں ہے کہ اول تو بااثر اور خوش حال لوگ بھی اپنی شادیوں کی تقریبات میں حتی الامکان سادگی اختیار کریں، اور ہمت کر کے ان رسموں کو توڑیں جنہوں نے شادی کو ایک عذاب بنا کر رکھ دیا ہے، دوسرے اگر دولت مند افراد اس طریق کار کو نہیں چھوڑتے تو کم از کم محدود آمدنی والے افراد یہ طے کرلیں کہ وہ دولت مندوں کی حرص میں اپنا پیسہ اور توانائیاں

ضائع کرنے کے بجائے اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلائیں گے، اور اپنی استطاعت کی حدود سے آگے نہیں بڑھیں گے۔

اس سلسلے میں اگر ہم مندرجہ ذیل باتوں کا خاص طور پر اہتمام کرلیں تو امید ہے کہ مذکورہ بالا خرابیوں میں ان شاء اللہ نمایاں کمی واقع ہوگی۔

① خاص نکاح اور ولیمہ کی تقریبات کے علاوہ جو تقریبات منگنی، مہندی، ابٹن اور چوتھی وغیرہ کے نام سے رواج پا گئی ہیں، ان کو یکسر ختم کیا جائے، اور یہ طے کرلیا جائے کہ ہماری شادیوں میں یہ تقریبات نہیں ہوں گی، فریقین اگر واقعی محبت اور خوش دلی سے ایک دوسرے کو کوئی تحفہ دینا یا بھیجنا چاہتے ہیں وہ کسی باقاعدہ تقریب اور لاؤ لشکر کے بغیر سادگی سے پیش کردیں گے۔

② اظہار مسرت کے کسی بھی مخصوص طریقے کو لازمی اور ضروری نہ سمجھا جائے، بلکہ ہر شخص اپنے حالات اور وسائل کے مطابق بے تکلفی سے جو طرز عمل اختیار کرنا چاہے کرلے، نہ وہ خود کسی کی حرص کا شکار یا رسموں کا پابند ہو، نہ دوسرے اسے مطعون کریں۔

③ نکاح اور ولیمے کی تقریبات بھی حتی الامکان سادگی سے اپنے وسائل کی حد میں رہتے ہوئے منعقد کی جائیں، اور صاحب تقریب کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنے خاندانی یا مالی حالات کے مطابق جس کو چاہے دعوت دے، اور جس کو چاہے، دعوت نہ دے، اس معاملے میں بھی کسی کو کوئی سنجیدہ شکایت نہیں ہونی چاہئے۔

④ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہمیشہ ہمارے سامنے رہے:

((اَعْظَمُ النِّكَاحِ بَرَكَةً اَيْسَرُهُ مُؤْنَةً))(۱)

''سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں زیر باری کم سے کم ہو''

یعنی جس میں انسان نہ مالی طور پر زیر بار ہو، اور نہ بیجا مشقت و محنت کے کسی بوجھ میں مبتلا ہو۔

۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ

۱۵ اکتوبر ۱۹۹۵ء

☆☆☆

(۱) مسند أحمد بن حنبل، حديث سيدة عائشة رضى الله عنها، رقم: ۲۳۳۸۸

مہرِ شرعی کی حقیقت ☆

پچھلے دنوں ایک نکاح نامہ میری نظر سے گزرا جس میں ''مہر'' کے خانے میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی ''مبلغ بتیس روپیہ مہر شرعی'' اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ لوگوں سے بات چیت کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ وہ خدا جانے کس وجہ سے بتیس روپے کو مہر شرعی سمجھتے ہیں اور یہ تاثر تو بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے کہ مہر جتنا کم رکھا جائے، شریعت کی نگاہ میں اتنا ہی مستحسن ہے، اس کے علاوہ بھی مہر کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں، جن کا ازالہ ضروری ہے۔

''مہر'' دراصل ایک اعزازیہ (Honorarium) ہے جو ایک شوہر اپنی بیوی کو پیش کرتا ہے، اور اس کا مقصد عورت کا اعزاز و اکرام ہے، نہ تو یہ عورت کی قیمت ہے جسے ادا کر کے یہ سمجھا جائے کہ وہ شوہر کے ہاتھوں بک گئی، اور اب اس کی حیثیت ایک کنیز کی ہے، اور نہ یہ محض ایک فرضی کارروائی ہے جس کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ اسے عملاً ادا کرنے کی ضرورت نہیں، شوہر کے ذمے بیوی کا مہر لازم کرنے سے شریعت کا منشا یہ ہے کہ جب کوئی شخص بیوی کو اپنے گھر میں لائے تو اس کا مناسب اکرام کرے، اور اسے ایک ایسا ہدیہ پیش کرے جو اس کے اعزاز و اکرام کے مناسب ہو، لہٰذا شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ مہر کی رقم نہ تو اتنی کم رکھی جائے جس میں اعزاز و اکرام کا یہ پہلو بالکل مفقود ہو، اور نہ اتنی زیادہ رکھی جائے کہ شوہر اسے ادا کرنے پر قادر نہ ہو، اور بالآخر یا تو مہر ادا کیے بغیر دنیا سے رخصت ہو جائے یا آخر میں بیوی سے معاف کرانے پر مجبور ہو۔

شرعی نقطہ نظر سے ہر عورت کا اصل حق یہ ہے کہ اسے ''مہر مثل'' ادا کیا جائے، ''مہر مثل'' کا مطلب مہر کی وہ مقدار ہے جو اس عورت کے خاندان میں عام طور سے اس جیسی خواتین کے نکاح کے وقت مقرر کی جاتی رہی ہو، اور اگر اس عورت کے خاندان میں دوسری عورتیں نہ ہوں تو خاندان سے باہر اس کے ہم پلہ خواتین کا جو مہر عام طور سے مقرر کیا جاتا ہو، وہ اس عورت کا مہر مثل ہے، اور شرعی اعتبار سے بیوی مہر مثل وصول کرنے کی حق دار ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت باہمی رضامندی سے مہر کا تعین نہ کیا گیا ہو، یا مہر کا ذکر کیے بغیر نکاح کر لیا گیا ہو تو مہر مثل خود بخود لازم سمجھا جاتا ہے، اور شوہر

☆ ذکر و فکر، ص:

کے ذمے شرعاً ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بیوی کو اس کا مہر مثل ادا کرے، البتہ اگر بیوی خود مہر مثل سے کم پر خوش دلی سے راضی ہو جائے یا شوہر خوش دلی سے مہر مثل سے زیادہ مہر مقرر کرلے تو باہمی رضامندی سے مہر مثل سے کم یا زیادہ مہر مقرر کر لینا بھی شرعاً جائز ہے، لیکن یہاں بھی شریعت نے زیادہ سے زیادہ مہر کی تو کوئی حد مقرر نہیں کی، البتہ کم سے کم مہر کی حد مقرر کر دی ہے، اور وہ حد (حنفی موقف کے مطابق) دس درہم ہے، دس درہم کا مطلب دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہے جو آج کل کی قیمتوں کے لحاظ سے دو سو روپے کے لگ بھگ بنتی ہے، اس کم سے کم مقدار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اتنا مہر رکھنا شرعاً پسندیدہ ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سے کم مہر پر اگر خود عورت بھی راضی ہو جائے تو شریعت راضی نہیں ہے، کیونکہ اس سے مہر کا مقصد، یعنی عورت کا اعزاز و اکرام پورا نہیں ہوتا، یہ کم سے کم حد بھی ان لوگوں کا خیال کر کے رکھی گئی ہے جو مالی اعتبار سے کمزور ہیں، اور زیادہ رقم خرچ کرنے کے متحمل نہیں، ان کے لئے یہ گنجائش پیدا کر دی گئی ہے کہ اگر عورت راضی ہو تو کم از کم اس مقدار پر نکاح ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب لینا کسی طرح درست نہیں ہے کہ شریعت کو منظور ہی یہ ہے کہ مہر کی مقدار سو روپے رکھی جائے، اور اسے اس معنی میں مہر شرعی قرار دیا جائے، جن لوگوں نے آج کے دور میں بتیس روپیہ مہر باندھ کر اسے مہر شرعی قرار دیا، انہوں نے دو غلطیاں کیں، ایک غلطی تو یہ کی کہ دس درہم کی قیمت کسی زمانے میں بتیس روپیہ رہی ہوگی، انہوں نے اسے ہمیشہ کے لئے بتیس روپیہ ہی سمجھ لیا، دوسری غلطی یہ کی کہ شریعت نے مہر کی جو کم سے کم مقدار مقرر کی تھی، اس کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ شرعاً پسندیدہ ہی یہ ہے کہ اس سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، حالانکہ یہ تصور قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔

اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر پانچ سو درہم مقرر فرمایا تھا(۱)، جو ۱۳۱ تولہ تین ماشہ چاندی کے برابر ہوتا ہے، اور آج کل کے لحاظ سے اس کی قیمت نو دس ہزار روپیہ کے قریب بنتی ہے، خود آپ ﷺ نے اپنی متعدد ازواجِ مطہرات کا مہر بھی اس کے قریب قریب ہی مقرر فرمایا، جو اوسط درجے کے لحاظ سے ایک قابل لحاظ مقدار ہے۔

بعض حضرات اس مہر فاطمی ہی کو مہر شرعی کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، اور غالباً ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شرعی اعتبار سے اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنا پسندیدہ نہیں، یہ تصور بھی صحیح نہیں ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر فریقین مہر فاطمی کے برابر مہر مقرر کریں اور نیت یہ ہو کہ آنحضرت ﷺ کی مقرر کی ہوئی مقدار بابرکت اور معتدل ہوگی، نیز یہ کہ اس سے اتباع سنت کا اجر

(۱) کنز العمال، رقم: ۳۷۷۴۳ (۶۵۷/۱۳)

ملنے کی توقع ہے، تو یقیناً یہ جذبہ بہت مبارک اور مستحسن ہے، لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہ مقدار اس معنی میں مہر شرعی ہے کہ اس سے کم یا زیادہ مقرر کرنا شرعاً ناپسندیدہ ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، ہاں یہ اصول مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ مہر اتنا ہو جس سے بیوی کا اعزاز و اکرام بھی ہو، اور وہ شوہر کی استطاعت سے باہر بھی نہ ہو، جن بزرگوں نے بہت زیادہ مہر باندھنے سے منع کیا، ان کا مقصد یہی تھا کہ اگر استطاعت سے زیادہ مہر مقرر کرلیا جائے تو وہ محض ایک کاغذی کارروائی ہوکر رہ جاتی ہے، حقیقت میں اسے دینے کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی، اور مہر ادا نہ کرنے کا گناہ شوہر کی گردن پر رہ جاتا ہے، دوسرے بعض اوقات بہت زیادہ مہر مقرر کرنے کے پیچھے دکھاوے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے، اور لوگ محض اپنی شان وشوکت کے اظہار کے لئے غیر معمولی مہر مقرر کرلیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہیں، اس لئے متعدد بزرگوں نے غیر معمولی مہر مقرر کرنے سے منع فرمایا ہے، لیکن اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ یادرکھنے کے لائق ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایک مرتبہ تقریر کے دوران لوگوں سے کہا کہ وہ نکاح میں بہت زیادہ مہر نہ باندھا کریں اس پر ایک خاتون نے اعتراض کیا کہ قرآن کریم نے ایک جگہ مہر کے لئے ''قنطار''(۱) (سونے یا چاندی کا ڈھیر) کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ چاندی کا ڈھیر بھی مہر ہوسکتا ہے، پھر آپ زیادہ مہر مقرر کرنے سے کیوں روکتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خاتون کی بات سن کر فرمایا واقعی خاتون کا استدلال درست ہے اور زیادہ مہر باندھنے سے کلی طور پر منع کرنا درست نہیں۔(۲)

مطلب یہی تھا کہ اگر دکھاوا مقصود نہ ہو، اور ادائیگی کی نیت بھی ہو اور استطاعت بھی، تو زیادہ مہر مقرر کرنا بھی جائز ہے، البتہ ان میں سے کوئی بات مفقود ہو تو ناجائز۔

جب مہر کا ذکر چل نکلا تو ایک اور نکتے کی وضاحت بھی ہو جائے، مہر کی دو قسمیں مشہور ہیں: ''مہر معجّل'' اور ''مہر مؤجل'' یہ الفاظ چونکہ صرف نکاح کی مجلس ہی میں سنائی دیتے ہیں اس لئے بہت سے لوگوں کو ان کا مطلب معلوم نہیں ہوتا، شرعی اعتبار سے ''مہر معجّل'' اس مہر کو کہتے ہیں جو نکاح ہوتے ہی شوہر کے ذمے لازم ہو جاتا ہے، اور یہ اس کا فریضہ ہے کہ یا تو نکاح کے وقت ہی بیوی کو ادا کر دے، یا اس کے بعد جتنی جلد ممکن ہو، عورت کو بھی ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اس کا

---

(۱) اس جملہ میں سورۃ النساء کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ﴿وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا﴾ (النساء: ۲۰) یعنی اور ان میں سے ایک کو ڈھیر سارا مہر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

(۲) المقاصد الحسنة للسخاوی (۱/۱۷۱)، کشف الخفاء (۱/۲۶۹)

مطالبہ کرلے، چونکہ ہمارے معاشرے میں خواتین عام طور سے مطالبہ نہیں کرتیں، اس لئے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی ادائیگی ہمارے لئے ضروری نہیں، بلکہ شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ عورت کے مطالبے کا انتظار کیے بغیر بھی جس قدر جلد ممکن ہو اس فرض سے سبکدوش ہو جائے۔

''مہر مؤجل'' اس مہر کو کہا جاتا ہے جس کی ادائیگی کے لئے فریقین نے آئندہ کی کوئی تاریخ متعین کر لی ہو، جو تاریخ اس طرح متعین کر لی جائے، اس سے پہلے اس کی ادائیگی شوہر کے ذمے لازم نہیں ہوتی، نہ بیوی اس سے پہلے مطالبہ کر سکتی ہے، لہٰذا مہر کے مؤجل ہونے کا اصل مطلب تو یہی ہے کہ اس کی ادائیگی کے لئے کوئی تاریخ نکاح کے وقت ہی مقرر کر لی جائے، لیکن ہمارے معاشرے میں عام طور سے کوئی تاریخ مقرر کیے بغیر صرف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اتنا مہر مؤجل ہے، اور ہمارے معاشرے کے رواج کے مطابق اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مہر کی یہ مقدار اس وقت واجب الاداء ہوگی جب نکاح ختم ہوگا، چنانچہ اگر طلاق ہو جائے تب مہر مؤجل کی ادائیگی لازم ہوگی، یا میاں بیوی میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تب اس کی ادائیگی لازم سمجھی جاتی ہے۔

ایک اور نکتہ یہ قابل ذکر ہے کہ ہمارے معاشرے میں شوہر کی طرف سے دلہن کو جو زیور چڑھایا جاتا ہے اس کا بذات خود مہر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ہمارے معاشرے کے رواج کے مطابق یہ زیور دلہن کی ملکیت نہیں ہوتا، بلکہ اسے عارضی استعمال کے لئے دیا جاتا ہے، چنانچہ بیوی اسے شوہر کی اجازت کے بغیر نہ فروخت کر سکتی ہے نہ کسی کو تحفے میں دے سکتی ہے، نہ کسی اور کام میں لگا سکتی ہے نیز یہی وجہ ہے کہ اگر خدانخواستہ طلاق کی نوبت آ جائے تو شوہر یہ زیور واپس لے لیتا ہے، لہٰذا اس زیور سے مہر ادا نہیں ہوتا، ہاں اگر شوہر بیوی سے صراحۃً یہ کہہ دے کہ یہ زیور میں نے بطور مہر تمہاری ملکیت میں دے دیا، تو پھر اسے مہر میں شمار کر سکتے ہیں، اس صورت میں بیوی اس زیور کی مالک بن کر اس میں ہر طرح کا تصرف کر سکتی ہے، اور اسے کسی بھی حالت میں اس سے واپس نہیں لیا جا سکتا۔

بہرصورت! یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ مہر کا تعین محض ایک فرضی یا رسمی کارروائی نہیں ہے، جو سوچے سمجھے بغیر کر لی جائے، بلکہ یہ ایک دینی فریضہ ہے جو پوری سنجیدگی کا متقاضی ہے، یہ ایک معاملے کی بات ہے، شرعاً اس کے تمام پہلو صاف اور واضح ہونے چاہئیں، اور اس کی معاملے کے مطابق ادائیگی کی فکر کرنی چاہئے، یہ بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ اس حق کی ادائیگی سے ساری عمر بے فکر رہنے کے بعد بستر مرگ پر بیوی سے اس کی معافی حاصل کر لی جائے، جب ماحول کے جبر سے اس کے پاس معاف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

۱۸ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ/۱۲ نومبر ۱۹۹۵ء

کچھ جہیز کے بارے میں ☆

چند سال پہلے شام کے ایک بزرگ شیخ عبدالفتاح ہمارے یہاں تشریف لائے ہوئے تھے، اتفاق سے ایک مقامی دوست بھی اسی وقت آ گئے، اور جب انہوں نے ایک عرب بزرگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو ان سے دُعا کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ میری دو بیٹیاں شادی کے لائق ہیں دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ان کی شادی کے اسباب پیدا فرما دے۔ شیخ نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کے لئے کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ رشتہ تو دونوں کا ہو چکا ہے، لیکن میرے پاس اتنے مالی وسائل نہیں ہیں کہ ان کی شادی کر سکوں، شیخ نے یہ سن کر انتہائی حیرت سے پوچھا وہ آپ کی لڑکیاں ہیں یا لڑکے ہیں؟ کہنے لگے کہ لڑکیاں ہیں، شیخ نے سراپا تعجب بن کر کہا لڑکیوں کی شادی کے لئے مالی وسائل کی کیا ضرورت ہے؟ انہوں نے کہا کہ میرے پاس انہیں جہیز میں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے، شیخ نے پوچھا جہیز کیا ہوتا ہے؟ اس پر حاضرین مجلس نے انہیں بتایا کہ ہمارے ملک میں یہ رواج ہے کہ باپ شادی کے وقت اپنی بیٹی کو زیورات، کپڑے، گھر کا اثاثہ اور بہت سا ساز و سامان دیتا ہے اسے جہیز کہتے ہیں، اور جہیز دینا باپ کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے، جس کے بغیر لڑکی کی شادی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اور لڑکی کے سسرال والے بھی اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ شیخ نے یہ تفصیل سنی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے، اور کہنے لگے کہ کیا بیٹی کی شادی کرنا کوئی جرم ہے جس کی یہ سزا باپ کو دی جائے؟ پھر انہوں نے بتایا کہ ہمارے ملک میں اس قسم کی کوئی رسم نہیں ہے، اکثر جگہوں پر تو یہ لڑکے کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے کہ اپنے گھر میں دلہن کو لانے سے پہلے گھر کا اثاثہ اور دلہن کی ضروریات فراہم کر کے رکھے، لڑکی کے باپ کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا، اور بعض جگہوں پر رواج یہ ہے کہ لڑکی کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے سامان تو باپ ہی خریدتا ہے، لیکن اس کی قیمت لڑکا ادا کرتا ہے، البتہ باپ اپنی بیٹی کو رخصتی کے وقت کوئی مختصر تحفہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے، لیکن وہ بھی کچھ ایسا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

اس واقعے سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ ہمارے معاشرے میں جہیز کو جس طرح بیٹی کی

☆ ذکر و فکر، ص: ۲۸۲

شادی کا ایک ناگزیر حصہ قرار دے دیا گیا ہے، اس کے بارے میں عالم اسلام کے دوسرے علاقوں کا کیا نقطہ نظر ہے؟

جیسا کہ شیخ کے حوالے سے پیچھے بیان کیا گیا، شرعی اعتبار سے بھی جہیز کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگر کوئی باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اسے کوئی تحفہ اپنی استطاعت کے مطابق دینا چاہے تو دے دے، اور ظاہر ہے کہ تحفہ دیتے وقت لڑکی کی آئندہ ضروریات کو مدنظر رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے، لیکن نہ وہ شادی کے لئے کوئی لازمی شرط ہے، نہ سسرال والوں کو کوئی حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کا مطالبہ کریں، اور اگر کسی لڑکی کو جہیز نہ دیا جائے یا کم دیا جائے تو اس پر برا منائیں یا لڑکی کو مطعون کریں، نہ یہ کوئی دکھاوے کی چیز ہے کہ شادی کے موقع پر اس کی نمائش کر کے اپنی شان و شوکت کا اظہار کیا جائے، اس سلسلے میں ہمارے معاشرے میں جو غلط تصورات پھیلے ہوئے ہیں وہ مختصراً درج ذیل ہیں:

① جہیز کو لڑکی کی شادی کے لئے ایک لازمی شرط سمجھا جاتا ہے، چنانچہ جب تک جہیز دینے کے لئے پیسے نہ ہوں، لڑکی کی شادی نہیں کی جاتی، ہمارے معاشرے میں نہ جانے کتنی لڑکیاں اسی وجہ سے بن بیاہی رہتی ہیں کہ باپ کے پاس انہیں دینے کے لئے جہیز نہیں ہوتا، اور جب شادی سر پر آ ہی جائے تو جہیز کی شرط پوری کرنے کے لئے باپ کو بعض اوقات روپیہ حاصل کرنے کے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پڑتے ہیں، اور وہ رشوت، جعل سازی، دھوکہ فریب اور خیانت جیسے جرائم کے ارتکاب پر آمادہ ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی باپ اتنا باضمیر ہے کہ ان ناجائز ذرائع کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تو کم از کم اپنے آپ کو قرض ادھار کے شکنجے میں جکڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔

② جہیز کی مقدار اور اس کے لئے لازمی اشیاء کی فہرست میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اب جہیز محض ایک بیٹی کے لئے باپ کا تحفہ نہیں ہے جو وہ اپنی خوش دلی سے اپنی استطاعت کی حد میں رہ کر دے، بلکہ معاشرے کا ایک جبر ہے، چنانچہ اس میں صرف بیٹی کی ضروریات ہی داخل نہیں، بلکہ اس کے شوہر کی ضروریات پوری کرنا اور اس کے گھر کو مزین کرنا بھی ایک لازمی حصہ ہے، خواہ لڑکی کے باپ کا دل چاہے یا نہ چاہے، اسے یہ تمام لوازم پورے کرنے پڑتے ہیں۔

③ بات صرف اتنی نہیں ہے کہ لڑکی کی ضروریات پوری کر کے اس کا دل خوش کیا جائے، بلکہ جہیز کی نمائش کی رسم نے یہ بھی ضروری قرار دے دیا ہے کہ جہیز ایسا ہو جو ہر دیکھنے والے کو خوش

کر سکے، اور ان کی تعریف حاصل کر سکے۔

(۴) جہیز کے سلسلے میں سب سے گھٹیا بات یہ ہے کہ لڑکی کا شوہر یا اس کی سسرال کے لوگ جہیز پر نظر رکھتے ہیں، بعض جگہ تو شاندار جہیز کا مطالبہ پوری ڈھٹائی سے کیا جاتا ہے، اور بعض جگہ اگر صریح مطالبہ نہ ہو، تب بھی توقعات یہ باندھی جاتی ہیں کہ دلہن اچھا سا جہیز لے کر آئے گی، اور اگر یہ توقعات پوری نہ ہوں تو لڑکی کو طعنے دے دے کر اس کے ناک میں دم کر دیا جاتا ہے۔

جہیز کے ساتھ اس قسم کی جو رسمیں اور تصورات نتھی کر دیئے گئے ہیں اور ان کی وجہ سے جو معاشرتی خرابیاں جنم لیتی رہی ہیں، ان کا احساس ہمارے معاشرے کے اہل فکر میں مفقود نہیں، اس موضوع پر بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے، بعض تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں، بلکہ سرکاری سطح پر بعض قوانین بھی بنائے گئے ہیں، اور ان کوششوں کا یہ اثر بحمد اللہ ضرور ہوا ہے کہ اب جہیز کے بارے میں لوگوں کے بہت سے تصورات میں تبدیلی آئی ہے، جہیز کی نمائش کا سلسلہ کم ہوا ہے، بین الممالک شادیوں میں جہیز کی پابندی حالات کے جبر نے ترک کرادی، لیکن ابھی تک معاشرے کے ایک بڑے حصے میں ان غلط تصورات کی حکمرانی ختم نہیں ہوئی۔

بعض حضرات یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ جہیز کو قانوناً بالکل ممنوع قرار دے دیا جائے، لیکن دراصل یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے اور اس قسم کے مسائل صرف قانون کی جکڑ بندی سے حل نہیں ہوتے، اور نہ ایسے قوانین پر عمل کرنا ممکن ہوتا ہے، اس کے لئے تعلیم و تربیت اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک مناسب ذہنی فضا تیار کرنی ضروری ہے، بذاتِ خود اس بات میں کوئی شرعی یا اخلاقی خرابی بھی نہیں ہے، کہ ایک باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اپنے دل کے تقاضے سے اسے ایسی چیزوں کا تحفہ پیش کرے جو اس کے لئے آئندہ زندگی میں کارآمد ہوں، خود حضور اقدس ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سادگی کے ساتھ کچھ جہیز عطا فرمایا تھا، شرعی اعتبار سے اس قسم کے جہیز کے لئے کوئی مقدار بھی مقرر نہیں ہے، اگر دوسرے مفاسد نہ ہوں تو باپ اپنے دلی تقاضے کے تحت جو کچھ دینا چاہے دے سکتا ہے، لیکن خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ اول تو اسے نمود و نمائش کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، اور دوسرے لڑکے والے عملاً اسے اپنا حق سمجھتے ہیں، زیادہ سے زیادہ جہیز کی امیدیں باندھتے ہیں، اور انتہائی گھٹیا بات یہ ہے کہ اس کی کمی کی وجہ سے لڑکی اور اس کے گھر والوں کو مطعون کرتے ہیں، جہیز کی ان خرابیوں کو ختم کرنے کے لئے معاشرے کے تمام طبقات کو ان تصورات کے خلاف جہاد کرنا پڑے گا، تعلیم و تربیت، ذرائع ابلاغ اور وعظ و نصیحت کے ذریعے ان تصورات کی

قباحتیں مختلف انداز و اسلوب سے متواتر بیان کرنے اور کرتے رہنے کی ضرورت ہے، یہاں تک کہ یہ گھٹیا باتیں ہر کس و ناکس کی نظر میں ایک ایسا عیب بن جائیں جس کی اپنی طرف نسبت سے لوگ شرمانے لگیں، کسی بھی معاشرے میں پھیلے ہوئے غلط تصورات یا بری عادتیں اسی طرح رفتہ رفتہ دور ہوتی ہیں کہ اس معاشرے کے اہل اقتدار، اہل علم و دانش اور دوسرے بارسوخ طبقے مل جل کر ایک ذہنی فضا تیار کرتے ہیں، یہ ذہنی فضا رفتہ رفتہ فروغ پاتی ہے، اور لوگوں کی تربیت کرتی ہے، لیکن اس کے لئے دردمند دل اور انتھک جدوجہد درکار ہے، افسوس ہے کہ ہمارے ان طبقوں کے بیشتر افراد کچھ ایسے مسائل میں الجھ گئے ہیں کہ معاشرے کی اصلاح و تربیت کا کام، جو کسی بھی قوم کی تعمیر کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، کسی شمار وقطار میں نظر نہیں آتا، ذہنی تربیت اور کردار سازی کا کام سیاست اور فرقہ واریت کی ہاؤہو میں ایسا گم ہوا ہے کہ اب اس کا نام بھی ایک مذاق معلوم ہونے لگا ہے، لیکن اس صورت حال میں مایوس ہو کر بیٹھ جانا بھی درست نہیں ایک داعی حق کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی بات کہنے سے نہ اکتائے، اپنے دائرے کی حد تک کام کرنے سے نہ تھکے۔ بالآخر ایک وقت آتا ہے جب حق وصداقت کی کشش دوسروں کو بھی اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیتی ہے، اور قوموں کی نہ صرف سوچ میں بلکہ عمل میں بھی انقلاب آجاتا ہے۔

۲۵ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ

۱۹ نومبر ۱۹۹۵ء

☆☆☆

شادی کی دعوت اور بارات ☆

میں پچھلے مضمون میں جہیز کے بارے میں کچھ گذارشات لکھ چکا تھا، بعد میں ایسٹن برسٹل (برطانیہ) سے ایک صاحب کا خط مجھے موصول ہوا جس میں وہ لکھتے ہیں:

''میں آپ کی توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف دلانا چاہتا ہوں جس کی ابتداء کا زمانہ متعین کرنا تو ایک تاریخ داں کا کام ہے، مگر اس کی برائی ہر شخص کے سامنے ہے، وہ ہے جہیز، جہیز کی رسم چونکہ ہندو پاک میں بسنے والے مسلمانوں میں اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ جاری ہے، اس لئے جو مسلمان وہاں سے نقل مکانی کر کے مغرب آئے تو وہ یہ رسم بھی اپنے ساتھ لائے، چنانچہ اب یہ رسم مغرب میں بھی پھیل گئی ہے، آپ سے گذارش ہے کہ ایک تو آپ اس کی شرعی حیثیت بیان فرمائیں، تاکہ یورپ میں مسلمانوں کی نئی نسل اس سے آگاہ ہو سکے، اور شاید ان ہزاروں غریب لڑکیوں کی قسمت پر بھی اس کا کچھ اثر پڑے جو صرف جہیز نہ ہونے کی بنا پر دلہن نہیں بن سکتیں، کیا جہیز ضروری ہے؟ اگر ہے تو اس کی مقدار کیا ہے؟ کیا جہیز دینے کے بعد ماں باپ کو اپنی وراثت سے حصہ دینا ضروری نہیں رہتا؟ عموماً عورتیں اپنے حق وراثت سے اس لئے دست بردار ہو جاتی ہیں کہ ان کو جہیز مل گیا ہے، اور غمی خوشی میں ان کی ماں باپ کی طرف سے مدد متوقع ہوتی ہے، اوران کی شادی پر بھی خاصا خرچ ہو چکا ہوتا ہے، مگر یہ ساری باتیں تو لڑکے پر بھی صادق آتی ہیں، پھر وہ وراثت کا کیونکر حقدار ہوگا؟

دوسرے لڑکی کے والدین برات کو جو کھانا کھلاتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ عرب ممالک میں لڑکی کے والدین جو خرچ کرتے ہیں اس کی ادائیگی دولہا کرتا ہے، مگر ہمارے یہاں یہ تمام اخراجات والدین پر ہی کیوں ڈالے جاتے ہیں؟

تیسرے بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ لڑکی کا باپ دولہا سے شادی کے اخراجات کے علاوہ بھی کچھ رقم کا تقاضا کرتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

☆ ذکر وفکر، ص: ۲۸۷

بلاشبہ آپ کی کتابوں سے ان گنت لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں لیکن ''جنگ'' میں آپ نے مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، وہ مختصر اور عام فہم ہونے کی وجہ سے زیادہ مؤثر ہے، اگر آپ میرے مذکورہ سوالات کی وضاحت ''جنگ'' ہی کے صفحات میں فرمادیں تو امید ہے کہ اس سے بہت سے لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا'' عبدالمجید ایسٹن برسٹل برطانیہ

مکتوب نگار کے بعض سوالات کا جواب تو میرے پچھلے مضمون میں آچکا ہے، مثلاً یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ جہیز ہرگز نکاح کا کوئی ضروری حصہ نہیں ہے، اور اس کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں لڑکی کو نکاح کے بغیر بٹھائے رکھنا ہرگز جائز نہیں، کوئی باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اپنی استطاعت کی حدود میں رہتے ہوئے خوشی سے بیٹی کو کوئی تحفہ دینا چاہے تو وہ بے شک دے سکتا ہے، لیکن نہ اس کو نکاح کی لازمی شرط سمجھنے کی گنجائش ہے، نہ اس میں نام ونمود کا کوئی پہلو ہونا چاہئے، اور نہ شوہر یا اس کے گھر والوں کے لئے جائز ہے کہ وہ جہیز کا مطالبہ کریں، یا اس کی توقعات باندھیں۔

اب مکتوب نگار نے جو نئی بات ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ ''کیا جہیز دینے کے بعد ماں باپ کو اپنی وراثت سے حصہ دینا ضروری نہیں رہتا؟'' واقعی یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں خاصی عام ہے، اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جہیز کا وراثت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے، اگر کسی باپ نے اپنی بیٹی پر جہیز کی صورت میں اپنی ساری کائنات بھی لٹا دی ہو، تب بھی لڑکی کا حق وراثت ختم نہیں ہوتا، باپ کے انتقال کے بعد وہ اپنے باپ کے ترکے میں ضرور حصہ دار ہوگی، اور اس کے بھائیوں کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ سارا ترکہ خود لے بیٹھیں، اور اپنی بہن کو اس بنیاد پر محروم کردیں کہ اسے جہیز میں بہت کچھ مل چکا ہے، لڑکا ہو یا لڑکی، ان کے باپ نے اپنی زندگی میں انہیں جو کچھ دیا ہو، اس سے ان کے وراثت کے حصے میں کوئی کمی نہیں آتی، البتہ باپ کو حتی الامکان اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اپنی زندگی میں وہ اپنی اولاد کو جو کچھ دے، وہ قریب قریب برابر ہو، اور کسی ایک لڑکے یا لڑکی پر دولت کی بارش برسا کر دوسروں کو محروم نہ کرے۔ لیکن یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کی تفصیل ان شاء اللہ کسی اور موقع پر عرض کروں گا، بہرحال! یہ بات طے شدہ ہے، اور اس میں شرعی اعتبار سے کوئی ادنی شبہ نہیں کہ لڑکی کو جہیز دینے سے اس کا حق وراثت ختم نہیں ہوتا، بلکہ جہیز میں دی ہوئی مالیت کو اس کے حصہ وراثت سے منہا بھی نہیں کیا جا سکتا، اسے بہرصورت ترکے سے اپنا پورا حصہ ملنا ضروری ہے۔

مکتوب نگار نے دوسرا مسئلہ یہ اٹھایا ہے کہ ''لڑکی کے والدین برات کو جو کھانا کھلاتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟'' اس معاملے میں بھی ہمارے معاشرے میں افراط وتفریط پر مبنی تصورات

پھیلے ہوئے ہیں، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح لڑکے کے لئے نکاح کے بعد ولیمہ کرنا سنت ہے، اسی طرح لڑکی کے باپ کے لئے بھی نکاح کے وقت دعوت کرنا سنت یا کم از کم شرعی طور پر پسندیدہ ہے، حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے،لڑکی والوں کی طرف سے کسی دعوت کا اہتمام نہ سنت ہے، نہ مستحب، بلکہ اگر دوسری خرابیاں نہ ہوں تو صرف جائز ہے، یہی معاملہ بارات کا ہے، نکاح کے وقت دولہا کی طرف سے بارات لے جانا کوئی سنت نہیں، نہ نکاح کو شریعت نے اس پر موقوف کیا ہے، لیکن اگر دوسری خرابیاں نہ ہوں تو بارات لے جانا کوئی گناہ بھی نہیں، لہٰذا بعض حضرات جو بارات لے جانے اورلڑکی والوں کی طرف سے ان کی دعوت کو ایسا گناہ سمجھتے ہیں جیسے قرآن وسنت نے اس سے خاص طور پر منع کیا ہو، ان کا یہ تشدد بھی مناسب نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر اعتدال کے ساتھ کچھ لوگ نکاح کے موقع پرلڑکی کے گھر چلے جائیں، (جس میں لڑکی کے باپ پر کوئی بار نہ ہو) اور لڑکی کے والدین اپنی بچی کے نکاح کے فریضے سے سبکدوش ہونے کی خوشی میں اپنی دلی خواہش سے ان کی اور اپنے دوسرے عزیزوں دوستوں کی دعوت کردیں تو اس میں بذاتِ خود کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن ان تمام چیزوں میں خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ ان تقریبات کو نکاح کا لازمی حصہ سمجھ لیا جاتا ہے، اور جو شخص انہیں انجام دینے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، وہ خواہی نخواہی ان پر مجبور ہوتا ہے، اوراس غرض کے لئے بعض اوقات ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے، اور بعض اوقات قرض ادھار کا بوجھ اپنے سر لیتا ہے، اور اگر کوئی شخص اپنے مالی حالات کی وجہ سے یہ کام نہ کرے تو اسے معاشرے میں مطعون کیا جاتا ہے۔

کسی شخص کو کوئی ہدیہ تحفہ دینا یا اس کی دعوت کرنا اگر دل کے تقاضے اور محبت سے ہو تو نہ صرف یہ کہ کوئی گناہ نہیں، بلکہ باعث برکت ہے، بالخصوص جب نئے رشتے قائم ہو رہے ہوں تو ایسا کرنے سے باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ سب کچھ خلوص سے ہو، اور اپنی استطاعت کی حدود میں رہ کر ہو، لیکن جب یہ چیز نام ونمود اور دکھاوے کا ذریعہ بن جائے یا اس میں بدلے کی طلب شامل ہو جائے، یا یہ کام خوش دلی کے بجائے معاشرے اور ماحول کے جبر کے تحت انجام دیئے جائیں، یعنی اندر سے دل نہ چاہ رہا ہو، لیکن ناک کٹنے کے خوف سے زبردستی تحفے دیئے جائیں یا دعوتیں کی جائیں تو یہی کام جو باعث برکت ہو سکتے تھے الٹے گناہ، بے برکتی اور نحوست کا سبب بن جاتے ہیں، اوران کی وجہ سے معاشرہ طرح طرح کی اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، ہماری شامت اعمال یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو خود ساختہ رسموں میں جکڑ کر اچھے کاموں کو بھی اپنے لئے ایک عذاب بنا لیا ہے، اگر یہی کام سادگی بیساختگی اور بے تکلفی سے کیے جائیں تو ان میں کوئی خرابی نہیں، لیکن اگر رسموں کی پابندی، نام ونمود اور معاشرتی جبر کے تحت انجام دیئے جائیں تو یہ بہت بڑی برائی ہے۔

لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ اگر کسی لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کے نکاح کے وقت اپنی خوش دلی سے اس کی سسرال کے لوگوں کو، یا اپنے اعزہ اور احباب کو جمع کر کے ان کی دعوت کر دیتا ہے اور اسے نکاح کا لازمی حصہ یا سنت نہیں سمجھتا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو اس میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس کی شکایت کی جائے یا جس کی وجہ سے اسے مطعون کیا جائے، بلکہ اس کا عمل سادگی کی سنت سے زیادہ قریب ہے، اس لئے اس کی تعریف کرنی چاہئے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ بعض لوگ اپنی اولاد کے امتحان میں کامیاب ہونے پر یا انہیں اچھی ملازمت ملنے پر خوشی کے اظہار کے لئے اپنے خاص خاص ملنے والوں کی دعوت کر دیتے ہیں، اس دعوت میں ہرگز کوئی حرج نہیں، دوسری طرف بہت سے لوگوں کے بچے امتحان میں پاس ہوتے رہتے ہیں، یا انہیں اچھی ملازمتیں ملتی رہتی ہیں لیکن وہ اس خوشی میں کوئی دعوت نہیں کرتے، ان لوگوں پر بھی معاشرے کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا، نہ انہیں اس بنا پر مطعون کیا جاتا ہے کہ انہوں نے دعوت کیوں نہیں کی؟ اگر یہی طرزِ عمل نکاح کی دعوت میں بھی اختیار کر لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ یعنی جس کا دل چاہے دعوت کرے اور جس کا دل نہ چاہے، نہ کرے، لیکن خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ نکاح میں اگر کوئی دعوت نہ کرے تو سسرال والوں کی طرف سے باقاعدہ مطالبہ ہوتا ہے، اور یوں سمجھا جاتا ہے جیسے شادی ہوئی ہی نہیں، جن بزرگوں نے بارات لے جانے اور اس کی دعوت کے اہتمام سے روکا درحقیقت ان کے پیش نظر یہی خرابیاں تھیں، انہوں نے اس بات کی ترغیب دی کہ کم از کم کچھ بارسوخ افراد ان دعوتوں کے بغیر نکاح کریں گے تو ان لوگوں کو حوصلہ ہوگا جو ان کی استطاعت نہیں رکھتے، اور صرف معاشرے کی مجبوری سے انہیں یہ کام کرنے پڑتے ہیں۔

مکتوب نگار نے آخری بات یہ پوچھی ہے کہ بعض علاقوں میں لڑکی کا باپ دولہا سے نکاح کے اخراجات کے علاوہ مزید کچھ رقم کا بھی مطالبہ کرتا ہے، اور اس کے بغیر اسے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے پر تیار نہیں ہوتا، بے شک یہ بے بنیاد رسم بھی ہمارے معاشرے کے بعض حصوں میں خاصی رائج ہے، اور یہ شرعی اعتبار سے بالکل ناجائز رسم ہے، اپنی لڑکی کا رشتہ دینے کے لئے دولہا سے رقم لینے کو ہمارے فقہاء کرام رحمہم اللہ نے رشوت قرار دیا ہے، اور اس کا گناہ رشوت لینے کے گناہ کے برابر ہے، بلکہ اس میں ایک پہلو بے غیرتی کا بھی ہے، اور یہ عمل اپنی لڑکی کو فروخت کرنے کے مشابہ ہے، اور بعض جگہ جہاں یہ رسم پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے شوہر اس کے ساتھ زرخرید کنیز جیسا سلوک کرتا ہے، لہٰذا یہ رسم شرعی اور اخلاقی لحاظ سے انتہائی غلط رسم ہے جو واجب الترک ہے۔

۳ رجب ۱۴۱۶ھ / ۲۶ نومبر ۱۹۹۵ء

نکاح اور ولیمہ...... چند سوالات کا جواب ☆

میں نے پچھلے مضامین میں شادی بیان اور اس کے رسم ورواج کے بعض پہلو پر کچھ گذارشات پیش کیں تو میرے پاس قارئین کی طرف سے سوالات اور تجاویز کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا، جن سے ایک تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ شادی بیاہ میں ہونے والی فضول رسموں سے کتنے پریشان ہیں اور ان کا کوئی حل چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شادی بیاہ کے بارے میں دینی معلومات سے ناواقفیت کتنی عام ہوگئی ہے کہ وہ معمولی باتیں جو مسلمان گھرانے کے ہر فرد کو معلوم ہوا کرتی تھیں اب اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم نہیں ہیں، اور ان کی جگہ بہت سے بے بنیاد اور غلط مفروضوں نے لے لی ہے، تیسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان مسائل کی صحیح شرعی حیثیت جاننا چاہتے ہیں۔

ان میں سے بعض سوالات تو ایسے تھے کہ میں نے انہیں شائع کرنے کے بجائے ان کا انفرادی جواب دینا زیادہ مناسب سمجھا، لیکن ان میں سے بعض باتیں ایسی ہیں کہ ان کی وضاحت ان کالموں میں مناسب معلوم ہوتی ہیں تا کہ وہ وسیع پیمانے پر پڑھی جاسکیں۔ تاہم ہر خط کو اس کے الفاظ میں نقل کرنے کے بجائے مجموعی مضمون کے ذیل میں انشاء اللہ مطلوبہ سوالات کا جواب عرض کردوں گا۔

شادی کی تقریبات میں ''ولیمہ'' ایک ایسی تقریب ہے جو باقاعدہ سنت ہے، اور آنحضرت ﷺ نے اس کی صراحۃً ترغیب دی ہے، لیکن اول تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ دعوت کوئی فرض یا واجب نہیں جس کے چھوڑنے سے نکاح پر کوئی اثر پڑتا ہو، ہاں یہ سنت ہے اور حتی الامکان اس پر ضرور عمل کرنا چاہئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس سنت کی ادائیگی کے لئے شرعاً نہ مہمانوں کی کوئی تعداد مقرر ہے نہ کھانے کا کوئی معیار، بلکہ ہر شخص اپنی استطاعت کی حد میں رہتے ہوئے جس پیمانے پہ چاہے ولیمہ کر سکتا ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک ولیمہ ایسا کیا جس میں صرف دو سیر جو خرچ ہوئے، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر ولیمہ سفر میں ہوا، اور اس طرح ہوا کہ دستر خوان بچھا دیا گیا اور اس پر کچھ کھجوریں، کچھ پنیر اور کچھ گھی رکھ دیا گیا(۱) بس ولیمہ ہوگیا، البتہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا

☆ ذکر وفکر، ص: ۲۹۳

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأطعمة، باب الخبز المرقق والأكل على الخوان والسفرة، رقم: ٤٩٦٨

کے نکاح کے موقع پر روٹی اور بکری کے گوشت سے دعوت کی گئی۔(۱)

لہٰذا ولیمہ کے بارے میں یہ سمجھنا درست نہیں کہ اس میں مہمانوں کی کوئی بڑی تعداد ضروری ہے، یا کوئی اعلیٰ درجے کا کھانا ضرور ہونا چاہئے، اور اگر کسی شخص کے پاس خود گنجائش نہ ہو تو وہ قرض ادھار کر کے ان چیزوں کا اہتمام کرے، بلکہ شرعی اعتبار سے مطلوب یہی ہے کہ جس شخص کے پاس خود اپنے وسائل کم ہوں، وہ اپنی استطاعت کے مطابق اختصار سے کام لے، ہاں اگر استطاعت ہو تو زیادہ مہمان مدعو کرنے اور اچھے کھانے کا اہتمام کرنے میں بھی کچھ حرج نہیں، بشرطیکہ مقصد نام ونمود اور دکھاوا نہ ہو۔

ان حدود میں رہتے ہوئے ولیمہ بیشک مسنون ہے، اور اس لحاظ سے کارِ ثواب بھی، لہٰذا اس کے تقدس کو طرح طرح کے گناہوں سے مجروح کرنا اس کی ناقدری، بلکہ توہین کے مترادف ہے، محض شان وشوکت کے اظہار اور نام ونمود کے اقدامات، تقریب کی مصروفیات میں نمازوں کا ضیاع، بے محابا مردوں عورتوں کا بے حجاب میل جول ان کی فلم بندی، اور اس قسم کے دوسرے منکرات اس تقریب کی برکتوں پر پانی پھیر دیتے ہیں جن سے اس بابرکت تقریب کو بچانا چاہئے۔

ولیمہ کے بارے میں ایک اور غلط فہمی خاصی پھیلی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ پریشان رہتے ہیں، ایک صاحب نے خاص طور پر اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے اس نکتے کی وضاحت چاہی ہے وہ غلط فہمی یہ ہے کہ اگر دولہا دلہن کے درمیان تعلقات زن وشو قائم نہ ہو پائے ہوں تو ولیمہ صحیح نہیں ہوتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ولیمہ نکاح کے وقت سے لے کر رخصتی کے بعد تک کسی بھی وقت ہوسکتا ہے، البتہ مستحب یہ ہے کہ رخصتی کے بعد ہو، اور رخصتی کا مطلب رخصتی ہی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، یعنی یہ کہ دلہن دولہا کے گھر آ جائے اور دونوں کی تنہائی میں ملاقات ہو جائے، اور بس۔ لہٰذا اگر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان تعلق زن وشو قائم نہ ہوا ہو تو اس سے ولیمے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نہ ولیمہ ناجائز ہوتا ہے، نہ نفلی قرار پاتا ہے، اور نہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اس طرح ولیمہ کی سنت ادا نہیں ہوتی، بلکہ اگر ولیمہ رخصتی ہی سے پہلے منعقد کر لیا جائے تب بھی ولیمہ ادا ہو جاتا ہے، صرف اس کا مستحب وقت حاصل نہیں ہوتا، (یہاں دلائل کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، جو حضرات دلائل سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی فتح الباری میں صفحہ ۲۳۱ ج ۹ پر باب الولیمہ کے تحت حدیث نمبر ۵۱۶۶ کی تشریحات ملاحظہ فرمالیں)۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الولیمة بشاة، رقم: ٤٧٧٠

ایک صاحب نے ایک اور سوال کیا ہے اور وہ یہ کہ نکاح کے وقت جب لڑکی کے گھر والے لڑکی سے ایجاب وقبول کراتے ہیں تو کیا لڑکی کا اپنی زبان سے منظوری کا اظہار کرنا ضروری ہے یا نکاح نامے پر دستخط کر دینا کافی ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہمارے یہاں شادیاں عموماً اس طرح ہوتی ہیں کہ دلہن خود نکاح کی محفل میں موجود نہیں ہوتی، بلکہ دلہن کے گھر والوں میں سے کوئی نکاح سے پہلے اس سے اجازت لیتا ہے، جو دلہن کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے، اور نکاح نامے میں بھی اس کا نام وکیل کے خانے میں درج ہوتا ہے، جب یہ وکیل لڑکی سے اجازت لینے جاتا ہے تو یہ نکاح کا ایجاب وقبول نہیں ہوتا، بلکہ محض لڑکی سے نکاح کی اجازت لی جاتی ہے، اس میں اجازت لینے والے کو لڑکی سے یہ کہنا چاہئے کہ میں تمہارا نکاح فلاں ولد فلاں سے اتنے مہر پر کرنا چاہتا ہوں، کیا تمہیں یہ منظور ہے؟ اگر لڑکی کنواری ہے تو اس کا زبان سے منظور ہے کہنا ضروری نہیں بلکہ اتنا بھی کافی ہے کہ وہ انکار نہ کرے، البتہ زبان سے منظوری کا اظہار کر دے تو اور اچھا ہے، اور اگر صرف نکاح نامے پر دستخط کر دے تو بھی اجازت ہو جاتی ہے، البتہ اگر کوئی عورت پہلے شادی شدہ رہ چکی ہے اور اب یہ اس کی دوسری شادی ہے تو اس کا زبان سے منظوری کا اظہار ضروری ہے بصورت دیگر اسے منظوری نہیں سمجھا جائے گا۔

جب لڑکی سے اس طرح اجازت لے لی جائے تو جس شخص نے اجازت لی ہے وہ بحیثیت وکیل نکاح کرنے کا اختیار نکاح خواں کو دے دیتا ہے، اور پھر نکاح خواں جو الفاظ دولہا سے کہتا ہے وہ نکاح کا ایجاب ہے، اور دولہا جو جواب دیتا ہے قبول اور ان دونوں کلمات سے نکاح کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

۱۱ رجب ۱۴۱۶ھ/ ۴ دسمبر ۱۹۹۵ء

☆☆☆

طلاق کا صحیح طریقہ ☆

میرا مختلف حیثیتوں میں عام مسلمانوں کے خاندانی، بالخصوص ازدواجی تنازعات سے کافی واسطہ رہا ہے، اور یہ دیکھ دیکھ کر دکھ ہوتا رہا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ جو سامنے کی باتیں پہلے بچے بچے کو معلوم ہوتی تھیں، اب بڑوں بڑوں کو بھی معلوم نہیں ہوتیں، اسی لئے چند ماہ پہلے میں نے اس کالم میں شادی بیاہ کے مسائل اور اس سے متعلق بنیادی شرعی احکام کی وضاحت شروع کی تھی، جو مختلف عنوانات کے تحت کئی ہفتے جاری رہی، جب نکاح کا ذکر چھڑا تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''طلاق'' کے بارے میں کچھ گذارشات پیش کر دی جائیں، کیونکہ طلاق کے بالکل ابتدائی احکام سے بھی عام لوگ ناواقف ہو چکے ہیں، اور اس بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں عام ہو چکی ہیں۔

سب سے پہلی غلطی تو یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے طلاق کو غصہ نکالنے کا ایک ذریعہ سمجھا ہوا ہے، جہاں میاں بیوی میں کوئی اختلاف پیش آیا، اور نوبت غصے اور اشتعال تک پہنچی، شوہر نے فوراً طلاق کے الفاظ زبان سے نکال دیئے، حالانکہ طلاق کوئی گالی نہیں ہے جو غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے دے دی جائے، یہ نکاح کا رشتہ ختم کرنے کا وہ انتہائی اقدام ہے جس کے نتائج بڑے سنگین ہیں، اس سے صرف نکاح کا رشتہ ہی ختم نہیں ہوتا، بلکہ خاندانی زندگی کے بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں، میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جاتے ہیں، بچوں کی پرورش کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، املاک کی تقسیم میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے، مہر، نفقہ اور عدت کے معاملات پر اس کا اثر پڑتا ہے، غرض نہ صرف میاں بیوی، بلکہ ان کی اولاد، بلکہ پورے خاندان پر اس کے دوررس اثرات پڑتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاں طلاق کی اجازت دی ہے، وہاں اسے ''أبغض المباحات'' قرار دیا ہے، یعنی یہ وہ چیز ہے جو جائز کاموں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہے، عیسائی مذہب کا اصل تصور یہ تھا کہ میاں بیوی جب ایک مرتبہ نکاح کے رشتے میں بندھ جائیں تو اب طلاق دینے یا لینے کا کوئی راستہ نہیں ہے، بائبل میں تو طلاق کو بدکاری کے برابر قرار دیا گیا ہے،

☆ ذکر و فکر، ص: ۳۱۹

اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس لئے اس نے طلاق کے بارے میں یہ سخت موقف تو اختیار نہیں کیا، اس لئے کہ میاں بیوی کی زندگی میں بعض اوقات ایسے مرحلے پیش آجاتے ہیں، جب دونوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ شرافت کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں، ایسے موقع پر نکاح کے رشتے کو ان پر زبردستی تھوپے رکھنا دونوں کی زندگی کو عذاب بنا سکتا ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ عیسائی مذہب طلاق کے بارے میں اپنے اس قدیم موقف پر قائم نہیں رہ سکا، جس کی داستان بڑی طویل اور عبرتناک ہے) اس لئے اسلام نے طلاق کو ناجائز یا حرام تو قرار نہیں دیا، اور نہ اس کے ایسے لگے بندھے اسباب متعین کیے جو علیحدگی کے معاملے میں میاں بیوی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیں، لیکن اول تو آنحضرت ﷺ نے صاف صاف فرما دیا کہ مباح (جائز) چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے۔(۱)

دوسرے میاں بیوی کو ایسی ہدایات دی ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے تو طلاق کی نوبت کم سے کم آئے، تیسرے اگر طلاق کی نوبت آہی جائے تو اس کا ایسا طریقہ بتایا ہے جس میں خرابیاں کم سے کم ہوں، آج اگر لوگ ان ہدایات اور احکام کو اچھی طرح سمجھ لیں، اور ان پر عمل کریں تو نہ جانے کتنے گھریلو تنازعات اور خاندانی مسائل خود بخود حل ہو جائیں۔

جہاں تک ان ہدایات کا تعلق ہے جو طلاق کے سد باب کے لئے دی گئی ہیں ان میں سب سے پہلی ہدایت تو آنحضرت ﷺ نے یہ دی ہے کہ اگر کسی شوہر کو اپنی بیوی کی کوئی بات ناپسند ہے، تو اسے اس کی اچھی باتوں پر بھی غور کرنا چاہئے، مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص بے عیب نہیں ہوتا، اگر کسی میں ایک خرابی ہے تو دس اچھائیاں بھی ہو سکتی ہیں، ایک خرابی کو لے کر بیٹھنا اور دس اچھائیوں سے آنکھ بند کر لینا انصاف کے بھی خلاف ہے، اور اس سے کوئی مسئلہ حل بھی نہیں ہو سکتا، بلکہ قرآن کریم نے تو یہاں تک فرما دیا کہ ''اگر تمہیں اپنی بیوی کی کوئی بات ناپسند ہے تو (یہ سوچو) کہ شاید تم جس چیز کو برا سمجھ رہے ہو، اللہ تعالیٰ نے اس میں تمہارے لئے کوئی بڑی بھلائی رکھی ہو'' (۲)

دوسری ہدایت قرآن کریم نے یہ دی ہے کہ جب میاں بیوی آپس میں اپنے اختلافات طے نہ کر سکیں اور نرم و گرم ہر طریقہ آزمانے کے بعد بھی تنازعہ برقرار رہے تو فوراً علیحدگی کا فیصلہ کرنے کے بجائے دونوں کے خاندان والے ایک ایک شخص کو ثالث بنائیں، اور یہ دونوں طرف کے نمائندے

---

(۱) سنن أبي داؤد كتاب الطلاق، باب في كراهية الطلاق، رقم: ۱۸۶۳، سنن ابن ماجه، كتاب الطلاق، باب حدثنا سويد بن سعيد، رقم: ۲۰۰۸

(۲) النساء: ۱۹

آپس میں ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لے کر میاں بیوی کے درمیان تنازعہ ختم کرنے کی کوشش کریں، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا کہ اگر یہ دونوں نیک نیتی سے اصلاح کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت پیدا فرمادے گا۔(۱)

لیکن اگر یہ تمام کوششیں بالکل ناکام ہو جائیں اور طلاق ہی کا فیصلہ کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ حکم دیا ہے کہ شوہر اس کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرے، مناسب وقت کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ طلاق اس وقت دی جائے جب بیوی طہر کی حالت میں ہو، یعنی اپنے ماہانہ نسوانی دورے سے فارغ ہو چکی ہو، اور فراغت کے بعد سے دونوں کے درمیان وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کی نوبت نہ آئی ہو، لہٰذا اگر عورت طہر کی حالت میں نہ ہو تو ایسے وقت طلاق دینا شرعاً گناہ ہے، نیز اگر طہر ایسا ہو کہ اس میں میاں بیوی کے درمیان ازدواجی قربت ہو چکی ہو، تب بھی طلاق دینا شرعاً نہیں، ایسی صورت میں طلاق دینے کے لئے شوہر کو اگلے مہینے تک انتظار کرنا چاہئے۔

اس طریق کار میں یوں تو بہت سی مصلحتیں ہیں، لیکن ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ طلاق کسی وقتی منافرت یا جھگڑے کا نتیجہ نہ ہو، شوہر کو مناسب وقت کے انتظار کا حکم اس لئے بھی دیا گیا ہے کہ اس عرصے میں وہ تمام حالات پر اچھی طرح غور کر لے، اور جس طرح نکاح سوچ سمجھ کر ہوا تھا، اسی طرح طلاق بھی سوچ سمجھ کر ہی دی جائے، چنانچہ عین ممکن ہے کہ اس انتظار کے نتیجے میں دونوں کی رائے بدل جائے، حالات بہتر ہو جائیں، اور طلاق کی نوبت ہی نہ آئے۔

پھر اگر مناسب وقت آجانے پر بھی طلاق کا ارادہ برقرار رہے تو شریعت نے طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ بتایا ہے کہ شوہر صرف ایک طلاق دے کر خاموش ہو جائے، اس طرح ایک رجعی طلاق ہو جائے گی، جس کا حکم یہ ہے کہ عدت گزر جانے پر نکاح کا رشتہ شرافت کے ساتھ خود بخود ختم ہو جائے گا، اور دونوں اپنے اپنے مستقبل کے لئے کوئی فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔

اس طریقے میں فائدہ یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد اگر مرد کو اپنی غلطی کا احساس ہو، اور وہ یہ سمجھے کہ حالات اب بہتر ہو سکتے ہیں تو وہ عدت کے دوران اپنی دی ہوئی طلاق سے رجوع کر سکتا ہے، جس کے لئے زبان سے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ”میں نے طلاق سے رجوع کر لیا“ اس طرح نکاح کا رشتہ خود بخود تازہ ہو جائے گا، اور اگر عدت بھی گزر گئی ہو اور دونوں میاں بیوی یہ سمجھیں کہ اب انہوں نے سبق سیکھ لیا ہے، اور آئندہ وہ مناسب طریقے پر زندگی گزار سکتے ہیں تو ان کے لئے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ وہ باہمی رضامندی سے دوبارہ از سر نو نکاح کر لیں (جس کے لئے نیا ایجاب و قبول، گواہ اور مہر سب ضروری ہے)

---

(۱) النساء: ۳۵

اگر مذکورہ سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میاں بیوی نے پھر سے نکاح کا رشتہ تازہ کر لیا ہو، اور پھر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان تنازعہ کھڑا ہو جائے، تب بھی دوسری طلاق دینے میں جلدی نہ کرنی چاہئے، بلکہ ان تمام ہدایات پر عمل کرنا چاہئے جو اوپر بیان ہوئیں، ان تمام ہدایات پر عمل کے باوجود اگر شوہر پھر طلاق ہی کا فیصلہ کرے تو اس مرتبہ بھی ایک ہی طلاق دینی چاہئے، اب مجموعی طور پر دو طلاقیں ہو جائیں گی، لیکن معاملہ اس کے باوجود میاں بیوی کے ہاتھ میں رہے گا۔

یعنی عدت کے دوران شوہر پھر رجوع کر سکتا ہے، اور عدت گزرنے کے بعد دونوں باہمی رضامندی سے تیسری بار پھر نکاح کر سکتے ہیں۔

یہ ہے طلاق کا وہ طریقہ جو قرآن وحدیث میں بیان ہوا ہے، اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآن وسنت نے نکاح کے رشتے کو برقرار رکھنے اور اسے ٹوٹنے سے بچانے کے لئے درجہ بہ درجہ کتنے راستے رکھے ہیں، ہاں اگر کوئی شخص ان تمام درجوں کو پھلانگ جائے تو پھر نکاح وطلاق آنکھ مچولی کا کوئی کھیل نہیں ہے جو غیر محدود زمانے تک جاری رکھا جائے، لہٰذا جب تیسری طلاق بھی دے دی جائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ اب نکاح کو تازہ کرنے کا کوئی راستہ نہیں، اب نہ شوہر رجوع کر سکتا ہے، نہ میاں بیوی باہمی رضامندی سے نیا نکاح کر سکتے ہیں، اب دونوں کو علیحدہ ہونا ہی پڑے گا۔

ہمارے معاشرے میں طلاق کے بارے میں انتہائی سنگین غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ تین سے کم طلاقوں کو طلاق ہی نہیں سمجھا جاتا، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر طلاق کا لفظ صرف ایک یا دو مرتبہ لکھا جائے تو اس سے طلاق ہی نہیں ہوتی، چنانچہ جب کبھی طلاق کی نوبت آتی ہے تو لوگ تین طلاقوں سے کم پر بس نہیں کرتے، اور کم سے کم تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنا ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا طلاق صرف ایک مرتبہ کہنے سے بھی ہو جاتی ہے، بلکہ شریعت کے مطابق طلاق کا صحیح اور احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک مرتبہ طلاق کا لفظ کہا جائے لکھا جائے، اس طرح طلاق تو ہو جاتی ہے، لیکن اگر بعد میں سوچ سمجھ کر نکاح کا رشتہ تازہ کرنا ہو تو اس کے دروازے کسی کے نزدیک مکمل طور پر بند نہیں ہوتے، بلکہ ایک ساتھ تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنا شرعاً گناہ ہے، اور حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی چاروں فقہی مکاتب فکر کے نزدیک اس گناہ کی ایک سزا یہ ہے کہ اس کے بعد رجوع یا نئے نکاح کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، اور جو لوگ ان فقہی مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں ان کو اکثر تین طلاقیں ایک ساتھ دینے کے بعد شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا طلاق کے معاملے میں سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنے سے طلاق نہیں ہوتی، اور یہ بات اچھی طرح لوگوں میں عام کرنی ضروری ہے کہ طلاق کا صحیح

اور احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کیا جائے، اس سے زیادہ نہیں، اگر عدت کے دوران شوہر کے رجوع کا حق ختم کرنا مقصود ہو تو ایک طلاق بائن دے دی جائے، یعنی طلاق کے ساتھ بائن کا لفظ بھی ملا لیا جائے تو شوہر کو یک طرفہ طور پر رجوع کرنے کا حق نہیں رہے گا، البتہ باہمی رضامندی سے دونوں میاں بیوی جب چاہیں نیا نکاح کر سکیں گے۔ یہ بات کہ طلاق کا احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک طلاق دی جائے، پوری امت میں مسلم ہے، اور اس میں کسی مکتب فکر کا اختلاف نہیں ہے، ضرورت ہے کہ علماء کرام اپنے خطبوں میں اس مسئلے کو عوام کے سامنے واضح کریں، اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی طلاق کے یہ احکام لوگوں تک پہنچائے جائیں۔

۵ محرم ۱۴۱۷ھ / ۲۳ مئی ۱۹۹۶ء

☆☆☆

احسان اور ازدواجی زندگی ☆

حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب عارفی (رحمۃ اللہ علیہ) ہمارے زمانے کی ان درخشاں شخصیتوں میں سے تھے جو عمر بھر شہرت، پبلسٹی اور نام ونمود سے دامن بچا کر زندگی گزارتے ہیں، لیکن ان کی سیرت و کردار کی خوشبو خود بخود دلوں کو کھینچتی اور ماحول کو معطر کرتی ہے، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ اور تصوف وسلوک میں ان کے خلیفہ مجاز تھے، چنانچہ لوگ اپنے اعمال واخلاق کی اصلاح کے لئے ان سے رجوع کرتے اور ان کی ہدایات سے فیض یاب ہوتے تھے، ایک مرتبہ ایک صاحب حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوئے، اور اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ "الحمدللہ، مجھے احسان کا درجہ حاصل ہو گیا ہے" (احسان ایک قرآنی اصطلاح ہے جس کی تشریح حدیث میں یہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس دھیان کے ساتھ کی جائے جیسے عبادت کرنے والا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، یا کم از کم اس دھیان کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہے ہیں) ان صاحب کا مطلب یہ تھا کہ عبادت کی ادائیگی کے دوران بحمداللہ مجھے یہ دھیان حاصل ہو گیا ہے، جسے حدیث کی اصطلاح میں احسان کہا جاتا ہے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں انہیں مبارک باد دی، اور فرمایا "احسان واقعی بڑی نعمت ہے، جس کے حاصل ہونے پر شکر ادا کرنا چاہئے، لیکن میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ احسان کا یہ درجہ صرف نماز ہی میں حاصل ہوا ہے یا جب آپ اپنے بیوی بچوں سے یا دوست احباب سے کوئی معاملہ کرتے ہیں اس وقت بھی یہ دھیان باقی رہتا ہے؟" اس پر وہ صاحب کہنے لگے کہ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ احسان کا تعلق نماز اور دوسری عبادتوں کے ساتھ ہے، لہٰذا میں نے تو اس کی مشق نماز ہی میں کی ہے، اور بفضلہٖ تعالیٰ نماز کی حد تک یہ مشق کامیاب رہی ہے، لیکن نماز سے باہر زندگی کے عام معاملات میں کبھی احسان کی مشق کا خیال ہی نہیں آیا، حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے آپ سے یہ سوال کیا تھا، بے شک نماز اور دوسری عبادتوں میں یہ دھیان مطلوب ہے، کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، لیکن اس دھیان کی ضرورت صرف نماز ہی

☆ ذکر وفکر، ص:۳۰۲

کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ زندگی کے ہر کام میں اس کی ضرورت ہے، انسان کو لوگوں کے ساتھ زندگی گزارتے اور ان کے ساتھ مختلف معاملات انجام دیتے ہوئے بھی یہ دھیان رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، خاص طور پر میاں بیوی کا تعلق ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے دم دم کے ساتھی ہوتے ہیں، اور ان کی رفاقت میں بے شمار اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں، بہت سی ناگواریاں بھی پیش آتی ہیں، اور ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب انسان کا نفس اسے ان ناگواریوں کے جواب میں ناانصافیوں پر ابھارتا ہے، ایسے موقع پر اس دھیان کی ضرورت کہیں زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، اگر یہ احساس ایسے وقت دل میں جاگزین نہ ہو تو عموماً اس کا نتیجہ ناانصافی اور حق تلفی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اس کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر کبھی اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ طبعی غصے اور ڈانٹ ڈپٹ کا معاملہ نہیں فرمایا، اور اس سنت پر عمل کی کوشش میں میں نے بھی یہ مشق کی ہے کہ میں اپنے گھر والوں پر غصہ نہ اتاروں، چنانچہ میں اللہ تعالیٰ کے شکر کے طور پر کہتا ہوں کہ آج مجھے اپنی اہلیہ کے ساتھ رفاقت کو اکیاون سال ہو چکے ہیں لیکن اس عرصے میں الحمدللہ، میں نے کبھی ان سے لہجہ بدل کر بھی بات نہیں کی۔ بعد میں ایک مرتبہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ نے ازخود حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ تمام عمر مجھے یاد نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کبھی ناگواری کے لہجے میں بات کی ہو، اور نہ کبھی مجھے یہ یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے براہِ راست اپنا کوئی کام کرنے کو کہا ہو، میں خود ہی اپنے شوق سے ان کے کام کرنے کی کوشش کرتی تھی، لیکن وہ مجھ سے نہیں کہتے تھے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ باتیں آج مجھے اس لئے یاد آگئیں کہ میں نے پچھلے ہفتے خطبہ نکاح کا پیغام کی تشریح کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ پرمسرت اور خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے تقویٰ ضروری ہے، حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عمل (جو ہوا میں اڑنے اور پانی پر چلنے کی کرامتوں سے ہزاروں درجہ اونچے درجے کی کرامت ہے) درحقیقت اسی تقویٰ کا نتیجہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی عملی تصویر تھا کہ

''تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لئے بہتر ہوں'' (۱)

(۱) سنن الترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله، باب فضل أزواج النبي، رقم: ۳۸۳۰، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حسن معاشرة النساء، رقم: ۱۹۶۷، سنن الدارمي، كتاب النكاح، باب في حسن معاشرة النساء، رقم: ۲۱٦۰

بے شک قرآن کریم نے مردوں کو عورتوں پر قوام (نگران) قرار دیا ہے، لیکن آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات اور اپنے عمل سے یہ بات واضح فرما دی ہے کہ نگران ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرد ہر وقت عورتوں پر حکم چلایا کرے، بیوی کے ساتھ خادمہ جیسا معاملہ کرے، یا اسے اپنی آمریت کے شکنجے میں کس کر رکھے، حقیقت یہ ہے کہ خود قرآنِ کریم نے ہی ایک دوسری جگہ میاں بیوی کے رشتے کو مودت (دوستی) اور رحمت سے تعبیر فرمایا ہے۔

نیز اسی آیت میں شوہر کے لئے بیوی کو سکون کا ذریعہ قرار دیا ہے، (الروم: ۲۱) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان اصل رشتہ دوستی اور محبت کا ہے، اور دونوں ایک دوسرے کے لئے سکون اور راحت کا ذریعہ ہیں، لیکن اسلام ہی کی ایک تعلیم یہ ہے کہ جب کبھی کوئی اجتماعی کام کیا جائے تو لوگوں کو چاہئے کہ وہ کسی کو اپنا امیر بنالیں، تاکہ کام نظم و ضبط کے ساتھ انجام پائے، یہاں تک کہ اگر دو شخص کسی سفر پر جا رہے ہوں تب بھی مستحسن یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں، خواہ وہ دونوں آپس میں دوست ہی کیوں نہ ہوں، اب جس شخص کو بھی امیر بنایا جائے وہ ہر وقت دوسرے پر حکم چلانے کے لئے نہیں، بلکہ سفر کے معاملات کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے امیر بنایا گیا ہے، اس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھی یا ساتھیوں کی خبر گیری کرے، سفر کا ایسا انتظام کرے جو سب کی راحت و آرام کے لئے ضروری ہو، اور جب وہ یہ فرائض انجام دے تو دوسروں کا کام یہ ہے کہ وہ ان امور میں اس کی اطاعت اور اس کے ساتھ تعاون کریں۔

جب اسلام نے ایک معمولی سے سفر کے لئے بھی یہ تعلیم دی ہے تو زندگی کا طویل سفر اس تعلیم سے کیسے خالی رہ سکتا ہے؟ لہٰذا جب میاں بیوی اپنی زندگی کا مشترک سفر شروع کر رہے ہوں تو ان میں سے شوہر کو اس سفر کا امیر یا نگران بنایا گیا ہے، کیونکہ اس سفر کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے جو جسمانی قوت اور جو صفات درکار ہیں وہ قدرتی طور پر مرد میں زیادہ ودیعت کی گئی ہیں، لیکن اس انتظام سے یہ حقیقت ماند نہیں پڑتی کہ دونوں کے درمیان اصل تعلق دوستی، محبت اور رحمت کا تعلق ہے، اور ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے کے ساتھ ایک نوکر کا سا معاملہ کرے، یا شوہر اپنے امارت کے منصب کی بنیاد پر یہ سمجھے کہ بیوی اس کے ہر حکم کی تعمیل کے لئے پیدا ہوئی ہے، یا اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیوی سے اپنی ہر جائز یا ناجائز خواہش کی تکمیل کرائے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو جو قوت اور جو صفات عطا کی ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اس منصب کو جائز حدود میں رہتے ہوئے بیوی کی دلداری میں استعمال کرے، اور اس کی جائز خواہشات کو حتی الامکان پورا کرے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بیوی کو جو مقام بخشا ہے، اور اسے جو حقوق عطا کیے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتیں

اپنے شریک زندگی کے ساتھ تعاون اور اسے خوش رکھنے میں صرف کرے، اگر دونوں یہ کام کرلیں تو نہ صرف یہ کہ گھر دونوں کے لئے دنیوی جنت بن جاتا ہے بلکہ ان کا یہ طرز عمل مستقل عبادت کے حکم میں ہے جو آخرت کی حقیقی جنت کا وسیلہ بھی ہے، اسی لئے دونوں کو نکاح کے خطبے میں تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے، اور اسی لئے حضرت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ احسان کا موقع صرف نماز ہی نہیں بلکہ میاں بیوی کے تعلقات بھی ہیں۔

قرآن کریم کی بے شمار آیات میں سے آنحضرت ﷺ نے نکاح کے خطبے کے لئے خاص طور پر انہی تین آیات کا جو انتخاب فرمایا یقیناً اس میں کوئی بڑی مصلحت ہوگی، غور کیا جائے تو ان تینوں آیتوں میں جو بات مشترک طور پر کہی گئی ہے، وہ تقویٰ کا حکم ہے، تینوں آیتیں اسی حکم سے شروع ہو رہی ہیں، کہ تقویٰ اختیار کرو، کوئی نادان یہ کہہ سکتا ہے کہ تقویٰ کا شادی بیاہ سے کیا جوڑ؟ لیکن جو شخص حالات کے نشیب و فراز اور میاں بیوی کے تعلقات کی نزاکتوں کو جانتا ہے، اور جسے ازدواجی الجھنوں کی تہہ تک پہنچنے کا تجربہ ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات اور ایک دوسرے کے حقوق کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی کے لئے تقویٰ ایک لازمی شرط ہے، میاں بیوی کا رشتہ نازک ہوتا ہے، ان دونوں کے سینے میں چھپے ہوئے جذبات اور ان کی حقیقی سرشت ایک دوسرے کے سامنے اتنی کھل کر آتی ہے کہ کسی اور کے سامنے اتنی کھل کر نہیں آسکتی، دوسروں کے سامنے ایک شخص اپنی بدطینتی کو ظاہری مسکراہٹوں کے پردے میں چھپا سکتا ہے، اپنے اندر کے انسان پر خوبصورت الفاظ اور اوپری خوش اخلاقی کا ملمع چڑھا سکتا ہے، لیکن بیوی کے ساتھ اپنے شب و روز کے معاملات میں وہ یہ ملمع باقی نہیں رکھ سکتا، اسے اپنی ظاہرداری کے خول سے کبھی نہ کبھی باہر نکلنا ہی پڑتا ہے، اور اگر اندر کا یہ انسان تقویٰ سے آراستہ نہ ہو تو اپنے شریک زندگی کا جینا دوبھر کر دیتا ہے، ایک بیوی کو اپنے شوہر سے جو تکلیفیں پہنچتی ہیں، ان کا ازالہ ہمیشہ عدالت کے ذریعہ نہیں ہوسکتا، ان میں سے بے شمار تکلیفیں ایسی ہیں جو وہ عدالت تو کجا اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے سامنے بھی بیان نہیں کرسکتی، اسی طرح ایک شوہر کو بیوی سے جو شکایتیں ہوسکتی ہیں بسا اوقات شوہر کے پاس ان کا کوئی حل نہیں ہوتا، نہ کسی اور کے ذریعے وہ انہیں دور کرنے کا کوئی سامان کرسکتا ہے، اس قسم کی تکلیفوں اور شکایتوں کا کوئی علاج دنیا کی کوئی طاقت فراہم نہیں کرسکتی، ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دونوں کے دل میں تقویٰ ہو، یعنی وہ اس احساس کی دولت سے مالا مال ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے لئے امانت ہیں، اور اس امانت کی جواب دہی انہیں اپنے اللہ کے سامنے کرنی ہے، اپنے شریک زندگی کو اپنے کسی طرزِ عمل سے ستا کر وہ شاید دنیا کی جواب دہی سے بچ جائیں، لیکن ایک دن آئے گا جب وہ اللہ کے سامنے کھڑے

ہوں گے، اور انہیں اپنی ایک ایک حق تلفی کا وبال بھگتنا پڑے گا، اسی احساس کا نام تقویٰ ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو انسان کے دل پر ان تنہائیوں میں بھی پہرہ بٹھاتی ہے، جہاں اسے کوئی اور دیکھنے والا نہیں ہوتا، آنحضرت ﷺ یہ چاہتے ہیں کہ جب وہ مرد و عورت زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کے ساتھی بنیں تو وہ روزانہ ہونے سے پہلے اپنے دلوں پر یہ غیبی پہرہ بٹھالیں، تاکہ ان کی دوستی پائیدار ہو، اور ان کے دل میں ایک دوسرے کی محبت محض وقتی نفسانیت کی پیداوار نہ ہو، جو نئی نویلی زندگی کا جوش ٹھنڈا ہونے کے بعد فنا ہو جائے، بلکہ وہ تقویٰ کے سائے میں پلی ہوئی پائیدار محبت ہو جو خود غرضی سے پاک اور ایثار و وفاداری اور خیر خواہی کے سدا بہار جذبات سے مزین ہوتی ہے، اور جسم سے گذر کر واقعی قلب و روح کی گہرائیوں تک سرایت کر جاتی ہے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے نکاح کے خطبے میں ان تین آیات کا انتخاب فرمایا جن میں سے ہر آیت تقویٰ کے حکم سے شروع ہو رہی ہے، اور وہی اس کا بنیادی پیغام ہے۔

۲۵ رجب ۱۴۱۶ھ / ۱۸ دسمبر ۱۹۹۵ء

☆☆☆

بیوی کے حقوق، شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾(۱)

﴿وَلَن تَسْتَطِيعُواْ أَن تَعْدِلُواْ بَيْنَ النِّسَاء وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلاَ تَمِيلُواْ كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِن تُصْلِحُواْ وَتَتَّقُواْ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ غَفُوراً رَّحِيماً﴾ (۲)

وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ رَضِىَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ((اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا فَاِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ مَا فِى الضِّلَعِ اَعْلَاهُ فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهُ كَسَرْتَهٗ وَاِنْ تَرَكْتَهٗ لَمْ يَزَلْ اَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ))(۳)

حقوق العباد کی اہمیت

ان آیات قرآنیہ اور حدیث نبوی کی روشنی میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ حقوق العباد کا بیان شروع فرما رہے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اور اس کے پیغمبر نبی کریم ﷺ نے بندوں کے جو حقوق ضروری قرار دیئے

☆ اصلاحی خطبات (۴/ ۷۰ـ) ۲۹ مئی ۱۹۹۲ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، بعد از نماز عصر۔ زیر نظر درس امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''ریاض الصالحین'' کے باب نمبر ۳۰ "باب الوصية بالنساء" (صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۷) کا درس ہے۔

(۱) النسآء: ۱۹

(۲) النسآء: ۱۲۹

(۳) صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب الوصية بالنساء، رقم: ۴۷۸۷، صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، رقم: ۲۶۷۱، سنن الترمذی، كتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها، رقم: ۱۰۸۳، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق المرأة علی الزوج، رقم: ۱۸۴۱

ہیں اور جن کے تحفظ کا حکم دیا ہے۔ ان کا بیان یہاں سے شروع فرما رہے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بار بار عرض کر چکا ہوں کہ ''حقوق العباد'' دین کا بہت اہم شعبہ ہے اور یہ اتنا اہم شعبہ ہے کہ ''حقوق اللہ'' تو توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں، یعنی اگر خدانخواستہ حقوق اللہ سے متعلق کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے (خدا نہ کرے) تو اس کا علاج بہت آسان ہے کہ انسان کو جب کبھی اس پر ندامت پیدا ہو تو توبہ واستغفار کر لینے سے معاف ہو جاتے ہیں، لیکن بندوں کے حقوق ایسے ہیں کہ اگر ان میں کوتاہی ہو جائے تو اگر اس پر کبھی ندامت ہو اور اس پر توبہ واستغفار کرے تب بھی وہ گناہ معاف نہیں ہوتے جب تک کہ حق دار کو اس کا حق نہ پہنچایا جائے، یا جب تک صاحب حق اس کو معاف نہ کر دے، اس لئے حقوق العباد کا معاملہ بڑا سنگین ہے۔

ہم غیبت کو گناہ ہی نہیں سمجھتے

حقوق العباد کا معاملہ جتنا سنگین ہے ہمارے معاشرے میں اس سے غفلت اتنی ہی عام ہے ہم لوگوں نے چند عبادات کا نام دین رکھ لیا ہے یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ذکر، تلاوت، تسبیح وغیرہ ان چیزوں کو تو ہم دین سمجھتے ہیں، لیکن حقوق العباد کو ہم نے دین سے خارج کیا ہوا ہے، اور اسی طرح معاشرتی حقوق کو بھی دین سے خارج کر رکھا ہے، اس میں اگر کوئی شخص کوتاہی یا غلطی کرتا ہے تو اس کو اس کی سنگینی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

غیبت حقوق العباد تلف کرنے کے مترادف ہے

اس کی سادہ سی مثال یہ ہے کہ (خدا نہ کرے) کوئی مسلمان شراب نوشی کی لت میں مبتلا ہو۔ تو ہر وہ مسلمان جس کو ذرا سا بھی دین سے لگاؤ ہے۔ وہ اس کو برا سمجھے گا، اور خود وہ شخص بھی اپنے فعل پر نادم ہوگا کہ میں یہ ایک گناہ کا کام کر رہا ہوں، لیکن ایک دوسرا شخص ہے جو لوگوں کی غیبت کرتا ہے۔ اس غیبت کرنے والے کو معاشرے میں شراب پینے والے کے برابر برا نہیں سمجھا جاتا، اور نہ خود غیبت کرنے والا اپنے آپ کو گناہ گار اور مجرم خیال کرتا ہے۔ حالانکہ گناہ کے اعتبار سے شراب پینا جتنا بڑا گناہ ہے، غیبت کرنا بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہے، بلکہ غیبت اس لحاظ سے شراب پینے سے زیادہ سنگین ہے کہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور اس لحاظ سے بھی زیادہ سنگین ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اس کی ایسی مثال دی ہے کہ دوسرے گناہوں کی ایسی مثال نہیں دی۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے فرمایا:

''غیبت کرنے والا ایسا ہے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھانے والا'' (۱)
لیکن اتنی سنگینی کے باوجود یہ گناہ معاشرے میں عام ہوگیا ہے، شاید ہی کوئی مجلس اس گناہ سے خالی ہوتی ہو، اور پھر اس کو برا بھی نہیں سمجھا جاتا، گویا کہ دین کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حالت ''احسان'' ہر وقت مطلوب ہے

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب قدس سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ ایک دن فرمانے لگے کہ ایک صاحب میرے پاس آئے۔ اور آکر بڑے فخریہ انداز میں خوشی کے ساتھ کہنے لگے کہ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ''احسان'' کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ ''احسان'' ایک بڑا درجہ ہے جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے:

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))(۲)

یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کر جیسے کہ تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس خیال کے ساتھ عبادت کر کہ اللہ تعالیٰ تجھے دیکھ رہے ہیں، اس کو درجہ ''احسان'' کہا جاتا ہے۔ ان صاحب نے حضرت والا سے کہا کہ مجھے ''احسان'' کا درجہ حاصل ہوگیا ہے، حضرت ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو مبارک باد دی کہ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے، یہ تو بہت بڑی نعمت ہے، البتہ میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو یہ ''احسان'' کا درجہ صرف نماز میں حاصل ہوتا ہے، اور جب بیوی بچوں کے ساتھ معاملات کرتے ہو اس وقت بھی حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ یعنی بیوی بچوں کے ساتھ معاملات کرتے وقت بھی آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں یا یہ خیال اس وقت نہیں آتا؟ وہ صاحب جواب میں فرمانے لگے کہ حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ جب عبادت کرے تو اس طرح عبادت کرے گویا کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، یا اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہے ہیں، وہ تو صرف عبادت میں ہے ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ''احسان'' کا تعلق صرف نماز سے ہے، دوسری چیزوں کے ساتھ احسان کا کوئی تعلق نہیں، حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اسی لئے آپ سے یہ سوال کیا تھا، اس لئے کہ آج کل عام طور پر غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ''احسان'' صرف نماز ہی میں مطلوب ہے، یا ذکر و تلاوت ہی میں مطلوب ہے، حالانکہ احسان ہر وقت مطلوب ہے، زندگی کے ہر

---

(۱) الحجرات: ۱۲

(۲) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب سؤال جبریل النبی عن الإیمان والإسلام والإحسان، رقم: ۴۸، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان الإیمان والإسلام والإحسان، رقم: ۹

مرحلے اور شعبے میں مطلوب ہے، دکان پر بیٹھ کر تجارت کر رہے ہو وہاں پر ''احسان'' مطلوب ہے۔ یعنی دل میں یہ استحضار ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں جب اپنے ماتحتوں کے ساتھ معاملات کر رہے ہو، اس وقت بھی ''احسان'' مطلوب ہے۔ جب بیوی بچوں اور دوست احباب اور پڑوسیوں سے معاملات کر رہے ہو۔ اس وقت بھی یہ استحضار ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، حقیقت میں ''احسان'' کا مرتبہ یہ ہے، صرف نماز تک محدود نہیں ہے۔

ایک جہنمی عورت کا ذکر

خوب سمجھ لیں کہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم ہماری زندگی کے ہر شعبے کے ساتھ ہے، اسی واسطے روایت میں آتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ سے ایک خاتون کے بارے میں پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! ایک خاتون ہے۔ جو دن رات عبادت میں لگی رہتی ہے، نفل نماز اور ذکر و تلاوت بہت کرتی ہے۔ اور ہر وقت اسی میں مشغول رہتی ہے، اس خاتون کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ اس کا انجام کیسا ہوگا؟ آپ نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ وہ خاتون پڑوسیوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے؟ صحابہ کرام نے جواب دیا کہ پڑوسیوں کے ساتھ اس کا سلوک اچھا نہیں ہے۔ پڑوس کی خواتین تو اس سے خوش نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ خاتون جہنم میں جائے گی۔

ایک جنتی عورت کا ذکر

پھر ایک ایسی خاتون کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا کہ جو نفلی عبادت تو زیادہ نہیں کرتی تھی، صرف فرائض و واجبات پر اکتفا کرتی تھی، اور زیادہ سے زیادہ سنت مؤکدہ ادا کر لیتی۔ بس اس سے زیادہ نوافل، ذکر و تلاوت نہیں کرتی تھی۔ مگر پڑوسیوں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ اس کے معاملات اچھے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ خاتون جنت میں جائے گی۔ (۱)

حقیقی مفلس کون ہے؟

ان احادیث میں آنحضرت ﷺ نے یہ بات واضح فرما دی کہ اگر کوئی شخص نفلی عبادت کرے تو یہ بڑی اچھی بات ہے، اور اگر نفلی عبادت نہ کرے تو آخرت میں سوال نہیں ہوگا کہ تم نے فلاں نفلی

(۱) مسند احمد بن حنبل، مسند أبي هريرة، رقم: ۹۲۹۸، الأدب المفرد، باب لا يؤذي جاره، رقم: ۱۱۹، ص: ٤٨

عبادت کیوں نہیں کی۔ اس لئے کہ نفل کا مطلب ہی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کرے تو ثواب ملے گا اور اگر نہ کرے تو کوئی گناہ بھی نہیں ہوگا، لیکن حقوق العباد وہ چیز ہے کہ اس کے بارے میں قیامت کے روز سوال ہوگا اور اس پر جنت اور جہنم کا فیصلہ موقوف ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے روز بڑی مقدار میں نماز روزے لے کر آئے گا۔ لیکن دنیا میں کسی کا حق مار دیا، کسی کو برا کہہ دیا، کسی کی دل آزاری کردی تھی اور کسی کا دل دکھا دیا تھا۔ اب اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جتنے اعمال لے کر آیا تھا۔ وہ سارے کے سارے دوسروں کو دے دیئے۔ اور دوسروں کے گناہ اس پر ڈال دیئے گئے۔ (۱)

اس لئے حقوق العباد کا باب شریعت کا بہت اہم باب ہے۔

حقوق العباد، دین کا اہم ترین حصہ

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ''اسلامی فقہ'' جس میں شریعت کے احکام بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کو اگر چار برابر حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کا ایک حصہ عبادات کے بیان پر مشتمل ہے۔ اور بقیہ تین حصے حقوق العباد کے بیان میں ہیں، یعنی ان میں معاملات اور معاشرت کو بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے ''ہدایہ'' کا نام سنا ہوگا جو فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی جلد میں عبادات کا ذکر ہے۔ جس میں طہارت، نماز، روزہ، زکوۃ، اور حج کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ باقی تین جلدیں معاملات، معاشرت اور حقوق العباد سے متعلق ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حقوق العباد تین چوتھائی دین ہیں۔ اس لئے یہ بڑا اہم باب شروع ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کو عمل کے جذبے سے پڑھنے اور سننے کی توفیق عطا فرمائے اور حقوق العباد کی اپنی رضا اور خوشنودی کے مطابق ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اسلام سے پہلے عورت کی حالت

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلا باب یہ قائم فرمایا ''باب الوصیۃ بالنساء'' یعنی ان نصیحتوں کے بارے میں جو حضور اقدس ﷺ نے عورتوں کے حقوق کے متعلق بیان فرمائی ہیں، اور سب سے پہلے یہ باب اس لئے قائم فرمایا کہ سب سے زیادہ بے اعتدالیاں اور سب سے زیادہ کوتاہیاں اس حق میں ہوتی ہیں۔ جب تک اسلام نہیں آیا تھا۔ اور جب تک نبی کریم ﷺ کی تعلیمات نہیں آئی تھیں، اس

(۱) صحیح مسلم، باب تحریم الظلم، رقم: ٦٥٧٩

وقت تک عورت کو ایسی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ جو معاذ اللہ گویا انسانیت سے خارج ہے اور اس کے ساتھ بھیڑ بکریوں جیسا سلوک ہوتا تھا، اس کو انسانیت کے حقوق دینے سے لوگ انکار کرتے تھے۔ کسی بھی معاملے میں اس کے حقوق کی پرواہ نہیں کی جاتی تھی۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا جیسے کسی نے اپنے گھر میں بھیڑ بکری پال لی۔ بالکل اسی طریقے سے اپنے گھر میں ایک عورت کو لاکر بٹھا دیا۔ سلوک کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔

اسلام میں عورت کا مقام

حضور اقدس ﷺ نے پہلی بار اس دنیا کو جو آسمانی ہدایات سے بے خبر تھی خواتین کے حقوق کا احساس دلایا کہ خواتین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے قرآن کریم کی ایک آیت نقل فرمائی۔ جو اس باب میں جامع ترین آیت ہے:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾(۱)

اس میں تمام مسلمانوں سے خطاب ہے کہ تم خواتین کے ساتھ ''معروف'' یعنی نیکی کے ساتھ اچھا سلوک کر کے زندگی گزارو، ان کے ساتھ اچھی معاشرت برتو، ان کو تکلیف نہ پہنچاؤ، یہ عام ہدایت ہے، یہ آیت گویا اس باب کا متن اور عنوان ہے، اور حضور اقدس ﷺ نے اس آیت کی تشریح اپنے اقوال اور افعال سے فرمائی۔ اور حضور ﷺ کو خواتین کے ساتھ حسن سلوک کا اس درجہ اہتمام تھا کہ آپ نے فرمایا:

((خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَآءِ هِمْ وَاَنَا خِيَارُكُمْ لِنِسَائِيْ))(۲)

''تم میں سب سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنی خواتین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ اور میں تم میں اپنی خواتین کے ساتھ بہترین برتاؤ کرنے والا ہوں''

آنحضرت ﷺ کو خواتین کے حقوق کی نگہداشت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا اتنا اہتمام تھا کہ بے شمار احادیث میں اس کی تشریح فرمائی۔ چنانچہ سب سے پہلی حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

(۱) النساء: ۱۹

(۲) اس حدیث کی عبارت قابل تحقیق ہے، کیونکہ مجموعہ احادیث میں اس موضوع سے متعلق دو طرح کی روایات ملتی ہیں، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ((خیرکم خیرکم لأهله وأنا خیرکم لأهلی)) جبکہ دوسری روایت میں یہ الفاظ یہ ہیں: ((خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَآءِ هِمْ)) اس دوسری روایت میں ((وَاَنَا خِيَارُكُمْ لِنِسَائِيْ)) کے الفاظ جستجو کے باوجود نہیں مل سکے۔

سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا)) (۱)

''میں تم کو عورتوں کے بارے میں بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں، تم میری اس نصیحت کو قبول کرلو''

قرآن کریم صرف اصول بیان کرتا ہے

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک بات عرض کردوں کہ قرآن کریم میں آپ یہ دیکھیں گے کہ عام طور پر قرآن کریم موٹے موٹے اصول بیان کر دیتا ہے، تفصیلات اور جزئیات میں نہیں جاتا۔ انہیں بیان نہیں کرتا، یہاں تک کہ نماز جیسا اہم رکن جو دین کا ستون ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم نے تہتر مقامات پر حکم دیا کہ نماز قائم کرو۔ لیکن نماز کیسے پڑھی جاتی ہے؟ اس کا طریقہ کیا ہوتا ہے؟ اس کی رکعتیں کتنی ہوتی ہیں؟ اور کن چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، اور کن چیزوں سے نہیں ٹوٹتی؟ یہ تفصیلات قرآن نے بیان نہیں کیں۔ یہ حضور اقدس ﷺ کی تعلیمات پر چھوڑ دیں، آپ نے اپنی سنت سے بیان فرمائیں، اسی طرح زکوٰۃ کا حکم بھی قرآن کریم میں کم وبیش اتنی ہی مرتبہ آیا ہے، لیکن زکوٰۃ کا نصاب کیا ہوتا ہے؟ کس پر فرض ہوتی ہے؟ کتنی فرض ہوتی ہے؟ کن کن چیزوں پر فرض ہوتی ہے؟ یہ تفصیلات قرآن کریم نے بیان نہیں کیں۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر چھوڑ دیں، معلوم ہوا کہ قرآن کریم عام طور پر اصول بیان کرتا ہے، تفصیلی جزئیات میں نہیں جاتا۔

گھریلو زندگی، پورے تمدن کی بنیاد ہے

لیکن مرد وعورت کے تعلقات، خاندانی تعلقات ایسی چیز ہے کہ قرآن کریم نے اس کے نازک نازک جزوی مسائل بھی صراحت کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ ایک ایک چیز کو کھول کر بیان کر دیا ہے، اور پھر بعد میں نبی کریم ﷺ نے اس کی تشریح فرمائی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ مرد وعورت کے جو تعلقات ہیں، اور انسان کی جو گھریلو زندگی ہے یہ پورے تمدن کی بنیاد ہوتی ہے۔ اور اس پر پورے تہذیب وتمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اگر مرد وعورت کے تعلقات استوار ہیں،

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب الوصية بالنساء، رقم: ٤٧٨٧، صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، رقم: ٢٦٧١، سنن الترمذی، كتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها، رقم: ١٠٨٣، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق المرأة علی الزوج، رقم: ١٨٤١

خوشگوار ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے حقوق ادا کر رہے ہیں تو اس سے گھر کا نظام درست ہوتا ہے اور گھر کا نظام درست ہونے سے اولاد درست ہوتی ہے اور اولاد کے درست ہونے سے معاشرہ سنورتا ہے۔ اور اس پر پورے معاشرے کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، لیکن اگر گھر کا نظام خراب ہو، اور میاں بیوی کے درمیان رات دن تو تو میں میں ہوتی ہو۔ تو اس سے اولاد پر برا اثر پڑے گا۔ اور اس کے نتیجے میں جو قوم تیار ہوگی اس کے بارے میں آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کسی شائستہ قوم کے افراد بن سکتے ہیں یا نہیں۔ اس واسطے اس کو "عائلی احکام" یعنی گھر داری کے احکام کہا جاتا ہے اس لئے قرآن کریم نے ان تعلقات کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بیان فرمایا ہے۔

عورت کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے ہونے کا مطلب

اس کے بعد حضور اقدس ﷺ نے بہت اچھی تشبیہ بیان فرمائی ہے، اور یہ اتنی عجیب وغریب اور حکیمانہ تشبیہ ہے کہ ایسی تشبیہ ملنا مشکل ہے۔ فرمایا کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ اس کے بعد حضرت حوا علیہا السلام کو انہی کی پسلی سے پیدا کیا گیا، اور بعض علماء نے اس کی دوسری تشریح یہ بھی کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عورت کی تشبیہ دیتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ عورت کی مثال پسلی کی سی ہے کہ جس طرح پسلی دیکھنے میں ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے، لیکن پسلی کا حسن اور اس کی صحت اس کے ٹیڑھا ہونے میں ہی ہے، چنانچہ کوئی شخص اگر یہ چاہے کہ پسلی ٹیڑھی ہے، اس کو سیدھا کر دوں تو جب اسے سیدھا کرنا چاہے گا تو وہ سیدھی تو نہیں ہوگی البتہ ٹوٹ جائے گی، وہ پھر پسلی نہیں رہے گی اب دوبارہ پھر اس کو ٹیڑھا کر کے پلستر کے ذریعہ جوڑنا پڑے گا۔ اسی طرح حدیث شریف میں عورت کے بارے میں بھی یہی فرمایا:

((اِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهَا كَسَرْتَهَا وَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اِسْتَمْتَعْتَ وَفِيْهَا عِوَجٌ))(۱)

"اگر تم اس پسلی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ پسلی ٹوٹ جائے گی اور اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہو تو اس کے ٹیڑھے ہونے کے باوجود فائدہ اٹھاؤ گے"

(۱) صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب الوصية بالنساء، رقم: ٤٧٨٧، صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، رقم: ٢٦٧١، سنن الترمذي، كتاب الرضاع، باب ماجاء في حق المرأة على زوجها، رقم: ١٠٨٣، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق المرأة على الزوج، رقم: ١٨٤١

یہ بڑی عجیب وغریب اور حکیمانہ تشبیہ حضور ﷺ نے بیان فرمائی، کہ اس کی صحت ہی اس کے ٹیڑھے ہونے میں ہے اگر وہ سیدھی ہوگی تو وہ بیمار ہے صحیح نہیں ہے۔

بعض لوگ اس تشبیہ کو عورت کی مذمت میں استعمال کرتے ہیں کہ عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، لہٰذا اس کی اصل ٹیڑھی ہے چنانچہ میرے پاس بہت سے لوگوں کے خطوط آتے ہیں جس میں کئی لوگ یہ لکھتے کہ یہ عورت ٹیڑی پسلی کی مخلوق ہے۔ گویا کہ اس کو مذمت اور برائی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، حالانکہ خود نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے منشا یہ نہیں ہے۔

عورت کا ٹیڑھا پن ایک فطری تقاضا ہے

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو کچھ اور اوصاف دے کر پیدا فرمایا ہے، اور عورت کو کچھ اور اوصاف دے کر پیدا فرمایا، دونوں کی فطرت اور سرشت میں فرق ہے، سرشت میں فرق ہونے کی وجہ سے مرد عورت کے بارے میں یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ میری طبیعت اور فطرت کے خلاف ہے، حالانکہ عورت کا تمہاری طبیعت کے خلاف ہونا یہ کوئی عیب نہیں ہے، کیونکہ یہ اس کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ ٹیڑھی ہو۔ کوئی شخص پسلی کے بارے میں یہ کہے کہ پسلی کے اندر جو ٹیڑھا پن ہے وہ اس کے اندر عیب ہے، ظاہر ہے کہ وہ عیب نہیں، بلکہ اس کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ ٹیڑھی ہو، اس لئے آنحضرت ﷺ یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تمہیں عورت میں کوئی ایسی بات نظر آتی ہے جو تمہاری طبیعت کے خلاف ہو، اور اس کی وجہ سے تم اس کو ٹیڑھا سمجھ رہے ہو تو اس کو اس بناء پر مذمت وتنقید کا نشانہ نہ بناؤ، بلکہ یہ سمجھو کہ اس کی فطرت کا تقاضا یہی ہے، اور اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی اور اگر فائدہ اٹھانا چاہو گے تو ٹیڑھا ہونے کی حالت میں بھی فائدہ اٹھا سکو گے۔

”غفلت“ عورت کے لئے حسن ہے

آج الٹا زمانہ آگیا ہے، اس واسطے قدریں بدل گئی ہیں، خیالات بدل گئے، ورنہ بات یہ ہے کہ جو چیز مرد کے حق میں عیب ہے، بسا اوقات وہ عورت کے حق میں حسن اور اچھائی ہوتی ہے اگر ہم قرآن کریم کو غور سے پڑھیں تو قرآن کریم میں یہ بات نظر آجاتی ہے کہ جو چیز مرد کے حق میں عیب تھی، وہی چیز عورت کے بارے میں حسن قرار دی گئی۔ اور اس کو نیکی اور اچھائی کی بات کہا گیا۔ مثلاً مرد کے حق میں یہ بات عیب ہے کہ وہ جاہل اور غافل ہو۔ اور دنیا کی اس کو خبر نہ ہو، اس لئے کہ مرد پر اللہ تعالیٰ نے دنیا کے کاموں کی ذمہ داری رکھی ہے، اس لئے اس کے پاس علم بھی ہونا چاہیے،

اور اس کو باخبر بھی ہونا چاہیے، اگر باخبر نہیں ہے، بلکہ غافل ہے، اور غفلت میں مبتلا ہے تو یہ مرد کے حق میں عیب ہے لیکن قرآن کریم نے غفلت کو عورت کے حق میں حسن قرار دیا، چنانچہ سورۃ نور میں فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَٰتِ الْغَٰفِلَٰتِ الْمُؤْمِنَٰتِ﴾(۱)

''یعنی وہ لوگ جو ایسی عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں جو پاک دامن ہیں، اور غافل ہیں، یعنی دنیا سے بے خبر ہیں''

تو دنیا سے بے خبری کو ایک حسن کی صفت کے طور پر قران کریم نے بیان فرمایا۔ معلوم ہوا کہ عورت اگر دنیا کے کاموں سے بے خبر ہو۔ اور اپنے فرائض کی حد تک واقف ہو اور دنیا کے معاملات اتنے نہ جانتی ہو تو وہ عورت کے حق میں عیب نہیں، بلکہ وہ صفت حسن ہے، جس کو قرآن کریم نے صفت حسن کے طور پر ذکر فرمایا۔

زبردستی سیدھا کرنے کی کوشش نہ کریں

لہٰذا جو چیز مرد کے حق میں عیب تھی، وہ عورت کے حق میں عیب نہیں اور جو چیز مرد کے حق میں عیب نہیں تھی بعض اوقات وہ عورت کے حق میں عیب ہوتی ہے۔ اس لئے اگر تمہیں ان کے اندر کوئی ایسی چیز نظر آئے جو تمہارے لئے عیب ہے لیکن عورت کے لئے عیب نہیں تو اس کی وجہ سے عورت کے ساتھ برتاؤ میں خرابی نہ کرو، اس لئے کہ پسلی ہونے کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے تمہاری طبیعت سے مختلف ہو تو اب اس کو زبردستی سیدھا کرنے کی کوشش نہ کرو۔

سارے جھگڑوں کی جڑ

یہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ اور آپ سے زیادہ مرد و عورت کی نفسیات سے کون واقف ہو سکتا ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے سارے جھگڑوں کی جڑ پکڑ لی کہ سارے جھگڑے صرف اس بنا پر ہوتے ہیں کہ مرد یہ چاہتا ہے کہ جیسا میں خود ہوں، یہ بھی ویسی بن جائے، تو بھائی! یہ تو ویسی بننے سے رہی، اگر ویسی بنانا چاہو گے تو ٹوٹ جائے گی اس لئے اس فکر کو تو چھوڑ دو، ہاں! جو چیزیں اس کے حق میں اس کے حالات کے لحاظ سے اس کی فطرت اور سرشت کے لحاظ سے اس کے لئے عیب ہیں، ان کی اصلاح کی فکر کرو، اور ان کی اصلاح کی فکر بھی مرد کی ذمہ داری ہے لیکن اگر تم یہ چاہو کہ وہ تمہارے مزاج اور طبیعت کے موافق ہو جائے، یہ نہیں ہو سکتا۔

---

(۱) النور: ۲۴

اس کی کوئی عادت پسندیدہ بھی ہوگی

اس باب کی دوسری حدیث بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ((لَایَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِیَ مِنْهَا آخَرَ))(۱)

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عجیب وغریب اصول بیان فرمایا کہ کوئی مومن مرد یا کسی مومن عورت سے بالکلیہ بغض نہ رکھے، یعنی یہ نہ کرے کہ اس کو بالکلیہ فضول، احمق اور نادان قرار دے دے، اور یہ کہے کہ اس میں تو کوئی اچھائی نہیں ہے۔ اگر اس کی کوئی بات ناپسند ہے تو اس کی دوسری کوئی بات پسند بھی ہوگی۔

پہلا اصول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتادیا کہ جب دو انسان ایک ساتھ رہتے ہیں تو کوئی بات دوسرے کی اچھی لگتی ہے، اور کوئی بری لگتی ہے۔ اگر کوئی بات بری لگ رہی ہے تو اس کی وجہ سے اس کو علی الاطلاق برا نہ سمجھو، بلکہ اس وقت اس کے اچھے اوصاف کا استحضار کرو، اس کے اندر آخر کوئی اچھائی بھی تو ہوگی۔ بس اس اچھائی کا استحضار کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یہ اچھائی تو اس کے اندر ہے، اگر یہ عمل کرو گے تو ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر جو برائیاں ہیں۔ تمہارے دل کے اندر ان کی اتنی زیادہ اہمیت باقی نہ رہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آدمی ناشکرا ہے۔ اگر دو تین باتیں پسند ہوئیں اور بری لگیں بس! انہیں کو لے کر بیٹھ گیا کہ اس میں تو یہ خرابی ہے۔ اس میں تو یہ خرابی ہے۔ اب اچھائی کی طرف دھیان نہیں۔ اس لئے ہر وقت روتا رہتا ہے۔ اور ہر وقت اس کی برائیاں کرتا رہتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے۔

ہر چیز خیر وشر سے مخلوط ہے

دنیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ جس کے اندر برائی نہ ہو اور اس میں کوئی نہ کوئی اچھائی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بنائی ہے۔ اس میں ہر چیز کے اندر خیر اور شر مخلوط ہے۔ کوئی چیز اس کائنات میں خیر مطلق نہیں اور کوئی شر مطلق نہیں۔ اس میں خیر وشر ملے جلے ہوتے ہیں، کوئی کافر ہے یا مشرک ہے یا کوئی برا انسان ہے، اگر اس کے اندر بھی اچھائی تلاش کرو گے تو کوئی نہ کوئی اچھائی ضرور مل جائے گی۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء، رقم: ۲۶۷۲، مسند أحمد، رقم: ۸۰۱۳

انگریزی کی ایک کہاوت

انگریزی کی ایک کہاوت ہے اور ہمارے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''حکمت کی بات مومن کی گمشدہ متاع ہے۔ جہاں وہ اس کو پائے، اسے لے لے''(۱)
لہٰذا انگریزی کہاوت ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ضرور غلط ہی ہو۔ بات بڑی حکیمانہ ہے، کسی نے کہا کہ ''وہ گھنٹہ یا گھڑی جو بند ہوگئی ہو وہ بھی دن میں دو بار سچ بولتی ہے۔'' مثلاً فرض کرو کہ بارہ بج کر پانچ منٹ پر گھڑی بند ہوگئی، اب ظاہر ہے کہ ہر وقت تو وہ صحیح ٹائم نہیں بتائے گی۔ بلکہ غلط بتائے گی۔ لیکن دن میں دو مرتبہ ضرور صحیح ٹائم بتائے گی۔ ایک دن میں بارہ بج کر پانچ منٹ پر، اور ایک رات میں بارہ بج کر پانچ منٹ پر، تو دو مرتبہ وہ ضرور سچ بولے گی۔
کہاوت کہنے والے کا مقصد یہ ہے کہ چاہے کتنی بھی بیکار اور بری چیز ہو۔ لیکن اگر اس میں اچھائی تلاش کرو گے تو مل جائے گی۔ اسی طرح دنیا کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے اندر کوئی نہ کوئی اچھائی نہ ہو۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ہمارے والد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ اقبال مرحوم کا ایک شعر بہت پڑھا کرتے تھے کہ ؎

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

مطلب یہ ہے کہ جو چیز بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ اپنی حکمت اور مشیت سے پیدا فرمائی ہے۔ اگر غور کرو گے تو ہر ایک کے اندر حکمت اور مصلحت نظر آئے گی لیکن ہوتا یہ ہے کہ آدمی صرف برائیوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ اچھائیوں کی طرف نگاہ نہیں کرتا۔ اس وجہ سے وہ بددل ہو کر ظلم اور ناانصافی کا ارتکاب کرتا ہے۔

عورت کے اچھے وصف کی طرف نگاہ کرو

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا:

(۱) سنن الترمذی، کتاب العلم عن رسول الله، باب ماجاء في فضل الفقه على العبادة، رقم: ۲۶۱۱، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب الحكمة، رقم: ۴۱۵۹

﴿فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾(۱)

اگر تمہیں وہ عورتیں پسند نہیں ہیں جو تمہارے نکاح میں آ گئیں، تو اگرچہ وہ تمہیں ناپسند ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں بہت خیر رکھی ہو۔ اس لئے حکم یہ ہے کہ عورت کے اچھے وصف کی طرف نگاہ کرو اس سے تمہارے دل کو تسلی بھی ہوگی اور بدسلوکی کے راستے بھی بند ہوں گے۔

ایک بزرگ کا سبق آموز واقعہ

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ کی بیوی بہت لڑنے جھگڑنے والی تھی۔ ہر وقت لڑتی رہتی تھی۔ جب گھر میں داخل ہوتے بس لعنت ملامت لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا۔ کسی صاحب نے ان بزرگ سے کہا کہ دن رات کی جھک جھک اور لڑائی آپ نے کیوں پالی ہوئی ہے، یہ قصہ ختم کر دیجئے اور طلاق دے دیجئے۔ تو ان بزرگ نے جواب دیا کہ بھائی! طلاق دینا تو آسان ہے، جب چاہوں گا، دے دوں گا، بات دراصل یہ ہے کہ اس عورت میں اور تو بہت سی خرابیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کے اندر ایک وصف ایسا ہے۔ جس کی وجہ سے میں ان کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ اور کبھی طلاق نہیں دوں گا۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر وفاداری کا ایسا وصف رکھا ہے کہ اگر بالفرض میں گرفتار ہو جاؤں اور پچاس سال تک جیل میں بند رہوں تو مجھے یقین ہے کہ میں اس کو جس کونے میں بٹھا کر جاؤں گا اسی کونے میں بیٹھی رہے گی۔ اور کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ اور یہ وفاداری ایسا وصف ہے کہ اس کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ اور نازک مزاجی

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کا نام سنا ہوگا بڑے ولی اللہ گزرے ہیں، اور ایسے نفیس مزاج اور نازک مزاج بزرگ تھے کہ اگر کسی نے صراحی کے اوپر گلاس ٹیڑھا رکھ دیا تو اس کو ٹیڑھا دیکھ کر سر میں درد ہو جاتا تھا۔ ایسے نازک مزاج آدمی تھے۔ ذرا بستر پر شکنیں آ جائیں تو سر میں درد ہو جاتا تھا۔ لیکن ان کو بیوی جو ملی وہ بڑی بدسلیقہ، بدمزاج، زبان کی پھوہڑ، ہر وقت کچھ نہ کچھ بولتی رہتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو عجیب عجیب طریقے سے آزماتے ہیں اور ان کے درجات بلند فرماتے

---

(۱) النساء: ۱۹

ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش تھی لیکن انہوں نے ساری عمر ان کے ساتھ نبھایا۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو شاید اس طرح معاف فرمادیں۔

ہمارے معاشرے کی خواتین دنیا کی حوریں ہیں

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے ہندوستان پاکستان کے معاشرے کی خواتین دنیا کی حوریں ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان فرماتے کہ ان کے اندر وفاداری کا وصف ہے جب سے مغربی تہذیب وتمدن کا وبال آیا ہے اس وقت سے رفتہ رفتہ یہ وصف بھی ختم ہوتا جا رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر وفاداری کا ایسا وصف رکھا ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے لیکن یہ اپنے شوہر پر جان نثار کرنے کے لئے تیار ہے۔ اور اس کی نگاہ شوہر کے علاوہ کسی اور پر نہیں پڑتی۔

بہر حال ان بزرگ نے حقیقت میں اسی حدیث پر عمل کر کے دکھلایا:

((اِنْ کَرِہَ مِنْھَا خُلُقًا رَضِیَ مِنْھَا آخَرَ))(۱)

کہ اگر ایک بات ناپسند ہے اس عورت کی، تو دوسری بات پسند بھی ہوگی اس کی طرف دھیان اور خیال کرو، اور اس کے نتیجے میں اس کے ساتھ حسن سلوک کرو، ساری خرابی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ برائیوں کی طرف نگاہ ہوتی ہے، اچھائیوں کی طرف نگاہ نہیں ہوتی۔

بیوی کو مارنا بداخلاقی ہے

اس باب کی تیسری حدیث ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ زَمْعَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّہٗ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَخْطُبُ ثُمَّ ذَکَرَ النِّسَآءَ فَوَعَظَ فِیْھِنَّ فَقَالَ ((یَعْمِدُ اَحَدُکُمْ فَیَجْلِدُ امْرَأَتَہٗ جَلْدَ الْعَبْدِ فَلَعَلَّہٗ یُضَاجِعُھَا مِنْ آخِرِ یَوْمِہٖ))(۲)

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس خطبے میں بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں، لیکن اس خطبے میں اس باب سے متعلق جو باتیں ارشاد فرمائیں وہ یہ کہ آپ نے فرمایا کہ یہ

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء، رقم: ۲۶۷۲، مسند أحمد، رقم: ۸۰۱۳

(۲) صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب وقال مجاهد بطغواها بمعاصيها ولا یخاف عقباها، رقم: ۴۵۶۱، صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، باب النار یدخلها الجبارون والجنة یدخلها الضعفاء، رقم: ۵۰۹۵ مسند أحمد، رقم: ۱۵۶۳۱

بری بات ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنی بیوی کو اس طرح مارتا ہے جیسے آقا اپنے غلام کو مارتا ہے۔ اور دوسری طرف اسی سے اپنی جنسی خواہش بھی پوری کرتا ہے یہ کتنی بداخلاقی اور بے غیرتی کی بات ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو اس طرح مارے جس طرح غلام کو مارا جاتا ہے۔

بیوی کی اصلاح کے تین درجات

جیسا کہ میں نے عرض کیا، قرآن کریم نے میاں بیوی کے تعلقات کی چھوٹی چھوٹی جزئیات اور مسائل کا حکم بھی بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے میاں بیوی کے درمیان چپقلش کا پہلا درجہ یہاں سے شروع ہو جاتا ہے کہ شوہر کو بیوی کی کوئی بات ناپسند ہوگئی اس کا حل قرآن کریم نے یہ بتا دیا کہ جب ایک بات تمہیں ناپسند ہوگئی تو تم یہ دیکھو کہ دوسری بات اس کے اندر پسندیدہ ہوگی، اور پھر بھی اگر شوہر یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اندر بعض باتیں ایسی ہیں جو قابل برداشت نہیں ہیں بلکہ اصلاح کے لائق ہیں اور ظاہر ہے کہ مرد کو اس بات کا بھی مکلف بنایا گیا ہے کہ اگر وہ بیوی میں کوئی بات قابل اصلاح اور بری دیکھے تو اس کی اصلاح کی فکر کرے لیکن اس کی اصلاح کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟ وہ طریقہ قرآن کریم نے یہ بتا دیا:

﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾(۱)

سب سے پہلے تو ان کو نرمی خوش اخلاقی اور محبت سے نصیحت کرو، یہ اصلاح کا پہلا درجہ ہے، اگر نصیحت کے ذریعہ وہ باز آجائیں تو بس، اب آگے قدم نہ بڑھاؤ، اور اگر وعظ ونصیحت کا اثر نہ ہو تو پھر اصلاح کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ سونا چھوڑ دو، اپنا بستر الگ کر دو، اگر ذرا بھی سمجھ ہوگی، فہم میں درستگی ہوگی تو اب باز آجائیں گی۔ (بستر الگ کرنے کی تفصیل آگے مستقل حدیث کے تحت آرہی ہے)

بیوی کو مارنے کی حد

اگر اصلاح کا دوسرا درجہ بھی کارگر ثابت نہ ہو تو پھر تیسرا درجہ اختیار کرو، وہ ہے مارنا، لیکن مار کیسی ہونی چاہیے؟ اور کس قدر ہونی چاہیے؟ اس کے بارے میں حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے امت کو جو آخری نصیحتیں فرمائیں، ان میں یہ نصیحت بھی فرمائی:

---

(۱) النساء: ۳۴

((وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْباً غَيْرَ مُبَرِّحٍ))(۱)

یعنی اول تو مار کا مرحلہ آنا بھی نہیں چاہیے اور اگر آئے بھی تو اس صورت کو صرف اس وقت استعمال کیا جائے جب اس کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہ رہے اس لئے کہ مار بالکل آخری چارہ کار ہے، اور اس میں یہ قید لگا دی کہ وہ مار تکلیف دینے والی نہ ہو، یعنی اس مار سے تکلیف دینا مقصود نہ ہو بلکہ تادیب مقصود ہو اور اصلاح مقصود ہو اس لئے تکلیف دینے والی ایسی مار جائز نہیں جس سے نشان پڑ جائے۔ (مارنے کے بارے میں مزید تفصیل ان شاء اللہ آگے مستقل حدیث کے تحت آ رہی ہے)

بیویوں کے ساتھ آپ ﷺ کا سلوک

جب نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اس وقت نو ازواج مطہرات آپ کے نکاح میں تھیں اور وہ ازواج مطہرات آسمان سے نزول کیے ہوئے فرشتے نہیں تھے وہ اسی معاشرے کے افراد تھے اور ان کے درمیان وہ باتیں بھی ہوا کرتی تھیں جو سوکنوں کے درمیان آپس میں ہوا کرتی ہیں۔ اور وہ مسائل بھی کھڑے ہوتے تھے جو بعض اوقات شوہر اور بیوی میں کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ساری عمر نہ صرف یہ کہ کسی خاتون پر ہاتھ نہیں اٹھایا بلکہ جب کبھی گھر کے اندر داخل ہوتے تو چہرہ مبارک پر تبسم ہوتا تھا۔ (۲)

آپ ﷺ کی سنت

سرکار دو عالم ﷺ کی سنت یہی ہے کہ ان پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، اور مارنے کی جو اجازت ہے، وہ ناگزیر حالات کے اندر ہے، ورنہ عام حالات میں تو مارنے کی اجازت بھی نہیں اور نبی کریم ﷺ کی سنت بھی نہیں ہے، سنت وہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے چہرہ مبارک پر تبسم ہوتا تھا۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ ہمیں

(۱) سنن الترمذي، كتاب الرضاع، باب ما جاء في حق المرأة على زوجها، رقم: ۱۰۸۳، وفي كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب من سورة التوبة، رقم: ۳۰۱۲

(۲) سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد، باب في ضحكه صلى الله عليه وسلم وتبسمه (۱۲۱/۷)، كنز العمال، رقم: ۱۸۷۱۹ (۲۲۲/۷)

کبھی کبھی تعلیم کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ ''آج میرے نکاح کو پچپن سال ہو گئے ہیں لیکن الحمدللہ کبھی اس پچپن سال کے عرصہ میں لہجہ بدل کر بات نہیں کی'' میں کہا کرتا ہوں کہ لوگ پانی پر تیرنے اور ہوا میں اڑنے کو کرامت سمجھتے ہیں اصل کرامت تو یہ ہے کہ پچپن سال بیوی کے ساتھ زندگی گزاری۔ اور یہ تعلق ایسا ہوتا ہے کہ جس میں یقیناً ناگواریاں پیدا ہوتی ہیں، یہ بات ممکن نہیں کہ ناگواری نہ ہوتی ہو، لیکن فرماتے ہیں کہ ''میں نے لہجہ بدل کر بات نہیں کی'' اور اس سے آگے بڑھ کر ان کی اہلیہ اور ہماری پیرانی صاحبہ فرماتی ہیں کہ ساری عمر مجھ سے یہ نہیں کہا کہ ''مجھے پانی پلا دو'' یعنی اپنی طرف سے کسی کام کا حکم نہیں دیا کہ یہ کام کر دو، میں خود اپنے شوق اور جذبے سے سعادت سمجھ کر ان کا خیال رکھتی اور ان کا کام کرتی تھی، لیکن ساری عمر زبان سے انہوں نے مجھے کسی چیز کا حکم نہیں دیا۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے تو اپنے آپ کو یہ سمجھ لیا ہے اور اسی پر اعتقاد رکھتا ہوں، اور اسی پر خاتمہ چاہتا ہوں کہ میں تو خادم ہوں، مجھے تو اللہ تعالیٰ نے خدمت کے لئے دنیا میں بھیجا ہے، جتنے میرے اہل تعلقات ہیں، ان کی خدمت میرے ذمے ہے میں مخدوم بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ دوسرے لوگ میری خدمت کریں، بلکہ میں خادم ہوں، اپنی بیوی کا بھی خادم، اپنے بچوں کا خادم، اپنے مریدین کا بھی خادم اور اپنے متعلقین کا بھی خادم ہوں اس لئے کہ بندے کے لئے خادمیت کا مقام اچھا ہے اس لئے میں خادم ہوں'' فرمایا کہ ؎

زتسبیح و سجادہ و دلق نیست
طریقت بجز خدمت خلق نیست

طریقت درحقیقت خدمت خلق ہی کا نام ہے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جب میں نے یہ سمجھ لیا کہ میں خادم ہوں۔ مخدوم نہیں ہوں۔ تو خادم دوسروں پر کیسے حکم چلائے کہ یہ کام کر دو۔ ساری عمر اس طرح گزاری کہ جب ضرورت پیش آتی، خود کام کرتے، کسی سے نہیں کہتے۔ یہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع، ظاہری چیزوں میں تو ہم لوگ سنت کا اتباع کر لیتے ہیں۔ لیکن اخلاق میں معاملات میں معاشرت میں اور زندگی گزارنے کے طریقوں میں بھی سنت کی اتباع کرنی چاہیے۔

صرف دعویٰ کافی نہیں

اتباع سنت بڑی عجیب وغریب چیز ہے۔ یہ انسان کی دنیا بھی بناتی ہے اور آخرت بھی بناتی

ہے، اور زندگی کو استوار کرتی ہے، اور یہ صرف دعویٰ کرنے سے حاصل نہیں ہوتی ؎

وَكُلٌّ يَدَّعِىْ حُبًّا لِلَيْلٰى
وَلَيْلٰى لَاتُقَرِّبُهُمْ بِذَالِكْ

یہ صرف عمل سے حاصل ہوتی ہے کہ آدمی اپنے اخلاق میں، اپنے کردار میں، اور اپنے عمل سے اس چیز کو اپنائے کہ جس کے ساتھ ادنیٰ تعلق بھی ہو گیا، اس کو اپنی ذات سے ادنیٰ تکلیف بھی نہ پہنچائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے بیوی کی اصلاح کا تیسرا درجہ جو بتایا ہے اس کی تشریح نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل سے اس طرح فرمائی ہے کہ ساری عمر میں کبھی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، چاہے کتنی ناگواری کیوں نہ ہو گئی، اور ان لوگوں کو جو اپنی بیویوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں، برے لوگ اور بدترین لوگ قرار دیا۔

خطبہ حجۃ الوداع کا ایک اقتباس

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْاَحْوَصِ الْجُشَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ يَقُوْلُ بَعْدَ اَنْ حَمِدَ اللّٰهَ تَعَالٰى وَاَثْنٰى عَلَيْهِ وَذَكَّرَ وَوَعَظَ ثُمَّ قَالَ: ((اَلَا وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَاِنَّمَا هُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ لَيْسَ تَمْلِكُوْنَ مِنْهُنَّ شَيْئًا غَيْرَ ذٰلِكَ، اِلَّا اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ))(۱)

اس حدیث میں حضور نبی کریم ﷺ کے آخری خطبہ کا ایک اقتباس بیان کیا گیا ہے، یہ خطبہ جو آنحضرت ﷺ نے اپنے آخری حج، حجۃ الوداع کے موقع پر دیا تھا، اس خطبہ میں صراحۃً آپ نے یہ فرما دیا کہ شاید اس سال کے بعد میں تم کو یہاں نہ دیکھ سکوں، لہٰذا اس خطبہ میں آپ نے وہ باتیں چن چن کر ارشاد فرمائیں جن کے اندر امت کے پھسل جانے اور گمراہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ تاکہ قیامت تک امت کے لئے ایک دستور العمل اور ایک لائحہ عمل سامنے آجائے؟ اور امت کی گمراہی کے جتنے راستے ہیں۔ اس خطبہ میں ان راستوں کو بند کرنے کی کوشش فرمائی۔

خطبہ تو بہت طویل ہے لیکن اس خطبہ کے مختلف حصے مختلف مقامات پر بیان ہوئے ہیں اور یہ بھی اسی خطبہ کا حصہ ہے، جس میں مرد و عورت کے باہمی حقوق کو بیان فرمایا گیا ہے پھر خاص کر

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ما جاء فی حق المرأة علی زوجها، رقم: ۱۰۸۳، وفی کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله، باب من سورة التوبة، رقم: ۳۰۱۲

مردوں کو عورتوں کے حقوق پہچاننے اور ان کا خیال رکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، اب آپ ان حقوق کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں یہ حقوق آپ ﷺ خطبہ حجۃ الوداع میں ایسے موقع پر ارشاد فرما رہے ہیں جبکہ یہ خیال بھی ہے کہ آئندہ اس طرح سب لوگوں کے سامنے بات کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ لہٰذا حضور اقدس ﷺ نے دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے جن چیزوں کو بیان کرنے کے لئے منتخب فرمایا، اور جن باتوں کی اہمیت آپ نے محسوس فرمائی کہ امت کو ہر حال میں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے، ان میں مرد و عورت کے باہمی حقوق بھی داخل ہیں۔

میاں بیوی کے تعلقات کی اہمیت

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی زندگی میں شوہر اور بیوی کے تعلقات کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ اور خود صاحب شریعت یعنی نبی کریم ﷺ نے اس کی کتنی اہمیت محسوس فرمائی ہے۔ کیونکہ اگر میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے کے حقوق صحیح طور پر ادا نہ کریں۔ اور باہم تلخیوں پر کمر باندھ لیں تو اس کے ذریعہ صرف ایک دوسرے کے حقوق ہی ضائع نہیں ہوتے، بلکہ بالآخر اس کا اثر دونوں خاندانوں پر پڑتا ہے اور بچوں پر اس کا اثر پڑتا ہے اور اس کی وجہ سے اولاد خراب ہوتی ہے اور چونکہ سارے تمدن کی بنیاد خاندان اور گھر پر ہے اس لئے اس کے نتیجے میں پورا تمدن بگڑ جاتا ہے، اس واسطے حضور اقدس ﷺ نے بڑی اہمیت کے ساتھ اس کی تاکید فرمائی۔

عورتیں تمہارے پاس مقید ہیں

حضرت عمرو بن الاحوص جشمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس خطبہ میں آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرمائی۔ اور وعظ و نصیحت فرمائی، اور پھر فرمایا کہ خوب سن لو، میں تمہیں عورتوں کے ساتھ بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں تم اس نصیحت کو قبول کرلو، یہ وہی جملہ ہے جو پچھلی حدیث میں آیا تھا۔ اور اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((فَاِنَّمَا هُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ))

''اس لئے کہ وہ خواتین تمہارے پاس تمہارے گھروں میں مقید رہتی ہیں''

نبی کریم ﷺ نے خواتین کا یہ ایک ایسا وصف بیان فرمایا کہ اگر مرد صرف اس وصف پر غور کرے تو اس کو کبھی ان کے ساتھ بدسلوکی کا خیال بھی نہ آئے۔

ایک نادان لڑکی سے سبق لو

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک نادان اور غیر تعلیم یافتہ لڑکی سے سبق لو کہ صرف دو بول پڑھ کر جب ایک شوہر سے تعلق قائم ہو گیا، ایک نے کہا کہ میں نے نکاح کیا۔ اور دوسرے نے کہا کہ میں نے قبول کر لیا۔ اس لڑکی نے اس دو بول کی ایسی لاج رکھی کہ ماں کو اس نے چھوڑا، باپ کو اس نے چھوڑا، بہن بھائیوں کو اس نے چھوڑا، اپنے خاندان کو چھوڑا، اور پورے کنبے کو چھوڑا، اور شوہر کی ہو گئی۔ اور اس کے پاس آ کر مقید ہو گئی تو اس دو بول کی اس نادان لڑکی نے اتنی لاج رکھی اور اتنی وفاداری کی۔ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک نادان لڑکی تو اس دو بول کا اتنا بھرم رکھتی ہے کہ سب کو چھوڑ کر ایک کی ہو گئی، لیکن تم سے یہ نہیں ہو سکا کہ تم یہ دو بول

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

پڑھ کر اس اللہ کے ہو جاؤ جس کے لئے یہ دو بول پڑھے تھے۔ تم سے تو وہ نادان لڑکی اچھی کہ یہ دو بول پڑھ کر اس کی اتنی لاج رکھتی ہے، تم سے اتنی لاج بھی نہیں رکھی جا سکتی کہ اس اللہ کے ہو جاؤ۔

عورت نے تمہارے لئے کتنی قربانیاں دی ہیں

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ یہ دیکھو کہ اس نے تمہاری خاطر کتنی بڑی قربانی دی۔ اگر بالفرض معاملہ برعکس ہوتا۔ اور تم سے یہ کہا جاتا کہ تمہاری شادی ہوگی، لیکن تمہیں اپنا خاندان چھوڑنا ہوگا۔ اپنے ماں باپ چھوڑنے ہوں گے۔ یہ تمہارے لئے کتنا مشکل کام ہوتا، ایک اجنبی ماحول، اجنبی گھر، اجنبی آدمی کے ساتھ زندگی بھر نباہ کے لئے وہ عورت مقید ہو گئی۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ کیا تم اس قربانی کا لحاظ نہیں کرو گے؟ اس قربانی کا لحاظ کرو، اور اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔

اس کے علاوہ تمہارا ان پر کوئی مطالبہ نہیں

اس کے بعد بڑا سنگین جملہ ارشاد فرمایا، جب کبھی اس جملے کی تشریح کی نوبت آتی ہے تو مرد لوگ ناراض ہو جاتے ہیں وہ جملہ یہ ہے:

((لَیْسَ تَمْلِکُوْنَ مِنْهُنَّ شَیْئًا غَیْرَ ذٰلِكَ))

یعنی تمہیں ان پر صرف اتنا حق حاصل ہے کہ وہ تمہارے گھر میں رہیں، اس کے علاوہ شرعاً ان پر تمہارا کوئی مطالبہ نہیں۔

کھانا پکانا عورت کی شرعی ذمہ داری نہیں

اسی بنیاد پر فقہاء کرام نے یہ مسئلہ بیان کیا جو بڑا نازک مسئلہ ہے۔ جس کے بیان کرنے سے بہت سے لوگ ناراض ہو جاتے ہیں، وہ مسئلہ یہ ہے کہ گھر کا کھانا پکانا عورت کی شرعی ذمہ داری نہیں ہے۔ یعنی شرعاً یہ فریضہ ان پر عائد نہیں ہوتا کہ وہ ضرور کھانا پکائیں۔ بلکہ فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ عورتوں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ان عورتوں کی ہے جو اپنے گھر میں اپنے میکے میں بھی گھر کا کام کیا کرتی تھیں۔ اور دوسری قسم کی عورتیں وہ ہیں جو اپنے گھر میں کھانا نہیں پکاتی تھیں۔ بلکہ نوکر چاکر تھے۔ وہ کھانا پکاتے تھے۔ اگر دوسری قسم کی عورت شادی کے بعد شوہر کے گھر آ جائے تو اس کے ذمہ کھانا پکانا کسی طرح بھی واجب نہیں نہ دیانۃً، نہ قضاءً، نہ اخلاقاً، نہ شرعاً، بلکہ وہ عورت شوہر سے کہہ سکتی ہے کہ میرا نفقہ تو تمہارے ذمہ واجب ہے بجائے اس کے کہ میں کھانے پکاؤں تم میرے لئے پکا پکا کھانا لا کر دو، چنانچہ فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ اس صورت میں پکا پکایا کھانا لا کر عورت کو دینا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ اور اس عورت سے نہ قضاء کھانا پکانے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ دیانۃً، اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ نے صاف اور واضح الفاظ میں یہ فرمایا:

((لَيْسَ تَمْلِكُونَ مِنْهُنَّ شَيْئًا غَيْرَ ذٰلِكَ))

یعنی تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ ان کو اپنے گھر پر رکھو اور تمہاری اجازت کے بغیر ان کو گھر سے باہر جانا جائز نہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ان پر کوئی ذمہ داری شرعاً نہیں ہے۔

اور اگر وہ پہلی قسم کی عورت ہے یعنی جو اپنے گھر میں کھانا پکاتی تھی۔ اور کھانا پکاتی ہوئی شوہر کے گھر آئی ہے تو اس کے ذمہ کھانا پکانا قضاء واجب نہیں ہے۔ لیکن دیانۃً واجب ہے۔ یعنی بزور عدالت تو اس سے کھانا پکانے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں! البتہ اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا کھانا خود پکائے۔ اس صورت میں شوہر کے ذمہ یہ ہے کہ وہ کھانا پکانے کا سامان لا کر دے دے۔ باقی شوہر یا بچوں کے لئے کھانا پکانا۔ یہ اس کی ذمہ داری بھی نہیں ہے۔ اور یہ عورت شوہر سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ تم میرے لئے پکا پکایا کھانا لا کر دو۔ لیکن اگر وہ شوہر اور بچوں کے لئے کھانا پکانے سے انکار کر دے تو اب اس سے عدالت کے زور پر کھانا پکانے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، فقہاء کرام نے اتنی تفصیل کے ساتھ یہ مسائل بیان فرمائے ہیں۔

ساس، سسر کی خدمت واجب نہیں

ایک بات اور سمجھ لیجیے جس میں بڑی کوتاہی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جب عورت کے ذمہ شوہر کا اور اس کی اولاد کا کھانا پکانا واجب نہیں تو شوہر کے جو ماں باپ اور بہن بھائی ہیں ان کے لئے کھانا پکانا اور ان کی خدمت کرنا بطریق اولیٰ واجب نہیں۔ ہمارے یہاں یہ دستور چل پڑا ہے کہ جب بیٹے کی شادی ہوئی۔ تو اس بیٹے کے ماں باپ یہ سمجھتے ہیں کہ بہو پر بیٹے کا حق بعد میں ہے، اور ہمارا حق پہلے ہے، لہٰذا یہ بہو ہماری خدمت ضرور کرے۔ چاہے بیٹے کی خدمت کرے یا نہ کرے، اور پھر اس کے نتیجے میں ساس بہو بھاوج اور نندوں کے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور ان جھگڑوں کے نتیجے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

ساس سسر کی خدمت عورت کی سعادت مندی ہے

خوب سمجھ لیجیے اگر والدین کو خدمت کی ضرورت ہے تو لڑکے کے ذمے واجب ہے کہ وہ خود ان کی خدمت کرے، البتہ اس لڑکے کی بیوی کی سعادت مندی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے والدین کی خدمت بھی خوش دلی سے اپنی سعادت اور باعث اجر سمجھ کر انجام دے، لیکن لڑکے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے والدین کی خدمت کرنے پر مجبور کرے، جبکہ وہ خوش دلی سے ان کی خدمت پر راضی نہ ہو۔ اور نہ والدین کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی بہو کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ ہماری خدمت کرے، لیکن اگر وہ بہو خوش دلی سے اپنی سعادت مندی سمجھ کر اپنے شوہر کے والدین کی جتنی خدمت کرے گی ان شاء اللہ اس کے اجر میں بہت اضافہ ہوگا۔ اس بہو کو ایسا کرنا بھی چاہیے۔ تاکہ گھر کی فضا خوش گوار رہے۔

بہو کی خدمت کی قدر کریں

لیکن ساتھ ہی دوسری جانب ساس، سسر اور شوہر کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر یہ خدمت انجام دے رہی ہے تو یہ اس کا حسن سلوک ہے اس کا حسن اخلاق ہے، اس کے ذمہ یہ خدمت فرض واجب نہیں ہے۔ لہٰذا ان کو چاہیے کہ وہ بہو کی اس خدمت کی قدر کریں۔ اور اس کا بدلہ دینے کی کوشش کریں۔ ان حقوق اور مسائل کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں آج گھر کے گھر برباد ہو رہے ہیں۔ ساس بہو کی اور بھاوج اور نندوں کی لڑائیوں نے گھر کے گھر اجاڑ دیئے، یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ ان حقوق کی وہ حدود جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی ہیں وہ ذہنوں میں موجود نہیں ہیں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عجیب واقعہ

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک دن بڑا عجیب واقعہ سنایا کہ میرے متعلقین میں ایک صاحب تھے۔ وہ اور ان کی بیوی دونوں میری مجلس میں آیا کرتے تھے اور کچھ اصلاحی تعلق بھی قائم کیا ہوا تھا۔ دونوں نے ایک مرتبہ اپنے گھر میری دعوت کی چنانچہ میں ان کے گھر گیا، اور جا کر کھانا کھایا اور کھانا بڑا اچھا بنا ہوا تھا۔ ہمارے حضرت والا قدس اللہ سرہ کی ہمیشہ ہی عادت تھی کہ جب کھانا کھاتے تو کھانے کے بعد کھانا بنانے والی خاتون کی تعریف کرتے کہ تم نے بہت اچھا کھانا پکایا، تا کہ اس کی حوصلہ افزائی ہو، اس کا دل بڑھے، چنانچہ جب حضرت والا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو وہ خاتون پردے کے پیچھے آئیں اور آ کر حضرت والا کو سلام کیا تو حضرت والا نے فرمایا تم نے بڑا لذیذ کھانا اور اچھا کھانا بنایا کھانا کھانے میں بڑا مزہ آیا۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ جملہ کہا تو پردے کے پیچھے سے اس خاتون کی سسکیاں لینے اور رونے کی آواز آئی میں حیران ہو گیا کہ معلوم نہیں کہ میری کس بات سے ان کو تکلیف پہنچی اور ان کا دل ٹوٹا میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟ ان خاتون نے اپنے رونے پر بمشکل قابو پاتے ہوئے یہ کہا کہ حضرت! آج مجھے ان شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے چالیس سال ہو گئے ہیں لیکن اس پورے عرصے میں کبھی میں نے ان کی زبان سے یہ جملہ نہیں سنا کہ ''آج کھانا اچھا بنا ہے'' آج جب آپ کے منہ سے یہ جملہ سنا تو مجھے رونا آ گیا۔

ایسا شخص کھانے کی تعریف نہیں کرے گا

حضرت والا بکثرت یہ واقعہ سنا کر فرماتے تھے کہ وہ شخص یہ کام ہرگز نہیں کر سکتا جس کے دل میں یہ احساس ہو کہ یہ بیوی کھانے پکانے کی جو خدمت انجام دے رہی ہے، یہ اس کا حسن سلوک اور حسن معاملہ ہے جو وہ میرے ساتھ کر رہی ہے، لیکن جو شخص اپنی بیوی کو نوکر اور خادم سمجھتا ہو کہ یہ میری خادمہ ہے، اس کو تو یہ کام ضرور انجام دینا ہے۔ کھانا پکانا اس کا فرض ہے۔ اگر کھانا اچھا پکا رہی ہے تو اس پر اس کی تعریف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایسا شخص کبھی اپنی بیوی کی تعریف نہیں کرے گا۔

شوہر اپنے ماں باپ کی خدمت خود کرے

ایک مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ والدین ضعیف ہیں یا بیمار ہیں۔ اور ان کو خدمت کی ضرورت

ہے، گھر میں صرف بیٹا اور بہو ہے، اب کیا کیا جائے؟ اس صورت میں بھی شرعی مسئلہ یہ ہے کہ بہو کے ذمے واجب نہیں کہ وہ شوہر کے والدین کی خدمت کرے، البتہ اس کی سعادت اور خوش نصیبی ہے، اور اجروثواب کا موجب ہے، اگر خدمت کرے گی تو ان شاء اللہ بڑا ثواب حاصل ہوگا۔ لیکن بیٹے کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ کام میرا ہے۔ مجھے چاہیے کہ اپنے والدین کی خدمت کروں، اب چاہے وہ خدمت خود کرے، یا کوئی نوکر اور خادمہ رکھے، لیکن اگر بیوی خدمت کر رہی ہے تو یہ اس کا حسن سلوک اور احسان سمجھنا چاہیے۔

عورت کو اجازت کے بغیر باہر جانا جائز نہیں

لیکن ایک قانون اس کے ساتھ اور بھی سن لیں، ورنہ معاملہ الٹا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ لوگ جب یک طرفہ بات سن لیتے ہیں تو اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے تفصیل کے ساتھ عرض کیا کہ کھانا پکانا عورت کے ذمہ شرعاً واجب نہیں۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ یہ تمہارے گھروں میں مقید رہتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری اجازت کے بغیر ان کے لئے کہیں جانا جائز نہیں۔ لہٰذا جس طرح فقہاء کرام نے کھانا پکانے کا مسئلہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، اسی طرح فقہاء نے یہ قانون بھی لکھا ہے کہ اگر شوہر عورت سے یہ کہہ دے کہ تم گھر سے باہر نہیں جاسکتیں۔ اور اپنے عزیز واقارب سے ملنے نہیں جاسکتیں۔ حتیٰ کہ اس کے والدین سے بھی ملنے کے لئے جانے سے منع کر دے تو عورت کے لئے ان سے ملاقات کے لئے گھر سے باہر جانا جائز نہیں۔ البتہ اگر والدین اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے اس کے گھر آجائیں تو اب شوہر ان والدین کو ملاقات کرنے سے نہیں روک سکتا، لیکن فقہاء نے اس کی حد مقرر کر دی ہے کہ اس کے والدین ہفتے میں ایک مرتبہ آئیں اور ملاقات کر کے چلے جائیں۔ یہ اس عورت کا حق ہے۔ شوہر اس سے نہیں روک سکتا لیکن اجازت کے بغیر اس کے لئے جانا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے درمیان اس طرح توازن برابر کیا ہے کہ عورت کے ذمے قانونی اعتبار سے کھانا پکانا واجب نہیں تو دوسری طرف قانونی اعتبار سے اس کا گھر سے باہر نکلنا شوہر کی اجازت کے بغیر جائز نہیں۔

دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کو چلائیں

یہ قانون کی بات تھی۔ لیکن حسن سلوک کی بات یہ ہے کہ وہ اس کی خوشی کا خیال رکھے۔ اور یہ اس کی خوشی کا خیال رکھے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی اپنے درمیان یہ تقسیم کار فرما رکھی

تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ گھر کے باہر کے تمام کام انجام دیتے تھے۔ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گھر کے اندر تمام کام انجام دیتی تھیں۔ یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اور اسی پر عمل ہونا چاہیے۔ دونوں میاں بیوی قانون کی باریکیوں میں ہر وقت نہ پڑے رہیں۔ بلکہ شوہر بیوی کے ساتھ اور بیوی شوہر کے ساتھ خوش اسلوبی کا معاملہ کرے۔ اور یہ فطری تقسیم بھی ہے کہ گھر کے کام بیوی کے ذمے اور باہر کے کام شوہر کے ذمہ ہوں۔ اس طرح دونوں مل کر زندگی کی گاڑی کو چلائیں۔

اگر بے حیائی کا ارتکاب کریں تو؟

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے ارشاد فرمایا:

((اِلَّا اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ فَاِنْ فَعَلْنَ فَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَیْرَ مُبَرِّحٍ فَاِنْ اَطَعْنَ فَلَاتَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا))

ہاں! اگر وہ عورتیں گھر میں کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں تو وہ بے حیائی کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں، اس صورت میں قرآن کریم کے بتائے ہوئے نسخے کے مطابق پہلے ان کو نصیحت کرو۔ اور اس کے بعد اگر وہ باز نہ آئیں تو ان کا بستر الگ کر دو۔ اور پھر بھی اگر باز نہ آئیں تو بدرجہ مجبوری اس بے حیائی پر مارنے کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ وہ مار تکلیف دینے والی نہ ہو۔ اور اس کے بعد اگر وہ تمہاری اطاعت کرلیں۔ اور باز آجائیں تو اب اس کے بعد کوئی راستہ ان کے خلاف تلاش نہ کرو، یعنی ان کو مزید تکلیف پہنچانے کی گنجائش نہیں۔

((اَلَا وَحَقُّهُنَّ عَلَیْکُمْ اَنْ تُحْسِنُوْا اِلَیْهِنَّ فِیْ کِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ))

خبردار! ان عورتوں کا تم پر یہ حق ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھا معاملہ کرو، ان کے لباس میں اور ان کے کھانے میں اور ان کی دوسری ضروریات جو تمہارے ذمہ واجب ہیں تم ان میں احسان سے کام لو، صرف یہ نہیں کہ انتہائی ناگزیر ضرورت پوری کر دی، بلکہ احسان، فراخدلی اور کشادگی سے کام لو، اور ان کے لباس اور کھانے پر خرچ کرو۔

بیوی کو جیب خرچ الگ دیا جائے

یہاں دو تین باتیں اس سلسلے میں عرض کرنی ہیں، جن پر حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے اپنے مواعظ میں جا بجا زور دیا ہے۔ اور عام طور پر ان باتوں کی طرف سے غفلت پائی جاتی ہے۔ پہلی بات جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی، وہ یہ کہ نفقہ صرف یہ نہیں ہے کہ بس! کھانے کا

انتظام کر دیا، اور کپڑے کا انتظام کر دیا۔ بلکہ نفقہ کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ کھانے اور کپڑے کے علاوہ بھی کچھ رقم بطور جیب خرچ کے بیوی کو دی جائے۔ جس کو وہ آزادی کے ساتھ اپنی خواہش کے مطابق صرف کر سکے۔ بعض لوگ کھانے اور کپڑے کا تو انتظام کر دیتے ہیں۔ لیکن جیب خرچ کا اہتمام نہیں کرتے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جیب خرچ دینا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ انسان کی بہت سی ضروریات ایسی ہوتی ہیں جس کو بیان کرتے ہوئے بھی انسان شرماتا ہے، یا اس کو بیان کرتے ہوئے الجھن محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے کچھ رقم بیوی کے پاس ایسی ضروریات کے لئے بھی ہونی چاہیے، تاکہ وہ دوسرے کی محتاج نہ ہو، یہ بھی نفقہ کا ایک حصہ ہے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ جو لوگ یہ جیب خرچ نہیں دیتے، وہ اچھا نہیں کرتے۔

خرچہ میں فراخ دلی سے کام لینا چاہیے

دوسری بات یہ ہے کہ کھانے پینے میں اچھا سلوک کرو، یہ نہ ہو کہ صرف ''قوت لایموت'' دے دی، یعنی اتنا کھانا دے دیا جس سے موت نہ آئے۔ بلکہ احسان کرو، اور احسان کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی آمدنی کے معیار کے مطابق فراخی اور کشادگی کے ساتھ گھر کا خرچہ اس کو دے۔ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خلجان رہتا ہے کہ شریعت میں ایک طرف فضول خرچی اور اسراف کی ممانعت آئی ہے، اور دوسری طرف یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ گھر کے خرچ میں تنگی مت کرو، بلکہ کشادگی سے کام لو، اور اب سوال یہ ہے کہ دونوں میں حد فاصل کیا ہے؟ کون سا خرچہ اسراف میں داخل ہے اور کون سا خرچہ اسراف میں داخل نہیں؟

رہائش جائز، آسائش جائز

اس خلجان کے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے گھر کے بارے میں فرمایا کہ ایک ''گھر'' وہ ہوتا ہے جو قابل رہائش ہو۔ مثلاً جھونپڑی ڈال دی، یا چھپر ڈال دیا، اس میں بھی آدمی رہائش اختیار کر سکتا ہے۔ یہ تو پہلا درجہ ہے، جو بالکل جائز ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ رہائش بھی ہو، اور ساتھ میں آسائش بھی ہو، مثلاً پختہ مکان ہے۔ جس میں انسان آرام کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ اور گھر میں آسائش کے لئے کوئی کام کیا جائے تو اس کی ممانعت نہیں ہے اور یہ بھی اسراف میں داخل نہیں مثلاً ایک شخص ہے وہ جھونپڑی میں بھی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور دوسرا شخص جھونپڑی میں نہیں رہ سکتا اس کو تو رہنے کے لئے پختہ مکان چاہیے۔ اور پھر اس مکان میں بھی اس کو پنکھا اور بجلی چاہیے۔ اب اگر وہ شخص اپنے

گھر میں پنکھا اور بجلی اس لئے لگاتا ہے تا کہ اس کو آرام حاصل ہو۔ تو یہ اسراف میں داخل نہیں۔

آرائش بھی جائز

تیسرا درجہ یہ ہے کہ مکان میں آسائش کے ساتھ آرائش بھی ہو۔ مثلاً ایک شخص کا پختہ مکان بنا ہوا ہے۔ پلاستر کیا ہوا ہے بجلی بھی ہے پنکھا بھی ہے۔ لیکن اس مکان پر رنگ نہیں کیا ہوا، اب ظاہر ہے کہ رہائش تو ایسے مکان میں بھی ہو سکتی ہے لیکن رنگ و روغن کے بغیر آرائش نہیں ہو سکتی، اب اگر کوئی شخص آرائش کے حصول کے لئے مکان پر رنگ و روغن کرائے تو شرعاً وہ بھی جائز ہے۔

نمائش جائز نہیں

اس کے بعد چوتھا درجہ ہے ''نمائش'' اب جو کام کر رہا ہے اس سے نہ تو آرام مقصود ہے، نہ آرائش مقصود ہے۔ بلکہ اس کام کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ مجھے بڑا دولت مند سمجھیں، اور لوگ یہ سمجھیں کہ اس کے پاس بہت پیسہ ہے، اور تا کہ اس کے ذریعہ دوسروں پر اپنی فوقیت جتاؤں، اور اپنے آپ کو بلند ظاہر کروں، یہ سب ''نمائش'' کے اندر داخل ہے اور یہ شرعاً ناجائز ہے۔ اور اسراف میں داخل ہے۔

فضول خرچی کی حد

یہی چار درجات لباس اور کھانے میں بھی ہیں بلکہ ہر چیز میں ہیں ایک شخص اچھا اور قیمتی کپڑا اس لئے پہنتا ہے تا کہ مجھے آرام ملے اور تا کہ مجھے اچھا لگے، اور میرے گھر والوں کو اچھا لگے، اور میرے ملنے جلنے والے اس کو دیکھ کر خوش ہوں، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر کوئی شخص اچھا اور قیمتی لباس اس نیت سے پہنتا ہے، تا کہ مجھے دولت مند سمجھا جائے، مجھے بہت پیسے والا سمجھا جائے، اور میرا بڑا مقام سمجھا جائے تو یہ نمائش ہے اور ممنوع ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسراف کے بارے میں واضح حد فاصل کھینچ دی کہ اگر ضرورت پوری کرنے کے لئے کوئی خرچہ کیا جا رہا ہے۔ یا آسائش کے حصول کے لئے یا اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے آرائش کی خاطر کوئی خرچہ کیا جا رہا ہے وہ اسراف میں داخل نہیں۔

یہ اسراف میں داخل نہیں

میں ایک مرتبہ کسی دوسرے شہر میں تھا۔ اور واپس کراچی آنا تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے

ایک صاحب سے کہا کہ ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں میرا ٹکٹ بک کرا دو، اور میں نے ان کو پیسے دے دیئے، ایک دوسرے صاحب پاس بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے فوراً کہا کہ صاحب! یہ تو آپ اسراف کر رہے ہیں، اس لئے کہ ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں سفر کرنا تو اسراف میں داخل ہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر اوپر کے درجے میں سفر کر لیا تو یہ اسراف میں داخل ہے خوب سمجھ لیجیے، اگر اوپر کے درجے میں سفر کرنے کا مقصد راحت حاصل کرنا ہے، مثلاً گرمی کا موسم ہے۔ گرمی برداشت نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے پیسے دیئے ہیں تو پھر اس درجے میں سفر کرنا کوئی گناہ اور اسراف نہیں ہے۔ لیکن اگر اوپر کے درجے میں سفر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب میں ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں سفر کروں گا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ بڑا دولت مند آدمی ہے تو پھر وہ اسراف اور ناجائز ہے۔ اور نمائش میں داخل ہے، یہی تفصیل کپڑے اور کھانے میں بھی ہے۔

ہر شخص کی کشادگی کا معیار الگ ہے

لہٰذا شوہر کو چاہیے کہ ان درجات کو مدنظر رکھتے ہوئے بیوی کے نفقہ اور لباس میں کشادگی کے ساتھ خرچ کرے۔ ہر آدمی کی کشادگی الگ الگ ہوتی ہے۔ میرے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ بیان فرماتے ہوئے کہنے لگے کہ بھائی! ایک آدمی ایسا ہے جس کا نہ کوئی آگا نہ پیچھا، یعنی نہ کوئی اس کا رشتہ دار ہے۔ نہ کوئی عزیز واقارب ہے، اور نہ کوئی دوست ہے، اگر ایسا شخص اپنے گھر میں ایک بستر ایک رکابی، ایک ڈونگا رکھ لے تو بس! اس کے لئے یہ برتن کافی ہیں اب اگر اور زیادہ برتن جمع کرے گا تو اس کا مقصد سوائے نمائش کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اور اسراف ہوگا، لیکن ایک دوسرا آدمی جس کے مہمان آتے ہیں، جس کے تعلقات وسیع ہیں۔ جس کے عزیز واقارب بہت زیادہ ہیں، اس کی ضرورت اور کشادگی کا معیار اور ہے اب اگر ایسے شخص کے گھر میں بعض اوقات برتنوں کے سو سیٹ بھی ہوں یا سو بستر بھی ہوں تب بھی ان میں سے ایک برتن اور ایک بستر بھی اسراف میں داخل نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ سب اس کی ضرورت میں داخل ہیں، اس لئے فرمایا کہ ہر آدمی کا کشادگی کا معیار الگ ہوتا ہے۔

اس محل میں خدا کو تلاش کرنے والا احمق ہے

بعض اوقات لوگ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے بادشاہ تھے ان کا قصہ سن کر اسی سے استدلال کرتے ہیں، جن کا قصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے رات کے وقت

ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ محل کی چھت پر گھوم رہا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو پکڑ کر پوچھا کہ رات کے وقت یہاں محل کی چھت پر کیا کر رہے ہو؟ اس آدمی نے کہا کہ اونٹ تلاش کرنے آیا ہوں، میرا اونٹ گم ہو گیا ہے۔ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ارے بے وقوف، کم عقل، رات کے وقت محل کی چھت پر اونٹ تلاش کر رہا ہے۔ تجھے یہاں اونٹ کیسے ملے گا؟ اس آدمی نے حیرت سے پوچھا یہاں اونٹ نہیں مل سکتا؟ حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ نہیں، تجھے یہاں محل کی چھت پر اونٹ کیسے ملے گا؟ اس آدمی نے کہا کہ اگر اس محل میں اونٹ نہیں مل سکتا اور اس محل میں اونٹ تلاش کرنے والا احمق ہے۔ تو یہ بھی سمجھ لو کہ تم یہاں رہتے ہوئے خدا کو تلاش کر رہے ہو، تمہیں خدا بھی نہیں مل سکتا، اگر میں احمق ہوں تو مجھ سے زیادہ تم احمق ہو۔ بس! اس وقت حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر ایک چوٹ لگی، اور اسی وقت ساری بادشاہت چھوڑ کر جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور روانہ ہوتے وقت سوچا کہ اب تو اللہ کی یاد میں زندگی بسر کرنی ہے۔ اس لئے صرف ایک تکیہ اور ایک پیالہ ساتھ لے لیا تا کہ کھانے پینے کی ضرورت پیش آئے گی تو اس پیالے میں کھا پی لیں گے۔ اور سونے کی ضرورت پیش آئے گی تو زمین پر تکیہ رکھ کر سو جائیں گے، جب کچھ آگے چلے تو دیکھا کہ ایک آدمی دریا کے کنارے بیٹھا ہے اور چلو بنا کر پانی پی رہا ہے آپ نے سوچا کہ یہ پیالہ میں نے اپنے ساتھ فضول لے لیا۔ یہ کام تو ہاتھوں کے ذریعہ بھی ہو سکتا ہے چنانچہ وہ پیالہ پھینک دیا اور آگے روانہ ہو گئے کچھ اور آگے گئے تو دیکھا کہ ایک آدمی سر کے نیچے اپنا ہاتھ رکھ کر سو رہا ہے، پھر سوچا کہ یہ تکیہ بھی میں نے فضول لیا۔ تکیہ تو اللہ تعالیٰ نے خود دے رکھا ہے۔ اس سے کام چلائیں گے چنانچہ وہ تکیہ بھی پھینک دیا۔

غلبہ حال کی کیفیت قابل تقلید نہیں

اس قصہ کی وجہ سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ پیالہ رکھنا بھی اسراف ہے۔ اور تکیہ رکھنا بھی اسراف ہے اللہ تعالیٰ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ وہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی نکھار کر چلے گئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنے حالات کو حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پر قیاس مت کرو، ایک تو اس وجہ سے کہ جو کیفیت حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ پر طاری ہوئی، وہ غلبہ حال کی کیفیت تھی، وہ قابل تقلید کیفیت نہیں تھی۔ اور غلبہ حال کا مطلب یہ ہے کہ کسی وقت طبیعت پر کسی بات کا اتنا غلبہ ہو جاتا ہے کہ آدمی اس حالت میں معذور ہو جاتا ہے، معذور ہونے کی وجہ سے اس کے حالات دوسروں کے لئے قابل تقلید نہیں رہتے۔ اس لئے حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے یہ حالات ہمارے اور آپ کے لئے قابل تقلید نہیں۔ ورنہ دماغ میں یہ بات جم جائے گی

کہ تکیہ بھی چھوڑ دو، اور پیالہ بھی چھوڑ دو، اور گھر بار بھی چھوڑ دو، بیوی بچے چھوڑ دو، اس لئے کہ خدا اس کے بغیر نہیں ملے گا۔ حالانکہ دین کا یہ تقاضا نہیں، بلکہ یہ غلبہ حال کی کیفیت ہے جو حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ پر طاری ہوئی۔

آمدنی کے مطابق کشادگی ہونی چاہیے

دوسرے یہ کہ ہر آدمی کی ضرورت اس کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں، لہٰذا کشادگی کا معیار بھی ہر انسان کا الگ ہے۔ اب جو شخص کم آمدنی والا ہے۔ اس کی کشادگی کا معیار اور ہے، اور جو متوسط آمدنی والا ہے۔ اس کا معیار اور ہے، اور جو زیادہ آمدنی والا ہے اس کی کشادگی کا معیار اور ہے اس لئے ہر شخص کی آمدنی کے معیار کے اعتبار سے کشادگی ہونی چاہیے، یہ نہ ہو کہ شوہر بیچارے کی آمدنی تو کم ہے۔ اور ادھر بیوی صاحبہ نے دولت مند قسم کے لوگوں کے گھر میں جو چیزیں دیکھیں، ان کی نقل اتارنے کی فکر لگ گئی، اور شوہر سے اس کی فرمائش ہونے لگی۔ اس قسم کی فرمائشوں کا تو کوئی جواز نہیں۔ لیکن شوہر کو چاہیے کہ اپنی آمدنی کو مدنظر رکھتے ہوئے کشادگی سے کام لے۔ اور اپنی بیوی کے حق میں بخل اور کنجوسی سے کام نہ لے۔

بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟

((عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ حَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا حَقُّ زَوْجَةِ اَحَدِنَا عَلَيْهِ؟ قَالَ: ((اَنْ تُطْعِمَهَا اِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوَهَا اِذَا اكْتَسَيْتَ أَوِ اكْتَسَبْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ، وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِي الْبَيْتِ))(۱)

حضرت معاویہ بن حیدۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم لوگوں کی بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ، اور جب تم پہنو تو اس کو بھی پہناؤ، اور یہ کہ چہرے پر نہ مارو، اور برا بھلا مت کہو۔

''تقبح'' کے معنی ہیں طعنے دینا۔ برا بھلا کہنا۔ اور اس سے دل آزاری کی باتیں کرنا۔

اس کا بستر چھوڑ دو

جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا کہ اگر تم عورت کے اندر کوئی بے حیائی کی بات دیکھو تو پہلے اس کو

---

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب النكاح، باب في حق المرأة على زوجها، رقم: ۱۸۳۰، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق المرأة على الزوج، رقم: ۱۸٤۰

سمجھاؤ، اگر سمجھانے سے باز نہ آئے تو اس کا بستر چھوڑ دو۔ اور الگ بستر پر سونا شروع کر دو، اس حدیث میں بستر چھوڑنے کی تفصیل یہ بیان فرمادی کہ بستر چھوڑنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم گھر سے باہر چلے جاؤ۔ بلکہ گھر کے اندر ہی رہو۔ البتہ احتجاج کے طور پر تادیبی طور پر، اور ایک نفسیاتی مار کے طور پر کمرہ بدل دو، یا بستر بدل دو، اور اس سے علیحدگی اختیار کرلو۔

علیحدگی کی ناجائز صورت

علماء نے اس حدیث کے یہ معنی بھی بیان فرمائے ہیں کہ ایسے موقع پر اگرچہ بستر تو الگ کر دو، لیکن بالکلیہ بات چیت ختم نہ کرو، اور ایسی علیحدگی نہ ہو کہ ایک دوسرے کو سلام بھی نہ کیا جائے۔ اور سلام کا جواب بھی نہ دیا جائے اور کوئی ضروری بات کرنی ہو تو اس کا جواب بھی نہ دیا جائے۔ اس طرح کی علیحدگی جائز نہیں ہے۔

چار ماہ سے زیادہ سفر میں بیوی کی اجازت

اس حدیث کے تحت فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ مرد کے لئے چار مہینہ سے زیادہ گھر سے باہر رہنا بیوی کی اجازت اور اس کی خوش دلی کے بغیر جائز نہیں، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تمام قلمرو میں یہ حکم جاری فرمادیا تھا کہ جو مجاہدین گھر سے باہر رہتے ہیں، وہ چار ماہ سے زیادہ گھر سے باہر نہ رہیں اور اسی وجہ سے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کو چار ماہ سے کم کا سفر درپیش ہو تو اس کے لئے بیوی کی اجازت کی ضرورت نہیں، لیکن اگر چار ماہ سے زیادہ کا سفر درپیش ہو تو اس کے لئے بیوی سے اجازت لینی ضروری ہے۔ چاہے وہ سفر کتنا ہی بابرکت کیوں نہ ہو، حتیٰ کہ اگر حج کا سفر ہو تو اس میں بھی اگر وہ چار ماہ کے اندر واپس آسکتا ہے، تو پھر اجازت کی ضرورت نہیں، اگر نفلی طور پر وہاں زیادہ قیام کا ارادہ ہے تو پھر اجازت لینی ضروری ہے، یہی حکم تبلیغ، دعوت اور جہاد کے سفر کا ہے۔ لہٰذا جب ان مبارک سفروں میں بیوی کی اجازت ضروری ہے تو پھر جو لوگ ملازمت کے لئے پیسہ کمانے کے لئے لمبے سفر کرتے ہیں ان میں تو بطریق اولیٰ بیوی کی اجازت ضروری ہے، اگر بیوی کی اجازت کے بغیر جائیں گے تو یہ بیوی کی حق تلفی ہوگی اور شرعاً ناجائز ہوگا اور ایسا کرنے سے گناہ گار ہوں گے۔

بہترین لوگ کون ہیں؟

اگلی حدیث میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَخِیَارُكُمْ خِیَارُكُمْ لِنِسَائِهٖ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام مومنوں میں ایمان کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامل وہ شخص ہے۔ جو اخلاق کے اعتبار سے ان میں سب سے اچھا ہو۔ جو شخص جتنا زیادہ خوش اخلاق ہوگا، وہ اتنا ہی کامل ایمان والا ہوگا۔ اس لئے کامل ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ حسن اخلاق کا معاملہ کرے، اور تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں اور اپنی عورتوں کے لئے بہتر ہوں، ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے ہوں۔

آج کے دور میں ''خوش اخلاقی''

آج کل ہر چیز کے معنی بدل گئے ہر چیز کا مفہوم الٹ گیا، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے زمانہ کے مقابلہ میں اب اس دور میں ہر چیز الٹی ہوگئی، یہاں تک پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوتا تھا، اور اب بلب کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے، پھر فرماتے کہ آج کل ہر چیز کی قدریں بدل گئیں ہر چیز کا مفہوم الٹ گیا۔ حتیٰ کہ اخلاق کا مفہوم بھی بدل گیا آج صرف چند ظاہری حرکات کا نام اخلاق ہے مثلاً مسکرا کر مل لئے، اور ملاقات کے وقت رسمی الفاظ زبان سے ادا کر دیئے۔ مثلاً یہ کہہ دیا کہ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی'' یا ''آپ سے مل کر بڑا اچھا معلوم ہوا'' وغیرہ۔ اب زبان سے تو یہ الفاظ ادا کر رہے ہیں، لیکن دل کے اندر عداوت اور حسد کی آگ سلگ رہی ہے، دل کے اندر نفرت کروٹیں لے رہی ہے بس آج اسی کا نام خوش اخلاقی ہے۔ اور آج باقاعدہ یہ ایک فن بن گیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے تاکہ دوسرے لوگ ہمارے گرویدہ ہو جائیں اور باقاعدہ اس پر کتابیں لکھی جارہی ہیں کہ دوسرے کو گرویدہ بنانے کے لئے اور دوسرے کو متاثر کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کیے جائیں؟ لہٰذا سارا زور اس پر صرف ہورہا ہے کہ دوسرا گرویدہ ہو جائے دوسرا ہم سے متاثر ہو جائے اور ہم کو اچھا سمجھنے لگے۔ آج اسی کا نام ''اخلاق'' رکھا جاتا ہے۔

خوب سمجھ لیجیے اس کا اس اخلاق سے کوئی تعلق نہیں جس کا ذکر حضور اقدس ﷺ فرما رہے ہیں۔ یہ اخلاق نہیں، بلکہ ریاکاری اور دکھاوا ہے اور یہ نمائش ہے اور یہ دوسرے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے اور اپنے گرد اکٹھا کرنے کا بہانہ ہے، یہ حب جاہ ہے، یہ حب شہرت ہے، جو بذات خود بیماری

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها، رقم: ۱۰۸۳، مسند أحمد، رقم: ۷۰۹۵

اور بداخلاقی ہیں، حسن اخلاق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

''حسن اخلاق'' دل کی کیفیت کا نام ہے

حقیقت میں اخلاق دل کی ایک کیفیت کا نام ہے جس کا مظاہرہ اعضاء اور جوارح سے ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دل میں ساری مخلوق خدا کی خیر خواہی ہو۔ اور ان سے محبت ہو، خواہ دشمن اور کافر ہی کیوں نہ ہو، اور یہ سوچ کر کہ یہ میرے مالک کی مخلوق ہے لہٰذا مجھے اس سے محبت رکھنی چاہیے، اس کے ساتھ مجھے اچھا سلوک کرنا چاہیے، اولاً دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے اور پھر اس جذبے کے تحت اعمال صادر ہوتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ خیر خواہی کرتا ہے اب اس جذبہ کے بعد چہرے پر جو مسکراہٹ اور تبسم آتا ہے وہ بناوٹی نہیں ہوتا اور وہ دوسروں کو اپنا گرویدہ کرنے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی دلی خواہش اور دلی جذبے کا ایک لازمی اور منطقی تقاضا ہوتا ہے۔ لہٰذا حضور اقدس ﷺ کے بیان کردہ اخلاق میں اور آج کے اخلاق میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اخلاق پیدا کرنے کا طریقہ

ان اخلاق کو حاصل کرنے کے لئے محض کتاب پڑھ لینا کافی نہیں ہے، نہ محض وعظ سن لینا کافی ہوتا ہے۔ اس کے لئے کسی مربی اور کسی مصلح کی صحبت میں رہنے کی ضرورت ہوتی ہے تصوف اور پیری مریدی کا جو سلسلہ بزرگوں سے چلا آرہا ہے اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر اخلاق فاضلہ پیدا ہوں اور برے اخلاق دور ہوں۔ بہرحال ایمان میں کامل ترین افراد وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں، جن کے دل میں صحیح داعیے پیدا ہوتے ہوں اور ان صحیح داعیوں کا اظہار ان کے اعمال و افعال سے ہوتا ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو ان کاملین میں داخل فرمادیں۔ آمین

اللہ کی بندیوں کو نہ مارو

وَعَنْ إِيَاسِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِيْ ذُبَابٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((لَا تَضْرِبُوْا اِمَاءَ اللّٰهِ)) فَجَاءَ عُمَرُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: ذَئِرْنَ النِّسَاءُ عَلٰى اَزْوَاجِهِنَّ. الخ(۱)

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب النكاح، باب في ضرب النساء، رقم: ۱۸۳٤، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب ضرب النساء، رقم: ۱۹۷۵

حضرت ایاس بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی بندیوں کو مارو نہیں، یعنی عورتوں کو مارنا اچھی بات نہیں ہے، مت مارا کرو اور جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا کہ یہ کام مت کرو تو جس شخص نے براہ راست حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن لیا، اس کے لئے وہ کام حرام قطعی ہو گیا، اب اس کے لئے کسی بھی حالت میں مارنا جائز نہیں۔

یہ بات سمجھ لیجیے کہ ایک تو وہ حدیث ہے، جو ہم اور آپ کتاب میں پڑھتے ہیں۔ یا سنتے ہیں، اور جو لمبی سند کے ساتھ ہم تک پہنچتی ہے حدثنا فلان قال حدثنا فلان قال حدثنا فلان۔ ایسی حدیث ظنی کہلاتی ہے، اس لئے کہ ظنی طریقوں سے ہم تک پہنچتی ہے، لہٰذا اس حدیث پر عمل کرنا واجب ہے اگر عمل نہیں کرے گا تو گناہ گار ہوگا لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سن لی، وہ حدیث ظنی نہیں ہے، بلکہ قطعی ہے، لہٰذا اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے گا تو صرف گناہ گار نہیں ہوگا، بلکہ کافر ہو جائے گا، اس لئے کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا انکار کر دیا، لہٰذا فوراً کافر ہو گیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی اس لائق تھے

کبھی کبھی ہمارے دلوں میں یہ احمقانہ خیال آتا ہے کہ کاش! ہم بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوئے ہوتے، اور اس زمانے کی برکات حاصل کرتے۔ ارے یہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور وہی اپنی حکمت سے فیصلہ فرماتے ہیں اور اپنی حکمت سے ہمیں اس دور میں پیدا فرمایا، اگر ہم اس دور میں پیدا ہو جاتے تو خدا جانے کس اسفل السافلین میں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔ اس لئے کہ وہاں ایمان کا معاملہ اتنا نازک تھا کہ ذرا سی دیر میں انسان ادھر سے ادھر ہو جاتا تھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس جانثاری کا معاملہ فرمایا وہ انہیں کا ظرف تھا۔ اور اسی کے نتیجے میں وہ اس درجے تک پہنچے، اگر ہم جیسا آرام پسند اور عافیت پسند آدمی اس دور میں ہوتا تو خدا جانے کیا حشر بنتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں اس انجام سے بچایا۔ اور ایسے دور میں پیدا فرمایا جس میں ہمارے لئے بہت سی آسانیاں ہیں۔ آج ایک حدیث کے بارے میں ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث ظنی ہے۔ اور ظنی ہونے کی وجہ سے اگر کوئی انکار کر دے گا تو کافر نہ ہوگا۔ صرف گناہ گار ہی ہوگا۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معاملہ تو یہ تھا کہ اگر کوئی شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کوئی حکم سننے کے بعد انکار کر دے کہ میں نہیں کرتا، فوراً کافر ہو جاتا۔

یہ عورتیں شیر ہوگئیں ہیں

لہٰذا جب حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمایا کہ عورتوں کو نہ مارو، تو اب مارنے کا سلسلہ بالکل بند ہوگیا۔ اس لئے کہ صحابہ کرام تو ایسے نہیں تھے کہ حضور اقدس ﷺ سے کسی کام کے بارے میں ممانعت سنیں، اور پھر بھی وہ کام جاری رکھیں۔ جب مارنے کا سلسلہ بالکل بند ہوگیا تو کچھ دنوں کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"ذَئِرْنَ النِّسَآءُ عَلٰی اَزْوَاجِهِنَّ"

یا رسول اللہ! یہ عورتیں تو اب اپنے شوہروں پر شیر ہوگئیں، اس لئے کہ آپ نے مارنے کی ممانعت کردی۔ جس کے بعد اب کوئی شخص اپنی بیوی کو نہیں مارتا۔ بلکہ مار کے قریب جانے سے بھی ڈرتا ہے۔ اور اس نہ مارنے کے نتیجے میں عورتیں شیر ہوگئیں ہیں۔ اور شوہروں کی حق تلفیاں کرنے لگی ہیں۔ اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگی ہیں۔ اب آپ فرمائیں کہ ان حالات میں ہم کیا کریں؟

"فَرَخَّصَ فِیْ ضَرْبِهِنَّ"

چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے اجازت دے دی کہ اگر عورتیں شوہروں کی حق تلفی کریں۔ اور مارنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو تمہیں مارنے کی بھی اجازت ہے۔ اب اس اجازت دینے کے نتیجے میں یہ ہوا کہ ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں بہت سی خواتین آنی شروع ہوگئیں۔ اور آکر عرض کرتیں کہ یا رسول اللہ! آپ نے شوہروں کو مارنے کی اجازت دے دی۔ جس سے لوگوں نے غلط فائدہ اٹھایا اور ہمیں اس طرح مارا۔

یہ اچھے لوگ نہیں ہیں

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لَقَدْ اَطَافَ بِاٰلِ بَیْتِ مُحَمَّدٍ نِسَآءٌ كَثِیْرٌ یَشْكُوْنَ اَزْوَاجَهُنَّ لَیْسَ اُولٰٓئِكَ بِخِیَارِكُمْ))

"آپ نے اپنا نام لے کر فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر میں بہت سی خواتین چکر لگاتی ہیں۔ اور وہ اپنے شوہروں کی شکایت کرتی ہیں کہ وہ شوہر ان کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ ان کو بری طرح مارتے ہیں۔ لہٰذا خوب اچھی طرح سن لو کہ جو لوگ یہ مار پیٹ کر رہے ہیں وہ تم میں اچھے لوگ نہیں ہیں"

اچھے مومن اور مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ مار پیٹ کرے، اس سارے مجموعے سے

آنحضرت ﷺ نے یہ بات واضح فرمادی کہ اگرچہ ناگزیر حالت میں، جب کوئی اور چارہ نہ رہے اس وقت شریعت کی طرف سے ایسی مار کی اجازت ہے جس سے نشان نہ پڑے، اور بہت زیادہ تکلیف نہ ہو، لیکن اس کے باوجود محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کی اصل خواہش یہ ہے کہ کوئی مرد کسی عورت پر کبھی ہاتھ نہ اٹھائے۔ چنانچہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ساری عمر کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا، لہٰذا سنت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

دنیا کی بہترین چیز ”نیک عورت“

وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ ((اَلدُّنْیَا مَتَاعٌ وَخَیْرُ مَتَاعِھَا الْمَرْأَۃُ الصَّالِحَۃُ))(۱)

”حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ دنیا ساری کی ساری لطف اندوزی کی چیز ہے“

یعنی ایسی چیز ہے جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ نفع اٹھاتا ہے۔ اور لطف اٹھاتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا انسان کے نفع کے لئے پیدا فرمائی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾(۲)

اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے۔ اور تمہارے نفع کے لئے، اور تمہارے لطف اٹھانے کے لئے اور تمہاری ضرورت پوری کرنے کے لئے پیدا کیا۔ اور دنیا کی بہترین متاع جس سے انسان نفع اٹھائے۔ وہ نیک اور صالح عورت ہے۔ ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمُ النِّسَاءُ وَالطِّیْبُ وَجُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلَاۃِ))(۳)

مجھے تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں بہت زیادہ محبوب ہیں۔ کتنا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا کہ ”تمہاری دنیا“ میں سے، یہ اس لئے فرمایا کہ آپ ﷺ دوسری جگہ پر یہ ارشاد فرما چکے تھے کہ:

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب خیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ رقم: ۲۶۶۸، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب المرأۃ الصالحۃ، رقم: ۳۱۸۰، مسند أحمد، رقم: ۶۲۷۹

(۲) البقرہ: ۲۹

(۳) سنن البیھقی الکبری، رقم: ۱۳۲۳۲ (۷/۷۸)، زادالمعاد (۴/۳۰۷)، نیل الأوطار (۱/۳۳۰) کشف الخفاء (۱/۳۴۰)، کنز العمال، رقم: ۱۸۹۱۳، (۷/۲۸۷)

((مَا لِيْ وَمَا لِلدُّنيَا مَا أَنَا فِي الدُّنيَا اِلَّا كَرَاكِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ، ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا))(۱)

''میرا دنیا سے کیا تعلق! میں تو اک ایسے سوار کی طرح ہوں جو کسی درخت کے سائے میں ذرا سی دیر کے لئے ٹھہرتا ہے۔ اور پھر چلا جاتا ہے۔ اور اس درخت کو چھوڑ دیتا ہے''

اس لئے آپ نے فرمایا کہ تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں مجھے بہت زیادہ محبوب اور پسند ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ ایک عورت دوسری خوشبو، اور تیسری ٹھنڈا پانی، اس لئے دنیا کی ساری نعمتوں میں سے یہ تین چیزیں اول درجے کی نعمتیں ہیں۔

ٹھنڈا پانی عظیم نعمت ہے

چنانچہ احادیث میں کہیں یہ ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ساری زندگی میں کبھی کسی خاص کھانے کا اہتمام فرمایا ہو نہ کبھی یہ ثابت ہے کہ آپ نے کسی کھانے کی فرمائش کی ہو کہ فلاں کھانا پکا لو۔ بلکہ جو کچھ آپ کے سامنے آیا، آپ نے تناول فرما لیا۔ لیکن ٹھنڈے پانی کا اتنا اہتمام تھا کہ پینے کے لئے ٹھنڈا پانی آپ کے لئے بئر غرس سے لایا جاتا تھا۔ جو مسجد نبوی سے تقریباً دو یا اڑھائی میل دور تھا۔ اس لئے کہ اس کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا ہوتا تھا۔ اور اسی لئے آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ انتقال کے بعد مجھے اسی کنویں کے پانی سے غسل دیا جائے۔(۲)

ٹھنڈا پانی پیا کرو

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک حکمت بیان فرمائی۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ میاں اشرف علی! جب کبھی پانی پیو تو خوب ٹھنڈا پیو، تاکہ رگ رگ سے شکر نکلے، اس لئے کہ جب ٹھنڈا پانی پئے گا تو رگ رگ سیراب ہوگی، تو پھر رگ رگ سے ''الحمدللہ'' نکلے گا اور بے ساختہ رگ رگ سے شکر ادا ہوگا۔

(۱) سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب ماجاء في أخذ المال بحقه، رقم: ۲۲۹۹، مسند أحمد، رقم: ۲٦۰۸

(۲) سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد(۲۲۱/۷)، طبقات ابن سعد (۱۸۵/۲/۱)

بری عورت سے پناہ مانگو

بہرحال تین پسندیدہ چیزوں میں سے ایک نیک عورت ہے، اس لئے کہ اگر عورت نیک نہ ہو تو اس سے حضور اقدس ﷺ نے پناہ مانگی:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ عَنِ امْرَأَةٍ تُشَیِّبُنِیْ قَبْلَ الْمَشِیْبِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَلَدٍیَّكُوْنَ عَلَیَّ وَبَالًا))(۱)

اے اللہ! میں اس عورت سے پناہ مانگتا ہوں جو مجھے بڑھاپے سے پہلے بوڑھا کردے، اور اس اولاد سے پناہ مانگتا ہوں جو میرے لئے وبال ہو جائے۔ اس لئے جب اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے تلاش کرو تو ایسی عورت تلاش کرو جس میں دین ہو۔ صلاح ہو۔ نیکی ہو۔ اگر خدا نہ کرے نیکی نہیں ہے۔ تو وہ عذاب بننے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کو صالح بیوی کی نعمت میسر آئی ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کی قدر کرے۔ اس کی ناقدری نہ کرے۔ اور اس کی قدر یہی ہے کہ اس کے حقوق ادا کرے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان ارشادات پر ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

☆☆☆

(۱) المعجم الأوسط، رقم: ٦٣٥٩ (١٣/٤٣٦)، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (١١/٥٨)، رقم: ١٧٤٢٩، الزهد لهنادبن السري، رقم: ١٠٣٣ (٣/١١٧)

شوہر کے حقوق، شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾(۱)

پچھلا باب ان حقوق کے بیان میں تھا جو ایک بیوی کے اس کے شوہر کے ذمے عائد ہوتے ہیں۔ اس میں یہ ہدایات دی گئیں تھیں کہ ایک شوہر کو اپنی بیوی کے ساتھ کس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ لیکن شریعت، جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے، وہ صرف ایک پہلو کو مدنظر رکھنے والا نہیں ہوتا، بلکہ اس میں دونوں جانبوں کی برابر رعایت ہوتی ہے، اور دونوں کے لیے دنیا و آخرت کی صلاح و فلاح کی ضمانت ہوتی ہے، چنانچہ جس طرح شوہر کے ذمے بیوی کے حقوق عائد کیے گئے۔ اسی طرح اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے عورت کے ذمے شوہر کے حقوق بھی بیان فرمائے۔ اور قرآن و حدیث میں ان دونوں قسموں کے حقوق کی ادائیگی پر بڑا زور اور بڑی تاکید کی گئی ہے۔

آج ہر شخص اپنا حق مانگ رہا ہے

شریعت میں ہر شخص کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کرے، حقوق کے مطالبے پر زور نہیں دیا گیا ہے۔ آج کی دنیا، حقوق کے مطالبے کی دنیا ہے۔ ہر شخص اپنا حق مانگ رہا ہے۔ اور اس کے لیے مطالبہ کر رہا ہے، تحریکیں چلا رہا ہے، مظاہرے کر رہا ہے، ہڑتال کر رہا ہے، گویا کہ اپنا حق مانگنے اور اپنے حق کا مطالبہ کرنے کے لیے دنیا بھر میں کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اور اس

☆ اصلاحی خطبات (۳/۷۷ تا ۱۱۶) جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، بعد از نماز عصر۔ زیر نظر بیان امام نووی رحمہ اللہ کی کتاب "ریاض الصالحین" کے باب نمبر ۳۱ "باب حق الزوج علی المرأة" (صفحہ ۱۲۵ تا ۱۲۷) کا درس ہے۔

(۱) النسآء: ۳٤

کے لیے باقاعدہ انجمنیں قائم کی جا رہی ہیں۔ جن کا نام "انجمن تحفظ حقوق فلاں" رکھا جاتا ہے، لیکن آج "ادائیگی فرائض" کے لیے کوئی انجمن موجود نہیں، کسی بھی شخص کو اس بات کی فکر نہیں ہے کہ جو فرائض میرے ذمے عائد ہیں۔ وہ ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ مزدور کہتا ہے کہ مجھے میرا حق ملنا چاہئے۔ سرمایہ دار کہتا ہے کہ مجھے میرا حق ملنا چاہئے۔ لیکن دونوں میں سے کسی کو یہ فکر نہیں ہے کہ میں اپنا فریضہ کیسے ادا کروں؟ مرد کہتا ہے کہ مجھے میرے حقوق ملنے چاہئیں۔ اور عورت کہتی ہے کہ مجھے میرے حقوق ملنے چاہئیں۔ اس کے لیے کوشش اور جدوجہد جاری ہے۔ لڑائی ٹھنی ہوئی ہے۔ جنگ جاری ہے۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ جو فرائض میرے ذمے عائد ہو رہے ہیں، وہ میں ادا کر رہا ہوں، یا نہیں؟

ہر شخص اپنے فرائض ادا کرے

اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف توجہ کرے۔ اگر ہر شخص اپنے فرائض ادا کرنے لگے تو سب کے حقوق ادا ہو جائیں۔ اگر مزدور اپنے فرائض ادا کر دے تو سرمایہ دار اور مالک کے حقوق ادا ہو گئے، اگر سرمایہ دار اور آجر اپنے فرائض ادا کر دے تو مزدور کے حقوق ادا ہو گئے۔ شوہر اگر اپنے فرائض ادا کرے تو بیوی کا حق ادا ہو گیا۔ اور اگر بیوی اپنے فرائض ادا کرے تو شوہر کا حق ادا ہو گیا۔ شریعت کا اصل مطالبہ یہی ہے کہ تم اپنے فرائض ادا کرنے کی فکر کرو۔

پہلے اپنی فکر کرو

آج ہمارے زمانے میں عجیب الٹی گنگا بہنی شروع ہو گئی ہے۔ جب کوئی شخص اصلاح کا جھنڈا اٹھاتا ہے، تو اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دوسرا شخص اپنی اصلاح کا آغاز کرے، اپنی فکر نہیں کہ میرے اندر بھی کچھ کوتاہی ہے۔ میں بھی غلطی کا شکار ہوں۔ میں اس کی فکر کروں۔ حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ (۱)

اے ایمان والو! اپنے آپ کی فکر کرو کہ تمہارے ذمے کیا فرائض ہیں؟ اللہ اور اللہ کے رسول کے تم سے کیا مطالبات ہیں؟ شریعت، دیانت، امانت اور اخلاق کے تم سے کیا مطالبات ہیں، ان مطالبات کو بجا لاؤ، دوسرا شخص اگر گمراہی میں مبتلا ہے، اور اپنے فرائض انجام نہیں دے رہا تو اس

(۱) المائدة: ۱۰۵

کا نقصان تمہارے اوپر نہیں ہوگا بشرطیکہ تم اپنے فرائض صحیح طریقے سے انجام دے رہے ہو۔

حضور ﷺ کی تعلیم کا انداز

حضور اقدس ﷺ کی تعلیم کی بات دیکھیے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے عامل جایا کرتے تھے، جو لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرتے تھے، اور اس زمانے میں زیادہ تر مال مویشیوں یعنی اونٹ، بکریاں، گائے وغیرہ کی شکل میں ہوتا تھا۔ آنحضرت ﷺ جب عاملوں کو بھیجتے تو ان کو ایک ہدایت نامہ عطا فرماتے کہ تمہیں وہاں جا کر کیا طریقہ اختیار کرنا ہے؟ اس ہدایت نامے میں یہ بھی تحریر فرماتے:

((لَا جَلَبَ وَلَا جَنَبَ فِیْ زَکَاۃٍ، وَلَا تُؤْخَذُ صَدَقَاتُھُمْ اِلَّا فِیْ دُوْرِھِمْ))(۱)

یعنی تم خود لوگوں کے گھروں پر جا کر زکوٰۃ وصول کرنا۔ ایسا مت کرنا کہ تم ایک جگہ پر بیٹھ جاؤ اور لوگوں کو اس بات کی تکلیف دو کہ وہ زکوٰۃ کا مال تمہارے پاس لا کر دیں، اور یہ بھی ہدایت فرماتے:

((اَلْمُتَعَدِّیْ فِی الصَّدَقَۃِ کَمَانِعِھَا))(۲)

یعنی جو شخص زکوٰۃ وصول کرنے میں زیادتی کر رہا ہے، مثلاً جتنی زکوٰۃ واجب تھی، مقدار میں اس سے زیادہ وصول کر رہا ہے، یا کیفیت میں زیادہ وصول کر رہا ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ ایسا شخص بھی اتنا ہی گنہگار ہے۔ جتنا زکوٰۃ نہ دینے والا گنہگار ہے۔ لہٰذا ایک طرف عاملوں کو تو یہ تاکید کی جا رہی ہے کہ تم لوگوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ اور جتنی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس سے ایک ذرہ بھی زیادہ وصول نہ کرو، اگر ایسا کرو گے تو قیامت کے دن تمہاری پکڑ ہوگی۔ دوسری طرف جن لوگوں کے پاس زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ان عاملوں کو بھیجا جا رہا تھا۔ ان سے خطاب کر کے فرمایا:

((اِذَا جَاءَکُمُ الْمُصَدِّقُ فَلَا یُفَارِقَنَّکُمْ اِلَّا عَنْ رِضًی))(۳)

---

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الزكاة، باب أين تصدق الأموال، رقم: ١٣٥٧، مسند أحمد، رقم: ٦٧٢٨

(۲) سنن الترمذي، كتاب الزكاة عن رسول الله، باب ماجاء في المتعدي في الصدقة، رقم: ٥٨٥، سنن أبي داؤد، كتاب الزكاة، باب في زكاة السائمة، رقم: ١٣٥٢، سنن ابن ماجه، كتاب الزكاة، باب ماجاء في عمال الصدقة، رقم: ١٧٩٨

(۳) سنن الترمذي، كتاب الزكاة عن رسول الله، باب ماجاء في رضا المصدق، رقم: ٥٨٦، مسند أحمد، رقم: ١٨٤٣٤، سنن الدارمي، كتاب الزكاة، باب ليرجع المصدق عنكم وهو راض، رقم: ١٦١٠

یعنی تمہارے پاس زکوۃ وصول کرنے والے آئیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے ناراض ہو کر جائیں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم ان کو راضی کرو، اور کوئی ایسی غلطی نہ کرو جس سے وہ ناراض ہو جائیں۔ کیونکہ درحقیقت وہ میرے فرستادہ اور میرے نمائندے ہیں، اور ان کو ناراض کرنا گویا مجھے ناراض کرنا ہے۔ لہٰذا عاملین کو یہ تاکید فرمائی کہ تم کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرو۔ اور زکوۃ دینے والوں کو یہ تاکید فرمائی کہ جب عاملین تمہارے پاس آئیں تو وہ تم سے راضی ہو کر جائیں۔ ہر ایک کو اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی کا احساس دلایا جا رہا ہے۔ آپ نے زکوۃ دینے والوں کو یہ نہیں فرمایا کہ تم سب مل کر ایک تحریک چلاؤ کہ یہ جو عاملین زکوۃ وصول کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ ہمارے حقوق پامال نہ کریں۔ اس کے لیے انجمن قائم کرو۔ اس لیے کہ یہ ایک لڑائی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

شریعت میں سارا زور اس بات پر ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی نگہداشت کرے، فرائض کو بجا لانے کی فکر کرے، اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک ایک عمل کا جواب دینا ہے۔ اس کی فکر کرے کہ میں اللہ کے سامنے ٹھیک جواب دے سکوں گا یا نہیں؟ دین کا سارا فلسفہ یہ ہے، یہ نہیں ہے کہ ہر شخص دوسروں سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا رہے۔ اور اپنے فرائض کی ادائیگی سے غافل رہے۔

زندگی استوار کرنے کا طریقہ

میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں بھی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ دونوں کو ان کے فرائض بتا دیئے۔ شوہر کو بتا دیا کہ تمہارے فرائض یہ ہیں، اور بیوی کو بتا دیا کہ تمہارے فرائض یہ ہیں۔ ہر ایک اپنے فرائض ادا کرنے کی فکر کرے۔ اور درحقیقت زندگی کی گاڑی اسی طرح چلتی ہے کہ دونوں اپنے فرائض کا احساس کریں، اور دوسرے کے حقوق کا پاس کریں۔ اپنے حقوق حاصل کرنے کی اتنی فکر نہ ہو۔ جتنی دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کی فکر ہو۔ اگر یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو پھر یہ زندگی استوار ہو جاتی ہے، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو ہماری زندگی کے استوار کرنے کی اتنی زیادہ فکر ہے کہ قرآن و حدیث ان ہدایات سے بھرے ہوئے ہیں کہ تمہارے فرائض یہ ہیں، اور تمہارے فرائض یہ ہیں۔ اور اگر ان فرائض اور تعلقات میں رخنہ پڑ جائے تو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو اس دنیا میں کوئی بات اتنی ناپسند نہیں جتنے میاں بیوی کے باہمی جھگڑے ناپسند ہیں۔

ابلیس کا دربار

ایک حدیث میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس کبھی کبھی سمندر میں پانی کے

اوپر اپنا تخت بچھاتا ہے، اور اپنا دربار منعقد کرتا ہے، اس وقت دنیا میں اس کے جتنے چیلے ہیں۔ جو اس کی اسکیموں پر اور اس کی ہدایات پر عمل کر رہے ہیں۔ وہ سب اس دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور ان تمام چیلوں سے ان کی کارکردگی کی رپورٹیں طلب کی جاتی ہیں کہ تم نے کیا فرائض انجام دیئے؟ اس وقت ہر ایک چیلا اپنی کارگزاری بیان کرتا ہے، اور یہ ابلیس تخت پر بیٹھ کر ان کی کارگزاری سنتا ہے۔ ایک چیلا آکر اپنی یہ کارگزاری سناتا ہے کہ ایک شخص نماز پڑھنے کے ارادے سے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے درمیان میں اس کو ایک ایسے کام میں پھنسا دیا جس سے اس کی نماز چھوٹ گئی ابلیس سن کر خوش ہوتا ہے کہ تم نے اچھا کام کیا۔ لیکن بہت زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کرتا۔ دوسرا چیلا آکر بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص فلاں عبادت کی نیت سے جا رہا تھا، میں نے اس کو عبادت سے روک دیا۔ ابلیس سن کر خوش ہوتا ہے کہ تم نے اچھا کیا۔ اسی طرح ہر چیلا اپنی کارگزاری سناتا ہے۔ اور ابلیس سن کر خوش ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک چیلا آکر یہ بیان کرتا ہے کہ دو میاں بیوی باہمی اتفاق اور محبت کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے، بڑی اچھی زندگی گزر رہی تھی، میں نے جا کر ایک ایسا کام کیا جس کے نتیجے میں دونوں میں لڑائی ہو گئی، اور لڑائی کے نتیجے میں دونوں میں جدائی واقع ہو گئی، جب ابلیس یہ سنتا ہے کہ اس چیلے نے دونوں میاں بیوی کو آپس میں لڑا دیا جو اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ خوش ہو کر اپنے تخت سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس چیلے سے معانقہ کرتا ہے۔ اس کو گلے لگا لیتا ہے۔ اور اس سے کہتا ہے کہ صحیح معنی میں میرا نمائندہ تو ہے۔ اور تو نے جو کارنامہ انجام دیا وہ اور کسی نے انجام نہیں دیا۔ (۱)

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو میاں بیوی کے باہمی جھگڑے اور ایک دوسرے سے نفرت اور قطع تعلق کتنے ناپسندیدہ ہیں۔ اور شیطان کو یہ اعمال کتنے محبوب ہیں۔ اس لیے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن وحدیث میں دونوں پر ایک دوسرے کے فرائض اور حقوق بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ اگر انسان ان پر عمل کر لے تو دنیا بھی درست ہو جائے، اور آخرت بھی درست ہو جائے۔

مرد عورت پر حاکم ہے

اس لیے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دوسرا باب قائم فرمایا ہے جس کا عنوان ہے:

"باب حق الزوج علی المرأة"

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، باب تحریش الشیطان و بعثه سرایاہ لفتنة الناس وأن مع کل انسان قرین، رقم: ۵۰۳۰

یعنی شوہر کے بیوی پر کیا حقوق ہیں۔ اور اس کے تحت قرآنی آیات اور احادیث ذکر فرمائیں۔ سب سے پہلے قرآن کریم کی یہ آیت لائے ہیں:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾(۱)

یعنی مرد عورتوں پر نگہبان اور ان کے منتظم ہیں۔ بعض حضرات نے اس کا یہ ترجمہ بھی کیا ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ ''قوام'' اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کام کے کرنے یا اس کا انتظام کرنے کا ذمہ دار ہو، گویا کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ ان کے کاموں کے منتظم ہیں۔ اور ان کے حاکم ہیں۔ یہ ایک اصول بیان فرمادیا۔ اس لیے کہ اصولی باتیں ذہن میں نہ ہونے کی صورت میں جتنے کام انسان کرے گا وہ غلط تصورات کے ماتحت کرے گا، لہٰذا مرد کے حقوق بیان کرتے ہوئے عورت کو پہلے اصولی بات سمجھادی کہ وہ مرد تمہاری زندگی کے امور کا نگہبان اور منتظم ہے۔

آج کی دنیا کا پروپیگنڈہ

آج کی دنیا میں جہاں مرد وعورت کی مساوات، ان کی برابری اور آزادی نسواں کا بڑا زور و شور ہے۔ ایسی دنیا میں لوگ یہ بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ شریعت نے مرد کو حاکم بنایا ہے۔ اور عورت کو محکوم بنایا ہے۔ اس لیے کہ آج کی دنیا میں یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ مرد کی عورت پر بالادستی قائم کردی گئی ہے۔ اور عورت کو محکوم بنا کر اس کے ہاتھ میں قید کردیا گیا ہے۔ اور اس کو چھوٹا قرار دے دیا گیا ہے۔

سفر کے دوران ایک کو امیر بنالو

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں، زندگی کا سفر دونوں کو ایک ساتھ طے کرنا ہے، اب زندگی کا سفر طے کرنے میں انتظام کی خاطر یہ لازمی بات ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک شخص سفر کا ذمہ دار ہو۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ حکم دیا کہ جب بھی دو آدمی کوئی سفر کر رہے ہوں چاہے وہ سفر چھوٹا سا کیوں نہ ہو، اس سفر میں اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لو، (۲) امیر بنائے بغیر سفر نہیں کرنا چاہئے۔ تا کہ سفر کے جملہ انتظامات اور پالیسی اس امیر کے فیصلے

(۱) النساء: ۳۴

(۲) الجامع الکبیر للسیوطی، رقم: ۱۳۲۶۰ (۱/ ۱۳۴۴۰)، کنز العمال، رقم: ۱۷۵۱۷ (۶/ ۷۱۰)

کے تابع ہوں۔ اگر امیر نہیں بنائیں گے تو ایک بدنظمی ہو جائے گی۔

لہٰذا جب ایک چھوٹے سے سفر میں امیر بنانے کی تاکید کی گئی ہے تو زندگی کا یہ طویل سفر جو ایک ساتھ گزارنا ہے۔ اس میں یہ تاکید کیوں نہیں ہوگی کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالو۔ تاکہ بدنظمی پیدا نہ ہو۔ بلکہ انتظام قائم رہے۔ اس انتظام کو قائم کرنے کے لیے کسی ایک کو امیر بنانا ضروری ہے۔

زندگی کے سفر کا امیر کون ہے؟

اب دو راستے ہیں۔ یا تو مرد کو اس زندگی کے سفر کا امیر بنا دیا جائے، یا عورت کو امیر بنا دیا جائے، اور مرد کو اس کا محکوم بنا دیا جائے۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اب انسانی خلقت، فطرت، قوت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بھی اور عقل کے ذریعہ انسان غور کرے تو یہی نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو قوت مرد کو عطا کی ہے۔ بڑے بڑے کام کرنے کی جو صلاحیت مرد کو عطا فرمائی ہے۔ وہ عورت کو عطا نہیں کی۔ لہٰذا اس امارت اور اس سربراہی کا کام صحیح طور پر مرد ہی انجام دے سکتا ہے۔ اور اس کے لیے اپنی عقل سے فیصلہ کرنے کے بجائے اس ذات سے پوچھا جائے جس نے ان دونوں کو بنایا اور پیدا کیا کہ آپ نے دونوں کو سفر پر روانہ کیا۔ اب آپ ہی بتائیں کس کو امیر بنائیں اور کس کو مامور بنائیں؟ اور سوائے اس کے فیصلے کے کسی اور کا فیصلہ قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ خواہ وہ فیصلہ عقلی دلائل سے آراستہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرما دیا کہ اس زندگی کے سفر کو طے کرنے کے لیے مرد ''قوام، حاکم اور منتظم'' ہیں، اگر تم اس فیصلے کو صحیح جانتے ہو، اور مانتے ہو تو اسی میں تمہاری سعادت اور کامیابی ہے۔ اور اگر نہیں مانتے، بلکہ اس فیصلے کی خلاف ورزی کرتے ہو۔ اور اس کے ساتھ بغاوت کرتے ہو، تو پھر تم جانو اور تمہاری زندگی جانے، اب تمہاری زندگی خراب ہوگی۔ اور ہو رہی ہے، جن لوگوں نے اس فیصلے کے خلاف بغاوت کی ان کا انجام دیکھ لیجیے کہ کیا ہوا؟

اسلام میں امیر کا تصور

البتہ اللہ تعالیٰ نے جو لفظ یہاں استعمال فرمایا، اس کو سمجھ لیجیے، اللہ تعالیٰ نے یہاں ''امیر''، ''حاکم'' اور ''بادشاہ'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ بلکہ ''قوام'' کا لفظ استعمال کیا۔ اور ''قوام'' کا معنی وہ شخص جو کسی کام کا ذمہ دار ہو۔ اور ذمہ دار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بحیثیت مجموعی زندگی گزارنے کی پالیسی وہ طے کرے گا، اور پھر اس پالیسی کے مطابق زندگی گزاری جائے گی۔ لیکن ''قوام'' ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ آقا ہے۔ اور بیوی اس کی کنیز ہے۔ یا بیوی اس کی نوکر ہے۔ بلکہ دونوں کے

درمیان امیر اور مامور، حاکم اور محکوم کا رشتہ ہے۔ اور اسلام میں ''امیر'' کا تصور یہ نہیں ہے کہ وہ تخت پر بیٹھ کر حکم چلائے۔ بلکہ اسلام میں امیر کا تصور وہ ہے جو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ))(۱)

قوم کا سرداران کا خادم ہوتا ہے۔

یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ ہم دیوبند سے کسی دوسری جگہ سفر پر جانے لگے تو ہمارے استاد حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند میں ''شیخ الادب'' کے نام سے مشہور تھے، وہ بھی ہمارے ساتھ سفر میں تھے، جب ہم اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی کے آنے میں دیر تھی، مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب تم کہیں سفر پر جاؤ تو کسی کو اپنا امیر بنالو، لہٰذا ہمیں بھی اپنا امیر بنالینا چاہئے، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چونکہ ہم شاگرد تھے وہ استاد تھے۔ اس لیے ہم نے کہا کہ امیر بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ امیر تو بنے بنائے موجود ہیں۔ حضرت مولانا نے پوچھا کہ کون؟ ہم نے کہا کہ امیر آپ ہیں، اس لیے کہ آپ استاد ہیں۔ ہم شاگرد ہیں، حضرت مولانا نے کہا کہ اچھا آپ لوگ مجھے امیر بنانا چاہتے ہیں؟ ہم نے کہا کہ جی ہاں! آپ کے سوا اور کون امیر بن سکتا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ اچھا ٹھیک ہے، لیکن امیر کا ہر حکم ماننا ہوگا۔ اس لیے کہ امیر کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حکم کی اطاعت کی جائے، ہم نے کہا جب امیر بنایا ہے تو ان شاء اللہ ہر حکم کی اطاعت بھی کریں گے، مولانا نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، میں امیر ہوں۔ اور میرا حکم ماننا۔ جب گاڑی آئی تو حضرت مولانا نے تمام ساتھیوں کا کچھ سامان سر پر اور کچھ ہاتھ میں اٹھایا، اور چلنا شروع کردیا۔ ہم نے کہا کہ حضرت یہ کیا آپ غضب کر رہے ہیں؟ ہمیں اٹھانے دیجیے۔ مولانا نے فرمایا کہ نہیں۔ جب امیر بنایا ہے تو اب حکم ماننا ہوگا، اور یہ سامان مجھے اٹھانے دیں، چنانچہ وہ سارا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھا۔ اور پھر پورے سفر میں جہاں کہیں مشقت کا کام آتا وہ کام خود کرتے، اور جب ہم کچھ کہتے تو فوراً مولانا فرماتے کہ دیکھو تم نے مجھے امیر بنایا ہے، اور امیر کا حکم ماننا ہوگا۔ لہٰذا میرا حکم مانو۔ ان کو امیر بنانا ہمارے لیے قیامت ہوگیا۔ حقیقت میں امیر کا تصور یہ ہے۔

---

(۱) جامع الأحاديث، رقم: ۱۳۲۲۲، (۱۳/۳۲٤)، الجامع الصغير وزيادة، رقم: ۷۰٦٦ (۱/۷۰۸)، كشف الخفاء، رقم: ۱٥۱٥ (۲/۵۰۰)

امیر وہ جو خدمت کرے

آج ذہن میں جب امیر کا تصور آتا ہے تو وہ بادشاہوں اور بڑے سربراہوں کی صورت میں آتا ہے۔ جو اپنے رعایا کے ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے، لیکن قرآن وحدیث کا تصور یہ ہے کہ امیر وہ شخص ہے جو خدمت کرے، جو خادم ہو۔ امیر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کو بادشاہ بنا دیا گیا ہے۔ اب وہ حکم چلایا کرے گا۔ اور دوسرے اس کے ماتحت نوکر اور غلام بن کر رہیں گے، بلکہ امیر کے معنی یہ ہیں کہ بے شک فیصلہ اس کا معتبر ہوگا، ساتھ ہی وہ فیصلہ ان کی خدمت کے لیے ہوگا، ان کی راحت اور خیر خواہی کے لیے ہوگا۔

میاں بیوی میں دوستی کا تعلق ہے

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مردوں کو یہ آیت تو یاد رہتی ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾(۱)

یعنی مرد عورتوں پر حکمران اور حاکم ہیں۔ اب بیٹھ کر عورتوں پر حکم چلا رہے ہیں۔ اور ذہن میں یہ بات ہے کہ عورت کو ہر حال میں تابع اور فرماں بردار ہونا چاہئے اور ہمارا ان کے ساتھ آقا اور نوکر جیسا رشتہ ہے۔ معاذ اللہ۔ لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور آیت بھی نازل فرمائی ہے۔ وہ آیت مردوں کو یاد نہیں رہتی۔ وہ آیت یہ ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾(۲)

''اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تا کہ تم کو ان کے پاس آرام ملے، اور تم دونوں میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی''

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بے شک مرد عورت کے لیے قوام ہے۔ لیکن ساتھ میں دوستی کا تعلق بھی ہے۔ انتظامی طور پر تو قوام ہے، لیکن باہمی تعلق دوستی جیسا ہے، لہٰذا ایسا تعلق نہیں ہے جیسا آقا اور کنیز کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو دوست کہیں سفر پر جا رہے

(۱) النساء: ۳٤

(۲) الروم: ۲۱

ہوں۔ اور ایک دوست نے دوسرے دوست کو امیر بنالیا ہو۔ لہٰذا شوہر اس لحاظ سے تو امیر ہے کہ ساری زندگی کا فیصلہ کرنے کا وہ ذمہ دار ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسے نوکروں اور غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس دوستی کے تعلق کے کچھ آداب اور کچھ تقاضے ہیں۔ ان آداب اور تقاضوں میں ناز کی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کو حاکم ہونے کے خلاف نہیں کہا جاسکتا۔

ایسا رعب مطلوب نہیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں بعض مرد حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ہم حاکم ہیں، لہٰذا ہمارا اتنا رعب ہونا چاہئے کہ ہمارا نام سن کر بیوی کانپنے لگے۔ اور بے تکلفی کے ساتھ بات نہ کرسکے۔ میرے ایک ہم سبق دوست تھے، انہوں نے ایک مرتبہ بڑے فخر کے ساتھ مجھ سے یہ بات کہی کہ جب میں کئی مہینوں کے بعد اپنے گھر جاتا ہوں تو میرے بیوی بچوں کی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ میرے پاس آجائیں اور مجھ سے بات کریں، بڑے فخر کے ساتھ یہ بات کہہ رہے تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ جب گھر جاتے ہیں تو کیا کوئی درندہ یا شیر چیتا بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے بیوی بچے آپ کے پاس آنے سے ڈرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ نہیں بلکہ اس لیے کہ ہم قوام ہیں، ہمارا رعب ہونا چاہئے۔ اچھی طرح سمجھ لیں کہ قوام ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ بیوی بچے پاس آنے اور بات کرنے سے بھی ڈریں، بلکہ ان کے ساتھ دوستی کا تعلق بھی ہے۔ اور وہ دوستی کا تعلق کس قسم کا ہونا چاہئے؟ سنئے!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت دیکھئے

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو، اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو، دونوں حالتوں میں مجھے علم ہوجاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ یارسول اللہ! کس طرح علم ہوجاتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو تو رب محمد (محمد کے رب کی قسم) کے الفاظ سے قسم کھاتی ہو اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو رب ابراہیم (ابراہیم کے رب کی قسم) کے الفاظ سے قسم کھاتی ہو۔ اس وقت تم میرا نام نہیں لیتیں، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام لیتی ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"اِنِّیْ لَا اَهْجُرُ اِلَّا اسْمَكَ"

''یا رسول اللہ! ایسے موقع پر میں صرف آپ ﷺ کا نام ہی چھوڑتی ہوں، لیکن آپ ﷺ کی محبت دل سے جدا نہیں ہوتی''(۱)

اب آپ اندازہ لگائیں کہ کون ناراض ہو رہا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور کس سے ناراض؟ حضور اقدس ﷺ سے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ناز سے بعض اوقات ایسی بات فرما دیتی تھیں جس سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کے دل میں کدورت اور ناراضگی ہے لیکن اس کو آنحضرت ﷺ نے اپنی ''قوامیت'' کے خلاف نہیں سمجھا بلکہ آنحضرت ﷺ نے بڑی خوش طبعی کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا کہ تمہاری ناراضگی کا مجھے پتہ چل جاتا ہے۔

بیوی کے ناز کو برداشت کیا جائے

جب ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر سنگین تہمت لگائی گئی (نعوذ باللہ) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اس تہمت کی وجہ سے قیامت گزر گئی۔ آنحضرت ﷺ کو بھی ظاہر ہے کہ اس بات کا قلق تھا کہ لوگوں میں اس قسم کی باتیں پھیل گئی ہیں، لیکن ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرما دیا:

''اے عائشہ! دیکھو بات یہ ہے کہ تمہیں اتنا غمگین ہونے کی ضرورت نہیں اگر تم بے خطا اور بے قصور ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور تمہاری برأت ظاہر فرما دیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ تم سے کوئی قصور اور غلطی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلو، استغفار کرلو۔ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ بات بہت شاق گزری کہ آپ نے یہ دو شقیں کیوں کی کہ اگر بے قصور ہو تو اللہ تعالیٰ برأت ظاہر فرما دے گا۔ اور اگر قصور ہوا ہو تو توبہ کرلو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے دل میں بھی اس بات کا ہلکا سا احتمال ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس بات کا بہت سخت صدمہ ہوا، اور صدمہ سے نڈھال ہو کر لیٹ گئیں، اور اسی حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برأت کی آیات نازل ہوئیں۔ اس وقت گھر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ جب یہ آیات سنیں تو حضور اقدس ﷺ بھی بہت خوش ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اب ان شاء اللہ یہ سارا بہتان ختم ہو جائے گا۔ اس وقت حضرت ابوبکر

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب غيرة النساء ووجدهن، رقم: ٤٨٢٧، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب في فضائل عائشة، رقم: ٤٤٦٩، مسند أحمد، رقم: ٢٣١٨٢

صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ خوشخبری سن لو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری برأت میں آیات نازل فرمادیں، اور اب کھڑی ہو جاؤ اور آ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرو، حضرت عائشہ بستر پر لیٹی ہوئی ہیں، اور برأت کی آیات سن لیں۔ لیٹے لیٹے فرمایا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے میری برأت نازل فرمادی لیکن میں اللہ کے سوا کسی کا شکر ادا نہیں کرتی۔ کیونکہ آپ لوگوں نے تو اپنے دل میں یہ احتمال پیدا کرلیا تھا کہ شاید مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔(۱)

بظاہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہونے سے اعراض فرمایا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برا نہیں سمجھا، اس لیے کہ یہ ناز کی بات تھی۔ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے سرزد ہوئی۔

یہ ناز درحقیقت اس دوستی کا تقاضا ہے، لہٰذا میاں بیوی کے درمیان صرف حاکمیت اور محکومیت کا رشتہ نہیں ہے بلکہ دوستی کا بھی رشتہ ہے اور اس دوستی کا حق یہ ہے کہ اس قسم کے ناز کو برداشت کیا جائے۔ البتہ جہاں بات بالکل غلط ہوگئی وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری اور غصہ کا بھی اظہار فرمایا۔ لیکن اس قسم کی ناز کی باتوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے گوارا فرمایا۔

بیوی کی دلجوئی سنت ہے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوستی کا حق اس طرح ادا فرمایا کہ کہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامات اور درجات عالیہ کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہے۔ اور ہم کلامی ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ دلداری اور دلجوئی اور حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ رات کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو گیارہ عورتوں کا قصہ سنا رہے ہیں کہ یمن کے اندر گیارہ عورتیں تھیں۔ انہوں نے آپس میں یہ طے کیا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے کو اپنے اپنے شوہروں کی حقیقی اور واقعی حالت بیان کریں گی یعنی ہر عورت یہ بتائے گی کہ اس کا شوہر کیسا ہے؟ اس کے کیا اوصاف ہیں؟ ان گیارہ عورتوں نے اپنے شوہروں کے اوصاف کس وضاحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کیے ہیں کہ ساری ادبی لطافتیں اس پر ختم ہیں۔ وہ سارا قصہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سنا رہے ہیں۔(۲)

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب تفسير القرآن، باب "لولا اذسمعتموه ظن المؤمنون......"، رقم: ٤٣٨١، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب في فضل عائشة، رقم: ٤٤٧٧، مسند أحمد: ٢٣٦٩٠

(۲) صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب حسن المعاشرة مع الأهل، رقم: ٤٧٩٠، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب ذكر حديث أم زرع، رقم: ٤٤٨١

بیوی کے ساتھ ہنسی مذاق سنت ہے

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں مقیم تھے، اور ان کی باری کا دن تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کے لیے ایک حلوہ پکایا اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر لائیں، اور لا کر حضور اقدس ﷺ کے سامنے رکھ دیا اور حضرت سودہ بھی سامنے بیٹھی ہوئی تھیں ان سے کہا کہ آپ بھی کھائیں۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو یہ بات گراں گزری کہ جب حضور اقدس ﷺ میرے گھر میں تھے اور میری باری کا دن تھا تو پھر یہ حلوہ پکا کر کیوں لائیں؟ اس لیے حضرت سودہ نے انکار کر دیا کہ میں نہیں کھاتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ حلوہ کھاؤ اور اگر نہیں کھاؤ گے تو پھر یہ حلوہ تمہارے منہ پر مل دوں گی، حضرت سودہ نے فرمایا کہ میں تو نہیں کھاؤں گی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تھوڑا سا حلوہ اٹھا کر حضرت سودہ کے منہ پر مل دیا۔ اب حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے حضور اقدس ﷺ سے شکایت کی یا رسول اللہ! انہوں نے میرے منہ پر حلوہ مل دیا ہے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں آیا ہے:

﴿وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾(۱)

یعنی کوئی شخص اگر تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تو تم بھی بدلے میں اس کے ساتھ برا سلوک کر سکتے ہو۔ اب اگر انہوں نے تمہارے منہ پر حلوہ مل دیا ہے تو تم بھی ان کے چہرے پر حلوہ مل دو، چنانچہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے تھوڑا سا حلوہ اٹھا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے چہرے پر مل دیا، اب دونوں کے چہروں پر حلوہ ملا ہوا ہے اور یہ سب حضور اقدس ﷺ کے سامنے ہو رہا ہے۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی، پوچھا کہ کون؟ معلوم ہوا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں (شاید اس وقت تک پردے کے احکام نہیں آئے تھے) جب آپ نے یہ سنا کہ حضرت عمر تشریف لائے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ تم دونوں جلدی جا کر اپنے چہرے دھولو۔ اس لیے کہ عمر آرہے ہیں چنانچہ دونوں نے جا کر اپنا چہرہ دھویا۔ (۲)

وہ ذات جس کا ہر آن اللہ جل جلالہ کے ساتھ رابطہ قائم ہے۔ جس کی ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ گفتگو ہو رہی ہے اور وحی آرہی ہے، اللہ تعالیٰ کی حضوری کا وہ مقام حاصل ہے جو اس روئے زمین پر کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ یہ انداز اور ان کی دلداری کا اتنا خیال ہے۔

---

(۱) النساء: ۱٤۹

(۲) مجمع الزوائد (۳۱٦/٤)

مقام ''حضوری'' کی حقیقت

ہم اور آپ زبان سے ''حضوری'' کا لفظ بول دیتے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں۔ اگر کوئی شخص اس کا مزہ چکھ لے تو اس کو پتہ لگے گا کہ یہ کیا چیز ہے، ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضوری کا خیال اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ وہ پاؤں پھیلا کر نہیں سو سکتے، لیٹ نہیں سکتے، اس لیے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے ہونے کا احساس ہے، اور جب اپنا بڑا سامنے ہو تو کوئی شخص پاؤں پھیلا کر لیٹے گا؟ ہرگز نہیں لیٹے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حاضر ہونے کا احساس اور خیال اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ انسان پاؤں پھیلا کر لیٹ نہیں سکتا۔ لہٰذا جس ذات کو ''حضوری'' کا اتنا بڑا مقام حاصل ہو جو دنیا میں کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ وہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ کس طرح خوش طبعی کے معاملات کر لیتے ہیں؟ یہ مقام صرف ایک پیغمبر ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔

فیصلہ خاوند کا چلے گا

بہر حال! چونکہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو ''قوام'' بنایا ہے اس لیے فیصلہ اسی کا ماننا ہوگا۔ ہاں تم اپنی رائے اور مشورہ دے سکتی ہو۔ اور ہم نے مرد کو یہ ہدایت بھی دے رکھی ہے کہ وہ حتی الامکان تمہاری دلداری کا خیال بھی کرے لیکن فیصلہ اسی کا مانا جائے گا۔ لہٰذا اگر یہ بات ذہن میں نہ ہو، اور بیگم صاحبہ یہ چاہیں کہ ہر معاملے میں فیصلہ میرا چلے اور مرد قوام نہ بنے، میں قوام بن جاؤں تو یہ صورت فطرت کے خلاف ہے۔ شریعت کے خلاف ہے۔ عقل کے خلاف ہے اور انصاف کے خلاف ہے اس کا نتیجہ گھر کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

عورت کی ذمہ داریاں

آیت مبارکہ کا دوسرا حصہ یہ ہے:

﴿فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾(۱)

فرمایا کہ نیک عورتوں کا کام کیا ہے؟ نیک عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ ''قانتات'' ہیں یعنی اللہ کی اطاعت کرنے والی۔ اللہ نے جو حقوق شوہر کے عائد کیے ہیں ان حقوق کو صحیح طور بجا لانے والی اور

---

(۱) النساء: ۳۴

شوہر کی غیر موجودگی میں شوہر کے گھر کی حفاظت کرنے والی۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورت کا لازمی وصف قرار دیا۔ اور اس کے ذمے یہ فریضہ عائد کیا کہ جب شوہر گھر میں موجود نہ ہو تو اس وقت وہ اس کے گھر کی حفاظت کرے۔ گھر کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ اول تو خود اپنی حفاظت کرے کہ کسی گناہ میں مبتلا نہ ہو اور شوہر کا جو مال ومتاع ہے، اس کی حفاظت کرے۔ اس لیے اس کی حفاظت کی ذمہ داری بیوی پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

((اَلْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِيْ بَيْتِ زَوْجِهَا))(۱)

عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔ یعنی اس کے مال ومتاع کی حفاظت عورت کی ذمہ داری ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اکثر حالات میں عورت کے ذمہ کھانا پکانا واجب نہیں ہوتا۔ لیکن شوہر کے گھر کی حفاظت اور اس کے مال ومتاع کی اس طرح حفاظت کہ وہ مال بے جا خرچ نہ ہو۔ قرآن کریم نے یہ اس کی ذمہ داری قرار دی ہے۔

زندگی قانون کے خشک تعلق سے نہیں گزر سکتی

یہ جو میں نے کہا کہ عورت کے ذمے کھانا پکانے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ ایک قانون کی بات تھی۔ لیکن زندگی قانون کے خشک تعلق سے نہیں چلا کرتی، لہٰذا جس طرح قانوناً عورت کے ذمہ کھانا پکانا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر عورت بیمار ہو جائے تو قانوناً شوہر کے ذمہ اس کا علاج کرانا، یا علاج کے لیے خرچہ دینا بھی ضروری نہیں۔ اور قانوناً شوہر کے ذمہ یہ بھی نہیں ہے کہ وہ عورت کو اس کے والدین کے گھر ملاقات کے لیے لے جایا کرے۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ جب عورت کے ماں باپ اپنی بیٹی سے ملاقات کے لیے آئیں تو ان کو گھر میں بٹھائے۔ بلکہ فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ ہفتہ میں صرف ایک دن عورت کے ماں باپ آئیں اور دور سے ملاقات اور زیارت کر کے چلے جائیں۔ گھر میں بٹھا کر ملاقات کرانا شوہر کے ذمہ ضروری نہیں۔ لہٰذا اگر قانون کے خشک تعلق کی بنیاد پر اگر زندگی بسر ہونی شروع ہو جائے تو دونوں کا گھر برباد ہو جائے۔ بات جب چلتی ہے جب خاوند قانون کی بات سے آگے بڑھ کر سنت رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرے۔ اور بیوی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی سنت کی اتباع کرے۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن، رقم: ۸٤٤، مسند أحمد، رقم: ۵۷۵۳

بیوی کے دل میں شوہر کے پیسے کا درد ہو

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے مواعظ میں ذکر فرمایا کہ عورت کے فرائض میں داخل ہے کہ اس کے دل میں شوہر کے پیسے کا درد ہو، شوہر کا پیسہ غلط جگہ پر بلا وجہ صرف نہ ہو۔ اور فضول خرچی میں اس کا پیسہ ضائع نہ ہو۔ یہ چیز عورت کے فرائض میں داخل ہے۔ یہ نہ ہو کہ شوہر کا پیسہ دل کھول کر خرچ کیا جارہا ہے۔ یا گھر کی نوکرانیوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ جس طرح چاہ رہی ہیں کر رہی ہیں۔ اگر کوئی عورت ایسا کرتی ہے تو یہ قانونی فرائض کے خلاف کر رہی ہے۔

ایسی عورت پر فرشتوں کی لعنت

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَاَتَهٗ اِلٰى فِرَاشِهٖ فَلَمْ تَاْتِهٖ فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَيْهَا لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتّٰى تُصْبِحَ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مرد اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف بلائے اور یہ میاں بیوی کے مخصوص تعلقات سے کنایہ ہے۔ یعنی شوہر اپنی بیوی کو ان تعلقات کو قائم کرنے کے لیے بلائے۔ اور وہ عورت نہ آئے۔ یا ایسا طرز عمل اختیار کرے جس سے شوہر کا وہ منشا پورا نہ ہو، اور اس کی وجہ سے شوہر ناراض ہو جائے، ساری رات صبح تک فرشتے اس عورت پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں کہ اس عورت پر خدا کی لعنت ہو اور لعنت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کو حاصل نہیں ہوگی، اس لیے کہ تمہارے اتنے حقوق بیان کیے گئے۔ تمہارے حقوق کا لحاظ کیا گیا۔ اس کا منشا درحقیقت یہ ہے کہ تمہارے اور تمہارے شوہر کے درمیان جو تعلق ہے وہ درست ہو جائے۔ اور اس تعلق کی درستی کا ایک لازمی حصہ یہ ہے کہ تمہارے ذریعہ شوہر کو عفت حاصل ہو۔ پاک دامنی حاصل ہو۔ نکاح کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ پاک دامنی حاصل ہو۔ اور نکاح کے بعد شوہر کو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہ رہے۔ اس لیے تمہارے ذمے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس معاملے میں تمہاری طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔ اگر کوتاہی ہوگی تو پھر فرشتوں کی طرف سے تم پر لعنت ہوتی رہے گی۔

---

(۱) صحیح البخاری کتاب النکاح، باب اذا باتت المرأة مهاجرة فراش زوجها، رقم: ٤٧٩٤، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم امتناعها من فراش زوجها، رقم: ٢٥٩٤، سنن أبي داؤد، کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المرأة، رقم: ١٨٢٩، مسند احمد، رقم: ٨٢٢٤

دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں:

((اِذَا بَاتَتِ الْمَرْأَةُ مُهَاجِرَةً فِرَاشَ زَوْجِهَا لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتّٰى تُصْبِحَ))

اگر کوئی عورت اپنے شوہر کا بستر چھوڑ کر رات گزارے تو اس کو فرشتے لعنت کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ صبح ہو جائے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ حدیث شریف میں ایک چھوٹی بات کہی گئی ہے کہ اگر شوہر نے بیوی کو اس کام کے لیے دعوت دی ہے اور وہ انکار کرے، یا ایسا طرز عمل اختیار کرے جس سے شوہر کا منشا پورا نہ ہو سکے تو ساری رات لعنت ہوتی رہتی ہے۔ اور اگر شوہر کی اجازت اور شوہر کی مرضی کے بغیر عورت گھر سے باہر چلی جائے تو جب تک وہ گھر سے باہر رہے گی۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی لعنت ہوتی رہے گی۔ ان تمام معاملات کی نبی کریم ﷺ نے تفصیل کے ساتھ ایک ایک چیز بیان فرما دی، اس لیے کہ یہی چیزیں جھگڑے اور فساد کا باعث ہوتی ہیں۔

شوہر کی اجازت سے نفلی روزہ رکھے

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

((لَا یَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ اَنْ تَصُوْمَ وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ إِلَّا بِإِذْنِهٖ، وَلَا تَأْذَنَ فِیْ بَیْتِهٖ إِلَّا بِإِذْنِهٖ))(۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ کسی عورت کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کی موجودگی میں روزہ رکھے۔ مگر شوہر کی اجازت سے، یعنی کسی عورت کے لیے نفلی روزہ رکھنا شوہر کی اجازت کے بغیر حلال نہیں۔ نفلی روزہ کے کتنے فضائل احادیث میں مذکور ہیں لیکن عورت شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں رکھ سکتی۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ دن کے وقت روزہ سے ہونے کی وجہ سے شوہر کو تکلیف ہو۔ اس لیے پہلے شوہر سے اجازت لے لے۔ البتہ شوہر کو چاہئے کہ وہ بلاوجہ بیوی کو نفلی روزے سے منع نہ کرے، بلکہ روزے کی اجازت دے دے۔ بعض اوقات میاں بیوی کے درمیان اس بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے کہ بیوی کہتی ہے کہ میں روزہ رکھنا چاہتی ہوں اور شوہر کہتا ہے میں اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے مرد کو چاہئے کہ وہ بلاوجہ اس فضیلت کو حاصل کرنے سے بیوی کو منع نہ کرے۔ لیکن عورت کے لیے بلا اجازت روزہ رکھنا جائز نہیں۔ اگر شوہر اجازت نہیں دیتا تو عورت وہ نفلی روزہ چھوڑ دے۔ اس لیے کہ شوہر کی اطاعت زیادہ مقدم ہے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لاتأذن المرأة فی بیت زوجها لأحد الا باذنه، رقم: ٤٧٩٦، صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب ما أنفق العبد من مال مولاه، رقم: ١٧٠٤، مسند أحمد، رقم: ٧٨٤١

شوہر کی اطاعت نفلی عبادت پر مقدم ہے

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے شوہر کی اطاعت کو تمام نفلی عبادتوں پر فوقیت عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا جو ثواب اس عورت کو روزہ رکھ کر ملتا، اب شوہر کی اطاعت کرنے میں اس سے زیادہ ثواب ملے گا اور وہ عورت یہ نہ سمجھے میں روزہ سے محروم ہوگئی۔ اس لیے کہ وہ یہ سوچے کہ روزہ کس لیے رکھ رہی تھی؟ روزہ تو اس لیے رکھ رہی تھی کہ ثواب ملے گا۔ اور اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گا جب تک تیرا شوہر تجھ سے راضی نہیں ہوگا اس لیے جو ثواب تمہیں روزہ رکھ کر ملتا، وہی روزے کا ثواب کھانے پینے کے بعد بھی ملے گا۔ ان شاء اللہ

گھر کے کام کاج پر اجر و ثواب

بعض مرتبہ ہم لوگوں کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ یہ میاں بیوی کے تعلقات ایک دنیاوی قسم کا معاملہ ہے۔ اور یہ صرف نفسانی خواہشات کی تکمیل کا معاملہ ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ دینی معاملہ بھی ہے اس لیے کہ اگر عورت یہ نیت کر لے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ذمے یہ فریضہ عائد کیا ہے، اور اس تعلق کا مقصد شوہر کو خوش کرنا ہے۔ اور شوہر کو خوش کرنے کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا ہے۔ تو پھر یہ سارا عمل ثواب بن جاتا ہے۔ گھر کا جو کام خواتین کرتی ہیں، اور اس میں نیت شوہر کو خوش کرنے کی ہے۔ تو صبح سے لے کر شام تک وہ جتنا کام کر رہی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے یہاں عبادت میں لکھا جاتا ہے، چاہے وہ کھانا پکانا ہو، گھر کی دیکھ بھال ہو، یا بچوں کی تربیت ہو، یا شوہر کا خیال ہو، یا شوہر کے ساتھ خوش دلی کی باتیں ہوں، ان سب پر اجر لکھا جا رہا ہے بشرطیکہ نیت درست ہو۔

جنسی خواہش کی تکمیل پر اجر و ثواب

اس موضوع پر بالکل صریح حدیث موجود ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میاں بیوی کے جو باہمی تعلقات ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر بھی اجر عطا فرماتے ہیں۔ صحابہ کرام نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! وہ تو انسان اپنی نفسانی خواہشات کے تحت کرتا ہے۔ اس پر کیسا اجر؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ نفسانی خواہشات کو ناجائز طریقے سے پورا کرتے تو اس پر گناہ ہوتا یا نہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! گناہ ضرور ہوتا'' آپ نے فرمایا چونکہ میاں بیوی ناجائز طریقے

کو چھوڑ کر جائز طریقے سے نفسانی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی وجہ سے اور اس کے حکم کے ماتحت کر کر رہے ہیں اس لیے اس پر بھی ثواب ہوگا۔(۱)

اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں

ایک حدیث جو میں نے خود تو نہیں دیکھی البتہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کے مواعظ میں یہ حدیث پڑھی ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کئی جگہ اس حدیث کا ذکر فرمایا۔ وہ حدیث یہ ہے کہ شوہر باہر سے گھر کے اندر داخل ہوا اور اس نے محبت کی نگاہ سے بیوی کو دیکھا اور بیوی نے محبت کی نگاہ سے شوہر کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ میاں بیوی کے تعلقات محض دنیوی قصہ نہیں ہے۔ یہ آخرت اور جنت وجہنم بنانے کا راستہ بھی ہے۔

قضا روزوں میں شوہر کی رعایت

ترمذی شریف میں حدیث ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رمضان کے مہینے میں طبعی مجبوری کی وجہ سے جو روزے مجھ سے قضا ہو جاتے تھے، میں عام طور پر ان روزوں کو آنے والے شعبان کے مہینے میں رکھا کرتی تھی یعنی تقریباً گیارہ ماہ بعد، یہ میں اس لیے کرتی تھی کہ شعبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کثرت سے روزے رکھا کرتے تھے۔ لہٰذا اگر اس زمانے میں بھی روزے سے ہوں گی۔ اور آپ بھی روزے سے ہوں گے تو یہ صورت زیادہ بہتر ہے بنسبت اس کے کہ میں روزہ سے ہوں۔ اور آپ کا روزہ نہ ہو حالانکہ وہ نفلی روزے نہیں تھے۔ بلکہ رمضان کے قضا روزے تھے۔ اور قضا روزوں کے بارے میں حکم یہ ہے کہ ان کو جتنا جلدی ہو سکے، ادا کر لینے چاہئیں، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صرف آپ کی تکلیف کے خیال سے شعبان تک مؤخر فرماتی تھیں۔(۲)

بیوی ناپسندیدہ شخص کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دے

اس حدیث کا اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَلَاتَأْذَنَ فِیْ بَیْتِهٖ إِلَّا بِإِذْنِهٖ))

---

(۱) مسند أحمد (٥/٦٧)

(۲) صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب متى يقضى قضاء رمضان، رقم: ١٨١٤، صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب قضاء رمضان في شعبان، رقم: ١٩٣٣،

یعنی عورت کے ذمہ یہ بھی فرض ہے کہ شوہر کے گھر میں کسی کو شوہر کی اجازت کے بغیر داخل ہونے کی اجازت نہ دے۔ یا کسی ایسے شخص کو گھر کے اندر آنے کی اجازت دینا جس کو شوہر ناپسند کرتا ہو۔ یہ عورت کے لیے بالکل ناجائز اور حرام ہے۔ ایک دوسری حدیث میں اس بات کو اور تفصیل سے بیان فرمایا:

((اَلَا اِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَائِكُمْ حَقًّا وَلِنِسَائِكُمْ عَلَيْكُمْ حَقًّا فَاَمَّا حَقُّكُمْ عَلَيْهِنَّ اَنْ لَّايُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ مَنْ تَكْرَهُوْنَ وَلَايَاْذَنَّ فِىْ بُيُوْتِكُمْ لِمَنْ تَكْرَهُوْنَ))(۱)

یاد رکھو، تمہارا تمہاری بیویوں پر بھی کچھ حق ہے اور تمہاری بیویوں کا تم پر کچھ حق ہے یعنی دونوں کے ذمے ایک دوسرے کے کچھ حقوق ہیں اور دونوں کے حقوق کی نگہداشت اور پاسداری فریقین پر لازم ہے۔ وہ حقوق کیا ہیں؟ وہ یہ ہیں کہ اے مردو! تمہارا حق ان بیویوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو ایسے لوگوں کو استعمال نہ کرنے دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھر میں ایسے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ دیں، جن کا آنا تم ناپسند کرتے ہو، یہاں دو حق بیان فرمائے ایک یہ کہ بیوی کے ذمہ یہ فرض ہے کہ وہ گھر کے اندر کسی ایسے شخص کو آنے نہ دے جس کے آنے کو شوہر ناپسند کرتا ہو، حتیٰ کہ اگر بیوی کے کسی عزیز کا گھر میں آنا شوہر کو ناپسند ہو تو اس صورت میں اپنے عزیزوں کو بھی گھر میں آنے کی اجازت دینا بھی جائز نہیں۔ اور والدین کو بھی صرف اتنی اجازت ہے کہ ہفتہ میں ایک مرتبہ آکر بیٹی کی صورت دیکھ لیں۔ اس سے تو شوہر ان کو روک نہیں سکتا۔ لیکن ان کے لیے بھی شوہر کی اجازت کے بغیر گھر میں ٹھہرنا اور رہنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ جن کو تم ناپسند کرتے ہو ان کو آنے کی اجازت نہ دو، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

اور دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ وہ بیویاں تمہارے بستروں کو استعمال کرنے کی اجازت نہ دیں، جن کو تم ناپسند کرتے ہو، بستر کے استعمال میں سب چیزیں داخل ہیں یعنی بستر پر بیٹھنا، بستر پر لیٹنا، بستر پر سونا یہ سب اس میں داخل ہیں۔

حضرت ام حبیبہ کا اسلام اور تعظیم رسول ﷺ

ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا حضور اقدس ﷺ کی زوجہ مطہرہ ہیں۔ حضرات صحابہ

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها، رقم: ۱۰۸۳، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب حق المرأة علی الزوج، رقم: ۱۸٤۱

کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات کے اندر نور بھرا ہوا ہے۔ یہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں جنہوں نے تقریباً اکیس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں گزارے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگیں لڑیں اور مکہ مکرمہ کے سرداروں میں سے تھے اور آخر میں فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہو کر صحابی بن گئے اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا کرشمہ تھا کہ کافروں کے اتنے بڑے سردار کی بیٹی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر دونوں مسلمان ہو گئے، باپ مسلمانوں کی مخالفت اور ان کے ساتھ عداوت میں لگا ہوا ہے، اور بیٹی اور داماد دونوں مسلمان ہو گئے، ان دونوں کے مسلمان ہونے سے ابوسفیان کے کلیجے پر چھری چلتی تھی اور ان کو بیٹی اور داماد کا مسلمان ہونا برداشت نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کو تکلیفیں پہنچانے کے درپے رہتے تھے۔ اس زمانے میں بہت سے مسلمان کافروں کی تکلیفوں سے تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر بھی تھے۔ یہ دونوں وہاں جا کر رہنے لگے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کے عجیب وغریب انداز ہیں، جب حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ میں قیام کیا تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے خواب میں دیکھا کہ میرے شوہر کی صورت بالکل بدل گئی ہے۔ اور مسخ ہو گئی ہے۔ جب یہ بیدار ہوئیں تو ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے شوہر کے دین وایمان میں کچھ خلل آ جائے اس کے بعد جب کچھ دن گزرے تو اس خواب کی تعبیر سامنے آ گئی اور یہ ہوا کہ ان کے شوہر ایک عیسائی کے پاس جایا کرتے تھے اس کے پاس جانے کے نتیجے میں دل سے ایمان نکل گیا اور عیسائی بن گئے۔

اب حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا پر تو بجلی گر گئی، اسلام کی خاطر ماں باپ کو چھوڑا، وطن کو چھوڑا، سارے عزیز واقارب کو چھوڑا، اور آ کر اس دیار غیر میں مقیم ہو گئے۔ اور لے دے کر ایک شوہر جو ہمدرد اور دم ساز ہو سکتا تھا۔ وہ کافر ہو گیا، اب ان پر تو قیامت گزر گئی۔ اور کچھ دنوں کے بعد ان کے شوہر کا اسی حالت میں انتقال ہو گیا، اب یہ حبشہ کے اندر بالکل تنہا رہ گئیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں اس کی اطلاع ملی کہ ان کے شوہر عیسائی بن کر انتقال کر گئے ہیں اور حضرت ام حبیبہ دیار غیر میں اکیلی اور تنہا ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو پیغام بھیجا کہ چونکہ ام حبیبہ دیار غیر میں اکیلی اور تنہا ہیں۔ ان کو میری طرف سے نکاح کا پیغام دے دو، چنانچہ نجاشی کی معرفت ان کو نکاح کا پیغام بھیجا گیا۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا خود اپنا واقعہ سناتی ہیں کہ ایک دن میں اسی بے بسی کے عالم میں گھر میں

بیٹھی تھی، اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باہر ایک کنیز کھڑی ہوئی ہے۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اس سے پوچھا کہ کہاں سے آئی ہو؟ اس کنیز نے جواب دیا کہ مجھے حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے بھیجا ہے (یہ وہی نجاشی ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر مسلمان ہو گئے تھے) انہوں نے پھر پوچھا کہ کیوں بھیجا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ آپ کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا پیغام بھیجا ہے۔ اور نجاشی بادشاہ کی معرفت بھیجا ہے۔ حضرت ام حبیبہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتی ہیں کہ جس وقت یہ الفاظ میرے کان میں پڑے، اس وقت مجھے اس قدر مسرت اور حیرت ہوئی کہ میرے پاس اس وقت جو کچھ بھی تھا۔ وہ میں نے اٹھا کر کنیز کو دے دیا اور کہا کہ تو میرے لیے اتنی اچھی خبر لائی ہے۔ اس لیے یہ تیرا انعام ہے۔ اس کے بعد اس حالت میں نکاح ہوا کہ حضرت ام حبیبہ حبشہ ہی میں تھیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تھے۔ اور پھر کچھ عرصہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ منورہ بلوانے کا انتظام فرمایا۔(۱)

متعدد نکاح کی وجہ

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو متعدد نکاح فرمائے۔ ناحق شناس لوگ تو معلوم نہیں کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ لیکن ہر نکاح کے پیچھے بڑی عظیم الشان حکمتیں ہیں۔ اس نکاح میں دیکھ لیجیے کہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا حبشہ میں کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہی تھیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ اب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اس طرح دلداری نہ فرماتے تو ان کا کیا بنتا، آپ نے اس طریقے سے ان سے نکاح فرما کر ان کو مدینہ طیبہ بلوایا۔

غیر مسلم کی زبان سے تعریف

یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ جب وقت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہو گیا تو اس کی اطلاع مکہ مکرمہ میں حضرت ابوسفیان کو پہنچی، اور اس وقت حضرت ابوسفیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن اور کافر تھے۔ جب ان کو یہ اطلاع ملی کہ میری بیٹی کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گیا ہے۔ اس وقت بیساختہ ان کی زبان پر جو جملہ آیا وہ یہ تھا کہ یہ خبر تو خوشی کی خبر ہے، اس لیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کے پیغام کو رد کیا جائے۔ لہٰذا یہ تو خوش قسمتی کی بات ہے کہ ام حبیبہ (رضی اللہ عنہا) وہاں چلی گئیں۔

---

(۱) الاصابة فی تمییز الصحابة (۲۹۸/٤) لفظ "رملة"

معاہدۂ حدیبیہ کا خاتمہ

صلح حدیبیہ کے موقع پر آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوسفیان کے درمیان جنگ بندی کا ایک معاہدہ ہوا تھا۔ کتب سیرت میں جس کی تفصیل موجود ہے۔ ایک سال تک حضرت ابوسفیان اور دوسرے کافروں نے اس معاہدے کی شرائط کی پابندی کی، لیکن ایک سال کے بعد انہوں نے عہد شکنی شروع کر دی۔ اس عہد شکنی کے نتیجے میں حضور اقدس ﷺ نے یہ اعلان فرما دیا کہ اب ہم اس معاہدے کے پابند نہیں رہے۔ اس لیے اب ہم جب چاہیں گے مکہ مکرمہ پر حملہ کر دیں گے۔ کیونکہ ہمارے دشمنوں نے جب عہد کا پاس نہیں کیا تو اب ہم بھی اس کے پابند نہیں رہے، اس اعلان کے بعد حضرت ابوسفیان کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ کسی وقت بھی حضور اقدس ﷺ مکہ مکرمہ پر حملہ کر سکتے ہیں۔

آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں

ایک مرتبہ حضرت ابوسفیان شام سے واپس آ رہے تھے کہ مسلمانوں نے ان کو اور ان کے قافلے کو گرفتار کر لیا۔ حضرت ابوسفیان رات کے وقت میں چھپ چھپا کر مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ اور یہ خیال ہوا کہ میری بیٹی تو حضور اقدس ﷺ کے گھر میں ہیں، لہٰذا میں ان سے بات کروں گا تو شاید میری جان بخشی ہو جائے۔ چنانچہ یہ چھپ کر حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں داخل ہو گئے۔ بیٹی نے ان کا استقبال کیا۔ جس وقت یہ گھر میں داخل ہوئے اس وقت حضور اقدس ﷺ کا بستر گھر میں بچھا ہوا تھا۔ حضرت ابوسفیان نے گھر میں داخل ہو کر اس بستر پر بیٹھنے کا ارادہ کیا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا تیزی سے آگے بڑھیں اور حضور اقدس ﷺ کا بستر ایک طرف ہٹا کر لپیٹ کر رکھ دیا۔

(حضرت) ابوسفیان کو بیٹی کا طرز عمل بڑا انوکھا اور عجیب محسوس ہوا اور ایک جملہ یہ کہا:

''رملہ! کیا یہ بستر میرے لائق نہیں ہے، یا میں اس بستر کے لائق نہیں ہوں؟''

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا:

''ابا جان! بات یہ ہے کہ آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں اس واسطے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے اور جو آدمی مشرک ہو، میں اس کو اپنی زندگی میں اس بستر پر بیٹھنے کی اجازت نہیں دے سکتی''

اس پر (حضرت) ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے کہا:

''رملہ! مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی بدل جاؤ گے کہ اپنے باپ کو بھی اس بستر پر

بیٹھنے کی اجازت نہیں دوں گی‘‘(۱)

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا یہ عمل کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر اپنے باپ کو بھی بیٹھنے سے منع فرمایا۔ یہ درحقیقت اس حدیث پر عمل ہے کہ ’’ لَایُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ مَنْ تَكْرَهُوْنَ ‘‘جن کو تم ناپسند کرتے ہو، ان لوگوں کو وہ بیویاں تمہارا بستر استعمال کرنے کی اجازت نہ دیں۔

خاوند کے بلانے پر سب کام چھوڑ دے

وَعَنْ أَبِیْ عَلِی طَلْقِ بْنِ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((اِذَا دَعَا الرَّجُلُ زَوْجَتَهُ لِحَاجَتِهٖ فَلْتَأْتِهٖ وَاِنْ كَانَتْ عَلَى التَّنُّوْرِ))(۲)

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب مرد اپنی بیوی کو اپنی حاجت کے لیے بلائے۔ تو اس عورت پر واجب ہے کہ وہ آجائے، خواہ وہ تنور پر بھی کیوں نہ ہو۔ مراد یہ ہے کہ اگرچہ وہ عورت روٹی پکانے کے کام میں مشغول ہو، اس وقت بھی اگر شوہر اپنی حاجت پوری کرنے کے لیے اس کو دعوت دے اور بلائے تو وہ انکار نہ کرے۔

نکاح جنسی تسکین کا حلال راستہ

ان سارے احکام کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مرد وعورت کے اندر فطری طور پر ایک جنسی جذبہ اور خواہش رکھی ہے۔ اور اس فطری جذبے اور خواہش کی تسکین کے لیے ایک حلال راستہ تجویز فرما دیا ہے، وہ ہے نکاح کا راستہ، اور شوہر بیوی کے تعلقات میں اس ضرورت کو پورا کرنا اولین اہمیت کا حامل ہے، اس لیے حلال کے سارے راستے کھول دیئے، تاکہ کسی بھی مرد وعورت کو حرام طریقے سے اس جذبہ اور خواہش کی تسکین کا خیال پیدا نہ ہو، بیوی کو شوہر سے تسکین ہو، اور شوہر کو بیوی سے تسکین ہو، تاکہ دوسروں کی طرف دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

نکاح کرنا آسان ہے

اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے نکاح کے رشتے کو بہت آسان بنایا۔ صرف مرد وعورت موجود ہوں،

(۱) الاصابة فی تمییز الصحابة (۲۹۸/٤) لفظ "رملہ"

(۲) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق الزوج علی المرأة، رقم: ۱۰۸۰

اور دو گواہ ہوں، اور وہ مرد عورت ان گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کرلیں۔ بس نکاح ہو گیا، حتیٰ کہ خطبہ نکاح پڑھنا بھی ضروری نہیں۔ البتہ خطبہ پڑھنا سنت ہے، اسی طرح کسی قاضی سے یا کسی اور سے نکاح پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے، اگر دوسرے سے پڑھوالے تو یہ سنت ہے، لیکن اس کے بغیر بھی اگر مرد وعورت خود دو گواہوں کی موجوگی میں ایجاب وقبول کرلیں ایک کہے کہ میں نے تم سے نکاح کیا، اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا، بس! نکاح منعقد ہو گیا۔ نکاح کے لیے نہ تو مسجد میں جانے کی ضرورت ہے اور نہ درمیان میں تیسرے شخص کو ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ حلال کا راستہ آسان سے آسان تر ہو جائے۔

برکت والا نکاح

اور دوسری طرف یہ تاکید فرمائی کہ نکاح کا معاملہ اور نکاح کی تقریب سادگی اور آسانی کے ساتھ انجام دی جائے، کوئی رسم، کوئی شرط، کوئی لمبی چوڑی تقریب کرنے کی ضرورت نہیں۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ جب اولاد بالغ ہو جائے تو اس کے نکاح کی فکر کرو، تاکہ اس کو حرام کی طرف جانے کی خواہش اور ضرورت پیدا نہ ہو، اور حلال کا راستہ آسان ہو جائے۔ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَعْظَمُ النِّکَاحِ بَرَکَۃً اَیْسَرُہٗ مُؤْنَۃً))(۱)

سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں بہت سے زیادہ آسانی ہو۔ اور سادگی ہو، نکاح کو جتنا پھیلایا جائے گا اور جتنا اس کے اندر دھوم دھڑکا ہو گا، اسی قدر اس میں برکت کم ہوتی چلی جائے گی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نکاح

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، یعنی ان دس خوش نصیب صحابہ میں سے ہیں جن کو حضور اقدس ﷺ نے دنیا ہی میں خوش خبری سنادی تھی کہ یہ جنت میں جائیں گے، ایک مرتبہ جب حضور اقدس ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوئے تو حضور اقدس ﷺ نے دیکھا کہ ان کی قمیص کے اوپر زرد نشان اور رنگ لگا ہوا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہاری قمیص پر یہ نشان کیسا لگا ہوا ہے؟ انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، حديث سيدة عائشة رضي الله عنها، رقم: ۲۳۳۸۸

ایک خاتون سے نکاح کر لیا ہے۔ اور نکاح کے وقت ایک خوشبو لگائی تھی۔ اور یہ خوشبو کا نشان ہے، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَعَلَيْكَ أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ))

''اللہ تعالیٰ اس میں تمہارے لیے برکت عطا فرمائیں ولیمہ کر لو، چاہے ایک بکری سے کیوں نہ ہو''(۱)

اس حدیث میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، اور حضور ﷺ کے انتہائی قریبی صحابی ہیں، لیکن نکاح کی تقریب میں صرف یہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کو بلایا نہیں، بلکہ ذکر تک نہیں کیا۔ اور پھر جب خود حضور اقدس ﷺ نے رنگ کے بارے میں پوچھا تو اس کے جواب کے ضمن میں نکاح کی اطلاع دی۔ اور نکاح کی خبر سن کر حضور ﷺ نے یہ شکایت نہیں کی کہ تم اکیلے نکاح کر کے بیٹھ گئے۔ ہمیں بلایا تک نہیں۔ اس لیے کہ شریعت نے نکاح کی تقریب پر سرے سے کوئی شرط اور قید عائد نہیں کی۔

آج نکاح کو مشکل بنا دیا گیا ہے

حضرت جابر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آئے، اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے ایک خاتون سے نکاح کر لیا ہے۔(۲)

یہ حضور اقدس ﷺ کے بہت قریبی صحابہ میں سے تھے۔ اور ہر وقت حضور ﷺ سے ملتے رہتے تھے، لیکن نکاح میں شرکت کی دعوت نہیں دی۔ اس لیے کہ حضور اقدس ﷺ کے عہد مبارک میں اس کا عام رواج تھا کہ نکاح کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا تھا یہ نہیں تھا کہ نکاح ہو رہا ہے تو ایک طوفان برپا ہے۔ مہینوں سے اس کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اور پورے خاندان میں اس کی دھوم

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب البيوع، باب ما جاء فی قول الله تعالى فإذا قضيت الصلاة، رقم: ۱۹۰۷ صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب الصداق وجواز تعليم القرآن و خاتم حديث، رقم: ٢٥٥٦، سنن الترمذی، كتاب النكاح عن رسول الله، باب ما جاء فی الوليمة، ١٠١٤، سنن النسائی، كتاب النكاح، باب التزويج على نواة من ذهب، رقم: ٣٢٩، سنن أبی داؤد، كتاب النكاح، باب قلة المهر، رقم: ١٨٠٤، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب الوليمة، رقم ١٨٩٧، مسند أحمد، رقم: ١٢٢٢٤

(۲) صحيح البخاری، كتاب النفقات، باب عون المرأة زوجها فی ولدها، رقم: ٤٩٤٨، صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب استحباب نكاح البكر، رقم: ٢٦٦٤، مسند أحمد، رقم: ١٤٤٨٢

ہے اس کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا۔ شریعت نے نکاح کو جتنا آسان کیا تھا، ہم نے اس کو اپنی غلط رسموں کے ذریعہ اتنا ہی مشکل بنا دیا، اس کا نتیجہ دیکھ لیجیے کہ لڑکیاں بغیر نکاح کے گھروں میں بیٹھی ہیں۔ وہ اس لیے گھروں میں بیٹھی ہیں کہ جہیز مہیا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ یا عالی شان تقریب کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اب ان کاموں کے لیے پیسے جمع کرنے کے لیے حلال وحرام ایک ہو رہا ہے۔ یہ سب رسومات ہم نے ہندوؤں سے اور عیسائیوں سے لے لی ہیں۔ اور حضور ﷺ نے سنت کا جو طریقہ ہمارے لیے مقرر فرمایا تھا وہ ہم نے چھوڑ دیا اور آج اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حلال کے راستے بند ہیں، حلال طریقے سے خواہش پوری کرنے کے لیے بہت مال و دولت والا ہونا ضروری ہے لاکھوں روپیہ ہو۔ تب جا کر نکاح کر سکے گا۔ ورنہ نہیں، اور دوسری طرف حرام کے ذرائع چاروں طرف چوپٹ کھلے ہیں۔ جب چاہے، جس طرح چاہے پوری کر لے۔ دن رات گھر میں ٹی وی چل رہے ہیں، فلمیں آرہی ہیں، اور اس کے ذریعہ نفسانی شہوانی جذبات کو برانگیختہ کیا جا رہا ہے۔ ان کو بھڑکایا جا رہا ہے، اگر بازار میں نکلو تو آنکھوں کو پناہ ملنی مشکل ہے۔ اور اس کے نتیجے میں فحاشی، عریانی، بے غیرتی، بے حیائی اور بے پردگی کی لعنت مسلط ہو رہی ہیں۔ لہٰذا ان رسومات نے ہمارے معاشرے کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے۔

جہیز موجودہ معاشرے کی ایک لعنت

اس معاملے میں سب سے زیادہ ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو کھاتے پیتے، امیر اور دولت مند گھرانے کہلاتے ہیں۔ اس عذاب سے نجات اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کھاتے پیتے اور امیر کہلانے والے لوگ اس بات کا اقدام نہ کریں کہ ہم اپنے خاندان میں شادیاں اور نکاح سادگی کے ساتھ کریں گے، اور ان غلط رسموں کو ختم کریں گے، اس وقت تک تبدیلی نہیں آئے گی، اس لیے کہ ایک غریب آدمی تو یہ سوچتا ہے کہ مجھے اپنی سفید پوشی برقرار رکھتے ہوئے اور اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے یہ کام کرنا ہی ہے۔ اس کے بغیر میرا گزارہ نہیں ہوگا، اگر لڑکی کو جہیز نہیں دیں گے تو سسرال والے طعنے دیا کریں گے کہ کیا لے کر آئی تھی۔ آج جہیز کو شادی کا ایک لازمی حصہ سمجھ لیا گیا ہے۔ گھر کا سامان مہیا کرنا جو شوہر کے ذمے واجب تھا۔ وہ آج بیوی کے باپ کے ذمے واجب ہے، گویا کہ وہ باپ اپنی بیٹی اور اپنے جگر کا ٹکڑا بھی شوہر کو دے دے، اور اس کے ساتھ لاکھوں روپیہ بھی دے، گھر کا فرنیچر مہیا کرے اور اس طرح وہ دوسرے کا گھر آباد کرے۔ شریعت میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں۔ ٹھیک ہے اگر کوئی باپ اپنی بیٹی کو کوئی چیز دینا چاہتا ہے تو وہ سادگی کے ساتھ دے دے، بہرحال جو متمول اور کھاتے پیتے

گھرانے کہلاتے ہیں۔ ان پر یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے کہ وہ جب تک اس سادگی کو نہیں اپنائیں گے اور اس کو ایک تحریک کی شکل میں نہیں چلائیں گے اس وقت تک اس عذاب سے نجات ملنی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ بات ہمارے دلوں میں ڈال دے۔ آمین

عورت کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے

وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:
((لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا))(۱)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میرے لیے کسی کو یہ حکم دینا جائز ہوتا کہ ایک شخص دوسرے کو سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے''

لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے کے آگے سجدہ کرنا جائز نہیں، لہٰذا میں یہ سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ لیکن اگر اس دنیا میں کسی انسان کے لیے دوسرے انسان کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

یہ دو دلوں کا تعلق ہے

زندگی کے سفر میں جہاں مرد و عورت ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے مرد کو ''امیر'' اور ''نگران'' بنایا ہے۔ اس ''امارت'' کے علاوہ اور جتنی امارتیں ہیں وہ سب وقتی اور عارضی ہیں۔ آج ایک آدمی امیر اور حاکم بن گیا۔ یا ملک کا بادشاہ بنا دیا گیا لیکن اس کی حاکمیت اور بادشاہت اور امارت ایک مخصوص وقت تک کے لیے ہے۔ کل تک حاکم اور امیر بنا ہوا تھا، اور آج وہ جیل خانے میں ہے، کل تک بادشاہ بنا ہوا تھا۔ اور آج دو کوڑی کے لیے پوچھنے کو تیار نہیں، لہٰذا یہ امارتیں اور حکومتیں آنی جانی چیزیں ہیں۔ آج ہیں، کل نہیں۔ لیکن میاں بیوی کا تعلق زندگی بھر کا تعلق ہے۔ دم دم کا ساتھ ہے، ایک ایک لمحے کی رفاقت ہے، لہٰذا اس تعلق کے نتیجے میں مرد کو جو امارت حاصل ہوتی ہے، وہ مرتے دم تک برقرار رہتی ہے یا جب تک نکاح کا رشتہ برقرار ہے۔ اس لیے یہ ''امارت'' عام امارتوں سے مختلف ہے۔ دوسری امارتوں میں حاکم کا محکوم کے ساتھ، امیر کا رعیت کے ساتھ صرف ایک

(۱) سنن الترمذي، كتاب الرضاع، باب ماجاء في حق الزوج على المرأة، رقم: ۱۰۷۹، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق الزوج على المرأة، رقم: ۱۸۴۳، مسند أحمد، رقم: ۱۲۱۵۳

ضابطے کا دستوری اور قانونی تعلق ہوتا ہے، لیکن میاں بیوی کا تعلق محض ضابطے، قانون اور محض خانہ پری کا تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ دلوں کا جوڑ ہے، یہ دلوں کا تعلق ہے، جس کے اثرات ساری زندگی پر محیط ہیں۔ اسی واسطے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے، کیونکہ وہ اس کی زندگی بھر کے سفر کا امیر ہے۔

سب سے زیادہ قابل محبت ہستی

حضور نبی کریم ﷺ کی سنت یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے فرائض کی طرف توجہ دلاتے ہیں، جب شوہر سے خطاب تھا اس وقت ساری باتیں عورت کے حقوق کے بارے میں بیان کی جارہی تھیں کہ عورت کے یہ حقوق ہیں، عورت کے یہ حقوق ہیں۔ اب جب عورت سے خطاب ہو رہا ہے تو عورت کو اس کے فرائض کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ تمہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے بعد تمہارے لیے سب سے زیادہ قابل احترام اور سب سے زیادہ قابل محبت ہستی اس روئے زمین پر تمہارا شوہر ہے۔ جب تک یہ بات نہیں سمجھوگی، شوہر کے حقوق صحیح طور پر ادا نہیں کر پاؤ گی۔ البتہ اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم سب پر مقدم ہے، جب اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم آجائے تو پھر نہ باپ کی اطاعت، نہ ماں کی اطاعت، اور نہ شوہر کی اطاعت، لیکن اللہ اور اللہ کے رسول کے بعد شوہر کا درجہ ہے۔ اس کو خوش کرنے کی فکر کرو اور اس کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرو، اس کی اطاعت کی فکر کرو۔

جدید تہذیب کی ہر چیز الٹی ہے

آج ہمارے دور میں ہر چیز کے اندر الٹی گنگا بہنے لگی ہے، حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کی تہذیب میں ہر چیز الٹی ہوگئی ہے، یہاں تک کہ پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوا کرتا تھا۔ اور اب بلب کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے اور اس درجہ الٹی ہوگئی ہے کہ گھر کا کام کاج اگرچہ شرعاً عورت کے ذمے نہ ہو، لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سنت ضرور ہے، اس لیے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گھر کا سارا کام خود اپنے ہاتھ سے کیا کرتی تھیں۔ اور دوسری طرف عورت کو شوہر کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا کہ ان کی اطاعت کرو۔ اب اگر ایک عورت گھر کا کام کاج کرتی ہے اور اپنے شوہر اور بچوں کے لیے کھانا پکاتی ہے تو اس پر اس کے لیے اعلیٰ ترین اجر وثواب لکھا جاتا ہے۔ لیکن آج کی الٹی تہذیب کا فیصلہ یہ ہے کہ عورت کا گھر میں بیٹھنا اور گھر کا کام کاج تو رجعت پسندی، دقیانوسیت اور پرانا طریقہ ہے، اور یہ عورت کو گھر کی چار دیواری میں قید کرنا ہے، لیکن اگر وہی عورت ہوائی جہاز میں ایئر ہوسٹس

بن کر چار سو آدمیوں کو کھانا کھلائے، اور ان کے سامنے ٹرے سجا کر لے جائے، اور چار سو آدمیوں کی ہولناک نگاہوں کا نشانہ بنے، ایک شخص اس سے کوئی خدمت لے رہا ہے، دوسرا شخص اس سے کوئی خدمت لے رہا ہے، اور بعض اوقات بلا وجہ خدمت لیتے ہیں، کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی، کسی نے بیل بجا کر اس کو بلایا، اور اس سے کہا کہ یہ تکیہ اٹھا کر دے دو، اس خدمت کا نام آج کی جدید تہذیب میں آزادی ہے اور اگر وہی عورت گھر میں اپنے شوہر اپنے بچوں اور اپنے بہن بھائیوں کے لیے یہ خدمت انجام دے تو اس کا نام ''دقیانوسیت'' ہے اور یہ ترقی کے خلاف ہے۔

اگر وہی عورت ہوٹل میں ''ویٹرس'' بنی ہوئی ہے، اور دن رات لوگوں کی خدمت انجام دے رہی ہے، کھانا کھلا رہی ہے، تو وہ ''آزادی نسواں'' کا ایک حصہ ہے، یا وہ کسی کی سیکریٹری بن جائے۔ یا وہ عورت کسی کی اسٹینو گرافر بن جائے یہ تو آزادی ہے اور اگر یہی عورت کام گھر میں رہ کر اپنے شوہر اپنے بچوں اور ماں باپ کے لیے یہ کام کرے تو اس کو ''دقیانوسیت'' کا نام دے دیا گیا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا نام خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

عورت کی ذمہ داری

حضور اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ عورت کے ذمے دنیا کے کسی فرد کی خدمت واجب نہیں، نہ اس کے ذمے کوئی ذمہ داری ہے اور نہ اس کے کاندھوں پر کسی کی ذمہ داری کا بوجھ ہے، تم ہر بوجھ اور ہر ذمہ داری سے آزاد ہو۔ لیکن صرف ایک بات ہے کہ تم اپنے گھر میں قرار سے رہو، اور اپنے شوہر کی اطاعت کرو، اور اپنے بچوں کی تربیت کرو، یہ تمہارا فریضہ ہے اور اس کے ذریعہ تم قوم کی تعمیر کر رہی ہو۔ اور اس کی معمار بن رہی ہو۔ حضور اقدس ﷺ نے تمہیں عزت کا یہ مقام دیا تھا۔ اب تم میں سے جو چاہے اس عزت کے مقام کو اختیار کرے، اور جو چاہے ذلت کے مقام کو اختیار کرے۔ جو آنکھوں سے نظر آ رہا ہے۔

وہ عورت سیدھی جنت میں جائے گی

وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّةَ))(۱)

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی حق الزوج علی المرأة، رقم: ۱۰۸۱، سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة، رقم: ۱۸٤٤

''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس عورت کا انتقال اس حالت میں ہوا کہ اس کا شوہر اس سے خوش ہو تو وہ سیدھی جنت میں جائے گی''

وہ تمہارے پاس چند دن کا مہمان ہے

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:
((لَاتُؤْذِیْ امْرَأَةٌ زَوْجَهَا فِی الدُّنْیَا اِلَّا قَالَتْ زَوْجَتُهُ مِنَ الْحُوْرِ الْعِیْنِ لَاتُؤْذِیْهِ قَاتَلَكِ اللّٰهُ! فَاِنَّمَا هُوَ عِنْدَكِ دَخِیْلٌ یُوْشِكُ أَنْ یُفَارِقَكِ اِلَیْنَا))(۱)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کبھی کوئی بیوی اپنے شوہر کو کوئی تکلیف پہنچاتی ہے۔ (اس لیے کہ بسا اوقات عورت کی طبیعت سلامتی کی حامل نہیں ہوتی۔ اور اس کی طبیعت میں فساد اور بگاڑ ہوتا ہے۔ اور اس فساد اور بگاڑ کے نتیجے میں اپنے شوہر کو تکلیف پہنچا رہی ہے) تو اس کے شوہر کی جو بیویاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنت میں حوروں کی شکل میں اس کے لیے مقدر فرمائی ہیں، وہ حوریں جنت سے اس دنیاوی بیوی سے خطاب کر کے کہتی ہیں:

''تو اس کو تکلیف مت پہنچا، اس لیے کہ یہ تمہارے پاس چند دن کا مہمان ہے، اور عنقریب وہ تم سے جدا ہو کر ہمارے پاس آ جائے گا۔''

یہ بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فساد طبیعت رکھنے والی بیوی کو متوجہ کر کے فرما رہے ہیں کہ تم اپنے شوہر کو جو تکلیف پہنچا رہی ہو، اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس لیے کہ دنیا میں تو اس کو جو چاہو گی تکلیف پہنچا دو گی۔ لیکن آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا رشتہ ایسی ''حورعین'' کے ساتھ قائم فرمائیں گے، جو ان شوہروں سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ ان کے دل کو ابھی سے اس بات کی تکلیف ہو رہی ہے کہ دنیا میں ہمارے شوہر کے ساتھ یہ کیسا تکلیف پہنچانے والا معاملہ کیا جا رہا ہے۔

مردوں کے لیے شدید ترین آزمائش

عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَیْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

(۱) سنن الترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی کراهیة الدخول علی المغیبات، رقم: ۱۰۹٤، مسند أحمد، رقم: ۲۱۰۸۵

((مَاتَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً هِيَ أَضَرُّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ))(۱)

''حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے بعد کوئی فتنہ ایسا نہیں چھوڑا جو مردوں کے لیے زیادہ نقصان دہ ہو بنسبت عورتوں کے فتنے کے''

عورتوں کا فتنہ اس دنیا میں مردوں کے لیے شدید ترین فتنہ ہے، اس حدیث کی اگر تشریح لکھی جائے تو ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے کہ یہ عورتیں مردوں کے لیے کس کس طریقے سے فتنہ ہیں۔

عورت کس طرح آزمائش ہے؟

فتنہ کے معنی ہیں ''آزمائش'' اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اس دنیا میں مردوں کی آزمائش کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اور یہ عورت کس کس طریقے سے آزمائش ہے؟ ایک مختصر مجلس میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ عورت اس طریقے سے بھی آزمائش ہے جس طریقے سے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آئی۔ یعنی مرد کی طبیعت میں عورت کی طرف کشش کا ایک میلان رکھ دیا گیا۔ اب اس کے حلال راستے بھی بیان کردیے، اور حرام راستے بھی بیان کردیے۔ اب آزمائش اس طرح ہے کہ یہ مرد حلال کا راستہ اختیار کرتا ہے یا حرام کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہ مرد کے لیے سب سے بڑی آزمائش ہے۔

اس کے ذریعہ دوسری آزمائش اس طرح ہے کہ یہ بیوی جو اس کے لیے حلال ہے۔ اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتا ہے، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ ویسا سلوک کرتا ہے یا اس کی حق تلفی کرتا ہے۔

تیسری آزمائش یہ ہے کہ یہ شخص بیوی کی محبت اور اس کے حقوق کی ادائیگی میں ایسا غلو اور انہماک تو نہیں کرتا کہ اس کے مقابلے میں دین کے احکام کو پس پشت ڈال دے، یہ تو اس نے سن لیا کہ بیوی کو خوش کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہئے۔ لیکن اب حرام اور ناجائز کاموں میں بھی اس کی دلجوئی کر رہا ہے۔ اور اس کی صحیح دینی تربیت نہیں کر رہا ہے۔ اس طرح بھی یہ آزمائش ہے۔ اس لیے مرد کو دونوں طرف خیال رکھنا ہے۔ ایک طرف محبت کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی پر روک

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب مایتقی من شؤم المرأة، رقم: ٤٨٠٦، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب أکثر أهل الجنة الفقراء وأکثر أهل النار النساء، رقم: ٤٩٢٣، سنن الترمذی، کتاب الأدب عن رسول الله، باب ماجاء فی تحذیر فتنة النساء، رقم: ٢٧٥٤، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب فتنة النساء، رقم: ٣٩٨٨، مسند أحمد، رقم: ٢٥٨٢٨

ٹوک نہ کرے، اور دوسری طرف دین کا تقاضا یہ ہے خلاف شرع کاموں پر روک ٹوک کرے۔ غرض آزمائشوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے انسان ان تمام آزمائشوں سے سرخروئی کے ساتھ اس طرح نکل سکتا ہے کہ اس کے حقوق بھی ادا کرے۔ اس کی تعلیم و تربیت کا بھی خیال رکھے۔ اس کے نفع و نقصان کا بھی خیال رکھے، اور حرام کی طرف بھی متوجہ نہ ہو، ان تمام باتوں کا خیال کرنا صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی خاص توفیق ہی کے ذریعے ہوسکتا ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ نے ایک دعا تلقین فرمائی ہے۔ جو آپ کی ماثور دعاؤں میں سے ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ فِتۡنَةِ النِّسَآءِ))(۱)

''اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں عورتوں کے فتنے سے''

اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ اس آزمائش میں کھرا اترنا اور سرخرو ہونا اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق کے بغیر ممکن نہیں، لہٰذا انسان کو اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتے رہنا چاہئے کہ اے اللہ! مجھے اس آزمائش میں پورا اتار دیجیے، بھٹکنے اور پھسلنے سے اور غلطی کا مرتکب ہونے سے بچا لیجیے، اس لیے اس ماثور دعا کو اپنی دعاؤں میں شامل کر لینا چاہئے۔

ہر شخص نگہبان ہے

عَنۡ ابۡنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

((كُلُّكُمۡ رَاعٍ، وَكُلُّكُمۡ مَسۡئُوۡلٌ عَنۡ رَعِيَّتِهٖ))(۲)

یہ بڑی عجیب و غریب حدیث ہے اور جوامع الکلم میں سے ہے۔ اور ہم میں سے ہر شخص اس حدیث کا مخاطب ہے، چنانچہ فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے۔ اور ہر شخص سے اس کے زیر نگہبان اشیاء اور افراد کے بارے میں سوال ہوگا، یعنی جن چیزوں کی نگہبانی اس کے سپرد کی گئی تھی۔ اس کے بارے میں اس سے سوال ہوگا۔

''راعی'' کے اصل معنی ہوتے ہیں ''نگہبان'' چرواہے کو بھی ''راعی'' کہتے ہیں۔ اس لیے کہ

(۱) کنز العمال، رقم: ۳٦٨٧ (۱۸۹/۲)، جامع الاحادیث رقم: ۵۰٤۳

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القریٰ والمدن، رقم: ۸٤٤، صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب فضیلة الإمام، عقوبة الجائر والحث علی الرفق، رقم: ۳٤۰۸، سنن الترمذی، کتاب الجهاد، باب ماجاء فی الإمام، رقم: ۱٦۲۷، سنن أبی داؤد، کتاب الخراج والإمارة والفئی، باب مایلزم الإمام من حق الرعیة، رقم: ۲۵۳۹، مسند أحمد، رقم: ٤۹۲۰

وہ بکریوں کی نگہداشت کرتا ہے۔ اور "راعی" کے معنی "حاکم" کے بھی ہوتے ہیں، اور حاکم کے جو ماتحت ہوتے ہیں۔ ان کو "رعیت" کہا جاتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص "راعی" ہے۔ اور ہر شخص سے اس کی "رعیت" کے بارے میں سوال ہوگا کہ ان کی نگہبانی تم نے کس طرح کی؟

"امیر" رعایا کا نگہبان ہے

((وَالْاَمِیْرُ رَاعٍ))

ہر امیر اپنے زیر نگہبانی افراد کا "راعی" اور "نگہبان" ہے۔ اور اس سے سوال ہوگا کہ تم نے ان کی کیسی نگہبانی کی۔ "امیر" کے بارے میں اسلام کا تصور یہ نہیں ہے کہ وہ امارت کا تاج سر پر لگا کر لوگوں سے الگ ہو کر بیٹھ جائے، بلکہ امیر کا تصور یہ ہے کہ وہ راعی ہے۔ اسی واسطے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر جائے تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے سوال ہوگا کہ اے عمر! تیری حکومت میں ایک کتا بھوکا مر گیا تھا۔

"خلافت" ذمہ داری کا ایک بوجھ

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شہادت سے پہلے زخمی ہوئے تو لوگوں نے کہا کہ آپ اپنے بعد خلیفہ بنانے کے لیے کسی کو نامزد کر دیں۔ اس وقت لوگوں نے آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا نام لیا کہ ان کو خلافت کے لیے نامزد فرما دیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بلاشبہ جلیل القدر صحابی تھے۔ ان کے علم و فضل، تقویٰ، اخلاص کسی چیز میں کسی کو کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ جب لوگوں نے حضرت فاروق اعظم کے سامنے ان کے بیٹے کا نام لیا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پہلے تو ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ تم میرے بعد ایسے شخص کو مجھ سے خلیفہ نامزد کرانا چاہتے ہو جس کو اپنی بیوی کو طلاق دینا بھی نہیں آتا۔

جس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں ایک مرتبہ اپنی اہلیہ کو ایسی حالت میں طلاق دے دی تھی، جب ان کی اہلیہ ماہواری کی حالت میں تھیں، اور ماہواری کی حالت میں طلاق دینا ناجائز ہے۔ ان کو یہ مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ اس لیے طلاق دے دی۔ بعد میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس طلاق سے رجوع کر لو۔ چنانچہ انہوں نے اس طلاق سے رجوع کر لیا۔ اس واقعہ کی طرف حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اشارہ فرمایا کہ تم مجھ سے ایسے شخص کو خلیفہ بنوانا چاہتے ہو جسے اپنی بیوی کو طلاق دینی بھی نہیں آتی۔ میں اس کو کیسے خلیفہ بنا دوں؟

لوگوں نے پھر اصرار کیا اور کہا حضرت! وہ قصہ آیا گیا ہوگیا۔ مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے ایسا کرلیا تھا۔ اس واقعہ کی وجہ سے وہ خلافت کی اہلیت سے تو نہیں نکلے، بلکہ وہ اس کے اہل ہیں، آپ ان کو بنادیں۔ اس کے جواب میں جو جملہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا، وہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ خلافت کا پھندا خطاب کی اولاد میں سے ایک ہی شخص کے گلے میں پڑ گیا تو کافی ہے۔ اب میں اپنے خاندان میں سے کسی اور فرد کے گلے میں یہ پھندا ڈالنا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ امارت اور خلافت درحقیقت ذمہ داری کا بہت بڑا بوجھ ہے۔ اور آخرت میں جب اللہ تعالیٰ کے سامنے جاکر حساب کتاب دوں تو اگر برابر سرابر بھی چھوٹ جاؤں تو بہت غنیمت سمجھوں گا۔

یہ ہے امیر کا تصور، اس کے راعی ہونے کا تصور، کہ اس نے اس امارت کے حق کو کیسے ادا کیا۔

مرد، بیوی بچوں کا نگہبان ہے

((وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی أَهْلِ بَيْتِه))

یعنی مرد اپنے گھر والوں کا راعی اور نگہبان ہے۔ گھر والوں میں بیوی اور بچے جو اس کے ماتحت ہیں جس فیملی کا وہ سربراہ ہے، وہ سب آگئے۔ ہر مرد سے اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ اس گھرانے کو تمہارے زیر انتظام دیا گیا تھا۔ بیوی بچے تھے۔ ان کے ساتھ تمہارا کس طرح معاملہ رہا؟ اور ان کی کیسی نگہبانی کی؟ ان کے حقوق کیسے ادا کیے؟ اور کیا تم نے اس بات کی نگہبانی کی کہ وہ دین پر چل رہے ہیں یا نہیں؟ کہیں وہ جہنم کی طرف تو نہیں جارہے؟ یہ کام تم نے کیا یا نہیں؟ اس کام کا خیال تمہارے دل میں آیا یا نہیں؟ قیامت کے روز مرد سے ان تمام چیزوں کے بارے میں سوال ہوگا، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾(۱)

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو بھی آگ سے بچاؤ، اور اپنے گھر والوں کو بھی آگ سے بچاؤ''

ایسا کرنا درست نہیں کہ خود تو آگ سے بچ کر بیٹھ گئے، خود تو نماز بھی پڑھ رہے ہیں اور روزہ بھی رکھ رہے ہیں۔ فرائض، واجبات اور نوافل و تسبیحات سب ادا ہو رہے ہیں۔ اور دوسری طرف

(۱) التحریم: ٦

اولاد غلط راستے پر جارہی ہے، اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اس کا کوئی خیال نہیں، تو پھر یاد رکھو، قیامت کے روز تم سوال سے بچ نہیں سکو گے تم سے بھی سوال ہوگا، اور اس کا عذاب بھی ہوگا کہ تم نے اپنا فریضہ کیوں انجام نہیں دیا تھا؟ اس لیے فرمایا کہ مرد اپنے گھر والوں کے لیے ''راعی'' ہے۔

''عورت'' شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے

((وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ))

''اور عورت اپنے شوہر کے گھر پر اور اس کی اولاد پر نگہبان ہے''

گویا عورت کو دو چیزیں سپرد کی گئی ہیں: ایک شوہر کا گھر، دوسرے اس کی اولاد، یعنی گھر کی حفاظت کرے۔ گھر کا انتظام صحیح رکھے۔ گھر کے معاملات کی دیکھ بھال صحیح کرے، اور دوسرے اولاد کی دیکھ بھال صحیح کرے۔ دنیوی دیکھ بھال بھی، اور دینی دیکھ بھال بھی، یہ عورت کے فرائض میں داخل ہے۔ اور اس حدیث میں ہر ایک کے فرائض بیان کر دیئے گئے ہیں۔

خواتین حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سنت اختیار کریں

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جنت کی خواتین کی سردار ہیں نکاح کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئیں تو حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپس میں یہ طے کر لیا کہ حضرت علی گھر کے باہر کے کام کریں گے، اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گھر کے اندر کے کام کریں گی، چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بڑی محنت سے گھر کے کام انجام دیتی تھیں۔ اور بڑے شوق و ذوق سے کرتی تھیں، اور اپنے شوہر کی خدمت کرتی تھیں۔ لیکن محنت کا کام بہت زیادہ ہوتا تھا۔ وہ زمانہ آج کل کے زمانے کی طرح تو تھا نہیں آج کل تو بجلی کا سوئچ آن کر دیا اور کھانا تیار ہو گیا۔ بلکہ کھانا تیار کرنے کے لیے چکی کے ذریعہ آٹا پیستیں، تندرو کے لیے لکڑیاں کاٹ کر لاتیں اور تندور سلگاتیں۔ پھر روٹی پکاتیں۔ ایک لمبا چوڑا عمل تھا، جس میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بڑی مشقت اٹھانا پڑتی تھی، اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بڑے شوق و ذوق سے یہ مشقت اٹھاتیں تھیں۔ لیکن جب غزوہ خیبر کے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت مال غنیمت آیا، اس مال غنیمت میں غلام اور باندیاں بھی تھیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام میں ان کو تقسیم کرنا شروع کیا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے کہا کہ آپ بھی جا کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیں کہ ایک کنیز اور باندی آپ کو بھی دے دیں۔ چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں حاضر ہوئیں۔ اور ان سے کہا کہ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں کہ چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں

پر نشانات پڑ گئے ہیں، اور پانی کی مشک اٹھاتے اٹھاتے سینے پر نیل پڑ گئے ہیں۔ اس وقت چونکہ مال غنیمت میں اتنے سارے غلام اور باندیاں آئی ہیں، کوئی غلام یا باندی اگر مجھے مل جائے تو میں اس مشقت سے نجات پالوں، یہ کہہ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا واپس اپنے گھر آ گئیں۔

جب حضور اقدس ﷺ گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی صاحب زادی حضرت فاطمہ تشریف لائیں تھیں۔ اور یہ فرما رہی تھیں، آخر باپ تھے، اور جب ایک باپ کے سامنے چہیتی بیٹی یہ جملہ کہے کہ چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں میں گڑھے پڑ گئے ہیں۔ اور پانی کی مشک اٹھانے سے سینے پر نیل کے نشان آ گئے ہیں۔ آپ اندازہ لگائیں کہ اس وقت باپ کے جذبات کا کیا عالم ہوگا۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے ان کو اپنے گھر بلایا، اور فرمایا: فاطمہ! تم نے مجھ سے باندی یا غلام کی درخواست کی ہے۔ لیکن جب تک سارے اہل مدینہ کو غلام اور باندی میسر نہ آ جائیں، اس وقت تک میں محمد کی بیٹی کو غلام اور باندی دینا پسند نہیں کرتا۔

خواتین کے لیے نسخہ کیمیا ''تسبیح فاطمی''

البتہ میں تمہیں ایک ایسا نسخہ بتاتا ہوں جو تمہارے لیے غلام اور باندی سے بہتر ہوگا، وہ نسخہ یہ ہے کہ جب تم رات کے وقت بستر پر لیٹنے لگو تو اس وقت ۳۳ مرتبہ ''سبحان اللہ'' ۳۳ مرتبہ ''الحمد للہ'' اور ۳۴ مرتبہ ''اللہ اکبر'' پڑھ لیا کرو، یہ تمہارے لیے غلام اور باندی سے زیادہ بہتر ہوگا۔ بیٹی بھی سرکار دو عالم ﷺ کی بیٹی تھی۔ پلٹ کر کچھ نہیں کہا بلکہ جو کچھ حضور ﷺ نے فرمایا اسی پر مطمئن ہو گئیں۔ اور واپس تشریف لے گئیں۔ اسی وجہ سے اس تسبیح کو ''تسبیح فاطمی'' کہا جاتا ہے۔(۱)

آنحضرت ﷺ نے اپنی بیٹی کو خواتین کے لیے ایک مثال بنا دیا کہ بیوی ایسی ہو۔ قانونی اعتبار سے خواہ کچھ بھی حق ہو۔ لیکن سنت یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔ اور اس نگہبان ہونے کی وجہ سے وہ اس کے کاموں کو اپنا کام سمجھ کر انجام دے رہی ہے۔

اولاد کی تربیت ماں کے ذمہ ہے

اور وہ عورت صرف گھر کی نگہبان نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اولاد کی بھی نگہبان ہے۔ اولاد کی پرورش، اولاد کی خدمت، اولاد کی تربیت اور اس کی تعلیم کی ذمہ داری حضور اقدس ﷺ نے عورت پر ڈالی ہے۔ اگر اولاد کی تربیت صحیح نہیں ہو رہی ہے۔ ان کے اندر اسلامی آداب نہیں آ رہے ہیں۔ تو

---

(۱) جامع الأصول (۱۰۵/٦)

اس کے بارے میں پہلے عورت سے سوال ہوگا، اور بعد میں مرد سے ہوگا۔ اس لیے کہ ان چیزوں کی پہلی ذمہ داری عورت کی ہے۔ لہٰذا عورت سے سوال ہوگا کہ تمہاری گود میں پلنے والے بچوں میں دین وایمان کیوں پیدا نہیں ہوا؟ ان کے دلوں میں اسلامی آداب کیوں پیدا نہیں ہوئے؟ اس لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ عورت سے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کے بارے میں سوال ہوگا۔ آگے پھر دوبارہ وہی جملہ دھرادیا:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ))

کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر شخص سے اس کی زیر رعایت چیزوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو ان فرائض کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

بیوی سے محبت حبِّ دنیا نہیں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

بیوی سے محبت قابل تحسین ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی سالک کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

''بیوی کی محبت دنیا تو ہے مگر مباح بلکہ محمود، مگر اس شرط سے کہ غافل عن الدین نہ کرے، بیوی کے ساتھ محبت کا زیادہ ہونا عین مطلوب ہے، جب تقویٰ بڑھتا ہے تو بیوی سے محبت بڑھ جاتی ہے''(۱)

ہر وہ چیز جو گناہ پر آمادہ کرے ''دنیا'' ہے

وہ دنیا جس کی قرآن وحدیث میں مذمت آئی ہے اور جس کے بارے میں فرمایا گیا:

((حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ))(۲)

اور جس کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾(۳)

یعنی دنیاوی زندگی دھوکہ کا سامان ہے وغیرہ، ان سب سے مراد دو صورتوں میں سے ایک ہے، ایک یہ کہ دنیا کے ساتھ ایسا تعلق ہو جائے کہ وہ تعلق انسان کو کسی گناہ پر آمادہ کر دے۔ اور گناہ کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ اپنے ذمے جو فرائض اور واجبات ہیں، ان کے ترک پر آمادہ کر دے۔

☆ اصلاحی مجالس (۱۸۹/۴ تا ۲۰۰) بعد از نمازِ ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

(۱) انفاس عیسیٰ، ص: ۱۷۵

(۲) كنز العمال، رقم: ٦١١٤ (٣٥٣/٣)، حدیث مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے''

(۳) الحديد: ٢٠

مباحات میں انہماک ''دنیا'' ہے

دوسری صورت یہ ہے کہ اگرچہ دنیا کے ساتھ تعلق نے انسان کو براہ راست گناہ پر آمادہ نہیں کیا لیکن مباحات میں اس درجہ تک انہماک پیدا کر دیا کہ اب صبح سے لے کر شام تک دنیا کے مباحات کے علاوہ کسی اور چیز کا خیال ہی دل میں نہیں آتا، ہر وقت وہی مباحات دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور آخرت کا خیال کبھی دل میں نہیں آتا۔ اگرچہ اس دوسری صورت کو فتویٰ کے اعتبار سے گناہ اور معصیت نہیں کہہ سکتے، کیونکہ کسی معصیت کا ارتکاب ابھی تک نہیں ہوا، لیکن تجربہ یہ ہے کہ یہ انہماک بالآخر انسان کو معصیت تک لے جاتا ہے، اس لیے دنیا کے اندر ایسا انہماک بھی نہ ہونا چاہیے۔

اگر دنیا کے ساتھ ساتھ مندرجہ بالا دو صورتیں نہ ہوں، یعنی نہ تو کسی معصیت کا ارتکاب ہو اور نہ دنیا کے اندر ایسا انہماک ہو کہ ہر وقت دنیا کی فکر دل و دماغ پر چھا جائے تو پھر یہ دنیا مضر ہونے کے بجائے اور زیادہ فائدہ مند ہو جاتی ہے، اور پھر وہ دنیا آخرت کا اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا زینہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا انسان ان دو صورتوں سے بچے، پھر دنیا مضر نہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل شدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

دنیا کی تعریف ہے اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جانا، یہ کپڑا، یہ سونا، یہ بیوی اور یہ بچے دنیا نہیں، اگر اللہ تعالیٰ سے آخرت سے غفلت ہے تو یہ دنیا مذموم ہے اور اگر یہ غفلت نہیں ہے تو پھر خواہ مال و دولت کے انبار لگے ہوئے ہوں، تب بھی وہ دنیا مذموم نہیں۔

کیا اہل دنیا سب کافر ہیں؟

ایک بزرگ کا شعر ہے کہ ؎

اہل دنیا کافرانِ مطلق اند
ہر دم اندر بق بق و در چق چق اند

اس شعر پر اشکال ہوتا ہے کہ ان بزرگ نے اہل دنیا کو کافر قرار دے دیا کہ یہ سب کافر ہیں اور ہر وقت دنیا کے بارے میں بق بق اور چق چق میں لگے رہتے ہیں۔

اس شعر کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ اہل دنیا سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا سے اتنا تعلق

قائم کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے منکر ہو گئے اور واقعی کفر اختیار کر لیا۔

دوسری توجیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب وغریب فرمائی ہے، فرمایا کہ اس شعر میں جو یہ کہا کہ ''اہل دنیا کافران مطلق اند'' اس میں لفظ ''اہل دنیا'' خبر مقدم ہے اور ''کافران مطلق اند'' مبتدا مؤخر ہے، لہٰذا اس شعر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل دنیا مطلق کافر ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''کافرانِ مطلق اہل دنیا ہیں''

''غفلت'' کا نام دنیا ہے

بہرحال! دنیا کی مال و دولت اور دنیا کے اسباب کا نام ''دنیا'' نہیں، بلکہ دنیا نام ہے اللہ تعالیٰ سے غفلت کا، اللہ تعالیٰ کے دین سے غفلت کا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے سے غفلت کا۔ اگر یہ غفلت نہ ہو تو پھر یہی دنیا آخرت کے لیے معین بن جاتی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تو اپنے نفس کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے، اپنی بیوی کے حقوق، اپنے بچوں کے حقوق اور ملنے جلنے والوں کے حقوق ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اب اگر ان حقوق کی ادائیگی کی خاطر دنیا کما رہے ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہ کمانا کوئی غفلت نہیں اور دنیائے مذموم نہیں، بلکہ ایسی دنیا کے بارے میں فرمایا:

﴿وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ دنیا کو ''فضل اللہ'' سے تعبیر فرمایا، کیونکہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ حقوق کی ادائیگی کے لیے دنیا تلاش کر رہا ہے تو وہ فضل اللہ ہے، وہ دنیائے مذموم نہیں، بلکہ دین ہے، اور آخرت کے لیے معین ہے۔

بیوی سے محبت عین دین ہے

اور حضرت والا نے یہ جو فرمایا کہ بیوی سے محبت عین مطلوب ہے، اس لیے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾(۲)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان محبت اور شفقت پیدا فرمائی۔ لہٰذا اس محبت کو خود اللہ تعالیٰ

---

(۱) الجمعة: ۱۰

(۲) الروم: ۲۱

نے پیدا فرمایا ہے اور حضور اقدس ﷺ نے حدیث شریف میں اس کا حکم دیا ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا:

((خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَآءِ هِمْ وَاَنَا خِيَارُكُمْ لِنِسَائِيْ))(۱)

یعنی تم (لوگوں) میں بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنی بیویوں کے لیے تم میں سب سے بہتر ہوں۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

((اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا))(۲)

یعنی عورتوں کے بارے میں اچھا سلوک کرنے کی وصیت کو قبول کر لو۔ لہٰذا جب ان احکام کی تعمیل میں کوئی شخص اپنی بیوی سے محبت کر رہا ہے تو وہ دنیا نہیں بلکہ عین دین ہے اور مطلوب ہے۔

تقویٰ بڑھنے سے بیوی سے محبت زیادہ ہوتی ہے

لہٰذا حضرت والا نے فرمایا کہ جب انسان کے اندر تقویٰ بڑھتا ہے تو بیوی سے محبت بڑھ جاتی ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے حقوق میرے ذمے عائد کیے گئے ہیں، لہٰذا میں ان کو ادا کرنے کا پابند ہوں، اس لیے جب وہ اس نیت سے ان حقوق کو ادا کرے گا تو اسے ثواب ملے گا۔

ہماری اور ان کی محبت میں فرق

اسی وجہ سے جتنے اولیاء کامل ہوتے ہیں، وہ اپنے بیوی بچوں سے محبت بھی بھرپور کرتے ہیں، اور ہم بھی اپنے بیوی بچوں سے محبت کرتے ہیں، البتہ ہم اتنی محبت نہیں کرتے جتنی محبت وہ کرتے

---

(۱) اس حدیث کی عبارت قابل تحقیق ہے، کیونکہ مجموعہ احادیث میں اس موضوع سے متعلق دو طرح کی روایات ملتی ہیں، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ((خيركم خيركم لأهله وأنا خيركم لأهلي)) جبکہ دوسری روایت میں یہ الفاظ یہ ہیں: ((خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَآءِ هِمْ)) اس روایت میں ((وَاَنَا خِيَارُكُمْ لِنِسَائِيْ)) کے الفاظ نہیں ملتے۔

(۲) صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب الوصلة بالنساء، رقم: ٤٧٨٧، صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، رقم: ٢٦٧١، سنن الترمذي، كتاب الرضاع، باب ماجاء في حق المرأة على زوجها، رقم: ١٠٨٣، سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق المرأة على الزوج، رقم: ١٨٤١

ہیں، لیکن ہماری محبت میں اور اولیاء کرام کی محبت میں بڑا فرق ہے، اگرچہ دیکھنے میں ایک جیسی محبت معلوم ہوتی ہے کہ ہم بھی محبت کر رہے ہیں اور وہ بھی محبت کر رہے ہیں، ہم بھی بچوں سے کھیل رہے ہیں اور وہ بھی بچوں سے کھیل رہے ہیں، ہم بھی بیوی سے تعلق کا اظہار کر رہے ہیں اور وہ بھی کر رہے ہیں، لیکن حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

ان کی محبت اداءِ حقوق کے لیے ہے

وہ فرق یہ ہے کہ ہم لوگ دنیاوی لذات کی وجہ سے محبت کرتے ہیں، مثلاً ہم لوگ اگر بچوں سے کھیل رہے ہیں تو اس لیے کھیل رہے ہیں کہ اس میں مزہ آرہا ہے، یا بیوی سے ہم تعلق اس لیے قائم کیے ہوئے ہیں کہ وہ موجب لذت ہے۔ اور اولیاء اللہ اس لیے محبت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا حق ہم سے وابستہ کر دیا ہے اور ان اولیاء اللہ کو ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہی نور محسوس ہوتا ہے اور وہی برکات محسوس ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرتے وقت محسوس ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمارے تعلق اور ان کے تعلق میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کی ازواج مطہرات سے خوش طبعی پر تعجب

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک دن حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ پہلے مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوتا تھا کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے کس طرح ایسی خوش طبعی کی باتیں کرلیا کرتے تھے جیسا کہ روایات میں آتی ہیں۔ مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ لگا رہے ہیں اور اپنے کندھے کے پیچھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کھڑا کر کے حبشیوں کے کرتب دکھا رہے ہیں اور رات کو گیارہ عورتوں کی کہانی سنا رہے ہیں۔ جس ذات کا رابطہ اللہ جل شانہ کے ساتھ قائم ہو، جس پر وحی نازل ہو رہی ہو، ملائکہ اس پر اتر رہے ہوں اور ملاء اعلیٰ کے ساتھ اس کا رشتہ جڑا ہوا ہو، وہ ذات ایسی دنیا کی حقیر چیزوں کی طرف کیسے متوجہ ہو جاتی ہے؟ اس پر مجھے تعجب ہوتا تھا۔

یہ دونوں باتیں جمع ہو سکتی ہیں

بعد میں فرمایا کہ الحمدللہ، اب سمجھ میں آنے لگا کہ یہ دونوں کام ایک ساتھ ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ بیوی بچوں کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے، درحقیقت اس کی نوعیت بدلی ہوئی ہے، اس طرح کہ وہ

معاملات بھی ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مظہر ہیں، کیونکہ جب نیت درست کر لی تو اب دنیا کے سارے کاموں میں بھی وہی نور ہے جو خالص عبادات میں ہے۔

قطبی پڑھ کر ایصال ثواب کرنا

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ سنا کہ وہ ایک دن قطبی کا سبق پڑھا رہے تھے جو منطق کی کتاب ہے، درس کے دوران ایک صاحب نے آ کر کہا کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، ایصال ثواب کی درخواست ہے۔ حضرت نے ہاتھ اٹھائے اور دعا شروع کر دی کہ یا اللہ! ہم جو یہ سبق پڑھ رہے ہیں، اس کا ثواب ان کو پہنچا دیجیے۔ وہ صاحب بڑے حیران ہوئے کہ قطبی کا بھی ایصال ثواب ہوتا ہے، قرآن شریف یا حدیث شریف پڑھ کر ایصال ثواب کرتے تو بات سمجھ آ جاتی، یہ قطبی پڑھ کر ایصال ثواب کیسے؟ حضرت نے فرمایا کہ میاں! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نیت درست ہو تو میرے نزدیک بخاری شریف اور قطبی کے ثواب میں کوئی فرق نہیں، جو ثواب بخاری شریف میں ہے، وہی ثواب قطبی میں بھی ہے۔ ان شاء اللہ۔

ملا حسن کے درس میں دل سے اللہ اللہ جاری تھا

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ میرے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس منطق کی کتاب "ملا حسن" کا سبق پڑھا کرتے تھے، اس سبق میں ہم اپنے کانوں سے سنا کرتے تھے کہ ان کے قلب سے "اللہ اللہ" کی آواز آ رہی ہے۔ منطق کے سبق میں یہ بات ہوتی تھی جس کو کہنے والوں نے "گندگی" تک کہہ دیا، گویا کہ اس سبق میں بھی انوار و برکات تھے، کیونکہ نیت درست تھی اور طریقہ درست تھا۔

اتباع سنت کو اختیار کر لو

اللہ تعالیٰ ہماری نیتوں کو درست فرما دے، آمین۔ ہر چیز میں اتباع سنت کی نیت ہو، کیونکہ "سنت" تمام زندگی کے کاموں پر حاوی ہے، جو کچھ کرو گے کہیں نہ کہیں سنت سے رشتہ مل جائے گا، لہٰذا ہر کام میں اتباع سنت کی نیت کرو گے تو بالآخر دنیا کے سارے کام بھی دین بن جائیں گے اور ان کے اندر بھی وہ انوار و برکات حاصل ہوں گے جو عبادات میں ہوتے ہیں اور پھر وہ دنیائے مذموم میں داخل نہ ہوں گے۔

اس کے لیے مشق کی ضرورت ہے

لیکن اس کے لیے مشق کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مدتوں میں نے اتباعِ سنت کی مشق کی ہے، مثلاً کھانا سامنے آیا، کھانا لذیذ ہے، بھوک لگی ہوئی ہے، کھانے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن ایک لمحہ کے لیے دل میں یہ ارادہ کیا کہ دل چاہنے پر کھانا نہیں کھائیں گے، پھر دوسرے لمحے یہ بات ذہن میں لائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذمے ہمارے نفس کا حق رکھا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب کھانا سامنے آتا تو شکر کرتے ہوئے کھانا تناول فرمالیا کرتے تھے، اب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع میں کھاؤں گا، پھر ''بسم اللہ'' پڑھ کر کھانا شروع کردیا۔ چونکہ نیت درست ہوگئی، اس لیے اب وہ کھانا دنیا نہ رہا بلکہ دین بن گیا۔

ہر عمل کو دین بنالیں

یا مثلاً گھر کے اندر داخل ہوئے اور بچہ کھیلتا ہوا اچھا لگا، دل چاہا کہ اس کو گود میں اٹھا کر پیار کروں، لیکن ایک لمحہ کے لیے رک گئے اور یہ سوچا کہ دل کے چاہنے پر یہ کام نہیں کریں گے، پھر دوسرے لمحے یہ خیال لائے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے ساتھ پیار فرماتے تھے، اب میں بھی آپ کی اتباع میں بچے کو اٹھا کر پیار کروں گا، پھر بچہ کو گود میں اٹھا کر پیار کرلیا تو یہ عمل بھی اتباع سنت کے نتیجے میں دین بن گیا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کے معمولات میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جس کو حسن نیت سے اتباع سنت اور دین کا کام نہ بنایا جاسکے، جب اتباع سنت کی نیت سے وہ کام کرو گے تو وہی دنیا دین بن جائے گی۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

☆☆☆

والدین کی خدمت، جنت کا ذریعہ ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾(۱)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ایک نیا باب قائم فرمایا ہے، جو والدین کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی کے بیان میں ہے، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ ابواب جو اس کتاب ''ریاض الصالحین'' میں چل رہے ہیں، ان کا تعلق حقوق العباد سے ہے، بعض حقوق العباد کا بیان گزر چکا ہے، ان حقوق کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات آپ سن چکے ہیں اس نئے باب میں والدین کے ساتھ حسن سلوک اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں آیات اور احادیث لائے ہیں۔

افضل عمل کون سا؟

عَنْ اَبِىْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ سَئَلْتُ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَىُّ الْعَمَلِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ؟ قَالَ: ((اَلصَّلَاةُ عَلٰى وَقْتِهَا)) قُلْتُ: ثُمَّ اَىٌّ؟ قَالَ: ((بِرُّ الْوَالِدَيْنِ)) قُلْتُ: ثُمَّ اَىٌّ؟ قَالَ: ((اَلْجِهَادُ

☆ اصلاحی خطبات (۱/۵۳ تا ۷۸)، ۲۸ اگست ۱۹۹۲ء بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی۔ زیر نظر درس امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''ریاض الصالحین'' کے باب نمبر ۳۶ "باب بر الوالدين وصلة الأرحام" (صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۵) کا درس ہے۔

(۱) النساء: ٣٦

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) (۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب عمل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ محبوب عمل یہ ہے کہ نماز اپنے وقت پر ادا کی جائے، میں نے پھر پوچھا کہ نماز کے بعد سب سے زیادہ محبوب عمل کون سا ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک، میں نے پوچھا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بعد تیسرے نمبر پر محبوب عمل کون سا ہے؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا''

اس حدیث میں ترتیب اس طرح بیان فرمائی گئی کہ سب سے افضل اور پسندیدہ عمل وقت پر نماز پڑھنے کو قرار دیا گیا، دوسرے نمبر پر والدین کے ساتھ حسن سلوک اور تیسرے نمبر پر جہاد فی سبیل اللہ کو۔

نیک کاموں کی حرص

یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں، ایک یہ کہ اگر احادیث کا جائزہ لیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مختلف مواقع پر حضور اقدس ﷺ سے یہ پوچھا کہ سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ فکر اور یہ حرص ظاہر ہوتی ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور افضل ہو اس کو انجام دینے کی کوشش کی جائے، اور وہ عمل ہماری زندگیوں میں آجائے، اس لیے کہ ہر وقت دل و دماغ پر آخرت کی فکر طاری تھی، وہ تو یہ چاہتے تھے کہ آخرت میں کسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا حاصل ہو جائے، اس لیے ہر وقت یہ معلوم کرنے کی فکر میں رہتے تھے کہ کس عمل میں کیا اجر و ثواب ہے، اور وہ ہمیں حاصل ہو جائے۔

آج ہم لوگ فضائل کی احادیث میں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں عمل میں یہ فضیلت ہے۔ فلاں عمل میں یہ فضیلت ہے پڑھتے بھی ہیں۔ سنتے بھی ہیں۔ لیکن اس کے بعد کما حقہ عمل کا داعیہ پیدا نہیں ہوتا، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال یہ تھا کہ چھوٹے سے چھوٹا عمل جس کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ثواب کا کام ہے بس اس کی طرف دوڑتے تھے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب فضل الصلاۃ لوقتبھا، رقم: ٤٩٦، سنن النسائی، کتاب المواقیت، باب فضل الصلاۃ لمواقیتھا، رقم: ٦٠٦، مسند أحمد، رقم: ٣٦٩٥

افسوس! میں نے تو بہت سے قیراط ضائع کر دیئے

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنائی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی نماز جنازہ میں شریک ہو، تو اس کو ایک قیراط اجر ملے گا، ''قیراط'' اس زمانے میں ایک پیمانہ تھا۔ جس کے ذریعہ سونا چاندی کا وزن کیا جاتا تھا۔ اور جو شخص نماز جنازہ کے بعد اس کے پیچھے چلے اس کو دو قیراط ملیں گے، اور جو شخص اس کی تدفین میں بھی شامل ہو، اس کو تین قیراط اجر ملیں گے۔ ویسے تو ''قیراط'' ایک چھوٹا سا پیمانہ ہے۔ لیکن ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ جنت کا ''قیراط'' احد پہاڑ سے بھی بڑا ہے۔

جب یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سنائی تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے یہ حدیث پہلے نہیں سنی، جس کی وجہ سے ہم نے بہت سے قیراط ضائع کر دیئے۔ (۱)

مقصد یہ تھا کہ مجھے پہلے یہ معلوم نہیں تھا کہ نماز جنازہ پڑھنے اور جنازہ کے پیچھے چلنے، اور تدفین میں شرکت کی ایسی فضیلت ہے، اگر پہلے سے مجھے معلوم ہوتا تو میں اس کا اہتمام کرتا، اور اہتمام نہ کرنے کی وجہ سے میرے بہت سے ''قیراط'' ضائع ہو گئے۔ حالانکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جن کا مشغلہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا تھا، جن کے نامہ اعمال میں نیکیوں کا ذخیرہ موجود ہے لیکن اس کے باوجود جب ایک نیا عمل معلوم ہوا تو انہیں اس پر افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے کیوں اب تک یہ عمل اختیار نہیں کیا تھا۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی حال نظر آتا ہے کہ ہر وقت اسی فکر میں ہیں کہ ذرا سی کوئی نیکی کرنے کا موقع مل جائے جس سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و ثواب میں اضافہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔

سوال ایک، جواب مختلف

اسی لیے بار بار صحابہ کرام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے کہ یا رسول اللہ! سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ روایات میں یہ نظر آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف صحابہ کرام کو مختلف جواب دیئے۔ مثلاً اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ سب سے افضل عمل وقت پر نماز پڑھنا ہے، ایک حدیث پیچھے گزر چکی ہے کہ ایک صحابی کے اس سوال کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب فضل اتباع الجنائز، رقم الحدیث: ۱۲۲۹

کہ سب سے افضل عمل یہ ہے کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے۔(۱)

یعنی ہر وقت تمہاری زبان پر اللہ کا ذکر جاری ہو، چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے، ہر حالت میں تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے، یہ عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ سب سے افضل عمل اعمال کو پابندی کے ساتھ کرنا ہے۔(۲)

کسی صحابی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا سب سے افضل عمل ہے۔(۳)

غرض یہ کہ مختلف صحابہ کرام کو آنحضرت ﷺ نے مختلف جوابات عطا فرمائے، بظاہر اگرچہ ان جوابات میں تضاد نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں تضاد نہیں۔

ہر شخص کا افضل عمل جدا ہے

بات دراصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے حالات کے لحاظ سے افضل عمل بدلتا رہتا ہے، کسی شخص کے لیے نماز پڑھنا سب سے افضل عمل ہے، کسی شخص کے لیے والدین کی اطاعت سب سے افضل عمل ہے، کسی شخص کے لیے جہاد سب سے افضل عمل ہے، کسی شخص کے لیے ذکر سب سے افضل عمل ہے، حالات کے لحاظ سے اور آدمیوں کے لحاظ سے فرق پڑ جاتا ہے، مثلاً بعض صحابہ کرام کے بارے میں آپ کو پہلے سے معلوم تھا کہ نماز کی تو ویسے بھی پابندی کرتے ہیں، ان کے سامنے نماز کی زیادہ فضیلت بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن والدین کے حقوق میں کوتاہی ہو رہی ہو، تو اب حضور اقدس ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تمہارے حق میں سب سے افضل عمل والدین کی اطاعت ہے کسی صحابی کا عبادت کی طرف تو زیادہ دھیان تھا۔ مگر جہاد کی طرف اتنی رغبت نہیں تھی۔ ان کے حق میں فرمایا کہ تمہارے لیے سب سے افضل عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے، کسی صحابی کو آپ نے دیکھا کہ وہ

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اله، باب ماجاء فی فضل الذکر، رقم: ۳۲۹۷، سنن ابن ماجه، کتاب الأرب، باب فضل الذکر، رقم: ۳۷۸۳، مسند أحمد، رقم: ۱۷۰۲۰

(۲) صحيح البخاری، کتاب الجمعة، باب من نام عندالسحر، رقم: ۱۰٦٤، صحيح مسلم، کتاب صلاة المسافرين و قصرها، باب فضيلة العمل الدائم من قيام الليل وغيره، رقم: ۱۳۰۳، سنن الترمذی، کتاب الأرب عن رسول الله، باب ماجاء فی الفصاحة والبيان، رقم: ۲۷۸۳، مسند أحمد، رقم: ۲۲۹۱۵

(۳) مسند أحمد، رقم: ۳۵٦/۷۹

عبادت بھی کر رہے ہیں، جہاد بھی کر رہے ہیں، لیکن ذکر اللہ کی طرف اتنا التفات نہیں ہے، ان کو فرمایا کہ تمہارے حق میں سب سے افضل عمل ذکر اللہ ہے۔ لہٰذا مختلف صحابہ کرام کو ان کے حالات کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے مختلف جواب دیئے۔ لیکن یہ سب فضیلت والے اعمال ہیں، یعنی وقت پر نماز پڑھنا۔ والدین کی اطاعت کرنا، جہاد فی سبیل اللہ کرنا، ہر وقت ذکر اللہ کرنا وغیرہ، البتہ لوگوں کے حالات کے لحاظ سے فضیلت بدلتی رہتی ہے۔

نماز کی افضلیت

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے افضل اعمال کی ترتیب یہ بیان فرمائی کہ سب سے افضل عمل وقت پر نماز پڑھنا، صرف نماز پڑھنا نہیں، بلکہ وقت کا لحاظ کر کے نماز پڑھنا، بعض اوقات انسان وقت کا دھیان نہیں کرتا۔ اور وقت گزار دیتا ہے۔ اور یہ سوچتا ہے کہ نماز قضا ہوگئی تو ہونے دو۔ یہ انسان کے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں، بلکہ وقت کے اندر نماز ادا کرنے کی فکر کرے، قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾(۱)

یعنی ان نمازیوں پر افسوس ہے، جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت میں ہیں۔ نماز کا وقت آیا۔ اور چلا گیا۔ نماز ادا کرنے کی طرف دھیان نہیں دیا، یہاں تک کہ نماز قضا ہوگئی۔ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ فَاتَتْهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَكَاَنَّمَا وُتِرَ اَهْلَهٗ وَمَالَهٗ))(۲)

یعنی جس شخص کی عصر کی نماز فوت ہوگئی وقت گزر گیا۔ اور نماز نہیں پڑھی۔ وہ ایسا ہے جیسا اس کے سارے گھر والے لٹ گئے اور سارا مال لٹ گیا، جس طرح وہ شخص تنگ دست اور مفلوک الحال ہے اسی طرح وہ شخص بھی مفلوک الحال ہے جس کی ایک عصر کی نماز قضا ہوگئی ہو، لہٰذا نماز کو قضاء

---

(۱) الماعون: ٤

(۲) صحيح البخاری، كتاب مواقيت الصلاة، باب إثم من فاتة العصر، رقم: ٥١٩، صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب التغليظ فی تفويت صلاة العصر، رقم: ٩٩١، سنن الترمذی، كتاب الصلاة، باب ماجاء فی السهر عن وقت صلاة العصر، رقم: ١٦٠، سنن النسائی، كتاب المواقيت، باب التشديد فی تأخير العصر، رقم: ٥٠٨، سنن أبی داؤد، كتاب العصر، باب فی وقت صلاة العصر، رقم: ٣٥١، سنن ابن ماجه، كتاب الصلاة، باب المحافظة على صلاة العصر، رقم: ٦٧٧، مسند أحمد، رقم: ٤٣١٧، مؤطا مالك، كتاب وقوت الصلاة، باب جامع الوقوت، رقم: ١٨، سنن الدارمی، كتاب الصلاة، باب فی الذی تفوته صلاة العصر، رقم: ١٢٠٢

کرنا بڑی سنگین بات ہے، اور اس پر بڑی سخت وعیدیں آئی ہیں۔ اس لیے نماز کا بھی دھیان ہونا چاہیے، اور نماز کے وقت کا بھی دھیان ہونا چاہیے۔

جہاد کی افضلیت

اس حدیث میں دوسرے نمبر پر افضل عمل ''والدین کے ساتھ حسن سلوک'' کو قرار دیا، اور تیسرے نمبر پر جہاد فی سبیل اللہ، گویا کہ والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو جہاد جیسی عبادت پر فوقیت عطا فرمائی ہے۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ جہاد اتنی بڑی عبادت ہے، اور اس کے اتنے فضائل ہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں جہاد کرے، اور اس جہاد میں شہید ہو جائے تو جنت میں جانے کے بعد اسے دوبارہ دنیا میں جانے کی خواہش ہوگی تاکہ مزید دس مرتبہ شہید کیا جائے اور شہید کو ملنے والے اکرام کو حاصل کر سکے۔ (۱)

ایک حدیث میں ہے کہ جب ایک انسان مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے مقامات قرب کا مشاہدہ کرے گا، اور جنت کا مشاہدہ کرے گا تو اس کے دل میں کبھی دنیا میں واپس آنے کی خواہش پیدا نہیں ہو گی، کہ میں دنیا میں واپس جاؤں، اس لیے کہ دنیا کی حقیقت کھل کر اس کے سامنے آجائے گی۔ کہ یہ دنیا اس جنت کے مقابلے میں کتنی بے حقیقت، کتنی ناپائیدار اور کتنی گندی چیز تھی، جو جنت اس کو مل گئی ہے۔ لیکن وہ شخص جو جہاد کرتے ہوئے اللہ کے راستے میں شہید ہو چکا ہو۔ وہ تمنا کرے گا کہ کاش مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے۔ اور وہاں جا کر دوبارہ جہاد کروں۔ اور پھر اللہ کے راستے میں شہید ہو جاؤں۔

اسی لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میرے دل کی خواہش یہ ہے کہ میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں، اور شہید ہو جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے۔ پھر شہید ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جائے۔ پھر شہید ہو جاؤں۔ تو جنت میں جانے کے بعد کوئی اللہ کا بندہ دنیا میں واپس آنے کی خواہش نہیں کرے گا۔ سوائے شہید کے کہ وہ اس بات کی خواہش کرے گا، جہاد کی اتنی بڑی فضیلت ہے۔ (۲)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب تمنی المجاهد أن یرجع الی الدنیا، رقم: ۲۶۰۶، صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب فضل الشهادة فی سبیل الله، رقم: ۳۴۸۸، سنن الترمذی، کتاب فضائل الجهاد عن رسول الله، باب فی ثواب الشهید، رقم: ۱۵۸۵، سنن النسائی، کتاب الجهاد، باب مایتمنی اهل الجنة، رقم: ۳۱۰۹، مسند أحمد، رقم: ۱۱۵۵۶

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب تمنی الشهادة، رقم: ۲۵۸۸، صحیح مسلم، کتاب الإمارة، رقم: ۳۴۸٤، سنن النسائی، کتاب الجهاد، رقم: ۳۱۰۱، سنن ابن ماجه، کتاه الجهاد، باب فضل الجهاد فی سبیل الله، رقم: ۲۷٤۳، مسند أحمد، رقم: ٦٨٦٠

والدین کا حق

لیکن والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو جہاد پر بھی مقدم رکھا ہے، اس لیے بزرگوں نے فرمایا کہ جتنے حقوق العباد ہیں، ان میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے، اس سے واجب الاحترام حق دنیا میں کسی اور کا نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے والدین کو انسان کے وجود کا ذریعہ بنایا ہے، اس لیے ان کا حق بھی سب سے زیادہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ حسن سلوک کا اتنا اجر رکھا ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک مرتبہ اپنے والدین کو محبت کی نگاہ سے دیکھے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اس کو ایک حج اور عمرہ کے برابر ثواب عطا فرماتے ہیں۔

ماں باپ کی محبت، بے غرض محبت

یاد رکھئے! اس دنیا میں جتنی محبتیں اور تعلقات ہیں، ان تمام محبتوں اور تعلقات میں انسان کو کوئی نہ کوئی غرض ضرور وابستہ ہے، اس دنیا میں بے غرض محبت نہیں ملے گی، سوائے والدین کی محبت کے یعنی والدین کی اپنی اولاد کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ بے غرض ہوتی ہے، اس محبت میں ان کا اپنا کوئی مفاد اور کوئی غرض شامل نہیں، اس کے علاوہ کوئی محبت بے غرض نہیں مثلاً شوہر بیوی سے محبت کرے تو اس میں غرض شامل ہے، بیوی شوہر سے محبت کرے تو اس میں غرض ہے، بھائی بھائی سے محبت کرے، یا ایک دوست دوسرے دوست سے محبت کرے، غرض یہ کہ جتنے تعلقات ہیں سب کے اندر غرض شامل ہے، ان سب میں کوئی نہ کوئی غرض کارفرما ہوتی ہے، لیکن ایک محبت غرض سے پاک ہے، وہ ماں باپ کی محبت ہے، یعنی ماں باپ اپنی اولاد سے جو محبت کرتے ہیں اس میں ان کی ذات کی کوئی غرض شامل نہیں ہوتی ان کا جذبہ تو ہوتا ہے کہ اپنی جان بھی چلی جائے۔ لیکن اولاد کو فائدہ پہنچ جائے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حقوق میں ان کا درجہ سب سے زیادہ رکھا، اور جہاد فی سبیل اللہ پر بھی اس کو مقدم فرمایا۔

والدین کی خدمت، ایک عظیم سعادت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں، اور جہاد سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہو جائیں، اور اس پر مجھے اجر و ثواب عطا

فرمائیں۔ صرف اسی غرض کے لیے جہاد میں جانا چاہتا ہوں، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم واقعی ثواب حاصل کرنے کے لیے جہاد کرنا چاہتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا، ہاں! یا رسول اللہ، میں صرف ثواب حاصل کرنا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے والدین زندہ ہیں، آپ نے فرمایا کہ جاؤ اور جا کر ان کی خدمت کرو، اس لیے کہ اگر تمہیں اجر حاصل کرنا ہے تو پھر والدین کی خدمت کر کے تمہیں جو اجر حاصل ہوگا وہ اجر جہاد سے بھی حاصل نہیں ہوگا۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ))

یعنی جا کر ان کی خدمت کر کے جہاد کرو، ان روایات میں والدین کی خدمت کو جہاد سے بھی زیادہ فوقیت عطا فرمائی۔(۱)

اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بات فرمایا کرتے تھے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے۔ فرماتے تھے کہ بھائی! اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں، بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کا نام دین ہے، یہ دیکھو کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے اس وقت کا کیا تقاضا ہے؟ بس! اس تقاضے کو پورا کرو، اس کا نام دین ہے اس کا نام دین نہیں کہ مجھے فلاں چیز کا شوق ہوگیا ہے، اس شوق کو پورا کر رہا ہوں، مثلاً کسی کو اس بات کا شوق ہوگیا کہ میں ہمیشہ صف اول میں نماز پڑھوں، کسی کو اس بات کا شوق ہوگیا کہ میں جہاد پر جاؤں، کسی کو اس بات کا شوق ہوگیا کہ میں تبلیغ و دعوت کے کام میں نکلوں، اگرچہ یہ سب کام دین کے کام ہیں۔ اور باعث اجر و ثواب ہیں، لیکن یہ دیکھو کہ اس وقت کا تقاضا کیا ہے؟ مثلاً گھر کے اندر والدین بیمار ہیں، اور انہیں تمہاری خدمت کی ضرورت ہے، لیکن تمہیں تو اس بات کا شوق لگا ہوا ہے صف اول میں جا کر جماعت سے نماز

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، باب الجهاد بإذن الأبدين: ۲۷۸۲، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب بر الوالدين وأنهما أحق به، رقم: ٤٦٢٣، سنن الترمذي، كتاب الجهاد عن رسول الله، باب ماجاء فيمن خرج في الغزو وترك أبويه، رقم: ١٥٩٤، سنن النسائي، كتاب الجهاد، باب الرخصة في التخلف لمن له والدان، رقم: ٣٠٥٢، سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في الرجل يغزو وأبواه كارهان، رقم: ٢١٦٧، مسند أحمد، رقم: ٦٢٥٧

پڑھوں، اور والدین اتنے بیمار ہیں کہ حرکت کرنے کے قابل نہیں، اب اس وقت تمہارے لیے اللہ کی طرف سے تقاضا یہ ہے کہ صف اول کی نماز کو چھوڑو، اور والدین کی خدمت انجام دو اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور نماز گھر کے اندر تنہا پڑھ لو، اب اگر اس وقت تم نے والدین کو اس حال میں چھوڑ دیا کہ وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں، اور تم اپنا شوق پورا کرنے کے لیے مسجد میں چلے گئے اور صف اول میں جاکر شامل ہوگئے تو یہ دین کی اتباع نہ ہوئی بلکہ اپنا شوق پورا کرنا ہوگا۔

یہ حکم اس صورت میں ہے کہ جب مسجد کہیں دور ہے، مسجد آنے جانے میں وقت لگے گا، اور والدین کی حالت ایسی ہے کہ ان کو تکلیف ہوگی۔ لیکن اگر مسجد گھر کے بالکل قریب ہے اور والدین کی حالت ایسی ہے کہ ان کو بیٹے کے تھوڑی دیر کے دور رہنے سے تکلیف نہ ہوگی یا کوئی اور خدمت کرنے والا موجود ہے تو اس صورت میں اس کو مسجد میں جاکر جماعت ہی سے نماز ادا کرنی چاہیے۔

اپنے شوق کا نام دین نہیں

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک مثال دی، فرمایا کہ فرض کریں کہ ایک ویرانے جنگل میں ایک شخص اور صرف اس کی بیوی ہے۔ اور کوئی شخص قریب میں موجود نہیں، اس حالت میں نماز کا وقت ہوگیا اور مسجد آبادی کے اندر فاصلے پر ہے، اب یہ شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ چونکہ نماز کا وقت ہوگیا ہے اس لیے میں تو مسجد میں جاکر جماعت سے نماز ادا کروں گا، اس کی بیوی کہتی ہے کہ اس ویرانے جنگل کے اندر میں تنہا ہوں۔ کوئی پاس نہیں۔ اب اگر تم نماز کے لیے دور آبادی میں چلے گئے تو اس ویرانے میں خوف کی وجہ سے میری تو جان نکل جائے گی۔ لیکن شوہر کہتا ہے کہ جماعت سے صف اول میں نماز پڑھنے کی بڑی فضیلت ہے، میں تو صف اول میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کروں گا۔ اور اس فضیلت کو میں حاصل کروں گا۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ دین نہ ہوا، یہ تو صف اول میں نماز پڑھنے کا شوق ہوگیا، اس شوق کو پورا کر رہا ہے، اس لیے کہ اس وقت دین کا تقاضا تو یہ ہے کہ جماعت کی نماز کو چھوڑو۔ اور وہیں پر تنہا نماز پڑھو، اگر ایسا نہیں کروگے تو پھر اپنا شوق پورا کرنا ہو جائے گا۔ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ ہوگی۔

یا مثلاً گھر میں والدین بیمار ہیں، بیوی بچے ہیں، اور ان کو آپ کی خدمت کی ضرورت ہے، لیکن آپ کو تبلیغ میں جانے کا شوق ہوگیا۔ اور آپ نے کہا کہ میں تبلیغ میں جاتا ہوں۔ دیکھئے ویسے تبلیغ میں جانا بڑا ثواب کا کام ہے، لیکن اس حالت میں جب کہ والدین یا بیوی بچوں کو تمہاری خدمت کی

ضرورت ہے اور تمہاری خدمت کے بغیر ان کا کام نہیں چلے گا۔ تو اس حالت میں یہ اپنا شوق پورا کرنا ہوگا یہ دین کا تقاضا نہ ہوگا۔ اور دین اپنا شوق پورا کرنے کا نام نہیں، بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ماننے کا نام دین ہے، جس وقت جس کام کا تقاضا ہے، اس وقت اس کو انجام دو۔

آپ نے اس حدیث میں دیکھا کہ ایک صحابی آئے، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں جہاد میں جانا چاہتا ہوں، لیکن آپ نے ان کو منع فرما دیا، اور فرمایا کہ تمہارے لیے حکم یہ ہے کہ جا کر والدین کی خدمت کرو۔

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ، حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں موجود ہیں، اور مسلمان ہیں، اور وہ چاہتے بھی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی زیارت کروں، اور آنحضرت ﷺ کی زیارت وہ سعادت اور خوش نصیبی ہے کہ شاید اس روئے زمین پر اس سے بڑی سعادت اور خوش نصیبی کوئی اور نہیں ہوگی اور آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے جائیں تو پھر آپ کے جانے کے بعد یہ شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں لیکن میری والدہ بیمار ہیں، اور ان کو میری خدمت کی ضرورت ہے، آنحضرت ﷺ نے ان کو حاضر ہونے سے منع فرما دیا۔ اور یہ فرما دیا کہ تم یہاں میری زیارت اور ملاقات کے لیے مت آؤ۔ بلکہ والدہ کی خدمت کرو۔(۱)

بھلا بتلایئے! کیسا بھی صاحب ایمان ہو، اس کے دل میں حضور ﷺ کی زیارت کا کتنا شوق ہوگا۔ اور جب آپ اس دنیا میں بقید حیات تھے، اس وقت آپ سے ملاقات اور آپ کی زیارت کا شوق کا کیا عالم ہوگا جب کہ آج یہ حالت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے امتی آپ کے روضہ اقدس کی زیارت کے لیے کتنے بے تاب اور بے چین رہتے ہیں، کہ ایک مرتبہ حاضری ہو جائے، اور روضہ اقدس کی زیارت ہو جائے۔ لیکن آپ کی زیارت کے شوق، اس کی بے چینی اور بیتابی کو ماں کی خدمت پر قربان کر دیا، آپ نے حکم فرما دیا کہ ماں کی خدمت کرو، اور میری زیارت اور ملاقات کی سعادت کو چھوڑ دو، چنانچہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے آپ کے حکم پر اس سعادت کو چھوڑ دیا۔ جس کے نتیجے میں ''صحابیت'' کا مقام چھوٹ گیا۔ اس لیے کہ ''صحابیت'' کا درجہ آپ کی ملاقات اور زیارت پر

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أويس القرني، رقم: ٤٦١٣، مسند أحمد، رقم: ٢٥٧، سنن الدارمي، المقدمة، رقم: ٤٤٠

موقوف ہے اور ''صحابی'' وہ مقام ہے کہ کوئی شخص ولایت اور بزرگی کے چاہے کتنے بڑے مقام پر پہنچ جائے مگر وہ کسی ''صحابی'' کے گرد تک نہیں پہنچ سکتا۔

''صحابیت'' کا مقام

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ تبع تابعین میں سے ہیں۔ مشہور بزرگ فقیہ، محدث گزرے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان سے ایک عجیب سوال کیا۔ سوال یہ کیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں، یا حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ؟ سوال کرنے والے شخص نے یہ سوال اس طرح ترتیب دیا کہ صحابہ کرام میں سے ان صحابی کا انتخاب کیا جن کے بارے میں لوگوں نے طرح طرح کی مختلف باتیں مشہور کر رکھی ہیں، اور اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی لڑائی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی تو اس لڑائی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ برحق تھے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اجتہادی غلطی ہوئی تھی۔ اس عقیدے پر تقریباً ساری امت متفق ہے۔ بہرحال! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تو ان صحابی کو لیا جن کی شخصیت متنازع فیہ رہی ہے، اور دوسری طرف سوال میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا۔ جن کو عدل وانصاف اور تقویٰ طہارت وغیرہ میں ''عمر ثانی'' کہا جاتا ہے۔ اور یہ دوسری صدی ہجری کے مجدد ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت اونچا مقام عطا فرمایا تھا۔ بہرحال! حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ بھائی! تم یہ پوچھ رہے ہو کہ حضرت معاویہ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں؟ ارے! حضرت معاویہ تو درکنار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے جو مٹی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ناک میں گئی تھی، وہ مٹی بھی ہزار عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ''صحابیت'' کا جو مقام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا تھا، ساری زندگی انسان کوشش کرتا رہے، تب بھی ''صحابیت'' کا وہ مقام حاصل نہیں کر سکتا''(۱)

ماں کی خدمت کرتے رہو

بہرحال: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو یہ فرما دیا کہ ہماری زیارت کی ضرورت نہیں، اور ''صحابیت'' کا مقام حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ماں کی خدمت کرو۔ اگر ہم جیسا کوئی ناداشناس ہوتا تو یہ کہتا کہ یہ ''صحابیت'' کی دولت بعد میں تو ملنے والی نہیں، اگر ماں بیمار ہے

---

(۱) البداية والنهاية (۱/۱۳۹)

تو کیا ہوا، کسی نہ کسی ضرورت کے تحت گھر سے باہر نکلنا ہوتا ہی ہے، اس لیے اس ضرورت کے تحت گھر سے چلے جاؤ۔ اور جا کر نبی کریم ﷺ کی زیارت کر کے واپس آ جاؤ۔ مگر وہاں تو اپنا شوق پورا کرنا پیش نظر نہیں تھا، اپنی ذاتی خواہش پوری نہیں کرنی تھی۔ بلکہ وہاں تو صرف اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا شوق تھا۔ اس لیے آپ کی زیارت کو چھوڑ دیا۔ اور گھر میں ماں کی خدمت میں لگے رہے حتیٰ کہ حضور نبی کریم ﷺ کا وصال ہو گیا، اور حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی زیارت نہ کر سکے۔

ماں کی خدمت کا صلہ

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو ماں کی خدمت کا یہ صلہ عطا فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے عمر! کسی زمانے میں ''قرن'' یعنی یمن کے علاقے سے ایک آدمی مدینہ آئے گا۔ جس کے یہ اوصاف یہ حلیہ ہوگا، جب یہ آدمی تمہیں مل جائے تو اے عمر! اپنے حق میں ان سے دعا کرانا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول فرمائیں گے۔

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب بھی یمن سے کوئی قافلہ مدینہ طیبہ آتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جا کر ان سے سوال کرتے کہ اس قافلے میں اویس قرنی نامی کوئی شخص ہیں؟ جب ایک مرتبہ قافلہ آیا اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس میں اویس قرنی تشریف لائے ہیں۔ تو آپ بہت خوش ہوئے، جا کر ان سے ملاقات کی اور ان کا نام دریافت کیا اور جو حلیہ نبی کریم ﷺ نے بتایا تھا۔ وہ حلیہ بھی موجود تھا۔ تو پھر آپ نے ان سے درخواست کی کہ آپ میرے حق میں دعا فرمائیں۔ حضرت اویس قرنی نے سوال کیا کہ آپ مجھ سے دعا کرانے کیوں کر تشریف لائے؟ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے یہ وصیت فرمائی تھی کہ جب ''قرن'' سے یہ صاحب آئیں تو ان سے اپنے حق میں دعا کرانا، اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو قبول فرمائیں گے۔ جب حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے یہ سنا کہ حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمایا تھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہ حضور اقدس ﷺ نے مجھے یہ نسبت عطا فرمائی۔(۱)

دیکھیے! حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اپنے حق میں دعا کراؤ۔ یہ چیز ان کو کس طرح حاصل ہوئی یہ چیز ان کو والدہ کی خدمت اور نبی کریم ﷺ کی اطاعت

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أويس القرني، رقم: ٤٦١٣، مسند أحمد، رقم: ٢٥٧، سنن الدارمي، المقدمة، رقم: ٤٤٠

کی بدولت حاصل ہوئی۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ میرے حضور ﷺ نے مجھے جس کام کا حکم دیا ہے۔ اب میں اس پر عمل کروں گا چاہے کچھ ہو جائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جانثاری

کون صحابی ایسا تھا جو حضور اقدس ﷺ کا جانثار اور وفا کار نہ ہو، میں نے ایک مضمون میں ایک بات لکھی اور وہ بات صحیح لکھی تھی کہ ہر صحابی کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی جان دے کر کسی دوسرے کی زندگی میں اضافہ کرنے کے قابل ہوتا تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سرکار دو عالم ﷺ کی زندگی کے ایک سانس کے اوپر اپنی ساری جانیں نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتے، وہ صحابہ اتنے فدا کار تھے ان کا تو یہ حال تھا کہ وہ کسی وقت یہ نہیں چاہتے کہ حضور ﷺ کا جلوۂ انور نگاہوں سے روپوش ہو، یہاں تک جنگ کے میدان میں بھی یہ بات گوارہ نہیں تھی۔

حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ، جن کو جنگ احد میں حضور اقدس ﷺ نے اپنے دست مبارک سے تلوار عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ جب دشمنوں کی طرف مقابلے کے لیے نکلے تو اس وقت دشمنوں کی طرف سے حضور اقدس ﷺ پر تیروں کی بوچھاڑ آ رہی تھی۔ اس وقت حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ تیروں کی طرف پشت کر کے اور حضور اقدس ﷺ کی طرف چہرہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ اور سارے تیر اپنی پشت پر لینے لگے۔ سینے پر اس لیے نہ لیے کہ اگر تیروں کو اپنے سینے پر سامنے سے روکیں تو حضور اقدس ﷺ کی طرف پشت ہوتی۔ اور حضور اقدس ﷺ کا جلوہ جہاں آراء نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ لہٰذا جنگ کی حالت میں بھی یہ احتیاط کہ پشت حضور اقدس ﷺ کی طرف نہ ہو، بلکہ پشت تیروں کی طرف رہے۔ اور چہرہ حضور اقدس ﷺ کی طرف ہو۔(۱)

بہرحال! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو اپنا ایک ایک لمحہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں گزارنے کے لیے بے چین تھے لیکن حضور اقدس ﷺ نے ان صحابہ میں سے کسی کو شام بھیج دیا۔ کسی کو یمن بھیج دیا، کسی کو مصر بھیج دیا، اور یہ حکم دیا کہ وہاں جا کر میرے دین کا پیغام پہنچاؤ۔ جب یہ حکم آ گیا تو اب حضور کی خدمت میں رہنے کا شوق قربان کر دیا۔ اور حضور اقدس ﷺ کے حکم کی تعمیل کو مقدم رکھا۔ اور مدینہ طیبہ سے روانہ ہو گئے۔

ہمارے حضرت والا ایک عجیب بات بیان فرمایا کرتے تھے، یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ دین وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام ہے۔ یہ دیکھو کہ اس وقت کا کیا تقاضا ہے؟ وہ کام انجام دو،

(۱)　المعجم الکبیر، رقم: ۱۵۳۵۶ (۱۳/۳۳۶)، مجمع الزوائد (۶/۱۱۳)

لہٰذا اگر وقت کا تقاضا والدین کی خدمت ہے، پھر جہاد بھی اس کے آگے بے حقیقت ہے تبلیغ بھی اس کے آگے بے حقیقت ہے، پھر نماز باجماعت بھی اس کے آگے بے حقیقت ہے، چاہے ان سب عبادات کے اپنے فضائل کتنے زیادہ ہوں اس لیے ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

والدین کی خدمت گزاری کی اہمیت

والدین کی خدمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے یہ بیان فرما دیا کہ والدین کی خدمت ساری عبادتوں پر مقدم ہے، چنانچہ قرآن کریم میں والدین کی خدمت کے بارے میں ایک دو نہیں بلکہ متعدد آیات نازل فرمائیں، چنانچہ ایک آیت میں ارشاد فرمایا کہ

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا﴾(۱)

یعنی ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ اچھائی کرنے کی نصیحت کی کہ والد کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرو اور ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾(۲)

یعنی ایک یہ کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور دوسرے یہ کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، دیکھئے اس آیت میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کو توحید کے ساتھ ملا کر ذکر کیا، کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ توحید، اور والدین کے ساتھ حسن سلوک گویا کہ توحید کے بعد انسان کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

جب والدین بوڑھے ہو جائیں......

پھر اس کے آگے کیا خوبصورت انداز میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ﴾(۳)

یعنی اگر تمہاری زندگی میں تمہارے والدین بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔ تو پھر ان والدین کو کبھی ''اف'' بھی مت کہنا۔ اور بڑھاپے کا ذکر اس لیے کیا کہ جب ماں باپ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو بڑھاپے کے اثر سے بعض اوقات ذہن نارمل نہیں رہتا۔ اور اس کی وجہ سے بعض اوقات غلط ملط

(۱) العنکبوت: ۸

(۲) الاسراء: ۲۳

(۳) الاسراء: ۲۳

باتوں پر اصرار بھی کرتے ہیں، اس لیے خاص طور پر بڑھاپے کا ذکر کیا کہ چاہے ماں باپ وہ باتیں کہہ رہے ہیں جو تمہارے خیال میں غلط اور ناحق ہی کیوں نہ ہوں، لیکن تمہارا کام یہ ہے کہ ''اف'' بھی مت کہو، اور ان سے جھڑک کر بات نہ کرنا، اور ان سے ہمیشہ عزت کے ساتھ بات کرنا، اور آگے فرمایا کہ

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا﴾(۱)

ان کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل کر کے رکھنا، اور یہ دعا مانگتے رہنا کہ یا اللہ! ان کے اوپر رحمت فرمایئے۔ جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پالا تھا۔ بڑھاپے کے اندر اگر ماں باپ کے مزاج میں ذرا سا چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تو اس سے گھبرا کر ''اف'' مت کہو، اس کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔

ڈائری کا ایک ورق

میں نے ایک کتاب میں ایک قصہ پڑھا تھا۔ معلوم نہیں کہ سچا ہے یا جھوٹا، لیکن بڑا سبق آموز واقعہ ہے، وہ یہ کہ ایک صاحب بوڑھے ہو گئے، انہوں نے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلا کر فاضل بنا دیا۔ ایک دن گھر کے صحن میں باپ بیٹے بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک کوا گھر کی دیوار پر آ کر بیٹھ گیا تو باپ نے بیٹے سے پوچھا کہ بیٹا! یہ کیا چیز ہے؟ اس نے کہا: ابا جان! یہ کوا ہے، تھوڑی دیر کے بعد پھر باپ نے پوچھا بیٹا! یہ کیا ہے؟ بیٹے نے کہا: ابا جان! ابھی تو آپ کو بتایا تھا کہ یہ کوا ہے، تھوڑی دیر گزرنے کے بعد پھر باپ نے پوچھا کہ بیٹا! یہ کیا ہے؟ اب بیٹے کے لہجے میں تبدیلی آ گئی اور اس نے جھڑک کر کہا کہ ابا جان! کوا ہے کوا، پھر تھوڑی دیر کے بعد باپ نے پوچھا کہ بیٹا! یہ کیا ہے۔ اب بیٹے سے رہا نہ گیا۔ اس نے کہا کہ آپ ہر وقت ایک بات پوچھتے رہتے ہیں ہزار مرتبہ کہہ دیا کہ یہ کوا ہے؟ آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بہرحال، اس طرح بیٹے نے باپ کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باپ اپنے کمرے میں اٹھ کر گیا اور ایک پرانی ڈائری نکال کر لایا، اور اس ڈائری کا ایک صفحہ کھول کر بیٹے کو دکھاتے ہوئے کہا کہ بیٹا! یہ ذرا پڑھنا، کیا لکھا ہے؟ چنانچہ اس نے پڑھا تو اس میں یہ لکھا تھا کہ آج میرا چھوٹا بیٹا صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور میں بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک کوا آ گیا، تو بیٹے نے مجھ سے ۲۵ مرتبہ پوچھا کہ ابا جان یہ کیا ہے؟ تو میں نے ۲۵ مرتبہ اس کو جواب دیا کہ بیٹا، یہ کوا ہے، اور مجھے اس ادا پر بڑا پیار آیا۔ اس کے پڑھنے کے بعد باپ نے کہا! بیٹا دیکھو! باپ اور بیٹے میں یہ فرق

(۱) الاسراء: ۲۴

ہے، جب تم بچے تھے تو تم نے مجھ سے ۲۵ مرتبہ پوچھا۔ اور میں نے ۲۵ مرتبہ بالکل اطمینان سے نہ صرف جواب دیا بلکہ میں نے اس بات کا اظہار کیا کہ مجھے اس کی ادا پر بڑا پیار آیا، آج جب میں نے تم سے صرف ۵ مرتبہ پوچھا تو تمہیں اتنا غصہ آ گیا۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک

بہر حال! اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ یہ بات یاد رکھو! کہ بڑھاپے کی عمر تک پہنچنے کے بعد ماں باپ کے اندر تھوڑا سا چڑچڑا پن بھی پیدا ہو جائے گا۔ ان کی بہت سی باتیں ناگوار بھی معلوم ہوں گی۔ لیکن اس وقت تم یہ یاد رکھنا کہ تمہارے بچپن میں اس سے کہیں زیادہ ناگوار باتیں تمہارے ماں باپ نے برداشت کی ہیں۔ لہٰذا تمہیں بھی ان کی ناگوار باتوں کو برداشت کرنا ہے، یہاں تک کہ اگر ماں باپ کافر بھی ہوں تو ان کے بارے میں بھی قرآن کریم نے فرمایا:

﴿وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا﴾(۱)

یعنی اگر تمہارے والدین کافر مشرک ہوں، تو پھر شرک میں تو ان کی اطاعت مت کرنا لیکن عام زندگی کے اندر ان کے ساتھ حسن سلوک پھر بھی ضروری ہے، اس لیے کہ اگرچہ وہ کافر ہے، لیکن تمہارا باپ ہے، تو والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی اتنی تاکید فرمائی ہے، آج کی دنیا ہر معاملے میں الٹی جا رہی ہے، اب تو باقاعدہ اس بات کی تربیت دی جا رہی ہے کہ والدین کی اطاعت، ان کا احترام ان کی عظمت کا نقش اولاد کے دلوں سے مٹا دیا جائے۔ اور باقاعدہ اس کی تربیت ہو رہی ہے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ ماں باپ بھی انسان ہیں، اور ہم بھی انسان ہیں، ہم میں اور ان میں کیا فرق ہے، ان کا ہم پر کیا حق ہے۔

جب انسان دین سے دور ہو جاتا ہے، اور اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے، اور آخرت کی فکر ختم ہو جاتی ہے تو اس وقت اس قسم کی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین

والدین کی نافرمانی کا وبال

بہر حال! یہ عرض کرنا تھا کہ والدین کی اطاعت واجب ہے اگر والدین کسی کام کا حکم دیں تو

(۱) لقمان: ۱۵

وہ کام کرنا اولاد کے ذمے شرعاً فرض ہو جاتا ہے، اور بالکل ایسا فرض ہو جاتا ہے جیسا کہ نماز پڑھنا فرض ہے بشرطیکہ ماں باپ جس کام کا حکم دے رہے ہیں، وہ شرعاً جائز ہو۔ اور اگر اولاد وہ کام نہ کرے تو یہ ایسا گناہ ہے، جیسا نماز چھوڑ دینا گناہ ہے، اسی کو ''عقوق الوالدین'' کہا جاتا ہے، یعنی والدین کی نافرمانی، اور بزرگوں نے فرمایا کہ والدین کی نافرمانی کا وبال یہ ہوتا ہے کہ مرتے وقت کلمہ نصیب نہیں ہوتا۔

ایک عبرت ناک واقعہ

ایک شخص کا واقعہ لکھا ہے کہ اس کی موت کا وقت آ گیا، اور نزع کا وقت ہے، سب لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ زبان سے کلمہ پڑھ لے۔ مگر زبان پر کلمہ جاری نہیں ہوتا، چنانچہ لوگ ایک بزرگ کو لائے، اور ان سے پوچھا کہ اس کا کیا حل نکالا جائے اس کی زبان پر کلمہ جاری نہیں ہو رہا ہے، ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر اس کی والدہ یا والد حیات ہوں تو ان سے اس کے لیے معافی مانگو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے والدین کی نافرمانی کی ہے، اس کے نتیجے میں اس پر یہ وبال آیا ہے، اور جب تک ان کی طرف سے معافی نہیں ہوگی، اس وقت تک اس کی زبان پر کلمہ جاری نہیں ہوگا۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ والدین کہ نافرمانی کرنا، اور ان کا دل دکھانا کتنی خطرناک اور وبال کی چیز ہے، حضور نبی کریم ﷺ نے ہر ہر قدم پر اپنی تعلیمات میں والدین کا احترام، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا لحاظ رکھا۔ جو صحابہ آپ سے مشورہ کرنے آتے تو آپ ان کو حسن سلوک کا مشورہ دیتے۔

علم کے لیے والدین کی اجازت

ہمارے ہاں دارالعلوم میں بعض مرتبہ بعض طالب علم داخلے کے لیے آتے ہیں، ان کو پڑھنے کا شوق ہے۔ عالم بننے اور درس نظامی پڑھ کر فارغ التحصیل ہونے کا شوق ہے، لیکن جب ان سے پوچھا جاتا کہ والدین کی اجازت سے آئے ہو؟ تو معلوم ہوتا کہ والدین کی اجازت کے بغیر آئے ہیں، اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کیا کریں والدین ہمیں اجازت نہیں دے رہے تھے، اس لیے ہم بغیر اجازت کے چلے آئے ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ یاد رکھیں، مولوی بننا کوئی فرض نہیں والدین کی اطاعت کرنا فرض ہے ہاں! اگر والدین اتنا علم بھی حاصل کرنے سے روک دیں جس سے انسان ایک مسلمان جیسی زندگی گزار سکے، مثلاً نماز کا طریقہ سیکھنے سے روکیں، تو اس صورت میں والدین کی اطاعت نہیں، لیکن مولوی بننا (پورے دین کا علم حاصل کرنا) فرض و واجب نہیں، لہٰذا جب تک

والدین اس کی اجازت نہ دیں اس وقت تک وہ نہ کرے، اور اگر اجازت کے بغیر مولوی بننے میں لگے گا تو وہی بات ہوگی جو ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ اپنا شوق پورا کرنا ہوگا۔ یہ دین کا کام نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی حقیقت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جنت حاصل کرنے کا آسان راستہ

یاد رکھو! جب تک والدین حیات ہیں تو وہ اتنی بڑی نعمت ہیں کہ اس روئے زمین پر انسان کے لیے اس سے بڑی نعمت کوئی اور نہیں جیسا کہ حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر ماں باپ کو محبت اور پیار کی نظر سے دیکھ لو تو ایک حج اور ایک عمرہ کا ثواب ہے۔(۱)

اس لیے ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مردود ہو وہ شخص جو اپنے والدین کو بڑھاپے کی حالت میں پائے، پھر وہ ان کی خدمت کر کے اپنے گناہ معاف نہ کرالے۔(۲)

اس لیے کہ اگر ماں باپ بوڑھے ہیں تو جنت حاصل کرنا اتنا آسان ہے جس کی کوئی حد نہیں، ذرا سی ان کی خدمت کرلو گے تو ان کے دل سے دعا نکل جائے گی۔ اور تمہاری آخرت سنور جائے گی۔ بہانے بہانے سے تم جنت کما سکتے ہو، بہر حال! والدین جب تک حیات ہوں ان کو نعمت سمجھ کر ان کی قدر کریں، اس لیے کہ جب والدین اٹھ جاتے ہیں تو اس وقت حسرت ہوتی ہے کہ ہم نے زندگی کے اندر ان کی کوئی قدر نہ کی، ان کے ساتھ حسن سلوک کر کے جنت نہ کمالی، بعد میں افسوس ہوتا ہے۔

والدین کی وفات کے بعد تلافی کی صورت

اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ والدین کے مرنے کے بعد اولاد کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کتنی بڑی نعمت کھو دی اور ہم نے اس کا حق ادا نہ کیا، اس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے ایک راستہ رکھا ہے، فرمایا کہ اگر کسی نے والدین کے حقوق میں کوتاہی کی ہو، اور ان سے فائدہ نہ اٹھایا ہو، تو اس کی تلافی کے دو راستے ہیں، ایک ان کے لیے ایصال ثواب کی کثرت کرنا۔ جتنا ہو سکے ان کو ثواب پہنچائیں۔ صدقہ دے کر ہو، یا نوافل پڑھ کر ہو، یا قرآن کریم کی تلاوت کر کے ذریعہ ہو، اس کے ذریعہ اس کی تلافی ہو جاتی ہے، دوسرے یہ کہ والدین کے جو اعزہ و اقرباء دوست احباب ہیں، ان

(۱) الدر المنثور (٥/٢٦٤)، جامع الأحاديث، رقم: ٢٠٨٢١ (١٩/٣٠٤)

(٢) مسند أحمد، رقم: ١٨٢٥٤

کے ساتھ حسن سلوک کرے اور ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرے جیسا باپ کے ساتھ کرنا چاہیے اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کوتاہی کی تلافی فرما دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ماں کے تین حق باپ کا ایک حق

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! مَنْ اَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صُحْبَتِیْ؟ قَالَ: ((اُمُّكَ)) قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ((اُمُّكَ)) قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ ((اُمُّكَ)) قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ ((اَبُوْكَ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! ساری دنیا کے انسانوں میں سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟ کس کے ساتھ میں سب سے زیادہ اچھا سلوک کروں؟ آپ نے فرمایا: تمہاری ماں یعنی سارے انسانوں میں سب سے زیادہ تمہارے حسن سلوک کی مستحق تمہاری ماں ہے، ان صاحب نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کون ہے؟ آپ نے دوبارہ جواب دیا: تمہاری ماں، ان صاحب نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کون ہے؟ آپ نے پھر جواب دیا: تمہاری ماں ان صاحب نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کون ہے؟ تو چوتھے نمبر پر فرمایا: تمہارا باپ۔

تین مرتبہ ماں کا نام لیا، آخر میں چوتھے نمبر پر باپ کا نام لیا، اس واسطے علماء کرام نے اس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے فرمایا کہ ماں کا حق حسن صحبت میں باپ سے بھی زیادہ ہے ماں کے تین حق ہیں، اور باپ کا ایک حق ہے، اس لیے کہ بچے کی پرورش کے لیے ماں جتنی مشقتیں جھیلتی ہے، باپ اس کا چوتھائی بھی نہیں جھیلتا، اس لیے اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حصے ماں کے بیان فرمائے۔ اور ایک حصہ باپ کا بیان فرمایا۔

باپ کی تعظیم، ماں کی خدمت

اسی لیے بزرگوں نے فرمایا کہ اگر کوئی ہدیہ یا تحفہ دینا ہو تو ماں کو زیادہ دینا چاہیے، بزرگوں نے یہ بھی فرمایا کہ دو چیزیں علیحدہ ہیں، ایک ہے "تعظیم" اس میں تو باپ کا حق ماں پر مقدم ہے، اور

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب بر الوالدین وأنهما أحق به، رقم: ٤٦٢٢

دوسری چیز ہے ''حسن سلوک'' اور ''خدمت'' اس میں ماں کا حق باپ پر مقدم ہے۔ لیکن جہاں تک خدمت کا تعلق ہے، اس میں ماں کا حق مقدم ہے، اور باپ کے مقابلے میں تین چوتھائی زیادہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قدرتی طور پر ماں کے اندر یہ بات رکھی ہے کہ ماں کے ساتھ اولاد کی بے تکلفی زیادہ ہوتی ہے، بہت سی باتیں بیٹا کھل کر باپ سے نہیں کہہ سکتا، لیکن ماں کے سامنے وہ کہہ دیتا ہے تو شریعت نے اس کا بھی لحاظ رکھا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں بزرگوں کا بیان کیا ہوا یہ اصول لکھا ہے کہ اولاد باپ کی تعظیم زیادہ کرے، اور ماں کی خدمت زیادہ کرے، اس اصول کے ذریعہ احادیث کے درمیان بھی تطبیق ہو جاتی ہے۔

ماں کی خدمت کا نتیجہ

بہر حال! ماں کی خدمت وہ چیز ہے جو انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتی ہے جیسا کہ آپ نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے واقعے میں دیکھا، اور بھی بہت سے بزرگوں کا یہی حال ذکر کیا گیا ہے، مثلاً امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے، کہ ایک عرصہ تک صرف ماں کی خدمت میں مشغولی کی وجہ سے علم حاصل نہیں کر سکے، لیکن بعد میں جب ان کی خدمت سے فارغ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے علم کے اندر بہت اونچا مقام عطا فرمایا، لہٰذا اس خدمت کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

واپس جا کر ان کے ساتھ حسن سلوک کرو

وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: اَقْبَلَ رَجُلٌ اِلٰى نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: اُبَايِعُكَ عَلَى الْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ اَبْتَغِي الْاَجْرَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى، قَالَ: ((فَهَلْ لَكَ مِنْ وَالِدَيْكَ اَحَدٌ حَيٌّ؟)) قَالَ: نَعَمْ، بَلْ كِلَاهُمَا، قَالَ: ((فَتَبْتَغِي الْاَجْرَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى؟)) قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: ((فَارْجِعْ اِلٰى وَالِدَيْكَ فَاَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا))(۱)

یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کے پاس دو چیزوں پر بیعت کرنے آیا ہوں، ایک ہجرت پر اور ایک

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب الوالدين وأنهما أحق به، رقم: ٤٦٢٤، مسند أحمد، رقم: ٦٢٣٩

جہاد پر، یعنی میں اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ طیبہ میں رہنے کے لیے ہجرت کے ارادے سے آیا ہوں، اور آپ کے ساتھ جہاد کرنے کی نیت سے آیا ہوں، اور میں اپنے اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کا طلب گار ہوں، تو آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس شخص نے جواب دیا ہاں بلکہ والد اور والدہ دونوں زندہ ہیں، آپ نے فرمایا کہ کیا تم واقعی اجر وثواب چاہتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ جی ہاں! یا رسول اللہ، آپ نے جواب دیا کہ میرے ساتھ جہاد کرنے کے بجائے تم اپنے والدین کے پاس واپس جاؤ، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو''

دیکھئے! اس حدیث میں اپنے ساتھ جہاد کرنے کی فضیلت کو والدین کے ساتھ حسن سلوک پر قربان فرمادیا، اور ان کو واپس فرمادیا، ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ جہاد کی تیاری ہو رہی تھی، ایک صاحب حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں جہاد میں شریک ہونے کے لیے آیا ہوں، اور فخر کے طور پر بیان کیا کہ میں جہاد میں شرکت کرنے کا اتنا سچا طالب ہوں کہ جہاد میں شرکت کے لیے اپنے والدین کو روتا چھوڑ کر آیا ہوں، مطلب یہ تھا کہ میرے والدین مجھے نہیں چھوڑتے تھے، اور مجھے جہاد میں شرکت کی اجازت نہیں دے رہے تھے، لیکن اس کے باوجود میں ان کو اس حالت میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ میری جدائی کی وجہ سے رو رہے تھے، تو آنحضرت ﷺ نے اس شخص سے فرمایا:

((اِرْجِعْ فَاَضْحِکْهُمَا کَمَا اَبْکَیْتَهُمَا))(۱)

واپس جاؤ، اور ان کو جس طرح روتا چھوڑا تھا، اب جا کر ان کو ہنساؤ اور ان کو راضی کرو، تمہیں میرے ساتھ جہاد پر جانے کی اجازت نہیں۔

دین ''حفظ حدود'' کا نام ہے

یہ ہے حفظ حدود، اسی لیے ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دین نام ہے ''حفظ حدود'' کا یہ کوئی دین نہیں کہ جب جہاد کی فضیلت سن لی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جہاد کے لیے روانہ ہوگئے۔ بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکموں کی رعایت کرتے ہوئے ہر موقع پر کام کرنا ہوتا ہے، میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل لوگ یک باگے ہو گئے ہیں،

(۱) سنن أبي داود، كتاب الجهاد، باب في الرجل يغزو وأبواه كارهان، رقم: ۲۱٦٦، سنن ابن ماجه، كتاب الجهاد، باب الرجل يغزو وله أبوان، رقم: ۲۷۷۲، مسند أحمد: ٦٦١٥

جیسے اگر گھوڑے کی ایک باگ ہو تو وہ ایک صرف ایک ہی طرف چلے گا۔ دوسری طرف دھیان بھی نہیں دے گا، اسی طرح لوگ بھی یک باگ ہو گئے، یعنی جب یہ سن لیا کہ فلاں کام بڑی فضیلت والا ہے بس اس کی طرف دوڑ پڑے۔ اور یہ نہیں دیکھا کہ ہمارے ذمہ اور کیا حقوق واجب ہیں، اور دوسرے کاموں کی کیا حد ہے؟

اہل اللہ کی صحبت

اور یہ ''حفظ حدود'' کی بات عادۃ اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی، جب تک کسی اللہ والے کی صحبت میسر نہ آئے، زبان سے میں نے بھی کہہ دیا، اور آپ نے سن بھی لیا، کتابوں میں بھی یہ بات لکھی ہے، لیکن کس موقع پر کیا طرز عمل اختیار کرنا ہے، اور کس موقع پر کس چیز کو ترجیح دینی ہے، یہ بات کسی کامل شیخ کی صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، اور آدمی افراط و تفریط ہی میں مبتلا رہتا ہے شیخ کامل ہی بتاتا ہے کہ اس وقت کیا کام کرنا ہے، وہ بتاتا ہے کہ اس وقت میرے لیے کیا چیز بہتر ہے، اور کیا چیز بہتر نہیں، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اصلاح کے لیے لوگ آتے تو آپ بہت سے لوگوں کے وظیفے چھڑا دیتے، اور دوسرے کاموں پر لگا دیتے، اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ اس کام پر لگا رہے گا تو حدود کی حفاظت نہیں کرے گا۔

شریعت، سنت، طریقت

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ''حقوق'' تمام تر شریعت ہے، یعنی شریعت حقوق کا نام ہے، اللہ کے حقوق، اور بندوں کے حقوق اور ''حدود'' تمام تر سنت ہے یعنی سنت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کس حق کی کیا حد ہے، حق اللہ کی حد کہاں تک ہے، اور حق العبد کی حد کہاں تک ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں یہ بتاتی ہیں کہ کس حق پر کس حد تک عمل کیا جائے گا۔ اور ''حفظ حدود'' تمام تر طریقت ہے، یعنی طریقت جس کو تصوف اور سلوک کہا جاتا ہے۔ ان حدود کی حفاظت کا نام ہے، یعنی وہ حدود جو سنت سے ثابت ہیں، ان کی حفاظت تصوف اور سلوک کے ذریعہ ہوتی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ''شریعت'' تمام تر حقوق، سنت تمام تر حدود اور طریقت تمام تر حفظ حدود، بس! اگر یہ تین چیزیں حاصل ہو جائیں تو پھر کسی چیز کی حاجت نہیں، لیکن یہ چیزیں اس وقت تک حاصل نہیں ہوتیں جب تک انسان کسی اللہ والے کے سامنے رگڑے نہ کھائے اور کسی شیخ کامل کے حضور اپنے آپ کو پامال نہ کرے۔

قال را بگزار صاحب حال شو
پیش مردے کامل پامال شو

جب تک آدمی کسی مرد کامل کے سامنے اپنے آپ کو پامال نہیں کرے گا۔ اس وقت تک یہ بات حاصل نہیں ہوگی۔ بلکہ افراط وتفریط میں ہی مبتلا رہے گا کبھی ادھر جھک گیا، کبھی ادھر جھک گیا۔ سارے تصوف کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کو افراط وتفریط سے بچائے اور اس کو اعتدال پر لائے، اور اس کو یہ بتائے کہ کس وقت دین کا کیا تقاضا ہے، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

اولاد کی تربیت کیسے کریں؟ ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَیْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴾ (۱)

علامہ نووی رحمہ اللہ نے آگے اس کتاب ''ریاض الصالحین'' میں ایک نیا باب قائم فرمایا ہے، جس کے ذریعہ یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ انسان کے ذمے صرف خود اپنی اصلاح ہی واجب نہیں ہے، بلکہ اپنے گھر والوں، اپنے بیوی بچوں اور اپنے ماتحت جتنے بھی افراد ہیں، ان کی اصلاح کرنا ان کو دین کی طرف لانے کی کوشش کرنا، ان کو فرائض و واجبات کی ادائیگی کی تاکید کرنا، اور گناہوں سے اجتناب کی تاکید کرنا بھی انسان کے ذمے فرض ہے اس مقصد کے تحت یہ باب قائم فرمایا ہے، اور اس میں کچھ آیات قرآنی اور کچھ احادیث نبوی نقل کی ہیں۔

خطاب کا پیارا عنوان

یہ آیت جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، یہ درحقیقت اس باب کا بنیادی عنوان ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾

یعنی اے ایمان والو۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے

☆ اصلاحی خطبات (۲۲/۱-۵۰)، ۱۷ جولائی، ۱۹۹۲، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، گلشن اقبال، کراچی۔ زیر نظر درس امام نووی رحمہ اللہ کی کتاب ''ریاض الصالحین'' کے باب نمبر ۳۴ "باب وجوب أمره أهله و أولاده المميزين و سائر من فى رعيته بطاعة الله تعالىٰ و نهيهم عن المخالفة و تأديبهم و منعهم عن ارتكاب منهى عنه" (صفحہ ۱۳۰ تا ۱۳۲) کا درس ہے۔

(۱) التحریم: ٦

خطاب کرنے کے لیے جگہ جگہ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا عنوان اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے استعمال فرماتے ہیں۔ یہ بڑا پیارا عنوان ہے، یعنی اے ایمان والو، اے وہ لوگو جو ایمان لائے، اس خطاب میں بڑا پیار ہے، اس لیے کہ خطاب کا ایک طریقہ یہ ہے کہ مخاطب کا نام لے کر خطاب کیا جائے، اے فلاں اور خطاب کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو اس رشتے کا حوالہ دے کر خطاب کیا جائے جو خطاب کرنے والے کا اس سے قائم ہے، مثلاً ایک باپ اپنے بیٹے کو بلائے تو اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس بیٹے کا نام لے کر اس کو پکارے کہ اے فلاں اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ''بیٹا'' کہہ کر پکارے کہ اے بیٹے، ظاہر ہے کہ بیٹا کہہ کر پکارنے میں جو پیار، جو شفقت اور جو محبت ہے، اور سننے کے لیے اس میں جو لطف ہے، وہ پیار اور لطف نام لے کر پکارنے میں نہیں ہے۔

لفظ ''بیٹا'' ایک شفقت بھرا خطاب

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی قدس اللہ سرہ، اتنے بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ ہم نے تو ان کو اس وقت دیکھا تھا جب پاکستان میں تو کیا، ساری دنیا میں علم و فضل کے اعتبار سے ان کا ثانی نہیں تھا۔ ساری دنیا میں ان کے علم و فضل کا لوہا مانا جاتا تھا، کوئی ان کو ''شیخ الاسلام'' کہہ کر مخاطب کرتا، کوئی ان کو ''علامہ'' کہہ کر مخاطب کرتا، بڑے تعظیمی القاب ان کے لیے استعمال کیے جاتے تھے، کبھی کبھی وہ ہمارے گھر تشریف لاتے تھے، اس وقت ہماری دادی بقید حیات تھیں، ہماری دادی صاحبہ رشتے میں حضرت علامہ کی ممانی لگتی تھیں، اس لیے وہ ان کو ''بیٹا'' کہہ کر پکارتی تھیں، اور ان کو دعا دیتی تھیں کہ ''بیٹا! جیتے رہو'' جب ہم ان کے منہ سے یہ الفاظ اتنے بڑے علامہ کے لیے سنتے، جنہیں دنیا ''شیخ الاسلام'' کے لقب سے پکار رہی تھی تو اس وقت ہمیں بڑا عجیب محسوس ہوتا تھا، لیکن علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں حضرت مفتی صاحب (مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ) کے گھر میں دو مقصد سے آتا ہوں۔

ایک یہ کہ حضرت مفتی صاحب سے ملاقات، دوسرے یہ ہے کہ اس وقت روئے زمین پر مجھے ''بیٹا'' کہنے والا سوائے ان خاتون کے کوئی اور نہیں ہے، صرف یہ خاتون مجھے بیٹا کہہ کر پکارتی ہیں، اس لیے میں بیٹا کا لفظ سننے کے لیے آتا ہوں، اس کے سننے میں جو لطف اور پیار محسوس ہوتا ہے وہ مجھے کوئی اور لقب سننے میں محسوس نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کی قدر اس شخص کو ہوتی ہے جو اس کہنے والے کے جذبے سے آشنا ہو، وہ اس کو جانتا ہے کہ مجھے یہ جو ''بیٹا'' کہہ کر پکارا جارہا ہے، یہ کتنی بڑی نعمت ہے، ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان یہ لفظ سننے کو ترس جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا خطاب کر کے اس رشتے کا حوالہ دیتے ہیں۔ جو ہر صاحب ایمان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو ''بیٹا'' کہہ کر پکارے، اور اس لفظ کو استعمال کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آگے جو بات باپ کہہ رہا ہے وہ شفقت، محبت اور خیر خواہی سے بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی قرآن کریم میں جگہ جگہ ان الفاظ سے مسلمانوں کو خطاب فرما رہے ہیں۔ انہی جگہوں میں سے ایک جگہ یہ ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾(۱)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو بھی آگ سے بچاؤ، وہ آگ کیسی ہے؟ آگے اس آگ کی صفت بیان فرمائی کہ اس آگ کا ایندھن لکڑیاں اور کوئلے نہیں ہے، بلکہ اس آگ کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، اور اس آگ کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے فرشتے مقرر ہیں جو بڑے غیظ اور تند خو ہیں سخت مزاج ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کو جس بات کا حکم دیتے ہیں، وہ اس حکم کی کبھی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہی کام کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔

ذاتی عمل نجات کے لیے کافی نہیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ بات صرف یہاں تک ختم نہیں ہوتی کہ بس اپنے آپ کو آگ سے بچا کر بیٹھ جاؤ، اور اس سے مطمئن ہو جاؤ کہ بس میرا کام ہو گیا، بلکہ اپنے اہل و عیال کو بھی آگ سے بچانا ضروری ہے آج یہ منظر بکثرت نظر آتا ہے کہ آدمی اپنی ذات میں بڑا دیندار ہے، نماز کا اہتمام ہے، صف اول میں حاضر ہو رہا ہے، روزے رکھ رہا ہے، زکوۃ ادا کر رہا ہے، اللہ کے راستے میں مال خرچ کر رہا ہے، اور جتنے اوامر و نواہی ہیں، ان پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن اس کے گھر کو دیکھو، اس کی اولاد کو دیکھو، بیوی بچوں کو دیکھو تو ان میں اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہے، یہ کہیں جا رہا ہے، وہ کہیں جا رہے ہیں، اس کا رخ مشرق کی طرف ہے، ان کا رخ

(۱)　التحریم: ٦

مغرب کی طرف ہے، ان میں نماز کی فکر ہے، نہ فرائض دینیہ کو بجا لانے کا احساس ہے، اور نہ گناہوں کو گناہ سمجھنے کی فکر ہے، بس: گناہوں کے سیلاب میں بیوی بچے بہہ رہے ہیں، اور یہ صاحب اس پر مطمئن ہیں کہ میں صف اول میں حاضر ہوتا ہوں، اور باجماعت نماز ادا کرتا ہوں، خوب سمجھ لیں۔ جب اپنے گھر والوں کو آگ سے بچانے کی فکر نہ ہو، خود انسان کی اپنی نجات نہیں ہوسکتی، انسان یہ کہہ کر جان نہیں بچا سکتا کہ میں تو خود اپنے عمل کا مالک تھا، اگر اولاد دوسری طرف جا رہی تھی تو میں کیا کرتا، اس لیے کہ ان کو بچانا بھی تمہارے فرائض میں شامل تھا، جب تم نے اس میں کوتاہی کی تو اب آخرت میں تم سے مواخذہ ہوگا۔

اگر اولاد نہ مانے تو کیا کریں؟

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ، درحقیقت اس میں ایک شبہ کے جواب کی طرف اشارہ فرمایا جو شبہ عام طور پر ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے وہ شبہ یہ ہے کہ آج جب لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ اپنی اولاد کو بھی دین کی تعلیم دو، کچھ دین کی باتیں ان کو سکھاؤ، ان کو دین کی طرف لاؤ، گناہوں سے بچانے کی فکر کرو، تو اس کے جواب میں عام طور پر بکثرت لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اولاد کو دین کی طرف لانے کی بڑی کوشش کی، مگر کیا کریں کہ ماحول اور معاشرہ اتنا خراب ہے کہ بیوی بچوں کو بہت سمجھایا، مگر وہ مانتے نہیں ہیں اور زمانے کی خرابی سے متاثر ہو کر انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا ہے، اور اس راستے پر جا رہے ہیں۔ اور راستہ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اب ان کا عمل ان کے ساتھ ہے ہمارا عمل ہمارے ساتھ ہے، اب ہم کیا کریں۔ اور دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تو آخر کار کافر رہا، اور حضرت نوح علیہ السلام اس کو طوفان سے نہ بچا سکے، اسی طرح ہم نے بہت کوشش کر لی ہے، وہ نہیں مانتے تو ہم کیا کریں؟

دنیاوی آگ سے کس طرح بچاتے ہو؟

چنانچہ قرآن کریم نے اس آیت میں ''آگ'' کا لفظ استعمال کر کے اس اشکال اور شبہ کا جواب دیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ بات ویسے اصولی طور پر تو ٹھیک ہے کہ اگر ماں باپ نے اولاد کو بے دینی سے بچانے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کر لی ہے تو ان شاء اللہ ماں باپ پھر بری الذمہ ہو جائیں گے، اور اولاد کے کیے کا وبال اولاد پر پڑے گا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ماں باپ نے اولاد کو بے دینی

سے بچانے کی کوشش کس حد تک کی ہے؟ اور کس درجے تک کی ہے؟ قرآن کریم نے ''آگ'' کا لفظ استعمال کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ ماں باپ کو اپنی اولاد کو گناہوں سے اس طرح بچانا چاہیے جس طرح ان کو آگ سے بچاتے ہیں۔

فرض کریں کہ ایک بہت بڑی خطرناک آگ سلگ رہی ہے، جس آگ کے بارے میں یقین ہے کہ اگر کوئی شخص اس آگ کے اندر داخل ہو گیا تو زندہ نہیں بچے گا، اب آپ کا نادان بچہ اس آگ کو خوش منظر اور خوبصورت سمجھ کر اس کی طرف بڑھ رہا ہے، تو اب بتاؤ تم اس وقت کیا کرو گے؟ کیا تم اس پر اکتفا کرو گے کہ دور سے بیٹھ کر بچے کو نصیحت کرنا شروع کر دو کہ بیٹا! اس آگ میں مت جانا۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے۔ اگر جاؤ گے تو تم جل جاؤ گے، اور مر جاؤ گے؟ کیا کوئی صرف زبانی نصیحت پر اکتفا کرے گا؟ اور اس نصیحت کے باوجود اگر بچہ اس آگ میں چلا جائے تو کیا وہ ماں باپ یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ ہم نے تو اس کو سمجھا دیا تھا۔ اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اس نے نہیں مانا اور خود ہی اپنی مرضی سے آگ میں کود گیا تو میں کیا کروں؟ دنیا میں کوئی ماں باپ ایسا نہیں کریں گے، اگر وہ اس بچے کے حقیقی ماں باپ ہیں تو اس بچے کو آگ کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر ان کی نیند حرام ہو جائے گی، ان کی زندگی حرام ہو جائے گی اور جب تک اس بچے کو گود میں اٹھا کر اس آگ سے دور نہیں لے جائیں گے، اس وقت تک ان کو چین نہیں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ جب تم اپنے بچے کو دنیا کی معمولی سی آگ سے بچانے کے لیے صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفا نہیں کرتے تو جہنم کی وہ آگ جس کی حد و نہایت نہیں، اور جس کا دنیا میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس آگ سے بچے کو بچانے کے لیے زبانی جمع خرچ کو کافی کیوں سمجھتے ہو؟ لہٰذا یہ سمجھنا کہ ہم نے انہیں سمجھا کر اپنا فریضہ ادا کر لیا، یہ بات آسانی سے کہنے کی نہیں ہے۔

آج دین کے علاوہ ہر چیز کی فکر ہے

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی جو مثال دی جاتی ہے کہ ان کا بیٹا کافر رہا، وہ اس کو آگ سے نہیں بچا سکے یہ بات درست نہیں اس لیے کہ یہ بھی تو دیکھو کہ انہوں نے اس کو راہ راست پر لانے کی نو سو سال تک لگاتار کوشش کی، اس کے باوجود جب راہ راست پر نہیں آیا تو اب ان کے اوپر کوئی مطالبہ اور کوئی مواخذہ نہیں۔ لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ ایک دو مرتبہ کہا اور پھر فارغ ہو کر بیٹھ گئے کہ ہم نے تو کہہ دیا، حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ ان کو گناہوں سے اسی طرح بچاؤ جس طرح ان کو حقیقی آگ سے بچاتے ہو، اگر اس طرح نہیں بچا رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فریضہ ادا نہیں ہو رہا ہے۔ آج

تو یہ نظر آ رہا ہے کہ اولاد کے بارے میں ہر چیز کی فکر ہے، مثلاً یہ تو فکر ہے کہ بچے کی تعلیم اچھی ہو، اس کا کیریئر اچھا بنے یہ فکر ہے کہ معاشرے میں اس کا مقام اچھا ہو، یہ فکر تو ہے کہ اس کے کھانے پینے اور پہننے کا انتظام اچھا ہو جائے، لیکن دین کی فکر نہیں۔

''تھوڑا سا بے دین ہو گیا''

ہمارے ایک جاننے والے تھے، جو اچھے خاصے پڑھے لکھے تھے۔ دیندار اور تہجد گزار تھے، ان کے لڑکے نے جدید انگریزی تعلیم حاصل کی، جس کے نتیجے میں اس کو کہیں اچھی ملازمت مل گئی ایک دن وہ بڑی خوشی کے ساتھ بتانے لگے کہ ماشاء اللہ ہمارے بیٹے نے اتنا پڑھ لیا، اب اس کو ملازمت مل گئی اور معاشرے میں اس کو بڑا مقام حاصل ہو گیا، البتہ تھوڑا سا بے دین تو ہو گیا، لیکن معاشرے میں اس کا کیریئر بڑا شاندار بن گیا ہے۔

اب اندازہ لگائیے کہ ان صاحب نے اس بات کو اس طرح بیان کیا کہ ''وہ بچہ ذرا سا بے دین تو ہو گیا۔ مگر اس کا کیریئر بڑا شاندار بن گیا'' معلوم ہوا کہ بے دین ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے، بس ذرا سی گڑبڑ ہو گئی ہے، حالانکہ وہ صاحب خود بڑے دیندار اور تہجد گزار آدمی تھے۔

''جان'' تو نکل گئی ہے

ہمارے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا، لیکن لوگ اس کو زندہ سمجھ رہے تھے، چنانچہ لوگوں نے ڈاکٹر کو بلایا۔ تا کہ اس کا معائنہ کرے کہ اس کو کیا بیماری ہے؟ یہ کوئی حرکت کیوں نہیں کر رہا ہے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ بالکل ٹھیک ٹھاک آدمی ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک تمام اعضاء ٹھیک ہیں۔ بس ذرا سی جان نکل گئی ہے۔

بالکل اسی طرح ان صاحب نے اپنے بیٹے کے بارے میں کہا کہ ''ماشاء اللہ اس کا کیریئر تو بڑا شاندار بن گیا ہے، بس ذرا سا بے دین ہو گیا ہے۔'' گویا کہ ''بے دین'' ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے۔

نئی نسل کی حالت

آج ہمارا یہ حال ہے کہ اور ہر چیز کی فکر ہے، مگر دین کی طرف توجہ نہیں، بھائی، اگر یہ دین اتنی

ہی ناقابل توجہ چیز تھی تو پھر آپ نے نماز پڑھنے کی اور تہجد گزاری کی اور مسجدوں میں جانے کی تکلیف کیوں فرمائی؟ آپ نے بھی اپنے بیٹے کی طرح اپنا کیریئر بنالیا ہوتا۔ شروع سے اس بات کی فکر نہیں کہ بچے کو دین کی تعلیم سکھائی جائے آج یہ حال ہے کہ پیدا ہوتے ہی بچے کو ایسی نرسری میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں اس کو کتا بلی تو سکھایا جاتا ہے، لیکن اللہ کا نام نہیں سکھایا جاتا، دین کی باتیں نہیں سکھائی جاتیں۔ اس وقت وہ نسل تیار ہو کر ہمارے سامنے آچکی ہے، اور اس نے زمام اقتدار سنبھال لی ہے۔ زندگی کی باگ دوڑ اس کے ہاتھ میں آگئی ہے، جس نے پیدا ہوتے ہی اسکول کالج کی طرف رخ کیا، اور ان کے اندر ناظرہ قرآن شریف پڑھنے کی بھی اہلیت موجود نہیں، نماز پڑھنا نہیں آتا۔ اگر اس وقت پورے معاشرے کا جائزہ لے کر دیکھا جائے تو شاید اکثریت ایسے لوگوں کی ملے جو قرآن شریف ناظرہ نہیں پڑھ سکتے، جنہیں نماز صحیح طریقے سے پڑھنا نہیں آتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی ماں باپ نے یہ فکر تو کی کہ اس کو کون سے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کیا جائے لیکن دین کی تعلیم کی طرف دھیان اور فکر نہیں۔

آج اولاد ماں باپ کے سر پر سوار ہے

یاد رکھو، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک سنت ہے، جو حدیث شریف میں بیان کی گئی ہے کہ جو شخص کسی مخلوق کو راضی کرنے کے لیے اللہ کو ناراض کرے تو اللہ تعالیٰ اسی مخلوق کو اس پر مسلط فرما دیتے ہیں، مثلاً ایک شخص نے ایک مخلوق کو راضی کرنے کے لیے گناہ کیا، اور گناہ کر کے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا، تو بالآخر اللہ تعالیٰ اسی مخلوق کو اس پر مسلط فرما دیتے ہیں، تجربہ کر کے دیکھو۔

آج ہماری صورت حال یہ ہے کہ اپنی اولاد اور بچوں کو راضی کرنے کی خاطر یہ سوچتے ہیں کہ ان کا کیریئر اچھا ہو جائے، ان کی آمدنی اچھی ہو جائے۔ اور معاشرے میں ان کا ایک مقام بن جائے، ان تمام کاموں کی وجہ سے ان کو دین نہ سکھایا، اور دین نہ سکھا کر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی اولاد جس کو راضی کرنے کی فکر تھی۔ وہی اولاد ماں باپ کے سر پر مسلط ہو جاتی ہے۔ آج آپ خود معاشرے کے اندر دیکھ لیں کہ کس طرح اولاد اپنے ماں باپ کی نافرمانی کر رہی ہے۔ اور ماں باپ کے لیے عذاب بنی ہوئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ماں باپ نے ان کو صرف اس لیے بے دینی کے ماحول میں بھیج دیا، تاکہ ان کو اچھا کھانا پینا میسر آجائے، اور اچھی ملازمت مل جائے، اور ان کو ایسے بے دینی کے ماحول میں آزاد چھوڑ دیا جس میں ماں باپ کی عزت اور عظمت کا کوئی خانہ نہیں ہے، جس میں ماں باپ کے حکم کی اطاعت کا بھی کوئی خانہ نہیں ہے، وہ اگر کل کو اپنی نفسانی خواہشات

کے مطابق فیصلے کرتا ہے، تو اب ماں باپ بیٹھے رو رہے ہیں کہ ہم نے تو اس مقصد کے لیے تعلیم دلائی تھی، مگر اس نے یہ کر لیا۔ ارے بات اصل میں یہ ہے تم نے اس کو ایسے راستے پر چلایا، جس کے نتیجے میں وہ تمہارے سروں پر مسلط ہو، تم ان کو جس قسم کی تعلیم دلوا رہے ہو، اور جس راستے پر لے جا رہے ہو، اس تعلیم کی تہذیب تو یہ ہے کہ جب ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو اب وہ گھر میں رکھنے کے لائق نہیں، ان کو نرسنگ ہوم (Nursing Home) میں داخل کر دیا جاتا ہے اور پھر صاحبزادے پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے کہ وہاں ماں باپ کس حال میں ہیں، اور کس چیز کی ان کو ضرورت ہے۔

باپ ''نرسنگ ہوم'' میں

مغربی ممالک کے بارے میں تو ایسے واقعات بہت سنتے تھے کہ بوڑھا باپ ''نرسنگ ہوم'' میں پڑا ہوا ہے، وہاں اس باپ کا انتقال ہو گیا، وہاں کے منیجر نے صاحب زادے کو فون کیا کہ جناب، آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، تو جواب میں صاحب زادے نے کہا کہ مجھے بڑا افسوس ہے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اب آپ براہ کرم ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کر دیں۔ اور براہ کرم بل مجھے بھیج دیجئے میں بل کی ادائیگی کر دوں گا۔ وہاں کے بارے میں تو یہ بات سنی تھی۔ لیکن ابھی چند روز پہلے مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ یہاں کراچی میں بھی ایک ''نرسنگ ہوم'' قائم ہو گیا ہے۔ جہاں بوڑھوں کی رہائش کا انتظام ہے، اس میں بھی یہی واقعہ پیش آیا کہ ایک صاحب کا وہاں انتقال ہو گیا۔ اس کے بیٹے کو اطلاع دی گئی، بیٹے صاحب نے پہلے تو آنے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن بعد میں معذرت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے تو اس وقت فلاں میٹنگ میں جانا ہے۔ اس لیے آپ ہی اس کے کفن دفن کا بندوبست کر دیں، میں نہیں آسکوں گا۔ یہ وہ اولاد ہے جس کو راضی کرنے کی خاطر تم نے خدا کو ناراض کیا، اس لیے وہ اب تمہارے اوپر مسلط کر دی گئی۔ جیسا کہ حدیث میں صراحت موجود ہے کہ جس مخلوق کو راضی کرنے کے لیے خدا کو ناراض کرو گے اللہ تعالیٰ اسی مخلوق کو تمہارے اوپر مسلط کر دیں گے۔

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

جب وہ اولاد سر پر مسلط ہو گئی تو اب ماں باپ بیٹھے رو رہے ہیں کہ اولاد دوسرے راستے پر جا رہی ہے، ارے جب تم نے شروع ہی سے اس کو ایسے راستے پر ڈالا، جس کے ذریعہ اس کا ذہن بدل جائے، اس کا خیال بدل جائے، اس کی سوچ بدل جائے تو اس کا انجام یہی ہونا تھا۔

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
بازی گوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش

پہلے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے سمندر کے اندر ڈبو دیا، اس کے بعد کہتے ہو کہ ہوشیار! دامن تر مت کرنا، بھائی: اگر تم نے پہلے اس کو کچھ قرآن شریف پڑھایا ہوتا۔ اس کو کچھ حدیث نبوی سکھائی ہوتی۔ وہ حدیث سکھائی ہوتی جس میں رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی جب دنیا سے چلا جاتا ہے تو تین چیزیں اس کے لیے کارآمد ہوتی ہیں، ایک علم ہے جسے وہ چھوڑ گیا، جس سے لوگ نفع اٹھا رہے ہیں، مثلاً کوئی آدمی کوئی کتاب تصنیف کر گیا۔ اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، یا کوئی آدمی علم دین پڑھاتا تھا، اب اس کے شاگرد آگے علم پڑھا رہے ہیں، اس سے اس مرنے والے شخص کو بھی فائدہ پہنچتا رہتا ہے۔ یا کوئی صدقہ جاریہ چھوڑ گیا۔ مثلاً کوئی مسجد بنا دی۔ کوئی مدرسہ بنا دیا۔ کوئی شفاخانہ بنا دیا۔ کوئی کنواں بنا دیا۔ اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، ایسے عمل کا ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اور تیسری چیز نیک اولاد ہے، جو وہ چھوڑ گیا۔ وہ اس کے حق میں دعائیں کریں۔ (۱) تو اس کا عمل مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے، کیونکہ ماں باپ کی تربیت کے نتیجے میں اولاد جو کچھ کر رہی ہے، وہ سب ماں باپ کے نامہ اعمال میں لکھا جا رہا ہے۔ اگر یہ حدیث پڑھائی ہوتی تو آج باپ کا یہ انجام نہ ہوتا۔ لیکن چونکہ اس راستے پر چلایا ہی نہیں۔ اس لیے اس کا انجام بد آنکھوں کے سامنے ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور اولاد کی فکر

بھائی اولاد کو دین کی طرف لانے کی فکر اتنی ہی لازمی ہے جتنی اپنی اصلاح کی فکر لازم ہے، اولاد کو صرف زبانی سمجھانا کافی نہیں۔ جب تک اس کی فکر اس کی تڑپ اسی طرح نہ ہو جس طرح اگر دہکتی ہوئی آگ کی طرف بچہ بڑھ رہا ہو، اور آپ اس کو لپک کر جب تک اٹھا نہیں لیں گے، اس وقت تک آپ کو چین نہیں آئے گا، اسی طرح کی تڑپ یہاں بھی ہونی ضروری ہے۔ پورا قرآن کریم اس حکم کی تاکید سے بھرا ہوا ہے، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کا ذکر فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ﴾ (۲)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزھد، رقم: ۷٤۲٤

(۲) مریم: ۵۵

یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوۃ کا حکم دیا کرتے تھے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو اپنی ساری اولاد اور بیٹوں کو جمع کیا کوئی شخص اپنی اولاد کو اس فکر کے لیے جمع کرتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟ کس طرح کماؤ گے؟ لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی اولاد کو جمع کر رہے ہیں اور یہ پوچھ رہے ہیں کہ بتاؤ! میرے مرنے کے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟(۱)

ان کو اگر فکر ہے تو عبادت کی فکر ہے۔ بس! اپنی اولاد اپنے اہل وعیال کے بارے میں اس فکر کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

قیامت کے روز ماتحتوں کے بارے میں سوال ہوگا

بات صرف اہل وعیال کی حد تک محدود نہیں، بلکہ جتنے بھی ماتحت ہیں، جن پر انسان اپنا اثر ڈال سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی جگہ افسر ہے اور کچھ لوگ اس کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ قیامت کے دن اس شخص سے سوال ہوگا کہ تم نے اپنے ماتحتوں کو دین پر لانے کی کوشش کی تھی؟ ایک استاذ ہے اس کے ماتحت بہت سے شاگرد پڑھتے ہیں۔ قیامت کے روز اس استاد سے سوال ہوگا کہ تم نے اپنے شاگردوں کو راہ راست پر لانے کے سلسلے میں کیا کام کیا؟ ایک مستاجر ہے۔ اس کے ماتحت بہت سے مزدور محنت مزدوری کرتے ہیں، قیامت کے روز اس مستاجر سے سوال ہوگا کہ تم نے اپنے ماتحتوں کو دین پر لانے کے سلسلے میں کیا کوشش کی تھی؟ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))(۲)

یہ گناہ حقیقت میں آگ ہیں

یہ آیت جو شروع میں تلاوت کی، اس آیت کے تحت میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ، یہ اس طرح کہا جا رہا ہے جیسے کہ آگ سامنے نظر

(۱) البقرہ: ۱۳۳

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القریٰ والمدن، رقم: ۸٤٤، صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب فضیلة الإمام، عقوبة الجائر والحث علی الرفق، رقم: ۳٤۰۸، سنن الترمذی، کتاب الجهاد، باب ماجاء فی الإمام، رقم: ۱٦۲۷، سنن أبی داؤد، کتاب الخراج والإمارة والفئی، باب مایلزم الإمام من حق الرعیة، رقم: ۲۵۳۹، مسند أحمد، رقم: ٤۹۲۰

آ رہی ہے۔ حالانکہ اس وقت کوئی آگ بھڑکتی ہوئی نظر نہیں آ رہی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ جتنے گناہ ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ یہ سب حقیقت میں آگ ہیں۔ چاہے دیکھنے میں یہ گناہ لذیذ اور خوش منظر معلوم ہو رہے ہوں، لیکن حقیقت میں یہ سب آگ ہیں۔ اور یہ دنیا جو گناہوں سے بھری ہوئی ہے، وہ ان گناہوں کی وجہ سے جہنم بنی ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت میں گناہوں سے مانوس ہو کر ہماری حس مٹ گئی ہے، اس لیے گناہوں کی ظلمت اور آگ محسوس نہیں ہوتی۔ ورنہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ صحیح حس عطا فرماتے ہیں اور ایمان کا نور عطا فرماتے ہیں۔ ان کو یہ گناہ واقعۃً آگ کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ یا ظلمت کی شکل میں نظر آتے ہیں۔

حرام کے ایک لقمے کا نتیجہ

دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص کی دعوت پر اس کے گھر کھانا کھانے چلا گیا، ابھی صرف ایک لقمہ ہی کھایا تھا کہ یہ احساس ہو گیا کہ کھانے میں کچھ گڑبڑ ہے شاید یہ حلال کی آمدنی نہیں ہے، جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ واقعۃً حلال کی آمدنی نہیں تھی، لیکن وہ حرام آمدنی کا لقمہ نادانستہ طور پر حلق کے اندر چلا گیا۔ حضرت مولانا فرماتے تھے کہ میں نے اس پر توبہ استغفار کی۔ لیکن اس کے باوجود دو مہینے تک اس حرام لقمے کی ظلمت محسوس ہوتی رہی اور دو ماہ تک بار بار یہ خیال اور وسوسہ آتا رہا کہ فلاں گناہ کر لو فلاں گناہ کر لو، اور گناہ کے داعیے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کے دلوں کو مجلی اور مزکی فرماتے ہیں انہیں ان گناہوں کی ظلمت کا احساس ہوتا ہے۔ ہم لوگ چونکہ ان گناہوں سے مانوس ہو گئے ہیں اس لیے ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔

اندھیرے کے عادی ہو گئے ہیں

ہم لوگ یہاں شہروں میں بجلی کے عادی ہو گئے ہیں ہر وقت شہر بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہا ہے، اب اگر چند منٹ کے لیے بجلی چلی جائے۔ تو طبیعت پر گراں گزرتا ہے اس لیے کہ نگاہیں بجلی کی روشنی اور اس کی راحت کی عادی ہیں، جب وہ راحت چھن جاتی ہے تو سخت تکلیف ہوتی ہے، اور وہ ظلمت بہت بری لگتی ہے، البتہ بہت سے دیہات ایسے ہیں کہ وہاں کے لوگوں نے بجلی کی شکل تک نہیں دیکھی، وہاں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے۔ کبھی بجلی کے قمقمے وہاں جلتے ہی نہیں ہیں ان کو کبھی اندھیرے کی تکلیف نہیں ہوتی، اس لیے کہ انہوں نے بجلی کے قمقموں کی روشنی دیکھی ہی نہیں، البتہ جس

نے یہ روشنی دیکھی ہے، اس سے جب یہ روشنی چھن جاتی ہے۔ تو اس کو تکلیف ہوتی ہے۔

یہی ہماری مثال ہے کہ ہم صبح شام گناہ کرتے رہتے ہیں اور ان گناہوں کی ظلمت کے عادی ہو گئے ہیں، اس لیے اس ظلمت کا احساس نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کا نور عطا فرمائے۔ تقویٰ کا نور عطا فرماء، تب ہمیں معلوم ہو کہ ان گناہوں کے اندر کتنی ظلمت ہے، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ گناہ درحقیقت آگ ہی ہیں، اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا﴾(۱)

یعنی جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے پیٹوں میں آگ کھا رہے ہیں

اس آیت کے تحت اکثر مفسرین نے یہ فرمایا کہ یہ مجاز اور استعارہ ہے کہ آگ کھا رہے ہیں، یعنی حرام کھا رہے ہیں، جس کا انجام بالآخر جہنم کی آگ کی شکل میں ان کے سامنے آئے گا، لیکن بعض مفسرین نے بیان فرمایا کہ یہ مجاز اور استعارہ نہیں ہے، بلکہ حقیقت ہے یعنی وہ حرام کا جو لقمہ کھا رہے ہیں، وہ واقعی آگ ہے، لیکن اس وقت بے حسی کی وجہ سے آگ معلوم نہیں ہو رہی ہے۔ لہٰذا جتنے گناہ ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں آگ ہیں اور حقیقت میں دوزخ کے انگارے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنی بے حسی کی وجہ سے نظر نہیں آتے۔

اللہ والوں کو گناہ نظر آتے ہیں

اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو چشم بصیرت عطا فرماتے ہیں، ان کو ان کی حقیقت نظر آتی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں صحیح اور مستند روایتوں میں ہے کہ جس وقت کوئی آدمی وضو کر رہا ہوتا، یا غسل کر رہا ہوتا تو آپ اس کے بہتے ہوئے پانی میں گناہوں کی شکلیں دیکھ لیتے تھے کہ یہ فلاں فلاں گناہ بہتے ہوئے جا رہے ہیں۔

ایک بزرگ تھے۔ جب وہ اپنے گھر سے باہر نکلتے تو چہرے پر کپڑا ڈال لیتے تھے۔ کسی شخص نے ان بزرگ سے پوچھا کہ حضرت! آپ جب بھی باہر نکلتے ہیں تو چہرے پر کپڑا ڈال کر نکلتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ ان بزرگ نے جواب میں فرمایا کہ میں کپڑا اٹھا کر باہر نکلنے پر قادر نہیں، اس لیے کہ جب میں باہر نکلتا ہوں تو کسی انسان کی شکل نظر نہیں آتی، بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ کوئی کتا ہے کوئی خنزیر ہے، کوئی بھیڑیا ہے، کوئی گدھا ہے، اور مجھے انسانوں کی شکلیں ان صورتوں میں نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہ ان شکلوں میں متشکل ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ بہر حال، چونکہ ان گناہوں کی

(۱) النساء: ۱۰

حقیقت ہم پر منکشف نہیں ہے، اس لیے ہم ان گناہوں کو لذت اور راحت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ گندگی اور نجاست ہے آگ اور ظلمت ہے۔

یہ دنیا گناہوں کی آگ سے بھری ہوئی ہے

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ دنیا جو گناہوں کی آگ سے بھری ہوئی ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی کمرے میں گیس بھر گئی ہو، اب وہ گیس حقیقت میں آگ ہے، صرف دیا سلائی لگانے کی دیر ہے، ایک دیا سلائی دکھاؤ گے تو پورا کمرہ آگ سے دھک جائے گا، اسی طرح یہ بداعمالیاں یہ گناہ جو معاشرے کے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں آگ ہیں، صرف ایک صور پھونکنے کی دیر ہے، جب صور پھونکا جائے گا تو یہ معاشرہ آگ سے دھک جائے گا، ہمارے یہ برے اعمال بھی درحقیقت جہنم ہے، ان سے اپنے آپ کو بھی بچاؤ، اور اپنے اہل وعیال کو بھی بچاؤ۔

پہلے خود نماز کی پابندی کرو

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری آیت یہ بیان فرمائی ہے:

﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾(۱)

یعنی اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو، اور خود بھی اس نماز کی پابندی کرو، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عجیب ترتیب رکھی ہے بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ پہلے خود نماز قائم کرو۔ اور پھر اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو، لیکن یہاں ترتیب الٹ دی ہے کہ پہلے اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو، اور پھر خود بھی اس کی پابندی کرو۔ اس ترتیب میں اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ تمہارا اپنے گھر والوں کو یا اولاد کو نماز کا حکم دینا اس وقت تک موثر اور فائدہ مند نہیں ہوگا، جب تک تم ان سے زیادہ اس کی پابندی نہیں کرو گے۔ اب زبان سے تو تم نے ان کو کہہ دیا کہ نماز پڑھو۔ لیکن خود اپنے اندر نماز کا اہتمام نہیں ہے۔ تو اس صورت میں ان کو نماز کے لیے کہنا بالکل بے کار جائے گا۔ لہٰذا اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دینے کا ایک لازمی حصہ یہ ہے کہ ان سے زیادہ پابندی خود کرو۔ اور ان کے لیے ایک مثال اور نمونہ بنو۔

---

(۱) طٰہٰ: ۱۳۲

بچوں کے ساتھ جھوٹ مت بولو

حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے سامنے ایک خاتون نے اپنے بچے کو گود میں لینے کے لیے بلایا، بچہ آنے میں تردد کر رہا تھا، تو اس خاتون نے کہا تم ہمارے پاس آؤ، ہم تمہیں کچھ چیز دیں گے۔ اب وہ بچہ آ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس خاتون سے پوچھا کہ تم نے بچے کو یہ جو کہا کہ ہمارے پاس آؤ، ہم تمہیں کچھ چیز دیں گے، تو کیا تمہاری واقعی کچھ دینے کی نیت تھی؟ اس خاتون نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس ایک کھجور تھی۔ اور یہ کھجور اس کو دینے کی نیت تھی، آپ نے فرمایا کہ اگر دینے کی نیت نہ ہوتی تو یہ تمہاری طرف سے بہت بڑا جھوٹ ہوتا، اور گناہ ہوتا۔(۱)

اس لیے کہ تم بچے سے جھوٹا وعدہ کر رہی ہو گویا اس کے دل میں بچپن سے یہ بات ڈال رہے ہو کہ جھوٹ بولنا اور وعدہ خلافی کرنا کوئی ایسی بری بات نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ بیوی بچوں کو جو بھی حکم دو، پہلے خود اس پر عمل کرو، اور اس کی پابندی دوسروں سے زیادہ کرو۔

بچوں کو تربیت دینے کا انداز

آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ احادیث لائے ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: اَخَذَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا تَمْرَةً مِنْ تَمْرِ الصَّدَقَةِ فَجَعَلَهَا فِیْ فِیْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: ((كَخْ كَخْ، اِرْمِ بِهَا، اَمَا عَلِمْتَ اَنَّا لَا نَاْكُلُ الصَّدَقَةَ!؟))(۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ جب کہ ابھی بچے ہی تھے۔ ایک مرتبہ صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لی، جب حضور اقدس ﷺ نے دیکھا تو فوراً فرمایا: ''کخ کخ'' عربی میں یہ لفظ ایسا ہے جیسے ہماری زبان میں ''تھوتھو'' کہتے ہیں یعنی اگر بچہ کوئی چیز منہ میں ڈال دے، اور اس کی شناعت

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في التشديد في الكذب، رقم: ٤٣٣٩، مسند أحمد، رقم: ١٥١٤٧

(۲) صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب مايذكر في الصدقة للنبي وآله، رقم: ١٣٩٦، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب تحريم الزكاة على رسول الله وعلى آله...... الخ، رقم: ١٧٧٨، مسند أحمد، رقم: ١٦٢٩، سنن الدارمي، كتاب الزكاة، باب الصدقة لاتحل للنبي ولا لأهل بيته، رقم: ١٥٨٥

کے اظہار کے ساتھ وہ چیز اس کے منہ سے نکلوانا مقصود ہو تو یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے، بہرحال! حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ''کخ کخ''، یعنی اس کو منہ سے نکال کر پھینک دو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم یعنی بنو ہاشم صدقے کا مال نہیں کھاتے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے نواسے ہیں۔ اور ایسے محبوب نواسے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے۔ اس وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہو گئے۔ تو حضور اقدس ﷺ منبر سے اترے، اور آگے بڑھ کر ان کو گود میں اٹھا لیا۔ اور بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ حضور اقدس ﷺ نماز پڑھ رہے ہیں۔ اور یہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ کے کندھے پر سوار ہو گئے اور جب آپ سجدے میں جانے لگے تو آپ نے ان کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر نیچے اتار دیا، اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ کو گود میں لیتے اور فرماتے:

((مَبْخَلَةٌ وَمَجْبَنَةٌ))(۱)

یعنی یہ اولاد ایسی ہے کہ انسان کو بخیل بھی بنا دیتی ہے، اور بزدل بھی بنا دیتی ہے۔ اس لیے کہ انسان اولاد کی وجہ سے بعض اوقات بخیل بن جاتا ہے، اور بعض اوقات بزدل بن جاتا ہے۔ ایک طرف تو حضور ﷺ کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اتنی محبت ہے، دوسری طرف جب انہوں نے نادانی میں ایک کھجور بھی منہ میں رکھ لی تو آنحضرت ﷺ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ اس کھجور کو کھا جائیں۔ مگر چونکہ ان کو پہلے سے اس چیز کی تربیت دینی تھی۔ اس لیے فوراً وہ کھجور منہ سے نکلوائی۔ اور فرمایا کہ یہ ہمارے کھانے کی چیز نہیں ہے۔

بچوں سے محبت کی حد

اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ بچے کی تربیت چھوٹی چھوٹی چیزوں سے شروع ہوتی ہے۔ اسی سے اس کا ذہن بنتا ہے، اسی سے اس کی زندگی بنتی ہے۔ یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے۔ آج کل یہ عجیب منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ماں باپ کے اندر بچوں کو غلط باتوں پر ٹوکنے کا رواج ہی ختم ہو گیا ہے۔ آج سے پہلے بھی ماں باپ بچوں سے محبت کرتے تھے۔ لیکن وہ عقل اور تدبیر کے ساتھ محبت کرتے تھے۔ لیکن آج کل یہ محبت اور لاڈ اس درجے تک پہنچ چکا ہے کہ بچے کتنے ہی غلط کام کرتے رہیں، غلط حرکتیں کرتے رہیں، لیکن ماں باپ ان غلطیوں پر ٹوکتے ہی نہیں،

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب برّ الوالد والإحسان إلى البنات، رقم: ٣٦٥٦، مسند أحمد، رقم: ١٦٩٠٤

ماں باپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نادان بچے ہیں ان کو ہر قسم کی چھوٹ ہے، ان کی روک ٹوک کرنے کی ضرورت نہیں۔ ارے بھائی، یہ سوچو کہ اگر وہ بچے نادان ہیں مگر تم تو نادان نہیں ہو، تمہارا فرض ہے کہ ان کو تربیت دو، اگر کوئی بچہ ادب کے خلاف، تمیز کے خلاف یا شریعت کے خلاف کوئی غلط کام کر رہا ہے۔ تو اس کو بتانا ماں باپ کے ذمے فرض ہے، اس لیے کہ وہ بچہ اسی طرح بدتہذیب بن کر بڑا ہو گیا تو اس کا وبال تمہارے اوپر ہے کہ تم نے اس کو ابتداء سے اس کی عادت نہیں ڈالی۔ بہر حال! اس حدیث کو یہاں لانے کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کی چھوٹی چھوٹی حرکتوں کو بھی نگاہ میں رکھو۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ بیتی میں اپنا ایک قصہ لکھا ہے کہ جب میں چھوٹا بچہ تھا تو ماں باپ نے میرے لیے ایک چھوٹا سا خوبصورت تکیہ بنا دیا تھا، جیسا کہ عام طور پر بچوں کے لیے بنایا جاتا ہے، مجھے اس تکیہ سے بڑی محبت تھی، اور ہر وقت میں اس کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ایک دن میرے والد صاحب لیٹنا چاہ رہے تھے۔ ان کو تکیے کی ضرورت پیش آئی تو میں نے والد صاحب سے کہا کہ ابا جی! میرا تکیہ لے لیجیے یہ کہہ کر میں نے اپنا تکیہ ان کو اس طرح پیش کیا، جس طرح کہ میں نے اپنا دل نکال کر باپ کو دے دیا، لیکن جس وقت وہ تکیہ میں نے ان کو پیش کیا، اسی وقت والد صاحب نے مجھے ایک چپت رسید کیا۔ اور کہا کہ ابھی سے تو اس تکیے کو اپنا تکیہ کہتا ہے، مقصد یہ تھا کہ تکیہ تو درحقیقت باپ کی عطاء ہے، لہٰذا اس کو اپنی طرف منسوب کرنا یا اپنا قرار دینا غلط ہے۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس وقت تو مجھے بہت برا لگا کہ میں نے تو اپنا دل نکال کر باپ کو دے دیا تھا۔ اس کے جواب میں باپ نے ایک چپت لگا دیا۔ لیکن آج سمجھ میں آیا کہ کتنی باریک بات پر اس وقت والد صاحب نے تنبیہ فرمائی تھی۔ اور اس کے بعد سے ذہن کا رخ بدل گیا۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ماں باپ کو نظر رکھنی پڑتی ہے، تب جا کر بچے کی تربیت صحیح ہوتی ہے، اور بچہ صحیح طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔

کھانا کھانے کا ایک ادب

عَنْ اَبِیْ حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ اَبِیْ سَلَمَةَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالْاَسَدِ رَبِیْبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: کُنْتُ غُلَامًا فِیْ حَجْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، وَکَانَتْ یَدِیْ تَطِیْشُ فِی الصَّحْفَةِ، فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((يَا غُلَامُ سَمِّ اللّٰهَ، وَكُلْ بِيَمِينِكَ، وَكُلْ مِمَّا يَلِيكَ)) فَمَا زَالَتْ تِلْكَ طِعْمَتِي بَعْدُ.(۱)

حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتیلے بیٹے ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، جوام المومنین ہیں، ان کے پچھلے شوہر سے یہ صاحبزادے پیدا ہوئے تھے۔ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تو یہ ان کے ساتھ ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے، اس لیے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب یعنی سوتیلے بیٹے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بڑی محبت وشفقت فرمایا کرتے تھے، اوران کے ساتھ بڑی بے تکلفی کی باتیں کیا کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ جس وقت میں چھوٹا بچہ تھا۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کر زیر پرورش تھا، ایک روز کھانا کھاتے ہوئے میرا ہاتھ پیالے میں ادھر سے ادھر حرکت کر رہا تھا، یعنی کبھی ایک طرف سے لقمہ اٹھایا۔ کبھی دوسری طرف سے۔ اور کبھی تیسری طرف سے لقمہ اٹھالیا۔ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس طرح کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا اے لڑکے! کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھو۔ اور داہنے ہاتھ سے کھاؤ، اور برتن کا جو حصہ تمہارے سامنے ہے، وہاں سے کھاؤ، ادھر ادھر سے ہاتھ بڑھا کر کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دیکھ کر اس پر تنبیہ فرماتے اور صحیح ادب سکھاتے۔

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

ایک اور صحابی حضرت عکراش بن ذویب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ میں ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، جب کھانا سامنے آیا تو میں نے یہ حرکت شروع کی کہ ایک نوالہ ادھر سے لیا۔ اور دوسرا نوالہ ادھر سے لے لیا۔ اور اس طرح برتن کے مختلف حصوں سے کھانا شروع کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا اے عکراش، ایک جگہ سے کھاؤ، اس لیے کہ کھانا ایک جیسا ہے ادھر ادھر سے کھانے سے بدتہذیبی بھی معلوم ہوتی ہے۔ اور بدسلیقگی ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے ایک جگہ سے کھاؤ، حضرت عکراش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک جگہ سے کھانا شروع کر دیا۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو ایک بڑا تھال لایا گیا جس میں مختلف قسم کی کھجوریں بکھری ہوئی تھیں۔ چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے فرما چکے تھے کہ ایک جگہ سے کھاؤ۔ اس لیے میں نے دو کھجوریں

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأطعمة، باب التسمية على الطعام والأكل باليمين، رقم: ٤٩٥٧، صحيح مسلم، كتاب الأشربة، باب آداب الطعام والشراب وأحكامهما، رقم: ٣٧٦٧، سنن ابن ماجه، كتاب الأطعمة، باب الأكل باليمين، رقم: ٣٢٥٨

ایک جگہ سے کھانی شروع کر دیں۔ اور آنحضرت ﷺ کبھی ایک طرف سے کھجور اٹھاتے، کبھی دوسری طرف سے اٹھاتے۔ اور مجھے جب ایک طرف سے کھاتے ہوئے دیکھا تو آپ نے پھر فرمایا کہ اے عکراش! تم جہاں سے چاہو کھاؤ، اس لیے کہ یہ مختلف قسم کی کھجوریں ہیں۔ اب اگر ایک طرف سے کھاتے رہے۔ پھر دل تمہارا دوسری قسم کی کھجور کھانے کو چاہ رہا ہے۔ تو ہاتھ بڑھا کر وہاں سے کھجور اٹھا کر کھاؤ۔(۱)

گویا کہ اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے یہ ادب سکھایا کہ اگر ایک ہی قسم کی چیز ہے تو پھر صرف اپنی طرف سے کھاؤ، اور اگر مختلف قسم کی چیزیں ہیں تو دوسرے اطراف سے بھی کھا سکتے ہو۔ اپنی اولاد اور اپنے صحابہ کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر حضور اقدس ﷺ کی نگاہ تھی۔ یہ سارے اداب خود بھی سیکھنے کے ہیں اور اپنے گھر والوں کو سکھانے کے ہیں یہ اسلامی آداب ہیں جن سے اسلامی معاشرہ ممتاز ہوتا ہے۔

سات سال کے بچوں کو نماز پڑھائیں

عَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مُرُوْا اَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعٍ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا، وَهُمْ اَبْنَاءُ عَشْرٍ، وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ))(۲)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں یعنی سات سال کے بچے کو نماز پڑھنے کی تاکید کرنا شروع کرو، اگرچہ اس کے ذمے نماز فرض نہیں ہوئی لیکن اس کو عادی بنانے کے لیے سات سال کی عمر سے تاکید کرنا شروع کر دو، اور جب دس سال کی عمر ہو جائے، اور پھر بھی نماز نہ پڑھے تو اس کو نماز نہ پڑھنے پر مارو، اور دس سال کی عمر میں بچوں کے بستر الگ الگ کر دو، ایک بستر میں دو بچوں کو نہ سلاؤ۔

سات سال سے پہلے تعلیم

اس حدیث میں پہلا حکم یہ دیا کہ سات سال کی عمر سے نماز کی تاکید شروع کر دو، اس سے

(۱) سنن الترمذي، كتاب الأطعمة عن رسول الله، باب ما جاء في التسمية في الطعام، رقم: ۱۷۷۱، سنن ابن ماجه، كتاب الأطعمة، باب الأكل مما يليك، رقم: ۳۲۶۵

(۲) سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، رقم: ۴۱۷، مسند أحمد، رقم: ۶۴۰۲

معلوم ہوا کہ سات سال سے پہلے اس کو کسی چیز کا مکلّف کرنا مناسب نہیں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب تک بچے کی عمر سات سال تک نہ پہنچ جائے، اس پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے، جیسے کہ بعض لوگ سات سال سے پہلے روزہ رکھوانے کی فکر شروع کر دیتے ہیں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے بہت مخالف تھے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اللہ میاں تو سات سال سے پہلے نماز پڑھانے کو نہیں کہہ رہے ہیں، مگر تم سات سال سے پہلے اس کو روزہ رکھوانے کی فکر میں ہو، یہ ٹھیک نہیں۔ اسی طرح سات سال سے پہلے نماز کی تاکید کی کوشش بھی درست نہیں۔ اسی لیے کہا گیا کہ سات سال سے کم عمر کے بچے کو مسجد میں لانا ٹھیک نہیں۔ البتہ کبھی کبھار اس کو اس شرط کے ساتھ مسجد میں لا سکتے ہیں کہ وہ مسجد کو گندگی وغیرہ سے ملوث نہیں کرے گا۔ تاکہ وہ تھوڑا تھوڑا مانوس ہو جائے۔ لیکن سات سال سے پہلے اس پر باقاعدہ بوجھ ڈالنا درست نہیں۔

بلکہ ہمارے بزرگ فرماتے ہیں کہ سات سال سے پہلے تعلیم کا بوجھ ڈالنا بھی مناسب نہیں۔ سات سال سے پہلے کھیل کود کے اندر اس کو پڑھا دو، لیکن باقاعدہ اس پر تعلیم کا بوجھ ڈالنا، اور باقاعدہ اس کو طالب علم بنا دینا ٹھیک نہیں۔ آج کل ہمارے یہاں یہ وبا ہے کہ بس بچہ تین سال کا ہوا تو اس کو پڑھانے کی فکر شروع ہوگئی، یہ غلط ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب وہ تین سال کا ہو جائے تو اس کو گھر کی تعلیم دے دو۔ اس کو اللہ و رسول کا کلمہ سکھا دو، اس کو کچھ دین کی باتیں سمجھا دو، اور یہ کام گھر میں رکھ کر جتنا کر سکتے ہو، کرلو باقی اس کو مکلّف کر کے باقاعدہ نرسری میں بھیجنا۔ اور ضابطے کا طالب علم بنا دینا اچھا نہیں۔

قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ

ہمارے بزرگ حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ قرآن کریم کا زندہ معجزہ تھے، جن لوگوں نے ان کی زیارت کی ہے۔ ان کو معلوم ہو گا۔ ساری زندگی قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے میں گزاری، اور حدیث میں جو یہ دعا آتی ہے کہ یا اللہ! قرآن کریم کو میری رگ میں پیوست کر دیجیے۔ میرے خون میں پیوست کر دیجیے، میرے جسم میں پیوست کر دیجیے، میری روح میں پیوست کر دیجیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی یہ دعا ان کے حق میں پوری طرح قبول ہوگئی کہ قرآن کریم ان کے رگ و پے میں پیوست تھا۔

قاری صاحب قرآن کی تعلیم کے معاملے میں بڑے سخت تھے جب کوئی بچہ ان کے پاس آتا

تو اس کو بہت اہتمام کے ساتھ پڑھاتے تھے، اور اس کو پڑھنے کی بہت تاکید کرتے تھے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ جب تک بچے کی عمر سات سال نہ ہو جائے، اس وقت تک اس پر تعلیم کا باقاعدہ بوجھ ڈالنا درست نہیں، اس لیے کہ اس سے اس کی نشو ونما رک جاتی ہے، اور اسی مذکورہ بالا حدیث میں استدلال فرماتے تھے کہ حضور اقدس ﷺ نے بچوں کو نماز کا حکم دینے کے لیے سات سال عمر کی قید لگائی ہے۔

جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو پھر رفتہ رفتہ اس پر تعلیم کا بوجھ ڈالا جائے۔ یہاں تک کہ جب بچہ دس سال کا ہو جائے تو اس وقت آپ نے نہ صرف تادیباً مارنے کی اجازت دی۔ بلکہ مارنے کا حکم دیا کہ اب وہ نماز نہ پڑھے تو اس کو مارو۔

بچوں کو مارنے کی حد

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ استاد کے لیے یا ماں باپ کے لیے بچے کو اس حد تک مارنا جائز ہے، جس سے بچے کے جسم پر مار کا نشان نہ پڑے۔ آج کل یہ جو بے تحاشہ مارنے کی جوریت ہے یہ کسی طرح بھی جائز نہیں۔ جیسا کہ ہمارے یہاں قرآن کریم کے مکتبوں میں مار کٹائی کا رواج ہے۔ اور بعض اوقات اس مار پٹائی میں خون نکل آتا ہے، زخم ہو جاتا ہے، یا نشان پڑ جاتے ہیں، یہ عمل اتنا بڑا گناہ ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس گناہ کی معافی کی کیا شکل ہو گی؟ اس لیے کہ اس گناہ کی معافی کس سے مانگے؟ اگر اس بچے سے مانگے تو وہ نابالغ بچہ معاف کرنے کا اہل نہیں ہے، اس لیے کہ اگر نابالغ بچہ معاف بھی کر دے تو شرعاً اس کی معافی کا اعتبار نہیں اس لیے حضرت والا فرمایا کرتے تھے اس کی معافی کا کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آتا، اتنا خطرناک گناہ ہے۔ اس لیے استاد اور ماں باپ کو چاہیے کہ وہ بچے کو اس طرح نہ ماریں کہ اس سے زخم ہو جائے یا نشان پڑ جائے، البتہ ضرورت کے تحت جہاں مارنا ناگزیر ہو جائے، صرف اس وقت مارنے کی اجازت دی گئی ہے۔

بچوں کو سزا دینے کا شرعی طریقہ

اس کے لیے حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ نے ایک عجیب نسخہ بتایا ہے، اور ایسا نسخہ وہی بتا سکتے تھے، یاد رکھنے کا ہے، فرماتے تھے کہ جب کبھی اولاد کو مارنے کی ضرورت محسوس ہو، یا اس پر غصہ کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو جس وقت غصہ آ رہا ہو اس وقت نہ مارو، بلکہ بعد میں جب

غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس وقت مصنوعی غصہ پیدا کر کے مارلو اس لیے کہ جب طبعی غصہ کے وقت اگر مارو گے یا غصہ کرو گے تو پھر حد پر قائم نہیں رہو گے، بلکہ حد سے تجاوز کر جاؤ گے، اور چونکہ ضرورۃً مارنا ہے، اس لیے مصنوعی غصہ پیدا کر کے پھر مارلو، تا کہ اصل مقصد بھی حاصل ہو جائے، اور حد سے گزرنا بھی نہ پڑے۔

اور فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ساری عمر اس پر عمل کیا کہ طبعی غصے کے وقت نہ کسی کو مارا اور نہ ڈانٹا، پھر جب غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تو اس کو بلا کر مصنوعی قسم کا غصہ پیدا کر کے وہ مقصد حاصل کر لیتا۔ تا کہ حدود سے تجاوز نہ ہو جائے۔ کیونکہ غصہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس میں انسان اکثر و بیشتر حد پر قائم نہیں رہتا۔

بچوں کو تربیت دینے کا طریقہ

اسی لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک اصول بیان فرمایا کرتے تھے۔ جو اگرچہ کلی اصول تو نہیں ہے، اس لیے کہ حالات مختلف بھی ہو سکتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر اس اصول پر عمل کیا جا سکتا ہے کہ جس وقت کوئی شخص غلط کام کر رہا ہو، ٹھیک اس وقت میں اس کو سزا دینا مناسب نہیں ہوتا۔ بلکہ وقت پر ٹوکنے سے بعض اوقات نقصان ہوتا ہے، اس لیے بعد میں اس کو سمجھا دو، یا سزا دینی ہو تو سزا دے دو، دوسرے یہ کہ ہر ہر کام پر بار بار ٹوکتے رہنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک مرتبہ بٹھا کر سمجھا دو۔ کہ فلاں وقت تم نے یہ غلط کام کیا۔ فلاں وقت یہ غلط کیا اور پھر ایک مرتبہ جو سزا دینی ہے دے دو۔ واقعہ یہ ہے کہ غصہ ہر انسان کی جبلت میں داخل ہے، اور یہ ایسا جذبہ ہے کہ جب ایک مرتبہ شروع ہو جاتے تو بعض اوقات انسان اس میں بے قابو ہو جاتا ہے اور پھر حدود پر قائم رہنا ممکن نہیں رہتا، اس لیے کہ اس کا بہترین علاج وہی ہے، جو ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تجویز فرمایا۔ بہرحال! اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر ضرورت محسوس ہو تو کبھی کبھی مارنا بھی چاہیے، آج کل اس میں افراط و تفریط ہے، اگر ماریں گے تو حد سے تجاوز کر جائیں گے، یا پھر بالکل مارنا چھوڑ دیا ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ بچے کو کبھی نہیں مارنا چاہیے، یہ دونوں باتیں غلط ہیں وہ افراط ہے، اور یہ تفریط ہے، اعتدال کا راستہ وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا۔

تم میں سے ہر شخص نگران ہے

آخر میں وہی حدیث لائے ہیں جو پیچھے کئی مرتبہ آ چکی ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، اَلْإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِيْ اَهْلِهِ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِيْ بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا، وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِيْ مَالِ سَيِّدِهِ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَكُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))(۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس ﷺ سے سنا فرماتے ہیں کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے، نگہبان ہے، ذمہ دار ہے، اور ہر شخص سے قیامت کے روز اس کی ذمہ داری اور نگہبانی کے بارے میں سوال ہوگا، امام یعنی سربراہ حکومت ذمہ دار ہے، اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں آخرت میں سوال ہوگا کہ تم نے ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا؟ ان کی کیسی تربیت کی؟ اور ان کے حقوق کا کتنا خیال رکھا؟ اور مرد اپنے گھر والوں کا بیوی بچوں کا نگران اور نگہبان ہے قیامت کے روز اس سے سوال ہوگا کہ بیوی بچے جو تمہارے سپرد کیے گئے تھے ان کی کیسی تربیت کی، ان کے حقوق کس طرح ادا کیے؟ عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے، جو چیز اس کی نگہبانی میں دی گئی ہے۔ اس کے بارے میں اس سے قیامت کے روز سوال ہوگا کہ تم نے اس کی کس طرح نگہبانی کی؟ اور نوکر اپنے آقا کے مال میں نگہبان ہے۔ یعنی اگر آقا نے پیسے دیئے ہیں تو وہ پیسے اس کے لیے امانت ہے وہ اس کا ذمہ دار ہے، اور آخرت کے دن اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ تم نے اس امانت کا حق کس طرح ادا کیا؟

لہٰذا تم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی کی حیثیت سے راعی ہے اور جس چیز کی نگہبانی اس کے سپرد کی گئی ہے، قیامت کے روز اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا۔

اپنے ماتحتوں کی فکر کریں

اس حدیث کو آخر میں لانے کی منشا یہ ہے کہ بات صرف باپ اور اولاد کی حد تک محدود نہیں، بلکہ زندگی کے جتنے شعبے ہیں، ان سب میں انسان کے ماتحت کچھ لوگ ہوتے ہیں، مثلاً گھر کے اندر اس کے ماتحت بیوی بچے ہیں، دفتر میں اس کے ماتحت کچھ افراد کام کرتے ہوں گے، اگر کوئی دکاندار

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن، رقم: ۸٤٤، صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب فضيلة الإمام، عقوبة الجائر والحث على الرفق، رقم: ۳٤۰۸، سنن الترمذي، كتاب الجهاد، باب ماجاء في الإمام، رقم: ۱٦۲۷، سنن أبي داؤد، كتاب الخراج والإمارة والفئ، باب مايلزم الإمام من حق الرعية، رقم: ۲۵۳۹، مسند أحمد، رقم: ٤۹۲۰

ہے، تو اس دکان میں اس کے ماتحت کوئی آدمی کام کرتا ہوگا، اگر کسی شخص نے فیکٹری لگائی ہے، تو اس فیکٹری میں اس کے ماتحت کچھ عملہ کام کرتا ہوگا، یہ سب اس کے ماتحت اور تابع ہیں لہٰذا ان سب کو دین کی بات پہنچانا اور ان کو دین کی طرف لانے کی کوشش کرنا انسان کے ذمے ضروری ہے۔ یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی ذات یا اپنے گھر کی حد تک ذمہ دار ہوں، بلکہ جو لوگ تمہارے زیردست اور ماتحت ہیں، ان کو جب تم دین کی بات بتاؤ گے تو تمہاری بات کا بہت زیادہ اثر ہوگا، اور اس اثر کو وہ لوگ قبول کریں گے۔ اور اگر تم نے ان کو دین کی بات نہیں بتائی تو اس میں تمہارا قصور ہے۔ اور اگر وہ دین پر عمل نہیں کر رہے ہیں تو اس میں تمہارا قصور ہے کہ تم نے ان کو دین کی طرف متوجہ نہیں کیا، اس لیے جہاں کہیں جس شخص کے ماتحت کچھ لوگ کام کرنے والے موجود ہیں ان تک دین کی باتیں پہنچانے کی فکر کریں۔

صرف دس منٹ نکال لیں

اس میں شک نہیں کہ آج کل زندگیاں مصروف ہوگئیں ہیں، اوقات محدود ہو گئے ہیں، لیکن ہر شخص اتنا تو کر سکتا ہے کہ چوبیس گھنٹے میں سے پانچ دس منٹ روزانہ اس کام کے لیے نکال لے کہ اپنے ماتحتوں کو دین کی بات سنائے گا۔ مثلاً کوئی کتاب پڑھ کر سنا دے، کوئی وعظ پڑھ کر سنا دے، ایک حدیث کا ترجمہ سنا دے، جس کے ذریعہ دین کی بات ان کے کان میں پڑتی رہے۔ یہ کام تو ہر شخص کر سکتا ہے، اگر یہ شخص اس کام کی پابندی کر لے تو ان شاء اللہ اس حدیث پر عمل کرنے کی سعادت حاصل ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ سب کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

بیٹی کی پرورش، دخول جنت کا ذریعہ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَّضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تُدْرِكَا دَخَلْتُ أَنَا وَهُوَ فِي الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ وَأَشَارَ مُحَمَّدٌ (بن عبد العزيز) بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى وَبَابَانِ يُعَجَّلَانِ فِي الدُّنْيَا: اَلْبَغْيُ وَقَطِيْعَةُ الرَّحِمِ))(١)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں تو میں اور وہ دونوں جنت میں اس طرح داخل ہوں گے (آپ نے اپنی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ جس طرح شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی ملی ہوئی ہیں اس طرح وہ شخص جنت میں میرے ساتھ مل کر داخل ہوگا) اور فرمایا کہ دو کام ایسے ہیں کہ جن کی سزا انسان کو دنیا میں مل جاتی ہے ایک ظلم اور دوسرے قطع رحمی''

اس حدیث میں نبی پاک نے دو باتیں بیان فرمائی پہلی تو لڑکیوں کی پرورش اور تربیت کی فضیلت بیان فرمائی اور کتنی بڑی فضیلت بیان فرمائی کہ میرے ساتھ جنت میں داخل ہوگا کہ لڑکیوں کی پرورش اور تربیت کرنے والا جنت میں اس طرح میرے ساتھ ہوگا جس طرح دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں۔

اس سے بڑی سعادت انسان کی کیا ہو سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طرح جنت میں

☆ ضبط و ترتیب: محمد جنید سرور، جامعہ اشرفیہ، لاہور (2/3/2009)

(١) المستدرك للحاكم رقم: ٧٣٥٠ (٦/١٦٣) شرح السنة للبغوی (٣/٢٠٨)، الأدب المفرد رقم: ٨٩٤ (١/٣٠٨)، كنز العمال رقم: ٤٥٣٧٢،

داخل ہو۔

اس کا اصل پس منظر تو یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب لوگ لڑکیوں کو بہت برا سمجھتے تھے، قرآن مجید میں ہے:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ﴾ (۱)

''حالانکہ ان میں سے کسی کو جب بیٹی کی ولادت کی خوشخبری دی جاتی ہے جو اس نے خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کر رکھی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہتا ہے''

بعض اہل عرب تو لڑکیوں کو اس درجہ برا سمجھتے تھے کہ لڑکی کو زندہ درگور کر دیتے تھے، چنانچہ قرآن مجید نے کہا ہے:

﴿أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ﴾ (۲)

''یا اسے زمین میں گاڑ دے''

یعنی وہ لڑکی کو لوگوں سے چھپاتا پھرتا کہ میں کتنا بدنصیب ہوں کہ میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے وہ پریشان ہو کر سوچتا تھا کہ اب میں اس کو رکھنے کی ذلت برداشت کروں یا اس کو زمین میں دفن کر دوں۔

تو لڑکیوں کا گھر میں ہونا اور ان کی پرورش کرنا اس کو اہل عرب بہت معیوب سمجھتے تھے اور لڑکیوں کہ کوئی قدر و قیمت نہ تھی، تو اس معاشرہ میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ سب جاہلیت کی باتیں ہیں اور اگر کوئی شخص لوگوں کے طعنوں اور عیب بینی کی پرواہ کئے بغیر بچیوں کی پرورش کرے تو وہ جنت میں میرے ساتھ اس طرح ہو گا جس طرح دو انگلیوں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں۔

اصل پس منظر تو اس کا یہ ہے لیکن اس جاہلیت کے اثرات اب بھی کچھ نہ کچھ انسانوں میں پائے جاتے ہیں اگر لڑکا ہو جائے تو خوشیاں مناتے ہیں اور اگر لڑکی ہو جائے تو زبان سے خواہ کچھ نہ کہیں لیکن دل میں ضرور ملال ہوتا ہے، غم کا احساس ہوتا ہے کہ لڑکی کیوں ہوگئی لڑکا پیدا ہو جاتا، حالانکہ حضور ﷺ نے یہ عظیم بشارت لڑکے کی پرورش کے بارے میں نہیں فرمائی بلکہ لڑکی کی پرورش کے بارے میں فرمائی ہے۔

---

(۱) الزخرف: ۱۷

(۲) النحل: ۵۹

تو لڑکی تو ایک عظیم نعمت ہے اگر کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو یہ ایک عظیم نعمت ہے کہ اس پر نبی کریم ﷺ کے ساتھ جنت میں معیت کی بشارت دی گئی ہے۔ اس لئے بچی کی پیدائش پر رنجیدہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس حدیث کا مصداق بننے کی توفیق عطا فرمائی۔

ہمارے معاشرے میں بھی جاہلیت کے اثرات کچھ نہ کچھ پائے جاتے ہیں اور بچیوں کی پیدائش کو برا سمجھا جاتا ہے اور لڑکی کی پیدائش پر غمزدہ ہونے لگتے ہیں اور خاص طور پر اگر کسی کے ہاں نرینہ اولاد نہ ہو اور لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں تو وہ تو بچی کی پیدائش پر انتہائی رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو ستم رسیدہ سمجھتا ہے غمگین ہوتا ہے، یہ سب باتیں جاہلیت کی ہیں۔

اللہ جل جلالہ ہی فیصلہ کرنے والے ہیں اور وہ سب جانتے ہیں کہ کس کے حق میں کیا بہتر ہے اور کس کے حق میں کیا مفید ہے، اگر لڑکا ہو جاتا اور تمہارا نافرمان بن جاتا، تمہیں تکلیفیں پہنچاتا تو وہ بہتر تھا یا یہ لڑکی ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے سعادت عطا فرما دی۔

اس واسطے اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہمارے بارے میں لکھا ہے وہی ہمارے حق میں بہتر ہے انسان یہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشھادۃ ہے، وہ ما کان وما یکون (جو ہو کچھ ہو چکا اور جو ہونے والا ہے) سب سے باخبر ہے، وہی جانتا ہے کہ بندوں کے حق میں کیا بہتر ہے، اس لئے ہمیشہ اس کے فیصلے پر راضی رہنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کس کے حق میں کیا چیز بہتر ہے۔ انسان پتہ نہیں لگا سکتا کہ وہ جس بات کی تمنا کر رہا ہے کہ وہ اس کے حق میں بہتر ہوگی یا نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (۱)

''اور جن چیزوں میں ہم نے تم کو ایک دوسرے پر فوقیت دی ہے، ان کی تمنا نہ کرو''

یہ اللہ جل جلالہ کی تقسیم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ﴾ (۲)

''بھلا کیا یہ لوگ ہیں جو تمہارے رب کی رحمت تقسیم کریں گے؟ دنیوی زندگی میں

---

(۱) النساء: ۳۲

(۲) الزخرف: ۳۲

ان کی روزی کے ذرائع بھی ہم نے ہی ان کے درمیان تقسیم کر رکھے ہیں اور ہم نے ہی ان میں ایک کو دوسرے پر درجات میں فوقیت دی ہے''

اس واسطے ان باتوں پر غمگین ہونا جاہلیت کی باتیں ہیں، اس لئے انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی عظیم نعمت عطا فرمادی کہ رسول اللہ ﷺ کا ساتھ جنت میں نصیب ہوگا۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ لڑکیوں کہ پرورش جب وہ پیدا ہوجائیں تو کرنی ہی پڑتی ہے کوئی بھی مسلمان ہو یا کافر، فاسق ہو یا صالح، لیکن اگر آدمی اس پرورش کے دوران اس حدیث کو مدنظر رکھے گا اور اس حدیث کو سامنے رکھ کر بیٹی کی تربیت کرے گا تو اس پورے عرصے میں اس کا یہ سارا عمل اللہ کی رحمت سے عبادت بن جائے، اس کے لئے کمائے گا تو عبادت، اس کو کھلائے گا تو عبادت، اس کو خوش کرے گا تو عبادت، اس کا دل بہلا رہا ہے تو عبادت، اس کے لئے لباس کا انتظام کرے گا تو عبادت، یہ سارے اوقات جو اس کی تربیت و پرورش پر خرچ کرے گا اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے عبادت بن جائیں گے۔ جب نیت کرے گا کہ میں حضور ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔

یہ نیت ایک ایسی چیز ہے جو مٹی کو بھی سونا بنانے والی ہے۔ کرنا تو ہے لیکن اگر رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی نیت سے کرلے تو ساری زندگی ثواب لکھا جاتا رہے گا۔

اس فضیلت کی ایک تو یہ وجہ تھی کہ لوگ لڑکیوں کو معیوب سمجھتے تھے اور دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے (واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم) کہ لڑکیوں کی پرورش لڑکوں کے مقابلے میں تھوڑی سی زیادہ نازک ہوتی ہے۔ نزاکت اس میں زیادہ ہے کیونکہ لڑکے آگے چل کر خود کفیل ہوجاتے ہیں، اپنے پاؤں پر کھڑے ہوجاتے ہیں، لڑکیوں کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے مردوں پر رکھی ہے۔ جب تک نکاح نہیں ہوتا اس کی ذمہ داری باپ پر ہے باپ نہ ہو تو بھائیوں پر ہے، شادی ہوجائے اس کی ساری ذمہ داری خاوند پر آجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا کے کام دھندوں سے فارغ رکھا ہے۔ تاکہ وہ باہر نکل کر خراب نہ ہو اور دوسروں کو خراب نہ کرے۔ اس لئے اس کی ساری ذمہ داری مرد پر یا باپ یا بھائی پر یا بالآخر شوہر رکھی ہے۔ اس لئے باپ کو اس پر خرچ بھی زیادہ کرنا پڑتا ہے۔

اس کی تربیت نازک اس لئے ہے کہ اس کی حفاظت بھی کرنی ہے، اس کو باہر نکالنے میں بڑی احتیاط بھی کرنی ہے، ساتھ ساتھ اس کی تعلیم وتربیت بھی زیادہ کرنی ہے۔ تعلیم وتربیت کے دوران اس کی حفاظت کی احتیاط کا کام لڑکوں کی بہ نسبت زیادہ دشوار اور محنت طلب ہے۔ اس لئے اس کی زیادہ فضیلت رکھی گئی ہے۔ اس لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے بچیوں کی نعمت عطا فرمائی ہو، اسے خوش ہونا چاہئے

اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور اس نعمت کی قدر کرنی چاہئے اور اس نیت سے تربیت کرنی چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم پر عمل کرنے کی نیت سے اس کی پرورش کر رہا ہوں۔

دوسرا فقرہ جو اس حدیث میں بیان فرمایا وہ یہ ہے:

''دو گناہ ایسے ہیں جن کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں جلدی عطا فرما دیتے ہے''

بہت سارے گناہ تو وہ ہیں جن کی سزا اللہ تعالیٰ نے آخرت کی طرف مؤخر کر رکھی ہے۔ کہ جب آخرت میں حساب ہوگا جنت جہنم کا فیصلہ ہوگا اس وقت ان گناہوں کی سزا بھی دے دی جائے گی۔ لیکن یہ دو گناہ ایسے ہیں جن کی سزا آخرت میں تو ہوگی ہی لیکن آخرت سے پہلے دنیا میں بھی کسی نہ کسی وقت دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

یہاں مختصر مضمون ہے لیکن ابو داؤد اور ترمذی وغیرہ کی حدیث میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے کہ یہ دو گناہ ایسے ہیں کہ آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا میں بھی ان کی سزا دی جاتی ہے۔

ایک گناہ ہے ''بغی'' یعنی ظلم، کسی بھی انسان پر ظلم کرنا، یہ ایسا گناہ ہے جس کی سزا اللہ تبارک وتعالیٰ آخرت میں بھی دیتے ہیں اور دنیا کے اندر بھی اس مبتلائے عذاب کر دیا جاتا ہے۔

بعض اوقات اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہوتی ہے، خود اللہ رب العزت قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ﴾(۱)

''ہم انہیں اس طرح دھیرے دھیرے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اور میں انہیں ڈھیل دے رہا ہوں یقین رکھو میری تدبیر بڑی مضبوط ہے''

بعض اوقات ہم ڈھیل دیتے ہیں بعض اوقات ہم ظالم کو دیکھتے ہیں بڑے مزے میں ہے بظاہر بڑا خوشحال ہے، عیش کی زندگی گزار رہا ہے، تو وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہوتی ہے، بالآخر یہ انجام ہوتا ہے کہ دنیا کے اندر کسی نہ کسی وقت اسے پکڑ لیا جاتا ہے، اور کسی بھی طریقے سے پکڑ لیا جاتا ہے، بعض اوقات لوگوں کو اس گرفت کا علم ہوتا ہے اور بعض اوقات نہیں ہوتا، لیکن گرفت ہوتی ضرور ہے اور اللہ تعالیٰ اسے پکڑ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت بڑی سخت ہے۔ اگر کسی ظالم کو پھلتا پھولتا دیکھو تو یہ نہ سمجھو کہ یہ خوشحال ہو رہا ہے بلکہ اسے اللہ کی طرف سے ڈھیل دی جا رہی اس کی رسی دراز ہو رہی ہے لیکن کسی بھی وقت جب اللہ تعالیٰ اسے پکڑے گا، جب گرفت آئے گی تو سب کچھ پتہ

---

(۱) القلم: ٤٤-٤٥

چل جائے سب اگلا پچھلا بھول جائے گا۔

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَى دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ﴾(۱)

''اور اس بڑے عذاب سے پہلے سے پہلے بھی ہم انہیں کم درجے کے عذاب کا مزہ بھی ضرور چکھائیں گے''

تو ظلم سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی پناہ مانگیں اور کسی بھی انسان پر ظلم کرنے سے بچیں کہ یہ بڑی سخت چیز اور بہت بڑا جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔

دوسری چیز بیان فرمائی، قطیعۃ الرحم، یعنی رشتوں کے حقوق کی حق تلفی، اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں کے بہت سے حقوق رکھے ہیں:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى﴾ (۲)

''بے شک اللہ انصاف کا، احسان کا، اور رشتہ داروں کو ان کے حقوق دینے کا حکم دیتا ہے''

اگر کوئی شخص رشتہ داروں کے حقوق کو پامال کرے کسی بھی طرح پامال کرے، اللہ تعالیٰ نے ان کے جو حقوق رکھے ہیں وہ ان کو نہ دے۔ والدین کا حق ہے، بہن بھائیوں کا حق ہے، بچوں کا حق ہے، اور رشتہ داروں کے حقوق ہیں اگر کوئی شخص ان کے حقوق ادا نہ کرے اور قطع تعلقی کر لے، ان سے ملنا چھوڑ دے، سلام نہ کرے، اس سے بات چیت بند ہے یہ سب قطع رحمی میں داخل ہے۔ اگر ناجائز اور ناحق طریقے پر ایسا کرے تو یہ ایسا بڑا گناہ ہے کہ اس سزا آخرت سے پہلے دنیا میں ہی مل جاتی ہے کسی نہ کسی شکل میں۔ آخرت میں تو ملتی ہے۔

تو ان دو چیزوں کا خاص طور پر رسول اللہ ﷺ نے ذکر فرمایا کہ ان سے بچنے کی کوشش کرو ایک ظلم اور دوسرا قطع رحمی، کیونکہ ان سے آخرت بھی خراب ہوگی اور دنیا بھی خراب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

---

(۱) السجدة: ۲۱

(۲) النحل: ۹۰

چھوٹے پر زیادتی کی صورت میں معافی کا طریقہ ☆

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ، اَمَّابَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم صریح الفاظ میں (اپنے سے چھوٹے سے) معافی مانگیں گے تو یہ گستاخ ہو کر زیادہ نافرمانی کرے گا، بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم معافی مانگیں گے تو یہ شرمندہ ہوگا، مگر یہ عذر اس وقت ہیں جب اس سے تعلق رکھنا چاہیں، تو ان صورتوں میں صرف اس کو خوش کر دینا امید ہے کہ معافی کے قائم مقام ہو جائے گا۔ اور بعض اوقات اس سے (آئندہ) تعلق ہی نہیں رکھنا، جیسے ملازم کو موقوف کر دیا، یا ملازم خود (ملازمت) چھوڑ کر جانے لگا، تو اس وقت ضروری ہے کہ زیادتی ہو جانے کی صورت میں اس سے صریح معافی مانگی جائے، کیونکہ یہاں وہ دونوں عذر موجود نہیں، اس میں اگر رکاوٹ ہو تو میرے نزدیک اس کا سبب ضرور ''کبر'' ہے، گو اپنے کو بڑا نہ سمجھے، مگر کبر کے مقتضیٰ پر عمل تو ہوا، غایت سے غایت (زیادہ سے زیادہ) کبر اعتقادی نہ ہوگا، مگر کبر عملی تو ضرور ہے، اگر کوئی (شخص) کبر کی تقسیم کو تسلیم نہ کرے تب بھی ظلم تو ہوا، جس سے معافی مانگنا واجب ہے، لہٰذا معافی نہ مانگنے میں اگر کبر کا گناہ نہ ہوا تو ظلم کا (گناہ) تو ہوا''(۱)

یہ مسئلہ اکثر لوگوں کو بکثرت پیش آتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص افسر ہے اور لوگ اس کے ماتحت کام کرتے ہیں، اس کو یہ مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح باپ کو اپنے بیٹے کے ساتھ یہ مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح استاد کو اپنے شاگردوں کے ساتھ یہ مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح شیخ کو اپنے مریدوں کے

☆ اصلاحی مجالس (۲/ ۷۴ تا ۹۳) بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) انفاس عیسیٰ، ص: ۱۵۸

ساتھ پیش آتا ہے، وہ یہ کہ بعض اوقات اپنے ماتحت کو یا اپنے بیٹے کو یا اپنے شاگرد کو یا اپنے مرید کو کسی غلطی پر تنبیہ کرنے میں زیادتی ہو جاتی ہے، جتنی تنبیہ کرنی چاہیے تھی اس سے زیادہ کر دی، یا جتنا اس کو ڈانٹنا چاہیے تھا اس سے زیادہ ڈانٹ دیا، یا جتنی سزا دینی چاہیے تھی اس سے زیادہ دے دی، یا سزا کا موقع نہیں تھا، لیکن اس کو غلط سزا دے دی۔ اس طرح کے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں۔

اب سیدھی بات تو یہ ہے کہ جس کے ساتھ تم نے زیادتی کی ہے، اس سے معافی مانگ لو کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، مجھے معاف کر دو۔ لیکن بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر میں اس طرح صریح الفاظ میں اس سے معافی مانگوں گا تو اس کے اندر اور زیادہ نافرمانی کا جذبہ پیدا ہو جائے گا، یہ اور گستاخ ہو جائے گا اور غلط راستے پر چل پڑے گا۔

دیکھئے! آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے، کوئی آدمی تو ایسا ہوتا ہے کہ اگر اس سے کوئی بڑا آدمی جھک کر بات کر لے اور دب کر بات کر لے تو پانی پانی ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں ہمیشہ کے لیے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ کسی بڑے نے جھک کر بات کر لی یا دب کر بات کر لی تو وہ اور شیر ہو جاتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں وہ اور زیادہ سرکشی پر اتر آتے ہیں۔ ''متنبی'' شاعر بعض اوقات بڑی حکیمانہ باتیں کہتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

إِذَا أَنْتَ أَكْرَمْتَ الْكَرِيْمَ مَلَكْتَهٗ
وَإِنْ أَنْتَ أَكْرَمْتَ اللَّئِيْمَ تَمَرَّدَا

یعنی اگر تم کسی شریف آدمی کی عزت کرو گے اور اس کا اکرام کرو گے تو وہ تمہارا غلام بن جائے گا اور تم اس کے مالک بن جاؤ گے، اور اگر تم کسی کمینے کے ساتھ عزت کا معاملہ کرو گے تو وہ سرکش ہو جائے گا۔ آگے کہتا ہے:

وَضْعُ النَّدٰى فِي مَوْضِعِ السَّيْفِ بالعلى
مُضِرٌّ كَوَضْعِ السَّيْفِ فِي مَوْضِعِ النَّدٰى

یعنی جس جگہ تلوار استعمال کرنی چاہیے تھی، اگر تم نے وہاں سخاوت کا برتاؤ کیا تو یہ بھی اتنا ہی مضر ہے جتنا کہ سخاوت کے موقع پر تلوار کا استعمال مضر ہے۔ بہرحال، آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے، کسی آدمی کے ساتھ اگر آپ تواضع سے پیش آئیں تو وہ بچھ جائے گا اور پھر کبھی بھی سرکشی پر آمادہ نہیں ہوگا، اور بعض وہ ہوتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ تواضع کے ساتھ پیش آؤ تو وہ الٹا سرکش بن جاتے ہیں۔

اس لیے بعض اوقات دل میں خیال آتا ہے کہ اگر میں اپنے سے چھوٹے سے معافی مانگوں گا تو وہ سرکش ہو جائے گا اور زیادہ نافرمانی پر اتر آئے گا، اس کے دماغ میں اور زیادہ خناس پیدا ہو جائے گا۔

دو میں سے ایک بات کا فیصلہ کر لیں

ایسی صورت کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ پہلے دو باتوں میں سے ایک بات کا فیصلہ کر لو، وہ یہ کہ جس چھوٹے کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے، آئندہ اس سے تعلق باری رکھنا ہے یا نہیں؟ مثلاً اپنے کسی نوکر کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آ گیا، تو پہلے یہ فیصلہ کرو کہ ائندہ اس کو اپنے پاس بطور ملازم کے رکھنا ہے یا اس کو ملازمت سے علیحدہ کرنا ہے۔

ملازم کے ساتھ اچھا برتاؤ کیجیے

اگر اس کو ملازمت پر برقرار رکھنا ہے تو اس صورت میں نوکر سے صریح الفاظ میں معافی مانگنے کے بجائے کسی اور عنوان سے اس کی دلداری کر دی جائے، مثلاً اس کو کوئی ہدیہ یا تحفہ دے دیا، یا اس سے ہنسی مذاق کی میٹھی بات کر لی، یا اس کی دعوت کر دی، تا کہ اس کے نتیجے میں وہ یہ سمجھے کہ میرے ساتھ حسن سلوک کیا گیا ہے، ایسا حسن سلوک کر کے سابقہ زیادتی کی تلافی کر لی جائے۔

اور اگر یہ ارادہ ہے کہ اب اس کو ملازمت پر نہیں رکھنا، بلکہ اس کی ملازمت سے چھٹی کرنی ہے اور اب اس کے ساتھ تعلق برقرار نہیں رکھنا، تو اس صورت میں چونکہ گستاخ یا سرکش ہو جانے کا اندیشہ فضول اور بے کار ہے، اس لیے اس صورت میں صراحۃً اس نوکر سے معافی مانگنی چاہیے۔ چنانچہ جب اس ملازم کو رخصت کرو تو اس سے صاف صاف کہہ دو کہ جو ہم سے زیادتی ہوئی ہو وہ ہمیں معاف کر دو، اور خاص طور پر اس زیادتی کا بھی ذکر کر دو کہ فلاں وقت میں مجھ سے زیادتی ہوئی تھی اور مجھ سے غلطی ہوئی تھی، مجھے معاف کر دو۔

یہ تکبر کی بیماری کا علاج ہے

جب تم اپنے ملازم سے یہ کہو گے کہ فلاں وقت مجھ سے جو زیادتی ہوئی تھی، مجھے معاف کر دو۔ ان الفاظ کو زبان سے نکالتے وقت متکبر کے دل پر آرے چل جاتے ہیں، لیکن تکبر کا علاج ہی یہ ہے کہ ملازم کو رخصت کرتے وقت صریح الفاظ میں اس سے یہ الفاظ کہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جب صریح لفظوں میں معافی ہو جائے گی تو پھر ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے یہاں مواخذہ نہیں ہوگا کہ تم نے اپنے ماتحت کو ناحق سزا دی تھی یا ناحق ڈانٹا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تکبر کی بیماری کا علاج ہو جائے گا۔

حضور ﷺ کا معافی مانگنا

اس کائنات میں کوئی شخص حضور اقدس ﷺ کی عزت اور منصب کے برابر ہوسکتا ہے؟ بلکہ دنیا و آخرت میں کوئی منصب، کوئی عہدہ، کوئی رتبہ، کوئی حیثیت سرکار دو عالم ﷺ کے منصب اور عہدے سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے باوجود حضور اقدس ﷺ مجمع عام میں کھڑے ہوکر اعلان فرما رہے ہیں کہ اگر کسی سے معاملہ کرتے وقت مجھ سے کوئی زیادتی ہوگئی ہو یا میں نے کسی کی جان، کسی کا مال، کسی کی عزت و آبرو پر کوئی زیادتی کی ہو تو آج میں یہاں سب کے سامنے موجود ہوں، اگر وہ چاہے تو مجھ سے بدلہ لے لے یا مجھے معاف کردے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینا

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ ﷺ سے بدلہ لینا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کس چیز کا بدلہ لینا ہے؟ ان صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ایک دن آپ ﷺ نے میری کمر پر مارا تھا، اس کا بدلہ لینا ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تو یاد نہیں ہے کہ میں نے کسی کو مارا ہو، لیکن اگر تمہیں مارنا یاد ہو تو بدلہ لے لو، ان صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جس وقت آپ ﷺ نے میری کمر پر مارا تھا، اس وقت میری کمر ننگی تھی، میری کمر پر کوئی کپڑا نہیں تھا، برابر بدلہ تو اس وقت ہوگا جب آپ کی کمر پر بھی کپڑا نہ ہو، اس وقت تو آپ ﷺ کی کمر پر چادر ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی کمر سے چادر ہٹالی اور فرمایا کہ اب بدلہ لے لو چنانچہ جب آپ ﷺ نے کمر مبارک سے چادر ہٹائی تو مہر نبوت نظر آنے لگی۔ وہ صحابی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی پشت کی طرف گئے اور مہر نبوت کو جا کر بوسہ دیا اور کہا کہ میرا مقصد تو مہر نبوت کو بوسہ لینا تھا، بدلہ لینا میرا مقصود نہیں تھا۔

جب سرکار دو عالم ﷺ کھڑے ہوکر یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ اگر کسی کے ساتھ میں نے زیادتی کی ہے تو وہ بدلہ لے لے یا مجھے معاف کردے تو ہما شما کس شمار و قطار میں ہیں۔

بہرحال! انسان یہ کہتے ہوئے کیوں شرمائے کہ میری غلطی پر مجھے معاف کردو۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب اس ملازم اور نوکر سے تعلق نہیں رکھنا تو صاف صاف الفاظ میں اس سے معافی مانگ لو اور معافی مانگنے میں کبھی شرم کو آڑے نہ آنے دو۔

معافی کا دروازہ بند ہونے سے پہلے معافی مانگ لیں

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے ذمے دوسرے کا کوئی جانی یا مالی حق ہو، وہ آج اس شخص سے معاف کرالے جس کا حق ہے، قبل اس کے کہ وہ وقت آجائے کہ معافی کا دروازہ بند ہو جائے۔

آج تو تم اس کی خوشامد کر کے معاف کرالو گے یا کوئی معاوضہ دے کر معاف کرالو گے، لیکن ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب تمہارے پاس اس کو پیش کرنے کے لیے نہ دینار ہوگا اور نہ درہم ہوگا، آخرت میں تو وہاں کی کرنسی استعمال ہوگی اور وہاں کی کرنسی نیکیاں ہیں، وہاں پر تو حق کی معافی کے لیے یا تو اپنی نیکیاں اس کو دینی پڑیں گی یا اس کے گناہ اپنے اوپر لینے پڑیں گے، اس کے حق کو ادا کرنے کا اور اس کے وبال سے بچنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا وہ وقت آنے سے پہلے پہلے معاف کرالو۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معافی مانگنا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضور اقدس ﷺ کی معافی مانگنے کی سنت پر عمل کرتے ہوئے وفات سے چند سال پہلے ایک رسالہ لکھا تھا، اس رسالے کا نام تھا "العذر والنذر" اس رسالے میں لکھا تھا کہ ساری عمر میرا جن لوگوں سے تعلق رہا، نہ جانے مجھ سے کس کی کیا کیا حق تلفی ہوئی ہو، میں آج ان حقوق کی ادائیگی کے لیے تیار ہوں، اگر کسی کا مالی حق میرے ذمے ہے اور مجھے ادا کرنا یاد نہیں رہا تو مجھے یاد دلا کر وہ حق وصول کرلے، اور اگر کسی کا جانی حق ہے تو اگر وہ مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہے تو بدلہ لے لے، معاف کرنا چاہتا ہے تو معاف کردے، میں آپ سب سے معافی کا طالب گار ہوں۔ پھر یہ رسالہ خط کی شکل میں اپنے سارے متعلقین کو بھیجا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معافی مانگنا

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی وفات سے تقریباً دو سال پہلے معافی کا ایک مضمون مجھ سے لکھوایا اور پھر اس کو "کچھ تلافی مافات" کے نام سے "البلاغ" میں بھی شائع کیا اور فرداً فرداً بھی اپنے متعلقین کے پاس بھیجا اور اس کے ذریعہ اپنے تمام متعلقین سے معافی مانگی۔

لہٰذا یہ معافی مانگ لینا کمی کی بات نہیں، اس سے انسان کی عزت میں کمی نہیں آتی، اس کے

ذریعہ انسان آخرت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تکبر کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ہدیہ دے کر نوکر کو خوش کر دیجیے

اور اگر اس ملازم اور نوکر سے آئندہ تعلق باقی رکھنا ہے تو اس صورت میں صراحتاً اس سے معافی مانگنے کی صورت میں اگر اس کے سرکش ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں اس کے ساتھ کسی عنوان سے اس کی دلداری کر لو، مثلاً اس کو کوئی ہدیہ دے دو یا کوئی تحفہ دے دو اور اس کا دل خوش کر دو۔

نوکر اور ماتحت کے بارے میں اتنی تاکید کیوں؟

''نوکر'' اور ''ماتحت'' ایسے لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، ورنہ اکثر و بیشتر انسان اپنے ماتحتوں کے معاملے میں انصاف سے تجاوز کر جاتا ہے، اس لیے کہ وہ ماتحت اپنی گرفت اور اپنے پنجے میں ہوتا ہے، ہم جب چاہیں اس کو ڈانٹ سکتے ہیں، جب چاہیں اس کی خبر لے سکتے ہیں، تو چونکہ ماتحت پر انسان کو قدرت حاصل ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں وہ اس قدرت کو حدود کے اندر رہ کر استعمال کرنے سے قاصر رہتا ہے اور اس قدرت کو غلط استعمال کر جاتا ہے۔ اسی لیے حضور اقدس ﷺ نے خاص طور پر اس کی طرف توجہ دلائی۔

غلاموں کے ساتھ بھی انصاف کیجئے

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو مار رہے تھے، اب ظاہر ہے کہ کسی واقعی غلطی پر سزا دے رہے ہوں گے، بلاوجہ تو سزا نہیں دے رہے تھے، حضور اقدس ﷺ نے آپ کو مارتے ہوئے دیکھا تو ارشاد فرمایا:

((اَللّٰہُ اَقْدَرُ عَلَیْکَ مِنْکَ عَلَیْہِ))(۱)

(۱) صحیح مسلم، کتاب الأیمان، باب صحبة المماليك وكفارة من لطم عبده، رقم: ۳۱۳۵، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب النهی عن ضرب الخدم و شتمهم، رقم: ۱۸۷۱، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی حق المملوك، رقم: ٤٤٩٢، مسند أحمد، رقم: ١٦٤٦٧۔ واضح رہے کہ ہمارے ذکر کردہ مراجع کے مطابق یہ واقعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کا ہے، جن کا اصل نام ''عقبة بن عمرو بن ثعلبة'' تھا۔ تتبع کے باوجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ان الفاظ کے ساتھ ایسا واقعہ نہیں مل سکا۔

یعنی جتنی قدرت تمہیں اس غلام پر حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کو اس سے زیادہ قدرت تم پر حاصل ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ذرا اس بات کا دھیان کرو کہ اس قدرت کو صحیح اور برمحل اور مناسب حدود میں استعمال کر رہے ہو یا نہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر قدرت کا مظاہرہ کرنے پر آجائیں تو تمہارا ٹھکانہ کہاں ہوگا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

بہرحال! ان چھوٹوں اور ماتحتوں کے ساتھ معاملات کرنے میں تکبر کے بڑے امکانات ہیں، لہٰذا اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی چاہیے۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جب میں کبھی اپنے کسی چھوٹے سے مواخذہ کرتا ہوں اور اس کو ڈانٹنے کی نوبت آجاتی ہے تو الحمدللہ کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی کہ ایک طرف تو اس کو ڈانٹ رہا ہوتا ہوں اور دوسری طرف دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ یا اللہ! مجھ سے ایسا مواخذہ نہ فرمائیے گا۔ اب بتایئے جس شخص کے دل میں ہر وقت آخرت کی یہ فکر لگی ہوئی ہو، وہ کیسے حد سے تجاوز کرے گا۔

بھائی نیاز صاحب مرحوم کا واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے، جن کا نام "بھائی نیاز" تھا، وہ حضرت کے بہت قریب رہتے تھے، اس وجہ سے ذرا منہ چڑھے خادم تھے، اور جو کسی بڑے کا منہ چڑھا ہوتا ہے وہ دوسروں پر ناز بھی کیا کرتا ہے، بقول کسی کے ع

بنا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

شاہ کا مصاحب دوسروں پر ناز کرتا ہے۔ اس لیے حضرت والا کے پاس جو آنے جانے والے مہمان ہوتے، بعض اوقات ان کے ساتھ نامناسب انداز میں پیش آتے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی اطلاع ہوئی کہ یہ بھائی نیاز آنے جانے والوں کے ساتھ درشتی کا معاملہ کرتے ہیں، حضرت نے ان کو بلایا اور سخت لفظوں میں ان سے کہا: میاں نیاز! تم آنے والوں کے ساتھ لڑتے جھگڑتے رہتے ہو اور ان کے ساتھ بدتہذیبی سے بات کرتے ہو۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ حضرت! جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو۔ دیکھئے کہ ایک نوکر اور خادم اپنے آقا سے کہہ رہا ہے کہ "جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو" اب اس وقت تو اور زیادہ اس نوکر کو ڈانٹنا چاہیے تھا لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ "استغفراللہ، استغفراللہ" کہتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔

بعد میں لوگوں کے سوال کرنے پر حضرت والا نے بتایا کہ جب بھائی نیاز نے مجھ سے کہا کہ ''جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو'' اس وقت مجھے تنبہ ہوا کہ میں نے یک طرفہ بیان سن کر ان کو ڈانٹنا شروع کر دیا تھا، ابھی میں نے صرف لوگوں کی بات سنی تھی کہ انہوں نے لوگوں کے ساتھ یہ زیادتی کی ہے، مجھے یہ چاہیے تھا کہ میں ان کا بیان بھی سنتا اور ان سے پوچھتا کہ لوگ تمہارے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں، بتاؤ! یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ ان کے بیان کو سننے کے بعد ڈانٹنے کا فیصلہ کرتا، لیکن میں نے یک طرفہ بات پر ڈانٹنا شروع کر دیا، اس وجہ سے مجھ سے غلطی ہوئی، اس لیے میں استغفار کرتا ہوا چلا گیا۔

حضرت بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنانے کے بعد فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ بھائی نیاز کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت جھوٹ نہ بولیں اور اللہ سے ڈریں، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے آپ سے شکایت لگائی ہے ان کو چاہیے کہ وہ جھوٹ نہ بولیں اور اللہ سے ڈریں۔ لیکن جلدی میں زبان سے براہ راست حضرت والا سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا کہ جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو۔

اللہ کی حدود پر رک جانے والے

لیکن اس واقعہ میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جب ایک خادم کو ڈانٹا تو فوراً اس وقت ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں نے یک طرفہ بیان پر فیصلہ کر دیا، یہ مجھ سے غلطی ہوئی، لہٰذا اس پر استغفار کرتے ہوئے چلے گئے، اس کو کہا جاتا ہے:

"کان وقّافاً عند حدود الله"

''یعنی اللہ تعالیٰ کی حدود کے آگے ٹھہر جانے والے تھے۔''

یہ تھے ''حکیم الامت'' ویسے ہی ''حکیم الامت'' نہیں بن جاتے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کا فیض چار دانگ عالم میں پھیلایا۔ آج ہم نے چند ظاہری رسوم کا نام ''دین'' رکھ لیا ہے، حالانکہ یہ بھی سب دین کا حصہ ہے کہ کس وقت سے کیا معاملہ کیا جائے اور کس حد میں کیا کیا جائے؟ یہ ترازو اپنے میں لگانی پڑتی ہے کہ کہیں ایک طرف پلہ جھکے نہیں، بلکہ توازن کے ساتھ سارے کام انجام پائیں۔

بدلہ میں برابری آسان نہیں

بہر حال! چھوٹوں کے ساتھ معاملات کرنے میں خون کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

دو گونہ رنج و عذاب جانِ مجنون را

ایک طرف اس کا خیال رکھنا ہے کہ ہماری طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو جائے اور اگر کوئی زیادتی ہو تو اس کی معافی تلافی ہو جائے۔ اور دوسری طرف یہ ہے کہ وہ سرکش نہ بنے، انتظام خراب نہ ہو۔ ان دونوں کے درمیان توازن رکھنا بس یہی حدود اللہ کو قائم کرنا ہے۔ اور یہ کام عموماً کسی شیخ کی صحبت اور تربیت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اس کے بغیر آدمی پھسل جاتا ہے۔ ہاں اگر کسی کی باقاعدہ تربیت ہوئی ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ کس جگہ پر کیا طرز عمل اختیار کرنا ہے اور کتنا اختیار کرنا ہے، اگر کسی کو ڈانٹنا بھی ہے تو کتنا زور دینا ہے، اور اس سے زیادہ دینے میں کس طرح زیادتی ہو جائے گی۔ یہ ترازو ویسے ہی دل میں پیدا نہیں ہو جاتی، اگر میں اس کو دو اور دو چار کر کے لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو بیان نہیں کر سکتا، بلکہ یہ ایک ذوق اور ملکہ ہے، وہ ذوق اور ملکہ جب دل میں پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ اس جگہ اتنے ڈوز کی ضرورت ہے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں، اس سے زیادہ کرو گے تو زیادت ہو جائے گی۔ قرآن کریم میں یہ جو فرمایا:

﴿فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾(۱)

یعنی جتنی زیادتی کسی نے تم پر کی ہے، تم بھی اتنی ہی زیادتی اس پر کر سکتے ہو۔ اس آیت پر عمل کرنا بہت مشکل کام ہے، کیونکہ جانچ تول کر یہ کرنا کہ میں اتنا بدلہ لوں جتنا اس نے کیا ہے، یہ آسان کام نہیں۔

اولیاء کے مختلف رنگ ہوتے ہیں

''ارواح ثلاثہ'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے کسی بزرگ سے سوال کیا کہ حضرت میں نے سنا ہے کہ اولیاء اللہ کے مختلف الوان ہوتے ہیں اور ان کی مختلف شانیں ہوتی ہیں، لہٰذا میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا مختلف الوان ہوتے ہیں اور کیا شانیں ہوتی ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ تم اسی چکر میں مت پڑو، اپنے کرنے کا جو کام ہے وہ کیے جاؤ، ان صاحب نے اصرار کیا کہ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

ان بزرگوں نے فرمایا کہ اچھا ایسا کرو کہ فلاں گاؤں میں ایک مسجد ہے، اس مسجد میں جاؤ، وہاں تمہیں تین بزرگ ذکر اللہ میں مشغول نظر آئیں گے، تم جا کر تینوں کو پیچھے سے ایک ایک مکہ مار دینا، پھر دیکھنا کہ وہ کیا کرتے ہیں، جو وہ کریں مجھے آ کر بتانا۔ چنانچہ وہ صاحب گاؤں کی مسجد میں گئے، جا کر دیکھا تو واقعۃً تین بزرگ ذکر اللہ میں مشغول تھے، اس نے جا کر پہلے ایک کو پیچھے سے مکہ

(۱) البقرہ: ۱۹٤

مارا، ان صاحب نے پیچھے مڑ کر ان کو بھی ایک مکہ اتنی زور کا مارا اور پھر ذکر اللہ میں مشغول ہو گئے۔ دوسرے کو جا کر مکہ مارا تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں کہ کس نے مارا اور کیوں مارا، بلکہ اپنے ذکر میں مشغول رہے۔ جب تیسرے شخص کو مارا تو انہوں نے پلٹ کر ان کا ہاتھ دبانا شروع کر دیا کہ تمہارے ہاتھ میں چوٹ تو نہیں لگی۔

جب یہ صاحب واپس ہوئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے ساری تفصیل بتا دی کہ تینوں نے علیحدہ علیحدہ معاملہ کیا، ان بزرگ نے فرمایا کہ تم بزرگوں کے الوان جاننا چاہ رہے تھے، یہ مختلف الوان تھے، پہلے بزرگ جنہوں نے تم سے بدلہ لیا، یہ بتاؤ کہ انہوں نے اتنی ہی زور کا مکہ مارا جتنی زور کا تم نے مارا تھا، یا زیادہ زور کا مارا؟ ان صاحب نے کہا کہ نہیں، اتنی ہی زور کا مارا تھا، فرمایا کہ انہوں نے یہ سوچا کہ جتنی زیادتی اس نے میرے ساتھ کی، میں نے بھی اتنا ہی بدلہ لے لیا۔

لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض اللہ کے ولی لوگوں سے بدلہ اس لیے لیتے ہیں تاکہ یہ شخص آخرت کے مواخذہ سے بری ہو جائے، اس لیے بدلہ نہیں لیتے کہ اس نے مجھے تکلیف پہنچائی، بلکہ اس لیے بدلہ لیتے ہیں کہ اگر میں اس سے یہاں بدلہ لے لوں گا تو یہ آخرت کے مواخذہ سے بری ہو جائے گا، اسی لیے ان بزرگ نے بدلہ لیا، لیکن اتنا ہی لیا جاتنا لینا چاہتے تھے، اس سے زیادہ نہیں لیا۔

دوسرے بزرگ جو تھے انہوں نے سوچا کہ بدلہ لینے کے چکر میں کون پڑے، کیونکہ اگر ایک انچ بھی زیادہ بدلہ لے لیا تو الٹی اپنی گردن پکڑی جائے گی، کیوں خواہ مخواہ چکر میں پڑوں اور جس کام میں لگا ہوا ہوں، اس سے اپنا وقت ضائع کروں، اللہ کے ذکر میں لگا ہوا ہوں، اسی میں لگا رہوں، کوئی اگر مارتا ہے تو مارتا رہے۔

تیسرے بزرگ نے اپنے آپ کو اتنا مٹایا ہوا تھا کہ نہ صرف یہ کہ ان کو اپنی چوٹ کی پروا نہ ہوئی، بلکہ الٹا مارنے والے کا ہاتھ دبانے لگے کہ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی۔ بہر حال! بزرگوں کے یہ مختلف رنگ اور مختلف طریقے تھے، اور تینوں طریقے جائز تھے، پہلا طریقہ بھی جائز تھا، اس لیے کہ برابر کا بدلہ لینا جائز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾(۱)

اور دوسرا طریقہ یعنی معاف کرنا بھی جائز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

(۱) الشوریٰ: ۴۰، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اور کسی برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے۔''

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾(۱)

اور حضور اقدس ﷺ کی سنت بھی یہی تھی کہ معاف فرما دیا کرتے تھے، اپنی ذات کے لیے کبھی بدلہ نہیں لیا۔ اور تیسرا طریقہ اس سے زیادہ افضل اور اعلیٰ تھا کہ اپنی فکر کے بجائے مارنے والے کی فکر کر رہے تھے۔

بہر حال! بندوں کے حقوق کا معاملہ بڑا نازک ہے، اس میں ہر وقت انسان کو ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں مجھ سے زیادتی نہ ہو جائے۔ آج لوگ کس بے دردی سے اور بلا خوف انسانوں کے حقوق پر، ان کی جان پر، ان کے مال پر، ان کی آبرو پر ڈاکے ڈالتے ہیں، وہ جان مال اور آبرو جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کی جان اور مال اور آبرو بیت اللہ سے زیادہ حرمت والا ہے، اگر کسی نے مسلمان کی جان مال پر حملہ کیا تو وہ ایسا ہے جیسے اس نے کعبہ کو ڈھا دیا۔ العیاذ باللہ۔

ایک صاحب کے لٹنے کا واقعہ

ایک صاحب اپنا قصہ بیان کر رہے تھے کہ وہ دفتر سے گھر جا رہے تھے، پیسوں کا تھیلہ ہاتھ میں تھا، دو صاحبان راستے میں آ گئے، پہلے پستول دکھایا اور ایک تھپڑ مارا، دو گالیاں دیں، اور پھر کہا کہ جو کچھ ہے وہ ہمارے حوالے کر دو۔ مطلب یہ ہے کہ صرف مال لینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جان، مال اور آبرو، تینوں پر حملہ کیا، اور یہ خیال ہی نہیں آتا ہے کہ ہم کیا کام کر رہے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ آخر ہمیں مرنا بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جانا ہے، اور یہ زندگی جس میں ہم جی رہے ہیں، معلوم نہیں ہے کہ ایک دن کی ہے یا زیادہ کی ہے، جو آدمی دوسروں پر پستول لیے پھرتا ہے اس کی زندگی بھی موہوم ہے، پتہ نہیں صبح موت کو دیکھے یا شام کو دیکھے، اس دنیا سے جانا یقینی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ کام کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو ہدایت عطا فرمائے اور فکر عطا فرمائے۔ اور ہمیں بھی حقوق العباد کی فکر کرنی چاہیے کہ اپنی ذات سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے، نہ جسمانی، نہ مالی اور نہ آبرو کی، اور اگر دوسروں کو ہم سے تکلیف پہنچی ہو تو فوراً اس کو معاف کرانے کی فکر کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

---

(۱) الشوریٰ: ۴۳

خاندانی نظام ☆

عائلی زندگی معاشرے کا وہ بنیادی پتھر ہے جس پر تہذیب وتمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اگر معاشرے میں خاندانی نظام کا ڈھانچہ توڑ پھوڑ اور افراتفری کا شکار ہو، تو خواہ زمینیں سونا اگل رہی ہوں، یا مشینوں سے لعل و جواہر برآمد ہو رہے ہوں، زندگی سکون سے محروم ہو جاتی ہے۔ آج یورپ اور امریکہ کی وہ دنیا جو سیاسی اور معاشی اعتبار سے پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کے لیے قابل رشک سمجھی جاتی ہے، خاندانی نظام کی توڑ پھوڑ کی وجہ سے اسی سنگین مسئلے سے دو چار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دولت کی ریل پیل، اور تیز رفتار مادی ترقی کے باوجود لوگ ایک انجانے اضطراب کا شکار ہیں، اپنی اندرونی بے چینی سے گھبرا کر کوئی یوگا کے دامن میں پناہ لے رہا ہے، کوئی منشیات اور خواب آور دواؤں میں سکون ڈھونڈ رہا ہے، اور بالآخر جب ان میں سے کوئی چیز اس بے چینی کا علاج نہیں کر پاتی، تو آخری چارۂ کار کے طور پر لوگ خودکشی کر رہے ہیں، اور خودکشی کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے میں سوئیٹزرلینڈ میں تھا، میرے میزبانوں نے آمدورفت کے لیے جس گاڑی کا انتظام کیا تھا، اس کا ڈرائیور ایک اطالوی نسل کا تعلیم یافتہ آدمی تھا، اور انگریزی روانی سے بول لیتا تھا، وہ چند روز میرے ساتھ رہا، اس کی عمر تقریباً چالیس سال کو پہنچ رہی تھی، لیکن ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی، میرے وجہ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہمارے معاشرے میں شادی اکثر اس لیے بے مقصد ہو جاتی ہے کہ شادی کے بعد شوہر اور بیوی کے درمیان زندگی کی پائیدار رفاقت کا تصور بہت کمیاب ہے، اس کے بجائے شادی ایک رسمی تعلق کا نام رہ گیا ہے، جس کا مقصد بڑی حد تک ایک دوسرے سے مالی فوائد حاصل کرنا ہوتا ہے، بہت سی خواتین شادی کے بعد جلد ہی طلاق حاصل کر لیتی ہیں، اور یہاں کے قوانین کے مطابق شوہر کی جائیداد کا بڑا حصہ ہتھیا کر اسے دیوالیہ کر جاتی ہیں، اور یہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ کون سی عورت صرف شوہر کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے شادی کر رہی ہے، اور کون وفاداری کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے، اس نے حسرت بھرے انداز میں یہ بات کہہ کر

☆ ذکر و فکر، ص: ۳۰۸

ساتھ ہی یہ تبصرہ بھی کیا کہ آپ کے ایشیائی ممالک میں شادی واقعی بامقصد ہوتی ہے، اس سے ایک جما ہوا خاندان وجود میں آتا ہے، جس کے افراد آپس میں دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں، ہم ایسے خاندانی ڈھانچے سے محروم ہوتے جارہے ہیں، میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین یا بہن بھائی تمہیں اچھی بیوی کی تلاش میں مدد نہیں دیتے؟ اس نے یہ سوال بڑے تعجب کے ساتھ سنا، اور کہنے لگا کہ ''میرے والدین تو رخصت ہو چکے، بہن بھائی ہیں، لیکن ان کا میری شادی سے کیا تعلق؟ ہر شخص اپنے مسائل کو خود ہی حل کرتا ہے، میری تو ان سے ملاقات کو بھی کئی سال گزر جاتے ہیں۔''

یہ ایک ڈرائیور کے تاثرات تھے، (واضح رہے کہ یورپ کے سفید فام ڈرائیور بھی اکثر پڑھے لکھے اور بعض اوقات خاصے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، جس ڈرائیور کا میں نے ذکر کیا اس کا نام آرلینڈو تھا، گریجویٹ تھا، اور تاریخ، جغرافیہ اور بہت سے سماجی معاملات پر اس کا مطالعہ خاصا تھا) ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنے ذاتی حالات کی وجہ سے کچھ مبالغے سے بھی کام لیا ہو، لیکن مغرب میں خاندانی ڈھانچے کی ٹوٹ پھوٹ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر زیادہ دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، یہ بات پوری دنیا میں مشہور و معروف ہے مغرب کے اہل فکر اس پر ماتم کر رہے ہیں، اور جوں جوں اس کا علاج کرنا چاہتے ہیں اتنی ہی تیز رفتاری سے خاندان کا ڈھانچہ مزید تباہی کی طرف جارہا ہے۔

سابق سوویت یونین کے آخری صدر میخائل گورباچوف اب دنیا کے سیاسی منظر سے تقریباً غائب ہو چکے، لیکن ان کی کتاب Perestroika جو انہوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں لکھی تھی، نہ صرف سوویت یونین، بلکہ پورے مغرب کے سماجی اور معاشی نظام پر ایک جرأت مندانہ تبصرے کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کے بعض حصوں میں آج بھی غور و فکر کا بڑا سامان ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے خواتین اور خاندان (Women and Family) کے عنوان سے خاندانی نظام کی شکست و ریخت پر بھی بحث کی ہے، انہوں نے شروع میں لکھا ہے کہ تحریک آزادی نسواں کا یہ پہلو تو بے شک قابل تعریف ہے کہ اس کے ذریعے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملے، عورتیں زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کے قابل ہوئیں، اور اس کے نتیجے میں ہماری معاشی پیداوار میں اضافہ ہوا، لیکن آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"But over the years of our diffiult and heroic hsitory, we failed to pay attention to women`s specific rights and needs arising from their role as mother and home-maker, and their in dispensable

educational function as regards children. Engaged in scientific rescarsh, working on construction sites, in production and in the services, and involved in creative activities, women no longer have enough time to perform their everyday duties at home housework, the upbringing of children and the creation of a good family atmosphere. We have discovered that many of our problems in children's and young peoples's behavior, in our morals, culture and in production are partially caused by the weakening of family tyes and slack attitude to family responsibilites. Thsi is a paradoxicl results of our sincere and politically justified desire to make women equal with man in every thing. now' in the course of perestroika, we have begun to overcome this shortcoming. That is why we are now holding heated debates in the press, on public organizations at work and at home, about the question of what we shaould do to make it possoble for women to retrun to their purely womanly mission."

''لیکن اپنی مشکل اور جرأت مندانہ تاریخ کے پچھلے سالوں میں ہم خواتین کے ان حقوق اور ضروریات کی طرف توجہ دینے میں ناکام رہے جو ایک ماں اور گھر ستین کی حیثیت میں، نیز بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ان کے ناگزیر کردار سے پیدا ہوتے ہیں، خواتین چونکہ سائنسی تحقیق میں مشغول ہوگئیں، نیز زیر تعمیر عمارتوں کی دیکھ بھال میں، پیداواری کاموں اور خدمات میں اور دوسری تخلیقی سرگرمیوں میں

مصروف رہیں، اس لیے ان کو اتنا وقت نہیں مل سکا کہ وہ خانہ داری کے روزمرہ کے کام انجام دے سکیں، بچوں کی پرورش کر سکیں، اور ایک اچھی خاندانی فضا پیدا کر سکیں، اب ہمیں اس حقیقت کا انکشار ہوا ہے کہ ہمارے بہت سے مسائل جو بچوں اور نوجوانوں کے رویے، ہماری اخلاقیات، ثقافت اور پیداواری عمل سے تعلق رکھتے ہیں، اس وجہ سے بھی پیدا ہوئے ہیں کہ خاندانی رشتوں کی گرفت کمزور پڑ گئی ہے، اور خاندانی فرائض کے بارے میں ایک غیر ذمہ دارانہ رویہ پروان چڑھا ہے، ہم نے عورتوں کو ہر معاملے میں مردوں کے برابر قرار دینے کی جو مخلصانہ سیاسی اعتبار سے درست خواہش کی تھی، یہ صورت حال اس کا تضاد آفرین نتیجہ ہے، اب اپنی تعمیر نو کے دوران ہم نے اس خامی پر قابو پانے کا عمل شروع کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم پریس میں، عوامی تنظیمات میں، کام کر رہے ہیں جن میں اس سوال پر بحث کی جارہی ہے کہ عورت کو اس کے خالص نسوانی مشن کی طرف واپس لانے کے لیے ہمیں کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟'' (۱)

یہ ایک ایسے سیاسی لیڈر کا تبصرہ ہے جس کے معاشرے میں خاندان سے متعلق یا مرد و عورت کے حقوق و فرائض کے بارے میں کسی قسم کی مذہبی اقدار کا کوئی تصور یا تو موجود نہیں ہے، یا اگر ہے تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، لہٰذا خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ پر اس کا اظہار افسوس کسی اعلیٰ آسمانی ہدایت کے زیر اثر نہیں، بلکہ اس کے صرف ان نقصانات کی بنا پر ہے جو ٹھیٹھ مادی زندگی میں اسے آنکھوں سے محسوس ہوئے، ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم صرف ظاہری اور مادی یا دنیوی نفع و نقصان کے نہیں، بلکہ ان آسمانی ہدایات کے بھی پابند ہیں، جو قرآن وسنت کے واسطے سے ہمارے لیے واجب العمل ہیں، لہٰذا خاندانی نظام کی ابتری صرف ہمارا سماجی اور معاشرتی نقصان ہی نہیں ہے، بلکہ ہمارے عقیدے ہمارے نظریۂ حیات اور ہمارے دین کے لحاظ سے ایک بہت بڑا فساد ہے جو ایک مسلم معاشرے میں کسی بھی طرح قابل برداشت نہیں۔

جب سے ہمارے درمیان مغربی افکار کا ایک سیلاب امڈا ہے، اور بالخصوص جب سے ٹی وی، وڈیو اور انگریزی فلموں کی بہتات نے ہمارے معاشرے پر ثقافتی یلغار شروع کی ہے، اس وقت سے ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر انہی معاشرتی تصورات کی طرف بڑھ رہے ہیں جن کی داغ بیل مغرب نے ڈالی تھی۔ الحمدللہ! ابھی ہمارا خاندانی نظام درہم برہم نہیں ہوا، لیکن جس رفتار سے مغربی ثقافت

---

(۱) Perestrocia, P.117 ed. 1987

ہمارے درمیان پھیل رہی ہے، انگریزی فلموں کے سیلاب نے مغربی طرز زندگی کو جس طرح گھر گھر اور گاؤں گاؤں پھیلا دیا ہے، جس طرح بے سوچے سمجھے خواتین کو گھروں سے نکالنے اور انہیں ایک عامل معیشت (Factor of Proudction) بنانے پر زور دیا جارہا ہے، اور گھر اور خاندان کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے جس تیزی کے ساتھ دوری اختیار کی جا رہی ہے، وہ مستقبل میں ہمارے خاندانی نظام کے لیے ایک زبردست خطرہ ہے جس کی روک تھام آج ہی سے ضروری ہے، اور اس روک تھام کا طریقہ اسلام کی ان معتدل تعلیمات کی ٹھیک ٹھیک پیروی کے سوا کچھ نہیں جو نہ مشرقی ہیں نہ مغربی، جن کا ماخذ ومنبع وحی الٰہی ہے، اور وہ ایک ایسی ذات کی وضع کردہ تعلیمات ہیں جو انسان کے حال و مستقبل کی تمام ضروریات سے بھی پوری طرح باخبر ہے، اور انسانی نفس کی ان چوریوں کو بھی خوب جانتی ہے جو زہر ہلاہل پر قند وشکر کی تہیں چڑھانے میں مہارت تامہ رکھتی ہے، لہٰذا ہمارا کام وقت کے ہر چلے ہوئے نعرے کے پیچھے چل پڑنا نہیں ہے، بلکہ اسے قرآن وسنت کی کسوٹی پر رکھ کر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ ہمارے مزاج ومذاق کے مطابق ہے یا نہیں؟ جب تک ہم میں یہ جرأت اور بصیرت پیدا نہ ہوگی، ہم باہر کی ثقافتی یلغار کے لیے ایک تر نوالہ بنے رہیں گے، اور ہمارے اجتماعی زندگی کی ایک ایک چول رفتہ رفتہ ہلتی چلی جائیں گی۔

۱۹ ذوالحجہ ۱۴۱۶ھ / ۸ مئی ۱۹۹۶ء

☆☆☆

رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کیجیے ☆

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَلَقَ الْخَلْقَ، حَتّٰى إِذَا فَرَغَ مِنْهُمْ قَامَتِ الرَّحِمُ فَقَالَتْ: هٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِ بِكَ مِنَ الْقَطِيْعَةِ قَالَ: نَعَمْ اَمَا تَرْضَيْنَ اَنْ اَصِلَ مَنْ وَصَلَكِ وَاَقْطَعَ مَنْ قَطَعَكِ؟ قَالَتْ: بَلٰى قَالَ: بِذٰلِكِ لَكِ)) ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِقْرَأُوْا اِنْ شِئْتُمْ:

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ﴾(۱)

صلہ رحمی کی تاکید

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا۔ تو اس سے فراغت کے بعد قرابت داری اور رشتہ داری کھڑی ہو گئی۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عرش کا پایہ پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ اب سوال یہ ہے کہ قرابت داری اور رشتہ داری کس طرح کھڑی ہوگئی؟ یہ وہ بات ہے جس کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی جان سکتے ہیں۔ ہم اس کی کیفیت نہیں بتلا سکتے اس لیے کہ قرابت داری کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا جسم ہو۔ لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں کو جو جسم نہیں رکھتی ہیں۔ آخرت اور ملاء اعلیٰ میں جسم عطا فرما دیتے ہیں۔ بہرحال۔ وہ رشتہ داری کھڑی ہوگئی۔ اور عرض کیا کہ یا اللہ! یہ ایسی جگہ ہے

☆ اصلاحی خطبات (۸/۱۷۲ تا ۱۹۵) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاری، كتاب تفسير القرآن، باب وتقطعوا أرحامكم، رقم: ٤٤٥٥، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والأداب، باب صفة الرحم وتحريم قطعيتها، رقم: ٤٦٣٤، مسند أحمد، رقم: ٨٠١٧، محمد: ٢٢-٢٣

جہاں پر میں اپنے حق کو پامال ہونے کی پناہ مانگتی ہوں۔ یعنی دنیا میں لوگ میرے حقوق کو پامال کریں گے۔ اس سے میں پناہ چاہتی ہوں کہ کوئی میرے حق کو پامال کرے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میں یہ اعلان کر دوں کہ جو شخص تمہارے حقوق کو ضائع کرے گا، تو میں اس کو سزا دوں گا، اور اس کے حقوق کو ادا نہیں کروں گا۔ جواب میں رشتہ داری نے کہا: یا اللہ! میں اس پر راضی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہیں یہ مقام اور درجہ دیتا ہوں۔ اور یہ اعلان کرتا ہوں کہ جو شخص رشتہ داری کے حقوق کا خیال رکھے گا اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا تو میں بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک کروں گا۔ اور جو شخص رشتہ داروں کے حقوق کو پامال کرے گا تو میں بھی اس کے حقوق کا خیال نہیں رکھوں گا۔

یہ واقعہ اور حدیث بیان کرنے کے بعد حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر چاہو تو قرآن کریم کی یہ آیت پڑھ لو، جس میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ﴾ (۱)

کیا ایسا ہے کہ تم زمین کے اندر فساد مچاؤ، اور رشتہ داریوں کے حقوق کو ضائع کرو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اوپر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔ اور ان کو بہرا اور اندھا بنا دیا ہے۔

قطع رحمی کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتنی سخت وعید ارشاد فرمائی۔

قیامت کے دن صلہ رحمی کے بارے میں سوال ہوگا

یہ حدیث درحقیقت ان تمام آیات قرآنی کی تفسیر ہے جن میں بار بار اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھنے کا حکم دیا ہے کہ قرابت داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ چنانچہ خطبہ نکاح کے موقع پر حضور اقدس ﷺ قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کیا کرتے تھے:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ﴾ (۲)

یعنی اس اللہ سے ڈرو جس کے نام کا واسطہ دے کر تم دوسروں سے اپنے حقوق مانگتے ہو، اور رشتہ داریوں کے حقوق پامال کرنے سے ڈرو۔ چنانچہ جب کوئی شخص دوسرے سے اپنا حق مانگتا ہے تو اللہ کا واسطہ دے کر مانگتا ہے کہ اللہ کے واسطے میرا یہ حق دے دو اور اس بات سے ڈرو کہ کہیں ایسا نہ ہو

(۱) محمد: ۲۲-۲۳

(۲) النساء: ۱

کہ تمہاری طرف سے کسی رشتہ دار کی حق تلفی ہو جائے۔ اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آخرت میں تمہیں عذاب دے۔ قرآن کریم اور حضور اقدس ﷺ کی احادیث رشتہ داریوں کے حقوق صحیح طور پر ادا کرنے کے بیان سے اور اس کی تاکید سے بھری ہوئی ہیں۔

''شریعت'' حقوق کی ادائیگی کا نام ہے

بات دراصل یہ ہے کہ ''شریعت'' حقوق کی ادائیگی کا دوسرا نام ہے، شریعت میں اللہ کا حق ادا کرنا ہے۔ یا اللہ کے بندوں کا حق ادا کرنا۔ پھر اللہ کے بندوں میں بھی مختلف لوگوں کے مختلف حقوق ہیں۔ مثلاً والدین کے حقوق ہیں۔ اولاد کے حقوق، بیوی کے حقوق، شوہر کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق ہیں۔ پڑوسیوں کے حقوق ہیں۔ ہم سفروں کے حقوق ہیں۔ اس طرح پوری شریعت حقوق سے عبارت ہے۔ ان حقوق میں سے کسی ایک کا بھی حق ادائیگی سے رہ جائے تو شریعت پر عمل ناقص ہے، اور اس کا دین ناقص ہے۔ اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کا حق تو ادا کر دیا۔ لیکن اللہ کے بندوں کا حق ادا نہ کیا تو دین کامل نہ ہوا۔ اور دین پر عمل ادھورا رہ گیا۔ ان میں سے خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں کے حقوق بھی رکھے ہیں۔

تمام انسان آپس میں رشتہ دار ہیں

یوں اگر دیکھا جائے تو سارے ابن آدم اور سارے انسان آپس میں رشتہ دار ہیں، جیسا کہ حضور اقدس ﷺ نے حدیث میں بھی اس کا ذکر فرمایا ہے، کیونکہ تمام انسانوں کے باپ ایک ہیں، یعنی حضرت آدم علیہ السلام، جن سے ہم سب پیدا ہوئے۔ بعد میں آگے چل کر شاخیں ہوتی چلی گئیں، خاندان اور قبیلے تقسیم ہوتے چلے گئے۔ کوئی کہیں جا کر آباد ہوا۔ اور کوئی کہیں۔ اور دور کی رشتہ داریاں ہو گئیں۔ جس کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے کو رشتہ دار نہیں سمجھتے۔ ورنہ حقیقت میں تو سارے انسان ایک دوسرے کے قرابت دار اور رشتہ دار ہیں۔ البتہ کسی کی رشتہ داری قریب کی ہے۔ کسی کی رشتہ داری دور کی ہے۔ لیکن رشتہ داری ضرور ہے۔

حقوق کی ادائیگی سکون کا ذریعہ ہے

جو قریب ترین رشتہ دار ہوتے ہیں۔ جن کو عرف عام میں رشتہ دار سمجھا جاتا ہے۔ جیسے بھائی، بہن، چچا، تایا، بیوی، شوہر، خالہ، ماموں، باپ اور ماں ان رشتہ داروں کے کچھ خاص حقوق اللہ تعالیٰ

نے مقرر فرمائے ہیں۔ اور ان حقوق کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ان رشتہ داروں کے حقوق صحیح طور پر ادا کیے جائیں تو اس کے نتیجے میں زندگی پر امن اور پرسکون ہو جاتی ہے۔ یہ لڑائی اور جھگڑے یہ نفرتیں اور عداوتیں، یہ مقدمہ بازیاں، یہ سب ان حقوق کو پامال کرنے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر ہر شخص اپنے اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے تو پھر کبھی کوئی جھگڑا اور کوئی لڑائی نہ ہو، کبھی مقدمہ بازی کی نوبت نہ آئے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہ حکم دیا کہ اگر تم ان حقوق کو ادا کرو گے تو تمہاری زندگی پرسکون ہوگی۔ ''خاندان'' کسی بھی معاشرے کی بنیاد ہوتی ہے، اگر ''خاندان'' متحد نہیں ہے اور خاندان والوں کے درمیان آپس میں محبتیں نہیں ہیں۔ آپس کے تعلقات درست نہیں ہیں۔ تو یہ چیز پورے معاشرے کو خراب کرتی ہے۔ اور پورے معاشرے کے اندر اس کا فساد پھیلتا ہے، اس کے نتیجے میں پوری قوم خراب ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا خاص طور پر حکم دیا۔

اللہ کے لیے اچھا سلوک کرو

ویسے تو ہر مذہب میں اور ہر اخلاقی نظام میں رشتہ داروں کے حقوق کی رعایت کا سبق دیا گیا ہے، اور ہر مذہب والے یہ کہتے ہیں کہ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ لیکن حضور ﷺ نے ان حقوق کے بارے میں ایک ایسا اصول بیان فرمایا ہے جو تمام دوسرے مذاہب اور اخلاقی نظاموں سے بالکل ممتاز اور الگ ہے۔ اگر وہ اصول ہمارے دلوں میں بیٹھ جائے تو پھر کبھی بھی رشتہ داروں کے حقوق کی خلاف ورزی نہ ہو، اور ان کے ساتھ کبھی بھی بدسلوکی نہ کریں۔

وہ اصول یہ ہے کہ جب بھی ان کے ساتھ اچھا برتاؤ اچھا سلوک کرو تو یہ کام ان کو خوش کرنے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے کرو، یعنی رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے وقت یہ نیت ہونی چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اس عمل سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر یہ سلوک کر رہا ہوں، جب انسان اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اچھا سلوک کرے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا وہ اپنے رشتہ داروں سے کسی ''بدلے'' کی توقع نہیں رکھے گا۔ بلکہ اس کے ذہن میں یہ ہوگا کہ میں تو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے ان کے ساتھ اچھا سلوک کر رہا ہوں، میرے اچھے سلوک کے نتیجے میں یہ رشتہ دار خوش ہو جائیں۔ اور میرا شکر یہ ادا کریں، اور کوئی بدلہ دیں تو وہ ایک نعمت ہے، لیکن اگر وہ خوش نہ ہوں، اور بدلہ نہ دیں تو بھی مجھے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے۔ مجھے اپنا وہ فریضہ انجام دینا ہے جو میرے اللہ نے میرے سپرد کیا ہے۔

شکریہ اور بدلے کا انتظار مت کرو

رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کے بارے میں ہر شخص یہ کہتا ہے کہ یہ حقوق ادا کرنا اچھی بات ہے، یہ حقوق ادا کرنے چاہئیں۔ لیکن سارے جھگڑے اور سارے فساد یہاں سے پیدا ہوتے ہیں کہ جب رشتہ دار کے ساتھ اچھا سلوک کر لیا تو اب آپ اس امید اور انتظار میں بیٹھے ہیں کہ اس کی طرف سے شکریہ ادا کیا جائے گا۔ اس کی طرف سے اس حسن سلوک کا بدلہ ملے گا، اور اس انتظار میں ہیں کہ وہ میرے حسن سلوک کے بارے میں خاندان والوں میں چرچا کرے گا، اور میرے گن گائے گا۔ لیکن آپ کی یہ امید پوری نہ ہوئی۔ اس نے نہ تو شکریہ ادا کیا۔ اور نہ ہی بدلہ دیا۔ تو اب آپ کے دل میں اس کی طرف سے برائی آ گئی کہ ہم نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ لیکن اس نے پلٹ کر پوچھا تک نہیں۔ اس کی زبان پر کبھی ''شکریہ'' کا لفظ ہی نہیں آیا۔ اس نے تو کبھی بدلہ ہی نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے اس کے ساتھ جو حسن سلوک کیا تھا اس کے ثواب کو ملیامیٹ کر دیا۔ آپ اپنے دل میں اس کی طرف سے برائی لے کر بیٹھ گئے، اور آئندہ جب کبھی حسن سلوک کرنے کا موقع آئے گا تو آپ یہ سوچیں گے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے کیا فائدہ اس کی زبان پر تو کبھی ''شکریہ'' کا لفظ بھی نہیں آتا۔ میں اس کے ساتھ کیا اچھائی کروں۔ چنانچہ آئندہ کے لیے اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا چھوڑ دیا۔ اور اب تک جو اس کے ساتھ حسن سلوک کیا تھا۔ اس کا ثواب بھی اکارت گیا۔ اس لیے کہ اب تک بھی اس کے ساتھ جو حسن سلوک کیا تھا۔ وہ اللہ کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو ''شکریہ'' اور ''بدلہ'' لینے کے لیے کیا تھا۔ اس لیے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی کے ساتھ حسن سلوک کرو تو صرف اللہ کو راضی کرنے کے لیے کرو، اس خیال سے مت کرو کہ یہ میرے ساتھ بھی بدلے میں حسن سلوک کرے گا۔ یا میرا شکریہ ادا کرے گا۔

صلہ رحمی کرنے والا کون ہے؟

ایک حدیث جو ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے۔ وہ یہ کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِيْ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ مَنْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا))(۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب لیس الواصل بالمکافی، رقم: ۵۵۳۲، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ماجاء فی صلة الرحم، رقم: ۱۸۳۱، سنن أبی داؤد، کتاب الزکاة، باب فی صلة الرحم، رقم: ۱٤٤٦، مسند أحمد، رقم: ٦٢٣٨

یعنی وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے جو اپنے کسی رشتہ دار کی صلہ رحمی کا بدلہ دے کہ دوسرا رشتہ دار میرے ساتھ جتنی صلہ رحمی کرے گا میں بھی اتنی ہی صلہ رحمی کروں گا، اور اگر وہ صلہ رحمی کرے گا تو میں بھی کروں گا۔ اگر وہ نہیں کرے گا تو میں بھی نہیں کروں گا، ایسا شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے۔ اس کو صلہ رحمی کا اجر وثواب نہیں ملے گا۔ بلکہ صلہ رحمی کرنے والا حقیقت میں وہ شخص ہے کہ دوسرا تو اس کا حق ضائع کر رہا ہے، اور اس کے ساتھ قطع تعلق کر رہا ہے، لیکن یہ شخص پھر بھی اللہ کی رضا جوئی کی خاطر اس کے ساتھ اچھا معاملہ کر رہا ہے، یہ شخص حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا ہے اور صلہ رحمی کے اجر وثواب کا مستحق ہے۔

ہمیں رسومات نے جکڑ لیا ہے

آج جب کسی شخص سے پوچھا جائے کہ رشتہ داروں کا بھی کچھ حق ہے؟ ہر ایک ہم سے یہی جواب دے گا کہ رشتہ داروں کے بہت حقوق ہیں۔ لیکن کون شخص ان حقوق کو کس درجے میں کس طرح ادا کر رہا ہے؟ اگر اس کا جائزہ لے کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ ہمارے سارے معاشرے کو رسموں نے جکڑ لیا ہے، اور رشتہ داروں سے جو تعلق ہے وہ صرف رسموں کی ادائیگی کی حد تک ہے اس سے آگے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً اگر کسی کے گھر شادی بیاہ ہے تو اس موقع پر اس کو کوئی تحفہ دینے کو دل نہیں چاہ رہا ہے، یا دینے کی طاقت نہیں ہے تو اب یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر تقریب میں خالی ہاتھ چلے گئے تو برا معلوم ہوگا۔ چنانچہ اب بادل نخواستہ اس خیال سے تحفہ دیا جا رہا ہے کہ اگر نہ دیا تو ناک کٹ جائے گی۔ اور خاندان والے کیا کہیں گے اور جس کے یہاں شادی ہو رہی ہے وہ یہ کہے گا کہ ہم نے تو اس کی شادی میں یہ تحفہ دیا تھا۔ اور اس نے ہمیں کچھ نہ دیا۔ چنانچہ یہ تحفہ دل کی محبت سے نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ رسم پوری کرنے کے لیے نام ونمود کے لیے دیا جا رہا ہے'' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحفہ دینے کا ثواب تو ملا نہیں، بلکہ نام ونمود کی نیت کی وجہ سے الٹا گناہ ہو گیا۔

تقریبات میں ''نیوتہ'' دینا حرام ہے

ایک رسم جو ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے، کسی علاقے میں کم اور کسی علاقے میں زیادہ ہے، وہ ''نیوتہ'' کی رسم ہے تقریبات میں لینے دینے کی رسم کو ''نیوتہ'' کہا جاتا ہے، ہر ایک کو یہ یاد ہوتا ہے کہ فلاں شخص نے ہماری تقریب کے موقع پر کتنے پیسے دیئے تھے، اور میں کتنے دے رہا ہوں۔ بعض علاقوں میں تو تقریبات کے موقع پر باقاعدہ فہرست تیار کی جاتی ہے کہ فلاں شخص نے اتنے پیسے دیئے، فلاں شخص نے اتنے پیسے دیئے۔ پھر اس فہرست کو محفوظ رکھا جاتا ہے، اور پھر جس

شخص نے پیسے دیئے ہیں۔ اس کے گھر جب کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہوگی تو اب یہ ضروری ہے کہ جتنے پیسے اس نے دیئے تھے، اتنے پیسے اس کی تقریب میں دینا لازم اور ضروری ہے۔ چاہے قرض لے کر دے، یا اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر دے، یا چوری اور ڈاکہ ڈال کر دے، لیکن دینا ضرور ہے، اگر نہیں دے گا تو یہ اس معاشرے کا بدترین مجرم کہلائے گا۔ اسے ''نیوتہ'' کہا جاتا ہے۔ دیکھئے اس میں یہ پیسے صرف اس لیے دیئے جارہے ہیں کہ میرے گھر میں جب تقریب کا موقع آئے گا تو وہ بھی دے گا، لہٰذا ''بدلہ'' کے خیال سے جو پیسے دیئے جارہے ہیں یہ حرام قطعی ہیں، قرآن کریم نے اس کے لیے ''ربوا'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ﴾(۱)

تم لوگوں کو نیوتہ کے طور پر جو کچھ ہدیہ یا تحفہ دیتے ہو (لیکن اس خیال سے دیا کہ وہ میری تقریب پر یا تو اتنا ہی دے گا، یا اس سے زیادہ دے گا) تاکہ اس سے مال کے اندر اضافہ ہو، تو یاد رکھو اللہ کے نزدیک اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اور جو زکوٰۃ یا صدقہ تم اللہ کی رضا مندی کی نیت سے دیتے ہو تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے مال مین چندور چند اضافہ فرماتے ہیں۔

تحفہ کس مقصد کے تحت دیا جائے؟

لہٰذا اگر کسی شخص کے دل میں خیال آیا کہ میرے ایک عزیز کے یہاں خوشی کا موقع ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کو کوئی ہدیہ پیش کروں۔ اور اس کی خوشی کے اندر میں بھی شریک ہو جاؤں، اور ہدیہ دینے سے ''بدلہ'' اور نام ونمود اور دکھاوا پیش نظر نہیں ہے۔ بلکہ اپنی رشتہ داری کا حق ادا کرنا ہے اور اللہ کو راضی کرنا ہے تو اس صورت میں تحفہ دینا اور پیسہ دینا اجر وثواب کا باعث ہوگا۔ اور یہ تحفے اور پیسے صلہ رحمی میں لکھے جائیں گے۔ بشرطیکہ ہدیہ دینے سے اللہ کو راضی کرنا مقصد ہو۔

مقصد جانچنے کی کسوٹی

اس کی پہچان کیا ہے کہ ہدیہ دینے سے اللہ کو راضی کرنا مقصود ہے یا ''بدلہ'' لینا مقصود ہے؟

(۱) الروم: ۳۹، آیت کا ترجمہ یہ ہے: اور یہ جو تم سود دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مال میں شامل ہو کر بڑھ جائے تو وہ اللہ کے نزدیک بڑھتا نہیں ہے، اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو، تو جو لوگ بھی ایسا کرتے ہیں وہ ہیں جو (اپنے مال کو) کئی گنا بڑھا لیتے ہیں۔

اس کی پہچان یہ ہے کہ اگر ہدیہ دینے کے بعد اس بات کا انتظار لگا ہوا ہے کہ سامنے والا شخص اس کا شکریہ ادا کرے، اور کم از کم پلٹ کر اتنا تو کہہ دے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ یا اس بات کا انتظار ہے کہ جب میرے گھر کوئی تقریب ہوگی تو یہ تقریب کے موقع کوئی ہدیہ تحفہ پیش کرے گا۔ یا اگر بالفرض تمہارے ہاں کوئی تقریب ہو تو وہ کوئی ہدیہ تحفہ نہ لائے تو اس وقت تمہارے دل پر میل آجائے، اور اس کی طرف سے تمہیں شکایت ہو کہ ہم نے تو اتنا دیا تھا، اور اس نے تو کچھ بھی نہیں دیا۔ یا ہم نے زیادہ دیا تھا، اور اس نے ہمیں کم دیا۔ یہ سب اس بات کی علامات ہیں کہ اس دینے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود نہیں تھی۔ لہٰذا دیا بھی، اور اس کو ضائع بھی کر دیا۔ لیکن اگر ہدیہ دینے کے بعد ذہن کو فارغ کر دیا کہ چاہے یہ میرا شکریہ ادا کرے یا نہ کرے۔ میرے یہاں تقریب کے موقع پر چاہے دے یا نہ دے، لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے دینے کی توفیق دی تو میں نے اللہ کو راضی کرنے کے لیے اپنے رشتہ داروں کی خوشی کے موقع پر اس کی خدمت میں ہدیہ پیش کر دیا۔ نہ تو مجھے شکریہ کا انتظار ہے، اور نہ بدلے کا انتظار ہے، اگر میرے گھر میں تقریب کے موقع پر یہ کچھ نہ دے تو بھی میرے دل پر میل نہیں آئے گا۔ میرے دل میں شکایت پیدا نہیں ہوگی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ ہدیہ اللہ کی رضامندی کی خاطر دیا گیا ہے، یہ ہدیہ دینے والے اور لینے والے دونوں کے لیے مبارک ہے۔

''ہدیہ'' حلال طیب مال ہے

حتیٰ کہ حدیث شریف میں یہ تک بیان فرمایا گیا ہے کہ اگر آپ کا کسی شخص کی طرف دھیان لگا ہوا ہے کہ فلاں شخص میرے پاس ملاقات کے لیے آئے گا مجھے ہدیہ پیش کرے گا۔ اب آپ کو اس کے آنے کا اشتیاق اور انتظار ہو رہا ہے۔ تو اس صورت میں اس ہدیہ کے اندر برکت نہیں ہوگی۔ اور جو ہدیہ طلب کے بغیر اور انتظار کے بغیر اس طرح آپ کو ملا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندہ کے دل میں یہ خیال ڈالا کہ وہ تمہیں ہدیہ پیش کرے۔ اس نے وہ ہدیہ لا کر پیش کر دیا۔ وہ ہدیہ بڑی برکت والا ہے۔ گویا کہ اشتیاق اور انتظار سے اس ہدیہ کی برکت میں کمی آجاتی ہے۔ اس لیے کہ ہدیہ آنے سے پہلے ہی اس میں اپنی نفسانی غرض بھی شامل ہوگئی۔ اس لیے اس میں اتنی برکت نہیں ہوگی۔

ایک بزرگ کا واقعہ

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے جو بڑے اللہ والے درویش بزرگ تھے، اور اللہ والوں پر بڑے بڑے کٹھن حالات پیش آتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر فاقوں کی نوبت آگئی۔ کئی دن سے فاقہ تھا، اور

مریدین اور معتقدین کی مجلس میں وعظ فرما رہے تھے، آواز میں بہت کمزوری تھی۔ آہستہ اور پست آواز سے بیان فرما رہے تھے۔ مجلس میں ایک مرید نے جب یہ حالت دیکھی تو سمجھ گئے کہ بھوک کی شدت کی وجہ سے یہ کمزوری ہے۔ شاید ان پر فاقے گزر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اس خیال سے مجلس سے اٹھ کر چلے گئے کہ میں شیخ کے لیے کھانے کا انتظام کروں۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا لے کر اور ایک تھال میں لگا کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کھانا دیکھ کر شیخ نے تھوڑی دیر تامل کر کے فرمایا کہ نہیں۔ یہ کھانا لے جاؤ۔ میں اس کو قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ مرید کھانا لے کر واپس چلے گئے۔ آجکل کے مریدوں کی طرح کوئی ہوتا تو وہ اصرار کرتا کہ نہیں جی۔ آپ یہ کھانا ضرور کھائیں۔ مگر وہ مرید جانتا تھا کہ شیخ کامل ہیں۔ اور شیخ کامل کا حکم بے چوں و چرا ماننا چاہئے۔ اور وہ کھانے سے انکار تکلفاً نہیں کر رہے ہیں بلکہ کوئی وجہ ہی ہوگی جس کی وجہ سے کھانے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے وہ کھانا لے کر واپس چلا گیا۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد مرید دوبارہ کھانا لے کر آیا۔ اور ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت اب قبول فرما لیجیے۔ شیخ نے فرمایا کہ ہاں! اب میں قبول کرتا ہوں۔

بعد میں مرید نے بتایا کہ جب میں پہلی مرتبہ کھانا لے کر آیا، اور حضرت نے کھانے سے انکار کر دیا تو میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ حضرت والا کھانے سے جو انکار کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں کھانا لینے کے لیے مجلس سے اٹھ کر گیا تو حضرت والا کے دل میں یہ خیال آیا کہ شاید یہ میری کمزوری دیکھ کر سمجھ گیا اور شاید یہ میرے کھانے کا بندوبست کرنے گیا ہو، جس کی وجہ سے کھانے کا انتظار لگ گیا، لہٰذا جب میں کھانا لے کر آیا تو وہ کھانا انتظار اور اشتیاق کے عالم میں لایا، اور یہ حدیث سامنے تھی کہ جو ہدیہ انتظار اور اشتیاق کے عالم میں ملے اس ہدیہ میں برکت نہیں ہوتی، اس لیے انہوں نے وہ کھانا قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ کھانا لے کر میں واپس چلا گیا۔ تاکہ ان کا انتظار اور اشتیاق ختم ہو جائے، پھر تھوڑی دیر کے بعد میں وہی کھانا لے کر دوبارہ حاضر ہو گیا تو اب ہدیہ قبول کرنے میں جو رکاوٹ تھی۔ وہ ختم ہو گئی تھی۔ اس لیے شیخ نے اس کو قبول فرما لیا۔ بہرحال اگر ہدیہ میں انتظار لگ جائے، یا اس کے دینے میں نام و نمود اور شہرت کی نیت کر لی جائے۔ یا اس کے بدلے میں طمع اور لالچ پیدا ہو جائے۔ تو یہ چیزیں ہدیہ کی برکت اور نور کو زائل کر دیتی ہیں۔

ہدیہ دو، محبت بڑھاؤ

حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((تَهَادُوْا تَحَابُّوْا)) (۱)

''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو تو تمہارے درمیان آپس میں محبت پیدا ہوگی''

لیکن یہ محبت اس وقت پیدا ہوگی جب اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہدیہ دیا جا رہا ہو۔ قرابت داری کا حق ادا کرنے کے لیے، اپنی آخرت سنوارنے کے لیے اور اللہ کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے وہ ہدیہ دیا جا رہا ہو۔ لیکن آج ہم لوگ ان مقاصد کے لیے ہدیہ نہیں دیتے۔ چنانچہ شادیوں کے موقع پر دیکھ لیں کہ کس نیت سے تحفہ دیا جا رہا ہے۔ صرف رسم پوری کرنے کے لیے تحفہ دے دیں گے۔ لیکن رسم کے علاوہ کبھی کوئی تحفہ کسی رشتہ دار کو دینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ چنانچہ بعض اوقات مردوں کے دل میں خیال بھی آتا ہے کہ فلاں عزیز کو فلاں تحفہ دے دیں تو اکثر خواتین اپنے شوہر کو یہ کہہ کر روک دیتی ہیں کہ اس وقت تحفہ پیش کریں گے تو ذرا نام بھی ہو جائے گا۔ اور اس وقت اپنا بوجھ بھی اترے گا۔ اس وقت دینے کا کیا فائدہ حالانکہ سارہ فائدہ تو اس وقت دینے میں ہے، اس لیے کہ جس وقت دل میں کسی تصنع اور تکلف اور بناوٹ کے بغیر محض اللہ کی خاطر اپنے کسی عزیز یا دوست کو خوش کرنے کے لیے تحفہ دینے کا داعیہ پیدا ہوا، بس تحفہ دینے کا وہی صحیح موقع ہے۔ اسی وقت تحفہ اور ہدیہ دے دو۔

نیکی کے تقاضے پر جلد عمل کر لیجئے

بزرگوں نے فرمایا کہ جب دل میں کسی نیک کام کرنے کا شوق اور جذبہ پیدا ہوا کہ فلاں نیک کام کر لوں تو اس نیک کام کو جتنا جلد ہو سکے کر ڈالو۔ اس کام کو ٹلاؤ نہیں، آئندہ کے لیے اس کو مؤخر اور ملتوی نہ کرو۔ اس لیے کہ نیک کام کرنے کا یہ شوق جس اخلاص اور جذبے کے ساتھ پیدا ہوا ہے، خدا جانے وہ شوق کل کو باقی رہے نہ رہے، کل کو حالات سازگار رہیں یا نہ رہیں، کل کو موقع ملے یا نہ ملے، اس لیے فوراً اس شوق پر عمل کر لو۔

نیکی کا تقاضا اللہ کا مہمان ہے

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''نیکی کا داعیہ'' اللہ تعالیٰ کا مہمان ہے اور صوفیاء کرام اس کو ''وارد'' کہتے ہیں۔ یہ ''وارد'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا مہمان ہے۔ اگر تم نے اس مہمان کی عزت اور اکرام کیا تو یہ مہمان دوبارہ آئے گا۔ اور بار بار آئے گا،

---

(۱) مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب ماجاء في المهاجرة، رقم: ۱۴۱۳

اور اگر تم نے اس مہمان کو دھتکار دیا، اور اس کا اکرام نہ کیا، مثلاً دل میں نیک کام کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن اس خیال کو یہ سوچ کر جھٹک دیا کہ میاں چھوڑو، بعد میں دیکھا جائے گا۔ تو تم نے اللہ کے مہمان کی ناقدری کی۔ اور بے عزتی کی، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مہمان ناراض ہو جائے گا۔ اور آنا چھوڑ دے گا۔ اور اگر تم نے اس خیال پر عمل کرتے ہوئے وہ نیک کام کر لیا تو اللہ تعالیٰ پھر دوبارہ اس مہمان کو تمہارے پاس بھیجیں گے۔ اور وہ داعیہ کسی اور موقع پر کوئی اور نیک کام تم سے کرالے گا۔ اس لیے جس وقت کسی عزیز یا دوست کو تحفہ اور ہدیہ دینے کا داعیہ دل میں پیدا ہوا۔ بس اسی وقت اس داعیہ پر عمل کر ڈالو۔

ہدیہ کی قیمت مت دیکھیں، جذبہ دیکھیں

پھر حضور اقدس ﷺ نے ایک تعلیم یہ دی کہ یہ مت دیکھو کہ ہدیہ اور تحفے کے طور پر کیا چیز دی جارہی ہے، بلکہ یہ دیکھو کہ کس جذبے کے ساتھ وہ تحفہ اور ہدیہ دیا جارہا ہے، اگر چھوٹی سی چیز بھی محبت سے پیش کی جائے۔ یقیناً وہ اس بڑی چیز سے ہزار درجہ بہتر ہے جو صرف دکھاوے اور نام ونمود کے لیے دی جائے۔ اس لیے ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَاتَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ فِرْسِنَ شَاةٍ))(۱)

یعنی اگر کوئی پڑوسن کوئی ہدیہ بھیجے تو اس کو کبھی حقیر مت سمجھو، چاہے وہ ہدیہ ایک بکری کا پایہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ اس چیز کو مت دیکھو جو پیش کی جارہی ہے۔ بلکہ اس جذبے کو دیکھو جس جذبے کے ساتھ وہ پیش کی جارہی ہے، اگر محبت کے جذبے سے پیش کی گئی ہے، اس کی قدر کرو۔ وہ ہدیہ تمہارے لیے مبارک ہے۔ لیکن اگر بہت قیمتی چیز تمہیں ہدیہ میں دی گئی۔ مگر دکھاوے کی خاطر دی گئی۔ تو اس میں برکت نہیں ہوگی۔ اس لیے اللہ کا کوئی بندہ تمہیں کوئی چھوٹی سی چیز ہدیے میں دے تو اس کو مبارک سمجھ کر قبول کرلو۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ عموماً چھوٹی چیز ہدیہ میں دینے میں دکھاوا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ چیز ہی معمولی سی ہے، اس میں کیا دکھاوا کریں۔ اور قیمتی چیز ہدیہ میں دینے میں دکھاوا آجاتا ہے۔ اس لیے ہدیہ میں اگر کوئی شخص چھوٹی چیز دے تو اس کی زیادہ قدر کرنی چاہئے۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب لاتحقرن جارة لجارتها، رقم: ۵۵۵۸، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب الحث على الصدقة ولوبالقليل، رقم: ۱۷۱۱، سنن الترمذي، كتاب الولاء والهبة عن رسول الله، باب في حث النبي على التهادي، رقم: ۲۰۵۶، مسند أحمد، رقم: ۷۲۷۴

حلال دعوت کی برکات

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ دیوبند میں ایک بزرگ گھانس کاٹا کرتے تھے۔ اور گھانس بیچ کر اپنا گزارہ کرتے تھے، یومیہ ان کی آمدنی چھ پیسے ہوتی تھی، ان کی تقسیم اس طرح کر رکھی تھی کہ دو پیسے تو اپنے استعمال میں لاتے، اور دو پیسے صدقہ خیرات کرتے، اور دو پیسے جو بچتے، ان کو دارالعلوم دیوبند کے بڑے بڑے اکابر اور علماء کی دعوت کے لیے جمع کرتے۔ جب کچھ پیسے جمع ہو جاتے تو علماء اور اکابر دیوبند کی دعوت کرتے۔ جن میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ۔ یہ حضرات فرماتے تھے کہ ہمیں سارے مہینے ان بزرگ کی دعوت کا انتظار رہتا ہے۔ جبکہ بڑے بڑے دولت مند اور روساء بھی دعوت کرتے تھے، ان کا انتظار نہیں رہتا تھا اس لیے یہ ایک اللہ کے بندے کی حلال طیب کمائی سے اور خالص محبت فی اللہ کی خاطر یہ دعوت کی جاتی تھی۔ اور اس میں جو نورانیت محسوس ہوتی وہ کسی اور دعوت میں نہیں محسوس ہوتی تھی۔ فرماتے تھے جب اس اللہ کے نیک بندے کی دعوت کھا لیتے ہیں تو کئی دن تک دل میں نور محسوس ہوتا ہے۔ اور عبادت کرنے اور ذکر و اذکار میں مشغول رہنے کی خواہش رہتی ہے۔ بہر حال، چھوٹی اور معمولی چیز ہدیہ میں دینے میں اخلاص کی زیادہ توقع ہے بڑی چیز کے مقابلے میں، اس لیے معمولی ہدیہ کی زیادہ قدر کرنی چاہئے۔

ہدیہ میں رسمی چیز مت دو

پھر ہدیہ دینے میں اس بات کا خیال رہنا چاہئے کہ ہدیہ اور تحفہ کا مقصد راحت پہنچانا اور اس کو خوش کرنا ہے۔ لہٰذا جو ہدیہ رسم پوری کرنے کے لیے دیا جاتا ہے، اس میں راحت کا یا خوشی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ اس میں رسم پوری کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے ہدیہ میں صرف وہ رسمی چیز ہی دی جاتی ہے، مثلاً یا تو مٹھائی کا ڈبہ دے دیا، یا کپڑے کا جوڑا دے دیا وغیرہ، اگر اس مخصوص چیز کے علاوہ کوئی دوسری چیز لے جائیں گے تو یہ رسم کے خلاف ہوگی، اور اس کو بطور ہدیہ دیتے ہوئے شرم آئے گی کہ یہ بھی کوئی ہدیہ ہے۔ لیکن جو شخص اللہ کے لیے اخلاص کے ساتھ کوئی ہدیہ دے گا وہ تو یہ دیکھے گا کہ اس شخص کی ضرورت کی چیز کیا ہے؟ میں وہ چیز اس کو ہدیہ میں دوں، تاکہ اس کے ذریعہ اس کو فائدہ اور راحت پہنچے۔

ایک بزرگ کے عجیب ہدایا

ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ تبلیغی جماعت کے معروف حضرات میں سے تھے۔ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ سے بڑی محبت فرماتے، اور بکثرت ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب یہ بزرگ حضرت والد صاحب سے ملنے کے لیے دارالعلوم تشریف لاتے تو وہ ایسے عجیب وغریب چیزیں ہدیہ میں لاتے کہ ہم نے ایسے ہدیے کہیں اور نہیں دیکھے، مثلاً کبھی کاغذ کا ایک دستہ لے آئے۔ اور حضرت والد صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اب دیکھئے کہ کاغذ کا دستہ آج تک کسی نے ہدیہ میں پیش نہیں کیا۔ مگر وہ اللہ کے بندے جانتے تھے کہ حضرت مفتی صاحب کا ہر وقت لکھنے کا کام ہوتا ہے۔ یہ کاغذ ان کے کام آئے گا۔ اور لکھنے کا جو نیک کام کریں گے۔ اس میں میرا بھی حصہ لگ جائے گا، اور مجھے بھی ثواب مل جائے گا۔ کبھی روشنائی کی دوات لا کر حضرت والد صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ اب بتایئے جو شخص دکھاوا کرے گا، وہ کبھی روشنائی کی دوات پیش کرے گا؟ لیکن جس شخص کے پیش نظر ہدیہ کے ذریعہ اللہ کو راضی کرنا ہے۔ اور جس شخص کے پیش نظر سامنے والے کو راحت اور آرام پہنچانا ہے۔ اسی شخص کے دل میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ ایسا ہدیہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے، اب اگر مٹھائی کا ڈبہ ہدیہ میں پیش کر دیتے تو حضرت والد صاحب مٹھائی تو کھاتے نہیں تھے۔ وہ دوسروں کے کھانے میں آتی۔

ہدیہ دینے کے لیے عقل چاہئے

بہر حال ہدیہ اور تحفہ دینے کے لیے بھی عقل چاہئے، اور یہ عقل بھی اللہ کی توفیق سے اور اللہ کی رضا جوئی اور اخلاص سے ملتی ہے، لیکن جہاں ہدیہ دینے کا مقصد ریا اور نام ونمود ہو۔ وہاں یہ عقل کام نہیں آتی۔ وہاں تو انسان رسموں کے پیچھے پڑا رہتا ہے، وہ تو یہ سوچے گا اگر میں ہدیہ میں روشنائی کی دوات لے کر جاؤں گا تو بڑی شرم معلوم ہو گی، اگر مٹھائی کا ڈبہ لے جاتا تو ذرا دیکھنے میں بھی اچھا لگتا۔ آج ہمارے پورے معاشرے کو رسموں نے جکڑ لیا ہے۔ اور اس طرح جکڑ لیا ہے کہ عزیز اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا جو معاملہ کرتے ہیں۔ اس کو بھی ان رسموں نے تباہ کر دیا ہے۔ چنانچہ ہدیہ اور تحفہ دینا بڑی اچھی چیز ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔ لیکن ہم نے اس کو رسموں کی جکڑ بندی میں لا کر اس کا ثواب غارت کیا، اس کا نور بھی غارت کیا، اور اس کی برکت بھی غارت کی، اور الٹا اپنے ذمے گناہ لے لیا۔ خوب یاد رکھیے یہ ''نیوتہ'' وغیرہ حرام قطعی ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص خوش دلی

سے بدلے اور شکریے کی توقع کے بغیر اگر دے گا تو ان شاء اللہ اس پر اجر و ثواب ملے گا۔

ہر کام اللہ کے لیے کریں

یہ تو ہدیہ اور تحفے کی بات تھی۔ اس کے علاوہ بھی عزیز و رشتہ داروں کے حقوق ہیں، مثلاً کسی کے دکھ درد میں شریک ہو گئے۔ کسی کی ضرورت کے موقع پر اس کے کام آ گئے وغیرہ، اس میں بھی حضور اقدس ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ جب کسی عزیز رشتہ دار کا کوئی کام کرو تو صرف اللہ کے لیے کرو۔ اور اس خیال سے مت کرو کہ یہ میرے گن گائے گا، یا میرا شکریہ ادا کرے گا۔ یا مجھے بدلہ دے گا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا کام بھی کرو گے اور پھر بھی دنیا میں خوشی حاصل نہیں ہوگی۔

کیا رشتہ دار بچھو کے مانند ہیں؟

ہمارے معاشرے کی غلط فکر کی وجہ سے عربی زبان میں ایک مثل مشہور ہے:

"اَلْاَقَارِبُ کَالْعَقَارِبِ"

''اقارب'' کے معنی ہیں رشتہ دار، اور عقارب عقرب کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں بچھو۔ معنی یہ ہوئے کہ رشتہ دار بچھو جیسے ہیں ہر وقت ڈنگ مارنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کبھی راضی نہیں ہوتے، یہ مثل اس لیے مشہور ہوئی کہ رشتہ داروں کے ساتھ جب بھی حسن سلوک کیا تو اس امید کے ساتھ کیا کہ ان کی طرف سے جواب ملے گا۔ اگر یہ حسن سلوک اس نیت سے کیا جاتا کہ میرے اللہ نے حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اور یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے۔ اس وقت انسان یہ سوچتا ہے کہ یہ رشتہ دار جواب دے یا نہ دے، لیکن اللہ تو جواب دینے والا موجود ہے، اس لیے کہ میں نے یہ کام اللہ کے لیے کیا ہے۔ مزہ تو اسی وقت ہے کہ تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرتے رہو، اور ان کی طرف سے جواب نہ ملے، بلکہ الٹا جواب ملے، مگر پھر بھی ان کے ساتھ حسن سلوک اس نیت سے کیے جاؤ کہ جس کے لیے کر رہے ہیں۔ وہ جواب دینے والا موجود ہے، اس لیے حضور اقدس ﷺ نے فرما دیا کہ صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص نہیں ہے جو بدلے کا انتظار کرے، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ شخص ہے کہ دوسرے تو قطع رحمی کریں، لیکن یہ اس کے باوجود صلہ رحمی کرے۔

حضور ﷺ کا رشتہ داروں سے سلوک

حضور اقدس نبی کریم ﷺ کو دیکھئے کہ آپ نے رشتہ داروں کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ چند

رشتہ داروں کے علاوہ باقی سب رشتہ دار آپ کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے تھے، اور آپ کو تکلیفیں پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، یہاں تک کہ آپ کے چچا اور چچا کے بیٹے جو قریب ترین عزیز تھے، مگر آپ کو تکلیف پہنچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے اپنی طرف سے رشتہ داری کا حق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب بدلہ لینے کا وقت آیا تو آپ نے سب کو معاف کر دیا، اور یہ اعلان فرما دیا کہ جو شخص حرم میں داخل ہو جائے گا وہ بھی مامون ہے جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ بھی مامون ہے، اور کسی سے بدلہ نہیں لیا، اور نہ کسی سے یہ توقع رکھی کہ وہ میرے حسن سلوک کا بدلہ دے گا۔ لہٰذا رشتہ داروں کی بدسلوکی پر حسن سلوک کرنا بھی سنت ہے اور اچھائی کے ساتھ بدلہ دینا بھی سنت ہے۔

مخلوق سے توقعات ختم کر دیں

اسی لیے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مواعظ میں بڑے تجربے کی بات فرمائی ہے، فرمایا:

''دنیا میں راحت سے رہنے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے۔ وہ یہ کہ مخلوق سے توقعات ختم کر دو''

مثلاً یہ توقع رکھنا کہ فلاں شخص میرے ساتھ اچھائی کرے گا۔ فلاں شخص میرے کام آئے گا۔ فلاں شخص میرے دکھ درد میں شریک ہوں گا، یہ تمام توقعات ختم کر کے صرف ایک ذات یعنی اللہ جل شانہٗ سے توقع رکھو، اس لیے کہ مخلوقات سے توقع ختم کرنے کے بعد اگر ان کی طرف سے کوئی اچھائی ملے گی تو وہ خلاف توقع ملے گی، اس کے نتیجے میں خوشی بہت ہوگی، کیونکہ خلاف توقع ملی ہے اور اگر مخلوق کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے گی تو پھر رنج زیادہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اچھائی کی توقع تو تھی نہیں، تکلیف ہی کی توقع تھی، وہ تکلیف توقع کے مطابق ہی ملی، اس لیے صدمہ اور رنج زیادہ نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ اچھائی کی توقع کے بعد تکلیف پہنچے تو صدمہ اور رنج بہت زیادہ ہوتا ہے کہ توقع تو یہ تھی اور یہ ملا، لہٰذا توقع کے بغیر جو اچھائی مل رہی ہے وہ سب بونس ہے۔

دنیا دکھ ہی پہنچاتی ہے

دنیا کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو دکھ ہی پہنچاتی ہے، اگر کبھی خوشی اور منفعت حاصل ہو جائے تو سمجھ لو کہ یہ اللہ کا خاص انعام ہے، اور اگر دکھ آئے تو سمجھ لو کہ یہ تو آنا ہی تھا، اس لیے اس پر زیادہ

صدمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات بالکل سو فیصد درست ہے۔ اگر ہم اس بات کو پلے باندھ لیں اور اس پر عمل کر لیں تو پھر سارے شکوے اور شکایتیں ختم ہو جائیں۔ اس لیے کہ یہ شکوے اور شکایتیں توقعات کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جو توقع رکھنی ہے اللہ تعالیٰ سے رکھو، مخلوقات سے توقع رکھنا چھوڑ دو گے تو ان شاء اللہ راحت اور آرام میں آ جاؤ گے۔

اللہ والوں کا حال

ہمارے بڑے یہ نسخہ بتا گئے، اور میں نے آپ کے سامنے یہ نسخہ بتا دیا۔ اور آپ نے سن لیا۔ لیکن محض کہنے اور سننے سے بات نہیں بنتی ہے، بلکہ اس بات کو دل میں بٹھائیں، اور اس کی مشق کریں، بار بار اپنا جائزہ لیں کہ ہم نے دوسروں سے کون کون سی توقعات باندھ رکھی ہیں؟ اور کیوں باندھ رکھی ہیں؟ اللہ سے توقعات کیوں نہیں باندھیں؟ آپ نے اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ ان کے اوپر بڑے سے بڑا غم بھی آ جائے گا تو تھوڑا بہت رنج ہوگا، لیکن وہ غم ان کے اوپر مسلط نہیں ہوگا، اور وہ غم ان کو بے چین اور بے تاب نہیں کرے گا، کیونکہ انہوں نے اپنے مالک سے اپنا تعلق جوڑا ہوا ہے، مخلوق کی طرف نگاہ نہیں ہے۔ مخلوق سے توقعات نہیں، مخلوق سے کچھ نہیں مانگتے، جو کچھ مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سکون اور اطمینان سے رہتے ہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا حال ہے؟ کیسے مزاج ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ الحمدللہ بہت اچھا حال ہے، پھر فرمایا کہ میاں اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو کہ اس کائنات میں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا۔ یعنی میں وہ شخص ہوں کہ کائنات میں کوئی کام میری مرضی کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ ہر کام میری مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ اور اس کائنات کے سب کام جس کی مرضی کے مطابق ہو رہے ہوں اس سے زیادہ خوش اور اس سے زیادہ عیش میں کون ہو سکتا ہے؟ سوال کرنے والے کو بڑا تعجب ہوا، اس نے کہا کہ یہ بات تو انبیاء علیہم السلام کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی کہ اس کائنات کا ہر کام ان کی مرضی کے مطابق ہوتا ہو، بلکہ ان کی مرضی کے خلاف بھی کام ہوتے تھے، آپ کا ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق کیسے ہو جاتا ہے؟

ان بزرگ نے جواب دیا کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع بنا دیا ہے، بس جو میرے اللہ کی مرضی وہ میری مرضی، جو میرے اللہ کی مشیت وہی میری مشیت، اور اس کائنات میں ہر کام اللہ کی مرضی اور اس کی مشیت کے مطابق ہو رہا ہے، اور میں نے اپنی انا کو مٹا دیا ہے اس لیے ہر کام میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے، کیونکہ وہ اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ اس لیے میں بڑا خوش ہوں، اور عیش و عشرت میں ہوں۔

بزرگوں کا سکون اور اطمینان

بہر حال اللہ والوں کو جو سکون اور آرام اور راحت میسر ہے، جس کے بارے میں حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر دنیا کے بادشاہوں کو ہماری عافیت اور سکون اور راحت کا پتہ چل جائے تو وہ بادشاہ تلواریں لے کر ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے آجائیں کہ یہ راحت اور سکون ہمیں دے دو۔ یہ سکون مخلوق سے نگاہیں ہٹانے سے اور مخلوق سے توقعات ختم کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب مخلوق سے توقعات ختم ہو جاتی ہیں تو پھر دیکھو کیسا سکون حاصل ہوتا ہے۔ لیکن یہ چیزیں صرف کہنے سننے سے حاصل نہیں ہوتیں، صحبت کے نتیجے میں یہ چیزیں رفتہ رفتہ منتقل ہو جاتی ہیں۔ اور انسان کی دنیا اور آخرت سنور جاتی ہیں۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ عزیز و اقارب کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ حسن سلوک اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہو اور محض دکھاوے کے لیے اور رسوم پوری کرنے کے لیے نہ ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے اور آپ سب کو اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور اس پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

تعلقات کو نبھانا سیکھیں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَتْ عَجُوْزٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ((كَيْفَ أَنْتُمْ كَيْفَ حَالُكُمْ، كَيْفَ كُنْتُمْ بَعْدَنَا؟)) قَالَتْ: بِخَيْرٍ بِأَبِيْ أَنْتَ وَأُمِّيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! فَلَمَّا خَرَجَتْ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! تُقْبِلُ هٰذِهِ الْعَجُوْزَ هٰذَا الْإِقْبَالَ؟ فَقَالَ: ((يَا عَائِشَةُ! إِنَّهَا كَانَتْ تَأْتِيْنَا زَمَانَ خَدِيْجَةَ وَإِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْإِيْمَانِ)) (۱)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عمر رسیدہ خاتون آئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بڑا اکرام اور استقبال کیا، ان کو عزت کے ساتھ بٹھایا، ان کی بڑی خاطر تواضع کی اور ان کی خیریت دریافت کی۔ جب وہ خاتون چلی گئیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے ان خاتون کے لیے بہت اکرام اور اہتمام فرمایا۔ یہ کون خاتون تھیں؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّهَا كَانَتْ تَأْتِيْنَا زَمَانَ خَدِيْجَةَ))

یہ خاتون اس وقت ہمارے گھر آیا کرتی تھیں جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حیات تھیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ان کا تعلق تھا، گویا کہ یہ ان کی سہیلی تھیں، اس لیے میں نے ان کا اکرام کیا۔ پھر فرمایا:

((وَإِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْإِيْمَانِ))

یعنی کسی کے ساتھ اچھی طرح نباہ کرنا بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/۹۸ تا ۱۰۶) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) کنز العمال، رقم:۳۷۷۶۸ (۱۳/۶۶۷)، شعب الإيمان للبيهقي، رقم:۹۱۲۲(۶/۵۱۷)

تعلقات نبھانے کی کوشش کرے

یعنی مومن کا کام یہ ہے کہ جب اس کا کسی کے ساتھ تعلق قائم ہو تو اب حتی الامکان اپنی طرف سے اس تعلق کو نہ توڑے، بلکہ اس کو نبھاتا رہے، چاہے طبیعت پر نبھانے کی وجہ سے گرانی بھی ہو، لیکن پھر بھی اس کو نبھاتا رہے، اور اس تعلق کو بدمزگی پر ختم نہ کرے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرے کہ اگر کسی کے ساتھ تمہاری مناسبت نہیں ہے تو اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا زیادہ نہ کرے، لیکن ایسا تعلق ختم کرنا کہ اب بول چال بھی بند، اور علیک سلیک بھی ختم، ملنا جلنا بھی ختم، ایک مومن کے لیے یہ بات مناسب نہیں۔

اپنے گزرے ہوئے عزیزوں کے متعلقین سے نباہ

اس حدیث میں ہمارے لیے دو سبق ہیں۔ پہلا سبق یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اپنے تعلق والوں سے نباہ کرنا چاہئے بلکہ اپنے وہ عزیز جو پہلے گزر چکے ہیں، مثلاً ماں باپ ہیں یا بیوی ہے، تو ان کے اہل تعلق سے بھی نباہ کرنا چاہئے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صاحب حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آکر عرض کیا کہ حضور میرے والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور میری طبیعت پر اس بات کا اثر ہے کہ میں زندگی میں ان کی خدمت نہیں کر سکا اور ان کی قدر نہ کر سکا اور جیسے حقوق ادا کرنا چاہئے تھے اس طرح حقوق ادا نہ کر سکا۔ (جو لوگ زندگی میں والدین کی خدمت نہیں کرتے ان کے دلوں میں اس قسم کی حسرت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ان صاحب کے دل میں بھی اس کی حسرت تھی، اس لیے عرض کیا کہ میرے دل میں اس کی شدید حسرت ہے اور اثر ہے) اب میں کیا کروں۔ جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اب تم یہ کرو کہ تمہارے والد کے جو دوست احباب ہیں اور جو ان کے تعلق والے اور ان کے قرابت دار ہیں، تم ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔(۱)

اس کے نتیجے میں تمہارے والد کی روح خوش ہوگی، اور تم نے اپنے والد کے اکرام اور حسن سلوک میں جو کوتاہی کی ہے، ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی درجے میں اس کی تلافی فرما دیں گے۔ لہٰذا والدین اور اہل تعلقات کے انتقال کے بعد ان کے اہل تعلقات سے نباہ کرنا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور ان سے ملتے جلتے رہنا یہ بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔ یہ نہیں کہ جو آدمی مر گیا تو وہ

---

(۱) سنن أبي داؤد، باب في بر الوالدين، رقم: ٥١٤٢

اپنے اہل تعلقات کو بھی ساتھ لے گیا بلکہ اس کے اہل تعلقات تو دنیا میں موجود ہیں، تم ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ دیکھئے! حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو انتقال ہوئے بہت عرصہ گزر چکا تھا لیکن اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خاتون کا اکرام فرمایا۔ اس کے علاوہ بعض احادیث میں آتا ہے کہ آپ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کے پاس ہدیے تحفے بھیجا کرتے تھے، صرف اس وجہ سے کہ ان کا تعلق حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تھا اور یہ ان کی سہیلیاں تھیں۔(۱)

تعلق کو نبھانا سنت ہے

اس حدیث میں دوسرا سبق وہ ہے جو حدیث کے الفاظ ''حسن العہد'' سے معلوم ہو رہا ہے۔ ''حسن العہد'' کے معنی ہیں، اچھی طرح نباہ کرنا، یعنی جب ایک مرتبہ کسی سے تعلق قائم ہو گیا تو حتی الامکان اس تعلق کو نبھاؤ اور جب تک ہو سکے اپنی طرف سے اس کو توڑنے سے پرہیز کرو۔ بالفرض اگر اس کی طرف سے تمہیں تکلیفیں بھی پہنچ رہی ہیں تو یہ سمجھو کہ دوسرے کے ساتھ تعلق کو نبھانا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، پھر سنت اور عبادت سمجھ کر اس تعلق کو نبھاؤ۔

حسن تعلق کا انوکھا واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہل تعلقات میں ایک صاحب تھے، ویسے تو بڑے نیک آدمی تھے۔ لیکن بعض لوگوں کی اعتراض کرنے کی طبیعت ہوتی ہے، وہ جب بھی کسی سے ملیں گے تو اس پر کوئی نہ کوئی اعتراض کر دیں گے اور کوئی طعنہ مار دیں گے، کوئی شکایت کر دیں گے۔ بعض لوگوں کا ایسا مزاج ہوتا ہے۔ ان صاحب کا بھی ایسا ہی مزاج تھا، چنانچہ لوگ اس معاملے میں ان سے پریشان رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی اس عادت کے مطابق خود میرے ساتھ ایسی بات کی کہ وہ میری برداشت سے باہر ہو گئی، وہ بات میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس وقت تو میں اس بات کو پی گیا۔ میرے دماغ میں اس وقت یہ بات آئی کہ یہ صاحب کچھ اپنے مرتبے اور کچھ اپنے مال و دولت کے گھمنڈ میں دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں، اور اسی وجہ سے انہوں نے مجھ سے ایسی بات کی ہے۔ چنانچہ گھر واپس آ کر میں نے ایک تیز خط لکھا اور اس خط میں یہ بات بھی لکھ دی کہ آپ کے مزاج میں یہ بات ہے، جس کے نتیجے میں لوگوں کو آپ سے شکایتیں رہتی ہیں۔ اور اب

(۱) صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خديجة أم المؤمنين رضى الله عنها، رقم: ٦٤٣١، كنز العمال رقم: ١٨٣٣٩ (١٣٠/٧)

آج آپ نے میرے ساتھ جو رویہ اختیار کیا، یہ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ اس لیے اب آئندہ میں آپ سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ خط لکھا۔

اپنی طرف سے تعلق مت توڑیں

لیکن چونکہ الحمدللہ میری عادت یہ تھی کہ جب کبھی کوئی ایسی بات سامنے آتی تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ضرور پیش کر دیتا تھا۔ چنانچہ وہ خط لکھ کر حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ کی خدمت میں پیش کیا اور ان کو سارا قصہ بھی سنایا کہ یہ بات ہوئی اور انہوں نے یہ رویہ اختیار کیا، اور اب یہ بات میری برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔ چونکہ اس وقت میری طبیعت میں ہیجان اور اشتعال تھا، اس لیے والد صاحب نے اس وقت تو وہ خط لے کر رکھ لیا اور فرمایا کہ اچھا پھر کسی وقت بات کریں گے۔ یہ کہہ کر ٹال دیا۔ جب پورا ایک دن گزر گیا تو حضرت والد صاحب نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ تمہارا خط رکھا ہوا ہے اور میں نے پڑھ لیا ہے، اس خط سے تمہارا کیا مقصد ہے؟ میں نے کہا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ اب یہ خط ان کو بھیج کر تعلقات ختم کر دیں۔ اس وقت حضرت والد صاحب نے ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ دیکھو کسی سے تعلق توڑنا ایسا کام ہے کہ جب چاہو کر لو، اس میں کسی انتظار کی یا وقت کی ضرورت نہیں، اس میں کوئی لمبا چوڑا کام نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن تعلق جوڑنا ایسا کام ہے جو ہر وقت نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا تمہیں اس کی جلدی کیا ہے کہ یہ خط ابھی بھیجنا ہے، ابھی کچھ دن اور انتظار کر لو اور دیکھ لو، البتہ اگر ان سے ملنے کا دل نہیں چاہتا تو ان کے پاس مت جاؤ، لیکن اس طرح خط لکھ کر باقاعدہ قطع تعلق کر لینا تو یہ اپنی طرف سے تعلق ختم کرنے کی بات ہوئی۔

تعلق توڑنا آسان ہے جوڑنا مشکل ہے

پھر فرمایا کہ تعلق ایسی چیز ہے کہ جب ایک مرتبہ قائم ہو جائے تو حتیٰ الامکان اس تعلق کو نبھاؤ۔ تعلق کو توڑنا آسان ہے جوڑنا مشکل ہے۔ اگر تمہاری طبیعت ان کے ساتھ نہیں ملتی تو یہ ضروری نہیں ہے کہ تم صبح و شام ان کے پاس جایا کرو بلکہ طبیعت نہیں ملتی تو مت جاؤ، لیکن جب تعلق قائم ہے تو اپنی طرف سے قطع کرنے کی کوشش نہ کرو۔ پھر ایک دوسرا خط نکال کر دکھایا جو خود لکھا تھا اور فرمایا کہ اب میں نے یہ دوسرا خط لکھا ہے، اس خط کو پڑھو اور اپنے خط کو پڑھو، تمہارا خط تعلقات کو ختم کرنے والا ہے، اور میرا خط پڑھو، میرے خط کے اندر بھی شکایت کا اظہار ہو گیا اور یہ بات بھی اس میں آ گئی کہ ان کا یہ طریقہ اور رویہ تمہیں ناگوار ہوا، معاملے کی بات پوری آ گئی لیکن اس خط نے تعلقات کو ختم نہیں

کیا۔ چنانچہ وہ خط لے کر میں نے پڑھا تو میرے خط میں اور حضرت کے خط میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ہم نے اپنے جذبات اور اشتعال میں آ کر وہ خط لکھ دیا تھا اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کی سنت کے مطابق بات نبھانے کے لیے اس طرح خط لکھا کہ شکایت اپنی جگہ ہوگئی اور ان کے جس طرز عمل سے ناگواری ہوئی تھی، اس کا بھی اظہار ہوگیا کہ آپ کی یہ بات ہمیں پسند نہیں آئی۔ لیکن آئندہ کے لیے قطع تعلق کی جو بات تھی وہ اس میں سے کاٹ دی۔

پھر فرمایا کہ دیکھو یہ پرانے تعلقات ہیں اور ان صاحب سے تعلق میرا اپنا ذاتی تعلق نہیں ہے بلکہ ہمارے والد صاحب کے وقت سے یہ تعلق چلا آ رہا ہے۔ ان کے والد صاحب سے ہمارے والد صاحب کا تعلق تھا۔ اب اتنے پرانے تعلق کو ایک لمحے میں کاٹ کر ختم کر دینا یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

عمارت ڈھانا آسان ہے، بنانا مشکل!

بہرحال، حضرت والد صاحب نے یہ جملہ جو ارشاد فرمایا تھا کہ تعلقات کو توڑنا آسان ہے جوڑنا مشکل ہے۔ یہ ایسا جملہ فرما دیا کہ آج یہ جملہ دل پر نقش ہے۔ ایک عمارت کھڑی ہوئی ہے، اس عمارت کو ڈھا دو، وہ عمارت دو دن کے اندر ختم ہو جائے گی۔ لیکن جب تعمیر کرنے لگو گے تو اس میں کئی سال خرچ ہو جائیں گے۔ لہٰذا کوئی بھی تعلق ہو اس کو توڑنا آسان ہے جوڑنا مشکل ہے۔ اس لیے تعلق توڑنے کے لیے پہلے ہزار مرتبہ سوچو۔ اس لیے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((وَاِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْاِيْمَانِ))

"اچھی طرح نبھاؤ کرنا یہ ایمان کا تقاضہ ہے"

اگر تعلقات سے تکلیف پہنچے تو؟

فرض کریں کہ اگر آپ کو تعلق کی وجہ سے دوسرے سے تکلیف بھی پہنچ رہی ہے تو یہ سوچو کہ تمہیں جتنی تکلیفیں پہنچیں گی، تمہارے درجات میں اتنا ہی اضافہ ہوگا، تمہارے ثواب میں اضافہ ہو گا۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی مؤمن کو ایک کانٹا بھی چبھتا ہے تو وہ کانٹا اس کے ثواب اور اس کے درجات میں اضافہ کرتا ہے۔ (۱)

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب المرضى، باب ما جاء في كفارة المرضى، رقم: ٥٢٠٩، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب ثواب المؤمن فيما يصيبه من مرض أو حزن أو نحو ذلك، رقم: ٤٦٦٤

لہٰذا اگر کسی سے تمہیں تکلیف پہنچ رہی ہے اور تم اس پر صبر کر رہے ہو تو اس صبر کا ثواب تمہیں مل رہا ہے، اور اگر حضور اقدس ﷺ کے اس ارشاد ((وَاِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْاِيْمَانِ)) پر عمل کرنے کی نیت ہے تو اس صورت میں اتباع سنت کا اور زیادہ ثواب تمہیں مل رہا ہے۔

تکالیف پر صبر کرنے کا بدلہ

لہٰذا یہاں جو تکلیفیں تمہیں پہنچ رہی ہیں وہ اس دنیا میں رہ جائیں گی، یہ تو تھوڑی دیر اور تھوڑے وقت کی ہیں لیکن اس کا جو اجر و ثواب تم اپنی قبر میں سمیٹ کر لے جاؤ گے اور جو اجر و ثواب اللہ تعالیٰ تمہیں آخرت میں عطا فرمائیں گے، وہ اجر و ثواب ان شاء اللہ ان تکلیفوں کے مقابلے میں اتنا زیادہ ہوگا کہ اس کے سامنے ان تکلیفوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے روز صبر کرنے والوں کو اپنی رحمتوں سے نوازیں گے اور ان کو صبر کا صلہ عطا فرمائیں گے تو جو لوگ دنیا میں آرام اور راحت سے رہے ہیں وہ تمنا کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالوں کو قینچیوں سے کاٹا گیا ہوتا اور اس پر ہم صبر کرتے اور ہمیں بھی اتنا ہی ثواب ملتا جتنا ان لوگوں کو مل رہا ہے۔(۱)

اس طرح لوگ حسرت کریں گے، اس لیے جو یہ تکلیفیں تھوڑی بہت پہنچ رہی ہیں ان کو برداشت کرلو۔

تعلق کو نباہنے کا مطلب

لیکن نباہ کرنے کے معنی سمجھ لینا چاہئے۔ نباہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حقوق ادا کرتے رہو اور اس سے تعلق ختم نہ کرو۔ لیکن نباہ کرنے کے لیے دل میں مناسبت کا پیدا ہونا اور اس کے ساتھ دل کا لگنا اور طبیعت میں کسی قسم کی الجھن کا باقی نہ رہنا ضروری نہیں۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ دن رات ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا باقی رہے اور ان کے ساتھ ہنسنا بولنا اور ملنا جلنا باقی رہے۔ نباہ کے لیے ان چیزوں کا باقی رکھنا ضروری نہیں بلکہ تعلقات کو باقی رکھنے کے لیے حقوق شرعیہ کی ادائیگی کافی ہے۔ لہٰذا آپ کو اس بات پر کوئی مجبور نہیں کرتا کہ آپ کا دل تو فلاں کے ساتھ نہیں لگتا لیکن آپ زبردستی اس کے ساتھ جا کر ملاقات کریں۔ یا آپ کی ان کے ساتھ محبت نہیں ہے تو اب کوئی اس پر مجبور نہیں کرتا

(۱) المعجم الكبير، رقم: ۸٦۸۹ (۸/٦٦)، الترغيب والترهيب، رقم: ۵۱۵۹ (۴/۱۴۲)، كنز العمال، رقم: ٦٦٦٠ (۳/۳۰۳)

کہ آپ طبیعت کے خلاف ان کے پاس جا کر بیٹھیں۔ بس صرف ان کے حقوق ادا کرتے رہیں اور قطع تعلق نہ کریں۔ بس ((وَاِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْاِيْمَانِ)) کے یہی معنی ہیں۔

یہ سنت چھوڑنے کا نتیجہ ہے

بہر حال، ہمارے آپس کے تعلقات میں دن رات لڑائیاں اور جھگڑے اٹھتے رہتے ہیں، وہ درحقیقت حضور اقدس ﷺ کی اس سنت کو چھوڑنے اور آپ کی ہدایات اور تعلیمات کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر ایک وہ حدیث جو پچھلے بیان میں پڑھی تھی اور ایک یہ حدیث جو آج پڑھی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم ان دونوں حدیثوں کو پلے باندھ لیں اور ان کی حقیقت سمجھ لیں اور ان پر عمل کر لیں تو ہمارے معاشرے کے بے شمار جھگڑے ختم ہو جائیں۔ وہ یہ کہ محبت کرو تو اعتدال سے کرو اور بغض کرو تو اعتدال سے کرو۔ شریعت کی ساری تعلیم یہ ہے کہ اعتدال سے کام لو اور کہیں بھی حد سے متجاوز نہ ہو جاؤ۔ اور یہ کہ جب کسی سے تعلق قائم ہو جائے تو اس تعلق کو نباہنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے مجھے اور آپ سب کو ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

خاندانی اختلافات کا پہلا حل

باہمی الفت ومحبت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ.

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّلٰوةِ وَالصَّدَقَةِ)) قَالُوْا: بَلٰى قَالَ: ((إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ الْحَالِقَةُ))(۱)

یہ حدیث حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ''حکیم ہذہ الامۃ'' کا لقب عطا فرمایا تھا یعنی یہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکیم ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ''حکمت'' عطا فرمائی تھی۔(۲)

سوال کے ذریعہ طلب پیدا کرنا

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا ''کیا میں تمہیں ایسا درجہ نہ بتاؤں جو نماز، روزے اور صدقے سے بھی افضل ہے؟''

یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز گفتگو تھا کہ جب کسی چیز کی اہمیت بیان کرنی منظور ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خود ہی سوال فرمایا کرتے تھے، تاکہ ان کے دل میں طلب پیدا ہو جائے۔ اگر دل میں

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/ ۱۷۰ تا ۲۰۴)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في إصلاح ذات البين، رقم: ۴۲۷۳، مسند أحمد، رقم: ۲۶۲۳۶، موطا مالك، كتاب الجامع، باب عن عائشة زوج النبي......، رقم: ۱۴۰۵

(۲) الإبانة الكبرى لابن بطة، رقم: ۹۸ (۱/ ۱۰۳)

طلب ہو تو اس وقت جو بات کہی جائے اس کا اثر بھی ہوتا ہے، اور اگر دل میں طلب نہ ہو تو کیسی بھی اچھی سے اچھی بات کہہ دی جائے، کیسا ہی اچھے سے اچھا نسخہ بتا دیا جائے، بہتر سے بہتر تعلیم دے دی جائے، ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ طلب بڑی چیز ہے۔

دین کی طلب پیدا کریں

اس لیے بزرگان دین نے فرمایا کہ انسان کی کامیابی کا راز اس میں ہے کہ انسان اپنے اندر دین کی طلب اور دین کی باتوں پر عمل کرنے کی طلب پیدا کر لے۔ جب یہ طلب پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ خود نواز دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے۔ اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

آب کم جو تشنگی آور بدست
تا بجوشد آب از بالا وپست

یعنی پانی کم تلاش کرو، پیاس زیادہ پیدا کرو، جب پیاس پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ پھر اوپر اور نیچے ہر طرف سے پانی جوش مارتا ہے۔ یہ طلب بڑی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کے دلوں میں پیدا فرما دے۔ آمین

''طلب'' بے چینی پیدا کرتی ہے

یہ ''طلب'' ہی وہ چیز ہے کہ جب ایک مرتبہ انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو پھر انسان کو چین لینے نہیں دیتی، بلکہ اس کو بیتاب رکھتی ہے، جب تک انسان کو مقصود حاصل نہ ہو جائے انسان کو چین نہیں آتا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جب انسان کو بھوک لگ جائے اور ''بھوک'' کے معنی ہیں ''کھانے کی طلب'' تو جب انسان کو بھوک لگی ہوئی ہو گی تو کیا انسان کو چین آئے گا؟ کسی دوسرے کام کو کرنے کا دل چاہے گا؟ جب کھانے کی طلب لگی ہوئی ہے تو آدمی کو اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک کہ اس کو کھانا نہ مل جائے۔ اگر انسان کو پیاس لگی ہوئی ہے تو ''پیاس'' کے معنی ہیں ''پانی کی طلب'' جب تک پانی نہیں مل جائے گا اس وقت تک چین نہیں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں ''دین'' کی بھی ایسی ہی طلب پیدا فرما دے، جب یہ طلب پیدا ہو جاتی ہے تو انسان کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک دین حاصل نہ ہو جائے بلکہ بے چینی لگی رہتی ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اور دین کی طلب

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی حال تھا کہ ان میں سے ہر شخص کو یہ بے چینی لگی ہوئی تھی کہ مرنے کے بعد میرا کیا انجام ہونا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، اس کے بعد یا جہنم ہے یا جنت ہے، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میرا انجام کیا ہونے والا ہے، اس بے چینی کا نتیجہ یہ تھا کہ صبح سے لے کر شام تک معمولی معمولی کاموں میں بھی فکر لگی ہوئی ہے کہ معلوم نہیں کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے مطابق ہے یا نہیں؟ کہیں اس کی وجہ سے میں جہنم کا مستحق تو نہیں ہوگیا۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو فکر آخرت

یہاں تک کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آکر عرض کیا:

"يَا رَسُولَ اللّٰهِ! نَافَقَ حَنْظَلَةُ"

"اے اللہ کے رسول! حنظلہ منافق ہوگیا"

اپنے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ میں تو منافق ہوگیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ کیسے منافق ہوگئے؟ انہوں نے فرمایا کہ جب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو اس وقت تو آخرت کی فکر لگی ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم کو اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں، اور اس کی وجہ سے دل میں رقت اور نرمی پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، لیکن جب آپ کی مجلس سے اٹھ کر بیوی بچوں کے پاس گھر جاتے ہیں تو اس وقت دل کی یہ کیفیت باقی نہیں رہتی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں تو منافق ہوگیا، اس لیے کہ آپ کے پاس ایک حالت ہوتی ہے اور گھر جا کر دوسری حالت ہو جاتی ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اطمینان دلایا اور فرمایا کہ اے حنظلہ! یہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔(۱)

کسی وقت انسان پر ایک حال کا غلبہ ہو جاتا ہے اور دوسرے وقت دوسری حالت کا غلبہ ہو جاتا ہے، اس لیے پریشان نہ ہوں، بلکہ جو کام اللہ تعالیٰ نے بتائے ہیں ان میں لگے رہو، ان شاء اللہ بیڑا پار ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ فکر کہ میں کہیں منافق تو نہیں ہوگیا، یہ آخرت کی طلب ہے جو بے چین کر رہی ہے۔

(۱) صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب فضل دوام الذكر والفكر..... رقم: ۴۹۳۷، سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۴۳۸، مسند أحمد، رقم: ۱۸۲۶۸

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور فکر آخرت

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اتنے بڑے جلیل القدر صحابی، خلیفہ ثانی، جن کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔(۱)

جن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس راستے سے عمر گزر جاتے ہیں، اس راستے سے شیطان نہیں گزرتا، شیطان راستہ بدل دیتا ہے۔(۲)

وہ عمر جن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جنت کے اندر تمہارا محل دیکھا ہے۔(۳)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تمام باتیں سننے کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو قسم دے کر پوچھتے ہیں کہ اے حذیفہ! خدا کے لیے یہ بتاؤ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کی جو فہرست تمہیں بتائی ہے، ان میں کہیں میرا نام تو نہیں ہے؟ یہ فکر اور طلب لگی ہوئی ہے۔

طلب کے بعد مدد آتی ہے

اور جب طلب لگ جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے عطا فرما ہی دیتے ہیں۔ اس لیے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

آب کم جو تشنگی آور بدست
تا بجوشد آب از بالا وپست

پانی تلاش کرنے سے زیادہ پیاس پیدا کرو، دل میں ہر وقت کھٹک اور بے چینی اور بیتابی لگی ہوئی ہو کہ مجھے صحیح بات کا علم ہو جائے، اور جب یہ طلب پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے عطا فرما ہی دیتے ہیں، ان کی سنت یہ ہے کہ کسی سچے طالب کو جس کے دل میں طلب صادق ہو آج تک اللہ تعالیٰ نے رد نہیں فرمایا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا یہ انداز تھا کہ آپ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم

(۱) سنن الترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب في مناقب عمر بن الخطاب، رقم: ٣٦١٩، مسند أحمد، رقم: ١٦٧٦٤

(۲) صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب مناقب عمر بن الخطاب أبي حفص القرشي العدوي، رقم: ٣٤٠٣، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر، رقم: ٤٤١٠

(۳) صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب مناقب عمر بن الخطاب أبي حفص القرشي العدوي، رقم: ٣٤٠٣، مسند أحمد، رقم: ١٣٣٦٩

میں پہلے طلب پیدا فرماتے تھے۔ اس لیے پہلے آپ نے ان سے سوال کیا کہ کیا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا اور اجر و ثواب کا ایسا درجہ نہ بتاؤں جو نماز سے بھی افضل، روزوں سے بھی افضل اور صدقہ سے بھی افضل ہو؟ یہ سوال کر کے ان کے اندر شوق اور طلب پیدا فرما رہے ہیں۔

نماز، قربِ خداوندی کا ذریعہ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور بتایئے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تو ہر وقت یہ دھن لگی ہوئی تھی کہ کون سی چیز ایسی ہے جو اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرنے والی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا عطا کرنے والی ہے۔ اور اب تک روزے کی نماز کی اور صدقے کی فضیلت سن چکے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز دین کا ستون ہے۔ (۱)

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے اور جتنے نوافل زیادہ پڑھتا ہے وہ اتنا ہی میرے قریب ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک درجہ ایسا آ جاتا ہے کہ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ (۲)

گویا کہ نوافل کی کثرت کے نتیجے میں وہ انسان اللہ تعالیٰ کے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس انسان کا سراپا اللہ تعالیٰ کی رضا کا مظہر بن جاتا ہے۔ صحابہ کرام نماز کی یہ فضیلت سن چکے تھے، اس لیے ان کے ذہنوں میں یہ تھا کہ نماز سے زیادہ افضل کیا چیز ہو گی۔

روزے کی فضیلت

روزے کی یہ فضیلت بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سن چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دوسری عبادتوں کا اجر تو میں نے مقرر کر دیا ہے کہ فلاں عبادت کا ثواب دس گنا، فلاں عبادت کا ثواب سو گنا اور فلاں عبادت کا ثواب سات سو گنا، لیکن روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((اَلصَّوْمُ لِیْ وَأَنَا أُجْزِیْ بِه)) (۳)

(۱) کنز العمال، رقم: ۱۸۸۸۹ (۲۸٤/۷)، شعب الإیمان للبیهقی، رقم: ۲۸۰۷ (۹۳/۳)

(۲) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، رقم: ٦٠٢١

(۳) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول الله تعالی یریدون أن یبدلوا کلام الله، رقم: ٦٩٣٨، صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام، رقم: ۱۹٤٦، سنن الترمذی، کتاب الصوم، باب ماجاء فی فضل الصوم، رقم: ٦٩٥، سنن النسائی، کتاب الصیام، باب فضل الصیام، رقم: ۲۱۸۱، مسند أحمد، رقم: ٤٠٣٦

''یہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا''

یعنی روزے کا جو اجر و ثواب میں عطا کرنے والا ہوں وہ تمہاری گنتی میں اور تمہارے پیمانوں میں اس اجر و ثواب کا تصور آ ہی نہیں سکتا، یہ روزہ چونکہ میرے لیے ہے، اس لیے اس کا اجر و ثواب بھی میں اپنی شان کے مطابق دوں گا، اپنی عظمت کے مطابق دوں گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روزے کی یہ فضیلت سن چکے تھے۔ اس لیے ان کے ذہنوں میں یہ تھا کہ روزہ بہت زیادہ افضل عبادت ہے۔

صدقہ کی فضیلت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صدقہ کی یہ فضیلت سن چکے تھے کہ اللہ کے راستے میں صدقہ کرنے سے سات سو گنا اجر و ثواب ملنا تو یقینی ہے اور یہ سات سو گنا ثواب بھی ہمارے حساب سے نہیں بلکہ جنت کے حساب سے ملنا ہے۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ سمجھتے تھے کہ صدقہ کرنا بہت افضل عبادت ہے۔

سب سے افضل عمل جھگڑے ختم کرانا

اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ کیا میں ایسی چیز نہ بتاؤں جو اس نماز سے بھی افضل ہے، اس روزے سے بھی افضل ہے، اس صدقہ کرنے سے بھی افضل ہے جن کی فضیلتیں تم نے سن رکھی ہیں؟ چنانچہ یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل میں شوق پیدا ہوا اور انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ چیز ضرور بتائیں تاکہ ہم وہ چیز حاصل کریں اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ہمیں ان عبادات سے بھی زیادہ ثواب عطا فرمادیں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((صَلَاحُ ذَاتِ الْبَیْنِ))

یعنی وہ چیز آپس میں صلح کرانا ہے، یعنی اگر دو مسلمانوں کے درمیان ناچاقی، اختلاف اور کٹاؤ ہوگیا ہے یا دو مسلمانوں کے درمیان جھگڑا کھڑا ہوگیا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں ہیں تو اب کوئی ایسا کام کرو جس کے نتیجے میں ان کے درمیان وہ جھگڑا ختم ہو جائے اور دونوں کے دل آپس میں مل جائیں اور دونوں ایک ہو جائیں۔ تمہارا یہ عمل نماز سے بھی افضل ہے، روزے سے بھی افضل ہے، صدقہ سے بھی افضل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ انداز بیان تھا۔

صلح کرانا نفل نماز روزے سے افضل ہے

لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ اس حدیث میں نماز روزے سے نفلی نماز روزے مراد ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر ایک طرف تم ساری رات نفلی نمازیں پڑھتے رہو، سارا دن نفلی روزے رکھو اور بہت سا مال نفلی صدقہ کرو، تو ان میں سے ہر کام بڑی فضیلت اور ثواب کا ہے لیکن دوسری طرف دو مسلمان بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہے، اور اس جھگڑے کی وجہ سے دونوں کے درمیان ناچاقی پیدا ہو گئی ہے، تو اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے اگر تم تھوڑا سا وقت صرف کرو گے اور ان کے دل اور گلے ملوا دو گے اور ان کے درمیان محبت پیدا کروا دو گے تو اس صورت میں تم نے جو ساری رات نفل نمازیں پڑھی تھیں، نفل روزے رکھے تھے اور سینکڑوں روپے نفل صدقہ کے طور پر دیئے تھے، ان سب سے زیادہ اجر و ثواب تمہیں اس عمل میں حاصل ہو جائے گا۔ آپ اندازہ کریں کہ کتنی بڑی بات حضور اقدس ﷺ نے بیان فرما دی۔

آپس کے اختلافات دین کو مونڈنے والے ہیں

ایک طرف تو یہ فرما دیا کہ مسلمانوں کے درمیان آپس میں محبتیں بھائی چارہ اور اخوت قائم کرنا تمام نفلی عبادتوں سے افضل ہے، اور دوسری طرف اگلا جملہ اس کے بالکل برعکس ارشاد فرما دیا:

((وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ ھِیَ الْحَالِقَةُ))

یعنی آپس کے جھگڑے، آپس کی نفرتیں اور ناچاقیاں یہ مونڈنے والی چیزیں ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں اس کی تشریح کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ آپس کے یہ جھگڑے تمہارے بالوں کو مونڈنے والے ہیں، بلکہ یہ جھگڑے تمہارے دین کو مونڈنے والے ہیں۔ کیونکہ جب آپس میں نفرتیں ہوتی ہیں اور جھگڑے ہوتے ہیں تو اس جھگڑے کی وجہ سے انسان نہ جانے کتنے بے شمار گناہوں کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے، ان جھگڑوں کے نتیجے میں ایک دوسرے کی غیبت ہوتی ہے، ایک دوسرے پر بہتان لگایا جاتا ہے، ایک دوسرے کی ایذاء رسانی ہوتی ہے، ایک دوسرے پر تہمتیں لگائی جاتی ہیں۔ تو یہ جھگڑے بے شمار گناہوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

جھگڑوں کی نحوست

ان جھگڑوں کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ انسان دین سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور دین کا نور جاتا رہتا ہے اور دل میں ظلمت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے جا بجا یہ تاکید فرمائی کہ آپس کے جھگڑوں سے بچو۔

مصالحت کے لیے آپ ﷺ کا جماعت چھوڑ دینا

دیکھیے! حضور اقدس ﷺ پوری حیات طیبہ میں مسجد نبوی میں امامت کے فرائض انجام دیتے رہے، ظاہر ہے کہ آپ کی موجودگی میں کون نماز پڑھائے گا، اور آپ ﷺ سے زیادہ کون نماز باجماعت کی پابندی کرے گا، لیکن پوری حیات طیبہ میں صرف ایک مرتبہ آپ ﷺ نماز کے وقت مسجد نبوی میں تشریف نہیں لا سکے، یہاں تک کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔ اور نماز کے وقت حاضر نہ ہونے کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ آپ ﷺ کو پتہ چلا کہ فلاں قبیلے میں مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا ہے، چنانچہ ان کے جھگڑے کو ختم کرانے کے لیے اور ان کے درمیان صلح کرانے کے لیے حضور اقدس ﷺ اس قبیلہ میں تشریف لے گئے، اس مصالحت کرانے میں دیر لگ گئی، یہاں تک کہ نماز کا وقت آ گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ موجود نہیں ہیں، تو اس وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے امامت فرمائی اور حضور اقدس ﷺ بعد میں تشریف لائے۔(۱)

پوری حیات طیبہ میں صرف یہ ایک واقعہ ہے کہ آپ ﷺ صحت کی حالت میں نماز کے وقت مسجد نبوی میں تشریف نہ لا سکے، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ لوگوں کے درمیان مصالحت کرانے اور جھگڑا ختم کرانے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اس لیے قرآن و حدیث ان ارشادات سے بھرے ہوئے ہیں کہ خدا کے لیے مسلمانوں کے درمیان جھگڑوں کو کسی قیمت پر برداشت نہ کرو، جہاں کہیں جھگڑے کا کوئی سبب پیدا ہو، فوراً اس کو ختم کرانے کی کوشش کرو، اور اس لیے کہ یہ جھگڑے دین کو مونڈ دینے والے ہیں۔

جنت کے بیچ میں مکان دلانے کی ضمانت

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَنَا زَعِيمٌ بِبَيْتٍ فِي رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌّ))(۲)

''میں اس شخص کے لیے جنت کے کنارے میں گھر دلوانے کی ضمانت لیتا ہوں جو

(۱) صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب رقم: ٤١٠، سنن النسائي، كتاب الطهارة، رقم: ٨١، سنن أبي داود، كتاب الطهارة، باب رقم: ١٢٨، مسند أحمد، رقم: ١٧٤٣٢، سنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب السنة فيمن سبق ببعض الصلاة، رقم: ١٣٠١،

(۲) سنن أبي داود كتاب الأدب، باب في حسن الخلق، رقم: ٤١٦٧

شخص حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے“

یعنی وہ شخص حق پر تھا اور حق پر ہونے کی وجہ سے اگر وہ چاہتا تو اپنے اس حق کو وصول کرنے کے لیے مقدمہ دائر کر دیتا، یا کوئی اور ایسا طریقہ اختیار کر لیتا جس کے نتیجے میں اس کو اس کا حق مل جاتا، لیکن اس نے یہ سوچ کر کہ جھگڑا بڑھے گا اور جھگڑا بڑھانے سے کیا فائدہ، لہٰذا اپنا حق ہی چھوڑ دیا۔ ایسے شخص کے لیے آپ نے فرمایا کہ میں اس کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں۔ اتنی بڑی بات سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

یہ ضمانت دوسرے اعمال پر نہیں

یہ ذمہ داری حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دوسرے عمل پر نہیں لی لیکن حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑنے والے کے لیے یہ ذمہ داری لے رہے ہیں۔ اس کے ذریعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ آپس کے اختلافات ختم کر دو، اللہ کے بندے بن جاؤ اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ، اور جھگڑے کے جو جو اسباب ہو سکتے ہیں، ان کو بھی ختم کرو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے وحدت میں اخوت میں اور محبت میں ایک نور رکھا ہے، اس نور کے ذریعے انسان کی دنیا بھی روشن ہوتی ہے اور آخرت بھی روشن ہوتی ہے، اور اگر آپس میں جھگڑے ہوں، فساد ہوں تو یہ ظلمت ہے، دنیا میں بھی ظلمت اور آخرت میں بھی ظلمت، جو انسان کے دین کو مونڈ کر رکھ دیتی ہے۔

قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَ الْمَقْتُوْلُ كِلَاهُمَا فِي النَّارِ))

اگر دو مسلمان تلوار کے ذریعہ ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کھڑے ہو جائیں اور آپس میں لڑائی کرنا شروع کر دیں تو اگر ان میں سے ایک دوسرے کو قتل کر دے گا تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! قاتل تو جہنم میں جائے گا کیونکہ اس نے ایک مسلمان کو ناحق قتل کیا، لیکن مقتول جہنم میں کیوں جائے گا؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

((إِنَّهُ كَانَ حَرِيْصاً عَلَى قَتْلِ صَاحِبِه))(۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا، رقم: ۳۰، سنن النسائی، کتاب تحریم الدم، باب تحریم القتل، رقم: ۴۰۵۱

کیونکہ یہ مقتول بھی اپنے مدمقابل کو مارنے کے ارادے سے چلا تھا، اسی لیے تلوار اٹھائی تھی کہ اگر میرا داؤ چل گیا تو میں ماردوں گا، لیکن اتفاق سے داؤ اس کا نہیں چلا بلکہ دوسرے کا داؤ چل گیا، اس لیے یہ مقتول بن گیا اور وہ قاتل بن گیا، اس وجہ سے یہ بھی جہنم میں وہ بھی جہنم میں۔ اس لیے فرمایا کہ کسی مسلمان کے ساتھ لڑائی کا معاملہ ہرگز نہ کرو۔

حبشی غلام حاکم کی اتباع کیجیے

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی حبشی غلام بھی تم پر حاکم بن کر آجائے تو اس کے خلاف بھی تلوار مت اٹھاؤ، جب تک وہ کفر کا ارتکاب نہ کرے، کیونکہ اگر تم اس کے خلاف تلوار اٹھاؤ گے تو کوئی تمہارا ساتھ دے گا اور کوئی دوسرے کا ساتھ دے گا، اس کے نتیجے میں مسلمان دو گروہ میں تقسیم ہو جائیں گے اور ان کے درمیان منافرت پیدا ہو جائے گی، اور مسلمانوں کے درمیان افتراق، انتشار اور نا چاقی کو حضور اقدس ﷺ نے کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں فرمایا۔ آپ نے فرمادیا:

((كُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا))

''اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ''(۱)

آج زندگی جہنم بنی ہوئی ہے

جب ہمارے ذہنوں میں عبادت کا خیال آتا ہے تو نماز روزے کا تو خیال آتا ہے، صدقہ کا خیال آتا ہے، ذکر اور تسبیح کا خیال آتا ہے، تلاوتِ قرآن کریم کا خیال آتا ہے، اور الحمدللہ یہ سب بھی اونچے درجے کی عبادتیں ہیں، لیکن سرکار دو عالم ﷺ فرمار ہے ہیں کہ ان سے بھی اونچے درجے کی چیز مسلمانوں کے درمیان آپس میں صلح کرانا ہے۔ اور آج ہمارا معاشرہ حضور اقدس ﷺ کے اس ارشاد سے اتنا دور چلا گیا ہے کہ قدم قدم پر منافرت ہے، جھگڑے اور لڑائیاں ہیں، نا اتفاقیاں ہیں، اور اس کی وجہ سے زندگی جہنم بنی ہوئی ہے، حالانکہ آپ نے یہ فرمادیا کہ یہ چیز دین کو مونڈنے والی

(۱) صحيح البخاری، كتاب الأدب، باب ما ينهى عن التى سدوالتدابر، رقم: ٥٦٠٤، صحيح مسلم، كتاب البروالصلة والآداب، باب تحريم التحاسد والتباغض والتدابر، رقم: ٤٦٤١، سنن الترمذی، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ماجاء فی الحسد، رقم: ١٨٥٨، سنن أبی داود، كتاب الأدب، باب فی من يهجرا خاه المسلم، رقم: ٤٢٦٤، سنن ابن ماجه، كتاب الدعاء باب الدعاء بالعفو والعافية، رقم: ٣٨٣٩، مسند أحمد: ١٧

ہے، اس نے آج ہمارے دین کو مونڈ ڈالا ہے، جس کی وجہ سے اس کی شناعت، قباحت اور اس کی برائی ہمارے دلوں میں بیٹھی ہوئی نہیں ہے۔

لوگوں کے درمیان اختلاف ڈالنے والے کام

اگر ہمارے معاشرے میں کوئی بے نمازی ہے یا کوئی شراب پیتا ہے یا کسی اور گناہ میں مبتلا ہے، تو اس کو تو ہمارے معاشرے میں الحمدللہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص برا کام کر رہا ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایسا کام کر رہا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان لڑائیاں ہو رہی ہیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان جھگڑے ہو رہے ہیں، تو اس کی طرف سے کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ اتنا بڑا مجرم ہے جتنا سرکار دو عالم ﷺ اس کو مجرم قرار دے رہے ہیں، اور اس بات کی فکر بھی کسی کے دل میں نہیں ہے کہ ان جھگڑوں کو کیسے ختم کیا جائے؟ لہٰذا یہ بہت بڑا باب ہے جو حضور اقدس ﷺ نے کھولا اور آپس میں صلح کرانے کو نماز روزے اور صدقے سے بھی افضل قرار دیا۔

ایسا شخص جھوٹا نہیں

یہاں تک کہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمادیا:

((لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِي يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ وَيَقُوْلُ خَيْرًا وَيَنْمِي خَيْرًا))(۱)

یعنی جو شخص ایک مسلمان بھائی کے دل میں دوسرے کی محبت پیدا کرنے کے لیے اور نفرت دور کرنے کے لیے کوئی ایسی بات کہہ دے جو بظاہر خلافِ واقعہ ہو، تو وہ جھوٹ بولنے والوں میں شمار نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک شخص کو معلوم ہوا کہ فلاں دو مسلمان بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں، یہ شخص چاہتا ہے کہ دونوں کے درمیان محبت ہو جائے، اب اگر یہ شخص جا کر ان میں سے کسی سے ایسی بات کہہ دے جو بظاہر خلافِ واقعہ ہے، مثلاً یہ کہہ دے کہ آپ تو فلاں سے اتنی نفرت کرتے ہیں لیکن وہ تو آپ سے محبت کرتا ہے، وہ تو آپ کے حق مین دعا کرتا ہے، میں نے اس کو آپ کے حق میں دعا کرتے دیکھا ہے۔

اب اگرچہ اس کا نام لے کر دعا کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، لیکن دل میں یہ نیت کر لی کہ وہ یہ دعا تو کرتا ہی ہوگا:

(۱) صحیح مسلم، كتاب البر والصلة والأدب، باب تحريم الكذب وبيان المباح منه، رقم: ٤٧١٧، مسند أحمد، رقم: ٢٦٠١١

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾(۱)

جس کے معنی یہ ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو دنیا میں بھی اچھائی عطا فرما اور آخرت میں بھی اچھائی عطا فرما۔ لفظ ''ہم'' میں سارے مسلمان داخل ہو گئے۔

ہر مسلمان کے لیے دعا

اسی طرح کہنے والے نے یہ نیت کر لی کہ یہ نماز میں ''التحیات'' تو پڑھتا ہے اور ''التحیات'' میں یہ الفاظ ہیں ''السلام علینا و علی عباداللہ الصالحین'' ان الفاظ میں وہ تمام مسلمانوں کے لیے سلامتی کی دعا کرتا ہے، اسی طرح نماز کے آخر میں سلام پھیرتے وقت کہتا ہے: ''السلام علیکم و رحمۃ اللہ''، ''السلام علیکم'' کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ! ان پر سلامتی نازل فرما۔ اور فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ جب آدمی نماز کے آخر میں دائیں طرف سلام پھیرے تو سلام پھیرتے وقت یہ نیت کر لے کہ دائیں طرف جتنے ملائکہ، جنات اور مسلمان ہیں ان سب کے لیے سلامتی کی دعا کرتا ہوں، اور جب بائیں طرف سلام پھیرے تو یہ نیت کر لے کہ بائیں طرف جتنے ملائکہ، جنات اور مسلمان ہیں، ان سب کے لیے سلامتی کی دعا کرتا ہوں۔

لہٰذا اس نیت کے ساتھ اگر دوسرے مسلمان سے یہ کہہ دے کہ فلاں تو تمہارے حق میں دعا کرتا ہے، تو سامنے والے کے دل میں اس کی قدر پیدا ہو گی کہ میں تو اس کو برا سمجھتا تھا لیکن وہ تو میرے حق میں دعا کرتا ہے، لہٰذا مجھے اس سے دشمنی نہیں رکھنی چاہئے۔

بلکہ بعض فقہاء نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا کہ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے صریح جھوٹ بھی بولنا پڑے تو صریح جھوٹ بولنا بھی جائز ہے، اگر اس کے نتیجے میں دو دل مل رہے ہوں۔ بہر حال، آپس کے اختلافات کی خرابی اتنی زیادہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے یہاں تک فرما دیا کہ ایسے حالات میں خلافِ واقعہ بات کہہ دینا بھی جائز ہے جس سے دوسرے کے دل میں قدر و محبت اور منزلت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا جہاں کہیں موقع ملے تو آپس میں صلح کرانے کے عظیم درجے اور عظیم ثواب کو حاصل کر لو۔ کہاں تم ساری رات تہجد پڑھو گے، کہاں تم ساری عمر روزے رکھو گے، کہاں تم سارا مال صدقہ کرو گے، لیکن اگر تم نے مسلمانوں کے درمیان اتفاق اور اتحاد اور محبت پیدا کرانے کی کوشش کر لی تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے بھی آگے کا درجہ عطاء فرما دیں گے۔

بعض لوگ بالکل اس کے الٹ ہوتے ہیں، ان کو دو ملے ہوئے دل کبھی اچھے نہیں لگتے،

---

(۱) البقرۃ:۲۰۱

جہاں کہیں دیکھا کہ فلاں دو شخصوں میں محبت ہے تو وہ ان کے درمیان ایسا شوشہ چھوڑ دیتے ہیں جس سے دونوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یاد رکھیے! اس سے زیادہ بدترین گناہ کوئی اور نہیں ہے۔

ابلیس کا صحیح جانشین کون؟

ابلیس نے اپنے چھوٹے شیاطین کی ایک فوج بنا رکھی ہے جو پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور وہ لوگوں کو صحیح راستے سے بہکانے کا کام کرتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ ابلیس بعض اوقات سمندر پر اپنا دربار منعقد کرتا ہے اور ان سے رپورٹ طلب کرتا ہے اور اس کی تمام فوج اس کو اپنی اپنی کارگزاری سناتی ہے۔ چنانچہ ایک شیطان آ کر کہتا ہے کہ ایک شخص نماز پڑھنے جا رہا تھا، میں نے اس کے دل میں ایسی بات ڈالی کہ وہ نماز کے لیے نہ جا سکا اور اس کی نماز قضا ہوگئی، میں نے اس کو نماز سے محروم کر دیا، ابلیس اس کو شاباش دیتا ہے کہ تم نے اچھا کام کیا۔ دوسرا شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک شخص روزہ رکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، میں نے اس کے دل کو ایسا پلٹا کہ وہ روزے سے باز آ گیا، ابلیس اس کو شاباش دیتا ہے کہ تم نے اچھا کام کیا۔ اس کے بعد تیسرا شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں شخص صدقہ خیرات کرنا چاہتا تھا، میں نے اس کے حالات ایسے پیدا کر دیئے کہ وہ صدقہ کرنے سے رک گیا، ابلیس اس کو بھی شاباش دیتا ہے کہ تم نے اچھا کام کیا۔ آخر میں ایک شیطان آ کر کہتا ہے کہ دو میاں بیوی بڑی محبت سے زندگی گزار رہے تھے، میں نے جا کر ان کے درمیان ایسا مسئلہ کھڑا کر دیا کہ دونوں کے درمیان ناچاقی ہوگئی اور دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہ رہے، یہاں تک کہ دونوں کے درمیان جدائی ہوگئی، ابلیس یہ سن کر اپنے تخت سے کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کو گلے سے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو میرا صحیح جانشین ہے، تو نے صحیح کام کیا اور میرے مطلب کے مطابق کام کیا۔(۱)

نفرتیں ڈالنے والا بڑا مجرم ہے

بہرحال، شیطان کا سب سے بڑا حربہ اور سب سے کامیاب ترین منصوبہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں نفرتیں پیدا کرے۔ لہٰذا جن لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ اچھے خاصے رہتے بستے لوگوں کے درمیان اور محبت کرنے والے دوستوں کے درمیان منافرت پیدا کر دیتے ہیں، اور ادھر کی

(۱) صحیح مسلم، کتاب صفة القيامة والجنة والنار، باب تحريش الشيطان وبعثه سراياه لفتنة الناس، رقم: ۵۰۳۲، مسند أحمد، رقم: ۱۳۸۵۸

بات ادھر لگا دیتے ہیں، لگاوا جوئی شروع کر دیتے ہیں، اس حدیث کی رو سے وہ بہت خطرناک جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں، نماز روزے سے روک دینا بھی شیطانی عمل ہے۔ لیکن یہ ایسا شیطانی عمل ہے کہ ابلیس اس سے بہت خوش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ لہٰذا اس سے بچنے کی فکر کرنی چاہئے۔

جھگڑوں سے کیسے بچیں؟

اب سوال یہ ہے کہ ان جھگڑوں سے کیسے بچیں اور آپس میں محبتیں کیسے پیدا ہوں، اور یہ آپس کے اختلافات کیسے ختم ہوں؟ اس کے لیے حضور اقدس ﷺ نے امت کو بڑی باریک بینی سے ہدایات عطا فرمائی ہیں۔ ان ہدایات میں سے ایک ایک ہدایت آپس میں محبت کو پیدا کرنے والی ہے اور آپس کے جھگڑوں کو ختم کرنے والی ہے۔ لیکن ان ہدایات کے بیان سے پہلے ایک اصولی بات سمجھ لیں:

جھگڑے ختم کرنے کی ایک شرط

اصولی بات یہ ہے کہ آپس کے جھگڑے ختم کرنے اور آپس میں محبت پیدا کرنے اور آپس میں اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے کی ایک خاص شرط ہے، جب تک وہ شرط نہیں پائی جائے گی، اس وقت تک جھگڑے دور نہیں ہوں گے۔ آج ہر طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد ہونا چاہئے، جھگڑے ختم ہونے چاہئیں، اور حتیٰ کہ جو لوگ جھگڑوں کا بیج بونے والے ہیں وہ بھی اتفاق اور اتحاد کا نعرہ لگاتے ہیں، لیکن پھر بھی اتحاد اور اتفاق قائم نہیں ہوتا، کیوں اتحاد قائم نہیں ہوتا؟ اس کے بارے میں ایک مرد درویش کی بات سن لیجیے، جس نے اس بیماری کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ کر اس بیماری کی تشخیص کی ہے۔ اور مرض کی صحیح تشخیص ہمیشہ اللہ والے ہی کرتے ہیں، کیونکہ ہر بیماری کی صحیح تشخیص اور اس کا صحیح علاج اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے قلوب پر ہی وارد فرماتے ہیں۔

حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر

ہمارے سید الطائفہ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ، جو ہمارے شیخ کے شیخ کے شیخ ہیں۔ اگر ان کے کوائف پوچھو تو وہ کسی مدرسے کے فارغ التحصیل بھی نہیں، باقاعدہ ضابطہ سند یافتہ عالم بھی نہیں، صرف کافیہ اور قدوری تک کتابیں پڑھے ہوئے تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے پر معرفت کے دروازے کھولتے ہیں تو ہزار علم و تحقیق کے شناور اس کے

آگے قربان ہو جاتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے علم کے پہاڑ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ علم کے پہاڑ بھی اپنی تربیت کے لیے، اپنے تزکیے کے لیے اور اپنے اخلاق کو درست کرانے کے لیے ان کے پاس جا کر زانوئے تلمذ طے کر رہے ہیں۔

اتحاد کے لیے دو شرطیں، تواضع اور ایثار

انہوں نے یہ عقدہ کھولا کہ جب سب لوگ اتحاد اور اتفاق کی کوشش کر رہے ہیں، اس کے باوجود اتحاد کیوں قائم نہیں ہو رہا ہے؟ اس کے جواب میں جو حکیمانہ بات حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمائی ہے، میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر اس بات کو ہم لوگ پلے باندھ لیں ہمارے معاشرے کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ فرمایا کہ

> ''اتحاد و اتفاق کا بنیادی راستہ یہ ہے کہ اپنے اندر دو چیزیں پیدا کرو، اگر یہ دو چیزیں پیدا ہو گئیں تو اتحاد قائم ہو جائے گا اور اگر ان میں سے ایک چیز بھی مفقود ہوئی تو کبھی اتحاد قائم نہیں ہوگا، وہ دو چیزیں یہ ہیں ایک تواضع، دوسرا ایثار''

''تواضع'' کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو یوں سمجھے کہ میری کوئی حقیقت نہیں، میں تو اللہ کا بندہ ہوں اور بندہ ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہوں، اور اپنی ذات میں میرے اندر کوئی فضیلت نہیں، میرا کوئی حق نہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص میری حق تلفی کرتا ہے تو وہ کون سا برا کام کرتا ہے، میں تو حق تلفی کا ہی مستحق ہوں۔

اتحاد میں رکاوٹ ''تکبر''

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اتحاد اس لیے قائم نہیں ہوتا کہ ہر آدمی کے دل میں تکبر ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں بڑا ہوں، میرے فلاں حقوق ہیں، فلاں نے میری شان کے خلاف یہ بات کی ہے، فلاں نے میرے درجے کے خلاف کام کیا ہے، میری حق تلفی کی ہے، میرا حق یہ تھا کہ وہ میری تعظیم کرتا، لیکن اس نے میری تعظیم نہیں کی، میں اس کے گھر گیا، اس نے میری خاطر تواضع نہیں کی، اس تکبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ جھگڑا کھڑا ہو گیا۔

تکبر کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھا اور بڑا سمجھنے کے نتیجے میں اپنے لیے کچھ حقوق گھڑ لیے اور یہ سوچا کہ میرے درجے کا تقاضہ تو یہ تھا کہ فلاں شخص میرے ساتھ ایسا سلوک کرتا، جب دوسرے نے ایسا سلوک نہیں کیا تو اب دل میں شکایت ہو گئی، اور اس کے نتیجے میں گرہ بیٹھ گئی اور اس کے بعد

نفرت پیدا ہو گئی اور اس کے بعد اس کے ساتھ معاملات خراب کرنا شروع کر دیئے۔ لہٰذا جھگڑے کی بنیاد ''تکبر'' ہے۔

راحت والی زندگی کے لیے بہترین نسخہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں تمہیں لذیذ اور راحت والی زندگی کا ایک نسخہ بتاتا ہوں، اگر تم اس نسخہ پر عمل کر لو گے تو پھر ان شاء اللہ کسی کی طرف سے دل میں کوئی شکوہ شکایت اور گلہ پیدا نہیں ہو گا۔ وہ یہ کہ دل میں یہ سوچ لو کہ یہ دنیا خراب چیز ہے اور اس کی اصل وضع ہی تکلیف پہنچانے کے لیے ہے، لہٰذا اگر مجھے کسی انسان یا جانور سے تکلیف پہنچتی ہے تو یہ تکلیف پہنچنا دنیا کی تخلیق فطرت کے عین مطابق ہے، اور اگر دنیا میں کسی کی طرف سے تمہیں اچھائی پہنچے تو اس پر تمہیں تعجب کرنا چاہئے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

اچھی توقعات وابستہ نہ کریں

لہٰذا دنیا میں کسی بھی اپنے ملنے جلنے والے سے، چاہے وہ دوست ہو، یا رشتہ دار ہو، یا قریبی عزیز ہو، کسی سے اچھائی کی توقع قائم نہ کرو کہ یہ مجھے کچھ دے گا، یا یہ مجھے کچھ نفع پہنچائے گا، یا یہ میری عزت کرے گا، یہ میری مدد کرے گا، کسی بھی مخلوق سے کسی بھی قسم کی توقع قائم نہ کرو، اور جب کسی مخلوق سے نفع کی کوئی توقع نہیں ہو گی، پھر اگر کسی مخلوق نے کوئی فائدہ پہنچا دیا اور تمہارے ساتھ اچھا سلوک کر لیا تو اس سے تمہیں خوشی ہو گی، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یا اللہ! آپ نے اپنے فضل سے اس کے دل میں بات ڈال دی جس کے نتیجے میں اس نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

دشمن سے شکایت نہیں ہوتی

اور اگر کسی مخلوق نے تمہارے ساتھ بدسلوکی کی، تو اس سے تکلیف نہیں ہو گی، کیونکہ پہلے ہی سے اس سے کوئی اچھی توقع نہیں تھی۔ دیکھئے! اگر کوئی دشمن تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو اس سے تمہیں کوئی شکایت ہوتی ہے؟ نہیں ہوتی، کیونکہ وہ تو دشمن ہی ہے، اس کا کام ہی تکلیف پہنچانا ہے۔ اس لیے اس کے تکلیف پہنچانے سے زیادہ صدمہ اور رنجش نہیں ہوتی، شکوہ اور گلہ نہیں ہوتا، شکوہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب کسی سے اچھائی کی توقع تھی، لیکن اس نے برائی کر لی۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ساری مخلوق سے توقع مٹا دو۔

صرف ایک ذات سے توقع رکھیں

توقع تو صرف ایک ذات سے قائم کرنی چاہئے، اسی سے مانگو، اسی سے توقع رکھو، اسی سے امید رکھو، باقی ساری دنیا سے امیدیں قطع کردو، صرف اللہ جل جلالہ سے امیدیں وابستہ کرلو۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ یہ دعا مانگا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ رَجَاءَكَ، وَاقْطَعْ رَجَائِيْ عَنْ مَّنْ سِوَاكَ)) (۱)

''اے اللہ! میرے دل میں اپنی امید ڈال دیجئے اور میری امیدیں اپنے سوا ہر ایک مخلوق سے ختم کردیجئے''

اتحاد کی پہلی بنیاد ''تواضع''

اور جب انسان کے اندر تواضع ہوگی تو وہ اپنا حق دوسروں پر نہیں سمجھے گا کہ میرا کوئی حق دوسرے کے ذمے ہے، بلکہ وہ تو یہ سمجھے گا کہ میں تو اللہ کا بندہ ہوں، کوئی مقام اور کوئی درجہ نہیں، اللہ تعالیٰ جو معاملہ میرے ساتھ فرمائیں گے میں اس پر راضی ہوں۔ جب دل میں یہ تواضع پیدا ہوگی تو دوسرے سے توقع بھی قائم نہیں ہوگی۔ جب توقع نہیں ہوگی تو پھر دوسرے سے شکوہ شکایت بھی نہیں ہوگی، اور جب شکوہ نہیں ہوگا تو جھگڑا بھی پیدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا اتفاق اور اتحاد کی پہلی بنیاد ''تواضع'' ہے۔

اتحاد کی دوسری بنیاد ''ایثار''

اتفاق اور اتحاد کی دوسری بنیاد ''ایثار'' ہے۔ یعنی مخلوق خدا کے ساتھ ایثار کا رویہ اختیار کرو۔ ''ایثار'' کے معنی یہ ہیں کہ دل میں یہ جذبہ ہو کہ میں اپنی راحت کی قربانی دے دوں اور اپنے مسلمان بھائی کو راحت پہنچا دوں۔ میں خود تکلیف اٹھالوں لیکن اپنے مسلمان بھائی کو تکلیف سے بچالوں۔ خود نقصان اٹھالوں لیکن اپنے مسلمان بھائی کو نفع پہنچا دوں۔ یہ ایثار کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرلو۔

اس نفع و ضرر کی دنیا میں
یہ ہم نے لیا ہے درسِ جنوں
اپنا تو زیاں تسلیم مگر
اوروں کا زیاں منظور نہیں

---

(۱) مختصر تاریخ دمشق (۱/۸۹۵)

اپنا نقصان کر لینا منظور ہے، لیکن اوروں کا نقصان منظور نہیں۔ یہی وہ سبق ہے جو نبی کریم ﷺ نے عطا فرمایا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ایثار

اور قرآن کریم نے انصاری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایثار کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾(۱)

یعنی یہ انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے ہیں کہ چاہے سخت تنگدستی اور مفلسی کی حالت ہو، لیکن اس حالت میں بھی دوسروں کے لیے ایثار کرتے ہیں۔ کیسے کرتے ہیں؟ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں کچھ مسافر آ گئے جو تنگدست تھے۔ ایسے موقع پر حضور اقدس ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرماتے کہ کچھ مہمان باہر سے آ گئے ہیں جو تنگدست ہیں، لہٰذا جن کو استطاعت ہو وہ اپنے ساتھ مہمان کو لے جائیں اور ان کے کھانے کا بندوبست کر دیں۔

ایک صحابی کا ایثار

چنانچہ اس موقع پر یہ ارشاد سن کر ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ ایک مہمان کو اپنے گھر لے گئے، گھر جا کر بیوی سے پوچھا کہ کھانا ہے؟ مہمان آئے ہیں۔ بیوی نے جواب دیا کہ اتنا کھانا نہیں ہے کہ مہمان کو بھی کھلا سکیں، یا تو مہمان کھائیں گے یا ہم کھائیں گے، سب نہیں کھا سکتے۔ ان صحابی نے فرمایا کہ کھانا مہمان کے سامنے رکھ دو اور چراغ بجھا دو، چنانچہ بیوی نے کھانا مہمان کے سامنے رکھ دیا اور چراغ بجھا دیا، ان صحابی نے مہمان سے کہا کہ کھانا کھایئے، مہمان نے کھانا شروع کیا اور یہ صحابی ان کے ساتھ بیٹھ گئے، لیکن کھانا نہیں کھایا بلکہ اپنا خالی ہاتھ کھانے تک لے جاتے اور منہ تک لاتے، تاکہ مہمان یہ سمجھے کہ کھانا کھا رہے ہیں، حقیقت میں وہ خالی ہاتھ چلا رہے تھے۔ چنانچہ میاں بیوی اور بچوں نے رات بھوک میں گزاری اور مہمان کو کھانا کھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ انداز اتنا پسند آیا کہ قرآن کریم میں اس کا بیان فرما دیا:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾(۲)

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے خود ان پر تنگدستی کی حالت

---

(۱) الحشر: ۹

(۲) الحشر: ۹

ہو۔ خود بھوکا رہنا گوارا کر لیا، لیکن دوسرے کو راحت پہنچادی اور اس کو کھانا کھلا دیا۔

ایثار کا مطلب

لہٰذا ایثار یہ ہے کہ اپنے اوپر تھوڑی سی تکلیف برداشت کرلے، لیکن اپنے مسلمان بھائی کا دل خوش کر دے۔ یاد رکھیے! جس کو اللہ تعالیٰ یہ صفت عطا فرماتے ہیں، اس کو ایمان کی ایسی حلاوت عطا فرماتے ہیں کہ دنیا کی ساری حلاوتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ جب انسان اپنی ذات پر تنگی برداشت کر کے دوسرے مسلمان بھائی کو خوش کرتا ہے اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ لاتا ہے تو اس کو جو لذت ہے اس کے آگے دنیا کی ساری لذتیں ہیچ ہیں۔ یہ دنیا معلوم نہیں کتنے دن کی ہے، پتہ نہیں کب بلاوا آجائے، بیٹھے بیٹھے آدمی رخصت ہو جاتا ہے، اس لیے ایثار پیدا کرو، جب ایثار پیدا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے دلوں میں محبتیں پیدا فرما دیتے ہیں، اور ایثار کرنے والے کو اپنی نعمتوں سے نوازتے ہیں۔

ایک شخص کی مغفرت کا واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ پچھلی امتوں میں ایک شخص تھا، جب اس کا انتقال ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوا تو اس کے نامہ اعمال میں کوئی بڑی عبادت نہیں تھی، اللہ تعالیٰ نے نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں سے پوچھا کہ اس کے اعمال نامے میں کوئی نیکی ہے یا نہیں؟ فرشتوں نے جواب دیا کہ اس کے اعمال نامے میں کوئی بڑی نیکی تو نہیں ہے، البتہ ایک نیکی اس کی یہ ہے کہ جب کسی سے کوئی مال خریدتا تو مال بیچنے والے سے جھگڑتا نہیں تھا، بس جو پیسے اس نے بتا دیئے، اس سے تھوڑا کم کرایا اور مال خرید لیا۔

((سَهْلاً اِذَا بَاعَ، سَهْلاً اِذَا اشْتَرٰی))(۱)

اور جب مال بیچنے جاتا تو اس میں بھی نرمی کرتا اس پر ضد نہیں کرتا تھا کہ بس میں اتنے پیسے لوں گا، بلکہ جب یہ دیکھا کہ خریدنے والا غریب ہے تو پیسے کم کر دیئے۔ اسی طرح اگر اس کا قرضہ دوسرے پر ہوتا اور وہ دیکھتا کہ یہ اپنا قرضہ ادا نہیں کر پا رہا ہے تو اس کو معاف کر دیتا تھا۔

بس اس کی صرف یہ نیکی نامہ اعمال میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب یہ میرے بندوں کو

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله، باب ماجاء فی استقراض البیر......، رقم: ۱۲۴۱، مسند أحمد، رقم: ۱۴۱۳۱

قرض معاف کر دیتا تھا تو میں اس بات کا زیادہ مستحق ہوں کہ اس کو معاف کر دوں، لہٰذا میں نے اس کو معاف کر دیا۔ اس بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی۔ یہ کیا چیز تھی؟ یہ ''ایثار'' تھا۔

خودغرضی ختم کر دو

بہرحال حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنے اندر سے تکبر کو نکالو اور ایثار پیدا کر لو، تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ اور ''خودغرضی'' یہ ایثار کی ضد ہے، خودغرضی کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر وقت اپنی کائنات میں الجھا ہوا ہے کہ کس طرح مجھے پیسے زیادہ مل جائیں، کس طرح مجھے عزت زیادہ مل جائے، کس طرح مجھے شہرت مل جائے، کس طرح لوگوں کی نگاہ میں میرا درجہ بلند ہو جائے، دن رات اسی فکر میں حیران و سرگرداں ہے۔ یہ ہے ''خودغرضی'' ایثار اس کی ضد ہے۔

''تواضع'' کی ضد ہے ''تکبر'' لہٰذا اگر انسان تکبر اور خودغرضی چھوڑ دے اور تواضع اور ایثار اختیار کر لے تو پھر اتحاد اور محبت قائم ہو جائے گی، ان شاء اللہ، لہٰذا ہر مسلمان اس کو پلے باندھ لے۔ بہرحال ایک عمل تو یہ ہو گیا جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔

پسندیدگی کا معیار ایک ہو

دوسری بات جو حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی جو درحقیقت تمام اخلاق فاضلہ کی بنیاد ہے، اگر یہ چیز ہمارے اندر پیدا ہو جائے تو سارے جھگڑے ہمارے اندر سے ختم ہو جائیں۔ وہ بات یہ ارشاد فرمائی:

((أَحِبَّ لِأَخِيكَ مَاتُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَاكْرَهْ لِأَخِيكَ مَاتَكْرَهُ لِنَفْسِكَ))(۱)

یعنی اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، اور اپنے بھائی کے لیے وہی بات ناپسند کرو جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو۔ لہٰذا جب بھی کسی کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آئے تو خود کو اس کی جگہ پر رکھ کر سوچ لو کہ اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا اور یہ میری جگہ پر ہوتا اور میرے ساتھ یہ معاملہ کرتا تو میں کس بات کو پسند کرتا اور کس بات کو ناپسند کرتا۔ لہٰذا جس بات کو میں پسند کرتا مجھے اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرنا چاہئے، اور جو چیز میں ناپسند کرتا مجھے بھی اس کے ساتھ وہ چیز نہیں کرنی چاہئے۔ بہترین پیمانہ ہے کہ اس کے ذریعہ آپ دوسروں کے ساتھ کیے گئے ہر معاملے کو جانچ سکتے ہیں۔

---

(۱) مسند احمد اور کنز العمال میں اس حدیث کے یہ الفاظ منقول ہیں: "تحب للناس ما تحب لنفسك وتكره لهم ما تكره لنفسك" كنز العمال، رقم: ۱۳۷۵ (۱/۲۷۹)، مسند أحمد، رقم: ۲۲۷۸٤

دوہرے پیمانے ختم کردیں

ہمارے معاشرے کی بہت بڑی بیماری یہ ہے کہ ہم نے دوہرے پیمانے بنا رکھے ہیں، اپنے لیے معیار کچھ اور ہے اور دوسرے کے لیے معیار کچھ اور ہے اپنے لیے جو بات پسند کرتے ہیں وہ دوسروں کے لیے پسند نہیں کرتے۔ آپ ذرا غور کر کے دیکھیں کہ اگر ہر شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت پر عمل کرنا شروع کر دے کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے تو پھر کوئی جھگڑا باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے کہ اس صورت میں ہر شخص ایسے عمل سے پرہیز کرے گا جو دوسروں کو تکلیف دینے والا ہوگا۔

بہر حال، اپنے درمیان اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے کی یہ چند اصولی باتیں ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان کی سمجھ بھی عطا فرمائے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

☆☆☆

خاندانی اختلافات کا دوسرا حل

صبر و برداشت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

گزشتہ اتوار کو خاندانی اختلافات اور ان کو ختم کرنے کے بارے میں کچھ عرض کیا تھا۔ ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ان اختلافات اور جھگڑوں کو ختم کرنے کا ایک اور طریقہ بیان فرمایا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((اَلْمُسْلِمُ إِذَا كَانَ مُخَالِطًا النَّاسَ وَ يَصْبِرُ عَلٰى أَذَاهُمْ خَيْرٌ مِنَ الْمُسْلِمِ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ وَلَا يَصْبِرُ عَلٰى أَذَاهُمْ))(۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان وہ ہے جو لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گیا، لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی، مثلاً وہ کسی مسجد میں یا مدرسہ میں یا عبادت گاہ میں بیٹھ گیا تاکہ لوگوں سے سابقہ پیش نہ آئے، اور یہ سوچا کہ میں تنہائی میں عبادت کرتا رہوں گا۔ دوسرا مسلمان وہ ہے جس نے تنہائی اختیار نہیں کی، بلکہ لوگوں سے ملا جلا رہا، لوگوں سے تعلقات بھی ہیں، رشتہ داریاں اور دوستیاں بھی ہیں، اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی ہے، اور ان کے ساتھ ہر قسم کے معاملات بھی کرتا ہے، اور پھر ساتھ رہنے اور ان کے ساتھ اپنے معاملات کرنے کے نتیجے میں لوگوں سے تکلیفیں بھی پہنچتی ہیں، اور وہ ان تکلیفوں پر صبر کرتا ہے۔ فرمایا کہ یہ

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۲۰۶ تا ۲۳۸) بعد از نمازِ عصر، جامع دارالعلوم، کراچی

(۱) سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۴۳۱، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، رقم: ۴۰۲۲، مسند أحمد، رقم: ۴۷۸۵

دوسرا مسلمان جو لوگوں کے ساتھ مل کر رہتا ہے اور ان کی تکالیف پر صبر کرتا ہے، یہ مسلمان بدرجہا بہتر ہے اس مسلمان سے جو لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کو تکالیف پر صبر کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔

اسلام میں رہبانیت نہیں

یہ آپ حضرات کو معلوم ہی ہے کہ ہمارے دین نے عیسائی مذہب کی طرح رہبانیت کی تعلیم نہیں دی، عیسائیوں کے یہاں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان اپنے سارے دنیاوی کاروبار کو نہ چھوڑ دے، اور اپنے تمام تعلقات کو خیر آباد نہ کہے اور رہبانیت کی زندگی نہ گزارے، لیکن حضور اقدس ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ لوگوں کے ساتھ ملے جلے رہو اور پھر لوگوں سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر کریں۔

ساتھ رہنے سے تکلیف پہنچے گی

اگر آپ غور کریں تو یہ عجیب وغریب تعلیم ہے، کیونکہ اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے لوگوں کے ساتھ ملے جلے رہنے کو اور ان سے پہنچنے والی تکلیف کو ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ دونوں کام ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم ہیں، یعنی جب تم لوگوں کے ساتھ ملو جلو گے اور ان کے ساتھ رہو گے تو ان سے تمہیں ضرور تکلیف پہنچے گی، اور جب تمہارا کسی بھی دوسرے انسان سے واسطہ پیش آئے گا تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اس سے تمہیں کبھی بھی کوئی تکلیف نہ پہنچے، لازماً تکلیف پہنچے گی، چاہے وہ تمہارا کتنا ہی قریبی عزیز ہو، اور چاہے وہ کتنا ہی قریبی دوست ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ تکلیف کیوں پہنچے گی؟ اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ انسان کے چہرے میں

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب سے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، اس وقت سے لے کر آج تک اربوں کھربوں انسانوں کو پیدا فرمایا، آگے قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے، اور ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک چہرہ عطا فرمایا ہے جو بالشت بھر کا ہے، اس میں آنکھ بھی ہے، ناک بھی ہے، منہ بھی ہے، دانت بھی ہیں، اور کان بھی ہیں، رخسار بھی ہیں، اور ٹھوڑی بھی ہے، ہر انسان کے چہرے میں یہ چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن اتنے اربوں، کھربوں، پدموں انسانوں میں کسی دو

انسانوں کا چہرہ سو فیصد ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ دیکھئے کہ ہر انسان کے چہرے کی لمبائی ایک بالشت ہے، اور یہ بھی نہیں ہے کہ کسی انسان کی ناک ہو کسی کی ناک نہ ہو، کسی کے کان ہوں کسی کے نہ ہوں، کسی کی آنکھیں ہوں کسی کی نہ ہوں، بلکہ تمام انسانوں کے چہرے میں یہ سب چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن کسی دو انسانوں کا چہرہ ایک جیسا نہیں ملے گا، بلکہ ہر انسان کا چہرہ دوسرے سے مختلف ہوگا۔ اور یہ اختلاف صرف ان انسانوں کے چہروں میں نہیں ہے جو اب تک پیدا ہو چکے ہیں، بلکہ جو نئے انسان پیدا ہو رہے ہیں، ان کے اندر بھی یہ اختلاف موجود ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اب جو نیا انسان پیدا ہوگا وہ کسی سابقہ انسان کی کاپی اور نقل ہوگا، ایسا نہیں ہے، بلکہ نیا پیدا ہونے والا انسان اپنا چہرہ خود لے کر آئے گا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کو دوسرے انسان سے ایسا ممتاز کر دیا کہ چہرے کے نقوش دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ یہ فلاں انسان ہے اور یہ فلاں انسان ہے۔

رنگوں کے اختلاف میں قدرت کا نظارہ

اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ مختلف نسلوں کے انسانوں کے نقوش میں ایک چیز ''مابہ الاشتراک'' ہے اور ایک ''مابہ الامتیاز'' ہے۔ یعنی ایک چیز ایسی ہے جو سب میں مشترک ہے، مثلاً افریقی نسل کے جو انسان ہوں گے، وہ دور سے دیکھ کر پہچان لیے جائیں گے کہ یہ افریقی نسل کا ہے۔ ''یورپ'' والا الگ پہچان لیا جائے گا کہ یہ یورپ کا ہے، باوجودیکہ ان کے درمیان بھی آپس میں فرق ہے، کوئی دو فرد ایک جیسے نہیں ہیں۔ لہٰذا ''مابہ الاشتراک'' بھی موجود اور ''مابہ الامتیاز'' بھی موجود۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ ہے، انسان کہاں اس قدرت کا احاطہ کر سکتا ہے۔

انگلیوں کے پوروں میں اللہ کی قدرت

اور چیزوں کو چھوڑیے! انگلیوں کے پوروں کو لے لیں، ہر انسان کے ہاتھ کی انگلیوں کے پورے دوسرے انسان کے پورے سے مختلف ہیں، چنانچہ کاغذات پر بے شمار ضروریات کے لیے دستخط لینے کے ساتھ ساتھ انگوٹھا بھی لگوایا جاتا ہے، اس لیے کہ انگوٹھے کے پورے میں جو چھوٹی چھوٹی لکیریں ہیں، وہ کسی ایک انسان کی لکیریں دوسرے انسان کی لکیروں سے نہیں ملتیں، ہر ایک کی لکیریں علیحدہ ہیں۔ اگر ویسے دو انسانوں کے انگوٹھے ملا کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ کوئی فرق نہیں ہے، لیکن یہ بات عالمی طور پر مُسلّم اور طے شدہ ہے کہ دو انسانوں کے انگوٹھوں کی لکیریں ایک جیسی نہیں ہیں، لہٰذا جب کسی انسان نے کسی کاغذ پر انگوٹھا لگا دیا تو یہ متعین ہو گیا کہ یہ فلاں انسان کے

انگوٹھے کے نشان ہیں، کیونکہ دوسرے انسان کے انگوٹھے کے نشان اس سے مختلف ہوں گے۔

انگوٹھے کی لکیروں کے ماہرین کا دعویٰ

اب تو ایسے ماہرین بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے سامنے کسی انسان کے انگوٹھے کے نشان رکھ دیئے جائیں، ہم اس کے نشانات کو بڑا کر کے دیکھیں گے، اور اس کے ذریعے ہم اس انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک سارے خدوخال کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ لکیریں یہ بتا دیتی ہیں کہ اس انسان کی آنکھ کیسی ہوگی، اس کی ناک کیسی ہوگی، اس کے دانت کیسے ہوں گے، اور ہاتھ کیسے ہوں گے؟

اللہ تعالیٰ انگوٹھے کے پورے کو دوبارہ بنانے پر قادر ہیں

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ قرآن کریم کی سورۃ ''قیامۃ'' میں ایک آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ﴾(۱)

کیا یہ (کافر) انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کر سکیں گے۔ یہ کافر جو آخرت کے منکر ہیں، وہ یہ کہا کرتے تھے کہ جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے اور ہماری ہڈیاں تک گل جائیں گی، پھر کس طرح سے ہمیں دوبارہ زندہ کیا جا سکے گا؟ اور کون زندہ کرے گا؟

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں دوبارہ جمع نہیں کر سکیں گے؟ کیوں نہیں! ہم تو اس پر بھی قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کے پوروں کو بھی ویسا ہی دوبارہ بنا دیں، اس کائنات کا بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی یہ نہیں کر سکتا کہ ویسا ہی انگوٹھا بنا دے، لیکن ہم اس پر قادر ہیں۔

آیت سن کر مسلمان ہونا

اللہ تعالیٰ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کا چہرہ دوبارہ بنا دیں، اس کے ہاتھ دوبارہ بنا دیں، اس کے پاؤں دوبارہ بنا دیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر پوروں کا ذکر فرمایا کہ

(۱) القیامۃ: ۳،۴

پورے کو دوبارہ بنانے پر قادر ہیں۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک نومسلم سائنٹسٹ اس آیت کو پڑھ کر مسلمان ہو گیا، اور اس نے یہ کہا کہ یہ بات سوائے خالق کائنات کے دوسرا نہیں کہہ سکتا کہ ہم اس پورے کو دوبارہ بنا سکتے ہیں، یہ بات صرف وہی کہہ سکتا ہے جس نے اس کائنات کو بنایا ہو، جس نے انسان کو پیدا کیا ہو، جس نے انسان کے ایک ایک عضو کو بنایا ہو۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ

بہرحال! کوئی انسان اپنی ظاہری شکل وصورت میں دوسرے انسان جیسا نہیں ہے، بلکہ اگر دو انسان ایک جیسے ہو جائیں تو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ دیکھیں یہ دو انسان ہم شکل ہیں، الگ الگ ہونے پر کوئی تعجب نہیں ہوتا، اس لیے کہ ہر انسان دوسرے سے الگ ہے۔ حالانکہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ الگ الگ کیسے ہیں، اگر سارے انسان ایک دوسرے کے ہم شکل ہوتے تو تعجب ک بات نہ ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو دیکھئے کہ اس نے اربوں کھربوں انسان پیدا فرما دیئے، مگر ہر ایک کی صورت دوسرے سے مختلف ہے، مرد کی صورت الگ ہے، عورت کی صورت الگ ہے، ہر ایک صنف میں ایک دوسرے سے امتیاز بھی موجود ہے، ایک دوسرے سے اشتراک بھی موجود ہے۔

دو انسانوں کے مزاج میں اختلاف

لہٰذا جب دو انسانوں کے چہرے ایک جیسے نہیں ہو سکتے، تو پھر دو انسانوں کی طبیعتیں کیسے ایک جیسی ہو سکتی ہیں، جب ظاہر ایک جیسا نہیں تو پھر ان کی طبیعتوں میں بھی فرق ہوگا، کسی کی طبیعت کیسی ہے، کسی کی کیسی ہے۔ کسی کا مزاج کیسا ہے، کسی کا مزاج کیسا ہے۔ کسی کی پسند کچھ ہے، کسی کی کچھ ہے۔ ہر انسان کی پسند مختلف، ہر انسان کا مزاج مختلف، ہر انسان کی طبیعت مختلف، لہٰذا طبیعتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ دو آدمی ایک ساتھ زندگی گزار رہے ہوں اور ایک ساتھ رہتے ہوں، اور کبھی بھی ان میں سے ایک کو دوسرے سے تکلیف نہ پہنچے، ایسا ہونا ممکن ہی نہیں، طبیعت مختلف ہونے کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے ضرور تکلیف پہنچے گی، کبھی جسمانی تکلیف پہنچے گی، کبھی روحانی تکلیف پہنچے گی، کبھی نفسیاتی تکلیف پہنچے گی، کبھی دوسرے کی طرف سے خلاف طبع بات ہوگی جو دوسرے کو بری لگے گی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مزاج مختلف تھے

دیکھئے! اس کائنات میں انبیاء علیہم السلام کے بعد حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ افضل مخلوق اس زمین و آسمان کی نگاہوں نے نہیں دیکھی۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ افضل، ان سے زیادہ متقی، ان سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے، ان سے زیادہ ایثار کرنے والے، ان سے زیادہ ایک دوسرے پر جان نثار کرنے والی کوئی مخلوق پیدا نہیں ہوئی اور نہ آئندہ پیدا ہوگی۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طبیعتیں بھی مختلف تھیں، ان کے آپس کے مزاج میں بھی فرق تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات

روئے زمین پر کوئی بیوی اپنے شوہر کے لیے اتنی وفادار اور اتنا خیال رکھنے والی نہیں ہوسکتی جتنی کہ امہات المؤمنین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال رکھنے والی تھیں، لیکن ان کو بھی طبیعت کے خلاف باتیں پیش آجاتی تھیں، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بعض اوقات طبیعت کے خلاف ہونے کی وجہ سے ان سے کچھ گرانی اور ناراضگی ہو جاتی تھی، چنانچہ ایک مرتبہ اس گرانی کی وجہ سے ایک مہینہ ایسا گزرا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں قسم کھا لی تھی کہ میں ایک ماہ تک اپنی ازواج مطہرات کے پاس نہیں جاؤں گا۔(۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ناراضگی

اور پھر یہ نہیں کہ ازواج مطہرات کی طرف سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو گرانی ہوتی تھی بلکہ بعض اوقات ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے گرانی ہو جاتی تھی، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اے عائشہ! مجھے پتہ چل جاتا ہے جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہے اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ کیسے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو قسم کھاتے وقت یہ کہتی ہو ''ورب محمد'' یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردگار کی قسم'' اور جب مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو قسم کھاتے وقت یہ کہتی ہو''ورب ابراہیم'' ابراہیم علیہ السلام کے پروردگار کی قسم۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب هجرة النبی نساء ہ فی غیر بیوتهن، رقم:۴۸۰۳، صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب فی الإيلاء واعتزال النساء، رقم:۲۷۰۸

''اِنِّیْ لَا اَھْجُرُ اِلَّا اسْمَكَ''(۱)

''یا رسول اللہ! ایسے موقع پر میں صرف آپ ﷺ کا نام ہی چھوڑتی ہوں، لیکن آپ ﷺ کی محبت دل سے جدا نہیں ہوتی''

اب دیکھئے! سرکار دو عالم ﷺ سے زیادہ شفیق و مہربان کوئی اور ہو سکتا ہے؟ خاص طور پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ ﷺ کی محبت کا جو عالم تھا وہ کوئی مخفی چیز نہیں، لیکن اس کے باوجود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی بعض اوقات آپ ﷺ سے کچھ گرانی پیدا ہو جاتی تھی، اور اس گرانی اور ناراضگی کا احساس نبی کریم ﷺ کو بھی ہو جاتا تھا۔

میاں بیوی کے تعلق کی حیثیت سے ناراضگی

البتہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضور اقدس ﷺ کو تو تکلیف پہنچانا معاذ اللہ کفر ہے، تو اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچی تو یہ کتنی بری بات ہوئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیثیتیں الگ الگ رکھی ہیں، لہٰذا حضور اقدس ﷺ کو جو گرانی ہوتی تھی وہ ایک شوہر ہونے کی حیثیت سے ہوتی تھی، جس طرح بیوی کو شوہر پر ناز ہوتا ہے، ایسے ہی شوہر کو بھی بیوی پر ناز ہوتا ہے، اس ناز کے عالم میں اس قسم کی ناراضگی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مزاجوں میں اختلاف

بہر حال! حضور اقدس ﷺ اور آپ کی ازواج مطہرات کے درمیان بھی خلاف طبع امور پیدا ہو جاتے تھے۔ اور آگے بڑھیے۔ حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما جن کو ''شیخین'' کہا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد ان دونوں بزرگوں سے زیادہ افضل انسان اس روئے زمین پر پیدا نہیں ہوئے۔ اور حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ان دونوں کے تعلق کا عالم یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے نام ہمیشہ ایک ساتھ آیا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم یوں کہا کرتے تھے:

''جَاءَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ ذَهَبَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ خَرَجَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ''

جہاں نام آ رہا ہے دونوں کا ایک ساتھ آ رہا ہے۔ اس طرح یک جان دو قالب تھے، ہر وقت

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب غیرۃ النساء ووجدھن، رقم: ۴۸۲۷، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضائل عائشة، رقم: ۴۴۶۹، مسند أحمد، رقم: ۲۳۱۸۲

ان دونوں کا نام سامنے ہوتا۔ جہاں حضور اقدس ﷺ کو مشورہ کرنے کی ضرورت پیش آتی، فرماتے ذرا ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو بلاؤ، کبھی دونوں میں جدائی کا تصور نہیں ہوتا تھا۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عزت کرنے کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ میری زندگی کی ساری عبادتیں مجھ سے لے لیجیے اور سارے اعمال مجھ سے لے لیں اور وہ ایک رات جو آپ نے حضور اقدس ﷺ کے ساتھ غارِ ثور میں گزاری ہے وہ مجھے دے دیجیے۔(۱)

دونوں کے درمیان عظمت اور محبت کا یہ عالم تھا، لیکن دونوں کی طبیعتوں میں اختلاف تھا جس کی وجہ سے بعض اوقات ان کے درمیان اختلاف بھی ہو جاتا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف کا ایک واقعہ

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ان دونوں کے درمیان بات چیت ہو رہی تھی، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کوئی بات کہہ دی جس کی وجہ سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ناراض ہو کر چل دیئے، اب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان کو منانے کے لیے اور سمجھانے کے لیے ان کے پیچھے پیچھے چل دیئے، چلتے چلتے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں داخل ہو گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ یہ تو بہت زیادہ ناراض ہو گئے ہیں تو حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور اقدس ﷺ ان کے چہرے کو دیکھ کر سمجھ گئے یا بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خبر دے دی، چنانچہ ابھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور اقدس ﷺ کی مجلس کی طرف آرہے تھے کہ حضور اقدس ﷺ نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ جو تمہارے دوست آرہے ہیں، یہ آج کسی سے جھگڑا کر کے آرہے ہیں۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مجلس میں آ کر بیٹھ گئے۔

دوسری طرف جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جنہوں نے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا تھا، جب تنہائی میں پہنچے تو ان کو بڑی شرمندگی اور ندامت ہوئی کہ میں نے یہ بہت برا کیا کہ اول تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ناراضگی کا اظہار کیا، پھر جب وہ میرے پیچھے آئے تو میں نے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا، چنانچہ گھر سے باہر نکلے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پیچھے چل پڑے کہ جا کر ان کو مناؤں، جب حضور اقدس ﷺ کی مجلس میں پہنچے تو دیکھا کہ حضور ﷺ بھی تشریف فرما ہیں

(۱) البداية والنهاية (۳/۱۸۰)، حلية الأولياء (۱/۳۳)

اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی بیٹھے ہیں۔ مجلس میں آ کر اپنی ندامت اور شرمندگی کا اظہار شروع کر دیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے غلطی ہوئی تھی، ان سے زیادہ غلطی نہیں ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو معاف کر دیجیے، اصل میں غلطی میری تھی۔ اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے عجیب وغریب جملہ ارشاد فرمایا، فرمایا:

''کیا میرے ساتھی کو میرے لیے چھوڑو گے یا نہیں؟ یہ وہ شخص ہے کہ جب میں نے یہ کہا تھا ''اے لوگو! میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔ اس وقت تم سب نے کہا تھا کہ "کَذَبْتَ" صرف اس نے کہا تھا "صَدَقْتَ" یہ تنہا وہ شخص تھا جس نے کہا تھا کہ تم سچ کہتے ہو'' (۱)

بہر حال! صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما جیسے انسان جن کا ذکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک ساتھ آتا تھا، ان کی طبیعتوں میں اور مزاجوں میں بھی اختلاف تھا جس کے نتیجے میں ان کے درمیان بھی اس قسم کے واقعات پیش آئے۔

مزاجوں کا اختلاف حق ہے

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی دو انسان ایسے نہیں ہیں جن کی طبیعتیں ایک جیسی ہوں، جیسا تم چاہتے ہو دوسرا بھی ویسا ہی ہو، یہ نہیں ہوسکتا۔ کوئی باپ یہ چاہے کہ میرا بیٹا سو فیصد میری مرضی کے مطابق ہو جائے، نہیں ہوسکتا، کوئی بیٹا یہ چاہے کہ میرا باپ سو فیصد میری مرضی کے مطابق ہو جائے، نہیں ہوسکتا، کوئی شوہر یہ چاہے کہ میری بیوی سو فیصد میری مرضی کے مطابق ہو جائے، نہیں ہوسکتی، کوئی بیوی یہ چاہے کہ میرا شوہر سو فیصد میری مرضی کے مطابق ہو جائے، نہیں ہوسکتا۔

صبر نہیں کریں گے تو لڑائیاں ہوں گی

لہٰذا جب آدمیوں کے ساتھ رہنا ہوگا تو پھر تکلیفیں بھی پہنچیں گی، آدمیوں کے ساتھ رہنا اور ان سے تکلیفیں پہنچنا یہ دونوں لازم اور ملزوم ہیں، ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا ہی نہیں جاسکتا۔ لہٰذا جب آدمیوں کے ساتھ رہنا ہے تو یہ سوچ کر رہنا ہوگا کہ ان سے مجھے تکلیف بھی پہنچے گی اور اس تکلیف پر مجھے صبر بھی کرنا ہوگا، اگر صبر نہیں کریں گے تو لڑائیاں، جھگڑے، فتنے اور فساد ہوں

(۱) صحيح البخاري، كتاب تفسير القرآن، باب قل يا أيها الناس إني رسول الله إليكم جميعا، رقم: ٤٢٧٤

گے، اور یہ چیزیں وہ ہیں جو دین کو مونڈ دینے والی ہیں۔

لہٰذا جس کسی سے کوئی تعلق ہو، چاہے وہ تعلق رشتہ داری کا ہو، چاہے وہ تعلق دوستی کا ہو، چاہے وہ زوجیت کا تعلق ہو، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان تعلقات میں تکلیفیں بھی پہنچیں گی، اور ان تکلیفوں پر مجھے صبر کرنا ہوگا، اور ان تکلیفوں کو مستقل ناچاقی کا ذریعہ نہیں بناؤں گا۔ ٹھیک ہے ساتھ رہنے کے نتیجے میں تلخی بھی تھوڑی بہت ہو جاتی ہے، لیکن اس تلخی کو مستقل ناچاقی اور منافرت کا ذریعہ بنانا ٹھیک نہیں۔

تکالیف سے بچنے کا طریقہ

اب سوال یہ ہے کہ جب دوسروں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس تکلیف پر اپنے آپ کو کیسے تسلی دیں؟ اس تکلیف سے اپنے آپ کو کیسے بچائیں؟ اور طبیعت کے خلاف ہونے کے باوجود آپس میں کیسے محبتیں پیدا کریں؟ اس کا نسخہ بھی جناب رسول اللہ ﷺ نے بتلا دیا، کوئی بات آپ تشنہ چھوڑ کر نہیں گئے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے میاں بیوی کے تعلق کے بارے میں بیان فرمایا، کیونکہ سب سے زیادہ خلافِ طبع امور میاں بیوی کے تعلقات میں ہی پیش آتے ہیں، اس لیے کہ جتنا قرب زیادہ ہوگا، اتنا ہی طبیعت کے خلاف باتیں پیش آنے کا بھی امکان ہوگا، اور میاں بیوی کے درمیان جتنا قرب ہوتا ہے وہ کسی اور رشتے میں نہیں ہوتا۔ چونکہ اس تعلق میں دوسرے تعلق کے مقابلے میں تکلیف پہنچنے کے امکانات زیادہ ہیں، اس لیے اس کے بارے میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک نسخہ کیمیا بیان فرمادیا:

((لَا يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ))(۱)

یعنی کوئی مومن مرد کسی مومنہ عورت سے بغض نہ رکھے، مطلب یہ ہے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی سے مستقل بغض نہ رکھے۔ کیونکہ اگر وہ اپنی بیوی کی کسی بات کو ناپسند کرے گا تو دوسری کسی بات کو پسند بھی کرے گا۔ یعنی جب بیوی سے طبیعت کے خلاف کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو تم ناراض ہوتے ہو اور بُرا مناتے ہو، اور اسی بات کو لیے بیٹھے رہتے ہو کہ یہ ایسی ہے، یہ یوں کرتی ہے، یوں کرتی ہے، اس میں یہ خرابی ہے، یہ خرابی ہے۔ خدا کے لیے یہ دیکھیں کہ اس کے اندر کچھ اچھائیاں بھی تو ہوں گی، لہٰذا جب بیوی سے کوئی بات سامنے آئے جو تمہیں بری لگ رہی ہے تو اس وقت اس کی اس بات کا تصور کریں جو آپ کو پسند ہے۔ جب اچھائی کا تصور کریں گے تو اس برائی کے احساس میں کمی آئے گی۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء، رقم: ۲۶۷۲، مسند أحمد، رقم: ۸۰۱۳

صرف اچھائیوں کی طرف دیکھیں

یاد رکھیے! دنیا میں کوئی انسان سراپا سیاہ یا سراپا سفید نہیں ہوتا، کوئی سراپا خیر یا سراپا شر نہیں ہوتا، اگر کوئی برا ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ بھلائی بھی ضرور ہوگی، اگر بھلا ہے تو اس میں کچھ برائی بھی ضرور ہوگی۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنی بیوی کی اچھائی کی طرف دھیان کریں، اس کے نتیجے میں تمہیں نظر آئے گا کہ یہ بات اگر چہ اس کے اندر تکلیف دِہ ہے، لیکن دوسری باتیں میری بیوی کے اندر قابل قدر اور قابل تعریف ہیں۔ یہ سوچنے سے صبر آ جائے گا۔

حضور اقدس ﷺ نے ایک صاحب کا بڑا اچھا علاج لیا۔ وہ اس طرح کہ ایک صاحب حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی بیوی کی شکایت کرنے لگے کہ اس میں فلاں عادت بڑی خراب ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر اتنی خراب ہے کہ تمہارے لیے نا قابل برداشت ہے تو اس کو طلاق دے دو۔ اب اس کا دماغ ٹھیک ہوگیا اور اس نے سوچا کہ اگر میں نے اس کو طلاق دے دی اور وہ چلی گئی تو مجھ پر کیا گزرے گی۔ اس لیے اس نے حضور ﷺ سے کہا کہ یا رسول اللہ! اس کے بغیر صبر بھی نہیں آتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر اس کو روکے رکھو۔(۱)

یعنی جب اس کے اندر خرابی ہے، لیکن اس کے بغیر صبر بھی نہیں آتا تو اس کا علاج اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اس کو روکے رکھیں اور اس کی اس خرابی کو برداشت کریں، البتہ اپنی طرف سے اس کی اصلاح کی جتنی کوشش تم سے ہوسکتی ہے وہ کرلو۔

بیوی کی اچھائیوں کا تصور کیجیے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اس نے حضور اقدس ﷺ کے سامنے اپنی بیوی کی خرابی بیان کی تو اپ نے فوراً اس سے یہ کہہ دیا کہ اس کو طلاق دے دو۔ آپ ﷺ نے اس کو ایک دم سے طلاق دینے کا مشورہ کیوں دے دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے طلاق دینے کا مشورہ اس لیے دیا کہ دراصل اس شخص کا سارا دھیان اپنی بیوی کی برائی کی طرف لگا ہوا تھا، اس کی وجہ سے اس کے دل میں اس کی برائی اس طرح بیٹھ گئی تھی کہ اس کا اپنی بیوی کی اچھائیوں کی طرف دھیان ہی نہیں جارہا تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے اس کو آخری بات کہہ دی کہ اگر یہ تمہاری بیوی اتنی بری ہے تو اس کو طلاق دے کر الگ کردو۔ اب طلاق کا سن کر اس کے دماغ میں یہ آیا کہ میری بیوی میرا یہ کام کرتی

---

(۱) سنن النسائی، کتاب الطلاق، باب ماجاء فی الخلع، رقم: ۳۴۱۱

ہے، یہ کام کرتی ہے، میرے لیے وہ اتنی فائدہ مند ہے، اگر میں نے طلاق دے دی تو یہ سارے فائدے جاتے رہیں گے، تو میں پھر کیا کروں گا اور کیسے زندگی گزاروں گا۔ اس لیے فوراً اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے اس کے بغیر صبر بھی نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا تو پھر اس کو روکے رکھو۔

برائیوں کی طرف دھیان کرنے کا نتیجہ

بات دراصل یہ ہے کہ جب کسی کی برائیاں تمہارے دل میں بیٹھ جاتی ہیں اور اس کی برائی کی طرف دھیان لگ جاتا ہے تو پھر اس کی اچھائیوں سے آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کی اچھائیوں کا تصور کریں، اور جب اچھائیوں کا تصور کریں گے تو اس کی قدر دل میں بیٹھے گی اور عافیت محسوس ہوگی۔ اس وقت پتہ چلے گا کہ تکلیف تو پہنچتی ہے، کوئی نہ کوئی بات طبیعت کے خلاف ہوگی، لیکن اس طبیعت کے خلاف بات کو برداشت کرنا پڑے گا۔

غلطی آپ کی بھی ہوسکتی ہے

یہ بات بھی سمجھ لیں کہ جب تم کسی دوسرے کی کسی بات کو اپنی طبیعت کے خلاف سمجھ رہے ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ شخص غلطی پر ہو، بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ دوسرا شخص غلطی پر ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم غلطی پر ہو، کیونکہ طبیعتوں کا فرق ہے۔

مثلاً ایک آدمی کو ایک کھانا پسند ہے، دوسرے کو دوسرا کھانا پسند ہے، ایک آدمی کو کریلے پسند ہیں، اس کا سالن اس کو مزیدار معلوم ہوتا ہے، دوسرے آدمی کو کریلے ناپسند ہیں، وہ کہتا ہے کہ یہ کڑوے ہیں، مجھ سے نہیں کھائے جاتے۔ یہ طبیعت کا اختلاف ہے۔ اب یہ ضروری نہیں کہ جو شخص یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے کریلے بہت اچھے لگتے ہیں، وہ غلطی پر ہے، یا جو شخص یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے کریلے پسند نہیں، وہ غلطی پر ہے، بلکہ دونوں غلطی پر نہیں ہیں، البتہ دونوں کے مزاجوں کا فرق ہے، طبیعتوں کا فرق ہے وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے اور وہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے۔

دونوں اپنی جگہ درست بھی ہوسکتے ہیں

لہٰذا جس جگہ مباحات کے اندر آپس میں اختلاف ہوتا ہے، وہاں کسی ایک فریق کو حق پر اور دوسرے کو باطل پر نہیں کہہ سکتے، بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر درست ہوتے ہیں۔ چنانچہ اکثر میاں بیوی

کے درمیان طبیعتوں میں اختلاف ہوتا ہے، جب ہر دو انسانوں کی طبیعتوں میں اختلاف ہوتا ہے تو اگر صنف بھی بدل جائے کہ ایک مرد ہے اور ایک عورت ہے تو پھر طبیعتوں کا یہ اختلاف اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ عورت کی ایک فطرت ہے اور اس کی ایک نفسیات ہے، مرد کی ایک فطرت ہے اور اس کی ایک نفسیات ہے۔ مرد اپنی فطرت کے مطابق سوچتا ہے، عورت اپنی فطرت کے مطابق سوچتی ہے۔ اس لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کی صرف برائیوں کو مت دیکھیں بلکہ اچھائیوں کی طرف بھی دیکھیں۔

سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ دو گے

ایک اور بات یاد آ گئی، وہ یہ کہ حضور اقدس ﷺ نے عورت کو پسلی سے تشبیہ دی، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمَرْأَةُ كَالضِّلَعِ اِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهَا كَسَرْتَهَا وَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اِسْتَمْتَعْتَ وَفِيْهَا عِوَجٌ))(۱)

''عورت پسلی کی طرح ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو اس کو توڑ دو گے، اور اگر تم اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو گے تو باوجود یکہ وہ تم کو ٹیڑھی نظر آ رہی ہے پھر بھی تم اس سے فائدہ اٹھا سکو گے''

عورت کا حسن ٹیڑھے پن میں ہے

اب بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ جب حضور اقدس ﷺ نے اس کو ٹیڑھی پسلی کہہ دیا تو اس کی مذمت بیان فرما دی۔ چنانچہ بعض لوگ اس کو اس کی مذمت اور برائی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اور جب ان کا بیوی سے جھگڑا ہوتا ہے تو وہ بیوی سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اے ٹیڑھی پسلی میں تجھے سیدھا کر کے رہوں گا''

حالانکہ ان لوگوں نے یہ غور نہیں کیا کہ حضور اقدس ﷺ پسلی کو ٹیڑھی کہہ رہے ہیں، پسلی اگر ٹیڑھی نہ ہو بلکہ سیدھی ہو جائے تو وہ پسلی کہلانے کے لائق نہیں، پسلی کا حسن اور صحت یہ ہے کہ وہ ٹیڑھی ہو، اگر وہ پسلی سیدھی ہو جائے تو وہ بیمار ہے۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب المداراة مع النساء، رقم: ٤٧٨٦، صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، رقم: ٢٦٦٩، سنن الترمذي، كتاب الطلاق واللعان عن رسول الله، باب ماجاء في مداراة النساء، رقم: ١١٠٩، مسند أحمد، رقم: ٩٤١٩

ٹیڑھا ہونا ایک اضافی چیز ہے

درحقیقت اس حدیث کے ذریعے حضور اقدس ﷺ یہ بتلانا چاہ رہے ہیں کہ ٹیڑھا ہونا اور سیدھا ہونا ایک اضافی چیز ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز کو ایک نگاہ سے دیکھیں تو وہ سیدھی ہے اور دوسری نگاہ سے دیکھیں تو وہ ٹیڑھی ہے۔

دیکھئے! سامنے مسجد کے باہر جو سڑک ہے، اگر مسجد کے اندر سے دیکھیں تو وہ یہ نظر آئے گا کہ یہ سڑک ٹیڑھی ہے، اس لیے کہ مسجد کی نسبت سے سڑک ٹیڑھی ہے۔ اور اگر سڑک پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ سڑک سیدھی ہے اور مسجد ٹیڑھی ہے، حالانکہ نہ سڑک ٹیڑھی ہے، نہ مسجد ٹیڑھی ہے، اس لیے کہ مسجد کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ قبلہ رخ ہو۔ لہٰذا کسی چیز کا سیدھا اور ٹیڑھا ہونا اضافی صفت ہے، ایک چیز ایک لحاظ سے ٹیڑھی ہے اور دوسرے لحاظ سے سیدھی ہے۔

عورت کا ٹیڑھا پن فطری ہے

بہرحال! اس حدیث کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ چونکہ تمہاری طبیعت عورت کی طبیعت سے مختلف ہے، لہٰذا تمہارے لحاظ سے وہ ٹیڑھی ہے، لیکن حقیقت میں وہ ٹیڑھا پن اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ جس طرح پسلی کی فطرت کا حصہ یہ ہے کہ وہ ٹیڑھی ہو، اگر پسلی سیدھی ہو جائے تو اس کو ''عیب'' کہا جائے گا اور ڈاکٹر اس کو دوبارہ ٹیڑھی کرنے کی کوشش کرے گا، اس لیے کہ اس کی فطرت کے اندر ٹیڑھا پن موجود ہے۔ لہٰذا اس حدیث کے ذریعہ عورت کی برائی بیان نہیں کی جارہی ہے، بلکہ یہ کہا جارہا یہ کہ چونکہ عورت کی طبیعت تمہاری طبیعت کے لحاظ سے مختلف ہے، اس لیے تمہیں ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اس کو سیدھا کرنے کی فکر مت کرنا، کیونکہ اس کو سیدھا کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے پسلی کو سیدھا کرنا، اور اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو اس کو توڑ ڈالو گے، اور اگر تم اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دو گے تو اس کے ٹیڑھا ہونے کے باوجود تم اس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔

بڑھیا اور عقاب کا واقعہ

عربی سکھانے کی ایک کتاب ''مفید الطالبین'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ بادشاہ کا ایک عقاب اڑ کر ایک بڑھیا کے پاس پہنچ گیا، اس بڑھیا نے اس کو پکڑ کر اس کو پالنا شروع کیا۔ جب بڑھیا نے یہ

دیکھا کہ اس کی چونچ ٹیڑھی ہے اور اس کے پنجے ٹیڑھے ہیں۔ تو بڑھیا کو اس پر بڑا ترس آیا کہ یہ بیچارہ پرندہ ہے، اللہ کی مخلوق ہے، جب اس کو کھانے کی ضرورت ہوتی ہوگی تو یہ کیسے کھاتا ہوگا، کیونکہ اس کی چونچ ٹیڑھی ہے، اور جب اس کو چلنے کی ضرورت ہوگی تو یہ چلتا کیسے ہوگا، اس لیے کہ اس کے پنجے ٹیڑھے ہیں۔ اس بڑھیا نے سوچا کہ میں اس کی یہ مشکل آسان کروں، چنانچہ قینچی سے پہلے اس کی چونچ کاٹی، اور پھر اس کے پنجے کاٹے، جس کے نتیجے میں اس کا خون بہنے لگا اور وہ زخمی ہوگیا، جتنا پہلے چل سکتا تھا، اس سے بھی وہ معذور ہوگیا۔ یہ واقعہ نادان کی محبت کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے، کیونکہ اس بڑھیا نے اس عقاب کے ساتھ محبت تو کی، لیکن نادانی اور بے عقلی کے ساتھ محبت کی، اور یہ نہ سوچا کہ اس کی چونچ اور اس کے پنجوں کا ٹیڑھا ہونا اس کی فطرت کا حصہ ہے اور اس کا حسن اس کے ٹیڑھے پن میں ہے، اگر اس کے یہ اعضاء ٹیڑھے نہ ہوں تو یہ ''عقاب'' کہلانے کا مستحق نہیں۔

بہرحال! جب بھی دو آدمیوں کے درمیان تعلقات ہوں گے، چاہے وہ مرد ہوں، یا عورتیں ہوں، اس تعلق کے نتیجے میں طبیعتوں کا اختلاف ضرور ظاہر ہوگا، اور اس اختلاف کے نتیجے میں ایک کو دوسرے سے تکلیف بھی پہنچے گی۔ اب دو ہی راستے ہیں: ایک راستہ تو یہ ہے کہ جب بھی دوسرے سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر اس سے لڑو، اور اس تکلیف کو آپس میں چپقلش اور ناچاقی کا سبب بناؤ، اگر تم یہ راستہ اختیار کروں گے تو تمہیں کبھی بھی چین اور سکون نصیب نہیں ہوگا۔

لوگوں کی تکالیف پر صبر کیجئے

دوسرا راستہ یہ ہے کہ جب دوسرے سے تکلیف پہنچے تو یہ سوچ لو کہ جب طبیعتیں مختلف ہیں تو تکلیف تو پہنچنی ہی ہے اور زندگی بھی ساتھ گزارنی ہے، اور یہ زندگی ہمیشہ کی زندگی تو ہے نہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ یہیں رہنا ہو، بلکہ چند دنوں کے لیے اس دنیا میں آئے ہیں، نہ جانے کس وقت یہاں سے روانہ ہوجائیں۔ لہٰذا اس چند روزہ زندگی میں اگر دوسرے سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس پر اللہ کے لیے صبر کرلو۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب تمہیں تکلیف پہنچے گی تو اس وقت تمہارے دل میں اشتعال پیدا ہوگا، غصہ آئے گا، اور دل یہ چاہے گا کہ میں اس کا منہ نوچ ڈالوں، اس کو برا بھلا کہوں، اس کی غیبت کروں، اس کی برائی بیان کروں، اس کو بدنام کروں، اس لیے کہ اس نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے۔

تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوگا؟

لیکن یہ سوچو کہ اگر تم نے یہ کام کرلیے تو تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوا؟ ہاں یہ ہوا کہ معاشرے

میں لڑائی جھگڑا پھیلا اور ذرا سا دل کا جذبہ ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن حقیقت میں دل کا جذبہ ٹھنڈا نہیں ہوتا، کیونکہ جب ایک مرتبہ دشمنی کی آگ بھڑک جاتی ہے تو پھر وہ ٹھنڈی نہیں ہوتی بلکہ اور بڑھتی رہتی ہے۔ چلئے مان لیجیے کہ یہ تھوڑا سا فائدہ حاصل ہو گیا، لیکن اس بدلہ لینے میں تم نے جو زیادتی کی ہو گی اس کا تمہیں قیامت کے دن جو حساب دینا ہو گا اور اس پر تمہیں جو عذاب جھیلنا ہو گا وہ عذاب اس سے کہیں زیادہ ہے کہ دنیا میں اس کی تکلیف پر صبر کر لیتے اور یہ سوچتے کہ چلو اس نے اگرچہ میرے ساتھ زیادتی کی ہے، لیکن میں اس پر صبر کرتا ہوں اور اپنے معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔

صبر کرنے کا اجر

اگر صبر کر لیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾(۱)

''اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرماتے ہیں''

کوئی گنتی ہی نہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو گنتی بیان کر دیتے، لیکن ہم لوگ گنتی سے عاجز ہیں، ہمارے پاس تو گنتی کے لیے چند عدد ہیں، مثلاً ہزار، لاکھ، کروڑ، ارب، کھرب، پدم، بس آگے کوئی اور لفظ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے تو صبر کا اجر دینے کے لیے کوئی لفظ پیدا فرما دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ صبر کرنے والے کو اجر دینے کے لیے کوئی گنتی ہی نہیں۔

مثلاً اگر کسی نے تمہیں ایک مکا مار دیا، اب اگر بدلہ میں تم نے بھی اس کو ایک مکا مار دیا تو تمہارے لیے یہ بدلہ لینا جائز تھا، لیکن اس بدلہ لینے کے نتیجے میں تمہیں کیا ملا؟ کچھ نہیں۔ اور اگر تم نے صبر کر لیا اور بدلہ نہ لیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تمہیں اتنا اجر دوں گا کہ تم شمار بھی نہیں کر سکو گے۔ لہٰذا صبر پر ملنے والے اس اجر و ثواب کو سوچ کر غصہ پی جاؤ اور بدلہ نہ لو۔

بدلہ لینے سے کیا فائدہ؟

اور اگر کوئی دوسرا شخص تمہیں تکلیف پہنچا رہا ہے تو شریعت نے تمہیں اس کی اجازت دی ہے کہ اس تکلیف کو جس حد تک روکنا تمہارے لیے ممکن ہے، اس حد تک اس کا راستہ بند کرنے کی کوشش کر لو، لیکن اپنے اوقات کو اس تکلیف دینے والے کے درپے آزاد ہونے میں صرف کرنا، اوقات کا اس سے بڑا ضیاع کوئی نہیں۔ مثلاً آپ نے کسی سے سنا کہ فلاں آدمی مجلس کے اندر آپ کی برائی

(۱)　الزمر: ۱۰

کر رہا تھا، اب اگر تمہیں پتہ ہی نہ چلتا کہ فلاں آدمی برائی کر رہا تھا، پھر تو کچھ بھی نہ ہوتا، لیکن دوسرے شخص نے تمہیں بتادیا، اس کے نتیجے میں تمہارے دل پر چوٹ لگ گی، اب ایک راستہ یہ ہے کہ تم اس کی کھوج میں لگ جاؤ کہ اس مجلس میں کون کون موجود تھے اور پھر ان میں سے ہر ایک کے پاس جا کر تفتیش کریں کہ فلاں نے میری کیا برائی بیان کی؟ اور ہر ایک سے گواہی لیتے پھرو، اور اپنا سارا وقت اس کام میں خرچ کریں، تو اس کا حاصل کیا نکلا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کے برخلاف اگر تم نے یہ سوچا کہ اگر فلاں شخص نے میری برائی بیان کی تھی تو وہ جانے، اس کا اللہ جانے، اس کے اچھا کہنے سے نہ میں اچھا ہوسکتا ہوں، اور اس کے برا کہنے سے نہ میں برا ہوسکتا ہوں، میرا معاملہ تو میرے اللہ کے ساتھ ہے، اگر میرا معاملہ میرے اللہ کے ساتھ درست ہے تو پھر دنیا مجھے کچھ بھی کہتی رہے، مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ؏

خلقے پس او دیوانہ و دیوانہ بکارے

ساری مخلوق اگر میری برائی کرتی ہے تو کرتی رہے۔ میرا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

اگر یہ سوچ کر تم اپنے کام میں لگ جاؤ تو یہ ''صبر علی الاذیٰ'' ہے جس پر اللہ تعالیٰ بے حساب اجر عطا فرمائیں گے۔

بدلہ لینے میں انصاف کریں

اور اگر تم نے دل کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے بدلہ لینے کا ہی ارادہ کرلیا کہ میں تو بدلہ ضرور لوں گا، تو بدلہ لینے کے لیے وہ ترازو اور پیمانہ کہاں سے لاؤ گے جس سے یہ پتہ چلے کہ میں نے بھی اتنی ہی تکلیف پہنچائی ہے جتنی تکلیف اس نے پہنچائی تھی؟ اگر تم تکلیف پہنچانے میں ایک انچ اور ایک تولہ آگے بڑھ گئے تو اس پر آخرت میں جو پکڑ ہوگی اس کا حساب کون کرے گا؟ اس لیے بدلہ لینے کا آپ کو حق حاصل ہے، مگر یہ حق بڑا خطرناک ہے۔ لیکن اگر تم نے معاف کردیا تو اس پر بے حساب اجر و ثواب کے مستحق بن جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ﴾ (۱)

''اگر صبر کرو تو صبر کرنا بدرجہا بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لیے''

(۱) النحل: ۱۲۶

خلاصہ

بہر حال! جب لوگوں کے ساتھ رہو گے، ان کے ساتھ تعلقات رکھو گے، اور ان کے ساتھ معاملات ہوں گے تو پھر تکلیفیں بھی پہنچیں گی۔ لیکن اس کا نسخہ نبی کریم ﷺ نے یہ بتادیا کہ ان تکلیفوں پر صبر کرے۔ اور ہر شخص اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچے کہ اگر ہر انسان اس نسخے پر عمل کرلے اور یہ سوچ لے کہ دوسرے کی طرف سے جو خلاف طبع امور پیش آئیں گے، اس پر حتیٰ الامکان صبر کروں گا، تو دنیا سے تمام جھگڑے اور فساد ختم ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی اس عظیم نسخے پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

☆☆☆

خاندانی اختلافات کا تیسرا حل

عفوودرگزر ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِيْ مُوْسىٰ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((مَا أَحَدٌ اَصْبَرُ عَلٰى اَذًى سَمِعَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَدْعُوْنَ لَهُ الْوَلَدَ ثُمَّ يُعَافِيْهِمْ وَ يَرْزُقُهُمْ))(۱)

دوسروں سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر

پچھلے اتوار ایک حدیث پڑھی تھی، جس کی تشریح میں میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کے درمیان آپس میں ناچاقیاں اور اختلافات اور بغض و عداوت یہ ایک بہت بڑی دینی اور معاشرتی بیماری ہے، اور حضور اقدس ﷺ نے اس بیماری سے بچانے کے لیے اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اخوت قائم کرنے کے لیے بہت سی ہدایات عطا فرمائیں ہیں، ان ہدایات میں سے ایک ہدایت پچھلے بیان میں عرض کی تھی کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دوسروں کے ساتھ ملا جلا رہتا ہے اور پھر لوگوں سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے تو وہ اس شخص سے بدرجہا بہتر ہے جو لوگوں کے ساتھ میل جول نہیں رکھتا اور جس کے نتیجے میں لوگوں سے پہنچنے والی تکالیف پر صبر کرنے کی نوبت نہیں آتی۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ آپس کے اختلاف اور ناچاقی کا بہت بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ دوسروں

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/ ۲۶۳ تا ۲۴۰) بعد از نماز عصر، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

(۱) صحيح البخاري، كتاب التوحيد، باب قول الله تعالى إن الله هوالرزاق ذو القوة المتين، رقم: ٦٨٣٠، صحيح مسلم، كتاب صفة القيامة والجنة والنار، باب لاأحد أصبر على أذى من الله، رقم: ٥٠١٦، مسند أحمد، رقم: ١٨٧٠٦

(۲) سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ٢٤٣١، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، رقم: ٤٠٢٢، مسند أحمد، رقم: ٤٧٨٥

سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر نہ کیا جائے، ساتھ رہنے کے نتیجے میں دوسرے سے کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور پہنچے گی، لیکن اس تکلیف پر انسان کو صبر کرنا چاہیے۔

سب سے زیادہ صبر کرنے والی ذات

اسی ہدایت کی تاکید کے طور پر حضور اقدس ﷺ نے وہ حدیث ارشاد فرمائی جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کائنات میں کوئی بھی ذات دوسرے سے پہنچنے والی تکلیف پر اتنا صبر کرنے والی نہیں جتنی اللہ جل شانہ کی ذات صبر کرنے والی ہے۔ لوگ اللہ جل جلالہ کو ایسی باتیں کہتے ہیں جو ایذاء اور تکلیف کا ذریعہ ہوتی ہیں، چنانچہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹا مانتے ہیں جیسے عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ معاذ اللہ۔ بعض یہودیوں نے حضرت عزیز علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا دیا، بعض مشرکین نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دے دیا، بہت سے لوگوں نے پتھروں کو، درختوں کو، یہاں تک کہ جانوروں کو، گائے بیل کو، سانپ بچھو کو خدا ماننا شروع کر دیا۔ جس ذات نے ان سب انسانوں کو پیدا کیا اور فرشتوں کو یہ بتا کر پیدا کیا کہ میں انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنا رہا ہوں، وہی انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بردباری دیکھئے

یہ انسان اللہ تعالیٰ کو تکلیف پہنچانے والے کام کر رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی بردباری دیکھئے کہ یہ سب باتیں سنتے ہیں، اس کے باوجود ان انسانوں کو عافیت بھی دے رکھی ہے اور ان کو رزق بھی دے رکھا ہے۔ اس کائنات میں آپ دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ کافروں اور مشرکوں کی تعداد زیادہ ہے، اور ہمیشہ سے ان کی تعداد زیادہ رہی ہے، اور قرآن کریم نے بھی کہہ دیا کہ

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾(۱)

"یعنی اگر آپ زمین میں رہنے والوں کی اکثریت کے پیچھے چلیں گے تو وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹکا دے گا"

اس لیے کہ انسانوں کی اکثریت تو کفر میں شرک میں اور فسق میں مبتلا ہے۔

---

(۱) الانعام: ۱۱٦

جمہوریت کا فلسفہ ماننے کا نتیجہ

آج کل دنیا میں ''جمہوریت'' کا شور مچایا جا رہا ہے، اور یہ کہا جا رہا ہے کہ اکثریت جو بات کہہ دے وہ حق ہے۔ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ ''کفر'' برحق ہے اور ''اسلام'' باطل ہے۔ العیاذ باللہ۔ اس لیے کہ روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کی اکثریت یا تو کفر میں مبتلا ہے یا شرک میں مبتلا ہے، اور جو لوگ مسلمان کہلاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل ہیں، حضور اقدس ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں، آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، ان میں بھی آپ دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ ٹھیک ٹھیک شریعت کے دائرہ پر چلنے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اور بے فکر، بے پرواہ اور فسق و فجور کے اندر مبتلا اور معصیتوں میں گرفتار انسانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

کافروں کے ساتھ حسن سلوک

اس روئے زمین پر کفر بھی ہو رہا ہے، شرک بھی ہو رہا ہے، معصیت بھی ہو رہی ہے، فسق و فجور بھی ہو رہا ہے، لیکن ان سب چیزوں کو دیکھنے کے باوجود انہی لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کے وجود تک کا انکار کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو رزق عطا فرما رہے ہیں، ان کو عافیت دے رکھی ہے اور ان پر دنیا میں نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کا حلم اور بردباری، اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون ان ایذاؤں پر صبر کرنے والا ہوگا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

برخوان یغما چہ دشمن چہ دوست

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں رزق کا جو دسترخوان بچھایا ہوا ہے، اس میں دوست دشمن سب برابر ہیں، دوست کو بھی کھلا رہے ہیں، دشمن کو بھی کھلا رہے ہیں، بلکہ بعض اوقات دشمن کو زیادہ کھلا رہے ہیں۔ اس وقت آپ کافروں اور مشرکوں کو دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ ان کے پاس دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں، جبکہ مسلمانوں پر بعض اوقات فقر و فاقہ بھی گزر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی باتوں کو سننے کے باوجود ان کے ساتھ حلم کا معاملہ فرما رہے ہیں، ان کو عافیت اور رزق عطا فرما رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کریں

بہر حال! اللہ تعالیٰ کے اس حلم کو دیکھئے اور پھر حضور اقدس ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کریں کہ آپ نے فرمایا:

((تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ))(١)

اے انسانوں! تم اللہ تعالیٰ کے اخلاق حاصل کرنے کی اور ان کو اپنانے کی کوشش کرو، اگرچہ سو فیصد تو حاصل نہیں ہو سکتے، لیکن اس بات کی کوشش کریں کہ وہ اخلاق تمہارے اندر بھی آ جائیں۔ جب اللہ جل جلالہ لوگوں کی ایذاء رسانیوں پر اتنا صبر فرما رہے ہیں، تو اے اللہ کے بندو! تم بھی لوگوں کی ایذاء رسانیوں پر صبر کرو، اور دوسرے سے اگر تمہیں تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس کو برداشت کرنے کی عادت ڈالو۔

دنیا میں بدلہ نہ لیں

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں صبر فرما رہے ہیں اور کافروں اور مشرکوں کو عافیت اور رزق دے رکھا ہے، یہ دنیا میں ترقی کر رہے ہیں، لیکن جب آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کو پکڑیں گے تو پھر چھوٹ نہیں پائیں گے، اور ان کو ایسا سخت عذاب دیں گے کہ یہ اس سے بچ نہیں سکیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ دنیا میں صبر کا معاملہ فرمایا ہے تو تم بھی یہ معاملہ کر لو کہ دنیا میں جس شخص سے تمہیں تکلیف پہنچ رہی ہے، اس سے کہہ دو کہ میں تم سے بدلہ نہیں لیتا اور میں نے تمہارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا، آخرت میں اللہ خود انصاف کرا دیں گے، لہٰذا تم اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دو۔ اس لیے کہ تم دنیا میں اس تکلیف پر جو بدلہ لو گے وہ بدلہ اس انتقام کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو آخرت میں اللہ تعالیٰ لیں گے۔ لہٰذا اگر تمہیں بدلہ لینے کا شوق ہے تو پھر یہاں پر بدلہ نہ لو بلکہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو۔

معاف کرنا بہتر ہے

تمہارے لیے بہتر تو یہ ہے کہ معاف ہی کر دو، اس لیے کہ جب تم معاف کر دو گے تو اللہ تعالیٰ خود کفالت فرمائیں گے اور تمہاری حاجتیں پوری فرمائیں گے اور تمہیں جو تکلیفیں پہنچی ہیں وہ ختم فرمائیں گے، چنانچہ اللہ کے بندے معاف ہی فرما دیتے ہیں۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا جو ہمارے دادا پیر ہیں اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ تھے، ان کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی شخص ان کو تکلیف پہنچاتا تو فرماتے کہ یا اللہ! میں

---

(١) بريقة محمودية فى شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية(٢/٤)، تفسير الرازى(٤/٤٤٤)، تفسير الألوسى(٢٣/٣١)

نے اس کو معاف کر دیا، حتیٰ کہ اگر کوئی چور مال چوری کر کے لے جاتا تو آپ فرماتے کہ یا اللہ! میں نے یہ مال اس کے لیے حلال کر دیا، میں اس سے بدلہ لے کر اور اس کو عذاب دلوا کر کیا کروں گا۔ ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے، جب بازار کوئی چیز خریدنے جاتے تو پیسوں کی تھیلی ہاتھ میں ہوتی، سامان خریدنے کے بعد وہ تھیلی دوکاندار کو پکڑا دیتے کہ اس تھیلی میں سے اس کی قیمت لے لے، خود نہ گنتے، اس لیے کہ جتنا وقت نکال کر گننے میں لگے گا اتنا وقت میں ذکر میں مشغول رہوں گا۔

حضرت میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

ایک مرتبہ بازار سے گزر رہے تھے، ہاتھ میں پیسوں کی تھیلی تھی، ایک چور کو پتہ چل گیا کہ میاں صاحب کے پاس پیسوں کی تھیلی ہے، وہ چور پیچھے سے آیا اور تھیلی چھین کر بھاگ گیا۔ میاں جی نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کون تھیلی چھین کر لے گیا، یہ سوچا کہ کون اس کے پیچھے بھاگے اور تحقیق کرے کہ کون لے گیا۔ بس ذکر کرتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل دیئے اور دل میں یہ نیت کر لی کہ اے اللہ! جس چور نے یہ پیسے لیے ہیں، وہ پیسے میں نے اس کو معاف کر دیئے اور اس کے لیے وہ پیسے ہبہ کر دیئے۔ اب وہ چور چوری کر کے مصیبت میں پھنس گیا، اور اپنے گھر کی طرف جانا چاہتا ہے لیکن ان گلیوں سے نکلنے کا راستہ نہیں پاتا، ایک گلی سے دوسری گلی میں، دوسری سے تیسری گلی میں آ جاتا، وہ گلیاں اس کے لیے بھول بھلیاں بن گئیں، جہاں سے چلتا، دوبارہ وہاں پہنچ جاتا، نکلنے کا راستہ ہی اس کو نہ ملتا، جب کئی گھنٹے گزر گئے اور چلتے چلتے تھک گیا تو اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ یہ بڑے میاں کی کوئی کرامت معلوم ہوتی ہے، میں نے ان کے پیسے چھینے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے میرا راستہ بند کر دیا۔ اب کیا کروں؟ اس نے سوچا کہ اب یہی راستہ ہے کہ ان بزرگ کے پاس دوبارہ واپس جاؤں اور ان سے درخواست کروں کہ خدا کے لیے یہ پیسے لے لو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے میری جان چھڑاؤ۔ چنانچہ میاں صاحب کے گھر کے دروازے پر پہنچا اور دستک دی، میاں صاحب نے پوچھا کہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ حضور! میں نے آپ کے پیسے چھین لیے تھے، مجھ سے غلطی ہو گئی تھی، خدا کے لیے یہ پیسے واپس لے لو۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ میں نے یہ پیسے تمہارے لیے حلال کر دیئے اور تمہیں ہبہ کر چکا، اب یہ پیسے میرے نہیں رہے، میں نے تمہیں دے دیئے، اب میں واپس نہیں لے سکتا۔ اس چور نے کہا کہ خدا کے لیے یہ پیسے واپس لے لو۔ اب دونوں کے درمیان بحث ہو رہی ہے، چور کہتا ہے کہ خدا کے لیے پیسے لے لو، وہ کہتے ہیں کہ میں نہیں لیتا، میں تو ہبہ کر چکا۔ آخر کار میاں جی نے پوچھا کہ کیوں واپس کرنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا حضرت! بات یہ ہے کہ

میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں مگر راستہ نہیں مل رہا ہے، میں کئی گھنٹوں سے ان گلیوں میں بھٹک رہا ہوں۔ میاں جی نے فرمایا کہ اچھا میں دعا کر دیتا ہوں، تمہیں راستہ مل جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے دعا کی اور اس کو راستہ مل گیا۔

کسی سے ''بُغض'' نہ رکھو

بہرحال! ان اللہ والوں کو اگر کوئی تکلیف بھی پہنچائے تو یہ اللہ والے اس کے ساتھ بھی ''بُغض'' نہیں رکھتے، بُغض ان کی گلی میں گزرا ہی نہیں۔

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن

آئین ما است سینہ چوں آئینہ داشتن

ہماری طریقت میں کسی شخص سے ''بغض'' رکھنا کفر کی طرح ہے۔ ہمارا آئین تو یہ ہے کہ ہمارا دل آئینہ کی طرح ہوتا ہے، اس پر کسی کے بُغض، عناد اور دشمنی کا کوئی داغ نہیں ہے۔

بدلہ اللہ پر چھوڑ دیں

لہٰذا جو تمہیں تکلیف پہنچائے، اس کو اللہ کے لیے معاف کر دو، اور اگر بدلہ لینا ہی ہے تو اس بدلے کو اللہ پر چھوڑ دو۔ اس لیے کہ اگر خود بدلہ لو گے تو اس سے لڑائی جھگڑے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوگا کہ جتنا تمہیں بدلہ لینے کا حق تھا اتنا ہی بدلہ لیا یا اس سے زیادہ بدلہ لے لیا۔ اس لیے اگر زیادہ بدلہ لے لیا تو قیامت کے دن تمہاری گردن پکڑی جائے گی، اس لیے بدلہ اللہ پر چھوڑ دو۔

ہر انسان اپنے فرائض کو ادا کرے

البتہ یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے، وہ یہ کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ ہمیشہ ہر انسان کو اس کے فرائض کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ تمہارا فریضہ یہ ہے، تمہارا یہ کام ہونا چاہیے، تمہارا طریقہ کار یہ ہونا چاہیے۔ لہٰذا جس شخص کو تکلیف پہنچی ہے اس کو تو آپ صبر کرنے کی تلقین فرما رہے ہیں کہ تم صبر کرو اور معاف کر دو، بدلہ نہ لو، اس سے بُغض اور عداوت نہ رکھو، اور اس تکلیف کو اختلاف اور انتشار کا ذریعہ نہ بناؤ۔ لیکن دوسری طرف حضور اقدس ﷺ نے تکلیف پہنچانے والے کو دوسرے انداز سے خطاب فرمایا تا کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جب حضور اقدس ﷺ جس شخص کو تکلیف پہنچی ہے، اس کو صبر کی تلقین فرما رہے ہیں تو پھر تکلیف پہنچانے میں بھی کوئی حرج نہیں، ایسا نہیں۔

دوسروں کو تکلیف مت دیں

بلکہ تکلیف پہنچانے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا تو یہ فرمان ہے کہ کسی بھی انسان کو اگر تمہاری ذات سے کوئی تکلیف پہنچی تو میں اس وقت تک معاف نہیں کروں گا جب تک وہ بندہ معاف نہ کر دے یا تم اس کے حق کی تلافی نہ کر دو۔ لہٰذا کسی بھی انسان کو تکلیف پہنچانے سے بچو، کسی بھی قیمت پر ایسا اقدام نہ کریں جس سے دوسرے کو تکلیف پہنچے۔

چیف جسٹس کا روزانہ دوسو رکعت نفل پڑھنا

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، اور بڑے درجے کے فقہاء میں سے ہیں، فقیہ ہونے کی حیثیت سے تو مشہور ہیں، البتہ ولی اللہ ہونے کی حیثیت سے معروف نہیں ہیں، لیکن ان کے واقعات میں لکھا ہے کہ جب ''قاضی القضاۃ'' (چیف جسٹس) بن گئے، تو اس کے بعد اپنی تمام مشغولیت کے باوجود دن بھر میں دوسو رکعت نفل پڑھا کرتے تھے۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو کسی نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر فکر اور تشویش کے آثار ہیں، ان سے پوچھا کہ آپ کو کس چیز کی فکر اور تشویش ہے؟ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہے، وہاں پر اپنی زندگی کے اعمال کا کیا جواب دوں گا۔ اور تمام واقعات کے بارے میں مجھے یاد ہے کہ میں ان سے توبہ کر چکا ہوں اور استغفار کر چکا ہوں، اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے۔

یہ ناانصافی مجھ سے ہوگئی

لیکن ایک واقعہ ایسا یاد آ رہا ہے جس کی وجہ سے مجھے بہت سخت تشویش ہے، وہ واقعہ یہ ہے کہ جس وقت میں ''قاضی'' کے عہدے پر تھا، اور لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتا تھا، اس دوران ایک مرتبہ ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم کا مقدمہ میرے پاس آیا، میں نے مقدمہ سنتے وقت مسلمان کو تو اچھی جگہ پر بٹھایا اور غیر مسلم کو اس سے کمتر جگہ پر بٹھایا، حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب تمہارے پاس مقدمہ کے دو فریق آئیں تو ان کے دریان مجلس بھی برابر ہونی چاہیے، جس جگہ پر مدعی کو بٹھایا ہے اسی جگہ پر مدعا علیہ کو بھی بٹھاؤ، ایسا نہ ہو کہ دونوں کے درمیان نشست کے اندر فرق کر کے ناانصافی کی جائے۔ مجھ سے یہ ناانصافی ہوگئی ہے، اگرچہ میں نے فیصلہ تو حق کے مطابق کیا الحمدللہ، لیکن بٹھانے

کی ترتیب میں شریعت کا جو حکم ہے اس میں رعایت نہ رہ سکی۔ مجھے اس کی تشویش ہو رہی ہے کہ اگر اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پوچھ لیا تو کیا جواب دوں گا، کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جو کہ توبہ سے معاف نہیں ہو سکتی جب تک کہ صاحب حق معاف نہ کرے۔

حقیقی مسلمان کون؟

لہٰذا صرف مسلمان ہی نہیں، غیر مسلموں کے بھی شریعت نے حقوق بتائے ہیں، حتیٰ کہ جانوروں کے بھی حقوق شریعت نے بیان کیے ہیں، احادیث میں کئی واقعات آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کے ساتھ زیادتی کرنے کے نتیجے میں لوگوں پر کیسے عذاب آئے۔ بہر حال! ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ خبردار! اپنی ایک ایک نقل و حرکت میں اور اپنے ایک ایک انداز و ادا میں اس بات کا خیال رکھو کہ تمہاری ذات سے دوسرے کو ادنیٰ سی تکلیف بھی نہ پہنچے۔ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ))(۱)

''مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اس کی ذات سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے''

یہ اتنی خطرناک چیز ہے کہ اس کی معافی کا کوئی راستہ نہیں، سوائے اس کے کہ صاحب حق معاف کرے۔ لہٰذا ایک طرف تو ہر ایک انسان کو یہ تنبیہ کر دی کہ تمہاری ذات سے دوسرے کو تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے، اور دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ اگر تمہیں دوسرے سے تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کریں اور اس کو معاف کر دیں، اس کی وجہ سے اس سے بغض اور عداوت نہ رکھو اور اس کو افتراق کا ذریعہ نہ بناؤ۔ یہ وہ تعلیم ہے جو نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائی۔

حضور اقدس ﷺ کی تربیت کا انداز

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس وقت حضور اقدس ﷺ نے دس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے

(۱) صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ۹، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان تفاضل الإسلام وأى أموره أفضل، رقم: ۵۸، سنن الترمذی، كتاب الإيمان عن رسول الله، باب ما جاء فی أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ۲۵۵۱، سنن النسائی، كتاب الإيمان وشرائعه، باب صفة المسلم، رقم: ۴۹۱۰، سنن أبی داود، كتاب الجهاد، باب فی الهجرة هل انقطعت، رقم: ۲۱۲۲

ساتھ مکہ مکرمہ فتح فرمالیا، ان صحابہ میں مہاجرین بھی تھے اور انصار بھی تھے، پھر فتح مکہ کے بعد حنین کی جنگ پیش آئی، وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے بالآخر فتح عطا فرمائی، اس پورے سفر میں بڑی مقدار میں مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ میں آیا، اس زمانے میں گائے، بیل، بکری کی شکل میں مال ہوتا تھا، چنانچہ جس کے پاس جتنے زیادہ جانور ہوتے اتنا ہی بڑا مالدار سمجھا جاتا تھا، تو مال غنیمت کے اندر بڑی مقدار میں جانور مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

نئے مسلمانوں کے درمیان مال غنیمت کی تقسیم

جب مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو حضور اقدس ﷺ نے یہ محسوس فرمایا کہ وہ لوگ جو مکہ مکرمہ کے آس پاس رہنے والے ہیں، یہ ابھی تازہ مسلمان ہوئے ہیں، ابھی اسلام ان کے دلوں کے اندر راسخ نہیں ہوا، اور ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے بلکہ اسلام کی طرف تھوڑا سا میلان ہوا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے یہ محسوس کیا کہ اگر ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے گا تو جو لوگ تازہ مسلمان ہوئے ہیں وہ اسلام پر پختہ ہو جائیں گے، اور جو لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے ہیں وہ بھی اس کے نتیجے میں مسلمان ہو جائیں گے، پھر یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف سازش نہیں کریں گے، لہٰذا مال غنیمت آیا تھا حضور اقدس ﷺ نے وہ سارا کا سارا مال وہاں کے لوگوں کے درمیان تقسیم فرمادیا۔

منافقین کا کام لڑائی کرانا ہے

اس وقت کوئی منافق انصارِ صحابہ کے پاس چلا گیا اور ان سے جا کر کہا کہ دیکھو تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے، لڑنے کے لیے مدینہ منورہ سے تم چل کر آئے، اور حضور اقدس ﷺ کا ساتھ تم نے دیا، اور حضور ﷺ کے ساتھ جہاد کر کے تم نے اپنی جانیں دیں، لیکن مال غنیمت ان لوگوں میں تقسیم ہو گیا جو ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں، اور جن کے خلاف تمہاری تلواریں چل رہی تھیں، اور جن کے خون سے تمہاری تلواریں اب بھی آلودہ ہیں، اور تمہیں مال غنیمت میں سے کچھ نہ ملا۔ چونکہ منافقین ہر جگہ ہوتے تھے، ان میں سے کسی نے صحابہ کے درمیان لڑائی کرانے کے لیے یہ بات چھیڑی تھی، اب انصار صحابہ میں جو عمر رسیدہ اور تجربہ کار حضرات تھے، ان کے دلوں میں کوئی خیال پیدا نہیں ہوا، وہ جانتے تھے کہ اس مال و دولت کی حقیقت کیا ہے؟

لیکن انصار صحابہ میں جو نوجوان تھے، ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ یہ عجیب

معاملہ ہوا کہ سارا مال غنیمت انہی میں تقسیم ہو گیا اور ہم لوگ جو جہاد میں شریک تھے، ہمیں کچھ نہ ملا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکیمانہ خطاب

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ بعض انصار صحابہ کو یہ خیال ہو رہا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ تمام انصار صحابہ کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار صحابہ رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اے گروہ انصار! تمہیں اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت عطا فرمائی، تمہیں اللہ تعالیٰ نے نبی کی میزبانی کا شرف عطا فرمایا، اور میں نے یہ مال غنیمت ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جو یہاں کے رہنے والے ہیں تاکہ یہ ایمان پر پختہ اور راسخ ہو جائیں، اور کتنی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ میں جس کو مال غنیمت نہیں دیتا ہوں وہ زیادہ معزز اور محبوب ہوتا ہے اس کے مقابلے میں جس کو میں مال غنیمت دیتا ہوں، لیکن میں نے سنا ہے کہ بعض لوگوں کے دلوں میں اس قسم کا خیال پیدا ہوا ہے۔ پھر فرمایا: اے گروہ انصار! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ جب یہ لوگ اپنے گھروں کو واپس جائیں تو ان کے ساتھ گائے، بیل، بکریاں ہوں، اور جب تم اپنے گھروں کی طرف واپس جاؤ تو تمہارے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ بتاؤ ان میں سے کون افضل ہے؟''

جس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی، اس وقت تمام لوگوں کے دلوں میں ٹھنڈک پڑ گئی، انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے لیے تو اس سے بڑا اعزاز کوئی نہیں ہے، یہ بات صرف چند نوجوانوں نے کہہ دی تھی ورنہ ہمارے جو بڑے ہیں ان میں سے کسی کے دل میں کوئی خیال پیدا نہیں ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا فیصلہ فرمائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیصلہ برحق ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص الخاص کون تھے؟

جب یہ سارا قصہ ختم ہو گیا تو اس کے بعد پھر انصار صحابہ رضی اللہ عنہم سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اے انصار خوب سن لو! تم میرے خاص الخاص لوگ ہو:

((لَوْ سَلَكَ النَّاسُ وَادِياً لَسَلَكْتُ شِعْبَ الْأَنْصَارِ))

''اگر لوگ ایک راستے پر جائیں اور انصار دوسرے راستے پر جائیں تو میں انصار

والا راستہ اختیار کروں گا"

انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کو صبر کرنے کی وصیت

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے انصار! ابھی تک تو تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوئی، اور مجھے تمہارے ساتھ جو محبت اور تعلق ہے وہ ان شاء اللہ برقرار رہے گا، لیکن میں تمہیں پہلے سے بتا دیتا ہوں کہ میرے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد تمہیں اس بات سے واسطہ پیش آئے گا کہ تمہارے مقابلے میں دوسروں کو زیادہ ترجیح دی جائے گی۔ یعنی جو امراء، اور حکام بعد میں آنے والے ہیں، وہ تمہارے ساتھ اتنا اچھا سلوک نہیں کریں گے، جتنا اچھا سلوک مہاجرین اور دوسروں کے ساتھ کریں گے۔

اے گروہ انصار! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اگر تمہارے ساتھ ایسا سلوک ہو تو اس وقت تم صبر کرنا یہاں تک کہ حوض کوثر پر تم مجھ سے آملو" (۱)

اس ارشاد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے یہ بتا دیا کہ آج تو تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوئی، لیکن آئندہ تمہارے ساتھ ناانصافی ہوگی اور میں تمہیں وصیت کرتا ہو کہ اس ناانصافی کے موقع پر صبر کرنا۔

انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کا اس وصیت پر عمل

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انصار صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ نہیں فرمایا کہ اس موقع پر "تحفظ حقوق انصار" کی ایک انجمن بنا لینا، پھر اپنے حقوق طلب کرنے کے لیے جھنڈا لے کر کھڑے ہو جانا اور بغاوت کا علم بلند کر دینا، بلکہ یہ فرمایا کہ اس وقت تم صبر کرنا یہاں تک کہ تم مجھ سے حوض کوثر پر آکر مل جاؤ۔ چنانچہ انصار صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم پر ایسا عمل کر کے دکھایا کہ پوری تاریخ اسلام میں انصار کی طرف سے کوئی لڑائی اور جھگڑا آپ کو نہیں ملے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان مشاجرات ہوئے اور اس کے نتیجے میں جنگ جمل اور جنگ صفین بھی ہوئیں، لیکن انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے امراء اور حکام کے خلاف کوئی بات پیش نہیں آئی۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الطائف في شوال سنة ثمان، رقم: ۳۹۸۵،
• صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب إعطاء المؤلفة قلوبهم على الإسلام وتصبر من قوى، رقم: ۱۷۵۸، مسند أحمد، رقم: ۱۱۱۲۲

انصار کے حقوق کا خیال رکھنا

ایک طرف تو حضور اقدس ﷺ نے انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ وصیت فرمائی، دوسری طرف حضور اقدس ﷺ نے مرض الوفات میں جب آپ ﷺ مسجد نبوی میں نماز کے لیے بھی تشریف نہیں لا رہے تھے، اس وقت لوگوں کو جو وصیتیں فرمائیں، ان وصیتوں میں ایک یہ تھی کہ یہ انصار صحابہ رضی اللہ عنہم انہوں نے میری مدد کی ہے اور انہوں نے قدم قدم پر ایمان کا مظاہرہ کیا ہے، لہٰذا ان کے حقوق کا خیال رکھنا، ایسا نہ ہو کہ ان انصار کے دل میں ناانصافی کا خیال پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ایک طرف تو صحابہ کرام کو آپ نے یہ تلقین فرمائی کہ ان انصار کے حقوق کا خیال رکھنا، اور دوسری طرف انصار کو یہ تلقین کی کہ اگر کبھی تمہارے ساتھ ناانصافی ہو تو صبر کا معاملہ کرنا۔

ہر شخص اپنے حقوق بجالائے

لہٰذا حضور اقدس ﷺ کی تعلیم اور تلقین یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فریضے کو دیکھے کہ میرے ذمہ کیا فریضہ عائد ہوتا ہے؟ مجھ سے کیا مطالبہ ہے؟ اور میں اس فریضے کو اور اس مطالبے کو پورا کر رہا ہوں یا نہیں؟ اور جب ہر انسان کو یہ دھن لگ جاتی ہے کہ میں اپنا فریضہ صحیح طور پر ادا کروں اور میرے ذمے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مطالبہ ہے وہ پورا کروں تو اس صورت میں سب کے حقوق ادا ہو جاتے ہیں۔

آج ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہا ہے

آج دنیا میں اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے، اور آج یہ سبق قوم کو پڑھایا جا رہا ہے کہ ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے لیے جھنڈا لے کر کھڑا ہو جائے کہ مجھے میرے حقوق ملنے چاہئیں، اس کے نتیجے میں وہ اس بات سے بے پرواہ ہے کہ میرے ذمے کیا فرائض اور حقوق عائد ہوتے ہیں؟ مجھ سے کیا مطالبات ہیں؟ مزدور یہ نعرہ لگا رہا ہے کہ میرے حقوق مجھے ملنے چاہئیں، آجر کہہ رہا ہے کہ مجھے میرے حقوق ملنے چاہئیں، لیکن نہ مزدور کو اپنے فرائض کی پرواہ ہے اور نہ آجر کو اپنے فرائض کی پرواہ ہے، آج مزدور کو یہ حدیث تو خوب یاد ہے کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو، لیکن اس کی فکر نہیں کہ جو کام اس نے کیا ہے اس میں پسینہ بھی نکلا یا نہیں؟ اس کو اس کی فکر نہیں کہ میں نے جو کام کیا ہے، وہ واقعۃً اس لائق ہے کہ اس پر مزدوری دی جائے؟

ہر انسان اپنا جائزہ لے

لہٰذا ہر انسان اپنا جائزہ لے، اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے کہ میں جو کام کر رہا ہوں، وہ درست ہے یا نہیں؟ اگر ایک شخص دفتر میں کام کر رہا ہے اس کو اس کی فکر تو ہوتی ہے کہ میری تنخواہ بڑھنی چاہیے، میرا فلاں گریڈ ہونا چاہیے، مجھے اتنی ترقیاں ملنی چاہئیں، لیکن کیا اس ملازم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ دفتر کے اندر جو فرائض میرے ذمے عائد ہیں، وہ فرائض میں ٹھیک طریقے پر ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج لوگوں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں، آج کسی کو اپنا حق نہیں مل رہا ہے، جبکہ حضور اقدس ﷺ کا طریقہ ہے کہ ہر ایک کو اس کے فرائض سے باخبر فرماتے ہیں کہ تمہارا یہ فریضہ ہے، لہٰذا تم اپنے اس فریضے کو ادا کرو۔ صرف یہی طریقہ ہے جو معاشرے کو اصلاح کی طرف لا سکتا ہے۔

بہر حال! حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ حلیم اور بردبار کوئی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ لوگوں کی نافرمانیاں اور ان کے کفر و شرک کو دیکھ رہے ہیں، لیکن پھر بھی صبر کرتے ہیں اور ان کو عافیت اور رزق دیتے ہیں۔ لہٰذا تم بھی اللہ تعالیٰ کے ان اخلاق کو اپنے اندر پیدا کریں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆

خاندانی اختلافات کا چوتھا حل
معاملات کی صفائی ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

گزشتہ چند ہفتوں سے خاندانی اختلافات کے مختلف اسباب کا بیان چل رہا ہے۔ ہمارے خاندانوں میں جو اختلافات اور جھگڑے پھیلے ہوئے ہیں ان کی ایک بہت بڑی وجہ شریعت کے ایک اور حکم کا لحاظ نہ رکھنا ہے۔ شریعت کا وہ حکم یہ ہے:

"تَعَاشَرُوْا كَالْاَخْوَانِ، تَعَامَلُوْا كَالْاَجَانِبِ"

تم آپس میں تو بھائیوں کی طرح رہو اور ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں جیسا برتاؤ کرو، اخوت اور محبت کا برتاؤ کرو، لیکن جب لین دین کے معاملات پیش آئیں، اور خرید وفروخت اور کاروباری معاملات آپس میں پیش آئیں تو اس وقت اجنبیوں کی طرح معاملہ کریں، اور معاملہ بالکل صاف ہونا چاہیے، اس میں کوئی اجمال، ابہام اور پیچیدگی نہ ہو، بلکہ جو بات ہو، وہ صاف ہو۔ یہ نبی کریم ﷺ کی بڑی زبردست تعلیم ہے۔

ملکیت ممتاز ہونی چاہیے

اور نبی کریم ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ مسلمانوں کی ایک ایک بات واضح اور صاف ہونی چاہیے۔ ملکیتیں الگ الگ ہونی چاہئیں، اور کون سی چیز کس کی ملکیت ہے، یہ واضح ہونا چاہیے۔ شریعت کے اس حکم کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے آج ہمارا معاشرہ فسادات اور جھگڑوں سے بھرا ہوا ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/ ۲۶۷ تا ۲۷۸) بعد از نماز عصر، جامع دار العلوم، کراچی

باپ بیٹے کا مشترک کاروبار

مثلاً ایک کاروبار باپ نے شروع کیا، اب بیٹوں نے بھی اس کاروبار میں کام شروع کر دیا، اب یہ متعین نہیں ہے کہ بیٹا جو باپ کے کاروبار میں کام کر رہا ہے، وہ بحیثیت پارٹنر اور شریک کے کام کر رہا ہے، یا ویسے ہی باپ کی مدد کر رہا ہے، یا بیٹا بحیثیت ملازم کے باپ کے ساتھ کام کر رہا ہے اور اس کی تنخواہ مقرر ہے۔ ان میں سے کوئی بات طے نہیں ہوئی اور معاملہ اندھیرے میں ہے۔ اب دن رات باپ بیٹے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، باپ کو جتنے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کاروبار میں سے اتنے پیسے نکال لیتا ہے اور جب بیٹے کو ضرورت ہوتی ہے وہ نکال لیتا ہے، اب اسی طرح کام کرتے ہوئے سالہا سال گزر گئے اور رفتہ رفتہ دوسرے بیٹے بھی اس کاروبار میں آ کر شامل ہوتے رہے، اب کوئی بیٹا پہلے آیا، کوئی بعد میں آیا، کسی بیٹے نے زیادہ کام کیا اور کسی بیٹے نے کم کام کیا۔

اب حساب کتاب آپس میں کچھ نہیں رکھا، بس جس کو جتنی رقم کی ضرورت ہوتی وہ اتنی رقم کاروبار میں سے نکال لیتا، اور یہ بھی متعین نہیں کیا کہ اس کاروبار کا مالک کون ہے اور کس کی کتنی ملکیت ہے؟ اور نہ یہ معلوم کہ کاروبار میں کس کا کتنا حصہ ہے؟ نہ یہ معلوم کہ کس کی تنخواہ کتنی ہے؟ اب اگر دوسرا ان سے کہے کہ آپس میں حساب و کتاب رکھو، تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ بھائیوں کے درمیان کیا حساب و کتاب، باپ بیٹے میں کیا حساب و کتاب، یہ تو دوئی کی اور عیب کی بات ہے کہ باپ بیٹے یا بھائی بھائی آپس میں حساب و کتاب کریں، ایک طرف ایسی محبت کا اظہار ہے۔

بعد میں جھگڑے کھڑے ہو گئے

لیکن جب دس بارہ سال گزر گئے، شادیاں ہو گئیں، بچے ہو گئے، یا باپ جنہوں نے کاروبار شروع کیا تھا، دنیا سے چل بسے، تو اب بھائیوں کے درمیان لڑائی جھگڑے کھڑے ہو گئے اور اب ساری محبت ختم ہو گئی اور ایک دوسرے پر الزام عائد کرنے شروع کر دیئے کہ اس نے زیادہ لے لیا، میں نے کم لیا، فلاں بھائی زیادہ کھا گیا، میں نے کم کھایا، اب یہ جھگڑے ایسے شروع ہوئے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے، اور ایسے پیچیدہ ہو گئے کہ اصل حقیقت کا پتہ ہی نہیں چلتا، آخر میں جب معاملہ تناؤ پر آ گیا اور ایک دوسرے سے بات چیت کرنے اور شکل و صورت دیکھنے کے بھی روادار نہیں رہے، اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، تو آخر میں مفتی صاحب کے پاس آ گئے کہ اب آپ مسئلہ بتائیں کہ کیا کریں؟ اب مفتی صاحب مصیبت میں پھنس گئے۔ بھائی! جب کاروبار شروع کیا

تھا، اس وقت تو ایک دن بھی بیٹھ کر یہ نہیں سوچا کہ تم کس حیثیت میں کاروبار کر رہے ہو؟ اب جب معاملہ الجھ گیا تو مفتی بیچارہ کیا بتائے کہ کیا کریں۔

معاملات صاف ہونے چاہئیں

یہ سارے جھگڑے اس لیے کھڑے ہوئے کہ شریعت کے اس حکم پر عمل نہیں کیا کہ معاملات صاف ہونے چاہئیں۔ چاہے کاروبار باپ بیٹے کے درمیان ہو یا بھائی بھائی کے درمیان ہو یا شوہر اور بیوی کے درمیان ہو، لیکن ہر ایک کی ملکیت دوسرے سے ممتاز ہونی چاہیے، کس کا کتنا حق ہے؟ وہ معلوم ہونا چاہیے۔ یاد رکھئے! بغیر حساب و کتاب کے جو زندگی گزر رہی ہے، وہ گناہ کی زندگی گزر رہی ہے، اس لیے کہ یہ معلوم ہی نہیں کہ جو کھا رہے ہو وہ اپنا حق کھا رہے ہو یا دوسرے کا حق کھا رہے ہو۔

میراث فوراً تقسیم کر دیں

شریعت کا حکم یہ ہے کہ جونہی کسی کا انتقال ہو جائے، فوراً اس کی میراث تقسیم کریں، اور شریعت نے جس کا جتنا حق رکھا ہے وہ ادا کریں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تعزیت کے لیے تشریف لائے، ابھی تدفین نہیں ہوئی تھی، جنازہ رکھا ہوا تھا، اس وقت حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت ناساز تھی، کمزوری تھی، اور ساتھ میں حضرت والد صاحب کی وفات کے صدمے کا بھی طبیعت پر بڑا اثر تھا، حضرت والد صاحب کا خمیرہ رکھا ہوا تھا ہم وہ خمیرہ حضرت ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے کہ حضرت تھوڑا سا کھا لیں تاکہ کمزوری دور ہو جائے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خمیرہ ہاتھ میں لینے سے پہلے فرمایا کہ بھائی! اب اس خمیرہ کا کھانا میرے لیے جائز نہیں، کیونکہ یہ خمیرہ اب ورثاء کی ملکیت ہو گیا اور جب تک سارے ورثاء اجازت نہ دیں اس وقت تک میرے لیے اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت! سارے ورثاء بالغ ہیں اور سب یہاں موجود ہیں، اور سب بخوشی اجازت دے رہے ہیں، لہٰذا آپ تناول فرما لیں، تب جا کر آپ نے وہ خمیرہ تناول فرمایا۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ نے میراث تقسیم کرنے کی تاکید فرمائی کہ کسی کے انتقال پر فوراً اس کی میراث وارثین کے درمیان تقسیم کریں تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو۔

میراث جلد تقسیم نہ کرنے کا نتیجہ

لیکن آج ہمارے معاشرے میں جہالت اور نادانی کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی کے مرنے پر اس کے وارثین سے یہ کہا جائے کہ بھائی میراث تقسیم کریں، تو جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ توبہ، توبہ، ابھی تو مرنے والے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور تم نے میراث کی تقسیم کی بات شروع کر دی۔ چنانچہ میراث کی تقسیم کو دنیاوی کام قرار دے کر اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اب ایک طرف تو اتنا تقویٰ ہے کہ یہ کہہ دیا کہ ابھی تو مرنے والے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا، اس لیے مال و دولت کی بات ہی نہ کریں، اور دوسری طرف یہ حال ہے کہ جب میراث تقسیم نہیں ہوئی اور مشترکہ طور پر استعمال کرتے رہے تو سال کے بعد وہی لوگ جو مال و دولت کی تقسیم سے بہت اعراض برت رہے تھے، وہی لوگ اسی مال و دولت کے لیے ایک دوسرے کا خون پینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کرنے لگتے ہیں کہ فلاں زیادہ کھا گیا، فلاں نے کم کھایا۔

گھر کے سامان میں ملکیتوں کا امتیاز

لہٰذا شریعت نے میراث کی تقسیم کا فوری حکم اس لیے دیا تاکہ ملکیتیں ممتاز ہو جائیں، اور ہر شخص کی ملکیت واضح ہو کہ کون سی چیز کس کی ملکیت ہے۔ آج ہمارے معاشرے کا یہ حال ہے کہ میاں بیوی کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ گھر کا کون سا سامان میاں کا ہے اور کون سا بیوی کا ہے، زیور میاں کا ہے یا بیوی کا ہے، جس گھر میں مقیم ہیں، اس کا مالک کون ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعد میں جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی بات یاد آ گئی، آخر زمانے میں وفات سے کچھ عرصہ پہلے بیمار تھے، اور بستر پر تھے، اور اپنے کمرے ہی کے اندر محدود ہو کر رہ گئے تھے، اس کمرے میں ایک چار پائی ہوتی تھی، اسی چار پائی پر سارے کام انجام دیتے تھے، والد صاحب کے کمرے کے برابر میں میرا ایک چھوٹا سا کمرہ ہوتا تھا، میں اس میں بیٹھا رہتا تھا۔ کھانے کے وقت جب والد صاحب کے لیے ٹرے میں کھانا لایا جاتا، تو آپ کھانا تناول فرماتے اور کھانے کے بعد فرماتے کہ یہ برتن جلدی سے واپس اندر لے جاؤ، یا مدرسہ سے کوئی کتاب یا کوئی چیز منگوائی تو فارغ ہوتے ہی فرماتے کہ اس کو جلدی سے

واپس کر دو، یہاں مت رکھو۔ بعض اوقات ہمیں وہ برتن یا کتاب وغیرہ واپس لے جانے میں تاخیر ہو جاتی تو ناراضگی کا اظہار فرماتے کہ دیر کیوں کی، جلدی لے جاؤ۔

ہمارے دل میں بعض اوقات یہ خیال آتا کہ والد صاحب برتن اور کتاب واپس کرنے میں بہت جلدی کرتے ہیں، اگر پانچ سات منٹ تاخیر ہو جائے گی تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ اس دن یہ عُقدہ کھلا جب آپ نے ایک دن ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے اپنے وصیت نامے میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ یہ میرا کمرہ جس میں میری چارپائی ہے، اس کمرے کے اندر جو اشیاء ہیں، صرف یہ اشیاء میری ملکیت ہیں، اور گھر کی باقی سب اشیاء میں اپنی اہلیہ کی ملکیت کر چکا ہوں۔ اب اگر میرا انتقال اس حالت میں ہو جائے کہ میرے کمرے میں باہر کی کوئی چیز پڑی ہوئی ہو تو اس وصیت نامے کے مطابق لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ میری ملکیت ہے، اور پھر اس چیز کے ساتھ میری ملکیت جیسا معاملہ کریں گے۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے اس کمرے میں کوئی باہر کی چیز دیر تک پڑی نہ رہے، جو چیز بھی آئے وہ جلدی واپس چلی جائے۔

بہر حال! ملکیت واضح کرنے کا اس درجہ اہتمام تھا کہ بیٹوں کی ملکیت سے، بیوی کی ملکیت سے، ملنے جلنے والوں کی ملکیت سے بھی اپنی ملکیت ممتاز تھی، الحمدللہ، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

بھائیوں کے درمیان بھی حساب صاف ہو

لہٰذا شریعت نے ہمیں یہ حکم دیا کہ اپنی ملکیت واضح ہونی چاہیے۔ جب یہ مسئلہ ہم اپنے ملنے جلنے والوں کو بتاتے ہیں کہ بھائی! اپنا حساب کتاب صاف کرلو اور بات واضح کرلو، تو جواب میں کہتے ہیں کہ یہ حساب کتاب کرنا دوئی اور غیریت کی بات ہے۔ لیکن چند ہی سالوں کے بعد یہ ہوتا ہے کہ وہی لوگ جو اس وقت اپنائیت کا مظاہرہ کر رہے تھے، ایک دوسرے کے خلاف تلوار لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا آپس کے اختلافات اور جھگڑوں کا ایک بہت بڑا سبب ملکیتوں کو صاف نہ رکھنا ہے۔

مکان کی تعمیر اور حساب کی صفائی

یا مثلاً ایک مکان تعمیر ہو رہا ہے، اس ایک مکان میں کچھ پیسے باپ نے لگائے، کچھ پیسے ایک بیٹے نے لگائے، کچھ پیسے دوسرے بیٹے نے لگائے، کچھ پیسے کہیں سے قرض لے لیے، اور اس طرح وہ مکان تعمیر ہو گیا، اس وقت آپس میں کچھ طے نہیں کیا کہ بیٹے اس تعمیر میں جو پیسے لگا رہے ہیں، وہ

قرض کے طور پر لگا رہے ہیں؟ یا باپ کی مدد کر رہے ہیں؟ یا وہ بیٹے اس مکان میں اپنا حصہ لگا کر پارٹنر بننا چاہتے ہیں؟ اس کا کچھ پتہ نہیں، اور پیسے سب کے لگ رہے ہیں، لیکن کوئی بات واضح نہیں ہے۔ جب ان میں سے ایک کا انتقال ہوا تو اب جھگڑا کھڑا ہو گیا کہ یہ مکان کس کا ہے؟ ایک کہتا ہے کہ میں نے اس مکان میں اتنے پیسے لگائے ہیں، دوسرا کہتا ہے کہ میں نے اتنے پیسے لگائے ہیں، تیسرا کہتا ہے کہ زمین تو میں نے خریدی تھی، اور اس جھگڑے کے نتیجے میں ایک فساد برپا ہو گیا۔ اس وقت فیصلے کے لیے مفتی کے پاس پہنچتے ہیں کہ اب آپ بتائیں کہ اس کا کیا حل ہے؟ ایسے وقت میں فیصلہ کرتے وقت بعض اوقات ناانصافی ہو جاتی ہے۔

لہٰذا یہ مسئلہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ باپ کے کاروبار میں بیٹا کام کر رہا ہے، اور بات واضح ہوئی نہیں کہ وہ بیٹا کس حیثیت میں کام کر رہا ہے؟ آیا وہ باپ کا شریک ہے یا باپ کا ملازم ہے، تو اگر بیٹا ساری عمر بھی اس طرح کام کرتا رہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے للہ فی اللہ باپ کی مدد کی ہے، کاروبار میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔ لہٰذا پہلے سے بات واضح کرنی چاہیے۔

دوسرے کو مکان دینے کا صحیح طریقہ

اور اگر وضاحت کرتے ہوئے تقسیم کا معاملہ کرنا ہے تو تقسیم کرنے کے لیے بھی شریعت نے طریقہ بتایا ہے کہ تقسیم کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ محض یہ کہہ دینے سے نہیں ہوتا کہ میں نے تو اپنا مکان بیوی کے نام کر دیا تھا، یعنی اس کے نام مکان رجسٹری کرا دیا تھا، اب رجسٹری کرا دینے سے وہ یہ سمجھے کہ وہ مکان بیوی کے نام ہو گیا، حالانکہ شرعی اعتبار سے کوئی مکان کسی کے نام رجسٹری کرانے سے اس کی طرف منتقل نہیں ہوتا، جب تک اس پر اس کا قبضہ نہ کرا دیا جائے، اور اس سے یہ نہ کہا جائے کہ میں نے یہ مکان تمہاری ملکیت کر دیا، اب تم اس کے مالک ہو۔ اس کے بغیر دوسرے کی ملکیت اس پر نہیں آتی۔

تمام مسائل کا حل، شریعت پر عمل

ان سارے مسائل کا آج لوگوں کو علم نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ الل ٹپ معاملہ چل رہا ہے اور اس کے نتیجے میں لڑائی جھگڑے ہو رہے ہیں، فتنہ اور فساد پھیل رہا ہے، اور معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے، آپس میں مقدمہ بازیاں چل رہی ہیں۔ اگر آج لوگ شریعت پر ٹھیک ٹھیک عمل کر لیں تو

آدھے سے زیادہ مقدمات تو خود بخود ختم ہو جائیں۔

یہ خرابیاں اور جھگڑے تو ان لوگوں کے معاملات میں ہیں جن کی نیت خراب نہیں ہے، وہ لوگ جان بوجھ کر دوسروں کا مال دبانا نہیں چاہتے، البتہ جہالت کی وجہ سے انہوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ اس کے نتیجے میں لڑائی جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ لیکن جو لوگ بددیانت ہیں، جن کی نیت ہی خراب ہے، جو دوسروں کا مال ہڑپ کرنا چاہتے ہیں، ان کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔

خلاصہ

بہر حال! یہ بہت بڑا فساد ہے جو آج ہمارے معاشرے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس مسئلے کو خود بھی اچھی طرح سمجھنا چاہیے اور اپنے تمام ملنے جلنے والوں اور اعزہ رشتہ داروں کو یہ مسئلہ بتانا چاہیے کہ ایک مرتبہ حساب صاف کرلیں اور پھر آپس میں محبت کے ساتھ معاملات کریں، لیکن حساب صاف ہونا چاہیے اور ہر بات واضح ہونی چاہیے، کوئی بات مجمل اور مبہم نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

خاندانی اختلافات کا پانچواں حل
جھگڑے اور بے تکلفی سے اجتناب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

گزشتہ چند ہفتوں سے خاندانی اختلافات کے مختلف اسباب کا بیان چل رہا ہے، ان اسباب میں سے ایک سبب وہ ہے جو حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے، وہ حدیث یہ ہے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا تُمَارِ اَخَاكَ وَلَا تُمَازِحْهُ وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِداً فَتُخْلِفَهُ))(۱)

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے تین حکم ارشاد فرمائے، پہلا حکم یہ دیا کہ اپنے کسی بھائی سے جھگڑا مت کر۔ دوسرا حکم یہ دیا کہ اس کے ساتھ نامناسب مذاق مت کریں۔ تیسرا حکم یہ دیا کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا وعدہ نہ کریں جس کو پورا نہ کرسکو، یعنی وعدہ خلافی نہ کریں۔

اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کریں

پہلا حکم یہ دیا کہ

((لَاتُمَارِ أَخَاكَ))

''اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کریں''

یہ ہماری اردو زبان بہت تنگ زبان ہے، جب ہم عربی سے اردو میں ترجمہ کرتے ہیں تو ہمارے پاس بہت محدود الفاظ ہوتے ہیں، اس لیے ہمیں اس تنگ دائرے میں رہ کر ہی ترجمہ کرنا پڑتا

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۲۸۰ تا ۲۹۹) بعد از نمازِ عصر، جامع دارالعلوم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة، عن رسول الله، باب ماجاء في المراء، رقم: ۱۹۱۸

ہے، لہٰذا اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے یہ لفظ ''لاتمار'' ارشاد فرمایا، اس کے ترجمہ کے لیے ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی لفظ نہیں ہے کہ ''جھگڑا نہ کریں۔'' لیکن عربی زبان میں یہ لفظ ''مراء'' سے نکلا ہے جو اس کا مصدر ہے، اور ''مراء'' کا لفظ بہت وسیع معنی رکھتا ہے، اس کے اندر ''بحث و مباحثہ کرنا'' مجادلہ کرنا، جسمانی لڑائی لڑنا، زبانی تو تکار کرنا، یہ سب اس کے مفہوم کے اندر داخل ہیں، لہٰذا چاہے جسمانی جھگڑا ہو، یا زبانی جھگڑا ہو، یا بحث و مباحثہ ہو، یہ تینوں چیزیں مسلمانوں کے درمیان باہمی اتفاق و اتحاد، محبت اور ملاپ پیدا کرنے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ لہٰذا حتیٰ الامکان اس بات کی کوشش کریں کہ جھگڑا کرنے کی نوبت نہ آئے۔

ہاں! بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک موقع پر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا حق پامال ہو گیا ہے، اگر وہ عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ نہیں کرے گا تو صحیح طور پر زندگی نہیں گزار سکے گا، اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی اور اس کے ساتھ ظلم ہوگا، تو اس ظلم اور زیادتی کی وجہ سے مجبوراً اس کو عدالت میں جانا پڑے تو یہ اور بات ہے، ورنہ حتیٰ الامکان جھگڑا چکاؤ، جھگڑے میں پڑنے سے پرہیز کریں۔

بحث ومباحثہ سے اجتناب کیجئے

یہ ہدایت خاص طور پر ان لوگوں کو دی جارہی ہے جو دوسروں کی ہر بات میں کجی نکالتے ہیں، اور دوسروں کی ہر بات کو رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ چیز ان کے مزاج کا ایک حصہ بن جاتی ہے کہ دوسرے سے ضرور بحث کرنی ہے، ذرا سی بات لے کر بیٹھ گئے، اور اس پر بحث و مباحثہ کا ایک محل تعمیر کر لیا۔ ہمارے معاشرے میں یہ جو فضول بحثوں کا رواج چل پڑا ہے، نہ ان کا دین سے کوئی تعلق، نہ دنیا سے کوئی تعلق، جن کے بارے میں نہ قبر میں سوال ہوگا، نہ حشر میں سوال ہوگا، نہ آخرت میں سوال ہوگا، لیکن ان کے بارے میں لمبی لمبی بحثیں ہو رہی ہے، یہ سب فضول کام ہے، اس کے نتیجے میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اور فرقے بن جاتے ہیں اور آپس میں منافرت بڑھتی ہے۔

جھگڑے سے علم کا نور چلا جاتا ہے

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے:

''اَلْمِرَاءُ وَالْجِدَالُ فِي الْعِلْمِ يُذْهِبُ بِنُوْرِ الْعِلْمِ''(۱)

یعنی یہ بحث و مباحثہ علم کے نور کو غارت کر دیتا ہے، علم کا نور اس کے ساتھ موجود نہیں رہتا۔

---

(۱) ترتيب المدارك وتقريب المسالك(۱/۵۱)

بس جس بات کو تم حق سمجھتے ہو، اس کو حق طریقے سے اور حق نیت سے دوسرے کو بتا دو کہ میرے نزدیک یہ حق ہے، اب دوسرا شخص اگر مانتا ہے تو مان لے، نہیں مانتا تو وہ جانے اس کا اللہ جانے، کیونکہ تم داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے کہ لوگوں کی اصلاح تمہارے ذمے فرض ہو، کہ اگر ان کی اصلاح نہیں ہوگی تو تم سے پوچھا جائے گا، ایسا نہیں ہے۔

تمہاری ذمہ داری بات پہنچا دینا ہے

ارے جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا:

﴿مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغ﴾(۱)

رسول پر صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، زبردستی کرنا انبیاء علیہم السلام کا کام نہیں، تو تم کیوں زبردستی کرتے ہو، لہٰذا ایک حد تک سوال و جواب کریں، اور جب یہ دیکھو کہ بات بحث ومباحثہ کے حدود میں داخل ہو رہی ہے اور سامنے والا شخص حق کو قبول کرنے والا نہیں ہے تو اس کے بعد خاموش ہو جاؤ اور بحث ومباحثہ کا دروازہ بند کر دو۔

شکوہ وشکایت نہ کریں

بعض لوگوں کو ہر بات میں شکوہ اور شکایت کرنے کی عادت ہوتی ہے، جہاں کسی جاننے والے سے ملاقات ہوئی تو فوراً کوئی شکایت جڑ دیں گے کہ تم نے فلاں وقت یہ کیا تھا، تم نے فلاں وقت یہ نہیں کیا تھا، اور بسا اوقات یہ کام محبت کے نام پر کیا جاتا ہے، اور یہ جملہ ایسے لوگوں کو بہت یاد ہوتا ہے کہ ''شکایت محبت ہی سے پیدا ہوتی ہے'' جس سے محبت ہوتی ہے اس سے شکوہ بھی ہوتا ہے۔ یہ بات تو درست ہے، لیکن اس شکایت کی بھی ایک حد ہوتی ہے، جب کوئی اہم بات ہوئی تو اس پر شکوہ کر لیا، لیکن ذرا ذرا سی بات لے کر بیٹھ جانا کہ فلاں تقریب میں تم نے فلاں کو دعوت دی اور ہمیں دعوت نہیں دی۔ ارے بھائی! دعوت دینے والے کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ جس کو چاہے دعوت دے اور جس کو چاہے دعوت نہ دے، ہمارے پاس شکایت کرنے کا کیا جواز ہے کہ تم یہ کہو کہ ہمیں دعوت میں کیوں نہیں بلایا تھا؟ بھائی تمہیں اس لیے نہیں بلایا تھا کہ تمہیں بلانے کا دل نہیں چاہا، اس وقت تمہیں بلانے کے حالات نہیں تھے، لیکن تم اس شکایت کو لیے بیٹھے ہو۔ آج ہم لوگ ذرا ذرا سی بات پر دوسرے کی شکایت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اس کے نتیجے میں سامنے والے اس سے

(۱) المائدة: ۹۹

شکایت کرتے ہیں کہ فلاں موقع پر تم نے بھی ہمیں نہیں بلایا تھا، چنانچہ شکوہ اور جواب شکوہ کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دلوں میں محبت پیدا ہونے کے بجائے عداوت پیدا ہورہی ہے اور آپس میں نفرت پیدا ہورہی ہے۔

اپنے بھائی کے عمل کی تاویل کرلیں

آج میں تجربہ کی بات کہہ رہا ہوں کہ اس کے نتیجے میں گھرانے کے گھرانے اجڑ گئے، ذرا ذرا سی بات لیے بیٹھے ہیں۔ ارے بھائی! اگر کسی سے غلطی ہوگئی ہے تو اس کو معاف کردو اور اس کو اللہ کے حوالے کردو۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے معاف کرنے کی کتنی تلقین فرمائی ہے، لہٰذا اگر تم معاف کردو گے تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا، تمہارا کیا نقصان ہوجائے گا، کون سا پہاڑ تم پر ٹوٹ پڑے گا، کون سی قیامت تم پر آجائے گی؟ لہٰذا چشم پوشی کرجاؤ، اور اس کے عمل کی کوئی تاویل تلاش کرلو کہ شاید اس وجہ سے دعوت نہیں دی ہوگی وغیرہ۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم تھے۔ جن کے فتاویٰ کا مجموعہ "فتاویٰ دارالعلوم دیوبند" کے نام سے دس جلدوں میں چھپ گیا ہے، جس میں علوم کے دریا بہادیے، یہ عجیب وغریب بزرگ تھے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ان کو ہمیشہ اس طرح دیکھا کہ کبھی کسی آدمی کی منہ پر تردید نہیں کرتے تھے کہ تم نے یہ بات غلط کہی، بلکہ اگر کسی نے غلط بات بھی کہہ دی تو آپ سن کر فرماتے کہ اچھا گویا کہ آپ کا مطلب یہ ہوگا، اس طرح اس کی تاویل کرکے اس کا صحیح مطلب اس کے سامنے بیان کردیتے۔ اس کے ذریعے اس کو تنبیہ بھی فرمادیتے کہ تم نے جو بات کہی ہے وہ صحیح نہیں ہے، لیکن اگر یہ بات اس طرح کہی جائے تو صحیح ہوجائے گی۔ ساری عمر کبھی کسی کے منہ پر تدرید نہیں فرمائی۔

اپنا دل صاف کرلیں

اس لیے اگر تمہارا کوئی مسلمان بھائی ہے، دوست ہے، یا عزیز وقریب ہے، یا رشتہ دار ہے، اگر اس سے کوئی غلط معاملہ سرزد ہوا ہے تو تم بھی اس کی کوئی تاویل تلاش کرلو کہ شاید فلاں مجبوری پیدا

ہوگئی ہوگی، تاویل کر کے اپنا دل صاف کر لو۔ اور اگر شکایت کرنی ہی ہے تو نرم لفظوں میں اس سے شکایت کرلو کہ فلاں وقت تمہاری بات مجھے ناگوار گزری، اگر کوئی وضاحت پیش کرے تو اس کو قبول کر لو، یہ نہ کریں کہ اس شکایت کو لے کر بیٹھ جاؤ اور اس کی بنیاد پر جھگڑا کھڑا کر دو۔ اسی لیے جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ((لَا تُمَارِ اَخَاكَ)) اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کریں۔

یہ زندگی چند روزہ ہے!

میاں! یہ دنیا کتنے دن کی ہے، چند دن کی دنیا ہے، کتنے دن کی گارنٹی لے کر آئے کہ اتنے دن زندہ رہو گے، اور عام طور پر شکایتیں دنیا کی باتوں پر ہوتی ہیں کہ فلاں نے مجھے دعوت میں نہیں بلایا، فلاں نے میری عزت نہیں کی، فلاں نے میرا احترام نہیں کیا، یہ سب دنیا کی باتیں ہیں۔ یہ دنیا کا مال و دولت، دنیا کے اسباب، دنیا کی وجاہت، دنیا کی شہرت، دنیا کا منصب، ان سب کی کوئی حقیقت نہیں ہے، نہ جانے کب فنا ہو جائیں، کب یہ چیزیں چھن جائیں۔ اس کے بجائے وہاں کے بارے میں سوچو جہاں ہمیشہ رہنا ہے، جہاں ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی گزارنی ہے، وہاں کیا حال ہوگا؟ وہاں کس طرح زندگی بسر کریں گے؟ وہاں پر اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دو گے؟ اس کی فکر کریں۔ حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِعْمَلْ لِدُنْيَاكَ بِقَدْرِ مَقَامِكَ فِيْهَا وَاعْمَلْ لِاٰخِرَتِكَ بِقَدْرِ بَقَائِكَ فِيْهَا))(۱)

''یعنی دنیا کے لیے اتنا کام کریں جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لیے اتنا کام کریں جتنا آخرت میں رہنا ہے''

یاد رکھئے! یہ مال و دولت، یہ شہرت، یہ عزت، سب آنی جانی چیزیں ہیں، آج ہیں کل نہیں رہیں گی۔

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

وہ لوگ جن کا دنیا میں ڈنکا بج رہا تھا، جن کا طوطی بول رہا تھا، جن کا اقتدار تھا، جن کے نام سے لوگ لرزتے تھے، آج جیل خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں، اور جن لوگوں کے ناموں کے ساتھ عزت و شرف کے القاب لگائے جاتے تھے، آج ان پر جرائم کی فہرستوں کے انبار لگے ہوئے ہیں کہ انہوں نے چوری کی، انہوں نے ڈاکہ ڈالا، انہوں نے رشوت لی، انہوں نے خیانت کی۔ ارے! کس

(۱) بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية (٤/٢٨٣)، تفسير حقي (١٢/١٤٩)

عزت پر، کس شہرت پر، کس پیسے پر لڑتے ہو، نہ جانے کس دن اور کس وقت اللہ تعالیٰ یہ چیزیں تم سے چھین لے، ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر تم نے جھگڑے کھڑے کیے ہوئے ہیں، ان باتوں پر تم نے خاندان اجاڑے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا تُمَارِ اَخَاكَ))

''اپنے بھائی سے جھگڑا مت کریں''

کون سا مذاق جائز ہے؟

اس حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے دوسرا حکم یہ دیا:

((وَلَا تُمَازِحْهُ))

''اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ دل لگی اور مذاق نہ کریں''

اس حدیث میں ''مذاق'' سے مراد وہ مذاق ہے جو دوسرے کی گرانی کا سبب ہو، اگر ایسا مذاق ہے جو حدود شریعت کے اندر ہے اور خوش طبعی کے لیے کیا جارہا ہے، سننے والے کو بھی اس سے کوئی گرانی نہیں ہے تو ایسے مذاق میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ اگر وہ مذاق حق ہے اور اس مذاق میں دوسرے کو خوش کرنے کی نیت ہے تو اس پر ثواب بھی ملے گا۔

مذاق اڑانا اور تمسخر کرنا جائز نہیں

ایک ہوتا ہے مذاق کرنا، ایک ہوتا ہے مذاق اڑانا، مذاق کرنا تو درست ہے، لیکن کسی کا مذاق اڑانا کہ اس کے ذریعہ اس کا استہزاء کیا جائے اور اس کے ساتھ ایسا مذاق اور ایسی دل لگی کی جائے جو اس کے لیے ناگوار ہو اور اس کی دل شکنی کا سبب ہو، ایسا مذاق حرام اور ناجائز ہے۔ بعض لوگ دوسرے کی چھیڑ بنا لیتے ہیں، اور یہ سوچتے ہیں کہ جب اس کے سامنے یہ بات کریں گے تو وہ غصہ ہوگا اور اس کے نتیجے میں ہم ذرا مزہ لیں گے، یہ وہ مذاق ہے جس کو حضور اقدس ﷺ منع فرمارہے ہیں۔ اتنا مذاق کریں جس کو دوسرا آدمی برداشت کر سکے، اب آپ نے دوسرے کے ساتھ اتنا مذاق کیا کہ اس کے نتیجے میں اس کو زچ کر دیا، اب وہ اپنے دل میں تنگی محسوس کر رہا ہے، تو یاد رکھئے! اگرچہ اس مذاق کے نتیجے میں دنیا میں تمہیں تھوڑا بہت مزہ آرہا ہے، لیکن آخرت میں اس کا عذاب بڑا شدید ہے، العیاذ باللہ۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے تم نے ایک مسلمان کا دل دکھایا اور مسلمان کا دل دکھانا بڑا سخت گناہ ہے۔

مسلمان کی عزت ''بیت اللہ'' سے زیادہ

ابن ماجہ میں ایک حدیث ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ بیت اللہ شریف کا طواف فرما رہے تھے، طواف کرتے ہوئے آپ ﷺ نے بیت اللہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

''اے بیت اللہ! تو کتنا عظیم ہے، تیری قدر و منزلت کتنی عظیم ہے کہ اس روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنا گھر قرار دیا، تیری حرمت کتنی عظیم ہے۔ لیکن اے بیت اللہ! ایک چیز ایسی ہے جس کی حرمت تیری حرمت سے بھی زیادہ ہے، وہ ہے مسلمان کی جان، اس کا مال، اس کی آبرو''(۱)

اگر کوئی شخص ایسا سنگدل اور شقی القلب ہو کہ وہ بیت اللہ کو ڈھا دے، العیاذ باللہ، تو ساری دنیا اس کو برا کہے گی کہ اس نے اللہ کے گھر کی کتنی بے حرمتی کی ہے، مگر سرکار دو عالم ﷺ فرما رہے ہیں کہ اگر کسی نے کسی مسلمان کی جان، مال، آبرو پر حملہ کر دیا، یا اس کا دل دکھایا دیا تو بیت اللہ کو ڈھانے سے زیادہ سنگین گناہ ہے۔ لیکن تم نے اس کو معمولی سمجھا ہوا ہے اور تم دوسرے کا مذاق اڑا رہے ہو، اور اس کی وجہ سے اس کا دل دکھا رہے ہو اور تم مزے لے رہے ہو؟ ارے یہ تم بیت اللہ کو ڈھا رہے ہو، اس کی حرمت کو پامال کر رہے ہو۔ لہٰذا کسی کو مذاق کا نشانہ بنا لینا اور اس کا استہزاء کرنا حرام ہے۔

بے جا مذاق نفرتیں پیدا کرتا ہے

اور یہ مذاق بھی ان چیزوں میں سے ہے جو دلوں کے اندر گرہیں ڈالنے والی ہیں اور دلوں کے اندر عداوتیں اور نفرتیں پیدا کر دیتی ہیں۔ اگر دوسرا تمہارے بارے میں یہ محسوس کرے کہ یہ میرا مذاق اڑاتا ہے، میری توہین کرتا ہے، تو بتاؤ کیا کبھی اس کے دل میں تمہاری محبت پیدا ہو گی؟ کبھی بھی محبت پیدا نہیں ہو گی، بلکہ اس کے دل میں تمہاری طرف سے نفرت پیدا ہو گی کہ یہ آدمی میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہے اور پھر اس نفرت کے نتیجے میں آپس میں جھگڑا اور فساد پھیلے گا۔ البتہ اگر دوست واحباب یا عزیز و اقارب آپس میں ایسا مذاق کر رہے ہیں جس میں کسی کی دل آزاری نہیں ہے، جس میں جھوٹ نہیں ہے، تو شرعاً ایسے مذاق کی اجازت ہے، شریعت نے ایسے مذاق پر پابندی نہیں لگائی۔

---

(۱) شعب الإيمان، رقم: ٦٧٠٦ (٢٩٦/٥)، مصنف ابن ابی شيبة (٤٠١/٦)، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (٤٤/١)

وعدہ نبھانے کی عادت اپنائیں

اس حدیث میں تیسرا حکم یہ دیا کہ

((وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِداً فَتُخْلِفَهُ))

"یعنی کوئی ایسا وعدہ نہ کریں جس کو تم پورا نہ کر سکو"

بلکہ جس سے جو وعدہ کیا ہے اس وعدہ کو پورا کریں، اس وعدہ کا ایفاء کریں، وعدہ کر کے پورا نہ کرنے کو حضور اقدس ﷺ نے نفاق کی علامت قرار دیا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ فَهُوَ مُنَافِقٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))(۱)

منافق کی تین نشانیاں

تین باتیں جس شخص میں پائی جائیں، وہ خالص منافق ہے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ کی خلاف ورزی کرے، اور جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس امانت میں خیانت کرے۔ یہ تین باتیں جس شخص میں پائی جائیں، وہ پکا منافق ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وعدہ کی خلاف ورزی نفاق کی علامت ہے، لہٰذا اگر تمہیں بھروسہ نہ ہو کہ میں وعدہ پورا کر سکوں گا، تو وعدہ مت کریں، لیکن جب ایک مرتبہ وعدہ کر لیں تو جب تک کوئی عذر شدید پیش نہ آ جائے، اس وقت تک اس کی پابندی لازم ہے۔

بچوں سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا کریں

حضور اقدس ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ بچوں سے بھی جو وعدہ کریں اس کو پورا کریں۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے ایک بچے کو بلاتے ہوئے کہا کہ میرے پاس آؤ، ہم تمہیں چیز دیں گے، حضور اقدس ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تمہارا واقعی اس کو کچھ دینے کا ارادہ تھا یا ویسے ہی اس کو بہلانے کے لیے کہہ دیا، ان صحابی نے فرمایا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس کھجور ہے، وہ

(۱) سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب علامة النفاق، رقم: ۴۹۳۷، مسند أحمد، رقم: ۱۰۵۰۴

دینے کا ارادہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم ویسے ہی وعدہ کر لیتے اور کچھ دینے کا ارادہ نہ ہوتا تو تمہیں اس بچے کے ساتھ وعدہ خلافی کرنے کا گناہ ہوتا۔(۱)

اور بچے کے ساتھ وعدہ خلافی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے بچے کو شروع سے یہ تعلیم دے دی کہ وعدہ خلافی کرنا کوئی بری بات نہیں ہے، اور تم نے پہلے دن سے ہی اس کی تربیت خراب کر دی۔ لہٰذا بچوں کے ساتھ وعدہ خلافی نہیں کرنی چاہیے، بچوں کے ساتھ بھی جو وعدہ کیا ہے، اس کو پورا کریں۔

اور بعض وعدہ خلافیاں تو ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں نے فلاں کے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہے، مجھے اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن بعض وعدہ خلافیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی طرف ہم لوگوں کا دھیان ہی نہیں جاتا کہ وہ بھی کوئی وعدہ خلافی ہے۔

اصول وضوابط کی پابندی نہ کرنا وعدہ خلافی ہے

مثلاً ہر ادارے کے اپنے کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں، چنانچہ جب ہم کسی ادارے میں ملازمت اختیار کرتے ہیں تو اس ادارے کے ساتھ منسلک ہوتے وقت ہم عملاً یہ وعدہ کرتے ہیں کہ اس ادارے کے قواعد وضوابط کی پابندی کریں گے۔ یا مثلاً آپ نے پڑھنے کے لیے دارالعلوم میں داخلہ لے لیا، تو داخلہ لیتے وقت طالب علم سے ایک تحریری وعدہ بھی لیا جاتا ہے کہ میں یہ یہ کام نہیں کروں گا اور یہ یہ کام کروں گا اور اگر کسی طالب علم سے تحریری وعدہ نہ بھی لیا جائے تب بھی داخل ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ یہ اقرار کر رہا ہے کہ دارالعلوم کے جو قواعد وضوابط ہیں میں ان کی پابندی کروں گا اب اگر کوئی طالب علم ان قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کرے گا تو یہ اس وعدہ کی خلاف ورزی ہوگی اور یہ عمل ناجائز اور گناہ ہوگا۔

جو قوانین شریعت کے خلاف نہ ہوں ان کی پابندی لازم ہے

اسی طرح جو آدمی کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ شخص عملاً اس ملک کے ساتھ یہ معاہدہ کرتا ہے کہ میں اس ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا تاوقتیکہ کوئی قانون مجھے کسی خلاف شرع امر پر مجبور نہ کرے۔ اگر کوئی قانون ایسا ہے جو شریعت کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرتا ہے تو اس کے

---

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في التشديد في الكذب، رقم: ٤٣٣٩، مسند أحمد، رقم: ١٥١٤٧

بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمادیا:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ))(۱)

''یعنی خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہے''

اگر کسی کام سے شریعت تمہیں روک دے تو پھر اس کام کے کرنے کو خواہ کوئی بادشاہ کہے، یا کوئی صدر یا وزیر اعظم کہے، یا کوئی قانون اس کام کا حکم دے، لیکن تم اس حکم کے ماننے کے پابند نہیں ہو، بلکہ تم اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے کے پابند ہو۔

قوانین کی خلاف ورزی وعدہ خلافی ہے

لہٰذا اگر کوئی آپ کو گناہ پر مجبور نہیں کر رہا ہے، بلکہ مباحات سے متعلق کوئی قانون بنا ہوا ہے تو اس صورت میں ہر شہری چاہے وہ مسلمان ہو، یا غیر مسلم ہو، اپنی حکومت سے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ میں قوانین کی پابندی کروں گا، اب اگر کوئی شخص بلا عذر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو یہ بھی وعدہ خلافی میں داخل ہے۔

ٹریفک کے قوانین کی پابندی کریں

مثلاً ٹریفک کے قوانین ہیں کہ جب سرخ بتی جلے تو رک جاؤ اور جب سبز بتی جلے تو چل پڑو۔ اس قانون کی پابندی شرعاً بھی ضروری ہے، اس لیے کہ تم نے وعدہ کیا ہوا ہے کہ میں اس ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا۔ اگر تم اس قانون کو روندتے ہوئے گزر جاتے ہو تو اس صورت میں وعدہ خلافی کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہو اور عہد شکنی کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہو، چاہے وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک ہو۔

بے روزگاری الاؤنس وصول کرنا

برطانیہ کی حکومت ایک بے روزگاری الاؤنس جاری کرتی ہے، یعنی جو لوگ بے روزگار ہوتے ہیں ان کو ایک الاؤنس دیا جاتا ہے، گویا کہ روزگار ملنے تک حکومت ان کی کفالت کرتی ہے۔ یہ ایک اچھا طریقہ ہے۔ لیکن ہمارے بعض بھائی جو یہاں سے وہاں گئے ہیں، انہوں نے اس بے روزگاری کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے، اب ایسے لوگ رات کو چوری چھپے نوکری کر لیتے ہیں اور ساتھ میں بے

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۱۰٤۱

روزگاری الاؤنس بھی وصول کرتے ہیں، اچھے خاصے نمازی اور دیندار لوگ یہ دھندا کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے مجھ سے اس کے بارے میں مسئلہ پوچھا تو میں نے بتایا کہ یہ عمل تو بالکل ناجائز اور گناہ ہے اول تو یہ جھوٹ ہے کہ بے روزگار نہیں ہو لیکن اپنے کو بے روزگار ظاہر کر رہے ہو، دوسرے یہ کہ تم حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہو، کیونکہ جب تم اس ملک میں داخل ہو گئے تو اب اس ملک کے جائز قانون کی پابندی لازم ہے۔ ان صاحب نے جواب میں کہا کہ یہ تو غیر مسلم حکومت ہے اور غیر مسلم حکومت کا پیسہ جس طرح بھی حاصل ہو، اس کو لے کر خرچ کرنا جائز ہے۔ العیاذ باللہ۔ ارے بھائی! جب تم اس ملک میں داخل ہوئے تھے اس وقت تم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم اس ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، لہٰذا اب اس ملک کے قانون کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں، اور جس طرح مسلمان کے ساتھ خلاف ورزی جائز نہیں، کافروں کے ساتھ بھی وعدہ خلافی جائز نہیں، اور اس خلاف ورزی کے نتیجے میں جو پیسہ حاصل ہوگا وہ بھی ناجائز اور حرام ہوگا۔

خلاصہ

بہر حال جھگڑے کا ایک بہت بڑا سبب یہ وعدہ خلافی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو سرکار دو عالم ﷺ کے ان احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

خاندانی اختلافات کا چھٹا حل

جھوٹ سے پرہیز ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

گزشتہ چند ہفتوں سے خاندانی اختلافات کے مختلف اسباب کا بیان چل رہا ہے، ان اسباب میں سے ایک سبب وہ ہے جو حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے، وہ حدیث یہ ہے:

حضرت سفیان بن اُسید حضرمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضرت اقدس ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كَبُرَتْ خِيَانَةً اَنْ تُحَدِّثَ اَخَاكَ حَدِيْثاً هُوَ لَكَ بِهِ مُصَدِّقٌ وَاَنْتَ لَهُ بِهِ كَاذِبٌ))(۱)

یہ بڑی ہی خیانت کی بات ہے کہ تم اپنے بھائی کو کوئی ایسی بات سناؤ جس کو وہ سمجھ رہا ہو کہ تم اس کو سچی بات بتا رہے ہو لیکن حقیقت میں تم اس کے سامنے جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ وہ عمل ہے جس سے دلوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں، دلوں میں شگاف پڑ جاتے ہیں، اور عداوتیں کھڑی ہو جاتی ہیں، دشمنیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جھوٹ بولنا تو ہر حال میں بڑا زبردست گناہ ہے، لیکن اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ خاص طور پر اس جھوٹ کو بیان فرما رہے ہیں جہاں تمہارا مخاطب تم پر اعتماد کر رہا ہے، اور وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ شخص جو بات مجھ سے کہے گا وہ سیدھی اور سچی بات کہے گا، لیکن تم الٹا اس کے اعتماد کو مجروح کرتے ہوئے اس کے ساتھ جھوٹ بولو۔ تمہارے اس عمل میں جھوٹ کا گناہ تو ہے ہی، ساتھ ہی اس میں خیانت کا بھی گناہ ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۳۰۳ تا ۳۲۰) بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في المعاريض، رقم: ٤٣٣٠

وہ امانت دار ہے

اس لیے کہ جو شخص تم سے رجوع کر رہا ہے، وہ تمہیں امین اور سچا سمجھ کر رجوع کر رہا ہے، حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ))(۱)

''جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے''

گویا کہ مشورہ طلب کرنے والا اس کے پاس امانت رکھوائے ہوئے ہے کہ تم صحیح بات مجھے بتانا، اور اس پر اعتماد اور بھروسہ بھی کر رہا ہے، لیکن تم نے اس کے ساتھ جھوٹ بولا اور غلط بات بتائی، لہٰذا تم خیانت کے گناہ کے بھی مرتکب ہوئے۔

جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ

آج ہمارے معاشرے میں جتنی تصدیقات اور سرٹیفکیٹ جاری ہوتے ہیں، وہ سب اس حدیث کے تحت آتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص بیمار ہے اور اس کو اپنے محکمے سے چھٹی لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس بات کا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کرے کہ وہ واقعتاً بیمار ہے۔ تو اب جس ڈاکٹر سے سرٹیفکیٹ طلب کیا جائے گا، وہ امانت دار ہے کیونکہ وہ محکمہ اس ڈاکٹر پر بھروسہ اور اعتماد کر رہا ہے کہ یہ جو سرٹیفکیٹ جاری کرے گا، وہ سچا سرٹیفکیٹ جاری کرے گا، وہ شخص واقعی بیمار ہوگا تب ہی وہ سرٹیفکیٹ جاری کرے گا ورنہ جاری نہیں کرے گا۔ اب اگر وہ ڈاکٹر پیسے لے کر یا پیسے لیے بغیر صرف دوستی کی مد میں اس خیال سے کہ اس سرٹیفکیٹ کے ذریعہ اس کو چھٹی مل جائے، جھوٹا سرٹیفکیٹ جاری کر دے گا تو یہ ڈاکٹر جھوٹ کے گناہ کے ساتھ بڑی خیانت کا بھی مرتکب ہوگا۔ اور جو شخص ایسا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر کو مجبور کرے کہ وہ ایسا جھوٹا سرٹیفکیٹ جاری کر دے، ایسا شخص بے شمار گناہوں کا ارتکاب کر رہا ہے، ایک یہ کہ خود جھوٹ بول رہا ہے اور دوسرے ڈاکٹر کو جھوٹ بولنے پر مجبور کر رہا ہے اور اگر پیسے دے کر یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر رہا ہے تو رشوت دینے کے گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے، اور پھر جھوٹ بول کر جو چھٹی لے رہا ہے، وہ چھٹی بھی حرام ہے اور اس چھٹی کی جو تنخواہ لی ہے وہ تنخواہ بھی حرام ہے، اور اس تنخواہ سے جو کھانا کھایا وہ بھی حرام ہے، لہٰذا ایک جھوٹا

(۱) سنن الترمذي، كتاب الأدب عن رسول الله، باب إن المستشار مؤتمن، رقم: ٤٧٤٧، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في المشورة، رقم: ٤٤٦٣، سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب المستشار مؤتمن، رقم: ٣٧٣٥، مسند أحمد، رقم: ٢١٣٢٦

میڈیکل سرٹیفکیٹ جاری کرانے میں اتنے بے شمار گناہ جمع ہیں۔ العیاذ باللہ العظیم۔

آج ہمارا معاشرہ ان چیزوں سے بھرا ہوا ہے، اچھے خاصے پڑھے لکھے، دیندار، نمازی، متشرع لوگوں کو بھی جب ضرورت پڑتی ہے تو وہ بھی جھوٹا سرٹیفکیٹ نکلوانے میں کوئی شرم اور عار محسوس نہیں کرتے، اور اس چیز کو دین سے خارج ہی کر دیا ہے۔

مدارس کی بلاتحقیق تصدیق کرنا

اسی طرح مدرسوں کی تصدیق ہے، بہت سے مدارس کے حضرات میرے پاس بھی آتے ہیں کہ آپ ہمارے مدرسے کی تصدیق کر دیجیے کہ یہ مدرسہ قائم ہے اور ٹھیک کام کر رہا ہے، اگر اس میں چندہ دیا جائے گا تو چندہ صحیح مصرف میں استعمال ہوگا۔ یہ تصدیق ایک گواہی ہے، اب اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ فلاں سے تصدیق کرا کر لاؤ، تب ہم تمہیں چندہ دیں گے، گویا کہ اس نے مجھ پر بھروسہ کیا، اب میرا یہ فرض ہے کہ میں اس وقت تک تصدیق جاری نہ کروں جب تک مجھے واقعتاً اس بات کا یقین نہ ہو کہ واقعتاً یہ مدرسہ اس چندہ کا مستحق ہے۔ اگر ایک شخص میرے پاس آئے اور میں محض دوستی یا مروت میں آ کر تصدیق کر دوں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ لوگ تو میرے اوپر بھروسہ کر رہے ہیں اور میں ان کے ساتھ جھوٹ بول رہا ہوں، کیونکہ میں نے اس مدرسہ کو دیکھا نہیں، میں اس کے حالات سے واقف نہیں، اس کے طریقہ کار سے میں باخبر نہیں، لیکن اس کے باوجود میں نے تصدیق نامہ جاری کر دیا، تو میں اس بدترین خیانت کا مرتکب ہوں گا۔ اب مدرسہ کے حضرات تصدیق کے لیے میرے پاس آتے ہیں، جب میں ان سے معذرت کرتا ہوں تو کہتے ہیں کہ ان سے اتنا چھوٹا سا کام نہیں کیا جاتا، وہ سمجھتے ہیں کہ انکار کرنا مروت کے خلاف ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ شہادت ہے، اور حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ بدترین خیانت ہے کہ لوگ تم پر بھروسہ کر کے تمہیں سچا سمجھ رہے ہیں اور تم ان کے سامنے جھوٹ بول رہے ہو۔

جھوٹا کیریکٹر سرٹیفکیٹ

آج کل مورل سرٹیفکیٹ اور کیریکٹر سرٹیفکیٹ بنوائے جاتے ہیں، اور سرٹیفکیٹ جاری کرنے والا اس میں لکھتا ہے کہ میں اس شخص کو پانچ سال سے جانتا ہوں یا دس سال سے جانتا ہوں، حالانکہ وہ اس کو صرف دو دن سے جانتا ہے، میں اس کے حالات سے واقف ہوں، یہ بہت اچھے اخلاق اور کردار کا مالک ہے۔ اب سرٹیفکیٹ جاری کرنے والا یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اس شخص کے ساتھ بھلائی کر

رہا ہوں، لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ اس بھلائی کے نتیجے میں قیامت کے روز گردن پکڑی جائے گی کہ تم نے تو یہ لکھا تھا کہ میں اس کو پانچ سال سے یا دس سال سے جانتا ہوں، حالانکہ تم اس کو نہیں جانتے تھے۔ یہ بدترین خیانت کے اندر داخل ہے، کیونکہ لوگ تم پر بھروسہ کر رہے ہیں اور تم لوگوں کے ساتھ جھوٹ بول رہے ہو۔

آج سرٹیفکیٹ کی کوئی قیمت نہیں

آج معاشرہ ان باتوں سے بھر گیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج سرٹیفکیٹ کی بھی کوئی قیمت نہیں رہی، کیونکہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ سب جھوٹے اور مصنوعی سرٹیفکیٹ ہیں۔ آج ہم نے سرکار دو عالم ﷺ کے ان ارشادات کو زندگی سے خارج ہی کر دیا ہے، اور صرف نماز روزے اور تسبیح کا نام دین رکھ دیا ہے، لیکن دنیا کی زندگی میں ہم لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آ رہے ہیں، اس طرف دھیان ہی نہیں ہے۔

جھوٹ نفرت پیدا کرتا ہے

یہ چیز بھی ہمارے آپس کے اختلافات اور جھگڑوں کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اس لیے کہ جب تم ایک آدمی پر بھروسہ اور اعتماد کر رہے ہو کہ یہ شخص تمہیں سچ بات بتائے گا، لیکن وہ شخص تم سے جھوٹ بولے، تو اس جھوٹ کے نتیجے میں اس کے دل میں تمہارے خلاف گرہ پڑ جائے گی کہ میں نے تو اس پر بھروسہ کیا، لیکن اس نے میرے ساتھ جھوٹ بولا، مجھے دھوکہ دیا اور مجھے غلط راستہ دکھایا۔ لہٰذا اس کے دل میں تمہارے خلاف عداوت پیدا ہوگی۔

بہر حال! باہمی اختلافات اور نااتفاقی کا ایک بہت بڑا سبب ''جھوٹ'' ہے، اگر اس جھوٹ کو ختم نہیں کریں گے تو آپس کی ناچاقیاں اور اختلافات کیسے ختم ہوں گے؟ اس لیے اس جھوٹ کو ختم کریں۔ ویسے تو ہر جھوٹ حرام ہے، لیکن خاص طور پر وہ جھوٹ جہاں پر دوسرا شخص تم پر بھروسہ کر رہا ہو اور تم اس کے ساتھ جھوٹ بولو، یہ بڑا خطرناک جھوٹ ہے۔

گزشتہ کی تلافی کیسے کریں؟

اب ایک سوال ذہنوں میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے آپس کے اختلافات اور نااتفاقی کے جو اسباب بیان فرمائے ہیں، اگر ہم آج ان سے پرہیز کرنے کا ارادہ کر لیں اور محنت کر

کے اپنے آپ کو اس کا پابند بنالیں تو ان شاء اللہ آئندہ کی زندگی تو درست ہو جائے گی، لیکن گزشتہ زمانہ میں اب تک ہم سے حضور اقدس ﷺ کی ان تعلیمات کی خلاف ورزی ہوئی، مثلاً کسی کی غیبت کرلی، کسی کو برا کہا، کسی کو دکھ پہنچایا، کسی کو تکلیف پہنچائی، کسی کی دل آزاری کی، اور ان خلاف ورزیوں کے نتیجے میں اور حقوق العباد کو ضائع کرنے کے نتیجے میں ہمارا نامہ اعمال سیاہ ہوگیا ہے، اس کا کیا حل ہے؟ اگر ہم اپنی پچھلی زندگی کی طرف نظر دوڑائیں تو یہ نظر آئے گا کہ سالہا سال میں نہ جانے کتنے انسانوں سے رابطہ ہوا، کتنے انسانوں سے تعلقات ہوئے، ہم نے کس کی کتنی حق تلفی کی؟ اس کا ہمارے پاس نہ کوئی حساب ہے، نہ پیمانہ ہے، اور نہ ان سے معافی مانگنے کی کوئی صورت ہے۔ لہٰذا اگر ہم آج سے اپنی اصلاح شروع کر بھی دیں تو پچھلے معاملات کا اور پچھلی زندگی کا کیا بنے گا؟ اور پچھلا حساب کتاب صاف کرنے کا کیا راستہ ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے اور ہم سب کو اس کی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

حضور ﷺ کا معافی مانگنا

لیکن نبی کریم ﷺ پر قربان جایئے کہ آپ نے ہماری ہر مشکل کا حل اپنے اسوۂ حسنہ میں تجویز فرما دیا ہے۔ جو آدمی اپنی پچھلی زندگی کی اصلاح کرنا چاہتا ہو، اس کو خیال ہو کہ میں نے بہت سے اللہ کے بندوں کے حقوق ضائع کر دیئے ہیں، تو اس کا راستہ بھی نبی کریم ﷺ نے بتایا اور خود اس پر اس طرح عمل کر کے دکھایا کہ ایک دن آپ نے مسجد نبوی ﷺ میں کھڑے ہو کر عام صحابہ کے مجمع کے سامنے فرمایا:

> ''میری ذات سے کبھی کسی انسان کو کوئی تکلیف پہنچی ہو، یا کبھی مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو، تو میں آج اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اگر وہ اس زیادتی کا بدلہ لینا چاہتا ہے تو میں بدلہ دینے کو تیار ہوں، اور اگر وہ مجھ سے کوئی صلہ طلب کرنا چاہتا ہے تو میں وہ دینے کے لیے تیار ہوں، اور اگر وہ معاف کرنا چاہتا ہے تو میری درخواست ہے کہ وہ معاف کر دے''

حضور ﷺ کا اعلیٰ مقام

یہ اعلان اس ذات نے فرمایا جن کے بارے میں قرآن کریم نے فرمادیا:

﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾(۱)

(۱) الفتح: ۲

''تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرما دے''

اور جن کے بارے میں یہ فرما دیا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾(۱)

''یعنی پروردگار کی قسم! لوگ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصل نہ بنائیں، اور پھر جو کچھ آپ فیصلہ کریں اس کے بارے میں وہ اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور سر تسلیم خم نہ کریں''

لہٰذا جس ذات کے بارے میں قرآن کریم میں یہ ارشادات نازل ہوئے ہوں اور جن کے بارے میں اس بات کی وضاحت آگئی ہو کہ آپ کی ذات سے کسی کو ظلم اور زیادتی پہنچ سکتی ہی نہیں، ان سب باتوں کے باوجود آپ ﷺ نے مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے مندرجہ بالا اعلان فرمایا۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا انوکھا بدلہ

روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ اعلان سن کر ایک صحابی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں بدلہ لینا چاہتا ہوں، آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیسا بدلہ؟ انہوں نے عرض کیا کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے میری کمر پر مارا تھا، میں اس کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تو مارنا یاد نہیں ہے، لیکن اگر تمہیں یاد ہے تو آجاؤ اور بدلہ لے لو، چنانچہ وہ صحابی کمر کے پیچھے آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جس وقت آپ ﷺ نے مجھے مارا تھا اس وقت میری کمر پر کپڑا نہیں تھا، بلکہ میری کمر ننگی تھی۔ سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی چادر کمر سے ہٹ دی، تو مہر نبوت نظر آنے لگی، وہ صحابی آگے بڑھے اور مہر نبوت کو بوسہ دیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نے مہر نبوت کو بوسہ دینے کے لیے یہ حیلہ اختیار کیا تھا۔ بہر حال! حضور اقدس ﷺ نے اپنے آپ کو پیش کر دیا کہ جو بدلہ لینا چاہے تو میں اس کو بدلہ دینے کو تیار ہوں۔

سب سے معافی تلافی کرالیں

اس عمل کے ذریعے حضور اقدس ﷺ نے امت کو سکھا دیا کہ جب میں یہ عمل کر رہا ہوں تو تم

(۱) النساء: ٦٥

بھی اگر اپنی پچھلی زندگی کے داغ دھونا چاہتے ہو تو اپنے ملنے جلنے والوں، اپنے عزیز و اقارب، اپنے دوست احباب سے یہی پیش کش کریں کہ نہ جانے پچھلی زندگی میں مجھ سے آپ کی کیا حق تلفی ہوئی ہو، آج میں اس کا بدلہ دینے کو تیار ہوں، اور اگر آپ معاف کر دیں تو آپ کی مہربانی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معافی مانگنا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خاص طور پر ایک رسالہ اس موضوع پر لکھا اور اس رسالے کو شائع کیا اور پھر اپنے تمام ملنے جلنے والوں میں وہ رسالہ تقسیم کیا۔ اس رسالے کا نام ہے "العذر والنذر" اس رسالے میں یہی مضمون لکھا ہے کہ چونکہ میرے بہت سے لوگوں سے تعلقات رہے ہیں، نہ جانے مجھ پر کس کا حق ہو اور وہ حق مجھ سے پامال ہو گیا ہو، یا مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو، آج میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں، اگر مجھ سے اس حق کا بدلہ لینا چاہتا ہے تو بدلہ لے لے، اگر کوئی مالی حق میرے ذمے واجب ہے وہ مجھے مالی حق یاد دلا دے، میں بدلہ دے دوں گا، یا کسی کو جانی تکلیف پہنچائی ہے تو اس کا بدلہ دینے کو تیار ہوں، ورنہ میں معافی کی درخواست پیش کرتا ہوں۔ اور ساتھ میں یہ حدیث بھی لکھ دی:

> "ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان سے سچے دل سے معافی مانگتا ہے کہ مجھے معاف کر دیجئے، مجھ سے غلطی ہوگئی، تو دوسرے مسلمان بھائی کا یہ فریضہ ہے کہ اس کو معاف کر دے، اگر وہ معاف نہیں کرے گا تو وہ آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے معافی کی امید نہ رکھے"(۱)

روپے پیسے کا معاملہ علیحدہ ہے، اگر دوسرے کے ذمہ روپے پیسے واجب ہیں تو اس کو حق ہے کہ اس کو وصول کر لے۔ لیکن دوسرے قسم کے حقوق، مثلاً کسی کی غیبت کر لی تھی، یا دل آزاری کر لی تھی، یا کوئی اور تکلیف پہنچائی تھی، اور تکلیف پہنچانے والا اب معافی مانگ رہا ہے تو دوسرے مسلمان کو چاہیے کہ وہ معاف کر دے۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا معافی مانگنا

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے وفات سے تین سال پہلے جب پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑا، تو ہسپتال ہی میں مجھے بلا کر فرمایا کہ تم میری طرف سے ایسا ہی ایک

(۱) سنن أبي داؤد، باب في النهي عن البغي، رقم: ٤٩٠١

مضمون لکھ دو جیسے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "العذر والنذر" میں اپنے اہل تعلق کو لکھا تھا، اور اس کا نام یہ رکھنا "کچھ تلافی مافات" اس میں لفظ "کچھ" سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اس کے ذریعہ یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں اپنے پچھلے سارے معاملات کی تلافی کر رہا ہوں، بلکہ یہ "کچھ" تلافی کر رہا ہوں۔ یہ مضمون لکھوانے کے بعد شائع فرمایا، اور اپنے تمام اہل تعلق کو خط کے ذریعے بھیجا تا کہ ان کی طرف سے معافی ہو جائے۔

اپنا کہا سنا معاف کرالیں

ہمارے بزرگوں نے ایک جملہ سکھایا ہے جو اکثر و بیشتر لوگوں کی زبان پر ہوتا ہے، یہ بڑا اچھا جملہ ہے، وہ یہ کہ جب کسی سے جدا ہوتے ہیں تو اس سے کہتے ہیں:

"بھائی! ہمارا کہا سنا معاف کر دینا"

یہ بڑا کام کا جملہ ہے اور اس میں بڑی عظیم حکمت کی بات ہے، اگر چہ لوگ اس کو بغیر سوچے سمجھے کہہ لیتے ہیں، لیکن حقیقت میں اس جملے میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اس وقت ہم تم سے جدا ہو رہے ہیں، اب دوبارہ معلوم نہیں کہ ملاقات ہو یا نہ ہو، موقع ملے یا نہ ملے، لہٰذا میں نے تمہارے بارے میں کچھ کہا سنا ہو، یا تم پر کوئی زیادتی کی ہو، تو آج میں تم سے اس کی معافی مانگتا ہوں۔ لہٰذا سفر میں جاتے ہوئے اس کی عادت ڈالنی چاہیے کہ جن سے میل ملاقات رہتی ہو، ان سے یہ جملہ کہہ دینا چاہیے، جب دوسرا سامنے والا جواب میں یہ کہہ دے کہ میں نے معاف کر دیا تو ان شاء اللہ معافی ہو جائے گی۔

جن تک رسائی نہیں ان سے معافی کا طریقہ

معاف کرانے کا یہ طریقہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے بارے میں بتایا جن تک رسائی ہو سکتی ہے، لیکن بہت سے اہل تعلقات ایسے ہوتے ہیں کہ ان تک رسائی ممکن نہیں، مثلاً ہم لوگ اکثر بسوں میں، ریلوں میں، ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں، اور ان سفروں میں نہ جانے کتنے لوگوں کو ہم سے تکلیف پہنچ گئی ہوگی، اب ہمیں نہ ان کا نام معلوم ہے اور نہ ہی ان کا پتہ معلوم ہے، اور اب ان تک پہنچ کر ان سے معافی مانگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، ایسے لوگوں سے معافی مانگنے کا بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طریقہ بتا دیا جو انتہائی آسان ہے۔

ان کے لیے یہ دعا کریں

وہ یہ کہ حضور اقدس ﷺ نے ایسے لوگوں کے حق میں یہ دعا فرمادی:

((اَیُّمَا مُؤْمِنٍ اَوْ مُؤْمِنَۃٍ آذَیْتُہٗ اَوْشَتَمْتُہٗ اَوْجَلَدْتُّہٗ اَوْلَعَنْتُہٗ فَاجْعَلْھَا لَہٗ صَلَاۃً وَزَکٰوۃً وَقُرْبَۃً تُقَرِّبُہٗ بِھَا اِلَیْکَ))(۱)

''یعنی اے اللہ! میری ذات سے کسی مؤمن مرد یا عورت کو کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہو، یا میں نے کبھی کسی کو برا بھلا کہا ہو، یا میں نے کبھی کسی کو مارا ہو، یا کبھی کسی کو لعنت کی ہو، یا کبھی اس کے حق میں بددعا کی ہو، تو اے اللہ! میرے ان سارے اعمال کو اس شخص کے حق میں رحمت بنا دیجیے، اور اس کو اس کے پاک ہونے کا ذریعہ بنا دیجیے اور میرے اس عمل کے نتیجے میں اس کو اپنا قرب عطا فرما دیجیے''

لہٰذا بزرگوں نے فرمایا کہ جن تک آپ نہیں پہنچ سکتے اور جن سے معافی مانگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، ان کے حق میں یہ دعا کر دیں۔ کیونکہ جب آپ کی پہنچائی ہوئی تکلیف ان کے حق میں رحمت بن جائے گی تو ان شاء اللہ خود ہی معاف کر دیں گے۔ اور ان کے حق میں ایصال ثواب کریں۔

زندہ کو ایصال ثواب

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایصال ثواب صرف مردوں کو ہوسکتا ہے جو دنیا سے جا چکے، زندوں کو نہیں ہوسکتا، یہ خیال غلط ہے، ایصال ثواب تو زندہ آدمی کو بھی کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا عبادت کر کے، تلاوت کر کے اس کا ثواب ایسے لوگوں کو پہنچا دو جن کو آپ کی ذات سے کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہو، اس کے نتیجے میں تم نے اس کے ساتھ جو زیادتی کی ہے ان شاء اللہ اس کی تلافی ہو جائے گی۔

عمومی دعا کر لیں

اس کے علاوہ ایک عمومی دعا یہ کر لو کہ یا اللہ! جس جس شخص کو مجھ سے تکلیف پہنچی ہو، اور جس جس شخص کی مجھ سے حق تلفی ہوئی ہو، اے اللہ! اپنے فضل سے اس پر اپنی رحمتیں نازل فرمایئے اور میرے اس عمل کو اس کے لیے رحمت کا ذریعہ بنا دیجیے اور اس کو مجھ سے راضی کر دیجیے، اور اس کے دل کو میری طرف سے صاف کر دیجیے تاکہ وہ مجھے معاف کر دے۔

(۱) سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب فی قول النبی أیما رجل لعنته أو سببته، رقم: ۲٦٤٧، مسند أحمد، رقم: ۷۸٥۲

ایک غلط خیال کی تردید

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وعظ میں یہ دعا والی حدیث بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس سے کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے گناہ کرنے والوں کو لعنت کی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

((لَعَنَ اللّٰهُ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ))(۱)

''اللہ تعالیٰ رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر لعنت کرے''

اب یہ حدیث سن کر رشوت دینے والا یا لینے والا اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ لعنت میرے حق میں دعا بن جائے گی، اس لیے کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمادی ہے کہ اے اللہ! میں نے جس جس کو لعنت کی ہے وہ لعنت اس کو دعا بن کر لگے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ دعا کی حدیث کے شروع میں یہ الفاظ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے:

((اِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ أَغْضَبُ كَمَا يَغْضَبُ الْبَشَرُ))(۲)

''اے اللہ! میں تو ایک انسان ہوں اور جس طرح اور انسانوں کو غصہ آجاتا ہے اسی طرح مجھے بھی غصہ آجاتا ہے''

اس غصے کے نتیجے میں اگر کبھی میں نے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی ہو یا لعنت کی ہو یا بُرا بھلا کہا ہو، تو اس کو اس کے حق میں دعا بنا کر لگا دیجئے۔

لہٰذا یہ حدیث اس لعنت کے بارے میں ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کی حالت میں بشری تقاضے سے کسی پر لعنت کی ہو، ایسی لعنت اس کے حق میں دعا بن کر لگے۔ لیکن اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص پر گناہ کی وجہ سے لعنت کی ہو، یا دین اور شریعت کے تقاضے سے لعنت کی ہو، تو یہ دعا والی حدیث اس لعنت کے بارے میں نہیں ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

☆☆☆

(۱) مسند أحمد، رقم: ۸٦٦۲

(۲) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب من لعنه النبيؐ أوسبه أودعا عليه......، رقم: ٤۷۰۸، مسند أحمد، رقم: ۷۰۱۰

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ”اسلام اور ہماری زندگی“ انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۱

اسلامی عقائد

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور، پاکستان ★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی ★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵ فون ۳۷۲۲۳۶۹، ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روز مرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن و سنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین و دنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات و تحریرات

جلد ۶

اصلاح و تصوّف

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بکسیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۳ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور — فون ۳۷۳۳۲۶۴۱۲، فیکس ۹۲۰۴۲۰۳۷۳۲۴۷۸۵
★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان — فون ۳۷۲۴۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵
★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی — فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۷

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انار کلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۲۷۸۵ فون ۳۷۲۳۲۴۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۸

اخلاق سیئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی

فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۲۸۵ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱ : ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۹

اخلاقِ حسنہ اور ان کے فضائل

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات
پبلشرز ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور — فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵
★ ۱۹۰ انارکلی، لاہور پاکستان — فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵
★ موہن روڈ چوک اردو بازار، کراچی — فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعۂ خطبات وتحریرات

جلد ۱۰

روزمرہ کی سُنتیں اور اعمال

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان ★ موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی

فون ۳۷۳۲۴۴۱۲، ۳۷۳۲۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۲۷۸۵ فون ۳۷۳۵۳۲۵۵، ۳۷۲۲۳۹۹۱ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خطبات وتحریرات)

جلد نمبر ۶

اصلاح وتصوّف

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

اصلاح و تصوّف

جلد ٦

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں الجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۶

اصلاح وتصوّف

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات

★ ۱۳-دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰-انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی

فون [illegible] فیکس [illegible] فون [illegible] فون [illegible]

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ حضرت [illegible]

جلد ۹

عنوان [illegible]

اشاعت اول

[illegible]

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

[illegible] لاہور فون [illegible] فیکس [illegible]

۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان فون [illegible]

[illegible] اردو بازار کراچی پاکستان فون [illegible]

www.idaraeislamiat.com
E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دارالعلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دارالعلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ دارالعلوم، جامعہ دارالعلوم کورنگی کراچی نمبر ۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ اردو بازار کراچی

دارالاشاعت، اردو بازار کراچی نمبر ۱

بیت القرآن، اردو بازار کراچی نمبر ۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۶

اصلاح وتصوّف

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

مرتب

مولانا محمد اویس سرور صاحب

پبلشرز بکسیلرز ایکسپورٹرز

ادارۂ اسلامیات

★ ۱۹۰ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان ★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی

فون ۳۷۳۴۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵ فون ۳۷۲۲۳۹۹، ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

فہرست مضامین

"تصوّف" کی حقیقت اور اس کے تقاضے ۱۷

باطن سے متعلق احکام کا تذکرہ ۱۷
باطن سے متعلق حرام کام ۱۸
یہ چیزیں تربیت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں ۱۸
"علم تصوف" کے بارے میں غلط فہمیاں ۱۹
تصوف کے بارے میں دو غلط تصرفات ۱۹
تصوف کا درست تصور ۱۹
حضرت فاروق اعظمؓ کو جنت کی بشارت ۲۰
حضرت فاروقِ اعظمؓ کا خوف آخرت ۲۱
حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا پرنالہ توڑنا ۲۱
میری پیٹھ پر کھڑے ہو کر پرنالہ لگاؤ ۲۲
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور نفس کی اصلاح ۲۳
ہمارے معاشرے کی حالت ۲۳
ہمیں معالج کی ضرورت ہے ۲۳
اخلاق کو پاکیزہ بنانے کا آسان راستہ ۲۴
سادہ دل بندے کدھر جائیں ۲۴
مصلح قیامت تک باقی رہیں گے ۲۴
ہر چیز میں ملاوٹ ہوگئی ۲۵
جیسی روح ویسے فرشتے ۲۵
خلاصہ ۲۵

تصوف کا مقصد اور شیخِ طریقت کی ضرورت ۲۶

کتاب "انفاسِ عیسیٰ" کے مرتب کا تعارف ۲۶
کتاب "انفاسِ عیسیٰ" کا تعارف ۲۷
تصوف کا مقصدِ اصلی کیا ہے؟ ۲۸
شیخ کی ضرورت ۳۰
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ۳۱
تواضع اور ذلتِ نفس میں فرق ۳۱
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ۳۲
خوشبو کی مثال ۳۲
آم اور گڑ کی مٹھاس کا فرق ۳۳
اپنی اصلاح کرانا ضروری ہے ۳۳

"تزکیہ" کیا چیز ہے؟ ۳۵

تین صفات کا بیان ۳۵
آیت کا دوسرا مطلب ۳۶
حضور ﷺ کی بعثت کے چار مقاصد ۳۶
تزکیہ کی ضرورت کیوں؟ ۳۷
تھیوریکل (لکھائی پڑھائی کی) تعلیم کے بعد ٹریننگ ضروری ہے ۳۷
آپ ﷺ کو تعلیم اور تربیت دونوں کے لئے بھیجا گیا ۳۸

اخلاق کو پاکیزہ بنانے کا کیا مطلب ہے؟	۳۸
''دل'' انسان کے اعمال کا سرچشمہ ہے	۳۹
دل میں لطیف قوتیں رکھی گئی ہیں	۳۹
''دل'' میں اچھی خواہشیں پیدا ہونی چاہئیں	۴۰
''دل'' کی اہمیت	۴۰
جسم کی صحت دل کی صحت پر موقوف ہے	۴۱
''دل'' کا ارادہ پاک ہونا چاہئے	۴۱
نیک ارادے کی مثال	۴۱
دل کے اعمال میں حلال بھی ہے اور حرام بھی	۴۲
''اخلاص'' دل کا حلال عمل ہے	۴۲
''شکر'' اور ''صبر'' دل کے اعمال ہیں	۴۲
''تکبر'' دل کا حرام فعل ہے	۴۳
''تزکیہ'' اسی کا نام ہے	۴۳
تصوف کی اصل حقیقت	۴۴
خلاصہ	۴۴
معاشرے کی اصلاح کیسے ہو؟	۴۵
اصلاحِ معاشرہ کی کوششیں کیوں بے اثر ہیں؟	۴۵
بیماری کی تشخیص	۴۶
اپنے حال سے غافل، اور دوسروں کی فکر	۴۶
سب سے زیادہ برباد شخص!	۴۷
بیمار شخص کو دوسرے کی بیماری کی فکر کہاں؟	۴۷
''لیکن اس کے پیٹ میں تو درد نہیں''	۴۸
بیماری کا علاج	۴۸
خود احتسابی کی مجلس	۴۹
انسان کا سب سے پہلا کام	۴۹
معاشرہ کیا ہے؟	۴۹
حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل	۴۹
حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی خصوصیت	۵۰
خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کو اپنے نفاق کا اندیشہ	۵۱
دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے	۵۱
بے عمل کی بات کا اثر نہیں ہوتا	۵۱
حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز	۵۲
حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا روزہ	۵۲
''صوم وصال'' کی ممانعت	۵۲
حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور زکوۃ	۵۳
اللہ کے محبوب نے خندق بھی کھودی	۵۴
پیٹ پر پتھر باندھنا	۵۴
تاجدارِ مدینہ کے پیٹ پر دو پتھر تھے	۵۴
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مشقت اُٹھانا	۵۴
۳۰ شعبان کو نفلی روزہ رکھنا	۵۵
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط	۵۶
معاشرے کی اصلاح کا راستہ	۵۷
اپنا فرض بھی ادا کرو	۵۷
اس آیت کی غلط تشریح کی جاتی ہے	۵۸
آیت کی صحیح تشریح وتفسیر	۵۹
اولاد کی اصلاح کب تک؟	۵۹
تم اپنے آپ کو مت بھولو	۶۰
مقررین اور واعظین کیلئے خطرناک بات	۶۰
چراغ سے چراغ جلتا ہے	۶۱

اپنی اصلاح کی بھی فکر کیجئے	۶۳
مسلمانوں کی بدحالی کا سبب	۶۳
یہ کیسی منزل ہے کیسی راہیں	۶۴
اصلاح کا آغاز دوسروں سے کیوں؟	۶۵
اپنی اصلاح کی فکر نہیں	۶۵
بات میں وزن نہیں	۶۵
ہر شخص کو اپنے اعمال کا جواب دینا ہے	۶۶
حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ	۶۷
اپنے گناہوں کی طرف نظر تھی	۶۷
نگاہ میں کوئی برا نہ رہا	۶۸
اپنی بیماری کی فکر کیسی ہوتی ہے	۶۹
ایک خاتون کا نصیحت آموز واقعہ	۶۹
حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو اپنے نفاق کا شبہ	۷۰
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نفاق کا شبہ	۷۱
دین سے ناواقفیت کی انتہاء	۷۲
آج کل ہماری حالت	۷۲
اصلاح کا طریقہ یہ ہے	۷۳
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے تربیت کی؟	۷۳
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کندن بن گئے	۷۴
اپنا جائزہ لیں	۷۵
چراغ سے چراغ جلتا ہے	۷۶
یہ فکر کیسے پیدا ہو؟	۷۶
دارالعلوم میں ہونے والی اصلاحی مجالس	۷۷
دلوں کی پاکی اور اسکے اثرات	۷۸
دل کی اہمیت	۷۸
فساد کی وجہ اخلاق کی خرابی ہے	۷۹
اخلاق کی خرابی کے نتائج	۷۹
روپیہ حاصل کرنے کی دوڑ	۸۰
اللہ اور رسول کی محبت کی کمی کا نتیجہ	۸۰
عراق پر امریکہ کا حملہ	۸۰
قرآن کریم کا ارشاد اور اس پر عمل چھوڑنے کا نتیجہ	۸۱
مسلمان وسائل سے مالا مال ہیں	۸۱
ذاتی مفاد کو سامنے رکھنے کے نتائج	۸۲
ہم لوگ خود غرضی میں مبتلا ہیں	۸۲
ہمارے ملک میں کرپشن	۸۲
دنیا میں کامیابی کے لئے محنت شرط ہے	۸۳
اللہ تعالیٰ کا ایک اصول	۸۳
ہماری دعائیں کیوں قبول نہیں ہوئیں؟	۸۳
ہم پورے دین پر عامل نہیں	۸۴
ہم دشمن کے محتاج بن کر رہ گئے ہیں	۸۵
اس واقعہ سے سبق لیجئے	۸۵
معاشرے کی اصلاح فرد کی اصلاح سے ہوتی ہے	۸۵
امریکہ کی بزدلی	۸۶
ایسے حملے کب تک ہوں گے؟	۸۶
دلوں کو ان بیماریوں سے پاک کرلو	۸۷
اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مراقبہ کیجئے	۸۸
محبت اختیار میں نہیں	۸۹
اللہ کے انعامات اور اپنے اعمال کو سوچنا	۸۹
نعمتوں کا مراقبہ اور دھیان کیجئے	۹۰

اللہ والوں کی صحبت سے دھیان حاصل ہوتا ہے	۹۰
قرآن کریم میں تدبر اور تفکر کی دعوت	۹۰
یہ زمین میرے لئے، یہ آسمان میرے لئے	۹۱
یہ سورج میرے لئے ہے	۹۲
اپنے جسم کے اندر غور کیجئے	۹۲
بھوک کب لگتی ہے؟	۹۳
''ذائقہ'' ایک عظیم نعمت	۹۳
اگر یہ ''ذائقہ'' خراب ہو جائے تو	۹۴
''معدہ'' میں خودکار مشین لگی ہوئی ہے	۹۴
بغیر طلب کے یہ سب کچھ دے دیا	۹۵
''آنکھیں'' عظیم نعمت ہیں	۹۵
''کان'' اور ''زبان'' عظیم نعمتیں ہیں	۹۶
رات کو سونے سے پہلے یہ عمل کر لو	۹۶
گردوپیش کی نعمتوں پر شکر	۹۷
پریشانی کے وقت نعمتوں کا استحضار	۹۷
میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ	۹۷
بیماری میں شکر کا انداز	۹۷
نعمتوں پر شکر ادا کرو	۹۸
''دانت'' ایک عظیم نعمت ہے	۹۸
اللہ والوں کی صحبت کا فائدہ	۹۹
کیا محسن سے محبت نہیں ہوگی؟	۹۹
شکر ادا کرنے کا عجیب وغریب واقعہ	۱۰۰
اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کے اسباب اور طریقے	۱۰۱
ان کے انعامات سب پر عام ہیں	۱۰۱
دوستوں کو تنگی اور دشمنوں کو فراخی	۱۰۲
ان نعمتوں کی طرف دھیان نہیں	۱۰۲
تیسرا طریقہ: اپنے برتاؤ کو سوچنا	۱۰۳
اپنی حیثیت میں غور کرو	۱۰۳
اس سے اللہ کا شکر اور محبت بڑھتی ہے	۱۰۴
ایک بزرگ اور متکبر کا واقعہ	۱۰۴
شکستگی مطلوب ہے	۱۰۵
اپنی نظر میں چھوٹا دوسروں کی نظر میں بڑا	۱۰۵
اول وآخر ''فنا ہی فنا''	۱۰۶
چوتھا طریقہ: اللہ والوں کی صحبت	۱۰۶
اللہ کی محبت بھر رہا ہوں	۱۰۶
پانچواں طریقہ: طاعت پر مواظبت	۱۰۷
یہ تو ''دور'' لازم آرہا ہے؟	۱۰۷
شروع میں تھوڑی سی محنت اور ہمت	۱۰۷
ریل بھاپ کے ذریعہ تیز چلتی ہے	۱۰۸
''محبت'' ''بھاپ'' کی طرح	۱۰۸
اُڑنے سے پہلے زمین پر جہاز کا چلنا	۱۰۸
ایمان کی لذت حاصل کر لو	۱۰۹
خواہشات کو روکنے کے لئے یہ تصور مفید ہے	۱۰۹
دوراستے ۔ رب چاہی یا من چاہی	۱۱۰
یہ تکلیف لذیذ بن جائے گی	۱۱۰
اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ہے	۱۱۰
یہ دل ان کی تجلی گاہ ہے	۱۱۱
ہم اسی گھر میں رہیں گے جسے برباد کیا	۱۱۱
محبت سے اطاعت، اطاعت سے محبت کا نتیجہ	۱۱۲

اطاعت کا آسان نسخہ، اتباع رسول ﷺ	۱۱۲
حضور ﷺ کی اتباع کرو، اللہ تعالیٰ محبت کریں گے	۱۱۳
محبت پہلے محبوب کے دل میں پیدا ہوتی ہے	۱۱۳
ہر کام میں حضور ﷺ کی اتباع	۱۱۴
کوئی ''سنت'' چھوٹی نہیں	۱۱۴
اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو	۱۱۴
وہ سنتیں جن میں کوئی مشقت نہیں	۱۱۵
سنتوں کی ڈائری ''اسوۂ رسول اکرم ﷺ''	۱۱۵
جب تک بازار میں لوکی ملے ضرور لاؤ	۱۱۶
تین دن تک زندگی کا جائزہ	۱۱۶
یہ طعنے گلے کا ہار ہیں	۱۱۶
قیامت کے روز ایمان والے ان پر ہنسیں گے	۱۱۷

اللہ سے اللہ کی محبت مانگئے

اللہ سے اللہ کی محبت مانگئے	۱۱۸
اللہ کی محبت ان تین چیزوں سے زیادہ	۱۱۹
آپ ﷺ کو ٹھنڈا پانی بہت مرغوب تھا	۱۱۹
جھولی اور پیالہ بھی انہی سے مانگو	۱۱۹
مانگنے کا طریقہ بھی انہی سے مانگو	۱۲۰
اچھی دعا مانگنے کی توفیق انہی سے مانگو	۱۲۰
بیت اللہ پر پہلی نظر کے وقت دعا	۱۲۱
اسبابِ محبت کا خلاصہ	۱۲۱
محبت کا کوئی خاص درجہ طلب مت کرو	۱۲۲
محبت اسکے ظرف کے مطابق دی جاتی ہے	۱۲۲
ناشکری اور مایوسی کا شکار ہو جاؤ گے	۱۲۳
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے	۱۲۳
ایک خط اور حضرت والا کا جواب	۱۲۴
خلاصہ	۱۲۴

نفس کی کشمکش

نفس کی کشمکش	۱۲۵
انسان کا نفس، لذتوں کا خوگر ہے	۱۲۶
خواہشاتِ نفسانی میں سکون نہیں	۱۲۶
لطف اور لذت کی کوئی حد نہیں ہے	۱۲۶
مغرب میں علانیہ زنا کاری کی بہتات	۱۲۷
امریکہ میں ''زنا بالجبر'' کی کثرت کیوں؟	۱۲۷
یہ پیاس بجھنے والی نہیں	۱۲۸
تھوڑی سی مشقت برداشت کرلو	۱۲۸
نفس کمزور پر شیر ہے	۱۲۸
نفس دودھ پیتے بچے کی طرح ہے	۱۲۹
اس کو گناہوں کی چاٹ لگی ہوئی ہے	۱۳۰
سکون اللہ کے ذکر میں ہے	۱۳۰
اللہ کا وعدہ جھوٹا نہیں ہوسکتا	۱۳۱
اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے	۱۳۱
ماں یہ تکلیف کیوں برداشت کرتی ہے؟	۱۳۲
محبت تکلیف کو ختم کردیتی ہے	۱۳۲
مولیٰ کی محبت لیلیٰ سے کم نہ ہو	۱۳۳
تنخواہ سے محبت ہے	۱۳۳
عبادت کی لذت سے آشنا کردو	۱۳۴
مجھے تو دن رات بے خودی چاہئے	۱۳۴
نفس کو کچلنے میں مزہ آئے گا	۱۳۵
ایمان کی حلاوت حاصل کرلو	۱۳۵

حاصلِ تصوف ۱۳۶
دل تو ہے ٹوٹنے کے لئے ۱۳۶

دل کی بیماریاں اور طبیبِ روحانی کی ضرورت ۱۳۸

اخلاق کی حقیقت و اہمیت ۱۳۸
روح کی اہمیت ۱۳۹
جلدی سے دفن کردو ۱۳۹
روح کی بیماریاں ۱۴۰
روح کا حسن و جمال ۱۴۰
جسمانی عبادات ۱۴۱
تواضع دل کا فعل ہے ۱۴۱
اخلاص دل کی ایک کیفیت ہے ۱۴۲
شکر دل کا عمل ہے ۱۴۲
صبر کی حقیقت ۱۴۲
اخلاقِ باطنہ کا حصول فرض ہے ۱۴۲
باطنی بیماریاں حرام ہیں ۱۴۲
غصہ کی حقیقت ۱۴۳
غصہ نہ آنا ایک بیماری ہے ۱۴۴
غصہ میں بھی اعتدال مطلوب ہے ۱۴۴
حضرت علی رضی اللہ عنہ اور غصہ ۱۴۴
اعتدال کی ضرورت ۱۴۵
دل کی اہمیت ۱۴۵
یہ ان دیکھی بیماریاں ہیں ۱۴۶
دل کے ڈاکٹر، صوفیاء کرام ۱۴۶
تواضع یا تواضع کا دکھاوا! ۱۴۶
دوسروں کی جوتیاں سیدھی کرنا ۱۴۸
تصوف کیا ہے؟ ۱۴۸
وظائف و معمولات کی حقیقت ۱۴۹
مجاہدات کا اصل مقصد ۱۴۹
شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے پوتے کا واقعہ ۱۴۹
شیخ کے پوتے کا استقبال ۱۵۰
ابھی کسر باقی ہے ۱۵۱
اب دل کا طاغوت ٹوٹ گیا ۱۵۱
وہ دولت آپ کے حوالے کردی ۱۵۲
اصلاح کا اصل مقصد ۱۵۲
اصلاحِ باطن ضروری کیوں؟ ۱۵۲
اپنا معالج تلاش کیجئے ۱۵۳

دنیا کو دل سے نکال دیجئے ۱۵۴

"زہد" کی حقیقت ۱۵۴
گناہوں کی جڑ "دنیا کی محبت" ۱۵۵
حضور ﷺ کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت ۱۵۵
دل میں صرف ایک کی محبت سما سکتی ہے ۱۵۶
دنیا میں ہوں، دنیا کا طلب گار نہیں ہوں ۱۵۷
دنیا کی مثال ۱۵۷
دو محبتیں جمع نہیں ہو سکتیں ۱۵۸
دنیا کی مثال "بیت الخلاء" کی سی ہے ۱۵۹
دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے ۱۵۹
شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ۱۶۰
حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ۱۶۱
اس سے سبق حاصل کریں ۱۶۲
میرے والد ماجدؒ اور دنیا کی محبت ۱۶۲

وہ باغ میرے دل سے نکل گیا ۱۶۲
دنیا ذلیل ہوکر آتی ہے ۱۶۳
دنیا مثل سائے کے ہے ۱۶۳
بحرین سے مال کی آمد ۱۶۴
تم پر فقر وفاقے کا اندیشہ نہیں ہے ۱۶۵
صحابہ کے زمانے میں تنگ عیشی ۱۶۶
یہ دنیا تمہیں ہلاک نہ کردے ۱۶۶
جب تمہارے نیچے قالین بچھے ہوں گے ۱۶۷
جنت کے رومال اس سے بہتر ہیں ۱۶۷
پوری دنیا مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ۱۶۸
ساری دنیا ان کی غلام ہوگئی ۱۶۹
شام کے گورنر حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ ۱۶۹
شام کے گورنر کی رہائش ۱۷۰
بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں ۱۷۰
ایک دن مرنا ہے ۱۷۱
''دنیا'' دھوکے کا سامان ہے ۱۷۱
''زہد'' کیسے حاصل ہو؟ ۱۷۲

مال وجاہ کی محبت، ایک باطنی بیماری ۱۷۳

حبِ جاہ کا مطلب ۱۷۳
نام ونمود اور تعریف پسندی ۱۷۳
جاہ کا کچھ حصہ شرعاً بھی مطلوب ہے ۱۷۴
ضرورت سے زائد جاہ کی طلب ۱۷۴
عہدہ کی طلب، حدیثِ نبوی ﷺ کے آئینہ میں ۱۷۴
شدید حاجت کیا ہے؟ ۱۷۵
وعظ وتقریر میں احتیاط ۱۷۵
مقبول واعظ کے لئے احتیاط ۱۷۶
خرابیٔ نفس کا عجیب واقعہ ۱۷۶
ایک غلط سوچ ۱۷۷
شیخ کی نگرانی میں کام کیجئے ۱۷۷
شیخ ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کا اخلاص ۱۷۷
شیخ ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص کا بادشاہ پر اثر ۱۷۸
حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ۱۷۸
تمام بزرگ تواضع سے اولیاء اللہ بنتے ہیں ۱۷۹
جائز منصب کے استعمال میں غلطیاں ۱۸۰
دباؤ ڈال کر چندہ کرنا ۱۸۰
مہر بھی خوشدلی کے بغیر معاف نہیں ہوتا ۱۸۰
مہر کی معافی، ایک بُرا رواج ۱۸۱
چندہ کی ایک جائز صورت ۱۸۱
سفارش کا معنی ۱۸۱
عہدے کا غلط استعمال ۱۸۲
تعریف پسندی کا وبال ۱۸۲
تحفے کے بارے میں ایک غلط رواج ۱۸۳
تعریف پسندی کی کوئی حقیقت نہیں ۱۸۳
ایک حجام کا واقعہ ۱۸۴
ہندی زبان کی ایک کہاوت ۱۸۴
ہر کام اللہ کی خاطر کریں ۱۸۵
حبِ جاہ کا علاج ۱۸۵
جب کوئی اچھا کام ہوجائے ۱۸۶

سُستی کا علاج، چستی ۱۸۷

حاصلِ تصوف ''دو باتیں'' ۱۸۷

نفس کو بہلا پھسلا کر اس سے کام لو ۱۸۸
اگر صدرِ مملکت کی طرف سے بلاوا آجائے ۱۸۹
آج کا کام کل پر مت ٹالو ۱۸۹
اپنے فائدے کے لئے حاضر ہوتا ہوں ۱۹۰
وہ لمحاتِ زندگی کس کام کے؟ ۱۹۰
دنیا کے مناصب اور عہدے ۱۹۱
بزرگوں کی خدمت میں حاضری کا فائدہ ۱۹۲
وہ بات تمہاری ہوگئی، وقت پر یاد آجائے گی ۱۹۲
زبردستی کان میں باتیں ڈال دیں ۱۹۳
''عذر'' اور ''سستی'' میں فرق ۱۹۳
یہ روزہ کس کے لئے رکھ رہے تھے؟ ۱۹۴
سستی کا علاج ۱۹۴

بدنگاہی، ایک مہلک بیماری ۱۹۵

بدنگاہی کی حقیقت ۱۹۵
یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا ۱۹۶
عربوں کا قہوہ ۱۹۶
پھر حلاوت اور لذت حاصل ہوگی ۱۹۷
آنکھیں بڑی نعمت ہیں ۱۹۷
سات میل کا سفر ایک لمحے میں ۱۹۷
آنکھ کا صحیح استعمال ۱۹۸
بدنگاہی سے بچنے کا علاج ۱۹۸
شہوانی خیالات کا علاج ۱۹۹
تمہاری زندگی کی فلم چلا دی جائے تو؟ ۱۹۹
دل کا مائل ہونا اور مچلنا گناہ نہیں ۲۰۰
سوچ کر لذت لینا حرام ہے ۲۰۰
راستے میں چلتے وقت نگاہ نیچی رکھو ۲۰۱
یہ تکلیف جہنم کی تکلیف سے کم ہے ۲۰۱
ہمت سے کام لو ۲۰۲
حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت اپناؤ ۲۰۲
حضرت یونس علیہ السلام کا طرز اختیار کرو ۲۰۳
دنیاوی مقاصد کے لئے دعا کی قبولیت ۲۰۴
دینی مقصد کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے ۲۰۵
دعا کے بعد اگر گناہ ہوجائے؟ ۲۰۵
توبہ کی توفیق اور ہوجاتی ہے ۲۰۵
پھر ہم تمہیں بلند مقام پر پہنچائیں گے ۲۰۶
تمام گناہوں سے بچنے کا صرف ایک ہی نسخہ ۲۰۶

نگاہوں کو جھکانا سیکھیں ۲۰۷

مغربی تہذیب کی لعنت ۲۰۸
یہ جذبہ کسی حد پر رکنے والا نہیں ۲۰۸
پھر بھی تسکین نہیں ہوتی ۲۰۸
حد سے گزرنے کا نتیجہ ۲۰۹
پہلا بند: نظر کی حفاظت ۲۰۹
نگاہیں نیچے رکھیں ۲۱۰
آج کل نظر بچانا مشکل ہے ۲۱۰
یہ آنکھ کتنی بڑی نعمت ہے ۲۱۱
آنکھوں کی حفاظت کے لئے پیسہ خرچ کرنے پر تیار ۲۱۱
آنکھ کی پتلی کی عجیب شان ۲۱۱
آنکھ کی حفاظت کا خدائی انتظام ۲۱۲
نگاہ پر صرف دو پابندیاں ہیں ۲۱۲

اگر بینائی واپس دیتے وقت شرط لگادی جائے ۲۱۳
نگاہ ڈالنا اجر وثواب کا ذریعہ ۲۱۳
نظر کی حفاظت کا ایک طریقہ ۲۱۴
ہمت سے کام لو ۲۱۴
خلاصہ ۲۱۵

آنکھیں بڑی نعمت ہیں ۲۱۶

پہلا حکم: نگاہ کی حفاظت ۲۱۷
آنکھیں بڑی نعمت ہیں ۲۱۷
آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں ۲۱۸
شرمگاہ کی حفاظت آنکھ کی حفاظت پر ہے ۲۱۸
قلعے کا محاصرہ کرنا ۲۱۹
مؤمن کی فراست سے بچو ۲۱۹
پورا لشکر بازار سے گزر گیا ۲۲۰
یہ منظر دیکھ کر اسلام لائے ۲۲۰
کیا اسلام تلوار سے پھیلا ہے؟ ۲۲۱
شیطان کا حملہ چار اطراف سے ۲۲۱
نیچے کا راستہ محفوظ ہے ۲۲۲
اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کا دھیان ۲۲۲
اچٹتی نگاہ معاف ہے ۲۲۲
یہ نمک حرامی کی بات ہے ۲۲۳
اللہ تعالیٰ سے دعا ۲۲۳

گناہ چھوڑ دو، عابد بن جاؤ گے ۲۲۵

عبادت گذار کیسے بنو گے؟ ۲۲۵
نفلی عبادات نجات کے لئے کافی نہیں ۲۲۶
گناہوں کی مثال ۲۲۶
حلال کھانے کی فکر کرو ۲۲۷
دونوں میں سے کون افضل ہے؟ ۲۲۷
دو عورتوں کا واقعہ ۲۲۷
زیادہ فکر اس کی کریں ۲۲۸
یہ بڑی خطرناک بات ہے ۲۲۸
بدگمانی کو چھوڑ دو ۲۲۹
افواہ پھیلانا گناہ ہے ۲۲۹
ملازمت کے اوقات پورے دے رہے ہو؟ ۲۳۰
جاپانی کہہ کر مال فروخت کرنا ۲۳۰
سٹہ کھیلنا حرام ہے ۲۳۰
جھوٹا سرٹیفکیٹ بنوانا ۲۳۰
عبادت نام ہے بندگی کا ۲۳۱
زبان کی حفاظت کرو ۲۳۱
زبان سے نکلنے والا ایک کلمہ ۲۳۲
مجالس میں غیبت اور تنقید ۲۳۲
پہلے تولو پھر بولو ۲۳۳
حقیقی مجاہد کون؟ ۲۳۳
آنکھ، کان، زبان بند کرلو ۲۳۴

گناہوں کے نقصانات ۲۳۵

پسندیدہ شخص کون ہے؟ ۲۳۶
اصل چیز گناہوں سے پرہیز ہے ۲۳۶
گناہ چھوڑنے کی فکر نہیں ۲۳۷
نفلی عبادات اور گناہوں کی بہترین مثال ۲۳۷
طالبین اصلاح کے لئے پہلا کام ۲۳۸

ہر قسم کے گناہ چھوڑ دو ۲۳۹
بیوی بچوں کو گناہ سے بچاؤ ۲۳۹
خواتین کے کردار کی اہمیت ۲۳۹
نافرمانی اور گناہ کیا چیز ہیں؟ ۲۴۰
گناہ کی پہلی خرابی ''احسان فراموشی'' ۲۴۰
گناہ کی دوسری خرابی ''دل پر زنگ لگنا'' ۲۴۰
گناہ کے تصور میں مؤمن اور فاسق کا فرق ۲۴۱
نیکی چھوٹنے پر مؤمن کا حال ۲۴۱
گناہ کی تیسری خرابی ''ظلمت اور تاریکی'' ۲۴۲
گناہوں کے عادی ہوجانے کی مثال ۲۴۲
گناہوں کی چوتھی خرابی ''عقل خراب ہونا'' ۲۴۳
گناہ نے شیطان کی عقل کو اوندھا کر دیا ۲۴۳
شیطان کی توبہ کا سبق آموز واقعہ ۲۴۴
تمہیں حکمت پوچھنے کا اختیار نہیں ۲۴۵
تم ملازم نہیں، بندے ہو ۲۴۵
محمود اور ایاز کا عبرت آموز واقعہ ۲۴۶
بندہ وہ ہے جو حکم مانے ۲۴۷
گناہ چھوڑنے سے نور کا حصول ۲۴۷
گناہوں کا پانچواں نقصان ''بارش بند ہونا'' ۲۴۸
گناہوں کا چھٹا نقصان ''بیماریوں کا پیدا ہونا'' ۲۴۸
گناہوں کا ساتواں نقصان ''قتل و غارت گری'' ۲۴۸
قتل و غارت گری کا واحد حل ۲۴۹
وظائف سے زیادہ گناہوں کی فکر کرنی چاہئے ۲۴۹
گناہوں کا جائزہ لیں ۲۵۰
تہجد گزار سے آگے بڑھنے کا طریقہ ۲۵۰
مؤمن اور اس کے ایمان کی مثال ۲۵۰
گناہ لکھنے میں تاخیر کی جاتی ہے ۲۵۱
جہاں گناہ کیا، وہیں توبہ کرلو ۲۵۲
گناہوں سے بچنے کا اہتمام کریں ۲۵۲

گناہوں کا علاج خوفِ خدا ۲۵۳

اس کا نام ''تقویٰ'' ہے ۲۵۳
اللہ تعالیٰ کی عظمت ۲۵۴
میرے والد ماجدؒ کی میرے دل میں عظمت ۲۵۴
ڈرنے کی چیز اللہ کی ناراضگی ہے ۲۵۴
دودھ میں پانی ملانے کا واقعہ ۲۵۵
ایک سبق آموز واقعہ ۲۵۶
جرائم ختم کرنے کا بہترین طریقہ ۲۵۶
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تقویٰ ۲۵۷
ہماری عدالتیں اور مقدمات ۲۵۷
ایک عبرت آموز واقعہ ۲۵۸
شیطان کس طرح راستہ مارتا ہے ۲۵۸
نوجوانوں کو ٹی وی نے خراب کر دیا ۲۵۹
چھوٹے گناہوں کا عادی بڑے گناہ کرتا ہے ۲۵۹
یہ گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ ہے؟ ۲۶۰
گناہ کے تقاضے کے وقت یہ تصور کرلو ۲۶۰
گناہوں کی لذت عارضی ہے ۲۶۱
جوانی میں خوف اور بڑھاپے میں اُمید ۲۶۲
دنیا کا نظام خوف پر قائم ہے ۲۶۲

تحریکِ آزادی	۲۶۳
لال ٹوپی کا خوف	۲۶۳
خوف دلوں سے نکل گیا	۲۶۴
خوفِ خدا پیدا کریں	۲۶۴
تنہائی میں اللہ کا خوف	۲۶۵
روزہ کی حالت میں خوفِ خدا	۲۶۵
ہر موقع پر یہ خوف پیدا کریں	۲۶۵
جنت کس کے لئے ہے؟	۲۶۶
جنت کے اردگرد مشقت	۲۶۶
عبادت پر بھی استغفار کرنا چاہئے	۲۶۷
نیک بندوں کا حال	۲۶۷
اللہ کا خوف بقدر معرفت	۲۶۸
حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ اور خوف	۲۶۸
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور خوف	۲۶۹
خوف پیدا کرنے کا طریقہ	۲۷۰
تقدیر غالب آجاتی ہے	۲۷۱
اپنے عمل پر ناز نہ کریں	۲۷۱
بُرے عمل کی نحوست	۲۷۱
صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کی مثال	۲۷۲
بزرگوں کی گستاخی کا وبال	۲۷۲
نیک عمل کی برکت	۲۷۲
تقدیر کی حقیقت	۲۷۳
بے فکر نہ ہو جائیں	۲۷۴
جہنم کا سب سے ہلکا عذاب	۲۷۴
جہنمیوں کے درجات	۲۷۵
میدانِ حشر میں انسانوں کا حال	۲۷۵
جہنم کی وسعت	۲۷۶

مجاہدہ کی ضرورت واہمیت ۲۷۷

دنیاوی کاموں میں ''مجاہدہ''	۲۷۷
بچپن سے ''مجاہدہ'' کی عادت	۲۷۷
جنت میں مجاہدہ نہ ہوگا	۲۷۸
عالَمِ جہنم	۲۷۸
یہ عالَم دنیا ہے	۲۷۸
یہ کام اللہ کی رضا کے لئے کرلو	۲۷۹
اگر اس وقت بادشاہ کا پیغام آجائے	۲۸۰
اللہ تعالیٰ کی معیت کوشش کرنے والوں کیلئے	۲۸۰
وہ کام آسان ہو جائے گا	۲۸۱
آگے قدم تو بڑھاؤ	۲۸۱
جائز کاموں سے رکنا بھی مجاہدہ ہے	۲۸۲
جائز کاموں میں مجاہدہ کیوں؟	۲۸۲
چار مجاہدات	۲۸۳
کم کھانا ''مجاہدہ'' ہے	۲۸۳
وزن بھی کم اور اللہ بھی راضی	۲۸۴
نفس کو لذت سے دور رکھا جائے	۲۸۴
پیٹ بھرے کی مستیاں	۲۸۵
کم بولنا ''مجاہدہ'' ہے	۲۸۵
زبان کے گناہوں سے بچ جائے گا	۲۸۵
جائز تفریح کی اجازت ہے	۲۸۶
مہمان سے باتیں کرنا سنت ہے	۲۸۶
اصلاح کا ایک طریقہ	۲۸۷
کم سونا ''مجاہدہ'' ہے	۲۸۸
لوگوں سے تعلقات کم رکھنا ''مجاہدہ'' ہے	۲۸۸
دل ایک آئینہ ہے	۲۸۸

اللہ تعالیٰ سے تعلق کا آسان طریقہ ۲۹۰

ہر وقت کی دعا لگ ہے ۲۹۰
تعلق مع اللہ کا طریقہ ۲۹۱
اللہ تعالیٰ ذکر سے بے نیاز ہے ۲۹۲
تمام برائیوں کی جڑ، اللہ سے غفلت ۲۹۲
اللہ کہاں گیا؟ ۲۹۳
ذکر سے غفلت، جرائم کی کثرت ۲۹۴
جرائم کا خاتمہ حضور ﷺ نے فرمایا ۲۹۵
زبانی ذکر بھی مفید و مطلوب ہے ۲۹۵
تعلق مع اللہ کی حقیقت ۲۹۵
ہر وقت مانگتے رہو ۲۹۶
یہ چھوٹا سا چٹکلا ہے ۲۹۶
ذکر کے لئے کوئی قید و شرط نہیں ۲۹۷
مسنون دعاؤں کی اہمیت ۲۹۷

کیا آپ کو خیالات پریشان کرتے ہیں؟ ۲۹۹

شیطان ایمان کا چور ہے ۲۹۹
وساوس پر گرفت نہیں ہوگی ۳۰۰
عقیدوں کے بارے میں خیالات ۳۰۱
گناہوں کے خیالات ۳۰۱
برے خیالات کے وقت اللہ کی طرف رجوع کرو ۳۰۱
نماز میں آنے والے خیالات کا حکم ۳۰۲
نماز کی ناقدری مت کرو ۳۰۲
امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ۳۰۳
آیاتِ قرآنی میں تدبر کا حکم ۳۰۳
یہ سجدہ صرف اللہ کے لئے ہے ۳۰۴
خیالات اور وساوس میں بھی حکمت ہے ۳۰۴
نیکی اور گناہ کے ارادے پر اجر و ثواب ۳۰۵
خیالات کی بہترین مثال ۳۰۶
خیالات کا لانا گناہ ہے ۳۰۶
خیالات کا علاج ۳۰۶
دل نہ لگنے کے باوجود نماز پڑھنا ۳۰۷
انسان عمل کا مکلف ہے ۳۰۷
کیفیات نہ مقصود ہیں نہ اختیار میں ہیں ۳۰۸
عمل سنت کے مطابق ہونا چاہئے ۳۰۸
ایک ریٹائرڈ شخص کی نماز ۳۰۹
ٹھیلہ لگانے والے کی نماز ۳۰۹
کس نماز میں روحانیت زیادہ ہے؟ ۳۱۰
مایوس مت ہو جاؤ ۳۱۰
وسوسوں پر خوش ہونا چاہئے ۳۱۱
وسوسہ کی تعریف ۳۱۱
خیالات سے بچنے کا دوسرا علاج ۳۱۱

''تصوّف'' کی حقیقت اور اس کے تقاضے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَحَبِيْبَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات کا بیان کئی جمعوں سے چل رہا ہے جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فلاح پانے والے مؤمنین کی صفات بیان فرمائی ہیں، ان میں سے چوتھی آیت میں ایک صفت یہ بیان فرمائی کہ فلاح پانے والے مؤمن وہ ہیں جو زکوۃ پر عمل کرنے والے ہیں۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اس آیت کے دو مطلب ہیں۔ ایک مطلب ہے زکوۃ ادا کرنا۔ اور دوسرا مطلب ہے اپنے اخلاق کو پاکیزہ بنانا۔ اس دوسرے مطلب کو بیان کرنے میں کئی جمعے گزر گئے، آج اس کا تتمہ عرض کرنا ہے۔ پھر زندگی رہی تو انشاء اللہ اگلی آیات کی طرف متوجہ ہوں گے۔

باطن سے متعلق احکام کا تذکرہ

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہماری ظاہری زندگی سے متعلق کچھ

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/ ۱۱۸ تا ۱۳۴) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱۔ ۷، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے۔ جو اپنی نمازوں میں دل سے جھکنے والے ہیں، اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اور جو زکوۃ پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابل ملامت نہیں ہیں''

احکام ہم پر لازم کئے ہیں مثلاً نماز، روزہ وغیرہ، اسی طرح ہمارے باطن سے متعلق بھی کچھ احکام اللہ تعالیٰ نے عائد فرمائے ہیں، مثلاً یہ کہ انسان کے دل میں ''اخلاص'' ہونا چاہئے، ریا کاری نہیں ہونی چاہئے، انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی محبت ہونی چاہئے، انسان کے دل میں تواضع ہونی چاہئے، اپنی بڑائی دل میں نہ ہونی چاہئے، جب ''صبر'' کرنے کا موقع آئے تو انسان کو صبر کرنا چاہئے، جب شکر کا موقع آئے تو ''شکر'' کرنا چاہئے۔ ان سب احکام کا تعلق انسان کے قلب اور باطن سے ہے۔

باطن سے متعلق حرام کام

اسی طرح باطن سے متعلق بہت سے کام حرام ہیں، مثلاً ''حسد'' کرنا حرام ہے، ''تکبر'' کرنا حرام ہے، کسی سے ''بغض'' رکھنا حرام ہے، ریا کاری اور نام ونمود کرنا حرام ہے۔ پس اخلاق کو درست کرنا اور ان کو پاکیزہ بنانا بھی ایک مؤمن کا انتہائی اہم فریضہ ہے، صرف اتنی بات کافی نہیں کہ آپ نے نماز پڑھ لی اور رمضان کے روزے رکھ لیے اور زکوٰۃ ادا کردی، موقع ہوا تو حج کرلیا اور عمرہ کرلیا، بات ختم ہوگئی، ایسا نہیں ہے، بلکہ باطن کے ان اعمال اور اخلاق کی اصلاح ضروری ہے کہ دل میں تکبر نہ ہو، حسد نہ ہو، ریا کاری نہ ہو، نام ونمود نہ ہو، دنیا کی محبت دل میں بیٹھی ہوئی نہ ہو، بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت دل میں ہو، یہ سب چیزیں باطن کے اندر حاصل ہونی ضروری ہیں۔

یہ چیزیں تربیت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں

اب سوال یہ ہے کہ یہ چیزیں باطن کے اندر کیسے حاصل ہوں؟ خوب سمجھ لیں کہ یہ چیزیں محض کتابیں پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتیں، محض تقریریں سن لینے سے حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ اس کے لئے تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا کہ حضور اقدس ﷺ کی بعثت کے جو مقاصد قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں، ان میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ آپ لوگوں کے اخلاق کو پاکیزہ بنائیں اور ان کے دلوں سے بداخلاقی کی گندگیاں دور فرمائیں، یہ کام تربیت کے ذریعہ ہوتا ہے، ہمارے اسلامی علوم میں ''تصوف'' جس علم کو کہا جاتا ہے، اس کا اصل مقصد تربیت اخلاق ہی ہے۔ آپ نے ''فقہ'' کا لفظ سنا ہوگا، ''فقہ'' اس علم کو کہا جاتا ہے جس میں ظاہری اعمال کے احکام بیان کئے جاتے ہیں کہ کیا کام جائز ہے اور کیا ناجائز ہے؟ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے؟ نماز کے اوقات کیا ہیں؟ نماز کس طرح درست ہے اور کس طرح فاسد ہوجاتی ہے؟ روزے کے کیا احکام ہیں؟ زکوٰۃ کے کیا احکام ہیں؟ حج کے کیا احکام ہیں؟ یہ سب باتیں علم فقہ کے اندر بیان کی جاتی ہیں اور ان احکام کا تعلق ظاہری اعمال سے ہے۔

''علم تصوف'' کے بارے میں غلط فہمیاں

اخلاق سے متعلق جو باتیں میں عرض کر رہا ہوں، ان کا بیان اور ان کو حاصل کرنے کا طریقہ ''علم تصوف'' میں بتایا جاتا ہے۔ آج ''علم تصوف'' کے بارے میں لوگ افراط وتفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں، بعض لوگ تو سمجھتے ہیں کہ ''تصوف'' کا شریعت سے کوئی واسطہ نہیں اور قرآن کریم اور حدیث مبارکہ میں اس کا کہیں ذکر نہیں، بلکہ ''تصوف'' کو اختیار کرنا بدعت ہے۔ خوب سمجھ لیں کہ قرآن کریم اور حدیث مبارکہ نے اخلاق کو درست کرنے کا جو حکم دیا ہے، وہی ''تصوف'' کا موضوع ہے، اس لئے یہ ''تصوف'' قرآن کریم اور حدیث مبارکہ کے خلاف نہیں۔ دوسری طرف بعض لوگوں نے ''تصوف'' کو غلط معنی پہنا دیئے ہیں، ان کے نزدیک ''تصوف'' کے معنی ہیں مراقبے کرنا، کشف حاصل ہونا، الہام ہونا، خواب اور اس کی تعبیر اور کرامات کا حاصل ہونا وغیرہ۔ ان کے نزدیک اسی کا نام ''تصوف'' ہے۔ اس کے نتیجے میں ان لوگوں نے بعض اوقات تصوف کے نام پر ایسے کام شروع کر دیئے جو شریعت کے خلاف ہیں۔ اس سلسلے میں دو تصرف کر لیے۔

تصوف کے بارے میں دو غلط تصرفات

ایک تصرف تو یہ کیا کہ بہت سے لوگ جو اپنے آپ کو ''صوفی'' کہلاتے ہیں مگر ساتھ میں بھنگ بھی پی رہے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ بھنگ مولویوں کے لئے حرام ہے لیکن صوفیوں کے لئے حلال ہے، اس لئے کہ ہم تو بھنگ پی کر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر رہے ہیں۔ العیاذ باللہ العلی العظیم۔ خدا جانے کہاں کہاں کے خرافات، غلط عقیدے، مشرکانہ خیالات داخل کر دیئے اور اس کا نام ''تصوف'' رکھ دیا۔

دوسرا تصرف یہ کیا کہ مرید پیر کا غلام ہے، جب ایک مرتبہ کسی کو پیر بنا لیا تو اب وہ پیر چاہے شراب پیئے، چاہے جوا کھیلے، چاہے حرام کاموں کا ارتکاب کرے، سنتوں کو پامال کرے، لیکن پیر صاحب اپنی جگہ برقرار ہیں، مرید کے ذمے ان کے قدم چومنا لازم ہے اور ہر چند روز کے بعد اس پیر کو نذرانہ پیش کرنا لازم ہے، کیونکہ جب تک وہ پیر صاحب کو اس طرح خوش نہیں کرے گا، جنت کے دروازے اس کے لئے نہیں کھل سکتے۔ العیاذ باللہ العلی العظیم۔ ''تصوف'' کا یہ تصور نہ قرآن کریم میں ہے اور نہ حدیث میں ہے، اس تصور کا کوئی تعلق شریعت اور سنت سے نہیں ہے۔

تصوف کا درست تصور

''تصوف'' کا اصل تصور ''اخلاق'' کی اصلاح اور باطنی اعمال کی اصلاح تھا، اس کے لئے

ضروری تھا کہ کوئی شخص کسی متبعِ سنت، صحیح علم رکھنے والے، صحیح عقیدہ رکھنے والے شخص کو اپنا مقتدا بنائے، جس نے خود اپنی تربیت کسی بڑے سے کرائی ہو اور اس سے جاکر کہے کہ میں آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں اور وہ پھر اس کی رہنمائی کرے، جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مقتدا بنایا کہ آپ ہمارے مربی ہیں، ہماری تربیت کرنے والے ہیں، ہمارے اعمال و اخلاق کو درست کرنے والے ہیں، اس لئے آپ کی اطاعت ہمیں کرنی ہے۔ یہ تصور بالکل درست تھا اور یہ پیری مریدی صحیح تھی اور قرآن وحدیث کے مطابق تھی۔ قرآن وحدیث میں جگہ جگہ اچھے اخلاق اختیار کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے، ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ))(۱)

''مجھے تو بھیجا ہی اس لئے گیا ہے تاکہ میں لوگوں کے اخلاق درست کروں اور ان کی تکمیل کروں''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے آپ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا تھا کہ آپ جس طرح کہیں گے اسی طرح کریں گے، ہمارا دل چاہ رہا ہو یا نہ چاہ رہا ہو، ہماری عقل میں بات آ رہی ہو یا نہ آ رہی ہو، لیکن آپ جو کچھ فرمائیں گے، ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق کو ایسا مجلّٰی اور مصفّٰی فرما دیا کہ اس روئے زمین پر اور اس آسمان کے نیچے ایسے بہترین اخلاق والے انسان ان کے بعد پیدا نہیں ہوئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال یہ تھا کہ کسی بھی وقت اپنے نفس سے غافل نہیں ہوتے تھے، اگرچہ ان کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت حاصل ہو گئی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ کیمیا نے ان کو کندن بنا دیا تھا، لیکن اس کے باوجود ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں ہم صحیح راستے سے بھٹک نہ جائیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت

حضرت فاروقِ اعظم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جن کے بارے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيًّا لَكَانَ عُمَرُ))(۲)

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن خطاب ہوتے''

(۱) كنزالعمال، رقم: ٥٢١٧ (٣/٣٤)، جمع الجوامع للسيوطي، رقم: ٣٠٠٠ (١/ ٩٢١٥)، سنن البيهقي، رقم: ٢١٣٠١ (٢/ ٤٧٢)، جامع الأحاديث، رقم: ٨٨٩٢ (٩/ ٤٨٦)، أدب الدنيا والدين (١/ ٢٨٤)، الدر المنتشرة (١/ ٨)

(۲) سنن الترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله، باب في مناقب عمر بن الخطاب، رقم: ٣٦١٩، مسند أحمد، رقم: ١٦٧٦٤

جنہوں نے اپنے کانوں سے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سن لیا کہ عمر جنت میں جائے گا۔ جنہوں نے براہِ راست حضور اقدس ﷺ سے یہ سنا کہ اے عمر! میں جب معراج پر گیا اور جنت کی سیر کی تو وہاں جنت میں ایک بہت شاندار محل دیکھا، میں نے پوچھا کہ یہ کس کا محل ہے تو مجھے بتایا گیا کہ یہ عمر بن خطاب کا محل ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں محل کے اندر جاکر دیکھوں، لیکن مجھے تمہاری غیرت یاد آگئی کہ تم بڑے غیور آدمی ہو، اس لئے تمہارے گھر میں تمہاری اجازت کے بغیر داخل نہیں ہونا چاہئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو رو پڑے اور عرض کیا:

"أَوَ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَغَارُ"

''یا رسول اللہ! کیا میں آپ پر غیرت کروں گا''(۱)

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا خوفِ آخرت

ان تمام باتوں کے باوجود آپ کا یہ حال تھا کہ جب حضورِ اقدس ﷺ کا وصال ہوگیا تو آپ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ وہ صحابی تھے جن کو حضورِ اقدس ﷺ نے منافقین کی فہرست بتا رکھی تھی کہ مدینہ میں فلاں فلاں شخص منافق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے اور ان کو قسم دے کر فرمایا کہ خدا کے لئے بتادو کہ منافقین کی جو فہرست حضورِ اقدس ﷺ نے آپ کو بتائی ہے، اس فہرست میں کہیں میرا نام تو نہیں ہے۔(۲)

یہ ڈر اس لئے لگا ہوا تھا کہ حضورِ اقدس ﷺ کے زمانے میں تو بے شک میری حالت ٹھیک ہوگی جس کی وجہ سے حضور ﷺ نے مجھے یہ خوشخبری دی، لیکن کہیں بعد میں میری حالت خراب نہ ہوگئی ہو اور بعد میں میرے اخلاق تباہ نہ ہوگئے ہوں، اس وجہ سے مجھے دھڑکا لگا ہوا ہے۔ یہ تھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہ ہر وقت اور ہر آن ان کو یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں ہمارے اعمال میں اور ہمارے اخلاق میں خرابی نہ آجائے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا پرنالہ توڑنا

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجدِ نبوی میں تشریف لائے، اس وقت بارش ہو رہی تھی، آپ نے

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب مناقب عمر بن الخطاب أبی حفص القرشی العدوی، رقم: ۳۴۰۳، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر، رقم: ۴۴۰۸، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل عمر، رقم: ۱۰۴، مسند أحمد، رقم: ۸۱۱۵

(۲) البداية والنهاية (۵/ ۱۹)

دیکھا کہ کسی شخص کے گھر کے پرنالے سے مسجد نبوی کے صحن میں پانی گر رہا ہے، آپ نے فرمایا کہ گھر کے پرنالے سے مسجد کے اندر پانی نہیں گرنا چاہئے، اس لئے کہ مسجد اس کام کے لئے نہیں ہے کہ لوگ اس کے اندر اپنے گھر کے پرنالے گرایا کریں۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کس کا گھر ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا گھر ہے جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ غلط بات ہے، مسجد کسی کی جاگیر نہیں ہوتی اور اس کے اندر گھر کا پرنالہ گرنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے وہ پرنالہ توڑ دیا۔

میری پیٹھ پر کھڑے ہو کر پرنالہ لگاؤ

اس کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور پوچھا کہ امیر المؤمنین! آپ نے یہ پرنالہ کیوں توڑا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مسجد نبوی وقف ہے اور اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور یہ پرنالہ تمہارے ذاتی گھر کا ہے، اس کا مسجد میں گرنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ یہ پرنالہ لگانا جائز نہیں تھا، اس لئے میں نے توڑ دیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! آپ کو معلوم نہیں ہے کہ یہ پرنالہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لگایا تھا، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لگائے ہوئے پرنالے کو آپ نے توڑ دیا؟ یہ سن کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سناٹے میں آگئے اور پوچھا: اے عباس! کیا واقعی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی تھی؟ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں! حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ خدا کے لئے یہ کرو کہ میں ابھی یہاں جھک کر کھڑا ہوتا ہوں اور تم میری پیٹھ پر کھڑے ہو کر ابھی اسی پرنالے کو درست کرو۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ رہنے دیں، آپ نے اجازت دے دی، بات ختم ہوگئی، میں پرنالے کو لگوا لوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک کہ کوئی شخص میری کمر پر کھڑے ہو کر اس پرنالے کو نہ لگا دے، اس لئے کہ ابن خطاب کی یہ مجال کیسے ہوئی کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجازت دیئے ہوئے پرنالے میں تصرف کیا اور اس کو توڑ دیا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنی کمر پر سوار کر کے اس پرنالے کو درست کرایا۔ (۱)

ایسا کیوں کیا؟ یہ اس لئے کیا تاکہ دل میں یہ خیال نہ آجائے کہ اب میں حاکم بن گیا ہوں اور میرا حکم چلتا ہے، اب میں فرعون بن گیا ہوں جو چاہوں کروں، اس لئے اس عمل کے ذریعہ اس خیال کو ختم فرمایا اور اپنے نفس کی اصلاح فرمائی۔ بہرحال ہر لمحہ ان کو اس بات کی فکر تھی کہ ہمارے اخلاق درست ہوں۔

---

(۱) طبقات ابن سعد (۱۲/٤) كنز العمال (٦٦/٧) مجمع الزوائد (٢٠٦/٤) حياة الصحابة (٤٢٤/٢)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور نفس کی اصلاح

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو مشہور صحابی ہیں اور بیشمار احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں، پڑھنے پڑھانے والے تھے، صوفی منش بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ ان کو بحرین کا گورنر بنا دیا گیا۔ اب دن میں یہ وہاں کا انتظام کرتے اور شام کو روزانہ یہ معمول تھا کہ سر پر لکڑیوں کا گٹھر سر پر رکھتے اور بیچ بازار سے گزرتے اور لکڑیاں بیچتے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ یہ کام کیوں کررہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ میرا نفس بڑا شریر ہے، مجھے اندیشہ رہتا ہے کہ حاکم بننے کی وجہ سے کہیں میرے دل میں تکبر نہ آجائے، لہٰذا میں اپنے نفس کو اپنی حقیقت بار بار دکھاتا رہتا ہوں کہ تیری حقیقت یہ ہے۔

ہمارے معاشرے کی حالت

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے نفس کی اصلاح کرنے اور اپنے اخلاق کو پاکیزہ بنانے اور اپنے دل سے تکبر، حسد، بغض، عداوت اور نفرت ختم کرنے کے لئے بڑی محنت اور مجاہدے کئے، یہی کام صوفیاء کرام کراتے ہیں، جو لوگ ان کے پاس اپنی اصلاح کے لئے آتے ہیں، یہ حضرات صوفیاء کرام ان کے اخلاق کی نگرانی کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہمیں کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ہمارے اندر کچھ خرابی ہے یا کوئی عیب ہے یا ہمارے اخلاق خراب ہیں یا ہمارے اندر تکبر پیدا ہورہا ہے، خود پسندی آرہی ہے، ریاکاری پیدا ہورہی ہے، نام ونمود پیدا ہورہا ہے یا دنیا کی محبت دل میں بیٹھ رہی ہے، ان باتوں کا خیال شاذونادر ہی کسی کو آتا ہوگا، بلکہ صبح سے شام تک زندگی کے اوقات گزر رہے ہیں اور ان برائیوں کے ہونے اور نہ ہونے کی کوئی پروا نہیں ہے۔ یہ برائیاں ایسی ہیں کہ انسان کو خود پتہ نہیں چلتا کہ میرے اندر یہ برائی ہے، چنانچہ تکبر کرنے والے کو خود یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میں تکبر کررہا ہوں۔ تکبر کرنے والے سے اگر پوچھا جائے کہ تم تکبر کرتے ہو؟ وہ کہے گا کہ میں تو تکبر نہیں کرتا، کوئی متکبر یہ نہیں کہے گا کہ میں متکبر ہوں یا کوئی حسد کرنے والا یہ نہیں کہے گا کہ میں حسد کرتا ہوں، حالانکہ اس کے دل میں تکبر اور حسد بھرا ہوا ہے۔

ہمیں معالج کی ضرورت ہے

اور یہ برائیاں ایسی ہیں جو انسان کے اخلاق کو تباہ کردیتی ہیں اور برباد کردیتی ہیں، اس لئے کسی معالج کی ضرورت ہوتی ہے جو اس بات کو پہچانتا ہو کہ یہ بیماری اس کے اندر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کا علاج کرے۔ اسی کا نام ''تصوف'' اور پیری مریدی ہے اور ''تصوف'' کی اصل حقیقت یہی

ہے، چنانچہ قرآن کریم نے فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾(۱)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو اور تقویٰ اختیار کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جو متقی لوگ ہیں ان کی صحبت اختیار کرو۔ جب تم ان کی صحبت اختیار کرو گے تو ان کا رنگ ڈھنگ تمہارے اندر منتقل ہوگا، ان کا مزاج تمہاری طرف منتقل ہوگا، اور جب تمہارے اندر کوئی بیماری پیدا ہوگی تو وہ پہچان لیں گے اور پہچان لینے کے بعد وہ تمہاری بیماری کا علاج کریں گے اور تمہاری اصلاح کریں گے۔ اخلاق کو پاکیزہ بنانے اور اپنی اصلاح کرنے کا یہی طریقہ جناب رسول اللہ ﷺ سے لے کر آج تک چلا آرہا ہے۔

اخلاق کو پاکیزہ بنانے کا آسان راستہ

بہر حال! قرآن کریم کے اس حکم کے مطابق کسی اللہ والے سے جو علم صحیح رکھتا ہو اور عقیدہ صحیح رکھتا ہو اور بظاہر متبع سنت ہو اور خود اس نے اپنی اصلاح کسی بزرگ سے کرائی ہو، اس سے رجوع کرنا اور پھر اس کی بتائی ہوئی ہدایات پر عمل کرنا، اخلاق کو پاکیزہ بنانے کا آسان راستہ ہے۔

سادہ دل بندے کدھر جائیں

آج لوگ یہ اشکال کرتے ہیں کہ ہم اپنی اصلاح کے لئے کس کے پاس جائیں؟ کوئی مصلح نظر ہی نہیں آتا، پہلے زمانے میں بڑے بڑے بزرگ اور بڑے بڑے مشائخ ہوا کرتے تھے، جیسے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت جنید بغدادی، حضرت علامہ شبلی اور حضرت معروف کرخی رحمہم اللہ تعالیٰ، اب یہ حضرات تو موجود نہیں۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

لہٰذا جب کوئی مصلح نہیں ہے تو اب ہماری چھٹی، ہم جو چاہیں کریں، کسی کے پاس جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

مصلح قیامت تک باقی رہیں گے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شیطان کا بہت بڑا دھوکہ ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب قرآن کریم نے یہ کہہ دیا کہ اللہ والوں کی صحبت اختیار کرو، تو یہ

(۱) التوبۃ: ۱۱۹

حکم صرف حضور اقدس ﷺ کے زمانے تک کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے، لہٰذا اسی آیت میں یہ خوشخبری بھی ہے کہ قیامت تک اللہ والے باقی رہیں گے، صرف تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

ہر چیز میں ملاوٹ ہوگئی

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل ملاوٹ کا زمانہ ہے، ہر چیز میں ملاوٹ ہے، گندم میں ملاوٹ، گھی میں ملاوٹ، دودھ میں ملاوٹ، کوئی چیز اصلی نہیں ملتی، لیکن اس ملاوٹ کی وجہ سے کیا ہم نے یہ فیصلہ کرلیا کہ چونکہ فلاں چیز میں ملاوٹ ہے، اس لئے فلاں چیز نہیں کھائیں گے، مثلاً گھی اور تیل میں ملاوٹ ہے، لہٰذا آئندہ گھی اور تیل استعمال نہیں کریں گے بلکہ گریس استعمال کریں گے۔ ایسا نہیں کرتے، بلکہ ہم اس ملاوٹ کے دور میں بھی تلاش اور جستجو کرتے ہیں کہ کہاں پر گھی اچھا ملتا ہے، کہاں پر تیل اچھا ملتا ہے، پھر وہاں سے حاصل کرکے استعمال کرتے ہیں۔ تو فرمایا کرتے تھے کہ جب ہر چیز میں ملاوٹ ہے تو اللہ والوں میں بھی ملاوٹ ہے، لیکن کوئی جستجو کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو صحیح جگہ پر پہنچا دیتے ہیں۔ آج بھی اصلاح کرنے والے ختم نہیں ہوئے۔

جیسی روح ویسے فرشتے

دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ آج کے دور میں یہ تلاش کریں گے کہ مجھے تو اصلاح کرانے کے لئے جنید بغدادی چاہئیں، مجھے تو شیخ عبدالقادر جیلانی چاہئیں تو یہ حماقت ہے، کیونکہ اصول یہ ہے کہ جیسی روح ویسے فرشتے، جیسے تم ہو، اسی معیار کے تمہارے مصلح بھی ہوں گے۔ لہٰذا آج پرانے دور کے معیار کا مصلح تو نہیں ملے گا، لیکن ایسا مصلح ضرور مل جائے گا جو تمہاری اصلاح کے لئے کافی ہو جائے گا، اس لئے کسی اللہ والے کو تلاش کرو اور اس تک پہنچنے کی کوشش کرو اور اپنے حالات کی اصلاح کی فکر کرو، اللہ تعالیٰ انشاء اللہ ضرور مدد فرمائیں گے۔

خلاصہ خلاصہ یہ نکلا کہ قرآن کریم نے اس آیت میں ہمیں اخلاق کو پاکیزہ بنانے کا حکم دیا ہے۔ اخلاق سے مراد ہے باطن کے اعمال، اور ان کو پاکیزہ بنانے کا بہترین اور آسان راستہ اللہ والوں کی صحبت اختیار کرنا ہے، لہٰذا اللہ والوں کو تلاش کرو اور ان کی صحبت اختیار کرو اور اپنی اصلاح ان سے کرانے کی کوشش کرو، پھر اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

تصوف کا مقصد اور شیخِ طریقت کی ضرورت ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ. اَمَّا بَعْدُ!

کئی سال سے رمضان المبارک میں حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات سنانے کا معمول ہے۔ سنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہمارے اندر اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہو، رمضان المبارک کا مہینہ خصوصی طور پر اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے۔ اگر انسان اس ماہ کی قدر کرے اور اس ماہ میں اپنی اصلاح کی فکر اور اس کا اہتمام کرے تو وہ جلد منزل کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اسی لئے کئی سال سے رمضان المبارک میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تہذیب اخلاق سے متعلق ارشادات سنانے کا یہ سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔

کتاب ''انفاسِ عیسیٰ'' کے مرتب کا تعارف

جو کتاب اس وقت میرے سامنے ہے، اس کا نام ''انفاسِ عیسیٰ'' ہے، یہ کتاب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصلاحی ملفوظات، آپ کی تربیتی ہدایات اور نفسانی امراض کے علاج کے لئے مفید اور مجرب نسخوں کا خلاصہ ہے جس کو حضرت والا کے خاص خلیفہ مجاز حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کیا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء کی بڑی تعداد ہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنی بساط اور صلاحیت کے مطابق حضرت والا سے کسب فیض کیا، اور ان میں سے ہر ایک ہمارے لئے آفتاب اور ماہتاب کا درجہ رکھتا ہے، لیکن ہر خلیفہ میں کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو اس کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔ حضرت مولانا عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت والا کے ابتدائی دور کے خلفاء میں سے ہیں؛ ان کے بارے میں یہ بات معروف و مشہور ہے کہ حضرت والا کے ساتھ مشابہت میں ان کی کوئی نظیر نہیں تھی، ظاہری

☆ اصلاحی مجالس (۱/ ۲۷ تا ۳۹) بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

شکل وصورت، لباس و پوشاک، چال ڈھال، رفتار وگفتار ہر چیز میں حضرت والا کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت تھی، یہاں تک کہ آواز میں بھی مشابہت تھی۔ چنانچہ جب آپ قرآن کریم کی تلاوت کرتے تو باہر سے سننے والے کو دھوکہ ہو جاتا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تلاوت کر رہے ہیں یا حضرت مولانا عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ تلاوت کر رہے ہیں، اتنی زیادہ مشابہت تھی۔ اور جب ظاہری مشابہت اتنی زیادہ تھی تو اندر اور باطن میں حضرت تھانویؒ سے کیا کیا کسب فیض کیا ہوگا، اس کا اندازہ ہم اور آپ کر ہی نہیں سکتے۔

جب کسی کو اپنے شیخ کے ساتھ شدید محبت ہو، مناسبت کامل ہو اور پھر طویل صحبت اور رفاقت رہی ہو اور اکتساب فیض رسوخ کے ساتھ کیا ہو تو بسا اوقات ظاہری انداز وعادات میں بھی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں بھی اس کی مثال ملتی ہے، چنانچہ روایات میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے:

"كَانَ أَشْبَهُ النَّاسِ سَمْتًا وَدَلًّا وَهَدْيًا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْنَ أُمِّ عَبْدٍ"(۱)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اپنے انداز وادا میں، اٹھنے بیٹھنے میں، چال ڈھال میں، لباس و پوشاک میں جتنی مشابہت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی، اتنی مشابہت کسی اور کو حاصل نہیں تھی''

چنانچہ لوگ ان کو دیکھ کر اپنی آنکھیں اس طرح ٹھنڈی کیا کرتے تھے جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے ٹھنڈی کیا کرتے تھے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو بہرحال ایک الگ حیثیت رکھتا ہے، تاہم اس سے ملتی جلتی کیفیت کے نمونے امت میں پائے گئے ہیں، اسی طرح کا ایک نمونہ حضرت مولانا عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ جس شخص میں ظاہری طور پر بھی ایسی مشابہت ہو جائے اس کے بارے میں یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ اپنے شیخ کے مزاج و مذاق اور ان کے علوم و فیوض کو جذب کئے ہوئے اور پوری طرح ہضم کئے ہوئے ہے۔

کتاب ''انفاسِ عیسیٰ'' کا تعارف

بہرحال، حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اور خدمت

(۱) مسند أحمد، رقم: ۲٤۱۱۹ (۱٤۱/۵۱)، فضائل الصحابة، رقم: ۱۵٤۱ (۸٤۰/۲)، "ابن ام عبد" حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔

میں رہنے کے دوران حضرت والا سے جو باتیں سنیں اور جو تعلیمات حاصل کیں، ان کا خلاصہ ہمارے لئے اس کتاب ''انفاس عیسیٰ'' میں جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب حضرت کے دیگر عام ملفوظات کے مجموعوں کی طرح ملفوظات کی کتاب نہیں ہے، چنانچہ عام ملفوظات اور مجالس کی کتابوں میں یہ نظر آئے گا کہ حضرت والا نے کسی موضوع سے متعلق ایک بات ارشاد فرمائی، پھر تھوڑی دیر کے بعد دوسرے کسی اور موضوع سے متعلق دوسری بات ارشاد فرمائی۔ اور پھر تیسری بات تیسرے موضوع سے متعلق ارشاد فرمائی اور ان باتوں کو لوگوں نے جمع کرنا شروع کر دیا۔

لیکن اس کتاب میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ حضرت تھانویؒ کی صحبت میں رہنے کے دوران تصوف اور طریقت سے متعلق جو کچھ سنا اور جو تعلیم حاصل کی، پہلے اس کو ہضم کیا، پھر اس کی تلخیص اس طرح لکھی کہ اس میں اکثر الفاظ بھی حضرت والا ہی کے ہیں۔

اس طرح ان تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہمارے لئے اس کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے، لہٰذا یہ کتاب ''انفاسِ عیسیٰ'' ہمارے لئے بڑی عجیب وغریب نعمت ہے۔

تصوف کا مقصدِ اصلی کیا ہے؟

تصوف، طریقت، سلوک، احسان ایک ہی مفہوم کے مختلف عنوانات ہیں۔ اس تصوف کا اصل مقصد نہ تو محض ذکر ہے، چنانچہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصود ''ذکر'' ہی ہے۔ جب ہم کسی شیخ سے بیعت ہو جائیں گے تو وہ ہمیں وظائف بتادے گا۔ اور بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصد عملیات اور روحانی علاج ہے کہ شیخ ہمیں کچھ عملیات اور تعویذ گنڈے اور روحانی علاج کا طریقہ بتائے گا۔ خوب سمجھ لیں کہ ''تصوف'' کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں حتیٰ کہ ''ذکر'' بھی تصوف کا مقصود اصلی نہیں، بلکہ مقصود اصلی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی طرح بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کہیں تنہائی میں بیٹھ کر مراقبہ کرے اور چلہ کاٹے، مجاہدے کرے۔ حالانکہ یہ سب چیزیں بھی ''تصوف'' کا مقصد اصلی نہیں ہیں بلکہ مقصود اصلی کو حاصل کرنے کے مختلف طریقے اور راستے ہیں۔

پھر ''تصوف'' کا مقصود اصلی کیا ہے؟ تصوف کا مقصود اصلی وہ ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾(۱)

یعنی نفس کا تزکیہ کرے، جس کو اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے بیان کرتے ہوئے فرمایا:

---

(۱) الشمس: ۹، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''فلاح اسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے''

﴿رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَیُزَكِّیۡهِمۡ﴾(۱)

اس آیت میں تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کو مقاصد بعثت میں سے بیان فرمایا، پھر ''تزکیہ'' کو علیحدہ کر کے بیان فرمایا۔ ''تزکیہ'' کے لفظی معنی ہیں، پاک صاف کرنا۔ شریعت کی اصطلاح میں تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح انسان کے ظاہری اعمال وافعال ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے بعض اوامر ونواہی ہیں مثلاً یہ کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ دو، حج کرو وغیرہ، یہ اوامر ہیں، اور جھوٹ نہ بولو، غیبت نہ کرو، شراب نہ پیو، چوری نہ کرو، ڈاکہ نہ ڈالو وغیرہ، یہ نواہی اور گناہ ہیں، ان سے بچنے کا شریعت نے حکم دیا ہے۔

اسی طرح انسان کے باطن یعنی قلب میں بعض صفتیں مطلوب ہیں، وہ اوامر میں داخل ہیں، ان کو حاصل کرنا واجب ہے اور ان کو حاصل کئے بغیر فریضہ ادا نہیں ہوتا، اور بعض صفات ایسی ہیں جن کو چھوڑنا واجب ہے، وہ نواہی میں داخل ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی نعمت پر شکر کرنا واجب ہے، اگر کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو اس پر صبر کرنا واجب ہے، اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ رکھنا واجب ہے، تواضع اختیار کرنا یعنی اپنے آپ کو کمتر سمجھنا واجب ہے، اخلاص حاصل کرنا، یعنی جو کام بھی آدمی کرے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرے، اس اخلاص کی تحصیل واجب ہے، اخلاص کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں۔ لہٰذا یہ صفات شکر، صبر، توکل، تواضع، اخلاص، وغیرہ، یہ سب صفات فضائل اور اخلاق فاضلہ کہلاتی ہیں، ان کی تحصیل واجب ہے۔

اسی طرح باطن کے اندر بعض بری صفات ہیں جو حرام اور ناجائز ہیں جن سے بچنا ضروری ہے، وہ ''رذائل'' اور ''اخلاق رذیلہ'' کہلاتی ہیں، یعنی یہ صفات کمینی اور گھٹیا صفات ہیں، اگر یہ صفات باطن کے اندر موجود ہوں تو ان کو کچلا اور مٹایا جاتا ہے، تاکہ یہ صفات انسان کو گناہ پر آمادہ نہ کریں، مثلاً تکبر کرنا یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، حسد کرنا، ریاکاری، اور دکھاوا، یعنی انسان اللہ کو راضی کرنے کے بجائے مخلوق کو راضی کرنے کے لئے اور ان دکھانے کے لئے کوئی دینی کام کرے، یہ ریا ہے، لہٰذا تکبر حرام، حسد حرام، بغض حرام، ریاکاری حرام، اور بے صبری یعنی اللہ تعالیٰ کی قضا پر راضی نہ ہونا بلکہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ کرنا، یہ حرام ہے، یہ سب رذائل ہیں جو انسان کے باطن میں موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح غصہ کو اگر انسان بے محل استعمال کرے تو یہ بھی رذائل میں داخل ہے۔

خلاصہ یہ کہ باطن میں بہت سے فضائل ہیں جن کو حاصل کرنا ضروری ہے، اور بہت سے

---

(۱) البقرۃ: ۱۲۹، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور ہمارے پروردگار! ان میں ایک ایسا رسول بھیجنا جو انہی میں سے ہو، جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاکیزہ بنائے''

رذائل ہیں جن سے اجتناب ضروری ہے۔ حضرات صوفیاء اور مشائخ یہ کام کرتے ہیں کہ اپنے مریدین اور شاگردوں کے دلوں میں اخلاق فاضلہ کی آبیاری کرتے ہیں تا کہ اخلاق رذیلہ کچلتے کچلتے نہ ہونے کے حکم میں ہو جائیں۔ جس کے لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اصطلاح بیان فرمائی کہ ''امالہ بدرجہ ازالہ'' یعنی باطن کے اندر جو رذیلہ ہے، اس کو اتنا کچلو اور اس کو اتنا پیٹو کہ اس کے بعد وہ رذیلہ باقی تو رہے گا، ختم تو نہیں ہوگا، لیکن نہ ہونے کے حکم میں ہو جائے گا۔ بہر حال، تصوف میں رذائل کو کچلنا ہوتا ہے اور فضائل کو حاصل کرنا ہوتا ہے، اسی کا نام تزکیہ ہے اور بس یہی تصوف کا مقصود اصلی ہے۔

شیخ کی ضرورت

لیکن عام طور پر یہ چیز کسی شیخ کی صحبت حاصل کیے بغیر اور شیخ کے سامنے اپنے آپ کو فنا کئے بغیر حاصل نہیں ہوتی، کیوں؟ اس لئے کہ ''لکل فن رجال'' یعنی ہر فن کو حاصل کرنے کے لئے اس کے ماہر کے پاس جانا ضروری ہے، اگر فقہ کا مسئلہ معلوم کرنا ہو تو کسی مفتی کے پاس چلے جاؤ کیونکہ اس کو یہ فن آتا ہے، وہ جانتا ہے کہ کس سوال کا کیا جواب دینا چاہئے۔ لیکن اعمال باطنہ کے بارے میں مہارت حاصل کرنا اور یہ پہچاننا کہ آیا اس شخص کے اندر یہ بیماری پیدا ہو رہی ہے یا نہیں؟ کیونکہ باطن کی بیماریاں بھی مخفی اور باریک قسم کی ہوتی ہیں، ایک چیز بڑی اچھی ہے اور دوسری چیز بڑی خراب ہے، لیکن دونوں کے درمیان فرق کرنا بڑا مشکل ہے۔ مثلاً تکبر کرنا حرام ہے اور اس سے بچنا واجب ہے، اس لئے کہ یہ تکبر اُمّ الامراض ہے۔ لیکن دوسری صفت ''عزت نفس'' ہے، اس کو حاصل کرنا واجب ہے، کیونکہ اپنے نفس کو ذلیل کرنا جائز نہیں۔ لیکن یہ دیکھنا کہ کہاں ''تکبر'' ہے اور کہاں ''عزت نفس'' ہے، جو کام میں کر رہا ہوں یہ ''تکبر'' کی وجہ سے کر رہا ہوں یا یہ ''عزت نفس'' کی وجہ سے کر رہا ہوں، دونوں کے درمیان کون خط امتیاز کھینچے اور دونوں کو کون پہچانے کہ یہ تکبر ہے اور یہ ''عزت نفس'' ہے، یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ خاص طور پر انسان کا خود اپنے اندر ان بیماریوں کا پہچاننا بڑا مشکل ہے۔

مثلاً ایک بیماری ہے ''اپنی بڑائی بیان کرنا'' کہ میں ایسا اور ویسا ہوں، میرے اندر یہ اچھائی ہے، میرے اندر یہ خوبی ہے، یہ حرام ہے، اسی کو ''تعلّی'' کہا جاتا ہے۔ دوسری چیز ہے ''تحدیثِ نعمت'' جس کا قرآن کریم کے اندر ذکر ہے:

﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾(۱)

اب کون اس کے درمیان فرق کرے کہ میں جو اپنی اچھائی بیان کر رہا ہوں، یہ ''تعلّی'' ہے یا ''تحدیثِ نعمت'' ہے؟

(۱) الضحیٰ: ۱۱، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جو تمہارے پروردگار کی نعمت ہے، اس کا تذکرہ کرتے رہنا''

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

مجھے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہوئی ایک بات یاد آ گئی، فرمایا کہ ایک مرتبہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ دہلی مسجد کے منبر پر بیٹھ کر وعظ فرما رہے تھے، بہت بڑا مجمع سامنے بیٹھا ہوا تھا، وعظ فرماتے کہنے لگے کہ آج میں ایک بات آپ لوگوں سے بیان کرتا ہوں، یہ بات مجھ ہی سے سنیں گے اور کسی سے سننے میں نہیں آئے گی، اور میں یہ بات ''تحدیثِ نعمت'' کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ یہ علم اللہ تعالیٰ نے مجھے ہی القاء فرمایا ہے۔ یہ بات کہنے کے بعد ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا کہ ''استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ'' میں نے یہ جملہ کہہ دیا کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سن سکیں گے اور کہیں سننے میں نہیں آئے گی، یہ تو دعویٰ اور ''تعلّی'' ہے اور میں نے اپنی بڑائی بیان کی ہے، اور اس کو میں نے ''تحدیثِ نعمت'' کا نام دے دیا، لہٰذا میں اس پر استغفار کرتا ہوں ''استغفر اللہ، استغفر اللہ'' اوّل تو میں نے اپنی بڑائی بیان کی اور پھر اس بڑائی کو ''تحدیثِ نعمت'' کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی، اور قاعدہ ہے کہ ''توبۃ السر بالسر والعلانیۃ بالعلانیۃ''(۱) کیونکہ یہ گناہ میں نے اعلانیہ کیا تھا، اس لئے توبہ بھی اعلانیہ کرتا ہوں کہ یہ مجھ سے غلطی ہوئی، اس غلطی پر استغفار کرتا ہوں، ''استغفر اللہ، استغفر اللہ۔ عین وعظ کے دوران یہ کام کیا، اس طرح کوئی دوسرا کر کے دکھائے، یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو مٹا چکا ہو، اپنے کو فنا کر چکا ہو، اور پھر نفس کی باریک چالوں سے باخبر ہو، اپنے نفس کا نگراں رہتا ہو، اس کا احتساب ہمہ وقت کرتا رہتا ہو۔ اب آپ دیکھیں کہ جو بات میں بیان کر رہا ہوں، یہ ''تعلّی'' کے طور پر بیان کر رہا ہوں یا ''تحدیثِ نعمت'' کے طور پر بیان کر رہا ہوں، ان کے درمیان فرق کرنا بڑا مشکل ہے اور اس کو پہچاننا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

تواضع اور ذلت نفس میں فرق

اسی طرح ''تواضع'' بڑی عمدہ چیز ہے، اعلیٰ درجے کی صفت ہے اور مطلوب ہے، ایک دوسری صفت ہوتی ہے ''ذلت نفس'' یعنی دوسرے کے سامنے نفس کو ذلیل کرنا، یہ حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے نفس کی عزت واجب کی ہے، اس کو ذلیل نہیں کرنا چاہئے، لیکن ان دونوں کے درمیان فرق کرنا کہ کون سا عمل ''تواضع'' کی وجہ سے کیا جا رہا ہے اور کون سے فعل میں ''ذلت نفس'' ہے، ان کے درمیان فرق کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

---

(۱) یعنی خفیہ گناہ کی توبہ خفیہ اور ظاہری گناہ کی توبہ علانیہ ہونی چاہئے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

اسی فرق کے سلسلے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے اپنا واقعہ بیان فرمایا کہ میں ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہا تھا، ریل میں میرے پاس کچھ دیہاتی بھی بیٹھے ہوئے تھے، سفر کے دوران جب کھانے کا وقت آیا تو ان دیہاتیوں نے اپنے ساتھ جو سالن روٹی لائے تھے، وہ نکال کر سامنے رکھا، اور مجھے بھی کھانے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ حضرت جی! کچھ گوہ موت ہمارے ساتھ بھی کھالو، اس کھانے کو تواضعاً ''گوہ موت'' کا نام دیدیا، اب بظاہر تو یہ تواضع کی بات تھی، لیکن حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی ناقدری تھی کہ اللہ تعالیٰ کے رزق کو ''گوہ موت'' قرار دے کر اس کی دوسرے کو دعوت دے اور بلائے، یہ ''تواضع'' نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری، ناشکری اور بے توقیری ہے۔

بہرحال، کبھی تواضع کی سرحد ذلتِ نفس کے ساتھ مل جاتی ہے، اور کبھی اس کی سرحد ناشکری کے ساتھ مل جاتی ہے، اب کس حد تک تواضع کرے اور کس حد پر تواضع نہ کرے، کہاں تواضع ہے کہاں ناشکری ہے۔ کہاں تواضع ہے اور کہاں ذلتِ نفس ہے، ان کے درمیان فرق کو پہچاننا ہر ایک کا کام نہیں جب تک کسی شیخ سے تربیت حاصل نہ کرلے۔

یہ چیز محض پڑھا دینے سے حاصل نہیں ہوتی کہ کتاب میں پڑھ کر کسی چیز کی حد تام معلوم کرلی اور پھر خود ہی اس کے فوائد اور قیود نکالنے شروع کردیئے۔ یاد رکھئے! یہ اس قسم کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ کام عملی تربیت سے آتا ہے، جب کسی شیخ کو مسلسل آدمی دیکھتا رہے اور اس کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کرتا رہے اور اس کو اپنے حالات بتا کر اس سے ہدایات لیتا رہے، اس کے نتیجے میں پھر انسان کو یہ ادراک حاصل ہوتا ہے کہ عمل و اخلاق کا یہ درجہ قابل حصول صفت ہے اور یہ کیفیت یا درجہ قابل ترک رذیلہ ہے۔

خوشبو کی مثال

میں اس کی یہ مثال دیا کرتا ہوں جیسے ایک گلاب کا پھول ہے۔ کسی بڑے سے بڑے فلسفی اور منطقی سے کہا جائے کہ تم اس گلاب کے پھول کی خوشبو کی ایسی جامع مانع تعریف کرو جو اس کو چنبیلی کی خوشبو سے ممتاز کردے۔ گلاب کے پھول سے بھی خوشبو آرہی ہے اور چنبیلی کے پھول سے بھی خوشبو آرہی ہے، اس کام کے لئے کسی بڑے سے بڑے فصیح اور بلیغ کو بلالو، کسی ادیب اور شاعر کو بلالو اور اس سے کہو کہ گلاب اور چنبیلی کی خوشبو میں فرق بیان کرو، بتایئے! کوئی فرق بیان کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بس اس کا فرق معلوم کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ پوچھنے والے سے کہا جائے کہ اس

گلاب کے پھول کو سونگھ لو اور اس چنبیلی کے پھول کو سونگھ لو۔ سونگھنے کے بعد پتہ چل جائے گا کہ گلاب کی خوشبو کیسی ہوتی ہے اور چنبیلی کی خوشبو کیسی ہوتی ہے، اس کے علاوہ دونوں کے درمیان فرق معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔

آم اور گڑ کی مٹھاس کا فرق

ایک مثال اور سنئے! دیکھیں، آم بھی میٹھا ہوتا ہے اور گڑ بھی میٹھا ہوتا ہے گڑ کی مٹھاس کیسی ہے؟ اور آم کی مٹھاس کیسی ہے؟ دونوں کی مٹھاس میں جو فرق ہے، وہ کسی بڑے سے بڑے فلسفی اور منطقی سے بیان کراؤ، ہرگز بیان نہیں کرسکتا، کیونکہ دونوں کی مٹھاس کا جو فرق ہے وہ زبان سے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا، اس فرق کو جاننے کا یہ طریقہ ہے کہ اس پوچھنے والے سے کہا جائے کہ تو گڑ بھی کھا اور آم بھی کھا، پھر پتہ چل جائے گا کہ آم کی مٹھاس کیسی ہوتی ہے اور گڑ کی مٹھاس کیسی ہوتی ہے۔

بالکل اسی طرح انسان کے باطن کے جو فضائل ہیں۔ مثلاً "تواضع" ہے، اگر اس کی لفظوں میں کوئی مکمل تعریف بیان کرنا چاہے تو بہت مشکل ہے، لیکن جب کسی متواضع آدمی کو دیکھو گے اور اس کے طرز عمل کا مشاہدہ کرو گے اور اس کی صحبت میں رہو گے تو اس کے نتیجے میں وہ اوصاف تمہارے اندر بھی منتقل ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اس لئے تصوف اور سلوک میں شیخ کی صحبت اور اس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف باتیں کر لینے سے یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، بلکہ کسی کے سامنے رگڑے کھانے سے اللہ تعالیٰ فضل فرما دیتے ہیں اور یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔

اپنی اصلاح کرانا ضروری ہے

بہرحال، پیر اور شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہونا کوئی فرض نہیں کہ آدمی کسی شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ضرور بیعت ہو جائے، لیکن اپنی اصلاح کرانا ضروری ہے، اور جب اپنی اصلاح کے لئے کوئی شخص اپنے شیخ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس رجوع کرنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ آدمی کو فضائل حاصل ہوں اور رذائل سے آدمی بچ جائے، ان رذائل کا ازالہ ہو اور وہ انسان کے قابو میں آجائیں سلوک وتصوف کا یہ اصل مقصد ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں اذکار اور اوراد یا مختلف وظائف سالک کے لئے معین اور مددگار ہو جاتے ہیں، مگر ہر شخص کے لئے ان اذکار اور اوراد کی مقدار، اس کا موقع اور وقت، یہ شیخ کی رہنمائی اور مشورے سے ہی مقرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی سے اصلاح حال کا فائدہ ہوتا ہے، ورنہ عام حالات میں یہ اذکار اور اوراد اس درجہ میں خود مقصود نہیں، بلکہ اصل کام اپنے اخلاق کی اصلاح ہے اور اس کا تزکیہ ہے، جس کے لئے ضروری ہے کہ شیخ کو اپنے حالات کی اطلاع

دیتا رہے اور اس سے ہدایات لیتا رہے اور پھر ان ہدایات پر عمل کرتا رہے، بس ساری زندگی یہی کام کرتا رہے۔ شیخ کی طرف رجوع کرنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے۔

اس کتاب ''انفاس عیسیٰ'' میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''رذائل'' اور ''فضائل'' سے متعلق جو ملفوظات جمع فرمائے ہیں، ان کو پڑھ لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان کی تھوڑی سی تشریح کر دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو سمجھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے اور ان کے ذریعہ اپنی اصلاح کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

''تزکیہ'' کیا چیز ہے؟☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ،

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ O الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ O وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ O وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ O﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۃ مؤمنون کی ابتدائی آیات کی تفسیر اور تشریح کافی عرصہ سے چل رہی ہے، ان آیات کا اس لئے انتخاب کیا گیا ہے کہ ان آیات میں اللہ جل شانہ نے وہ بنیادی صفات بیان فرمائی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو ایک مسلمان سے مطلوب ہیں اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ میرے مؤمن بندے ان صفات کے حامل ہوں اور یہ صفات اپنے اندر پیدا کریں۔ اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ جو ان صفات کے حامل ہوں گے اور جو یہ کام کریں گے ان کو فلاح حاصل ہوگی اور کامیابی حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان صفات کا حامل بنائے اور یہ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تین صفات کا بیان

ان صفات میں سے پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگ اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں، اس کی تفصیل بقدرِ ضرورت الحمدللہ بیان ہو چکی۔ دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگ لغو اور بیہودہ اور فضول کاموں میں نہیں پڑتے، یعنی اپنا وقت بے فائدہ کاموں میں صرف کرنے کو پسند نہیں کرتے، فضول کاموں سے اعراض کرتے ہیں، اس کا بیان بھی الحمدللہ تفصیل سے ہو چکا۔ تیسری صفت اس آیت میں بیان فرمائی:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُونَ﴾

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/ ۶۵ تا ۸۰)، قبل از نمازِ جمعہ، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱-۴

ہیں، ایک مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اس لئے کہ زکوٰۃ بھی بڑا اہم فریضہ ہے اور دین کے ستونوں میں سے ایک اہم ستون ہے۔ اس کے بارے میں پچھلے دو تین جمعوں میں تفصیل سے عرض کردیا ہے اور اس کے بارے میں جو ضروری مسائل تھے وہ بھی بیان کردیئے۔ آج اس آیت کا دوسرا مطلب عرض کرنا ہے۔

آیت کا دوسرا مطلب

عربی زبان کے اعتبار سے اس کا ایک دوسرا مطلب بھی ہوسکتا ہے۔ وہ مطلب یہ ہے کہ "یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو پاک کرتے ہیں اور پاکی اختیار کرتے ہیں" یہاں بھی یہی مسئلہ ہے کہ جب ہم عربی سے اُردو ترجمہ کرتے ہیں تو عربی لفظ کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اُردو میں صحیح لفظ نہیں ملتا، ہمارے پاس چونکہ لفظ "زکوٰۃ" کے لئے کوئی اور لفظ نہیں ہے، اس لئے ہم اس آیت کا یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو پاکی اختیار کرتے ہیں۔ لیکن یہاں پر پاکی سے جسم کی پاکی مراد نہیں، کیونکہ جسم کی پاکی کے لئے عربی زبان میں "طہارت" کا لفظ بولا جاتا ہے، بلکہ اس سے "اخلاق" کی پاکیزگی مراد ہوتی ہے، اس کو عربی زبان میں "زکوٰۃ" اور "تزکیہ" کہا جاتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے آیت:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ﴾

کا ترجمہ یہ ہوگا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اخلاق کو پاک صاف رکھتے ہیں اور ان کو پاکیزہ بناتے ہیں اور اخلاق کے اندر جو گندگیاں اور نجاستیں شامل ہوجاتی ہیں، ان سے وہ اپنے آپ کو پاک کرتے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے اس آیت کا مفہوم بڑا وسیع ہے اور اس کا پس منظر بڑا ہمہ گیر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے چار مقاصد

لیکن اس بات کو سمجھنے سے پہلے یہ جان لیجئے کہ قرآن کریم نے کم از کم چار جگہوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی بیان فرمائے ہیں، اس میں یہ بتایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کیوں بھیجا؟ کیا کام آپ کے سپرد کئے گئے؟ کیا کام آپ کو انجام دینے تھے؟ قرآن کریم نے چار مقامات پر ان کاموں کو بیان فرمایا ہے، چنانچہ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝﴾(۱)

اس آیت میں سب سے پہلا کام یہ بیان فرمایا:

(۱) البقرة: ۱۲۹

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ﴾

یعنی ہم نے آپ کو اس لئے بھیجا تا کہ آپ لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیات تلاوت کریں۔ دوسرا کام یہ فرمایا:

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾

یعنی ہم نے آپ ﷺ کو اس لئے بھیجا تا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی آیات کی لوگوں کو تعلیم دیں، کیونکہ ہماری کتاب کو لوگ براہِ راست سمجھ نہیں سکیں گے۔ تیسرا کام یہ بیان فرمایا:

﴿وَالْحِكْمَةَ﴾

اور تا کہ آپ لوگوں کو حکمت کی تعلیم دیں، دانائی اور عقلمندی کی باتوں کی تعلیم دیں۔ چوتھا کام یہ بیان فرمایا:

﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾

اور ہم نے آپ کو اس لئے بھیجا تا کہ آپ لوگوں کا تزکیہ کریں اور ان کو پاک صاف اور پاکیزہ بنائیں۔

تزکیہ کی ضرورت کیوں؟

اب آپ غور کریں کہ اس آیت میں تزکیہ کے بیان سے پہلے قرآن کریم کی آیات تلاوت کرنے کا ذکر آگیا، اس کے بعد قرآن کریم کی تعلیم دینے اور سکھانے کا ذکر آگیا، اس کے بعد حکمت کی باتیں سکھانے کا ذکر آگیا، لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ تنہا یہ تین کام کافی نہیں ہیں، بلکہ آپ ﷺ کا چوتھا کام یہ ہے کہ لوگوں کے اعمال و اخلاق کو پاکیزہ بنائیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ نے قرآن کریم سکھا دیا اور اس کا مطلب سمجھا دیا اور حکمت کی باتیں بتا دیں پھر یہ اضافی کام کیوں بتایا کہ آپ لوگوں کو پاک صاف کریں۔

تھیوریکل (لکھائی پڑھائی کی) تعلیم کے بعد ٹریننگ ضروری ہے

اس کا جواب سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات جان لیں کہ دنیا میں جتنے علوم و فنون اور ہنر ہیں، ان کی ایک نظریاتی اور تھیوریکل تعلیم ہوتی ہے کہ اس میں اس علم کی تھیوری اور نظریہ بتا دیا، اس کو ''تعلیم'' کہا جاتا ہے، لیکن دنیا کے کسی فن کو سمجھنے کے لئے محض نظریاتی تعلیم کافی نہیں ہوتی جب تک اس کی عملی تربیت اور عملی ٹریننگ نہ دی جائے۔ آپ اگر ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں تو کیا میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ لینے سے آپ ڈاکٹر بن جائیں گے؟ نہیں، بلکہ اگر آپ نے میڈیکل سائنس کا پورا کورس پڑھ لیا اور

نظریاتی طور پر سمجھ بھی لیا کہ کیا کیا بیماریاں ہوتی ہیں اور ان کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ ان کا علاج کیا ہوتا ہے؟ اگر یہ سب تفصیلات آپ نے معلوم کرلیں تب بھی آپ ڈاکٹر نہیں بنیں گے، آپ ڈاکٹر اس وقت بنیں گے جب آپ کسی ماہر ڈاکٹر کے ساتھ رہ کر تربیت لے لیں کہ کس طرح علاج کیا جاتا ہے اور کس طرح مرض کی تشخیص کی جاتی ہے اور کس طرح دوائیں تجویز کی جاتی ہیں اور کس طرح مریض کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے، جب تک آپ یہ تربیت حاصل نہیں کریں گے، اس وقت تک آپ علاج کرنے کے قابل نہیں بنیں گے، یہی وجہ ہے کہ وہ یونیورسٹیاں جو میڈیکل سائنس کی تعلیم دیتی ہیں، وہ تعلیم مکمل کرانے کے بعد ہاؤس جاب کو لازمی قرار دیتی ہیں کہ کسی اسپتال میں کسی ماہر ڈاکٹر کے ساتھ رہ کر یہ سیکھنا پڑے گا کہ کس طرح علاج کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یونیورسٹی میں جو پڑھا تھا وہ نظریاتی تعلیم تھی اور اسپتالوں میں جاکر جو ہاؤس جاب کیا جارہا ہے یہ تربیت اور ٹریننگ ہے۔

آپ ﷺ کو تعلیم اور تربیت دونوں کے لئے بھیجا گیا

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دونوں کاموں کے لئے دنیا میں بھیجا ہے کہ آپ ﷺ قرآن کریم کی نظریاتی تعلیم بھی دیں اور یہ بھی بتائیں کہ ان آیات کا کیا مطلب ہے؟ اور ساتھ میں آپ لوگوں کو تربیت بھی دیں اور ان کا تزکیہ بھی کریں اور ان کی نگرانی کریں اور ان کے اعمال و اخلاق کو گندگیوں سے پاک کریں اور ان کو پاکیزہ بنائیں۔ یہ چیزیں صرف کتابیں پڑھانے سے حاصل نہیں ہوتیں، نظریہ سمجھا دینے سے حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ یہ چیزیں صحبت سے حاصل ہوتی ہیں۔ جب انسان کسی کی صحبت میں ایک مدت تک رہتا ہے اور اس کے طرزِ عمل کو دیکھتا ہے تو اس کے طرزِ عمل کی خوشبو رفتہ رفتہ اس انسان کے اندر بھی سرایت کرجاتی ہے، اسی کا نام تزکیہ ہے۔

اخلاق کو پاکیزہ بنانے کا کیا مطلب ہے؟

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ﴾

دوسری تفسیر کے لحاظ سے اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ فلاح ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے اخلاق اور اعمال کو پاکیزہ بنانے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ پاکیزہ بنانے کا کیا مطلب ہے؟ اگر جسم کو گندگی سے پاک کرنا ہو تو اس کو پانی سے دھودیا جائے تو وہ پاک ہوجائے گا، اگر کپڑے کو گندگی سے پاک کرنا ہو تو اس کو پانی سے دھودیا جائے تو وہ پاک ہوجائے گا، لیکن اخلاق اور اعمال کو پاکیزہ بنانے اور ان کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ کیا ان کو پانی سے دھودیا جائے؟ یا ان

اعمال کو غسل دے دیا جائے؟

''دل'' انسان کے اعمال کا سرچشمہ ہے

خوب سمجھ لیں کہ اعمال اور اخلاق کو پاکیزہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان دنیا کے اندر جو بھی کام کرتا ہے، درحقیقت اس عمل کا سرچشمہ اور اس کا منبع، اس کی اصل انسان کے دل میں ہوتی ہے۔ پہلے انسان کے دل میں اس عمل کا ارادہ پیدا ہوتا ہے، اس کے بعد اس سے وہ عمل سرزد ہوتا ہے۔ مثلاً آپ جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد میں تشریف لائے تو پہلے آپ کے دل میں یہ ارادہ پیدا ہوا کہ آج جمعہ کا دن ہے اور مجھے جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد میں جانا چاہئے اور جا کر نماز ادا کرنی چاہئے، لہٰذا پہلے ارادہ پیدا ہوا اور پھر اس ارادے میں پختگی آئی اور طبیعت میں جو سستی پیدا ہو رہی تھی، اس سستی کا مقابلہ کر کے اس ارادے کو پختہ کیا اور پختہ ارادے کے نتیجے میں آپ کے پاؤں مسجد کی طرف چلنے لگے۔ اگر آپ پختہ ارادہ نہ کرتے تو آپ کے پاؤں مسجد کی طرف نہ چلتے۔ ہاں اگر کوئی آدمی پاگل ہو جائے تو اس کے ہاتھ پاؤں بے ارادہ حرکت کر سکتے ہیں، لیکن جب تک انسان کے اندر عقل اور شعور موجود ہے، اس کے دل میں جب تک کسی کام کا ارادہ پیدا نہیں ہوگا، اس وقت تک وہ کوئی عمل نہیں کر سکتا، چاہے وہ اچھا کام ہو یا برا کام ہو۔ اس سے پتہ چلا کہ انسان کے اعمال کا سرچشمہ انسان کا ''دل'' ہے۔

دل میں لطیف قوتیں رکھی گئی ہیں

یہ ''دل'' اللہ تعالیٰ نے بڑی عجیب چیز بنائی ہے، بظاہر دیکھنے میں تو یہ خون کا لوتھڑا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس لوتھڑے کے ساتھ کچھ لطیف قوتیں وابستہ کر دی ہیں، وہ قوتیں نہ نظر آتی ہیں اور نہ ہی کسی لیبارٹری میں ان قوتوں کو ٹیسٹ کیا جا سکتا ہے، لیکن وہ قوتیں اس دل کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ اس دل میں خواہشیں پیدا ہوتی ہیں کہ یہ کام کر لوں اور فلاں کام کر لوں، یہ ''خواہشیں'' دل میں پیدا ہوتی ہیں، اسی دل میں ''ارادے'' پیدا ہوتے ہیں، اسی دل میں ''جذبات'' جنم لیتے ہیں، اسی دل میں ''غصہ'' پیدا ہوتا ہے، اسی دل میں ''شہوت'' پیدا ہوتی ہے، اسی دل میں دنیا بھر کی ''امنگیں'' پیدا ہوتی ہیں، اسی دل میں ''صدمہ'' آتا ہے، اسی دل میں ''غم'' پیدا ہوتا ہے، اسی دل میں ''خوشی'' آتی ہے، یہ سب چیزیں دل کے اردگرد گھومتی ہیں۔

''دل'' میں اچھی خواہشیں پیدا ہونی چاہئیں

اب اگر اچھی خواہشیں دل میں پیدا ہورہی ہیں تو انسان سے اچھے اعمال سرزد ہوں گے اور اگر دل میں غلط خواہشیں پیدا ہورہی ہیں تو انسان کے ارادے بھی خراب ہوں گے اور اعمال بھی خراب ہوں گے۔ اس لئے انسان کی ساری بھلائی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس کے دل میں ایسی خواہشیں پیدا ہوں جو نیک ارادوں کو جنم دیں، جس کے نتیجے میں اچھے اعمال وجود میں آئیں اور ایسی خواہشات دل میں پیدا نہ ہوں جن سے انسان غلط راستے پر پڑ جائے، یا اگر ایسی خواہشات دل میں پیدا ہوں تو وہ مغلوب ہوں جس سے انسان غلط راستے پر نہ پڑے۔ انسان کے تمام اعمال اسی اصول کے تحت گھومتے ہیں۔

''دل'' کی اہمیت

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:

((أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ))

''خوب سن لو! بے شک جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ صحیح ہوجائے تو سارا جسم صحیح ہوجائے، اگر وہ خراب ہوجائے تو سارا جسم خراب ہوجائے، خوب سن لو کہ وہ لوتھڑا ''دل'' ہے''(۱)

یہ ''دل'' بڑی عجیب چیز اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے کہ انسان کی ظاہری زندگی بھی اس پر موقوف ہے اور باطن کی اچھائی اور بُرائی بھی اس پر موقوف ہے۔ جسمانی صحت کا ''دل'' پر موقوف ہونا تو ہر انسان جانتا ہے کہ جب تک یہ ''دل'' ٹھیک ٹھیک کام کررہا ہے، اس وقت تک انسان زندہ ہے۔ یہ ''دل'' انسان کی پیدائش سے بھی پہلے اپنا کام شروع کردیتا ہے اور مرتے دم تک اس کا کام جاری رہتا ہے، اس کی کبھی چھٹی نہیں ہوتی، کبھی اس کے کام میں کوئی وقفہ نہیں آتا، اس کو کبھی آرام نہیں ملتا، اس کا کام یہ ہے کہ وہ ایک منٹ میں بہتّر مرتبہ پورے جسم میں خون پھینکتا ہے اور پھر واپس لیتا ہے، اس کو اس

(۱) سنن البیهقی الکبری، رقم: ۱۰۱۸۰ (۲٦٥/٥)، صحیح ابن حبان، رقم: ۲۹۷ (۵۳۳/۱)، الزواجر عن اقتراف الکبائر (۱۹۸/۱)، اتحاف الخیرة المهرة بزوائد المسانید العشرة (۱۳٤/۷)، مستخرج أبی عوانة، رقم: ٤٤٤۳ (۱٤۳/۱۱)، الزهد الکبیر للبیهقی، رقم: ۸۷۲ (۳۷۸/۲)، الأربعون للفسوی، رقم: ۳۸ (٦۳/۱)

کام سے کبھی آرام نہیں ملتا، جبکہ دوسرے اعضاء کے کاموں میں وقفہ بھی آجاتا ہے اور دوسرے اعضاء کو آرام بھی مل جاتا ہے، مثلاً اگر آدمی سورہا ہے تو سوتے وقت آنکھوں کو آرام مل گیا، کانوں کو آرام مل گیا، جسم کے دوسرے اعضاء کو آرام مل گیا، لیکن سونے کی حالت میں بھی دل اپنا کام کررہا ہے، یہاں تک کہ بے ہوشی کی حالت میں بھی دل کا کام جاری رہتا ہے، اس لئے کہ جس دن اس دل نے آرام کرلیا، اس دن اس انسان کی موت ہے اور انسان کی زندگی ختم ہے۔

جسم کی صحت دل کی صحت پر موقوف ہے

اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر دل صحیح ہے اور تندرست وتوانا ہے تو سارا جسم توانا ہے اور جس دن یہ بیمار ہوجائے، اس دن انسان کے جسم کے لئے اس سے بڑی کوئی مصیبت نہیں۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے کہ

نیست بیماری چوں بیماریٔ دل

یعنی کوئی بیماری دل کی بیماری کے برابر نہیں۔ یہ تو دل کی ظاہری حالت تھی۔

''دل'' کا ارادہ پاک ہونا چاہئے

دل کی باطنی حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دل کے اندر جو لطیف طاقتیں پیدا فرمائی ہیں، جن کے نتیجے میں خواہشات پیدا ہوتی ہیں اور جذبات جنم لیتے ہیں، جن کے ذریعہ ارادے پیدا ہوتے ہیں، وہ لطیف طاقتیں اگر پاک صاف ہیں تو پھر انسان کے اعمال بھی پاک صاف ہوں گے، اور اگر وہ لطیف طاقتیں پاک نہیں بلکہ خراب اور گندی ہیں تو اعمال بھی خراب ہوں گے۔ اگر ایک عمل بظاہر دیکھنے میں اچھا نظر آرہا ہے، نیک عمل نظر آرہا ہے، لیکن دل کا وہ ارادہ اور وہ خواہش جس نے اس عمل کو جنم دیا، اگر وہ پاک نہیں تو وہ عمل بھی پاک نہیں ہے۔

نیک ارادے کی مثال

مثلاً اس وقت ہم سب یہاں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نمازِ جمعہ پڑھنے کے لئے جمع ہیں، نماز پڑھنا بظاہر نیک اور اچھا عمل ہے، اگر آپ کے دل نے آپ سے یہ نیک عمل اس لئے کروایا کہ نماز پڑھنا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرنے میں اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ثواب دیں گے، اگر اس ارادے سے عمل کیا تو وہ عمل اچھا ہے اور نیک ہے، لیکن اگر دل نے یہ ارادہ کیا کہ میں نمازِ جمعہ اس لئے پڑھ رہا ہوں تاکہ لوگوں میں شہرت حاصل کروں کہ یہ آدمی بڑا نیک نمازی

ہے، بڑا عابد وزاہد ہے، بڑا متقی پرہیزگار ہے، مسجد میں صفِ اول میں جا کر نماز پڑھتا ہے تو اس صورت میں عمل تو اچھا ہے لیکن ارادہ غلط ہے، خواہش غلط ہے، دل نے غلط راستہ سمجھا دیا، اس لئے یہ عمل بھی اکارت اور بیکار ہو گیا۔ اسی لئے حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ اگر یہ قلب ٹھیک ہے اور یہ صحیح قسم کے جذبات پیدا کر رہا ہے اور صحیح ارادے پیدا کر رہا ہے تو بے شک تمہارے سارے اعمال درست ہیں، لیکن اگر یہ قلب ٹھیک نہیں ہے اور یہ غلط راستے بتا رہا ہے تو تمہارے اعمال بھی غلط ہیں، چاہے وہ اعمال دیکھنے میں کتنے ہی اچھے ہوں۔

دل کے اعمال میں حلال بھی ہے اور حرام بھی

بہرحال! اس دل میں اچھی خواہشات پیدا ہوں، اچھے جذبات پیدا ہوں، صحیح ارادے پیدا ہوں اسی کا نام ''تزکیہ'' ہے، کیونکہ ''تزکیہ'' کے معنی ہیں اپنے قلب کو غلط خواہشات، غلط جذبات اور غلط ارادوں سے پاک کرنا۔ جس طرح وہ اعمال جو ہم ظاہر میں ادا کرتے ہیں جیسے نماز ہے، روزہ ہے، زکوٰۃ ہے، حج ہے، یہ سب ظاہری اعمال ہیں اور ہمارے ذمے فرض ہیں، اور جس طرح کچھ اعمال ظاہری حرام ہیں، جیسے شراب پینا حرام ہے، جھوٹ بولنا حرام ہے، رشوت لینا حرام ہے، رشوت دینا حرام ہے، بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قلب کے اعمال میں بھی کچھ اعمال فرض و واجب قرار دیئے ہیں اور کچھ اعمال حرام اور ناجائز قرار دیئے ہیں۔

''اخلاص'' دل کا حلال عمل ہے

مثلاً ''اخلاص'' دل کا عمل ہے، ہاتھ پاؤں، ناک، کان، زبان کا کام نہیں ہے، اس لئے کہ اخلاص دل میں جنم لیتا ہے اور باطنی عمل ہے، اور یہ اخلاص حاصل کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسے نماز پڑھنا فرض ہے، جیسے رمضان کے روزے رکھنا فرض ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ فرض ہے، کیونکہ اگر اخلاص دل میں نہیں تو پھر ظاہری اعمال بھی بیکار ہیں، مثلاً نماز اگر اخلاص کے بغیر پڑھیں گے تو یہ عمل بھی بیکار ہوگا۔

''شکر'' اور ''صبر'' دِل کے اعمال ہیں

اسی طرح نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا، یہ دل کا عمل ہے، آدمی دل سے یہ تصور کرے کہ میں اس نعمت کے لائق نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے مجھے اس نعمت سے نوازا ہے، اس کو ''شکر'' کہتے ہیں، یہ دل کا عمل ہے اور فرض ہے۔ اسی طرح ''صبر'' ہے، صبر کا مطلب یہ ہے

کہ جب کوئی ناگوار واقعہ پیش آجائے یا تکلیف پہنچ جائے تو اس تکلیف پر انسان دل میں یہ سوچے کہ اگرچہ مجھے تکلیف ہورہی ہے لیکن میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہوں اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کیا وہ اس کی حکمت کے مطابق ہے، اس کا نام ''صبر'' ہے اور یہ دل کا کام ہے، اس کو حاصل کرنا فرض ہے۔ اس طرح کے بہت سے اعمال ہیں جو انسان کے دل سے متعلق ہیں، ان کو ''اخلاق'' کہا جاتا ہے اور یہ ''اخلاق'' حاصل کرنا فرض ہے۔

''تکبر'' دل کا حرام فعل ہے

کچھ ''اعمال'' دل سے متعلق ایسے ہیں جو حرام ہیں، مثلاً تکبر کرنا، یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور یہ سمجھنا کہ ''ہم چوں ما دیگرے نیست'' یعنی مجھ جیسا کوئی نہیں ہے اور سب لوگ میرے آگے حقیر اور ذلیل ہیں، ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، میں ہی سب سے بڑا ہوں، یہ ''تکبر'' ہے جو دل میں پیدا ہوتا ہے۔ بسا اوقات یہ تکبر زبان سے ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ زبان سے تو وہ یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں بہت حقیر ہوں، بہت ناچیز ہوں، ناکارہ ہوں، لیکن اس کے دل میں تکبر بھرا ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ یہ تکبر دل کی باطنی بیماری ہے اور حرام ہے، اور یہ تکبر اتنا شدید حرام ہے کہ خنزیر کھانے سے بھی زیادہ حرام ہے، شراب پینے سے بھی زیادہ حرام ہے، اس لئے کہ تکبر کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ سے لڑائی کرنے والا ہے، کیونکہ کبریائی اور بڑائی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں بڑا ہوں، وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کررہا ہے۔ بہر حال تکبر بہت بڑی بلا اور حرام ہے۔

''تزکیہ'' اسی کا نام ہے

اسی طرح ''حسد'' دل کی بیماری ہے، یعنی کسی دوسرے انسان کو کوئی نعمت مل گئی، اب اس نعمت کو دیکھ کر دل میں جلن پیدا ہورہی ہے کہ یہ نعمت اس کو کیوں مل گئی، یہ نعمت اس سے چھن جائے، یہ خواہش دل میں پیدا ہورہی ہے اور یہ حرام ہے۔ بہر حال جس طرح ظاہری اعمال میں سے کچھ اعمال فرض ہیں، کچھ واجب ہیں، کچھ حرام ہیں، اسی طرح انسان کے ساتھ لگے ہوئے جو جذبات، خواہشات اور ارادے ہیں، ان میں سے کچھ فرض و واجب ہیں اور کچھ حرام ہیں۔ ان میں سے جو فرض و واجب ہیں، انسان ان کو برقرار رکھے اور جو گناہ اور حرام ہیں، ان سے اپنے دل کو بچالے، اس کا نام ''تزکیہ'' ہے اور اسی کا نام ''قلب کو پاک کرنا'' ہے، لہٰذا اس آیت میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ﴾

وہ لوگ جو تزکیہ کرنے والے ہیں، یعنی اپنے قلب کو ناپاک اخلاق سے، ناپاک جذبات

سے، ناپاک ارادوں سے پاک کرتے ہیں، وہ لوگ ''فلاح یافتہ'' ہیں۔

تصوف کی اصل حقیقت

آپ حضرات نے ''تصوف'' کا لفظ بار بار سنا ہوگا۔ آج لوگوں نے تصوف کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کر کے اس کو ایک ملغوبہ بنادیا ہے، حالانکہ تصوف کا اصل مقصد یہ ہے کہ تمہارے جذبات صحیح ہونے چاہئیں، تمہارے اخلاق صحیح ہونے چاہئیں، تمہاری خواہشات صحیح ہونی چاہئیں اور ان کو کس طرح صحیح کیا جائے، یہ اعمال ''تصوف'' کے اندر بتائے جاتے ہیں۔ ''تصوف'' کی حقیقت بس اتنی ہے، اس سے آگے لوگوں نے جو باتیں تصوف کے اندر داخل کردی ہیں، اس کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح فقہاء ظاہری اعمال مثلاً نماز، روزے، زکوٰۃ، حج، بیع وشراء، نکاح وطلاق کے احکام بیان کرتے ہیں، اسی طرح صوفیاء کرام دل میں پیدا ہونے والے جذبات کے احکام بیان کرتے ہیں۔

خلاصہ

بہر حال! قرآن کریم نے حضورِ اقدس ﷺ کی بعثت کے جو مقاصد بیان فرمائے، ان میں سے ایک اہم مقصد لوگوں کے اخلاق کا تزکیہ کرنا تھا، اس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝﴾

اس کی مزید تشریح انشاء اللہ آئندہ جمعوں میں عرض کروں گا، اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ سب حضرات کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

معاشرے کی اصلاح کیسے ہو؟ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،
﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾(۱)

یہ ایک عجیب و غریب آیت ہے، جو ہماری ایک بہت بڑی بیماری کی تشخیص کر رہی ہے، اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ آیت ہماری دکھتی ہوئی رگ پکڑ رہی ہے۔ اللہ جل شانہ سے زیادہ کون انسان کی نفسیات اور اس کے مزاج اور اس کی بیماریوں کو پہچان سکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس آیت میں ہمارے ایک بہت بڑے سوال کا جواب بھی دیا گیا ہے، جو آج کل کثرت سے ہمارے دلوں میں پیدا ہو رہا ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کی کوششیں کیوں بے اثر ہیں؟

پہلے وہ سوال عرض کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد اس آیت کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکے گا۔ بعض اوقات ہمارے اور آپ کے دِلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج ہم دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ اصلاحِ حال اور اصلاحِ معاشرہ کی نہ جانے کتنی کوششیں مختلف جہتوں اور مختلف گوشوں سے ہو رہی ہیں۔ کتنی انجمنیں، کتنی جماعتیں، کتنی پارٹیاں، کتنے افراد، کتنے جلسے، کتنے جلوس، کتنے اجتماع ہوتے ہیں۔ اور سب کا مقصد بظاہر یہ ہے کہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کا سدباب کیا جائے، معاشرے کو سیدھے راستے پر لایا جائے۔ اور انسان کو انسان بنانے کی فکر کی جائے۔ ہر ایک کے اغراض و مقاصد میں اصلاحِ حال، اصلاحِ معاشرہ، فلاح و بہبود جیسی بڑی بڑی باتیں درج ہوتی ہیں اور بڑے بڑے دعوے ہوتے ہیں۔ جو انجمنیں اور جماعتیں اس کام پر لگی ہوئی ہیں اور جو ایسے افراد اس کام میں مصروف ہیں، اگر ان کو شمار کیا جائے تو شاید ہزاروں تک ان کی تعداد پہنچے گی۔ ہزاروں جماعتیں ہزاروں افراد اس کام پر لگے ہوئے ہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۳/ ۱۹۸ تا ۲۲۰)، ۲۹ نومبر ۱۹۹۱ء، بروز جمعہ، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المائدة: ۱۰۵

لیکن دوسری طرف اگر معاشرے کی عمومی حالت کو بازاروں میں نکل کر دیکھیں، دفتروں میں جا کر دیکھیں، جیتی جاگتی زندگی کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ساری کوششیں ایک طرف اور خرابی کا سیلاب ایک طرف، معاشرے پر اس اصلاح کا کوئی نمایاں اثر نظر نہیں آتا، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ زندگی کا پہیہ اسی طرح غلط راستے پر گھوم رہا ہے، اگر ترقی ہو رہی ہے تو برائی میں ہو رہی ہے، اچھائی میں نہیں ہو رہی ہے۔ تو ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ساری کوششیں معاشرے کو بدلنے میں کیوں ناکام نظر آتی ہیں؟ اِکا دُکا مثالیں اپنی جگہ ہیں۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی اگر پورے معاشرے پر نظر ڈال کر دیکھا جائے تو کوئی بڑا فرق نظر نہیں آتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

بیماری کی تشخیص

اس سوال کا جواب بھی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عطا فرمایا ہے۔ اور ہماری ایک بیماری کی تشخیص بھی فرما دی ہے۔ اور یہ وہ آیت ہے جو اکثر و بیشتر ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ اس کے معنی بھی معلوم نہیں ہیں۔ مفہوم بھی پیش نظر نہیں رہتا۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾(۱)

"اے ایمان والو! تم اپنے آپ کی خبر لو، اگر تم سیدھے راستے پر آگئے (تم نے ہدایت حاصل کر لی، صحیح راستہ اختیار کر لیا) تو جو لوگ گمراہ ہیں، ان کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے، وہاں پر اللہ تعالیٰ تمہیں بتائیں گے کہ تم دنیا کے اندر کیا کرتے رہے ہو"

اپنے حال سے غافل، اور دوسروں کی فکر

اس آیت میں ہماری ایک بہت بنیادی بیماری یہ بتا دی کہ یہ اصلاح کی کوششیں جو ناکام نظر آتی ہیں، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص جب اصلاح کا جھنڈا لے کر کھڑا ہوتا ہے تو اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اصلاح کا آغاز دوسرا شخص اپنے آپ سے کرے۔ یہ خود دوسروں کو بلا رہا ہے۔ دوسروں کو دعوت دے رہا ہے۔ دوسروں کو اصلاح کا پیغام دے رہا ہے۔ لیکن اپنے آپ سے اور اپنے حالات میں تبدیلی لانے سے غافل ہوتا ہے۔ آج ہم سب اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لیں کہ مختلف محفلوں اور مجلسوں میں ہمارا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ ہم معاشرے کی برائیوں کا تذکرہ مزے لے

(۱) المائدۃ: ۱۰۵

لے کر کرتے ہیں ''سب لوگ تو یوں کر رہے ہیں'' ''لوگوں کا تو یہ حال ہے'' ''معاشرہ تو اس درجے خراب ہوگیا ہے'' ''فلاں کو میں نے دیکھا وہ یوں کر رہا تھا'' سب سے آسان کام اس بگڑے ہوئے معاشرے میں یہ ہے کہ دوسروں پر انسان اعتراض کردے، تنقید کردے، دوسروں کے عیب بیان کردے کہ لوگ تو یوں کر رہے ہیں، اور معاشرے کے اندر یہ ہو رہا ہے، شاید ہی ہماری کوئی محفل اور کوئی مجلس اس تذکرے سے خالی ہوتی ہو، لیکن کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ دیکھنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ خود میں کتنا بگڑ گیا ہوں، خود میرے حالات کتنے خراب ہیں، خود میرا طرزِ عمل کتنا غلط ہے، اس کی کتنی اصلاح کی ضرورت ہے، بس دوسروں پر تنقید کا سلسلہ جاری رہتا ہے، دوسروں کی عیب جوئی جاری رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری گفتگو لطفِ سخن کے لئے، مجلس آرائی کے لئے، مزہ لینے کے لئے ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں اصلاح کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھتا۔

سب سے زیادہ برباد شخص!

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: کیا عجیب ارشاد ہے، ہم لوگوں کو یاد رکھنا چاہئے، فرمایا:

((إِذَا قَالَ الرَّجُلُ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ أَهْلَكُهُمْ))(۱)

''جو شخص یہ کہے کہ ساری دنیا تباہ و برباد ہوگئی (یعنی دوسروں پر اعتراض کر رہا ہے کہ وہ بگڑ گئے، ان کے اندر بے دینی آگئی، ان کے اندر بے راہ روی آگئی، وہ بدعنوانیوں کا ارتکاب کرنے لگے) تو سب سے زیادہ برباد خود وہ شخص ہے''

اس لئے کہ دوسروں پر اعتراض کی غرض سے یہ کہہ رہا ہے کہ وہ برباد ہوگئے، اگر اس کو واقعی بربادی کی فکر ہوتی تو پہلے اپنے گریباں میں منہ ڈالتا، اپنی اصلاح کی فکر کرتا۔

بیمار شخص کو دوسرے کی بیماری کی فکر کہاں؟

جس شخص کے اپنے پیٹ میں درد ہو رہا ہو، مروڑ اُٹھ رہے ہوں، چین نہ آ رہا ہو، وہ دوسروں کی چھینکوں کی کیا پرواہ کرے گا کہ دوسرے کو چھینکیں آرہی ہیں، نزلہ ہو رہا ہے۔ خدا نہ کرے، اگر میرے پیٹ میں شدید درد ہے، تو مجھے اپنی فکر ہوگی، اپنی جان کی فکر ہوگی، اپنے درد کو دور کرنے کی فکر

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب النهي عن قول هلك الناس، رقم: ۴۷۵۵، سنن أبي داود، کتاب الأدب، باب لا يقال خبثت نفسي، رقم: ۴۳۳۱، مسند أحمد، رقم: ۸۱۵۸، مؤطا مالك، کتاب الجامع، باب ما يكره من الكلام، رقم: ۱۵۵۹

ہوگی، اپنی تکلیف مٹانے کی فکر ہوگی، دوسرے کی بیماری اور دوسرے کی معمولی تکلیف کی طرف دھیان بھی نہیں جائے گا۔ بلکہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر اپنی تکلیف معمولی ہے، اور دوسرے کی تکلیف بہت زیادہ ہے، اس کے باوجود اپنی تکلیف کا خیال اتنا چھایا ہوا ہوتا ہے کہ دوسرے کی بڑھی ہوئی تکلیف بھی نظر نہیں آتی۔

”لیکن اس کے پیٹ میں تو درد نہیں“

میری ایک عزیز خاتون تھی۔ ان کے پیٹ میں تکلیف تھی، اور وہ تکلیف ایسی تشویش ناک نہیں تھی۔ ان کو ڈاکٹر کے پاس دکھانے کے لئے کسی ہسپتال میں لے گیا، تو لفٹ (Lift) میں جاتے ہوئے دیکھا کہ ایک خاتون رواں کرسی (Wheel Chair) پر سوار آئیں۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں سب ٹوٹے ہوئے تھے، اور اس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا، اور سینہ جلا ہوا تھا۔ اور اس کی بری حالت تھی۔ میں نے اپنی عزیز خاتون کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ دیکھئے کہ یہ عورت کتنی سخت پریشانی اور کتنی سخت تکلیف میں ہے، اس کو دیکھنے سے آدمی کو اپنی تکلیف کی کمی کا احساس ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر زبان پر جاری ہوتا ہے، تو جواب میں وہ خاتون کہتی ہیں کہ واقعی اس کے ہاتھ پاؤں تو ٹوٹ گئے ہیں، مگر کم از کم اس کے پیٹ میں تو درد نہیں ہو رہا ہے۔ تو ان کے ذہن میں سب سے بڑی تکلیف یہ تھی کہ میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ اس کی جلی ہوئی کھال، اور ٹوٹے ہوئے ہاتھ پاؤں دیکھ کر بھی ان کو اپنی تکلیف کا خیال نہیں جا رہا تھا۔ اس لئے کہ اپنی تکلیف اور بیماری کا احساس ہے۔ لیکن جس شخص کو اپنی تکلیف اور بیماری کا احساس نہیں ہوتا دوسرے کی معمولی معمولی تکلیفوں کو دیکھتا پھرتا ہے۔ تو ہماری ایک بہت بڑی بیماری یہ ہے کہ ہم اپنی اصلاح کی فکر سے غافل ہیں۔ اور دوسروں پر اعتراض اور تنقید کرنے کے لئے ہم لوگ ہر وقت تیار ہیں۔

بیماری کا علاج

اللہ جل جلالہ اس آیت کے اندر فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! پہلے اپنے آپ کی فکر کرو، اور یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ فلاں شخص گمراہ ہوگیا، فلاں شخص تباہ و برباد ہوگیا، تو یاد رکھو کہ اگر تم سیدھے راستے پر آگئے تو اس کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ ہر انسان کے ساتھ اس کا اپنا عمل جائے گا، لہٰذا اپنی فکر کرو۔ تم سب اللہ تعالیٰ کے پاس لوٹ کر جاؤ گے۔ وہاں وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا عمل کرتے رہے تھے۔ تمہارا عمل زیادہ بہتر تھا یا دوسرے کا عمل زیادہ بہتر تھا۔ کیا معلوم کہ جس پر اعتراض کر رہے ہو، جس کے عیب تلاش کر رہے ہو، اس کی کوئی ادا، اس کا کوئی فعل اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں

اتنا مقبول ہو کہ وہ تم سے آگے نکل جائے۔ بہرحال! یہ صرف لطفِ سخن کے لئے اور مجلس آرائی کے لئے ہم لوگ جو باتیں کرتے ہیں وہ اصلاح کا راستہ نہیں۔

خود احتسابی کی مجلس

ہاں! اگر کسی جگہ محفل ہی اسی کام کے لئے منعقد ہو کہ اس میں اس بات کا تذکرہ ہو کہ ہم لوگوں میں کیا کیا خرابیاں پائی جاتی ہیں، اور لوگ اس نیت سے اس محفل میں شریک ہوں کہ ان باتوں کو سنیں گے، اور سمجھیں گے، اور پھر اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں گے، تو پھر ایسی محفل منعقد کرنا درست ہے۔

انسان کا سب سے پہلا کام

انسان کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اپنے شب و روز کا جائزہ لے اور پھر یہ دیکھے کہ میں کتنا کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اور اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کر رہا ہوں، اور کتنا کام اس کے خلاف کر رہا ہوں۔ اگر اس کے خلاف کر رہا ہوں تو اس کی اصلاح کا کیا راستہ ہے؟ اللہ تعالیٰ یہ فکر ہمارے اور آپ کے دلوں میں پیدا فرمادے تو ہمارے معاشرے کی اصلاح بھی ہو جائے گی۔

معاشرہ کیا ہے؟

معاشرہ کس چیز کا نام ہے؟ افراد کا مجموعہ معاشرہ بن جاتا ہے۔ اگر ہر شخص کو اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہو جائے تو سارا معاشرہ خود بخود سدھر جائے۔ لیکن اگر ہر شخص دوسرے کی فکر کرتا رہے، اور اپنے کو چھوڑتا رہے تو سارا معاشرہ خراب ہی رہے گا۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کو دیکھیں گے تو یہ نظر آئے گا کہ ہر شخص اس فکر میں تھا کہ کسی طرح میں درست ہو جاؤں، کسی طرح میں اپنی بیماریوں کو دور کرلوں۔ چنانچہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جو مشہور صحابی ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے، اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ہو کر اور آپ کی باتیں سن کر دلوں پر کیا اثر ہوتا ہوگا، کیسی رقت طاری ہوتی ہوگی، کیسا جذبہ پیدا ہوتا ہوگا۔ ایک دن مضطربانہ چیختے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آکر عرض کیا:

"نَافَقَ حَنْظَلَةُ، يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!"(۱)

"یارسول اللہ! حنظلہ منافق ہوگیا"

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ اپنے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ میں منافق ہوگیا۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیسے منافق ہوگئے؟ کہا "یارسول اللہ! جب تک آپ کی مجلس میں بیٹھتا ہوں آپ کی بات سنتا ہوں تو دل پر بڑا اثر ہوتا ہے، حالات بہتر کرنے کی طرف توجہ ہوتی ہے، لیکن جب باہر نکلتا ہوں، اور دنیا کے کاموں کے اندر لگتا ہوں تو وہ جذبہ جو آپ کی مجلس میں بیٹھ کر پیدا ہوا تھا، وہ ختم ہوجاتا ہے، یہ تو منافق کا کام ہے۔ کہ ظاہر حالات کچھ ہوں اور اندر کچھ ہوں۔ اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہوگیا"

سرکارِ دوعالم ﷺ نے تسلی دی کہ حنظلہ! تم منافق نہیں ہوئے، بلکہ یہ گھڑی گھڑی کی بات ہوتی ہے۔ ہر وقت دل کی کیفیت ایک جیسی نہیں رہتی، کسی وقت جذبہ زیادہ ہوتا ہے کسی وقت کم ہوتا ہے، اس سے یہ سمجھنا کہ میں منافق ہوگیا کوئی صحیح بات نہیں ہے۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے دل میں اپنے بارے تو یہ خیال پیدا ہوا کہ میں منافق ہوگیا لیکن آپ نے کسی دوسرے کو منافق نہیں کہا، خود احتسابی سے اپنے آپ کو منافق تصور کرکے بے قرار ہوگئے کہ اپنی فکر ہے، یہ فکر ہے کہ کہیں میرے اندر تو نفاق نہیں آگیا ہے؟

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی خصوصیت

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے اپنے بہت سے راز بتلا رکھے تھے، آپ ہی کو رازداری سے منافقین کی پوری فہرست بھی بتا رکھی تھی کہ مدینہ شریف میں فلاں فلاں شخص منافق ہے۔ اور اس درجہ وثوق سے بتا رکھی تھی کہ جب مدینہ طیبہ میں کسی کا انتقال ہوجاتا تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ دیکھتے تھے کہ اس نمازِ جنازہ میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ شامل ہیں یا نہیں؟ اگر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ شامل ہیں تو یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ شخص مؤمن تھا۔ اور اگر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اس کے جنازہ میں شامل نہیں تو صحابہ کرام یہ اندازہ کیا کرتے تھے کہ شاید یہ شخص منافق ہے، اگر مؤمن ہوتا تو حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ ضرور شامل ہوتے۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب فضل دوام الذكر والفكر في أمور الآخرة والمراقبة، رقم: ۴۹۳۷، سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۴۳۸، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب المداومة على العمل، رقم: ۴۲۲۹، مسند أحمد، رقم: ۱۶۹۴۹

خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کو اپنے نفاق کا اندیشہ

کتب حدیث میں آتا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، جبکہ خلیفہ بن چکے ہیں، اور آدھی سے زیادہ دنیا پر حکومت ہے اور جن کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ جب دیکھو غلط کار لوگوں کی اصلاح کے لئے درّہ لئے پھر رہے ہیں، انتظام کا رعب اور دبدبہ ہے، لیکن اسی عالم میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے خوشامد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے حذیفہ! خدا کے لئے مجھے یہ بتادو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں منافقین کی جو فہرست بتادی ہے، اس میں عمر بن خطاب کا نام تو نہیں ہے؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں میرا نام تو اس فہرست میں شامل نہیں؟ کہیں میں منافقین میں شامل تو نہیں؟(۱)

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ ہر ایک کو یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ میرا کوئی فعل، میرا کوئی عمل، میرا کوئی قول، میری کوئی ادا اللہ تبارک وتعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف تو نہیں ہے، اور جب یہ فکر لگی ہوئی ہے تو اب جب وہ کسی دوسرے سے کوئی اصلاح کی بات کہتے ہیں تو وہ بات دل پر اثر انداز ہوتی ہے، اس سے زندگیاں بدلتی ہیں، اس سے انقلاب آتے ہیں، اور انقلاب برپا کر کے دنیا کو دکھا بھی دیا۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے مشہور واعظ تھے، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے ایک ایک وعظ میں نو نو سو آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر گناہوں سے توبہ کی ہے۔ بس ایک وعظ کہہ دیا، اور سب کا دل کھینچ لیا۔ اور بات یہ نہیں تھی کہ ان کی تقریر بہت جوشیلی ہوتی تھی۔ یا بڑی فصیح و بلیغ ہوتی تھی۔ بلکہ بات دراصل یہ تھی کہ دل سے اُمڈتا ہوا جذبہ جب زبان سے باہر نکلتا ہے تو وہ دوسرے کے دل پر اثر ڈالتا ہے۔

بے عمل کی بات کا اثر نہیں ہوتا

ہماری یہ حالت ہے کہ میں آپ کو ایک بات کی نصیحت کر رہا ہوں، اور خود میرا عمل اس پر نہیں ہے۔ اس لئے اولاً تو اس بات کا اثر نہ ہوگا، اور اگر اس بات کا اثر ہو بھی گیا تو سننے والا جب یہ دیکھے گا کہ یہ خود تو اس کام کو نہیں کر رہے ہیں، اور ہمیں نصیحت کر رہے ہیں، اگر یہ کوئی اچھا کام ہوتا تو پہلے یہ خود عمل کرتے، اس طرح وہ بات ہوا میں اُڑ جاتی ہے، اور اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

---

(۱) البدایة والنهایة (۱۹/۵)

حضورِ اقدس ﷺ کی نماز

حضورِ اقدس ﷺ کی سیرت نے جو انقلاب برپا کیا، اور صرف ۲۳ سال کی مدت میں پورے جزیرہ عرب کی کایا پلٹ دی، بلکہ پوری دنیا کی کایا پلٹ دی، یہ انقلاب اس لئے آیا کہ آپ نے جس بات کا اُمت کو کرنے کا حکم دیا، پہلے خود اس بات پر اس سے زیادہ عمل کیا۔ مثلاً ہمیں اور آپ کو حکم دیا کہ پانچ وقت کی نماز پڑھا کرو۔ لیکن خود حضور ﷺ آٹھ وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ یعنی پانچ نمازوں کے علاوہ اشراق، چاشت، اور تہجد بھی پڑھا کرتے تھے، بلکہ آپ کی یہ حالت تھی:

((إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ صَلَّى))(۱)

یعنی جب آپ کو کسی کام کی پریشانی پیش آتی تو آپ ﷺ فوراً نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے دعا کرتے۔ اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

((جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ))(۲)

''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''

حضورِ اقدس ﷺ کا روزہ

اسی طرح دوسروں کو پورے سال میں ایک ماہ یعنی رمضان المبارک میں روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ لیکن آپ کا خود کا معمول یہ تھا کہ پورے سال میں کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا تھا، جس میں کم از کم تین روزے آپ نہ رکھتے ہوں، اور بعض اوقات تین سے زیادہ بھی رکھتے تھے۔ اور دوسروں کو تو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جب افطار کا وقت آ جائے تو فوراً افطار کر لو۔ اور دو روزوں کو ایک ساتھ جمع کرنے کو ناجائز قرار دیا۔

''صوم وصال'' کی ممانعت

چنانچہ بعض صحابہ کرام کو آپ نے دیکھا کہ وہ اس طرح دو روزے ملا کر رکھ رہے ہیں تو آنحضرت ﷺ نے ان کو منع فرما دیا کہ تمہارے لئے اس طرح ملا کر روزے رکھنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ حرام ہے۔ لیکن آپ ﷺ خود ''صوم وصال'' رکھتے، اور یہ فرماتے کہ تم اپنے آپ کو مجھ پر قیاس نہ کرو، اس لئے کہ میرا پروردگار مجھے کھلاتا بھی ہے، اور پلاتا بھی ہے۔ یعنی تمہارے اندر اس روزے کی طاقت

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب وقت قيام النبي من الليل، رقم: ۱۱۲٤، مسند أحمد، رقم: ۱٦۷۰

(۲) سنن النسائي، كتاب عشرة النساء، باب حب النساء، رقم: ۳۸۷۸، مسند أحمد، رقم: ۱۱۸٤٥

نہیں ہے، میرے اندر طاقت ہے۔ اس لئے میں رکھتا ہوں گویا کہ دوسروں کے لئے آسانی اور سہولت کا راستہ بتا دیا کہ افطار کے وقت خوب کھاؤ، پیو، اور رات بھر کھانے کی اجازت ہے۔ (۱)

حضورِ اقدس ﷺ اور زکوٰۃ

ہمیں اور آپ کو تو یہ حکم دیا کہ اپنے مال کا چالیسواں حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دو، زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، لیکن آپ کا یہ حال تھا کہ جتنا مال آ رہا ہے، سب صدقہ ہو رہا ہے۔ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نماز پڑھانے کے لئے مصلی پر تشریف لائے، اور اقامت ہو گئی، اور نماز شروع ہونے والی ہے، اچانک آپ مصلے سے ہٹ گئے اور فوراً گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد واپس تشریف لے آئے۔ اور نماز پڑھا دی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس پر تعجب ہوا، چنانچہ نماز کے بعد صحابہ نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! آج آپ نے ایسا عمل کیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا، اس کی کیا وجہ تھی؟ سرکارِ دو عالم ﷺ نے جواب دیا کہ میں اس لئے گھر واپس گیا تھا کہ جب میں مصلی پر کھڑا ہوا، اس وقت مجھے یاد آیا کہ میرے گھر میں سات دینار (اشرفیاں) پڑے ہیں۔ اور مجھے اس بات سے شرم آئی کہ محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے سامنے اس حالت میں پیش ہو کہ اس کے گھر میں ضرورت سے زائد سات دینار رکھے ہوں، چنانچہ میں نے ان کو ٹھکانے لگا دیا، اور پھر اس کے بعد آ کر نماز پڑھائی۔ (۲)

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب الصوم، باب الوصال ومن قال ليس في الليل صيام، رقم: ۱۸۲۸، صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب النهي عن الوصال في الصوم، رقم: ۱۸٤٦، مسند أحمد، رقم: ٤٥٢٢، مؤطا مالك، كتاب الصيام، باب النهي عن الوصال في الصيام، رقم: ٥٩١، سنن الدارمي، كتاب الصوم، باب النهي عن الوصال في الصوم، رقم: ١٦٤١

(۲) کتب سیر میں "سات دنانیر" سے متعلق دو واقعات ملتے ہیں، ایک واقعہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا بیان کردہ ہے جس میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی پاک ﷺ گھر تشریف لائے تو آپ کے پاس سات دینار تھے، آپ نے انہیں بستر کے نیچے رکھ دیا، پھر آپ باہر تشریف لے گئے کچھ دیر بعد واپس آئے تو آپ کے چہرہ مبارک کا رنگ بدلا ہوا تھا میں نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا بات ہے خیریت تو ہے۔ آپ نے فرمایا مجھے ان دنانیر نے پریشان کر رکھا ہے جو صبح کو ہمارے پاس آئے تھے لیکن شام ہونے کے باوجود ہمارے پاس باقی ہیں اور ہم نے انہیں خرچ نہیں کیا (ان دیناروں کی ہمارے پاس موجودگی نے مجھے پریشان کر دیا) تهذيب الآثار للطبری، رقم: ۲٤۷۸ (٤٦٢/٥)، دوسرا واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے جس میں مرض الوفات میں آپ ﷺ نے انہیں اپنے پاس موجود سات دنانیر صدقہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ الترغيب والترهيب، رقم: ۱۳۷۰ (۲۹/۲)، صحيح ابن حبان، رقم: ۷۱٦ (٤٢٤/۳)، مجمع الزوائد (۱۲٤/۳)

اللہ کے محبوب نے خندق بھی کھودی

غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھودی جارہی ہے، صحابہ کرام خندق کھودنے میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ نہیں تھا کہ دوسرے لوگ تو خندق کھودیں، اور خود امیر ہونے کی وجہ سے آرام سے بستر پر سو جائیں، بلکہ وہاں یہ حال تھا کہ دوسروں کو جتنا حصہ کھودنے کے لئے ملا تھا، اتنا حصہ سرکارِدو عالم ﷺ نے اپنے لئے بھی مقرر فرمایا۔ ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ اس حالت میں جب خندق کھودی جارہی تھی، مشقت کا وقت تھا، اور کھانے پینے کا کما حقہ انتظام نہیں تھا، اور میں بھوک سے بیتاب ہورہا تھا تو بھوک کی شدت کی وجہ سے میں نے اپنے پیٹ پر ایک پتھر باندھ لیا تھا۔

پیٹ پر پتھر باندھنا

پیٹ پر پتھر باندھنے کا محاورہ ہم نے اور آپ نے بہت سنا ہے، لیکن کبھی دیکھا نہیں اور اللہ تعالیٰ نہ دکھائے۔ لیکن جس پر یہ حالت گزری ہو وہ جانتا ہے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پیٹ پر پتھر باندھنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اور پتھر باندھنے سے کس طرح بھوک مٹتی ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ جب بھوک کی شدت ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے انسان کو اتنی کمزوری لاحق ہو جاتی ہے کہ وہ کچھ کام نہیں کرسکتا، اور پتھر باندھنے سے پیٹ پر ذرا ثقل ہو جاتا ہے اس کی وجہ سے آدمی میں کھڑا ہونے کی طاقت آجاتی ہے۔ ورنہ وہ کمزوری کی وجہ سے کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔

تاجدارِ مدینہ کے پیٹ پر دو پتھر تھے

بہر حال! تو ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ شدتِ بھوک کی وجہ سے میں نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیا تھا، اور اسی حالت میں حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے بھوک کی شدت کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا ہے، تو حضورِ اقدس ﷺ نے اپنے پیٹ پر سے قمیص اُٹھادی، اور میں نے دیکھا کہ آپ کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے ہیں۔

یہ ہے وہ چیز کہ جس بات کی تعلیم دی جارہی ہے، جس بات کی تبلیغ کی جارہی ہے، جس بات کا حکم دیا جارہا ہے، پہلے خود اس پر اس سے زیادہ عمل کر کے دکھادیا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مشقت اُٹھانا

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، جنت کی خواتین کی سردار، ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر

ہوتی ہیں، اور اپنے ہاتھ مبارک دکھا کر عرض کرتی ہیں کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیس پیس کر گٹے پڑ گئے ہیں، اور پانی کی مشک ڈھو ڈھو کر سینے پر نیل آ گئے ہیں، یا رسول اللہ! خیبر کی فتح کے بعد سارے مسلمانوں کے درمیان غلام اور کنیزیں تقسیم ہوئی ہیں، جو ان کے گھروں کا کام کرتی ہیں، لہٰذا کوئی خدمت گار کنیز مجھے بھی عطا فرما دیجئے۔

اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کوئی کنیز خدمت کے لئے مل جاتی تو اس کی وجہ سے آسمان نہ ٹوٹتا، لیکن جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ''فاطمہ! جب تک سارے مسلمانوں کا انتظام نہیں ہو جاتا، اس وقت تک محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے گھر والوں کے لئے کوئی غلام اور کنیز نہیں آئے گی۔ میں تمہیں اس مشقت کے عوض غلام اور کنیز سے بہتر نسخہ بتاتا ہوں، اور پھر فرمایا کہ ہر نماز کے بعد ''سبحان اللہ'' ۳۳ بار، ''الحمد للہ'' ۳۳ بار، اور ''اللہ اکبر'' ۳۴ بار پڑھا کرو''(۱)

اس وجہ سے اس کو ''تسبیح فاطمہ'' کہا جاتا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اس کی تلقین فرمائی ہے لہٰذا دوسروں کے ساتھ تو معاملہ یہ ہے کہ غلام تقسیم ہو رہے ہیں، کنیزیں تقسیم ہو رہی ہیں، اور پیسے بھی تقسیم ہو رہے ہیں، اور خود اپنے گھر میں یہ حالت ہے۔

لہٰذا جب یہ صورت ہوتی ہے کہ خود کہنے والا دوسروں سے زیادہ عمل کرتا ہے تو اس کی بات میں تاثیر ہوتی ہے، اور وہ بات پھر دل پر اثر انداز ہوتی ہے، وہ انسانوں کی دنیا بدل دیتی ہے، ان کی زندگیوں میں انقلاب لاتی ہے اور انقلاب لائی، چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔

۳۰ شعبان کو نفلی روزہ رکھنا

تیس شعبان کا جو دن ہوتا ہے، اس میں حکم یہ ہے کہ اس دن روزہ نہ رکھا جائے، بعض لوگ اس خیال سے روزہ رکھ لیتے ہیں کہ شاید آج رمضان کا دن ہو۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ رمضان کا

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب التکبیر والتسبیح عند المنام، رقم: ۵۸۴۳، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب التسبیح أول النهار وعند النوم، رقم: ۴۹۰۶، سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ما جاء فی التسبیح والتکبیر والتحمید عند المنام، رقم: ۳۳۳۰، سنن أبی داؤد، کتاب الخراج والإمارة والفیء، باب فی بیان مواضع قسم الخمس وسهم ذی القربی، رقم: ۲۵۹۵، مسند أحمد، رقم: ۷۰۲

چاند ہو چکا ہو، لیکن ہمیں نظر نہ آیا ہو۔ اس لئے احتیاط کے طور پر لوگ شعبان کی ۳۰ تاریخ کا روزہ رکھ لیتے ہیں۔ لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے احتیاطِ رمضان کے طور پر ۳۰ شعبان کو روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے لیکن یہ روزہ نہ رکھنے کا حکم اس شخص کے لئے ہے جو صرف احتیاطِ رمضان کی غرض سے روزہ رکھ رہا ہو، البتہ جو شخص عام نفلی روزے رکھتا چلا آرہا ہے، اور وہ اگر ۳۰ شعبان کو بھی روزہ رکھ لے، اور احتیاطِ رمضان کی نیت اور خیال دل میں نہ ہو تو اس کے لئے جائز ہے۔ (۱)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ۳۰ شعبان کے دن خود روزے سے ہوتے تھے، اور پورے شہر میں منادی کرتے ہوئے پھرتے تھے کہ آج کے دن کوئی شخص روزہ نہ رکھے، اس لئے کہ عام لوگوں کے بارے میں یہ خطرہ تھا کہ اگر وہ اس دن روزہ رکھیں گے تو احتیاطِ رمضان کا خیال ان کے دل میں آجائے گا اور روزہ رکھنا گناہ ہوگا، اس لئے سختی سے منع فرمایا دیا کرتے تھے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ، جن کے ہم اور آپ نام لیوا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ کو لوگوں کے لئے فتوی کے اندر آسانی پیدا کرنے کی ہر وقت فکر رہتی تھی، تاکہ لوگوں کو مشکل نہ ہو، جتنا ہو سکے آسانی پیدا کی جائے آج کل بازاروں میں پھلوں کی جو خرید و فروخت ہوتی ہے آپ حضرات جانتے ہوں گے کہ آج کل یہ ہوتا ہے کہ ابھی درخت پر پھول بھی نہیں آتا کہ پوری فصل فروخت کردی جاتی ہے اور اس طرح پھل کے آئے بغیر اس کو بیچنا شرعاً جائز نہیں، حضورِ اقدس ﷺ اس سے منع فرماتے تھے کہ جب تک پھل ظاہر نہ ہو جائے اس وقت تک بیچنا جائز نہیں اس شرعی حکم کی وجہ سے بعض علماء نے یہ فتوی دیا ہے کہ بازاروں میں جو پھل فروخت ہوتے ہیں، ان کی خرید و فروخت چونکہ اسی طریقے پر ہوتی ہے، اس لئے ان پھلوں کو خرید کر کھانا جائز نہیں، لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان پھلوں کو کھانے کی گنجائش ہے، البتہ خود ہمیشہ احتیاط کی اور ساری عمر بازار سے پھل لے کر نہیں کھایا، اور دوسروں کو کھانے کی اجازت دے دی۔ یہ اللہ کے بندے ہیں۔ جس چیز کی دوسروں کو تلقین کرتے ہیں، اس سے زیادہ خود اس پر عمل کرتے ہیں، تب ان کی بات میں اثر پیدا ہوتا ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصوم عن رسول اللہ، باب ما جاء فی کراهية صوم يوم الشك، رقم: ۶۲۲، سنن أبي داؤد، كتاب الصوم، باب كراهية صوم يوم الشك، رقم: ۱۹۸۷، سنن ابی ماجه، كتاب الصيام، باب ما جاء فی صيام يوم الشك، رقم: ۱۶۳۵، سنن النسائی، کتاب الصيام، باب صيام يوم الشك، رقم: ۲۱۵۹، سنن النسائی، کتاب الصوم، باب فی النهی عن صيام يوم الشك، رقم: ۱۶۲۰

معاشرے کی اصلاح کا راستہ

ہمارے اندر خرابی یہ ہے کہ اصلاح کا جو پروگرام شروع ہوگا، جو جماعت قائم ہوگی، جو انجمن کھڑی ہوگی، جو آدمی کھڑا ہوگا، اس کے دماغ میں یہ بات ہوگی کہ یہ سب لوگ خراب ہیں، ان کی اصلاح کرنی ہے۔ اور اپنی خرابی کی طرف دھیان اور فکر نہیں، اس لئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ﴾(۱)

''اے ایمان والو! اپنی خبر لو، اگر تم راستے پر آجاؤ تو گمراہ ہونے والے اور غلط راستے پر جانے والے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے''

لہٰذا مجلس آرائی کے طور پر، اور محض برسبیل تذکرہ دوسروں کی برائیاں بیان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اپنی فکر کرو، اور اپنی جتنی اصلاح کر سکتے ہو، وہ کرلو، واقعہ یہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کا راستہ بھی یہی ہے، اس لئے کہ معاشرہ کس کا نام ہے؟ میرا، آپ کا اور افراد کے مجموعے کا نام معاشرہ ہے۔ اب اگر ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر کرلے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں، تو رفتہ رفتہ سارا معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن اگر معاملہ یہ رہا کہ میں تمہارے اوپر تنقید کروں اور تم میرے اوپر تنقید کرو، میں تمہاری برائی بیان کروں، اور تم میری برائی بیان کرو، پھر تو اس طرح معاشرے کی حالت کبھی درست نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اپنی فکر کرو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ دنیا جھوٹ بول رہی ہے، لیکن تم نہ بولو، دوسرے لوگ رشوت لے رہے ہیں، تم رشوت نہ لو، دوسرے لوگ سود کھا رہے ہیں، تم سود نہ کھاؤ، دوسرے لوگ دھوکہ دے رہے ہیں، تم دھوکہ نہ دو، دوسرے لوگ حرام کھا رہے ہیں، تم نہ کھاؤ، لیکن اس کے تو کوئی معنی نہیں ہیں کہ مجلس کے اندر تو کہہ دے کہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اور پھر خود بھی صبح سے شام تک جھوٹ بول رہے ہیں، یہ طریقہ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس فکر کو ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے کہ ہر شخص کو اپنی اصلاح کی فکر ہو جائے۔

اپنا فرض بھی ادا کرو

البتہ یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر میں یہ بات بھی ضروری ہے کہ جس جگہ نیکی کی بات پہنچانا ضروری ہے وہاں نیکی کی بات پہنچائے اور اپنا فرض ادا کرے، اس کے بغیر وہ ہدایت یافتہ نہیں کہلا سکتا، نہ اس کے بغیر اپنی اصلاح کا فریضہ مکمل ہوتا ہے۔ یہی بات سیدنا ابوبکر

(۱) المائدۃ: ۱۰۵

صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث میں واضح فرمادی ہے، حدیث یہ ہے:

عَنْ اَبِیْ بَکْرِ الصِّدِّیْقِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ: یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّکُمْ تَقْرَءُ وْنَ ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ:

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ ج لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ط﴾(۱)

وَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: "اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ یَاْخُذُوْا عَلٰی یَدَیْہِ اَوْشَکَ اَنْ یَعُمَّھُمُ اللّٰہُ بِعِقَابٍ مِّنْہُ" (۲)

اس آیت کی غلط تشریح کی جاتی ہے

یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جس میں آپ نے قرآن کریم کی اس آیت کی صحیح تشریح نہ سمجھنے پر لوگوں کو تنبیہ فرمائی اور اس آیت کی تشریح میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ارشاد فرمائی جس سے اس آیت کے صحیح مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ بعض لوگ اس آیت کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ اپنی خبر لو، اپنی اصلاح کی فکر کرو، بس اب ہمارے ذمے تو اپنی اصلاح کی فکر واجب ہے۔ اگر کسی دوسرے کو غلط کام کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں تو اس کو ٹوکنا، اس کی اصلاح کی فکر کرنا ہمارے ذمے ضروری نہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمارہے ہیں کہ اس آیت کا یہ مطلب لینا غلط فہمی ہے۔ اس لئے کہ اگر لوگ یہ دیکھیں کہ ایک ظالم کسی دوسرے پر ظلم کررہا ہے، لیکن وہ لوگ اس ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس کو ظلم سے نہ روکیں تو ان حالات میں قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے تمام افراد پر اپنا عذاب نازل فرمادیں۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ فرمارہے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ تمہارے سامنے ظالم ظلم کررہا ہے اور مظلوم پٹ رہا ہے، اور ظالم کو ظلم سے روکنے کی طاقت تمہارے اندر موجود ہے، لیکن اس کے باوجود تم نے یہ سوچا کہ اگر یہ ظلم کررہا ہے یا غلط کام کررہا ہے تو یہ اس کا اپنا ذاتی عمل ہے، میں تو ظلم نہیں کررہا ہوں، لہٰذا مجھے اس کے اس فعل میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے اور مجھے ان سے الگ رہنا چاہئے، اور وہ اپنے اس طرزِ عمل پر اس آیت سے استدلال کرے کہ اللہ تعالیٰ

---

(۱) المائدة:۱۰۵

(۲) سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی نزول العذاب إذا لم یغیّر المنکر، رقم: ۲۰۹۴، سنن أبی داؤد، کتاب الملاحم، باب الأمر والنھی، رقم: ۳۷۷۵، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب الأمر بالمعروف والنھی عن المنکر، رقم: ۳۹۹۵، مسند أحمد، رقم: ۱

نے تو یہ فرمادیا کہ اپنی اصلاح کی فکر کرو، اگر دوسرا شخص غلط کام کر رہا ہے تو اس کی غلط کاری تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمار ہے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اس آیت سے یہ مطلب نکالنا بالکل غلط ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اگر ظالم کو ظلم سے روکنے کی قدرت اور طاقت تمہارے اندر ہو تو تم ضرور اس کو ظلم سے روک دو۔

آیت کی صحیح تشریح وتفسیر

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں یہ جو فرمایا کہ ''کسی کی غلط کاری تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی، بشرطیکہ تم اپنی اصلاح کی فکر کرلو'' اس میں اصل بات یہ ہے کہ ایک شخص اپنی استطاعت کے مطابق اور اپنی طاقت کے مطابق امر بالمعروف کا فریضہ ادا کر چکا ہے، لیکن اس کے باوجود دوسرا شخص اس کی بات نہیں مانتا، تو تمہارے اوپر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اب اس کی غلط کاری تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی، اب تم اپنی فکر کرو، اور اپنے حالات کو درست رکھو، انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے ہاں تم سے مواخذہ نہیں ہوگا۔

اولاد کی اصلاح کب تک؟

مثلاً اولاد ہے، اولاد کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر والدین یہ دیکھ رہے ہیں کہ اولاد غلط راستے پر جارہی ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ اس کو روکیں، اور اس کو غلط کاری سے بچائیں، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا کہ تم اپنے آپ کو بھی آگ سے بچاؤ، اور اپنے گھر والوں کو بھی آگ سے بچاؤ،(۱) والدین کے ذمہ یہ فرض ہے، لیکن ایک شخص نے اپنی ساری توانائیاں صرف کردیں، لیکن اولاد نے بات نہ مانی، تو اس صورت میں انشاء اللہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں معذور ہوگا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی آخر وقت تک اسلام نہیں لایا اور حضرت نوح علیہ السلام نے اس کو سمجھایا، اس کو تبلیغ کی، دعوت دی، اور ان سے زیادہ کون حق تبلیغ ادا کرے گا۔ لیکن اس کے باوجود آخر وقت تک وہ اسلام نہ لایا۔ اب اس کا مواخذہ حضرت نوح علیہ السلام سے نہیں ہوگا۔

ایک شخص کا دوست غلط راستے پر جارہا ہے، غلط کاموں میں مبتلا ہے، اور یہ شخص اپنی استطاعت کے مطابق اپنے دوست کو پیار ومحبت سے ہر طرح اس کو سمجھاتا رہا، اور سمجھا سمجھا کر تھک گیا، لیکن وہ دوست غلط کاموں سے باز نہیں آیا، تو اب اس کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوگی۔

---

(۱) التحریم: ٦

تم اپنے آپ کو مت بھولو

آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آیت نقل کی ہے:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾(۱)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا تم دوسروں کو نیکی کی نصیحت کرتے ہو، اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، یعنی تم تورات کے عالم ہو، جس کی وجہ سے لوگ تمہاری طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ حکم اگرچہ یہودیوں کے لئے تھا، لیکن مسلمانوں کے لئے بطریق اولیٰ ہوگا کہ جو شخص دوسروں کو نصیحت کر رہا ہے، اس کو چاہئے کہ وہ اس نصیحت کو پہلے اپنے اوپر لاگو کرے۔

یہ مسئلہ تو میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ تبلیغ کے بارے حکم یہ نہیں کہ جو شخص برائی میں مبتلا ہے وہ تبلیغ نہ کرے، اور دوسروں کو نصیحت نہ کرے، بلکہ حکم یہ ہے کہ نصیحت کرے، لیکن نصیحت کرنے کے بعد یہ سوچے کہ میں جب دوسروں کو نصیحت کر رہا ہوں تو خود بھی اس پر عمل کروں، اور اپنے آپ کو نہ بھولے، اور یہ نہ سمجھے کہ یہ نصیحت دوسروں کے لئے ہے، بلکہ یہ سوچے کہ یہ نصیحت میرے لئے بھی ہے، اور مجھے بھی اس پر عمل کرنا ہے۔

مقررین اور واعظین کے لئے خطرناک بات

اس آیت کے بعد علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ جس میں بڑی خطرناک بات ارشاد فرمائی گئی ہے، اللہ تعالیٰ اس کا مصداق بننے سے ہم سب کو بچائے، فرمایا:

عَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ((يُؤْتٰى بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقٰى فِي النَّارِ فَتَنْدَلِقُ اَقْتَابُ بَطْنِهٖ فَيَدُوْرُ كَمَا يَدُوْرُ الْحِمَارُ فِي الرَّحَاءِ فَيَجْتَمِعُ اِلَيْهِ اَهْلُ النَّارِ فَيَقُوْلُوْنَ يَا فُلَانُ مَا لَكَ؟ اَلَمْ تَكُنْ تَاْمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ؟ فَيَقُوْلُ: بَلٰى كُنْتُ اٰمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَا اٰتِيْهِ وَاَنْهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ وَاٰتِيْهِ))(۲)

---

(۱) البقرہ: ۴۴، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "کیا تم (دوسرے) لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو، اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو! کیا تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں؟"

(۲) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة النار وأنها مخلوقة، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

''حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا اور آگ میں ڈال دیا جائے گا، آگ میں گرتے ہی گرمی کی شدت کی وجہ سے اس کی آنتیں پیٹ سے باہر نکل آئیں گی، اور وہ شخص اپنی آنتوں کے گرد اس طرح گھومے گا جس طرح گدھا چکی کے گرد گھومتا ہے (اس زمانے میں ایک بڑی چکی ہوا کرتی تھی، اس چکی میں گدھے کو باندھ دیتے تھے، وہ اس چکی کو گھماتا تھا) جب اہل جہنم اس کا یہ منظر دیکھیں گے تو وہ آکر اس کے پاس جمع ہو جائیں گے، اور اس سے پوچھیں گے کہ یہ کیا قصہ ہے؟ ایسی سزا تمہیں کیوں دی جا رہی ہے؟ کیا تم وہ شخص نہیں ہو کہ تم لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے؟ اور برائی سے روکا کرتے تھے؟ (تم عالم فاضل تھے اور داعی حق تھے اور لوگوں کے لئے مصلح کا درجہ رکھتے تھے) آج تمہارا یہ انجام کیسے ہوا؟ اس وقت وہ شخص جواب میں کہے گا کہ ہاں! میں اصل میں لوگوں کو تو نیکی کی نصیحت کرتا تھا، لیکن خود نیکی نہیں کرتا تھا اور لوگوں کو برائی سے روکتا تھا، اور میں خود اس برائی کا ارتکاب کیا کرتا تھا، اس وجہ سے آج میرا یہ انجام ہو رہا ہے۔''

اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، اس حدیث کو جب پڑھتا ہوں تو ڈر لگتا ہے، وہ لوگ جن کو نیکی کی بات کہنے اور دین کی بات سنانے کا کام کرنا ہوتا ہے ان کے لئے یہ بڑا نازک اور خطرناک مرحلہ ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ اس کا مصداق بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کا مصداق بننے سے بچائے۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے

بہرحال! اگر آدمی کو اپنی فکر نہ ہو، اور دوسرے کی اصلاح کی فکر لے کر آدمی چل کھڑا ہو، اور دوسروں کے عیب تلاش کرتا رہے تو اس طرح معاشرے کی اصلاح ہونے کے بجائے اور زیادہ فساد کا راستہ کھلتا ہے، اور زیادہ بگاڑ پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ ہمارے سامنے ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ فکر پیدا فرما دے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے عیوب کا جائزہ لے کہ میں کیا کیا کام غلط کر رہا ہوں، اور پھر اس کی اصلاح کی فکر میں لگ جائے، چاہے دس سال کی زندگی باقی ہو، یا پندرہ سال اور بیس سال

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رقم: ۳۰۲۷، صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقائق، باب عقوبة من يأمر بالمعروف ولا يفعله وينهى عن المنكر......، رقم: ۵۳۰۵، مسند أحمد، رقم: ۲۰۷۸۵

کی زندگی باقی ہو، آخر میں ہر ایک کو اپنی قبر میں پہنچنا ہے اور اپنے سارے اعمال کا اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہونا ہے، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا جائزہ لے، اپنے حالات کو دیکھے، اور اس میں جہاں جہاں خرابیاں نظر آئیں، ان کی اصلاح کی طرف قدم بڑھائے، پھر چاہے کوئی انجمن اور جماعت نہ بنائے لیکن ایک آدمی کم از کم اپنے آپ کی اصلاح کرلے، اور وہ خود سیدھے راستے پر لگ جائے تو قرآن کریم کے اس حکم پر عمل ہو جائے گا۔ ایک سے دو، دو سے تین، چراغ سے چراغ جلتا ہے، شمع سے شمع روشن ہوتی ہے اور اس طرح دین کا یہ طریقہ دوسروں تک بھی پہنچتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ فکر پیدا فرمائیں، اور اپنی اصلاح کرنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائیں، اور اپنے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اپنی اصلاح کی بھی فکر کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ،

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (۱)

یہ قرآن کریم کی ایک مختصر سی آیت ہے۔ قرآن کریم کا یہ عجیب وغریب اعجاز ہے کہ اس کی کوئی آیت مختصر ہی کیوں نہ ہو، اگر انسان اس کو ٹھیک طرح سمجھ کر اس پر عمل کرلے تو اس کی زندگی کو درست کرنے کے لئے تنہا ایک آیت بھی کافی ہو جاتی ہے۔ یہ آیت بھی اسی قسم کی ہے۔ اس آیت میں ایک عجیب وغریب حقیقت کا بیان فرمایا گیا ہے اور پوری اُمتِ مسلمہ کو ایک عجیب ہدایت دی گئی ہے۔ اگر یہ ہدایت ہمارے دلوں میں اُتر جائے اور ہم اس پر عمل پیرا ہونے کا عہد کرلیں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ذریعہ ہمارے سارے مصائب وآلام کا خاتمہ ہو جائے۔

مسلمانوں کی بدحالی کا سبب

اس سے پہلے کہ اس آیت کا ترجمہ اور اس کا مطلب آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں، ایک اہم سوال کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں، جو اکثر وبیشتر ہم میں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت پوری اُمتِ مسلمہ جہاں کہیں آباد ہے وہ مسائل کا شکار ہے، مصیبتوں اور پریشانیوں سے سابقہ ہے۔

کہیں بوسنیا کے مسلمانوں پر ظلم وستم ہو رہا ہے۔ کہیں کشمیر میں مسلمان ظلم وستم برداشت کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان کافروں اور ہندوؤں کے ظلم وستم کا شکار ہیں۔ صومالیہ میں

☆ اصلاحی خطبات (۷/۴۸ تا ۷۰)، ۲۶ مئی ۱۹۹۴ء، بعد از نماز عصر، جامع مسجد اقصیٰ جے ایریا، کورنگی، کراچی

(۱) المائدة: ۱۰۵، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اے ایمان والو! تم اپنی فکر کرو۔ اگر تم صحیح راستے پر ہوگے تو جو لوگ گمراہ ہیں وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ اس وقت وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا عمل کرتے رہے ہو''

مسلمان خانہ جنگی کا شکار ہیں۔ افغانستان میں مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ یہ سارے مسائل جو پوری اُمتِ مسلمہ کو درپیش ہیں، ان کے سبب پر جب غور کرنے کی نوبت آتی ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں ایمان کی ذرہ برابر بھی رمق ہے، وہ لوگ غور کرنے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ ان مصائب و آلام کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم دین کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اللہ کی بندگی کرنی چھوڑ دی ہے۔ آپ کی سنتوں کی اتباع کرنا چھوڑ دیا ہے اور بداعمالیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں یہ آفتیں ہمارے اوپر آرہی ہیں۔ اور یہ بات بالکل درست ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ﴾(۱)

یعنی جو کچھ مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ سب تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور بہت سے تمہارے اعمالِ بد ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دیتے ہیں۔ ان کی کوئی سزا تمہیں نہیں دیتے۔ لیکن بعض بداعمال ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی سزا اس دنیا کے اندر ان مصیبتوں کی شکل میں دی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب ہم آپس میں بیٹھ کر اُمتِ مسلمہ کے ان مصائب کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے اسباب کا جائزہ لیتے ہیں تو مشکل ہی سے شاید ہماری کوئی مجلس اس تذکرہ سے خالی جاتی ہوگی کہ ہم سب بداعمالیوں کا شکار ہیں۔ بدعنوانیوں کا شکار ہیں۔ گناہوں کے اندر مبتلا ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو چھوڑا ہوا ہے۔ یہ ساری مصیبتیں ان بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔

یہ کیسی منزل ہے کیسی راہیں

لیکن یہ سارا تذکرہ ہونے کے باوجود یہ نظر آتا ہے کہ پرنالہ وہیں گر رہا ہے اور حالات میں کوئی بہتری نظر نہیں آتی۔ بہت سی جماعتیں، انجمنیں اور ادارے اس مقصد کے تحت قائم ہیں کہ حالات کی اصلاح کریں۔ لیکن حالات جوں کے توں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے دینی کا جو سیلاب اُمڈ رہا ہے اس کی رفتار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں کمی نہیں آرہی ہے۔ کسی شاعر نے کہا تھا۔

یہ کیسی منزل ہے کیسی راہیں
کہ تھک گئے پاؤں چلتے چلتے
مگر وہی فاصلہ ہے قائم
جو فاصلہ تھا سفر سے پہلے

یعنی جو فاصلہ سفر سے پہلے تھا وہ فاصلہ اب بھی قائم ہے۔ ہزاروں قربانیاں بھی دی جارہی

(۱) الشوریٰ: ۳۰

ہیں۔ لوگ جانیں بھی دے رہے ہیں۔ انجمنیں، جماعتیں اور ادارے اصلاحِ حال میں لگے ہوئے ہیں۔ محنت ہو رہی ہے۔ لیکن عالمِ وجود کے اندر ان کا کوئی واضح فائدہ نظر نہیں آتا۔ ایسا کیوں ہے؟

اصلاح کا آغاز دوسروں سے کیوں؟

یہ آیت جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے اس میں اس سوال کا تسلی بخش جواب عطا فرمایا ہے۔ قرآن کریم اس آیت میں ہمیں اس طرف توجہ دلا رہا ہے کہ جب تم حالات کی اصلاح کرنے کی فکر لے کر اُٹھتے ہو تو تم ہمیشہ اصلاح کا آغاز دوسروں سے کرنا چاہتے ہو۔ یعنی تمہارے دلوں میں یہ بات ہوتی ہے کہ لوگ خراب ہو گئے ہیں۔ لوگ بد اعمالیوں میں مبتلا ہیں۔ لوگ دھوکہ، فریب کر رہے ہیں۔ بدعنوانیوں میں مبتلا ہیں۔ رشوت لے رہے ہیں۔ سود کھا رہے ہیں۔ عریانی اور فحاشی کا بازار گرم ہے۔ ان سب باتوں کے تذکرے کے وقت تمہارے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ یہ سب کام دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو ان کاموں سے روکنا ہے اور ان کی اصلاح کرنی ہے۔

اپنی اصلاح کی فکر نہیں

لیکن یہ خیال شاذ و نادر ہی کسی اللہ کے بندے کے دل میں آتا ہے کہ میں بھی کسی خرابی کے اندر مبتلا ہوں۔ میرے اندر بھی کچھ عیوب اور خرابیاں پائی جاتی ہیں اور ان خرابیوں کی اصلاح کرنا میرا سب سے پہلا فرض ہے۔ میں دوسروں کی طرف بعد میں دیکھوں گا پہلے میں اپنا جائزہ لوں اور اپنی اصلاح کی پہلے فکر کروں۔ آج ہمارا حال یہ ہے کہ جب اصلاح کے لئے کوئی جماعت، کوئی تنظیم یا ادارہ قائم ہوتا ہے تو اس ادارے کے چلانے والوں اور اس تنظیم کو قائم کرنے والوں میں سے ہر شخص کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ میں عوام کی اصلاح کروں۔ لیکن میں اپنی اصلاح کروں اور اپنے عیوب کو دور کروں، یہ خیال شاذ و نادر ہی کسی اللہ کے بندے کے دل میں آتا ہوگا۔

بات میں وزن نہیں

اس عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ جب میں اپنے عیوب سے بے خبر ہوں۔ اپنی خرابیوں کی اصلاح کی تو مجھے فکر نہیں ہے۔ میرے اپنے اعمال اللہ کی رضا کے مطابق نہیں ہیں۔ اور میں دوسروں کی اصلاح کی فکر میں لگا ہوا ہوں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میری بات میں نہ تو کوئی اثر اور وزن ہوتا ہے اور نہ اس کے اندر برکت اور نور ہوتا ہے کہ وہ بات دوسروں کے دلوں میں اُتر جائے اور وہ اس کو ماننے پر آمادہ ہو جائیں۔ بلکہ وہ ایک لچھے دار تقریر ہوتی ہے جو کانوں سے ٹکرا کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

ہر شخص کو اپنے اعمال کا جواب دینا ہے

قرآن کریم کا ارشاد یہ ہے کہ اے ایمان والو! تم اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اگر تم نے اپنی اصلاح کر لی اور ہدایت کے راستے پر آ گئے تو پھر جو لوگ گمراہی کی طرف جا رہے ہیں اور گمراہیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں، ان کی برائی اور گمراہی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ اس لئے کہ تم سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ تم کو بتائے گا جو کچھ تم اس دنیا میں کیا کرتے تھے۔ اس آیت میں یہ بتا دیا کہ ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کے پاس اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ بدعملی دوسرا شخص کرے اور جواب مجھ سے طلب کیا جائے کہ وہ شخص بدعملی کے اندر کیوں مبتلا تھا۔ یا میں کوئی برا عمل کروں اور جواب دوسرے سے طلب کیا جائے۔ ایسا نہیں ہوگا بلکہ ہر شخص سے اس کے اپنے عمل کا سوال ہوگا۔ اس لئے تم پہلے اپنی فکر کرو کہ تمہارے اعمال کیسے ہیں؟ تم جب اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری دو گے تو تم اپنی زندگی کے اعمال کے بارے میں کیا جواب دو گے؟ اس لئے دوسروں کی فکر سے پہلے اپنی خبر لو۔ اور ہر شخص اپنے اعمال اور اخلاق کا جائزہ لے کر دیکھے کہ وہ کس گمراہی اور کس غلطی کے اندر مبتلا ہے۔ اور پھر ان غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ یہ نہ ہو کہ دوسروں کے عیوب اور برائیوں کو تو تلاش کرتا پھرے، اور اپنے عیوب سے غافل ہو جائے۔

ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ أَهْلَكُهُمْ))(۱)

جو شخص یہ کہے کہ سارے لوگ ہلاک اور برباد ہو گئے۔ اس لئے کہ ان کے اعمال خراب، ان کے عقائد خراب، ان کی عبادتیں خراب، اس کے نتیجے میں وہ لوگ تباہ و برباد ہو گئے۔ تو سب سے زیادہ ہلاک ہونے والا شخص وہ خود ہے جو دوسروں کی برائیاں تو بیان کر رہا ہے لیکن اپنی حالت سے بے خبر ہے۔ اگر اپنے اعمال اور اپنی اصلاح کی فکر میں لگ جائے اور دل میں یہ تڑپ لگ جائے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دوں گا تو یقیناً اس صورت میں وہ شخص اپنے آپ کو سب سے برا محسوس کرے گا اور اس وقت دوسرے لوگ برے نظر نہیں آئیں گے۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب النهي عن قول هلك الناس، رقم: ٤٧٥٥، سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب لا يقال خبثت نفسي، رقم: ٤٣٣١، مسند أحمد، رقم: ٨١٥٨، موطا مالك، كتاب الجامع، باب ما يكره من الكلام، رقم: ١٥٥٩

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ یہ اتنے بڑے بزرگ ہیں کہ ہم لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے بارے میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے شہر میں قحط پڑ گیا۔ اور بارش بند ہوگئی۔ لوگ پریشان تھے۔ اور بارش کی دعائیں کر رہے تھے۔ کچھ لوگ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت! آپ دیکھ رہے ہیں کہ پوری قوم قحط سالی کے اندر مبتلا ہے، زبانیں اور گلے تک خشک ہوگئے ہیں۔ جانوروں کو پلانے کے لئے پانی نہیں ہے۔ کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی نہیں ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بارش عطا فرمائے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دعا تو میں کروں گا انشاء اللہ، لیکن ایک بات سن لو، وہ یہ کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ جو کچھ تمہیں دنیا میں کوئی مصیبت یا پریشانی آتی ہے وہ لوگوں کی بداعمالیوں اور گناہوں کی وجہ سے آتی ہے۔ لہٰذا اگر بارش نہیں ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بداعمالیوں میں مبتلا ہیں اور ان بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہم سے بارش کو روک دیا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم میں سے کون سا شخص سب سے زیادہ بداعمالی میں مبتلا ہے۔ اور جب میں اپنا جائزہ لیتا ہوں تو یہ نظر آتا ہے کہ پوری بستی میں مجھ سے زیادہ خراب کوئی آدمی نہیں ہے۔ مجھ سے زیادہ گناہ گار کوئی نہیں ہے۔ میرا غالب گمان یہ ہے کہ بارش اس وجہ سے رُکی ہوئی ہے کہ میں اس بستی کے اندر مقیم ہوں۔ جب میں اس بستی سے نکل جاؤں گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس بستی پر نازل ہو جائے گی۔ انشاء اللہ۔ اس لئے بارش ہونے کا علاج یہ ہے کہ میں اس بستی سے چلا جاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں عافیت کے ساتھ رکھے اور تم پر بارش نازل فرمائے۔

اپنے گناہوں کی طرف نظر تھی

دیکھئے! حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ جیسا ولی اللہ، ولی کامل، اللہ کا نیک بندہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اس روئے زمین پر مجھ سے بڑا گناہگار کوئی نہیں۔ اس لئے اگر میں اس بستی سے نکل جاؤں گا تو اللہ تعالیٰ اس بستی پر بارش نازل فرمادیں گے۔ اب بتایئے کہ کیا وہ جھوٹ بول رہے تھے؟ اور کیا وہ تواضعاً ایسا کہہ رہے تھے؟ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ جیسے ولی کامل کی زبان سے جھوٹ نہیں نکل سکتا بلکہ واقعۃً وہ اپنے آپ کو یہ سمجھتے تھے کہ سب سے زیادہ گناہگار اور عیب دار میں ہوں۔ ایسا کیوں سمجھتے تھے؟ اس لئے کہ ہر وقت ان کی نگاہ اس پر تھی کہ میرے اندر کیا خرابیاں ہیں؟ اور ان کو کیسے دور کروں؟

نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس دور میں اللہ تعالیٰ نے عمل اور تقویٰ کا نمونہ بنایا تھا۔ ان کے ایک خلیفہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے ذکر کیا کہ جب آپ بیان فرماتے ہیں اور میں آپ کی مجلس میں ہوتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مجمع میں مجھ سے زیادہ تباہ حال شخص کوئی اور نہیں ہے۔ اور سب سے زیادہ گناہگار میں ہوں۔ اور دوسرے لوگوں کے مقابلے میں، میں اپنے آپ کو جانور محسوس کرتا ہوں۔ جواب میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی تم یہ جو اپنی حالت بیان کر رہے ہو سچ پوچھو تو میری بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ جب میں وعظ اور بیان کر رہا ہوتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ سب لوگ مجھ سے اچھے ہیں۔ میں سب سے زیادہ خراب ہوں۔

ایسا کیوں تھا؟ اس لئے کہ ہر وقت ان کو یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ میرے اندر کون سا عیب ہے؟ کون سا گناہ ہے؟ میں اس کو کس طرح دور کروں؟ اور اللہ تعالیٰ کی رضا کیسے حاصل کروں؟ اگر انسان اپنے عیوب کا جائزہ لینا شروع کرے تو پھر دوسروں کے عیوب نظر نہیں آتے۔ اس وقت اپنی فکر میں انسان لگ جاتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم نے کہا تھا کہ۔

تھے جو اپنی برائی سے بے خبر رہے اوروں کے ڈھونڈتے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

یعنی جب تک دوسروں کو دیکھتے رہے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ فلاں کے اندر یہ برائی ہے اور فلاں کے اندر یہ برائی ہے۔ لیکن جب اپنی برائیوں پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ کوئی بھی اتنا برا نہیں ہے جتنا برا میں خود ہوں۔ اس لئے کہ جب اپنے اعمال کا جائزہ لینے کی توفیق ہوئی تو ساری گندگیاں اور برائیاں سامنے آگئیں۔

یاد رکھئے! کوئی انسان دوسرے کی برائی سے اتنا واقف نہیں ہوسکتا جتنا انسان اپنی برائی سے واقف ہوتا ہے۔ انسان اپنے بارے میں جانتا ہے کہ میں کیا سوچتا ہوں۔ اور میرے دل میں کیا خیالات پیدا ہوتے ہیں؟ کیسے کیسے ارادے میرے دل میں آتے ہیں؟ لیکن چونکہ اپنی طرف نظر نہیں، اپنے عیوب سے بے خبر ہے، اس لئے دوسروں کے عیوب اس کو نظر آتے ہیں۔ اس کو اپنی پرواہ نہیں ہوتی۔

اپنی بیماری کی فکر کیسی ہوتی ہے

مثلاً ایک شخص کے پیٹ میں شدید درد ہے اور اس درد کی وجہ سے بے چین ہے، کسی کروٹ قرار نہیں آرہا ہے۔ بتائیے! کیا وہ شخص دوسروں کو دیکھتا پھرے گا کہ کس شخص کو نزلہ ہو رہا ہے، کس کو کھانسی ہے، کس کو زکام ہے؟ بلکہ وہ شخص اپنے درد کو لے کر بیٹھ جائے گا، دوسروں کی بیماریوں کی پرواہ بھی نہیں کرے گا۔ بلکہ اگر کوئی شخص اس سے یہ کہے گا کہ مجھے نزلہ اور کھانسی ہو رہی ہے تو جواب میں کہے گا کہ تمہارا نزلہ کھانسی اپنی جگہ، لیکن میں تو اپنے پیٹ کے درد میں مبتلا ہوں، میں اپنے درد کا پہلے علاج کروں یا تمہارے نزلہ کھانسی کو دیکھوں۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہوگا جو اپنے درد سے بے چین ہونے کی حالت میں دوسروں کی معمولی بیماریوں کو دیکھتا پھرے۔

ایک خاتون کا نصیحت آموز واقعہ

میرے عزیزوں میں ایک خاتون تھیں، ایک مرتبہ ان کے پیٹ میں ریاحی تکلیف ہوگئی اور اس کی وجہ سے وہ بے چین ہوگئیں اور نفسیاتی طور پر ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ میں بہت زیادہ بیمار ہوں۔ میں ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے ان کو ایک ہسپتال لے گیا۔ جب لفٹ کے ذریعہ اُوپر جانے لگے تو وہاں ایک اور خاتون وہیل چیئر کے اُوپر بیٹھی تھی۔ اور اس کا سارا جسم آگے سے جلا ہوا تھا۔ اور بعض جگہ کی ہڈیاں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کھال جلی ہوئی تھی۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں اپنی عزیزہ خاتون سے کہوں کہ یہ تم سے زیادہ اور سخت تکلیف کے اندر مبتلا ہے تاکہ ان کو اپنی بیماری کا احساس کم ہو جائے۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ دیکھو، یہ خاتون کتنی مصیبت میں ہے اور کتنی سخت تکلیف کے اندر مبتلا ہے۔ میری عزیزہ نے ان خاتون پر ایک اُچٹتی نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ ہاں یہ تکلیف کے اندر مبتلا تو ہے، لیکن اس کے پیٹ میں تو درد نہیں ہو رہا ہے۔ دیکھئے! جس کا سارا جسم جلا ہوا ہے اور ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے، اس کی بیماری کا اتنا احساس نہیں جتنا اپنی بیماری کا احساس ہے۔

اس واقعہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ کاش دین کے معاملے میں ہمارے دلوں میں ایسی فکر پیدا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ دین کی بیماریوں اور باطن کی بیماریوں میں یہ فکر پیدا کردے کہ میرے اندر جو بیماری ہے مجھے اس کی فکر لگ جائے اور اس کے نتیجے میں دوسروں کی بیماریوں پر نظر جانے کے بجائے میں اپنی بیماریوں کی اصلاح کی فکر کروں۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو اپنے نفاق کا شبہ

ایک مرتبہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں تباہ و برباد ہوگیا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں منافق ہوگیا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیسے منافق ہوگئے؟ جواب میں فرمایا کہ یا رسول اللہ! جب میں آپ کی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو دل میں نیک جذبات اور نیک خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ کی یاد دل میں تازہ ہوتی ہے۔ اپنی اصلاح کی فکر ہوتی ہے۔ آخرت کی نعمتیں یاد آتی ہیں۔ لیکن جب کاروبارِ زندگی میں جاتا ہوں اور بیوی بچوں کے پاس جاتا ہوں تو وہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔ اللہ کی طرف دھیان، اپنی اصلاح کی فکر اور آخرت اور جنت کا خیال باقی نہیں رہتا۔ اور یہ تو منافقت کی بات ہے کہ ظاہر میں تو مسلمان ہیں اور دل کے اندر برے برے خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس لئے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں تو منافق ہوگیا۔ اب آپ مجھے بتائیے کہ کس طرح اس منافقت سے نکلوں؟

دیکھئے! حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی یہ بات کہہ رہے ہیں اور صحابہ کے بارے میں پوری اُمت کا اس پر اتفاق ہے:

"اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عَدُوْلٌ"

"تمام صحابہ عادل ہیں"

ان میں کوئی فاسق نہیں ہوسکتا۔ ان کو یہ شبہ پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہوگیا؟ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ گھر میں جا کر تمہیں جو خیالات بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور کیفیت بدلی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اس سے پریشان نہ ہو۔ اس لئے کہ اس سے آدمی منافق نہیں ہوتا۔ یہ تو وقت وقت کی بات ہے۔ کسی وقت انسان کے دل پر اللہ کی یاد زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے رقت زیادہ ہو جاتی ہے، اور کسی وقت میں اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان کیفیات کے بدلنے سے آدمی منافق نہیں ہوتا۔ (۱)

ان صحابی کو فکر اس بات کی نہیں تھی کہ فلاں شخص منافق ہوگیا۔ بلکہ اس بات کی فکر تھی کہ میں منافق ہوگیا۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فضل دوام الذکر والفکر فی أمور الآخرة والمراقبة، رقم: ٤٩٣٧، سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ٢٤٣٨، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب المداومة علی العمل، رقم: ٤٢٢٩، مسند أحمد، رقم: ١٦٩٤٩

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نفاق کا شبہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جو مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ تھے، جن کے بارے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَوْ كَانَ بَعْدِیْ نَبِيًّا لَكَانَ عُمَرُ))(۱)

''اگر میرے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو وہ عمر ہوتے، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں''

اتنا اونچا مقام اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔ ان کا حال سنئے! سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی تھے۔ جن کا نام تھا حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار مشہور تھے۔ اس لئے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ منورہ میں رہنے والے منافقین کے نام بتادیئے تھے کہ فلاں فلاں شخص منافق ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے بتادیا تھا کہ مدینہ منورہ میں فلاں فلاں شخص منافق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمت کے تحت وہ نام حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کو نہیں بتائے تھے۔ حتیٰ کہ جب کسی شخص کا انتقال ہوجاتا تو لوگ یہ دیکھا کرتے تھے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس شخص کی نمازِ جنازہ میں شریک ہیں یا نہیں؟ اس لئے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا شریک ہونا اس بات کی علامت تھی کہ اس کا نام منافقین میں شامل نہیں۔ اور اگر شریک نہ ہوتے تو پتہ چل جاتا کہ اس کا نام منافقین میں شامل ہے اس لئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ شریک نہیں ہوئے۔ پس حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے ہیں، اور ان سے التجا کرکے پوچھتے ہیں کہ اے حذیفہ! خدا کے لئے مجھے یہ بتادیں کہ تمہارے پاس منافقین کی جو فہرست ہے، اس میں ''عمر'' کا نام تو نہیں ہے؟(۲) وہ شخص یہ بات پوچھ رہے ہیں جنہوں نے اپنے کانوں سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن لیا ہے کہ "عُمَرُ فِی الْجَنَّةِ" عمر جنت میں جائے گا۔(۳)

اور جن کے بارے میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔ ان کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہوں۔

(۱) سنن الترمذی، كتاب المناقب عن رسول الله، باب فی مناقب عمر بن الخطاب، رقم: ۳٦۱۹، مسند أحمد، رقم: ١٦٧٦٤

(۲) البداية والنهاية (۱۹/۵)

(۳) سنن الترمذی، كتاب المناقب عن رسول الله، باب مناقب عبد الرحمن بن عوف الزهری، رقم: ۳٦۸۰، سنن أبی داود، كتاب السنة، باب فی الخلفاء، رقم: ٤۰۳۱، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضائل العشرة، رقم: ۱۳۰، مسند أحمد، رقم: ۱٥٤۳

یہ فکر اس لئے تھی کہ بے شک حضورِ اقدس ﷺ نے یہ فرمادیا کہ "عمر جنت میں جائے گا" اور حضورِ اقدس ﷺ نے یہ بھی فرمادیا ہے کہ جو شخص بھی کلمہ "لا الہ الا اللہ" پڑھ لے گا وہ جنت میں جائے گا۔(۱)

اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خیال ہوا کہ کلمہ پڑھنے والا بے شک جنت میں جائے گا لیکن اگر مرنے سے پہلے کسی کے اعمال خراب ہوگئے تو پھر وہ شخص اس بشارت میں داخل نہیں ہوسکتا، اس لئے مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں میرے اعمال خراب ہوگئے ہوں، اور میں منافقین میں داخل ہوگیا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اپنے عیوب کا جائزہ لیتا ہے اور جب اس کو اپنی فکر لاحق ہوجاتی ہے کہ میری اصلاح کیسے ہو تو اس کے بعد اس کو دوسرے لوگ اتنے برے نظر نہیں آتے جتنا وہ اپنے آپ کو برا نظر آتا ہے۔

دین سے ناواقفیت کی انتہاء

آج ہمارا معاملہ اُلٹا ہوگیا ہے۔ آج اگر ہم دین کی کوئی بات کرتے ہیں تو اس میں عموماً اصلاح والی باتیں مفقود ہوتی ہیں۔ بلکہ عموماً ان باتوں میں یا تو فرقہ واریت کے اندر مبتلا ہوجاتے ہیں۔ کبھی سیاست پر گفتگو چھیڑ دی جاتی ہے یا کبھی ایسے نظریاتی مسائل پر گفتگو شروع ہوجاتی ہے جن کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں دین سے ناواقفیت اتنی عام ہوگئی ہے کہ پہلے دین کی جو باتیں چھوٹے بچوں کو معلوم ہوتی تھیں آج بڑے بڑے پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ افراد کو معلوم نہیں ہیں۔ اور اگر ان کو بتایا جائے کہ یہ دین کی بات ہے تو اجنبیت اور حیرت سے پوچھتے ہیں کہ اچھا یہ بھی دین کی بات ہے۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ بھی دین کا حصہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آج ہمارے اندر سے اپنی اصلاح کی فکر ختم ہوگئی ہے۔ قرآن کریم صاف صاف یہ کہہ رہا ہے کہ جب تک تم میں سے ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر اپنے دل میں پیدا نہیں کرے گا، یاد رکھو! معاشرے کی اصلاح کبھی نہیں ہوگی۔ چاہے اصلاح کی جتنی انجمنیں بنالو، جتنے ادارے قائم کرلو۔

آج کل ہماری حالت

مثلاً اب اگر میں جھنڈے لگا کر اور بینر لگا کر اصلاحِ معاشرہ کے نعرے لگاتا پھرتا ہوں لیکن خود میرا یہ حال ہے کہ جب رشوت لینے کا موقع آتا ہے تو کسی سے پیچھے نہیں رہتا۔ اور جب دوسرے کو

(۱) سنن الترمذي، كتاب الإيمان، باب ما جاء فيمن يموت وهو يشهد أن لا إله إلا الله، رقم ۲۵۶۲

دھوکہ دے کر اس سے پیسے بٹورنے کا موقع مل جائے تو اس سے نہیں چوکتا۔ اور سودی نظام کے خلاف نعرے لگانے میں پیش پیش ہوں لیکن جب سودی معاملہ کرنے کا وقت آتا ہے تو خاموشی سے وہ معاملہ کر لیتا ہوں۔ بتایئے! پھر معاشرے کی اصلاح کہاں سے ہو؟ ساری دنیا کو برا بھلا کہتا ہوں کہ آج لوگ جھوٹے ہو گئے ہیں، مکر و فریب پھیل گیا ہے۔ دھوکہ بازی ہو گئی ہے۔ فسق و فجور کا بازار گرم ہے۔ لیکن جب جھوٹ بولنے کا موقع آجاتا ہے یا چھٹی بڑھانے کے لئے جھوٹا اور جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ بنانے کا موقع آجاتا ہے تو کیا کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ لے رہا ہوں۔ یہ جھوٹ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی بات ہے۔ بتایئے! جب یہ سارے برے کام نہیں چھوڑتا تو پھر میرے اصلاحِ معاشرہ کے نعرے لگانے سے، جلسے کرنے سے اور جلوس نکالنے سے کیا حاصل ہے؟ اسی طرح اگر میں دوسروں کو تو یہ طعنے دیتا ہوں کہ وہ دین سے دور چلے گئے ہیں اور دین کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہیں، لیکن میری کوئی مجلس غیبت سے خالی نہیں ہوتی، کبھی اس کی برائی کرتا ہوں، کبھی اس کی برائی کرتا ہوں، اور اس طرح قرآن کریم کے بتانے کے مطابق ہر وقت، ہر روز اپنے مردار بھائی کا گوشت کھاتا ہوں، بتایئے! پھر معاشرے کی اصلاح کہاں سے ہو؟

اصلاح کا طریقہ یہ ہے

معاشرے کی اصلاح تو اس وقت ہوگی جب یہ سوچوں گا کہ میں جھوٹ بولتا ہوں تو کس طرح میں جھوٹ بولنا چھوڑ دوں؟ میں دوسروں کی غیبت کرتا ہوں تو اس غیبت کو چھوڑ دوں۔ میں دھوکہ بازی کرتا ہوں تو اس کو چھوڑ دوں۔ اگر میں رشوت لیتا ہوں تو رشوت لینا چھوڑ دوں۔ اگر سود کھاتا ہوں تو اس کو چھوڑ دوں۔ اگر میں بے پردگی اور عریانی و فحاشی میں مبتلا ہوں تو اس کو ترک کر دوں۔ جب تک میرے اندر یہ فکر پیدا نہیں ہوگی، یاد رکھیں! اس وقت تک میں اصلاح کی یہ فکر دوسرے کے اندر منتقل نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے فرمادیا:

﴿عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ﴾(۱)

اپنی جانوں کی فکر کرو، اگر دوسرے لوگ گمراہ ہو رہے ہیں تو ان کی گمراہی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، بشرطیکہ تم راہِ راست پر ہو۔

حضور ﷺ نے کیسے تربیت کی؟

دیکھئے! حضورِ اقدس ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے۔ نبوت کے بعد ۲۳ سال اس دنیا میں

(۱) المائدۃ: ۱۰۵

قیام فرمایا۔ ایسے وقت میں تشریف لائے جس وقت پورا جزیرہ عرب گمراہی اور جہالت کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُمید کی کوئی کرن نہیں نظر آرہی تھی۔ ہدایت کی کوئی روشنی موجود نہیں تھی۔ ایسے وقت میں آپ تن تنہا تشریف لائے، اور آپ کو حکم یہ دیا گیا کہ اس پورے معاشرے کو بدلنا ہے۔ اس کے اندر انقلاب لانا ہے۔ لیکن ۲۳ سال کے بعد جب اس دنیا سے واپس تشریف لے جاتے ہیں تو اس وقت جزیرہ عرب سے کفر اور شرک کا نام مٹ چکا تھا۔ اور وہی قوم جو ضلالت اور گمراہی اور جہالت کے اندر ڈوبی ہوئی تھی، ۲۳ سال کے بعد وہ قوم پوری دنیا کے لئے ایک مثال اور نمونہ بن کر اُبھرتی ہے۔ یہ انقلاب کیسے آیا؟

ان ۲۳ سال میں سے تیرہ سال مکہ مکرمہ میں گزرے۔ ان ۱۳ سال میں نہ جہاد کا حکم ہے، نہ کوئی ریاست اور حکومت ہے اور نہ کوئی قانون ہے۔ بلکہ اس وقت حکم یہ ہے کہ اگر تمہیں کوئی مارے تو اس کا بدلہ بھی مت لو، بلکہ مار کھالو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ﴾(۱)

ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں، حالانکہ اگر دوسرا شخص دس ہاتھ مار سکتا تھا تو ایک ہاتھ یہ بھی مار سکتے تھے۔ لیکن حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو تپتی ہوئی ریت پر لٹایا جارہا ہے۔ اور سینے پر پتھر کی سلیں رکھی جارہی ہیں۔ اور یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کا انکار کرو۔ جس وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر یہ ظلم کیا جارہا تھا تو اس کے جواب میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ ایک تھپڑ تو مار سکتے تھے۔ لیکن اس وقت حکم یہ تھا کہ مار کھائے جاؤ، تمہیں تلوار اُٹھانے کی یا ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کندن بن گئے

یہ سب کیوں تھا؟ اس لئے کہ ان کو آزمائش کی اس بھٹی سے گزار کر کندن بنانا مقصود تھا کہ مار کھائیں اور اس پر صبر کریں۔ کون انسان ایسا ہے جس کو دوسرا انسان مارے اور اس کو غصہ نہ آئے۔ لیکن حکم یہ دیا جارہا ہے کہ اس غصے کو دباؤ۔ اس لئے کہ جب اس غصے کو اللہ کے لئے دباؤ گے تو اپنی نفسانی خواہشات کو اللہ کے حکم کے آگے قربان کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ لہٰذا مکی زندگی کے تیرہ سال اس طرح گزرے کہ اس میں حکم یہ تھا کہ دوسرے سے بدلہ لینے کے لئے ہاتھ مت اُٹھاؤ بلکہ عبادت میں لگے رہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، اللہ کو یاد کرو، آخرت کا تصور کرو، جنت اور دوزخ کا تصور کرو اور اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کرو۔ جب تیرہ سال کے عرصے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت اس صبر اور آزمائش سے گزر کر کندن بن کر تیار ہوگئی تو اس کے بعد مدینہ طیبہ کی زندگی کا آغاز

(۱) النحل: ۱۲۷، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور (اے پیغمبر!) تم صبر سے کام لو اور تمہارا صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے''

ہوا۔ پھر آپ نے وہاں ایسی حکومت اور ایسا نظام قائم فرمایا کہ چشم فلک نے ایسا نظام نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ اس کے بعد کبھی دیکھا۔ اس لئے کہ ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر سے سرشار ہو کر اپنے آپ کو کندن بنا چکا تھا۔ لہٰذا پہلا کام یہ ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اپنی اصلاح کے بعد جب انسان آگے دوسروں کی اصلاح کی طرف قدم بڑھائے گا تو انشاء اللہ اس میں کامیاب ہوگا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جس جگہ پر بھی پہنچے، فتح اور نصرت کو اللہ تعالیٰ نے ان کا مقدر بنا دیا۔ اس لئے کہ اپنی اصلاح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کرا چکے تھے۔

آج ایسا لگتا ہے کہ اصلاح کی کوششیں بحیثیتِ مجموعی ناکام ہو رہی ہیں۔ اور معاشرے پر ان کا کوئی نمایاں اثر نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ اپنی اصلاح کی فکر سے غافل ہو گئے ہیں۔ آج ہمارے اندر سے یہ فکر ختم ہو گئی کہ مجھے اللہ کے سامنے حاضر ہو کر جواب دینا ہے اور میرے اندر کیا کیا خرابیاں ہیں، میں ان کو کس طرح دور کروں؟

اپنا جائزہ لیں

میری آج کی گزارش کا حاصل یہ ہے کہ ہر شخص روزانہ یہ جائزہ لے کہ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی میں کہاں کہاں میں اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر رہا ہوں۔ اسلام پانچ قسم کے اعمال کا مجموعہ ہے۔

(۱) عقائد درست ہونے چاہئیں۔

(۲) عبادات یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ درست ہونے چاہئیں۔

(۳) معاملات یعنی خرید وفروخت حلال طریقے سے ہو، آمدنی حلال ہو، کوئی آمدنی حرام کی نہ ہو۔

(۴) معاشرت یعنی آپس میں رہنے سہنے کے آداب میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت اور ان کی پابندی کرے۔

(۵) اخلاق یعنی انسان کے اخلاق درست ہوں۔ برے اخلاق مثلاً بغض، تکبر، حسد، عناد وغیرہ انسان کے اندر نہ ہوں۔ اور اچھے اخلاق ہوں۔ مثلاً تواضع ہو، توکل ہو، شکر اور صبر ہو۔

ان پانچ شعبوں پر انسان عمل کرے تب انسان کا دین کامل ہوتا ہے۔ تب وہ شخص صحیح معنی میں مسلمان بنتا ہے۔ ہر شخص ان پانچ شعبوں کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لے۔ مثلاً میرے عقائد درست ہیں یا نہیں؟ میرے ذمے پانچ وقت کی نماز باجماعت فرض ہے۔ میں ان میں سے کتنی ادا کر لیتا ہوں اور کتنی نمازیں چھوڑتا ہوں؟ میری آمدنی حلال ہو رہی ہے یا حرام ہو رہی ہے؟ بازار میں جب میں معاملات کرتا ہوں تو وہ معاملات درست ہوتے ہیں یا نہیں؟ میرے اخلاق درست ہیں یا نہیں؟

دوسروں کے ساتھ میرا برتاؤ درست ہے یا نہیں؟ میں جھوٹ تو نہیں بولتا۔ میں غیبت تو نہیں کرتا۔ میں کسی کا دل تو نہیں دُکھاتا۔ میں کسی کو پریشان تو نہیں کرتا۔ اپنے اندر ان باتوں کا جائزہ لے۔ اور اگر کہیں کوئی برائی ہے تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اگر بالکل نہیں چھوڑ سکتا تو اس کو کم کرنے کی کوشش کرے۔

مثلاً یہ دیکھے کہ میں دن میں کتنی مرتبہ جھوٹ بولتا ہوں۔ پھر دیکھے کہ ان میں سے کتنی مرتبہ جھوٹ بولنے کو میں فوراً چھوڑ سکتا ہوں ان کو فوراً چھوڑ دے۔ مجلس کے اندر کتنی مرتبہ میں غیبت کرتا ہوں۔ اس کو کس حد تک چھوڑ سکتا ہوں اس کو چھوڑ دے۔ اس طرح جائزہ لے کر گناہوں کو چھوڑنا شروع کردے اور اپنی اصلاح کی فکر پیدا کرلے۔ اگر ایک مرتبہ اصلاح کی فکر کی شمع تمہارے دل میں روشن ہوگئی تو انشاء اللہ یہ شمع تمہاری زندگی کو منور کردے گی۔ یہ مت سوچو کہ اگر ایک آدمی درست ہوگیا تو اس سے کیا اثر پڑے گا۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے

یاد رکھئے! ''معاشرہ'' میرا اور تمہارا اور افراد کا نام ہے۔ اگر ایک آدمی کی اصلاح ہوگئی اور اس نے کچھ گناہ چھوڑ دیئے اور اللہ کے احکام کی اطاعت شروع کردی تو کم از کم ایک چراغ تو جل گیا۔ چراغ چاہے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو وہ اپنے ماحول کے اندر اندھیرے کو نہیں رہنے دیتا۔ بلکہ اپنے ماحول کو ضرور روشن کردے گا۔ کیا بعید ہے کہ ایک جلتے ہوئے چراغ کو دیکھ کر دوسرا شخص اس سے اپنا چراغ جلالے، دوسرے سے تیسرا چراغ جل جائے اور اس طرح پورا ماحول روشن اور منور ہو جائے۔ لیکن اگر آدمی یہ سوچتا رہے کہ میں اپنے چراغ کو تو ٹھنڈا رکھوں اور اس ٹھنڈے چراغ سے دوسرے لوگوں کے چراغ جلاؤں اور ان کو روشن کروں، یاد رکھئے ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ جو چراغ خود بجھا ہوا ہو وہ دوسرے چراغ روشن نہیں کرسکتا۔ بالکل اسی طرح اگر میں اپنی اصلاح کی فکر کئے بغیر دوسروں کی اصلاح کرنا شروع کردوں تو یہ ایسا ہے جیسے میں اپنے ٹھنڈے چراغ سے دوسروں کے چراغ روشن کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ اور ایسا ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنی اصلاح کی فکر ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے۔

یہ فکر کیسے پیدا ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر کیسے پیدا ہو؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح اس وقت یہاں بیٹھ کر اپنی اصلاح کی فکر کی باتیں ہم نے کیں اور سنیں تو اس کے نتیجے میں ہمارے دلوں

میں اصلاح کی فکر کی تھوڑی بہت حرکت پیدا ہوئی۔ اب یہی تذکرہ بار بار سنا جائے اور مختلف مجلسوں میں سنا جائے تو بار بار سننے کے نتیجے میں یہ فکر انشاء اللہ ہمارے دلوں میں پیدا ہو جائے گی۔ دیکھئے! قرآن کریم میں "وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" (یعنی نماز قائم کرو) کے الفاظ باسٹھ مرتبہ آئے ہیں۔ حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ بھی یہ حکم دے دیتے کہ نماز قائم کرو تو وہ بھی کافی تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بار بار دہرایا۔ کیوں؟ اس لئے کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب کوئی بات بار بار کہی جاتی ہے تو اس کا اثر دل پر ہوتا ہے۔ وہ بات دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ صرف ایک مرتبہ سننے سے فائدہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس فکر کو پیدا کرنے کے لئے ایسی مجلسوں میں جانے کا اہتمام کریں جہاں اصلاح کا تذکرہ ہوتا ہو۔

دارالعلوم میں ہونے والی اصلاحی مجالس

آپ کے قریب دارالعلوم کراچی موجود ہے۔ جہاں ہفتہ وار تین مجلسیں ہوتی ہیں۔ حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم جو دارالعلوم کے صدر ہیں، ان کا بیان بدھ کے روز عصر سے مغرب تک ہوتا ہے۔ جس میں مردوں کے لئے بھی انتظام ہوتا ہے اور خواتین کے لئے بھی۔ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب مدظلہم (۱) جو دارالعلوم کراچی کے شیخ الحدیث ہیں، ہمارے استاد اور بزرگ ہیں، ان کا بیان ہر اتوار کو عصر اور مغرب کے درمیان ہوتا ہے۔ حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب مدظلہم جو دارالعلوم کے استاد ہیں اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز ہیں، ان کا بیان ہر منگل کو عصر سے مغرب تک ہوتا ہے۔ اس طرح ہر ہفتے میں تین مجلسیں دارالعلوم میں ہوتی ہیں۔ ان مجلسوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان کے ذریعہ اپنی اصلاح کی فکر پیدا کی جائے۔

دیکھئے! جلسے اور تقریریں تو بہت ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ان مجلسوں کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے اندر اپنے آپ کو درست کرنے کی اور اصلاح کرنے کی فکر پیدا ہو۔ اگر ہفتے میں آپ عصر سے مغرب تک کا ایک گھنٹہ اس مقصد کے لئے فارغ کرلیں اور ان مجالس میں سے کسی ایک مجلس میں بھی شرکت فرمالیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دل میں اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہوگی اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ غلطیاں اور کوتاہیاں کہاں کہاں ہورہی ہیں۔ اس لئے کہ ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ غلطیاں کہاں کہاں ہورہی ہیں۔ اور پھر ان غلطیوں کی اصلاح کرنے کا طریقہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہم سب کو اپنی اصلاح کی فکر عطا فرمائیں۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(۱) مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین ثم آمین

دلوں کی پاکی اور اس کے اثرات ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ○﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! جو آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں ان کی تشریح پچھلے چند جمعوں سے بیان کی جارہی ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے فلاح یافتہ مؤمنوں کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ ان کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔ قرآن کریم نے نبی کریم ﷺ کو دنیا میں بھیجنے کا ایک مقصد یہ بیان فرمایا کہ آپ ﷺ لوگوں کے اخلاق کو پاکیزہ بنائیں۔ اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ انسان کے جتنے اعمال وافعال ہیں، وہ سب اس کے اخلاق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اگر انسان کوئی اچھا کام کرتا ہے تو وہ اچھے اخلاق کے نتیجے میں کرتا ہے اور اگر وہ کوئی برا کام کرتا ہے تو وہ برے اخلاق کے نتیجے میں کرتا ہے۔ اگر انسان کے اخلاق درست ہوجائیں تو اس کی ساری زندگی درست ہوجائے اور اگر اس کے اخلاق خراب ہوجائیں تو ساری زندگی خراب ہوجائے۔

دل کی اہمیت

اسی بات کو جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا:

((أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ لَمُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ))(۲)

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۱۰۰ تا ۱۱۶)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) المؤمنون: ۱۔۴، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے۔ جو اپنی نمازوں میں دل سے جھکنے والے ہیں، اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ پر عمل کرنے والے ہیں''

(۲) سنن البيهقي الكبرى، رقم: ۱۰۱۸۰ (۵/۲۶۵)، صحيح ابن حبان، رقم: ۲۹۷ (۱/۵۳۳)، الزواجر عن اقتراف الكبائر (۱/۱۹۸)، اتحاف الخيرة المهرة (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

’’جسم میں ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم صحیح رہتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، وہ لوتھڑا انسان کا دل ہے‘‘

مطلب یہ ہے کہ دل میں جو جذبات اور خواہشات پیدا ہوتی ہیں، اگر وہ صحیح نہ ہوں تو انسان کی پوری زندگی خراب ہو جاتی ہے۔

فساد کی وجہ اخلاق کی خرابی ہے

ہمارے موجودہ حالات میں اور اس دور میں اس کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ ہمیں اپنے اردگرد جو فساد پھیلا ہوا نظر آتا ہے، اگر اس میں غور کریں تو یہ نظر آئے گا کہ یہ فساد درحقیقت اس بات پر مبنی ہے کہ آج اخلاق کے درست کرنے کا اہتمام نہیں۔ اگر ہمارے دلوں میں جذبات صحیح پرورش پاتے، نیک خواہشات پیدا ہوتیں تو آج ہمیں اپنے گردوپیش میں اتنا بڑا فساد نظر نہ آتا، کوئی ظالم دوسرے پر ظلم اس لئے کرتا ہے کہ اس کے دل میں ایسے جذبات اور خواہشات پیدا ہورہی ہیں جو شیطانی جذبات اور شیطانی خواہشات ہیں، جو گندگیوں اور نجاستوں سے بھری ہوئی ہیں، کوئی آدمی عریانی اور فحاشی میں اس لئے مبتلا ہوتا ہے کہ اس کے دل میں گندی خواہشات اور گندے جذبات پیدا ہورہے ہیں۔ اگر یہ گندے خیالات اور جذبات پیدا نہ ہوتے تو وہ فحاشی اور عریانی کے کام نہ کرتا۔ اسی چیز نے ہمارے معاشرے میں فساد پھیلایا ہوا ہے۔

اخلاق کی خرابی کے نتائج

خاص طور پر معاشرت کے ماحول میں اور معیشت کے ماحول میں اور سیاست کے ماحول میں ان اخلاق کی خرابی نے ہمیں اسفل السافلین میں پھینکا ہوا ہے۔ آج ہمارے ملک میں جو حالات چل رہے ہیں، اس میں ہر شخص یہ شکوہ کررہا ہے کہ رشوت کا بازار گرم ہے، کرپشن پھیلا ہوا ہے، حرام کھانے کے لئے لوگ منہ کھولے بیٹھے ہیں اور حرام مال کو شیرِ مادر سمجھ لیا گیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح شیر مادر حلال ہے، اسی طرح رشوت کا مال بھی حلال ہے، دھوکے کا مال بھی حلال ہے، جھوٹ کے ذریعہ آنے والا مال بھی حلال ہے، بلکہ بسا اوقات وہ لوگ جو اپنی ذاتی زندگی میں نمازیں پڑھتے ہیں، عبادتیں ادا کرتے ہیں، وعظ وتقریر بھی سنتے ہیں، لیکن جب وہ لوگ دنیا کے کاروبار میں داخل ہوتے ہیں اور روپے پیسے کے معاملات کرتے ہیں تو اس میں حلال وحرام کی تمیز نہیں کرتے۔ وہ یہ نہیں سوچتے

(بقیہ حاشیہ) بزوائد المسانید العشرة (۱۳٤/۷)، مستخرج أبی عوانة، رقم: ٤٤٤٣ (۱٤۳/۱۱)، الزهد الكبير للبيهقي، رقم: ۸۷۲ (۳۷۸/۲)، الأربعون للفسوي، رقم: ۳۸ (٦۳/۱)

کہ پیسہ جو میں کمار ہا ہوں، یہ حلال کمار ہا ہوں یا حرام کمار ہا ہوں۔ یہ لقمہ جو میرے منہ میں جار ہا ہے، یہ حلال کا لقمہ ہے یا حرام کا لقمہ ہے۔ بلکہ آج پیسے حاصل کرنے کے لئے جھوٹ بولنے میں کوئی باک نہیں، جھوٹا سرٹیفکیٹ بنانے میں کوئی خوف نہیں، جھوٹی شہادت دینے میں کوئی عار نہیں۔ جب روپے پیسے کا معاملہ آجاتا ہے تو ساری دین داری اور سارا تقویٰ دھرارہ جاتا ہے۔

روپیہ حاصل کرنے کی دوڑ

آج یہ دوڑ لگی ہوئی ہے کہ دونوں ہاتھوں سے جتنا روپیہ سمیٹا جائے سمیٹ لو، چاہے حلال طریقے سے ہو یا حرام طریقے سے ہو، بس پیسہ آنا چاہئے۔ اس کے لئے اگر رشوت لینی پڑے تو رشوت لو، اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دو، اس کے لئے اگر دھوکہ دینا پڑے تو دھوکہ دو، اگر جھوٹے کاغذات بنانے پڑیں تو جھوٹے کاغذات بناؤ، اگر جھوٹی گواہی دینی پڑے تو جھوٹی گواہی دو، جو کچھ کرنا پڑے، کرگزرو، لیکن پیسہ آنا چاہئے۔ آج ہمارے معاشرے میں جو فساد پھیلا ہوا ہے، وہ درحقیقت اس ذہنیت اور اس فکر کا نتیجہ ہے۔

اللہ اور رسول کی محبت کی کمی کا نتیجہ

اگر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ اور اپنے مسلمان بھائیوں کی محبت دل میں جاگزیں ہوتی تو پھر دنیا کی محبت اور دنیا کے مال و دولت کی محبت دل پر غالب نہ ہوتی اور آدمی دنیا کے حصول کے لئے حلال وحرام کو ایک نہ کرتا۔

عراق پر امریکہ کا حملہ

آج پوری اُمتِ مسلمہ کے دل ان واقعات کی وجہ سے ٹوٹے ہوئے ہیں جو ''عراق'' میں گزشتہ دنوں پیش آئے۔ سقوطِ بغداد کا المناک سانحہ جو پیش آیا، اس پر ہر مسلمان کا دل مرجھایا ہوا ہے۔ لوگ پریشان ہیں اور یہ پریشانی بھی بجا ہے، کیونکہ ایک مسلمان ملک پر ظلم اور تشدد کے ساتھ حملہ کیا گیا اور ساری دنیا تماشہ دیکھتی رہی اور کوئی مسلمان ملک اس کی مدد کے لئے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس واقعہ کی وجہ سے پوری اُمتِ مسلمہ میں ایک بے چینی، ایک اضطراب، ایک صدمہ، ایک افسوس اور ایک رنج کی کیفیت ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد اور اس پر عمل چھوڑنے کا نتیجہ

لیکن یہ بات یاد رکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کے اندر ہمارے اُوپر کچھ فرائض عائد کئے ہیں اور اس دنیا میں یہ قانون بنایا ہے کہ جو شخص جیسے اسباب اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو ایسا نتیجہ عطا فرمائیں گے۔ صدیوں سے ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم کے ارشادات کو پسِ پشت ڈالا ہوا ہے۔ قرآن کریم کے ارشادات میں ایک اہم ارشاد یہ ہے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾(۱)

یعنی تم جتنی زیادہ سے زیادہ اپنی قوت بنا سکتے ہو اور قوت حاصل کر سکتے ہو، وہ قوت حاصل کرو۔ آج سے چودہ سو سال پہلے اس کے ذریعہ مسلمانوں کو خطاب کیا جا رہا ہے کہ تم ایسی قوت حاصل کرو جس کے ذریعہ تم اللہ تعالیٰ کے دشمن پر اور اپنے دشمن پر رعب طاری کر سکو۔ اس حکم کا تقاضہ یہ تھا کہ پوری اُمتِ مسلمہ جہاں کہیں بھی ہو، اپنے آپ کو مضبوط بنانے کی پوری کوشش کرے، اپنے دفاع کے لحاظ سے، ساز وسامان کے لحاظ سے اور معیشت کے لحاظ سے اپنے آپ کو مضبوط بنائے۔

مسلمان وسائل سے مالا مال ہیں

لیکن بحیثیتِ مجموعی اگر اُمتِ مسلمہ پر نظر ڈالی جائے تو یہ نظر آئے گا کہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو مضبوط بنانے کے بجائے اپنی ساری لگام غیروں کے ہاتھ میں دی ہوئی ہے۔ آج مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ تاریخ میں روئے زمین پر اتنی تعداد اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی، آج مسلمانوں کے پاس اتنے وسائل ہیں کہ تاریخ میں اس سے پہلے اتنے وسائل کبھی نہیں رہے، آج اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اتنی دولت عطا فرمائی ہے کہ تاریخ میں اس سے پہلے اتنی دولت کبھی ان کے پاس نہیں رہی، دنیا کے عظیم ترین وسائل پیدا وار اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے خطے میں عطا فرمائے ہیں، تیل یہاں نکلتا ہے، گیس یہاں نکلتی ہے، سونا یہاں نکلتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بہترین انسانی صلاحیتیں یہاں عطا فرمائی ہیں اور سارے کرۂ زمین کا نقشہ اُٹھا کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ پورے کرۂ زمین کا دل مسلمانوں کے پاس ہے۔

---

(۱) الانفال: ۶۰، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور (مسلمانو!) جس قدر طاقت اور گھوڑوں کی جتنی چھاؤنیاں تم سے بن پڑیں، ان سے مقابلے کے لئے تیار کرو، جن کے ذریعے تم اللہ کے دشمن اور اپنے (موجودہ) دشمن پر بھی ہیبت طاری کر سکو''

ذاتی مفاد کو سامنے رکھنے کے نتائج

مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک مسلسل اسلامی ملکوں کا سلسلہ ہے، گویا کہ ایک زنجیر ہے جس میں مسلمان پروئے ہوئے ہیں، درمیان میں صرف دو ملک حائل ہیں، ایک اسرائیل اور ایک بھارت۔ دنیا کی عظیم ترین شاہراہیں مسلمانوں کے قبضے میں ہیں، نہر سوئز ان کے پاس ہے، آبنائے باسفورس ان کے پاس ہے، خلیج عدن ان کے پاس ہے، اگر مسلمان متحد ہو کر اپنی اس طاقت کو استعمال کریں تو غیر مسلموں کے ناک میں دم کر دیں، لیکن مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان تمام وسائل سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کو سوچ رہا ہے۔ اس ذاتی مفاد کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ممالک جن کے اندر سونے کی ریل پیل ہے، جن کے یہاں تیل بے تحاشہ پیدا ہو رہا ہے، انہوں نے اپنی ساری زندگی کا دارومدار دوسرے ممالک سے درآمد کیے ہوئے سامان پر رکھا ہوا ہے، ان کے اپنے ملک میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی ان ممالک میں ایسے افراد تیار کیے جاتے ہیں جو اس دور کے لحاظ سے ساز و سامان تیار کر سکیں اور مناسب اسلحہ تیار کر سکیں۔

ہم لوگ خود غرضی میں مبتلا ہیں

یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ اس ساری دولت پر اور سارے وسائل پر خود غرضی کا شیطان مسلط ہے۔ ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ مجھے پیسے ملنے چاہئیں، چاہے حلال طریقے سے ملیں یا حرام طریقے سے ملیں، وقتی طور پر میں خوش ہو جاؤں، وقتی طور پر میرا کام بن جائے، وقتی طور پر مجھے راحت مل جائے، چاہے اس کی خاطر مجھے قوم اور ملک کو داؤ پر لگانا پڑ جائے، چاہے اس کی خاطر مجھے اپنی پوری ملت کو بیچنا پڑ جائے، لیکن میں کسی طرح اپنا اُلو سیدھا کر لوں۔ یہ وہ ماحول ہے جس میں ہم اور آپ زندگی گزار رہے ہیں اور حکام سے لے کر عوام تک ہر شخص اس بیماری میں مبتلا ہے۔

ہمارے ملک میں کرپشن

آج ہر شخص کرپشن کا رونا رو رہا ہے، ہر شخص یہ کہتا ہے کہ حکومت کے کسی دفتر میں جاؤ تو اس وقت تک کام نہیں بنتا جب تک پیسے نہ کھلائے جائیں، دفتروں میں لوگ حرام کھانے کے لئے منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ یہ شکایت ہر شخص کر رہا ہے، لیکن جب اس کو موقع مل جائے تو وہ بھی اپنا منہ کھولے بغیر نہیں رہتا اور وہ اس سے زیادہ رشوت لے گا جتنی وہ دوسروں کے رشوت لینے کی شکایت کر رہا تھا، وہ دوسروں سے زیادہ کرپشن کا مظاہرہ کرے گا، جھوٹے سرٹیفکیٹ بنائے گا، جھوٹی شہادتیں دے گا، یہ

سب کام ہمارے ملک اور ہمارے معاشرے میں ہو رہے ہیں۔

دنیا میں کامیابی کے لئے محنت شرط ہے

بے شک یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بنائی ہے، لیکن یہ دنیا اس لئے بنائی ہے کہ اس میں محنت اور جدوجہد کر کے حلال اور جائز طریقے سے کماؤ اور اس کے وسائل کو اپنی بہتری کے لئے اور اُمت کی بہتری کے لئے استعمال کرو، یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے اس لئے نہیں بنائی تھی کہ ہر انسان دوسرے کو دھوکہ دے کر اور فریب دے کر دولت کمائے اور دوسروں پر ڈاکہ ڈالے اور اپنی تجوریاں بھرتا چلا جائے اور ملک وملت کو فراموش کر دے۔ آج مسلمانوں نے چونکہ یہ وطیرہ اختیار کیا ہوا ہے، اس لئے ان کی ہر جگہ پٹائی ہو رہی ہے۔ دشمن سے کیا شکوہ کریں، دشمن کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ ہمیں تباہ کرے، شکوہ اور گلہ تو اپنا ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو ایسا بنالیا ہے کہ دنیا کی جو قوم چاہے آ کر ہم پر ڈاکہ ڈالے اور خوشی کے تازیانے بجاتے ہوئے یہاں سے چلی جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ایک اصول

یاد رکھئے! یہ صورتِ حال اس وقت تک نہیں بدلے گی جب تک ہم اپنے آپ کو نہیں بدلیں گے، قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾(۱)

''اللہ تعالیٰ اس قوم کی حالت کو نہیں بدلتے جو قوم خود اپنے آپ کو بدلنے کے لئے تیار نہ ہو''

یہ قرآن کریم کا ارشاد ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے فرما دیا تھا کہ اگر تم اپنے آپ کو نہیں بدل سکتے تو تمہاری حالت بھی نہیں بدلے گی۔ اگر تم اپنے کرتوتوں کی وجہ سے پٹ رہے ہو تو پھر تمہاری پٹائی اس وقت تک ہوتی رہے گی جب تک تم اپنے کرتوت نہیں چھوڑو گے۔

ہماری دعائیں کیوں قبول نہیں ہوئیں؟

آج لوگ یہ کہتے ہیں کہ اتنی دعائیں کی گئیں، اللہ تعالیٰ سے اتنا مانگا گیا، لیکن ہماری دعائیں قبول نہیں ہوئیں، ہمیں فتح نہیں دی گئی اور دشمن کو فتح ہوگئی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہاں تک کہ لوگوں کے ایمان متزلزل ہو رہے ہیں، لوگوں کے دلوں میں یہ شکوک اور شبہات پیدا ہو رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

(۱) الرعد:۱۱

ہماری مدد کو کیوں نہیں آیا؟ ہماری مدد کیوں نہیں کی؟

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا عالم اسباب بنائی ہے، جب تم اپنی حالت بدلنے کے لئے تیار نہیں ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی آواز پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں ہو، بلکہ جہاں تمہیں چار پیسے کا نفع مل رہا ہو، وہاں تم اللہ کو بھلا بیٹھتے ہو اور رسول کو بھی بھلا بیٹھتے ہو تو پھر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کیوں کریں گے؟ قرآن کریم فرمایا ہے:

﴿نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ﴾(۱)

یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کو بھلا دینے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کو چھوڑ دیا۔

ہم پورے دین پر عامل نہیں

عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال آتا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو کہاں بھلا دیا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ نماز پڑھو، ہم نماز پڑھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ جمعہ کی نماز کے لئے آؤ، ہم جمعہ کی نماز کے لئے آرہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ رمضان میں روزے رکھو تو ہم روزے رکھ رہے ہیں، لہٰذا ہم نے اللہ کو نہیں بھلایا۔

بات دراصل یہ ہے کہ لوگوں نے صرف نماز پڑھنے اور روزے رکھنے کو دین سمجھ لیا ہے اور زکوٰۃ دینے اور حج کرنے اور عمرے کرنے کو دین سمجھ لیا ہے، حالانکہ دین کے بیشمار شعبے ہیں، اس میں معاملات بھی ہیں، اس میں معاشرت بھی ہے، اس میں اخلاق بھی ہیں، یہ سب دین کے شعبے ہیں، اب ہم نے نماز تو پڑھ لی اور روزہ بھی رکھ لیا، زکوٰۃ کا وقت آیا تو زکوٰۃ بھی دے دی، عمرے کر کے خوب سیر سپاٹے بھی کر لیے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے اپنے مصالح کو قربان کرنے کا موقع آتا ہے تو وہاں پھسل جاتے ہیں اور تاویل شروع کر دیتے ہیں کہ آج کل سب لوگ ایسا کر رہے ہیں اور حالات ایسے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

آج ہم اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھلائے ہوئے ہیں، خاص طور سے اپنی معاشرت کی زندگی میں، اپنے معاملات کی زندگی میں، اخلاق کی زندگی میں اور سیاست کی زندگی میں اسلام کو اور اسلامی احکام کو فراموش کیا ہوا ہے۔

---

(۱) التوبة: ٦٧

ہم دشمن کے محتاج بن کر رہ گئے ہیں

اسی کا ایک شعبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ اپنے لئے طاقت کو جمع کرو، لیکن ہم نے یہ طاقت جمع نہیں کی۔ اور پھر یہ طاقت کیسے حاصل ہوتی جبکہ ہمارے سارے وسائل رشوت کی نذر ہورہے ہیں، کرپشن کی نذر ہورہے ہیں اور اس کے نتیجے میں ہر وقت اپنے دشمنوں کے سامنے بھیک کا پیالہ لیے کھڑے ہیں اور ان سے مانگتے ہیں کہ خدا کے لئے ہماری مدد کرو۔ اب اگر وہ دشمن ہماری پٹائی کرتا ہے یا ہم پر حکومت کرتا ہے تو پھر اس کا شکوہ کیوں کرتے ہیں؟ کیونکہ ہم نے خود اپنے آپ کو ان کا محتاج بنادیا ہے اور اپنے حالات ہم نے ایسے بنا رکھے ہیں کہ اس کے نتیجے میں ہماری زندگی ان پر موقوف ہوگئی ہے، لہٰذا ان سے کیا شکوہ؟ شکوہ تو اپنا ہے کہ ہم نے خود اپنے کو ذلیل کیا۔ اگر آج بھی ہمارے پاکستان جیسے ملک کے وسائل ٹھیک دیانتداری اور امانت داری کے ساتھ استعمال ہوں اور ہم یہ تہیہ کرلیں کہ ہم اپنی چادر کی حد تک پاؤں پھیلائیں گے اور اپنے وسائل کے دائرے میں رہ کر کام کریں گے اور اپنے وسائل کا صحیح استعمال کریں گے تو پھر ہمیں بھیک کا پیالہ لے کر دوسروں کے پاس جانا نہیں پڑے گا اور ہم خود کفیل ہوجائیں گے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوجائیں گے اور اپنی قوت مجتمع کریں گے، لیکن اس ملک میں رشوت اور کرپشن نے ہماری زندگی کو تباہ کیا ہوا ہے۔

اس واقعہ سے سبق لیجئے

بہر حال! یہ جو کچھ ہوا (کہ امریکہ نے عراق پر حملہ کرکے وہاں کی حکومت کو طاقت کے بل بوتے پر ختم کردیا اور خود قابض ہوگیا) اس پر صدمہ تو اپنی جگہ ہے، لیکن ہمیں اس واقعہ سے سبق لینے کی ضرورت ہے، وہ سبق یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص یہ تہیہ کرلے کہ آج کے دن کے بعد کوئی حرام لقمہ ہمارے پیٹ میں نہیں جائے گا، کوئی حرام پیسہ ہمارے گھر میں نہیں آئے گا، رشوت کا پیسہ نہیں آئے گا، دھوکے کا پیسہ نہیں آئے گا، جھوٹ کا پیسہ نہیں آئے گا، سود کا پیسہ نہیں آئے گا، گھر میں جو پیسہ آئے گا وہ حلال کا اور محنت کا پیسہ آئے گا۔ میں آپ حضرات سے اللہ کے بھروسے پر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس دن قوم نے یہ تہیہ کرلیا تو انشاء اللہ کوئی دشمن ان پر فتح یاب نہیں ہوسکے گا۔

معاشرے کی اصلاح فرد کی اصلاح سے ہوتی ہے

لوگ یہ اشکال پیش کرتے ہیں کہ جب سارا معاشرہ ہی خراب ہے تو اگر ہم نے اپنے اندر کوئی تبدیلی کر بھی لی تو ہم اکیلے پورے معاشرے کو کیسے بدل سکتے ہیں؟ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا، ہماری

تبدیلی سے معاشرے پر کیا اثر مرتب ہوگا؟

یاد رکھئے! یہ شیطان کا دھوکہ ہے، اگر ہر آدمی یہی سوچتا رہے تو کبھی بھی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ اصلاح اس طرح ہوتی ہے کہ ایک شخص اپنی زندگی کو درست کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں کم از کم ایک برائی اس دنیا سے دور ہو جاتی ہے۔ جب ایک برائی دور ہوئی تو اُمید کا ایک چراغ جل گیا اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب ایک چراغ جلتا ہے تو اس چراغ سے دوسرا چراغ جلتا ہے اور دوسرے سے تیسرا چراغ جلتا ہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ ماحول میں روشنی پیدا فرما دیتے ہیں۔

بہرحال! ایک طرف تو یہ ہو کہ ہر انسان اپنے گریبان میں منہ ڈالے اور یہ تہیہ کرے کہ میں اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کروں گا اور اللہ تعالیٰ کی وہ نافرمانی جس نے سارے معاشرے میں فساد مچایا ہوا ہے، نہیں کروں گا یعنی کرپشن نہیں کروں گا اور کوئی حرام پیسہ میرے گھر میں نہیں آئے گا۔ اور دوسری طرف اس ملک کے وسائل صحیح طور پر استعمال ہونے لگیں تو اس ملک کو بھی ترقی حاصل ہوگی اور اس کے اندر قوت آئے گی اور جب قوت آجائے گی تو کسی دشمن کو جرأت نہیں ہوگی کہ وہ بری نظر اس پر ڈالے۔

امریکہ کی بزدلی

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اتنی بڑی سپر طاقت (امریکہ) جس کی طاقت اور قوت کا دنیا بھر میں ڈنکا بجا ہوا ہے، اس کو بھی اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے کے لئے نہتے مسلمان ہاتھ آئے۔ افغانستان جس کے پاس کوئی جنگی طیارہ نہیں تھا، نہ اس کے پاس جدید اسلحہ تھا، نہ اس کے پاس کوئی منظم فوج تھی، یا وہ ملک (عراق) جس پر سالہا سال سے پابندیاں عائد تھیں، جو دوا کی ایک پڑیا بھی باہر سے نہیں منگوا سکتا تھا اور جس کے طیاروں کو اُڑنے سے روکا ہوا تھا ان کے اوپر اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا، اور پھر امریکہ نے اکیلے حملہ نہیں کیا بلکہ برطانیہ اور دوسرے اتحادی ملکوں کی فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ جب تک سوویت یونین (روس) موجود تھا، اس وقت تک اس کو کسی ملک پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، لیکن جب اس کا مدِمقابل ختم ہو گیا اور نہتے مسلمان ہاتھ آگئے تو ان نہتوں پر حملہ کرنے اور ان پر اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔

ایسے حملے کب تک ہوں گے؟

لہٰذا جب تک اُمتِ مسلمہ اپنے آپ کو ایسا مدِمقابل نہیں بنائیں گے کہ دشمن جب اس پر حملہ کرنے کا ارادہ کرے تو اس پر جھرجھری آجائے، اس وقت تک یہ ہوتا رہے گا کہ کل افغانستان پر حملہ کیا

اور آج عراق پر حملہ کر دیا اور آئندہ کل کسی اور مسلم ملک پر حملہ کر دے گا۔ لیکن اگر اُمتِ مسلمہ قرآن کریم کے اس حکم پر عمل کر لے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ﴾(۱)

یعنی جو قوت تم تیار کر سکتے ہو وہ قوت تیار کرو۔ تو پھر انشاء اللہ دشمن ہمارے اُوپر بری نگاہ ڈالنے کی جرأت بھی نہیں کر سکے گا۔ البتہ یہ قوت اس کرپشن کے ماحول میں تیار نہیں ہو سکتی۔ یہ قوت اس وقت تیار ہوگی جب ہم اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کریں گے اور اس کرپشن کو ختم کریں گے۔

دلوں کو ان بیماریوں سے پاک کرلو

اور یہ ساری خرابی اس لئے پیدا ہو رہی ہے کہ ہمارے دلوں میں مال کی محبت بیٹھی ہوئی ہے، دل میں دنیاوی عیش وعشرت کی محبت بیٹھی ہوئی ہے، دل میں خود غرضی اور مفاد پرستی کی محبت بیٹھی ہوئی ہے، اس محبت نے ہمیں تباہ کیا ہوا ہے۔ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ﴾

یعنی فلاح پانے والے مؤمنین اپنے آپ کو ان بیماریوں سے پاک صاف بنانے والے ہیں۔ اگر تم اپنے آپ کو ان بیماریوں سے پاک صاف بنالو گے تو تم فلاح پا جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

❖❖❖

(۱) الانفال: ۶۰

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مراقبہ کیجئے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ. اَمَّا بَعْدُ!

پچھلے کئی روز سے حضرت والا کے ایک ملفوظ کا بیان چل رہا ہے، جس کا موضوع یہ ہے کہ دین پر چلنے کا جب کوئی شخص ارادہ کرے تو اس کے لئے اس کو کچھ محنت کرنی پڑتی ہے، اس ''محنت'' کو حضرات صوفیاء کرام ''مجاہدہ'' اور ''ریاضت'' کہتے ہیں، لیکن ان تمام مجاہدات اور ریاضتوں کا جو اصل مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے ساتھ مضبوط تعلق قائم ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں سما جائے۔ جب یہ تعلق قائم اور مضبوط ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں سما جاتی ہے تو پھر دین کے تمام احکام پر عمل آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ''محبت'' کے نتیجے میں مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتے ہیں، لہٰذا اصل چیز یہ ہے کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت مطلوب درجے میں پیدا ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس مطلوب درجے میں تعلق قائم ہو جائے۔ جب یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے تو باقی سارے کام خود بخود ہوتے رہتے ہیں۔

حضرت والا فرما رہے ہیں کہ ویسے تو محبت غیر اختیاری چیز ہے، کسی سے محبت ہے، کسی سے محبت نہیں ہے، یا ایک سے محبت زیادہ ہے، اور دوسرے سے محبت کم ہے، چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے ازواجِ مطہرات کے درمیان ہر طرح سے مثالی مساوات قائم فرمائی، اور ہر ایک کے ساتھ برابری کا سلوک فرمایا، لیکن اس سب کے باوجود آپ نے یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰھُمَّ ھٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَا اَمْلِكُ، وَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا لَا اَمْلِكُ))(۱)

☆ اصلاحی مجالس (۱۳۲/۶ تا ۱۵۳)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، کتاب النکاح عن رسول اللہ، باب ما جاء فی التسویۃ بین الضرائر، رقم: ۱۰۵۹، سنن النسائی، کتاب عشرۃ النساء، باب میل الرجل الی بعض نسائہ، رقم: ۳۸۸۲، سنن أبی داؤد، کتاب النکاح، باب فی القسم بین النساء، رقم: ۱۸۲۲، سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب القسمۃ بین النساء، رقم: ۱۹۶۱، مسند أحمد، رقم: ۲۳۹۵۹، سنن الدارمی، کتاب النکاح، باب فی قسمہ بین النساء، رقم: ۲۱۱۰

اے اللہ! جو میں نے تقسیم کیا ہے وہ اپنے اختیاری معاملات میں تقسیم کیا ہے کہ جتنے پیسے ایک بیوی کو دیئے، اتنے ہی پیسے دوسری بیویوں کو دیئے، جیسا کھانا ایک بیوی کو دیا، ویسا ہی کھانا دوسری بیویوں کو دیا، جیسے کپڑے ایک بیوی کو دیئے، ویسے ہی کپڑے دوسری بیویوں کو دیئے، جیسا برتاؤ ایک بیوی کے ساتھ کیا، ویسا ہی برتاؤ دوسری بیویوں کے ساتھ کیا، لہٰذا اختیاری معاملات میں تو میں نے عدل اور مساوات کی کوشش کرلی، لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جو میرے اختیار میں نہیں ہیں، اے اللہ! ان غیر اختیاری چیزوں پر مجھ سے مؤاخذہ مت فرمایئے گا۔

محبت اختیار میں نہیں

اس موقع پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا چیز آپ کے اختیار میں نہیں تھی؟ حضرات علماء کرام نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ وہ "محبت" ہے کہ یہ اختیار میں نہیں کہ تمام ازواجِ مطہرات سے محبت بھی برابر ہو، بلکہ محبت کسی سے زیادہ ہے، اور کسی سے کم ہے۔ یہ چیز انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ انسان وہ پیمانہ کہاں سے لائے، جس سے وہ یہ ناپے کہ میں جتنی محبت اس سے کرتا ہوں، دوسرے سے بھی اتنی محبت کروں۔ اس سے معلوم ہوا کہ "محبت" انسان کے اختیار میں نہیں، اور جب اختیار میں نہیں تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ محبت کس طرح قائم ہو؟ اس کے جواب میں حضرت والا فرمارہے ہیں کہ اگرچہ "محبت" اختیار میں نہیں، لیکن اس کے "اسباب" اختیار میں ہیں، جب ان اسباب کو اختیار کروگے تو وہ "محبت" دل میں پیدا ہوگی۔ اس ملفوظ میں حضرت والا ان "اسباب" کو بیان فرمارہے ہیں، ان میں سے پہلا سبب یہ بیان فرمایا کہ "کثرتِ ذکراللہ"، جتنا انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے گا اتنی ہی اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے دل میں پیدا ہوگی، اور "کثرتِ ذکراللہ" کے کچھ طریقے میں نے بتائے تھے کہ ادعیہ ماثورہ کا اہتمام کرے، اور دعا کی کثرت کرے، اور ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگے، اور تھوڑا سا وقت مخصوص کرکے اس میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام کرے، ان سب کا بیان تفصیل سے ہوگیا۔

اللہ کے انعامات اور اپنے اعمال کو سوچنا

آگے حضرت والا "محبت" پیدا ہونے کا دوسرا "سبب" بیان فرمارہے ہیں، چنانچہ فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنا"

اس میں حضرت والا نے دو چیزیں بیان فرمائیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کو سوچنا، دوسری یہ کہ پھر اپنے برتاؤ کو سوچنا، ان دونوں چیزوں کو سوچنا اللہ تعالیٰ کی "محبت" پیدا کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ

سے تعلق مضبوط کرنے کے لئے بڑا اکسیر ہے۔ ہر وقت ہم پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں مبذول ہیں، ہر وقت نعمتوں کی جو بارش برس رہی ہے، اس کا دھیان کرو، اس کو سوچو، ان نعمتوں کا ''مراقبہ'' کرو، ''مراقبہ'' اور ''دھیان'' کرنے سے سمجھ میں آئے گا، اس کے بغیر سمجھ میں بھی نہیں آئے گا۔

نعمتوں کا مراقبہ اور دھیان کیجئے

انسان صبح سے شام تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں پل رہا ہے، ہر ہر فرد بشر پر ہر آن اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں کی بارش ہورہی ہے، لیکن اس طرف دھیان اور خیال بھی نہیں جاتا کہ یہ بھی کوئی نعمت ہے جو ہمیں حاصل ہے، اس کے نتیجے میں انسان غفلت کا شکار رہتا ہے، لیکن جب انسان اہتمام اور دھیان کے ساتھ ان نعمتوں کی طرف توجہ کرتا ہے تو پھر ان نعمتوں کا استحضار ہوجاتا ہے، اور ان کی طرف نگاہ جانے لگتی ہے، اور اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، جو مجھے ہر وقت ہر آن حاصل ہیں۔

اللہ والوں کی صحبت سے دھیان حاصل ہوتا ہے

یہ دھیان، احساس اور استحضار اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان کسی اللہ والے کی صحبت میں بیٹھتا ہے، جب تک اللہ والے کی صحبت نصیب نہیں تھی تو غفلت میں وقت گزر رہا تھا، اس وقت اس طرف دھیان ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیا کیا نعمتیں میری طرف مبذول ہیں، بلکہ ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت کو لے کر روتا ہی رہتا تھا۔ ذرا سی کوئی تکلیف آگئی، ذرا سی پریشانی آگئی تو بس اسی کو لیے بیٹھا ہے، اس کو لے کر رورہا ہے۔ لیکن جب اللہ جل شانہ کسی اللہ والے کے ساتھ تعلق قائم فرمادیتے ہیں، اور انسان کسی اللہ والے کا دامن پکڑ لیتا ہے تو پھر یہ فہم اور سمجھ آتی ہے کہ ارے تو کس ذرا سی مصیبت کو لے کر بیٹھا تھا، تیرے اُوپر تو صبح سے لے کر شام تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش برس رہی ہے۔

قرآن کریم میں تدبر اور تفکر کی دعوت

اور قرآن کریم بھی تمہیں یہی دعوت دے رہا ہے کہ ذرا سوچا کرو، ذرا غور وفکر کیا کرو، جگہ جگہ قرآن کریم میں تدبر اور تفکر کا حکم دیا گیا ہے، اب لوگ اس تدبر اور تفکر کا غلط مطلب سمجھ بیٹھے، چنانچہ آج کل لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم بار بار تدبر اور تفکر کی دعوت دے رہا ہے، اس کا مطلب یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں خوب ترقی کرو یہ مطلب درست نہیں۔ ویسے تو سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی

کرنا کوئی بری بات نہیں، بلکہ جائز اور مستحب ہے، اور بعض حالات میں واجب ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جس تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں، بلکہ قرآن کریم کے تدبر اور تفکر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی نعمتوں کا، اور اس کی تخلیق کی حکمتوں کا، اور اس کی قدرتِ کاملہ کا، اور اس کی حکمتِ بالغہ کا انسان دھیان کرے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ رات کو تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے، اور یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾(۱)

"ان آسمانوں کی تخلیق میں، اور زمینوں کی تخلیق میں، اور دن رات کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں، (عقل والے کون لوگ ہیں؟ اس کی تفصیل آگے اللہ تعالیٰ نے خود فرمادی کہ عقل والے وہ لوگ ہیں) جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہونے کی حالت میں، اور بیٹھنے کی حالت میں، اور لیٹنے کی حالت میں، اور وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! (آپ نے یہ آسمان، زمین، یہ ستارے اور کائنات کی) تمام اشیاء بے فائدہ پیدا نہیں کیں (بلکہ ہمارے فائدے کے لئے اور ہماری مصلحت کے لئے پیدا فرمائی ہیں)"(۲)

ان میں سے ہر چیز ہمارے لئے ایک نعمت ہے، اے اللہ! جب آپ نے اس دنیا میں ہمیں یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں تو اے پروردگار! ہمیں اپنی رحمت سے جہنم کے عذاب سے بھی نجات عطا فرما۔ حضور اقدس ﷺ تہجد کے وقت یہ آیات تلاوت کیا کرتے تھے۔

یہ زمین میرے لئے، یہ آسمان میرے لئے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی ایک نظم ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ

---

(۱) آل عمران: ۱۹۰

(۲) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب ماجاء فی تخلیق السموات والأرض وغیرها، رقم:۶۸۹۸، صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب الدعاء فی صلاة اللیل وقیامه، رقم: ۱۲۸۰، سنن أبی داود، کتاب الصلاة، باب فی صلاة اللیل، رقم:۱۱۴۸، مسند أحمد، رقم:۲۳۸۵

یہ زمیں میرے لئے، یہ آسماں میرے لئے
چل رہا ہے دیر سے یہ کارواں میرے لئے

یہ سب کارواں اللہ تعالیٰ نے میرے لئے پیدا فرمایا ہے، یعنی میری مصلحت کے لئے، میرے فائدے کے لئے۔ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ یہ سورج تمہاری خدمت کر رہا ہے، یہ چاند تمہاری خدمت کر رہا ہے، یہ ستارے تمہاری خدمت کر رہے ہیں، یہ ہوائیں تمہاری خدمت کر رہی ہیں، یہ سمندر، یہ دریا، یہ پہاڑ، یہ جنگل، غرض ہر چیز تمہارے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾(۱)

''جو کچھ اس نے زمین میں پیدا کیا ہے، وہ تمہارے لئے پیدا کیا ہے''

یہ سورج میرے لئے ہے

روزانہ صبح کے وقت سورج نکلتا ہے، اور اپنی کرنیں پھیلاتا ہے، اور دھوپ ڈالتا ہے، اور شام کو غروب ہوتا ہے، یہ سب کیوں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے انسان! یہ سورج جو اتنی بڑی مخلوق ہے، یہ میں نے تیرے لئے پیدا کی ہے، تاکہ تجھے روشنی حاصل ہو، تجھے گرمی حاصل ہو، اور اس کی روشنی میں تو اپنی زندگی کے مقاصد پورے کرے، اور اس سورج کو اتنے فاصلے پر رکھا کہ اس کا فائدہ تو تمہیں حاصل ہو جائے، لیکن اس کے نقصان سے تم محفوظ رہو۔ پھر اس سورج کی کرنوں میں مفید اجزاء بھی ہیں، اور مضر اجزاء بھی ہیں، اب مضر اجزاء سے انسان کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کے اردگرد ایک ''چھلنی'' لگادی ہے، جس کو آج کل ''اوزون'' (Ozone) کہا جاتا ہے۔ یہ چھلنی بڑی مہین اور لطیف ہے، اس چھلنی سے سورج کی کرنیں چھن کر اس کے صرف مفید اجزاء انسان تک پہنچتے ہیں، اور مضر اجزاء روک دیئے جاتے ہیں۔ آج کے دور میں مدتوں کے بعد، صدیوں کے بعد یہ ''اوزون'' دریافت ہوا، ورنہ انسان کو پتہ بھی نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت ہی وہ چھلنی لگادی تھی، ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ ہمارے فائدے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں کیا کچھ نظام مقرر فرما رکھا ہے، ایک ایک چیز کی ماہیت اور حقیقت پر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ صرف ایک چیز کے اندر اللہ تعالیٰ کی لاکھوں نعمتیں موجود ہیں۔

اپنے جسم کے اندر غور کیجئے

یہ تو ''آفاق'' کی باتیں ہیں، ارے تم جسم پر غور کرلو، سر سے لے کر پاؤں تک، اور بال سے

(۱) البقرة: ۲۹

لے کر ناخن تک، تمہارے جسم کا ایک ایک حصہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ، اس کی حکمتِ بالغہ، اس کی رحمتِ واسعہ کا کرشمہ ہے، تمہیں تو پتہ بھی نہیں کہ تمہارے جسم میں کیا ہو رہا ہے، آج تک تم اپنے جسم کو بھی پوری طرح دریافت نہیں کر سکے، تمہارے جسم کا کون سا حصہ کیا عمل کر رہا ہے؟ جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا، اس وقت سے لے کر آج تک اپنے وجود کی تحقیق میں مصروف ہے، چنانچہ طب اور میڈیکل سائنس کا ایک شعبہ اسی تحقیق میں مصروف ہے کہ اس چھ فٹ کے وجود میں اللہ تعالیٰ نے کیا کارخانہ لگا رکھا ہے، لیکن آج تک یہ کارخانہ کلی طور پر دریافت نہیں ہو سکا، اور جو کچھ دریافت ہوا، اس سے پتہ چلا کہ یہ عجیب وغریب کارخانہ ہے، دنیا کا کوئی کارخانہ، کوئی فیکٹری، کوئی مِل ایسی عجیب و غریب نہیں ہے، جیسے انسان کے جسم کی فیکٹری ہے، جو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے، انسان اس فیکٹری کو اِدھر سے اُدھر لئے پھر رہا ہے، اس کو استعمال کر رہا ہے، اس کے ایک ایک عضو سے فائدہ اُٹھا رہا ہے، لیکن خود اس کو پتہ نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

بھوک کب لگتی ہے؟

انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے، پھر بھوک مٹانے کے لئے کھانا کھا رہا ہے، ذائقہ اور لذت حاصل کرنے کے لئے کھانا کھا رہا ہے، اس بیوقوف کو یہ پتہ نہیں کہ اس وقت اس سرکاری مشین کو تیل کی ضرورت ہے، اس کو ایندھن کی ضرورت ہے، یہ تیل کب ختم ہو رہا ہے، اور کتنا باقی ہے، اس کو جاننے کے لئے کوئی میٹر تو لگا ہوا نہیں ہے، گاڑی کے اندر تو تم نے میٹر لگا دیا ہے، جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ اب اس گاڑی کا پٹرول ختم ہونے والا ہے، اس لئے اس میں پٹرول ڈلوا دو۔ اس جسم کے اندر اللہ تعالیٰ نے اتنا مزیدار میٹر لگا دیا ہے کہ جب اس جسم کو ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کو بھوک لگ جاتی ہے، خود بخود کھانا کھانے کو دل چاہتا ہے۔ یہ بیوقوف انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ میں بھوک مٹانے کے لئے کھانا کھا رہا ہوں، اور لذت حاصل کرنے کے لئے کھانا کھا رہا ہوں۔

''ذائقہ'' ایک عظیم نعمت

پھر اللہ تعالیٰ نے اس منہ کے اندر ایک ذائقہ رکھ دیا، تاکہ اس ذائقے کو حاصل کرنے کے لئے خود انسان کھانے کی طرف مائل ہو، اور اس ذائقے کی تسکین کے لئے کھانا کھائے۔ اب یہ انسان سمجھ رہا ہے کہ میں ذائقے کی تسکین کے لئے کھانا کھا رہا ہوں، لیکن حقیقت میں اس کے جسم کو ''غذا'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ ذائقہ تمہاری چھوٹی سی زبان میں رکھ دیا، اگر یہ مزیدار کھانا تم ناک میں رکھ لو، یا جسم کے کسی اور حصہ میں لگاؤ تو کیا کوئی ذائقہ محسوس ہوگا؟ کیا یہ پتہ چلے گا کہ یہ کھٹا ہے یا میٹھا

ہے؟ کچھ بھی نہیں، لیکن اس چھوٹی سی زبان میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لعاب پیدا فرما دیئے کہ اس لعاب کے نتیجے میں ذائقہ معلوم ہوتا ہے، اور کھانے میں مزہ آتا ہے، اگر وہ ذائقہ خراب ہو جائے تو اچھی خاصی میٹھی چیز بھی کڑوی معلوم ہوتی ہے۔

اگر یہ ''ذائقہ'' خراب ہو جائے تو

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مجھے شاید نزلہ ہو گیا تھا، اس کے نتیجے میں ذائقہ بالکل رخصت ہو گیا، چنانچہ میں ایک جگہ دعوت میں گیا، کسی نے مجھے مرچوں والا قیمہ لا کر دیا، اور اس کے بعد میٹھی کھیر لا کر دی۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ قیمہ کھانے میں اور کھیر کھانے میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا، نہ مرچیں محسوس ہوئیں، اور نہ مٹھاس محسوس ہوئی، بس ویسے ہی حلق سے اُتار لیا۔ عام حالات میں اللہ تعالیٰ نے اس زبان کے اندر ایسا ذائقہ رکھ دیا کہ کھانے میں لذت آرہی ہے، مزہ آرہا ہے، اسی ذائقے کے حصول کی خاطر انسان متنوع اور مختلف قسم کی اشیاء بنا رہا ہے، ایک بڑی مخلوق صرف تمہارے اس ذائقے کی تسکین کے لئے لگی ہوئی ہے، اور اشیاء میں چٹخارہ پیدا کرنے کے لئے لگی ہوئی ہے۔ اب آدمی تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں چٹخارے کی تسکین کر رہا ہوں، حقیقت میں اس کے نتیجے میں اس کے بدن کو غذا مل رہی ہے، اس کے بدن کو ایندھن مل رہا ہے۔

''معدہ'' میں خودکار مشین لگی ہوئی ہے

اور پھر تم نے تو ذائقہ حاصل کرنے کی خاطر ہر چیز کو منہ میں ڈال کر اس کو حلق سے اُتار لیا، افطار کے وقت دیکھیں کہ آپ کیا کرتے ہیں، ابھی میٹھی چیز کھائی، ابھی کھٹی چیز کھائی، اب پھلکیاں کھالیں، اب پکوڑے کھالیے، اب کھجور کھالی، سب کچھ اندر بھر لیا، اس کی کوئی فکر نہیں کی کہ اندر کیا ہوگا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے جسم کے اندر ایک کارخانہ لگا دیا ہے، جو ہر ہر چیز کو الگ کر رہا ہے، اور چھانٹی کر رہا ہے۔ یہ میرا بندہ اپنے ذائقے کے حصول کے لئے سب کچھ کھا گیا ہے، اس لئے ہم نے اندر ایک خودکار مشین لگا دی ہے، جو ہر چیز کو الگ کر رہی ہے۔ جس چیز سے خون بننا چاہئے، اس سے خون بن رہا ہے، جس چیز سے جسم کو توانائی ملنی چاہئے، اس سے توانائی مل رہی ہے، جو فضلہ اور بیکار ہے، وہ خارج ہو رہا ہے، ایک طرف سے غذا آرہی ہے، اور دوسری طرف سے خارج ہو رہی ہے، ایک مکمل نظام قائم ہے، جو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے۔

بغیر طلب کے یہ سب کچھ دے دیا

اگر اس نظام کی ایک کل ذرا سی ڈھیلی ہو جائے تو آدمی بے چین اور پریشان ہو جاتا ہے، اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے، اور اب ڈاکٹروں کے پیچھے پھر رہا ہے۔ کیا تم نے اللہ میاں سے کہا تھا کہ ہم کھانا کھائیں گے تو اس کھانے کے نظام کو ٹھیک کر دیجئے گا؟ ہمارے جسم کے اندر ایسا جگر بنا دیجئے گا، ایسا گردہ اور ایسا معدہ بنا دیجئے گا، کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے ان چیزوں کے بنانے کی فرمائش کی تھی؟ نہیں، بلکہ اسی نے محض اپنی رحمت سے اپنے فضل وکرم سے یہ سارا کارخانہ تمہارے لئے بنا دیا۔ اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ما نبودیم و تقاضہ ما نبود لطف او ناگفتۂ ما می شنود

یعنی نہ ہم موجود تھے، اور نہ ہماری طرف سے کوئی فرمائش اور تقاضا تھا، اسی کے کرم نے ہماری وہ بات سن لی جو ہم نے کہی نہیں تھی۔ ہماری نہ کہی ہوئی بات سن کر ہمارے لئے یہ کارخانہ بنا دیا۔

''آنکھیں'' عظیم نعمت ہیں

یہ ایسا عجیب وغریب کارخانہ ہے کہ دنیا کا کوئی کارخانہ اس کی نظیر نہیں ہے، نہ اس کی نظیر مل سکتی ہے، اگر کوئی انسان یہ کارخانہ بنانا چاہے تو اربوں کھربوں میں بھی یہ کارخانہ نہیں بن سکتا۔ اب جو صاحبِ نظر ہے وہ ان نعمتوں کو دیکھتا ہے، ان کا استحضار کرتا ہے، ان کے بارے میں وہ سوچتا ہے کہ یا اللہ! آپ نے ہمیں یہ آنکھ عطا فرمائی ہے کہ جب سے ہم پیدا ہوئے ہیں، اس وقت سے لے کر آج تک حسین مناظر اس آنکھ سے دیکھ رہے ہیں، اور اس آنکھ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، کبھی تمہارے ذہن میں اس کے نعمت ہونے کا خیال آیا؟ کبھی تم نے اس نعمت کا شکر ادا کیا؟ اور یہ کہا: یا اللہ! آپ نے یہ آنکھ دی، اس میں بینائی اور روشنی عطا کی، ہم نے شکر نہیں ادا کیا، بلکہ غفلت کے عالم میں اس عظیم نعمت کو استعمال کر رہے ہیں، بے پروائی کے عالم میں اس کو استعمال کر رہے ہیں۔ ہاں! خدا نہ کرے کبھی یہ بینائی چلی جائے، یا اس میں کمی واقع ہو جائے، تب پتہ چلے گا کہ یہ کتنی بڑی نعمت تھی جو ہم سے چھن گئی، لیکن اس وقت لاپروائی سے استعمال کر رہے ہیں، پھر اس کے استعمال میں حلال وحرام سب ایک کر رکھا ہے۔ لہٰذا کبھی سوچا کرو کہ یہ آنکھ کتنی بڑی نعمت ہے، کیا ہمارے بس میں تھا کہ ایسی بینائی والی چیز کسی طرح حاصل کر لیتے؟ جب چلی جاتی ہے تو لاکھوں کروڑوں خرچ کرنے کے بعد بھی واپس نہیں آتی، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کے لئے دو پہرے دار بٹھا دیئے، یہ دو پلکیں پہرے دار ہیں، جب کوئی چیز آنکھ کی طرف آتی ہے تو یہ پلکیں اس کو روک لیتی ہیں، تاکہ براہِ راست آنکھ پر ضرب نہ

لگے، اس لئے کہ یہ آنکھیں اتنی نازک ہیں کہ اگر ذرا سی بھی کوئی چیز لگ جائے گی تو خراب ہو جائیں گی، ایسی نعمت کے بارے میں بیٹھ کر غور کیا کرو، سوچا کرو، اور اس پر شکر ادا کیا کرو۔

''کان'' اور ''زبان'' عظیم نعمتیں ہیں

یہ کان اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، ان لوگوں سے اس کی قدر پوچھو جو سننے کی قوت سے محروم ہیں، یہ زبان اور قوتِ گویائی عطا فرمائی، اپنے دل کی بات کہنے کا ذریعہ عطا فرمایا، ورنہ تمہارے دل میں جذبات اُمڈتے رہتے، اور زبان سے کچھ نہ کہہ سکتے۔ اس کی قدر ان لوگوں سے پوچھو جن کی زبان پر فالج گر جاتا ہے، وہ لوگ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں، اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، لیکن اظہار نہیں کر پاتے۔ آپ کو یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے مفت میں عطا فرما رکھی ہے۔ بہر حال! سر سے لے کر پاؤں تک اپنے وجود ہی میں غور کر لو کہ اللہ تعالیٰ نے کیا کیا نعمتیں عطا فرما رکھی ہیں۔

رات کو سونے سے پہلے یہ عمل کر لو

ان نعمتوں کا مراقبہ کیا کرو، اس مراقبہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس ذات نے یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں، اس کی محبت دل میں پیدا ہوگی۔ اس مراقبہ کا بہترین طریقہ جو حضرت والا نے بیان فرمایا، یہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے پانچ دس منٹ اس مراقبہ کے لئے مختص کر لو، اور اس مراقبہ میں ان نعمتوں کا دھیان کرو جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہوئی ہیں۔ ایک ایک نعمت کا دھیان کر کے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جاؤ، اے اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے آنکھیں عطا فرمائی ہیں، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اے اللہ! آپ نے میری آنکھ میں صحت اور بینائی عطا فرمائی ہے، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے کان عطا فرمائے ہیں، اور اس میں شنوائی کی طاقت عطا فرمائی، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اے اللہ! آپ نے زبان عطا فرمائی، اور اس میں گویائی کی طاقت عطا فرمائی، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے یہ دانت عطا فرمائے، جو صحیح سالم ہیں، اور یہ کھانے کا کام دے رہے ہیں، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے یہ ہاتھ عطا فرمائے ہیں، جن کے ذریعے میں اپنے کام انجام دیتا ہوں، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے پاؤں عطا فرمائے، ان میں چلنے کی طاقت عطا فرمائی، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اس طرح ایک ایک عضو کا تصور کر کے اور ان کے اندر جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہیں، ان کا تصور کرو، اور پھر ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

گردوپیش کی نعمتوں پر شکر

پھر اپنے اِردگرد کے ماحول پر نظر ڈالو اور یہ کہو کہ اے اللہ! آپ نے مجھے گھر عطا فرمایا، جو عافیت کا گھر ہے، اور نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو گھر کے بغیر زندگی گزار رہے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے آرام دہ بستر عطا فرمایا، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے بیوی بچے عطا فرمائے جو محبت کرنے والے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، ایک ایک چیز کی طرف دھیان لے جاؤ، اور پھر ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

پریشانی کے وقت نعمتوں کا استحضار

انسان پر کوئی نہ کوئی تکلیف اور پریشانی بعض اوقات آجاتی ہے، لیکن انسان کا کام یہ نہیں کہ ان پریشانیوں کو لے کر بیٹھ جائے، اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بھول جائے، بلکہ عین پریشانی اور عین تکلیف کے وقت بھی اگر غور کرو گے تو اس وقت میں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس مصیبت اور تکلیف کے مقابلے میں ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ نظر آئیں گی، مگر چونکہ انسان بے صبرا ہے، جب کوئی تکلیف آتی ہے تو اسی کو لے کر بیٹھ جاتا ہے، اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔

میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک استاذ تھے، حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو ''میاں صاحب'' کے نام سے مشہور تھے، بڑے عجیب بزرگ تھے، اور پیدائشی ولی تھے، میرے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، میرے دادا فرمایا کرتے تھے کہ یہ پیدائشی ولی ہیں، اس لئے کہ یہ بچپن سے میرے پاس پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے، اس وقت سے لے کر آج تک کبھی انہوں نے جھوٹ نہیں بولا۔ جب میں بچوں کو پڑھا رہا ہوتا، کوئی بچہ کوئی شرارت کر لیتا تو میں ڈانٹ کر پوچھتا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ سب بچے خاموش دم بخود ہو جاتے، لیکن یہ کھڑے ہو جاتے اور کہتے کہ استاد جی! مجھ سے یہ غلطی ہو گئی، اس وقت بھی کبھی ان کی زبان پر جھوٹ نہیں آیا۔

بیماری میں شکر کا انداز

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ مجھے اطلاع ملی کہ وہ بیمار ہیں، میں ان کی عیادت کے لئے گیا، جا کر دیکھا تو شدید بخار کے اندر تپ رہے ہیں، شدید بے چینی کے اندر ہیں۔

میں نے پوچھا کہ حضرت کیسی طبیعت ہے؟ فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری آنکھیں صحیح کام کررہی ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے کان بہت اچھی طرح کام کررہے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اللہ کا شکر ہے کہ گویائی کی قوت بحال ہے، الحمدللہ جگر، دل اور معدہ ٹھیک ہے، بس بخار ہورہا ہے، دعا کردیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دور فرمادیں۔

دیکھئے! جو تکلیفیں نہیں تھیں، ان کا ذکر کرکے پہلے ان پر شکر ادا فرمایا، پھر آخر میں بخار کا ذکر کیا۔ یہ وہ لوگ تھے کہ عین تکلیف کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں مبذول ہیں، ان کی طرف دھیان جارہا ہے، اور ان پر شکر ادا ہورہا ہے، اس کے بعد تکلیف کا بھی تھوڑا سا تذکرہ کردیا، اور اس کو بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کردیا، یہ ہے ایک شکر گزار بندے کا طرزِ عمل۔

نعمتوں پر شکر ادا کرو

ہم جیسوں کا تو یہ حال ہے کہ جب ذرا سی تکلیف آجائے تو اس وقت ہم ساری نعمتیں بھلا بیٹھتے ہیں، اور اس تکلیف کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں، اسی پر شکوہ شکایت کرنا شروع کردیتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾(۱)

''میرے بندوں میں شکر گزار بندے بہت کم ہیں''

جو نعمتیں میں نے ان پر ہر وقت مبذول کر رکھی ہیں، ان کا احساس ہی نہیں ہے، ان نعمتوں کا دھیان ہی نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ نعمتوں کو یاد کرو، اور ان پر شکر ادا کرو، جو تکلیفیں تم پر آرہی ہیں، بیشک ان کو بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرو، اور کہو کہ اے اللہ! میں کمزور ہوں، مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہورہی ہے، آپ اپنے فضل وکرم سے میری اس تکلیف کو دور کردیجئے، آپ نے جہاں اتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، اس تکلیف کے دور ہونے کی نعمت بھی عطا فرمادیں، لیکن خدا کے لئے ان موجودہ نعمتوں کی ناشکری نہ کریں۔

''دانت'' ایک عظیم نعمت ہے

ہماری ایک بہن کی جب عمر زیادہ ہوگئی، اور ان کے دانت ٹوٹنے لگے، ایک مرتبہ وہ اپنا دانت نکلوا کر واپس آئیں تو وہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہنے لگیں کہ ابا جی! یہ دانت بھی عجیب چیز ہیں کہ یہ آتے وقت بھی تکلیف دیتے ہیں اور جاتے وقت بھی تکلیف دیتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ جب

(۱) سبأ: ۱۳

بچپن میں دانت نکلتے ہیں تو اس کے نتیجے میں بچے کو دست آرہے ہیں، کبھی بخار آرہا ہے، اور بڑی عمر میں جب یہ ٹوٹتے ہیں تو اس وقت بھی یہ بہت تکلیف دیتے ہیں۔حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی بات سن کر ایک آہ بھری، اور فرمایا: خدا کی بندی! تمہیں ان دانتوں کی دو ہی چیزیں یاد رہیں کہ انہوں نے آتے وقت بھی تکلیف دی، اور جاتے وقت بھی تکلیف دے رہے ہیں، اور پچاس ساٹھ سال کی درمیانی مدت میں ان سے جو مزہ لیا ہے، ان سے جو راحت حاصل کی ہے، جو ذائقہ حاصل کیا ہے، اس کا کبھی دھیان اور خیال نہیں آیا؟ ٹھیک ہے کہ آتے وقت بھی تکلیف ہوئی، اور جاتے وقت بھی تھوڑی سی تکلیف ہورہی ہے، لیکن سالہا سال تک اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس چکی سے منوں اور ٹنوں خوراک کو پیسا ہے، اور اس کو اپنے جسم کا جز بنایا ہے، اس کی طرف دھیان نہیں۔بس ذرا سی تکلیف آجاتی ہے تو ہم اس کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بھول جاتے ہیں۔

اللہ والوں کی صحبت کا فائدہ

اللہ والوں کی صحبت سے یہی بات حاصل ہوتی ہے کہ وہ انسان کا زاویہ نگاہ درست کر دیتے ہیں، اب تک نگاہ تکلیفوں پر، مصیبتوں پر اور پریشانیوں پر جارہی تھی، اللہ والے کی صحبت کے نتیجے میں نعمت پر جانے لگتی ہے۔ٹھیک ہے جو تکلیفیں ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر دیں، اور کہہ دیں کہ یا اللہ! میں کمزور ہوں، میں اس تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتا، اے اللہ! اپنی رحمت سے اس کو دور فرما دیجئے، لیکن جو تمہیں نعمتیں دی ہیں، کم از کم ان کو تو مت بھولو۔

کیا محسن سے محبت نہیں ہوگی؟

لہٰذا رات کو سونے سے پہلے تھوڑی دیر بیٹھ کر نعمتوں کا جائزہ لو، اپنے جسم پر ہونے والی نعمتوں کا، اپنے گردوپیش پر ہونے والی نعمتوں کا، اپنے گھر والوں پر ہونے والی نعمتوں کا جائزہ لو، اور ان میں سے ایک ایک پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اسی کا نام ''مراقبہ'' ہے۔یہ مراقبہ بڑا اکسیر ہے، روزانہ کر کے دیکھو، اس لئے کہ جب روزانہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مراقبہ کرو گے تو اس کے نتیجے میں خود بخود اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی۔فرض کرو کہ کوئی شخص تمہارے دروازے پر روزانہ پیسے پھینک کر چلا جاتا ہے، تم اس کو اُٹھا کر اپنی ضروریات پوری کر لیتے ہو، اور اس طرح تمہارا کام چل رہا ہے، اب خود بخود تمہارے دل میں اس شخص کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو جائے گا کہ یہ شخص جو روزانہ پیسے ڈال کر جارہا ہے، اور میری حاجتیں پوری کر رہا ہے، اس کو دیکھوں تو سہی، پھر اس کو دیکھنے کا موقع ملے یا نہ ملے، لیکن اس کی محبت دل میں ضرور پیدا ہوگی۔وہ ایک انسان جو دن میں صرف ایک مرتبہ تمہارے دروازے پر

پیسے ڈال گیا، اور اس کے ذریعے تمہاری حاجتیں پوری ہوگئیں، جب اس کا تصور کرکے تمہارے دل میں اس کی محبت پیدا ہورہی ہے، تو وہ ذات جو ہر وقت تمہارے اُوپر نعمتوں کا فیضان نچھاور کررہی ہے، وہ ذات اگرچہ نظر نہیں آرہی ہے، لیکن کیا تم اس سے محبت نہیں کروگے؟ کیا اس کی نعمتوں کے تصور سے اس کے ساتھ محبت پیدا نہیں ہوگی؟ اس لئے روزانہ رات کو دس منٹ کے لئے نعمتوں کے استحضار کا مراقبہ کیا کرو، اور ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرو۔

شکر ادا کرنے کا عجیب وغریب واقعہ

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ چیز اپنے ایک عزیز سے سیکھی، وہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے بستر پر بیٹھے ان الفاظ کی رٹ لگاتے، اور بار بار فرماتے، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ آپ رات کو سونے سے پہلے یہ کیا کرتے ہیں؟ جواب میں فرمایا: ہاں بھائی، سارے دن تو نعمتوں پر شکر ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا، اس لئے میں رات کو سونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرتا ہوں، اور ایک ایک نعمت کا دھیان کرکے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے شکر ادا کرنے کا عجیب طریقہ بیان فرمادیا۔

بہرحال، رات کو سونے سے پہلے صرف دس منٹ اس کام کے لئے نکال لو، اور اس وقت چھوٹی چھوٹی نعمتوں کا بھی تصور کرو، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، یہ عمل تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرے گا، اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت اور تعلق پیدا ہوجائے گا تو پھر سب کچھ آسان ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اللہ تعالیٰ کی محبت
پیدا کرنے کے اسباب اور طریقے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، اَمَّا بَعْدُ!

یہ مضمون کئی روز سے چل رہا ہے، اس کا موضوع ہے "تعلق مع اللہ کی اہمیت اور اس کو پیدا کرنے کا طریقہ" اللہ جل شانہ کی محبت سارے دین کی بنیاد ہے۔ حضرت والا نے اللہ کی محبت پیدا کرنے کے طریقوں میں پہلا طریقہ بیان فرمایا "کثرت ذکر اللہ" اس کی تھوڑی سی تفصیل پچھلے بیانات میں عرض کردی۔ دوسری چیز جس کا گذشتہ کل تھوڑا سا ذکر ہوا تھا، وہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اپنے برتاؤ کو سوچنا"، اللہ جل شانہ کی وہ نعمتیں جو ہر وقت ہر انسان پر مبذول ہیں، ان کا تصور اور دھیان کرنے کے نتیجے میں اپنے محسن حقیقی کی محبت دل میں پیدا ہوگی، ظاہر ہے کہ جو شخص ہر وقت دوسرے کا زیر بارِ احسان ہو، اور دوسرا شخص اس پر بے مانگے بھی احسان کررہا ہے تو طبعی بات یہ ہے کہ اس شخص سے محبت پیدا ہوگی۔

ان کے انعامات سب پر عام ہیں

اللہ تعالیٰ جن کے انعامات کا سلسلہ غیر متناہی ہے، جب ان انعامات کا بار بار تصور کیا جائے گا، تو ان کی محبت دل میں پیدا ہوگی، بات صرف دھیان کی ہے، ان کے انعامات تو مسلسل جاری ہیں، تم شکر کرو، یا ناشکری کرو، ان کے انعامات میں تو کمی نہیں ہے، ان کی نعمتوں میں کمی نہیں آرہی ہے، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ادیم زمین سفرۂ عام اوست
بریں خوانِ نعمت چہ دشمن چہ دوست

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پوری زمین کو ایسا عام دسترخوان بنا رکھا ہے کہ ساری مخلوق اس کی نعمتوں سے مستفید ہورہی ہے، اور اس دسترخوان پر دشمن اور دوست کی کوئی تفریق نہیں، دشمن کو بھی اسی

☆ اصلاحی مجالس (۶/۱۵۶ تا ۱۸۴)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

طرح دے رہے ہیں، جس طرح دوست کو دے رہے ہیں، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ظاہری نعمتیں مسلمان اور کافر سب پر جاری ہیں، بلکہ بعض اوقات کافروں پر زیادہ ہو رہی ہیں، وہ مسلمانوں سے زیادہ خوشحال ہیں، زیادہ ترقی کر رہے ہیں، ان کے پاس زیادہ پیسہ ہے، مال و دولت زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں کہ فلاں دشمن مجھے جھٹلا رہا ہے، میری توہین کر رہا ہے، میری گستاخی کر رہا ہے، میرے وجود کا بھی منکر ہے، پھر بھی اللہ تعالیٰ اس کو نعمتیں دے رہے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

دوستوں کو تنگی اور دشمنوں کو فراخی

بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں اپنے پیارے محبوب بندوں کو اس دنیا میں تنگی کا شکار کیا جاتا ہے، اور دشمنوں کو نوازا جاتا ہے، چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست

کس را چرا و چوں نہ رسد در قضائے ما

یعنی بعض اوقات ہم دشمن کو پالتے ہیں، اور اپنے دوست کو مارتے ہیں، قتل کرا دیتے ہیں، جیسے سامری جادوگر کو جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ پالا جا رہا ہے، اور دوسری طرف حضرت الیاس علیہ السلام کو آروں سے چروا دیا گیا۔ لہٰذا دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دوست، دشمن، مسلم اور کافر سب پر جاری ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اندر تو کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی ہے۔

ان نعمتوں کی طرف دھیان نہیں

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج

ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

وہ تو ہر وقت جاری ہیں، بات صرف دھیان کی ہے کہ ہم اس کی ان نعمتوں کی طرف سے غافل ہیں، اس کا دھیان نہیں کرتے، اس کا استحضار نہیں کرتے، اس کی وجہ سے ان نعمتوں کا خیال نہیں کرتے، اگر اللہ تعالیٰ ان کا دھیان کرنے کی توفیق عطا فرما دے، اور ان کو یاد کرنے کی توفیق عطا فرما دے، تو پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی ان نعمتوں کو سوچے، اور پھر بھی اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا نہ ہو۔ اس لئے کل میں نے عرض کیا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے نعمتوں کا استحضار کر کے اس پر شکر ادا کیا کرو۔ بہرحال! محبت پیدا کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو سوچنا۔

تیسرا طریقہ: اپنے برتاؤ کو سوچنا

اس کے بعد حضرت فرماتے ہیں کہ ساتھ میں اپنے برتاؤ کو بھی سوچے، یعنی یہ سوچے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یہ عالم ہے کہ بارش کی طرح ہر لمحے برس رہی ہیں، اور دوسری طرف میرا برتاؤ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذرا سی عبادت کا حکم دیا ہے، اسی میں سستی کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ نے جس گناہ سے بچنے کا حکم دیا تھا، اس سے بچنے میں سستی کر رہا ہوں، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

کارسازِ ما بسازِ کارِ ما　　فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

یعنی ہمارا کارساز تو دن رات ہمارے کام میں لگا ہوا ہے، ہماری حاجتوں کو پورا کر رہا ہے، ہم پر اپنی نعمتوں کو نازل فرما رہا ہے، لیکن جو کام ہمارے سپرد کیا گیا تھا، وہ کام ہمارے لئے آزار بنا ہوا ہے، ہم اس کو اپنے لئے مصیبت سمجھ رہے ہیں کہ یہ نماز پڑھنا، یہ روزے رکھنا اور گناہوں سے بچنا، ان کو مصیبت سمجھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے جواب میں بندے کا طرزِ عمل کتنی ناشکری والا طرزِ عمل ہے، اگر انسان یہ سوچے کہ میرے اس طرزِ عمل کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے اُوپر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے، تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہوگی۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور پھر اپنے برتاؤ کو سوچو۔

اپنی حیثیت میں غور کرو

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت کا ایک اور مطلب بھی ہوسکتا ہے جو حضرت والا نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے، جیسا کہ ہمارے بھائی کلیم صاحب نے بتایا کہ انہوں نے حضرت کے وعظ میں یہ پڑھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنے سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اپنی حیثیت میں غور کرنے سے بھی دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ اپنی حیثیت میں غور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی عظمت، اس کا جلال، اس کی کبریائی، اس کی رحمتیں، اس کی قدرتِ کاملہ، اس کی حکمتِ بالغہ میں غور کرے، اور دوسری طرف اپنی کم حیثیتی کا تصور کرے کہ میری تو کوئی حقیقت نہیں، میں تو کسی کام پر قادر نہیں، میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب ان کی عطا ہے، ورنہ میرے پاس تو کچھ نہیں تھا، نہ میں اپنے وجود کو خود سے وجود میں لا سکتا تھا، نہ میں اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتا تھا، نہ یہ شکل و صورت، نہ یہ صحت، نہ یہ علم حاصل کر سکتا تھا، ان میں سے کچھ بھی میرے پاس نہیں تھا، یہ سب کچھ انہی کی عطا ہے، اور وہ جب چاہیں چھین لیں، واپس لے لیں۔

اس سے اللہ کا شکر اور محبت بڑھتی ہے

اور جب سب کچھ انہی کی عطا ہے تو پھر میں کس بات پر تکبر کروں، کس بات پر اتراؤں، کس بات پر عجب اور خود پسندی کے اندر مبتلا ہوں، اس لئے کہ اپنی ذات میں تو میرے پاس کچھ بھی نہیں، یہ ہے ''اپنی حیثیت کو سوچنا''، اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ جتنا اپنی کم حیثیتی کا احساس ہوگا، اتنا ہی اللہ جل جلالہ کی نعمتوں کی عظمت کا احساس ہوگا۔ اگر انسان اپنے آپ کو ان نعمتوں کا مستحق سمجھے تو وہ سوچے گا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ کام میرے ساتھ کرنا ہی چاہئے تھا، اللہ تعالیٰ کو یہ نعمتیں مجھے دینی تھیں، ایسا انسان اللہ تعالیٰ کا کیا شکر ادا کرے گا، اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کہاں سے پیدا ہوگی؟ لیکن اگر انسان یہ سوچتا ہے کہ میں بے حیثیت ہوں، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نعمتیں میرے اُوپر نازل ہو رہی ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ کے شکر کا اور اس کی محبت کا احساس دل میں پیدا ہوگا۔

ایک بزرگ اور متکبر کا واقعہ

جب دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم بڑے آدمی ہیں، ہمیں شان وشوکت حاصل ہے، تکبر کے احساسات دل میں پیدا ہو رہے ہیں، اس وقت انسان دوسرے سے کہتا ہے کہ ''جانتے نہیں ہم کون ہیں؟'' چنانچہ ایک شخص سے ایک بزرگ نے کوئی اصلاح کی بات کہی تو اس نے پلٹ کر کہا کہ ''جانتے نہیں ہم کون ہیں؟'' یعنی ہم تو اتنے بڑے آدمی ہیں، تم ہماری اصلاح کرتے ہو؟ جواب میں ان بزرگ نے فرمایا کہ ہاں! میں جانتا ہوں تم کون ہو، تمہاری حقیقت یہ ہے:

أَوَّلُكَ نُطْفَةٌ مَذِرَةٌ وَاٰخِرُكَ جِيْفَةٌ قَذِرَةٌ

وَاَنْتَ فِيْمَا بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ

یعنی تمہاری ابتداء ایک گندہ اور ناپاک نطفہ اور منی کا قطرہ تھا، اصل تو تمہاری یہ ہے، اور آخری انجام تمہارا یہ ہے کہ تم بدبودار مُردار بننے والے ہو، ایسے بدبودار کہ تمہارے گھر والے بھی چوبیس گھنٹے تمہیں اپنے گھر میں رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، وہ تمہارے مرنے پر روئیں گے، لیکن رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے، وہ یہ کہیں گے کہ اس میں سے جو بدبو اُٹھے گی اس کو برداشت کرنا ہمارے بس میں نہیں، لہٰذا فوراً قبرستان لے جا کر قبر میں ڈال دیں گے، اور پیدائش سے لے کر وفات تک جو درمیان کا زمانہ ہے، اس زمانے میں تو ہر وقت نجاست کا بوجھ اُٹھائے پھر رہا ہے، یہ کوئی مبالغہ نہیں، بلکہ حقیقت ہے، کیونکہ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ انسان سر سے لے کر پاؤں تک نجاستوں کا پلندا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کھال کے ذریعہ ہماری پردہ پوشی کر رکھی ہے، عیب چھپے ہوئے

ہیں، گندگی چھپی ہوئی ہے، ورنہ اس خوبصورت چہرے پر ذرا سا چیرا لگاؤ، تو اندر سے گندگی نکل آئے گی، کہیں خون بھرا ہوا ہے، کہیں پیپ بھری ہوئی ہے، کہیں پیشاب اور کہیں پاخانہ بھرا ہوا ہے، اس وقت تو سب لوگ محبت کر رہے ہیں، اپنے پاس بٹھا رہے ہیں، لیکن اگر چہرے سے کھال اُتر جائے تو کوئی پاس بیٹھنے کو بھی تیار نہ ہو، بلکہ نفرت کریں، اور دیکھنے کو بھی تیار نہ ہو، وہی خوبصورت چہرہ خوفناک بن جائے گا، اور دیکھ کر ڈر لگے گا۔ لہٰذا تیری ابتداء گندے نطفے سے ہوئی، اور تیری انتہاء ایک بدبودار مردار پر ہوگی، اور درمیان کے زمانے میں تو گندگی اُٹھائے پھر رہا ہے، یہ تیری حقیقت ہے، اور پھر بھی یہ کہتا ہے کہ "جانتا نہیں میں کون ہوں؟"

شکستگی مطلوب ہے

جب تک انسان کو اپنی اس حقیقت کا ادراک اور احساس نہ ہو، اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی نہ تو نعمتوں کا ادراک ہوسکتا ہے، اور نہ ہی اللہ جل شانہ کی محبت کما حقہ پیدا ہوسکتی ہے، اسی لئے حضرت فرماتے ہیں کہ "اپنی حیثیت کو پہچانو" اور اس طریق میں اول و آخر سبق یہی ہے کہ "اپنی حقیقت کو پہچاننا اور اپنے آپ کو مٹانا اور فنا کرنا" جس میں دعویٰ ہو، جس میں تعلّی ہو، جو شان و شوکت بنائے، اور جو تکبر کرے، اس کو اس طریق کی ہوا بھی نہیں لگی، یہاں شکستگی مطلوب ہے، اپنی حیثیت کا احساس ہو، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے شکستگی ہو۔

اپنی نظر میں چھوٹا دوسروں کی نظر میں بڑا

اس لئے حضور اقدس ﷺ نے اللہ رب العزت سے یہ دعا مانگی:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا))

"اے اللہ! مجھے اپنی آنکھ میں چھوٹا اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بنا دیجئے"(۱)

یعنی جب میں اپنے آپ کو دیکھوں تو اپنے آپ کو چھوٹا سمجھوں، تاکہ میرے اندر تواضع پیدا ہو، البتہ لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا دیجئے، اس لئے کہ اگر لوگ بھی مجھے چھوٹا سمجھنے لگیں گے تو وہ مجھ پر ظلم اور زیادتی کریں گے، کسی نے خوب کہا ہے:

"سگ باش، و برادرِ خورد مباش"

"کتے بن جاؤ، لیکن چھوٹے بھائی مت بنو"

---

(۱) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (۴۳۱/۴)، سبل الهدى والرشاد فى سيرة خير العباد (۵۳۲/۸)، كنز العمال، رقم: ۳۶۷۵ (۲۷۹/۲)

مطلب یہ ہے کہ ساری بلائیں چھوٹے بھائی پر نازل ہوتی ہیں، اس لئے کہ اگر دوسرے یہ سمجھنے لگیں کہ یہ چھوٹا ہے تو لوگ اس پر ظلم کریں گے، اس کو بھون کر ہی کھا جائیں گے، چونکہ یہ چھوٹا ہے اس لئے جو سلوک چاہو، اس کے ساتھ کرو۔ لہٰذا اپنے دفاع کے لئے اور اپنے بچاؤ کے لئے لوگوں کی نگاہ میں اے اللہ! مجھے بڑا بنا دیجئے، لیکن میں اپنے آپ کو چھوٹا ہی سمجھتا رہوں۔

اول و آخر ''فنا ہی فنا''

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں تو پہلا و آخری سبق ''فنا ہی فنا'' ہے، یعنی اپنے آپ کو مٹانا، فرماتے ہیں کہ جو شخص مشیخت، پیری اور شان و شوکت کا راستہ اپنائے، اس کو ہمارے راستے کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اس لئے عام آدمی کی طرح رہو، کوئی شان و شوکت بنانے کی ضرورت نہیں، شان بنانے سے پرہیز کرو، اور اپنی حیثیت کو پیش نظر رکھو، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ادراک ہوگا، اور پھر شکر کی توفیق ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی۔

چوتھا طریقہ: اللہ والوں کی صحبت

آگے حضرت والا نے محبت پیدا کرنے والے اسباب میں سے چوتھا سبب یہ بیان فرمایا کہ ''کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا'' یہ بھی محبت پیدا کرنے کا بڑا قوی ذریعہ ہے، بلکہ شاید سب سے قوی ذریعہ ہو، اس لئے کہ اللہ والوں سے جتنی محبت ہوگی، اور اللہ والوں سے تعلق ہوگا، ان کی صحبت اُٹھاؤ گے، ان کے ساتھ رہو گے، اتنی ہی اللہ جل جلالہ کی محبت دل میں بڑھے گی۔ ہمارے حضرت ایک شعر پڑھا کرتے تھے۔

ملنے والوں سے راہ پیدا کر ان سے ملنے کی ہے یہی اک راہ

ان سے ملنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے جو ملنے والے ہیں، ان سے راہ پیدا کر، ان سے تعلق جوڑ لے، تو پھر انشاء اللہ وہ بھی مل جائیں گے۔ لہٰذا جو اللہ والے ہیں، جن کے دلوں میں اللہ کی محبت سمائی ہوئی ہے، ان کی صحبت اختیار کرنا، ان کے قریب رہنا، ان سے تعلق پیدا کرنا، ان سے محبت کرنا، ان کاموں سے اللہ تعالیٰ کی محبت تمہارے دل میں بھی پیدا ہوگی۔

اللہ کی محبت بھر رہا ہوں

حضرت والد صاحبؒ اکثر یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ مجلس میں اللہ تعالیٰ

کی محبت اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت پر بیان فرمارہے تھے، حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب ؒ بھی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، دورانِ بیان حضرت مجذوب صاحب نے فرمایا کہ حضرت! خدا کے واسطے کچھ ہمارے دل میں بھی بھردیجئے۔ حضرت نے فرمایا، میں اور کیا کررہا ہوں، یعنی یہ جو بیان ہورہا ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی محبت تمہارے دلوں میں بھری جارہی ہے، اور کیا کررہا ہوں۔

بہرحال! جب آدمی اللہ والوں کے پاس بیٹھتا ہے، ان کی باتیں سنتا ہے، ان کے ملفوظات کو سنتا ہے، ان کی اداؤں کو دیکھتا ہے، تو ان سب کاموں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے رابطہ جڑتا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں قوت پیدا ہوتی ہے، اسی لئے حضرت والا نے اسبابِ محبت میں یہ بیان فرمایا: کسی اللہ والے سے تعلق رکھنا۔

پانچواں طریقہ: طاعت پر مواظبت

اسبابِ محبت میں پانچواں سبب یہ بیان فرمایا کہ "طاعت پر مواظبت کرنا" یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرنا، جتنی زیادہ اطاعت کروگے اتنی ہی محبت بڑھے گی۔ اللہ تعالیٰ نے "محبت" اور "اطاعت" کے درمیان عجیب رشتہ رکھا ہے، وہ یہ کہ "اطاعت" سے محبت پیدا ہوتی ہے، اور پھر "محبت" سے مزید اطاعت ہوتی ہے، پھر اس "اطاعت" سے مزید "محبت" پیدا ہوتی ہے، پھر اس "محبت" سے مزید "اطاعت" انجام پاتی ہے، یہ سلسلہ ایک لامتناہی حد تک چلا جاتا ہے۔

یہ تو "دور" لازم آرہا ہے؟

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ یہ کہا جاتا ہے اللہ کے حکم کی اطاعت کرنے اور دین کے حکم پر چلنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا کرلی جائے، جب یہ پوچھا گیا کہ "محبت" کیسے پیدا کریں تو یہ کہا گیا کہ محبت پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، یہ تو "دور" لازم آگیا، یعنی یہ کہا جارہا ہے کہ دین پر چلنا ہے تو محبت کرو، اور محبت پیدا کرنے کے لئے دین پر چلو، یہ تو "دور" لازم آرہا ہے کہ جن دو چیزوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے پر موقوف ہورہی ہے۔ اس کے جواب کو غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

شروع میں تھوڑی سی محنت اور ہمت

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ جو بندہ بھی ابتداء میں تھوڑی سی محنت کرکے اطاعت کرے گا تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کو "محبت" کا ایک خاص درجہ

عطا فرمائیں گے، پھر ''محبت'' کے اس درجہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مزید ''اطاعت'' کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ شروع میں بغیر کسی محنت اور عمل کے خود بخود محبت پیدا نہیں ہوگی، اور نہ ہی خود بخود اطاعت کرنا آسان ہوگا، بلکہ دین شروع میں تھوڑی سی قربانی مانگے گا تھوڑی سی محنت اور ہمت مانگے گا، اس ہمت اور محنت کے بغیر یہ دولت نہیں ملتی، لہٰذا شروع میں انسان کو یہ کرنا پڑے گا کہ اپنی خواہشات، جذبات اور اپنے دنیاوی اور بشری تقاضوں کے خلاف تھوڑی سی محنت کرنی پڑے گی، اور جب ایک مرتبہ انسان وہ محنت کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایک نورِ محبت پیدا فرما دیتے ہیں۔

ریل بھاپ کے ذریعہ تیز چلتی ہے

اس بات کو حضرت والا نے دوسری جگہ پر ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے، فرمایا کہ جیسے ریل کے انجن میں اگر بھاپ بھری ہوئی ہو (اُس زمانے میں ریل بھاپ کے ذریعہ چلائی جاتی تھی، پیٹرول اور ڈیزل دستیاب نہیں تھا) تو وہ ریل بہت تیز بھاگتی ہے، لیکن اگر ریل میں سب چیزیں موجود ہیں، پہیے بھی لگے ہیں، لیکن انجن کے اندر بھاپ نہیں ہے، اب اگر کوئی شخص دھکا لگا کر اس ریل کو چلانا چاہے گا تو وہ ریل پورے دن میں بمشکل ایک دو کلو میٹر کا فاصلہ طے کرے گی، لیکن اگر انجن میں بھاپ بھری ہوئی ہے، اور اس بھاپ کے ذریعہ اس ریل کو چلایا جائے گا تو وہ دن بھر میں چار پانچ سو میل کا فاصلہ طے کرے گی۔

''محبت'' ''بھاپ'' کی طرح

حضرت فرماتے ہیں کہ ٹرین کے تیز رفتار چلنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک بھاپ کی، دوسرے پہیوں کی، اگر انجن اور بھاپ نہ ہو، صرف پہیے ہوں تو وہ ٹرین تیز نہیں چل سکتی، اور اگر بھاپ ہو، لیکن پہیے نہ ہوں، تو وہ بھاپ اس ٹرین کو تباہ کر دے گا، اور وہ ٹرین زمین کے اندر دھنس جائے گی۔ لہٰذا بھاپ کی بھی ضرورت ہے، اور پہیوں کی بھی ضرورت ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اسی طرح انسان کے اندر ''محبت'' بمنزلہ ''بھاپ'' کے ہے، اور ''عمل'' بمنزلہ ''پہیے'' کے ہیں، اس لئے پہلے تھوڑا سا ''عمل'' تو کرنا پڑے گا، پھر اس ''عمل'' کے نتیجے میں جب ''محبت'' کی بھاپ پیدا ہوگی تو پھر تیز رفتاری سے ترقی ہوگی، اور تیز رفتاری سے ''عمل'' ہوگا۔

اُڑنے سے پہلے زمین پر جہاز کا چلنا

آج کل کی مثال سے یوں سمجھ لیں، جیسے یہ ہوائی جہاز ہے، یہ ہوا میں اُڑتا ہے، اور ہوا میں

پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتا ہے، لیکن اُڑنے سے پہلے ہوائی جہاز کو زمین پر ''ٹیکسی'' کرنا پڑتی ہے، کوئی جہاز ایسا نہیں ہے جو کھڑا کھڑا سیدھا اُڑ جائے، بلکہ تھوڑی دیر اس کو زمین پر چلنا پڑتا ہے، یہ وقت مجھ جیسے مسافر کے لئے بڑا صبر آزما وقت ہوتا ہے، اس لئے کہ جب جہاز اُڑ جاتا ہے تو میں اپنے لکھنے کے کام میں مشغول ہو جاتا ہوں، اور جب تک زمین پر چل رہا ہوتا ہے اس وقت تک کوئی کام نہیں کرسکتا، بہر حال! ہر جہاز اُڑنے سے پہلے زمین پر آہستہ آہستہ چلتا ہے، پھر اُڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح ''محبت'' پیدا کرنے کے لئے تھوڑی محنت کرنی پڑے گی، اور تھوڑا سا ''عمل'' کرنا پڑے گا، اور جب اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں اپنی خواہشات کے خلاف عمل کرنا شروع کرو گے تو پھر ''محبت'' کی بھاپ تمہارے اندر پیدا ہو جائے گی، اور پھر تیز رفتاری سے ترقی ہوگی۔

ایمان کی لذت حاصل کرلو

یہی معنی اس حدیث کے ہیں جس میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی نامحرم پر لذت لینے کے لئے نگاہ ڈالنے کو دل چاہ رہا ہے، اور بہت شدید تقاضا ہو رہا ہے کہ میں اس پر نگاہ ڈال کر لذت حاصل کرلوں، لیکن اگر تم نے اللہ کے حکم کا خیال کر کے اللہ کے ڈر سے اس نگاہ کو بچالیا، اور نظر نہیں ڈالی، اور نظر ہٹانے کی تکلیف اپنے نفس پر برداشت کرلی تو اللہ تعالیٰ تمہیں ایمان کی ایسی لذت عطا فرمائیں گے کہ گناہوں کی لذت اس کے سامنے ہیچ در ہیچ ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ بندے سے فرماتے ہیں کہ اے بندے! میں نے تیرے اُوپر صبح سے لے کر شام تک کتنے انعامات کر رکھے ہیں، تیرے اُوپر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے، تجھ سے صرف یہ مطالبہ ہے کہ میری خاطر ناجائز خواہشات سے اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لئے بچالے، اور جب تو اپنے آپ کو اس سے بچائے گا تو میں تجھ سے یہ وعدہ کر رہا ہوں:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۱)

یعنی جو لوگ ہمارے راستے میں تھوڑی سی کوشش کریں گے تو ہم ضرور بالضرور ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستوں پر لے جائیں گے۔

خواہشات کو روکنے کے لئے یہ تصور مفید ہے

لہٰذا تھوڑی سی قربانی دینی ہوگی، یہ جنت اتنی سستی نہیں ہے، اور یہ محبت اتنی سستی نہیں ہے، اور وہ قربانی یہ ہے کہ نفس کو ناجائز خواہشات سے روکنے کی عادت ڈالو، اور اس کام میں آسانی پیدا کرنے کے لئے یہ تصور کرو کہ یہ دنیا ہے، یہ جنت نہیں ہے، اور اس دنیا کے اندر بڑے سے بڑا انسان چاہے وہ

(۱) العنکبوت: ٦٩

بڑے سے بڑا حاکم ہو، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ہو، اور دولت مند ہو، کیا وہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ میری مرضی کے موافق ہو رہا ہے، بلکہ اس دنیا میں ہر انسان پر اس کی مرضی کے خلاف حالات پیش آتے ہیں، اور آتے رہیں گے، اس سے بچنا ممکن نہیں۔ آج جن کے ہاتھ میں پوری دنیا کی کمان ہے، جن کے پاس دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں، نوکر چاکر ہیں، حشم خدم موجود ہیں، اور دنیا بھر کے تمام وسائل ان کو میسر ہیں ان سے جاکر پوچھو کیا تمہاری طبیعت کے خلاف کوئی واقعہ ہوا یا نہیں؟ بسا اوقات ان کی طبیعت کے خلاف اتنی زیادہ باتیں ہوتی ہیں، جتنی ہماری اور آپ کی طبیعت کے خلاف نہیں ہوتیں۔ لہٰذا یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں ہمیشہ خوش رہوں، اور مجھے کبھی کوئی غم اور تکلیف نہ آئے، کبھی کوئی صدمہ نہ پہنچے، اور کبھی کوئی خلاف طبع بات نہ ہو۔ لہٰذا طبیعت کے خلاف تو حالات پیش آئیں گے۔

دو راستے ۔ رب چاہی یا من چاہی

اب دو راستے ہیں، ایک راستہ تو یہ ہے کہ طبیعت کے خلاف کرنے کے لئے ایسے کاموں کو اختیار کرلو جس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ راضی ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ فرمائیں کہ دیکھو! یہ ہے میرا بندہ، جس نے میری خاطر اپنی طبیعت کے تقاضے کو پامال کردیا۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنی خواہشات کو پورا کرتے رہو، اس کی کوشش کرتے رہو، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ساری زندگی خواہشات کو پورا کرنے میں لگے رہو گے، اور اللہ تعالیٰ سے دور ہوتے چلے جاؤ گے۔ لہٰذا جب خواہشات کے خلاف کام ہونے ہی ہیں، چاہے تم کچھ بھی کرلو، تو پھر اللہ کے حکم کی خاطر خواہشات کے خلاف کام کیوں نہ کرلو۔

یہ تکلیف لذیذ بن جائے گی

اور جب تم ایک مرتبہ یہ تصور کرو گے کہ میں طبیعت کے خلاف یہ کام اللہ جل شانہ کی اطاعت میں کر رہا ہوں، تو اس صورت میں وہ تکلیف بھی بالآخر لذیذ بن جائے گی، کیوں؟ اس لئے کہ جب یہ تصور آئے گا کہ میں نے الحمد للہ اپنے محبوبِ حقیقی کی خاطر اپنے نفس کو پامال کیا ہے تو اس سے طبیعت کو جو انشراح نصیب ہوگا، اور اس سے جو نور پیدا ہوگا، اس سے جو فرحت اور انبساط پیدا ہوگا، اس کے سامنے دنیا کی ہزاروں لذتیں قربان ہیں۔

اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ہے

اللہ تعالیٰ تم سے یہ چاہتے ہیں کہ کبھی کبھی میرا بندہ اپنے دل پر چوٹ مارا کرے، مثلاً ایک کام کرنے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن اپنے دل پر چوٹ مار کر رک گیا، اور جب اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے دل پر

چوٹ ماری تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس دل میں آ کر بیٹھوں گا، یہ دل میری تجلی گاہ ہوگا، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ))(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اب دل کا ٹوٹنا دو طرح سے ہوتا ہے۔ یا تو غیر اختیاری طور پر دل ٹوٹے ہوئے ہیں، اس لئے کہ ان کے ساتھ مصائب پیش آئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کے ساتھ ہوں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ دل میں گناہ کرنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی، لیکن انہوں نے اپنی خواہشات کو پامال کر کے اپنا دل توڑا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

یہ دل ان کی تجلی گاہ ہے

اس بات کو کہنے کے لئے اقبال مرحوم نے بڑا خوبصورت شعر کہا ہے کہ۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

یعنی ایسا نہ کر کہ تیرا دل بچا رہے، اور اس میں جو خواہش پیدا ہو رہی ہے تو اس کو ہمیشہ پورا کرتا رہے، تو ایسا نہ کر، اس لئے کہ جس ذات نے یہ دل کا آئینہ بنایا ہے، اس ذات کا کہنا یہ ہے کہ جتنا یہ دل کا آئینہ ٹوٹے گا اتنا ہی یہ محبوب ہوگا، اتنا ہی میں اس دل کا ساتھی بنوں گا۔ یہ ''دل'' اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بنایا ہے، یہ ''دل'' انہی کی تجلی گاہ ہے، اس میں کسی دوسری چیز کی شمولیت اللہ تعالیٰ کو گوارا نہیں ہے، اور یہ ''دل'' اللہ تعالیٰ کے لئے اس وقت بنتا ہے جب خواہشات کے شیشے توڑے جاتے ہیں۔

ہم اسی گھر میں رہیں گے جسے برباد کیا

میں نے بھی ایک شعر کہا تھا، ہمارے بزرگ حضرت حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم اس شعر کو بہت پسند کرتے ہیں، اور اپنی مجلسوں میں سنایا کرتے ہیں، وہ یہ کہ۔

دردِ دل دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
ہم اسی گھر میں رہیں گے جسے برباد کیا

(۱) جامع الأحاديث القدسية، رقم: ۸۷۷ (۴۸/۱)، الزهد لأحمد بن حنبل، رقم: ۳۹۷ (۴۰۸/۱)، المدخل (۴۸/۳)، الدر المنثور (۵۳۹/۳)، المقاصد الحسنة للسخاوي (۷۵۶/۱)، كشف الخفاء، رقم: ۶۱۴ (۲۳۴/۱)، الزهد الكبير للبيهقي، رقم: ۳۷۹ (۳۸۳/۱)

دل کو برباد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خواہشات کو اللہ کے لئے پامال کریں۔ دل میں گناہوں کے تقاضے اُٹھ رہے ہیں، دل میں گناہوں کے داعیے پیدا ہو رہے ہیں، اور چاروں طرف سے گناہ کے محرکات گناہ کی طرف بلا رہے ہیں، لیکن میں نے اپنے اللہ کی خاطر اس دل کو توڑ کر برباد کیا، تو پھر اللہ تعالیٰ اس دل میں مقیم ہوتے ہیں، پھر وہ دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بنتا ہے۔

محبت سے اطاعت، اطاعت سے محبت کا نتیجہ

اسی بات کو حضرت والا یہاں فرما رہے ہیں کہ جب پہلے اطاعت کرنے کے لئے تھوڑی سی قربانی دو گے، تھوڑا سا آگے بڑھو گے، اور خواہشات کو پامال کرنے کی کوشش کرو گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی ''محبت'' عطا فرمائیں گے، یہ ان کا وعدہ ہے، ممکن نہیں ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا نہ ہو، اور جب ''محبت'' پیدا ہو جائے گی تو اس ''محبت'' کے نتیجے میں جو کام پہلے مشکل معلوم ہو رہے تھے، وہ آسان نظر آئیں گے، اور مزید ''طاعت'' ہوگی اور جب مزید ''طاعت'' ہوگی تو ''محبت'' اور بڑھے گی، اور ''محبت'' میں اضافہ ہوگا، اور جب ''محبت'' میں اضافہ ہوگا تو اور ''طاعت'' آئے گی، اور یہ سلسلہ مرتے دم تک چلتا رہے گا، یہاں تک کہ موت کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام آجائے گا:

﴿يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾(۱)

اے اطمینان والی جان، آج اپنے پروردگار کی طرف آجا، جس کی محبت میں تو نے زندگی کے دن رات گزارے ہیں، آج آکر میرے بندوں میں شامل ہو جا، اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

یہ ہے انجام اس سارے تسلسل کا، یعنی طاعت سے محبت، اور محبت سے طاعت، پھر طاعت سے محبت، پھر محبت سے طاعت، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس مقام تک پہنچا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں اس راستے پر لگا دے۔

اطاعت کا آسان نسخہ، اتباع رسول ﷺ

اسی طاعت کا سب سے آسان اور مختصر نسخہ وہ ہے جو قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کا بتایا ہے، وہ یہ ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾(۲)

(۱) الفجر: ۲۷۔۳۰ (۲) آل عمران: ۳۱

اللہ تعالیٰ حضور اقدس ﷺ سے فرمار ہے ہیں کہ ان سے کہہ دو، یعنی تمام ایمان والوں سے کہہ دو کہ اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو، اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو، تو اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ تم میری اتباع کرو، یعنی رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے۔

حضور ﷺ کی اتباع کرو، اللہ تعالیٰ محبت کریں گے

بظاہر تو یوں کہنا چاہئے تھا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی اتباع کرو، جب حضور اقدس ﷺ کی اتباع کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی محبت تمہارے دل میں پیدا ہو جائے گی، اور تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے لگو گے۔ لیکن اس طرح نہیں فرمایا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ سے محبت کا ارادہ ہے تو میری اتباع کرو، تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ اس طرح کیوں فرمایا؟ دراصل اس سے اشارہ اس طرف فرمادیا کہ ارے تم کیا اللہ تعالیٰ سے محبت کرو گے، تم کہاں، اللہ میاں کہاں، اس لئے کہ تمہارا وجود ناقص، تمہاری ذات ناقص، تمہاری ذات متناہی، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات واجب الوجود، غیر متناہی، تم کیسے اللہ تعالیٰ سے محبت کرو گے؟ اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی حقیقی محبت اور اس کے اندر کمال کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ البتہ جب تم حضور اقدس ﷺ کی اتباع کرو گے تو پھر اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا، اور پھر اس کی محبت کا عکس تمہارے دلوں پر پڑے گا، اس عکس کو اللہ تعالیٰ کی محبت کہیں گے۔

محبت پہلے محبوب کے دل میں پیدا ہوتی ہے

کسی فارسی شاعر نے اسی بات کو شعر میں کہا ہے کہ ع

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

یعنی پہلے محبوب اور معشوق کے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے، اور پھر محبوب کی محبت کا عکس محبّ کے دل پر پڑتا ہے، اس طرح محبت محبّ کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا ہے، کیونکہ جس ذات کو دیکھا نہ ہو، جس کی معرفت کاملہ حاصل نہ ہو تو اس ذات سے انسان کیسے محبت کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے تصور اور خیال سے ماوراء ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پہلے میں تم سے محبت کروں گا، اور جب میں محبت کروں گا تو میری محبت کا عکس تمہارے دل میں آئے گا، اور پھر تم اللہ سے محبت کرو گے۔

ہر کام میں حضور ﷺ کی اتباع

بہر حال! قرآن کریم نے یہ حقیقت بتادی کہ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا بہترین اور آسان ترین راستہ ''اتباع سنت'' ہے، ہر کام میں نبی کریم ﷺ کی سنت کی اتباع ہے، اپنی چال ڈھال میں، اپنی وضع قطع میں، اپنی بول چال میں، اپنی صورت وسیرت میں، اپنے کردار میں، اُٹھنے بیٹھنے میں، کھانے پینے میں، معاملات میں، معاشرت میں، ایک دوسرے کے ساتھ میل جول میں، اخلاق میں نبی کریم ﷺ کی ''سنت'' اختیار کرلو، جوں جوں ''سنت'' کی اتباع کرتے جاؤ گے، اتنی ہی اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی جائے گی۔

کوئی ''سنت'' چھوٹی نہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ جس کسی وقت بھی کسی سنت پر عمل کر رہا ہوتا ہے، چاہے وہ سنت دیکھنے میں چھوٹی نظر آرہی ہو، ویسے تو حضور اقدس ﷺ کی کوئی سنت چھوٹی نہیں، ہر سنت عظیم الشان ہے، اس وقت وہ بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوتا ہے، مثلاً مسجد میں داخل ہوتے ہوئے تم نے دایاں پاؤں پہلے اندر رکھا یہ سوچتے ہوئے کہ یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے، اور مسجد میں داخل ہوتے وقت وہ دعا پڑھی جو مسنون ہے:

((اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ))(۱)

اگر چہ یہ چھوٹا سا عمل ہے، لیکن جب اتباع سنت کی خاطر تم یہ عمل کر رہے ہو تو جس وقت یہ عمل کر رہے ہو اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو۔

اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو

تم بیت الخلاء میں داخل ہو رہے ہو، داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں اس نیت سے داخل کیا کہ یہ حضور ﷺ کی سنت ہے، اور داخل ہونے سے پہلے مسنون دعا پڑھ لی تو اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے

(۱) صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب ما يقول إذا دخل المسجد، رقم:۱۱٦٥، سنن النسائي، كتاب المساجد، باب القول عند دخول المسجد وعند الخروج منه، رقم:۷۲۱، سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب فيما يقوله الرجل عند دخوله المسجد، رقم:۳۹۳، سنن ابن ماجه، كتاب المساجد والجماعات، باب الدعاء عند دخول المسجد، رقم:۷٦٤، مسند أحمد، رقم:۱٥٤۷۷، سنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب القول عند دخول المسجد، رقم: ۱۳٥۸، دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے''

محبوب بن رہے ہو۔ بیت الخلاء سے باہر نکلتے وقت دایاں پاؤں اس نیت سے باہر نکالا کہ یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے، اور باہر نکل کر مسنون دعا پڑھ لی تو تم اس وقت اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو، اس لئے کہ تم اللہ کے محبوب کی سنت پر عمل کر رہے ہو۔ پس جتنا جتنا تم اتباع سنت میں بڑھتے چلے جاؤ گے، اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی چلی جائے گی، اور اس کے نتیجے میں دین پر عمل کرنا مزید آسان ہوتا چلا جائے گا۔

وہ سنتیں جن میں کوئی مشقت نہیں

حضور اقدس ﷺ کی سنتیں تو بے شمار ہیں، اور ہر شعبۂ زندگی میں ہیں، لیکن بہت سی سنتیں ایسی ہیں کہ ان کو اختیار کرنے میں کچھ خرچ نہیں ہوتا، نہ وقت لگتا ہے، نہ پیسے لگتے ہیں، نہ محنت صرف ہوتی ہے، صرف دھیان کی بات ہے، جیسے ابھی بتایا کہ سنت یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں داخل کرو، اور نکلتے وقت بایاں پاؤں نکالو، بتاؤ! اس پر عمل میں کیا تکلیف ہے؟ کتنا وقت صرف ہوتا ہے؟ کتنے پیسے خرچ ہوتے ہیں؟ کتنی محنت لگتی ہے؟ ارے بھائی! پاؤں تو نکالنا ہی ہے، صرف دھیان کرنے کی بات ہے، دھیان نہ کرنے کے نتیجے میں سنت کی برکت اور رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کوئی اگر یہ سوال کرے کہ کیا دایاں پاؤں مسجد سے نکالنا گناہ ہے؟ یہی جواب دیا جائے کہ گناہ نہیں۔ کیا فرض و واجب ہے کہ بایاں پاؤں ہی پہلے نکالو؟ نہیں، فرض و واجب بھی نہیں، لیکن اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں ایک بڑی رحمت سے محرومی ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی اتباع کے نتیجے میں جو رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت حاصل ہوتی ہے، اس نعمت سے محرومی ہے۔
اسی طرح کھانا کھاتے وقت کی سنت یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے کھانا کھاؤ، اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرو، اور جب کھانا کھا چکو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور دعا پڑھو، کیا ایسا کرنا فرض و واجب ہے؟ نہیں۔ ایسا نہ کرنا گناہ ہے؟ نہیں، گناہ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ کرنے پر کوئی پکڑ بھی نہیں، لیکن نہ کرنے کے نتیجے میں انسان اپنے آپ کو ایک عظیم نعمت سے محروم کر رہا ہے، جو نعمت مفت میں حاصل ہو رہی تھی۔

سنتوں کی ڈائری ”اُسوۂ رسولِ اکرم ﷺ“

لہٰذا ہر انسان اپنی زندگی کا ذرا جائزہ لے، اور یہ دیکھے کہ میں کہاں کہاں حضور اقدس ﷺ کی سنتوں کو چھوڑے ہوئے ہوں۔ ہمارے حضرت والا کی کتاب ہے ”اُسوۂ رسول اکرم ﷺ“
حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تمہارے لئے ڈائری بنا دی ہے، اس کتاب کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لیتے رہو کہ کہاں کہاں میں سنت پر عمل کر رہا ہوں، اور کہاں کہاں چھوڑے ہوئے ہوں،

بس، جہاں عمل چھوڑے ہوئے ہو، وہاں عمل کرنا شروع کردو۔ بیشمار سنتیں ایسی ہیں جو صرف تمہارے دھیان کی منتظر ہیں، اس میں نہ محنت، نہ مشقت، نہ پیسہ، نہ وقت کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا، البتہ کچھ سنتیں ایسی ہیں جو کچھ وقت اور محنت کا تقاضا کرتی ہیں، تھوڑی سی محنت کرلو گے تو ان پر بھی عمل ہو جائے گا۔

جب تک بازار میں لوکی ملے ضرور لاؤ

ہمارے حضرت والا یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے گھر میں دیکھا کہ دستر خوان پر لوکی کی ترکاری یا سالن ضرور ہوتا تھا۔ کئی دن تک دیکھتا رہا کہ روزانہ لوکی کی ترکاری ضرور ہوتی ہے۔ میں نے ایک دن اہلیہ سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے آپ کئی روز سے لوکی کی ترکاری مسلسل پکا رہی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو لوکی بہت پسند تھی، اس لئے میں نے سودا لانے والے سے کہہ دیا ہے کہ جب تک بازار میں لوکی ملے تو ضرور لوکی لایا کرو، تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کی کچھ اتباع نصیب ہو جائے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنی اہلیہ کی یہ بات سنی تو مجھے لرزہ سا آگیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سنت جو نہ فرض ہے، نہ واجب ہے، بلکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محض ایک عادت ہے، اس عورت کو تو اس سنت کا اتنا اہتمام ہے، اور ہم اپنے آپ کو عالم کہلاتے ہیں، لوگ ہمیں عالم کہتے ہیں، سمجھتے ہیں، لیکن ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتنا اہتمام نہیں۔

تین دن تک زندگی کا جائزہ

اس کے بعد میں نے یہ تہیہ کرلیا کہ جب تک میں اپنی ساری زندگی کا جائزہ لے کر نہیں دیکھوں گا کہ میں کہاں کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل نہیں کر رہا ہوں، اس وقت تک آگے نہیں بڑھوں گا، چنانچہ زندگی کا جائزہ لینے میں تین دن لگائے، اور یہ دیکھا کہ کہاں کہاں میں اتباعِ سنت سے محروم ہوں، اور پھر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے راہِ عمل واضح ہوگیا، اور جو سنتیں چھوٹی ہوئی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما دی۔

بہرحال! یہ اتباعِ سنت ایسی چیز ہے کہ جتنا بھی آپ اس کی طرف بڑھیں گے، اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں سمائے گی۔

یہ طعنے گلے کا ہار ہیں

بسا اوقات جب آدمی اتباعِ سنت کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اس کو طعنے بھی دیئے جاتے

ہیں، اس پر فقرے بھی کسے جاتے ہیں، بعض اوقات اس کا مذاق بھی اُڑایا جاتا ہے، ان فقروں اور طعنوں کی وجہ سے بعض لوگ کمزور پڑ جاتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے:

﴿یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾(۱)

یعنی یہ لوگ اللہ کے راستے میں محنت کرتے ہیں، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے۔ دنیا والے لوگ جو چاہیں کہا کریں، چاہے وہ ہمیں ''دقیانوس'' کہیں، یا ہمیں ''رجعت پسند'' کہیں، یا ''جاہلانہ اسلام والے'' کہیں، ارے یہ طعنے تو اللہ کے راستے پر چلنے والے کا ہار ہے، یہ طعنے تو انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے، ان کو ''بیوقوف'' کہا گیا، اور ان انبیاء کے متبعین سے کہا گیا:

﴿اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ﴾(۲)

کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں، جس طرح یہ بیوقوف ایمان لائے۔ یہ سارے طعنے انبیاء علیہم السلام کو بھی ملے ہیں، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی ملے ہیں۔ ان کو ''پاگل'' کہا گیا، ان کو ''گمراہ'' کہا گیا، لیکن درحقیقت جب اللہ تعالیٰ کے راستے میں یہ طعنے پڑتے ہیں تو ایک مؤمن کے لئے تمغہ ہے۔ کہاں تک دنیا والوں کی زبانیں روکو گے؟ کب تک ان کی پرواہ کرو گے؟

قیامت کے روز ایمان والے ان پر ہنسیں گے

لہٰذا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے راستے میں چلو تو طعنوں سے بے نیاز ہو جاؤ، کمر کس کر تیار ہو جاؤ، اور یہ سوچو کہ جو طعنہ ہمیں اس راستے میں ملے گا وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے باعثِ اعزاز ہے۔ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے:

﴿فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ یَضْحَكُوْنَ﴾(۳)

کہ آج وہ وقت آ گیا کہ آج ایمان والے ان منکرین پر ہنسیں گے۔ وہ وقت آ کر رہے گا، اس کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ لہٰذا دنیا والوں کے طعنوں سے بے نیاز ہو جاؤ، اگر تم اللہ کے راستے پر چلنا چاہتے ہو۔

جس کو ہو جان ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

جب اس راستے پر چلے ہو تو ان طعنوں کو برداشت کرنا پڑے گا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اور اپنی رحمت سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

---

(۱) المائدۃ: ۵٤ (۲) البقرۃ: ۱۳ (۳) التطفیف: ۳٤

اللہ سے اللہ کی محبت مانگئے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ، أَمَّا بَعْدُ!

گذشتہ چند دنوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے اسباب کا بیان چل رہا ہے، اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے پانچ اسباب بیان فرمائے ہیں، ان میں سے چار اسباب کا بیان الحمدللہ تفصیل سے ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آگے پانچواں سبب یہ بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ سے دعا کرنا۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک مطلب تو وہ ہے جو کل عرض کیا تھا کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگتے رہو، دل ہی دل میں چلتے پھرتے مانگتے رہو، اُٹھتے بیٹھتے مانگتے رہو۔

اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ”محبت بھی انہی سے مانگو“ اور کہو کہ یا اللہ! ہم آپ کی محبت کے محتاج ہیں، آپ ہی اپنی محبت ہمیں دے دیجئے۔ چنانچہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّىْ أَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ))(۱)

”اے اللہ! میں آپ سے آپ کی محبت مانگتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی محبت پیدا ہو، اور جس کی محبت آپ کے نزدیک مجھے فائدہ پہنچانے والی ہو، اس کی محبت عطا فرما“

ایک اور دعا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ أَحَبَّ الْأَشْيَاءِ إِلَيَّ))(۲)

”اے اللہ! اپنی محبت کو دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب بنا دیجئے“

☆ اصلاحی مجالس (۶/۱۸۶ تا ۱۹۶)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی۔

(۱) سنن الترمذی، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما جاء فی عقد التسبيح باليد، رقم: ۳٤۱۲

(۲) حلية الأولياء (۲۸۲/۸)، جامع العلوم والحكم (۱٤/۳۸)

اللہ کی محبت ان تین چیزوں سے زیادہ

ایک اور دعا میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَاَھْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ))(۱)

''اے اللہ! اپنی محبت کو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز بنادیجئے، اپنے گھر والوں سے زیادہ عزیز بنادیجئے، اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنادیجئے''

آپ ﷺ کو ٹھنڈا پانی بہت مرغوب تھا

اس سے حضور اقدس ﷺ کے ٹھنڈے پانی سے محبت اور شوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کو ٹھنڈا پانی اتنا مرغوب تھا کہ ''بئر غرس'' جو مدینہ منورہ سے دو میل کے فاصلے پر کنواں تھا، وہاں سے آپ کے لئے پانی لایا جاتا تھا، چنانچہ کسی اور چیز کے بارے میں احادیث میں یہ منقول نہیں کہ حضور اقدس ﷺ کو فلاں غذا زیادہ مرغوب تھی، اور وہ غذا فلاں جگہ سے لائی جاتی تھی، صرف پانی کے بارے میں یہ منقول ہے کہ ''بئر غرس'' سے آپ کے لئے لایا جاتا تھا، اس لئے کہ اس کا پانی دوسرے کنوؤں کے مقابلے میں زیادہ ٹھنڈا اور شاید زیادہ میٹھا ہوتا تھا، اور آپ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ وفات کے بعد مجھے غسل بھی اس ''بئر غرس'' کے پانی سے دیا جائے، چنانچہ ''بئر غرس'' کے پانی سے آپ کو غسل دیا گیا۔ (۲)

آپ کو ٹھنڈا پانی اتنا زیادہ پسند تھا، اس لئے آپ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! اپنی ذات کو میری جان سے زیادہ محبوب بنادیجئے، میرے گھر والوں سے زیادہ محبوب بنادیجئے، اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنادیجئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! اپنی محبت عطا فرما، اور اپنی محبت کو تمام محبتوں پر غالب فرما۔

جھولی اور پیالہ بھی انہی سے مانگو

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مجلس میں یہ مضمون بیان فرما رہے تھے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہئے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں دینے میں کوئی کمی نہیں۔ وہی بات جو کسی نے کہی ہے کہ ۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید، رقم: ۳۴۱۲

(۲) سنن ابن ماجہ، کتاب ما جاء فی الجنائز، باب ما جاء فی غسل النبی، رقم: ۱۴۵۷

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

حضرت نے فرمایا کہ مانگنے میں نقص رہ جاتا ہے، ورنہ اگر انسان مانگے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں دینے میں کوئی کمی نہیں۔ بس میاں! اللہ تعالیٰ کے سامنے جھولی پھیلانے والا چاہئے، پھر اللہ تعالیٰ اس جھولی کو بھر کر ہی بھیجتے ہیں۔ حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوال کیا کہ حضرت! اگر کسی کے پاس جھولی ہی نہ ہو تو پھر کیا کرے؟ حضرت نے فرمایا کہ جھولی بھی انہی سے مانگے، اور یہ کہے کہ یا اللہ! میرے پاس تو جھولی بھی نہیں ہے، اپنی رحمت سے مجھے جھولی بھی عطا فرما دیجئے، میرے اندر مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے، مانگنے کا سلیقہ بھی عطا فرما دیجئے۔

مانگنے کا طریقہ بھی انہی سے مانگو

چنانچہ ایک دعا میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح مانگا:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّىٓ أَسْئَلُكَ خَيْرَ الْمَسْئَلَةِ وَخَيْرَ الدُّعَاءِ وَخَيْرَ الْإِجَابَةِ))(۱)

''اے اللہ! میں آپ سے بہترین سوال کرتا ہوں، یعنی میں آپ سے اچھے سوال کروں، اور اچھی باتیں مانگوں، اے اللہ! میں آپ سے یہ مانگتا ہوں کہ مجھے اچھی دعا کرنے کی توفیق ہو، اور اچھی طرح قبول بھی ہو'' (لہٰذا جھولی بھی انہی سے مانگو)

اچھی دعا مانگنے کی توفیق انہی سے مانگو

جب آپ کسی قبولیتِ دعا کے مقام میں جائیں، یا قبولیتِ دعا کا موقع آپ کو مل جائے، جس میں دعا کی قبولیت کی اُمید زیادہ ہوتی ہے، مثلاً افطار کا وقت ہے، یا سحری کا وقت، یا تہجد کا وقت، یا جمعہ کا دن ہے، یا بیت اللہ شریف پر پہلی نظر پڑنے کا موقع ہے، یا آپ طواف کر رہے ہیں، وغیرہ، ایسے مواقع پر دعا کرنے سے پہلے یہ مانگو کہ یا اللہ! مجھے اچھی دعا کرنے کی توفیق دیدے، یعنی ایسی دعا

---

(۱) یہ دعا مختلف کتبِ احادیث میں موجود ہے، اور مزید تفصیل کے ساتھ وارد ہوئی ہے لیکن "خیر الإجابة" کا لفظ اس دعا میں نہیں مل سکا، دعا کے الفاظ یہ ہیں: "اللّٰھم إني أسألك خير الدعاء وخير المسألة وخير النجاح وخير العمل وخير الثواب وخير الحياة وخير الممات" مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (٤/٤٢٧)، المعجم الكبير للطبراني (١٧/١٤٣)، المستدرك للحاكم، رقم: ١٩١١ (٢/١٧٨)، كنز العمال، رقم: ٣٨٢٠ (٢/٢١٤)، جامع الأحاديث، رقم: ٤٩٣٧ (٦/١٦٤)، سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد (٨/٥٢٥)

کروں جو میرے دین و دنیا کے لئے فائدہ مند ہو، اور پھر اے اللہ! اس کو میرے حق میں قبول بھی فرمالیجئے۔ لہٰذا ان تمام مواقعِ قبولیت میں دعا کرنے کی توفیق بھی اللہ ہی سے مانگو۔

بیت اللہ پر پہلی نظر کے وقت دعا

جب آدمی پہلی مرتبہ بیت اللہ شریف کو دیکھتا ہے تو آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ موقع آرہا ہے، اس موقع پر کیا مانگوں؟ اللہ کے بندوں کے عجیب عجیب مدارک ہوتے ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ اس موقع پر کیا مانگوں؟ امام صاحب نے فرمایا کہ میاں دعا مانگ لینا کہ میں ''مستجاب الدعوات'' بن جاؤں کہ ساری عمر میں میری ساری دعائیں قبول ہوا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں یہ بات ڈال دی۔

بہر حال! مانگنا بھی ایک ہنر اور ایک فن ہے، جو ہر ایک کو نہیں آتا۔ میرا جب حرمین جانا ہوا، اور بیت اللہ پر نظر پڑی تو میں نے کہا: یا اللہ! میری سمجھ میں تو نہیں آرہا ہے، یا اللہ! جو دعا آپ کے نزدیک میرے حق میں بہتر ہو، وہ دعا میرے دل میں ڈال دیجئے، اور اس طرح دعا کے کرنے کی توفیق دے دیجئے۔ وہی بات جو حضرت والا نے بیان فرمائی کہ جھولی بھی انہی سے مانگو۔ اسی طرح محبت بھی انہی سے مانگو کہ یا اللہ! اپنی محبت میرے دل میں پیدا فرمادیجئے، اور اس محبت کو ساری محبتوں پر غالب فرمادیجئے۔

اسبابِ محبت کا خلاصہ

بہر حال! حضرت والا نے اسبابِ محبت میں چھ باتیں ذکر فرمائیں:

(۱) کثرتِ ذکر اللہ

(۲) اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد کرنا

(۳) اپنے برتاؤ کو اور حقیقت کو سوچنا

(۴) کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا

(۵) طاعت پر مواظبت کرنا

(۶) اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا

ان چھ باتوں سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں راسخ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان سب باتوں پر ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

محبت کا کوئی خاص درجہ طلب مت کرو

آگے حضرت والا کی مجددانہ باتیں سنئے، فرمایا:

''اس تدبیر میں تو کوئی غلطی نہیں، صرف ایک غلطی علمی محتمل ہے، وہ قابل تنبیہ ہے، وہ یہ کہ اپنے ذہن سے محبت کا کوئی درجہ تراش کر اس کا منتظر رہے، یہ غلطی ہوگی''(۱)

یعنی جو باتیں اور محبت پیدا کرنے کے جو اسباب بتائے ہیں، ان کے اندر تو کوئی غلطی نہیں ہے، یہ انشاء اللہ بالکل صحیح ہیں، مستند اور معتبر ہیں، اور انشاء اللہ انہی کے ذریعہ محبت پیدا ہوگی، لیکن غلطی اس طرح لگتی ہے کہ ''محبت'' کا کوئی خاص درجہ اپنی طرف سے تراش کر اس کے انتظار میں آدمی بیٹھ جاتا ہے کہ مجھے محبت کا یہ درجہ حاصل ہونا چاہئے، مثلاً دماغ میں یہ تصور لئے بیٹھا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو جو محبت حاصل تھی، وہ مجھے حاصل ہو جائے، یا حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو جو محبت حاصل تھی، وہ مجھے حاصل ہو جائے، اور حضرت شاہ عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو جو محبت حاصل تھی، وہ مجھے بھی حاصل ہو جائے، گویا کہ ''محبت'' کا ایک درجہ اپنے ذہن سے تراش کر اپنے لئے اس کو تجویز کر لیا کہ مجھے ''محبت'' کا یہ درجہ ملنا چاہئے، اب اس درجے کے انتظار میں بیٹھا ہے، اور پھر جب وہ درجہ محبت کا حاصل نہیں ہوتا تو پھر وہ شخص یا تو اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتا ہے، یا محبت پیدا کرنے کی تدبیروں کے صحیح ہونے پر شک کرتا ہے، یا پھر مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔

محبت اس کے ظرف کے مطابق دی جاتی ہے

اس لئے یہ فیصلہ کہ کس درجہ کی ''محبت'' تمہیں حاصل ہو؟ تمہیں یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں، یہ فیصلہ وہی ذات کرے گی جو ''محبت'' دینے والی ہے کہ تمہیں کس درجہ کی محبت دینی ہے، اور جس درجہ کی محبت تمہیں دینی ہے، وہی ''محبت'' تمہارے حق میں مفید بھی ہے۔

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

''ظرف'' کے حساب سے چیز دی جاتی ہے، تمہارا ''ظرف'' جتنا ہے، اتنی ''محبت'' تمہیں ملے گی، باقی تم اپنی طرف سے محبت کا ایک درجہ تراش کر یہ کہو کہ یہ درجہ محبت کا مجھے ملنا چاہئے، اس کے مطالبے کا تمہیں کوئی حق نہیں، لیکن محبت کا جو درجہ تمہیں ملے گا، انشاء اللہ تمہارے حق میں وہ کافی ہوگا، بشرطیکہ ان تدبیروں پر عمل کر لیا۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۹۴

ناشکری اور مایوسی کا شکار ہو جاؤ گے

ہوتا یہ ہے کہ ہم لوگ ایک طرف تو بزرگوں کی بتائی ہوئی تدبیروں پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں، اور دوسری طرف اپنے لئے کوئی اعلیٰ درجہ تجویز کر لیتے ہیں کہ یہ میری منزل ہے، اور مجھے اس منزل پر پہنچنا ہے، ان تدبیروں پر عمل شروع کرنے کے بعد جب وہ مطلوب منزل بہت دور نظر آتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب تک جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کی ناقدری اور ناشکری شروع کر دیتے ہیں، اور چونکہ وہ مطلوب منزل حاصل نہیں ہو رہی ہے، اس لئے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں، اور پھر اس مایوسی کے نتیجے میں ان تدابیر کو چھوڑ دیتے ہیں، اور عمل کرنا ترک کر دیتے ہیں۔ اس لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اپنی طرف سے کوئی درجہ تجویز مت کرو، اگر تدبیریں صحیح ہیں تو انشاء اللہ ان سے نتیجہ ضرور حاصل ہوگا، چاہے اس درجہ کا نتیجہ نہ ہو جو تم نے اپنے لئے تجویز کر رکھا ہے، البتہ تمہارے حق میں جتنا مفید ہے اتنا ضرور حاصل ہوگا، کسی نے خوب کہا ہے کہ

بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

جب اس راستے پر آ گئے تو انشاء اللہ ضرور کامیابی ہوگی، بس اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت نہیں، جو کچھ تمہیں ملا ہے، اس پر شکر ادا کرو، اور تدبیروں میں لگے رہو، تمہارے لئے اتنا کافی ہے۔

میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر بڑا عجیب وغریب ہے، کوئی دوسرا شخص اس شعر کو اس وقت تک سمجھ ہی نہیں سکتا جب تک یہ مضمون اس کے سامنے نہ ہو جو میں بیان کر رہا ہوں، فرماتے ہیں کہ ۔

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مے
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

یعنی مجھ کو اس سے کیا غرض کہ دوسرے لوگوں کو کیا ملا، اور کیا نہیں ملا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے جو کچھ عطا فرمایا ہے، میرے لئے تو مناسب وہی ہے، اور حاصل بھی وہی ہے۔ لہٰذا اپنے لئے کوئی درجہ تجویز کرنا، اور پھر نہ ملنے پر شکایت پیدا ہونا، مایوس ہونا، یہ سب غلط ہے۔ جب تدبیریں سب صحیح ہیں تو انشاء اللہ اس کا نتیجہ بھی یقیناً ظاہر ہو رہا ہے۔

ایک خط اور حضرت والا کا جواب

ایک مرتبہ میں نے حضرت والا کو خط میں لکھا کہ فلاں کام مجھ سے نہیں ہوتا، فلاں کام مجھ سے نہیں ہوتا، فلاں کام مجھ سے نہیں ہوتا، اور جس آدمی سے یہی کام نہیں ہوتے، وہ دنیا میں اور کیا کام کرے گا؟ حضرت والا نے اس آخری عبارت پر لکیر کھینچ کر اس کے سامنے یہ جواب لکھا:

''کیا اپنی ذات سے جلیل القدر امور متوقع ہیں؟''

یعنی تمہارا یہ فقرہ کہ جس سے یہ کام نہیں ہو سکتے، اس سے کیا کام ہوگا، گویا کہ اپنی ذات سے بہت جلیل القدر امور کی توقع لگائے بیٹھے ہیں کہ ہم تو اس مقام کے آدمی ہیں، لہٰذا اس بلند مقام کے امور ہم سے سرزد ہونے چاہئیں، وہ امور چونکہ نہیں ہو رہے ہیں لہٰذا مایوسی ہو رہی ہے۔

دراصل اس جواب کے ذریعہ یہ تنبیہ فرما دی کہ درحقیقت دل میں اس خیال کے پیدا ہونے کا منشاء کبر ہے، یعنی اپنے لئے بہت جلیل القدر امور تجویز کر رکھے ہیں کہ یہ ہونے چاہئیں، اور جب وہ نہیں ہو رہے ہیں تو اب مایوس ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اس کا منشاء حقیقت میں کبر ہے۔

خلاصہ

بہرحال! خلاصہ یہ ہے کہ ''محبت'' کے حصول کی جو تدبیریں بتائی گئی ہیں، ان پر عمل کرو، اور اپنے لئے ''محبت'' کا کوئی درجہ تجویز مت کرو کہ ''محبت'' کے فلاں درجے تک ہمیں پہنچنا ہے۔ ان تدبیروں کے نتیجے میں ''محبت'' کا جو درجہ تمہیں ملے گا، وہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا، تم اسی کے مستحق ہو گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان تدبیروں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

نفس کی کشمکش ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ o﴾(۱)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے ایک نیا باب قائم فرمایا ہے:

"بَابٌ فِي الْمُجَاهَدَةِ"

"مجاہدہ" کے لفظی معنی ہیں "کوشش کرنا، محنت کرنا"

"جہاد" بھی اسی سے نکلا ہے، اس لئے کہ عربی زبان میں "جہاد" کے معنی لڑنے کے نہیں ہیں، بلکہ محنت اور کوشش کرنے کے ہیں، اور لفظ "مجاہدہ" کے معنی بھی یہی ہیں، یعنی "کوشش کرنا" اور قرآن و سنت اور صوفیاء کی اصطلاح میں "مجاہدہ" اس کو کہا جاتا ہے کہ انسان اس بات کی کوشش کرے کہ اس کے اعمال درست ہو جائیں، اس کے اخلاق درست ہو جائیں، اور گناہوں سے بچ جائے، اور اپنے نفس کو غلط سمت میں جانے سے بچائے، اس کا نام "مجاہدہ" ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ))(۲)

"اصلی "مجاہد" وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے"

لڑائی کے میدان میں دشمن سے لڑنا بھی "جہاد" ہے، لیکن اصلی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے اس طرح جہاد کرے کہ نفس کی خواہشات، نفس کی آرزوئیں، نفس کے تقاضے ایک طرف بلا رہے ہیں اور انسان نفس کے ان تقاضوں اور آرزوؤں کو پامال کر کے دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے تو اس کا نام "مجاہدہ" ہے، لہٰذا جو شخص بھی اپنی اصلاح کی طرف قدم بڑھانا چاہے اور اللہ جل شانہ کی طرف قدم

☆ اصلاحی خطبات (۲/۲۲۶ تا ۲۴۳)، ۱۰ مئی، ۱۹۹۱ء، بروز جمعہ، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) العنکبوت: ۶۹، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے، اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے"

(۲) سنن الترمذي، كتاب فضائل الجهاد عن رسول الله، باب ما جاء في فضل من مات مرابطًا، رقم: ۱۵٤٦، مسند أحمد، رقم: ۲۲۸۳۳

بڑھانا چاہے تو اس کو ''مجاہدہ'' کرنا ہی پڑتا ہے یعنی اپنے نفس کی مخالفت کرنا اور نفسانی خواہشات کے خلاف زبردستی کر کے محنت کر کے کوشش کر کے کڑوا گھونٹ پی کر عمل کرنا، اور کسی طرح اپنے نفس کی خواہشات کو دبا کر اور کچل کر اس کے خلاف کرنا، اس کا نام ''مجاہدہ'' ہے۔

انسان کا نفس، لذتوں کا خوگر ہے

ہمارا اور آپ کا نفس یعنی وہ قوت جو انسان کو کسی کام کے کرنے کی طرف ابھارتی ہے، وہ نفس دنیاوی لذتوں کا عادی بنا ہوا ہے، لہٰذا جس کام میں اس کو ظاہری لذت اور مزہ آتا ہے، اس کی طرف یہ دوڑتا ہے، یہ اس کی جبلت اور خصلت ہے کہ اپنے کاموں کی طرف انسان کو مائل کرے، یہ انسان سے کہتا ہے کہ یہ کام کرلو تو مزہ آجائے گا، یہ کام کرلو تو لذت حاصل ہو جائے گی، لہٰذا یہ نفس انسان کے دل میں خواہشات کے تقاضے پیدا کرتا رہتا ہے، اب اگر انسان اپنے نفس کو بے لگام اور بے مہار چھوڑ دے، اور جو بھی لذت کے حصول کا تقاضا پیدا ہو، اس پر عمل کرتا جائے، اور نفس کی ہر بات مانتا جائے، تو اس کے نتیجے میں پھر وہ انسان انسان نہیں رہتا، بلکہ جانور بن جاتا ہے۔

خواہشاتِ نفسانی میں سکون نہیں

نفسانی خواہشات کا اصول یہ ہے کہ اگر ان کی پیروی کرتے جاؤ گے، اور ان کے پیچھے چلتے جاؤ گے، اور اس کی باتیں مانتے جاؤ گے، تو پھر کسی حد پر جا کر قرار نہیں آئے گا، انسان کا نفس کبھی یہ نہیں کہے گا کہ اب ساری خواہشات پوری ہوگئیں، اب مجھے کچھ نہیں چاہئے، یہ کبھی زندگی بھر نہیں ہوگا، اس لئے کہ کسی انسان کی ساری خواہشات اس زندگی میں پوری نہیں ہوسکتیں، اور اس کے ذریعہ کبھی قرار اور سکون نصیب نہیں ہوگا۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں نفس کے ہر تقاضے پر عمل کرتا جاؤں، اور ہر خواہش پوری کرتا جاؤں تو کبھی اس شخص کو قرار نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ اس نفس کی خاصیت یہ ہے کہ ایک لطف اٹھانے کے بعد اور ایک مرتبہ لذت حاصل کر لینے کے بعد یہ فوراً دوسری لذت کی طرف بڑھتا ہے، لہٰذا اگر تم چاہتے ہو کہ نفسانی خواہشات کے پیچھے چل چل کر سکون حاصل کرلیں تو ساری عمر بھی سکون نہیں ملے گا تجربہ کر کے دیکھ لو۔

لطف اور لذت کی کوئی حد نہیں ہے

آج جن کو ترقی یافتہ اقوام کہا جاتا ہے انہوں نے یہ ہی کہا ہے کہ انسان کی ''پرائیویٹ زندگی'' میں کوئی دخل اندازی نہ کرو، جس کی مرضی میں جو کچھ آرہا ہے، وہ اس کو کرنے دو، اور جس شخص کو جس

کام میں مزہ آرہا ہے، وہ اسے کرنے دو، نہ اس کا ہاتھ روکو، اور نہ اس پر کوئی پابندی لگاؤ، اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کرو، چنانچہ آپ دیکھ لیں کہ آج انسان کو لطف حاصل کرنے اور مزہ حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں، نہ قانون کی رکاوٹ نہ مذہب کی رکاوٹ، نہ اخلاق کی رکاوٹ، نہ معاشرے کی رکاوٹ ہے، کوئی پابندی نہیں ہے، اور ہر شخص وہ کام کر رہا ہے جو اس کی مرضی میں آرہا ہے، اور اگر اس شخص سے کوئی پوچھے کہ کیا تمہارا مقصد حاصل ہو گیا؟ تم جتنا لطف اس دنیا سے حاصل کرنا چاہتے تھے، کیا لطف کی وہ آخری منزل اور مزے کا وہ آخری درجہ تمہیں حاصل ہو گیا، جس کے بعد تمہیں اور کچھ نہیں چاہئے؟ کوئی شخص بھی اس سوال کا ''ہاں'' میں جواب نہیں دے گا، بلکہ ہر شخص یہی کہے گا کہ مجھے اور مل جائے، مجھے اور مل جائے، آگے بڑھتا چلا جاؤں، اس لئے کہ ایک خواہش دوسری خواہش کو اُبھارتی رہتی ہے۔

مغرب میں علانیہ زنا کاری کی بہتات

مغربی معاشرے میں ایک مرد اور ایک عورت آپس میں ایک دوسرے سے جنسی لذت حاصل کرنا چاہیں تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جاؤ، کوئی رکاوٹ نہیں، کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں، حد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو ارشاد فرمایا تھا، وہ آنکھوں نے دیکھ لیا، آپ نے فرمایا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ زنا اس قدر عام ہو جائے گا کہ دنیا میں سب سے نیک شخص وہ ہو گا کہ دو آدمی ایک سڑک کے چوراہے پر بدکاری کا ارتکاب کر رہے ہوں گے، وہ شخص آکر ان سے کہے گا کہ اس درخت کی اوٹ میں کرلو، وہ ان کو اس کام سے منع نہیں کرے گا کہ یہ کام برا ہے، بلکہ وہ یہ کہے گا کہ یہاں سب کے سامنے کرنے کے بجائے اس درخت کی اوٹ میں جا کر کرلو، وہ کہنے والا شخص سب سے نیک آدمی ہو گا(۱)، آج وہ زمانہ تقریباً آچکا ہے، آج کھلم کھلا بغیر کسی رکاوٹ اور پردے کے یہ کام ہو رہا ہے۔

امریکہ میں ''زنا بالجبر'' کی کثرت کیوں؟

لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے جنسی جذبات کو تسکین دینے کے لئے حرام طریقہ اختیار کرنا چاہے تو اس کے لئے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود ''زنا بالجبر'' کے واقعات جتنے امریکہ میں ہوتے ہیں دنیا میں اور کہیں نہیں ہوتے، حالانکہ رضامندی کے ساتھ یہ کام کرنے کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں، جو آدمی جس طرح چاہے، اپنے جذبات کو تسکین دے سکتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ رضامندی کے ساتھ زنا کر کے دیکھ لیا، اس میں جو مزہ تھا، وہ حاصل کرلیا، لیکن اس کے بعد اس میں بھی

(۱) کنز العمال، رقم: ۳۸۸۸۶ (۱۴/۳۴۵)، تاریخ دمشق (۶۴/۲۶۸)

قرار نہ آیا تو اب با قاعدہ یہ جذبہ پیدا ہوا کہ یہ کام زبردستی کرو، تاکہ زبردستی کرنے کا جو مزہ ہے وہ بھی حاصل ہو جائے۔لہٰذا یہ انسانی خواہشات کسی مرحلے پر جا کر رکتی نہیں ہیں، بلکہ اور آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں، اور یہ ہوس کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

یہ پیاس بجھنے والی نہیں

آپ نے ایک بیماری کا نام سنا ہوگا جس کو ''جوع البقر'' کہتے ہیں، اس بیماری کی خاصیت یہ ہے کہ انسان کو بھوک لگتی رہتی ہے، جو دل چاہے کھالے، جتنا چاہے، کھالے، مگر بھوک نہیں مٹتی۔اسی طرح ایک اور بیماری ہے، جس کو ''استسقاء'' کہا جاتا ہے، اس بیماری میں انسان کو پیاس لگتی رہتی ہے، گھڑے کے گھڑے پی جائے، کنویں بھی ختم کر جائے، مگر پیاس نہیں بجھتی۔ یہی حال انسان کی خواہشات کا ہے، اگر ان کو قابو نہ کیا جائے، اور ان پر کنٹرول نہ کیا جائے، اور جب تک ان کو شریعت اور اخلاق کے بندھن میں نہ باندھا جائے، اس وقت تک اس کو ''استسقاء'' کی بیماری کی طرح لطف و لذت کے کسی بھی مرحلے پر جا کر قرار نصیب نہیں ہوتا، بلکہ لذت کی وہ ہوس بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

تھوڑی سی مشقت برداشت کرلو

اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ نفسانی خواہشات کے پیچھے مت چلو، ان کی اتباع مت کرو، اس لئے کہ یہ تمہیں ہلاکت کے گڑھے میں لے جا کر ڈال دے گی۔ بلکہ اس کو ذرا قابو میں رکھو، اور اس کو کنٹرول کر کے شریعت کی معقول حدود کے اندر رکھو، اور اگر تم رکھنا چاہو گے تو شروع شروع میں یہ نفس تمہیں ذرا تنگ کرے گا، تکلیف ہوگی، صدمہ ہوگا، دکھ ہوگا۔ایک کام کو دل چاہ رہا ہے، مگر اس کو روک رہے ہیں۔ دل چاہ رہا ہے کہ ٹی وی دیکھیں، اور اس میں جو خراب خراب فلمیں آرہی ہیں، وہ دیکھیں، یہ نفس کا تقاضا ہو رہا ہے۔اب جو آدمی اس کا عادی ہے، اس سے کہو کہ اس کو مت دیکھ، اور اس نفسانی تقاضا پر عمل نہ کر، اگر وہ نہیں دیکھے گا، اور آنکھ کو اس سے روکے گا، تو شروع میں اس کو دقت ہوگی، اور مشقت ہوگی، برا لگے گا، اس لئے کہ وہ دیکھنے کا عادی ہے، اس کو دیکھے بغیر چین نہیں آتا، لطف نہیں آتا۔

یہ نفس کمزور پر شیر ہے

لیکن ساتھ میں اللہ تعالیٰ نے اس نفس کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ اگر کوئی شخص اس مشقت اور تکلیف کے باوجود ایک مرتبہ ڈٹ جائے کہ چاہے مشقت ہو، یا تکلیف ہو، چاہے دل پر آرے چل

جائیں، تب بھی یہ کام نہیں کروں گا، جس دن یہ شخص نفس کے سامنے اس طرح ڈٹ گیا، بس اس دن سے یہ نفسانی خواہشات خود بخود ڈھیلی پڑنی شروع ہو جائیں گی۔ یہ نفس اور شیطان کمزور کے اوپر شیر ہیں، جو اس کے سامنے بھیگی بلی بنا رہے، اور اس کے تقاضوں پر چلتا رہے، اس کے اوپر یہ چھا جاتا ہے، اور غالب آ جاتا ہے، اور جو شخص ایک مرتبہ پختہ ارادہ کر کے اس کے سامنے ڈٹ گیا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا، چاہے کتنا تقاضا ہو، چاہے دل پر آرے چل جائیں، پھر یہ نفس ڈھیلا پڑ جاتا ہے، اور اس کام کے نہ کرنے پر پہلے دن جتنی تکلیف ہوئی تھی، دوسرے دن اس سے کم ہوگی، اور تیسرے دن اس سے کم، اور ہوتے ہوتے وہ تکلیف ایک دن بالکل رفع ہو جائے گی، اور نفس اس کا عادی بن جائے گا۔

نفس دودھ پیتے بچے کی طرح ہے

علامہ بوصیریؒ ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں جن کا "قصیدہ بردہ" بہت مشہور ہے جو حضور اقدس ﷺ کی شان میں ایک نعتیہ قصیدہ ہے۔ اس میں اُنہوں نے ایک عجیب وغریب حکیمانہ شعر کہا ہے۔

اَلنَّفْسُ کَالطِّفْلِ اِنْ تُمْهِلْهُ شَبَّ عَلٰی
حُبِّ الرَّضَاعِ وَاِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمِ

یہ انسان کا نفس ایک چھوٹے بچے کی طرح ہے۔ جو ماں کا دودھ پیتا ہے، اور وہ بچہ دودھ پینے کا عادی بن گیا، اب اگر اس سے دودھ چھڑانے کی کوشش کرو تو وہ بچہ کیا کرے گا؟ روئے گا، چلائے گا، شور کرے گا۔ اب اگر ماں باپ یہ سوچیں کہ دودھ چھڑانے سے بچے کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے، چلو چھوڑو، اسے دودھ پینے دو، دودھ پیتا رہے۔

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر بچے کو اس طرح دودھ پینے کی حالت میں چھوڑ دیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جوان ہو جائے گا، اور اس سے دودھ نہیں چھوٹ پائے گا۔ اس لئے کہ تم اس کی تکلیف، اس کی فریاد اور اس کی چیخ پکار سے ڈر گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے دودھ نہیں چھڑا سکے۔ اب اگر اس کے سامنے روٹی لاتے ہیں تو وہ کہتا ہے میں تو نہیں کھاؤں گا۔ میں تو دودھ ہی پیوں گا۔ لیکن دنیا میں کوئی ماں باپ ایسے نہیں ہوں گے جو یہ کہیں کہ چونکہ بچے کو دودھ چھڑانے سے تکلیف ہو رہی ہے، اس لئے دودھ نہیں چھڑاتے۔ ماں باپ جانتے ہیں کہ دودھ چھڑانے سے روئے گا، چلائے گا، رات کو نیند نہیں آئے گی، خود بھی جاگے گا، ہمیں بھی جگائے گا، لیکن پھر بھی دودھ چھڑاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ بچے کی بھلائی اسی میں ہے۔ اگر آج اس کو دودھ نہ چھڑایا گیا تو ساری عمر یہ کبھی روٹی کھانے کے لائق نہیں ہوگا۔

اس کو گناہوں کی چاٹ لگی ہوئی ہے

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ انسان کا نفس بھی بچے کی مانند ہے۔ اس کے منہ کو گناہ لگے ہوئے ہیں۔ گناہوں کا ذائقہ اور اس کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ اگر تم نے اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا کہ چلو کرنے دو، گناہ چھڑانے سے تکلیف ہوگی۔ نظر غلط جگہ پر پڑتی ہے اور اس کو ہٹانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ زبان کو جھوٹ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اگر جھوٹ بولنا چھوڑیں گے تو بڑی تکلیف ہوگی۔ اور اس زبان کو مجلسوں کے اندر بیٹھ کر غیبت کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اگر اس کو روکیں گے تو بڑی دقت ہوگی۔ نفس ان باتوں کا عادی بن گیا ہے۔ رشوت لینے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اللہ بچائے، سود کھانے کی عادت پڑ گئی۔ اور بہت سے گناہوں کی عادت پڑ گئی ہے۔ اور اب ان عادتوں کو چھڑانے سے نفس کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اگر نفس کی اس تکلیف سے گھبرا کر اور ڈر کر بیٹھ گئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری عمر نہ کبھی گناہ چھوٹیں گے، اور نہ قرار ملے گا۔

سکون اللہ کے ذکر میں ہے

یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں قرار اور سکون نہیں ہے، ساری دنیا کے اسباب و وسائل جمع کر لیے، لیکن اس کے باوجود سکون نصیب نہیں۔ چین نہیں ملتا۔ میں نے آپ کو ابھی مغربی معاشرے کی مثال دی تھی کہ وہاں پیسے کی ریل پیل، تعلیم کا معیار بلند، لذت حاصل کرنے کے سارے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے کہ جس طرح چاہو، لذت حاصل کر لو، لیکن اس کے باوجود یہ حال ہے کہ خواب آور گولیاں کھا کھا کر اس کی مدد سے سو رہے ہیں۔ کیوں! دل میں سکون و قرار نہیں، سکون کیوں نہیں ملا؟ اس لئے کہ گناہوں میں سکون کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہو، یاد رکھو! ان گناہوں اور نافرمانیوں میں اور معصیتوں میں سکون نہیں۔ سکون تو صرف ایک چیز میں ہے، اور وہ ہے:

﴿اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾(۱)

اللہ کی یاد میں اطمینان اور سکون ہے۔ اس واسطے یہ سمجھنا دھوکہ ہے کہ نافرمانیاں کرتے جائیں گے، اور سکون ملتا جائے گا۔ یاد رکھو! زندگی بھر نہیں ملے گا، اس دنیا سے تڑپ تڑپ کر جاؤ گے، اگر نافرمانیوں کو نہ چھوڑا تو سکون کی منزل حاصل نہ ہوگی۔

سکون اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو دیتے ہیں جن کے دل میں اس کی محبت ہو، جن کے دل میں اس کی یاد ہو، جن کا دل اس کے ذکر سے آباد ہو۔ ان کے سکون اور اطمینان کو دیکھو کہ ظاہری طور پر

---

(۱) الرعد: ۲۸

پریشان حال بھی ہیں، فقر ہے، فاقے بھی گزر رہے ہیں، لیکن دل کو سکون اور قرار کی نعمت میسر ہے۔ لہٰذا اگر دنیا کا بھی سکون حاصل کرنا چاہتے ہو تو ان نافرمانیوں اور گناہوں کو تو چھوڑنا پڑے گا، اور گناہوں کو چھوڑنے کے لئے ذرا سا مجاہدہ کرنا پڑے گا، نفس کے مقابلے میں ذرا سا ڈٹنا پڑے گا۔

اللہ کا وعدہ جھوٹا نہیں ہوسکتا

اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ بھی فرمالیا:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۱)

جو لوگ ہمارے راستے میں یہ مجاہدہ اور محنت کرتے ہیں کہ ماحول کا، معاشرے کا، نفس کا شیطان کا اور خواہشات کا تقاضا چھوڑ کر وہ ہمارے حکم پر چلنا چاہتے ہیں، تو ہم کیا کرتے ہیں:

﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۲)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ "ہم ان کے ہاتھ پکڑ کر لے چلیں گے" یہ نہیں کہ دور سے دکھادیا کہ "یہ راستہ ہے" بلکہ فرمایا کہ ہم اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جائیں گے، لیکن ذرا کوئی قدم تو بڑھائے، ذرا کوئی ارادہ تو کرے، ذرا کوئی اپنے اس نفس کے مقابلے میں ایک مرتبہ ڈٹے تو سہی، پھر اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، جو کبھی جھوٹا نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا "مجاہدہ" اسی کا نام ہے کہ ایک مرتبہ آدمی ڈٹ کر ارادہ کرلے کہ یہ کام نہیں کروں گا، دل پر آرے چل جائیں گے، خواہشات پامال ہوجائیں گی، دل و دماغ پر قیامت گزر جائے گی، لیکن یہ گناہ کا کام نہیں کروں گا، جس دن نفس کے سامنے ڈٹ گیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس دن سے ہمارا محبوب ہوگیا، اب ہم خود اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے جائیں گے۔

اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے

اس لئے اصلاح کے راستے میں سب سے پہلا قدم "مجاہدہ" ہے اس کا عزم کرنا ہوگا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس سرہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں پامال ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے

(۱) العنکبوت: ۶۹، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے"

(۲) العنکبوت: ۶۹، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے"

جو آرزوئیں دل میں پیدا ہو رہی ہیں، وہ چاہے برباد ہو جائیں، چاہے ان کا خون ہو جائے، اب میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اب تو اس دل کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے۔ اب اس دل میں اللہ جل جلالہ کے انوار کا نزول ہوگا، اب اس دل میں اللہ کی محبت جاگزیں ہوگی، اب یہ گناہ نہیں ہوں گے، پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسی رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اور آدمی اس راہ پر چل پڑتا ہے۔

یاد رکھو! کہ شروع شروع میں تو یہ کام کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے کہ دل تو کچھ چاہ رہا ہے، اور اللہ کی خاطر اس کام کو چھوڑنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے، لیکن بعد میں اس تکلیف میں ہی مزہ آنے لگتا ہے، اور لطف آنے لگتا ہے۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ میں نفس کو جو کچل رہا ہوں اور آرزوؤں کا جو خون کر رہا ہوں، یہ اپنے مالک اور خالق کی خاطر کر رہا ہوں، اس میں جو مزہ اور کیف ہے آپ ابھی اس کا تصور نہیں کر سکتے۔

ماں یہ تکلیف کیوں برداشت کرتی ہے؟

ماں کو دیکھئے کہ اس کی کیا حالت ہوتی ہے کہ سخت سردی کا عالم ہے، اور کڑکڑاتے جاڑے کی رات ہے، لحاف میں لیٹی ہوئی ہے، اور بچہ پاس پڑا ہے۔ اس حالت میں اس بچے نے پیشاب کر دیا، اب نفس کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ گرم گرم بستر چھوڑ کر کہاں جاؤں، یہ تو جاڑے کا موسم ہے، گرم گرم بستر چھوڑ کر جانا تو بڑا مشکل کام ہے، لیکن ماں یہ سوچتی ہے کہ اگر میں نہ گئی تو بچہ گیلا پڑا رہے گا، اس کے کپڑے گیلے ہیں۔ اس طرح گیلا پڑا رہے گا، تو کہیں اس کو بخار نہ ہو جائے۔ اس کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ وہ بے چاری اپنے نفس کا تقاضا چھوڑ کر سخت کڑاکے کے جاڑے میں باہر جا کر ٹھنڈے پانی سے اس کے کپڑے دھو رہی ہے، اور اس کے کپڑے بدل رہی ہے، یہ کوئی معمولی مشقت ہے؟ معمولی تکلیف ہے؟ لیکن ماں یہ تکلیف برداشت کر رہی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اپنے بچے کی فلاح اور اس کی صحت ماں کے پیشِ نظر ہے، اس لئے وہ اس سخت جاڑے میں اپنے نفس کے تقاضے کو پامال کر کے یہ سارے کام کر رہی ہے۔

محبت تکلیف کو ختم کر دیتی ہے

ایک عورت کا کوئی بچہ نہیں ہے، کوئی اولاد نہیں، وہ کہتی ہے، بھائی! کسی طرح میرا علاج کراؤ، تاکہ بچہ ہو جائے، اولاد ہو جائے، اور اس کے لئے دعائیں کراتی پھرتی ہے کہ دعا کرو اللہ میاں سے مجھے اولاد دیدے، اور اس کے لئے تعویذ، گنڈے اور خدا جانے کیا کیا کراتی پھر رہی ہے، ایک دوسری عورت اس سے کہتی ہے کہ ارے! تو کس چکر میں پڑی ہے؟ بچہ پیدا ہوگا تو تجھے بہت سی مشقتیں اُٹھانی

پڑیں گی، جاڑے کی راتوں میں اُٹھ کر ٹھنڈے پانی سے کپڑے دھونے ہوں گے، تو وہ عورت جواب دیتی ہے کہ میرے ایک بچے پر ہزار جاڑوں کی راتیں قربان ہیں، اس لئے کہ اس بچے کی قدر و قیمت اور اس کے دولت ہونے کا احساس اس کے دل میں ہے، اس واسطے اس ماں کے لئے ساری تکلیفیں راحت بن گئیں، وہ ماں جو اللہ سے مانگ رہی ہے کہ یا اللہ! مجھے اولاد دیدے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اولاد کی جتنی ذمہ داریاں ہیں، جتنی تکلیفیں ہیں، وہ دیدے، لیکن وہ تکلیفیں اس کی نظر میں تکلیفیں ہی نہیں، بلکہ وہ راحت ہیں۔ اب جو ماں جاڑے کی رات میں اُٹھ کر کپڑے دھو رہی ہے اس کو طبعی طور پر تکلیف تو ضرور ہو رہی ہے، لیکن عقلی طور پر اسے اطمینان ہے میں یہ کام اپنے بچے کی بھلائی کی خاطر کر رہی ہوں، جب یہ اطمینان ہوتا ہے تو اس وقت اسے اپنی آرزوؤں کو کچلنے میں بھی لطف آنے لگتا ہے۔ اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرماتے ہیں ؏

از محبت تلخہا شیریں شود

کہ جب محبت پیدا ہو جاتی ہے تو کڑوی سے کڑوی چیزیں بھی میٹھی معلوم ہونے لگتی ہیں، جن کاموں میں تکلیف ہو رہی تھی، محبت کی خاطر ان میں بھی مزہ آنے لگتا ہے، لطف آنے لگتا ہے کہ میں یہ کام محبت کی وجہ سے کر رہا ہوں، محبت کی خاطر کر رہا ہوں۔

مولیٰ کی محبت لیلیٰ سے کم نہ ہو

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں محبت کی بڑی عجیب حکایتیں لکھی ہیں، لیلیٰ مجنوں کا قصہ لکھا ہے کہ مجنوں لیلیٰ کی خاطر کس طرح دیوانہ بنا، اور کیا کیا مشقتیں اُٹھائیں، دودھ کی نہر نکالنے کے ارادہ سے چل کھڑا ہوا، اور کام شروع بھی کر دیا، یہ ساری مشقتیں اُٹھا رہا ہے، کوئی اس سے کہے کہ تو یہ جو کام کر رہا ہے، یہ بڑی مشقت کا کام ہے، اسے چھوڑ دے، تو وہ کہتا ہے کہ ہزار مشقتیں قربان، جس کی خاطر یہ کام کر رہا ہوں، اس کی محبت میں کر رہا ہوں، مجھے تو اسی نہر کے کھودنے میں مزہ آ رہا ہے، اس لئے کہ یہ میں اپنی محبوبہ کی خاطر کر رہا ہوں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

مولیٰ کا عشق حقیقی کب لیلیٰ کے عشق سے کم ہو سکتا ہے۔ مولیٰ کے لئے گیند بن جانا زیادہ اولیٰ ہے، لہٰذا جب آدمی محبت کی خاطر یہ تکلیفیں اُٹھاتا ہے تو پھر بڑا لطف آنے لگتا ہے۔

تنخواہ سے محبت ہے

ایک آدمی ملازمت کرتا ہے، جس کے لئے صبح کو سویرے اُٹھنا پڑتا ہے، اچھی خاصی سردی میں

بستر پر لیٹا ہوا ہے، اور جانے کا وقت آ گیا تو بستر چھوڑ کر جا رہا ہے، نفس کا تقاضا تو یہ تھا کہ گرم گرم بستر میں پڑا رہتا، لیکن گھر چھوڑ کر بیوی بچوں کو چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اور سارا دن محنت کی چکی پیسنے کے بعد رات کو کسی وقت گھر واپس آتا ہے۔ اور بے شمار لوگ ایسے بھی ہیں جو صبح اپنے بچوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر جاتے ہیں، اور رات کو واپس آ کر سوتا ہوا پاتے ہیں۔ غرض وہ شخص یہ سب تکلیفیں برداشت کر رہا ہے، اب اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ ارے بھائی! تم ملازمت میں بہت تکلیف اُٹھا رہے ہو، چلو میں تمہاری ملازمت چھڑوا دیتا ہوں۔ وہ جواب دے گا، نہیں، بھائی نہیں، بڑی مشکل سے تو یہ ملازمت لگی ہے، اس کو مت چھڑوانا۔ اس کو صبح سویرے اُٹھ کر جانے میں ہی مزہ آ رہا ہے، اور اولاد کو بیوی کو چھوڑ کر جانے میں بھی مزہ آ رہا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اس کو اس تنخواہ سے محبت ہو گئی ہے جو مہینے کے آخر میں ملنے والی ہے، اس محبت کے نتیجے میں یہ ساری تکلیفیں شیریں بن گئیں۔ اب اگر کسی وقت ملازمت چھوٹ گئی تو روتا پھر رہا ہے کہ ہائے وہ دن کہاں گئے، جب صبح کو سویرے اُٹھ کر جایا کرتا تھا، اور لوگوں سے سفارشیں کراتا پھر رہا ہے کہ مجھے ملازمت پر دوبارہ بحال کر دیا جائے۔ اگر محبت کسی چیز سے ہو جائے تو اس راستے کی ساری تکلیفیں آسان اور مزیدار ہو جاتی ہیں، اسی میں لطف آنے لگتا ہے۔

اسی طرح گناہوں کو چھوڑنے میں تکلیف ضرور ہے، شروع میں مشقت ہوگی، لیکن جب ایک مرتبہ ڈٹ گئے، اور اس کے مطابق عمل شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد بھی ہوگی، اور پھر انشاء اللہ تعالیٰ اس تکلیف میں مزہ آنے لگے گا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مزہ آنے لگے گا۔

عبادت کی لذت سے آشنا کر دو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک مرتبہ بڑی عجیب وغریب بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ انسان کے اس نفس کو لذت اور مزہ چاہئے، اس کی خوراک لذت اور مزہ ہے، لیکن لذت اور مزے کی کوئی خاص شکل اس کو مطلوب نہیں کہ فلاں قسم کا مزہ چاہئے، اور فلاں قسم کا نہیں چاہئے، بس اس کو تو مزہ چاہئے۔ اب تم نے اس کو خراب قسم کے مزے کا عادی بنا دیا ہے، خراب قسم کی لذتوں کا عادی بنا دیا ہے، ایک مرتبہ اس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کی لذت سے آشنا کر دو۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے کی لذت سے آشنا کر دو پھر یہ نفس اسی میں لذت اور مزہ لینے لگے گا۔

مجھے تو دن رات بے خودی چاہئے

غالب کا ایک مشہور شعر ہے، خدا جانے لوگ اس کا کیا مطلب لیتے ہوں گے، لیکن ہمارے

حضرت مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا بڑا اچھا مطلب نکالا ہے، وہ شعر ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

شراب سے مجھ کو کوئی تعلق نہیں، مجھے تو دن رات لذت کی بے خودی چاہئے، تم نے مجھے شراب کا عادی بنادیا تو مجھے شراب میں بے خودی حاصل ہوگئی، شراب میں لذت آنے لگی، اگر تم مجھے اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ذکر اور اس کی اطاعت کا عادی بنا دیتے تو یہ بے خودی مجھے اللہ کے ذکر میں حاصل ہوجاتی، میں تو اسی میں خوش ہوجاتا، لیکن یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم نے مجھے ان چیزوں کے بجائے شراب کا عادی بنادیا۔

نفس کو کچلنے میں مزہ آئے گا

اسی طرح یہ مجاہدہ شروع میں تو بڑا مشکل لگتا ہے کہ بڑا کٹھن سبق دیا جارہا ہے کہ اپنے نفس کی مخالفت کرو، اپنے نفس کی خواہشات کی خلاف ورزی کرو۔ نفس تو چاہ رہا ہے کہ غیبت کروں، مجلس میں غیبت کرنے کا موضوع بھی آگیا، اب جی چاہ رہا ہے کہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لوں، اب اس وقت اس کو لگام دینا کہ نہیں، یہ کام مت کرو۔ یہ بڑا مشکل کام لگتا ہے، لیکن یاد رکھئے کہ دور دور سے یہ مشکل نظر آتا ہے، جب آدمی نے یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ یہ کام نہیں کروں گا، تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اور فضل و کرم سے مدد بھی ہوگی، اور پھر تم نے اس لذت آرزو اور خواہش کو جو کچلا ہے، اس کچلنے میں جو مزہ آئے گا انشاء اللہ تم انشاء اللہ اس کی حلاوت اس غیبت کی لذت سے کہیں زیادہ ہوگی۔

ایمان کی حلاوت حاصل کرلو

حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص کے دل میں تقاضا پیدا ہوا کہ نگاہ غلط جگہ پر ڈالوں۔ اور کون شخص ہے جس کے دل میں یہ تقاضا نہیں ہوتا، اب دل بڑا کسمسا رہا ہے کہ اس کو دیکھ ہی لوں، لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خشیت کے خیال سے نظر کو بچالیا، اور نگاہِ بد نہیں ڈالی، بڑی تکلیف ہوئی، دل پر آرے چل گئے، لیکن اسی تکلیف کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ایمان کی ایسی حلاوت عطا فرمائیں گے کہ اس کے آگے دیکھنے کی لذت ہیچ ہے، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ ہے، اور حدیث میں موجود ہے۔ (۱)

یہ وعدہ صرف نگاہ کے گناہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر گناہ چھوڑنے پر یہ وعدہ ہے، مثلاً

(۱) مسند أحمد (٥/٢٦٤)

غیبت میں بڑا مزہ آرہا ہے، لیکن ایک مرتبہ آپ نے اللہ جل جلالہ کے خیال سے غیبت چھوڑ دی، اور غیبت کرتے کرتے رک گئے۔ اللہ کے ڈر کے خیال سے غیبت کا کلمہ زبان پر آتے آتے رک گیا، پھر دیکھو کیسی لذت حاصل ہوتی ہے اور جب انسان گناہوں کی لذتوں کے مقابلے میں اس لذت کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے ساتھ تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

حاصلِ تصوف

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی، یاد رکھنے کے لائق ہے، فرمایا:

"وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جب دل میں کسی اطاعت کے کرنے میں سستی پیدا ہو، مثلاً نماز کا وقت ہوگیا، لیکن نماز کو جانے میں سستی ہو رہی ہے، اس سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کرے، اور جب گناہ سے بچنے میں دل سستی کرے تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے"

پھر فرمایا:

"بس! اسی سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہوتی ہے، اور جس شخص کو یہ بات حاصل ہو جائے، اس کو پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں"

لہٰذا نفسانی خواہشات پر آرے چلا چلا کر اور ہتھوڑے مار مار کر جب اس کو کچل دیا تو اب وہ نفس کچلنے کے نتیجے میں اللہ جل جلالہ کی تجلی گاہ بن گیا۔

دل تو ہے ٹوٹنے کے لئے

ہمارے والد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک مثال دیا کرتے تھے۔ اب تو وہ زمانہ چلا گیا، پہلے زمانے میں یونانی حکیم ہوا کرتے تھے، وہ کشتہ بنایا کرتے تھے، سونے کا کشتہ، چاندی کا کشتہ، سنکھیا کا کشتہ، اور نہ جانے کیا کیا کشتے تیار کرتے تھے اور کشتہ بنانے کے لئے وہ سونے کو جلاتے تھے اور اتنا جلاتے تھے کہ وہ سونا راکھ بن جاتا تھا۔ اور کہتے تھے کہ سونے کو جتنا زیادہ جلایا جائے گا، اتنا ہی اس کی طاقت میں اضافہ ہوگا، اب جلا جلا کر جب کشتہ تیار کیا تو وہ کشتہ طلا تیار ہوگیا، کوئی اس کو ذرا سا کھالے تو پتہ نہیں کہاں کی قوت آجائے گی، تو جب سونے کو جلا جلا کر مٹا مٹا کر پامال کر کر کے راکھ بنا دیا تو اب یہ کشتہ تیار ہوگیا۔

ہمارے حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ان خواہشاتِ نفس کو جب کچلو گے، اور کچل کچل کر پیس پیس کر راکھ بنا کر فنا کر دو گے، تب یہ کشتہ بن جائے گا، اس میں اللہ جل جلالہ

کے ساتھ تعلق کی قوت آجائے گی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت آجائے گی۔ اب دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بن جائے گا، اس دل کو جتنا توڑو گے، اتنا ہی یہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں محبوب بنے گا۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

تم اس پر جتنی چوٹیں لگاؤ گے، اتنا ہی یہ بنانے والے کی نگاہ میں محبوب ہوگا۔ بنانے والے نے اس کو اسی لئے بنایا ہے کہ اسے توڑا جائے، اس کی خاطر اس کی خواہشات کو کچلا جائے۔ اور جب وہ کچل جاتا ہے تو کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ کیا اچھا شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

یہ کہہ کے کوزہ گر نے پیالہ پٹک دیا
اب اور کچھ بنائیں گے اس کو بگاڑ کے

اور کچھ بنائیں گے، یعنی جو وہ چاہیں گے، وہ بنائیں گے، لہٰذا یہ نہ سمجھو کہ خواہشاتِ نفس کو کچلنے سے جو چوٹیں لگ رہی ہیں، اور جو تکلیف ہو رہی ہے وہ بیکار جا رہی ہیں بلکہ اس کے بعد جب یہ دل اللہ تعالیٰ کی محبت کا محل بنے گا، اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد کا محل بنے گا، اس وقت اس کو جو حلاوت نصیب ہوگی، خدا کی قسم اس کے مقابلے میں گناہوں کی یہ ساری لذتیں خاک در خاک ہیں، انکی کوئی حقیقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ دولت ہم سب کو نصیب فرمائیں، بس! شروع میں تھوڑی سی محنت اور مشقت اُٹھانی پڑے گی۔ اور اسی کا نام مجاہدہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اسی بات کو حدیث شریف میں اس طرح بیان فرمایا:

((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ))(۱)

''مجاہد درحقیقت وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے''

اپنے نفس کی خواہشات کو اللہ کی خاطر کچلے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اپنے نفس کی خواہشات کے ہاتھوں میں کھلونا بننے سے بچائے، اور ان خواہشاتِ نفس کو قابو کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

❁❁❁

(۱) سنن الترمذی، کتاب فضائل الجهاد عن رسول الله، باب ما جاء فی فضل من مات مرابطًا، رقم: ۱۵٤٦، مسند أحمد، رقم: ۲۲۸۳۳

دل کی بیماریاں
اور
طبیبِ روحانی کی ضرورت ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ))(۱)

اخلاق کی درستگی اور اس کو اللہ جل جلالہ کے احکام کے مطابق بنانا اتنا ہی ضروری اور اتنا ہی اہم اور واجب ہے جتنا کہ عبادات کو بجالانا ضروری ہے، بلکہ اگر ذرا اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ عبادات، معاملات اور معاشرت کے جتنے احکام ہیں، ان میں سے کوئی بھی حکم اس وقت تک صحیح طریقے سے بجا نہیں لایا جا سکتا، جب تک اخلاق درست نہ ہوں۔ اگر اخلاق درست نہ ہوں تو بعض اوقات یہ نماز روزہ بھی بیکار ہو جاتا ہے۔ نہ صرف بیکار، بلکہ اُلٹا وبال بن جاتا ہے، اسی لئے اخلاق کی درستگی اور ان کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق بنانا عملی زندگی کی بنیاد ہے۔ یہ بنیاد نہ ہو تو عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی۔

اخلاق کی حقیقت واہمیت

اخلاق کا مطلب آج کل عرفِ عام میں کچھ اور سمجھا جاتا ہے اور جس اخلاق کی میں بات کر رہا ہوں وہ کچھ اور ہے۔ عرفِ عام میں اخلاق اس کو کہتے ہیں کہ ذرا مسکرا کر کسی آدمی سے مل لیے، اس

☆ اصلاحی خطبات (۳/۷۶ تا ۹۲)، ۱۸ دسمبر ۱۹۹۱ء، بروز جمعہ، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن البيهقي الكبرى، رقم: ١٠١٨٠ (٥/٢٦٥)، صحيح ابن حبان، رقم: ٢٩٧ (١/٥٣٣)، الزواجر عن اقتراف الكبائر (١/١٩٨)، اتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة (٧/١٣٤)، مستخرج أبي عوانة، رقم: ٤٤٤٣ (١١/١٤٣)، الزهد الكبير للبيهقي، رقم: ٨٧٢ (٢/٣٧٨)، الأربعون للفسوي، رقم: ٣٨ (١/٦٣)

کے ساتھ خندہ پیشانی سے، نرمی سے بات کرلی، اس کو کہتے ہیں کہ یہ بہت خوش اخلاق آدمی ہے، اس کے اخلاق بہت اچھے ہیں۔ لیکن جس اخلاق کی میں بات کر رہا ہوں اور جس اخلاق کا مطالبہ دین نے ہم سے کیا ہے اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ صرف اتنی بات نہیں ہے کہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے مل لیے۔ یہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملنا بھی اس کا ایک نتیجہ ہوتا ہے لیکن اصل اخلاق یہ نہیں ہے۔ بلکہ اصل اخلاق انسان کے باطن کی، اس کے دل کی، اس کی روح کی ایک صفت ہے۔ انسان کے باطن کے اندر مختلف قسم کے جذبات، خیالات، خواہشات پروان چڑھتے ہیں، ان کو اخلاق کہتے ہیں اور ان کو درست کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

روح کی اہمیت

اس بات کو ذرا وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ انسان کس کو کہتے ہیں؟ انسان نام ہے جسم اور روح کے مجموعے کا۔ صرف جسم کا نام انسان نہیں بلکہ انسان وہ جسم ہے جس میں روح موجود ہو۔ فرض کرو کہ ایک شخص کا انتقال ہوگیا۔ بتایئے کہ اس کے ظاہری جسم میں کیا فرق واقع ہوا؟ آنکھ اسی طرح موجود ہے، ناک اسی طرح موجود ہے، کان اسی طرح موجود ہیں، زبان اسی طرح موجود ہے، چہرہ ویسا ہی ہے، ہاتھ پاؤں ویسے ہی ہیں۔ سارا جسم جوں کا توں ہے لیکن کیا فرق پیدا ہوا؟ فرق یہ ہوا کہ پہلے اس جسم کے اندر روح سمائی ہوئی تھی، اب وہ روح نکل گئی۔ اور روح کے نکل جانے سے انسان، انسان نہیں رہتا، لاش بن جاتا ہے، جمادات میں داخل ہو جاتا ہے۔

جلدی سے دفن کردو

وہی انسان جو روح نکلنے سے پہلے دیکھنے والوں کی نگاہوں کا پیارا تھا، عزیز تھا، لوگ اس سے محبت کرتے تھے، زمین جائداد کا مالک تھا، بیوی بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا تھا، دوست احباب کا عزیز تھا، سبھی کچھ تھا، لیکن ادھر روح جسم سے نکلی، ادھر نہ تو زمین جائداد اس کی رہی، نہ وہ بیوی کا شوہر رہا اور نہ بچوں کا خبر گیری کرنے والا رہا۔ جو لوگ اس سے محبت کرتے تھے، اس کو اچھی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے، اب وہ اس فکر میں ہیں کہ جلد از جلد اس کو اٹھا کر قبر میں پہنچا کر ٹھکانے لگائیں۔ کوئی کہے کہ بھئی یہ تمہارا عزیز ہے اس کو ذرا اپنے گھر میں رکھ لو، تو کوئی اس کو رکھنے کو تیار نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک دو دن رکھے گا، بہت کوئی رکھ لے گا تو برف وغیرہ لگا کر ہفتہ بھر رکھ لے گا، لیکن اس سے زیادہ کوئی نہیں رکھے گا۔ اب سب اس فکر میں ہیں کہ جلد سے جلد اٹھا کر اس کو قبر میں ڈالو اور دفن کرو۔ وہی محبت کرنے والے جو دن رات اس کی چشم و ابرو کو دیکھتے تھے، اس کے اشاروں

پرناچتے تھے، روح کے نکلنے کے بعد اب یہ حالت ہوگئی کہ بیٹا اپنے ہاتھ سے باپ کو قبر میں رکھنا چاہتا ہے اور مٹی دے کر جلد از جلد اس کو دفن کردینا چاہتا ہے، بلکہ کسی نے قصہ بتایا کہ اخبار میں چھپا تھا کہ ایک آدمی کو، جسے شاید سکتہ ہوگیا تھا، لوگوں نے غلطی سے مردہ سمجھ کر دفن کردیا۔ جب سکتہ ختم ہوا تو وہ بیچارہ قبر پھاڑ کر کسی طرح گھر پہنچا۔ جب اس نے دستک دی تو باپ نے اندر سے پوچھا کہ کون ہے۔ جب اس نے اپنا نام بتایا تو باپ گھر سے لاٹھی لے کر نکلا اور لاٹھی سے اس کو مارا کہ یہ اس کا بھوت کہاں سے آگیا۔ جو غریب پہلے نہیں مرا تھا، اب لاٹھی سے مرگیا۔

آخر یہ کیا انقلابِ عظیم واقع ہوا کہ سارا جسم اسی طرح ہے جیسے پہلے تھا مگر اب کوئی اس کو گھر میں رکھنے کو تیار نہیں۔ فرق یہ واقع ہوا کہ اس کے جسم سے روح نکل گئی۔ معلوم یہ ہوا کہ انسان کے جسم کے اندر اصل چیز اس کی روح ہے۔ جب تک یہ روح انسان کے اندر موجود ہے اس وقت تک انسان انسان ہے، لیکن جب یہ روح نکل جائے تو پھر وہ انسان نہیں ہے، محض ایک لاش ہے جس سے کسی کو کوئی تعلق نہیں، سب اس فکر میں ہیں کہ اس کو جلد سے جلد قبرستان میں لے جاکر دفن کردیں۔

روح کی بیماریاں

جس طرح انسان کے جسم کے اندر بہت سی صفات ہوتی ہیں کہ بعض اوقات جسم صحتمند ہے، خوبصورت ہے، طاقتور ہے، توانا ہے اور بعض دفعہ جسم نحیف کمزور، دبلا پتلا، بیمار، بدصورت ہے، اسی طرح انسان کی روح کی بھی کچھ صفات ہوتی ہیں۔ بعض اوقات روح طاقتور ہوتی ہے اور بعض اوقات کمزور ہوتی ہے۔ بعض اوقات روح اچھی صفات کی مالک ہوتی ہے اور بعض اوقات خراب صفات کی مالک ہوتی ہے۔ جس طرح انسان کے جسم کو بیماریاں لگتی ہیں کہ کبھی بخار ہوگیا، کبھی پیٹ خراب ہوگیا، کبھی قبض ہوگیا، کبھی دست آگئے، اسی طرح روح کو بھی بیماریاں لگتی ہیں۔ روح کو کیا بیماریاں لگتی ہیں؟ روح کو یہ بیماریاں لگتی ہیں کہ کبھی اس میں تکبر پیدا ہوگیا، کبھی اس میں حسد پرورش پانے لگا، کبھی اس میں بغض پیدا ہوگیا، کبھی اس میں ناشکری پیدا ہوگئی۔ یہ ساری کی ساری روح کی بیماریاں ہیں۔

روح کا حسن وجمال

اسی طرح جیسے انسان کے جسم کی خوبصورتی ہے مثلاً کہتے ہیں کہ اس کا چہرہ بہت خوبصورت ہے، اس کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں، اس کا جسم بہت خوبصورت ہے۔ اسی طرح روح کی بھی کچھ خوبصورتی ہے، اس کا بھی کچھ جمال ہے، اس کا بھی کچھ حسن ہے۔ روح کا حسن کیا ہے؟ روح کا حسن یہ ہے کہ انسان کے اندر تواضع ہو، صبر وشکر ہو، اخلاص ہو، خود پسندی نہ ہو، ریاکاری نہ ہو۔ یہ سب روح

کا حسن و جمال ہے۔

جسمانی عبادات

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو بہت سے احکام دیئے ہیں۔ جن کا تعلق ہمارے ظاہری جسم سے ہے، مثلاً نماز ہے کہ نماز کس طرح پڑھی جاتی ہے؟ جسم کو کبھی کھڑا کیا جاتا ہے، کبھی رکوع میں چلے جاتے ہیں، کبھی سجدے میں چلے جاتے ہیں، کبھی سلام پھیرتے ہیں۔ یہ ساری حرکات جسم کے ذریعے انجام پاتی ہیں۔ تو یہ ایک جسمانی عبادت ہے۔ روزہ کس طرح رکھتے ہیں؟ ایک مقررہ وقت تک بھوکے پیاسے رہتے ہیں، یہ بھی ایک جسمانی عبادت ہے۔ مال کی ایک خاص مقدار محتاج کو دینا فرض کیا گیا ہے، جس کو زکوٰۃ کہتے ہیں، یہ بھی اپنے ہاتھ سے دی جاتی ہے۔ اور حج بھی ایک جسمانی اور مالی عبادت ہے۔ حج کے اندر محنت کرنی پڑتی ہے، سفر کرنا پڑتا ہے، خاص ارکان انجام دینے پڑتے ہیں۔ یہ سارے کام جسم سے ادا کیے جاتے ہیں، اس لئے یہ بھی ایک جسمانی عبادت ہے۔

تواضع دل کا فعل ہے

جس طرح یہ ساری عبادتیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے جسم سے متعلق رکھی ہیں، اسی طرح بہت سے فرائض ہماری روح اور باطن سے متعلق رکھے ہیں، مثلاً یہ حکم دیا کہ ہر انسان کو تواضع اختیار کرنی چاہئے۔ اب یہ تواضع جسم کا فعل نہیں ہے۔ یہ دل کا فعل ہے، باطن کا فعل ہے، روح کا فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ یہ صفت اپنے دل میں پیدا کی جائے۔

بہت سے بے پڑھے لکھے لوگ تواضع کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ کوئی مہمان آیا تو اس کی خاطر تواضع کر دو، کچھ کھانا وغیرہ اس کو کھلا دو، اس کو تواضع کہتے ہیں۔ تواضع کا مطلب یہ نہیں ہے۔ جو کچھ پڑھے لکھے ہیں، وہ بھی تواضع کا مطلب سمجھتے ہیں انکسار، دوسروں سے انکساری کے ساتھ پیش آنا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کی ذرا گردن جھکی ہوئی ہو، کچھ سینہ مڑا ہوا ہو، تو جو آدمی اس طرح لوگوں سے ملتا ہے، اس کو کہتے ہیں بڑا منکسر المزاج آدمی ہے، بہت متواضع ہے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ تواضع کا کوئی تعلق جسم سے نہیں ہے۔ تواضع کا تعلق قلب اور روح سے ہے۔ انسان اپنے دل میں اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھے کہ میری کوئی حقیقت نہیں ہے، میری کوئی قدرت نہیں ہے، میں تو ایک بیکس، بے بس بندہ ہوں۔ یہ خیال دل کے اندر پیدا ہو جائے، اس کو کہتے ہیں تواضع، اور اللہ تعالیٰ نے اسی کا حکم دیا ہے۔

اخلاص دل کی ایک کیفیت ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اخلاص کا حکم دیا ہے کہ اپنے اندر اخلاص پیدا کرو۔ عبادتوں میں اخلاص پیدا کرو، جو کام کرو اللہ جل جلالہ کی رضامندی اور خوشنودی کے لئے کرو، یہ ہے اخلاص۔ اخلاص زبان سے کہنے سے نہیں حاصل ہوتا۔ یہ دل کی ایک کیفیت ہے، باطن کی ایک صفت ہے، جس کو حاصل کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

شکر دل کا عمل ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے شکر کا حکم دیا ہے کہ جب کوئی نعمت تمہیں حاصل ہو تو اللہ جل جلالہ کا شکر ادا کرو۔ یہ شکر بھی انسان کے قلب کا فعل ہے، انسان کی روح کا فعل ہے۔ جتنا شکر ادا کرے گا، روح اتنی ہی زیادہ طاقتور ہوگی۔

صبر کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے صبر کا حکم دیا ہے کہ اگر کوئی ناگوار بات پیش آجائے تو سمجھو کہ اللہ جل جلالہ کی طرف سے ہے، جو کچھ بھی ہوا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت سے ہوا ہے، اس کی مشیت کے مطابق ہے۔ چاہے یہ مجھ کو کتنا ہی ناگوار ہو لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی مصلحت اسی میں تھی۔ انسان ہر ناگوار واقعے کے وقت یہ سوچے اور اس کا احساس دل میں پیدا کرے، اس کو صبر کہتے ہیں۔

اخلاقِ باطنہ کا حصول فرض ہے

لہٰذا بہت سے احکام ایسے ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری روح اور ہمارے باطن سے متعلق ہم کو عطا فرمائے ہیں۔ یاد رکھئے کہ صبر کے موقع پر صبر کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسا کہ نماز پڑھنا فرض ہے، شکر کے موقع پر شکر کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسا کہ روزہ رکھنا فرض ہے، اخلاص کے موقع پر اخلاص کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسا کہ زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ یہ سب بھی فرائض ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائے ہیں۔

باطنی بیماریاں حرام ہیں

بہت سے کام ظاہری اور جسمانی اعتبار سے گناہ قرار دیئے گئے ہیں، مثلاً جھوٹ بولنا، غیبت

کرنا، رشوت لینا، سود کھانا، شراب پینا، ڈاکہ ڈالنا۔ یہ سارے کے سارے کام گناہ ہیں جو ہمارے ظاہری جسم سے متعلق ہیں، ہمارے اعضاء سے سرزد ہوتے ہیں، اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت سے باطنی کاموں کو بھی گناہ قرار دیا ہے، مثلاً تکبر ایک باطنی بیماری ہے جو ہاتھ پاؤں سے انجام نہیں دی جاتی، یہ انسان کے باطن کا ایک روگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا ہے اور یہ اتنا ہی حرام ہے جتنا شراب پینا حرام ہے، جتنا سور کھانا حرام ہے، جتنا زنا اور بدکاری کرنا حرام ہے۔ اسی طرح حسد بھی ایک باطنی بیماری ہے اور اس کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور یہ بھی اتنا ہی حرام ہے جتنے وہ گناہ حرام ہیں جن کا میں نے پہلے آپ کے سامنے ذکر کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے باطن اور روح سے متعلق بھی کچھ احکام رکھے ہیں۔ کچھ صفات کو پیدا کرنے کا حکم دیا ہے اور کچھ صفات سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ جن صفات کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا کرنے کا حکم دیا ہے، وہ صفات اپنے باطن کے اندر پیدا کرلے اور جن صفات سے بچنے کا حکم دیا ہے وہ صفات اپنے باطن سے الگ کرلے تو کہیں گے کہ اس کے اخلاق درست ہوگئے۔ اخلاق انہی باطنی کیفیات اور روح کی صفات کا نام ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اچھے اخلاق جن کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے، ان کو اخلاقِ فاضلہ اور برے اخلاق جن کو دور کرنا چاہئے، ان کو اخلاقِ رذیلہ کہتے ہیں۔

اُمید ہے کہ اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اخلاق کا مطلب ایک دوسرے سے اچھی طرح بات کرلینا یا اچھی طرح مسکرا دینا نہیں ہے۔ یہ اس کا ایک نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ جب اخلاق درست ہوجاتے ہیں تو انسان کا رویہ ہر دوسرے انسان کے ساتھ بہتر ہوجاتا ہے، لیکن بنیادی طور پر اس کو اخلاق نہیں کہتے۔ اخلاق کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کا باطن درست ہوجائے، اخلاقِ فاضلہ پیدا ہوجائیں، اخلاقِ رذیلہ دور ہوجائیں اور انسان کا باطن اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کے مطابق ڈھل جائے۔

غصہ کی حقیقت

اخلاق کی اصلاح کیسے ہوتی ہے؟ یہ بات ایک مثال کے ذریعے آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائے گی، مثلاً غصہ انسان کے باطن کی ایک صفت ہے۔ یہ غصہ انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے، پھر اس کا مظاہرہ بعض اوقات ہاتھ پاؤں سے ہوتا ہے، بعض اوقات زبان سے۔ جب غصہ آگیا اور غصے سے مغلوب ہوگیا تو چہرہ سرخ ہوگیا، رگیں تن گئیں، زبان بے قابو ہوکر اول فول بکنے لگی، ہاتھ پاؤں چلنے لگے۔ یہ غصہ کا نتیجہ ہے لیکن اصل غصہ اس کیفیت کا نام ہے جو انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔

یہ غصہ ایسی چیز ہے کہ بے شمار باطنی رذائل کی بنیاد اور جڑ ہے، اس کی وجہ سے بہت سے گناہ سرزد ہوتے ہیں اور بہت سی باطنی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

غصہ نہ آنا ایک بیماری ہے

اگر یہ غصہ انسان میں بالکل بھی نہ ہو، کوئی کچھ بھی کرتا رہے، لیکن اس کو کبھی غصہ آتا ہی نہیں، یہ بھی بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو غصہ اس مقصد کے لئے دیا ہے کہ انسان اپنا، اپنی جان کا، اپنی آبرو کا، اپنے دین کا دفاع کر سکے۔ اب اگر کوئی شخص پستول تانے کھڑا ہے اور اس کی جان لینا چاہتا ہے اور ان صاحب کو غصہ آتا ہی نہیں، یہ بیماری ہے۔ اگر کوئی آدمی نعوذ باللہ نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے تو اس وقت ایک آدمی کو غصہ آتا ہی نہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ یہ بیمار ہے۔ یہ مواقع ایسے تھے کہ غصہ آنا چاہئے تھا، اگر نہیں آرہا تو یہ بیماری ہے۔

غصہ میں بھی اعتدال مطلوب ہے

اور اگر غصہ حدِ اعتدال سے زیادہ ہے تو یہ بھی بیماری ہے۔ غصہ اس لئے آئے تاکہ دوسرے آدمی کے شر سے اپنی حفاظت کر سکے۔ اس حد تک تو غصہ صحیح ہے۔ اب اگر غصہ کرنے کی جتنی ضرورت تھی اس سے زیادہ کر رہا ہے۔ مثلاً ایک تھپڑ مار دینے سے کام چل سکتا تھا لیکن اب یہ غصہ میں آکر ایک تھپڑ کے بجائے مارے چلا جا رہا ہے۔ یہ غصہ حدِ اعتدال سے زیادہ ہے اور گناہ ہے۔ لہٰذا غصہ اگر کم ہو تو یہ بھی باطن کی بیماری اور زیادہ ہو تو یہ بھی باطن کی بیماری۔ غصہ اعتدال کی حد میں ہونا چاہئے کہ ضرورت کے موقع پر آئے اور بلا ضرورت نہ آئے اور اگر بلا ضرورت آئے بھی تو آدمی اس کو استعمال نہ کرے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور غصہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی نے حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمہ کہہ دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہاں سننے والے تھے۔ وہ اس یہودی کو گرا کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے۔ یہودی نے جب دیکھا کہ اب کچھ اور نہیں کر سکتا تو اس نے وہیں زمین پر لیٹے لیٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرہ مبارک پر تھوک دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً اس کو چھوڑ کر الگ کھڑے ہو گئے۔ کسی نے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ اب تو اس نے مزید گستاخی کی۔ اس کو اور مارنا چاہئے تھا۔ فرمایا کہ اصل میں بات یہ ہے کہ پہلے میں نے اس کو اس لئے سزا دی تھی کہ اس نے نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کی تھی۔

اس وقت میرا غصہ اپنی ذات کے لئے نہیں تھا، بلکہ نبی کریم ﷺ کی ناموس کی حفاظت کے لئے تھا۔ اس واسطے میں اس پر چڑھ بیٹھا۔ جب اس نے مجھ پر تھوکا تو میرے دل میں اپنی ذات کے لئے غصہ پیدا ہوا کہ اس نے میرے منہ پر کیوں تھوکا۔ اپنی ذات کا انتقام لینے کا جذبہ میرے دل میں پیدا ہوا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اپنی ذات کے لئے انتقام لینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کی سنت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ اس لئے میں اسے چھوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا۔ یہ ہے غصے میں اعتدال کہ پہلے غصے کا صحیح موقع تھا تو غصہ آیا اور اس پہ عمل بھی کیا اور دوسرا غصے کا صحیح موقع نہیں تھا اس لئے اس پر عمل نہیں کیا اور اس یہودی کو چھوڑ کر الگ کھڑے ہو گئے۔

اعتدال کی ضرورت

انسان کے باطن کے جتنے بھی اخلاق ہیں ان سب کا یہی حال ہے کہ اپنی ذات میں وہ برے نہیں ہوتے۔ جب تک وہ حدِ اعتدال میں رہیں اس وقت تک وہ صحیح ہیں لیکن اگر اعتدال سے کم ہو گئے تو وہ بھی بیماری اور اعتدال سے زیادہ ہو گئے تو وہ بھی بیماری، اصلاحِ نفس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ان اخلاق کو اعتدال پر رکھا جائے، نہ کم ہوں نہ زیادہ ہوں۔

دل کی اہمیت

اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ))

یعنی خوب یاد رکھو کہ انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم صحیح ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔

پھر فرمایا کہ خوب سن لو کہ وہ لوتھڑا جس کی وجہ سے سارا جسم صحیح ہوتا ہے یا خراب ہوتا ہے وہ انسان کا دل ہے۔ مگر اس لوتھڑے سے وہ گوشت کا لوتھڑا مراد نہیں ہے، اس لئے کہ اگر دل کو چیر کر دیکھو تو اس میں یہ بیماریاں نظر نہیں آئیں گی، نہ تکبر نظر آئے گا، نہ حسد نظر آئے گا، نہ بغض نظر آئے گا، اور اگر ڈاکٹر کے پاس جاؤ تو وہ دل کی ظاہری بیماریاں چیک کر کے بتادے گا کہ اس کی دھڑکن صحیح ہے یا نہیں ہے، رگیں صحیح کام کر رہی ہیں یا نہیں، اس میں خون کی سپلائی صحیح ہو رہی ہے یا نہیں۔ لیکن یہ تمام چیزیں جو چیک اپ اور آلات کے ذریعے معلوم کی جاسکتی ہیں، یہ دل کے صرف ظاہری عمل کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔

یہ ان دیکھی بیماریاں ہیں

لیکن انسان کے قلب کے ساتھ کچھ چیزیں ایسی وابستہ ہیں جو ان دیکھی ہیں، آنکھوں سے نظر نہیں آتیں۔ وہ یہ ہیں جن کا میں نے اُوپر ذکر کیا، یعنی یہ کہ دل میں شکر ہے یا نہیں؟ حسد ہے یا نہیں؟ بغض ہے یا نہیں؟ صبر وشکر کی کیفیات ہیں یا نہیں؟ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ظاہری امراض کا ڈاکٹر دیکھ کر نہیں بتا سکتا اور کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی ہے جس کے ذریعے چیک کر کے بتا دیا جائے کہ اس کو یہ باطنی بیماری ہے۔

دل کے ڈاکٹر، صوفیاء کرام

اس بیماری کے ڈاکٹر، اس کی تشخیص کرنے والے، اس کا علاج کرنے والی کوئی اور ہی قوم ہے۔ یہی وہ قوم ہے جن کو "حضرات صوفیاء کرام" کہتے ہیں۔ جو علم الاخلاق کے ماہر ہوتے ہیں، باطن کی بیماریوں کی تشخیص اور ان کا علاج کرتے ہیں۔ یہ ایک مستقل فن ہے، ایک مستقل علم ہے، اس کو بھی اسی طریقے سے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے جس طرح ڈاکٹری پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔

پھر آپ نے ظاہری بیماری میں دیکھا ہوگا کہ بہت سی ظاہری بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کا انسان کو خود پتہ لگ جاتا ہے۔ بخار ہوگیا تو معلوم ہوگا کہ گرمی لگ رہی ہے، بدن میں درد ہے، معلوم ہوگا کہ بخار ہے، بیمار خود بھی پہچان لے گا کہ بخار ہے اور اگر خود نہیں پہچان سکے گا تو تھرمامیٹر لگا کر دیکھ لے گا، اس سے پتہ چل جائے گا کہ بخار ہے۔ اگر خود بھی نہیں پہچان سکا، اس کے گھر والے ذاتی آلات سے بھی نہیں پہچان سکے تو ڈاکٹر کے پاس چلا جائے گا، وہ ڈاکٹر بتا دے گا کہ فلاں بیماری ہے۔

لیکن باطن کی بیماریاں ایسی ہیں کہ نہ تو بسا اوقات مریض کو خود پتہ لگتا ہے کہ میرے اندر یہ بیماری ہے اور نہ کوئی آلہ ایسا انسان کے پاس موجود ہے جس سے پتہ لگ جائے کہ تکبر کا ٹمپریچر کیا ہے؟ اور ظاہری ڈاکٹر کے پاس جائے تو وہ بے بیچارہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اندر یہ بیماری ہے یا نہیں؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کسی باطن کے معالج کے پاس جا کر تشخیص کرائے کہ میرے اندر تکبر ہے یا نہیں؟

تواضع یا تواضع کا دکھاوا

تواضع کا مطلب آپ کی سمجھ میں آگیا کہ تواضع کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھنا۔ اس کو عرف عام میں انکساری بھی کہتے ہیں۔ اب سنئے، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی

تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات لوگ کہتے ہیں کہ میں تو بڑا بیکار آدمی ہوں، میں تو بے حقیقت ہوں، جاہل ہوں، بہت گناہ گار ہوں، بڑا ناچیز آدمی ہوں میری کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس سے بظاہر شبہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بیچارہ بہت تواضع کر رہا ہے کہ اپنے آپ کو بے حقیقت، ناکارہ، ناچیز، جاہل اور گناہ گار سمجھ رہا ہے۔

بظاہر دیکھنے میں یہ تواضع معلوم ہو رہی ہے لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص یہ الفاظ کہہ رہا ہوتا ہے حقیقت میں وہ متواضع نہیں ہوتا بلکہ اس میں دو بیماریاں ہوتی ہیں، ایک تکبر اور دوسری تواضع کا دکھاوا۔ یعنی یہ جو کہہ رہا ہے کہ میں بڑا بے حقیقت آدمی ہوں، جاہل آدمی ہوں، یہ سچے دل سے نہیں کہہ رہا، بلکہ اس لئے کہہ رہا ہے تاکہ دیکھنے والے اس کو متواضع سمجھیں اور کہیں کہ یہ تو بڑا منکسر المزاج ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ کہہ رہا ہو کہ میں بڑا گناہگار، جاہل، ناکارہ اور ناچیز ہوں، اس کے امتحان کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اگر اس وقت دوسرا آدمی یہ کہہ دے کہ بیشک آپ ناکارہ بھی ہیں اور ناچیز بھی، گناہ گار بھی، جاہل بھی اور بے حقیقت بھی، پھر دیکھو کہ اس وقت اس کے دل پر کیا گزرے گی؟ کیا اس کا شکر گزار ہوگا کہ آپ نے بڑی اچھی بات کہی۔ میرے خیال میں تقریباً سو فیصد معاملات میں اگر دوسرا کہہ دے گا کہ بیشک آپ ایسے ہی ہیں، تو طبیعت کو بڑی ناگواری ہوگی کہ دیکھو اس نے مجھے ناچیز، ناکارہ اور جاہل کہہ دیا۔

معلوم ہوا کہ صرف زبان سے کہہ رہا تھا کہ ناکارہ ہے، ناچیز ہے، جاہل ہے، لیکن دل میں یہ خیال نہیں تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ جب میں اپنی زبان سے کہوں گا کہ جاہل ہوں، ناکارہ ناچیز ہوں، تو سامنے والا یہ کہے گا کہ نہیں حضرت! یہ تو آپ کی تواضع ہے۔ آپ تو حقیقت میں بڑے عالم و فاضل آدمی ہیں۔ بڑے متقی و پارسا ہیں۔ یہ کہلوانے کے لئے یہ سب کچھ کہہ رہا ہے اور دکھاوا کر رہا ہے کہ میں بڑا متواضع ہوں۔ حقیقت میں دل میں تکبر بھرا ہوا ہے، دکھاوا بھرا ہوا ہے اور ظاہر یہ کر رہا ہے کہ میں بہت متواضع ہوں۔

آپ اندازہ لگایئے کہ اس کو کون پہچانے گا کہ یہ الفاظ سچے دل سے کہے جا رہے ہیں یا اندر بیماری بھری ہوئی ہے۔ اس کو تو وہی پہچان سکتا ہے جو باطنی امراض کا ماہر اور معالج ہو۔ اسی لئے ضرورت ہوتی ہے معالج کے پاس جانے کی کہ اکثر اوقات انسان خود اپنے باطنی امراض کو نہیں پہچان سکتا۔

دوسروں کی جوتیاں سیدھی کرنا

ایک صاحب میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کی مجلس میں آیا کرتے تھے۔ ایک دن والد صاحب نے دیکھا کہ انہوں نے خود اپنی مرضی سے مجلس میں آنے والوں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کر دیئے۔ اس کے بعد سے ہر دفعہ وہ آکر پہلے مجلس میں آنے والوں کے جوتے سیدھے کرتے اور پھر مجلس میں بیٹھتے۔ والد صاحب نے کئی دفعہ ان کو یہ کام کرتے دیکھا تو ایک دن ان کو منع کر دیا کہ یہ کام مت کیا کرو۔ پھر بعد میں بتایا کہ بات دراصل یہ تھی کہ یہ بیچارہ یہ سمجھا تھا کہ میرے اندر تکبر ہے اور اس تکبر کا علاج اپنی رائے سے تجویز کر لیا کہ لوگوں کے جوتے سیدھے کروں گا تو اس سے میرا تکبر دور ہوگا۔ تو والد صاحب فرماتے ہیں کہ اس علاج سے فائدہ ہونے کے بجائے اس کو اُلٹا نقصان ہوتا، تکبر اور عجب میں اضافہ ہوتا۔ اس لئے کہ جب جوتے سیدھے کرنے شروع کیے، تو دل و دماغ میں یہ بات پیدا ہوتی کہ میں نے تو اپنے آپ کو مٹا دیا، میں نے تو تواضع کی حد کر دی کہ لوگوں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کر دیئے۔ اس سے مزید خود پسندی پیدا ہوتی، اس لئے اسے روک دیا کہ تمہارا کام یہ نہیں، اور اس کے لئے دوسرا علاج تجویز فرمایا۔

اب بتایئے! بظاہر دیکھنے میں جو شخص دوسروں کے جوتے سیدھے کر رہا ہے وہ متواضع معلوم ہو رہا ہے لیکن جاننے والا جانتا ہے کہ یہ کام حقیقت میں تکبر پیدا کر رہا ہے تواضع سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا نفس کے اندر اتنے باریک نکتے ہوتے ہیں کہ آدمی خود سے اندازہ نہیں لگا سکتا، جب تک کہ کسی باطنی امراض کے ماہر سے رجوع نہ کرے اور وہ نہ بتائے کہ تمہارا یہ عمل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مقرر کی ہوئی حد کے اندر ہے یا نہیں؟ وہی بتا سکتا ہے کہ اس حد تک درست ہے اور اس حد سے باہر یہ عمل درست نہیں ہے۔

تصوف کیا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ آج تصوف نام ہو گیا اس بات کا کہ کسی پیر صاحب کے پاس چلے گئے، ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا، بیعت کر لی اور بیعت کرنے کے بعد انہوں نے کچھ وظیفے بتا دیئے، کچھ اوراد سکھا دیئے کہ صبح کو یہ پڑھا کرو، شام کو یہ پڑھا کرو اور بس اللہ اللہ خیر سلا۔ اب نہ باطن کی فکر، نہ اخلاق کے درست کرنے کا اہتمام، نہ اخلاقِ فاضلہ کو حاصل کرنے کا شوق، نہ اخلاقِ رذیلہ کو ختم کرنے کی فکر۔ یہ سب کچھ نہیں بس بیٹھے ہوئے وظیفے پڑھ رہے ہیں اور بعض اوقات یہ وظیفے پڑھنا ان بیماریوں کے اندر اور زیادہ شدت پیدا کر دیتا ہے۔

وظائف ومعمولات کی حقیقت

ان وظائف، اذکار، معمولات کی مثال ایسی ہے جیسے مقویات۔ اور مقویات کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی کے اندر بیماری موجود ہے اور بیماری کی حالت میں وہ مقویات کھاتا رہے تو بسا اوقات نہ صرف یہ کہ اس کو قوت حاصل نہیں ہوتی بلکہ بیماری کو قوت حاصل ہوتی ہے، بیماری بڑھ جاتی ہے۔ اگر دل میں تکبر بھرا ہوا ہے، عجب بھرا ہوا ہے اور بیٹھ کر وظیفے گھونٹ رہا ہے اور ذکر بہت کر رہا ہے تو بعض اوقات اس کے نتیجے میں اصلاح ہونے کے بجائے تکبر اور بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے یہ جو بتایا جاتا ہے کہ جب بھی کوئی وظیفہ کرو یا ذکر کرو کسی شیخ کی رہنمائی میں کرو اس لئے کہ شیخ جانتا ہے کہ اس سے زیادہ اگر بتاؤں گا تو وہ اس کے اندر بیماری پیدا کرے گا۔ اس واسطے وہ اس کو روک دیتا ہے کہ بس، اب مزید ذکر کی ضرورت نہیں۔ حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے کتنے آدمیوں کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ تمام وظائف واذکار ترک کر دیں۔ حضرت نے ان کے تمام معمولات چھڑوا دیئے۔ خاص حالات میں جب دیکھا کہ اس کے لئے یہ وظیفہ مضر ثابت ہو رہا ہے تو وہ چھڑوا دیا۔

مجاہدات کا اصل مقصد

لیکن آج کل تصوف کا اور پیری مریدی کا سارا زور اس پر ہے کہ معمولات بتا دیئے گئے کہ فلاں وقت یہ ذکر کرنا ہے، فلاں وقت یہ ذکر کرنا ہے۔ بس، وہ محض ذکر کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، چاہے باطن کے اندر کتنی ہی بیماریاں جوش مار رہی ہوں۔ پہلے زمانے میں صوفیائے کرام کے ہاں معمول تھا کہ کسی شخص کی اصلاح کا پہلا قدم یہ ہوتا تھا کہ اس کے اخلاق کی اصلاح کرنے کی فکر کرتے، اس کے لئے مجاہدات کروائے جاتے تھے، ریاضتیں ہوتی تھیں، رگڑا جاتا تھا، تب جاکر اندر کی اصلاح ہوتی تھی اور اس کے بعد انسان کسی قابل ہوتا تھا۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے کا واقعہ

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ گنگوہ کے بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کے شجرے کے اندر ان کا اعلیٰ درجے کا واسطہ ہے۔ ان کے ایک پوتے تھے۔ جب تک شیخ حیات تھے، پوتے کو فکر نہ ہوئی۔ ساری دنیا آکر دادا سے فیض حاصل کرتی رہی لیکن وہ صاحب زادگی کی موج میں رہے اور دادا کی طرف اس نقطۂ نظر سے رجوع نہ کیا کہ اپنی اصلاح کرائیں۔ جب شیخ کا انتقال ہوگیا تب ان کو حسرت ہوئی کہ یا اللہ! میں کتنا محروم رہ گیا۔ کہاں کہاں

سے آکر ساری دنیا فیض اُٹھا گئی، اور میں گھر میں ہوتے ہوئے کچھ بھی حاصل نہ کرسکا، اور چراغ تلے اندھیرا۔ اب حسرت ہوئی تو سوچا کہ کیا کروں، تلافی کیسے ہو۔ خیال آیا کہ میرے دادا سے جن لوگوں نے اصلاحِ نفس کی یہ دولت حاصل کی ہے ان میں سے کسی کی طرف رجوع کروں۔ معلوم کیا کہ میرے دادا کے خلفاء میں سے کون اُونچے مقام کا بزرگ ہے۔ معلوم ہوا کہ بلخ میں ایک اُونچے مقام کے بزرگ ہیں۔ اب کہاں گنگوہ، کہاں بلخ۔ کہاں یہ کہ گھر میں دولت موجود تھی اور ہر وقت ان سے رجوع کرسکتے تھے وہ نہ کیا۔ آخر کار اس کی نوبت آئی کہ بلخ تک اتنا لمبا چوڑا مشقت کا سفر کریں اب چونکہ طلب صادق تھی اس لئے سفر پر روانہ ہوگئے۔

شیخ کے پوتے کا استقبال

ادھر جب شیخ کے خلیفہ کو جو بلخ میں مقیم تھے معلوم ہوا کہ میرے شیخ کے پوتے آرہے ہیں تو اپنے شہر سے باہر نکل کر انہوں نے بڑا شاہانہ استقبال کیا۔ اکرام کے ساتھ گھر لے کر آئے، شاندار کھانے پکوائے، اعلیٰ درجے کی دعوت کی، بہت اعلیٰ درجے کی رہائش کا انتظام کیا، قالین بچھوائے اور خدا جانے کیا کچھ کیا۔

جب ایک دو دن گزر گئے تو انہوں نے کہا کہ حضرت آپ نے میرے ساتھ بڑی شفقت کا معاملہ کیا، بڑا اکرام فرمایا، لیکن درحقیقت میں کسی اور مقصد سے آیا تھا۔ پوچھا کیا مقصد؟ کہا کہ مقصد یہ تھا کہ آپ میرے گھر سے جو دولت لے کر آئے تھے اس دولت کا کچھ حصہ مجھے بھی عنایت فرمادیں۔ اس لئے حاضر ہوا تھا۔ شیخ نے کہا: ''اچھا! وہ دولت لینے آئے ہو؟'' کہا کہ ''جی ہاں!''، کہا کہ ''اگر وہ دولت لینے آئے ہو تو یہ غالیچے، یہ قالین، یہ اعزاز و اکرام، یہ کھانے پینے کا انتظام، سب ختم کردیا جائے۔ رہائش کا انتظام جو اعلیٰ درجے کا کیا گیا تھا وہ بھی ختم کردیا جائے'' انہوں نے پوچھا کہ ''اب کیا کروں؟'' فرمایا ''ہماری مسجد کے پاس ایک حمام ہے، اس میں وضو کرنے والوں کے لئے لکڑیاں جلا کر پانی گرم کیا جاتا ہے۔ تم وہاں حمام کے پاس بیٹھا کرو اور لکڑیاں جھونک کر وضو کرنے والوں کے لئے پانی گرم کیا کرو۔ بس تمہارا یہی کام ہے'' نہ بیعت، نہ وظیفہ، نہ ذکر، نہ معمولات، نہ کچھ اور۔ انہوں نے پوچھا ''رہائش کہاں؟'' فرمایا ''رات کو جب سونا ہو تو وہیں حمام کے پاس سوجایا کرو'' کہاں تو یہ اعزاز و اکرام، استقبال ہو رہا ہے، قالین بچھ رہے ہیں، کھانے پک رہے ہیں، دعوتیں ہو رہی ہیں، اور کہاں اب حمام جھونکنے پر لگادیئے گئے۔ اب حمام میں بیٹھے ہیں اور آگ میں لکڑیاں جھونک رہے ہیں۔

ابھی کسر باقی ہے

لکڑیاں جھونکتے جھونکتے شیخ نے ایک دن جمعدارنی کو ہدایت کی کہ ایسا کرنا کہ حمام کے پاس ایک آدمی بیٹھا ہوگا، یہ کچرے کا ٹوکرا لے کر اس کے قریب سے گزر جانا اور اس طرح گزرنا کہ اس ٹوکرے کی بو ان کی ناک میں پہنچ جائے۔ اب وہ ٹوکرا لے کر حمام کے پاس سے جو گزری تو چونکہ یہ تو صاحب زادے تھے، نواب زادگی کی زندگی گزاری تھی۔ ایک کڑی نگاہ اس پر ڈالی اور کہا "تیری یہ مجال کہ تو یہ ٹوکرا لے کر میرے پاس سے گزرے، نہ ہوا گنگوہ، ورنہ میں تجھے بتاتا" شیخ نے جمعدارنی کو بلا کر پوچھا کہ جب تو ٹوکرا لے کر گزری تو کیا ہوا؟ اس نے کہا کہ "جی وہ تو بہت غصے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ گنگوہ ہوتا تو تجھے بہت سخت سزا دیتا" کہا کہ "اوہو! ابھی بہت کسر ہے۔ ابھی چاول گلا نہیں"

پھر کچھ دن گزرے تو شیخ نے جمعدارنی سے کہا کہ "اب کے نہ صرف وہ ٹوکرا لے کر ان کے قریب سے گزرنا بلکہ اس طرح گزرنا کہ ٹوکرا ان کے جسم سے لگ جائے اور پھر مجھے بتانا کہ کیا ہوا" اس نے یہی کیا۔ شیخ نے پوچھا کہ "کیا ہوا؟" اس نے کہا کہ "جی ہوا یہ کہ جب میں ٹوکرا لے کر گزری اور ٹوکرا بالکل ان کے جسم سے رگڑ کھاتا ہوا گزرا تو انہوں نے نہایت ترش نگاہ سے میری طرف دیکھا، لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا" شیخ نے کہا "الحمد للہ، فائدہ ہو رہا ہے"

اب دل کا طاغوت ٹوٹ گیا

پھر کچھ دن بعد شیخ نے کہا کہ "اب کے اس طرح گزرنا کہ ٹوکرا گر جائے اور اس طرح گرے کہ تھوڑا سا کچرا ان کے اوپر بھی پڑ جائے اور پھر مجھے بتا دینا کہ انہوں نے کیا کہا" اس نے ایسا ہی کیا۔ شیخ نے پوچھا کہ "اب کیسا ہوا؟" اس نے کہا "جی! اب تو عجیب معاملہ ہوا۔ میں نے جو ٹوکرا گرایا تو تھوڑا سا کوڑا ان کے اوپر بھی پڑا اور میں بھی گر گئی۔ میں جو گری تو ان کو اپنے کپڑوں کا تو ہوش نہیں تھا، مجھ سے پوچھنے لگے کہ چوٹ تو نہیں لگی؟" فرمایا کہ "الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دل میں جو طاغوت تھا، وہ ٹوٹ گیا"

اب ان کو بلا کر ڈیوٹی بدل دی۔ کہا کہ "اب تمہارا وہ حمام کا کام ختم۔ اب تم ہمارے ساتھ رہا کرو۔ وہ اس طرح کہ ہم کبھی کبھی شکار کے لئے جاتے ہیں تو تم ہمارے شکاری کتوں کی زنجیر پکڑ کر ہمارے ساتھ چلا کرو" اب ذرا اونچا درجہ عطا ہوا کہ شیخ کے ساتھ صحبت اور ہم رکابی کا شرف بھی عطا ہو رہا ہے، لیکن کتے کی زنجیر تھام کر ساتھ چلنے کا حکم ہے۔ شکار کے دوران کتوں نے کوئی شکار دیکھ لیا اور اس کی طرف جو دوڑے تو چونکہ شیخ کا حکم تھا کہ زنجیر نہ چھوڑنا اس لئے انہوں نے زنجیر نہیں چھوڑی۔

کتے تیز بھاگے جا رہے ہیں اور یہ زنجیر چھوڑتے نہیں ۔ اسی حالت میں زمین پر گر گئے اور کتوں کے پیچھے زمین پر گھسٹتے ہوئے چلے جا رہے ہیں، جسم پر کئی زخم لگ گئے اور لہولہان ہو گئے ۔

وہ دولت آپ کے حوالے کر دی

رات کو شیخ نے اپنے شیخ حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ”میاں! ہم نے تو تم سے ایسی محنتیں نہیں لی تھیں“ اس وقت ان کو تنبیہ ہوئی، بلایا، اور بلا کر گلے سے لگایا اور فرمایا ”آپ جو دولت لینے آئے تھے اور جو دولت آپ کے گھر سے اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی تھی، الحمد للہ میں نے وہ ساری دولت آپ کے حوالے کر دی۔ دادا کی وراثت آپ کی طرف منتقل ہو گئی ، ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اب آپ اطمینان سے وطن واپس تشریف لے جائیں“

اصلاح کا اصل مقصد

عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ حضرات صوفیائے کرام کا اصل کام اندر کی بیماریوں کا علاج تھا۔ محض وظیفے، ذکر، تسبیح ،معمولات نہیں تھیں ۔ یہ ذکر، وظیفے، تسبیح معمولات، یہ سب بطور مقویات کے ہیں ۔ یہ اصلاح کے عمل میں معاونت کرنے کے لئے کروائے جاتے تھے لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ باطن کی بیماریاں دور ہوں ۔ تکبر دل سے نکلے، حسد دل سے نکلے، بغض دل سے نکلے، عجب دل سے نکلے، منافقت دل سے نکلے، دکھاوے کا شوق دل سے نکلے، حب جاہ دل سے نکلے، حبِ دنیا دل سے نکلے، قلب کو ان چیزوں سے صاف کرنا اصل مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو، اللہ تعالیٰ سے اُمید وابستہ ہو، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہو، توکل ہو، استقامت ہو، اخلاص ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے تواضع ہو، یہ چیزیں پیدا کرنا تصوف کا اصل مقصود ہے۔

اصلاحِ باطن ضروری کیوں؟

لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف شریعت سے کوئی الگ چیز ہے۔ خوب سمجھ لو کہ یہ شریعت ہی کا ایک حصہ ہے۔ شریعت، انسان کے ظاہری اعمال وافعال سے متعلق جتنے احکام ہیں ان کے مجموعے کا نام ہے اور طریقت یا تصوف باطن کے اعمال وافعال سے متعلق احکام کے مجموعے کا نام ہے، اور باطن کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے اگر یہ درست نہ ہو تو ظاہری اعمال بھی بیکار ہو جاتے ہیں۔ فرض کرو کہ اخلاص نہیں ہے۔ اخلاص کے کیا معنی ہیں؟ اخلاص کے معنی یہ ہیں ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی فکر کہ انسان جو کام بھی کرے، صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے کرے۔ یہ ہے اخلاص۔ یہ

اخلاص ایک باطنی فعل ہے۔ایک شخص کو اخلاص حاصل نہیں ہے تو اگر وہ نماز بغیر اخلاص کے پڑھ رہا ہے اور اس لئے پڑھ رہا ہے کہ لوگ مجھے متقی، پرہیز گار سمجھیں، عبادت گزار سمجھیں۔اب ظاہری اعمال تو درست ہیں، لیکن چونکہ باطن میں اخلاص کی روح نہیں ہے اس واسطے وہ ظاہری اعمال بیکار ہیں، بے مصرف ہیں، گناہ ہیں، کیونکہ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ))(۱)

''یعنی جو شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھ رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کر رہا ہے''

گویا اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلوق کو شریک ٹھہرایا، اللہ تعالیٰ کے بجائے مخلوق کو راضی کرنا چاہتا ہے۔اس لئے باطن کی اصلاح ظاہری اعمال کو درست کرنے کے لئے بھی لازمی ہے۔اگر یہ نہیں ہوگی تو ظاہری اعمال بھی بیکار ہو جائیں گے۔

اپنا معالج تلاش کیجئے

ہمارے بزرگوں نے یہ طریقہ بتلایا کہ چونکہ انسان ان چیزوں کی اصلاح خود نہیں کر سکتا، لہٰذا کوئی معالج تلاش کرنا چاہئے۔اس معالج کو چاہے پیر کہہ لو، چاہے شیخ کہہ لو، چاہے استاد کہہ لو، لیکن اصل میں وہ معالج ہے، باطن کی بیماریوں کا ڈاکٹر ہے۔جب تک انسان یہ نہیں کرے گا، اس وقت تک اسی طرح بیماریوں میں مبتلا رہے گا اور اس کے اعمال خراب ہوتے چلے جائیں گے۔

جو باب آگے شروع ہو رہا ہے یہ اس کا تھوڑا سا تعارف تھا۔اب آگے اخلاق کے جتنے شعبے ہیں، ایک ایک کا بیان اس میں آئے گا کہ اچھے اخلاق کو حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے اور برے اخلاق کو دور کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں اس کو سمجھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے اور اس پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(۱) مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۱۶۵۱۷

دنیا کو دل سے نکال دیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،
﴿يٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وقفه وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾ (۱)

ہر مسلمان کے لئے اخلاقِ باطنہ کی تحصیل ضروری ہے جن کے حاصل کیے بغیر نہ دین درست ہوسکتا ہے، اور نہ دنیا درست ہوسکتی ہے۔ کیونکہ حقیقت میں دنیا کی درستگی بھی دین کی درستگی پر موقوف ہے۔ یہ شیطانی دھوکہ ہے کہ دین کے بغیر بھی دنیا اچھی، پُرسکون اور راحت و آرام والی ہوجاتی ہے۔ دنیا کے اسباب و وسائل کا حاصل ہوجانا اور بات ہے، اور دنیا میں پُرسکون زندگی، اطمینان، راحت و آرام اور مسرت کی زندگی حاصل ہوجانا اور بات ہے۔ دنیا کے وسائل و اسباب تو دین کو چھوڑ کر حاصل ہوجائیں گے، پیسوں کا ڈھیر لگ جائے گا، بنگلے کھڑے ہوجائیں گے، کارخانے قائم ہوجائیں گے، کاریں حاصل ہوجائیں گی، لیکن جس کو ''دل کا سکون'' کہا جاتا ہے، سچی بات یہ ہے کہ وہ دین کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور اسی وجہ سے دنیا کی حقیقی راحت بھی انہی اللہ والوں کو حاصل ہوتی ہے جو اپنی زندگی کو اللہ جل شانہ کے احکام کے تابع بناتے ہیں۔ اس لئے جب تک ان اخلاق کی اصلاح نہ ہو، نہ دین درست ہوسکتا ہے، اور نہ دنیا درست ہوسکتی ہے۔ ان اخلاق میں سے دو کا بیان پچھلے جمعہ ہو چکا، ایک خوف اور ایک رجا (اُمید)، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

''زہد'' کی حقیقت

آج بھی ایک بہت بنیادی اخلاق کا بیان ہے، جس کو ''زہد'' کہا جاتا ہے۔ آپ حضرات نے

☆ اصلاحی خطبات (۳/۹۸ تا ۹۹)، ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۲ء، بروز جمعہ، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی

(۱) الفاطر: ۵، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اے لوگو! یقین جانو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، لہٰذا تمہیں یہ دنیوی زندگی ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے، اور نہ اللہ کے معاملہ میں تمہیں وہ (شیطان) دھوکے میں ڈالنے پائے جو بڑا دھوکے باز ہے''

یہ لفظ بہت سنا ہوگا کہ فلاں شخص بڑا عابد اور زاہد ہے۔ زاہد اس شخص کو کہتے ہیں جس میں ''زہد'' ہو، اور ''زہد'' ایک باطنی اخلاق ہے۔ جسے ہر مسلمان کو حاصل کرنا ضروری ہے، اور ''زہد'' کے معنی ہیں، ''دنیا سے بے رغبتی'' اور ''دنیا کی محبت سے دل کا خالی ہونا'' دل دنیا میں اٹکا ہوا نہ ہو، اس کی محبت اس طرح دل میں پیوست نہ ہو کہ ہر وقت اسی کا دھیان اور اسی کا خیال اسی کی فکر ہے اور اسی کے لئے دوڑ دھوپ ہو رہی ہے، اس کا نام ''زہد'' ہے۔

گناہوں کی جڑ ''دنیا کی محبت''

ہر مسلمان کو اس کا حاصل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اگر دنیا کی محبت دل میں سمائی ہوئی ہو تو پھر صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں نہیں آسکتی اور جب اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں ہوتی وہ محبت غلط رخ پر چل پڑتی ہے، اسی وجہ سے حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ))(۱)

''دنیا کی محبت ہر گناہ اور معصیت کی جڑ ہے''

جتنے جرائم اور گناہ ہیں اگر انسان ان کی حقیقت میں غور کرے گا تو اس کو یہی نظر آئے گا کہ ان سب میں دنیا کی محبت کارفرما ہے۔ چور کیوں چوری کر رہا ہے؟ اس لئے کہ دنیا کی محبت ہے۔ اگر کوئی شخص بدکاری کر رہا ہے، تو کیوں کر رہا ہے؟ اس لئے کہ دنیا کی لذتوں کی محبت دل میں جمی ہوئی ہے۔ شرابی اس لئے شراب نوشی کر رہا ہے کہ وہ دنیاوی لذتوں کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کسی بھی گناہ کو لے لیجئے۔ اس کے پیچھے دنیا کی محبت کارفرما نظر آئے گی۔ اور جب دنیا کی محبت دل میں سمائی ہوئی ہے تو پھر اللہ کی محبت کیسے داخل ہوسکتی ہے۔

حضور ﷺ کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت

یہ دل اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ اس میں حقیقی محبت تو صرف ایک ہی کی سما سکتی ہے۔ ضرورت کے وقت تعلقات تو بہت سے لوگوں سے قائم ہو جائیں گے۔ لیکن حقیقی محبت ایک ہی کی سما سکتی ہے۔ جب ایک کی محبت آگئی تو پھر دوسرے کی محبت اس درجے میں نہیں آسکے گی۔ اس واسطے حضور اقدس ﷺ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

---

(۱) كنزالعمال، رقم: ٦١١٤ (٣٠٤/٣)، جامع الأحاديث، رقم: ٤٥٠٣٠ (٣٢٥/٤١)، جامع العلوم والحكم (٣٤/٣١)، الدرالمنثرة (٩/١)، جامع الأصول من أحاديث الرسول، رقم: ٢٦٠٣ (٢٦٤٢/١)، الدرالمنثور (٤٨٨/٨)

((لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ خَلِيْلًا))(۱)

''اگر میں اس دنیا میں کسی کو اپنا محبوب بناتا تو ''ابو بکرؓ'' (رضی اللہ عنہ) کو بناتا''

حضور ﷺ کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اس درجہ تعلق تھا کہ دنیا میں ایسا تعلق کسی اور سے نہیں ہوا، یہاں تک کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مثال حضورِ اقدس ﷺ کے سامنے ایسی ہے، جیسے کہ ایک آئینہ حضورِ اقدس ﷺ کے سامنے رکھا جائے۔ اور اس آئینے میں حضورِ اقدس ﷺ کا عکس نظر آئے، اور پھر کہا جائے کہ یہ حضورِ اقدس ﷺ ہیں۔ اور آئینے میں جو عکس ہے وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ مقام تھا لیکن اس کے باوجود آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ان کو اپنا محبوب بناتا ہوں، بلکہ یہ فرمایا کہ اگر میں کسی کو اپنا محبوب بناتا تو ان کو بناتا، لیکن میرے محبوبِ حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہیں، اور جب وہ محبوب بن گئے تو دوسرے کے ساتھ حقیقی محبت کے لئے دل میں جگہ نہ رہی۔ البتہ تعلقات دوسروں سے ہو سکتے ہیں۔ اور وہ ہوتے بھی ہیں، مثلاً بیوی سے تعلق، بچوں سے تعلق، ماں سے تعلق، باپ سے تعلق، بھائی سے تعلق، بہن سے تعلق، مگر یہ تعلقات اس محبت کے تابع ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی حقیقی محبت دل میں ہوتی ہے۔

دل میں صرف ایک کی محبت سما سکتی ہے

لہٰذا دل میں حقیقی محبت یا تو اللہ تعالیٰ کی ہوگی، یا دنیا کی ہوگی، دونوں محبتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اسی وجہ سے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

یعنی دنیا کی محبت بھی دل میں سمائی ہوئی ہو، اور اللہ تعالیٰ کی محبت بھی سمائی ہوئی ہو، یہ دونوں باتیں نہیں ہو سکتیں، اس لئے کہ یہ صرف خیال ہے اور محال ہے اور جنون ہے، اس واسطے اگر دل میں دنیا کی محبت سما گئی تو پھر اللہ کی محبت نہیں آئے گی۔ جب اللہ کی محبت نہیں ہوگی تو پھر دین کے جتنے کام ہیں، وہ سب محبت کے بغیر بے روح ہیں، بے حقیقت ہیں، ان کے ادا کرنے میں پریشانی دشواری اور مشقت ہوگی اور صحیح معنی میں وہ دین کے کام انجام نہیں پا سکیں گے۔ بلکہ قدم قدم پر آدمی ٹھوکریں

---

(۱) صحیح البخاري، كتاب المناقب، باب قول النبي لو كنت متخذا خليلا، رقم: ۳۳۸٤، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أبي بكر الصديق، رقم: ٤۳۹۰، سنن الترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله، باب مناقب أبي بكر الصديق، رقم: ۳۵۸۸، سنن ابن ماجه، كتاب المقدمة، باب فضل أبي بكر الصديق، رقم: ۹۰، مسند أحمد، رقم: ۳۳۹۹

کھائے گا، اس لئے کہا گیا کہ انسان دل میں دنیا کی محبت کو جگہ نہ دے۔ اسی کا نام ''زہد'' ہے اور ''زہد'' کو حاصل کرنا ضروری ہے۔

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلب گار نہیں ہوں

لیکن یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے کہ دنیا کے بغیر گزارا بھی نہیں ہے، دنیا کے اندر بھی رہنا ہے، جب بھوک لگتی ہے تو کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور جب پیاس لگتی ہے تو پانی کی ضرورت پیش آتی ہے، سر چھپانے اور رہنے کے لئے گھر کی بھی ضرورت ہے، کسب معاش کی بھی ضرورت ہے، لیکن اب سوال یہ ہے کہ جب یہ سب کام بھی انسان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انسان دنیا کے اندر بھی رہے، اور دنیا کی ضروریات بھی پوری کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دل میں دنیا نہ آئے، دل میں دنیا سے بے رغبتی پائی جائے۔ ان دونوں کا ایک ساتھ جمع ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ یہی وہ کام ہے حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے وارثین آکر سکھاتے ہیں کہ کس طرح تم دنیا میں رہو، اور دنیا کی محبت کو دل میں جگہ نہ دو۔ ایک حقیقی مسلمان دنیا کے اندر بھی رہے گا، دنیا والوں سے تعلق بھی قائم کرے گا، حقوق بھی ادا کرے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی محبت سے بھی پرہیز کرے گا۔ حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

یہ کیفیت کیسے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی دنیا میں رہے، دنیا سے گزرے، دنیا کو برتے، لیکن دنیا کی محبت دل میں نہ آئے۔

دنیا کی مثال

اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال سے سمجھایا ہے اور بڑی پیاری مثال دی ہے، فرماتے ہیں کہ دنیا کے بغیر انسان کا گزارہ بھی نہیں ہے، اس لئے کہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے بے شمار ضرورتیں انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، اور انسان کی مثال کشتی جیسی ہے، اور دنیا کی مثال پانی جیسی ہے، جیسے پانی کے بغیر کشتی نہیں چل سکتی، اس لئے کہ اگر کوئی شخص خشکی پر کشتی چلانا چاہے تو نہیں چلے گی، اسی طرح انسان کو زندہ رہنے کے لئے دنیا ضروری ہے، انسان کو زندہ رہنے کے لئے پیسہ چاہئے، کھانا چاہئے، پانی چاہئے، مکان چاہئے، کپڑا چاہئے، اور ان سب چیزوں کی اس کو ضرورت ہے، اور یہ سب چیزیں دنیا ہیں لیکن جس طرح پانی کشتی کے لئے اس وقت تک فائدہ مند ہے جب

تک پانی کشتی کے نیچے ہے اور اس کے دائیں طرف اور بائیں طرف ہے، اس کے آگے اور پیچھے ہے پانی اس کشتی کو چلائے گا۔ لیکن اگر وہ پانی دائیں بائیں کے بجائے کشتی کے اندر داخل ہوگیا تو وہ کشتی کو ڈبودے گا، تباہ کردے گا۔

اسی طرح دنیا کا یہ اسباب اور دنیا کا یہ ساز و سامان جب تک تمہارے چاروں طرف ہے تو پھر کوئی ڈر نہیں ہے اس لئے کہ یہ ساز و سامان تمہاری زندگی کی کشتی کو چلائے گا۔ لیکن جس دن دنیا کا یہ ساز و سامان تمہارے اردگرد سے ہٹ کر تمہارے دل کی کشتی میں داخل ہوگیا، اس دن تمہیں ڈبودے گا، چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

آب اندر زیر کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاک کشتی است

یعنی جب تک پانی کشتی کے اردگرد ہو تو وہ کشتی کو چلاتا ہے، اور دھکا دیتا ہے، لیکن اگر وہ پانی کشتی کے اندر داخل ہو جاتا ہے تو وہ کشتی کو ڈبو دیتا ہے۔

دو محبتیں جمع نہیں ہو سکتیں

لہٰذا ''زہد'' اسی کا نام ہے کہ یہ دنیا تمہارے چاروں طرف اور اردگرد رہے، لیکن اس کی محبت تمہارے دل میں داخل نہ ہو، اس لئے کہ اگر دنیا کی محبت دل میں داخل ہوگئی، تو پھر اللہ کی محبت کے لئے دل میں جگہ نہیں چھوڑے گی، اور اللہ کی محبت دنیا کی محبت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک شعر سنایا کرتے تھے، غالباً حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ حضرت میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ شعر منسوب فرماتے تھے وہ انہی کے مقام کا شعر ہے، فرماتے کہ۔

بھر رہا ہے دل میں حب جاہ و مال
کب سماوے اس میں حب ذوالجلال

یعنی جب مال و جاہ اور منصب کی محبت دل میں بھری ہوئی ہے تو پھر اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے سما سکتی ہے، اس لئے حکم یہ ہے کہ اس دنیا کی محبت کو دل سے نکال دو، دنیا کو نکالنا ضروری نہیں، دنیا کو ترک کرنا ضروری نہیں، لیکن دنیا کی محبت نکالنا ضروری ہے، اگر دنیا ہو، لیکن بغیر محبت کی ہو تو وہ دنیا نقصان دہ نہیں ہے۔

دنیا کی مثال ''بیت الخلاء'' کی سی ہے

عام طور پر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک طرف تو انسان اس دنیا کو ضروری بھی سمجھے اور اس کی اہمیت بھی ہو، لیکن دل میں اس کی محبت نہ ہو، اس بات کو ایک مثال سے سمجھ لیں۔ آپ جب ایک مکان بناتے ہیں، تو اس مکان کے مختلف حصے ہوتے ہیں، ایک سونے کا کمرہ ہوتا ہے، ایک ملاقات کا کمرہ ہوتا ہے، ایک کھانے کا کمرہ ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ، اور اسی مکان میں آپ ایک بیت الخلاء بھی بناتے ہیں اور بیت الخلاء کے بغیر وہ مکان نامکمل ہے۔ اگر ایک مکان بڑا شاندار بنا ہوا ہے، کمرے اچھے ہیں، بیڈروم بڑا اچھا ہے، ڈرائنگ روم بہت اعلیٰ ہے، کھانے کا کمرہ اچھا ہے اور پورے گھر میں بڑا شاندار اور قیمتی قسم کا فرنیچر لگا ہوا ہے۔ مگر اس میں بیت الخلاء نہیں ہے، بتایئے کہ وہ مکان مکمل ہے یا ادھورا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ مکان ناقص ہے، اس لئے کہ بیت الخلاء کے بغیر کوئی مکان مکمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ بتایئے کہ کیا کوئی انسان ایسا ہوگا کہ اس کا دل بیت الخلاء سے اس طرح اٹکا ہوا ہو کہ ہر وقت اس کے دماغ میں یہی خیال رہے کہ کب میں بیت الخلاء جاؤں گا، اور کب اس میں بیٹھوں گا اور کس طرح بیٹھوں گا، اور کتنی دیر بیٹھوں گا، اور کب واپس نکلوں گا، ہر وقت اس کے دل و دماغ پر بیت الخلاء چھایا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ کوئی انسان بھی بیت الخلاء کو اپنے دل و دماغ پر اس طرح سوار نہیں کرے گا اور کبھی اس کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے گا۔ اگرچہ وہ جانتا ہے کہ بیت الخلاء ضروری چیز ہے، اس کے بغیر چارہ کار نہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اسکے بارے میں ہر وقت یہ نہیں سوچے گا کہ میں بیت الخلاء کو کس طرح آراستہ کروں، اور آرام دہ بناؤں، اس لئے کہ اس بیت الخلاء کی محبت دل میں نہیں ہے۔

دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے

دین کی تعلیم بھی درحقیقت یہ ہے کہ یہ سارے مال و اسباب کا بھی یہ حال ہے کہ وہ سب ضروری تو ہیں، اور ایسے ہی ضروری ہیں جیسے بیت الخلاء ضروری ہوتا ہے، لیکن اس کی فکر، اس کی محبت، اس کا خیال دل و دماغ پر سوار نہ ہو جائے، بس دنیا کی حقیقت یہ ہے، اس لئے بزرگوں نے فرمایا کہ اس بات کا استحضار بار بار کرے کہ اس دنیا کی حقیقت کیا ہے۔ یہ آیت جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، اس میں اللہ جل شانہ نے فرمایا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّ وَعْدَ ٱللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَا وقفه وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِٱللَّهِ ٱلْغَرُورُ٥﴾(۱)

---

(۱) الفاطر: ۵، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اے لوگو! یقین جانو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، لہٰذا تمہیں یہ دنیوی زندگی ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے، اور نہ اللہ کے معاملہ میں تمہیں وہ (شیطان) دھوکے میں ڈالنے پائے جو بڑا دھوکے باز ہے''

اے لوگو! اللہ کا وعدہ سچا ہے، کیا وعدہ ہے؟ وہ وعدہ یہ ہے کہ ایک دن مروگے، اور اس کے سامنے پیشی ہوگی، اور پھر تمام اعمال کا جواب دینا ہوگا، لہٰذا دنیاوی زندگی تمہیں ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے، اور وہ دھوکے باز یعنی شیطان تمہیں اللہ سے دھوکے میں نہ ڈالے شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا میں رہو، مگر اس سے دھوکہ نہ کھاؤ، اس لئے کہ یہ دارالامتحان ہے، جس میں بہت سے مناظر ایسے ہیں جو انسان کا دل لبھاتے ہیں اور اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں، اس لئے ان دل لبھانے والے مناظر کی محبت کو خاطر میں نہ لاؤ، اگر دنیا کا سازوسامان جمع ہو بھی گیا تو کچھ حرج نہیں، بشرطیکہ دل اس کے ساتھ اٹکا ہوا نہ ہو۔

شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے کچھ لطیف تو تیں ان کے پاس بھیج دیتے ہیں، اور ان لطیف قوتوں کے بھیجنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بندے کو دنیا کی محبت سے نکال کر اپنی محبت کی طرف بلایا جائے۔ حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ جو مشہور بزرگ گزرے ہیں، ان کا واقعہ میں نے اپنے والد ماجد (حضرت مفتی محمد شفیع صاحب) قدس اللہ سرہ سے سنا، فرمایا کہ شیخ فریدالدین عطار یونانی دواؤں اور عطر کے بہت بڑے تاجر تھے، اور اسی وجہ سے ان کو "عطار" کہا جاتا ہے، دواؤں اور عطر کی بہت بڑی دکان تھی۔ کاروبار بہت پھیلا ہوا تھا، اور اس وقت وہ ایک عام قسم کے دنیادار تاجر تھے، ایک دن دکان پر بیٹھے ہوئے تھے، اور دکان دواؤں اور عطر کی شیشیوں سے بھری ہوئی تھی، اتنے میں ایک مجذوب قسم کا درویش اور ملنگ آدمی دکان پر آگیا۔ اور دکان میں داخل ہوگیا، اور کھڑا ہوکر پوری دکان میں کبھی اوپر سے نیچے کی طرف دیکھتا، اور کبھی دائیں سے بائیں طرف دیکھتا، اور دواؤں کا معائنہ کرتا رہا۔ کبھی ایک شیشی کو دیکھتا، کبھی دوسری شیشی کو دیکھتا۔ جب کافی دیر اس طرح دیکھتے ہوئے گزر گئی تو شیخ فریدالدین نے اس سے پوچھا کہ تم کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا چیز تلاش کررہے ہو؟ اس درویش نے جواب دیا کہ بس ویسے ہی یہ شیشیاں دیکھ رہا ہوں۔ شیخ فریدالدین نے پوچھا کہ تمہیں کچھ خریدنا بھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، مجھے کچھ خریدنا تو نہیں ہے۔ بس ویسے ہی دیکھ رہا ہوں، اور پھر اِدھر اُدھر الماری میں رکھی شیشیوں کی طرف نظر دوڑاتا رہا، باربار دیکھتا رہا۔ پھر شیخ فریدالدین نے پوچھا کہ بھائی! آخر تم کیا دیکھ رہے ہو؟ اس درویش نے کہا کہ میں اصل میں یہ دیکھ رہا ہوں جب آپ مریں گے تو آپ کی جان کیسے نکلے گی؟ اس لئے کہ آپ نے یہاں اتنی ساری شیشیاں رکھی ہوئی ہیں۔ جب آپ مرنے لگیں گے اور آپ کی روح نکلنے لگے گی تو اس وقت آپ کی روح کبھی ایک شیشی میں داخل ہوجائے گی کبھی دوسری شیشی میں داخل ہوجائے گی، اور اس کو باہر نکلنے کا راستہ کیسے ملے گا؟

اب ظاہر ہے کہ شیخ فریدالدین عطار اس وقت چونکہ ایک دنیادار تاجر تھے، یہ باتیں سن کر غصہ آ گیا۔ اور اس سے کہا کہ تو میری جان کی فکر کر رہا ہے۔ تیری جان کیسے نکلے گی؟ جیسے تیری جان نکلے گی، ویسے میری بھی نکل جائے گی۔ اس درویش نے جواب دیا کہ میری جان نکلنے میں کیا پریشانی ہے۔ اس لئے کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ میرے پاس تجارت ہے نہ دکان ہے اور نہ شیشیاں ہیں، نہ ساز وسامان ہے، میری جان تو اس طرح نکلے گی بس اتنا کہہ کر وہ درویش دکان کے باہر نیچے زمین پر لیٹ گیا اور کلمہ شہادت ''اشھدان لا الہ الا اللہ واشھدان محمداً رسول اللہ'' کہا، اور روح پرواز کر گئی۔

بس! یہ واقعہ دیکھنا تھا کہ حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر ایک چوٹ لگی کہ واقعتاً میں تو دن رات اسی دنیا کے کاروبار میں منہمک ہوں، اور اسی میں لگا ہوا ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف دھیان نہیں ہے، اور یہ ایک اللہ کا بندہ سبک سیر طریقے پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں چلا گیا۔ بہر حال، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لطیفہ غیبی تھا، جوان کی ہدایت کا سبب بن گیا، بس! اسی دن اپنا سب کاروبار چھوڑ کر دوسروں کے حوالے کیا، اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی، اور اسی راستے پر لگ کر اتنے بڑے شیخ بن گئے کہ دنیا کی ہدایت کا سامان بن گئے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

شیخ ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ ایک علاقے کے بادشاہ تھے۔ رات کو دیکھا کہ ان کے محل کی چھت پر ایک آدمی ٹہل رہا ہے۔ یہ سمجھے کہ شاید یہ کوئی چور ہے، اور چوری کی نیت سے یہاں آیا ہے۔ پکڑ کر اس سے پوچھا کہ تم اس وقت یہاں کہاں سے آ گئے؟ کیا کر رہے ہو؟ وہ شخص کہنے لگا کہ اصل میں میرا ایک اُونٹ گم ہو گیا ہے، اُونٹ تلاش کر رہا ہوں۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمہارا دماغ صحیح ہے؟ اُونٹ کہاں، اور محل کی چھت کہاں۔ اگر تیرا اُونٹ گم ہو گیا ہے تو پھر جنگل میں جا کر تلاش کر، یہاں محل کی چھت پر اُونٹ تلاش کرنا بڑی حماقت ہے، تم احمق انسان ہو۔ اس آدمی نے کہا کہ اگر اس محل کی چھت پر اُونٹ نہیں مل سکتا، تو پھر اس محل میں خدا بھی نہیں مل سکتا۔ اگر میں احمق ہوں تو تم مجھ سے زیادہ احمق ہو۔ اس لئے کہ اس محل میں رہ کر خدا کو تلاش کرنا اس سے بڑی حماقت ہے بس اس کا یہ کہنا تھا کہ دل پر ایک چوٹ لگی، اور سب بادشاہت وغیرہ چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ بہر حال! یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لطیفہ غیبی تھا۔

اس سے سبق حاصل کریں

ہم جیسے لوگوں کے لئے اس واقعہ سے یہ سبق لینا تو درست نہیں ہے کہ جس طرح وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے نکل پڑے، ہم بھی ان کی طرح نکل جائیں، ہم جیسے کم ظرف لوگوں کے لئے یہ طریقہ اختیار کرنا مناسب نہیں، لیکن اس واقعہ سے جو بات سبق لینے کی ہے وہ یہ کہ اگر انسان کا دل دنیا کے سازوسامان میں، دنیا کے راحت وآرام میں اٹکا ہوا ہو، اور صبح سے شام تک دنیا حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ میں لگا ہوا ہو، ایسے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں آتی۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آجاتی ہے تو دنیا کا یہ سازوسامان انسان کے پاس ضرور ہوتا ہے، لیکن دل اس کے ساتھ اٹکا نہیں ہوتا۔

میرے والد ماجد اور دنیا کی محبت

میرے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) قدس اللہ سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کی ذات میں شریعت اور طریقت کے بے شمار نمونے دکھادیئے۔ اگر ہم ان کو نہ دیکھتے تو یہ بات سمجھ میں نہ آتی کہ سنت کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟ انہوں نے دنیا میں رہ کر سب کام کیے، درس وتدریس انہوں نے کی، فتوے انہوں نے لکھے، تصنیف انہوں نے کی، وعظ وتبلیغ انہوں نے کی، پیری مریدی انہوں نے کی، اور ساتھ ساتھ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے عیالداری کے حقوق ادا کرنے کے لئے تجارت بھی کی، لیکن یہ سب ہوتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ان کے دل میں دنیا کی محبت ایک رائی کے دانے کے برابر بھی داخل نہیں ہوئی۔

وہ باغ میرے دل سے نکل گیا

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کو چمن کاری کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ پاکستان بننے سے پہلے دیوبند ہی میں بڑے شوق سے ایک باغ لگایا۔ دارالعلوم دیوبند میں ملازمت کے دوران تنخواہ کم اور عیال زیادہ تھے۔ اس تنخواہ سے گزارا بھی بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ لیکن تنخواہ سے بڑی مشکل سے کچھ انتظام کر کے آم کا باغ لگایا اور اس باغ میں پہلی مرتبہ پھل آرہا تھا کہ اسی سال پاکستان بننے کا اعلان ہوگیا اور آپ نے ہجرت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور اس باغ اور مکان پر ہندوؤں نے قبضہ کرلیا۔ بعد میں حضرت والد صاحب کی زبان سے اکثر یہ جملہ سنا کہ ''جس دن میں نے اس گھر اور باغ سے قدم نکالا، اس دن سے وہ باغ اور گھر میرے دل سے نکل گئے، ایک مرتبہ بھی

بھول کر بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں نے کیسا باغ لگایا تھا، اور کیسا گھر بنایا تھا'' وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ سارے کام ضرور کیے تھے، لیکن ان کا مقصد اداء حق تھا، اور دل ان کے ساتھ اٹکا ہوا نہیں تھا۔

دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے

ساری عمر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول دیکھا کہ جب بھی کوئی شخص کسی چیز کے بارے میں بلاوجہ آپ سے جھگڑا شروع کرتا تو والد صاحب اگرچہ حق پر ہوتے، لیکن ہمیشہ آپ کا یہ معمول دیکھا کہ آپ اس سے فرماتے کہ ارے بھائی جھگڑا چھوڑو اور یہ چیز لے جاؤ۔ اپنا حق چھوڑ دیتے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنایا کرتے تھے:

((وَمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌّ بُنِيَ لَهُ فِي وَسَطِ الْجَنَّةِ)) (۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس شخص کو جنت کے اطراف میں گھر دلانے کا ذمہ دار ہوں، جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے حضرت والد صاحب کو ساری عمر اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے دیکھا بعض اوقات ہمیں یہ تردد ہوتا کہ آپ حق پر تھے۔ اگر اصرار کرتے تو حق مل بھی جاتا۔ لیکن آپ چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا عطا فرمائی، اور ایسے لوگوں کے پاس دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے:

((أَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ))(۲)

یعنی جو شخص ایک مرتبہ اس دنیا کی طلب سے منہ پھیر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس دنیا ذلیل کر کے لاتے ہیں۔ وہ دنیا اس کے پاؤں سے لگی پھرتی ہے، لیکن اس کے دل میں اس کی محبت نہیں ہوتی۔

دنیا مثل سائے کے ہے

کسی شخص نے دنیا کی بڑی اچھی مثال دی ہے، فرمایا کہ دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے انسان کا سایا، اگر کوئی شخص چاہے کہ میں اپنے سائے کا تعاقب کروں، اور اس کو پکڑلوں، تو نتیجہ یہ ہوگا وہ اپنے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی المراء، رقم: ۱۹۱۶، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب اجتناب البدع والجدل، رقم: ۵۰

(۲) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۳۸۹، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب الهم بالدنيا، رقم: ۴۰۹۵، مسند أحمد، رقم: ۲۰۶۰۸، سنن الدارمی، المقدمة، باب الإقتداء بالعلماء، رقم: ۲۳۱

سائے کے پیچھے جتنا دوڑے گا، وہ سایہ اور آگے دوڑتا چلا جائے گا۔ کبھی اس کو پکڑ نہیں سکے گا۔ لیکن اگر انسان اپنے سائے سے منہ موڑ کر اس کی مخالف سمت میں دوڑنا شروع کر دے تو پھر سایہ اس کے پیچھے پیچھے آئے گا اللہ تعالیٰ نے دنیا کو بھی ایسا ہی بنایا ہے کہ اگر دنیا کے طالب بن کر اور اس کی محبت دل میں لے کر اس کے پیچھے بھاگو گے تو وہ دنیا تم سے آگے آگے بھاگے گی۔ تم کبھی اس کو پکڑ نہیں سکو گے۔ لیکن جس دن ایک مرتبہ تم نے اس کی طلب سے منہ موڑ لیا، تو پھر دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کس طرح ذلیل کر کے لاتے ہیں۔ بے شمار مثالیں ایسی ہوئی ہیں کہ دنیا اس کے پاس آتی ہے۔ اور وہ اس کو ٹھوکر مار دیتا ہے۔ لیکن وہ دنیا پھر بھی پاؤں میں پڑتی ہے۔ اس کے لئے ایک مرتبہ سچے دل سے اس دنیا کی طلب سے منہ موڑنا ضروری ہے۔ اور یہ بات دنیا کی حقیقت سمجھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور دنیا کی حقیقت حضور اقدس ﷺ نے ان احادیث میں بیان فرمادی۔ ان احادیث کو پڑھ کر دنیا کی محبت دل سے نکالنے کی فکر کرنی چاہئے۔

بحرین سے مال کی آمد

عَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ الْاَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ اَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَى الْبَحْرَيْنِ وَسَمِعَتِ الْاَنْصَارُ بِقُدُوْمِ اَبِيْ عُبَيْدَةَ فَوَافَوْا صَلَاةَ الْفَجْرِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا صَلَّى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْصَرَفَ فَتَعَرَّضُوْا لَهٗ فَتَبَسَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ رَآهُمْ ثُمَّ قَالَ اَظُنُّكُمْ سَمِعْتُمْ اَنَّ اَبَا عُبَيْدَةَ قَدِمَ بِشَيْءٍ قَالُوْا اَجَلْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَاَبْشِرُوْا وَاَمِّلُوْا مَا يَسُرُّكُمْ فَوَاللّٰهِ مَا الْفَقْرُ اَخْشٰى عَلَيْكُمْ، وَلٰكِنِّيْ اَخْشٰى اَنْ تُبْسَطَ الدُّنْيَا عَلَيْكُمْ كَمَا بُسِطَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَتَنَافَسُوْهَا كَمَا تَنَافَسُوْهَا فَتُهْلِكَكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ))(۱)

حضرت عمرو بن عوف انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا اور ان کو یہ کام بھی سپرد کیا کہ وہاں کے کفار اور مشرکین پر جو جزیہ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب شهود الملائكة بدرا، رقم: ۳۷۱۲، صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب، رقم: ۵۲۶۱، سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۳۸۶، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب فتنة المال، رقم: ۳۹۸۷، مسند أحمد، رقم: ۱۶۵۹۹

اور ٹیکس واجب ہے وہ ان سے وصول کرکے لایا کریں، چنانچہ ایک مرتبہ یہ بحرین سے ٹیکس اور جزیہ کا مال لے کر مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، وہ مال نقدی کی شکل میں بھی ہوتا تھا، کپڑے کی شکل میں بھی ہوتا تھا۔حضور ﷺ کا معمول یہ تھا کہ وہ جزیہ کا مال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تقسیم فرمادیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کچھ انصاری صحابہ کو پتہ چلا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بحرین سے مال لائے ہیں تو وہ انصاری صحابہ فجر کی نماز میں مسجد نبوی میں حاضر ہوگئے۔حضور ﷺ فجر کی نماز سے فارغ ہوکر واپس گھر کی طرف تشریف لے جانے لگے تو وہ انصاری صحابہ حضور اقدس ﷺ کے سامنے آگئے، اور زبان سے کچھ نہیں کہا۔سامنے آنے کا مقصد یہ تھا کہ جو مال بحرین سے آیا ہوا ہے وہ ہمارے درمیان تقسیم فرمادیں یہ وہ زمانہ تھا جس میں صحابہ کرام تنگ دستی کی انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے، کئی کئی وقتوں کے فاقے گزرتے تھے، پہننے کو کپڑا موجود نہیں تھا۔انتہائی تنگی کا زمانہ تھا جب حضور اقدس ﷺ نے ان صحابہ کو دیکھا کہ اس طرح سامنے آگئے ہیں تو آپ نے تبسم فرمایا، اور سمجھ گئے کہ یہ حضرات اس مال کی تقسیم کا مطالبہ کررہے ہیں پھر آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ میرے خیال میں تم کو یہ معلوم ہوگیا کہ ابوعبیدہ بن جراح بحرین سے کچھ سامان لے کر آئے ہیں۔انہوں نے جواب دیا کہ جی ہاں! یارسول اللہ! حضور ﷺ نے پہلے تو ان سے یہ فرمایا کہ خوشخبری سن لو کہ تمہیں خوش کرنے والی چیز ملنے والی ہے، وہ مال تمہیں مل جائے گا۔

تم پر فقروفاقے کا اندیشہ نہیں ہے

لیکن آپ ﷺ نے یہ محسوس فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس طرح آنا، اور اپنے آپ کو اس کام کے لئے پیش کرنا، اور اس بات کا انتظار کرنا یہ مال ہمیں ملنے والا ہے، یہ عمل کہیں ان کے دل میں دنیا کی محبت پیدا نہ کردے، اس لئے آپ نے ان کو خوشخبری سنانے کے فوراً بعد فرمادیا:

((فَوَاللّٰهِ مَا الْفَقْرُ أَخْشٰى عَلَيْكُمْ، وَلٰكِنِّيْ اَخْشٰى اَنْ تُبْسَطَ الدُّنْيَا عَلَيْكُمْ كَمَا بُسِطَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَتَنَافَسُوْهَا كَمَا تَنَافَسُوْهَا فَتُهْلِكَكُمْ كَمَا اَهْلَكَتْهُمْ))

''خدا کی قسم، مجھے تمہارے اوپر فقروفاقے کا اندیشہ نہیں ہے، یعنی اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ تمہارے اوپر فقروفاقہ گزرے گا، اور تم تنگ عیشی کے اندر مبتلا ہوجاؤ گے، اور مشقت اور پریشانی ہوگی، اس لئے کہ اب تو ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ انشاءاللہ مسلمانوں میں کشادگی اور فراخی ہوجائے گی''

حقیقت یہ ہے کہ اُمت کے حصے کا سارا فقروفاقہ خود حضور اقدس ﷺ جھیل گئے۔چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تین تین مہینے تک ہمارے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔اور اس وقت

ہمارا کھانا صرف دو چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا، ایک کھجور اور ایک پانی۔(۱)
سرکارِ دو عالم ﷺ نے کبھی دو وقت پیٹ بھر کر روٹی تناول نہیں فرمائی۔ گندم تو میسر ہی نہیں تھی، جو کی روٹی کا یہ حال تھا، لہٰذا فقر و فاقہ تو خود سرکارِ دو عالم ﷺ جھیل گئے۔

صحابہ کے زمانے میں تنگ عیشی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس زمانے میں ہمارا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ ہمارے گھر میں چھینٹ کا کپڑا کہیں سے تحفے میں آ گیا۔ یہ ایک خاص قسم کا نقش و نگار والا سوتی کپڑا تھا۔ اور کوئی بہت زیادہ قیمتی کپڑا نہیں تھا۔ لیکن پورے مدینہ منورہ میں جب بھی کسی کی شادی ہوتی، اور کسی عورت کو دلہن بنایا جاتا تو اس وقت میرے پاس یہ فرمائش آتی کہ وہ چھینٹ کا کپڑا عاریۃً ہمیں دے دیں، تاکہ ہم اپنی دلہن کو پہنائیں۔ چنانچہ شادیوں کے موقع پر وہ کپڑا دلہنوں کو پہنایا جاتا تھا، بعد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ آج اس جیسے بہت سے کپڑے بازاروں میں فروخت ہو رہے ہیں۔ اور وہی کپڑا آج اگر میں اپنی باندی کو بھی دیتی ہوں تو وہ بھی ناک منہ چڑھاتی ہے کہ میں تو یہ کپڑا نہیں پہنتی۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں کتنی تنگ عیشی تھی اور اب کتنی فراوانی ہے۔

یہ دنیا تمہیں ہلاک نہ کر دے

اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ آئندہ زمانے میں اولاً تو اُمت پر عام فقر و فاقہ نہیں آئے گا۔ چنانچہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجئے کہ حضور ﷺ کے زمانے کے بعد عام فقر و فاقہ نہیں آیا، بلکہ کشادگی کا دور آتا چلا گیا، اور آپ نے فرمایا کہ اگر مسلمانوں پر فقر و فاقہ آ بھی گیا تو اس فقر و فاقہ سے مجھے نقصان کا اندیشہ نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ دنیاوی تکلیف ہوگی، لیکن اس سے گمراہی پھیلنے کا اندیشہ نہیں ہوگا۔ البتہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ تمہارے اُوپر دنیا اس طرح پھیلا دی جائے گی جس طرح پچھلی اُمتوں پر پھیلا دی گئی اور تمہارے چاروں طرف دنیا کے ساز و سامان اور مال و دولت کے انبار لگے ہوں گے اور اس وقت تم ایک دوسرے سے ریس کرو گے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو گے اور یہ سوچو گے کہ فلاں شخص کا جیسا بنگلہ ہے میرا بھی ویسا ہی ہو جائے، فلاں شخص کی جیسی کار ہے، میرے پاس بھی ویسی ہو جائے، فلاں شخص کے جیسے کپڑے ہیں، میرے بھی ویسے ہو جائیں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھنے کی خواہش ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ دنیا تمہیں اس طرح

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبی وأصحابه وتخليهم من الدنيا، رقم: ۵۹۷۸، صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقاق، باب، رقم: ۵۲۸۲

ہلاک کردے گی جس طرح پچھلی اُمتوں کو ہلاک کردیا۔

جب تمہارے نیچے قالین بچھے ہوں گے

ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ تشریف فرما تھے کہ آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے نیچے قالین بچھے ہوں گے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضور ﷺ کی اس بات پر بہت تعجب ہوا کہ قالین تو بہت دور کی بات ہے ہمیں تو بیٹھنے کے لئے کھجور کے پتوں کی چٹائی بھی میسر نہیں ہے، ننگے فرش پر سونا پڑتا ہے، لہٰذا قالین کہاں اور ہم کہاں؟ چنانچہ حضور ﷺ سے سوال کیا:

"یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! أَنّٰی لَنَا أَنْمَاطٌ"

''قالین ہمارے پاس کہاں سے آئیں گے''

حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا:

((أَنَّھَا سَتَکُوْنُ))

''اگرچہ آج تو تمہارے پاس قالین نہیں ہیں، لیکن وہ وقت آنے والا ہے جب تمہارے پاس قالین ہوں گے''(۱)

اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تم پر فقر کا اندیشہ نہیں ہے لیکن مجھے اس وقت کا ڈر ہے جب تمہارے نیچے قالین بچھے ہوں گے اور دنیاوی سازوسامان کی ریل پیل ہوگی اور تمہارے چاروں طرف دنیا پھیلی ہوئی ہوگی، اس وقت تم کہیں اللہ تعالیٰ کو فراموش نہ کردو، اور اس وقت تم پر کہیں دنیا غالب نہ آجائے۔

جنت کے رومال اس سے بہتر ہیں

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ کے پاس شام سے ریشمی کپڑا آگیا، ایسا کپڑا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لئے صحابہ کرام اُٹھ اُٹھ کر ہاتھ لگا کر اس کو دیکھنے لگے۔ حضور اقدس ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کپڑے کو اس طرح دیکھ رہے ہیں تو آپ نے فوراً ارشاد فرمایا:

((لَمَنَادِیْلُ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ فِی الْجَنَّةِ أَفْضَلُ مِنْ ھٰذَا))(۲)

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الأنماط ونحوها للنساء، رقم: ٤٧٦٤، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب الأنماط، رقم: ٣٣٢٣ (۲) حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

''کیا اس کپڑے کو دیکھ کر تمہیں تعجب ہو رہا ہے اور کیا یہ کپڑا تمہیں بہت پسند آ رہا ہے؟ ارے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں جو رومال عطا فرمائے ہیں وہ اس کپڑے سے کہیں زیادہ بہتر ہیں''

گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً دنیا سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توجہ ہٹا کر آخرت کی طرف متوجہ فرمایا، کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی محبت تمہیں دھوکے میں ڈال دے اور تم آخرت کی نعمتوں سے غافل ہو جاؤ۔ قدم قدم پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی گھٹی میں یہ بات ڈال دی کہ یہ دنیا بے حقیقت ہے، یہ دنیا ناپائیدار ہے، اس دنیا کی لذتیں، اس کی نعمتیں سب فانی ہیں اور یہ دنیا دل لگانے کی چیز نہیں۔

پوری دنیا مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شُرْبَةً))(۱)

''اگر اس دنیا کی حقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو دنیا سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیا جاتا''

لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ دنیا کی دولت کافروں کو خوب مل رہی ہے اور وہ خوب مزے اڑا رہے ہیں باوجود یہ کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں، مگر پھر بھی دنیا ان کو ملی ہوئی ہے۔ اس لئے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حقیقت ہے، پوری دنیا کی حیثیت مچھر کے ایک پر کے برابر بھی نہیں ہے، اگر اس کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کافروں کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیا جاتا۔

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ ایک راستے سے گزر رہے تھے، راستے میں آپ نے دیکھا کہ ایک بکری کا مرا ہوا کان کٹا بچہ پڑا ہے، اور اس کی بدبو پھیل رہی ہے۔ آپ نے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی صفة الجنة وأنها مخلوقة، رقم: ۳۰۱۰، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل سعد بن معاذ، رقم: ۴۵۱۴، سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول الله، باب مناقب سعد بن معاذ، رقم: ۳۷۸۲، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل سعد بن معاذ، رقم: ۱۵۳، مسند أحمد، رقم: ۱۱۷۷۶

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء فی هوان الدنيا على الله عزوجلّ، رقم: ۲۲۴۲، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب مثل الدنیا، رقم: ۴۱۰۰

بکری کے اس مردہ بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ تم میں سے کون شخص اس مردہ بچے کو ایک درہم میں خریدے گا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ بچہ اگر زندہ بھی ہوتا تب بھی کوئی شخص اس کو ایک درہم میں لینے کے لئے تیار نہ ہوتا، اس لئے کہ یہ عیب دار بچہ تھا۔ اور اب تو یہ مردہ ہے۔ اس لاش کو لے کر ہم کیا کریں گے؟ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ساری دنیا اور اس کے مال و دولت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے زیادہ بے حقیقت اور بے حیثیت ہے، جتنا بکری کا یہ مردہ بچہ تمہارے نزدیک بے حقیقت ہے۔ (۱)

ساری دنیا ان کی غلام ہوگئی

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات صحابہ کرام کے دلوں میں بٹھادی کہ دنیا سے دل مت لگالو، دنیا کی طرف رغبت کا اظہار مت کرو، ضرورت کے وقت دنیا کو استعمال ضرور کرو، لیکن محبت نہ کرو۔ یہی وجہ ہے کہ جب دنیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل سے نکل گئی تو پھر اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کو ان کا غلام بنادیا، کسریٰ ان کے قدموں میں آکر ڈھیر ہوا، قیصر ان کے قدموں میں آکر ڈھیر ہوا، اور انہوں نے ان کے مال و دولت کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھی۔

شام کے گورنر حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو شام کا گورنر بنادیا گیا، اس لئے کہ شام کا اکثر علاقہ انہوں نے ہی فتح کیا تھا، اس وقت شام ایک بہت بڑا علاقہ تھا۔ آج اس شام کے علاقے میں چار ممالک ہیں یعنی شام، اُردن، فلسطین، لبنان، اور اس وقت یہ چاروں مل کر اسلامی ریاست کا ایک صوبہ تھا اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اس کے گورنر تھے۔ اور شام کا صوبہ بڑا زرخیز تھا۔ مال و دولت کی ریل پیل تھی۔ اور روم کا پسندیدہ اور چہیتا علاقہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں بیٹھ کر سارے عالمِ اسلام کی کمان کررہے تھے، چنانچہ وہ ایک مرتبہ معائنہ کے لئے شام کے دورہ پر تشریف لائے۔ شام کے دورہ کے دوران ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے ابوعبیدہ! میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے بھائی کا گھر دیکھوں، جہاں تم رہتے ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ تھا کہ ابوعبیدہ اتنے بڑے صوبے کے گورنر بن گئے ہیں اور یہاں مال و دولت کی ریل پیل ہے، اس لئے ان کا گھر دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے کیا کچھ جمع کیا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب، رقم: ٥٢٥٧، سنن أبي داؤد، کتاب الطهارة، باب ترك الوضوء من مس الميتة، رقم: ١٥٨، مسند أحمد، رقم: ١٤٤٠٢

شام کے گورنر کی رہائش

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ امیر المؤمنین! آپ میرے گھر کو دیکھ کر کیا کریں گے، اس لئے کہ جب آپ میرے گھر کو دیکھیں گے تو آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اصرار فرمایا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ امیر المؤمنین کو لے کر چلے، شہر کے اندر سے گزر رہے تھے، جاتے جاتے جب شہر کی آبادی ختم ہوگئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کہاں لے جارہے ہو؟ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بس اب تو قریب ہے۔ چنانچہ پورا دمشق شہر جو دنیا کے مال واسباب سے جگ مگ کررہا تھا، گزر گیا تو آخر میں لے جاکر کھجور کے پتوں سے بنا ہوا ایک جھونپڑا دکھایا، اور فرمایا کہ امیر المؤمنین، میں اس میں رہتا ہوں۔ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے تو چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا تو وہاں سوائے ایک مصلے کے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اے ابو عبیدہ! تم اس میں رہتے ہو؟ یہاں تو کوئی سازوسامان، کوئی برتن، کوئی کھانے پینے اور سونے کا انتظام کچھ بھی نہیں ہے، تم یہاں کیسے رہتے ہو؟

انہوں نے جواب دیا کہ امیر المؤمنین! الحمدللہ میری ضرورت کے سارے سامان میسر ہیں، یہ مصلی ہے، اس پر نماز پڑھ لیتا ہوں، اور رات کو اس پر سو جاتا ہوں، اور پھر اپنا ہاتھ اوپر چھپر کی طرف بڑھایا اور وہاں سے ایک پیالہ نکالا، جو نظر نہیں آرہا تھا، اور وہ پیالہ نکال کر دکھایا کہ امیر المؤمنین، برتن یہ ہے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب اس برتن کو دیکھا تو اس میں پانی بھرا ہوا تھا اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے بھیگے ہوئے تھے، اور پھر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین، میں دن رات تو حکومت کے سرکاری کاموں میں مصروف رہتا ہوں، کھانے وغیرہ کے انتظام کرنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ ایک خاتون میرے لئے دو تین دن کی روٹی ایک وقت میں پکادیتی ہے۔ میں اس روٹی کو رکھ لیتا ہوں اور جب وہ سوکھ جاتی ہے تو میں اس کو پانی میں ڈبو دیتا ہوں اور رات کو سوتے وقت کھالیتا ہوں۔ (۱)

بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ حالت دیکھی تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المؤمنین، میں تو آپ سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ میرا مکان دیکھنے کے بعد آپ کو آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے ابو عبیدہ! اس

---

(۱) سیر اعلام النبلاء (۱/۷)

دنیا کی ریل پیل نے ہم سب کو بدل دیا، مگر خدا کی قسم تم ویسے ہی ہو جیسے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے، اس دنیا نے تم پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ حقیقت میں یہی لوگ اس کے مصداق ہیں کہ ع

بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

ساری دنیا آنکھوں کے سامنے ہے، اس کی دلکشیاں بھی سامنے ہیں اور اس کی رعنائیاں بھی سامنے ہیں اور دوسرے لوگ جو دنیا کی ریل پیل میں گھرے ہوئے ہیں وہ سب سامنے ہیں لیکن آنکھوں میں کوئی جچتا نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ جل جلالہ کی محبت اس طرح دل پر چھائی ہوئی ہے کہ ساری دنیا کے جگ مگ کرتے ہوئے مناظر دھوکہ نہیں دے سکتے، اللہ تعالیٰ کی محبت ہر وقت دل و دماغ پر مسلط اور طاری ہے، ہمارے حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؂

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا (مجذوبؒ)

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جن کے قدموں میں دنیا ذلیل ہو کر آئی۔ لیکن دنیا کی محبت کو دل میں جگہ نہیں دی۔ حقیقت میں یہ نبی کریم ﷺ کی تربیت تھی۔ آپ ﷺ نے بار بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دنیا کی حقیقت کی طرف متوجہ کیا۔ اور بار بار دنیا کی بے ثباتی کی طرف اور آخرت کی ابدی اور دائمی نعمتوں اور عذابوں کی طرف متوجہ کیا جس سے قرآن و حدیث بھرے ہوئے ہیں۔

ایک دن مرنا ہے

انسان ذرا سوچے تو سہی کہ یہ دنیا کس وقت تک کی ہے، ایک دن کی، دو دن کی، تین دن کی، کسی کو پتہ ہے کہ کب تک اس دنیا میں رہوں گا؟ کیا اس کو یقین ہے کہ میں اگلے گھنٹے بلکہ اگلے لمحے زندہ رہوں گا؟ بڑے سے بڑا سائنس دان، بڑے سے بڑا فلسفی، بڑے سے بڑا صاحبِ اقتدار یہ نہیں بتا سکتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی کتنی ہے؟ لیکن اس کے باوجود انسان دنیا کا ساز و سامان اکٹھا کرنے میں لگا ہوا ہے اور دن رات دنیا کی دوڑ دھوپ لگی ہے اور صبح سے شام تک اسی کا چکر چل رہا ہے اور جس دن بلاوا آئے گا سب کچھ چھوڑ کر چلا جائے گا، کوئی چیز ساتھ نہیں جائے گی۔

”دنیا“ دھوکے کا سامان ہے

لہٰذا قرآن کریم کی یہ آیت:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾(۱)

(۱) الحدید: ۲۰

یہ بتا رہی ہے کہ دنیاوی زندگی دھوکے کا سودا ہے، اس دھوکے کے سودے میں اس طرح نہ پڑ جانا کہ وہ تمہیں آخرت سے غافل کر دے۔ اس دنیا سے ضرور گزرو مگر اس سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ اگر یہ بات دل میں اُتر جائے تو پھر چاہے تمہاری کوٹھیاں کھڑی ہوں یا بنگلے ہوں یا مل ہوں، یا دنیا کا ساز وسامان ہو یا مال و دولت ہو اور بینک بیلنس ہو لیکن ان کی محبت دل میں نہیں ہے تو پھر زاہد ہو، الحمدللہ، پھر تمہیں زہد کی نعمت حاصل ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ خسارے کا سودا اس شخص کا ہے جس نے دنیا میں کمایا تو کچھ بھی نہیں اور قلاش ہے مگر دل میں دنیا کی محبت بھری ہے، تو اس شخص کو زہد حاصل نہیں ہے، اس کو زاہد نہیں کہیں گے، اس لئے کہ دنیا کی عشق ومحبت میں مبتلا ہے اور ایسا شخص بڑے خسارے میں ہے۔

''زہد'' کیسے حاصل ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ یہ چیز کیسے حاصل ہو؟ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان قرآن وحدیث کے ان ارشادات پر غور کرے اور موت کا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا مراقبہ کرے اور آخرت کی نعمتوں کا، آخرت کے عذاب کا، دنیا کی بے ثباتی کا مراقبہ کرے اور اس کے لئے روزانہ پانچ دس منٹ کا وقت نکالے۔ اس سے رفتہ رفتہ دنیا کی محبت دل سے زائل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دنیا کی حقیقت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مال وجاہ کی محبت، ایک باطنی بیماری ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلَا فِيْ غَنَمٍ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِيْنِهِ))(۱)

یہ حدیث حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر دو بھوکے بھیڑیے کسی بکریوں کے گلہ میں چھوڑ دیئے جائیں تو وہ اس بکریوں کے گلہ میں اتنا فساد نہیں مچائیں گے جتنا مال اور جاہ کی محبت انسان کے دین میں پیدا کرتی ہے" پہلی چیز مال کی محبت ہے جس سے اکثر حضرات واقف ہیں، دوسری چیز شرف کی محبت ہے جس میں دو چیزیں داخل ہیں، ایک وہ جسے عام طور پر حب جاہ سے تعبیر کرتے ہیں، اور دوسری وہ جسے دکھاوا اور نام ونمود سے تعبیر کرتے ہیں، یہ دونوں چیزیں ملتی جلتی ہیں لیکن ان میں تھوڑا سا فرق ہے۔

حبِ جاہ کا مطلب

حب جاہ کا معنی یہ ہے کہ اس بات کی حرص اور طلب ہو کہ لوگوں پر میرا اثر قائم ہو جائے، کوئی ایسا عہدہ اور منصب حاصل کرلوں جو بااثر ہو، جس سے لوگ میری عزت کرنے لگیں اور مجھے اپنا قائد اور لیڈر ماننے لگیں۔ تو یہ شوق کہ لوگ میری بات مانیں اور لوگوں پر میرا اثر ہو اس کا نام حب جاہ ہے۔

نام ونمود اور تعریف پسندی

یہ خواہش کہ لوگ مجھے بلند سمجھیں اور میری ہر ادا کو پسند کریں۔ اس کو خواہ تعریف پسندی کہیں

☆ اصلاحی مواعظ (۱/۴۳ تا ۶۵)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء في أخذ المال بحقه، رقم: ۲۲۹۸، مسند أحمد، رقم: ۱۵۲۲٤، سنن الدارمي، کتاب الرقاق، باب ما ذئبان جائعان، رقم: ۲٦۱٤

یا دکھاوا، یہ بھی حبِ جاہ کا ایک حصہ ہے۔ حضور ﷺ اس حدیث مبارک میں ہمیں اسی طرف متوجہ فرمارہے ہیں کہ یہ جاہ کی محبت خواہ منصب کے ذریعے ہو یا تعریف پسندی کے ذریعے یہ انسان کے دین میں بڑا فساد پھیلاتی ہیں۔ جس طرح بھوکے بھیڑیے بکریوں کے گلے میں فساد پھیلاتے ہیں اس سے زیادہ فساد یہ چیزیں پھیلاتی ہیں۔ ان دونوں چیزوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ بڑے نازک مقامات ہیں، اوران سے بچنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا شراب پینے اور خنزیر کھانے سے بچنا چاہئے۔ پہلا حصہ جو میں نے عرض کیا کہ بڑا منصب یا عہدہ حاصل کرنے کی کوشش اور فکر کرنا تاکہ لوگوں کو متاثر کیا جاسکےاور رعب ڈالا جاسکے، یہ سب ناجائز اور حرام ہے۔

جاہ کا کچھ حصہ شرعاً بھی مطلوب ہے

جاہ کا کچھ حصہ شرعاً مطلوب بھی ہےاور جائز بھی، یعنی لوگوں کے دلوں پر اتنا اثر قائم ہوجائے جس کے نتیجے میں انسان دوسروں کی ایذاہی اور نقصان سے اپنے آپ کو بچاسکے، گویا اگر کوئی شخص بالکل بے حیثیت اور بے عزت ہے، دوسروں کی ایذارسانی سے اپنے آپ کو نہیں بچاسکتا تو اتنے جاہ کا حصہ کہ جس کے ذریعے انسان اپنے آپ کو تکلیف سے بچاسکے یہ نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ مثلاً ایک آدمی کی کسی کی نگاہ میں کوئی وقعت اور عزت نہیں ہے، کوئی آکر اُس کو مار گیا، کوئی اُس کا مال لوٹ گیا یا کوئی اُس کی جان پر حملہ آور ہوگیا، اب اگر کہیں جاکر وہ شکایت کرتا ہےتو کوئی اُس کی بات نہیں سنتا۔ تھانے میں جاتا ہےتو پولیس والے رپورٹ درج نہیں کرتے۔ آج کی دنیا ایسے بے وقعت آدمی کو مار ڈالے گی۔ لہٰذا اتنی جاہ کہ جس سے تکلیف کو دور کرسکے جائز بھی ہے اور ضروری بھی۔ اتنی جاہ اگر کوئی طلب کرے تو شریعت میں اس کی ممانعت نہیں ہے۔

ضرورت سے زائد جاہ کی طلب

لیکن اگر جاہ اس لئے طلب کررہا ہے تاکہ اپنی ضرورت سے زائد منافع حاصل کروں، کیونکہ اگر یہ منصب مجھے مل جائے گا تو میں اس سے لوگوں پر اثر ڈالوں گااور اپنے لئے منافع حاصل کروں گا، یہ حبِ جاہ ہے جو کہ حرام ہے۔

عہدہ کی طلب، حدیثِ نبوی ﷺ کے آئینہ میں

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ حکومت کے جتنے بھی عہدے اور منصب ہیں، اگر کسی شخص کو بے مانگے عطا ہوجائیں اور انسان اس کو اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حدود کے مطابق استعمال کرے تو

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے اور ان شاء اللہ اس کی مدد ہوگی، لیکن جو شخص اُس عہدے کے پیچھے بھاگتا ہے، لوگوں سے سفارشیں اور درخواستیں کراتا ہے، تو حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی کوئی مدد نہیں ہوتی۔ (۱)

اس لئے شریعت کا حکم بھی یہی ہے کہ انسان کوئی بھی عہدہ، منصب، وزارت یا حکمرانی خود سے بڑھ کر طلب نہ کرے مگر یہ کہ قومی مفاد کے لئے بہت ہی شدید حاجت ہو۔

شدید حاجت کیا ہے؟

منصب کی طلب میں شدید حاجت یہ ہے کہ اگر میں آگے بڑھ کر قبول نہیں کروں گا تو ظالم لوگ اس پر قابض ہو کر مخلوقِ خدا کو نقصان پہنچائیں گے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کیا کہ جب بادشاہ نے آپ کو اپنے پاس بلایا اور اپنا مقرب بنایا تو بادشاہِ مصر کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام نے خود فرمایا:

﴿اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ﴾ (۲)

"مجھے آپ حکومت کے خزانے کا محکمہ حوالے کردیں تاکہ میں اس کی نگرانی ٹھیک سے کروں"

کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ اگر میں نہیں جاؤں گا تو کچھ لوگ دوسروں کے حقوق غصب کر کے کھا جائیں گے اور ظلم وستم کا نشانہ بنائیں گے۔ لہٰذا مخلوقِ خدا کو ظلم سے بچانے کی خاطر انہوں نے اس عہدے کو طلب کرلیا، چنانچہ یہ ایک استثنائی صورت ہے، اگر کہیں پیش آجائے تو جائز ہے کہ اُس عہدے کو طلب کرلیا جائے، لیکن اصل حکم یہ ہے کہ خود سے آگے بڑھ کر عہدہ طلب نہ کرے۔

وعظ وتقریر میں احتیاط

علماء نے یہاں تک فرمایا کہ خود سے آگے بڑھ کر واعظ بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ ایسا کرنے میں برکت نہیں ہوتی۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأحکام، من لم یسأل الإمارة أعانه الله علیه، رقم: ۶۶۱۳، صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب النهی عن طلب الإمارة والحرص علیها، رقم: ۳۴۰۱، سنن الترمذی، کتاب الأحکام عن رسول الله، باب ما جاء عن رسول الله فی القاضی، رقم: ۱۲۴۶، سنن النسائی، کتاب آداب القضاة، باب النهی عن مسألة الإمارة، رقم: ۵۲۸۹، سنن أبی داؤد، کتاب الخراج والإمارة والفیء، باب ما جاء فی طلب الإمارة، رقم: ۲۵۴۰، سنن ابن ماجه، کتاب الأحکام، باب ذکر القضاة، رقم: ۲۳۰۰

(۲) یوسف: ۵۵

((لَا يَقُصُّ اِلَّا اَمِيْرٌ أَوْ مَأْمُوْرٌ أَوْ مُخْتَالٌ))(۱)

''وعظ یا تو وہ کہے جو دینی امور میں امیر ہو اور اللہ تعالیٰ نے اُسے امارت کا منصب عطا کیا ہو، یا وعظ کا حق اس کو ہے جسے امیر کی طرف سے حکم دیا گیا ہو''

مثلاً کسی اللہ والے نے وعظ کے لئے بٹھا دیا کہ تم یہ خدمت انجام دو تو اُس کے لئے وعظ کہنا جائز ہے۔ تیسرا جو شخص بھی وعظ کہے گا تو آنحضور ﷺ کا فرمان ہے کہ وہ ''مختال'' یعنی دکھاوا کرنے والا ہے، اور اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر وعظ کہہ رہا ہے۔ بعض لوگ خود اپنی طرف سے بغیر کسی کے کہے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کے وعظ ونصیحت میں برکت نہیں ہوتی، اُلٹے تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے بزرگوں نے فرمایا کہ جب تک کوئی اللہ والا بزرگ کسی منصب پر نہ بٹھا دے اُس وقت تک خود سے اُس منصب پر نہ بیٹھے۔

مقبول واعظ کے لئے احتیاط

ہم لوگوں کی مثال کچھ ایسی ہے کہ جب وعظ کرنا شروع کیا اور کچھ لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے تعظیم وتکریم کرتے ہوئے بات سننا شروع کر دی، تو دماغ میں یہ خیال آتا ہے کہ اتنے سارے لوگ جو میری بات سن رہے ہیں یقیناً کچھ نہ کچھ میرے اندر ضرور موجود ہے، تو اس سے انسان کا نفس خراب ہو جاتا ہے اور انسان تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

خرابیٔ نفس کا عجیب واقعہ

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے اس کی مثال میں ایک قصہ لکھا ہے۔ عرب میں ایک مشہور لالچی شخص گزرا ہے، جس کا نام اشعب تھا۔ ایک مرتبہ کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں کچھ لوگوں کو برتن بناتے دیکھا۔ اُس نے اُن سے کہا کہ تم لوگ اتنے چھوٹے چھوٹے تھال کیوں بنا رہے ہو؟ بڑے بڑے تھال بناؤ۔ لوگوں نے اُس سے کہا: ہم خواہ چھوٹے چھوٹے تھال بنائیں یا بڑے تمہیں کیا مطلب؟ کہنے لگا: ہوسکتا ہے کہ جو تھال تم بنا رہے ہو کسی ایسے شخص کے پاس پہنچے جو میرے پاس اُس تھال میں تحفہ لے کر آئے، اس لئے تم بڑا تھال بناؤ۔

اسی کے لالچ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بعض اوقات گھر سے نکلتا اور بچوں کو کھیلتا دیکھ کر جھوٹ موٹ کہتا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو فلاں جگہ جاؤ وہاں مٹھائی بٹ رہی ہے۔ چونکہ بچوں کو مٹھائی

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب العلم، باب في القصص، رقم: ۳۱۸۰، مسند أحمد، رقم: ۱۷۳۵۸، سنن الدارمي، كتاب الرقاق، باب في النهي عن القصص، رقم: ۲٦٦۰

کا شوق ہوتا ہے لہٰذا وہ کھیل کو چھوڑ کر اُس طرف بھاگے۔ جب سب بچے بھاگنے لگے تو خود بھی اُن کے پیچھے بھاگنے لگا۔ کسی نے پوچھا: تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ اُس نے کہا: میں اس لئے پیچھے بھاگ رہا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ مٹھائی بٹ رہی ہو۔ (۱)

ایک غلط سوچ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ کچھ لوگ بعض اوقات اپنے تقدس، بزرگی اور علم وفضل سے لوگوں کو خود دھوکہ دیتے ہیں، اور جب کچھ لوگ مائل ہو گئے تو پھر سوچتے ہیں کہ اتنی ساری مخلوق جو مائل ہو رہی ہے آخر کوئی بات ہے جو سارے لوگ میرے پیچھے آرہے ہیں۔ یہ سوچ غلط ہے جو کہ بعض اوقات انسان کو تکبر میں مبتلا کر دیتی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا یقیناً ایک عظیم کام ہے، لیکن اس کا فائدہ اُسی وقت ہوتا ہے کہ جب بندہ اس کام کو تعریف کروانے، مشہور ہونے یا پرہیزگار کہلوانے کے لئے نہ کرے، بلکہ اس کا مقصد صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی اور اُس کی رضامندی ہو.

شیخ کی نگرانی میں کام کیجئے

اس لئے یہ بڑا خطرناک اور نازک معاملہ ہے کہ جب تک کوئی بزرگ کسی منصب پر نہ بٹھادے یا کسی کی باقاعدہ نگرانی نہ ہو، تو بعض اوقات انسان حبِ جاہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسی لئے بزرگوں نے فرمایا کہ کام کرنے سے پہلے اور کام کرنے کے ساتھ ساتھ کسی اللہ والے سے تعلق قائم رکھو، تاکہ انسان کا نفس حبِ جاہ کی بیماری سے محفوظ رہے۔

شیخ ابوالحسن نوری رحمہ اللہ کا اخلاص

شیخ ابوالحسن نوری رحمہ اللہ جو بڑے درجے کے بزرگ تھے، اُن کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جارہے تھے۔ راستے میں دیکھا کہ سمندر کے کنارے کشتیوں سے کچھ مٹکے اُتر رہے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ شراب کے مٹکے ہیں جو حاکمِ وقت کے لئے کسی دوسرے ملک سے آئے ہیں، اور اب ایک بڑے جہاز میں لاد کر اُس کے پاس جانے ہیں۔ شیخ ابوالحسن نوری رحمہ اللہ کو بہت صدمہ ہوا کہ ایک مسلمان ملک کا حاکم شراب کے مٹکے منگوا رہا ہے۔ آپ کو نہی عن المنکر کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور آپ نے اُن بیس مٹکوں کو ایک ایک کر کے توڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اُنیس مٹکے توڑ

(۱) نفحة العرب، ص: ۱۵

ڈالے۔ جب بیسواں مٹکا توڑنے کے لئے ہاتھ بلند کیا تو اچانک دل میں کچھ خیال کر کے اس آخری مٹکے کو چھوڑ دیا اور واپس چلے آئے۔ کسی طرح یہ خبر حاکم تک پہنچ گئی کہ فلاں شخص نے اُنیس مٹکے توڑ ڈالے۔ بادشاہ نے طلب کر لیا اور پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ نے فرمایا کہ دراصل قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ نیکی کا حکم کرو اور برائی سے روکو اور اس کے نتیجے میں جو کچھ تکلیف پہنچے اس پر صبر کرو" چنانچہ جب میں نے دیکھا کہ یہ برائی آپ تک پہنچے گی اور پھر مخلوق کے اندر پھیلے گی تو ان کو توڑنا چاہا لیکن خیال آیا کہ تو بڑا بہادر ہے کہ بادشاہ کی قید و سزا کو نظر انداز کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی، جب لوگوں کو پتا چلے گا کہ ابوالحسن نے بادشاہ کے مٹکے توڑ دیئے ہیں تو لوگوں میں تیری شہرت ہوگی۔ جب مجھے یہ خیال آیا تو اب میرا توڑنا اللہ کے لئے نہ رہتا بلکہ مخلوق کی تعریف طلبی کے لئے ہوتا۔ اب تک جتنے مٹکے توڑے تھے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم ماننے اور اُس کی رضا کے لئے توڑے تھے، اور اگر آخری مٹکے کو بھی توڑ دیتا تو وہ اپنے نفس اور دکھاوے کے لئے توڑتا لہٰذا آخری مٹکے کو چھوڑ آیا۔

شیخ ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص کا بادشاہ پر اثر

روایات میں آتا ہے کہ شیخ ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ کا بادشاہ پر ایسا اثر پڑا کہ اُس نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مستقل طور پر آپ کو محتسب مقرر کر دیا کہ اب آپ شہر کی نگرانی کریں اور جتنی برائیاں نظر آئیں اُن کو دور کریں۔ غرض کسی کو نیکی کی بات بتانا اور برائی سے روکنا یہ اُس وقت قابل تعریف ہے جب اُس کا مقصد سوائے اللہ تعالیٰ کی تعریف کے اور کچھ نہ ہو، کیونکہ اگر یہی کام شہرت، نام اور متقی کہلوانے کے لئے ہو تو ساری محنت اکارت ہو جاتی ہے اور انسان اُلٹا گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد بھی تھے اور بڑے درجے کے بزرگ بھی تھے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کانپور مدرسے میں پڑھانے لگے۔ کانپور کے لوگوں میں بدعات کا بہت زور تھا۔ لوگوں کا التفات قرآن و حدیث کی طرف کم اور منطق و فلسفہ کی طرف زیادہ تھا جبکہ علماء دیوبند کا التفات قرآن و سنت کی طرف زیادہ تھا، اس لئے وہ لوگ علمائے دیوبند کو کمتر سمجھتے تھے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ سوچا کہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کو کانپور بلاؤں اور آپ کا یہاں وعظ کراؤں تاکہ لوگوں کو دین کی حقیقت بھی معلوم ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ علمائے دیوبند ہر فن کو جاننے والے ہیں۔ چنانچہ جلسہ منعقد کیا گیا اور حضرت شیخ الہند کو بلایا گیا۔ جلسے کے دوران حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو اشارۃً یہ بتادیا کہ حضرت فلاں مسئلہ پر ذرا خاص طور پر بیان فرمادیجئے کیونکہ یہاں اُس مسئلے کے بارے میں بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مسئلے کا تعلق بھی منطق اور فلسفے سے تھا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جب بیان شروع کیا تو اُس وقت تو وہ لوگ نہیں پہنچے تھے جن کو وعظ سنانا مقصود تھا، لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ آئے۔ حضرت شیخ الہند نے اُس مسئلے پر بیان کرنا شروع کردیا جس میں حضرت نے بڑے اُونچے درجے کے علوم بیان فرمائے۔ بیان ابھی جاری تھا کہ اچانک شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں آگے بیان کرنے سے معذرت خواہ ہوں اور ''وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین'' کہہ کر بیٹھ گئے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے بڑی تشویش ہوئی کہ جب بیان کا اصل وقت آیا تو حضرت بیٹھ گئے، چنانچہ میں نے حضرت سے پوچھا کہ اب تو اصل موقع تھا لیکن آپ نے وعظ ختم فرمادیا۔ حضرت نے فرمایا کہ دراصل مجھے اس چیز کا خیال آگیا کہ اب میں ان لوگوں کے سامنے اپنی علمیت کا اظہار کررہا ہوں۔ اب اگر میں وعظ جاری رکھتا تو یہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہوتا بلکہ اپنی ذات کو نمایاں کرنے اور اپنی علمیت کو جتانے کے لئے ہوتا، اور ایسا وعظ بیکار ہے جس کا مقصد اللہ کی رضا نہ ہو بلکہ اپنی علمیت ظاہر کرنا مقصود ہو۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ انسان مجمع عام میں تقریر کے دوران یہ سوچ کر بیٹھ جائے کہ اب تک جو کہا تھا وہ اللہ کے لئے تھا لیکن اب جو کہوں گا وہ علمیت کے اظہار کے لئے ہوگا۔ دراصل حبِ جاہ سے بچنے کے لئے ایسا کرنا پڑتا ہے۔ پس کوئی بھی منصب، کوئی بھی عہدہ اپنا اثر ورسوخ پیدا کرنے کے لئے حاصل کرنا برا ہے۔ البتہ مخلوق کو فائدہ یا راحت پہنچانے کے لئے عہدہ حاصل کیا جائے تو اس کی اجازت ہے۔

تمام بزرگ تواضع سے اولیاء اللہ بنتے ہیں

بعض اوقات جاہ ومنصب یا اثر ورسوخ بغیر مانگے خود بخود حاصل ہوجاتا ہے۔ عام طور پر یہ اُن اللہ والوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو تواضع سے مٹاتے چلے جاتے ہیں اور دنیا اُن کے قدموں میں آتی چلی جاتی ہے۔ حدیث میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ))(۱)

''جو اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اُسے اللہ تعالیٰ بلند مقام عطا فرمادیتے ہیں''

---

(۱) الترغيب والترهيب، رقم: ٤٣٩٥ (٣٥١/٣)، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (٤٠٤/٣)، كنزالعمال، رقم: ٦٣٤٩ (٢٤١/٣)، الزواجر عن اقتراف الكبائر (١٩١/١)، شعب الإيمان، رقم: ٨١٤٠ (٢٧٦/٦)، مصنف ابن ابي شيبه (١٧٩/٨)، جامع الأحاديث، رقم: ٣٦٢٨١ (٢٩١/٣٣)

جتنے بھی بزرگ اور اولیاء اللہ ہوتے ہیں وہ خود چاہتے ہیں کہ کسی کو میری خبر نہ ہو، میں گمنام رہوں، لیکن وہ خوشبو جو مہکتی ہے وہ دیوانہ وار لوگوں کو کھینچ لاتی ہے۔ اگر چہ وہ اپنے اردگرد حصار قائم کر لیتے ہیں لیکن مخلوق اُن کے قدموں پر نچھاور ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی خوشبو عطا فرمائی ہے جو بغیر مانگے اُن کو حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے۔

جائز منصب کے استعمال میں غلطیاں

لیکن ایسی جاہ جو جائز طریقے سے اور بے مانگے حاصل ہو جائے، اس کے استعمال میں بڑی زبردست غلطیاں اور غفلتیں ہوتی ہیں جن کی طرف انسان کا ذہن نہیں جاتا اور انسان اُس میں مبتلا رہتا ہے، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس جاہ کا استعمال بعض اوقات اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شخص سے اُس کی مرضی اور خوشنودی کے خلاف کوئی کام محض اپنی شخصیت اور عہدے کا دباؤ ڈال کر کرایا جاتا ہے جو سراسر ناجائز ہے۔

دباؤ ڈال کر چندہ کرنا

مثلاً کسی نیک کام کے لئے چندہ کے لئے دو چار بااثر لوگوں کو ساتھ لے لیا جائے اور اُن کے ذریعے لوگوں سے چندہ کروایا جائے تاکہ اُن لوگوں کی وجہ سے وہ چندہ دینے سے انکار نہ کریں۔ کیونکہ اگر تنہا جائے اور بااثر لوگ ساتھ نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ اُن لوگوں کے دلوں میں چندہ دینے کا داعیہ پیدا ہوتا یا نہ ہوتا، یا چندہ دیتا مگر کم دیتا۔ لیکن جب کسی بھاری شخصیت کا رعب ڈال دیا گیا تو اُس سے انکار نہیں ہوا اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے وہ چندہ اُس کی شخصیت کے رعب کی بناء پر دیا ہے ورنہ دل سے وہ چندہ دینے پر راضی نہ تھا۔ ایسا کرنا جاہ کا غلط استعمال ہے۔ حدیث میں حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسِہٖ مِنْہُ))(۱)

''کسی کا مال اس کی خوشنودی کے بغیر حلال نہیں''

مہر بھی خوشدلی کے بغیر معاف نہیں ہوتا

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ جب عورت مہر معاف کرے تو صرف زبانی معافی کافی نہیں بلکہ عورت اگر دل سے معاف کرے تو مہر معاف ہوتا ہے۔ یہ مفہوم قرآن مجید میں اس طرح مذکور ہے:

(۱) مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۷۷٤

﴿فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا﴾(۱)
یعنی اگر بیویاں خوشی سے تمہیں کچھ دے دیں تو جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔

مہر کی معافی، ایک بُرا رواج

عام طور پر لوگوں میں یہ رواج پڑ گیا ہے کہ ساری زندگی ساتھ گزاری لیکن کبھی بھی نہ مہر دینے کا خیال آیا اور نہ ہی ارادہ کیا۔ جب بسترِ مرگ پر پہنچ گئے اُس وقت بیوی سے کہہ دیتے ہیں کہ میرے ذمہ تمہارا مہر ہے اُسے معاف کر دو۔ اب ایسے وقت میں اُس بیچاری کی زبان سے اس کے سوا کیا نکلے گا کہ میں معاف کرتی ہوں۔ جبکہ قرآن کہتا ہے ایسی معافی معتبر نہیں۔ معافی وہی معتبر ہے جو خوشدلی سے ہو۔ حالات سے مجبور ہو کر معاف کر دینا معتبر نہیں۔ چندہ کا بھی یہ حال ہے، حالات یا شخصیات کے دباؤ میں آ کر دیا ہوا چندہ حلال نہیں بلکہ یہ شخصیت کا غلط استعمال ہے۔

چندہ کی ایک جائز صورت

اور اگر ایک آدمی چندہ دینا تو چاہتا ہے لیکن اگر آپ خود جائیں تو اُس کو یہ اعتماد نہیں ہوتا کہ یہ چندہ لینے والا اس چندہ کو صحیح مصرف پر خرچ بھی کرے گا یا نہیں۔ لہٰذا آپ ایک ایسے شخص کو ساتھ لے گئے جس کی وجہ سے چندہ دینے والے کو اس بات کا اعتماد ہو جائے کہ چندہ لینے والا غلط آدمی نہیں ہے۔ تو یہ طریقہ جائز ہے۔ لیکن اگر کسی اہم شخص کو اس لئے ساتھ لے گیا کہ چندہ دینے والا دباؤ اور رعب میں آ کر کچھ نہ کچھ دے ہی دے گا تو یہ بالکل حرام ہے اور اپنے منصب کا غلط استعمال ہے۔

سفارش کا معنیٰ

اسی طرح آج کل سفارش کا بھی بہت رواج ہو گیا ہے۔ کسی بڑے آدمی کی سفارش اس لئے کرائی جاتی ہے تاکہ دوسرا آدمی شخصیت کا دباؤ محسوس کر کے کام کر ہی دے۔ یہ بھی جاہ کا ناجائز استعمال ہے۔ سفارش کا مطلب یہ نہیں کہ کسی پر دباؤ ڈال کر کوئی کام کرایا جائے بلکہ سفارش کا مطلب توجہ دلانا اور مشورہ دینا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے کسی کے نام سفارشی خط لکھ دیا کہ اس کو فلاں جگہ ملازم رکھ لیں۔ اب جس کے نام خط لکھا گیا ہے وہ سوچتا ہے کہ میں اتنی بڑی شخصیت کی سفارش کو کیسے رد کروں جبکہ جس کی سفارش کی جارہی ہے وہ اُس منصب کا اہل نہیں ہے۔ آج کل میرے پاس بہت سے لوگ

(۱) النساء: ٤، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''ہاں اگر وہ خود اس کا کچھ حصہ خوش دلی سے چھوڑ دیں تو اسے خوشگواری اور مزے سے کھالو''

آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے نام زوردار الفاظ میں سفارش لکھ دیں۔ جبکہ زوردار الفاظ میں سفارش لکھنا ہی ناجائز ہے۔ سفارش کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو یہ لکھا جائے کہ فلاں شخص میرے خیال کے مطابق حاجتمند بھی ہے اور اہل بھی۔ اگر آپ کے حالات اجازت دیں اور مصلحت کے مطابق ہو تو اس کا کام کر دیجئے، میں اس کی سفارش کرتا ہوں۔ پھر اگر وہ سفارش قبول نہ کرے تو دل پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ جبکہ زوردار الفاظ میں یوں کہنا کہ آپ نے ہر حالت میں اور ہر قیمت پر یہ کام کرنا ہے، یہ سفارش ناجائز اور حرام ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے پر اپنی شخصیت، مال و دولت اور منصب کا دباؤ ڈالنا بھی شریعت میں ممنوع ہے۔ صرف عبادات کی بات نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں دین کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے اور انہیں چیزوں کو فراموش کر کے ہمارا معاشرہ بگڑ رہا ہے اور ہماری زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ اب تو کچھ اندازہ ہوا ہوگا کہ حضور ﷺ کا یہ فرمان کہ مال و جاہ کی محبت انسان کے دین میں کتنا فساد مچاتی ہیں۔ ہم لوگ جاہ و منصب کو حاصل کر کے باقاعدہ اُس کا استعمال کر رہے ہیں۔

عہدے کا غلط استعمال

ہمارے ہاں جو انتخابات ہوتے ہیں اُس میں ہر اُمیدوار یہ کہتا ہے کہ ''ہمچوں ما دیگرے نیست'' خود اپنے فضائل بیان کرنا اور دوسرے پر تنقید کرنا انتخابات کا لازمی حصہ ہے۔ اور ویسے بھی لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کیے بغیر کوئی انتخابات نہیں لڑ سکتا۔ لاکھوں کروڑوں خرچ کر کے اسمبلی کا ممبر بن گیا، یا وزارت کے عہدے پر فائز ہو گیا تو کیا اپنی خرچ کی ہوئی ساری رقم اللہ کے راستے میں لٹا دی؟ بلکہ یہ تو پوری سرمایہ کاری ہے کہ جب تک صرف کی ہوئی رقم کا دوگنا یا چوگنا وصول نہ کرے اُس وقت تک اُس کا عہدہ بیکار ہے۔ یہ سب جاہ کا حصول اس لئے ہو رہا ہے تا کہ جو ایک کروڑ روپے خرچ کیے تھے اُس کا دس کروڑ بنائے۔ اور اگر دس کروڑ نہ بنائے تو گویا ممبری لے کر حماقت کا ارتکاب کیا۔ آپ دیکھ لیں اس کا فساد معاشرے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو حضور ﷺ ان الفاظ کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں کہ جاہ کی محبت انسان کے دین میں اتنا فساد مچاتی ہے کہ جو بھوکا بھیڑیا بھی بکریوں کے گلے میں نہیں مچاتا۔

تعریف پسندی کا وبال

حب جاہ کا دوسرا حصہ تعریف پسندی ہے۔ اس بات کا شوق کہ لوگ میری تعریف کریں یہ شوق ایک زبردست بیماری ہے جو حب جاہ کی بنیاد ہے خواہ کوئی کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو لیکن اُسے اپنی تعریف سننے کا شوق ہوتا ہے جس کی وجہ سے اچھے خاصے نیکی کے کام برباد ہو جاتے ہیں۔

مثلاً ایک کا مسلمان بھائی کو ہدیہ یا تحفہ دینا بہت ثواب کا کام ہے اور حضور ﷺ نے اس کے بہت فضائل بیان فرمائے ہیں، لیکن وہی تحفہ اگر اس لئے دیا جائے کہ اس کے ذریعے میری تعریف اور نام مشہور ہو جائے تو وہ سارا اجر وثواب اکارت ہو جاتا ہے بلکہ اُلٹا گناہ لکھا جاتا ہے۔

تحفے کے بارے میں ایک غلط رواج

ہمارے معاشرے میں ایک عام سی بات ہے کہ رشتے داروں کے ہاں تحفہ لے جانے کا اتنا رواج نہیں۔ کوئی اگر تحفہ دینا بھی چاہے تو اُس کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ اس وقت چھوڑو، فلاں تقریب آنے والی ہے اُس موقع پر دو گے تو تمہارے تحفے کا نام بھی ہو گا اور تعریف بھی ہو گی کہ فلاں شخص نے یہ تحفہ دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ دیا جا رہا ہے وہ صرف نام ونمود اور دکھاوا ہے۔ جبکہ عام حالات میں اگر سادگی سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور ایک مسلمان کو خوش کرنے کے لئے تحفہ دیا جائے تو اُس کا بہت بڑا اجر ہے۔ لیکن اگر تعریف کروانا مقصود ہو تو اس کا کچھ فائدہ نہیں۔

تعریف پسندی کی کوئی حقیقت نہیں

میرے مرشد حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ ایک بات بڑے کام کی فرمایا کرتے تھے کہ تعریف پسندی ایسی بے حقیقت چیز ہے کہ اس کا مدار دوسرے پر ہے کہ دوسرا تعریف کرے، پھر دوسرا اپنے اختیار میں کب ہے؟ تعریف کرے یا نہ کرے! اگر کبھی دی تو کب تک کرے گا؟ مثلاً آپ نے کسی کو تحفہ دیا، اُس نے کہا: آپ بہت سخی ہیں۔ دو تین مرتبہ کہہ کر وہ رک گیا۔ آپ نے اُس سے پھر کہا کہ آپ کی تعریف مجھے بہت اچھی لگی ذرا ایک مرتبہ پھر فرما دیجئے۔ اُس نے پھر تعریف کر دی۔ اب اس سے سارا ثواب ضائع ہو جائے گا۔ اور اگر یہ سب کچھ صرف اللہ کے لئے ہوتا تو اس کا اجر ضرور آخرت میں ملتا۔ میرے مرشد ایک شعر پڑھا کرتے تھے جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اگر اُس پر عمل کر لیا جائے تو حب جاہ کی بیماری دور ہو جائے۔

ختم ہو جاتی ہے حب جاہ دنیا جس کے پاس
اک ذرا سی بات ہے اے دل پھر کیا اُس کے پاس

ذرا تصور کریں جس نے کئی مرتبہ تعریف کر دی پھر اُس کے پاس کیا رہا؟ اس بات پر اگر غور کیا جائے تو حب جاہ و دنیا ختم ہو جائے۔ اگر کوئی تعریف کے بجائے صرف رضائے الٰہی کی خاطر کوئی کام کرے تو اُس کا اجر ابدی اور سرمدی ہے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جب انسان کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہو، تعریف وتوصیف نہ ہو تو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اُس کی تعریف کرواتے ہیں۔ آپ ذرا

غور کریں کیا آپ کو زندگی میں کوئی ایسا شخص ملا جس کی کسی نے بھی برائی نہ کی ہو؟ کوئی نہ کوئی برائی ضرور کرتا ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبروں کی بھی برائی کی گئی، لیکن جب تک تعریف اور برائی سے بے پرواہ ہو کر اللہ جل شانہ کی تعریف نہیں کرے گا اُس وقت تک حب جاہ ہے۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ تعریف بھی ایسے کی معتبر ہونی چاہئے جس کی تعریف کوئی وقعت رکھتی ہو، مثلاً آپ نے کوئی بڑا شاندار کارنامہ انجام دیا لیکن آپ کی تعریف کوئی جمعدار کر رہا ہے تو آپ کو اُس کی تعریف کی کیا خوشی ہوگی؟ خوشی تو اُس کی تعریف کی ہوگی جو اُس کو بہتر طریقہ پر جانتا ہے۔

ایک حجام کا واقعہ

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک حجام کو بادشاہ نے حجامت بنوانے کے لئے بلوایا۔ جب حجام پہنچا اُس وقت بادشاہ کی آنکھ لگ گئی۔ حجام نے اتنی مہارت سے حجامت بنائی کہ بادشاہ سوتا رہا اُس کو معلوم بھی نہ ہو سکا۔ بیدار ہونے کے بعد دیکھا کہ بڑی شاندار حجامت بنی ہوئی ہے۔ اُس نے کہا: یہ کس طرح بن گئی؟ کسی نے کہا کہ حجام آیا تھا، اُس نے سوتے ہوئے حجامت بنا دی۔ بادشاہ نے کہا کہ بڑا کاریگر حجام تھا جو اتنی نفاست سے کام کیا کہ مجھ کو خبر تک نہ ہو سکی۔ لہٰذا اُس کو بلوایا جائے۔ جب وہ حجام آیا تو بادشاہ نے کہا کہ ہم تمہاری اس مہارت کی وجہ سے تمہیں ''رئیس الحلاقین'' یعنی حجاموں کے سردار کا خطاب دیتے ہیں۔ جب حجام کو یہ خطاب ملا تو حجام نے کوئی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ ہم نے تمہیں اتنا بڑا خطاب دیا اور تم نے کسی بھی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا؟ حجام نے جواب دیا کہ بادشاہ سلامت آپ کا کرم ہے کہ آپ نے مجھے یہ خطاب دیا۔ لیکن اگر سب حجام مل کر مجھے یہ خطاب دیتے تو مجھے خوشی ہوتی کیونکہ وہ میرے ہم پیشہ اور میرے ہنر کو جاننے والے تھے اور آپ کو اس فن کی نزاکتوں سے واقفیت نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غیر ماہر خطاب دے تو کوئی خاص خوشی کی بات نہیں ہے۔ بلکہ خوشی تو اس وقت ہوتی جب میرے فن کے آدمی مجھے یہ خطاب دیتے۔ میرے والد صاحب قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ اس حجام نے بڑی حکیمانہ بات کہی کیونکہ جتنی بھی مخلوق ہے یہ اعمالِ صالحہ کی قدر جاننے والی نہیں ہے۔ اُن کی قدر اگر کوئی جاننے والا ہے تو وہ ایک ہی اللہ کی ذات ہے۔ اگر وہ تعریف کرے اور خوش ہو جائے تو پھر خوشی کی بات ہے ورنہ مخلوق کی تعریف کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

ہندی زبان کی ایک کہاوت

ہندی زبان کی ایک کہاوت ہے ''سہاگن وہ جسے پیا چاہے'' اس کا قصہ اس طرح ہے کہ ایک

عورت کو دلہن بنایا جارہا تھا۔ دلہن بناتے وقت جو عورت بھی اُس سے ملتی تو کہتی کہ تو آج بہت خوبصورت لگ رہی ہے، تیرے بال بڑے خوبصورت لگ رہے ہیں، تیرا چہرہ بہت حسین لگ رہا ہے، غرض ہر عورت اُس کی تعریف کر رہی تھی۔ اور وہ ہر عورت کو ایک ہی جواب دے رہی تھی کہ مجھے تمہاری تعریف کرنے سے خوشی نہیں ہوگی مجھے تو فکر اس کی ہے کہ جہاں جارہی ہوں اگر وہ تعریف کرے تو میرے لئے خوشی کی بات ہے۔ کیونکہ تم تو تعریف کر کے واپس چلی جاؤ گی لیکن میرا جس سے ہمیشہ کے لئے واسطہ پڑنے والا ہے وہ میری تعریف کرے تو بات ہے۔ یہ نماز، روزے، صدقات وغیرہ جو ادا کیے جارہے ہیں مخلوق خواہ کتنی ہی اس پر تعریف کرے وہ تعریف بے حقیقت ہے جب تک اللہ جل شانہ نہ فرمادیں کہ میرے بندے میں تجھ سے راضی ہوگیا۔

ہر کام اللہ کی خاطر کریں

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ کوئی بھی کام لوگوں کی تعریف حاصل کرنے کی خاطر نہ کرو بلکہ ہر کام اللہ تعالیٰ کی خاطر کرو جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں سے تمام شکوے اور شکایات ختم ہوجائیں گے۔ کیونکہ آج کل یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم نے فلاں کو اتنے پیسے دیئے تھے لیکن اُس کے منہ سے تعریف کا ایک لفظ نہیں سنا، ہم نے فلاں کے ساتھ اتنی ہمدردی کی تھی لیکن اُس اللہ کے بندے نے شکریہ کا لفظ تک نہ بولا جس سے دلوں میں شکوے اور شکایات پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے پیدا ہورہا ہے کہ ہمدردی کرتے وقت اس بات کی طرف دھیان تھا کہ اگر میں اس کے ساتھ بھلائی کروں گا تو یہ میری تعریف کرے گا اور میرا شکریہ ادا کرے گا، اور اگر اس طرف دھیان نہ ہوتا بلکہ دل میں یہ ہوتا کہ میں تو اللہ کے لئے دے رہا ہوں خواہ یہ شکریہ ادا کرے یا نہ کرے تو پھر دل میں کسی قسم کی کوئی شکایت پیدا نہ ہوتی۔ اگرچہ اُس کا فرض تھا کہ وہ شکریہ ادا کرتا کیونکہ حدیث کے مطابق جو انسان کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔ لیکن اس کے باوجود اگر کام صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے کیا جاتا تو دل میں اس قسم کی کوئی بات پیدا نہ ہوتی۔ لہٰذا اس مخلوق کی بے حقیقت رضامندی کو چھوڑ کر خالقِ حقیقی کی رضا کی فکر کرنی چاہئے۔

حبِ جاہ کا علاج

حب جاہ کا علاج حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی کوئی ایسا کام کرو جس کے بارے میں یہ خیال ہو کہ اس کی وجہ سے لوگ میری تعریف کریں گے تو ایک مرتبہ دل میں یہ سوچ لو کہ یا اللہ میرا یہ کام آنے والا ہے جس کے بارے میں لوگ میری تعریف کریں گے، اس

تعریف کے ذریعے میرا نفس خراب نہ کیجئے گا۔ کیونکہ یہ تعریف حقیقت میں آپ کی تعریف ہے۔آپ نے توفیق عطا فرمائی ہے، اس لئے میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ لوگوں نے تعریف کی۔ آپ نے اُن کے دلوں سے میرے عیوب چھپا دیئے، اور اچھائی ظاہر کردی۔ اگر آپ یہ نہ کرتے اور میری اندرونی حقیقت سامنے آجاتی تو لوگ نفرت کرتے اور میرے پاس بیٹھنے کو تیار نہ ہوتے۔ اے اللہ یہ تیری ستاری ہے کہ تو نے میرے عیوب پر پردہ ڈال کر میرے ایک عمل کو اس طرح ظاہر کردیا کہ جس کی وجہ سے لوگ میری تعریف کر رہے ہیں۔ یا اللہ آپ اس تعریف سے میرے نفس کو خراب نہ کیجئے۔ بس اللہ تعالیٰ سے ہر ایسے موقع پر یہ دعا کرلو۔ پھر دیکھو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ ضرور محفوظ رکھیں گے۔

جب کوئی اچھا کام ہو جائے

جب کوئی اچھا کام ہو جائے تو فوراً اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ یہ کام تو نے کرا دیا ورنہ یہ میرے بس میں نہیں تھا۔ یہ صرف آپ کا کرم ہے۔ یہ صرف آپ کا کرم ہے۔ اب اس کے ذریعے میرے دل کو خراب نہ کیجئے گا۔ باقی اپنی نیتوں کو درست کرنے کی فکر ہو یعنی اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کی فکر ہونی چاہئے۔ مخلوق کی رضامندی کی فکر نہ ہو۔ اس لئے کہ مخلوق کی رضامندی بے حقیقت ہے۔ لہٰذا جب بھی مخلوق کی رضامندی کا خیال آئے تو فوراً اس بات کا تصور کریں کہ مخلوق تو ساری فنا ہونے والی ہے لہٰذا اس کی رضامندی کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور اپنی نگاہ اللہ کی طرف لے جائیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

یہ کہاں کا فسانۂ سود و زیاں
جو گیا سو گیا جو ملا سو ملا
کہو دل سے جو فرصتِ عمر ہے کم
جو دلا تو خدا ہی کی یاد دلا

کوئی کچھ بھی کہے اس کی فکر نہ کریں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی رضا کی فکر کریں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنی رحمت سے یہ حقیقت ہمارے دلوں میں بٹھا دیں اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

سستی کا علاج، چستی ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۖ وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾(۱)

میں پچھلے دنوں رنگون اور برما کے بعض دوسرے شہروں کے سفر پر تھا۔ مسلسل دس بارہ روز سفر میں گزرے۔ متواتر بیانات کا سلسلہ رہا، ایک ایک دن میں بعض اوقات چار چار، پانچ پانچ بیانات ہوئے، اس لئے آواز بیٹھی ہوئی ہے، اور طبیعت میں تکان بھی ہے، اور اتفاق سے کل دوبارہ حرمین شریفین کا سفر درپیش ہے، اس لئے آج طبیعت سستی کر رہی تھی، اور یہ خیال ہو رہا تھا کہ جب پچھلے جمعہ ناغہ ہو گیا تھا تو ایک جمعہ اور سہی، لیکن اپنے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ کی ایک بات یاد آگئی۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا:

> ''جب کسی معمول کے پورا کرنے میں سستی ہو رہی ہو، تو وہی موقع انسان کے امتحان کا ہے، اب ایک صورت تو یہ ہے کہ اس سستی کے آگے ہتھیار ڈال دے، اور نفس کی بات مان لے۔ تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج ایک معمول میں ہتھیار ڈالے، کل کو نفس دوسرے معمول میں ہتھیار ڈلوائے گا، اور پھر آہستہ آہستہ طبیعت اس سستی کے تابع اور اس کی عادی ہو جائے گی۔
>
> اور دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اس سستی کا ہمت سے مقابلہ کر کے اس معمول کو کر گزرے، محنت اور مشقت کر کے زبردستی اس کام کو کرے، تو پھر اس محنت اور مشقت اور مقابلہ کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ آئندہ بھی معمولات کے پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں گے''

حاصل تصوف ''دو باتیں''

اور ایسے موقع پر ہمارے حضرت والا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ سنایا کرتے تھے۔ حقیقت میں یہ ملفوظ یاد رکھنے، بلکہ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے، حضرت تھانوی فرمایا کرتے تھے:

☆ اصلاحی خطبات (۱۰۴/۵ تا ۱۱۵)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔ (۱) العنکبوت: ٦٩

''وہ ذراسی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جس وقت کسی طاعت کی ادائیگی میں سستی ہو، تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کرے، اور جس وقت کسی گناہ کا داعیہ (تقاضا) پیدا ہو، تو اس داعیے (تقاضے) کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے۔ جب یہ بات حاصل ہو جائے تو پھر کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ اسی سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے مضبوط ہوتا ہے، اور اسی سے ترقی کرتا ہے''

بہر حال، سستی دور کرنے کا صرف ایک ہی رستہ ہے، یعنی اس سستی کا ہمت سے مقابلہ کرنا۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شیخ کوئی نسخہ گھول کر پلا دے گا تو ساری سستی دور ہو جائے گی، اور سب کام ٹھیک ہوتے چلے جائیں گے یاد رکھو کہ سستی کا مقابلہ ہمت سے ہی ہوگا، اس کا اور کوئی علاج نہیں۔

نفس کو بہلا پھسلا کر اس سے کام لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ نفس کو ذرا بہلا پھسلا کر اس سے کام لیا کرو پھر اپنا ایک واقعہ سنایا کہ ایک دن جب تہجد کے وقت آنکھ کھلی تو طبیعت میں بڑی سستی اور کسل تھا۔ دل میں خیال آیا کہ آج تو طبیعت بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہے، کسل بھی ہے، اور عمر بھی تمہاری زیادہ ہے اور تہجد کی نماز کوئی فرض وواجب بھی نہیں ہے، پڑے سوتے رہو۔ اگر آج تہجد کی نماز نہیں پڑھی تو کیا ہو جائے گا؟

حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ بات تو ٹھیک ہے کہ تہجد کی نماز فرض وواجب بھی نہیں ہے، اور دوسری طرف طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے لیکن یہ وقت تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کا وقت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب رات کا ایک تہائی حصہ گزر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتیں اہل زمین پر متوجہ ہوتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منادی پکارتا رہتا ہے کہ ہے کوئی مغفرت مانگنے والا کہ اس کی مغفرت کی جائے [1] لہٰذا ایسے مبارک وقت کو بیکار گزارنا بھی ٹھیک نہیں۔ پھر اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہا کہ اچھا ایسا کرو کہ نماز مت پڑھو، لیکن اُٹھ کر بستر پر ہی بیٹھ جاؤ، اور تھوڑی سی دعا کرو۔ دعا کر کے پھر دوبارہ سو جانا چنانچہ میں فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور دعا کرنی شروع کر دی۔ اب دعا کرتے کرتے پھر نفس سے کہا کہ میاں! جب تم اُٹھ کر بیٹھ گئے تو تمہاری نیند تو چلی گئی، اب ایسا کرو کہ غسل خانے تک چلے جاؤ، اور استنجاء وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ۔ پھر آرام سے آکر لیٹ جانا۔ چنانچہ میں غسل خانے میں پہنچ گیا، اور استنجاء وغیرہ سے فارغ ہو گیا تو سوچا کہ چلو وضو بھی کرلو، اس لئے کہ وضو کر کے دعا کرنے میں قبولیت کی توقع زیادہ ہے۔ چنانچہ وضو کرلیا، اور واپس بستر پر آکر بیٹھ گیا، اور دعا شروع کر دی۔ پھر نفس سے کہا کہ یہ بستر پر

(۱) کنز العمال، رقم: ۲۱۳۹۸، المعجم الکبیر، رقم: ۱۸۳۶۲

بیٹھ کر کیا دعا ہو رہی ہے۔ دعا کرنے کی جو تمہاری جگہ ہے، جائے نماز، وہاں جا کر دعا کر لو۔ یہ کہہ کر نفس کو جائے نماز تک کھینچ کر لے گیا، اور جب جائے نماز پر پہنچا تو جلدی سے دو رکعت تہجد کی نیت باندھ لی۔

پھر فرمایا کہ اس طرح نفس کو تھوڑا سا بہلاوا دے دے کر بھی لانا پڑتا ہے، اور جس طرح یہ نفس تمہارے ساتھ نیک کام کو ٹلانے کا معاملہ کرتا ہے۔ اسی طرح تم بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا کرو، اور اس کو کھینچ کھینچ لے جایا کرو۔ انشاء اللہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ پھر اس عمل کی توفیق عطا فرمادیں گے

اگر صدرِ مملکت کی طرف سے بلاوا آجائے

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم نے اپنا یہ معمول بنا کر رکھا ہے کہ فلاں وقت میں تلاوت کروں گا، یا فلاں وقت میں نفل نماز پڑھوں گا، لیکن جب وہ وقت آیا تو طبیعت میں سستی ہو رہی ہے، اور اُٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے تو ایسے وقت میں اپنے نفس کی ذرا تربیت کیا کرو، اور اس نفس سے کہو کہ اچھا، اس وقت تو تمہیں سستی ہو رہی ہے، اور بستر سے اُٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اگر اس وقت صدر مملکت کی طرف سے یہ پیغام آجائے کہ ہم تمہیں بہت بڑا انعام، یا بہت بڑا منصب یا عہدہ دینا چاہتے ہیں اس لئے تم اس وقت فوراً ہمارے پاس آجاؤ بتاؤ، کیا اس وقت بھی سستی رہے گی؟ اور کیا تم پیغام لانے والے کو یہ جواب دو گے کہ میں اس وقت نہیں آسکتا، کیونکہ اس وقت تو مجھے نیند آرہی ہے کوئی بھی انسان جس میں ذرا بھی عقل و ہوش ہے، صدر مملکت کا یہ پیغام سن کر اس کی ساری سستی، کاہلی اور نیند دور ہو جائے گی۔ اور خوشی کے مارے فوراً انعام حاصل کرنے کے لئے بھاگ کھڑا ہو گا

لہٰذا اگر اس وقت یہ نفس اس انعام کے حصول کے لئے بھاگ پڑے گا تو اس سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں اُٹھنے سے کوئی عذر نہیں تھا۔ اگر حقیقت میں اُٹھنے سے کوئی عذر ہوتا تو صدر مملکت کا پیغام سن کر نہ اُٹھتے، بلکہ بستر پر پڑے رہتے اس کے بعد یہ سوچو کہ دنیا کا ایک سربراہِ مملکت جو بالکل عاجز، انتہائی عاجز، انتہائی عاجز ہے، وہ اگر تمہیں ایک انعام یا منصب دینے کے لئے بلا رہا ہے تو تم اس کے لئے اتنا بھاگ سکتے ہو، لیکن وہ احکم الحاکمین، جس کے قبضہ وقدرت میں پوری کائنات ہے۔ دینے والا وہی ہے۔ چھیننے والا وہی ہے۔ اس کی طرف سے بلاوا آرہا ہے تو اس کے دربار میں حاضر ہونے میں سستی کر رہے ہو؟ ان باتوں کا تصور کرنے سے انشاء اللہ اس کام کی ہمت ہو جائے گی، اور سستی دور ہو جائے گی۔

آج کا کام کل پر مت ٹالو

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک نیک عمل کا دل میں خیال پیدا ہوا، کہ یہ نیک کام کرنا چاہئے۔

لیکن پھر انسان کا نفس اس کو یہ بہکاتا ہے کہ یہ کام تو اچھا ہے، البتہ کل سے یہ کام شروع کریں گے یاد رکھو، یہ نفس کا کید ہے۔ اس لئے کہ وہ کل پھر نہیں آتی۔ جو کام کرنا ہے وہ آج، بلکہ ابھی شروع کردو، کیا پتہ کہ کل آئے یا نہ آئے۔ کیا معلوم کل کو موقع ملے یا نہ ملے۔ کیا پتہ کل کو یہ داعیہ موجود رہے یا نہ رہے۔ کیا پتہ کل کو حالات سازگار رہیں یا نہ رہیں۔ اور کیا پتہ کل کو زندگی رہے یا نہ رہے۔ اس لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَسَارِعُوٓا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ﴾(۱)

''یعنی اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف جلدی دوڑو، دیر نہ کرو، اور اس جنت کی طرف دوڑو، جس کی چوڑائی سارے آسمان اور زمین کے برابر ہے''

بہر حال، یہ عرض کر رہا تھا کہ آج مجھے سستی ہو رہی تھی، مگر اپنے حضرت والا کی یہ باتیں یاد آگئیں، جس کی وجہ سے آنے کی ہمت ہوگئی، اور چلا آیا

اپنے فائدے کے لئے حاضر ہوتا ہوں

دوسرے یہ کہ یہاں درحقیقت میں اپنے فائدے کے لئے حاضر ہوتا ہوں، اور میں تو یہ سوچتا ہوں کہ اللہ کے نیک بندے نیک طلب لے کر دین کی باتیں سننے کے لئے یہاں جمع ہوتے ہیں، مجھے بھی ان کی برکتیں حاصل ہو جاتی ہیں بات یہ ہے کہ جب اللہ کے بندے دین کی خاطر کسی جگہ ہوتے ہیں، تو آپس میں ایک دوسرے پر برکتوں کا انعکاس ہوتا ہے، اس لئے میں تو ہمیشہ اس نیت سے آتا ہوں کہ نیک لوگوں کی برکتیں حاصل کروں۔

وہ لمحاتِ زندگی کس کام کے؟

تیسرے یہ کہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کی ایک بات اور یاد آگئی، یہ بات بھی میں نے حضرت والا ہی سے سنی۔ فرمایا کہ جب حضرت والا مرض الوفات میں بیمار اور صاحبِ فراش تھے۔ اور ڈاکٹروں نے آپ کو ملاقات اور بات چیت سے منع کر رکھا تھا۔ ایک دن آپ بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ لیٹے لیٹے اچانک آنکھ کھولی۔ اور فرمایا کہ مولوی محمد شفیع صاحب کہاں ہیں۔ ان کو بلاؤ ''مولوی محمد شفیع صاحب'' سے مراد میرے والد ماجد ہیں۔ حضرت والا نے میرے والد صاحب کو ''احکام القرآن'' عربی زبان میں تالیف کرنے پر لگا رکھا تھا چنانچہ جب والد صاحب تشریف لائے تو ان سے فرمایا کہ آپ احکام القرآن لکھ رہے ہیں۔ مجھے ابھی خیال آیا کہ قرآن کریم کی فلاں آیت سے

(۱) آل عمران: ۱۳۳

فلاں مسئلہ نکلتا ہے۔ یہ مسئلہ میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا۔ جب آپ اس آیت پر پہنچیں تو اس مسئلہ کو بھی لکھ لیجئے گا یہ کہہ کر پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے اب دیکھئے کہ مرض الوفات میں لیٹے ہیں۔ مگر دل و دماغ میں قرآن کریم کی آیات اور ان کی تفسیر گھوم رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آنکھ کھولی، اور فرمایا کہ فلاں صاحب کو بلاؤ۔ جب وہ صاحب آ گئے تو ان سے متعلق کچھ کام بتا دیا۔ جب بار بار آپ نے ایسا کیا تو مولانا شبیر علی صاحب نے، جو حضرت کی خانقاہ کے ناظم تھے اور حضرت والا سے بے تکلف بھی تھے فرمایا کہ حضرت! ڈاکٹروں اور حکیموں نے تو بات چیت سے منع کر رکھا ہے، مگر آپ بار بار لوگوں کو بلا کر ان سے بات کرتے ہیں، خدا کے لئے آپ ہماری جان پر تو رحم کریں۔ ان کے جواب میں حضرت والا نے فرمایا:

> ''بات تو تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن میں یہ سوچتا ہوں کہ وہ لمحات زندگی کس کام کے جو کسی کی خدمت میں صرف نہ ہوں؟ اگر کسی خدمت کے اندر یہ عمر گزر جائے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے''

دنیا کے مناصب اور عہدے

یہ ''خادمیت'' یہ بڑی عجیب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمارے دلوں میں پیدا فرما دے۔ ہر ایک کے خادم بنو، اپنے اندر خدمت کا جذبہ پیدا کرو حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کے تمام عہدوں کا حال یہ ہے کہ اگر انسان ان کو حاصل کرنا چاہے، تو اس کو حاصل کرنا اختیار میں نہیں ہوتا۔ مثلاً دل چاہ رہا ہے کہ میں ''صدر مملکت'' بن جاؤں، لیکن صدر مملکت بننا اپنے اختیار میں نہیں۔ یا دل چاہ رہا ہے کہ ''وزیر اعظم'' بن جاؤں، لیکن وزیر اعظم بننا اختیار میں نہیں۔ یا دل چاہ رہا ہے کہ اسمبلی کا صرف ممبر بن جاؤں۔ وہ بھی اختیار میں نہیں۔ یا کہیں افسر بننا چاہتا ہے۔ ملازمت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو اب اس کے لئے درخواست دو، انٹرویو دو، کتنے پاپڑ بیلو۔ اور تمام کوششیں کرنے کے بعد جب وہ منصب حاصل ہو گیا تو اب لوگ حسد کرنے لگے کہ یہ ہم سے آگے بڑھ گیا، اور ہم پیچھے رہ گئے۔ اب اس کے خلاف سازشیں ہونے لگیں کہ کسی طرح یہ منصب اور یہ عہدہ اس سے چھین لیا جائے چنانچہ اچھا خاصا وزیر اعظم بنا ہوا تھا۔ اب ختم ہو گیا۔ عہدہ چھن گیا۔ صدر بنا ہوا تھا۔ ختم ہو گیا۔ تو دنیا کے سارے عہدوں اور منصبوں کا یہی حال ہے کہ نہ تو ان کا حصول اپنے اختیار میں ہے، اور اگر حاصل ہو جائے تو اس پر برقرار رہنا اپنے اختیار میں نہیں۔ پھر لوگ اس پر حسد بھی کرتے ہیں فرمایا کرتے تھے کہ میں تمہیں ایک ایسا منفرد منصب بتاتا ہوں، جس کا حاصل کرنا بھی اپنے اختیار میں ہے، اور اگر تم وہ منصب حاصل کر لو تو کوئی شخص تمہارے اوپر حسد بھی نہیں کرے گا، اور نہ کوئی تم سے

لڑے گا، اور نہ کوئی تمہیں اس سے معزول کرسکتا ہے، وہ ہے ''خادم'' کا منصب۔ تم خادم بن جاؤ۔ یہ منصب اپنے اختیار میں ہے۔ اس کے لئے درخواست دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ نہ ووٹ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ نہ الیکشن کی ضرورت ہے۔ اگر یہ منصب حاصل ہوجائے تو اس پر دوسروں کو حسد بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ یہ تو کام ہی خدمت کا کر رہا ہے تو اب دوسرا شخص اس پر کیا حسد کرے گا۔ اور نہ کوئی شخص تمہیں اس منصب سے معزول کرسکتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ خادم بن جاؤ کس کے خادم بن جاؤ؟ اپنے گھر والوں کے خادم بن جاؤ۔ گھر کا جو کام کرو، خدمت کی نیت سے کرو۔ اپنی بیوی کا خادم، اپنے بچوں کا خادم، اپنے دوستوں کا خادم، اور جو کوئی ملنے والے آئیں، ان کی بھی خدمت کرو، اور اللہ کی مخلوق کی، اللہ کے نیک بندوں کی خدمت کرو، جو کام بھی کرو، خدمت کی نیت سے کرو، اگر وعظ کہہ رہے ہو، وہ بھی خدمت کے لئے۔ تصنیف کر رہے ہو، وہ بھی خدمت کے لئے۔ اس خادمیت کے منصب کو حاصل کرو، اس لئے کہ سارے جھگڑے مخدوم بننے میں ہیں۔ اس لئے حضرت والا خود اپنے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں تو اپنے آپ کو خادم سمجھتا ہوں۔ اپنی بیوی کا بھی خادم، اپنے بچوں کا بھی خادم، اپنے مریدوں کا خادم، اپنے اہل تعلقات کا خادم۔ اور یہ وہ منصب ہے کہ جس میں شیطانی وساوس بھی کم ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ عجب، تکبر، بڑائی وغیرہ ان عہدوں میں پیدا ہوتی ہے جو دنیاوی اعتبار سے بڑے سمجھے جاتے ہیں۔ اب خادم کے عہدے میں کیا بڑائی ہے اس لئے شیطانی وساوس بھی نہیں آتے، اس واسطے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

بزرگوں کی خدمت میں حاضری کا فائدہ

بہرحال، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج طبیعت میں سستی ہو رہی تھی۔ لیکن ہمارے حضرت والا کی یہ باتیں یاد آگئیں، اور ہمت ہوگئی، اور اللہ والوں سے تعلق قائم کرنے کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ باتیں حضرت والا نے کب کہی ہوں گی۔ ہماری طرف سے نہ تو طلب تھی۔ نہ خواہش تھی۔ نہ کوئی کوشش تھی۔ مگر حضرت والا نے زبردستی کچھ باتیں کان میں ڈال دیں، اور اب وہ باتیں الحمدللہ وقت پر یاد آجاتی ہیں، اور کام بنا دیتی ہیں۔

وہ بات تمہاری ہوگئی، وقت پر یاد آجائے گی

حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ مجلس میں جو باتیں ہوتی ہیں، بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان باتوں کو یاد کرلیں۔ مگر یہ باتیں یاد نہیں ہوتیں۔ اس پر اپنا واقعہ سنایا کہ میں بھی حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کی مجلس میں جب حاضر ہوتا تو یہ دل چاہتا کہ حضرت والا کی باتیں لکھ لیا کروں، بعض لوگ لکھ لیا کرتے

تھے۔ مجھ سے تیز لکھا نہیں جاتا تھا، اس لئے میں لکھنے سے رہ جاتا تھا میں نے ایک دن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! میرا دل چاہتا ہے کہ ملفوظات لکھ لیا کروں۔ مگر لکھا جاتا نہیں، اور یاد رہتے نہیں ہیں۔ بھول جاتا ہوں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ لکھنے کی کیا ضرورت ہے، خود صاحبِ ملفوظ کیوں نہیں بن جاتے؟ حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں تو تھرا گیا کہ میں کہاں صاحبِ ملفوظ بن سکتا ہوں۔ پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ جو بات حق ہو، اور فہم سلیم پر مبنی ہو، صحیح فکر پر مبنی ہو، جب ایسی بات تمہارے کان میں پڑ گئی، اور تمہارے دل نے اسے قبول کرلیا، وہ بات تمہاری ہوگئی، اب چاہے وہ بات بعینہٖ انہی لفظوں میں یاد رہے یا نہ رہے، جب وقت آئے گا، انشاء اللہ اس وقت یاد آجائے گی، اور اس پر عمل کی توفیق ہوجائے گی۔

بزرگوں کی خدمت میں جانے اور ان کی باتیں سننے کا یہی فائدہ ہوتا ہے کہ وہ کان میں باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔ ڈالتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ باتیں انسان کی طبیعت میں داخل ہوجاتی ہیں۔ اور پھر وقت پر یاد آجاتی ہیں۔

زبردستی کان میں باتیں ڈال دیں

میں آج سوچتا ہوں کہ حضرت والد ماجد قدس اللہ سرہ، حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ، اور حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس اللہ سرہ، ان تینوں بزرگوں سے میرا تعلق رہا ہے۔ اپنا حال تو تباہ ہی تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی خدمت میں حاضری کی توفیق عطا فرمادی، یہ ان کا فضل و کرم تھا۔ اب ساری عمر بھی اس پر شکر ادا کروں تب بھی ادا نہیں ہوسکتا۔ یہ بزرگ کچھ باتیں زبردستی کانوں میں ڈال گئے، اپنی طرف سے جن کی نہ تو طلب تھی اور نہ خواہش، اور اگر میں ان باتوں کو اب نمبر وار لکھنا چاہوں جو ان بزرگوں کی مجلسوں میں سنی تھیں تو فوری طور پر سب کا یاد آنا مشکل ہے، لیکن کسی نہ کسی موقع پر وہ باتیں یاد آجاتی ہیں۔ اور بزرگوں سے تعلق کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ اور جس طرح بزرگوں کی خدمت میں حاضری نعمت ہے، اور ان کی بات سننا نعمت ہے، اسی طرح ان بزرگوں کے ملفوظات، حالات، سوانح پڑھنا بھی اس سے استفادہ ہوجاتا ہے۔ آج یہ حضرات موجود نہیں ہیں۔ مگر الحمدللہ سب باتیں لکھی ہوئی چھوڑ گئے ہیں۔ ان کو مطالعہ میں رکھنا چاہئے۔ یہ باتیں کام آجاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں ان بزرگوں کا دامن تھامے رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

’’عذر‘‘ اور ’’سستی‘‘ میں فرق

بہر حال، میں یہ عرض کررہا تھا کہ جب بھی سستی ہو، اس سستی کا مقابلہ کرنا چاہئے، اور معمول

کو پورا کرنا چاہئے۔ دیکھئے، ''عذر'' اور چیز ہے ''سستی'' اور چیز ہے۔ اگر عذر کی وجہ سے معمول چھوٹ جائے تو پھر کوئی غم نہیں۔ مثلاً بیماری کی وجہ سے معمول چھوٹ گیا، یا سفر کی وجہ سے معمول چھوٹ گیا، اس میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس پر مواخذہ نہیں کیا، بلکہ عذر کی وجہ سے رعایت دی ہے تو پھر ہم خود کون ہوتے ہیں پابندی کرانے والے؟ اس لئے کسی عذر کی وجہ سے اس کے چھوٹنے پر رنج نہیں کرنا چاہئے۔

یہ روزہ کس کے لئے رکھ رہے تھے؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ حضرت تھانوی ﷫ کی یہ بات نقل فرماتے تھے کہ ایک شخص رمضان میں بیمار ہوگیا، اور بیماری کی وجہ سے روزہ چھوٹ گیا۔ اب اس کو اس بات کا غم ہورہا ہے کہ رمضان کا روزہ چھوٹ گیا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ غم کرنے کی کوئی بات نہیں، اس لئے کہ یہ دیکھو کہ تم روزہ کس کے لئے رکھ رہے ہو؟ اگر تم اپنی ذات کے لئے اپنا جی خوش کرنے کے لئے، اور اپنا شوق پورا کرنے کے لئے روزہ رکھ رہے ہو، پھر تو بیشک اس پر غم اور صدمہ کرو کہ بیماری آگئی، اور روزہ چھوٹ گیا، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کے لئے روزہ رکھ رہے ہو تو پھر غم کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو خود فرمادیا ہے کہ بیماری میں روزہ چھوڑ دو۔

لہٰذا اگر شرعی عذر کی وجہ سے روزے قضا ہورہے ہیں، یا معمولات چھوٹ رہے ہیں، مثلاً بیماری ہے، سفر ہے، یا خواتین کی طبعی مجبوری ہے، یا کسی زیادہ اہم مصروفیت کی وجہ سے جو دین ہی کا تقاضا تھی، معمول چھوٹ گیا، مثلاً ماں باپ بیمار ہیں، ان کی خدمت میں لگا ہوا ہے، اور اس خدمت کی وجہ سے معمول چھوٹ گیا، تو اس سے بالکل رنجیدہ اور غمگین نہ ہونا چاہئے لیکن سستی کی وجہ سے معمول کو چھوڑنا نہیں چاہئے عذر کی وجہ سے چھوٹ جائے تو اس پر رنجیدہ نہ ہونا چاہئے۔

سستی کا علاج

اور سستی کا واحد علاج یہ ہے کہ اس کا مقابلہ کرو، اور اس کے آگے ڈٹ جاؤ، اور ہمت سے مقابلہ کرو، اس کا علاج سوائے استعمال ہمت کے اور کچھ نہیں ہے اگر ہماری زندگیوں میں صرف یہ بات بھی آجائے یعنی ''سستی کا مقابلہ کرنا'' تو سمجھ لو کہ آدھا کام ہوگیا، اور اس کے بعد بقیہ آدھے کام کے حصول کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے سستی کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

بدنگاہی، ایک مہلک بیماری ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ أَزْكٰى لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ۝﴾(۱)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہماری ایک بیماری کا بیان فرمایا ہے۔ وہ ہے ''بدنگاہی'' یہ بدنگاہی ایسی بیماری ہے جس میں بے حد ابتلاء ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ، علماء، اہل اللہ کی صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے والے، متدین، نماز، روزے کے پابند بھی اس بیماری کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور آج کل تو حالت یہ ہے کہ اگر آدمی گھر سے باہر نکلے تو آنکھوں کو بچانا مشکل نظر آتا ہے۔ ہر طرف ایسے مناظر ہیں کہ ان سے آنکھوں کو پناہ ملنی مشکل ہے۔

بدنگاہی کی حقیقت

''بدنگاہی'' کا حاصل یہ ہے کہ کسی غیر محرم پر نگاہ ڈالنا، بالخصوص شہوت کے ساتھ نگاہ ڈالی جائے، یا لذت حاصل کرنے کے لئے نگاہ ڈالی جائے، چاہے وہ غیر محرم حقیقی طور پر زندہ ہو، اور چاہے غیر محرم کی تصویر ہو۔ اس پر بھی نگاہ ڈالنا حرام ہے، اور ''بدنگاہی'' کے اندر داخل ہے۔

یہ بدنگاہی کا عمل اپنے نفس کی اصلاح کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اور یہ عمل انسان کے باطن کے لئے اتنا تباہ کن ہے کہ دوسرے گناہوں سے یہ بہت آگے بڑھا ہوا ہے، اور انسان کے باطن کو خراب کرنے میں اس کا بہت دخل ہے۔ جب تک اس عمل کی اصلاح نہ ہو، اور نگاہ قابو میں نہ آئے، اس وقت تک باطن کی اصلاح کا تصور تقریباً محال ہے۔ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

☆ اصلاحی خطبات (۵/۱۱۸ تا ۱۳۳)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی

(۱) النور: ۳۰

((اَلنَّظْرَۃُ سَھْمٌ مَسْمُوْمٌ مِنْ سِھَامِ اِبْلِیْسَ))(۱)

''نظر ابلیس کے تیروں میں سے ایک زہر آلود تیر ہے، یہ تیر جو ابلیس کے کمان سے نکل رہا ہے''

اگر کسی نے اس کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلیا، اور اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ باطن کی اصلاح میں اب بڑی رکاوٹ کھڑی ہوگئی، اس لئے کہ انسان کے باطن کو خراب کرنے میں جتنا دخل اس آنکھ کے غلط استعمال کا ہے، شاید کسی اور عمل کا نہ ہو۔

یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ سے سنا، فرماتے تھے کہ نگاہ کا غلط استعمال باطن کے لئے سمِ قاتل ہے۔ اگر باطن کی اصلاح منظور ہے تو سب سے پہلے اس نگاہ کی حفاظت کرنی ہوگی یہ کام بڑا مشکل نظر آتا ہے۔ ڈھونڈنے سے بھی آنکھوں کو پناہ نہیں ملتی۔ ہر طرف بے پردگی، بے حجابی، عریانی، اور فحاشی کا بازار گرم ہے۔ ایسے میں اپنی نگاہوں کو بچانا مشکل نظر آتا ہے لیکن اگر ایمان کی حلاوت حاصل کرنا منظور ہے اور اللہ جل جلالہ کے ساتھ تعلق اور محبت منظور ہے، اور اپنے باطن کی صفائی، تزکیہ، اور طہارت منظور ہے، تو پھر یہ کڑوا گھونٹ تو پینا ہی ہوگا، اور یہ کڑوا گھونٹ پیئے بغیر بات آگے نہیں بڑھ سکتی، لیکن یہ کڑوا گھونٹ ایسا ہے کہ شروع میں تو بہت کڑوا ہوتا ہے، مگر جب ذرا اس کی عادت ڈال لو تو پھر یہ گھونٹ ایسا میٹھا ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے بغیر چین بھی نہیں آتا۔

عربوں کا قہوہ

عرب کے لوگ قہوہ پیا کرتے ہیں۔ آپ حضرات نے بھی دیکھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے فنجانوں میں قہوہ پیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹا بچہ ہی تھا، اس وقت قطر کے ایک شیخ کراچی آئے ہوئے تھے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ میں بھی ان سے ملنے کے لئے چلا گیا۔ اس ملاقات کے دوران وہاں مجلس میں پہلی مرتبہ وہ قہوہ دیکھا۔ وہ قہوہ سب کو پینے کے لئے پیش کیا گیا۔ جب قہوہ کا لفظ سنا تو ذہن میں یہی خیال آیا کہ میٹھا ہوگا۔ لیکن جب اس کو زبان سے لگایا تو وہ اتنا کڑوا تھا کہ اس کو حلق سے اُتارنا مشکل ہوگیا۔ حالانکہ وہ ذرا سا قہوہ تھا، اور اس کا ذائقہ بھی تلخ تھا، اور اب وہاں مجلس میں بیٹھ کر کلی تو کر نہیں سکتے تھے، اس لئے چار و ناچار اس کو کسی طرح حلق سے اُتارا، لیکن

---

(۱) مجمع الزوائد (۶۳/۸)، کنز العمال، رقم: ۱۳۰۶۸ (۴۸۱/۵)، عدۃ الصابرین وذخیرۃ الشاکرین (۱۸/۱)

جب حلق سے اُتارا تو اب ذرا اس کا سرور محسوس ہوا۔ اس کے بعد پھر ایک اور مجلس میں پینے کا اتفاق ہوا۔ آہستہ آہستہ اب یہ حالت ہوگئی کہ اب اتنا پیارا اور اتنا مزیدار لگتا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں، اس لئے کہ اب پینے کی عادت ہوگئی ہے۔

پھر حلاوت اور لذت حاصل ہوگی

اسی طرح یہ بھی ایسا کڑوا گھونٹ ہے کہ شروع میں اس کو پینا بڑا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پینے کے بعد جب اس کا سرور طاری ہو جائے گا تو پھر دیکھو گے کہ اس کے پینے میں کیا لطف ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حلاوت ہم سب کو عطا فرمادے۔ بہر حال، یہ ایسی کڑوی چیز ہے کہ ایک مرتبہ اس کی کڑواہٹ کو برداشت کرلو، اور ایک مرتبہ دل پر پتھر رکھ کر اس کی کڑواہٹ کو نگل جاؤ تو پھر انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ ایسی حلاوت، ایسا سرور، ایسی لذت عطا فرمائیں گے کہ اس کے آگے اس بدنگاہی کی لذت ہیچ در ہیچ ہے۔ اس کے آگے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

آنکھیں بڑی نعمت ہیں

یہ آنکھ ایک مشین ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے کہ انسان اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ اور بے مانگے مل گئی ہے، اور مفت میں مل گئی ہے، اس کے لئے کوئی محنت اور پیسہ خرچ نہیں کرنا پڑا۔ اس لئے اس نعمت کی قدر نہیں ہے۔ ان لوگوں سے جاکر پوچھو جو اس نعمت سے محروم ہیں۔ نابینا ہیں۔ یا تو بینائی چلی گئی ہے۔ یا جن کے پاس یہ نعمت شروع ہی سے نہیں ہے۔ ان سے پوچھو کہ یہ آنکھ کیا چیز ہے؟ اور خدا نہ کرے، اگر بینائی میں کوئی خلل آنے لگے، اور بینائی جاتی ہوئی معلوم ہونے لگے تو اس وقت معلوم ہوگا کہ ساری کائنات اندھیر ہوگئی ہے، اور اس وقت انسان اپنی ساری دولت خرچ کر کے بھی یہ چاہے گا کہ مجھے یہ دولت دوبارہ حاصل ہو جائے۔ اور یہ ایسی مشین ہے کہ آج تک ایسی مشین کوئی ایجاد نہیں کر سکا۔

سات میل کا سفر ایک لمحے میں

میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی آنکھ میں جو یہ پتلی رکھی ہے، یہ اندھیرے میں پھیلتی ہے، اور روشنی میں سکڑ جاتی ہے۔ جب آدمی اندھیرے سے روشنی میں آتا ہے، یا روشنی سے اندھیرے میں آتا ہے تو اس وقت یہ سکڑنے اور پھیلنے کا عمل ہوتا ہے، اور اس سکڑنے اور پھیلنے میں آنکھ کے اعصاب سات میل کا فاصلہ طے کرتے ہیں، لیکن انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کیا

بات ہوئی، ایسی نعمت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمادی ہے۔

آنکھ کا صحیح استعمال

اب اگر اس نعمت کا صحیح استعمال کرو گے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تم کو اس پر ثواب بھی دوں گا۔ مثلاً اس آنکھ کے ذریعہ محبت کی نگاہ اپنے والدین پر ڈالو تو حدیث شریف میں ہے کہ ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب ملے گا، اللہ اکبر۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ شوہر گھر میں داخل ہوا، اور اس نے اپنی بیوی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور بیوی نے شوہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھا تو اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جب اس آنکھ کو صحیح جگہ پر استعمال کیا جارہا ہے تو صرف یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر لذت اور لطف عطا فرمارہے ہیں، بلکہ اس پر اجر وثواب بھی عطا فرمارہے ہیں لیکن اگر اس کا غلط استعمال کرو گے، اور غلط جگہ پر نگاہ ڈالو گے، اور غلط چیزیں دیکھو گے تو پھر اس کا وبال بھی بڑا سخت ہے۔ اور یہ عمل انسان کے باطن کو خراب کرنے والا ہے۔

بدنگاہی سے بچنے کا علاج

اب اس بدنگاہی سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے، وہ یہ ہے کہ ہمت سے کام لے کر یہ طے کرلو کہ یہ نگاہ غلط جگہ پر نہیں اُٹھے گی۔ اس کے بعد پھر چاہے دل پر آرے ہی کیوں نہ چل جائیں، لیکن اس نگاہ کو مت ڈالو۔

آرزوئیں خون ہوں، یا حسرتیں برباد ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے

بس ہمت اور ارادہ کرکے اس نگاہ کو بچائیں، تو پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسی مدد اور نصرت آتی ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آنکھ کو بدنگاہی سے بچانے کی کچھ تدبیریں بیان فرمائی ہیں، وہ یاد رکھنے کی ہیں، فرماتے ہیں:

> ''اگر کوئی عورت نظر آئے اور نفس یہ کہے کہ ایک دفعہ دیکھ لے۔ کیا حرج ہے؟ کیونکہ تو بدفعلی تو کرے گا نہیں۔ تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ نفس کا کید ہے۔ اور طریقہ نجات کا یہ ہے کہ عمل نہ کیا جائے''(۱)

اس لئے یہ شیطان کا دھوکہ ہے، وہ کہتا ہے کہ دیکھنے میں کیا حرج ہے؟ دیکھنا تو اس لئے منع ہے تاکہ انسان کسی بدفعلی کے اندر مبتلا نہ ہو، اور یہاں بدفعلی کا امکان ہی نہیں۔ اس لئے دیکھ لو، کوئی

(۱) انفاس عیسیٰ، حصہ اول، ص ۱۴۲

حرج نہیں۔حضرت والا فرماتے ہیں کہ یہ نفس کا مکر ہے، اور اس کا علاج یہ ہے کہ اس پر عمل نہ کیا جائے، اور چاہے جتنا بھی تقاضا ہو رہا ہو، نگاہ کو وہاں سے ہٹا لے۔

شہوانی خیالات کا علاج

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ یہ جو گناہ کے داعیے اور تقاضے پیدا ہوتے ہیں، ان کا علاج اس طرح کرو کہ جب دل میں یہ سخت تقاضا پیدا ہو کہ اس نگاہ کو غلط جگہ پر استعمال کروں، اور اس نگاہ کو غلط جگہ استعمال کر کے لذت حاصل کروں، تو اس وقت ذرا سا یہ تصور کرو کہ اگر میرے والد مجھے اس حالت میں دیکھ لیں۔کیا پھر بھی یہ حرکت جاری رکھوں گا؟ یا اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ میرے شیخ مجھے اس حالت میں دیکھ رہے ہیں، کیا پھر بھی یہ کام جاری رکھوں گا؟ یا مجھے پتہ ہو کہ میری اولاد میری اس حرکت کو دیکھ رہی ہے تو کیا پھر بھی یہ کام جاری رکھوں گا؟ ظاہر ہے کہ اگر ان میں سے کوئی بھی میری اس حرکت کو دیکھ رہا ہوگا تو میں اپنی نظر نیچی کرلوں گا۔اور یہ کام نہیں کروں گا۔ چاہے دل میں کتنا شدید تقاضا پیدا کیوں نہ ہو

پھر یہ تصور کرو کہ ان لوگوں کے دیکھنے نہ دیکھنے سے میری دنیا و آخرت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔لیکن میری اس حالت کو احکم الحاکمین دیکھ رہا ہے، اس کی پرواہ مجھے کیوں نہ ہو، اس لئے کہ وہ مجھے اس پر سزا بھی دے سکتا ہے۔اس خیال اور تصور کی برکت سے اُمید ہے کہ انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس گناہ سے محفوظ رکھیں گے۔

تمہاری زندگی کی فلم چلادی جائے تو؟

حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ کی ایک بات اور یاد آگئی فرماتے تھے کہ ذرا اس بات کا تصور کرو کہ اگر اللہ تعالیٰ آخرت میں تم سے یوں فرمائیں کہ اچھا اگر تمہیں جہنم سے ڈر لگ رہا ہے، تو چلو ہم تمہیں آگ سے اور جہنم سے بچالیں گے، لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے، وہ یہ کہ ہم ایک یہ کام کریں گے کہ تمہاری پوری زندگی جو بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک اور مرنے تک تم نے گزاری ہے، اس کی ہم فلم چلائیں گے اور اس فلم کے دیکھنے والوں میں تمہارا باپ ہوگا، تمہاری ماں ہوگی، تمہارے بہن بھائی ہوں گے، تمہاری اولاد ہوگی، تمہارے شاگرد ہوں گے، تمہارے استاذ ہوں گے، تمہارے دوست احباب ہوں گے، اور اس فلم کے اندر تمہاری پوری زندگی کا نقشہ سامنے کردیا جائے گا، اگر تمہیں یہ بات منظور ہو تو پھر تمہیں جہنم سے بچالیا جائے گا۔

اس کے بعد حضرت فرماتے تھے کہ ایسے موقع پر آدمی شاید آگ کے عذاب کو گوارا کرلے گا،

مگر اس بات کو گوارا نہیں کرے گا کہ ان تمام لوگوں کے سامنے میری زندگی کا نقشہ آجائے لہٰذا جب اپنے ماں، باپ، دوست احباب، عزیز واقارب اور مخلوق کے سامنے اپنی زندگی کے احوال کا آنا گوارا نہیں، تو پھر ان احوال کا اللہ تعالیٰ کے سامنے آنا کیسے گوارا کرلو گے؟ اس کو ذرا سوچ لیا کرو۔

دل کا مائل ہونا اور مچلنا گناہ نہیں

پھر آگے دوسرے ملفوظ میں ارشاد فرمایا:

''بدنگاہی میں ایک درجہ میلان کا ہے، جو کہ غیر اختیاری ہے، اور اس پر مواخذہ بھی نہیں اور ایک درجہ ہے اس کے مقتضاء پر عمل کرنے کا، یہ اختیاری ہے۔ اس پر مواخذہ ہے''(۱)

میلان کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے کا بہت دل چاہ رہا ہے، دل مچل رہا ہے، یہ دل کا چاہنا، مچلنا اور مائل ہونا، چونکہ یہ غیر اختیاری ہے، اس لئے اس پر مواخذہ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر انشاء اللہ کوئی گرفت نہیں ہوگی، کوئی گناہ نہیں ہوگا لیکن دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس دل کے چاہنے پر عمل کرلیا، اور اس کی طرف نگاہ اُٹھادی، یہ اختیاری ہے، اور اس پر مواخذہ بھی ہے یا نگاہ غیر اختیاری طور پر پڑگئی تھی، اب اس نگاہ کو اپنے اختیار سے باقی رکھا۔ اس پر بھی مواخذہ ہے، اور اس پر بھی گناہ ہے۔ تو میلان کا پہلا درجہ جو غیر اختیاری ہے، وہ معاف ہے، اس پر گرفت نہیں، اور دوسرا درجہ اختیاری ہے، اس پر مواخذہ بھی ہے۔

سوچ کر لذت لینا حرام ہے

آگے فرمایا:

''اور اس عمل میں قصداً دیکھنا اور سوچنا سب داخل ہے، اور اس کا علاج کفِ نفس اور غضِ بصر ہے''

کسی اجنبی اور نامحرم عورت کا تصور کر کے لذت لینا، یہ بھی اسی طرح حرام ہے، جیسے بدنگاہی حرام ہے، تو دیکھنا بھی اس میں داخل ہے، اور سوچنا بھی اس میں داخل ہے، اور اس کا علاج یہ بتلا دیا کہ نفس کو روکو، اور نگاہ کو نیچی رکھو، آگے پیچھے، ادھر ادھر، اور دائیں بائیں دیکھنے کے بجائے زمین کی طرف نگاہ رکھتے ہوئے چلے۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۱۴۲

راستے میں چلتے وقت نگاہ نیچی رکھو

حضرت والا قدس اللہ تعالیٰ سرہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو جنت سے نکالا تو جاتے جاتے وہ دعا مانگ گیا کہ یا اللہ، مجھے قیامت تک کی مہلت دے دیجئے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دے دی۔ اب اس نے اکڑ پھوں دکھائی، چنانچہ اس وقت اس نے کہا:

﴿لَاٰتِيَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَعَنۡ اَيۡمَانِهِمۡ وَعَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ﴾(۱)

''میں ان بندوں کے پاس ان کے دائیں طرف سے، بائیں طرف سے، آگے سے اور پیچھے سے جاؤں گا، اور چاروں طرف سے ان پر حملے کروں گا''

حضرت والا فرماتے ہیں کہ شیطان نے چار سمتیں تو بیان کر دیں، تو معلوم ہوا کہ شیطان انہی چار سمتوں سے حملہ آور ہوتا ہے، کبھی آگے سے ہوگا، کبھی پیچھے سے ہوگا، کبھی دائیں سے ہوگا، کبھی بائیں سے ہوگا، لیکن دو سمتیں وہ چھوڑ گیا، ان کو نہیں بیان کیا۔ ایک اُوپر کی سمت، اور ایک نیچے کی سمت۔ اس لئے اُوپر کی سمت بھی محفوظ، اور نیچے کی سمت محفوظ ہے، اب اگر نگاہ اُوپر کر کے چلو گے تو ٹھوکر کھا کر گر جاؤ گے، اس لئے اب ایک ہی راستہ رہ گیا کہ نیچے کی طرف نگاہ کر کے چلو گے تو انشاء اللہ شیطان کے چار طرفی حملے سے محفوظ رہو گے اس لئے بلاوجہ دائیں بائیں نہ دیکھو، بس اللہ اللہ کرتے ہوئے نیچے دیکھتے ہوئے چلو۔ پھر دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح تمہاری حفاظت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ وَيَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَهُمۡ﴾(۲)

یعنی مؤمنین سے کہہ دو کہ اپنی نگاہوں کو نیچی کرلیں، تو خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے نگاہ نیچی کرنے کا حکم فرمادیا، اور پھر آگے اس کا نتیجہ بیان فرمادیا کہ اس کی وجہ سے شرم گاہوں کی حفاظت ہو جائے گی، اور پاک دامنی حاصل ہو جائے گی۔

یہ تکلیف جہنم کی تکلیف سے کم ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ آگے فرماتے ہیں:

''ہمت کر کے ان (دونوں) کو اختیار کرے۔ گو نفس کو تکلیف ہو، مگر یہ تکلیف نارِ جہنم کی تکلیف سے کم ہے''

یعنی اس وقت تو نگاہ کو بچانے سے نفس کو تکلیف ہو رہی ہے۔ لیکن اس بدنگاہی کے بدلے میں جو جہنم کا عذاب ہے، اس کی تکلیف کے مقابلے میں یہ تکلیف لاکھوں، کروڑوں، بلکہ اربوں گنا کم ہے،

(۱) الاعراف:۱۷ (۲) النور:۳۰

بلکہ یہاں کی تکلیف کو وہاں کی تکلیف سے کوئی نسبت ہی نہیں، کیونکہ وہاں کا عذاب غیر متناہی ہے، کبھی ختم ہونے والا نہیں، اور یہاں کی تکلیف ختم ہونے والی ہے۔

ہمت سے کام لو

آگے فرمایا:

''جب چند روز ہمت سے ایسا کیا جائے گا تو میلان میں بھی کمی ہو جائے گی، بس یہی علاج ہے، اس کے سوا کچھ علاج نہیں، اگرچہ ساری عمر سرگرداں رہے''

اس لئے کہ جب انسان محنت اور مشقت برداشت کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے وعدہ فرمالیا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۱)

''جو شخص ہمارے راستے میں مجاہدہ کرے گا، ہم ضرور اس کو راستہ دکھادیں گے''

وہ مجاہدہ کرنے والے کو راستہ دیتے ہیں۔ لہٰذا مجاہدہ کر کے نظر نیچی کرلو گے بالآخر اللہ تعالیٰ میلان بھی کم فرمادیں گے، انشاء اللہ۔ بس یہی علاج ہے، اس کے سوا کچھ علاج نہیں، اگرچہ ساری عمر سرگرداں رہو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جب ہم شیخ کے پاس جائیں تو شیخ ایسی پھونک مارے، یا ایسا نسخہ پلادے، یا ایسا وظیفہ پڑھ دے کہ بس یہ میلان ختم ہو جائے ارے بھائی، ایسا نہیں ہوا کرتا۔ جب تک انسان ہمت سے کام نہ لے۔

دیکھو، دو کام کرلو، ایک ہمت کو استعمال کرو، دوسرے اللہ تعالیٰ سے رجوع کرو، ''ہمت کے استعمال'' کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو حتی الامکان جتنا بچاسکتے ہو، بچالو، اور ''رجوع الی اللہ'' کا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی ایسی آزمائش پیش آئے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے کہو، یا اللہ، اپنی رحمت سے مجھے بچالیجئے، میری آنکھ کو بچالیجئے، میرے خیالات کو بچالیجئے، اگر آپ نے مدد نہ فرمائی تو میں مبتلا ہو جاؤں گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت اپناؤ

حضرت یوسف علیہ السلام جب آزمائش میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے بھی یہی کام کیا کہ اپنی طرف سے کوشش کی۔ چنانچہ جب زلیخا نے چاروں طرف دروازوں میں تالے ڈال دیئے، اور حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت دی، اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ

(۱) العنکبوت: ۶۹

دروازوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں، اور نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، مگر حضرت یوسف علیہ السلام دروازوں کی طرف بھاگ پڑے۔ اب جب آنکھوں سے نظر آرہا ہے کہ دروازوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں تو بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ راستہ تو ہے نہیں۔ مگر چونکہ اپنے اختیار میں تو اتنا ہی تھا کہ دروازے تک بھاگ جاتے، چنانچہ جب اپنے حصے کا کام کرلیا، اور اپنے اختیار میں جو تھا، وہ کرلیا، اور دروازے تک پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ سے یہ کہنے کے حقدار ہوگئے کہ یا اللہ، میرے اختیار میں تو بس اتنا ہی تھا، میرے بس میں اس سے زیادہ نہیں، اب آگے تو آپ کے کرنے کا کام ہے تو جب اپنے حصے کا کام کرکے اللہ تعالیٰ سے مانگ لیا کہ یا اللہ، باقی آگے کا کام آپ کے قبضے میں ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے حصے کا کام کرلیا، اور انہوں نے بھی دروازوں کے تالے توڑ دیئے۔ اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کتنے خوبصورت انداز میں بیان فرماتے ہیں کہ۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید خیرہ یوسف وار می باید دوید

اگرچہ تمہیں اس دنیا کے اندر کوئی راستہ اور کوئی پناہ گاہ نظر نہیں آرہی ہے، چاروں طرف سے گناہوں کی دعوت دی جارہی ہے، لیکن تم دیوانہ وار اس طرح بھاگو، جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام بھاگے، تم جتنا بھاگ سکتے ہو، اتنا تو بھاگ لو، باقی اللہ سے مانگو۔ بہر حال، اگر انسان یہ دو کام کرلے، ایک اپنی استطاعت کی حد تک کام کرلے، اور دوسرے اللہ سے مانگے، یقین کیجئے، دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کا طرز اختیار کرو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ بھی بڑی عجیب عجیب باتیں ارشاد فرمایا کرتے تھے، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو تین دن تک مچھلی کے پیٹ میں رکھا، اب وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، چاروں طرف تاریکیاں اور اندھیریاں چھائی ہوئی تھیں، اور معاملہ اپنے بس سے باہر ہوگیا تھا، بس اس وقت ان تاریکیوں میں اللہ تعالیٰ کو پکارا اور یہ کلمہ پڑھا:

﴿لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ﴾(۱)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب اس نے ہمیں تاریکیوں کے اندر پکارا تو پھر ہم نے یہ کہا:

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ، وَكَذٰلِكَ نُنْجِى الْمُؤْمِنِيْنَ۝﴾(۲)

یعنی ہم نے اس کی پکار سنی، اور ہم نے اس گھٹن سے اس کو نجات عطا فرمادی، چنانچہ تین دن

(۱) الانبیاء: ۸۸، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''(یا اللہ!) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو ہر عیب سے پاک ہے۔ بے شک میں قصوروار ہوں''

(۲) الانبیاء: ۸۸

کے بعد مچھلی کے پیٹ سے نکل آئے۔ آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم اسی طرح مؤمنوں کو نجات دیتے ہیں، اور دیں گے۔

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ تم ذرا سوچو تو سہی کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں کیا لفظ ارشاد فرمادیا کہ ہم مؤمنوں کو اسی طرح نجات دیں گے؟ کیا ہر مؤمن پہلے مچھلی کے پیٹ میں جائے گا، اور پھر وہاں جاکر اللہ تعالیٰ کو پکارے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو نجات دیں گے، کیا اس آیت کا یہ مطلب ہے؟ آیت کا یہ مطلب نہیں، بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ کی تاریکیوں میں گرفتار ہوئے تھے، اسی طرح تم کسی اور قسم کی تاریکیوں میں گرفتار ہوسکتے ہو۔ لیکن وہاں پر بھی تمہارا سہارا وہی ہے جسے حضرت یونس علیہ السلام نے اختیار کیا تھا۔ وہ یہ کہ ہمیں ان الفاظ سے پکارو:

﴿لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾(۱)

جب تم ان الفاظ سے ہمیں پکارو گے تو تم جس قسم کی تاریکی میں گرفتار ہو گے، ہم تمہیں نجات دے دیں گے۔

لہٰذا جب نفس کے تقاضوں کی تاریکیاں سامنے آئیں، ماحول کی ظلمتیں اور تاریکیاں سامنے آئیں تو اس وقت تم ہمیں پکارو یا اللہ، ان تاریکیوں سے بچالیجئے، ان تاریکیوں سے نکال دیجئے، ان اندھیروں سے باہر کردیجئے، ان کے شر سے محفوظ فرمایئے جب دعا کرو گے تو پھر ممکن نہیں ہے کہ یہ دعا قبول نہ ہو۔

دنیاوی مقاصد کے لئے دعا کی قبولیت

دیکھئے، جب انسان کسی دنیوی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے۔ مثلاً یہ دعائیں کرتا ہے کہ یا اللہ، مجھے صحت دیدے۔ یا اللہ، مجھے پیسے دیدے۔ یا اللہ، مجھے فلاں ملازمت دیدے۔ یا اللہ، مجھے فلاں عہدہ دیدے ویسے تو ہر دعا قبول ہوتی ہے، مگر قبولیت کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہی چیز اللہ تعالیٰ دے دیتے ہیں جو مانگی تھی۔ مثلاً پیسہ مانگا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پیسہ دے دیا۔ یا اللہ تعالیٰ سے کوئی منصب مانگا تھا۔ وہ دے دیا۔ لیکن بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ انسان اپنی بیوقوفی اور نادانی کی وجہ سے ایسی چیز مانگ رہا ہے اگر میں نے اس کو دے دی تو وہ چیز اس کے لئے عذاب ہوجائے گی۔ مثلاً یہ پیسہ مانگ رہا ہے، لیکن اگر میں نے اس کو پیسہ دے دیا تو اس کا دماغ خراب ہوجائے گا، اور یہ فرعون بن جائے گا۔ اپنی دنیا بھی خراب کرے گا، اور آخرت بھی خراب کرے گا۔ اس لئے ہم اس کو زیادہ

(۱) الانبیاء: ۸۸، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''(یا اللہ!) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو ہر عیب سے پاک ہے۔ بے شک میں قصوروار ہوں''

پیسے نہیں دیتے۔ یا مثلاً ایک شخص نے کوئی عہدہ یا منصب مانگ لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اگر یہ منصب اس کو مل گیا تو یہ معلوم نہیں کیا کیا فساد برپا کرے گا، اس لئے بعض اوقات وہ چیز دینا مناسب نہیں ہوتا جو اس نے مانگی ہے، اس لئے اس کے بجائے اللہ تعالیٰ اس سے اچھی چیز دے دیتے ہیں۔

دینی مقصد کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے

لیکن اگر کوئی شخص دین مانگ رہا ہے، اور یہ دعا کر رہا ہے کہ یا اللہ، مجھے دین پر چلا دے، مجھے سنت پر چلا دیجئے، مجھے گناہوں سے بچالیجئے، تو کیا اس میں اس بات کا امکان ہے کہ دین پر چلنے میں نقصان زیادہ ہے، اور کسی اور راستے پر چلنے میں نقصان کم ہے؟ اور اللہ تعالیٰ دین کے بجائے وہ دوسرے راستے پر چلا دیں؟ چونکہ اس بات کا امکان ہی نہیں، لہٰذا وہ دعا جو دین کے لئے مانگی جاتی ہے کہ یا اللہ، مجھے دین عطا فرمادے۔ یا اللہ، مجھے گناہوں سے بچالے۔ یا اللہ، مجھے طاعات عطا فرمادے۔ یہ دعائیں تو ضرور قبول ہوتی ہیں، اس میں قبول نہ ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں اس لئے جب بھی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو تو اس یقین کے ساتھ مانگو کہ ضرور قبول ہوگی۔

دعا کے بعد اگر گناہ ہو جائے؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ جب تم نے یہ دعا مانگ لی کہ یا اللہ! مجھے گناہ سے بچالیجئے، لیکن اس دعا کے بعد پھر تم گناہ کے اندر مبتلا ہو گئے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ دعا قبول نہیں ہوئی دنیا کے معاملے میں تو یہ جواب دیا تھا کہ جو چیز بندے نے مانگی تھی، چونکہ وہ بندے کے لئے مناسب نہیں تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے وہ چیز نہیں دی، بلکہ کوئی اور اچھی چیز دے دی لیکن ایک شخص یہ دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! میں گناہ سے بچنا چاہتا ہوں، مجھے گناہ سے بچنے کی توفیق دے دیجئے، تو کیا یہاں بھی یہ جواب دے سکتے ہیں کہ گناہ سے بچنا اچھا نہیں تھا، اس سے اچھی کوئی چیز تھی جو اللہ تعالیٰ نے اس دعا مانگنے والے کو دے دی۔

توبہ کی توفیق اور ہو جاتی ہے

بات دراصل یہ ہے کہ گناہ سے بچنے کی یہ دعا قبول تو ہوئی، لیکن اس دعا کا اثر یہ ہوگا کہ اول تو انشاء اللہ گناہ سرزد نہیں ہوگا، اور اگر بالفرض گناہ ہو بھی گیا تو توبہ کی توفیق ضرور ہو جائے گی۔ انشاء اللہ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ توبہ کی توفیق نہ ہو۔ لہٰذا دین کے بارے میں یہ دعا کبھی رائیگاں نہیں جا سکتی، کبھی یہ دعا بیکار نہیں ہو سکتی۔ اور اگر گناہ کے بعد توبہ کی توفیق ہو جائے تو وہ توبہ بعض اوقات انسان کو اتنا اونچا لے

جاتی ہے، اور اس کا اتنا درجہ بلند کرتی ہے کہ بعض اوقات گناہ نہ کرنے کی صورت میں اس کا اتنا درجہ بلند نہ ہوتا، اور وہ اتنا اونچا نہ جاتا۔ اس لئے کہ غلطی سرزد ہونے کے بعد جب اللہ تعالیٰ کے سامنے اس نے توبہ کی، رویا، گڑگڑایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے نتیجے میں اس کا درجہ اور زیادہ بلند کر دیا۔

پھر ہم تمہیں بلند مقام پر پہنچائیں گے

اس لئے ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اس دعا کرنے کے باوجود اگر پاؤں پھسل گیا، اور وہ گناہ سرزد ہو گیا تو اللہ تعالیٰ سے بدگمان مت ہو جاؤ کہ اللہ میاں نے ہماری دعا قبول نہیں کی۔ ارے نادان، تجھے کیا معلوم، ہم تجھے کہاں پہنچانا چاہتے ہیں اس لئے کہ جب گناہ سرزد ہو گا تو پھر ہم تمہیں توبہ کی توفیق دیں گے۔ پھر ہم تمہیں اپنی ستاری کا، اپنی غفاری، اپنی پردہ پوشی کا، اور اپنی رحمتوں کا مورد بنائیں گے۔ اس لئے اس دعا کو کبھی رائیگاں اور بیکار مت سمجھو بس یہ دو کام کرتے رہو۔ ہمت سے کام لو، اور دعا مانگتے رہو۔ پھر دیکھو، کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

تمام گناہوں سے بچنے کا صرف ایک ہی نسخہ

بدنگاہی کے بارے میں یہ باتیں عرض کر دیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ صرف بدنگاہی نہیں، دنیا کے ہر گناہ کے اندر یہ ضروری ہے کہ ہمت کا استعمال کرنا، اس کو بار بار تازہ کرنا، اور اللہ تعالیٰ سے رجوع اور دعا کرنا۔ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں، ان میں سے صرف ایک چیز سے کام نہیں بنے گا۔ اگر صرف دعا کرتے رہو گے، اور ہمت نہیں کرو گے تو یہ چیز حاصل نہیں ہوگی۔ مثلاً ایک آدمی مشرق کی طرف بھاگا جا رہا ہے، اور ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے دعا یہ کر رہا ہے کہ یا اللہ، مجھے مغرب میں پہنچا دے ارے تو مشرق کی طرف بھاگ رہا ہے، اور دعا مغرب کی کر رہا ہے، یہ دعا کیسے قبول ہوگی؟ کم از کم پہلے اپنا رخ تو مغرب کی طرف کر۔ اور جتنا تیرے بس میں ہے، وہ تو کر لے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگ کہ یا اللہ، مجھے مغرب پہنچا دے، تب تو وہ دعا فائدہ مند ہے، ورنہ وہ دعا نہیں، وہ تو اللہ تعالیٰ سے مذاق ہے۔

اس لئے پہلے رخ اس طرف کرو، اور ہمت کرو، اور جتنا ہو سکے، اس طرف قدم بڑھاؤ، اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگو، تمام گناہوں سے بچنے کا یہی نسخہ ہے۔ یہی نسخہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور نسخہ نہیں ہے۔ اور ساری طاعات کو حاصل کرنے کا بھی یہی نسخہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

نگاہوں کو جھکانا سیکھیں☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،
﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گزشتہ کئی جمعوں سے فلاح یافتہ مؤمنوں کی صفات کا بیان چل رہا ہے، تین صفات کا بیان تفصیل سے ہو چکا۔ چوتھی صفت قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی کہ فلاح یافتہ مؤمن وہ ہیں جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں اور کنیزوں کے کہ ان کے ذریعہ جو شخص اپنی جنسی خواہش پوری کرے تو ان پر کوئی ملامت نہیں۔ اور جو شخص ان کے علاوہ کسی اور طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرنا چاہے تو وہ حد سے گزرنے والے ہیں۔ اور اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں۔ پچھلے جمعہ کو عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین دیا ہے جس میں ہماری ہر جائز خواہش کو تسکین دینے کا صاف ستھرا پاک راستہ موجود ہے۔ انسان کا جنسی جذبہ انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس جذبہ پر اللہ تعالیٰ نے کوئی قدغن، کوئی پابندی عائد نہیں فرمائی، لیکن یہ بتا دیا کہ اس جنسی جذبہ کی تسکین کا جائز راستہ نکاح ہے۔ اب اگر انسان اس راستے سے اس جذبہ کی تسکین کرے تو یہ نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ باعثِ اجر و ثواب ہے۔ لیکن اگر اس کے علاوہ کوئی اور راستہ تلاش کرے

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۱۵۲ تا ۱۶۶)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱-۸، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے۔ جو اپنی نمازوں میں دل سے جھکنے والے ہیں، اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اور جو زکوۃ پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابل ملامت نہیں ہیں، ہاں جو اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیں تو ایسے لوگ حد سے گذرے ہوئے ہیں''

اور نکاح سے ہٹ کر بغیر نکاح کے اپنی جنسی خواہش کی تسکین کرنا چاہے تو یہ حد سے تجاوز ہے۔ فساد کا راستہ ہے۔ فتنہ کا راستہ ہے اور یہ انسان کو تباہی کی طرف لے جانے والا ہے۔

مغربی تہذیب کی لعنت

جن جن معاشروں میں نکاح سے ہٹ کر بغیر نکاح کے جنسی خواہش کی تسکین کا دروازہ کھولا گیا، وہ اخلاقی اعتبار سے اور معاشرتی اعتبار سے تباہی کا شکار ہوئے۔ آج مغربی دنیا، یورپ اور امریکہ کی تہذیب کا دنیا میں ڈنکا بجا ہوا ہے، لیکن انہوں نے جنسی خواہش کی تسکین کے لئے نکاح کے علاوہ دوسرے راستے اختیار کرنے کی کوشش کی تو اس جنسی خواہش نے ان کو کتوں اور گدھوں اور بلیوں کی صفت میں شامل کر دیا۔ بعض معاشرے ایسے ہیں جن کے ریکارڈ پر یہ بات موجود ہے کہ یہاں کی ستر اسی فیصد آبادی حرام کی اولاد ہیں اور خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہے۔ فیملی سسٹم کا ستیاناس ہو گیا۔ باپ بیٹے، ماں، بیٹی، بھائی، بہن کے تصورات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ آج مغربی دنیا کے مفکرین چیخ رہے ہیں کہ ہم نے اس جہت سے اپنے آپ کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ہے۔ یہ اسلئے کہ قرآن کریم نے جو راستہ بتایا تھا کہ نکاح کے ذریعہ جنسی خواہش کی تسکین کرو، اس کو چھوڑ کر دوسرے راستے اختیار کر لیے۔

یہ جذبہ کسی حد پر رکنے والا نہیں

اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام بنایا ہے کہ اگر یہ جنسی خواہش کا جذبہ جائز حدود کے اندر ہے تو یہ جذبہ بقاء نوع انسانی کا جذبہ بنتا ہے اور انسان کو بہت سے فوائد پہنچاتا ہے، لیکن جس وقت یہ جذبہ جائز حدود سے آگے بڑھ جاتا ہے تو یہ جذبہ ایک نہ مٹنے والی بھوک اور نہ مٹنے والی پیاس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی انسان ناجائز طریقے سے اپنی خواہش کو پوری کرتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر کسی حد پر نہیں رکتا، کسی حد پر اس کو قرار اور چین نہیں آتا۔ وہ اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور کبھی اس کی پیاس اور بھوک نہیں مٹتی۔ جیسے جو شخص استسقاء کا مریض ہوتا ہے وہ ہزار مرتبہ بھی پانی پی لے، اور مٹکے کے مٹکے اپنے پیٹ میں داخل کر لے پھر بھی اس کی پیاس نہیں بجھتی۔ یہی صورتِ حال اس وقت ہوتی ہے جب جنسی جذبہ اپنی معقول حدود سے تجاوز کر جائے، وہ جذبہ پھر کسی حد پر رکتا نہیں ہے۔

پھر بھی تسکین نہیں ہوتی

آج مغربی دنیا میں یہی صورتِ حال ہو رہی ہے۔ ایک طریقے سے جنسی خواہش کی تسکین شروع کی۔ لیکن پوری تکمیل نہ ہو سکی۔ پھر اور آگے بڑھے، پھر بھی پوری تسکین نہ ہوئی، اور پھر اور آگے

بڑھے، پھر بھی تسکین مکمل نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اب صورتِ حال یہ ہے کہ مغربی دنیا میں ایسے بے شمار واقعات سامنے آرہے ہیں کہ اب بعض لوگوں کو جنسی خواہش کی تسکین اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک وہ کسی خاتون کے ساتھ جنسی خواہش پوری کرنے کے بعد اس کو قتل نہ کردیں۔

حد سے گزرنے کا نتیجہ

مغربی دنیا کا یہ عجیب منظر ہے کہ جہاں ان کے معاشرے نے عورت کو اتنا سستا کردیا کہ قدم قدم پر عورت سے تسکین حاصل کرنے کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے ہیں، کوئی قدغن اور کوئی پابندی ان پر نہیں، لیکن جن ملکوں میں عورت اتنی سستی ہے انہی ملکوں میں زنا بالجبر کے واقعات ساری دنیا سے زیادہ ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ رضامندی کے ساتھ جنسی خواہش کی تسکین کرلینے کے بعد بھی نفس کو قرار نہیں آیا، اب یہ خیال آیا کہ زبردستی کرنے میں زیادہ لذت ہے اور پھر زبردستی کرنے کی حد یہ ہے کہ جس عورت سے جنسی تسکین حاصل کی جارہی ہے اس کو اسی وقت میں قتل کرنا بھی جنسی تسکین کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ آج اس معاشرے میں ایسے واقعات بھرے پڑے ہیں کہ اب فکر رکھنے والے یہ سوچ رہے ہیں کہ ہم نے اپنے معاشرے کو کس تباہی کے دہانے پر پہنچادیا ہے۔ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ جو لوگ اس نکاح کے بندھن سے ہٹ کر جنسی خواہش کی تسکین کا راستہ تلاش کرنا چاہتے ہیں، وہ حد سے گزرنے والے ہیں اور حد سے گزرنے کے بعد بھی ان کو کسی حد پر قرار نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ہم نے نکاح کے ذریعہ تمہارے لئے ایک جائز راستہ پیدا کردیا، اس جائز راستے کی فضیلت رکھ دی کہ اگر انسان اپنی بیوی کے ساتھ اپنے جنسی جذبے کی تسکین کرے تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ اس پر اجر وثواب بھی ملتا ہے۔ باقی سب راستے حرام کردیئے۔

پہلا بند: نظر کی حفاظت

اب حرام راستوں اور طریقوں سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے پہرے بٹھادیئے ہیں کہ اگر ان پہروں کا لحاظ رکھا جائے تو انسان کبھی بھی جنسی گمراہی میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ ان میں سے سب سے پہلے اپنی نظر کی حفاظت کا حکم دیا۔ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلنَّظْرَةُ سَهْمٌ مَسْمُوْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ))(۱)

''انسان کی نظر ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے''

---

(۱) مجمع الزوائد (۶۳/۸)، کنزالعمال، رقم: ۱۳۰۶۸ (۴۸۱/۵)، عدة الصابرين وذخيرة الشاكرين (۱۸/۱)

یعنی شیطان انسان کو اس نگاہ کے ذریعہ غلط راستے پر ڈالتا ہے۔ اور اس نظر کو غلط جگہ پر ڈلوانا چاہتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان کے دل میں فاسد خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے دل میں فاسد جذبات اُبھرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں بالآخر انسان کو عملی گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔

نگاہیں نیچے رکھیں

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ﴾ (۱)

"آپ مؤمنین سے کہہ دیں کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں"

گویا کہ یہ جتلا دیا کہ شرمگاہوں کی حفاظت کرنے کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہے کہ اپنی نگاہوں کی حفاظت کرو، یہ نگاہ غلط جگہ پر نہ پڑے۔ کسی نامحرم عورت پر لذت لینے کی غرض سے نگاہ ڈالنا زنا کی پہلی سیڑھی ہے۔ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَلْعَیْنَانِ تَزْنِیَانِ، وَزِنَاهُمَا النَّظَرُ)) (۲)

"آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا دیکھنا ہے"

آنکھوں سے غیر محرم کو لذت حاصل کرنے کی غرض سے دیکھنا یہ زنا کی پہلی سیڑھی ہے، شریعت نے اس پر پابندی عائد فرمادی ہے۔

آج کل نظر بچانا مشکل ہے

آج کل کے معاشرے میں جہاں چاروں طرف انسان کی نگاہ کو پناہ نہیں ہے، چاروں طرف فتنے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس موقع پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ نگاہ کو نیچے رکھو اور اپنی نگاہ کا غلط استعمال نہ کرو۔ آج کا نوجوان یہ کہے گا کہ نگاہ کو نیچے رکھ کر اور چاروں طرف سے آنکھیں بند کرکے چلنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس لئے کہ کہیں بورڈ پر تصویر نظر آرہی ہے اور کہیں اخبارات میں تصویریں نظر آرہی ہیں، کسی رسالے کو دیکھو تو اس میں تصویر موجود، بازار سے کوئی چیز خریدو تو اس پر تصویر موجود، بے پردہ عورتیں ہر جگہ باہر چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، اس لئے نظریں بچانا تو بڑا مشکل کام ہے۔

---

(۱) النور: ۳۰

(۲) مختصر ارواء الغلیل، رقم: ۲۳۷۰ (۱/۴۷۱)، غایة المرام، رقم: ۱۸٤ (۱/۱۳۲) اس حدیث کے مضمون کی تائید بخاری، مسلم اور احمد بن حنبل کی ذکر کردہ بیشتر روایات سے بھی ہوتی ہے۔

یہ آنکھ کتنی بڑی نعمت ہے

لیکن اس مشکل پر قابو پانے کے لئے ذرا اس پر غور کرو کہ یہ آنکھ جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں عطا فرمائی ہے یہ کیا چیز ہے؟ یہ ایک ایسی مشین اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمائی ہے جو پیدائش سے لے کر مرتے دم تک بغیر کسی پیسے اور بغیر محنت کے یہ مشین کام کر رہی ہے اور اس طرح کام کر رہی ہے کہ جو چیز چاہو اس کے ذریعہ دیکھ لو، جو چاہو لطف اٹھالو۔ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں اس مشین کے اندر غور کرنے کی توفیق دے تب پتہ چلے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس چھوٹی سی جگہ میں کیا کارخانہ فٹ کر رکھا ہے۔ جو آنکھوں کے اسپیشلسٹ ہیں، انہوں نے کالجوں، یونیورسٹیوں اور اسپتالوں میں ساری عمر لگادی، لیکن اب تک یہ دریافت نہیں کر سکے کہ یہ کیسا کارخانہ ہے؟ اس کارخانے کے اندر کتنے پردے ہیں؟ کتنی جھلیاں ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس میں کتنے پردے فٹ کر رکھے ہیں؟ لیکن چونکہ یہ مفت میں مل گئی ہے، اس کے لئے کوئی پائی پیسہ خرچ نہیں کرنا پڑا ہے، کوئی محنت نہیں کرنی پڑی، اس وجہ سے اس نعمت کی قدر نہیں۔

آنکھوں کی حفاظت کے لئے پیسہ خرچ کرنے پر تیار

جس دن آنکھ کی بینائی پر ذرہ برابر فرق آجائے تو تمہارے جسم میں زلزلہ آجاتا ہے کہ کہیں میری بینائی نہ چلی جائے۔ اور اگر خدانہ کرے یہ بینائی چلی جائے تو پھر انسان ساری دنیا کی دولت خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے کہ چاہے میری دولت چلی جائے، لیکن میری بینائی مجھے واپس مل جائے تاکہ میں اپنی بیوی کو دیکھ سکوں، میں اپنے بچوں کو دیکھ سکوں، میں اپنے ماں باپ کو دیکھ سکوں۔ بینائی جانا تو درکنار بلکہ اگر بینائی میں ذرہ فرق آجائے کہ ٹیڑھا نظر آنے لگے یا آنکھوں کے سامنے ترمرے ناچنے لگیں یا آنکھوں کے سامنے حلقے اور دائرے نظر آنے لگیں تو انسان گھبرا جاتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا اور پھر آنکھوں کے اسپیشلسٹ کے پاس بھاگتا ہے اور ہزاروں خرچ کرتا ہے کہ کسی طرح میری آنکھوں کا یہ نقص دور ہو جائے لیکن ہمیں اور آپ کو یہ دولت ملی ہوئی ہے اور مرتے دم تک کام کرتی ہے، نہ اس کی سروس کی ضرورت، نہ اس میں تیل ڈالنے کی ضرورت۔

آنکھ کی پتلی کی عجیب شان

اور اس آنکھ کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب وغریب نظام بنایا ہے مجھے ایک آنکھوں کے ماہر ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ انسان جب روشنی میں جاتا ہے تو اس کی آنکھ کی پتلی پھیلتی ہے اور جب

اندھیرے میں آتا ہے تو اس آنکھ کی پتلی کے پٹھے سکڑتے ہیں کیونکہ اندھیرے میں صحیح طور پر دیکھنے کے لئے اس کا سکڑنا ضروری ہے اور اس ڈاکٹر نے بتایا کہ اس سکڑنے اور پھیلنے کے عمل میں انسان کی آنکھ کے پٹھے سات میل کا فاصلہ طے کرتے ہیں اور یہ کام خود بخود ہوتا ہے۔ اگر یہ کام انسان کے سپرد کیا جاتا، اور یہ کہا جاتا کہ جب تم اندھیرے میں جاؤ تو یہ بٹن دبایا کرو اور جب روشنی میں جاؤ تو یہ دوسرا بٹن دبایا کرو، تب تمہاری آنکھیں صحیح کام کریں گی، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کسی انسان کی سمجھ میں یہ بات آتی اور کسی کی سمجھ میں نہ آتی اور غلط وقت پر بٹن دبا دیتا اور ضرورت سے زیادہ بٹن دبا دیتا تو خدا جانے اس آنکھ کا کیا حشر بنتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک آٹو میٹک سسٹم اس آنکھ کے اندر لگا دیا کہ جیسی ضرورت ہو اس کے مطابق اس آنکھ کی پتلی پھیلتی بھی ہے اور سکڑتی ہے۔

آنکھ کی حفاظت کا خدائی انتظام

اور یہ آنکھ اتنی نازک ہے کہ شاید پورے جسم انسانی میں اس سے زیادہ نازک کوئی چیز نہ ہو۔ آپ کو تجربہ ہوا ہوگا کہ اگر انسان کی آنکھ میں ریت یا مٹی کا معمولی سا ذرہ جس کو دیکھنا بھی مشکل ہو، اگر وہ انسان کی آنکھ میں چلا جائے تو انسان بے تاب ہو جاتا ہے اور درد سے بے چین ہو جاتا ہے۔ اور یہ آنکھ انسان کے چہرے میں بالکل سامنے ہے کہ اگر انسان کے سامنے سے اس پر حملہ ہو یا کسی سے تصادم ہو تو اس کی چوٹ سب سے پہلے انسان کے چہرے پر پڑتی ہے، لیکن آنکھ کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو پہرے دار بٹھا دیئے، یہ ماتھے کی ہڈی اور رخسار کی ہڈی، ان دونوں ہڈیوں کے قلعہ میں انسان کی آنکھ کو رکھ دیا تاکہ اگر چہرے پر کوئی چوٹ پڑے تو ہڈیاں اس کو برداشت کریں اور آنکھ محفوظ رہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے پلکوں کے دو پردے آنکھوں کے اوپر ڈال دیئے تاکہ کوئی گرد و غبار اس کے اندر نہ جائے۔ اگر کوئی مٹی یا گرد و غبار اُڑ کر آئے گا تو یہ پلکیں اس کو اپنے اوپر لے لیں گی اور آنکھوں کو بچالیں گی۔ جب انتہاء ہو جائے تب جا کر آنکھ پر چوٹ پڑتی ہے ورنہ آنکھ کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ خود کار نظام بنا دیا ہے۔ ان کے ذریعہ انسان کے چہرے کا حسن بھی ہے اور اس آنکھ کی نعمت کی حفاظت بھی ہے۔

نگاہ پر صرف دو پابندیاں ہیں

یہ سب انتظام اللہ تعالیٰ نے کر رکھا ہے اور اس انتظام کے لئے کوئی پیسہ نہیں مانگا کہ جب تم اتنے پیسے دوگے تو آنکھ ملے گی بلکہ یہ خود کار مشین پیدائش کے وقت سے تمہارے حوالے کر دی ہے۔ صرف اتنا فرمایا کہ یہ سرکاری مشین ہے، اس کو جہاں چاہو، استعمال کرو، صرف چند جگہیں ہیں ان میں

اس کو استعمال نہ کرنا۔ اس آنکھ کے ذریعہ آسمان کو دیکھو، زمین کو دیکھو، اچھے مناظر کو دیکھو، باغات کو دیکھو، پھلوں کو پھولوں کو دیکھو، دریاؤں اور نہروں کو دیکھو، پہاڑوں اور اچھے مناظر کو دیکھو۔ اپنے ملنے جلنے والوں کو دیکھو، اور ان سے لطف اُٹھاؤ۔ صرف دو چیزوں سے بچو، ایک یہ کہ کسی نامحرم عورت پر لذت لینے کی نیت سے نگاہ مت ڈالو اور کسی انسان کی طرف حقارت کی نظر سے مت دیکھو، بس آپ کے اوپر یہ دو پابندیاں ہیں، باقی سب کچھ دیکھنا تمہارے لئے حلال کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس سرکاری مشین کو جتنا چاہو استعمال کرو۔

اگر بینائی واپس دیتے وقت شرط لگادی جائے

اگر پھر بھی انسان کہے کہ یہ کام بڑا مشکل ہے، ساری کائنات کا نظام دکھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا انتظام تمہیں دے رکھا ہے، خدانہ کرے اگر کسی دن تمہاری آنکھ کا پردہ پھٹ جائے، خدانہ کرے کسی دن تمہاری آنکھ کی بینائی جاتی رہے، اس وقت اگر تم سے یہ کہا جائے کہ یہ بینائی تمہیں واپس تو مل جائے گی لیکن شرط یہ ہے کہ فلاں فلاں چیز نہیں دیکھو، تو جواب میں وہ شخص کہے گا کہ ساری زندگی ان چیزوں کو نہ دیکھنے کا بونڈ لکھوالو، لیکن مجھے بینائی واپس دے دو۔ تاکہ اس کے ذریعہ میں اپنی بیوی بچوں کو دیکھ سکوں، اپنے بہن بھائیوں کو دیکھ سکوں، میں اپنے گھر کو دیکھ سکوں۔ اس وقت تو بونڈ لکھنے کے لئے تیار ہو جائے گا، اس لئے کہ بینائی جا چکی ہے اور اب اس کے واپس آنے کا کوئی راستہ نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بونڈ لکھوائے بغیر تمہیں یہ نعمت دے رکھی ہے۔ لیکن یہ نعمت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جس جگہ یہ بینائی استعمال کرنے کے لئے دی ہے صرف اس جگہ استعمال کرو۔

نگاہ ڈالنا اجر و ثواب کا ذریعہ

اور اگر صرف اس جگہ پر استعمال کرو گے تو اس کے نتیجے میں تمہارے اعمال نامے میں نیکیوں کے ڈھیر لگتے چلے جائیں گے اور آخرت میں اجر و ثواب کے خزانے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنے ماں باپ کو ایک مرتبہ محبت کی نگاہ سے دیکھے تو ایک نگاہ ڈالنے سے ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب ملتا ہے۔ (۱)

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ایک شوہر اپنے گھر میں داخل ہوا اور اس نے اپنی بیوی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور بیوی نے اپنے شوہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھا تو اللہ تعالیٰ

(۱) شعب الإيمان، رقم:١١٧٦ (٣٦٥/١٦)، كنز العمال، رقم:٤٥٥٣٥ (٤٧٧/١٦)، الدر المنثور (٢٦٤/٥)

دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔(۱)

اب دیکھئے کہ نگاہ کو صحیح جگہ پر استعمال کیا تو اللہ تعالیٰ نے نیکیوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

نظر کی حفاظت کا ایک طریقہ

خدا نہ کرے اگر آدمی اس نگاہ کو غلط جگہ پر استعمال کرے اور اس کے ذریعہ نامحرموں کو لذت لینے کی غرض سے دیکھے تو اس نگاہ کے بارے میں فرمایا کہ شیطان کے زہر کے بجھے ہوئے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔

آج ہم لوگ یہ کہتے ہیں کہ آج کے دور میں آنکھوں کو بچانا بڑا مشکل ہے اس لئے کہ ڈھونڈنے سے بھی ملتی نہیں آنکھوں کو پناہیں، کہاں جائیں؟ اور کس طرح بچیں؟ اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم یہ تصور کرو کہ آج اگر ہماری بینائی جاتی رہے اور پھر کوئی تم سے یہ کہے کہ تمہاری بینائی واپس مل جائے گی لیکن شرط یہ ہے کہ اس بینائی کو کسی نامحرم کو دیکھنے میں استعمال نہیں کرو گے، اگر یہ پکا وعدہ کرو اور پختہ عہد کرو اور لکھ کر دو تب بینائی واپس ملے گی، ورنہ نہیں ملے گی۔ بتاؤ کیا تم اس وعدہ کو کرنے اور لکھنے پر تیار ہو جاؤ گے یا نہیں؟ کونسا انسان ہے جو لکھنے اور وعدہ کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا اور کون انسان ہوگا جو یہ کہے گا کہ اگر میں نامحرم کو نہیں دیکھ سکتا تو پھر مجھے بینائی نہیں چاہئے۔ کوئی انسان ایسا کہے گا؟ ہرگز نہیں کہے گا۔ اگر تم اس وقت وعدہ کرنے اور لکھ کر دینے کے لئے تیار ہو جاؤ گے تو جس مالک کریم نے وہ بینائی تم سے کوئی معاہدہ کیے بغیر پہلے سے تمہیں دے رکھی ہے اور بعد میں وہ مالک تم سے یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ اس نگاہ کو غلط استعمال نہ کرو تو پھر تمہیں کیوں مشکل نظر آتی ہے؟ پھر کیا پریشانی لاحق ہوتی ہے، لہٰذا جب بدنظری کا موقع سامنے آئے تو یہ تصور کرلو کہ اگر میں بدنظری کروں گا تو میری بینائی چلی جائے گی۔

ہمت سے کام لو

حقیقت یہ ہے کہ جب انسان اپنی بینائی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کرتا ہے تو حقیقت میں بینائی نہیں ہے، بلکہ وہ تو اندھا پن ہے اور بینائی تو اس کی جا چکی ہے، قرآن کریم میں فرمادیا:

﴿مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا﴾(۲)

---

(۱) کنز العمال، رقم: ۴۴۴۳۷ (۱۶/۲۷۶)، جامع الأحادیث، رقم: ٦٢٩٦ (٢٧٩/٧)

(۲) بنی إسرائیل: ۷۲، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ”اور جو شخص دنیا میں اندھا بنا رہا، وہ آخرت میں بھی اندھا، بلکہ راستے سے اور زیادہ بھٹکا ہوا رہے گا“

لہٰذا انسان یہ عہد کرلے کہ میں اس نگاہ کو غلط جگہ پر استعمال نہیں کروں گا، اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمت اور حوصلے میں، عہد میں بڑی طاقت رکھی ہے، یہ انسان کی ہمت ربڑ کی طرح ہے۔ اس کو جتنا چاہو کھینچ لو۔ جب انسان اس ہمت کو استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس ہمت میں برکت اور ترقی عطا فرماتے ہیں۔

خلاصہ

بہرحال! اس نگاہ پر دو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، ایک یہ کہ نامحرم عورت کو لذت کی نگاہ سے دیکھنا، اور دوسرے یہ کہ کسی مسلمان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا، کسی مسلمان پر حقارت کی نظر ڈالنا یہ بھی آنکھ کا گناہ ہے۔ ان دونوں گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرلیا جائے تو انشاء اللہ زندگی درست ہو جائے گی، اور خیالات وجذبات بھی پاکیزہ ہوں گے اور اللہ تعالیٰ بھی راضی ہو جائیں گے، اور آخرت کی بھی تیاری ہو جائے گی۔ اور اگر یہ طریقہ اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مشین کو علی الاطلاق استعمال کررہے ہیں، اس پر کوئی قید اور کوئی پابندی نہیں لگا رہے ہیں تو یہی آنکھ آپ کو جہنم کے گڑھے میں لے جاکر ڈالے گی اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق بنادے گی، اس لئے اس آنکھ کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آنکھ کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ مضمون ابھی باقی ہے لیکن وقت ختم ہو چکا ہے، زندگی رہی تو اگلے جمعہ میں انشاء اللہ عرض کروں گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

آنکھیں بڑی نعمت ہیں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ،
﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۙ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خٰشِعُونَ ۙ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۙ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُونَ ۙ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ ۙ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُونَ ۞﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۃ مؤمنون کی پانچویں اور چھٹی آیت کا بیان گزشتہ دو جمعوں سے چل رہا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مؤمنوں کی فلاح کے لئے جو صفات بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک صفت یہ ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ﴾

جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی طبیعت میں ایک جنسی جذبہ رکھا ہے اور چونکہ اسلام ایک دینِ فطرت ہے، لہٰذا اس جنسی جذبے کی تسکین کے لئے اللہ تعالیٰ نے حلال راستہ تجویز فرمادیا، وہ نکاح کا راستہ ہے کہ نکاح کے ذریعہ انسان اپنے اس فطری جذبے کی تکمیل کرے، تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ موجبِ اجر وثواب بھی ہے۔ لیکن اس نکاح کے راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کرنے والے لوگ حد سے گزرنے والے ہیں۔ قرآن کریم نے لفظ تو بہت مختصر استعمال فرمایا کہ وہ حد سے گزرنے والے ہیں۔ لیکن اس کے مفہوم میں بہت ساری خرابیاں داخل ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/ ۱۶۸ تا ۱۸۲)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) المؤمنون: ۱۔۸، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے۔ جو اپنی نمازوں میں دل سے جھکنے والے ہیں، اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اور جو زکوۃ پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابل ملامت نہیں ہیں، ہاں جو اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیں تو ایسے لوگ حد سے گذرے ہوئے ہیں''

جو شخص نکاح کے رشتے کے باہر اپنے جنسی جذبے کی تسکین کرنا چاہے وہ شخص معاشرے کے اندر فساد اور بگاڑ پھیلاتا ہے، یہ اس آیت کے مطلب اور تشریح کا خلاصہ ہے۔

پہلا حکم: نگاہ کی حفاظت

شریعت نے جہاں ناجائز جنسی تسکین کا راستہ بند کیا اور اس کو حرام قرار دیا تو اس کے لئے فضا بھی ایسی سازگار پیدا فرمائی جس میں اس حکم پر عمل کرنا انسان کے لئے آسان ہو جائے۔ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے نکاح کے راستے کو آسان سے آسان فرمایا ہے۔ لیکن ہم نے اپنے معاشرے میں طرح طرح کی رسموں اور قیدوں سے اس نکاح کو جکڑ کر اپنے لئے اس کو مشکل بنا دیا ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے وہ تمام دروازے بند فرمائے جو انسان کو بدکاری کی طرف لے جانے والے ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلا حکم نگاہوں کی حفاظت کا حکم دیا کہ اپنی نگاہ کو پاکیزہ رکھو، اور اس کو غلط جگہ پر استعمال نہ کرو۔ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلنَّظْرَةُ سَهْمٌ مَسْمُوْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ))(۱)

''یہ نظر شیطان کے زہر کے بجھے ہوئے تیروں میں سے ایک تیر ہے''

بعض اوقات صرف ایک نگاہ انسان کے دل کی حالت کو خراب کر دیتی ہے، اس میں فساد پیدا کر دیتی ہے۔ بعض اوقات ایک غلط نگاہ کے نتیجے میں انسان کی سوچ، انسان کی فکر، اس کے خیالات اس کے جذبات اور بعض اوقات اس کا کردار بھی خراب ہو جاتا ہے، اس لئے شریعت نے پہلا پہرہ انسان کی نگاہ پر عائد فرمایا۔

آنکھیں بڑی نعمت ہیں

یہ نگاہ اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت ہے کہ اگر کوئی انسان بینائی سے محروم ہو تو وہ لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کر کے بھی یہ نعمت حاصل نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت ہمیں مفت میں بغیر معاوضے کے عطا فرما رکھی ہے، اس لئے اس نعمت کی قدر نہیں ہوتی۔ اور یہ نعمت پیدائش سے لے کر مرتے دم تک تمہارے ساتھ رہتی ہے۔ یہ نازک اتنی ہے کہ اگر ذرا اس کے اندر کوئی بال آجائے، ذرا خراش لگ جائے تو یہ بیکار ہو جائے، لیکن اتنی نازک مشین پوری زندگی انسان کا ساتھ دیتی ہے اور اس طرح ساتھ دیتی ہے کہ نہ اس کی سروس کی ضرورت ہے نہ اس کو پٹرول اور تیل کی ضرورت ہے بلکہ اللہ تعالیٰ

(۱) مجمع الزوائد (۸/۶۳)، کنز العمال، رقم: ۱۳۰۶۸ (۵/۴۸۱)، عدة الصابرين وذخيرة الشاكرين (۱/۱۸)

آٹو میٹک نظام کے تحت اس کی سروس بھی کرتے رہتے ہیں اور اس کو غذا بھی پہنچاتے رہتے ہیں، چنانچہ جو لقمہ تم اپنی بھوک مٹانے کی خاطر کھاتے ہو اسی لقمہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ جسم کے ہر حصے کو غذا پہنچاتے ہیں، اسی طرح آنکھ کو بھی پہنچاتے ہیں۔

آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں

یہ آنکھ تمہیں اس لئے دی گئی ہے تاکہ تم اس کے ذریعہ لذت حاصل کرو، تاکہ اس کے ذریعہ تم اپنے کام نکالو، اس آنکھ پر صرف چیزوں کو نہ دیکھنے کی پابندی عائد کی گئی ہے کہ ان چیزوں کی طرف مت دیکھنا، وہ یہ کہ کسی نامحرم خاتون کو لذت حاصل کرنے کی غرض سے مت دیکھنا، ایسا کرنے کو گناہ قرار دیا گیا اور فرمایا کہ یہ آنکھوں کا زنا ہے۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اَلْعَيْنَانِ تَزْنِيَانِ، وَزِنَاهُمَا النَّظَرُ))(۱)

یعنی آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا دیکھنا ہے۔ لذت کی غرض سے شہوت کی نگاہ سے کسی غیر محرم کو دیکھنا یہ بدنظری ہے، اس کو شریعت میں ناجائز اور حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ جب تمہاری نگاہ محفوظ ہوگی تو تمہارے خیالات بھی پاکیزہ ہوں گے، تمہارے جذبات بھی پاکیزہ وں گے، اور پھر تمہارے اعمال بھی پاکیزہ ہوں گے۔

شرمگاہ کی حفاظت آنکھ کی حفاظت پر ہے

چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ﴾(۲)

"اے محمد ﷺ! آپ مؤمنوں سے فرمادیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں"

یہ تمہارے لئے پاکی حاصل کرنے کا بہترین راستہ ہے اور عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ اس کے ذریعے یہ بتادیا کہ شرمگاہ کی حفاظت کا راستہ یہ ہے کہ اس کا آغاز آنکھ کی حفاظت سے ہو، اور جب آنکھ محفوظ رہے گی تو پھر تمہاری شرمگاہ بھی محفوظ رہے گی اور تم بدکاری سے محفوظ رہو گے۔ یہ حکم کسی مولوی اور ملا کا بیان کردہ حکم نہیں ہے، یہ کسی قدامت

---

(۱) مختصر ارواء الغليل، رقم: ۲۳۷۰ (۴۷۱/۱)، غاية المرام، رقم: ۱۸۴ (۱۳۲/۱) اس حدیث کے مضمون کی تائید بخاری، مسلم اور احمد بن حنبل کی ذکر کردہ بیشتر روایات سے بھی ہوتی ہے۔

(۲) النور: ۳۰

پسند، مذہبی، دہشت گرد کا حکم نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جو قرآن کریم کے اندر بیان فرمایا ہے۔

قلعے کا محاصرہ کرنا

جب تک مسلمانوں نے اس حکم پر عمل کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان فتنوں اور فسادات سے محفوظ رکھا۔ میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا تھا جو ایک تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور بڑے درجے کے صحابہ میں سے ہیں، اور شام کے فاتح ہیں، اس لئے کہ شام کے بہت سے علاقوں کی فتح کا سہرا اللہ تعالیٰ نے ان کے سر رکھا، بعد میں وہ شام کے گورنر رہے۔ ان کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے غیر مسلموں کے قلعے پر حملہ کیا، اور اس قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرہ لمبا ہوگیا اور قلعہ فتح نہیں ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب قلعہ کے لوگوں نے یہ دیکھا کہ مسلمان بڑی ثابت قدمی سے محاصرہ کیے ہوئے ہیں تو انہوں نے ایک سازش تیار کی۔ وہ یہ کہ ہم مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہم قلعے کا دروازہ آپ کے لئے کھول رہے ہیں، آپ اپنی فوج کو لے کر شہر میں داخل ہو جائیں۔ اور یہ سازش کی کہ شہر کا دروازہ جس طرف کھلتا تھا اس طرف بہت لمبا بازار تھا۔ جس کے دونوں طرف دکانیں تھیں اور وہ بازار شاہی محل پر جاکر ختم ہوتا تھا۔ ان لوگوں نے بازار کے دونوں طرف عورتوں کو مزین کر کے اور آراستہ کر کے ہر دکان پر ایک ایک عورت کو بٹھا دیا، اور ان عورتوں کو یہ تاکید کردی کہ اگر یہ مجاہدین داخل ہونے کے بعد تمہیں چھیڑنا چاہیں اور تمہارے ساتھ کوئی معاملہ کرنا چاہیں تو تم انکار مت کرنا، رکاوٹ مت ڈالنا۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ یہ لوگ حجاز کے رہنے والے ہیں، مہینوں سے اپنے گھروں سے دور ہیں، جب اندر داخل ہونے کے بعد اچانک ان کو خوبصورت اور آراستہ عورتیں نظر آئیں گی تو یہ لوگ ان کی طرف مائل ہوں گے، اور جب یہ ان کے ساتھ مشغول ہوں گے، اس وقت ہم پیچھے سے ان پر حملہ کردیں گے۔

مؤمن کی فراست سے بچو

منصوبہ بنا کر قلعے کے والی نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام بھیجا کہ ہم ہار مان گئے ہیں اور اب ہم قلعے کا دروازہ آپ کے لئے کھول رہے ہیں، آپ اپنی فوج کو لے کر قلعے کے اندر داخل ہو جائیں۔ جب حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام ملا جب اللہ تعالیٰ ایمان عطا فرماتے ہیں تو فراستِ ایمانی بھی عطا فرماتے ہیں، حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ))(۱)

''مؤمن کی فراست سے بچو، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے''

جب یہ پیغام ملا تو حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا ماتھا ٹھنک گیا کہ اب تک یہ لوگ مقابلے کے لئے تیار تھے اور دروازہ نہیں کھول رہے تھے، اور اب اچانک یہ کیا بات ہوئی کہ انہوں نے دروازہ کھولنے کی پیش کش کر دی، اور فوجوں کو داخل ہونے کی اجازت دے دی، اس میں ضرور کوئی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔

پورا لشکر بازار سے گزر گیا

چنانچہ آپ نے سارے لشکر کو جمع کیا اور ان کے سامنے خطبہ دیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دشمن نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور وہ ہمیں داخل ہونے کی دعوت دے رہا ہے، آپ لوگ بیشک داخل ہوں، لیکن میں آپ کے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت پڑھتا ہوں، آپ اس آیت کو پڑھتے ہوئے اور اس آیت پر عمل کرتے ہوئے داخل ہوں، اس وقت آپ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ﴾(۲)

''مؤمنوں سے کہہ دو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں''

یہ ان کے لئے پاکیزگی کا راستہ ہے چنانچہ لشکر قلعے کے اندر اس شان سے داخل ہوا کہ ان کی نگاہیں نیچی تھیں اور اسی حالت میں پورے بازار سے گزر گئے اور شاہی محل تک پہنچ گئے اور کسی نے دائیں بائیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا کہ کیا فتنہ ان دکانوں میں ان کا انتظار کر رہا ہے۔

یہ منظر دیکھ کر اسلام لائے

جب شہر والوں نے یہ منظر دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ یہ کونسی مخلوق ہے، اس لئے کہ کوئی فوج فاتح بن کر کسی شہر میں داخل ہوتی ہے تو سینہ تان کر داخل ہوتی ہے، آزادی کے ماحول میں داخل ہوتی ہے، اور لوٹ مار کرتی ہے اور عصمتیں لوٹتی ہے، لیکن یہ عجیب وغریب لشکر اس شان سے داخل ہوا چونکہ ان کے امیر نے کہہ دیا تھا کہ نگاہیں نیچی رکھنا تو سب کی نگاہیں نیچی تھیں، اور اس حالت میں پورا لشکر اس بازار کو پار کر گیا۔ اور شہر کے بے شمار لوگ صرف یہ منظر دیکھ کر مسلمان ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ نے

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة الحجر، رقم: ۳۰۵۲

(۲) النور: ۳۰

ان کو اسلام کی توفیق عطا فرمادی۔

کیا اسلام تلوار سے پھیلا ہے؟

لوگ کہتے ہیں کہ ''اسلام'' تلوار سے پھیلا تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس کردار سے پھیلا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس عمل سے پھیلا تھا۔

بہر حال! آنکھوں کو نیچے رکھنے کے عمل نے نہ صرف یہ کہ ان کو جسمانی اور نفسانی اور شہوانی فتنے سے محفوظ رکھا، بلکہ اس ذریعہ سے دشمن کے منصوبے اور ان کی چال سے بھی حفاظت فرمائی۔

شیطان کا حملہ چار اطراف سے

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو جنت سے نکالا اور اس کو راندۂ درگاہ کیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑے چیلنج کے انداز میں کہا تھا کہ جب آپ نے مجھے جنت سے نکالا ہے اور میری یہ دعا بھی آپ نے قبول کر لی ہے کہ میں قیامت تک زندہ رہوں گا تو اس نے یہ عزم کیا تھا کہ یہ آدم جس کی وجہ سے مجھے جنت سے نکلنا پڑا اس کی اولاد کو میں اس طرح گمراہ کروں گا:

﴿لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ﴾(۱)

میں ان کے سامنے سے حملہ کروں گا، ان کے پیچھے سے حملے کروں گا، دائیں سے حملے کروں گا، بائیں طرف سے حملے کروں گا، اور آپ کی اس مخلوق پر چاروں طرف سے حملے کروں گا۔ لہٰذا شیطان نے چاروں جہتیں گھیر رکھی ہیں۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ دو سمتوں کو بیان کرنا بھول گیا، ایک اوپر کی جہت اور ایک نیچے کی جہت۔ لہٰذا یہ چاروں سے تو حملہ آور ہے اور اس سے بچاؤ کا راستہ یا تو اوپر ہے، یا نیچے ہے۔ اور اوپر کے راستہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرو، اور اس سے مدد مانگو، اس سے رجوع کرو، اس کی طرف انابت کرو اور کہو کہ یا اللہ! یہ شیطان مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اپنے فضل وکرم سے مجھے شیطان کے حملوں سے بچایئے۔ لہٰذا اوپر کا راستہ تو شیطان سے اس لئے محفوظ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ ہے۔

---

(۱) الاعراف: ۱۷

نیچے کا راستہ محفوظ ہے

اور نیچے کا راستہ شیطان سے اس لئے محفوظ ہے تاکہ تم نگاہ کو نیچے کر کے چلو، دائیں بائیں آگے پیچھے ان چاروں طرف سے شیطان کا حملہ ہوسکتا ہے، لیکن نیچے کی جہت شیطان کے حملے سے محفوظ ہے۔ جب تم نیچے نگاہ کر کے چلو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت فرمائیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ یہ حکم دے رہے ہیں کہ اپنی نگاہ کو نیچے کر کے چلو تاکہ اس فتنے میں مبتلا نہ ہو۔

بہر حال! یہ نگاہ کا فتنہ انسان کے باطنی اخلاق کو باطنی کیفیات کو تباہ کرنے والا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ بلا ایسی پھیل گئی ہے کہ شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ اس سے بچا ہوا ہوگا۔ ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ چاروں طرف نگاہ کو متوجہ کرنے اور نگاہ کو لبھانے کے سامان بکھرے پڑے ہیں۔ ہر طرف سے دعوتِ نظارہ مل رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو معاشرہ نبی کریم ﷺ نے قائم فرمایا تھا اس معاشرے میں پردہ تھا، حجاب تھا، حیاء تھی، شرم تھی، اور انسانیت کی اعلیٰ صفات اس کے اندر موجود تھیں۔ لیکن آج کے معاشرے میں بے پردگی، بے حیائی، بے شرمی اور فحاشی اور عریانی کی دوڑ چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے کسی طرف نگاہ کو پناہ نہیں ملتی۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کا دھیان

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمتیں کمزور ہوگئی ہیں اور ایک مؤمن کے اندر اپنے آپ پر قابو پانے کا جو ملکہ ہونا چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کو ہر وقت پیش نظر رکھے وہ ایمان کا جذبہ کمزور پڑ گیا ہے، اس کی وجہ سے چاروں طرف بدنظری کا فتنہ پھیلا ہوا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھئے کہ شریعت کے جس حکم پر عمل کرنا جس وقت مشکل ہو جاتا ہے اتنا ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فضل و کرم ہوتا ہے اور اتنا ہی اس حکم پر اجر و ثواب بھی زیادہ دیا جاتا ہے۔

اچٹتی نگاہ معاف ہے

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر پہلی مرتبہ بلا قصد اور بلا ارادہ کسی نامحرم پر نگاہ پڑ جائے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں معاف ہے اس پر کوئی گناہ نہیں، البتہ حکم یہ ہے کہ جب بے اختیار نگاہ پڑے تو فوراً ہٹالو۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَكَ النَّظْرَةُ الأُولٰى وَلَيْسَتْ لَكَ الثَّانِيَةُ))(۱)

---

(۱) جامع الأصول من أحاديث الرسول، رقم: ٤٩٥٤ (٥٠١٤/١)، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

پہلی نگاہ تمہارے لئے ہے، یعنی اس میں کوئی گناہ نہیں، لیکن اگر دوسری نگاہ ڈالی اور اس کو باقی رکھا تو یہ گناہ ہے اور قابل مؤاخذہ ہے۔ لہٰذا اگر کبھی بلا اختیار نگاہ پڑ جائے تو یہ سمجھ کر فوراً ہٹائے کہ یہ میرے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور یہ مراقبہ کرے کہ جس وقت میں آنکھ کا غلط استعمال کر رہا ہوں، اگر اس وقت اللہ تعالیٰ میری بینائی واپس لے لے اور مجھ سے یہ کہا جائے کہ جب تک تم بدنگاہی نہیں چھوڑو گے اس وقت تک یہ بینائی نہیں ملے گی تو میں ہزار مرتبہ اس بدنگاہی کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاؤں گا۔ جب میں اس وقت اس گناہ سے بچنے کے لئے تیار ہو سکتا ہوں تو آج بھی یہ سوچ کر تیار ہو سکتا ہوں کہ میرے مالک نے مجھے اس گناہ سے منع کیا ہے۔

یہ نمک حرامی کی بات ہے

آدمی یہ سوچے کہ جس محسن نے بلا معاوضہ بے مانگے بلا قیمت یہ نعمت مجھے دے رکھی ہے اس کی مرضی کے خلاف اس کو استعمال کرنا بڑی بے حیائی کی بات ہے اور بڑی نمک حرامی کی بات ہے، اس نمک حرامی سے بچنے کے لئے میں اس گناہ کو چھوڑتا ہوں اور پھر ہمت کر کے اس نگاہ کو ہٹا لے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمت میں بڑی طاقت دی ہے، اپنی ہمت سے بڑے بڑے پہاڑ سر کر لیتا ہے، لہٰذا اس ہمت کو استعمال کرو اور اس نظر کو ہٹالو، اور نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث میں یہ وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈر کر نگاہ کو غلط جگہ سے ہٹالے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی ایسی روحانی لذت عطا فرمائیں گے جس کے آگے بدنگاہی کی لذتیں ہیچ در ہیچ ہیں، ان لذتوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا

اس کے علاوہ یہ کرو کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے رہو کہ یا اللہ! میں کمزور ہوں، بے ہمت ہوں، بے حوصلہ ہوں، اے اللہ! جب آپ نے یہ کام گناہ قرار دیا ہے تو اپنی رحمت سے مجھے ہمت بھی عطا فرمایئے، مجھے حوصلہ بھی دیجئے، اور مجھے اس بات کی توفیق عطا فرمایئے کہ میں آپ کے اس حکم پر عمل کر سکوں، اور آپ کی دی ہوئی اس نعمت کو صحیح استعمال کر سکوں، غلط جگہ استعمال کرنے سے بچوں۔ خاص طور پر اس وقت جب آدمی گھر سے باہر نکلے، چونکہ وہ اس وقت فتنے کے ماحول کی طرف نکل رہا ہے، نہ جانے کونسا فتنہ پیش آجائے، اس لئے گھر سے نکلنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ یا اللہ!

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) شرح معاني الآثار، رقم: ٣٩٦٨ (١٥/٣)، شعب الإيمان للبيهقي (٣٦٥/١) بعض روایات میں ليست لك الآخرة کے الفاظ ہیں، سنن الترمذي، كتاب الأدب عن رسول الله، باب ما جاء في نظرة المفاجأة، رقم: ٢٧٠١

میں عہد تو کرتا ہوں کہ آپ کی دی ہوئی اس نعمت کو غلط استعمال نہیں کروں گا لیکن مجھے اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے اور میں اس وقت تک نہیں بچ سکتا جب تک آپ کی مدد شامل نہ ہو، اس لئے یا اللہ! مجھے اپنے فضل و کرم سے اس فتنے سے بچا لیجئے۔ یہ دعا مانگ کر گھر سے باہر نکلو اور ہمت کو کام میں لاؤ، اور اگر کبھی غلطی ہو جائے تو فوراً توبہ استغفار کرو۔ اگر انسان یہ کام کرتا رہے تو ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ وہ اس فتنے سے محفوظ رہ سکے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے بھی اور آپ کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

گناہ چھوڑ دو، عابد بن جاؤ گے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((إِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ، وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ، وَأَحْسِنْ إِلٰی جَارِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا، وَأَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ، وَلَا تُكْثِرِ الضَّحِكَ فَإِنَّ كَثْرَةَ الضَّحِكِ تُمِيْتُ الْقَلْبَ))(۱)

یہ ایک حدیث ہے، جس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرما رہے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، آپ نے فرمایا کہ میں پانچ باتیں کہتا ہوں، کون شخص ہے جو ان پانچ باتوں کو یاد رکھے، اور ان پر عمل کرے، اور یہ باتیں دوسروں کو بتا کر ان کو بھی ان پر عمل کرائے؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا "میں ان پانچ باتوں کو یاد بھی رکھوں گا، اور عمل کرنے کی بھی کوشش کروں گا، اور دوسروں تک ان کو پہنچاؤں گا" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلیوں پر گن کر یہ کلمات ارشاد فرمائے، ان میں سے ایک ایک کلمہ جوامع الکلم کے اندر شامل ہے، ہر جملہ اور ہر کلمہ اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادے تو ہمارا سارا معاملہ درست ہو جائے۔

عبادت گزار کیسے بنو گے؟

پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((إِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ))

یعنی تم حرام کاموں سے بچو تو تم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/۸۸ تا ۱۰۲)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، كتاب الزهد عن رسول الله، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس، رقم: ۲۲۲۷، مسند أحمد، رقم: ۷۷٤۸

حضورِ اقدس ﷺ نے اس جملہ کے ذریعے یہ حقیقت واضح فرمادی کہ فرائض و واجبات کی تعمیل کے بعد سب سے زیادہ اہم چیز مؤمن کے لئے یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ناجائز و حرام کاموں سے بچائے، نفلی عبادتوں کا معاملہ اس کے بعد آتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس دنیا میں اپنے آپ کو گناہوں سے بچالے تو ایسا شخص سب سے زیادہ عبادت گزار ہے، چاہے وہ نفلیں زیادہ نہ پڑھتا ہو۔

نفلی عبادات نجات کے لئے کافی نہیں

حضورِ اقدس ﷺ نے اس جملے کے ذریعہ ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ فرمایا ہے، وہ یہ کہ ہم لوگ بسا اوقات نفلی عبادتوں کو تو بہت اہمیت دیتے ہیں، مثلاً نوافل پڑھنا، تسبیح، مناجات، تلاوت وغیرہ، حالانکہ ان میں کوئی ایک کام بھی ایسا نہیں جو فرض ہو، چاہے نفلی نمازیں ہوں، یا نفلی روزے ہوں، یا نفلی صدقات ہوں، ان کو تو ہم نے بڑی اہمیت دی ہوئی ہے، لیکن گناہوں سے بچنے کا اور ان کو ترک کرنے کا اہتمام نہیں۔ یاد رکھیں کہ یہ نفلی عبادات انسان کو نجات نہیں دلاسکتیں، جب تک کہ انسان گناہوں کو نہ چھوڑے۔ اب رمضان المبارک کا مہینہ چل رہا ہے، اس ماہِ مبارک میں لوگوں کی نفل عبادات کی طرف توجہ ہوتی ہے کہ عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ نفلیں پڑھ لیں، تلاوت زیادہ کرلیں، ذکر و تسبیح زیادہ کرلیں، یہ بھی اچھی بات ہے۔ لیکن کوئی یہ نہیں سوچتا کہ میں نفل عبادات تو کررہا ہوں، ساتھ میں گناہ بھی تو کررہا ہوں، اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے، ان کے اندر مبتلا ہورہا ہوں، دونوں کا اگر موازنہ کریں تو یہ نظر آئے گا کہ نفلی عبادات سے جو فائدہ ہورہا تھا، وہ گناہوں کے ذریعے نکل رہا ہے۔

گناہوں کی مثال

اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ نے اپنے کمرے کا ایئر کنڈیشن تو چلا دیا، لیکن دروازے اور کھڑکیاں کھلی پڑی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف سے ٹھنڈک آرہی ہے، اور دوسری طرف سے ٹھنڈک نکل رہی ہے، اور باہر کی گرمی بھی اندر آرہی ہے، اور اس کے نتیجے میں کمرہ ٹھنڈا نہیں ہورہا ہے، اور ایئر کنڈیشن چلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہورہا ہے۔ اسی طرح آپ نے نفلوں کا ایئر کنڈیشن تو لگالیا، ذکر اور تلاوت کا ایئر کنڈیشن تو لگالیا، لیکن گناہوں کی کھڑکیاں چاروں طرف سے کھلی ہوئی ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ان عبادات سے جو فائدہ حاصل ہونا چاہئے تھا، وہ حاصل نہیں ہورہا ہے۔

حلال کھانے کی فکر کرو

اب رمضان المبارک میں تراویح پڑھنے کا کتنا اہتمام ہم لوگ کر رہے ہیں، جو لوگ پنج وقتہ نمازوں میں کوتاہی کرتے ہیں، ان کو بھی رمضان میں تراویح کی لمبی لمبی بیس رکعتوں میں کھڑے ہونے میں کوئی تأمل نہیں ہوتا، اور رات کو سحری کے وقت تہجد بھی پڑھ لیتے ہیں۔ لہٰذا نفلی عبادات تو ہو رہی ہیں۔ لیکن اس شخص کو یہ فکر نہیں کہ جب شام کو افطار کرنے کے لئے دسترخوان پر بیٹھیں گے تو وہ کھانا حلال ہوگا یا حرام ہوگا؟ سارا دن روزہ رکھا، رات کو تراویح ادا کی، تہجد پڑھے، لیکن منہ میں جو لقمہ جا رہا ہے، وہ حلال کا ہے یا حرام کا ہے، اس کی فکر نہیں۔ اس حدیث کے ذریعے حضور اقدس ﷺ یہ فرما رہے ہیں کہ اصل فکر اس کی کرو کہ کوئی گناہ تم سے سرزد نہ ہو۔ اگر یہ کر لیا تو پھر چاہے نفلی عبادات تم نے زیادہ نہ کی ہوں، تو بھی تمام لوگوں میں تم سب سے زیادہ عبادت گزار لکھے جاؤ گے۔

دونوں میں سے کون افضل ہے؟

اس بات کو ایک مثال سے اور زیادہ واضح طریقے پر سمجھ لیں، فرض کریں کہ ایک شخص نفلی عبادات بھی کرتا ہے، ذکر میں، تلاوت میں مشغول رہتا ہے، ہر وقت اس کی تسبیح چلتی رہتی ہے، لیکن ساتھ میں وہ گناہ بھی کرتا رہتا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جس نے زندگی بھر ایک نفلی عبادت نہیں کی، لیکن زندگی بھر اس نے کوئی گناہ بھی نہیں کیا، بتاؤ! ان دونوں میں سے افضل کون ہے؟ وہ شخص افضل ہے جس نے گناہوں سے بچتے ہوئے زندگی گزاری، اگرچہ نفلی عبادتوں میں اس کا کوئی خاص حصہ نہیں ہے۔ اس شخص سے آخرت میں یہ سوال نہیں ہوگا کہ تم نے نفلی عبادات کیوں نہیں کیں؟ کیونکہ نفلی عبادات فرض نہیں ہیں، لہٰذا انشاء اللہ وہ سیدھا جنت میں جائے گا۔ اس کے برخلاف پہلا شخص جو نفلی عبادات میں تو بہت مشغول رہا، لیکن ساتھ ساتھ گناہ بھی کرتا رہا، اور گناہ ایسی چیز ہے جس کے بارے میں آخرت میں سوال ہوگا، "مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ"(۱)

لہٰذا اس سے یہ سوال ہوگا کہ تو نفلی عبادات تو کرتا رہا، اور یہ گناہ کا کام بھی کرتا رہا، نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسا شخص بڑے خسارے میں ہوگا۔

دو عورتوں کا واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ کی مجلس میں دو عورتوں کا ذکر کیا

(۱) الزلزال:۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جس نے ذرہ برابر کوئی برائی کی ہوگی، وہ اسے دیکھے گا''

گیا۔ ایک عورت تو بہت عبادت میں مشغول رہتی ہے، نوافل بہت پڑھتی ہے، لیکن زبان کی خراب ہے، اور اپنی زبان سے لوگوں کو اور خاص کر اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ دوسری عورت صرف فرائض و واجبات پر اکتفا کرتی ہے، نفلی عبادات زیادہ نہیں کرتی، لیکن زبان کی بڑی میٹھی ہے، اور لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتی ہے، اس کی پڑوسنیں اس سے خوش ہیں۔ پھر آپ سے سوال کیا گیا کہ ان میں سے کون سی عورت افضل ہے؟ وہ عبادت گزار خاتون، یا یہ پرہیزگار خاتون؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ دوسری خاتون پہلی خاتون کے مقابلے میں بدرجہا فضیلت رکھتی ہے، بلکہ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ پہلی خاتون جہنمی ہے، اور دوسری خاتون جنتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ زبان سے دوسروں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔(۱)

زیادہ فکر اس کی کریں

اس حدیث سے بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ نفلی عبادات بیشک اعلیٰ درجے کی نعمت ہے، ضرور ان کو انجام دینا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ زیادہ فکر اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کی کرنی چاہئے۔ رمضان المبارک میں تو الحمدللہ، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے روزے رکھے، تلاوت بھی خوب کی، تراویح بھی باجماعت ادا کی، تہجد بھی پڑھے، نوافل بھی پڑھیں، اعتکاف بھی کیا، لیکن ادھر رمضان رخصت ہوا، ادھر دوبارہ وہی پرانی زندگی شروع ہوگئی۔ اب نہ آنکھ کی حفاظت، نہ زبان کی حفاظت، نہ کان کی حفاظت، نہ حلال و حرام کی فکر، جس کا مطلب یہ ہوا کہ رمضان المبارک میں جو پونجی نیکیوں کی جمع کی تھی، وہ جا کر لٹا دی۔ لہٰذا فکر اس کی کرنی ہے کہ گناہوں سے بچ جائیں، اور گناہوں سے بچنے کا پکا عزم بھی کریں، اور ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے گناہوں سے بچنے کی توفیق کی دعا بھی کریں کہ یا اللہ! مجھے گناہوں سے بچنے کی توفیق بھی دیدے۔

یہ بڑی خطرناک بات ہے

یہ جو میں نے عرض کیا کہ ہمارے دلوں میں نفلی عبادات کی تو اہمیت ہے، لیکن گناہوں سے بچنے کی اہمیت اور فکر نہیں، یہ ایک ایسا مرض ہے جس میں ہم سب مبتلا ہیں، شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ اس سے مستثنیٰ ہوگا۔ اس لئے کہ بعض گناہ تو ایسے ہیں، جن کو ہم گناہ سمجھتے ہیں، اور گناہ سمجھنے کی وجہ سے ان سے نفرت بھی ہوتی ہے، ان سے اپنے آپ کو بچانے کی کچھ فکر بھی ہو جاتی ہے، الحمدللہ، لیکن کتنے گناہ ایسے ہیں جن کو گناہ سمجھا ہی نہیں جاتا، یہ بڑی خطرناک بات ہے، کیونکہ انسان بیماری کو بیماری سمجھے گا تو اس کا

(۱) مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۹۲۹۸

علاج بھی کرے گا۔ خاص طور پر شریعت کے یہ تین شعبے، یعنی معاملات، معاشرت اور اخلاقیات ایسے ہیں، جن پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہماری ساری کوششیں اکارت ہو رہی ہیں۔ معاملات میں حلال و حرام کی فکر، معاشرت میں حلال وحرام کی فکر، اخلاقیات میں حلال وحرام کی فکر ختم ہوتی جارہی ہے، اور ان کو ہم نے دین سے خارج کردیا ہے۔ زبان کی حفاظت، آنکھ کی حفاظت، کان کی حفاظت کی طرف دھیان نہیں۔

بدگمانی کو چھوڑو

چند موٹے موٹے گناہوں کے بارے میں تو ذہن میں یہ ہے کہ یہ گناہ ہیں، بس ان سے بچ جاؤ، الحمد للہ، ان سے بچے ہوئے ہیں، مثلاً اللہ کا شکر ہے کہ شراب نہیں پیتے، اللہ کے فضل و کرم سے خنزیر نہیں کھاتے، اللہ کے فضل وکرم سے زنا میں مبتلا نہیں ہوتے۔ لیکن اور جو بے شمار گناہ ہیں، مثلاً غیبت کا گناہ ہے، اس سے ہم نہیں بچتے۔ دن رات ہماری مجلسیں غیبت سے بھری ہوئی ہیں۔ بدگمانی کا گناہ ہے، قرآن کریم میں ہے:

﴿إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾(۱)

لیکن ہم لوگ دوسرے آدمی کی طرف سے اپنے دل میں بدگمانی لیے بیٹھے ہیں، اور اس کو پکارہے ہیں، لیکن ہم لوگ اس کو گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ یہ بات ذہن میں لے کر بیٹھ گئے کہ فلاں شخص نے میرے خلاف یہ عمل کیا ہوگا، اور اب اس کو اپنے دماغ و دل میں پکالیا۔ یہ ہمارا عمل "إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ" میں داخل ہوگیا، لیکن یہ احساس نہیں کہ یہ گناہ ہے۔

افواہ پھیلانا گناہ ہے

ایک بے تحقیق بات سنی، اور اس کی تحقیق کیے بغیر کہ وہ بات درست ہے یا نہیں، اس کو آگے چلتا کردیا، اور اس کو کسی اور کے سامنے بیان کردیا، یا افواہ پھیلادی۔ اس عمل کو کوئی شخص بھی گناہ نہیں سمجھتا، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ))(۲)

یعنی یہ بات بھی جھوٹ میں داخل ہے کہ انسان نے جو کچھ اُلٹا، سیدھا، صحیح، غلط سنا، اور بلا تحقیق اس کو آگے بیان کرنا شروع کردیا۔ یہ گناہ ہے، مگر ہم اس کو گناہ سمجھتے ہی نہیں۔

(۱) الحجرات: ۱۲، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "بعض گمان گناہ ہوتے ہیں"

(۲) صحيح مسلم، المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع، رقم: ٦، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في التشديد في الكذب، رقم: ٤٣٤٠

ملازمت کے اوقات پورے دے رہے ہو؟

لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہم حلال کھا رہے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ سود نہیں کھا رہے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ جوا نہیں کھیل رہے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ شراب بیچ کر پیسے نہیں کما رہے ہیں۔ لیکن ذرا یہ تو دیکھو کہ اگر تم ملازم ہو تو کیا ملازمت کا جو وقت مقرر تھا وہ پورا وقت ملازمت کے کام میں لگایا یا نہیں؟ یا ڈنڈی مار گئے۔ اگر پورا وقت نہیں لگایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنا وقت تم نے بیچا تھا، اور جس کے بدلے میں تمہیں تنخواہ مل رہی تھی، اس میں سے جتنا وقت تم نے ملازمت کے کام میں نہیں لگایا، اس کے بدلے میں جو تنخواہ تم نے وصول کی، وہ تنخواہ حرام ہو گئی، اور جب تنخواہ حرام ہو گئی تو اب ان پیسوں سے جو کھانا خریدا وہ کھانا حرام ہو گیا، اور جو افطاری کا سامان خریدا وہ حرام۔ لہٰذا یہ بھی حرام خوری میں داخل ہے۔

جاپانی کہہ کر مال فروخت کرنا

اگر کوئی شخص تاجر ہے، اور اس نے اس تجارت میں کسی قسم کا دانستہ یا نادانستہ دھوکہ کیا ہے، مثلاً پاکستان میں بنا ہوا مال تھا، اس کو جاپانی کہہ کر بیچ دیا تو حرام کیا، اور اس کے نتیجے میں جو پیسے حاصل ہوئے وہ حرام ہوئے، اور ان پیسوں سے جو کھانا خریدا وہ حرام، اب پیٹ میں حرام لقمہ جا رہا ہے، حلال کا لقمہ نہیں جا رہا ہے۔

سٹہ کھیلنا حرام ہے

ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے جو بڑے عبادت گزار اور تہجد گزار تھے، ان کی تہجد میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا، اور ذکر و اذکار اور تسبیحات کے پابند تھے۔ تاجر آدمی تھے، ان کی دکان بھی تھی، معلوم ہوا کہ وہ رات کو گھنٹوں تہجد بھی پڑھتے ہیں، تلاوت بھی کرتے ہیں، تسبیحات بھی پڑھتے ہیں، اور دن میں جا کر ''سٹہ'' بھی کھیلتے ہیں، اور وظیفے اس مقصد کے لئے پڑھتے ہیں تاکہ سٹے کا نمبر معلوم ہو جائے۔ یہ تو بالکل واضح گناہ ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ گناہ ہے۔

جھوٹا سرٹیفکیٹ بنوانا

لیکن میں ان چیزوں کی طرف توجہ دلا رہا ہوں جن کے بارے میں یہ احساس بھی نہیں کہ میں یہ کوئی گناہ کا کام کر رہا ہوں۔ مثلاً جھوٹا سرٹیفکیٹ بنوا لینا آج عام ہو چکا ہے۔ چھٹی لینی ہے، اور ویسے

نہیں مل سکتی، تو کسی ڈاکٹر سے جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوالیا، اور اس کی بنیاد پر چھٹی حاصل کر لی۔ اس کے نتیجے میں خود بھی گناہ کیا، اور جس ڈاکٹر سے سرٹیفکیٹ بنوایا، اس کو بھی گناہ میں مبتلا کیا، کیونکہ اس ڈاکٹر نے جھوٹ بولا، اور رشوت بھی لی، اس لئے کہ للہ فی اللہ تو اس نے یہ کام کیا نہیں ہوگا، اس طرح اس ڈاکٹر نے رشوت لینے کا گناہ بھی کمایا، اور جھوٹ بولنے کا گناہ بھی کمایا، اور یہ صاحب اس گناہ کا سبب بنے۔ یہ سب گناہ تو ہوئے، اس کے علاوہ یہ کہ مہینے کے آخر میں جو تنخواہ ملی، اس تنخواہ میں سے اتنا حصہ حرام کا شامل ہو گیا۔

عبادت نام ہے بندگی کا

اس لئے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَکُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ))

یعنی عبادت گزاری یہ نہیں کہ آدمی رات کو خوب نفلیں اور تہجد پڑھ رہا ہے، بلکہ عبادت گزاری یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے انسان اپنے آپ کو محفوظ کرلے، اصلی عبادت گزاری یہ ہے، اس لئے کہ عبادت کے معنی ہیں بندگی، اور بندگی کا پہلا جز اللہ کے حکم کی اطاعت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں تو وہ بندگی کیا ہوئی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ تو کرلیا، لیکن ساتھ میں یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کا حکم نہیں مانوں گا، میں وہی کروں گا جو میری مرضی میں آئے گا، یہ کیا بندگی ہوئی؟ لہٰذا اطاعت بندگی کا جزِ اعظم ہے۔ اس لئے یہ فکر ہونی چاہئے کہ ہم کوئی کام اللہ جل شانہ کے حکم کے خلاف اور نافرمانی میں نہ کریں۔

زبان کی حفاظت کرو

خاص طور پر جو عرض کرنا ہے، اور جس میں عام ابتلاء رہتا ہے، ان میں سے ایک تو زبان کے گناہ ہیں، ایک آنکھ کے گناہ، ان دونوں گناہوں میں اچھے اچھے لوگ مبتلا ہیں۔ جو لوگ بظاہر عابد وزاہد نظر آتے ہیں، متقی و پرہیز گار نظر آتے ہیں، وہ بھی اگر اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ وہ بھی زبان کے گناہ اور آنکھ کے گناہ میں مبتلا ہیں۔ لہٰذا یہ فکر ہونی چاہئے کہ ہماری زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکلے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والا ہو۔ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بعض اوقات انسان اپنی زبان سے کوئی کلمہ بے پرواہی میں ایسا نکال دیتا ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں پہنچا دیتے ہیں۔ (۱)

(۱) کنز العمال، رقم: ۷۸۵۶ (۵۵۱/۳)، روضة المحدثين، رقم: ۳۴۸۱ (۳۱۰/۸)

مثلاً اس نے کسی وقت کسی جذبے کے ساتھ اللہ جل شانہ کی حمد وثنا کرتے ہوئے ''الحمد للہ'' کہہ دیا، یا ''سبحان اللہ'' کہہ دیا، یا کوئی اور ذکر کرلیا، ایسے اخلاص اور جذبے کے ساتھ کیا کہ میرے مولیٰ نے اس کو قبول فرمالیا، اور اسی پر بیڑا پار کردیا۔ یا زبان سے کوئی ایسا کلمہ کہا جس سے ٹوٹے دل کا علاج ہوگیا، اور اس کے دل کو تسلی ہوگئی، اب بظاہر تو تم نے اہتمام کرکے وہ کلمہ نہیں کہا تھا، لیکن چونکہ اس کے ذریعے ٹوٹے دل کی تسلی ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا، اس کی بدولت تمہارا بیڑہ پار کردیا، اور جنت میں پہنچادیا۔

زبان سے نکلنے والا ایک کلمہ

پھر آپ نے فرمایا کہ بعض اوقات انسان اپنی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکالتا ہے جس کو وہ کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا، لیکن اس ایک کلمہ کی بدولت وہ جہنم کا مستحق ہوجاتا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ کلمہ اس کو جہنم میں اتنی گہرائی میں پھینک دیتا ہے کہ جو ستر سال کی مسافت پر ہوتی ہے۔ مثلاً جھوٹ بول دیا، غیبت کردی، کسی کا دل توڑ دیا، کسی کو برا بھلا کہہ دیا، جس کے نتیجے میں اس کلمے نے اس کو ستر سال کی مسافت کی گہرائی میں پہنچادیا۔ جب ایک کلمہ اس حد تک گہرائی میں پہنچادیتا ہے تو یہ زبان جو ہر وقت صبح سے لے کر شام تک بے مہابہ قینچی کی طرح چل رہی ہے، معلوم نہیں کہ جہنم کی کتنی گہرائی میں ہمیں ڈال دے۔

مجالس میں غیبت اور تنقید

ایک اور حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسانوں کو اوندھے منہ جہنم میں گرانے والی کوئی چیز ''زبان'' سے زیادہ خطرناک نہیں۔ (۱)

لیکن کیا ہمیں اس کی کچھ فکر ہے کہ اس زبان کو روکیں، اور اس کو قابو کرلیں، اور اس کو صرف اللہ جل شانہ کی مرضیات میں استعمال کریں، اور اللہ جل شانہ کی معصیتوں اور گناہوں میں اس کو استعمال نہ کریں۔ اگر مجلس میں بیٹھے ہیں تو غیبت ہورہی ہے، لیکن ہمیں کوئی پرواہ نہیں، اگر کسی سے گفتگو ہورہی ہے تو بعض لوگوں کو گفتگو کے دوران دوسروں پر تنقید کا بڑا شوق ہوتا ہے، اور اس تنقید کے نتیجے میں دوسروں کو ڈنگ مارتے ہیں، دوسروں کا دل توڑتے ہیں، لیکن اس شخص کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی حرمة الصلاة، رقم: ۲۵۴۱، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب کف اللسان فی الفتنة، رقم: ۳۹۶۳، مسند أحمد، رقم: ۲۱۰۰۸

پہلے تولو پھر بولو

ارے بھائی! جھوٹ ہو، غیبت ہو، بے تحقیق باتیں ہوں، ان سب سے بچو، خلاصہ یہ کہ زبان کو سوچ سوچ کر استعمال کرو۔ وہ جو بزرگوں نے فرمایا کہ "پہلے تولو پھر بولو"، یہ نہ ہو زبان بے محابہ چل رہی ہے، اور اس کی پرواہ نہیں ہے کہ میری زبان سے کیا نکل رہا ہے، اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس لئے سوچ کر بولو، اور جب کسی سے بات کرو تو ڈرتے ہوئے بات کرو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری زبان سے اس کو تکلیف پہنچ جائے، اور آخرت میں اللہ جل شانہ کے پاس مجھے اس کا جواب دینا پڑے، اس کی فکر کرو۔ لہٰذا اپنی زبان کو، اپنی آنکھ کو، اپنے کانوں کو گناہوں سے بچاؤ، کیونکہ جس طرح غیبت کرنا ناجائز ہے، اسی طرح غیبت سننا بھی ناجائز ہے، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ))

حرام کاموں سے بچو تو تم سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔

حقیقی مجاہد کون؟

نفلیں پڑھنا تو سب کو نظر آتا ہے، اور دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ یہ بڑا عابد و زاہد آدمی ہے، لیکن گناہوں سے بچنا اور بچنے کی فکر کرنا ایسی چیز ہے، جو دوسروں کو پتہ بھی نہیں چلتی، مثلاً دل میں گناہ کا تقاضا ہوا، اور آدمی نے اس تقاضے کو دبا دیا، اور اس تقاضے پر عمل نہیں کیا، یہ اتنا بڑا جہاد ہے جس کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ))(۱)

اتنا بڑا جہاد کر لیا، اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلا، اس میں کوئی شہرت بھی نہیں ہوتی، نہ اس میں ریاکاری کا احتمال ہے، بلکہ اپنے کو بچا کے رکھنے کی فکر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے اور آپ سب کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔

رمضان المبارک کے روزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝﴾(۲)

"اے ایمان والو تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے تم سے پہلوں پر فرض کیے گئے تھے تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ"

(۱) سنن الترمذی، كتاب فضائل الجهاد عن رسول الله، باب ما جاء فی فضل من مات مرابطًا، رقم: ١٥٤٦، مسند أحمد، رقم: ٢٢٨٣٣ (۲) البقرة:١٨٣

اس آیت میں روزے کا مقصد یہ بیان فرمایا کہ تا کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو، اور گناہوں سے بچنے کی فکر کا نام ''تقویٰ'' ہے، لہٰذا اس ماہِ رمضان میں یہ فکر پیدا کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان روزوں اور تراویح کی برکت سے یہ فکر ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے، اور جب رمضان المبارک ختم ہو تو اس کے بعد بھی ہم اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے والے بن جائیں، اور یہ فکر پیدا ہو جائے کہ یہ گناہ کتنی مہلک چیز ہے، جس سے بچنا ضروری ہے۔ اگر آنکھ کی حفاظت، زبان کی حفاظت، کانوں کی حفاظت، دل کی حفاظت کرلیں تو پھر دیکھیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کیسے انوار و برکات نازل ہوتے ہیں۔

آنکھ، کان، زبان بند کرلو

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

چشم بند و گوش بند و لب ببند
گر نہ بینی نورِ حق، بر من بخند

مولانا فرماتے ہیں کہ اپنی آنکھ بند کرو، بند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اہتمام کرو کہ یہ آنکھ ناجائز جگہ پر نہ دیکھے، کانوں کو بند کرو، کانوں کو بند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی فکر کرو کہ یہ کان گناہ کی کوئی بات نہ سنے، جیسے گانا سننا، غیبت، جھوٹ نہ سنے، اور ہونٹوں کو بند کرو کہ کوئی غلط بات منہ سے نہ نکلے۔ یہ تین کام کرلو، یہ تین کام کرنے کے بعد اگر اللہ کا نور نظر نہ آئے تو مجھ پر ہنس دینا۔ یہ بات وہ شخص کہہ رہا ہے جس کی ساری زندگی اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں گزری۔ نورِ حق اس وقت نظر آتا ہے جب آدمی اپنے آپ کو ان گناہوں سے محفوظ کرلیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس حدیث کے اس ارشاد پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

آج اس حدیث کے ایک جملے کا بیان ہوگیا، باقی کا بیان انشاء اللہ کل کروں گا، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

گناہوں کے نقصانات ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا اَنَّہٗ قَالَ لَہٗ رَجُلٌ: قَلِیْلُ الْعَمَلِ قَلِیْلُ الذُّنُوْبِ اَعْجَبُ اِلَیْکَ اَوْ رَجُلٌ کَثِیْرُ الْعَمَلِ کَثِیْرُ الذُّنُوْبِ قَالَ لَا اَعْدِلُ بِالسَّلَامَۃِ. (۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے۔ اس لئے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے اور یہ حضرت عبداللہ بن عباس ان کے بیٹے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ بہت کم عمر تھے۔ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو اس وقت ان کی عمر تقریباً دس سال کی تھی لیکن کم سنی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو علم کا بہت اونچا مرتبہ عطا فرمایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا فرمائی:

((اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ وَفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ))(۲)

''اے اللہ! ان کو قرآن کریم کا علم عطا فرما اور دین میں ان کو سمجھ عطا فرما''

اگرچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت ان کی عمر صرف دس سال تھی، اب دس سال کی

☆ اصلاحی خطبات (۹/۱۷۰ تا ۲۰۳)، ۶ مئی ۱۹۹۴ء، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی۔ زیر نظر بیان امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کی کتاب "کتاب الزھد" کے "باب ما جاء فی تخویف عواقب الذنوب" کا درس ہے۔

(۱) کتاب الزھد لابن المبارک، باب ما جاء فی تخویف عواقب الذنوب، رقم: ٦٦ (١/٢٢)، الزھد لھناد، رقم: ٩٠٢ (٢/٤٥٤)، فتح الباری (١١/٢٥٧)، روضۃ المحدثین، رقم: ٢٦٠٥ (٦/٣٣٠)

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس کو دو دعائیں دیں: (پہلی دعا یہ ہے) اللّٰھم علّمہ الکتاب، صحیح البخاری، کتاب العلم، باب قول النبی اللّٰھم علمہ الکتاب، رقم: ٧٣، مسند أحمد، رقم: ٣٢٠٦، (دوسری دعا یہ ہے) اللّٰھمّ فقھہ فی الدین، صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب وضع الماء عند الخلاء، رقم: ١٤٠٠، مسند أحمد، رقم: ٢٢٧٤

عمر ہی کیا ہوتی ہے، لیکن ایک طرف تو انہوں نے حضور اقدس ﷺ کے زمانے کی باتیں اپنے دل و دماغ پر نقش کی ہوئی تھیں۔ پھر حضور اقدس ﷺ کے وصال کے بعد انہوں نے سوچا کہ اب تو حضور اقدس ﷺ اس دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں، لیکن بڑے بڑے صحابہ کرام ابھی تشریف فرما ہیں، میں ان کی خدمت میں جا کر نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور آپ کی احادیث حاصل کروں۔ چنانچہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس جاتے اور ان کے پاس جانے کے لئے سفر کرتے اور مشقتیں اُٹھاتے، اور اس طرح انہوں نے بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا اور اس مقام پر پہنچے کہ آج انہیں ''امام المفسرین'' کہا جاتا ہے۔ یعنی تمام مفسرین کے امام۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو دعا دی تھی کہ اے اللہ! ان کو کتاب اللہ کا علم عطا فرما۔ آج تفسیر قرآن کے باب میں ان سے زیادہ قابل اعتماد بات کسی کی نہیں۔ یہ انہی کا قول ہے جو میں نے آپ کے سامنے پڑھا۔

پسندیدہ شخص کون ہے؟

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نقل فرمارہے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ ایک شخص عمل تو کم کرتا ہے یعنی نفلی عبادات اور نفل نماز بہت زیادہ نہیں پڑھتا، زیادہ تر فرائض و واجبات پر اکتفا کرتا ہے، نفلی عبادات، ذکر و اذکار، وظائف اور تسبیحات زیادہ نہیں کرتا، لیکن اس کے گناہ بھی کم ہیں، ایسا شخص آپ کو زیادہ پسند ہوگا یا آپ کو وہ شخص زیادہ پسند ہوگا جس کی نفلی عبادتیں بھی زیادہ ہیں اور گناہ بھی زیادہ ہیں؟ مثلاً تہجد کی نماز بھی پڑھتا ہے، اشراق کی نماز بھی پڑھتا ہے، اوابین بھی پڑھتا ہے، تلاوت بھی خوب کرتا ہے، وظائف اور تسبیحات بھی خوب کرتا ہے، لیکن ساتھ میں گناہ بھی بہت کرتا ہے۔ آپ کے نزدیک ان دونوں میں سے کون بہتر ہے؟ پہلے شخص کا عمل کم مگر گناہ بھی کم، دوسرے شخص کے اعمال زیادہ مگر گناہ بھی زیادہ۔ جواب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ گناہوں سے حفاظت کے برابر میں کسی چیز کو نہیں سمجھتا۔ یعنی آدمی گناہوں سے محفوظ ہو جائے، یہ اتنی بڑی نعمت اور اتنا بڑا فائدہ ہے کہ دنیا کا کوئی عمل اس کے برابر نہیں۔ اگر ایک شخص گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرے تو نفلی عبادات اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

اصل چیز گناہوں سے پرہیز ہے

اس حدیث سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ جتنی نفلی عبادات ہیں، یہ اپنی جگہ پر بڑی فضیلت کی چیزیں ہیں، لیکن ان نفلی عبادات کے بھروسے پر اگر انسان یہ سوچے کہ میں تو نفلی عبادتیں بہت کرتا ہوں اور پھر اس کے نتیجے میں گناہوں سے پرہیز نہ کرے تو یہ بڑے دھوکے کی بات ہے۔ اصل چیز یہ ہے

کہ انسان اپنی زندگی کے اندر گناہوں سے پرہیز کرنے کی فکر کرے، گناہوں سے پرہیز کرنے کے بعد بالفرض اگر اس کو زیادہ نفلی عبادات کرنے کا موقع نہیں ملا تو اس صورت میں اس کا کوئی گھاٹا اور نقصان نہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں انشاء اللہ وہ نجات پا جائے گا، لیکن اگر نفلی عبادتیں تو خوب کرتا ہے اور ساتھ میں گناہ بھی بہت کرتا ہے تو اس کی نجات کی کوئی ضمانت نہیں، کیونکہ یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔

گناہ چھوڑنے کی فکر نہیں

آج کل ہمارے معاشرے میں یہ دھیان بہت کم ہو گیا ہے۔ جب کسی کے دل میں دین پر چلنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق ہوتی ہے تو اس کو یہ فکر ہوتی ہے کہ مجھے کچھ وظائف بتائے جائیں، کچھ معمولات سکھا دیئے جائیں، اور اوراد واذکار تلقین کر دیئے جائیں اور یہ بتایا جائے کہ نفلی عبادت کیسے کروں اور کس وقت کروں۔ بس چند ظاہری معمولات کی طرف توجہ ہو جاتی ہے اور پھر ان معمولات کو پورا کرنے میں دن رات لگا رہتا ہے، لیکن اس کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ میری صبح سے شام تک کی زندگی میں کتنے کام گناہ کے ہو رہے ہیں؟ اور کتنے کام اللہ کی مرضی کے خلاف ہو رہے ہیں؟ اچھے خاصے پڑھے لکھے دیندار لوگوں کو دیکھا کہ وہ صفِ اول کے پابند ہیں، مسجد میں پابندی سے جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، وظائف و اوراد کے پابند ہیں، نفلی عبادتیں اور تہجد اور اشراق کی نمازیں بھی بڑی پابندی سے پڑھتے ہیں، لیکن ان کو اس کی فکر نہیں کہ گھر کے اندر جو گناہوں کا بازار گرم ہے، اس کو کس طرح ٹھیک کیا جائے؟ اور جب بازار جاتے ہیں تو وہاں پر حلال و حرام کی فکر نہیں ہوتی، جب گفتگو کرتے ہیں تو غیبت اور جھوٹ کی فکر نہیں کرتے۔ اگر ان کے گھر میں ناجائز اور حرام چیزیں موجود ہیں تو ان کو باہر نکالنے کی کوئی فکر نہیں ہے۔ گھر میں فلمیں دیکھی جا رہی ہیں۔ ناجائز پروگرام دیکھے جا رہے ہیں۔ گانا بجانا ہو رہا ہے۔ اس کی طرف کوئی دھیان نہیں۔ البتہ وظائف کی طرف دھیان ہے کہ کوئی وظیفہ بتا دو۔ حالانکہ یہ گناہ انسان کے لئے مہلک ہیں، ان سے بچنے کی فکر پہلے کرنی چاہئے۔

نفلی عبادات اور گناہوں کی بہترین مثال

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ یہ جتنی نفلی عبادتیں ہیں، چاہے وہ نفلی نماز ہو، تلاوت ہو، یا ذکر و تسبیح ہو، یہ سب ٹانک ہیں، اس سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ جیسے کوئی شخص جسم کی طاقت کے لئے کوئی ٹانک استعمال کرے۔ اور یہ گناہ زہر ہیں۔ اب اگر ایک شخص ٹانک بھی خوب کھائے اور زہر بھی خوب کھائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ٹانک اس کے اوپر اثر نہیں کرے گا، البتہ زہر اثر کر جائے گا اور اس شخص

کی تباہی کا ذریعہ بن جائے گا۔ اور ایک شخص وہ ہے جو کوئی ٹانک اور طاقت کی دوا تو استعمال نہیں کرتا، صرف دال روٹی پر اکتفا کرتا ہے، لیکن جو چیزیں صحت کے لئے مضر ہیں، ان سے پرہیز کرتا ہے، تو یہ آدمی صحت مند رہے گا، باوجود یہ کہ یہ ٹانک نہیں کھاتا۔ پہلا شخص جو ٹانک بھی کھاتا ہے اور ساتھ میں مضر صحت چیزوں سے پرہیز نہیں کرتا، یہ لازماً بیمار پڑ جائے گا اور ایک دن ہلاک ہو جائے گا۔ نفلی عبادات اور گناہوں کی بالکل یہ مثال ہے۔ لہٰذا یہ فکر ہونی چاہئے کہ ہماری صبح سے لے کر شام تک کی زندگی سے گناہ نکل جائیں، منکرات اور معصیتیں نکل جائیں۔ جب تک یہ چیزیں نہیں نکلیں گی، اس وقت تک یہ نفلی عبادات ہمارے حق میں مفید نہیں ہوسکتیں۔

طالبینِ اصلاح کے لئے پہلا کام

آج تو معمول یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی شیخ کے پاس اصلاحی تعلق قائم کرنے جاتا ہے تو وہ شیخ اس کو اسی وقت یہ بتا دیتا ہے کہ تم یہ معمولات انجام دیا کرو، اتنا ذکر کیا کرو، اتنی تسبیحات پڑھا کرو۔ لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا معمول یہ تھا کہ جب ان کے پاس کوئی شخص اپنی اصلاح کی غرض سے آتا تو اس کو ذکر واذکار اور تسبیحات وغیرہ کچھ نہ بتاتے۔ بلکہ سب سے پہلے اس سے یہ فرماتے کہ گناہوں کو چھوڑو۔ چنانچہ اس راہ میں سب سے پہلا کام تکمیلِ توبہ کا ہے۔ یعنی سب سے پہلے انسان اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرے کہ یا اللہ! جو گناہ مجھ سے پہلے ہو چکے ہیں، اپنی رحمت سے ان کو معاف فرما دیجئے اور آئندہ کے لئے عزم کرتا ہوں کہ میں آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا۔ پھر آئندہ کے لئے گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرے۔ پھر یہ نہیں کہ بس صرف چند مشہور گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرلیا، بلکہ ہر گناہ گناہ ہے، ہر ایک گناہ سے بچنے کا اہتمام کرے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهٗ﴾

''یعنی ظاہر کے گناہ بھی چھوڑو اور باطن کے گناہ بھی چھوڑو''

آگے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ۝﴾(۱)

''یعنی جو لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، قیامت کے روز ان کے ان اعمال کی سزا دی جائے گی جو وہ لوگ یہاں پر کیا کرتے تھے''

---

(۱) الانعام: ۱۲۰

ہر قسم کے گناہ چھوڑ دو

لہٰذا کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جس کی طرف سے بے توجہی برتی جائے، نہ ظاہر کا گناہ اور نہ باطن کا گناہ۔ یہ نہ ہو کہ چند موٹے موٹے گناہ تو چھوڑ دیئے، اور باقی گناہوں کے چھوڑنے کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ مثلاً مجلسوں میں غیبت ہورہی ہے، دل آزاری ہورہی ہے، دوسروں کو تکلیف پہنچائی جارہی ہے، یا دوسروں سے حسد اور بغض ہورہا ہے، یا دل میں تکبر بھرا ہوا ہے، مال کی محبت، جاہ کی محبت، دنیا کی محبت دل میں بھری ہوئی ہے۔ پھر تو گناہ چھوڑنا نہ ہوا۔ ہر وہ کام جس کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے گناہ قرار دیا ہے، ان کو چھوڑنا ہوگا، اس کی فکر انسان کو ہونی چاہئے۔

بیوی بچوں کو گناہ سے بچاؤ

ایک بات اور عرض کردوں کہ یہ گناہ اس وقت تک چھوٹ نہیں سکتے جب تک انسان اپنے ماحول کی درستی کی فکر نہ کرے۔ کوئی شخص اگر یہ چاہے کہ میں گناہوں سے محفوظ ہوجاؤں اور بیوی بچے غلط راستے پر جارہے ہیں، ان کی طرف کوئی دھیان اور توجہ نہ کرے۔ یاد رکھئے! اس طرز عمل سے کبھی بھی گناہ نہیں چھوٹ سکتے۔ اگر تم گناہ سے بچنے کی کتنی بھی کوشش کرلو لیکن اگر گھر کا ماحول خراب ہے اور بیوی بچے غلط راستے پر جارہے ہیں، اور تمہیں ان کی فکر نہیں تو وہ بیوی بچے ایک نہ ایک دن تمہیں ضرور گناہ کے اندر مبتلا کردیں گے۔ اس لئے انسان کے لئے خود گناہوں سے بچنا جتنا ضروری ہے، اتنا ہی بیوی بچوں کو بھی بچانا ضروری ہے۔ اور ہر وقت دھیان اور فکر ہونی چاہئے کہ بیوی بچے کسی وقت گناہ کے اندر مبتلا نہ ہوجائیں۔

خواتین کے کردار کی اہمیت

اس معاملے میں خواتین کا کردار بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر خواتین کے دل میں یہ فکر پیدا ہوجائے کہ ہمیں اپنی زندگی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق گزارنی ہے اور گناہوں سے بچنا ہے تو پھر گھروں کا ماحول درست ہوجائے۔ اس لئے کہ عورت گھر کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر عورت کے دل میں اللہ کی اطاعت اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوجائے تو پورا گھر سنور جائے۔ لیکن اگر عورت کا یہ حال ہو کہ اس کو پردے کی کوئی فکر نہیں ہے، سر کھلا ہوا ہے، بال کھلے ہوئے ہیں، فواحش کے اندر ذہن لگا ہوا ہے، اور فضولیات میں منہمک ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گھر کا ماحول خراب ہوگا۔ اس لئے خواتین پر یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے کہ وہ گناہوں کے

کاموں کو چھوڑ دیں۔

نافرمانی اور گناہ کیا چیز ہیں؟

یہ گناہ کیا چیز ہیں؟ اور گناہوں کے عواقب اور انجام کیا ہوتے ہیں؟ پہلے اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ گناہ کے معنی ہیں ''نافرمانی''، مثلاً تمہارے ایک بڑے نے تمہیں حکم دیا کہ یہ کام اس طرح کرو اور تم کہو کہ میں یہ کام نہیں کرتا۔ یا بڑے نے کہا کہ اس بات سے اور اس کام سے بچو اور تم کہو کہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔ یہ بڑے کی بات نہ ماننا ''نافرمانی'' کہلاتا ہے۔ اگر یہ ''نافرمانی'' اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے ساتھ کی جائے تو اسی کا نام ''گناہ'' ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے اثرات اتنے دور رس اور اتنے خراب اور برے ہیں کہ ان کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

گناہ کی پہلی خرابی ''احسان فراموشی''

گناہ کی سب سے پہلی خرابی ''احسان فراموشی'' ہے، اس لئے کہ جس محسن نے انسان کو وجود بخشا ہے اور ہر وقت انسان اس کی نعمتوں میں غرق ہے، سر سے لے کر پاؤں تک اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس کے اوپر مبذول ہیں۔ جس کے ایک ایک عضو کو لے کر اندازہ کرو کہ اس کی کتنی قیمت اور کتنی اہمیت ہے۔ چونکہ یہ نعمتیں مفت ملی ہوئی ہیں اس لئے دل میں ان کی کوئی وقعت اور قدر نہیں۔ خدانخواستہ اگر کسی وقت ان اعضاء میں سے کسی ایک عضو کو بھی نقصان پہنچ جائے، تب پتہ چلے گا کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے اور یہ نقصان کتنا بڑا نقصان ہے۔ یہ آنکھ کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ کان کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ زبان کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ صحت کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ رزق جو صبح شام کھانے کے لئے اللہ تعالیٰ عطا فرما رہے ہیں یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ تو جس عظیم محسن اور منعم کی نعمتوں نے ہمیں ڈھانپ لیا ہے، اس کا صرف یہ کہنا ہے کہ تم لوگ صرف چند باتوں سے پرہیز کرلو اور باز آجاؤ۔ لیکن تم سے اتنا چھوٹا سا کام نہیں ہوتا۔ لہٰذا ''گناہ'' کی سب سے پہلی خرابی احسان فراموشی، ناشکری اور محسن کا حق ادا نہ کرنا ہے۔

گناہ کی دوسری خرابی ''دل پر زنگ لگنا''

''گناہ'' کی دوسری خرابی یہ ہے کہ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب انسان پہلی مرتبہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگا دیا جاتا ہے۔ اس نقطے کی حقیقت کیا ہے اس کو تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اور جب دوسرا گناہ کرتا ہے تو دوسرا نقطہ لگا دیا جاتا ہے، جب تیسرا گناہ کرتا ہے تو تیسرا نقطہ لگا دیا جاتا ہے، اگر اس دوران وہ توبہ کرلے تو یہ نقطے مٹا دیئے جاتے

ہیں۔ لیکن اگر وہ توبہ نہ کرے بلکہ مسلسل گناہ کرتا رہے اور گناہ کرتا ہی چلا جائے تو آہستہ آہستہ وہ سیاہ نقطے اس کے پورے دل کو گھیر لیتے ہیں اور پھر وہ نقطے زنگ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور دل کو زنگ لگ جاتا ہے، اور جب دل کو زنگ لگ جاتا ہے تو اس کے بعد اس کے اندر حق بات ماننے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی، پھر اس پر غفلت کا وہ عالم طاری ہوتا ہے کہ پھر گناہ کے گناہ ہونے کا احساس مٹ جاتا ہے اور گناہوں کے مفاسد کا ادراک اور احساس ختم ہو جاتا ہے، گویا کہ انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔(۱)

گناہ کے تصور میں مؤمن اور فاسق کا فرق

ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ مؤمن جو اب تک گناہ کا عادی نہیں ہے وہ گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے پہاڑ اس کے سر پر ٹوٹنے والا ہے، اور فاسق و فاجر گناہ کو اتنا ہلکا اور معمولی سمجھتا ہے جیسے کوئی مکھی ناک پر آکر بیٹھ گئی اور اس نے ہاتھ مار کر اس کو اُڑا دیا۔ یعنی وہ گناہ کو بہت معمولی سمجھتا ہے اور اس کے کرنے کے بعد اس پر اس کو کوئی ندامت اور شرمندگی نہیں ہوتی۔ لیکن ایک مؤمن جس کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی برکات عطا فرمائی ہیں وہ گناہ کو ایک پہاڑ تصور کرتا ہے۔ اگر غلطی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے سر پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ غم اور صدمہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

نیکی چھوٹنے پر مؤمن کا حال

گناہ تو دور کی بات ہے اگر ایک مؤمن کو نیکی کرنے کا موقع ملے مگر وہ موقع ہاتھ سے نکل جائے تو اس کی وجہ سے بھی اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے کہ ہائے مجھے نیکی کرنے کا یہ موقع ملا تھا مگر افسوس کہ مجھ سے یہ موقع چھوٹ گیا۔ اسی کے بارے میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

بر دل سالک ہزاروں غم بود
گر زباغ دل خلالے کم بود

اگر سالک کے دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے یعنی نیکی کرنے کے مواقع ملے تھے مگر ان میں سے کسی وقت ایک نیکی نہ کر سکا تو اس وقت سالک کے دل پر غم کے ہزار ہا پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں کہ افسوس مجھ سے یہ نیکی چھوٹ گئی۔ جب نیکی چھوٹنے پر اتنا صدمہ ہوتا ہے تو گناہ سرزد

(۱) شعب الإیمان، رقم: ۷۲۰۷ (۴۴۱/۵)، الدر المنثور (۴۴۶/۸)، الزهد لأبي داود، رقم: ۲۷۱ (۲۹۲/۱)

ہو جانے پر کیا صدمہ نہیں ہوگا؟ بلکہ اس سے کہیں زیادہ صدمہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس حالت سے بچائے کہ جب گناہوں کی وجہ سے دل پر نقطے لگتے چلے جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گناہ کو اتنا معمولی سمجھتا ہے جیسے مکھی ناک پر آکر بیٹھی اور اس کو اُڑا دیا اور اس گناہ پر کوئی صدمہ اور غم ہی نہیں ہوتا۔ بہرحال گناہوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ وہ انسان کو غافل بنا دیتے ہیں اور اس کے ذریعہ دل پر پردے پڑ جاتے ہیں۔

گناہ کی تیسری خرابی ”ظلمت اور تاریکی“

چونکہ ہم لوگ گناہ کے ماحول کے عادی ہو چکے ہیں، اس وجہ سے ان گناہوں کی ظلمت اور کراہیت دلوں سے مٹ چکی ہے، ورنہ ہر گناہ میں ایسی ظلمت اور ایسی کراہیت ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ صحیح ایمانِ کامل عطا فرمائے تو انسان اس ظلمت اور کراہیت کو برداشت نہ کر سکے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ غلطی سے کسی موقع پر حرام آمدنی کا ایک لقمہ منہ میں چلا گیا، جس کی وجہ یہ پیش آئی کہ ایک صاحب نے دعوت کی، ان کے یہاں کھانے کے لئے چلے گئے، بعد میں پتہ چلا کہ اس کی آمدنی حرام کی تھی، فرماتے تھے کہ دو مہینے تک اس حرام لقمے کی ظلمت اپنے دل میں محسوس کرتا رہا، اور اس ظلمت کا نتیجہ یہ تھا کہ اس دو مہینے کے عرصے میں بار بار دل میں گناہ کے داعیے اور تقاضے پیدا ہوتے رہے۔ کبھی تقاضا ہوتا کہ فلاں گناہ کرلوں، کبھی تقاضا ہوتا کہ فلاں گناہ کرلوں، یہ سب ایک گناہ کا اثر تھا اور اس کی ظلمت تھی۔

گناہوں کے عادی ہو جانے کی مثال

ہمارے دلوں میں ان گناہوں کی ظلمت اور کراہیت اس لئے محسوس نہیں ہوتی کہ ہم ان گناہوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے ایک بدبودار گھر ہو اور اس گھر میں تعفن اُٹھ رہا ہو، سڑی ہوئی اشیاء اس گھر میں پڑی ہوئی ہوں۔ اگر باہر سے کوئی شخص اس گھر کے اندر جائے گا تو اس کے لئے اندر جا کر ذرا دیر بھی کھڑا ہونا مشکل ہوگا۔ لیکن ایک شخص اسی بدبودار مکان کے اندر ہی رہتا ہے تو اس کو بدبو کا احساس نہیں ہوگا، اس لئے کہ وہ بدبو کا عادی ہو چکا ہے اور اس کے اندر خوشبو اور بدبو کی تمیز ہی نہیں رہی، اس لئے اب وہ بہت آرام سے اس مکان میں رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ تم اتنے گندے اور بدبودار مکان میں رہتے ہو تو وہ اس کو پاگل کہے گا اور کہے گا کہ میں تو بہت آرام سے اس مکان میں رہتا ہوں، مجھے تو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ شخص اس بدبو کا عادی ہو چکا ہے۔ اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اس بدبو سے محفوظ رکھا ہے بلکہ خوشبو والے ماحول

میں رکھا ہے۔ اس کا تو یہ حال ہوگا کہ اگر دور سے ذرا سی بھی بدبو آجائے تو اس کا دماغ خراب ہو جائے گا۔ اسی طرح جو لوگ صاحب ایمان ہیں اور جن کا سینہ تقویٰ کی وجہ سے آئینہ کی طرح صاف شفاف ہے، ایسے لوگ گناہوں کی ظلمت اور کراہیت کو بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ بہر حال، گناہوں کی تیسری بڑی خرابی اور انجام دل میں ظلمت اور کراہیت کا پیدا ہونا ہے۔

گناہوں کی چوتھی خرابی ''عقل خراب ہونا''

گناہوں کی چوتھی خرابی یہ ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا چلا جاتا ہے تو اس کی عقل خراب ہو جاتی ہے اور اس کی مت اُلٹی ہو جاتی ہے، اس کی فکر اور سمجھ غلط راستے پر پڑ جاتی ہے اور پھر اچھی بات کو برا اور بری بات کو اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ اگر اس کو صحیح بات بھی نرمی سے سمجھاؤ تو وہ اس کے دماغ میں نہیں اُترتی۔ اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کردے اس کی ہدایت کا کوئی راستہ نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کسی کو بے وجہ گمراہ نہیں کرتے بلکہ جب کوئی شخص گناہ اور نافرمانی کرتا ہی چلا جاتا ہے تو پھر ان گناہوں کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ پھر صحیح بات اس کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔

گناہ نے شیطان کی عقل کو اوندھا کر دیا

دیکھئے! یہ ابلیس اور شیطان جو گناہ کا سرچشمہ اور گناہ کا موجد اور بانی ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے اس دنیا میں گناہ کو اسی نے ایجاد کیا، خود بھی گناہ میں مبتلا ہوا اور حضرت آدم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو بھی بہکا گیا، اور اس گناہ کرنے کے نتیجے میں اس کی عقل اوندھی ہو گئی۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے حکم ماننے کے بجائے عقلی دلیل پیش کرنی شروع کر دی کہ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ یہ دلیل بظاہر تو بڑی اچھی ہے کہ آگ افضل ہے، اور مٹی اس کے مقابلے میں مفضول ہے لیکن اس کی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ آگ کو پیدا کرنے والا بھی وہی ہے اور مٹی کو بنانے والا بھی وہی ہے۔ جب بنانے والا یہ حکم دے رہا ہے کہ آگ کو چاہئے کہ مٹی کو سجدہ کرے، تو پھر آگ کی فضیلت کہاں گئی اور مٹی کی مفضولیت کہاں گئی؟ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راندۂ درگاہ ہوا اور مردود اور ذلیل ہوا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں توبہ کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے، انسان کے لئے بھی اور شیطان کے لئے بھی، اگر وہ عقل کو صحیح استعمال کر کے اللہ تعالیٰ سے کہہ دیتا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی مجھے معاف کردو، اب آپ جو کہیں گے وہ کروں گا۔ مگر یہ بات کہنے کے لئے آج بھی تیار نہیں۔

شیطان کی توبہ کا سبق آموز واقعہ

میں نے اپنے شیخ سے ایک قصہ سنا، اگرچہ بظاہر اسرائیلی واقعہ ہے لیکن بڑا سبق آموز واقعہ ہے۔ وہ یہ کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کے لئے کوہ طور پر تشریف لے جانے لگے تو راستے میں یہ شیطان مل گیا۔ اس نے کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لئے تشریف لے جارہے ہیں تو ہمارا ایک چھوٹا سا کام کردیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: کیا کام ہے؟ شیطان نے کہا کہ ہم تو اب راندۂ درگاہ اور مردود اور ملعون ہوچکے ہیں کہ اب تو ہماری نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے سفارش فرمادیں کہ ہمارے لئے بھی توبہ کا کوئی راستہ مل جائے اور نجات کی کوئی صورت نکل آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بہت اچھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر پہنچے، وہاں پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی ہوئی لیکن اس دوران شیطان کی بات پہنچانا بھول گئے۔ جب واپس چلنے لگے تو خود اللہ تعالیٰ نے یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں کسی نے کوئی پیغام دیا تھا؟ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں یا اللہ! میں بھول گیا۔ راستے میں مجھے ابلیس ملا تھا اور بڑی پریشانی کا اظہار کررہا تھا، اور یہ التجا کررہا تھا کہ ہمارے لئے بھی نجات کا کوئی راستہ نکل آئے۔ اے اللہ! آپ تو رحیم و کریم ہیں، ہر ایک کو معاف فرمادیتے ہیں، وہ توبہ کررہا ہے تو اس کو بھی معاف فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے کب کہا کہ توبہ کا دروازہ بند ہے، ہم تو معاف کرنے کو تیار ہیں۔ اس کو کہہ دو کہ تیری توبہ قبول ہوجائے گی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس وقت ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرلے، اس وقت تو نے ہماری بات نہیں مانی، اب بھی معاملہ بہت آسان ہے کہ اس کی قبر پر جاکر سجدہ کرلے، ہم تمہیں معاف کردیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ معاملہ تو بہت آسان ہوگیا۔ چنانچہ یہ پیغام لے کر واپس تشریف لائے۔ راستے میں پھر شیطان سے ملاقات ہوئی۔ پوچھا کہ میری معافی کا کیا ہوا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا کہ تیرے معاملے میں تو اللہ تعالیٰ نے بڑا آسان راستہ بتادیا، اس وقت تجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ تو نے آدم کو سجدہ نہیں کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تو آدم کی قبر کو سجدہ کرلے تو تیرا گناہ معاف ہوجائے گا۔ جواب میں شیطان نے فوراً کہا کہ واہ بھائی! میں نے زندہ کو سجدہ کیا نہیں، اب مردے کو کیسے سجدہ کرلوں؟ اور اس کی قبر کو کیسے سجدہ کرلوں؟ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ یہ جواب اس لئے دیا کہ عقل اُلٹی ہوگئی تھی۔ بہرحال، گناہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی عقل کو اوندھا کردیتا ہے اور انسان کی مَت ماری جاتی ہے اور پھر صحیح بات انسان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

تمہیں حکمت پوچھنے کا اختیار نہیں

جن گناہوں کو قرآن وحدیث نے صراحۃً کھلے الفاظ میں حرام قرار دے دیا ہے، ان میں جو لوگ مبتلا ہیں ان سے جا کر اگر کہا جائے کہ یہ گناہ حرام ہیں، تو وہ فوراً اس کے خلاف عقلی تاویلیں کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس کے خلاف عقلی دلائل دینا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ گناہ کیوں حرام قرار دیا گیا ہے؟ اس میں تو فلاں فائدہ ہے، اس میں تو فلاں مصلحت ہے، اس کو حرام قرار دینے میں کیا مصلحت اور حکمت ہے؟ ایسے لوگوں سے کوئی یہ پوچھے کہ تم اس دنیا میں خدا بن کر آئے ہو یا بندے بن کر آئے ہو۔ اگر تم بندے بن کر آئے ہو تو تم اپنے اس اعتراض کو اپنے ملازم کے اعتراض پر ہی قیاس کر لو جس کو تم نے اپنے گھر میں ملازم رکھا ہے۔ مثلاً آپ نے گھر کا سودا سلف لانے کے لئے ایک شخص کو ملازم رکھا۔ اب آپ نے اس ملازم سے کہا کہ بازار جا کر اتنے روپے کی فلاں چیز خرید کر لے آؤ۔ اب ملازم یہ کہنے لگے کہ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سودا سلف مجھ سے کیوں منگوایا جارہا ہے؟ اور اتنی مقدار میں کیوں منگوایا جارہا ہے؟ اور اس فضول خرچی کی کیا حکمت ہے؟ پہلے مجھے یہ بتاؤ۔ اگر ایک ملازم اس طرح ہمارے کاموں کی حکمت اور مصلحت پوچھے تو ایسا ملازم اس لائق ہے کہ اس کا کان پکڑ کر ملازمت سے الگ کر دیا جائے اور گھر سے باہر نکال دیا جائے، اس لئے کہ اس ملازم کو یہ حق ہی نہیں پہنچتا کہ وہ یہ پوچھے کہ یہ چیز کیوں منگوائی جارہی ہے؟ اس کو ملازم اس لئے رکھا ہے کہ جو کام اس کو بتا دیا جائے وہ کام کرے۔ سمجھ میں آئے تو کرے، سمجھ میں نہ آئے تو کرے، یہ ہے ملازم۔ اور کاموں کی مصلحت اور حکمت پوچھنا ملازم کا منصب نہیں ہے۔

تم ملازم نہیں، بندے ہو

ایک ملازم جس کو تم نے آٹھ گھنٹے کے لئے ملازم رکھا ہے، وہ ملازم تمہارا غلام نہیں ہے، تم نے اس کو پیدا نہیں کیا، وہ تمہارا بندہ نہیں ہے اور تم اس کے خدا نہیں ہو۔ بلکہ صرف وہ تمہارا تنخواہ دار ملازم ہے، وہ اگر تم سے تمہارے کاموں کی حکمت اور مصلحت پوچھنے لگے تو وہ تمہیں گوارا نہ ہو۔ لیکن تم اللہ تعالیٰ کے ملازم نہیں ہو، نہ غلام ہو، بلکہ اللہ کے بندے ہو، اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ وہ اگر تم سے یہ کہتا ہے کہ تم فلاں کام کرو تو تم یہ کہتے ہو کہ پہلے ہمیں وجہ بتاؤ، حکمت اور مصلحت بتاؤ، پھر میں یہ کام کروں گا۔ تو یہ حکمت اور مصلحت کا مطالبہ اتنی ہی بڑی حماقت ہے جتنی بڑی حماقت وہ ملازم کر رہا تھا، بلکہ اس سے بڑی اور بدتر حماقت ہے، کیونکہ وہ ملازم تو پھر بھی انسان ہے، اور تم بھی انسان ہو، وہ بھی عقل رکھتا ہے، تم بھی عقل رکھتے ہو، اس کی اور تمہاری عقل برابر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کہاں، اور

تمہاری یہ چھوٹی سی عقل کہاں؟ دونوں کے درمیان کوئی نسبت نہیں۔ پھر بھی تم حکمت اور مصلحت کا مطالبہ کررہے ہو کہ اس حکم شرعی میں کیا مصلحت ہے؟ پہلے حکمت اور مصلحت بتاؤ، تب عمل کریں گے ورنہ نہیں کریں گے۔ وجہ اس مطالبے کی یہ ہے کہ عقل اندھی ہو چکی ہے اور گناہوں کی کثرت نے عقل کو اوندھا کردیا ہے۔

محمود اور ایاز کا عبرت آموز واقعہ

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک واقعہ سنایا تھا جو بڑی عبرت کا اور بڑا سبق آموز واقعہ ہے۔ فرمایا کہ محمود غزنوی جو مشہور فاتح اور بادشاہ گزرے ہیں، ان کا ایک چہیتا اور لاڈلا غلام تھا ''ایاز''۔ چونکہ یہ ''ایاز'' بادشاہ کا چہیتا تھا، اس لئے اس کے بارے میں لوگ یہ کہتے تھے کہ یہ بادشاہ کا منہ چڑھا غلام ہے، اور محمود غزنوی اس غلام کو دوسرے بڑے بڑے لوگوں پر ترجیح دیتا ہے۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ محمود غزنوی بڑے بڑے وزیروں اور امیروں کی بات اتنی نہیں مانتا تھا جتنی ایاز کی بات مانتا تھا۔

محمود غزنوی نے چاہا کہ ان وزراء اور اُمراء کو دکھاؤں کہ تم میں اور ایاز میں کیا فرق ہے؟ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بہت بڑا قیمتی ہیرا کہیں سے تحفے میں محمود غزنوی کے پاس آیا۔ یہ ہیرا بہت قیمتی اور بہت خوبصورت اور بہت شاندار تھا۔ بادشاہ کا دربار لگا ہوا تھا۔ سب نے اس قیمتی ہیرے کو دیکھا اور اس کی تعریف کی۔ اس کے بعد محمود غزنوی نے وزیراعظم کو اپنے قریب بلایا اور اس سے پوچھا کہ تم نے یہ ہیرا دیکھا، یہ ہیرا کیسا ہے؟ وزیراعظم نے کہا کہ سرکار! یہ بہت قیمتی ہیرا ہے اور پوری دنیا میں اس کی نظیر موجود نہیں، یہ بہت بڑا ہیرا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اس ہیرے کو زمین پر پٹخ کر توڑ دو۔ وزیراعظم ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کہا: جہاں پناہ! یہ بہت قیمتی ہیرا ہے، آپ کے پاس یہ یادگار تحفہ ہے، آپ اس کو تڑوا رہے ہیں؟ میری درخواست یہ ہے کہ آپ اس کو نہ تڑوائیں۔ بادشاہ نے کہا کہ اچھا بیٹھ جاؤ۔ پھر ایک دوسرے وزیر کو بلایا اور اس سے کہا کہ تم اس کو توڑ دو۔ وہ وزیر بھی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: بادشاہ سلامت! یہ بہت قیمتی ہیرا ہے، میری ہمت نہیں ہو رہی ہے کہ اس کو توڑوں۔ اسی طرح اس نے کئی وزراء اور اُمراء کو بلوایا اور اس ہیرے کو توڑنے کے لئے کہا، مگر ہر ایک نے معافی مانگی اور توڑنے سے معذرت کرلی۔

آخر میں محمود غزنوی نے ایاز کو بلایا کہ ایاز! اس نے کہا: جی جہاں پناہ۔ محمود غزنوی نے کہا کہ یہ ہیرا رکھا ہے، اس کو اُٹھا کر پٹخ کر توڑ دو۔ ایاز نے وہ ہیرا اُٹھایا اور زمین پر پٹخ کر توڑ دیا اور وہ چور چور ہو گیا۔ جب بادشاہ نے دیکھا کہ ایاز نے وہ ہیرا توڑ دیا تو بادشاہ نے اس کو ڈانٹا کہ تم نے ہیرا کیوں توڑا؟ یہ بڑے بڑے وزراء اور اُمراء صاحبانِ عقل جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے جب ہیرا

توڑنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے اس ہیرے کو توڑنے کی ہمت نہیں کی، کیا یہ سب پاگل تھے؟ تم نے اُٹھا کر توڑ دیا۔ کیوں توڑا؟ پہلے تو ایاز نے کہا کہ جہاں پناہ! غلطی ہوگئی۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تم نے توڑا کیوں؟ ایاز نے کہا کہ میرے دل میں خیال آیا کہ یہ ہیرا ہے، چاہے اس کی قیمت کتنی زیادہ کیوں نہ ہو، یہ اگر ٹوٹ جائے تو اتنی بری بات نہیں، لیکن آپ کا حکم نہیں ٹوٹنا چاہئے۔ اور آپ کے حکم کو ہیرے سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس ہیرے کے ٹوٹنے کے مقابلے میں حکم ٹوٹنا زیادہ بری بات ہے۔ اس لئے میں نے اس ہیرے کو توڑ دیا۔

اس کے بعد محمود غزنوی نے ان وزراء سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم میں اور ایاز میں یہ فرق ہے۔ تمہیں اگر کسی کام کا حکم دیا جائے تو اس کے اندر حکمتیں اور مصلحتیں تلاش کرتے ہو۔ اور یہ ایاز تو حکم کا بندہ ہے۔ اس سے جو کہا جائے گا وہ یہ کرے گا۔ اس کے سامنے حکمت اور مصلحت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

بندہ وہ ہے جو حکم مانے

تو محمود غزنوی کے حکم کی کیا حقیقت ہے؟ اس کی عقل بھی محدود، اس کے وزراء اور ایاز کی عقل بھی محدود، یہ مقام تو درحقیقت اس ذات کو حاصل ہے جس نے ساری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ چاہے ہیرا ٹوٹ جائے، چاہے دل ٹوٹ جائے، چاہے انسان کے جذبات ٹوٹ جائیں، چاہے خیالات اور خواہشات ٹوٹ جائیں، لیکن اس کا حکم نہ ٹوٹے، یہ مقام درحقیقت صرف اللہ جل شانہ کو حاصل ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے حکم میں حکمت اور مصلحت تلاش کرنا نادانی اور بے عقلی کی بات ہے، اور اس بے عقلی کا اصل سبب گناہ ہیں، جتنے گناہ کرو گے اتنی ہی یہ عقل اوندھی ہوتی چلی جائے گی۔ بہر حال گناہ کی نحوست یہ ہے کہ انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔

گناہ چھوڑنے سے نور کا حصول

تم ذرا اللہ تعالیٰ کے حضور ان گناہوں سے کچھ دیر کے لئے ہی توبہ کر کے دیکھو، اور چند روز کے لئے گناہوں سے بچ کر دیکھو، کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا برکت اور کیا نور حاصل ہوتا ہے، اور پھر عقل کے اندر ایسی باتیں سمجھ میں آئیں گی جو پہلے سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾(۱)

اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حرام کیے ہوئے معاصی اور گناہوں سے بچو

(۱) الانفال: ۲۹

گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والا ایک کانٹا پیدا کردیں گے، جو واضح طور پر تمہیں یہ بتادے گا کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے، یہ صحیح ہے، اور یہ غلط ہے۔ آج حق و باطل کے درمیان تمیز مٹ چکی ہے۔ اس لئے کہ ہم نے گناہ کر کر کے اپنی عقلیں خراب کردی ہیں۔

گناہوں کا پانچواں نقصان ''بارش بند ہونا''

گناہوں کا پانچواں نقصان یہ ہے کہ ان کی اصل سزا تو آخرت میں ملے گی، لیکن اس دنیا میں بھی ان گناہوں کی نحوست اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب لوگ زکوٰۃ دینا بند کردیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بارشیں بند کردیتے ہیں۔

گناہوں کا چھٹا نقصان ''بیماریوں کا پیدا ہونا''

اور چھٹا نقصان یہ ہے کہ جب لوگوں میں بدکاری، فحاشی، عریانی پھیل جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو ایسی ایسی بیماریوں میں مبتلا کردیتے ہیں کہ ان کے آباء واجداد نے ان بیماریوں کے بارے میں کبھی سنا بھی نہیں تھا کہ ایسی بھی کوئی بیماری ہوتی ہے اور نہ ان کا نام سنا تھا۔ چنانچہ اس حدیث کو سامنے رکھ کر ''ایڈز'' کی بیماری کو دیکھ لیں جس کا ساری دنیا میں آج طوفان برپا ہے۔ نبی کریم ﷺ چودہ سو سال پہلے بتا گئے کہ ایسی ایسی بیماریاں آئیں گی۔ ہر گناہ کے کچھ خاصے ہوتے ہیں اور ان خاصوں کا مظاہرہ اسی دنیا ہی کے اندر ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ آنکھوں سے دکھا دیتے ہیں۔ اور ان گناہوں کی شامتِ اعمال طاری ہو جاتی ہے۔

گناہوں کا ساتواں نقصان ''قتل و غارت گری''

حدیث شریف میں ہے:

((يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ يَوْمٌ لَا يَدْرِي الْقَاتِلُ فِيْمَ قَتَلَ، وَلَا الْمَقْتُوْلُ فِيْمَ قُتِلَ، فَقِيْلَ: كَيْفَ يَكُوْنُ ذٰلِكَ؟ قَالَ: اَلْهَرَجُ، اَلْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِي النَّارِ))(۱)

''آخر زمانے میں ایک زمانہ ایسا آجائے گا کہ اس میں قتل و غارت گری کی کثرت ہوگی اور آدمی کو مارا جائے گا اور نہ اس کو اور نہ ہی اس کے ورثاء کو پتہ چلے گا کہ کیوں مارا گیا؟ اور کس نے مارا؟ اس زمانے کے قاتل و مقتول دونوں جہنمی ہیں''

(۱) صحيح مسلم، كتاب الفتن وأشراط الساعة، باب لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل بقبر الرجل...... الخ، رقم: ٥١٧٨

پہلے جب کوئی قتل ہوتا تھا تو پتہ چل جاتا تھا کہ دشمنی تھی، اس کی وجہ سے مارا گیا۔
یہ حدیث پڑھ لو آج جو قتل و غارت گری ہو رہی ہے اس کو دیکھ لو کہ کس طرح لوگ مر رہے ہیں۔ آج کسی کا قتل ہو جائے اور اس کے بارے میں پوچھا جائے کہ کیوں مارا گیا؟ اور کس نے مارا؟ تو اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے چودہ سو سال پہلے آج کے حالات دیکھ کر یہ بات ارشاد فرمائی تھی۔ یہ سب ہماری شامتِ اعمال اور شامتِ گناہ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اور گناہوں کی کثرت نے یہ صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔

قتل و غارت گری کا واحد حل

آج ہم لوگ ان فسادات اور قتل و غارت گری کے مختلف حل تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ سیاسی حل تلاش کرنا چاہئے، کوئی کہتا ہے کہ آپس میں مذاکرات ہونے چاہئیں۔ یہ سب تدبیریں تلاش کر رہے ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ان فسادات کا اصل سبب گناہوں کا پھیل جانا ہے۔ جب کسی اُمت کے اندر گناہ پھیل جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی شامتِ اعمال کی یہ صورت پھیل جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ عقلِ سلیم عطا فرمائے اور ان گناہوں کو چھوڑنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمیں پہلا کام یہ کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے تمام گناہوں سے توبہ کریں اور شامتِ اعمال سے پناہ مانگیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اے اللہ! ہم سے ہماری شامتِ اعمال کو دور فرما۔

وظائف سے زیادہ گناہوں کی فکر کرنی چاہئے

بہرحال، نفلی عبادتوں میں زیادہ انہماک اچھی بات ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری کام گناہوں سے بچنا ہے۔ میرے پاس روزانہ کئی حضرات اور خاص طور پر خواتین کے فون آتے ہیں کہ فلاں کام کی دعا بتا دیجئے، فلاں مقصد کے لئے دعا بتا دیجئے۔ بعض خواتین کا یہ خیال ہے کہ ہر مقصد کے لئے الگ دعا ہوتی ہے اور اس کا الگ کوئی وظیفہ ہوتا ہے۔ بھائی! یہ دعائیں اور یہ وظیفے اپنی جگہ قابلِ فضیلت ہیں، لیکن زیادہ فکر اس کی کرنی چاہئے کہ گناہ سرزد نہ ہوں۔ اور گناہوں سے خود بھی بچو اور اپنے گھر والوں اور اپنے بچوں کو بھی گناہوں سے بچاؤ۔ جب تک یہ کام نہیں کرو گے تو یاد رکھو یہ وظیفے کچھ کام نہیں آئیں گے۔ یہ وظیفے اسی وقت کام آتے ہیں جب دل میں گناہوں سے بچنے کی فکر اور اس کا جذبہ ہو، اور بچنے کا اہتمام بھی ہو تو اس وقت ان وظائف اور دعاؤں کے ذریعہ دل میں قوت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر گناہوں سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر گناہوں سے بچنے کی فکر تو

ہے نہیں، غفلت میں وقت گزر رہا ہے، اور ساتھ میں وظائف اور نوافل بھی چل رہے ہیں تو پھر اس وقت ان وظائف سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

گناہوں کا جائزہ لیں

خلاصہ یہ کہ ہم گناہوں سے بچنے کی فکر کریں، اپنی صبح سے شام تک کی زندگی کا جائزہ لیں اور گناہوں کی فہرست بنائیں کہ کون کون سے کام اللہ کی مرضی کے خلاف ہو رہے ہیں۔ پھر یہ جائزہ لیں کہ ان گناہوں میں سے کن کن گناہوں کو فوراً چھوڑ سکتے ہیں، ان کو تو فوراً چھوڑ دیں، اور جن گناہوں کے چھوڑنے کے لئے کسی تدبیر کی ضرورت ہو، ان کے لئے تدبیر اختیار کریں۔ اور اپنے گناہوں سے توبہ واستغفار کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو گناہوں سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔

تہجد گزار سے آگے بڑھنے کا طریقہ

ایک حدیث میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ میں کسی عبادت گزار اور تہجد گزار آدمی سے آگے بڑھ جاؤں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہوں سے محفوظ رکھے۔ مثلاً ہم بزرگوں کے حالات میں پڑھتے ہیں کہ وہ ساری ساری رات عبادت کرتے تھے، اتنی رکعات نفل پڑھتے تھے، اتنے پارے تلاوت کرتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں اس عبادت گزار سے آگے بڑھ جاؤں تو وہ گناہوں سے اپنے آپ کو محفوظ کرلے۔ کیونکہ گناہوں سے حفاظت ہونے کے نتیجے میں انشاء اللہ ان کی بھی نجات ہوگی اور تمہاری بھی نجات ہوگی۔ اگر وہ لوگ بھی گناہوں سے بچتے ہوں گے تو بس اتنا فرق ہوگا کہ ان کا درجہ اونچا ہوگا اور تمہارا درجہ نیچا ہوگا، لیکن نجات میں دونوں برابر ہوں گے۔ اور اگر کوئی شخص عبادت گزار تھا لیکن ساتھ میں گناہ بھی کرتا تھا تو پھر اس سے آگے بڑھ جاؤ گے، اس لئے کہ تم نے اپنے آپ کو گناہوں سے بچالیا ہے۔

مؤمن اور اس کے ایمان کی مثال

ایک اور حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک مؤمن اور اس کے ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گھوڑا کسی لمبی رسّی کے ذریعہ کھونٹے سے بندھا ہوا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ گھوڑا گھومتا بھی رہتا ہے، لیکن ایک حد تک وہ گھوم سکتا ہے، اس حد سے آگے جانے سے وہ کھونٹا اس کو روک دیتا ہے، وہ گھوڑا ذرا سا چکر لگا کر پھر واپس اپنے کھونٹے

کے پاس آکر بیٹھ جائے گا۔ اس طرح وہ کھونٹا دو کام کرتا ہے، ایک یہ کہ وہ گھوڑے کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے سے روکتا ہے، اور دوسرا یہ کہ وہ کھونٹا ہی اس کی جائے پناہ بنا ہوا ہے۔ وہ گھوڑا اِدھر اُدھر چکر لگانے کے بعد واپس اسی کھونٹے کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے۔ (۱)

یہ مثال بیان کر کے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کا کھونٹا اس کا ایمان ہے، اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مؤمن ایک حد تک اِدھر اُدھر جائے گا، گھومے گا پھرے گا، لیکن اگر حد سے آگے جانے کی کوشش کرے گا تو ایمان اس کی رسّی کھینچ لے گا، اور اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد آخر کار وہ مؤمن اپنے ایمان کے کھونٹے کے پاس واپس آجائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ مؤمن کا ایمان اتنا قوی ہوتا ہے کہ وہ اس کو گناہ کرنے نہیں دیتا۔ اور اگر کبھی بھول چوک سے گناہ ہو گیا تو پھر لوٹ کر واپس اپنے ایمان کے کھونٹے کے پاس آجاتا ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ کتنی خوبصورت مثال بیان فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کا یہ کھونٹا مضبوط فرمادے۔

گناہ لکھنے میں تاخیر کی جاتی ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں۔ ایک نیکیاں لکھنے والا اور ایک برائیاں لکھنے والا۔ میں نے اپنے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس اللہ سرہ سے سنا ہے کہ نیکی لکھنے والے فرشتے کو یہ حکم ہے کہ جب وہ انسان نیکی کرے تو فوراً اس کو لکھ لو، اور بدی لکھنے والے فرشتے کو حکم یہ ہے کہ جب وہ انسان بدی کرے تو لکھنے سے پہلے نیکی لکھنے والے فرشتے سے پوچھے کہ لکھوں یا نہ لکھوں۔ گویا کہ نیکی لکھنے والا فرشتہ اس کا امیر ہے۔ چنانچہ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ بدی لکھنے والا فرشتہ نیکی لکھنے والے فرشتے سے پوچھتا ہے کہ لکھوں یا نہ لکھوں؟ نیکی والا فرشتہ کہتا ہے کہ نہیں، ابھی مت لکھو، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ یہ توبہ کرلے اور استغفار کرلے تو پھر لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اگر وہ شخص دوبارہ گناہ کرلیتا ہے اور اپنے پہلے گناہ سے توبہ نہیں کرتا تو پھر پوچھتا ہے کہ اب لکھ لوں۔ نیکی والا فرشتہ کہتا ہے کہ نہیں۔ ابھی ٹھہر جاؤ۔ پھر جب تیسری مرتبہ گناہ کرلیتا ہے تو پھر پوچھتا ہے کہ لکھوں یا نہیں؟ اب جاکر وہ کہتا ہے کہ ہاں اب لکھ لو۔ اس کے بعد وہ گناہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اتنا آسانی کا معاملہ کردیا ہے کہ نیکی فوراً لکھ لی جاتی ہے اور بدی کے لکھنے میں تأمل اور تاخیر کی جاتی ہے کہ شاید یہ گناہ سے توبہ کرلے۔

---

(۱) مسند أحمد، رقم: ۱۰۹۰۷

جہاں گناہ کیا، وہیں توبہ کرلو

اسی وجہ سے بزرگوں نے فرمایا کہ جب کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً بلا تاخیر توبہ واستغفار کرلو، تاکہ وہ گناہ تمہارے نامۂ اعمال کے اندر لکھا ہی نہ جائے۔ اور بزرگوں نے یہ بھی فرمایا کہ جس زمین پر گناہ کیا ہے، اسی زمین پر فوراً توبہ واستغفار کرلو، تاکہ قیامت کے روز جب وہ زمین تمہارے گناہ کی گواہ دے تو اس کے ساتھ ساتھ وہ زمین تمہاری توبہ کی بھی گواہی دے کہ اس شخص نے میرے سینے پر گناہ کیا تھا، اس کے بعد میرے سینے پر ہی توبہ بھی کرلی تھی۔ یہ سب حضورِ اقدس ﷺ کے اس ارشاد کی تعمیل ہو رہی ہے کہ ایمان مؤمن کا کھونٹا ہے، جب مؤمن اِدھر اُدھر چلا جاتا ہے تو گھوم پھر کر واپس اپنے کھونٹے کے پاس آجاتا ہے۔

گناہوں سے بچنے کا اہتمام کریں

اس لئے اوّل تو گناہوں سے بچنے کا اہتمام اور فکر کریں، اہتمام اور فکر کے بغیر گناہوں سے بچا نہیں جاسکتا، اگر اہتمام اور فکر کے باوجود کسی مجبوری سے یا بھول چوک سے یا غلطی سے گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کرو، استغفار کرو اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ یہ کرتے رہو گے تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس گناہ کو معاف فرمادیں گے۔ اور یہ غفلت اور لاپرواہی سب سے بڑی بلا ہے کہ انسان کو فکر اور دھیان اور توجہ ہی نہ ہو بلکہ اپنے گناہوں پر نادم ہونے کے بجائے اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو گناہوں کے وبال سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

گناہوں کا علاج
خوفِ خدا☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،
﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾(۱)

جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے کے منظر سے ڈرے، اور اس بات کا خوف رکھے کہ ایک دن مجھے اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور اپنے ایک ایک عمل کا جواب دینا ہے، اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مشہور تابعی بزرگ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں وہ شخص مراد ہے جس کے دل میں کسی برائی کے کرنے کا خیال آیا کہ فلاں گناہ کرلوں، لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اللہ تعالیٰ کا دھیان کرلیا، اور یہ بات یاد آئی کہ مجھے ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اس یاددہانی کے بعد اس نے اس گناہ کے کرنے کا ارادہ ترک کردیا، اور اس گناہ کو چھوڑ دیا۔ تو ایسے شخص کے لئے دو جنتوں کا وعدہ ہے۔

اس کا نام ''تقویٰ'' ہے

پھر اس کی مزید تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک شخص تنہائی میں ہے۔ اور وہاں اس کو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ اگر وہاں کوئی گناہ کرنا چاہے تو بظاہر گناہ کرنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔ اس تنہائی میں اس کے دل میں گناہ کرنے کا داعیہ اور تقاضا پیدا ہوا۔ لیکن اس تنہائی میں اس نے یہ سوچا کہ اگرچہ کوئی انسان تو مجھے نہیں دیکھ رہا ہے لیکن میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اور ایک دن مجھے اس کے سامنے جاکر کھڑا ہونا ہے۔ اس خیال کے بعد وہ شخص اس گناہ کو ترک کردے تو یہ وہ شخص ہے جس کے لئے اس آیت میں دو جنتوں کا وعدہ ہے۔ اور اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا دھیان کرکے اپنی خواہشِ نفس کے قوی سے قوی اور مضبوط سے مضبوط تقاضے کو چھوڑ دے۔ اور

☆ اصلاحی خطبات (۸/۱۳۶ تا ۱۴۹)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) الرحمٰن: ٤٦

یہ سوچے کہ اگرچہ دنیا نہیں دیکھ رہی ہے لیکن کوئی دیکھنے والا دیکھ رہا ہے۔ اور ساری طریقت اور ساری شریعت کا حاصل بھی یہی ہے کہ یہ خوف دل میں پیدا ہو جائے کہ مجھے اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عظمت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص جہنم سے ڈرے، یا عذاب سے ڈرے، یا آگ سے ڈرے، بلکہ فرمایا کہ جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت ہو کہ وہ یہ سوچے کہ چاہے اللہ تعالیٰ اس گناہ پر عذاب دیں یا نہ دیں، لیکن میں اس عمل کو لے کر اللہ تعالیٰ کے سامنے کیسے جاؤں گا؟ جس شخص کے دل میں دوسرے کی عظمت ہوتی ہے، اس کو چاہے یہ اندیشہ نہ ہو کہ وہ مجھے مارے گا اور سزا دے گا، لیکن اس کی عظمت کی وجہ سے اس کو یہ خوف ہوتا ہے کہ میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کر کے اس کے سامنے جا کر کیا منہ دکھاؤں گا؟ اس خوف کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی میرے دل میں عظمت

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ساری عمر میں ایک دو مرتبہ کے علاوہ کبھی نہیں مارا۔ ایک دو مرتبہ ان کا طمانچہ کھانا یاد ہے، لیکن ان کی شخصیت اور عظمت کا حال یہ تھا کہ ان کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے قدم ڈگمگا جاتے تھے کہ ہم کس کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ اس لئے کہ دل میں یہ خیال تھا کہ کہیں ان کی آنکھوں کے سامنے ہمارا کوئی ایسا عمل نہ آ جائے جو ان کی شان، ان کی عظمت اور ان کے ادب کے خلاف ہو۔ جب ایک مخلوق کے لئے دل میں یہ عظمت ہو سکتی ہے تو خالق کائنات جو سب کا خالق اور سب کا مالک ہے، اس کے لئے دل میں یہ عظمت ضرور ہونی چاہئے کہ آدمی اس بات سے ڈرے کہ میں اس کے سامنے یہ کرتوت اور یہ گناہ کر کے کیسے کھڑا ہوں گا؟ اور اس کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ اسی کے بارے میں اس آیت میں فرمایا:

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾(۱)

ڈرنے کی چیز اللہ کی ناراضگی ہے

دیکھئے، جہنم اور عذاب اس لئے ڈرنے کی چیز ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا مظہر

(۱) النازعات: ۴۰، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''لیکن وہ جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف رکھتا تھا، اور اپنے نفس کو بری خواہشات سے روکتا تھا''

ہے، ورنہ اصل ڈر اور خوف تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا ہونا چاہئے۔عربی کا ایک شاعر کہتا ہے۔

لَا تَسْقِنِیْ مَاءَ الْحَیَاۃِ بِذِلَّۃٍ

بَلْ فَاسْقِنِیْ بِالْعِزِّ کَاْسَ الْحَنْظَلِ

مجھے آبِ حیات بھی ذلیل کر کے مت پلا۔یعنی میں ذلت اُٹھا کر آبِ حیات بھی پینے کے لئے تیار نہیں۔بلکہ مجھے حنظل کا کڑوا گھونٹ پلا دے،مگر عزت کے ساتھ پلا۔

بہرحال، جو لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہو جائے۔اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ جائیں۔اور چونکہ جہنم اور عذاب اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مظہر ہے، اس لئے اس سے بھی ڈر رہے ہیں۔ورنہ اصل میں ڈرنے کی چیز اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے۔

دودھ میں پانی ملانے کا واقعہ

قصہ لکھا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے رات کے وقت گشت کیا کرتے تھے۔اگر کسی کے بارے میں پتہ چلتا کہ فلاں شخص فقر و فاقہ کی حالت میں ہے تو اس کی مدد فرماتے۔اگر یہ پتہ چلتا کہ فلاں شخص کسی مصیبت کا شکار ہے تو اس سے اس کی مصیبت دور فرماتے،اور اگر کوئی غلط کام کرتا ہوا نظر آتا تو اس کی اصلاح فرماتے۔ایک دن اسی طرح آپ تہجد کے وقت مدینہ کی گلیوں میں گشت فرما رہے تھے کہ ایک گھر سے دو عورتوں کی باتیں کرنے کی آواز آئی۔آواز سے اندازہ ہوا کہ ایک عورت بوڑھی ہے اور ایک جوان ہے۔وہ بوڑھی عورت جوان عورت سے جو اس کی بیٹی تھی یہ کہہ رہی تھی کہ بیٹی! یہ دودھ جو تم نے نکالا ہے اس میں پانی ملا دو تا کہ یہ زیادہ ہو جائے اور پھر اس کو فروخت کر دینا۔بیٹی نے جواب دیا: امیر المؤمنین حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ حکم جاری کیا ہے کہ کوئی دودھ بیچنے والا دودھ میں پانی نہ ملائے۔اس لئے ہمیں نہیں ملانا چاہئے۔جواب میں ماں نے کہا کہ بیٹی! امیر المؤمنین یہاں بیٹھے ہوئے تو نہیں ہیں، اگر تم نے پانی ملا دیا تو وہ کونسا تمہیں دیکھ لیں گے، وہ تو اپنے گھر میں ہوں گے۔اس وقت رات کا اندھیرا ہے،کوئی دیکھنے والا تو ہے نہیں،اس لئے ان کو کیسے پتہ چلے گا کہ تم نے پانی ملا دیا ہے۔جواب میں بیٹی نے کہا: اماں جان! امیر المؤمنین تو نہیں دیکھ رہے ہیں،لیکن امیر المؤمنین کا حاکم یعنی اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔اس لئے میں یہ کام نہیں کروں گی۔

دروازے کے باہر حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ یہ ساری گفتگو سن رہے تھے۔جب صبح ہوئی تو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے معلومات کرائی کہ یہ کون خاتون ہیں اور یہ بیٹی کون ہیں؟ معلومات کرانے کے بعد اس لڑکی کے ساتھ اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے نکاح کا پیغام بھیجا، اور اس

سے اپنے بیٹے کی شادی کروائی۔ اس نکاح کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس خاتون کے خاندان میں ان کے نواسے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔ جو مسلمانوں کے پانچویں خلیفہ راشد کہلاتے ہیں۔ بہر حال، یہ بات اس لڑکی کے دل میں پیدا ہوئی کہ اگرچہ امیر المؤمنین تو نہیں دیکھ رہے ہیں، لیکن اللہ دیکھ رہا ہے، جبکہ خلوت اور تنہائی ہے اور رات کی تاریکی ہے، کوئی اور دیکھنے والا نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ بس اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

ایک سبق آموز واقعہ

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مدینہ منورہ کے باہر کسی علاقے میں گئے۔ ایک بکریوں کا چرواہا اُن کے پاس سے گزرا، جو روزے سے تھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کی دیانت کو آزمانے کے لئے اس سے پوچھا کہ اگر تم بکریوں کے اس گلے میں سے ایک بکری ہمیں بیچ دو تو اس کی قیمت بھی تمہیں دیدیں گے، اور بکری کے گوشت میں سے اتنا گوشت بھی دیدیں گے جس پر تم افطار کرسکو۔ اس نے جواب میں کہا کہ یہ بکریاں میری نہیں ہیں، میرے آقا کی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر اس کی ایک بکری گم ہو جائے گی تو وہ کیا کرے گا؟ یہ سنتے ہی چرواہے نے پیٹھ پھیری اور آسمان کی طرف انگلی اُٹھا کر کہا: فَأَيْنَ اللهُ؟ یعنی اللہ کہاں گیا؟ اور یہ کہہ کر روانہ ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما چرواہے کے اس جملے کو دہراتے رہے۔ مدینہ منورہ پہنچے تو اس چرواہے کے آقا سے مل کر اس سے بکریاں بھی خرید لیں اور چرواہے کو بھی خرید لیا، پھر چرواہے کو آزاد کر دیا، اور ساری بکریاں اس کو تحفے میں دے دیں۔ (۱)

جرائم ختم کرنے کا بہترین طریقہ

یاد رکھئے جب تک دلوں میں یہ احساس پیدا نہیں ہوگا، جو اس چرواہے کے دل میں تھا کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، اس وقت تک دنیا سے جرائم نہیں مٹ سکتے، اور بدعنوانیاں ختم نہیں ہوسکتیں، چاہے جرائم کو ختم کرنے کے لئے پولیس کے پہرے بٹھا لو، چاہے کتنے محکمے بنا لو، اس لئے کہ یہ پولیس اور یہ محکمے زیادہ سے زیادہ دن کی روشنی میں اور شہر کی آبادی میں لوگوں کو جرم کرنے سے روک دیں گے، لیکن رات کی تاریکی میں اور جنگل کی تنہائی میں جرائم کو روکنے والی صرف ایک چیز ہے، وہ ہے اللہ کا خوف، اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں روک سکتی، اور جب یہ خوف دلوں سے رخصت ہو جاتا ہے تو پھر معاشرے کا انجام بہت برا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آج دیکھ لیجئے کہ جرائم کو روکنے کے لئے پولیس کے اوپر دوسری

(۱) أسد الغابة في معرفة الصحابة (۳/۲۲۸)

پولیس اور ایک محکمے کے اوپر دوسرا محکمہ بنایا جارہا ہے، اور قانون پر قانون بنایا جارہا ہے، لیکن وہ قانون آج بازار میں دو دو پیسے میں فروخت ہو رہا ہے، حالانکہ عدالتیں اپنی جگہ کام کررہی ہیں، پولیس والے اپنی جگہ کام کررہے ہیں، اور ''محکمہ انسدادِ رشوت ستانی'' قائم ہے، جس پر لاکھوں روپیہ خرچ ہورہا ہے، لیکن دوسری طرف یہ حال ہے کہ رشوت کے ریٹ میں اضافہ ہورہا ہے، اور جو محکمہ رشوت ستانی کے انسداد کے لئے قائم ہوا تھا، وہ خود رشوت ستانی میں مبتلا ہے۔ کہاں تک یہ محکمے اور ادارے قائم کرتے جاؤ گے؟ اس لئے کہ ہر قانون اور ہر تدبیر کا توڑ موجود ہے۔ آج تک دنیا میں کوئی ایسا فارمولا ایجاد نہیں ہوا جو جرائم کا خاتمہ کردے۔ ہاں اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ جرائم ختم ہوسکتے ہیں اور ظلم رفع ہوسکتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تقویٰ

یہی خوف اور احساس حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں پیدا فرمایا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا جب کسی شخص سے کوئی جرم سرزد ہوجاتا تو وہ بے چین ہوجاتا کہ یہ مجھ سے کیا ہوگیا۔ اور جب تک اپنے اوپر شرعی سزا جاری نہ کرالیتا اور جب تک اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہوکر گڑگڑا کر معافی اور توبہ نہ کرلیتا، اس وقت تک اس کو چین نہیں آتا تھا۔ چنانچہ مجرم خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے اوپر سزا جاری کراتا، اور یہ کہتا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کسی طریقے سے پاک کردیجئے۔ لہٰذا جب تک دل میں خدا کا خوف اور اور آخرت کی فکر نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس نہ ہو، اس وقت تک جرائم دنیا سے ختم نہیں ہوسکتے۔ ان کو ختم کرنے کے لئے جو چاہو تدبیر کرلو۔

ہماری عدالتیں اور مقدمات

کئی سال سے میرا عدالت سے بھی تعلق رہا ہے۔ قاعدے کی رو سے چوری اور ڈاکے کے جتنے مقدمات ہوتے ہیں، ان کی آخری اپیل ہمارے پاس عدالت میں آنی چاہئے، لیکن شروع کے تین سال اس طرح گزرے کہ اس عرصہ میں چوری اور ڈاکے کا کوئی مقدمہ ہی نہیں آیا، میں حیران ہوگیا۔ آخر میں نے معلوم کرایا کہ ہمارے یہاں چوری اور ڈاکے کے کتنے مقدمات اس عرصے میں آئے۔ تو پتہ چلا کہ صرف تین یا چار مقدمات آئے۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی شخص یہ اعداد و شمار دیکھے کہ اس ملک میں تین سال کے عرصے میں سپریم کورٹ کے اندر چوری اور ڈاکے کے صرف تین چار مقدمات آئے ہیں تو وہ یہ سمجھے گا کہ یہ تو فرشتوں کی بستی ہے، اور یہاں امن و امان کا دور دورہ ہے۔ اور دوسری طرف

اگر اخبار پڑھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ چوری اور ڈاکے کے پچاسیوں کیس روزانہ ہو رہے ہیں۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ چوری اور ڈاکے کے یہ سارے کیس نیچے ہی نیچے طے ہو جاتے ہیں، اور مقدمہ کے اوپر آنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

ایک عبرت آموز واقعہ

تین سال کے بعد ایک ڈاکے کا جو مقدمہ میرے پاس آیا، وہ یہ تھا کہ ایک شخص کویت میں نوکری کرتا تھا۔ چھٹیوں میں جب وہ کراچی آیا تو ایئرپورٹ پر اس نے ایک ٹیکسی کرایہ پر کی۔ اور اس میں اپنا سامان رکھ کر اپنے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں بہادر آباد کی چورنگی پر گھوڑ سوار پولیس کا ایک دستہ جا رہا تھا۔ رات کے تین بجے کا وقت تھا۔ اس پولیس کے دستے نے اس ٹیکسی کو روک لیا، اور اس سے پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ کویت سے آرہا ہوں اور اب ایئرپورٹ سے اپنے گھر جا رہا ہوں۔ پھر پوچھا کہ تم وہاں سے کیا سامان لائے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ جو سامان لایا ہوں اس کی تفتیش اور تحقیق کسٹم والوں نے کر لی ہے، تمہارا اس سے کیا تعلق؟ آخر کار ایک پولیس والے نے بندوق تان لی کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ نکال دو، اور ہمارے حوالے کر دو۔ یہ پہلا مقدمہ میرے پاس آیا، جس میں وہ پولیس والے جو چوری اور ڈاکے سے حفاظت کے لئے گشت کر رہے تھے، وہی بندوق تان کر دوسروں کا مال چھین رہے ہیں۔ جو لوگ قانون کے محافظ اور امن و امان کے محافظ تھے، وہ خود امن و امان کو غارت کرنے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ دل سے خدا کا خوف مٹ چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا احساس مٹ گیا ہے۔ آدمی یہ بھول گیا ہے کہ مجھے ایک دن مرنا ہے اور مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے۔ جس کے نتیجے میں آج قتل و غارت گری، بدامنی، اور بے چینی ہمارے اوپر مسلط ہے۔

شیطان کس طرح راستہ مارتا ہے

یاد رکھئے! یہ احساس ایک دم سے فوراً نہیں مٹا کرتا، بلکہ آہستہ آہستہ یہ احساس مٹتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ شیطان انسان کو غلط راستے پر لانے کے لئے ایک دم سے کسی بڑے گناہ پر آمادہ نہیں کرتا۔ مثلاً شیطان پہلی مرتبہ کسی انسان سے یہ نہیں کہتا کہ تو جا کر ڈاکہ ڈال۔ اس لئے کہ وہ انسان فوراً انکار کر دے گا۔ کہ ڈاکہ ڈالنا تو بہت خراب چیز ہے، میں نہیں ڈالتا۔ بلکہ وہ شیطان انسان کو پہلے چھوٹے چھوٹے گناہوں میں مبتلا کرتا ہے۔ مثلاً اس سے کہتا ہے کہ نگاہ غلط جگہ پر ڈال لو، اس میں مزہ آئے گا۔ جب رفتہ رفتہ اس چھوٹے گناہ کا عادی بن جاتا ہے تو شیطان اس سے کہتا ہے کہ جب تو

نے فلاں گناہ کیا تھا، اس وقت تو تجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے اور مرنا ہے، جب اس وقت خیال نہیں آیا تو اب یہ دوسرا گناہ بھی کر لے، اس کے بعد تیسرے اور چوتھے گناہ پر آمادہ کرتا ہے، جب چھوٹے چھوٹے گناہوں کا انسان عادی ہو جاتا ہے تو آخر میں شیطان اس سے کہتا ہے کہ جب یہ اتنے سارے گناہ کر لیے تو ایک بڑا گناہ کرنے میں کیا حرج ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ انسان کو بڑے گناہ اور بڑے جرائم پر آمادہ کرتا چلا جاتا ہے۔

نوجوانوں کو ٹی وی نے خراب کر دیا

آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ نوجوان لڑکے ہاتھ میں پستول لیے پھر رہے ہیں۔ اور پستول دکھا کر کسی کا مال چھین لیا، کسی کی جان لے لی، اور کسی کی آبرو لوٹ لی۔ یہ سارے کام پہلے کرتے تھے؟ نہیں، ان کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ پہلے لڑکوں سے کہا گیا کہ ٹی وی ساری دنیا دیکھ رہی ہے، تم بھی دیکھو، فلمیں دیکھو۔ اور اس کے ذریعہ رفتہ رفتہ ان کو گناہ کی طرف آمادہ کیا۔ اور اس کے اثرات ان کے ذہنوں پر مرتب ہو گئے۔ اور جب ایک مرتبہ یہ حوصلہ کھل گیا کہ اللہ تعالیٰ کو بھول کر اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس دل سے مٹا کر میں یہ گناہ کے کام کر رہا ہوں اور یہ فلمیں دیکھ رہا ہوں تو ذرا سا اور آگے بڑھ جاؤں۔ اور شیطان دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ تم نے فلاں فلم کے اندر فلاں تماشہ دیکھا تھا، اب اس کو ذرا خود بھی تجربہ کر کے دیکھو۔ اس طرح آہستہ آہستہ اس کو بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

چھوٹے گناہوں کا عادی بڑے گناہ کرتا ہے

یاد رکھئے! بڑا گناہ ہمیشہ چھوٹے گناہوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ شیطان کی طرف سے پہلے چھوٹے گناہوں کے کرنے کی جرأت پیدا کی جاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو بڑے گناہوں پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ آج کے ان نوجوانوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ہمیں ہمیشہ اس دنیا میں رہنا ہے۔ کبھی اس دنیا سے نہیں جانا۔ کیونکہ گناہوں کا عادی بن جانے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینے کا احساس دلوں سے مٹ گیا۔ تو اب بڑے سے بڑے گناہ کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔ دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ اب جو گناہ چاہو کر والو۔ عربی زبان کا ایک مقولہ ہے:

اَلشَّرُّ یَبْدَأُہٗ فِی الْاَصْلِ اُصْغَرُہٗ

یعنی بڑی برائی کی ابتداء ہمیشہ چھوٹی برائی سے ہوتی ہے۔ اور ذرا سی چنگاری سے آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ اس لئے کبھی کسی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر اختیار مت کرو کہ چلو یہ چھوٹا سا گناہ ہے، کر لو۔ اس لئے

کہ یہ تو شیطان کا دانہ ہے، جو اس نے تم کو اپنے جال میں پھانسنے کے لئے اور اپنا کنٹرول تمہارے اوپر حاصل کرنے کے لئے اور تمہارے دل سے اللہ تعالیٰ کا خوف اور آخرت کی فکر مٹانے کے لئے ڈال دیا ہے۔ اس لئے گناہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، اس کو اللہ تعالیٰ کے خوف سے چھوڑ دو۔

یہ گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ ہے؟

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ لوگ بہت اشتیاق سے پوچھتے ہیں کہ فلاں گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ ہے؟ اور پوچھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر صغیرہ ہے تو کرلیں گے۔ اور اگر کبیرہ ہے تو اس کے کرنے میں تھوڑا ڈر اور خوف محسوس ہوگا۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چنگاری اور ایک بڑا انگارہ۔ کبھی آپ نے کسی کو دیکھا کہ ایک چھوٹی سی چنگاری کو صندوق میں رکھ لے، اور یہ سوچے کہ یہ تو ایک چھوٹی سی چنگاری ہے، کوئی عقلمند انسان ایسا نہیں کرے گا، کیونکہ صندوق میں رکھنے کے بعد وہ آگ بن جائے گی اور صندوق کے اندر جتنی چیزیں ہوں گی ان سب کو جلادے گی اور صندوق کو بھی جلادے گی۔ اور ہوسکتا ہے کہ وہ پورے گھر کو جلادے۔ یہی حال گناہ کا ہے، گناہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، وہ آگ کی چنگاری ہے۔ اگر تم اپنے اختیار سے ایک گناہ کرو گے تو ہوسکتا ہے کہ وہ ایک گناہ تمہاری پوری زندگی کی پونجی خاکستر کردے۔ اس لئے اس فکر میں مت پڑو کہ چھوٹا ہے یا بڑا۔ بلکہ یہ دیکھو کہ گناہ ہے یا نہیں، یہ کام ناجائز ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے یا نہیں؟ جب یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس پیدا کر کے یہ سوچو کہ یہ گناہ کر کے میں اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ بہر حال، اس آیت کا مصداق بننے کا طریقہ یہ ہے کہ جب بھی انسان کے دل میں گناہ کا داعیہ پیدا ہو تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے موجود ہونے کا دل میں دھیان کرے اور اس کے ذریعہ گناہ کو چھوڑ دے۔

گناہ کے تقاضے کے وقت یہ تصور کرلو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ انسان اگر اللہ تعالیٰ کا تصور کرنا چاہے تو بسا اوقات اللہ تعالیٰ کا دھیان اور تصور نہیں بنتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو کبھی دیکھا تو ہے نہیں، اور تصور تو اس چیز کا ہوسکتا ہے جس کو انسان نے دیکھا ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا تصور اور دھیان کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ لیکن جب گناہ کا داعیہ پیدا ہو تو ایک چیز کا تصور اور دھیان کرلیا کرو۔ اور وہ یہ کہ میں جس گناہ کے کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں، اگر اس گناہ کے ارتکاب کے وقت میرا

باپ مجھے دیکھ لے۔ یا میری اولاد مجھے دیکھ لے۔ یا میرے استاد مجھے دیکھ لیں۔ یا میرے شاگرد مجھے دیکھ لیں۔ یا میرے دوست احباب مجھے دیکھ لیں تو کیا اس وقت بھی میں یہ گناہ کا کام کروں گا؟

مثلاً نگاہ کو غلط جگہ پر ڈالنے کا داعیہ دل میں پیدا ہوا، اس وقت ذرا یہ سوچو کہ اگر اس وقت تمہارا شیخ تمہیں دیکھ رہا ہو۔ یا تمہارا باپ تمہیں دیکھ رہا ہو۔ یا تمہاری اولاد تمہیں دیکھ رہی ہو۔ تو کیا اس وقت بھی آنکھ غلط جگہ کی طرف اٹھاؤ گے؟ ظاہر ہے کہ نہیں اٹھاؤ گے۔ اس لئے کہ یہ خوف ہے کہ اگر ان لوگوں میں سے کسی نے مجھے اس حالت میں دیکھ لیا تو یہ لوگ مجھے برا سمجھیں گے۔ لہٰذا جب ان معمولی درجے کی مخلوق کے سامنے شرمندہ ہونے کے ڈر سے اپنے داعیے پر قابو پا لیتے ہو اور نگاہ کو روک لیتے ہو، تو ہر گناہ کے وقت یہ تصور کر لیا کرو کہ اللہ تعالیٰ جو مالک الملک ہے اور ان سب کا خالق اور مالک ہے، وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس تصور سے انشاء اللہ دل میں ایک رکاوٹ پیدا ہوگی۔

گناہوں کی لذت عارضی ہے

جب انسان گناہ کا عادی ہوتا ہے تو اس کو شروع میں گناہ سے بچنے میں دقت اور مشقت ہوتی ہے، اور گناہ سے بچنا آسان نہیں ہوتا، لیکن گناہ سے بچنے کا علاج ہی یہ ہے کہ زبردستی اپنے آپ کو گناہ سے روکے۔ اور گناہ کی خواہش کو اللہ کے لئے کچلے، اور جس وقت وہ اپنی اس خواہش کو اللہ کے لئے کچلے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی ایسی حلاوت عطا فرمائیں گے کہ اس کے آگے گناہوں کی لذت ہیچ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو گناہوں سے بچنے کی حلاوت عطا فرمائے۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ گناہوں کی لذت کی مثال ایسی ہے جیسے خارش زدہ کو خارش کرنے میں لذت آتی ہے۔ اور کھجانے میں اس کو بہت مزہ آتا ہے۔ لیکن وہ لذت صحت کی لذت نہیں ہے۔ وہ بیماری کی لذت ہے۔ اس لئے کہ زیادہ کھجانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس جگہ پر زخم ہو جائے گا۔ اور زخم کی اور جلن کی جو تکلیف ہوگی، اس کے آگے خارش کرنے کی لذت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لیکن اگر خارش کرنے سے رک گیا، اور یہ سوچا کہ خارش کرنے کے بعد زیادہ تکلیف ہوگی، اس لئے کھجانے کے بجائے اس پر مرہم لگاتا ہوں، اور خارش کی کڑوی دوا کھاتا ہوں، تو اس دوا کے کھانے میں تکلیف تو ہوگی، لیکن بالآخر اس خارش سے نجات ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد صحت کی لذت حاصل ہو جائے گی۔ اور وہ صحت کی لذت اس خارش کی لذت سے ہزار درجہ بہتر ہوگی۔ بالکل اسی طرح گناہ کی لذت بالکل بے حقیقت ہے، اور دھوکہ والی لذت ہے۔ اس لذت کو اللہ کے لئے چھوڑ دو۔ اور اس کے بجائے تقویٰ کی لذت حاصل کرو، پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کہاں سے کہاں پہنچاتے ہیں۔ ارے یہ خواہشاتِ نفسانی تو پیدا ہی اس لئے کی گئی ہیں کہ ان کو کچلا جائے۔ اور اس کے ذریعہ

اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کی جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل وکرم سے یہ حقیقت ہمارے دلوں میں جاگزیں فرمائے۔

جوانی میں خوف اور بڑھاپے میں اُمید

ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ جل شانہ سے خوف بھی رکھے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے اُمید بھی رکھے۔ لیکن بزرگوں نے فرمایا کہ جوانی کے دور میں اگر خوف کا غلبہ ہو تو زیادہ بہتر ہے، کیونکہ جوانی کے دور میں جب آدمی کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح چل رہے ہوں، قویٰ مضبوط ہوں، اور آدمی ہر قسم کے کام کرسکتا ہو تو اس وقت گناہوں کے داعیے بھی دل میں بہت پیدا ہوتے ہیں اور گناہوں کے محرکات بھی بہت ہوتے ہیں اور گناہوں کا تقاضا بھی زیادہ ہوتا ہے، اس زمانے میں اس کے دل میں اللہ کے خوف کا غلبہ ہونا زیادہ فائدہ مند ہے تاکہ وہ خوف انسان کو گناہ سے باز رکھے۔ البتہ جب آدمی بوڑھا ہو جائے اور آخری عمر میں پہنچ جائے تو اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کی اُمید اس پر غالب ہونی چاہئے تاکہ وہ مایوسی کا شکار نہ ہو۔

دنیا کا نظام خوف پر قائم ہے

آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خوفِ خدا کوئی حاصل کرنے کی چیز نہیں، چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ میاں تو ہمارے ہیں، ان سے کیسا خوف اور کیسا ڈر؟ وہ تو ہمارے پیدا کرنے والے ہیں اور قرآن کریم میں بار بار فرمارہے ہیں کہ وہ غفور رحیم ہیں۔ تو پھر ان سے ڈر اور خوف کیسا؟ ظاہر ہے کہ جب یہ سوچ ہوگی تو پھر خوفِ خدا کو حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس کیسے ہوگا؟ اسی کا نتیجہ ہے کہ آجکل لوگ غفلت میں گناہوں کے اندر منہمک ہوکر زندگی گزار رہے ہیں۔ یاد رکھئے! یہ خوف ایسی چیز ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو دنیا کا کوئی کام، کوئی کاروبار نہیں چل سکتا۔ اگر طالب علم کو امتحان میں فیل ہونے کا اندیشہ اور خوف نہ ہو تو وہ کبھی محنت نہیں کرے گا۔ یہ خوف ہی اس سے محنت کروا رہا ہے اور اس کو پڑھوا رہا ہے۔ اگر کسی شخص کو ملازمت سے برخواست کردیئے جانے کا خوف نہ ہو تو وہ شخص اپنے فرائض انجام نہیں دے گا بلکہ خالی بیٹھ کر وقت ضائع کرے گا اور کام کرنے کی مصیبت اور تکلیف نہیں اُٹھائے گا۔ اگر بیٹے کو باپ کا خوف نہ ہو، ماتحت کو افسر کا خوف نہ ہو، عام آدمی کو قانون کا خوف نہ ہو تو اس کا نتیجہ لاقانونیت، انارکی اور ظلم ہوگا جس میں کسی بھی انسان کا حق محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ آج آپ یہ جو بدامنی اور بے چینی کا طوفان دیکھ رہے ہیں کہ نہ کسی کی جان محفوظ ہے اور نہ کسی کا مال محفوظ ہے، نہ کسی کی آبرو محفوظ ہے، ڈاکے پڑ رہے ہیں، چوریاں ہو رہی ہیں، اور آج انسان مکھی اور مچھر سے بھی

زیادہ بے حقیقت ہو گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو خوف خدا دلوں سے نکل گیا اور قانون کا خوف بھی اُٹھ گیا۔ آج قانون دو دو پیسے میں فروخت ہو رہا ہے، بس پیسے خرچ کرو اور قانون سے بچ جاؤ۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ پورے معاشرے میں فساد برپا ہے۔

تحریکِ آزادی

جب برصغیر میں انگریز کی حکومت تھی، اس وقت مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر انگریزوں کے خلاف تحریک چلائی ہوئی تھی، انگریزوں کے خلاف مظاہرے اور ہڑتالیں ہو رہی تھیں، چونکہ مسلمان اور ہندو دونوں اس تحریک میں شامل تھے اس لئے بعض اوقات مسلمانوں سے ہندوؤں کے کام کرالیے جاتے تھے اور بعض معاملات میں اسلام اور ہندومت کا امتیاز ختم ہوتا جارہا تھا، مثلاً جب جلوس نکالتے تو مسلمان بھی اپنے ماتھے پر قشقہ لگا لیتے اور ان کے مندروں میں جا کر ان کی رسموں میں شریک ہو جاتے۔ اس قسم کے منکرات اس تحریک میں ہو رہے تھے، اور تحریک چلانے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو پسند نہیں تھا، اس لئے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس تحریک سے الگ تھلگ رہے اور اپنے ملنے والوں اور اپنے مریدوں کو بتاتے رہے کہ میرے نزدیک اس تحریک میں شامل ہونا ٹھیک نہیں ہے۔

لال ٹوپی کا خوف

ایک مرتبہ اس تحریک کے قائدین وفد بنا کر حضرت تھانویؒ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ حضرت! اگر آپ اس تحریک میں شامل ہو جائیں تو انگریز کو بہت جلد یہاں سے بھگایا جاسکتا ہے۔ آپ چونکہ اس تحریک سے الگ ہیں اس لئے انگریزوں کی حکومت باقی ہے۔ لہٰذا آپ ہمارے ساتھ اس تحریک میں شامل ہو جائیں۔ جواب میں حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ آپ نے جو طریقہ اختیار کیا ہے مجھے تو اس طریقے سے اتفاق نہیں، اس لئے میں اس میں کیسے شامل ہوں۔ اور آپ مجھے یہ بتایئے کہ آپ کئی سالوں سے یہ تحریک چلا رہے ہیں، مظاہرے کر رہے ہیں، ہڑتالیں کر رہے ہیں، جلسے جلوس نکال رہے ہیں، اس سے اب تک آپ نے کیا فائدہ حاصل کیا؟ اس وفد میں سے ایک صاحب نے کہا کہ حضرت! اب تک آزادی تو حاصل نہیں ہوئی، لیکن ایک بہت بڑا فائدہ حاصل ہو گیا ہے، وہ فائدہ یہ ہے کہ ہم نے لوگوں کے دلوں سے لال ٹوپی کا خوف نکال دیا ہے۔ اس زمانے میں پولیس کی لال ٹوپی ہوا کرتی تھی اس لئے ''لال ٹوپی'' بول کر پولیس مراد ہوتی تھی۔ اب کسی آدمی کے دل میں پولیس کا خوف نہیں رہا۔ ورنہ پہلے یہ حال تھا کہ اگر پولیس آجاتی تھی تو سارا محلہ تھرا جاتا تھا، اب ہم نے

مظاہرے کر کے اور ہڑتالیں کر کے اس لال ٹوپی کا خوف دلوں سے نکال دیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہمیں حاصل ہوگئی ہے۔ اور رفتہ رفتہ جب ہم آگے بڑھیں گے تو انگریز سے بھی نجات مل جائے گی۔

اس وقت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی حکیمانہ بات ارشاد فرمائی۔ فرمایا کہ آپ نے لوگوں کے دلوں سے لال ٹوپی کا خوف نکال دیا ہے، آپ نے بڑا خراب کام کیا، اس لئے کہ لال ٹوپی کا خوف دلوں سے نکال دینے کے معنی یہ ہیں کہ اب چوروں اور ڈاکوؤں کے مزے آگئے۔ اب چور چوری کرے گا اور اس کو لال ٹوپی کا خوف نہیں ہوگا۔ ڈاکو ڈاکہ ڈالے گا اور اس کو لال ٹوپی کا خوف نہیں ہوگا۔ کم از کم آپ لال ٹوپی کا خوف دلوں سے نکال کر اپنی سبز ٹوپی کا خوف ان کے دلوں میں داخل کر دیتے تو بیشک بڑی کامیابی کی بات تھی، لیکن آپ نے لال ٹوپی کا خوف تو دلوں سے نکال دیا اور دوسرا خوف داخل نہیں کیا تو اب اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرے میں بدامنی اور بے چینی پیدا ہوگی اور لوگوں کے جان و مال، عزت اور آبرو خطرے میں پڑ جائیں گے۔ لہٰذا آپ نے یہ کوئی اچھا کام نہیں کیا، اس کام پر میں آپ کی تعریف نہیں کر سکتا۔

خوف دلوں سے نکل گیا

یہ وہ بات ہے جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ساٹھ سال پہلے فرمائی تھی۔ لیکن آج اس بات کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کر لیجئے کہ آج وہ خوف جب دل سے نکل گیا تو اب بدامنی اور بے چینی کا ایک طوفان معاشرے پر مسلط ہے۔ ورنہ اُس زمانے کا یہ حال تھا کہ اگر کبھی کسی بستی میں کسی ایک آدمی کا بھی قتل ہو جاتا تو پورا ملک ہل جاتا تھا کہ یہ قتل کیسے ہوا؟ اور اس کی تحقیق و تفتیش شروع ہو جاتی تھی۔ آج انسان کی جان مکھی اور مچھر سے زیادہ بے حقیقت ہوگئی ہے، اس لئے کہ خوف دل سے نکل گیا۔

خوفِ خدا پیدا کریں

بہرحال، یہ خوف ایسی چیز ہے کہ اس پر سارے عالم کا نظام قائم ہے۔ اگر یہ خوف نہ ہو تو بدامنی، بے چینی اور لاقانونیت کا دور دورہ ہو جائے۔ اس لئے قرآن کریم میں بار بار فرمایا: اِتَّقُوا اللّٰهَ، اِتَّقُوا اللّٰهَ، تقویٰ اختیار کرو۔ اور تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے خوف سے اس کی معصیتوں سے بچنا۔ جس طرح دنیا کا نظام خوف کے بغیر نہیں چل سکتا، اسی طرح دین کا مدار بھی اللہ کے خوف پر ہے۔ خدا نہ کرے اگر یہ خوف دل سے مٹ جائے یا اس میں کمی آجائے تو پھر گناہوں کا دور دورہ ہو جائے، جیسا کہ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ قرآن کریم میں کہیں جنت کا ذکر ہے، کہیں جہنم اور اس کے عذاب کا ذکر ہے، کہیں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی قدرت کا ذکر ہے تا کہ ہر مسلمان ان باتوں کو

بار بار سوچے اور ان کا دھیان کرے اور ان کے ذریعہ اپنے دل میں خدا کا خوف پیدا کرے۔

تنہائی میں اللہ کا خوف

پولیس کا خوف، قانون کا خوف یا سزا کا خوف یا جیل کا خوف ایسی چیز ہے جو صرف دوسروں کے سامنے جرائم کرنے سے باز رکھ سکتی ہے، لیکن جب خدا کا خوف دل میں اُتر جاتا ہے تو پھر جنگل کی تنہائی میں بھی اور رات کی تاریکی میں بھی وہ خوف انسان کو گناہ سے روک دیتا ہے جبکہ کوئی اور دیکھنے والا بھی موجود نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ رات کی اندھیری ہے اور جنگل کی تنہائی ہے اور کوئی دیکھنے والا موجود نہیں ہے، اس وقت اگر کوئی مؤمن گناہ سے بچ رہا ہے تو اللہ کے خوف کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے جو اس کو گناہ سے روک رہی ہے، اللہ کا خوف اس کو گناہ سے باز رکھے ہوئے ہے۔

روزہ کی حالت میں خوفِ خدا

اس خوفِ خدا کا تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ اس دور میں بھی آدمی کتنا ہی فاسق اور فاجر اور گناہ گار ہو اور رمضان کے مہینے میں روزہ رکھ لے۔ اب شدید گرمی پڑ رہی ہے، سخت پیاس لگی ہوئی ہے، زبان باہر کو آرہی ہے، کمرہ بند ہے اور کمرہ میں اکیلا ہے، کوئی دوسرا شخص پاس موجود نہیں اور کمرہ میں فرج موجود ہے۔ فرج میں ٹھنڈا پانی رکھا ہوا ہے، اس وقت اس انسان کا نفس یہ تقاضا کر رہا ہے کہ اس شدید پیاس کے عالم میں ٹھنڈا پانی پی لوں، لیکن کیا آج کے اس گئے گزرے دور میں بھی کوئی مسلمان ایسا ہے جو اس وقت فرج میں سے پانی نکال کر گلاس میں ڈال کر پی لے؟ وہ ہرگز پانی نہیں پیئے گا، حالانکہ اگر وہ پانی پی لے تو کسی بھی انسان کو کانوں کان خبر نہ ہوگی اور کوئی اس کو لعنت ملامت بھی نہیں کرے گا اور دنیا والوں کے سامنے وہ روزہ دار ہی رہے گا۔ اور شام کو باہر نکل کر لوگوں کے ساتھ افطاری کھالے تو کسی شخص کو بھی پتہ نہیں چلے گا کہ اس نے روزہ توڑ دیا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ پانی نہیں پیئے گا۔

اب بتایئے! وہ کون سی چیز ہے جو اس کو بند کمرے میں پانی پینے سے روک رہی ہے، اللہ کے خوف کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں جو اس کو روک رہی ہے۔ چونکہ ہمیں روزہ رکھنے کی عادت پڑ گئی ہے اس لئے اس عادت کے نتیجے میں وہ خوف کارآمد ہو گیا۔

ہر موقع پر یہ خوف پیدا کریں

اب شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ جس طرح روزہ کی حالت میں بند کمرے میں اللہ کا خوف تمہیں پانی پینے سے روک رہا تھا، بالکل اسی طرح اگر نگاہ کا شدید تقاضا ہو رہا ہے کہ وہ غلط جگہ پڑ جائے تو اس

شدید تقاضے کو بھی اللہ کے خوف سے دبا کر اس نگاہ کو روک لو۔ اسی طرح غیبت کرنے یا جھوٹ بولنے کا شدید تقاضا ہو رہا ہے، تو جس طرح روزے کی حالت میں اللہ کے خوف سے پانی پینے سے رک گئے تھے، اسی طرح یہاں بھی غیبت اور جھوٹ سے رک جاؤ۔ یہ ہے اللہ کا خوف۔ یہ جب دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے تو پھر انسان کسی بھی حالت میں اللہ کی مرضی کے خلاف کام نہیں کرتا۔ یہ خوفِ خدا شریعت میں مطلوب ہے۔

جنت کس کے لئے ہے؟

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ٥ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ٥﴾(۱)

کیا عجیب الفاظ ارشاد فرمائے ہیں۔ فرمایا کہ وہ شخص جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا کہ میں کسی دن اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہوں گا تو کس منہ سے اپنے پروردگار کے سامنے جاؤں گا۔ اور یہ خوف اتنا شدید پیدا ہوا کہ اس خوف کے نتیجے میں اس نے اپنے نفس کو ناجائز خواہشات پر عمل کرنے سے روک لیا تو ایسے انسان کا ٹھکانہ جنت ہے۔ اور ایسے ہی انسان کے لئے جنت تیار کی گئی ہے۔

جنت کے اردگرد مشقت

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ الْجَنَّةَ حُفَّتْ بِالْمَكَارِهِ))(۲)

جنت کو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے گھیر رکھا ہے جو انسان کی طبیعت کو ناگوار معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی مشقت اور محنت والے کام جو طبیعت پر بار معلوم ہوتے ہیں ان سے جنت کو گھیرا ہوا ہے، گویا کہ اگر تم ان ناگوار کاموں کو کرلو گے تو جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ اس لئے یہ کہا جا رہا ہے کہ اپنے دلوں میں اللہ کا خوف پیدا کرو، اس کے نتیجے میں ناجائز خواہشات پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی اور جنت حاصل ہو جائے گی۔ اور یہ خوف اس درجہ کا ہو کہ اپنے ہر فعل اور ہر قول کے اندر یہ دھڑکا لگا ہو کہ یہ کہیں

---

(۱) النازعات: ۴۰۔۴۱، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''لیکن وہ جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف رکھتا تھا، اور اپنے نفس کو بری خواہشات سے روکتا تھا۔ تو جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہو گی''

(۲) صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، رقم: ۵۰۴۹، سنن الترمذي، كتاب صفة الجنة عن رسول الله، باب ما جاء صفت الجنة بالمكاره، رقم: ۲۴۸۲

میرے مالک کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔ چنانچہ صحابہ کرام کے خوف کا یہ عالم تھا کہ ان کو اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اوپر سزا جاری نہ کرا لیتے۔

عبادت پر بھی استغفار کرنا چاہئے

پھر جب اس خوف میں ترقی ہوتی ہے تو پھر یہ خوف صرف اس بات کا نہیں ہوتا کہ ہم سے گناہ نہ ہو جائے بلکہ پھر اس بات کا بھی خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم جو عبادت کر رہے ہیں وہ اللہ جل شانہ کے شایانِ شان ہے یا نہیں؟ وہ عبادت اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنے کے لائق ہے یا نہیں؟ گویا کہ وہ شخص ایسے اعمال بھی کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا والے اعمال ہیں، لیکن ڈر رہا ہے کہ کہیں یہ عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے شایانِ شان نہ ہو اور اس عمل میں کوئی گستاخی اور بے ادبی نہ ہوگئی ہو۔ اس لئے بزرگوں نے فرمایا کہ ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ عمل کرتا رہے اور ڈرتا رہے، قرآن کریم نے فرمایا:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾(۱)

ان کے پہلو رات کے وقت بستروں سے الگ رہتے ہیں۔ اور اللہ کے حضور کھڑے ہو کر عبادت کرتے رہتے ہیں، لیکن اس وقت بھی دل خوف سے خالی نہیں ہوتا بلکہ اپنے پروردگار کو خوف کے ساتھ پکارتے رہتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ میرا عمل اللہ کے حضور پیش کرنے کے لائق ہے یا نہیں؟

نیک بندوں کا حال

ایک دوسری جگہ پر نیک بندوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾(۲)

یعنی اللہ کے نیک بندے رات کے وقت بہت کم سوتے ہیں۔ بلکہ اللہ کے حضور کھڑے ہو کر عبادت کرتے رہتے ہیں، تہجد ادا کرتے ہیں، لیکن جب سحری کا وقت آتا ہے تو اس وقت استغفار کرتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور اقدس ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! سحری کے وقت استغفار کرنے کا تو موقع نہیں ہے، اس لئے کہ استغفار تو کسی گناہ کے بعد ہوتا ہے، یہ تو ساری رات اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر عبادت کرتے رہے، کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ جواب میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ وہ لوگ اپنی عبادت سے استغفار کرتے ہیں کہ جیسی عبادت کرنی چاہئے تھی ایسی عبادت ہم نہیں کر سکے، عبادت کا جیسا حق ادا کرنا چاہئے تھا ویسا حق ہم سے ادا نہ ہو سکا۔

(۱) السجدۃ:۱۶ (۲) الذاریات:۱۷۔۱۸

بہر حال، اللہ کے ان نیک بندوں کو صرف گناہ کا خوف نہیں ہوتا بلکہ عبادت کے غلط ہونے کا بھی خوف ہوتا ہے کہ کہیں یہ عبادت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب نہ بن جائے۔

اللہ کا خوف بقدر معرفت

خوف کے بارے میں اصول یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی جتنی معرفت زیادہ ہوگی اتنا ہی اس کو اللہ تعالیٰ کا خوف زیادہ ہوگا، اور جتنا نادان ہوگا اتنا ہی خوف کم ہوگا۔ دیکھئے ایک چھوٹا سا بچہ ہے، جو ابھی نادان ہے، اس کے سامنے بادشاہ آجائے یا وزیر آجائے یا شیر آجائے تو اس کو کوئی خوف نہیں ہوتا۔ لیکن جو شخص بادشاہ کا مرتبہ جانتا ہے وہ بادشاہ کے پاس جاتے ہوئے تھراتا ہے اور کانپتا ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ کی معرفت انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ تھی، اس لئے ان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف بھی زیادہ تھا۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ اور خوف

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ پریشان اور ڈرتے ہوئے، کانپتے ہوئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا:

"نَافَقَ حَنْظَلَةُ، يَا رَسُوْلَ اللهِ!"

''اے اللہ کے رسول! حنظلہ تو منافق ہوگیا''

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیسے منافق ہوگئے؟ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جب ہم آپ کی مجلس میں بیٹھتے ہیں اور جنت اور دوزخ کا ذکر سنتے ہیں اور آخرت کا ذکر سنتے ہیں تو اس کے نتیجے میں دل میں رقت اور گداز پیدا ہوتا ہے، اور دنیا سے اعراض پیدا ہوجاتا ہے اور آخرت کی فکر پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن جب ہم گھر جاتے ہیں، بیوی بچوں سے ملتے ہیں، کاروبارِ زندگی میں لگ جاتے ہیں تو دل کی وہ کیفیت باقی نہیں رہتی، بلکہ دنیا کی محبت ہمارے دلوں پر چھا جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں آکر ایک حالت اور باہر جاکر دوسری حالت ہوجاتی ہے، یہ تو منافق ہونے کی علامت ہے۔ جواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"يَا حَنْظَلَةُ! سَاعَةً وَسَاعَةً"(۱)

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب فضل دوام الذكر والفكر فى أمور الآخرة والمراقبة، رقم: ۴۹۳۷، سنن الترمذى، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۴۳۸، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب المداومة على العمل، رقم: ۴۲۲۹، مسند أحمد، رقم: ۱۶۹۴۹

اے حنظلہ! گھبرانے کی بات نہیں، یہ تو وقت وقت کی بات ہے، کسی وقت دل میں رقت زیادہ ہوگئی اور کسی وقت کم ہوگئی، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر مدار نہیں ہے، بلکہ اصل مدار اعمال پر ہے کہ انسان کا کوئی عمل شریعت کے خلاف نہ ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور خوف

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اپنے کانوں سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن چکے تھے:

((عُمَرُ فِي الْجَنَّةِ)) ''عمر جنت میں جائیں گے''(۱)

اور یہ واقعہ بھی سن چکے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب میں معراج پر گیا اور وہاں جنت کی سیر کی تو جنت میں، میں نے ایک بہت شاندار محل دیکھا، اور اس محل کے کنارے ایک خاتون بیٹھی وضو کر رہی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ محل کس کا ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ یہ عمر کا محل ہے۔ وہ محل اتنا شاندار تھا کہ میرا دل چاہا کہ اندر جا کر اس محل کو دیکھوں، لیکن اے عمر! مجھے تمہاری غیرت یاد آگئی کہ تم بہت غیور انسان ہو۔ اس لئے میں اس محل کے اندر داخل نہیں ہوا اور واپس آگیا۔ جب حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو رو پڑے، اور عرض کیا:

''أَوَ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَغَارُ''

''یا رسول اللہ! کیا میں آپ پر غیرت کروں گا''(۲)

دیکھئے! حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اپنے لئے جنت کی بشارت سن چکے، اور جنت میں اپنے محل کے بارے میں سن چکے، اس کے باوجود آپ کا یہ حال تھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تشریف لائے، جن کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کی فہرست بتا دی تھی کہ مدینے میں فلاں فلاں شخص منافق ہے۔ آپ ان سے پوچھ رہے ہیں کہ اے حذیفہ! خدا کے لئے مجھے یہ بتا دو کہ کہیں اس فہرست میں میرا نام تو نہیں ہے؟(۳)

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول الله، باب مناقب عبد الرحمن بن عوف الزهری، رقم: ۳۶۸۰، سنن أبی داود، کتاب السنة، باب فی الخلفاء، رقم: ۴۰۳۱، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضائل العشرة، رقم: ۱۳۰، مسند أحمد، رقم: ۱۵۴۳

(۲) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب مناقب عمر بن الخطاب أبی حفص القرشی العدوی، رقم: ۳۴۰۳، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر، رقم: ۴۴۰۸، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل عمر، رقم: ۱۰۴، مسند أحمد، رقم: ۸۱۱۵

(۳) البداية والنهاية (۱۹/۵)

خیال یہ آرہا تھا کہ حضورِ اقدس ﷺ نے تو جنت کی بشارت دے دی تھی، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے بعد کے اعمال کی وجہ سے ان بشارتوں پر پانی پھر جائے۔ دیکھئے! حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو یہ خطرہ لگا ہوا ہے۔ بہرحال، جس شخص کو جتنی زیادہ معرفت ہوتی ہے اتنا ہی اس کو خوف بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یہ خوف جب تک دل میں کسی نہ کسی درجے میں حاصل نہ ہو، یاد رکھئے! اس وقت تک تقویٰ حاصل نہیں ہوسکتا۔

خوف پیدا کرنے کا طریقہ

اس خوف کو پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ وقت فجر کے بعد یا رات کو سوتے وقت مقرر کرے، پھر اس وقت اس بات کا تصور کرے کہ میں مر رہا ہوں، بسترِ مرگ پر لیٹا ہوا ہوں، اعزہ اور اقرباء جمع ہیں، میری روح نکل رہی ہے، اس کے بعد مجھے کفن پہنانے کے بعد دفن کیا جارہا ہے، پھر فرشتے سوال و جواب کے لئے آرہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوں۔ ان سب باتوں کا دھیان کرکے سوچے، جب روزانہ انسان یہ سب باتیں سوچے گا تو انشاء اللہ دل سے رفتہ رفتہ غفلت کے پردے اُٹھنا شروع ہوجائیں گے۔ ہم پر غفلت اس لئے چھائی ہوئی ہے کہ ہم اور آپ موت سے غافل ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے پیاروں کو مٹی دے کر آتے ہیں، اپنے کاندھوں پر جنازہ اُٹھاتے ہیں، اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ فلاں آدمی بیٹھے بیٹھے دنیا سے رخصت ہوگیا، اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جس دنیا کو جمع کرنے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے صبح شام دوڑ دھوپ کررہا تھا، محنت اور مشقت برداشت کررہا تھا، لیکن جب دنیا سے گیا تو ان کی طرف منہ موڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ ان تمام چیزوں کو دیکھنے کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ موت کا واقعہ اس کے ساتھ پیش آیا ہے، اپنی طرف دھیان نہیں جاتا کہ مجھے بھی ایک دن اس طرح دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ))(۱)

اس چیز کو کثرت سے یاد کیا کرو جو ان ساری لذتوں کو ختم کرنے والی ہے یعنی موت۔ اس کو بھلاؤ نہیں، بلکہ اس کو کثرت سے یاد کرو۔ بہرحال، روزانہ صبح یا شام کے وقت ان چیزوں کا تھوڑا سا مراقبہ کرلے تو اس سے مطلوبہ خوف کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور پیدا ہوجاتا ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ماجاء فی ذکر الموت، رقم: ۲۲۲۹، سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب کثرة ذکر الموت، رقم: ۱۸۰۱

تقدیر غالب آجاتی ہے

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص جنت والوں کے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، اس وقت اس کے اوپر لکھی ہوئی تقدیر غالب آجاتی ہے اور وہ شخص پھر جہنم والوں کے اعمال شروع کر دیتا ہے حتیٰ کہ آخرکار وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص ساری عمر جہنم والوں کے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، اس وقت اس کے اوپر لکھی ہوئی تقدیر غالب آجاتی ہے اور اس کے بعد وہ جنت کے عمل شروع کر دیتا ہے حتیٰ کہ آخرکار وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے(۱)۔

اپنے عمل پر ناز نہ کریں

اس حدیث سے یہ سبق ملا کہ کوئی شخص اپنے عمل پر ناز نہ کرے کہ میں فلاں عمل کر رہا ہوں اور فلاں عمل کر رہا ہوں، اس لئے کہ ان اعمال کا کوئی اعتبار نہیں، اعتبار زندگی کے آخری اعمال کا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا:

((إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ))(۲)

یعنی خاتمہ کا اعتبار ہے کہ خاتمے کے وقت وہ کیسے اعمال کر رہا تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی عمل کی نحوست انسان کو جہنمیوں کے اعمال کی طرف لے جائے، اسلئے نیک عمل کرتے ہوئے بھی ڈرنا چاہئے۔

بُرے عمل کی نحوست

لیکن ایک بات خوب سمجھ لینی چاہئے کہ اُس انسان سے جہنمیوں والے اعمال جبری طور پر نہیں کرائے جائیں گے تاکہ اس کی وجہ سے وہ جہنم میں چلا جائے۔ ایسا نہیں ہوگا، بلکہ وہ یہ سارے اعمال اپنے اختیار سے کرتا ہے، مجبور نہیں ہوتا۔ لیکن ان اعمال کی نحوست ایسی ہوتی ہے کہ وہ پچھلے سارے نیک

(۱) صحيح البخاري، كتاب تفسير القرآن، باب فسنيسره للعسرى، رقم: ٤٥٦٨، صحيح مسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي في بطن أمه، رقم: ٤٧٨٧، سنن الترمذي، كتاب القدر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الشقاء والسعادة، رقم: ٢٠٦٢، سنن أبي داود، كتاب السنة، باب في القدر، رقم: ٤٠٨٦، سنن أبي ماجه، المقدمة، في القدر، رقم: ٧٥، مسند أحمد، رقم: ١٩

(۲) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب الأعمال بالخواتيم وما يخاف منها، رقم: ٦٠١٢، مسند أحمد، رقم: ٢١٧٦٨

اعمال کے اجر و ثواب کو ختم کر دیتی ہے، اور برے اعمال کی طرف انسان کو گھسیٹ کر لے جاتی ہے۔ بعض گناہوں کی نحوست ایسی ہوتی ہے کہ اس نحوست کی وجہ سے وہ پھر دوسرے گناہ میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے، اور دوسرے گناہ کی نحوست سے وہ تیسرے گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور آہستہ آہستہ وہ گناہوں کے اندر اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں اس کی ساری پچھلی زندگی پر پانی پھر جاتا ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے فرمایا کہ کسی بھی چھوٹے گناہ کو معمولی سمجھ کر مت کرو، اس لئے کہ کیا پتہ یہ چھوٹا گناہ تمہاری عمر بھر کی نیکیوں کو ختم کر دے۔ اور پھر کسی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر کر لینا ہی اس کو کبیرہ بنا دیتا ہے، اور اس کا نقد وبال یہ ہوتا ہے کہ وہ گناہ دوسرے گناہ کو کھینچتا ہے، رفتہ رفتہ پھر وہ گناہوں کے اندر مبتلا ہوتا چلا جاتا ہے۔

صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کی مثال

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چھوٹے گناہ کی مثال ایسی ہے جیسے چھوٹی سی چنگاری، اور بڑے گناہ کی مثال ایسی ہے جیسے بڑی آگ اور بڑا انگارہ۔ اب کوئی شخص یہ سوچ کر کہ یہ تو چھوٹی سی چنگاری ہے اور بڑی آگ تو ہے نہیں، لاؤ میں اس کو اپنے صندوق میں رکھ لیتا ہوں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ چھوٹی سی چنگاری سارے صندوق اور کپڑوں کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

بزرگوں کی گستاخی کا وبال

اسی طرح اللہ والوں کی بے حرمتی کرنا، ان کی شان میں گستاخی کرنا یا ان کا دل دکھانا یہ ایسی چیز ہے کہ بعض اوقات اس کی وجہ سے انسان کی مت اُلٹی جاتی ہے، لہٰذا اگر کسی اللہ والے سے تمہیں اختلاف ہو گیا تو اس اختلاف کو اختلاف کی حد تک رکھو، لیکن اگر تم نے اس کی شان میں گستاخی اور بے ادبی شروع کر دی تو اس کا وبال یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات انسان گناہوں میں پھنستا چلا جاتا ہے۔

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ ہے، جس کا نام ہے ''درسِ عبرت'' اس میں ایک بہت بڑے بزرگ کا عبرت ناک واقعہ لکھا ہے، جو ساری عمر شیخ، بزرگ اور اللہ والے رہے، اور پھر اچانک مت اُلٹی ہوئی، اور برے کاموں کے اندر مبتلا ہو گئے۔ تو بعض اوقات یہ چھوٹے سے گناہ کا وبال ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کسی بھی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر مت کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گناہ سوءِ خاتمہ پر منتج ہو جائے۔ اسی لئے تمام بزرگ ہمیشہ خاتمہ بالخیر کی دعائیں کراتے ہیں۔

نیک عمل کی برکت

اس کے برعکس بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے اعمال خراب ہیں، گناہوں کے اندر

مبتلا ہے، اچانک اللہ تعالیٰ نے نیک اعمال کی توفیق دیدی، اور یہ توفیق بھی کسی نیک عمل کے نتیجے میں ملتی ہے، مثلاً پہلے کسی چھوٹے نیک عمل کی توفیق ہوگئی اور پھر اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مزید نیک اعمال کی توفیق عطا فرمادی، اور اس کے نتیجے میں اس کے لئے جنت کا دروازہ کھل گیا۔ اسی وجہ سے حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَيْئًا))(۱)

''تم میں سے کوئی بھی شخص کسی بھی نیکی کو حقیر مت سمجھے''

کیا پتہ کہ وہی نیکی تمہاری زندگی کے اندر انقلاب پیدا کردے اور اس کی وجہ سے بیڑا پار ہوجائے، اور اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمادے۔ اللہ والوں کے ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ چھوٹی سی نیکی کی اور اس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے زندگی میں انقلاب پیدا فرمادیا۔ اس لئے چھوٹی سی نیکی کو بھی حقیر مت سمجھو۔ اور میں نے ایک رسالہ ''آسان نیکیاں'' کے نام سے لکھ دیا ہے۔ جس میں ایسے چھوٹے چھوٹے اعمال لکھ دیئے ہیں جن کی احادیث میں بڑی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے۔ اگر انسان ان نیک کاموں کو کرلے تو اس کے نتیجے میں اس کے نیک اعمال میں بہت زیادہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ ہر مسلمان کو یہ رسالہ ضرور پڑھنا چاہئے اور ان نیکیوں کو اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

تقدیر کی حقیقت

بعض لوگ اس حدیث کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ جب تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے کہ کون شخص جنتی ہے اور کون سا شخص جہنمی ہے تو اب عمل کرنے سے کیا فائدہ۔ ہوگا تو وہی جو تقدیر میں لکھا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم وہی عمل کروگے جو تقدیر میں لکھا ہے۔ بلکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تقدیر میں وہی بات لکھی ہے جو تم لوگ اپنے اختیار سے کروگے۔ اس لئے کہ تقدیر تو علمِ الٰہی کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ کو پہلے سے پتہ تھا کہ تم اپنے اختیار سے کیا کچھ کرنے والے ہو۔ لہٰذا وہ سب اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ میں لکھ دیا۔ لیکن تمہارا جنت میں جانا یا جہنم میں جانا درحقیقت تمہارے اختیاری اعمال ہی کی بنیاد پر ہوگا۔ یہ بات نہیں ہے کہ انسان عمل وہی کرے گا جو تقدیر میں لکھا ہے، بلکہ تقدیر میں وہی لکھ دیا گیا ہے جو انسان اپنے اختیار سے عمل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار دیا ہے اور اس اختیار کے مطابق انسان عمل کرتا رہتا ہے۔ اب یہ سوچنا کہ تقدیر میں تو سب لکھ دیا گیا ہے، لہٰذا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤ، یہ درست نہیں ہے۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب البرّ والصلة والآداب، باب استحباب طلاقة الوجه عند اللقاء، رقم: ٤٧٦٠، مسند أحمد، رقم: ١٥٣٨٩

چنانچہ جب حضورِ اقدس ﷺ نے یہ حدیث بیان فرمائی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھ لیا:
((فَفِيْمَا الْعَمَلُ يَا رَسُوْلَ اللهِ!))
''جب یہ فیصلہ ہو چکا کہ فلاں شخص جنتی اور فلاں شخص جہنمی، تو پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ؟''

سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا:
((اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ))
''عمل کرتے رہو، اس لئے کہ ہر انسان کو وہی کام کرنا ہوگا جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا، لہٰذا تم اپنے اختیار کو کام میں لا کر عمل کرتے رہو''(۱)

بے فکر نہ ہو جائیں

اس حدیث کو یہاں لانے کا منشاء یہ ہے کہ آدمی یہ نہ سوچے کہ میں بڑے بڑے وظائف اور تسبیحات پڑھ رہا ہوں اور نوافل پڑھ رہا ہوں اور اپنی طرف سے پوری شریعت پر چل رہا ہوں اس لئے اب میں مطمئن ہو جاؤں۔ ارے آخر دم تک انسان کو مطمئن نہیں ہونا چاہئے، بلکہ یہ دھڑکا اور یہ خوف انسان کو لگا رہنا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری یہ حالت بدل جائے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اندریں راہ می تراش و می خراش
تا دم آخر دمے فارغ مباش

اس راستے میں تو ہر وقت تراش خراش چلتی رہتی ہے، ہر وقت اپنے نفس کی نگرانی کرنی پڑتی ہے کہ کہیں یہ غلط راستے پر تو نہیں جا رہا ہے۔ بڑے بڑے لوگ بے فکری کی وجہ سے پھسل گئے، اس لئے آخر دم تک انسان کو بے فکر نہ ہونا چاہئے۔

جہنم کا سب سے ہلکا عذاب

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے ہلکا عذاب جس شخص

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب تفسير القرآن، باب فسنيسره للعسرى، رقم: ٤٥٦٨، صحيح مسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي في بطن أمه، رقم: ٤٧٨٧، سنن الترمذي، كتاب القدر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الشقاء والسعادة، رقم: ٢٠٦٢، سنن أبي داود، كتاب السنة، باب في القدر، رقم: ٤٠٨٦، سنن أبي ماجه، المقدمة، في القدر، رقم: ٧٥، مسند أحمد، رقم: ١٩

کو ہوگا، وہ ہلکا عذاب یہ ہوگا کہ اس کے پاؤں کے تلووں کے نیچے دو چنگاریاں رکھ دی جائیں گی، مگر ان کی شدت اتنی زیادہ ہوگی کہ اس کی وجہ سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا، اور وہ شخص یہ سمجھ رہا ہوگا کہ شاید سب سے زیادہ سخت عذاب مجھ کو ہو رہا ہے۔ حالانکہ اس کو سب سے ہلکا عذاب ہو رہا ہوگا۔ (۱)

بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ عذاب حضور اقدس ﷺ کے چچا ابو طالب کو ہوگا، کیونکہ انہوں نے حضور اقدس ﷺ کی مدد اور نصرت بہت کی تھی، لیکن آخر وقت تک ایمان نہیں لائے۔ اس لئے ان کو یہ عذاب ہوگا۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

بہر حال، اس حدیث سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جب سب سے ہلکے عذاب کی وجہ سے یہ حال ہوگا کہ اس چنگاری کے نتیجے میں اس شخص کا دماغ کھول رہا ہوگا تو جن کے لئے شدید عذاب کی وعید آئی ہے، ان کا کیا حال ہوگا؟ جہنم کے اس عذاب کا انسان کبھی کبھی تصور کرلیا کرے تو اس کے نتیجے میں انسان کے اندر خوف پیدا ہوتا ہے اور اس کے دل میں تقویٰ جاگزیں ہوتا ہے۔

جہنمیوں کے درجات

ایک حدیث میں مختلف جہنمیوں کا حال بیان فرماتے ہوئے سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بعض جہنمی ایسے ہوں گے کہ جہنم کی آگ ان کے ٹخنے تک پہنچی ہوگی۔ جس کے صرف تلووں میں چنگاری رکھی جائے گی اس کا حال تو آپ نے اوپر کی حدیث میں سن لیا۔ اگر وہ آگ ٹخنوں تک پہنچ جائے تو اس کا کیا حال ہوگا۔ اور بعض جہنمی ایسے ہوں گے کہ جہنم کی آگ ان کے گھٹنوں تک پہنچی ہوئی ہوگی۔ اور بعض جہنمی ایسے ہوں گے کہ آگ ان کی کمر تک پہنچی ہوئی ہوگی۔ اور بعض ایسے ہوں گے کہ ان کی ہنسلی کی ہڈی تک آگ پہنچی ہوئی ہوگی۔ یہ جہنمیوں کے مختلف درجات ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

میدانِ حشر میں انسانوں کا حال

یہ تو جہنم کا حال تھا، لیکن جہنم میں جانے سے پہلے جب میدانِ حشر میں پیشی ہوگی، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ اس کے بارے میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے، یہاں تک کہ ایک شخص اپنے پسینے میں آدھے کانوں تک ڈوبا ہوا

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار، رقم: ٦٠٧٦، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب أهون أهل النار عذابا، رقم: ٢٦١، سنن الترمذي، كتاب صفة جهنم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء أن أكثر أهل النار النساء، رقم: ٢٥٢٩، مسند أحمد، رقم: ٢٥٠٤

ہوگا، گویا کہ گرمی کی شدت کی وجہ سے پسینہ نکلتے نکلتے اتنا زیادہ ہوگیا کہ وہ آدھے کانوں تک پہنچ گیا۔ ایک اور حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز لوگوں کا اتنا پسینہ بہے گا کہ وہ ستر ہاتھ زمین کے اندر بہہ کر چلا جائے گا۔ اور وہ پسینہ لوگوں کو ڈھانپتا رہے گا یہاں تک کہ ان کے کانوں تک پہنچ جائے گا۔(۱)

جہنم کی وسعت

ایک اور روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں آپ نے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی، آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ یہ کس چیز کے گرنے کی آواز ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ آج سے ستر سال پہلے ایک پتھر جہنم کے اندر پھینکا گیا تھا، آج وہ پتھر اس کی تہہ میں پہنچا ہے، یہ اس پتھر کے گرنے کی آواز ہے۔(۲)

پہلے لوگ اس کو بہت مبالغہ سمجھتے تھے کہ وہ پتھر ستر سال سفر کرنے کے بعد تہہ میں پہنچا، لیکن اب تو سائنس نے ترقی کر لی ہے، چنانچہ سائنس کا کہنا ہے کہ بہت سے ستارے ایسے ہیں کہ جب سے وہ پیدا ہوئے ہیں ان کی روشنی زمین کی طرف سفر کر رہی ہے، لیکن آج تک وہ روشنی زمین تک نہیں پہنچی۔ جب اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اس قدر وسیع ہے تو پھر اس میں کیا بعد ہے کہ ایک پتھر جہنم کے اندر ستر سال سفر کرنے کے بعد اس کی تہہ میں پہنچا ہو۔ بہرحال، اس حدیث کے ذریعہ جہنم کی وسعت جتلانا مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس جہنم سے محفوظ رکھے۔

ان تمام احادیث کا حاصل یہ ہے کہ انسان کبھی کبھی اپنی موت کا اور جنت اور جہنم کی ان باتوں کا تصور کیا کرے۔ اس سے رفتہ رفتہ دلوں میں گداز اور خوف پیدا ہوگا۔ اس کے ذریعہ پھر نیک اعمال کا کرنا آسان ہو جائے گا اور گناہوں کو چھوڑنا بھی آسان ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے دلوں میں یہ خوف پیدا فرما دے۔ اور گناہوں سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) مسند أحمد، رقم: ١٦٧٩٨

(۲) صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، باب فی شدة حر نار جهنم وبعد قعرها، رقم: ٥٠٧٨، مسند أحمد، رقم: ٨٤٨٤

مجاہدہ کی ضرورت واہمیت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾(۱)

گذشتہ جمعہ کو ''مجاہدہ'' سے متعلق جو گزارشات کی تھیں، ان کا خلاصہ یہ تھا کہ ''مجاہدہ'' کے معنی یہ ہیں کہ نفسانی خواہشات کا مقابلہ کر کے اللہ جل جلالہ کے حکم کے مطابق چلنے کی فکر کرنا۔ یہ مجاہدہ ہے۔ آج اس کی مزید تفصیل عرض کرنی ہے۔ تاکہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے کہ مجاہدہ کیوں کرنا پڑتا ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟

دنیاوی کاموں میں ''مجاہدہ''

دین کا کام ''مجاہدہ'' کے بغیر نہیں چلتا، بلکہ دنیا کے کام بھی مجاہدے کے بغیر نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی شخص روزی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اس کو بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے۔ اس کے لئے اپنے نفس کے تقاضوں کو کچلنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ نفس کا تقاضا تو یہ ہے کہ آرام سے گھر میں پڑا سوتا رہے، لیکن وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر میں سوتا رہ گیا تو روزی کیسے کماؤں گا۔

بچپن سے ''مجاہدہ'' کی عادت

بچپن ہی سے بچے کو مجاہدے کی عادت ڈالنی پڑتی ہے۔ بچے کو جب شروع شروع میں پڑھنے کے لئے بھیجا جاتا ہے تو اس کی طبیعت کے خلاف ہوتا ہے۔ پڑھنے کے لئے جانے کو اس کا دل نہیں چاہتا، لیکن اس کو اس کی طبیعت کے خلاف پڑھنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ یہ ''مجاہدہ'' ہے، لہٰذا تعلیم حاصل کرنے کے لئے، روزی کمانے کے لئے، بلکہ دنیا کے تمام مقاصد کے لئے انسان کو اپنی طبیعت کے خلاف کرنا پڑتا ہے۔ اگر انسان یہ سوچے کہ میں اپنی طبیعت کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گا، ایسا شخص نہ دنیا کا کوئی مقصد حاصل کر سکتا ہے، اور دین کا مقصد حاصل کر سکتا ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۲/۲۴۶ تا ۲۶۲)، ۱۷ مئی ۱۹۹۱ء، بروز جمعہ بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) العنکبوت: ۶۹

جنت میں مجاہدہ نہ ہوگا

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں۔ ایک عالم وہ ہے جس میں آپ کی ہر خواہش پوری ہوگی، اس میں خواہش کے خلاف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، جو دل چاہے گا، وہ ہوگا۔ اس میں انسان نفس کی خواہش کے مطابق کرنے کے لئے آزاد ہوگا، اس کو اس کے مواقع میسر ہوں گے، وہ عالم ''جنت'' ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ٥﴾(۱)

یعنی جو تمہارا دل چاہے گا، وہ ملے گا، اور جو مانگو گے وہ ملے گا۔

بعض روایات میں یہ تفصیل آئی ہے کہ مثلاً بیٹھے بیٹھے یہ دل چاہا کہ انار کا جوس پی لوں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ قریب میں نہ تو انار ہے، اور نہ انار کا درخت ہے، اور نہ جوس نکالنے والا ہے، لیکن یہ ہوگا کہ جس وقت تمہارے دل میں اس کے پینے کا خیال آیا، اسی وقت اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انار کا جوس نکل کر تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کو یہ قدرت عطا فرمائیں گے کہ جس چیز کا دل چاہے گا، وہ ملے گا۔ وہاں پر تمہیں کسی خواہش کو کچلنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کسی تقاضے کو دبانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کسی خواہش کے خلاف کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کسی مجاہدے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ عالم جنت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے وہ عالم عطا فرمادے۔

عالَم جہنم

دوسرا عالم اس کے بالکل برعکس ہے، وہاں ہر کام طبیعت کے خلاف ہوگا، ہر کام دکھ دینے والا ہوگا، ہر کام غم میں مبتلا کرنے والا، ہر کام میں تکلیف اور مصیبت ہوگی، کوئی آرام، کوئی راحت اور کوئی خوشی نہیں ہوگی، وہ عالم دوزخ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔

یہ عالم دنیا ہے

تیسرا عالم وہ ہے جس میں طبیعت کے مطابق بھی کام ہوتے ہیں، اور طبیعت کے خلاف بھی کام ہوتے ہیں، خوشی بھی حاصل ہوتی ہے، غم بھی آتا ہے، تکلیف بھی پہنچتی ہے، راحت بھی ملتی ہے، اس عالم میں کسی کی کوئی تکلیف خالص نہیں، کوئی راحت خالص نہیں، ہر راحت میں تکلیف کا کوئی کانٹا لگا ہوا ہے، اور ہر تکلیف میں راحت کا پہلو بھی ہے۔ یہ عالم دنیا ہے۔ اس دنیا میں آپ بڑے سے بڑے

---

(۱) حٰمٓ السجدۃ: ۳۱

سرمایہ دار، بڑے سے بڑے دولت مند، بڑے سے بڑے صاحبِ وسائل سے پوچھ لیجئے کہ تمہیں کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہے یا نہیں؟ یا تم ساری عمر آرام اور اطمینان سے رہے؟ کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہہ دے کہ مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی، اور کوئی کام میری طبیعت کے خلاف نہیں ہوا۔ اس لئے کہ یہ عالم دنیا ہے، جنت نہیں ہے، یہاں راحت بھی پہنچے گی، تکلیف بھی پہنچے گی۔ یہ دنیا تو اسی کام کے لئے بنائی گئی ہے۔ کوئی شخص یہ چاہے کہ مجھے راحت ہی راحت ملے، کبھی تکلیف نہ ہو، تو ایسا کبھی زندگی بھر نہیں ہوسکتا۔ ایک شاعر نے کہا ہے کہ:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لہٰذا یہ دنیا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی کام کے لئے بنائی ہے کہ اس میں تمہارے دل کو راحتیں بھی ملیں گی، اور اس کو توڑنے والے اسباب اور حالات بھی ہوں گے، اس لئے جیتے جی مرتے دم تک غم سے نجات ممکن نہیں۔ اور تو اور انبیاء علیہم السلام جو اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہوتے ہیں، ان کو بھی تکلیفیں پیش آئیں، بلکہ بسا اوقات عام لوگوں سے زیادہ پیش آئیں، ان کو بھی طبیعت کے خلاف واقعات پیش آئے، اس دنیا کے اندر کوئی انسان بھی ان سے بچ نہیں سکتا، اگر انسان کافر بن کر رہے، تب بھی طبیعت کے خلاف ہوگا، اگر مؤمن بن کر رہے، تب بھی طبیعت کے خلاف ہوگا، خدا کا انکار کرے، تب بھی طبیعت کے خلاف ہوگا۔

یہ کام اللہ کی رضا کے لئے کرلو

لہٰذا جب اس دنیا میں طبیعت کے خلاف باتیں پیش آنی ہی ہیں، تو پھر طبیعت کے خلاف کام کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ طبیعت کے خلاف کام بھی کرو، صدمے بھی اُٹھاؤ، تکلیفیں بھی برداشت کرو، لیکن ان تکلیفوں کے بدلے میں آخرت میں کوئی نتیجہ نہ نکلے، اس غم سے آخرت میں کوئی فائدہ نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس سے راضی نہ ہو۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت کے خلاف کام کرے، نفس کے تقاضے کو کچلے، تاکہ آخرت سنور جائے۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت یہ ہے کہ اس دنیا میں طبیعت کے خلاف تو ہونا ہی ہے۔ تمہارا دل چاہے، یا نہ چاہے، لیکن ایک مرتبہ یہ عہد کرلو کہ طبیعت کے خلاف وہ کام کریں گے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا۔

مثلاً نماز کا وقت ہوگیا۔ مسجد سے پکار آرہی ہے، لیکن جانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔ اور سستی ہورہی ہے، تو اب ایک راستہ یہ ہے کہ دل کے چاہنے پر عمل کرلیا، اور بستر پر لیٹے رہے، اور اتنے میں

دروازے پر دستک ہوئی، معلوم ہوا کہ دروازے پر ایک ایسا آدمی آگیا ہے جس کے لئے نکلنا ضروری ہے، چنانچہ اس کی خاطر بستر چھوڑا، اور باہر نکل گئے، نتیجہ یہ نکلا کہ طبیعت کے خلاف بھی ہوا۔ خواہش کے خلاف بھی ہوا، اور آرام بھی نہیں ملا، تکلیف جوں کی توں رہی۔ لہٰذا آدمی یہ سوچے کہ تکلیف سے بچنا تو میرے قبضہ اور قدرت میں نہیں ہے، اس لئے کیوں نہ میں اللہ کو راضی کرنے کے لئے تکلیف برداشت کرلوں۔ یہ سوچ کر اس وقت اُٹھ کر نماز کے لئے چلا جائے۔

اگر اس وقت بادشاہ کا پیغام آجائے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ ہمارے لئے بڑی کارآمد باتیں فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے کہ بھئی! اگر تمہیں نماز کے لئے جانے میں سستی ہورہی ہو یا کسی دین کے کام میں سستی ہورہی ہو، مثلاً فجر کی نماز کے لئے یا تہجد کی نماز کے لئے سستی ہورہی ہے۔ آنکھ تو کھل گئی، مگر نیند کا غلبہ ہے، بستر چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے تو اس وقت ذرا یہ سوچو کہ اس نیند کے غلبے کے عالم میں اگر تمہارے پاس یہ پیغام آجائے کہ سربراہِ مملکت تمہیں بہت بڑا اعزاز دینا چاہتے ہیں۔ اور وہ اعزاز اسی وقت تمہیں ملے گا، تو یہ بتاؤ کہ اس وقت وہ نیند اور وہ سستی باقی رہے گی؟ ظاہر ہے کہ وہ نیند اور سستی سب غائب ہوجائے گی۔ کیوں؟ اس لئے کہ تمہارے دل میں اس اعزاز کی قدر و منزلت ہے، جس کی وجہ سے تم طبیعت کے خلاف کرنے پر آمادہ ہوجاؤ گے، اور یہ سوچو گے کہ کہاں کی غفلت، کہاں کی نیند، اس اعزاز کو حاصل کرنے کے لئے دوڑ جاؤ، اگر یہ موقع نکل گیا تو پھر ہاتھ آنے والا نہیں، چنانچہ اس کام کے لئے نیند اور آرام چھوڑ کر فوراً نکل کھڑے ہوگے، لہٰذا جب تم ایک دنیا کے بادشاہ سے اعزاز حاصل کرنے کے لئے نیند چھوڑ سکتے ہو، اپنی راحت چھوڑ سکتے ہو، تو پھر اللہ جل جلالہ اور احکم الحاکمین کو راضی کرنے کے لئے راحت اور نیند نہیں چھوڑ سکتے؟ جب کسی نہ کسی وجہ سے راحت اور نیند چھوڑنی ہے تو پھر کیوں نہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے راحت و آرام چھوڑا جائے؟

اللہ تعالیٰ کی معیت کوشش کرنے والوں کے لئے

حضرات انبیاء علیہم السلام کا یہی پیغام ہے کہ اپنے نفس کو طبیعت کے خلاف ایسے کام کرنے کی عادت ڈالو جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والے ہوں، اسی کا نام ''مجاہدہ'' ہے۔ جو صدمے اور جو تکلیفیں غیر اختیاری طور پر پہنچ رہی ہیں، بظاہر ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہورہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جو لوگ ہماری خاطر یہ ''مجاہدہ'' کریں گے، ہماری خاطر نفس کے خلاف کام کریں گے تو ہم ضرور ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے چلیں گے۔

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾(۱)

اور وہ راستہ پر تنہا نہیں ہوں گے، بلکہ جو شخص اس راستے پر چل رہا ہے، وہ محسنین میں سے ہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ محسنین کا ساتھی بن جاتا ہے۔

وہ کام آسان ہو جائے گا

اللہ تبارک وتعالیٰ کیسے ان کا ساتھی بن جاتا ہے؟ اس طرح کہ شروع میں نفس کی مخالفت میں بڑی دشواری معلوم ہو رہی تھی، طبیعت کے خلاف کرنا بڑا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اللہ کو راضی کرنے کے لئے چل کھڑے ہوئے تو پھر وہی راستہ اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے آسان کر دیتے ہیں۔ ایک شخص کو نماز کی عادت نہیں ہے، نماز پڑھنا بھاری معلوم ہوتا ہے، پانچ وقت کی نماز پڑھنا مشکل لگتا ہے۔ لیکن اس نے نفس کے اس تقاضے کے باوجود نماز پڑھنی شروع کر دی، یہاں تک کہ نماز کا عادی بن گیا، اب عادی بننے کے بعد اسی شخص کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ نماز پڑھنے میں کوئی مشقت ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے اگر کوئی یہ کہے کہ ہزار روپے لے لو، اور آج کی نماز چھوڑ دو، بتائیے کیا وہ شخص نماز چھوڑنے پر راضی ہوگا؟ ہرگز نہیں، جو شخص ایک مرتبہ نماز کا عادی بن گیا، وہ کبھی ہزاروں روپے لے کر بھی ایک نماز چھوڑنے پر راضی نہیں ہوگا، اس لئے کہ جس کام کو پہلے وہ مشکل سمجھ رہا تھا تھوڑے سے عرصے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو آسان کر دیا۔

آگے قدم تو بڑھاؤ

یہی حال پورے دین کا ہے، اگر انسان بیٹھ کر سوچتا رہے تو اس کو مشکل نظر آئے گا، لیکن جب دین کے راستے پر چلنا شروع کر دے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اسے آسان فرما دیتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی ایک مثال دیا کرتے تھے کہ ایک لمبی سڑک سیدھی جا رہی ہو، اور اس کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں ہوں، دائیں طرف بھی اور بائیں طرف بھی، اب اگر کوئی شخص اس سڑک پر کھڑا ہو کر دیکھے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ درختوں کی دونوں قطاریں آپس میں آگے جا کر مل گئی ہیں۔ اور آگے راستہ بند ہے۔ اگر کوئی احمق شخص یہ کہے کہ چونکہ آگے چل کر درختوں کی قطاریں آپس میں مل گئی ہیں، اس لئے اس سڑک پر چلنا بیکار ہے، تو یہ شخص کبھی راستہ قطع نہیں کر سکے گا، اور کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ وہی شخص منزل تک پہنچ سکے گا جو راستہ کو بند دیکھنے کے باوجود آگے قدم بڑھائے گا۔ اس لئے کہ جب وہ آگے قدم بڑھائے گا تو اسے نظر آئے گا کہ حقیقت میں راستہ بند نہیں تھا، بلکہ آنکھیں

(۱) العنکبوت: ۶۹

دھوکہ دے رہی تھیں، جوں جوں وہ آگے بڑھتا چلا جائے گا، راستے کھلتے چلے جائیں گے، اس لئے دین کے راستے پر چلنے والوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ دور دور سے مشکل سمجھ کرمت بیٹھ جاؤ۔ اللہ کے بھروسے پر آگے قدم بڑھانا شروع کردو۔ جب آگے قدم بڑھاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے راستہ آسان فرمادیں گے۔ البتہ ہمت سے کام کرنے کی ضرورت ہمیشہ رہے گی، اور طبیعت کے خلاف کام کرنے کا عزم کرنا پڑے گا۔ اور اسی کا نام ''مجاہدہ'' ہے۔

جائز کاموں سے رکنا بھی مجاہدہ ہے

اصل مجاہدہ تو یہ ہے کہ انسان جو ناجائز اور شریعت کے خلاف کام کررہا ہے، ان سے اپنے آپ کو بچائے، اور اپنے نفس پر زبردستی دباؤ ڈال کر ان سے باز رہے، لیکن چونکہ ہمارا نفس لذتوں کا، خواہشات کا اور راحتوں کا عادی ہو چکا ہے، اور اتنا زیادہ عادی بنا ہوا ہے کہ اگر اس کو اللہ کے راستے کی طرف اور شریعت کی طرف موڑنا چاہو تو آسانی سے نہیں مڑتا، بلکہ دشواری پیدا ہوتی ہے، اس لئے اس نفس کو رام کرنے کے لئے اور اللہ کے بتائے ہوئے احکام کے تابع بنانے کے لئے اس کو بعض مباح اور جائز کاموں سے بھی روکنا پڑتا ہے، اس لئے کہ جب نفس کو جائز کاموں سے روکیں گے تو پھر اس کو لذتوں کو چھوڑنے کی عادت پڑے گی، اور پھر اس کے لئے ناجائز امور سے بچنا بھی آسان ہو جائے گا، صوفیاء کرام کی اصطلاح میں اس کو بھی ''مجاہدہ'' کہا جاتا ہے۔

مثلاً خوب پیٹ بھر کر کھانا کوئی گناہ کا کام نہیں، لیکن صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ خوب پیٹ بھر کرمت کھاؤ، اس لئے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ نفس غافل ہو جائے گا، اور لذتوں کا خوگر ہو جائے گا، اس لئے نفس کو عادی بنانے کے لئے کھانے میں تھوڑی سی کمی کردو، یہ بھی ''مجاہدہ'' ہے۔

جائز کاموں میں مجاہدہ کیوں؟

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا بات ہے کہ صوفیاء کرام بعض جائز کاموں سے بھی روک دیتے ہیں؟ اور ان کو چھڑا دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جائز قرار دیا ہے؟ حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ دیکھو اس کی مثال یہ ہے کہ یہ کتاب کا ورق ہے، اس ورق کو موڑو، موڑ دیا، اچھا اس کو سیدھا کرو، اب وہ ورق سیدھا نہیں ہوتا، بہت کوشش کر لی۔ لیکن وہ دوبارہ مڑ جاتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اس کو سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس ورق کو مخالف سمت میں موڑ دو، یہ سیدھا ہو جائے گا، پھر فرمایا کہ یہ نفس کا کاغذ بھی گناہوں کی طرف مڑا ہوا ہے، معصیتوں کی طرف مڑا ہوا ہے، اب اگر اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو یہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کو

دوسری طرف موڑ دو، اور تھوڑے سے مباحات بھی چھڑا دو، جس کے نتیجے میں یہ بالکل سیدھا ہو جائے گا۔اور راستے پر آجائے گا۔یہ بھی ''مجاہدہ'' ہے۔

چار مجاہدات

چنانچہ صوفیاء کرام رحمہم اللہ کے یہاں چار چیزوں کا مجاہدہ کرنا مشہور ہے:

(۱) تقلیلُ الطعام، کم کھانا

(۲) تقلیلُ الکلام، کم بولنا

(۳) تقلیلُ المنام، کم سونا

(۴) تقلیلُ الاختلاط مع الانام، لوگوں سے کم ملنا

کم کھانا ''مجاہدہ'' ہے

(۱) تقلیلُ الطعام، کم کھانا

پہلے زمانے میں صوفیاء کرام کم کھانے پر بڑے بڑے مجاہدے کرایا کرتے تھے، یہاں تک کہ فاقہ کشی تک نوبت آجاتی تھی، لیکن حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ یہ زمانہ اب اس قسم کے مجاہدوں کا نہیں ہے، اب تو لوگ ویسے ہی کمزور ہیں۔اگر کھانا کم کردیں گے تو اور بیماریاں آجائیں گی، اور اس کے نتیجے میں کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلے جو عبادت کرتا تھا، اس سے بھی محروم ہو جائے۔اس لئے فرمایا کہ آج کے دور میں انسان ایک بات کی پابندی کرلے تو پھر تقلیلِ طعام کا مقصد حاصل ہو جائے گا، وہ یہ کہ جب کھانا کھائے تو کھانا کھاتے وقت ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اس وقت دل میں یہ تردّد پیدا ہوتا ہے کہ اب مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ کچھ اور کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ بس جس وقت یہ تردّد کا مرحلہ آئے، اس وقت کھانا چھوڑ دو، اس سے تقلیلِ طعام کا منشا پورا ہو جائے گا۔

اور یہ جو تردّد پیدا ہوتا ہے کہ مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ یہ عقل اور طبیعت کے درمیان لڑائی ہوتی ہے۔کیونکہ کھانا کھانے میں مزہ آرہا ہے، تو اب نفس یہ تقاضا کر رہا ہے کہ اور کھانا کھا کر مزہ لے لے، اور عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اب مزید کھانا مت کھاؤ، اب مزید کھاؤ گے تو کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ، نفس اور عقل کے درمیان یہ لڑائی ہوتی ہے، اور اس لڑائی کا نام تردّد ہے، لہٰذا ایسے موقع پر نفس کے تقاضے کو چھوڑ دو، اور عقل کے تقاضے پر عمل کرلو۔

وزن بھی کم اور اللہ بھی راضی

یہ مضمون میں نے حضرت والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ سے اور حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کئی بار سنا، اور مواعظ میں بھی پڑھا، لیکن بعد میں ایک ماہر ڈاکٹر کا مضمون نظر سے گزرا، جس میں لکھا تھا:

آج کل لوگ اپنے بدن کا وزن کم کرنے کے لئے طرح طرح کے نسخے استعمال کرتے ہیں۔ کسی نے روٹی چھوڑ دی۔ کسی نے دوپہر کا کھانا چھوڑ دیا۔ آجکل کی اصطلاح میں اس کو ''ڈائیٹنگ'' کہتے ہیں۔ یورپ میں اس کا بہت رواج ہے، یہ چیز وہاں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جسم کا وزن کم ہو جائے۔ اور خاص طور پر خواتین میں اس کا اتنا رواج ہے کہ گولیاں کھا کھا کر وزن کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور بعض اوقات اس میں مر بھی جاتی ہیں۔

اس کے بعد وہ ڈاکٹر لکھتا ہے کہ میرے نزدیک وزن کم کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی نہ تو کسی وقت کا کھانا مستقل چھوڑے، نہ روٹی کم کرے، بلکہ ساری عمر اس کا معمول بنالے کہ جتنی بھوک ہے، اس سے تھوڑا سا کم کھا کر کھانا بند کر دے۔ اس کے بعد اس ڈاکٹر نے بعینہ یہ بات لکھی ہے کہ جس وقت کھانا کھاتے ہوئے یہ تردد ہو جائے کہ کھانا کھاؤں یا نہ کھاؤں، اس وقت کھانا چھوڑ دے۔ جو شخص اس پر عمل کرے گا، اس کو کبھی جسم بڑھنے کی اور معدے کے خراب ہونے کی شکایت نہیں ہوگی، اور نہ اس کو ڈائیٹنگ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

یہی بات حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کئی سال پہلے لکھ گئے تھے۔ اب چاہو تو وزن کم کرنے کی خاطر اس پر عمل کرلو، چاہو تو اللہ کو راضی کرنے کی خاطر اس مشورے پر عمل کرلو۔ لیکن اگر نفس کے علاج کے طور پر اللہ کو راضی کرنے کے لئے یہ عمل کرو گے تو اس کام میں اجر و ثواب بھی ملے گا، اور وزن بھی کم ہو جائے گا۔ اور اگر صرف وزن کم کرنے کی خاطر کرو گے تو شاید وزن تو کم ہو جائے گا۔ لیکن اجر و ثواب نہیں ملے گا۔

نفس کو لذت سے دور رکھا جائے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو ہمارے لئے یہ عمل کتنا آسان کر دیا۔ ورنہ پہلے زمانے میں تو صوفیاء کرام خدا جانے کیا کیا ریاضتیں کرایا کرتے تھے۔ صوفیاء کرام کے یہاں لنگر ہوا کرتے تھے۔ اس لنگر کے اندر شوربا بنتا تھا۔ خانقاہ میں جو مریدین ہوا کرتے تھے، ان کو یہ حکم ہوتا تھا کہ جس کے پاس ایک پیالہ شوربے کا آئے تو وہ اس شوربے میں ایک پیالہ پانی ملائے، اور پھر کھائے، تاکہ نفس کو

لذت گیری کی قید سے آزاد کیا جائے۔ اس کے علاوہ ان سے فاقے بھی کرواتے تھے۔ لیکن وہ زمانہ اور تھا، اور آجکل کا زمانہ اور ہے۔ جیسے طب کے اندر زمانے کے بدلنے سے علاج کے طریقے بدل جاتے ہیں۔ اسی طرح حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے ہمارے زمانے کے لحاظ سے، ہمارے مزاجوں کا لحاظ رکھتے ہوئے نسخے تجویز کر گئے، تقلیلِ طعام کا یہ نسخہ ہمارے لئے تجویز کر گئے، جس سے تقلیلِ طعام کا منشا حاصل ہو جائے گا۔

پیٹ بھرے کی مستیاں

پورا پیٹ بھر کر اس طرح کھانا کہ اس کا کوئی حصہ خالی نہ رہے، اگرچہ فقہی اعتبار سے ناجائز نہیں، حرام نہیں، لیکن یہ انسان کے لئے جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی بیماریوں کا سبب اور ذریعہ ہے، اس لئے کہ جتنی معصیتیں اور نافرمانیاں ہیں، وہ سب بھرے ہوئے پیٹ پر سوجھتی ہیں۔ اگر آدمی کا پیٹ بھرا ہوا نہ ہو تو یہ گناہ اور نافرمانیاں نہیں سوجھتیں۔ اس لئے حکم یہ ہے کہ "شِبَع" یعنی پیٹ بھرے ہونے سے اپنے آپ کو بچانا چاہئے۔ اسی کا نام "تقلیلِ طعام" کا مجاہدہ ہے۔

کم بولنا "مجاہدہ" ہے

دوسری چیز ہے "تقلیلِ کلام" بات کم کرنا۔ یعنی صبح سے شام تک یہ ہماری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے، اور اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ جو منہ میں آرہا ہے، انسان بول رہا ہے، یہ صورتِ حال غلط ہے۔ اس لئے جب تک انسان اس زبان کو لگام نہیں دے گا، اور اس کو قابو نہیں کرے گا، اس وقت تک یہ گناہ کرتی رہے گی۔ یاد رکھئے، حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ انسان کو اوندھے منہ جہنم میں ڈالنے والی چیز اس کی زبان ہے،(۱) اس لئے کہ جب زبان کو آزاد چھوڑ رکھا ہے، اس پر روک ٹوک نہیں ہے تو پھر وہ زبان جھوٹ میں مبتلا ہوگی، غیبت میں مبتلا ہوگی، دل آزاری میں مبتلا ہوگی، ان گناہوں کے سبب وہ جہنم میں جائے گا۔

زبان کے گناہوں سے بچ جائے گا

اس لئے انسان کو "تقلیلِ کلام" کا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے کہ بات کم کرے، زبان سے فضول بات نہ نکالے، ضرورت کے مطابق بات کرے، اور بولنے سے پہلے یہ سوچے کہ یہ بات کرنا میرے لئے مناسب ہے یا نہیں؟ کہیں گناہ کی بات تو نہیں، اور بلاوجہ زبان چلانے سے بچے، اور پھر آہستہ آہستہ

---

(۱) المعجم الکبیر، رقم: ۱۶۶۲۶ (۱۴/۱۵)

انسان کم بولنے کا عادی ہو جاتا ہے، پھر یہ ہوتا ہے کہ بولنے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن اس نے اپنی اس خواہش کو دبا دیا تو اس کے نتیجے میں زبان پر قابو پیدا ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ جھوٹ، غیبت اور اس طرح کے دوسرے گناہوں میں مبتلا نہیں ہوتا۔

جائز تفریح کی اجازت ہے

یہ جو فضول قسم کی مجلس آرائی ہوتی ہے، جس کو آجکل کی اصطلاح میں گپ شپ کہا جاتا ہے، کوئی دوست مل گیا تو فوراً اس سے کہا کہ آؤ ذرا بیٹھ کر گپ شپ کریں، یہ گپ شپ لازماً انسان کو گناہ کی طرف لے جاتی ہے۔ ہاں! شریعت نے ہمیں تھوڑی بہت تفریح کی بھی اجازت دی ہے۔ نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((رَوِّحُوا الْقُلُوْبَ سَاعَةً فَسَاعَةً))(۱)

''دلوں کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے آرام بھی دیا کرو''

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر قربان جایئے کہ ہمارے مزاج، ہماری نفسیات اور ہماری ضروریات کو ان سے زیادہ پہچاننے والا اور کون ہوگا۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان سے کہا گیا کہ اللہ کے ذکر کے علاوہ کچھ نہ کرو، ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہو تو یہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے کہ یہ فرشتے نہیں ہیں۔ یہ تو انسان ہیں۔ ان کو تھوڑے سے آرام کی بھی ضرورت ہے، تھوڑی سی تفریح کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے تفریح کے لئے کوئی بات کرنا، خوش طبعی کے ساتھ ہنس بول لینا نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ پسندیدہ ہے، اور نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ لیکن اس میں زیادہ منہمک ہو جانا کہ اسی میں کئی کئی گھنٹے برباد ہو رہے ہیں، قیمتی اوقات ضائع ہو رہے ہیں تو یہ چیز انسان کو لازمی طور پر گناہ کی طرف لے جانے والی ہے۔ اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ تم باتیں کم کرنے کی عادت ڈالو، اور یہ بھی ''مجاہدہ'' ہے۔

مہمان سے باتیں کرنا سنت ہے

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے۔ وہ باتیں بہت کرتے تھے۔ جب کبھی آتے تو بس اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتے، اور رکنے کا نام نہ

(۱) كنز العمال، رقم: ٥٣٥٤ (٣٧/٣)، كشف الخفاء، رقم: ١٤٠٠ (٣٨٣/٢)، سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد (٣٩٤/٩)، جامع بيان العلم وفضله، رقم: ٤٨٣ (٨/٢)، جامع الأحاديث، رقم: ١٢٧٨٩ (١٤٨/١٣)

لیتے۔ ہمارے سب بزرگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اگر کوئی شخص مہمان بن کر ملنے کے لئے آتا تو اس کا اکرام کرتے، اس کی بات سنتے، اور حتی الامکان اس کی تشفی کی کوشش کرتے۔ یہ کام ایک مصروف آدمی کے لئے بڑا مشکل ہے۔ جن لوگوں کی زندگی مصروفیات سے بھری ہو، وہ جان سکتے ہیں کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب آپ سے کوئی شخص ملنے کے لئے آتا، اور آپ سے بات کرنا شروع کرتا تو آپ اس کی طرف سے کبھی منہ نہیں موڑتے تھے، جب تک وہ خود ہی منہ نہ موڑ لے، اس کی بات سنتے رہتے تھے، چنانچہ حدیث کے الفاظ ہیں:

((حَتّٰی یَکُوْنَ هُوَ الْمُنْصَرِفُ))(۱)

''حتیٰ کہ وہ خود ہی نہ چلا جائے''

یہ کام بڑا مشکل ہے، اس لئے کہ بعض لوگ لمبی بات کرنے کے عادی ہوتے ہیں، ان کی پوری بات پوری توجہ سے سننا ایک مشکل کام ہے، لیکن حضور ﷺ کی سنت کی وجہ سے ہمارے بزرگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ آنے والے کی بات سنتے، اس کی تشفی کرتے۔

اصلاح کا ایک طریقہ

لیکن اگر کوئی شخص اصلاح کی غرض سے آتا تو اس پر روک ٹوک ہوتی تھی، بہرحال! وہ صاحب آکر باتیں شروع کر دیتے۔ اور حضرت والد صاحب مسکینیت سے اس کی باتیں سنتے رہتے۔ ایک دن اُن صاحب نے آکر حضرت والد صاحب سے بیعت کی درخواست کی کہ حضرت! میں آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں، میرے لئے کوئی وظیفہ کوئی تسبیح بتا دیجئے۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ تمہارے لئے کوئی تسبیح اور وظیفہ نہیں ہے، تمہارا کام یہ ہے کہ زبان کو قابو میں کرو، اس پر تالو ڈالو، تم جو ہر وقت بولتے رہتے ہو، زبان نہیں رکتی، یہ غلط ہے۔ آئندہ جب آؤ تو بالکل خاموش بیٹھے رہو، زبان سے کوئی لفظ نہ نکالنا۔ اب اس پابندی کے نتیجے میں ان صاحب پر قیامت گزر گئی۔ یہ خاموش بیٹھنے کا مجاہدہ ان کے لئے ہزار مجاہدوں سے بھاری تھا۔ اب یہ ہوتا کہ بار بار ان کے دل میں بولنے کا تقاضا پیدا ہوتا، لیکن پابندی کی وجہ سے نہ بولنے پر مجبور ہیں۔ اور اسی علاج کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے سارا طریق طے کرا دیا۔ اس لئے کہ حضرت والد صاحب یہ سمجھ گئے تھے کہ ان کی

(۱) الشمائل المحمدية للترمذی، رقم: ۳۳۱ (۳۷۷/۱)، کنز العمال، رقم: ۱۸۵۳۵ (۱٦٤/۷)، الشفاء بتعريف حقوق المصطفى (۱۲۰/۱)، دلائل النبوة للبيهقی (۲٦۹/۱)، شعب الإيمان (۱٥٤/۲)، المعجم الكبير للطبرانی (۳۰/۱٦)

بنیادی بیماری یہ ہے، جب یہ قابو میں آجائے گی تو سب کام آسان ہو جائے گا، چنانچہ کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ہر ایک کی بیماری الگ الگ ہے، لہٰذا حالات کو دیکھ کر شیخ علاج تجویز کرتا ہے کہ اس کے لئے کونسا علاج مفید ہوگا۔ بہر حال یہ "تقلیلِ کلام" کا مجاہدہ ہے۔

کم سونا "مجاہدہ" ہے

تیسرا مجاہدہ ہے "تقلیلِ منام" یعنی کم سونا، اس میں بھی پہلے تو نہ سونے کا مجاہدہ ہوتا تھا، چنانچہ جیسا کہ مشہور ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ لیکن بزرگوں نے فرمایا کہ کم سونے کی حد یہ ہے کہ آدمی کو دن رات میں کم از کم چھ گھنٹے ضرور سونا چاہئے، چھ گھنٹے سے کم نہ کرے، ورنہ بیمار ہو جائے گا۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اگر کسی کو بے وقت سونے کی عادت ہے تو وہ اس کو ختم کرے، یہ بھی کم سونے کی حد میں داخل ہے، اور یہ بھی "مجاہدہ" ہے۔

لوگوں سے تعلقات کم رکھنا "مجاہدہ" ہے

چوتھا مجاہدہ ہے "تقلیل الاختلاط مع الانام" یعنی لوگوں سے میل جول کم کرنا، اور بہت زیادہ میل جول سے پرہیز کرنا، اس لئے کہ انسان کے جتنے زیادہ تعلقات ہوں گے، اتنا ہی گناہوں میں مبتلا ہونے کا اندیشہ رہے گا۔ تجربہ کر کے دیکھ لو۔ آجکل تو تعلقات بڑھانا باقاعدہ ایک فن اور ہنر بن گیا ہے، جس کو "پبلک ریلیشن" (Public Relation) کہا جاتا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ تعلقات زیادہ پیدا کرو، اور اپنا اثر ورسوخ بڑھاؤ، اور ان تعلقات کی بنیاد پر اپنا کام نکالو، لیکن ہمارے بزرگوں نے اس سے منع فرمایا ہے کہ بلاضرورت تعلقات نہ بڑھائے جائیں، بلکہ تعلقات کو کم کیا جائے۔

دل ایک آئینہ ہے

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل کو ایک آئینہ بنایا ہے، جو تصویر انسان کے سامنے سے گزرتی ہے، اس کا عکس دل پر جم جاتا ہے، لہٰذا جب انسان کے تعلقات زیادہ ہوں گے تو اس میں پھر اچھے لوگ بھی آئیں گے، اور برے بھی آئیں گے، اور جب برے کاموں میں مصروف لوگ ملاقات کریں گے تو ان کے کاموں کا عکس دل پر پڑے گا، اور اس سے دل خراب ہوگا، اس لئے فرمایا کہ دوسرے لوگوں سے بلاضرورت زیادہ نہ ملو، دوسرے لوگوں سے تعلقات جتنے کم ہوں گے، اتنا ہی اللہ جل شانہ سے تعلق میں اضافہ ہوگا۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

تعلق حجاب است و بے حاصلی
چون پیوند ہا بکسلی واصلی

یعنی یہ تعلقات اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے میں حجاب اور پردے بن جاتے ہیں۔ دنیا کی جتنی محبتیں بڑھیں گی کہ اس سے بھی محبت ہے، اس سے بھی محبت ہے، اتنا ہی اللہ تبارک وتعالیٰ سے تعلق میں کمی آئے گی۔ البتہ جو حقوق العباد ہیں، وہ بیشک ادا کرنے ہیں، ان میں کوتاہی نہیں کرنی ہے۔ لیکن بلاوجہ تعلقات نہیں بڑھانا چاہئے، اسی کا نام "تقلیل الاختلاط مع الانام" ہے۔

بہر حال یہ مجاہدات اس لئے کرائے جاتے ہیں، تاکہ ہمارا یہ نفس قابو میں آجائے۔ اور ناجائز کاموں پر اکسانا چھوڑ دے، اس لئے یہ مجاہدات ہر انسان کو کرنے چاہئیں اور بہتر یہ ہے کہ یہ مجاہدات کسی رہنما کی نگرانی میں کرے، خود اپنی مرضی اور اپنے فیصلے سے نہ کرے، اس لئے کہ اگر انسان خود سے یہ فیصلہ کرے گا کہ میں کتنا کھاؤں، کتنا نہ کھاؤں، کتنا سوؤں، کتنا نہ سوؤں، کتنے لوگوں سے تعلقات رکھوں، کن سے تعلقات نہ رکھوں، تو اس میں بے اعتدالی ہو سکتی ہے، لیکن جب کسی رہنما کی رہنمائی میں یہ کام کرے گا تو انشاء اللہ اس کے فوائد حاصل ہوں گے، اور ہر کام اعتدال میں رہ کر ہوتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اللہ تعالیٰ سے تعلق کا آسان طریقہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اسْتَجَدَّ ثَوْبًا سَمَّاهُ بِاسْمِهٖ، عِمَامَةً أَوْ قَمِيْصًا أَوْ رِدَاءً يَقُوْلُ ((اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ كَسَوْتَنِيْهِ، أَسْأَلُكَ خَيْرَهٗ وَخَيْرَ مَا صُنِعَ لَهٗ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهٖ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَهٗ))(۱)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب آپ کوئی نیا کپڑا پہنتے، تو اس کپڑے کا نام لیتے، چاہے وہ عمامہ یا قمیص ہو یا چادر ہو، اور اس کا نام لے کر یہ دعا کرتے:

((اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ أَنْتَ كَسَوْتَنِيْهِ، أَسْأَلُكَ خَيْرَهٗ وَخَيْرَ مَا صُنِعَ لَهٗ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهٖ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَهٗ))

''اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ لباس عطا فرمایا، میں آپ سے اس لباس کے خیر کا سوال کرتا ہوں، اور جن کاموں کے لئے یہ بنایا گیا ہے، ان میں سے بہتر کاموں کا سوال کرتا ہوں، اور میں آپ سے اس لباس کے شر سے پناہ چاہتا ہوں، اور جن برے کاموں کے لئے یہ بنایا گیا ہے، اس کے شر سے پناہ چاہتا ہوں''

ہر وقت کی دعا الگ ہے

لباس پہنتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ آپ یہ دعا پڑھتے تھے۔ اگر کسی کو یہ الفاظ یاد نہ

☆ اصلاحی خطبات (۱۳۲/۴ تا ۱۴۳)، ۱۷ ستمبر ۱۹۹۳ء، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب اللباس عن رسول اللہ، باب ما یقول إذا لبس ثوبا جدیدا، رقم: ۱۶۸۹، سنن أبی داود، کتاب اللباس، باب، رقم: ۳۵۰۴، مسند أحمد، رقم: ۱۰۸۱۸

ہوں تو پھر اُردو ہی میں لباس پہنتے وقت یہ الفاظ کہہ لیا کرے۔ حضور اقدس ﷺ کا اس اُمت پر یہ عظیم احسان ہے کہ آپ ﷺ نے قدم قدم پر اللہ جل شانہ سے دعا مانگنے کا طریقہ سکھایا۔ ہم تو وہ لوگ ہیں جو محتاج تو بے انتہاء ہیں، لیکن ہمیں مانگنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔ ہمیں نہ تو یہ معلوم ہے کہ کیا مانگا جائے۔ اور نہ یہ معلوم ہے کہ کس طرح مانگا جائے۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے ہمیں طریقہ بھی سکھا دیا کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح مانگو۔ صبح سے لے کر شام تک بے شمار اعمال انسان انجام دیتا ہے۔ تقریباً ہر عمل کے لئے علیحدہ دعا حضور اقدس ﷺ نے تلقین فرمائی ہے۔ مثلاً فرمایا کہ صبح کو جب بیدار ہو تو یہ دعا پڑھو، جب استنجاء کے لئے جانے لگو تو یہ دعا پڑھو، استنجاء سے فارغ ہو کر باہر آؤ تو یہ دعا پڑھو، جب وضو شروع کرو تو یہ دعا پڑھو، وضو کے دوران یہ دعائیں پڑھتے رہو، وضو سے فارغ ہو کر یہ دعا پڑھو، جب نماز کے لئے مسجد میں داخل ہونے لگو تو یہ دعا پڑھو، اور پھر مسجد میں عبادت کرتے رہو، پھر جب مسجد سے باہر نکلو تو یہ دعا پڑھو، جب اپنے گھر میں داخل ہونے لگو تو یہ دعا پڑھو، جب بازار میں پہنچو تو یہ دعا پڑھو، گویا کہ ہر ہر نقل و حرکت پر حضور اقدس ﷺ نے دعائیں تلقین فرمادیں کہ یہ دعائیں اس طرح پڑھا کرو۔

تعلق مع اللہ کا طریقہ

یہ ہر ہر نقل و حرکت پر علیحدہ علیحدہ دعا کیوں تلقین فرمائی؟ یہ درحقیقت حضور اقدس ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنے کے لئے نسخہ اکسیر بتا دیا۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا آسان ترین اور مختصر ترین راستہ یہ ہے کہ ہر وقت انسان اللہ تعالیٰ سے مانگتا رہے اور دعا کرتا رہے قرآن کریم نے ہمیں یہ حکم دیا کہ

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾(۱)

''اے ایمان والو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو، کثرت سے اس کا ذکر کرو''

حضور اقدس ﷺ سے کسی نے پوچھا: یا رسول اللہ، سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل عمل یہ ہے:

((لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ))(۲)

یعنی تمہاری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر رہے، ہر وقت زبان پر ذکر جاری رہے۔ خلاصہ

---

(۱) الاحزاب: ٤١

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ما جاء فی فضل الذکر، رقم: ۳۲۹۷، سنن ابن ماجه، کتاب الأدب، باب فضل الذکر، رقم: ۳۷۸۳، مسند أحمد، رقم: ۱۷۰۲۰

یہ کہ کثرت سے ذکر کرنے کا حکم قرآن کریم نے بھی دیا، اور حضور اقدس ﷺ نے حدیث میں اس کی فضیلت بیان فرمائی۔

اللہ تعالیٰ ذکر سے بے نیاز ہے

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کثرتِ ذکر کا کیوں حکم دیا؟ العیاذ باللہ، کیا اللہ تعالیٰ کو ہمارے ذکر سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو اس بات سے مزہ آتا ہے کہ میرے بندے میرا ذکر کر رہے ہیں؟ کیا اس کو اس سے لذت آتی ہے؟ یا اس کو کوئی نفع ملتا ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہو، اور اس پر ایمان رکھتا ہو، وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر ساری کائنات ہر وقت ہر لمحے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتی رہے تو اس کی کبریائی میں، اس کے جلال و جمال میں، اس کی عظمت میں ایک ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوتا، اور اگر (العیاذ باللہ) ساری کائنات مل کر اس بات کا عہد کرلے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ کو بھلا دیں، ذکر سے غافل ہو جائیں، اور معصیتوں کا ارتکاب کرنے لگیں، نافرمانیوں میں مبتلا ہو جائیں تو اس کی عظمت وجلال میں ذرّہ برابر کمی واقع نہیں ہوگی۔ وہ ذات تو بے نیاز ہے "اللہ الصمد" وہ ہمارے ذکر سے بھی بے نیاز، ہمارے سجدوں سے بھی بے نیاز، ہماری تسبیح سے بھی بے نیاز، اس کو ہمارے ذکر کی ضرورت نہیں۔

تمام برائیوں کی جڑ، اللہ سے غفلت

لیکن یہ جو کہا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو، اس سے ہمارا ہی فائدہ ہے، اس لئے کہ دنیا میں جتنے جرائم، بدعنوانیاں اور بداخلاقیاں برائیاں ہوتی ہیں اگر ان سب برائیوں کی جڑ دیکھی جائے تو وہ اللہ سے غفلت ہے۔ جب انسان اللہ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کو بھلا بیٹھتا ہے، تب گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں ہو، اللہ تعالیٰ کا ذکر دل میں ہو، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس دل میں ہو کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے تو پھر گناہ سرزد نہیں ہوگا۔

چور جس وقت چوری کر رہا ہے، اس وقت وہ اللہ کی یاد سے غافل ہے، اگر اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوتا تو چوری کا ارتکاب نہ کرتا، بدکار جس وقت بدکاری کر رہا ہے، اس وقت وہ اللہ کی یاد سے غافل ہے، اگر اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوتا تو وہ بدکاری کا ارتکاب نہ کرتا، اسی بات کو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ لَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ لَا یَشْرَبُ الشَّارِبُ حِیْنَ یَشْرَبُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ))(۱)

یعنی جب زنا کرنے والا زنا کرتا ہے، اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا، مؤمن ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ایمان اس وقت مستحضر نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کا ذکر مستحضر نہیں ہوتا، جب چور چوری کرتا ہے تو اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا، یعنی اس وقت اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں ہوتی تو وہ گناہ کا ارتکاب نہ کرتا، لہٰذا ساری برائیاں، سارے مظالم، ساری بداخلاقیاں جو دنیا کے اندر پائی جارہی ہیں، ان کا بنیادی سبب اللہ کے ذکر سے غفلت ہے۔

اللہ کہاں گیا؟

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ سفر پر جارہے تھے۔ جنگلوں کا سفر تھا۔ اور اس وقت آجکل کی طرح ہوٹلوں کا رواج تو تھا نہیں، اس لئے جب بھوک لگی، اور زادِ راہ ختم ہوگیا، تو آس پاس بستی تلاش کی کہ قریب میں کوئی بستی ہو تو وہاں جاکر کھانا کھالیا جائے۔ تلاش کے دوران دیکھا کہ بکریوں کا ایک گلہ چر رہا ہے۔ آپ نے قریب جاکر چرواہے کو تلاش کیا۔ اور اس سے ملاقات کرکے اس سے کہا کہ میں مسافر ہوں۔ اور بھوک لگی ہوئی ہے، اس لئے بکری کا دودھ نکال دو اور مجھ سے اس کے پیسے لے لو۔ تاکہ میں دودھ پی کر اپنی بھوک کا مداوا کرلوں یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ آدھی دنیا سے زیادہ کے حکمراں اور بادشاہ بن چکے تھے جواب میں چرواہے نے کہا کہ جناب میں آپ کو ضرور دودھ دے دیتا، مگر بات یہ ہے کہ یہ بکریاں میری نہیں ہیں، یہ میرے مالک کی ہیں، اور اس نے مجھے چرانے کے لئے دی ہیں، اس لئے یہ بکریاں بھی میرے پاس امانت ہیں، اور ان کا دودھ بھی میرے پاس امانت ہے، اس لئے میں مالک کی اجازت کے بغیر اس کا دودھ دینے کا مجاز نہیں ہوں، اس لئے مجبوری ہے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ اس شخص کا تھوڑا امتحان لیا جائے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس چرواہے سے کہا کہ میں تمہیں ایک تدبیر بتاتا ہوں، اگر تم اس پر عمل کرلو،

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحدود، باب لا یشرب الخمر، رقم: ٦٢٧٤، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی، رقم: ٨٧، سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء لا یزنی الزانی وھو مؤمن، رقم: ٢٥٤٩، سنن النسائی، کتاب قطع السارق، باب تعظیم السرقة، رقم: ٤٧٨٧، سنن أبی داؤد، کتاب السنة، باب الدلیل علی زیادة الإیمان ونقصانه، رقم: ٤٠٦٩، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب النھی عن النھبة، رقم: ٣٩٢٦، مسند أحمد، رقم: ٧٨٥٥

اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے، اور میرا بھی فائدہ ہے۔ اس چرواہے نے پوچھا کہ وہ کیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم ایسا کرو کہ ایک بکری تم مجھے فروخت کر دو، اور اس بکری کی جو قیمت ہو وہ تم مجھ سے لے لو، اس میں میرا تو یہ فائدہ ہے کہ میں اس بکری کو اپنے ساتھ سفر میں رکھوں گا۔ اور جب ضرورت ہوگی، اس کا دودھ نکال کر پی لوں گا، اور تمہارا فائدہ یہ ہے کہ تمہیں بکری کے پیسے مل جائیں گے۔ رہا مالک، تو اگر مالک پوچھے کہ بکری کہاں گئی تو اس کو یہ کہہ دینا اس کو بھیڑیا کھا گیا، اس لئے کہ اس قسم کے واقعات جنگل میں پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ اس لئے اس کو یقین آجائے گا اس میں تمہارا بھی بھلا ہو جائے گا، میرا بھی بھلا ہو جائے گا چرواہے نے جونہی یہ تدبیر سنی تو فوراً اس کی زبان پر یہ کلمات آئے:

"یَا هٰذَا فَأَیْنَ اللّٰهُ؟"

''پھر اللہ کہاں گیا؟''

یعنی اگر یہ سب کام میں کرلوں تو اگرچہ مالک تو نہیں دیکھ رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے، یہ سب کچھ حقیقت میں جھوٹ ہے۔ فریب اور دھوکہ ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے جا کر میں کیا جواب دوں گا؟ (۱)

ذکر سے غفلت، جرائم کی کثرت

یہ ہے اللہ کا ذکر، اللہ کی یاد، جو دل میں اس طرح جم گیا کہ کسی بھی وقت، جنگل کی تنہائی میں بھی، رات کی تاریکی میں بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر دل سے نکلتا نہیں بہرحال حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب اس چرواہے کا جواب سنا تو فرمایا کہ جب تک تم جیسے انسان اس روئے زمین پر موجود رہیں گے، اور جب تک اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر جواب دہی کا احساس دلوں میں موجود ہوگا، اس وقت تک اس روئے زمین پر ظلم نہیں آسکتا۔ اس لئے کہ جواب دہی کا احساس وہ چیز ہے جو تنہائی میں بھی انسان کے دل پر پہرے بٹھا دیتا ہے۔ اور اگر یہ احساس باقی نہ رہے تو اس کا انجام آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ پولیس کی تعداد بڑھ رہی ہے، محکموں میں اضافہ ہو رہا ہے، عدالتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، فوج لگی ہوئی ہے، گلی کوچوں میں پہرے لگے ہوئے ہیں مگر پھر بھی ڈاکے پڑ رہے ہیں، لوگوں کے جان و مال اور آبرو پر کس طرح حملے ہو رہے ہیں، جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ سب کیوں ہے؟ اس لئے کہ جرائم کی جڑ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی، جب تک اللہ جل شانہ کی یاد اور اللہ تعالیٰ کا ذکر دل میں نہ سما جائے، جب تک اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کا احساس دل میں پیدا نہ ہو، لہٰذا جب تک دل میں یہ شمع

---

(۱) أسد الغابة في معرفة الصحابة (۲۲۸/۳)، کتب تاریخ میں یہ واقعہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سفر کا مذکور ہے، جیسا کہ اس جلد میں بھی پہلے گزر چکا ہے۔

فروزاں نہیں ہوتی، اس وقت تک ہزار پہرے بٹھالو، ہزار فوجی بلالو، مگر جرائم بند نہیں ہوں گے، ذرا سی کسی کی آنکھ بہکے گی، اور جرم ہو جائے گا۔ بلکہ جو آنکھ حفاظت کے لئے مقرر تھی، آج وہ آنکھ جرم کرا رہی ہے۔ جس کو لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کے لئے بٹھایا گیا تھا، وہی لوگ جان و مال پر ڈاکے ڈال رہے ہیں لہٰذا جب تک اللہ کا ذکر، اس کی یاد دل میں نہ ہو، جواب دہی کا احساس دل میں نہ ہو، اس وقت تک جرائم کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔

جرائم کا خاتمہ حضور ﷺ نے فرمایا

جرائم کا خاتمہ تو محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا کہ نہ پولیس ہے، نہ محکمہ ہے، نہ عدالت، نہ فوج، بلکہ جس کسی سے جرم صادر ہو گیا تو وہ روتا ہوا آرہا ہے کہ یا رسول اللہ مجھ پر سزا جاری کر دیجئے، تاکہ میں آخرت کے عذاب سے بچ جاؤں، اور ایسی سزا جاری کریں کہ پتھر مار مار کر مجھے ہلاک کر دیجئے، اور مجھے رجم کر دیجئے بس بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کا خوف دل میں سما گیا۔ اسی لئے کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرو، ورنہ ہمارے ذکر سے اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ نہیں، لیکن جتنا ذکر کرو گے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس دل میں پیدا ہوگا، اور پھر جرم گناہ، معصیت اور نافرمانی سے انشاء اللہ بچاؤ ہوگا، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرو۔

زبانی ذکر بھی مفید و مطلوب ہے

لوگ کہتے ہیں کہ اگر صرف زبان سے ''اللہ اللہ'' کر رہے ہیں، یا ''سبحان اللہ'' کہہ رہے ہیں، یا زبان سے ''الحمدللہ'' کہہ رہے ہیں، اور دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے تو اس سے کیا حاصل؟ یاد رکھو یہ زبان سے ذکر کرنا پہلی سیڑھی ہے۔ اگر یہ سیڑھی قطع نہ کی تو دوسری سیڑھی پر کبھی نہیں پہنچ سکتے، زندگی بھر نہیں پہنچ سکتے، اور اگر یہ سیڑھی قطع کر لی اور زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا شروع کر دیا تو کم از کم ایک سیڑھی تو طے ہوگئی، پھر اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ دوسری سیڑھی بھی قطع کرا دیں گے۔ اس لئے اس ذکر کو بیکار مت سمجھو، یہ ذکر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اگر ہمارا سارا جسم نہ سہی تو کم از کم ایک عضو تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہے۔ اگر اس میں لگے رہے تو انشاء اللہ آگے جا کر یہی ترقی کر جائے گا۔

تعلق مع اللہ کی حقیقت

بہر حال، اللہ کے ذکر اور اللہ کی یاد کے دل میں سما جانے کا نام ہی ''تعلق مع اللہ'' ہے۔ یعنی ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کچھ نہ کچھ رابطہ اور تعلق قائم ہے۔ صوفیائے کرام کے سلسلوں میں جتنی

ریاضتیں، مجاہدات، وظیفے اور اشغال ہیں، ان سب کا حاصل اور خلاصہ اور مقصود صرف ایک ہی چیز ہے، وہ ہے ''تعلق مع اللہ کو مضبوط کرنا''، اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہوجاتا ہے تو پھر انسان سے گناہ بھی نہیں ہوتے، پھر انسان اللہ کی عبادت بھی اپنی بساط کے مطابق بہتر سے بہتر انجام دیتا ہے، پھر اخلاقِ فاضلہ اس کو حاصل ہوجاتے ہیں، اور اخلاقِ رذیلہ سے نجات مل جاتی ہے، یہ سب چیزیں تعلق مع اللہ سے حاصل ہوتی ہیں۔

ہر وقت مانگتے رہو

اس تعلق مع اللہ کو حاصل کرنے کے لئے صوفیاء کرام کے یہاں بڑے لمبے چوڑے مجاہدات اور ریاضتیں کرائی گئی ہیں۔ لیکن ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس تعلق مع اللہ کو حاصل کرنے کے لئے میں تمہیں ایک مختصر اور آسان راستہ بتاتا ہوں، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت اور ہر لمحے مانگنے اور مانگتے رہنے کی عادت ڈالو، ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگو، جو دکھ اور تکلیف پہنچے، پریشانی ہو، جو ضرورت اور حاجت ہو، بس اللہ تعالیٰ سے مانگو، مثلاً اگر گرمی لگ رہی ہے، کہو، اے اللہ! گرمی دور فرمادیجئے، بجلی چلی گئی، یا اللہ! بجلی عطا فرمادیجئے، بھوک لگ رہی ہے، کہو، یا اللہ! اچھا کھانا دے دیجئے، گھر میں داخل ہو رہے ہیں، کہو، یا اللہ! گھر میں اچھا منظر سامنے آئے، عافیت کی خبر ملے، کوئی پریشانی کی بات نہ ہو، دفتر میں داخل ہونے سے پہلے کہو یا اللہ! دفتر جارہا ہوں، حالات ٹھیک رہیں، طبیعت کے موافق رہیں، کوئی ناخوشگوار بات پیش نہ آئے، کوئی تکلیف کی بات پیش نہ آئے۔ بازار جارہے ہو، کہو، یا اللہ! فلاں چیز خریدنے جارہا ہوں، مناسب قیمت پر مناسب چیز دلادیجئے۔ ہر وقت ہر لمحے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی عادت ڈالو۔

یہ چھوٹا سا چٹکلا ہے

واقعہ یہ ہے کہ کہنے کو یہ معمولی بات ہے، اس لئے کہ یہ کام اتنا آسان ہے جس کی کوئی حد نہیں، اسی وجہ سے اس کی قدر نہیں ہوتی، لیکن اس نسخے پر عمل کرکے دیکھو، اللہ تعالیٰ سے مانگ کے دیکھو، ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے رٹ لگاؤ، جو مسئلہ سامنے آئے، اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرو، یا اللہ یہ کام کردیجئے، اگر اس کی عادت ڈال لو تو پھر کوئی لمحہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے سے خالی نہیں جائے گا۔ مثلاً ایک آدمی سامنے سے آپ سے ملاقات کے لئے آرہا ہے، آپ ایک لمحے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیں کہ یا اللہ! یہ شخص اچھی خبر لے کر آیا ہو، کوئی بری خبر لے کر نہ آیا ہو، یا اللہ! یہ شخص جو بات کہنا چاہ رہا ہے، اس کا اچھا نتیجہ نکال دیجئے ڈاکٹر کے پاس دوا کے لئے جارہے ہیں، کہو، یا اللہ!

اس ڈاکٹر کے دل میں صحیح تجویز ڈال دیجئے، صحیح دوا اس کے دل میں ڈال دیجئے، گویا کہ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی عادت ڈالو یہ چھوٹا سا چٹکلا اور چھوٹا سا نسخہ ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس چٹکلے پر عمل کر کے دیکھو، کیا سے کیا ہو جاتا ہے، انسان اس کی وجہ سے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

ذکر کے لئے کوئی قید و شرط نہیں

اور یہ جو مسنون دعائیں ہیں، حضور نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ذریعہ اس نسخے کی طرف لا رہے ہیں کہ جب کوئی مسئلہ پیش آئے اللہ تعالیٰ سے مانگو، اور دعا کرو، اور اللہ تعالیٰ نے اس مانگنے کو اور فریاد کو اتنا آسان فرما دیا ہے کہ اس پر کوئی قید اور شرط نہیں لگائی، بلکہ کسی بھی حالت میں ہو، اللہ تعالیٰ سے مانگو، نہ وضو کی شرط، نہ قبلہ رو ہونے کی شرط، حتیٰ کہ جنابت کی حالت میں بھی دعا مانگنا ممنوع نہیں ہے، اگرچہ اس حالت میں قرآن کریم کی تلاوت جائز نہیں لیکن دعا کر سکتے ہو، حتیٰ کہ جس وقت انسان قضاء حاجت میں مصروف ہے، اس وقت زبان سے کوئی دعا نہیں کرنی چاہئے، زبان سے ذکر نہیں کرنا چاہئے، اس وقت بھی دل دل میں ذکر کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس ذکر کو اتنا آسان کر دیا کہ کوئی قید و شرط نہیں، اور کوئی خاص طریقہ نہیں، اگر موقع ہو تو باوضو ہو کر قبلہ رو ہو کر ہاتھ اُٹھا کر مانگو لیکن اگر ایسا موقع نہ ملے تو نہ وضو کی شرط، نہ ہاتھ اُٹھانے کی شرط، نہ زبان سے بولنے کی شرط، بلکہ دل دل میں اللہ تعالیٰ سے مانگ لو، یا اللہ یہ کام کر دیجئے۔

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص سوال کرنے کے لئے آتا ہے، اور آ کر یہ کہتا ہے کہ حضرت ایک بات پوچھنی ہے، تو اس وقت فوراً دل دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ، یہ شخص معلوم نہیں کیسا سوال کرے گا۔ اے اللہ اس سوال کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دیجئے، اور کبھی اس عمل سے تخلف نہیں ہوتا، ہمیشہ یہ عمل کرتا ہوں۔

مسنون دعاؤں کی اہمیت

اب ہر ہر موقع پر اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا نکتہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سکھایا کہ مانگنے کی خاص خاص جگہیں بتا دیں کہ اس جگہ تو مانگ ہی لو، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس احسانِ عظیم پر قربان جائیے کہ انہوں نے دعا مانگنا بھی سکھا دیا۔ ارے تم خود کیا مانگو گے؟ کس طرح مانگو گے؟ کن الفاظ سے مانگو گے؟ تمہیں تو مانگنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔ یہ مانگنے کا ڈھنگ بھی میں ہی تم کو بتا دیتا ہوں کہ یہ مانگو، اور اس طرح مانگو، ان الفاظ سے مانگو، یہ سب کچھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سکھا گئے، اب ہمارا آپ کا

کام یہ ہے کہ ان دعاؤں کو یاد کریں، اور جب وہ موقع آئے تو توجہ کے ساتھ وہ دعا مانگ لیا کریں، بس اتنا سا کام ہے۔ سب کام حضور اقدس ﷺ کر گئے۔ پکی پکائی روٹی تیار کر کے پوری اُمت کے لئے چھوڑ گئے۔ اب اُمت کا کام ہے کہ اس روٹی کو اُٹھا کر اپنے حلق میں ڈال لے، بس اتنا کام بھی ہم سے نہیں ہوتا۔ اور علماء نے ادعیہ ماثورہ اور مسنون دعاؤں کے نام سے بے شمار کتابیں لکھ دیں، اور اس میں وہ دعائیں جمع کر لیں، تاکہ ہر مسلمان اس کو آسانی کے ساتھ یاد کر لے پہلے مسلمان گھرانوں میں یہ رواج تھا کہ جب بچے نے بولنا شروع کیا تو سب سے پہلے اس کو دعائیں سکھائی جاتیں۔ کہ بیٹا بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھاؤ، کھانے کے بعد یہ دعا پڑھو، بستر پر جاؤ تو یہ دعا پڑھو، کپڑے پہنو تو یہ دعا پڑھو، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کام کے لئے باقاعدہ کلاس لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اور پھر بچپن کا حافظہ بھی ایسا ہوتا ہے جیسے پتھر پر لکیر، ساری عمر یاد رہتا ہے، اب بڑی عمر میں یاد کرانا آسان کام نہیں، لیکن بہرحال، یہ کام کرنے کا ہے، ہر مسلمان اس کو غنیمت سمجھے اور یہ مسنون دعائیں کوئی لمبی چوڑی نہیں ہوتیں۔ بلکہ چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں۔ روزانہ ان مسنون دعاؤں میں سے ایک دعا یاد کرلو، اور پھر اس کو موقع پر پڑھنے کا عزم کرلو کہ جب یہ موقع آئے گا، اس دعا کو ضرور پڑھیں گے، پھر دیکھئے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کے کیسے انوار و برکات عطا فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر وقت اپنا ذکر کرنے اور اس میں مشغول رہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

کیا آپ کو خیالات پریشان کرتے ہیں؟ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وسوسے کے بارے میں پوچھا گیا کہ دل میں کفر وشرک کے اور فسق و فجور کے جو وسوسے آتے ہیں ان کا کیا حکم ہے؟ جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((ذَاكَ مَحْضُ الْاِیْمَانِ))

''یہ وسوسے خالص ایمان کی علامت ہیں''

ان سے مت گھبراؤ اور ان کی وجہ سے مایوس مت ہو جاؤ اور ان کی وجہ سے زیادہ پریشان مت ہو، کیونکہ یہ خالص ایمان کی علامت ہیں۔ (۱)

ایک صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! بعض اوقات ہمارے دل میں ایسے وسوسے اور خیالات آتے ہیں کہ ان خیالات کو زبان پر لانے کے مقابلے میں ہمیں جل کر کوئلہ ہو جانا زیادہ پسند ہے، یعنی ان خیالات کو زبان سے ظاہر کرنا آگ میں جل جانے سے زیادہ برا لگتا ہے۔ اس کے جواب میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو ایمان کی علامت ہے۔ (۲)

شیطان ایمان کا چور ہے

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ''وسوسہ'' شیطان کا عمل ہے کیونکہ شیطان ہی انسان کے دل میں یہ وسوسے ڈالتا ہے۔ اور شیطان

☆ اصلاحی خطبات (۹/۱۵۶ تا ۱۷۵)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) کنز العمال، رقم: ۱۲۵۸ (۱/۴۳۹)، مجمع الزوائد (۱/۱۲)، جامع الأحادیث، رقم: ۱۲٤۷۳ (۱۳/۲۷)، مسند أحمد، رقم: ۲٤۷۹٦، المعجم الأوسط، رقم: ۸۵٤۲ (۸/۲٤۹)، مسند اسحاق بن راهویه، رقم: ۱۷۹٦ (۳/۱۰۳۹)، صحیح ابن حبان، رقم: ۳۵۹ (۱/۳۵۰)

(۲) کنز العمال، رقم: ۱۲٦۳ (۱/٤٤۰)

ایمان کا چور ہے، یہ تمہارے ایمان پر ڈاکہ ڈالنا چاہتا ہے۔ چور اور ڈاکو اس گھر میں ڈاکہ ڈالے گا جس گھر میں دولت ہو، اگر دولت ہے ہی نہیں تو پھر ڈاکو ڈاکہ کیوں ڈالے گا۔ لہٰذا شیطان جو تمہارے دل میں وسوسے ڈال رہا ہے اور تمہارے دل میں داخل ہو رہا ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمہارے دل میں ایمان کی دولت موجود ہے، اگر یہ ایمان کی دولت نہ ہوتی تو یہ ڈاکو اس گھر میں داخل نہ ہوتا، اس وجہ سے ان سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ میرے دل میں ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ان کو ظاہر کرنے کے مقابلے میں جل کر مر جانا زیادہ پسند ہے، یہ اندر سے تمہارا ایمان بول رہا ہے۔ تمہارا ایمان یہ بول رہا ہے کہ بات زبان سے نکالنے والی نہیں۔ اگر دل میں ایمان نہ ہوتا تو یہ بات نہ ہوتی، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو عین ایمان کی علامت ہے۔

وساوس پر گرفت نہیں ہوگی

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَدَّ کَیْدَ الشَّیْطَانِ اِلَی الْوَسْوَسَةِ))(۱)

''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے شیطان کے مکر اور جال کو وسوسے کی حد تک محدود کر دیا، اس سے آگے نہیں بڑھایا''

یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ شیطان کی تدبیر تمہارے اُوپر اس سے زیادہ کارگر نہیں ہو رہی ہے۔ ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِیْ عَنْ اُمَّتِیْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا))(۲)

''اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے دلوں میں جو وسوسے پیدا ہوتے ہیں اس سے درگزر فرما دیا ہے اور ان کو معاف فرما دیا ہے، ان پر مؤاخذہ نہیں ہوگا'' (البتہ عمل پر مؤاخذہ ہوگا)

---

(۱) إحياء علوم الدين (۳/۳۱٤)، سنن أبی داؤد میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے: الحمد لله الذی ردّ كيدهٗ الى الوسوسة، سنن أبی داود، كتاب الأدب، باب فی ردّ الوسوسة، رقم: ٤٤٤٨

(۲) صحيح البخاری، كتاب العتق، باب الخطأ والنسيان فی العتاقة والطلاق ونحوه، رقم: ۲۳٤۳، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب تجاوز الله عن حديث النفس والخواطر بالقلب، رقم: ۱۸۱، سنن أبی داود، كتاب الطلاق، باب فی الوسوسة بالطلاق، رقم: ۱۸۸۸، سنن ابن ماجه، كتاب الطلاق، باب من طلق فی نفسه ولم يتكلم به، رقم: ۲۰۳۰، مسند أحمد، رقم: ۸۷٤٥

عقیدوں کے بارے میں خیالات

وسوسے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک وسوسے عقیدے کے بارے میں ہیں، یعنی دل میں شیطان اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں وسوسہ ڈالے یا آخرت کے بارے میں وسوسہ ڈالے کہ معلوم نہیں کہ آئے گی یا نہیں۔اس قسم کے وسوسوں کے بارے میں تو حضور اقدس ﷺ نے خود فرمایا کہ جب تک تم اپنا عقیدہ درست رکھو گے، پھر چاہے خیالات اور وساوس کیسے بھی آجائیں اس پر انشاء اللہ مؤاخذہ نہیں ہوگا اور نہ ان خیالات کی وجہ سے انسان کافر ہوتا ہے۔ان خیالات کی وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں شیطان ہوگیا، میں تو کافر ہوگیا۔یاد رکھئے! ان وسوسوں کے دل میں آنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک انسان اپنے دل، اپنی زبان اور اپنے عمل سے مؤمن ہے۔لہٰذا آدمی کو مطمئن ہوجانا چاہئے۔

گناہوں کے خیالات

دوسرے گناہ کرنے اور فسق و فجور کرنے کے وسوسے اور خیالات آتے ہیں۔مثلاً دل میں یہ خیال آتا ہے کہ فلاں گناہ کا ارتکاب کرلوں یا فلاں گناہ کرلوں یا کسی گناہ کی طرف طبیعت مائل ہورہی ہے اور اس کی طرف کشش ہورہی ہے۔ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ اگر محض دل میں خیال آیا ہے تو اس پر انشاء اللہ کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا جب تک اس خیال اور وسوسے پر عمل نہ کرلو گے، لہٰذا جب گناہ کے تقاضے اور داعیے پر عمل کرلو گے تو یہ قابلِ مؤاخذہ اور قابلِ گرفت ہے۔اور جب بھی کسی گناہ کا خیال یا وسوسہ آئے کہ فلاں گناہ کرلوں تو اس کا فوری توڑ یہ ہے کہ فوراً اللہ کی پناہ مانگو کہ یا اللہ! میرے دل میں اس گناہ کا خیال آرہا ہے، میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں، آپ مجھے اس گناہ سے بچالیجئے۔اس طرح اس خیال اور وسوسے کا توڑ ہوجائے گا۔

برے خیالات کے وقت اللہ کی طرف رجوع کرو

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ آپ آزمائش میں مبتلا ہوئے اور اس آزمائش کے نتیجے میں ان کے دل میں بھی گناہ کا کچھ وسوسہ آیا اس لئے کہ بہرحال آپ بھی انسان تھے لیکن اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی:

﴿وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَاهِلِينَ﴾(۱)

(۱) یوسف: ۳۳، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور اگر تو نے مجھے ان کی چالوں سے محفوظ نہ کیا تو میرا دل بھی ان کی طرف کھنچنے لگے گا اور جو لوگ جہالت کے کام کرتے ہیں، ان میں میں بھی شامل ہوجاؤں گا''

یعنی اے اللہ! اگر آپ ان عورتوں کے مکر کو مجھ سے دور نہیں کریں گے تو میں بھی تو ایک انسان ہوں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا، لہٰذا ان عورتوں کے مکر کو مجھ سے دور کر دیجئے۔ جب کبھی گناہ کا خیال یا گناہ کا وسوسہ اور داعیہ دل میں پیدا ہو تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے اس سے پناہ مانگ لو کہ اے اللہ! اپنے فضل و کرم سے مجھے اس گناہ سے محفوظ رکھئے۔ اور اس وقت اپنی ہمت کو تازہ کر لو کہ میں گناہ کے اس داعیہ پر عمل نہیں کروں گا۔ اگر یہ کر لو گے تو پھر انشاء اللہ یہ خیالات اور وسوسے کچھ بھی نقصان نہیں کریں گے۔

نماز میں آنے والے خیالات کا حکم

وسوسے کی تیسری قسم اگرچہ مباح ہے کیونکہ وہ کسی گناہ کا وسوسہ اور خیال نہیں ہے لیکن وہ خیال انسان کو کسی عبادت اور طاعت کی طرف متوجہ ہونے سے روک رہا ہے۔ مثلاً جیسے ہی نماز کی نیت باندھی بس اس وقت دنیا بھر کے خیالات کی چکی چلنی شروع ہو گئی۔ اور وہ خیالات چاہے گناہ کے خیال نہ ہوں مثلاً کھانے پینے کا خیال، بیوی بچوں کا خیال، اپنی روزی کا خیال، تجارت کا خیال، یہ تمام خیالات فی نفسہ گناہ کے خیالات نہیں ہیں۔ لیکن ان خیالات کی وجہ سے دل نماز کی طرف متوجہ نہیں ہو رہا ہے اور ان خیالات کی وجہ سے خشوع میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ چونکہ یہ خیالات جو غیر اختیاری طور پر آ رہے ہیں اور انسان کے اپنے اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے اس لئے انشاء اللہ ان خیالات پر کوئی گرفت اور مواخذہ نہیں ہوگا بلکہ معاف ہوں گے، البتہ اپنے اختیار سے باقاعدہ ارادہ کر کے خیالات نماز میں مت لاؤ اور نہ دل ان میں لگاؤ بلکہ جب اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرو تو ذہن کو نماز کی طرف متوجہ کرو، جب ثنا پڑھو تو اس کی طرف دھیان لگاؤ اور جب سورۃ فاتحہ پڑھنی شروع کرو تو اس کی طرف دھیان لگاؤ، پھر دھیان لگانے کے باوجود غیر اختیاری طور پر ذہن دوسری طرف بھٹک گیا اور خیالات کہیں اور چلے گئے تو انشاء اللہ ان پر گرفت نہیں ہوگی۔ لیکن جب تنبہ ہو جائے کہ میں تو بھٹک گیا تو پھر دوبارہ نماز کی طرف لوٹ آؤ اور نماز کے الفاظ اور اذکار کی طرف لوٹ آؤ۔ بار بار یہ کرتے رہو گے تو انشاء اللہ یہ خیالات آنے کم ہو جائیں گے اور اس کام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ خشوع عطا فرما دیں گے۔

نماز کی ناقدری مت کرو

بہرحال نماز میں یہ جو خیالات آتے ہیں، بہت سے لوگ ان سے پریشان ہوتے ہیں اور ان خیالات کے نتیجے میں سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ نماز تو اُٹھک بیٹھک ہے، اس میں کوئی روح اور جان نہیں

ہے۔ یاد رکھئے! نماز کی ایسی ناقدری نہیں کرنی چاہئے۔ ارے یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ اور ان خیالات کی وجہ سے اپنی نماز کو بیکار مت سمجھو، یہ نماز کی توفیق تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اور ان غیر اختیاری خیالات کی وجہ سے انشاء اللہ تمہاری گرفت نہیں ہوگی۔ البتہ اپنے اختیار سے خیالات مت لاؤ۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے عالم اور صوفی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت اونچا مقام عطا فرمایا تھا۔ ان کے ایک بھائی تھے جو بالکل خالص صوفی مزاج آدمی تھے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جب امامت فرماتے اور نماز پڑھاتے تو یہ بھائی ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ کسی نے ان کی والدہ سے شکایت کردی کہ یہ ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ والدہ نے ان کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ تم ان کے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ان کی نماز ہی کیا ہے، میں ان کے پیچھے کیسے نماز پڑھوں۔ اس لئے کہ جب یہ نماز پڑھاتے ہیں تو اس وقت ان کا دل اور دماغ حیض اور نفاس کے مسائل میں الجھا رہتا ہے۔ اس لئے یہ گندی نماز ہے، میں اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا۔ وہ والدہ بھی امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ تھیں۔ جواب میں فرمایا کہ تمہارا بھائی تو نماز کے اندر فقہی مسائل سوچتا ہے اور نماز کے اندر فقہی مسئلے سوچنا جائز ہے، اور تم نماز کے اندر اپنے بھائی کی عیب جوئی میں لگے رہتے ہو اور یہ دیکھتے رہتے ہو کہ اس کی نماز صحیح ہے یا غلط ہے؟ اور نماز کے اندر یہ کام یقینی طور پر حرام ہے۔ لہٰذا بتاؤ کہ وہ بہتر ہے یا تم بہتر ہو؟ بہرحال امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ نے بھی یہ بات واضح فرمادی کہ نماز میں فقہی مسئلے کو سوچنا کوئی گناہ کی بات نہیں۔ لہٰذا اپنے اختیار سے ایسے خیالات لانا جو خود عبادت اور طاعت کا حصہ ہیں وہ بھی نماز کے خشوع کے منافی نہیں۔

آیاتِ قرآنی میں تدبر کا حکم

چنانچہ حکم یہ ہے کہ قرآن کریم پڑھتے وقت قرآن کریم کی آیات میں تدبر کرو، غور و فکر کرو۔ اب اگر ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اور نماز میں تلاوت کے وقت قرآن کریم کے اسرار و حکم کے اندر غلطاں و پیچاں ہے اور منہمک ہے، یہ سب جائز ہے اور عبادت ہی کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا کوئی بھی ایسا خیال جو طاعت اور عبادت کا خیال ہو ان کو اپنے اختیار سے بھی نماز میں لا سکتے ہیں۔ البتہ وہ خیالات جو طاعت اور عبادت کا حصہ نہیں ہیں۔ مثلاً دنیا کے بارے میں خیالات کہ کس طرح دنیا کماؤں، کس طرح خرچ کروں وغیرہ تو اس قسم کے خیالات اپنے اختیار سے تو نہ لائیں، خود سے آرہے ہیں تو آنے

دو، اس سے نماز کے خشوع میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا۔ ہاں! جب دھیان اس طرف آجائے کہ یہ خیالات آرہے ہیں پھر بھی ان خیالات کو باقی رکھا اور ان خیالات سے مزے لیتا رہا تو یہ ناجائز ہے۔ لہٰذا جب تنبہ ہوجائے تو دوبارہ نماز کی طرف لوٹ آؤ۔

یہ سجدہ صرف اللہ کے لئے ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک صاحب آئے اور عرض کیا کہ حضرت! میں بہت پریشان ہوں، اس لئے کہ میری نمازیں کسی کام کی نہیں، جب میں سجدہ کرتا ہوں تو اس وقت دماغ میں ایسے شہوانی اور نفسانی خیالات کا ہجوم ہوتا ہے کہ الامان، تو وہ میرا سجدہ کیا ہوا، وہ تو ویسے ہی ٹکریں مارنا ہوا۔ میں تو بہت پریشان ہوں کہ کس طرح اس مصیبت سے نجات پاؤں۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم یہ جو سجدہ کرتے ہو تمہارے خیال میں یہ کیسا سجدہ ہے؟ اس نے کہا کہ حضرت! بڑا ناپاک اور بڑا گندہ سجدہ ہے، اس لئے کہ اس میں ناپاک اور گندے شہوانی خیالات آتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ ناپاک اور گندہ سجدہ تو اللہ میاں کو نہیں کرنا چاہئے، اچھا ایسا کرو کہ تم یہ ناپاک سجدہ مجھے کرلو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے تو بہت پاکیزہ اور اعلیٰ قسم کا سجدہ ہونا چاہئے، اور یہ ناپاک سجدہ ہے یہ مجھ ناپاک کے سامنے کرلو۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ توبہ توبہ! آپ کے سامنے کیسے سجدہ کرلوں؟ حضرت نے فرمایا کہ بس اس سے پتہ چلا کہ یہ سجدہ اسی ذات کے لئے ہے، یہ پیشانی کسی اور کے سامنے جھک نہیں سکتی، چاہے اس سجدہ میں کیسے ہی گندے شہوانی اور نفسانی خیالات کیوں نہ آرہے ہوں، لیکن یہ پیشانی اگر جھکے گی تو اسی کے در پر جھکے گی۔ لہٰذا یہ سجدہ اسی اللہ کے لئے ہے۔ اور اگر یہ فاسد خیالات غیر اختیاری طور پر آرہے ہیں تو انشاء اللہ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معاف ہیں۔

خیالات اور وساوس میں بھی حکمت ہے

دیکھئے! اگر ہم جیسے لوگوں کو نماز کے اندر یہ خیالات اور وساوس نہ آئیں بلکہ بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کا خیال ہی نہ آئے، اگر ہم جیسے لوگوں کو یہ مقام حاصل ہوجائے تو خدا جانے ہمارا دماغ تکبر، عجب اور خود پسندی میں کہاں پہنچ جائے گا۔ اور یہ سمجھ بیٹھیں گے کہ ہم تو بہت اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ صَلَّی الْحَائِكُ رَكْعَتَيْنِ وَانْتَظَرَ الْوَحْيَ، ایک جولاہے نے ایک مرتبہ دو رکعت نماز پڑھ لی تو نماز کے بعد اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ کب اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے اُوپر وحی آتی ہے۔ اگر ہم میں سے بھی کسی کو خشوع و خضوع والی نماز

حاصل ہو جائے تو خدانخواستہ وہ پیغمبری کا یا مہدی ہونے کا دعویٰ نہ کردے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ظرف دیکھ کر یہ مقام عطا فرماتے ہیں۔ لہٰذا خیالات کے آنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت اور مصلحت ہے۔

نیکی اور گناہ کے ارادے پر اجر وثواب

بہر حال اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں دل کے خیالات پر مواخذہ نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے کہ گناہ کے بارے میں تو یہ اصول مقرر فرمادیا کہ اگر گناہ کرنے کے بارے میں خیال آیا اور شوق پیدا ہوا اور دل میں تھوڑا سا ارادہ بھی کر لیا کہ یہ گناہ کرلو، البتہ عزم اور پختہ ارادہ کی حد تک نہیں پہنچا تو اس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی پکڑ نہیں، بلکہ اگر بار بار گناہ کا خیال آتا رہا اور انسان اس خیال کو دفع کرتا رہا اور اس پر عمل نہیں کیا تو انشاء اللہ گناہ نہ کرنے پر اجر وثواب ملے گا کیونکہ گناہ کا خیال آنے کے باوجود اس نے اپنے آپ کو گناہ سے بچالیا۔ اور نیکی کے بارے میں یہ اصول مقرر فرمایا کہ اگر کسی نیکی کے بارے میں خیال آیا اور ارادہ کیا کہ فلاں نیکی کرلوں، اگرچہ اس نیکی کا پختہ ارادہ نہیں کیا تب بھی صرف ارادے پر اللہ تعالیٰ اجر وثواب عطاء فرماتے ہیں، مثلاً یہ ارادہ کیا کہ اگر مجھے مال مل گیا تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اتنا مال صدقہ کروں گا تو اس پر بھی اس کو ثواب ملے گا۔ یا مثلاً یہ ارادہ کرلیا کہ جب جہاد فی سبیل اللہ کی نوبت آئے گی تو اللہ کے راستے میں جہاد کروں گا اور شہادت کا درجہ حاصل کروں گا تو اس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی شہداء میں شمار فرماتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

((مَنْ سَئَلَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَإِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهِ))(۱)

''اگر کوئی شخص سچے دل سے شہادت طلب کرے کہ اے اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت کا مقام عطا فرمایئے تو اللہ تعالیٰ اس کو شہیدوں ہی میں شمار فرمائیں گے، چاہے بستر پر اس کو موت آئی ہو''

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب استحباب طلب الشهادة فی سبیل اللّٰه تعالیٰ، رقم: ۳۵۳۲، سنن الترمذی، کتاب فضائل الجهاد عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فیمن سأل الشهادة، رقم: ۱۵۷۷، سنن النسائی، کتاب الجهاد، باب مسألة الشهادة، رقم: ۳۱۱۱، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب فی الإستغفار، رقم: ۱۲۹۹، سنن ابن ماجه، کتاب الجهاد، باب القتال فی سبیل اللّٰه سبحانه وتعالیٰ، رقم: ۲۷۸۷، مسند أحمد، رقم: ۲۱۰۹٤

بہر حال نیکی کے بارے میں قانون یہ ہے کہ پختہ ارادہ کرنے سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ اجروثواب عطا فرماتے ہیں۔اور گناہ کے اندر قانون یہ ہے کہ جب تک پختہ ارادہ نہ کرے اس وقت تک مواخذہ نہیں فرماتے، یہ رحمت کا معاملہ ہے۔

خیالات کی بہترین مثال

بہر حال گناہوں کے پختہ ارادہ کرنے سے بچنا چاہئے لیکن گناہوں کے جو وساوس اور خیالات آرہے ہیں ان کی پرواہ نہ کرے بلکہ اپنے کام میں لگا رہے، ان خیالات کی وجہ سے اپنے کام کو نہ چھوڑے۔حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان خیالات کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص کو سربراہِ وقت اور بادشاہ نے دعوت دی ہے اور بلایا ہے، اب یہ شخص جلدی میں بادشاہ سے ملاقات کرنے جارہا ہے۔ اب کوئی شخص اس کا دامن گھسیٹتا ہے اور کوئی اس کا ہاتھ پکڑتا ہے اور اس کو روک کر اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس طرح لوگ اس کو تنگ کررہے ہیں۔اب بتایئے کیا یہ شخص ان راستہ روکنے والوں سے اُلجھنا شروع کردے گا یا اپنا سفر جاری رکھے گا؟ اگر یہ شخص راستہ روکنے والوں کے ساتھ الجھ گیا تو یہ شخص بادشاہ کے دربار میں کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔لیکن اگر اس نے یہ سوچا کہ یہ تو پاگل اور بیوقوف لوگ ہیں، میرے راستے میں رکاوٹ بن رہے ہیں، مجھے تو اس وقت بادشاہ کے پاس جانا ہے اور اس سے ملاقات کا اعزاز وشرف حاصل کرنا ہے تو وہ شخص ان کی طرف دھیان بھی نہیں دے گا۔

خیالات کا لانا گناہ ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خط میں لکھا کہ حضرت! جب میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو طرح طرح کے خیالات آتے رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے کہ میری نماز تو کچھ بھی نہیں۔حضرت نے اس کے جواب میں لکھا کہ ''خیالات کا آنا گناہ نہیں، خیالات کا لانا گناہ ہے''، یعنی اگر وہ خیالات خودبخود آرہے ہیں تو یہ گناہ نہیں ہے، ہاں جان بوجھ کر ارادہ کرکے دل میں خیالات لارہے ہیں تو یہ گناہ ہے۔

خیالات کا علاج

اور خیالات اور وساوس کا علاج ہی یہ ہے کہ ان خیالات کی طرف التفات اور توجہ مت کرو۔ جب توجہ نہیں کروگے تو انشاء اللہ یہ خیالات خودبخود دُور ہوجائیں گے۔بس اپنا کام کیے جاؤ کہ جب نماز کی نیت باندھو تو اپنا ذہن نماز کی طرف لگاؤ۔حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ اور ملفوظات میں

یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ یہ نماز بذاتِ خود مطلوب ہے، لہٰذا اگر غیر اختیاری طور پر خیالات آرہے ہیں تو اس کی وجہ سے نماز کی ناقدری مت کرو۔ نمازی اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن نماز میں مزہ ہی نہیں آتا، لطف ہی نہیں آتا، یا پہلے نماز میں بہت لطف اور مزہ آتا تھا اور اب وہ لطف آنا بند ہوگیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بھائی! یہ نماز اس لئے فرض نہیں کی گئی کہ اس میں تمہیں مزہ اور لطف آیا کرے، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کا ایک طریقہ ہے۔ اب اگر نماز میں مزہ آجائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اگر مزہ نہ آئے تو اس کی وجہ سے نماز کی فضیلت میں ذرّہ برابر کمی نہیں آتی۔ اگر تم نماز کے ارکان اور اس کی شرائط اور اس کے آداب پورے طور پر بجالارہے ہو اور سنت کے مطابق نماز ادا کررہے ہو تو پھر ساری عمر بھی اگر مزہ نہ آئے تو اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں۔ اگر نماز میں مزہ آئے تو بھی نماز پڑھنی ہے، اگر مزہ نہ آئے تو بھی نماز پڑھنی ہے۔

دل نہ لگنے کے باوجود نماز پڑھنا

بلکہ اگر نماز میں مزہ نہیں آیا اور نماز پڑھنے میں مشقت محسوس ہوئی، لیکن اس کے باوجود تم نے نماز پڑھی تو اس پر تمہارے لئے زیادہ ثواب لکھا جائے گا۔ اس لئے کہ نماز پڑھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا بلکہ نفس شرارت کررہا تھا لیکن تم نے زبردستی اللہ کی عبادت کی خاطر اور اس کی اطاعت کی خاطر نفس پر جبر کرکے نماز پڑھ لی تو انشاء اللہ اس نماز پر تمہیں ثواب زیادہ ملے گا۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کو ساری عمر کبھی نماز میں مزہ نہ آئے لیکن پھر بھی نماز پڑھتا رہے، نماز کو چھوڑے نہیں، میں اس کو دو باتوں کی مبارک باد دیتا ہوں۔ ایک اس بات کی کہ جب اس کو نماز میں مزہ نہیں آیا لیکن اس کے باوجود وہ نماز پڑھتا رہا تو انشاء اللہ اس کے اجر میں اضافہ ہوگا اور اس کو ثواب زیادہ ملے گا۔ اور دوسرے اس پر کہ اگر اس کو نماز میں مزہ آتا تو یہ شبہ ہوتا کہ یہ شاید نفس کے مزے کی خاطر نماز پڑھ رہا ہے، لیکن جب نماز میں مزہ آیا ہی نہیں تو اب یہ شائبہ ختم ہوگیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ نماز صرف اللہ کے لئے پڑھ رہا ہے، کیونکہ اس میں اخلاص زیادہ ہوگیا، اس کی وجہ سے اجر و ثواب میں اضافہ ہوجائے گا۔ اس لئے اس فکر میں مت پڑا کرو کہ مزہ آیا یا نہیں، لطف آیا یا نہیں۔

انسان عمل کا مکلّف ہے

لوگ خطوط میں لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم پہلے نماز پڑھا کرتے تھے تو بڑی عجیب و غریب کیفیت ہوتی تھی۔ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہوجاتے تھے اور اب لطف جاتا رہا اور وہ کیفیت باقی نہیں رہی، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شیطان نے مجھے مردود بنادیا ہے۔ خوب سمجھ لیں کہ یہ ساری

کیفیات جو غیر اختیاری ہیں جس میں انسان کے اختیار کو دخل نہیں ہے، مزہ آیا یا نہیں، یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے، مزہ آنا اور لطف آنا اور نہ آنا انسان کے اختیار میں نہیں اور انسان اس کا مکلف بھی نہیں۔ اس لئے کہ انسان تو عمل کا مکلف ہے، دیکھنا یہ ہے کہ عمل کیا یا نہیں؟ اور اگر عمل کیا تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ عمل محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق کیا یا نہیں؟ اگر اس طرح عمل کرلیا تو چاہے کوئی کیفیت حاصل ہوئی یا نہیں مگر عہدہ برا ہوگئے اور تمہارا وہ عمل مقبول ہوگیا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ساری کیفیات آنی جانی ہیں، نہ ان پر عمل کی قبولیت موقوف ہے اور نہ ہی ان پر نجات موقوف ہے۔ بس اگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے عمل کی توفیق ہو رہی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہو۔

کیفیات نہ مقصود ہیں نہ اختیار میں ہیں

جو لوگ حج یا عمرہ پر حرمین شریفین جاتے ہیں، عام طور سے ان پر مختلف کیفیات طاری ہوتی ہیں، مثلاً یہ بات مشہور ہے کہ جب بیت اللہ پر پہلی نظر پڑتی ہے تو اس پر گریہ طاری ہوجاتا ہے یا ہنسی آجاتی ہے یا کوئی دوسری کیفیت طاری ہوجاتی ہے، اور جب ملتزم پر پہنچتے ہیں تو وہاں پر بھی رونا آتا ہے اور گریہ طاری ہوجاتا ہے، وغیرہ وغیرہ، تو یہ سب کیفیات پیدا ہوتی ہیں لیکن یہ کیفیات غیر اختیاری ہیں۔ اگر حاصل ہوجائیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں اور اگر حاصل نہ ہوں تو اس پر گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ صرف اس وجہ سے پریشان ہوجاتے ہیں کہ ہم عمرہ کرنے یا حج کرنے گئے، وہاں تو ہمارا دل پتھر ہوگیا، نہ تو ہمیں رونا آیا، نہ ہم پر گریہ طاری ہوا، نہ آنسو نکلے اور نہ ہی کوئی اور کیفیت طاری ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اوپر مردودیت غالب ہوگئی ہے اور ہم پر شیطانی اثرات غالب آگئے، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے خیالات دل میں آتے ہیں۔ یاد رکھئے! اللہ تعالیٰ تمہیں اس بنیاد پر راندۂ درگاہ نہیں کریں گے کہ تمہیں غیر اختیاری طور پر رونا کیوں نہیں آیا؟ اور نہ اس بات پر گرفت کریں گے۔ بشرطیکہ عمل صحیح ہو اور جناب رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق ہو تو پھر رونا آئے یا نہ آئے، کیفیت طاری ہو یا نہ ہو لیکن انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ حج وعمرہ مقبول ہے اور موجبِ اجر ہے۔

عمل سنت کے مطابق ہونا چاہئے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ کیفیات پر مدار نہیں، بلکہ عمل پر مدار ہے۔ اگر عمل سنت کے مطابق ہے تو انشاء اللہ منزل پر پہنچ جاؤ گے ؏

بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

یعنی اگر صراطِ مستقیم پر تمہارا قدم ہے تو اے دل! پھر تم گمراہ نہیں ہو سکتے، چاہے خیالات اور وسوسے کسی طرح کے آرہے ہوں، کیفیات طاری ہو رہی ہوں یا نہ ہو رہی ہوں، چاہے لذت آرہی ہو یا نہ آرہی ہو۔

ایک ریٹائرڈ شخص کی نماز

میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین ایک دن فرمانے لگے کہ ایک شخص ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے، کھانے پینے کو سب کچھ میسر ہے، بینک بیلنس موجود ہے، معاش کی اور دنیا کمانے کی کوئی فکر نہیں ہے۔ نہ اس کو ملازمت پر جانا ہے، نہ اس کو تجارت کرنی ہے، نہ دکان کھولنی ہے۔ اس کا معمول یہ ہے کہ جیسے ہی کسی نماز کی آذان ہوئی تو اذان ہوتے ہی وہ گھر سے نکل گیا، مسجد میں پہنچ کر بہت اطمینان سے اچھے طریقے سے وضو کیا اور پھر تحیۃ المسجد کی دو رکعت ادا کیں اور پھر سنتیں ادا کیں اور پھر جماعت کے انتظار میں بیٹھا ذکر کرتا رہا، جب جماعت کھڑی ہوئی تو اس نے خشوع اور خضوع کے ساتھ نماز ادا کی، اس کا دل اور دماغ سب نماز کی طرف متوجہ ہیں، جب وہ تلاوت کرتا ہے تو اس میں اس کو لطف آتا ہے۔ جب ذکر کرتا ہے تو اس میں لطف آتا ہے، رکوع میں بھی اور سجدے میں بھی لطف آرہا ہے، اس طرح پوری نماز بہت سکون اور اطمینان کے ساتھ ادا کی، پھر بعد کی سنتیں ادا کیں، اور پھر اطمینان سے دل لگا کر دعا کی، پھر واپس گھر آگیا، اور پھر دوسری نماز کے انتظار میں دل لگا ہوا ہے کہ کب اذان ہو اور کب مسجد جاؤں۔ ایک آدمی تو یہ ہے۔

ٹھیلہ لگانے والے کی نماز

دوسرا شخص بیوی بچوں والا ہے، اس کے اوپر ہزار طرح کی ذمہ داریاں اور حقوق ہیں۔ ان حقوق کی ادائیگی کے لئے اور اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے ٹھیلہ لگاتا ہے اور آواز لگا لگا کر سامان فروخت کرتا ہے۔ اب لوگ اس کے ٹھیلے کے اردگرد کھڑے ہوئے سامان خرید رہے ہیں، اتنے میں اذان ہوگئی، اب وہ جلدی جلدی لوگوں کو نمٹانے کی کوشش کر رہا ہے، حتیٰ کہ جماعت کا وقت آگیا۔ تو اس نے جلدی سے اپنا ٹھیلا ایک طرف کیا اور اس کے اوپر کپڑا ڈالا اور بھاگتے ہوئے مسجد میں پہنچا، جلدی جلدی وضو کیا اور جا کر امام کے پیچھے کھڑا ہوگیا اور جلدی سے نیت باندھ لی۔ اب اس کا دل کہیں، دماغ کہیں۔ ٹھیلے کی فکر لگی ہوئی ہے۔ اور گاہکوں کی فکر لگی ہوئی ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوگیا، اور جماعت سے نماز ادا کی، پھر سنتیں ادا کیں اور جلدی سے

جا کر دوبارہ ٹھیلا لگا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دوسرا آدمی ہے۔

کس نماز میں روحانیت زیادہ ہے؟

پھر فرمایا کہ بتاؤ ان دونوں میں سے کس کی نماز روحانیت سے زیادہ قریب ہے؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے شخص کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے، اس لئے کہ وہ اذان کے وقت گھر سے نکلا، مسجد میں آکر اطمینان سے وضو کیا، تحیۃ المسجد پڑھی، سنتیں پڑھیں اور اطمینان اور خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس دوسرے آدمی کی نماز روحانیت کے زیادہ قریب ہے۔ اگرچہ اس نے حواس باختگی کی حالت میں نماز پڑھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلے شخص کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں تھی اور اس کے اوپر کوئی فکرات نہیں تھے۔ اس نے اپنے آپ کو ہر ذمہ داری سے فارغ کر لیا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں اس کو نماز میں بہت لذت بھی آرہی تھی اور لطف بھی آرہا تھا۔ لیکن یہ دوسرا شخص اپنا وہ ٹھیلہ چھوڑ کر آرہا ہے جس ٹھیلہ پر اس کی اپنی معیشت اور اس کے گھر والوں کی معیشت موقوف ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کا وقت آگیا تو وہ ٹھیلہ اس کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہونے سے غافل نہیں کر سکا، اس ٹھیلے کو چھوڑ کر جماعت میں آخر کھڑا ہو گیا اور نماز ادا کر لی۔ اس شخص کا عمل زیادہ مشقت والا اور زیادہ مقبول اور زیادہ موجبِ اجر ہے۔ اگرچہ اس کے اوپر کیفیت طاری نہیں ہوئی اور نہ اس کو لذت آئی لیکن اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کے اجر وثواب میں کمی نہیں کریں گے۔ انشاء اللہ۔

مایوس مت ہو جاؤ

آج کل لوگ عام طور پر غیر اختیاری امور کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے پریشان اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور پھر مایوسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالآخر شیطان وہ عمل چھڑوا دیتا ہے۔ شیطان اس کو یہ سکھاتا ہے کہ جب تیری نماز کسی قابل نہیں ہے تو پڑھنے سے کیا فائدہ؟ اس گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس لئے غیر اختیاری امور کے پیچھے مت پڑو۔ اور نماز پڑھنے کا جو طریقہ نبی کریم ﷺ نے سکھا دیا بس اسی طریقے سے نماز پڑھنے کی فکر کرو اور اپنی طرف سے دھیان نماز کی طرف لگانے کی کوشش کرتے رہو، اس کے بعد اگر کیفیت طاری ہو یا نہ ہو، نماز میں لذت آئے یا نہ آئے، اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ نماز مقبول ہے۔

وسوسوں پر خوش ہونا چاہئے

بہر حال اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے بتا دیا کہ یہ وسوسے ایمان کی علامت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے دل میں وسوسوں کے آنے کو کوئی گناہ قرار نہیں دیا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی جو تشریح کی ہے وہ یہ کہ ''ان دونوں حدیثوں میں امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہ ہونا مذکور ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان حدیثوں میں وساوس پر مسرور ہونے کی طرف اشارہ ہے'' یعنی اگر دل میں وسوسے آرہے ہیں مگر ان وسوسوں پر عمل نہیں ہو رہا ہے تو ان وسوسوں پر خوش ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ وسوسے تمہارے ایمان کی علامت ہیں، کسی کافر کے دل میں یہ وسوسے نہیں آتے بلکہ صاحب ایمان کے دل میں وسوسے آتے ہیں۔ اس لئے تم ان پر خوش ہو جاؤ۔ پھر آگے فرمایا کہ ان وسوسوں سے نجات کی یہی تدبیر ہے کہ ان کی کچھ پرواہ نہ کرے بلکہ ان پر خوش ہو۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ ''شیطان کو مؤمن کی خوشی گوارہ نہیں۔ جب شیطان مؤمن کو وساوس پر خوش ہوتا ہوا دیکھے گا تو وسوسے ڈالنا چھوڑ دے گا''

وسوسہ کی تعریف

البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ وسوسہ وہ ہے جو خود بخود دل میں آجائے، لیکن اپنی طرف سے سوچ کر وسوسہ لانا یا گناہ کا تصور کرنا یا گناہ کا ارادہ دل میں لانا، یہ وسوسہ نہیں ہے بلکہ خود ایک عمل ہے، اور یہ عمل بکثرت خود گناہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنی طرف سے سوچ کر قصد اور ارادہ کرکے وسوسہ نہ لائے اور جو وسوسہ خود بخود آجائے اس کی پرواہ نہ کرے۔

خیالات سے بچنے کا دوسرا علاج

اور یہ خیالات اور وسوسے جو انسان قصد اور ارادہ کرکے دل میں لاتا ہے، اس سے بچنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جب کبھی اس قسم کا خیال دل میں پیدا ہو، اس وقت اپنے آپ کو کسی اور کام میں لگالے۔ اس لئے کہ یہ وسوسے اس طرح دور نہیں ہوتے کہ آدمی لاٹھی لے کر ان کے پیچھے پڑ جائے، بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کسی اور کام میں لگالے، کسی اور مشغلے میں اپنے آپ کو مشغول کر دے۔ اس کے لئے حضور اقدس ﷺ نے جو دعا تلقین فرمائی ہے وہ دعا بکثرت کیا کرے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کے حق میں وہ دعا قبول فرمالے، آمین۔ وہ دعا یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ وَسَاوِسَ قَلْبِیْ خَشْيَتَكَ وَذِكْرَكَ وَاجْعَلْ هِمَّتِیْ وَهَوَایَ فِيْمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی))

کیا عجیب وغریب دعا ہے۔ آپ ایسی ایسی دعائیں تلقین فرما گئے کہ انسان ان کا تصور نہیں کرسکتا۔ یعنی اے اللہ! میرے دل میں آنے والے خیالات کو اپنی خشیت اور اپنے ذکر میں تبدیل فرمادیجئے۔ انسان کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا دماغ کبھی بھی خیالات سے خالی نہیں ہوتا، کوئی نہ کوئی خیال اس کے ذہن میں ہروقت رہتا ہے، مثلاً ہاتھوں سے کچھ کام کررہا ہے، لیکن دماغ کہیں اور لگا ہوا ہے اور خیالات مسلسل آرہے ہیں، کوئی لمحہ خیالات سے خالی نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ دعا کرو کہ یہ جو فضول خیالات آرہے ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں ہے، یا اللہ! یہ خیالات بدل کر آپ کے ذکر اور آپ کی خشیت میں تبدیل ہوجائیں۔ جو خیال بھی آئے وہ یا تو آپ کا ہو یا آپ کی خشیت کا ہو، آپ کی یاد کا ہو، آپ کے سامنے حاضر ہونے کا ہو، آپ کی جنت کی نعمتوں کا ہو، دوزخ کے عذاب کا ہو اور آپ کے دین کے احکام کا خیال ہو۔ اور اے اللہ! میرے دل کے خیالات اور میری خواہشات کا رخ موڑ کر ان چیزوں کی طرف کردیجئے جو آپ کو پسند ہوں، اور دل صرف اس چیز کی طرف مائل ہو جو آپ کو پسند ہو۔

یہ دعا نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اس دعا کو ہم سب کے حق میں قبول فرمالے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خطبات و تحریرات)

جلد نمبر ۷

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

جلد ۷

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین و دنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۷

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات
پبلشرز • بک سیلرز • ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی

فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۲۸۵ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات و تحریرات

جلد ۷

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۳۷۳۲۳۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان ـــــ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان ـــــ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idura.e.islamiat@gmuil.cont

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعۂ خُطبات وتحریرات

جلد ۷

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

مرتب

مولانا محمد اویس سرور صاحب

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور، پاکستان ★ موہن روڈ چوک اُردو بازار کراچی
فون: ۳۶۳۲۳۱۲۸، فیکس ۹۲-۴۲-۳۶۳۲۴۵۸۵ فون ۳۷۳۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

فہرست عنوانات

عنوانات	نمبر شمار
کھانے کے آداب	۱۷
"معاشرت" کی اصلاح کے بغیر دین ناقص ہے	۱۸
حضورؐ ہر ہر چیز سکھا گئے	۱۸
کھانے کے تین آداب	۱۹
پہلا ادب "بسم اللہ" پڑھنا	۱۹
شیطان کے قیام وطعام کا انتظام مت کرو	۲۰
گھر میں داخل ہونے کی دعا	۲۰
بڑا پہلے کھانا شروع کرے	۲۱
شیطان کھانا حلال کرنا چاہتا تھا	۲۲
بچوں کی تربیت کریں	۲۳
شیطان نے قے کردی	۲۳
یہ کھانا اللہ کی نعمت ہے	۲۴
یہ کھانا تم تک کس طرح پہنچا؟	۲۴
مسلمان اور کافر کے کھانے میں امتیاز	۲۵
زیادہ کھانا کمال نہیں	۲۵
جانور اور انسان میں فرق	۲۶
حضرت سلیمان علیہ السلام کی مخلوق کی دعوت	۲۶
کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرو	۲۷
ہر کام کرتے وقت زاویہ نگاہ بدل لو	۲۸
کھانا، ایک نعمت	۲۸
کھانے کی لذت	۲۹
عزت سے کھانا ملنا، تیسری نعمت	۲۹
بھوک لگنا، چوتھی نعمت	۲۹
کھانے کے وقت عافیت، پانچویں نعمت	۳۰
دوستوں کے ساتھ کھانا، چھٹی نعمت	۳۰
یہ کھانا عبادتوں کا مجموعہ ہے	۳۰
نفل کام کی تلافی	۳۱
دسترخوان اٹھاتے وقت کی دعا	۳۲
کھانے کے بعد کی دعا پڑھ کر گناہ معاف کرالیں	۳۳
عمل چھوٹا، ثواب عظیم	۳۳
کھانے کے اندر عیب مت نکالو	۳۴
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں	۳۴
ایک بادشاہ اور ایک مکھی	۳۵
ایک بچھو کا واقعہ	۳۵
نجاست میں پیدا ہونے والے کیڑے	۳۷
رزق کی ناقدری مت کرو	۳۷
حضرت تھانویؒ اور رزق کی قدر	۳۸
دسترخوان جھاڑنے کا صحیح طریقہ	۳۸
آج ہمارا حال	۳۹
سرکہ بھی ایک سالن ہے	۴۰
آپؐ کے گھر کی حالت	۴۰
حضورؐ نعمت کی قدر فرماتے تھے	۴۱
کھانے کی تعریف کرنی چاہیے	۴۱
پکانے والے کی تعریف کرنی چاہیے	۴۱
ہدیہ کی تعریف کیجیے	۴۲
بندوں کا شکریہ ادا کردو	۴۳
حضورؐ کا سوتیلے بیٹے کو ادب سکھانا	۴۳

عنوانات	نمبر شمار
اپنے سامنے سے کھانا ادب ہے	۴۴
کھانے کے درمیان میں برکت نازل ہوتی ہے	۴۴
اگر مختلف اشیاء ہوں تو آگے ہاتھ بڑھا سکتے ہیں	۴۵
بائیں ہاتھ سے کھانا جائز نہیں	۴۶
غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ لینی چاہیے	۴۷
اپنی غلطی پر اڑنا درست نہیں	۴۸
بزرگوں کی شان میں گستاخی سے بچو	۴۹
دو کھجوریں ایک ساتھ مت کھاؤ	۴۹
مشترک چیز کے استعمال کا طریقہ	۵۰
پلیٹ میں کھانا احتیاط سے نکالو	۵۰
ریل میں زائد نشست پر قبضہ کرنا جائز نہیں	۵۱
ساتھ سفر کرنے والے کے حقوق	۵۱
مشترک کاروبار میں حساب کتاب شرعاً ضروری ہے	۵۲
ملکیتوں میں امتیاز شرعاً ضروری ہے	۵۲
حضرت مفتی صاحبؒ اور ملکیت کی وضاحت	۵۳
مشترک چیزوں کے استعمال کا طریقہ	۵۳
مشترکہ بیت الخلاء کا استعمال	۵۴
غیر مسلموں نے اسلامی اصول اپنا لیے	۵۴
ایک انگریز خاتون کا واقعہ	۵۵
غیر مسلم قومیں کیوں ترقی کر رہی ہیں؟	۵۶
ٹیک لگا کر کھانا خلاف سنت ہے	۵۶
اکڑوں بیٹھ کر کھانا مسنون نہیں	۵۷
کھانے کی بہترین نشست	۵۷
چار زانوں بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے	۵۸
میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا	۵۸
زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت ہے	۵۸
بشرطیکہ اس سنت کا مذاق نہ اُڑایا جائے	۵۹
ایک سبق آموز واقعہ	۶۰
اس وقت مذاق کی پرواہ نہ کرے	۶۱
بلا ضرورت میز کرسی پر نہ کھائے	۶۱
چارپائی پر کھانا	۶۱
کھانے کے وقت باتیں کرنا	۶۲
کھانے کے بعد ہاتھ پونچھ لینا جائز ہے	۶۲
کھانے کے بعد اُنگلیاں چاٹ لینا سنت ہے	۶۳
برکت کیا چیز ہے؟	۶۳
اسباب میں راحت نہیں	۶۴
راحت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے	۶۴
کھانے میں برکت کا مطلب	۶۵
کھانے کے باطن پر اثرات	۶۵
کھانے کے اثرات کا واقعہ	۶۵
ہم مادہ پرستی میں پھنسے ہوئے ہیں	۶۶
کیا اُنگلیاں چاٹ لینا شائستگی کے خلاف ہے؟	۶۷
تہذیب اور شائستگی سنتوں میں منحصر ہے	۶۷
کھڑے ہو کر کھانا بد تہذیبی ہے	۶۷
فیشن کو بنیاد مت بناؤ	۶۸
تین اُنگلیوں سے کھانا سنت ہے	۶۸
اُنگلیاں چاٹنے میں ترتیب	۶۸
کب تک طعنے جانے سے ڈرو گے؟	۶۹
یہ طعنے انبیاء علیہم السلام کی وراثت ہے	۶۹
اتباع سنت پر عظیم بشارت	۷۰
اللہ تعالیٰ اپنا محبوب بنا لیں گے	۷۱
اُنگلیاں دوسرے کو بھی چٹوانا جائز ہے	۷۱

عنوانات	نمبر شمار
کھانے کے بعد برتن چاٹنا	۷۲
ورنہ چمچے کو چاٹ لے	۷۲
گرا ہوا لقمہ اُٹھا کر کھالینا چاہیے	۷۳
حضرت حذیفہ بن یمانؓ کا واقعہ	۷۳
اپنا لباس نہیں چھوڑیں گے	۷۴
تلوار دیکھ لی، بازو بھی دیکھ	۷۴
ان احمقوں کی وجہ سے سنت چھوڑ دوں؟	۷۵
یہ ہے فاتح ایران	۷۵
کسریٰ کے غرور کو خاک میں ملا دیا	۷۶
مذاق اُڑانے کے ڈر سے سنت چھوڑنا کب جائز ہے	۷۶
کھانے کے دوران اگر کوئی مہمان آجائے تو؟	۷۷
سائل کو ڈانٹ کر مت بھگاؤ	۷۸
ایک عبرت آموز واقعہ	۷۸
حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ارشاد	۸۰
سنتوں پر عمل کریں	۸۰
پینے کے آداب	۸۲
پانی خدائی نظام کا کرشمہ	۸۳
پوری سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی	۸۴
ٹھنڈا پانی، ایک عظیم نعمت	۸۵
تین سانس میں پانی پینا	۸۵
حضورؐ کی مختلف شانیں	۸۶
پانی پیو، ثواب کماؤ	۸۶
مسلمان ہونے کی علامت	۸۷
منہ سے برتن ہٹا کر سانس لو	۸۷
ایک عمل میں کئی سنتوں کا ثواب	۸۸
دائیں طرف سے تقسیم شروع کرو	۸۸
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام	۸۹
داہنی جانب باعث برکت ہے	۸۹
داہنی جانب کا اہتمام	۹۰
بہت بڑے برتن سے منہ لگا کر پانی پینا	۹۱
ممانعت کی دو وجوہات	۹۱
حضورؐ کی اپنی اُمت پر شفقت	۹۲
مشکیزے سے منہ لگا کر پانی پینا	۹۲
حضورؐ کے ہونٹ جس چیز کو چھو لیں	۹۳
یہ بات متبرک ہوگئے	۹۳
تبرکات کی حیثیت	۹۳
متبرک دراہم	۹۴
حضورؐ کا مبارک پسینہ	۹۴
حضورؐ کے مبارک بال	۹۴
صحابہ کرامؓ اور تبرکات	۹۵
بت پرستی کی ابتداء	۹۵
تبرکات میں اعتدال ضروری ہے	۹۶
بیٹھ کر پانی پینا سنت نبویؐ ہے	۹۶
کھڑے ہو کر پینا بھی جائز ہے	۹۷
بیٹھ کر پینے کی فضیلت	۹۷
سنت کی عادت ڈال لو	۹۸
نیکی کا خیال اللہ کا مہمان ہے	۹۸
زمزم کا پانی کس طرح پیا جائے؟	۹۹
زمزم اور وضو کا بچا ہوا پانی بیٹھ کر پینا افضل ہے	۹۹
کھڑے ہو کر کھانا	۱۰۰
کھڑے ہو کر کھانے سے بچئے	۱۰۰

عنوانات	نمبر شمار
دعوت کے آداب	۱۰۲
دعوت قبول کرنے کا مقصد	۱۰۳
دال اور خشکے میں نورانیت	۱۰۳
دعوت کی حقیقت ''محبت کا اظہار''	۱۰۴
دعوت یا عداوت	۱۰۴
اعلیٰ درجے کی دعوت	۱۰۵
متوسط درجے کی دعوت	۱۰۵
ادنیٰ درجے کی دعوت	۱۰۵
دعوت کا انوکھا واقعہ	۱۰۵
محبت کا تقاضا ''راحت رسانی''	۱۰۶
دعوت کرنا ایک فن ہے	۱۰۷
دعوت قبول کرنے کی شرط	۱۰۷
کب تک ہتھیار ڈالو گے؟	۱۰۸
پردہ دار خاتون اچھوت بن جائے؟	۱۰۹
دعوت قبول کرنے کا شرعی حکم	۱۰۹
دعوت کے لیے نفلی روزہ توڑنا	۱۰۹
بن بلائے مہمان کا حکم	۱۱۰
وہ شخص چور اور لٹیرا ہے	۱۱۰
میزبان کے بھی حقوق ہیں	۱۱۱
پہلے سے اطلاع کرنی چاہیے	۱۱۱
مہمان بلا اجازت روزہ نہ رکھے	۱۱۱
مہمان کو کھانے کے وقت پر حاضر رہنا چاہیے	۱۱۲
میزبان کو تکلیف دینا گناہ کبیرہ ہے	۱۱۲
لباس کے شرعی اصول و آداب	۱۱۳
موجودہ دور کا پروپیگنڈہ	۱۱۳
ہر لباس اپنا اثر رکھتا ہے	۱۱۴

عنوانات	نمبر شمار
حضرت عمرؓ پر جبہ کا اثر	۱۱۴
آج کل کا ایک اور پروپیگنڈہ	۱۱۵
ظاہر اور باطن دونوں مطلوب ہیں	۱۱۵
ایک خوبصورت مثال	۱۱۵
دنیاوی کاموں میں ظاہر بھی مطلوب ہے	۱۱۶
یہ شیطان کا دھوکہ ہے	۱۱۶
شریعت نے کوئی لباس مخصوص نہیں کیا	۱۱۷
لباس کے چار بنیادی اصول	۱۱۷
لباس کا پہلا بنیادی مقصد	۱۱۷
لباس کے تین عیب	۱۱۸
آج کل کا ننگا پہناوا	۱۱۸
خواتین ان اعضاء کو چھپائیں	۱۱۹
گناہوں کے برے نتائج	۱۱۹
قرب قیامت میں خواتین کی حالت	۱۲۰
کھلم کھلا گناہ کرنے والے	۱۲۰
سوسائٹی کو چھوڑ دو	۱۲۱
ایک قرآنی واقعہ	۱۲۲
ہم ''بیک ورڈ'' ہی سہی	۱۲۲
یہ طعنے مسلمان کے لیے مبارک ہیں	۱۲۳
لباس کا دوسرا مقصد	۱۲۴
اپنا دل خوش کرنے کے لیے قیمتی لباس پہننا	۱۲۴
مالدار کو اچھے کپڑے پہننا چاہیے	۱۲۵
حضورؐ کا قیمتی لباس پہننا	۱۲۵
نمائش اور دکھاوا جائز نہیں	۱۲۶
یہاں شیخ کی ضرورت ہے	۱۲۶
اسراف اور تکبر سے بچئے	۱۲۶

عنوانات	نمبر شمار
فیشن کے پیچھے نہ چلیں	۱۲۷
من بھاتا کھاؤ، من بھاتا پہنو	۱۲۷
خواتین اور فیشن پرستی	۱۲۸
حضرت امام مالکؒ اور نئے جوڑے	۱۲۸
حضرت تھانویؒ کا ایک واقعہ	۱۲۹
دوسرے کا دل خوش کرنا	۱۳۰
لباس کے بارے میں تیسرا اصول	۱۳۰
"تشبہ" کی حقیقت	۱۳۱
گلے میں زنار ڈالنا	۱۳۱
ماتھے پر قشقہ لگانا	۱۳۱
پتلون پہننا	۱۳۲
تشبہ اور مشابہت میں فرق	۱۳۲
حضورؐ کا مشابہت سے دور رہنے کا اہتمام	۱۳۳
مشرکین کی مخالفت کرو	۱۳۳
مسلمان ایک ممتاز قوم ہے	۱۳۴
یہ بے غیرتی کی بات ہے	۱۳۵
انگریزوں کی تنگ نظری	۱۳۵
تم اپنا سب کچھ بدل ڈالو لیکن	۱۳۶
اقبال مرحوم کا مغربی زندگی پر تبصرہ	۱۳۶
تشبہ اور مشابہت دونوں سے بچو	۱۳۷
لباس کے بارے میں چوتھا اصول	۱۳۷
ٹخنے چھپانا جائز نہیں	۱۳۸
ٹخنے چھپانا تکبر کی علامت ہے	۱۳۸
انگریز کے کہنے پر گھٹنے بھی کھول دیے	۱۳۹
حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ	۱۴۰
اگر دل میں تکبر نہ ہو تو کیا اس کی اجازت ہوگی؟	۱۴۰

عنوانات	نمبر شمار
علماء محققین کا صحیح قول	۱۴۱
سفید رنگ کے کپڑے پسندیدہ ہیں	۱۴۲
حضورؐ کا سرخ دھاری دار کپڑے پہننا	۱۴۲
خالص سرخ کپڑے مرد کے لیے جائز نہیں	۱۴۳
آپ کا سبز کپڑے پہننا	۱۴۳
آپؐ کے عمامے کے رنگ	۱۴۴
آستین کہاں تک ہونی چاہیے	۱۴۴
بیمار کی عیادت کے آداب	۱۴۶
بیمار پرسی ایک عبادت ہے	۱۴۶
سنت کی نیت سے بیمار پرسی کریں	۱۴۷
ایک شیطانی حربہ	۱۴۷
صلہ رحمی کی حقیقت	۱۴۸
بیمار پرسی کی فضیلت	۱۴۹
ستر ہزار فرشتوں کی دعائیں حاصل کریں	۱۴۹
اگر بیمار سے ناراضگی ہو تو	۱۵۰
مختصر عیادت کریں	۱۵۰
یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے	۱۵۱
حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا واقعہ	۱۵۱
عیادت کے لیے مناسب وقت کا انتخاب کرو	۱۵۲
بے تکلف دوست زیادہ دیر بیٹھ سکتا ہے	۱۵۲
مریض کے حق میں دعا کرو	۱۵۳
"بیماری" گناہوں سے پاکی کا ذریعہ ہے	۱۵۳
حصول شفا کا ایک عمل	۱۵۴
ہر بیماری سے شفا	۱۵۵
عیادت کے وقت زاویہ نگاہ بدل لو	۱۵۵
دین کس چیز کا نام ہے؟	۱۵۶

عنوانات	نمبر شمار
عیادت کے وقت ہدیہ لے جانا	۱۵۶
جنازے کے آداب اور چھینکنے کے آداب	۱۵۷
جنازے کے پیچھے چلنے کی فضیلت	۱۵۷
جنازے میں شرکت کے وقت نیت کیا ہو؟	۱۵۸
جنازے کے ساتھ چلتے وقت کلمہ شہادت پڑھنا	۱۵۸
جنازہ اُٹھاتے وقت موت کا مراقبہ کریں	۱۵۹
جنازے کے آگے نہ چلیں	۱۵۹
جنازے کو کندھا دینے کا طریقہ	۱۵۹
جنازے کو تیز قدم سے لے کر چلنا	۱۶۰
جنازہ زمین پر رکھنے تک کھڑے رہنا	۱۶۱
اسلامی الفاظ اور اصطلاحات	۱۶۱
اسلامی اصطلاحات سے ناواقفی کا نتیجہ	۱۶۱
انگریزی الفاظ کا رواج	۱۶۲
آج "معارف القرآن" سمجھ میں نہیں آتی	۱۶۲
چھینکنے کے آداب	۱۶۲
جمائی سستی کی علامت ہے	۱۶۳
حضور اقدس کا عاجزی اور سستی سے پناہ مانگنا	۱۶۳
چھینک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے	۱۶۴
اللہ تعالیٰ کو مت بھولو	۱۶۴
یہ سنت مردہ ہوتی جارہی ہے	۱۶۵
چھینکنے والے کا جواب دینا واجب ہے	۱۶۵
فرض عین اور فرض کفایہ کا مطلب	۱۶۵
یہ مسلمان کا ایک حق ہے	۱۶۶
کتنی مرتبہ جواب دینا چاہیے	۱۶۶
حضورؐ کا طرز عمل	۱۶۶
یہ جواب دینا کب واجب ہے؟	۱۶۷

عنوانات	نمبر شمار
حضور اقدس کا جواب نہ دینا	۱۶۷
چھینکنے والا بھی دعا دے	۱۶۸
ایک چھینک پر تین مرتبہ ذکر	۱۶۸
کمزور اور مظلوم کی مدد کرنا	۱۶۹
مظلوم کی مدد واجب ہے	۱۶۹
ورنہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے گا	۱۷۰
عذاب کی مختلف شکلیں	۱۷۰
احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات	۱۷۰
ایک عبرتناک واقعہ	۱۷۰
مسلمان کی مدد کرنے کی فضیلت	۱۷۱
زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا	۱۷۱
قسم کھانے والے کی مدد کرنا	۱۷۲
سلام کرنے کے آداب	۱۷۳
سات باتوں کا حکم	۱۷۳
سلام کرنے کا فائدہ	۱۷۴
سلام اللہ کا عطیہ ہے	۱۷۴
سلام کرنے کا اجر و ثواب	۱۷۵
سلام کے وقت یہ نیت کرلیں	۱۷۵
نماز میں سلام پھیرتے وقت کی نیت	۱۷۶
جواب سلام سے بڑھ کر ہونا چاہیے	۱۷۶
مجلس میں ایک مرتبہ سلام کرنا	۱۷۷
ان مواقع پر سلام کرنا جائز نہیں	۱۷۷
دوسرے کے ذریعہ سلام بھیجنا	۱۷۷
تحریری سلام کا جواب واجب ہے	۱۷۸
غیر مسلموں کو سلام کرنے کا طریقہ	۱۷۸
ایک یہودی کا سلام کرنے کا واقعہ	۱۷۹

عنوانات	نمبر شمار
حتی الامکان نرمی کرنا چاہیے	۱۸۰
سلام ایک دعا ہے	۱۸۰
حضرت معروف کرخیؒ کی حالت	۱۸۰
حضرت معروف کرخیؒ کا ایک واقعہ	۱۸۱
"شکریہ" کے بجائے "جزاکم اللہ" کہنا چاہیے	۱۸۱
سلام کا جواب بلند آواز سے دینا چاہیے	۱۸۲
مصافحہ کے آداب	۱۸۳
حضورؐ کی شفقت	۱۸۴
حضورؐ سے دعاؤں کا حصول	۱۸۴
حضورؐ اور تواضع	۱۸۵
حضور اقدسؐ کے مصافحہ کا انداز	۱۸۵
دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا سنت ہے	۱۸۶
ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا خلاف سنت ہے	۱۸۶
موقع دیکھ کر مصافحہ کیا جائے	۱۸۷
یہ مصافحہ کا موقع نہیں	۱۸۷
مصافحہ کا مقصد "اظہار محبت"	۱۸۸
اس وقت مصافحہ کرنا گناہ ہے	۱۸۸
یہ تو دشمنی ہے	۱۸۸
عقیدت کی انتہا کا واقعہ	۱۸۹
مصافحہ کرنے سے گناہ جھڑتے ہیں	۱۸۹
مصافحہ کرنے کا ایک ادب	۱۹۰
ملاقات کا ایک ادب	۱۹۰
عیادت کرنے کا عجیب واقعہ	۱۹۰
ملاقات اور فون کرنے کے آداب	۱۹۲
دور سے بلانا ادب کے خلاف ہے	۱۹۳
حضور اقدسؐ پر درود و سلام کا طریقہ	۱۹۳

عنوانات	نمبر شمار
حاضر و ناظر کے عقیدے سے پکارنا	۱۹۴
"یارسول اللہ" کہنا ادب کے خلاف ہے	۱۹۴
حضورؐ کے دروازے پر دستک دینا	۱۹۴
اُستاد کے دروازے پر دستک دینا	۱۹۵
حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لیے حضورؐ کی دعا	۱۹۵
علم سیکھنے کے لیے ادب کا لحاظ	۱۹۶
جانے سے پہلے وقت لے لیں	۱۹۶
میزبان کے حقوق مہمان پر	۱۹۷
حضور اقدسؐ کا ایک واقعہ	۱۹۷
حضورؐ نے پھر انہیں منایا	۱۹۸
فون کرنے کے آداب	۱۹۹
لمبی بات کرنے سے پہلے اجازت لے لیں	۱۹۹
خدمت کے آداب	۲۰۰
افضل خدمت مخدوم کو خوش کرنا ہے	۲۰۰
خدمت کے لیے عقل کی ضرورت ہے	۲۰۱
مخدوم کی ذمہ داری	۲۰۱
افراط و تفریط نہ ہونا چاہیے	۲۰۲
سونے کے آداب	۲۰۳
سوتے وقت وضو کرلیں	۲۰۴
یہ آداب محبت کا حق ہیں	۲۰۴
دائیں کروٹ پر لیٹیں	۲۰۴
دن کے معاملات اللہ کے سپرد کردو	۲۰۵
سکون و راحت کا ذریعہ "تفویض" ہے	۲۰۵
پناہ کی جگہ ایک ہی ہے	۲۰۶
تیر چلانے والے کے پہلو میں بیٹھ جاؤ	۲۰۷
ایک نادان بچے سے سبق لو	۲۰۷

عنوانات	نمبر شمار
سیدھے جنت میں جاؤ گے	۲۰۷
سونے اور جاگنے کی دُعائیں	۲۰۸
نیند ایک چھوٹی موت ہے	۲۰۸
بیدار ہونے کی دُعا	۲۰۹
موت کو کثرت سے یاد کرو	۲۰۹
اُلٹا لیٹنا پسندیدہ نہیں	۲۱۰
وہ مجلس باعث حسرت ہوگی	۲۱۰
ہماری مجلسوں کا حال	۲۱۱
تفریح طبع کی باتیں کرنا جائز ہے	۲۱۲
حضورؐ کی شان جامعیت	۲۱۲
اظہار محبت پر اجر وثواب	۲۱۳
ہر کام اللہ کی رضا کی خاطر کرو	۲۱۳
حضرت مجذوب رحمہ اللہ اور اللہ کی یاد	۲۱۴
دل کی سوئی اللہ کی طرف	۲۱۵
دل اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے بنایا ہے	۲۱۵
مجلس کی دُعا اور گناہ	۲۱۶
سونے کو عبادت بنالو	۲۱۷
اگر تم اشرف المخلوقات ہو	۲۱۷
ایسی مجلس مردار گدھا ہے	۲۱۷
نیند اللہ کی عطا ہے	۲۱۸
رات اللہ کی عظیم نعمت ہے	۲۱۸
سفارش	۲۲۰
سفارش موجب اجر وثواب ہے	۲۲۱
ایک بزرگ کی سفارش کا واقعہ	۲۲۱
سفارش کرکے احسان نہ جتلائے	۲۲۲
سفارش کے احکام	۲۲۲
نااہل کے لیے منصب کی سفارش	۲۲۲

عنوانات	نمبر شمار
سفارش، شہادت اور گواہی ہے	۲۲۲
ممتحن سے سفارش کرنا	۲۲۳
سفارش کا ایک عجیب واقعہ	۲۲۳
مولوی کا شیطان بھی مولوی	۲۲۳
سفارش سے منصف کا ذہن خراب نہ کریں	۲۲۴
عدالت کے جج سے سفارش کرنا	۲۲۴
سفارش پر میرا ردعمل	۲۲۴
بری سفارش گناہ ہے	۲۲۵
سفارش کا مقصد صرف توجہ دلانا	۲۲۵
یہ تو دباؤ ڈالنا ہے	۲۲۶
سفارش کے بارے میں حکیم الامتؒ کا فرمان	۲۲۶
مجمع میں چندہ کرنا درست نہیں	۲۲۷
مدرسہ کے مہتمم کے خود چندہ کرنا	۲۲۷
سفارش کے الفاظ کیا ہوں؟	۲۲۷
سفارش میں دونوں طرف کی رعایت	۲۲۸
سفارش معاشرے میں ایک لعنت	۲۲۸
سفارش ایک مشورہ ہے	۲۲۹
حضرت بریرہ اور حضرت مغیثؓ کا واقعہ	۲۲۹
باندی کی فسخ نکاح اختیار	۲۳۰
حضور اقدسؐ کا مشورہ	۲۳۰
ایک خاتون نے حضورؐ کا مشورہ رد کردیا	۲۳۱
حضور اقدسؐ نے کیوں مشورہ دیا؟	۲۳۲
اُمت کو سبق دے دیا	۲۳۲
سفارش ناگواری کا ذریعہ کیوں ہے؟	۲۳۲
خلاصہ	۲۳۲

عنوانات	نمبر شمار
گفتگو کے آداب	۲۳۳
ذمہ دار انسان کا رویہ اختیار کرو	۲۳۳
زبان عظیم نعمت ہے	۲۳۵
زبان کی قدر بے زبان سے پوچھئے	۲۳۵
تمام مشینیں حرکت کر رہی ہیں	۲۳۶
سوچ کر زبان کو استعمال کرو	۲۳۶
ایک ایک لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے	۲۳۶
اس وقت کیوں محتاط گفتگو کرو گے؟	۲۳۷
ذمہ دار بننے کی فکر کریں	۲۳۷
جھوٹ کی بدترین سواری	۲۳۷
لڑائیاں کیوں جنم لے رہی ہیں؟	۲۳۸
سارے جھگڑے ختم ہو جائیں	۲۳۸
زبان کی حفاظت کیجئے	۲۳۹
زبان کی دیکھ بھال کریں	۲۴۰
زبان ایک عظیم نعمت	۲۴۱
اگر زبان بند ہو جائے	۲۴۱
زبان اللہ کی امانت ہے	۲۴۱
زبان کا صحیح استعمال	۲۴۲
زبان کو ذکر سے تر رکھو	۲۴۲
زبان کے ذریعہ دین سکھائیں	۲۴۳
تسلی کا کلمہ کہنا	۲۴۳
زبان جہنم میں لے جانے والی ہے	۲۴۴
پہلے تولو پھر بولو	۲۴۴
حضرت میاں صاحبؒ کا تذکرہ	۲۴۵
ہماری مثال	۲۴۵
زبان کو قابو کرنے کا علاج	۲۴۶

عنوانات	نمبر شمار
زبان پر تالہ ڈال لو	۲۴۷
گپ شپ میں زبان کو لگانا	۲۴۷
خواتین اور زبان کا استعمال	۲۴۷
میں جنت کی ضمانت دیتا ہوں	۲۴۸
نجات کے لیے تین کام	۲۴۸
گناہوں پر رو	۲۴۹
اے زبان! اللہ سے ڈرنا	۲۴۹
قیامت کے روز اعضا بولیں گے	۲۵۰
غیر ضروری سوالات سے پرہیز کریں	۲۵۱
کس قسم کے سوالات سے پرہیز کیا جائے	۲۵۲
فضول سوالات میں لگانا شیطان کا کام ہے	۲۵۲
حکم شرعی کی علت کے بارے میں سوال	۲۵۳
علت کے بارے میں سوال کا بہترین جواب	۲۵۳
اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں میں دخل مت دو	۲۵۴
صحابہ کرامؓ "کیوں" سے سوال نہیں کیا کرتے تھے	۲۵۴
یہ اللہ کی محبت اور عظمت کی کمی کی دلیل ہے	۲۵۴
بچے اور نوکر کی مثال	۲۵۵
آواز بلند نہ کیجئے	۲۵۷
مجلس نبوی کا ایک ادب	۲۵۸
دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے	۲۵۹
بلند آواز سے بات کرنا پسندیدہ نہیں	۲۵۹
بلند آواز سے کان میں خلل ہو جانا	۲۶۰
لاؤڈ اسپیکر کا غلط استعمال	۲۶۰
دین کے نام پر ناجائز کام کرنا	۲۶۰
ایک واعظ کا واقعہ	۲۶۱
مار مار کر یہ ڈنڈا توڑ دوں گا	۲۶۱

عنوانات	نمبر شمار
بلند آواز سے قرآن شریف پڑھنا	۲۶۲
تہجد کے لیے اُٹھتے وقت آپ کا انداز	۲۶۲
قانون کب حرکت میں آتا ہے	۲۶۳
اللہ کے ذکر کے لیے آواز پست رکھنے کا حکم	۲۶۳
آواز نکلنا بڑی نعمت ہے	۲۶۴
خلاصہ	۲۶۴
گناہ کی تہمت سے بچئے	۲۶۵
بیوی کا اکرام کرنا چاہیے	۲۶۵
دوسروں کے خدشات کو وضاحت کر کے دور کر دینا چاہیے	۲۶۶
اپنے کو مواقعِ تہمت سے بچاؤ	۲۶۶
مواقعِ تہمت سے بچنے کے دو فائدے	۲۶۷
گناہ کے موقع سے بھی بچنا چاہیے	۲۶۸
حضورؐ کی سنت	۲۶۸
"ملامتی" فرقہ کا اندازِ زندگی	۲۶۸
ایک گناہ سے بچنے کے لیے دوسرا گناہ کرنا	۲۶۹
نماز مسجد میں ہی پڑھنی چاہیے	۲۶۹
اپنا عذر ظاہر کر دیں	۲۶۹
اس حدیث کی تشریح حضرت تھانویؒ کی زبانی	۲۷۰
کسی نیک کام کی تاویل کی ضرورت نہیں	۲۷۰
خلاصہ	۲۷۱
صحت اور فرصت کی قدر کر لو	۲۷۲
حضرت مفتی صاحبؒ اور حدیث بالا	۲۷۳
ہر نعمت پر تین حق	۲۷۳
صحت اور فراغت کی قدر کر لو	۲۷۴
شیطان کے بہکانے کا انداز	۲۷۴

عنوانات	نمبر شمار
نوافل اللہ کی محبت کا حق ہے	۲۷۵
جنت اور مغفرت کی طرف دوڑو	۲۷۵
نیک کام کو ٹالو نہیں	۲۷۶
نیک کام کا خیال "اللہ کا مہمان" ہے	۲۷۶
گناہ چھوڑنے کا کام مت ٹالو	۲۷۶
گناہوں سے نجات کا یہ طریقہ نہیں	۲۷۷
گناہ کرنے سے تسکین حاصل نہیں ہوتی	۲۷۷
توبہ کے بھروسہ پر گناہ کر لینا حماقت ہے	۲۷۸
ایک نصیحت آموز واقعہ	۲۷۸
اس واقعہ سے تین سبق	۲۷۹
جب ہاتھ پاؤں حرکت کرنے چھوڑ دیں گے	۲۷۹
کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟	۲۷۹
کیا فقر و فاقہ کا انتظار ہے	۲۸۰
کیا مالداری کا انتظار ہے	۲۸۰
کیا بیماری کا انتظار ہے؟	۲۸۰
کیا بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو؟	۲۸۱
یہ ہے شیوہ پیغمبری	۲۸۱
کیا موت کا انتظار کر رہے ہو؟	۲۸۲
کیا دجال کا انتظار کر رہے ہو؟	۲۸۲
کیا تم قیامت کا انتظار کر رہے ہو؟	۲۸۲
خلاصہ	۲۸۲
وقت کی قدر کیجیے	۲۸۴
حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا تعارف	۲۸۴
آپ کی اصلاح کا عجیب و غریب واقعہ	۲۸۵
علم حدیث میں آپ کا مقام	۲۸۶
دنیا سے آپ کی بے رغبتی اور کنارہ کشی	۲۸۷

عنوانات	نمبر شمار
حدیث رسول کا مشغلہ	۲۸۷
لوگوں کے دلوں میں آپ کی عظمت اور محبت	۲۸۷
آپ کی فیاضی کا عجیب واقعہ	۲۸۸
آپ کی سخاوت اور غرباء پروری	۲۸۹
آپ کی دریادلی کا ایک اور واقعہ	۲۹۰
"کتاب الزہد والرقائق" کا تعارف	۲۹۱
دو عظیم نعمتیں اور ان سے غفلت	۲۹۱
صحت کی قدر کرلو	۲۹۲
صرف ایک حدیث پر عمل	۲۹۲
"ابھی تو جوان ہیں" شیطانی دھوکہ ہے	۲۹۳
کیا ہم نے اتنی عمر نہیں دی تھی	۲۹۳
ڈرانے والے کون ہیں	۲۹۳
ملک الموت سے مکالمہ	۲۹۴
جو کرنا ہے ابھی کرلو	۲۹۴
دو رکعت کی حسرت ہوگی	۲۹۵
نیکیوں سے میزان عمل بھرلو	۲۹۵
حافظ ابن حجرؒ اور وقت کی قدر	۲۹۶
حضرت مفتی صاحبؒ اور وقت کی قدر	۲۹۶
کام کرنے کا بہترین گر	۲۹۷
کیا پھر بھی نفس سستی کرے گا؟	۲۹۷
شہوانی خیالات کا علاج	۲۹۸
تمہاری زندگی کی فلم چلادی جائے تو؟	۲۹۹
کل پر مت ٹالو	۲۹۹
نیک کام میں جلد بازی پسندیدہ ہے	۳۰۰
پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو	۳۰۰
جوانی کی قدر کرلو	۳۰۰

عنوانات	نمبر شمار
صحت، مالداری اور فرصت کی قدر کرو	۳۰۱
صبح کو یہ دعائیں کرلو	۳۰۱
حضرت حسن بصریؒ	۳۰۳
وقت سونا چاندی سے زیادہ قیمتی ہے	۳۰۳
دو رکعت نفل کی قدر	۳۰۳
مقبرے سے آواز آرہی ہے	۳۰۴
صرف "عمل" ساتھ جائے گا	۳۰۴
موت کی تمنا مت کرو	۳۰۵
حضرت میاں صاحبؒ کا کشف	۳۰۶
زیادہ باتوں سے بچنے کا طریقہ	۳۰۶
ہماری مثال	۳۰۶
حضرت تھانویؒ اور وقت کی قدر	۳۰۷
حضرت تھانویؒ اور نظام الاوقات	۳۰۷
"سالگرہ" کی حقیقت	۳۰۸
گزری ہوئی عمر کا مرثیہ	۳۰۹
کاموں کی تین قسمیں	۳۰۹
یہ بھی حقیقت میں بڑا نقصان ہے	۳۰۹
ایک تاجر کا انوکھا نقصان	۳۱۰
ایک بلے کا قصہ	۳۱۰
موجودہ دور اور وقت کی بچت	۳۱۱
شیطان نے ٹیپ ٹاپ میں لگادیا	۳۱۲
خواتین میں وقت کی ناقدری	۳۱۳
بدلہ لینے میں کیوں وقت ضائع کروں	۳۱۳
حضرت میاں نور محمد اور وقت کی قدر	۳۱۳
معاملہ تو اس سے زیادہ جلدی کا ہے	۳۱۴
حضورؐ کا دنیا سے تعلق	۳۱۵

عنوانات	نمبر شمار
دنیا میں کام کا اصول	۳۱۶
وقت سے کام لینے کا آسان طریقہ	۳۱۶
اپنے اوقات کا چٹھا بناؤ	۳۱۷
یہ بھی جہاد ہے	۳۱۷
نیک کام کو مت ٹالو	۳۱۸
دل میں اہمیت ہو تو وقت مل جاتا ہے	۳۱۸
اہم کام کو فوقیت دی جاتی ہے	۳۱۸
تمہارے پاس صرف آج کا دن ہے	۳۱۹
شاید یہ میری آخری نماز ہو	۳۱۹
خلاصہ کلام	۳۲۰
نظم وضبط	۳۲۱
پاکی اور صفائی	۳۲۵
رزق کا صحیح استعمال	۳۲۹
غلط نسبت سے بچیے	۳۳۳
یہ بھی جھوٹ اور دھوکہ ہے	۳۳۳

عنوانات	نمبر شمار
اپنے نام کے ساتھ "فاروقی" "صدیقی" لکھنا	۳۳۴
کپڑوں سے تشبیہ کیوں؟	۳۳۴
جولاہوں کا "انصاری" اور قصائیوں کا "قریشی" لکھنا	۳۳۴
نسب اور خاندان فضیلت کی چیز نہیں	۳۳۵
"متقی" کو حقیقی بات کی طرف منسوب کریں	۳۳۶
حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۳۳۶
اپنے نام کے ساتھ "مولانا" لکھنا	۳۳۸
اپنے نام کے ساتھ "پروفیسر" لکھنا	۳۳۸
لفظ "ڈاکٹر" لکھنا	۳۳۹
جیسا اللہ نے بنایا ہے ویسے ہی رہو	۳۳۹
مالداری کا اظہار	۳۳۹
نعمت خداوندی کا اظہار کریں	۳۴۰
عالم کے لیے علم کا اظہار کرنا	۳۴۰
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں	۳۴۲
اپنی خبر لیجیے	۳۴۶

کھانے کے آداب ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَنَبِيَّنَا وَحَبِيْبَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عَمْرِو بْنِ اَبِيْ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: كُنْتُ غُلَامًا فِيْ حِجْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ يَدِيْ تَطِيْشُ فِي الصَّحْفَةِ، فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((يَا غُلَامُ سَمِّ اللّٰهَ، وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ))(۱)

آپ حضرات کے سامنے پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ دین اسلام نے جو احکام ہم پر عائد کئے ہیں۔ وہ پانچ شعبوں سے متعلق ہیں۔ یعنی عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق، دین ان پانچ شعبوں سے مکمل ہوتا ہے، اگر ان میں سے ایک کو بھی چھوڑ دیا جائے گا تو پھر دین مکمل نہیں ہوگا، لہٰذا عقائد بھی درست ہونے چاہئیں، عبادات بھی صحیح طریقے سے انجام دینی چاہئیں لوگوں کے

☆ اصلاحی خطبات (۵/۱۳۶ تا ۲۱۴) بعد از نماز عصر جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔ مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ کا یہ بیان علامہ نووی کی " رياض الصالحين " کے ایک حصہ (كتاب أدب الطعام، باب التسمية فى أوله والحمد فى آخره) کا درس ہے۔ رياض الصالحين، ص: ۲٦۲

(۱) صحيح البخارى، كتاب الأطعمة، باب التسمية على الطعام والأكل باليمين، رقم: ٤٩٥٧، صحيح مسلم، كتاب الأشربة، باب آداب الطعام والشراب وأحكامهما، رقم: ٣٧٦٧، سنن ابن ماجه، كتاب الأطعمة، باب الأكل باليمين، رقم: ٣٢٥٨

ساتھ لین دین اور خرید و فروخت کے معاملات بھی شریعت کے مطابق ہونے چاہئیں اور باطن کے اخلاق بھی درست ہونے چاہئیں۔ اور زندگی گزارنے کے طریقے بھی درست ہونے چاہئیں۔ جس کو معاشرت کہا جاتا ہے۔

"معاشرت" کی اصلاح کے بغیر دین ناقص ہے

اب تک اخلاق کا بیان چل رہا تھا، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نیا باب قائم فرمایا ہے۔ اس میں دین کے جس شعبے کے بارے میں احادیث لائے ہیں، وہ ہے "معاشرت" معاشرت کا مطلب ہے دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنا۔ زندگی گزارنے کے صحیح طریقے کیا ہیں؟ پانی کس طرح پیے؟ گھر میں کس طرح رہے دوسروں کے سامنے کس طرح رہے؟ یہ سب باتیں معاشرت کے شعبہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے:

"آج کل لوگوں نے معاشرت کو تو دین سے بالکل خارج کر دیا ہے، اور اس میں دین کے عمل و دخل کو لوگ قبول نہیں کرتے، حتیٰ کہ جو لوگ نماز روزے کے پابند ہیں بلکہ تہجد گزار ہیں۔ ذکر و تسبیح کرنے کے پابند ہیں۔ لیکن معاشرت ان کی بھی خراب ہے۔ دین کے مطابق نہیں ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا دین ناقص ہے"

اس لئے معاشرت کے بارے میں جو احکام اور تعلیمات اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی ہیں۔ ان کو جاننا، ان کی اہمیت پہچاننا اور ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہر چیز سکھا گئے

معاشرت کے بارے میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلا باب "کھانے پینے کے آداب" سے شروع فرمایا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح زندگی کے ہر شعبے سے متعلق بڑی اہم تعلیمات ارشاد فرمائی ہیں۔ اسی طرح کھانے پینے کے بارے میں بھی اہم تعلیمات ہمیں عطا فرمائی ہیں، ایک مرتبہ ایک مشرک نے اسلام پر اعتراض کرتے ہوئے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے کہا:

"اِنِّیْ اَرٰی صَاحِبَکُمْ یُعَلِّمُکُمْ کُلَّ شَیْءٍ حَتّٰی الْخِرَاءَۃَ"

"تمہارے نبی تمہیں ہر چیز سکھاتے ہیں، حتیٰ کہ قضاء حاجت کا طریقہ بھی سکھاتے ہیں۔"

اس کا مقصد اعتراض کرنا تھا کہ بھلا قضاء حاجت کا طریقہ بھی کوئی سکھانے کی چیز ہے۔ یہ تو کوئی

ایسی اہم بات نہیں تھی کہ ایک نبی اور پیغمبر جیسا جلیل القدر اور عظیم الشان انسان اس کے بارے میں کچھ کہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا:

"قَالَ اَجَلْ اَمَرَنَا اَنْ لَا نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ وَ لَا نَسْتَنْجِیْ بِاَ یْمَانِنَا" الخ(۱)

جس چیز کو تم اعتراض کے طور پر بیان کر رہے ہو وہ ہمارے لئے فخر کی بات ہے، یعنی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہر چیز سکھائی ہے، یہاں تک کہ ہمیں یہ بھی سکھایا کہ جب ہم قضاء حاجت کے لئے جائیں تو قبلہ رخ نہ بیٹھیں، اور نہ داہنے ہاتھ سے استنجا کریں۔ جیسے ماں باپ اپنی اولاد کو سب کچھ سکھاتے ہیں۔ اس لئے اگر ماں باپ اس بات سے شرمانے لگیں کہ اپنی اولاد کو پیشاب پاخانے کے طریقے کیا بتائیں تو اس صورت میں اولاد کو کبھی پیشاب پاخانے کا صحیح طریقہ نہیں آئے گا؟ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر اور آپ پر ماں باپ سے کہیں زیادہ شفیق اور مہربان ہیں۔ اس لئے آپ نے ہمیں ہر چیز کے طریقے سکھائے۔ ان میں کھانے کا طریقہ بھی ہے۔ اور کھانے کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ایسے آداب بیان فرمائے جن کے ذریعہ کھانا عبادت بن جائے۔ اور باعث اجر وثواب بن جائے۔

کھانے کے تین آداب

چنانچہ یہ حدیث جو میں نے ابھی پڑھی، اس میں حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ کھانے کے وقت اللہ کا نام لو۔ یعنی "بسم اللہ" پڑھ کر کھانا شروع کرو اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور برتن کے اس حصے سے کھاؤ جو تم سے قریب تر ہے، آگے ہاتھ بڑھا کر دوسری جگہ سے مت کھاؤ۔ اس حدیث میں تین آداب بیان فرما دیئے۔

پہلا ادب "بسم اللہ" پڑھنا

ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کھانا، شروع کرے تو اللہ کا نام لے، اور اگر کوئی شخص شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول گیا

(۱) صحیح مسلم کتاب الطھارة باب الاستطابة ، رقم:۳۸۵،سنن الترمذی ، کتاب الطھارة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب الاستنجاء بالحجارة رقم:۱۶،سنن النسائی، کتاب الطھارة، باب النھی عن الاکتفاء فی الاستطابة......، رقم:۴۱ سنن ابی داؤد ،کتاب الطھارة، باب كراهية استقبال القبلة عند قضاء الحاجة رقم:۶،سنن ابن ماجه، کتاب الطھارة وسننھا، باب الاستنجاء بالحجارة و النھی عن الروث والرومة، رقم:۳۱۲،مسند أحمد، رقم:۲۲۴۹۰

تو اس کو چاہیے کہ کھانا کھانے کے دوران جب بھی بسم اللہ پڑھنا یاد آئے، اس وقت یہ الفاظ کہہ دے:

((بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَآخِرَهٗ))(۱)

یعنی اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں۔ اول میں بھی اللہ کا نام، اور آخر میں بھی اللہ کا نام۔

شیطان کے قیام وطعام کا انتظام مت کرو

ایک حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا نام لیتا ہے، اور کھانے کے وقت بھی اللہ کا نام لیتا ہے تو شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ اس گھر میں نہ تو تمہارے لئے رات کو رہنے کی کوئی گنجائش ہے، اور نہ ہی کھانے کے لئے کوئی گنجائش ہے، اس لئے کہ اس شخص نے گھر داخل ہوتے وقت بھی اللہ کا نام لے لیا، اور کھانا کھاتے وقت بھی اللہ کا نام لے لیا، اس لئے نہ تو یہاں قیام کا انتظام ہے اور نہ طعام کا انتظام ہے اور اگر کسی شخص نے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا نام نہیں لیا اور ویسے ہی گھر میں داخل ہو گیا تو شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ لو بھائی تمہارے قیام کا انتظام ہو گیا تم یہاں رات گزار سکتے ہو۔ کیونکہ یہاں پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا، اور جب وہ شخص کھانا کھاتے وقت بھی اللہ کا نام نہیں لیتا تو اس وقت شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ تمہارے طعام کا بھی انتظام ہو گیا۔(۲)

بہر حال، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا نام نہ لینے سے شیطان کا عمل دخل ہو جاتا ہے، اور گھر کے اندر اس کے قیام کا انتظام ہو جانے اور اس کا عمل دخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ تمہیں طرح طرح سے ورغلائے گا، بہکائے گا اور گناہ پر آمادہ کرے گا۔ ناجائز کاموں پر آمادہ کرے گا اور تمہارے دل میں بدی کے خیالات اور وسوسے ڈالے گا، وہم پیدا کرے گا، اور کھانے کا انتظام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب جو کھانا تم کھاؤ گے اس میں اللہ کی طرف سے برکت نہیں ہوگی، اور وہ کھانا تمہاری زبان کے چٹخارے کے لئے تو شاید کافی ہو جائے لیکن اس کھانے کا نور اور برکت حاصل نہ ہوگی۔

گھر میں داخل ہونے کی دعا

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باتوں کی تاکید فرمائی ہے۔ ایک یہ کہ جب آدمی گھر

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمة، باب التسمية على الطعام، رقم: ۳۷٦۷

(۲) صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب آداب الطعام و الشراب واحکامها، رقم: ۳۷٦۲ سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمة، باب التسمية على الطعام، رقم: ۳۲۷۳، مسند أحمد رقم: ۱۴۲۰۳

میں داخل ہو تو اللہ کا نام لے کر داخل ہو۔ اور بہتر یہ ہے کہ وہ دعا پڑھے جو حضور اقدس ﷺ سے منقول ہے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَ الْمَوْلَجِ وَخَیْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللّٰهِ خَرَجْنَا وَعَلَی اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَکَّلْنَا))(۱)

حضور اقدس ﷺ کا معمول تھا کہ جب گھر میں داخل ہوتے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اے اللہ میں آپ سے بہترین داخلہ مانگتا ہوں کہ میرا داخلہ خیر کے ساتھ ہو، اور جب گھر سے نکلوں تو بھی خیر کے ساتھ نکلوں'' اس لئے کہ جب آدمی گھر میں داخل ہوتا ہے تو اس کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ میرے پیچھے گھر میں کیا ہو گیا، ہو سکتا ہے گھر میں داخل ہونے کے بعد تکلیف کی خبر ملے، یا رنج اور صدمے اور پریشانی کی خبر ملے، چاہے وہ دنیوی پریشانی کی ہو، یا دینی پریشانی کی خبر ہو۔ اس لئے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر لو کہ یا اللہ! میں گھر میں داخل ہو رہا ہوں، اندر جا کر میں اپنے گھر کو اور گھر والوں کو اچھی حالت میں پاؤں۔ اور اس کے بعد پھر ضرورت سے دوبارہ گھر سے نکلنا تو ہوگا، لیکن وہ نکلنا بھی خیر کے ساتھ ہو، کسی پریشانی یا دکھ اور تکلیف کی وجہ سے گھر سے نہ نکلنا پڑے۔ مثلاً گھر میں داخل ہونے کے بعد پتہ چلا کہ گھر والے بیمار ہیں، اب ان کے علاج اور دوا کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑا، یا گھر میں کوئی پریشانی آگئی۔ اور اب اس پریشانی کے مداوا کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑا، تو یہ اچھی حالت اور اچھے مقصد کے لئے نکلنا نہ ہوا، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا تلقین فرما دی کہ گھر میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھ لیا کرو۔

دعا پڑھنا یاد نہ آئے تو اپنے گھر کے دروازے پر لکھ کر لگا لو، تاکہ اس کو دیکھ کر یاد آ جائے اس لئے کہ یہ دعا دنیاوی پریشانیوں سے بچانے کا سبب ہے، اور آخرت کا ثواب اور فضیلت الگ حاصل ہوگی۔ لہٰذا جب انسان یہ دعا پڑھتے ہوئے داخل ہوا کہ میرا داخل ہونا بھی خیر کے ساتھ ہو اور میرا نکلنا بھی خیر کے ساتھ ہو تو پھر بتایئے، شیطان کی اس گھر میں قیام کرنے کی گنجائش کہاں باقی رہے گی؟ اس لئے شیطان کہتا ہے کہ اس گھر میں میرے لئے قیام کا انتظام نہیں۔

بڑا پہلے کھانا شروع کرے

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم حضور اقدس ﷺ کے ساتھ کسی کھانے میں شریک ہوتے تو ہمارا معمول یہ تھا کہ جب تک حضور اقدس ﷺ کھانا شروع نہ فرماتے، اس وقت تک ہم لوگ کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتے تھے، بلکہ اس کا انتظار کرتے تھے کہ جب حضور اقدس ﷺ

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الآداب، باب ما یقول اذا خرج من بیته، رقم: ٥٩٦

کھانے کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔ اس وقت ہم کھانا شروع کریں۔(۱)

اس حدیث سے فقہاء کرام رحمہم اللہ نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ جب کوئی چھوٹا کسی بڑے کے ساتھ کھانا کھا رہا ہو تو ادب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ چھوٹا خود پہلے شروع نہ کرے، بلکہ بڑے کے شروع کرنے کا انتظار کرے۔

شیطان کھانا حلال کرنا چاہتا تھا

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ کھانے کے وقت ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاضر تھے، اتنے میں ایک نو عمر بچی بھاگتی ہوئی آئی۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھوک سے بیتاب ہے، اور ابھی تک کسی نے کھانا شروع نہیں کیا تھا، اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اب تک کھانا شروع نہیں فرمایا تھا، مگر اس بچی نے آکر جلدی سے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اس کو کھانا کھانے سے روک دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک دیہاتی آیا۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تا کہ وہ بھی بھوک سے بہت بے تاب ہے، اور کھانے کی طرف لپک رہا ہے، اس نے بھی آکر کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ لیا، اور اس کو بھی کھانے سے روک دیا۔ اس کے بعد پھر آپ نے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

((إِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ إِنْ لَا يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَإِنَّهُ جَاءَ بِهٰذِهِ الْجَارِيَةِ لِيَسْتَحِلَّ بِهَا، فَأَخَذْتُ بِيَدِهَا، فَجَاءَ هٰذَا الْأَعْرَابِيُّ لِيَسْتَحِلَّ بِهٖ، فَأَخَذْتُ بِيَدِهٖ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ، إِنَّ يَدَهٗ فِيْ يَدِيْ مَعَ يَدِهَا))(۲)

شیطان اس کھانے کو اس طرح اپنے لئے حلال کرنا چاہتا تھا کہ اس کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا جائے چنانچہ اس نے اس لڑکی کے ذریعہ کھانا حلال کرنا چاہا۔ مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے بعد اس نے اس دیہاتی کے ذریعہ کھانا حلال کرنا چاہا۔ مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اللہ کی قسم شیطان کا ہاتھ اس لڑکی کے ہاتھ کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب آداب الطعام و الشراب واحکامهما، رقم: ۳۷٦۱، سنن ابی داود، کتاب الأطعمة، باب التسمية على الطعام، رقم: ۳۲۷٤، مسند أحمد رقم: ۲۲۱٦٥

(۲) صحيح مسلم، کتاب الا شربة، باب آداب الطعام و الشراب و أحكامهما، رقم: ۲۰۱۷

بچوں کی تربیت کریں

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ بڑے کا کام یہ ہے کہ اگر چھوٹا اس کی موجودگی میں اللہ کا نام لئے بغیر شروع کر رہا ہے تو بڑے کو چاہیے کہ وہ اس کو متنبہ کرے اور ضرورت ہو تو اس کا ہاتھ بھی پکڑ لے اور اس سے کہے کہ پہلے "بسم اللہ" کہو پھر کھانا کھاؤ۔

آج ہم لوگ بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ کھانے پر بیٹھتے ہیں۔ لیکن اس بات کا خیال نہیں ہوتا کہ اولاد اسلامی آداب کا لحاظ کر رہی ہے یا نہیں؟ اس لئے حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں اس بات کی تعلیم دیدی کہ بڑے کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی طرف نگاہ رکھے۔ اور ٹوکتا رہے، اور ان کو اسلامی آداب سکھائے، ورنہ کھانے کی برکت دور ہو جائے گی۔

شیطان نے قے کردی

حضرت امیہ بن مخشی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ تشریف فرما تھے۔ آپ کے سامنے ایک شخص کھانا کھا رہا تھا، اس نے بسم اللہ پڑھے بغیر کھانا شروع کر دیا تھا یہاں تک کہ سارا کھانا کھالیا۔ صرف ایک لقمہ باقی رہ گیا، جب وہ شخص اس آخری لقمے کو منہ کی طرف لے جانے لگا تو اس وقت یاد آیا کہ میں نے کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی۔ اور حضور اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ جب آدمی کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو کھانے کے دوران جب اس کو بسم اللہ پڑھنا یاد آجائے اس وقت وہ "بسم اللہ اولہ وآخرہ" پڑھ لے، جب اس شخص نے یہ دعا پڑھی تو حضور اقدس ﷺ اس کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جس وقت یہ کھانا کھا رہا تھا تو شیطان بھی اس کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ لیکن جب اس نے اللہ کا نام لیا اور "بسم اللہ اولہ وآخرہ" پڑھ لیا تو شیطان نے جو کچھ کھایا تھا اس کی قے کر دی۔ اور اس کھانے میں اس کا جو حصہ تھا اس ایک چھوٹے سے جملے کی وجہ سے وہ ختم ہو گیا۔ اور آنحضرت ﷺ نے اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تبسم فرمایا، اور آپ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا کہ اگر آدمی کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا بھول گیا تو جب یاد آجائے۔ اس وقت بسم اللہ اولہ وآخرہ پڑھ لے، اس کی وجہ سے اس کھانے سے بے برکتی زائل ہو جائے گی۔ (۱)

---

(۱) سنن ابی داود، کتاب الاطعمة، باب التسمية على الطعام، رقم: ۳۲۷۶

یہ کھانا اللہ کی نعمت ہے

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ لینا چاہئے اور کہنے کو تو یہ معمولی بات ہے کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھ کر کھانا شروع کر دیا۔ لیکن اگر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ یہ اتنی عظیم الشان عبادت ہے کہ اس کی وجہ سے ایک طرف تو یہ کھانا، عبادت اور باعث ثواب بن جاتا ہے۔ اور دوسری طرف اگر آدمی ذرا دھیان سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کہہ لے۔ تو اس کی وجہ سے اللہ جل جلالہ کی معرفت کا بہت بڑا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھنا حقیقت میں انسان کو اس طرف متوجہ کر رہا ہے کہ جو کھانا میرے سامنے اس وقت موجود ہے یہ میری قوت بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ کسی دینے والے کی عطا ہے۔ میرے بس میں یہ بات نہیں تھی کہ میں یہ کھانا مہیا کر لیتا، اور اس کے ذریعہ اپنی ضرورت پوری کر لیتا۔ اپنی بھوک مٹا دیتا، یہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس کا کرم ہے کہ اس نے مجھے یہ کھانا عطا فرما دیا۔

یہ کھانا تم تک کس طرح پہنچا؟

اور درحقیقت یہ "بسم اللہ" کا پڑھنا اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ ذرا غور تو کرو کہ یہ ایک نوالہ جو تم نے منہ میں رکھا اور ایک سیکنڈ میں تم نے حلق سے نیچے اتار لیا۔ اس ایک نوالے کو تمہارے منہ تک پہنچانے کے لئے کائنات کی کتنی قوتیں صرف ہوئیں۔ ذرا سوچو تو سہی کہ روٹی کا یہ ایک ٹکڑا کس طرح تم تک پہنچا؟ کہاں کس کاشت کار نے بیج بونے سے پہلے زمین کو نرم اور ہموار کرنے کے لئے کتنی مدت تک بیلوں کے ذریعہ ہل چلایا؟ اور پھر اس زمین کے اندر بیج ڈالا، اور پھر اس کو پانی دیا، پھر اس کے اوپر مسلسل ہوائیں چلیں، سورج نے اس کے اوپر اپنی روشنی کب ڈالیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے بادل بھیج کر بارشیں برسائیں۔ اس کے بعد جا کر باریک اور کمزور سی اچانک ایک اور کمزور سی کونپل نمودار ہوئی۔ اور وہ کونپل اتنی کمزور کہ اگر ایک چھوٹا سا بچہ بھی اس کو اپنے ہاتھ سے دبا دے تو وہ مسل جائے۔ لیکن زمین جیسی سخت چیز کا پشت پھاڑ کر اس میں شگاف ڈال کر نمودار ہو رہی ہے، پھر اس کونپل سے پودا بنا، اور پودے سے درخت بنا، اور پھر اس کے اوپر خوشے نمودار ہوئے۔ اور پھر اس پر غلے کے دانے پیدا ہوئے، پھر کتنے انسان اس کے توڑنے میں شریک ہوئے، اور کتنے جانوروں نے اس کو روند کر اس کے بھوسے کو الگ اور دانے کو الگ کیا، پھر وہاں سے کتنے شہروں میں ہوتا ہوا تمہارے شہر میں پہنچا اور کتنے انسان اس کی خرید و فروخت میں شریک ہوئے پھر کس نے اس گندم کو چکی میں پیس کر آٹا بنایا اور پھر تم اس کو خرید کر اپنے گھر لائے اور کس نے اس آٹا کو گوندھ کر روٹی پکائی؟ اور جب

وہ روٹی تمہارے سامنے آئی تو تم نے ایک لمحے کے اندر منہ میں ڈال کر حلق سے نیچے اتار دیا۔

اب ذرا سوچو، کیا یہ تمہاری قدرت میں تھا کہ تم کائنات کی ان ساری قوتوں کو جمع کر کے روٹی کے ایک نوالے کو تیار کر کے حلق سے نیچے اتار لیتے؟ کیا آسمان سے بارش برسانا تمہاری قدرت میں تھا؟ کیا سورج کی کرنوں کو پہنچانا تمہاری قدرت میں تھا؟ کیا تمہاری قدرت میں یہ تھا کہ تم اس کمزور کونپل کو زمین سے نکالتے؟ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ ۝ ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ ۝﴾ (۱)

یعنی ذرا غور کرو کہ تم جو چیز زمین میں ڈالتے ہو۔ کیا تم اس کے اگانے والے ہو۔ یا ہم اس کو اگاتے ہیں؟ تم اس کے لئے کتنے بھی پیسے خرچ کر لیتے۔ کتنے ہی وسائل جمع کر لیتے، مگر پھر بھی یہ کام تمہارے بس میں نہیں تھا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور جب اس دھیان اور استحضار کے ساتھ کھاؤ گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور ان کا کرم ہے کہ انہوں نے مجھے عطا فرمایا تو وہ سارا تمہارے لئے عبادت بن جائیگا۔

مسلمان اور کافر کے کھانے میں امتیاز

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دین درحقیقت زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے۔ ذرا سا زاویہ نگاہ بدل لو تو یہی دنیا دین بن جائے گی۔ مثلاً یہی کھانا ''بسم اللہ'' پڑھے بغیر کھا لو۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کے استحضار کے بغیر کھا لو۔ تو پھر اس کھانے کی حد تک تم میں اور کافر میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے کھانا کافر بھی کھا رہا ہے اور تم بھی کھا رہے ہو؟ اس کھانے کے ذریعہ سے تمہاری بھوک دور ہو جائے گی، اور زبان کو چٹخارہ مل جائے گا۔ لیکن وہ کھانا تمہاری دنیا ہے، دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اور جیسے گائے، بھینس، اور بکری اور دوسرے جانور کھا رہے ہیں۔ اسی طرح تم بھی کھا رہے ہو، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

زیادہ کھانا کمال نہیں

دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بڑا حکیمانہ واقعہ ہے۔ ان کے زمانے میں آریہ سماج ہندوؤں نے اسلام کے خلاف بڑا شور مچایا ہوا تھا۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ان آریہ سماج والوں سے مناظرہ کیا کرتے تھے، تاکہ لوگوں پر حقیقت حال واضح ہو

---

(۱) الواقعة: ۶۳، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اچھا یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم زمین میں بوتے ہو، کیا اسے تم اگاتے ہو یا اگانے والے ہم ہیں"

جائے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ ایک مناظرہ کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں ایک آریہ سماج کے پنڈت سے مناظرہ تھا۔ اور مناظرہ سے پہلے کھانے کا انتظام تھا، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بہت تھوڑا کھانے کے عادی تھے، جب کھانا کھانے بیٹھے تو حضرت والا چند نوالے کھا کر اٹھ گئے اور جو آریہ سماج کے عالم تھے، وہ کھانے کے استاد تھے، انہوں خوب ڈٹ کر کھایا، جب کھانے سے فراغت ہوئی تو میزبان نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ حضرت آپ نے تو بہت تھوڑا سا کھانا کھایا، حضرت نے فرمایا کہ مجھے جتنی خواہش تھی اتنا کھالیا۔ وہ آریہ سماج بھی قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حضرت سے کہا کہ مولانا آپ کھانے کے مقابلے میں تو ابھی سے ہار گئے، اور یہ آپ کے لئے بدفالی ہے کہ جب آپ کھانے پر ہار گئے تو اب دلائل کا مقابلہ ہوگا تو اس میں بھی آپ ہار جائیں گے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ بھائی اگر کھانے کے اندر مناظرہ اور مقابلہ کرنا تھا تو مجھ سے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کسی بھینس سے یا بیل سے کیا ہوتا۔ اگر اس سے مناظرہ کریں گے تو آپ یقیناً بھینس سے ہار جائیں گے میں تو دلائل میں مناظرہ کرنے آیا تھا۔ کھانے میں مناظرہ اور مقابلہ کرنے تو نہیں آیا تھا۔

جانور اور انسان میں فرق

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس جواب میں اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اگر غور سے دیکھو تو کھانے پینے کے اندر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔ جانور بھی کھاتا ہے، اور انسان بھی کھاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر جانور کو رزق دیتے ہیں اور بسا اوقات ان کو تم سے اچھا رزق دیتا ہے۔ لیکن ان کے درمیان اور تمہارے درمیان فرق یہ ہے کہ تم کھانا کھاتے وقت اپنے کھلانے والے کو فراموش نہ کرو، بس جانور اور انسان میں یہی فرق ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی مخلوق کو دعوت

واقعہ لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ساری دنیا پر حکومت عطا فرمادی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی یا اللہ جب آپ نے مجھے ساری دنیا پر حکومت عطا فرمادی تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ کی ساری مخلوق کی ایک سال تک دعوت کروں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کام تمہاری قدرت اور بس میں نہیں۔ انہوں نے پھر درخواست کی یا اللہ ایک ماہ کی دعوت کی اجازت دیدیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمہاری قدرت میں نہیں، آخر میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ یا اللہ ایک دن کی اجازت دے دیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اس کی بھی قدرت نہیں رکھتے، لیکن اگر

تمہارا اصرار ہے تو چلو ہم تمہیں اس کی اجازت دیدتے ہیں، جب اجازت مل گئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات اور انسانوں کو اجناس اور غذائیں جمع کرنے کا حکم دیا۔ اور کھانا پکنا شروع ہوا۔ اور کئی مہینوں تک کھانا تیار ہوتا رہا اور پھر سمندر کے کنارے ایک بہت لمبا چوڑا دستر خوان بچھایا گیا اور اس پر کھانا چنا گیا اور ہوا کو حکم دیا کہ وہ اس پر چلتی رہے تاکہ کھانا خراب نہ ہو جائے۔ اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی یا اللہ کھانا تیار ہو گیا ہے۔ آپ اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھیج دیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم پہلے سمندری مخلوق میں سے ایک مچھلی کو تمہاری دعوت کھانے کے لئے بھیج دیتے ہیں، چنانچہ ایک مچھلی سمندر سے نکلی اور کہا کہ اے سلیمان! معلوم ہوا ہے کہ آج تمہاری طرف سے دعوت ہے؟ انہوں نے فرمایا ہاں تشریف لائیں۔ کھانا تناول کریں چنانچہ اس مچھلی نے دستر خوان کے ایک کنارے سے کھانا شروع کیا اور دوسرے کنارے تک سارا کھانا ختم کر گئی، پھر حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ اور لائیں، حضرت سلیمان نے فرمایا کہ تم تو سارا کھانا کھا گئیں۔ مچھلی نے کہا کہ کیا میزبان کی طرف سے مہمان کو یہی جواب دیا جاتا ہے۔ جب سے میں پیدا ہوئی ہوں۔ اس وقت سے لے کر آج تک ہمیشہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے۔ لیکن آج تمہاری دعوت کی وجہ سے بھوکی رہی ہوں۔ اور کتنا کھانا تم نے تیار کیا تھا اللہ تعالیٰ روزانہ مجھے اتنا کھانا دن میں دو مرتبہ کھلاتے ہیں۔ مگر آج پیٹ بھر کے کھانا نہیں ملا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام فوراً سجدے میں گر گئے، اور استغفار کیا۔ (۱)

کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرو

بہرحال، اللہ تعالیٰ ہر ایک مخلوق کو رزق دے رہے ہیں، سمندر کی تہہ میں اور اس کی تاریکیوں میں رزق عطا فرماتا ہے، قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ (۲)

یعنی کوئی جاندار زمین پر چلنے والا ایسا نہیں ہے کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو، لہٰذا کھانے کی حد تک تمہارے اور جانوروں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس کو بھی مل رہی ہیں۔ جانوروں کو چھوڑیئے، اللہ تعالیٰ تو اپنے ان دشمنوں کو بھی رزق دے رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کر رہے ہیں۔ خدا کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ خدا کی توہین کر رہے ہیں۔ جو اس کے لائے ہوئے دین کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی رزق دے رہا ہے۔ لہٰذا کھانے کے اعتبار سے تم میں اور ان میں کیا فرق ہے؟ وہ فرق یہ ہے کہ جانور اور کافر اور مشرک صرف زبان کے چٹخارے اور پیٹ کی آگ

(۱) نفحة العرب، ص: ۱۱۰

(۲) هود: ٦

بجھانے کی خاطر کھاتا ہے، اس لئے وہ کھانا کھاتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتا۔ اللہ کا ذکر نہیں کرتا، تم مسلمان ہو۔ تم ذرا سے خیال اور دھیان کر کے۔ اس کھانے کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھ کر، اس کا نام لے کر کھاؤ۔ اور پھر اس کا شکر ادا کرو، تو یہی کھانا عبادت بن جائے گا۔

ہر کام کرتے وقت زاویہ نگاہ بدل لو

میرے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سالہا سال اس بات کی مشق کی ہے۔ مثلاً گھر میں داخل ہوا، اور کھانے کا وقت آیا، اور دسترخوان پر بیٹھے۔ کھانا سامنے آیا۔ اب بھوک شدید ہے۔ اور کھانا بھی لذیذ ہے، دل چاہ رہا ہے کہ فوراً کھانا شروع کر دوں۔ لیکن ایک لمحے کے لئے کھانے سے رک گیا اور دل سے کہا کہ یہ کھانا نہیں کھائیں گے۔ اس کے بعد دوسرے لمحے یہ سوچا کہ یہ کھانا اللہ کی عطا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے یہ میرے قوت بازو کا کرشمہ نہیں ہے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کھانا سامنے آتا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اس کو کھالیا کرتے تھے۔ اس لئے میں بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اس کھانے کو کھاؤں گا۔ اس کے بعد بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرتا۔ گھر میں داخل ہوئے۔ اور بچہ کھیلتا ہوا اچھا معلوم ہوا۔ دل چاہا کہ اس کو گود میں اٹھا کر پیار کریں۔ لیکن ایک لمحے کے لئے رک گئے۔ اور سوچا کہ محض دل کے چاہنے پر بچے کو گود میں نہیں لیں گے، پھر دوسرے لمحے یہ خیال لائے کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور بچوں سے محبت فرمایا کرتے تھے۔ اور ان کو گود میں لے لیا کرتے تھے۔ اب میں بھی آپ کی سنت کی اتباع میں بچے کو گود میں اٹھاؤں گا۔ اس کے بعد بچے کو اٹھا لیا۔ حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سالہا سال تک اس عمل کی مشق کی ہے اور یہ شعر سنایا کرتے تھے:

جگر پانی کیا ہے مدتوں غم کی کشاکش میں
کوئی آسان ہے کیا خوگر آزار ہو جانا

سالہا سال کی مشق کے بعد یہ چیز حاصل ہوئی ہے۔ اور الحمد للہ اب تکلف نہیں ہوتا۔ اب جب بھی اس قسم کی کوئی نعمت سامنے آتی ہے تو پہلے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ اور پھر اس پر شکر ادا کر کے بسم اللہ پڑھ کر اس کام کو کر لیتا ہوں۔ اور اب عادت پڑ گئی ہے، اور اسی کو زاویہ نگاہ کی تبدیلی کہتے ہیں، اس کے نتیجے میں دنیا کی چیز دین بن جاتی ہے۔

کھانا، ایک نعمت

ایک مرتبہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک دعوت میں گئے۔ جب دسترخوان پر کھانا

آیا، اور کھانا شروع کیا گیا تو حضرت والا نے فرمایا کہ تم ذرا غور کرو کہ اس ایک کھانے میں جو تم اس وقت کھا رہے ہو، اس میں اللہ تعالیٰ کی مختلف قسم کی کتنی نعمتیں شامل ہیں، سب سے پہلے تو کھانا مستقل نعمت ہے۔ اس لئے اگر انسان شدید بھوکا ہو، اور بھوک کی وجہ سے مر رہا ہو، اور کھانے کی کوئی چیز میسر نہ ہو۔ تو اس وقت خواہ کتنا ہی خراب سے خراب کھانا اس کے سامنے لایا جائے، وہ اس کو بھی غنیمت سمجھ کر کھانے کے لئے تیار ہو جائے گا، اور اس کو بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت سمجھے گا، اس سے معلوم ہوا کہ کھانا اچھا ہو، یا برا ہو، لذیذ ہو، یا بے مزہ ہو، وہ کھانا بذات خود ایک نعمت ہے۔ اس لئے کہ وہ بھوک کی تکلیف کو دور کر رہا ہے۔

کھانے کی لذت

دوسری نعمت یہ ہے کہ یہ کھانا مزیدار بھی ہے۔ اپنی طبیعت کے مطابق بھی ہے، اب اگر کھانا تو موجود ہوتا۔ لیکن مزیدار نہ ہوتا، اور اپنی طبیعت کے موافق نہ ہوتا تو ایسے کھانے کو کھا کر کسی طرح پیٹ بھر کر بھوک مار لیتے، لیکن لذت حاصل نہیں ہوتی۔

عزت سے کھانا ملنا، تیسری نعمت

تیسری نعمت یہ ہے کہ کھلانے والا عزت سے کھلا رہا ہے۔ اب اگر کھانا بھی میسر ہوتا، اور مزیدار بھی ہوتا، لذیذ بھی ہوتا، لیکن کھلانے والا ذلت کے ساتھ کھلاتا، اور جیسے کسی نوکر اور غلام کو کھلایا جاتا ہے، اس طرح ذلیل کر کے کھلاتا۔ تو اس وقت اس کھانے کی ساری لذت دھری رہ جاتی، اور سارا مزہ خراب ہو جاتا جیسے کسی نے کہا:

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لہٰذا اگر کوئی شخص ذلیل کر کے کھانا کھلا رہا ہے، تو اس کھانے میں کوئی لطف نہیں، وہ کھانا بے حقیقت ہے، الحمد للہ ہمیں یہ تیسری نعمت بھی حاصل ہے کہ کھلانے والا عزت سے کھلا رہا ہے۔

بھوک لگنا، چوتھی نعمت

چوتھی نعمت یہ ہے کہ بھوک اور کھانے کی خواہش بھی ہے۔ اس لئے کہ اگر کھانا بھی میسر ہوتا۔ اور وہ کھانا لذیذ بھی ہوتا، اور کھلانے والا عزت سے بھی کھلاتا، لیکن بھوک نہ ہوتی، اور معدہ خراب ہوتا، تو اس صورت میں اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا بھی بیکار ہے، اس لئے کہ انسان ان کو نہیں کھا سکتا، تو الحمد للہ، کھانا

بھی لذیذ ہے، کھلانے والا عزت سے کھلا رہا ہے، اور کھانے کی بھوک اور خواہش بھی موجود ہے۔

کھانے کے وقت عافیت، پانچویں نعمت

پانچویں نعمت یہ ہے کہ عافیت اور اطمینان کے ساتھ کھا رہے ہیں۔ کوئی پریشانی نہیں ہے، اس لئے کہ اگر کھانا تو لذیذ ہوتا، کھلانے والا عزت سے بھی کھلاتا، بھوک بھی ہوتی، لیکن طبیعت میں کوئی ایسی پریشانی لاحق ہوتی، کوئی فکر طبیعت پر ہوتی یا اس وقت کوئی خطرناک قسم کی خبر مل جاتی، جس سے دل ودماغ پریشان اور ماؤف ہو جاتا، تو ایسی صورت میں بھوک ہوتے ہوئے بھی وہ کھانا انسان کے لئے بیکار ہو جاتا۔ الحمدللہ، عافیت اور اطمینان حاصل ہے، کوئی ایسی پریشانی نہیں ہے، جس کی وجہ سے کھانا بے لذت بے مزہ ہو جاتا۔

دوستوں کے ساتھ کھانا، چھٹی نعمت

چھٹی نعمت یہ ہے کہ اپنے احباب اور دوستوں کے ساتھ مل کر کھانا کھا رہے ہیں، اگر یہ سب نعمتیں حاصل ہوتیں۔ لیکن اکیلے بیٹھے کھا رہے ہوتے، اس لئے کہ تنہا کھانے میں اور اپنے دوست احباب کے ساتھ مل کر کھانے میں بڑا فرق ہے۔ اپنے دوست احباب کے ساتھ مل کر کھانے میں جو کیف اور لطف حاصل ہوتا ہے وہ تنہا کھاتے وقت حاصل نہیں ہو سکتا، لہٰذا یہ ایک مستقل نعمت ہے، بہرحال، فرمایا کرتے تھے کہ یہ کھانا ایک نعمت ہے، لیکن اس ایک کھانے میں اللہ تعالیٰ کی کتنی نعمتیں شامل ہیں تو کیا پھر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرو گے؟

یہ کھانا عبادتوں کا مجموعہ ہے

لہٰذا جب یہ کھانا اس استحضار کے ساتھ کھایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، تو پھر ہر نعمت اللہ کا شکر ادا کر کے کھانا کھاؤ۔ اور جب اس طرح ہر نعمت پر شکر ادا کرتے جاؤ گے تو ایک طرف تو کھانے کے اندر عبادتوں میں اضافہ ہو رہا ہے، اس لئے کہ اگر صرف ''بسم اللہ'' پڑھ کر کھانا کھا لیتے، اور ان نعمتوں کا استحضار نہ کرتے، تو بھی وہ کھانا عبادت بن جاتا، لیکن کئی نعمتوں کا استحضار کرتے ہوئے اور ان پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کھانا جو حقیقت میں دنیا ہے۔ ایک طرف اس کے ذریعے لذت بھی حاصل ہو رہی ہے، اور دوسری طرف تمہاری نیکیوں میں بھی اضافہ کا سبب بن رہا ہے۔ بس اسی کا نام ''زاویہ نگاہ کی تبدیلی'' ہے، اس زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے انسان کی دنیا بھی دین بن جاتی ہے۔ مولانا شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ابرو باد و مہ و خورشید و فلک درکار اند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

() گلستان سعدی

یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ آسمان، یہ زمین، یہ بادل، یہ چاند، یہ سورج، ان سب کو تمہاری خدمت کے لئے لگایا ہوا ہے۔ تاکہ ایک روٹی تمہیں حاصل ہو جائے، مگر اس روٹی کو غفلت کے ساتھ مت کھانا، بس تمہارا کام صرف اتنا ہی ہے، بلکہ اللہ کا نام لے کر۔ اللہ کا ذکر کر کے کھاؤ، اگر کھانے سے پہلے بھول جاؤ تو جب یاد آجائے، اس وقت "بسم اللہ اولہ وآخرہ" پڑھ لو۔

نفل کام کی تلافی

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی بنیاد پر جس میں دعا بھول جانے کا ذکر ہے، فرمایا کہ جب بھی آدمی کوئی نفلی عبادت اپنے وقت پر ادا کرنا بھول گیا۔ یا کسی عذر کی وجہ سے وہ نفلی عبادت نہ کر سکا، تو یہ نہ سمجھے کہ بس اب اس نفل عبادت کا وقت تو چلا گیا، اب چھٹی ہو گئی، بلکہ بعد میں جب موقع مل جائے، اس نفلی عبادت کو کر لے۔

چنانچہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک اجتماع میں شرکت کے لئے جا رہے تھے، مغرب کے وقت وہاں پہنچنا تھا، مگر ہمیں نکلتے ہوئے دیر ہو گئی، جس کی وجہ سے مغرب کی نماز راستے میں ہی ایک مسجد میں پڑھی، چونکہ خیال یہ تھا کہ وہاں پر لوگ منتظر ہوں گے۔ اس لئے حضرت والا نے صرف تین فرض اور دو سنتیں پڑھیں۔ اور ہم نے بھی تین فرض اور دو سنتیں پڑھ لیں اور وہاں سے جلدی روانہ ہو گئے، تاکہ جو لوگ انتظار کر رہے ہیں، ان کو انتظار زیادہ نہ کرنا پڑے، چنانچہ تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ گئے، اجتماع ہوا۔ پھر عشاء کی نماز بھی وہیں پڑھی، اور رات کے دس تک اجتماع رہا۔ پھر جب حضرت والا وہاں سے رخصت ہونے لگے تو ہم لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ بھائی! آج مغرب کے بعد کی اوابین کہاں گئی؟ ہم نے کہا کہ حضرت، وہ تو آج رہ گئی۔ چونکہ راستے میں جلدی تھی، اس لئے نہیں پڑھ سکے، حضرت والا نے فرمایا کہ رہ گئیں، اور بغیر کسی معاوضے کے رہ گئیں، ہم نے کہا کہ حضرت چونکہ لوگ انتظار میں تھے، جلدی پہنچنا تھا، اس عذر کی وجہ سے اوابین کی نماز رہ گئی۔ حضرت نے فرمایا کہ الحمد للہ، جب میں نے عشاء کی نماز پڑھی، تو عشاء کی نماز کے ساتھ جو نوافل پڑھا کرتا ہوں ان کے علاوہ مزید چھ رکعتیں پڑھ لیں، اب اگرچہ وہ نوافل اوابین نہ ہوں۔ اس لئے کہ اوابین کا وقت تو مغرب کے بعد ہے۔ لیکن یہ سوچا کہ وہ چھ رکعتیں جو پڑھ کر اوابین کی تلافی کر لی ہے۔ اب تم جانو، تمہارا کام۔ پھر فرمایا کہ تم مولوی ہو، یہ کہو گے کہ نوافل کی قضا ہوتی ہے۔ سنت اور نفل

کی قضا نہیں ہوتی، آپ نے اوابین کی قضا کیسے کرلی؟ تو بھائی تم نے وہ حدیث پڑھی ہے جس میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر تم کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جاؤ، تو جب درمیان میں یاد آ جائے تو اس وقت پڑھ لو، اور اگر آخر میں یاد آ جائے۔ اس وقت پڑھ لو۔ اب دعا پڑھنا کوئی فرض و واجب تو تھا نہیں۔ پھر آپ نے یہ کیوں فرمایا کہ بعد میں پڑھ لو۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک نفل اور مستحب کام جو ایک نیکی کا کام تھا اور جس کے ذریعہ نامہ اعمال میں اضافہ ہوسکتا تھا۔ وہ اگر کسی وجہ سے چھوٹ گیا تو اس کو بالکلیہ مت چھوڑو، دوسرے وقت کرلو۔ اب چاہے اس کو "قضا" کہو یا نہ کہو۔ لیکن اس نفل کام کی تلافی ہو جائے۔

یہی باتیں بزرگوں سے سیکھنے کی ہوتی ہیں، اس دن حضرت والا نے ایک عظیم باب کھول دیا۔ ہم لوگ واقعی یہی سمجھتے تھے، اور فقہ کی اندر لکھا ہے کہ نوافل کی قضا نہیں ہوتی، لیکن اب معلوم ہوا ٹھیک ہے، قضا تو نہیں ہوسکتی، لیکن تلافی تو ہوسکتی ہے۔ اسلئے کہ اس نفل کے چھوٹنے کی وجہ سے نقصان ہو گیا نیکیاں تو گئیں، لیکن بعد میں جب اللہ تعالیٰ فراغت کی نعمت عطا فرمائے۔ اس وقت اس نفل کو ادا کرلو۔

دسترخوان اٹھاتے وقت کی دعا

"عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا رَفَعَ مَائِدَتَهٗ قَالَ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَکًا فِیْهِ غَیْرَ مَکْفِیٍّ وَّلَا مُوَدَّعٍ وَّلَا مُسْتَغْنًی عَنْهُ رَبَّنَا)) (۱)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب دسترخوان اٹھتا تو حضور اقدس ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَکًا فِیْهِ غَیْرَ مَکْفِیٍّ وَّلَا مُوَدَّعٍ وَّلَا مُسْتَغْنًی عَنْهُ رَبَّنَا))

یہ عجیب وغریب دعا حضور اقدس ﷺ نے تلقین فرمائی، اس کی تلقین اس لئے فرمائی کہ انسان کا بھی عجیب مزاج ہے، وہ یہ کہ جب انسان کو کسی چیز کی شدید خواہش اور حاجت پوری ہو جائے، اور اس سے دل بھر جائے تو پھر اسی چیز سے اس کو نفرت ہونے لگتی ہے مثلاً جس انسان کو بھوک لگتی ہے تو اس وقت اس کو کھانے کی طرف رغبت اور شوق تھا۔ اور کھانے کی طرف طبیعت مائل ہو رہی تھی، لیکن جب پیٹ بھر گیا اور بھوک مٹ گئی تو اس کے بعد اگر وہی کھانا دوبارہ لایا جائے، تو طبیعت اسی سے نفرت

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاطعمة، باب مایقول اذافرغ من طعامه، رقم: ۵۴۵۸

کرتی ہے اور بعض اوقات کھانے کے تصور سے متلی آنے لگتی ہے۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ نے اس دعا کے ذریعے یہ تعلیم دی کہ یہ تمہارے دل میں کھانے کی نفرت پیدا ہو رہی ہے۔ اس نفرت کے نتیجے میں کہیں اللہ کے رزق کی ناقدری اور ناشکری نہ ہو جائے، اس لئے آپ نے یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ اس وقت یہ دسترخوان ہم اپنے سامنے سے اٹھا تو رہے ہیں، لیکن اس وجہ سے نہیں اٹھا رہے ہیں کہ ہمارے دل میں اس کی قدر نہیں بلکہ اسی کھانے نے ہماری بھوک بھی مٹائی، اور اسی کھانے کے ذریعہ ہمیں لذت بھی حاصل ہوئی، اور نہ اس وجہ سے اٹھا رہے ہیں کہ ہم اس سے مستغنی اور بے نیاز ہیں، اے اللہ ہم اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ دوبارہ ہمیں اس کی ضرورت اور حاجت پیش آئے گی۔ دسترخوان اٹھاتے وقت یہ دعا کرلو، تاکہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی ناقدری نہ ہو، اور دوسری اس بات کی دعا بھی ہو جائے کہ یا اللہ، ہمیں دوبارہ یہ رزق عطا فرمائیے۔

کھانے کے بعد کی دعا پڑھ کر گناہ معاف کرالیں

عَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَكَلَ طَعَامًا فَقَالَ ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنِيْ هٰذَا وَرَزَقَنِيْهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِّنِّيْ وَلَا قُوَّةٍ غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) (۱)

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کھانا کھانے کے بعد اگر یہ الفاظ کہے: اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا، اور میری طاقت اور قوت کے بغیر یہ کھانا مجھے عطا فرمایا۔ اس کے یہ کہنے سے اللہ تعالیٰ اس کے تمام پچھلے گناہ معاف فرمادیتے ہیں۔

اب آپ اندازہ لگائیں کہ یہ چھوٹا سا عمل ہے، لیکن اس کا اجر و ثواب یہ ہے کہ تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کا کتنا بڑا کرم ہے۔

عمل چھوٹا، ثواب عظیم

یہ بات میں پہلے بھی کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ جہاں کہیں احادیث میں یہ آتا ہے کہ فلاں عمل سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس سے مراد صغیرہ گناہ ہوتے ہیں اور کبیرہ گناہوں کے بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ وہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے، اسی طرح حقوق العباد بھی صاحب حق کے معاف

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات، باب مایقول اذا فرغ من الطعام، رقم: ۳۴۵۴

کئے بغیر معاف نہیں ہوتے، لیکن اللہ تعالیٰ صغیرہ گناہوں کو نیک عمل کے ذریعہ بھی معاف فرما دیتے ہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص کھانا کھانے کے بعد یہ دعا پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام صغیرہ گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ اور وہ آدمی صغیرہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے، یہ اتنا چھوٹا سا عمل ہے، لیکن اس پر ثواب اتنا عظیم ہے، حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہم سب کو نسخہ کیمیا بتا گئے، اب چاہے اس دعا کو آدمی زور سے پڑھے، یا ہلکی آواز سے پڑھے یا دل میں پڑھ لے تو بھی شکر کی نعمت حاصل ہو جاتی ہے، اور آدمی اس نعمت کا مستحق ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان آداب پر ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

کھانے کے اندر عیب مت نکالو

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: مَا عَابَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ طَعَامًا قَطُّ، اِنِ اشْتَهَاهُ اَکَلَهٗ، وَاِنْ کَرِهَهٗ تَرَکَهٗ" (۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ اور کسی کھانے کی برائی نہیں کی، اگر اس کے کھانے کی خواہش ہوتی تو کھا لیتے، اور اگر کھانے کی خواہش نہ ہوتی تو اس کو چھوڑ دیتے۔

یعنی اگر کھانا پسند نہیں ہے تو اس کو نہیں کھایا، مگر اس کی برائی بیان نہیں کرتے تھے، اس لئے کہ جو کھانا ہے، وہ چاہے ہمیں پسند آ رہا ہو، یا پسند نہ آ رہا ہو، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ رزق ہے، اور اللہ کے عطا کئے ہوئے رزق کا احترام اور اس کی تعظیم ہمارے ذمے واجب ہے۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

یوں تو اس کائنات میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت اور مصلحت کے بغیر پیدا کی ہو، اس کائنات میں ہر چیز اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت پیدا فرمائی ہے، ہر چیز کا کوئی نہ کوئی عمل اور فائدہ ضرور ہے، اقبال مرحوم نے خوب کہا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأطعمة، باب ما عاب النبی طعاما، رقم: ٤٨٧٨، صحیح مسلم، کتاب الأشربة، باب لایعیب الطعام، رقم: ٣٨٤٤، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله باب ما جاء فی ترك العیب للنعمة، رقم: ١٩٥٤، سنن أبی داؤد، کتاب الأطعمة، باب فی کراهیة ذم الطعام، رقم: ٣٢٧١، سنن ابن ماجه، کتاب الاطعمة باب النهی ان یعاب الطعام، رقم: ٣٤٥٠، مسند أحمد، رقم: ٩١٤٢

نہیں کوئی چیز نکمی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں کوئی چیز بری پیدا نہیں فرمائی، تکوینی اعتبار سے سب اچھی ہیں۔ ہر ایک کے اندر کوئی نہ کوئی تکوینی مصلحت ضرور ہے، البتہ جب ہمیں کسی چیز کی حکمت اور مصلحت کا پتہ نہیں لگتا تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ چیز بری ہے، ورنہ حقیقت میں کوئی چیز بری نہیں۔ حتیٰ کہ وہ مخلوقات جو بظاہر موذی اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً سانپ بچھو ہیں۔ ان کو ہم اس لئے برا سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات یہ ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ لیکن کائنات کے مجموعی انتظام کے لحاظ سے ان میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت ضرور ہے۔ ان میں فائدہ موجود ہے۔ چاہے ہمیں پتہ چلے یا نہ چلے۔

ایک بادشاہ ایک مکھی

ایک بادشاہ کا قصہ لکھا ہے کہ وہ ایک دن اپنے دربار میں بڑے شان و شوکت سے بیٹھا ہوا تھا، ایک مکھی آکر اس کی ناک پر بیٹھ گئی، اس بادشاہ نے اس کو اڑا دیا، وہ پھر آکر بیٹھ گئی، اس نے دوبارہ اڑایا، وہ پھر آکر بیٹھ گئی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض مکھیاں بہت لیچڑ قسم کی ہوتی ہیں، ان کو کتنا ہی اڑالو، وہ دوبارہ آکر بیٹھ جاتی ہیں۔ وہ بھی اس قسم کی تھی، بادشاہ نے اس وقت کہا کہ خدا جانے یہ مکھی اللہ تعالیٰ نے کیوں پیدا کی؟ یہ تو تکلیف ہی تکلیف پہنچا رہی ہے، اس کا کوئی فائدہ تو نظر نہیں آتا، اس وقت دربار میں ایک بزرگ موجود تھے۔ ان بزرگ نے اس بادشاہ سے کہا کہ اس مکھی کا فائدہ تو یہ ہے کہ تم جیسے جابر اور متکبر انسانوں کے دماغ درست کرنے کے لئے پیدا کی ہے، تم اپنی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا کہ تم کتنے عاجز ہو کہ اگر ایک مکھی تمہیں ستانا چاہے تو تمہارے اندر اتنی بھی طاقت نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اس کی تکلیف سے بچالو، اس کی پیدائش کی یہی حکمت اور مصلحت کیا کم ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کسی مصلحت اور حکمت کے تحت پیدا کی ہے۔

ایک بچھو کا واقعہ

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ مشہور بزرگ اور علم کلام کے ماہر گزرے ہیں۔ جنہوں نے "تفسیر کبیر" کے نام سے قرآن کی مشہور تفسیر لکھی ہے۔ اس تفسیر میں صرف سورہ فاتحہ کی تفسیر دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس تفسیر میں سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت۔ "الحمدللہ رب العالمین" کی تفسیر کے تحت ایک واقعہ لکھا ہے کہ میں نے ایک بزرگ سے خود ان کا اپنا واقعہ سنا، وہ بغداد میں رہتے تھے۔ وہ بزرگ فرماتے ہیں کہ ایک دن شام کو سیر کرنے کے لئے "دریائے دجلہ" کے کنارے کی طرف چلا گیا، جب میں دریائے

دجلہ کے کنارے کنارے چلنے لگا تو میں نے دیکھا کہ میرے آگے ایک بچھو چلا جا رہا ہے میرے دل میں خیال آیا کہ یہ بچھو بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کسی نہ کسی حکمت اور مصلحت کے تحت ہی پیدا کیا ہے، اب اس وقت پتہ نہیں کہاں سے آرہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اس کی منزل کیا ہے؟ وہاں جا کر کیا کرے گا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ میرے پاس تو وقت ہے، میں سیر کے لئے نکلا ہوں، آج میں اس بچھو کا تعاقب کرتا ہوں کہ یہ کہاں جاتا ہے چنانچہ وہ بچھو آگے آگے چلتا رہا۔ اور چلتے چلتے اس نے پھر دریا کی طرف رخ کیا اور کنارے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں بھی قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ دریا میں ایک کچھوا تیرتا ہوا آرہا ہے، وہ کچھوا آکر کنارے لگ گیا اور یہ بچھو چھلانگ لگا کر اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دریا عبور کرنے کے لئے کشتی بھیج دی۔ چنانچہ وہ کچھوا اس کو اپنی پیٹھ پر سوار کر کے روانہ ہو گیا، چونکہ میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ آج میں یہ دیکھوں گا کہ بچھو کہاں جا رہا ہے، اس لئے میں نے بھی کشتی کرائے پر لی اور اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس کچھوے نے دریا پار کیا، اور جا کر اسی طرح دوسرے کنارے جا کر لگ گیا، اور بچھو چھلانگ لگا کر اتر گیا۔ اب بچھو آگے چلا اور میں نے اس کا پھر تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ آگے میں نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک درخت کے نیچے سو رہا ہے، میرے دل میں خیال آیا کہ شاید یہ بچھو اس آدمی کو کاٹنے جا رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں جلدی سے اس آدمی کو بیدار کر دوں، تا کہ وہ شخص اس بچھو سے بچ جائے۔ لیکن جب میں اس آدمی کے قریب گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک زہریلا سانپ اپنا پھن اٹھائے اس آدمی کے سر کے پاس کھڑا ہے، اور قریب ہے کہ وہ سانپ اس کو ڈس لے، اتنے میں یہ بچھو تیزی کے ساتھ سانپ کے اوپر سوار ہو گیا، اور اس کو ایک ایسا ڈنک مارا کہ وہ سانپ بل کھا کر زمین پر گر پڑا، اور تڑپنے لگا، پھر وہ بچھو وہاں سے کسی اور منزل پر روانہ ہو گیا، اچانک اس وقت اس سونے والے شخص کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا کہ قریب سے ایک بچھو جا رہا ہے، اس نے فوراً ایک پتھر اٹھا کر اس بچھو کو مارنے کے لئے دوڑا، میں قریب ہی کھڑا ہوا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس لئے میں نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے کہا کہ تم جس بچھو کو مارنے جا رہے ہو یہ تمہارا محسن ہے، اور اس نے تمہاری جان بچائی ہے، حقیقت میں یہ سانپ جو یہاں مرا پڑا ہے، تم پر حملہ کرنے والا تھا، اور قریب تھا کہ ڈنک مار کر تمہیں موت کے گھاٹ اتار دے، لیکن اللہ تعالیٰ نے بہت دور سے اس بچھو کو تمہاری جان بچانے کے لئے بھیجا ہے، اور اب تم اسی بچھو کو مارنے کی کوشش کر رہے ہو۔ وہ بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے اس روز اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا یہ کرشمہ دیکھا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اس بچھو کو دریا کے دوسرے کنارے سے اس شخص کی جان بچانے کے لئے یہاں لائے۔ بہر حال، دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے پیدا کرنے میں کوئی نہ کوئی تکوینی حکمت اور مصلحت نہ ہو۔ (۱)

---

(۱) التفسير الكبير، تفسير سورة الفاتحة

نجاست میں پیدا ہونے والے کیڑے

ایک اور قصہ دیکھا، معلوم نہیں کہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو بڑی عبرت کا واقعہ ہے، وہ یہ کہ ایک صاحب ایک دن قضائے حاجت کر رہے تھے، قضاء حاجت میں ان کو سفید کیڑے نظر آئے۔ جو بعض اوقات پیٹ کے اندر پیدا ہو جاتے ہیں ان صاحب کے دل میں یہ خیال آیا کہ اور جتنی مخلوق ہے ان سب کی پیدائش کی کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن یہ جاندار مخلوق، جو نجاست میں پیدا ہو جاتی ہے۔ نجاست کے ساتھ نکلتی ہے، اور نجاست کے ساتھ ہی بہادی جاتی ہے۔ اس کا کوئی عمل اور فائدہ ہی نظر نہیں آتا، پتہ نہیں اللہ تعالیٰ نے یہ مخلوق کس مصلحت سے پیدا کی ہے؟ کچھ عرصہ کے بعد ان صاحب کی آنکھ میں کچھ تکلیف ہوئی، اب تکلیف کے خاتمے کے لئے سارے علاج کر لئے۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہو، آخر میں ایک پرانا کوئی طبیب تھا۔ اس کے پاس جا کر بتایا کہ یہ تکلیف ہے۔ اس کا کیا علاج ہے؟ اس طبیب نے بتایا کہ اس کا کوئی اور علاج نہیں ہے۔ البتہ ایک علاج ہے جو کبھی کبھی کارآمد ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان کے جسم میں جو کیڑے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کیڑوں کو پیس کر اگر لگایا جائے تو اس کے ذریعہ سے بعض اوقات یہ بیماری دور ہو جاتی ہے، اس وقت میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اب میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ آپ نے ان کیڑوں کو کس مصلحت سے پیدا کیا ہے۔

غرض کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جس کی کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر چیز کے فوائد اور حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، بالکل اسی طرح جو کھانا آپ کو پسند نہیں ہے، اس کے کھانے کو طبیعت نہیں چاہتی، لیکن اس کی پیدائش میں کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت ضرور ہے اور کم از کم یہ بات موجود ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا رزق ہے اور اس کا احترام کرنا ضروری ہے۔ اس لئے اگر کوئی کھانا پسند نہیں ہے تو اس کو مت کھاؤ لیکن اس کو برا بھی مت کہو۔ بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب کھانا پسند نہیں آیا اس میں عیب نکالنے شروع کر دیتے ہیں کہ اس میں یہ خرابی ہے۔ یہ تو بدذائقہ ہے۔ ایسی باتیں کہنا درست نہیں۔

رزق کی ناقدری مت کرو

یہ بھی حضور اقدس ﷺ کی بڑی اعلیٰ درجے کی تعلیم ہے کہ اللہ کے رزق کا احترام کرو، اس کا ادب کرو، اس کی بے ادبی نہ کرو، آج کل ہمارے معاشرے میں یہ اسلامی ادب بری طرح پامال ہو رہا ہے۔ ہر چیز میں غیروں کی نقالی شروع کی تو اس میں بھی ایسا ہی کیا۔ اور اللہ کے رزق کا کوئی ادب باقی

نہیں رہا، کھانا بچا تو اس کو اٹھا کر کوڑے میں ڈال دیا، بعض اوقات دیکھ کر دل لرزتا ہے، یہ سب مسلمانوں کے گھروں میں ہو رہا ہے، خاص طور پر دعوتوں میں اور ہوٹلوں میں غذاؤں کے بڑے بڑے ڈھیر اس طرح کوڑے میں ڈال دیئے جاتے ہیں، حالانکہ ہمارے دین کی تعلیم یہ ہے کہ اگر روٹی کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی کہیں پڑا ہوا ہو تو اس کی بھی تعظیم کرو، اس کا بھی ادب کرو، اور اس کو اٹھا کر کسی اونچی جگہ رکھ دو۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور رزق کی قدر

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بیمار ہوئے۔ اس دوران ایک صاحب نے آپ کو پینے کے لئے دودھ لا کر دیا، آپ نے وہ دودھ پیا، اور تھوڑا سا بچ گیا، وہ بچا ہوا دودھ آپ نے سرہانے کی طرف رکھ دیا، اتنے میں آپ کی آنکھ لگ گئی۔ جب بیدار ہوئے تو ایک صاحب جو پاس کھڑے تھے ان سے پوچھا کہ بھائی وہ تھوڑا سا دودھ بچ گیا تھا، وہ کہاں گیا؟ تو اُن صاحب نے کہا کہ حضرت وہ تو پھینک دیا ہے ایک گھونٹ ہی تو تھا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تم نے اللہ کی اس نعمت کو پھینک دیا۔ تم نے بہت غلط کام کیا، اگر میں اس دودھ کو نہیں پی سکا، تم خود پی لیتے، کسی اور کو پلا دیتے، یا بلی کو پلا دیتے، یا طوطے کو پلا دیتے۔ اللہ کی کسی مخلوق کے کام آ جاتا، تم نے اس کو کیوں پھینکا؟ اور پھر ایک اصول، بیان فرما دیا:

> ''جن چیزوں کی زیادہ مقدار سے انسان اپنی عام زندگی میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ ان کی تھوڑی مقدار کی قدر اور تعظیم اس کے ذمہ واجب ہے''

مثلاً کھانے کی بڑی مقدار کو انسان کھاتا ہے، اس سے اپنی بھوک مٹاتا ہے، اپنی ضرورت پوری کرتا ہے، لیکن اگر اسی کھانے کا تھوڑا سا حصہ بچ جائے تو اس کا احترام اور توقیر بھی اس کے ذمہ واجب ہے، اس کو ضائع کرنا جائز نہیں، یہ اصل بھی درحقیقت اسی حدیث سے ماخوذ ہے کہ اللہ کے رزق کی ناقدری مت کرو، اس کو کسی نہ کسی مصرف میں لے آؤ۔

دستر خوان جھاڑنے کا صحیح طریقہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے دارالعلوم دیوبند میں ایک استاد تھے۔ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ''حضرت میاں صاحب'' کے نام سے مشہور تھے، بڑے عجیب و غریب بزرگ تھے، ان کی باتیں سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے

ہیں کہ ایک مرتبہ میں ان کی خدمت میں گیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ کھانے کا وقت ہے۔ آؤ کھانا کھالو، میں ان کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو میں نے دستر خوان کو صاف کرنا شروع کیا، تا کہ میں جا کر دستر خوان جھاڑ دوں، تو حضرت صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا: کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا کہ حضرت دستر خوان جھاڑنے جا رہا ہوں۔ حضرت میاں صاحب نے پوچھا کہ دستر خوان جھاڑنا آتا ہے؟ میں نے کہا کہ حضرت دستر خوان جھاڑنا کونسا فن یا علم ہے، جس کے لئے باقاعدہ تعلیم کی ضرورت ہو، باہر جا کر جھاڑ دوں گا۔ حضرت میاں صاحب نے فرمایا کہ اسی لئے تو میں نے تم سے پوچھا تھا کہ دستر خوان جھاڑنا آتا ہے یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ تمہیں دستر خوان جھاڑنا نہیں آتا۔ میں نے کہا پھر آپ سکھا دیں، فرمایا کہ ہاں دستر خوان جھاڑنا بھی ایک فن ہے۔

پھر آپ نے اس دستر خوان کو دوبارہ کھولا اور اس دستر خوان پر جو بوٹیاں یا بوٹیوں کے ذرات تھے، ان کو ایک طرف کیا۔ اور ہڈیوں کو جن پر کچھ گوشت وغیرہ لگا ہوا تھا، ان کو ایک طرف کیا، اور روٹی کے ٹکڑوں کو ایک طرف کیا، اور روٹی کے جو چھوٹے چھوٹے ذرات تھے، ان کو ایک طرف جمع کیا، پھر مجھ سے فرمایا کہ دیکھو۔ یہ چار چیزیں ہیں، اور میرے یہاں ان چاروں چیزوں کی علیحدہ علیحدہ جگہ مقرر ہے، یہ بوٹیاں ہیں ان کی فلاں جگہ ہے، بلی کو معلوم ہے کھانے کے بعد اس جگہ بوٹیاں رکھی جاتی ہیں، وہ آکر ان کو کھا لیتی ہے، اور ان ہڈیوں کے لئے فلاں جگہ مقرر ہے، محلے کے کتوں کو وہ جگہ معلوم ہے۔ وہ آکر ان کو کھا لیتے ہیں، اور یہ جو روٹیوں کے ٹکڑے ہیں، ان کو میں اس دیوار پر رکھتا ہوں، یہاں پرندے، چیل، کوے آتے ہیں، اور وہ ان کو اٹھا لیتے ہیں، اور یہ جو روٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرات ہیں، تو میرے گھر میں چونٹیوں کا بل ہے، ان کو اس بل کے پاس رکھ دیتا ہوں، وہ چونٹیاں اس کو کھا لیتی ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا رزق ہے۔ اس کا کوئی حصہ ضائع نہیں جانا چاہیے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس دن ہمیں معلوم ہوا کہ دستر خوان جھاڑنا بھی ایک فن ہے اور اس کو بھی سیکھنے کی ضرورت ہے۔

آج ہمارا حال

آج ہمارا یہ حال ہے کہ دستر خوان کو جا کر کوڑے دان کے اندر جھاڑ دیا، اللہ کے رزق کے احترام کا کوئی اہتمام نہیں، ارے یہ ساری اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہیں۔ جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ رزق پیدا کیا، اگر تم نہیں کھا سکتے تو کسی اور مخلوق کے لئے اس کا احترام کرو، اگر کہیں روٹی کا ٹکڑا نظر آتا تو اس کو چوم کر ادب کے ساتھ اونچی جگہ پر رکھ دیتے، لیکن جوں جوں مغربی تہذیب کا غلبہ ہمارے معاشرے پر بڑھ رہا ہے، رفتہ رفتہ اسلامی آداب رخصت ہو رہے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کھانا پسند آئے

تو کھالو، اور اگر پسند نہ آئے تو کم از کم اس میں عیب مت نکالو، اس کی ناقدری اور بے حرمتی مت کرو، اس سنت کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے، یہ سب باتیں کوئی قصہ کہانی یا کوئی افسانہ نہیں ہے، بلکہ یہ سب باتیں عمل کرنے کے لئے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے رزق کا ادب اور اس کی تعظیم کریں، اور ان آداب کو اپنائیں جو نبی کریم ﷺ نے ہمیں سکھائے اور جو ہمارے دین کا حصہ ہیں۔ جو ہمارے دین کا طرہ امتیاز ہیں۔ اور یہ جو مغرب نے بلائیں ہم پر نازل کی ہیں۔ ان سے چھٹکارہ حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

سرکہ بھی ایک سالن ہے

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَئَلَ اَهْلَهُ الْاَدَمَ فَقَالُوْا: مَا عِنْدَنَا اِلَّا خَلٌّ فَدَعَا بِهٖ، فَجَعَلَ يَاْكُلُ وَيَقُوْلُ: ((نِعْمَ الْاَدَمُ الْخَلُّ، نِعْمَ الْاَدَمُ الْخَلُّ))(۱)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم ﷺ گھر میں تشریف لے گئے اور گھر والوں سے فرمایا کہ کچھ سالن ہو تو لے آؤ۔ (روٹی موجود تھی) گھر والوں نے کہا ہمارے پاس تو سرکے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، سرکہ رکھا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہی لے آؤ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے اس سرکے کو روٹی کے ساتھ تناول فرمانا شروع کیا اور ساتھ میں بار بار یہ فرماتے جاتے کہ سرکہ بڑا اچھا سالن ہے، سرکہ بڑا اچھا سالن ہے۔

آپ ﷺ کے گھر کی حالت

حضور اقدس ﷺ کے گھر کا یہ حال تھا کہ کوئی سالن موجود نہیں، حالانکہ روایات میں آتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ سال کے شروع میں تمام ازواج مطہرات کے پاس پورے سال کا نان نفقہ اور خرچہ بھیج دیا کرتے تھے۔ لیکن وہ ازواج بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج تھیں۔ ان کے یہاں صدقات، خیرات اور دوسرے مصارف کی اتنی کثرت تھی کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بسا اوقات تین تین مہینے تک ہمارے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ دو چیزوں پر ہمارا گزارا ہوتا تھا کہ کھجور کھا

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب فضیلة الخل و التأدم به، رقم:۳۸۲۳، سنن الترمذی، کتاب الاطعمة عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی الخل، رقم:۱۷٦۲، سنن النسائی، کتاب الایمان والنذور، باب اذا حلف أن لا یأتدم فأکل خبزا بخل، رقم:۳۷۳٦، سنن ابی داود، کتاب الأطعمة، باب فی الخل، رقم:۳۳۲٤، سنن ابن ماجه، کتاب الاطعمة، باب الائتدام بالخل، رقم:۳۳۰۷، مسند أحمد، رقم:۱۳۷٤۲

لی اور پانی پی لیا۔(۱)

حضور ﷺ نعمت کی قدر فرماتے تھے

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس ﷺ کو جو نعمت میسر آجاتی اس کی قدر فرماتے، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرماتے، حالانکہ عام معاشرے میں سرکہ کو بطور سالن کے استعمال نہیں کیا جاتا۔ بلکہ زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے لوگ سرکے کو سالن کے ساتھ ملا کر کھاتے ہیں، لیکن حضور اقدس ﷺ نے اسی سرکے سے روٹی تناول فرمائی اور ساتھ ساتھ اس کے اتنی تعریف فرمائی کہ بار بار آپ نے فرمایا کہ یہ بڑا اچھا سالن ہے یہ بڑا اچھا سالن ہے۔

کھانے کی تعریف کرنی چاہئے

اسی حدیث کے تحت حضرات محدثین نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اس نیت سے سرکہ استعمال کرے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس کو تناول فرمایا اور اس کی تعریف فرمائی، تو انشاء اللہ، اس نیت کی وجہ سے اس کو سرکہ کھانے پر بھی ثواب ملے گا۔

اس حدیث سے دوسرا مسئلہ یہ نکلتا ہے کہ جو کھانا آدمی کو پسند آئے، اس کو چاہئے کہ وہ اس کھانے کی کچھ تعریف بھی کرے، تعریف کرنے کا مقصد تو اس کھانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ کھانا عنایت فرمایا، دوسرے یہ کہ جس نے وہ کھانا تیار کیا ہے، اس تعریف کے ذریعہ اس کا دل خوش ہو جائے۔ یہ بھی کھانے کے آداب میں سے ہے، یہ نہ ہو کہ کھانے کے ذریعہ پیٹ کی بھوک مٹائی۔ اور زبان کا چٹخارہ بھی پورا کیا۔ حضور اقدس ﷺ کو دیکھئے کہ آپ نے سرکے کی اتنی تعریف فرمائی، لہٰذا جب کھانے پکانے والے نے محنت کی، اور اپنے آپ کو آگ اور چولھے کے سامنے پیش کر کے تمہارے لئے کھانا تیار کیا اس کا اتنا تو حق ادا کرو کہ دو کلمے بول کر اس کی تعریف کر دو، اور اس کی ہمت افزائی کر دو، جو شخص تعریف کے دو کلمے بھی ادا نہ کرے، وہ بڑا بخیل ہے۔

پکانے والے کی تعریف کرنی چاہئے

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ اپنا یہ واقعہ سنایا کہ ایک صاحب میرے پاس

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الهنة وفضلها والتحريض عليها، رقم:۲۳۷۹، صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب، رقم:۵۲۸۰، سنن الترمذی كتاب صفه القيامة والرقائق عن رسول الله، باب منه، رقم:۲۳۹۵، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب معيشة آل محمد، رقم:۴۱۳۴، مسند أحمد رقم:۲۳۰۹۹

آیا کرتے تھے، وہ اور ان کی بیوی دونوں نے اصلاحی تعلق بھی قائم کیا ہوا تھا۔ ایک دن انہوں نے اپنے گھر پر میری دعوت کی، میں چلا گیا، اور جا کر کھانا کھالیا۔ کھانا بڑا لذیذ اور بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی ہمیشہ کی یہ عادت تھی کہ جب کھانے سے فارغ ہوتے تو اس کھانے کی اور کھانا بنانے والی خاتون کی تعریف ضرور کرتے، تاکہ اس پر اللہ کا شکر بھی ادا ہو جائے، اور اس خاتون کا دل بڑھ جائے۔ چنانچہ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو وہ خاتون پردے کے پیچھے آ گئیں، اور آ کر حضرت والا کو سلام کیا، تو حضرت والا نے فرمایا کہ تم نے بڑا لذیذ اور بہت اچھا کھانا پکایا۔ کھانے میں بڑا مزہ آیا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ کہا تو پردے کے پیچھے سے اس خاتون کے رونے اور سسکیاں لینے کی آواز آئی۔ میں حیران ہو گیا کہ معلوم نہیں میری کس بات سے ان کو تکلیف ہوئی، اور ان کا دل ٹوٹا۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟ ان خاتون نے بمشکل اپنے رونے پر قابو پاتے ہوئے کہا کہ حضرت مجھے ان (شوہر) کے ساتھ رہتے ہوئے چالیس سال ہو گئے ہیں، لیکن اس پورے عرصے میں ان کی زبان سے میں نے یہ جملہ نہیں سنا کہ "آج کھانا بڑا اچھا پکا ہے" آج جب آپ کی زبان سے یہ جملہ سنا تو مجھے رونا آ گیا۔ چونکہ وہ صاحب حضرت والاؒ کے زیر تربیت تھے۔ اس لئے حضرت والا نے ان سے فرمایا کہ خدا کے بندے، ایسا بھی کیا بخل کرنا کہ آدمی کسی کی تعریف میں دو لفظ نہ کہے، جس سے اس کے دل کو خوش ہو جائے۔ لہٰذا کھانے کے بعد اس کھانے کی تعریف اور اس کے پکانے والے کی تعریف کرنی چاہئے، تاکہ اس کھانے پر اللہ کا شکر بھی ادا ہو جائے اور کھانا بنانے والے کا دل بھی خوش ہو جائے۔

ہدیہ کی تعریف کیجئے

عام طور پر تو لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب ان کو ہدیہ پیش کیا جائے تو وہ تکلف کہتے ہیں کہ بھائی، اس ہدیہ کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے بے کار میں تکلیف کیا۔ لیکن ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ جب حضرت کے بے تکلف احباب میں سے کوئی محبت کے ساتھ ان کی خدمت میں ہدیہ پیش کرتا، تو حضرت والا تکلف نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ اس ہدیہ کی طرف بہت اشتیاق کا اظہار فرماتے، اور یہ کہتے بھائی، تم تو ایسی چیز لے آئے جس کی ہمیں ضرورت تھی۔

ایک مرتبہ میں حضرت والا کی خدمت میں ایک کپڑا لے گیا، اور مجھے اس بات کا تصور بھی نہیں تھا کہ حضرت والا اس پر اتنی خوشی کا اظہار فرمائیں گے۔ چنانچہ جب میں نے وہ پیش کیا تو حضرت والا نے فرمایا کہ ہمیں ایسے کپڑے کی ضرورت تھی۔ ہم تو اس کی تلاش میں تھے، اور فرمایا کہ جس رنگ کا کپڑا لائے ہو، یہ رنگ تو ہمیں بہت پسند ہے اور یہ کپڑا بھی، محبت سے ہدیہ لے کر آیا ہے تو کم از کم اتنی

تعریف تو اس کی کرو کہ اس محبت کی قدر دانی ہو جائے اور اس کا دل خوش ہو جائے کہ جو چیز میں نے ہدیہ میں پیش کی، وہ پسند آ گئی اور یہ جو حدیث شریف میں ہے:

((تَهَادُوْا تَحَابُّوْا)) (۱)

''آپس میں ہدیہ دیا کرو، اور اس کے ذریعہ محبت میں اضافہ کرو''

تو محبت میں اضافہ کا ذریعہ اس وقت ہوگا جب تم ہدیہ وصول کر کے اس پر پسندیدگی اور محبت کا اظہار کرو۔

بندوں کا شکریہ ادا کردو

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ)) (۲)

یعنی جو شخص انسانوں کا شکرادا نہیں کرتا۔ وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص بھی تمہارے ساتھ محبت اور اخلاص کا معاملہ کرے، اور اس کے ذریعہ سے تمہیں کوئی فائدہ پہنچے تو کم از کم زبان سے اس کا شکریہ ادا کردو، اور اس کی تعریف میں دو کلمے تو کہہ دو، یہ سنت ہے۔ اس لئے کہ یہ سب حضور اقدس ﷺ کی تعلیمات ہیں۔ اگر ہم ان طریقوں کو اپنالیں تو دیکھو کتنی محبتیں پیدا ہوتی ہیں اور تعلقات میں کتنی خوشگواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہ عداوتیں اور نفرتیں، یہ بغض اور یہ سب دشمنیاں ختم ہو جائیں گی۔ بشرطیکہ انسان حضور ﷺ کی تعلیمات پر ٹھیک ٹھیک عمل کرلے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

حضور کا سوتیلے بیٹے کو ادب سکھانا

عَنْ عَمْرِو بْنِ اَبِیْ سَلَمَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ: كُنْتُ غُلَامًا فِیْ حِجْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَتْ يَدِیْ تَطِيْشُ فِی الصَّحْفَةِ، فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((يَا غُلَامُ سَمِّ اللّٰهَ، وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ)) (۳)

---

(۱) مؤطا الإمام مالك، كتاب الجامع، باب ماجاء فی المهاجرة، رقم: ۱٤۱۳

(۲) سنن الترمذی، كتاب البر والصلة والآداب، باب ماجاء فی الشكر لمن أحسن إليك، رقم: ۱۸۷۸

(۳) صحيح البخاری، كتاب الأطعمة، باب التسمية على الطعام والأكل باليمين، رقم: ٤۹٥۷، صحيح مسلم، كتاب الأشربة، باب آداب الطعام والشراب وأحكامهما، رقم: ۳۷٦۷، سنن ابن ماجه، كتاب الأطعمة، باب الأكل باليمين، رقم: ۳۲٥۸

یہ حدیث پیچھے گزر چکی ہے حضرت عمرو بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یہ حضور اقدس ﷺ کے سوتیلے بیٹے تھے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا پہلے حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، ان کے انتقال کے بعد آنحضرت ﷺ حضرت نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تھا، اور یہ حضرت عمرو بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ حضرت ابوسلمہ کے بیٹے تھے، نکاح کے بعد یہ بھی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آگئے تھے، اس طرح یہ حضور اقدس ﷺ کے سوتیلے بیٹے بن گئے اور آنحضرت ﷺ کے زیر تربیت تھے، ایک مرتبہ جب میں حضور ﷺ کے ساتھ کھانے کے لئے بیٹھا، تو کھانے کے دوران میرا ہاتھ کھانے کے برتن میں چاروں طرف حرکت کرتا تھا۔ ایک نوالہ اس طرف سے کھالیا، دوسرا نوالہ اس طرف سے کھالیا۔ تیسرے نوالہ کسی اور طرف سے کھالیا، اور جب حضور اقدس ﷺ نے میری یہ حرکت دیکھی تو آپ نے فرمایا:

"اے لڑکے، کھانا شروع کرنے سے پہلے اللہ کا نام لو، بسم اللہ پڑھو، اور داہنے ہاتھ سے کھاؤ، اور اپنے سامنے سے کھاؤ"

یعنی برتن کا جو حصہ تمہارے سامنے ہے، اس سے کھاؤ۔

اپنے سامنے سے کھانا ادب ہے

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے تین آداب بیان فرمائے:

پہلا ادب یہ ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ۔ اس کے بارے میں پیچھے تفصیل سے بیان ہوگیا۔

دوسرا ادب یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے کھاؤ۔ اس کا بیان بھی پیچھے آچکا ہے۔

تیسرا ادب یہ بیان فرمایا کہ اپنے سامنے سے کھاؤ، ادھر ادھر ہاتھ نہ لے جاؤ، اس ادب پر آنحضرت ﷺ نے بڑی تاکید فرمائی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو بالکل ظاہر ہے، وہ یہ کہ اگر انسان کھانا اپنے سامنے سے کھائے گا تو اس صورت میں اگر کھانے کا کچھ حصہ بچ جائے گا، تو وہ بدنما اور برا نہیں معلوم ہوگا، ورنہ اگر چاروں طرف سے کھائے گا، تو اس صورت میں جو کھانا بچ جائے گا، وہ بدنما ہو جائے گا، اور دوسرا آدمی اس کو کھانا چاہے گا تو اس کو کراہت ہوگی، جس کے نتیجے میں اس کھانے کو ضائع کرنا پڑے گا، اس لئے فرمایا کہ اپنے سامنے سے کھاؤ۔

کھانے کے درمیان میں برکت نازل ہوتی ہے

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کو جب کھانا سامنے رکھا جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کھانے کے وسط اور درمیان میں برکت نازل ہوتی ہے۔ (۱)

(۱) سنن الترمذي، كتاب الأطعمة، باب ماجاء في كراهية الأكل من وسط الطعام، رقم: ١٨٠٦

اب اگر اس کھانے کے درمیان ہی سے کھالیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کھانے کی برکت ختم ہوگئی، اس لئے اگر ایک طرف سے کھانا کھایا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ کی برکت زیادہ دیر تک برقرار رہے گی۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ برکت کیا چیز ہے؟ درمیان میں کس طرح نازل ہوتی ہے؟ یہ ساری باتیں ایسی ہیں، جن کو ہم اپنی محدود عقل سے نہیں سمجھ سکتے، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں۔ وہ جانیں اور ان کے رسول ﷺ جانیں، ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بس ہمیں تو یہ ادب سکھا دیا کہ اپنے سامنے سے کھاؤ ادھر ادھر سے مت کھاؤ۔

اگر مختلف اشیاء ہوں تو آگے ہاتھ بڑھا سکتے ہیں

لیکن یہ ادب اس وقت ہے، جب کھانا ایک قسم کا ہو۔ اگر برتن کے اندر مختلف انواع کی چیزیں رکھی ہیں۔ تو اس صورت میں اپنی مطلب کی چیز لینے کے لئے ہاتھ ادھر ادھر، دائیں بائیں کیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ حضرت عکراش بن زہیب رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضور اقدس ﷺ کسی جگہ دعوت میں تشریف لے جانے لگے تو آپ نے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ہمارے سامنے دسترخوان پر "ثرید" لایا گیا۔ "ثرید" اسے کہتے ہیں کہ روٹی کے ٹکڑے توڑ کر شوربے میں بھگو دیئے جاتے ہیں۔ پھر اس کو کھایا جاتا ہے۔ یہ کھانا حضور اقدس ﷺ کو بہت پسند تھا۔ اور آپ نے اس کی فضیلت بھی بیان فرمائی ہے کہ "ثرید" بڑا اچھا کھانا ہے۔(۱)

بہر حال، حضرت عکراش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے ثرید کھانا شروع کیا تو ایک کام تو یہ کیا کہ میں نے بسم اللہ نہیں پڑھی، ویسے ہی کھانا شروع کر دیا تو حضور اقدس ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ کھانے سے پہلے اللہ کا نام لو، اور بسم اللہ پڑھو۔ اس کے بعد دوسرا کام یہ کیا کہ میں کھانے کے دوران ایک نوالہ یہاں سے لیتا، دوسرا آگے سے لیتا۔ کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے نوالہ لیتا، جب حضور اقدس ﷺ نے میری یہ حرکت دیکھی تو آپ نے فرمایا:

((يَا عِكْرَاشُ! كُلْ مِنْ مَوْضِعٍ وَاحِدٍ، فَإِنَّهُ طَعَامٌ وَّاحِدٌ))

اے عکراش، اپنے سامنے سے کھانا کھاؤ، اس لئے کہ ایک ہی قسم کا کھانا ہے، چنانچہ میں نے ایک ہی جگہ سے کھانا شروع کر دیا، جب کھانے سے فارغ ہو گئے تو ہمارے سامنے ایک بڑا تھال لایا گیا، جس میں مختلف قسم کی کھجوریں تھیں۔ کوئی کسی رنگ کی، کوئی کسی رنگ کی، کوئی عمدہ، کوئی درمیانی،

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأطعمة، باب الثرید، رقم: ۴۹۹۸

کوئی تر، کوئی خشک، مثل مشہور ہے کہ دودھ کا جلا چھاچ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ چونکہ حضور اقدس ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تلقین فرمائی تھی، کہ اپنے سامنے سے کھانا چاہئے، اس لئے میں صرف اپنے سامنے کی کھجوریں کھاتا رہا، اور میں نے حضور اقدس ﷺ کو دیکھا کہ آپ کا ہاتھ کبھی یہاں جا رہا ہے، کبھی وہاں جا رہا ہے، جب حضور اقدس ﷺ نے دیکھا کہ میں ایک ہی جگہ سے کھا رہا ہوں، تو آپ نے فرمایا:

((یَا عِکْرَاشُ! کُلْ مِنْ حَیْثُ شِئْتَ، فَاِنَّهٗ غَیْرُ لَوْنٍ وَّاحِدٍ))

"اے عکراش، اب جہاں سے چاہو، کھاؤ۔ اس لئے کہ یہ کھجوریں مختلف قسم کی ہیں، اب مختلف جگہوں سے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں"(۱)

بہر حال اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے یہ ادب سکھا دیا کہ جب ایک قسم کا کھانا ہو تو اپنے سامنے سے کھانا چاہئے، اور جب مختلف قسم کے کھانے دسترخوان پر چنے ہوئے ہوں تو ادھر ادھر ہاتھ بڑھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

بائیں ہاتھ سے کھانا جائز نہیں

عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَکْوَعِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَجُلًا اَکَلَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِشِمَالِهٖ فَقَالَ((کُلْ بِیَمِیْنِکَ)) قَالَ: لَا اَسْتَطِیْعُ قَالَ:((لَا اسْتَطَعْتَ)) مَا مَنَعَهٗ اِلَّا الْکِبْرُ، فَمَا رَفَعَهَا اِلٰی فِیْهِ" (۲)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور اقدس ﷺ کے پاس بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے کھانا کھاؤ اس شخص نے جواب میں کہا کہ میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا (بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص منافق تھا، اور اس کے دائیں ہاتھ میں کوئی خرابی اور عذر بھی نہیں تھا، ویسے ہی اس نے جھوٹ بول دیا کہ میں نہیں کھا سکتا) اس لئے کہ بعض لوگوں کی طبیعت ایسی ہوتی ہے کہ وہ غلطی کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، بلکہ اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں، اسی طرح یہ شخص بھی بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا۔ حضور اقدس ﷺ نے ٹوکا، شاید اس کو حضور ﷺ کا ٹوکنا پسند نہیں آیا۔ اس لئے اس نے صاف کہہ دیا کہ میں

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الاطعمة عن رسول الله، باب ما جاء فی التسمیة فی الطعام رقم:۱۷۷۱، سنن ابن ماجه، کتاب الاطعمة، باب الاکل مما یلیك، رقم:۳۲۶۵

(۲) صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب آداب الطعام والشراب وأحکامهما، رقم:۳۷۶۶، مسند أحمد، رقم:۱۵۸۹۶

دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا، اور حضور ﷺ کے سامنے جھوٹ بول دیا۔ اور نبی کے سامنے جھوٹ بولنا، یا غلط بات کہنا اور بلا وجہ اپنی غلطی کو چھپانا اللہ تعالیٰ کو انتہائی ناپسند ہے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے اس کو بددعا دیتے ہوئے فرمایا:

((لَا اسْتَطَعْتَ))

تمہیں دائیں ہاتھ سے کھانے کی کبھی طاقت نہ ہو۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ اس کے بعد اس شخص کی یہ حالت ہوگئی کہ اگر کبھی اپنے دائیں ہاتھ کو منہ تک لے جانا بھی چاہتا تب بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ لینی چاہئے

اصول یہ ہے کہ اگر بشری تقاضے کے وجہ سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے، پھر وہ انسان ندامت اور شرمندگی کا اظہار کرے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں، لیکن غلطی ہو، اور پھر اس غلطی پر اصرار ہو، اور سینہ زوری ہو اور اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوششیں بھی کرے، اور پھر نبی کے سامنے جھوٹ بولے، یہ بڑا سنگین گناہ ہے۔

حضور اقدس ﷺ کا کسی کے حق میں بددعا کرنا شاذ و نادر ہی ثابت ہے۔ حتیٰ کہ آپ نے اپنے دشمنوں کے حق میں بددعا نہیں فرمائی، جو لوگ آپ کے مقابلے میں لڑ رہے ہیں۔ آپ پر تلوار اٹھا رہے ہیں۔ اور آپ پر تیروں کی بارش کر رہے ہیں، ان کے لئے بھی آپ نے بددعا نہیں فرمائی، بلکہ یہ دعا دی:

((اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ))(۱)

''اے اللہ، میری قوم کو ہدایت دیدیجئے یہ مجھے جانتے نہیں''

لیکن یہ موقع ایسا تھا کہ آپ کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ شخص تکبر کی وجہ سے بطور عناد کے منافقت کی بنیاد پر دائیں ہاتھ سے کھانے سے انکار کر رہا ہے، حقیقت میں اس کو کوئی عذر نہیں ہے۔ اس لئے آپ نے اس کے حق میں بددعا کا کلمہ ارشاد فرمایا، اور وہ بددعا فوراً قبول ہوگئی۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب استتابة المرتدین والمعاندین وقتالهم، باب اذا عرض الذمی وغیره بسب النبی ولم یصرح۔ الخ، رقم: ٦٤١٧، صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب غزوة أحد، رقم: ٣٣٤٧، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء، رقم: ٤٠١٥، مسند أحمد، رقم: ٣٤٢٩

اپنی غلطی پر اڑنا درست نہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر آدمی غلط کاری اور گناہوں میں مبتلا ہو۔ پھر بھی بزرگوں اور اللہ تعالیٰ والوں کے پاس اسی حال میں چلا جائے۔ اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن وہاں جا کر اگر جھوٹ بولے گا یا اپنی غلطی پر اڑا رہے گا تو یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ انبیاءؑ کی شان تو بہت بڑی ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انبیاء کے وارثین پر بھی اللہ تعالیٰ بعض اوقات یہ فضل فرما دیتے ہیں کہ ان کو تمہاری حقیقت حال سے باخبر فرما دیتے ہیں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب ہی نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ حضرت والا کی مجلس ہو رہی تھی۔ حضرت والا وعظ فرما رہے تھے، ایک صاحب اسی مجلس میں دیوار یا تکیہ پر ٹیک لگا کر متکبرانہ انداز میں بیٹھ گئے۔ اس طرح ٹیک لگا کر پاؤں پھیلا کر بیٹھنا مجلس کے ادب کے خلاف ہے اور جو شخص بھی مجلس میں آتا تھا، وہ اپنی اصلاح ہی کی غرض سے آتا تھا، اس لئے کوئی غلط کام کرتا تو حضرت والا کا فرض تھا کہ اس کو ٹوکیں، چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص کو ٹوک دیا، اور فرمایا کہ اس طرح بیٹھنا مجلس کے ادب کے خلاف ہے، آپ ٹھیک سے ادب کے ساتھ بیٹھ جائیں، ان صاحب نے بجائے سیدھے بیٹھنے کے عذر بیان کرتے ہوئے کہا: حضرت میری کمر میں تکلیف ہے۔ اس کی وجہ سے میں اس طرح بیٹھا ہوں، بظاہر وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ کا یہ ٹوکنا غلط ہے۔ اس لئے کہ آپ کو کیا معلوم کہ میں کس حالت میں ہوں۔ کس تکلیف میں مبتلا ہوں، آپ کو مجھے ٹوکنا نہیں چاہئے تھا، حضرت ڈاکٹر صاحب خود بیان فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ آپ نے ایک لمحے کے لئے گردن جھکائی، اور آنکھ بند کی۔ اور پھر گردن اٹھا کر اس سے فرمایا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں، آپ کی کمر میں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ آپ مجلس سے اٹھ جایئے۔ یہ کہہ کر ڈانٹ کر اٹھا دیا۔ اب بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کو کیا پتہ کہ اس کی کمر میں تکلیف ہے یا نہیں؟ لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے کسی نیک بندے کو کسی واقعے کی خبر عطا فرما دیتے ہیں۔ لہٰذا بزرگوں سے جھوٹ بولنا، یا ان کو دھوکہ دینا بڑی خطرناک بات ہے، اگر غلطی ہو جائے، اس کے بعد آدمی اس پر نادم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ اس پر توبہ کی توفیق دے دے تو انشاء اللہ وہ گناہ اور غلطی معاف ہو جائے گی بہر حال حضرت والا نے اس شخص کو مجلس اٹھا دیا، بعد میں لوگوں نے اس سے پوچھا تو اس نے صاف صاف بتا دیا کہ واقعۃً حضرت والا نے صحیح فرمایا تھا، میری کمر میں کوئی تکلیف نہیں تھی، میں نے محض اپنی بات رکھنے کے لئے یہ بات بنائی تھی

بزرگوں کی شان میں گستاخی سے اجتناب کریں

دیکھئے گناہ، کوتاہی، دنیا میں کس سے نہیں ہوئی؟ انسان سے غلطی اور کوتاہی ہو ہی جاتی ہے، اگر کوئی شخص بزرگوں کی بات پر نہیں چل رہا ہے تو بھی اللہ تعالیٰ کسی وقت توبہ کی توفیق دیدیں گے، اس کی خطا کو معاف فرمادیں گے۔ لیکن بزرگوں کی شان میں گستاخی کرنا، یا ان کے لئے برے کلمات زبان سے نکالنا، اور اپنے گناہ کو صحیح ثابت کرنا، یہ اتنی بری لعنت ہے کہ بسا اوقات اس کی وجہ سے ایمان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی اللہ والے کی کوئی بات پسند نہ آئے۔ تو کوئی بات نہیں، ٹھیک ہے پسند نہیں آئی۔ لیکن اس کی وجہ سے ان کے حق میں کوئی ایسا کلمہ نہ کہو۔ جو بے عزتی اور گستاخی کی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کلمہ اللہ تعالیٰ کو ناگوار ہو جائے، تو انسان کا ایمان اور اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے آمین۔

آج کل لوگوں میں یہ بیماری پیدا ہوگئی ہے کہ غلطی کو تسلیم کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔ گناہ کو گناہ تسلیم کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔ چوری اور پھر سینہ زوری۔ گناہ بھی کر رہے ہیں اور پھر گناہ کو صحیح ثابت کرنے کی فکر میں ہیں، مثلاً کسی بزرگ کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ وہ تو دکاندار آدمی تھے۔ ایسے ویسے تھے ایسے کلمات زبان سے نکالنا بڑی خطرناک بات ہے۔ اس سے خود پرہیز کریں اور دوسروں کو بچانے کی فکر کریں۔

دو کھجوریں ایک ساتھ مت کھاؤ

عَنْ جَبَلَةَ بْنِ سُحَيْمٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اَصَابَنَا عَامُ سَنَةٍ مَعَ ابْنِ الزُّبَيْرِ، فَرَزَقَنَا تَمْرًا، فَكَانَ عَبْدُاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا يَمُرُّ بِنَا وَنَحْنُ نَاْكُلُ وَيَقُوْلُ: لَاتُقَارِنُوْا، فَاِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْقِرَانِ، ثُمَّ يَقُوْلُ: اِلَّا اَنْ يَسْتَاْذِنَ الرَّجُلُ اَخَاهُ. (۱)

حضرت جبلہ بن سحیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حکومت کے زمانے میں ہمارے اوپر قحط پڑا، قحط کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے کھانے کے لئے کچھ کھجوریں عطا فرمادیں، جب ہم وہ کھجوریں کھا رہے تھے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہمارے پاس سے گزرے، انہوں نے ہم

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الاطعمة، باب القران في التمر، رقم: ۵۰۲۶، صحيح مسلم، كتاب الاشربة، باب نهي الأكل مع جماعة عن قران تمرتين، رقم: ۳۸۰۹، مسنداحمد، رقم: ۴۷۹۴، سنن الدارمي، كتاب الأطعمة، باب النهي عن القران، رقم: ۱۹۷۰

سے فرمایا کہ دو دو کھجوریں ایک ساتھ مت کھاؤ، اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس طرح دو دو کھجوریں ایک ساتھ کھانے کو عربی میں ''قران'' کہتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے اس لئے منع فرمایا کہ جو کھجوریں کھانے کے لئے رکھی ہیں اس میں سب کھانے والوں کا برابر مشترک حق ہے، اب اگر دوسرے لوگ تو ایک ایک کھجور اٹھا کر کھا رہے ہیں۔ اور تم نے دو دو کھجوریں اٹھا کر کھانی شروع کر دیں تو اب تم دوسروں کا حق مار رہے ہو۔ اور دوسرں کا حق مارنا جائز نہیں۔ البتہ اگر دوسرے لوگ بھی دو دو کھجوریں کھا رہے ہیں۔ تم بھی اسی طریقے سے کھاؤ، اس حدیث سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ دوسروں کا حق مارنا جائز نہیں۔

مشترک چیز کے استعمال کا طریقہ

اس حدیث میں حضور ﷺ نے ایک اصول بیان فرما دیا کہ جو چیز مشترک ہو، اور سب لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوں، اس مشترک چیز سے کوئی شخص دوسرے لوگوں سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے تو یہ جائز نہیں۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے دوسروں کا حق فوت ہو جائے گا، اس اصول کا تعلق صرف کھجور سے نہیں۔ بلکہ حقیقت میں زندگی کے ان تمام شعبوں سے اس کا تعلق ہے، جہاں چیزوں میں اشتراک پایا جاتا ہے، مثلاً آج کل کی دعوتوں میں ''سلف سروس'' کا رواج ہے کہ آدمی خود اٹھ کر جائے۔ اور اپنا کھانا لائے، اور کھانا کھائے، اب اسی کھانے میں تمام کھانے والوں کا مشترک حق ہے، اب اگر ایک شخص جا کر بہت سارا کھانا اپنے برتن میں ڈال کر لے آیا، اور دوسرے لوگ اس کو دیکھتے رہ گئے۔ تو یہ بھی اس اصول کے تحت ناجائز ہے، اور اس ''قران'' میں داخل ہے جس سے حضور اقدس ﷺ نے منع فرمایا۔

پلیٹ میں کھانا احتیاط سے نکالو

اس اصول کے ذریعہ امت کو یہ تعلیم دی ہے کہ ایک مسلمان کا کام ہے کہ وہ ایثار سے کام لے، نہ یہ کہ وہ دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالے۔ چاہے وہ حق چھوٹا سا کیوں نہ ہو، لہٰذا جب آدمی کوئی عمل کرے تو دوسروں کا حق مدنظر رکھتے ہوئے کام کرے، یہ نہ ہو کہ بس، مجھے مل جائے، چاہے دوسروں کو ملے، یا نہ ملے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دستر خوان پر بیٹھ کر یہی مسئلہ بیان کرتے ہوئے فرمایا جب کھانا دستر خوان پر آئے تو یہ دیکھو کہ دستر خوان پر کتنے آدمی کھانے والے ہیں اور جو چیز دستر خوان پر آئی ہے وہ سب کے درمیان برابر تقسیم کی جائے تو تمہارے حصے میں کتنی آئے

گی؟ بس اس حساب سے وہ چیز تم کھالو، اگر اس سے زیادہ کھاؤ گے تو یہ "قران" میں داخل ہے جو ناجائز ہے۔

ریل میں زائد نشست پر قبضہ کرنا جائز نہیں

اسی طرح ایک مرتبہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ تم ریل گاڑی میں سفر کرتے ہو۔ تم نے ریل گاڑی کے ڈبے میں یہ لکھا ہوا دیکھا ہوگا کہ اس ڈبے میں ۲۲ مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ اب آپ نے پہلے جا کر تین چار نشستوں پر قبضہ کرلیا، اور اپنے لئے خاص کرلیا، اور اس پر بستر لگا کر لیٹ گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ سوار ہوئے، ان کو بیٹھنے کے لئے سیٹ نہیں ملی، اب وہ کھڑے ہیں اور آپ لیٹے ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ بھی "قران" میں داخل ہے۔ جو ناجائز ہے۔ اس لئے کہ تمہارا حق تو صرف اتنا تھا کہ ایک آدمی کی نشست پر بیٹھ جاتے، لیکن جب آپ نے کئی نشستوں پر قبضہ کر کے دوسروں کے حق کو پامال کیا تو اس عمل کے ذریعہ تم نے دو گناہ کئے۔ ایک یہ کہ تم نے صرف ایک سیٹ کا ٹکٹ خریدا تھا۔ پھر جب تم نے اس سے زیادہ سیٹوں پر قبضہ کرلیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسرے مسلمان بھائیوں کی سیٹ پر قبضہ کرلیا ان کا حق پامال کیا، اس طرح اس عمل کے ذریعہ دو گناہوں کے مرتکب ہوئے، پہلے گناہ کے ذریعے حق اللہ پامال ہوا، اور دوسرے گناہ کے ذریعہ بندے کا حق پامال ہوا۔

ساتھ سفر کرنے والے کے حقوق

اور یہ بندے کا ایسا حق ہے کہ جس کو بندوں سے معاف کرانا بھی مشکل ہے اس لئے کہ بندوں کے حق اس وقت تک معاف نہیں ہوتے، جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، محض توبہ کرنے سے معاف نہیں ہوتے۔ اب اگر کسی وقت اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق دی، اور دل میں خیال آیا کہ مجھ سے یہ غلطی ہوگئی تھی تو اب اس وقت اس شخص کو کہاں تلاش کرو گے جس نے تمہارے ساتھ ریل گاڑی میں سفر کیا تھا، اور تم نے اس کا حق ضائع کر دیا تھا، اس لئے اب معافی کا کوئی راستہ نہیں۔ اس لئے ان معاملات میں بہت اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم نے کئی مقامات پر اس بات کا حکم دیا:

﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾ (۱)

یعنی "صاحب بالجنب" کا حق ادا کرو، "صاحب بالجنب" اس کو کہتے ہیں جو کسی وقت عارضی طور پر ریل کے سفر میں یا بس میں، یا جہاز میں، تمہارے ساتھ آ کر بیٹھ گیا ہو۔ وہ "صاحب بالجنب" ہے۔

(۱) النساء: ۳۶

اس کے بھی حقوق ہیں۔ ان حقوق کو ضائع نہ کرو۔ اور اس کے ساتھ ایثار سے کام لو۔ ذرا سی دیر سفر ہے۔ ختم ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس سفر کے دوران تم نے اپنے ذمے گناہ لازم کر لیا، تو وہ گناہ ساری عمر تمہارے نامہ اعمال میں لکھا رہے گا، اس کی معافی ہونی مشکل ہے۔ یہ سب ''قرآن'' میں داخل ہے ناجائز ہے۔

مشترک کاروبار میں حساب کتاب شرعاً ضروری ہے

آج کل یہ وبا بھی عام ہے کہ چند بھائیوں کا مشترک کاروبار ہے، لیکن حساب کتاب کوئی نہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم سب بھائی ہیں۔ حساب کتاب کی کیا ضرورت ہے؟ حساب کتاب تو غیروں میں ہوتا ہے، اپنوں میں حساب کتاب کہاں۔ اب اس کا کوئی حساب کتاب، کوئی لکھت پڑھت نہیں کہ کس بھائی کی کتنی ملکیت اور کتنا حصہ ہے؟ ماہانہ کس کو کتنا منافع دیا جائے گا؟ اس کا کوئی حساب نہیں، بلکہ الٹا معاملہ چل رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ دنوں تک تو محبت پیار سے حساب چلتا رہتا ہے، لیکن بعد میں دلوں میں شکوے شکایتیں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ کہ فلاں کی اولاد تو اتنی ہے۔ وہ زیادہ رقم لیتا ہے، فلاں کی اولاد کم ہے، وہ کم لیتا ہے، فلاں کی شادی پر اتنا خرچ کیا گیا، ہمارے بیٹے کی شادی پر کم خرچ ہوا، فلاں نے کاروبار سے اتنا فائدہ اٹھا لیا، ہم نے نہیں اٹھایا۔ وغیرہ بس اس طرح کی شکایتیں شروع ہوتی ہیں۔

یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ہم نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے سے دور چلے گئے، یاد رکھئے، ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اگر کوئی مشترک چیز ہے تو اس مشترک چیز کا حساب و کتاب رکھا جائے، اگر حساب و کتاب نہیں رکھا جا رہا ہے تو تم خود بھی گناہوں میں مبتلا ہو رہے ہو، اور دوسروں کو بھی گناہ میں مبتلا کر رہے ہو، یاد رکھیے، بھائیوں کے درمیان معاملات کے اندر جو محبت و پیار ہوتا ہے۔ وہ کچھ دن چلتا ہے، بعد میں وہ لڑائی جھگڑوں میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور پھر وہ لڑائی جھگڑے ختم ہونے کو نہیں آتے، کتنی مثالیں اس وقت میرے سامنے ہیں۔

ملکیتوں میں امتیاز شرعاً ضروری ہے

ملکیتوں میں امتیاز ہونا ضروری ہے۔ یہاں تک باپ بیٹے کی ملکیت میں اور شوہر بیوی کی ملکیت میں امتیاز ہونا ضروری ہے، حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی دو بیویاں تھیں۔ دونوں کے گھر الگ الگ تھے، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میری ملکیت اور میری دونوں بیویوں کی ملکیت بالکل الگ الگ کر کے بالکل امتیاز کر رکھا ہے۔ وہ اس طرح کہ جو کچھ سامان بڑی اہلیہ کے گھر میں

ہے، وہ ان کی ملکیت ہے، اور جو سامان چھوٹی اہلیہ کے گھر میں ہے، وہ ان کی ملکیت ہے، اور جو سامان خانقاہ میں ہے، وہ میری ملکیت ہے، آج اگر دنیا سے چلا جاؤں تو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ الحمدللہ سب امتیاز موجود ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ملکیت کی وضاحت

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اسی طرح دیکھا کہ ہر چیز میں ملکیت واضح کر دینے کا معمول تھا۔ آخری عمر میں حضرت والد صاحب نے اپنے کمرے میں ایک چار پائی ڈال لی تھی۔ دن رات وہیں رہتے تھے، ہم لوگ ہر وقت حاضر خدمت رہا کرتے تھے، میں نے دیکھا کہ جب میں ضرورت کی کوئی چیز دوسرے کمرے سے ان کے کمرے میں لاتا تو ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً فرماتے کہ اس چیز کو واپس لے جاؤ۔ اگر کبھی واپس لے جانے میں دیر ہو جاتی تو ناراض ہوتے کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ واپس پہنچا دو، ابھی تک واپس کیوں نہیں پہنچائی؟

کبھی کبھی ہمارے دل میں خیال آتا کہ اتنی جلدی واپس لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی واپس پہنچا دیں گے، ایک دن خود والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنے وصیت نامہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ میرے کمرے میں جو چیزیں ہیں، وہ سب میری ملکیت ہیں۔ اور اہلیہ کے کمرے میں جو چیزیں ہیں، وہ ان کی ملکیت ہے، لہٰذا جب میرے کمرے میں کسی دوسرے کی چیز آ جاتی ہے تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا انتقال اس حالت میں ہو جائے کہ وہ چیز میرے کمرے کے اندر ہو، اس لئے کہ وصیت نامہ کے مطابق وہ چیز میری تصور کی جائے گی، حالانکہ حقیقت میں وہ چیز میری ملکیت نہیں ہے۔ اس لئے میں اس بات کا اہتمام کرتا ہوں، اور تمہیں کہتا ہوں کہ یہ چیز جلدی واپس لے جاؤ۔ یہ سب باتیں دین کا حصہ ہیں۔ آج ہم نے ان کو دین سے خارج کر دیا ہے، اور یہی باتیں بڑوں سے سیکھنے کی ہیں، اور یہ سب باتیں اسی اصول سے نکل رہی ہیں، جو اصول حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرما دیا وہ یہ کہ "قران" سے بچو۔

مشترک چیزوں کے استعمال کا طریقہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ گھر میں بعض اشیاء مشترک استعمال کی ہوتی ہیں، جس کو گھر کا ہر فرد استعمال کرتا ہے، اور ان کی ایک جگہ مقرر ہوتی ہے کہ فلاں چیز فلاں جگہ پر رکھی جائے گی، مثلاً گلاس فلاں جگہ رکھا جائے گا، پیالہ فلاں جگہ رکھا جائے گا، صابن فلاں جگہ رکھا جائے گا، ہمیں فرمایا کرتے تھے کہ تم لوگ ان چیزوں کو استعمال کر کے بے جگہ رکھ دیتے ہو، تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا یہ

عمل گناہ کبیرہ ہے، اس لئے کہ وہ چیز مشترک استعمال کی ہے، جب دوسرے شخص کو اس کے استعمال کی ضرورت ہوگی تو وہ اس کو اس جگہ پر تلاش کرے گا، اور جب جگہ پر اس کو وہ چیز نہیں ملے گی تو اس کو تکلیف اور ایذا ہوگی اور کسی بھی مسلمان کو تکلیف پہنچانا گناہ کبیرہ ہے۔ ہمارا ذہن کبھی اس طرف گیا بھی نہیں تھا کہ یہ بھی گناہ کی بات ہے، ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ تو دنیاداری کا کام ہے۔ گھر کا انتظامی معاملہ ہے۔ یاد رکھو، زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جس کے بارے میں دین کی کوئی ہدایت موجود نہ ہو۔ ہم سب اپنے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ کیا ہم لوگ اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ مشترک استعمال کی اشیاء استعمال کے بعد ان کی متعین جگہ پر رکھیں، تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو؟ اب یہ چھوٹی سی بات ہے، جس میں ہم صرف بے دھیانی اور بے توجہی کی وجہ سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمیں دین کی فکر نہیں، دین کا خیال نہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا احساس نہیں، دوسرے اس لئے کہ ان مسائل سے جہالت اور ناواقفیت بھی آج کل بہت ہے۔

بہر حال، یہ سب باتیں ''قِران'' کے اندر داخل ہیں۔ ویسے تو یہ چھوٹی سی بات ہے کہ دو کھجوروں کو ایک ساتھ ملا کر نہ کھانا چاہئے۔ لیکن اس سے یہ اصول معلوم ہوا کہ ہر وہ کام کرنا، جس سے دوسرے مسلمان کو تکلیف ہو، یا دوسروں کا حق پامال ہو، سب ''قِران'' میں داخل ہیں۔

مشترکہ بیت الخلاء کا استعمال

بعض اوقات ایسی بات ہوتی ہے، جس کو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے، لیکن دین کی باتیں سمجھانے میں شرم کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ مثلاً آپ بیت الخلاء میں گئے، اور فارغ ہونے کے بعد غلاظت کو بہایا نہیں، ویسے ہی چھوڑ کر چلے آئے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ عمل گناہ کبیرہ ہے، اس لئے کہ جب دوسرا شخص بیت الخلاء استعمال کرے گا تو اس کو کراہت ہوگی، اور تکلیف ہوگی، اور اس تکلیف کا سبب تم بنے، تم نے اس کو تکلیف پہنچائی، اور ایک مسلمان کو تکلیف پہنچا کر تم نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔

غیر مسلموں نے اسلامی اصول اپنا لئے

ایک مرتبہ میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ڈھاکہ کے سفر پر گیا۔ ہوائی جہاز کا سفر تھا، راستے میں مجھے غسل خانے میں جانے کی ضرورت پیش آئی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہوائی جہاز کے غسل خانے میں واش بیسن کے اوپر یہ عبارت لکھی ہوتی ہے: ''جب آپ واش بیسن کو استعمال کر لیں تو اس کے بعد کپڑے سے اس کو صاف اور خشک کر دیں۔ تاکہ بعد میں آنے والے کو کراہت نہ ہو''

جب میں غسل خانے سے واپس آیا تو حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ غسل خانے میں واش بیسن پر جو عبارت لکھی ہے، یہ ہی بات ہے جو میں تم لوگوں سے بار بار کہتا رہتا ہوں کہ دوسروں کو تکلیف سے بچانا دین کا حصہ ہے۔ جو ان غیر مسلموں نے اختیار کر لیا ہے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں ترقی عطا فرمادی ہے، اور ہم لوگوں نے ان باتوں کو دین سے خارج کر دیا ہے، اور دین کو صرف نماز روزے کے اندر محدود کر دیا ہے۔ معاشرت کے ان آداب کو بالکل چھوڑ دیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم لوگ پستی اور تنزل کی طرف جا رہے ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو عالم اسباب بنایا ہے۔ اس میں جیسا عمل اختیار کرو گے، اللہ تعالیٰ اس کے ویسے ہی نتائج پیدا فرمائیں گے۔

ایک انگریز خاتون کا واقعہ

گذشتہ سال مجھے لندن جانے کا اتفاق ہوا، پھر وہاں لندن سے ٹرین کے ذریعہ ایڈمبرا جا رہا تھا۔ راستے میں غسل خانے میں جانے کی ضرورت پیش آئی، جب غسل خانے کے پاس گیا تو دیکھا کہ ایک انگریز خاتون دروازے پر کھڑی ہے، میں یہ سمجھا کہ شاید غسل خانہ اس وقت فارغ نہیں ہے، اور یہ خاتون اس انتظار میں ہے کہ جب فارغ ہو جائے تو وہ اندر جائے۔ چنانچہ اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ جب کافی دیر اس طرح گزر گئی کہ نہ تو اندر سے کوئی نکل رہا تھا، اور نہ یہ اندر جا رہی تھی۔ میں دوبارہ غسل خانے کے قریب گیا تو میں نے دیکھا کہ غسل خانے کے دوازے پر لکھا ہے کہ یہ خالی ہے، اندر کوئی نہیں۔ چنانچہ میں نے ان خاتون سے کہا کہ آپ اندر جانا چاہے تو چلی جائیں، غسل خانہ تو خالی ہے، ان خاتون نے کہا کہ ایک اور وجہ سے کھڑی ہوں۔ وہ یہ کہ میں اندر ضرورت کے لئے گئی تھی۔ اور ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد ابھی میں نے اس کو فلش نہیں کیا تھا کہ اتنے میں گاڑی اسٹیشن پر آ کر کھڑی ہو گئی، اور قانون یہ ہے کہ جب گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو، اس وقت غسل خانہ استعمال نہ کرنا چاہئے، اور نہ اس میں پانی بہانا چاہئے، اب میں اس انتظار میں ہوں کہ جب گاڑی چل پڑے تو میں اس کو فلش کر دوں۔ اور اس میں پانی بہا دوں۔ اور پھر اپنی سیٹ پر واپس جاؤں،

اب آپ اندازہ لگائیں کہ وہ خاتون صرف اس انتظار میں تھی کہ فلش کرنا رہ گیا تھا۔ اور اب تک فلش بھی اس لئے نہیں کیا تھا کہ یہ قانون کی خلاف ورزی ہو جائے گی۔ اس وقت مجھے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات یاد آ گئی، وہ فرمایا کرتے تھے: اس بات کا خیال اور اہتمام کہ آدمی فلش کر کے جائے، اصل میں یہ دین کا حکم ہے، تاکہ بعد میں آنے والے کو تکلیف نہ ہو۔ لیکن دین کی اس بات پر ایک غیر مسلم نے کس قدر اہتمام سے عمل کیا، آپ اندازہ لگائیں کہ کیا ہم میں سے کوئی شخص اگر

مشترک چیز کو استعمال کرے تو کیا اس کو اس بات کا اہتمام اور خیال ہوتا ہے؟ بلکہ ہم لوگ ویسے ہی گندہ چھوڑ دیتے ہیں، اور یہ سوچتے ہیں کہ جو بعد میں آئے گا۔ وہ بھرے گا۔ وہ خود ہی نمٹ لے گا۔ وہ جانے، اس کا کام جانے۔

غیر مسلم قومیں کیوں ترقی کر رہی ہیں

خوب سمجھ لیجئے، یہ دنیا، اسباب کی دنیا ہے، اگر یہ باتیں غیر مسلموں نے حاصل کر کے ان پر عمل کرنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں ترقی دے دی۔ اگرچہ آخرت میں تو ان کا کوئی حصہ نہیں، لیکن معاشرت کے وہ آداب جو ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ نے سکھائے تھے۔ ان آداب کو انہوں نے اختیار کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ترقی دے دی۔ لہٰذا یہ اعتراض تو کر دیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ کلمہ پڑھتے ہیں۔ ایمان کا اقرار کرتے ہیں، اس کے باوجود دنیا میں ہم ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ دوسرے لوگ غیر مسلم ہونے کے باوجود ترقی کر رہے ہیں۔ لیکن یہ نہیں دیکھا کہ ان غیر مسلموں کا یہ حال ہے کہ وہ تجارت میں جھوٹ نہیں بولیں گے، امانت اور دیانت سے کام لیں گے، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت چمکا دی، لیکن مسلمانوں نے ان چیزوں کو چھوڑ دیا۔ اور دین کو مسجد اور مدرسے تک محدود کر کے بیٹھ گیا۔ زندگی کی باقی چیزوں کو چھوڑ دیا۔ زندگی کی باقی چیزوں کو دین سے خارج کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے دین سے بھی دور ہو گئے، اور دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہو گئے۔ حالانکہ حضور اقدس ﷺ نے یہ سب تعلیمات ہمیں عطا فرمائیں۔ تاکہ ہم ان کو اپنی زندگی کے اندر اپنائیں، اور ان کو دین کا حصہ سمجھیں۔ بہر حال، بات یہاں سے چلی تھی کہ ''دو کھجوروں کو ایک ساتھ ملا کر نہ کھاؤ'' لیکن اس سے کتنے اہم اصول ہمارے لئے نکلتے ہیں، اور یہ کتنی ہمہ گیر بات ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں احساس اور ادراک پیدا فرما دے۔ آمین۔

ٹیک لگا کر کھانا خلاف سنت ہے

عَنْ اَبِیْ جُحَیْفَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:
((اِنِّیْ لَا آكُلُ مُتَّكِئًا)) (۱)

---

۱) صحیح البخاری، کتاب الاطعمة، باب الأکل متکئا، رقم: ۴۹۷۹، سنن الترمذی، کتاب الأطعمة عن رسول الله، باب ماجاء فی کراهیة الاکل متکئا، رقم: ۱۷۵۳، سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمة، باب ما جاء فی الاکل متکئا، رقم: ۳۲۷۷، سنن ابن ماجه، کتاب الاطعمة، باب الاکل متکئا، رقم: ۳۲۵۳، مسند أحمد، رقم: ۱۸۰۰۵

''حضرت ابو حجیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا''

ایک دوسری حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا مُقْعِيًا يَأْكُلُ تَمْرًا))(۱)

''میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ اس طرح بیٹھے ہوئے کھجور کھا رہے تھے کہ آپ نے اپنے گھٹنے کھڑے کئے ہوئے تھے''

اکڑوں بیٹھ کر کھانا مسنون نہیں

کھانے کی نشست کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں چند غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کو دور کرنا ضروری ہے۔ حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی روشنی میں کھانے کی مستحب اور بہتر نشست یہ ہے کہ آدمی اس طرح بیٹھ کر کھائے کہ اس نشست کے ذریعہ کھانے کی تعظیم بھی ہو، اور تواضع بھی ہو، متکبرانہ نشست نہ ہو، اور اس نشست میں کھانے کی بے توقیری اور بے عزتی نہ ہو۔ یہ جو مشہور ہے کہ حضور اقدس صلی علیہ وسلم اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے، یہ بات اس طرح درست نہیں، مجھے ایسی کوئی حدیث نہیں ملی، جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اکڑوں بیٹھ کر کھانا ثابت ہو، البتہ اُوپر جو حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں جس نشست کا ذکر کیا گیا ہے، وہ یہ کہ آپ نے زمین پر بیٹھ کر اپنے دونوں گھٹنے سامنے کی طرف کھڑے کر دیئے تھے۔ اس حدیث میں ''اکڑوں'' بیٹھنا مراد نہیں، لہٰذا یہ جو مشہور ہے کہ ''اکڑوں'' بیٹھ کر کھانا سنت ہے، یہ درست نہیں۔ البتہ یہ بات ثابت ہے کہ کھانے کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست تواضع والی نشست ہوتی تھی، جس میں دیکھنے والے کو فرعونیت، یا تکبر یا رعونت کا احساس نہ ہو، بلکہ عبدیت کا احساس ہوتا ہو۔

کھانے کی بہترین نشست

ایک صحابی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ آپ اس طرح کھانا کھا رہے تھے، جس طرح غلام کھانا کھاتا ہے۔ بہر حال، احادیث کے مجموعے سے فقہاء کرام رحمہم اللہ نے جو بات اخذ کی ہے، وہ یہ ہے کہ کھانے کی بہتر نشست یہ کہ آدمی یا دو زانوں بیٹھ کر کھائے اس لئے کہ اس میں تواضع بھی زیادہ ہے، اور کھانے کا احترام بھی ہے۔ اور اس

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب استحباب تواضع الآكل وصفة قعوده، رقم: ۳۸۰۷، سنن ابیداؤد، کتاب الأطعمة، باب ماجاء فی الأكل متكئا، رقم: ۳۲۷۹، مسند أحمد، رقم: ۱۲۳۹۵

نشست میں بسیار خوری کا سدباب بھی ہے، اس لئے جب آدمی خوب پھیل کر بیٹھے گا تو زیادہ کھایا جائے گا، اور ہمارے بزرگوں نے فرمایا کہ ایک ٹانگ اٹھا کر اور ایک ٹانگ بچھا کر کھانا بھی اسی میں داخل ہے، اور یہ بھی تواضع والی نشست ہے، اور اس طرح بیٹھ کر کھانے میں دنیا کا بھی فائدہ اور آخرت کا بھی فائدہ ہے۔

چارزانوں بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے

کھانے کے وقت چارزانوں ہو کر بیٹھنا بھی جائز ہے۔ ناجائز نہیں۔ اس میں کوئی گناہ نہیں، لیکن یہ نشست تواضع کے اتنے قریب نہیں ہے، جتنی پہلی دو نشستیں قریب ہیں، لہٰذا عادت تو اس بات کی ڈالنی چاہئے کہ آدمی دوزانوں بیٹھ کر کھائے، یا ایک ٹانگ کھڑی کر کے کھائے، چارزانوں نہ بیٹھے، لیکن اگر کسی سے اس طرح نہیں بیٹھا جاتا، یا کوئی شخص اپنے آرام کے لئے چارزانوں بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے تو یہ کوئی گناہ نہیں۔ یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ چارزانوں بیٹھ کر کھانا ناجائز ہے۔ یہ خیال درست نہیں۔ غلط ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ دوزانوں بیٹھ کر کھائے۔ اس لئے کہ اس نشست میں کھانے کی عظمت اور توقیر زیادہ ہے۔

میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا

میز کرسی پر کھانا بھی کوئی گناہ اور ناجائز نہیں۔ لیکن زمین پر بیٹھ کر کھانے میں سنت کے اتباع کا ثواب بھی ہے، اور سنت سے زیادہ قریب ہے۔ اس لئے حتی الامکان انسان کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ زمین پر بیٹھ کر کھائے، اس لئے کہ جتنا سنت سے زیادہ قریب ہوگا، اتنی ہی برکت زیادہ ہوگی، اور اتنا ہی ثواب ملے گا۔ اتنے ہی فوائد زیادہ حاصل ہوں گے۔ بہر حال میز، کرسی پر بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے، گناہ نہیں ہے۔

زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت ہے

حضور اقدس ﷺ دو وجہ سے زمین پر بیٹھ کر کھاتے تھے، ایک تو یہ کہ اس زمانہ میں زندگی سادہ تھی، میز کرسی کا رواج ہی نہیں تھا۔ اس لئے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نیچے بیٹھ کر کھانے میں تواضع زیادہ ہے، اور کھانے کی توقیر بھی زیادہ ہے۔ آپ اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ کرسی پر بیٹھ کر کھانے میں دل کی کیفیت اور ہوگی، اور زمین پر بیٹھ کر کھانے میں دل کی کیفیت اور ہو گئی، دونوں میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا۔ اس لئے کہ زمین پر بیٹھ کر کھانے کی صورت میں

طبیعت کے اندر تواضع زیادہ ہوگی، عاجزی ہوگی، مسکنت ہوگی، عبدیت ہوگی، اور میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کی صورت یہ باتیں پیدا نہیں ہوتیں، اس لئے حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ آدمی زمین پر بیٹھ کر کھائے۔ لیکن اگر کہیں میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کا موقع آجائے، تو اس طرح کھانے میں کوئی حرج اور گناہ بھی نہیں ہے، لہٰذا اس پر اتنا تشدد کرنا بھی ٹھیک نہیں، جیسا کہ بعض لوگ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو حرام اور ناجائز ہی سمجھتے ہیں، اور اس پر بہت زیادہ نکیر کرتے ہیں۔ یہ عمل بھی درست نہیں۔

بشرطیکہ اس سنت کا مذاق نہ اڑایا جائے

اور یہ جو میں نے کہا کہ زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت سے زیادہ قریب ہے، اور زیادہ افضل ہے، اور زیادہ ثواب کا باعث ہے، یہ بھی اس وقت ہے، جب اس سنت کو "معاذ اللہ" مذاق نہ بنایا جائے، لہٰذا اگر کسی جگہ پر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر نیچے زمین پر بیٹھ کر کھانا کھایا گیا تو لوگ اس سنت کا مذاق اڑائیں گے۔ تو ایسی جگہ پر زمین پر کھانے پر اصرار بھی درست نہیں۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن سبق میں ہمیں ایک واقعہ سنایا کہ ایک دن میں اور میرے کچھ رفقاء دیوبند سے دہلی گئے، جب دہلی پہنچے تو وہاں کھانا کھانے کی ضرورت پیش آئی، چونکہ کوئی اور جگہ کھانے کی نہیں تھی، اس لئے ایک ہوٹل میں کھانے کے لئے چلے گئے، اب ظاہر ہے کہ ہوٹل میں میز کرسی پر کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارے دو ساتھیوں نے کہا کہ ہم تو کرسی پر بیٹھ کر نہیں کھائیں گے۔ اس لئے کہ زمین پہ بیٹھ کر کھانا سنت ہے۔ چنانچہ انہوں نے چاہا کہ ہوٹل کے اندر زمین پر اپنا رومال بچھا کر وہاں بیرے سے کھانا منگوائیں، حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو منع کیا کہ ایسا نہ کریں۔ بلکہ میز کرسی ہی پر بیٹھ کر کھانا کھالیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم میز کرسی پر کیوں کھائیں؟ جب زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت کے زیادہ قریب ہے۔ تو پھر زمین پر بیٹھ کر کھانے سے کیوں ڈریں، اور کیوں شرمائیں، حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ شرمانے اور ڈرنے کی بات نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب تم لوگ یہاں اس طرح زمین پر اپنا رومال بچھا کر بیٹھو گے، تو لوگوں کے سامنے اس سنت کا مذاق بناؤ گے، اور لوگ اس سنت کی توہین کے مرتکب ہوں گے۔ اور سنت کی توہین کا ارتکاب کرنا صرف گناہ ہی نہیں۔ بلکہ بعض اوقات انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

ایک سبق آموز واقعہ

پھر حضرت والد صاحب نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو ایک قصہ بتاتا ہوں، ایک بہت بڑے محدث اور بزرگ ہیں، "جو سلیمان اعمش" کے نام سے مشہور ہیں۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بھی استاد ہیں۔ تمام احادیث کی کتابیں ان کی روایتوں سے بھری ہوئی ہیں، عربی زبان میں "اعمش" چوندھے کو کہا جاتا ہے۔ جس کی آنکھوں میں چندھیاہٹ ہو، جس میں پلکیں گر جاتی ہیں۔ اور روشنی کی وجہ سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، چونکہ ان کی آنکھیں چندھائی ہوئی تھیں۔ اس وجہ سے "اعمش" کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے پاس ایک شاگرد آ گئے۔ وہ شاگرد اعرج یعنی لنگڑے تھے، پاؤں سے معذور تھے، شاگرد بھی ایسے تھے جو ہر وقت استاد سے چمٹے رہنے والے تھے، جیسے بعض شاگردوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر وقت استاد سے چمٹے رہتے ہیں۔ جہاں استاد جا رہے ہیں، وہاں شاگرد بھی ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔ یہ بھی ایسے تھے، چنانچہ امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ جب بازار جاتے تو یہ "اعرج" شاگرد بھی ساتھ ہو جاتے، بازار میں لوگ ان پر فقرے کستے کہ دیکھو استاد "چوندھا" ہے، اور شاگرد "لنگڑا" ہے، چنانچہ امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد سے فرمایا کہ جب ہم بازار جایا کریں تو تم ہمارے ساتھ مت جایا کرو، شاگرد نے کہا کیوں؟ میں آپ کا ساتھ کیوں چھوڑوں؟ امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب ہم بازار جاتے ہیں تو لوگ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں کہ استاد چوندھا ہے، اور شاگرد لنگڑا ہے۔ شاگرد نے کہا:

"مَا لَنَا نُؤجَرُ وَيَأْثَمُوْنَ"

حضرت، جو لوگ مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کو مذاق اڑانے دیں۔ اس لئے اس مذاق اڑانے کے نتیجے میں ہمیں ثواب ملتا ہے، اور ان کو گناہ ہوتا ہے۔ اس میں ہمارا تو کوئی نقصان نہیں۔ بلکہ ہمارا تو فائدہ ہے، حضرت امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا:

"نَسْلَمُ وَيَسْلَمُوْنَ خَيْرٌ مِنْ اَنْ نُؤجَرَ وَيَأْثَمُوْنَ"

ارے بھائی، وہ بھی گناہ سے بچ جائیں، اور ہم بھی گناہ سے بچ جائیں، یہ اس کے بنسبت بہتر ہے کہ ہمیں ثواب ملے، اور ان کو گناہ ہو۔ میرے ساتھ جانا کوئی فرض و واجب تو ہے نہیں، اور نہ جانے میں کوئی نقصان تو ہے نہیں، البتہ فائدہ یہ ہے کہ لوگ اس گناہ سے بچ جائیں گے۔ لہٰذا ہمارے مسلمان بھائیوں کو گناہ ہو۔ اس سے بہتر یہ صورت ہے کہ نہ ان کو گناہ ہو اور نہ ہمیں گناہ ہو۔ اس لئے آئندہ میرے ساتھ بازار مت جایا کرو۔

اس وقت مذاق کی پرواہ نہ کرے

لیکن یہ بات رکھو، اگر کوئی گناہ کا کام ہے۔ تو پھر چاہے کوئی مذاق اڑائے۔ یا ہنسی اڑائے، اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ لوگوں کے مذاق اڑانے کی وجہ سے گناہ کا کام کرنا جائز نہیں۔ لوگوں کے مذاق اڑانے کی وجہ سے کوئی فرض یا واجب کام چھوڑنا جائز نہیں، لیکن اگر ایک طرف جائز اور مباح کام ہے، اور دوسرے طرف اولی اور افضل کام ہے۔ اب اگر لوگوں کو گناہ سے بچانے کے لئے افضل کام چھوڑ دو۔ اور اس کے مقابلے میں جو جائز کام ہے۔ اس کو اختیار کرلو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، ایسا کرنا درست ہے۔

بلاضرورت میز کرسی پر نہ کھائے

چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مرتبہ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانے کی ضرورت پیش آگئی۔ تو حضرت تھانوی نے اس وقت فرمایا کے ویسے تو میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا ناجائز تو نہیں ہے، لیکن اس میں تھوڑا سا تشبہ ہے کہ چونکہ انگریزوں کا چلایا ہوا طریقہ ہے۔ اس طرح کھانے میں ان کے ساتھ مشابہت نہ ہو جائے، اس لئے جب آپ کرسی پر بیٹھے تو پاؤں اٹھا کر بیٹھ گئے، پاؤں لٹکائے نہیں۔ اور پھر فرمایا کہ انگریزوں کے ساتھ مشابہت پیدا ہو جانے کا جو شبہ تھا، وہ اس طرح بیٹھنے سے ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ وہ لوگ پاؤں لٹکا کر کھاتے ہیں، میں نے پاؤں اوپر کر لئے ہیں۔

بہرحال، میز کرسی پر کھانا کھانا ناجائز اور گناہ نہیں، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ آدمی جتنا سنت سے قریب ہوگا، اتنی ہی برکت زیادہ ہوگی، اتنا ہی اجر زیادہ ملے گا۔ لہٰذا بلا وجہ اور بلاضرورت کے میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو اپنی عادت بنا لینا اچھا نہیں، بہتر یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر کھانے کا اہتمام کرے۔ لیکن جہاں کہیں ضرورت داعی ہو، وہاں کھائے۔ بلکہ آگے کی طرف جھک کر کھائے، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹیک لگا کر کھانے کو متکبرین کا طریقہ قرار دیا ہے، یہ طریقہ درست نہیں۔

چارپائی پر کھانا

اسی طرح چارپائی پر بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے۔ بلکہ کرسی پر کھانے کے مقابلے میں چارپائی پر کھانا زیادہ بہتر ہے، اس لئے کہ وہ طریقہ جس میں کھانے والا اور کھانے کی سطح برابر ہو۔ اس سے بہتر ہے جس میں کھانا اوپر ہو۔ اور کھانے والا نیچے ہو۔ البتہ سب سے بہتر یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر کھایا جائے، اس میں ثواب بھی زیادہ ہے۔ تواضع بھی اس سے زیادہ ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بھی

زیادہ قریب ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں سنتوں سے زیادہ قریب رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کھانے کے وقت باتیں کرنا

ایک غلط بات لوگوں میں یہ مشہور ہے کھانا کھاتے وقت باتیں کرنا جائز نہیں، یہ بھی بے اصل بات ہے، شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں، کھانا کھانے کے دوران ضرورت کی بات کی جاسکتی ہے، اور حضور اقدس ﷺ سے ثابت بھی ہے، البتہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس بات کا اہتمام کرنا چاہئے کہ کھانے کے وقت جو باتیں کی جائیں۔ وہ ہلکی پھلکی ہوں، زیادہ سوچ و بچار اور زیادہ انہماک کی باتیں کھانے کے وقت نہیں کرنی چاہئے، اس لئے کہ کھانے کا بھی حق ہے۔ وہ حق یہ ہے کہ کھانے کی طرف متوجہ ہو کر کھاؤ، لہٰذا ایسی باتیں کرنا جس میں انسان منہمک ہو جائے، اور کھانے کی طرف توجہ نہ رہے۔ ایسی باتیں کرنا درست نہیں۔ خوش طبعی اور ہنسی مذاق کی ہلکی پھلکی باتیں کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ جو مشہور ہے کہ آدمی کھانے کے وقت بالکل خاموش رہے۔ کوئی بات نہ کرے۔ یہ درست نہیں۔

کھانے کے بعد ہاتھ پونچھ لینا جائز ہے

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اِذَا اَكَلَ اَحَدُكُمْ طَعَامًا فَلَا يَمْسَحْ اَصَابِعَهُ حَتّٰى يَلْعَقَهَا اَوْيُلْعِقَهَا))(۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھا چکے تو اپنی انگلیوں کو صاف نہ کرے۔ جب تک خود ان انگلیوں کو چاٹ نہ لے، یا دوسرے کو نہ چٹوادے۔

علماء کرام رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث سے دو مسئلے نکلتے ہیں۔ اور دو ادب اس حدیث میں بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا مسئلہ اس سے یہ نکلتا ہے کہ کھانا کھانے کے بعد جس طرح ہاتھ دھونا جائز، بلکہ مستحب اور سنت ہے۔ اسی طرح ان ہاتھوں کو کسی چیز سے پونچھ لینا بھی جائز ہے۔ البتہ افضل تو یہ ہے کہ ہاتھوں کو پانی سے دھولیا جائے۔ لیکن اگر پانی موجود نہیں ہے یا پانی استعمال کرنے میں کوئی تکلیف اور دشواری ہے تو اس صورت میں کسی کاغذ یا کپڑے سے پونچھ لینا بھی جائز ہے، جیسا کہ آجکل ٹیشو پیپر اسی مقصد کے لئے ایجاد ہوگئے ہیں، ان سے ہاتھ پونچھ لینا بھی جائز ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاطعمة ، باب لعق الاصابع و مصها، رقم: ۵۰۳۵، صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب استحباب لعق الاصابع و القصعة واکل اللقمة الساقطة، رقم: ۳۷۸۷، سنن ابن ماجه ، کتاب الاطعمة، باب لعق الاصابع، رقم: ۳۲۶۰، مسند أحمد، رقم: ۲۵۴۷

کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ لینا سنت ہے

دوسرا مسئلہ جو اس حدیث کے بیان کا اصل مقصود ہے۔ وہ یہ کہ ہاتھوں کو دھونے اور پونچھنے سے پہلے انگلیوں کو چاٹ لینا چاہئے، اور خود حضور اقدس ﷺ کا یہ معمول تھا، اور آپ کی یہ سنت تھی کہ کھانے کے جو ذرات انگلیوں پر رہ جاتے، آپ ان کو چاٹ لیتے تھے، اور اس کی حکمت حضور اقدس ﷺ نے ایک دوسری حدیث میں یہ بیان فرمائی کہ تمہیں نہیں معلوم کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھانے کے اس مخصوص جز میں کوئی برکت کا پہلو ہو سکتا ہے، جو دوسرے اجزاء میں نہیں ہے۔ شاید برکت اسی حصے میں ہو۔ جو تمہاری انگلیوں پر لگا رہ گیا ہے، لہٰذا اس حصے کو بھی ضائع نہ کرو۔ بلکہ اس کو بھی کھا لو، تاکہ اس برکت سے محروم نہ رہو۔

برکت کیا چیز ہے؟

یہ برکت کیا چیز ہے؟ آج کی دنیا جو مادہ پرستی میں گری ہوئی ہے، صبح سے لے کر شام تک مادہ ہی چکر کاٹتا نظر آتا ہے اور مادے کے پیچھے، مال و دولت اور سامان و اسباب کے پیچھے جھانکنے کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی ہے۔ اس لئے آجکل برکت کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ برکت کیا چیز ہے؟ برکت ایک ایسا وسیع مفہوم ہے۔ جس میں دنیا و آخرت کی تمام صلاح و فلاح سب شامل ہو جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک عطا ہوتی ہے۔ جس کا آپ نے اپنی زندگی میں بار بار مشاہدہ کیا ہوگا۔ وہ یہ کہ بعض اوقات انسان کسی چیز کے بے شمار اسباب جمع کر لیتا ہے۔ مگر ان سے فائدہ نہیں ہوتا، مثلاً اپنے گھر کے اندر آرام و راحت کے تمام اسباب جمع کر لئے، اعلیٰ سے اعلیٰ فرنیچر سے گھر کو سجا دیا۔ بہترین بیڈ لگا لئے۔ حشم خدم، نوکر چاکر سب جمع کر لئے۔ سجاوٹ کا سارا سامان جمع کر لیا۔ لیکن اس کے باوجود رات کو نیند نہیں آتی، ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے رہے، معلوم ہوا کہ ساز و سامان میں برکت نہیں۔ اور اس سامان سے جو فائدہ حاصل ہونا چاہئے تھا وہ حاصل نہیں ہوا۔ اب بتاؤ کہ کیا یہ سامان اپنی ذات میں خود مقصود ہے کہ ان کو دیکھتے رہو؟ اور خوش ہوتے رہو، ارے یہ سامان تو اس لئے کہ اس کے ذریعہ راحت ملے، آرام ملے، سکون حاصل ہو یاد رکھو۔ یہ ساز و سامان سکون اور راحت کا ذریعہ تو ہیں اور جس چیز کا نام "راحت اور سکون" ہے۔ وہ خالص اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے، تب "راحت و آرام" حاصل ہوگا۔ ورنہ دنیا کا کتنا بھی اسباب و سامان جمع کر لو۔ مگر راحت اور آرام نہیں ملے گا۔

اسباب میں راحت نہیں

آج ہر شخص اپنے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لے کہ آج سے تیس چالیس سال پہلے ہر شخص کے پاس کیسا ساز و سامان تھا، اور آج کتنا ہے، اور کیسا ہے؟ جائزہ لینے سے یہی نظر آئے گا کہ بیشتر افراد وہ ہیں، جن کی معاشی حالت میں ترقی ہوئی ہے۔ ان کے گھر کے ساز و سامان میں اضافہ ہوا ہے۔ فرنیچر پہلے سے اچھا ہے۔ گھر پہلے سے اچھا بن گیا ہے، آرام وہ چیزیں پہلے سے زیادہ حاصل ہو گئیں، لیکن یہ دیکھو کہ کیا سکون بھی حاصل ہوا؟ کیا راحت و آرام ملا؟ اگر سکون اور آرام نہیں ملا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سامان میں اللہ تعالیٰ سے برکت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز میں برکت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز کے استعمال سے جو فائدہ حاصل ہونا چاہئے تھا۔ وہ حاصل ہو رہا ہے۔ اور بے برکتی یہ ہے کہ اس چیز کے استعمال کے باوجود راحت اور آرام حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

راحت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے

یاد رکھو۔ راحت، آرام، سکون، یہ چیزیں بازار سے پیسوں کے ذریعہ نہیں خریدی جاسکتیں، یہ خالص اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، وہی عطا فرماتے ہیں۔ اسی کا نام برکت ہے۔ جن لوگوں کے پیسوں میں برکت ہوتی ہے۔ گنتی کے اعتبار سے تمہارے مقابلے میں ان کے پاس شاید کم ہوں لیکن پیسوں کا جو فائدہ ہے۔ یعنی راحت و آرام، وہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دے رکھا ہے۔ مثلاً ایک دولتمند انسان ہے۔ اس کے پاس دنیا کا سارا ساز و سامان جمع ہے۔ کارخانے کھڑے ہیں، کاریں ہیں، فرنیچر ہے، نوکر چاکر ہیں۔ جب کھانا چنا جاتا ہے تو دسترخوان پر اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے موجود ہیں، لیکن معدہ خراب ہے۔ بھوک نہیں لگتی۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے کہ فلاں چیز نہیں کھاسکتے۔ فلاں چیز نہیں کھاسکتے، اب نعمتوں کے موجود ہونے کے باوجود ان سے فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ اسی کا نام بے برکتی ہے۔ دوسری طرف ایک مزدور نے آٹھ گھنٹے محنت کر کے سو روپے کمائے، اور پھر ہوٹل سے دال روٹی یا سبزی روٹی خریدی، اور بھر پور بھوک کے بعد خوب پیٹ بھر کر کھایا، کھانے کی پوری لذت حاصل کی، اور جب رات کو اپنی ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر سویا تو آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لے کر اٹھا، جس سے معلوم ہوا کہ کھانے کی لذت اس مزدور کو حاصل ہوئی۔ نیند کی لذت بھی اس کو حاصل ہوئی۔ البتہ اتنی بات ہے کہ دولت مند جیسا ٹیپ ٹاپ اس کے پاس نہیں ہے۔ یہ ہے برکت کہ اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی چیز میں برکت ڈال دی، اور جن چیزوں سے جو فائدہ حاصل ہونا تھا۔ وہ اس سے حاصل کر لیا۔

کھانے میں برکت کا مطلب

دیکھئے، جو کھانا آپ کھا رہے ہیں، یہ کھانا بذات خود مقصود نہیں، بلکہ کھانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ قوت حاصل ہو، جسم کو تقویت ملے، کھانے سے مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ بھوک مٹ جائے، اور وہ کھانا جزو بدن بن جائے، اس کے ذریعہ لذت اور راحت حاصل ہو۔ لیکن کھانے کے ذریعہ ان تمام چیزوں کا حاصل ہونا، یہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ اس بات کو حضور اقدس ﷺ اس حدیث میں بیان فرمارہے ہیں کہ تمہیں کیا معلوم کہ کھانے کے کس جزء میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی تھی، ہوسکتا ہے جو کھانا تم کھا چکے ہو۔ اس میں برکت نہ ہو، اور انگلیوں پر کھانے کا جو حصہ لگا ہوا تھا اس میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی تھی۔ تم نے اس کو چھوڑ دیا۔ جس کے نتیجے میں تم برکت سے محروم رہ گئے۔ چنانچہ وہ کھانا تو تم نے کھالیا۔ لیکن وہ کھانا نہ تو جزو بدن بنا، بلکہ اس کھانے نے بدہضمی پیدا کردی، اور صحت کو نقصان پہنچا دیا۔ اور اس سے جو قوت حاصل ہونی تھی وہ حاصل نہ ہوئی۔

کھانے کے باطن پر اثرات

یہ تو میں ظاہری سطح کی باتیں کر رہا ہوں، ورنہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو "دیدہ بینا" یعنی بصیرت کی آنکھ عطا فرماتے ہیں، وہ اس سے بھی آگے پہنچتے ہیں، وہ یہ کہ کھانے کھانے میں فرق ہے۔ یہ کھانا انسان کی فکر پر، اس کی سوچ پر، اس کے جذبات اور خیالات پر اثر انداز ہوتا ہے، بعض کھانے وہ ہوتے ہیں جو انسان باطنی حالات میں ظلمت اور تاریکی پیدا کرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے برے خیالات اور بُرے جذبات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ گناہوں کا شوق اور غلط داعیے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور بعض کھانے ایسی برکت والے ہوتے ہیں کہ جس کی وجہ سے باطن کو سرور حاصل ہوتا ہے، روح کو غذا ملتی ہے۔ اچھے ارادے اور اچھے خیالات دل میں آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انسان کو نیکیوں کی ترغیب ہوتی ہے، نیکیوں کا داعیہ دل میں ابھرتا ہے۔ لیکن چونکہ ہماری آنکھیں اس مادہ پرستی کے دور میں اندھی ہو چکی ہیں۔ ہم لوگ بصیرت کھو چکے ہیں، جس کی وجہ سے کھانے کی ظلمت اور نورانیت کا فرق نہیں پتہ چلتا۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ بصیرت کی آنکھ عطا فرماتے ہیں۔ ان سے پوچھئے۔

کھانے کے اثرات کا واقعہ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے۔ غالباً انہی کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے ایک مرتبہ حضرت والا کی دعوت کی۔

آپ وہاں تشریف لے گئے، کھانا شروع کیا، ایک نوالہ کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ جس شخص نے دعوت کی ہے۔ اس کی آمدنی حلال نہیں ہے، اس کی وجہ سے یہ کھانا حلال نہیں ہے۔ چنانچہ کھانا چھوڑ کر کھڑے ہو گئے، اور واپس چلے آئے، لیکن ایک نوالہ جو حلق سے نیچے اتار لیا تھا۔ اس کی ظلمت اور تاریکی دو ماہ تک مجھے محسوس ہوتی رہی۔ وہ اس طرح کے دو ماہ تک میرے دل میں گناہ کرنے کے داعیے بار بار پیدا ہوتے رہے۔ دل میں یہ تقاضہ ہوتا کہ فلاں گناہ کرلوں۔ فلاں گناہ کرلوں۔ اب بظاہر تو اس میں کوئی جوڑ نظر نہیں آتا کہ ایک لقمہ کھا لینے میں اور گناہ کا تقاضا پیدا ہونے میں کیا جوڑ ہے؟ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ ہمیں اس لئے محسوس نہیں ہوتا کہ ہمارا سینہ ظلمت کے داغوں سے بھرا ہوا ہے۔ جیسے ایک سفید کپڑے کے اوپر بے شمار سیاہ داغ لگے ہوئے ہوں۔ اس کے بعد ایک داغ اور لگ جائے، پتہ بھی نہیں چلے گا کہ نیا داغ کونسا ہے؟ لیکن اگر کپڑا سفید، صاف، شفاف ہو، اس پر اگر ایک چھوٹا سا بھی داغ لگ جائے گا تو دور سے نظر آئے گا کہ داغ لگا ہوا ہے؟ بالکل اسی طرح ان اللہ والوں کے دل آئینے کی طرح صاف شفاف ہوتے ہیں۔ اس پر اگر ایک داغ بھی لگ جائے تو وہ داغ محسوس ہوتا ہے، اور اس کی ظلمت نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان اللہ کے بندے نے یہ محسوس کرلیا کہ اس ایک لقمہ کے کھانے سے پہلے تو نیکی کے داعیے بھی دل میں پیدا ہو رہے ہیں، گناہوں سے نفرت ہے، لیکن ایک لقمہ کھانے کے بعد دل میں گناہوں کے تقاضے پیدا ہونے لگے، اس لئے بعد میں فرمایا کہ در حقیقت یہ اس ایک خراب لقمے کی ظلمت تھی۔ اس کا نام "برکت باطنی" ہے، جب اللہ تعالیٰ یہ برکت باطنی عطا فرما دیتے ہیں تو پھر اس کے ذریعہ انسان کے باطن میں ترقی ہوتی ہے۔ اخلاق اور خیالات درست ہو جاتے ہیں۔

ہم مادہ پرستی میں پھنسے ہوئے ہیں

آج ہم مادہ پرستی میں اور پیسوں کی گنتی کے چکر میں پھنس گئے، ساز و سامان اور ٹیپ ٹاپ میں پھنس گئے، جس کے نتیجے میں ہر کام کی باطنی روح ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی، اور یہ باتیں اجنبی اور اچھی معلوم نہیں ہوتی ہیں۔ اس لئے برکت کا مطلب بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ کوئی اگر ہزار بار کہے کہ فلاں کام میں برکت ہے، تو اس کی کوئی اہمیت دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ کھانا کھاؤ گے تو ایک ہزار روپے زیادہ ملیں گے، تو اب طبیعت میں اس کھانے کی طرف رغبت پیدا ہو گی کہ ہاں، یہ فائدہ کا کام ہے، اور اگر کوئی کہے کہ فلاں طریقے سے کھانا کھاؤ گے تو اس سے کھانے میں برکت ہو گی، تو اس طریقے کی طرف رغبت نہیں ہو گی، اس لئے کہ یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ برکت کیا ہوتی ہے، اس برکت کا ذہن میں تصور ہی نہیں، حالانکہ حضور نبی کریم ﷺ نے جگہ جگہ احادیث میں فرما

دیا کہ اس عمل سے برکت حاصل ہوگی، اور اس عمل سے برکت سلب ہو جائے گی، برکت حاصل کرنے کی کوشش کرو، بے برکتی سے بچو۔ اس لئے یہ بات یاد رکھو کہ یہ برکت اس وقت تک حاصل نہیں ہوگی جب تک حضور اقدس ﷺ کی سنتوں کا اتباع نہیں ہوگا، چنانچہ اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ لو۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ کھانے کے جو ذرات انگلیوں میں لگے ہوئے ہیں، ان میں برکت ہو۔

کیا اُنگلیاں چاٹ لینا شائستگی کے خلاف ہے؟

آج فیشن پرستی کا زمانہ ہے۔ لوگوں نے اپنے لئے نئے نئے ایٹیکیٹ بنا رکھے ہیں، چنانچہ اگر دستر خوان پر سب کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں، اس وقت اگر انگلیوں پر لگے ہوئے سالن کو چاٹ لیں، تو شائستگی کے خلاف ہے، تہذیب کے خلاف ہے، یہ تو ناشائستگی اور بدتہذیبی ہے، اس لئے اس کام کو کرتے ہوئے شرم آتی ہے، اگر لوگوں کے سامنے کریں گے تو لوگ ہنسی مذاق اڑائیں گے، اور کہیں گے کہ یہ شخص غیر مہذب اور ناشائستہ ہے۔

تہذیب اور شائستگی سنتوں میں منحصر ہے

لیکن یاد رکھو، ساری تہذیب اور ساری شائستگی حضور اقدس ﷺ کی سنتوں میں منحصر ہے، جس چیز کو آپ ﷺ نے شائستگی قرار دے دیا وہ ہے شائستگی، یہ نہیں ہے کہ جس چیز کو فیشن نے شائستگی قرار دے دیا، وہ شائستگی ہو، اس لئے کہ یہ فیشن تو روز بدلتے ہیں۔ کل تک جو چیز ناشائستہ تھی، آج وہ چیز شائستہ بن گئی۔

کھڑے ہو کر کھانا بدتہذیبی ہے

مثلاً کھڑے ہو کر کھانا آجکل فیشن بن گیا ہے، ایک ہاتھ میں پلیٹ پکڑی ہے، دوسرے ہاتھ سے کھانا کھا رہے ہیں، اسی پلیٹ میں سالن بھی ہے۔ اسی میں روٹی بھی ہے، اسی میں سلاد ہے، اور جس وقت دعوت میں کھانا شروع ہوتا ہے اس وقت چھینا جھپٹی ہوتی ہے، اس میں کسی کو بھی ناشائستگی نظر نہیں آتی؟ اس لئے کہ فیشن نے آنکھیں اندھی کر دی ہیں، اس کے نتیجے میں اس کے اندر ناشائستگی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ جب تک کھڑے ہو کر کھانے کا فیشن اور رواج نہیں چلا تھا، اس وقت اگر کوئی شخص کھڑے ہو کر کھانا کھاتا تو ساری دنیا اس کو یہی کہتی کہ۔ غیر مہذب اور بڑا ناشائستہ طریقہ ہے، صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی آرام سے بیٹھ کر کھائے۔

فیشن کو بنیاد مت بناؤ

لہٰذا فیشن کی بنیاد پر تو تہذیب اور شائستگی روز بدلتی ہے، اور بدلنے والی چیز کا کوئی بھروسہ اور کوئی اعتبار نہیں، اعتبار اس چیز کا ہے جس کو محمد ﷺ نے سنت قرار دے دیا، اور جس کے بارے میں آپ نے بتا دیا کہ برکت اس میں ہے۔ اب اگر حضور اقدس ﷺ کی اتباع کی نیت سے یہ کام کرلو گے تو آخرت میں بھی اجر وثواب، اور دنیا میں بھی برکت حاصل ہوگی، اور اگر معاذ اللہ ناشائستہ سمجھ کر اس کو چھوڑ دو گے تو پھر تم اس کی برکتوں سے بھی محروم ہو جاؤ گے، اور پھر یہ بے چینیاں تمہاری مقدر ہوں گی، محرومیاں تمہاری مقدر بن جائیں گی، گناہوں کی رغبت تمہارا مقدر ہوگی، اور دن رات تمہارے دل میں ظلمت اور تاریکیاں پیدا ہوتی رہیں گی۔ بہرحال بات لمبی ہوگئی، اس حدیث میں آپ نے اس بات کی تاکید فرمائی کہ کھانے کے بعد اپنی انگلیاں چاٹ لیا کرو، تاکہ کھانے کی برکت حاصل ہو جائے۔

تین انگلیوں سے کھانا سنت ہے

حضور اقدس ﷺ کی عام عادت یہ تھی کہ آپ عموماً تین انگلیوں سے کھانا تناول فرمایا کرتے تھے، یعنی انگوٹھا، شہادت کی انگلی، اور بیچ کی انگلی، ان تینوں کی ملا کر نوالہ لیتے تھے، علماء کرام نے تین انگلیوں سے کھانے کی ایک حکمت تو یہ لکھی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا زمانہ سادہ غذاؤں کا زمانہ تھا، آج کل کی طرح بہت لمبے چوڑے کھانے نہیں ہوتے تھے اور دوسری حکمت یہ لکھی ہے کہ جب تین انگلیوں سے کھائیں گے تو نوالہ چھوٹا بنے گا، اور چھوٹے نوالے میں ایک فائدہ طبی طور پر یہ ہے کہ نوالہ جتنا چھوٹا ہوگا، اتنا ہی اس کے ہضم میں آسانی ہوگی، اس لئے کہ بڑا نوالہ پوری طرح چبے گا نہیں۔ اور پھر معدہ میں جا کر نقصان پہنچائے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر بڑا نوالہ لیا جائے گا تو اس سے انسان کی حرص کا اظہار ہوتا ہے، اور چھوٹے نوالے میں قناعت کا اظہار ہوتا ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ تین انگلیوں سے تناول فرماتے تھے، اور کبھی کبھار چار انگلیوں سے بھی کھایا کرتے تھے، بلکہ ایک روایت میں ایک واقعہ آیا کہ حضور اقدس ﷺ نے پانچ انگلیوں سے کھانا تناول فرمایا۔ جس کے ذریعہ آپ نے یہ بتا دیا کہ تین کے بجائے چار اور پانچ انگلیوں سے کھانا بھی جائز ہے۔ لیکن عام طور پر آپ کا معمول اور آپ کی سنت تین انگلیوں سے کھانے کی تھی۔ (۱)

انگلیاں چاٹنے میں ترتیب

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عشق دیکھئے کہ حضور اقدس ﷺ کی ایک ایک ادا کو ہمارے لئے اس طرح

محفوظ کر کے چھوڑ گئے ہیں کہ ہمارے لئے اس کی نقل اتارنا اور اس کی اتباع آسان ہو جائے، چنانچہ صحابہ کرامؓ نے ہمیں یہ بتا دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس ترتیب سے یہ تین انگلیاں چاٹا کرتے تھے، فرماتے ہیں کہ ان تین انگلیوں کے چاٹنے کی ترتیب یہ ہوتی تھی کہ پہلے بیچ کی انگلی، پھر شہادت کی انگلی، اور پھر انگوٹھا۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں مل کر بیٹھتے تو آپ کی سنتوں کا تذکرہ کرتے، اور ایک دوسرے کو ترغیب دیتے کہ ہمیں بھی اسی طرح کرنا چاہئے۔ اب اگر کوئی انگلیاں نہ چاٹے تو کوئی گناہ نہیں ہوگا مگر سنت کی برکت سے محروم ہو جائے گا۔

کب تک ہنسے جانے سے ڈرو گے؟

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اگر ہم لوگوں کے سامنے انگلیاں چاٹیں گے تو لوگ اس پر ہنسی مذاق اڑائیں گے، اور ہمیں غیر مہذب اور غیر شائستہ کہیں گے۔ تو یاد رکھئے۔ جب تک ایک مرتبہ خم ٹھوک کر، کمر مضبوط کر کے اس بات کا تہیہ نہیں کر لو گے کہ دنیا کے لوگ جو کہیں، کہا کریں۔ ہمیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت محبوب ہے، ہمیں تو اس پر عمل کرنا ہے، جب تک یہ فیصلہ نہیں کرو گے۔ یاد رکھو۔ یہ دنیا تمہارا ہنسی مذاق اڑاتی رہے گی، مغربی قوموں کی نقالی کرتے کرتے ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ سر سے لے کر پاؤں تک اپنا سراپا ان کے سانچے میں ڈھال لیا، لباس پوشاک ان جیسا، رہن سہن ان جیسا، وضع قطع ان جیسی، طریقے ان جیسے، تہذیب ان کی اختیار کر لی۔ ہر چیز میں ان کی نقالی کر کے دیکھ لی۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا ان کی نظر میں تمہاری عزت ہو گئی؟ آج بھی وہ قوم تمہیں ذلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے، تمہیں ذلیل سمجھتی ہے، روزانہ تمہاری پٹائی ہوتی ہے۔ تمہارے اوپر طمانچے لگتے ہیں، تمہیں حقیر سمجھا جاتا ہے، یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ تم نے ان کو خوش کرنے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے چھوڑ کے ان کے طریقے اختیار کر لئے ہیں، چنانچہ وہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ ہمارے مقلد اور ہمارے نقال ہیں۔ اب تم ان کے سامنے کتنے ہی بن سنور کے چلے جاؤ۔ لیکن تم دقیانوس اور فنڈامینٹلسٹ ہی رہو گے، اور تمہارے اوپر یہی طعنہ لگے گا کہ یہ بنیاد پرست اور غیر مہذب ہیں، رجعت پسند ہیں۔

یہ طعنے انبیاء علیہم السلام کی وراثت ہے

جب تک تم ایک مرتبہ کمر مضبوط کر کے یہ تہیہ نہیں کر لو گے کہ یہ لوگ طعنے دیتے ہیں تو دیا کریں،

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب استحباب لعق الاصابع والقصعة......رقم: ۳۷۹۰، سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمة، باب فی المندیل، رقم: ۳۳۵۰، مسند أحمد، رقم: ۱۴۲۰۴

کیونکہ یہ طعنے تو حق کے راستے کے راہی کا زیور ہیں، جب انسان حق کے راستے پر چلتا ہے تو اس کو یہی طعنے ملا کرتے ہیں۔ ارے، ہم کیا ہیں۔ ہمارے پیغمبروں کو یہی طعنے ملے، چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

﴿مَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ﴾ (۱)

یہ کفار پیغمبروں سے کہا کرتے تھے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جو لوگ تمہاری اتباع کر رہے ہیں، یہ بڑے ذلیل قسم کے لوگ ہیں۔ حقیر اور ناشائستہ اور غیر مہذب ہیں۔ بہر حال، اگر تم مسلمان ہو، پیغمبروں کے امتی اور ان کے متبع ہو تو پھر جہاں اور چیزیں ان کی وراثت میں تمہیں حاصل ہوئی ہیں، یہ طعنے بھی ان کی وراثت ہیں۔ آگے بڑھ کر ان طعنوں کو گلے لگاؤ، اور اپنے لئے ان کو باعث فخر سمجھو کہ الحمدللہ، وہی طعنے جو انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے تھے، ہمیں بھی دیئے جا رہے ہیں، یاد رکھو! جب تک یہ جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ اس وقت یہ ساری قوم میں تمہارا مذاق اڑاتی رہیں گی۔ اسد ملتانی مرحوم ایک شاعر گزرے ہیں، انہوں نے بڑا اچھا شعر کہا ہے:

ہنسے جانے سے جب تک تم ڈرو گے
زمانہ تم پر ہنستا ہی رہے گا

دیکھ لو، زمانہ ہنس رہا ہے، خدا کے لئے یہ پرواہ دل سے نکال دو کہ دنیا کیا کہے گی، بلکہ یہ دیکھو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت کیا ہے؟ اس پر عمل کر کے دیکھو، انشاء اللہ، دنیا سے عزت کراؤ گے، آخر کار عزت تمہاری ہوگی، کیونکہ عزت سرکار دو عالم ﷺ کی سنت کی اتباع میں ہے، کسی اور کی اتباع میں نہیں۔

اتباع سنت پر عظیم بشارت

اتباع سنت پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اتنی عظیم بشارت دی ہے کہ اس کے برابر کوئی بشارت ہو ہی نہیں سکتی، چنانچہ فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (۲)

یعنی اے نبی! آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے، تو میری اتباع کرو، میرے پیچھے چلو اور جب میرے پیچھے چلو گے اور میری اتباع کرو گے تو اللہ تعالیٰ سے محبت کرو گے، تمہاری کیا حقیقت تمہاری کیا مجال کہ تم اللہ تعالیٰ سے محبت کر سکو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے، بشرطیکہ تم محمد رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کی اتباع کرنے لگو۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یہ

(۱) ھود: ۲۷
(۲) آل عمران: ۳۱

اس بات کی بشارت ہے کہ جس عمل کو سرکار دو عالم ﷺ کی اتباع کی غرض سے اختیار کیا جائے، تو پھر جس وقت انسان وہ عمل کر رہا ہے، اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے، دیکھو سنت یہ ہے کہ جب آدمی بیت الخلاء میں جائے، تو جانے سے پہلے یہ دعا پڑھے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ))(۱)

اور داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں داخل کرے، تو جس وقت تم نے اس نیت سے بایاں پاؤں داخل کر رہے ہو کہ یہ سرکار دو عالم ﷺ کی سنت ہے، اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہو، اس لئے کہ اس وقت تم اللہ کے محبوب کی سنت کی اتباع کر رہے ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنا محبوب بنالیں گے

اسی طرح جس وقت تم اس نیت سے یہ انگلی چاٹ رہے ہو کہ یہ سرکار دو عالم ﷺ کی سنت ہے، اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کر رہے ہیں، ارے تم مخلوق کی طرف کیوں دیکھتے ہو کہ وہ محبت کر رہے ہیں یا نہیں؟ وہ اچھا سمجھ رہے ہیں یا نہیں؟ اس مخلوق کا خالق اور مالک جب تم سے محبت کر رہا ہے، اور وہ کہہ رہا ہے کہ یہ کام بڑا اچھا ہے۔ پھر تمہیں کیا پرواہ کہ دوسرے پسند کریں یا نہ کریں۔ اس لئے سنتوں کے ان طریقوں کو اپنی زندگی میں داخل کریں۔ ان کو اپنائیں اور ان طعنوں کی پرواہ نہ کریں۔ لوگ کہتے ہیں کہ آجکل ایسا زمانہ آگیا ہے کہ اس میں دین پر عمل کرنا بڑا مشکل ہے۔ ارے بھائی، ہم نے اپنے ذہن سے مشکل بنا رکھا ہے، ورنہ بتایئے کہ اس انگلیاں چاٹنے کی سنت پر عمل کرنے میں کیا دشواری ہے؟ کون تمہارا ہاتھ روک رہا ہے؟ تمہارے مال و دولت میں یا راحت و آرام میں اس سنت پر عمل کرنے سے کونسا خلل آ رہا ہے؟ جب اس ایک سنت کو اختیار کر لیا تو اللہ کی محبوبیت تمہیں حاصل ہو گئی، اور اس سنت کی برکات حاصل ہو گئیں۔ کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ ایک سنت کے صلے میں تمہیں نواز دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تمام سنتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اُنگلیاں دوسرے کو بھی چٹوانا جائز ہے

اس حدیث میں ایک اختیار اور دے دیا، فرمایا کہ:

((اَوْیُلْعِقَھَا))

(۱) صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب ما یقول عند الخلاء، رقم:۱۲۹، صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب ما یقول إذا أراد دخول الخلاء، رقم:۵٦۳، سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله ﷺ، باب ما یقول إذا دخل الخلاء، رقم:٦

یعنی اگر انگلیاں خود نہ چاٹے تو کسی اور کو چٹا دے، علماء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ اس کا منشاء یہ ہے کہ بعض اوقات ایسی صورت ہو جاتی ہے کہ آدمی انگلیاں چاٹنے پر قادر نہیں ہوتا، ایسی صورت میں کسی اور کو چٹا دے، مثلاً بچے کو چٹا دے، یا بلی کو چٹا دے، کسی پرندے کو چٹا دے، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالی کا رزق ضائع نہ ہو۔ اب اگر اس کو جا کر دھو ڈالو گے تو رزق ضائع ہو جائے گا۔ اور مخلوق کو چٹا دو تا کہ اس کو بھی برکت حاصل ہو جائے۔

کھانے کے بعد برتن چاٹنا

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِلَعْقِ الْاَصَابِعِ وَالصَّحْفَةِ، وَقَالَ: ((اِنَّكُمْ لَاتَدْرُوْنَ فِيْ اَيِّ طَعَامِكُمُ الْبَرَكَةُ))(۱)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلیاں چاٹنے اور پیالہ چاٹنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے کھانے کے کس حصے میں برکت ہے۔

اس حدیث میں ایک ادب اور بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ کھانے کے بعد انگلیاں بھی چاٹے، اور جس برتن میں کھا رہا ہے۔ اس برتن کو بھی چاٹ کر صاف کر لے، تا کہ اللہ تعالی کے رزق کی ناقدری نہ ہو۔ ویسے تو برتن میں اتنا ہی سالن نکالنا چاہئے۔ جتنا کھا سکنے کی توقع ہو، زیادہ نہ نکالے، تا کہ بعد میں بچے نہیں، لیکن اگر بالفرض کھانا پلیٹ میں زیادہ نکل آیا، اور کھانا بچ گیا، اور اب کھانے کی گنجائش باقی نہ رہی، ایسے موقع پر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پلیٹ میں جتنا سالن نکال لیا ہے، اس سب کو کھا کر ختم کرنا ضروری ہے، حتی کہ بعض لوگ اس کو فرض واجب سمجھنے لگے ہیں چاہے بعد میں ہیضہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یاد رکھئے! شریعت میں یہ حکم نہیں کہ ضرور پورا کھانا کھاؤ، بلکہ شریعت کا اصل طریقہ یہ ہے کہ اول تو زیادہ کھانا نکالو ہی نہیں۔ لیکن اگر زیادہ کھانا نکل آئے تو اس کو چھوڑ دینے کی گنجائش ہے۔ لیکن اس کو اس طرح چھوڑو کہ وہ چھوڑا ہوا کھانا پیالے کے ایک طرف ہو، پورے پیالے میں پھیلا ہوا نہ ہو، پورا پیالہ گندا نہ ہو، لہٰذا اس کا طریقہ یہ ہے اپنے سامنے سے کھا کر اس حصے کو صاف کر لو۔ تا کہ آپ کا بچا ہوا کھانا کسی اور کو دیا جائے تو اس کو گھن نہ آئے۔ اس کو پریشانی نہ ہو، اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہے۔

ورنہ چمچے کو چاٹ لے

بعض اوقات آدمی ہاتھ سے کھانا نہیں کھاتا، بلکہ چمچوں سے کھانا کھاتا ہے۔ اس وقت انگلیوں کے چاٹنے کی سنت پر کس طرح عمل کرے؟ اس لئے کہ انگلیوں پر کھانا لگا ہی نہیں۔ تو بعض علماء نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص چمچے سے کھا رہا ہے تو چمچے پر جو کھانا لگا ہوا ہے۔ اس کو اس نیت سے چاٹ لے کہ

نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ معلوم نہیں کہ کھانے کے کس حصے میں برکت ہے؟ اب کھانا میری انگلیوں پر لگا نہیں ہے۔ مگر چمچوں پر لگا ہوا ہے۔ اس کو صاف کر لے، تو امید ہے کہ انشاء اللہ، اس سنت کی فضیلت اس میں بھی حاصل ہو جائے گی۔

گرا ہوا لقمہ اٹھا کر کھا لینا چاہئے

وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((اِذَا وَقَعَتْ لُقْمَةُ اَحَدِكُمْ فَلْيَاْخُذْهَا فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ اَذًى وَ لْيَاْكُلْهَا، وَ لَا يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ، وَلَا يَمْسَحْ يَدَهُ بِالْمِنْدِيْلِ حَتّٰى يَلْعَقَ اَصَابِعَهُ، فَاِنَّهُ لَا يَدْرِيْ فِيْ اَيِّ طَعَامِهِ الْبَرَكَةُ)) (۱)

بعض اوقات کھانا کھاتے وقت کوئی لقمہ یا کوئی چیز گر جائے تو اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھا لینا چاہئے، بعض اوقات انسان اس کو اٹھا کر کھاتے ہوئے شرماتا ہے اور جھجکتا ہے، اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا رزق ہے، اس کی عطا ہے اس کی ناقدری نہ کرو، اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھا لو۔ البتہ اگر وہ لقمہ اس طرح گر گیا کہ بالکل ملوث یا ناپاک ہو گیا، اور گندہ ہو گیا، اور اب اس کو صاف کر کے کھانا ممکن نہیں ہے تو بات دوسری ہے۔ مجبوری ہے۔ لیکن اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھایا جا سکتا ہو، اس وقت تک نہ چھوڑو۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا رزق ہے، اس کی قدر اور تعظیم واجب ہے، جب تک اللہ تعالیٰ کے رزق کے چھوٹے حصوں کی قدر اور تعظیم نہیں کرو گے، اس وقت تک تمہیں رزق کی برکت حاصل نہیں ہو گی۔ اس میں بھی وہی بات ہے کہ گرے ہوئے لقمے کو اٹھا کر کھانا آج کل کی تہذیب کے خلاف ہے، اس لئے آدمی اس سے شرماتا ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ اگر میں اس کو اٹھاؤں گا تو لوگ کہیں گے کہ یہ بڑا اندیدہ ہے۔ لیکن اس پر ایک واقعہ سن لیجئے۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما جو حضور اقدس ﷺ کے بڑے جانثار صحابی ہیں، اور حضور اقدس ﷺ کے رازدار، ان کا لقب "صاحب سر رسول اللہ ﷺ" مشہور تھا۔ جس وقت مسلمانوں نے ایران میں کسریٰ کی سلطنت پر حملہ کیا، جو کسریٰ اس وقت کی بڑی عظیم طاقت اور سپر پاور تھا، اور ایران کی

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب استحباب لعق الاصابع والقصعة......رقم:۳۷۹۳، سنن الترمذی، کتاب الاطعمة عن رسول اللہ، باب ما جاء فی اللقمة تسقط، رقم:۱۷۲۵، سنن ابن ماجه، کتاب الاطعمة، باب لعق الاصابع، رقم:۳۲۶۱، مسند أحمد، رقم:٤٢٨٥

تہذیب ساری دنیا کے اندر مشہور تھی، اور اس کا غلغلہ تھا۔ اس لئے کہ اس وقت دو ہی تہذیبیں تھیں۔ ایک رومی اور ایک ایرانی، لیکن ایرانی تہذیب اپنی نزاکت، اپنی صفائی ستھرائی میں زیادہ مشہور تھی۔ بہر حال، جب حملہ کیا تو کسریٰ نے مسلمانوں کو مذاکرات کی دعوت دی کہ آپ لوگ ہمارے ساتھ مذاکرات کریں۔

اپنا لباس نہیں چھوڑیں گے

حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ جب مذاکرات کے لئے جانے لگے، اور کسریٰ کے محل میں داخل ہونے لگے، تو اس وقت وہ اپنا وہی سیدھا سادہ لباس پہنے ہوتے تھے، چونکہ لمبا سفر کر کے آئے تھے، اس لئے ہوسکتا ہے کہ وہ کپڑے کچھ میلے بھی ہوں، دربار کے دروازے پر جو دربان تھا، اس نے آپ کو اندر جانے سے روک دیا، اس نے کہا کہ تم اتنے بڑے بادشاہ کسریٰ کے دربار میں ایسے لباس میں جارہے ہو؟ اور یہ کہہ کر اس نے ایک جبہ دیا کہ آپ یہ جبہ پہن کر جائیں حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے اس دربان سے کہا کہ اگر دربار میں جانے کے لئے اس کا دیا ہوا جبہ پہننا ضروری ہے، تو پھر ہمیں اس کے دربار میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں، اگر ہم جائیں گے تو اسی لباس میں جائیں گے، اور اگر اس کو اس لباس میں ملنا منظور نہیں، تو پھر ہمیں بھی اس سے ملنے کا کوئی شوق نہیں۔ لہٰذا ہم واپس جارہے ہیں۔

تلوار دیکھ لی، بازو بھی دیکھ

اس دربان نے اندر پیغام بھیجا کہ عجیب قسم کے لوگ آئے ہیں، جو جبہ لینے کو تیار نہیں، اس دوران حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ اپنی تلوار کے اوپر لپٹی ہوئی کترنوں کو درست کرنے لگے، جو تلوار کے ٹوٹے ہوئے حصے پر لپٹی ہوئی تھیں۔ اس دربان نے تلوار دیکھ کر کہا: ذرا مجھے اپنی تلوار تو دکھاؤ، آپ نے تلوار اس کو دے دی، اس نے وہ تلوار دیکھ کر کہا کہ کیا تم اس تلوار سے ایران فتح کرو گے؟

حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابھی تک تم نے صرف تلوار دیکھی ہے، تلوار چلانے والا ہاتھ نہیں دیکھا، اس نے کہا کہ اچھا ہاتھ بھی دکھا دو، حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاتھ دیکھنا چاہتے ہو تو ایسا کرو کہ تمہارے پاس تلوار کا وار روکنے والی جو سب سے زیادہ مضبوط ڈھال ہو وہ منگوالو، اور پھر میرا ہاتھ دیکھو، چنانچہ وہاں جو سب سے زیادہ مضبوط لوہے کی ڈھال تھی، جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کوئی تلوار اس کو نہیں کاٹ سکتی، وہ منگوائی گئی، حضرت ربعی بن عامرؓ نے فرمایا کہ کوئی شخص اس کو میرے سامنے لے کر کھڑا ہو جائے، چنانچہ ایک آدمی اس ڈھال کو لے کر کھڑا ہو گیا، تو

حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے وہ تلوار جس پر کترنیں لپٹی ہوئی تھیں، اس کا ایک وار جو کیا تو اس ڈھال کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ سب لوگ یہ نظارہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ خدا جانے یہ کیسی مخلوق آ گئی ہے۔ چنانچہ دربان نے اندر اطلاع بھیج دی یہ ایسی مخلوق ہے کہ اپنی ٹوٹی ہوئی تلوار سے ڈھال کے دو ٹکڑے کر دیئے، پھر ان کو اندر بلا لیا گیا۔

ان احمقوں کی وجہ سے سنت چھوڑ دوں؟

جب اندر پہنچے تو تواضع کے طور پر پہلے ان کے سامنے کھانا لا کر رکھا گیا، چنانچہ آپ نے کھانا شروع کیا، کھانے کے دوران آپ کے ہاتھ سے ایک نوالہ نیچے گر گیا۔ حضور اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ اگر نوالہ نیچے گر جائے تو اس کو ضائع نہ کرو وہ اللہ کا رزق ہے، اور یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رزق کے کون سے حصے میں برکت رکھی ہے، اس لئے اس نوالے کی ناقدری نہ کرو، بلکہ اس کو اٹھا لو، اگر اس کے اوپر کچھ مٹی لگ گئی ہے تو اس کو صاف کر لو، اور پھر کھا لو۔ چنانچہ جب نوالہ نیچے گرا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو یہ حدیث یاد آ گئی، اور آپ نے اس نوالے کو اٹھانے کے لئے نیچے ہاتھ بڑھایا، آپ کے برابر ایک صاحب بیٹھے تھے انہوں نے آپ کو کہنی مار کر اشارہ کیا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ تو دنیا کی سپر طاقت کسریٰ کا دربار ہے، اگر تم اس دربار میں زمین پر گرا ہوا نوالہ اٹھا کر کھاؤ گے تو ان لوگوں کے ذہنوں میں تمہاری وقعت نہیں رہے گی، اور یہ سمجھیں گے کہ یہ بڑے ندیدہ قسم کے لوگ ہیں، اس لئے یہ نوالہ اٹھا کر کھانے کا موقع نہیں ہے، آج اس کو چھوڑ دو۔ جواب میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے کیا عجیب جملہ ارشاد فرمایا:

"أَأَتْرُكُ سُنَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِهٰؤُلَاءِ الْحَمْقٰى؟"

کیا میں ان احمقوں کی وجہ سے سرکار دو عالم ﷺ کی سنت چھوڑ دوں؟ چاہے یہ اچھا سمجھیں، عزت کریں، یا ذلت کریں، یا مذاق اڑائیں، لیکن میں سرکار دو عالم ﷺ کی سنت نہیں چھوڑ سکتا۔ چنانچہ وہ لقمہ اٹھا کر صاف کر کے کھا لیا۔

یہ ہے فاتح ایران!

کسریٰ کے دربار کا دستور یہ تھا کہ وہ خود تو کرسی پر بیٹھا رہتا تھا اور سارے درباری سامنے کھڑے رہتے تھے۔ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے کسی سے کہا کہ ہم محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے پیروکار ہیں، اور حضور اقدس ﷺ نے ہمیں اس بات سے منع کیا ہے کہ ایک آدمی بیٹھا رہے اور باقی آدمی اس کے سامنے کھڑے رہیں، لہٰذا ہم اس سے مذاکرات کرنے کے لئے تیار نہیں، یا تو

ہمارے لئے بھی کرسیاں منگوائی جائیں، یا کسریٰ بھی ہمارے سامنے کھڑا ہو۔ کسریٰ نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ تو ہماری توہین کرنے کے لئے آگئے، چنانچہ اس نے حکم دیا کہ ایک مٹی کا ٹوکرا بھر کر ان کے سر پر رکھ کر ان کو واپس روانہ کر دو، میں ان سے بات نہیں کرتا، چنانچہ ایک مٹی کا ٹوکرا ان کو دے دیا گیا۔ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے وہ ٹوکرا سر پر رکھ لیا، جب دربار سے نکلنے لگے تو جاتے ہوئے یہ کہا: اے کسریٰ، یہ بات یاد رکھنا کہ تم نے ایران کی مٹی ہمیں دے دی۔ یہ کہہ کر روانہ ہو گئے ایرانی لوگ بڑے تو ہم پرست قسم کے لوگ تھے، انہوں نے سوچا کہ یہ جو کہا کہ "ایران کی مٹی ہمیں دے دی" یہ تو بڑی بد فالی ہو گئی، اب کسریٰ نے فوراً ایک آدمی پیچھے دوڑایا کہ جاؤ جلدی سے وہ مٹی کا ٹوکرا واپس لے آؤ۔ اب حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کہاں ہاتھ آنے والے تھے۔ چنانچہ وہ لے جانے میں کامیاب ہو گئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا تھا کہ ایران کی مٹی انہی ٹوٹی ہوئی تلوار والوں کے ہاتھ میں ہے۔

کسریٰ کے غرور کو خاک میں ملا دیا

اب بتایئے کہ انہوں نے اپنی عزت کرائی یا آج ہم سنتیں چھوڑ کر کروا رہے ہیں؟ عزت انہوں نے ہی کرائی، اور ایسی عزت کرائی کہ ایک طرف تو سنت پر عمل کرتے ہوئے نوالہ اٹھا کر کھایا، تو دوسری طرف ایران کے وہ کج کلاہ جو غرور کے مجسمے بنے ہوئے تھے، ان کا غرور ایسا خاک میں ملایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا:

((اِذَا هَلَكَ كِسْرٰى فَلَا كِسْرٰى بَعْدَهٗ))(۱)

جس دن کسریٰ ہلاک ہوا اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہے، دنیا سے اس کا نام و نشان مٹ گیا۔ بہر حال، یہ جو سنت کہ اگر نوالہ نیچے گر جائے تو اس کو اٹھا کر کھا لو، اس کو شرما کر مت چھوڑنا چاہئے، بلکہ اس سنت پر عمل کرنا چاہئے۔

مذاق اڑانے کے ڈر سے سنت چھوڑنا کب جائز ہے؟

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی سنت ایسی ہے۔ جس کا ترک بھی جائز ہے، اور اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ اگر اس سنت پر عمل کیا گیا تو کچھ مسلمان جو بے فکر اور آزاد خیال ہیں۔ وہ اس سنت کا مذاق اڑا کر کفر و ارتداد میں مبتلا ہوں گے، تو ایسے موقع میں اس سنت پر عمل چھوڑ دے تو یہ جائز

(۱) صحیح البخاری، کتاب فرض الخمس، باب قول النبی أحلت لکم الغنائم، رقم: ۲۸۸۸، صحیح مسلم، کتاب الفتن وأشراط الساعة، باب لاتقوم الساعة حتی یمر الرجل بقبر الرجل، رقم: ۵۱۹۶، سنن الترمذی، کتاب الفتن عن رسول اللہ، باب ما جاء اذا ذهب كسرىٰ فلا كسرىٰ بعده، رقم: ۲۱۴۲، مسند أحمد، رقم: ٦٨٨٧

ہے، مثلاً زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت سے قریب تر ہے۔ لیکن اگر آپ کسی وقت ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں کھانے کے لئے چلے گئے۔ وہاں کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ اب آپ نے وہاں جا کر یہ سوچا کہ زمین پر بیٹھ کر کھانا سنت سے زیادہ قریب ہے، چنانچہ وہیں پر آپ زمین پر رومال بچھا کر بیٹھ گئے۔ تو اس صورت میں اگر اس سنت کی توہین اور تضحیک کا اندیشہ ہو، اور اس سے لوگوں کے کفر اور ارتداد میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں بہتر یہ ہے کہ اس وقت آدمی اس سنت کو چھوڑ دے، اور کرسی پر بیٹھ کر کھالے۔

لیکن یہ اس وقت ہے جب اس سنت کو چھوڑنا جائز ہو، لیکن جہاں اس سنت کو چھوڑنا جائز اور مباح نہ ہو، وہاں کسی کے مذاق اڑانے کی وجہ سے اس سنت کو چھوڑنا جائز نہیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمان کی بات اور ہے۔ کافر کی بات اور ہے، اس لئے کہ مسلمان کے اندر تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ سنت کا مذاق اڑانے کے نتیجے میں کافر ہو جائے گا، لیکن اگر کافروں کا مجمع ہے۔ تو وہ پہلے سے ہی کافر ہیں، ان کے مذاق اڑانے سے کچھ فرق نہیں پڑیگا۔ لہٰذا وہاں پر سنت پر عمل کو چھوڑنا درست نہیں ہوگا۔

کھانے کے دوران اگر کوئی مہمان آجائے تو؟

وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ((طَعَامُ الْوَاحِدِ يَكْفِي الْاِثْنَيْنِ، وَطَعَامُ الْاِثْنَيْنِ يَكْفِي الْاَرْبَعَةِ، وَطَعَامُ الْاَرْبَعَةِ يَكْفِي الثَّمَانِيَةَ))(۱)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمی کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ اور دو آدمی کا کھانا چار کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ اور چار کا کھانا آٹھ کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں آپ نے یہ اصول بیان فرمایا کہ اگر تم کھانا کھانے بیٹھے، اور اس وقت کوئی مہمان یا ضرورت مند آ گیا، تو اس مہمان کو یا اس ضرورت مند کو صرف اس وجہ سے واپس مت لوٹاؤ کہ کھانا تو ہم نے ایک ہی آدمی کا بنایا تھا، اگر اس مہمان کو یا ضرورت مند کو کھانے میں شریک کر لیا تو کھانے میں کمی واقع ہو جائے گی، بلکہ ایک آدمی کا کھانا دو کے لئے بھی کافی ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس ضرورت مند کو واپس مت لوٹاؤ، بلکہ اس کو بھی کھانے میں شریک کر لو، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کھانے میں برکت عطا فرمائیں گے۔ اور جب ایک کا کھانا دو کے لئے کافی

(۱) صحيح مسلم، كتاب الاشربة، باب فضيلة المواساة فى الطعام القليل رقم:۳۸۳۶، سنن الترمذى، كتاب الاطعمة عن رسول الله، باب ما جاء فى طعام الواحد يكفى الاثنين، رقم: ۱۷۴۳، سنن ابن ماجه، كتا ب الاطعمة، باب طعام الواحد يكفى الاثنين، رقم:۳۲۴۵، مسند أحمد، رقم:۸۹۰۹

ہو جاتا ہے تو دو کا کھانا چار کے لئے، اور چار کا کھانا آٹھ کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

سائل کو ڈانٹ کر مت بھگاؤ

ہمارے یہاں یہ عجیب رواج پڑ گیا ہے کہ مہمان اسی کو سمجھا جاتا ہے جو ہمارے ہم پلہ ہو، یا جس سے شناسائی ہو، دوستی ہو، رشتہ دار ہو، اور وہ بھی اپنے ہم پلہ اور اپنے اسٹیٹس کا ہو، وہ تو حقیقت میں مہمان ہے، اور جو بے چارہ غریب اور مسکین آ جائے تو کوئی شخص اس کو مہمان نہیں مانتا، بلکہ اس کو بھکاری سمجھا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ یہ مانگنے والا آ گیا، حالانکہ حقیقت میں وہ بھی اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا مہمان ہے۔ اس کا اکرام کرنا بھی ہر مسلمان کا حق ہے، لہٰذا اگر کھانے کے وقت ایسا مہمان آ جائے تو اس کو بھی کھانے میں شریک کر لو، اس کو واپس مت کرو۔ اس میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے کہ اگر کھانے کے وقت سائل آ جائے تو اس کو واپس لوٹانا اچھی بات نہیں، اس کو کچھ دے کر رخصت کرنا چاہئے۔ اور اس سے تو ہر حال میں پرہیز کرنا چاہئے کہ اس کو ڈانٹ کر بھگا دیا جائے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (۱)

سائل کو جھڑکو نہیں اس لئے حتی الامکان اس بات کی کوشش کرو کہ جھڑکنے کی نوبت نہ آئے، اس لئے بعض اوقات آدمی اس کے اندر حدود سے تجاوز کر جاتا ہے، جس کے نتیجے میں بڑے خراب حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔

ایک عبرت آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک صاحب بڑے دولت مند تھے، ایک مرتبہ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، کھانا بھی اچھا بنا ہوا تھا۔ اس لئے بہت شوق و ذوق سے کھانا کھانے کے لئے بیٹھے، اتنے میں ایک سائل دروازے پر آ گیا، اب کھانے کے دوران سائل کا آنا ان کو ناگوار ہوا، چنانچہ انہوں نے اس سائل کو ڈانٹ ڈپٹ کر ذلیل کر کے باہر نکال دیا۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ بعض اوقات انسان کا ایک عمل اللہ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد میاں بیوی میں ان بن شروع ہو گئی، لڑائی جھگڑے رہنے لگے، یہاں تک کہ طلاق کی نوبت آ گئی، اور اس نے طلاق دے دی۔ بیوی نے اپنے میکے میں آ کر عدت گزاری، اور عدت کے

---

(۱) الضحیٰ: ۱۰

بعد کسی اور شخص سے اس کا نکاح ہو گیا، وہ بھی ایک دولت مند آدمی تھا۔ پھر وہ ایک دن وہ اپنے اس دوسرے شوہر کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھی کہ اتنے میں دروازے پر ایک سائل آ گیا، چنانچہ بیوی نے اپنے شوہر سے کہا کہ میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آ چکا ہے۔ مجھے اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں اللہ کا غضب نازل نہ ہو جائے۔ اس لئے میں پہلے سائل کو کچھ دے دوں۔ شوہر نے کہا کہ دے آؤ۔ جب وہ دینے گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ سائل جو دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ اس کا پہلا شوہر تھا۔ چنانچہ وہ حیران رہ گئی، اور واپس آ کر اپنے شوہر کو بتایا کہ آج میں نے عجیب منظر دیکھا کہ یہ سائل وہ میرا پہلا شوہر ہے، جو بہت دولت مند تھا۔ میں ایک دن اس کے ساتھ اس طرح بیٹھی کھانا کھا رہی تھی کہ اتنے میں دروازے پر ایک سائل آ گیا اور اس نے اس کو جھڑک کر بھگا دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں اب اس کا یہ حال ہو گیا۔ اس شوہر نے کہا کہ میں تمہیں اس سے زیادہ عجیب بات بتاؤں کہ وہ سائل جو تمہارے شوہر کے پاس آیا تھا۔ وہ درحقیقت میں ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسکی دولت اس دوسرے شوہر کو عطا فرما دی، اور اس کا فقر اس کو دے دیا، اللہ تعالیٰ برے وقت سے محفوظ رکھے۔ نبی کریم ﷺ نے اس بات سے پناہ مانگی ہے۔ فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْکَوْرِ))(۱)

بہر حال، کسی بھی سائل کو ڈانٹنے ڈپٹنے سے حتی الامکان پرہیز کرو، البتہ بعض اوقات ایسا موقع آ جاتا ہے کہ ڈانٹنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تو فقہاء رحمہم اللہ نے اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن حتی الامکان اس بات کی کوشش کرو کہ ڈانٹنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ بلکہ کچھ دے کر رخصت کر دو۔

اس حدیث کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنے کھانے کی مقدار کو ایسی پتھر کی لکیر مت بناؤ کہ کتنا کھانے کا معمول ہے۔ روزانہ اتنا ہی کھانا ضروری ہے، بلکہ اگر کبھی کسی وقت کچھ کمی کا موقع آ جائے تو اس کی بھی گنجائش رکھو، اس لئے آپ نے فرمایا کہ ایک آدمی کا کھانا دو کے لئے، اور دو کا کھانا چار کے لئے کافی ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کی حقیقت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

---

(۱) پوری دعا اس طرح ہے: ((اللھم إنی أعوذبك من وعثاء السفر وکآبة المنقلب ومن الحور بعد الکور ومن دعوة المظلوم و من سوء المنظر فی الأھل و المال)) سنن الترمذی کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ما یقول اذا خرج مسافرا، رقم:۳۳٦۱، سنن النسائی کتاب الاستعاذة، باب الاستعاذة من الحور بعد الکور، رقم:۵٤٠٤، سنن ابن ماجه، کتاب الدعاء، باب ما یدعو به الرجل اذا سافر، رقم:۳۸۷۸، مسند أحمد، رقم:۱۹۸٤۳

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

بہر حال، کھانے کی تقریباً اکثر سنتوں کا بیان ہو چکا، اگر ان سنتوں پر عمل نہیں ہے، تو آج ہی سے اللہ کے نام پر ان پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیں۔ یقین رکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نورانیت، اور دوسرے عجیب وغریب فوائد اتباع سنت میں رکھے ہیں، وہ انشاء اللہ ان چھوٹی چھوٹی سنتوں پر عمل کرنے سے بھی حاصل ہو جائیں گے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد بار بار سننے کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے علوم ظاہرہ سے سرفراز فرمایا، حدیث پڑھی، تفسیر پڑھی، فقہ پڑھی، گویا تمام علوم ظاہرہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے، اس میں اللہ تعالیٰ نے مجھے کمال بخشا، اس کے بعد مجھے خیال ہوا کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ صوفیاء کرام رحمہم اللہ کیا کہتے ہیں؟ ان کے پاس کیا علوم ہیں؟ چنانچہ ان کی طرف متوجہ ہو کر ان کے علوم حاصل کئے، صوفیاء کرام کے جو چار سلسلے ہیں۔ سہروردیہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور قادریہ ان سب کے بارے میں دل میں یہ جستجو پیدا ہوئی کہ کونسا سلسلہ کیا طریقہ تعلیم کرتا ہے؟ سب کی سیر کی، اور چاروں سلسلوں میں جتنے اعمال، جتنے اشغال، جتنے اذکار، جتنے مراقبات، جتنے چلے ہیں۔ وہ سب انجام دیئے، سب کچھ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا مقام بخشا کہ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے مجھے خلعت پہنایا، پھر اللہ تعالیٰ نے اتنا اونچا مقام بخشا کہ اصل کو پہنچا، پھر اصل سے ظل کو پہنچا، حتیٰ کہ میں ایسے مقام پر پہنچا کہ اگر اس کو زبان سے ظاہر کروں تو علماء ظاہر مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا دیں، اور علماء باطن مجھ پر زندیق ہونے کا فتویٰ لگا دیں۔ لیکن میں کیا کروں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے واقعۃً اپنے فضل سے یہ سب مقامات عطا فرمائے، اب یہ سارے مقامات حاصل کرنے کے بعد میں ایک دعا کرتا ہوں، اور جو شخص اس دعا پر آمین کہہ دے گا، انشاء اللہ اس کی بھی مغفرت ہو جائے گی، وہ دعا یہ ہے:

> ''اے اللہ! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کی توفیق عطا فرما، اے اللہ! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر زندہ رکھ اور اے اللہ! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی پر موت عطا فرما'' آمین

سنتوں پر عمل کریں

بہر حال، تمام مقامات کی سیر کرنے کے بعد آخر میں نتیجہ یہی ہے کہ جو کچھ ملے گا، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع میں ملے گا۔ تو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں تو سارے مقامات کی سیر کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا، تم پہلے دن پہنچ جاؤ، پہلے ہی دن اس بات کا ارادہ کر لو نبی

کریم ﷺ کی جتنی سنتیں ہیں۔ ان پر عمل کروں گا، پھر اس کی برکت اور نورانیت دیکھو گے، پھر زندگی کا لطف دیکھو، یاد رکھو، زندگی کا لطف فسق و فجور میں نہیں ہے، گناہوں میں نہیں ہے، اس زندگی کا لطف ان لوگوں سے پوچھو، جنہوں نے اپنی زندگی کو نبی کریم ﷺ کی سنتوں میں ڈھال لیا ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کا جو لطف اور اس کا جو کیف اور لذت ہمیں عطا فرمائی ہے۔ اگر ان دنیا کے بادشاہوں کو پتہ لگ جائے تو تلواریں سونت کر ہمارے مقابلے کے لئے آجائیں۔ تاکہ ان کو یہ لذت حاصل ہو جائے۔ ایسی لذت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی۔ لیکن کوئی اس پر عمل کر کے دیکھے۔ اس راہ پر چل کر دیکھے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت سے ہم سب کو اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆

پینے کے آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَتَنَفَّسُ فِي الشَّرَابِ ثَلَاثًا، يَعْنِيْ يَتَنَفَّسُ خَارِجَ الْاِنَاءِ.(۱)

”حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پینے کی چیز کو، خواہ وہ پانی ہو یا شربت ہو۔ اس کو تین سانس میں پیا کرتے تھے، پھر سانس لینے کی وضاحت آگے کردی کہ پینے کے دوران برتن منہ سے ہٹا کر سانس لیا کرتے تھے“

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:((لَاتَشْرَبُوْا وَاحِدًا كَشُرْبِ الْبَعِيْرِ، وَلٰكِنِ اشْرَبُوْا مَثْنٰى وَثُلَاثَ، وَسَمُّوْا اِذَا اَنْتُمْ شَرِبْتُمْ وَاحْمَدُوْا اِذَا اَنْتُمْ رَفَعْتُمْ)) (۲)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، پینے کی کسی بھی چیز کو اونٹ کی طرح ایک ہی مرتبہ نہ پیا کرو۔ یعنی ایک ہی سانس میں ایک ہی مرتبہ آدمی غٹ غٹ کرکے پورا گلاس حلق میں انڈیل دے، یہ صحیح نہیں۔ اور اس عمل کو آپ نے اونٹ کے پینے سے تشبیہ دی، اس لئے کہ اونٹ کی عادت یہ ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ میں سارا پانی پی جاتا

☆ اصلاحی خطبات (۵/۲۱۶ تا ۲۴۰) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ کا یہ بیان علامہ نووی کی ” رياض الصالحين “ کے ایک حصہ (باب أدب الشرب واستحباب التنفس ثلاثا خارج الإناء، وكراهية التنفس في الإناء، واستحباب إدارة الإناء على الأيمن فالأيمن بعد المبتدىء) کا درس ہے۔ رياض الصالحين، ص:۲۶۸

(۱) صحيح مسلم، كتاب الأشربة، باب كراهية التنفس في نفس الاناء، رقم: ۳۷۸۲، مسند أحمد، رقم: ۱۲۷۳۰

(۲) سنن الترمذي، كتاب الأشربة عن رسول الله، باب ما جاء في التنفس في الاناء، رقم: ۱۸۰۷

ہے۔ تم اس کی طرح مت پیو، بلکہ تم جب پانی پیو تو یا دو سانس میں پیو، یا تین سانس میں پیو، اور جب پانی پینا شروع کرو تو اللہ کا نام لے کر اور بسم اللہ پڑھ کر شروع کرو، یہ نہیں کہ محض غٹ غٹ کر کے پانی حلق سے اتار لیا۔

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک چھوٹا رسالہ ہے، جس کا نام ہے "بسم اللہ کے فضائل و مسائل" اس چھوٹے سے رسالے میں حقائق و معارف کا دریا بند ہے۔ اگر اس کو پڑھے تو انسان کی آنکھیں کھل جائیں۔ اس میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہی بیان فرمایا کہ یہ پانی جس کو تم نے اک لمحے کے اندر حلق سے نیچے اتار لیا، اس کے بارے میں ذرا یہ سوچو کہ یہ پانی کہاں تھا؟ اور تم تک کیسے پہنچا؟

پانی کے خدائی نظام کا کرشمہ

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سارا ذخیرہ سمندر میں جمع کر رکھا ہے، اور اس سمندر کے پانی کو کھارا بنایا، اس لئے کہ اگر اس پانی کو میٹھا بناتے تو کچھ عرصے کے بعد یہ پانی سڑ کر خراب ہو جاتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس پانی کے اندر ایسے نمکیات رکھے کہ روزانہ لاکھوں جانور اس میں مر جاتے ہیں۔ اس کے باوجود اس میں کوئی خرابی اور کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا ذائقہ نہیں بدلتا۔ نہ اس کے اندر کوئی سڑان پیدا ہوتی ہے۔ پھر اگر تم سے یہ کہا جاتا کہ جب پانی کی ضرورت ہو تو سمندر سے حاصل کر لو۔ اور اس کو پی لو۔ تو انسان کے لئے کتنا دشوار ہو جاتا، اس لئے کہ اول تو ہر شخص کا سمندر تک پہنچنا مشکل ہے، اور دوسری طرف وہ پانی اتنا کھارا ہے کہ ایک گھونٹ بھی حلق سے اتارنا مشکل ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ اس سمندر سے مون سون کے بادل اٹھائے، اور پھر عجیب قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس بادل کے اندر ایسی آٹومیٹک مشین لگی ہوئی ہے کہ جب وہ بادل سمندر سے اٹھتا ہے تو اس پانی کی ساری نمکیات نیچے رہ جاتی ہیں، اور صرف میٹھا پانی اوپر اٹھ کر چلا جاتا ہے، اور پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا سال میں ایک مرتبہ بادلوں کے ذریعہ سارا پانی برسا دیتے، اور یہ فرماتے کہ تم یہ پانی اپنے پاس جمع کر لو۔ اور ذخیرہ کر لو، ہم صرف ایک مرتبہ بارش برسا دیں گے، تو اس صورت وہ برتن اور ٹنکیاں کہاں سے لاتے جن کے اندر تم اتنا پانی جمع کر لیتے جو تمہارے سال بھر کے لئے کافی ہو جاتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ﴾ (۱)

---

(۱) المومنون: ۱۸

یعنی ہم نے پہلے آسمان سے پانی برسایا، اور پھر اس کو زمین کے اندر بٹھا دیا اور جمع کر دیا۔ اس کو اس طرح بٹھا دیا کہ پہلے پہاڑوں پر برسایا، اور پھر اس کو برف کی شکل میں وہاں جما دیا، اور تمہارے لئے وہاں ایک قدرتی فریزر بنا دیا۔ اب پہاڑ کی چوٹیوں پر تمہارے لئے پانی محفوظ ہے۔ اور ضرورت کے وقت وہ پانی پگھل پگھل کر دریاؤں کے ذریعہ زمین کے مختلف خطوں میں پہنچ رہا ہے، اور پھر دریاؤں سے نہریں اور ندیاں نکالیں اور دوسری طرف زمین کی رگوں کے ذریعہ کنوؤں تک پانی پہنچا دیا۔ لہٰذا اب پہاڑوں کی چوٹیوں پر ذخیرہ بھی موجود ہے، اور سپلائی لائن بھی موجود ہے، اور اس سپلائی لائن کے ذریعہ ایک ایک آدمی تک پانی پہنچ رہا ہے۔ اب اگر ساری دنیا کے سائنس دان اور انجینئر مل کر بھی اس طرح پانی کی سپلائی کا انتظام کرنا چاہتے تو انتظام نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا جب پانی پیو تو ذرا غور کر لیا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے ذریعہ یہ پانی کا گلاس تم تک پہنچایا۔ اور اسی بات کی طرف یاد دہانی کے لئے کہا جا رہا ہے کہ جب پانی پیو تو بسم اللہ کر کے پانی پیو۔

پوری سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی

بادشاہ ہارون الرشید ایک مرتبہ شکار کی تلاش میں جنگل میں گھوم رہے تھے۔ گھومتے گھومتے راستہ بھٹک گئے، اور زاد راہ ختم ہو گیا اور پیاس سے بیتاب ہو گے، چلتے چلتے ایک جھونپڑی نظر آئی وہاں جا کر جھونپڑی والے سے کہا کہ ذرا پانی پلا دو، وہ کہیں سے پانی لایا، اور ہارون الرشید نے پینا چاہا تو اس شخص نے کہا "امیر المومنین! ذرا ایک لمحے کے لیے ٹھہر جائیے۔ پہلے یہ بتائیں کہ یہ پانی جو اس وقت میں آپ کو دے رہا ہوں، بالفرض یہ پانی نہ ملتا، اور پیاس اتنی ہی شدید ہوتی جتنی اس وقت ہے۔ تو بتائیے اس ایک گلاس پانی کی کیا قیمت لگاتے، اور اس کے حاصل کرنے پر کتنی رقم خرچ کر دیتے؟

ہارون الرشید نے کہا کہ "یہ پیاس تو ایسی چیز ہے کہ اگر انسان کو پانی نہ ملے تو اس کی وجہ سے بے تاب ہو جاتا ہے، اور مرنے کے قریب ہو جاتا ہے، اس لئے میں ایک گلاس حاصل کرنے کی خاطر اپنی آدھی سلطنت دے دیتا"

اس کے بعد اس نے کہا کہ اب آپ اس پانی کو پی لیں، ہارون الرشید نے پانی پی لیا، اس کے بعد اس شخص نے ہارون الرشید سے کہا "امیر المومنین! ایک سوال کا اور جواب دے دیں"

انہوں نے پوچھا "کیا سوال ہے؟"

اس شخص نے کہا "ابھی آپ نے جو ایک گلاس پانی پیا ہے۔ اگر یہ پانی آپ کے جسم کے اندر رہ جائے اور خارج نہ ہو، پیشاب نہ آئے تو پھر اس کو خارج کرنے کے لئے کیا کچھ کر دیں گے؟"

ہارون الرشید نے جواب دیا "یہ تو پہلی مصیبت سے بھی زیادہ بڑی مصیبت ہے کہ پانی اندر جا

کر خارج نہ ہو پیشاب نہ آئے۔ اس کو خارج کرنے کے لئے بھی میں آدھی سلطنت دے دیتا"

اس کے بعد اس شخص نے کہا "آپ کی پوری سلطنت کی قیمت صرف ایک گلاس پانی کا اندر لے جانا اور اس کو باہر لانا ہے۔ اور یہ پانی پینے اور اس کو باہر نکالنے کی نعمت صبح سے شام تک کئی مرتبہ آپ کو حاصل ہوتی ہے۔ کبھی آپ نے اس پر غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی نعمت دے رکھی ہے"

اس لئے یہ جو کہا جا رہا ہے کہ بسم اللہ بڑھ کر پانی پیو، اس سے اسی طرف سے متوجہ کیا جا رہا ہے کہ یہ پانی کا گلاس جس کو تم پی رہے ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ اس پانی پینے کو تمہارے لئے عبادت بنا دیں گے۔

ٹھنڈا پانی، ایک عظیم نعمت

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا "میاں اشرف علی جب بھی پانی پیو، تو ٹھنڈا پیو، تاکہ روئیں روئیں سے اللہ کا شکر نکلے" اس لئے کہ جب مومن آدمی ٹھنڈا پانی پیئے گا تو اس کے روئیں روئیں سے اللہ تعالیٰ کا شکر نکلے گا، شاید یہی وجہ ہو کہ حضور اقدس کے ایک ارشاد میں آپ کی چند پسندیدہ چیزوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک چیز ٹھنڈا پانی ہے۔

چنانچہ روایات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ آپ کے لئے کسی خاص کھانے کا اہتمام کیا جا رہا ہو۔ لیکن ٹھنڈے پانی کا اتنا اہتمام تھا کہ مدینے سے دو میل کے فاصلے پر ایک کنواں تھا، جس کا نام تھا "بیر غرس" اس کا پانی بہت ٹھنڈا ہوتا تھا۔ اس کنویں کا پانی خاص طور پر آپ کے لئے لایا جاتا تھا اور آپ نے وصیت بھی فرمائی تھی کے میرے انتقال کے بعد مجھے غسل بھی اسی کنویں کے پانی سے دیا جائے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی "بیر غرس" کے پانی سے غسل دیا گیا۔ اس کنویں کے آثار اب بھی باقی ہیں، مگر پانی خشک ہو چکا ہے، الحمد للہ میں نے اس کنویں کی زیارت کی ہے۔ آپ ٹھنڈے پانی کا اہتمام اس لئے فرماتے تھے کہ جب آدمی ٹھنڈا پانی پیئے گا تو روئیں روئیں سے اللہ کا شکر نکلے گا۔

تین سانس میں پانی پینا

ان احادیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی پینے کا ادب بتا دیا۔ جس میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ تین سانس میں پانی پیا جائے۔ اس معنی میں جتنی احادیث حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں ان کی روشنی میں علماء کرام رحمہم اللہ نے فرمایا کہ تین سانس میں پانی وغیرہ پینا افضل ہے، اور سنت کے زیادہ قریب ہے۔ لیکن دو سانس میں پانی پینا بھی جائز ہے، چار سانس میں پینا بھی جائز ہے۔ البتہ ایک سانس میں سارا پانی پی جانا خلاف اولیٰ ہے، اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ ایک سانس میں پینا طبی طور پر بھی نقصان دہ ہے، واللہ اعلم۔

بہر حال، طبی طور پر نقصان دہ ہو یا نہ ہو، مگر حضور اقدس ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اور تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ نے ایک سانس میں پانی پینے کی جو ممانعت فرمائی ہے وہ حرمت والی ممانعت نہیں، یعنی ایک سانس میں پانی پینا حرام نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص ایک سانس میں پانی پی لے گا تو گناہ گار نہ ہوگا۔

حضور ﷺ کی مختلف شانیں

بات دراصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی حیثیت امت کے لئے مختلف شانیں رکھتی ہے، ایک حیثیت آپ کی رسول کی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے احکام لوگوں تک پہنچانے والے ہیں اگر اس حیثیت سے آپ کسی کام سے ممانعت فرمادیں گے تو وہ کام حرام ہو جائے گا، اور اس کام کو کرنا گناہ ہوگا، اور ایک حیثیت آپ کی ایک شفیق رہنما کی ہے، لہٰذا اگر شفقت کی وجہ سے امت کو کسی کام سے منع فرماتے ہیں کہ یہ کام مت کرو، تو اس ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنے میں تمہارے لئے نقصان ہے، یہ اچھا اور پسندیدہ کام نہیں ہے، لیکن وہ کام حرام نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے گناہ کا کام کیا، یا حرام کام کیا، لیکن یہ کہا جائے گا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا کے خلاف کام کیا، اور آپ کے پسندیدہ طریقے کے خلاف کیا، اور وہ شخص جس کے دل میں سرکار دو عالم ﷺ کی محبت ہو، وہ صرف حرام کاموں ہی کو نہیں چھوڑتا، بلکہ جو کام محبوب حقیقی کو ناپسند ہو، اس کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔

پانی پیو، ثواب کماؤ

لہٰذا فقہی طور پر تو میں نے بتا دیا کہ ایک سانس میں پانی پینا حرام اور گناہ نہیں ہے۔ لیکن ایک محب صادق، جس کے دل میں سرکار دو عالم ﷺ کی محبت ہو، تو ایسے کاموں کے قریب بھی نہیں جائے گا جو آپ کو پسند نہیں ہیں۔ لہٰذا جس کام کے بارے میں آپ نے یہ کہہ دیا کہ یہ کام پسندیدہ نہیں ہے، ایک مسلمان کو حتی الامکان اس کے قریب نہیں جانا چاہئے، اور اس کو اختیار نہ کرنا چاہئے، اگرچہ کر لینا کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اچھی بات نہیں۔ اسی لئے علماء نے فرمایا کہ ایک سانس میں پینا خلاف اولیٰ ہے، اور بعض علماء نے فرمایا کہ مکروہ تنزیہی ہے، لہٰذا کیوں خواہ مخواہ ایک سانس میں پی کر خلاف اولیٰ کا ارتکاب کیا جائے، پانی تو پینا ہی ہے۔ اس پانی کو اگر تین سانس میں اس نقطہ نظر سے پی لو کہ یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت شریفہ ہے تو یہ پانی پینا تمہارے لئے عبادت کے عبادت بن گیا، اور سنت کے انوار و برکات تمہیں حاصل ہو گئے، اور چونکہ ہر سنت پر عمل کرنے سے انسان اللہ کا محبوب بن جاتا

ہے۔ اس لئے اس وقت آپ کو اللہ کی محبت حاصل ہو گئی۔ اللہ کے محبوب بن گئے، ذرا سی توجہ سے اس پر اتنا بڑا اجر و ثواب حاصل ہو گیا۔ اب کیوں بے پرواہی میں اس کو چھوڑ دیا جائے؟ لہٰذا اس کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔

مسلمان ہونے کی علامت

دیکھئے، ہر ملت و مذہب کے کچھ طریقے اور آداب ہوتے ہیں، جس کے ذریعہ وہ ملت پہچانی جاتی ہے۔ یہ تین سانس میں پانی پینا بھی مسلمان کے شعار اور علامات میں سے ہے، چنانچہ بچپن سے بچے کو سکھایا جاتا ہے کہ بیٹا، تین سانس میں پانی پیو، آج کل تو اس کا رواج ہی ختم ہو گیا کہ اگر بچہ کوئی عمل اسلامی آداب کے خلاف کر رہا ہے تو اس کو ٹوکا جائے کہ بیٹا، اس طرح کرو، اس طرح نہ کرو۔ بعض عشاق کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ اگر پانی ایک ہی گھونٹ ہوتا ہے تو سنت کی اتباع کے لئے اس ایک گھونٹ کو بھی تین سانس میں پیتے ہیں، تاکہ رسول ﷺ کی سنت کا اجر حاصل ہو جائے۔

منہ سے برتن ہٹا کر سانس لو

عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی اَنْ یُّتَنَفَّسَ فِیْ فَائِہٖ. (۱)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے برتن کے اندر سانس لینے سے منع فرمایا۔ یعنی ایک آدمی پانی پیتے ہوئے برتن کے اندر ہی سانس لے، اور سانس لیتے وقت برتن نہ ہٹائے، اس سے حضور ﷺ نے منع فرمایا، ایک اور حدیث میں اس کی تفصیل آئی ہے کہ ایک صاحب حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ، مجھے پانی پیتے وقت بار بار سانس لینے کی ضرورت ہو، اس وقت جس گلاس یا پیالے کے ذریعہ تم پانی پی رہے ہو۔ اسکو اپنے منہ سے الگ کر کے سانس لے لو، اور پھر پانی پی لو، لیکن پانی پینے کے دوران برتن اور گلاس کے اندر سانس لینا، اور پھنکارے مارنا ادب کے خلاف ہے۔ اور سنت کے خلاف ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب کراهية التنفس فی نفس الاناء واستحباب التنفس...... رقم: ۳۷۸۰، سنن الترمذی کتاب الاشربة عن رسول الله، باب ماجاء فی التنفس فی الاناء، رقم: ۱۸۰۵، سنن النسائی، کتاب الطهارة، باب النهی عن الاستنجاء بالیمین، رقم: ۴۷، سنن ابی داؤد، کتاب الاشربة، باب فی النفخ فی الشراب والتنفس فيه، رقم: ۳۲۴۰، سنن ابن ماجه، کتاب الاشربة، باب الشرب بثلاثة أنفاس، رقم: ۳۴۰۷، مسند أحمد، رقم: ۱۸۰۸، سنن الدرمی، کتاب الاشربة، باب فی الشرب بثلاثة أنفاس، رقم: ۲۰۲۸

ایک عمل میں کئی سنتوں کا ثواب

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ سنتوں پر عمل کرنے کی نیت کرنا لوٹ کا مال ہے، مطلب یہ ہے کہ ایک عمل کے اندر جتنی سنتوں کی نیت کرلو گے، اتنی سنتوں کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔ مثلاً پانی پیتے وقت یہ نیت کرلو کہ میں تین سانس میں پانی اس لئے پی رہا ہوں کہ حضور اقدس ﷺ کی عادت شریفہ تین سانس میں پینے کی تھی، اس سنت کا ثواب حاصل ہو گیا۔ اسی طرح یہ نیت کرلی کہ میں سانس لیتے وقت برتن کو اس لئے منہ سے ہٹا رہا ہوں کہ حضور اقدس ﷺ نے برتن میں سانس لینے سے منع فرمایا ہے۔ اب دوسری سنت پر عمل کا بھی ثواب حاصل ہو گیا۔ اس لئے سنتوں کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ تا کہ آدمی جب کوئی عمل کرے تو ایک ہی عمل کے اندر جتنی سنتیں ہیں۔ ان سب کا دھیان اور خیال رکھے۔ اور ان کی نیت کرے تو پھر ہر ہر نیت کے ساتھ انشاء اللہ مستقل سنت کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔

دائیں طرف سے تقسیم شروع کرو

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُتِیَ بِلَبَنٍ قَدْ شِیْبَ بِمَاءٍ، وَعَنْ یَمِیْنِہٖ اَعْرَابِیٌّ، وَعَنْ یَسَارِہٖ اَبُوْبَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَشَرِبَ، ثُمَّ اَعْطَی الْاَعْرَابِیَّ وَقَالَ اَلْاَیْمَنُ فَالْاَیْمَنُ. (۱)

اس حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ایک اور عظیم ادب بیان فرمایا ہے، اور یہ ادب بھی امت مسلمہ کی علامات میں سے ہے، اور اس ادب سے بھی ہمارے معاشرے میں بڑی غفلت پائی جارہی ہے۔ وہ ادب اس حدیث میں ایک واقعہ کے اندر بیان فرمادیا۔ وہ یہ کہ ایک شخص حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں دودھ لے کر آئے، اور اس دودھ میں پانی ملا ہوا تھا۔ یہ پانی ملانا کوئی ملاوٹ کی غرض سے اور دودھ بڑھانے کی غرض سے نہیں تھا۔ بلکہ اہل عرب میں یہ بات مشہور تھی کہ خالص دودھ اتنا مفید نہیں ہوتا جتنا پانی ملا ہوا دودھ مفید ہوتا ہے، اس لئے وہ صاحب دودھ میں پانی ملا کر حضور ﷺ کی خدمت میں لائے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اس دودھ میں سے کچھ پیا، جو دودھ

(۱) سنن الترمذی، کتاب الأشربة عن رسول الله، باب ماجاء ان الایمنین احق با لشراب، رقم: ۱۷۱۵، صحیح البخاری، کتاب المساقاة، باب فی الشرب، رقم:۲۱۷۱، صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب استحباب إدارة الماء واللبن و نحوهما...... رقم:۳۷۸۳، سنن ابی داؤد، کتاب الاشربة، باب فی الساقی متی یشرب، رقم:۳۲۳۸، سنن ابن ماجه، کتاب ا لاشربة ، باب اذا شرب اعطی الأیمن فالأیمن، رقم:۳۴۱۶، مسند احمد، رقم: ۱۱۶۳۴

باقی بچا، آپ نے چاہا کہ حاضرین کو پلا دیں، اس وقت آپ کے داہنی جانب ایک اعرابی یعنی دیہات کا رہنے والا بیٹھا تھا۔ جس کو بدو بھی کہتے ہیں، اور آپ کے بائیں جانب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بچا ہوا دودھ دائیں طرف بیٹھے ہوئے اعرابی کو پہلے عطا فرما دیا، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نہیں دیا، اور آپ نے ساتھ میں فرمایا ''ا لایمن فالایمن'' یعنی جو آدمی داہنی طرف بیٹھا ہو، پہلے اس کا حق ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام

آپ اندازہ لگائیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ترتیب کا اتنا خیال فرمایا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ مقام عطا فرمایا کہ انبیا علیہم السلام کے بعد اس روئے زمین پر ان سے زیادہ افضل انسان پیدا نہیں ہوا، جن کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''صدیق'' وہ انسان ہے کہ اگر نبی کسی آئینے کے سامنے کھڑے ہوں، تو یہ جو کھڑے ہوئے انسان ہیں، یہ تو نبی ہیں۔ اور آئینے میں ان کا جو عکس نظر آرہا ہے۔ وہ ''صدیق'' ہیں گویا کہ ''صدیق'' وہ ہے جو نبوت کا پورا عکس اور پوری چھاپ لئے ہوئے ہو۔ اور جو صحیح معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہو۔ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وہ انسان ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میری پوری زندگی کے تمام اعمال خیر مجھ سے لے لیں، اور اس کے بدلے میں وہ ایک رات جو انہوں نے ہجرت کے موقع پر غار کے اندر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گزاری تھی، وہ مجھے دے دیں، تو بھی سودا ستا رہے گا۔(۱)

اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنا اونچا مقام عطا فرمایا تھا۔ لیکن اس بلند مقام کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم کے وقت دودھ کا پیالہ اعرابی کو دے دیا، ان کو نہیں دیا: فرما رہے ہیں:

((اَلْاَیْمَنُ فَالْاَیْمَنُ))

''تقسیم کے وقت دائیں جانب والا مقدم ہے، بائیں جانب والا موخر ہے''

داہنی جانب باعث برکت ہے

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول سکھا دیا کہ اگر مجلس میں لوگ بیٹھے ہوئے ہوں، اور کوئی چیز تقسیم کرنی مقصود ہو۔ مثلاً پانی پلانا ہو۔ یا کھانے کی کوئی چیز تقسیم کرنی ہو۔ یا چھوارے تقسیم

---

(۱) البداية والنهاية (۳/ ۱۸۰)، حلية الأولياء (۱/ ۳۳)

کرنے ہو، اس میں ادب یہ ہے کہ دائیں جانب والوں کو دے، اور پھر بائیں جانب تقسیم کرے۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے دائیں جانب کو بہت اہمیت دی ہے۔ دائیں جانب کو عربی زبان میں ''یمین'' کہتے ہیں۔ اور ''یمین'' کے معنی عربی زبان میں مبارک کے بھی ہوتے ہیں، اس لئے دائیں جانب سے کام کرنے میں برکت ہے۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ دائیں جانب سے کام کرنے میں برکت ہے۔ اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ، دائیں ہاتھ سے پانی پیو، دایاں جوتا پہلے پہنو چلنے میں راستے کے دائیں جانب چلو، یہاں تک کہ جب حضور اقدس ﷺ اپنے بالوں میں کنگھی کرتے تو پہلے دائیں جانب کے بالوں میں کنگھی کرتے، پھر بائیں جانب کرتے، دائیں کا اتنا اہتمام فرماتے۔ لہٰذا دائیں جانب سے ہر کام شروع کرنے میں برکت بھی اور سنت بھی ہے۔

داہنی جانب کا اہتمام

ایک اور حدیث میں یہی مضمون آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پینے کی کوئی چیز لائی گئی، آپ نے اس میں سے کچھ پی لی، کچھ بچ گئی، اس وقت مجلس میں دائیں جانب ایک نوعمر لڑکا بیٹھا تھا، اور بائیں جانب بڑے بڑے لوگ بیٹھے تھے، جو عمر میں بھی بڑے تھے، علم اور تجربہ میں بھی زیادہ تھے، اب حضور اقدس ﷺ نے سوچا کہ ادب اور اصول کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ پینے کی چیز اس چھوٹے لڑکے کو دے دی جائے، لیکن بائیں جانب بڑے بڑے مشائخ بیٹھے ہیں۔ ان کے درجے اور مرتبے کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کو ترجیح دی جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس نوجوان لڑکے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تمہارے بائیں جانب بڑے لوگ بیٹھے ہیں، اب حق تو تمہارا بنتا ہے کہ تمہیں دیا جائے۔ اس لئے کہ تم دائیں جانب ہو۔ لیکن بائیں جانب تمہارے بڑے بیٹھے ہیں۔ اگر تم اجرت دو تو میں ان کو دے دوں؟ وہ لڑکا بھی بڑا سمجھدار تھا۔ اس نے کہا کہ یارسول اللہ، اگر کوئی اور چیز ہوتی تو میں ضرور ان بڑوں کو اپنے آپ پر ترجیح دے دیتا، لیکن یہ آپ کا بچا ہوا ہے۔ اور آپ کے بچا ہوا پر میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، لہٰذا اگر میرا حق بنتا ہے تو آپ مجھے ہی عطا فرمائیں۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ وہ چیز اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے فرمایا کہ لو، تم ہی پی لو۔ یہ نوجوان حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تھے۔ (۱)

---

(۱) صحیح البخاری کتاب المساقا ة، باب فی الشرب، رقم:۲۱۸۰، صحیح مسلم، کتاب الاشربة باب استحباب ادارة الماء واللبن ونحوهماعن یمین،رقم:۳۷۸۶،مسند أحمد، رقم:۲۱۷۵۸

دیکھئے، حضور اقدس ﷺ نے دائیں جانب کا اتنا اہتمام فرمایا، حالانکہ بائیں جانب بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہیں، اور خود آپ کی بھی یہ خواہش کہ یہ چیز ان بڑوں کو مل جائے۔ لیکن آپ نے اس قاعدے اور اس اصول کے خلاف نہیں کیا کہ دائیں جانب سے شروع کیا جائے۔ آئے روز ہمارے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ مثلاً گھر میں لوگ بیٹھے ہیں ان کے درمیان کوئی چیز تقسیم کرنی ہے، یا مثلاً دسترخوان پر برتن لگاتے ہیں۔ یا کھانا تقسیم کرنا ہے۔ اس میں اگر ہم اس بات کا اہتمام کریں کہ دائیں جانب سے شروع کریں اور حضور اقدس ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کی نیت کر لیں۔ پھر دیکھیں اس میں کتنی برکت اور کتنا نور معلوم ہوگا۔

بہت بڑے برتن سے منہ لگا کر پانی پینا

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ اخْتِنَاثِ الْاَسْقِیَۃِ، یَعْنِیْ اَنْ تُکْسَرَ اَفْوَاھُھَا وَیُشْرَبَ مِنْھَا.(۱)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ مشکیزوں کا منہ کاٹ کر پھر اس سے منہ لگا کر پانی پیا جائے۔ اس زمانے میں پانی بڑے بڑے مشکیزوں میں بھر کر رکھا جاتا تھا، جیسے آج کل بڑے بڑے گیلن اور کین ہوتے ہیں، ان سے منہ سے لگا کر پانی پینے سے آپ نے منع فرمایا۔

ممانعت کی دو وجوہات

علماء نے فرمایا کہ اس ممانعت کی دو وجہیں ہیں، ایک وجہ یہ ہے کہ اس مشکیزے یا گیلن کے اندر بڑی مقدار میں پانی بھرا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پانی کے اندر کوئی نقصان دہ چیز پڑی ہوئی ہو، جس کی وجہ سے وہ پانی خراب ہوگیا ہو۔ یا نقصان دہ ہوگیا ہو۔ جیسے بعض اوقات کوئی جانور یا کیڑا وغیرہ اندر گر کر پانی میں مرجاتا ہے، اب نظر تو نہیں آرہا ہے کہ اندر کیا ہے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ منہ لگا کر پانی

(۱) صحیح البخاری کتاب الاشربۃ، باب اختناث الاسقیۃ، رقم: ۵۱۹۴، صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ، باب آداب الطعام والشراب و احکامھما، رقم: ۳۷۶۹، سنن الترمذی، کتاب الاشربۃ عن رسول اللہ، باب ماجاء فی النھی عن اختناث الاسقیۃ، رقم: ۱۸۱۲، سنن ابی داؤد کتاب الاشربۃ، باب فی اختناث الاسقیۃ، رقم: ۳۲۳۲، سنن ابن ماجہ، کتاب الاشربۃ، باب اختناث الاسقیۃ، رقم: ۳۴۰۹، مسند أحمد، رقم: ۱۰۶۰۲، سنن الدارمی، کتاب الاشربۃ، باب فی النھی عن الشرب فی السقاء، رقم: ۲۰۲۷

پینے کے نتیجے میں کوئی خطرناک چیز حلق میں نہ چلی جائے۔ یا پانی ناپاک اور نجس نہ ہو گیا ہو۔ اس لئے آپ نے سا طرح منہ لگا کر پینے سے منع فرمایا۔ اور دوسری وجہ علماء نے یہ بیان فرمائی کہ جب آدمی اتنے بڑے برتن سے منہ لگا کر پانی پئے گا تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ ایک دم سے بہت سا پانی منہ میں آ جائے، اور اس کے نتیجے میں اچھولگ جائے، پھندا لگ جائے، یا کوئی اور تکلیف ہو جائے۔ اس لئے آپ نے اس سے منع فرمایا۔

حضور ﷺ کی اپنی امت پر شفقت

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ حضور اقدس ﷺ جن باتوں سے منع فرماتے ہیں، ان میں سے بعض باتیں تو وہ ہوتی ہیں جو حرام اور گناہ ہوتی ہیں، اور بعض باتیں وہ ہوتی ہیں جو حرام اور گناہ تو نہیں ہوتی۔ لیکن حضور اقدس ﷺ ہم پر شفقت کرتے ہوئے اور ادب سکھاتے ہوئے اس سے منع فرماتے ہیں۔ اور جس کام کو آپ شفقت کی وجہ سے منع فرماتے ہیں۔ جبکہ وہ کام حرام اور گناہ نہیں ہوتا، اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھار زندگی میں آپ اس کام کو کر کے بھی دکھا دیتے ہیں، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ کام حرام اور ناجائز نہیں ہے۔ لیکن ادب کے خلاف ہے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ایک دو مرتبہ مشکیزے سے منہ لگا کر بھی پانی پیا۔ علماء نے فرمایا کہ ان تمام برتنوں کا بھی یہی حکم ہے۔ جو بڑے ہوں، اور ان میں زیادہ مقدار میں پانی آتا ہو۔ جیسے بڑا کنستر ہے یا مٹکا ہے۔ ان سے بھی منہ لگا کر پانی نہیں پینا چاہئے، البتہ ضرورت داعی ہو جائے تو الگ ہے، چنانچہ اگلی حدیث میں اس کی وضاحت آ رہی ہے۔

مشکیزے سے منہ لگا کر پانی پینا

وَعَنْ أُمِّ ثَابِتٍ كَبْشَةَ بِنْتِ ثَابِتٍ أُخْتِ حَسَّانِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَ عَنْهَا قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَشَرِبَ مِنْ فِيْ قِرْبَةٍ مُعَلَّقَةٍ قَائِمًا، فَقُمْتُ إِلٰى فِيْهَا، فَقَطَعْتُهُ. (۱)

حضرت کبشہ بنت ثابت رضی اللہ عنہا، جو حضرت حسان بنت ثابت رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے۔ ہمارے گھر میں ایک مشکیزہ لٹکا ہوا تھا۔ آپ نے کھڑے ہو کر اس مشکیزے سے منہ لگا کر پانی پیا۔ اس عمل کے ذریعہ آپ نے بتا دیا کہ اس

(۱) سنن الترمذي، كتاب الاشربة عن رسول صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء في الرخصة في ذلك، رقم: ۱۸۱۴، سنن ابن ماجه، كتاب الاشربة، باب الشرب قائما، رقم: ۳۴۱۴

طرح مشکیزہ سے منہ لگا کر پینا کوئی حرام نہیں ہے۔ صرف تم پر شفقت کرتے ہوئے ایک مشورے کے طور پر یہ حکم دیا گیا ہے۔ حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آپ چلے گئے تو میں کھڑی ہوئی، اور مشکیزے کے جس حصے سے منہ لگا کر آپ نے پانی پیا تھا، اس حصے کو کاٹ کر وہ چمڑا اپنے پاس رکھ لیا۔

حضور ﷺ کے ہونٹ جس چیز کو چھولیں

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک ایک صحابی حضور اقدس ﷺ کے جانثار، عاشق زار، فداکار تھا۔ ایسے فداکار اور جانثار کسی اور ہستی کے نہیں مل سکتے، جیسا کہ آپ نے اوپر دیکھا کہ حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا نے اس مشکیزہ کا منہ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اور فرمایا کہ یہ وہ چمڑا ہے جس کو نبی کریم سرور دو عالم ﷺ کے مبارک ہونٹ چھوئے ہیں، اور آئندہ کسی اور کے ہونٹ اس کو نہیں چھونے چاہئیں، اور اب یہ چمڑا اس لئے نہیں ہے کہ اس کو مشکیزے کے طور پر استعمال کیا جائے، یہ تو تبرک کے طور پر رکھنے کے قابل ہے۔ اس لئے اس کو کاٹ کر تبرک کے طور پر اپنے گھر میں رکھ لیا۔

یہ بال متبرک ہوگئے

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی، جن کو حضور اقدس ﷺ نے مکہ مکرمہ کا موذن مقرر فرمایا تھا۔ جس وقت یہ مسلمان ہوئے تھے۔ اس وقت یہ چھوٹے بچے تھے، اور حضور اقدس ﷺ نے شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ رکھا، جس طرح چھوٹے بچوں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس مقام پر سرکار دو عالم ﷺ نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا، ساری عمر اس جگہ کے بال نہیں کٹوائے، اور فرماتے تھے کہ یہ وہ بال ہیں جس کو سرکار دو عالم ﷺ کے دست مبارک چھوئے ہیں۔

تبرکات کی حیثیت

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ آنحضرت ﷺ کی کوئی چیز تبرک کے طور پر رکھنا، یا آپ کے صحابہ کرام، تابعین، بزرگان دین، اور اولیاء کرام کی کوئی چیز تبرک کے طور پر رکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ آج کل اس بارے میں لوگوں کے درمیان افراط و تفریط پایا جاتا ہے، بعض لوگ ان تبرکات سے بہت چڑتے ہیں، اگر ذرا سی تبرک کے طور پر کوئی چیز رکھ لی، تو ان کے نزدیک وہ شرک ہوگیا۔ اور بعض لوگ وہ ہیں جو تبرکات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حق ان دونوں کے درمیان میں ہے۔ نہ تو انسان یہ کرے کہ تبرک کو شرک کا ذریعہ بنالے۔ اور نہ ہی تبرک کا ایسا انکار کرے کہ بے ادبی تک پہنچ

جائے، جس چیز کو اللہ والوں کے ساتھ نسبت ہو جائے، اللہ تعالیٰ اس میں برکتیں نازل فرماتے ہیں، ایک واقعہ تو آپ نے ابھی سن لیا کہ حضور اقدس ﷺ نے مشکیزے کی جس جگہ سے منہ لگا کر پانی پیا تھا، ان صحابیہ نے اس کو کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

متبرک دراہم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے چاندی کے درہم عطا فرمائے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ان دراہم کو ساری عمر خرچ نہ کیا، اور فرماتے کہ یہ حضور اقدس ﷺ کے عطا فرمودہ ہیں۔ وہ اٹھا کر رکھ دیے، حتی کہ اولاد کو وصیت کر گئے کہ یہ دراہم حضور ﷺ کے عطا کردہ ہیں، ان کو خرچ مت کرنا، بلکہ تبرک کے طور پر ان کو گھر میں رکھنا۔ چنانچہ ایک عرصہ دراز تک وہ دراہم ان کے خاندان میں چلتے رہے، ایک دوسرے کی طرف منتقل ہوتے رہے۔ حتی کہ کسی ہنگامے کے موقع پر وہ ضائع ہو گئے۔

حضور کا مبارک پسینہ

حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ ایک جگہ سو رہے ہیں، گرمی کا موسم تھا، اور عرب میں گرمی بہت سخت پڑتی تھی۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ کے جسم مبارک سے پسینہ بہہ کر زمین پر گر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک شیشی لا کر آپ کا مبارک پسینہ اس میں محفوظ کر لیا۔ فرماتی ہیں کہ وہ پسینہ اتنا خوشبودار تھا کہ مشک و زعفران اس کے آگے ہیچ تھے، اور پھر میں نے اس کو اپنے گھر میں رکھ لیا، اور جب گھر میں خوشبو استعمال کرتی تو اس میں سے تھوڑا پسینہ شامل کر لیتی۔ اور ایک عرصہ دراز تک میں نے اس کو اپنے پاس محفوظ رکھا۔

حضور ﷺ کے مبارک بال

ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا کو کہیں سے حضور اقدس ﷺ کے بال مل گئے، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے ان بالوں کو ایک شیشی کے اندر ڈال کر اس میں پانی بھر دیا، اور پھر جب قبیلے میں کوئی بیمار ہوتا، تو اس پانی کا ایک قطرہ دوسرے پانی میں ملا کر بیمار کو پلا دیتے، تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ شفا عطا فرما دیتے۔

بہر حال، صحابہ کرام نے بہت سے طریقوں سے حضور اقدس ﷺ کے تبرکات کا احترام کیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تبرکات

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے راستے میں جس جس جگہ پر ایسی منزل آتی، جہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے گزرتے ہوئے کبھی قیام فرمایا تھا۔ تو وہاں میں اترتا، اور دو رکعت نفل ادا کر لیتا، اور پھر آگے روانہ ہوتا۔

بہر حال، اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات کو باقی رکھنے اور محفوظ رکھنے کا بہت اہتمام فرمایا۔ لیکن حضرات صحابہ کرام تبرکات کی حقیقت سے بھی واقف تھے، ان تبرکات میں غلو، مبالغہ، یا افراط یا تفریط کا ان سے کوئی امکان نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ انہی تبرکات کو وہ سب کچھ سمجھ بیٹھتے، انہی کو مشکل کشا یا حاجت روا سمجھ بیٹھے، یا ان تبرکات کو شرک کا ذریعہ بنا لیتے یا ان تبرکات کی پرستش شروع کر دیتے۔

بت پرستی کی ابتداء

عرب میں بت پرستی کا رواج بھی درحقیقت ان تبرکات میں غلو کے نتیجے میں شروع ہوا تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے پاس قیام کیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام وہیں پر پلے بڑھے، جوان ہوئے، اور پھر بنی جرہم کے لوگ وہاں آ کر آباد ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں مکہ مکرمہ کی بستی آباد ہو گئی، بعد میں بنی جرہم کی ایک دوسرے قبیلے والوں سے لڑائی ہو گئی۔ لڑائی کے نتیجے میں دوسرے قبیلے والوں نے بنی جرہم کو مکہ مکرمہ سے باہر نکال دیا۔ چنانچہ بنی جرہم کے لوگ وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جب ہجرت کر کے جانے لگے تو یادگار کے طور پر کسی نے مکہ مکرمہ کی مٹی اٹھالی۔ کسی نے پتھر اٹھا لئے۔ کسی نے بیت اللہ کے آس پاس کی کوئی اور چیز اٹھالی، تا کہ یہ چیزیں ہم اپنے پاس تبرک اور یادگار کے طور پر رکھیں گے، اور ان کو دیکھ کر ہم بیت اللہ شریف اور مکہ مکرمہ کو یاد کریں گے، جب دوسرے علاقے میں جا کر قیام کیا تو وہاں پر بڑے اہتمام سے ان تبرکات کی حفاظت کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب پرانے لوگ رخصت ہو گئے، اور کوئی صحیح راستہ بتانے والا باقی نہ رہا تو بعد کے لوگوں نے رفتہ رفتہ اس مٹی اور پتھروں سے کچھ صورتیں بنالیں۔ اور وہ صورتیں بتوں کی شکل میں تیار ہو گئیں، اور پھر انہی کی پرستش شروع کر دی، اہل عرب کے اندر یہیں سے بت پرستی کا آغاز ہوا۔

تبرکات میں اعتدال ضروری ہے

اگر ان تبرکات کا احترام حد کے اندر نہ ہو تو پھر شرک اور بت پرستی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے تبرکات کے معاملے میں بڑے اعتدال کے ساتھ چلنے کی ضرورت ہے۔ نہ تو ان کی بے ادبی ہو، اور نہ ہی ایسی تعظیم ہو، جس کے نتیجے میں انسان شرک میں مبتلا ہو جائے۔ یا شرک کی سرحدوں کو چھونے لگے، تبرکات کی حقیقت یہ ہے کہ برکت کے لئے اس کو اپنے پاس رکھ لے، اس لئے کہ جب ایک چیز کو کسی بزرگ کے ساتھ نسبت ہو گی تو اس نسبت کی بھی قدر کرنی چاہئے۔ اس نسبت کی بھی تعظیم اور ادب کرنا چاہئے۔

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ کے ساتھ نسبت رکھنے والے کتے کا بھی احترام کرتا ہوں۔ اس لئے کہ اس کتے کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر کے ساتھ نسبت حاصل ہے، یہ سب عشق کی باتیں ہوتی ہیں کہ محبوب کے ساتھ کسی چیز کو ذرا سی بھی نسبت ہو گئی تو اس کا ادب اور احترام کیا۔ اور جب نسبت کی وجہ سے کوئی شخص تعظیم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر بھی اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں کہ اس نے میرے محبوب کی نسبت کی بھی قدر کی، بشرطیکہ حدود میں رہے، حد سے آگے نہ بڑھے، یہ بات بھی ہمیشہ سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے، اس لئے کہ لوگ بکثرت افراط و تفریط کی باتیں کرتے ہیں، اور اس کی وجہ سے پریشانی کا شکار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اعتدال میں رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بیٹھ کر پانی پینا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ نَهٰى أَنْ يَّشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِمًا. (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا۔

اس حدیث کی بنیاد پر علماء نے فرمایا کہ حتی الامکان کھڑے ہو کر پانی نہیں پینا چاہئے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت شریفہ یعنی عام عادت یہ تھی کہ آپ بیٹھ کر پانی پیتے تھے۔ اس لئے کھڑے ہو کر پانی پینا مکروہ تنزیہی ہے، مکروہ تنزیہی کا مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الأشربة، باب كراهية الشرب قائما، رقم: ۳۷۷۲، سنن الترمذی، کتاب الاشربة، عن رسول الله، باب ماجاء في النهي عن الشرب قائما، رقم: ۱۸۰۰، سنن ابی داؤد، کتاب الاشربة، باب في الشرب قائما، رقم: ۳۲۲۹، مسند أحمد، رقم: ۷۹۸۵

پینے کو ناپسند فرمایا۔ اگر چہ کوئی شخص کھڑے ہو کر پانی پی لے تو کوئی گناہ نہیں، حرام نہیں۔ لیکن خلاف ادب اور خلاف اولیٰ ہے۔ اور حضور اقدس ﷺ کا ناپسندیدہ ہے۔

کھڑے ہو کر پینا بھی جائز ہے

یہ بات بھی سمجھ لیں کہ جب حضور اقدس ﷺ نے کسی چیز سے منع فرمایا، جب کہ وہ چیز حرام اور گناہ بھی نہیں ہے، تو ایسے موقع پر آنحضرت ﷺ لوگوں کو بتانے کے لئے کبھی کبھار خود بھی وہ عمل کر کے دکھا دیا، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ عمل گناہ اور حرام نہیں، چنانچہ حضور اقدس ﷺ سے کئی مرتبہ کھڑے ہو کر پانی پینا بھی ثابت ہے۔ ابھی میں آپ کو حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا کے مشکیزے سے پانی پینے کا واقعہ سنایا۔ وہ مشکیزہ دیوار کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ اور آپ نے کھڑے ہو کر منہ لگا کر اس سے پانی پیا، اسی وجہ سے علماء نے فرمایا کہ اگر کوئی جگہ ایسی ہے جہاں بیٹھنے کی گنجائش نہیں ہے، ایسے موقع پر اگر کوئی شخص کھڑے ہو کر پانی پی لے تو کوئی مضائقہ نہیں، بلا کراہت جائز ہے۔ اور بعض اوقات آپ نے صرف یہ بتانے کے لئے کھڑے ہو کر پانی پیا کہ کھڑے ہو کر پانی پینا بھی جائز ہے، چنانچہ حضرت نزال بن سبرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ "باب الرحبۃ" میں تشریف لائے، "باب الرحبۃ" کوفہ کے اندر ایک جگہ کا نام ہے۔ وہاں پر کھڑے ہو کر آپ نے پانی پیا، اور فرمایا:

"إِنِّي رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَلَ كَمَا رَأَيْتُمُوْنِي فَعَلْتُ"(۱)

یعنی میں نے حضور اقدس ﷺ کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا جس طرح تم نے مجھے دیکھا کہ میں کھڑے ہو کر پانی پی رہا ہوں۔ بہر حال، کبھی کبھی حضور اقدس ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پی کر یہ بتا دیا کہ یہ عمل گناہ نہیں۔

بیٹھ کر پینے کی فضیلت

لیکن اپنی امت کو جس کی تعلیم دی، اور جس کی تاکید فرمائی، اور جس پر ساری عمر عمل فرمایا، وہ یہ تھا کہ حتی الامکان بیٹھ کر ہی پانی پیتے تھے۔ اس لئے یہ بیٹھ کر پانی پینا حضور اقدس ﷺ کی اہم سنتوں میں سے ہے۔ اور جو شخص اس کا جتنا اہتمام کرے گا۔ انشاء اللہ اس پر اس کو اجر و ثواب اور اس کی فضیلت اور برکات حاصل ہوں گی، اس لئے خود بھی اس کا اہتمام کرنا چاہئے، اور دوسروں سے بھی اس کا اہتمام کرانا چاہئے، اپنے گھر والوں کو بتانا چاہئے، اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دینی چاہئے، اور بچوں

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاشربة، باب الشرب قائما، رقم: ۵۱۸٤، مسند أحمد، رقم: ۱۱۹۹

کے دل میں یہ بات بٹھانی چاہئے کہ جب بھی پانی پیو تو بیٹھ کر پیو۔ اگر انسان اس کی عادت ڈال لے تو مفت کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس عمل میں کوئی خاص محنت اور مشقت ہے نہیں۔ اگر آپ پانی کھڑے ہو کر پینے کے بجائے بیٹھ کر پی لیں تو اس میں کیا حرج اور کیا مشقت لازم آ جائے گی؟ لیکن جب سنت کی اتباع کی نیت کر کے پانی بیٹھ کر پی لیا اتباع سنت کا عظیم اجر و ثواب حاصل ہو جائے گا۔

سنت کی عادت ڈال لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ میں ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے گیا، وہاں پانی پینے کی ضرورت پیش آئی، مسجد میں مٹکے رکھے تھے، میں نے مٹکے سے پانی نکالا۔ اور اپنی عادت کے مطابق ایک جگہ بیٹھ کر پانی پینے لگا، ایک صاحب یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، وہ قریب آئے، اور کہا "یہ آپ نے بیٹھنے کا اتنا اہتمام کیا، اس کی کیا ضرورت تھی؟ کھڑے ہو کر ہی پی لیتے" میں نے سوچا کہ اب میں ان سے کیا بحث کروں، میں نے کہا کہ اصل میں ہمیشہ سے بیٹھ کر پانی پینے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس شخص نے کہا کہ یہ آپ نے عجیب بات فرمائی کہ عادت پڑ گئی، ارے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت پڑ جانا کوئی معمولی بات ہے؟ بہر حال، عادتیں تو انسان بہت سی ڈال لیتا ہے، لیکن جب عادت ڈالے تو سنت کی عادت ڈالے۔ تاکہ اس پر اجر و ثواب بھی حاصل ہو جائے۔

نیکی کا خیال اللہ کا مہمان ہے

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب دل میں کسی نیک کام کرنے یا کسی سنت پر عمل کرنے کا خیال آئے، تو اس "خیال" کو صوفیاء کرام "وارد" کہتے ہیں۔ یہ "وارد" اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا مہمان ہے اس مہمان کا اکرام کرو، اور اس کی قدر پہچانو، مثلاً جب آپ نے کھڑے ہو کر پانی پینا شروع کیا تو اس وقت دل میں خیال آیا کہ کھڑے ہو کر پانی پینا اچھا نہیں ہے۔ سنت کے خلاف ہے، بیٹھ کر پانی پینا چاہئے، اگر آپ نے اس خیال اور "وارد" کا اکرام کرتے ہوئے بیٹھ کر پانی پی لیا تو یہ مہمان بار بار آئے گا، آج اس نے تمہیں بٹھا کر پانی پلا دیا تو کل کو کسی اور سنت پر عمل کرائے گا، پرسوں کسی اور نیکی پر عمل کرائے گا۔ اس طرح یہ تمہاری نیکیوں میں اضافہ کراتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے اس مہمان کی ناقدری کی۔ مثلاً پانی پیتے وقت بیٹھ کر پانی پینے کا خیال آیا تو تم نے فوراً اس خیال کو یہ کہہ کر جھٹک دیا کہ بیٹھ کر پانی پینا کونسا فرض و واجب

ہے، کھڑے ہو کر پینا گناہ تو ہے نہیں۔ چلو کھڑے کھڑے پانی پی لو۔ اب تم نے اس مہمان کی ناقدری کی، اور اس کو واپس بھیج دیا، اور اگر چند مرتبہ تم نے اس کی اس طرح ناقدری کی تو پھر یہ آنا بند کر دے گا۔ اور جب یہ مہمان آنا بند کر دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دل سیاہ ہو گیا ہے۔ اس لئے جب بھی اتباع سنت کا خیال آئے تو فوراً اس پر عمل کر لو۔ شروع شروع میں تھوڑی تکلیف ہو گی۔ لیکن آہستہ آہستہ جب عادت پڑ جائے گی، تو پھر آسان ہو جائے گا۔

زمزم کا پانی کس طرح پیا جائے؟

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمَا قَالَ: سَقَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ زَمْزَمَ، فَشَرِبَ وَهُوَ قَائِمٌ. (۱)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زمزم کا پانی پلایا، تو آپ نے کھڑے ہو کر وہ زمزم پیا۔ اس حدیث کی وجہ سے بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ زمزم کا پانی بیٹھ کر پینے کے بجائے کھڑے ہو کر پینا افضل اور بہتر ہے، چنانچہ یہ بات مشہور ہے کہ دو پانی ایسے ہیں جو کھڑے ہو کر پینے چاہئیں۔ ایک زمزم کا پانی، اور ایک وضو کا بچا ہوا پانی، اس لئے کہ وضو سے بچا ہوا پانی پینا بھی مستحب ہے۔

لیکن دوسرے علماء یہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں پانی بھی بیٹھ کر پینے چاہئیں، جہاں تک حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کا تعلق ہے کہ اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف تو زمزم کا کنواں۔ اور دوسرا اس پر لوگوں کا ہجوم، اور پھر کنویں کے چاروں طرف کیچڑ، قریب میں کہیں بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کھڑے ہو کر پیا۔

زمزم اور وضو کا بچا ہوا پانی بیٹھ کر پینا افضل ہے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہی تھی کہ زمزم کا پانی بیٹھ کر پینا افضل ہے۔ اسی طرح وضو کا بچا ہوا پانی بھی بیٹھ کر پینا افضل ہے، البتہ عذر کے مواقع پر جس طرح عام پانی کھڑے ہو کر پینا جائز ہے۔ اسی طرح زمزم اور وضو سے بچا ہوا پانی بھی کھڑے ہو کر پینا جائز

(۱) صحیح البخاری کتاب الحج، باب ماجاء فی زمزم، رقم: ۱۵۲۹، صحیح مسلم، کتاب الاشربة باب فی الشرب من زمزم قائما، رقم: ۳۷۷۶، سنن النسائی، کتاب مناسك الحج، باب الشرب من زمزم قائما، رقم: ۲۹۱۶، مسند أحمد رقم: ۲۱۷٤

ہے۔ عام طور پر لوگ یہ کرتے ہیں کہ اچھے خاصے بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن جب زمزم کا پانی دیا گیا تو ایک دم سے کھڑے ہو گئے، اور کھڑے ہو کر اس کو پیا، اتنا اہتمام کر کے کھڑے ہو کر پینے کی ضرورت نہیں، بلکہ بیٹھ کر پینا چاہئے، وہی افضل ہے۔

کھڑے ہو کر کھانا

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ نَھٰی اَنْ یَّشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِمًا۔ قَالَ قَتَادَۃُ: فَقُلْنَا لِاَنَسٍ: فَالْاَکْلُ؟ قَالَ: ذَالِکَ اَشَرُّ اَوْ اَخْبَثُ (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا، حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کھڑے ہو کر کھانے کا کیا حکم ہے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر کھانا تو اس سے بھی زیادہ برا اور اس سے بھی زیادہ خبیث ہے یعنی کھڑے ہو کر پانی پینے کے مقابلے میں کھڑے ہو کر کھانا اس سے زیادہ برا ہے۔ چنانچہ اسی حدیث کی بنیاد پر بعض علماء نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر پینا تو مکروہ تنزیہی ہے۔ اور کھڑے ہو کر کھانا مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے۔ اس لئے کہ کھڑے ہو کر کھانے کو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے زیادہ خبیث اور برا طریقہ فرمایا۔

کھڑے ہو کر کھانے سے بچئے

بعض لوگ کھڑے ہو کر کھانے کے جواز پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا کہ ہم حضورؐ کے زمانے میں چلتے ہوئے بھی کھا لیتے تھے، اور کھڑے ہو کر پانی پی لیتے تھے۔ یہ حدیث لوگوں کو بہت یاد رہتی ہے، اور اس کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کھڑے ہو کر کھا لیتے تھے تو ہمیں کھڑے ہو کر کھانے سے کیوں منع کیا جا رہا ہے؟

خوب سمجھ لیں ابھی آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سن لی کہ کھڑے ہو کر کھانا زیادہ خبیث اور زیادہ برا طریقہ ہے، یعنی ایسا کرنا ناجائز ہے۔ اس حدیث سے مراد وہ کھانا ہے جو باقاعدہ کھایا جاتا ہے۔ جہاں تک حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کا تعلق ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز جس کو باقاعدہ بیٹھ کر دسترخوان بچھا کر نہیں کھایا جاتا، بلکہ کوئی چھوٹی سی معمولی سی چیز ہے۔ مثلاً

(۱) صحیح مسلم، کتاب الأشربة، باب کراهية الشرب قائما، رقم: ۳۷۷۶، مسند أحمد، رقم: ۱۱۸۸۸

چاکلیٹ ہے۔ یا چھوارا ہے۔ یا بادام وغیرہ یا کوئی پھل چکھنے کے طور پر کھا لیا، اس میں چلتے پھرتے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن جہاں تک دوپہر کے کھانے اور رات کے کھانے، لنچ اور ڈنر کا تعلق ہے کہ ان کو کھڑے ہو کر کھانا، اور کھڑے ہو کر کھانے کا باقاعدہ اہتمام کرنا کسی طرح جائز نہیں، آج کل کی دعوتوں میں کھڑے ہو کر کھانے کا طریقہ عام ہوتا جا رہا ہے اس سے بچنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ انسانوں کا طریقہ نہیں ہے، بلکہ جانوروں کا طریقہ ہے۔ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ چرنے کا طریقہ ہے۔ کھانے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ کبھی ادھر سے چر لیا۔ کبھی ادھر سے چر لیا۔ اور پھر اس طریق میں بے تہذیبی ہے، ناشائستگی بھی ہے اور مہمانوں کی بھی بے عزتی ہے، خدا کے لئے اس طریقے کو چھوڑنے کی فکر کریں۔ ذرا سے اہتمام کی ضرورت ہے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس طریقے میں کفایت شعاری ہے۔ اس لئے کہ کرسیوں کا کرایہ بچ جاتا ہے، اور کم جگہ پر زیادہ کام ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باقی سب جگہوں پر کفایت کر رکھی ہے۔ حالانکہ بلا وجہ چراغاں ہو رہا ہے، فضول لائٹنگ ہو رہی ہے۔ وہاں کفایت کا خیال نہیں آتا۔ اس کے علاوہ فضول رسموں میں بے پناہ رقم صرف کر دی جاتی ہے۔ وہاں کفایت شعاری کا خیال نہیں آتا، ساری کفایت شعاری کا خیال کھڑے ہو کر کھانے میں آ جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ سوائے فیشن پرستی کے اور کوئی مقصد اس میں نہیں ہوتا۔ اس لئے اہتمام کر کے اس سے بچیں، اور آج ہی اس بات کا عزم کر لیں کہ خواہ بٹھا کر کھلانے میں کتنا پیسہ زیادہ خرچ ہو جائے۔ مگر کھڑے ہو کر نہیں کھلائیں گے۔ اپنے یہاں سے اس طریقے کے رواج کو ختم کریں۔ تاکہ یہ خبیث طریقہ ہمارے یہاں سے نکل جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

☆☆

دعوت کے آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

((اِذَا دُعِيَ اَحَدُكُمْ فَلْيُجِبْ، فَاِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيُصَلِّ، وَاِنْ كَانَ مُفْطِرًا فَلْيَطْعَمْ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کی دعوت کی جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کی دعوت کو قبول کرلے اب اگر وہ شخص روزے سے ہے تو اس کے حق میں دعا کردے یعنی اس کے گھر جا کر سب کے حق میں دعا کردے۔ اور اگر روزے سے نہیں ہے تو اس کے ساتھ کھانا کھالے۔

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کی دعوت قبول کرنے کی تاکید فرمائی۔ اور دعوت کے قبول کرنے کو مسلمانوں کے حقوق میں شمار فرمایا۔ ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ خَمْسٌ، رَدُّ السَّلَامِ، تَشْمِيْتُ الْعَاطِسِ، اِجَابَةُ الدَّعْوَةِ، اِتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ، وَعِيَادَةُ الْمَرِيْضِ))(۲)

☆ اصلاحی خطبات (۵/۲۴۲ تا ۲۵۲) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔ مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ کا یہ بیان علامہ نووی رحمہ اللہ کی "رياض الصالحين" کے ایک حصہ (باب ما يقوله من حضر الطعام وهو صائم إذا لم يفطر) کا درس ہے۔ رياض الصالحين، ص: ۲٦٤

(۱) صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب الامر باجابة الداعي الى دعوة، رقم: ۲۵۸٤، سنن ابی داؤد، كتاب الصوم، باب في الصائم يدعى الى وليمة، رقم: ۲۱۰٤، مسند أحمد، رقم: ۱۰۱۸۰

(۲) صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب الامر باتباع الجنائز، رقم: ۱۱٦٤، صحيح مسلم، كتاب السلام، باب من حق المسلم للمسلم رد السلام، رقم: ٤۰۲۲، مسند أحمد، رقم: ۱۰۵٤۳

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں، نمبر ایک، اس کے سلام کا جواب دینا، دوسرے، اگر کسی کو چھینک آئے، تو اس کے جواب میں "یرحمک اللہ" کہنا، تیسرے، اگر کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازے کے پیچھے جانا۔ چوتھے، اس کے جنازے کے ساتھ چلنا۔ پانچویں اگر کوئی مسلمان بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کرنا۔ حضور ﷺ نے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر یہ پانچ حقوق بیان فرمائے۔ ان میں سے ایک حق دعوت قبول کرنے کا بھی ہے۔ اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی شخص کو دعوت دی جائے تو اس کو قبول کرنا چاہئے۔

دعوت قبول کرنے کا مقصد

اور اس نیت سے دعوت قبول کرنا چاہئے کہ یہ میرا بھائی ہے، اور یہ مجھے محبت سے بلا رہا ہے۔ اس کی محبت کی قدر دانی ہو جائے، اور اس کا دل خوش ہو جائے۔ دعوت قبول کرنا سنت ہے، اور باعث اجر و ثواب ہے۔ یہ نہ ہو کہ کھانا اچھا ہو تو قبول کر لے، اور کھانا اچھا نہ ہو تو قبول نہ کرے، بلکہ دعوت قبول کرنے کا مقصد اور منشا یہ ہو کہ میرے بھائی کا دل خوش ہو جائے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ

((وَلَوْ دُعِيْتُ اِلٰى ذِرَاعٍ أَوْ كُرَاعٍ لَأَجَبْتُ))(۱)

یعنی اگر کوئی شخص بکری کے پائے کی بھی دعوت کرے گا تو میں قبول کرلوں گا آج کل اگرچہ پائے کی دعوت کو عمدہ سمجھا جاتا ہے، لیکن اس زمانے میں پائے کو بہت معمولی چیز سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا دعوت دینے والا مسلمان غریب ہی کیوں نہ ہو، تم اس کی دعوت اس نیت سے قبول کرلو کہ یہ میرا بھائی ہے، اس کا دل خوش ہو جائے، غریب اور امیر کا فرق نہ ہونا چاہئے کہ اگر امیر آدمی دعوت دے رہا ہو تب تو قبول کر لی جائے، اور اگر کوئی معمولی حیثیت کا غریب آدمی دعوت دے رہا ہے تو اس کو ٹال دیا۔ بلکہ غریب آدمی اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس دعوت قبول کی جائے۔

دال اور خشکے میں نورانیت

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کئی بار یہ واقعہ سنا کہ دیوبند میں ایک صاحب گھسیارے تھے، یعنی گھاس کاٹ کر بازار میں فروخت کرتے، اور اس کے ذریعہ اپنا گزر

(۱) صحيح البخاري، كتاب الهبة و فضلها والتحريض عليها، باب القليل من الهبة، رقم: ۲۳۸۰، سنن الترمذي، كتاب الاحكام عن رسول الله، باب ما جاء في قبول الهدية واجابة الدعوة، رقم: ۱۲۵۸، مسند أحمد، رقم: ۱۰۲۳۹

بسر کرتے تھے، اور ایک ہفتہ میں ان کی آمدنی چھ پیسے ہوتی تھی۔ اکیلے آدمی تھے، اور اس آمدنی کو وہ اس طرح تقسیم کرتے تھے کہ اس میں سے دو پیسے اپنے کھانے وغیرہ پر خرچ کرتے تھے، اور دو پیسے اللہ کی راہ میں صدقہ کیا کرتے تھے، اور دو پیسے جمع کرتے تھے، اور ایک دو ماہ کے بعد جب کچھ پیسے جمع ہو جاتے تو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے جو بڑے بزرگ اساتذہ تھے۔ ان کی دعوت کیا کرتے تھے، اور دعوت میں خشک چاول ابال لیتے، اور اس کے ساتھ دال پکا لیتے، اور اساتذہ کو کھلا دیتے تھے۔ میرے والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں پورے مہینے ان صاحب کی دعوت کا انتظار رہتا ہے، اس لئے کہ ان صاحب کے خشکے اور دال کی دعوت میں جو نورانیت محسوس ہوتی ہے، وہ نورانیت پلاؤ اور بریانی کی بڑی بڑی دعوتوں میں محسوس نہیں ہوتی۔

دعوت کی حقیقت ”محبت کا اظہار“

لہٰذا دعوت کی حقیقت ”محبت کا اظہار“ ہے، اور اس کے قبول کرنے کی بھی حقیقت ”محبت کا اظہار“ ہے اگر محبت سے کسی نے تمہاری دعوت کی ہے۔ محبت سے تم قبول کرلو، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ کبھی کسی کی دعوت کو رد نہیں فرماتے، دعوت دینے والا چاہے کوئی معمولی آدمی کیوں نہ ہوتا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات معمولی شخص کی دعوت پر آپ نے میلوں کا سفر کیا، تو دعوت کی حقیقت یہ ہے کہ محبت سے کی جائے، اور محبت سے قبول کی جائے، اخلاص سے دعوت کی جائے، اخلاص سے قبول کی جائے، تب یہ دعوت نورانیت رکھتی ہے، سنت ہے، اور باعث اجر و ثواب ہے۔

دعوت یا عداوت

لیکن آج کل ہماری دعوتیں رسموں کے تابع ہو کر رہ گئی ہیں۔ رسم کے موقع پر دعوت ہوگی، اس کے علاوہ نہیں ہوگی، اور اگر دعوت قبول کرے تو مصیبت، قبول نہ کرے تو مصیبت، اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دعوت ہو، عداوت نہ ہو، یعنی ایسا طریقہ اختیار کرو کہ وہ دعوت اس کے لئے عذاب اور مصیبت بن جائے، جیسا بعض لوگ کرتے ہیں، ان کے دماغ میں یہ بات آگئی کہ فلاں کی دعوت کرنی چاہئے، نہ اس بات کا خیال کیا کہ ان کے پاس وقت ہے یا نہیں؟ مگر بار بار دعوت قبول کرنے پر اصرار کروا رہے ہیں، چاہے اس دعوت کی خاطر کتنی ہی مصیبت اٹھانی پڑے۔ یہ دعوت نہیں، بلکہ یہ تو اس کے ساتھ عداوت اور دشمنی ہے۔ اگر دعوت کے ذریعہ تم اس کے ساتھ محبت کا اظہار کرنا چاہتے ہو تو اس محبت کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ جس کی دعوت کر رہے ہو، اس کو راحت پہنچانے کی فکر

ہو، اس کو آرام پہنچانے کی فکر کرو، نہ یہ کہ اس پر مصیبت ڈال دو۔

اعلیٰ درجے کی دعوت

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دعوت کی تین قسمیں ہوتی ہیں، ایک سب سے اعلیٰ۔ دوسرے متوسط، تیسرے ادنیٰ۔ آج کل کے ماحول میں سب سے اعلیٰ دعوت یہ ہے کہ جس کی دعوت کرنی ہو، اس کو جا کر نقد ہدیہ پیش کر دو، اور نقد ہدیہ پیش کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کو کوئی تکلیف تو اٹھانی نہیں پڑے گی، اور پھر نقد ہدیہ میں اس کو اختیار ہوتا ہے کہ چاہے اس کو کھانے پر صرف کرے۔ اور یا کسی اور ضرورت میں صرف کرے، اس سے اس شخص کو زیادہ راحت اور زیادہ فائدہ ہو گا، اور تکلیف اس کو ذرہ برابر بھی نہیں ہوگی، اس لئے یہ دعوت سب سے اعلیٰ ہے۔

متوسط درجے کی دعوت

دوسرے نمبر کی دعوت یہ ہے کہ جس شخص کی دعوت کرنا چاہتے ہو، کھانا پکا کر اس کے گھر بھیج دو۔ یہ دوسرے نمبر پر اس لئے ہے کہ کھانے کا قصہ ہوا اس کو کھانے کے علاوہ کوئی اور اختیار نہیں رہا، البتہ اس کھانے پر اس کو کوئی زحمت اور تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔ آپ نے گھر بلانے کی زحمت اس کو نہیں دی بلکہ گھر پر ہی کھانا پہنچا دیا۔

ادنیٰ درجے کی دعوت

تیسرے نمبر کی دعوت یہ ہے کہ اس کو اپنے گھر بلا کر کھانا کھلاؤ۔ آج کل کے شہری ماحول میں، جہاں زندگیاں مصروف ہیں، فاصلے زیادہ ہیں، اس میں اگر آپ کسی شخص کو دعوت دیں۔ اور وہ تیس میل کے فاصلے پر رہتا ہے۔ تو آپ کی دعوت قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دو گھنٹے پہلے گھر سے نکلے، پچاس روپے خرچ کرے۔ اور پھر تمہارے یہاں آ کر کھانا کھائے۔ تو یہ آپ نے اس کو راحت پہنچائی یا تکلیف میں ڈال دیا؟ لیکن اگر اس کے بجائے کھانا پکا کر اس کے گھر بھیج دیتے۔ یا اس کو نقد رقم دے دیتے، اس میں اس کے ساتھ زیادہ خیر خواہی ہوتی۔

دعوت کا انوکھا واقعہ

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے، لاہور میں قیام تھا، ایک مرتبہ کراچی تشریف لائے تو

دارالعلوم کورنگی میں حضرت والد صاحب سے ملنے کے لئے بھی تشریف لائے، چونکہ اللہ والے بزرگ تھے، اور والد صاحب کے بہت مخلص دوست تھے۔ اس لئے ان کی ملاقات سے والد صاحب بہت خوش ہوئے، صبح دس بجے کے قریب دارالعلوم پہنچے تھے۔ والد صاحب نے ان سے پوچھا کہ کہاں قیام ہے؟ فرمایا کہ آگرہ کالونی میں ایک صاحب کے یہاں قیام ہے۔ کب واپس تشریف لے جائیں گے؟ فرمایا کل انشاء اللہ واپس لاہور روانہ ہو جاؤں گا، بہرحال، کچھ دیر بات چیت اور ملاقات کے بعد جب واپس جانے لگے تو والد صاحب نے ان سے فرمایا: بھائی مولوی ادریس، تم اتنے دنوں کے بعد یہاں آئے ہو، میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری دعوت کروں۔ لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہارا قیام آگرہ تاج کالونی میں ہے۔ اور میں یہاں کورنگی میں رہتا ہوں، اب اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ فلاں وقت میرے یہاں آ کر کھانا کھائیں۔ تب تو آپ کو میں مصیبت میں ڈال دوں گا، اس لئے کل آپ کو واپس جانا ہے۔ کام بھی بہت سے ہوں گے، اس لئے دل اس بات کو گوارہ نہیں کرتا کہ آپ کو دوبارہ یہاں آنے کی تکلیف دوں۔ لیکن یہ بھی مجھے گوارہ نہیں ہے کہ آپ تشریف لائیں۔ اور بغیر دعوت کے آپ کو روانہ کر دوں۔ اس لئے میری طرف سے دعوت کے بدلے یہ سو روپے ہدیہ رکھ لیں۔ مولانا محمد ادریس صاحب نے وہ سو روپے کا نوٹ اپنے سر رکھ لیا، اور فرمایا کہ یہ تو آپ نے مجھے بہت بڑی نعمت عطا فرمادی، آپ کی دعوت کا شرف بھی حاصل ہو گیا، اور کوئی تکلیف بھی اٹھانی نہیں پڑی۔ اور پھر اجازت لے کر روانہ ہو گئے۔

محبت کا تقاضا ”راحت رسانی“

یہ ہے بے تکلفی، اور راحت رسانی۔ حضرت مفتی صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یہ کہتا کہ ”یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ لاہور سے کراچی تشریف لائیں، اور میرے گھر دعوت کھائے بغیر چلے جائیں، اس وقت آپ واپس جائیں اور دوسرے وقت تشریف لائیں۔ اور کھانا کھا کر جائیں۔ چاہے اس کے لئے سو مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ مولانا ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جگہ کوئی اور ہوتا وہ کہتا کہ میں تمہاری دعوت کا بھوکا ہوں، میں فقیر ہوں، جو تم مجھے پیسے دے رہے ہو کہ اسکا کھانا کھالیتا۔

یاد رکھو! محبت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ جس سے محبت کی جا رہی ہے، اس کو راحت اور آرام پہنچانے کی کوشش کی جائے، نہ یہ کہ اس کو تکلیف میں ڈالا جائے۔ میرے بڑے بھائی ذکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ اللہ ان کے درجے بلند فرمائے، شعر بہت اچھے کہا کرتے تھے، ان کا ایک بہت خوبصورت شعر ہے:

میرے محبوب میری ایسی وفا سے توبہ
جو تیرے دل کی کدورت کا سبب بن جائے

ایسی وفاداری، اور ایسا اظہار محبت جس سے تکلیف ہو، جس سے دل میں کدورت پیدا ہو جائے، میں ایسی وفاداری اور محبت سے تو بہ کرتا ہوں۔ جب بھائی صاحب نے یہ شعر کہا تو میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کے اس شعر نے بدعت کی جڑ کاٹ دی، اس لئے ساری بدعات اسی سے پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی اپنی طرف سے وفاداری کے طریقے گھڑ کر اس پر عمل شروع کر دیتا ہے، اور اس کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وفاداری کا طریقہ میرے محبوب کے دل کی کدورت کا سبب بن رہا ہے۔

دعوت کرنا ایک فن ہے

بہر حال، دعوت کرنا بھی ایک فن ہے، ایسی دعوت کرو جس سے واقعی راحت پہنچے، جس سے آرام ملے، نہ یہ کہ دوسرے کے لئے تکلیف کا سبب بن جائے۔ دوسرے یہ کہ دعوت کا منشا تو محبت کا اظہار ہے، محبت کا تقاضے پر عمل کرنا ہے۔ اس دعوت کا رسموں سے کوئی تعلق نہیں، مثلاً یہ رسم ہے کہ عقیقے کے موقع پر دعوت کی جاتی ہے، یا تیجے دسویں اور چالیسویں کے موقع پر دعوت کی جاتی ہے، اس رسم کے موقع پر دعوت کریں گے، فلاں کو بلائیں گے۔ یاد رکھئے، ان رسمی دعوتوں کا حضور ﷺ کی سنت سے کوئی تعلق نہیں، دعوت تو وہ ہے کو کھلے دل سے کسی قید اور شرط کے بغیر، کسی رسم کے بغیر آدمی دوسرے کی دعوت کرے۔

یہ باتیں تو دعوت کرنے کے بارے میں تھیں، جہاں تک دعوت قبول کرنے کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے کہ اس کی دعوت قبول کرے، لیکن دعوت قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دعوت قبول کرنے والے کے پیش نظر اس کی محبت اور قدر دانی ہو، اور اس کے پیش نظر یہ نہ ہو کہ اگر میں اس دعوت میں شریک نہیں ہوا تو خاندان میں میری ناک کٹ جائے گی، اگر اس خیال کے ساتھ شریک ہوا تو پھر وہ دعوت قبول کرنا مسنون نہیں رہے گا، یہ دعوت مسنون اس وقت ہوگی جب شرکت سے پیش نظر یہ ہو کہ میرے جانے سے اس کا دل خوش ہو جائے گا۔

دعوت قبول کرنے کی شرط

پھر دعوت قبول کرنے کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ دعوت قبول کرنا اس وقت سنت ہے جب اس دعوت قبول کرنے کے نتیجے میں آدمی کسی معصیت اور گناہ میں مبتلا نہ ہو، مثلاً ایک ایسی جگہ کی دعوت قبول کر لی جہاں گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہو رہا ہے، اب ایک سنت پر عمل کرنے کے لئے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا جا رہا ہے، ایسی دعوت قبول کرنا سنت نہیں۔ آج کل کی اکثر دعوتیں ایسی ہیں جن میں یہ

مصیبت پائی جاتی ہے، ان میں معصیتیں ہو رہی ہیں، منکرات ہو رہی ہیں، گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ شادی کے کارڈ پر لکھا ہوتا ہے "ولیمہ مسنونہ" یہ تو معلوم ہے کہ ولیمہ کرنا سنت ہے۔ لیکن کس طرح یہ ولیمہ مسنونہ کیا جائے۔؟ اس کا کیا طریقہ ہے یہ معلوم نہیں۔ چنانچہ ولیمہ مسنونہ کے اندر بے پردگی ہو رہی ہے، مردوں اور عورتوں کا مخلوط اجتماع ہے، گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہے۔

کب تک ہتھیار ڈالو گے؟

یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ ہم لوگ ان رسموں اور گناہوں کے سامنے ہتھیار ڈالتے جا رہے ہیں، اور ہتھیار ڈالتے ڈالتے اب اس مقام تک پہنچ گئے کہ مفاسد، گناہ، منکرات معاشرے میں پھیل کر رائج ہو گئے ہیں۔ اگر کسی وقت کوئی اللہ کا بندہ اسٹینڈ لے کر خاندان والوں سے یہ کہتا ہے کہ اگر اس گناہ کا ارتکاب ہوگا تو میں اس دعوت میں شریک نہیں ہوں گا، تو اس بات کی امید تھی کہ اتنی تیزی سے منکرات نہ پھیلتے، آج جب لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جس دعوت میں مردوں اور عورتوں کا مخلوط اجتماع ہو، اس میں شرکت مت کرو، تو لوگ یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر ہم نے شرکت نہ کی تو خاندان سے اور معاشرے سے کٹ جائیں گے، میں کہتا ہوں اگر گناہوں سے بچنے کے لئے اللہ کی خاطر خاندان سے کٹنا پڑے تو کٹ جاؤ، یہ کٹنا تمہارے لیے مبارک ہے، اور اگر کوئی تمہاری دعوت کرنا چاہتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ تمہارے اصول کا بھی کچھ خیال کرے، جو شخص تمہارے اصول کا خیال نہیں رکھتا اس کی دعوت قبول کرنا تمہارے ذمے کوئی ضروری نہیں۔

اگر ایک مرتبہ کچھ لوگ اسٹینڈ لے لیں۔ اور اپنے خاندان والوں سے صاف صاف کہہ دیں کہ ہم مردوں اور عورتوں کی مخلوط دعوتوں میں شریک نہیں ہوں گے، اگر ہمیں بلانا چاہتے ہو تو مردوں اور عورتوں کا انتظام الگ کرو، پھر دیکھو گے کہ کچھ عرصہ کے اندر اس کی بہت اصلاح ہو سکتی ہے، ابھی یہ سیلاب اتنا آگے نہیں بڑھا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جو آدمی دین پر عمل کرنا چاہتا ہے، وہ یہ بات کہی تو لوگ بیک ورڈ سمجھیں گے پسماندہ اور رجعت پسند سمجھیں گے۔ اور اس کے برخلاف جو شخص بے دینی اور آزادی کے راستے پر چلتا ہے، وہ سینہ تان کر فخر کے ساتھ اپنی آزادی اور بے دینی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اب تو شادی اور دیگر تقریبات کی دعوتوں میں یہاں تک نوبت آگئی ہے، کہ نوجوان لڑکیاں مردوں کے سامنے رقص کرنے لگی ہیں، مگر پھر بھی ایسی دعوتوں میں لوگ شریک ہو رہے ہیں، کہاں تک اس سیلاب میں بہتے جاؤ گے؟ اگر یہی سلسلہ چلتا رہا تو کوئی بعید نہیں کہ مغربی تہذیب کی لعنتیں ہمارے معاشرے پر بھی پوری طرح مسلط ہو جائیں۔ کوئی حد تو ہوگی جہاں جا کر تمہیں رکنا پڑے گا۔ اس لئے اپنے لئے کچھ ایسے اصول بنا لو، مثلاً جس دعوت میں کھلے منکرات کا ارتکاب ہوگا وہاں ہم شریک نہیں

ہوں گے۔ یا جس دعوت میں مخلوط اجتماع ہوگا، ہم شریک نہیں ہوں گے، اگر اب بھی اللہ کے کچھ بندے اسٹینڈ لیں تو اس سیلاب پر بند لگ سکتا ہے۔

پردہ دار خاتون اچھوت بن جائے؟

بعض اوقات لوگ یہ سوچتے ہیں کہ تقریبات میں پردہ کرنے والی عورتیں اکا دکا ہوتی ہیں، تو ان کے لئے ہم علیحدہ انتظام کردیں گے۔ ذرا سوچو، کیا تم اس پردہ دار خاتون کو اچھوت بنانا چاہتے ہو؟ وہ سب سے الگ اچھوت بن کر بیٹھی رہے، اگر ایک بے پردہ عورت ہے، وہ اگر مردوں سے الگ پردہ میں ہوجائے تو اس کا کیا نقصان ہوا؟ لیکن ایک پردہ دار سے بے پردہ ہوکر مردوں کے سامنے چلی جائے گی تو اس کا تو دین غارت ہوجائے گا، اس لئے مردوں اور عورتوں کے الگ انتظام کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے، بس صرف توجہ دینے کی بات ہے، صرف اہتمام کرنے اور اس پر ڈٹ جانے کی بات ہے۔

دعوت قبول کرنے کا شرعی حکم

اور شرعی مسئلہ یہ ہے کہ جس دعوت کے بارے میں پہلے سے یہ معلوم ہو کہ اس دعوت میں فلاں گناہ کبیرہ ارتکاب ہوگا اور اندیشہ یہ ہو کہ میں بھی اس گناہ میں مبتلا ہوجاؤں گا، اس دعوت میں شرکت کرنا جائز نہیں، اور جس دعوت کے بارے میں یہ خیال ہو کہ اس دعوت میں فلاں گناہ تو ہوگا۔ لیکن میں اپنے آپ کو اس گناہ سے بچالوں گا، ایسی دعوت میں عام آدمی کو شرکت کی گنجائش ہے۔ لیکن جس آدمی کے لئے کسی حال میں بھی ایسی دعوت میں شرکت کرنا جائز نہیں۔ اور یہ دعوت قبول کرنے کا اہم اصول ہے، دعوت قبول کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی اس کی وجہ سے گناہوں کا ارتکاب کرے۔

دعوت کے لئے نفلی روزہ توڑنا

اس حدیث میں حضور ﷺ نے یہ بھی فرمادیا کہ جس شخص کی دعوت کی گئی ہے، اگر وہ روزہ دار ہے، اور روزے کی وجہ سے کھانا نہیں کھاسکتا تو وہ میزبان کے حق میں دعا کردے۔ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے تو بعض احادیث کی روشنی میں یہاں تک لکھا ہے کہ اگر نفلی روزہ کسی نے رکھا ہے، اور اس کی کسی مسلمان نے دعوت کردی، تو اب مسلمان کی دعوت قبول کرنے کے لئے اور اس کا دل خوش کرنے کے لئے نفلی روزہ توڑ دے تو اس کی بھی اجازت ہے، بعد میں اس روزے کی قضا کرلے۔ لیکن اگر روزہ توڑنا نہیں چاہتا تو کم از کم اس کے حق میں دعا کردے۔

بن بلائے مہمان کا حکم

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْبَدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ دَعَا رَجُلٌ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِطَعَامٍ صَنَعَهُ لَهٗ خَامِسَ خَمْسَةٍ، فَتَبِعَهُمْ رَجُلٌ، فَلَمَّا بَلَغَ الْبَابَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذَا تَبِعَنَا فَاِنْ شِئْتَ اَنْ تَاْذَنَ وَاِلَّا رَجَعَ، قَالَ: بَلْ اٰذَنُ لَهٗ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ.(۱)

حضرت ابو مسعود البدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور ﷺ کی دعوت کی، اور آپ کے ساتھ چار افراد کی بھی دعوت کی، سادگی کا زمانہ تھا، اس لئے بسا اوقات جب کوئی شخص حضور اقدس ﷺ کی دعوت کرتا تو عام طور پر وہ حضور سے یہ بھی کہہ دیتا کہ آپ اپنے ساتھ مزید تین افراد کو بھی لے آئیں۔ یا چار افراد کو لے آئیں۔ چنانچہ ان صاحب نے پانچ افراد کی دعوت کی تھی۔ ایک حضور اقدس ﷺ اور چار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب حضور اقدس ﷺ دعوت میں جانے لگے تو ایک صاحب اور ساتھ ہو لئے، جیسے بزرگوں کے بعض معتقدین ہوتے ہیں کہ جو بزرگوں کے ساتھ لگ جاتے ہیں، جب حضور اقدس ﷺ میزبان کے گھر کے دروازے پر پہنچے تو آپ نے میزبان سے فرمایا کہ یہ صاحب ہمارے ساتھ آ گئے ہیں، ان کو آپ نے دعوت نہیں دی تھی، اب اگر آپ کی اجازت ہو تو یہ اندر آ جائیں، اگر اجازت نہ ہو تو یہ واپس چلے جائیں، میزبان نے کہا: یا رسول اللہ، میں اجازت دیتا ہوں، آپ ان کو بھی اندر لے آئیں۔

وہ شخص چور اور لٹیرا ہے

اس حدیث کے ذریعہ حضور اقدس ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ جب کسی کے گھر دعوت میں شرکت کے لئے جاؤ، اور اتفاق سے کوئی ایسا شخص تمہارے ساتھ اس دعوت میں آ گیا جس کو دعوت نہیں دی گئی تو میزبان کو اس کے آنے کی اطلاع کر دو، اور پھر اس کی اجازت کے بعد اس کو دعوت میں شریک کرو، کیونکہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی دعوت میں بن بلائے شرکت کر لے تو وہ شخص چور بن کر داخل ہوا، اور لٹیرا بن کر نکلا۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب ما قیل فی اللحام و الجزار، رقم: ۱۹۳۹، صحیح مسلم، کتاب الاشربة، باب ما یفعل الضیف اذا تبعه غیر من دعاه صاحب الطعام، رقم: ۳۷۹۷، مسند أحمد، رقم: ١٦٤٦٦

میزبان کے بھی حقوق ہیں

درحقیقت حضور اقدس ﷺ کی یہ تعلیم ایک بہت بڑے اصول کی نشان دہی کرتی ہے، جس کو ہم نے بھلا دیا ہے، وہ یہ کہ ہمارے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا مہمان بن جائے تو میزبان پر بے شمار حقوق عائد ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کا اکرام کرے، اس کی خاطر مدارات کرے وغیرہ، لیکن اس حدیث کے ذریعہ سے حضور اقدس ﷺ نے یہ بتا دیا کہ جس طرح مہمان کے حقوق میزبان پر ہیں، اسی طرح میزبان کے بھی کچھ حقوق مہمان پر ہے، ان میں سے ایک حق ہے کہ مہمان میزبان کو بلاوجہ تکلیف نہ دے، مثلاً یہ کہ مہمان ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ نہ لے جائے جن کی دعوت نہیں ہے، جیسے آج کل کے بعض پیروں، فقیروں کے یہاں ہوتا ہے کہ جس کسی نے پیر صاحب کی دعوت کی تو اب پیر صاحب اکیلے نہیں جائیں گے، بلکہ ان کے ساتھ ایک لشکر بھی میزبان کے گھر پر حملہ آور ہو جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میزبان کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ اتنے مہمان آئیں گے، جب اچانک وقت پر اتنا بڑا لشکر پہنچ جاتا ہے تو اب میزبان کے لئے ایک مصیبت کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ایسا شخص چور بن کر داخل ہوا، اور لٹیرا بن کر نکلا۔ البتہ جہاں بے تکلفی کا معاملہ ہو، اور یقین سے یہ بات معلوم ہو کہ اگر میں اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا تو میزبان زیادہ خوش ہو جائے گا۔ ایسے مواقع پر ساتھ لے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ جہاں ذرا بھی تکلیف پہنچنے کا احتمال ہو، وہاں پہلے سے بتانا واجب ہے۔

پہلے سے اطلاع کرنی چاہئے

اسی طرح میزبان کا ایک حق یہ ہے کہ جب تم کسی کے یہاں مہمان بن کر جانا چاہتے ہو تو پہلے سے اس کو اطلاع کر دو، یا کم از کم ایسے وقت میں جاؤ، کہ وہ کھانے کا انتظام آسانی کے ساتھ کر سکے، کیونکہ تم عین کھانے کے وقت کسی کے گھر پہنچ گئے تو اس کو فوری طور پر کھانے کا انتظام کرنے میں تکلیف اور مشقت ہوگی۔ لہٰذا ایسے وقت میں جانا ٹھیک نہیں، یہ میزبان کا حق ہے۔

مہمان بلا اجازت روزہ نہ رکھے

حضور اقدس ﷺ کی تعلیمات پر قربان جایئے کہ ایک حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ کسی مہمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ میزبان کو بتائے بغیر روزہ رکھے، اس لئے کہ جب تم نے اس کو بتایا نہیں کہ آج میں روزہ رکھوں گا، اس کو تو یہ معلوم ہے کہ تم اس کے مہمان ہو، اس لئے وہ تمہارے لئے

ناشتے کا بھی انتظام کرے گا۔ دوپہر کے کھانے کا بھی انتظام کرے گا، پھر جب اس نے سب انتظام کر لیا تو عین وقت پر تم نے اس سے کہا کہ میرا تو روزہ ہے، اس کی محنت بے کار گئی، اس کے مصارف بے کار گئے، اور اس کو تم نے تکلیف بھی پہنچائی، اس لئے حکم یہ ہے کہ میزبان کی اجازت کے بغیر روزہ رکھنا جائز نہیں۔ لہٰذا جس طرح مہمان کے حقوق ہیں، اسی طرح میزبان کے بھی حقوق ہیں۔

مہمان کو کھانے کے وقت پر حاضر رہنا چاہئے

یا مثلاً میزبان کے یہاں کھانے کا وقت مقرر ہے، اور تم اس وقت غائب ہو گئے۔ اور وہ تم کو تلاش کرتا پھر رہا ہے، اور اب وہ بے چارہ مہمان کے بغیر کھانا نہیں کھا سکتا، اس لئے اصول یہ ہے کہ مہمان کو چاہئے کہ اگر کسی وقت کھانا نہ کھانا ہو، یا دیر ہو جانے کا امکان ہو تو پہلے سے میزبان کو بتا دو کہ آج میں کھانے پر دیر سے آؤں گا۔ تاکہ اس کو تلاش اور انتظام کی تکلیف نہ ہو۔

میزبان کو تکلیف دینا گناہ کبیرہ ہے

دین صرف نماز روزے کا اور ذکر و تسبیح کا نام نہیں، یہ سب باتیں دین کا حصہ ہیں۔ ہم نے اس کو دین سے خارج کر دیا، بڑے بڑے دین دار، بڑے بڑے تہجد گزار، اشراق اور چاشت پڑھنے والے بھی معاشرت کے ان آداب کا لحاظ نہیں کرتے، جس کی وجہ سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، یاد رکھو، اگر ان آداب کا لحاظ نہ کرنے کے نتیجے میں میزبان کو تکلیف ہو گی تو ایک مسلمان کو تکلیف کا گناہ کبیرہ اس مہمان کو ہو گا۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کسی مسلمان کو اپنے قول یا فعل سے تکلیف پہنچانا گناہ کبیرہ ہے، جیسے شراب پینا، چوری کرنا، زنا کرنا گناہ کبیرہ ہے، لہٰذا اگر تم نے اپنے کسی عمل سے میزبان کو تکلیف میں مبتلا کر دیا تو ایذاء مسلم ہوئی، یہ سب گناہ کبیرہ ہے، یہ ساری باتیں اس اصول میں داخل ہیں، جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بتا دیا، دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

☆☆

لباس کے شرعی اصول و آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِىْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا، وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾(۱)

جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کی تعلیمات زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہیں، لہٰذا ان کا تعلق ہماری معاشرت اور رہن سہن کے ہر حصے سے ہے، زندگی کا کوئی گوشہ اسلام کی تعلیمات سے خالی نہیں۔ ''لباس'' بھی زندگی کے گوشوں میں سے اہم گوشہ ہے۔ اس لئے قرآن وسنت نے اس کے بارے میں بھی تفصیلی ہدایات دی ہیں۔

موجودہ دور کا پروپیگنڈہ

آج کل ہمارے دور میں یہ پروپیگنڈہ بڑی کثرت سے کیا گیا ہے کہ لباس تو ایسی چیز ہے جس کا ہر قوم اور ہر وطن کے حالات سے تعلق ہوتا ہے، اس لئے آدمی اگر اپنی مرضی اور ماحول کے مطابق کوئی لباس اختیار کر لے تو اس کے بارے میں شریعت کو بیچ میں لاتا اور شریعت کے احکام سنانا تنگ نظری کی بات ہے۔ اور یہ جملہ تو لوگوں سے بکثرت سننے میں آتا ہے کہ ان مولویوں نے اپنی طرف سے قیدیں شرطیں لگا دی ہیں، ورنہ دین میں تو بڑی آسانی ہے، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے تو دین میں اتنی پابندیاں نہیں لگائی ہیں، مگر ان ملاؤں نے اپنی طرف سے گھڑ کر یہ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں، اور یہ ان

☆ اصلاحی خطبات (۲۵۸/۵ تا ۳۱۵) جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔ مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ کا یہ بیان علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی '' رياض الصالحين '' کے ایک حصہ (كتاب اللباس، باب استحباب الثوب الأبيض وجواز الأحمر والأخضر والأصفر والأسود وجوازه من قطن وكتان وشعر وصوف وغيرها إلا الحرير) کا درس ہے۔ رياض الصالحين، ص: ۲۷۳

(۱) الاعراف: ۲٦

ملاؤں کی تنگ نظری کی دلیل ہے، اور اس تنگ نظری کے نتیجے میں انہوں نے خود بھی بہت سی باتوں کو چھوڑ رکھا ہے اور دوسروں سے بھی چھڑا رکھا ہے۔

ہر لباس اپنا اثر رکھتا ہے

خوب سمجھ لیجئے لباس کا معاملہ اتنا سادہ اور اتنا آسان نہیں ہے کہ آدمی جو چاہے لباس پہنتا رہے اور اس لباس کی وجہ سے اس کے دین پر، اس کے اخلاق پر، اس کی زندگی پر اس کے طرز عمل پر کوئی اثر واقع نہ ہو۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے، جس کو شریعت نے تو ہمیشہ بیان فرمایا، اور اب نفسیات اور سائنس کے ماہرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ انسان کے لباس کا اس کی زندگی پر، اس کے اخلاق پر، اس کے کردار پر بڑا اثر واقع ہوتا ہے۔ لباس محض ایک کپڑا نہیں ہے جو انسان نے اٹھا کر پہن لیا، بلکہ یہ لباس انسان کے طرز فکر پر، اس کی سوچ پر، اس کی ذہنیت پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لئے اس لباس کو معمولی نہیں سمجھنا چاہئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جبہ کا اثر

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں خطبہ دینے کے لئے تشریف لائے، اس وقت وہ ایک بہت شاندار جبہ پہنے ہوئے تھے، جب خطبہ سے فارغ ہو کر گھر تشریف لے گئے تو اس جبہ کو جا کر اتار دیا اور فرمایا کہ میں آئندہ اس جبہ کو نہیں پہنوں گا، اس لئے کہ اس جبہ کو پہننے سے میرے دل میں بڑائی اور تکبر کا احساس پیدا ہو گیا، اس لئے میں آئندہ اس کو نہیں پہنوں گا۔ حالانکہ وہ جبہ بذات خود ایسی چیز نہیں تھی جو حرام ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ جن حضرات کی طبیعتوں کو آئینے کی طرح شفاف بناتے ہیں، ان کو ذرا ذرا سی باتیں بھی بری لگتی ہیں، اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے ایک کپڑا داغ دار ہے اور اس کپڑے پر ہر جگہ دھبے ہی دھبے لگے ہوئے ہیں، اس کے بعد اس کپڑے پر ایک داغ اور لگ جائے تو اس کپڑے پر کوئی اثر ظاہر نہ ہوگا۔ ہمارا بھی یہی حال ہے کہ ہمارا سینہ داغوں اور دھبوں سے بھرا ہوا ہے، اس لئے اگر خلاف شریعت کوئی بات ہو جاتی ہے تو اس کی ظلمت اور اس کی تاریکی اور اس کے وبال کا احساس نہیں ہوتا، لیکن جن حضرات کے سینوں کو اللہ تعالیٰ آئینے کی طرح شفاف بناتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سفید صاف شفاف کپڑا ہو، اس پر اگر ذرا سا بھی داغ لگ جائے گا تو وہ داغ بہت نمایاں نظر آئے گا، اسی طرح اللہ والوں کے دل صاف شفاف ہوتے ہیں، ان پر ذرا سی بھی چھینٹ پڑ جائے تو ان کو ناگوار ہوتی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ لباس کا اثر انسان کے اخلاق و کردار پر اور اس کی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ اس لئے

لباس کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہئے، اور لباس کے بارے میں شریعت کے جو اصول ہیں وہ سمجھ لینے چاہئیں اور ان کی پیروی کرنی بھی ضروری ہے۔

آج کل کا ایک اور پروپیگنڈہ

آج کل یہ جملہ بھی بہت کثرت سے سننے میں آتا ہے کہ اس ظاہری لباس میں کیا رکھا ہے، دل صاف ہونا چاہئے اور ہمارا دل صاف ہے ہماری نیت اچھی ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق قائم ہے، سارے کام تو ہم ٹھیک کر رہے ہیں، اب اگر ذرا سا لباس بدل دیا تو اس میں کیا حرج ہے؟ کیونکہ دین ظاہر کا نام نہیں بلکہ باطن کا نام ہے، دین جسم کا نام نہیں بلکہ روح کا نام ہے، شریعت کی روح دیکھنی چاہئے، دین کی روح کو سمجھنا چاہئے۔ آج کل اس قسم کے جملے بہت کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں اور پھیلائے جا رہے ہیں اور فیشن بن گئے ہیں۔

ظاہر اور باطن دونوں مطلوب ہیں

خوب یاد رکھئے، دین کے احکام روح پر بھی ہیں اور جسم پر بھی ہیں، باطن پر بھی ہیں اور ظاہر پر بھی ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ﴾ (۱)

یعنی ظاہر کے گناہ بھی چھوڑ دو اور باطن کے گناہ بھی چھوڑ دو، صرف یہ نہیں کہا کہ باطن کے گناہ چھوڑ دو۔ خوب یاد رکھئے، جب تک ظاہر خراب ہے تو پھر یہ شیطان کا دھوکہ ہے کہ باطن ٹھیک ہے، اس لئے کہ ظاہر اسی وقت خراب ہوتا ہے جب اندر سے خراب ہوتا ہے، اگر باطن خراب نہ ہو تو ظاہر بھی خراب نہیں ہوگا۔

ایک خوبصورت مثال

ہمارے ایک بزرگ ایک مثال دیا کرتے تھے کہ جب کوئی پھل اندر سے سڑ جاتا ہے تو اس کے سڑنے کے آثار چھلکے پر داغ کی شکل میں نظر آنے لگتے ہیں اور اگر اندر سے وہ پھل سڑا ہوا نہیں ہے تو چھلکے پر بھی خرابی نظر نہیں آئے گی، چھلکے پر اسی وقت خرابی ظاہر ہوتی ہے جب اندر سے خراب ہو۔ اسی طرح جس شخص کا ظاہر خراب ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ باطن میں بھی کچھ نہ کچھ خرابی ضرور

---

(۱) الانعام: ۱۲۰

ہے، ورنہ ظاہر خراب ہوتا ہی نہیں، لہٰذا یہ کہنا کہ ہمارا ظاہر اگر خراب ہے تو کیا ہوا، باطن ٹھیک ہے، یاد رکھئے، اس صورت میں باطن کبھی ٹھیک ہو ہی نہیں سکتا۔

دنیاوی کاموں میں ظاہر بھی مطلوب ہے

دنیا کے سارے کاموں میں تو ظاہر بھی مطلوب ہے اور باطن بھی مطلوب ہے، ایک بے چارا دین ہی ایسا رہ گیا ہے جب کے بارے میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہمیں اس کا باطن چاہئے، ظاہر نہیں چاہئے، مثلاً دنیا کے اندر جس آپ مکان بناتے ہیں تو مکان کا باطن تو یہ ہے کہ چار دیواری کھڑی کر کے اوپر سے چھت ڈال دی تو باطن حاصل ہو گیا، اب اس پر پلاستر کی کیا ضرورت ہے؟ اور رنگ و روغن کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ مکان کی روح تو حاصل ہو گئی ہے، وہ مکان رہنے کے قابل ہو گیا۔ مگر مکان کے اندر کی تو یہ فکر ہے کہ صرف چار دیواری اور چھت کافی نہیں، بلکہ پلاستر بھی ہو، رنگ و روغن بھی ہو، اس میں زیب و زینت کا سارا سامان موجود ہو، یہاں کبھی صرف باطن ٹھیک کر لینے کا فلسفہ نہیں چلتا۔ یا مثلاً گاڑی ہے، ایک اس کا باطن ہے اور ایک ظاہر ہے، گاڑی کا باطن یہ ہے کہ ڈھانچہ لے کر اس میں انجن لگا لو تو باطن حاصل ہے، اس لئے کہ انجن لگا ہوا ہے، وہ سواری کرنے کے قابل ہے، لہٰذا اب نہ باڈی کی ضرورت ہے، نہ رنگ و روغن کی ضرورت ہے۔ وہاں تو کسی شخص نے آج تک یہ نہیں کہا کہ مجھے گاڑی کا باطن حاصل ہے، اب ظاہر کی ضرورت نہیں، بلکہ وہاں تو ظاہر بھی مطلوب ہے اور باطن بھی مطلوب ہے، ایک بے چارہ دین ہی ایسا مسکین رہ گیا کہ اس میں صرف باطن مطلوب ہے اور ظاہر مطلوب نہیں۔

یہ شیطان کا دھوکہ ہے

یاد رکھئے، یہ شیطان کا دھوکہ اور فریب ہے، لہٰذا ظاہر بھی درست کرنا ضروری ہے اور باطن بھی درست کرنا ضروری ہے، چاہے لباس ہو، یا کھانا، یا آداب معاشرت ہوں، اگرچہ ان سب کا تعلق ظاہر سے ہے، لیکن ان سب کا گہرا اثر باطن پر واقع ہے، اس لئے لباس کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں، ان کو دین کی حقیقی فہم حاصل نہیں، اگر یہ بات نہ ہوتی تو حضور ﷺ لباس کے بارے میں کوئی ہدایت نہ فرماتے، کوئی تعلیم نہ دیتے، لیکن آپ ﷺ نے لباس کے بارے میں ہدایات دیں، آپ کی تعلیمات اسی جگہ پر آتی ہیں جہاں لوگوں کے بھک جانے اور غلطی میں پڑ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان اصولوں کو اور ان تعلیمات کو اہتمام کے ساتھ سننے کی ضرورت ہے۔

شریعت نے کوئی لباس مخصوص نہیں کیا

شریعت نے لباس کے بارے میں بڑی معتدل تعلیمات عطا فرمائی ہیں، چنانچہ شریعت نے کوئی خاص لباس مقرر کرکے اور اس کی ہیئت بتا کر یہ نہیں کہا کہ ہر آدمی کے لئے ایسا لباس پہننا ضروری ہے، لہٰذا جو شخص اس ہیئت سے ہٹ کر لباس پہنے گا، وہ مسلمانی کے خلاف ہوگا۔ ایسا اس لئے کہا کہ اسلام دین فطرت ہے، اور حالات کے لحاظ سے، مختلف ممالک کے لحاظ سے، وہاں کے موسموں کے لحاظ سے، وہاں کی ضروریات کے لحاظ سے لباس مختلف ہوسکتا ہے، کہیں باریک، کہیں موٹا، کہیں کسی وضع کا، کہیں کسی ہیئت کا لباس اختیار کیا جاسکتا ہے، لیکن اسلام نے لباس کے بارے میں کچھ بنیادی اصول عطا فرمادیئے، ان اصولوں کی ہر حالت میں رعایت رکھنی ضروری ہے، ان کو سمجھ لینا چاہئے۔

لباس کے چار بنیادی اصول

جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے لباس کے بنیادی اصول بتادیئے ہیں، فرمایا:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا، وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾(۱)

"اے بنی آدم، ہم نے تمہارے لئے ایسا لباس اتارا جو تمہاری پوشیدہ اور شرم کی چیزوں کو چھپاتا ہے اور جو تمہارے لئے زینت کا سبب بنتا ہے، اور تقوی کا لباس تمہارے لئے سب سے بہتر ہے۔"

یہ تین جملے ارشاد فرمائے اور ان تین جملوں میں اللہ تعالیٰ نے معانی کی کائنات بھردی ہے۔

لباس کا پہلا بنیادی مقصد

اس آیت میں لباس کا پہلا مقصد یہ بیان فرمایا کہ وہ تمہاری پوشیدہ اور شرم کی چیزوں کو چھپا سکے۔ "سوآۃ" کے معنی ہیں وہ چیز جس کے ذکر کرنے سے یا جس کے ظاہر ہونے سے انسان شرم محسوس کرے، اس سے مراد ہے "ستر" تو گویا لباس کا سب سے بنیادی مقصد "ستر" چھپانے کی چیز ہے، وہ ستر مردوں میں الگ ہے اور عورتوں میں الگ ہے، مردوں میں ستر کا حصہ جس کو چھپانا ہر حال

(۱) الاعراف:۲۶

میں ضروری ہے، وہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ہے، عام حالات میں اس کو چھپانا ضروری ہے، عورت کا سارا جسم، سوائے چہرہ اور گٹوں تک ہاتھ کے سب کا سب "ستر" ہے۔ جس کا چھپانا ضروری ہے اور کھولنا جائز نہیں۔

لہٰذا لباس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ شریعت کے مقرر کئے ہوئے ستر کے حصوں کو چھپا لے، جو لباس اس مقصد کو پورا نہ کرے، شریعت کی نگاہ میں وہ لباس ہی نہیں، وہ لباس کہلانے کے لائق نہیں، کیونکہ وہ لباس اپنا بنیادی مقصد پورا نہیں کر رہا ہے جس کے لئے وہ بنایا گیا ہے۔

لباس کے تین عیب

لباس کے بنیادی مقصد کو پورا نہ کرنے کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ لباس اتنا چھوٹا ہے کہ لباس پہننے کے باوجود ستر کا کچھ حصہ کھلا رہ گیا، اس لباس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اس لباس سے اس کا بنیادی مقصد حاصل نہ ہوا اور کشف عورت ہو گیا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس لباس سے ستر کو چھپا تو لیا، لیکن وہ لباس اتنا باریک ہے کہ اس سے اندر کا بدن جھلکتا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ لباس اتنا چست ہے کہ لباس پہننے کے باوجود جسم کی بناوٹ اور جسم کا ابھار نظر آ رہا ہے، یہ بھی ستر کے خلاف ہے۔ اس لئے مرد کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ایسے کپڑے سے چھپانا ضروری ہے جو اتنا موٹا ہو کہ اندر سے جسم نہ جھلکے اور وہ اتنا ڈھیلا ڈھالا ہو کہ اندر کے اعضاء کو نمایاں نہ کرے اور اتنا مکمل ہو کہ جسم کا کوئی حصہ کھلا نہ رہ جائے، اور یہی تین چیزیں عورت کے لباس میں بھی ضروری ہیں۔

آج کل کا ننگا پہناوا

موجودہ دور کے فیشن نے لباس کے اصل مقصد ہی کو مجروح کر دیا ہے، اس لئے کہ آج کل مردوں اور عورتوں میں ایسے لباس رائج ہو گئے ہیں جن میں اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ جسم کا کونسا حصہ کھل رہا ہے اور کونسا حصہ ڈھکا ہوا ہے، حالانکہ شریعت کی نگاہ میں وہ لباس لباس ہی نہیں۔ جو خواتین بہت باریک اور بہت چست لباس پہنتی ہیں جس کی وجہ سے کپڑا پہننے کے باوجود جسم کی بناوٹ دوسروں کے سامنے نمایاں ہوتی ہے، ایسی خواتین کے بارے میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((كَاسِيَاتٍ عَارِيَاتٍ))(۱)

(۱) صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، باب النساء الکاسیات العاریات المائلات الممیلات رقم: ۳۹۷۱، مسند أحمد، رقم: ۸۳۱۱، موطأ مالك، کتاب الجامع، باب ما یکرہ للنساء لبسه من الثیاب، رقم: ۱۴۲۱

"وہ خواتین لباس پہننے کے باوجود ننگی ہوں گی"

یعنی لباس پہنا ہوگا مگر ننگی ہوں گی، اس لئے کہ اس کپڑے سے لباس کا وہ بنیادی مقصد حاصل نہ ہوا جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے لباس اتارا تھا۔ آج کل خواتین میں یہ وبا اس کثرت سے پھیل چکی ہے جس کی کوئی حد نہیں، شرم و حیا سے بالائے طاق ہو کر رہ گئی ہے، اور ایسا لباس رائج ہو گیا جو جسم کو چھپانے کے بجائے اور نمایاں کرتا ہے، خدا کے لئے ہم اس بات کو محسوس کریں اور اپنے اندر فکر پیدا کریں اور اپنے گھروں میں ایسے لباس پر پابندی عائد کریں جو نبی کریم ﷺ کے ان ارشادات کے خلاف ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمارے دلوں میں یہ احساس اور فکر پیدا فرمائے۔

خواتین ان اعضاء کو چھپائیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شاید ہی کوئی جمعہ ایسا جاتا ہو جس میں اس پہلو کی طرف توجہ نہ فرماتے ہوں، فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو فتنے آج کل عام رواج پا گئے ہیں، ان کو کسی طرح ختم کرو، خواتین اس حالت میں مجمع عام کے اندر جا رہی ہیں کہ سر کھلا ہوا ہے، بازو کھلے ہوئے ہیں، سینہ کھلا ہوا ہے، پیٹ کھلا ہوا ہے۔ حالانکہ "ستر" کا حکم یہ ہے کہ مرد کے لئے مرد کے سامنے ستر کھولنا بھی جائز نہیں اور عورت کے لئے عورت کے سامنے ستر کھولنا جائز نہیں، مثلاً اگر کسی عورت نے ایسا لباس پہن لیا جس میں سینہ کھلا ہوا ہے، پیٹ کھلا ہوا ہے، بازو کھلے ہوئے ہیں تو اس عورت کو اس حالت میں دوسری عورتوں کے سامنے آنا بھی جائز نہیں، چہ جائیکہ اس حالت میں مردوں کے سامنے آئے، اس لئے کہ یہ اعضاء اس کے ستر کا حصہ ہیں۔

گناہوں کے برے نتائج

آج کل کی شادی کی تقریبات میں جا کر دیکھئے، وہاں کیا حال ہو رہا ہے، خواتین بہت بے حیائی کے ساتھ ایسا لباس پہن کر مردوں کے سامنے آجاتی ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینے والی بات نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ڈنکے کی چوٹ، سینہ تان کر اور ڈھٹائی کے ساتھ جب حضور ﷺ کے ارشادات کی ایسی کھلم کھلا خلاف ورزی ہوگی تو اس کے بارے میں ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ درحقیقت ان فتنوں نے ہمارے اوپر یہ عذاب مسلط کر رکھا ہے، یہ بدامنی اور بے چینی جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ کسی انسان کی جان و مال محفوظ نہیں ہے، درحقیقت ہماری ان ہی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ﴾ (۱)

(۱) الشوریٰ: ۳۰

یعنی جو کچھ تمہیں برائی پہنچتی ہے وہ سب تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے پہنچتی ہے اور بہت سے گناہ تو اللہ تعالیٰ معاف ہی فرما دیتے ہیں اور ان پر پکڑ نہیں فرماتے ہیں۔

خدا کے لئے اپنے گھروں سے اس فتنے کو دور کریں۔

قرب قیامت میں خواتین کی حالت

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے اس زمانے کا ایک ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ اگر آج کا زمانہ کسی نے نہ دیکھا ہوتا تو وہ شخص حیران ہو جاتا کہ اس حدیث کا مطلب کیا ہے؟ آپ نے اس طرح نقشہ کھینچا ہے جس طرح کہ آپ ﷺ نے موجودہ دور کی خواتین کو دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا ہو، اس لئے کہ اس زمانے میں اس کا تصور بھی مشکل تھا۔ چنانچہ فرمایا کہ قیامت کے قریب عورتیں لباس پہننے کے باوجود ننگی ہوں گی اور ان کے سروں کے بال ایسے ہوں گے جیسے بختی اونٹوں کے کوہان ہوتے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جس زمانے میں حضور اقدس ﷺ نے یہ بات فرمائی تھی، اس زمانے میں اس قسم کے بالوں کا کوئی رواج نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ بعض شراح حدیث نے اس پر کلام کیا ہے کہ اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ بختی اونٹوں کے کوہان کی طرح بال کس طرح ہو سکتے ہیں؟ لیکن آج کے جدید فیشن نے حضور اقدس ﷺ کی پیشین گوئی کو پورا کر دیا اور ایسا لگتا ہے کہ حضور ﷺ نے آج کی عورتوں کو دیکھ کر یہ بات ارشاد فرمائی ہو۔ آگے ارشاد فرمایا:

((مُمِيْلَاتٍ مَائِلَاتٍ))(۱)

یعنی وہ عورتیں اپنے لباس سے، اپنے انداز سے، اپنے زیب و زینت اور اپنے بناؤ سنگھار سے دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے والی ہوں گی اور دوسروں کی طرف مائل ہونے والی ہوں گی۔

خدا کے لئے اس بات کو ذہن نشین کیجئے کہ یہ جو کچھ فتنے اور مصائب اور بدامنی اور بے چینی ہے، یہ حقیقت میں اس بات کا نتیجہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے احکامات کی کھلم کھلا بغاوت ہو رہی ہے۔

کھلم کھلا گناہ کرنے والے

ایک بات اور سمجھئے کہ گناہوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک گناہ وہ ہے کو انسان چوری چھپے تنہائی میں کر رہا ہے، علی الاعلان دوسروں کے سامنے نہیں کر رہا ہے اور کبھی کبھی اس کو گناہوں پر شرمندگی اور

(۱) صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، باب النساء الكاسيات المائلات المميلات رقم:۳۹۷۱، مسند أحمد، رقم:۸۳۱۱، موطأ مالك، كتاب الجامع، باب ما يكره للنساء لبسه من الثياب، رقم:۱۴۲۱

ندامت بھی ہو جاتی ہے اور توبہ کی بھی توفیق ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسرا شخص علی الاعلان اور کھلم کھلا دوسروں کے سامنے گناہ کر رہا ہے اور اس پر فخر بھی کر رہا ہے کہ میں نے یہ گناہ کیا، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ أُمَّتِيْ مُعَافًى إِلَّا الْمُجَاهِرِيْنَ))(۱)

یعنی میری اُمت میں جتنے گناہ کرنے والے ہیں، سب کی مغفرت کی توقع ہے، انشاء اللہ سب کی معافی ہو جائے گی، یا تو توبہ کی توفیق ہو جائے گی یا اللہ تعالیٰ ویسے ہی معاف فرما دیں گے، لیکن وہ لوگ جو ڈنکے کی چوٹ پر کھلم کھلا اعلانیہ گناہ پر فخر کرتے ہوں گے اور بلکہ اس گناہ کو ثواب سمجھ کر کرتے ہوں گے اور یہ کہتے ہوں گے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہ درست ہے، اور اگر ان کو سمجھایا جائے تو اس پر بحث کرنے اور مناظرہ کرنے کو تیار ہو جاتے ہوں گے، اور کہتے ہوں گے کہ اس میں کیا حرج ہے؟ کیا ہم زمانے سے کٹ جائیں؟ کیا ہم دقیانوس ہو کر بیٹھ جائیں؟ اور ساری دنیا کے طعنے ہم اپنے سر لے لیں؟ کیا سوسائٹی سے کٹ کر بیٹھ جائیں؟ ایسے لوگوں کی مغفرت نہیں ہو گی۔

سوسائٹی کو چھوڑ دو

ارے یہ تو دیکھو کہ اگر سوسائٹی سے کٹ کر اللہ کے ہو جاؤ گے تو یہ کونسا مہنگا سودا ہے؟ ذرا غور تو کرو کہ یہ سوسائٹی کب تک تمہارا ساتھ دے گی؟ تمہیں کہاں تک لے جائے گی؟ یاد رکھو کہ قبر میں جانے کے بعد تمہارے اعمال کے سوا کوئی تمہارا ساتھی نہیں ہو گا، اس وقت تم اپنی سوسائٹی کو مدد کے لئے پکارنا کہ تمہاری وجہ سے ہم یہ کام کر رہے تھے، اب آ کر ہماری مدد کرو، کیا اس وقت تمہاری سوسائٹی کے افراد میں سے کوئی آ کر تمہاری مدد کرے گا؟ اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھڑا سکے گا؟ اس وقت کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾(۲)

یعنی اس وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی تمہارا ولی اور مددگار نہیں ہو گا جو تمہیں عذاب سے چھڑا سکے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب ستر المؤمن علی نفسه، رقم:۵٦٠٨، صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب النهی عن هتك الانسان ستر نفسه، رقم:٥٣٠٦

(۲) البقرة:١٠٧

ایک قرآنی واقعہ

قرآن کریم نے سورۂ صافات میں ایک شخص کا واقعہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس شخص کو جب جنت میں پہنچا دیں گے اور جنت کی ساری نعمتیں عطا فرما دیں گے، اس وقت اس کو اپنے ایک ساتھی اور دوست کا خیال آئے گا کہ معلوم نہیں اس کا کیا حال ہے؟ اس لئے کہ وہ دنیا کے اندر مجھے غلط کاموں پر اکسایا کرتا تھا اور مجھ سے بحث کیا کرتا تھا کہ آج کل کے حالات ایسے ہیں، ماحول ایسا ہے، سوسائٹی کے یہ تقاضے ہیں، وقت کے تقاضے یہ ہیں وغیرہ، تو ایسی باتیں کر کے مجھے ورغلایا کرتا تھا، اب ذرا اس کو میں دیکھوں تو وہ کس حال میں ہے؟ چنانچہ وہ اس کو دیکھنے کے لئے جہنم کے اندر جھانکے گا۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

﴿فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ، وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ﴾ (۱)

جب وہ اس کو دیکھنے کے لئے جہنم کے اندر جھانکے گا تو اس ساتھی کو جہنم کے بیچوں بیچ دیکھے گا اور پھر اس کو مخاطب ہو کر اس سے کہے گا کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تو نے مجھے ہلاک ہی کر دیا تھا یعنی اگر میں تیرے کہنے میں آ جاتا، تیری بات مان لیتا اور تیری اتباع کرتا تو آج میرا بھی یہی حشر ہوتا تھا جو حشر تیرا ہو رہا ہے۔ اور اگر میرے ساتھ میرے رب کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو مجھے بھی اسی طرح دھر لیا گیا ہوتا جس طرح آج تجھے دھر لیا گیا ہے۔

ہم ”بیک ورڈ“ ہی سہی

بہر حال، اس سوسائٹی کے تقاضے یہاں پر تو بڑے خوش نما لگتے ہیں، لیکن اگر اس بات پر پورا ایمان ہے کہ ایک دن مرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہے، تو خدا کے لئے اس سوسائٹی کی باتوں کو چھوڑو، اس کے ڈر اور خوف کو چھوڑو، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کی طرف آؤ۔ اور یہ سوسائٹی تمہیں جو طعنے دیتی ہے، ان طعنوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرو، اگر سوسائٹی یہ کہتی ہے کہ تم رجعت پسند ہو، تم دقیانوس ہو، تم بیک ورڈ ہو تم زمانے کے ساتھ چلنا نہیں جانتے، تو ایک مرتبہ اس سوسائٹی کو خم ٹھوک کر اور کمر کس کر یہ جواب دے دو کہ ہم ایسے ہی ہیں، تم اگر ہمارے ساتھ تعلق رکھنا چاہتے ہو رکھو، نہیں رکھنا چاہتے تو مت رکھو، جب تک ایک مرتبہ یہ نہیں کہو گے، اس وقت تک۔ یاد رکھو، یہ سوسائٹی تمہیں جہنم کی طرف لے جاتی رہے گی۔

---

(۱) الصفت [illegible]

یہ طعنے مسلمان کے لئے مبارک ہیں

حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی یہ طعنے دیئے گئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی یہ طعنے دیئے گئے، اور جو شخص بھی دین پر چلنا چاہتا ہے، اس کو یہ طعنے دیے جاتے ہیں۔ لیکن جب تک ان طعنوں کو اپنے لئے باعث فخر نہیں قرار دو گے، یاد رکھو، اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ ایک روایت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((أَكْثِرُوْا ذِكْرَ اللّٰهِ حَتّٰى يَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ)) (۱)

اللہ کی یاد اور ذکر اس حد تک کرو کہ لوگ تمہیں پاگل کہنے لگیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر سوسائٹی ایک طرف جارہی ہے، زمانہ ایک طرف جارہا ہے، اب تم اس کے بہاؤ پر بہنے کے بجائے اس کے بہاؤ کا رخ موڑنے کی کوشش کرلو تو لوگ تمہیں پاگل کہیں گے۔ چنانچہ آج اگر کوئی شخص دیانتداری اور امانت داری سے کوئی کام کرتا ہے تو لوگ اس کے بارے میں یہی کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہے، اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ مثلاً آج اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں رشوت نہ لوں، رشوت نہ دوں، سود نہ کھاؤں، حرام کاموں سے اجتناب کروں، اور لباس کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے احکام پر عمل کروں، تو اس وقت سوسائٹی اسکو یہی کہے گی کہ اس کا دماغ خراب ہے، یہ پاگل ہے، حالانکہ جب سوسائٹی تمہیں یہ کہے کہ تم پاگل ہو تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے تو یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بشارت ہے اور تمہارے لئے باعث فخر کلمہ ہے، اور یہ وہ لقب ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں دیا ہے۔ لہٰذا جس دن تمہیں دین کی وجہ سے کوئی شخص یہ کہہ دے کہ یہ پاگل ہے، اس دن خوشی مناؤ اور دو رکعت شکرانہ کی نفل ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے آج تمہیں اس مقام تک پہنچا دیا جو نبی کریم نے ایک مومن کے لئے فرمایا تھا، اس لئے اس سے ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں مولانا ظفر علی خان مرحوم نے خوب کہا:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

لہٰذا اگر ساری دنیا کے خفا ہونے کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے تمہارا تعلق جڑ جائے تو کیا یہ مہنگا سودا ہے؟ یہ دنیاوی زندگی معلوم نہیں کتنے دن کی زندگی ہے، یہ باتیں اور یہ طعنے سب ختم ہو کر رہ جائیں گے، اور جس دن تمہاری آنکھ بند ہوگی اور وہاں تمہارا استقبال ہوگا، اس وقت تم دیکھنا کہ ان

(۱) مسند أحمد بن حنبل، رقم: ۱۱۲۲۶

طعنہ دینے والوں کا کیا حشر ہوگا، اور یہ طعنے دینے والے جو آج تم پر ہنس رہے ہیں، قیامت کے دن یہ ہنسنے والے روئیں گے اور تم ان پر ہنسا کروگیا۔ لہٰذا ان سوسائٹی والوں سے کب تک تم ان کے پیچھے چلو گے۔ لہٰذا جب تک ایک مرتبہ ہمت کر کے ارادہ نہیں کرو گے، اس وقت تک چھٹکارا نہیں ملے گا۔ اور برہنگی کے لباس کا جو رواج چل پڑا ہے، ایک مرتبہ عزم کر کے اس کو ختم کرو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے آمین۔ بہرحال، اللہ تعالیٰ نے لباس کا پہلا مقصد بیان فرمایا، وہ ہے ستر، جو لباس ساتر نہیں، وہ حقیقت میں لباس ہی نہیں، وہ برہنگی ہے۔

لباس کا دوسرا مقصد

لباس کا دوسرا مقصد اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ ''ریشا'' یعنی ہم نے اس لباس کو تمہارے لئے زینت کی چیز اور خوبصورتی کی چیز بنائی۔ ایک انسان کی خوبصورتی لباس میں ہے، لہٰذا لباس ایسا ہونا چاہئے کہ جسے دیکھ کر انسان کو فرحت ہو، بدہیئت اور بے ڈھنگا نہ ہو جس کو دیکھ کر دوسروں کو نفرت اور کراہت ہو، بلکہ ایسا ہونا چاہئے جس کو پہن کر زینت کا فائدہ حاصل ہو سکے۔

اپنا دل خوش کرنے کے لئے قیمتی لباس پہننا

بعض اوقات دل میں یہ اشتباہ رہتا ہے کہ کیسا لباس پہنیں؟ اگر بہت قیمتی لباس پہن لیا تو یہ خیال رہتا ہے کہ کہیں اسراف میں داخل نہ ہو جائے؟ اگر معمولی لباس پہنیں تو کس درجے کا پہنیں؟ اللہ تعالیٰ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دور کے اندر ان سے ایسا عجیب کام لیا کہ آپ نے کوئی چیز پردہ خفا کے اندر نہیں چھوڑی، ہر چیز کو دو اور دو چار کر کے بالکل واضح کر کے اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ چنانچہ آپ نے لباس کے بارے میں فرمایا کہ لباس ایسا ہونا چاہئے جو ساتر ہو اور ساتر ہونے کے ساتھ ساتھ اس سے تھوڑا سا آسائش کا مقصد بھی حاصل ہو، یعنی لباس کے ذریعے جسم کو راحت بھی حاصل ہو، آرام بھی حاصل ہو، ایسا لباس پہننے میں کوئی حرج نہیں۔ مثلاً پتلا لباس پہن لیا، اس خیال سے کہ جسم کو آرام ملے گا، اس میں کوئی حرج نہیں، شرعاً جائز ہے، شریعت نے اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ اسی طرح اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے زیبائش کا لباس پہنے تو یہ بھی جائز ہے، مثلاً ایک کپڑا دس روپے گز ہے اور دوسرا کپڑا پندرہ روپے گز مل رہا ہے، اب اگر ایک شخص پندرہ روپے گز والا اس لئے خریدے کہ اس کے ذریعے میرے جسم کو آرام ملے گا یا اس وجہ سے کہ یہ کپڑا مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے، اس کو پہننے سے میرا دل خوش ہوگا، اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی وسعت دی ہے کہ میں دس روپے کے بجائے پندرہ روپے گز والا کپڑا پہن سکتا ہوں، تو یہ اسراف میں

داخل نہیں ہے اور گناہ بھی نہیں ہے، بلکہ شرعاً یہ بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں وسعت بھی دی ہے اور تم اپنا دل خوش کرنے کے لئے ایسا کپڑا پہن رہے ہو، اس لئے جائز ہے۔

مالدار کو اچھے کپڑے پہننا چاہئے

بلکہ جس شخص کی آمدنی اچھی ہو، اس کے لئے خراب قسم کا کپڑا اور بہت گھٹیا قسم کا لباس پہننا کوئی پسندیدہ بات نہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک صاحب حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ وہ صاحب بہت بد ہیئت قسم کا پرانا لباس پہنے ہوئے ہیں، حضور اقدس ﷺ نے ان صاحب سے پوچھا تمہارے پاس مال ہے؟ اس نے کہا ہاں، آپ ﷺ نے پوچھا کہ تیرے پاس کس قسم کا مال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کا مال عطا فرمایا ہے یعنی اونٹ، بکرے، گھوڑے اور غلام سب ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دیا ہے تو اس کے انعامات کا کچھ اثر تمہارے لباس سے بھی ظاہر ہونا چاہئے۔(۱)

ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تو سب کچھ دے رکھا ہے، لیکن فقیر اور گداگر کی طرح پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، یہ تو ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اثر ظاہر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آرام کی خاطر اور اپنی آسائش یا زیبائش کی خاطر کوئی شخص اچھا اور قیمتی لباس پہن لے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں، جائز ہے۔

حضور ﷺ کا قیمتی لباس پہننا

میں یہ کہتا ہوں کہ حضور اقدس ﷺ کے بارے میں یہ بات جو مشہور ہو گئی کہ "کالی کملی والے" اس بات کو ہمارے شاعروں نے بہت مشہور کر دیا، یہ بات صحیح ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی زیادہ حیات طیبہ سادگی کی حالت میں بسر ہوئی، لیکن آپ ﷺ کے بارے میں اس طرح یہ منقول ہے کہ آپ موٹا کپڑا زیب تن فرماتے تھے۔ اور جہاں یہ منقول ہے کہ آپ نے موٹی چادریں استعمال فرمائیں، اسی طرح آپ کے بارے میں یہ بھی منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک جبہ زیب تن فرمایا جس کی قیمت دو ہزار دینار تھی، وجہ اس کی یہ ہے کہ حضور ﷺ کا ہر عمل شریعت کا حصہ بننا تھا، اس لئے ہم جیسے کمزوروں کے لئے یہ بھی کر کے دکھا دیا کہ اگر تم اپنی جسمانی راحت اور آسائش کے لئے کوئی قیمتی لباس پہننا چاہتے ہو تو یہ بھی جائز ہے۔

---

(۱) سنن النسائي، كتاب الزينة، باب الجلاجل، رقم: ۵۱۲۹، سنن أبي داود، كتاب اللباس، باب في غسل الثوب وفي الخلقان، رقم: ۳۵٤۱، مسند أحمد، رقم: ۱۵۳۲۳

نمائش اور دکھاوا جائز نہیں

لیکن اگر لباس پہننے سے نہ تو آسائش مقصود ہے اور نہ آرائش مقصود ہے، بلکہ نمائش اور دکھاوا مقصود ہے، تاکہ لوگ دیکھیں کہ ہم نے اتنا شاندار کپڑا پہنا ہوا ہے، اور اتنا اعلیٰ درجے کا لباس پہنا ہوا ہے، اور یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہم بڑی دولت والے اور بڑے پیسے والے ہیں، اور دوسروں پر بڑائی جتانا اور دوسروں پر رعب جمانا مقصود ہے تو یہ سب باتیں نمائش میں داخل ہیں اور حرام ہیں، اس لئے کہ نمائش کی خاطر جو بھی لباس پہنا جائے گا وہ حرام ہے۔

یہاں شیخ کی ضرورت ہے

ان دونوں باتوں میں بہت باریک فرق ہے کہ اپنا دل خوش کرنا مقصود ہے یا دوسروں پر اپنی بڑائی جتانا مقصود ہے، یہ کون فیصلہ کرے گا کہ یہ لباس اپنا دل خوش کرنے کے لئے پہنا ہے یا دوسروں پر بڑائی جتانے کے لئے پہنا ہے؟ یہ فیصلہ کرنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ اس مقصد کے لئے کسی مصلح اور رہنما کی ضرورت پڑتی ہے، وہ ان دونوں کے درمیان فرق کرکے بتا دیتا ہے کہ اس وقت جو کپڑے تم پہن رہے ہو اور یہ کہہ رہے ہو کہ اپنا دل خوش کرنے کے لئے پہن رہا ہوں، یہ دراصل شیطان کا دھوکا ہے، حقیقت میں ان کپڑوں کے پہننے کا مقصد دوسروں پر بڑائی ظاہر کرنا ہے۔ اور بعض اوقات اس کے برعکس بھی ہو جاتا ہے۔ بہرحال، کسی شیخ کی ضرورت ہے۔ اور یہ پیری مریدی درحقیقت اسی کام کیلئے ہوتی ہے کہ اس قسم کے کاموں میں اس سے رہنمائی حاصل کی جائے کہ اس وقت میرے ساتھ یہ صورت حال ہے، بتائیے کہ اس وقت ایسے کپڑے پہنوں یا نہ پہنوں؟ وہ شیخ بتاتا ہے کہ اس وقت ایسے کپڑے پہنو اور اس وقت مت پہنو۔ نمائش اور آسائش میں یہ باریک فرق ہے۔ دنیا کے جتنے کام ہیں، چاہے وہ لباس ہو، یا کھانا ہو، یا جوتے ہوں، یا مکان ہو، ان سب میں یہ اصول کارفرما ہے جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرما دیا ہے۔ یہ بڑا زرین اصول ہے۔

اسراف اور تکبر سے بچئے

اسی لئے حضور اقدس ﷺ کا بڑا اصولی ارشاد ہے:

((كُلْ مَا شِئْتَ وَالْبَسْ مَا شِئْتَ مَا أَخْطَأَتْكَ اثْنَتَانِ سَرَفٌ أَوْ مَخِيلَةٌ))(۱)

(۱) یہ جملہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب اللباس کے پہلے باب میں ترجمۃ الباب کے اندر استعمال فرمایا ہے اور اسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ البتہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی ترجمۃ الباب میں نبی پاک ﷺ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے: ((كلوا واشربوا والبسوا وتصدقوا في غير إسراف ولا مخيلة)) واضح رہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ، مشکاۃ المصابیح، کشف الخفاء، تفسیر الکشاف، المجالسۃ وجواہر العلم، روح المعانی اور کچھ دوسری کتابوں میں بھی یہ جملہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

"جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو، لیکن دو چیزوں سے پرہیز کرو، ایک اسراف سے اور دوسرے تکبر سے"

مطلب یہ ہے کہ جس طرح کا کپڑا چاہو پہنو تمہارے لئے یہ جائز ہے، لیکن اسراف نہ ہو، اور اسراف اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی نمائش کے لئے کپڑا پہنتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جس کپڑے کو پہن کر تکبر پیدا ہو، اس سے بچے۔ لیکن کون سے کپڑے سے اسراف ہو گیا اور کون سے کپڑے سے تکبر پیدا ہو گیا، اس کے لئے کسی شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بتاتا ہے کہ یہاں تکبر ہو گیا اور یہاں اسراف ہو گیا۔ بہر حال: میں یہ عرض کر رہا تھا کہ لباس کا دوسرا مقصد ہے زینت، لیکن اس زینت کی حدود ہیں، بس ان حدود شریعت کے اندر رہ کر جتنی زینت کر سکتے ہو، اس کو اختیار کر لو، لیکن اگر ان حدود سے باہر نکل کر زینت اختیار کرو گے تو یہ حرام ہو گی اور ناجائز ہو گی۔

فیشن کے پیچھے نہ چلیں

آج کل عجیب مزاج بن گیا ہے کہ اپنی پسند یا ناپسند کا کوئی معیار نہیں، بس جو فیشن چل گیا وہ پسند ہے، اور جو چیز فیشن سے باہر ہو گئی وہ ناپسند ہے، ایک زمانے میں ایک چیز کا فیشن چل رہا ہے تو اب اس کو پسند کیا جانے لگا اور اس کی تعریف کی جانے لگی کہ یہ بہت اچھی چیز ہے اور جب اس کا فیشن نکل گیا تو اب اسی کی برائی شروع ہو گی۔ مثلاً ایک زمانے میں لمبی اور نیچی قمیص کا فیشن چل گیا تو اب جس کو بھی دیکھو وہ لمبی قمیص پہن رہا ہے اور اس کے فضائل بیان کر رہا ہے اور اس کی تعریف کر رہا ہے کہ یہ بہت اچھی چیز ہے اور جب اونچی قمیص پہننے کا فیشن چل پڑا تو اب اونچی قمیص کی تعریف ہو رہی ہے اور اس کو پسندیدہ قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ فیشن کے تابع ہو کر خوبصورتی اور بدصورتی کا تعین صحیح نہیں، بلکہ اپنے آپ کو جو چیز اچھی لگے اور اپنے خیال کو جو چیز خوبصورت لگے، اس کو پہننے کی شریعت کی طرف سے اجازت ہے۔

من بھاتا کھاؤ، من بھاتا پہنو

ہمارے یہاں ہندی میں ایک مقولہ مشہور تھا کہ "کھائے من بھاتا اور پہنے جگ بھاتا" یعنی کھائے تو وہ چیز جو اپنے من کو بھائے، اپنے دل کو اچھی لگے، اپنا دل اس سے خوش ہو اور اپنے آپ کو پسند ہو۔ لیکن لباس وہ پہنے جو جگ کو بھائے۔ جگ سے مراد زمانہ، یعنی جو زمانے کے لوگوں کو پسند ہو، زمانے کے لوگ جس کو پسند کریں اور ان کی آنکھوں کو اچھا لگے۔ یہ کہاوت مشہور ہے، لیکن یہ اسلامی اصول نہیں، اسلامی اصول یہ ہے کہ پہنے بھی من بھاتا اور کھائے بھی من بھاتا، اور "جگ بھاتا" والی

بات نہ لباس میں درست ہے اور نہ کھانے میں درست ہے، بلکہ شریعت نے تو یہ کہا ہے کہ اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے حدود شریعت میں رہتے ہوئے جو بھی لباس استعمال کرو، وہ جائز ہے، لیکن فیشن کی اتباع میں لوگوں کو دکھانے کے لئے اور نمائش کے لئے کوئی لباس استعمال کر رہے ہو تو وہ جائز نہیں۔

خواتین اور فیشن پرستی

اس معاملے میں آج کل خاص طور پر خواتین کا مزاج قابل اصلاح ہے۔ خواتین یہ سمجھتی ہیں کہ لباس اپنے لئے نہیں بلکہ دوسرں کے لئے ہے، اس لئے لباس پہن کر اپنے دل کو خوش کرنے کا معاملہ بعد کا ہے، اصل یہ ہے کہ دیکھنے والے اس لباس کو دیکھ کر اس کو فیشن کے مطابق قرار دیں اور اس کی تعریف کریں، اور ہمارا لباس دیکھ کر لوگ یہ سمجھیں کہ یہ بڑے لوگ ہیں۔ یہ باتیں عورتوں میں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ عورتیں اپنے گھر میں اپنے شوہروں کے سامنے تو میلی جولی رہیں گی اور اچھا لباس پہننے کا خیال بھی نہیں آئے گا، لیکن جہاں کہیں گھر سے باہر نکلنے کی نوبت آ گئی یا کسی تقریب میں شرکت کی نوبت آ گئی تو پھر اس کے لئے اس بات کا اہتمام کیا جا رہا ہے کہ وہ لباس فیشن کے مطابق ہو اور اس کے پہننے کے نتیجے میں وہ لوگ ہمیں دولت مند سمجھیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک لباس ایک تقریب کے اندر پہن لیا تو اب وہ لباس دوسری تقریب کے اندر نہیں پہنا جا سکتا، اب وہ لباس حرام ہو گیا، اس لئے کہ اگر وہی لباس پہن کر دوسری تقریب میں چلے گئے تو دوسری خواتین یہ سمجھیں گی یہ بار بار ایک ہی لباس پہن کر آ جاتی ہیں، جس کی وجہ سے ہماری بے عزتی ہو جائے گی۔ درحقیقت ان باتوں کے پس پردہ نمائش کا جذبہ ہے اور یہ نمائش کا جذبہ ممنوع ہے، البتہ نمائش کے ارادے اور اہتمام کے بغیر کوئی خاتون اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے آج ایک جوڑا پہن لے اور کل دوسرا جوڑا پہن لے، اور اللہ تعالیٰ نے عطا بھی فرمایا ہے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور نئے جوڑے

ہمارے بزرگوں میں بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جو بہت اچھا اور عمدہ لباس پہنا کرتے تھے، حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا نام آپ نے سنا ہوگا، جو بڑے درجے کے امام گزرے ہیں، مدینہ طیبہ کے رہنے والے تھے۔ انہیں "امام دار الھجرۃ" بھی کہا جاتا تھا۔

ان کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہوا دیکھا کہ وہ ہر روز ایک نیا جوڑا پہنا کرتے تھے، گویا کہ ان کے لئے سال میں تین سو ساٹھ جوڑے بنتے تھے، اور جو جوڑا ایک دن پہنا، وہ دوبارہ بدن پر نہیں آتا

تھا، دوسرے دن دوسرا جوڑا تیسرے دن تیسرا جوڑا۔ کسی کو خیال آیا کہ روز نیا جوڑا پہننا تو اسراف ہے، چنانچہ اس نے آپ سے کہا کہ حضرت یہ روزانہ نیا جوڑا پہننا تو اسراف میں داخل ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں کیا کروں، بات دراصل یہ ہے کہ جب سال شروع ہوتا ہے تو میرا ایک دوست تین سو ساٹھ جوڑے سلوا کر میرے گھر لے آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ آپ کا روز کا ایک جوڑا ہے، اب میں نے خود سے تو اس بات کا اہتمام نہیں کیا کہ روزانہ ایک نیا جوڑا پہنوں، اگر میں ان جوڑوں کو واپس کر دوں تو اس کی دل شکنی ہوتی ہے، اور اگر نہ پہنوں تو بھی اس کا مقصد حاصل نہیں ہوگا، اس لئے میں روزانہ ایک جوڑا بدلتا ہوں، اور اس کو اتارنے کے بعد کسی مستحق کو دے دیتا ہوں، جس کی وجہ سے بہت سے اللہ کے بندوں کا بھلا ہو جاتا ہے۔ بہر حال ان کا روزانہ نیا جوڑا پہننا دکھاوے کے لئے نہیں تھا بلکہ جس نے ہدیہ دیا تھا اس کا دل خوش کرنے کی خاطر تھا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

ایک بڑا عجیب وغریب واقعہ یاد آ گیا، یہ واقعہ میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے، بڑا سبق آموز واقعہ ہے، وہ یہ کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی دو اہلیہ تھیں، ایک بڑی اور ایک چھوٹی، دونوں کو حضرت والا سے بہت تعلق تھا، لیکن بڑی پیرانی صاحبہ پرانے وقتوں کی تھیں اور حضرت والا کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی فکر میں رہتی تھیں، عید آنے والی تھی، بڑی پیرانی صاحبہ کے دل میں خیال آیا کہ حضرت والا کے لئے کسی عمدہ اور اچھے کپڑے کا اچکن بنایا جائے۔ اس زمانے میں ایک کپڑا چلا کرتا تھا، جس کا نام تھا "آنکھ کا نشہ" یہ بڑا شوخ قسم کا کپڑا ہوتا تھا۔ اب حضرت والا سے پوچھے بغیر کپڑا خرید کر اس کا اچکن سینا شروع کر دیا، حضرت والا کو اس خیال سے نہیں بتایا کہ اچکن سلنے کے بعد جب اچانک میں ان کو پیش کروں گی تو اچانک ملنے سے خوشی زیادہ ہوگی، اور سارا رمضان اس کے سینے میں مشغول رہیں، اس لئے کہ اس زمانے میں مشین کا رواج تو تھا نہیں، ہاتھ سے سلائی ہوتی تھی، چنانچہ جب وہ سل کر تیار ہو گیا تو عید کی رات کو وہ اچکن حضرت والا کی خدمت میں پیش کر کے کہا کہ میں نے آپ کے لئے یہ اچکن تیار کیا ہے، میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ اس کو پہن کر عید گاہ جائیں اور عید کی نماز پڑھیں۔ اب کہاں حضرت والا کا مزاج اور کہاں وہ شوخ اچکن، وہ تو حضرت والا کے مزاج کے بالکل خلاف تھا۔ لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ اگر میں پہننے سے انکار کروں تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا، اس لئے کہ انہوں نے تو پورا رمضان اس کے سینے میں محنت کی اور محبت سے محنت کی، اس لئے آپ نے ان کا دل رکھنے کے لئے فرمایا کہ تم نے تو یہ ماشاء اللہ بڑا اچھا اچکن بنایا ہے، اور پھر آپ نے وہ اچکن پہنا اور عید گاہ میں پہنچے اور نماز پڑھائی،

جب نماز سے فارغ ہوئے تو ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور کہا کہ حضرت آپ نے یہ جو اچکن پہنا ہے، یہ آپ کو زیب نہیں دیتا، اس لئے کہ یہ بہت شوخ قسم کا اچکن ہے، حضرت نے جواب میں فرمایا کہ ہاں بھائی تم بات تو ٹھیک کہہ رہے ہو، اور یہ کہہ کر پھر آپ نے وہ اچکن اتارا اور اسی شخص کو دے دیا کہ یہ تمہیں ہدیہ ہے، اس کو تم پہن لو۔

دوسرے کا دل خوش کرنا

اس کے بعد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا کہ جس وقت میں یہ اچکن پہن کر عیدہ گاہ کی طرف جا رہا تھا، تو کچھ نہ پوچھو کہ اس وقت میرا دل کتنا کٹ رہا تھا، اس لئے کہ ساری عمر اس قسم کا شوخ لباس کبھی نہیں پہنا، لیکن دل میں اس وقت یہ نیت تھی کہ جس اللہ کی بندی نے محنت کے ساتھ اس کو سیا ہے، اس کا دل خوش ہو جائے تو اس کا دل خوش کرنے کے لئے اپنے اوپر یہ مشقت برداشت کر لی، اور اس کے پہننے پر طعنے بھی سہے، اس لئے کہ لوگوں نے اس کے پہننے پر طعنے بھی دیئے کہ کیسا لباس پہن کر آ گئے، لیکن گھر والوں کا دل خوش کرنے کے لئے یہ کام کر لیا۔

بہر حال انسان اچھے سے اچھا لباس اپنا دل خوش کرنے کے لئے پہنے، اپنے گھر والوں کا دل خوش کرنے کے لئے پہنے، اور کسی ہدیہ اور تحفہ دینے والے کا دل خوش کرنے کے لئے پہنے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اچھا لباس اس مقصد کے لئے پہننا تاکہ لوگ مجھے بڑا سمجھیں، میں فیشن ایبل نظر آؤں، میں دنیا والوں کے سامنے بڑا بن جاؤں، اور نمائش اور دکھاوے کے لئے پہنے تو یہ عذاب کی چیز ہے اور حرام ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

لباس کے بارے میں تیسرا اصول

لباس کے بارے میں شریعت نے جو تیسرا اصول بیان فرمایا، وہ ہے "تشبہ سے بچنا" یعنی ایسا لباس پہننا جس کو پہن کر انسان کسی غیر مسلم قوم کا فرد نظر آئے، اور اس مقصد سے وہ لباس پہنے تاکہ میں ان جیسا ہو جاؤں، اس کو شریعت میں تشبہ کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ کسی غیر مسلم قوم کی نقالی کی نیت سے کوئی لباس پہننا، اس سے قطع نظر کہ وہ چیز ہمیں پسند ہے یا نہیں، وہ اچھی ہے یا بری، لیکن چونکہ فلاں قوم کی نقالی کرنی ہے، بس ان کی نقالی کے پیش نظر اس لباس کو اختیار کیا جا رہا ہے، اس کو "تشبہ" کہا جاتا ہے۔ اس نقالی پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سخت وعید ارشاد فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ))(۱)

یعنی جو شخص کسی قوم کے ساتھ تشبہ اختیار کرے، اس کی نقالی کرے، اور ان جیسا بننے کی کوشش کرے، تو وہ انہیں میں سے ہے، گویا کہ وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے، اسی قوم کا ایک فرد ہے، اس لئے کہ یہ شخص انہی کو پسند کر رہا ہے، انہی سے محبت رکھتا ہے، انہی جیسا بننا چاہتا ہے، تو اب اس کا حشر بھی انہی کے ساتھ ہوگا، اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے۔

"تشبّہ" کی حقیقت

تشبہ کے بارے میں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ یہ "تشبہ" کب پیدا ہوتی ہے اور کب اس کی ممانعت آتی ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی ایسے کام میں دوسری قوم کی نقالی کرنا جو فی نفسہ برا کام ہے اور شریعت کے اصول کے خلاف ہے، ایسے کام میں نقالی تو حرام ہی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کام اگرچہ فی نفسہ تو برا نہیں ہے بلکہ مباح ہے، لیکن جو شخص اس غرض سے وہ کام کر رہا ہے کہ میں ان جیسا نظر آؤں اور دیکھنے میں ان جیسا لگوں اور اہتمام کر کے ان جیسا بننے کی کوشش کر رہا ہے، تو اس صورت میں وہ مباح کام بھی حرام اور ناجائز ہو جاتا ہے۔

گلے میں زنار ڈالنا

مثلاً ہندو اپنے گلے میں زنار ڈالا کرتے ہیں، اب یہ زنار ایک طرح کا ہار ہی ہوتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان ویسے ہی اتفاقاً ڈال لے تو کوئی گناہ کا کام نہیں، ناجائز اور حرام کام نہیں ہے بلکہ مباح ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس مقصد کے لئے اپنے گلے میں "زنار" ڈال رہا ہے تاکہ میں ان جیسا لگوں تو یہ ناجائز اور حرام ہے اور "تشبہ" میں داخل ہے۔

ماتھے پر قشقہ لگانا

یا مثلاً ہندو عورتیں اپنے ماتھے پر سرخ قشقہ لگاتی ہیں، اب اگر بالفرض ہندو عورتوں میں اس طرح قشقہ لگانے کا رواج نہ ہوتا اور کوئی مسلمان عورت خوبصورتی اور زینت کے لئے لگاتی تو یہ کام فی نفسہ مباح تھا، کوئی ناجائز اور حرام نہیں تھا، لیکن اب اگر ایک عورت قشقہ اس لئے لگا رہی ہے تاکہ میں ان کا فیشن اختیار کروں اور ان جیسی نظر آؤں، تو اس صورت میں یہ قشقہ لگانا حرام ہے اور ناجائز ہے۔

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب اللباس، باب في لبس الشهرة، رقم: ۳۵۱۲، مسند أحمد، رقم: ۴۸۶۸

ہندوستان میں مسلمان عورتیں تو ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے یہ قشقہ لگاتی ہیں، لیکن اب سنا ہے کہ یہاں پاکستان میں بھی عورتوں میں قشقہ لگانے کا رواج شروع ہو گیا ہے، حالانکہ یہاں ہندو عورتوں کے ساتھ معاشرت بھی نہیں ہے، اس کے باوجود مسلمان خواتین اپنے ماتھے پر یہ قشقہ لگاتی ہیں تو یہ ان کے ساتھ ''تشبہ'' اختیار کرنا ہے، جو حرام اور ناجائز ہے۔ لہٰذا کوئی عمل جو اگرچہ فی نفسہ جائز اور مباح ہو، مگر اس کے ذریعہ دوسری قوموں کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا مقصود ہو اس کو ''تشبہ'' کہتے ہیں، جس کو حضور اقدس ﷺ نے ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔

پتلون پہننے کا حکم

اسی مندرجہ بالا اصول کی بنیاد پر یہ کہا جائے گا کہ جو لباس کسی بھی قوم کا شعار بن چکا ہے، یعنی وہ لباس اس قوم کی امتیازی علامت بن چکا ہے، اگر ان کی نقالی کی غرض سے ایسا لباس اختیار کیا جائے گا تو وہ حرام اور ناجائز ہوگا اور گناہ ہوگا۔ مثال آج کل مردوں میں کوٹ پتلون کا رواج چل پڑا ہے اس میں بعض باتیں تو فی نفسہ بھی ناجائز ہیں، چاہے اس میں تشبہ پایا جائے یا نہ پایا جائے، چنانچہ ایک خرابی تو یہ ہے کہ پتلون ٹخنوں سے نیچے پہنی جاتی ہے، اور کوئی لباس بھی مردوں کے لئے ٹخنوں سے نیچے پہننا جائز نہیں۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر پتلون ایسی چست ہو کہ اس کی وجہ سے اعضا نمایاں ہوں، تو پھر لباس کا جو بنیادی مقصد تھا، یعنی ''ستر'' کرنا، وہ حاصل نہ ہوا پھر وہ لباس شرعی لحاظ سے بے معنی اور بے کار ہے۔ لہٰذا ان دو خرابیوں کی وجہ سے فی نفسہ پتلون پہننا جائز نہیں، لیکن اگر کوئی شخص اس بات کا اہتمام کرے کہ وہ پتلون چست نہ ہو، بلکہ ڈھیلی ڈھالی ہو، اور اس کا اہتمام کرے کہ وہ پتلون ٹخنوں سے نیچے نہ ہو تو ایسی پتلون پہننا فی نفسہ مباح ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص پتلون اس مقصد سے پہنے تا کہ میں انگریز نظر آؤں، اور میں ان کی نقالی کروں اور ان جیسا بن جاؤں، تو اس صورت میں پتلون پہننا حرام اور ناجائز ہے اور ''تشبہ'' میں داخل ہے، لیکن اگر نقالی مقصود نہیں ہے اور اس بات کا بھی اہتمام کر رہا ہے کہ پتلون ٹخنوں سے اونچی اور ڈھیلی ہو، تو ایسی صورت میں اس کے پہننے کو حرام تو نہیں کہیں گے، لیکن فی نفسہ اس پتلون کا پہننا پھر بھی اچھا نہیں اور کراہت سے خالی نہیں۔ کیوں؟ اس بات کو ذرا غور سے سمجھ لیں۔

تشبہ اور مشابہت میں فرق

وہ یہ کہ یہ دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک ''تشبہ'' اور ایک ہے ''مشابہت'' دونوں میں فرق ہے۔ ''تشبہ'' کے معنی تو یہ ہیں کہ آدمی ارادہ کر کے نقالی کرے، اور ارادہ کر کے ان جیسا بننے کی کوشش

کرے، یہ تو بالکل ہی ناجائز ہے۔ دوسری چیز ہے ''مشابہت'' یعنی اس جیسا بننے کا ارادہ تو نہیں کیا تھا، لیکن اس عمل سے ان کے ساتھ مشابہت خود بخود پیدا ہوگئی۔ یہ ''مشابہت'' جو خود بخود پیدا ہو جائے حرام نہیں، لیکن حضور اقدس ﷺ نے بلا ضرورت مشابہت پیدا ہونے سے بھی بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ فرمایا کہ اس کی کوشش کرو کہ ان سے امتیاز رہے، مسلمان قوم اور مسلمان ملت کا ایک امتیاز ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ دیکھ کر پتہ نہ چلے کہ یہ آدمی مسلمان ہے یا نہیں، سر سے لے کر پاؤں تک اپنا حلیہ ایسا بنا کر رکھا ہے کہ دیکھ کر یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ مسلمان ہے یا نہیں، اس کو سلام کریں یا نہ کریں، مباحات کے ذریعہ بھی ایسا حلیہ بنانا پسندیدہ نہیں۔

حضور ﷺ کا مشابہت سے دور رہنے کا اہتمام

آنحضرت ﷺ نے ''مشابہت'' سے بچنے کا اتنا اہتمام فرمایا کہ محرم کی دس تاریخ کو عاشورہ کے دن روزہ رکھنا بڑی فضیلت کا کام ہے، اور جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ابتداء میں عاشورہ کا روزہ فرض تھا، اور رمضان کے روزے اس وقت تک فرض نہیں ہوئے تھے، اور جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو عاشورہ کے روزے کی فرضیت منسوخ ہو گئی، اب فرض تو نہ رہا، البتہ نفل اور مستحب بن گیا۔ لیکن حضور اقدس ﷺ کو یہ معلوم ہوا کہ یہودی بھی عاشورہ کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر مسلمان عاشورہ کے دن روزہ رکھیں گے تو وہ یہودیوں کی نقالی میں تو نہیں رکھیں گے، وہ تو حضور اقدس ﷺ کی اتباع میں رکھیں گے۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر آئندہ سال میں زندہ رہا تو عاشورہ کے ساتھ ایک روزہ اور ملا کر رکھوں گا، یا نویں تاریخ کا روزہ یا گیارہویں تاریخ کا روزہ، تاکہ یہودیوں کے ساتھ مشابہت پیدا نہ ہو، بلکہ ان سے علیحدگی اور امتیاز ہو جائے۔(۱)

اب دیکھئے کہ روزے جیسی عبادت میں بھی آنحضرت ﷺ نے مشابہت پیدا ہونے کو پسند نہیں فرمایا، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب عاشورہ کا روزہ رکھو تو اس کے ساتھ یا تو نویں تاریخ کا روزہ ملا لو، تاکہ یہودیوں کے ساتھ مشابہت بھی پیدا نہ ہو۔ لہٰذا ''تشبہ'' تو حرام ہے، لیکن ''مشابہت'' پیدا ہو جانا بھی کراہت سے خالی نہیں، حضور اقدس ﷺ نے اس سے بھی بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔

مشرکین کی مخالفت کرو

ایک حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

(۱) سنن أبي داود، كتاب الصوم، باب ما روى أن عاشوراء اليوم التاسع، رقم: ۲۰۸۹

((خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ))(۱)

مشرکین کے طریقے کی مخالفت کرو۔ یعنی انہوں نے جیسے طریقے اختیار کئے ہیں، تم ان سے الگ اپنا طریقہ بناؤ۔ چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا:

((فَرْقُ مَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْمُشْرِكِيْنَ الْعَمَائِمُ عَلَى الْقَلَانِسِ))(۲)

یعنی ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق ٹوپی پر عمامہ پہننا ہے، یعنی یہ مشرکین عمامے کے نیچے ٹوپیاں نہیں رکھتے ہیں، تم ان کی مخالفت کرو اور عمامے کے نیچے ٹوپی بھی پہنا کرو۔ حالانکہ بغیر ٹوپی کے عمامہ پہننا کوئی ناجائز اور حرام نہیں لیکن ذرا سی مشابہت سے بچنے کے لئے حضور اقدس ﷺ نے یہ حکم فرمایا کہ عمامے کے نیچے ٹوپی پہنو، تاکہ اشتباہ لازم نہ آئے، لہٰذا بلاوجہ کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار کرنا اچھا نہیں ہے، آدمی اس سے جتنا بچے بہتر ہے۔ اس لئے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس کا بہت اہتمام فرماتے تھے کہ دوسری قوموں کی مشابہت پیدا نہ ہو۔

مسلمان ایک ممتاز قوم ہے

سوچنے کی بات ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک الگ قوم بنایا اور اپنے گروہ میں شامل فرما کر تمہارا نام ''حزب اللہ'' رکھا، یعنی اللہ کا گروہ ساری دنیا ایک طرف اور تم ایک طرف۔ قرآن کریم نے بیان فرمایا کہ بنیادی طور پر پوری دنیا میں دو جماعتیں ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ﴾ (۳)

یعنی دو جماعتیں ہیں: ایک کافر اور ایک مومن، اس لئے مومن کو کبھی کافر کی جماعت کے ساتھ مخلوط نہ ہونا چاہئے، اس کا امتیاز ہونا چاہئے اس کے لباس میں، اس کی پوشاک میں، اس کی وضع قطع میں، اس کے اٹھنے بیٹھنے میں، اس کے طریق ادا میں، ہر چیز میں اسلامی رنگ نمایاں ہونا چاہئے، اب اگر مسلمان دوسروں کا طریقہ اختیار کرلے تو اس کے نتیجے میں وہ امتیاز مٹ جائے گا۔ اب آج دیکھ لو کہ یہ جو طریقہ چل پڑا ہے کہ سب کا لباس ایک جیسا ہے، اگر تم کسی مجمع میں جاؤ گے تو یہ پتہ نہیں لگا سکتے ہیں، پوشاک سے، اور نہ کسی اور انداز سے، اب اس کو سلام کریں یا نہ کریں؟ اور اس سے کس قسم

(۱) صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب تقليم الأظفار، رقم:۵۴۴۲، صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب خصال الفطرة، رقم:۳۸۲

(۲) سنن الترمذي، كتاب اللباس عن رسول الله، باب العمائم على القلانس، رقم: ۱۷۰۶، سنن ابي داؤد، كتاب اللباس، باب في العمائم، رقم: ۳۵۵۶

(۳) التغابن:۲

کی باتیں کریں؟ لہٰذا ان خرابیوں کے سد باب کے لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تشبہ سے بھی بچو، اس لئے کہ وہ تو بالکل ہی حرام ہے، اور "مشابہت" سے بھی بچو، اور یہ مشابہت بھی کراہت سے خالی نہیں ہے اور پسندیدہ بھی نہیں ہے۔

یہ بے غیرتی کی بات ہے

یہ کتنی بے غیرتی کی بات ہے کہ انسان ایک ایسی قوم کا لباس پسند کر کے اس کو اختیار کرے جس قوم نے تمہیں ہر طریقے سے غلامی کی چکی میں پیسا، تمہارے اوپر ظلم وستم توڑے، تمہارے خلاف سازشیں کیں، تمہیں موت کے گھاٹ اتارا، اور ظلم وستم کا کوئی طریقہ ایسا نہیں ہے جو اس نے فروگذاشت کر دیا ہو، اب تم ایسی قوم کے طریق کو عزت اور تکریم کے ساتھ اختیار کرو۔ یہ کتنی بے غیرتی کی بات ہے۔

انگریزوں کی تنگ نظری

لوگ ہمیں یہ کہتے ہیں کہ آپ جو اس قسم کا لباس پہننے سے منع کرتے ہیں، یہ تنگ نظری کی بات ہے۔ اور ایسی بات کہنے والوں کو تنگ نظر کہا جاتا ہے، حالانکہ جس قوم کا لباس تم اختیار کر رہے ہو، اس کی تنگ نظری اور اس کی مسلمان دشمنی کا عالم یہ ہے کہ جب اس نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو ہمارے مغل مسلمان بادشاہوں کا جو لباس تھا، یعنی عمامہ اور خاص شلوار قمیص، اس نے یہ لباس اپنے خانساموں کو پہنایا، اپنے بیروں کو پہنایا، اپنے چوکیداروں کو پہنایا، اور اس نے ان کو لباس پہننے پر مجبور کیا۔ ایسا کیوں کیا؟ صرف مسلمانوں کو ذلیل کرنے کے لئے اور یہ دکھانے کے لئے کہ دیکھو، ہم نے تمہارے بادشاہوں کا لباس اپنے نوکروں کو، اپنے خانساموں کو اور اپنے بیروں کو پہنایا۔ اس قوم کی تنگ نظری کا تو یہ عالم ہے اور ماشاء اللہ ہماری فراخی قلب کا یہ عالم ہے کہ ہم ان کا لباس بڑے فخر سے اور بڑے ذوق وشوق سے پہننے کے لئے تیار ہیں۔ اب اگر ان سے کوئی کہے کہ یہ لباس پہننا غیرت کے خلاف ہے تو اس کو کہا جاتا ہے کہ تو تنگ نظر ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

بہر حال اس میں شرعی قباحت کے علاوہ بڑی بے غیرتی کی بھی بات ہے۔

تم اپنا سب کچھ بدل ڈالو، لیکن

یہ بات بھی خوب سمجھ لو کہ تم کتنا ہی ان کا لباس پہن لو، اور کتنا ہی ان کا طریقہ اختیار کر لو، مگر تم پھر بھی ان کی نگاہ میں عزت نہیں پا سکتے، قرآن کریم نے صاف صاف کہہ دیا ہے:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾(۱)

یہ یہود اور نصاریٰ تم سے کبھی بھی راضی نہیں ہوں گے جب تک تم ان کی ملت کو اختیار نہیں کر لو گے، ان کے نظریات، ان کے ایمان، ان کے دین کو اختیار نہیں کر لو گے، اس وقت تک وہ تم سے راضی نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اب تم اپنا لباس بدل لو، پوشاک بدل لو، سراپا بدل لو، جسم بدل لو، جو چاہو بدل لو، لیکن وہ تم سے راضی ہونے کو تیار نہیں۔

چنانچہ تم نے تجربہ کر لیا اور سب کچھ کر کے دیکھ لیا، سب کچھ ان کی نقالی پر فنا کر کے دیکھ لیا، سر سے لے کر پاؤں تک تم نے اپنے آپ کو بدل لیا، کیا تم سے وہ لوگ خوش ہو گئے؟ کیا تم سے راضی ہو، گئے؟ کیا تمہارے ساتھ انہوں نے ہمدردی کا برتاؤ شروع کر دیا؟ بلکہ آج بھی ان کی دشمنی کا وہی عالم ہے، اور اس لباس کی وجہ سے ان کے دل میں تمہاری عزت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

اقبال مرحوم کا مغربی زندگی پر تبصرہ

اقبال مرحوم نے نثر کے انداز میں تو بہت گڑبڑ باتیں بھی کی ہیں، لیکن اشعار میں بعض اوقات بڑی حکمت کی باتیں کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ مغربی لباس اور مغربی طرز زندگی وغیرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے:

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دختران بے حجاب
نے ز سحر ساحران لالہ روس
نے ز عریاں ساق، نے از قطع موش

یعنی مغربی ممالک کے اندر جو قوت نظر آ رہی ہے، وہ اس چنگ و رباب کی وجہ سے نہیں، موسیقی اور گانوں کی وجہ سے نہیں، اور لڑکیوں کے بے پردہ ہونے اور ان کے ناچنے گانے کی وجہ سے بھی نہیں ہے اور یہ ترقی اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان کی عورتوں آدھے سر کے بال کاٹ کر پٹھے بنا لئے، اور نہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اپنی پنڈلیاں ننگی کر لیں۔ آگے کہتے ہیں:

(۱) البقرة: ۱۲۰

قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

یعنی جو کچھ قوت ہے وہ ان کی محنت کی وجہ سے ہے، علم و ہنر کی وجہ سے ہے، اور اسی وجہ سے ترقی کر رہے ہیں، پھر آخر میں کہا:

حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانع علم و ہنر عمامہ نیست

یعنی حکمت اور ہنر کسی خاص قسم کا لباس پہننے سے حاصل نہیں ہوتا، اور عمامہ پہننے سے علم و ہنر حاصل ہونے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ بہر حال اصل چیز جو حاصل کرنے کی تھی، وہ تو حاصل کی نہیں، اور لباس و پوشاک اور طریق زندگی میں ان کی نقل اتار کر ان کے آگے بھی اپنے آپ کو ذلیل کر لیا۔ دنیا سے عزت وہی کراتا ہے جس کو اپنے طریق زندگی سے عزت ہو، اگر دل میں اپنی عزت نہیں، اپنے طریقے کی عزت نہیں، تو پھر وہ دنیا سے کیا عزت کرائے گا۔ لہٰذا تمہارا یہ انداز اور یہ طریقہ ان کو کبھی پسند نہیں آئے گا، چاہے تم ان کے طریقوں میں غرق ہو کر اور ڈوب کر دیکھ لو اور اپنے آپ کو پوری طرح بدل کر دیکھ لو۔

تشبہ اور مشابہت دونوں سے بچو

بہر حال فتوے کی بات وہ ہے جو میں نے پہلے عرض کی کہ "تشبہ" تو ناجائز حرام اور گناہ ہے۔ اور "تشبہ" کا مطلب یہ ہے کہ ارادہ کر کے ان جیسا بننے کی کوشش کرنا، اور "مشابہت" کے معنی یہ ہیں کہ ان جیسا بننے کا ارادہ تو نہیں تھا لیکن کچھ مشابہت پیدا ہو گئی۔ یہ گناہ اور حرام تو نہیں ہے، البتہ کراہت سے خالی نہیں، اور غیرت کے تو بالکل خلاف ہے، اس لئے ان دونوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔ یہ لباس کا تیسرا اصول تھا۔

لباس کے بارے میں چوتھا اصول

لباس کے بارے میں چوتھا اصول یہ ہے کہ ایسا لباس پہننا حرام ہے جس کو پہن کر دل میں تکبر اور بڑائی پیدا ہو جائے، چاہے وہ لباس ٹاٹ ہی کا کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر کوئی ایک شخص ٹاٹ کا لباس پہنے اور مقصد یہ ہو کہ یہ پہن کر میں لوگوں کی نظروں میں بڑا درویش اور صوفی نظر آؤں اور بڑا متقی اور پرہیز گار بن جاؤں، اور پھر اس کی وجہ سے دوسروں پر اپنی بڑائی کا خیال دل میں آ جائے اور دوسروں کی تحقیر پیدا ہو جائے تو ایسی صورت میں وہ ٹاٹ کا لباس بھی تکبر کا ذریعہ اور سبب ہے، اس لئے وہ بھی

حرام ہے۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تکبر کپڑے پہننے سے نہیں ہوتا، بلکہ دوسروں کی حقارت دل میں لانے سے ہوتا ہے، اس لئے بعض اوقات ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں بڑا تواضع والا لباس پہن رہا ہوں، حقیقت میں اس کے اندر تکبر بھرا ہوتا ہے۔

ٹخنے چھپانا جائز نہیں

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے کپڑے کو تکبر کے ساتھ نیچے گھسیٹے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو رحمت کی نگاہ سے دیکھیں گے بھی نہیں۔ (۱)

دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرد کی زیر جامہ کا کتنا حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ حصہ جہنم میں جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مردوں کے لئے ٹخنوں سے نیچے پائجامہ، شلوار، پتلون، لنگی وغیرہ پہننا جائز نہیں، اور اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دو وعیدیں بیان فرمائیں، ایک یہ کہ ٹخنوں سے نیچے جتنا حصہ ہوگا وہ جہنم میں جائے گا، اور دوسرے یہ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی طرف رحمت کی نگاہ سے دیکھے گا بھی نہیں۔ اب دیکھئے کہ ٹخنوں سے اوپر شلوار پہننا ایک معمولی بات ہے، اگر ایک انچ اوپر شلوار پہن لی تو اس سے کیا آفت اور مصیبت آ جائے گی؟ کونسا آسمان ٹوٹ پڑے گا؟ لیکن اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت حاصل ہوگی اور یہ ایسا گناہ بے لذت ہے کہ جس میں پوری کی پوری قوم مبتلا ہے، کسی کو فکر ہی نہیں۔

ٹخنے چھپانا تکبر کی علامت ہے

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا زمانہ جاہلیت کا زمانہ تھا، اس میں ٹخنے ڈھکنے اور ازار کو نیچے تک پہننے کا بڑا فیشن اور رواج تھا، بلکہ اگر ازار زمین پر بھی گھسٹتا جائے تو اس کو اور اچھا اور قابل فخر سمجھا جاتا تھا۔ مدارس کے درس نظامی میں ایک کتاب "حماسہ" پڑھائی جاتی ہے جو جاہلیت کے شاعروں کے اشعار پر مشتمل ہے، اس کتاب میں ایک شاعر اپنے حالات پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب قول الله تعالیٰ قل من حرم زينة الله، رقم:٥٣٣٧، صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة ،باب تحريم جر الثوب خيلاء، رقم:٣٨٨٧،سنن الترمذی، کتاب اللباس عن رسول الله، باب ماجاء فی كراهية جر الازار،رقم:١٦٥٢،سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء في اسبال الإزار ، رقم:٣٥٦٣، مسند أحمد، رقم:٥٠٩٨

"اِذَا مَا اصْطَبَحْتُ اَرْبَعًا خَطَّ مِئْزَرِیْ"(۱)

''جب میں صبح کے وقت شراب کے چار جام چڑھا کر نکلتا ہوں تو میرا ازار زمین پر لکیریں بناتا ہوا جاتا ہے''

اب وہ اپنے اس طرز عمل کو اپنا قابل فخر کارنامہ بتا رہا ہے، لیکن جب حضور اقدس ﷺ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے جس طرح جاہلیت کے اور طریقوں کو ختم فرمایا، اسی طرح اس طریقے کو بھی ختم فرمایا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس عمل کے ذریعہ دل میں تکبر اور رعونت پیدا ہوتی ہے، لہٰذا ازار ٹخنوں سے اوپر ہونا چاہئے۔ اس سے اس پروپیگنڈہ کا بھی جواب ہو گیا جو آج کل بہت پھیلایا جا رہا ہے، اور بہت سے لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ درحقیقت حضور اقدس ﷺ نے وہ طریقے اختیار کر لئے جو آپ کے زمانے میں رائج تھے، اور جیسا لباس قریش میں رائج تھا، جیسی وضع قطع رائج تھی، اسی کو اختیار کر لیا، اب اگر آج ہم اپنے دور کے رائج شدہ طریقے اختیار کر لیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ خوب سمجھ لیجئے کہ حضور اقدس ﷺ نے کبھی بھی اپنے زمانے میں رائج طریقوں کو اختیار نہیں فرمایا، بلکہ ان میں تبدیلی پیدا کی اور ان کو ناجائز قرار دیا۔ آج لوگ نہ صرف یہ کہ غلط کاری میں مبتلا ہیں، بلکہ بعض اوقات بحث کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ اگر ازار ٹخنوں سے ذرا نیچے ہو گیا تو اس میں کیا حرج ہے؟ ارے حرج یہ ہے کہ یہ حصہ جہنم میں جائے گا اور یہ عمل اللہ تعالیٰ کے غضب کا موجب ہے۔

انگریز کے کہنے پر گھٹنے بھی کھول دیئے

ہمارے بزرگ حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک تقریر میں فرمانے لگے کہ اب ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ٹخنے کھول دو اور ٹخنے ڈھکنا جائز نہیں تو اس وقت ہم لوگ ٹخنے کھولنے کو تیار نہیں تھے اور جب انگریز نے کہا کہ گھٹنہ کھول دو اور نیکر پہن لو، تو اب گھٹنہ کھلوانے کو تیار ہو گئے۔ انگریز کے حکم پر گھٹنہ بھی کھول دیا اور نیکر پہن لی اور حضور اقدس ﷺ کے حکم پر ٹخنے کھولنے پر تیار نہیں۔ یہ کتنی بے غیرتی کی بات ہے۔ ارے حضور اقدس ﷺ سے محبت کے بھی کچھ تقاضے ہیں لہٰذا جب آپ ﷺ نے اس عمل کو ناپسند فرمایا تو ایک مسلمان کو کس طرح یہ گوارا

(۱) دیوان الحماسۃ (۱/ ۵۵)، پورا شعر یوں ہے:

اِذَا مَا اصْطَبَحْتُ اَرْبَعًا خَطَّ مِئْزَرِیْ
وَاَتْبَعْتُ دَلْوِیْ فِی السَّمَاحِ رِشَاءَ هَا

''جب میں صبح کے وقت شراب کے چار جام چڑھاتا ہوں تو اس وقت میرا ازار زمین پر گھسٹ رہا ہوتا ہے اور میں اس نشے کی حالت میں بھی پوری پوری سخاوت کرتا ہوں اور ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرتا ہوں''

ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے خلاف کرے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ میں نے آپ کو پہلے بھی سنایا تھا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آپ کفار مکہ سے مذاکرات کے لئے تشریف لے جارہے تھے، تو آپ کے چچازاد بھائی نے جو آپ کے ساتھ تھے کہا کہ یہ آپ کا ازار ٹخنوں سے اونچا ہے اور مکہ کے جن روساء اور سرداروں سے آپ مذاکرات کے لئے جارہے ہیں اور وہ لوگ ایسے آدمی کو حقیر سمجھتے ہیں جس کا ازار ٹخنوں سے اونچا ہو۔ اس لئے آپ تھوڑی دیر کے لئے اپنا ٹخنہ ڈھک لیں اور ازار کو نیچے کرلیں تاکہ وہ لوگ آپ کو حقیر نہ سمجھیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا:

"لَا، هٰكَذَا اِزْرَةُ صَاحِبِنَا رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"(۱)

نہیں، یہ کام نہیں کرسکتا، اس لئے کہ میرے آقا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ازار ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب چاہے وہ لوگ حقیر سمجھیں یا ذلیل سمجھیں، اچھا سمجھیں یا برا سمجھیں، اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں، بس میرے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ ہے اور میں تو اسی کو اختیار کروں گا پھر انہوں نے ہی دنیا سے اپنی عزت کرائی۔ آج ہم اس مصیبت میں مبتلا ہیں کہ ڈر رہے ہیں، جھینپ رہے ہیں، شرمارہے ہیں کہ اگر ازار ٹخنوں سے اونچا کرلیا تو قاعدے کے خلاف ہوجائے گا، وقار کے خلاف ہوجائے گا، فیشن کے خلاف ہوجائے گا۔ خدا کے لیے یہ خیالات دل سے نکال دو اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سنت کا جذبہ دل میں پیدا کرو۔

اگر دل میں تکبر نہ ہو تو کیا اس کی اجازت ہوگی؟

بعض لوگ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کی وجہ سے ٹخنے سے نیچے ازار پہننے کو منع فرمایا تھا، لہٰذا اگر تکبر نہ ہو تو پھر ٹخنوں سے نیچے پہننے میں کوئی حرج نہیں۔ اور دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے تو فرمایا کہ ازار کو ٹخنے سے نیچے نہ کرو، لیکن میرا ازار بار بار ٹخنے سے نیچے ڈھلک جاتا ہے، میرے لئے اوپر رکھنا مشکل ہوتا ہے، میں کیا کروں؟ تو حضور اقدس ل نے فرمایا کہ

(۱) مصنف ابن ابی شیبة، رقم:۳٦۸۵۲(۳۸٦/۷)، روضة المحدثین،رقم:۵٦۲۲ (۱۲/۱۲۲)، اتحاف الخیرة المهرة بزوائد المسانید العشرة، رقم:۵۵٤۱، الریاض النضرة فی مناقب العشرة (۲۰۸/۱)

تمہارا ازار جو نیچے ڈھلک جاتا ہے، یہ تکبر کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ تمہارے عذر اور مجبوری کی وجہ سے ڈھلک جاتا ہے، اس لئے تم ان میں داخل نہیں۔(۱)

اب لوگ استدلال میں اس واقعہ کو پیش کر کے یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی تکبر کی وجہ سے نہیں کرتے، لہٰذا ہمارے لئے جائز ہونا چاہئے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ فیصلہ کون کرے کہ تم تکبر کی وجہ سے کرتے ہو یا تکبر کی وجہ سے نہیں کرتے؟ ارے بھائی یہ تو دیکھو کہ حضور اقدس ﷺ سے زیادہ تکبر سے پاک کون ہوسکتا ہے؟ لیکن حضور اقدس ﷺ نے کبھی زندگی بھر ٹخنوں سے نیچے ازار نہیں پہنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جو اجازت دی گئی تھی، وہ ایک مجبوری کی وجہ سے اجازت دی گئی تھی۔ وہ مجبوری یہ تھی کہ ان کے جسم کی بناوٹ ایسی تھی کہ بار بار ان کا ازار خود بخود نیچے ڈھلک جاتا تھا، لیکن تمہارے ساتھ کیا مجبوری ہے؟ اور آج تک آپ نے کوئی ایسا متکبر دیکھا ہے جو یہ کہے کہ میں تکبر کرتا ہوں، میں متکبر ہوں، اس لئے کہ کسی متکبر کو کبھی خود سے اپنے متکبر ہونے کا خیال نہیں آتا۔ اس لئے شریعت نے علامتوں کی بنیاد پر احکام جاری کئے ہیں، یہ نہیں کہا کہ تکبر ہو تو ازار کو اونچا رکھو ورنہ نیچے کرلیا کرو۔ بلکہ شریعت نے بتادیا کہ جب ازار کو نیچے لٹکا رہے ہو، باوجودیکہ حضور اقدس ﷺ نے اس سے منع فرمادیا ہے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تمہارے اندر تکبر ہے، اس لئے ہر حالت میں ازار نیچے لٹکانا ناجائز ہے۔

علماء محققین کا صحیح قول

اگرچہ بعض فقہاء نے یہ لکھ دیا ہے کہ اگر تکبر کی وجہ سے نیچے کرے تو مکروہ تحریمی ہے اور تکبر کے بغیر کرے تو مکروہ تنزیہی ہے لیکن علماء محققین کا صحیح قول یہ ہے اور جس پر ان کا عمل بھی رہا ہے کہ ہر حالت میں نیچے کرنا مکروہ تحریمی ہے، اس لئے کہ تکبر کا پتہ لگانا آسان نہیں ہے، اس لئے اس سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ آدمی ٹخنے سے اونچا ازار پہنے اور تکبر کی جڑ ہی ختم کردے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحمت سے ان اصولوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

بہرحال لباس کے یہ چار اصول ہیں، پہلا اصول یہ ہے کہ وہ ساتر ہونا چاہئے دوسرا اصول یہ ہے کہ حدود شریعت میں رہتے ہوئے اس کے ذریعہ زینت بھی حاصل کرنی چاہئے، تیسرا اصول یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نمائش اور دکھاوا مقصود نہ ہو، چوتھا اصول یہ ہے کہ اس کے پہننے سے دل میں تکبر پیدا

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب قول النبی لوکنت متخذا خلیلا، رقم:۳۳۹۲، سنن النسائی، کتاب الزینة، باب اسبال الازار، رقم: ۵۲۴۰، سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ما جاء فی اسبال الازار، رقم:۳۵۶۳، مسند احمد، رقم:۵۰۹۸

نہ ہو۔ اب آگے لباس سے متعلق جو احادیث حضور اقدس ﷺ سے منقول ہیں وہ پڑھ لیتے ہیں۔

سفید رنگ کے کپڑے پسندیدہ ہیں

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((اِلْبَسُوْا مِنْ ثِیَابِکُمُ الْبَیَاضَ، فَاِنَّهَا مِنْ خَیْرِ ثِیَابِکُمْ ، وَکَفِّنُوْا فِیْهَا مَوْتَاکُمْ))(۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سفید رنگ کے کپڑے پہنو، اس لئے کہ مردوں کے لئے سب سے اچھے کپڑے سفید رنگ کے ہیں اور اپنے مُردوں کو بھی سفید کفن دو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس ﷺ نے مردوں کے لئے سفید کے کپڑوں کو پسند فرمایا ہے، اگرچہ دوسرے رنگ کے کپڑے پہننا ناجائز نہیں، حرام نہیں۔ چنانچہ خود حضور اقدس ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے بعض اوقات دوسرے رنگ کے کپڑے زیب تن فرماتے تھے۔ لہٰذا اگر مرد اس نیت سے سفید کپڑے پہنے کہ آپ ﷺ کو سفید کپڑے پسند تھے تو اس نیت کی وجہ سے انشاء اللہ اتباع سنت کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔ ہاں اگر کبھی دوسرے رنگ کا کپڑا پہن لیا تو وہ بھی بعض شرائط کے ساتھ مردوں کے لئے جائز ہے، کوئی ناجائز نہیں، چنانچہ اگلی حدیث ہے:

حضور ﷺ کا سرخ دھاری دار کپڑے پہننا

عَنْ بَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَرْبُوْعًا وَقَدْ رَأَیْتُهٗ فِیْ حُلَّةٍ حَمْرَآءَ مَارَأَیْتُ شَیْئًا قَطُّ اَحْسَنَ مِنْهُ.(۲)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ درمیانہ قد کے تھے، اور میں نے آپ کو ایک مرتبہ سرخ جوڑے میں دیکھا اور میں نے آپ سے زیادہ خوبصورت چیز اس کائنات میں کوئی نہیں دیکھی۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول اللہ، باب ما یستحب من الاکفان، رقم: ۹۱۵، سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب ای الکفن خیر، رقم: ۱۸۷۰، سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب فی الامر بالکحل، رقم: ۳۳۸۰، مسند احمد، رقم: ۲۱۰۹

(۲) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب الثوب الاحمر، رقم: ۵۴۰۰، سنن النسائی، کتاب الزینة، باب اتخاذ الجمة، رقم: ۵۱۳۷

بلکہ ایک صحابی حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ چودھویں کا چاند چمک رہا تھا، چاندنی رات تھی، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سرخ جوڑا پہنے تشریف فرما تھے، تو اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اتنے حسین لگ رہے تھے کہ میں بار بار کبھی چودھویں کے چاند کو دیکھتا، اور کبھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا، آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ یقیناً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال چودھویں کے چاند سے کہیں زیادہ تھا۔ تو ان احادیث سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا سرخ جوڑا پہننا ثابت ہے۔(۱)

خالص سرخ کپڑے مرد کے لئے جائز نہیں

لیکن یہ بات سمجھ لیجئے کہ سرخ جوڑے سے مراد یہ نہیں ہے کہ پورا سرخ تھا، بلکہ علماء کرام نے دوسری روایات کی روشنی میں تحریر فرمایا ہے کہ اس زمانے میں یمن سے کچھ چادریں آیا کرتی تھیں، ان چادروں پر سرخ رنگ کی دھاریاں ہوا کرتی تھیں، پوری سرخ نہیں ہوتی تھیں، اور وہ بہت اچھا کپڑا سمجھا جاتا تھا، تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سرخ دھاریوں والے کپڑے کا جوڑا پہنا ہوا تھا۔ اور یہ جوڑا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے پہنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو پتہ چل جائے کہ اس قسم کے کپڑے پہننا جائز ہے، کوئی گناہ نہیں، البتہ بالکل خالص سرخ کپڑا پہننا مرد کے لئے جائز نہیں۔ اسی طرح ایسے کپڑے جو عورتوں کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے ہیں، ایسے کپڑے پہننا بھی مردوں کے لئے جائز نہیں، اس لئے کہ اس میں عورتوں کے ساتھ تشبہ ہو جائے گا اور یہ تشبہ بھی ناجائز ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سبز کپڑے پہننا

عَنْ رُفَاعَةَ التَّيْمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَوْبَانِ اَخْضَرَانِ.(۲)

حضرت رفاعہ تیمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر دو سبز رنگ کے کپڑے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سبز رنگ کے کپڑے بھی پہنے ہیں، تو کبھی کبھی آپ نے دوسرے رنگوں کے کپڑے پہن کر یہ بتا دیا کہ ایسا کرنا بھی جائز ہے، کوئی گناہ نہیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسندیدہ کپڑا سفید ہی تھا۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب الادب عن رسول اللہ، باب ما جاء فی الرخصۃ فی لبس الحمرۃ للرجال، رقم: ۲۷۳۵، سنن الدارمی، المقدمۃ، باب فی حسن النبی، رقم: ۵۷

(۲) سنن النسائی، کتاب الزینۃ، باب لبس الخضر من الثیاب، رقم: ۵۲۲۴، سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی الخضرۃ، رقم: ۳۵۴۳

آپ ﷺ کے عمامے کے رنگ

وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَامَ الْفَتْحِ مَكَّةَ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ.(۱)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ فتح مکہ کے دن جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو اس وقت آپ ﷺ کے سر پر سیاہ رنگ کا عمامہ تھا۔ حضور اقدس ﷺ سے سیاہ عمامہ پہننا ثابت ہے اور بعض روایات سے سفید عمامہ پہننے کا بھی اشارہ ملتا ہے۔

آستین کہاں تک ہونی چاہئے

وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ يَدُ كُمِّ قَمِيْصِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الرُّسْغِ. (۲)

یعنی حضور اقدس ﷺ کی قمیص کی آستین گٹوں تک ہوتی تھی۔ اس لئے مردوں کے لئے تو سنت یہ ہے کہ ان کی آستین گٹوں تک ہو، اگر اس سے کم ہوگی سنت ادا نہیں ہوگی، اگرچہ جائز ہے، لیکن عورتوں کے لئے گٹوں سے اوپر کا تو حصہ کھلا رکھنا کسی طرح بھی جائز نہیں، حرام ہے، کیونکہ ان کے لئے نیچے سے لیکر پوری کلائی ستر میں داخل ہے، اس کا کھولنا کسی بھی حال میں جائز نہیں۔

آج کل یہ فیشن بھی عورتوں میں چل پڑا ہے کہ قمیص کی آستین آدھی ہوتی ہے اور بسا اوقات پورے بازو کھلے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے اپنی سالی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو بلا کر فرمایا کو جب لڑکی بالغ ہو جائے تو اس کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہ رہنا چاہئے سوائے گٹوں تک ہاتھوں کے اور چہرے کے۔ لہٰذا اگر آستین چھوٹی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ستر کا حصہ کھلا ہوا ہے اور اس طرح خواتین ستر کھولنے کے گناہ میں مبتلا ہو جاتی ہیں، اس لئے ان کو اس کا بھی اہتمام کرنا

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الحج، باب جواز دخول مكة بغير احرام، رقم: ۲٤۱۹، سنن الترمذى، كتاب اللباس عن رسول الله، باب ما جاء فى العمامة السوداء، رقم: ۱٦٥۷، سنن النسائى، كتاب مناسك الحج، باب دخول مكة بغير احرام، رقم: ۲۸۲۰، سنن ابى داؤد، كتاب اللباس، باب فى العمائم، رقم: ۳٥٥٤، سنن ابن ماجه، كتاب الجهاد، باب لبس العمائم فى الحرب، رقم: ۲۸۱۲، مسند أحمد، رقم: ۱٤۳۷٥

(۲) سنن الترمذى، كتاب اللباس عن رسول الله، باب ماجاء فى القميص، رقم: ۱٦۸۷، سنن ابى داؤد، كتاب اللباس، باب ما جاء فى القميص، رقم: ۳٥۰۹

چاہئے۔ اور مردوں کو بھی چاہئے کہ وہ خواتین کو ان باتوں پر متنبہ کرتے رہیں، یہ جو ہم نے کہنا سننا چھوڑ دیا ہے، اس کے نتیجے میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

بیمار کی عیادت کے آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِسَبْعٍ: ((عِيَادَةِ الْمَرِيْضِ وَاتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَتَشْمِيْتِ الْعَاطِسِ، وَنَصْرِ الضَّعِيْفِ، وَعَوْنِ الْمَظْلُوْمِ، وَاِفْشَاءِ السَّلَامِ، وَاِبْرَارِ الْمُقْسِمِ))(۱)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا، ایک مریض کی عیادت کرنا، دوسرے جنازوں کے پیچھے چلنا، تیسرے چھینکنے والے کے "الحمدللہ" کہنے کے جواب میں "یرحمک اللہ" کہنا، چوتھے کمزور آدمی کی مدد کرنا، پانچویں مظلوم کی امداد کرنا، چھٹے سلام کو رواج دینا، ساتویں قسم کھانے والے کی قسم کو پورا کرنے میں اس کی مدد کرنا۔

یہ ساتوں چیزیں جن کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں حکم فرمایا ہے، بڑی اہمیت رکھتی ہیں، اس لئے ایک مسلمان کی زندگی کے آداب میں سے ہے کہ وہ ان باتوں کا اہتمام کرے۔ اس لئے ان ساتوں چیزوں کو تفصیل کے ساتھ عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان تمام باتوں پر سنت کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بیمار پرسی ایک عبادت ہے

سب سے پہلی چیز جس کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا وہ ہے مریض کی عیادت کرنا اور بیمار کی بیمار پرسی کرنا۔ مریض کی عیادت کرنا یہ مسلمان کے حقوق میں سے بھی ہے اور یہ ایسا عمل ہے جس کو سب کرتے ہیں۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا شخص ہوگا جس نے زندگی میں کبھی بیمار پرسی نہ کی ہو لیکن

☆ اصلاحی خطبات (۶/۱۶۳ تا ۱۸۰) ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۳ بروز جمعہ، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب افشاء السلام، رقم: ۵۷۶۶، مسند أحمد، رقم: ۱۷۷۷۳

ایک بیمار پرسی تو صرف رسم پوری کرنے کے لئے کی جاتی ہے کہ اگر ہم اس بیمار کی عیادت کرنے کے لئے نہ گئے تو لوگوں کو شکایت ہوگی، ایسی صورت میں انسان دل پر جبر کر کے عیادت کرنے کے لئے جاتا ہے۔ اس لئے کہ دل میں اخلاص نہیں ہے، ایک عیادت تو یہ ہے لیکن حضور اقدس ﷺ جس عیادت کا ذکر فرمارہے ہیں وہ عیادت ہے جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ ہو، اخلاص کے ساتھ اور اجر و ثواب حاصل کرنے کی نیت سے انسان عیادت کرے، احادیث میں عیادت کے جو فضائل بیان کئے گئے ہیں وہ اسی عیادت پر مرتب ہوتے ہیں۔

سنت کی نیت سے بیمار پرسی کریں

مثلاً آپ ایک شخص کی عیادت کرنے جارہے ہیں اور دل میں یہ خیال ہے کہ جب ہم بیمار پڑیں گے تو یہ بھی ہماری عیادت کے لئے آئے گا۔ لیکن اگر یہ ہماری عیادت کرنے کے لئے نہیں آئے گا تو پھر آئندہ ہم بھی اس کی عیادت کے لئے نہیں جائیں گے۔ ہمیں اس کی عیادت کی کیا ضرورت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عیادت "بدلے" کے لئے ہورہی ہے، رسم پوری کرنے کے لئے ہورہی ہے، ایسی عیادت پر کوئی ثواب نہیں ملے گا لیکن جب عبادت کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو تو اس صورت میں آدمی یہ نہیں دیکھتا کہ میں جب بیمار ہوا تھا۔ اس وقت یہ میری عیادت کے لئے آیا تھا یا نہیں؟ بلکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر یہ نہیں بھی آیا تھا تب بھی میں اس کی عیادت کے لئے اس کے پاس جاؤں گا کیونکہ حضور اقدس ﷺ نے عیادت کا حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ عیادت خالصتاً اللہ کے لئے کی جارہی ہے۔ اور حضور اقدس ﷺ کی سنت پوری کرنے کے لئے کی جارہی ہے۔

ایک شیطانی حربہ

یہ شیطان ہمارا بڑا دشمن ہے، اس نے ہماری اچھی خاصی عبادتوں کا ملیا میٹ کر رکھا ہے، اگر ان عبادتوں کو ہم صحیح نیت اور صحیح ارادے سے کریں تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں بڑا اجر و ثواب ملے اور آخرت کا بڑا ذخیرہ جمع ہو جائے لیکن شیطان یہ نہیں چاہتا کہ ہمارے لئے آخرت میں اجر و ثواب کا بڑا ذخیرہ تیار ہو جائے، اس لئے وہ ہماری بہت سی عبادتوں میں ہماری نیتوں کو خراب کرتا رہتا ہے۔ مثلاً عزیزوں اور رشتہ داروں، یا دوست احباب سے میل ملاقات کرنا، ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا، ان کو ہدیہ اور تحفہ دینا، یہ سب بڑے اجر و ثواب کے کام ہیں اور سب دین کا حصہ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں، اور ان کاموں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے اجر و ثواب کے وعدے ہیں۔ لیکن شیطان نیت کو خراب کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں وہ شخص یہ سوچتا ہے کہ جو شخص میرے ساتھ جیسا

سلوک کرے گا میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرونگا۔ مثلاً فلاں شخص کے گھر سے میرے گھر کبھی کوئی ہدیہ نہیں آیا، میں اس کے گھر کیوں ہدیہ بھیجوں؟ جب میرے ہاں شادی ہوئی تھی تو اس نے کچھ نہیں دیا تھا۔ میں اس کے ہاں شادی میں کیوں ہدیہ دوں؟ اور فلاں شخص نے چونکہ ہمارے ہاں شادی کے موقع پر تحفہ دیا تھا، لہٰذا میں بھی اس کو شادی میں ضرور تحفہ دونگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مسلمان بھائی کو ہدیہ اور تحفہ دینے کا عمل جس کی حضور اقدس ﷺ نے بڑی فضیلت بیان فرمائی تھی۔ شیطان نے اس کے اجر و ثواب کو خاک ملا دیا، اور اب آپس میں ہدیہ اور تحفہ کا جو لین دین ہو رہا ہے، وہ بطور رسم کے ہو رہا ہے اور بطور "نیوتہ" ہو رہا ہے، یہ صلہ رحمی نہیں ہے۔

صلہ رحمی کی حقیقت

صلہ رحمی وہ ہے جو اس بات کو دیکھے بغیر کی جائے کہ دوسرے نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا، نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر قربان جایئے۔ آپ نے فرمایا:

((لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ لٰكِنَّ الْوَاصِلَ مَنْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا))(۱)

یعنی وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے جو مکافات کرے اور بدلہ دے اور ہر وقت اس ناپ تول میں لگا رہے کہ اس نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا اور میں اس کے ساتھ کیسا سلوک کروں۔ بلکہ صلہ رحمی کرنے والا درحقیقت وہ شخص ہے کہ دوسرے شخص کے قطع رحمی کرنے کے باوجود یہ اس کے ساتھ صلہ رحمی کر رہا ہے یا مثلاً دوسرا شخص تو اس کے لئے کبھی کوئی تحفہ نہیں لایا، لیکن یہ اس کے لئے تحفہ لے کر جا رہا ہے۔ اور اس نیت سے لے جا رہا ہے کہ ہدیہ دینے کا مقصد تو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے، اور حضور اقدس ﷺ کی سنت پر عمل کرنا ہے، لہٰذا اب دوسرا شخص ہدیہ دے یا نہ دے میں تو ہدیہ دونگا، اس لئے کہ میں "بدلہ" کا قائل نہیں ہوں میں اس کو درست نہیں سمجھتا۔ حقیقت میں ایسا شخص صلہ رحمی کرنے والا ہے، لہٰذا ہر معاملے میں ترازو لے کر مت بیٹھ جایا کرو کہ اس نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا، جیسا اس نے کیا تھا میں بھی ویسا کرونگا یہ غلط ہے بلکہ صلہ رحمی کو عبادت سمجھ کر انجام دینا چاہئے۔ جب آپ نماز پڑھتے ہیں تو کیا اس وقت آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ میرا دوست تو نماز نہیں پڑھتا، اس لئے میں بھی نہیں پڑھتا۔ یا میرا دوست جیسی نماز پڑھتا ہے، میں بھی ویسی ہی پڑھوں، نماز کے وقت یہ خیال نہیں آتا، اس لئے کہ اس کی نماز اس کے ساتھ، تمہاری نماز تمہارے ساتھ، اس کا عمل اس کے ساتھ،

(۱) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافی، رقم: ۵۵۳۲، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی صلة الرحم، رقم: ۱۸۳۱، مسند أحمد، رقم ۶۲۳۸

تمہارا عمل تمہارے ساتھ، بالکل اسی طرح صلہ رحمی بھی ایک عبادت ہے، اگر وہ صلہ رحمی کی عبادت انجام نہیں دے رہا ہے تو تم تو اس عبادت کو انجام دو، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرو۔ اسی طرح اگر وہ تمہاری عیادت کے لئے نہیں آرہا ہے تو تم تو اس کی عیادت کے لئے جاؤ، اس لئے کہ عیادت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

بیمار پرسی کی فضیلت

یہ عیادت بھی ایسی عظیم الشان ہے کہ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ الْمُسْلِمَ اِذَا عَادَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ لَمْ يَزَلْ فِيْ خُرْفَةِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَرْجِعَ))(۱)

یعنی جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے، جتنی دیر وہ عیادت کرتا ہے، وہ مسلسل جنت کے باغ میں رہتا ہے۔ جب تک وہ واپس نہ آ جائے ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَعُوْدُ مُسْلِمًا غُدْوَةً اِلَّا صَلّٰى عَلَيْهِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ حَتّٰى يُمْسِيَ وَاِنْ عَادَهُ عَشِيَّةً اِلَّا صَلّٰى عَلَيْهِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ حَتّٰى يُصْبِحَ وَكَانَ لَهُ خَرِيْفٌ فِي الْجَنَّةِ))(۲)

یعنی جب کوئی مسلمان بندہ اپنے مسلمان بھائی کی صبح کے وقت عیادت کرتا ہے تو صبح سے لیکر شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں، اور اگر شام کو عیادت کرتا ہے تو شام سے لیکر صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے ایک باغ متعین فرما دیتے ہیں۔

ستر ہزار فرشتوں کی دعائیں حاصل کریں

یہ کوئی معمولی اجر وثواب ہے؟ فرض کریں کہ گھر کے قریب ایک پڑوسی بیمار ہے تم اس کی عیادت

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل عيادة المريض، رقم:٤٦٥٩، سنن الترمذی، كتاب الجنائز عن رسول الله، باب ما جاء فی عيادة المريض، رقم: ٨٩٠، مسند أحمد، رقم:٢١٣٧٣

(۲) سنن الترمذی، كتاب الجنائز عن رسول الله، باب ما جاء في عيادة المريض، رقم:٨٩١، سنن أبی داود ، كتاب الجنائز باب فی فضل العيادة على وضوء، رقم:٢٦٩٤، مسند أحمد، رقم:٩٢٨

کے لیے چلے گئے اور پانچ منٹ کے اندر اتنے عظیم الشان اجر کے مستحق بن گئے۔ کیا پھر بھی یہ دیکھو گے کہ وہ میری عیادت کے لئے آیا تھا یا نہیں؟ اگر اس نے یہ ثواب حاصل نہیں کیا، اگر اس نے ستر ہزار فرشتوں کی دعائیں نہیں لیں اگر اس نے جنت کا باغ حاصل نہیں کیا تو کیا تم یہ کہو گے کہ میں بھی جنت کا باغ حاصل نہیں کرنا چاہتا، اور مجھے بھی ستر ہزار فرشتوں کی دعاؤں کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ اسے ضرورت نہیں۔ دیکھئے اس اجر و ثواب کو اللہ تعالیٰ نے کتنا آسان بنا دیا ہے، لوٹ کا معاملہ ہے۔ اس لئے عیادت کے لئے جاؤ، چاہے دوسرا شخص تمہاری عیادت کے لئے آئے یا نہ آئے۔

اگر بیمار سے ناراضگی ہو تو

بلکہ اگر وہ بیمار ایسا شخص ہے جس کی طرف سے تمہارے دل میں کراہیت ہے اس کی طرف سے دل کھلا ہوا نہیں ہے، طبیعت کو اس سے مناسبت نہیں ہے، پھر بھی عیادت کے لئے جاؤ گے تو انشاء اللہ اللہ دوہرا ثواب ملے گا، ایک عیادت کرنے کا ثواب اور دوسرے ایک ایسا مسلمان جس کی طرف سے دل میں انقباض تھا۔ اس انقباض کے ہوتے ہوئے تم نے اس کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کیا۔ اس پر علیحدہ ثواب ملے گا، لہٰذا مریض کی عیادت معمولی چیز نہیں ہے، خدا کے لئے رسم بنا کر اس کے ثواب کو ضائع مت کرو، صرف اس نیت سے عیادت کرو کہ یہ حضور اقدس ﷺ کا حکم ہے، آپ کی سنت ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ اجر عطا فرماتے ہیں۔

مختصر عیادت کریں

حضور اقدس ﷺ نے عیادت کے بھی کچھ آداب بیان فرمائے ہیں، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کی تفصیل آپ نے بیان نہ فرمائی ہو، ایسے ایسے آداب آپ بتا کر تشریف لے گئے جن کو آج ہم نے بھلا دیا اور ان آداب کو زندگی سے خارج کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ زندگی عذاب بنی ہوئی ہے، اگر ہم ان آداب اور تعلیمات پر عمل کرنا شروع کر دیں تو زندگی جنت بن جائے چنانچہ عیادت کے آداب بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

((مَنْ عَادَ مِنْكُمْ فَلْيُخَفِّفْ))(۱)

جب تم کسی کی عیادت کرنے جاؤ تو ہلکی پھلکی عیادت کرو یعنی ایسا نہ ہو کہ ہمدردی کی خاطر عیادت کرنے جاؤ، اور جا کر اس مریض کو تکلیف پہنچا دو بلکہ وقت دیکھ لو کہ یہ وقت عیادت کے لئے

---

(۱) ذخیرہ احادیث میں تلاش بسیار کے باوجود یہ حدیث نہیں مل سکی، البتہ یہی ادب زندگی گزارنے کے سنہری آداب میں ضرور ملتا ہے۔ مرتب

مناسب ہے یا نہیں؟ یہ وقت اس کے آرام کرنے کا تو نہیں ہے؟ یا اس وقت وہ گھر والوں کے پاس تو نہیں ہوگا؟ اس وقت میں اس کو پردہ وغیرہ کا انتظام کرانے میں تکلیف تو نہیں ہوگی، لہٰذا مناسب وقت دیکھ کر عیادت کے لئے جاؤ۔

یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے

اور جب عیادت کے لئے جاؤ تو مریض کے پاس تھوڑا بیٹھو، اتنا زیادہ مت بیٹھو جس سے اس کو گرانی ہونے لگے، حضور اقدس ﷺ سے زیادہ کون انسانی فطرت سے واقف ہو سکتا ہے دیکھئے بیمار کی طبعی، خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ذرا بے تکلف رہے، ہر کام بلا تکلف انجام دے لیکن جب کوئی مہمان آجاتا ہے تو اس کی وجہ سے طبیعت میں تکلف آجاتا ہے، مثلاً وہ پاؤں پھیلا کر لیٹنا چاہتا ہے، مہمان کے احترام کی وجہ سے نہیں لیٹ سکتا، یا اپنے گھر والوں سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے مگر اس کی وجہ سے نہیں کر سکتا، اب ہوا یہ کہ تم تو عیادت کی نیت سے ثواب کمانے کے لئے گئے لیکن تمہاری وجہ سے وہ بیمار مشقت میں پڑ گیا، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ عیادت میں ایسا طریقہ اختیار مت کرو جس کی وجہ سے اس مریض پر گرانی ہو، بلکہ ہلکی پھلکی عیادت کرو، مریض کے پاس جاؤ، مسنون طریقے سے اس کا مختصر حال پوچھو، اور جلدی سے رخصت ہو جاؤ، تا کہ اس پر گرانی نہ ہو، یہ نہ ہو کہ اس کے پاس جا کر جم کر بیٹھ گرے، اور ہلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اب وہ بیچارہ نہ تو بے تکلفی سے کوئی کام انجام دے سکتا ہے۔ نہ گھر والوں کو اپنے پاس بلا سکتا ہے، مگر آپ اس کی ہمدردی میں گھنٹوں اس کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے ایسی عیادت سے ثواب ہونے کے بجائے الٹا گناہ ہونے کا اندیشہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا واقعہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جو بہت اونچے درجے کے صوفیاء میں سے ہیں، محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے کمالات عطا فرمائے تھے۔ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے اب چونکہ اللہ تعالیٰ نے بہت اونچا مقام عطا فرمایا تھا اس لئے آپ سے محبت کرنے والے لوگ بھی بہت تھے، اس لئے بیماری کے دوران عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، لوگ آرہے ہیں اور خیریت پوچھ کر واپس جا رہے ہیں، لیکن ایک صاحب ایسے آئے جو وہیں جم کر بیٹھ گئے، اور واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتے تھے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش یہ تھی کہ یہ صاحب واپس جائیں تو میں اپنے ضروری کام بلا تکلف انجام دوں اور گھر والوں کو اپنے پاس بلاؤں، مگر وہ صاحب تو ادھر ادھر کی باتیں

کرنے میں لگے رہے جب بہت دیر گزر گئی اور وہ شخص جانے کا نام ہی نہیں لے رہا تو آخر حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی یہ بیماری تو اپنی جگہ تھی مگر عیادت کرنے والوں نے الگ پریشان کر رکھا ہے، نہ مناسب وقت دیکھتے ہیں اور نہ آرام کا خیال کرتے ہیں اور عیادت کے لئے آجاتے ہیں، اس شخص نے جواب میں کہا کہ حضرت یقیناً ان عیادت کرنے والوں کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہو رہی ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں دروازے کو بند کردوں؟ تاکہ آئندہ کوئی عیادت کرنے کے لئے نہ آئے۔ وہ اللہ کا بندہ پھر بھی نہیں سمجھا کہ میری وجہ سے حضرت والا کو تکلیف ہو رہی ہے آخرکار حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے فرمایا کہ ہاں دروازہ بند تو کردو، مگر باہر جاکر بند کردو، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم تکلیف پہنچا رہے ہیں، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو ان کی خدمت کر رہے ہیں۔

عیادت کے لئے مناسب وقت کا انتخاب کرو

لہٰذا اپنا شوق پورا کرنے کا نام عیادت نہیں اور عیادت کا یہ مقصد ہے کہ اسکے ذریعہ برکت حاصل ہو، یہ نہیں کہ بڑی محبت سے عیادت کے لئے گئے اور جاکر شیخ کو تکلیف پہنچا دی۔ محبت کے لئے عقل درکار ہے، ایسی محبت محبت نہیں ہے بلکہ وہ دشمنی ہے، وہ نادان دوست کی محبت ہے، لہٰذا عیادت میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ جس شخص کی عیادت کے لیے گئے ہو اس کو تکلیف نہ ہو یا مثلاً آپ رات کو بارہ بجے عیادت کے لیے پہنچ گئے جو اس کے سونے کا وقت ہے یا دوپہر کو آرام اور قیلولے کے وقت عیادت کے لئے پہنچ گئے اور اس کو پریشان کر دیا۔ اس لئے عقل سے کام لو سوچ سمجھ کر جاؤ کہ تمہارے جانے سے اس کو تکلیف نہ پہنچے تب تو عیادت سنت ہے ورنہ پھر وہ رسم ہے۔ بہرحال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کا پہلا ادب یہ بیان فرمایا کہ ہلکی پھلکی عیادت کرو۔

بے تکلف دوست زیادہ دیر بیٹھ سکتا ہے

البتہ بعض لوگ ایسے بے تکلف ہوتے ہیں کہ ان کے زیادہ دیر بیٹھنے سے بیمار کو تکلیف کے بجائے تسلی ہوتی ہے اور راحت حاصل ہوتی ہے تو ایسی صورت میں زیادہ دیر بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بے تکلف اور محبت کرنے والے استاذ حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے تو حضرت والد صاحب ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، مسنون طریقے سے عیادت کی، جاکر سلام کیا، خیریت معلوم کی، اور دعا کی، اور دو چار منٹ کے بعد واپس جانے کی اجازت طلب کی، تو میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میاں: یہ جو تم نے

اصول پڑھا ہے:

((مَنْ عَادَ مِنْكُمْ فَلْيُخَفِّفْ))(۱)

''جو شخص عیادت کرے وہ ہلکی پھلکی عیادت کرے''

کیا یہ میرے لئے ہی پڑھا تھا؟ یہ قاعدہ میرے اوپر آزما رہے ہو؟ ارے یہ اصول اس وقت نہیں ہے جب بیٹھنے والے کے بیٹھنے سے مریض کو آرام ملتا ہو آرام سے بیٹھ جاؤ چنانچہ حضرت والد صاحب بیٹھ گئے، بہر حال ہر جگہ کے لئے ایک ہی نسخہ نہیں ہوتا، بلکہ جیسا موقع ہو، جیسے حالات ہوں ویسے ہی عمل کرنا چاہئے لہٰذا اگر آرام اور راحت پہنچانے کے لئے زیادہ بیٹھے گا تو انشاء اللہ زیادہ ثواب حاصل ہوگا اس لئے کہ اصل مقصود تو اس کو راحت پہنچانا ہے اور تکلیف سے بچانا ہے۔

مریض کے حق میں دعا کرو

عیادت کرنے کا دوسرا ادب یہ ہے کہ جب آدمی کسی کی عیادت کے لئے جائے تو پہلے مختصراً اس کا حال دریافت کرے کہ کیسی طبیعت ہے؟ وہ مریض اپنی تکلیف بیان کرے تو پھر اس کے حق میں دعا کرے، کیا دعا کرو؟ یہ بھی حضور اقدس ﷺ ہمیں سکھا گئے، چنانچہ حضور اقدس ﷺ ان الفاظ سے دعا دیا کرتے تھے:

((لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ))(۲)

یعنی اس تکلیف سے آپ کا کوئی نقصان نہیں، آپ کے لئے یہ تکلیف انشاء اللہ آپ کے گناہوں سے پاک ہونے کا ذریعہ بنے گی اس دعا میں ایک طرف تو مریض کو تسلی دی کہ تکلیف تو آپ کو ضرور ہے لیکن گناہوں سے پاکی اور آخرت کے ثواب کا ذریعہ بنے گی۔ دوسری طرف یہ دعا بھی ہے کہ اے اللہ اس تکلیف کو اس کے حق میں اجر و ثواب کا سبب بنا دیجئے اور گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ بنا دیجئے۔

''بیماری'' گناہوں سے پاکی کا ذریعہ ہے

یہ حدیث تو آپ نے سنی ہوگی کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس مسلمان کو جو کوئی تکلیف پہنچی ہے حتی کہ اگر اس کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض کوئی نہ کوئی گناہ

---

(۱) ذخیرہ احادیث میں تلاش بسیار کے باوجود یہ حدیث نہیں مل سکی، البتہ ہمیں اصول زندگی گزارنے کے سنہری آداب میں ضرور ملتا ہے۔ مرتب

(۲) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، رقم: ۳۳٤۷

معاف فرماتے ہیں، اور اس کا درجہ بلند فرماتے ہیں ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْحُمّٰی مِنْ فَیْحِ جَهَنَّمَ))(۱)

یعنی "یہ بخار جہنم کی گرمی کا ایک حصہ ہے" علماء کرام نے اس حدیث کی مختلف تشریحات کی ہیں بعض علماء نے اس کا جو مطلب بیان فرمایا ہے، اس کی بعض احادیث سے تائید بھی ہوتی ہے، وہ یہ کہ بخار کی گرمی انسان کے لئے جہنم کی گرمی کا بدلہ ہوگئی ہے یعنی گناہوں کی وجہ سے آخرت میں جہنم کی جو گرمی برداشت کرنی پڑتی اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے یہ گرمی دیدی تاکہ جہنم کے اندر ان گناہوں کی گرمی برداشت نہ کرنی پڑے، بلکہ اس بخار کی وجہ سے وہ گناہ دنیا ہی کے اندر دھل جائے اور معاف ہو جائے۔ اس کی تائید اس دعا سے ہوتی ہے کہ حضور اقدس ﷺ عیادت کے وقت کیا کرتے تھے:

((لَا بَأْسَ طَهُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ))

یعنی کوئی غم نہ کرو یہ بخار تمہارے گناہوں سے پاکی کا ذریعہ اور سبب بن جائے گا۔

حصول شفا کا ایک عمل

عیادت کرنے کا تیسرا ادب یہ ہے کہ اگر موقع مناسب ہو اور اس عمل کے ذریعہ مریض کو تکلیف نہ ہو تو یہ عمل کرے کہ مریض کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا پڑھے:

((اَللّٰهُمَّ رَبَّ النَّاسِ اَذْهِبِ الْبَأْسَ اَنْتَ الشَّافِيْ لَاشَافِيَ اِلَّا اَنْتَ لَايُغَادِرُ سَقَمًا))(۲)

"اے اللہ، جو تمام انسانوں کے رب ہیں، تکلیف کو دور کرنے والے ہیں، اس بیمار کو شفا عطا فرما، آپ شفا دینے والے ہیں، آپ کے سوا کوئی شفا دینے والا نہیں۔ اور ایسی شفا عطا فرما جو کسی بیماری کو نہ چھوڑے"

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة النار وأنها مخلوقة، رقم:۳۰۲۱، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب لکل داء واستحباب التداوی، رقم: ۴۰۹۳، سنن الترمذی، کتاب الطب عن رسول الله، باب ماجاء فی تبرید الحمی با لماء، رقم: ۲۰۰۰، سنن ابن ماجه، کتاب الطب، باب الحمی من فیح جهنم فابردوها با لماء، رقم:۳۴۶۲، مسند أحمد، رقم:۲۵۱۷

(۲) صحیح البخاری، کتاب المرضی، باب دعا العائد للمریض، رقم: ۵۲۴۳، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب استحباب رقیة المریض، رقم:۴۰۶۱، سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول الله، باب ما جاء فی التعوذ للمریض، رقم:۸۹۵، سنن أبی داود، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمائم، رقم:۳۳۸۵، مسند أحمد، رقم:۵۳۳

یہ دعا جس کو یاد نہ ہو اس کو چاہئے کہ اس کو یاد کرلیں اور پھر یہ عادت بنالیں کہ جس بیمار کے پاس جائیں موقع دیکھ کر یہ دعا ضرور پڑھ لیں۔

ہر بیماری سے شفا

ایک اور دعا بھی حضور اقدس ﷺ سے منقول ہے جو اس سے بھی زیادہ آسان اور مختصر ہے اس کو یاد کرنا بھی آسان ہے اور اس کا فائدہ بھی حضور اقدس ﷺ نے بڑا عظیم بیان فرمایا ہے وہ دعا یہ ہے:

((اَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَنْ يَّشْفِيَكَ)) (۱)

"عظمت والے اللہ، اور عظیم عرش کے مالک سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تم کو شفا عطا فرمادے"

حدیث میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو مسلمان بندہ دوسرے مسلمان بھائی کی عیادت کے وقت سات مرتبہ یہ دعا کرے تو اگر اس بیمار کی موت کا وقت نہیں آیا تو پھر اس دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کو صحت عطا فرمادیں گے ہاں اگر کسی کی موت ہی کا وقت آچکا ہو تو اس کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔

عیادت کے وقت زاویہ نگاہ بدل لو

اور ان دعاؤں کے پڑھنے میں تین طرح سے ثواب حاصل ہوتا ہے ایک ثواب تو اس بات کا ملے گا کہ آپ نے مریض کی عیادت کے دوران حضور اقدس ﷺ کی سنت پر عمل کیا اور وہ الفاظ کہے جو عیادت کے وقت حضور اقدس ﷺ کہا کرتے تھے، دوسرے ایک مسلمان بھائی کے ساتھ ہمدردی کرنے کا ثواب حاصل ہوگا، تیسرے اس کے حق میں دعا کرنے کا ثواب حاصل ہوگا۔ اس لئے کہ دوسرے مسلمان بھائی کے لئے دعا کرنا باعث اجر وثواب ہے، گویا کہ اس چھوٹے سے عمل کے اندر تین ثواب جمع ہیں، لہٰذا مریض کی عیادت تو سب کرتے ہی ہیں لیکن عیادت کے وقت ذرا زاویہ نگاہ بدل لو، اور اتباع سنت کی نیت کرلو، اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کرلو، اور عیادت کے جو آداب ہیں اس پر عمل کرلو یعنی مختصر وقت کے لئے عیادت کرو، اور عیادت کے وقت حضور اقدس ﷺ کی بتائی ہوئی دعائیں پڑھ لو، تو پھر ماشاء اللہ عیادت کا یہ معمولی سا عمل عظیم عبادت بن جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم

(۱) سنن الترمذی، کتاب الطب عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی التداوی بالعسل، رقم:۲۰۰۹، سنن أبی داؤد، کتاب الجنائز، باب الدعا للمریض عند العیادۃ، رقم:۲۷۰۰، مسند أحمد، رقم:۲۰۳۰

سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

دین کس چیز کا نام ہے؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے کام کی بات بیان فرماتے تھے، دل پر نقش کرنے کے قابل ہے، فرماتے تھے کہ "دین صرف زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے، صرف ذرا سا زاویہ نگاہ بدل لو تو یہی دنیا دین بن جائیگی، یہی سب کام جو اب تک تم انجام دے رہے تھے وہ سب عبادت بن جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے کام بن جائیں گے بشرطیکہ دو کام کرلو، ایک نیت درست کرلو دوسرے اس کا طریقہ سنت کے مطابق انجام دے دو بس اتنا کرنے سے ہی کام دین بن جائیں گے۔ اور بزرگوں کے پاس جانے سے یہی فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ انسان کا زاویہ نگاہ بدل دیتے ہیں، سوچ کا انداز بدل دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں انسان کے اعمال اور افعال کا رخ صحیح ہو جاتا ہے پہلے وہ دنیا کا کام تھا اور اب وہ دین کا کام بن جاتا ہے اور عبادت بن جاتا ہے۔

عیادت کے وقت ہدیہ لے جانا

مریض کی عیادت کے موقع پر ایک اور رسم ہمارے یہاں جاری ہے وہ یہ کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جب عیادت کے لئے جائیں تو کوئی ہدیہ، تحفہ ضرور لیکر جانا چاہیے مثلاً پھل فروٹ یا بسکٹ وغیرہ اور اس کو اتنا ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ بعض لوگ جب تک کوئی ہدیہ لے کر جانے کی استطاعت نہیں ہوتی، عیادت کے لئے ہی نہیں جاتے اور دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر خالی ہاتھ چلے گئے تو وہ مریض یا مریض کے گھر والے کیا سوچیں گے کہ خالی ہاتھ عیادت کے لئے آ گئے۔

یہ ایسی رسم ہے جس کی وجہ سے شیطان نے ہمیں عیادت کے عظیم ثواب سے محروم کر دیا ہے حالانکہ عیادت کے وقت کوئی ہدیہ، تحفہ لے کر جانا نہ سنت ہے نہ فرض نہ واجب۔ پھر کیوں ہم نے اس کو اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ خدا کے لئے اس رسم کو چھوڑ دو اس کی وجہ سے عیادت کے فضائل اور اس پر ملنے والے اجر و ثواب سے محروم مت ہو جاؤ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح فہم عطا فرمائے اور ہر کام سنت کے مطابق انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

بہر حال اس حدیث میں جن سات چیزوں کا حکم دیا گیا ہے ان میں سے یہ پہلی چیز کا بیان تھا۔ باقی چیزوں کا بیان انشاء اللہ آئندہ جمعہ میں عرض کرونگا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

جنازے کے آداب اور چھینکنے کے آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِسَبْعٍ ((بِعِيَادَةِ الْمَرِيْضِ وَاتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَتَشْمِيْتِ الْعَاطِسِ وَنَصْرِ الضَّعِيْفِ وَعَوْنِ الْمَظْلُوْمِ وَاِفْشَاءِ السَّلَامِ وَاِبْرَارِ الْمُقْسِمِ))(۱)

ایک مسلمان کے ذمے دوسرے مسلمانوں کے جو حقوق ہیں، ان میں سے دو کا بیان پیچھے ہو چکا:

(۱) سلام کا جواب دینا (۲) مریض کی عیادت کرنا

تیسرا حق جو اس حدیث میں بیان فرمایا وہ ہے ''اتباع الجنائز'' جنازوں کے پیچھے جانا۔ یہ بھی بڑی فضیلت والا کام ہے اور مرنے والے کا حق ہے۔ البتہ یہ حق مردوں پر ہے، عورتوں پر یہ حق نہیں ہے، اور عیادت مریض کا عمل مرد کے لئے بھی ہے اور عورت کے لئے بھی ہے اور عیادت مریض کا جو ثواب مرد کے لئے ہے، وہی ثواب عورت کے لئے بھی ہے۔ لیکن جنازوں کے پیچھے جانا صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے، البتہ خواتین تعزیت کے لئے جا سکتی ہیں، اور ''انشاء اللہ'' اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ ان کو تعزیت کرنے میں بھی وہی اجر و ثواب حاصل ہو جائے گا جو مردوں کو جنازے کے پیچھے جانے سے حاصل ہوتا ہے۔

جنازے کے پیچھے چلنے کی فضیلت

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازے کے پیچھے چلنے کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

☆ اصلاحی خطبات (۱۲/۱۰۲ تا ۱۲۷) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب افشاء السلام، رقم: ۵۷٦٦، مسند أحمد، رقم: ۱۷۷۷۳

((مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهَا فَلَهُ قِيْرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَهَا حَتّٰى تُدْفَنَ فَلَهُ قِيْرَاطَانِ)) قِيْلَ: وَمَا الْقِيْرَاطَانِ؟ قَالَ: ((مِثْلُ الْجَبَلَيْنِ الْعَظِيْمَيْنِ))(۲)

"جو شخص جنازے کے ساتھ اس کی نماز پڑھی جانے تک حاضر رہے، اس کو ایک قیراط ثواب ملے گا اور جو شخص دفن تک شریک رہے، اس کو دو قیراط ثواب ملے گا۔ کسی صحابی نے سوال کیا یا رسول اللہ! یہ دو قیراط کیسے ہونگے؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ یہ قیراط دو بڑے پہاڑوں کے برابر ہوں گے"

بہر حال، نماز جنازہ پڑھنے اور دفن تک شریک ہونے کا بڑا عظیم ثواب ہے۔

جنازے میں شرکت کے وقت نیت کیا ہو؟

جنازہ کے پیچھے جانے کا عمل ایسا ہے جو ہم سب کرتے ہیں، شاید ہی کوئی شخص ہوگا جو کبھی بھی جنازے کے پیچھے نہیں گیا ہوگا، بلکہ ہر شخص کو اس عمل سے سابقہ پڑتا ہے، لیکن صحیح طریقہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یہ عمل بھی ایک رسمی خانہ پوری ہو کر رہ جاتا ہے، مثلاً بعض اوقات جنازہ میں شرکت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر شرکت نہ کی تو لوگ ناراض ہو جائیں گے، یہ نیت اور مقصد غلط ہے۔ اس لئے جنازہ میں شرکت کرتے وقت اپنی نیت درست کرلو اور یہ نیت کرلو کہ میں اس مسلمان کا حق ادا کرنے کے لئے شرکت کر رہا ہوں، اور جنازے کے پیچھے چلنا چونکہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے اور آپ ﷺ کا حکم ہے، اس لئے میں بھی آپ ﷺ کی اتباع میں شریک ہو رہا ہوں۔ اس نیت سے جب شرکت کرو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ یہ عمل بڑے اجر و ثواب کا باعث بن جائے گا۔

جنازے کے ساتھ چلتے وقت کلمہ شہادت پڑھنا

دوسرے یہ کہ جنازہ میں شرکت کرنے کا طریقہ سنت کے مطابق ہونا چاہئے، ناواقفیت اور بے دھیانی کی وجہ سے ہم بہت سی سنتوں پر عمل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں اور بلا وجہ اجر و ثواب ضائع کر دیتے ہیں، ذرا سا دھیان اگر کرلیں گے تو ایک ہی عمل میں بہت سارے ثواب حاصل ہو جائیں گے۔ مثلاً ناواقفیت کی وجہ سے ہمارے یہاں ایک طریقہ یہ چل پڑا ہے کہ جب جنازے کو کندھا دیا جاتا ہے تو ایک آدمی بلند آواز سے نعرہ لگاتا ہے "کلمہ شہادت" اور دوسرے لوگ اس کے جواب میں بلند

---

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب من انتظر حتی تدفن، رقم: ۱۲۴۰، صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب فضل الصلاة علی الجنازة واتباعها، رقم: ۱۵۷۰، سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب ثواب من صلی علی جنازة، رقم: ۱۹۶۸

آواز سے "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" پڑھتے ہیں۔ یہ طریقہ بالکل غلط ہے، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، یہ عمل نہ تو حضور اقدس ﷺ نے کیا، نہ صحابہ کرام نے کیا، اور نہ ہی ہمارے بزرگان دین سے یہ عمل منقول ہے۔ بلکہ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جنازے کے ساتھ جاتے ہوئے کسی قسم کا کوئی ذکر بلند آواز سے کرنا مکروہ ہے، اور جنازے کے ساتھ جانے کا ادب یہ ہے کہ خاموش چلے، بلا ضرورت باتیں کرنا بھی اچھا نہیں، لہٰذا ''کلمہ شہادت'' کا نعرہ لگانا یا ''شہادت'' بلند آواز سے پڑھنا سنت کے خلاف ہے، اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

جنازہ اٹھاتے وقت موت کا مراقبہ کریں

اور خاموش چلنے میں حکمت یہ ہے کہ خاموش رہ کر یہ غور کرو اور سوچو کہ جو وقت اس پر آیا ہے، تم پر بھی آنے والا ہے، یہ نہیں کہ اس جنازے کو تو تم لے جا کر قبر میں دفن کر دو گے اور تم ہمیشہ زندہ رہو گے، لہٰذا خاموش رہ کر اس موت کا مراقبہ کرو کہ ایک دن اسی طرح میں بھی مر جاؤں گا اور میرا بھی جنازہ اسی طرح اٹھایا جائے گا اور مجھے بھی قبر میں دفن کر دیا جائے گا اس طرح موت کا مراقبہ کرنے کے نتیجے میں دل میں کچھ نرمی پیدا ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا احساس بڑھے گا، اس لئے خاموش رہ کر موت کا مراقبہ کرنا چاہئے، البتہ کوئی ضروری بات کرنی ہو تو کر سکتے ہیں، کوئی ناجائز اور حرام نہیں ہے، البتہ ادب کے خلاف ہے۔

جنازے کے آگے نہ چلیں

ایک ادب یہ ہے کہ جب جنازہ لے جا رہے ہوں تو جنازہ آگے ہونا چاہئے اور لوگ اس پیچھے پیچھے چلیں، دائیں بائیں چلیں تو بھی ٹھیک ہے، لیکن جنازے کے آگے آگے چلنا ٹھیک نہیں، ادب کے خلاف ہے۔ البتہ کندھا دینے کی غرض سے وقتی طور پر آگے بڑھ جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن کندھا دینے کے لئے بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جنازے کے آگے دو رویہ لمبی قطار لگا لیتے ہیں، جس کے نتیجے میں جنازہ کے ساتھ چلنے والے تمام لوگ جنازہ سے آگے ہو جاتے ہیں اور جنازہ پیچھے ہو جاتا ہے، یہ طریقہ بھی کچھ اچھا نہیں ہے۔

جنازے کو کندھا دینے کا طریقہ

اسی طرح جنازے کو کندھا دینے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے میت کے دائیں ہاتھ کی طرف والا پایہ اپنے داہنے کندھے پر رکھیں اور کم از کم دس قدم چلیں، یہ افضل ہے، بشرطیکہ دس قدم

چلنے کی طاقت ہو۔ لہٰذا دوسرے لوگوں کو اتنی جلدی نہیں کرنی چاہئے کہ ابھی ایک نے جنازہ کندھے پر رکھا اور دوسرے شخص نے فوراً آگے بڑھ کر اس کو لے لیا، ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ اگر کوئی کمزور اور ضعیف آدمی ہے تو اس صورت میں دوسرے لوگوں کو چاہئے کہ اس سے جلدی لے لیں تاکہ اس کو تکلیف نہ ہو۔ پھر میت کے دائیں پاؤں کی طرف کا پایہ اپنے داہنے کندھے پر اٹھائے اور دس قدم چلے، اور پھر میت کے بائیں ہاتھ کی طرف کا پایہ اپنے بائیں کندھے پر اٹھائے اور دس قدم چلے، پھر میت کے بائیں پاؤں کی طرف کا پایہ اپنے بائیں کندھے پر اٹھائے اور دس قدم چلے، اس طرح ہر شخص جنازے کے چاروں اطراف میں کندھا دے اور چالیس قدم چلے، یہ طریقہ سنت سے زیادہ قریب ہے اور افضل ہے، اگرچہ اس کے خلاف کرنا ناجائز نہیں ہے، لیکن سنت کا ثواب ضائع ہو جائے گا۔

آج کل جنازہ لے جاتے وقت دھکم پیل ہوتی ہے، کندھا دینے کے شوق میں دوسرے مسلمان بھائیوں کو دھکا دیدیا جاتا ہے اور اس بات کا خیال ہی نہیں ہوتا کہ ہم ایذاءِ مسلم کر کے حرام کا ارتکاب کر رہے ہیں، کندھا دینے کا ثواب ضائع کر کے الٹا گناہ کما رہے ہیں۔ اس لیے ایسا نہ کرنا چاہئے، بلکہ اطمینان سے کندھا دینا چاہئے اور دوسروں کو اس کا موقع دینا چاہئے کہ دوسرا مسلمان بھائی کندھا دیتے ہوئے دس قدم پورے کر لے، اس کے بعد آپ اس سے لے لیں۔

جنازے کو تیز قدم سے لے کر چلنا

حضور اقدس ﷺ نے ایک حدیث میں جنازہ لے جانے کا یہ ادب بھی بیان فرمایا کہ جب جنازہ لے کر جاؤ تو ذرا تیز تیز قدم بڑھاؤ، آہستہ مت چلو، اور اس کی وجہ بھی بیان فرما دی کہ اگر وہ جنتی ہے تو اس کو جنت میں پہنچانے میں کیوں دیر کرتے ہو؟ اس کو جلدی اس کے اچھے ٹھکانے پر پہنچا دو، اور اگر وہ دوزخی ہے۔ معاذ اللہ۔ تو دوزخ والے کو جلدی اس کے ٹھکانے تک پہنچا کر اپنے کندھے سے اس بوجھ کو دور کر دو۔ البتہ اتنی تیزی بھی نہیں کرنی چاہئے جس سے جنازہ حرکت کرنے لگے، ہلنے لگے، بلکہ متوسط انداز کی چال سے چلو اور اس کو جلدی پہنچا دو۔(۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب السرعة با لجنائزة، رقم:۱۲۳۱، صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب الاسراع بالجنازة، رقم: ۱۵۶۸، سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول الله، باب ماجاء فی المشی خلف الجنائز، رقم:۹۳۲، سنن النسائی، کتاب الجنائز باب السرعة بالجنازة، رقم:۱۸۸٤، سنن أبی داؤد، کتاب الجنائز، باب الاسراع بالجنازة، رقم:۲۷٦۷، سنن ابن ماجه، کتاب ما جاء فی الجنائز، باب ما جاء فی شهود الجنائز، رقم:۱٤٦٦، مسند أحمد، رقم:٦٩٦٩

جنازہ زمین پر رکھنے تک کھڑے رہنا

اسی طرح ایک ادب اور سنت یہ ہے کہ قبرستان میں جب تک جنازہ کندھوں سے اتار کر نیچے نہ رکھ دیا جائے، اس وقت تک لوگ نہ بیٹھیں بلکہ کھڑے رہیں، البتہ جب جنازہ نیچے رکھ دیا جائے تو اس وقت بیٹھ سکتے ہیں۔ ہاں! اگر کوئی شخص کمزور اور ضعیف ہے، وہ بیٹھنا چاہتا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں لہٰذا ہر عمل اتباع سنت کی نیت سے اور اس کا اہتمام کر کے کرے تو پھر ہر ہر موقع پر کیا جانے والا ہر عمل عبادت بن جاتا ہے۔

اسلامی الفاظ اور اصطلاحات

چوتھا حق جس کا حدیث میں ذکر ہے وہ ہے " تشمیت العاطس" یعنی چھینکے والے کے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہنے کے جواب میں "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کہنا، حضور اقدس ﷺ نے اس کو "تشمیت" کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

حضور اقدس ﷺ سے جو الفاظ احادیث میں مروی ہیں یا قرآن کریم میں جو الفاظ آئے ہیں، وہ الفاظ بھی سیکھنے چاہئیں، ایک زمانہ وہ تھا کہ مسلمان چاہے وہ باقاعدہ عالم نہ ہو اور اس نے کسی مدرسہ سے علم دین حاصل نہ کیا ہو، لیکن اسلامی الفاظ اور اسلامی اصطلاحات سے وہ اتنا مانوس ہوتا تھا کہ بہت سے اسلامی الفاظ اور اسلامی اصطلاحات لوگوں کی زبانوں پر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ علماء کی تصانیف، کتابیں، تقاریر، وعظ وغیرہ کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، معاشرے میں ان اسلامی الفاظ اور اسلامی اصطلاحات کا عام رواج تھا، اس کا بڑا فائدہ تھا۔

اسلامی اصطلاحات سے جہالت کا نتیجہ

لیکن اب ان اسلامی اصطلاحات سے رفتہ رفتہ ناواقفیت اس درجہ بڑھ گئی ہے اور لوگ اس درجہ ان سے غافل اور لاعلم ہو گئے ہیں کہ اگر عام لفظ بھی اگر ان کے سامنے بولا جائے تو اس طرح حیرت سے چہرہ تکنے لگتے ہیں کہ معلوم نہیں کس زبان کا لفظ بول دیا۔ اس ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ ابھی قریب ہی زمانے کی لکھی علماء کی تصانیف، کتابیں، ملفوظات اور مواعظ پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے اور شکایت کرتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آئیں۔ اب آج کے دور کا عام آدمی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف، آپ کے مواعظ اور ملفوظات کو نہیں سمجھتا، اس لئے کہ عام آدمی ان الفاظ سے اور ان اسلامی اصطلاحات سے نابلد ہے اس سے مانوس نہیں، اور نہ ہی ان الفاظ

کے سمجھنے کی طرف دھیان اور توجہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان علماء کی تصانیف اور مواعظ اور ملفوظات کے استفادہ سے محروم رہ جاتا ہے۔

انگریزی الفاظ کا رواج

لہٰذا یہ وبا اور بیماری ہمارے اندر پھیل گئی ہے کہ "اسلامی اصطلاحات" ہماری بول چال سے خارج ہوگئی ہیں اور دوسری طرف انگریزی زبان داخل ہوگئی، آج اگر شخص تھوڑا سا پڑھ لکھ لے اور میٹرک کرلے یا انٹر پاس کرلے تو اب وہ اپنی گفتگو میں آدھے الفاظ انگریزی کے بولے گا اور آدھے الفاظ اردو کے بولے گا، حالانکہ نہ تو اس کو اردو پوری طرح آتی ہے اور نہ انگریزی پوری طرح آتی ہے، تو انگریزی الفاظ بولنے کا اتنا خیال ہے، لیکن اسلامی اصطلاحات سے اتنا بعد اتنی دوری ہے کہ ان کا مطلب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا، حالانکہ ان کو بھی سیکھنے کی فکر کرنی چاہئے۔

آج "معارف القرآن" سمجھ میں نہیں آتی

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی تفسیر "معارف القرآن" لکھی ہے، انہوں نے لکھی ہی اس مقصد سے تھی کہ ایک عام آدمی کو آسان انداز میں قرآن کریم کی تفسیر سمجھ میں آجائے۔ لیکن بہت سے لوگ آکر یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو "معارف القرآن" سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر اس سے بھی کوئی آسان تفسیر لکھدیں تو کہیں گے کہ وہ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتی، وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کو حاصل کرنے اور ان الفاظ سے اپنے آپ کو مانوس کرنے کی فکر ہی نہیں ہے۔ ورنہ آج سے پچاس سال پہلے ایک عام آدمی جس نے باقاعدہ علم دین حاصل نہیں کیا تھا، اس کے خطوط میں ایسے بہت سے الفاظ نظر آئیں گے کہ آج کل کا گریجویٹ اور ایم اے بھی اس خط کو نہیں سمجھ سکتا۔ بہرحال! اس کی فکر کرنی چاہئے، اس لئے جب حدیث سنا کریں تو اس کے الفاظ سے بھی اپنے کو مانوس کیا کریں۔

چھینکنے کے آداب

بہرحال! یہ لفظ "تشمیت" ہے۔ اس لفظ کو "س" سے "تسمیت" پڑھنا بھی درست ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ جب کسی شخص کو چھینک آئے تو اس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ چھینکنے والے کو "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہنا چاہئے، اور جو شخص پاس بیٹھا سن رہا ہے اس کو "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کہنا چاہئے، یعنی اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے، یہ "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کے الفاظ کہنا "تشمیت" ہے۔ یہ عربی ہے اور

اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اس بات کی دعا دینا کہ وہ صحیح راستے پر رہے۔

جمائی سستی کی علامت ہے

حضور اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ چھینکنے والا "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہے اور اس کے ذریعہ اللہ تبارک و تعالی کا شکر ادا کرے۔ ویسے تو ہر نعمت اللہ تعالی کے شکر کا متقاضی ہے، لیکن حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلتَّثَاؤُبُ مِنَ الشَّیْطَانِ وَالْعُطَاسُ مِنَ الرَّحْمٰنِ))(۱)

یعنی "جمائی" شیطانی اثرات کی حامل ہوتی ہے اور چھینک اللہ تعالی کی رحمت کا ایک حصہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ "جمائی" سستی کے وقت آتی ہے اور اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس کو سستی آرہی ہے، اور "سستی" شیطانی اثرات لئے ہوئے ہوتی ہے جو انسان کو بھلائی سے، نیک کاموں سے اور صحیح طرز عمل سے باز رکھتی ہے، اگر انسان اس سستی پر عمل کرتا چلا جائے تو بالآخر وہ ہر طرح کی خیرات سے محروم ہو جاتا ہے۔ لہذا حضور اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ اس سستی کو دور کرو، کاہلی کو دور کرو اور جس خیر کے کام میں سستی آرہی ہے، اس سستی کا مقابلہ کرکے وہ خیر کا کام کر گزرو۔

حضور اقدس ﷺ کا عاجزی اور سستی سے پناہ مانگنا

اسی لئے حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا فرمائی ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ))(۲)

"اے اللہ! میں عاجزی اور سستی سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں"

---

(۱) ((اَلتَّثَاؤُبُ مِنَ الشَّیْطَانِ)) کے لئے دیکھئے: صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة ابلیس وجنوده، رقم: ۳۰٤٦، صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب تشمیت العاطس وکراهة التثاوب، رقم: ۵۳۱۰، سنن الترمذی، کتاب الادب عن رسول الله، باب ماجاء ان الله یحب العطاس ویکره التثاوب، رقم: ۲٦۷۰، مسند أحمد، رقم: ۸۷۹۷، ((وَالْعُطَاسُ مِنَ الرَّحْمٰنِ)) کے الفاظ نہیں مل سکے۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب ما یتعوذ من الجبن، رقم: ۲٦۱۱، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب التعوذ من العجز والکسل وغیره، رقم: ٤۸۷۸، سنن النسائی، کتاب الاستعاذه، باب الاستعاذة من البخل، رقم: ۵۳۵۳، سنن أبی داود، کتاب الصلاة، باب فی الاستعاذة، رقم: ۱۳۱۷، مسند أحمد، رقم: ۱۱٦۷۰

اس لئے کہ یہ سستی بہت خراب چیز ہے، اس سے بچنا چاہئے، اور اگر کسی کو سستی ہوتی ہو تو اس کا اس کے علاوہ کوئی علاج نہیں کہ اس سستی کا مقابلہ کرے، مثلاً سستی کی وجہ سے دل چاہ رہا ہے کہ گھر میں پڑا رہوں اور کام پر نہ جاؤں، تو اس کا علاج یہ ہے کہ زبردستی کر کے کھڑا ہو جائے اور اس سستی کا مقابلہ کرے۔ اور ''جمائی'' اس سستی کی ایک علامت ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ''جمائی'' شیطانی اثرات کی حامل ہے۔

چھینک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

اور چھینک کے بارے میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ چھینک ''رحمٰن'' کی طرف سے ہے، یعنی اللہ جل شانہ کی رحمت کا ایک عنوان ہے۔ ایک چھینک وہ ہوتی ہے جو نزلہ اور زکام کی وجہ سے آنی شروع ہو جاتی ہے اور مسلسل آتی چلی جاتی ہے، یہ تو بیماری ہے، لیکن اگر ایک آدمی صحت مند ہے اور نزلہ زکام کی کوئی بیماری نہیں ہے، اس کے باوجود اس کو چھینک آرہی ہے تو اس کے بارے میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ رحمٰن کی طرف سے رحمت کی علامت ہے۔ چنانچہ اطباء نے لکھا ہے کہ بعض اوقات انسان کے جسم پر کسی بیماری کا حملہ ہونے والا ہوتا ہے تو چھینک اس حملے کو روک دیتی ہے، اس طرح یہ چھینک اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا ایک عنوان ہے یہ تو ظاہری رحمت ہے، ورنہ اس کے اندر جو باطنی رحمتیں ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ چونکہ چھینک اللہ تعالیٰ کی رحمت کے عنوانات میں سے ایک عنوان ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی کو چھینک آئے تو ''الحمد للہ'' کہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

اللہ تعالیٰ کو مت بھولو

ان احکام کے ذریعہ قدم قدم پر یہ سکھایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مت بھولو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہر موقع پر رجوع کرو، اور ہر ہر موقع پر یہ کہا جارہا ہے کہ اس وقت یہ پڑھ لو، اس وقت یہ پڑھ لو، یہ سب اس لئے کہا جارہا ہے تاکہ ہماری زندگی کا ہر لحہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے معمور ہو جائے اور ہر تغیر کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی عادت پڑ جائے۔ ساری عبادتوں، سارے زہد، سارے مجاہدوں، ساری ریاضتوں اور سارے تصوف اور سلوک کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی عادت پڑ جائے اور جس سے اللہ تعالیٰ کا تعلق حاصل ہو جائے۔ اس رجوع الی اللہ کی عادت ڈالنے کے لئے حضور اقدس ﷺ نے یہ مختلف طریقے تلقین فرمائے ہیں۔ مثلاً یہ کہ چھینک آئے تو فوراً کہو ''الحمد للہ''

یہ سنت مردہ ہوتی جارہی ہے

ایک زمانہ وہ تھا کہ جب یہ بات مسلمانوں کے شعائر میں داخل تھی اس کو سکھانے اور بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، اور اس وقت اس بات کا تصور بھی نہیں تھا کہ اگر کسی مسلمان کو چھینک آئے گی تو وہ "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" نہیں کہے گا، بچپن سے تربیت ایسی کی جاتی تھی کہ اس کے خلاف ہوتا ہی نہیں تھا۔ لیکن اب یہ چیز مٹتی جارہی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ یہ سنت بھی مردہ ہوتی جارہی ہے، اس سنت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے جب چھینک آئے تو فوراً کہو "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ"

چھینکنے والے کا جواب دینا واجب ہے

پھر دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو شخص چھینکنے والے کے پاس بیٹھا ہے اور اس نے یہ سنا کہ چھینکنے والے نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہا تو اس سننے والے پر شرعاً واجب ہے کہ جواب میں "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کہے، اسی کا نام "تشمیت" ہے۔ اور یہ جواب دینا صرف سنت یا مستحب نہیں بلکہ واجب ہے لہٰذا اگر کوئی شخص "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کے ذریعہ جواب نہیں دے گا تو اس کو ترک واجب کا گناہ ہوگا۔ البتہ یہ اس وقت واجب ہے کہ چھینکنے والے نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہا ہو، اور اگر چھینکنے والے نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" نہیں کہا تو پھر سننے والے پر "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کہنا واجب نہیں۔

البتہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اتنی آسانی فرمادی ہے کہ اس کو واجب علی الکفایہ قرار دیا ہے، یعنی واجب علی العین نہیں ہے کہ ہر سننے والے پر جواب دینا ضروری ہو، بلکہ اگر سننے والے دس افراد ہیں اور ان میں سے ایک نے "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کہہ دیا تو سب کی طرف سے واجب ادا ہوگیا۔ لیکن ساری مجلس میں کسی ایک فرد نے بھی "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" نہیں کہا تو تمام افراد ترک واجب کی وجہ سے گناہ گار ہوں گے۔

فرض عین اور فرض کفایہ کا مطلب

یہ سب اصطلاحات بھی جاننے کی ہیں اور سیکھنی چاہئیں۔ دیکھئے! ایک ہے "فرض عین" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کام ہر ایک آدمی پر فرض ہے، جیسے نماز ہر ہر آدمی پر علیحدہ علیحدہ فرض ہے، ایک کی نماز سے دوسرے کی نماز ادا نہیں ہوتی، اس کو "فرض عین" کہا جاتا ہے۔ دوسرا ہے "فرض کفایہ" اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بہت سے افراد میں سے ایک دو افراد نے بھی وہ کام کرلیا تو سب کی طرف سے وہ فریضہ ادا ہو جائے گا، جیسے نماز جنازہ "فرض کفایہ" ہے، اگر چند افراد بھی نماز جنازہ ادا کرلیں گے تو

سب کی طرف سے فرض ادا ہو جائے گا، لیکن اگر کوئی بھی نہیں پڑھے گا تو سب گناہ گار ہوں گے۔

مثلاً رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرنا "سنت موکدہ علی الکفایہ" ہے۔ یعنی اگر محلے میں سے کوئی ایک شخص بھی مسجد میں جا کر اعتکاف میں بیٹھ گیا تو تمام اہل محلّہ کی طرف سے وہ سنت ادا ہو جائے گی، لیکن اگر ایک شخص بھی اعتکاف میں نہیں بیٹھا تو سارے محلے والے ترک سنت موکدہ کے گناہ گار ہوں گے۔ اسی طرح چھینکنے والے کا جواب دینا "واجب علی الکفایہ" ہے، یعنی اگر مجلس میں ایک شخص نے بھی جواب دیدیا تو سب کی طرف سے واجب ادا ہو گیا، لیکن اگر کسی نے بھی جواب نہ دیا تو سب کے سب ترک واجب کے گناہ گار ہوں گے۔

یہ مسلمان کا ایک حق ہے

ہم لوگ ذرا جائزہ لیں کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس واجب سے کتنی غفلت برتتے ہیں۔ اول تو چھینکنے والا "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" نہیں کہتا، اور اگر وہ "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہے تو سننے والے "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کے ذریعہ جواب دینے کا اتنا اہتمام نہیں کرتے جتنا اہتمام کرنا چاہئے۔ حضور اقدس ﷺ اس حدیث کے ذریعہ یہ بتا رہے ہیں کہ "تشمیت" کرنا ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے اور اس کے ذمے واجب ہے۔

کتنی مرتبہ جواب دینا چاہئے

البتہ جیسا کہ ابھی بتلایا کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے آسانی یہ فرمادی ہے کہ ایک تو اس حق کو "واجب علی الکفایہ" قرار دیا، دوسرے یہ کہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو مسلسل چھینکیں آرہی ہیں اور وہ مسلسل اَلْحَمْدُلِلّٰہِ کہہ رہا ہے، اور سننے والا مسلسل "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کہتا جا رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ دوسرے کام چھوڑ کر بس یہی کرتا رہے۔ تو اس کے بارے میں بھی حضور اقدس ﷺ نے یہ ادب بتا دیا کہ اگر ایک مرتبہ چھینک آئے تو جواب دینا واجب ہے، اور دوسری مرتبہ چھینک آئے تو جواب دینا سنت ہے، اور تیسری مرتبہ جواب دینا بھی سنت ہے اور باعث اجر وثواب ہے۔ اس کے بعد اگر چھینک آئے تو جواب نہ تو واجب ہے اور نہ سنت ہے البتہ اگر کوئی شخص جواب دینا چاہے تو جواب دیدے، انشاء اللہ اس پر بھی ثواب ملے گا۔

حضور ﷺ کا طرز عمل

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مجلس میں حضور اقدس ﷺ تشریف فرما تھے، ایک صحابی کو

چھینک آئی، انہوں نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہا، آپ ﷺ نے جواب میں "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" فرمایا، دوسری مرتبہ پھر چھینک آئی، آپ ﷺ نے جواب دیا "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" تیسری مرتبہ پھر چھینک آئی آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ جواب دیا "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" جب چوتھی مرتبہ ان کو چھینک آئی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((رَجُلٌ مَزْكُوْمٌ))(۱)

یعنی "ان صاحب کو نزکام ہے اور اس مرتبہ آپ ﷺ نے جواب نہیں دیا"۔

اس حدیث کے ذریعہ آپ ﷺ نے یہ مسئلہ بتا دیا کہ تیسری مرتبہ کے بعد جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ دیکھئے! شریعت نے ہماری اور آپ کی سہولت کے لئے کن کن باریکیوں کی رعایت فرمائی ہے تاکہ یہ نہ ہو کہ آدمی بس اسی کام میں لگا رہے اور دوسرے ضروری کام چھوڑ بیٹھے۔

یہ جواب دینا کب واجب ہے؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" کے ذریعہ جواب دینا اس وقت واجب ہے جب چھینکنے والا "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہے، اگر چھینکنے والے نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" نہیں کہا تو اس کا جواب دینا واجب نہیں، لیکن جواب دینا اچھا ہے، تاکہ چھینکنے والے کو تنبیہ ہو جائے کہ مجھے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہنا چاہئے تھا۔

حضور اقدس ﷺ کا جواب نہ دینا

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ مجلس میں تشریف فرما تھے، ایک صحابی کو چھینک آئی، انہوں نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہا، آپ نے ﷺ جواب میں "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" فرمایا، تھوڑی دیر کے بعد ایک اور صحابی کو چھینک آئی، لیکن انہوں نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" نہیں کہا، آپ ﷺ نے "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" بھی نہیں کہا۔ ان صحابی نے حضور اقدس ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ان صاحب کو تھوڑی دیر پہلے چھینک آئی تھی تو آپ نے ان کو "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" کے ذریعہ دعا دیدی تھی اور اب مجھے چھینک آئی تھی تو آپ ﷺ مجھے دعا نہیں دی۔ آپ نے جواب دیا کہ ان صاحب نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہہ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا، اس لئے میں نے ان کے جواب میں "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ"

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب تشمیت العاطس و كراهة التثاؤب، رقم: ۵۳۰۹، سنن الترمذی، کتاب الأدب عن رسول الله، باب ما جاء كم يشمت العاطس، رقم: ۲۶۶۷، سنن أبي داود، كتاب الادب، باب كم مرة يشمت العاطس، رقم: ۴۳۸۰، مسند أحمد، رقم: ۱۵۹۰۴

کہا، تم نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" نہیں کہا، اس لئے میں نے جواب میں "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" نہیں کہا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" کے ذریعہ جواب دینا اس وقت واجب ہے جب چھینکنے والا "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہے۔(۱)

چھینکنے والا بھی دعا دے

پھر تیسری بات یہ ہے کہ جب "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کے جواب میں سننے والے نے "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" کہا تو اب چھینکنے والے کو چاہئے کہ وہ "یَهْدِیْكُمُ اللّٰہُ" کہے۔

اس لئے کہ جب سننے والے نے یہ دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے تو اب جواب میں چھینکنے والا اس کو یہ دعا دے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت عطا فرمائے اور تمہارے سب کام ٹھیک کر دے۔ ان احکام کے ذریعہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو دعا دینے کی عادت ڈالی جا رہی ہے، کیونکہ جب ایک مومن دوسرے مومن کے لئے دعا کرتا ہے تو اس دعا کی قبولیت کی بہت امید ہوتی ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ دوسروں کے لئے دعا کیا کرو۔(۲)

ایک چھینک پر تین مرتبہ ذکر

دیکھئے! چھینک ایک مرتبہ آئی، لیکن اس میں تین مرتبہ اللہ کا ذکر ہو گیا، تین مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو گیا اور تین دعائیں ہو گئیں۔ اور دو مسلمانوں کے درمیان آپس میں دعاؤں کا تبادلہ ہوا، اور اس تبادلے کے نتیجے میں ایک دوسرے سے ہمدردی اور خیر خواہی کرنے کا ثواب بھی ملا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بھی قائم ہو گیا۔ یہ وہ نسخہ کیمیا ہے جو حضور اقدس ﷺ بیان کر کے تشریف لے گئے۔ بہر حال! "تشمیت" کرنا، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے اور واجب ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الحمد للعاطس، رقم:۵۷۵۳، صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب تشمیت العاطس و کراهة التثاؤب، رقم:۵۳۰۷، سنن الترمذی، کتاب الادب عن رسول الله، باب ما جاء فی إیجاب التشمیت بحمد العاطس، رقم:۲۶۶۶، سنن أبی داود، کتاب الادب، باب فیمن یعطس ولایحمد الله، رقم:۴۳۸۲، سنن ابن ماجه، کتاب الادب، باب تشمیت العاطس، رقم:۳۷۰۳، مسند أحمد، رقم:۷۹۹۶

(۲) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب اذا عطس کیف یشمت، رقم:۵۷۵۶، سنن الترمذی، کتاب الادب عن رسول الله، باب ماجاء کیف تشمیت العاطس، رقم:۲۶۶۳: سنن أبی داود، کتاب الادب، باب ماجاء فی تشمیت العاطس، رقم:۴۳۷۷، سنن ابن ماجه، کتاب الادب، باب تشمیت العاطس، رقم:۳۷۰۵، مسند أحمد، رقم:۹۲۵، سنن الدارمی، کتاب الاستئذان، باب اذاعطس الرجل مایقول، رقم:۲۵۴۴

کمزور اور مظلوم کی مدد کرنا

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر پانچواں حق یہ بیان فرمایا:

((نَصْرُ الضَّعِيْفِ))

"کمزور کی مدد کرنا"

اسی کے ساتھ چھٹا حق یہ بیان فرمایا:

((عَوْنُ الْمَظْلُوْمِ))

"مظلوم کی مدد کرنا"

"جو شخص کسی ظلم کا شکار ہے، اس سے ظلم دور کرنے کے لئے اس کی مدد کرنا بھی ایک مومن کا دوسرے مومن پر حق ہے"

اور یہ انسان کے اندر جتنی استطاعت ہو، اس استطاعت کی حد تک دوسرے مسلمان کی مدد کرنا واجب ہے، اگر ایک مومن قدرت کے باوجود دوسرے مومن کو ظلم سے نہ بچائے یا اس کی مدد نہ کرے تو وہ گناہ گار ہوگا۔

مظلوم کی مدد واجب ہے

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يُسْلِمُهٗ))(۱)

"ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ خود اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے"

یعنی اگر کوئی شخص کسی مسلمان پر ظلم کر رہا ہے اور تم اس کو روک سکتے ہو، تو ایسے موقع پر اس کو بے یار و مددگار چھوڑنا جائز نہیں، بلکہ اس کی مدد کرنا واجب ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغصب، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه، رقم:۲۲٦۲، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظلم، رقم:٤٦۷۷، سنن الترمذی، کتاب الحدود عن رسول الله، باب ماجاء فی الستر علی المسلم، رقم:۱۳٤٦، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب المواخاة، رقم:٤۲٤۸، مسند أحمد، رقم:۵۱۰۳

ورنہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے گا

بلکہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے بڑی سخت وعید بیان فرمائی کہ اگر کچھ لوگ یہ دیکھ رہے ہوں کہ کوئی شخص کسی مسلمان پر ظلم کر رہا ہے، چاہے وہ ظلم جانی ہو یا مالی ہو، اور ان کو اس ظالم کا ہاتھ پکڑنے کی اور اس شخص کو ظلم سے بچانے کی قدرت ہو، پھر بھی وہ اس ظالم کا ہاتھ نہ پکڑیں، اور اس کو ظلم سے نہ بچائیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر اپنا عذاب نازل فرمادے۔

عذاب کی مختلف شکلیں

پھر یہ ضروری نہیں کہ وہ عذاب اسی قسم کا ہو جیسے پچھلی امتوں پر عذاب آئے، مثلاً آسمان سے انگارے برسیں، یا طوفان آجائے، یا ہوا کے جھکڑ چل پڑیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے عذاب اور عتاب سے محفوظ رکھے۔ آمین، ہم دن رات جو دیکھ رہے ہیں کہ ڈاکے پڑ رہے ہیں، چوریاں ہو رہی ہیں، بدامنی اور بے چینی کا دور دورہ ہے، کسی شخص کی جان، کسی کا مال، کسی کی عزت اور آبرو محفوظ نہیں، ہر شخص بے چینی اور بے اطمینانی کا شکار ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کے عذاب کے عنوانات ہیں، یہ سب عذاب کی مختلف شکلیں ہیں۔ اب یہ تو دور آگیا ہے کہ اپنی آنکھوں سے ایک انسان پر ظلم ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اور اس کو ظلم سے بچانے کی قدرت بھی ہے، لیکن اس کے باوجود اس کو ظلم سے بچانے کی طرف توجہ نہیں ہے۔

احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

خاص طور پر جب سے ہمارے یہاں مغربی تہذیب کا سیلاب امڈ آیا ہے اور لوگوں کے پاس دولت آگئی ہے تو اس دولت نے لوگوں کو اس طرح اندھا کر دیا ہے مروت، انسانیت، شرافت سب کچل کر رہ گیا ہے۔ اقبال مرحوم نے کہا تھا:

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

لہٰذا ان جدید آلات نے مروت کے احساس کچل دیا ہے۔

ایک عبرتناک واقعہ

ایک مرتبہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بہت شاندار کار سڑک پر گزری، جس میں

کوئی صاحب بہادر بیٹھے تھے، اور اس کار نے ایک راہ گیر کو ٹکر ماری، وہ سڑک پر گرا اور اس کے جسم سے خون بہنے لگا، مگر ان صاحب بہادر کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ کار روک کر دیکھ لے کہ کتنی چوٹ آئی، صرف اتنا ہوا کہ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ ایک شخص زمین پر گرا ہوا ہے، بس یہ دیکھ کر وہ روانہ ہو گیا۔ وجہ یہ ہے کہ اس دولت نے اور اس مغربی تہذیب نے ہمیں اس درجہ پر پہنچا دیا کہ کسی آدمی کی جان مکھی اور مچھر سے زیادہ بے وقعت ہو کر رہ گئی ہے، آج کا انسان انسان نہیں رہا۔

مسلمان کی مدد کرنے کی فضیلت

واقعہ یہ ہے کہ انسان اس وقت تک انسان نہیں بن سکتا جب تک وہ محمد ﷺ کی سنت پر عمل نہ کرے، آپ کی سنت یہ ہے کہ آدمی ضعیف کی مدد کرے اور مظلوم کے ساتھ تعاون کرے۔ حضور اقدس ﷺ نے اس کی بڑی فضیلت بھی ارشاد فرمائی ہے:

((وَاللّٰهُ فِیْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا کَانَ الْعَبْدُ فِیْ عَوْنِ اَخِیْهِ))(۱)

یعنی جب تک مسلمان کسی معاملے میں اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی مدد کرتا رہتا ہے اور اس کے کام بناتا رہتا ہے۔

زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے بڑا اچھا ارشاد فرمایا۔ اس حدیث کے بارے میں محدثین کے یہاں یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ جب بھی کوئی طالب علم کسی محدث کے پاس حدیث پڑھنے جاتا ہے تو استاذ اس طالب علم کو سب سے پہلے یہ حدیث سناتے ہیں، وہ حدیث یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْكُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ))(۲)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن وعلی الذکر، رقم: ٤٨٦٧، سنن الترمذی، کتاب الحدود عن رسول الله، باب ما جاء فی الستر علی المسلم، رقم: ١٣٤٥، سنن أبی داود، کتاب الادب، باب فی المعونة للمسلم، رقم: ٤٦٩٥، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، رقم: ٢٢١، مسند أحمد، رقم: ٧١١٨

(۲) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی رحمة الناس، رقم: ١٨٤٧، سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی الرحمة، رقم: ٤٢٩٠

”رحم کرنے والوں پر ”رحمٰن“ رحم کرتا ہے تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا“
اور جو آدمی زمین والوں پر رحم کرنا نہیں جانتا، اس کو آسمان والے سے بھی رحمت کی توقع مشکل ہے۔ بہر حال! ضعیف کی مدد کرنا اور مظلوم کی اعانت کرنا اسلامی تعلیمات کا اہم شعار ہے۔

قسم کھانے والے کی مدد کرنا

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر حقوق ہیں، ان میں سے ساتواں حق جو حدیث میں بیان فرمایا: وہ ہے:

((اِبْرَارُ الْمُقْسِمِ))

اس کا مطلب ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کوئی قسم کھالی ہے اور اب وہ اس قسم کو پورا کرنے پر قادر نہیں ہے، تو ایسے مسلمان کی مدد کرنا تا کہ وہ اپنی قسم پوری کر لے، یہ بھی مسلمان کے حقوق میں داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

☆☆☆

سلام کرنے کے آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِسَبْعٍ: ((عِيَادَةِ الْمَرِيْضِ وَ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَتَشْمِيْتِ الْعَاطِسِ وَنَصْرِ الضَّعِيْفِ وَعَوْنِ الْمَظْلُوْمِ وَاِفْشَاءِ السَّلَامِ وَاِبْرَارِ الْمُقْسِمِ))(۱)

سات باتوں کا حکم

''حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا (۱) مریض کی عیادت کرنا (۲) جنازوں کے پیچھے چلنا (۳) چھینکنے والے اَلْحَمْدُلِلّٰہِ کہنے کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا (۴) کمزور آدمی کی مدد کرنا (۵) مظلوم کی امداد کرنا (۶) سلام کو رواج دینا (۷) قسم کھانے والے کی قسم کو پورا کرنے میں تعاون کرنا''

ان سات میں سے الحمدللہ پانچ چیزوں کا بیان ہو چکا، چھٹی چیز ہے سلام کو رواج دینا، اور آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت سلام کرنا۔ سلام کرنے کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ایسا مقرر فرمایا ہے جو ساری دوسری قوموں سے بالکل ممتاز ہے، ہر قوم کا یہ دستور ہے کہ جب وہ آپس میں ملاقات کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی لفظ ضرور استعمال کرتے ہیں۔ کوئی ''ہیلو'' کہتا ہے۔ کوئی ''گڈ مارننگ'' کہتا ہے۔ کوئی ''گڈ ایوننگ'' کہتا ہے۔ کوئی ''نمستے'' کہتا ہے۔ کوئی ''نمسکار'' کہتا ہے۔ گویا کہ ہر قوم والے کوئی نہ کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اللہ جل جلالہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے

☆ اصلاحی خطبات (۲/۱۸۲ تا ۱۹۵) ستمبر ۱۹۹۳ء جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاری، كتاب الاستئذان، باب افشاء السلام، رقم: ۵۷٦٦، مسند أحمد، رقم: ۱۷۷۷۳

ہمارے لئے جو لفظ تجویز فرمایا ہے وہ تمام الفاظ سے نمایاں اور ممتاز ہے، وہ ہے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''

سلام کرنے کا فائدہ

دیکھئے اگر آپ نے کسی سے ملاقات کے وقت ''ہیلو'' کہہ دیا تو آپ کے اس لفظ سے اس کو کیا فائدہ ہوتا؟ دنیا کا کوئی فائدہ ہوا؟ یا آخرت کا کوئی فائدہ ہوا؟ ظاہر ہے کہ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لیکن اگر آپ نے ملاقات کے وقت یہ الفاظ کہے: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''تم پر سلامتی ہو، اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں'' تو ان الفاظ سے یہ فائدہ ہوا کہ آپ نے ملاقات کرنے والے کو تین دعائیں دیدیں، اور اگر آپ نے کسی کو ''گڈ مارننگ'' کہا یعنی صبح بخیر، تو اگر اس کو دعا کے معنی پر بھی محمول کر لیں تو اس صورت میں آپ نے جو اس کو دعا دی، وہ صرف صبح اور شام کی حد تک محدود ہے کہ تمہاری صبح اچھی ہو جائے، یا تمہاری شام اچھی ہو جائے، لیکن اسلام نے ہمیں جو کلمہ سکھایا، وہ ایسا جامع کلمہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ بھی کسی مخلص مسلمان کا سلام اور دعا ہمارے حق میں اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے تو انشاء اللہ ساری گندگی ہم سے دور ہو جائے گی، اور دنیا و آخرت کی فلاح حاصل ہو جائے گی۔ یہ نعمت آپ کو دنیا کی دوسری قوموں میں نہیں ملے گی۔

سلام اللہ کا عطیہ ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کو جاؤ اور فرشتوں کی جو جماعت بیٹھی ہے اس کو سلام کرو۔ اور وہ فرشتے جو جواب دیں اس کو سننا اس لئے کہ وہ تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے جا کر سلام کیا ''السلام علیکم'' تو فرشتوں نے جواب میں کہا: ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' چنانچہ فرشتوں نے لفظ ''رحمۃ اللہ'' بڑھا کر جواب دیا۔(۱)

یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس طرح عطا فرمائی۔ اگر ذرا غور کریں تو یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اسکا حد وحساب ہی نہیں۔ اب اس سے زیادہ ہماری بدنصیبی کیا ہوگی کہ اس اعلیٰ ترین کلمے کو چھوڑ کر ہم اپنے

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب بدء السلام، رقم: ۵۷۵۹، صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، باب یدخل الجنة أقوام أفئدتهم مثل أفئدة الطیر، رقم: ۵۰۷۵، مسند أحمد، رقم: ۷۸۲٤

بچوں کو "گڈ مارننگ" "گڈ ایوننگ" سکھائیں۔ اور دوسری قوموں کی نقالی کریں۔ اس سے زیادہ ناقدری اور ناشکری اور محرومی اور کیا ہوگی۔

سلام کرنے کا اجر وثواب

افضل طریقہ یہ ہے کہ ملاقات کے وقت پورا سلام کیا جائے۔ یعنی "السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہ" صرف "السلام علیکم" کہہ دیا تب بھی سلام ہو جائے گا۔ لیکن تین جملے بولنے میں زیادہ اجر وثواب ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ مجلس میں تشریف فرما تھے ایک صحابی تشریف لائے اور کہا: "السلام علیکم" آپ نے ان کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: "دس" اس کے بعد دوسرے صحابی آئے اور آ کر سلام کیا۔ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" آپ نے ان سلام کا جواب دیا اور فرمایا "بیس" اس کے بعد تیسرے صحابی آئے اور آ کر سلام کیا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آپ نے ان کو سلام کا جوب دیا اور فرمایا "تیس" (۱)

آپ کا مطلب یہ تھا کہ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہنے میں بیس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اور "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہنے میں تیس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ اگرچہ سلام کی سنت صرف "السلام علیکم" کہنے سے ادا ہو جاتی ہے۔ دیکھئے: ان الفاظ میں دعا بھی ہے اور اجر وثواب الگ ہے۔

اور جب سلام کیا جائے تو صاف الفاظ سے سلام کرنا چاہیے، الفاظ بگاڑ کر مسخ کر کے سلام نہیں کرنا چاہئے، بعض لوگ اس طرح سلام کرتے ہیں کہ جس کی وجہ سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا کیا الفاظ کہے؟ اس لئے پوری طرح واضح کر کے "السلام علیکم" کہنا چاہئے۔

سلام کے وقت یہ نیت کرلیں

ایک بات میں اور غور کیجئے کہ حضور اقدس ﷺ نے ہمیں جو کلمہ تلقین فرمایا وہ ہے "السلام علیکم" جو جمع کا صیغہ ہے۔ "السلام علیک" نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ "السلام علیک" کے معنی ہیں "تجھ پر سلامتی ہو" اور السلام علیکم کے معنی ہیں کہ تم پر سلامتی ہو۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس طرح ہم لوگ اپنی گفتگو میں "تو" کے بجائے "تم" یا "آپ" کے لفظ سے خطاب کرتے ہیں اس کے ذریعہ مخاطب کی تعظیم مقصود ہوتی ہے اسی طرح "السلام علیکم" میں جمع کا لفظ مخاطب کی تعظیم کے لئے لایا گیا ہے۔

---

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الادب، باب كيف السلام، رقم: ٤٥٢١، سنن الدارمي، كتاب الاستئذان، باب في فضل التسليم ورده، رقم: ٢٥٢٦

لیکن بعض علماء نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ اس لفظ سے ایک تو مخاطب کی تعظیم مقصود ہے۔ دوسرے یہ کہ جب تم کسی کو سلام کرو تو سلام کرتے وقت یہ نیت کرو کہ تین افراد پر سلام کرتا ہوں۔ جو اس کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں۔ جن کو "کراماً کاتبین" کہا گیا ہے' ایک فرشتہ انسان کی نیکیاں لکھتا ہے' دوسرا فرشتہ اس کی برائیاں لکھتا ہے' اس لئے سلام کرتے وقت ان کی بھی نیت کرلو تا کہ تمہارا سلام تین افراد کو ہو جائے۔ اور اب انشاء اللہ تین افراد کو سلام کرنے کا ثواب مل جائے گا اور جب تم فرشتوں کو سلام کرو گے تو وہ تمہارے سلام کا ضرور جواب بھی دیں گے۔ اور اس طرح ان فرشتوں کی دعائیں تمہیں حاصل ہو جائیں گی جو اللہ تعالیٰ کی معصوم مخلوق ہیں۔

نماز میں سلام پھیرتے وقت کی نیت

اسی وجہ سے بزرگوں نے فرمایا کہ نماز کے اندر جب آدمی سلام پھیرے تو داہنی طرف سلام پھیرتے وقت یہ نیت کرلے کہ میرے دائیں جانب جتنے مسلمان اور جتنے فرشتے ہیں۔ ان سب پر سلامتی بھیج رہا ہوں۔ اور جب بائیں جانب سلام پھیرے تو اس وقت یہ نیت کرلے کہ میرے بائیں جانب جتنے مسلمان اور جتنے فرشتے ہیں۔ ان سب پر سلامتی بھیج رہا ہوں۔ اور پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ تم فرشتوں کو سلام کرو' اور وہ جواب نہ دیں۔ وہ ضرور جواب دیں گے' اور اس طرح ان کی دعائیں تمہیں حاصل ہو جائیں گی۔ لیکن ہم لوگ بے خیالی میں سلام پھیر دیتے ہیں اور نیت نہیں کرتے جس کی وجہ سے اس عظیم فائدے اور ثواب سے محروم رہ جاتے ہیں۔

جواب سلام سے بڑھ کر ہونا چاہئے

سلام کی ابتداء کرنا بڑا اجر و ثواب کا موجب ہے اور سنت ہے۔ اور سلام کا جواب دینا واجب ہے' قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا﴾(۱)

فرمایا کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس کے سلام سے بڑھ کر جواب دو کم از کم ویسا جواب دو جیسا اس نے سلام کیا۔ مثلاً کسی نے "السلام علیکم" کہا تو تم جواب میں "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہو۔ تا کہ جواب سلام سے بڑھ کر ہو جائے۔ ورنہ کم از کم "وعلیکم السلام" ہی کہہ دو تا کہ جواب برابر ہو جائے۔

---

(۱) النساء: ۸۶

مجلس میں ایک مرتبہ سلام کرنا

اگر مجلس میں بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ اور ایک شخص اس مجلس میں آئے' تو وہ آنے والا شخص ایک مرتبہ سب کو سلام کرلے تو یہ کافی ہے۔ اور مجلس میں سے ایک شخص اس کے سلام کا جواب دیدے تو سب کی طرف سے واجب ادا ہو جاتا ہے۔ ہر ایک کو علیحدہ جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

ان مواقع پر سلام کرنا جائز نہیں

سلام کرنا بہت سی جگہ پر نا جائز بھی ہوتا ہے۔ مثلاً جب کوئی شخص دوسرے لوگوں سے کوئی دین کی بات کر رہا ہو' اور دوسرے لوگ سن رہے ہوں۔ تو اس وقت آنے والے کو سلام کرنا جائز نہیں۔ بلکہ سلام کئے بغیر مجلس میں بیٹھ جانا چاہئے۔ اسی طرح اگر ایک شخص تلاوت کر رہا ہے۔ اس کو سلام کرنا بھی جائز نہیں۔ اسی طرح ذکر کرنے والے کو سلام کرنا جائز نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی آدمی کسی کام میں مشغول ہو اور اس بات کا اندیشہ ہو کہ تمہارے سلام کا جواب دینے سے اس کے کام میں حرج ہوگا' ایسی صورت میں سلام کرنے کو پسند نہیں کیا گیا۔ اس لئے ایسے موقع پر سلام نہیں کرنا چاہئے۔

دوسرے کے ذریعہ سلام بھیجنا

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کا سلام پہنچاتا ہے۔ کہ فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے' اور دوسرے شخص کے ذریعہ سلام بھیجنا بھی سنت ہے۔ اور یہ بھی سلام کے قائم مقام ہے' اور اس کے ذریعے بھی سلام کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جب کسی کو دوسرے کا سلام پہنچایا جائے تو اس کے جواب کا مسنون طریقہ یہ ہے" علیھم و علیکم السلام " اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر بھی سلامتی ہو' جنہوں نے سلام بھیجا ہے۔ اور تم پر بھی سلامتی ہو۔ اس میں دو سلام اور دو دعائیں جمع ہو گئیں۔ اور دو آدمیوں کو دعا دینے کا ثواب مل گیا۔

بعض لوگ اس موقع پر بھی صرف "وعلیکم السلام" سے جواب دیتے ہیں۔ اس سے جواب تو ادا ہو جائے گا۔ لیکن صحیح جواب نہیں ہوگا' اس لئے کہ اس صورت میں آپ نے اس شخص کو تو سلامتی کی دعا دے دی جو سلام لانے والا ہے۔ اور وہ شخص جو اصل سلام بھیجنے والا تھا۔ اس کو دعا نہیں دی۔ اس لئے جواب دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ "علیھم و علیکم السلام " کہہ کر جواب دیا جائے۔

تحریری سلام کا جواب واجب ہے

اگر کسی کے پاس کسی شخص کا خط آئے، اور اس خط میں "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" لکھا ہو تو اس کے بارے میں بعض علماء نے فرمایا کہ اس سلام کا تحریری جواب دینا چونکہ واجب ہے، اس لئے خط کا جواب دینا بھی واجب ہے۔ اگر خط کے ذریعہ اس کے سلام کا جواب اور اس کے خط کا جواب نہیں دیں گے تو ایسا ہوگا کہ جیسے کوئی شخص آپ کو سلام کرے، اور آپ جواب نہ دیں۔

لیکن بعض دوسرے علماء نے فرمایا کہ اس خط کا جواب دینا واجب نہیں ہے۔ اس لئے کہ خط کا جواب دینے میں پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ اور کسی انسان کے حالات بعض اوقات اس کے متحمل نہیں ہوتے کہ وہ پیسے خرچ کرے، اس لئے اس خط کا جواب دینا واجب تو نہیں ہے، لیکن مستحب ضرور ہے، البتہ جس وقت خط کے اندر سلام کے الفاظ پڑھے، اس وقت زبان سے اس سلام کا جواب دینا واجب ہے، اور اگر خط پڑھتے وقت بھی زبان سے سلام کا جواب نہ دیا۔ اور نہ خط کا جواب دیا۔ تو اس صورت میں ترک واجب کا گناہ ہوگا، اس میں ہم سے کتنی کوتاہی ہوتی ہے کہ خط آتے ہیں اور پڑھ کر اس کو ویسے ہی ڈال دیتے ہیں نہ زبانی جواب دیتے ہیں، نہ تحریری جواب دیتے ہیں۔ اور مفت میں ترک واجب کا گناہ اپنے نامہ اعمال میں لکھوا لیتے ہیں۔ یہ سب ناواقفیت کی وجہ سے کر لیتے ہیں۔ اس لئے جب بھی خط آئے تو فوراً زبانی سلام کا جواب دے دینا چاہئے۔

غیر مسلموں کو سلام کرنے کا طریقہ

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ غیر مسلم کو سلام کرنا جائز نہیں۔ اگر غیر مسلم سے ملاقات ہو، اور اسے سلام کرنے کی ضرورت پیش آئے تو سلام کے لئے وہ لفظ استعمال کرے جو لفظ وہ لوگ خود استعمال کرتے ہیں، لیکن اگر غیر مسلم کسی مسلمان سے ملاقات کے وقت "السلام علیکم" کہے تو ان کے جواب میں صرف "وعلیکم" کہے۔ اور پورا جواب نہ دے۔ اور یہ لفظ کہتے وقت یہ نیت کر لے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو ہدایت کی اور مسلمان بننے کی توفیق ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں مدینے منورہ میں اور اس کے آس پاس بڑی تعداد میں یہودی آباد تھے، یہ قوم ہمیشہ سے شریر قوم ہے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب سامنے آتے تو یہ لوگ خباثت سے کام لیتے ہوئے ان کو سلام کرتے ہوئے کہتے "السام علیکم"، لام درمیان سے نکال دیتے تھے، اب سننے والا جلدی میں یہی سمجھتا ہے کہ اس نے "السلام علیکم" کہا ہے۔ "سام" کے معنی عربی زبان میں موت اور ہلاکت کے ہیں۔ "السام علیکم" کے معنی ہوئے کہ تمہیں موت آجائے۔ اور تم ہلاک اور تباہ ہو جاؤ، ظاہر

میں تو سلام کرتے۔ اور حقیقت میں بددعا دیتے تھے۔ کچھ روز تک یہ معاملہ چل گیا۔ لیکن چند روز کے بعد صحابہ نے سمجھ لیا کہ یہ لوگ جان بوجھ کر درمیان سے لام حذف کر کے "السام علیکم" کہتے ہیں۔(۱)

ایک یہودی کا سلام کرنے کا واقعہ

ایک مرتبہ یہودیوں کی ایک جماعت نے آ کر حضور اقدس ﷺ کو اس طرح سلام کیا:

"اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ الفاظ سنے تو ان کو غصہ آ گیا اور جواب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"عَلَیْکُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ"

"تم پر ہلاکت ہو اور لعنت ہو"

دو لفظ بول دیئے' حضور اقدس ﷺ نے سن لیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ترکی بترکی جواب دیا ہے، تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

((مَهْلًا يَا عَائِشَةُ))

"اے عائشہ! رک جاؤ اور نرمی سے کام لو"

پھر فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْاَمْرِ كُلِّهِ))

"اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں نرمی کو پسند فرماتے ہیں"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ کیسے گستاخ ہیں کہ آپ سے خطاب کرتے ہوئے "السام علیکم" کہہ رہے ہیں۔ اور ہلاکت کی بددعا کر رہے ہیں' آپ نے فرمایا: اے عائشہ! "السام علیکم" کہا تو میں نے جواب میں کہا "وعلیکم"

مطلب یہ ہے کہ جو بددعا تم ہمارے لئے کر رہے ہو اللہ تعالیٰ وہ تمہارے حق میں قبول کر لے۔ لہٰذا غیر مسلم کے سلام کے جواب میں صرف "وعلیکم" کہنا چاہئے۔ پھر آپ نے فرمایا:

((يَا عَائِشَةُ! مَا كَانَ الرِّفْقُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا زَانَهُ وَلَا نُزِعَ عَنْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهُ))

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب کیف یرد علی أهل الذمة السلام، رقم: ۵۷۸۶، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب النهی عن ابتداء أهل الکتاب بالسلام و کیف یرد، رقم: ۴۰۲۷، سنن الترمذی، کتاب الاستئذان و الآداب عن رسول الله، باب ماجاء فی التسلیم علی اهل الذمة، رقم: ۲۶۲۵، مسند أحمد، رقم: ۲۲۹۶۱

''اے عائشہ! نرمی جس چیز میں ہوگی اس کو زینت بخشے گی اور جس چیز سے نکال دی جائے گی اس کو عیب دار کردے گی'' (۱)

اس لئے معاملہ حتی الامکان نرمی سے کرنا چاہئے۔ چاہے مقابلے پر کفار ہی ہوں۔

حتی الامکان نرمی کرنا چاہئے

آپ دیکھئے کہ یہودی نے حضور اقدس ﷺ کے ساتھ گستاخی کی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو الفاظ جواب میں فرمائے بظاہر وہ انصاف کے خلاف نہیں تھے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے یہ سکھا دیا کہ میری سنت یہ ہے کہ نرمی کا معاملہ کرو۔ اور صرف اتنی بات زبان سے ادا کرو جتنی ضرورت ہے۔ بلاوجہ اپنی طرف سے بات آگے بڑھا کر سختی کا برتاؤ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔

سلام ایک دعا ہے

بہر حال یہ ''سلام'' معمولی چیز نہیں یہ زبردست دعا ہے۔ اور اس کو دعا کی نیت سے کہنا اور سننا چاہئے۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر ایک آدمی کی بھی دعا ہمارے حق میں قبول ہو جائے تو ہمارا بیڑہ پار ہو جائے۔ اس لئے کہ دنیا و آخرت کی ساری نعمتیں اس سلام کے اندر جمع ہیں۔ یعنی تم پر سلامتی ہو۔ اللہ کی رحمت ہو۔ اور اللہ کی برکت ہو۔ اس لئے یہ دعا لوگوں سے لینی چاہئے۔ اور اس شوق اور ذوق میں لینی چاہئے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کی زبان میرے حق میں مبارک کردے۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کی حالت

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ اور حضرت جنید بغدادیؒ کے دادا پیر ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں۔ اور حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں۔ ہر وقت ذکر اللہ میں مصروف رہتے تھے۔ کوئی وقت اللہ کے ذکر سے خالی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ حجام سے حجامت بنوا رہے تھے' جب مونچھیں بنانے کا وقت آیا تو حجام نے دیکھا کہ زبان حرکت کر رہی ہے۔ اور ہونٹ ہل رہے ہیں۔ حجام

(۱) صحيح البخاري، كتاب الاستئذان، باب كيف يرد على أهل الذمة السلام، رقم: ۵۷۸۶، صحيح مسلم، كتاب السلام، باب النهي عن ابتداء أهل الكتاب بالسلام و كيف يرد، رقم: ۴۰۲۷، سنن الترمذي، كتاب الاستئذان و الآداب عن رسول الله، باب ماجاء في التسليم على اهل الذمة، رقم: ۲۶۲۵، مسند أحمد، رقم: ۲۲۹۶۱

نے کہا کہ حضرت تھوڑی دیر کے منہ بند کر لیجئے۔ تاکہ میں آپ کی مونچھیں بنالوں' حضرت نے جواب دیا کہ تم تو اپنا کام کر رہے ہو میں اپنا کام نہ کروں؟ آپ کا یہ حال تھا۔ ہر وقت زبان پر ذکر جاری تھا۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

ان کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ راستے میں دیکھا کہ ایک سقہ لوگوں کو پانی پلا رہا ہے' اور یہ آواز لگا رہا ہے کہ ''اللہ اس بندے پر رحم کرے جو مجھ سے پانی پئے'' حضرت معروف کرخی اس سقہ کے پاس گئے۔ اور اس سے کہا کہ ایک گلاس پانی مجھے بھی پلادو' چنانچہ اس نے دیدیا' آپ نے پانی لے کر پی لیا' ایک ساتھی جوان کے ساتھ تھے' انہوں نے کہا کہ حضرت آپ تو روزے سے تھے: اور آپ نے پانی پی کر روزہ توڑ دیا: آپ نے فرمایا کہ یہ اللہ کا بندہ دعا کر رہا تھا کہ اللہ اس بندے پر رحم کرے جو مجھ سے پانی پی لے' مجھے خیال آیا کہ کیا معلوم اللہ تعالیٰ اس کی دعا میرے حق میں قبول کر لے نفل روزہ جو توڑ دیا اس کی قضا تو بعد میں کرلوں گا لیکن بعد میں اس بندے کی دعا مجھے مل سکے گی یا نہیں اس لئے میں نے اس بندے کی دعا لینے کے لئے پانی پی لیا۔

اب آپ اندازہ لگایئے کہ اتنے بڑے اللہ کے ولی' اتنے بڑے بزرگ' اتنے بڑے صوفی۔ لیکن ایک معمولی سے سقے کی دعا لینے کے لئے روزہ توڑ دیا۔ کیوں روزہ توڑ دیا؟ اس لئے کہ یہ حضرات اللہ کے بندوں کی دعائیں لینے کے حریص ہوتے ہیں کہ پتہ نہیں کس کی دعا کس وقت ہمارے حق میں قبول ہو جائے۔

''شکریہ'' کے بجائے ''جزاکم اللہ'' کہنا چاہئے

اسی وجہ سے ہمارے دین میں ہر ہر موقع کے لئے دعائیں تلقین کی گئی ہیں۔ مثلاً چھینکنے والے کے جواب میں کہو: ''یرحمك الله'' اللہ تم پر رحم کرے۔ ملاقات کے وقت ''السلام علیکم'' کہو' تم پر سلامتی ہو' کوئی تمہارے ساتھ بھلائی کرے تو کہو ''جَزَاکُمُ اللّٰہ'' اللہ تعالیٰ تمہیں بدلہ دے۔

آج کل یہ رواج ہو گیا ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے کے ساتھ کوئی بھلائی کرتا ہے تو اس کے جواب میں کہتا ہے کہ ''آپ کا بہت بہت شکریہ'' یہ لفظ کہنا یا شکریہ ادا کرنا کوئی گناہ کی بات نہیں۔ اچھی بات ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

((مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ))(۱)

(۱) سنن الترمذی، کتاب البروالصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی الشکر لمن أحسن الیك، رقم:۱۸۷۸ مسند احمد، رقم: ۷۱۹۱

''جو شخص انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا' وہ اللہ کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتا''

لیکن شکریہ ادا کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ کا شکر ادا کر رہے ہو اس کو کچھ دعا دے دو۔ تاکہ اس دعا کے نتیجے میں اس کا فائدہ ہو جائے۔ کیونکہ اگر آپ نے کہا کہ ''بہت بہت شکریہ'' تو ان الفاظ کے کہنے سے اس کو کیا ملا؟ کیا دنیا یا آخرت کی کوئی نعمت مل گئی؟ یا اس کو کوئی فائدہ پہنچا؟ کچھ نہیں ملا۔ لیکن جب تم نے ''جزاکم اللہ'' کہا تو اس کو ایک دعا مل گئی۔ بہر حال' اسلام میں یہ طریقہ سکھایا گیا کہ قدم قدم پر دوسروں کو دعائیں دو اور دعائیں لو۔ اس لئے ان کو اپنے معمولات میں اور شب و روز کی گفتگو میں شامل کر لینا چاہئے۔ خود بھی ان کی عادت ڈالیں۔ اور بچوں کو بھی بچپن ہی سے ان کلمات کو ادا کرنا سکھائیں۔

سلام کا جواب بلند آواز سے دینا چاہئے

ایک صاحب نے پوچھا ہے کہ سلام کا جواب بلند آواز سے دینا ضروری ہے یا آہستہ آواز سے بھی جواب دے سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ویسے تو سلام کا جواب دینا واجب ہے' البتہ اتنی آواز سے جواب دینا کہ سلام کرنے والا وہ جواب سن لے، یہ مستحب اور سنت ہے لیکن اگر اتنا آہستہ آواز سے جواب دیا کہ مخاطب نے وہ جواب نہیں سنا تو واجب تو ادا ہو جائے گا لیکن مستحب ادا نہیں ہوگا۔ لہٰذا بلند آواز سے جواب دینے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

☆☆☆

مصافحہ کے آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اسْتَقْبَلَهُ الرَّجُلُ فَصَافَحَهُ لَا يَنْزِعُ يَدَهُ عَنْ يَدِهِ، حَتّٰى يَكُونَ الرَّجُلُ هُوَ الَّذِيْ يَنْزِعُ وَلَا يَصْرِفُ وَجْهَهُ حَتّٰى يَكُونَ الرَّجُلُ هُوَ الَّذِيْ يَصْرِفُهُ وَلَمْ يُرَ مُقَدِّمًا رُكْبَتَيْهِ بَيْنَ يَدَيْ جَلِيْسٍ لَهُ.(۱)

یہ حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یہ وہ صحابی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیات عطا فرمائی تھی کہ دس سال تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم رہے، یہ دن رات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے تھے، ان کی والدہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا ان کو بچپن ہی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چھوڑ کر گئی تھیں۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے ہوئے ہی انہوں نے ہوش سنبھالا، وہ خود قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ میں نے پورے دس سال تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی، لیکن اس پورے دس سال کے عرصہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی مجھے ڈانٹا، نہ کبھی مارا اور نہ کبھی مجھ پر غصہ فرمایا اور نہ کبھی میرے کئے ہوئے کام کے بارے میں پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اور نہ کبھی نہ کئے ہوئے کام کے بارے میں یہ پوچھا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا؟ اس شفقت کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی پرورش فرمائی۔(۲)

☆ اصلاحی خطبات (۶/۱۹۸-۲۱۰) ۱۲ اگست ۱۹۹۴ء، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق و الورع عن رسول الله باب، رقم: ۲٤۱٤، سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب اكرام الرجل جليسه، رقم: ۳۷۰٦

(۲) صحیح مسلم، كتاب الفضائل، باب كان رسول الله احسن الناس خلقا، رقم: ٤۲٦۹، سنن الترمذی، کتا ب البر والصلة عن رسول الله، باب ماجاء فی خلق النبی، رقم: ۱۹۳۸، مسند أحمد، رقم: ۱۲۸۹٤، سنن الدارمی، كتاب المقدمة، باب فی حسن النبی، رقم: ٦۲

حضور ﷺ کی شفقت

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے مجھے کسی کام کے لئے بھیجا، میں گھر سے کام کرنے کے لئے نکلا، راستے میں دیکھا کہ بچے کھیل رہے ہیں (یہ خود بھی بچے ہی تھے) میں ان بچوں کے ساتھ کھیل میں لگ گیا، اور یہ بھول گیا کہ حضور اقدس ﷺ نے تو مجھے کسی کام کے لئے بھیجا تھا، جب کافی دیر گزر گئی تو مجھے یاد آیا۔ اب مجھے فکر ہوئی کہ میں نے وہ کام تو کیا نہیں، اور کھیل میں لگ گیا، چنانچہ میں گھر واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ کام خود حضور اقدس ﷺ نے اپنے دست مبارک سے انجام دے دیا ہے، مگر آپ نے مجھ سے یہ پوچھا نہیں کہ میں نے تم کو فلاں کام کے لئے بھیجا تھا۔ تم نے کیوں نہیں کیا؟ (۱)

حضور ﷺ سے دعاؤں کا حصول

خدمت کے دوران حضور اقدس ﷺ سے دعائیں بھی لیں، اس لئے کہ جب بھی کوئی خدمت انجام دیتے، اس پر حضور اقدس ﷺ ان کو دعائیں دیتے، چنانچہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! ان کی عمر اور ان کی اولاد میں برکت عطا فرما، یہ دعا ایسی قبول ہوئی کہ تقریباً صحابہ میں سب سے آخر میں آپ کی وفات ہوئی، اور آپ ہی نے بے شمار انسانوں کو تابعی بنایا، اگر آپ نہ ہوتے تو ان کو تابعی ہونے کا شرف حاصل نہ ہوتا۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یقینی طور پر زیارت کی ہے، امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زیارت کی ہے۔ جس کے ذریعہ وہ تابعی بن گئے، اتنی لمبی عمر اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی اور اولاد میں برکت کا یہ حال تھا کہ اتنی اولاد ہوئی کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ آج میری اولاد اور اولاد کی اولاد کی تعداد سو سے زائد ہو چکی ہے۔ (۲)

بہر حال! حضرت انس رضی اللہ عنہ اس حدیث میں فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی آپ کے پاس آکر آپ سے مصافحہ کرتا، تو آپ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے اس وقت تک نہیں کھینچتے تھے، جب تک وہ خود اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے، اور آپ اپنا چہرہ اور اپنا رخ اس ملاقات

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب كان رسول الله أحسن الناس خلقا، رقم:٤٢٧٢، سنن أبي داؤد، كتاب الادب، باب في الحلم و أخلاق النبي، رقم:٤١٤٣

(۲) صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب من زار قوما فلم يفطر عندهم، رقم:١٨٤٦، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أنس بن مالك، رقم:٤٥٣١

کرنے والے کی طرف سے نہیں پھیرتے تھے، جب تک وہ خود اپنا چہرہ نہ پھیر لے اور نہ کبھی یہ دیکھا گیا کہ جب آپ مجلس میں لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوں تو آپ نے اپنا گھٹنا ان میں سے کسی شخص سے آگے کیا ہو۔

حضور ﷺ اور تواضع

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ کے تین اوصاف بیان کئے ہیں، پہلا وصف یہ بیان کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ کی طبیعت میں اس قدر تواضع تھی کہ اتنے بلند مقام پر ہونے کے باوجود جب کوئی اللہ کا بندہ آپ سے ملاقات کرتا، تو آپ اپنا ہاتھ اس وقت تک نہیں کھینچتے تھے، جب تک وہ خود اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے، اور دوسرا وصف یہ بیان کیا کہ آپ اپنا چہرہ نہیں پھیرتے تھے، جب تک وہ خود اپنا چہرہ نہ پھیرتے، اور تیسرا وصف یہ بیان کیا کہ کہ اپنا گھٹنا کسی سے آگے نہیں کرتے تھے۔ بعض دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص آپ سے بات کرنا شروع کرتا تو آپ اس کی بات نہیں کاٹتے تھے، اور اس وقت تک اس کی طرف متوجہ رہتے تھے، جب تک وہ خود ہی اٹھ کر نہ چلا جائے اور اگر کوئی بڑھیا بھی کسی معمولی سے کام کیلئے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرتی تو آپ اس کے ساتھ اس کا کام کرنے کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔

حضور اقدس ﷺ کے مصافحہ کا انداز

حقیقت میں حضور اقدس ﷺ کی جتنی سنتیں ہیں وہ سب ہمارے لئے ہیں۔ لیکن بعض سنتوں پر عمل کرنا آسان ہے، اور بعض سنتوں پر عمل کرنا مشکل ہے، اس حدیث میں جو سنت بیان کی گئی ہے کہ آدمی مصافحہ کرنے کے بعد اس وقت تک اپنا ہاتھ نہ کھینچے جب تک دوسرا اپنا نہ کھینچ لے اور جب دوسرا بات شروع کرے تو اس کی بات نہ کاٹے، جب تک وہ خود ہی بات ختم نہ کرے، ایک مشغول انسان کے لئے ساری زندگی اس پر عمل کرنا بظاہر دشوار ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ دوسرے شخص کا زیادہ وقت نہ لیا جائے، لیکن بعض لیچڑ قسم کے لوگ ہوتے ہیں، جب باتیں کرنے بیٹھیں گے تو اب ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیں گے، اس قسم کے لوگوں سے ملاقات کے وقت ان کی بات سنتے رہنا، اور ان کی بات نہ کاٹنا جب تک وہ خود اپنی بات ختم نہ کریں، یہ بڑا مشکل کام ہے، خاص طور پر اس ذات کے لئے جس پر دونوں جہاں کی ذمہ داریاں ہیں، جہاد جاری ہے، تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ جاری ہے، مدینہ کی ریاست کا انتظام جس کے سر پر ہے، حقیقت میں تو یہ حضور اقدس ﷺ کا معجزہ ہی تھا۔

اس عظیم منصب کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ معجزہ عطا فرمایا تھا، آپ کی تواضع اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ اللہ کے ہر بندے کے ساتھ تواضع اور عاجزی کے ساتھ پیش آتے تھے۔

دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا سنت ہے

اس حدیث کے پہلے جملے سے دو مسئلے معلوم ہوئے:

پہلا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا سنت ہے، احادیث میں اگرچہ مصافحہ کے بارے میں زیادہ تفصیل تو نہیں آئی، لیکن بزرگوں نے فرمایا کہ مصافحہ کا وہ طریقہ جو سنت سے زیادہ قریب ہے، وہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا جائے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مصافحہ کے بیان پر جو باب قائم کیا ہے اس میں حضرت حماد بن زید رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا بیان کیا ہے۔(۱)

اور غالباً حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب آدمی مصافحہ کرے تو دونوں ہاتھوں سے کرے۔

ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا خلاف سنت ہے

آج کے دور میں ایک طرف تو انگریزوں کی طرف سے فیشن چلا کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا چاہئے، دوسری طرف بعض حلقوں کی طرف سے، خاص طور پر سعودی عرب کے حضرات اس بارے میں تشدد اختیار کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ مصافحہ تو ایک ہاتھ سے کرنا سنت ہے۔ دونوں ہاتھوں سے کرنا سنت نہیں، خوب سمجھ لیجئے، یہ خیال غلط ہے۔ اس لئے کہ حدیث میں مفرد کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، اور تثنیہ کا لفظ بھی آیا ہے، اور بزرگوں نے اس کا جو مطلب سمجھا وہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا سنت ہے، چنانچہ کسی حدیث میں یہ نہیں آیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا، جبکہ روایتوں میں دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ بزرگان دین میں بھی یہی طریقہ متعارف رہا ہے، اسی طریقے کو علماء امت نے سنت کے قریب سمجھا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا جائے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے "التحیات" اس طرح یاد کرائی:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب الاخذ بالیدین، امام بخاری کے الفاظ یہ ہیں: "وصافح حماد بن زید ابن المبارک بیدیه"

"كَفِّي بَيْنَ كَفَّيْهِ"

"میرے ہاتھ حضور اقدس ﷺ کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تھے"(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس ﷺ کے عہد مبارک میں بھی مصافحہ کرنے کا طریقہ یہی تھا اس لئے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا سنت سے زیادہ قریب ہے۔

اب اگر کوئی شخص ایک ہاتھ سے مصافحہ کر لے تو اس کو میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے ناجائز کام کیا، یا اس کی سنت ادا نہیں ہوگی، لیکن وہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو سنت سے زیادہ قریب ہو۔ اور جس طریقے کو علماء، فقہاء اور بزرگان دین نے سنت سے قریب سمجھ کر اختیار کیا ہو۔ اس کو ہی اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے۔

موقع دیکھ کر مصافحہ کیا جائے

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مصافحہ کرنا اگرچہ سنت ضرور ہے، لیکن ہر سنت کا کوئی محل اور موقع بھی ہوتا ہے، اگر وہ سنت اس کے موقع پر انجام دی جائے تو سنت ہوگی، اور اس پر عمل کرنے سے انشاء اللہ ثواب حاصل ہوگا، لیکن اگر اس سنت کو بے موقع اور بے محل استعمال کر لیا تو ثواب کے بجائے الٹا گناہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر مصافحہ کرنے سے سامنے والے شخص کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں مصافحہ کرنا ناجائز ہے۔ ایسے وقت میں صرف زبان سے سلام کرنے پر اکتفا کرے۔ اور "السلام علیکم" کہہ دے، اور سامنے والا جواب دیدے۔

یہ مصافحہ کا موقع نہیں

مثلاً ایک شخص کے دونوں ہاتھ مصروف ہیں، دونوں میں سامان ہے، اور آپ نے ملاقات کے وقت مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے، ایسے وقت وہ بے چارہ پریشان ہوگا۔ اب آپ سے مصافحہ کرنے کی خاطر اپنا سامان پہلے زمین پر رکھے، اور پھر آپ سے مصافحہ کرے، لہذا ایسی حالت میں مصافحہ کرنا سنت نہیں، بلکہ خلاف سنت ہے، بلکہ اگر مصافحہ کی وجہ سے دوسرے کو تکلیف پہنچے گی تو گناہ کا بھی اندیشہ ہے، آج کل لوگ اس معاملے میں بڑی بے احتیاطی کرتے ہیں۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الاستئذان، باب الاخذ باليدين، رقم: ٥٧٩٤

مصافحہ کا مقصد ''اظہار محبت''

دیکھئے کہ یہ ''مصافحہ'' محبت کا اظہار ہے۔ اور محبت کے اظہار کے لئے وہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے، جس سے محبوب کو راحت ملے، نہ یہ کہ اس کے ذریعہ اس کو تکلیف پہنچائی جائے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی بزرگ اللہ والے کسی جگہ پہنچے تو آپ لوگوں نے یہ سوچا کہ چونکہ یہ بزرگ ہیں، ان سے مصافحہ کرنا ضروری ہے، چنانچہ مصافحہ کرنے کے لئے پورا مجمع ان بے چارے ضعیف اور چھوئی موئی بزرگ پر ٹوٹ پڑا، اب اندیشہ اس کا ہے کہ بزرگ گر پڑیں گے، ان کو تکلیف ہوگی۔ لیکن مصافحہ نہیں چھوڑیں گے، ذہن میں ہے کہ مصافحہ کر کے برکت حاصل کرنی ہے اور جب تک حاصل نہیں ہو گی، ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔

اس وقت مصافحہ کرنا گناہ ہے

خاص طور پر یہ بنگال اور برما کا جو علاقہ ہے، اس میں یہ رواج ہے کہ اگر کسی بزرگ کا وعظ اور بیان سنیں گے تو وعظ کے بعد ان بزرگ سے مصافحہ کرنا لازم اور ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ وعظ کے بعد ان بزرگ پر ٹوٹ پڑیں گے، اس کا خیال نہیں ہوگا کہ جن سے مصافحہ کر رہے ہیں۔ وہ کہیں دب نہ جائیں۔ ان کو تکلیف نہ پہنچ جائے، لیکن مصافحہ کرنا ضروری ہے۔

پہلی مرتبہ جب اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بنگال جانا ہوا تو پہلی بار یہ منظر دیکھنے میں آیا کہ جلسہ میں ہزارہا افراد کا مجمع تھا۔ حضرت والد صاحب نے بیان فرمایا، لیکن جب جلسے سے فارغ ہوئے تو سارا مجمع مصافحہ کے لئے والد صاحب پر ٹوٹ پڑا، اور والد صاحب کو وہاں سے بچا کر نکالنا مشکل ہو گیا۔

یہ تو دشمنی ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وعظ ہے، جو آپ نے رنگون (برما) کی سورتی مسجد میں کیا تھا، اس وعظ میں یہ لکھا ہے کہ جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وعظ سے فارغ ہوئے تو مصافحہ کرنے کے لئے مجمع کا اتنا زور پڑا کہ حضرت والا گرتے گرتے بچے، یہ حقیقی محبت نہیں ہے، یہ محض صورت محبت ہے، اس لئے کہ محبت کو بھی عقل چاہئے کہ جس سے محبت کی جا رہی ہے، اس کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کیا جائے، اور اس کو دکھ اور تکلیف سے بچایا جائے، یہ حقیقی محبت ہے۔

عقیدت کی انتہا کا واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ کسی علاقے میں چلے گئے، وہاں کے لوگوں کو ان بزرگ سے اتنی عقیدت ہوئی کہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان بزرگ کو اب باہر نہیں جانے دیں گے، ان کو یہیں رکھیں گے، تاکہ ان کی برکت حاصل ہو۔ اور اس کی صورت یہ سمجھ میں آئی کہ ان بزرگ کو قتل کر کے یہاں دفن کر دیا جائے تاکہ ان کی یہ برکت اس علاقے سے باہر نہ نکل جائے۔

جوش محبت میں بے عقلی کا جو انداز ہے۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں محبت وہ ہے جس سے محبوب کو راحت اور آرام ملے۔ اسی طرح مصافحہ کے وقت یہ دیکھ کر مصافحہ کرنا چاہئے کہ اس وقت مصافحہ کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ اس کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ اگر دونوں ہاتھ مشغول ہوں تو ایسی صورت میں راحت اور آرام کی نیت سے مصافحہ نہ کرنے میں زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔ انشاء اللہ

مصافحہ کرنے سے گناہ جھڑتے ہیں

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے محبت کے ساتھ مصافحہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دونوں کے ہاتھوں کے گناہ جھاڑ دیتے ہیں۔(۱)

لہٰذا مصافحہ کرتے وقت یہ نیت کر لینی چاہئے کہ اس مصافحہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کی بھی مغفرت فرمائیں گے، اور ان کے بھی گناہوں کی مغفرت فرمائیں گے اور ساتھ میں یہ نیت بھی کر لے کہ یہ اللہ کا نیک بندہ جو مجھ سے مصافحہ کرنے کے لئے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ کی برکت میری طرف منتقل فرمادیں گے۔ خاص طور پر ہم جیسے لوگوں کے ساتھ ایسے موقع بہت پیش آتے ہیں کہ جب کسی جگہ پر وعظ بیان کیا تو وعظ کے بعد لوگ مصافحہ کے لئے آگئے۔

ایسے موقع کے لئے ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! جب بہت سارے لوگ مجھ سے مصافحہ کرنے کے لئے آتے ہیں تو میں بہت خوش ہوتا ہوں اس لئے خوش ہوتا ہوں کہ یہ سب اللہ کے نیک بندے ہیں کچھ پتہ نہیں کہ کونسا بندہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول بندہ ہے جب اس مقبول بندے کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھو جائیگا تو شاید اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مجھ پر بھی نوازش فرمادیں، یہی باتیں بزرگوں سے سیکھنے کی ہیں۔ اس لئے جب بہت سے لوگ کسی سے

---

(۱) نصب الرایۃ (۴/۳۲۵)، بریقۃ محمودیۃ فی شرح طریقۃ محمدیۃ وشریعۃ نبویۃ (۵/۳۸۰)

مصافحہ کے لئے آئیں تو اس وقت آدمی کا دماغ خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، اور یہ خیال ہوتا ہے کہ جب اتنی ساری مخلوق مجھ سے مصافحہ کر رہی ہے، اور میری معتقد ہو رہی ہے، واقعتاً اب میں بھی بزرگ بن گیا ہوں۔ لیکن جب مصافحہ کرتے وقت یہ نیت کر لی کہ شاید ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ مجھے نوز دیں، میری بخشش فرما دیں، تو اب سارا نقطہ نظر تبدیل ہو گیا، اور اب مصافحہ کرنے کے نتیجے میں تکبر اور اپنی بڑائی پیدا ہونے کے بجائے تواضع اور عاجزی، اور شکستگی انکساری پیدا ہو گی۔ لہٰذا مصافحہ کرتے وقت یہ نیت کر لیا کرو۔

مصافحہ کرنے کا ایک ادب

حدیث کے اگلے جملے میں یہ بیان فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ کسی شخص سے مصافحہ کرتے وقت اپنا ہاتھ اس وقت تک نہیں کھینچتے تھے۔ جب تک سامنے والا شخص اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے اس سے مصافحہ کرنے کا ایک اور ادب معلوم ہوا کہ آدمی مصافحہ کرتے وقت اپنا ہاتھ خود سے نہ کھینچے یعنی سامنے والے کو اس بات کا احساس نہ ہو کہ تم اس کی ملاقات سے اکتا رہے ہو، یا تم اس کو حقیر اور ذلیل سمجھ رہے ہو، بلکہ شگفتگی کے ساتھ مصافحہ کرے، جلدی بازی نہ کرے، البتہ اگر کوئی شخص ایسا ہو جو چمٹ ہی جائے، اور آپ کا ہاتھ چھوڑے ہی نہیں۔ اس وقت بہر حال اس کی گنجائش ہے کہ آپ اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔

ملاقات کا ایک ادب

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ کا دوسرا وصف یہ بیان فرمایا کہ آپ ملاقات کے وقت اپنا چہرہ اس وقت تک نہیں پھیرتے تھے، جب تک کہ سامنے والا اپنا چہرہ نہ پھیرے۔

یہ بھی حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے۔ اس سنت پر عمل کرنے میں بڑا مجاہدہ ہے، لیکن انسان کی اپنی طرف سے یہی کوشش ہونی چاہئے کہ جب تک ملاقات کرنے والا خود ملاقات کر کے رخصت نہ ہو جائے۔ اس وقت تک اپنا چہرہ اس سے نہ پھیرے۔ البتہ اگر کہیں مجبوری ہو جائے تو بات دوسری ہے۔

عیادت کرنے کا عجیب واقعہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ لکھا ہے کہ جب آپ مرض الوفات میں تھے، لوگ آپ کی عیادت کرنے کے لئے آنے لگے، عیادت کے بارے میں حضور اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے:

((مَنْ عَادَ مِنْكُمْ فَلْيُخَفِّفْ))(۱)

(۱) ذخیرہ احادیث میں تلاش بسیار کے باوجود یہ حدیث نہیں مل سکی، البتہ ہمیں یہ ادب زندگی گزارنے کے سنہری آداب میں ضرور ملتا ہے۔ مرتب

یعنی جو شخص تم میں سے کسی بیمار کی عیادت کرنے جائے اس کو چاہئے کہ وہ ہلکی پھلکی عیادت کرے بیمار کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھے کیونکہ بعض اوقات مریض کو خلوت کی ضرورت ہوتی ہے اور لوگوں کی موجودگی میں وہ اپنا کام بے تکلفی سے انجام نہیں دے سکتا، اس لئے مختصر عیادت کر کے چلے آؤ اس کو راحت پہنچاؤ۔ تکلیف مت پہنچاؤ، بہر حال، حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے، ایک صاحب عیادت کے لئے آ کر بیٹھ گئے، اور ایسے جم کر بیٹھ گئے کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے، اور بہت سے لوگ عیادت کے لئے آتے رہے، اور مختصر ملاقات کر کے جاتے رہے۔ مگر وہ صاحب بیٹھے رہے نہ اٹھے اور حضرات ملاقات کر کے جاتے رہے۔ مگر وہ صاحب بیٹھے رہے نہ اٹھے اب حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اس انتظار میں تھے کہ یہ صاحب چلے جائیں تو میں خلوت میں بے تکلفی سے اپنی ضروریات کے کچھ کام کرلوں۔ مگر خود سے اس کو چلے جانے کے لئے کہنا بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ جب کافی دیر گزر گئی۔ اور وہ اللہ کا بندہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا تو حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے ان صاحب سے فرمایا "یہ بیماری کی تکلیف تو اپنی جگہ پر ہے ہی، لیکن عیادت کرنے والوں نے علیحدہ پریشان کر رکھا ہے کہ عیادت کے لئے آتے ہیں، اور پریشان کرتے ہیں"

آپ کا مقصد یہ تھا کہ شاید یہ میری بات سمجھ کر چلا جائے، مگر وہ اللہ کا بندہ پھر بھی نہیں سمجھا اور حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت اگر آپ اجازت دیں تو کمرے کا دروازہ بند کردوں؟ تاکہ کوئی دوسرا شخص عیادت کے لئے نہ آئے، حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا "ہاں بھائی بند کردو، مگر اندر سے بند کرنے کے بجائے باہر سے جا کر بند کردو"

بہر حال بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ ایسا معاملہ بھی کرنا پڑتا ہے اس کے بغیر کام نہیں چلتا، لیکن عام حالت میں حتی الامکان یہ کوشش کی جائے کہ دوسرا آدمی یہ محسوس نہ کرے کہ مجھ سے اعراض برتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو ان سنتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

ملاقات اور فون کرنے کے آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ o بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ o وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ o﴾ (۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۂ حجرات کی تفسیر کا بیان کئی جمعوں سے چل رہا ہے، آج میں نے آپ کے سامنے اس کی دو آیات تلاوت کیں، ان میں سے پہلی آیت میں حضور اقدس ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ آپ کو حجروں یعنی رہائش گاہ کے پیچھے سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر لوگ ناسمجھ ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ بنوتمیم کا ایک وفد حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آیا تھا، ان کے اندر آداب اور تہذیب کی کمی تھی، چنانچہ ان لوگوں نے اس وقت جبکہ آپ کے آرام کا وقت تھا، آپ کے مکان کے پیچھے سے آپ کو پکارنا شروع کر دیا:

"يَا مُحَمَّدُ اُخْرُجْ إِلَيْنَا" (۲)

اے محمد ﷺ آپ باہر تشریف لائیں، ہم آپ سے ملنے آئے ہیں۔ یہ آیت کریمہ ان کے بارے میں نازل ہوئی، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ آپ کو حجروں کے پیچھے سے پکار رہے ہیں، ان میں سے اکثر لوگ ناسمجھ ہیں، اگر یہ لوگ آپ کو پکارنے کے بجائے باہر صبر کرتے، اور انتظار کرتے، یہاں تک کہ آپ خود۔ سے باہر تشریف لے آتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا، لیکن ساتھ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا کہ چونکہ یہ عمل ان سے نادانی میں سرزد ہوا ہے، اس لئے ان کو معاف کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے، بڑا مغفرت کرنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے، لیکن آئندہ کے لئے

☆ اصلاحی خطبات (۶/۲۵۳ تا ۲۶۷)

(۱) الحجرات : ۵

(۲) التفسير لابن كثير (۲۶۳/٤)

سبق دے دیا۔

دور سے بلانا ادب کے خلاف ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو سبق دیئے، ایک سبق یہ دیا کہ کسی بڑے کو دور سے پکارنا بے ادبی ہے، چاہے یہ پکارنا گھر کے باہر سے ہو، یا کسی اور جگہ سے ہو، اگر کسی بڑے سے آپ کو کوئی کام ہے تو اس کے قریب جا کر اس سے بات کریں۔ بلکہ عام انسانوں میں بھی یہ بے ادبی کی بات ہے، مثلاً کوئی بیٹا باپ کو اس طرح دور سے پکارے، یا کوئی شخص اپنے سے بڑے رشتے دار کو دور سے پکارے، یہ سب بے ادبی کے اندر داخل ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں تو بے ادبی بڑی ہی سنگین ہے، اسی لئے قرآن کریم نے یہ طریقہ بتا دیا کہ دور سے آواز دینے کے بجائے حضور اقدس ﷺ کے قریب جاؤ اور پھر درخواست کرنی ہو "یا رسول اللہ" کہہ کر درخواست کرو۔

حضور اقدس ﷺ پر درود و سلام کا طریقہ

فقہاء کرام نے اسی آیت سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ دنیا سے تشریف لے جانے کے باوجود اپنی قبر مبارک میں تشریف فرما ہیں، اور آپ کو ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہے، جس طرح شہداء کے بارے میں فرمایا کہ وہ شہداء مرتے نہیں ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں احساس نہیں ہوتا۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا معاملہ شہداء سے بھی اونچا ہے، وہ بھی زندہ ہیں، اور خاص قسم کی زندگی اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرما رکھی ہے، جو ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ اسی لئے ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تم حضور اقدس ﷺ کے روضہ اقدس پر جاؤ تو وہاں جا کر کہو:

"اَلصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ"

یعنی حضور اقدس ﷺ کو خطاب کر کے سلام پیش کرو، لیکن جب تم روضہ اقدس سے دور ہو تو پھر تم یوں کہو:

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ"

لہٰذا اس آیت کی رو سے روضہ اقدس سے دور ہونے کی صورت میں "اَلصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" کہنا درست نہیں، کیونکہ حضور اقدس ﷺ کو دور سے پکارنا بے ادبی کی بات ہے، اور یہ آپ کی تعظیم کے خلاف ہے۔

حاضر وناظر کے عقیدے سے پکارنا

خاص طور پر "اَلصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" کے الفاظ سے اس عقیدے سے پکارنا کہ حضور ﷺ ہر جگہ موجود ہیں، اور آپ حاضر وناظر ہیں اللہ بچائے۔ یہ عقیدہ انسان کو بعض اوقات شرک تک پہنچا دیتا ہے، اور اگر اس عقیدے سے یہ الفاظ کسی نے کہے کہ جب ہم "اَلصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" کہہ کر درود بھیجتے ہیں تو آپ کو روح مبارک کی تشریف لاتی ہے، خوب سمجھ لیجئے یہ بات احادیث میں کہیں ثابت نہیں، دوسری طرف یہ آپ کی تعظیم کے بھی خلاف ہے کہ ہم حضور اقدس ﷺ کو دور سے سلام کریں، اور سلام لینے کے لئے حضور اقدس ﷺ خود تشریف لائیں۔ آپ ذرا اندازہ کریں کہ ہم تو یہاں بیٹھ کر پکار رہے ہیں، اور حضور اقدس ﷺ کی روح مبارک ہم سے سلام لینے کے لئے تشریف لائے، یہ کوئی ادب کی بات ہے؟ یہ کوئی تعظیم اور محبت کی بات ہے؟ صحیح طریقہ وہ ہے جو حضور اقدس ﷺ نے خود بیان فرما دیا، وہ یہ کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص میری قبر پہ آ کر مجھے سلام کرے گا، میں اس کا جواب دوں گا، اور جو شخص دور سے مجھ پر درود بھیجے گا تو وہ درود مجھ تک فرشتوں کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے کہ آپ کے فلاں امتی نے درود شریف کا یہ تحفہ پیش کیا ہے۔ یہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے، جو حدیث میں منقول ہے۔

"یارسول اللہ" کہنا ادب کے خلاف ہے

لہٰذا آپ کی ظاہری زندگی میں جس طرح یہ حکم تھا کہ جو شخص بھی آپ سے خطاب کرے، وہ قریب جا کر کرے، دور نہ کرے، اسی طرح آپ کی وفات کے بعد جبکہ آپ کو قبر مبارک میں دوسری حیات طیبہ حاصل ہے، وہاں بھی یہی حکم ہے کہ قریب جا کر ان الفاظ سے سلام کرو:

"اَلصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ"

لیکن دور سے کہنا ہے تو درود شریف پڑھو، ان الفاظ سے سلام کہنا آپ کی تعظیم اور ادب کے خلاف ہے۔ اس آیت سے ایک سبق تو یہ دے دیا۔

حضور ﷺ کے دروازے پر دستک دینا

اس آیت سے دوسرا سبق یہ دیا کہ اگر کسی شخص کو حضور اقدس ﷺ سے کوئی کام ہے تو آپ کے دروازے پر دستک دے کر آپ کو باہر بلانا آپ کے ادب کے خلاف ہے، اگر کوئی بہت ضروری اور فوری کام ہو تو دوسری بات ہے، لیکن عام حالات میں آپ کے دروازے پر دستک دینا اور آپ کو باہر

آنے کی زحمت دینا مناسب نہیں۔ لہٰذا اگر آپ سے کسی شخص کو کوئی کام ہے تو باہر بیٹھ کر انتظار کرے، جب حضور اقدس ﷺ خود کسی ضرورت سے باہر تشریف لائیں، ظاہر ہے کہ پانچ وقت کی نماز کے لئے تو آپ باہر تشریف لاتے ہی تھے، اس وقت ملاقات کر کے اپنی ضرورت پیش کرو، یہ طریقہ تمہارے لئے ہزار درجہ بہتر ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾(۱)

یعنی اگر یہ لوگ صبر کر لیتے، یہاں تک کہ آپ خود باہر تشریف لے آتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔ بہ نسبت اس کے کہ حضور ﷺ کو آواز دے کر باہر بلائیں۔

استاد کے دروازے پر دستک دینا

حضرات مفسرین نے اس آیت کے تحت یہ فرمایا کہ ہر شاگرد اور استاد کا معاملہ بھی ایسا ہے، یعنی اگر کوئی شاگرد کسی استاد سے ملاقات کرنا چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ شاگرد استاد کی خلوت میں خلل انداز ہو، اور استاد کے دروازے پر دستک دے کر اس کو باہر آنے کی دعوت دینے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اس کا انتظار کرے، اور جب وہ استاد خود باہر آئے اس وقت جا کر ملاقات کرے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لئے حضور ﷺ کی دعا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو حضور اقدس ﷺ کے چچا کے بیٹے تھے، جب حضور اقدس ﷺ کی وفات ہوئی اس وقت ان کی عمر صرف دس سال تھی، لیکن دس سال کی عمر کے دوران ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بلا کر ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا فرمائی تھی:

((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ))(۲)

"اے اللہ! اس بچے کو دین کی سمجھ عطا فرما، اور اس کو قرآن کریم کا تفسیر کا علم عطا فرما"

چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا اس طرح قبول فرمائی کہ جب نبی کریم ﷺ کا وصال ہو گیا تو مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ رسول ﷺ تو دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں، اور میں آپ سے قرآن کریم کی تفسیر کا علم حاصل نہ کر سکا، دل میں خیال آیا کہ ابھی بہت سے ایسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود ہیں جنہوں نے براہ راست نبی کریم ﷺ سے علم حاصل کیا ہے، میں ان

---

(۱) الحجرات:۵

(۲) (صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب وضع الماء عند الخلاء، رقم: ۱۴۰)

میں سے ایک کے پاس جاؤں، اور جا کر ان سے علم حاصل کروں۔ چنانچہ جس کسی صحابی کے بارے میں مجھے علم ہوتا کہ ان کے پاس رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہیں تو میں سفر کر کے ان کے پاس جاتا۔

علم سیکھنے کے لئے ادب کا لحاظ

خود فرماتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ شدید گرمی کا موسم ہے، اور عرب کی گرمی تو بہت زیادہ شدید ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان سے آگ برس رہی ہے، اور زمین شعلے اگل رہی ہے، ایسی شدید گرمی میں سفر کر کے جاتا، اور جس صحابی سے علم حاصل کرنا مقصود ہوتا، اس صحابی کے دروازے پر جا کر بیٹھ جاتا، یہ پسند نہیں تھا کہ جس صحابی کو اپنا استاد بناتا ہے، اور ان سے حضور اقدس ﷺ کی احادیث حاصل کرنی ہیں، ان کے دروازے پر دستک دے کر ان کو باہر آنے پر مجبور کروں، یہ مجھے گوارا نہیں تھا، اس لئے دروازے پر بیٹھ جاتا کہ جب وہ خود سے کسی وقت گھر سے باہر نکلیں گے تو ان سے اپنی درخواست پیش کروں گا۔ اور جب میں دروازے پر بیٹھا ہوتا تو ریت کا طوفان چل رہا ہوتا کہ میں دستک دے کر ان کو باہر بلاؤں، اور جب وہ خود کسی وجہ سے باہر نکلتے اور دیکھتے کہ حضور اقدس ﷺ کے چچازاد بھائی اس طرح دروازے پر بیٹھے ہوئے ہیں، تو وہ مجھے سینے سے لگاتے اور کہتے کہ آپ تو حضور اقدس ﷺ کے چچا کے بیٹے ہیں، آپ یہاں میرے گھر کے دروازے پر بیٹھے ہیں؟ آپ نے دستک دے کر مجھ کیوں نہیں بلا لیا؟ اور گھر کے اندر کیوں تشریف نہیں لائے؟ میں عرض کرتا کہ آج میں آپ کے پاس حضور اقدس ﷺ کے چچا کے بیٹے کی حیثیت سے نہیں آیا، بلکہ آج میں آپ کے پاس شاگرد کی حیثیت سے آیا ہوں، اور آپ سے حضور اقدس ﷺ کی باتیں سننے کے لئے آیا ہوں، اس وجہ سے مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ آپ کو تکلیف دوں، اور آپ کو گھر سے باہر بلاؤں۔ چونکہ قرآن کریم نے حضور اقدس ﷺ کے بارے میں کہا تھا کہ بنو تمیم کے لوگوں کو چاہیے تھا کہ وہ باہر دروازے پر صبر کرتے، حتی کہ حضور اقدس ﷺ خود تشریف لے آتے، اگر وہ ایسا کرتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔ اس لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے استاد کے ساتھ وہی معاملہ کیا۔

جانے سے پہلے وقت لے لیں

یہ تو استاد شاگرد، باپ بیٹے اور پیر مرید کے بارے میں اصول تھا، لیکن عام انسانوں کے ساتھ ملاقاتوں میں بھی تلقین کی گئی کہ جس شخص سے تم ملنے جا رہے ہو، حتی الامکان اس کو تکلیف پہنچانے سے گریز کرو، یہ نہ ہو کہ بس کسی بھی وقت مصیبت بن کر کسی کے گھر میں وارد ہو گئے، اور اس پر مسلط ہو گئے۔ بلکہ جب کسی کے پاس ملاقات کے لئے جانا ہو تو پہلے یہ دیکھو کہ یہ وقت اس شخص سے ملاقات

کے لئے مناسب ہے یا نہیں؟ اس شخص کا نظم الاوقات کیا ہے؟ کسی وقت کوئی شخص خلوت اور تنہائی میں اپنے گھر والوں کے پاس رہنا چاہتا ہے، کوئی شخص کسی وقت مصروف ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے یہ معلوم کرلو کہ فلاں شخص سے ملاقات کے لئے کون سا وقت زیادہ موزوں ہے؟ کہ اس وقت ملاقات کرنے سے اس کو تکلف نہیں ہوگی۔

میزبان کے حقوق مہمان پر

جس طرح مہمان کے حقوق ہیں میزبان پر کہ جب کوئی مہمان آئے تو میزبان کو چاہیے کہ اس کا اکرام کرے، اس کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آئے، اسی طرح میزبان کا بھی مہمان کے اوپر حق ہے، وہ یہ ہے کہ مہمان اس کے لئے مہمان بنے، وبال جان نہ بنے کہ ایسے وقت میں اس کے پاس پہنچ جائے جو اس کے لئے مناسب نہیں تھا، لہٰذا علماء کرام نے اس آیت کے تحت یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ جب کسی سے ملنے کے لئے جاؤ تو یہ اندازہ کر کے جاؤ کہ اس وقت اس سے ملنا مناسب ہوگا یا نہیں؟ اس کے بغیر اگر جاؤ گے تو تکلیف کا سبب بنو گے، اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور میں دو رکوع اس موضوع پر نازل فرمائے ہیں کہ جب تم کسی سے ملاقات کے لئے جاؤ تو کس طرح جاؤ، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی کے پاس جانے سے اس کو تکلیف نہ دو، جانے سے پہلے اجازت لو کہ میں فلاں وقت میں آؤں یا نہ آؤں؟ اور گر دوسرا شخص معذرت کرلے کہ میں اس وقت مشغول ہوں، میں ملاقات نہیں کر سکتا تو اس کا برا نہ مناؤ، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ﴾(۱)

یعنی اگر میزبان تم سے یہ کہے کہ اس وقت ملنا میرے لیے مشکل ہے، میں کسی کام میں مشغول ہوں، میرے ساتھ معذوری لاحق ہے تو اس سے برا نہ مناؤ، بلکہ واپس چلے جاؤ، تمہارے لئے واپس جانا بہتر ہے۔ ان تمام اصولوں کی بنیاد یہ ہے کہ تمہارے کسی عمل سے کسی شخص کو کوئی ناواجبی تکلیف نہ پہنچے۔ یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے۔

حضور اقدس ﷺ کا ایک واقعہ

ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کسی صحابی سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے، وہ صحابی مدینہ منورہ سے دو تین میل کے فاصلے پر رہتے تھے، آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب کسی صحابی سے ملنے کے لئے

(۱) النور: ۲۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اور اگر تم سے کہا جائے کہ: "واپس چلے جاؤ" تو واپس چلے جاؤ۔ یہی تمہارے لئے پاکیزہ ترین طریقہ ہے"

اس کے گھر تشریف لے جاتے تو اجازت طلب کرنے کے لئے سلام کرتے کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! کیا میں اندر آجاؤں؟ بہرحال ان صحابی کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر آپ نے حسب معمول سلام کیا، اندر سے کوئی جواب نہ آیا، آپ نے دوبارہ سلام کیا، پھر بھی کوئی جواب نہیں آیا، آپ نے تیسری مرتبہ سلام کیا، پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ وہ صحابہ کسی اور حال میں تھے، ان کے دل میں خیال آیا کہ حضور ﷺ مجھے دعا دے رہے ہیں، اس لئے کہ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کے معنی ہیں کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو، تم پر اللہ کی رحمت ہو، تو ان صحابی نے یہ سوچا کہ میں حضور اقدس ﷺ کی زیادہ سے زیادہ دعائیں حاصل کرلوں، اس لئے وہ اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے۔ دوسری طرف جب رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ سلام کرلیا تو واپس جانے لگے، اس لئے کہ حکم ہے کہ جب تین مرتبہ اجازت مانگ چکو، اور تمہیں یہ اندازہ ہو کہ تمہاری آواز اندر والے نے سن لی ہے تو تین مرتب اجازت مانگنے کے باوجود اگر وہ باہر نہ نکلے تو تم واپس چلے جاؤ، اس لئے کہ وہ شخص تم سے اس وقت نہیں ملنا چاہتا، اور خواہ مخواہ زبردستی دوسرے پر سوار ہو جانا اسلامی اداب کا تقاضا نہیں، اس لئے حضور اقدس ﷺ واپس جانے لگے، جب ان صحابی کو اندازہ ہوا کہ حضور اقدس ﷺ تشریف لے جارہے ہیں، تو جلدی سے گھر سے باہر نکلے، اور جا کر حضور اقدس ﷺ سے ملاقات کی، اور عرض کیا کہ آپ واپس کیوں جارہے ہیں؟ گھر کے اندر تشریف لائیں۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ حکم ہے کہ تین مرتبہ اجازت مانگو، اور جب یہ اندازہ ہو کہ اس شخص نے تمہاری آواز سن لی ہے، اس کے باوجود وہ اندر آنے کی اجازت نہیں دے رہا تو، واپس چلے جاؤ۔ اب دیکھئے حضور اقدس ﷺ نے برا نہیں منایا، اور یہ نہیں کہا کہ تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا، اور اندر آنے کی اجازت کیوں نہیں دی، بلکہ واپس چلے گئے، ان صحابی نے فرمایا میں یہ سوچتا رہا کہ آپ کی دعائیں لیتا رہوں۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ دعائیں لینے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا، تم دعائیں ویسے لے لیتے، میں باہر کھڑا انتظار کرتا رہا، یہ اچھی بات نہیں ہے۔

حضور ﷺ نے برا نہیں منایا

بہرحال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضور اقدس ﷺ نے تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کے بعد جب اجازت نہیں ملی تو اس پر آپ نے برا نہیں منایا، اور نہ غصہ کیا کہ ہم تمہارے گھر پہ آئے، تم نے ہمارے سلام کا جواب نہیں دیا، بلکہ آپ واپس چلے گئے۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے یہ فرمادیا تھا کہ اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو اس وقت تم واپس چلے جاؤ، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مہمان پر بھی میزبان کے کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں، وہ یہ کہ بلاوجہ اس کو تکلیف نہ پہنچائے۔

فون کرنے کے آداب

آج کل ملاقاتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا ہے، اور وہ ٹیلی فون کے ذریعہ آدمی ملاقات ہے، اس میں بھی یہی احکام ہیں، میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں سورۃ النور کی تفسیر میں ٹیلی فون استعمال کرنے کے احکام بھی لکھے ہیں، وہ یہ کہ جب تم کسی کو ٹیلی فون کرو تو یہ دیکھو کہ میں ایسے وقت میں ٹیلی فون تو نہیں کر رہا ہوں جو اس کی تکلیف کا سبب ہو، بسا اوقات لوگ اس کا خیال نہیں کرتے، بس دماغ میں آیا کہ فلاں سے فلاں بات کرنی ہے، اور اس وقت فون کر دیا، یہ دیکھے بغیر کہ اس وقت یہ اس کے آرام کا وقت ہوگا، یا نماز کا وقت ہوگا، یا دوسری ضروریات کا وقت ہوگا۔ یہ بے چارہ "مولوی" تو ساری دنیا کی میراث ہے، اس سے ملاقات اور اس سے بات کرنے کے لئے کسی قاعدے اور قانون کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ میرے پاس تو رات کے دو بجے ٹیلیفون آ جاتا ہے، ایک مرتبہ رات کے دو بجے فون آیا، میں نے پوچھا کہ فون کرنے سے پہلے گھڑی میں ٹائم دیکھا تھا، اس وقت کیا ٹائم ہو رہا ہے؟ جواب دیا: دیکھی تو تھی، لیکن یہ خیال تھا کہ شاید آپ اس وقت تہجد کے لئے اٹھے ہوں گے، لہٰذا اس وقت آپ کو فون کر لیں۔ اب دو بجے رات کو فون کر رہے ہیں، اور مسئلہ بھی کوئی ایسا نہیں تھا جس کی فوری ضرورت ہو، بلکہ عام مسئلہ کے لئے رات کے دو بجے فون کر رہے ہیں۔ آج اس بات کا خیال بھی دل سے اٹھ گیا کہ اگر کسی کو فون کریں تو ایسے وقت میں کریں کہ جس سے سامنے والے کو تکلیف نہ ہو۔

لمبی بات کرنے سے پہلے اجازت لے لیں

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ فون کی گھنٹی بجی، اور آپ نے ریسیور اٹھا لیا، لیکن آپ جلدی میں ہیں، اور آپ کو فوراً کہیں جانا ہے، مثلاً آپ کے جہاز کا وقت ہے، یا دفتر میں پہنچنا ہے، اور یا بیت الخلاء کا تقاضا ہے، اب سامنے والے نے فون پر لمبی بات شروع کر دی۔ اس لئے معارف القرآن میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر کسی سے فون پر لمبی بات کرنی ہو تو پہلے پوچھ لو کہ میں ذرا لمبی بات کرنا چاہتا ہوں، اگر اس وقت فارغ ہوں تو ابھی کر لوں، یا دوسرا وقت بتا دیں، میں اس وقت فون کر لوں گا، تاکہ اس کو تکلیف نہ ہو۔ یہ سارے آداب بھی دین کا حصہ ہیں، اسلام نے ان کی تعلیم دی ہے، لیکن ہم نے دین اسلام کو چند عبادتوں میں محدود کر دیا ہے، اور معاشرت کے یہ احکام جو قرآن حدیث میں بھرے ہوئے ہیں، ان کو دین سے خارج کر دیا ہے، اس کے نتیجے میں ہماری زندگیوں میں ایک عجیب قسم کی بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ سورۃ الحجرات کی یہ آیت ان تمام آداب کی طرف اشارہ کر رہی ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی فہم عطا فرمائے، اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

خدمت کے آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ الْخَلَاءَ فَوَضَعْتُ لَهٗ وُضُوْءًا، قَالَ: مَنْ وَضَعَ هٰذَا؟ فَأُخْبِرَ، فَقَالَ: ((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ))(۱)

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء میں داخل ہوئے تو میں نے آپ کے لئے وضو کا پانی بھر کر رکھ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھرے بھرائے لوٹے سے آرام محسوس کرنے کے بعد پوچھا کہ یہ کس نے رکھا ہے؟ بتایا گیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے رکھا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ))

"اے اللہ! ان کو دین میں تفقہ اور سمجھ عطا فرما"

اس سے امام بخاری نے ترجمۃ الباب پر استدلال فرمایا کہ خلاء میں وضو کی تیاری کے لئے پہلے سے پانی رکھ دینا جائز ہے۔

افضل خدمت مخدوم کو خوش کرنا ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے کسی بڑے کی ایسی خدمت کر دینا جس کا اس نے حکم نہیں دیا لیکن یقین ہے کہ وہ اس کے لئے راحت کا سبب ہوگی، فضیلت کی بات ہے۔

ایک تو وہ خدمت ہے جو مخدوم کے کہنے سے کی جائے، اس نے کہا کہ میرا یہ کام کردو، خادم نے

☆ انعام الباری (۲/۲۴۹-۲۵۲)، زیر نظر بیان صحیح بخاری کے ایک سبق کا حصہ ہے۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب الوضوء، باب وضع الماء عند الخلاء، رقم: ١٤٠، مسند أحمد، رقم: ٢٢٧٤

کر دیا، اس میں بھی سب بڑی فضیلت ہے لیکن کوئی ایسی خدمت کرنا جس کا اس نے کہا نہیں تھا خود سے یہ خیال آیا کہ میں یہ کام کر دوں جس سے اسے راحت ملے گی تو یہ اور زیادہ فضیلت کی بات ہے، اس لئے کہ اس سے مخدوم کو وہ راحت ملے گی جس کی پہلے سے اس کو توقع نہیں تھی۔

ایک وہ راحت ہے جس کی پہلے سے توقع ہو اس سے بھی خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن ایک وہ راحت ہے جس کی پہلے سے توقع نہ ہو اس سے زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے، زیادہ آرام ملتا ہے۔ تو خادم اگر مخدوم کا ایسا کام کر دے جو اس کی توقع سے زیادہ ہو تو اس کو زیادہ خوشی اور راحت ملے گی اور خادم کو اجر و ثواب اور فضیلت بھی زیادہ حاصل ہوگی۔

لیکن یہ اسی وقت ہے، جب یقین ہو کہ میری اس خدمت سے مخدوم کو راحت ملے گی اور یہ جاننے کے لئے فہم سلیم کی ضرورت ہے، یہ نہیں کہ اپنی طرف سے ایسی خدمت کر دی جس سے الٹی تکلیف پہنچ گئی حالانکہ راحت پہنچانے کا ارادہ تھا، تو ایسی صورت میں جبکہ تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو خدمت نہ کرنا بہتر ہے۔

خدمت کے لئے عقل کی ضرورت ہے

ایک مرتبہ ہم مسجد میں گئے اور جوتے باہر چھوڑ گئے، نماز پڑھ کر باہر آئے تو دیکھا کہ جوتے غائب ہیں، ساتھی تلاش کرنے لگے کوئی ادھر دوڑ رہا ہے کوئی ادھر دوڑ رہا ہے میں سمجھا کوئی بے چارہ اٹھا کر مسجد میں لے گیا ہوگا، ایسے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں، جب پانچ سات منٹ ہو گئے تو ایک صاحب اندر سے ٹہلتے ہوئے تشریف لائے اور کہا کہ جی باہر رکھے ہوئے تھے میں نے اس خیال سے اٹھا کر اندر رکھ دیئے کہ چوری نہ ہو جائیں۔

اب اس بے چارہ نے اپنی دانست میں تو بھلائی کی کہ چوری سے بچانے کے لئے اندر لے جا کر رکھ دیئے لیکن بے چارہ عقل سے پیدل تھا اس واسطے اس نے یہ کام کر دیا اور بتایا نہیں کہ کہاں رکھے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے فائدہ پہنچنے کے نقصان پہنچ گیا، تو خدمت کے لئے بھی عقل اور سمجھ چاہئے بغیر فہم و عقل کے جو خدمت کی جائے گی وہ فائدہ کے بجائے نقصان کا سبب بن جاتی ہے، ایک تو یہ بات معلوم ہوئی۔

مخدوم کی ذمہ داری

دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی مخدوم کو ایسے کسی خادم سے کوئی راحت پہنچے تو اس مخدوم کے لئے سنت یہ ہے کہ خادم کے حق میں دعا کرے یعنی اس کی خدمت کا حق یہ ہے کہ اس کو تھوڑا سا خوش کیا

جائے، خوش کرنے کا ایک طریقہ یہ ہوگا کہ محض تعریف کردے کہ بڑا اچھا کام کیا، اس سے بھی آدمی خوش کیا جائے، خوش ہو جاتا ہے اس کی حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے لیکن اس سے صرف اتنا ہی فائدہ حاصل ہوا کہ سن کر تھوڑا سا دل خوش ہو گیا۔

لیکن اگر اس کے حق میں دعا کردیں تو دعا ایسی چیز ہے جو دنیا و آخرت میں اس کے لئے نافع ہے، نبی کریم ﷺ نے بھی یہاں دعا دی اور دعا بھی ایسی کہ جو چیز یعنی دین کی سمجھ سالہا سال کی مشقت سے بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے اس کی دعا فرمادی اور سید الانبیاء ﷺ کی دعا سے بڑی نعمت اور کیا ہے؟

اس واسطے معلوم ہوا کہ مخدوم خدمت لے کر خاموش نہ بیٹھا رہے بلکہ اس کا کام ہے کہ خادم کو دعا دے، کم از کم "جَزَاكَ اللّٰهُ" ہی کہہ دے تاکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو دنیا و آخرت میں اس کا بدلہ عطا فرمائیں۔

پیر صاحبان تو خدمت کو اپنا حق سمجھتے ہیں، یہ سمجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی خادم خدمت کر رہا ہے تو وہ ہمارا قرضہ چکا رہا ہے، لہٰذا شکر یہ ادا کرنے کی ضرورت ہے او نہ ہمت افزائی کی حاجت ہے بلکہ الٹا ڈانٹ پھٹکار ہی چلتی رہتی ہے، تو یہ طریقہ سنت کے مطابق نہیں ہے، سنت یہ ہے کہ اپنے خادم کی حوصلہ افزائی کرے اور اس کے لیے دعا کرے کیونکہ یہ خدمت کو اپنا حق سمجھ رہا ہے تاکہ حق ہونے کی بات اس کے ذہن سے نکل جائے، اس لئے کہ دعا کرنے کا مطلب ہے یہ ہے کہ یہ میرا حق نہیں ہے اللہ تعالیٰ ہی آپ کو اس کا بدلہ دیں۔

افراط وتفریط نہ ہونا چاہئے

یہ باتیں اس لئے ذکر کر رہا ہوں کہ ان میں بڑی افراط وتفریط ہوتی رہتی ہے، ابھی تو آپ یہاں طالب علم ہیں، خادم بن کر رہتے ہیں لیکن جب استاذ بن کر جائیں گے تو پھر دماغ میں تھوڑا سا "خناس" آجائے گا کہ میں محتاج الیہ ہوں اور جو سامنے بیٹھے ہیں وہ محتاج ہیں، لہٰذا یہ خادم ہیں اور میں مخدوم ہوں، تو شاگردوں کے ساتھ معاملہ کبھی کبھار تکبر کی حدود میں آجاتا ہے اور بعض اوقات دل شکنی کی صورت میں آجاتا ہے، طالب علم بے چارہ کہے یا نہ کہے۔

اور اگر خدانخواستہ پیر بن گئے تو اللہ اکبر، پھر تو چھوٹی سی خدائی ہے، جتنے مریدین ہیں بے چارے سب بندے بن گئے، اللہ بچائے پھر اس کی کھال اور چمڑی بھی حلال، ان کا مال اور آبرو بھی حلال۔ تو یہ سب باتیں حضور اقدس ﷺ کی سنت کو نہ سمجھنے اور عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

سونے کے آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَوٰى اِلٰى فِرَاشِهٖ نَامَ عَلٰى شِقِّهٖ، ثُمَّ قَالَ:((اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَيْكَ، وَ وَجَّهْتُ وَجْهِیْ اِلَيْكَ، وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَيْكَ، وَاَلْجَأْتُ ظَهْرِیْ اِلَيْكَ، رَغْبَةً وَرَهْبَةً اِلَيْكَ، لَامَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ، آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَنَبِيِّكَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ))(۱)

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے سوتے وقت کی دعا سکھائی ہے اور سونے کا طریقہ بتا دیا کہ جب بستر پر جاؤ تو کس طرح لیٹو، کس طرح سو، حضور اقدس ﷺ کی شفقتیں اور رحمتیں اس امت کے لئے دیکھیں کہ ایک ایک چیز کا طریقہ بتا رہے ہیں۔ جس طرح ماں باپ اپنے بچے کو ایک ایک چیز سکھاتے ہیں۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ایک ایک بات اس امت کو سکھائی ہے۔ ایک اور حدیث میں انہی صحابی سے روایت ہے:

قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اِذَا اَتَيْتَ مَضْجَعَكَ فَتَوَضَّأْ وُضُوْءَكَ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلٰى شِقِّكَ الْاَيْمَنِ))(۲)

☆ اصلاحی خطبات (۴/۱۱۰ تا ۱۳۰) ۲۴ ستمبر ۱۹۹۳ء بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاری، كتاب الدعوات، باب مايقول اذا نام، رقم:۵۸۳۸، صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء و التوبة والاستغفار، باب مايقول عند النوم وأخذ المضجع، رقم: ٤٨٨٥، سنن الترمذی، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب ماجاء فی الدعاء اذا اوى الى فراشه، رقم: ۳۳۱۷، مسند أحمد، رقم: ۱۷۷۸۲، سنن الدارمی، كتاب الاستئذان، باب الدعاء عندالنوم، رقم: ۱۲۵٦۷

(۲) صحيح البخاری، كتاب الوضوء، باب فضل من بات على الوضوء، رقم: ۲۳۹، سنن أبی داؤد، كتاب الأدب، باب مايقال عند النوم، رقم: ٤٣٨٩

سوتے وقت وضو کرلیں

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ جب تم بستر پر سونے کے لئے جانے لگو تو ویسا ہی وضو کرلو جیسا کہ نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے۔ یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے کہ آدمی وضو کر کے سوئے۔ اگر کوئی شخص وضو کے بغیر سو جائے تو کوئی گناہ نہیں۔ اس لئے کہ سونے کے واسطے وضو کرنا کوئی فرض واجب نہیں۔ لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کا ادب یہ بتایا کہ سونے سے پہلے وضو کرلو۔

یہ آداب محبت کا حق ہیں

یہ آداب اور مستحبات جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائے ہیں۔ یہ اگرچہ فرض و واجب تو نہیں، لیکن ان کے انوار و برکات بے شمار ہیں۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ فرائض و واجبات اللہ جل جلالہ کی عظمت کا حق ہیں، اور یہ آداب و مستحبات اللہ جل جلالہ کی محبت کا حق ہیں، اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا حق ہے، جو آداب آپ نے تلقین فرمائے ہیں۔ انسان کو چاہئے کہ ان آداب کو اختیار کرے، یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ انہوں نے یہ فرمادیا کہ اگر ان کو اختیار نہیں کرو گے تو کوئی گناہ نہیں دیں گے، ورنہ یہ آداب و مستحبات ادا کرانا مقصود ہے۔ ایک مومن بندہ وہ تمام آداب و مستحبات بجالائے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کر گئے۔ اس لئے حتی الامکان ان کو اختیار کرنا چاہئے۔

دائیں کروٹ پر لیٹیں

بہرحال، سونے سے پہلے وضو کرنا ادب ہے، اب اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی حکمت کی انتہا کو کون پہنچ سکتا ہے۔ خدا معلوم اس حکم میں کیا کیا انوار و برکات پوشیدہ ہیں۔ اس کے بعد سونے کا طریقہ بتادیا کہ دائیں کروٹ پر لیٹو، یہ بھی آداب میں ہے کہ انسان جب سونے کے لئے بستر پر لیٹے تو ابتداء دائیں کروٹ پر لیٹے، بعد میں اگر ضرورت ہو تو کروٹ بدل دے، وہ ادب کے خلاف نہیں ہے اور لیٹ کر یہ الفاظ زبان سے ادا کرو، اور اللہ تعالیٰ سے رابطہ اور تعلق قائم کرو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، اور یہ دعا پڑھو:

((اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْكَ، وَ وَجَّهْتُ وَجْهِیْ اِلَیْكَ، وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَیْكَ، وَاَلْجَأْتُ ظَهْرِیْ اِلَیْكَ، رَغْبَةً وَرَهْبَةً اِلَیْكَ، لَامَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا

اِلَیْکَ، آمَنْتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَنَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ))

دن کے معاملات اللہ کے سپرد کر دو

حضور اقدس ﷺ اس دعا میں ایسے عجیب وغریب الفاظ لائے ہیں کہ آدمی ان الفاظ پر قربان ہو جائے، فرمایا کہ اے اللہ، میں نے اپنے نفس کو آپ کے تابع بنا دیا، اس کا ترجمہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ اے اللہ، میں نے اپنے نفس کو آپ کے حوالے کر دیا، اور میں نے اپنا رخ آپ کی طرف کر دیا، اور اے اللہ، میں نے اپنے سارے معاملات آپ کو سونپ دیئے، مطلب یہ ہے کہ سارا دن تو دوڑ دھوپ میں لگا رہا۔ کبھی رزق کی تلاش میں کبھی نوکری کی تلاش میں، کبھی تجارت میں، کبھی صنعت میں اور کبھی کسی اور دھندے میں لگا رہا، یہاں تک کہ دن ختم ہو گیا۔ ساری کاروائیاں کر کے گھر پہنچ گیا، اور اب سونے کے لئے لیٹنے لگا۔ اور انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ رات کو بستر پر سونے کے لئے لیٹتا ہے۔ تو جو کچھ دن میں حالات گزرے ہیں۔ اس کے خیالات دل پر چھا جاتے ہیں، اور پھر اس کو یہ فکر اور تشویش لاحق ہوتی ہے کہ خدا جانے کل کیا ہو گا؟ جو کام ادھورا چھوڑ کر آیا ہوں۔ اس کا کیا بنے گا؟ دکان چھوڑ کر آیا ہوں۔ کہیں رات کو چوری نہ ہو جائے۔ یہ سب اندیشے اور تشویشات رات کو سوتے وقت انسان کو ہوتے ہیں، اور یہ اندیشے دل کو ستاتے ہیں، اس لئے دعا کر لو کہ یا اللہ دن میں تو جو کام مجھ سے ہو سکے، میں کرتا رہا، اب تو یہ سارے معاملات میں نے آپ کے سپرد کر دیئے ہیں۔

دن میں جو کچھ کر سکتا تھا وہ کر لیا، اب میرے بس میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ ہی کی طرف رجوع کروں، اور آپ ہی سے مانگوں، کہ یا اللہ! جو معاملات میں نے کئے ہیں۔ ان کو انجام تک پہنچا دیجئے۔

سکون وراحت کا ذریعہ ''تفویض'' ہے

یہی ''تفویض'' ہے اور اسی کا نام توکل ہے کہ اپنے کرنے کا جو کام تھا وہ کر لیا، اپنے بس میں جتنا تھا وہ کر گزرے، اور اس کے بعد اللہ کے حوالے کر دیا کہ یا اللہ! اب آپ کے حوالے ہے، اس دعا میں حضور اقدس ﷺ نے سکھا دیا کہ اب تم سونے کے لئے جا رہے ہو۔ تو ان خیالات اور پریشانیوں کو دل سے نکال دو، اور اللہ کے حوالے کر دو۔

سپردم بتو مایہ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

سپردگی اور ''تفویض'' کے لطف اور اس کے کیف اور مزے کا اندازہ انسان کو اس وقت تک نہیں

ہوتا، جس تک یہ سپردگی اور تفویض کی حالت اور کیفیت انسان پر گزرتی نہیں۔ یاد رکھو، دنیا میں عافیت، اطمینان اور سکون کا کوئی راستہ تفویض اور توکل کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، بس اپنا سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے ہر کام کے لئے دوڑ دھوپ کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس حد سے آگے انسان کچھ نہیں کر سکتا۔

ایک مسلمان اور کافر میں یہی فرق ہے کہ ایک کافر ایک کام کے لئے دوڑ دھوپ کرتا، محنت کرتا ہے، کوشش کرتا ہے، جد جہد کرتا ہے اور پھر سارا بھروسہ اسی کوشش پر کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر وقت تشویشات اور اندیشوں میں مبتلا رہتا ہے اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ ''توکل'' اور ''تفویض'' کی نعمت عطا فرماتے ہیں۔ وہ اللہ میاں سے کہتا ہے کہ یا اللہ، میرے بس میں اتنا کام تھا۔ جو میں نے کر لیا۔ اب آگے آپ کے حوالے ہے اور آپ کا جو فیصلہ ہے، اس پر میں راضی ہوں۔ یاد رکھو، جب انسان کے اندر یہ ''تفویض'' کی صفت پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا کے اندر اس کو نا قابل برداشت پریشانی نہیں آتی، بہرحال، سوتے وقت یہ دعا کر لو کہ یا اللہ، میں نے تمام معاملات آپ کے سپرد اور آپ کے حوالے کر دیئے۔

پناہ کی جگہ ایک ہی ہے

((وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِیْ إِلَيْكَ، رَغْبَةً وَرَهْبَةً إِلَيْكَ، لَامَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ))

اور میں نے آپ کو آپ کی پناہ حاصل کرنے والا بنا دیا، یعنی میں نے آپ کی پناہ پکڑی آپ کی پناہ میں آگیا، اور اب ساری دنیا کے وسائل اور اسباب سب منقطع کر لئے۔ اب سوائے آپ کی پناہ کے میرا کوئی سہارا نہیں، اور اس حالت میں ہوں کہ آپ کی طرف رغبت بھی ہے۔ آپ کی رحمت کی امید بھی ہے کہ آپ رحمت کا معاملہ فرمائیں گے، لیکن ساتھ میں خوف بھی ہے۔ یعنی اپنی بداعمالیوں کا ڈر بھی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی بات پر گرفت ہو جائے، اس حالت میں لیٹ رہا ہوں۔ آگے کیا عجیب جملہ فرمایا:

((لَامَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ))

آپ سے بچ کر جانے کی کوئی اور جگہ سوائے آپ کے نہیں ہے کہ خدا نہ کرے۔ اگر آپ کا کوئی قہر آجائے۔ یا آپ کا عذاب آجائے تو ہم بچ کر کہاں جائیں، اس لئے کہ کوئی اور پناہ کی جگہ ہے نہیں، پھر لوٹ کر آپ ہی کے پاس آنا پڑے گا کہ اے ''اللہ'' اپنے غضب اور قہر سے بچا لیجئے۔

تیر چلانے والے کے پہلو میں بیٹھ جاؤ

ایک بزرگ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ تم یہ تصور کرو کہ ایک زبردست قوت ہے، اور اس کے ہاتھ میں کمان ہے، اور یہ پورا آسمان اس کمان کی قوس ہے، اور زمین اس کی تانت ہے، اور حوادث اور مصیبتیں اس کمان سے چلنے والے تیر ہیں، اب یہ دیکھو کہ ان حوادث کے تیروں سے بچنے کا راستہ کیا ہے؟ کیسے ان سے بچیں؟ کہاں جائیں؟ پھر خود ہی ان بزرگ نے جواب دیا کہ ان تیروں سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ خود اسی تیر چلانے والے کے پاس جا کر کھڑا ہو جائے، ان تیروں سے بچنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے، یہی مفہوم ہے ان الفاظ کا:

((لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ))

ایک نادان بچے سے سبق لو

میرے ایک بڑے بھائی ہیں ان کا ایک پوتا ہے۔ ایک دن انہوں نے دیکھا کہ اس پوتے کی ماں اس پوتے کو کسی بات پر مار رہی ہیں، لیکن عجیب منظر یہ دیکھا کہ ماں جتنا مارتی جا رہی ہے۔ بچہ اسی ماں کی گود میں چڑھتا جا رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ وہاں سے بھاگے، وہ تو اور گود کے اندر گھس رہا ہے، اور ماں سے لپٹا جا رہا ہے، یہ بچہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ اس لئے کہ وہ بچہ جانتا ہے کہ اس ماں کی پٹائی سے بچنے کا راستہ بھی اسی ماں ہی کے پاس ہے، اور اسی ماں ہی کے پاس جا کر قرار اور سکون ملے گا، اس ماں کی گود کے علاوہ کوئی اور سکون اور قرار کی جگہ نہیں ہے، اس نادان بچے کو تو اتنا فہم ہے، وہ جانتا ہے کہ کہیں اور قرار نہیں ملے گا۔

یہی فہم اور ادراک نبی کریم سرور دو عالم ﷺ ہمارا اندر بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مصیبت اور تکلیف آئی ہے، تو پناہ بھی اسی کے پاس ہے، اسی سے مانگو کہ یا اللہ! اس مصیبت اور تکلیف کو دور فرما دیجئے، آپ کے علاوہ کوئی پناہ کی جگہ بھی نہیں، اس لئے آپ ہی سے آپ کے عذاب سے پناہ مانگتے ہیں۔

سیدھے جنت میں جاؤ گے

آگے فرمایا:

((آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِىْ اَنْزَلْتَ وَنَبِيِّكَ الَّذِىْ اَرْسَلْتَ))

”میں ایمان لایا آپ کی کتاب پر جو آپ نے نازل کی، اور آپ کے نبی پر جو آپ

نے بھیجا، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ پر"

اور پھر فرمایا کہ یہ کلمات سونے سے پہلے کہو، اور یہ کلمات تمہاری آخری گفتگو ہو۔ اس کے بعد کوئی اور بات نہ کرو، بلکہ سو جاؤ۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ رات کو سوتے وقت چند کام کرلیا کرو۔ ایک تو دن کے بھر کے گناہوں سے توبہ کرلیا کرو۔ بلکہ سارے پچھلے گناہوں سے توبہ کرلیا کرو۔ اور وضو کرلیا کرو۔ اور یہ مذکورہ بالا دعا پڑھ لیا کرو۔ اس دعا کے ذریعہ ایمان کی بھی تجدید ہوگئی۔ اس کے بعد داہنی کروٹ پر سو جاؤ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری نیند عبادت بن گئی، اور اگر اس حالت میں رات کو سوتے سوتے موت آگئی تو انشاء اللہ سیدھے جنت میں جاؤ گے، اللہ نے چاہا تو کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

سونے اور جاگنے کی دعائیں

وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَخَذَ مَضْجَعَهُ مِنَ اللَّيْلِ وَضَعَ يَدَهُ تَحْتَ خَدِّهِ ثُمَّ يَقُوْلُ: ((اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوْتُ وَأَحْيَا)) وَإِذَا اسْتَيْقَظَ قَالَ: ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ)) (١)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب رات کے وقت اپنے بستر پر تشریف لے جاتے، تو اپنا ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھ لیتے تھے، اور پھر یہ دعا پڑھتے:

((اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوْتُ وَأَحْيَا))

"اے اللہ! میں آپ کے نام سے مرتا ہوں، آپ کے نام سے جیتا ہوں"

نیند ایک چھوٹی موت ہے

اس سے پہلے جو حدیث گزری اس میں طویل دعا منقول تھی، اور اس حدیث میں مختصر دعا منقول ہے، بہر حال، سوتے وقت دونوں دعائیں پڑھنا ثابت ہیں، لہٰذا کبھی ایک دعا پڑھ لی جائے، اور کبھی دوسری دعا پڑھ لی جائے اور اگر دونوں دعاؤں کو جمع کرلیا جائے تو اور بھی اچھا ہے اور یہ دوسری دعا تو بہت ہی مختصر ہے، اس کو یاد رکھنا بھی آسان ہے، اس مختصر دعا میں سوتے وقت حضور اقدس ﷺ

---

(١) صحيح البخاري، كتاب الدعوات، باب ما يقول إذا أصبح، رقم: ٥٨٥٠، سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب منه، رقم: ٣٣٣٩، مسند أحمد، رقم: ٢٠٤٠٤

نے اس بات کی طرف توجہ دلادی کہ نیند بھی ایک چھوٹی موت ہے۔ اس لئے کہ نیند میں انسان دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے، جیسا کہ مردہ بے خبر ہوتا ہے۔ اس لئے اس چھوٹی موت کے وقت اس بڑی موت کا احساس کیا جائے۔ اس کو یاد کیا جائے۔ یہ چھوٹی نیند تو مجھے روزانہ آتی ہے اور عام طور پر میں اس سے بیدار ہو جاتا ہوں لیکن ایک نیند آنے والی ہے۔ جس سے بیداری قیامت کے دن ہوگی۔ اس کا استحضار کیا جائے۔ اس کو یاد کیا جائے، اور اللہ تعالیٰ سے اس کے بارے میں مدد مانگی جائے کہ اے اللہ! میں آپ ہی کے نام پر مرتا ہوں اور جیتا ہوں۔

بیدار ہونے کی دعا

اور جب آپ ﷺ سونے سے بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ))

''اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہمیں موت کے بعد زندگی عطا فرمائی، اور بالآخر اسی کی طرف ایک دن لوٹ کر جانا ہے''

یعنی آج یہ موت آئی وہ چھوٹی موت تھی، اس سے بیداری ہوگئی۔ زندگی کی طرف واپسی ہوگئی، لیکن بالآخر ایک ایسی نیند آنے والی ہے، جس کے بعد واپسی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہوگی، اس دنیا کی طرف نہیں ہوگی۔

موت کو کثرت سے یاد کرو

قدم قدم پر حضور اقدس ﷺ دو باتیں سکھا رہے ہیں۔ ایک تعلق مع اللہ، یعنی قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔ قدم قدم پر اللہ کا ذکر اور دوسرے آخرت کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اس لئے کہ جب روزانہ انسان سوتے وقت اور جاگتے وقت یہ دعائیں پڑھے گا تو اس کو ایک نہ ایک دن موت اور موت کے بعد پیش آنے والے واقعات کا دھیان ضرور آئے گا۔ کب تک یہ دھیان اور خیال نہیں آئے گا۔ کب تک غفلت میں مبتلا رہے گا۔ اس لئے یہ دعائیں آخرت کی فکر پیدا کرنے کے لئے بڑی اکسیر ہیں، حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَکْثِرُوْا ذِکْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ))(۱)

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ماجاء فی ذکر الموت، رقم:۲۲۲۹، سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب کثرة ذکر الموت، رقم:۱۸۰۱

''اس چیز کا ذکر کثرت سے کرو جو تمام لذتوں کو ختم کر دینے والی ہے، یعنی موت''

اس لئے مرنے کو یاد کرنے سے موت کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونے کا احساس خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ ہماری زندگیوں میں جو خرابیاں آ گئی ہیں۔ وہ غفلت کی وجہ سے آئی ہیں۔ موت سے غفلت دور ہو جائے، اور یہ بات مستحضر ہو جائے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ تو پھر انسان اپنے ہر قول اور فعل کو سوچ سوچ کر کرے گا۔ کہ کوئی کام اللہ کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے۔ اس لئے ان دعاؤں کو خود بھی یاد کرنا چاہئے اور اپنے بچوں کو بچپن ہی میں یاد کرا دینا چاہئے۔

الٹا لیٹنا پسندیدہ نہیں

عَنْ يَعِيْشِ بْنِ طَخْفَةَ الْغِفَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ اَبِیْ: بَيْنَمَا آنَا مُضْطَجِعٌ فِي الْمَسْجِدِ عَلٰى بَطْنِيْ اِذَا رَجُلٌ يُحَرِّكُنِيْ بِرِجْلِهٖ فَقَالَ: ((إِنَّ هٰذِهٖ ضِجْعَةٌ يُبْغِضُهَا اللّٰهُ)) قَالَ: فَنَظَرْتُ فَإِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (۱)

''حضرت یعیش بن طخفہ غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے والد نے مجھے یہ واقعہ بتایا کہ میں ایک دن مسجد میں پیٹ کے بل اُلٹا لیٹا ہوا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کوئی شخص اپنے پاؤں سے مجھے حرکت دے رہا ہے، اور ساتھ ساتھ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ لیٹنے کا وہ طریقہ ہے جسے اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتے ہیں۔ جب میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ کہنے والے شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تھے''

گویا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے سے لیٹنے کو پسند نہیں فرمایا، یہاں تک کہ پاؤں سے حرکت دے کر ان کو اس پر تنبیہ فرمائی، اس سے معلوم ہوا کہ بلا ضرورت الٹا لیٹنا مکروہ ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھی ناپسند ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ناپسند ہے۔

وہ مجلس باعث حسرت ہوگی

وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((مَنْ قَعَدَ مَقْعَدًا لَمْ يَذْكُرِ اللّٰهَ تَعَالىٰ فِيْهِ كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللّٰهِ تِرَةٌ وَمَنِ اضْطَجَعَ مَضْجَعًا لَايَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْهِ كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللّٰهِ تِرَةٌ))(۲)

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في الرجل ينبطح على بطنه، رقم:۴۳۸۳، مسند أحمد، رقم:۱۴۹۹۳

(۲) سنن أبي داود، كتاب الادب، باب كراهية أن يقوم الرجل من مجلسه لايذكر الله، رقم:۴۲۱۵

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جو شخص کسی ایسی مجلس میں بیٹھے جس میں اللہ کو یاد نہ کیا گیا ہو، اللہ کا کوئی ذکر اس مجلس میں نہ آیا ہو، نہ اللہ کا نام لیا گیا ہو، تو آخرت میں وہ مجلس اس کے لئے حسرت کا باعث بنے گی۔ یعنی جب آخرت میں پہنچے گا، اس وقت حسرت کرے گا کہ کاش، میں مجلس میں نہ بیٹھا ہوتا، جس میں اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ اس لئے فرمایا کہ مسلمان کی کوئی مجلس اللہ کے ذکر سے خالی نہ ہونی چاہئے۔

ہماری مجلسوں کا حال

اب ذرا ہم لوگ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اپنے حالات کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہماری کتنی مجلسیں محفلیں غفلت کی نظر ہو جاتی ہیں، اور ان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر، اللہ کا نام، یا اللہ کے دین کا کوئی تذکرہ ان میں نہیں ہوتا، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ قیامت کے روز ایسی تمام مجلسیں وبال اور حسرت کا ذریعہ ہونگی۔ ہمارے یہاں مجلس آرائی کا سلسلہ چل پڑا ہے، اسی مجلس آرائی ہی کو مقصد بنا کر لوگ بیٹھ جاتے ہیں، اور فضول باتیں کرنے کے لئے باقاعدہ محفل جمائی جاتی ہے، جس کا مقصد گپ شپ کرنا ہوتی ہے، یہ گپ شپ کی مجلس بالکل فضول اور بے کار اور بے مقصد اور اوقات کو ضائع کرنے والی بات ہے اور جب مقصد صحیح نہیں ہوتا، بلکہ محض وقت گزاری مقصود ہوتی ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسی مجلس میں اللہ تبارک وتعالیٰ اور اللہ کے دین سے غفلت تو ہوگی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس مجلس میں کبھی کسی کی غیبت ہوگی، کبھی جھوٹ ہوگا، کبھی کسی کی دل آزادی ہوگی، کسی کی تحقیر ہوگی، کسی کا مذاق اڑایا جائے گا۔ یہ سارے کام اس مجلس میں ہوں گے۔ اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ سے غافل ہوگئے، تو اس غفلت کے نتیجے میں وہ مجلس بہت سے گناہوں کا مجموعہ بن جائے گی، اس بات کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ جس مجلس میں اللہ کا ذکر نہ کیا جائے تو وہ مجلس قیامت کے روز حسرت کا سبب بنے گی، ہائے ہم نے وہ وقت کیسا ضائع کر دیا، کیونکہ آخرت میں تو ایک ایک لمحے کی قیمت ہو گی، ایک ایک نیکی کی قیمت ہوگی۔ جب انسان کا حساب وکتاب ہو رہا ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حضوری ہوگی۔ اس وقت ایک ایک نیکی کا حساب ہوگا، اس وقت تمنا کرے گا کہ کاش، ایک نیکی میرے نامہ اعمال میں بڑھ جاتی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جو ہم پر ماں باپ سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں۔ وہ اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ قبل اس کے کہ وہ حسرت کا وقت آئے، ابھی سے اس بات کا دھیان کرلو کہ یہ مجلسیں حسرت بننے والی ہیں۔

تفریح طبع کی باتیں کرنا جائز ہے

لیکن ایک بات عرض کردوں کے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بس خشک اور کھر درا ہو کر رہ جائے، اور کسی سے کوئی خوش طبعی اور شگفتگی کی بات نہ کرے، یہ مقصد ہرگز نہیں، کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ سے منقول ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے پاس بیٹھے، تو کبھی آپ سے تفریح طبع کی باتیں بھی کیا کرتے تھے، بلکہ خود حضور اقدس نے فرمایا:

((رَوِّحُوا الْقُلُوْبَ سَاعَةً فَسَاعَةً)) (۱)

''کبھی کبھی اپنے دلوں کو آرام اور راحت دیا کرو''

اس لئے کبھی کبھی خوش طبعی اور شگفتگی کی باتیں کرنے میں کچھ حرج نہیں، یہاں تک کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ بعض اوقات حضور کی مجلس میں بیٹھے ہوتے تو زمانہ جاہلیت کے واقعات بھی کبھی کبھی بیان کرتے کہ ہم زمانہ جاہلیت میں یوں رہتے تھے اور بعض اوقات تبسم بھی فرماتے، لیکن ان مجلسوں میں اس بات کا اہتمام تھا کہ کوئی گناہ کا کام نہ ہو، غیبت اور دل آزاری نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ ان مجلسوں کے باوجود دل کی لو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف لگی ہوئی ہے۔ ذکر اللہ سے وہ مجلس خالی نہیں تھی، مثلاً اس مجلس میں زماہ جاہلیت کا ذکر کیا، اور پھر اس پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ضلالت اور گمراہی اور تاریکی سے نکال دیا، لہٰذا یہ طریقہ تھا حضور نبی کریم ﷺ کا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا، وہ حضرات اس کا مصداق تھے:

دست بکار، دل بیار

کہ ہاتھ اپنے کام میں مشغول ہے، زبان سے دوسری باتیں نکل رہی ہیں، اور دل کی لو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف لگی ہوئی ہے۔

حضور ﷺ کی شان جامعیت

''یہ بات کہنے کو تو آسان ہے، لیکن مشق سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے''

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بارہا سنا کہ ''یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ نبی کریم ﷺ کی وہ ذات بالا صفات جس کا ہر وقت اللہ جل شانہ سے رابطہ قائم ہے، وحی آرہی ہے، ایسے جلیل القدر مقامات پر جو ہستی فائز ہیں، وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ دل لگی کیسے کر لیتے ہیں؟ وہ اپنے اہل وعیال سے دنیا کی باتیں کیسے کر لیتے ہیں؟ جبکہ

(۱) کنز العمال، رقم: ٥٣٥٤ (٣٧/٣)

ہر وقت حضوری کا یہ عالم ہے۔ مگر رات کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو گیارہ عورتوں کی کہانی سنا رہے ہیں کہ گیارہ عورتیں تھیں۔ ان عورتوں نے یہ معاہدہ کیا کہ ہر عورت اپنے شوہر کی کیفیت بیان کرے کہ اس کا شوہر کیسا ہے؟ اب ہر عورت نے اپنے شوہر کا پورا حال بیان کیا کہ میرا شوہر ایسا ہے، میرا شوہر ایسا ہے، اب یہ سارا واقعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سنا رہے ہیں۔ (۱)

بہر حال، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات پہلے سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ جس ذات گرامی کا اللہ تعالیٰ سے اس درجہ تعلق قائم ہو، وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسری ازواج مطہرات کے ساتھ ہنسی اور دل لگی کی باتیں کیسے کر لیتے ہیں؟ لیکن بعد میں فرمایا کہ الحمدللہ، اب سمجھ میں آ گیا کہ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ جمع ہو سکتی ہیں، کہ دل لگی بھی ہو رہی ہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے ہو رہی ہے۔ اور دل میں یہ خیال ہے کہ میرے اوپر اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ حق واجب کیا ہے کہ ان کا دل خوش کروں۔ اس حق کی وجہ سے یہ دل لگی ہو رہی ہے۔ تو اللہ تبارک کے ساتھ رابطہ بھی قائم ہے، اور اس دل لگی کی وجہ سے وہ رابطہ نہ ٹوٹتا ہے، اور نہ کمزور ہوتا ہے۔ اس میں کوئی نقص نہیں آتا، بلکہ اس تعلق میں اور زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔

اظہار محبت پر اجر وثواب

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! اگر میاں بیوی آپس میں باتیں کرتے ہیں، اور ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کرتے ہیں، تو اس وقت ان کے ذہنوں میں اس بات کا تصور بھی نہیں ہوتا کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اس واسطے کر رہا ہوں، تو کیا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر ملتا ہے؟

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہاں، اللہ تعالیٰ اس پر بھی اجر عطا فرماتے ہیں، اور جب ایک مرتبہ دل میں یہ ارادہ کر لیا کہ میں ان تمام تعلقات کا حق اللہ کے لئے ادا کر رہا ہوں۔ اللہ کے حکم کے مطابق ادا کر رہا ہوں تو اب اگر ہر ہر مرتبہ میں اس بات کا استحضار بھی نہ ہو تو جب ایک مرتبہ جو نیت کر لی گئی ہے۔ انشاء اللہ وہ بھی کافی ہے۔

ہر کام اللہ کی رضا کی خاطر کرو

اس لئے ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم صبح کو بیدار ہو جاؤ، تو

(۱) صحيح البخاري، كتاب النكاح، باب حسن المعاشرة مع الأهل، رقم: ۴۷۹۰، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب ذكر حديث أم زرع، رقم: ۴۴۸۱

نماز کے بعد تلاوت قرآن اور ذکر و اذکار اور معمولات سے فارغ ہونے کے بعد ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرلو:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾(۱)

اے اللہ، آج دن بھر میں جو کچھ کام کروں گا، وہ آپ کی رضا کی خاطر کروں گا۔ کماؤں گا تو آپ کی رضا کی خاطر۔ گھر میں جاؤں گا تو آپ کی خاطر بچوں سے بات کروں گا تو آپ کی رضا کی خاطر، یہ سب کام میں اس لئے کروں گا کہ ان کے حقوق آپ نے میرے ساتھ وابستہ کر دیئے ہیں، اور جب ایک مرتبہ یہ نیت کرلی تو اب یہ دنیا کے کام نہیں ہیں۔ بلکہ یہ سب دین کے کام ہیں، اور اللہ کی رضا کے کام ہیں۔ ان کاموں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے تعلق ختم نہیں ہوتا، بلکہ وہ تعلق زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔

حضرت مجذوب رحمۃ اللہ علیہ اور اللہ کی یاد

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے جو تربیت یافتہ حضرات تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی یہی صفت عطا فرمائی تھی، چنانچہ میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بارہا یہ واقعہ سنا کہ حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اکابر خلفاء میں تھے، ایک مرتبہ وہ اور ہم لوگ امرتسر میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے میں جمع ہوگئے۔ اس وقت آم کا موسم تھا، رات کو کھانے کے بعد سب لوگ مل کر آم کھاتے رہے، اور آپس میں بے تکلفی کی باتیں بھی ہوتی رہیں، حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ چونکہ شاعر بھی تھے، اس لئے انہوں نے بہت سے اشعار سنائے، تقریباً ایک گھنٹہ اس طرح گزر گیا کہ شعر و شاعری اور ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہم سے اچانک یہ سوال کیا کہ دیکھو، ہم سب ایک گھنٹے سے یہ باتیں وغیرہ کر رہے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم میں سے کس کس کو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد سے غفلت ہوئی؟ ہم نے کہا کہ ہم سب ایک گھنٹے سے انہی باتوں میں خوش گپیوں میں منہمک ہیں۔ اس لئے سب ہی اللہ کے ذکر سے غفلت میں ہیں، اس پر حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ مجھے اس پورے عرصے میں اللہ کی یاد اور اس کے ذکر سے غفلت نہیں ہوئی۔ دیکھئے، ہنسی مذاق بھی ہو رہا ہے۔ دل لگی کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ شعر بھی سنائے جا رہے ہیں، اور شعر بھی سادہ انداز میں نہیں۔ بلکہ ترنم کے ساتھ شعر سنائے جا رہے ہیں، بعض اوقات شعر و شاعری میں گھنٹوں گزار دیتے تھے، لیکن

---

(۱) الأنعام: ۱۶۳، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

وہ فرمارہے ہیں کہ الحمد للہ مجھے اللہ کی یاد سے غفلت نہیں ہوئی، اس پورے عرصے میں دل اللہ تعالیٰ کی طرف لگا رہا۔

یہ کیفیت مشق کی بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، جب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کیفیت کا کوئی حصہ ہم لوگوں کو عطا فرما دے، اس وقت معلوم ہوگا کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔

دل کی سوئی اللہ کی طرف

میں نے اپنے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مکتوب دیکھا جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھا تھا۔ حضرت والد صاحب نے اس مکتوب میں لکھا تھا:

> ''حضرت، میں اپنے دل کی یہ کیفیت محسوس کرتا ہوں کہ جس طرح قطب نما کی سوئی ہمیشہ شمال کی طرف رہتی ہے اسی طرح اب میرے دل کی یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ چاہے کہیں پر بھی کام کر رہا ہوں چاہے مدرسہ میں ہوں یا گھر میں ہوں یا دکان پر ہوں یا بازار میں ہوں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل کی سوئی تھانہ بھون کی طرف ہے''

اب ہم لوگ اس کیفیت کو اس وقت تک کیا سمجھ سکتے ہیں جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل سے ہم لوگوں کو عطا نہ فرما دے لیکن کوشش اور مشق سے یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے کہ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کا احساس ہوتا رہے تو پھر آہستہ آہستہ یہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے کہ زبان سے دل لگی کی باتیں ہو رہی ہیں مگر دل کی سوئی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف لگی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ کیفیت عطا فرما دے۔

دل اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بنایا ہے

یہ ساری دُعائیں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تلقین فرما رہے ہیں، ان سب کا منتہاء مقصود یہ ہے کہ جس کسی کام میں تم لگے ہوئے ہو جس حالت میں بھی تم ہو، مگر تمہارا دل اللہ تعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہو۔ یہ دل اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بنایا ہے۔ دوسرے جتنے اعضاء ہیں، آنکھ، ناک، کان، زبان وغیرہ یہ سب دنیوی کاموں کے لئے ہے کہ ان کے ذریعے دنیاوی مقاصد حاصل کرتے چلے جاؤ لیکن یہ دل اللہ تبارک وتعالیٰ نے خالصتاً اپنے لئے بنایا ہے تاکہ اس کے اندر اللہ کی تجلی ہو، اس کی محبت سے یہ معمور ہو، اس کے ذکر سے یہ آباد ہو، اس بات کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ان الفاظ کے ذریعہ ارشاد فرمایا کہ ''افضل عمل یہ ہے کہ انسان کی زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے'' اسی زبان کو اللہ تعالیٰ نے

دل میں اُترنے کا زینہ بنایا ہے۔ اس لئے جب زبان سے ذکر کرتے رہو گے تو انشاء اللہ اس ذکر کو دل کے اندر اُتار دیں گے اور طریقت، تصوف وسلوک کا اصل مقصد بھی یہ ہے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد، اللہ تعالیٰ کی محبت اس طرح سما جائے کہ یہ اللہ جل جلالہ کی تجلی گاہ بن جائے۔

مجلس کی دعا اور گناہ

بہرحال حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا کہ جو شخص ایسی مجلس میں بیٹھے جس میں اللہ کا ذکر نہ ہو تو وہ مجلس قیامت کے دن باعث حسرت بنے گی اور اسی لئے سرکار دو عالم ﷺ پر قربان جائیے کہ وہ ہم جیسے غافلوں کے لئے کمزوروں کے لئے اور تن آسانوں کے لئے آسان آسان نسخے بتا گئے۔ چنانچہ آپ نے ہمیں یہ نسخہ بتادیا کہ جب کسی مجلس سے اُٹھنے لگو یہ کلمات کہہ لو:

﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ (۱)

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر مجلس اب تک اللہ کے ذکر سے خالی تھی، تو اب اللہ کے ذکر سے آباد ہو گئی۔ اب اس مجلس کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں اللہ کا ذکر نہیں ہوا، بلکہ ذکر ہو گیا۔ اگرچہ آخر میں ہوا اور دوسرے یہ کہ مجلس میں جو کمی کوتاہی ہوئی اس کے لئے یہ کلمات کفارہ ہو جائیں گے انشاء اللہ اور دوسرا کلمہ یہ پڑھے:

((سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ، اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ))(۲)

بہرحال یہ دونوں کلمات اگر مجلس سے اُٹھنے سے پہلے پڑھ لو گے تو انشاء اللہ پھر قیامت کے دن وہ مجلس باعث حسرت نہیں بنے گی اور اس مجلس میں جو کمی کوتاہی یا صغیرہ گناہ ہوئے ہیں وہ انشاء اللہ معاف ہو جائیں گے۔ البتہ جو کبیرہ گناہ کئے ہیں تو وہ اس کے ذریعے معاف نہیں ہوں گے۔ جب تک آدمی توبہ نہ کرلے، اس لئے ان مجالس میں اس کا خاص اہتمام کریں کہ ان میں جھوٹ نہ ہو، غیبت نہ ہو، دل آزاری نہ ہو اور جتنے کبیرہ گناہ ہیں ان سے اجتناب ہو، کم از کم اس کا اہتمام کرلیں۔

(۱) الصّٰفّٰت: ۱۸۰۔۱۸۲، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "تمہارا پروردگار، عزت کا مالک، ان سب باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بناتے ہیں! اور سلام ہو پیغمبروں پر، اور تمام تر تعریف اللہ کی ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے"

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما يقول اذا قام من المجلس، رقم: ۳۳۵۵، سنن أبی داؤد، كتاب الأدب، باب فی كفارة المجلس، رقم: ٤٢١٦، مسند أحمد، رقم: ۱۸۹۳۳، دعا کا ترجمہ یہ ہے: "اے اللہ تو پاک ہے اور میں تیری ہی تعریف بیان کرتا ہوں میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں میں تجھ سے معافی طلب کرتا ہوں اور تیرے دربار میں توبہ کرتا ہوں"

سونے کو عبادت بنالو:

اس حدیث میں اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَمَنِ اضْطَجَعَ مَضْجَعًا لَّا يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْهِ كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللّٰهِ تِرَةٌ))

یعنی جو شخص کسی ایسے بستر پر لیٹے کہ اس لیٹنے کے سارے عرصے میں ایک مرتبہ بھی اللہ کا نام نہ لے تو وہ لیٹنا بھی قیامت کے روز اس کے لئے حسرت کا ذریعہ بنے گا اس بستر میں لیٹا تھا لیکن میں نے اس میں اللہ کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے کہ نہ سوتے وقت دعا پڑھی اور نہ بیداری کے وقت دعا پڑھی۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ سونے سے پہلے بھی ذکر کرلو اور آخر میں بھی ذکر کرلو اور درحقیقت مومن کی پہچان یہی ہے کہ وہ ذکر کر کے سوئے اس لئے کہ ایک کافر بھی سوتا ہے اور ایک مومن بھی سوتا ہے لیکن کافر غفلت میں سوتا ہے، اللہ کو یاد کئے بغیر سوتا ہے اور مومن اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ذکر کے ساتھ سوتا ہے اس لئے سارا سونا اس کے لئے عبادت بن جاتا ہے۔

اگر تم اشرف المخلوقات ہو

یہی وہ طریقے ہیں جو حضور نبی کریم ﷺ ہمیں سکھا گئے اور ہمیں جانوروں سے ممتاز کر دیا۔ کافروں سے ممتاز کر دیا۔ آخر گدھے گھوڑے بھی سوتے ہیں، کون سا جانور ایسا ہے جو نہیں سوتا ہوگا لیکن اگر تم اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتے ہو تو پھر سوتے وقت اور بیدار ہوتے وقت اپنے خالق کو یاد کرنا نہ بھولو۔ اسی لئے دعائیں ہمیں تلقین فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان دعاؤں کا پابند بنادے اور اس کے انوار و برکات ہم سب کو عطا فرمادے۔

ایسی مجلس مردار گدھا ہے

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:
((مَا مِنْ قَوْمٍ يَقُوْمُوْنَ مِنْ مَجْلِسٍ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ تَعَالٰى فِيْهِ اِلَّا قَامُوْا عَنْ مِثْلِ جِيْفَةِ حِمَارٍ، وَكَانَ لَهُمْ حسرةٌ))(۱)

"حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو قوم کسی ایسی مجلس سے اٹھے جس میں اللہ کا ذکر نہیں ہے تو یہ مجلس ایسی ہے جیسے کسی

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب كراهية أن يقوم الرجل من مجلسه ولا يذكر الله، رقم: ٤٢١٤، مسند أحمد، رقم: ١٠٢٦٤

مردہ گدھے کے پاس سے اُٹھ گئے، گویا کہ وہ مجلس مردار گدھا ہے جس میں اللہ کا ذکر نہ کیا جائے اور قیامت کے روز وہ مجلس ان کے لئے حسرت کا سبب بنے گی"

نیند اللہ کی عطا ہے

یہ سونے اور اس کے آداب، لیٹنے اور اس کے آداب اور اس کے متعلقات کا بیان چل رہا ہے اور جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں نبی ﷺ نے ہمیں صحیح طریقہ نہ بتایا ہو اور جس کے بارے میں یہ نہ بتایا ہو کہ اس وقت تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ نیند بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ اگر یہ حاصل نہ ہو تب پتہ لگے کہ اس کا نہ ہونا کتنی بڑی مصیبت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے عطا فرمادی ہے اور اس طرح عطا فرمائی ہے کہ ہماری کسی محنت کے بغیر نظام ہی ایسا بنا دیا کہ وقت پر نیند آجاتی ہے، انسان کے جسم میں کوئی ایسا سوئچ نہیں ہے کہ اگر اس کو دبا دو گے تو نیند آجائے گی، بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔

رات اللہ کی عظیم نعمت ہے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس پر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے نیند کا نظام ایسا بنا دیا کہ سب کو ایک ہی وقت میں نیند کی خواہش ہوتی ہے۔ ورنہ اگر یہ ہوتا کہ ہر شخص نیند کے معاملے میں آزاد ہے کہ جس وقت وہ چاہے سو جائے تو اب یہ ہوتا کہ ایک آدمی کا صبح آٹھ بجے سونے کا دل چاہ رہا ہے ایک آدمی کا بارہ بجے سونے کا دل چاہ رہا ہے، ایک آدمی کا چار بجے سونے کا دل چاہ رہا ہے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک آدمی سونا چاہ رہا ہے اور دوسرا آدمی اپنے کام میں لگا ہوا ہے اور اس کے سر پر کھٹ کھٹ کر رہا ہے تو اب صحیح طور پر نیند نہیں آئے گی۔ بے آرامی رہے گی اس لئے اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظام ایسا بنا دیا کہ ہر انسان کو، جانوروں کو پرندوں، چرندوں کو درندوں کو ایک ہی وقت میں نیند آتی ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کیا ایک وقت میں سونے کے نظام کے لئے کوئی بین الاقوامی کانفرنس ہوئی تھی؟ اور ساری دنیا کے نمائندوں کو بلا کر مشورہ کیا گیا تھا کہ کون سے وقت سویا کریں۔ اگر انسان کے اُوپر اس معاملے کو چھوڑا جاتا تو انسان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ پوری دنیا کا نظام اس طرح کا بنا دیتا کہ ہر آدمی اس وقت سو رہا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہر ایک کے دل میں خود بخود یہ احساس ڈال دیا کہ یہ رات کا وقت سونے کا ہے اور نیند کو ان پر مسلط کر دیا۔

﴿وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا﴾(۱)

(۱) الأنعام: ۹٦

سب اس ایک وقت میں سو رہے ہیں، اس لئے قرآن کریم میں فرمایا:

کہ رات کو سکون کا وقت بنایا، دن کو معیشت کے لئے اور زندگی کے کاروبار کے لئے بنایا اس لئے یہ نیند اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ اس کی عطا سے فائدہ اُٹھاؤ اور اس کو ذرا سا یاد کر لو کہ یہ عطا کس کی طرف سے ہے اور اس کا شکر ادا کر لو اور اس کے سامنے حاضری کا احساس کر لو۔ یہ ان ساری تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

☆☆☆

سفارش ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَاهُ طَالِبُ حَاجَةٍ اَقْبَلَ عَلٰی جُلَسَاءِ فَقَالَ ((اشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا))(۱)

”حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب کوئی حاجت مند اپنی ضرورت لے کر آتا، اور اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے کوئی درخواست کرتا تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جو لوگ بیٹھے ہوتے تھے، آپ ان کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے کہ تم اس حاجت مند کی مجھ سے سفارش کردو“ آپ اس کی حاجت پور کریں“ تاکہ تمہیں بھی سفارش کا اجروثواب مل جائے“

البتہ فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان پر ہی کرائے گا جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرمائیں گے۔ یعنی تمہاری سفارش کی وجہ سے کوئی غلط فیصلہ تو میں نہ کروں گا۔ فیصلہ تو وہی کرونگا جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ لیکن تم جب سفارش کرو گے تو سفارش کرنے کا ثواب تم کو بھی مل جائے گا۔ اس لئے تم سفارش کرو۔

☆ اصلاحی خطبات (۹۴/۱ تا ۱۱۴)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب تعاون المؤمنین بعضهم بعضا، رقم: ۵۵٦٧، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآدب، باب استحباب الشفاعة فیما لیس حرام، رقم: ٤٧٦١

سفارش موجب اجر وثواب ہے

اس حدیث میں درحقیقت اس طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ ایک مسلمان کے لئے کسی دوسرے مسلمان بھائی کی سفارش کرنا، تاکہ اس کا کام بن جائے، یہ بڑے اجر وثواب کا کام ہے۔ اور اسی کی ترغیب دینی مقصود ہے کہ ایک مسلمان کو چاہئے کہ وہ دوسرے مسلمان بھائی کی خیر خواہی میں لگا رہے۔ اور اس کی حاجت روائی میں جتنی کوشش ہوسکتی ہے۔ وہ کرے اور اس کی سفارش سے اس کا کوئی کم بن سکتا ہے تو اس کی سفارش کرے اور اس سفارش کرنے کا انشاء اللہ اس کو اجر ملے گا۔ اس سے سفارش کے عمل کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے۔ اچھی سفارش کرنا بڑا باعث اجر وثواب ہے، اور اسی وجہ سے بزرگوں کے یہاں اس کا بڑا معمول رہا کہ جب کوئی حاجت مند آکر سفارش کراتا تو وہ عموماً اس کی سفارش کردیتے۔ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ میں نے سفارش کرکے اس پر بہت بڑا احسان کردیا، بلکہ اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے تھے۔

ایک بزرگ کی سفارش کا واقعہ

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے۔ غالباً حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے۔ نام صحیح طور پر یاد نہیں۔ ایک شخص ان بزرگ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ حضرت! میرا ایک کام رُکا ہوا ہے، اور فلاں صاحب کے اختیار میں ہے۔ اگر آپ اس سے کچھ سفارش فرمادیں تو میرا کام بن جائے، تو حضرت نے فرمایا جن صاحب کا تم نام لے رہے ہو۔ وہ میرے بہت سخت مخالف ہیں۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میری سفارش ان تک پہنچ گئی تو اگر وہ تمہارا کام کرتے ہوئے بھی ہوں گے تو بھی نہیں کریں گے، میں تمہاری سفارش کر دیتا، لیکن میری سفارش سے فائدہ ہونے کے بجائے الٹا نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ لیکن وہ شخص ان بزرگ کے پیچھے ہی پڑ گیا، کہنے لگا بس! آپ لکھ دیجئے، اس لئے کہ اگرچہ وہ آپ کا مخالف ہے، لیکن آپ کی شخصیت ایسی ہے کہ امید ہے کہ وہ اس کو رد نہیں کریں گے، ان بزرگ نے مجبور ہوکر ان کے نام ایک پرچہ لکھ دیا، جب وہ شخص پرچہ لے کر وہاں پہنچا تو ان بزرگ کا جو خیال تھا کہ یہ میرا مخالف ہے، اور کام کرتا ہوا بھی ہوگا تو نہیں کرے گا، وہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ اور بجائے اس کہ وہ اس پرچہ کی کچھ قدر کرتا، یا اس پر عمل کرتا، اس اللہ کے بندے نے ان بزرگ کو گالی دے دی، اب وہ شخص ان بزرگ کے پاس واپس آیا، اور آکر کہا کہ حضرت! آپ کی بات سچی تھی۔ واقعۃً بجائے اس کے وہ اس کی قدر اور احترام کرتا، اس نے تو الٹا گالی دے دی، ان بزرگ نے فرمایا کہ اب میں اللہ تعالیٰ سے

تمہارے لئے دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا کام بنادے۔

سفارش کر کے احسان نہ جتلائیے

معلوم ہوا کہ سفارش کرنا بڑے اجر وثواب کا کام ہے، بشرطیکہ اس سے کسی اللہ کے بندے کو فائدہ پہنچانا اور ثواب حاصل کرنا مقصود ہو۔ احسان جتلانا مقصود نہ ہو کہ فلاں وقت میں نے تمہارا کام بنادیا تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا مقصود ہو کہ اللہ کے ایک بندے کے کام میں میں نے تھوڑی سی مدد کر دی۔ تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس پر مجھے اجر وثواب عطا فرمائیں گے۔ اس نقطہ نظر سے جو سفارش کی جائے، وہ بہت باعث اجر وثواب ہے۔

سفارش کے احکام

لیکن سفارس کرنے کے کچھ احکام ہیں۔ کس موقع پر سفارش کرنا جائز ہے اور کس موقع پر جائز نہیں؟ سفارش کا مطلب کیا ہے؟ سفارش کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے؟ کس طرح سفارش کرنی چاہئے؟ یہ ساری باتیں سمجھنے کی ہیں، اور ان کے نہ سمجھنے کی وجہ سے سفارش، جو بہت اچھی چیز بھی تھی۔ فائدہ مند اور باعث اجر وثواب چیز تھی، الٹی باعث گناہ بن رہی ہے۔ اور اس سے معاشرے میں فساد پھیل رہا ہے۔ اس لئے ان احکام کو سمجھنا ضروری ہے۔

نا اہل کے لئے منصب کی سفارش

پہلی بات یہ ہے کہ سفارش ہمیشہ ایسے کام کی ہونی چاہئے جو جائز اور برحق ہو۔ کسی ناجائز کام کے لئے یا ناحق کام کے لئے سفارش کسی حالت میں بھی جائز نہیں۔ ایک شخص کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ وہ فلاں منصب اور فلاں عہدہ کا اہل نہیں ہے۔ اور اس نے اس عہدہ کے حصول کے لئے درخواست دے رکھی ہے۔ اور آپ کے پاس سفارش کے لئے آتا ہے، لیکن آپ نے صرف یہ دیکھ کر کہ ضرورت مند ہے۔ سفارش لکھ دی کہ اس کو فلاں منصب پر فائز کر دیا جائے، یا فلاں ملازمت اس کو دے دی جائے، تو یہ سفارش ناجائز ہے۔

سفارش، شہادت اور گواہی ہے

اس لئے کہ سفارش جس طرح اس شخص کی حاجت پوری کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہاں ساتھ ساتھ ایک شہادت اور گواہی بھی ہے۔ جب آپ کسی شخص کے حق میں سفارش کرتے ہیں تو آپ اس

بات کی گواہی دیتے ہیں کہ میری نظر میں یہ شخص اس کام کے کرنے کا اہل ہے، لہٰذا میں آپ سے یہ سفارش کرتا ہوں کہ اس کو یہ کام دے دیا جائے۔ تو یہ ایک گواہی ہے، اور گواہی کے اندر اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ واقعہ کے خلاف نہ ہو، اگر آپ نے اس شخص کے بارے میں لکھ دیا، اور حقیقت میں وہ نااہل ہے تو گواہی حرام ہوئی۔ اور باعث ثواب ہونے کے بجائے الٹا باعث گناہ بن گئی، اور ایسا گناہ ہے کہ اگر اس کی نااہلی کے باوجود آپ کی سفارش کی بنیاد پر اس کو اس عہدہ پر رکھ لیا گیا، اور اپنی نااہلی کی وجہ سے اس نے لوگوں کو نقصان پہنچایا، یا کوئی غلط کام کیا۔ تو سارے نقصانات اور غلط کاموں کے وبال کا ایک حصہ سفارش کرنے والے پر بھی آئے گا۔ کیونکہ اس نااہل کے اس عہدہ تک پہنچنے میں یہ سبب بنا ہے۔ لہٰذا یہ سفارش بھی ہے اور گواہی بھی ہے اور ناجائز کام کے لئے سفارش کرنا گواہی دینا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

ممتحن سے سفارش کرنا

کسی زمانہ میں میرے پاس یونیورسٹی سے ایم اے اسلامک اسٹڈیز کے پرچے جانچنے کے لئے آجایا کرتے تھے۔ اور میں لے بھی لیا کرتا تھا، لیکن لینے کیا شروع کئے کہ اسکے نتیجے میں لوگوں کی قطار لگ گئی، کبھی کوئی ٹیلیفون آ رہا ہے، کبھی کوئی آدمی آ رہا ہے۔ اور آدمی بھی ایسے جو بظاہر بڑے دیانتدار اور امانت دار، اور ثقہ قسم کے لوگ باقاعدہ میرے پاس اسی مقصد کے لئے آتے اور ان کے ہاتھوں میں نمبروں کی ایک فہرست ہوتی، اور آکر کہتے کہ ان نمبر والوں کا ذرا خاص خیال رکھئے گا۔

سفارش کا ایک عجیب واقعہ

ایک مرتبہ بڑے عالم شخص بھی اس طرح نمبروں کی فہرست لے کر آگئے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت! یہ تو بڑی غلط اور ناجائز بات ہے کہ آپ یہ سفارش لے کر آگئے ہیں۔ انشاء اللہ حق وانصاف کے مطابق جو جتنے نمبر کا مستحق ہوگا اتنے نمبر لگائے جائیں گے۔ جواباً انہوں نے فوراً قرآن کریم کی آیت پڑھ دی:

﴿مَّن يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُن لَّهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا﴾(۱)

مولوی کا شیطان بھی مولوی

ہمارے والد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ مولوی کا شیطان بھی مولوی

(۱) النساء: ۸۵، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "جو شخص کوئی اچھی سفارش کرتا ہے، اس کو اس میں سے حصہ ملتا ہے"

ہوتا ہے۔ عام آدمی کا شیطان تو دوسرے طریقوں سے بہکاتا ہے۔ اور جو شیطان مولوی کو بہکاتا ہے، وہ مولوی بن کر بہکاتا ہے۔ ان عالم صاحب نے اس آیت سے استدلال کیا کہ قرآن کریم میں ہے کہ سفارش کرو، اس لئے کہ سفارش بڑے اجر و ثواب کا کام ہے، اس لئے میں سفارش لے کر آیا ہوں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ یہ سفارش جائز نہیں۔

سفارش سے منصف کا ذہن خراب نہ کریں

کسی قاضی اور جج کے تصفیہ کے لئے کوئی فیصلہ درپیش ہے، اور اس کے سامنے فریقین کی طرف سے گواہیاں پیش ہو رہی ہیں۔ اس وقت میں اگر کوئی یہ سفارش کرے کہ فلاں کا ذرا خیال رکھئے گا، یا فلاں کے حق میں فیصلہ کر دیجئے گا، تو یہ سفارش جائز نہیں۔ اور جو ممتحن امتحان لے رہا ہے اس کے پاس بھی سفارش لے کر جانا جائز نہیں۔ اس واسطے کہ اس سفارش کے نتیجے میں اس کا ذہن خراب ہو سکتا ہے۔ اور وہ قاضی تو اسی کام کے لئے بیٹھا ہے کہ دونوں طرف کے معاملات کو تول کر پھر اپنا فیصلہ دے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر ہے۔

عدالت کے جج سے سفارش کرنا

اس لئے شریعت میں اس کا بہت اہتمام کیا گیا کہ جب ایک قاضی کے سامنے کوئی مقدمہ درپیش ہو، تو اس قاضی کے لئے حکم یہ ہے کہ اس مقدمہ سے متعلق کسی ایک فریق کی بات دوسرے فریق کی غیر موجودگی میں نہ سنے، جب تک دونوں فریق موجود نہ ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک شخص نے آکر آپ کو تنہائی میں معاملہ بتا دیا اور دوسرا آدمی اس سے بے خبر ہے، وہ اس کا جواب نہیں دے سکتا، اور وہ بات آپ کے ذہن پر مسلط ہو گئی، اور آپ کا ذہن اس سے متاثر ہو گیا تو یہ انصاف کے خلاف ہے۔ اس واسطے جب معاملہ قاضی کے پاس چلا جائے تو اس کے بعد سفارش کا دروازہ بند۔

سفارش پر میرا ردعمل

میرے پاس بھی کچھ مقدمات آجاتے ہیں۔ اور ان مقدمات سے متعلق بعض لوگ میرے پاس پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ درپیش ہے۔ آپ اس کا خیال رکھیں، تو میں کبھی ان کی بات نہیں سنتا، اور، یہ کہہ دیتا ہوں کہ میرے لئے اس مقدمہ سے متعلق آپ کی کوئی بات سننا اس وقت تک شرعاً جائز نہیں جب تک کہ دوسرا فریق موجود نہ ہو، لہٰذا آپ کو جو کچھ کہنا ہو آپ عدالت میں آکر کہئے، تاکہ دوسرا فریق بھی سامنے موجود ہو، اور اس کی موجودگی میں بات کہی جائے اور سنی جائے، تاکہ اگر

آپ غلط بات کہیں تو وہ اس کا جواب دے سکے، یہاں تنہائی میں آ کر آپ میرے ذہن کو خراب کر جائیں۔ وہ کہتا ہے کہ صاحب! ہم تو ناجائز سفارش نہیں کر رہے ہیں۔ ہم تو بالکل جائز بات لے کر آئے ہیں۔

ارے بھائی! مجھے کیا پتہ کہ جائز لے کر آئے ہو، یا ناجائز لے کر آئے ہو۔ دوسرا فریق بھی موجود ہو، اور اس کے دلائل، اس کی گواہیاں اور شہادتیں بھی سامنے ہوں، اس وقت آمنے سامنے فیصلہ ہوگا۔ بہرحال! علیحدگی میں جا کر اس کے ذہن کو متاثر کرنا جائز نہیں۔

تو ایسے موقع پر یہ کہنا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿مَّن يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُن لَّهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا﴾(۱)

یہ کسی طرح بھی جائز نہیں چونکہ ہمارے یہاں عرصہ دراز سے اسلام کا نظام قضاء ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ مسائل بھی لوگوں کو یاد نہیں رہے۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے بھول جاتے ہیں کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ ان کی طرف سے بھی سفارش آجاتی ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہوئی کہ سفارش ایسی جگہ کرنی چاہئے جہاں سفارش جائز ہے۔

بُری سفارش گناہ ہے

دوسری بات یہ ہے کہ سفارش ایسے کام کے لئے ہونی چاہئے جو کام شرعاً جائز ہو، لہٰذا ناجائز کام کرانے کے لئے سفارش کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔ مثلاً آپ کا دوست کہیں افسر لگا ہوا ہے اور اس کے ہاتھ میں اختیارات ہیں۔ اور آپ نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی نااہل کو برطرف کرا دیا تو یہ جائز نہیں، بلکہ حرام ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں جہاں اچھی سفارش کو باعث اجر قرار دیا گیا ہے وہاں بری سفارش کو باعث گناہ قرار دیا گیا ہے، فرمایا:

﴿وَمَن يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُن لَّهُ كِفْلٌ مِّنْهَا﴾(۲)

جو شخص بری سفارش کرے گا تو اس سفارش کرنے والے کو بھی اس گناہ میں سے حصہ ملے گا۔

سفارش کا مقصد صرف توجہ دلانا

یہ بات تو اہم ہے ہی، اور لوگ اعتقادی طور پر اس کو جانتے بھی ہیں کہ ناجائز سفارش نہیں کرنی چاہئے، لیکن اس سے بھی آگے ایک مسئلہ ہے۔ جس کی طرف عموماً دھیان نہیں۔ اور آج کل لوگ اس کا

(۱) النساء: ۸۵، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ”جو شخص کوئی اچھی سفارش کرتا ہے، اس کو اس میں سے حصہ ملتا ہے“

(۲) النساء: ۸۵، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ”اور جو کوئی بری سفارش کرتا ہے اسے اس برائی میں سے حصہ ملتا ہے“

بالکل خیال نہیں کرتے۔ وہ یہ ہے کہ لوگ آج کل سفارش کی حقیقت نہیں سمجھتے سفارش کی حقیقت یہ ہے کہ جس کے پاس سفارش کی جارہی ہے اس کو صرف توجہ دلانا ہے۔ یعنی اس کے علم اور ذہن میں ایک بات نہیں ہے، آپ نے اپنی سفارش کے ذریعے یہ توجہ دلا دی کہ یہ بھی ایک موقع ہے۔ اگر تم کرنا چاہو تو کرلو، سفارش کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس پر دباؤ اور پریشر ڈالا جائے کہ وہ یہ کام ضرور کرے، اس لئے کہ ہر انسان کے اپنے کچھ خیالات ہوتے ہیں، اور اس کے کچھ قواعد اور ضوابط اور اصول ہوتے ہیں، اور وہ آدمی ان اصولوں کے تحت رہ کر کام کرنا چاہتا ہے۔ اب آپ نے سفارش کر کے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا، اور دباؤ ڈال کر اس سے کام کرانا چاہا، تو یہ سفارش نہیں، زبردستی ہے، اور کسی بھی مسلمان کے اوپر زبردستی کرنا جائز نہیں، اس کا عام طور پر لوگ خیال نہیں کرتے۔

ایسے آدمی کی سفارش لے کر جائیں گے جس کے بارے میں یہ خیال ہو کہ جب اس کی سفارش جائے گی تو وہ انکار نہ کر سکے گا، یہ تو دباؤ ڈالا جا رہا ہے، اور شخصیت کا وزن ڈالا جا رہا ہے۔ یہ سفارش نہیں ہے۔

یہ تو دباؤ ڈالنا ہے

کئی لوگ میرے پاس بھی سفارش کرانے آجاتے ہیں، ایک صاحب آئے، اور آکر کہا کہ حضرت! آپ سے ایک کام کے لئے کہنا ہے، لیکن پہلے یہ بتایئے کہ آپ انکار تو نہیں کریں گے؟ گویا اس کا اقرار پہلے لینا چاہتے ہیں کہ انکار مت کیجئے گا، میں نے کہا بھائی: یہ بتاؤ تو سہی کہ کیا کام ہے؟ وہ کام میری قدرت میں ہے یا نہیں؟ میری استطاعت میں ہے یا نہیں؟ میں اس کو کر سکوں گا یا نہیں؟ جائز ہوگا یا ناجائز ہوگا؟ پہلے یہ بتاؤ تو سہی۔ لیکن پہلے یہ اقرار لینا چاہتے ہیں کہ آپ پہلے یہ طے کرلیں کہ اس کام کو ضرور کریں گے۔ یہ سفارش نہیں ہے۔ بلکہ یہ دباؤ ڈالنا ہے۔ جو جائز نہیں۔

سفارش کے بارے میں حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ کو اللہ تعالیٰ نے دین کی صحیح فہم عطا فرمائی، اور دین کے مخفی گوشوں کو انہوں نے جس طرح آشکارہ فرمایا، اور ملفوظات میں جگہ جگہ اس پر تنبیہ فرمائی۔ فرماتے ہیں کہ سفارش اس طرح نہ کراؤ جس طریقہ دوسرا آدمی مغلوب ہو جائے۔ جس سے دباؤ پڑے، یہ سفارش جائز نہیں، اس لئے کہ سفارش کی حقیقت "توجہ دلانا" ہے کہ میرے نزدیک یہ شخص حاجت مند ہے، اور میں آپ کو متوجہ کر رہا ہوں کہ یہ اچھا مصرف ہے۔ اس پر اگر آپ کچھ خرچ کر دیں گے تو انشاء اللہ اجر و ثواب ہوگا۔ یہ نہیں کہ اس کام کو ضرور کرو، اگر تم نہیں کرو گے تو میں ناراض ہو جاؤں گا، خفا

ہو جاؤں گا، یہ سفارش نہیں ہے، یہ دباؤ ہے۔

مجمع میں چندہ کرنا درست نہیں

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے یہی بات چندہ کے بارے میں بیان فرمائی کہ اگر مجمع کے اندر چندہ کا اعلان کر دیا کہ فلاں کام کے لئے چندہ ہو رہا ہے، چندہ دیں۔ اب جناب! جس شخص کا چندہ دینے کا دل بھی نہیں چاہ رہا ہے، اب اس نے دوسروں کو دیکھ کر شرما شرمی میں چندہ دے دیا، اور یہ سوچا کہ اگر نہیں دیا تو ناک کٹ جائے گی۔ تو چونکہ وہ چندہ اس نے خوش دلی سے نہیں دیا، اور حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسِهٖ مِنْهُ))(۱)

''کسی مسلمان کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں''

اگر کسی نے زبان سے مال لینے کی اجازت بھی دی ہو، لیکن وہ مال اس نے خوش دلی سے نہیں دیا تو وہ حلال نہیں۔ لہٰذا اس طریقے سے چندہ کرنا جائز نہیں۔

مدرسہ کے مہتمم کا خود چندہ کرنا

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات چندہ وصول کرنے کے لئے کسی بڑے مولانا صاحب کو ساتھ لے گئے۔ یا کوئی بڑے مولانا صاحب یا مدرسہ کے مہتمم خود چندہ وصول کرنے کسی کے پاس چلے گئے۔ تو ان کا خود چلا جانا بذات خود ایک دباؤ ہے، کیونکہ سامنے والا شخص یہ خیال کرے گا کہ یہ تو بڑے مولانا صاحب خود آئے ہوئے ہیں۔ اب میں ان کو کیسے انکار کروں۔ اور چنانچہ دل نہ چاہنے کے باوجود اس کو چندہ دیا، یہ چندہ وصول کرنا جائز نہیں۔

سفارش کے الفاظ کیا ہوں؟

یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ سفارش کا انداز دباؤ ڈالنے والا نہ ہو۔ اسی لیے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ جب کسی کے نام سفارش لکھتے تو اکثر و بیشتر یہ الفاظ لکھتے:

''میرے خیال میں یہ صاحب اس کام کے لئے موزوں ہیں، اگر آپ کے اختیار میں ہو، اور آپ کی مصلحت اور اصول کے خلاف نہ ہو تو ان کا کام کر دیجئے''

---

(۱) مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۷۷٤

اور میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی الفاظ میں سفارش لکھتے تھے۔

دو چار مرتبہ ہمیں بھی سفارش لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو چونکہ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ سے یہ بات سنی ہوئی تھی۔ اور حضرت تھانوی کے مواعظ بھی دیکھے ہوئے تھے، اس لئے میں نے بھی وہی جملے سفارش کے اندر لکھ دیئے کہ "اگر یہ کام آپ کے اختیار میں ہو، اور آپ کی مصلحت اور اصول کے خلاف نہ ہو تو ان کا یہ کام کر دیجئے" نتیجہ یہ ہوا کہ جن صاحب کی سفارش لکھی تھی وہ ناراض ہو گئے۔" اور کہنے لگے کہ "یہ آپ نے قیدیں اور شرطیں کیوں لگا دیں کہ اگر مصلحت کے خلاف نہ ہو تو کر دیجئے۔ آپ کو تو سیدھا سادہ لکھنا چاہئے تھا کہ "یہ کام ضرور کر دیجئے" ان الفاظ کے بغیر تو یہ سفارش نامکمل ہے۔

سفارش میں دونوں طرف کی رعایت

لیکن جس شخص کو دونوں طرف کی رعایت کرنی مقصود ہے۔ ایک طرف اس کو جائز حدود میں رہتے ہوئے حاجت مند کی مدد بھی مقصود ہے۔ اور دوسری طرف اس کی بھی رعایت کرنی ہے جس کے پاس سفارش کی گئی ہے، اور اس پر بھی بوجھ نہیں ڈالنا کہ کہیں وہ یہ خیال نہ کرے کہ صاحب اتنے بڑے صاحب کا پرچہ آ گیا ہے۔ اب میرے لئے اس کا ٹالنا ممکن نہیں۔ اگرچہ یہ کام میری مصلحت کے خلاف میرے اصول کے خلاف اور میرے قواعد وضوابط کے خلاف ہے۔ لیکن چونکہ اتنے بڑے آدمی کا پرچہ آ گیا ہے اب میں کیا کروں؟ لہٰذا اب وہ کشمکش اور مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ اگر سفارش کے مطابق عمل کیا تو اپنے قواعد اور اصول کے خلاف کیا، اور اگر سفارش کے مطابق عمل نہ کیا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ اتنے بڑے صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ اور پھر ان کو کیا منہ دکھاؤں گا، وہ کہیں گے کہ میں نے ایک ذرا سے کام کی سفارش کی تھی، اور آپ نے اس کو پورا نہیں کیا۔ یہ سب سفارش کے اصول کے خلاف ہیں۔

سفارش معاشرے میں ایک لعنت

اور اسی وجہ آج سفارش معاشرے میں ایک لعنت بن گئی ہے آج کوئی کام ناجائز سفارش کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ سفارش کے احکام لوگوں نے بھلا دیئے ہیں۔ شریعت کے تقاضوں کو فراموش کر دیا ہے۔ لہٰذا جب ان رعایتوں کے ساتھ سفارش کی جائے گی تب جائز ہو گی۔

سفارش ایک مشورہ ہے

تیسری بات یہ ہے کہ سفارش ایک مشورہ بھی ہے، دباؤ ڈالنا نہیں ہے۔ آج کل لوگ مشورہ کو نہیں سمجھتے کہ مشورہ کیا چیز ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے مشورہ کے بارے میں فرمایا:

((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمِنٌ))(۱)

جس شخص سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہے۔ یعنی اس کا فرض ہے کہ اپنی دیانت اور امانت کے لحاظ سے جس بات کو بہتر سے بہتر سمجھتا ہو، وہ مشورہ لینے والے کو بتا دے، یہ ہے مشورہ کا حق، اور پھر جس کو مشورہ دیا گیا ہے، وہ اس بات کا پابند نہیں ہے کہ آپ کے مشورے کو ضرور قبول کرے، اگر وہ رد بھی کر دے تو اس کو اختیار ہے، کیونکہ مشورہ کے معنی بھی یہی ہیں کہ دوسرے کو توجہ دلا دینا۔ اسی حدیث میں آپ نے دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھ سے سفارش کرو، اور یہ ضروری نہیں کہ میں تمہاری سفارش قبول بھی کرلوں، بلکہ فیصلہ میں وہی کروں گا جو اللہ تعالیٰ کی منشا کے مطابق ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر سفارش کے خلاف بھی عمل کر لیا جائے تو اس سے سفارش کی ناقدری نہیں ہوتی، آج لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صاحب! ہم نے سفارش بھی کی، اور فائدہ کچھ حاصل نہ ہوا، حقیقت میں یہ بات نہیں۔ اس لئے سفارش کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ ایک بھائی کی مدد میں میرا حصہ لگ جائے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے راضی ہو جائے۔ اب وہ مقصد حاصل ہو گیا یا نہیں؟ کام ہوا یا نہیں یہ سفارش کا لازمی حصہ نہیں، اگر کام نہیں ہوا، اور اس نے آپ کی سفارش نہیں مانی، تو اس کی وجہ سے کوئی جھگڑا اور ناراضگی نہیں ہونی چاہئے۔ اور اس کو برا ماننا بھی درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ مشورہ تھا، اور مشورہ کے اندر دونوں باتیں ہوتی ہیں۔

حضرت بریرہ اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہما کا واقعہ

اب سنئے کہ نبی کریم ﷺ نے مشورہ کی کیا حقیقت بیان فرمائی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حضور نبی ﷺ نے دنیا کی زندگی کے متعلق باریک باریک باتیں تفصیل سے بیان فرما دیں۔ اب یہ بتائے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الأدب عن رسول الله، باب ان المستشار مؤتمن، رقم:۲۷٤۷، سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی المشورة، رقم:٤٤٦۳، سنن ابن ماجه، کتاب الأدب، باب المستشار مؤتمن، رقم:۳۷۳۵، مسند أحمد، رقم:۲۱۳۲٦، سنن الدارمی، کتاب السیر، باب فی المستشار مؤتمن، رقم:۲۳٤۱

کہ اس دنیا میں، بلکہ پوری کائنات میں کس شخص کا مشورہ حضور اقدس ﷺ کے مشورے سے زیادہ قابل احترام اور قابل تعمیل ہوسکتا ہے؟ لیکن واقعہ سننے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک کنیز تھیں، جن کا نام حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا تھا، پہلے یہ کسی اور کی کنیز تھیں، اور اس نے ان کا نکاح حضرت مغیث رضی اللہ عنہ سے کردیا تھا۔ اور چونکہ اصول یہ ہے کہ اگر آقا اپنی باندی کی کسی سے شادی کردے تو آقا کو اپنی باندی سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ آقا کی ملکیت ہوتی ہے، اس واسطے اس سے اجازت بھی نہیں لی جاتی بلکہ آقا جس سے چاہے۔ اس کا نکاح کرسکتا ہے، چنانچہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ان کے آقا نے حضرت مغیث رضی اللہ عنہ سے کردیا۔ اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ صورت شکل کے اعتبار سے کوئی پسندیدہ شخصیت نہیں تھے، اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا حسین وجمیل خاتون تھیں، اس حالت میں ان کا نکاح ہوگیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے چاہا کہ ان خرید کر آزاد کردیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو خریدا اور پھر آزاد کردیا۔

باندی کی فسخ نکاح اختیار

شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب کوئی کنیز آزاد ہوجائے اور اس کا نکاح پہلے سے کسی کے ساتھ ہوچکا ہو، تو آزادی کے وقت اس کنیز کو یہ اختیار ملتا ہے کہ چاہے تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ نکاح کو برقرار رکھے اور اگر چاہے تو اس نکاح کو ختم کردے اور فسخ کردے، اور پھر کسی اور سے نکاح کرے۔

حضور اقدس ﷺ کا مشورہ

جب حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا آزاد ہوئیں تو شریعت کے قاعدہ کے مطابق ان کو بھی فسخ نکاح کا اختیار مل گیا، اور ان سے کہا گیا کہ اگر تم چاہو تو مغیث سے اپنا نکاح برقرار رکھو، اور چاہو تو اس نکاح کو ختم کردو۔ انہوں نے فوراً یہ کہہ دیا کہ میں مغیث کے ساتھ نہیں رہتی، اور اپنے نکاح کو فسخ کردیا، اب چونکہ حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کو ان سے بہت محبت تھی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت مغیث رضی اللہ عنہ مدینہ کی گلیوں میں گھوم رہے ہیں۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسوں بہہ رہے ہیں۔ اور ان آنسوؤں سے داڑھی بھیگ رہی ہے۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کی خاشامد کررہے ہیں، اور ان کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ خدا کے لئے اس فیصلے کو تبدیل کرلو، اور دوبارہ مجھ سے نکاح کرلو، مگر حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا مانتی نہیں تھیں۔ آخر کار حضرت مغیث رضی اللہ عنہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ جا کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! ایسا قصہ پیش آیا ہے، چونکہ مجھے ان سے تعلق ہے۔ اور اتنا عرصہ ساتھ گزارا ہے۔ اب وہ میری بات نہیں مانتیں۔ لہٰذا اب آپ ہی ان سے میری کچھ سفارش فرما

دیجئے۔ چنانچہ آپ نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور فرمایا:

((لَوْ رَاجَعْتِیْهِ فَاِنَّهٗ اَبُوْ وَلَدِكِ))(۱)

''اگر تم اپنے اس فیصلے سے رجوع کر لو تو اچھا ہو، اس لئے کہ وہ تمہارے بچے کے باپ ہیں بچارے اتنے پریشان ہیں''

سبحان اللہ! حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے فوراً سوال کیا ''یارسول اللہ! آپ یہ فرما رہے ہیں کہ رجوع کر لو، یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے؟ اگر آپ کی طرف سے یہ حکم ہے تو بے شک سر تسلیم خم ہے۔ اور میں ان کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنے کو تیار ہوں''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّمَا اَشْفَعُ))

''میں یہ صرف سفارش کر رہا ہوں''

یہ میرا حکم نہیں ہے، جب حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے یہ سنا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ صرف سفارش اور مشورہ ہے، تو فوراً فرمایا ''یارسول اللہ! اگر یہ مشورہ ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے آزادی ہے کہ قبول کروں یا نہ کروں۔ لہٰذا میرا فیصلہ یہی ہے کہ اب میں دوبارہ ان کے پاس نہیں جاؤں گی'' چنانچہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا دوبارہ ان کے پاس نہیں گئیں۔ اور ان سے علیحدگی اختیار کر لی۔

ایک خاتون نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ رد کر دیا

اب اندازہ لگائیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ ہے اور آپ کی سفارش ہے۔ لیکن ایک عورت، جو اب تک کنیز تھی، اور آپ کی اہلیہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے صدقہ سے آزاد ہوئیں، اس کو بھی یہ حق دیا جا رہا ہے کہ ہم جو بات کہہ رہے ہیں۔ وہ مشورہ ہے، تمہارا دل چاہے تو مانو اور تمہارے دل نہ چاہے تو نہ مانو، اور رد کر دو، چنانچہ وہ مشورہ ان خاتون نے رد کر دیا۔ اور اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ادنیٰ سی ناگواری کا اظہار بھی نہیں فرمایا کہ ہم نے تم کو ایک مشورہ دیا تھا۔ لیکن تم نے ہماری بات نہیں مانی۔ اس کے ذریعہ آپ نے امت کو تعلیم دے دی کہ مشورہ اور سفارش یہ ہے کہ جس کو مشورہ دیا گیا ہے، یا جس سے سفارش کی گئی ہے بس اس کو توجہ دلانا مقصود ہے، دباؤ ڈالنا مقصود نہیں۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الطلاق، باب شفاعة النبی فی زوج بریرة، رقم: ٤٨٧٥، سنن النسائی، کتاب آداب القضاة، باب شفاعة الحاکم للخصوم قبل فصل الحکم، رقم: ٥٣٢٢، سنن ابی داود، کتاب الطلاق، فی المملوکة تعتق وهی تحت حر أو عبد رقم: ١٩٠٤، سنن ابن ماجه، کتاب الطلاق، باب خیار الأمة إذا أعتقت، رقم: ٢٠٦٥، مسند أحمد، رقم: ١٧٤٧

حضور اقدس ﷺ نے کیوں مشورہ دیا؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ کو یہ معلوم تھا کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے یہ نکاح خود ختم کر دیا، اور وہ ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتیں تو پھر آپ نے سفارش ہی کیوں کی؟

آپ نے سفارش اس لئے کہ آپ جانتے تھے کہ حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کے اندر سوائے شکل وصورت کے کوئی خرابی نہیں ہے۔ اگر یہ ان کی بات مان لے گی۔ اور دوبارہ ان کے نکاح میں آ جائے گی تو ان کو اجر وثواب بہت ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے اللہ کے ایک بندے کی خواہش کو پورا کیا۔ اور اس واسطے آپ نے سفارش بھی کر دی۔ لیکن جب انہوں نے سفارش کو قبول نہیں کیا تو آنحضرت ﷺ نے ادنی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا۔

امت کو سبق دے دیا

لہٰذا آپ نے قیامت تک آنے والی امت کو یہ سبق دے دیا کہ مشورہ کو کبھی بھی یہ نہ سمجھو کہ یہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے، یا لازمی کیا جا رہا ہے۔ بلکہ مشورہ کا حاصل صرف توجہ دلانا ہے۔ اب اس کو اختیار ہے، چاہے وہ اس پر عمل کرے، چاہے نہ کرے۔

سفارش ناگواری کا ذریعہ کیوں ہے؟

آج ہمارے اندر سفارش اور مشورہ باقاعدہ ناگواری کا ذریعہ بن گئیں ہیں۔ اگر کسی کے مشورہ کو قبول نہ کیا جائے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ ہم نے تو بھائی ایسا مشورہ دیا تھا۔ لیکن ہماری بات نہیں چلی، ہماری نہیں مانی گئی۔ اس پر ناراضگی ہو رہی ہے خفا ہو رہے ہیں، برا منایا جا رہا ہے اور یہ سوچا جا رہا ہے کہ اب آئندہ ان سے رابطہ نہیں رکھیں گے۔ اس لئے کہ یہ ہماری بات تو مانتے ہی نہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ سفارش کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ نے دو باتیں بیان فرما دیں کہ سفارش کرو، اجر ملے گا۔ لیکن اگر سفارش قبول نہ کی جائے تو تمہارے دل میں اس کے خلاف کوئی ناراضگی اور بددلی نہیں پیدا ہونی چاہیے کہ اس نے ہماری بات نہیں مانی۔ ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اگر سفارش کی جائے گی وہ ان شاء اللہ بڑے اجر وثواب کا موجب ہوگی۔

خلاصہ

ایک مرتبہ پھر خلاصہ عرض کر دیتا ہوں کہ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ سفارش ان معاملات میں

کریں جن میں سفارش کرنا جائز ہے۔ جہاں سفارش کرنا جائز نہیں، جیسے مقدمات ہیں، یا امتحانی پرچوں کی جانچ کا معاملہ ہے، ان جگہوں پر سفارش کرنا بھی جائز نہیں۔ دوسرے یہ کہ سفارش جائز کام کی ہو، ناجائز کام کی نہ ہو، تیسرے یہ کہ سفارش کا انداز مشورے کا ہو، دباؤ ڈالنے کا نہ ہو، چوتھے اگر مشورہ اور سفارش نہ مانی جائے تو اس پر کوئی ناراضگی اور ناگواری نہ ہونی چاہئے۔ ان چار چیزوں کی رعایت کے ساتھ اگر سفارش کی جائے گی تو سفارش کی وجہ سے کوئی فساد برپا نہیں ہوسکتا۔ اور وہ سفارش اجر وثواب کا سبب ہوگی ان شاء اللہ تعالی۔ اللہ تعالی اپنی رحمت سے ہمیں اس کی سمجھ عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆☆☆

گفتگو کے آداب☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوْا أَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ﴾ (۱)

بزرگان محترم و برادران عزیز! سورۃ الحجرات کی تفسیر کا بیان کچھ عرصہ سے چل رہا ہے، کیونکہ یہ سورۃ مسلمانوں کے لئے بڑے اہم احکام پر مشتمل ہے، اور ہمارے درمیان جو معاشرتی خرابیاں پائی جاتی ہیں، ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے اس سورۃ میں دی گئی ہدایات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس سورۃ کی ایک آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی جس کا بیان دو جمعوں سے چل رہا ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

> ''اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے (فاسق کے معنی ہیں ''گناہ گار'' کے، اس سے ہر غیر ذمہ دار آدمی مراد ہے، بہر حال! اگر کوئی گناہ گار یا غیر ذمہ دار آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے) تو تم ہوشیار ہو جاؤ، اور پہلے اس خبر کی تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ اس خبر پر بھروسہ کر کے تم کچھ لوگوں کے خلاف کاروائی کر ڈالو، اور بعد میں تمہیں اس پر ندامت اور شرمندگی ہو۔

ذمہ دار انسان کا رویہ اختیار کرو

جس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، اس کی تفصیل گزشتہ جمعہ کو عرض کر چکا ہوں، اس آیت میں ایک عظیم ہدایت یہ ہے کہ مسلمان کا رویہ بڑے ذمہ دار انسان کا رویہ ہونا چاہئے، یہ نہ ہو کہ جو بات کان

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/ ۲۸۶ تا ۲۹۴) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) الحجرات: ٦

میں پڑی، اس پر بھروسہ کر لیا، اور اس کو آگے سنانا شروع کر دیا، اور اس کی بنیاد پر کسی کے خلاف کارروائی شروع کر دی، یا اس کی بنیاد پر کسی کے خلاف دل میں بدگمانی پیدا کر لی، یہ سب ناجائز ہیں، اور ایک مسلمان کا شیوہ نہیں ہے، جب تک کسی معاملے کی پوری تحقیق نہ ہو جائے، اور یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ واقعہ سچا ہے، اس وقت تک اس پر نہ تو بھروسہ کرو اور نہ وہ بات دوسروں کو سناؤ، اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی کارروائی کرو۔

زبان عظیم نعمت ہے

اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ جو زبان عطا فرمائی ہے، یہ اتنی بڑی اور عظیم نعمت ہے کہ ہم جب چاہیں، اور جو بات چاہیں، اپنی زبان سے نکال کر اپنے دل کی خواہش دوسرے تک پہنچا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایسا خودکار نظام بنا دیا ہے کہ ادھر دل میں ایک خیال آیا، اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کا ارادہ ہوا، ادھر دماغ سے لے کر زبان تک تمام سرکاری مشینیں حرکت میں آ گئیں، اور اسی لمحے آپ نے وہ بات دوسروں تک پہنچا دی، اگر یہ کہا جاتا کہ جب تم کوئی بات دوسرے تک پہنچانا چاہتے ہو تو پہلے ایک سوئچ آن کرو، اور پھر نمبر ملاؤ، اور پھر دوسرے تک پہنچاؤ، جیسے ٹیلیفون میں کرنا پڑتا ہے، بتایئے! اس وقت کتنی مصیبت ہوتی کہ آدمی فوراً ایک بات دوسرے سے کہنا چاہتا ہے، اور وہ دوسرا شخص سامنے موجود ہے، لیکن فوراً وہ بات اس تک نہیں پہنچا سکتے، بلکہ پہلے سوئچ آن کرنا پڑے گا، پھر نمبر ملانا پڑے گا، پھر بات پہنچا سکو گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کاموں کی تکلیف نہیں دی، بلکہ ادھر دل میں ایک خیال آیا، ادھر آپ نے زبان سے اس کو ادا کر دیا، اور دوسروں کو اپنا خیال سنا دیا۔

زبان کی قدر بے زبان سے پوچھئے

میں نے اپنی زندگی میں دو آدمی ایسے دیکھے کہ ان کا حال یہ تھا کہ ان کے گلے کا بانسہ جس سے آواز نکلتی ہے، وہ خراب ہو گیا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ زبان تو حرکت کرتی تھی، لیکن آواز نہیں نکلتی تھی، ڈاکٹروں کے پاس گئے تو انہوں نے ایک آلہ تجویز کیا، اب بات کرنی ہوتی تو اس آلہ کو وہ گلے پر لگاتا، پھر آواز نکلتی، لیکن وہ آواز ایسی نکلتی جیسے کوئی جانور بول رہا ہے، اور بچے وہ آواز سن کر ہنستے تھے۔ میں اس شخص کی بے چینی دیکھتا کہ جب اس کو بات کہنی ہوتی تو پہلے وہ آلہ تلاش کرتا۔ پھر اس کو لگاتا اور گلے کو زور سے دباتا، تب جا کر بہ مشکل آواز نکلتی۔ دیکھ کر عبرت ہوئی کہ یہ بھی ایک انسان ہے، اس کا یہ دل چاہتا کہ میں اپنے دل کی بات جلدی سے دوسروں تک پہنچا دوں، لیکن اس کو اس پر قدرت نہیں۔ اللہ جل شانہ نے اپنے فضل و کرم سے زبان کی یہ نعمت ہمیں عطا فرمائی ہوئی ہے کہ ادھر دل میں خیال

آیا، ادھر دوسرے تک پہنچادیا، درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہے۔

تمام مشینیں حرکت کر رہی ہیں

پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں کہ جب آدمی بات کرنا چاہتا ہے تو پہلے دل میں اس بات کا خیال آتا ہے، پھر وہ خیال دماغ میں جاتا ہے، اور پھر دماغ کی طرف سے زبان کے لئے حکم جاری ہوتا ہے، پھر زبان بولتی ہے۔ دیکھئے! ایک طرف دل ہے جو سوچ رہا ہے، دوسری طرف دماغ ہے، جو حکم جاری کر رہا ہے اور تیسری طرف زبان ہے، جو حرکت کر رہی ہے، اور پھر گلے کا پورا نظام کام کر رہا ہے، جس کے نتیجے میں آواز باہر نکل رہی ہے، یہ مشینریاں صرف اس لئے حرکت میں ہیں تاکہ ہم اپنی بات دوسروں تک پہنچادیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے بے مانگے مفت میں ہمیں عطا کر رکھی ہے۔

سوچ کر زبان کو استعمال کرو

اللہ تعالیٰ کا صرف ایک مطالبہ ہے، وہ یہ کہ یہ سرکاری مشینیں جو تمہیں دیدی گئی ہیں، بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اور مرتے دم تک یہ مشینیں کام کر رہی ہیں، کبھی اس مشین کو ورکشاپ بھیجنا نہیں پڑتا، کبھی اس کی سروس نہیں کرانی پڑتی، جو مشینیں مسلسل تمہارے ساتھ ہیں، ہمارا صرف ایک مطالبہ ہے، وہ یہ کہ جب تم اس زبان کو استعمال کرو تو سوچ سمجھ کر کرو کہ اس سے کیا نکال رہے ہو، یہ نہ ہو کہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے، جو منہ میں آرہا ہے وہ زبان سے نکال رہے ہو، یہ دیکھے بغیر کہ اس سے فائدہ پہنچے گا، یا نقصان پہنچے گا، صحیح بات کہہ رہا ہوں، یا غلط بات کہہ رہا ہوں، یہ بات اللہ کو راضی کرنے والی ہے، یا ناراض کرنے والی ہے، اس سرکاری مشین سے فائدہ اٹھاؤ، لیکن ذرا سوچ کر فائدہ اٹھاؤ۔

ایک ایک لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے

قرآن کریم نے فرمادیا:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾(۱)

انسان جو کلمہ بھی اور جو لفظ بھی زبان سے نکال رہا ہے، اس کو محفوظ کرنے والا اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے، جو ریکارڈ کر رہا ہے، آج سے پہلے تو ریکارڈ کرنے کا تصور کرنے میں دشواری ہوتی تھی کہ

(۱) ق: ۱۸

ایک ایک لفظ کس طرح ریکارڈ ہو رہا ہے۔ لیکن آج کل ٹیپ ریکارڈ اور دوسرے جدید آلات نے اس کا تصور آسان کر دیا ہے، اب صورت حال یہ ہے کہ لفظ بھی زبان سے نکلا وہ ریکارڈ ہو گیا، چاہے وہ اچھی بات ہو، یا بری بات ہو، اسی طرح ہر ہر لفظ اللہ تعالیٰ کے یہاں ریکارڈ ہو رہا ہے، روز پیدائش سے لے کر آج تک کے، اور مرنے تک تمام الفاظ ریکارڈ کرنے کا سسٹم اللہ تعالیٰ کے یہاں موجود ہے، اور جب ہم اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچیں گے تو وہاں پر وہ ریکارڈنگ سنا دی جائے گی کہ تم نے فلاں وقت میں فلاں بات کہی تھی، آج اس بات کا ثبوت پیش کرو جو تم نے کہی تھی، یہ بات تم نے صحیح کہی تھی، یا غلط کہی تھی، اور تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟

اس وقت کیوں محتاط گفتگو کرو گے؟

آج اگر لوگ ایک جگہ پر بیٹھے ہوں، اور یہ پتہ ہو کہ سی آئی ڈی کی طرف سے یہاں پر ایک ٹیپ ریکارڈ لگا ہوا ہے، اور جو شخص بھی جو بات کہے گا وہ ریکارڈ ہو جائے گی، بتاؤ! کیا اس وقت اتنی آزادی سے بولو گے؟ جیسے آج بولتے ہو، یا اس وقت بھی اسی طرح بے محابہ جو منہ میں آئے گا، بک جاؤ گے؟ نہیں، ایسا نہیں کرو گے، اس لئے کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں سی آئی ڈی نے ٹیپ ریکارڈ لگایا ہوا ہے، اور ایک ایک کلمہ ریکارڈ ہو رہا ہے، اور اس کے نتیجے میں اگر یہ بات حکام بالا تک پہنچ گئی تو میں پکڑا جاؤں گا، اس لئے اس مجلس میں ہر شخص محتاط ہو کر گفتگو کرے گا۔

ذمہ دار بننے کی فکر کریں

اللہ تعالیٰ نے تو چودہ سو سال پہلے سے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ تمہاری ایک ایک بات اللہ تعالیٰ کے یہاں ریکارڈ ہو رہی ہے، لہٰذا جب بھی بولو تو سوچ سمجھ کر بولو کہ بات صحیح کہہ رہے ہو، یا غلط کہہ رہے ہو، ویسے افواہیں پھیلا رہے ہو، غیر ذمہ دارانہ گفتگو کر رہے ہو، لوگوں پر الزام لگا رہے ہو، لوگوں کی غیبتیں کر رہے ہو، لوگوں کی دل آزاریاں کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں سب باتوں کا جواب دینا ہو گا۔ یہ مت سمجھنا کہ بات زبان سے نکلی اور ہوا میں اڑ گئی اور ختم ہو گئی، کوئی بات ختم نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں محفوظ ہے۔ اس لئے قرآن کریم جو ہمارے لئے پیغام ہدایت ہے، وہ ہمیں ذمہ دار بننے کی تلقین کر رہا ہے، یہ نہ ہو کہ جو بات سنی وہ آگے چلتی کر دی۔

جھوٹ کی بدترین سواری

نبی کریم ﷺ پر قربان جائیے کہ آپ نے احادیث میں اس کی جو تشریحات فرمائی ہیں، اس میں

ہمارے لئے مزید تنبیہ کا سامان ہے، انسان کی نفسیات سے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے زیادہ کون باخبر ہو سکتا ہے، ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بِئْسَ مَطِيَّةُ الرَّجُلِ زَعَمُوْا)) (۱)

لڑائیاں کیوں جنم لے رہی ہیں؟

یہ سب باتیں ذہن میں رکھ کر اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑا کر دیکھئے کہ آج ہمارے معاشرے میں کیا ہو رہا ہے؟ کس طرح افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں؟ کس طرح بے بنیاد باتوں پر بھروسہ کر کے اسے آگے چلتا کیا جا رہا ہے؟ اور کس طرح بے بنیاد باتوں کی بناء پر بدگمانیاں دل میں پیدا کی جا رہی ہیں؟ آگے اسی سورۃ میں یہ بیان بھی آنے والا ہے کہ یہ بدگمانی بھی حرام ہے، اور بے بنیاد خبروں کی بنیاد پر بدگمانی دل میں پیدا کر کے اس کے خلاف کاروائی کی جا رہی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں ان احکام کی خلاف ورزی قدم قدم پر نظر آئے گی، اور یہی چیزیں ہیں جنہوں نے معاشرے کو فساد اور بگاڑ میں مبتلا کیا ہوا ہے، عداوتوں کی آگ بھڑک رہی ہے، دشمنیاں، بغض اور کینہ پیدا ہو رہا ہے، اختلافات اور جھگڑے ہو رہے ہیں، ان سب کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کی ان تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔

سارے جھگڑے ختم ہو جائیں

اگر آج ہم قرآن کریم کی اس ہدایت کو پلے باندھ لیں، اور سرکار دو عالم ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت کو پلے باندھ لیں تو نہ جانے کتنے جھگڑے، کتنے قصے اور کتنے اختلافات اپنی موت مر جائیں، سارے جھگڑے اس لئے پیدا ہو رہے ہیں کہ ہم ان بے بنیاد باتوں پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی رحمت سے ہمیں ان ہدایات کو سمجھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے، اور ان پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے، آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

(۱) سنن أبی داود، کتاب الادب، باب فی قول الرجل زعموا، رقم: ۴۳۲۱، مسند أحمد، رقم: ۱۶۴۵۸، سنن البیھقی، رقم: ۲۱۶۹۸ (۲/۴۱۰)

زبان کی حفاظت کیجئے ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْلِيَصْمُتْ))(۱)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ یا تو وہ اچھی اور نیک بات کہے یا خاموش رہے''

دوسری روایت بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ ((إِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مَا يَتَبَيَّنُ فِيْهَا، يَزِلُّ بِهَا فِي النَّارِ أَبْعَدَ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ))(۲)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک انسان سوچے سمجھے بغیر جب کوئی کلمہ زبان سے کہہ دیتا ہے تو وہ کلمہ اس شخص کو جہنم کے اندر اتنی گہرائی تک گرا دیتا ہے، جتنا مشرق اور

☆ اصلاحی خطبات (۴/۱۳۶ تا ۱۶۱) ۳ دسمبر ۱۹۹۳ء، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب حفظ اللسان، رقم: ۵۹۹٤، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب الحث على اكرام الجار والضيف ولزوم الصمت، رقم: ٦٧، سنن الترمذی، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲٤۲٤، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في حق الجوار، رقم: ٤٤٨٧، مسند أحمد، رقم: ٦٣٣٢، موطا مالك، كتاب الجامع، باب جامع ماجاء في الطعام والشراب، رقم: ١٤٥٤

(۲) صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب حفظ اللسان، رقم: ٥٩٩٦، صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب التكلم بالكلمة يهوى بها في النار، رقم: ٥٣٠٣، مسند أحمد، رقم: ٨٥٦٧

مغرب کے درمیان فاصلہ اور بعد ہے"

ایک تیسری حدیث بھی اس معنی میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : ((إِنَّ الْعَبْدَ يَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللّٰهِ تَعَالٰى لَا يلقى بِهَا بَالًا، يَرْفَعُهُ اللّٰهُ بِهَا فِي الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ تَعَالٰى لايلقى بِهَا بَالًا يهوى بِهَا فِيْ جَهَنَّمَ))(۱)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض اوقات ایک انسان اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا کوئی کلمہ کہتا ہے، یعنی ایسا کلمہ زبان سے ادا کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے مطابق ہے، لیکن جس وقت کلمہ زبان سے ادا کرتا ہے، اس وقت اس کو اس کلمہ کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا، اور لاپرواہی سے وہ کلمہ زبان سے نکال دیتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اس کلمہ کی بدولت جنت میں اس کے درجات بلند فرما دیتے ہیں، اور اس کے برعکس بعض اوقات ایک انسان زبان سے ایسا کلمہ نکالتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والا ہوتا ہے اور وہ محض لاپرواہی میں اس کلمہ کو نکال دیتا ہے، لیکن وہ کلمہ اس کو جہنم میں لے جا کر گرا دیتا ہے"

زبان کی دیکھ بھال کریں

ان تینوں احادیث میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ آدمی زبان کے گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرے، اور اس زبان کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات میں خرچ کرے، اور اس کے ناراضگی کے کاموں سے اس کو بچائے، جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہم لوگوں کے لئے سب سے زیادہ اہتمام کی چیز یہ ہے کہ گناہوں سے بچیں، گناہ سرزد نہ ہوں۔ ان گناہوں میں یہاں زبان کے گناہوں کا بیان شروع ہوا ہے، چونکہ زبان کے گناہ ایسے ہیں کہ بعض اوقات آدمی سوچے سمجھے بغیر بے پروائی کی حالت میں باتیں کر لیتا ہے، اور وہ باتیں اس کے لئے سخت ترین عذاب کا موجب ہوتی ہیں، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زبان کو دیکھ بھال کر استعمال کرو، اگر کوئی اچھی بات زبان سے کہنی ہے تو کہو، ورنہ خاموش رہو۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب حفظ اللسان، رقم:۵۹۹۷، مسند أحمد، رقم:۸۰۵۹

زبان ایک عظیم نعمت

یہ زبان جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہے اس میں ذرا غور تو کرو کہ یہ کتنی عظیم نعمت ہے، یہ کتنا بڑا انعام ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرما دیا۔ اور بولنے کی ایسی مشین عطا فرما دی کہ جو پیدائش سے لے کر مرتے دم تک انسان کا ساتھ دے رہی ہے، اور چل رہی ہے اور اس طرح چل رہی ہے کہ آدمی نے ادھر ذرا ارادہ کیا، ادھر اس نے کام شروع کر دیا اب چونکہ اس مشین کو حاصل کرنے کے لئے کوئی محنت اور مشقت نہیں کی، کوئی پیسہ خرچ نہیں ہوا، اس لئے اس نعمت کی قدر معلوم نہیں ہوتی اور جو نعمت بھی بیٹھے بٹھائے بے مانگے مل جاتی ہے، اس کی قدر نہیں ہوتی، اب یہ زبان بھی بیٹھے بٹھائے مل گئی، اور مسلسل کام کر رہی ہے، ہم جو چاہتے ہیں اس زبان سے بول پڑتے ہیں اس نعمت کی قدر ان لوگوں سے پوچھیں جو اس نعمت سے محروم ہیں زبان موجود ہے مگر بولنے کی طاقت نہیں ہے آدمی کوئی بات کہنا چاہتا ہے، مگر کہہ نہیں سکتا، دل میں جذبات پیدا ہو رہے ہیں مگر ان کا اظہار نہیں کر سکتا، اس سے پوچھو وہ بتائے گا کہ زبان کتنی بڑی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا انعام ہے۔

اگر زبان بند ہو جائے

اس بات کا ذرا تصور کرو کہ خدا نہ کرے اس زبان نے کام کرنا بند کر دیا اور اب تم بولنا چاہتے ہو لیکن نہیں بولا جاتا، اس وقت کیسی بے چارگی اور بے بسی کا عالم ہوگا۔ میرے ایک عزیز جن کا ابھی حال ہی میں اپریشن ہوا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اپریشن کے بعد کچھ دیر اس حالت میں گزری کہ سارا جسم بے حس تھا، پیاس شدت سے لگ رہی تھی سامنے آدمی موجود ہیں، میں اس سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے پانی پلا دو، لیکن زبان نہیں چلتی، اور آدھا گھنٹہ اسی طرح گزر گیا، بعد میں کہتے تھے میری پوری زندگی میں وہ آدھا گھنٹہ تکلیف دہ تھا، ایسا وقت کبھی میرے اوپر نہیں گزرا تھا۔

زبان اللہ کی امانت ہے

اللہ تعالیٰ نے زبان اور دماغ کے درمیان ایسا کنکشن رکھا ہے کہ جیسے ہی دماغ نے یہ ارادہ کیا کہ فلاں کلمہ منہ سے نکالا جائے، اسی لمحے زبان وہ کلمہ ادا کر دیتی ہے۔ اور اگر انسان کے اوپر چھوڑ دیا جاتا کہ تم خود اس زبان کو استعمال کرو، تو اس کے لئے پہلے یہ علم سیکھنا پڑتا کہ زبان کی کس حرکت سے "الف" نکالیں۔ زبان کو کہاں لے جا کر "ب" نکالیں تو پھر انسان ایک مصیبت میں مبتلا ہو جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر انسان کے اندر یہ بات رکھ دی کہ جو لفظ وہ زبان سے ادا کرنا چاہ رہا ہے تو

بس ارادہ کرتے ہی فوراً وہ لفظ زبان سے نکل جاتا ہے لیکن اب ذرا اس کو استعمال کرتے ہوئے یہ تو سوچو کہ کیا تم خود یہ مشین خرید کر لے آئے تھے؟ نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اس نے تمہیں عطا کی ہے، یہ تمہاری ملکیت نہیں، بلکہ تمہارے پاس امانت ہے اور جب ان کی دی ہوئی امانت ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو ان کی رضا کے مطابق استعمال کیا جائے، یہ نہ ہو کہ جو دل میں آیا، بک دیا بلکہ جو بات اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہے، وہ نکالو، اور جو بات اللہ کے احکام کے مطابق نہیں وہ بات مت نکالو، یہ سرکاری مشین ہے، اس کو اس کی مرضی کے مطابق استعمال کرو۔

زبان کا صحیح استعمال

اللہ تعالیٰ نے اس زبان کو ایسا بنایا ہے کہ اگر کوئی شخص اس زبان کو صحیح استعمال کر لے، جیسا کہ آپ نے ابھی اوپر ایک حدیث میں پڑھا کہ ایک شخص نے ایک کلمہ بے پرواہی میں زبان سے نکال دیا مگر وہ کلمہ اچھا تھا۔ تو اس کلمے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نہ جانے اس کے کتنے درجات بلند فرما دیتے ہیں، اس اس کو کتنا اجر و ثواب حاصل ہو جاتا، جب ایک انسان کافر سے مسلمان ہوتا ہے تو وہ اسی زبان کی بدولت ہوتا ہے، زبان سے کلمہ شہادت پڑھ لیتا ہے:

"اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ"

اس کلمہ شہادت پڑھنے سے پہلے وہ کافر تھا مگر اس کے پڑھنے کے بعد مسلمان ہو گیا، پہلے جہنمی تھا، اب جنتی بن گیا، پہلے اللہ کا مبغوض تھا، اب محبوب بن گیا، اور نبی کریم ﷺ کی امت اجابت میں شامل ہو گیا، یہ عظیم انقلاب اس ایک کلمہ کی بدولت آیا جو اس نے زبان سے ادا کیا۔

زبان کو ذکر سے تر رکھو

ایمان لانے کے بعد ایک مرتبہ منہ سے کہہ دیا "سبحان اللہ" تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ اسکے ذریعہ میزان عمل کا آدھا پلڑا ابھر جاتا ہے۔ یہ کلمہ چھوٹا ہے لیکن اس کا ثواب اتنا عظیم ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ دو کلمے زبان پر تو ہلکے پھلکے ہیں کہ ذرا سی دیر میں ادا ہو گئے، لیکن میزان عمل میں بہت بھاری ہیں، اور رحمان کو بہت محبوب ہیں، وہ کلمات یہ ہیں:

((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ))(۱)

---

(۱) صحیح البخاری، باب فضل التسبیح، رقم:٦٤٠٦(٢٤٩/٢١)سنن الترمذی، رقم:٣٨٠٣ (٤٢٦/١٢) سنن ابن ماجه،رقم:٣٩٣٨(٣٩٨/١١)،

بہر حال یہ مشین اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے اگر ذرا سا اس کا رخ بدل دو، اور صحیح طریقے سے اس کو استعمال کرنا شروع کر دو، تو پھر دیکھو یہ تمہارے نامہ اعمال میں کتنا اضافہ کرتی ہے، اور تمہارے لئے جنت میں کس طرح گھر بناتی ہے، اور تمہیں کس طرح اللہ تعالیٰ کی رضا مندی عطا کراتی ہے اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اس زبان کو تر رکھو، پھر دیکھو کس طرح تمہارے درجات میں ترقی ہوتی ہے۔

ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کونسا عمل افضل ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے، چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اللہ کا ذکر کرتے رہو۔(۱)

زبان کے ذریعہ دین سکھائیں

اگر اس زبان کے ذریعہ سے تم نے کسی کو چھوٹی سی دین کی بات سکھا دی، مثلاً ایک شخص غلط طریقے سے نماز پڑھ رہا تھا، اور تمہیں معلوم تھا کہ یہ غلط طریقے سے نماز پڑھ رہا ہے، چنانچہ تم نے چپکے سے تنہائی میں نرمی کے ساتھ محبت اور شفقت سے اس کو سمجھا دیا کہ بھائی! تمہاری نماز میں یہ غلطی تھی۔ اس طرح کر لیا کرو۔ آپ کی زبان کی ذرا سی حرکت سے اس کو اصلاح ہو گئی اور اس نے نماز ٹھیک پڑھنی شروع کر دی، تو اب ساری عمر جتنی نمازیں وہ ٹھیک طریقے سے پڑھے گا تو ان سب کا اجر و ثواب تمہارے نامہ اعمال میں بھی لکھا جائے گا۔

تسلی کا کلمہ کہنا

ایک شخص تکلیف اور پریشانی میں مبتلا تھا، تم نے اس کی پریشانی دور کرنے کے لئے اس سے کوئی تسلی کی بات کوئی تسلی کا کلمہ کہہ دیا جس کے نتیجے میں اس کو کچھ ڈھارس بندھ گئی، اس کو کچھ تسلی حاصل ہو گئی، تو یہ کلمہ کہنا تمہارے لئے عظیم اجر و ثواب کھینچ لایا، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ عَزّٰى ثَكْلٰى كُسِيَ بُرْدًا فِي الْجَنَّةِ))(۲)

"اگر کوئی شخص ایسی عورت کے لئے تسلی کے کلمات کہے جس کا بیٹا گم ہو گیا ہو، یا مر گیا ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس تسلی دینے والے کو جنت میں بیش بہا قیمتی جوڑے پہنائیں گے"

---

(۱) سنن الترمذی، باب ما جاء فی فضل الذکر، رقم: ۳۳۷۰ (۱۲/۲۶۸)

(۲) سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول اللہ، باب آخر فی فضل التعزیة، رقم: ۹۹۶

غرض یہ ہے کہ اس زبان کو نیک کاموں میں استعمال کرنے کے جو راستے اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں، ان میں اس کو ٹھیک طریقے سے استعمال کرلو، پھر دیکھو گے کہ تمہارے نامہ اعمال میں کس طرح ثواب کے ڈھیر لگ جائیں گے، مثلاً کوئی شخص جا رہا تھا تم نے اس کی رہنمائی کر کے اس کو صحیح راستہ بتا دیا اب یہ چھوٹا سا کام کر دیا، اور تمہیں خیال بھی نہیں ہوا کہ میں نے یہ کوئی نیکی کا کام کیا، لیکن اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں بے شمار اجر و ثواب عطا فرمائیں گے۔

بہرحال اگر ایک انسان اس زبان کو صحیح استعمال کرے تو یقین کیجئے اس کے لئے جنت کے دروازے کھل جائیں، اور اس کے بے شمار گناہوں کی معافی کا ذریعہ بن جائے، لیکن خدا نہ کرے، اگر اس زبان کا ناجائز اور غلط استعمال ہو، تو پھر یہی زبان انسان کو جہنم میں کھینچ کر لے جاتی ہے۔

زبان جہنم میں لے جانے والی ہے

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جتنے لوگ جہنم میں جائیں گے، ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہوگی، جو اپنی زبان کی کرتوت کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے۔ مثلاً جھوٹ بول دیا، غیبت کر دی، کسی کو تکلیف پہنچائی اور اس کا دل دکھا دیا، کسی کی دل آزاری کی، دوسروں کے ساتھ غیبت میں حصہ لیا، کسی کی تکلیف پر خوشی کا اظہار کیا وغیرہ جب یہ گناہ کے کام کئے تو اس کے نتیجے میں جہنم میں چلا گیا، حدیث شریف میں فرمایا:

((هَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ))(۱)

"بہت سے لوگ زبان کے کرتوت کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے"

لہٰذا یہ زبان جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہے، اگر اس کو ذرا دھیان سے استعمال کرو، اس کو قابو میں رکھو، بے قابو مت چھوڑ دو اور اس کو صحیح کاموں میں استعمال کرو، اس لئے فرمایا کہ زبان سے یا تو صحیح بات بولو، ورنہ خاموش رہو، اس لئے کہ خاموشی اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ آدمی غلط بات زبان سے نکالے۔

پہلے تولو پھر بولو

اسی وجہ سے کثرت کلام سے منع کیا گیا، اس لئے کہ اگر انسان زیادہ بولے گا تو زبان قابو میں نہیں رہے گی، کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور کرے گی، اور اس کے نتیجے میں انسان گناہ میں مبتلا ہو جائے گا،

(۱) سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول الله، باب ما جاء فی حرمة الصلاة، رقم:۲٥٤۱، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب کف اللسان فی الفتنة، رقم:۳۹٦۳، مسند أحمد، رقم:۲۱۰۰۸

اس لئے ضرورت کے مطابق بولو، زیادہ نہ بولو، جیسے ایک بزرگ نے ارشاد فرمایا کہ پہلے بات کو تولو، پھر بولو، جب تول تول کر بات کرو گے تو پھر یہ زبان قابو میں آجائے گی۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک استاد تھے حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب قدس اللہ سرہ بڑے اُونچے درجے کے بزرگ تھے۔ اور "حضرت میاں صاحب" کے نام سے مشہور تھے، یہ ایسے بزرگ تھے جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے کی یادیں تازہ کردیں، میرے حضرت والد صاحب ان سے بہت خصوصی تعلق رکھتے تھے، اور ان کی خدمت میں بہت کثرت سے جایا کرتے تھے اور حضرت میاں صاحب بھی والد صاحب پر بہت شفقت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ میں ایک مرتبہ حضرت میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور جاکر بیٹھ گیا تو حضرت میاں صاحب کہنے لگے کہ بھائی دیکھو مولوی شفیع صاحب آج ہم عربی میں بات کریں گے، اردو میں بات نہیں کریں گے، حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے بڑی حیرانی ہوئی، اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا، آج بیٹھے بٹھائے یہ عربی میں بات کرنے کا خیال کیسے آیا، میں نے پوچھا حضرت! کیا وجہ ہے؟ حضرت نے فرمایا نہیں بس ویسے ہی خیال آگیا کہ عربی میں بات کریں گے، جب میں نے بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ میں نے یہ دیکھا ہے کہ جب ہم دونوں مل کر بیٹھتے ہیں تو بہت باتیں چل پڑتی ہیں، اِدھر اُدھر کی گفتگو شروع ہو جاتی ہے، اور اس کے نتیجے میں ہم لوگ بعض اوقات غلط باتوں کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں، مجھے خیال ہوا کہ اگر ہم عربی میں بات کرنے کا اہتمام کریں تو عربی نہ تمہیں روانی کے ساتھ بولنی آتی ہے، اور نہ مجھے بولنی آتی ہے، لہٰذا کچھ تکلف کے ساتھ عربی میں بولنا پڑے گا، تو اس کے نتیجے میں یہ زبان جو بے محابا چل رہی ہے، یہ قابو میں آجائے گی اور پھر بلا ضرورت فضول گفتگو نہ ہوگی، صرف ضرورت کی بات ہوگی۔

ہماری مثال

پھر حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی! ہماری مثال اس شخص جیسی ہے جو اپنے گھر سے بہت ساری اشرفیاں، بہت سارے پیسے لے کر سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اور ابھی اس کا سفر جاری تھا۔ ابھی منزل تک نہیں پہنچا تھا کہ اس کی ساری اشرفیاں خرچ ہو گئیں۔ اور اب چند اشرفیاں اس کے پاس باقی رہ گئیں، اور اب وہ اشرفیوں کو بہت سنبھال کر اور پھونک پھونک کر خرچ کرتا ہے صرف بہت زیادہ ضرورت کی جگہ پر خرچ کرتا ہے۔ فضول جگہ پر خرچ نہیں کرتا ہے۔ تاکہ کسی طرح

وہ اپنی منزل تک پہنچ جائے۔

پھر فرمایا کہ ہم نے اپنی اکثر عمر گزار دی، اور عمر کے جو لمحات اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے تھے، یہ سب منزل تک پہنچنے کے لئے مال و دولت اور اشرفیاں تھیں، اگر ان کو صحیح طریقے سے استعمال کرتے تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا۔ اور منزل کا راستہ ہموار ہو جاتا، لیکن ہم نے پتہ نہیں، کن چیزوں میں اس کو خرچ کر دیا، بیٹھے ہوئے گپ شپ کر رہے ہیں، مجلس آرائی ہو رہی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ساری توانائیں ان فضول چیزوں میں خرچ ہو گئیں، اب پتہ نہیں کہ زندگی کے کتنے دن باقی ہیں، اب یہ دل چاہتا ہے زندگی کے ان اوقات کو تول تول کر احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر استعمال کرے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ یہ فکر عطا فرماتے ہیں، ان کا پھر یہی حال ہو جاتا ہے، وہ یہ سوچتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے زبان کی یہ دولت عطا فرمائی ہے تو اس کو ٹھیک استعمال کروں، غلط جگہ استعمال نہ کروں۔

زبان کو قابو کرنے کا علاج

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، جو انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے افضل انسان ہیں، وہ ایک مرتبہ اپنی زبان کو پکڑے بیٹھے تھے، اور اس کو مروڑ رہے تھے، لوگوں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا:

((اِنَّ هٰذَا اَوْرَدَنِیَ الْمَوَارِدَ))(۱)

''اس زبان نے مجھے بڑی ہلاکتوں میں ڈال دیا ہے، اس لئے میں اس کو قابو کرنا چاہتا ہوں''

بعض روایات میں مروی ہے کہ اپنے منہ میں کنکر ڈال کر بیٹھ گئے، تاکہ بلاضرورت زبان سے بات نہ نکلے، بہرحال، زبان ایسی چیز ہے کہ اس کے ذریعہ سے انسان جنت بھی کما سکتا ہے، اور دوزخ بھی کما سکتا ہے، اس کو قابو کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ بے جگہ استعمال نہ ہو، اس کا طریقہ یہی ہے کہ انسان کثرت کلام سے پرہیز کرے، اس لئے کہ انسان جتنا زیادہ کلام کرے گا، اتنا ہی زیادہ گناہوں میں مبتلا ہوگا، چنانچہ اپنی اصلاح کے خواہش مند حضرات جب کسی شیخ کے پاس علاج کے لئے جاتے ہیں، تو شیخ ہر ایک کے لئے اس کے مناسب الگ الگ نسخہ تجویز کرتے ہیں، اور وہ بہت سے حضرات کے لئے صرف زبان کو قابو میں کرنے کا علاج تجویز کرتے ہیں۔

---

(۱) موطامالك، كتاب الجامع، باب ماجاء فيما يخاف من اللسان، رقم: ۱۵٦٧

زبان پر تالہ ڈال لو

ایک صاحب میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا کرتے تھے، لیکن کوئی اصلاحی تعلق قائم نہیں کیا تھا، بس ویسے ہی ملنے کے لئے آ جایا کرتے تھے، اور جب باتیں شروع کرتے تو پھر رکنے کا نام نہ لیتے، ایک قصہ بیان کیا، وہ ختم ہوا تو دوسرا قصہ سنانا شروع کر دیا، حضرت والد صاحب برداشت کرتے رہتے تھے، ایک روز انہوں نے حضرت والد صاحب سے درخواست کی میں آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں، حضرت والد صاحب نے قبول کرلیا، اور اجازت دے دی، اس کے بعد انہوں نے کہا کہ حضرت مجھے کوئی وظیفہ پڑھنے کے لئے بتا دیں میں کیا پڑھا کروں؟ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ تمہارا ایک ہی وظیفہ ہے اور وہ یہ کہ اس زبان پر تالہ ڈال لو، اور یہ زبان جو ہر وقت چلتی رہتی ہے، اس کو قابو میں کرو، تمہارے لئے اور کوئی وظیفہ نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے جب زبان کو قابو میں کیا، تو اسی کے ذریعہ ان کی اصلاح ہوگئی۔

گپ شپ میں زبان کو لگانا

ہمارے ہاں زبان کو غلط استعمال کی جو وبا چل پڑی ہے، یاد رکھو، یہ بڑی خطرناک بات ہے، دوستوں کو بلالیا کہ آنا ذرا بیٹھ کر گپ شپ کریں گے اب اس گپ شپ کے اندر جھوٹ بولا جارہا ہے، غیبت اس کے اندر ہو رہی ہے، دوسروں کی برائی اس میں بیان کی جارہی ہے، دوسروں کی نقل اتاری جارہی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری ایک مجلس نہ جانے کتنے گناہوں کا مجموعہ ہوتی ہے، اس لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس زبان کو قابو میں کرنے کی اہمیت دل میں پیدا کریں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کی اہمیت ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے۔

خواتین اور زبان کا استعمال

یوں تو سارا معاشرہ اس زبان کے گناہوں میں مبتلا ہے لیکن احادیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کے اندر جن بیماریوں کے پائے جانے کی نشان دہی فرمائی، ان میں سے ایک بیماری یہ بھی ہے کہ زبان ان کے قابو میں نہیں ہوتی، حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اے خواتین! میں نے اہل جہنم میں سب سے زیادہ تعداد میں تم کو پایا، یعنی جہنم میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے"

خواتین نے پوچھا "یارسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟"
تو آنحضرت ﷺ نے جواب دیا:
((تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ))(۱)
"تم لعن طعن بہت کرتی ہو، اور شوہروں کی ناشکری بہت کرتی ہو، اس وجہ سے جہنم میں تمہاری تعداد زیادہ ہے"

دیکھئے اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے جو دو باتیں بیان فرمائیں، ان دونوں کا تعلق زبان سے ہے۔ لعنت کی کثرت اور شوہر کی ناشکری۔

معلوم ہوا کہ حضور اقدس ﷺ نے خواتین کے اندر جن بیماریوں کی تشخیص فرمائی، اس میں زبان کے بے جا استعمال کو بیان فرمایا، کہ یہ خواتین زبان کو غلط استعمال کرتی ہیں، مثلاً کسی کو طعنہ دے دیا، کسی کو برا کہہ دیا، کسی کی غیبت کردی، کسی کی چغلی کھالی، یہ سب اس کے اندر داخل ہے۔

میں جنت کی ضمانت دیتا ہوں

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((مَنْ يَضْمَنْ لِيْ مَا بَيْنَ لِحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ))(۲)

"حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھے دو چیزوں کی ضمانت دے دے تو میں اس کو جنت کی گارنٹی دیتا ہوں، ایک اس چیز کی گارنٹی دے دے جو اس کے دو جبڑوں کے درمیان ہے (یعنی زبان کہ یہ غلط استعمال نہیں ہوگی) اور ایک اس چیز کی ضمانت دے جو اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے (یعنی شرم گاہ) کہ اس کو غلط جگہ پر استعمال نہیں کروں گا تو میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں"

اس سے معلوم ہوا کہ زبان کی حفاظت دین کا آدھا باب ہے۔ اور آدھا دین زبان کے اندر ہے آدھے گناہ زبان کے ذریعہ ہوتے ہیں اس لئے اس کی حفاظت ضروری ہے۔

نجات کے لئے تین کام

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا النَّجَاةُ؟ قَالَ

---

(۱) شعب الإيمان، رقم:۲۹ (۱/۶۱)، المستدرك على الحاكم، رقم:۲۷۷۲ (۲/۴۹۱)
(۲) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب حفظ اللسان، رقم:۵۹۹۳

((اَمْسِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ، وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ وَابْكِ عَلٰى خَطِيْئَتِكَ))(۱)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! نجات کا کیا طریقہ ہے؟ یعنی آخرت میں عذاب جہنم سے نجات ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ اپنی رضا مندی عطا فرما دیں، اور جنت میں داخلہ فرما دیں، اس کا کیا طریقہ ہے؟ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کے جواب میں تین جملے ارشاد فرمائے، پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ تم اپنی زبان کو اپنے قابو میں رکھو، زبان بے قابو نہ ہونے پائے، اور دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ تمہارا گھر تمہارے لئے کافی ہو جائے، یعنی اپنا زیادہ وقت گھر میں گزارے، فضول اور بلا وجہ تمہیں گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔ صرف ضرورت کے تحت گھر سے باہر جاؤ، بلا ضرورت باہر مت جاؤ، تاکہ باہر جو فتنے ہیں۔ ان کے اندر مبتلا نہ ہو جاؤ۔

گناہوں پر رو

اور تیسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی غلطی کوئی گناہ یا خطا تم سے سرزد ہو جائے تو اس غلطی پر رو، رونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے توبہ کرو، اور اس پر ندامت کا اظہار کر کے استغفار کرو، رونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس پر واقعتا رو، جیسے ابھی چند روز پہلے ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے رونا آتا ہی نہیں ہے، اس لئے میں پریشان ہوتا ہوں، اصل بات یہ ہے کہ اگر خود سے غیر اختیاری طور پر رونا نہ آئے تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن گناہ پر دل سے نادم ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ استغفار کرے، کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہو گئی، آپ معاف فرما دیں۔

اے زبان! اللہ سے ڈرنا

عَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ((اِذَا اَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ، فَاِنَّ الْاَعْضَاءَ كُلَّهَا تكفر اللِّسَانَ، تَقُوْلُ اِتَّقِ اللّٰهَ فِيْنَا، فَاِنَّمَا نَحْنُ بِكَ، فَاِنِ اسْتَقَمْتَ اسْتَقَمْنَا، وَاِنِ اعْوَجَجْتَ اِعْوَجَجْنَا))(۲)

”حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ماجاء فی حفظ اللسان، رقم: ۲۳۳۰، مسند أحمد، رقم: ۱۶۶۹۶

(۲) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء فی حفظ اللسان، رقم: ۲۳۳۱، مسند أحمد، رقم: ۱۱۴۷۲

''جب صبح ہوتی ہے تو انسان کے جسم کے اندر جتنے اعضاء ہیں۔ وہ سب زبان سے مخاطب ہو کر یہ کہتے ہیں کے اے زبان! تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، اس لئے کہ ہم تو تیرے تابع ہیں، اگر تو سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے، اور اگر تو ٹیڑھی ہوگئی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے، مطلب یہ ہے کہ انسان کا سارا جسم زبان کے تابع ہوتا ہے، اگر زبان نے غلط کام کرنا شروع کر دیا تو اس کے نتیجے میں سارے کا سارا جسم گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لئے وہ زبان سے کہتے ہیں کہ سیدھی رہنا ورنہ تیرے کرتوت کی وجہ سے ہم بھی مصیبت میں پھنس جائیں گے''

اب کس طرح یہ اعضاء زبان سے مخاطب ہوتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ حقیقتاً کہتے ہوں اس لئے کہ کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اعضاء کو قوت گویائی عطا فرما دیتے ہوں، اور اس کے نتیجے میں وہ زبان سے گفتگو کرتے ہوں، اس لئے کہ زبان کو بھی قوت گویائی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان اعضاء کو قوت گویائی عطا فرمائیں گے۔

قیامت کے روز اعضا بولیں گے

گزشتہ زمانے میں ''نیچریت'' کا بڑا زور تھا۔ اور یہ فرقہ نیچریت کے لوگ معجزات وغیرہ کا انکار کرتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ یہ تو فطرت کے خلاف ہے کیسے ہو سکتا ہے، چنانچہ ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ یہ جو قرآن شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے روز یہ ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے۔ گفتگو کریں گے۔ یہ کس طرح گواہی دیں گے؟ ان کے اندر زبان نہیں ہے، اور بغیر زبان کے کیسے بولیں گے؟ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ زبان بغیر زبان کے کیسے بولتی ہے؟ یہ زبان بھی ایک گوشت کا ٹکڑا ہے، اس کے لئے الگ سے کوئی زبان نہیں ہے لیکن پھر بھی بول رہی ہے، جس اللہ تعالیٰ نے گوشت کے اس لوتھڑے کو گویائی کی قوت عطا فرما دی، تو یہ بولنے لگی، اگر اللہ تعالیٰ اس قوت کو سلب کر لیں، تو بولنا بند کر دے گی، اور یہی گویائی کی قوت جب اللہ تعالیٰ ہاتھ کو عطا فرمائیں گے تو ہاتھ بولنے لگے لگا، پاؤں کو عطا فرمائیں گے تو پاؤں بولنے لگے گا۔

بہرحال! یہ حقیقت بھی ہو سکتی ہے کہ صبح کے وقت اعضاء زبان سے کس طرح گفتگو کرتے ہوں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محض ایک تمثیل ہو کہ یہ سارے اعضاء چونکہ اس زبان کے تابع ہیں، اس لئے زبان کو صحیح رکھنے کی کوشش کرو۔ بہرحال اس زبان کی حفاظت بہت ضروری ہے جب تک انسان اس پر قابو نہ پالے اور اس کو گناہوں سے نہ بچالے، اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس زبان کی حفاظت کرنے اور اس کو صحیح استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

غیر ضروری سوالات سے پرہیز کریں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((دَعُوْنِيْ مَا تَرَكْتُمْ إِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَثْرَةُ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلٰى أَنْبِيَاءِهِمْ، فَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوْهُ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تک کسی خاص مسئلے کے بارے میں کوئی خاص بات نہ بتاؤں اس وقت تک تم مجھے چھوڑے رکھو اور مجھ سے سوال نہ کرو، یعنی جس کام کے بارے میں میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ کرنا فرض ہے یا یہ کام کرنا حرام اور ناجائز ہے، اس کام کے بارے میں بلاوجہ اور بلاضرورت سوال کرنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ تم سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی جو اُمتیں ہلاک ہوئیں، ان کی ہلاکت کا ایک سبب ان کا کثرت سے سوال کرنا بھی تھا، اور دوسرا سبب اپنے انبیاء کے بتائے ہوئے احکام کی خلاف ورزی تھی، لہٰذا جب میں تم کو کسی چیز سے روکوں تو تم اس سے رک جاؤ۔ اس میں قیل وقال اور چوں و چرا نہ کرو، اور جس چیز کا میں تم کو حکم دوں تو اس کو اپنی استطاعت کے مطابق بجالاؤ، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم پر شفقت دیکھئے کہ استطاعت کی قید لگا دی کہ اپنی استطاعت کے مطابق بجالاؤ گویا استطاعت سے زیادہ کا ہمیں مکلف نہیں بنایا۔

☆ اصلاحی خطبات (۷/۲۹۳ تا ۳۰۰)

(۱) صحيح مسلم، كتاب الحج، باب فرض الحج مرة فى العمر، رقم: ۲۳۸۰، سنن الترمذى، كتاب العلم عن رسول الله، باب فى الانتهاء عما نهى عنه رسول الله، رقم: ۲۶۰۳، سنن النسائى، كتاب مناسك الحج، باب وجوب الحج، رقم: ۲۵۷۲، مسند أحمد، رقم: ۷۰۶۳

کس قسم کے سوالات سے پرہیز کیا جائے؟

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے سوال کی کثرت کی مذمت بیان فرمائی ہے، لیکن بعض دوسری احادیث میں سوال کرنے کی فضیلت بھی آئی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّمَا شِفَاءُ الْعَيِّ السُّؤَالُ))(۱)

''پیاسے کی تشفی سوال سے ہوتی ہے''

دونوں قسم کی احادیث اپنی اپنی جگہ درست ہیں، دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ جس معاملے میں خود انسان کو حکم شرعی معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئے یہ معاملہ جو میں کر رہا ہوں، شرعاً جائز ہے یا نہیں، ایسے موقع پر سوال نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ضروری ہے، لیکن اگر سوالات کرنے کا منشاء یا تو محض وقت گزاری ہے یا اس سوال کا اس کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ وہ مسئلہ اس کو پیش نہیں آیا یا وہ ایسا مسئلہ ہے جس کی دین میں کوئی اہمیت نہیں اور عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ قبر میں اس کے بارے میں سوال ہوگا اور نہ آخرت میں سوال ہوگا اور اس کے معلوم نہ ہونے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے، تو ایسے مسائل کے بارے میں سوال کرنے کی اس حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

فضول سوالات میں لگانا شیطان کا کام ہے

مثلاً ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جو دو بیٹے تھے، ھابیل اور قابیل، ان دونوں کے درمیان لڑائی ہوئی، جس کے نتیجے میں قابیل نے ھابیل کو قتل کر دیا، اس لڑائی کا سبب ایک لڑکی تھی، اس لڑکی کا نام کیا تھا؟ اب بتایئے کہ اگر اس لڑکی کا نام معلوم ہو جائے تو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ اور اگر معلوم نہ ہو تو اس سے نقصان کیا ہوگا؟ کیا قبر میں منکر نکیر پوچھیں گے کہ اس لڑکی کا نام بتاؤ ورنہ تمہیں جنت نہیں ملے گی، یا میدان حشر میں اللہ تعالیٰ اس کے نام کے بارے میں تم سے سوال کریں گے۔ لہٰذا اس قسم کے مسائل جن کا قبر میں، حشر، آخرت میں بھی واسطہ پیش نہیں آئیگا ان کے بارے میں سوال کرنا درست نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کو صحیح راستے سے ہٹانے کے لئے شیطان کے پاس مختلف حربے ہیں، ان میں سے ایک حربہ یہ ہے کہ وہ شیطان انسان کو ایسے کام میں لگا

(۱) سنن أبي داود، كتاب الطهارة، باب في المجروح يتيمم، رقم: ۲۸٤، سنن ابن ماجه كتاب الطهار وسننها، باب في المجروح تصيبه الجنابة، رقم: ٥٦٥، مسند أحمد، رقم: ۲۸۹۸، سنن الدارمي، كتاب الطهارة، باب المجروح تصيبها الجنابة، رقم: ٧٤٥

دیتا ہے جس کا کوئی حاصل نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عملی کاموں سے انسان غافل ہو جاتا ہے اور ان فضول سوالات کے چکر میں لگ جاتا ہے۔

حکم شرعی کی علت کے بارے میں سوال

اسی طرح آج کل لوگوں میں یہ مرض بہت عام ہے کہ جب کسی عمل کے بارے میں بتاؤ کہ شریعت میں یہ حکم موجود ہے کہ یہ کام کرو، یا یہ حکم ہے کہ فلاں کام مت کرو، تو لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ فلاں چیز کو جو حرام قرار دیا گیا ہے، یہ حرمت کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ اور سوال کرنے والے کا انداز یہ بتاتا ہے کہ اگر ہمارے اس سوال کا معقول جواب ہمیں مل گیا اور ہماری عقل نے اس جواب کو صحیح تسلیم کر لیا تب تو ہم اس حکم شرعی کو مانیں گے ورنہ نہیں مانیں گے، حالانکہ اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے صاف صاف فرما دیا کہ جب میں نے تم کو کسی چیز سے روک دیا تو تمہارا کام یہ ہے کہ رک جاؤ اور اس تحقیق میں پڑنا تمہارا کام نہیں کہ اس روکنے میں کیا حکمت ہے؟ کیا مصلحت اور کیا فائدہ ہے؟

علت کے بارے میں سوال کا بہترین جواب

ایک صاحب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کے پاس آئے اور کسی شرعی مسئلے کے بارے میں پوچھنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز کو کیوں حرام کر دیا؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا حکمت اور مصلحت ہے؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک بات کا آپ جواب دے دیں تو میں اس کا جواب آپ کو دے دوں گا، انہوں نے کہا کہ وہ کیا بات؟ حضرت نے فرمایا کہ آپ کی ناک سامنے کیوں لگی ہے پیچھے کیوں نہیں لگی؟

مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مصلحت سے اس کارخانہ عالم کا نظام چلا رہے ہیں تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا یہ چھوٹا سا دماغ جو تمہارے سر میں ہے اس کی ساری حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ کر لے، حالانکہ آج کے دور میں سائنس اتنی ترقی کے باوجود اس چھوٹے سے دماغ کی بھی پوری تحقیق نہیں کر سکی اور یہ کہتی ہے کہ اس دماغ کا اکثر حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں اب تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس کا عمل کیا ہے ایسے دماغ کے ذریعہ تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ساری حکمتوں کا احاطہ کر لو کہ فلاں چیز کو کیوں حرام کیا؟ اور فلاں چیز کو کیوں حلال کیا؟ بات یہ کہ اپنی حقیقت سے ناواقفیت اور دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کی کمی کے نتیجے میں اس قسم کے سوال ذہن میں آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں میں دخل مت دو

اب مثلاً کوئی شخص یہ سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے فجر کی نماز میں دو رکعت فرض فرمائی ہیں، ظہر کی نماز میں چار، عصر کی نماز میں چار، مغرب کی نماز میں تین رکعت فرض فرمائی ہیں، اس فرق کرنے میں کیا حکمت ہے؟ اور کیا وجہ ہے؟ اب اگر کوئی شخص اپنے سے سوچ کر یہ کہے کہ فجر کی نماز کا وقت چونکہ فرصت کا ہوتا ہے تو اس وقت چار رکعت فرض ہونی چاہئیں اور چونکہ عصر کا وقت مشغولیت کا ہوتا ہے تو اس وقت دو رکعت فرض ہونی چاہئیں۔ ارے تم اپنی چھوٹی سی عقل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں کے اندر داخل دینا چاہتے ہو؟ اور یہ فیصلہ کرتے ہو کہ فلاں وقت اتنی رکعت فرض ہونی چاہئیں۔ لہٰذا شریعت کے کسی بھی حکم کے بارے میں یہ سوال کرنا کہ یہ حکم کیوں دیا گیا، یہ غلط سوال ہے۔ ایسے سوال سے آپ نے منع فرمایا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ''کیوں'' سے سوال نہیں کیا کرتے تھے

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات پڑھ کر دیکھئے تو آپ کو پورے ذخیرہ حدیث میں یہ کہیں نظر نہیں آئے گا کہ کسی صحابی نے کسی حکم شرعی کے بارے میں یہ سوال کیا ہو کہ یہ حکم کیوں دیا گیا؟ ایک مثال نہیں ملے گی۔ البتہ یہ سوال ملے گا کہ فلاں چیز کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟ لفظ ''کیوں'' سے سوال نہیں کرتے تھے۔ سوال نہ کرنے کی وجہ کیا تھی؟ کیا ان کے اندر عقل اور سمجھ نہیں تھی؟ کیا وہ ان شرعی حکموں کی حکمتیں اور مصلحتیں نہیں پہچان سکتے تھے؟ ایسا نہیں تھا، کیونکہ ان کی عقل اتنی تھی کہ آج کے دور کا بڑے سے بڑا عقل مند ان کی عقل کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا، پھر سوال نہ کرنے کی کیا وجہ تھی؟ وجہ یہ تھی کہ اس عقل ہی کا تقاضہ یہ تھا کہ جب اللہ کو اپنا خالق اور مالک مان لیا اور نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا رسول مان لیا تو اب جو بات اور جو حکم بھی ان کی طرف سے آئے گا وہ حق ہوگا، اس میں ہمارے لئے چوں وچرا کی مجال اور گنجائش نہیں، اس لئے لفظ ''کیوں'' سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سوال نہیں کرتے تھے۔

یہ اللہ کی محبت اور عظمت کی کمی کی دلیل ہے

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شریعت کے احکام کے سلسلے میں لوگوں کے دلوں میں بہت زیادہ شکوک وشبہات ہوتے ہیں اس کی اصل وجہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت دل میں ہوگی تو اس کی طرف سے دیئے گئے حکم میں شکوک وشبہات پیدا نہیں ہونگے

دنیا کے اندر دیکھ لیں کہ جس سے محبت اور عقیدت ہوتی ہے، وہ اگر کسی بات کا حکم دے تو چاہے وہ حکم ہماری سمجھ میں نہ آ رہا ہو، لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اتنا بڑا آدمی ہے کہ اس کے حکم کے پیچھے کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔ تو وہ ذات جس کی قدرت، جس کا علم اور جس کی رحمت ساری کائنات کو محیط ہے، وہ ذات اگر یہ حکم دے کہ یہ عمل کرو اور یہ عمل مت کرو تو اس کی عظمت اور محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی یہ نہ سوچے کہ مجھے یہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟ اور اس حکم میں کیا فائدہ اور کیا مصلحت ہے؟ دین نام ہی اس کا ہے کہ اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دو اور چوں چرا کو درمیان سے نکال دو۔ آج کی گمراہیوں کا سب سے بڑا سرچشمہ اور بنیادی سبب یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے احکام کو اپنی عقل سے پرکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور اگر کسی حکم کی حکمت عقل میں نہیں آ رہی تو اس کو شریعت کا حکم ماننے سے انکار کیا جا رہا ہے۔

بچے اور نوکر کی مثال

چھوٹا سا بچہ جو ابھی بالکل نادان ہے باپ اس کو کسی کام کا حکم دیتا ہے یا ماں اس کو حکم دیتی ہے، اگر وہ بچہ یہ کہے کہ مجھے حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟ جب تک آپ مجھے اس کام کی حکمت نہیں سمجھائیں گے اس وقت تک میں یہ کام نہیں کرونگا تو ایسا بچہ کبھی صحیح تربیت نہیں پا سکے گا، بچے کو چھوڑیے، ایک آدمی جو عاقل بالغ ہے اور اس کو آپ نے اپنا نوکر رکھا ہوا ہے، آپ نے اس سے کہا کہ بازار جا کر فلاں سودا لے آؤ، وہ پلٹ کر یہ پوچھتا ہے کہ پہلے آپ مجھے اس کی حکمت اور وجہ بتائیے کہ آپ یہ چیز بازار سے کیوں منگوا رہے ہیں؟ آپ حکمت بتائیے پھر میں بازار سے یہ چیز لاؤنگا۔ ایسا نوکر کان سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دینے کے لائق ہے۔ اس لئے کہ نوکر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ پوچھے کہ آپ یہ چیز کیوں منگوا رہے ہیں؟ نوکر کا کام یہ ہے کہ جو حکم بھی اس کو دیا جا رہا ہے وہ اس کو بجا لائے، وہ یہ نہ پوچھے کہ یہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟ جب نوکروں کے ساتھ تمہارا یہ معاملہ ہے، حالانکہ نوکر بھی انسان ہے اور تم بھی انسان ہو، تو اللہ تو خالق اور معبود ہیں اور تم اسکے بندے ہو، نوکر اور آقا میں تو پھر بھی مناسبت ہے، اس لئے کہ دونوں کی عقل محدود ہے، لیکن بندے اور اللہ میں تو کوئی مناسبت ہی نہیں، اس لئے کہ تمہاری عقل محدود اور اللہ جل شانہ کی حکمتیں لامحدود، اس لئے اس کے حکم کی حکمت کے بارے میں سوال کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ بہر حال اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے تین قسم کے سوالات سے منع فرمایا ہے، ایک بے فائدہ سوال کرنا جس کا عملی زندگی سے تعلق نہ ہو، دوسرے ایسے معاملے یا ایسی صورت حال کے بارے میں سوال کرنا جو اپنی ذات کو کبھی پیش نہ آیا ہو، تیسرے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے کسی حکم کی حکمت معلوم کرنے کے لئے سوال کرنا۔ اور مقصد سوال کرنے کا یہ ہو کہ اگر

اس حکم کی حکمت معلوم ہوگی تو عمل کرونگا ورنہ نہیں کرونگا۔ اور فرمایا کہ پچھلی امتیں ان تین چیزوں کے بارے میں سوالات کرنے سے ہلاک ہوئیں۔ تم ان چیزوں کے بارے میں سوال کرنے سے پرہیز کرو، اور جب میں تم کو کسی چیز سے روک دوں تو تم رک جاؤ، اس کی حکمت تلاش کرنے کے پیچھے مت پڑو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

آواز بلند نہ کیجئے ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾(۱)

بزرگان محترم و برادران عزیز! یہ سورۃ الحجرات کی ابتدائی چند آیات ہیں، جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں، پہلے ان آیات کا ترجمہ عرض کرتا ہوں، اس کے بعد ان کی تشریح عرض کروں گا، ان آیات کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں پیغمبر ﷺ کی آواز سے بلند مت کرو، اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں کھل کر ایک دوسرے سے بولا کرتے ہو، کہیں تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں، اور تم کو خبر بھی نہ ہو، بیشک جو لوگ اپنی آوازوں کی رسول اللہ ﷺ کے سامنے پست رکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے خالص کر دیا ہے، ان لوگوں کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے، جو لوگ آپ ﷺ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر لوگوں کو عقل نہیں ہے، اگر یہ لوگ صبر کرتے، یہاں تک کہ آپ خود باہر ان

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/۲۴۰ تا ۲۵۲) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) الحجرات: ۲ تا ۵

کے پاس آ جاتے تو یہ ان کے لئے بہتر تھا، اللہ تعالیٰ بخشنے والے بڑے رحیم ہیں"

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو دو حکم دیے گئے ہیں، ایک یہ کہ حضور اقدس ﷺ کی مجلس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آواز بلند کرنے سے منع فرمایا ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ مجلس میں بیٹھے ہوں تو اپنی آواز حضور اقدس ﷺ کی آوز پر بلند نہ کی جائے، اور آپ سے پست آواز میں بات کی جائے۔ دوسرا حکم یہ دیا گیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں تشریف فرما ہوں تو اس وقت گھر کے باہر سے حضور اقدس ﷺ کو آواز دینا جیسا، کہ بنو تمیم کے لوگوں نے ناواقفیت کی بناء پر ایسا طرز عمل اختیار کیا تھا کہ گھر کے باہر سے آپ کو آواز دینا شروع کر دیں کہ اے محمد! ہمارے لئے باہر آیئے۔(۱)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضوؐر جب خود سے باہر تشریف لے آتے، اس وقت یہ لوگ آپ کی زیارت کرتے، اور آپ سے ملاقات کرتے تو یہ ان کے لئے زیادہ بہتر تھا۔ بہر حال! یہ دو حکم ان آیات میں بیان فرمائے ہیں۔

مجلس نبوی ﷺ کا ایک ادب

پہلے حکم میں دراصل مجلس نبوی ﷺ کا ایک ادب بیان فرمایا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے آپ کی آواز سے زیادہ آواز بلند کرنا، یا بلند آواز سے اس طرح گفتگو کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے محابا گفتگو کیا کرتے ہیں، یہ ایک قسم کی بے ادبی اور گستاخی ہے، چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ڈر گئے، اور ان کی یہ حالت ہو گئی کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! قسم ہے کہ اب مرتے دم تک میں آپ سے اس طرح بولوں گا جیسے کوئی کسی سے سرگوشی کرتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ حالت ہو گئی کہ وہ اس قدر آہستہ بولنے لگے کہ بعض اوقات ان سے دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا کہ آپ نے کیا کہا۔

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ طبعی طور پر بہت بلند آواز تھے، یہ آیت سن کر بہت ڈر گئے، اور روئے اور اپنی آواز کو گھٹایا۔(۲)

---

(۱) التفسير لابن كثير(٤/٢٦٣)، سورة الحجرات، الآية: ٥

(۲) التفسير لابن كثير(٤/٢٦٢)، سورة الحجرات، الآية: ٤

دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے

یہ حکم اگرچہ براہ راست حضور اقدس ﷺ سے متعلق دیا گیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی موجودگی میں ایسا نہ کریں، اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ کو ادنیٰ تکلیف پہنچانا انسان کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے، اس لئے فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اس عمل سے حضور اقدس ﷺ کو کوئی تکلیف پہنچے اور اس کے نتیجے میں تمہارے سارے اعمال غارت ہو جائیں، لیکن اس کے ضمن میں ایک عمومی ہدایت یہ بھی دی گئی ہے کہ کسی بھی انسان کو دوسرے انسان سے کوئی تکلیف نہ پہنچے، حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ))(۱)

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے کسی دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے''

یہ حکم حضور اقدس ﷺ کے معاملے میں تو انتہائی سنگین ہے، لیکن اگر کسی اور انسان کے ساتھ بھی ناحق معاملہ کیا جائے، خاص طور پر اس وقت جب وہ ''مسلمان'' بھی ہو، یہ بھی گناہ ہے، اور انسان کے لئے قابل احتراز ہے۔

بلند آواز سے بات کرنا پسندیدہ نہیں

یہ جو حکم فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ کی موجودگی میں اپنی آواز بلند مت کرو، بلکہ آہستہ آواز سے بات کرو، یہ حکم حضور اقدس ﷺ کے بارے میں تو بہت زیادہ موکد ہے، لیکن قرآن کریم نے دوسری جگہ عام انسانوں کی گفتگو میں بھی بہت زیادہ بلند آواز سے بات کرنے کو پسند نہیں فرمایا، چنانچہ سورۃ لقمان میں فرمایا:

﴿وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾(۲)

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ۹، صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان تفاضل الإسلام وأي أموره أفضل، رقم: ۵۸، سنن الترمذي، كتاب الايمان عَنْ رسول الله، باب ما جاء في أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ۲۵۵۱، سنن النسائي، كتاب الايمان وشرائعه، باب صفة المسلم، رقم: ۴۹۱۰، سنن أبي داود، كتاب الجهاد، باب في الهجرة هل انقطعت، رقم: ۲۱۲۲

(۲) لقمان: ۱۹

''اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو، اور اپنی آواز کو آہستہ کرو، بے شک سب سے بدترین آواز گدھے کی آواز ہے''

اس لئے کہ گدھے کی آواز بلند ہوتی ہے، اور دور تک جاتی ہے، لہٰذا یہ اچھی بات نہیں کہ آدمی اتنی زور سے بولے جو ضرورت سے زیادہ ہو، اور اس کی وجہ سے دوسرے انسان کو تکلیف ہو۔

بلند آواز سے کان میں خلل ہو جانا

آج کل کے اطباء اور ڈاکٹر صاحبان یہ کہتے ہیں کہ اگر آدمی بہت زیادہ بلند آواز میں باتیں کرتا رہے اور دوسرے کے کان میں مسلسل وہ آواز جائے، تو اس کے نتیجے میں انسان کے کان میں خلل پیدا ہو جاتا ہے، اور رفتہ رفتہ اس کے سننے کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا اتنی زور سے بولنا جو دوسرے انسان کو تکلیف کا سبب ہو، اس سے منع کیا گیا ہے، یہاں تک کہ جب آدمی کسی مجمع سے خطاب کر رہا ہو تو اس کے بارے میں بھی ادب یہ ہے کہ آواز بہت زیادہ بلند کرنا ادب کے خلاف ہے، پسندیدہ نہیں ہے، خاص طور پر اس وقت جب اس بلند آواز کے نتیجے میں آس پاس کے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو، تو یہ کبیرہ گناہ ہے، کیونکہ آپ ناحق لوگوں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں۔

لاؤڈ اسپیکر کا غلط استعمال

جب سے یہ ''لاؤڈ اسپیکر'' وجود میں آیا ہے، اللہ بچائے اس وقت سے ہمارے معاشرے میں اس کا اتنا غلط استعمال ہو رہا ہے، جو سراسر گناہ ہے، بعض اوقات لوگ اپنی تقریبات میں شادیوں میں لاؤڈ اسپیکر پر گانا بلند آواز سے لگا دیتے ہیں، اول تو گانا بجانا ہی ناجائز ہے، اور پھر وہ آواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے سارے محلہ والے پریشان ہوتے ہیں، اگر کوئی سونا چاہتا ہے تو وہ سو نہیں سکتا۔ اگر کوئی بیمار ہے اور وہ سکون چاہتا ہے تو اس کو سکون نہیں ملتا، اس طرح اس ایک عمل کی وجہ سے ڈبل گناہ ہو رہا ہے، ایک ناجائز بات کی تشہیر کرنے کا گناہ دوسرے لوگوں کو تکلیف میں مبتلا کرنے کا گناہ۔

دین کے نام پر ناجائز کام کرنا

افسوس یہ ہے کہ جو گانا بجانے والے ہیں، ان کو تو چلو فکر ہی نہیں ہے کہ کیا چیز گناہ ہے اور کیا ثواب ہے؟ لیکن جو لوگ دین کے نام پر کام کرنے والے ہیں، جن کو دین کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے، ان کو بھی اس مسئلے کا اہتمام نہیں، چنانچہ لاؤڈ اسپیکر پر وعظ و تقریر ہو رہی ہے، یا نعتیں پڑھی جا رہی ہیں، یا

قوالی ہورہی ہے، اب اس کی وجہ سے سارا محلہ جاگ رہا ہے، جب تک وہ پروگرام ختم نہیں ہوگا، اس وقت تک کوئی آدمی سو نہیں سکتا، اس میں بھی ڈبل گناہ ہے، اس لئے کہ یہ گناہ کا کام دین کے نام پر کیا جارہا ہے، اگر کوئی بیمار اس آواز کی وجہ سے پریشان ہے، اور تکلیف میں ہے، لیکن وہ اس لئے کچھ نہیں کہتا کہ اس کو یہ ڈر ہے کہ یہ تو وعظ اور تقریر ہورہی ہے، میرا کچھ کہنا دین کے خلاف نہ ہوجائے، اس ڈر سے لوگ خاموش رہتے ہیں، حالانکہ یہ سنگین گناہ ہے۔

ایک واعظ کا واقعہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ روایت میں آتا ہے کہ آپ جس حجرہ میں مقیم تھیں، اور جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ اقدس واقع ہے، بعض اوقات ایک واعظ صاحب وعظ کہنے کے لئے آتے، اور مسجد نبوی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے سامنے بلند آواز سے وعظ کہنا شروع کر دیتے تھے، اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر تو نہیں تھا، لیکن آواز بہت بلند تھی، کافی دیر تک وہ تقریر کرتے رہتے تھے، ان کی آواز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں آتی تھی، اب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی عبادت یا کام میں مشغول ہوتیں، یا آرام کررہی ہوتیں تو اس آواز سے ان کو تکلیف ہوتی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس وقت کے خلیفہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت کی کہ یہ واعظ صاحب یہاں آکر اتنی بلند آواز سے تقریر کرتے ہیں کہ مجھے اس کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان کو بلوایا، اور ان کو سمجھایا کہ بے شک دین کی بات کہنا بڑی اچھی بات ہے، لیکن اس طرح کہنا چاہئے جس سے لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے، لہٰذا آئندہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے سامنے اس طرح تقریر مت کرنا، اگر وعظ کرنا ہے تو کسی اور جگہ پر جاکر کرو، اگر وہیں پر وعظ کرنا ہے تو اتنی آواز سے کرو کہ وہ آواز صرف سننے والوں کی حد تک محدود رہے، دور تک نہ جائے۔

مار مار کر یہ ڈنڈا توڑ دوں گا

کچھ دن تک تو وہ واعظ صاحب خاموش رہے۔ لیکن بعض لوگ جذباتی قسم کے ہوتے ہیں، ان کو وعظ کے بغیر چین نہیں آتا، وہ صاحب بھی اسی طرح کے تھے، چنانچہ چند روز کے بعد دوبارہ اسی طرح مجمع جمع کیا، اور بڑی زور سے تقریر شروع کردی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دوبارہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ ان صاحب نے دوبارہ ہی سلسلہ شروع کر دیا ہے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان صاحب کو بلایا، اور فرمایا میں نے پہلی مرتبہ تم کو سمجھایا تھا، معلوم ہوا کہ تم نے دوبارہ یہ حرکت شروع کردی ہے، اب اگر تیسری مرتبہ تمہاری یہ شکایت آئی تو پھر یہ جو میرے ہاتھ میں سوٹا ہے اس کے

ذریعے مار مار کر یہ سوٹا توڑ دوں گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شکایت پر حضرت فاروق اعظم نے اتنے سخت الفاظ اس واعظ سے ارشاد فرمائے۔

بلند آواز سے قرآن شریف پڑھنا

اس مسئلہ میں کسی فقیہ کا کسی امام کا اختلاف نہیں، ساری امت کے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ایسی بلند آواز سے کوئی بھی کام کرنا، چاہے وہ دین کا کام ہو، جس سے دوسرے لوگوں کے کاموں میں اس طرح خلل واقع ہو کہ اگر کوئی سونا چاہے تو وہ نہیں سو سکتا، اگر کوئی بیمار ہے تو اس کی وجہ سے وہ تکلیف میں مبتلا ہے، ایسا کام کرنا بالکل حرام ہے، اور اگر ایسا کام دین کے نام کیا جائے تو رحمہم اللہ ڈبل حرام ہے، اس لئے کہ اس کے ذریعے سے دین کی غلط نمائندگی کی جارہی ہے۔ چنانچہ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ ایسی جگہ پر قرآن کریم بلند آواز سے نہ پڑھیں جہاں لوگ سو رہے ہوں، یا جہاں پر لوگ اپنے کاموں کے اندر مشغول ہیں اور اسکے نتیجے میں وہ یا تو قرآن کریم سے بے التفاتی برتیں گے، یا ان کے کاموں میں خلل واقع ہوگا، اس طرح کے بے شمار احکام ہمیں شریعت نے بتائے ہیں کہ دین کا کام بھی اس طرح کرو کہ اس سے حتی الامکان دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔

تہجد کے لئے اٹھتے وقت آپ کا انداز

حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تہجد کی نماز کے لئے اٹھتے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سو رہی ہوتیں اور آپ کس انداز سے اٹھتے تھے؟ اس کے بارے میں خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"قَامَ رُوَيْدًا وَ فَتَحَ الْبَابَ رُوَيْدًا"(۱)

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم دھیرے سے اٹھتے تھے، اور دروازہ دھیرے سے کھولتے تھے"

کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آنکھ کھل جائے، حالانکہ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل کی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آنکھ کھل بھی جاتی تو شاید ان کو تکلیف محسوس نہ ہوتی، بلکہ وہ اس کو اپنے لئے سعادت سمجھتیں، اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش یہ تھی کہ میرے کسی عمل سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ادنیٰ تکلیف بھی نہ پہنچے، اور ان کی نیند میں خلل واقع نہ ہو، نماز پڑھ رہے ہیں تو اس انداز سے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تکلیف نہ ہو۔

ہم لوگ اپنے دین کے احکام اور تعلیمات سے غافل ہو کر جو سمجھ میں آرہا ہے کر رہے ہیں، اور

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، رقم:۱٦۱۹، مسند أحمد، رقم: ۲٤٦٧۱

پھر اس کو اپنے دین کی طرف منسوب کر رہے ہیں، یہ انتہائی خطرناک بات ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

قانون کب حرکت میں آتا ہے

بہرحال! لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جس بری طرح ہو رہا ہے، اور جس طرح لوگوں کے لئے تکلیف کا سبب بن رہا ہے، جب کہ حکومت نے بھی یہ قانون بنا رکھا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا غلط استعمال نہ ہو، لیکن اس معاشرے میں قانون کی کوئی وقعت کوئی قیمت نہیں، یہ قانون صرف اس وقت حرکت میں آتا ہے، جب حکومت کو کسی شخص سے عداوت ہو جائے، اس وقت ''لاؤڈ اسپیکر ایکٹ'' سامنے آجاتا ہے، لیکن آج کل دن رات اس قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، مگر کوئی دیکھنے والا کوئی سننے والا نہیں۔ بہرحال! ان آیات نے ہمیں ایک ہدایت تو یہ دی کہ آواز بھی اتنی رکھو جس سے مقصد حاصل ہو جائے، آپ کو ایک پیغام پہنچانا ہے تو جس آواز سے دوسرا سن لے بس اس حد پر اس آواز کو رکھو، اس سے زیادہ آواز کو بڑھانا جو دوسروں کی تکلیف کا سبب بن جائے، اس سے ان آیات میں منع فرمایا گیا ہے۔

اللہ کے ذکر کے لئے آواز پست رکھنے کا حکم

ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ ایک غزوہ میں تشریف لے جا رہے تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ساتھ تھے، رات کے وقت سفر ہو رہا تھا، سفر کے دوران بسا اوقات لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح وقت کٹے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سفر کے دوران بلند آواز سے ذکر شروع کر دیا، اور اللہ تعالیٰ کی تحمید و تقدیس بلند آواز سے شروع کر دی، حضور اقدس ﷺ نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاب کر کے فرمایا:

((اِنَّكُمْ لَاتَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَائِبًا)) (۱)

یعنی تم بہرے ذات کو نہیں پکار رہے ہو، اور نہ کسی ایسی شخصیت کو پکار رہے ہو جو تم سے غائب ہے بلکہ تم تو اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہو، اس کو پکارنے کے لئے بلند آواز کی ضرورت نہیں، اگر تم آہستہ آواز سے بھی پکارو گے تو اللہ تعالیٰ سن لیں گے، اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ موجود ہے، اور ہر ایک کی بات سنتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے یہ تعلیم قرآن کریم کے عین مطابق دی، اس لئے کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً﴾ (۲)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب مایکره من رفع الصوت فی التکبیر، رقم: ۲۷۷۰، سنن أبی داود، کتاب الصلاة باب فی الاستغفار، رقم: ۱۳۰۵، مسند أحمد، رقم: ۱۸۶۹۹

(۲) الأعراف: ۵۵

''اپنے رب کو عاجزی کے ساتھ اور آہستگی سے پکارو''

اس لئے دعا میں، ذکر میں درود شریف میں آواز بلند کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو سنانا مقصود ہے، اور اللہ تعالیٰ کو سنانے کے لئے آواز کو بلند کرنے کی ضرورت نہیں، آہستگی سے بھی کرو گے تو اللہ تعالیٰ سن لیں گے۔

آواز نکلنا بڑی نعمت ہے

یہ آواز کی نعمت جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دے رکھی ہے، یہ ایسی نعمت ہے کہ اگر کبھی یہ نعمت سلب ہو جائے تو اس وقت انسان اس کو حاصل کرنے کے لئے ساری دنیا کی دولت خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا، جب آواز بند ہو جاتی ہے تو آدمی کو ایسی بے چینی اور بے تابی ہو جاتی ہے کہ آدمی اپنے دل کی بات کہنا چاہتا ہے، لیکن نہیں کہہ سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں گھر بیٹھے مفت میں یہ دولت دے رکھی ہے، اور اس کے ذریعہ ہم اپنی آواز دوسروں تک پہنچا کر اپنا مفہوم واضح کر دیتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، لہٰذا ایک طرف تو اس کا شکر ادا کرنا چاہئے، دوسرے یہ کہ اس کو صحیح جگہ پر استعمال کرنا چاہئے، غلط جگہ پر استعمال سے پرہیز کرنا چاہئے، اور حد سے زیادہ استعمال نہ ہو، بس جتنی ضرورت ہے اتنی ہی استعمال ہو۔

خلاصہ

یہ سب دین کے احکام ہیں جو ہمیں ان آیات سے مل رہے ہیں، افسوس یہ ہے کہ ہم نے دین کو نماز روزے کی حد تک محدود کر لیا ہے، اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو ہدایت عطا فرمائی ہیں، ان کو ہم دین کا حصہ ہی نہیں سمجھتے، جس کی وجہ سے آج ہم معاشرتی فساد میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اپنے دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

گناہ کی تہمت سے بچئے ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ صَفِيَّةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخْبَرَتْهُ اَنَّهَا جَاءَتْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَزُوْرُهُ فِي اِعْتِكَافِهِ فِي الْمَسْجِدِ فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ.(۱)

یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں حضور اقدس ﷺ کے ایک واقعہ کا بیان ہے۔ اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ ہر سال رمضان المبارک میں مسجد نبوی میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ اعتکاف میں تھے کہ ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ سے ملنے کے لئے اعتکاف کی جگہ پر تشریف لائیں، چونکہ اعتکاف کی وجہ سے آپ گھر کے اندر تشریف نہیں لے جاسکتے تھے، اس لئے وہ خود ہی ملاقات کے لئے آئیں، اور جتنی دیر ان کو بیٹھنا تھا، اتنی دیر تک بیٹھی رہیں۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو حضور اقدس ﷺ ان کو رخصت کرنے کے لئے مسجد کے دروازے تک تشریف لائے۔

بیوی کا اکرام کرنا چاہئے

اب آپ حضور اقدس ﷺ کی سنتیں دیکھتے جائیں۔ پہلی بات تو اس سے یہ معلوم ہوئی کہ اگر بیوی پردے کے ساتھ شوہر سے ملاقات کے لئے معتکف میں آجائے تو یہ جائز ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۰ تا ۲۰۸/۲۱۸) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاري، كتاب الاعتكاف، باب هل يخرج المعتكف لحوائجه إلى باب المسجد، رقم: ١٨٩٤، صحيح مسلم، كتاب السلام، باب بيان انه يستحب لمن رئي خاليا بامرأة وكانت زوجته، رقم: ٤٠٤١، سنن الدارمي، كتاب الصوم، باب اعتكاف النبي، رقم: ١٧١٤

دوسری بات یہ سامنے آئی کہ حضور اقدس ﷺ نے صرف انہیں معتکف ہی سے رخصت کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ ان کو پہنچانے کے لئے مسجد کے دروازے تک تشریف لائے، ان کا اکرام کیا۔ اس عمل سے حضور اقدس ﷺ نے یہ تعلیم دے دی کہ بیوی کے ساتھ ایسا معاملہ اور سلوک کرنا چاہئے جو برابری کی بنیاد کا ہو، اس کا اکرام کرنا اس کا حق ہے، جب وہ تم سے ملنے کے لئے آئی ہے، اور اب تم اس کو پہنچانے کے لئے جا رہے ہو تو یہ پہنچانا بھی اس کے حقوق میں داخل ہے۔

دوسروں کے خدشات کو وضاحت کر کے دور کر دینا چاہئے

بہر حال، جب حضور اقدس ﷺ ان کو پہنچانے کے لئے دروازے کی طرف جانے لگے تو آپ نے دیکھا کہ دو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے پاس ملنے کے لئے وہاں آ رہے ہیں۔ آپ نے سوچا کہ کہیں ان دونوں حضرات کے قریب آنے سے ام المؤمنین کی بے پردگی نہ ہو، اس لئے آپ نے ان دونوں حضرات سے فرمایا کہ ذرا وہیں ٹھہر جاؤ۔ یہ حکم اس لئے دیا تا کہ جب حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا پردے کے ساتھ اپنے گھر واپس چلی جائیں تو پھر ان حضرات کو بلا لیا جائے۔ چنانچہ ام المؤمنین حضرت صفیہ وہاں سے گزر کر اپنے گھر تشریف لے گئیں، پھر آپ نے ان دو حضرات سے فرمایا کہ اب آپ تشریف لے آئیں۔ جب وہ آ گئے تو آپ نے ان دنوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ خاتون حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا تھیں یعنی میری بیوی تھیں۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے ان سے فرمایا کہ یہ صراحت میں نے اس لئے کر دی کہ کہیں شیطان تمہارے دل میں کوئی برائی نہ ڈال دے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جب ان حضرات نے یہ دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ کسی خاتون کے ساتھ مسجد نبوی میں جا رہے ہیں، تو کہیں ان حضرات کے دل میں یہ وسوسہ نہ آ جائے کہ یہ خاتون کون تھیں؟ اور حضور اقدس ﷺ نے وضاحت سے فرما دیا کہ یہ "صفیہ" تھیں، جو میری بیوی ہیں۔ یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں موجود ہے۔(۱)

اپنے کو مواقع تہمت سے بچاؤ

اس حدیث کی تشریح میں علماء کرام نے فرمایا کہ کیا کوئی شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ کسی صحابی کے دل میں حضور اقدس ﷺ کی طرف سے اس قسم کا کوئی غلط خیال آئے گا کہ آپ اس طرح کسی نامحرم

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاعتکاف، باب هل يخرج المعتكف لحوائجه إلى باب المسجد، رقم: ۱۸۹٤، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب بيان انه يستحب لمن رئي خاليا بامرأة وكانت زوجته، رقم: ٤٠٤١، سنن الدارمی، کتاب الصوم، باب اعتکاف النبی، رقم: ۱۷۱٤

خاتون کے ساتھ تشریف لے جا رہے ہوں گے؟ اور پھر رمضان کا مہینہ، اور رمضان کا بھی عشرہ اخیرہ، اور پھر جگہ بھی مسجد نبوی، اور پھر اعتکاف کی حالت۔ کسی عام مسلمان کے بارے میں بھی یہ خیال آنا مشکل ہے، چہ جائیکہ حضور اقدس ﷺ کے بارے میں۔

لیکن آپ ﷺ نے اس واقعہ کے ذریعہ اُمت کو یہ تعلیم دے دی کہ اپنے آپ کو تہمت کے مواقع سے بچاؤ، اگر کسی موقع پر اس بات کا اندیشہ ہو کہ کہیں کوئی تہمت نہ لگ جائے، یا کسی کے دل میں میرے بارے میں غلط خیال نہ آ جائے تو ایسے مواقع سے بھی اپنے آپ کو بچاؤ۔ حدیث کے طور پر ایک جملہ نقل کیا جاتا ہے اور حضور اقدس ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے:

((اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التُّهَمِ))(۱)

"تہمت کے مواقع سے بچو"

اگرچہ اس جملہ کی نسبت آپ ﷺ کی طرف صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، لیکن اس جملہ کی اصل یہ واقعہ ہے۔ لہٰذا جس طرح انسان کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ وہ گناہ سے بچے ناجائز کاموں سے بچے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہ کی تہمت سے بھی بچائے، ناجائز کام کی تہمت سے بچائے، کوئی ایسا کام نہ کرے جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال ہو کہ شاید یہ فلاں گناہ کے کام میں مبتلا ہے۔

مواقع تہمت سے بچنے کے دو فائدے

تہمت کے مواقع سے اپنے آپ کو بچانے کے دو فائدے ہیں:

ایک فائدہ تو یہ ہے کہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں بدگمان کیوں کیا جائے؟ کیونکہ جس طرح دوسروں کا حق ہے، اپنے نفس کا بھی حق ہے۔ اور نفس کا حق یہ ہے کہ اس کو بلاوجہ ذلیل نہ کیا جائے، بلاوجہ اس کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں بدگمانی نہ پیدا کی جائے۔

دوسرا فائدہ دیکھنے والے شخص کا ہے، اس لئے جو شخص تمہیں دیکھ کر بدگمانی میں مبتلا ہوگا، اور تحقیق کے بغیر تمہارے بارے میں بدگمانی کرے گا تو وہ بدگمانی کے گناہ میں مبتلا ہوگا، لہٰذا اس کو گناہ میں کیوں مبتلا کرتے ہو؟ بہر حال ایسا کام کرنا جس سے خواہ مخواہ لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوں، یہ درست نہیں۔

---

(۱) کشف الخفاء، رقم: ۵۳۵ (۱/۳۳٦)، الجامع الکبیر للسیوطی، رقم: ۵۳۳ (۱/۸۱۷)

گناہ کے موقع سے بھی بچنا چاہئے

گناہ کے جو مواقع ہوتے ہیں وہاں جا کر آپ چاہے گناہ نہ کریں لیکن گناہ کے ان مواقع کے پاس سے گزرنا اور اس طرح گزرنا کہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ یہ شخص بھی اس گناہ میں مبتلا ہوگا، یہ بھی درست نہیں۔ مثلاً کوئی سینما ہال ہے، اب آپ اس سینما ہال کے اندر سے یہ سوچ کر گزر گئے کہ چلو یہ راستہ مختصر ہے، یہاں سے نکل جائیں۔ اب آپ نے وہاں نہ تو کسی تصویر کو دیکھا اور نہ کوئی اور گناہ کیا، لیکن جو شخص بھی آپ کو گزرتے ہوئے دیکھے گا تو وہ یہی سمجھے گا کہ آپ سینما دیکھنے آئے ہوں گے، اس لئے کہ آپ نے ایسا کام کر لیا جس کی وجہ سے خواہ مخواہ آپ پر تہمت لگ گئی اور شبہ پیدا ہو گیا، ایسا کام کرنا بھی درست نہیں۔ اور اگر کبھی ایسی نوبت آجائے جس سے شبہ پیدا ہو تو وضاحت کر کے بتا دینا چاہئے کہ میں یہاں فلاں مقصد سے آیا تھا۔ جیسا کہ حضور اقدس ﷺ نے بتا دیا کہ یہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

حضور ﷺ کی سنت

یہ بڑا نازک معاملہ ہے، ایک طرف تو اپنے آپ کو جان بوجھ کر "متقی" ظاہر کرنا، یہ بھی شرعاً پسندیدہ نہیں۔ دوسری طرف بلا وجہ اپنے آپ کو گناہ گار ظاہر کرنا، یہ بھی نہیں، اور نہ یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے، بلکہ آپ کی سنت یہ ہے کہ اپنے آپ کو تہمت سے بچاؤ۔

"ملامتی" فرقہ کا اندازِ زندگی

ایک فرقہ گزرا ہے جو اپنے آپ کو "ملامتی" کہتا تھا، اور پھر اسی "ملامتی فرقہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ فرقہ اپنی ظاہری حالت گناہ گاروں، فاسقوں اور فاجروں جیسی رکھتا تھا، مثلاً وہ نہ تو مسجد میں جا کر نماز پڑھتے تھے، اور نہ ہی کسی کے سامنے ذکر و عبادت کرتے تھے، اپنا حلیہ بھی فاسقوں جیسا بناتے تھے، ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اپنا حلیہ اس لئے ایسا بنا دیتے ہیں تاکہ ریاکاری نہ ہو جائے، دکھاوا نہ ہو جائے۔ اگر ہم ڈاڑھی رکھیں گے اور مسجد میں جا کر صف اول میں نماز پڑھیں گے تو لوگ سمجھیں گے ہم بزرگ آدمی ہیں، لوگ ہماری عزت کریں گے، اور اس سے ہمارا دل خراب ہوگا، اور اس کے نتیجے میں ہمارے دلوں میں تکبر پیدا ہوگا، اس لئے ہم مسجد میں نماز نہیں پڑھتے۔ یہ "ملامتی فرقہ" کہلاتا تھا۔ یہ نام اس لئے پڑ گیا کہ یہ لوگ اپنی ظاہری حالت ایسی بناتے تھے کہ دوسرے لوگ ان پر ملامت کریں کہ یہ کیسے خراب لوگ ہیں۔ لیکن ان کا یہ طرز عمل اور طریقہ سنت کا طریقہ اور شریعت کا طریقہ نہیں تھا، اور نہ ہی یہ ہمارے بزرگان دین کا صحیح طریقہ تھا۔

ایک گناہ سے بچنے کے لئے دوسرا گناہ کرنا

یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ غلبہ حال میں ایسا طرز اختیار کر گیا ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معزز ہو گا، لیکن اس کا یہ طرز عمل قابل تقلید نہیں، کیونکہ یہ طرز عمل شرعاً درست نہیں۔ کیا آدمی اپنے آپ کو ریاکاری اور تکبر سے بچانے کے لئے ایک دوسرے گناہ کا ارتکاب کرے؟ ریاکاری ایک گناہ ہے اور اس سے بچنے کے لئے ایک دوسرے گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے کہ مسجد میں نماز نہیں پڑھ رہا ہے۔ شرعاً یہ بالکل درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حرام کر دیا، بس وہ حرام ہو گئی۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں مسجد میں جا کر نماز نہیں پڑھتا، بلکہ گھر میں نماز پڑھتا ہوں، اس لئے کہ اگر مسجد میں صف اول میں نماز پڑھوں گا تو یہ دکھاوا ہو جائے گا، سب لوگ دیکھیں گے کہ یہ شخص صف اول میں نماز پڑھ رہا ہے۔ چنانچہ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے ذہنوں میں یہ خیال آتا ہے۔

نماز مسجد میں ہی پڑھنی چاہئے

یاد رکھئے! یہ سب شیطان کا دھوکہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ مسجد میں آکر نماز پڑھو، تو بس اب مسجد میں ہی آ کر نماز پڑھنا ضروری ہے، اور یہ خیال کہ یہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنے سے ریاکاری اور دکھاوا ہو جائے گا، یہ سب شیطان کا دھوکہ ہے۔ اس خیال پر ہرگز عمل مت کرو اور مسجد میں آکر نماز پڑھو۔ اور اگر ریاکاری کا خیال آئے تو استغفار کر لو:

"أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ"

فرائض کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ ان کو علانیہ ادا کیا جائے البتہ نوافل گھر میں پڑھنے کی اجازت ہے۔ لیکن جہاں تک فرائض کا تعلق ہے تو مردوں کو چاہئے کہ وہ مسجد میں جا کر جماعت سے ادا کریں۔ اور اس "ملامتی فرقہ" کی جو بات بیان کی، اس کا شریعت سے اور قرآن و سنت سے کوئی تعلق نہیں اور شرعاً وہ طریقہ جائز نہیں۔ صحیح طریقہ وہ ہے جو حضور اقدس ﷺ نے بیان فرمایا، وہ یہ کہ "تہمت" کے مواقع سے بھی بچو۔

اپنا عذر ظاہر کر دیں

فرض کریں کہ آپ کسی شرعی عذر کی وجہ سے مسجد میں جماعت سے نماز نہیں پڑھ سکے، اس وقت آپ کے پاس کوئی مہمان ملنے آ گیا، اور آپ کو خیال آیا کہ چونکہ اس مہمان نے یہ دیکھ لیا ہے کہ میں مسجد میں شریک نہیں تھا، تو یہ مہمان میرے بارے میں یہ سمجھے گا کہ میں جماعت سے نماز نہیں پڑھتا، تو

اس وقت اگر آپ اس مہمان کے سامنے جماعت سے نماز نہ پڑھنے کا عذر واضح کر کے بتادیں کہ فلاں عذر کی وجہ سے میں جماعت میں پہنچ نہیں سکا تھا، تو کوئی گناہ کی بات نہیں، بلکہ یہ موضع تہمت اس وقت سکتی تھی کہ شاید یہ جان بوجھ کر جماعت کی نماز چھوڑ رہا ہے، اب آپ نے عذر بیان کر کے اس کا دل صاف کر دیا۔ اس میں نہ ریا کاری ہے اور نہ دکھاوا ہے، بلکہ یہ تہمت سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔

اس حدیث کی تشریح حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ ایسے شبہات کے مواقع سے بچنا چاہئے جن کی ظاہری صورت بعض منکرات کے مشابہ ہو۔ یعنی ظاہری طور پر ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس نے کسی گناہ کا دونوں صورتا مشابہ ہیں، ایسے مواقع پر احتیاط و مدافعت ضروری ہے باقی جو امور ایسے نہ ہوں، ان کی فکر میں پڑنا یہ خوف ملامت ہے جس کے ترک پر مدح کی گئی ہے۔

یعنی ظاہری اعتبار سے جو گناہ معلوم ہو رہے ہوں، ان کے شبہ سے اپنے آپ کو بچانا تو ضروری ہے، لیکن آدمی اپنے آپ کو ایسی باتوں سے مبرا ظاہر کرنے کی کوشش کرے جو فی نفسہ درست ہیں، اور لوگوں کی ملامت کے خوف سے ان کی تاویل و توجیہ کرے تو یہ بات پسندیدہ نہیں۔

کسی نیک کام کی تاویل کی ضرورت نہیں

مثلاً کسی شخص نے سنت کا کوئی کام کیا، لیکن وہ سنت کا کام ایسا ہے جس کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے جیسے کسی نے داڑھی رکھ لی، اور لوگ اس کو پسند نہیں کرتے، اب یہ شخص اس کی تاویل کرتا پھر رہا ہے تاکہ لوگ اس کو ملامت نہ کریں اور اس کی برائی نہ کریں۔

یاد رکھئے! اس کی چنداں ضرورت نہیں، اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے ایک سنت کا کام کیا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں یہ کام کیا ہے تو اب لوگ تمہیں اچھا سمجھیں یا برا سمجھیں، لوگ تمہیں اس کام پر ملامت کریں یا تمہاری تعریف کریں، ان سب سے بے نیاز ہو کر تم اپنا کام کئے جاؤ، اگر وہ ملامت کرتے ہیں تو کرنے دو۔ وہ ملامت ایک مسلمان کے گلے کا ہار ہے، وہ اس کے لئے زینت ہے۔ اگر کوئی شخص اتباع سنت کی وجہ سے تمہیں ملامت کر رہا ہے، دین پر چلنے اور اللہ کا حکم کی اتباع کی وجہ سے ملامت کر رہا ہے، تو وہ ملامت قابل مبارک باد ہے، یہ انبیاء علیہم السلام کا ورثہ ہے جو تمہیں مل رہا ہے، اس سے مت گھبراؤ، اور اس کی وجہ سے اپنی براءت ظاہر مت کرو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ نکلا اپنے آپ کو کسی گناہ کے شبہ سے بچانے کے لئے کسی دوسرے پر کوئی بات ظاہر کر دینا کہ یہ بات اصل میں ایسی تھی، یہ عمل صرف یہ کہ ناجائز نہیں بلکہ یہ عمل پسندیدہ ہے، تاکہ اس کے دل میں تمہاری طرف سے بدگمانی پیدا نہ ہو۔ اس لئے کہ دوسرے کو بدگمانی سے بچانا بھی ایک مسلمان کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اور اپنی رحمت سے حضور اقدس ﷺ کے ان ارشادات پر پوری طرح عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

صحت اور فرصت کی قدر کرلو ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ))(۱)

''دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں لوگ دھوکے کا شکار ہیں ایک صحت اور دوسری فراغت''

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! حدیث کی کتابوں میں ایک مستقل کتاب "کتاب الرقاق" کے نام سے محدثین قائم فرماتے ہیں، اور اس باب میں وہ احادیث لاتے ہیں جو انسان کے دل میں نرمی اور رقت پیدا کرتی ہیں، اور آخرت کی فکر پیدا کرتی ہیں، دنیا سے بے رغبتی اور زہد پیدا کرتی ہیں، ایسی احادیث کو ''رقاق'' کہا جاتا ہے۔

بعض محدثین نے تو اس موضوع کی احادیث پر مستقل کتاب مرتب کر دی ہے، جیسے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے " کتاب الزھد والرقاق "حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب الزھد" ہے، حضرت وکیع بن جراح رحمۃ اللہ علیہ کی " کتاب الزھد" ہے۔ اس موضوع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی عجیب احادیث ہیں جن کے الفاظ تو مختصر ہیں، لیکن وہ احادیث معنی کے اعتبار سے بڑی جامع ہیں، اگر آدمی ان پر غور کرے تو وہ احادیث انسان کی اصلاح کے لئے بے نظیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان احادیث کو سمجھنے اور ان کی قدر کرنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/ ۲۸ تا ۴۴) جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح البخاری، كتاب الرقاق، باب لاعيش الاعيش الآخرة، رقم: ۵۹۳۳، سنن الترمذی، كتاب الزهد عن رسول الله، باب الصحة والفراغ مغبون فيهما كثير من الناس، رقم: ٢٢٢٦، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الحكمة، رقم: ٤١٦٠، مسند أحمد، رقم: ٢٢٢٤، سنن الدارمی، كتاب الرقاق، باب فی الصحة و الفراغ، رقم: ٢٥٩١

اس وقت میں نے انہی احادیث میں سے ایک حدیث آپ کے سامنے تلاوت کی، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "صحیح البخاری" میں "کتاب الرقاق" کو اسی حدیث سے شروع فرمایا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج اور اسلوب بڑا عجیب وغریب ہے، جب وہ کسی کتاب میں کوئی باب قائم کرتے ہیں، اور پھر اس کے تحت جو حدیث لاتے ہیں وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوتا ہے "کتاب الرقاق" میں سب سے پہلے اس حدیث کو لا کر گویا انہوں نے اس بات کا اظہار فرمایا ہے کہ اس موضوع پر جو احادیث ہیں، ان میں یہ حدیث "اصل" کی حیثیت رکھتی ہے، اور یہ حدیث دوسری احادیث کے لئے "جڑ" اور "بنیاد" ہے، اور واقعتاً اس حدیث میں بڑی عجیب وغریب ہدایت ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حدیث بالا

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث بکثرت یاد دلایا کرتے تھے، اور بے شمار مرتبہ اس حدیث پر بیان بھی فرمایا، بلکہ جب آپ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد پہلی مرتبہ دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، تو دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور طلباء نے درخواست کی کہ کچھ بیان فرمائیں۔ اس موقع پر آپ نے ان کے سامنے جو بیان فرمایا، اس میں فرمایا کہ آپ حضرات شاید اس انتظار میں ہوں گے کہ میں یہاں کوئی علمی تقریر کروں گا، یا دارالعلوم دیوبند میں کسی پیچیدہ مسئلہ پر بیان کروں گا لیکن بات یہ ہے یہ علمی گناہ میں پہلے یہاں دارالعلوم دیوبند میں بہت کر چکا ہوں، لہٰذا میں اس کے بجائے کوئی خشک بات کہنا چاہتا ہوں، اور پھر آپ نے یہی حدیث پڑھی اور اس کی تشریح فرمائی۔

بہرحال اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ))

اللہ جل شانہ کی دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں لوگ بڑے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ جب یہ نعمت ہمیں حاصل ہے تو اب ہمیشہ ہمارے پاس رہے گی، ایک "صحت" کی نعمت اور دوسرے "فراغت" کی نعمت۔ ان دو نعمتوں کے بارے میں لوگ بکثرت دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔

ہر نعمت پر تین حق

انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہر آن ہر لمحہ بارش کی طرح برس رہی ہیں، انسان ان نعمتوں کو شمار بھی نہیں کر سکتا، اور ہر نعمت کا حق یہ ہے کہ اس کی قدر پہچانی جائے، اس پر شکر ادا کیا

جائے، اور اس کا صحیح استعمال کیا جائے، ہر نعمت پر یہ تین حق ہیں، اگر انسان ہر نعمت پر یہ تین حقوق ادا کرنے لگے تو اس کا بیڑا پار ہو جائے، حضور اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ انسان ان کے بارے میں دھوکے میں پڑا ہوا ہے، وہ نعمتیں ہیں ''صحت'' اور ''فراغت''

انسان اس دھوکہ میں پڑا ہوا ہے کہ یہ صحت اس وقت جو مجھے حاصل ہے، وہ رہے گی، آج میں تندرست ہوں تو کل بھی رہوں گا، اور پرسوں بھی رہوں گا، اس دھوکے کے نتیجے میں صحت کے دن گزرتے چلے جاتے ہیں اور انسان اپنے نیک کاموں کو ٹالتا رہتا ہے، یہی معاملہ ''فراغت'' کا ہے کہ انسان کو اس وقت فراغت میسر ہے، اور وقت خالی ہے، اب وہ یہ سوچتا ہے کہ میں فارغ ہی رہوں گا، لہٰذا وہ نیک کاموں کو ٹالتا رہتا ہے۔

صحت اور فراغت کی قدر کرلو

یہاں تک کہ وہ ''صحت'' جس کی بنیاد پر نیک کاموں کو ٹال رہا تھا کہ آج نہیں کل کروں گا، پرسوں کروں گا وہ صحت ڈھل جاتی ہے، اور انسان پر بیماری آجاتی ہے، اور پھر کام کرنے کا موقع نہیں رہتا۔ فراغت میں بھی کاموں کو ٹالتا رہا ہے کہ ابھی جلدی کیا ہے، کل کرلیں گے، پرسوں کرلیں گے، یہاں تک کہ فراغت ختم ہو جاتی ہے، اور مشغولیت آجاتی ہے، اور پھر وقت نہیں ملتا، اسی لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے بندو! صحت کی جو نعمت ہے، اس کی قدر پہچانو، اور اس کو صحیح مصرف میں خرچ کرلو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فراغت کی نعمت دی ہے، اس کی قدر پہچان لو، اس کو کسی صحیح مصرف پر خرچ کرلو، تو دھوکے سے بچ جاؤ گے۔ ورنہ یہ ہوتا ہے کہ نیک کاموں کو ٹالتے ٹالتے آدمی بیمار پڑ جاتا ہے، اور پھر دنیا سے جانے کا وقت آجاتا ہے، اس وقت یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش اپنی جوانی کی حالت میں اور اپنی صحت کی حالت میں اپنی فراغت کی حالت میں کچھ کام کرلیا ہوتا، اور آخرت کے لئے کوئی پونجی جمع کرلی ہوتی۔

شیطان کے بہکانے کا انداز

دیکھئے! جو آدمی صاحب ایمان ہوتا ہے، اس کو شیطان براہ راست اس طرح نہیں بہکاتا کہ تو بے ایمان ہو جا، یا تو نماز چھوڑ دے، یا روزہ چھوڑ دے۔ ایک صاحب ایمان کو اس طرح نہیں بہکاتا، کیوں؟ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ صاحب ایمان ہے، اگر اس سے یوں کہا جائے گا کہ تو بے ایمان ہو جا، یا تو نماز چھوڑ دے، یا روزہ چھوڑ دے تو وہ کبھی بھی اس کی یہ بات نہیں مانے گا۔ اس لئے شیطان صاحب ایمان پر دوسرے حربے آزماتا ہے، وہ اس طرح کہ صاحب ایمان نے یہ سنا کہ فلاں

نیک کام ہے اس کو کرنا چاہئے، اب شیطان اس کو بہکاتا ہے کہ ہاں یہ نیک کام ضرور کرنا چاہئے، لیکن جلدی کیا ہے؟ آج ذرا مصروفیت ہے، فلاں فلاں کام کرنے ہیں، کل سے یہ کام شروع کریں گے، جب کل آ جائے گی تو شیطان یہ بہکائے گا کہ آج تو فلاں عذر پیش آ گیا، فلاں کام پیش آ گیا، کل سے شروع کریں گے، کل کل کرتے اس نیک کام کو ٹالتا جائے گا، اور وہ کل کبھی نہیں آ گے گی۔ یہ ہے شیطان کا حربہ جو صاحب ایمان پر آزماتا ہے۔

نوافل اللہ کی محبت کا حق ہے

دل میں یہ خیال اور فکر تو ہے کہ اپنی نیکیوں میں اضافہ کیا جائے، جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری ہو، اور نیکیوں کا حساب و کتاب ہو تو ہماری نیکیوں کا پلہ جھک جائے، یہ خیال اور فکر تو ہے، لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو اس وقت ٹالنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، مثلاً یہ تو معلوم ہے کہ جس طرح فرائض و واجبات اللہ تعالیٰ کی عظمت کا حق ہیں، اسی طرح نوافل بھی اللہ تعالیٰ کی محبت کا حق ہیں، اس لئے بندہ کچھ نوافل بھی ادا کرے، کچھ ذکر کرے، تسبیحات پڑھے، دعائیں کرے، اور جب تک انسان نوافل ادا نہیں کرتا، عام طور پر اس وقت تک فرائض و واجبات میں بھی استقامت پیدا نہیں ہوتی۔ یا مثلاً تہجد کی نماز ہے، آدمی روزانہ سوچتا ہے کہ تہجد کی نماز پڑھنی چاہئے، اب شیطان اس کو یہ نہیں کہے گا کہ تہجد مت پڑھنا، اس سے تمہاری نیند خراب ہوگی، بلکہ اس طرح بہکائے گا کہ ہاں تہجد پڑھنا بڑی اچھی بات ہے لیکن انشاء اللہ کل سے شروع کریں گے، اور کل الارم لگا کر سوئیں گے، جب کل آئی تو کوئی اور عذر کر دیا کہ آج تو نیند کا غلبہ ہے، کل سے شروع کریں گے، اس طرح وہ ٹالتا رہے گا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "صحت" کی جو نعمت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے، جس میں وہ تہجد کی نماز پڑھ سکتا تھا، وہ نعمت اسی ٹالنے میں برباد ہو رہی ہے۔

جنت اور مغفرت کی طرف دوڑو

یا آج فراغت حاصل ہے، تہجد پڑھنے کے لئے وقت نکال سکتا ہے، لیکن اس کو ٹال کر وقت برباد کر رہا ہے۔ اس حدیث کا پیغام یہ ہے کہ جب بھی کسی نیک کام کا موقع ملے، یا نیک کام کا خیال آئے تو پھر اس کو انجام دینے میں دیر مت کرو، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾(۱)

---

(۱) ال عمران: ۱۳۳

''اپنے پروردگار کی مغفرت حاصل کرنے کی طرف تیزی سے دوڑو، اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے''

بلکہ اس آیت کا یہ ترجمہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر کرو، اور اس مغفرت اور جنت کی طرف جانے کے لئے ریس لگاؤ۔

نیک کام کو ٹالو نہیں

شیطان کا کام ہے ''ٹالنا'' اور پیغمبر کا کہنا ہے کہ جس نیک کام کے کرنے کا خیال اور موقع آیا ہے، اس کو ٹالو نہیں، بلکہ اسی وقت کر گزرو، اگر اس کو کل پر ٹالو گے تو پتہ نہیں کل موقع رہے یا نہ رہے، کل کو وقت ملے یا نہ ملے، کل کو یہ جذبہ موجود رہے یا نہ رہے، کچھ پتہ نہیں۔

نیک کام کا خیال ''اللہ کا مہمان'' ہے

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو نیک کام کرنے کا خیال دل میں آتا ہے کہ فلاں نیک کام کرلوں، اس کو صوفیاء کی اصطلاح میں ''وارد'' کہتے ہیں، یعنی دل میں یہ بات وارد ہوئی کہ میں فلاں کام کرلوں، نماز پڑھ لوں، تہجد پڑھ لوں، اوابین پڑھ لوں، اشرق پڑھ لوں، چاشت پڑھ لوں، اس قسم کے خیال کو ''وارد'' کہتے ہیں۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یہ ''وارد'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہمان ہوتا ہے، اگر تم نے اس کی تھوڑی سی قدر کرلی، خاطر مدارت کرلی تو یہ مہمان پھر آئے گا۔ خاطر مدارت اس طرح کی کہ جس نیکی کا خیال دل میں آیا تھا، اس پر عمل بھی کرلیا تو یہ مہمان دوبارہ آئے گا، اور تمہیں کسی دوسرے نیک کام کی دعوت دے گا، اور اگر تم نے اس کی خاطر مدارت نہیں کی تو چونکہ یہ مہمان بڑا غیرت مند ہے، اور بڑا غیور مہمان ہے، اگر تم نے ایک مرتبہ اس کی خاطر مدارت نہیں کی تو یہ مہمان تمہارے پاس آنا چھوڑ دے گا۔ اور اس وقت سے پناہ مانگو جب یہ مہمان آنا چھوڑ دے، اور ''مہمان آنا چھوڑ دے'' کے معنی یہ ہیں کہ اب دل میں نیکی کا خیال ہی نہیں آرہا ہے، اس وقت سے اللہ تعالیٰ بچائے، اور اب دل پر مہر لگ گئی، اور دل پر زنگ لگ گیا، اب نیک کام کرنے کا خیال ہی دل میں نہیں آتا۔

گناہ چھوڑنے کا کام مت ٹالو

بہر حال! اپنی اصلاح کو کس بات پر ٹال رہے ہو؟ گناہ چھوڑنے کو کس وجہ سے ٹال رہے ہو؟ مثلاً کوئی مسلمان صاحب ایمان کسی گناہ کے اندر مبتلا ہے، اور کسی گناہ کا عادی بن گیا ہے، تو اب

صاحب ایمان ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ یہ گناہ مجھے چھوڑنا چاہئے، اب شیطان اس کو اس طرح نہیں بہکائے گا کہ یہ تم بڑا اچھا کام رہے ہو، لہٰذا اس کو کیے جاؤ، اس لئے کہ شیطان جانتا ہے کہ یہ شخص صاحب ایمان ہے اور یہ میری بات نہیں مانے گا، بلکہ شیطان اس سے کہے گا کہ یہ کام تو بہت خراب ہے، اور اس کام کو چھوڑنا ہے، لیکن ایک مرتبہ کرلو، پھر چھوڑ دینا۔ جب ایک مرتبہ وہ گناہ کرلیا تو پھر کہے گا کہ ایک مرتبہ اور سہی پھر چھوڑ دینا، اس طرح وہ انسان کو گناہ کے اندر لگائے رکھتا ہے، اور اس کو نجات نصیب نہیں ہوتی۔

گناہوں سے نجات کا یہ طریقہ نہیں

گناہوں سے نجات کا یہ راستہ نہیں کہ آدمی یہ سوچے کہ میں ایک مرتبہ اور یہ گناہ کرلوں، پھر چھوڑ دوں گا، بلکہ گناہوں سے نجات کا راستہ یہ ہے کہ آدمی آج ہی سے وہ گناہ چھوڑ دے، اپنے دل پر چوٹ لگا کر اپنے آپ کو گناہوں سے فارغ کرو، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ شیطان کا ایک بڑا دھوکہ جس میں وہ اچھوں اچھوں کو مبتلا کردیتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے کہ چلو یار یہ گناہ کرہی لو، تاکہ دل میں اس کی حسرت باقی نہ رہے، بلکہ ایک ہی مرتبہ پھر اس دل سے نکل جائے، ورنہ کل کو دل میں یہ حسرت رہے گی کہ تم نے یہ کام نہیں کیا تھا۔ اس لئے ایک مرتبہ یہ گناہ کرگزرو، پھر توبہ کرلینا، استغفار کرلینا، اللہ تعالیٰ کے یہاں توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اس طرح شیطان اس کو بہکاتا ہے، اور وہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کر بیٹھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے۔

گناہ کرنے سے تسکین حاصل نہیں ہوتی

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شیطان کا انتہائی فتنہ انگیز حربہ ہے، اس لئے کہ وہ شخص جب ایک مرتبہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کرگزرا تو اب آسانی سے وہ گناہ نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے کہ اب تک اس کو گناہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہورہا تھا، جب ایک مرتبہ گناہ کرلیا تو اس کے اندر اب حوصلہ پیدا ہوگیا، اور جب حوصلہ پیدا ہوگیا تو اب اس گناہ کی خواہش میں اور زیادہ اضافہ ہوگا۔ کیونکہ گناہ کی خاصیت یہ ہے کہ یہ انسان کو کبھی بھی تسکین نہیں بخشتا، یہ نہیں ہوتا کہ ایک مرتبہ گناہ کرکے فارغ ہوگئے اور اب دل بھر گیا۔ گناہ کی مثال تو خارش کی سی ہے کہ کھجاتے رہو، اور مزہ لیتے رہو، لیکن کھجانے کے نتیجے میں کبھی بھی تسکین نہیں ہوگی، بلکہ بیماری اور بڑھتی چلی جائے گی۔ یہی گناہ کی خاصیت ہے، اس سے کبھی بھی تسکین نہیں ہوسکتی، جب ایک مرتبہ گناہ کرے گا تو پھر خواہش اور زیادہ بھڑکے گی، پھر گناہ کرے گا تو اور بھڑکے گی، پھر گناہ کرے گا تو اور بھڑکے گی، یہ سوچنا کہ ایک

مرتبہ گناہ کر کے جی بھر لوں گا، یہ شیطان کا زبردست دھوکہ ہے، جب تک انسان اس کے اندر مبتلا رہے گا، کبھی بھی اس کو گناہ چھوڑنے کی توفیق نہیں ہوگی۔

توبہ کے بھروسہ پر گناہ کر لینا حماقت ہے

شیطان یہ جو دھوکہ دیتا ہے کہ گناہ کر لے، پھر توبہ کر لینا، ارے اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ توبہ کا موقع ملے گا، اور توبہ کی توفیق ہوگی یا نہیں؟ کیا کسی نے ضمانت دے دی ہے کہ مرنے سے پہلے توبہ کا موقع مل جائے گا؟ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ توبہ کے بھروسے پر گناہ کر لینا ایسا ہی ہے جیسے عمل کے بھروسے پر بچھو سے کٹوا لینا، اور اس پر اپنا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ دارالعلوم کے قیام کے زمانے میں، میں نے بچھو کے ڈسے کا عمل سیکھا تھا، اور بڑا مجرب عمل تھا، چنانچہ دیو بند کے پورے قصبے میں یہ بات سب کو معلوم تھی، جب بھی کسی کو بچھو ڈس لیتا تو اس کو فوراً میرے پاس لاتے، میں عمل پڑھ کر دم کر دیتا، فوراً زہر اتر جاتا۔

ایک نصیحت آموز واقعہ

ایک مرتبہ رات کو میری والدہ کو اسٹور سے کچھ نکالنے کے لئے وہاں جانے کی ضرورت پیش آئی، اسٹور میں اندھیرا تھا، گھر میں ایک لالٹین تھی، اور میں اس وقت لالٹین کی روشنی میں کچھ لکھنے کا کام کر رہا تھا، میری والدہ نے کہا میں اسٹور میں جانا چاہتی ہوں، اور وہاں اندھیرا ہے، ذرا ایک منٹ کے لئے لالٹین مجھے دے دیں تو میں اپنا کام کر لوں، والد صاحب کو اپنے لکھنے کے کام میں خلل ڈالنا دشوار ہو رہا تھا، اس لئے والد صاحب نے کہا کہ ویسے ہی چلی جاؤ، وہ چیز اسٹور کے اندر سامنے ہی رکھی ہے، اٹھا لو، والدہ صاحبہ نے کہا کہ وہاں تو بچھو ہوتے ہیں، اگر بچھو نے کاٹ لیا تو؟ والد صاحب فرماتے ہیں کہ اس وقت میرے منہ سے نکل گیا کہ اگر بچھو نے کاٹ بھی لیا تو تمہارا کیا بگاڑ لے گا؟ مطلب یہ تھا کہ میرے پاس تو ایسا عمل موجود ہے جس سے بچھو کے کاٹنے کا سارا اثر ختم ہو جاتا ہے، لہٰذا تمہارا کیا نقصان کرے گا اگر بچھو نے کاٹ بھی لیا۔ اب والدہ صاحبہ بغیر لالٹین کے چلی گئیں، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ والدہ کے اسٹور میں قدم رکھتے ہی بچھو نے کاٹ لیا۔ اب والد صاحب کے پاس آئیں تو والد صاحب نے اپنا ہی عمل شروع کیا، فرماتے ہیں کہ میں عمل کر کر کے تھک گیا، لیکن بچھو کا زہر اُترنے کا نام نہیں لے رہا۔ زہر اتارنے کے جتنے طریقے تھے، جو سینکڑوں مرتبہ کے آزمائے ہوئے تھے، وہ سب طریقے آزمائے، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

اس واقعہ سے تین سبق

فرمایا کہ اس واقعہ سے تین سبق ملے، ایک یہ کہ انسان کو کوئی بڑا بول منہ سے نہیں نکالنا چاہئے، اور میرے منہ سے یہ بڑا بول نکل گیا تھا کہ اگر بچھو نے کاٹ بھی لیا تو تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔ دوسرا سبق یہ ملا کہ کسی عمل میں کسی، دوا میں، کسی وظیفے میں، کسی تریاق میں کچھ نہیں رکھا، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہ ہو، شفا انہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے صحت انہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ تیسرا یہ سبق یہ ملا کہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کر لینا ایسا ہی ہے جیسے عمل کے بھروسے پر بچھو سے کٹوا لینا، جیسے وہ حماقت اور بے وقوفی تھی، ایسے ہی یہ بھی حماقت اور بے وقوفی ہے، کیا معلوم کہ گناہ کے بعد توبہ کی توفیق ہو یا نہ ہو، توبہ کے لئے وقت ملے یا نہ ملے، اس لئے کہ توبہ کی توفیق بھی اللہ کی عطا ہے ان کی عطا کے بغیر توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ اور پھر جو آدمی اتنی جرات کر رہا ہو کہ گناہ کر کے توبہ کر لوں گا، کچھ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے توبہ کی توفیق ہی سلب کر لیں، اللہ تعالیٰ اس سے حفاظت فرمائے۔

جب ہاتھ پاؤں حرکت کرنا چھوڑ دیں گے

بہر حال! وقت گزر رہا ہے، اور انسان دھوکہ میں پڑا ہوا ہے، نبی کریم ﷺ کی اس حدیث کا حاصل یہ نکلا کہ صحت کے جو لمحات اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے ہوئے ہیں، ان کو غنیمت سمجھو، اور اسی طرح فراغت کے جو لمحات اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے ہوئے ہیں، ان کو غنیمت سمجھو، ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے:

ابھی تو ان کی آہٹ پر میں آنکھیں کھول دیتا ہوں
وہ کیسا وقت ہوگا، جب نہ ہوگا یہ بھی امکاں میں

ابھی تو ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں، اس وقت اگر کچھ کر لو گے تو نیکیوں کا سرمایہ جمع ہو جائے گا، لیکن ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب نہ ہاتھ چلیں گے، اور نہ پاؤں چلیں گے، کوئی شخص بھی اس وقت سے مستثنیٰ نہیں۔

کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟

ترمذی شریف میں ایک حدیث ہے، جس میں اسی مضمون کو حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا، اے اللہ کے بندو! نیک کام کرنے کے لئے کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ فرمایا:

((بَادِرُوْا بِالْاَعْمَالِ سَبْعًا، هَلْ تَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا فَقْرًا مُنْسِيًا، أَوْ غِنًى مُطْغِيًا، اَوْ

مَرَضًا مُفْسِدًا، اَوْ هَرَمًا مُفْنِدًا، اَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا، اَوِ الدَّجَّالَ فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ، اَوِ السَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ))(۱)

کیا فقر وفاقہ کا انتظار ہے

((هَلْ تَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا فَقْرًا مُنْسِيًا))

کیا اس بات کا انتظار کر رہے ہو کہ ابھی تو پیسے ہیں، کل صدقہ کر دیں گے، پرسوں کر دیں گے، تو کیا تم اس بات کا انتظار کر رہے ہو کہ تمہارے اوپر فقر وفاقہ آجائے، مفلسی آجائے، جو فقر وافلاس تمہیں صدقہ وخیرات کرنے کو بھلا دے، کیا اس وقت کا انتظار کر رہے ہو؟ کیا اس وقت صدقہ کرو گے؟ ارے بھائی! جب آج تمہارے پاس پیسے موجود ہیں تو ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو، کل کو معلوم نہیں کیا صورت ہو۔

کیا مالداری کا انتظار ہے

((اَوْ غِنًى مُطْغِيًا))

کیا تم ایسی مالداری کا انتظار کر رہے ہو جو تمہیں سرکش بنا دے۔ یعنی نیک کام کو یہ سوچ کر ٹال رہے ہو کہ آج تو نفلیں پڑھنے کا موقع نہیں ہے، ابھی تو اپنی تجارت میں اور ملازمت میں مصروف ہوں، جب ذرا فارغ البالی حاصل ہو جائے گی تو اس وقت نفلیں بھی پڑھیں گے، اور تہجد بھی پڑھیں گے، اشراق اور چاشت بھی پڑھیں گے، اور صدقہ کریں گے، ابھی تو فارغ البالی نہیں ہے، ابھی تو ذرا تجارت کو ترقی دینی ہے، مال بڑھانا ہے۔ حضور اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ تم ایسی مالداری کا انتظار کر رہے ہو جو تمہیں سرکش بنا دے کیا معلوم کہ جب خوشحالی اور مالداری حاصل ہو جائے تو دماغ سے اللہ کی یاد ہی نکل جائے، اور پھر نیکی کرنے کا خیال ہی ختم ہو جائے، اور پھر تکبر اور سرکشی میں ایسے مبتلا ہو جاؤ کہ پھر کسی نیکی کی طرف دھیان ہی نہ جائے۔

کیا بیماری کا انتظار ہے؟

((اَوْ مَرَضًا مُفْسِدًا))

---

(۱) سنن الترمذی، كتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء فی المبادرة بالعمل، رقم: ۲۲۲۸، مسند أحمد، باقی مسند المكثرين، رقم: ۷۹۵۲، رياض الصالحين، ص: ۵۹

یا اس وقت نیکی کو یہ سوچ کر ٹال رہے ہو کہ اس وقت ہاتھ پاؤں چل رہے ہیں صحت حاصل ہے اور عافیت حاصل ہے، فلاں نیک کام کل سے کریں گے، پرسوں سے کریں گے، اس طرح ٹالتے ٹالتے تمہارے اوپر کوئی بیماری آجائے جو تمہیں فساد میں مبتلا کر دے، اور پھر تم کچھ کرنے کے قابل ہی نہ ہو۔

کیا بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو؟

((اَوْ هَرَمًا مُفَنِّدًا))

یا اس وقت نیک کاموں کو یہ سوچ کر ٹال رہے ہو کہ ابھی تو میں جوان ہوں، لہٰذا نیک کاموں کی کیا جلدی ہے، ابھی تو جوانی میں کچھ لذتیں حاصل کرلیں جوانی کا کچھ مزہ لے لیں، جوانی میں عیش عشرت کرلیں، جب ذرا عمر ڈھل جائے گی، اس وقت انشاء اللہ توبہ بھی کریں گے، اور نیکیاں بھی کریں گے، تہجد بھی پڑھیں گے مسجد میں بھی جایا کریں گے، صدقہ وخیرات بھی کریں گے، آج یہ تصور بے شمار نوجوانوں کے ذہن میں رہتا ہے کہ بھائی جوان ہیں، نیک کام کرنے کی کیا جلدی ہے، اور یہ لوگ ان نوجوانوں کو ملامت کرتے ہیں جو اللہ کے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ کیا تم ایسے بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو جو تمہیں سٹھیا ڈالے، جب بڑھاپا آئے گا تو اس وقت تمہاری یہ حالت ہوگی کہ نہ منہ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت نہ کام کرنے کی طاقت اور قوت، اس وقت اگر کوئی نیک کام کرنا بھی چاہو گے تو حسرت کے سوا اور کیا ہوگا، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیز گار

ارے بڑھاپے میں ظالم بھیڑیا بھی پرہیزگار بن جاتا ہے، اور بکریوں کو کھانے سے توبہ کر لیتا ہے، لیکن وہ اس لئے توبہ کرتا ہے کہ اب چیر پھاڑ کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی، اب اگر بکری پر حملہ کرنا چاہے، تب بھی نہیں کرسکتا، تو اب توبہ کر کے بیٹھ گیا، تو کیا توبہ ہوئی؟ لہٰذا بڑھاپے میں توبہ کر لینا کوئی کمال نہیں، اس لئے کہ بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی توبہ کر لیتا ہے، پرہیزگار بن جاتا ہے، ہاں جوانی کی حالت میں توبہ کرنا، اللہ کے حکم کی خاطر اپنے نفس کی خواہشات کو کچلنا اور پامال کرنا، یہ ہے پیغمبروں کا شیوہ۔

یہ ہے شیوہ پیغمبری

حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھئے کہ بھرپور جوانی ہے، اور صحت کے اعلیٰ مقام پر ہیں، حسن جمال کے

اعلیٰ مقام پر ہیں، یہاں تک کہ دل میں گناہ کا خیال بھی آ رہا ہے، لیکن خیال آنے کے باوجود اپنے کو اس گناہ سے بچایا، یہ ہے شیوہ پیغمبری۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ کیا تم نیک کاموں کے لئے بڑھاپے کا انتظار کر رہے ہو، جب کہ اس وقت تم کچھ کرنے کے قابل نہیں رہو گے۔

کیا موت کا انتظار کر رہے ہو؟

((اَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا))

کیا تم نیک کاموں کو ٹال کر موت کا انتظار کر رہے ہو، یاد رکھو موت تمہارے پاس اچانک آ جائے گی، وہ سب قصہ ختم کر دے گی۔

کیا دجال کا انتظار کر رہے ہو؟

((اَوِ الدَّجَّالَ فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ))

یا تم نیک کاموں کو ٹال کر دجال کا انتظار کر رہے ہو کہ جب دجال آ جائے گا تو میں نیک کام کروں گا۔ ارے دجال تو وہ ہے کہ جتنی غائب چیزوں کا انتظار کر رہے ہو، ان میں سے بدترین چیز "دجال" ہے، جب دجال کا فتنہ آئے گا تو اس وقت پریشانی میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور نیکی کا موقع نہیں ملے گا، خود حضور اقدس ﷺ نے دجال کے فتنے سے پناہ مانگی ہے۔

کیا تم قیامت کا انتظار کر رہے ہو؟

((أَوِ السَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ))

کہ جب قیامت آئے گی اس وقت نیک کام کریں گے، وہ قیامت تو بڑی مصیبت کی چیز ہے، اس وقت تو عمل کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ بہر حال حضور اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ اپنی اصلاح کے لئے نیکیوں کی طرف بڑھنے کے لئے گناہوں سے بچنے کے لئے اور تقویٰ اختیار کرنے کے لئے، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار بنانے کے لئے، اللہ کے رسول ﷺ کی سنتوں پر عمل کرنے کے لئے آخر کون سے وقت کا انتظار کر رہے ہو؟ کچھ نہیں! بلکہ ہم لوگ اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ صحت ہمیشہ رہے گی، اور فراغت ہمیشہ رہے گی۔

خلاصہ

بہر حال! یہ حدیث توجہ دلا رہی ہے کہ اس زندگی کے جو لمحات اللہ جل شانہ نے ہمیں عطا فرمائے

ہوئے ہیں، اس کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے، اس کو تول تول کر خرچ کرو، اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے کاموں میں خرچ کرو، اور نفس وشیطان سے مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرو، خواہشات کے غلام نہ بنو کہ جو جی میں آیا بس اس کے پیچھے چل پڑے، جو شخص نفس کا غلام ہو کر زندگی گزارے تو یہ کوئی زندگی نہیں، ایسی زندگی سے اللہ کی پناہ مانگو، کوشش بھی کرو، اس کے لئے دعا بھی کرو کہ اوقات زندگی صحیح مصرف پر خرچ ہوں، اور صحت وفراغت کے لمحات کی قدر ہو، اور اس کو صحیح طریقے پر خرچ کرنے کی توفیق ہو، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اور اپنی رحمت سے مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

☆☆☆

وقت کی قدر کیجئے☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

اَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: ((نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِیْهِمَا كَثِیْرٌ مِنَ النَّاسِ اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ))(۱)

جیسا کہ میں نے پچھلے جمعہ عرض کیا تھا کہ "ریاض الصالحین" کی تکمیل کے بعد ان شاء اللہ حدیث کی کوئی دوسری کتاب شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ اس لئے آج اللہ کے نام پر حدیث کی دوسری کتاب شروع کی جارہی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کے انوار وبرکات ہم سب کو عطا فرمائے، اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

یہ کتاب ایک بہت بڑے امام، فقیہ، محدث، صوفی، مجاہد حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے، جس کا نام "کتاب الزهد والرقائق" ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا تعارف

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ہماری امت کے ان بزرگوں میں سے ہیں، جن کا نام آتے ہی دل میں عقیدت ومحبت کی پھواریں محسوس ہوتی ہیں۔ اس مجلس میں پہلے بھی ان کے کئی واقعات بیان کرتا رہا ہوں۔ یہ دوسری صدی ہجری کے بزرگ ہیں ان کی پیدائش غالباً دوسری صدی ہجری کے

☆ اصلاحی خطبات (۱۸۴/۴ تا ۲۲۹) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب لاعیش الاعیش الآخرة، رقم: ۵۹۳۳، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب الصحة والفراغ مغبون فیهما کثیر من الناس، رقم: ۲۲۲٦، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب الحکمة، رقم: ٤١٦٠، مسند أحمد، رقم: ۲۲۲٤، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب فی الصحة و الفراغ، رقم: ۲۵۹۱

ابتداء میں ہوئی ہے، گویا کہ یہ اس زمانے کے بزرگ ہیں، جبکہ ابھی حضور اقدس ﷺ کو اس دنیا سے گئے ہوئے سو سال ہوئے تھے، صحاح ستہ کے نام سے حدیث شریف کی جو چھ مشہور کتابیں بخاری شریف سے لے کر ابن ماجہ تک ہیں، یہ ان سب سے متقدم اور ان سب کے بزرگ ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر بھی ہیں۔ اور ان کے شاگرد بھی ہیں۔ اور یہ اس زمانے کے بزرگ ہیں۔ جب عالم اسلام ان بڑی بڑی علمی شخصیتوں سے جگمگا رہا تھا۔ اس زمانے کے جس خطے کو دیکھئے۔ اس میں بے نظیر شخصیتیں موجود تھیں۔ اور یہ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ خراسان کے شہر مرو میں پیدا ہوئے، اور پھر جا کر عراق کے شہر بغداد میں آباد ہوئے، اور وہیں قیام کیا۔

آپ کی اصلاح کا عجیب وغریب واقعہ

ان کے حالات بھی بڑے عجیب وغریب ہیں۔ ان بزرگوں کے تذکرے میں بھی بڑا نور اور بڑی برکت ہے۔ ان کے ایک ایک واقعے کے اندر یہ تاثیر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے دلوں کی دنیا بدل دیتے ہیں۔ شاید ان کا یہ قصہ میں نے آپ کو پہلے بھی سنایا ہو گا کہ یہ امیر کبیر گھرانے کے ایک فرد تھے۔ اور خاندانی رئیس تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "بستان المحدثین" میں ان کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کا ایک بہت بڑا سیب کا باغ تھا اور جس طرح امیر کبیر لوگوں میں آزادی ہوتی ہے، اسی طرح یہ بھی آزاد منش تھے، نہ علم سے کوئی تعلق، نہ دین سے کوئی تعلق، پینے پلانے والے اور گانے بجانے والے تھے، ایک مرتبہ جب سیب کا موسم آیا تو یہ اپنے اہل وعیال سمیت اپنے باغ ہی میں منتقل ہو گئے، تاکہ وہاں سیب بھی کھائیں گے۔ اور شہر سے باہر ایک تفریح کی فضا ہو گی، چنانچہ وہاں جا کر مقیم ہو گئے۔ دوست واحباب کا حلقہ بھی بڑا وسیع تھا۔ اس لئے وہاں پر دوستوں کو بھی بلا لیا، رات کو باغ کے اندر گانے بجانے کی محفل جمی، اور اس محفل میں پینے پلانے کا دور بھی چلا۔ یہ خود موسیقی کا آلہ رباط کے بجانے کے بہت ماہر تھے، اور اعلیٰ درجے کے موسیقار تھے، اب ایک طرف پینے پلانے کا دور اور اس کا نشہ، اور دوسری طرف موسیقی کی تانے، اسی نشے کے عالم میں ان کو نیند آ گئی۔ اور وہ ساز اسی حالت گود میں پڑا ہوا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ ساز گود میں رکھا ہوا ہے، اب اٹھ کر اس کو دوبارہ بجانا شروع کیا تو وہ ساز اب بجتا ہی نہیں۔ اس میں سے آواز ہی نہیں آ رہی تھی، چونکہ خود اس کی مرمت کرنے اور درست کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ پھر نہیں بجتا، دوبارہ اس کے تار وغیرہ درست کئے۔ اور بجانے کی کوشش کی تو اب بجائے اس میں سے موسیقی کی آواز نکلنے کے بجائے قرآن کریم کی ایک آیت کی آواز آ رہی تھی، وہ یہ تھی:

﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾(۱)

قرآن کریم بھی عجیب عجیب انداز سے خطاب فرماتا ہے، اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''کیا اب بھی ایمان والوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کا دل اللہ کے ذکر کے لئے پسیجے اور اللہ نے جو حق بات اس قرآن کے اندر اتاری ہے''

اس کے لئے ان کے دلوں میں گداز پیدا ہو، کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا؟

ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ آواز اسی ساز میں سے آرہی تھی، اور ایک روایت میں یہ ہے کہ جس جگہ وہ بیٹھے ہوئے تھے اس کے قریب ایک درخت پر ایک پرندہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس پرندے کے منہ سے یہ آواز آرہی تھی، بہر حال! اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ایک غیبی لطیفہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کو نوازنا منظور تھا۔ بس جس وقت یہ آواز سنی۔ اسی وقت دل پر چوٹ لگی، اور خیال آیا کہ اب تک میں نے اپنی عمر کس کام کے اندر گنوائی ہے۔ فوراً جواب میں فرمایا:

"بَلٰی یَا رَبِّ قَدْ آنَ، بَلٰی یَا رَبِّ قَدْ آنَ"

''اے پروردگار! اب وہ وقت آگیا، اے پروردگار! اب وہ وقت آگیا''

اب میں اپنے ان سارے دھندوں اور مشغلوں کو چھوڑتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ چنانچہ یہ سارے دھندے چھوڑ کر ہمہ تن دین کی طرف متوجہ ہو گئے۔(۲)

کہاں تو یہ عالم تھا کہ رات کے وقت بھی ساز و رباط کی محفلیں جمی ہوئی ہیں۔ پینے پلانے کا مشغلہ ہو رہا ہے۔ اور کہاں یہ انقلاب آیا کہ اس کتاب کے مؤلف بن کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ آج پوری امت مسلمہ کی گردنیں ان کے احسانات سے جھکی ہوئی ہیں۔

علم حدیث میں آپ کا مقام

اللہ تعالیٰ نے علم حدیث میں آپ کو بہت اونچا مقام عطا فرمایا تھا۔ علم حدیث میں بہت بڑے بڑے علماء پر تنقید کی گئی ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی تنقید سے نہیں بچے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نہیں بچے۔ بڑے بڑے ائمہ تنقید سے نہیں بچے۔ لیکن میری نظر میں اب تک کوئی آدمی ایسا نہیں گزرا۔ جس نے عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت اور حدیث کے بارے میں ان پر تنقید کی ہو، اتنے اونچے درجے کی محدث ہیں۔

---

(۱) الحدید: ۱٦

(۲) بستان المحدثین ص: ۱۵۵

دنیا سے آپ کی بے رغبتی اور کنارہ کشی

اور پھر دنیا سے اپنے آپ کو ایسا کاٹا، اور ایسے زاہد بن کر دنیا سے رخصت ہوئے کہ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ خاندانی رئیس اور امیر کبیر آدمی تھے۔ اس لئے حالات میں تبدیلی کے بعد بھی ایک ایک وقت میں ان کے دسترخوان پر دس دس پندرہ پندرہ قسم کے کھانے ہوتے تھے۔ اور کھانے کے وقت بڑا مجمع موجود ہوتا تھا لیکن سارے مجمع کھانے میں مشغول ہوتا تھا۔ مگر یہ خود روزے سے ہوتے تھے۔ اور لوگوں کو بلا بلا کر کھانے کے دعوت دیتے، اور ان کی حاجتیں پوری کرتے۔

حدیث رسول ﷺ کا مشغلہ

خراسان کے شہر ''مرو'' جہاں یہ پیدا ہوئے، وہاں پر ان کا جو مکان تھا۔ اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس مکان کا صرف صحن پچاس گز لمبا پچاس گز چوڑا تھا۔ وہ پورا صحن اہل حاجت سے بھرا رہتا تھا، کوئی مسئلہ پوچھنے آ رہا ہے تو کوئی علم حاصل کرنے کے لئے آ رہا ہے۔ کوئی اپنی ذاتی ضرورت کے لے آ رہا ہے۔ پھر بعد میں جب بغداد میں جا کر آباد ہوئے تو وہاں پر اپنے لئے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا، اور اس میں گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے، تو کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ حضرت، آپ اپنا عالیشان مکان چھوڑ کر یہاں بغداد میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے کے لئے آئے ہیں، یہاں آپ کا دل کیسے لگتا ہوگا؟ جواب میں فرمایا کہ الحمد للہ، یہاں میرا دل زیادہ لگتا ہے۔ اس لئے کہ پہلے لوگ میرے پاس بہت آیا کرتے تھے۔ اور اب میں تنہائی کی زندگی گزارتا ہوں۔ بس مسجد میں جا کر نماز پڑھ لیتا ہوں، اور پھر اپنے گھر چلا جاتا ہوں۔ اور وہاں میں ہوتا ہوں۔ اور رسول اللہ ﷺ ہوتے ہیں۔ یعنی گھر میں دن رات احادیث رسول کا مشغلہ ہے۔ اس میں مصروف رہتا ہوں، یہ زندگی مجھے بہت زیادہ پسند ہے۔ (۱)

لوگوں کے دلوں میں آپ کی عظمت اور محبت

بغداد کا ایک شہر رقہ تھا۔ جو اب بغداد ہی کا ایک محلہ بن گیا ہے، ہارون الرشید کی خلافت کا زمانہ تھا۔ ایک مرتبہ ہارون اس شہر میں اپنی والدہ یا بیوی کے ساتھ شاہی برجے میں بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں اس نے دیکھا کہ کہ شہر کی فصیل کے باہر ایک شور بلند ہو رہا ہے، ہارون الرشید کو خیال ہوا کی شاید کسی دشمن نے حملہ کر دیا، یا کوئی غنیم چڑھ آیا ہے، معلوم کرنے کے لئے فوراً آدمی دوڑائے تو معلوم ہوا کہ

(۱) تاریخ بغداد (۱۰/۱۵٤)

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ رقہ شہر میں تشریف لائے ہیں اور لوگ ان کے استقبال کے لئے جوق در جوق شہر سے باہر نکلے ہیں۔ یہ اس کا شور ہے۔ اور میرے اپنے والد ماجد حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ استقبال کے دوران حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو چھینک آ گئی تھی، اور اس پر انہوں نے "الحمدللہ" کہا، اور ان کے جواب میں پورے مجمع نے "یرحمك الله" کہا، اس سے یہ شور بلند ہوا، جب ہارون الرشید کی بیوی نے یہ صورت حال دیکھی تو ہارون الرشید سے کہا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تم بڑے بادشاہ ہو، اور آدمی دنیا پر تمہاری حکومت ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ بادشاہت تو ان لوگوں کا حق ہے۔ حقیقت میں تو یہ لوگ بادشاہ ہیں جو لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ کوئی پولیس ان کو کھینچ کر یہاں نہیں لائی ہے، بلکہ یہ صرف حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی محبت ہے جس نے اتنے سارے لوگوں کو یہاں پر جمع کر دیا ہے، یہ مقام اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔

آپ کی فیاضی کا عجیب واقعہ

اللہ تعالیٰ نے دولت اور دنیا کی نعمتیں بہت دیں۔ مگر وہی بات تھی کہ دنیا تو عطا فرمائی، لیکن دنیا کی محبت سے خالی رکھا، یہ جو کسی نے کہا ہے کہ دنیا ہاتھ میں ہو، دل میں نہ ہو، یہ کیفیت اللہ تعالیٰ نے ان کو اس درجہ عطا فرمائی کہ اس کی مثالیں ملنی مشکل ہے، خراسان میں قیام کے دورن ایک مرتبہ انہوں نے حج پر جانے کا ارادہ کیا، جب بستی کے لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ حج پر تشریف لے جا رہے ہیں۔ تو بستی کے لوگ ایک وفد بنا کر ان کے پاس آ گئے کہ حضرت ہم بھی آپ کے ساتھ حج کو جائیں گے، تا کہ حج کے اندر آپ کی صحبت میسر ہو، انہوں نے فرمایا کہ اچھا اگر تم لوگ بھی میرے ساتھ چلنا چاہتے ہو تو چلو، البتہ تم سب اپنا اپنا سفر کا خرچ میرے پاس جمع کرا دو، تا کہ میں تم سب کی طرف سے اکٹھا خرچ کرتا رہوں، چنانچہ جتنے لوگوں نے جانے کا ارادہ کیا ان سب نے اپنے اپنے پیسوں کی تھیلی لا کر حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جمع کرا دی، انہوں نے وہ ساری تھیلیاں لے کر ایک صندوق میں رکھ دیں۔ اور اس کے بعد سفر پر روانہ ہو گئے، چنانچہ تمام ساتھیوں کی سواری اور کھانے کا انتظام وغیرہ کرتے رہے، یہاں تک حج مکمل ہونے کے بعد ان سب کو مدینہ منورہ کے گئے۔ اور وہاں جا کر ان میں سے ہر ایک سے پوچھا کہ بھائی تمہارے گھر والوں نے مدینہ منورہ سے کیا چیز منگوائی تھی؟ چنانچہ ہر ایک کو بازار لے جا کر وہ چیز دلوا دی، پھر واپس مکہ مکرمہ تشریف لائے، اور وہاں آ کر پھر ہر ایک سے پوچھا کہ تمہارے گھر والوں نے مکہ مکرمہ سے کیا چیز لانے کو کہا تھا؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ فلاں چیز منگوائی تھی، چنانچہ ایک ایک فرد کو بازار لے جا کر وہ چیز دلوا دی۔ پھر واپس سفر کر کے جب خراسان پہنچے تو وہاں سب کی عالیشان دعوت کی، اور اس دعوت میں ہر ایک کو تحفے بھی پیش کئے، اس

کے بعد وہ صندوق کھولا جس میں جاتے وقت ہر ایک کے پیسوں کی تھیلی رکھی تھی، اور ہر ایک کو اس کی تھیلی واپس کردی، اس طریقے سے سخاوت کے دریا بہائے۔(۱)

آپ کی سخاوت اور غریب پروری

ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حج کو جا رہے تھے، ایک قافلہ بھی ساتھ تھا، راستے میں ایک جگہ پر قافلے والوں کی ایک مرغی مر گئی۔ قافلے والوں نے وہ مرغی اٹھا کر کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دی۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ قافلے والوں سے پیچھے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ قافلہ والے تو اس مردہ مرغی کو پھینک کر چلے گئے، اتنے میں قریب کی بستی سے ایک لڑکی نکلی، اور وہ تیزی سے اس مردہ مرغی پر جھپٹی، اور اس کو اٹھا کر ایک کپڑے میں لپیٹا، اور جلدی سے بھاگ کر اپنے گھر چلی گئی۔ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ یہ سب دیکھ رہے تھے۔ بہت حیران ہوئے کہ اس مردہ مرغی کو اس طرح رغبت کے ساتھ اُٹھا کر لے جانے والی لڑکی کون ہے؟ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بستی میں اس لڑکی کے گھر گئے۔ اور پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اور اس طرح مردہ مرغی اٹھا کر کیوں لائی ہے؟ جب بہت اصرار کیا تو اس لڑکی نے بتایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ جو ہمارے گھر میں واحد کمانے والے تھے، میری والدہ بیوہ ہے میں تنہا ہوں۔ اور لڑکی ذات ہوں۔ اور گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ ہم کئی روز سے اس حالت میں ہیں جس میں شریعت نے مردار کھانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ چنانچہ اس کوڑے کے ڈھیر میں جو کوئی مردار پھینک دیتا ہے۔ ہم اس کو کھا کر گزارہ کر لیتے ہیں۔

بس یہ سن کر حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے دل پر چوٹ لگی، انہوں نے سوچا کہ یہ اللہ کے بندے تو اس حالت میں ہیں کہ مردار کھا کھا کر گزارہ کر رہے ہیں۔ اور میں حج پر جا رہا ہوں، چنانچہ اپنے معاون سے پوچھا کہ تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟ اس نے بتایا کہ میرے پاس شاید دو ہزار دینار ہیں، انہوں نے فرمایا کہ ہمیں واپس گھر جانے کے لئے کتنے دینار کی ضرورت ہے؟ اس نے بتایا تقریباً بیس دینار۔ فرمایا وہ رکھ لو، اور باقی سب اس لڑکی کو دے دو، اور اس سال ہم حج نہیں کرتے، اور ان دیناروں سے اس کے گھر والوں کو جو فائدہ ہوگا، اللہ کی رحمت سے امید ہے اللہ تعالیٰ حج سے زیادہ اجر و ثواب اس پر عطا فرما دیں گے۔ یہ کہہ کر واپس چلے گئے۔

غرض یہ کہ ایک دو نہیں بلکہ ایسے بے شمار فضائل اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائے تھے کہ ہم لوگ ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

---

(۱) سیر أعلام النبلاء، (۳۸۵/۸)

آپ کی دریادلی کا ایک اور واقعہ

ایک اور واقعہ یاد آیا، جب کبھی یہ رقہ شہر میں جایا کرتے تھے تو ایک نوجوان ان سے آ کر ملا کرتا تھا۔ اور آ کر کبھی مسائل پوچھتا۔ کبھی دوسری باتیں آ کر پوچھتا، ایک مرتبہ جب رقہ شہر جانا ہوا تو وہ نوجوان نہیں آیا۔ اور نہ اس نے آ کر ملاقات کی، آنے والے لوگوں سے پوچھا کہ ایک نوجوان تھا جو ہمیشہ آ کر ملاقات کیا کرتا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ کہاں گیا؟ لوگوں نے بتایا کہ اس پر قرضہ بہت ہو گیا تھا۔ اور جس شخص کا قرضہ تھا۔ اس نے اس کو گرفتار کرا دیا ہے، اس لئے وہ جیل میں ہے، ان کو بڑا دکھ ہوا، انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ کتنا قرضہ ہو گیا تھا؟ لوگوں نے بتایا کہ دس ہزار دینار، پھر معلوم کیا کہ کس کا قرضہ تھا؟ لوگوں نے بتایا کہ فلاں شخص کا قرضہ تھا، چنانچہ آپ اس شخص کی تلاش میں نکلے، اور پتہ پوچھتے پوچھتے اس کے گھر پہنچے۔ اور جا کر اس سے کہا کہ ہمارا ایک دوست ہے۔ تمہارا قرضہ اس کے ذمے ہیں، جس کی وجہ سے وہ جیل میں ہے، میں وہ قرضہ تمہیں ادا کر دیتا ہوں، لیکن ایک شرط ہے، وہ یہ کہ میرے ساتھ وعدہ کرو، اور قسم کھاؤ کہ میرے جیتے جی اس کو یہ نہیں بتاؤ گے کہ یہ قرضہ کس نے ادا کیا ہے، چنانچہ اس نے قسم کھالی کہ میں نہیں بتاؤں گا، چنانچہ آپ نے دس ہزار دینار اس کو دے دیئے اور اسے کہا کہ اب اس کو رہا کرا دو۔ چنانچہ اس نے جیل جا کر اس کو رہا کرا دیا۔

جب وہ نوجوان جیل سے رہا ہو کر شہر میں آیا تو اس کو پتہ چلا کہ چند روز سے حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ یہاں آئے ہوئے تھے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہاں سے کب نکلے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ابھی نکلے ہیں۔ چنانچہ وہ نوجوان آپ کے پیچھے دوڑا، اور راستے میں آپ کو پکڑ لیا۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے سنا تھا کہ تم جیل میں ہو؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں، میں جیل میں تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے رہائی عطا فرما دی انہوں نے پوچھا کہ کیسے نکلے؟ اس نوجوان نے کہا کہ بس اللہ تعالیٰ نے غیب سے فرشتہ بھیج دیا۔ اس نے میرا قرضہ ادا کر دیا، اس لئے مجھے رہائی مل گئی۔ عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب اللہ تعالیٰ کا اس پر شکر ادا کرو، اور میں بھی تمہارے لئے دعائیں کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں رہائی عطا فرما دے۔

وہ نوجوان بعد میں کہتے ہیں کہ ساری زندگی مجھے یہ پتہ نہ چلا کہ میرا قرضہ ادا کرنے والے عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اس لئے کہ اس شخص نے عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں آپ کی زندگی میں اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا، لیکن جب عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہو گئی، اس وقت اس شخص نے مجھے بتایا کہ تمہاری رہائی کا سبب درحقیقت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے۔ (۱)

(۱) تاریخ بغداد (۱۰/۱۵۹)

”کتاب الزھد والرقائق“ کا تعارف

بہر حال! یہ اس مقام کے بزرگ ہیں کہ ہمیں ان کا نام لیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ یہ کتاب جو ہم آج شروع کر رہے ہیں یہ انہی کی لکھی ہوئی کتاب ہے جس کا نام ہے ”کتاب الزہد والرقائق“ یعنی ان احادیث کا مجموعہ ہے۔ جن میں نبی کریم سرور دو عالم ﷺ نے زہد کی تلقین فرمائی ہے۔ اور جن کو پڑھنے سے دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے اور ”رقائق“ کے معنی وہ احادیث جن کے پڑھنے سے قلب میں گداز اور رقت پیدا ہوتی ہے۔ دل نرم ہوتے ہیں، غفلت دور ہوتی ہے، ایسی احادیث کو ”رقائق“ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ایسی احادیث پر یہ مستقل کتاب لکھ دی ہے، ویسے، ”کتاب الزہد“ کے نام سے دوسرے محدثین نے بھی کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً امام وکیع بن الجراح رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ ان سب کی کتابیں اس موضوع پر اس نام سے موجود ہیں۔ لیکن حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب سب سے زیادہ اس لئے مشہور ہوئی کہ اول تو یہ متقد مین میں سے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہر کام کے اندر برکت عطا فرمائی تھی۔ اس لئے خیال ہوا کہ ان کی یہ کتاب شروع کی جائے، کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے ہمارے دلوں میں کچھ نرمی پیدا کر دے، یہ دنیا جو ہمارے دلوں پر چھائی ہوئی ہے، اس کے بدلے اللہ تعالیٰ آخرت کی کچھ فکر عطا فرما دیں۔

دو عظیم نعمتیں اور ان سے غفلت

اس کتاب میں احادیث بھی ہیں اور صحابہ و تابعین کے کچھ آثار اور واقعات بھی ہیں۔ پہلی حدیث وہ مشہور حدیث ہے، جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ))

”اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی دو نعمتیں ایسی ہیں کہ بہت سے لوگ ان کے بارے میں دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک نعمت صحت اور تندرستی ہے، اور دوسری نعمت فراغت اور فرصت ہے“

یہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ جب تک یہ نعمتیں حاصل رہتی ہیں، اس وقت تک انسان اس دھوکے میں پڑا رہتا ہے کہ یہ نعمتیں ہمیشہ باقی رہیں گی، چنانچہ جب تک تندرستی کا زمانہ ہے، اس وقت یہ خیال بھی نہیں آتا کہ کبھی بیماری آئے گی۔

یا فراغت کا زمانہ ہے، اس وقت یہ خیال بھی نہیں آتا کہ کبھی مصروفیت اتنی زیادہ ہو جائے گی۔اس لئے جب اللہ تعالیٰ صحت عطا فرما دیتے ہیں یا فراغت عطا فرما دیتے ہیں وہ دھوکے میں اپنا وقت گزارتا ہے، اور اچھے کاموں کو ٹلاتا رہتا ہے، اور یہ سوچتا رہتا ہے کہ ابھی تو بہت وقت پڑا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح سے محروم رہتا ہے، سرکار دو عالم ﷺ فرما رہے ہیں کہ ان نعمتوں کی اسی وقت قدر پہچان لو، جب یہ حاصل ہوں۔

صحت کی قدر کرلو

یہ صحت کی نعمت جو اس وقت حاصل ہے، کیا معلوم کہ کب تک یہ حاصل رہے گی، کچھ پتہ نہیں کہ کس وقت بیماری آ جائے، اور کیسی بیماری آ جائے، لہٰذا نیکی اور خیر کے کام کو، اور اپنی اصلاح کے کام کو، اللہ تعالیٰ کیطرف رجوع کے کام کو، آخرت کی فکر کو اسی زمانے کے اندر اختیار کرلو، کیا پتہ پھر موقع ملے یا نہ ملے۔

ارے جب بیماری آتی ہے تو پہلے نوٹس دے کر نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ بچائے، اچھا خاصا چنگا بھلا تندرست انسان ہے بیٹھے بیٹھے کسی بیماری کا حملہ ہو گیا۔ اور اب چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہیں، اس لئے یہ زمانہ ٹلا کر نہ گزارو، بلکہ جو نیک کام کرنا ہے، وہ کر گزرو، یہ صحت اللہ تعالیٰ نے اس لئے عطا فرمائی ہے کہ اس کو اس عالم کے لئے استعمال کرو جو مرنے کے بعد آنے والا ہے، لیکن اگر تم نے اس صحت کو گنوا دیا۔ اور بیماری آ گئی، تو پھر عمر بھر سر پکڑ کر رو گے، اور حسرت اور افسوس میں مبتلا رہو گے کہ کاش، اس صحت کے عالم میں کچھ کام کرلیا ہوتا، لیکن اس وقت حسرت اور افسوس کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اس لئے ان نعمتوں کی قدر کرو۔

صرف ایک حدیث پر عمل

یہ حدیث جو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے یہ "جوامع الکلم" میں سے ہے، اور غالباً امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ چند حدیثیں ایسی ہیں کہ اگر انسان صرف ان چند حدیثوں پر عمل کرے تو اس کی آخرت کی نجات کے لئے کافی ہے، ان میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے اسی وجہ سے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اس حدیث سے شروع فرمائی ہے، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی صحیح بخاری میں "کتاب الرقاق" کو اسی حدیث سے شروع فرمایا ہے، اس لئے کہ اس حدیث کے ذریعہ حضور اقدس ﷺ ہمیں پہلے سے تنبیہ فرما رہے ہیں، بعد میں تنبیہ تو خود ہو جاتی ہے، لیکن وہ تنبیہ اس وقت ہوتی ہے، جب تدارک کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، اس لئے نبی کریم ﷺ جو ہم پر ماں باپ سے

زیادہ شفیق ہیں، اور ہماری نفسیات اور رگوں سے واقف ہیں۔ وہ فرمارہے ہیں کہ دیکھو، اس وقت جو تمہیں صحت اور فراغت کا عالم میسر ہے۔ پھر بعد میں رہے یا نہ رہے۔ اس سے پہلے کہ حسرت کا وقت آ جائے۔ اس کو کام میں لگالو۔

''ابھی تو جوان ہیں'' شیطانی دھوکہ ہے

یہ ''نفس'' انسان کو دھوکہ دیتا رہتا ہے کہ میاں ابھی تو جوان ہیں، ابھی تو بہت وقت پڑا ہے۔ ہم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے، ابھی تو ذرا مزے اڑالیں۔ پھر جب موقع آئے گا تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں گے، اور اس وقت اصلاح کی فکر کرلیں گے ابھی کیا رکھا ہے؟

حضور اقدس ﷺ فرمارہے ہیں کہ نفس و شیطان کے اس دھوکے میں نہ آؤ، جو کچھ کرنا ہے کر گزرو، اس لئے کہ یہ وقت جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔ یہ بڑی قیمتی چیز ہے، یہ بڑی دولت ہے، عمر کے یہ لمحات جو اس وقت انسان کو میسر ہیں، اس کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے۔ اس کو برباد اور ضائع نہ کرو، بلکہ اس کو آخرت کے لئے استعمال کرو۔

کیا ہم نے اتنی عمر نہیں دی تھی؟

قرآن کریم فرماتا ہے کہ جب انسان آخرت میں اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے گا تو اللہ تعالیٰ سے کہے گا کہ ہمیں ایک مرتبہ اور دنیا میں بھیج دیں، ہم نیک عمل کریں گے، تو اللہ تعالیٰ جواب میں فرمائیں گے:

﴿أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ﴾(۱)

''کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اگر اس میں کوئی شخص نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کرلیتا''

صرف یہ نہیں کہ عمر دے کر تم کو ویسے ہی چھوڑ دیا، بلکہ تمہارے پاس ڈرانے والے تنبیہ کرنے والے بھیجتے رہے، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام بھیجے، اور آخر میں سرکار دو عالم ﷺ کو بھیجا، حضور اقدس ﷺ کے خلفاء اور وارثین تمہیں مسلسل جھنجوڑتے رہے، اور تمہیں غفلت سے بیدار کرتے رہے اور آ کر یہ کہتے رہے کہ خدا کے لئے اس وقت کو کام میں لگالو۔

ڈرانے والے کون ہیں

''ڈرانے والے'' کی تفسیر مفسرین نے مختلف فرمائی ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد

(۱) فاطر: ۳۷

انبیاء علیہم السلام اور ان کے وارثین ہیں، جو لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد "سفید بال" ہیں یعنی جب سفید بال آ گئے تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا آ گیا، کہ اب وقت آنے والا ہے۔ تیار ہو جاؤ، اور اب بھی اپنی سابقہ زندگی سے تائب ہو جاؤ، اور اپنے حالات کی اصلاح کر لو، اس لئے کہ "سفید بال" آ گئے ہیں، اور بعض مفسرین نے اس کی تفسیر "پوتے" سے کی ہے "یعنی جس کسی کا پوتا پیدا ہو جائے، اور وہ دادا بن جائے، تو وہ پوتا ڈرانے والا ہے اس بات سے کہ بڑے میاں تمہارا وقت آنے والا ہے، اب ہمارے لئے جگہ خالی کرو۔"

ملک الموت سے مکالمہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک واقعہ سنا کہ کسی شخص کی ملک الموت سے ملاقات ہو گئی۔ اس شخص نے ملک الموت سے شکایت کی آپ کا بھی عجیب معاملہ ہے دنیا میں کسی کو پکڑا جاتا ہے۔ تو دنیا کی عدالتوں کا قانون یہ ہے، کہ پہلے اس کے پاس نوٹس بھیجتے ہیں کہ تمہارے خلاف یہ مقدمہ قائم ہو گیا ہے، تم اس کی جواب دہی کے لئے تیاری کرو، لیکن آپ کا معاملہ بڑا عجیب ہے کہ جب چاہتے ہیں، بغیر نوٹس کے آ دھمکتے ہیں، بیٹھے بیٹھائے پہنچ گئے اور روح قبض کر لی، یہ کیا معاملہ ہے؟ ملک الموت نے جواب دیا کہ میاں! میں اتنے نوٹس بھیجتا ہوں کہ دنیا میں کوئی اتنے نوٹس نہیں بھیجتا، لیکن میں کیا کروں۔ تم میرے نوٹس کا نوٹس نہیں لیتے، اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ ارے جب تمہیں بخار آتا ہے۔ وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، جب تمہیں کوئی بیماری آتی ہے وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، جب تمہارے سفید بال آتے ہیں۔ وہ میرا نوٹس ہوتا ہے، تمہارے پوتے آتے ہیں وہ میرا نوٹس ہوتا ہے۔ میں تو اتنے نوٹس بھیجتا ہوں کہ کوئی حد و حساب نہیں۔ مگر تم کان ہی نہیں دھرتے۔

بہر حال! اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ قبل اس کے کہ وہ حسرت کا وقت آئے خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھال لو اور اس صحت کے وقت کو، اور اس فراغت کے وقت کو کام میں لے آؤ، خدا جانے کل کیا عالم پیش آئے۔

جو کرنا ہے ابھی کر لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب قدس اللہ سرہ ہم لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ اللہ میاں نے تمہیں جوانی دی ہے۔ صحت دی ہے، فراغت دی ہے اس کو کام میں لے لو اور جو کچھ کرنا ہے، اس وقت کر لو، عبادتیں اس وقت کر لو، اللہ کا ذکر اس وقت کر لو، اس وقت گناہوں سے بچ جاؤ، پھر جب بیمار ہو جاؤ گے یا ضعیف ہو جاؤ گے تو اس وقت کچھ بن نہیں پڑے گا، اور یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

ابھی تو ان کی آہٹ پر میں آنکھیں کھول دیتا ہوں
وہ کیسا وقت ہوگا جب نہ ہوگا یہ بھی امکاں میں

دو رکعت کی حسرت ہوگی

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سفر میں تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں ایک قبر کو دیکھا تو وہاں پر سواری سے اتر گئے اور اتر کر دو رکعت نفل پڑھی، اور پھر سواری پر سوار ہو کر آگے روانہ ہو گئے، ساتھ میں جو حضرات تھے، انہوں نے سمجھا کہ شاید کسی خاص آدمی کی قبر ہے۔ اس لئے یہاں اتر کر دو رکعت پڑھ لیں۔ چنانچہ انہوں نے پوچھا کہ حضرت، کیا بات ہے؟ آپ یہاں کیوں اترے؟ انہوں نے جواب دیا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ جب میں یہاں سے گزرا تو میرے دل میں خیال آیا کہ جو لوگ قبروں میں پہنچ چکے ہیں۔ ان کا عمل منقطع ہو چکا ہے، اور جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ یہ لوگ قبروں کے اندر اس بات کی حسرت کرتے ہیں کہ کاش کہ ہمیں اتنا موقع اور مل جائے کہ ہم دو رکعتیں اور پڑھ لیں۔ اور ہماری نیکیوں میں اور ہمارے اعمال میں دو رکعت نفل کا اضافہ ہو جائے۔ لیکن اس حسرت کے باوجود ان کے پاس نفل پڑھنے کا موقع نہیں ہوتا تو مجھے خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ موقع دے رکھا ہے، اس لئے چلو میں جلدی سے دو رکعت نفل پڑھ لوں۔ اس لئے میں نے اتر کر دو رکعت نفل پڑھ لیں۔

بہر حال، اللہ تعالیٰ جن کو یہ فکر عطا فرماتے ہیں وہ اپنے ایک ایک لمحے کو اس طرح کام میں لاتے ہیں۔

نیکیوں سے میزان عمل بھر لو

یہ وقت کے لمحات بڑے قیمتی ہیں، اسی واسطے کہا گیا کہ موت کی تمنا نہ کرو، اس لئے کہ کیا معلوم کہ موت کے بعد کیا ہونے والا ہے۔

ارے جو کچھ فرصت اور مہلت اللہ تعالیٰ نے عطا فرما رکھی ہے، سب کچھ اسی میں ہونا ہے۔ آگے جا کے کچھ نہیں ہوگا، اس لئے اس دنیا میں جو لمحات اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں، اس کو غنیمت سمجھو، اور اس کو کام میں لے لو، مثلاً ایک لمحہ میں اگر ایک مرتبہ سبحان اللہ کہہ دو، حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ سبحان اللہ پڑھنے سے میزان عمل کا آدھا پلڑا بھر جاتا ہے، اور ایک مرتبہ "الحمد للہ" کہہ دیا تو اب میزان عمل کا پورا پلڑا بھر گیا۔(۱)

(۱) کنز العمال، رقم: ۲۰۱۸

دیکھئے یہ لمحات کتنے قیمتی ہیں۔ لیکن تم اس کو گنواتے پھر رہے ہو، خدا کے لئے اس کو اس کام میں استعمال کرلو۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور وقت کی قدر

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے محدثین میں سے ہیں اور بخاری شریف کے شارح ہیں، اور علم کے پہاڑ ہیں، عمل کے جس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پہنچایا تھا۔ آج انسان اس مقام کا تصور بھی نہیں کرسکتا، عالم اور مصنف اور محدث کے نام سے مشہور ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ جس وقت تصنیف کررہے ہوتے تو کتاب لکھتے لکھتے جب قلم کا قط خراب ہوجاتا، اس زمانے میں لکڑی کے قلم ہوتے تھے، اور بار بار اس کا قط بنانا پڑتا تھا، تو اس کو چاقو سے دوبارہ درست کرنا پڑتا تھا، اور اس میں تھوڑا سا وقت لگتا تو یہ وقت بھی بے کار گزارنا گوارہ نہیں تھا، چنانچہ جتنا وقت قط لگانے میں گزرتا۔ اتنی دیر تیسرا کلمہ "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ" پڑھتے رہتے تھے۔ تاکہ یہ وقت بھی ضائع نہ جائے۔(۱)

اس لئے کہ جو وقت تصنیف کرنے میں گزر رہا ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزر رہا ہے۔ لیکن جو چند لمحات ملے ہیں۔ اس کو کیوں ضائع کریں۔ اور اس میں تیسرا کلمہ پڑھ لیں۔ تاکہ یہ لمحات بھی بے کار نہ جائیں، بہرحال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ وقت کی قدر پہچانیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور وقت کی قدر

آج ہمارے ماحول میں سب سے زیادہ بے قدر اور بے وقعت چیز وقت ہے۔ اس کو جس طرح چاہا گنوادیا، گپ شپ میں گزاردیا، یا فضولیات میں گزاردیا، یا بلاوجہ ایسے کام کے اندر گزاردیا جس میں نہ دنیا کا نفع نہ دین کا نفع۔

میرے والد ماجد حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے وقت کو تول تول کر خرچ کرتا ہوں، تاکہ کوئی لمحہ بے کار نہ گزرے۔ دین کے کام میں گزرے یا دنیا کے کام میں گزرے۔ اور دنیا کے کام میں بھی اگر نیت صحیح ہو تو وہ بھی بالآخر دین ہی کا کام بن جاتا ہے۔ اور ہمیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ یہ بات تو ہے ذرا شرم کی سی، لیکن تمہیں سمجھانے کے لئے کہتا ہوں کہ جب انسان بیت الخلاء میں بیٹھا ہوتا ہے۔ تو وہ وقت ایسا ہے کہ اس میں نہ تو انسان ذکر کرسکتا ہے، اس لئے کہ ذکر کرنا منع ہے۔ اور نہ کوئی اور کام کرسکتا ہے، اور میری طبیعت ایسی بن گئی ہے کہ جو وقت وہاں

---

(۱) ابن حجر العسقلانی، شاکر عبدالمعنم، ص: ۱۸۵

بے کاری میں گزرتا ہے، وہ بہت بھاری ہوتا ہے۔ کہ اس میں کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے اس وقت کے اندر میں بیت الخلاء کے لوٹے کو دھو لیتا ہوں۔ تا کہ یہ وقت بھی کسی کام میں لگ جائے اور تا کہ جب بعد میں دوسرا آدمی آ کر اس لوٹے کو استعمال کرے تو اس کو گندا اور برا معلوم نہ ہو۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ پہلے سوچ لیتا ہوں کہ فلاں وقت میں مجھے پانچ منٹ ملیں گے، اس پانچ منٹ میں کیا کام کرنا ہے؟ یا کھانا کھانے کے فوراً بعد پڑھنا لکھنا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ دس منٹ کا وقفہ ہونا چاہئے تو میں پہلے سے سوچ کر رکھتا ہوں کہ کھانے کے بعد یہ دس منٹ فلاں کام میں صرف کرنے ہیں، چنانچہ اس وقت میں وہ کام کر لیتا ہوں۔

جن حضرات نے میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی ہے، انہوں نے دیکھا ہوگا کہ آپ کار کے اندر سفر بھی کر رہے ہیں اور قلم بھی چل رہا ہے، اور بلکہ میں نے تو ان کو رکشہ کے اندر سفر کے دوران بھی لکھتے ہوئے دیکھا ہے، جس میں جھٹکے بھی بہت لگتے ہیں، اور ایک جملہ بڑے کام کا ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جو سب کے لئے یاد رکھنے کا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کام کرنے کا بہترین گر

فرماتے کہ دیکھو جس کام کو فرصت کے انتظار میں رکھا وہ ٹل گیا، یعنی جس کو اس انتظار میں رکھا کہ جب فرصت ملے گی تب کریں گے وہ ٹل گیا، وہ کام پھر نہیں ہوگا۔ کام کرنے کا راستہ یہ ہے کہ دو کاموں کے درمیان تیسرے کام کو زبردستی اس کے اندر داخل کر دو، تو وہ کام ہو جائے گا، میں تو اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا احسان مند ہوں، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آپ کا فرمایا ہوا یہ جملہ ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے، اور آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتا ہوں کہ واقعی جس کام کے بارے میں یہ سوچتا ہوں کہ فرصت ملے گی تو کریں گے وہ کام کبھی نہیں ہوتا، اس لئے کہ حوادث روزگار ایسے ہیں کہ پھر وہ موقع دیتے ہی نہیں، ہاں جس کام کی انسان کے دل میں اہمیت ہوتی ہے انسان اس کام کو کر ہی گزرتا ہے، زبردستی کر لیتا ہے، چاہے وقت ملے یا نہ ملے۔

کیا پھر بھی نفس سستی کرے گا؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو، وقت کو کام میں لگانے کا طریقہ سن لو۔ مثلاً تمہیں یہ خیال ہوا کہ فلاں وقت میں تلاوت کریں گے، یا نفل نماز پڑھیں گے، لیکن جب وہ وقت آیا تو اب طبیعت میں سستی ہو رہی ہے، اور اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔ تو ایسے

وقت میں اپنے نفس کی ذرا تربیت کیا کرو، اور اس نفس سے کہو کہ اچھا، اس وقت تو تمہیں سستی ہو رہی ہے، اور بستر سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ اگر اس وقت صدر مملکت کی طرف سے یہ پیغام آجائے کہ ہم تمہیں بہت بڑا انعام، یا بہت بڑا منصب یا بہت بڑا عہدہ، یا بہت بڑی ملازمت دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے تم اس وقت فوراً ہمارے پاس آجاؤ، بتاؤ کیا اس وقت بھی سستی رہے گی؟ اور کیا تم یہ جواب دے دو گے کہ میں اس وقت نہیں آسکتا، اس وقت تو مجھے نیند آرہی ہے، کوئی بھی انسان جس میں ذرا بھی عقل و ہوش ہے، بادشاہ کا یہ پیغام سن کر اس کی ساری سستی کاہلی اور نیند دور ہو جائے گی اور خوشی کے مارے فوراً اس انعام کو لینے کے لئے بھاگ کھڑا ہوگا، کہ مجھے اتنا بڑا انعام ملنے والا ہے۔

لہٰذا اگر اس وقت یہ نفس اس انعام کے حصول کے لئے بھاگ پڑے گا تو اس سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں اٹھنے سے کوئی عذر نہیں ہے، اگر حقیقت میں واقعتاً اٹھنے سے کوئی عذر ہوتا تو اس وقت نہ جاتے، بلکہ بستر پر پڑے رہتے، لہٰذا یہ تصور کرو کہ دنیا کا ایک سربراہ حکومت جو بالکل عاجز در عاجز در عاجز ہے، وہ اگر تمہیں ایک منصب کے لئے بلا رہا ہے تو اس کے لیے اتنا بھاگ رہے ہو لیکن وہ احکم الحاکمین، جس کے قبضہ وقدرت میں پوری کائنات ہے۔ دینے والا وہ ہے چھیننے والا وہ ہے اس کی طرف سے بلاوا آرہا ہے۔ تو تم اس کے دربار میں حاضر ہونے میں سستی کر رہے ہو؟، اس تصور سے انشاء اللہ ہمت پیدا ہوگی، اور وہ وقت جو بے کار جا رہا ہے، وہ انشاء اللہ کام میں لگ جائے گا۔

شہوانی خیالات کا علاج

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ جو گناہ کے داعیے اور تقاضے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا علاج اس طرح کرو کہ جب دل میں یہ سخت تقاضہ پیدا ہو کہ اس نگاہ کو غلط جگہ پر استعمال کر کے لذت حاصل کروں، تو اس وقت ذرا سا یہ تصور کرو کہ اگر میرے والد مجھے اس حالت میں دیکھ لیں۔ کیا پھر بھی یہ حرکت جاری رکھوں گا؟ یا اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ میرے شیخ مجھے اس حالت میں دیکھ رہے ہیں کیا پھر بھی یہ کام جاری رکھونگا؟ ظاہر ہے کہ اگر ان میں کوئی بھی میری اس حرکت کو دیکھ رہا ہوگا تو میں اپنی نظر نیچی کر لونگا۔ اور یہ کام نہیں کرونگا۔ چاہے دل میں کتنا شدید تقاضہ پیدا کیوں نہ ہو۔ پھر یہ تصور کرو کہ ان لوگوں کے دیکھنے نہ دیکھنے سے میری دنیا و آخرت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن میری اس حالت کو جو احکم الحاکمین دیکھ رہا ہے۔ اس کی پرواہ مجھے کیوں نہ ہو، اس لئے کہ وہ مجھے اس پر سزا بھی دے سکتا ہے۔ اس خیال اور تصور کی برکت سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس گناہ سے محفوظ رکھیں گے۔

تمہاری زندگی کی فلم چلادی جائے تو؟

حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ کی ایک بات اور یاد آ گئی فرماتے تھے کہ ذرا اس بات کا تصور کرو کہ اگر اللہ تعالیٰ آخرت میں تم سے یوں فرمائیں اچھا اگر تمہیں جہنم سے ڈر لگ رہا ہے، تو چلو ہم تمہیں جہنم سے بچالیں گے، لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ ہم ایک کام کریں گے کہ تمہاری پوری زندگی کی بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک اور مرنے تک جو تم نے گزاری ہے۔ اس کی ہم فلم چلائیں گے اور اس فلم کے دیکھنے والوں میں تمہارا باپ ہوگا تمہاری ماں ہوگی، تمہارے بہن بھائی ہونگے، تمہاری اولاد ہوگی تمہارے شاگرد ہونگے، تمہارے استاذ ہونگے۔ تمہارے دوست احباب ہونگے۔ اور اس فلم کے اندر تمہاری پوری زندگی کا نقشہ سامنے کر دیا جائے گا، اگر تمہیں یہ بات منظور ہو تو پھر جہنم سے بچالیا جائے گا۔

اس کے بعد حضرت فرماتے تھے کہ ایسے موقع پر آدمی شاید آگ کے عذاب کو گوارہ کرلے گا، مگر اس بات کو گوارہ نہیں کریگا کہ ان تمام لوگوں کے سامنے میری زندگی کا نقشہ جائے، لہٰذا جب اپنے ماں، باپ، دوست احباب، عزیز و اقارب اور مخلوق کے سامنے اپنی زندگی کے احوال کا آنا گوارہ نہیں۔ تو پھر ان احوال کا اللہ تعالیٰ کے سامنے آنا کیسے گوارہ کرلو گے؟ اس کو ذرا سوچ لیا کرو۔

کل پر مت ٹالو

بہر حال یہ حدیث جو حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمائی یہ بڑے کام کی حدیث ہے، اور لوح دل پر نقش کرنے کے قابل ہے کہ عمر کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے جو وقت اس وقت ملا ہوا ہے۔ اس کو ٹلاؤ نہیں۔ اور یہ جو انسان سوچتا ہے کہ اچھا یہ کام کل سے کریں گے، وہ کل پھر آتی نہیں، جو کام کرنا ہے، وہ ابھی اور آج ہی شروع کردو، بلا تاخیر شروع کردو۔ کیا پتہ کہ کل آئے یا نہ آئے، کیا پتہ کہ کل کو یہ داعیہ موجود رہے یا نہ رہے، کیا پتہ کہ کل کو حالات سازگار رہیں یا نہ رہیں، کیا پتہ کہ کل کو قدرت رہے یا نہ رہے۔ اور کیا پتہ کہ کل کو زندگی رہے یا نہ رہے۔ اس لئے قرآن کریم میں فرمایا:

﴿وَسَارِعُوٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾(۱)

"اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف جلدی دوڑو، دیر نہ کرو، اور اس جنت کی طرف دوڑوں جس کی چوڑائی سارے آسمان اور زمین ہے"

---

(۱) ال عمران: ۱۳۳

نیک کام میں جلد بازی پسندیدہ ہے

جلد بازی ویسے تو کوئی اچھی چیز نہیں۔ لیکن نیکی کے کام میں جلدی کرنا اور جس نیکی کا خیال دل میں پیدا ہوا ہے، اس نیکی کو کر گزرنا، یہ اچھی بات ہے۔ اور "مسارعت" کے معنی ہیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، ریس کرو، مقابلہ کرو، اگر دوسرا آگے بڑھ رہا ہے تو میں اس سے اور آگے بڑھ جاؤں۔ اور اسی کام کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں یہ وقت عطا فرمایا ہے، اس حدیث کو اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں اتار دے، اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادے۔

پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو

آج ہم لوگوں نے اپنے آپ کو غفلت اور بے فکری میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ غفلت میں بڑھتے چلے جارہے ہیں، اس مضمون کو حضور اقدس ﷺ نے اس طرح ارشاد فرمایا:

عَنْ عُمَرَ بْنِ مَيْمُوْنِ الْاَودِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِرَجُلٍ وَهُوَ يَعِظُهُ: ((اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ، شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ، وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سُقْمِكَ، وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ، وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ))(۱)

"عمر بن میمون اودی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک صاحب کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو بڑھاپے سے پہلے جوانی کو غنیمت سمجھو، بیماری سے پہلے صحت کو غنیمت سمجھو، اور اپنی مالداری کو محتاجی سے پہلے غنیمت سمجھو، اور فرصت کو مشغولی سے پہلے غنیمت سمجھو، اور اپنی زندگی کو موت سے پہلے غنیمت سمجھو"

جوانی کی قدر کرلو

مطلب یہ ہے یہ پانچوں ایسی ہیں کہ ان کا خاتمہ ہونے والا ہے اس وقت جوانی ہے، لیکن جوانی کے بعد بڑھاپا آنے والا ہے، یہ جوانی ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں ہے، بلکہ یا تو اس کے بعد بڑھاپا

---

(۱) کنز العمال، رقم: ۴۳۴۹۰ (۱۵/۱۳۳۱) المستدرك للحاكم، رقم: ۷۸۴۶ (۴/۳۴۱)، شعب الإیمان، رقم: ۱۰۶۴۸ (۷/۲۶۳)، کشف الخفاء، رقم: ۴۳۶ (۱/۱۴۸)، صحیح الترغیب والترهیب، رقم: ۳۳۵۵ (۳/۱۶۸)، مشکاة المصابیح، رقم: ۵۱۷۴ (۳/۱۲۲)

آئے گا یا موت آئے گی، تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لئے اس بڑھاپے سے پہلے اس جوانی کو غنیمت سمجھو۔ یہ قوت اور توانائی، صحت اللہ تعالیٰ نے اس وقت عطا فرمائی ہے، اس کو غنیمت سمجھ کر اچھے کام میں لگالو، بڑھاپے میں تو یہ حال ہو جاتا ہے کہ نہ منہ میں دانت اور نہ پیٹ میں آنت، اس وقت کیا کرو گے جب ہاتھ پاؤں نہیں ہلاسکو گے شیخ سعدی فرماتے ہیں:

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقت پیری گرگ ظالم میشود پرہیزگار

بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی پرہیزگار بن جاتا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ کھا ہی نہیں سکتا، طاقت ہی نہ رہی، اب کس کو کھائے گا۔ ارے جوانی میں توبہ کرنا پیغمبروں کا شیوہ ہے، اس لئے فرمایا کہ بڑھاپے سے پہلے جوانی کو غنیمت سمجھو۔

صحت، مالداری اور فرصت کی قدر کرو

اس وقت صحت ہے، لیکن یاد رکھو، کوئی انسان دنیا کے اندر ایسا نہیں ہے کہ صحت کے بعد اس کو بیماری نہ آئے۔ بیماری ضرور آئے گی۔ لیکن پتہ نہیں کب آجائے، اس لئے اس سے پہلے اس موجودہ صحت کو غنیمت سمجھ لو۔

اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے مالی فراغت اور مالداری عطا فرمائی ہے، کچھ پتہ نہیں کہ یہ کب تک کی ہے، کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے حالات بدل گئے ہیں، اچھے خاصے امیر کبیر تھے، مگر اب فقیر ہو گئے۔ خدا جانے کب کیا حال پیش آجائے، اس وقت کے آنے سے پہلے اس مالداری کو غنیمت سمجھو اور اس کو اپنی آخرت سنوارنے کے لئے استعمال کرلو۔

اور اپنی فرصت کو مشغولی سے پہلے غنیمت سمجھو، یعنی فرصت کے جو لمحات اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں۔ یہ مت سمجھو کہ یہ ہمیشہ باقی رہیں گے، کبھی نہ کبھی مشغولی ضرور آئے گی۔ اس لئے اس فرصت کو صحیح کام میں لگالو۔ اور زندگی کو موت سے پہلے غنیمت سمجھو۔

صبح کو یہ دعائیں کرلو

اور اس زندگی کے اوقات کو کام میں لینے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی صبح سے شام تک کی زندگی کا نظام اوقات بناؤ، اور پھر اس کا جائزہ لو کہ میں کیا کیا کر رہا ہوں، اور میں اعمال خیر کے اندر کیا کیا اضافہ کر سکتا ہوں، ان کا اضافہ کرو۔ اور میں کن کن گناہوں کے اندر مبتلا ہوں ان کو چھوڑو، اور صبح کو نماز پڑھ کر یہ دعا مانگا کرو کہ یا اللہ! یہ دن آنے والا ہے میں باہر نکلوں گا۔ خدا جانے کیا حالات پیش آئیں۔ یا

اللہ! میں اس کا ارادہ کر رہا ہوں کہ آج کے دن کو آخرت کے لئے ذخیرہ بناؤں گا، اے اللہ! مجھے اس کی توفیق عطا فرما، حضور اقدس ﷺ صبح کے وقت دعائیں مانگا کرتے تھے۔ ان دعاؤں کو یاد کر لینا چاہئے، اور صبح کو وہ دعائیں ضرور مانگنی چاہئے، چنانچہ آپ ﷺ دعا فرماتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَ مَا فِیْ ھٰذَا الْیَوْمِ وَخَیْرَ مَا بَعْدَہٗ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا فِیْ ھٰذَا الْیَوْمِ وَشَرِّ مَا بَعْدَہٗ))(۱)

آپ ﷺ یہ دعا بھی مانگا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَ ھٰذَا الْیَوْمِ وَفَتْحَہٗ وَنَصْرَہٗ وَنُوْرَہٗ وَبَرَكَتَہٗ وَھُدَاہُ))(۲)

حضور اقدس ﷺ ایسی ایسی دعائیں بتا گئے کہ دین و دنیا کی کوئی حاجت نہیں چھوڑی، جن کو یہ دعائیں یاد ہوں، وہ صبح کے وقت ان دعاؤں کو پڑھ لے۔ اور جن کو یہ دعائیں یاد نہ ہوں، وہ اُردو میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرلے کہ یا اللہ! یہ دن شروع کر رہا ہوں، اور یہ ارادہ کر رہا ہوں کہ اس دن کے چوبیس گھنٹوں کو صحیح استعمال کرونگا، غلط استعمال اور بے فائدہ ضائع کرنے سے بچاؤنگا، میں تو ارادہ کر رہا ہوں، لیکن یا اللہ میں کیا، اور میرا ارادہ کیا، میرا عزم کیا۔ میری ہمت اور میرے حوصلے کی کیا حقیقت ہے، عزم دینے والے بھی آپ ہیں، ہمت دینے والے بھی آپ ہیں، حوصلہ دینے والے بھی آپ ہیں۔ آپ ہی اپنے فضل سے مجھے ایسے راستے پر لگا دیجئے، ایسے حالات پیدا فرما دیجئے کہ میں اس دن کے چوبیس گھنٹوں کو آپ کی مرضی کے مطابق صرف کردو، بس صبح اٹھ کر روزانہ یہ دعا مانگ لیا کرو، انشاء اللہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس دن کے اوقات کو ضائع ہونے سے بچالیں گے۔

آگے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول نقل فرماتے ہیں:

"عَنِ الْحَسَنِ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ اَنَّہٗ كَانَ یَقُوْلُ: اَدْرَكْتُ اَقْوَامًا كَانَ اَحَدُھُمْ اَشَحَّ عَلیٰ عُمُرِہٖ مِنْہُ عَلیٰ دَرَاھِمِہٖ وَدَنَانِیْرِہٖ

"عَنِ الْحَسَنِ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ اَنَّہٗ كَانَ یَقُوْلُ: اِبْنَ آدَمَ! اِیَّاكَ وَالتَّسْوِیْفَ، فَاِنَّكَ بِیَوْمِكَ وَلَسْتَ بِغَدٍ، وَاِنْ یَّكُنْ غَدٌ لَّكَ فَكِسْ فِیْ غَدٍ كَمَا كِسْتَ فِی الْیَوْمِ وَاِلَّا یَكُنْ لَكَ لَمْ تَنْدَمْ عَلیٰ مَا فَرَّطْتَ فِی الْیَوْمِ"(۳)

---

(۱) زادالمعاد(۲/۳۳۲)، حصن المسلم، رقم:۷۷(۱/۴۲)، إحياء علوم الدين(۱/۳۲۷)، تحفة الذاكرين بعدة الحصن الحصين(۱/۹٤)

(۲) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب مايقول إذا أصبح، رقم: ٤٤٢١

(۳) كتاب الزهد لابن المبارك، رقم:۸(۱/٤)، اقتضاء العلم العمل، رقم:۱۹۹(۱/۱۱۳)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں، اور ہمارے مشائخ اور طریقت کے جتنے سلسلے ہیں ان سب کی انتہاء حضرت بصری رحمۃ اللہ علیہ پر ہوتی ہے، یعنی ابتداء حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور ان کے بعد حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ہیں، چنانچہ جو حضرات شجرہ پڑھتے ہیں ان کو معلوم ہوگا کہ اس میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی آتا ہے اس طرح ہم سب ان کے احسان مند ہیں۔ ہم سب کی گردنیں ان کے احسانات سے جھکی ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ ہم اللہ تعالیٰ نے جو کچھ عطا فرمایا ہے۔ وہ انہی بزرگوں کے واسطے سے عطا فرمایا ہے، بہر حال یہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔

وقت سونا چاندی سے زیادہ قیمتی ہے

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ان کے دو قول نقل کئے ہیں، پہلے قول میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسے لوگوں کو پایا ہے، "لوگوں" سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ اس لئے کہ یہ خود تابعین میں سے ہیں، اس لئے ان کے اساتذہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تھے، فرماتے ہیں کہ میں نے ان لوگوں کو پایا ہے اور ان لوگوں کی صحبت اٹھائی ہے جن کا اپنے عمر کے لمحات اور اوقات پر بخل سونے چاندی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اور اس کو حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ اور اگر کسی کے پاس سونا چاندی آجائے، تو وہ اس کو بڑی حفاظت سے رکھتا ہے۔ اور اس کو بے جگہ رکھنے سے پرہیز کرتا ہے۔ تاکہ کہیں چوری نہ ہو جائے، یا ضائع نہ ہو جائے۔ اس طرح یہ وہ لوگ تھے جو سونے چاندی سے کہیں زیادہ اپنی عمر کے لمحات کی حفاظت کرتے تھے۔ اس لئے کہ زندگی کا ایک لمحہ سونے چاندی کی اشرفیوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عمر کا کوئی لمحہ کسی بے کار کام میں، یا ناجائز کام میں، یا غلط کام میں صرف ہو جائے۔ وہ لوگ وقت کی قدر و قیمت پہچانتے تھے کہ عمر کے جو لمحات اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں۔ یہ بڑی عظیم نعمت ہے کہ اس کی کوئی حد و حساب نہیں، اور یہ نعمت کب تک حاصل رہے گی؟ اس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ اس لئے اس کو خرچ کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔

دو رکعت نفل کی قدر

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبر کے پاس سے گزر رہے تھے۔ تو اس وقت صحابہ آپ کے

ساتھ تھے۔ ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا یہ جو دو رکعت نفل کبھی جلدی جلدی میں تم پڑھ لیتے ہو، اور ان کو تم بہت معمولی سمجھتے ہو۔ لیکن یہ شخص جو قبر میں لیٹا ہوا ہے۔ اس کے نزدیک یہ دو رکعت نفل ساری دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں۔ اس لئے کہ یہ قبر والا شخص اس بات پر حسرت کر رہا ہے کہ کاش مجھے زندگی میں دو منٹ اور مل جاتے تو میں اس میں دو رکعت نفل اور پڑھ لیتا، اور اپنے نامہ اعمال میں اضافہ کر لیتا۔

مقبرے سے آواز آرہی ہے

ہمارے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کہی ہوئی ایک نظم پڑھنے کے قابل ہے۔ جو اصل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلام سے ماخوذ ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے۔ ''مقبرے کی آواز'' جیسا کہ ایک شاعرانہ تخیل ہوتا ہے کہ ایک قبر کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ تو وہ قبر والا گزرنے والے کو آواز دے رہا ہے:

مقبرے پر گزرنے والے سن
ٹھہر، ہم پر گزرنے والے سن
ہم بھی ایک دن زمین پر چلتے تھے
باتوں باتوں میں ہم مچلتے تھے

یہ کہہ کر اس نے زبان حال سے اپنی داستان سنائی ہے کہ ہم بھی اس دنیا کے ایک فرد تھے۔ تمہاری طرح کھاتے پیتے تھے۔ لیکن ساری زندگی میں ہم نے جو کچھ کمایا، اس میں سے ایک ذرہ بھی ہمارے ساتھ نہیں آیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جو کچھ نیک عمل کرنے کی توفیق ہوگئی تھی۔ وہ تو ساتھ آگیا، لیکن باقی کوئی چیز ساتھ نہ آئی۔ اس لئے وہ گزرنے والے کو نصیحت کر رہا ہے کہ آج ہمارا یہ حال ہے کہ ہم فاتحہ کو ترستے ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ آکر ہم پر فاتحہ پڑھ کر اس کا ایصال ثواب کر دے، اور اے گزرنے والے، تجھے ابھی تک زندگی کے یہ لمحات میسر ہیں۔ جنہیں ہم ترس رہے ہیں۔

صرف ''عمل'' ساتھ جائے گا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے کے کیا عجیب و غریب انداز ہیں۔ کس کس طریقے سے اپنی امت کو سمجھایا ہے۔ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مردے کو قبرستان لے جایا جاتا ہے تو تین چیزیں اس کے ساتھ جاتی ہیں۔ ایک اس کے عزیز و اقارب، اور رشتہ دار اس کو چھوڑنے کے لئے قبر تک جاتے ہیں۔ دوسرے اس کا مال، مثلاً چارپائی وغیرہ۔ اور تیسرے اس کا عمل، اور پھر پہلی دو

چیزیں یعنی رشتہ دار، اور مال قبر تک اس کو پہنچانے کے بعد واپس آجاتے ہیں۔ لیکن آگے جو چیز اس کے ساتھ جاتی ہے۔ وہ صرف اس کا عمل ہے۔(۱)

کسی نے خوب کہا ہے:

شکریہ اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ
اب اکیلے ہی گزر جائیں گے اس منزل سے ہم

وہاں کوئی نہیں جائے گا۔ بہر حال اس ''مقبرے کی آواز'' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہ سبق دیا کہ جب بھی کسی قبر کے پاس سے گزرو، ذرا سی دیر کے لئے یہ سوچ لیا کرو کہ یہ بھی ہماری طرح ایک انسان تھا۔ اور ہماری طرح اس کو بھی زندگی میسر تھی۔ اس کا بھی مال تھا، دولت تھی۔ اس کے بھی عزیز و رشتہ دار تھے، اس کے بھی چاہنے والے تھے، اس کی بھی خواہشات تھیں، اس کے بھی جذبات تھے، مگر آج وہ سب رخصت ہو چکیں، ہاں اگر کوئی چیز اس کے ساتھ ہے۔ تو وہ صرف اس کا عمل ہے۔ اور اب یہ چند لمحات کو ترس رہا ہے کہ اگر چند لمحات مجھے مل جائیں تو میں اپنی نیکیوں میں اضافہ کرلوں۔

موت کی تمنا مت کرو

اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''کبھی موت کی تمنا نہ کرو، چاہے تم کتنی ہی مصیبتوں اور تکلیفوں میں ہو''(۲)

اس وقت بھی یہ دعا نہ کرو کہ یا اللہ! مجھے موت دے دے۔ اس لئے کہ اگر چہ تم تکلیفوں میں گھرے ہوئے ہو لیکن عمر کے لمحات جو اس وقت میسر ہیں۔ اس میں پتہ نہیں کہ کس وقت کس نیکی کی توفیق ہو جائے۔ اور پھر اس نیکی کے عوض اللہ تعالیٰ کے یہاں بیڑہ پار ہو جائے۔ اس لئے کبھی موت کی تمنا نہ کرو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، یہ دعا کرو کہ یا اللہ، آپ نے زندگی کے جو لمحات عطا فرمائے ہیں۔ ان کو نیک کاموں میں اور اپنی رضا کے کاموں میں صرف فرما دے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب سکرات الموت، رقم:٦٠٣٣، صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب، رقم:٥٢٦٠، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ماجاء مثل ابن آدم و أهله و ولده وماله وعمله، رقم:٢٣٠١، سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب النهی عن سب الأموات، رقم:١٩١١، مسند أحمد، رقم:١١٦٣٧

(۲) صحیح البخاری، کتاب التمنی، باب مایکره من التمنی، رقم:٦٦٩٢، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب فی البناء والخراب، رقم:٤١٥٣، مسند أحمد، رقم:٢٥٦٤٠

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کشف

حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ میں سے تھے، اور بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے، اور صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے میرے استاد مولانا فضل محمد صاحب مدظلہم سوات میں ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو عافیت کے ساتھ سلامت رکھے۔ انہوں نے خود اپنا واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ حضرت میاں صاحب قدس اللہ سرہ حج سے واپس تشریف لائے، ہم اس وقت طالب علم تھے۔ اور دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے تھے، طلبہ میں سے ایک طالب علم نے کہا کہ اس نے حضرت میاں صاحب کے پاس جانے کی وجہ یہ بیان کی وہاں کھجوریں ملیں گی، ہمیں یہ بات بری تو لگی کہ یہ طالب علم میاں صاحب کے پاس صرف کھجور کھانے کے لئے جانا چاہتا ہے، حالانکہ وہ تو اتنے بڑے بزرگ ہیں اور حج کر کے آئے ہیں ان سے تو جا کر دعائیں لینی چاہئے، چنانچہ ہم چھ سات طلبہ ان سے ملاقات کے لئے چلے۔ جب میاں صاحب کے گھر پہنچے اور ان کو جا کر سلام کیا تو میاں صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے خادم سے فرمایا کہ یہ صاحب تو کھجوریں کھانے آئے ہیں، ان کو تو کھجوریں دے کر رخصت کر دو اور باقی طلبہ کو اندر بلا لو۔ ایسے صاحب کشف بزرگ تھے۔

زیادہ باتوں سے بچنے کا طریقہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے فرمایا کہ مولوی شفیع صاحب آج آپس میں عربی میں بات کریں گے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ آج تک کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ آج معلوم نہیں کیا بات ہو گئی، میں نے پوچھا کہ کیوں؟ کوئی وجہ تو بتائیے؟ فرمایا کہ جب ہم آپس میں بیٹھتے ہیں تو بعض اوقات فضول ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور یہ زبان قابو میں نہیں رہتی، اور بے تکلف عربی نہ تم بول سکتے ہو اور نہ میں بول سکتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ صرف ضرورت کی بات ہو گی، بے ضرورت بات نہ ہو گی۔

ہماری مثال

پھر فرمایا کہ ہماری مثال اس شخص جیسی ہے جو بہت مال و دولت سونا چاندی لے کر سفر پر روانہ ہوا تھا اور پھر وہ سارا مال و دولت اور سونا چاندی راستے میں خرچ ہو گیا۔ اور اب صرف چند سکے باقی رہ گئے اور سفر لمبا ہے۔ اس لئے اب ان چند سکوں کو بہت دیکھ بھال کر بہت احتیاط سے خرچ کرتا ہے۔ تا کہ وہ سکے بے جا خرچ نہ ہو جائیں، پھر فرمایا کہ ہماری بہت بڑی عمر تو بہت سے فضول کاموں میں

گزر گئی۔ اور اب چند لمحات باقی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی کسی بے فائدہ کام میں صرف ہو جائیں، یہ وہی بات ہے جو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی، حقیقت یہ ہے کہ دیوبند میں اللہ تعالیٰ نے جو علماء پیدا فرمائے تھے انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یادیں تازہ کر دیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور وقت کی قدر

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے خود حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کو دیکھا کہ مرض الموت میں جب بیمار اور صاحب فراش تھے، اور معالجوں اور ڈاکٹروں نے ملنے جلنے سے منع کر رکھا تھا۔ اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ زیادہ بات نہ کریں، ایک دن آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ لیٹے لیٹے اچانک آنکھ کھولی۔ اور فرمایا کہ بھائی! مولوی محمد شفیع صاحب کو بلاؤ۔ چنانچہ بلایا گیا، جب وہ تشریف لائے تو فرمایا کہ آپ "احکام القرآن" لکھ رہے ہیں، مجھے ابھی خیال آیا کہ قرآن کریم کی جو فلاں آیت ہے، اس سے فلاں مسئلہ نکلتا ہے اور یہ مسئلہ اس سے پہلے میں نے کہیں نہیں دیکھا، میں آنے آپ کہ اس لئے بتادیا کہ جب آپ اس آیت پر پہنچیں تو اس مسئلے کو بھی لکھ لیجئے گا، یہ کہہ کر پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آنکھیں کھولیں اور فرمایا کہ فلاں شخص کو بلاؤ۔ جب وہ صاحب آگئے تو ان سے متعلق کچھ کام بتا دیا۔ جب بار بار ایسا کیا تو مولانا شبیر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت کی خانقاہ کے ناظم تھے۔ اور حضرت تھانوی سے بھی بے تکلف تھے۔ اور انہوں نے حضرت سے فرمایا کہ حضرت، ڈاکٹروں اور حکیموں نے بات چیت کرنے سے منع کر رکھا ہے۔ مگر آپ لوگوں کو بار بار بلا کر ان سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ خدا کے لئے آپ ہماری جان پر تو رحم کریں، ان کے جواب میں حضرت والا نے کیا عجیب جملہ ارشاد فرمایا۔ فرمایا کہ بات تو ٹھیک کہتے ہو، لیکن میں یہ سوچتا ہوں "وہ لمحات زندگی کس کام کے جو کسی کی خدمت میں صرف نہ ہوں، اگر کسی کی خدمت کے اندر عمر گزر جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔"

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور نظام الاوقات

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں صبح سے لے کر شام تک پورا نظام الاوقات مقرر تھا، یہاں تک کہ آپ کا یہ معمول تھا کہ عصر کی نماز کے بعد اپنی ازواج کے پاس تشریف لے جاتے تھے۔ آپ کی دو بیویاں تھیں، دونوں کے اس عصر کے بعد عدل و انصاف کے ساتھ ان کی خیر و برکت کے لئے اور ان سے بات چیت کے لئے جایا کرتے تھے۔ اور یہ بھی درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تھی حدیث میں

آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ عصر کی نماز پڑھنے کے بعد ایک ایک کر کے تمام ازواج مطہرات کے پاس ان کی خبر گیری کے لئے تشریف لے جاتے تھے، اور یہ آپ کا روزانہ کا معمول تھا، اب دیکھئے کہ دنیا کے سارے کام بھی ہو رہے ہیں۔ جہاد بھی ہو رہے ہیں، تعلیم بھی ہو رہی ہے، تدریس بھی ہو رہی ہے۔ دین کے سارے کام بھی ہو رہے ہیں اور ساتھ میں ازواج مطہرات کے پاس جا کر ان کی دل جوئی بھی ہو رہی ہے۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کو نبی کریم ﷺ کی سنت پر ڈھالا ہوا تھا اور اسی اتباع سنت میں آپ بھی عصر کے بعد اپنی دونوں بیویوں کے پاس جایا کرتے تھے لیکن وقت مقرر تھا۔ مثلاً پندرہ منٹ ایک بیوی کے پاس بیٹھیں گے۔ اور پندرہ منٹ دوسری بیوی کے پاس بیٹھیں گے۔ چنانچہ آپ کا معمول تھا کہ گھڑی دیکھ کر داخل ہوتے۔ اور گھڑی دیکھ کر باہر نکل آتے۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ پندرہ منٹ کے بجائے سولہ منٹ ہو جائیں۔ یا چودہ منٹ ہو جائیں، بلکہ انصاف کے تقاضے کے مطابق پورے پندرہ پندرہ منٹ تو دونوں کے پاس تشریف رکھتے، تول تول کر ایک منٹ کا حساب رکھ کر خرچ کیا جا رہا ہے۔

دیکھئے، اللہ تعالیٰ نے وقت کی جو نعمت عطا فرمائی ہے۔ اس کو اس طرح ضائع نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بڑی زبردست دولت دی ہے، ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، اور یہ دولت جا رہی ہے۔ یہ پگھل رہی ہے۔ کسی نے خوب کہا:

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم
چپکے چپکے رفتہ رفتہ دم بدم

جس طرح برف ہر لمحے پگھلتی رہتی ہے، اسی طرح انسان کی عمر ہر لمحے پگھل رہی ہے، اور جا رہی ہے۔

”سال گرہ“ کی حقیقت

جب عمر کا ایک سال گزر جاتا ہے تو لوگ سالگرہ مناتے ہیں۔ اور اس میں اس بات کی بڑی خوشی مناتے ہیں، کہ ہماری عمر کا ایک سال پورا ہو گیا، اور اس میں موم بتیاں جلاتے ہیں۔ اور کیک کاٹتے ہیں اور خدا جانے کیا کیا خرافات کرتے ہیں۔ اس پر اکبر الہ آبادی مرحوم نے بڑا حکیمانہ شعر کہا ہے۔ وہ یہ:

جب سالگرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا
یہاں اور گرہ سے ایک برس جاتا ہے

”عقدہ“ بھی عربی میں ”گرہ“ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گرہ میں زندگی کے جو برس دیئے تھے، اس میں ایک اور کم ہو گیا۔ ارے یہ رونے کی بات ہے، یا خوشی کی بات ہے؟ یہ تو افسوس کرنے کا موقع ہے کہ تیری زندگی کا ایک سال اور کم ہو گیا۔

گزری ہوئی عمر کا مرثیہ

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ نے اپنی عمر کے تیس سال گزرنے کے بعد ساری عمر اس پر عمل فرمایا کہ جب عمر کے کچھ سال گزر جاتے تو ایک مرثیہ کہا کرتے تھے۔ عام طور پر لوگوں کے مرنے کے بعد ان کا مرثیہ کہا جاتا ہے۔ لیکن میرے والد صاحب اپنا مرثیہ خود کہا کرتے تھے۔ اور اس کا نام رکھتے "مرثیہ عمر رفتہ" یعنی گزری ہوئی عمر کا مرثیہ، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں فہم عطا فرمائیں تب یہ بات سمجھ میں آئے کہ واقعہ یہی ہے کہ جو وقت گزر گیا، وہ اب واپس آنے والا نہیں، اس لئے اس پر خوشی منانے کا موقع نہیں ہے، بلکہ آئندہ کی فکر کرنے کا موقع ہے کہ بقیہ زندگی کا وقت کس طریقے سے کام میں لگ جائے۔

آج ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ بے قیمت چیز وقت ہے، اس کو جہاں چاہا، کھو دیا، اور برباد کر دیا۔ کوئی قدر و قیمت نہیں، گھنٹے، دن مہینے بے فائدہ کاموں میں اور فضولیات میں گزر رہے ہیں جس میں نہ تو دنیا کا فائدہ، نہ دین کا فائدہ۔

کاموں کی تین قسمیں

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بھی کام ہیں، وہ تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن میں کچھ نفع اور فائدہ ہے، چاہے دین کا فائدہ ہو یا دنیا کا فائدہ ہو، دوسرے وہ کام ہیں جو مضرت والے اور نقصان دہ ہیں۔ ان میں یا تو دین کا نقصان ہے یا دنیا کا نقصان ہے، اور تیسرے وہ کام ہیں، جن میں نہ نفع ہے نہ نقصان ہے۔ اس کا نفع، نہ دین کا نفع، نہ دنیا کا نقصان، نہ دین کا نقصان، بلکہ فضول کام ہیں۔ اس کے بعد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جہاں تک ان کاموں کا تعلق ہے، جو نقصان دہ ہیں، ظاہر ہے کہ ان سے تو بچنا ضروری ہے۔ اور اگر غور سے دیکھو تو کاموں کی یہ جو تیسری قسم ہے۔ جس میں نہ نقصان ہے اور نہ نفع ہے، وہ بھی حقیقت میں نقصان دہ ہیں۔ اس لئے کہ جب تم ایسے کام میں اپنا وقت لگا رہے ہو۔ جس میں کوئی نفع نہیں ہے، حالانکہ اس وقت کو تم ایسے کام میں لگا سکتے تھے۔ جس میں نفع ہو، تو گویا کہ تم نے اس وقت کو برباد کر دیا۔ اور اس وقت کے نفع کو ضائع کر دیا۔

یہ بھی حقیقت میں بڑا نقصان ہے

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ فرض کریں کہ ایک شخص ایک جزیرے میں گیا، اور اس جزیرہ میں ایک سونے کا ٹیلہ ہے۔ اس ٹیلے کے مالک نے اس شخص سے کہا کہ جب تک تمہیں ہماری طرف سے

اجازت ہے، اس وقت تک تم اس میں سے جتنا سونا چاہو نکال لو، وہ سونا تمہارا ہے۔ لیکن ہم کسی بھی وقت تمہیں اچانک سونا نکالنے سے منع کر دیں گے کہ بس اب اجازت نہیں۔ البتہ ہم تمہیں یہ نہیں بتائیں گے کہ کس وقت تمہیں سونا نکالنے سے منع کر دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد تمہیں جبراً اس جزیرے سے نکلنا پڑے گا، کیا وہ شخص کوئی لمحہ ضائع کرے گا؟ کیا وہ شخص یہ سوچے گا کہ ابھی تو بہت وقت ہے۔ پہلے تھوڑی سی تفریح کر کے آ جاؤں۔ پھر سونا نکال لوں گا، وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ تو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر یہ کوشش کرے گا کہ اس میں سے جتنا زیادہ سے زیادہ سونا نکال سکتا ہوں، وہ نکال لوں۔ اس لئے کہ جو سونا نکال لوں گا۔ وہ میرا ہو جائے گا، اب اگر وہ شخص سونا نکالنے کے بجائے ایک طرف الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ تو بظاہر اس میں تو نہ نفع ہے، نہ نقصان ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ بہت بڑا نقصان ہے۔ وہ نقصان یہ ہے کہ جو بہت بڑا نفع حاصل ہونا تھا۔ وہ صرف اپنی غفلت سے چھوڑ دیا۔

ایک تاجر کا انوکھا نقصان

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کے پاس ایک تاجر آیا کرتے تھے۔ ان کی بہت بڑی تجارت تھی۔ ایک مرتبہ وہ آ کر کہنے لگے کہ حضرت کیا عرض کروں، کوئی دعا فرما دیں، بہت سخت نقصان ہو گیا ہے، والد صاحب فرماتے ہے کہ مجھے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا کہ یہ بے چارہ پتہ نہیں کس مصیبت کے اندر گرفتار ہو گیا، پوچھا کہ کتنا نقصان ہو گیا، اس نے کہا حضرت کروڑوں کا نقصان ہو گیا، والد صاحب نے فرمایا کہ ذرا تفصیل تو بتاؤ کہ کس قسم کا نقصان ہوا؟ جب انہوں نے اس نقصان کی تفصیل بتائی تو معلوم ہوا کہ کروڑوں کا ایک سودا ہونے والا تھا، وہ نہیں ہو پایا۔ بس اس کے علاوہ جو لاکھوں پہلے سے آ رہے تھے، وہ اب بھی آ رہے ہیں۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی، لیکن ایک سودا جو ہونے والا تھا، وہ نہیں ہوا۔ اس کے نہ ہونے کے بارے میں بتایا کہ یہ بہت زبردست نقصان ہو گیا، حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ اس شخص نے نفع نہ ہونے کو نقصان سے تعبیر کر دیا۔ یعنی جس نفع کی توقع تھی وہ نہیں ہوا، اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت بڑا نقصان ہو گیا۔

اس واقعہ کے بیان کے بعد والد صاحب فرماتے کہ کاش کہ یہ بات وہ دین کے بارے میں بھی سوچ لیتا کہ اگر میں اس وقت کو ڈھنگ کے کام میں لگاتا۔ تو اس کے ذریعہ دین کا اور آخرت کا اتنا بڑا فائدہ ہوتا، وہ رہ گیا، جس کی وجہ سے یہ نقصان ہو گیا۔

ایک بنیے کا قصہ

ایک بات ہے تو ہنسی کی۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ سمجھنے والی عقل دے تو اس میں سے بھی کام کی باتیں

نکلتی ہیں۔ ہمارے ایک بزرگ جو مشہور حکیم ہیں۔ انہوں نے ایک دن یہ قصہ سنایا کہ ایک بنیا عطار تھا۔ جو دوائیں بیچا کرتا تھا۔ اس کا بیٹا بھی اس کے ساتھ دوکان پر بیٹھتا تھا۔ ایک دن اس کو کسی ضرورت سے کہیں جانا پڑا تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ بیٹا۔ مجھے ذرا ایک کام سے جانا ہے، تو ذرا دوکان کی دیکھ بھال کرنا۔ اور احتیاط سے سودا وغیرہ فروخت کرنا، بیٹے نے کہا بہت اچھا۔ اور اس بنیے نے اپنے بیٹے کو ہر چیز کی قیمت بتا دی کہ فلاں چیز کی یہ قیمت ہے، فلاں چیز کی یہ قیمت ہے۔ یہ کہہ کر وہ بنیا چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک گاہک آیا۔ اور شربت کی دو بوتلیں اس نے خریدیں۔ بیٹے نے وہ دو بوتلیں سو سو روپے کی فروخت کر دیں، تھوڑی دیر کے بعد جب باپ واپس آیا تو اس نے بیٹے سے پوچھا کہ کیا کیا بکری ہوئی؟ بیٹے نے بتا دیا کہ فلاں فلاں چیزیں بیچ دیں اور یہ دو بوتلیں بھی بیچ دیں۔ باپ نے پوچھا کہ یہ بوتلیں کتنے میں بیچیں؟ بیٹے نے کہا کہ سو سو روپے کی بیچ دیں۔ یہ جواب سن کر باپ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور بیٹے سے کہا کہ تم نے تو میرا کباڑہ کر دیا ہے بوتلیں تو دو دو ہزار کی تھیں، تو نے سو سو روپے کی بیچ دیں؟ بڑا ناراض ہوا۔ اب بیٹا بھی بڑا رنجیدہ ہوا کہ افسوس، میں نے باپ کا اتنا بڑا نقصان کر دیا۔ اور بیٹھ کر رونے لگا۔ اور باپ سے معافی مانگنے لگا کہ ابا جان، مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ میں نے آپ کا بہت بڑا نقصان کرا دیا۔ جب باپ نے دیکھا کہ یہ بہت ہی رنجیدہ غمگین اور پریشان ہے۔ تو اس نے بیٹے سے کہا کہ بیٹا، اتنی زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ تو نے جو بوتلیں سو سو روپے کی بیچیں۔ اس سو روپے میں اٹھانوے روپے اب بھی نفع کے ہیں۔ باقی اگر تم زیادہ ہوشیاری سے کام لیتے تو ایک بوتل پر دو ہزار روپے مل جاتے، بس یہ نقصان ہوا، باقی گھر سے گیا کچھ نہیں۔

بہر حال! تاجر کو اگر نفع نہ ہو تو وہ کہتا ہے کہ بہت نقصان ہوا تو بھائی۔ جب دنیا کی تجارت میں یہ اصول ہے کہ نفع نہ ہونا نقصان ہے۔ تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دین کے بارے میں یہ سوچ لو اگر یہ لمحات زندگی ایسے کام میں لگا دیئے جس میں نفع نہیں ہوا۔ تو حقیقت میں یہ بھی نقصان ہے نفع کا سودا نہیں۔ بلکہ نقصان کا سودا ہے۔ اس لئے کہ اگر تم چاہتے تو اس سے آخرت میں بہت نفع حاصل کر لیتے۔ اس طرح اپنی زندگی گزار کر دیکھو۔

موجودہ دور اور وقت کی بچت

اور یہ بھی ذرا سوچو کہ اللہ جل جلالہ نے ہمیں اس دور میں کتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور ایسی ایسی نعمتیں ہمیں دے دیں کہ جو ہمارے آباء واجداد کے تصور میں بھی نہیں تھیں۔ مثلاً پہلے یہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی چیز بنانی ہوتی تو پہلے لکڑیاں لائی جائیں، پھر ان کو سکھایا جائے۔ پھر ان کو سلگایا جائے۔ اب اگر

ذرا سی چائے بھی بنانی ہے تو اس کے لئے ادھا گھنٹہ چاہئے۔ اب الحمدللہ گیس کے چولھے ہیں، اس کا ذرا سا کان مروڑا، اور دو منٹ کے اندر چائے تیار ہو گئی، اب صرف چائے کی تیاری پر اٹھائیس منٹ بچے پہلے یہ ہوتا تھا کہ اگر روٹی پکانی ہے تو پہلے گندم آئے گا۔ اس کو چکی میں پیسا جائے گا۔ پھر آٹا گوندیں گے، پھر جا کر روٹی پکے گی۔ اب ذرا سا بٹن دبایا اب مسالہ بھی تیار ہے۔ آٹا بھی تیار ہے، اس کام میں بھی بہت وقت بچ گیا۔ اب بتاؤ یہ وقت کہاں گیا؟ کس کام میں آیا؟ کہاں صرف ہوا؟ لیکن اب بھی خواتین سے کہاں جائے کہ فلاں کام کرلو۔ تو جواب ملتا ہے کہ فرصت نہیں ملتی۔ پہلے زمانے میں یہ تمام کام کرنے کے باوجود خواتین کو عبادت کی بھی فرصت تھی، تلاوت کی بھی فرصت تھی، ذکر کرنے کی بھی فرصت تھی، اللہ کو یاد کرنے کی بھی فرصت تھی، اب اللہ تعالیٰ نے ان نئے آلات کی نعمت عطا فرما دی تو اب ان خواتین سے پوچھا جائے کہ تلاوت کی توفیق ہو جاتی ہے۔؟ تو جواب ملتا ہے کہ کیا کریں، گھر کے کام دھندوں سے فرصت نہیں ملتی، پہلے زمانے میں سفر یا تو پیدل ہوتا تھا، یا گھوڑوں اور اونٹوں پر ہوتا تھا۔ اس کے بعد تانگوں اور سائیکلوں پر ہونے لگا۔ اور جس مسافت کو طے کرنے میں مہینوں صرف ہوتے تھے۔ اب گھنٹوں میں وہ مسافت طے ہو جاتی ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے گزشتہ کل میں اس وقت مدینہ منورہ میں تھا۔ اور کل ظہر، عصر مغرب، عشاء چاروں نمازیں مدینہ طیبہ میں ادا کیں اور آج جمعہ کی نماز یہاں آکر ادا کر لی۔ پہلے کوئی شخص کیا یہ تصور کر سکتا تھا، کہ کوئی شخص مدینہ منورہ سے اگلے دن واپس لوٹ آئے۔ بلکہ پہلے تو اگر کسی کو حرمین شریفین کے سفر پر جانا ہوتا تو لوگوں سے اپنی خطائیں معاف کرا کر جایا کرتے تھے۔ اس لئے کہ مہینوں کا سفر ہوتا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے سفر کو اتنا آسان فرما دیا ہے کہ آدمی چند گھنٹوں میں وہاں پہنچ جاتا ہے۔ جو سفر پہلے ایک مہینے میں ہوتا تھا، تو اب ایک دن میں ہو گیا۔ اور انتیس دن بچ گئے۔ اب اس کا حساب لگاؤ کہ وہ انتیس دن کہاں گئے؟ اور کس کام میں صرف ہو گئے؟ معلوم ہوا کہ وہ انتیس دن ضائع کر دیئے اور اب بھی وہی حال ہے کہ فرصت نہیں، وقت نہیں، کیوں وقت نہیں؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں اس لئے عطا فرمائی تھیں کہ وقت بچا کر مجھے یاد کرو۔ اور میری طرف رجوع کرو۔ اور آخرت کی تیاری کرو۔ اور اس کی فکر کرو۔

شیطان نے ٹیپ ٹاپ میں لگا دیا

شیطان نے یہ سوچا کہ یہ جو وقت بچ گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کی یاد میں صرف ہو جائے اس لئے اس نے اور دھندے نکال دیے۔ مثلاً اس نے ہم لوگوں کو ٹیپ ٹاپ میں لگا دیا ہے اور یہ خیال دل میں ڈالا کہ گھر میں فلاں چیز ہونی چاہئے، اور فلاں چیز ہونی چاہئے، اور اب چیز کی خریداری کے لئے

پیسے بھی ہونے چاہئیں اور پیسے کمانے کے لئے فلاں کام کرنا چاہئے۔ تو اب ایک نیا دھندا شروع ہو گیا۔ آج ہم سب اس کے اندر مبتلا ہیں۔ سب ایک کشتی کے سوار ہیں، مل کر بیٹھ گئے ہیں تو اب گپ شپ ہو رہی ہیں۔ اور ایک بے کار کام میں وقت گزر رہا ہے۔ اس وقت کا کوئی صحیح مصرف نہیں ہے۔ یہ سب وقت کو ضائع کرنے والے کام ہیں۔

خواتین میں وقت کی ناقدری

وقت ضائع کرنے اور ٹیپ ٹاپ کا مرض خاص طور پر خواتین میں بے انتہا پایا جاتا ہے۔ جو کام ایک منٹ میں ہو سکتا ہے، اس میں ایک گھنٹہ صرف کریں گی۔ اور جب آپس میں بیٹھیں گی تو لمبی لمبی باتیں کریں گی۔ اور جب باتیں لمبی لمبی ہوں گی تو اس میں غیبت بھی ہوگی۔ جھوٹ بھی نکلے گا کسی کی دل آزاری بھی ہو جائے گی۔ ، خدا جانے کن کن گناہوں کا ارتکاب اس گفتگو میں شامل ہو جائے گا، اس لئے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ میں نے ان لوگوں کو پایا ہے۔ جو اپنے لمحات زندگی کو سونے چاندی سے زیادہ قیمتی سمجھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بے فائدہ کام میں صرف ہو جائیں۔

بدلہ لینے میں کیوں وقت ضائع کروں؟

یہ قصہ آپ حضرات کو پہلے بھی سنایا تھا کہ ایک شخص اولیاء کی نسبت معلوم کرنے کے لئے نکلے۔ ایک بزرگ سے ملاقات کی۔ اور ان کے سامنے اپنا مقصد بیان کیا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ تم فلاں مسجد میں جاؤ۔ وہاں تمہیں تین بزرگ ذکر کرتے ہوئے ملیں گے۔ تم جا کر پیچھے سے ان تینوں کو ایک دھول رسید کر دینا۔ وہ صاحب مسجد میں پہنچے اور دیکھا کہ واقعی تین بزرگ ذکر میں مشغول ہیں۔ اس نے پیچھے سے جا کر ایک بزرگ کو دھول رسید کر دیا۔ تو ان بزرگ نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اور اپنے ذکر کے اندر مشغول رہے، کیوں؟ اس لئے کہ ان انہوں نے یہ سوچا کہ جتنی دیر میں میں پیچھے مڑ کر دیکھوں گا کہ کس نے دھول مارا ہے۔ اور اس سے بدلہ لوں گا۔ اتنی دیر میں تو میں کئی بار "سبحان اللہ" کہہ لوں گا، اس سے جو مجھے فائدہ ہوگا بدلہ لینے سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

حضرت میاں نور محمد اور وقت کی قدر

حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ حال تھا کہ جب بازار میں کوئی چیز خریدنے جاتے تو ہاتھ میں پیسوں کی تھیلی ہوتی۔ اور چیز خریدنے کے بعد خود پیسے گن کر دکاندار کو نہیں دیتے تھے۔ بلکہ پیسوں کی تھیلی اس کے سامنے رکھ دیتے۔ اور اس سے کہتے کہ خود ہی اس میں سے پیسے نکال لو۔ اس

لئے کہ اگر میں نکالوں گا۔ اور اس میں مجھے تو وقت لگے گا۔ اتنی دیر میں سبحان اللہ کئی مرتبہ کہہ لوں گا۔

ایک مرتبہ وہ اپنے پیسوں کی تھیلی اٹھائے ہوئے جا رہے تھے۔ کہ پیچھے سے ایک چور اُچکا آیا، اور وہ تھیلی چھین کر بھاگ کھڑا ہوا۔ حضرت میاں جی نور محمد نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے سوچا کہ کون اس چکر میں پڑے کہ اس کے پیچھے بھاگے۔ اور اس کو پکڑے، بس اللہ اللہ کرو، بہر حال ان حضرات کا مزاج یہ تھا کہ ہم اپنی زندگی کے اوقات کو کیوں ایسے کاموں میں صرف کریں جس میں آخرت کا فائدہ نہ ہو۔

معاملہ تو اس سے زیادہ جلدی کا ہے

درحقیقت یہ نبی کریم سرور دو عالم ﷺ کے ایک ارشاد پر عمل تھا۔ جب میں اس حدیث کو پڑھتا ہوں تو مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ مگر چونکہ بزرگوں سے اس حدیث کی تشریح بھی سنی ہوئی ہے۔ اس لئے بے تابی نہیں ہوتی۔ لیکن بہرحال، یہ بڑی عبرت کی حدیث ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میری ایک جھونپڑی تھی۔ حدیث میں لفظ "خص" آیا ہے۔ "خص" عربی میں جھونپڑی کو کہتے ہیں۔ اس جھونپڑی میں میں کچھ ٹوٹ پھوٹ ہو گئی تھی۔ اس لئے ایک روز میں اس جھونپڑی کی مرمت کر رہا تھا۔ اس وقت حضور اقدس ﷺ میرے پاس سے گزرے۔ اور مجھ سے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے جواب میں کہا:

"خُصٌّ لَنَا وَهٰى فَنَحْنُ نُصْلِحُه"

یا رسول اللہ ہم تو اپنی جھونپڑی کو ذرا درست کر رہے ہیں آپ نے فرمایا:

((مَا أُرَى الْأَمْرَ إِلَّا أَعْجَلَ مِنْ ذٰلِكَ))(۱)

بھائی، معاملہ تو اس سے بھی زیادہ جلدی کا ہے۔

مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے عمر کے جو لمحات عطا فرمائے ہیں، یہ پتہ نہیں کب ختم ہو جائیں۔ اور موت آ جائے۔ اور آخرت کا کام شروع ہو جائے۔ اور آخرت کا عالم شروع ہو جائے۔ یہ لمحات جو اس وقت میسر ہیں یہ بڑی جلدی کا وقت ہے۔ اس میں تم یہ اپنے گھر کی مرمت کا فضول کام لے بیٹھے؟

اب دیکھئے کہ وہ صحابی کوئی بڑا عالیشان مکان نہیں بنا رہے تھے۔ یا اس کی تزئین اور آرائش کا کام نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ صرف اپنی جھونپڑی کی مرمت کر رہے تھے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء في قصر الامل، رقم: ۲۲۵۷، سنن أبي داؤد، کتاب الأدب، باب ماجاء في البناء، رقم: ۴۵۵۸، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب في البناء والخراب، رقم: ۴۱۵۰، مسند أحمد، رقم: ۶۲۱۳

معاملہ اس سے بھی زیادہ جلدی کا ہے، حضرات علماء نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا ہے کہ اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ان صحابی کو اس کام سے منع نہیں فرمایا کہ تم یہ کام مت کرو، یہ کام گناہ ہے۔ اس لئے کہ وہ کام گناہ نہیں تھا۔ مباح اور جائز تھا۔ لیکن آپ نے ان صحابی کو اس طرف توجہ دلادی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری ساری توجہ، سارا دھیان، ساری کوشش اور ساری دوڑ دھوپ اسی دنیا کے ارد گرد ہو کر رہ جائے۔

بہر حال، اگر ہم سو فیصد ان بزرگوں کی اتباع نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ تو کرلیں کہ ہم فضول کاموں میں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں، اس سے بچ جائیں۔ اور اپنے لمحات زندگی کو کام میں لگائیں۔ اور حقیقت یہ ہے آدمی اس ذکر کی بدولت زندگی کے لمحے کو آخرت کی تیاری کے لئے صرف کر سکتا ہے، چل رہا ہے، پھر رہا ہے، مگر زبان پر اللہ جل جلالہ کا ذکر جاری ہے۔ اور ہر کام کرتے وقت اپنی نیت درست کرلو تو یہ وقت بے مصرف اور بے کار ضائع نہیں ہوگا۔

حضور ﷺ کا دنیا سے تعلق

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آپ رات کو بستر پر سوتے تو آپ کے جسم اطہر پر نشان پڑ جایا کرتے تھے، تو ایک مرتبہ میں نے آپ کے بستر کی چادر کو دہرا کر کے بچھا دیا تاکہ نشان نہ پڑیں اور زیادہ آرام ملے۔ جب صبح بیدار ہوئے تو آپ نے فرمایا اے عائشہ! اس کو دہرا مت کیا کرو۔ اس کو اکہرا ہی رہنے دو۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیوار کی آرائش کے لئے ایک پردہ لٹکا دیا تھا۔ جس پر تصویریں تھیں، تو آپ ﷺ نے اسی وقت سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اور فرمایا کہ میں اس وقت تک گھر میں داخل نہیں ہوں گا جب تک یہ پردہ نہیں ہٹادوگی۔ اس لئے کہ اس میں تصویر ہے۔

اور ایک مرتبہ زینت اور آرائش کے لئے ایسا پردہ لٹکایا جس میں تصویر تو نہیں تھی۔ لیکن اس کو دیکھ کر آپ نے ارشاد فرمایا:

((مَا لِیْ وَلِلدُّنْیَا مَا اَنَا وَالدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا))(۱)

”ارے، میرا دنیا سے کیا کام، میری مثال تو ایک سوار کی سی ہے۔ جو کسی درخت کی

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللہ باب ماجاء فی أخذ المال بحقه، رقم: ۲۲۹۹، سنن ابن ماجه، کتاب الزھد، باب مثل الدنیا، رقم: ۴۰۹۹

چھاؤں میں تھوڑی دیر کے لئے سایہ لیتا ہے۔ اور پھر اس سایہ کو چھوڑ کر آگے چلا جاتا ہے، میرا تو یہ حال ہے"

بہر حال، امت کو ان چیزوں سے منع تو نہیں کیا۔ لیکن اپنے عمل سے امت کو یہ سبق دیا کہ دنیا کے اندر زیادہ دل نہ لگاؤ، اس پر زیادہ وقت صرف نہ کرو اور آخرت کی تیاری میں لگو۔

دنیا میں کام کا اصول

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

((اِعْمَلْ لِدُنْيَاكَ بِقَدْرِ مَقَامِكَ فِيْهَا وَاعْمَلْ لِآخِرَتِكَ بِقَدْرِ بَقَائِكَ فِيْهَا))(۱)

"دنیا کے لئے اتنا کام کرو۔ جتنا دنیا میں رہنا ہے، اور آخرت کے لئے اتنا کام کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے"

اب ہمیشہ تو آخرت میں رہنا ہے لہٰذا اس کے لئے کام زیادہ کرو۔ اور دنیا میں چونکہ کم رہنا ہے، اس لئے اس کے لئے کام کم کرو۔ یہ حضور اقدس ﷺ کی تعلیم ہے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگرچہ اتنی اونچی پرواز نہ سہی کہ ہم حضرت میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ کے مقام تک یا ان دوسرے بزرگوں کے مقامات تک پہنچ جائیں۔ لیکن کم از کم اتنا تو ہو جائے کہ دنیا سے دل لگا کر آخرت سے غافل اور بے پرواہ تو نہ ہو جائیں۔ اور اپنی زندگی کے اوقات کو کسی طرح آخرت کے کام کے لئے استعمال کرلیں۔

وقت سے کام لینے کا آسان طریقہ

اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دو کام کرلو۔ ایک یہ کہ ہر کام کے اندر نیت کی درستگی اور اس کے اندر اخلاص ہو کہ جو کام بھی کروں گا، اللہ کی رضا کی خاطر کروں گا۔ مثلاً کھاؤں گا تو اللہ کی رضا کے لئے کھاؤں گا، کماؤں گا تو اللہ کی رضا کے لئے کماؤں گا، گھر میں اگر اپنی بیوی بچوں سے باتیں کروں گا تو اللہ کی رضا کی خاطر کروں گا اور اتباع سنت کی نیت سے کرنگا دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے ہو، اس میں کیا خرچ ہوتا ہے کہ آدمی چلتے پھرتے "سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَر" پڑھتا رہے۔ کیا اس کے پڑھنے میں کوئی محنت لگتی ہے؟ کوئی روپیہ پیسہ خرچ ہوتا ہے؟ یا زبان گھس جاتی ہے؟ لیکن اگر انسان یہ ذکر کرتا رہے تو اس کے لمحات زندگی کام میں لگ جائیں گے۔

---

(۱) بریقه محمودیة فی شرح طریقة محمدیة وشریعة نبویة(۲۸۳/٤)، تفسیر حقی(۱٤۹/۱۲)

اپنے اوقات کا چٹھا بناؤ

تیسرے یہ کہ فضولیات سے اجتناب کرو۔ اور اوقات کو ذرا تول تول کر خرچ کرو۔ اور اس کے لئے ایک نظام الاوقات بناؤ۔ اور پھر اس نظام الاوقات کے مطابق زندگی گزارو۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہر تاجر اپنا چٹھا تیار کرتا ہے۔ کہ کتنا روپیہ آیا تھا اور کتنا خرچ ہوا۔ اور کتنا نفع ہوا؟ اسی طرح تم بھی اپنے اوقات کا چٹھا بناؤ۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں چوبیس گھنٹے عطا فرمائے تھے۔ اس میں سے کتنا وقت اللہ تعالیٰ کی رضا کے کاموں میں صرف ہوا؟ اور کتنا وقت غلط کاموں میں صرف ہوا۔ اس طرح اپنے نفع اور نقصان کا حساب لگاؤ۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تجارت خسارے میں جارہی ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾(۱)

اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے نجات عطا کردے۔ وہ تجارت یہ ہے کہ اللہ پر ایمان رکھو اور اس کے رسول اللہ پر ایمان رکھو اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔

یہ بھی جہاد ہے

لوگ ''جہاد'' کا مطلب صرف یہ سمجھتے ہیں کہ ایک آدمی تلوار اور بندوق لے کر میدان جہاد میں جائے، بے شک وہ جہاد کا ایک اعلیٰ فرد ہے، لیکن جہاد اس میں منحصر نہیں۔ جہاد کا ایک فرد یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے نفس سے جہاد کرے، اپنی خواہشات سے جہاد کرے، اپنے جذبات سے جہاد کرے۔ دل میں اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کوئی جذبہ پیدا ہو رہا ہے تو اس کو روکے، یہ بھی جہاد ہے۔ اور آخرت کی تجارت ہے۔ جس کا نفع اور فائدہ آخرت میں ملنے والا ہے۔ اور میں نے اپنے والد صاحب سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد سنا کہ جو شخص اپنا نظام الاوقات نہیں بناتا اور اپنے اوقات کا حساب نہیں رکھتا کہ کہاں خرچ ہو رہے ہیں۔ درحقیقت آدمی ہی نہیں، اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق

(۱) الصف: ۱۰۔۱۱، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اے ایمان والو! کیا تمہیں ایک ایسی تجارت کا پتہ دوں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلادے؟ (وہ یہ ہے کہ) تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اپنے مال و دولت اور اپنی جانوں سے اس کے راستے میں جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے بہترین بات ہے اگر تم سمجھو''

عطا فرمائے۔ اور آپ حضرات کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

نیک کام کو مت ٹالو

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا ارشاد یہ ہے:

"اِبْنَ آدَمَ! اِیَّاکَ وَالتَّسْوِیْفَ"

"اے آدم کے بیٹے! ٹال مٹول سے بچو"

یعنی انسان کا نفس ہمیشہ نیک عمال کو ٹالتا رہتا ہے۔ کہ اچھا یہ کام کل سے کریں گے، پرسوں سے کریں گے، ذرا فرصت ملے گی تو کرلیں گے، ذرا فلاں کام سے فارغ ہو جائیں تو پھر کریں گے، یہ ٹالنا اچھا نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ کسی نیک کام کو مت ٹلاؤ۔ اس لئے کہ جس کام کو ٹلا دیا وہ ٹل گیا۔ کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اس کام کے لئے اہتمام کرے۔

دل میں اہمیت ہو تو وقت مل جاتا ہے

میرے ایک استاذ نے اپنا واقعہ سنایا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ آپ کبھی ہمارے پاس آتے ہی نہیں، نہ رابطہ رکھتے ہیں اور نہ خط لکھتے ہیں۔ تو میں جواب میں کہا کہ حضرت فرصت نہیں ملتی۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحب نے فرمایا کہ دیکھو، جس چیز کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ فرصت نہیں ملی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز کی اور اس کام کی اہمیت دل میں نہیں۔ کیونکہ جب کام کی اہمیت دل میں ہوتی ہے۔ آدمی اس کام کے لئے وقت اور فرصت زبردستی نکال ہی لیتا ہے۔ اور جو شخص یہ کہے کہ میں نے فلاں کام اس لئے نہیں کیا کہ کہ فرصت نہیں ملی۔ تو مطلب یہ ہے کہ اس کام کی اہمیت دل میں نہیں۔

اہم کام کو فوقیت دی جاتی ہے

ہمیشہ یہ بات یاد رکھو کہ جب آدمی کے پاس بہت سارے کام جمع ہو جائیں۔ تو اب ظاہر ہے کہ ایک وقت میں وہ ایک ہی کام کرے گا یا اسے کرے گا، یا اُسے کرے گا۔ سب کام تو ایک ساتھ کر نہیں سکتا۔ تو اس وقت آدمی اسی کام کو پہلے کرے گا۔ جس کی اہمیت دل میں زیادہ ہوگی۔ یا ایک شخص ایک کام کر رہا تھا، اس وقت اس کے پاس کوئی دوسرا کام آ گیا۔ اگر وہ پہلے کام سے زیادہ اہم ہے۔ تو وہ پہلے کام کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ جائے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس کام کی اہمیت دل میں

ہوتی ہے، آدمی اس کام کے لئے وقت نکال ہی لیتا ہے۔ مثلاً آپ بہت سے کاموں میں مشغول ہیں، اس وقت وزیراعظم کا یہ پیغام آجائے۔ کہ آپ کو بلایا ہے۔ تو کیا اس وقت بھی یہ جواب دو گے میں بہت مصروف ہوں۔ مجھے فرصت نہیں۔ وہاں تو یہ جواب آپ نہیں دیں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ آپ کے دل میں اس کی اہمیت ہے۔ اور جس چیز کی اہمیت ہوتی ہے آدمی اس کے لئے وقت اور فرصت نکال ہی لیتا ہے۔ اس لئے نیک اعمال کو فرصت پر ٹالنا کہ جب فرصت ملے گی تو کریں گے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اہمیت دل میں نہیں۔ جس دن دل میں اہمیت آئے گی۔ اس دن سب فرصت مل جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

تمہارے پاس صرف آج کا دن ہے

آگے کیا عجیب جملہ ارشاد فرمایا:

"فَاِنَّكَ بِيَوْمِكَ وَلَسْتَ بِغَدٍ، وَاِنْ يَّكُنْ غَدٌ لَكَ فَكُنْ فِيْ غَدٍ كَمَا كُنْتَ فِي الْيَوْمِ"

یعنی آج کا دن تمہارے پاس یقینی ہے۔ کل کا دن تمہارے پاس یقینی نہیں۔ کیا کسی کو اس بات کا یقین ہے کہ کل ضرور آئے گی؟ جب کل کا دن یقینی نہیں ہے تو جو کام ضروری ہے وہ آج ہی کے دن کر لو، پتہ نہیں کل آئے گی یا نہیں، اور یہ یقین مت کرو کہ کل ضرور آئے گی۔ بلکہ اس مفروضے پر کام کرو کہ کل نہیں آنی ہے۔ اس لئے جو بھی ضروری کام کرنا ہے۔ وہ آج ہی کرنا ہے۔ اگر کل کا دن مل جائے، اور کل آجائے تو کل کے دن بھی ایسے ہی ہو جاؤ، جیسے آج ہوئے تھے۔ یعنی اس دن کے بارے میں یہ یقین کرلو کہ یہ آج کا دن میرے پاس ہے۔ کل کا دن نہیں ہے، اور اگر وہ کل نہ آئی تو کم از کم تمہیں یہ پشیمانی نہیں ہوگی کہ میں نے کل کا دن ضائع کر دیا۔ اس لئے ہر دن کو اپنی زندگی کا آخری دن خیال کرو۔

شاید یہ میری آخری نماز ہو

اسی لئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم نماز پڑھو تو اس طرح نماز پڑھو جیسے دنیا سے رخصت ہونے والا نماز پڑھتا ہے اور اس کو یہ خیال ہوتا ہے کہ معلوم نہیں کل کو مجھے نماز پڑھنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ تاکہ جو کچھ حسرت اور جذبہ نکالنا ہے، وہ اسی میں نکال لوں، کیا پتہ کہ اگلی نماز کا وقت آئے گا یا نہیں؟(۱)

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الحكمة، رقم: ٤١٦١، مسند أحمد، رقم: ٢٢٤٠٠

بہرحال، یہ ساری باتیں جو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمائیں۔ ایمان اور اعتقاد کے درجے میں ہر مسلمان کو معلوم ہیں کہ کل کا پتہ نہیں، آج یقینی ہے، لیکن وہ علم کس کام کا جس پر انسان کا عمل نہ ہو؟ علم تو وہ ہے جو انسان کو عمل پر آمادہ کرے، تو ان بزرگوں کی باتوں میں یہ برکت ہوتی ہے کہ اگر ان کو طلب کے ساتھ پڑھا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے عمل کی توفیق بھی عطا فرما دیتے ہیں۔

خلاصہ کلام

خلاصہ یہ نکلا کہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو غنیمت سمجھو۔ اور اس کو اللہ کے ذکر اور اس کی اطاعت میں صرف کرنے کی کوشش کرو۔ غفلت، بے پروائی اور وقت کی فضول خرچی سے بچو، کسی نے خوب کہا ہے:

یہ کہاں کا فسانہ سود و زیاں
جو گیا سو گیا جو ملا سو ملا
کہو دل سے کہ فرصت عمر ہے کم
جو دلا تو خدا ہی کی یاد دلا

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمارا اور آپ کا یہ حال بنا دے کہ اپنے اوقات زندگی کو اللہ کے ذکر اور اس کی یاد اور آخرت کے کام اور اطاعت کے کام میں صرف کریں۔ اور فضولیات سے بچیں اور اللہ تعالیٰ ان باتوں پر ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

نظم وضبط ☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم
نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْم

اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اور اس کے تمام احکام انسان کی فلاح و بہبود ہی کے لئے ہیں، اس لئے اس کی ہر تعلیم میں انسانی فطرت کی پوری پوری رعایت موجود ہے، اور چنانچہ اسلام نے صرف احکام وقوانین دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنی ہر تعلیم میں اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں میں نظم وضبط اور سلیقہ پیدا ہو، کیونکہ جو کام بدنظمی اور بے ڈھنگے پن سے کیا جائے اس سے صرف ظاہری بدنمائی ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات اس کام کے خاطر خواہ نتائج بھی حاصل نہیں ہو پاتے۔

قرآن کریم کی سورۂ صافات اس آیتِ کریمہ سے شروع ہوئی ہے:

﴿وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا﴾ (۱)

یعنی قسم ہے ان کی جو اللہ کی عبادت کے لئے اچھی طرح صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں

اس آیت میں ان فرشتوں کی تعریف کی گئی ہے جو صف بستہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، اور اس آیت کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر کام میں نظم وضبط اور ترتیب وسلیقہ کا لحاظ رکھنا دین میں مطلوب اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو یا اس کے احکام کی تعمیل، یہ دونوں مقصد اس طرح بھی حاصل ہو سکتے تھے کہ یہ فرشتے صف باندھنے کے بجائے ایک غیر منظم بھیڑ کی شکل میں جمع ہو جایا کریں، لیکن اس بدنظمی کے بجائے ان کو صف بندی کی توفیق دی گئی، اور اس آیت میں ان کے اچھے اوصاف میں سب سے پہلے اسی وصف کو ذکر کر کے بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند ہے۔

اسلام نے اپنے پیروکاروں کو جو احکام عطا فرمائے ہیں، ان میں نظم وضبط کی رعایت ہر جگہ واضح ہے، مثلاً نماز جو اسلام کی اہم ترین عبادت ہے، درحقیقت اس کا مقصد بندوں کا تعلق اللہ تعالیٰ سے جوڑنا ہے، لہٰذا بظاہر اس کا یہ طریقہ زیادہ مناسب تھا کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ انفرادی طور سے نماز ادا

☆ نشری تقریریں، ص: ۱۱۳-۱۱۴

(۱) الصافات: ۱

کرلیا کرے، لیکن اسلام نے صرف نماز ادا کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ اس بات کی تاکید فرمائی کہ ہر فرض نماز حتی الامکان مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کی جائے، اور جماعت میں بھی اس بات کو ناگزیر قرار دیا کہ نماز پڑھنے والے اپنے میں سے کسی شخص کو اپنا امام بنالیں اور پھر نماز کی ہر نقل وحرکت میں اس کی پوری پوری اقتدا کریں، حد یہ ہے کہ اگر امام سے بھول چوک کی بنا پر کوئی غلطی ہو جائے تو مقتدیوں کو اس بات کی تو اجازت ہے کہ وہ سُبْحَانَ اللّٰہ یا اَللّٰہُ اَکْبَر کہہ کر امام کو غلطی پر متنبہ کردیں، لیکن امام کی اقتداء چھوڑ کر اپنی نماز درست کرنے کی اجازت نہیں، کیونکہ یہ بات نماز کے نظم وضبط کے خلاف ہے۔

پھر نماز میں کھڑے ہونے کا جو طریقہ اسلام نے بتایا ہے وہ نظم وضبط کی مجسم تعلیم ہے، مثلاً جماعت میں صف بندی کی بڑی تاکید کی گئی۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ہم سے فرمایا ''تم (نماز میں) اسی طرح صف بندی کیوں نہیں کرتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے حضور کرتے ہیں؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا ''فرشتے اپنے رب کے حضور کس طرح صف بندی کرتے ہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا'' وہ صفوں کو پورا کرتے ہیں، اور صف میں پیوست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں'' (یعنی بیچ میں خالی جگہ نہیں چھوڑتے) (۱)

نماز میں صفوں کو پورا کرنے اور سیدھا رکھنے کی تاکید میں اتنی احادیث وارد ہوئی ہیں کہ ان سے ایک پورا رسالہ تیار ہوسکتا ہے، حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہمارے کندھوں کو ہاتھ لگا کر فرمایا کرتے تھے کہ سیدھے رہو، آگے پیچھے مت ہو، ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ (۲)

پھر نماز کے جو پانچ اوقات اسلام نے مقرر فرمائے ہیں ان کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ وہ انسان کی زندگی میں نظم وضبط پیدا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم یہ بھی دیا جاسکتا تھا کہ ہر شخص جب وقت چاہے پانچ نمازیں پڑھ لیا کرے، لیکن نمازوں کے پانچ اوقات مقرر فرما کر اسلام نے ایک

(۱) صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب الأمر بالسکون فی الصلاۃ والنھی عن الاشارۃ بالید، رقم:۶۵۱، سنن النسائی، کتاب الإمامۃ، باب حث الإمام علی رصّ الصفوف والمقاربۃ بینھما، رقم:۸۰۷، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب تسویۃ الصفوف، رقم:۵۶۵، سنن ابن ماجہ، کتاب إقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب إقامۃ الصفوف، رقم:۹۸۲، مسند أحمد، رقم:۲۰۰۵۹

(۲) صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب تسویۃ الصفوف وإقامتھا وفضل الأول فالأول منھا، رقم:۶۵۴، سنن النسائی، کتاب الإمامۃ، باب من یلی الإمام ثم الذی یلیہ، رقم:۷۹۸، سنن ابن ماجہ، کتاب إقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب من یستحب ان یلی الإمام، رقم:۹۶۶، مسند أحمد، رقم:۱۶۴۸۶، سنن الدارمی، کتاب الصلاۃ، باب من یلی الامام من الناس، رقم:۱۲۳۸

مسلمان کی پوری زندگی کو نظم بنا دیا ہے، اس طریقے سے ایک نمازی مسلمان اپنے چوبیس گھنٹے کے معمولات کو بڑی آسانی سے پانچ حصوں پر منقسم کر کے اپنا بہترین نظام الاوقات ترتیب دے سکتا ہے جس میں اپنی ذاتی ضروریات، دنیوی مشاغل اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کا بہترین امتزاج ہو۔

روزہ بھی ایک عظیم الشان عبادت اور نفس کی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے، اور اس کی ادائیگی بظاہر اس طرح بھی ممکن تھی کہ ہر شخص جب چاہتا تیس روزے پورے کر لیتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے بجائے پوری امت کو ایک ہی مہینے میں روزوں کا اس طرح پابند بنا دیا کہ ایک علاقے کے لوگ ایک ہی وقت میں کھانا پینا چھوڑتے اور ایک ہی وقت میں افطار کرتے ہیں۔

اسی طرح زکوۃ جو اسلام کے مالی احکام میں سب سے بنیادی اہمیت رکھتی ہے، اس کے جہاں اور بہت سے فوائد ہیں، وہاں اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے ہر انسان کو اپنی آمد و خرچ کا حساب منظم رکھنے کا موقع مل جاتا ہے، اور جو لوگ سال بہ سال باقاعدگی سے زکوۃ ادا کرتے ہیں، عموماً ان کا حساب صاف رہتا ہے، اور وہ مالی بدنظمی کا شکار نہیں ہوتے۔

حج کی عبادت میں بھی اللہ تعالیٰ نے سارے مسلمانوں کے لئے ایک ہی زمانے اور ایک ہی مقام متعین فرما دیا ہے چنانچہ اس عبادت کے دوران دنیا بھر کے مسلمان ایک امیر کے زیر قیادت آجاتے ہیں، سب کے جسم پر ایک سا لباس اور سب کی زبانوں پر ایک ہی سی پکار ہوتی ہے، اور ان کی ہر ہر نقل و حرکت اسلامی اتحاد اور تنظیم کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ جب آنحضرت ﷺ دنیا میں تشریف لائے تو اہل عرب قبائلی نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے، ہر قبیلہ اپنی اپنی جگہ خود مختار تھا، اسی بنا پر ان کے درمیان بارہ مہینے تصادم کی فضا قائم رہتی تھی، اور پورا جزیرۂ عرب بدنظمی اور افتراق کا شکار تھا، نبی کریم ﷺ نے تشریف لا کر ان منتشر قبائل کو ایک پرچم تلے اکٹھا کیا، اور آئندہ ہمیشہ کی لئے یہ تعلیم دی کہ تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اپنا ایک امیر مقرر کریں، اور جب کوئی امیر باہمی مشورے سے مقرر کر لیا جائے تو جب تک وہ کسی گناہ کے کام کا حکم نہ دے ہر قیمت پر اس کی اطاعت کی جائے، کیونکہ اس کے بغیر نظم و ضبط قائم نہیں رہ سکتا، چنانچہ ایک حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ يُطِعِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِيْ وَمَنْ يَعْصِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِيْ))(۱)

”جس شخص نے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، باب من يقاتل من وراء الإمام ويتقى به، رقم۲۷۳۷، صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب طاعة الأمراء في غير معصية وتحريمها في...... الخ، رقم:۳٤۱۷، مسند أحمد، رقم:۷۷۸٦

نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی"

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے:

((إِنْ أُمِّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ يَقُودُ بِكِتَابِ اللّٰهِ فَاسْمَعُوا لَهُ وَأَطِيعُوهُ))(۱)

"اگر تم پر کسی ایسے غلام کو بھی امیر بنا دیا جائے جس کے ناک کان کٹے ہوئے ہوں اور وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کر رہا ہو تو اس کی ہر بات سنو اور اس کی اطاعت کرو"

اس طرح امیر کو کتاب و سنت کی اطاعت کا اور تمام مسلمانوں کو امیر کی اطاعت کا حکم دے کر اسلام نے پوری امت کو ایسے نظم و ضبط کا پابند دیا ہے جس سے ان کے تمام اجتماعی مسائل بہترین طریقے پر حل ہو سکتے ہیں۔

پھر اسلام نے اطاعت امیر کا یہ حکم صرف سیاست و حکومت ہی میں نہیں دیا، بلکہ تمام مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ اپنے ہر اجتماعی کام کو کسی امیر کے نظم کے تابع بنا لیا کریں، چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے:

((إِذَا كَانَ ثَلَاثَةٌ فِي سَفَرٍ فَلْيُؤَمِّرُوا أَحَدَهُمْ))(۲)

"جب تین آدمی سفر پر روانہ ہوں تو انہیں چاہئے کہ اپنے آپ میں سے کسی کو اپنا امیر بنا لیں"

اس ارشاد کا مقصد یہی ہے کہ اجتماعی سفر بھی کسی بدنظمی کا شکار نہ ہو، بلکہ کسی کو امیر بنا کر اسے سفر کے مسائل کا ذمہ دار بنا دیا جائے، تاکہ جو کام ہو وہ نظم و ضبط اور سلیقے کے ساتھ ہو۔

اسی طرح اسلامی شریعت نے باپ کو اولاد کا امیر، استاد کو شاگردوں کا امیر اور شوہر کو بیوی کا امیر بنایا اپنے تمام پیروؤں کو یہ سبق دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بدنظمی سے گزارنے کے بجائے نظم و ضبط اور خوش اسلوبی سے بسر کرنا سیکھیں اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم مسلمان ان اسلامی احکام کی حقیقی روح کو پہچان کر اپنی زندگیوں کو منظم کرنے کی عادت ڈالیں تو ہماری بے شمار مشکلات خود بخود ختم ہو سکتی ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق کامل عطا فرمائے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الامارة باب وجوب طاعة الأمير في غير معصية، رقم:۳٤۲۲، سنن الترمذي، كتاب الجهاد عن رسول الله، باب ماجاء في طاعة الإمام، رقم:۱٦۲۸، سنن ابن ماجه، كتاب الجهاد، باب طاعة الأمير، رقم:۲۸٥۲، مسند أحمد، رقم:۱٦۰٥۲

(۲) سنن أبي داود، كتاب الجهاد، باب في القوم يسافرون ويؤمرون أحدهم، رقم:۲۲٤۳

پاکی اور صفائی ☆

تقریباً دو سال پہلے میں برطانیہ کے ایک سفر کے دوران برمنگھم سے ٹرین کے ذریعے ایڈنبرا جارہا تھا، راستے میں مجھے غسل خانہ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی، میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا تو دیکھا کہ وہاں ایک انگریز خاتون پہلے سے انتظار میں کھڑی ہیں جس سے اندازہ ہوا کہ غسل خانہ خالی نہیں ہے، چنانچہ میں ایک قریبی سیٹ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا، جب کچھ دیر گزر گئی تو اچانک غسل خانے کے دروازے پر میری نگاہ پڑی، وہاں Vacant کی تختی صاف نظر آ رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ غسل خانہ خالی ہے، اور اس میں کوئی نہیں ہے، اس کے باوجود وہ خاتون بدستور دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں، اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید ان کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میں نے قریب جا کر ان سے کہا غسل خانہ تو خالی ہے، اگر آپ اندر جانا چاہیں تو چلی جائیں، انہوں نے جواب دیا کہ دراصل غسل خانے کے اندر میں ہی تھی، لیکن جب میں پیشاب سے فارغ ہوئی تو ریل پلیٹ فارم پر رک گئی، اور میں کموڈ کو فلش نہیں کر سکی، (یعنی اس پر پانی نہیں بہا سکی) کیونکہ جب گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو تو فلش کرنا مناسب نہیں، اب میں باہر آ کر اس انتظار میں ہوں کہ گاڑی چلے تو میں اندر جا کر کموڈ کو فلش کروں، پھر اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھوں گی۔

یہ بظاہر ایک چھوٹا سا معمولی واقعہ تھا، لیکن میرے ذہن پر ایک نقش چھوڑ گیا، یہ ایک انگریز خاتون تھیں، اور بظاہر غیر مسلم، لیکن انہوں نے جو طرز عمل اختیار کیا، وہ دراصل اسلام کی تعلیم تھی، مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ایک صاحب سے ایک مرتبہ یہ غلطی سرزد ہوئی کہ وہ غسل خانہ استعمال کرنے کے بعد اسے فلش کیے بغیر باہر آ گئے تو میرے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) نے اس پر انہیں سخت تنبیہ کی، اور فرمایا کہ ایسا کرنا لازمی تعلیمات کے مطابق سخت گناہ ہے، کیونکہ اس طرح گندگی پھیلانے سے آنے والے شخص کو تکلیف ہوگی، اور کسی بھی شخص کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے۔

دوسری طرف جب گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو تو اس وقت غسل خانے کا استعمال یا اسے فلش کرنا ریلوے کے قواعد کے تحت اس لئے منع ہے کہ اس کے نتیجے میں ریلوے اسٹیشن کی فضا خراب ہوتی ہے، اور پلیٹ فارم پر موجود لوگوں کو ریلوے لائن پر پڑی ہوئی گندگی سے ذہنی کوفت بھی ہوتی ہے، اور وہ گندگی بیماریاں پھیلنے کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے، اس خاتون نے بیک وقت دونوں باتوں کا خیال کیا،

☆ ذکر و فکر، ص: ۱۹۵ تا ۲۰۰

ٹرین کے کھڑے ہونے کی حالت میں پانی بہانا بھی گوارا نہ کیا، اور پانی بہائے بغیر سیٹ پر آ کر بیٹھنا بھی پسند نہیں کیا، تا کہ کوئی شخص اس حالت میں جا کر تکلیف نہ اٹھائے۔

ہم مسلمان ہیں، اور ہماری ہر دینی تعلیم کا آغاز ہی طہارت سے ہوتا ہے، جسے آنحضرت ﷺ نے ایمان کا آدھا حصہ قرار دیا ہے نیز آپ ﷺ نے انتہائی باریک بینی سے ہر اس کام سے منع فرمایا ہے جو ناحق کسی دوسرے کی تکلیف کا باعث ہو، لیکن یہ بات کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ ہمارے مشترک غسل خانے، خواہ وہ ریل میں ہوں یا جہاز میں، بازار میں ہوں یا مسجدوں میں تعلیم گاہوں میں ہوں یا شفا خانوں میں، ہر جگہ عموماً گندگی کے ایسے مراکز بنے ہوئے ہیں کہ ان کے قریب سے گزرنا مشکل ہوتا ہے، اور جب تک کوئی چارہ ہی نہ پڑ جائے، کسی سلیم الطبع شخص کے لئے ان کا استعمال ایک شدید آزمائش سے کم نہیں۔ اس صورت حال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان معاملات میں ہم نے دین کی تعلیمات کو بالکل نظر انداز کیا ہوا ہے، اور مشترک استعمال کے مقامات پر گندگی پھیلانے کے بعد ہمیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ہم اذیت رسانی کے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں، جس کا ہمیں جواب دینا پڑیگا۔

ہمارے ملک میں بھی ریلوں کے ہر غسل خانے میں یہ ہدایت درج ہے کہ جب تک گاڑی کسی اسٹیشن پر کھڑی ہو، بیت الخلاء استعمال نہ کیا جائے، لیکن عملاً صورت حال یہ ہے کہ کوئی اسٹیشن مشکل ہی سے ایسا ہوگا جس کی ریلوے لائن پر اس ہدایت کی خلاف ورزی کے مکروہ مناظر نظر نہ آتے ہوں، اسی طرح ہوائی جہازوں کے ہر غسل خانے میں یہ ہدایت درج ہوتی ہے کہ بیت الخلاء میں کوئی ٹھوس چیز نہ پھینکی جائے، نیز یہ کہ منہ ہاتھ دھونے کے لئے جو بیسن لگا ہوتا ہے اسے استعمال کرنے کے بعد آنے والے مسافر کی سہولت کے لئے اسے کاغذ کے تولیہ سے صاف کر دیا جائے، لیکن ان ہدایات پر بھی کما حقہ عمل نہیں کیا جاتا، چنانچہ ہمارے ہوائی جہازوں کے غسل خانے بھی اب ہمارے مجموعی قومی مزاج کی نہایت بھدی تصویر پیش کرتے ہیں، حالانکہ اگر ان ہدایات پر عمل کر کے ہم دوسروں کے لئے راحت کا سامان کریں تو یہ محض ایک شائستگی کی بات ہی نہیں ہے بلکہ یقیناً اجر و ثواب کا کام ہے۔

آنحضرت ﷺ کا ایک ارشاد اتنا مشہور ہے کہ بہت سے مسلمانوں کو معلوم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ایمان کے ستر سے بھی زیادہ شعبے ہیں، اور ان میں سے ادنیٰ ترین شعبہ یہ ہے کہ راستے سے گندگی یا تکلیف دہ چیز کو دور کر دیا جائے" (۱)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان عدد شعب الإیمان وأفضلها......الخ، رقم: ۵۱، سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول الله، باب ما جاء فی استکمال الإیمان وزیادته ونقصانه، رقم: ۲۵۳۹، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فی الإیمان، رقم: ۵٦، مسند أحمد، رقم: ۸۵۷۰

اس ارشاد نبوی ﷺ کی روشنی میں مومن کا کام تو یہ ہے کہ اگر کسی دوسرے شخص نے بھی کوئی گندگی پھیلا دی ہے اور اندیشہ ہے کہ لوگوں کو اس سے تکلیف پہنچے گی، تو وہ خود اسے دور کر دے، نہ یہ کہ خود گندگی پھیلاتا پھرے، اگر گندگی دور کرنا ایمان کا شعبہ ہے تو گندگی پھیلانا کس چیز کا شعبہ ہو گا؟ ظاہر ہے کہ بے ایمانی کا، یا کفر وفسق کا؟ لیکن ہم نے اپنے عمل سے کچھ ایسا تاثر دے رکھا ہے کہ صفائی ستھرائی درحقیقت ہمارا نہیں، بلکہ غیر مسلم مغربی اقوام کا شیوہ ہے۔

یہاں مجھے پھر اپنے والد ماجد کا سنایا ہوا ایک لطیفہ یاد آ گیا، وہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہندوستان میں ایک انگریز مسلمان ہو گیا، اور اس نے پانچوں وقت نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آنا شروع کر دیا، جب بھی اسے وضو خانے میں جانے کی ضرورت پیش آتی تو یہ دیکھ کر اس کا دل کڑھتا تھا کہ نالیوں میں گندگی پڑی رہتی ہے، کناروں پر کائی جمی رہتی ہے، نہ لوگ ان میں گندگی ڈالنے سے پرہیز کرتے ہیں نہ ان کی صفائی کا کوئی انتظام ہے، آخر ایک روز اس نے یہ طے کیا کہ اس مقدس عبادت گاہ کو صاف رکھنا چونکہ بڑے ثواب کا کام ہے، اس لئے وہ خود ہی یہ خدمت انجام دے گا، چنانچہ وہ کہیں سے جھاڑو وغیرہ لا کر اپنے ہاتھ سے اسے صاف کرنے لگا، معقول مسلمانوں نے تو یقیناً اس کے عمل کی قدر کی ہوگی، لیکن محلے کے ایک صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ انگریز مسلمان تو ہو گیا، لیکن اس کے دماغ سے انگریزیت کی بو نہیں گئی"

جن صاحب نے یہ افسوسناک تبصرہ کیا، انہوں نے تو کھل کر صریح لفظوں ہی میں یہ بات کہہ دی، لیکن اگر ہمارے مجموعی طرز عمل کا جائزہ لیا جائے تو محسوس یہ ہی ہوتا ہے کہ ہم نے صفائی ستھرائی کو "انگریزیت کی خوبی" قرار دے رکھا ہے۔ اور شاید گندگی کو اپنی خوبی، حالانکہ اسلام نے جس کے ہم نام لیوا ہیں، صفائی ستھرائی سے بھی بہت آگے بڑھ کر طہارت کا وہ تصور پیش کیا ہے جو ظاہری صفائی سے کہیں بلند و برتر ہے، اور جسم کے ساتھ ساتھ روح کی پاکیزگی کے وہ طریقے سکھاتا ہے جن سے بیشتر غیر اسلامی اقوام محروم ہیں، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ جن مغربی اقوام کی ظاہری صفائی پسندی کا ذکر پیچھے آیا ہے، ان کا یہ ذوق صرف اس صفائی کی حد تک محدود ہے جو دوسرے کو نظر آئے، لیکن جہاں تک ذاتی اور اندرونی (Intrinsic) صفائی کا تعلق ہے اس سے ان اقوام کی محرومی کا تھوڑا سا اندازہ ان طریقوں کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے جو وہ بیت الخلاء استعمال کرنے کے بعد اپنے جسم کی صفائی کے لئے اختیار کرتے ہیں، جب تک اس عمل کے بعد نہانا نہ ہو، جسم سے گندگی دور کرنے کے لئے پانی کے استعمال کا ان کے یہاں کوئی تصور نہیں، اس بات کا تو ان کے یہاں بڑا اہتمام ہے کہ غسل خانے کے فرش پر پاک پانی کی بھی کوئی چھینٹ پڑی نظر نہ آئے، لیکن جسم سے نجاست اور گندگی کو دور کرنے کے لئے صرف ٹائیلٹ پیپر کو کافی سمجھا جاتا ہے، حالانکہ پانی کے استعمال کے بغیر گندگی کا کلی ازالہ مشکل

ہے، چنانچہ اگر گندگی کے کچھ چھوٹے اجزاء جسم یا کپڑے پر اس طرح باقی رہ جائیں کہ وہ نظر نہ آئیں تو ان کے ازالے کی اتنی فکر نہیں ہے۔ پھر اگر اس عمل کے بعد غسل بھی کرنا ہو تو عموماً اس کا طریقہ یہ ہے کہ ٹب میں پانی جمع کر کے اسی حالت میں پانی کے اندر اس طرح داخل ہو جاتے ہیں کہ پانی کے اخراج کا راستہ نہیں ہوتا، اور نجاست کے باقی ماندہ چھوٹے اجزاء بعض اوقات پورے پانی کو ناپاک کر سکتے ہیں۔

یہ تمام طریقے اس لئے اختیار کئے گئے ہیں کہ سارا زور صرف اس ظاہری صفائی پر ہے جو دوسرے کو نظر آئے، ذاتی اور اندرونی صفائی جس کا نام "طہارت" ہے اس کا کوئی تصور نہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اسلام نے ہمیں ظاہری صفائی ستھرائی (نظافت) کے ساتھ ساتھ طہارت پاکی کے بھی مفصل احکام دیئے ہیں، اس لئے اسلام میں صفائی کا تصور کہیں زیادہ جامع ہمہ گیر اور بلند و برتر ہے، اسلام کو "طہارت" بھی مطلوب ہے اور نظافت بھی، طہارت کا مقصد یہ ہے کہ انسان بذات خود واقعی پاک صاف رہے، اور نظافت کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی گندگی سے دوسروں کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنے۔

آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں مسجد نبوی اتنی زیادہ کشادہ نہیں تھی، عام طور سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محنت پیشہ تھے، اور موٹے کپڑے پہنتے تھے، گرمی کے موسم میں جب پسینہ آتا تو کپڑے پسینے سے تر ہو جاتے اور جمعہ کے اجتماع میں اس پسینے کی وجہ سے بو پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام کو تاکید فرمائی کہ جمعہ کے روز سب حضرات غسل کر کے حتی الامکان صاف کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر مسجد میں آیا کریں۔ (۱)

اب ظاہر ہے کہ طہارت کا کم سے کم تقاضا تو اس طرح بھی پورا ہو سکتا تھا کہ لوگ وضو کر کے آجایا کریں، اور ان کے کپڑے ظاہری نجاست سے پاک ہوں، لیکن آنحضرت ﷺ نے اس پر اکتفا کرنے کے بجائے مذکورہ بالا احکام نظافت کی اہمیت کی وجہ سے عطا فرمائے، تاکہ کوئی شخص کسی دوسرے کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنے، اس چھوٹی سی مثال ہی سے یہ بات واضح ہوئی کہ طہارت کے ساتھ ساتھ نظافت بھی اسلام میں مطلوب ہے، اور کوئی بھی ایسا اقدام جائز نہیں ہے جس کی وجہ سے ماحول میں گندگی پھیلتی ہو، یہ ہر شخص کی ایسی دینی ذمہ داری ہے جس کی ادائیگی کے لئے بنیادی ضرورت توجہ کی ہے، یہ توجہ پیدا ہو جائے تو دیکھتے ہی دیکھتے ماحول سدھر جاتا ہے۔

۲۶ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ / ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۴ء

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب وقت الجمعة إذا زالت الشمس، رقم: ۸۵۲، صحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب وجوب غسل الجمعة على كل بالغ من الرجال، رقم: ۱۳۹۸، سنن النسائي، كتاب الجمعة باب الرخصة في ترك الغسل يوم الجمعة، رقم: ۱۳۶۲، مسند أحمد، رقم: ۲۳۲۰۳

رزق کا صحیح استعمال ☆

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو اپنے ملنے والوں میں حضرت میاں صاحب کے نام سے معروف تھے) دار العلوم دیو بند کے اساتذہ میں سے تھے جو شہرت اور نام و نمود سے ہمیشہ کوسوں دور رہے، عمر بھر اسلامی علوم کی تدریس کی خدمت انجام دی، اور ہزار ہا طلبہ کو اپنے علم و فضل سے سیراب کیا، آج برصغیر ہند و پاک کے نامور علماء دیو بند میں شاید کوئی نہ ہو جو ان کا بالواسطہ بلا واسطہ شاگرد نہ ہو، انہوں نے متعدد چھوٹی بڑی تصانیف بھی چھوڑی ہیں، موضوعات بھی اچھوتے اور زبان بھی اتنی شگفتہ کہ آج سے سو سال پہلے کی تحریروں میں ایسی شگفتگی کم ملتی ہے۔

علم و فضل کے مقام بلند کے باوجود سادگی تواضع اور مسکنت کا عالم یہ تھا کہ دیکھنے والا ان کے سراپا میں اس مقام بلند کا اندازہ کر ہی نہیں سکتا تھا، وہ دیو بند (ضلع سہارنپور) کے ایک چھوٹے سے محلے میں مقیم تھے، اور کچے مکان میں رہتے تھے۔ ہر سال جب برسات کا موسم آتا تو یہ کچا مکان جگہ جگہ سے گر جاتا، اور برسات گزرنے کے بعد کافی وقت اور پیسے اس کی مرمت پر خرچ کرنا پڑتا تھا۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں صاحب کے خاص شاگرد تھے، لیکن خصوصی تعلق کی بنا پر حضرت نے انہیں اپنے آپ سے بہت بے تکلف بھی بنایا ہوا تھا، ایک دن انہوں نے حضرت میاں صاحب سے کہا کہ آپ کو ہر سال اپنے مکان کی مرمت کرانی پڑتی ہے، جس میں پریشانی بھی ہوتی ہے، وقت بھی لگتا ہے، اور خرچ بھی خاصا ہو جاتا ہے، اگر آپ ایک مرتبہ مکان کو پکا بنوالیں تو اس روز روز کی پریشانی سے نجات مل جائے۔

حضرت میاں صاحب کی طبیعت میں ظرافت بھی بہت تھی، انہوں نے والد صاحب کی یہ تجویز سن کر شروع میں بڑی تعریف و توصیف اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: واہ مفتی صاحب آپ نے کیسی عقل کی بات کہی، ہم نے ساری عمر گذار دی، بوڑھے ہو گئے، اور اب تک ہماری عقل میں یہ بات نہیں آئی۔

والد صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت میاں صاحب نے یہ بات اتنی مرتبہ فرمائی کہ میں شرم سے

☆ ذکر و فکر، ص: ۱۷۶ تا ۱۷۶

پانی پانی ہوگیا، لیکن بالآخر میں نے عرض کیا کہ حضرت میرا مقصد تو وہ حکمت معلوم کرنا تھا جس کی وجہ سے آپ نے مالی استطاعت کے باوجود اب تک مکان کو پکا نہیں بنوایا، اب مجھے مزید شرمندہ کرنے کے بجائے حقیقی وجہ بیان فرما دیجئے۔

حضرت میاں صاحب شروع میں طرح دیتے رہے، لیکن جب والد صاحب نے زیادہ اصرار کیا تو والد صاحب کا ہاتھ پکڑ کر مکان کے دروازے تک لے آئے، اور فرمایا: دیکھو اس گلی کے دائیں بائیں دونوں طرف دیکھو، گلی کے اس سرے سے اس سرے تک کیا کوئی مکان تمہیں پکا نظر آتا ہے؟ والد صاحب نے فرمایا نہیں، اس پر میاں صاحب نے فرمایا کہ بتاؤ جب میرے سارے پڑوسیوں کے مکان کچے ہیں، تو پوری گلی میں تنہا میں اپنا مکان پکا بنا کر کیا اچھا لگوں گا؟ اور اتنی استطاعت مجھے میں نہیں کہ کہ میں اپنے سارے پڑوسیوں کے مکانات پکے بنوا سکوں، اس لئے میں اپنا مکان بھی پکا نہیں بنواتا کہ اپنے پڑوسیوں کے مقابلے میں اپنی کوئی امتیازی شان بنانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

یہ تھے حضرت میاں صاحب ان کا یہ واقعہ تو میں نے ان کے مزاج و مذاق کا تھوڑا سا تعارف کرانے کے لئے بیان کر دیا جس سے ان کی اس عظمت کردار کا تھوڑا سا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو مادہ پرستی کے اس دور میں انسانی تصور سے بھی ماوراء معلوم ہوتا ہے، لیکن دراصل میں ان کا ایک اور واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔

ایک مرتبہ میرے والد ماجد ان کے گھر ملاقات کے لئے گئے ہوئے تھے، کھانے کا وقت آ گیا تو بیٹھک میں دستر خوان بچھا کر کھانا کھایا گیا، کھانے سے فارغ ہونے پر والد صاحب دستر خوان سمیٹنے لگے تاکہ اسے کہیں جھٹک آئیں، حضرت میاں صاحب نے پوچھا: یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ والد صاحب نے عرض کیا کہ حضرت دستر خوان سمیٹ رہا ہوں تاکہ اسے کسی مناسب جگہ پر جھٹک دوں میاں صاحب بولے کیا آپ کو دستر خوان سمیٹنا آتا ہے؟ والد صاحب نے کہا کہ کیا دستر خوان سمیٹنا بھی ایک فن ہے، جسے سیکھنے کی ضرورت ہو؟ میاں صاحب نے جواب دیا جی ہاں، یہ بھی ایک فن ہے، اور اسی لئے میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کو یہ کام آتا ہے یا نہیں؟ والد صاحب نے درخواست کی کہ حضرت پھر تو یہ فن ہمیں بھی سکھا دیجئے میاں صاحب نے فرمایا کہ آئیے! میں آپ کو یہ فن سکھاؤں۔

یہ کہہ کر انہوں نے دستر خوان پر بچی ہوئی بوٹیاں الگ کیں، ہڈیوں کو الگ جمع کیا، روٹی کے جو بڑے ٹکڑے بچ گئے تھے، انہیں الگ رکھا، پھر روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو برادے کی سی شکل میں پڑے رہ گئے تھے انہیں چن چن کر الگ اکٹھا کر لیا، پھر فرمایا ”میں نے ان سے ہر چیز کی الگ جگہ مقرر کی ہوئی ہے، یہ بوٹیاں میں فلاں جگہ اٹھا کر رکھتا ہوں، وہاں روزانہ ایک بلی آتی ہے، اور یہ بوٹیاں کھا لیتی ہے، ان ہڈیوں کی الگ جگہ مقرر ہے، کتے کو وہ جگہ معلوم ہے، اور وہاں سے آ کر یہ

ہڈیاں اٹھا کر کھا لیتا ہے، اور روٹی کے یہ بڑے ٹکڑے میں فلاں جگہ رکھتا ہوں، وہاں پرندے آتے ہیں، اور یہ ٹکڑے ان کے کام آجاتے ہیں، اور یہ روٹی کے بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں، یہ میں چیونٹیوں کے کسی بل کے پاس رکھ دیتا ہوں، اور یہ ان کی غذا بن جاتی ہے" پھر فرمایا کہ "یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کا رزق ہیں، ان کا کوئی حصہ اپنے امکان کی حد تک ضائع نہیں ہونا چاہئے"

یہ تھا ایک حقیقی اسلامی معاشرے کا وہ مزاج و مذاق جو قرآن و سنت کے دلکش رنگ میں ڈھلا ہوا تھا، چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے حساب رزق عطا فرمایا ہوا ہے، اس لئے اس کے چھوٹے چھوٹے اور تھوڑے تھوڑے حصوں کی ہمیں نہ صرف یہ کہ قدر نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات ہم اس کی بے حرمتی تک پر آمادہ ہو جاتے ہیں، لیکن اگر کسی وقت خدانخواستہ اسی رزق کی قلت پیدا ہو جائے تو پتا چلے کہ ایک ایک ذرے کی کیا قدر و قیمت ہے؟

کہنے کو سبھی یہ کہتے ہیں کہ رزق کو ضائع نہیں کرنا چاہئے، اس کی قدر کرنی چاہئے، لیکن ہماری آج کی زندگی میں یہ بات محض ایک نظریہ ہو کر رہ گئی ہے جس کا عمل کی دنیا میں کوئی نشان نظر نہیں آتا، ہمارے گھروں میں دعوتوں کے مواقع پر اور ہوٹلوں میں جتنا رزق روزانہ ضائع ہوتا ہے، اگر اس کا مجموعی اندازہ لگایا جائے تو یقیناً وہ سینکڑوں خاندانوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے، لیکن حالت یہ ہے کہ جس ماحول میں نہ جانے کتنے گھرانے معمولی غذا کو ترس رہے ہوتے ہیں وہاں منوں کے حساب سے اعلیٰ ترین غذائیں کوڑے کرکٹ میں پڑی نظر آتی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی بار ایک سرکاری عشائیے میں شریک ہوا تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈرائیوروں کے لئے کھانے کا اہتمام ہو گا یا نہیں؟ چنانچہ میں نے بربنائے احتیاط اپنے ڈرائیور کو کھانے کے پیسے دیکر یہ کہدیا کہ تھا کہ اگر یہاں کھانے کا انتظام نہ ہو تو وہ کسی ہوٹل میں کھانا کھالے۔ جب میں اندر پہنچا تو میری میز پر ایک اعلیٰ سرکاری افسر میرے ہمنشین تھے، اور وہ ملک کے غریبوں کی حالت زار پر بڑا پر درد لیکچر دے رہے تھے، اس لیکچر میں عوام کی غربت و افلاس پر رنج و غم کا اظہار بھی تھا، اپنے معاشی نظام کی برائیاں بھی تھیں، سوشلسٹ ممالک کی تعریف بھی تھی، اور اپنے ملک کے سرمایہ داروں جاگیرداروں اور سوشلزم کے مخالف عناصر پر تنقید بھی تھی، جب ان کی گفتگو کا یہ موضوع ختم ہو گیا، اور کھانا شروع ہونے پر مختلف باتیں شروع ہو گئیں تو میں نے انہی صاحب سے عرض کیا کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ڈرائیوروں کے لئے کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے" کہنے لگے جی ہاں اس سطح کی دعوتوں میں عموماً یہ انتظام نہیں ہوتا میں نے عرض کیا کہ مجھے تو یہ بات بہت بری لگتی ہے کہ ہم یہاں کھانا کھا رہے ہوں، اور ہمارے ڈرائیور باہر بھوکے کھڑے ہوں" ۔اس پر انہوں نے خاصی بے پروائی سے جواب دیا: جی ہاں! یہ بات ہے تو تکلیف دہ مگر اتنے سارے ڈرائیوروں کا انتظام بھی تو مشکل

ہے، اور یہ لوگ اس بات کے عادی ہیں، وہ بعد میں گھر جا کر کھانا کھا لیتے ہیں"

اسی دعوت کے اختتام پر میں نے پلیٹوں اور ڈونگوں میں بچے ہوئے کھانے کا اندازہ لگایا تو میرا غالب گمان یہ تھا کہ اس میں تھوڑا سا اضافہ کر کے وہ کھانا تمام ڈرائیوروں کے لئے کافی ہو سکتا تھا، کھانے کے بعد وہاں عشائیہ میں تقریروں کا بھی سلسلہ تھا، اور وہ اتنا دراز ہوا کہ ہم گیارہ بجے کے بعد وہاں سے روانہ ہو سکے، راستے میں میں نے اپنے ڈرائیور سے پوچھا کہ تمہارے کھانے کا کیا ہوا؟ اس نے بتایا کہ میں نے اور میرے بعض ساتھیوں نے ایک قریب کے ہوٹل سے کھانا کھا لیا تھا، پھر وہ خود ہی کہنے لگا کہ البتہ بعض ڈرائیوروں کے پاس کھانے کے پیسے بھی نہیں تھے، وہ ابھی تک بھوکے ہیں، مثال کے طور پر اس نے کئی ڈرائیوروں کا ذکر کیا اور کہنے لگا کہ "وہ اب اپنے صاحب کو گھر پہنچا کر بس میں اپنے گھر جائیں گے، اور بارہ ایک بجے پہنچ کر کھانا کھائیں گے"

ایک طرف تو اپنے متعلقین اور ملازمین کے ساتھ (جو درحقیقت گھر ہی کے ایک فرد بن جاتے ہیں) ہماری بے حسی کا عالم یہ ہے، اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے رزق کی ناقدری اور اضاعت کا حال یہ ہے کہ سیروں کے حساب سے کھانا ہم پلیٹوں میں اس طرح بچا دیتے ہیں کہ وہ کسی دوسرے کے لئے قابل استعمال نہیں رہتا، اور کوڑے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتا ہے، بالخصوص ایسی بوفے دعوتوں میں جہاں کھانا ایک میز سے اٹھا کر خود لے جانا پڑتا ہے، عموماً لوگ ایک ہی دفعہ میں زیادہ سے زیادہ کھانا اٹھا کر محض اس لئے لے جاتے ہیں تا کہ بوقت ضرورت دوبارہ کھانا لانا نہ پڑے، لیکن اس ذرا سی زحمت سے بچنے کے لئے کھانے کی ایک بڑی مقدار بالکل ضائع ہو جاتی ہے۔

ایک طرف حضرت میاں صاحب کے مذکورہ بالا واقعے کا تصور کیجئے کہ انہیں انسانوں سے گزر کر کیسے بلیوں اور پرندوں اور چیونٹیوں کی بھی فکر ہے، اور دوسری طرف ہمارا حال یہ ہے کہ منوں اور سیروں کے حساب سے کھانا ضائع کر دینا گوارا ہے، مگر ڈرائیوروں اور ملازمین کے لئے کھانے کا انتظام کرنا گوارا نہیں۔

بہ بین تفاوت رہ، از کجاست تا بہ کجا؟

کیا ہم تھوڑی سی احتیاط اور دھیان کو کام میں لا کر رزق کی اس بے حرمتی اور اضاعت سے بچنے کا اہتمام نہیں کر سکتے؟ اگر ہم ایسا کر لیں تو کیا بعید ہے کہ اس ذرا سی توجہ کی بدولت مخلوق خدا کے کچھ افراد کی بھوک مٹ جائے؟ اور ہم ایک سنگین اجتماعی گناہ سے بچ جائیں۔

۲۱ شوال ۱۴۱۴ھ/ ۱۳ اپریل ۱۹۹۴ء

☆☆☆

غلط نسبت سے بچئے ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

اما بعد!

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَنْ تَحَلّٰى بِمَا لَمْ يُعْطَ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ))(۱)

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص آراستہ ہوا ایسی چیز کے جو اس کو نہیں دی گئی تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے''

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے بارے میں لوگوں کے سامنے کوئی ایسی صفت ظاہر کرے جو حقیقت میں اس کے اندر موجود نہیں تو گویا اس نے اپنے پورے جسم پر سر سے لے کر پاؤں تک جھوٹ لپیٹ رکھا ہے، اور جس طرح لباس نے سارے جسم کو ڈھانپا ہوا ہوتا ہے، اس طرح اس نے جھوٹ سے اپنے آپ کو ڈھانپ لیا ہے۔

یہ بھی جھوٹ اور دھوکہ ہے

مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ آدمی دھوکہ دینے کے لئے اپنے لئے کوئی ایسی صفت ظاہر کرے جو حقیقت میں اس کے اندر نہیں ہے، مثلاً ایک شخص عالم نہیں ہے لیکن اپنے آپ کو عالم ظاہر کرتا ہے۔ یا ایک شخص ایک خاص منصب نہیں رکھتا، لیکن اپنے آپ کو اس خاص منصب کا حامل ظاہر کرتا ہے۔ یا ایک شخص خاص حسب نسب سے تعلق نہیں رکھتا، مگر اپنے آپ کو اس نسب کے ساتھ منسوب کرتا ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/۲۵۰ تا ۲۶۲) جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی المتشبع بما لم یعطه، رقم: ۱۹۵۷

ان کے بارے میں فرمایا کہ جھوٹ کے کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔ اسی طرح اک شخص مالدار نہیں ہے، لیکن اپنے آپ کو مالدار ظاہر کرتا ہے۔ بہر حال، جو صفت انسان کے اندر موجود نہیں ہے، لیکن وہ بناوٹی طور پر اس صفت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس حدیث میں اس پر یہ وعید بیان فرمائی گئی ہے۔

اپنے نام کے ساتھ ''فاروقی'' ''صدیقی'' لکھنا

مثلاً ہمارے معاشرے میں اس میں بہت ابتلا پایا جاتا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو کسی ایسے نسب اور خاندان سے منسوب کر دیتے ہیں جس کے ساتھ حقیقت میں تعلق نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی شخص ''صدیقی'' نہیں ہے، لیکن اپنے نام کے ساتھ ''صدیقی'' لکھتا ہے یا کوئی شخص ''فاروقی'' نہیں ہے، لیکن اپنے آپ کو ''فاروقی'' لکھتا ہے، یا کوئی ''انصاری'' نہیں ہے، لیکن اپنے آپ کو ''انصاری'' لکھتا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو کسی اور نسب کی طرف منسوب کرنا جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ بڑا سخت گناہ ہے۔ اور اس کے بارے میں اس حدیث میں فرمایا کہ گویا اس نے سر سے لے کر پاؤں تک جھوٹ کا لباس پہنا ہوا ہے۔

کپڑوں سے تشبیہ کیوں؟

اس گناہ کو جھوٹ کے کپڑے پہننے والے سے اس لئے تشبیہ دی کہ ایک گناہ تو وہ ہوتا ہے جس میں انسان تھوڑی دیر کے لئے مبتلا ہوا، پھر وہ گناہ ختم ہوگیا۔ لیکن جس شخص نے غلط نسبت اختیار کر رکھی ہے، اور لوگوں میں اپنی ایسی حیثیت ظاہر کر رکھی ہے جو حقیقت میں اس کی حیثیت نہیں ہے تو وہ ایک دائمی گناہ ہے، اور ہر وقت اس کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ جس طرح لباس انسان کے ساتھ ہر وقت چپکا رہتا ہے، اسی طریقے سے یہ گناہ بھی ہر وقت انسان کے ساتھ چپکا رہے گا۔

جولاہوں کا ''انصاری'' اور قصائیوں کا ''قریشی'' لکھنا

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا جس کا نام ہے ''غایات النسب'' کیونکہ بعض قومیں اپنے ناموں کے ساتھ غلط نسبتیں لگا لیتی ہیں۔ ہندوستان میں یہ بات عام تھی کہ کپڑے بننے والے کو ''جولاہا'' کہا جاتا تھا، وہ اپنے نام کے ساتھ ''انصاری'' لکھتے تھے۔ اور گوشت فروخت کرنے والے قصائی جو اپنے ناموں کے ساتھ ''قریشی'' لکھتے تھے۔ اس لئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ رسالہ لکھا اور اس میں اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ نسب کے بارے میں جھوٹ بیان کرنا سخت گناہ ہے، اور اس کے بارے میں کئی

احادیث آئی ہیں جن میں جھوٹی نسبت سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ اس رسالہ کے لکھنے کے نتیجے میں ان قوموں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف پورے ہندوستان میں ایک طوفان کھڑا کر دیا کہ انہوں نے ہمارے خلاف بڑی سخت کتاب لکھی ہے۔ لیکن حقیقت وہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی۔

نسب اور خاندان فضیلت کی چیز نہیں

بات دراصل یہ ہے کہ ''نسب'' اور ''خاندان'' کا معاملہ ایسا ہے کہ اس پر کوئی دینی فضیلت موقوف نہیں، کوئی شخص کسی بھی نسب اور خاندان سے تعلق رکھتا ہو، لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو ''تقویٰ'' عطا فرمایا ہے تو اچھے سے اچھے نسب والے سے بہتر ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے صاف اعلان فرما دیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾(۱)

اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ مرد حضرت آدم علیہ السلام سے اور عورت حضرت حوا علیہا السلام سے۔ اس لئے جتنے بھی انسان دنیا میں آئے ہیں سب ایک ماں باپ کے بیٹے ہیں۔ البتہ ہم نے یہ جو مختلف قبیلے بنا دیے کہ کسی انسان کا تعلق کسی قبیلے سے ہے، اور کسی انسان کا تعلق کسی خاندان سے ہے، یہ خاندان اور قبیلے اس لئے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اگر سب انسان ایک ہی قبیلے کے ہوتے تو اک دوسرے کو پہچاننے میں دشواری ہوتی، اب یہ بتا دینا آسان ہے کہ یہ فلاں شخص ہے اور فلاں قبیلے کا ہے۔ لہٰذا صرف پہچان کی آسانی کی خاطر ہم نے تمہیں قبیلوں میں تقسیم کیا ہے، لیکن کسی قبیلے کو دوسرے قبیلے پر کوئی فضیلت نہیں بلکہ تم میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ والا اور عزت والا وہ ہے جس میں تقویٰ زیادہ ہو۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی ایسے نسب اور خاندان سے وابستہ ہے جس کو لوگ اعلیٰ نسب نہیں سمجھتے تو کوئی پرواہ کی بات نہیں، تم اپنے اعمال اور اخلاق صحیح کرو، اور اپنی زندگی کا کردار درست کرو تو پھر کردار اور عمل کے نتیجے میں تم اعلیٰ سے اعلیٰ نسب والے سے آگے بڑھ جاؤ گے۔ لہٰذا کیوں اپنے آپ کو غلط خاندان کی طرف منسوب کر کے گناہ کا ارتکاب کرتے ہو؟ اس لئے جس شخص کا جو نسب ہے وہ اسی کو بیان کرے۔ اور نسب بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، بیان ہی نہ

---

(۱) الحجرات: ۱۳، آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لئے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے''

کرے، لیکن اگر بیان کرنا ہی ہے تو وہ نسب بیان کرے جو اپنا واقعی نسب ہے، بلاوجہ دوسرے نسب کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا جائز نہیں، اس پر بڑی سخت وعید بیان فرمائی گئی ہے۔

''متبنّٰی'' کو حقیقی باپ کی طرف منسوب کریں

اسی طرح کا ایک دوسرا مسئلہ بھی ہے جس پر قرآن کریم نے آدھا رکوع نازل کیا ہے: وہ یہ کہ بعض اوقات کوئی شخص دوسرے کے بچے کو اپنا ''متبنی'' ''لے پالک'' بنالیتا ہے، مثلاً کسی شخص کی کوئی اولاد نہیں ہے اس نے دوسرے کا بچہ گود لے لیا اور اس کی پرورش کی، اور اس کو اپنا ''متبنی'' بنالیا تو شرعاً متبنی بنانا اور کسی بچے کی پرورش کرنا اور اپنے بیٹے کی طرح اس کو پالنا تو جائز ہے، لیکن شرعی اعتبار سے ''متبنی'' کسی بھی حالت میں اس پالنے والے کا حقیقی بیٹا نہیں بن سکتا۔ لہٰذا جب اس بچے کو منسوب کرنا ہو تو اس کو اصل باپ ہی کی طرف منسوب کرنا چاہئے کہ فلاں کا بیٹا ہے، پرورش کرنے والے کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں۔ اور رشتے کے جتنے احکام ہیں وہ سب اصل باپ کی طرف منسوب ہوں گے، یہاں تک کہ جس شخص نے اس کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہے، اور جو عورت منہ بولی ماں بنی ہے، اگر وہ نامحرم ہے تو اس بچے کے بڑے ہونے کے بعد اس سے اسی طرح پردہ کرنا ہوگا جس طرح ایک نامحرم سے پردہ ہوتا ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنا متبنی بنایا تھا۔ ان کا واقعہ بھی بڑا عجیب و غریب ہے۔ یہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ زمانہ جاہلیت میں کسی کے غلام تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو مکہ مکرمہ آنے کی توفیق دی، یہاں آ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر مسلمان ہو گئے۔ ان کے ماں باپ اور خاندان کے دوسرے افراد ان کی تلاش میں تھے کہ کہاں ہیں، تلاش کرتے کرتے کئی سال گزر گئے کئی سال کے بعد کسی نے ان کو خبر دی کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں ہیں اور وہ مسلمان ہو چکے ہیں، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے والد اور چچا تلاش کرتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور جا کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، اور کہا کہ یہ زید بن حارثہ جو آپ کے پاس رہتا ہے یہ ہمارا بیٹا ہے، ہم اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں، یہ ہمیں نہیں مل رہا تھا، اب یہاں ہمیں مل گیا ہے، ہم اس کو لے جانا چاہتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ٹھیک ہے تم اس کے باپ ہو، اور وہ تمہارا بیٹا ہے، جا کر اس سے پوچھ لو، وہ اگر تمہارے ساتھ جانا چاہے تو چلا جائے، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر وہ خوش ہو گئے، کہ چلو

انہوں نے بہت آسانی سے اجازت دے دی، اب یہ دونوں باپ اور چچا اس خیال میں تھے کہ بیٹے کو جدا ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں، باپ اور چچا کو دیکھ کر خوش ہو جائے گا اور ساتھ چلنے کے لئے فوراً تیار ہو جائے گا۔ اس وقت حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حرم میں تھے۔ جب یہ دونوں ان کو لینے کے لئے وہاں پہنچے اور ملاقات کی تو انہوں نے فی الحال خوشی کا اظہار تو کیا، لیکن جب باپ نے یہ کہا کہ اب میرے ساتھ گھر چلو، تو انہوں نے کہا کہ ابا جان میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اس لئے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام کی نعمت سے سرفراز فرما دیا ہے، اور آپ کو ابھی تک اسلام کی دولت نصیب نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ یہاں پر مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہے، اس صحبت کو چھوڑ کر میں نہیں جا سکتا۔ باپ نے ان سے کہا: بیٹا تم اتنے عرصہ کے بعد مجھ سے ملے، اس کے باوجود تم نے مجھے اتنا مختصر جواب دے دیا کہ تم میرے ساتھ نہیں جا سکتے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے جو حقوق ہیں، میں ان کو ادا کرنے کو تیار ہوں، لیکن جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے میرا جو تعلق قائم ہوا ہے وہ اب مرنے جینے کا تعلق ہے اس لئے میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ جواب سنا تو آپ نے فرمایا کہ چونکہ تم نے میرے ساتھ یہ تعلق قائم کیا ہے اس لئے میں تمہیں آج سے اپنا بیٹا بناتا ہوں۔ اس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنا متبنی بنالیا۔ اس کے بعد سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ بیٹے جیسا ہی سلوک فرماتے، تو لوگوں نے بھی ان کو زید بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر پکارنا شروع کر دیا، جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ آیت نازل ہوئی:

﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾(۱)

یعنی تم لوگوں نے متبنی کا جو نسب بیان کرنا شروع کر دیا ہے، یہ درست نہیں، بلکہ وہ بیٹا اپنے باپ کا ہے۔(۲)

اس کو اسی حقیقی باپ کی طرف منسوب کرو، کسی اور کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں۔ اور دوسری جگہ یہ آیت نازل فرمائی:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾(۳)

---

(۱) الأحزاب: ۵، آیت کا ترجمہ یہ ہے: "تم ان (منہ بولے بیٹوں) کو ان کے باپوں کے نام سے پکارا کرو۔ یہی طریقہ اللہ کے نزدیک پورے انصاف کا ہے"

(۲) صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب الملائكة بدراء، رقم: ۳٦۹۹، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل زيد بن حارثه و اسامة بن زيد، رقم: ٤٤٥١

(۳) الاحزاب: ٤٠

یعنی محمد ﷺ تم میں سے کسی مرد کے حقیقی باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں، اس لئے ان کی طرف کسی بیٹے کو منسوب مت کرو۔ اور آئندہ کے لئے یہ اصول مقرر فرما دیا کہ کوئی متبنیٰ آئندہ اپنے منہ بولے باپ کی طرف منسوب نہیں ہوگا، بلکہ حقیقی باپ کی طرف منسوب ہوگا۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ ایک اور صحابی حضرت سالم مولی حذیفہ رضی اللہ عنہ تھے، ان کو بھی متبنیٰ بنایا گیا تھا۔ ان کے بارے میں بھی حضور اقدس ﷺ نے حکم دیا کہ یہ منہ بولے باپ کی طرف منسوب نہیں ہوں گے، اور جب یہ اپنے منہ بولے باپ کے گھر میں داخل ہوں تو پردے کے ساتھ داخل ہوں۔

یہ سب احکام اس لئے دیے گئے کہ شریعت نے نسب کے تحفظ کا بہت اہتمام فرمایا ہے کہ کسی کی نسبت غلط نہ جائے، اس کی وجہ سے مغالطہ پیدا نہ ہو جائے۔ اس لئے جو شخص اپنا نسب غلط بیان کرے وہ اس حدیث کی وعید کے اندر داخل ہے اور وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔

اپنے نام کے ساتھ ''مولانا'' لکھنا

اسی طرح کوئی شخص علم کا حامل نہیں ہے لیکن اپنے آپ کو عالم ظاہر کرتا ہے مثلاً آج کل لوگ اپنے نام کے ساتھ ''مولانا'' لکھ دیتے ہیں، حالانکہ عرف عام میں لفظ ''مولانا'' یا لفظ ''علامہ'' ان افراد کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جو باقاعدہ دین کے حامل ہوں، اب اگر ایک شخص دین کا حامل نہیں ہے، وہ اگر ان الفاظ کو استعمال کرے گا تو اس کی وجہ سے مغالطہ پیدا ہوگا، اور وہ اس حدیث کی وعید میں داخل ہوگا۔

اپنے نام کے ساتھ ''پروفیسر'' لکھنا

اسی طرح لفظ ''پروفیسر'' ہے۔ ہمارے معاشرے میں ''پروفیسر'' ایک خاص منصب ہے اس کی خاص شرائط ہیں۔ ان شرائط کو جو شخص پوری کرے گا تو وہ پروفیسر کہلائے گا لیکن آج کل یہ حال ہے کہ جو شخص کسی جگہ کا استاذ بن گیا وہ اپنے نام کے ساتھ پروفیسر لکھ دیتا ہے۔ حالانکہ اس کے ذریعہ وہ اپنی ایک ایسی صفت ظاہر کر رہا ہے جو اس کے اندر موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ غلط بیانی ہے اور دوسروں کو مغالطہ میں ڈالنا ہے اور یہ بھی اس حدیث کی وعید کے اندر داخل ہے، اور حرام ہے اور ناجائز ہے۔

لفظ "ڈاکٹر" لکھنا

اسی طرح ایک شخص "ڈاکٹر" نہیں ہے، لیکن اپنے نام کے ساتھ لفظ "ڈاکٹر" لکھ دیا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہوں نے چند دن تک کسی ڈاکٹر کے پاس کمپاؤڈری کی، اس کے نتیجے میں کچھ دواؤں کے نام یاد ہو گئے تو بس اس کے بعد اپنے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" لکھنا شروع کر دیا اور پھر باقاعدہ کلینک کھول کر بیٹھ گئے اور علاج شروع کر دیا۔ یہ بھی اس وعید کے اندر داخل ہے اور یہ نسبت کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ یہ سب مغالطے اس حدیث کے تحت داخل ہیں کہ جو شخص ایسی چیز ظاہر کرے جو حقیقت میں اس کے اندر نہیں ہے تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔

جیسا اللہ نے بنایا ہے ویسے ہی رہو

اور یہ سب گناہ ایسے نہیں ہیں کہ ان کو ایک مرتبہ کر لیا، بس وہ گناہ ختم ہو گیا، بلکہ چونکہ اس شخص نے اس نسبت کو اپنے نام کا جز بنا رکھا ہے، مثلاً لفظ مولانا یا ڈاکٹر یا پروفیسر وغیرہ کو اپنے نام کا حصہ بنا رکھا ہے تو وہ گناہ مستقل اور دائمی ہے۔ اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا ہے۔ اس لیے گناہ کو جھوٹ کے کپڑے پہننے سے تشبیہ دی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس گناہ سے محفوظ فرمائے۔

ارے بھئی! اپنی کوئی صفت بیان کرنے میں کیا رکھا ہے۔ جیسا اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے ویسے ہی رہو اور بلاوجہ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش میں نہ پڑو۔ بلکہ جو صفت اللہ تعالیٰ نے دی ہے بس وہی صفت ظاہر کرو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے کسی کو کوئی صفت دے دی، کسی کو کوئی صفت دے دی۔ زندگی کا یہ سارا کاروبار اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت سے چل رہا ہے۔ تم اس کے اندر دخل اندازی کر کے ایک غلط بات ظاہر کرو گے تو یہ بات اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوگی۔

مالداری کا اظہار

اسی طرح اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ایک آدمی زیادہ مالدار نہیں ہے لیکن لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے اپنے آپ کو بہت مالدار ظاہر کرتا ہے اور دکھاوے کے لیے ایسے کام کرتا ہے تاکہ لوگ مجھے زیادہ دولت مند سمجھ کر میری زیادہ عزت کریں۔ یہی دکھاوا ہے اور یہی نام و نمود ہے۔ یہ بات بھی اسی گناہ میں داخل ہے۔

نعمت خداوندی کا اظہار کریں

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر قربان جائیں۔ آپ نے ایسی ایسی باریک تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔ چنانچہ آپ کی تعلیمات پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو حکم علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ایک حکم تو یہ ہے کہ جو صفت تمہارے اندر موجود نہیں ہے وہ ظاہر مت کرو تا کہ اس کی وجہ سے دوسرے کو دھوکہ نہ ہو لیکن دوسری طرف آپ نے دوسری تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يَرٰى اَثَرَ نِعْمَتِهٖ عَلٰى عَبْدِهٖ))(۱)

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بندے کو جو نعمت عطا فرمائی ہے اس نعمت کے آثار اس بندے پر ظاہر ہوں۔ مثلاً ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے کھاتا پیتا بنایا ہے اور اس کو مال و دولت عطاء فرمائی ہے تو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنا رہن سہن ایسا رکھے جس سے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا اظہار ہو۔ مثلاً وہ صاف ستھرے کپڑے پہنے، صاف ستھرے گھر میں رہے۔ اگر وہ شخص اس دولت کی نعمت کے باوجود فقیر اور مسکین بنا پھرتا ہے، مثلاً کچیلا اور پھٹا پرانا لباس پہنا رہتا ہے اور گھر کو گندا رکھتا ہے تو ایسی صورت بنانا ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہے۔ ارے بھائی! جب اللہ تعالیٰ نے نعمت عطا فرمائی ہے تو اس کے آثار تمہاری زندگی پر ظاہر ہونے چاہئیں۔ تمہاری صورت دیکھ کر کوئی تمہیں فقیر نہ سمجھ لے اور کوئی تمہیں مستحق زکوٰۃ سمجھ کر تمہیں زکوٰۃ نہ دے دے۔ اس لیے جیسے حقیقت میں تم ہو ویسے ہی رہو۔ نہ تو اپنے آپ کو زیادہ ظاہر کرو اور نہ ہی اتنا کم ظاہر کرو جس سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہو۔

عالم کے لیے علم کا اظہار کرنا

علم کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہے تو اب تواضع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی چھپ کر ایک کونے میں بیٹھ جائے۔ اس خیال سے کہ اگر میں دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو عالم ظاہر کروں گا تو اس کے نتیجے میں لوگ مجھے عالم سمجھیں گے اور یہ تواضع کے خلاف ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے علم کی نعمت عطا فرمائی ہے تو اس نعمت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس علم کا اتنا اظہار کرے جس سے عام لوگوں کو فائدہ پہنچے اور علم کی نعمت کا شکر یہ بھی یہی ہے کہ بندوں کی

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الأدب عن رسول اللہ، باب ماجاء ان اللہ تعالی یحب ان یری اثر نعمته علی عبده، رقم: ۲۷٤٤، مسند أحمد، رقم: ۷۷٥۹

خدمت میں اس علم کو استعمال کرے۔ وہ علم اللہ تعالیٰ نے اس لیے نہیں دیا کہ تم تکبر کر کے بیٹھ جاؤ، وہ علم اس لیے نہیں دیا کہ اس کے ذریعہ تم لوگوں پر اپنا رعب جماؤ بلکہ وہ علم اس لیے دیا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کی خدمت کرو۔ لہٰذا دونوں طرف توازن برقرار رکھتے ہوئے آدمی کو چلنا پڑتا ہے۔ یہ سب دین کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں ☆

ہمارے معاشرے میں کھانے پینے کی اشیاء کو جس بے دردی سے ضائع کیا جاتا ہے وہ رزق کے بے حرمتی کے علاوہ بھوکوں کے منہ سے نوالہ چھیننے کے مترادف ہے۔

رزقِ خداوندی کے بارے میں ہماری یہ لاپروائی صرف کھانے پینے کے اشیاء کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ دوسری اشیاء ضرورت کو ضائع کرنا بھی ہمارا ایک اجتماعی روگ بن چکا ہے اور اس کی وجہ سے بھی ہم طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے وضو کرتے وقت پانی احتیاط کے ساتھ خرچ کرنے کی اس قدر تاکید فرمائی ہے کہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا:

"پانی کی فضول خرچی کرنے سے بچو، خواہ تم کسی بہتے ہوئے دریا کے پاس کھڑے ہو"(۱)

ظاہر ہے کہ جو شخص کسی بہتے ہوئے دریا سے وضو کر رہا ہو اسے پانی کی کمی کا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا لیکن آنحضرت ﷺ نے اسے بھی پانی احتیاط کے ساتھ استعمال کرنے کی تاکید فرمائی اس لیے کہ اوّل تو جب ایک شخص کو پانی فضول بہانے کی عادت پڑ جاتی ہے تو وہ پانی کی کمی کے مواقع پر بھی اس فضول خرچی سے باز نہیں رہ سکتا۔ دوسرے جب کسی قوم کا مزاج یہ بن جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بے دریغ بلاضرورت استعمال کرے تو ایسی قوم کے لیے بہتے ہوئے دریا بھی کافی نہیں ہو سکتے۔

ہمارے ملک کو اللہ تعالیٰ نے جو قدرتی وسائل عطا فرمائے ہیں وہ دنیا کے دوسرے بہت سے ملکوں کے مقابلے میں قابل رشک ہیں لیکن ہم نے اپنی لاپروائی، فضول خرچی، خودغرضی اور بددیانتی کی وجہ سے انہیں اپنے لیے اس طرح ناکافی بنایا ہوا ہے کہ دوسروں کے سامنے ہماری بھیک کا پیالہ ہر وقت پھیلا رہتا ہے۔

آج ہمارا ملک بجلی کی قلت کی وجہ سے شدید مسائل سے دوچار ہے۔ ملک کا بیشتر حصہ لوڈشیڈنگ کی زد میں ہے۔ روزانہ کئی کئی گھنٹے بجلی غائب رہتی ہے اور اس کی وجہ سے لوگ سخت مشکلات سے

☆ ذکر و فکر، ص: ۷۷ تا ۸۲

(۱) سنن ابن ماجه، رقم: ٤٦٠ (٢/٥٦)، مسند أحمد، رقم: ٧٠٦٣، شعب الإيمان، رقم: ٢٧٨٨

دوچار ہوتے ہیں۔ پنجاب کے متعلقہ حکام نے اعلان کیا ہے کہ اس سال گرمی کے موسم میں پچھلے تمام سالوں سے زیادہ لوڈ شیڈنگ کرنی پڑے گی اور جوں جوں گرمی میں اضافہ ہوگا اسی نسبت سے لوڈشیڈنگ کا دورانیہ بھی بڑھتا چلا جائے گا۔

ہمارے ملک میں پڑنے والی شدید گرمی کے عالم میں بجلی کا میسر ہونا گرمی کی تکلیف کو دس گنا بڑھا دینے کے مترادف ہے لیکن بات صرف اس تکلیف کی نہیں، بعض مرتبہ بجلی بعض انسانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتی ہے، نہ جانے کتنے مریض ہیں جو بجلی کی نایابی کی وجہ سے مناسب علاج کی سہولت سے محروم رہتے ہیں اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے اسی وجہ سے جان دے دیتے ہیں۔

ایک طرف بجلی کی قلت کا تو یہ عالم ہے اور دوسری طرف جب کہیں بجلی میسر ہو تو وہاں اس کے بے محابا اور بے دریغ استعمال کا حال یہ ہے کہ اس میں کہیں کمی نظر نہیں آتی۔ خالی کمروں میں بلب روشن ہیں، پنکھے چل رہے ہیں اور بسا اوقات ایئر کنڈیشنر بھی پوری قوت کے ساتھ برسر کار ہیں۔ دن کے وقت بلاضرورت پردے ڈال کر سورج کی روشنی کو داخلے سے روک دیا گیا ہے اور بجلی کی روشنی میں کام ہو رہا ہے۔ معمولی معمولی بات پر گھروں اور دیواروں پر چراغاں کا شوق پورا کیا جا رہا ہے۔ جہاں لوگ بجلی کو ترس ترس کر مر رہے ہیں وہاں رات کے وقت ہاکی اور فٹ بال کھیلنے کے لیے میدانوں میں انتہائی طاقت کی سرچ لائٹیں روشن ہیں اور بعض میدان تو کھیل کے بغیر بھی ان کی روشنی سے بقعہ نور بنے ہوئے ہیں اور سڑکوں پر روشن اشتہارات (نیون سائنز) روشنی کی کسی حد کے پابند نہیں ہیں۔

بالخصوص جن مقامات پر بجلی کا بل خرچ کرنے والے کو خود ادا نہیں کرنا پڑتا وہاں تو بجلی کا استعمال اتنی بے دردی سے ہوتا ہے کہ الامان! سرکاری دفتروں میں دن کے وقت بسا اوقات بالکل بلاضرورت لائٹیں روشن ہوتی ہیں اور پنکھے اور ایئر کنڈیشنر اس طرح چل رہے ہوتے ہیں کہ ان کا خرچ بہت آسانی سے کم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض سرکاری ملازمین اور بہت سے نجی کمپنیوں کے ملازمین کو گھروں پر بھی بجلی کے مفت استعمال کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔ وہاں تو مالِ مفت دلِ بے رحم کی مثال پوری آب وتاب کے ساتھ صادق آتی ہے۔

چند سال پہلے مجھے چین جانے کا اتفاق ہوا۔ چین اس وقت دنیا کی ایک اُبھرتی ہوئی طاقت ہے اور رفتہ رفتہ اقتصادی ترقی میں بھی وہ عالمی برادری میں اپنا نمایاں مقام بنا رہی ہے لیکن بیجنگ ایئرپورٹ سے شہر کی طرف جاتے ہوئے سڑکوں پر روشنی کی کمی نمایاں طور پر محسوس ہوئی۔ شروع میں خیال ہوا کہ یہ بیرونِ شہر کا علاقہ ہے اس لیے معمولی روشنی پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن جب گاڑی شہر میں داخل ہوئی تو وہاں کا منظر بھی کچھ مختلف نظر نہ آیا، سوچا کہ یہ بھی شہر کا کوئی پسماندہ علاقہ ہوگا لیکن جب ہم شہر کے اس حصے میں پہنچے جسے بیجنگ کا دل کہنا چاہیے تو بھی روشنیوں کا معیار دیکھ کر بڑی حیرت

ہوئی۔ حد تو یہ ہے کہ چانگ پن اسٹریٹ جو دنیا کی سب سے کشادہ شاہراہ سمجھی جاتی ہے اس کے دونوں طرف بھی بہت معمولی لائٹیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد میں ایک ہفتے سے زیادہ چین میں رہا اور اس کے مختلف صوبوں اور شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر جگہ صورتِ حال یہی نظر آئی۔ اشتہارات اور نیون سائن تو خیر سرمایہ دار ملکوں کی خصوصیت ہیں کسی اشتراکی ملک میں ان کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی لیکن پورے ملک میں مجھے کوئی بھی آرائشی روشنی دکھائی نہیں دی۔

ہم چونکہ کراچی کی جگمگ کرتی ہوئی روشنیوں کے عادی تھے اس لیے رات کے وقت پورا ملک اندھیرا اندھیرا معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے اپنے میزبانوں سے اپنے اس تاثر کا ذکر کیا تو انہوں نے بڑا معقول جواب دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارا ملک بہت بڑا ہے اور آبادی کے لحاظ سے ہمارے یہاں بجلی کی قلت ہے۔ لہٰذا ہم اس قدر بجلی استعمال کرتے ہیں جتنی ہمارے ضروری کاموں کے لیے ناگزیر ہے۔ جب تک ہمارے ملک میں بجلی کی پیداوار وافر مقدار تک نہ پہنچ جائے ہم آرائشی روشنیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

یہ جواب ایک ایسے ملک کے باشندوں کا تھا جو ہم سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے اور جس کے پاس سرکارِ دو عالم ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی بھی موجود نہیں ہے:

''پانی کی فضول خرچی کرنے سے بچو، چاہے تم کسی بہتے ہوئے دریا کے پاس کھڑے ہو''(۱)

لیکن اس ارشادِ نبوی ﷺ کی روشنی سے مالا مال ہونے کے باوجود ہمارا حال یہ ہے کہ ہمیں لوڈشیڈنگ بھی گوارا ہے، اپنے دیہات کو بجلی سے بالکلیہ محروم رکھنا بھی منظور ہے، سسکتے ہوئے مریضوں کو مناسب تشخیص اور علاج کے لیے ترسانا بھی قبول ہے، لیکن نہ ہم چراغاں اور دوسری آرائشی روشنیوں سے دستبردار ہو سکتے ہیں اور نہ بجلی کے عام استعمال میں کفایت اور بچت کا لحاظ رکھ سکتے ہیں۔

ہماری خود غرضی اور قدرتی وسائل کے ساتھ بے رحمی تو اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ میں نے کئی گھروں میں یہ دیکھا کہ باورچی خانے میں گیس کے چولہے چوبیس گھنٹے مسلسل جلتے رہتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے بھی بند نہیں ہوتے۔ شروع میں میں نے اسے گھر والوں کی بے پروائی پر محمول کیا لیکن جب ذرا اہمیت کے ساتھ تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ چولہے اس لیے بند نہیں کیے جاتے کہ انہیں دوبارہ روشن کرنے کے لیے ماچس کی ایک تیلی خرچ نہ کرنی پڑے۔ چونکہ گیس کا بل ہر چولہے پر یکساں آتا تھا خواہ گیس کم خرچ ہوئی ہو یا زیادہ اس لیے اس کے مسلسل استعمال سے چولہے کے مالک کا ایک پیسہ بھی زیادہ خرچ نہیں ہوتا تھا لیکن اگر چولہے کو بند کر کے ضرورت کے وقت دوبارہ جلایا جائے تو اس پر

(۱) حسن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ما جاء في القصد في الوضوء، رقم: ٤١٩ مسند احمد، رقم ٦٧٦٨

ماچس کی ایک تیلی خرچ ہو جاتی تھی۔

جب میں نے پہلی بار چولہوں کے مسلسل جلنے کی یہ وجہ سنی تو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا لیکن جب کئی گھرانوں میں یہ منظر آنکھوں سے دیکھا اور بعض حضرات نے بے جھجک اس صورت حال کی یہ وجہ بیان بھی کی تو اندازہ ہوا کہ ہماری خودغرضی کتنی پستی تک پہنچ چکی ہے اور اپنی ماچس کی ایک تیلی بچانے کے لیے پوری قوم کی دولت کو کس طرح لٹایا جا رہا ہے۔

جن حضرات کو کسی وجہ سے بجلی، گیس یا دوسرے وسائل مفت میسر آتے ہیں اور ان کے فضول استعمال سے ان کی جیب پر کوئی بار نہیں پڑتا وہ صرف اتنا دیکھتے ہیں کہ فوری طور پر ان کا کوئی پیسہ خرچ نہیں ہوا لیکن اتنی گہرائی میں جانے کی فرصت کسے ہے کہ آخر وہ اسی ملک کے باشندے ہیں جس میں وسائل کی قلت کا رونا رویا جا رہا ہے اور بالآخر اس فضول خرچی کا نقصان دوسروں کے ساتھ انہیں بھی اُٹھانا پڑے گا۔

بجلی اور گیس کا ذکر تو مثال کے طور پر آ گیا۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کے ساتھ ہماری ناقدری، بے دردی اور خودغرضی کا یہی عالم ہے۔ پیداوار میں اضافے کی کوششیں اپنی جگہ ہیں اور یہ کوششیں ضرور جاری رہنی چاہئیں لیکن ان کوششوں کی صحیح منصوبہ بندی حکومت کا کام ہے اور اگر اسے سیاسی جھمیلوں سے فرصت ملے تو وہی یہ کام ٹھیک ٹھیک انجام دے سکتی ہے۔ یہ کام ایک ایک شخص کی انفرادی طاقت سے باہر ہے لیکن ہر شخص کے اپنے بس میں یہ ضرور ہے کہ وہ حاصل شدہ وسائل کو ٹھیک ٹھیک خرچ کرنے کا اہتمام کرے اور اپنے خرچ پر قابو پا کر قومی دولت کے ضیاع سے پرہیز کرے۔

بجلی ہی کے معاملے کو لے لیجئے۔ میرے بس میں براہ راست یہ نہیں ہے کہ میں ملک میں بجلی کی پیداوار میں اضافہ کر دوں لیکن یہ ضرور میرے بس میں ہے کہ جہاں ایک بلب سے کام چل سکتا ہے وہاں میں دو بلب نہ جلاؤں، جہاں سورج کی روشنی میسر ہو وہاں کوئی بلب روشن نہ کروں۔ جہاں ایک پنکھا کارآمد ہو سکتا ہے وہاں دو پنکھے نہ چلاؤں۔ جہاں ایئر کنڈیشنر کے بغیر گزارا ہو سکتا ہے وہاں ایئر کنڈیشنر استعمال نہ کروں۔ جس کسی کمرے میں بلاوجہ روشنی، پنکھا یا بجلی کا کوئی اور آلہ چلتا ہوا دیکھوں اُسے بند کر دوں۔ جہاں چند روشنیوں سے ضرورت پوری ہو جاتی ہو وہاں دیواروں اور گھروں پر چراغاں نہ کروں۔ کیا بعید ہے کہ اس طرح جس بجلی کا خرچ میں بچا رہا ہوں وہ کسی ضرورتمند کے کام آ جائے، اس سے کسی مریض کو راحت مل جائے یا کسی غریب کے ظلمت کدے میں اُجالا ہو جائے۔

اگر ہم میں سے ہر فرد اپنے دائرے میں آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کر لے کہ بہتے ہوئے دریا کے پاس بھی پانی کے فضول خرچ سے بچو تو نہ جانے کتنے انسانوں کے دُکھ دور ہو جائیں۔

۲۸ شوال ۱۴۱۴ھ/۱۰ اپریل ۱۹۹۴ء

اپنی خبر لیجیے ☆

زمانہ بڑا خراب ہے، امانت اور دیانت لوگوں کے دل سے اُٹھ چکی ہے۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ دفتروں میں پیسے یا سفارش کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ ہر شخص زیادہ سے زیادہ بٹورنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ شرافت اور اخلاق کا جنازہ نکل گیا ہے۔ بے دینی کا سیلاب چاروں طرف اُمڈ رہا ہے۔ لوگ خدا اور آخرت سے غافل ہو بیٹھے ہیں۔

اس قسم کے جملے ہیں جو ہم دن رات کسی نہ کسی اسلوب سے کہتے یا سنتے رہتے ہیں۔ ہماری کوئی محفل شاید ہی حالات کی خرابی کے اس شکوے سے خالی ہوتی ہو اور یہ شکوہ کچھ غلط بھی نہیں۔ واقعتاً زندگی کے جس شعبے کی طرف نظر ڈالیے، ایک نمایاں انحطاط دکھائی دیتا ہے اور معاشرتی خرابیاں ہمیں گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں۔

دوسری طرف اصلاح معاشرہ کی کوششوں کا جائزہ لیجیے تو بظاہر ان میں بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ نہ جانے کتنے ادارے، کتنی جماعتیں، کتنی انجمنیں اسی معاشرے کی اصلاح کے لیے قائم ہیں اور اپنے اپنے دائرے میں اپنی اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ کر رہی ہیں۔ شاید ملک کا کوئی قابل ذکر حصہ اس قسم کی کوششوں سے خالی ہو اور ان میں سے بعض کوششوں کا محدود سا اثر کہیں کہیں نظر بھی آ جاتا ہے، لیکن اگر بحیثیت مجموعی پورے معاشرے کو دیکھا جائے تو بظاہر یہ ساری کوششیں رائیگاں محسوس ہوتی ہیں اور معاشرے کی مجموعی فضا پر نہ صرف یہ کہ ان کا کوئی نمایاں اثر ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اُفق پر اُمید کی کوئی کرن بھی نظر نہیں آتی۔

اس صورت حال کے یوں تو بہت سے اسباب ہیں اور یہ اسباب اب اتنے اُلجھ گئے ہیں کہ اس اُلجھی ہوئی ڈور کا سرا پکڑنا بھی آسان نہیں رہا لیکن اس وقت میں صرف ایک اہم سبب کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف بسا اوقات ہمارا دھیان نہیں جاتا۔

وہ سبب یہ ہے کہ ہمارا اجتماعی مزاج کچھ ایسا بن گیا ہے کہ ہمیں دوسروں پر تنقید کرنے، ان کے عیوب تلاش کرنے اور ان کی برائیوں پر تبصرہ کرنے میں جو لطف آتا ہے وہ کسی حقیقی اصلاحی عمل میں

☆ ذکر و فکر، ص: ۵۹ تا ۶۵

نہیں آتا۔ حالات کی خرابی کا شکوہ ہمارے لیے وقت گزاری کا ایک مشغلہ ہے جس کے نت نئے اسلوب ہم ایجاد کرتے رہتے ہیں لیکن ان خرابیوں کی اصلاح کے لیے کوئی بامعنی قدم اُٹھانے کو تیار نہیں ہوتے اور اگر اصلاحِ احوال کے لیے کوئی جھنڈا بلند کرتے بھی ہیں تو ہماری خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اصلاح کے عمل کا آغاز کسی دوسرے سے ہو۔ ہماری اصلاحی جدوجہد اس ذہنی مفروضے کی بنیاد پر آگے بڑھتی ہے کہ ہمارے سوا ساری دنیا کے لوگ خراب ہو گئے ہیں اور ان کے اعمال واخلاق کو درست کرنے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ سوچتے اور کرتے ہوئے یہ خیال بہت کم لوگوں کو آتا ہے کہ کچھ خرابیاں خود ہمارے اندر بھی ہو سکتی ہیں اور ہمیں سب سے پہلے ان کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔ چنانچہ جو اصلاحی تحریک اپنے آپ سے بے خبر ہو کر صرف دوسروں کو اپنا ہدف بناتی ہے اس میں دوسروں کے لیے کوئی کشش اور تاثیر نہیں ہوتی اور وہ محض ایک رسمی کارروائی ہو کر رہ جاتی ہے۔

معاشرے کے حالات اور لوگوں کے طرزِ عمل پر تنقید کا سب سے خطرناک اور نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو خود اپنی غلط کاری کے لیے وجہ جواز بنا لیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ فقرہ بکثرت سننے میں آتا رہتا ہے کہ یہ کام ٹھیک تو نہیں ہے لیکن زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے زمانے اور زمانے کی ساری برائیوں کا تذکرہ تو اس انداز کرتے ہیں جیسے ہم ان تمام برائیوں سے معصوم اور محفوظ ہیں لیکن اس تذکرے کے بعد جب عملی زندگی میں پہنچتے ہیں تو ان کاموں کا بے تکان ارتکاب کرتے جاتے ہیں، جن کی برائی بیان کرتے ہوئے ہم نے اپنا سارا زورِ بیان خرچ کیا تھا۔

اگر ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ہولناک آگ بھڑک رہی ہو اور ہم یقین سے جانتے ہوں کہ اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو یہ پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی تو کیا پھر بھی ہمارا طرزِ عمل یہ ہوگا کہ ہم اطمینان سے بیٹھ کر اظہارِ افسوس کرتے رہیں اور ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش نہ کریں؟ ایسے موقع پر بے وقوف سے بے وقوف شخص بھی آگ کی تفصیلات کو نمک مرچ لگا کر بیان کرنے سے پہلے اُسے بجھانے کے لیے فائر بریگیڈ کو فون کرے گا اور خود بھی اسے بجھانے کا جو طریقہ ممکن ہو اختیار کرے گا اور اگر آگ بجھتی نظر نہ آئے تو کم از کم تو وہاں سے بھاگ ہی کھڑا ہوگا لیکن یہ کام کوئی بدترین دیوانہ ہی کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بجائے وہ آگ کا قصہ لوگوں کو سنا کر خود اسی آگ میں چھلانگ لگا دے۔

لیکن معاشرتی برائیوں کی جس آگ کا تذکرہ ہم دن رات کرتے ہیں عجیب بات ہے کہ اس کے بارے میں ہمارا طرزِ عمل یہی ہے کہ یہ تذکرہ کرنے کے بعد ہم خود بھی اسی میں کود جاتے ہیں۔ ہم دن رات رشوت خوروں کو صلواتیں سناتے ہیں لیکن اگر کبھی وقت پڑ جائے تو خود رشوت لینے یا دینے

میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جھوٹ، خیانت اور حرام خوری کی مذمت ہمارے ورد زبان رہتی ہے لیکن اگر کبھی داؤ چل جائے تو خود ان برائیوں سے نہیں چوکتے اور اگر کبھی اس پر اعتراض ہو تو ٹکسالی جواب یہ ہے کہ سارا معاشرہ جس ڈھب پر چل رہا ہے ہم اس سے کٹ کر کس طرح رہ سکتے ہیں؟ کیا اس طرز عمل کی مثال بالکل ایسی نہیں ہے کہ کوئی شخص بھڑکتی ہوئی آگ کو دیکھ کر خود اس میں چھلانگ لگا دے؟

جب معاشرے میں برائیوں اور گمراہیوں کا چلن عام ہو جائے تو ایسے موقع کے لیے قرآن کریم نے ایک بڑی اصولی ہدایت عطا فرمائی ہے جس سے غفلت کے نتیجے میں ہم موجودہ حالات سے دوچار ہیں۔ وہ ہدایت قرآن کریم ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾(۱)

"اے ایمان والو! خود اپنی خبر لو، اگر تم ہدایت کے راستے پر ہو تو جو لوگ گمراہ ہیں وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے"

اس آیت کریمہ نے یہ زریں حقیقت ارشاد فرمائی ہے کہ دوسروں کی بدعملی تمہاری بدعملی کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی، نہ صرف اس کا تذکرہ کر دینے سے کوئی مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنی خبر لو اور کم از کم اپنی ذات کی حد تک بداعمالیوں سے پرہیز کرو اور اپنا سارا زور خود اپنے آپ کو درست کرنے میں خرچ کر دو۔ جن برائیوں سے فوراً بچ سکتے ہو ان سے فوراً بچ جاؤ۔ جن سے بچنے کے لیے کسی کوشش اور محنت کی ضرورت ہے ان کے لیے کوشش شروع کر دو اگر کوئی دوسرا شخص رشوت لے رہا ہے تو کم از کم تم رشوت کے گناہ سے بچ جاؤ، اگر کوئی دوسرا خیانت کا مرتکب ہو رہا ہے تو کم از کم خود خیانت سے اجتناب کرو۔ اگر کوئی دوسرا جھوٹ بول رہا ہے تو کم از کم خود تم سچائی کو اپنا شعار بنالو۔ اگر کوئی دوسرا حرام خوری میں مبتلا ہے تو کم از کم تم یہ طے کر لو کہ حرام کا کوئی لقمہ میرے پیٹ میں نہیں جائے گا۔

یہی ہدایت ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ان الفاظ میں دی ہے:

((اِذَا رَاَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَهَوًى مُتَّبَعًا وَدُنْيَا مُؤْثَرَةً وَاِعْجَابَ كُلِّ ذِىْ رَاْيٍ بِرَاْيِهٖ فَعَلَيْكَ بِخَاصَّةِ نَفْسِكَ وَدَعْ عَنْكَ اَمْرَ الْعَامَّةِ))(۲)

---

(۱) المائدة: ۱۰۵

(۲) سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة المائدة، رقم: ۲۹۸٤، سنن أبي داؤد، كتاب الملاحم، باب الأمر والنهي، رقم: ۳۷۷۸، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب قوله تعالى يا أيها الذين آمنوا عليكم أنفسكم، رقم: ٤٠٠٤

”جب تم دیکھو کہ لوگ جذبہ بخل کی اطاعت کر رہے ہیں اور خواہشات نفسانی کے پیچھے دوڑ رہے ہیں دنیا کو ہر معاملے میں ترجیح دی جا رہی ہے اور ہر شخص اپنی رائے پر گھمنڈ میں مبتلا ہے تو ایسے میں خاص طور پر اپنی اصلاح کی فکر کرو اور عام لوگوں کے معاملے کو چھوڑ دو“

مطلب یہ ہے کہ ایسے موقع پر عام لوگوں کی برائی کرتے رہنا مسئلے کا کوئی حال نہیں، مسئلے کا حل یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر کرے اور اپنے آپ کو ان پھیلی ہوئی برائیوں سے بچانے کے لیے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دے۔ ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ قَالَ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ أَهْلَكُهُمْ))(۱)

”جو شخص یہ کہتا پھرے کہ لوگ برباد ہو گئے تو درحقیقت اُن سب سے زیادہ برباد خود وہ شخص ہے“

یعنی جو شخص ہر وقت دوسروں کی برائیوں کا راگ الاپتا رہتا ہو اور خود اپنے عیوب کی پروانہ کرے وہ سب سے زیادہ تباہ حال ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ اپنی اصلاح کی فکر کرلے اور اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لے کر اپنی برائیاں دور کرلے تو کم از کم معاشرے سے ایک فرد کی برائی ختم ہو جائے گی اور تجربہ یہ ہے کہ معاشرے میں ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا ہے اور ایک فرد کی اصلاح کسی دوسرے کی اصلاح کا بھی ذریعہ بن جاتی ہے۔ معاشرے درحقیقت افراد ہی کے مجموعے سے عبارت ہے اور اگر افراد میں اپنی اصلاح کی فکر عام ہو جائے تو دھیرے دھیرے پورا معاشرہ بھی سنور سکتا ہے۔

لہٰذا مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم معاشرے اور اس کی برائیوں کو ہر وقت کوستے ہی رہیں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات لوگوں میں مایوسی پھیلتی ہے اور بدعملی کو فروغ ملتا ہے۔ اس کے بجائے مسئلے کا حل قرآن وسنت کے مذکورہ بالا ارشادات کی روشنی میں یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے حالات کا جائزہ لے اور اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کی عادت ڈال کر یہ دیکھے کہ اس کے ذمے اللہ اور اس کے بندوں کے کیا کیا حقوق و فرائض ہیں؟ اور کیا وہ واقعتاً ان حقوق و فرائض کو ٹھیک ادا کر رہا ہے؟ معاشرے کی جن برائیوں کا شکوہ اس کی زبان پر ہے ان میں سے کن کن برائیوں میں وہ خود حصہ دار ہے؟

چونکہ ہم نے کبھی اس نقطہ نظر سے اپنا جائزہ لینے کی کوشش ہی نہیں کی اس لیے یہ اجمالی بہانہ ہم دن رات پیش کرتے رہتے ہیں کہ چار سُو پھیلی ہوئی بدعنوانیوں میں ایک اکیلا شخص کیا کر سکتا ہے؟

---

(۱) صحیح مسلم، باب النهي من قول هلك الناس، رقم: ۱۳۹ (۲۰۲٤/٤)، سنن أبي داؤد، رقم: ٤٩٨٥ (٣١٥/١٤) مسند أحمد، رقم: ١٠٠٠٦ (٢٦٥/٢)، مؤطا مالك، رقم: ١٨١٥

حالانکہ اگر انصاف کے ساتھ اس طرح جائزہ لے کر دیکھیں تو پتہ چلے کہ ان گئے گزرے حالات میں بھی ایک اکیلا شخص بہت کچھ کر سکتا ہے۔ جائزہ لینے سے معلوم ہوگا کہ ہماری بہت سی غلطیاں اور کوتاہیاں ایسی ہیں جن کا ہم فوری طور پر تدارک کر سکتے ہیں اور کوئی نہیں ہے جو اس تدارک کے راستے میں رکاوٹ بن سکے۔

اور بہت سی غلطیاں ایسی ہیں جن کا اگر فوری تدارک ممکن نہیں ہے تو کم از کم ان کی مقدار اور سنگینی میں فوری طور سے کمی کی جا سکتی ہے اور بہت سی ایسی بھی ہیں جن کی تلافی اور تدارک میں کچھ دشواریاں ہیں لیکن وہ دشواریاں ایسی نہیں ہیں جو حل نہ ہو سکیں۔ ان دشواریوں کو دور کرنے کی راہیں سوچی جا سکتی ہیں۔ آخر اسی گئے گزرے معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو برائیوں کی اس بھڑکی ہوئی آگ میں بھی اپنا دامن بچا کر زندگی گزار رہے ہیں، ایسے لوگ اپنی پاکباز زندگی کی وجہ سے مر نہیں گئے۔ وہ بھی اسی معاشرے میں زندہ ہیں بلکہ اگر حقیقت شناس نگاہ ہو تو بہت اچھی طرح زندہ ہیں۔

لیکن ان ساری باتوں کا احساس اسی وقت جاگ سکتا ہے جب دل میں اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہو جائے اور اس فکر کے نتیجے میں اپنا جائزہ لینے کی عادت پڑ جائے۔ جس دن ضمیر کی یہ طاقت بیدار ہو گئی اور اس کی آواز سننے کے لیے قلب و ذہن کے دریچے کھل گئے اس دن صحیح معنی میں اس حقیقت کا انکشاف ہوگا کہ معاشرے کی خرابی کا جو ہوا ہم نے اپنے سروں پر مسلط کر رکھا تھا اور جس نے ہمیں اپنی صحت کی ہر تدبیر سے روکا ہوا تھا وہ کتنا بے حقیقت اور کتنا بے وزن تھا؟ بیمار کا سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اسے اپنی بیماری کا احساس ہو اور اس بات کا یقین اس کے دل میں پیدا ہو کہ اس کی بیماری ناقابل علاج نہیں ہے اور آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہم اس احساس اور اس یقین سے مسلح ہو کر اپنی بیماری کا علاج تلاش کرنے کی فکر کریں۔

۷ شوال ۱۴۱۴ھ / ۲۰ مارچ ۱۹۹۴ء

☆☆☆

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۸

اخلاق سیئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰، انار کلی، لاہور، پاکستان ★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی

فون ۳۷۳۵۳۲۵۵-۳۷۲۲۳۹۹۱ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵ فون ۳۷۳۵۳۲۵۵۔۳۷۲۲۳۹۹۱ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۹

اخلاق حسنہ اور ان کے فضائل

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات

★ ۱۳ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی

فون ۳۷۳۲۴۴۱۲-۳۷۲۳۴۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۹۲-۴۲ فون ۳۷۲۳۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خُطبات و تحریرات)

جلد نمبر ۸

اخلاقِ سیّئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام مفتی مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

اخلاق سیّئہ اور ان کی اصلاح

جلد ۸

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۸

اخلاق سیئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور — فون ۳۷۳۲۴۴۱۲، فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵
★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان — فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۲۵۳۲۵۵
★ موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی — فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحر یرات

جلد ۸

اخلاق سیئہ اور ان کی اصلاح

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان ___ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱ - ۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان ___ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۸

اخلاق سیئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

مرتب

مولانا محمد اویس سرور صاحب

ادارۂ اسلامیات

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰۔ انارکلی، لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اُردو بازار کراچی

فون ۳۷۳۵۳۲۵۵-۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۲۲۳۷۸۵ فون ۳۷۳۵۳۲۵۵-۳۷۲۲۳۹۹۱ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

فہرست مضامین

جھوٹ اور اس کی مروجہ صورتیں ۱۹

اسلام ایک مکمل دین ہے ۲۰
زمانۂ جاہلیت میں جھوٹ کا تصور ۲۰
جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ، ایک جرم ۲۱
کیا دین صرف نماز روزے کا نام ہے؟ ۲۲
جھوٹی سفارش کا حکم ۲۲
بچوں کے ساتھ بھی جھوٹ نہ بولیں ۲۳
مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولیں ۲۳
حضور ﷺ کی خوش طبعی ۲۴
خوش طبعی کا ایک انوکھا انداز ۲۴
جھوٹا کیریکٹر سرٹیفکیٹ ۲۵
کردار معلوم کرنے کے دو طریقے ۲۵
سرٹیفکیٹ شرعاً ایک گواہی ہے ۲۶
جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے ۲۶
سرٹیفکیٹ جاری کرنے والا گناہ گار ہوگا ۲۷
عدالت میں جھوٹ کی وبا ۲۷
مدرسہ کی تصدیق گواہی ہے ۲۸
کتاب کی تقریظ لکھنا گواہی ہے ۲۸
جھوٹ کی اجازت کے مواقع ۲۹
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جھوٹ سے اجتناب ۲۹
حضرت گنگوہیؒ اور جھوٹ سے پرہیز ۳۰
حضرت نانوتویؒ اور جھوٹ سے پرہیز ۳۱
بچوں کے دلوں میں جھوٹ کی نفرت ۳۲
جھوٹ عمل سے بھی ہوتا ہے ۳۲
اپنے نام کے ساتھ ''سیّد'' لکھنا ۳۳
نام کے ساتھ ''پروفیسر'' یا ''مولانا'' لکھنا ۳۳

خیانت اور اس کی مروجہ صورتیں ۳۴

امانت داری کی تاکید ۳۴
اسلام میں امانت کا تصور ۳۵
امانت کے معنی ۳۵
یوم الست میں اقرار ۳۶
یہ زندگی اللہ کی امانت ہے ۳۶
یہ جسم ایک امانت ہے ۳۷
آنکھ، کان اور زبان امانت ہیں ۳۷
خودکشی کیوں حرام ہے؟ ۳۹
گناہ کرنا خیانت ہے ۳۹
''عاریت'' کی چیز امانت ہے ۴۰
یہ برتن امانت ہیں ۴۰
یہ کتاب امانت ہے ۴۱
ملازمت کے اوقات امانت ہیں ۴۱
دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کا معمول ۴۱
حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تنخواہ ۴۲
آج حقوق کے مطالبے کا دور ہے ۴۳
ہر شخص اپنے فرائض کی نگرانی کرے ۴۳

یہ بھی ناپ تول میں کمی ہے	۴۴
''منصب'' اور ''عہدہ'' ذمہ داری کا پھندا	۴۴
کیا ایسے شخص کو خلیفہ بنا دوں؟	۴۵
حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور احساسِ ذمہ داری	۴۶
پاکستان کا اوّلین مسئلہ ''خیانت'' ہے	۴۶
دفتر کا سامان امانت ہے	۴۷
سرکاری اشیاء امانت ہیں	۴۷
حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا پرنالہ	۴۸
مجلس کی گفتگو امانت ہے	۴۸
راز کی باتیں امانت ہیں	۴۹
ٹیلیفون پر دوسروں کی باتیں سننا حرام ہے	۴۹
خلاصہ	۵۰
وعدہ خلافی اور اسکی مروجہ صورتیں	۵۱
''منگنی'' ایک وعدہ ہے	۵۲
حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ابوجہل سے وعدہ	۵۲
حق و باطل کا پہلا معرکہ ''غزوۂ بدر''	۵۳
گردن پر تلوار رکھ کر لیا جانے والا وعدہ	۵۳
تم وعدہ کر کے زبان دے کر آئے ہو	۵۳
جہاد کا مقصد، حق کی سربلندی	۵۴
یہ ہے وعدہ کا ایفاء	۵۴
فتح حاصل کرنے کے لئے جنگی تدبیر	۵۵
یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے	۵۵
سارا مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا	۵۶
حضرت فاروق اعظمؓ اور معاہدہ کی پاسداری	۵۷
وعدہ خلافی کی مروجہ صورتیں	۵۷
ملکی قانون کی پابندی کرنا واجب ہے	۵۸
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قانون	۵۸
''ویزہ'' لینا ایک عملی وعدہ ہے	۵۹
ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی گناہ ہے	۵۹
یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے	۶۰
خلاصہ	۶۰
طنز اور طعنہ سے بچئے	۶۱
دنیا غم اور خوشی سے مرکب ہے	۶۱
''ہمارے دین پر مصیبت واقع نہ ہو''	۶۲
تمام گناہ آفات ہیں	۶۲
مؤمن یہ چار کام نہیں کرتا	۶۳
طعنہ کیا چیز ہے؟	۶۳
زبان سے دل زخمی ہو جاتے ہیں	۶۳
مؤمن کے جان و مال اور عزت کی حرمت	۶۴
ایسا شخص کعبہ کو ڈھانے والا ہے	۶۴
مؤمن کا دل تجلی گاہ ہے	۶۵
مسلمان کا دل رکھنا موجبِ ثواب ہے	۶۵
ایک سوال اور اس کا جواب	۶۵
ایک مؤمن دوسرے مؤمن کیلئے آئینہ ہے	۶۶
آئینہ سے تشبیہ دینے کی وجہ	۶۶
غلطی بتائے، ذلیل نہ کرے	۶۷
''طنز'' ایک فن بن گیا ہے	۶۷
انبیاء علیہم السلام طعنہ نہیں دیتے تھے	۶۷
میری ایک تالیف کا قصہ	۶۷
یہ کتاب کس مقصد سے لکھی ہے؟	۶۸
یہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ نہیں ہے	۶۸
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت	۶۹

حق بات کوئی لٹھ نہیں ہے	۶۹
حضرات انبیاء علیہم السلام کے اندازِ جواب	۶۹
حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۷۰
ترکی بہ ترکی جواب مت دو	۷۱
انتقام کے بجائے معاف کردو	۷۱
بزرگوں کی مختلف شانیں	۷۱
اپنا وقت بدلہ لینے میں کیوں ضائع کروں	۷۲
پہلے بزرگ کی مثال	۷۲
دوسرے بزرگ کا انداز	۷۲
بدلہ لینا بھی خیر خواہی ہے	۷۳
اللہ تعالیٰ کیوں بدلہ لیتے ہیں؟	۷۳
پہلے بزرگ کا طریقہ سنت تھا	۷۴
معاف کرنا باعثِ اجر وثواب ہے	۷۴
طعنہ سے بچیں	۷۵
مومن کسی پر لعنت نہیں کرتا	۷۵
بددعا کے الفاظ	۷۶
یہ لعنت جائز ہے	۷۶
فحش گوئی کرنا مومن کی شان نہیں	۷۷
بدگوئی کرنا مومن کا شیوہ نہیں	۷۷
یہودیوں کی مکاری	۷۸
نرمی زینت بخشتی ہے	۷۸
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاق میں بھی اتباع کریں	۷۹
لعنت کا وبال	۸۰
غیبت ۔ زبان کا ایک عظیم گناہ	۸۱
"غیبت" کی تعریف	۸۲
"غیبت" گناہِ کبیرہ ہے	۸۳
یہ لوگ اپنے چہرے نوچیں گے	۸۳
غیبت، زنا سے بدتر ہے	۸۴
غیبت کرنے والے کو جنت سے روک دیا جائے گا	۸۴
بدترین سود غیبت ہے	۸۴
غیبت، مردار بھائی کا گوشت کھانا ہے	۸۵
غیبت کرنے پر عبرت ناک خواب	۸۶
حرام کھانے کی ظلمت	۸۷
غیبت کی اجازت کے مواقع	۸۷
دوسرے کے شر سے بچانے کیلئے غیبت کرنا	۸۷
اگر دوسرے کی جان کا خطرہ ہو	۸۸
علانیہ گناہ کرنے والے کی غیبت	۸۹
یہ بھی غیبت میں داخل ہے	۸۹
فاسق وفاجر کی غیبت جائز نہیں	۸۹
ظالم کے ظلم کا تذکرہ غیبت نہیں	۹۰
غیبت سے بچنے کے لئے عزم اور ہمت	۹۱
غیبت سے بچنے کا علاج	۹۱
غیبت کا کفارہ	۹۲
حقوق کی تلافی کی صورت	۹۲
معاف کرنے کرانے کی فضیلت	۹۳
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معافی مانگنا	۹۳
اسلام کا ایک اصول	۹۴
غیبت سے بچنے کا آسان راستہ	۹۵
اپنی برائیوں پر نظر کرو	۹۵
گفتگو کا رخ بدل دو	۹۶
"غیبت" تمام خرابیوں کی جڑ	۹۶
اشارہ کے ذریعہ غیبت کرنا	۹۶

غیبت سے بچنے کا اہتمام کریں	۹۷
غیبت سے بچنے کا طریقہ	۹۷
غیبت سے بچنے کا عزم کریں	۹۸
''چغلی'' ایک سنگین گناہ	۹۸
''چغلی'' غیبت سے بدتر ہے	۹۹
عذابِ قبر کے دو سبب	۹۹
پیشاب کی چھینٹوں سے بچئے	۱۰۰
''چغلی'' سے بچئے	۱۰۱
راز فاش کرنا چغلی ہے	۱۰۱
زبان کے دو اہم گناہ	۱۰۲
غیبت اور اس کا علاج	۱۰۳
غیبت کے گناہ کی شدت	۱۰۳
غیبت کی تعریف	۱۰۴
غیبت اور بہتان میں فرق	۱۰۴
ایک پروفیسر صاحب کا غیبت پر تبصرہ	۱۰۵
اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک معیار رکھو	۱۰۶
غیبت کی اجازت کے مواقع	۱۰۷
فاسق اور گناہ گار کی غیبت کرنا	۱۰۷
دوسروں کا تذکرہ ہی نہ کریں	۱۰۸
اپنی فکر کریں	۱۰۸
غیبت کا ایک عملی علاج	۱۰۹
دل شکنی کی پرواہ نہ کرے	۱۰۹
وقت پر نماز پڑھنا فرض ہے	۱۰۹
دوسروں کی دنیا بنانے والا	۱۱۰
غیبت سے بچنے کیلئے ہمت کی ضرورت ہے	۱۱۱
ناجائز غیبت کی شرط ناگواری ہے	۱۱۱
ایسا ہنسی مذاق جائز نہیں	۱۱۲
غیبت سے بچنے کا طریقہ	۱۱۳
جہنم میں اوندھے منہ ڈالنے والی	۱۱۳
زبان کی قدر کریں	۱۱۴
دو عظیم کلمے	۱۱۴
اسلام میں داخل کرنے والی چیز	۱۱۵
زبان کا فائدہ اور نقصان دونوں عظیم ہیں	۱۱۶
امام شافعیؒ کا جواب سے پہلے خاموش رہنا	۱۱۶
زبان کی حفاظت پر جنت کی ضمانت	۱۱۶
فضول گوئی پر دو طالب علموں کا واقعہ	۱۱۷
علاج کا فائدہ	۱۱۸
علاج سخت ہونے پر اشکال اور جواب	۱۱۸
ہر شخص کا علاج علیحدہ ہوتا ہے	۱۱۹
میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل	۱۱۹
ایک صاحب کو ڈانٹنے کا واقعہ	۱۱۹
پہلے سوچو پھر بولو	۱۲۰
غیبت کو جائز کرنے کے لئے نفس کی تاویل	۱۲۱
اس تاویل کا جواب	۱۲۱
یہ سب شیطانی تاویلات ہیں	۱۲۲
غیبت کا علاج ہمت اور استحضار ہے	۱۲۲
غیبت پر اپنے نفس کو سزا دینا	۱۲۳
غیبت کرنے پر نفس کو فاقہ کرانا	۱۲۳
دوسروں کے عیوب ظاہر کرنے کا حکم	۱۲۳
مبتدی جائز غیبت بھی نہ کرے	۱۲۴
انفعالی کیفیت کے تقاضے پر عمل	۱۲۴
برائی کا خیال دل میں آنا	۱۲۵

کیفیت انفعالیہ گناہ نہیں	۱۲۶
اس کے مقتضیات پر عمل گناہ ہے	۱۲۶
معاف کرنے میں عافیت ہے	۱۲۶
بزرگوں کے مختلف رنگ	۱۲۷
منزل کھوٹی ہو گی	۱۲۷
شفقت کی بنیاد پر بدلہ	۱۲۸
تیسرا رنگ	۱۲۸
اس خیال کو جمنے مت دو	۱۲۸
ورنہ یہ خیال گناہ میں مبتلا کر دے گا	۱۲۹
غیر اختیاری خیال کا علاج	۱۲۹
پہلا علاج دعا کرنا	۱۳۰
دوسرا علاج، عذاب کا استحضار	۱۳۰
ایک ہفتہ کے بعد اطلاع دو	۱۳۰
غیبت کی معافی کا طریقہ	۱۳۱
حقوق العباد کی سنگینی	۱۳۱
غیبت کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں	۱۳۲
کہا سنا معاف کر دینا	۱۳۲
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل	۱۳۳
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا!	۱۳۳
اجمالی معافی تمام متعلقین سے مانگ لو	۱۳۳
حضور ﷺ کا صحابہ سے معافی مانگنا	۱۳۴
میرے والد ماجدؒ کا معافی نامہ شائع کرانا	۱۳۴
جس کی غیبت کی اس کی تعریف کرو	۱۳۵
جس کی غیبت کی تھی اگر وہ مر چکا ہو تو؟	۱۳۶
ننانوے قتل کرنے والے کا راستہ	۱۳۶
مایوس ہونے کی ضرورت نہیں	۱۳۷
کفر و شرک سے توبہ	۱۳۸
شیطان کا بہکاوا	۱۳۸
"ابونواس" کی مغفرت کا واقعہ	۱۳۸
ظاہری حالت پر فیصلہ مت کرو	۱۴۰
غیبت مباح کی صورت میں	۱۴۰
علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۱۴۰
امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۱۴۱
نفسانیت کی غیبت حرام ہے	۱۴۱
بلا تحقیق بات کہنا بہتان ہے	۱۴۲
غیبت سے حسی تکلیف ہوتی ہے	۱۴۳
مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۱۴۳
ہماری بے حسی کا حال	۱۴۴
مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۱۴۴
غیبت سے کیا حاصل ہوا؟	۱۴۴
غیبت کے نتیجے میں کئی گناہ ہو جاتے ہیں	۱۴۴
غیبت کا اصل علاج تواضع ہے	۱۴۵
ہمارے بزرگوں کی تواضع	۱۴۵
غیبت کو ختم کرنے والی چیز تواضع	۱۴۶
اپنے عیوب کا استحضار کریں	۱۴۶
انسان کی حقیقت یہ ہے	۱۴۷
تواضع کے لئے صحبتِ شیخ	۱۴۷
حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت	۱۴۸
علم کا "سور" دیر سے نکلتا ہے	۱۴۸
غیبت ہونے پر جرمانہ	۱۴۹
صرف آرزو کرنا کافی نہیں	۱۴۹
ایک دیہاتی کا قصہ	۱۴۹
یہ عاجز بندہ ہے	۱۵۰
ذرا چلو تو سہی	۱۵۰

اللہ تعالیٰ اُٹھالیں گے	۱۵۰
غیبت کا ایک عجیب عملی علاج	۱۵۱
کثرتِ کلام اور اس کا علاج	۱۵۲
حلال چیزوں کو کیوں چھڑوایا جاتا ہے؟	۱۵۲
طبیعت کو اعتدال پر لانا مقصود ہے	۱۵۳
ایک خوبصورت مثال	۱۵۳
ہمارا نفس گناہوں کی طرف مڑا ہوا ہے	۱۵۳
کم کھانے اور کم سونے کی حقیقت	۱۵۳
کم کھانے اور کم سونے کی حد	۱۵۴
اس طریق کا پہلا قدم ''زبان پر قابو پانا ہے''	۱۵۴
زبان کی حرکات و سکنات	۱۵۵
دماغ اور زبان کے درمیان رابطہ	۱۵۵
ایک عبرتناک واقعہ	۱۵۵
ہم بے شمار نعمتوں کے مالک ہیں	۱۵۶
اس نعمت کو گناہ میں استعمال مت کرنا	۱۵۶
''زبان'' آخرت کے خزانے جمع کرنے کا ذریعہ	۱۵۷
''زبان'' جہنم سے نکالنے والی ہے	۱۵۷
یہ زبان جہنم میں لے جانے والی ہے	۱۵۷
زبان کے ذریعہ غیبت	۱۵۸
اس زبان کو قابو میں رکھیں	۱۵۹
بلاضرورت مت بولیں	۱۵۹
حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۱۵۹
ہماری مثال	۱۶۰
جائز بات بھی بلاضرورت مت بولیں	۱۶۰
نئی نسل کو کوئی زبان نہیں آتی	۱۶۰
اُردو بولنے والوں کے چند فقرے	۱۶۱
حضرت تھانویؒ کا کلام جچا تلا ہوتا ہے	۱۶۱
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ	۱۶۲
جب اعتدال ہو تو ایسا ہی کلام نکلتا ہے	۱۶۲
کس مقصد سے بات کر رہے ہیں؟	۱۶۳
حضرت صدیق اکبرؓ اور جھوٹ سے پرہیز	۱۶۳
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا جھوٹ سے بچنا	۱۶۴
حضرت گنگوہیؒ اور جھوٹ سے پرہیز	۱۶۵
وساوس اور ان کا علاج	۱۶۶
وساوس کا علاج ''عدم التفات''	۱۶۶
کوئی شخص وساوس سے خالی نہیں	۱۶۷
دین پر چلنے والے کو وسوسے زیادہ آتے ہیں	۱۶۷
ان کی طرف توجہ نہ کی جائے	۱۶۷
''وساوس'' ایمان کی علامت ہیں	۱۶۷
چور اسی گھر میں آتا ہے جہاں دولت ہو	۱۶۸
خیالات پر پریشانی ایمان کی موجودگی کی علامت	۱۶۸
وساوس کیوں آتے ہیں؟	۱۶۸
وساوس و خیالات کی مثال	۱۶۹
وساوس کے وقت اپنے کام میں مشغول رہو	۱۷۰
وساوس کا ایک اور علاج	۱۷۰
دوسرے خیال کی طرف متوجہ ہو جاؤ	۱۷۰
وساوس دور کرنے کے لئے کوئی وظیفہ نہیں	۱۷۱
صحت مقصود ہوتی ہے نہ کہ دوا	۱۷۱

"عدم التفات کا علاج" خود مقصود بالذات ہے	۱۷۱
"راحت" خود مقصود بالذات نہیں	۱۷۲
پھر اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر پر راضی رہو	۱۷۲
تیرے لئے یہی مناسب تھا	۱۷۳
میرے پیمانے میں حاصل میخانہ	۱۷۳
صبر کرنے کا ثواب علیحدہ ملے گا	۱۷۳
دنیا میں تکلیف ضرور پہنچی ہے	۱۷۴
حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۱۷۵
"رضا بالقضا" میں سکون ہے	۱۷۵
بدگمانی اور اس کا علاج	۱۷۶
معاشرتی خرابیوں کا سبب	۱۷۷
ہمارے معاشرے کی حالت	۱۷۷
آیت قرآنی میں عجیب ترتیب	۱۷۷
تجسس اور تحسس میں فرق	۱۷۸
تجسس کیوں حرام ہے؟	۱۷۸
اپنے عیوب کی فکر کریں	۱۷۹
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی حالت	۱۷۹
مذموم بدگمانی کونسی؟	۱۸۰
دوسرے کے عمل کی تاویل کریں	۱۸۰
یہ بدگمانی حرام ہے	۱۸۰
بدگمانی کے دو درجے	۱۸۱
بدگمانی کا منشا کبر ہے	۱۸۱
تجسس اور بدگمانی کی انتہاء "غیبت" ہے	۱۸۲
بدگمانی میں گناہ کا درجہ	۱۸۳
بدگمانی اور تجسس اور غیبت سے بچنے کے تین علاج	۱۸۳
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا سکوت	۱۸۴
حضرت صدیق اکبرؓ کا زبان کو سزا دینا	۱۸۴
خاموش رہنے کا مجاہدہ	۱۸۵
غیبت ہونے پر جرمانہ	۱۸۵
نماز چھوڑنے پر جرمانہ	۱۸۵
اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاؤ	۱۸۶
تواضع پیدا کریں	۱۸۶
اپنی حقیقت میں غور کریں	۱۸۶
ایک صاحب کی قوت اور کمزوری	۱۸۶
علم پر ناز نہ کریں	۱۸۷
آڑ میں بیٹھ کر باتیں سننا	۱۸۷
ہمارا طریقۂ زندگی	۱۸۸
لڑائی جھگڑے کی بنیاد	۱۸۸
ایسی جگہ پر مت جائیں	۱۸۸
فون پر دوسروں کی باتیں سننا	۱۸۹
دوسروں کے خط پڑھنا	۱۸۹
تجسس کی جائز صورت	۱۸۹
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ	۱۸۹
آپ رضی اللہ عنہ کا استغفار کرنا	۱۹۰
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فیصلہ	۱۹۰
فقہاء کا قولِ فیصل	۱۹۱
اپنے جاگنے کی اطلاع کر دے	۱۹۱
زبان دانی کی اطلاع کر دے	۱۹۲
ایک بزرگ کا تجسس سے بچنا	۱۹۲
غصہ اور اس کا علاج	۱۹۴
غصہ کے ساتھ جمع ہونے والے امراض	۱۹۴

دو جبلی چیزیں	۱۹۴
حضور ﷺ سے مختصر نصیحت کا مطالبہ کرنا	۱۹۵
غصہ مت کرنا	۱۹۵
غصہ ضروری بھی ہے	۱۹۵
ایک صاحب بہادر کا قصہ	۱۹۶
غصہ کرنا عبادت بھی ہے	۱۹۶
سالک ابتداءً بالکل غصہ نہ کرے	۱۹۶
نفس کو دوسری سمت میں موڑ دو	۱۹۷
غصہ کا پہلا علاج، اپنے عیوب کو سوچنا	۱۹۷
غصہ کا دوسرا علاج، مغضوب علیہ کو دور کر دینا	۱۹۸
حضور ﷺ سے یہ علاج کرنا ثابت ہے	۱۹۸
غصہ کے وقت سزا مت دو	۱۹۸
غصہ کا تیسرا علاج، عذابِ الٰہی کا استحضار	۱۹۹
غصے کے تقاضے پر عمل مت کرو	۱۹۹
معاف کرنا افضل ہے	۲۰۰
بزرگوں کی مختلف شانیں	۲۰۰
بدلہ لینے میں وقت کیوں ضائع کروں	۲۰۱
برابر کا بدلہ لے لیا	۲۰۱
بدلہ لینے میں تمہارا فائدہ تھا	۲۰۲
ایک علمی اشکال اور اس کا جواب	۲۰۲
اس حدیث پر کلام	۲۰۳
مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا جواب	۲۰۳
بزرگوں کے لئے نقل کلام مت نکالو	۲۰۳
غصہ آنا غیر اختیاری ہے	۲۰۴
حد سے تجاوز کرنا مذموم ہے	۲۰۴
غصہ کا علاج: ہمت کا استعمال	۲۰۴
ہمت کو کام میں لانے کی تدبیریں	۲۰۵
پہلی اور دوسری تدبیر	۲۰۵
غصہ کا ایک اور علاج: درود شریف پڑھنا	۲۰۶
اللہ تعالیٰ کے غضب کو سوچنا	۲۰۶
تکلف کر کے نرمی اختیار کریں	۲۰۶
غصہ کے وقت کی سات تدبیریں	۲۰۷
میں بھی اللہ تعالیٰ کا خطاوار ہوں	۲۰۷
اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دیں گے	۲۰۷
ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے معاف کرنے کا واقعہ	۲۰۸
کسی کام میں لگ جائیں	۲۰۸
اپنے کو پستی کی طرف لے جانا	۲۰۹
غصہ کو قابو میں کرنے کا طریقہ	۲۰۹
غصے کا گھونٹ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے	۲۱۰
دل توڑنے کے لئے ہے	۲۱۰
نفس کی خواہشات کو کچل دو	۲۱۱
حلاوتِ ایمان کب نصیب ہوتی ہے؟	۲۱۱
یہ حلاوت مفت نہیں ملتی	۲۱۱
بربادِ دل پر تجلیات کا نزول	۲۱۲
دل پر ذرا نشتر لگائیے	۲۱۲
رفتہ رفتہ یہ غصہ قابو میں آجائے گا	۲۱۲
انسان کا نفس دودھ پیتے بچے کی طرح ہے	۲۱۳
نفس کو بے مہار مت چھوڑیں	۲۱۳
غصہ کا بہترین علاج	۲۱۴
اپنی ماں کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگیں	۲۱۴
شیخ کی نگرانی میں علاج کرے	۲۱۵
غصہ کا ایک اور علاج	۲۱۵
غصہ کے وقت بچے کو نہیں مارنا چاہئے	۲۱۶
بچوں کو مارنا بڑا خطرناک معاملہ ہے	۲۱۶

مدارس میں بچوں کے مارنے پر پابندی	۲۱۶
غصہ ختم ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر سزا دو	۲۱۷
اختتامیہ	۲۱۷
حسد اور اس کا علاج	۲۱۸
تین چیزیں اور ان کا حکم	۲۱۸
حسد کس کو کہتے ہیں؟	۲۱۸
حسد کی مثالیں	۲۱۹
رشک کرنا جائز ہے	۲۱۹
صرف دل کا رنجیدہ ہونا گناہ نہیں	۲۱۹
دل کے تقاضے پر عمل کرنا گناہ ہے	۲۲۰
البتہ دل کا خیال بھی خطرناک ہے	۲۲۰
خیال کے علاج کے لئے تین کام کریں	۲۲۰
ورنہ وہ خیال ہلاکت میں ڈال دے گا	۲۲۱
خیال کی مخالفت کا نتیجہ	۲۲۲
کیا گناہ اچھی چیز ہے؟	۲۲۲
دو شخصوں میں موازنہ کریں	۲۲۲
انگریزوں کے کباب لذیذ بنیں گے	۲۲۳
حاسد خود حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے	۲۲۳
''حاسد'' اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض کرنے والا ہے	۲۲۴
یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے	۲۲۴
اپنی نعمتوں کی طرف نظر کرو	۲۲۵
ان خیالات کو برا سمجھو	۲۲۵
جس سے حسد ہو رہا ہے اس کی تعریف کرو	۲۲۶
حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا چور کے پاؤں چومنا	۲۲۶
ہر انسان کے اندر کوئی خوبی ہوتی ہے	۲۲۷
محسود کی مدح کرو	۲۲۷
محسود سے نیازمندی کے ساتھ ملاقات کرو	۲۲۷
محسود کے ضرر پر رنج ظاہر کرو اور اس کی تعظیم کرو	۲۲۸
محسود کو ہدیہ دیا کرو	۲۲۸
یہ کام بار بار کرنے سے حسد دور ہوگا	۲۲۸
حسد اور حِقد میں فرق	۲۲۹
یہ کینہ ہے	۲۲۹
مادہ کو کمزور کرنا ضروری ہے	۲۳۰
شیطان کی حکایت	۲۳۰
علم سے حبِ جاہ اور حسد پیدا ہو جاتا ہے	۲۳۱
مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کا اخلاص	۲۳۱
حسد کی وجہ سے تعلقات کی خرابی	۲۳۲
بے مثال دوستی کا نمونہ	۲۳۲
علم کے ساتھ اخلاص اور خادمیت کا جذبہ	۲۳۳
پھر حسد پیدا نہیں ہوگا	۲۳۳
شہرت خراب چیز ہے	۲۳۳
کینہ اور اس کا علاج	۲۳۴
پاجامہ نیچے لٹکانے والا	۲۳۴
کینہ رکھنے والے سے اللہ کی ناراضگی	۲۳۵
''کینہ'' کسے کہتے ہیں؟	۲۳۵
کینہ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟	۲۳۵
یہ خیال گناہ نہیں	۲۳۶
غصہ میں انسان حد پر نہیں رہتا	۲۳۶
انتقام لینے کا جذبہ کینہ ہے	۲۳۶

انسان کے پاس ترازو نہیں ۲۳۷
حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سبق آموز واقعہ ۲۳۷
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تزکیہ شدہ تھے ۲۳۸
''کینہ'' کا علاج ۲۳۸
جنت کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے ۲۳۸
اس کے اندر اچھائی تلاش کرو ۲۳۹
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں ۲۳۹
کینہ سے متعلق وعیدوں کی طرف نظر کرو ۲۴۰
یہ بات بغض میں داخل نہیں ۲۴۰
انقباضِ طبعی کینہ نہیں ۲۴۱
دوسرے کے نقصان سے دل میں فرحت ۲۴۱
یہ فرحت قابلِ دفع ہے ۲۴۱
غیر اختیاری خیال گناہ نہیں لیکن برا ہے ۲۴۲
تکلیف پہنچنے کو اپنی بدعملی کا نتیجہ سمجھنا ۲۴۲
جلاد بادشاہ کے حکم کا تابع ہے ۲۴۳
''تقدیر'' اس سے یہ کروا رہی ہے ۲۴۳
یہ سوچنا اختیاری ہے ۲۴۴
حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ۲۴۴
میں ہی سب سے زیادہ بدعمل ہوں ۲۴۴
یہ سب کام کسی اور کے اشارے پر ہو رہے ہیں ۲۴۵
دنیا ہی میں پاک صاف کرنا چاہتے ہیں ۲۴۵
یہ سوچنا کینہ کو ختم کر دے گا ۲۴۵

ریاکاری اور اس کا علاج ۲۴۶

ریا کی اصل ۲۴۷
ریا کے درجے ۲۴۷
ریا ہر عبادت میں ہو سکتی ہے ۲۴۹
ریا کا ایک اور خفی درجہ ۲۴۹
ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ۲۵۰
انسان کے تواضع کی پہچان ۲۵۰
ایک بزرگ کا قصہ ۲۵۱
ریا کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا فرمان ۲۵۱
ریا کا علاج اور اس کی مثال ۲۵۱
منصور حلاج کا قصہ ۲۵۲
کسی بزرگ سے ایک سوال ۲۵۳
حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ایک دیہاتی ۲۵۳
سہاگن وہ جسے پیا چاہے ۲۵۴
خالق کی پسند کی فکر کرو ۲۵۴
اللہ کی محبت پیدا کرنے کا طریقہ ۲۵۵
اللہ بہت حلیم اور بردبار ہے ۲۵۵
خلاصۂ کلام ۲۵۶
بزرگوں کی نگاہ نعمت کی طرف ہوتی ہے ۲۵۶
تکالیف کے مقابلے میں نعمتیں زیادہ ہیں ۲۵۷

تکبر اور اس کا علاج ۲۵۸

''تکبر'' تمام گناہوں کی جڑ ہے ۲۵۸
کبر کے معنی ۲۵۹
تکبر ایک مخفی بیماری ۲۵۹
ٹخنوں سے نیچے شلوار لٹکانا ۲۶۰
حضور ﷺ کے ازار کی کیفیت ۲۶۱
ظاہری تواضع میں مخفی تکبر ۲۶۱
بظاہر تکبر حقیقت میں تکبر نہیں ۲۶۱
حضرت ذوالنون مصریؒ کا تعریف پر ہنسنا ۲۶۲

متکبر کی بہترین مثال	۲۶۳
عالم کا اپنے کو جاہل سے اچھا سمجھنے کا علاج	۲۶۳
ایک اشکال اور اس کا جواب	۲۶۴
اس نعمت پر شکر ادا کرے	۲۶۵
افضل سمجھنا بے بنیاد ہے	۲۶۵
ایک بزرگ کا واقعہ	۲۶۶
یہ خیال دل سے نکال دیں	۲۶۶
سبق آموز واقعہ	۲۶۷
تم کس بات پر اِتراتے ہو؟	۲۶۷
''شکر'' بے شمار بیماریوں کا علاج	۲۶۷
فرض کی ادائیگی شکر کا موقع نہیں	۲۶۸
شکر کا موقع یہ ہے	۲۶۸
شیطان کے داؤ سے بچنے کا طریقہ	۲۶۸
عین پریشانی میں نعمتوں کو یاد کرو	۲۶۹
''شکر'' کا ایک انوکھا انداز	۲۶۹
سونے سے پہلے شکر ادا کرلو	۲۷۰
تکبر سے بچنے کا ایک نسخہ	۲۷۰
تکبر کی اقسام	۲۷۱
کبر کے مختلف علاج	۲۷۱
خود اپنا علاج کرنا	۲۷۲
کسی شیخ سے تربیت حاصل کرنا	۲۷۲
حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا واقعہ	۲۷۳
تمہیں سب کچھ دے دیا	۲۷۳
حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی عجیب حالت	۲۷۴
حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا ایک اور واقعہ	۲۷۵
شیخ سے علاج تجویز کراؤ	۲۷۵
شیخ کی تقلید محض کرو	۲۷۶
بھائی ذکی کیفی مرحوم رحمہ اللہ کا واقعہ	۲۷۷
''علم'' تعلّی کا سبب	۲۷۷
علم دودھاری تلوار ہے	۲۷۸
شیطان کا واقعہ	۲۷۸
''ہم بھی کچھ ہیں'' کا خیال	۲۷۹
ایک لالچی کا واقعہ	۲۷۹
علم پر شکر ادا کریں	۲۸۰
عالم اور شیخ کے درمیان فرق	۲۸۰
ایک مثال	۲۸۱
کبر کا ایک علاج	۲۸۱
کھال کے ذریعہ پردہ پوشی	۲۸۲
قضاء حاجت کی حالت کا تصور	۲۸۲
ایک اور علاج	۲۸۳
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا علاج کرنا	۲۸۳
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور گورنری	۲۸۳
حضرت گنگوہیؒ کا طلبہ کے جوتے اُٹھانا	۲۸۳
حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی سیّد سلیمان ندوی رحمہ اللہ کو نصیحت	۲۸۴
علوم تو ان بڑے میاں کے پاس ہیں	۲۸۴
حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کی تواضع	۲۸۵
کبھی بڑائی کا تصور ہی نہیں آیا	۲۸۶
حضرت مدنیؒ کی مفتی صاحبؒ کو نصیحت	۲۸۶
کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کرو	۲۸۶
شیخ کے بتانے پر ذلت کے کام کرے	۲۸۷
کبر اور شکر کا فرق	۲۸۷
یہ ''تحدیثِ نعمت'' ہے	۲۸۷
''تحدیثِ نعمت'' کا حکم	۲۸۸

تحدیثِ نعمت کی علامت	۲۸۹
فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کی انکساری	۲۸۹
تکبر کی علامت	۲۹۰
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۲۹۰
نعمتوں میں اضافے سے رجوع الی اللہ میں اضافہ	۲۹۱
حضرت سلیمان علیہ السلام اور نعمتوں پر شکر	۲۹۱
شریر آدمی کی خاصیت	۲۹۲
شیخ کی ضرورت	۲۹۳
خود پسندی اور اس کا علاج	۲۹۴
''عُجب'' کی تعریف	۲۹۴
عُجب، کبر اور تکبر میں فرق	۲۹۵
چوتھی چیز ''استکبار''	۲۹۵
عُجب کا علاج	۲۹۵
علم کو عطاحق سمجھو	۲۹۶
نیک کام کرنے پر خوشی ایمان کی علامت ہے	۲۹۶
یہ خوشی نقد خوشخبری ہے	۲۹۶
خوشی مطلوب، خوشی ممنوع	۲۹۷
فرق کے لئے ''شیخ'' کی ضرورت	۲۹۷
آج کل ''شیخ'' بنانے کے مقاصد	۲۹۸
توفیقِ الٰہی پر شکر کرنا چاہئے	۲۹۸
شکر کے نتیجے میں مزید توفیق ہوگی	۲۹۹
''شکر ادا کرنا'' قلندری عمل ہے	۲۹۹
شکر ادا کرنے کی مشق کرو	۳۰۰
شکر رذائل کی جڑ کاٹتا ہے	۳۰۰
دوسرے کو حقیر سمجھنے کا علاج	۳۰۲
غیر اختیاری خیال کے آنے پر مؤاخذہ نہیں	۳۰۲
ذہین طالب علم کے دل میں اپنی برتری کا خیال	۳۰۲
کمزور طالب علم میں نیکی کی برتری	۳۰۳
اصل خرابی ''بے دین'' ہونا ہے	۳۰۳
''بے دین'' ہونے کی مثال	۳۰۳
کمتر لوگ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوں گے	۳۰۴
جنت کے اعلیٰ درجات والے لوگ	۳۰۴
کسی کے ظاہر پر مت جاؤ	۳۰۵
اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض لوگ	۳۰۵
کسی پر کوئی حکم مت لگاؤ	۳۰۶
کافر کو بھی حقیر مت سمجھو	۳۰۶
کافر پر ''مخلد فی النار'' ہونے کا حکم مت لگاؤ	۳۰۶
ایک شخص کی مغفرت کا واقعہ	۳۰۷
ظاہری کفر کے باوجود مغفرت کی وجہ	۳۰۷
''منصور حلاج'' پر کفر کا فتویٰ	۳۰۸
پھانسی کے وقت حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے گفتگو	۳۰۸
علماء دین کے چوکیدار ہیں	۳۰۸
کفر کے فتوے کے بعد جہنمی ہونے کا حکم مت لگاؤ	۳۰۹
بخل کی حقیقت	۳۱۰
بخل مال کی محبت کا نتیجہ ہے	۳۱۰

بخل کے نتائج	۳۱۰
بخل دودھاری تلوار ہے	۳۱۱
کتاب البخلاء	۳۱۱
اصلاح کا طریقہ اپنے عیوب کا اظہار ہے	۳۱۱
دل میں کھٹک پیدا ہونا	۳۱۲
پیسے جانے کا غم گناہ نہیں	۳۱۲
صرف مال کی محبت مضر نہیں	۳۱۳
حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دعا	۳۱۳
مال کی کونسی محبت گناہ ہے؟	۳۱۴
یہ خطرہ کی گھنٹی ہے	۳۱۴
دراہم، امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں	۳۱۵
میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ اور دنیا	۳۱۵
مال کی محبت سے ذرا بچتے رہو	۳۱۶
اس کیفیت کو برا سمجھو اور دعا کرو	۳۱۶
آپ نے اس کو تسلی دے دی	۳۱۶
یہ حبِ مال نہیں، حبِ اعتدال ہے	۳۱۶
بخل کا علاج	۳۱۸
ہر کام اللہ تعالیٰ کے لئے ہونا چاہئے	۳۱۸
''بخل'' مطلقاً مذموم نہیں	۳۱۸
صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مال خرچ کرو	۳۱۹
اپنی ذات پر خرچ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہے	۳۱۹
بازار سے چیز خریدنا اللہ تعالیٰ کیلئے ہے	۳۲۰
بیوی کے منہ میں لقمہ دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے	۳۲۰
یہ روکنا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے	۳۲۱
شادی بیاہ کے موقع پر دینا	۳۲۱
یہ صورت "مَنَعَ لِلّٰہِ" میں داخل ہے	۳۲۲
دوسروں کو دینا جائز طریقے پر ہونا چاہئے	۳۲۲
مال کی طرف میلان فطری ہے	۳۲۲
مال کی محبت کا صحیح استعمال اور غلط استعمال	۳۲۳
دوسروں کی چیزوں کا استعمال کب جائز ہے	۳۲۳
بلا اجازت بلکہ چھین کر کھانا	۳۲۴
خوش دلی کا یقین ہونا ضروری ہے	۳۲۴
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی پینا	۳۲۴
پانی کی ملکیت کا شرعی حکم	۳۲۵
آپؐ کے لئے بلا اجازت پانی پینا جائز تھا	۳۲۵
قوم کی کوڑی کو پیشاب کیلئے استعمال کرنا	۳۲۶
سلام کے جواب کے لئے تیمم کرنا	۳۲۶
تیمم کے لئے دوسرے کی دیوار کا استعمال	۳۲۷
دوسروں کی چیزوں کا استعمال شریعت کی نظر میں	۳۲۷
بخیل کی اجازت مشکوک ہے	۳۲۷
بخیل سے حق واجب زبردستی لینا	۳۲۸
شوہر کے مال سے بیوی کو خرچہ لینا	۳۲۸
غیر حق واجب وصول کرنا جائز نہیں	۳۲۹
مدارس کے لئے چندہ کرنا	۳۲۹
مجمع عام میں چندہ کرنا	۳۳۰
اِسراف اور اس کا علاج	۳۳۱
''بخل'' کی ضد ''اِسراف''	۳۳۱
خرچ سے پہلے سوچو	۳۳۱
مریض کے مطابق نسخہ	۳۳۲

ایسی صورت میں خرچ نہ کرے	۳۳۲
نقصان کا فیصلہ کون کرے؟	۳۳۲
خرچ کرنے میں فائدہ ہے یا نہیں؟	۳۳۲
یہ صورت ''اسراف'' نہیں	۳۳۳
سفر کے لئے سہولت کی سواری اختیار کرنا	۳۳۳
رہائش میں تین درجے جائز ہیں	۳۳۴
چوتھا درجہ جائز نہیں	۳۳۴
اصل معیار ''مشروع فائدہ'' ہے	۳۳۴
دو پیسوں کی تلاش کا واقعہ	۳۳۵
اجزاءِ قلیلہ کی قدر بھی ضروری ہے	۳۳۵
فائدہ غیر مشروعہ میں خرچ	۳۳۶
''اسراف'' اور ''تبذیر'' میں فرق	۳۳۶
مجاہدہ کیا ہے؟	۳۳۶
خرچ نہ کرنے میں نقصان نہ ہو تو چھوڑ دو	۳۳۷
خرچ سے پہلے کسی منتظم سے مشورہ	۳۳۷
یہ علاج ہر شخص کے لئے نہیں	۳۳۷
فائدہ اور عدم فائدہ کی تعیین شیخ سے کرائے	۳۳۸
رہبر اور رہنما کی ضرورت	۳۳۸
وہ حقیقی ضرورت نہیں	۳۳۸
بیوی بچوں کو خوش کرنے کیلئے خرچ کرنا	۳۳۹
استاذ کے اکرام میں باون قسم کے کھانے	۳۳۹
نیت کے فرق سے گناہ اور ثواب	۳۴۰
اسراف سے بچنے کی ترکیب	۳۴۰
اہل اللہ کی وضع اختیار کریں	۳۴۱
رسم اور فیشن کے قیدی مت بنیں	۳۴۱
بزرگوں کے لباس کی نقل کرنا اچھا ہے	۳۴۱
اس کو سنت سمجھنا غلط ہے	۳۴۲
حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۳۴۲
مجھے ملاقات کا شوق نہیں	۳۴۳
آپ نے ایسا جوتا کیوں اختیار کیا؟	۳۴۳
کیا اہتمام بدعت ہے؟	۳۴۴
محبوب کی شباہت	۳۴۴
التزام کرنا بدعت ہے	۳۴۴
غیر منکر پر نکیر کرنا خود منکر ہے	۳۴۵
زیر تربیت افراد کا معاملہ الگ ہے	۳۴۵
کیا تم خدا ہو؟	۳۴۵
اہل اللہ کی نقل اُتاریں	۳۴۶
نیت کی خرابی سے وبال کا اندیشہ	۳۴۶
وضعداری اچھی چیز نہیں	۳۴۶
اکبر الہ آبادی کا ایک واقعہ	۳۴۶
من بھاتا کھاؤ، من بھاتا پہنو	۳۴۷
زمانے کی تقلید میں اسراف ہے	۳۴۷
دو باتیں اختیار کرلیں	۳۴۸
قرض لینے سے پرہیز کریں	۳۴۸
اخراجات کم کرلیں	۳۴۹
استطاعت کم، کام زیادہ	۳۴۹
چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ	۳۴۹
مقروض کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار	۳۴۹
ایک معمولی خاتون کی قبر پر نمازِ جنازہ	۳۵۰
قرض کا ذمہ لینے کے بعد نمازِ جنازہ پڑھائی	۳۵۱
واپس کرنے کی طاقت نہ ہونے کے باوجود قرض کیوں لیا؟	۳۵۱
ہمارے معاشرے میں قرض کی وبا	۳۵۱
آج گناہ کے لئے قرض لیے جاتے ہیں	۳۵۲

جھوٹ
اور
اس کی مروجہ صورتیں ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا.

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ، وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) فِيْ رِوَايَةٍ ((وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں جو منافق ہونے کی نشانی ہیں۔ یعنی کسی مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ یہ کام کرے، اگر کسی انسان میں یہ باتیں پائی جائیں تو سمجھ لو کہ وہ منافق ہے۔ وہ تین باتیں یہ ہیں کہ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ اور جب وعدہ کرے، تو اس کی خلاف ورزی کرے، اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے تو وہ خیانت کرے۔ ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ چاہے وہ نماز بھی پڑھتا ہو اور روزے بھی رکھتا ہو اور چاہے وہ دعویٰ کرتا ہو کہ وہ مسلمان ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں، اس لئے کہ مسلمان ہونے کی جو بنیادی صفات ہیں، وہ ان کو چھوڑے ہوئے ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۳/۱۳۶ تا ۱۵۵)، ۲۹ نومبر ۱۹۹۱ء، بروز جمعہ بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب علامة المنافق، رقم: ۳۲، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان خصال المنافق، رقم: ۸۹، سنن الترمذي، كتاب الإيمان عن رسول الله، باب ما جاء في علامة المنافق، رقم: ۲۵۵۵، مسند أحمد، رقم: ۸۳۳۱

اسلام ایک مکمل دین ہے

خدا جانے یہ بات ہمارے ذہنوں میں کہاں سے بیٹھ گئی ہے، اور ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ دین بس نماز روزے کا نام ہے، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، اور نماز روزے کا اہتمام کرلیا، بس مسلمان ہوگئے، اب مزید ہم سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں ہے، چنانچہ جب بازار گئے تو اب وہاں جھوٹ فریب اور دھوکے سے مال حاصل ہو رہا ہے، حرام اور حلال ایک ہو رہے ہیں، اس کی کوئی فکر نہیں، زبان کا بھروسہ نہیں، امانت میں خیانت ہے۔ وعدہ کا پاس نہیں۔ لہٰذا اسلام کے بارے میں یہ تصور کہ یہ بس نماز روزہ کا نام ہے، یہ بڑا خطرناک اور غلط تصور ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے بتادیا کہ ایسا شخص چاہے نماز بھی پڑھ رہا ہو، اور روزے بھی رکھ رہا ہو، لیکن وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں، چاہے اس پر کفر کا فتویٰ نہ لگاؤ، اس لئے کہ کفر کا فتویٰ لگانا بڑی سنگین چیز ہے، اور فتویٰ کے اعتبار سے اس کو کافر نہ قرار دو، دائرۂ اسلام سے اس کو خارج نہ کرو، لیکن ایسا شخص سارے کام کافروں جیسے اور منافق جیسے کر رہا ہے۔

فرمایا کہ تین چیزیں منافق کی علامت ہیں، نمبر ایک جھوٹ بولنا، دوسرے وعدہ خلافی کرنا، تیسرے امانت میں خیانت کرنا، ان تینوں کی تھوڑی سی تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں ان تینوں کا تصور بہت محدود ہے، حالانکہ ان تینوں کا مفہوم بہت وسیع اور عام ہے۔ اس لئے ان کی تھوڑی سی تفصیل کرنے کی ضرورت ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں جھوٹ کا تصور

چنانچہ فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جھوٹ بولنا، یہ جھوٹ بولنا حرام ہے، ایسا حرام ہے کہ کوئی ملت، کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس میں جھوٹ بولنا حرام نہ ہو، یہاں تک کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ بھی جھوٹ بولنے کو برا سمجھتے تھے۔ واقعہ یاد آیا کہ جب حضور اقدس ﷺ نے روم کے بادشاہ کی طرف اسلام کی دعوت کے لئے خط بھیجا تو خط پڑھنے کے بعد اس نے اپنے درباریوں سے کہا کہ ہمارے ملک میں اگر ایسے لوگ موجود ہوں، جو ان (حضور اقدس ﷺ) سے واقف ہوں تو ان کو میرے پاس بھیج دو، تاکہ میں ان سے حالات معلوم کروں کہ وہ کیسے ہیں۔ اتفاق سے اسی وقت حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ایک تجارتی قافلہ لے کر وہاں گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ لوگ ان کو بادشاہ کے پاس لے آئے۔ یہ بادشاہ کے پاس پہنچے تو بادشاہ نے ان سے سوالات کرنا شروع کیے۔ پہلا سوال یہ کیا کہ یہ بتاؤ کہ یہ (محمد ﷺ) کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟ وہ کیسا خاندان ہے اس کی شہرت کیسی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ خاندان تو بڑے اعلیٰ درجے کا ہے، اعلیٰ درجے کے

خاندان میں وہ پیدا ہوئے۔ اور سارا عرب اس خاندان کی شرافت کا قائل ہے۔ اس بادشاہ نے تصدیق کرتے ہوئے کہا: بالکل ٹھیک ہے، جو اللہ کے نبی ہوتے ہیں، وہ اعلیٰ خاندان سے ہوتے ہیں۔ پھر دوسرا سوال بادشاہ نے یہ کیا کہ ان کی پیروی کرنے والے معمولی درجے کے لوگ ہیں، یا بڑے بڑے رؤساء ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ان کے متبعین کی اکثریت کم درجے کے معمولی قسم کے لوگ ہیں۔ بادشاہ نے تصدیق کی کہ نبی کے متبعین ابتداء ضعیف اور کمزور قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر سوال کیا کہ تمہاری ان کے ساتھ جب جنگ ہوتی ہے تو تم جیت جاتے ہو یا وہ جیت جاتے ہیں؟ اس وقت تک چونکہ صرف دو جنگیں ہوئی تھیں، ایک جنگِ بدر، اور ایک اُحد، اور غزوۂ اُحد میں چونکہ مسلمانوں کو تھوڑی سی شکست ہوئی تھی، اس لئے انہوں نے اس موقع پر جواب دیا کہ کبھی ہم غالب آجاتے ہیں اور کبھی وہ غالب آجاتے ہیں۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ مسلمان ہونے کے بعد فرماتے تھے کہ اس وقت تو میں کافر تھا۔ اس لئے اس فکر میں تھا کہ میں کوئی ایسا جملہ کہہ دوں جس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تاثر قائم ہو، لیکن اس بادشاہ نے جتنے سوالات کیے، ان کے جواب میں اس قسم کی کوئی بات کہنے کا موقع نہیں ملا، اس لئے کہ جو سوال وہ کررہا تھا، اس کا جواب تو مجھے دینا تھا۔ اور جھوٹ بول نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں جتنے جوابات دے رہا تھا، وہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جارہے تھے۔ (۱)

بہر حال! جاہلیت کے لوگ جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے وہ بھی جھوٹ بولنے کو گوارا نہیں کرتے تھے، چہ جائیکہ مسلمان اسلام لانے کے بعد جھوٹ بولے۔

جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ، ایک جرم

افسوس کہ اب اس جھوٹ میں عام ابتلاء ہے، یہاں تک کہ جو لوگ حرام و حلال اور جائز ناجائز کا اور شریعت پر چلنے کا اہتمام کرتے ہیں، ان میں بھی یہ بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے بھی جھوٹ کی بہت سی قسموں کو جھوٹ سے خارج سمجھ رکھا ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ گویا یہ جھوٹ ہی نہیں ہے، حالانکہ جھوٹا کام کررہے ہیں، غلط بیانی کررہے ہیں، اور اس میں دوہرا جرم ہے۔ ایک جھوٹ بولنے کا جرم، اور دوسرے اس گناہ کو گناہ نہ سمجھنے کا جرم، چنانچہ ایک صاحب جو بڑے نیک تھے، نماز روزے کے پابند، اذکار و اشغال کے پابند، بزرگوں سے تعلق رکھنے والے، پاکستان سے باہر قیام تھا۔ ایک مرتبہ

(۱) صحيح البخاري، كتاب بدء الوحي، باب بدء الوحي، رقم:٦، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب كتاب النبي إلى هرقل يدعوه إلى الإسلام، رقم:٣٣٢٢، مسند أحمد، رقم:٢٢٥٢

جب پاکستان آئے تو میرے پاس بھی ملاقات کے لئے آگئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ واپس کب تشریف لے جا رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں ابھی آٹھ دس روز اور ٹھہروں گا۔ میری چھٹیاں تو ختم ہوگئیں، البتہ کل ہی میں نے مزید چھٹی لینے کے لئے ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ بھجوا دیا ہے۔

کیا دین صرف نماز روزے کا نام ہے؟

انہوں نے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھجوانے کا ذکر اس انداز سے کیا کہ جس طرح یہ ایک معمول کی بات ہے، اس میں کوئی پریشانی کی بات ہی نہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسا؟ انہوں نے جواب دیا کہ مزید چھٹی لینے کے لئے بھیج دیا ہے، ویسے اگر چھٹی لیتا تو چھٹی نہ ملتی، اس کے ذریعہ چھٹی مل جائے گی۔ میں نے پھر سوال کیا کہ آپ نے اس میڈیکل سرٹیفکیٹ میں کیا لکھا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں یہ لکھا تھا کہ یہ اتنے بیمار ہیں کہ سفر کے لائق نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا دین صرف نماز روزے کا نام ہے؟ ذکر شغل کا نام ہے؟ آپ کا بزرگوں سے تعلق ہے، پھر یہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسا جا رہا ہے؟ چونکہ نیک آدمی تھے، اس لئے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نے آج پہلی مرتبہ آپ کے منہ سے یہ بات سنی کہ یہ بھی کوئی غلط کام ہے۔ میں نے کہا کہ جھوٹ بولنا اور کس کو کہتے ہیں؟ انہوں نے پوچھا کہ مزید چھٹی کس طرح لیں؟ میں نے کہا کہ جتنی چھٹیوں کا استحقاق ہے، اتنی چھٹی لو، مزید چھٹی لینی ضروری ہو تو بغیر تنخواہ کے لے لو، لیکن یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ بھیجنے کا جواز تو پیدا نہیں ہوتا۔

آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوانا جھوٹ میں داخل ہی نہیں ہے، اور دین صرف ذکر و شغل کا نام رکھ دیا۔ باقی زندگی کے میدان میں جا کر جھوٹ بول رہا ہو تو اس کا کوئی خیال نہیں۔

جھوٹی سفارش کا حکم

ایک اچھے خاصے پڑھے لکھے نیک اور سمجھدار بزرگ کا میرے پاس سفارشی خط آیا، اس وقت میں جدہ میں تھا، اس خط میں یہ لکھا تھا کہ یہ صاحب جو آپ کے پاس آرہے ہیں یہ انڈیا کے باشندے ہیں، اب یہ پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا آپ پاکستانی سفارت خانے سے ان کے لئے سفارش کر دیں کہ ان کو ایک پاکستانی پاسپورٹ جاری کر دیا جائے اس بنیاد پر کہ یہ پاکستانی باشندے ہیں، اور ان کا پاسپورٹ یہاں سعودی عرب میں گم ہوگیا ہے، اور خود انہوں نے پاکستانی سفارت خانے میں درخواست دے رکھی ہے کہ ان کا پاسپورٹ گم ہوگیا ہے۔ لہٰذا آپ ان کی سفارش کر دیں۔

اب آپ بتائیے! وہاں عمرے ہورہے ہیں، حج بھی ہورہا ہے، طواف اور سعی بھی ہورہی ہے، اور ساتھ میں یہ جھوٹ اور فریب بھی ہورہا ہے، گویا کہ یہ دین کا حصہ ہی نہیں ہے۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شاید لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب قصد اور ارادہ کرکے باقاعدہ جھوٹ کو جھوٹ سمجھ کر بولا جائے تب جھوٹ ہوتا ہے، لیکن ڈاکٹر سے جھوٹا سرٹیفکیٹ بنوالینا، جھوٹی سفارش لکھوالینا، یا جھوٹے مقدمات دائر کردینا، یہ کوئی جھوٹ نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾(۱)

یعنی زبان سے جو لفظ نکل رہا ہے، وہ تمہارے نامۂ اعمال میں ریکارڈ ہورہا ہے۔

بچوں کے ساتھ بھی جھوٹ نہ بولیں

ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ کے سامنے ایک خاتون ایک بچے کو بلاکر گود میں لینا چاہتی تھی، لیکن وہ بچہ قریب نہیں آرہا تھا، ان خاتون نے بچے کو بہلانے کے لئے کہا کہ بیٹا یہاں آؤ، ہم تمہیں چیز دیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی بات وہ سن لی، اور آپ نے خاتون سے پوچھا کہ تمہارا کوئی چیز دینے کا ارادہ ہے یا ویسے ہی اس کو بلانے اور بہلانے کے لئے کہہ رہی ہو؟ اس خاتون نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرا کھجور دینے کا ارادہ ہے کہ جب وہ میرے پاس آئے گا تو میں اس کو کھجور دوں گی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہارا کھجور دینے کا ارادہ نہ ہوتا، بلکہ محض بہلانے کے لئے کہتی کہ میں تمہیں کھجور دوں گی، تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا۔(۲)

اس حدیث سے یہ سبق دے دیا کہ بچے کے ساتھ بھی جھوٹ نہ بولو، اور اس کے ساتھ بھی وعدہ خلافی نہ کرو، ورنہ شروع ہی سے جھوٹ کی برائی اس کے دل سے نکل جائے گی۔

مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولیں

ہم لوگ محض مذاق اور تفریح کے لئے زبان سے جھوٹی باتیں نکال دیتے ہیں، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے مذاق میں بھی جھوٹی باتیں زبان سے نکالنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ افسوس ہے اس شخص پر یا سخت الفاظ میں اس کا صحیح ترجمہ یہ کرسکتے ہیں کہ "اس شخص

---

(۱) ق: ۱۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا، مگر اس پر ایک نگراں مقرر ہوتا ہے، ہر وقت (لکھنے کے لئے) تیار!"

(۲) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في التشديد في الكذب، رقم: ۴۳۳۹، مسند أحمد، رقم: ۱۵۱۴۷

کے لئے دردناک عذاب ہے، جو محض لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے"۔(۱)

حضور ﷺ کی خوش طبعی

خوش طبعی کی باتیں اور مذاق حضور اقدس ﷺ نے بھی کیا، لیکن کبھی کوئی ایسا مذاق نہیں کیا جس میں بات غلط ہو، یا واقعہ کے خلاف ہو۔ آپ نے کیسا مذاق کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک بڑھیا حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آئی، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے لئے دعا کردیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں پہنچادیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی، اور وہ بڑھیا رونے لگی کہ یہ تو بڑی خطرناک بات ہوگئی کہ بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی، پھر آپ نے وضاحت کرکے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی عورت اس حالت میں جنت میں نہیں جائے گی کہ وہ بوڑھی ہو، بلکہ وہ جوان ہوکر جائے گی۔

تو آپ نے ایسا لطیف مذاق فرمایا کہ اس میں کوئی بات نفس الامر کے خلاف اور جھوٹی نہیں تھی

خوش طبعی کا ایک انوکھا انداز

ایک دیہاتی آپ ﷺ کی خدمت میں آیا، اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے ایک اُونٹنی دے دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم تم کو ایک اُونٹنی کا بچہ دیں گے۔ اس نے کہا: یا رسول اللہ! میں بچے کو لے کر کیا کروں گا۔ مجھے تو سواری کے لئے ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں جو بھی اُونٹ دیا جائے گا وہ کسی اُونٹنی کا بچہ ہی تو ہوگا۔ یہ آپ نے اس سے مذاق فرمایا، اور ایسا مذاق جس میں خلافِ حقیقت اور غلط بات نہیں کہی۔ تو مذاق کے اندر بھی اس بات کا لحاظ ہے کہ زبان کو سنبھال کر استعمال کریں، اور زبان سے کوئی لفظ غلط نہ نکل جائے، اور آج کل ہمارے اندر سچے جھوٹے قصے پھیل گئے ہیں، اور خوش گپیوں کے اندر ہم ان کو بطور مذاق بیان کردیتے ہیں۔ یہ سب جھوٹ کے اندر داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔(۳)

---

(۱) سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی التشدید فی الکذب، رقم: ٤٣٣٧، مسند أحمد، رقم: ١٩١٧٠، سنن الدارمی، کتاب الإستئذان، رقم: ٢٥٨٦۔

(۲) مشکاۃ المصابیح (۵۹/۳)، احیاء علوم الدین (۱۲۹/۳)

(۳) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء فی المزاح، رقم: ١٩١٤، سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب ماجاء فی المزاح، رقم: ٤٣٤٦، مسند أحمد، رقم: ١٣٣١٥

جھوٹا کیریکٹر سرٹیفکیٹ

آج کل اس کا عام رواج ہوگیا ہے، اچھے خاصے دیندار اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں، کہ جھوٹے سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں، یا دوسروں کے لئے جھوٹے سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کو کیریکٹر سرٹیفکیٹ کی ضرورت پیش آگئی، اب وہ کسی کے پاس گیا، اور اس سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا، اور جاری کرنے والے نے اس کے اندر یہ لکھ دیا کہ میں ان کو پانچ سال سے جانتا ہوں، یہ بڑے اچھے آدمی ہیں، ان کا اخلاق و کردار بہت اچھا ہے۔ کسی کے حاشیۂ خیال میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم یہ ناجائز کام کررہے ہیں، بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام کررہے ہیں، اس لئے کہ یہ ضرورت مند تھا۔ ہم نے اس کی ضرورت پوری کردی۔ اس کا کام کردیا۔ یہ تو باعثِ ثواب کام ہے، حالانکہ اگر آپ اس کے کیریکٹر سے واقف نہیں ہیں تو آپ کے لئے ایسا سرٹیفکیٹ جاری کرنا ناجائز ہے، چہ جائیکہ وہ سمجھے کہ میں ایک ثواب کا کام کررہا ہوں۔ اور کسی ایسے شخص سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرنا جو آپ کو نہیں جانتا، یہ بھی ناجائز ہے، گویا کہ سرٹیفکیٹ لینے والا بھی گناہ گار ہوگا، اور دینے والا بھی گناہ گار ہوگا۔

کردار معلوم کرنے کے دو طریقے

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شخص نے کسی تیسرے شخص کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ حضرت! وہ تو بڑا اچھا آدمی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ فلاں شخص بڑے اچھے اخلاق اور کردار کا آدمی ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ کیا کبھی تمہارا اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ پیش آیا؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، لین دین کا معاملہ تو کبھی پیش نہیں آیا۔ پھر آپ نے پوچھا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا؟ اس نے کہا نہیں، میں نے کبھی اس کے ساتھ سفر تو نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تمہیں کیا معلوم کہ وہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے کیسا آدمی ہے؟

اس لئے کہ اخلاق و کردار کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب انسان اس کے ساتھ لین دین کرے، اور اس میں وہ کھرا ثابت ہو، تب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کردار اچھا ہے، اور اس کے اخلاق معلوم کرنے کا دوسرا راستہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ سفر کرے۔ اس لئے کہ سفر کے اندر انسان اچھی طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے، اس کے اخلاق، اس کا کردار، اس کے حالات، اس کے جذبات، اس کے خیالات، یہ ساری چیزیں سفر میں ظاہر ہوجاتی ہیں، لہٰذا اگر تم نے اس کے ساتھ کوئی لین دین کا معاملہ کیا ہوتا، یا اس کے ساتھ سفر کیا ہوتا، تب تو بیشک یہ کہنا درست ہوتا کہ وہ اچھا آدمی ہے، لیکن جب تم

نے اس کے ساتھ نہ تو معاملہ کیا، نہ اس کے ساتھ سفر کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کو جانتے نہیں ہو، اور جب تم جانتے نہیں تو پھر خاموش رہو، نہ برا کہو، اور نہ اچھا کہو، اور اگر کوئی شخص اس کے بارے میں پوچھے تو تم اس حد تک بتادو، جتنا تمہیں معلوم ہے، مثلاً یہ کہہ دو کہ بھائی! مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے تو میں نے دیکھا ہے، باقی آگے کے حالات مجھے معلوم نہیں۔

سرٹیفکیٹ شرعاً ایک گواہی ہے

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾(۱)

یاد رکھئے! یہ سرٹیفکیٹ اور یہ تصدیق نامہ شرعاً ایک گواہی ہے، اور جو شخص اس سرٹیفکیٹ پر دستخط کر رہا ہے، وہ حقیقت میں گواہی دے رہا ہے اور اس آیت کی رو سے گواہی دینا اس وقت جائز ہے جب آدمی کو اس بات کا علم ہو، اور یقین سے جانتا ہو کہ یہ واقع میں ایسا ہے، تب انسان گواہی دے سکتا ہے، اس کے بغیر انسان گواہی نہیں دے سکتا۔ آج کل ہوتا یہ ہے کہ آپ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، لیکن آپ نے کیریکٹر سرٹیفکیٹ جاری کر دیا، تو یہ جھوٹی گواہی کا گناہ ہوا، اور جھوٹی گواہی اتنی بری چیز ہے کہ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا۔

جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ کیا میں تم کو بتاؤں کہ بڑے بڑے گناہ کون کون سے ہیں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ضرور بتایئے۔ آپ نے فرمایا کہ بڑے گناہ یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا۔ اس وقت تک آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ پھر آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، اور پھر فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینا، اور اس جملے کو تین مرتبہ دہرایا۔(۲)

اب آپ اس سے اس کی شناعت کا اندازہ لگائیں کہ ایک طرف تو آپ نے اس کو شرک کے

---

(۱) الزخرف: ٨٦، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''ہاں البتہ جن لوگوں نے حق بات کی گواہی دی ہو، اور انہیں اس کا علم بھی ہو''

(۲) صحيح البخاري، كتاب الشهادات، باب ما قيل في شهادة الزور، رقم: ٢٤٦٥، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان الكبائر وأكبرها، رقم: ١٢٦، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة والآداب، باب ما جاء في حقوق الوالدين، رقم: ١٨٢٣، مسند أحمد، رقم: ١٥٤٦٥

ساتھ ملا کر ذکر فرمایا، دوسرے یہ کہ اس کو تین مرتبہ ان الفاظ کو اس طرح دہرایا کہ پہلے آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پھر اس کے بیان کے وقت سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، اور خود قرآن کریم نے بھی اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾(۱)

یعنی تم بت پرستی کی گندگی سے بھی بچو، اور جھوٹی بات سے بچو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی کتنی خطرناک چیز ہے۔

سرٹیفکیٹ جاری کرنے والا گناہ گار ہوگا

جھوٹی گواہی دینا جھوٹ بولنے سے بھی زیادہ شنیع اور خطرناک ہے۔ اس لئے کہ اس میں کئی گناہ مل جاتے ہیں، مثلاً ایک جھوٹ بولنے کا گناہ، اور دوسرا دوسرے شخص کو گمراہ کرنے کا گناہ، اس لئے کہ جب آپ نے غلط سرٹیفکیٹ جاری کر کے جھوٹی گواہی دی، اور وہ جھوٹا سرٹیفکیٹ جب دوسرے شخص کے پاس پہنچا تو وہ یہ سمجھے گا کہ یہ آدمی بڑا اچھا ہے، اور اچھا سمجھ کر اس سے کوئی معاملہ کرے گا، اور اگر اس معاملہ کرنے کے نتیجے میں اس کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اس نقصان کی ذمہ داری بھی آپ پر ہوگی، یا آپ نے عدالت میں جھوٹی گواہی دی، اور اس گواہی کی بنیاد پر فیصلہ ہوگیا، تو اس فیصلے کے نتیجے میں جو کچھ کسی کا نقصان ہوا، وہ سب آپ کی گردن پر ہوگا۔ اس لئے یہ جھوٹی گواہی کا گناہ معمولی گناہ نہیں ہے، بڑا سخت گناہ ہے۔

عدالت میں جھوٹ کی وبا

آج کل تو جھوٹ کا ایسا بازار گرم ہوا کہ کوئی شخص دوسری جگہ جھوٹ بولے یا نہ بولے، لیکن عدالت میں ضرور جھوٹ بولے گا۔ بعض لوگوں کو یہاں تک کہتے ہوئے سنا:

''میاں! سچی سچی بات کہہ دو کوئی عدالت میں تھوڑی کھڑے ہو''

مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بولنے کی جگہ تو عدالت ہے۔ وہاں پر جا کر جھوٹ بولنا، یہاں آپس میں جب بات چیت ہو رہی ہے تو سچی سچی بات بتا دو، حالانکہ عدالت میں جا کر جھوٹی گواہی دینے کو حضور اقدس ﷺ نے شرک کے برابر قرار دیا ہے، اور یہ کئی گناہوں کا مجموعہ ہے۔

---

(۱) الحج: ۳۰

مدرسہ کی تصدیق گواہی ہے

لہٰذا جتنے سرٹیفکیٹ معلومات کے بغیر جاری کیے جا رہے ہیں، اور جاری کرنے والا یہ جانتے ہوئے جاری کر رہا ہے کہ میں یہ غلط سرٹیفکیٹ جاری کر رہا ہوں، مثلاً کسی کے بیمار ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا، یا کسی کے پاس ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا، یا کسی کو کیریٹر سرٹیفکیٹ دے دیا، یہ سب جھوٹی گواہی کے اندر داخل ہیں۔

میرے پاس بہت سے لوگ مدارس کی تصدیق کرانے کے لئے آتے ہیں، جس میں اس بات کی تصدیق کرنی ہوتی ہے کہ یہ مدرسہ قائم ہے، اس میں اتنی تعلیم ہوتی ہے۔ اور اس تصدیق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اطمینان ہو جائے کہ واقعۃً یہ مدرسہ قائم ہے۔ اور امداد کا مستحق ہے، اور اب ان مدرسوں کی تصدیق لکھنے کو دل بھی چاہتا ہے، لیکن میں نے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کو دیکھا کہ جب کبھی ان کے پاس کوئی شخص مدرسہ کی تصدیق لکھوانے کے لئے آتا تھا تو آپ یہ عذر فرماتے ہوئے کہتے کہ بھائی! یہ ایک گواہی ہے، اور جب تک مجھے مدرسہ کے حالات کا علم نہ ہو، اس وقت تک میں یہ تصدیق نامہ جاری نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ جھوٹی گواہی ہو جائے گی، البتہ اگر کسی مدرسے کے بارے میں علم ہوتا تو جتنا علم ہوتا اتنا لکھ دیتے۔

کتاب کی تقریظ لکھنا گواہی ہے

بہت سے لوگ کتابوں پر تقریظ لکھوانے آجاتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب لکھی ہے، آپ اس پر تقریظ لکھ دیجئے کہ یہ اچھی کتاب ہے، اور صحیح کتاب ہے۔ حالانکہ جب تک انسان اس کتاب کو پورا نہ پڑھے، اس کا پورا مطالعہ نہ کرے، اس وقت تک یہ کیسے گواہی دیدے کہ یہ کتاب صحیح ہے، یا غلط ہے۔

بہت سے لوگ اس خیال سے تقریظ لکھ دیتے ہیں کہ اس تقریظ سے اس کا فائدہ اور بھلا ہو جائے گا، حالانکہ تقریظ لکھنا ایک گواہی ہے، اور اس گواہی میں غلط بیانی کو لوگوں نے غلط بیانی سے خارج کر دیا ہے چنانچہ لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو ایک ذرا سا کام لے کر ان کے پاس گئے تھے، اگر ذرا سا قلم ہلا دیتے، اور ایک سرٹیفکیٹ لکھ دیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا، یہ تو بڑے بداخلاق آدمی ہیں، کہ کسی کو سرٹیفکیٹ بھی جاری نہیں کرتے۔ بھائی، بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک ایک لفظ کے بارے میں سوال ہوگا، جو لفظ زبان سے نکل رہا ہے، جو لفظ قلم سے لکھا جا رہا ہے، سب اللہ تعالیٰ کے یہاں ریکارڈ ہو رہا ہے، اور اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ فلاں لفظ تم نے جو زبان سے نکالا تھا، وہ کس بنیاد پر نکالا تھا، جان بوجھ کر بولا تھا، یا بھول کر بولا تھا۔

بھائی! ہمارے معاشرے میں جو جھوٹ کی وبا پھیل گئی ہے، اس میں اچھے خاصے دیندار، پڑھے لکھے، نمازی، بزرگوں سے تعلق رکھنے والے، وظائف اور تسبیح پڑھنے والے بھی مبتلا ہیں، وہ بھی اس کو ناجائز اور برا نہیں سمجھتے کہ یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ جاری ہو جائے گا تو یہ کوئی گناہ ہوگا، حالانکہ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ "اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ" (وہ شخص منافق ہے جو بات بات پر جھوٹ بولے) اس میں یہ سب باتیں بھی داخل ہیں، اور یہ سب دین کا حصہ ہیں، اور ان کو دین سے خارج سمجھنا بدترین گمراہی ہے، اس لئے ان سے اجتناب ضروری ہے۔

جھوٹ کی اجازت کے مواقع

البتہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے جھوٹ کی بھی اجازت دے دی ہے، لیکن وہ مواقع ایسے ہیں کہ جہاں انسان اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جائے، اور جان بچانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو، یا کوئی ناقابلِ برداشت ظلم اور تکلیف کا اندیشہ ہو، کہ اگر وہ جھوٹ نہیں بولے گا تو وہ ایسے ظلم کا شکار ہو جائے گا جو قابلِ برداشت نہیں ہے، اس صورت میں شریعت نے جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے۔ البتہ اس میں بھی حکم یہ ہے کہ پہلے اس بات کی کوشش کرو کہ صریح جھوٹ نہ بولنا پڑے، بلکہ کوئی ایسا گول مول لفظ بول دو، جس سے وقتی مصیبت ٹل جائے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں "تعریض اور توریہ" کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا لفظ بول دیا جائے، جس کے ظاہری طور پر کچھ اور معنی سمجھ میں آرہے ہیں، اور حقیقت میں دل کے اندر آپ نے کچھ اور مراد لیا ہے، ایسا گول مول لفظ بول دو تا کہ صریح جھوٹ نہ بولنا پڑے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جھوٹ سے اجتناب

ہجرت کے موقع پر جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت فرما رہے تھے۔ تو اس وقت مکہ والوں نے آپ کو پکڑنے کے لئے چاروں طرف اپنے ہرکارے دوڑا رکھے تھے۔ اور یہ اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص حضورِ اقدس ﷺ کو پکڑ کر لائے گا اس کو سو اُونٹ انعام کے طور پر دیئے جائیں گے۔ اب اس وقت سارے مکہ کے لوگ آپ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ راستے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا جاننے والا ایک شخص مل گیا۔ وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جانتا تھا، مگر حضورِ اقدس ﷺ کو نہیں جانتا تھا۔ اس شخص نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کون صاحب ہیں؟ اب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ چاہتے تھے کہ آپ کے بارے میں کسی کو پتہ نہ چلے اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمنوں تک آپ کے بارے میں اطلاع پہنچ جائے۔ اب

اگر اس شخص کے جواب میں صحیح بات بتاتے ہیں تو آپ ﷺ کی جان کو خطرہ ہے، اور اگر نہیں بتاتے تو جھوٹ بولنا لازم آتا ہے۔ اب ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کی رہنمائی فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

"هٰذَا الرَّجُلُ يَهْدِيْنِي السَّبِيْلَ"

''یہ میرے رہنما ہیں، جو مجھے راستہ دکھاتے ہیں''(۱)

آپ نے ایسا لفظ ادا کیا جس کو سن کر اس شخص کے دل میں خیال آیا کہ جس طرح عام طور پر سفر کے دوران راستہ بتانے کے لئے کوئی رہنما ساتھ رکھ لیتے ہیں، اس قسم کے رہنما ساتھ جا رہے ہیں، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دل میں یہ مراد لیا کہ یہ دین کا راستہ دکھانے والے ہیں، جنت کا راستہ دکھانے والے ہیں، اللہ کا راستہ دکھانے والے ہیں اب دیکھئے کہ اس موقع پر انہوں نے صریح جھوٹ بولنے سے پرہیز فرمایا۔ بلکہ ایسا لفظ بول دیا جس سے وقتی کام بھی نکل گیا، اور جھوٹ بھی نہیں بولنا پڑا۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ یہ فکر عطا فرمادیتے ہیں کہ زبان سے کوئی کلمہ خلافِ واقعہ اور جھوٹ نہ نکلے، پھر اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح مدد بھی فرماتے ہیں۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کے خلاف جہاد میں بڑا حصہ لیا تھا، آپ کے علاوہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی وغیرہ ان سب حضرات نے اس جہاد میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے، اب جو لوگ اس جہاد میں شریک تھے، آخر کار انگریزوں نے ان کو پکڑنا شروع کیا۔ چوراہوں پر پھانسی کے تختے لٹکا دیئے۔

جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی صاحبِ دار ہے

اور ہر ہر محلے میں مجسٹریٹوں کی مصنوعی عدالتیں قائم کر دی تھیں، جہاں کہیں کسی پر شبہ ہوا، اس کو مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا، اور اس نے حکم جاری کر دیا کہ اس کو پھانسی پر چڑھا دو، پھانسی پر اس کو لٹکا دیا گیا۔ اسی دوران ایک مقدمہ میرٹھ میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف بھی قائم ہو گیا۔ اور مجسٹریٹ کے یہاں پیشی ہو گئی۔ جب مجسٹریٹ کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا کہ تمہارے پاس ہتھیار

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب هجرة النبي وأصحابه إلى المدينة، رقم: ٣٦٢١، مسند أحمد، رقم: ١١٦١٥

ہیں؟ اس لئے کہ اطلاع یہ ملی تھی کہ ان کے پاس بندوقیں ہیں، اور حقیقت میں حضرت کے پاس بندوقیں تھیں، چنانچہ جس وقت مجسٹریٹ نے یہ سوال کیا، اس وقت حضرت کے ہاتھ میں تسبیح تھی، آپ نے وہ تسبیح اس کو دکھاتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا ہتھیار یہ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ میرے پاس ہتھیار نہیں ہے، اس لئے کہ یہ جھوٹ ہو جاتا آپ کا حلیہ بھی ایسا تھا کہ بالکل درویش صفت معلوم ہوتے تھے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مدد بھی فرماتے ہیں، ابھی سوال جواب ہو رہا تھا کہ اتنے میں کوئی دیہاتی وہاں آ گیا۔ اس نے جب دیکھا کہ حضرت سے اس طرح سوال جواب ہو رہے ہیں تو اس نے کہا کہ ارے! اس کو کہاں سے پکڑ لائے، یہ تو ہمارے محلے کا موجن (مؤذن) ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلاصی عطا فرمائی۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں، چاروں طرف پولیس تلاش کرتی پھر رہی ہے اور آپ چھتہ کی مسجد میں تشریف فرما ہیں، وہاں پولیس پہنچ گئی، مسجد کے اندر آپ اکیلے تھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کا نام سن کر ذہنوں میں تصور آتا تھا کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں تو آپ شاندار قسم کے لباس اور جبہ قبہ پہنے ہونگے، وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ آپ تو ہر وقت ایک معمولی لنگی ایک معمولی کرتہ پہنے ہوتے تھے جب پولیس اندر داخل ہوئی تو یہ سمجھا کہ یہ مسجد کا کوئی خادم ہے۔ چنانچہ پولیس نے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب کہاں ہیں؟ آپ فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے، اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہاں تھے، اور اس کے ذریعہ اس کو یہ تاثر دیا کہ اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔ لیکن زبان سے یہ جھوٹا کلمہ نہیں نکالا کہ یہاں نہیں ہیں، چنانچہ وہ پولیس واپس چلی گئی۔

اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے وقت میں بھی، جب کہ جان پر بنی ہوئی ہو، اس وقت بھی یہ خیال رہتا ہے کہ زبان سے کوئی غلط لفظ نہ نکلے۔ زبان سے صریح جھوٹ نہ نکلے، اور اگر کبھی مشکل وقت آ جائے تو اس وقت بھی توریہ کر کے اور گول مول بات کر کے کام چل جائے، یہ بہتر ہے۔ البتہ اگر جان پر بن جائے، جان جانے کا خطرہ ہو، یا شدید ناقابل برداشت ظلم کا اندیشہ ہو، اور توریہ سے اور گول مول بات کرنے سے بھی بات نہ بنے تو اس وقت شریعت نے جھوٹ بولنے کی بھی اجازت دیدی ہے، لیکن اس اجازت کو اتنی کثرت کے ساتھ استعمال کرنا، جس طرح آج اس کا استعمال ہو رہا ہے، یہ سب حرام ہے، اور اس میں جھوٹی گواہی کا گناہ ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

بچوں کے دلوں میں جھوٹ کی نفرت

بچوں کے دل میں جھوٹ کی نفرت پیدا کریں، خود بھی شروع سے جھوٹ سے بچنے کی عادت ڈالیں۔ اور بچوں سے اس طرح بات کریں کہ ان کے دلوں میں بھی جھوٹ کی نفرت پیدا ہو جائے، اور سچائی کی محبت پیدا ہو، اس لئے بچوں کے سامنے کبھی غلط بات کوئی جھوٹ نہ بولیں، اس لئے کہ جب بچہ یہ دیکھتا ہے کہ باپ جھوٹ بول رہا ہے، ماں جھوٹ بول رہی ہے تو پھر بچے کے دل سے جھوٹ بولنے کی نفرت ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ جھوٹ بولنا تو روزانہ کا معمول ہے، اس لئے بچپن ہی سے بچوں میں اس بات کی عادت ڈالی جائے کہ زبان سے جو بات نکلے، وہ پتھر کی لکیر ہو، اس میں کوئی غلطی نہ ہو، اور نفس الامر کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔ دیکھئے، نبوت کے بعد سب سے اُونچا مقام ''صدیق'' کا مقام ہے۔ اور ''صدیق'' کے معنی ہیں ''بہت سچا'' جس کے قول میں خلافِ واقعہ بات کا شبہ بھی نہ ہو۔

جھوٹ عمل سے بھی ہوتا ہے

جھوٹ جس طرح زبان سے ہوتا ہے، بعض اوقات عمل سے بھی ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اوقات انسان ایسا عمل کرتا ہے، جو درحقیقت جھوٹا عمل ہوتا ہے۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ))(۱)

''جو شخص اپنے عمل سے اپنے آپ کو ایسی چیز کا حامل قرار دے جو اس کے اندر نہیں ہے تو وہ جھوٹ کا لباس پہننے والا ہے''

مطلب اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل سے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرے جیسا کہ حقیقت میں نہیں ہے۔ یہ بھی گناہ ہے۔ مثلاً ایک شخص جو حقیقت میں بہت دولت مند نہیں ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو اپنی اداؤں سے، اپنی نشست و برخاست سے، اپنے طریقِ زندگی سے اپنے آپ کو دولت مند ظاہر کرتا ہے، یہ بھی عملی جھوٹ ہے، یا اس کے برعکس ایک اچھا خاصا کھاتا پیتا انسان ہے۔ لیکن اپنے عمل سے تکلف کر کے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرتا ہے، تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے،

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب المتشبع بما ینل وما ینهی من افتخاره الضرّة، رقم: ۴۸۱۸، صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، باب النهی التزویر فی اللباس وغیره، رقم: ۳۹۷۲، سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی المتشبع بما لم یعط، رقم: ۴۳۴۵، مسند أحمد، رقم: ۲۴۱۷۵

یہ بہت مفلس ہے، نادار ہے، غریب ہے، حالانکہ حقیقت میں وہ غریب نہیں ہے، اس کو بھی نبی کریم ﷺ نے عملی جھوٹ قرار دیا لہٰذا عملی طور پر کوئی ایسا کام کرنا جس سے دوسرے شخص پر غلط تاثر قائم ہو، یہ بھی جھوٹ کے اندر داخل ہے۔

اپنے نام کے ساتھ ''سیّد'' لکھنا

بہت سے لوگ اپنے ناموں کے ساتھ ایسے الفاظ اور القاب لکھتے ہیں جو واقعہ کے مطابق نہیں ہوتے، چونکہ رواج چل پڑا ہے، اس لئے بلاتحقیق لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص نے اپنے نام کے ساتھ ''سیّد'' لکھنا شروع کر دیا۔ جبکہ حقیقت میں ''سیّد'' نہیں ہے، اس لئے کہ حقیقت میں ''سیّد'' وہ ہے جو باپ کی طرف سے نسب کے اعتبار سے نبی کریم ﷺ کی اولاد میں ہو، وہ ''سیّد'' ہے، بعض لوگ ماں کی طرف سے نبی کریم ﷺ کی اولاد میں سے ہوتے ہیں، اور اپنے آپ کو ''سیّد'' لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ لہٰذا جب تک ''سیّد'' ہونے کی تحقیق نہ ہو، اس وقت تک ''سیّد'' لکھنا جائز نہیں، البتہ تحقیق کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ اگر خاندان میں یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ یہ سادات کے خاندان میں ہیں تو پھر ''سیّد'' لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر ''سیّد'' ہونا معلوم نہیں ہے، اور نہ اس کی دلیل موجود ہے، تو اس میں بھی جھوٹ بولنے کا گناہ ہے۔

نام کے ساتھ ''پروفیسر'' یا ''مولانا'' لکھنا

بعض لوگ حقیقت میں ''پروفیسر'' نہیں ہیں، لیکن اپنے نام کے ساتھ ''پروفیسر'' لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ''پروفیسر'' تو ایک خاص اصطلاح ہے، جو خاص لوگوں کے لئے بولی جاتی ہے۔ یا جیسے ''عالم'' یا ''مولانا'' کا لفظ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو درسِ نظامی کا فارغ التحصیل ہو۔ اور باقاعدہ اس نے کسی سے علم حاصل کیا ہو۔ اس کے لئے ''مولانا'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اب بہت سے لوگ جنہوں نے باقاعدہ علم حاصل نہیں کیا، لیکن اپنے نام کے ساتھ ''مولانا'' لکھنا شروع کر دیتے ہیں، یہ بھی خلافِ واقعہ ہے، اور جھوٹ ہے ان باتوں کو ہم لوگ جھوٹ نہیں سمجھتے، اور ہم یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بھی گناہ کے کام ہیں۔ اس لئے ان سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

خیانت
اور
اس کی مروجہ صورتیں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: ((آیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ کَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) فِیْ رِوَایَةٍ((وَإِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ))(۱)

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے منافق کی تین نشانیاں بیان فرمائیں ہیں، اور اشارہ اس بات کی طرف فرمادیا کہ یہ تین کام مؤمن کے کام نہیں ہیں، اور جس میں یہ تین باتیں پائی جائیں، وہ صحیح معنی میں مسلمان اور مؤمن کہلانے کا مستحق نہیں ان میں سے دو کا بیان پچھلے دو جمعوں میں الحمدللہ قدرے تفصیل کے ساتھ ہوگیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امانت داری کی تاکید

منافق کی تیسری علامت جو بیان فرمائی، وہ ہے ''امانت میں خیانت'' یعنی مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ امانت میں خیانت کرے، بلکہ یہ منافق کا کام ہے۔ بہت سی آیات اور احادیث میں امانت پر زور دیا گیا ہے، اور امانت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

☆ اصلاحی خطبات (۳/۱۷۴ تا ۱۹۵)، ۱۳ دسمبر ۱۹۹۱ء، بروز جمعہ، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب علامة المنافق، رقم: ۳۲، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان خصال المنافق، رقم: ۸۹، سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فی علامة المنافق، رقم: ۲۵۵۵، مسند أحمد، رقم: ۸۳۳۱

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ امانتوں کو ان کے اہل تک اور ان کے مستحقین تک پہنچاؤ، اور اس کی اتنی تاکید فرمائی گئی ہے کہ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا إِيْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهٗ))(۲)

''جس کے اندر امانت نہیں، اس کے اندر ایمان بھی نہیں''

گویا کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی امین ہو۔ امانت میں خیانت نہ کرتا ہو۔

اسلام میں امانت کا تصور

لیکن آج کی مجلس میں جس بات کی طرف توجہ دلانی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے ان تمام چیزوں کا مطلب اور مفہوم بہت محدود سمجھا ہوا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں امانت کا صرف اتنا تصور ہے کہ کوئی شخص پیسے لے کر آئے۔ اور یہ کہے کہ یہ پیسے آپ بطور امانت اپنے پاس رکھ لیجئے۔ جب ضرورت ہوگی اس وقت میں آپ سے واپس لے لوں گا۔ تو یہ امانت ہے۔ اور اگر کوئی شخص امانت میں خیانت کرتے ہوئے ان پیسوں کو کھا کر ختم کردے۔ یا جب وہ شخص اپنے پیسے مانگنے آئے تو اس کو دینے سے انکار کردے تو یہ خیانت ہوئی۔ ہمارے ذہنوں میں امانت اور خیانت کا بس اتنا ہی تصور ہے۔ اس سے آگے نہیں ہے۔ بیشک یہ بھی امانت میں خیانت کا حصہ ہے۔ لیکن قرآن وحدیث کی اصطلاح میں ''امانت'' اس حد تک محدود نہیں، بلکہ ''امانت'' کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اور بہت ساری چیزیں امانت میں داخل ہیں، جن کے بارے میں اکثر و بیشتر ہمارے ذہنوں میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ بھی امانت ہے۔ اور اس کے ساتھ ''امانت'' جیسا سلوک کرنا چاہئے۔

امانت کے معنی

عربی زبان میں ''امانت'' کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص پر کسی معاملے میں بھروسہ کرنا۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو دوسرے کو اس طرح سپرد کی گئی ہو، کہ سپرد کرنے والے نے اس پر بھروسہ کیا ہو کہ یہ اس کا حق ادا کرے گا، یہ ہے امانت کی حقیقت، لہٰذا کوئی شخص کوئی کام یا کوئی چیز یا کوئی مال جو دوسرے کے سپرد کرے، اور سپرد کرنے والا اس بھروسے پر سپرد کرے کہ یہ شخص اس سلسلے میں اپنے فریضے کو صحیح طور پر بجالائے گا، اور اس میں کوتاہی نہیں کرے گا، یہ امانت ہے۔ لہٰذا ''امانت'' کی اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو بیشمار چیزیں اس میں داخل ہوجاتی ہیں۔

(۱) النساء: ۵۸ (۲) مسند أحمد، رقم: ۱۱۹۳۵

یومِ الست میں اقرار

اللہ تعالیٰ نے ''یومِ الست'' میں انسانوں سے جو عہد لیا تھا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں یا نہیں؟ اور تم میری اطاعت کرو گے یا نہیں؟ تمام انسانوں نے اقرار کیا کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے، اس عہد کو قرآن کریم نے سورۃ احزاب کے آخری رکوع میں امانت سے تعبیر فرمایا ہے، فرمایا:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾(۱)

یعنی ہم نے زمین پر امانت پیش کی، اور اس سے پوچھا کہ تم اس امانت کے بوجھ کو اُٹھاؤ گی؟ تو اس نے اس امانت کے اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ پھر آسمانوں پر پیش کی کہ تم یہ امانت اُٹھاؤ گے؟ انہوں نے بھی انکار کر دیا، اور پھر پہاڑوں پر یہ امانت پیش کی کہ تم اس امانت کے بوجھ کو اُٹھاؤ گے؟ انہوں نے بھی اس امانت کو اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ سب اس امانت کو اُٹھانے سے ڈر گئے۔ لیکن جب یہ امانت اس حضرت انسان پر پیش کی گئی تو یہ بڑے بہادر بن کر آگے بڑھ کر اقرار کر لیا کہ میں اس امانت کو اُٹھاؤں گا۔ چنانچہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ انسان بڑا ظالم اور جاہل تھا کہ اتنے بڑے بوجھ کو اُٹھانے کے لئے آگے بڑھ گیا، اور یہ نہ سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس امانت کے بوجھ کو اُٹھانے سے عاجز رہ جاؤں، جس کی وجہ سے میرا انجام خراب ہو جائے۔

یہ زندگی اللہ کی امانت ہے

بہر حال، اس بوجھ کو اللہ تعالیٰ نے ''امانت'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ یہ امانت کیا چیز تھی جو انسان پر پیش کی جارہی تھی؟ چنانچہ مفسرین نے فرمایا کہ یہاں امانت کے معنی یہ ہیں کہ اس انسان سے یہ کہا جارہا تھا کہ تمہیں ایک زندگی دی جائے گی، اور اس میں تمہیں اچھے کام کرنے کا بھی اختیار دیا جائے گا، اور برے کام کرنے کا بھی، اور جب اچھے کام کرو گے تو ہماری خوشنودی حاصل ہوگی، جنت کی ابدی اور دائمی نعمتیں تمہیں حاصل ہوں گی۔ اور اگر برے کام کرو گے تو اس کے نتیجے میں تم پر ہمارا غضب ہوگا، اور جہنم کا ابدی عذاب تم پر ہوگا، اب بتاؤ تمہیں ایسی زندگی منظور ہے یا نہیں؟ چنانچہ اور سب نے انکار کر دیا، لیکن انسان اس کے لئے تیار ہو گیا۔ حافظ شیرازی اسی کو بیان فرماتے ہیں کہ۔

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

---

(۱) الأحزاب: ۷۲

یعنی آسمان سے تو یہ بوجھ نہیں اُٹھا، اس نے تو انکار کر دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے، لیکن یہ حضرت انسان، مشت استخوان نے یہ بوجھ اُٹھالیا، اور قرعۂ فال میرے نام پر پڑ گیا۔ بہر حال! قرآن کریم نے اس کو ''امانت'' سے تعبیر فرمایا ہے۔

یہ جسم ایک امانت ہے

یہ پوری زندگی ہمارے پاس امانت ہے اور اس امانت کا تقاضا یہ ہے کہ اس زندگی کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق گزار دیں، لہٰذا سب سے بڑی امانت جو ہر انسان کے پاس ہے، جس سے کوئی انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے، وہ امانت خود اس کا ''وجود'' اور اس کی ''زندگی'' اور اس کے اعضاء و جوارح، اس کے اوقات، اس کی توانائیاں ہیں، یہ سب کی سب امانت ہیں۔ کیا کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے اس ہاتھ کا مالک ہو، یہ آنکھ جو مجھے ملی ہوئی ہے، میں اس کا مالک ہوں، ایسا نہیں، بلکہ یہ سارے اعضا ہمارے پاس امانت ہیں، ہم اس کے مالک نہیں ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کو استعمال کریں، بلکہ اعضا کی یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں استعمال کے لئے عطا فرمائی ہیں۔ لہٰذا اس امانت کا تقاضا یہ ہے کہ ان اعضا کو، اپنے اس وجود کو، اپنی صلاحیتوں کو اور اپنی توانائیوں کو اسی کام میں صرف کریں، جس کام کے لئے یہ دی گئی ہیں، اس کے علاوہ دوسرے کاموں میں صرف کریں گے تو یہ امانت میں خیانت ہوگی۔

آنکھ ایک امانت ہے

مثلاً آنکھ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو اس نے ہمیں عطا فرمائی ہے اور یہ ایسی نعمت ہے کہ ساری دنیا کی مال و دولت خرچ کر کے اس کو حاصل کرنا چاہے تو حاصل نہیں ہو سکتی، لیکن اس کی قدر اس لئے نہیں ہے کہ پیدائش کے وقت سے یہ سرکاری مشین لگی ہوئی ہے، اور کام کر رہی ہے۔ اس کے حاصل کرنے میں نہ تو کوئی پیسہ لگا ہے، اور نہ محنت کرنی پڑی ہے، لیکن جس دن خدانہ کرے اس آنکھ کی بینائی پر ادنیٰ سا نقص آ جائے، اور اس بات کا اندیشہ ہو کہ کہیں میری یہ بینائی نہ چلی جائے، اس وقت اس کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے، اور اس وقت آدمی ساری دولت ایک آنکھ کی بینائی کے لئے خرچ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور یہ ایسی سرکاری مشین ہے کہ نہ اس کی سروس کی ضرورت ہے، نہ اس کی اوور ہالنگ کی ضرورت۔ نہ اس کا ماہانہ خرچ، نہ ٹیکس، نہ کرایہ، بلکہ مفت ملی ہوئی ہے۔

لیکن یہ مشین اللہ تعالیٰ نے بطور امانت کے دے رکھی ہے، اور یہ فرما دیا ہے کہ اس مشین کو استعمال کرو، اس کے ذریعہ دنیا کو دیکھو، دنیا کا نظارہ کرو، دنیا کے مناظر سے لطف اُٹھاؤ، سب کچھ کرو،

لیکن صرف چند چیزوں کو دیکھنے سے منع کر دیا کہ اس سرکاری مشین کو ان کاموں میں استعمال نہ کریں، مثلاً حکم دے دیا کہ اس کے ذریعہ نامحرم پر نگاہ نہ ڈالی جائے۔ اب اگر اس کے ذریعہ ہم نے نامحرم کی طرف نگاہ ڈالی تو یہ اللہ تعالیٰ کی امانت میں خیانت ہوئی۔ اسی لئے قرآن کریم نے نامحرم کی طرف نگاہ کرنے کو خیانت سے تعبیر فرمایا، چنانچہ فرمایا:

﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ﴾(۱)

یعنی آنکھوں کی خیانت کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تم نے اس کو ایسی جگہ استعمال کیا جہاں استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا تھا۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ کسی شخص نے دوسرے کے پاس اپنا مال بطور امانت رکھوایا، اور اب وہ چوری چھپے آنکھ بچا کر اس کا مال استعمال کرنا چاہتا ہے، وہی معاملہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کے ساتھ بھی کرتا ہے، اور بیوقوف کو یہ پتہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی عمل چھپ نہیں سکتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی خیانت کو بہت بڑا گناہ اور جرم قرار دیا، اور نبی کریم ﷺ نے اس پر وعیدیں بیان فرمائیں۔

اور اگر آنکھ کی اس امانت اور نعمت کو صحیح جگہ استعمال کرو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر ایک شخص باہر سے گھر کے اندر داخل ہوا، اور اس نے اپنی بیوی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا، اور بیوی نے شوہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھا تو اس وقت اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس لئے کہ اس نے اس امانت کو صحیح جگہ پر استعمال کیا، اگرچہ اپنی ذاتی لذت کے لئے اپنے فائدے کے لئے کیا۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کیا، اس لئے ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوئی۔

کان ایک امانت ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کان سننے کے لئے عطا فرمایا ہے، اور پھر ہر چیز سننے کی اجازت دیدی، صرف چند چیزوں پر پابندی گادی کہ تم گانا بجانا مت سننا، موسیقی مت سننا، غیبت مت سننا، غلط اور جھوٹی باتیں مت سننا، لہٰذا اگر کان ان چیزوں کے سننے میں استعمال ہو رہا ہے تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

زبان ایک امانت ہے

''زبان'' اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے جو پیدائش کے وقت سے چل رہی ہے، اور مرتے

(۱) الغافر: ۹

دم تک چلتی رہتی ہے۔ زبان کی ذرا سی حرکت سے نہ جانے کیا کیا کام انسان لے رہا ہے۔ یہ زبان اتنی بڑی نعمت ہے کہ اگر ایک مرتبہ زبان کو حرکت دے کر یہ کہہ دو:

"سُبْحَانَ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ"

حدیث شریف میں ہے کہ اس کے ذریعہ سے میزانِ عمل کا آدھا پلڑا ابھر جاتا ہے۔ اس لئے اس کے ذریعہ آخرت کی تیاری کرنی چاہئے۔ لیکن اگر اس زبان کو جھوٹ بولنے میں استعمال کیا، غیبت کرنے میں استعمال کیا، مسلمان کی دل آزاری کرنے میں استعمال کیا، دوسروں کو تکلیف پہنچانے میں استعمال کیا تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

خودکشی کیوں حرام ہے؟

یہ تو صرف اعضاء کی بات تھی۔ ہمارا یہ پورا وجود، پورا جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ جسم ہمارا اپنا ہے، لہٰذا اس کے ساتھ ہم جو چاہیں کریں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اسی لئے شریعت میں خودکشی کرنا حرام ہے۔ اگر یہ جسم ہمارا اپنا ہوتا تو خودکشی کیوں حرام ہوتی۔ وہ اس لئے حرام ہے کہ یہ جان، یہ جسم، یہ وجود، یہ اعضاء، حقیقت میں ہماری ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ملکیت ہیں۔

مثلاً یہ کتاب میری ملکیت ہے۔ اب اگر میں کسی شخص سے کہوں کہ یہ کتاب تم لے جاؤ۔ میرے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ مجھے قتل کردو، میری جان لے لو، اب اس نے قتل کرنے کی اجازت دے دی۔ اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دے دیا۔ دستخط کردئے۔ مہر بھی لگادی۔ سب کچھ کردیا۔ لیکن اس کے باوجود جس کو قتل کی اجازت دی گئی ہے، اس کے لئے قتل کرنا جائز نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ جان اس کی ملکیت ہی نہیں ہے۔ اگر اس کی ملکیت ہوتی، تب وہ دوسرے کو اس کے لینے کی اجازت دے سکتا تھا۔ لہٰذا جب ملکیت نہیں، تو پھر دوسرے کو اجازت دینے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔

گناہ کرنا خیانت ہے

اللہ تعالیٰ نے یہ پورا وجود، پوری جان، اور یہ صلاحیتیں اور توانائیاں یہ سب ہمیں امانت کے طور پر عطا فرمائی ہیں، لہٰذا اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ پوری زندگی امانت ہے، اس لئے زندگی کا کوئی کام، اور ان اعضاء سے کیا جانے والا کوئی عمل، کوئی قول، کوئی فعل ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس امانت میں خیانت کا سبب بنے، لہٰذا امانت کا جو محدود تصور ہمارے ذہنوں میں ہے کہ کوئی شخص آکر

پیسے رکھوائے گا، اور ہم صندوقچی کھول کر اس میں وہ پیسے رکھیں گے، اور تالہ لگادیں گے، اب اگر ان پیسوں کو نکال کر خرچ کرلیا تو یہ خیانت ہوگی۔ امانت کا اتنا محدود تصور غلط ہے۔ بلکہ یہ پوری زندگی ایک امانت ہے۔ اور زندگی کا ایک ایک قول وفعل امانت ہے۔

لہٰذا یہ جو فرمایا کہ امانت میں خیانت کرنا نفاق کی علامت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنے بھی گناہ ہیں، چاہے وہ آنکھ کا گناہ ہو، یا کان کا گناہ ہو، یا زبان کا گناہ ہو، یا کسی اور عضو کا گناہ ہو، وہ سارے امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں، اور وہ مؤمن کے کام نہیں ہیں۔ بلکہ منافق کے کام ہیں۔

''عاریت'' کی چیز امانت ہے

یہ تو امانت کے بارے میں عام باتیں تھیں۔ لیکن امانت کے کچھ خاص شعبے بھی ہیں، بعض اوقات ہم ان کو امانت نہیں سمجھتے، اور امانت جیسی حفاظت نہیں کرتے۔ مثلاً ''عاریت'' کی چیز ہے، ''عاریت'' اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی کو ایک چیز کی ضرورت تھی۔ وہ چیز اس کے پاس نہیں تھی۔ اس لئے اس نے وہ چیز استعمال کرنے کے لئے دوسرے سے مانگ لی کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے، تھوڑی دیر کے لئے دے دو۔ اب یہ ''عاریت'' کی چیز ''امانت'' ہے۔ مثلاً میرا ایک کتاب پڑھنے کو دل چاہ رہا تھا، لیکن وہ کتاب میرے پاس نہیں تھی، اس لئے میں نے دوسرے شخص سے پڑھنے کے لئے وہ کتاب مانگ لی کہ میں پڑھ کر واپس کردوں گا، اب یہ کتاب میرے پاس ''عاریت'' ہے، شریعت کی اصطلاح میں اس کو عاریت کہا جاتا ہے، اور یہ عاریت کی چیز امانت ہوتی ہے، لہٰذا اس لینے والے شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس چیز کو مالک کی مرضی کے خلاف استعمال کرے۔ بلکہ اسے چاہئے کہ اس عاریت کی چیز کو اس طرح استعمال نہ کرے، جس سے مالک کو تکلیف ہو، اور دوسرے یہ کہ اس کو بروقت مالک کے پاس لوٹانے کی فکر کرے۔

یہ برتن امانت ہیں

حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ نے بیشمار مواعظ میں اس بات پر تنبیہ فرمائی ہے کہ لوگ بکثرت ایسا کرتے ہیں کہ جب ان کے گھر کسی نے کھانا بھیج دیا، اس بیچارے بھیجنے والے سے یہ غلطی ہوگئی کہ اس نے آپ کے گھر کھانا بھیج دیا، اب صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ وہ کھانا تم دوسرے برتن میں نکال لو، اور وہ برتن اس کو فوراً واپس کردو، مگر ہوتا یہ ہے کہ وہ بیچارہ کھانا بھیجنے والا برتن سے بھی محروم ہوگیا، چنانچہ وہ برتن گھر میں پڑے ہوئے ہیں، واپس پہنچانے کی فکر نہیں، بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ان برتنوں کو خود اپنے استعمال میں لانے شروع کردیئے، یہ امانت میں خیانت

ہے، اس لئے کہ وہ برتن آپ کے پاس بطور عاریت کے آئے تھے، آپ کو ان کا مالک نہیں بنایا گیا تھا، لہٰذا ان برتنوں کو استعمال کرنا، اور ان کو واپس پہنچانے کی فکر نہ کرنا امانت میں خیانت ہے۔

یہ کتاب امانت ہے

یا مثلاً آپ نے کسی سے کتاب پڑھنے کے لئے لے لی، اور کتاب پڑھ کر اس کو مالک کے پاس واپس نہیں پہنچائی یہ امانت میں خیانت ہے، حتیٰ کہ اب تو لوگوں میں یہ مقولہ بھی مشہور ہو گیا ہے کہ ''کتاب کی چوری جائز ہے'' اور جب کتاب کی چوری جائز ہو گئی تو امانت میں خیانت بطریق اولیٰ جائز ہو گی۔ اگر کسی نے کوئی کتاب پڑھنے کے لئے دے دی تو اب لوٹانے کا کوئی سوال نہیں، حالانکہ یہ سب باتیں امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں۔ اسی طرح جتنی عاریت کی چیزیں ہیں، جو آپ کے پاس کسی بھی طریقے سے آئی ہوں۔ ان کو حفاظت سے رکھنا، اور ان کو مالک کی مرضی کے خلاف استعمال نہ کرنا واجب اور فرض ہے، اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں۔

ملازمت کے اوقات امانت ہیں

اسی طرح ایک شخص نے کہیں ملازمت کر لی۔ اور ملازمت میں آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینے کا معاہدہ ہو گیا، یہ آٹھ گھنٹے آپ نے اس کے ہاتھ فروخت کر دیئے، لہٰذا یہ آٹھ گھنٹے کے اوقات آپ کے پاس اس شخص کی امانت ہے جس کے یہاں آپ نے ملازمت کی ہے۔ لہٰذا اگر ان آٹھ گھنٹوں میں سے ایک منٹ بھی آپ نے کسی ایسے کام میں صرف کر دیا جس میں صرف کرنے کی مالک کی طرف سے اجازت نہیں تھی، تو یہ امانت میں خیانت ہے۔ مثلاً ڈیوٹی کے اوقات میں دوست احباب ملنے کے لئے آ گئے، اب ان کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ وقت اس میں صرف ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہ وقت تمہارا بکا ہوا تھا۔ تمہارے پاس امانت تھا، تم نے اس وقت کو باتوں میں اور ہنسی مذاق میں گزار دیا تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

اب بتایئے، ہم لوگ کتنے غافل ہیں کہ جو اوقات ہمارے بکے ہوئے ہیں، ہم ان کو دوسرے کاموں میں صرف کر رہے ہیں، یہ امانت میں خیانت ہو رہی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مہینے کے آخر میں جو تنخواہ مل رہی ہے، وہ پوری طرح حلال نہیں ہوئی، اس لئے کہ وقت پورا نہیں دیا۔

دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کا معمول

دارالعلوم دیوبند کے حضرات اساتذہ کرام کو دیکھئے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے

ذریعہ صحابہ کرام کے دور کی یادیں تازہ کرائیں، ان حضرات اساتذہ کرام کی تنخواہ دس روپے ماہانہ یا پندرہ روپے ماہانہ ہوتی تھی، لیکن چونکہ جب تنخواہ مقرر ہوگئی، اور اپنے اوقات مدرسے کے ہاتھ فروخت کر دیئے، اس لئے ان حضرات اساتذہ کا یہ معمول تھا کہ اگر مدرسے کے اوقات کے دوران مہمان یا دوست احباب ملنے کے لئے آتے تو جس وقت وہ مہمان آتے فوراً گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ کر لیتے۔ اور پھر ان کو جلد از جلد نمٹانے کی فکر کرتے۔ اور جس وقت وہ مہمان چلے جاتے، اس وقت گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ کر لیتے۔ پورا مہینہ اس طرح وقت نوٹ کرتے رہتے پھر جب مہینہ پورا ہو جاتا تو وہ اساتذہ باقاعدہ درخواست دیتے کہ اس ماہ کے دوران ہم نے اتنا وقت مدرسے کے کام کے علاوہ دوسرے کاموں میں صرف کیا ہے۔ لہٰذا براہِ کرم میری تنخواہ میں سے اتنے وقت کے پیسے کاٹ لیے جائیں۔ وہ حضرات اساتذہ اس لئے ایسا کرتے تھے کہ اگر ہم نے اس وقت کی تنخواہ لے لی وہ تنخواہ ہمارے لئے حرام ہوگئی۔ اس لئے واپس کر دیتے۔ آج تنخواہ لینے کے لئے تو درخواستیں دی جاتی ہیں، تنخواہ کٹوانے کے لئے درخواست دینے کا آج تصور بھی مشکل ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تنخواہ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ، جو دار العلوم دیوبند کے پہلے طالب علم ہیں، جن کے ذریعہ دار العلوم دیوبند کا آغاز ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم میں، تقویٰ میں، معرفت میں بہت اُونچا مقام بخشا تھا۔ جس زمانے میں آپ دار العلوم دیوبند میں شیخ الحدیث تھے، اس وقت آپ کی تنخواہ ماہانہ دس روپے تھی، پھر جب آپ کی عمر زیادہ ہوگئی اور تجربہ بھی زیادہ ہوگیا، تو اس وقت دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ حضرت والا کی تنخواہ بہت کم ہے۔ جبکہ آپ کی عمر زیادہ ہوگئی ہے۔ ضروریات بھی زیادہ ہیں، مشاغل بھی زیادہ ہیں، اس لئے تنخواہ بڑھانی چاہئے۔ چنانچہ مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ اب آپ کی تنخواہ دس روپے کے بجائے پندرہ روپے ماہانہ کر دی جائے۔ جب تنخواہ تقسیم ہوئی تو حضرت والا نے دیکھا کہ اب دس کے بجائے پندرہ روپے ملے ہیں۔ حضرت والا نے پوچھا کہ یہ پندرہ روپے مجھے کیوں دیئے گئے۔ لوگوں نے بتایا کہ مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی تنخواہ دس روپے کے بجائے پندرہ روپے کر دی جائے۔ آپ نے وہ تنخواہ لینے سے انکار کر دیا، اور دار العلوم دیوبند کے مہتمم صاحب کے نام ایک درخواست لکھی کہ حضرت! آپ نے میری تنخواہ دس روپے کے بجائے پندرہ روپے کر دی ہے۔ حالانکہ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ پہلے تو میں نشاط کے ساتھ دو تین گھنٹے سبق پڑھا لیتا تھا، اور اب تو میں کم پڑھاتا ہوں۔ وقت کم دیتا ہوں۔ لہٰذا میری تنخواہ میں اضافے کا کوئی جواز نہیں، لہٰذا جو اضافہ آپ حضرات نے کیا ہے یہ واپس لیا جائے۔ اور میری تنخواہ اسی طرح

دس روپے کردی جائے۔

لوگوں نے آکر حضرت والا سے منت سماجت شروع کردی کہ حضرت! آپ تو اپنے تقویٰ اور ورع کی وجہ سے اضافہ واپس کر رہے ہیں، لیکن دوسرے لوگوں کے لئے یہ مشکل ہو جائے گی کہ آپ کی وجہ سے ان کی ترقیاں رک جائیں گی۔ لہٰذا آپ اس کو منظور کرلیں۔ مگر انہوں نے اپنے لئے اس کو گوارا نہ کیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہر وقت یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ یہ دنیا تو چند روز کی ہے۔ خدا جانے آج ختم ہو جائے، یا کل ختم ہو جائے۔ لیکن یہ پیسہ جو میرے پاس آرہا ہے، کہیں یہ پیسہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر وہاں شرمندگی کا سبب نہ بن جائے۔

دارالعلوم دیوبند عام یونیورسٹی کی طرح نہیں تھا کہ استاذ نے سبق پڑھا دیا۔ اور طالب علم نے سبق پڑھ لیا۔ بلکہ وہ ان اداؤں سے دارالعلوم دیوبند بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کی فکر سے بنا ہے۔ اس ورع اور تقویٰ سے بنا ہے۔ لہٰذا یہ اوقات جو ہم نے بیچ دیئے ہیں، یہ امانت ہیں۔ اس میں خیانت نہ ہونی چاہئے۔

آج حقوق کے مطالبے کا دور ہے

آج سارا زور حقوق کے حاصل کرنے پر ہے، حقوق حاصل کرنے کے لئے جلوس اور جلسے ہو رہے ہیں، نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ اور اس بات پر احتجاج ہو رہا ہے کہ ہمیں ہمارا حق دو، ہر شخص یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ مجھے میرا حق دو۔ لیکن کسی کو یہ فکر نہیں کہ دوسروں کے حقوق جو مجھ پر عائد ہو رہے ہیں وہ میں ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ آج یہ مطالبہ تو ہر شخص کر رہا ہے کہ میری تنخواہ بڑھنی چاہئے۔ مجھے ترقی ملنی چاہئے۔ یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ مجھے اتنی چھٹیاں ملنی چاہئیں، مجھے اتنا الاؤنس ملنا چاہئے۔ لیکن جو فرائض مجھے سونپے گئے ہیں، وہ میں ادا کر رہا ہوں یا نہیں، اس کی کوئی فکر نہیں۔

ہر شخص اپنے فرائض کی نگرانی کرے

حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ جب تک ہماری یہ ذہنیت برقرار رہے گی کہ میں دوسرے سے حقوق کا مطالبہ کرتا رہوں، اور مجھ سے کوئی حقوق کا مطالبہ نہ کرے، میں اپنے فرائض سے غافل رہوں، اور دوسروں سے حقوق کا مطالبہ کرتا رہوں، یاد رکھو! اس وقت تک دنیا میں کسی کا حق ادا نہیں ہوگا۔ حق ادا ہونے کا صرف ایک راستہ ہے، جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی نگرانی کرے، میرے ذمہ جو فریضہ ہے، میں اس کو ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ جب اس بات کا احساس دل میں ہوگا تو پھر سب کے حقوق ادا ہو جائیں گے۔ اگر شوہر کے دل میں یہ

احساس ہو کہ میرے ذمے بیوی کے جو فرائض ہیں، میں ان کو ادا کردوں، بس بیوی کا حق ادا ہو گیا۔ بیوی کے دل میں یہ احساس ہو کہ میرے ذمے شوہر کے جو فرائض ہیں، میں ان کو ادا کردوں، بس شوہر کا حق ادا ہو گیا۔ مزدور کے دل میں یہ احساس ہو کہ مالک کے میرے ذمے جو فرائض ہیں، میں ان کو ادا کردوں، مالک کا حق ادا ہو گیا۔ اور مالک کے دل میں یہ احساس ہو کہ مزدور کے میرے ذمے جو حقوق ہیں، وہ میں ادا کردوں، مزدور کا حق ادا ہو گیا۔ جب تک دلوں میں یہ احساس پیدا نہیں ہوگا، اس وقت تک حقوق کے مطالبے کے صرف نعرے ہی لگتے رہیں گے اور تحفظِ حقوق کی انجمنیں ہی قائم ہوتی رہیں گی۔ اور جلسے جلوس نکلتے رہیں گے، لیکن اس وقت تک کسی کا حق ادا نہ ہوگا، جب تک اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مجھے اس کے حقوق کا جواب دینا ہے۔ بس دنیا میں امن وسکون کا یہی راستہ ہے۔ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

یہ بھی ناپ تول میں کمی ہے

لہٰذا یہ اوقات ہمارے پاس امانت ہیں، قرآن کریم نے فرمایا:

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ﴾(۱)

فرمایا کہ ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، جب دوسروں سے وصول کرنے کا وقت آتا ہے تو پورا پورا وصول کرتے ہیں، تاکہ ذرا بھی کمی نہ ہو جائے، لیکن جب دوسروں کو دینے کا وقت آتا ہے تو اس میں کم دیتے ہیں اور ڈنڈی مارتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ناپ تول میں کمی اس وقت ہوتی ہے، جب آدمی کوئی سودا بیچے، اور اس میں ڈنڈی مار جائے، حالانکہ علماء نے فرمایا:

"اَلتَّطْفِيْفُ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ"

یعنی ناپ تول میں کمی ہر چیز میں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے، اور وہ پورے آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی نہیں دے رہا ہے، وہ بھی ناپ تول میں کمی کر رہا ہے۔ اور اس عذاب کا مستحق ہو رہا ہے۔ اس کا لحاظ کرنا چاہئے۔

"منصب" اور "عہدہ" ذمہ داری کا پھندا

آج ہم پر یہ بلا جو مسلط ہے کہ اگر کسی کو سرکاری دفتر میں کوئی کام پڑ جائے تو اس پر قیامت

(۱) المطففین: ۳

ٹوٹ پڑتی ہے، اس کا کام آسانی سے نہیں ہوتا، بار بار دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں، کبھی افسر صاحب سیٹ پر موجود نہیں ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ آج کام نہیں ہوسکتا کل کو آنا۔ جب دوسرے دن پہنچے تو کہا کہ پرسوں آنا۔ چکر پر چکر لگوائے جارہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے فرض کا احساس اور امانت کا احساس ختم ہوگیا ہے۔ اگر کسی کے پاس کوئی منصب ہے تو وہ کوئی منفعت نہیں ہے۔ وہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے، بلکہ وہ ذمہ داری کا ایک پھندا ہے، حکومت، اقتدار، منصب، عہدہ یہ سب ذمہ داری کے پھندے ہیں، یہ ایسی ذمہ داری ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا پیاسا مرجائے تو مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے سوال نہ ہوجائے کہ اے عمر! تیرے عہدِ خلافت میں فلاں کتا بھوکا پیاسا مرگیا تھا۔

کیا ایسے شخص کو خلیفہ بنادوں؟

روایت میں آتا ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ ہوا، اور آپ شدید زخمی ہوگئے تو کچھ صحابہ کرام آپ کی خدمت میں آئے، اور عرض کیا کہ حضرت آپ دنیا سے تشریف لے جارہے ہیں، آپ اپنے بعد کسی کو خلیفہ اور جانشین نامزد فرمادیں، تاکہ آپ کے بعد وہ حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لے، اور بعض حضرات نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر کو نامزد فرمادیں تاکہ آپ کی وفات کے بعد وہ خلیفہ بن جائیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پہلے تو جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم مجھ سے ایسے شخص کو خلیفہ بنوانا چاہتے ہو، جسے اپنی بیوی کو طلاق دینی بھی نہیں آتی۔ (۱)

واقعہ یہ ہوا تھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض یعنی ماہواری کے ایام میں طلاق دے دی تھی، اور مسئلہ یہ ہے کہ جب عورت ایام کی حالت میں ہو، اس وقت عورت کو طلاق دینا شرعاً ناجائز ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ غلط کیا، اس لئے اب رجوع کرلو، اور پھر سے اگر طلاق دینی ہو تو پاکی کی حالت میں طلاق دینا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم ایسے شخص کو خلیفہ بنانا چاہتے ہو جسے اپنی بیوی کو طلاق دینی بھی نہیں آتی۔ (۲)

---

(۱) تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۱۱۳

(۲) تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۱۱۳، تاریخ الطبری (۲۹۲/۳)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور احساسِ ذمہ داری

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کو دوسرا جواب یہ دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ خلافت کے بوجھ کا پھندا خطّاب کی اولاد میں سے ایک شخص کے گلے میں پڑ گیا تو یہ بھی کافی ہے، مراد اپنی ذات تھی کہ بارہ سال تک یہ پھندا میرے گلے میں پڑا رہا، وہی کافی ہے۔ اب اس خاندان کے کسی اور فرد کے گلے میں یہ پھندا میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اس واسطے کہ کچھ پتہ نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے جب مجھے اس ذمہ داری کا حساب دینا ہوگا، اس وقت میرا کیا حال ہوگا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جو خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ خوشخبری سن چکے ہیں کہ "عُمَرُ فِی الْجَنَّۃِ" کہ عمر جنت میں جائے گا۔(۱)

اس بشارت کے بعد اس بات کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا کہ جنت میں نہ جائیں، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب وکتاب کا ڈر اور اس امانت کا اتنا احساس ہے۔

ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ قیامت کے روز اگر میں اس امانت کے حساب کے نتیجے میں برابر سرابر بھی چھوٹ جاؤں کہ میرے اوپر نہ کوئی گناہ ہو، اور نہ ثواب ہو اور مجھے ''اعراف'' میں بھیج دیا جائے (جو جنت اور جہنم کے درمیان ایک علاقہ ہے جس میں ان لوگوں کو رکھا جائے گا، جن کے گناہ اور ثواب برابر ہوں گے) تو میرے لئے یہ بھی کافی، اور میں خلاصی پا جاؤں گا۔ حقیقت میں یہ ہے اس امانت کا احساس جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمائی ہے، اگر اس احساس کا تھوڑا ذرہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے تو ہمارے سارے مسئلے حل ہو جائیں۔

پاکستان کا اوّلین مسئلہ ''خیانت'' ہے

ایک زمانے میں یہ بحث چلی تھی کہ پاکستان کا مسئلہ نمبر ایک کیا ہے؟ یعنی سب سے بڑی مشکل کیا ہے جس کو حل کرنے میں اولیت دی جائے۔ حقیقت میں مسئلہ نمبر ایک ''خیانت'' ہے۔ آج امانت کا تصور ہمارے ذہنوں میں موجود نہیں ہے۔ اپنے فرائض ادا کرنے کا احساس دل سے اُتر گیا۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس باقی نہیں رہا، زندگی تیزی سے چلی جارہی ہے۔ جس میں پیسے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ کھانے کی دوڑ لگی ہے، اقتدار کی دوڑ ہے۔ اس دوڑ میں ایک دوسرے سے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللہ، باب مناقب عبد الرحمن بن عوف الزهری، رقم: ۳٦٨٠، سنن أبی داؤد، کتاب السنة، باب فی الخلفاء، رقم: ٤٠٣١، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضائل العشرة، رقم: ١٣٠، مسند أحمد، رقم: ١٥٤٣، تاریخ الطبری (٢٩٢/٣)

بازی لے جانے میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کی کوئی فکر نہیں، آج سب سے بڑا مسئلہ، اور ساری بیماریوں کی جڑ یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کے اندر یہ احساس پیدا فرمادے تو مسائل درست ہو جائیں۔

دفتر کا سامان امانت ہے

جس دفتر میں آپ کام کررہے ہیں، اس دفتر کا جتنا سامان ہے، وہ سب آپ کے پاس امانت ہے، اس لئے کہ وہ سامان آپ کو اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کو دفتری کاموں میں استعمال کریں لہٰذا آپ اس کو ذاتی کاموں میں استعمال نہ کریں۔ اس لئے کہ یہ بھی امانت میں خیانت ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر دفتر کی معمولی چیز اپنے ذاتی کام میں استعمال کرلی اس میں کیا حرج ہے؟ یاد رکھو! خیانت چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی چیز کی ہو، دونوں حرام ہیں، اور گناہِ کبیرہ ہیں۔ دونوں میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ اس لئے ان دونوں سے بچنا ضروری ہے۔

سرکاری اشیاء امانت ہیں

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ "امانت" کے صحیح معنی یہ ہیں کہ کسی شخص نے آپ پر بھروسہ کرکے اپنا کوئی کام آپ کے سپرد کیا، اور پھر آپ نے وہ کام اس کے بھروسہ کے مطابق انجام نہ دیا تو یہ خیانت ہوگی۔ یہ سڑکیں جن پر آپ چلتے ہیں۔ یہ بسیں جن میں آپ سفر کرتے ہیں۔ یہ ٹرینیں جن میں آپ سفر کرتے ہیں۔ یہ سب امانت ہیں۔ یعنی ان کو جائز طریقے پر استعمال کیا جائے اور اگر ان کو اس جائز طریقے سے ہٹ کر استعمال کیا جارہا ہے، تو وہ خیانت کے اندر داخل ہے۔ مثلاً اس کو استعمال کرتے وقت گندہ اور خراب کردیا۔ آج کل تو لوگوں نے سڑکوں کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ رکھا ہے۔ کسی نے کھود کر نالی نکال لی اور پانی جانے کا راستہ بنادیا۔ کسی نے سڑک گھیر کر شامیانہ لگادیا۔ حالانکہ فقہاء کرام نے یہاں تک مسئلہ لکھا ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنے گھر کا پرنالہ باہر سڑک کی طرف نکال دیا، تو اس شخص نے ایک ایسی فضا استعمال کی جو اس کی ملکیت میں نہیں تھی، اس لئے اس شخص کے لئے سڑک کی طرف پرنالہ نکالنا جائز نہیں، حالانکہ وہ پرنالہ کوئی جگہ نہیں گھیر رہا ہے۔ بلکہ فضا کے ایک حصے میں وہ پرنالہ نکلا ہوا ہے۔ اس پر فقہاء کرام نے تفصیلی بحث کی ہے کہ کہاں پرنالہ نکالنا جائز ہے، کتنا نکالنا جائز ہے، کتنا نکالنا حرام ہے، اس لئے کہ وہ جگہ امانت ہے، اپنی مِلک کا حصہ نہیں ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا پرنالہ

حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں ان کے پرنالے کا قصہ مشہور ہے ان کا گھر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل ساتھ ملا ہوا تھا۔ ان کے گھر کا ایک پرنالہ مسجد نبوی کے صحن میں گرتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اس پرنالے پر نظر پڑی تو دیکھا کہ وہ پرنالہ مسجد میں نکلا ہوا ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ پرنالہ کس کا ہے جو مسجد کے صحن کی طرف لگا ہوا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا پرنالہ ہے۔ آپ نے حکم فرمایا کہ اس کو توڑ دو۔ مسجد کی طرف کسی کو پرنالہ نکالنا جائز نہیں۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو ملاقات کے لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ عمر یہ تم نے کیا کیا؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ پرنالہ مسجد نبوی میں نکلا ہوا تھا۔ اس لئے گرادیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ پرنالہ میں نے نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لگایا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لگایا تھا تو فوراً فرمایا کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ چنانچہ مسجد نبوی میں تشریف لاکر خود جھک کر رکوع کی حالت میں کھڑے ہوگئے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے عباس! خدا کے لئے میری کمر پر سوار ہو کر اس پرنالے کو دوبارہ لگاؤ، اس لئے کہ خطاب کے بیٹے کی یہ مجال کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجازت دیئے ہوئے پرنالے کو توڑ دے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں لگوالوں گا، آپ رہنے دیں۔ لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں، جب میں نے توڑا ہے لہٰذا اب میں ہی اس کی سزا بھگتوں گا۔ (۱)

بہر حال! شریعت کا اصل مسئلہ تو یہی تھا کہ حاکم کی اجازت کے بغیر وہ پرنالہ لگانا جائز نہیں تھا۔ لیکن چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لگانے کی اجازت دیدی تھی، اس لئے اس کو لگانا ان کے لئے جائز ہوگیا۔

آج یہ حال ہے کہ جس شخص کا جتنی زمین پر قبضہ کرنے کا دل چاہا قبضہ کرلیا۔ اور اس کی کوئی فکر نہیں کہ یہ ہم گناہ کے کام کر رہے ہیں۔ نمازیں بھی ہو رہی ہیں، اور یہ خیانت بھی ہو رہی ہے۔ یہ سب کام امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں، اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔

مجلس کی گفتگو امانت ہے

ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) طبقات ابن سعد (۲۰/۴)

((اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ))(۱)

یعنی مجلسوں میں جو بات کی گئی ہو، وہ بھی سننے والوں کے پاس امانت ہے۔ مثلاً دو تین آدمیوں نے آپس میں مل کر باتیں کیں۔ بے تکلفی میں باہم اعتماد کی فضا میں راز کی باتیں کرلیں۔ اب ان باتوں کو ان کی اجازت کے بغیر دوسروں تک پہنچانا بھی خیانت کے اندر داخل ہے۔ اور ناجائز ہے۔ جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اِدھر کی بات اُدھر لگادی۔ اور اُدھر کی بات اِدھر لگادی۔ یہ سارا فتنہ فساد اسی طرح پھیلتا ہے۔ البتہ اگر مجلس میں کوئی ایسی بات کہی گئی ہو جس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، مثلاً دو تین آدمیوں نے مل کر یہ سازش کی فلاں وقت پر فلاں شخص کے گھر پر حملہ کریں گے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ بات ایسی نہیں ہے جس کو چھپایا جائے، بلکہ اس شخص کو بتادیا جائے کہ تمہارے خلاف یہ سازش ہوئی ہے۔ لیکن جہاں اس قسم کی بات نہ ہوئی ہو وہاں کسی کے راز کی بات دوسروں تک پہنچانا ناجائز ہے۔

راز کی باتیں امانت ہیں

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ راز کی بات مجلس میں ایک شخص نے سنی، اس نے جاکر دوسرے کو یہ تاکید کرکے سنادی کہ یہ راز کی بات بتارہا ہوں۔ تمہیں تو بتادی، لیکن کسی اور سے مت کہنا۔ اب وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ تاکید کرکے میں نے راز کا تحفظ کرلیا کہ آگے یہ بات کسی اور کو مت بتانا۔ اب وہ سننے والا آگے تیسرے شخص کو وہ راز کی بات اس تاکید کے ساتھ بتادیتا ہے۔ کہ یہ راز کی بات ہے، تم آگے کسی اور سے مت کہنا۔ یہ سلسلہ آگے اسی طرح چلتا رہتا ہے، اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم نے امانت کا خیال کرلیا۔ حالانکہ جب وہ بات راز تھی، اور دوسروں سے کہنے کو منع کیا گیا تھا تو پھر اس تاکید کے ساتھ کہنا بھی امانت کے خلاف ہے۔ یہ خیانت ہے اور جائز نہیں۔

یہ وہ چیزیں ہیں جنہوں نے ہمارے معاشرے میں فساد برپا کر رکھا ہے۔ آپ غور کرکے دیکھیں گے تو یہی نظر آئے گا کہ فساد اسی طرح برپا ہوتے ہیں کہ فلاں شخص تو آپ کے بارے میں یہ کہہ رہا تھا، اب اس کے دل میں اس کے خلاف غصہ اور بغض اور عناد پیدا ہوگیا۔ اس لئے اس لگائی بجھائی سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔

ٹیلیفون پر دوسروں کی باتیں سننا حرام ہے

دو آدمی آپ سے علیحدہ ہوکر آپس میں سرگوشی کررہے ہیں۔ اور آپ چھپ کر ان کی باتوں کو

(۱) سنن أبي داود، کتاب الأدب، باب في نقل الحديث، رقم: ۴۲۲۶، مسند أحمد، رقم: ۱۴۱۶۶

سننے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ میں ان کی باتیں سن لوں کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ امانت میں خیانت ہے۔

یا ٹیلیفون کرتے وقت کسی کی لائن آپ کے فون سے مل گئی۔ اب آپ نے ان کی باتوں کو سننا شروع کر دیا۔ یہ سب امانت میں خیانت ہے، تجسس میں داخل ہے، اور ناجائز ہے، حالانکہ آج اس پر بڑا فخر کیا جاتا ہے۔ مجھے فلاں کا راز معلوم ہو گیا۔ اس کو بڑا ہنر اور بڑا فن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ فرما رہے ہیں کہ یہ خیانت کے اندر داخل ہے، اور ناجائز ہے۔

خلاصہ

غرض یہ ہے کہ امانت میں خیانت کے مصداق اتنے ہیں کہ شاید زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں ہمیں امانت کا حکم نہ ہو۔ اور خیانت سے ہمیں روکا نہ گیا ہو۔ یہ ساری باتیں جو میں نے ذکر کی ہیں، یہ سب امانت کے خلاف ہیں اور نفاق کے اندر داخل ہیں۔ لہٰذا یہ حدیث ہر وقت مستحضر رہنی چاہئے کہ تین چیزیں منافق کی علامت ہیں۔ بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، اور اگر اس کے پاس کوئی امانت آئے تو اس میں خیانت کرے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔ یہ سب دین کا حصہ ہے۔ ہم لوگوں نے دین کو بہت محدود کر رکھا ہے، اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان باتوں کو فراموش کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمارے دلوں میں فکر پیدا فرمادے۔ اور اس کی توفیق عطا فرمادے کہ نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے اس طریقے پر ہم عمل کریں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

وعدہ خلافی اور اس کی مروجہ صورتیں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:
((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) فِيْ رِوَايَةٍ ((وَإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ))(۱)

پچھلے جمعہ کو اس حدیث میں بیان کی گئیں تین علامات میں سے ایک یعنی جھوٹ پر الحمدللہ قدرے تفصیل کے ساتھ بیان ہوگیا تھا۔ منافق کی دوسری علامت جو نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمائی، وہ یہ ہے:

((وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ))

کہ جب وہ وعدہ کرے، تو اس کی خلاف ورزی کرے۔ مؤمن کا کام یہ ہے کہ جب وہ وعدہ کرتا ہے تو اس کو نبھاتا ہے، اس کو پورا کرتا ہے۔ چنانچہ شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی وعدہ کیا، اور بعد میں اس وعدہ کو پورا کرنے میں کوئی شدید عذر پیش آیا، یا کوئی رکاوٹ پیش آگئی جس کی وجہ سے اس کے لئے اس وعدہ کو پورا کرنا ممکن نہیں رہا، تو اس صورت یہ وعدہ کرنے والا شخص اس دوسرے شخص سے بتادے کہ اب میرے لئے اس وعدہ کو پورا کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس لئے میں اس وعدہ سے دست بردار ہوتا ہوں۔ مثلاً ایک شخص نے وعدہ کیا کہ میں تم کو فلاں تاریخ کو ایک ہزار روپے دوں گا، بعد میں اس وعدہ کرنے والے کے پاس پیسے ختم ہوگئے۔ اور اب وہ اس قابل نہیں رہا کہ اس کی مدد کرسکے، اور اس کو ایک ہزار روپے دے سکے، تو اس صورت میں اس کو بتادے کہ میں نے ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اب میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اس وعدے کو پورا کرسکوں۔

☆ اصلاحی خطبات (۳/۱۵۸ تا ۱۷۱)، ۲۰ دسمبر ۱۹۹۱ء، بروز جمعہ، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب علامة المنافق، رقم: ۳۲، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان خصال المنافق، رقم: ۸۹، سنن الترمذي، كتاب الإيمان عن رسول الله، باب ما جاء في علامة المنافق، رقم: ۲۵۵۵، مسند أحمد، رقم: ۸۳۳۱

لیکن جب تک اس وعدہ کو پورا کرنے کی قدرت ہے، اور کوئی شرعی عذر نہیں ہے، اس وقت تک اس وعدہ کو پورا کرے۔

''منگنی'' ایک وعدہ ہے

مثلاً کسی شخص نے منگنی کرلی، اور کسی سے رشتہ کرنے کے بارے میں طے کرلیا تو یہ منگنی ایک وعدہ ہے۔ اس لئے حتی الامکان اس کو نبھانا چاہئے۔ لیکن اگر کوئی عذر پیش آجائے، مثلاً منگنی کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان دونوں کے درمیان اتفاق و اتحاد قائم نہیں رہے گا، طبیعتوں اور مزاجوں میں فرق ہے۔ اور کچھ حالات سامنے آئے جو پہلے معلوم نہیں تھے۔ اس صورت میں اس کو بتادے کہ ہم نے آپ سے شادی کا وعدہ اور منگنی کی تھی۔ لیکن اب فلاں عذر کی وجہ سے ہم اس کو پورا نہیں کرسکتے۔ لیکن جب تک عذر نہ ہو، اس وقت تک وعدہ کو نبھانا اور اس وعدہ کو پورا کرنا شرعاً واجب ہے۔ اور اگر وعدہ پورا نہیں کرے گا تو اس حدیث کا مصداق بن جائے گا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ابوجہل سے وعدہ

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ایسے وعدوں کو نبھایا کہ اللہ اکبر آج اس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار ہیں۔ جب یہ اور ان کے والد یمان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، تو مسلمان ہونے کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ آرہے تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات ابوجہل اور اس کے لشکر سے ہوگئی۔ اس وقت ابوجہل اپنے لشکر کے ساتھ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے جارہا تھا۔ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ملاقات ابوجہل سے ہوئی تو اس نے پکڑلیا۔ اور پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ جارہے ہیں۔ ابوجہل نے کہا کہ پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، اس لئے کہ تم مدینہ جاکر ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لوگے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد تو صرف حضور کی ملاقات اور زیارت ہے۔ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ ابوجہل نے کہا کہ اچھا ہم سے وعدہ کرو کہ وہاں جاکر صرف ملاقات کروگے، لیکن جنگ میں حصہ نہیں لوگے۔ انہوں نے وعدہ کرلیا۔ چنانچہ ابوجہل نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، اس وقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام کے ساتھ غزوۂ بدر کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہوچکے تھے، اور راستے میں ملاقات ہوگئی۔

حق و باطل کا پہلا معرکہ ''غزوۂ بدر''

اب اندازہ لگائیے کہ اسلام کا پہلا حق و باطل کا معرکہ (غزوۂ بدر) ہو رہا ہے۔ اور یہ وہ معرکہ ہے جس کو قرآن کریم نے ''یوم الفرقان'' فرمایا، یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والا معرکہ، وہ معرکہ ہو رہا ہے جس میں جو شخص شامل ہو گیا، وہ ''بدری'' کہلایا، اور صحابہ کرام میں ''بدری'' صحابہ کا بہت اُونچا مقام ہے۔ اور ''اسمائے بدریین'' بطور وظیفے کے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے نام پڑھنے سے اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں۔ وہ ''بدریین'' جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے یہ پیشین گوئی فرما دی کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اہلِ بدر کی، جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا، بخشش فرما دی ہے، ایسا معرکہ ہونے والا ہے۔

گردن پر تلوار رکھ کر لیا جانے والا وعدہ

بہر حال! جب حضورِ اقدس ﷺ سے ملاقات ہوئی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سارا قصہ سنا دیا کہ اس طرح راستے میں ہمیں ابو جہل نے پکڑ لیا تھا۔ اور ہم نے یہ وعدہ کر کے بمشکل جان چھڑائی کہ ہم لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے، اور پھر درخواست کی کہ یا رسول اللہ! یہ بدر کا معرکہ ہونے والا ہے، آپ اس میں تشریف لے جا رہے ہیں۔ ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں، اور جہاں تک اس وعدہ کا تعلق ہے، وہ تو انہوں نے ہماری گردن پر تلوار رکھ کر ہم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، اور اگر ہم وعدہ نہ کرتے تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لئے ہم نے وعدہ کر لیا، لیکن آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم اس جنگ میں حصہ لے لیں، اور فضیلت اور سعادت ہمیں حاصل ہو جائے۔ (۱)

تم وعدہ کر کے زبان دے کر آئے ہو

لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم وعدہ کر کے آئے ہو، اور زبان دے کر آئے ہو، اور اسی شرط پر تمہیں رہا کیا گیا ہے کہ تم وہاں جا کر محمد رسول اللہ ﷺ کی زیارت کرو گے، لیکن ان کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لو گے، اس لئے میں تم کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا

یہ وہ مواقع ہیں، جہاں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے وعدے کا کتنا پاس کرتا ہے۔ اگر ہم جیسا آدمی ہوتا تو ہزار تاویلیں کر لیتا، مثلاً یہ تاویل کر لیتا کہ ان کے ساتھ جو وعدہ کیا

---

(۱) الإصابة (۱/۳۱۶)

تھا، وہ سچے دل سے تو نہیں کیا تھا، وہ تو ہم سے زبردستی لیا گیا تھا۔ اور خدا جانے کیا کیا تاویلیں ہمارے ذہنوں میں آجاتیں۔ یا یہ تاویل کر لیتا کہ یہ حالتِ عذر ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا ہے اور کفر کا مقابلہ کرنا ہے۔ جبکہ وہاں ایک ایک آدمی کی بڑی قیمت ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے لشکر میں صرف ۳۱۳ نہتے افراد ہیں۔ جن کے پاس صرف ۷۰ اونٹ، ۲ گھوڑے اور ۸ تلواریں ہیں۔ باقی افراد میں سے کسی نے لاٹھی اُٹھالی ہے، کسی نے ڈنڈے، اور کسی نے پتھر اُٹھا لیے ہیں۔ یہ لشکر ایک ہزار مسلح سورماؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے جا رہا ہے، اس لئے ایک ایک آدمی کی جان قیمتی ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو بات کہہ دی گئی ہے، اور جو وعدہ کر لیا گیا ہے، اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

جہاد کا مقصد، حق کی سربلندی

یہ جہاد کوئی ملک حاصل کرنے کے لئے نہیں ہو رہا ہے، کوئی اقتدار حاصل کرنے کے لئے نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ یہ جہاد حق کی سربلندی کے لئے ہو رہا ہے۔ اور حق کو پامال کر کے جہاد کیا جائے؟ گناہ کا ارتکاب کر کے اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کیا جائے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ آج ہم لوگوں کی یہ ساری کوششیں بیکار جا رہی ہیں، اور ساری کوششیں بے اثر ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کر کے اسلام کی تبلیغ کریں، گناہ کر کے اسلام کو نافذ کریں، ہمارے دل و دماغ پر ہر وقت ہزاروں تاویلیں مسلط رہتی ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت کا یہ تقاضا ہے، چلو، شریعت کے اس حکم کو نظر انداز کر دو، اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت اس کام کے کرنے میں ہے۔ چلو، یہ کام کر لو۔

یہ ہے وعدہ کا ایفاء

لیکن وہاں تو ایک ہی مقصود تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہونا، نہ مال مقصود ہے، نہ فتح مقصود ہے۔ نہ بہادر کہلانا مقصود ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں ہے کہ جو وعدہ کر لیا گیا ہے، اس کو نبھاؤ، چنانچہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہما دونوں کو غزوۂ بدر جیسی فضیلت سے محروم رکھا گیا، اس لئے کہ یہ دونوں جنگ میں شرکت نہ کرنے پر زبان دے کر آئے تھے۔ یہ ہے وعدہ کا ایفاء۔

اگر آج اس کی مثال تلاش کریں تو اس دنیا میں ایسی مثالیں کہاں ملیں گی؟ ہاں! محمد رسول اللہ ﷺ کے غلاموں میں ایسی مثالیں مل جائیں گی۔ انہوں نے یہ مثالیں قائم کیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، ان صحابہ کرام میں سے ہیں جن کے بارے میں لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا غلط

قسم کے پروپیگنڈے کیے ہیں، اللہ تعالیٰ بچائے، لوگ ان کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ ان کا ایک قصہ سن لیجئے۔

فتح حاصل کرنے کے لئے جنگی تدبیر

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ شام میں تھے۔ اس لئے روم کی حکومت سے ان کی ہر وقت جنگ رہتی تھی۔ ان کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اور روم اس وقت کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی اور بڑی عظیم الشان عالمی طاقت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کرلیا، اور ایک تاریخ متعین کرلی کہ اس تاریخ تک ہم ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے۔ ابھی جنگ بندی کے معاہدے کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ جنگ بندی کی مدت تو درست ہے لیکن اس مدت کے اندر میں اپنی فوجیں رومیوں کی سرحد پر لے جاکر ڈال دوں، تاکہ جس وقت جنگ بندی کی مدت ختم ہو، اس وقت میں فوراً حملہ کردوں، اس لئے کہ دشمن کے ذہن میں تو یہ ہوگا کہ جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگی، پھر کہیں جاکر لشکر روانہ ہوگا، اور یہاں آنے میں وقت لگے گا، اس لئے معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی فوراً مسلمانوں کا لشکر حملہ آور نہیں ہوگا، اس لئے وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اگر میں اپنا لشکر سرحد پر ڈال دوں گا، اور مدت ختم ہوتے ہی فوراً حملہ کردوں گا تو جلدی فتح حاصل ہوجائے گی۔

یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندران کے علاقے میں ڈال دیا، اور حملہ کے لئے تیار ہوگئے۔ اور جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدے کی آخری تاریخ کا سورج غروب ہوا، فوراً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ چنانچہ جب لشکر نے پیش قدمی کی تو یہ چال بڑی کامیاب ثابت ہوئی، اس لئے کہ وہ لوگ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر شہر کے شہر، بستیاں کی بستیاں فتح کرتا ہوا چلا جارہا تھا۔ اب فتح کے نشے کے اندر پورا لشکر آگے بڑھتا جارہا تھا کہ اچانک دیکھا کہ اب پیچھے سے ایک گھوڑا سوار دوڑتا چلا آرہا ہے۔ اس کو دیکھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے انتظار میں رک گئے کہ شاید یہ امیر المؤمنین کا کوئی نیا پیغام لے کر آیا ہو۔ جب وہ گھوڑا سوار قریب آیا تو اس نے آوازیں دینا شروع کردیں

"اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، قِفُوْا عِبَادَ اللّٰہِ قِفُوْا عِبَادَ اللّٰہِ"

اللہ کے بندو، ٹھہر جاؤ، اللہ کے بندو، ٹھہر جاؤ۔ جب وہ اور قریب آیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

نے دیکھا کہ وہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا:

"وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ، وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ"

مؤمن کا شیوہ وفاداری ہے، غداری نہیں ہے، عہد شکنی نہیں ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے، میں نے تو اس وقت حملہ کیا ہے جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگئی تھی۔ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگرچہ جنگ بندی کی مدت ختم ہوگئی تھی، لیکن آپ نے اپنی فوجیں جنگ بندی کی مدت کے دوران ہی سرحد پر ڈال دی تھیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر بھی داخل کردیا تھا، اور یہ جنگ بندی کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ اور میں نے اپنے ان کانوں سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

((مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَحِلَّنَّهُ وَلَا يَشُدَّنَّهُ إِلَى أَنْ يَّمْضِيَ أَجَلٌ لَهُ أَوْ يَنْبِذَ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ))(۱)

یعنی جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو، تو اس وقت تک عہد نہ کھولے اور نہ باندھے جب تک کہ اس کی مدت نہ گزر جائے، یا ان کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان نہ کردے کہ ہم نے وہ عہد ختم کردیا۔ لہٰذا مدت گزرنے سے پہلے یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کیے بغیر ان کے علاقے کے پاس لے جاکر فوجوں کو ڈال دینا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق آپ کے لئے جائز نہیں تھا۔

سارا مفتوحہ علاقہ واپس کردیا

اب آپ اندازہ لگایئے کہ ایک فاتح لشکر ہے، جو دشمن کا علاقہ فتح کرتا ہوا جارہا ہے، اور بہت بڑا علاقہ فتح کرچکا ہے، اور فتح کے نشے میں چور ہے۔ لیکن جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کان میں پڑا کہ اپنے عہد کی پابندی مسلمان کے ذمے لازم ہے، اسی وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ جتنا علاقہ فتح کیا ہے، وہ سب واپس کردو، چنانچہ پورا علاقہ واپس کردیا اور اپنی سرحد میں دوبارہ واپس آگئے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی کہ اس نے صرف عہد شکنی کی بناء پر اپنا مفتوحہ علاقہ اس طرح واپس کردیا ہو۔ لیکن یہاں پر چونکہ کوئی زمین کا حصہ پیشِ نظر نہیں تھا، کوئی اقتدار اور سلطنت مقصود نہیں تھی، بلکہ مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا، اس لئے جب اللہ تعالیٰ کا حکم

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب السیر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی الغدر، رقم: ۱۵۰٦، سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، ۔۔۔ مسند احمد، مسند الشامیین، رقم: ۱٦٤۰

معلوم ہوگیا کہ وعدہ کی خلاف ورزی درست نہیں ہے، اور چونکہ یہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا تھوڑا سا شائبہ پیدا ہو رہا تھا، اس لئے واپس لوٹ گئے۔ یہ ہے وعدہ کہ جب زبان سے بات نکل گئی تو اب اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور معاہدہ کی پاسداری

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت وہاں پر جو عیسائی اور یہودی تھے، ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے، تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کے معاوضے میں تم ہمیں جزیہ ادا کرو گے ''جزیہ'' ایک ٹیکس ہوتا ہے جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے' چنانچہ جب معاہدہ ہوگیا تو وہ لوگ ہر سال جزیہ ادا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کا دوسرے دشمنوں کے ساتھ معرکہ پیش آگیا، جس کے نتیجے میں وہ فوج جو بیت المقدس میں متعین تھی ان کی ضرورت پیش آئی۔ کسی نے یہ مشورہ دیا کہ اگر فوج کی کمی ہے تو بیت المقدس میں فوجیں بہت زیادہ ہیں، اس لئے وہاں سے ان کو محاذ پر بھیج دیا جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ مشورہ اور تجویز بہت اچھی ہے، لہٰذا فوجیں وہاں سے اُٹھا کر محاذ پر بھیج دو، لیکن اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کرو، وہ یہ کہ بیت المقدس کے جتنے عیسائی اور یہودی ہیں، ان سب کو ایک جگہ جمع کرو، اور ان سے کہو کہ ہم نے آپ کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا، اور یہ معاہدہ کیا تھا کہ آپ کے جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کام کے لئے ہم نے وہاں فوج ڈالی ہوئی تھی، لیکن اب ہمیں دوسری جگہ فوج کی ضرورت پیش آگئی ہے، اس لئے ہم آپ کی حفاظت نہیں کرسکتے، لہٰذا اس سال آپ نے ہمیں جو جزیہ بطور ٹیکس ادا کیا ہے، وہ ہم آپ کو واپس کر رہے ہیں، اور اس کے بعد ہم اپنی فوجوں کو یہاں سے لے جائیں گے۔ اور اب آپ لوگ اپنی حفاظت کا انتظام خود کریں۔

یہ مثالیں ہیں اور میں کسی تردید کے خوف کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی مثال پیش نہیں کرسکتی کہ جس نے اپنے مخالف مذہب والوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کیا ہو۔

وعدہ خلافی کی مروجہ صورتیں

بہرحال، منافق کی دوسری علامت جو اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے، وہ یہ کہ وعدہ کی خلاف ورزی اور وعدہ کو توڑنا ایک منافق کی نشانی ہے۔ اس سے ہر مسلمان کو بچنا چاہئے۔ لیکن جیسے میں نے جھوٹ کے بارے میں پچھلے جمعہ کو عرض کیا تھا کہ جھوٹ کی بہت سی صورتیں

ایسی ہیں، جن کو ہم اور آپ نے بالکل شیرِ مادر سمجھ لیا ہے، اور ان کو جھوٹ کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔ ان کو جھوٹ سمجھتے ہی نہیں ہیں، اسی طرح وعدہ خلافی کی بھی بعض صورتیں وہ ہیں، جن کو وعدہ خلافی کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔ چنانچہ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ وعدہ خلافی اچھی چیز ہے؟ تو جواب میں وہ یہی کہے گا کہ یہ تو بہت بری چیز اور گناہ ہے، لیکن عملی زندگی میں جب موقع آتا ہے تو اس وقت وہ وعدہ خلافی کر لیتا ہے۔ اور اس کو وعدہ خلافی سمجھتا ہی نہیں کہ یہ وعدہ خلافی ہے۔

ملکی قانون کی پابندی کرنا واجب ہے

مثلاً ایک بات عرض کرتا ہوں، جس کی طرف عام لوگوں کو توجہ نہیں ہے، اور اس کو دین کا معاملہ نہیں سمجھتے، میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''وعدہ'' صرف زبانی نہیں ہوتا، بلکہ وعدہ عملی بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص ایک ملک میں بطور باشندے کے رہتا ہے تو وہ شخص عملاً اس حکومت سے وعدہ کرتا ہے کہ میں آپ کے ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا، لہٰذا اب اس شخص پر اس وعدے کی پابندی کرنا واجب ہے، جب تک اس ملک کا قانون اس کو کسی گناہ کرنے پر مجبور نہ کرے، اس لئے کہ اگر کوئی قانون اس کو گناہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے تو پھر اس قانون پر عمل کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ اس کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ کا صاف ارشاد ہے:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ))

''یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں''(۱)

لہٰذا ایسے قانون کی پابندی نہ صرف یہ کہ واجب نہیں، بلکہ جائز بھی نہیں، لیکن اگر کوئی قانون ایسا ہے جو آپ کو گناہ اور معصیت پر مجبور نہیں کر رہا ہے، اس قانون کی پابندی اس لئے واجب ہے کہ آپ نے عملاً اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ میں اس ملک کے قانون کی پابندی کروں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قانون

اس کی مثال میں حضرت والد صاحب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ملک میں رہتے تھے، اور نبی بننے سے پہلے ایک قبطی کو مکا مار کر قتل کر دیا تھا، جس کا واقعہ مشہور ہے، اور قرآن کریم نے بھی اس واقعہ کو ذکر کیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قتل پر استغفار کیا کرتے تھے، اور فرماتے: ﴿وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْبٌ﴾(۲)

(۱) مسند أحمد، رقم: ۱۰۴۱ (۲) الشعراء: ۱۴

یعنی میرے اُوپر ان کا ایک گناہ ہے، اور میں نے ان کا ایک جرم کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو جرم اور گناہ قرار دیتے تھے اور اس پر استغفار فرمایا کرتے تھے، اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ قتل جان بوجھ کر نہیں کیا تھا، بلکہ ایک مظلوم کی مدد فرمائی تھی اور یہ اندازہ نہیں تھا کہ مکا مارنے سے وہ مر جائے گا اس لئے یہ حقیقۃً گناہ نہیں تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصمت کے منافی بھی نہیں تھا، لیکن چونکہ صورت گناہ کی سی تھی، اس لئے آپ نے اسے گناہ سے تعبیر فرمایا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قبطی جس کو موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا تھا، وہ تو کافر تھا، اور کافر بھی حربی تھا، لہٰذا اگر اسے جان بوجھ کر بھی قتل کرتے تو اس حربی کافر کو قتل کرنے میں کیا گناہ ہوا؟ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ اس لئے گناہ ہوا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے شہر میں رہ رہے ہیں تو عملاً اس بات کا وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم آپ کے ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، اور ان کا قانون یہ تھا کہ کسی کو قتل کرنا جائز نہیں، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو قتل کیا، وہ اس قانون کی خلاف ورزی میں کیا، لہٰذا ہر حکومت کا ہر شہری، چاہے حکومت مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلم حکومت ہو، عملاً اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس ملک کے قانون کی پابندی کرے گا، جب تک وہ قانون کسی گناہ پر مجبور نہ کرے۔

''ویزہ'' لینا ایک عملی وعدہ ہے

اسی طرح جب آپ ویزہ لے کر دوسرے ملک جاتے ہیں۔ چاہے وہ غیر مسلم ملک ہو۔ مثلاً ہندوستان، امریکہ یا یورپ ویزہ لے کر چلے گئے، یہ ویزہ لینا عملاً ایک وعدہ ہے کہ ہم حتی الامکان اس ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، جب تک وہ قانون کسی گناہ پر مجبور نہ کرے، ہاں اگر وہ قانون گناہ پر مجبور کرے تو پھر اس قانون کی پابندی جائز نہیں۔ لہٰذا جو قوانین ایسے ہیں، جو انسان کو کسی گناہ پر مجبور نہیں کرتے، یا نا قابلِ برداشت ظلم کا سبب نہیں بنتے، ان قوانین کی پابندی بھی وعدہ کی پابندی میں داخل ہے۔

ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی گناہ ہے

مثلاً ٹریفک کا قانون ہے کہ دائیں طرف چلو، یا بائیں طرف چلو، یا یہ قانون ہے کہ جب سگنل کی لال بتی جلے تو رک جاؤ، اور جب سبز بتی جلے تو چل پڑو، اب ایک شہری ہونے کی حیثیت سے آپ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ ان قوانین کی پابندی کروں گا، لہٰذا اگر کوئی شخص ان قوانین کی پابندی نہ کرے، تو یہ وعدہ خلافی ہے۔ اور گناہ ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کر لی تو اس میں گناہ کی کیا بات ہے؟ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آدمی اپنے کو بڑا سیانا اور ہوشیار جتانے

کے لئے خلاف ورزی بھی کر رہا ہے، اور قانون کی گرفت میں بھی نہیں آ رہا ہے۔
یاد رکھئے، یہ کئی اعتبار سے گناہ ہے، ایک تو اس حیثیت سے گناہ ہے کہ یہ وعدہ کی خلاف ورزی ہے، دوسرے اس حیثیت سے بھی گناہ ہے یہ قوانین تو اس لئے بنائے گئے ہیں تاکہ نظم وضبط پیدا ہو، اور اس کے ذریعہ سے ایک دوسرے کو نقصان اور تکلیف پہنچانے کے راستے بند ہوں، لہٰذا اگر آپ نے قانون کی خلاف ورزی کی، اور اس سے کسی کو نقصان پہنچ گیا، تو اس نقصان کی دنیا و آخرت کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے

یہ سب باتیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان باتوں کا دین سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو دنیاداری کی باتیں ہیں۔ ان کی پابندی کی کیا ضرورت ہے؟ خوب سمجھ لیجئے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا دین ہے، جو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہے، اور دین داری صرف ایک شعبے کی حد تک محدود نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو قانون کسی گناہ پر مجبور کرے، اس کی تو کسی حال میں بھی اطاعت جائز نہیں، اور جو قانون ناقابل برداشت ظلم کرے، اس کی بھی پابندی نہیں کرنی ہے، لیکن اس کے علاوہ جتنے قوانین ہیں ان کی پابندی شرعاً بھی ہمارے ذمے واجب ہے، اگر ان کی پابندی نہیں کریں گے تو وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔

خلاصہ

لہٰذا بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم وعدہ خلافی سمجھتے ہیں۔ اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم وعدہ خلافی نہیں سمجھتے، مگر وہ وعدہ خلافی اور گناہ کے اندر داخل ہیں۔ ان سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔ دین ہماری زندگی کے ہر شعبے کے اندر داخل ہے۔ ان تمام چیزوں کا لحاظ نہ کرنا دین کے خلاف ہے۔

منافق کی دو علامتوں کا بیان ہو گیا، تیسری علامت ہے "امانت میں خیانت" اس کا معاملہ بھی ایسا ہے کہ اس کی اہمیت اور فضیلت تو اپنی جگہ ہے، مگر بیشمار کام ایسے ہیں جو "خیانت" کے اندر داخل ہوتے ہیں، لیکن ہم ان کو خیانت نہیں سمجھتے۔ اب چونکہ وقت ختم ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمائی تو اگلے جمعہ اس کے بارے عرض کروں گا۔ جو باتیں ہم نے کہیں اور سنیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

طنز اور طعنہ سے بچئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيءِ))(۱)

پچھلے چند جمعوں سے زبان کے گناہوں کا بیان چل رہا ہے، زبان کے اِن گناہوں کو صوفیاء کرام ''آفاتِ لسانی'' سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی زبان کی آفتیں۔ ''آفت'' کے معنی ہیں ''مصیبت''

ہم اور آپ ظاہری اعتبار سے مصیبت اس کو سمجھتے ہیں جیسے کوئی بیماری آ جائے، یا جان یا مال کو نقصان پہنچ جائے، یا اور کوئی دنیاوی ضرر لاحق ہو جائے، تو ہم اس کو آفت اور مصیبت سمجھتے ہیں۔ لیکن جن اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ حقیقت شناس نگاہ عطا فرماتے ہیں، وہ یہ فرماتے ہیں کہ حقیقی آفت وہ ہے جس کے ذریعے انسان کے دین کو ضرر لاحق ہو جائے۔

دنیا غم اور خوشی سے مرکب ہے

اگر کسی کو کوئی دنیاوی ضرر لاحق ہو گیا تو وہ اتنا تشویش ناک نہیں، کیونکہ دنیا میں دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، کبھی فائدہ اور کبھی نقصان، کبھی خوشی اور کبھی غم، نہ تو دنیا کا غم پائیدار ہے اور نہ خوشی پائیدار ہے۔ اگر کسی کو کوئی غم یا پریشانی آئی ہے تو وہ ان شاء اللہ چند دنوں کے بعد رفع ہو جائے گی اور انسان اس تکلیف اور غم کو بھول جائے گا، لیکن خدا نہ کرے اگر دین کو کوئی مصیبت لاحق ہو جائے تو یہ ناقابلِ تلافی ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۱۸ تا ۱۸۴/۱۱)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في اللعنة، رقم: ۱۹۰۰، مسند أحمد، رقم: ۳٦٤٦

''ہمارے دین پر مصیبت واقع نہ ہو''

حضورِ اقدس ﷺ نے بھی کیا کیا عجیب وغریب دعائیں تلقین فرمائی ہیں، آدمی اس کے ایک ایک لفظ پر قربان ہو جائے۔ چنانچہ ایک دعا کے اندر آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ لَاتَجْعَلْ مُصِیبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا))

''اے اللہ! کوئی مصیبت ہمارے دین پر واقع نہ ہو''(۱)

اس لئے کہ جب انسان اس دنیا میں آیا ہے تو اس کو کسی نہ کسی مصیبت سے سابقہ پیش آنا ہی ہے، کوئی بڑے سے بڑا بادشاہ ہو یا مالدار ہو یا صاحبِ اقتدار ہو، کوئی بھی ایسا نہیں ملے گا جس کو کوئی نہ کوئی مصیبت پیش نہ آئی ہو، اس دنیا میں مصیبت تو ضرور پیش آئے گی، لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ یہ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! جو مصیبت پیش آئے وہ دنیا کی مصیبت ہو، دین کی مصیبت پیش نہ آئے۔

پھر آگے ارشاد فرمایا:

((وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَامَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَاغَایَۃَ رَغْبَتِنَا))(۲)

''اے اللہ! ہماری ساری سوچ بچار دنیا ہی کے بارے میں نہ بنایئے کہ ہر وقت دنیا ہی کے بارے میں سوچتے رہیں اور آخرت کا کچھ خیال نہ ہو۔ اور اے اللہ! نہ اس دنیا کو ایسا بنایئے کہ ہمارا سارا علم اس دنیا ہی کے بارے میں ہو اور دین کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہ ہو۔ اور نہ ہماری ساری خواہشات کا مرکز اس دنیا کو بنایئے کہ ہماری ساری خواہشات اور ہماری ساری اُمنگیں اس دنیا ہی سے متعلق ہوں اور آخرت کے بارے میں ہمارے دل میں کوئی خواہش اور اُمنگ نہ ہو''

تمام گناہ آفات ہیں

لہٰذا حقیقی مصیبت وہ ہے جو انسان کے دین کو لاحق ہو۔ اور جتنے بھی گناہ ہیں وہ حقیقت میں آفت اور مصیبت ہیں، اگرچہ ظاہری اعتبار سے اس گناہ کے کرنے میں لذت آتی ہے، لیکن حقیقت میں وہ لذت دنیا میں بھی تباہی لانے والی ہے اور آخرت میں بھی تباہی لانے والی ہے۔ اس وجہ سے صوفیاء کرام گناہوں کو ''آفات'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ سب آفتیں ہیں۔ اور زبان کے گناہوں کو ''آفات اللسان'' کہتے ہیں، یعنی زبان پر آنے والی آفتیں اور مصیبتیں، جن کے ذریعہ انسان مصیبت

(۱) روضۃ المحدثین، رقم:۳۳۱۶ (۴۱/۸)، الجامع الصغیر وزیادتہ، رقم:۲۱۴۸ (۲۱۵/۱)

(۲) روضۃ المحدثین، رقم:۳۳۱۶ (۴۱/۸)، الجامع الصغیر وزیادتہ، رقم:۲۱۴۸ (۲۱۵/۱)

کا شکار ہوتا ہے۔ ان آفتوں میں سے ایک آفت یعنی ''غیبت'' کا بیان ہو چکا۔

مؤمن یہ چار کام نہیں کرتا

جو حدیث میں نے تلاوت کی ہے، اس حدیث میں بعض دوسری آفتوں کو بیان فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''مؤمن طعنہ دینے والا نہیں ہوتا، لعنت کرنے والا نہیں ہوتا، فحش کلامی کرنے والا نہیں ہوتا اور بد کلامی کرنے والا نہیں ہوتا''

یعنی مؤمن کا کام یہ ہے کہ اس کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جو طعنہ میں شامل ہو یا لعنت میں شامل ہو یا فاشی میں شامل وہ یا بد گوئی میں شامل ہو۔ اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار چیزیں بیان فرمائیں، ان چار چیزوں کا تعلق انسان کی زبان سے ہے۔

طعنہ کیا چیز ہے؟

اس حدیث میں پہلی چیز یہ بیان فرمائی کہ ''مؤمن طعنہ دینے والا نہیں ہوتا''

طعنہ دینا یہ ہے کہ کسی شخص کے منہ پر لپیٹ کر ایسی بات کرنا جس سے اس کی دل آزاری ہو۔ دیکھئے! ایک صورت یہ ہے کہ انسان دوسرے کو براہِ راست یہ کہہ دے کہ تمہارے اندر یہ برائی ہے، لیکن ''طعنہ'' اسے کہتے ہیں کہ گفتگو کسی اور موضوع پر ہو رہی ہے، مگر درمیان میں آپ نے ایک فقرہ اور ایک لفظ بول دیا، اور اس لفظ کو بولنے سے اس شخص پر طنز کرنا اور طعنہ دینا اور اعتراض کرنا مقصود تھا اور اس ''طنز اور طعنہ'' کے نتیجے میں اس کی دل آزاری ہوئی، یہ ''طنز اور طعنہ'' بہت سخت گناہ ہے۔ اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرما دیا کہ مؤمن کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو طعنہ دے۔

زبان سے دل زخمی ہو جاتے ہیں

عربی زبان میں ''طعنہ'' کے معنی ہے ''کسی کو نیزہ مارنا'' اس لفظ کے اندر اس طرف اشارہ ہے کہ ''طعنہ دینا'' ایسا ہے جیسے دوسرے کو نیزہ مارنا۔ عربی کا ایک مشہور شعر ہے۔

جِرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامٌ
وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

''نیزے کے زخم تو بھر جاتے ہیں، لیکن زبان کے لگائے ہوئے زخم نہیں بھرتے''(۱)

(۱) شرح كتاب الأمثال (۱/۲۳)، تاج العروس من جواهر القاموس (۱/۷۰۶۷)

اس لئے کہ جب دوسرے کے لئے "طعنہ" کا کوئی لفظ بولا، اور اس سے اس کا دل ٹوٹا، اور اس کی دل آزاری ہوئی تو دل آزاری کا زخم نہیں بھرتا، انسان ایک مدت تک یہ بات نہیں بھولتا کہ اس نے فلاں وقت مجھے اس طرح طعنہ دیا تھا۔ لہٰذا یہ طنز کرنا، دوسرے پر اعتراض کرنا اور طعنہ دینے کے انداز میں بات کرنا یہ دوسرے کی دل آزاری ہے اور اس کی آبرو پر حملہ ہے، اور حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ عمل انسان کے ایمان کے منافی ہے۔

مؤمن کے جان و مال اور عزت کی حرمت

ایک مسلمان کی جان، اس کا مال، اس کی آبرو، یہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ان کی اتنی حرمت بیان فرمائی ہے جس کا ہم اور آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر جب حضورِ اقدس ﷺ خطبہ دے رہے تھے تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ یہ دن جس میں تم سے گفتگو کر رہا ہوں، کونسا دن ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ عرفہ کا دن ہے۔ آپ ﷺ نے دوسرا سوال کیا کہ یہ جگہ جہاں میں کھڑا ہوں، یہ کونسی جگہ ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ یہ حرم کا علاقہ ہے۔ آپ ﷺ نے پھر تیسرا سوال کیا کہ یہ مہینہ جس میں میں خطاب کر رہا ہوں، یہ کونسا مہینہ ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ یہ ذی الحجہ کا مقدس اور حرمت والا مہینہ ہے۔ پھر فرمایا کہ اے مسلمانو! تمہاری جانیں، تمہارے مال، تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں جیسے آج کا یہ دن، آج کی یہ جگہ اور آج کا یہ مہینہ حرام ہے، یعنی جو حرمت اللہ تعالیٰ نے اس مکانِ مقدس کو اور اس وقتِ مقدس کو عطا فرمائی ہے، وہی حرمت ایک مؤمن کے جان و مال اور آبرو کی ہے۔ (1)

ایسا شخص کعبہ کو ڈھانے والا ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ بیت اللہ کا طواف فرما رہے تھے، طواف کرتے ہوئے آپ ﷺ نے "کعبہ" سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے بیت اللہ! تو کتنی حرمت والا ہے، کتنے تقدس والا ہے، تو کتنا عظیم الشان ہے۔ پھر آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ اے عبداللہ! کیا دنیا میں کوئی چیز ہے جس کی حرمت اور جس کا تقدس بیت اللہ سے زیادہ ہو؟ میں نے عرض کیا کہ "اللّٰہ ورسولہ أعلم"، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ متعین جواب تھا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ کونسی چیز اس سے زیادہ حرمت والی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں ایک چیز بتاتا ہوں جس کی حرمت اس بیت اللہ کی حرمت سے بھی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب الخطبة أیام منی، رقم: ۱۶۲۳، مسند أحمد، رقم: ۱۹۳۲

زیادہ ہے، وہ ہے ایک مسلمان کی جان، اس کا مال، اس کی آبرو، اگر ان میں سے کسی چیز کو کوئی شخص ناحق نقصان پہنچاتا ہے تو وہ شخص کعبہ کو ڈھانے والے کی طرح ہے۔ (۱)

مؤمن کا دل تجلی گاہ ہے

کسی کو طعنہ دینا، دراصل اس کی آبرو پر حملہ کرنا اور اس کی دل آزاری کرنا ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مؤمن کا دل تو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی کام کے لئے بنایا ہے، وہ یہ کہ مؤمن کا دل صرف اللہ رب العالمین کی جلوہ گاہ ہو، اس دل میں ان کا ذکر اور ان کی یاد ہو، ان کی فکر ہو، ان کی محبت ہو، یہاں تک کہ بعض صوفیاء کرام رحمہم اللہ نے یہ فرمادیا کہ مؤمن کا دل ''عرشِ الٰہی'' ہے، یعنی مؤمن کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت کی فرودگاہ ہے، یہ دل اللہ تعالیٰ کی ''تجلی گاہ'' ہے، چاہے انسان کتنا ہی برا ہو جائے، لیکن اگر اس کے دل میں ایمان ہے تو کسی نہ کسی وقت اس میں اللہ کی محبت ضرور اُترے گی۔ انشاء اللہ! اور جب یہ دل اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے لئے بنایا ہے تو ایک مؤمن کے دل کو توڑنا، درحقیقت اللہ جل شانہ کی جلوہ گاہ پر العیاذ باللہ حملہ کرنا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ تم کسی دوسرے مسلمان کا دل توڑو۔

مسلمان کا دل رکھنا موجبِ ثواب ہے

اگر تم نے کسی کا دل رکھ لیا، اس کو تسلی دیدی، یا کوئی ایسا کلمہ کہہ دیا جس سے اس کا دل خوش ہوگیا، تو یہ عمل تمہارے لئے بہت بڑے اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اسی کو مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ

دل بدست آور کہ حج اکبر است

یعنی کسی مسلمان کے دل کو تھامنا، یہ حج اکبر کا ثواب رکھتا ہے، اور طعنہ دینا دوسرے کا دل توڑنا ہے، اور یہ گناہِ کبیرہ ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جارہا ہے کہ امر بالمعروف کرو اور نہی عن المنکر کرو، یعنی لوگوں کو اچھائی کی دعوت دو اور اگر کوئی غلط کام میں مبتلا ہے تو اس کو بتادو اور اس کو روک دو، اور دوسری طرف یہ کہا جارہا ہے کہ دوسرے مسلمان کا دل مت توڑو۔ اب دونوں کے درمیان تطبیق کس طرح کی جائے گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق اس طرح

(۱) سنن ابی ماجہ، کتاب الفتن، باب حرمة دم المؤمن ومالہ، رقم: ۳۹۲۲

ہوگی کہ جب دوسرے شخص سے کوئی بات کہو تو خیر خواہی سے کہو، تنہائی میں کہو، نرمی سے کہو، محبت سے کہو اور اس انداز میں کہو کہ جس سے اس کا دل کم سے کم ٹوٹے۔ مثلاً تنہائی میں اس سے کہے کہ بھائی! تمہارے اندر یہ بات قابلِ اصلاح ہے، تم اس کی اصلاح کرلو۔ لیکن طعنہ کے انداز میں کہنا یا لوگوں کے سامنے سر بازار اس کو رسوا کرنا، یہ چیز انسان کے دل میں گھاؤ ڈال دیتی ہے، اس لئے حرام اور گناہ ہے۔

ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْمُؤْمِنُ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ))(۱)

''ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے''

جس طرح اگر کوئی شخص اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھ لے تو چہرہ میں کوئی عیب یا داغ دھبہ ہوتا ہے وہ نظر آجاتا ہے اور انسان اس کی اصلاح کر لیتا ہے، اسی طرح ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے سامنے آنے کے بعد اس کو بتا دیتا ہے کہ تمہارے اندر فلاں بات ہے اس کو درست کرلو۔ یہ حدیث کا مضمون ہے۔

آئینہ سے تشبیہ دینے کی وجہ

یہ حدیث ہم نے بھی پڑھی ہے اور آپ حضرات نے بھی اس کو پڑھا اور سنا ہوگا، لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ علم حقیقی عطا فرماتے ہیں، ان کی نگاہ بہت دور تک پہنچتی ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے مؤمن کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے، لوگ اتنا تو جانتے ہیں کہ آئینہ کے ساتھ یہ تشبیہ اس وجہ سے دی ہے کہ جس طرح آئینہ چہرے اور جسم کے عیوب بتا دیتا ہے، اسی طرح مؤمن بھی دوسرے مؤمن کے عیوب بتا دیتا ہے۔ لیکن آئینہ کے ساتھ تشبیہ دینے میں ایک اور وجہ بھی ہے، وہ یہ کہ آئینہ کا یہ کام ہے کہ وہ آئینہ عیب اور برائی صرف اس کو بتاتا ہے جس کے اندر وہ عیب ہوتا ہے اور جو اس کے سامنے کھڑا ہے، لیکن دوسرا شخص جو دور کھڑا ہے، اس کو نہیں بتاتا کہ دیکھو اس کے اندر یہ عیب ہے۔ اسی طرح مؤمن کا کام یہ ہے کہ جس کے اندر کمزوری یا نقص یا عیب ہے، اس کو تو محبت اور پیار سے بتا دے کہ تمہارے اندر یہ نقص اور کمزوری ہے، لیکن دوسرے کو بتاتا اور گاتا نہ پھرے کہ

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في النصيحة والحياطة، رقم: ٤٢٧٢

فلاں کے اندر فلاں عیب ہے اور فلاں نقص ہے۔ لہٰذا دوسروں کو ذلیل کرنا، رسوا کرنا، اس کی برائیاں بیان کرنا مؤمن کا کام نہیں۔

غلطی بتائے، ذلیل نہ کرے

لہٰذا اس ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے دونوں باتیں بیان فرما دیں، ایک یہ کہ مؤمن کا کام یہ بھی ہے کہ اگر وہ دوسرے مؤمن کے اندر کوئی غلطی دیکھ رہا ہے تو اس کو بتائے۔ دوسرے یہ کہ اس کو دوسروں کے سامنے ذلیل اور رسوا نہ کرے، اس کا عیب دوسروں کو نہ بتائے۔

''طنز'' ایک فن بن گیا ہے

آج ہمارے معاشرے میں طعنہ دینے کا رواج پڑ گیا ہے، اب تو ''طنز'' باقاعدہ ایک فن بن گیا ہے اور اس کو ایک ہنر سمجھا جاتا ہے کہ کس خوبصورتی کے ساتھ بات لپیٹ کر کہہ دی گئی، اس سے بحث نہیں کہ اس کے ذریعہ دوسرے کا دل ٹوٹا یا دل آزاری ہوئی۔

انبیاء علیہم السلام طعنہ نہیں دیتے تھے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے، اور یہ سب اللہ کے دین کی دعوت لے کر آئے، کسی نبی کی زندگی میں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملے گی کہ کسی نبی نے اپنے مخالف کو یا کسی کافر کو طعنہ دیا ہو، یا طنز کیا ہو، بلکہ جو بات وہ دوسروں سے کہتے تھے، وہ محبت اور خیر خواہی سے کہتے تھے، تاکہ اس کے ذریعہ دوسرے کی اصلاح ہو۔ آج کل تو طعنہ دینے اور طنز نگاری کا ایک سلسلہ چلا ہوا ہے۔

جب آدمی کو ادبیت اور مضمون نگاری کا شوق ہوتا ہے یا تقریر میں آدمی کو دلچسپی پیدا کرنے کا شوق ہوتا ہے تو پھر اس مضمون نگاری میں اور اس تقریر میں طنز اور طعن و تشنیع بھی اس کا ایک لازمی حصہ بن جاتا ہے۔

میری ایک تالیف کا قصہ

چنانچہ آج سے تقریباً تیس پینتیس سال پہلے کی بات ہے، میں اس وقت دارالعلوم کراچی سے نیا نیا فارغ ہوا تھا، اس وقت ایوب خان صاحب مرحوم کے دور میں جو عائلی قوانین نافذ ہوئے تھے، ان کے خلاف میں نے ایک کتاب لکھی، جن لوگوں نے ان قوانین کی حمایت کی تھی، ان کا ذکر کرتے

ہوئے اور ان کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے اس کتاب میں جگہ جگہ طنز کا انداز اختیار کیا تھا۔ اس وقت چونکہ مضمون نگاری کا شوق تھا، اس شوق میں بہت سے طنزیہ جملے اور طنزیہ فقرے لکھے، اور اس پر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ یہ بڑا اچھا جملہ چست کر دیا۔ جب وہ کتاب مکمل ہوگئی تو میں نے وہ کتاب حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو سنائی، تقریباً دو سو صفحات کی کتاب تھی۔

یہ کتاب کس مقصد سے لکھی ہے؟

جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پوری کتاب سن چکے تو فرمایا یہ بتاؤ کہ تم نے یہ کتاب کس مقصد کے لئے لکھی ہے؟ اگر اس مقصد سے لکھی ہے کہ جو لوگ پہلے سے تمہارے ہم خیال ہیں وہ تمہاری اس کتاب کی تعریف کریں کہ واہ واہ کیسا دندان شکن جواب دیا ہے، اور یہ تعریف کریں کہ مضمون نگاری کے اعتبار سے اور انشاء اور بلاغت کے اعتبار سے بہت اعلیٰ درجے کی کتاب لکھی ہے، اگر اس کتاب کے لکھنے کا یہ منشاء ہے تو تمہاری یہ کتاب بہترین ہے۔

لیکن اس صورت میں یہ دیکھ لیں کہ اس کتاب کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا قیمت ہوگی؟ اور اگر کتاب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جو آدمی غلطی پر ہے، اس کتاب کے پڑھنے سے اس کی اصلاح ہو جائے، تو یاد رکھو! تمہاری اس کتاب کے پڑھنے سے ایسے آدمی کی اصلاح نہیں ہوگی، بلکہ اس کتاب کو پڑھنے سے اس کے دل میں اور ضد پیدا ہوگی۔ دیکھو! حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے، انہوں نے دین کی دعوت دی اور کفر اور شرک کا مقابلہ کیا، لیکن ان میں سے ایک نبی بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے طنز کا راستہ اختیار کیا ہو۔ لہٰذا یہ دیکھ لو کہ یہ کتاب اللہ کے واسطے لکھی ہے یا مخلوق کے واسطے لکھی ہے۔ اگر اللہ کے واسطے لکھی ہے تو پھر اس کتاب سے اس طنز کو نکالنا ہوگا، اور اس کا طرزِ تحریر بدلنا ہوگا۔

یہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ نہیں ہے

مجھے یاد ہے کہ جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات ارشاد فرمائی تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سر پر پہاڑ توڑ دیا، کیونکہ دو اڑھائی سو صفحات کی کتاب لکھنے کے بعد اس کو از سر نو اُدھیڑنا بڑا بھاری معلوم ہوتا ہے، خاص طور پر اس وقت جبکہ مضمون نگاری کا بھی شوق تھا اور اس کتاب میں بڑے مزیدار فقرے بھی تھے، ان فقروں کو نکالتے بھی دل کٹتا تھا، لیکن یہ حضرت والد ماجدؒ کا فیض تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق عطا فرمائی اور میں نے پھر پوری کتاب کو ادھیڑا اور از سر نو اس کو لکھا۔ پھر الحمد للہ وہ کتاب ''ہمارے عائلی قوانین'' کے نام سے چھپی۔ لیکن وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، الحمد للہ یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ ایک داعی حق کے لئے طنز کا طریقہ اور طعنہ دینے کا طریقہ اختیار کرنا درست نہیں، یہ انبیاء علیہم السلام

کا طریقہ نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیج رہے تھے کہ جاؤ اس کو جا کر ہدایت کرو اور اس کو دعوت دو، تو اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو یہ ہدایت دی جا رہی تھی:

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾(۱)

یعنی فرعون کے پاس تم دونوں نرمی سے بات کرنا، شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے۔ حضرت والد صاحب یہ بات بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ آج تم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے مصلح نہیں ہو سکتے، اور تمہارا مخاطب فرعون سے بڑا گمراہ نہیں ہو سکتا۔ وہ فرعون جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، کفر ہی پر مرے گا، لیکن اس کے باوجود یہ کہا جا رہا ہے کہ اس سے جا کر نرمی سے بات کرنا، تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نرمی سے بات کرنے کو کہا جا رہا ہے تو ہما شما کس قطار میں ہیں۔

حق بات کوئی لٹھ نہیں ہے

آج ایک طرف تو یہ فکر ہی کسی کو نہیں ہوتی کہ دین کی بات کسی کو سکھائی جائے، یا کسی کو "نہی عن المنکر" کیا جائے، اور اگر کسی کے دل میں یہ بات آ گئی کہ حق بات دوسروں کو بتانی ہے، تو وہ اس کو اس طرح بتاتا ہے جیسے کہ وہ حق بات ایک لٹھ ہے جو اس نے جس طرح دل چاہا اٹھا کر مار دیا، یا جیسے وہ ایک پتھر ہے جو کھینچ کر اس کو مار دیا۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے انداز جواب

حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دعوت دینے کے وقت طعنہ نہیں دیتے، حتیٰ کہ اگر کوئی سامنے والا شخص طعنہ بھی دے تو جواب میں یہ حضرات طعنہ نہیں دیتے۔

غالباً حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کا واقعہ ہے کہ ان کی قوم نے ان سے کہا:

﴿اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ﴾(۲)

نبی سے کہا جا رہا ہے کہ ہمارا یہ خیال ہے کہ تم انتہا درجے کے بیوقوف ہو، احمق ہو، اور ہم تمہیں

(۱) طٰہٰ: ٤٤　　(۲) الأعراف: ٦٦، یہ واقعہ حضرت ہود علیہ السلام کا ہی ہے۔

کاذبین میں سے سمجھتے ہیں، تم جھوٹے معلوم ہوتے ہو۔ وہ انبیاء علیہم السلام جن پر حکمت اور صدق قربان ہیں، ان کے بارے میں یہ الفاظ کہے جا رہے ہیں، لیکن دوسری طرف جواب میں پیغمبر فرماتے ہیں:

﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾(۱)

''اے قوم! میں بیوقوف نہیں ہوں، بلکہ میں اللہ رب العالمین کی طرف سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں''

ایک اور پیغمبر سے کہا جا رہا ہے:

﴿إِنَّا لَنَرٰكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾(۲)

''ہم تمہیں دیکھ رہے ہیں کہ تم گمراہی میں پڑے ہوئے ہو''

جواب میں پیغمبر فرماتے ہیں:

﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾(۳)

اے قوم! میں گمراہ نہیں ہوں، بلکہ میں اللہ رب العالمین کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں''

آپ نے دیکھا کہ پیغمبر نے طعنہ کا جواب طعنہ سے نہیں دیا۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

میں نے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا۔ ایسی بزرگ ہستی کہ ماضی قریب میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ شاہی خاندان کے شہزادے تھے، اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لئے نکل پڑے اور قربانیاں دیں۔ ایک مرتبہ دہلی کی جامع مسجد میں خطاب فرما رہے تھے، خطاب کے دوران بھرے مجمع میں ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ (العیاذ باللہ) ہم نے سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں۔ اتنے بڑے عالم اور شہزادے کو ایک بڑے مجمع میں یہ گالی دی، اور وہ مجمع بھی معتقدین کا ہے۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم جیسا کوئی آدمی ہوتا تو اس کو سزا دیتا، اگر وہ سزا نہ بھی دیتا تو اس کے معتقدین اس کی تکہ بوٹی کر دیتے، اور کم از کم اس کو ترکی بہ ترکی یہ جواب تو دے ہی دیتے کہ تو حرام زادہ، تیرا باپ حرام زادہ، لیکن حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے جو پیغمبرانہ دعوت کے حامل تھے، جواب میں فرمایا:

''آپ کو غلط اطلاع ملی ہے، میری والدہ کے نکاح کے گواہ تو آج بھی دِلّی میں موجود ہیں''

اس گالی کو ایک مسئلہ بنا دیا، لیکن گالی کا جواب گالی سے نہیں دیا۔

(۱) الأعراف: ۸۷ (۲) الأعراف: ۶۰، یہ واقعہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہے۔ (۳) الأعراف: ۶۱

ترکی بہ ترکی جواب مت دو

لہٰذا طعنہ کا جواب طعنہ سے نہ دیا جائے۔ اگرچہ شرعاً ایک آدمی کو یہ حق حاصل ہے کہ جیسی دوسرے شخص نے تمہیں گالی دی ہے، تم بھی ویسی ہی گالی اس کو دے دو، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے وارثین انتقام کا یہ حق استعمال نہیں کرتے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی یہ حق کبھی استعمال نہیں فرمایا، بلکہ ہمیشہ معاف کر دینے اور درگزر کر دینے کا شیوہ رہا ہے اور انبیاءؑ کے وارثین کا بھی یہی شیوہ رہا ہے۔

انتقام کے بجائے معاف کر دو

ارے بھائی! اگر کسی نے تمہیں گالی دے دی تو تمہارا کیا بگڑا؟ تمہاری کونسی آخرت خراب ہوئی؟ بلکہ تمہارے تو درجات میں اضافہ ہوا، اگر تم انتقام نہیں لوگے، بلکہ درگزر کر دو گے اور معاف کر دو گے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں معاف کر دیں گے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص دوسرے کی غلطی کو معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس دن معاف فرمائیں گے جس دن وہ معافی کا سب سے زیادہ محتاج ہوگا یعنی قیامت کے دن، لہٰذا انتقام لینے کی فکر چھوڑ دو، معاف کر دو اور درگزر کر دو۔

بزرگوں کی مختلف شانیں

ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت ہم نے سنا ہے کہ اولیاء کرام کی شانیں عجیب و غریب ہوتی ہیں، کسی کا کوئی رنگ ہے، کسی کا کوئی رنگ ہے اور کسی کی کوئی شان ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ ان اولیاء کرام کی مختلف شانیں دیکھوں کہ وہ کیا شانیں ہوتی ہیں۔ ان بزرگ نے ان سے فرمایا کہ تم کس چکر میں پڑ گئے، اولیاء اور بزرگوں کی شانیں دیکھنے کی فکر میں مت پڑو، اپنے کام میں لگو۔ ان صاحب نے اصرار کیا کہ نہیں! میں ذرا دیکھنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کیسے کیسے بزرگ ہوتے ہیں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر تم دیکھنا ہی چاہتے ہو تو ایسا کرو کہ دہلی کی فلاں مسجد میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں تین بزرگ اپنے ذکر و اذکار میں مشغول نظر آئیں گے۔ تم جا کر ہر ایک کی پشت پر ایک مُکا مار دینا، پھر دیکھنا کہ اولیاء کرام کی شانیں کیا ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ صاحب گئے۔ وہاں جا کر دیکھا تو واقعۃً تین بزرگ بیٹھے ہوئے ذکر میں مشغول ہیں۔ انہوں نے جا کر پہلے بزرگ کو پیچھے سے ایک مُکا مارا تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں، بلکہ اپنے ذکر و اذکار میں مشغول رہے۔ جب دوسرے بزرگ کو مُکا

مارا تو انہوں نے بھی پلٹ کر ان کو مُکّا مار دیا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ جب تیسرے بزرگ کو مُکّا مارا تو انہوں نے پلٹ کر ان کا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا کہ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی۔

اس کے بعد یہ صاحب ان بزرگ کے پاس واپس آئے جنہوں نے ان کو بھیجا تھا۔ ان بزرگ نے ان سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے بتایا کہ بڑا عجیب قصہ ہوا۔ جب میں نے پہلے بزرگ کو مارا تو انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا بھی نہیں، اور دوسرے بزرگ نے پلٹ کر مجھے مُکّا مار دیا، اور تیسرے بزرگ نے پلٹ کر میرا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا۔

میں اپنا وقت بدلہ لینے میں کیوں ضائع کروں

ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ جنہوں نے تمہیں مُکّا مارا تھا، انہوں نے زبان سے کچھ کہا تھا؟ ان صاحب نے بتایا کہ زبان سے تو کچھ نہیں کہا، بس مُکّا مارا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اب سنو! پہلے بزرگ جنہوں نے بدلہ نہیں لیا، انہوں نے یہ سوچا کہ اگر اس نے مجھے مُکّا مارا تو میرا کیا بگڑ گیا، اب میں پیچھے مڑوں، اس کو دیکھوں کہ کس نے مارا ہے اور پھر اس کا بدلہ لوں، جتنا وقت اس میں صرف ہوگا وہ وقت میں اللہ کے ذکر میں صرف کر دوں۔

پہلے بزرگ کی مثال

ان پہلے بزرگ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو بادشاہ نے بلایا اور اس سے کہا کہ میں تمہیں ایک عالیشان انعام دوں گا۔ اب وہ شخص اس انعام کے شوق میں دوڑتا ہوا بادشاہ کے محل کی طرف جا رہا ہے اور وقت کم رہ گیا ہے اور اس کو وقت پر پہنچنا ہے۔ راستے میں ایک شخص نے اس کو مُکّا مار دیا۔ اب یہ شخص اس مُکّا مارنے والے سے اُلجھے گا یا اپنا سفر جاری رکھے گا کہ میں جلد از جلد کسی طرح بادشاہ کے پاس پہنچ جاؤں؟ ظاہر ہے کہ اس مُکّا مارنے والے سے نہیں اُلجھے گا، بلکہ وہ تو اس فکر میں رہے گا کہ میں کسی طرح جلد از جلد بادشاہ کے پاس پہنچ جاؤں اور جا کر اس سے انعام وصول کروں۔

دوسرے بزرگ کا انداز

دوسرے بزرگ جنہوں نے بدلہ لے لیا، انہوں نے یہ سوچا کہ شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ جتنی زیادتی کوئی شخص تمہارے ساتھ کرے، اتنی زیادتی تم بھی اس کے ساتھ کر سکتے ہو، اس سے زیادہ نہیں کر سکتے۔ اب تم نے ان کو ایک مُکّا مارا تو انہوں نے بھی تمہیں ایک مُکّا مار دیا۔ تم نے زبان سے کچھ نہیں بولا تو انہوں نے بھی زبان سے کچھ نہیں بولا۔

بدلہ لینا بھی خیر خواہی ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض بزرگوں سے یہ جو منقول ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لے لیا، یہ بدلہ لینا بھی درحقیقت اس شخص کی خیر خواہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اولیاء اللہ کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر کوئی انسان ان کو تکلیف پہنچائے یا ان کی شان میں کوئی گستاخی کرے اور وہ صبر کر جائیں تو ان کے صبر کے نتیجے میں یہ شخص تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

حدیث قدسی میں اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ))(۱)

''جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی کرے، اس کے لئے میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے''

بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں کے ساتھ کی ہوئی زیادتی پر ایسا عذاب نازل فرماتے ہیں کہ ایسے عذاب سے اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، کیونکہ اس ولی کا صبر اس شخص پر واقع ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ والے بعض اوقات اپنے ساتھ کی ہوئی زیادتی کا بدلہ لے لیتے ہیں تاکہ اس کا معاملہ برابر ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کا عذاب اس پر نازل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کیوں بدلہ لیتے ہیں؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو اس بات پر اشکال ہو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ اولیاء اللہ تو اتنے شفیق ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اوپر کی ہوئی زیادتی کا بدلہ نہیں لیتے، لیکن اللہ تعالیٰ عذاب دینے پر تلے ہوئے ہیں کہ وہ ضرور عذاب دیں گے اگر بدلہ نہ لیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اولیاء اللہ کی شفقت اللہ تعالیٰ کی شفقت اور رحمت کے مقابلے میں زیادہ ہوگئی۔ پھر اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ شیرنی کو اگر کوئی جا کر چھیڑے تو وہ شیرنی طرح دے جاتی ہے اور بدلہ نہیں لیتی اور اس پر حملہ نہیں کرتی، لیکن اگر کوئی جا کر اس شیرنی کے بچوں کو چھیڑے تو پھر شیرنی اس کو برداشت نہیں کرتی، بلکہ چھیڑنے والے پر حملہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی شان میں لوگ گستاخیاں کرتے ہیں، کوئی شرک کر رہا ہے، کوئی اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کر رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے تحمل سے اس کو درگزر فرما دیتے ہیں، لیکن اولیاء اللہ جو اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں، ان کی

(۱) جامع العلوم والحکم، ابن رجب الحنبلی (۱/۳۵۷)، معارج القبول، حافظ بن احمد حکمی (۳/۱۰۰۱)

شان میں گستاخی کرنا اللہ تعالیٰ برداشت نہیں فرماتے، اس لئے یہ گستاخی انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں یہ منقول ہے کہ کسی اللہ کے ولی نے بدلہ لے لیا، وہ بدلہ لینا اس کی خیر خواہی کے لئے ہوتا ہے، کیونکہ اگر بدلہ نہ لیا تو نہ معلوم اللہ تعالیٰ کا کیا عذاب اس پر نازل ہو جائے گا۔

جہاں تک تیسرے بزرگ کا تعلق ہے، جنہوں نے تمہارا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا تھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے خلقِ خدا پر رحمت اور شفقت کا وصف عطا فرمایا تھا، اس لئے انہوں نے پلٹ کر ہاتھ سہلانا شروع کر دیا۔

پہلے بزرگ کا طریقہ سنت تھا

لیکن اصل طریقہ سنت کا وہ ہے جس کو پہلے بزرگ نے اختیار فرمایا۔ اس لئے کہ اگر کسی نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے تو میاں! کہاں تم اس سے بدلہ لینے کے چکر میں پڑ گئے، کیونکہ اگر تم بدلہ لے لو گے تو تمہیں کیا فائدہ مل جائے گا؟ بس اتنا ہی تو ہوگا کہ سینے کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی، لیکن اگر تم اس کو معاف کر دو گے اور درگزر کر دو گے تو سینے کی آگ کیا بلکہ جہنم کی آگ بھی ٹھنڈی ہو جائے گی، انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ سے نجات عطا فرمائیں گے۔

معاف کرنا باعثِ اجر وثواب ہے

آج کل ہمارے گھروں میں، خاندانوں میں، ملنے جلنے والوں میں، دن رات یہ مسائل پیش آتے رہتے ہیں کہ فلاں نے میرے ساتھ یہ کر دیا، فلاں نے یہ کر دیا، اب اس سے بدلہ لینے کی سوچ رہے ہیں، دوسروں سے شکایت کرتے پھر رہے ہیں، اس کو طعنہ دے رہے ہیں، اس کی دوسروں سے برائی اور غیبت کر رہے ہیں، حالانکہ یہ سب گناہ کے کام ہیں۔ لیکن اگر تم معاف کر دو اور درگزر کر دو تو تم بڑی فضیلت اور ثواب کے مستحق بن جاؤ گے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾(۱)

”جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا بیشک یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے“

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿إِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾(۲)

دوسرے کی برائی کا بدلہ اچھائی سے دو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جن کے ساتھ عداوت ہے وہ

(۱) الشوریٰ: ۴۳　　(۲) حٰمٓ السجدۃ: ۳۴

سب تمہارے گرویدہ ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمادیا:

﴿وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ٥﴾(۱)

یعنی یہ عمل ان ہی کو نصیب ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ صبر کی توفیق عطا فرماتے ہیں، اور یہ دولت بڑے نصیب والے کو حاصل ہوتی ہے۔

طعنہ سے بچیں

بہر حال، پہلی چیز جو اس حدیث میں بیان فرمائی، وہ یہ ہے کہ مؤمن کا کام طعنہ دینا نہیں ہے، لہٰذا یہ طنز اور طعنہ جس سے دوسرے کی دل آزاری ہو، ایک مؤمن کے لئے اس سے مکمل پرہیز کرنا ضروری ہے، کیونکہ اگر طعنہ دینے کے نتیجے میں کسی کی دل آزاری ہوگئی، اور کسی کا دل ٹوٹا تو آپ کے اس عمل سے ایسے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب ہوا جو اس وقت تک معاف نہیں ہوسکتا جب تک وہ صاحبِ حق معاف نہ کرے، محض توبہ کر لینے سے معاف نہیں ہوگا۔ العیاذ باللہ۔ لہٰذا صبح سے شام تک کی زندگی میں ہم اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ جب لوگوں کے ساتھ ہمارا واسطہ پیش آتا ہے اور ان سے شکایتیں ہوتی ہیں تو اس میں کہیں ہم سے طعنہ اور دل آزاری کا ارتکاب تو نہیں ہوتا ہے۔ اس کا خیال کرتے ہوئے انسان زندگی گزارے، جو بات بھی دوسرے سے کہنی ہے وہ نرمی سے اور شفقت سے کہہ دو، اگر شکایت بھی کسی سے ہوئی ہے تو اس کو تنہائی میں بلاکر کہہ دو کہ تم سے یہ شکایت ہے، تاکہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مؤمن کسی پر لعنت نہیں کرتا

اس حدیث میں دوسرا لفظ یہ ارشاد فرمایا:

((وَلَا بِاللَّعَّانِ))

مؤمن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا، یعنی لعنت کے الفاظ زبان سے نکالنا یہ مؤمن کا کام نہیں ہے۔

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنے غلام پر غصہ آگیا۔ ظاہر ہے کہ کسی سنگین غلطی پر ہی غصہ آیا ہوگا، بلاوجہ تو وہ غصہ کرنے والے نہیں تھے، اس غصے میں کوئی لعنت کا کلمہ زبان سے نکل گیا، پیچھے سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ لعنت کا کلمہ ان کی زبان سے سن لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کلمہ سن کر ارشاد فرمایا:

---

(۱) حٰمٓ السجدۃ: ۳۵

((لَعَّانِيْنَ وَصِدِّيْقِيْنَ كَلَّا وَرَبِّ الْكَعْبَةِ))(۱)

''صدیق'' بھی ہو اور لعنت بھی کرتے ہو، رب کعبہ کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا''

یعنی یہ دو چیزیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں، اس لئے کہ جو ''صدیق'' ہو وہ لعنت کرنے والا نہیں ہوتا۔ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ جملہ سنا کہ صدیق کا یہ کام نہیں کہ وہ لعنت کرے، لیکن چونکہ یہ غلطی ان سے ہوگئی تھی، اس لئے فوراً کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اس غلام کو آزاد کرتا ہوں۔ اس غلام کو بھی آزاد کر دیا۔

روایت میں آتا ہے کہ بعض دوسرے غلاموں کو بھی آزاد کر دیا۔ لہٰذا طعنہ اور لعنت دونوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔

بددعا کے الفاظ

پھر لعنت کے اندر ساری بددعائیں داخل ہیں جو ہمارے معاشرے میں رائج ہیں، خاص طور پر خواتین کی زبان پر جاری رہتی ہیں۔ مثلاً کسی کو کمبخت کہہ دیا، کسی کو یہ کہہ دیا کہ اس نے جھاڑو پیٹا ہے، یہ سب لعنت کے اندر داخل ہیں، اور بلاوجہ زبان پر لعنت کے الفاظ جاری کرنا اپنے نامۂ اعمال میں گناہوں کا اضافہ کرنا ہے۔ لہٰذا اگر کسی دوسرے پر غصہ بھی آئے تو غصے میں بھی لعنت کے الفاظ زبان سے نہ نکالے۔

یہ لعنت جائز ہے

البتہ کسی انسان کو شخصی طور پر لعنت کرنا تو حرام ہے، لیکن کسی عمل کرنے والے پر لعنت کرنا، مثلاً یہ کہنا کہ جو شخص یہ عمل کرے اس پر لعنت ہے، یا جو لوگ ایسا عمل کرنے والے ہیں ان پر لعنت ہے، یہ صورت جائز ہے۔ جیسا کہ خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح سے لعنت کرنا منقول ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَعَنَ اللّٰهُ آكِلَ الرِّبَا وَمُوْكِلَهُ))(۲)

''اللہ تعالیٰ کی لعنت سود کھانے والے پر بھی ہے اور سود کھلانے والے پر بھی ہے''

---

(۱) جامع الأحاديث، رقم: ٢٥٥٠٨ (٣٥/٢٣)، شعب الإيمان، رقم: ٥١٥٤ (٢٩٤/٤)، المعجم الكبير للطبراني، رقم: ٩١ (٣٥/١٩)، الترغيب والترهيب، رقم: ٤٢١١ (٣١٢/٣)، كنز العمال، رقم: ٨١٨٩ (٦١٦/٣)

(۲) صحيح البخاري، كتاب الطلاق، باب مهر البغي والنكاح الفاسد، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اسی طرح ایک جگہ پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْمُصَوِّرِيْنَ))(۱)

''تصویر بنانے والوں پر اللہ کی لعنت ہے''

اسی طرح اور بہت سے برے عمل کرنے والوں پر آپ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، لیکن کسی آدمی کا نام لے کر شخصی طور پر لعنت کرنا حرام ہے، اس لئے کہ یہ مؤمن کا کام نہیں۔

فحش گوئی کرنا مومن کی شان نہیں

اس حدیث شریف میں تیسری بات یہ بیان فرمائی:

((وَلَا الْفَاحِشِ))

''مؤمن فحش گو نہیں ہوتا''

یعنی وہ ایسی بات زبان سے نہیں نکالتا جو فحاشی کے ذیل میں آتی ہو۔ لہٰذا جہاں غصہ کرنے کا اور بولنے کا موقع ہو وہاں فحاشی سے کام نہ لیا جائے، اور بے حیائی کے کلمات زبان سے نہ نکالے جائیں، یہ مؤمن کا شیوہ نہیں ہے۔

بدگوئی کرنا مؤمن کا شیوہ نہیں

چوتھا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَلَا الْبَذِيْ))

مؤمن بذی نہیں ہوتا۔ ''بذی'' کے معنی ہیں ''بدگو'' ''بداخلاق'' مؤمن کسی سے بات کرتے ہوئے بدگوئی سے کام لینے والا اور برے الفاظ استعمال کرنے والا نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی زبان کو برے کلمات سے روکتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رقم: ٤٩٢٨، صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب لعن آكل الربا وموكله، رقم: ٢٩٩٤، سنن الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله، باب ما جاء في أكل الربا، رقم: ١١٢٧، سنن النسائي، كتاب الطلاق، باب إحلال المطلقة ثلاثا وما فيه من التغليظ، رقم: ٣٣٦٣، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا وموكله، رقم: ٢٨٩٥، سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب التغليظ في الربا، رقم: ٢٢٦٨

(۱) أحكام القرآن للجصاص (٥/٢٤٥)، الكبائر للذهبي (١/١٦٤)، الأذكار للنووي (١/٨١٨)

یہودیوں کی مکاری

حضورِ اقدس ﷺ کے زمانے کے یہودی بڑے عیار تھے، اس لئے کہ ان کی فطرت میں ہمیشہ سے عیاری اور مکاری ہے، جب انہوں نے یہ دیکھا کہ مسلمان جب آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' تو انہوں نے یہ طریقہ نکالا کہ جب وہ کسی مسلمان سے ملتے تو ''السلام علیکم'' کے بجائے ''السام علیکم'' کہتے، درمیان سے ''لام'' کو گرادیتے تھے۔عربی میں ''السام'' کے معنی ہیں ''موت'' لہٰذا ''السام علیکم'' کے معنی یہ ہوئے کہ تمہارے اوپر موت آجائے۔

ایک مرتبہ یہودیوں کی ایک جماعت حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آئی اور کہا ''السام علیکم''۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا موجود تھیں، وہ سمجھ گئیں کہ یہ ''السام علیکم'' کہہ کر بظاہر سلام کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں بددعا دے رہے ہیں۔چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"عَلَیْکُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَۃُ"

''تمہارے اوپر موت ہو اور تم پر لعنت ہو''

جب حضورِ اقدس ﷺ نے یہ الفاظ سنے تو آپ نے فرمایا:

((مَھْلًا یَا عَائِشَۃُ!))

''اے عائشہ نرمی سے کام لو''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یارسول اللہ! آپ نے نہیں سنا کہ انہوں نے کیا بدتمیزی کی ہے، انہوں نے ''السام علیکم'' کہہ کر آپ کو بددعا دی ہے، اس لئے میں نے اس طریقے سے اس کا جواب دیا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے نہیں دیکھا کہ میں نے کیا جواب دیا، میں نے تو یہ جواب دیا ''وعلیکم'' یعنی جو کچھ تم میرے بارے میں کہہ رہے ہو، وہ تمہارے اوپر ہو۔(۱)

نرمی زینت بخشتی ہے

دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب کیف یرد علی أهل الذمة السلام، رقم: ۵۷۸۶، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب النهی عن ابتداء أهل الکتاب بالسلام و کیف یرد، رقم: ۴۰۲۷، سنن الترمذی، کتاب الاستئذان و الآداب عن رسول الله، باب ماجاء فی التسلیم علی اهل الذمة، رقم: ۲۶۲۵، مسند أحمد، رقم: ۲۲۹۶۱

((یَا عَائِشَۃُ اِمَا کَانَ الرِّفْقُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَہٗ وَلَانُزِعَ عَنْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَہٗ))(۱)

''نرمی جس چیز میں بھی ہوگی وہ نرمی اس کو زینت بخشے گی، اور جس چیز سے نرمی کو ختم کردیا جائے گا وہ اس کو عیب دار بنادے گا''

لہٰذا اس طریقے سے جواب دے کر تم کیوں اپنی زبان خراب کرتی ہو، صرف ''وعلیکم'' کہنے سے زبان خرابی سے بچ جاتی ہے۔

لہٰذا جب آدمی کلام کرے، چاہے غصے کے وقت بھی کلام کرے، اس وقت بھی بدگوئی کے الفاظ زبان پر نہ لائے۔ حضورِ اقدس ﷺ کے وہ اوصاف جو پچھلی کتبِ سماویہ یعنی تورات اور انجیل میں بطور علامت مذکور تھے، اس میں ایک جملہ یہ بھی تھا:

((وَلَا فَاحِشًا وَلَا مُتَفَحِّشًا وَلَا سَخَّابًا بِالْاَسْوَاقِ وَلَایُجْزِیْ بِالسَّیِّئَۃِ السَّیِّئَۃَ وَلٰکِنْ یَعْفُوْ وَیَصْفَحُ))(۲)

''نہ وہ فاحش ہوں گے، نہ متفحش ہوں گے، اور نہ بازاروں میں شور مچانے والے ہوں گے، وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیں گے۔ لیکن وہ معافی اور درگزر سے کام لیں گے''

اور یہ کلمات تو آج بھی ''بائبل'' میں موجود ہیں کہ ''بازاروں میں اس کی آواز سنائی نہیں دے گی'' اور وہ مسلے ہوئے سرکنڈے کو نہیں توڑے گا'' اور ٹمٹماتی ہوئی بتی کو نہیں بجھائے گا'' یہ حضورِ اقدس ﷺ کے اوصاف ہیں۔

حضور ﷺ کی اخلاق میں بھی اتباع کریں

حضورِ اقدس ﷺ کی اتباع صرف ظاہری اعمال کی حد تک محدود نہیں ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دایاں پاؤں پہلے داخل کردیا اور نکلتے وقت بایاں پاؤں پہلے نکال دیا۔ بیشک یہ بھی بڑے اجر وثواب کی سنتیں ہیں، ان پر ضرور عمل کرنا چاہئے، لیکن اتباع سنت ان اعمال کے ساتھ محدود نہیں، اتباع سنت کا ایک لازمی حصہ یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اخلاق اور آپ ﷺ کے طریقہ کار کو اپنایا جائے۔ خاص طور پر اس وقت جب کوئی شخص دوسروں کے ساتھ معاملہ کرے تو وہ فاحش اور بذی نہ ہو،

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والأداب، باب فضل الرفق، رقم: ۴٦۹۸، مسند أحمد، رقم: ۲۳۷۹۱

(۲) جامع الأحادیث، رقم: ۴۳۲۵۹ (۱۲۰/۴۰)، مسند أحمد، رقم: ۲٦۰۳۲، تاریخ ابن عساکر (۳۸۰/۳)، کنز العمال، رقم: ۳۲۰۹۱ (٦۰۰/۱۱)

اور بدکلامی نہ کرے اور طعنہ نہ دے۔

لعنت کا وبال

حضور اقدس ﷺ نے لعنت کی ایک اور وعید یہ بیان فرمائی ہے کہ جب ایک انسان دوسرے پر لعنت کرتا ہے، تو پہلے وہ لعنت آسمان کی طرف جاتی ہے اور پھر وہ لعنت اس شخص کی طرف آتی ہے جس پر وہ لعنت کی گئی ہے، اگر وہ لعنت کا مستحق ہوتا ہے تو اس کو وہ لعنت لگ جاتی ہے اور اگر وہ لعنت کا مستحق نہیں ہوتا تو وہ لعنت واپس اس شخص پر جا کر لگ جاتی ہے جس نے لعنت کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص لعنت کو غلط استعمال کرے تو اس لعنت کرنے والے کا کام تمام کر دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہماری زبانوں کی ان تمام گناہوں سے حفاظت فرمائے جن کا ذکر حضور اقدس ﷺ نے ان احادیث میں فرمایا ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

غیبت
زبان کا ایک عظیم گناہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ
﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا، أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَاكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ، إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ﴾(۱)

''غیبت'' ایک سنگین گناہ

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ان گناہوں کا بیان شروع فرمارہے ہیں جو اس زبان سے سرزد ہوتے ہیں، اور سب سے پہلے اس گناہ کو ذکر فرمایا جس کا رواج بہت زیادہ ہو چکا ہے، وہ ہے غیبت کا گناہ۔ یہ ایسی مصیبت ہے جو ہماری مجلسوں پر اور ہمارے معاشرے پر چھا گئی ہے۔ کوئی مجلس اس سے خالی نہیں، کوئی گفتگو اس سے خالی نہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بڑی سخت وعیدیں بیان فرمائی ہیں، اور قرآن کریم نے غیبت کے لئے اتنے سنگین الفاظ استعمال کیے ہیں کہ شاید کسی اور گناہ کے لئے اتنے سنگین الفاظ استعمال نہیں کیے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا، أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَاكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ﴾

''ایک دوسرے کی غیبت مت کرو (کیونکہ یہ ایسا برا عمل ہے، جیسے اپنے مردار بھائی کا گوشت کھانا) کیا تم میں سے کوئی اس کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے؟ تم اس کو بہت برا سمجھتے ہو''

لہٰذا جب تم اس عمل کو برا سمجھتے ہو تو غیبت کو بھی برا سمجھو اس میں ذرا غور کریں کہ اس میں غیبت

☆ اصلاحی خطبات (۴/۸۰ تا ۱۰۷)، ۱۰ دسمبر ۱۹۹۳ء، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) الحجرات: ۱۲

کی کتنی شناعت بیان فرمائی ہے۔ ایک تو انسان کا گوشت کھانا، اور آدم خور بن جانا ہی کتنی شناعت کی بات ہے، اور انسان بھی کونسا؟ اپنا بھائی، اور بھائی بھی زندہ نہیں، بلکہ مردہ، اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا جتنا سنگین ہے، اتنا ہی دوسرے کی غیبت کرنا سنگین اور خطرناک ہے

''غیبت'' کی تعریف

غیبت کے کیا معنی ہے؟ غیبت کے معنی ہیں، دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنا، چاہے وہ برائی صحیح ہو، وہ اس کے اندر پائی جارہی ہو، غلط نہ ہو، پھر بھی اگر بیان کرد گے تو وہ غیبت میں شمار ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ سے سوال کیا: یا رسول اللہ غیبت کیا ہوتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

((ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ))

''اپنے بھائی کا اس کے پیٹھ پیچھے ایسے انداز میں ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرتا ہو''

یعنی اگر اس کو پتہ چلے کہ میرا ذکر اس طرح اس مجلس میں کیا گیا تھا، تو اس کو تکلیف ہو، اور وہ اس کو برا سمجھے، تو یہ غیبت ہے۔ ان صحابی نے پھر سوال کیا:

''إِنْ كَانَ فِيْ أَخِيْ مَا أَقُوْلُ''

اگر میرے بھائی کے اندر وہ خرابی واقعۃً موجود ہے جو میں بیان کر رہا ہوں، تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر وہ خرابی واقعۃً موجود ہے تب تو یہ غیبت ہے، اور اگر وہ خرابی اس کے اندر موجود نہیں ہے، اور تم اس کی طرف جھوٹی نسبت کر رہے ہو، تو پھر یہ غیبت نہیں، پھر تو یہ بہتان بن جائے گا۔ اور دوہرا گناہ ہوجائے گا۔(۱)

اب ذرا ہماری محفلوں اور مجلسوں کی طرف نظر ڈال کر دیکھئے کہ کس قدر اس کا رواج ہو چکا ہے، اور دن رات اس گناہ کے اندر مبتلا ہیں اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ بعض لوگ اس کو درست بنانے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ میں غیبت نہیں کر رہا ہوں، میں تو اس کے منہ پر یہ بات کہہ سکتا ہوں مقصد یہ ہے کہ جب میں یہ بات اس کے منہ پر کہہ سکتا ہوں تو میرے لئے یہ غیبت کرنا جائز ہے یاد رکھو، چاہے تم وہ بات اس کے منہ پر کہہ سکتے ہو، یا نہ کہہ سکتے ہو، وہ ہر حالت میں غیبت ہے۔ بس اگر تم

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البرّ والصلة والآداب، باب تحریم الغيبة، رقم: ٤٦٩٠، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی الغيبة، رقم: ١٨٥٧، سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی الغيبة، رقم: ٤٢٣١، مسند أحمد، رقم: ٨٦٢٥، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب فی الغيبة، رقم: ٢٥٩٨

کسی کا برائی سے ذکر کر رہے ہو تو یہ غیبت کے اندر داخل ہے اور یہ گناہِ کبیرہ ہے۔

''غیبت'' گناہِ کبیرہ ہے

اور یہ ایسا ہی گناہِ کبیرہ ہے جیسے شراب پینا، ڈاکہ ڈالنا، بدکاری کرنا، کبیرہ گناہوں میں داخل ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی حرام قطعی ہیں، یہ بھی حرام قطعی ہے۔ بلکہ غیبت کا گناہ اس لحاظ سے ان گناہوں سے زیادہ سنگین ہے کہ غیبت کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور حقوق العباد کا معاملہ یہ ہے کہ جب تک بندہ اس کو معاف نہ کردے اس وقت تک وہ گناہ معاف نہیں ہوگا، دوسرے گناہ صرف توبہ سے معاف ہوسکتے ہیں لیکن یہ گناہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوگا، اس سے اس گناہ کی سنگینی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے خدا کے لئے اس کا اہتمام کریں کہ نہ غیبت کریں، اور نہ غیبت سنیں، اور جس مجلس میں غیبت ہو رہی ہو، اس میں گفتگو کا رُخ بدلنے کی کوشش کریں، کوئی دوسرا موضوع چھیڑ دیں، اگر گفتگو کا رخ نہیں بدل سکتے تو پھر اس مجلس سے اُٹھ کر چلے آئیں۔ اس لئے کہ غیبت کرنا بھی حرام ہے، اور غیبت سننا بھی حرام ہے۔

یہ لوگ اپنے چہرے نوچیں گے

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لَمَّا عُرِجَ بِيْ مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَهُمْ اَظْفَارٌ مِنْ نُحَاسٍ يَخْمُشُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَصُدُوْرَهُمْ فَقُلْتُ: مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرِيْلُ؟ قَالَ: هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ لُحُوْمَ النَّاسِ، وَيَقَعُوْنَ فِيْ اَعْرَاضِهِمْ))(۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خادم تھے، دس سال تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی، وہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جس رات معراج میں مجھے اوپر لے جایا گیا، تو وہاں میرا گزر ایسے لوگوں پر ہوا، جو اپنے ناخنوں سے اپنے چہرے نوچ رہے تھے میں نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے، اور لوگوں کی آبروؤں پر حملے کیا کرتے تھے''

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في الغيبة، رقم: ٤٢٣٥، مسند أحمد، رقم: ١٢٨٦١

غیبت، زنا سے بدتر ہے

چونکہ اس گناہ کو حضور اقدس ﷺ نے مختلف طریقوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش فرمایا، ان سب کو پیش نظر رکھنا چاہئے، تا کہ ہمارے دلوں میں اس کی شناعت اور قباحت بیٹھ جائے۔۔۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی شناعت ہمارے دلوں میں بٹھادے، اور اس شناعت اور قباحت سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس حدیث کے اندر آپ نے دیکھا کہ آخرت میں ان کا یہ انجام ہوگا کہ اپنے چہرے نوچ رہے ہوں گے اور ایک روایت میں جو سند کے اعتبار سے بہت مضبوط نہیں ہے، مگر معنی کے اعتبار سے صحیح ہے وہ یہ کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ غیبت کا گناہ زنا کے گناہ سے بھی بدتر ہے، اور وجہ اس کی یہ بیان فرمائی کہ خدا نہ کرے اگر کوئی زنا میں مبتلا ہو جائے تو جب کبھی ندامت اور شرمندگی ہوگی، اور توبہ کرلے گا تو انشاء اللہ معاف ہو جائے گا، لیکن غیبت کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوگا جب تک وہ شخص معاف نہ کردے جس کی غیبت اور بے آبروئی کی گئی ہے، اتنا خطرناک گناہ ہے۔(1)

غیبت کرنے والے کو جنت سے روک دیا جائے گا

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ غیبت کرنے والے ہوں گے، انہوں نے بظاہر دنیا میں بڑے اچھے اعمال کیے ہوں گے، نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، عبادتیں کیں، لیکن جس وقت وہ لوگ پل صراط پر سے گزریں گے آپ حضرات جانتے ہیں کہ پل صراط ایک پل ہے جو جہنم کے اوپر سے گزرتا ہے، ہر انسان کو اس کے اوپر سے گزرنا ہے، اب جو شخص جنتی ہے، وہ اس پل کو پار کرکے جنت میں پہنچ جائے گا، اور اللہ بچائے جس کو جہنم میں جانا ہے، اس کو اسی پل کے اوپر سے نیچے کھینچ لیا جائے گا، اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا لیکن غیبت کرنے والوں کو پل کے اوپر جانے سے روک دیا جائے گا، اور ان سے کہا جائے گا کہ تم آگے نہیں بڑھ سکتے، جب تک اس غیبت کا کفارہ ادا نہ کردو گے یعنی جس کی غیبت کی ہے ان سے معافی نہ مانگ لو گے، اور وہ تمہیں معاف نہ کردے اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتے۔

بدترین سود غیبت ہے

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ سود اتنا زبردست گناہ ہے کہ اس کے

(۱) مجمع الزوائد، باب ما جاء فی الغیبة والنمیمة (۸/۹۱)

اندر بے شمار خرابیاں ہیں، اور بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے، اور اس کا ادنیٰ گناہ ایسا ہے[1] العیاذ باللہ جیسے کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے، دیکھئے، سود پر اتنی سخت وعید آئی ہے، کہ ایسی وعید اور کسی گناہ پر نہیں آئی۔ پھر حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ سب سے بدترین سود یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی آبرو پر حملہ کرے، کتنی سخت وعید بیان فرمائی۔ (۲)

غیبت، مردار بھائی کا گوشت کھانا ہے

ایک روایت میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں دو خواتین تھیں، انہوں نے روزہ رکھا، اور روزہ کی حالت میں دونوں خواتین آپس میں بات چیت کرنے میں مشغول ہوگئیں، جس کے نتیجے میں غیبت تک پہنچ گئیں۔ کسی کا ذکر شروع ہوا تو اس کی غیبت بھی شروع ہوگئی تھوڑی دیر بعد حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں ایک صاحب آئے اور آکر بتایا کہ یا رسول اللہ ان دو خواتین نے روزہ رکھا تھا، مگر اب ان کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے، اور پیاس کی وجہ سے ان کی جان لبوں پر آرہی ہے، اور وہ خواتین مرنے کے قریب ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو بظاہر بذریعہ وحی یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ ان خواتین نے غیبت کی ہے چنانچہ آپ نے حکم فرمایا کہ ان خواتین کو میرے پاس لے آؤ۔ جب ان خواتین کو حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے دیکھا کہ واقعۃً وہ لبِ دم آئی ہوئی ہیں۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ ایک بڑا پیالہ لاؤ۔ چنانچہ پیالہ آیا تو آپ نے ان میں سے ایک خاتون کو حکم فرمایا کہ تم اس پیالے میں قے کرو۔ جب اس نے قے کرنی شروع کی تو قے کے ذریعہ اندر سے پیپ اور خون اور گوشت کے ٹکڑے خارج ہوئے۔ پھر دوسری خاتون سے فرمایا کہ تم قے کرو، جب اس نے قے کی تو اس میں بھی خون اور پیپ اور گوشت کے ٹکڑے خارج ہوئے۔ یہاں تک وہ پیالہ بھر گیا پھر حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ تمہارے ان بہنوں اور بھائیوں کا خون اور پیپ اور گوشت ہے جو تم دونوں نے روزے کی حالت میں کھایا تھا۔ (۳)

تم دونوں نے روزے کی حالت میں جائز کھانے سے تو اجتناب کرلیا، لیکن جو حرام کھانا تھا، یعنی دوسرے مسلمان بھائی کا خون اور گوشت کھانا اس کو تم نے نہیں چھوڑا، جس کے نتیجے میں تم دونوں کے پیٹوں میں یہ چیزیں بھر گئی تھیں، اس کی وجہ سے تم دونوں کی یہ حالت ہوئی اس کے بعد فرمایا کہ

---

(۱) جامع الأحادیث، رقم: ۱۲۸۲۳ (۱۶۳/۱۳)، الترغیب والترهیب، رقم: ۲۸٤٦ (۵/۳)، شعب الإیمان، رقم: ۵۲۷۹ (٤۹۹/۱۱)، کنز العمال، رقم: ۹۷۵۹ (۱۰۵/٤)

(۲) سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الغیبة، رقم: ٤۲۳۳، مسند أحمد، رقم: ۱۵٦٤

(۳) التفسیر لابن کثیر (۲۷۳/٤)، سورة الحجرات

آئندہ کبھی غیبت کا ارتکاب مت کرنا گویا اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے غیبت کی صورت مثالی دکھادی کہ غیبت کا یہ انجام ہوتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگوں کا ذوق خراب ہوگیا ہے، ہماری حس مٹ چکی ہے، جس کی وجہ سے گناہ کی شناعت اور قباحت دل سے جاتی رہی ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ حسِ سلیم عطا فرماتے ہیں، اور ذوقِ سلیم عطا فرماتے ہیں، ان کو اس کا مشاہدہ بھی کرا دیتے ہیں۔

غیبت کرنے پر عبرت ناک خواب

چنانچہ ایک تابعی جن کا نام ربعی ہے، وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ایک مجلس میں پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں، میں بھی اس مجلس میں بیٹھ گیا۔ اب باتیں کرنے کے دوران کسی آدمی کی غیبت شروع ہوگئی۔ مجھے یہ بات بری لگی کہ ہم یہاں مجلس میں بیٹھ کر کسی کی غیبت کریں، چنانچہ میں اس مجلس سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی مجلس میں غیبت ہورہی ہو، تو آدمی کو چاہئے اس کو روکے، اور اگر روکنے کی طاقت نہ ہو تو کم از کم اس گفتگو میں شریک نہ ہو۔ بلکہ اُٹھ کر چلا جائے چنانچہ میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ اب اس مجلس میں غیبت کا موضوع ختم ہوگیا ہوگا، اس لئے میں دوبارہ اس مجلس میں جاکر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اب تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر غیبت شروع ہوگئی۔ لیکن اب میری ہمت کمزور پڑ گئی، اور میں اس مجلس سے نہ اُٹھ سکا، اور جو غیبت وہ لوگ کر رہے تھے، پہلے تو اس کو سنتا رہا اور پھر میں نے خود بھی غیبت کے ایک دو جملے کہہ دیئے۔

جب اس مجلس سے اُٹھ کر گھر واپس آیا اور رات کو سویا تو خواب میں ایک انتہائی سیاہ فام آدمی کو دیکھا، جو ایک بڑے سے طشت میں میرے پاس گوشت لے کر آیا۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ خنزیر کا گوشت ہے اور وہ سیاہ فام آدمی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ یہ خنزیر کا گوشت کھاؤ۔ میں نے کہا کہ میں مسلمان آدمی ہوں، خنزیر کا گوشت کیسے کھاؤں؟ اس نے کہا کہ نہیں، یہ تمہیں کھانا پڑے گا، اور پھر زبردستی اس نے گوشت کے ٹکڑے اُٹھا کر میرے منہ میں ٹھونسنے شروع کر دیئے۔ اب میں منع کرتا جارہا ہوں۔ وہ ٹھونستا جارہا ہے۔ یہاں تک کہ مجھے متلی اور قے آنے لگی، مگر وہ ٹھونستا جارہا تھا۔ پھر اسی شدید اذیت کی حالت میں میری آنکھ کھل گئی جب بیدار ہونے کے بعد میں نے کھانے کے وقت کھانا کھایا تو خواب میں جو خنزیر کے گوشت کا بدبودار اور خراب ذائقہ تھا، وہ ذائقہ مجھے اپنے کھانے میں محسوس ہوا، اور تین دن تک میرا یہ حال رہا جس وقت بھی میں کھانا کھاتا تو ہر کھانے میں اس خنزیر کے گوشت کا بدترین ذائقہ میرے کھانے میں شامل ہو جاتا اور اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ نے

اس پر متنبہ فرمایا کہ ذرا سی دیر جو میں نے مجلس میں غیبت کر لی تھی، اس کا برا ذائقہ میں تین دن تک محسوس کرتا رہا اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

حرام کھانے کی ظلمت

بات دراصل یہ ہے کہ اس ماحول کی خرابی کی وجہ سے ہماری حس خراب ہوگئی ہے اس لئے گناہ کا گناہ ہونا محسوس نہیں ہوتا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ ایک جگہ دعوت میں کھانے کے ایک دو لقمے کھالیے تھے۔ وہ کھانا کچھ مشتبہ سا تھا، اس کے حرام ہونے کا کچھ شبہ تھا بعد میں فرماتے تھے کہ میں نے وہ ایک یا دو لقمے جو کھالیے تو اس کی ظلمت مہینوں تک قلب میں محسوس ہوتی رہی، اور بار بار برے خیالات دل میں آتے رہے، گناہ کرنے کے داعیے دل میں پیدا ہوتے رہے، اور گناہ کی طرف رغبت ہوتی رہی۔

گناہ کا اثر ایک یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے قلب میں ظلمت پیدا ہو جاتی ہے، اس ظلمت کے نتیجے میں دوسرے گناہ کرنے کے تقاضے پیدا ہوتے ہیں، اور ان کی طرف آدمی بڑھنے لگتا ہے، اور گناہوں کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کی حس کو درست فرمادے۔

بہر حال یہ غیبت کا گناہ بڑا خطرناک گناہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ حسِ سلیم عطا فرمادے وہی جان سکتا ہے کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں، اس سے اندازہ کریں کہ یہ غیبت کتنا بڑا گناہ ہے۔

غیبت کی اجازت کے مواقع

البتہ ایک بات ذرا سمجھ لیجئے وہ یہ کہ غیبت کی تعریف تو میں نے آپ کو بتادی تھی کہ کسی کا پیٹھ پیچھے اس طرح ذکر کرنا کہ اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ میرا اس طرح ذکر کیا گیا ہے، تو اس کو ناگوار ہو، چاہے بات صحیح کی جارہی ہو، یہ ہے غیبت لیکن شریعت نے ہر چیز کی رعایت رکھی ہے، انسان کی فطرت کی بھی رعایت کی ہے، انسان کی جائز ضروریات کا بھی لحاظ رکھا ہے، لہٰذا غیبت سے چند چیزوں کو مستثنیٰ کر دیا ہے، اگرچہ بظاہر وہ غیبت ہیں۔ لیکن شرعاً جائز ہیں۔

دوسرے کے شر سے بچانے کے لئے غیبت کرنا

مثلاً ایک شخص ایک ایسا کام کر رہا ہے، جس سے دوسرے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، اب اگر اس دوسرے کو اس کے بارے میں نہ بتایا گیا تو وہ اس کے ہاتھوں سے نقصان کا شکار ہو جائے گا۔ اس وقت اگر آپ اس دوسرے شخص کو بتادیں کہ فلاں شخص سے ہوشیار رہنا تو ایسا کرنا جائز ہے یہ بات خود

حضورِ اقدس ﷺ نے سکھادی، ہر بات بیان کر کے دنیا سے تشریف لے گئے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں بیٹھی ہوئی تھی اور ایک صاحب ہماری طرف سامنے سے آ رہے تھے، ابھی وہ صاحب راستے ہی میں تھے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے اس شخص کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے فرمایا:

((بِئْسَ اَخُو الْعَشِیْرَۃِ))

''یہ شخص اپنے قبیلے کا برا آدمی ہے''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی کہ یہ برا آدمی ہے، ذرا ہوشیار رہنا چاہئے، جب وہ شخص مجلس میں آ کر بیٹھ گیا تو آپ ﷺ نے اپنی عادت کے مطابق نرم انداز میں گفتگو فرمائی، اس کے بعد جب وہ شخص چلا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! آپ نے فرمایا کہ یہ شخص برا آدمی ہے، لیکن جب وہ آپ کے پاس آ کر بیٹھ گیا تو آپ اس کے ساتھ بہت نرمی اور میٹھے انداز میں گفتگو کرتے رہے، یہ کیا بات ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ دیکھو، وہ بدترین شخص ہے جس کے شر کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں، یعنی اس آدمی میں طبیعت کے لحاظ سے فساد ہے، اگر اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ نہ کیا جائے تو فتنہ فساد کھڑا کر سکتا ہے۔ اس لئے میں نے اپنی عادت کے مطابق اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا۔(۱)

علماء کرام نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے پہلے سے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتادیا کہ یہ برا آدمی ہے، بظاہر تو یہ غیبت ہے، اس لئے کہ اس کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی کی جارہی ہے، لیکن یہ غیبت اس لئے جائز ہوئی کہ اس کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو متنبہ کر دیا جائے تاکہ آئندہ وہ اس کے کسی فساد کا شکار نہ ہو جائیں لہٰذا کسی شخص کو دوسرے کے ظلم سے بچانے کے لئے اس کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی بیان کر دی جائے تو یہ غیبت میں داخل نہیں، ایسا کرنا جائز ہے۔

اگر دوسرے کی جان کا خطرہ ہو

بلکہ بعض صورتوں میں اس کی برائی بیان کرنا واجب ہے، مثلاً ایک آدمی کو آپ نے دیکھا کہ وہ دوسرے پر حملے کرنے اور اس کی جان لینے کی تیاری کر رہا ہے، تو ایسی صورت میں اس دوسرے شخص کو بتانا واجب ہے کہ تمہاری جان خطرے میں ہے تاکہ وہ اپنا تحفظ کر سکے، لہٰذا ایسے

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب لم يكن النبي فاحشا ولا متفحشا، رقم: ٥٥٧٢، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في حسن العشرة، رقم: ٤١٦٥، مسند أحمد، رقم: ٢٢٩٧٧

موقع پر غیبت جائز ہو جاتی ہے۔

علانیہ گناہ کرنے والے کی غیبت

ایک حدیث ہے، جس کا صحیح مطلب لوگ نہیں سمجھتے، اور وہ یہ کہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا غِيبَةَ لِفَاسِقٍ وَلَا مُجَاهِرٍ))(۱)

وہ یہ کہ "فاسق کی غیبت غیبت نہیں" اس کا مطلب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص اگر کسی گناہِ کبیرہ کے اندر مبتلا ہے تو اس کی جو چاہو، غیبت کرتے رہو، وہ جائز ہے، یا جو بدعات میں مبتلا ہے، تو اس کی غیبت جائز ہے حالانکہ اس قول کا یہ مطلب نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص علانیہ فسق و فجور کے اندر مبتلا ہے، مثلاً ایک شخص علی الاعلان کھلم کھلا شراب پیتا ہے، اب اگر کوئی شخص اس کے پیٹھ پیچھے یہ کہے کہ وہ شراب پیتا ہے تو یہ غیبت نہیں، اس لئے کہ وہ تو خود ہی اعلان کر رہا ہے کہ میں شراب پیتا ہوں، اب اگر اس کے پیچھے اس کے شراب پینے کا تذکرہ کیا جائے گا تو اس کو ناگواری نہیں ہوگی، اس لئے کہ وہ تو خود علانیہ لوگوں کے سامنے پیتا ہے، لہٰذا یہ غیبت میں داخل نہ ہوگا۔

یہ بھی غیبت میں داخل ہے

لیکن جو کام وہ دوسروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا، اگر اس کا تذکرہ آپ لوگوں کے سامنے کریں گے تو وہ غیبت میں داخل ہوگا۔ مثلاً وہ شخص کھم کھلا شراب تو پیتا ہے، کھلم کھلا سود تو کھاتا ہے، لیکن کوئی گناہ ایسا ہے جو وہ چھپ کر کرتا ہے، اور لوگوں کے سامنے اس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا، اور وہ گناہ ایسا ہے کہ اس کا نقصان دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا تو اب اس کی غیبت کرنا اور اس گناہ کا تذکرہ کرنا جائز نہیں، لہٰذا جس فسق و فجور کا ارتکاب وہ کھم کھلا کر رہا ہو، اس کا تذکرہ غیبت میں داخل نہیں ورنہ غیبت میں داخل ہے۔ یہ مطلب ہے اس قول کا کہ "فاسق کی غیبت غیبت نہیں"

فاسق و فاجر کی غیبت جائز نہیں

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ایک مجلس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما موجود تھے، اسی مجلس میں کسی شخص نے حجاج بن یوسف کی برائیاں شروع

(۱) جامع الأصول من أحاديث الرسول، رقم: ٦٢١٩ (٦٣٠٣/١)، كشف الخفاء، رقم: ٣٠٨١ (٣٦٦/٢)

کر دیں تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ٹوکا اور فرمایا کہ ''دیکھو یہ جو تم ان کی برائیاں بیان کر رہے ہو، یہ غیبت ہے، اور یہ مت سمجھنا کہ اگر حجاج بن یوسف کی گردن پر سینکڑوں انسانوں کا خون ہے تو اب اس کی غیبت حلال ہوگئی، حالانکہ اس کی غیبت حلال نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ جہاں حجاج بن یوسف سے ان سینکڑوں انسانوں کے خون کا حساب لیں گے جو اس کی گردن پر ہیں تو وہاں اس غیبت کا بھی حساب لیں گے جو تم اس کے پیچھے کر رہے ہو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

لہٰذا یہ مت سمجھو کہ فلاں شخص فاسق و فاجر اور بدعتی ہے، اس کی جتنی چاہو غیبت کرلو، بلکہ اس کی غیبت کرنے سے احتراز کرنا واجب ہے۔

ظالم کے ظلم کا تذکرہ غیبت نہیں

ایک اور موقع پر بھی غیبت کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ وہ یہ کہ ایک شخص نے تم پر ظلم کیا اور اب اس ظلم کا تذکرہ کسی دوسرے سے کرتے ہو کہ میرے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے، اور یہ زیادتی ہوئی ہے۔ یہ غیبت نہیں اس میں گناہ نہیں۔ چاہے وہ شخص جس کے سامنے تم اس ظلم کا تذکرہ کر رہے ہو اس ظلم کا تدارک کرسکتا ہو، چاہے تدارک نہ کرسکتا ہو۔ مثلاً ایک شخص نے تمہاری چوری کرلی، اب جا کر تھانے میں اطلاع دو کہ فلاں شخص نے چوری کرلی ہے تو اب اگرچہ یہ اس کے پیٹھ پیچھے اس کا تذکرہ ہے، لیکن غیبت میں داخل نہیں، اس لئے کہ تمہیں نقصان پہنچایا گیا، تم پر ظلم کیا گیا اور اب تم نے اس ظلم کے خلاف جا کر شکایت کی۔ وہ تمہارے ظلم کا تدارک کرسکتے ہیں تو یہ غیبت میں داخل نہیں۔

لیکن اگر اس چوری کا تذکرہ ایسے شخص کے سامنے کیا جا رہا ہے جو اس ظلم کا تدارک نہیں کرسکتا مثلاً چوری کے واقعے کے بعد کچھ لوگ تمہارے پاس آئے تو تم نے ان کے سامنے تذکرہ کر دیا کہ آج رات فلاں شخص نے چوری کرلی، یا فلاں شخص نے ہمیں یہ نقصان پہنچا دیا، یا فلاں شخص نے ہمارے ساتھ یہ زیادتی کردی تو یہ بیان کرنے میں کوئی گناہ نہیں، یہ غیبت میں داخل نہیں۔

دیکھئے! شریعت ہماری فطرت کی کتنی رعایت رکھتی ہے، انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب اس کے ساتھ ظلم ہو جائے تو کم از کم وہ اپنے غم کا دکھڑا رو کر اپنے دل کی تسلی کرسکتا ہے۔ چاہے دوسرا شخص اس کا تدارک کرسکتا ہو، یا نہ کرسکتا ہو، اس لئے شریعت نے اجازت دے دی کہ اس کی اجازت ہے۔

﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾(۱)

ویسے تو اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں فرماتے کہ برائی کا تذکرہ کیا جائے البتہ جس شخص پر ظلم

(۱) النساء: ۱۴۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی کی برائی علانیہ زبان پر لائی جائے، اِلّا یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو''

ہو اوہ اپنا ظلم دوسروں کے سامنے بیان کرسکتا ہے۔ یہ غیبت میں داخل نہیں، بلکہ جائز ہے بہرحال، یہ مستثنیات ہیں جنہیں غیبت سے اللہ تعالیٰ نے نکال دیا ہے، اس میں غیبت کا گناہ نہیں، لیکن ان کے علاوہ ہم لوگ مجلس میں بیٹھ کر قصہ گوئی کے طور پر، وقت گزاری کے طور پر مجلس آرائی کے طور پر دوسروں کا ذکر شروع کردیتے ہیں، یہ سب غیبت کے اندر داخل ہے۔ خدا کے لئے اپنی جانوں پر رحم کرکے اس کا سدِ باب کرنے کی کوشش کریں۔ اور ذرا اس زبان کو قابو میں لائیں۔ اس کو تھوڑا سا لگام لگائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

غیبت سے بچنے کے لئے عزم اور ہمت

غیبت کا تذکرہ میں نے آپ کے سامنے کردیا اور آپ نے سن لیا۔ لیکن محض کہنے سننے سے بات نہیں بنتی، جب تک عزم اور ارادہ نہ کیا جائے، ہمت نہ کی جائے اور قدم آگے نہ بڑھایا جائے۔ یہ عزم کرلو کہ آج کے بعد اس زبان سے کوئی غیبت کا کلمہ نہیں نکلے گا انشاء اللہ، اور اگر کبھی غلطی ہو جائے تو فوراً توبہ کرلو، اور صحیح علاج اس کا یہ ہے کہ جس کی غیبت کی ہے، اس سے معافی مانگ لو کہ میں نے تمہاری غیبت کی ہے، مجھے معاف کردو، بعض اللہ کے بندے یہ کام کرتے ہیں۔

غیبت سے بچنے کا علاج

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ میرے پاس آتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ میں نے آپ کی غیبت کی تھی، مجھے معاف کردیجئے، میں ان سے کہتا ہوں کہ میں تمہیں معاف کردوں گا، لیکن ایک شرط ہے، وہ یہ کہ پہلے یہ بتادو کہ کیا غیبت کی تھی؟ تاکہ مجھے پتہ تو چلے کہ میرے پیچھے کیا کہا جاتا ہے۔

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا؟

اگر بتادوگے تو میں معاف کردوں گا۔ پھر فرمایا کہ میں اس حکمت سے پوچھتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ جو بات میرے بارے میں کہی ہو وہ درست ہو، اور واقعی میرے اندر وہ غلطی موجود ہو، اور پوچھنے سے وہ غلطی سامنے آجائے گی تو اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بچنے کی توفیق دے دیں گے، اس لئے میں پوچھ لیتا ہوں۔

لہٰذا اگر غیبت کبھی سرزد ہو جائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ اس سے کہہ دو کہ میں نے آپ کی غیبت کی ہے، اس وقت دل پر بہت آرے تو چلیں گے، اپنی زبان سے یہ کہنا تو بڑا مشکل کام ہے، لیکن علاج یہی ہے، دو چار مرتبہ اگر یہ علاج کرلیا تو انشاء اللہ آئندہ کے لئے سبق ہو جائے گا۔

بزرگوں نے اس سے بچنے کے لئے دوسرے علاج بھی ذکر فرمائے ہیں، مثلاً حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب دوسرے کا تذکرہ زبان پر آنے لگے تو اس وقت فوراً اپنے عیوب کا استحضار کرو، کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو عیب سے خالی ہو، اور یہ خیال لاؤ کہ خود میرے اندر تو فلاں برائی ہے، میں دوسروں کی کیا برائی بیان کروں، اور اس عذاب کا دھیان کرو جس کا بیان ابھی ہوا کہ ایک کلمہ اگر زبان سے نکال دوں گا، لیکن اس کا انجام کتنا برا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے کہ یا اللہ! اس بلا سے نجات عطا فرما دیجئے۔ جب کبھی مجلس میں کوئی تذکرہ آنے لگے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلو، یا اللہ! یہ تذکرہ مجلس میں آرہا ہے۔ مجھے بچا لیجئے، میں کہیں اس کے اندر مبتلا نہ ہو جاؤں۔

غیبت کا کفارہ

البتہ بعض روایات میں ہے، جو اگرچہ ہیں تو ضعیف، لیکن معنی کے اعتبار سے صحیح ہیں۔ کہ اگر کسی کی غیبت ہوگئی ہے تو اس غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ اس کے لئے خوب دعائیں کرو، استغفار کرو، مثلاً فرض کریں کہ آج کسی کو غفلت سے تنبیہ ہوئی کہ واقعۃً آج تک ہم بڑی سخت غلطی کے اندر مبتلا رہے۔ معلوم نہیں کن کن لوگوں کی غیبت کرلی۔ اب آئندہ انشاء اللہ کسی کی غیبت نہیں کریں گے۔ لیکن اب تک جن کی غیبت کی ہے، ان کو کہاں کہاں تک یاد کریں اور ان سے کیسے معافی مانگیں؟ کہاں کہاں جائیں؟ اس لئے اب ان کے لئے دعا اور استغفار کرلو۔ (۱)

حقوق کی تلافی کی صورت

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ اور میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ نے تو یہ کیا تھا کہ ایک خط لکھ کر سب کو بھجوا دیا، اس خط میں یہ لکھا کہ زندگی میں معلوم نہیں آپ کے کتنے حقوق تلف ہوئے ہوں گے، کتنی غلطیاں ہوئی ہوں گی، میں اجمالی طور پر آپ سے معافی مانگتا ہوں کہ اللہ کے لئے مجھے معاف کردیجئے۔ یہ خط اپنے تمام اہلِ تعلقات کو بھجوا دیا، اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ ان حقوق کو معاف کرا دیں گے۔

اگر ایسے لوگوں کے حقوق تلف کیے ہیں جن سے اب رجوع کرنا ممکن نہیں، یا تو ان کا انتقال ہو چکا ہے، یا کسی ایسی جگہ چلے گئے ہیں کہ ان کا پتہ معلوم کرنا ممکن نہیں تو ایسی صورت کے لئے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس کی غیبت کی گئی تھی یا جن کے حقوق تلف کیے تھے ان کے حق میں

(۱) مشکوٰۃ، کتاب الآداب، باب حفظ اللسان، رقم: ۴۸۷۷ (۴۱۵/۲)

خوب دعا کرو کہ یا اللہ میں نے اس کی جو غیبت کی تھی اس کو اس کے حق میں باعثِ ترقی درجات بنا دیجئے اور اس کو دین و دنیا کی ترقیات عطا فرمایئے، اور اس کے حق میں خوب استغفار کرو تو یہ بھی اس کی تلافی کی ایک شکل ہے۔

اگر ہم بھی اپنے اہل تعلقات کو اس قسم کا خط لکھ کر بھیج دیں تو کیا اس سے ہماری ہیٹی ہو جائے گی؟ یا بے عزتی ہو جائے گی؟ کیا بعید ہے کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہماری معافی کا سامان کر دیں۔

معاف کرنے کرانے کی فضیلت

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ کسی دوسرے سے معافی مانگے اور سچے دل سے مانگے، اب اگر سامنے والا یہ دیکھ کر کہ یہ مجھ سے معافی مانگ رہا ہے نادم اور شرمندہ ہو رہا ہے اس کو معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس معاف کرنے والے کو اس دن معاف کرے گا جس دن اس کو معافی کی سب سے زیادہ حاجت ہوگی، اور اگر ایک شخص نادم ہو کر معافی مانگ رہا ہے لیکن یہ شخص معافی دینے سے انکار کر رہا ہے کہ میں معاف نہیں کروں گا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں اس کو اس دن معاف نہیں کروں گا جس دن اس کو معافی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ جب تو میرے بندوں کو معاف نہیں کرتا تو تجھے کیسے معاف کیا جائے۔

اس لئے یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔لہٰذا اگر کسی شخص نے ندامت کے ساتھ دوسرے سے معافی مانگ لی تو اس نے اپنا فریضہ ادا کر لیا اس سے عہدہ برا ہو گیا، چاہے دوسرا شخص معاف کرے یا نہ کرے۔اس لئے حقوق کی معافی مانگ کر ہر وقت تیار رہنا ہے۔

حضور ﷺ کا معافی مانگنا

ارے ہم اور آپ کس شمار و قطار میں ہیں۔حضور نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں کھڑے ہو گئے، اور تمام صحابہ کرام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آج میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کرتا ہوں۔اگر کسی شخص کو مجھ سے تکلیف پہنچی ہو، یا میں نے کسی کی جانی، مالی کسی بھی اعتبار سے حق تلفی کی ہو تو آج میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں، اگر بدلہ لینا چاہتے ہو تو بدلہ لے لو، اور اگر مجھے معاف کرنا چاہتے ہو تو معاف کر دو، تاکہ کل قیامت کے دن تمہارا کوئی حق میرے اوپر باقی نہ رہے۔

بتایئے! سرکارِ دو عالم ﷺ وہ محسنِ اعظم اور پیشوائے اعظم جن کے ایک سانس کے بدلے صحابہ کرام اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھے، وہ فرما رہے ہیں کہ اگر میں نے کسی کو مارا ہو یا

تکلیف پہنچائی ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے لے۔ چنانچہ ایک صحابی کھڑے ہو گئے، اور کہا کہ یا رسول اللہ! آپ نے ایک مرتبہ میری کمر پر مارا تھا، میں اس کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ حضور ﷺ نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا کہ آجاؤ، اور بدلہ لے لو، کمر پر مارلو۔ جب وہ صحابی کمر کے پیچھے آگئے تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! جس وقت آپ نے مجھے مارا تھا، اس وقت میری کمر ننگی تھی، اور اس وقت آپ کی کمر پر کپڑا ہے، اگر اسی حالت میں میں بدلہ لوں گا تو بدلہ پورا نہیں ہوگا۔ حضور ﷺ اس وقت چادر اوڑھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا کہ میں چادر اُٹھا دیتا ہوں۔ چنانچہ جس وقت آپ نے چادر اُٹھائی تو ان صحابی نے آگے بڑھ کر اس مہرِ نبوت کو چوم لیا، جو آپ کی پشت پر تھی، اور پھر ان صحابی نے فرمایا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ گستاخی میں نے صرف اس لئے کی تاکہ مجھے اس مہرِ نبوت کا بوسہ لینے کا موقع مل جائے، آپ ﷺ مجھے معاف فرمادیں۔(۱)

بہر حال، اس طرح حضور ﷺ نے اپنے آپ کو صحابہ کرام کے سامنے پیش کر دیا۔ اب ہم اور آپ کس شمار و قطار میں ہیں۔ اگر ہم بھی اپنے اہلِ تعلقات کو یہ لکھ کر بھیج دیں تو اس سے ہمارا کیا بگڑ جائے گا۔ شاید اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف فرمادیں، اور اتباعِ سنت کی نیت سے جب یہ کام کریں تو اس سنت کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہمارا بیڑہ پار فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اسلام کا ایک اصول

دیکھئے! اسلام کا ایک اصول ہے جو حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا، وہ یہ کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے لئے بھی وہی پسند کرو جو دوسرے کے لئے پسند کرتے ہو، اور دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ اور جو اپنے لئے ناپسند ہو وہ دوسرے کے لئے بھی ناپسند کرو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص اس طرح پیٹھ پیچھے برائی سے تمہارا ذکر کرے تو اس وقت تمہارے دل پر کیا گزرے گی؟ تم اس کو اچھا سمجھو گے یا برا سمجھو گے؟ اگر تم اس کو برا سمجھتے ہو، اور اپنے لئے اس کو پسند نہیں کرتے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس کو تم اپنے بھائی کے لئے پسند کرو؟ یہ دوہرے معیار وضع کرنا کہ اپنے لئے کچھ اور پیمانہ ہے، اور دوسرے کے لئے کچھ اور پیمانہ ہے۔ اسی کا نام منافقت ہے۔ گویا کہ غیبت کے اندر منافقت بھی داخل ہے۔ جب ان باتوں کو سوچو گے اور اس گناہ پر جو عذاب دیا جائے گا اس کو سوچو گے تو انشاء اللہ غیبت کرنے کے جذبے میں کمی آئے گی۔

(۱) مجمع الزوائد، باب فی وداعه صلی الله علیه وسلم (۲۷/۹)

غیبت سے بچنے کا آسان راستہ

ہمارے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ غیبت سے بچنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ دوسرے کا ذکر کرو ہی نہیں، نہ اچھائی سے ذکر کرو، اور نہ برائی سے ذکر کرو، کیونکہ یہ شیطان بڑا خبیث ہے، اس لئے کہ جب تم کسی کا ذکر اچھائی سے کرو گے کہ فلاں شخص بڑا اچھا آدمی ہے، اس کے اندر یہ اچھائی ہے، اس کے اندر یہ اچھائی ہے تو دماغ میں یہ بات رہے گی کہ میں اس کی غیبت تو نہیں کر رہا، بلکہ اچھائی سے اس کا ذکر کر رہا ہوں، لیکن پھر یہ ہوگا کہ اس کی اچھائیاں بیان کرتے کرتے شیطان کوئی جملہ درمیان میں ایسا ڈال دے گا جس سے وہ اچھائی برائی کے اندر تبدیل ہو جائے گی، مثلاً وہ کہے گا کہ فلاں شخص ہے تو بڑا اچھا آدمی، مگر اس کے اندر فلاں خرابی ہے۔ یہ لفظ "مگر" آ کر سارا کام خراب کر دے گا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گفتگو کا رخ غیبت کی طرف منتقل ہو جائے گا، اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دوسروں کا ذکر کرو ہی نہیں، اس لئے کہ دوسرے کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، نہ اچھائی سے کرو، اور نہ برائی سے کرو، اور اگر کسی کا ذکر اچھائی سے کر رہے ہو تو پھر ذرا کمر کس کے بیٹھو، تاکہ شیطان غلط راستے پر نہ ڈالے۔

اپنی برائیوں پر نظر کرو

ارے بھائی دوسروں کی برائی کیوں کرتے ہو، اپنی طرف نگاہ کرو، اپنے عیوب کا استحضار کرو، اگر دوسرے کے اندر کوئی برائی ہے تو اس برائی کا عذاب تمہیں نہیں ملے گا۔ اس برائی کا عذاب اور ثواب وہ جانے اور اس کا اللہ جانے، تمہیں تو تمہارے اعمال کا صلہ ملنا ہے، اس کی فکر کرو۔

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اپنی طرف دھیان کرو، اپنے عیوب کو دیکھو۔ دوسرے کے عیوب کا خیال انسان کو اسی وقت آتا ہے جب انسان اپنے آپ سے اور اپنی برائیوں سے بے خبر ہوتا ہے، لیکن جب اپنے عیوب کا استحضار ہوتا ہے اس وقت کبھی دوسرے کی برائی کی طرف خیال نہیں جاتا، دوسرے کی برائی کی طرف اس کی زبان ہی نہیں اُٹھ سکتی۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم نے بڑے اچھے شعر کہے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے ڈھونڈتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے عیوب کا استحضار ہمارے دلوں میں پیدا فرما دے۔ یہ سارا فساد اس سے پیدا ہوتا ہے کہ اپنی طرف دھیان نہیں ہے، یہ خیال نہیں ہے کہ مجھے اپنی قبر میں جا کر سونا ہے،

اس کا خیال نہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے، مگر کبھی اس کی برائی ہو رہی ہے، کبھی اس کی برائی، اس کے اندر فلاں عیب ہے، اس کے اندر فلاں عیب ہے، بس دن رات اس کے اندر پھنسے ہوئے ہیں۔ خدا کے لئے اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

گفتگو کا رخ بدل دو

جن حالات میں جس معاشرے سے ہم لوگ گزر رہے ہیں، اس کے اندر یہ کام ہے تو مشکل، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن اگر اس سے بچنا انسان کے اختیار سے باہر ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو حرام نہ کرتے، اس لئے اس سے بچنا انسان کے اختیار میں ہے، جب کبھی مجلس کے اندر گفتگو کا موضوع تبدیل ہو تو اس کو واپس لے آؤ، اور اگر کبھی غیبت کے اندر مبتلا ہو جاؤ تو فوراً استغفار کرو، اور آئندہ بچنے کے لئے دوبارہ عزم کو تازہ کرو۔

''غیبت'' تمام خرابیوں کی جڑ

یاد رکھو، یہ غیبت ایسی چیز ہے جو فساد پیدا کرنے والی ہے، جھگڑے اس کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں، باہمی نااتفاقیاں اس سے پیدا ہوتی ہیں، اور معاشرے میں اس وقت جو بگاڑ نظر آ رہا ہے، اس میں بہت بڑا دخل اس غیبت کا ہے، اگر کوئی شخص شراب پیتا ہو العیاذ باللہ تو جو شخص ذرا بھی دین سے تعلق رکھنے والا ہے، وہ اس کو بہت بری نگاہ سے دیکھے گا، اور اس کو برا سمجھے گا، اور یہ سوچے گا کہ یہ شخص بری لت کے اندر مبتلا ہے، اور جو شخص مبتلا ہو، وہ خود یہ سوچے گا کہ مجھ سے بڑی غلطی ہو رہی ہے، میں ایک بڑے گناہ کے اندر مبتلا ہوں۔ لیکن ایک شخص غیبت کر رہا ہے تو اس کے بارے میں اتنی برائی کا احساس دل میں پیدا نہیں ہوگا، اور نہ خود غیبت کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ میں کسی بڑے گناہ کے اندر مبتلا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس گناہ کی برائی دلوں میں بیٹھی ہوئی نہیں، اور اس کی حقیقت کا پورے طریقے سے اعتقاد نہیں ہے، ورنہ دونوں گناہوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر اس کو برا سمجھ رہے ہیں، تو اس کو بھی برا سمجھنا چاہئے، اس لئے اس کی برائی دلوں میں پیدا کرو کہ یہ کتنی خطرناک بیماری ہے۔

اشارہ کے ذریعہ غیبت کرنا

ایک مرتبہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے موجود تھیں۔ باتوں باتوں میں اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا ذکر آ گیا۔ اب بتقاضۂ بشری سوکنوں کے اندر آپس میں ذرا سی چشمک ہوا کرتی ہے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا قد ذرا چھوٹا تھا۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کا ذکر

کرتے ہوئے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کردیا کہ وہ چھوٹے قد والی ٹھگنی ہیں۔ زبان سے یہ نہیں کہا کہ وہ ٹھگنی ہیں۔ بلکہ صرف ہاتھ سے اشارہ کردیا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ! آج تم نے ایک ایسا عمل کیا کہ اگر اس عمل کی بو اور اس کا زہر سمندر میں ڈال دیا جائے تو پورے سمندر کو بدبودار اور زہریلا بنادے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ نبی کریم ﷺ نے غیبت کے معمولی اشارے کی کتنی شناعت بیان فرمائی ہے اور پھر فرمایا کہ کوئی شخص مجھے ساری دنیا کی دولت لاکر دیدے تو بھی میں کسی کی نقل اُتارنے کو تیار نہیں، جس میں دوسرے کا استہزاء ہو، جس میں اس کی برائی کا پہلو نکلتا ہو۔(۱)

غیبت سے بچنے کا اہتمام کریں

اب تو نقل اُتارنا فنونِ لطیفہ کے اندر داخل ہے، اور وہ شخص تعریف و توصیف کے کلمات کا مستحق ہوتا ہے جس کو دوسرے کی نقل اُتارنے کا فن آتا ہو، حالانکہ حضورِ اقدس ﷺ یہ فرمارہے ہیں کہ کوئی شخص ساری دنیا کی دولت بھی لاکر دیدے تب بھی میں نقل اُتارنے کو تیار نہیں، اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کتنے اہتمام سے ان باتوں سے روکا ہے۔ مگر ہم لوگوں کو معلوم نہیں کیا ہوگیا کہ ہم شراب پینے کو برا سمجھیں گے، زناکاری کو برا سمجھیں گے، لیکن غیبت کو برا نہیں سمجھتے، اس کو شیرِ مادر سمجھا ہوا ہے۔ کوئی مجلس اس سے خالی نہیں۔ خدا کے لئے اس سے بچنے کا اہتمام کریں۔

غیبت سے بچنے کا طریقہ

اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی برائی ذہن نشین کرکے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یا اللہ! یہ غیبت بڑا سنگین گناہ ہے، میں اس سے بچنا چاہتا ہوں، لیکن مجلسوں میں دوست احباب اور عزیز واقارب سے باتیں کرتے ہوئے غیبت کی باتیں بھی ہوجاتی ہیں، اے اللہ! میں اپنی طرف سے اس بات کا عزم کررہا ہوں کہ آئندہ غیبت نہیں کروں گا، لیکن اس عزم پر قائم اور ثابت رہنا آپ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔ اے اللہ! اپنی رحمت سے مجھے اس کی توفیق عطا فرما، اے اللہ! مجھے ہمت عطا فرما، حوصلہ عطا فرمادیجئے۔ عزم کرکے یہ دعا کریں۔ یہ کام آج ہی کریں۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۴۲٦، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الغيبة، رقم: ٤٢٣٢، مسند أحمد، رقم: ٢٣٨١٦

غیبت سے بچنے کا عزم کریں

دیکھو، جب تک انسان کسی کام کا عزم اور ارادہ نہیں کرلیتا، اس وقت تک دنیا میں کوئی کام نہیں ہوسکتا، اور دوسری طرف شیطان ہر اچھے کام کو ٹلاتا رہتا ہے۔ اچھا یہ کام کل سے شروع کریں گے۔ جب کل آئی تو کوئی عذر پیش آگیا۔ اب کہا کہ اچھا کل سے شروع کریں گے۔ اور وہ کل پھر آتی ہی نہیں۔ جو کام کرنا ہو وہ ابھی کرلو، اس لئے کہ جس کام کو ٹلا دیا، وہ ٹل گیا۔

دیکھئے! اگر کسی کو روزگار نہ مل رہا ہو تو وہ روزگار کے لئے بے چین ہوگا یا نہیں؟ کسی پر اگر قرضہ ہو تو وہ قرضہ ادا کرنے کے لئے بے چین ہوگا یا نہیں؟ اگر کوئی بیمار ہے تو وہ شفا حاصل کرنے تک بے چین ہے یا نہیں؟ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے اندر اس بات کی بے چینی کیوں نہیں کہ ہم سے یہ بری عادت نہیں چھوٹ رہی ہے؟ بے چینی پیدا کرکے دو رکعت صلاۃ الحاجۃ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ میں اس برائی سے بچنا چاہتا ہوں۔ اپنی رحمت سے اس برائی سے بچا لیجئے، اور ہمیں استقامت عطا فرما دیجئے۔ دعا کرنے کے بعد اس بات کا عزم کرکے اپنے اوپر پابندی عائد کریں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس سے کام نہ چلے تو اپنے اوپر جرمانہ مقرر کرلو، مثلاً یہ عزم کریں کہ جب بھی غیبت ہوگی تو دو رکعت نفل پڑھوں گا، یا اتنی رقم صدقہ کروں گا، اس طرح کرنے سے رفتہ رفتہ انشاء اللہ اس سے نجات ہوجائے گی، اور اس بیماری سے نجات حاصل کرنی ہے، اور اس کی بے چینی ایسی ہی پیدا کرنی ہے جیسے بیمار آدمی علاج کرانے کے لئے بے چین ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ بھی ایک بیماری ہے، اور خطرناک ترین بیماری ہے، اور جسمانی بیماری سے زیادہ خطرناک ہے، اس لئے کہ یہ بیماری جہنم کی طرف لے جارہی ہے۔ لہٰذا خود بھی اس سے بچیں، اور اپنے گھر والوں کو بھی بچائیں، اس لئے کہ خاص طور سے خواتین کے اندر یہ وبا بہت زیادہ عام ہے۔ جہاں چار عورتیں بیٹھیں، بس کسی نہ کسی کا ذکر شروع ہوگیا، اور اس میں غیبتیں شروع ہوگئیں۔ اگر خواتین اس پر عمل کرلیں، اور اس گناہ سے بچ جائیں تو گھرانوں کی اصلاح ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے، اور آپ کو بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

''چغلی'' ایک سنگین گناہ

ایک اور گناہ جو غیبت سے ملتا جلتا ہے، اور اتنا ہی سنگین ہے، بلکہ اس سے زیادہ سنگین ہے، وہ ہے ''چغلی'' عربی زبان میں اس کو ''نمیمۃ'' کہتے ہیں۔ اُردو زبان میں ''نمیمۃ'' کا ترجمہ چغلی سے کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ ''نمیمۃ'' کی حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کی کوئی

برائی دوسرے کے سامنے اس نیت سے کی جائے، تاکہ سننے والا اس کو کوئی تکلیف پہنچائے، اور یہ شخص خوش ہو کہ اچھا ہوا اس کو یہ تکلیف پہنچی، یہ ہے نمیمۃ کی تعریف، اور اس میں ضروری نہیں کہ جو برائی اس نے بیان کی ہو، وہ حقیقت میں اس کے اندر موجود ہو، چاہے وہ برائی اس کے اندر موجود ہو، یا نہ ہو، لیکن تم نے محض اس وجہ سے اس کو بیان کیا تاکہ دوسرا شخص اس کو تکلیف پہنچائے، یہ "نمیمۃ" ہے۔

"چغلی" غیبت سے بدتر ہے

قرآن و حدیث میں اس کی بہت زیادہ مذمت بیان کی گئی ہے۔ اور یہ غیبت سے بھی زیادہ شدید اس وجہ سے ہے کہ غیبت میں نیت کا برا ہونا ضروری نہیں کہ جس کی میں غیبت کر رہا ہوں، اس کو کوئی تکلیف اور صدمہ پہنچے، لیکن نمیمہ میں بدنیتی کا ہونا بھی ضروری ہے، اس لئے یہ نمیمہ دو گناہوں کا مجموعہ ہے، ایک تو اس میں غیبت ہے، دوسرے یہ کہ دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچانے کی خواہش اور نیت بھی ہے، اس لئے اس میں دوگنا گناہ ہے، اور اس لئے قرآن و حدیث میں اس پر بڑی سخت وعیدیں آئی ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ﴾(۱)

کافروں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ اس شخص کی طرح چلتے ہیں جو دوسروں کے اُوپر طعنے دیتا ہے، اور چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔

حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ))(۲)

"قتات" یعنی چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا، "قتات" بھی چغل خور کو کہتے ہیں۔

عذابِ قبر کے دو سبب

اور ایک حدیث مشہور ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں ایک جگہ پر دیکھا کہ دو قبریں بنی ہوئی ہیں۔ جب آپ ان قبروں کے

---

(۱) القلم: ۱۱

(۲) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب ما یکرہ من النمیمة، رقم: ۵۵۹۶، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان غلظ تحریم النمیمة، رقم: ۱۵۲، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول اللہ، باب ما جاء فی النمام، رقم: ۱۹۴۹، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب باب فی القتات، رقم: ۴۲۲۸، مسند أحمد، رقم: ۲۲۱۶۳

قریب پہنچے تو آپ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صحابہ کرام سے فرمایا:

((اِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ))

ان دونوں قبر والوں پر عذاب ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ پر عذابِ قبر منکشف فرما دیا تھا۔ یہ عذابِ قبر ایسی چیز ہے کہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جب قبر کے اندر عذاب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور رحمت سے اس عذاب کی آوازیں ہم لوگوں سے چھپالی ہیں، ورنہ اگر اس عذاب کی آوازیں ہم لوگ سننے لگیں تو کوئی انسان زندہ نہ رہ سکے، اور زندگی میں کوئی کام نہ کر سکے، اس لئے یہ اس کی رحمت ہے کہ انہوں نے اس کو چھپا لیا ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے کسی بندے پر اس کو ظاہر بھی فرما دیتے ہیں۔

بہر حال، حضورِ اقدس ﷺ پر منکشف ہوا کہ ان دونوں پر عذاب ہو رہا ہے۔ پھر صحابہ کرام سے پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ان دونوں کو کس وجہ سے عذاب ہو رہا ہے؟ پھر فرمایا: ان کو ایسی دو باتوں کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے کہ ان باتوں سے بچنا ان کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا، اگر یہ لوگ چاہتے تو آسانی سے بچ سکتے تھے، لیکن یہ بچے نہیں، اس کی وجہ سے یہ عذاب ہو رہا ہے۔ ایک یہ کہ ان میں سے ایک صاحب پیشاب کی چھینٹوں سے نہیں بچتے تھے، احتیاط نہیں کرتے تھے، مثلاً ایسی جگہ پر پیشاب کر دیا جس کی وجہ سے جسم پر چھینٹیں آ گئیں۔ خاص طور پر اس زمانے میں اُونٹ بکریاں چرانے کا بہت رواج تھا۔ اور ہر وقت ان جانوروں کے ساتھ رہنا ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر ان کی چھینٹیں پڑ جاتی تھیں۔ اس سے احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے۔ (۱)

پیشاب کی چھینٹوں سے بچئے

یہ بڑی فکر کی بات ہے۔ الحمد للہ، ہمارے یہاں اسلام میں طہارت کے آداب تفصیل کے ساتھ سکھائے ہیں کہ کس طرح طہارت کرنی چاہئے، لیکن آج مغربی تہذیب کے زیرِ اثر ظاہری صفائی ستھرائی کا تو بڑا اہتمام ہے، لیکن طہارتِ شرعیہ کے احکام کی طرف دھیان نہیں۔ بیت الخلاء ایسے طریقوں سے بنائے جاتے ہیں کہ ان میں چھینٹوں سے احتیاط نہیں ہوتی۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب ما جاء فی غسل البول، رقم: ۲۱۱، صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب الدلیل علی نجاسة البول، رقم: ۴۳۹، سنن الترمذی، کتاب الطهارة، باب ما جاء فی التشدید فی البول، رقم: ۶۵، سنن النسائی، کتاب الطهارة، باب التنزه عن البول، رقم: ۳۱، سنن أبی داؤد، کتاب الطهارة، باب الإستبراء من البول، رقم: ۱۹، سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب التشدید فی البول، رقم: ۳۴۱

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اِسْتَنْزِهُوْا عَنِ الْبَوْلِ، فَإِنَّ عَامَّةَ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنْهُ))(۱)

''پیشاب سے بچو، اس لئے کہ اکثر عذابِ قبر پیشاب کی وجہ سے ہوتا ہے''

پیشاب کی چھینٹوں کا جسم پر لگ جانا کپڑوں پر لگ جانے کی وجہ سے عذابِ قبر ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

''چغلی'' سے بچئے

اور دوسرے صاحب کو اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ دوسروں کی چغلی بہت کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس میں حضور اقدس ﷺ نے چغلی کو قبر کے عذاب کا سبب قرار دیا۔ اس لئے یہ چغلی کا عمل غیبت سے بھی زیادہ سخت ہے، اس لئے کہ اس میں بدنیتی سے دوسروں کے سامنے برائی بیان کرتا ہے، تاکہ دوسرا شخص اس کو تکلیف پہنچائے۔

راز فاش کرنا چغلی ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں فرماتے کہ دوسروں کا کوئی راز فاش کر دینا بھی چغلی کے اندر داخل ہے۔ ایک آدمی یہ نہیں چاہتا ہے کہ میری یہ بات دوسروں پر ظاہر ہو، وہ بات اچھی ہو، یا بری ہو، اس سے بحث نہیں، مثلاً ایک مالدار آدمی ہے، اور وہ اپنی دولت دوسروں سے چھپانا چاہتا ہے اور وہ یہ نہیں چاہتا کہ دوسروں کو یہ معلوم ہو کہ میرے پاس اتنی دولت ہے، اب آپ نے کسی طرح سن گن لگا کر پتہ لگا لیا کہ اس کے پاس اتنی دولت ہے۔ اب آپ ہر شخص سے کہتے پھر رہے ہیں کہ اس کے پاس اتنی دولت ہے۔ یہ جو اس کا راز آپ نے افشاء کر دیا، یہ بھی چغلی کے اندر داخل ہے اور حرام ہے۔

یا مثلاً ایک شخص نے اپنے گھریلو معاملات کے اندر کوئی پلان یا منصوبہ بنا رکھا ہے۔ آپ نے کسی طرح پتہ چلا کر دوسروں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہ چغلی ہے۔ اسی طرح کسی کا کسی قسم کا راز ہو، اس کی اجازت کے بغیر دوسروں پر افشا کرنا چغلی کے اندر داخل ہے۔ ایک حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمَجَالِسُ بِالْأَمَانَةِ))(۲)

---

(۱) كنز العمال، رقم: ٢٦٣٦٥ (٣٤٥/٩)، جامع الأحاديث، رقم: ١١٠٠٤ (٣٧٣/١١)، سنن الدارقطني، رقم: ٤٦٩ (٢١/٢)، الترغيب والترهيب، رقم: ٢٥٨ (٨٤/١)

(۲) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في نقل الحديث، رقم: ٤٢٢٦، مسند أحمد، رقم: ١٤١٦٦

مجلسوں کے اندر جو بات کی جاتی ہے، وہ بھی امانت ہے۔ مثلاً کسی شخص نے آپ کو محرمِ راز سمجھ کر راز دار سمجھ کر مجلس میں آپ سے ایک بات کہی۔ اب وہ بات جا کر آپ دوسروں سے نقل کر رہے ہیں، تو یہ امانت میں خیانت ہے۔ اور یہ بھی چغلی کے اندر داخل ہے۔

زبان کے دو اہم گناہ

بہر حال زبان کے گناہوں میں سے آج دو اہم گناہوں کا بیان کرنا مقصود تھا۔ یہ دونوں گناہ بڑے عظیم اور سنگین ہیں۔ ان کی سنگینی آپ نے احادیث کے اندر سنی، لیکن جتنے یہ سنگین ہیں آج ان کی طرف سے اتنی ہی بے پروائی اور غفلت ہے۔ مجلسیں ان سے بھری ہوئی ہیں، گھر ان سے بھرے ہیں، زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔ رکنے کا نام نہیں لیتی۔ خدا کے لئے اس کو لگام دو اور اس کو قابو کرو، اور اس کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق اس کو چلانے کی فکر کرو، ورنہ اس کا انجام یہ ہے کہ اس کی وجہ سے گھر کے گھر تباہ ہو رہے ہیں۔ آپس میں ناچاقیاں ہو رہی ہیں۔ فتنے ہیں، عداوتیں ہیں، دشمنیاں ہیں، خدا جانے کتنے گناہوں اور فتنوں کا ذریعہ ہے، اور آخرت میں تو اس کی وجہ سے جو عذاب ہونے والا ہے، وہ اپنی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحمت سے اس کی شناعت اور قباحت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

غیبت اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

اب تک ''بدنظری'' سے متعلق بیان چل رہا تھا اور اس سے بچنے کی تدبیریں بتائی گئی تھیں، آگے ایک اور باطنی بیماری کا تذکرہ ہے، وہ ہے ''غیبت''، یہ بیماری ایسی ہے کہ شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ اللہ کی توفیق سے بچا ہوا ہو، ورنہ سب لوگ کسی نہ کسی درجے میں اس بیماری میں مبتلا ہیں، اور یہ بیماری اتنی سنگین ہے کہ قرآن کریم نے اس کے لئے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ کسی اور بیماری کے لئے ایسے الفاظ استعمال نہیں کیے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا، أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ﴾(۱)

''تجسس نہ کرو اور تم میں سے بعض لوگ دوسرے بعض کی غیبت نہ کریں، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے، پس تم اس کو ناپسند کرتے ہو''

اس آیت میں غیبت کو مردار بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا۔ ایک تو انسان کا گوشت، اور انسان بھی بھائی، اور بھائی بھی مردہ، کوئی بھی انسان جس کے اندر انسانیت کا ذرہ بھی موجود ہوگا، وہ اس کام کا نہ تو ارتکاب کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچ سکتا ہے، لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ غیبت کرنا بھی ایسا ہے جیسے مردار بھائی کا گوشت کھانا۔ اور یہ ''غیبت'' گناہِ کبیرہ ہے، معمولی گناہ نہیں ہے۔

غیبت کے گناہ کی شدت

یہ غیبت کرنا ایسا ہی گناہ ہے جیسے شراب پینا گناہ ہے، جیسے خنزیر کھانا گناہ ہے، جیسے چوری کرنا

☆ اصلاحی مجالس (۱/۱۲۱ تا ۲۱۲)، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

(۱) الحجرات: ۱۲

اور ڈاکہ ڈالنا گناہ ہے۔ بلکہ غیبت کرنا ان گناہوں سے زیادہ سنگین ہے، کیونکہ شراب پینے اور خنزیر کھانے کا تعلق خالصۃً حقوق اللہ سے ہے، اگر کوئی شخص شراب نوشی کرتا ہے، یا خنزیر کھاتا ہے تو وہ اپنی ذات کا گناہ کرتا ہے، اس کا حقوق العباد سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اگر کبھی اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطا فرمادیں گے تو شراب کا گناہ بھی معاف ہو جائے گا اور خنزیر کھانے کا گناہ بھی معاف ہو جائے گا۔ لیکن غیبت کا گناہ ایسا ہے کہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور حقوق العباد کا اصول یہ ہے کہ یہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک صاحبِ حق معاف نہ کردے، ہزار توبہ استغفار کرتے رہو، نماز روزے کرتے رہو، لیکن یہ معاف نہیں ہوں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنا حق تو معاف کردوں گا، لیکن اگر تم نے کسی بندے کی جان کو نقصان پہنچایا، یا مال کو نقصان پہنچایا، یا اس کی آبرو کو نقصان پہنچایا، یا تم نے اس کی کوئی بھی حق تلفی کی، تو جب تک وہ معاف نہیں کرے گا یا جب تک اس کا حق ادا نہیں کردو گے، میں معاف نہیں کروں گا۔ حقوق العباد کا معاملہ اتنا خطرناک ہے، لیکن ہم نے اس کو اتنا معمولی سمجھ رکھا ہے جیسے ناک پر مکھی آبیٹھی اور اس کو اُڑادیا۔ اور ''غیبت'' بھی حقوق العباد میں سے ہے۔

غیبت کی تعریف

''غیبت'' کسے کہتے ہیں؟ غیبت یہ ہے کہ کسی مسلمان کا تذکرہ اس کی پیٹھ پیچھے اور اس کی غیر موجودگی میں اس انداز سے کیا جائے کہ اگر اس کو پتہ چلے کہ میرا تذکرہ اس انداز سے کیا گیا ہے تو اس کو ناگوار گزرے، تو یہ غیبت ہے اور گناہ ہے۔ اب ہم اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم لوگ صبح سے لے کر شام تک آپس میں جو گفتگو کرتے ہیں، اس میں غیبت ہوتی ہے یا نہیں؟ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں اس کے بارے میں یہ بات جو کہہ رہا ہوں، میں اس کے منہ پر کہہ دوں، اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غیبت تو اس وقت ہوگی جب منہ پر نہ کہہ سکیں، میں تو اس کے منہ پر کہنے کو تیار ہوں۔ ارے بھائی! تم اس کے منہ پر کہنے کو تیار ہو یا نہ ہو، اگر وہ بات اس کی ناگواری کا سبب ہے تو بس غیبت کی تعریف اس پر صادق آگئی اور وہ گناہ ہو گیا، اور تم نے مردار بھائی کا گوشت کھالیا۔ العیاذ باللہ۔

غیبت اور بہتان میں فرق

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میں جس شخص کی غیبت کر رہا ہوں، اس میں وہ بات واقعی موجود ہو، جو میں کہہ رہا ہوں، کیا پھر بھی گناہ ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو بات تم اس کے بارے میں کہہ رہے ہو، وہ بات اس کے اندر موجود

ہے اور تم اس کی سچی برائی بیان کر رہے ہو تو یہ غیبت ہے، اور اگر تم جھوٹی بات بیان کر رہے ہو، اور وہ بات اس کے اندر موجود نہیں ہے تو پھر غیبت کے ساتھ ''بہتان'' لگانے کا گناہ بھی ہوگا۔ (۱)

ایک شخص کے اندر ایک برائی موجود ہے، تم نے ایک مجلس کے اندر اس کی وہ خرابی بیان کر دی، مثلاً تم نے یہ کہہ دیا کہ فلاں آدمی تو بڑا جھوٹا ہے، اور حقیقت میں بھی وہ جھوٹا ہے، تو تمہارا اس کے پیٹھ پیچھے اس کے جھوٹا ہونے کا تذکرہ کرنا غیبت ہے اور گناہ ہے، بشرطیکہ اس کو اپنا جھوٹا کہلوانا ناگوار ہو۔ اور اگر وہ جھوٹا نہیں ہے، پھر بھی تم نے اس کو جھوٹا کہہ دیا، تو اس صورت میں تم نے دو گناہ کیے۔ ایک غیبت کرنے کا گناہ کیا اور ایک بہتان لگانے کا گناہ کیا۔ لہٰذا غیبت بڑا سنگین گناہ ہے، آدمی اپنی زبان کو سنبھال کر رکھے، اور اللہ تعالیٰ سے حفاظت کی توفیق مانگتا رہے تب تو اس گناہ سے بچ سکتا ہے، ورنہ اس گناہ کے اندر مبتلا ہو جائے گا۔

ایک پروفیسر صاحب کا غیبت پر تبصرہ

میں نے ایک مرتبہ غیبت کے بارے میں ایک مضمون لکھا، ایک یونیورسٹی کے پروفیسر صاحب نے وہ مضمون پڑھ کر مجھے ایک خط لکھا کہ آپ نے اس مضمون میں غیبت کی بہت برائی بیان کی کہ یہ غیبت گناہِ کبیرہ ہے، حرام اور ناجائز ہے، اس کو چھوڑنا چاہئے۔ میں نے اس غیبت پر بہت غور کیا، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر ''غیبت'' کو زندگی سے نکال دیں تو یہ زندگی پھیکی ہے، اس میں پھر کوئی مزہ ہی نہیں ہے، اس لئے کہ جب ہم دو چار آدمی مل کر بیٹھتے ہیں اور کوئی بات چیت چلتی ہے تو اس بات چیت میں غیبت شامل نہ ہو تو ہم پھر کس موضوع پر بات چیت کریں؟ بس پھر تو ''اللہ اللہ'' ہی کریں، اور کوئی ہنسی مذاق کی بات، کوئی تفریح کی بات، کوئی دل لگی کی گفتگو تو ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ نے اتنا لمبا چوڑا مضمون لکھا اور اس کی اتنی برائیاں بیان کیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ سب لوگ اپنی تفریح وغیرہ سے دست بردار ہو جائیں اور زندگی کا لطف ہی ختم کر دیں۔ چونکہ وہ پروفیسر صاحب تھے، اس لئے اپنی ذہنی سوچ کے مطابق آخر میں یہ کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ اسلام ایسی چیز کو منع کرے گا جس کو انسان ہر وقت کرتا ہی ہے، اور اگر نہ کرے تو مزہ ہی نہ رہے یہ خط لکھ کر بھیجا۔

میں نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ یہ جو آپ فرما رہے ہیں کہ اگر ''غیبت کو زندگی سے

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البرّ والصلة والآداب، باب تحریم الغیبة، رقم: ٤٦٩٠، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی الغیبة، رقم: ١٨٥٧، سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی الغیبة، رقم: ٤٢٣١، مسند أحمد، رقم: ٨٦٢٥، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب فی الغیبة، رقم: ٢٥٩٨

نکال دیا جائے تو زندگی کا مزہ ہی ختم ہو جائے، تو آپ کی زندگی کا مزہ تو "غیبت" نہ کرنے کی وجہ سے ختم ہو جائے گا، لیکن جب دوسرا شخص آپ کی غیبت کر رہا ہو، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ جب آپ کو پتہ چلے کہ پروفیسر صاحب کے بارے میں فلاں شخص نے فلاں مجلس میں یہ بات کہی، فلاں شخص نے فلاں مجلس میں یہ بات کہی تو اس وقت آپ کو زندگی کا لطف آئے گا یا کیا حال ہوگا؟

اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک معیار رکھو

بات دراصل یہ ہے کہ ہر انسان اپنے لطف اور مزہ کو تو دیکھتا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھتا کہ جو کام میں دوسرے کے ساتھ کر رہا ہوں، اگر دوسرا میرے ساتھ کرے تو مجھ پر کیا گزرے؟ مجھ پر کیا بیتے؟ حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسا کیمیا کا نسخہ بیان فرمادیا کہ ایک پیغمبر ہی ایسا نسخہ بیان کر سکتا ہے، کسی اور کے بس کا کام نہیں۔ اگر اس نسخے پر عمل کر لیا جائے تو معاشرے کے سارے مسائل حل ہو جائیں اور معاشرے کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں، ساری خرابی اس نسخے کو فراموش کرنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے، وہ نسخہ یہ ہے:

((اَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَتَكْرَهَ لَهُمْ مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ))(۱)

"اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو، اور دوسروں کے لئے وہی بات ناگوار سمجھو جس کو تم اپنے لئے ناگوار سمجھتے ہو"

یہ جو ہم نے دوہرے پیمانے بنا رکھے ہیں کہ اپنے لئے پیمانہ کچھ اور ہے اور دوسرے کے لئے کچھ اور ہے، اپنے لئے ترازو اور ہے اور دوسرے کے لئے اور ہے، اس کی وجہ سے معاشرے میں ساری خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ لہٰذا ہر معاملے میں یہ دیکھو کہ میں جو معاملہ دوسرے کے ساتھ کر رہا ہوں، اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا اور وہ میری جگہ پر ہوتا تو میرے اُوپر کیا گزرتی۔ ہر کام کرنے سے پہلے یہ سوچ لے تو کبھی بھی اس سے دوسرے کی حق تلفی نہ ہو اور ناانصافی نہ ہو اور دوسرے کا حق پامال نہ ہو۔

(۱) صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب من الإيمان أن يحب لأخيه ما يحب لنفسه، رقم:۱۲، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من خصال الفطرة أن يحب لأخيه، رقم:٦٤، سنن الترمذی، كتاب الزهد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس، رقم:۲۲۲۷، سنن النسائی، كتاب الإيمان وشرائعه، باب علامة الإيمان، رقم:٤٩٣٠، سنن ابن ماجه، كتاب المقدمة، باب فی الإيمان، رقم:٦٥، مسند أحمد، رقم:۲۱۱۱۳، حديث معاذ بن جبل رضی الله عنه، سنن الدارمی، رقم:۲٦۲۳

لہٰذا غیبت کرتے وقت ذرا یہ سوچو کہ اگر اس کی جگہ میں ہوتا مجلس کے اندر میرا اس انداز سے ذکر ہو رہا ہوتا، اور میرے بارے میں یہ باتیں کہی جارہی ہوتیں جو میں دوسروں کے بارے میں کہہ رہا ہوں، تو مجھے یہ چیز پسند ہوتی یا نہیں؟ اگر پسند نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ "غیبت" ہے اور اس سے بچنا ہے۔

لوگ یہ کہتے ہیں کہ غیبت سے بچا نہیں جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ غیبت اختیار سے ہوتی ہے، غیر اختیاری نہیں ہوتی، اور جب غیبت کرنا اختیار میں ہے تو بچنا بھی اختیار میں ہے، لہٰذا اس سے بچنا ضروری ہے۔

غیبت کی اجازت کے مواقع

البتہ جس موقع پر کسی مسلمان کو نقصان سے بچانا منظور ہو تو اس وقت غیبت جائز ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص آپ کے پاس آیا، اس نے کہا کہ فلاں شخص نے میری بیٹی کے لئے رشتہ بھیجا ہے، آپ کی نظر میں یہ آدمی کیسا ہے؟ اب اگر آپ کی نظر میں اس شخص کی ایسی برائی ہے جو شادی بیاہ کے معاملے میں قابل غور ہوا کرتی ہے، تو اس صورت میں اگر آپ وہ برائی اس کو بتا دیں تا کہ وہ اور اس کی بیٹی نقصان سے بچ جائے تو یہ غیبت میں داخل نہیں۔ یا مثلاً ایک شخص دھوکہ باز ہے اور دھوکہ دے کر لوگوں سے پیسے حاصل کر لیتا ہے۔ اگر آپ کسی کو یہ بتا دیں کہ اس شخص سے ذرا سوچ سمجھ کر معاملہ کرنا، یہ آدمی معاملے کا ٹھیک نہیں ہے، تو یہ غیبت نہیں، اس لئے کہ دوسرے شخص کو نقصان سے بچانا منظور ہے۔

لہٰذا جہاں دوسرے کو تنبیہ کرنے کی ضرورت ہو، اور دوسرے کو دنیا یا آخرت کے نقصان سے بچانے کی ضرورت ہو، وہاں کسی کی واقعی برائی بیان کرنا غیبت میں داخل نہیں، یہ جائز ہے

فاسق اور گناہ گار کی غیبت کرنا

عام طور پر لوگوں میں مشہور ہے کہ جو فاسق و فاجر ہو، اس کی غیبت جائز ہے۔ مطلقاً اس طرح سے یہ بات درست نہیں، بلکہ جس طرح نیک آدمی کی غیبت جائز نہیں اسی طرح سے فاسق و فاجر کی غیبت بھی جائز نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی گناہ کو اس طرح علانیہ کرتا ہے کہ اس گناہ کی اپنی طرف نسبت سے نہیں شرماتا، اور نہ اس کو وہ برا سمجھتا ہے کہ یہ گناہ اس کی طرف منسوب ہو، تو اگر اس گناہ کا ذکر اس کی غیر موجودگی میں کر کے اس کی طرف منسوب کریں تو یہ جائز ہے۔ مثلاً ایک آدمی علانیہ شراب پیتا ہے اور سب کو بتا کر پیتا ہے، اب اگر آپ اس کے پیٹھ پیچھے یہ ذکر کریں کہ فلاں شخص شراب

پیتا ہے، ظاہر ہے کہ آپ کے اس ذکر کرنے سے اس کو کوئی تکلیف اس لئے نہیں ہوگی کہ وہ خود دوسروں کو بتاتا ہے کہ میں شراب پیتا ہوں، لہٰذا یہ غیبت ناجائز نہیں ہے۔ لیکن جس گناہ کو وہ چھپانا چاہتا ہے، اور اس گناہ کا اپنی طرف منسوب ہونے کو برا سمجھتا ہے، اور اس کے ذکر سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے پیٹھ پیچھے اس گناہ کا تذکرہ کرنا ناجائز ہے، چاہے وہ سچی بات ہو، وہ غیبت ہے، اور حرام ہے۔ لہٰذا اگر زبان پر لگام نہ ڈالی جائے تو یہ انسان کو گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اور غیبت جس طرح کرنا جائز نہیں، اسی طرح سننا بھی جائز نہیں۔

دوسروں کا تذکرہ ہی نہ کریں

اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ احتیاط اس میں ہے کہ دوسروں کا تذکرہ ہی مت کرو، نہ اچھائی سے اور نہ برائی سے، کیونکہ جب دوسرے کا ذکر اچھائی سے بھی کرو گے تو شیطان آخر میں برائی کے تذکرے میں مبتلا کر ہی دے گا کہ بھائی! فلاں آدمی تو بڑا اچھا ہے لیکن اس میں ذرا یہ برائی بھی ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ انسان دوسرے کا ذکر ہی نہ کرے۔

اپنی فکر کریں

پھر دوسرے کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، بس اپنی فکر کرو۔ بقول کسی کے ؎

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جس کو اپنے عیوب کی فکر ہو وہ دوسروں کے عیوب کہاں تلاش کرے گا۔ جو خود بیمار ہو اور اس کے پیٹ میں درد ہو رہا ہو، وہ دوسروں کی بیماریوں کی کہاں فکر کرے گا۔ جب انسان اپنی فکر میں پڑ جاتا ہے کہ میں کس عیب کے اندر مبتلا ہوں، میرے اندر کیا خرابی ہے، اس کی کس طرح اصلاح کروں اور کس طرح اس کا تدارک کروں تو پھر اس سے دوسرے کی غیبت نہیں ہوتی۔ بہادر شاہ ظفر نے بڑے اچھے اشعار کہے۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے ڈھونڈتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

جب اپنی برائی پر نظر پڑی تو پتہ چلا کہ کوئی برا نہیں ہے، سب سے برا میں ہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے نفس کے عیوب پر نگاہ ڈالنے کی اور ان کے ادراک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

غیبت کا ایک عملی علاج

بہرحال، غیبت کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کی تشریح عرض کرتا ہوں۔ حضرت والا نے فرمایا:

> ''سالک کے سامنے کوئی غیبت یا لایعنی کلام کرے اور اس کو منع کرنے پر قدرت نہ ہو تو خود اُٹھ جانا چاہئے اور اس کی دل شکنی کا خیال نہ کرے، کیونکہ دوسرے کی دل شکنی سے اپنی دین شکنی زیادہ قابلِ احتراز ہے، یوں اگر نہ اُٹھ سکے تو کسی بہانہ سے اُٹھ جائے یا قصداً فی الفور مباح تذکرہ شروع کردیا جائے تاکہ وہ قطع ہوجائے۔''(۱)

جیسا کہ ابھی بتایا کہ غیبت جس طرح کرنا ناجائز ہے، اسی طرح سننا بھی ناجائز ہے۔ لہٰذا اگر مجلس میں غیبت شروع ہوگئی تو اب کیا کیا جائے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ اگر منع کرنے پر قدرت ہے تو روک دے، روکنے کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ تو یہ ہے کہ صاف صاف کہہ دے کہ دیکھو اس طرح تذکرہ کرنے سے غیبت ہوجائے گی، چھوڑو اس تذکرے کو۔ اور اگر اس طرح نہیں کہہ سکتے تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خود موضوعِ کلام بدل دے اور کوئی اور بات چھیڑ دے تاکہ وہ قصہ ختم ہوجائے۔ اور اگر ان دونوں طریقوں پر قدرت نہ ہو تو وہاں سے اُٹھ جائے، اس مجلس میں نہ بیٹھے۔

دل شکنی کی پرواہ نہ کرے

آگے ایک اصول بیان فرمادیا کہ اس کی دل شکنی کا خیال نہ کرے، کیونکہ دوسرے کی دل شکنی سے اپنی دین شکنی زیادہ قابلِ احتراز ہے۔ ہمارے ہاں افراط اور تفریط حد درجے کی ہے۔ ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ حقوق العباد کی پرواہ ہی نہیں، جس کا جو حق چاہا مارلیا، چاہے وہ جانی حق ہو یا مالی حق ہو۔ اور دوسری طرف یہ ہے کہ اگر کسی کو حقوق العباد کا خیال ہے تو وہ اس درجہ اس کے اندر آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں اپنے فرائضِ شرعیہ کے اندر کوتاہی کرنا شروع کردیتا ہے۔

وقت پر نماز پڑھنا فرض ہے

چنانچہ ایک ڈاکٹر صاحب تھے، ان کی بیوی نے مجھ سے بتایا کہ میرے شوہر ویسے تو بہت اچھے ہیں، لیکن مطب کے اوقات میں نماز نہیں پڑھتے۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ مطب کے اوقات کے

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص ۱۴۹

دوران جب نماز کا وقت آئے تو نماز پڑھ لیا کرو، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ میں تو لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں اور یہ حقوق العباد میں سے ہے، مطب میں مریض بیٹھے ہوں اور میں اپنی نماز شروع کردوں؟ چنانچہ وہ مطلب بند کر کے رات کو جب گھر آتے ہیں تو عصر، مغرب اور عشاء تینوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں تو خدمتِ خلق کرتا ہوں، اور خدمتِ خلق کے دوران نمازیں قضا ہو جائیں تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

بھائی! خدمتِ خلق تم پر اس طرح فرضِ عین نہیں جس طرح نماز فرضِ عین ہے۔ دوسرے اس خدمتِ خلق کے ساتھ نماز کا کوئی تعارض بھی نہیں ہے۔ اگر تم عصر کی چار رکعت پڑھ کر دوبارہ مریضوں کو دیکھنا شروع کردو تو اس میں کیا تکلیف ہوگی؟ لہٰذا نفس نے نمازیں قضا کرنے کا ایک بہانہ تلاش کرلیا کہ خدمتِ خلق ہو رہی ہے۔ یہ سب افراط اور تفریط ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دین کی صحیح فہم اور سمجھ نہیں۔ اسی لئے حضرت فرماتے ہیں کہ دوسرے کی دل شکنی سے بچنے کی خاطر اپنے دین کو توڑ دینا ٹھیک نہیں۔ لہٰذا یہ خیال کرنا کہ میں اگر اس کو غیبت سے روکوں گا تو اس کا دل برا ہوگا، یا میں اُٹھ کر چلا جاؤں گا تو اس کا دل برا ہوگا، یاد رکھئے! اگر معصیت سے بچنے کے نتیجے میں دوسرے کا دل برا ہوتا ہے تو ہونے دو، اس کی پرواہ ہی مت کرو۔ تم اس حد تک مکلف ہو کہ جائز حدود میں رہ کر اس کی دل شکنی سے بچو، لیکن جہاں دل شکنی سے بچنے کے لئے کسی گناہ کا ارتکاب کرنا پڑے تو پھر دل ٹوٹتا ہے تو ٹوٹنے دو، اس کی پرواہ نہ کرو۔

دوسروں کی دنیا بنانے والا

ایک حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دوسرے کو دنیا کا فائدہ پہنچانے کے لئے اپنی آخرت خراب کرے تو اللہ تعالیٰ اس دوسرے شخص کو دنیا ہی میں اس پر مسلط کر دیتے ہیں کہ تو نے اس کی دنیا کی خاطر اپنی آخرت خراب کی تھی، اب یہ تیری دنیا کو بھی خراب کرے گا۔ جو لوگ بیوی بچوں کو آرام اور راحت پہنچانے کی خاطر حرام آمدنی میں مبتلا ہوتے ہیں تو تجربہ یہ ہے کہ وہی بچے اس باپ کے سر پر جوتے بجاتے ہیں، اس لئے کہ اس نے بیوی بچوں کو راضی کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا، اور ان کی دنیا بنانے کے لئے اپنی آخرت خراب کی، تو پھر دنیا کے اندر ہی ان کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے دوسرے کی دل شکنی سے بچنے کے لئے اپنی دین شکنی مت کرو۔

غیبت سے بچنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے

ایک اور حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ))(۱)

''کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کرنی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی نوبت آجائے''

اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے نہ کسی کی بات ماننے کی ضرورت ہے اور نہ مخلوق کی دلداری کی اجازت ہے۔ یاد رکھئے! کوئی کام محنت کے بغیر نہیں ہوتا، ہر کام میں کچھ نہ کچھ محنت اور مشقت اُٹھانی پڑتی ہے، تب جا کر وہ کام انجام پاتا ہے، لہٰذا اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ غیبت کرنا برا کام ہے اور گناہ کا کام ہے، اور تم یہ سمجھتے ہو کہ اس سے آخرت تباہ ہو رہی ہے تو پھر محنت اور مشقت اور اپنی ہمت کو استعمال کرنا پڑے گا۔ جب اپنی ہمت کو استعمال کرو گے تو اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے اور پھر اس گناہ سے بچنا آسان ہو جائے گا۔

ناجائز غیبت کی شرط ناگواری ہے

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا:

''اگر کسی کو بنا بر بے تکلفی ایسی بات کہی جائے جو بنظرِ الفاظ تو ناگواری کی بات ہے، مگر بنظرِ بے تکلفی یا تعلق یا بطور مزاح ہونے کے ناگواری کا خیال نہیں۔ (تو آیا یہ بھی ناجائز اور غیبت میں داخل ہے یا نہیں؟)''(۲)

مطلب ان سوال کرنے والے کا یہ تھا کہ کچھ لوگوں سے بے تکلف تعلقات ہوتے ہیں، دوستی ہے، آپس میں ہنسی مذاق ہے، اور ایک دوسرے کو کچھ باتیں ہنسی مذاق میں کہہ دیتے ہیں، اب اگر اس کی غیر موجودگی میں بے تکلفی کے انداز کا اس کا اس طرح ذکر کر دیا جائے کہ اس کے الفاظ تو بظاہر ایسے ہیں کہ جب دوسرا سنے تو اس کو ناگوار ہو کہ میرے بارے میں ایسے الفاظ کہے، لیکن تعلقات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کے ساتھ بے تکلف دوستی ہے، رشتہ داری ہے، تو آیا ایسے الفاظ کہنا جائز ہیں یا نہیں، یہ الفاظ غیبت میں داخل ہیں یا نہیں؟ جواب میں حضرت والا نے فرمایا:

''جب وہ ناگواری ہے، خواہ کسی بھی حیثیت سے ہو، وہ ممانعت کے لئے کافی ہے، اور اگر خود ناگواری میں تردّد ہے تب بھی واجب الکف ہے، البتہ اگر عدم ناگواری یقینی ہو تو غیبت کی حد سے خارج ہو گیا''

(۱) مسند أحمد، رقم: ۱۰۴۱ (۲) انفاسِ عیسیٰ، ص ۱۳۹

حضرت والا کے اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کا مکمل سو فیصد یقین ہو کہ جس کے بارے میں میں یہ بات کہہ رہا ہوں وہ اگر یہ سنے گا تو اس کو میرا یہ جملہ اور فقرہ اور یہ الفاظ ناگوار نہیں ہوں گے، وہ ان کو برا نہیں سمجھے گا، کیونکہ تعلق کی نوعیت ایسی ہے تو اس صورت میں وہ الفاظ غیبت میں داخل نہیں۔ مثلاً اپنے کسی دوست سے کہا کہ تو بڑا بے وفا ہے، پھر بعد میں کسی مجلس میں اس دوست کا تذکرہ آیا تو اس نے کہا کہ اس بے وفا کا کیا اعتبار۔ اب لفظ ''بے وفا'' ایسا لفظ ہے کہ کسی اجنبی کو کہیں گے تو اس کو ناگواری بھی ہو سکتی ہے، لیکن دوستی میں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو عموماً ناگوار نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر اس بات کا یقین ہے کہ جب میرا دوست یہ سنے گا کہ میں نے اس کے بارے میں یہ بات کہی تھی تو اس کو ناگوار نہیں ہوگا تو یہ غیبت میں داخل نہیں۔ لیکن اگر ناگوار ہونے کا شبہ ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ ناگوار ہوگا اور یہ بھی احتمال ہے کہ ناگوار نہیں ہوگا تو اس کو ناجائز ہی سمجھیں گے۔

ایسا ہنسی مذاق جائز نہیں

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بعض اوقات دوستوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک دوست تو بے تکلفی میں دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہا ہے، اور اس کا مقصد دوسرے کو ستانا اور تکلیف پہنچانا نہیں ہے، لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہنسی مذاق کو پوری طرح برداشت نہیں کر پاتے اور اس پر وہ چڑتے ہیں اور ان کو ناگواری ہوتی ہے۔ لیکن دوست احباب ایسے شخص کو چڑانے کے لئے اس سے اور زیادہ ہنسی مذاق کرتے ہیں اور اس سے مزہ لیتے ہیں، تو اگرچہ دوست احباب اس کو بے تکلفی میں وہ الفاظ کہہ رہے ہیں، لیکن چونکہ اس کو تمہاری یہ بے تکلفی ناگوار ہو رہی ہے تو یہ ہنسی مذاق بھی جائز نہیں، کیونکہ کسی مسلمان کو ناگواری پہنچانا جائز نہیں۔ لہٰذا ایسے آدمی سے اس طرح گفتگو کرنا جو اس کی دل شکنی کا باعث ہو، یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

لیکن اگر یہ یقین ہے کہ فلاں سے ایسی بے تکلفی کی دوستی ہے کہ وہ برا نہیں مانے گا بلکہ اس کو اچھا لگے گا، اور اس کو اس سے تکلیف نہ ہوگی، تو ایسے موقع پر اس کے سامنے بھی ایسے الفاظ کہنا جائز ہے اور پیٹھ پیچھے کہنا بھی جائز ہے۔ خلاصہ یہ کہ تین صورتیں ہوئیں:

(۱) اگر ناگواری کا یقین ہو تو ایسے الفاظ کہنا ناجائز ہے۔

(۲) اگر ناگواری کا شبہ ہو تو بھی ناجائز ہے۔

(۳) اگر یہ یقین ہو کہ اس کو ناگوار نہیں ہوگا تو جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں غیبت سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔

غیبت سے بچنے کا طریقہ

حضرت والا نے غیبت سے بچنے کے لئے ایک اصول ارشاد فرمایا، وہ یہ ہے:

''بے سوچے ہرگز کوئی کلام نہ کیا جائے، اگرچہ بعض اوقات یہ بھی نہ یاد رہے گا کہ سوچ کر بولوں، مگر خیال رکھنے سے اکثر اوقات یاد رہے گا کہ سوچ کر بولوں، پھر انشاء اللہ ذھول نہ ہوگا، پس جب سوچ کر بولا جائے تو ہر کلام سے پہلے یہ سوچ لینا چاہئے کہ اس کلام سے گناہ تو نہ ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ اس سے بہت کچھ اصلاح ہوجائے گی''(۱)

یعنی بے سوچے سمجھے بولنے کی جو عادت پڑی ہوئی ہے، اس کو ختم کرو، بولو تو سوچ کر بولو، اور یہ سوچو کہ جو کلمہ میں زبان سے نکالنا چاہتا ہوں، وہ کہیں مجھے گناہ میں اور اللہ کی نافرمانی میں مبتلا نہ کردے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''قُلْ خَيْرًا وَإِلَّا فَاصْمُتْ''

''یا تو بھلائی کی بات کہو ورنہ خاموش رہو''

خاموش رہنا ہزار درجہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ آدمی فضول باتیں کرتا پھرے جو اس کے لئے عذابِ جہنم کا باعث ہوں۔

جہنم میں اوندھے منہ ڈالنے والی

حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((هَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ))(۲)

یعنی لوگوں کو جہنم میں اوندھے منہ گرانے والی چیز ان کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات ہوں گے، العیاذ باللہ۔

یہ زبان سرکاری مشین ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے عطا فرمادی ہے، جب سے پیدا ہوئے اس وقت سے یہ مشین چل رہی ہے اور مرتے دم تک چلتی رہے گی، نہ اس میں تیل ڈالنے کی ضرورت، نہ اس کی سروس کرانے کی ضرورت، نہ اس کی مرمت کرانے کی ضرورت، مگر یہ کام کررہی

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۴۹

(۲) سنن الترمذي، كتاب الإيمان عن رسول الله، باب ما جاء في حرمة الصلاة، رقم: ۲۵٤۱، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب كف اللسان في الفتنة، رقم: ۳۹٦۳، مسند أحمد، رقم: ۲۱۰۰۸

ہے، اور اس طرح کام کر رہی ہے کہ جیسے ہی ذہن میں ایک بات آئی کہ یہ بات زبان سے ادا کروں، بس فوراً وہ بات زبان کے ذریعہ باہر آجاتی ہے، گویا کہ آٹومیٹک مشین ہے۔ اس نعمت کی ہمیں قدر اس لئے نہیں ہے کہ یہ نعمت بچپن سے ہمارے ساتھ ہے اور کام دے رہی ہے، اور اس کے حصول کے لئے کوئی روپیہ پیسہ خرچ نہیں کرنا پڑا، اور کوئی محنت نہیں اُٹھانی پڑی، اس لئے اس کی قدر نہیں۔

زبان کی قدر کریں

اس کی قدر ان لوگوں سے پوچھئے جن کی گویائی کی قوت سلب ہو چکی ہے کہ وہ کس عذاب کے اندر مبتلا ہیں؟ جن لوگوں کی فالج کی وجہ سے زبان بند ہو جاتی ہے، وہ بات کہنا چاہتے ہیں، اپنی بیوی بچوں سے، اپنے ماں باپ سے، اپنے بھائی سے، اپنے دوست سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، لیکن قوتِ گویائی نہیں ہے، بول نہیں سکتے۔ بعض اوقات اپنا سر پیٹ لیتے ہیں کہ میں کہنا چاہتا ہوں، میں اپنے دل کی بات اس کو کیسے سمجھاؤں، اس وقت پتہ چلتا ہے کہ اس زبان کی گویائی کی کیا قیمت ہے۔ خدا نہ کرے، اگر ہم میں سے کسی کی گویائی دو منٹ کے لئے بند ہو جائے، اور بولنے کی طاقت نہ رہے، اور دوسرا شخص کہے کہ تمہارے بولنے کی طاقت تمہیں واپس نہیں مل سکتی، پہلے اس کے لئے تمہیں خرچ کرنا پڑے گا تو لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا تاکہ مجھے یہ قوتِ گویائی واپس مل جائے۔ اب اس وقت یہ گویائی مفت ملی ہوئی ہے، اور یہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے، اور انسان اس کو جابجا استعمال کر رہا ہے، اور اس کے ذریعہ حلال اور حرام ایک کر رکھے ہیں، کوئی فکر نہیں۔

دو عظیم کلمے

شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ سرکاری مشین تمہیں مفت ملی ہوئی ہے اور کام دینے والی مفید چیز ہے تو اس کو فائدے کے کاموں میں استعمال کرو اور حرام کاموں سے اس کو بچاؤ۔ اگر انسان اس سے فائدہ اُٹھانا چاہے تو اس کا فائدہ بھی بڑا عظیم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر ایک مرتبہ زبان سے "سبحان اللہ" کہہ دیا یا "الحمد للہ" کہہ دیا تو میزانِ عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے۔ بخاری شریف کے ختم کے موقع پر آپ یہ حدیث سنتے ہیں:

((كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِى الْمِيْزَانِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ))(۱)

"دو کلمے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بڑے محبوب ہیں۔ جن کا زبان سے ادا کرنا بہت

(۱) صحيح البخاری، كتاب الدعوات، باب فضل التسبيح، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

آسان ہے، ایک لمحے میں ادا ہو جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی یہاں میزانِ عمل میں بڑے بھاری ہیں، وہ دو کلمے یہ ہیں:

((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ))

لہٰذا اگر انسان اس زبان کو صحیح استعمال کر لیں، تو جنت کی نعمتوں کے ڈھیر لگا سکتا ہے۔ چلتے چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے انسان اس زبان کو اللہ کے ذکر سے تر رکھے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ سے سوال کیا کہ سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ آپ نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل عمل یہ ہے کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے۔(۱)

چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے اللہ کا ذکر کرتے رہو گے تو تمہارے نامۂ اعمال میں اضافہ ہوتا رہے گا، نیکیوں کے ڈھیر لگتے رہیں گے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و ثواب کا خزانہ اکٹھا ہوتا رہے گا۔

اسلام میں داخل کرنے والی چیز

یہی زبان ہے جو انسان کو کفر سے نکال کر اسلام میں داخل کر دیتی ہے، ایک ستر برس کے کافر کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دے دی اور اس نے زبان سے "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کہہ دیا تو وہ ستر برس کا کافر جہنم کے ساتویں طبقے سے نکل کر ایک لمحے میں جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا۔ یہ کس کی بدولت ہوا؟ اس زبان کی بدولت ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس زبان میں یہ تاثیر رکھی ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص کی ساری عمر کفر میں، فسق و فجور میں اور بداعمالیوں میں گزری، آخر میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دے دی اور اس نے کلمہ شہادت پڑھ لیا۔ کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اب اگر کلمہ شہادت پڑھنے سے ذرا دیر پہلے انتقال ہو جاتا تو سیدھا جہنم میں جاتا، لیکن جب اس کلمہ کے پڑھنے کے بعد انتقال ہوا تو سیدھا جنت میں چلا گیا۔ اس کلمہ نے اس کو جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رقم: ۵۹۲۷، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والإستغفار، باب فضل التهليل والتسبيح والدعاء، رقم: ٤٨٦٠، سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما جاء فی فضل التسبیح والتکبیر والتهلیل والتحمید، رقم: ٣٣٨٩، سنن ابن ماجه، کتاب الأدب، باب فضل التسبیح، رقم: ٣٧٩٦، مسند أحمد، رقم: ٦٨٧٠

(١) سنن الترمذی، باب ما جاء فی فضل الذکر، رقم: ٣٧٢٠ (٢٦٨/١٢)

زبان کا فائدہ اور نقصان دونوں عظیم ہیں

لہٰذا اگر چاہو تو اس زبان کے ذریعہ آخرت کا ذخیرہ جمع کر لو۔ تلاوت کے ذریعہ، ذکر و تسبیح کے ذریعہ، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے ذریعہ، شکر کے ذریعہ اور کسی مسلمان بھائی کا دل خوش کرنے کے ذریعہ آخرت کے لئے ذخیرہ جمع کر لو۔ کیونکہ زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکالنا جس سے دوسرے مسلمان بھائی کا دل خوش ہو جائے، یہ بھی صدقہ ہے۔ اور اگر زبان کو غلط استعمال کیا جائے تو اس کا نقصان بھی بہت ہے، جیسا کہ پہلے یہ حدیث سنائی کہ لوگوں کو جہنم میں اوندھے منہ گرانے والی چیز اس زبان کے کرتوت ہوں گے، کیونکہ جھوٹ یہ بول رہی ہے، غیبت یہ کر رہی ہے، دل آزاری یہ کر رہی ہے، فحش کلامی یہ کر رہی ہے، اور یہ سب کام انسان کو جہنم کے اندر اوندھے منہ گرانے والے ہیں۔ لہٰذا جب اس زبان کا فائدہ بھی عظیم ہے اور نقصان بھی عظیم ہے تو عافیت اور نجات کا راستہ یہی ہے کہ آدمی سوچ سمجھ کر زبان کو استعمال کرے۔ اسی لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب کوئی کلمہ بولو، تو بولنے سے پہلے سوچو کہ یہ کلمہ مجھے جنت میں لے جا رہا ہے یا جہنم میں لے جا رہا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب سے پہلے خاموش رہنا

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص آ کر ان سے سوال کرتا تو بعض اوقات امام صاحب دیر تک خاموش رہتے، کوئی جواب نہ دیتے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! اتنی دیر ہو گئی، آپ کچھ بول ہی نہیں رہے، کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں! جواب میں فرمایا:

"حَتّٰی اَعْرِفَ اَنَّ الْفَضْلَ فِی السُّکُوْتِ اَوْ فِی الْکَلَامِ"

''میں اس لئے خاموش ہوں کہ پہلے یہ دیکھ لوں کہ خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے یا بولنا زیادہ بہتر ہے''

لہٰذا پہلے تول رہے ہیں کہ اب جو کلمہ بولوں گا، یہ میرے لئے فائدہ مند ہو گا یا نقصان دہ ہو گا۔ پہلے تولو پھر بولو۔ جو کلمہ زبان سے نکالو، تول کر نکالو کہ یہ کلمہ کیسا ہے اور کتنا ہے؟ اور اس سے مجھے فائدہ پہنچے گا یا نقصان پہنچے گا؟

زبان کی حفاظت پر جنت کی ضمانت

اسی لئے حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ يَضْمَنْ لِي مَا بَيْنَ لِحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ))(۱)

جو شخص مجھے دو چیزوں کی ضمانت دیدے، میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ کونسی دو چیزیں؟ ایک وہ چیز جو جبڑوں کے درمیان ہے یعنی زبان، اس کی ضمانت دیدے کہ وہ اس کو غلط استعمال نہیں کرے گا۔ اور ایک وہ چیز جو ٹانگوں کے درمیان ہے یعنی شرمگاہ، کہ اس کو غلط استعمال نہیں کرے گا، میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

لہٰذا یہ نہ ہو کہ یہ سرکاری مشین مفت میں مل گئی ہے تو اب صبح سے شام تک قینچی کی طرح چل رہی ہے اور رکنے کا نام نہیں لتی، جو منہ میں آرہا ہے بک رہے ہیں، کوئی سوچ و فکر نہیں۔ یہ حالت ٹھیک نہیں، بلکہ بولنے سے پہلے سوچو کہ جو بات میں منہ سے نکالنے والا ہوں وہ فائدہ پہنچائے گی یا نقصان پہنچائے گی؟ اس کے بعد زبان سے بات نکالو۔

فضول گوئی پر دو طالب علموں کا واقعہ

دہلی میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ ان کی نازک مزاجی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ دو طالب علم ان سے بیعت ہونے کے لئے بلخ سے آئے۔ بلخ افغانستان کا ایک شہر ہے۔ وہاں انہوں نے یہ سنا کہ دہلی میں یہ بڑے بزرگ اور اللہ والے ہیں، تو دل میں خیال آیا کہ ان سے بیعت ہونا چاہئے۔ چنانچہ بلخ سے طویل سفر کر کے دہلی پہنچے، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کی مسجد میں پہنچے، نماز کا وقت قریب تھا اس لئے حوض پر بیٹھ کر دونوں وضو کرنے لگے، وضو کرتے وقت آپس میں باتیں کرنے لگے کہ یہ حوض بڑا ہے یا ہمارے بلخ کی مسجد کا حوض بڑا ہے؟ ایک نے کہا کہ یہ حوض بڑا ہے، دوسرے نے کہا: وہ بڑا ہے، اور آپس میں بحث ہونے لگی۔ حضرت مرزا صاحب نے وہاں سے گزرتے ہوئے ان کی گفتگو سن لی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ ہم بلخ سے آئے ہیں۔ حضرت والا نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟ کہا کہ ہم آپ کے دستِ مبارک پر بیعت ہونے آئے ہیں۔ حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بیعت ہونے تو آپ آئے ہیں، لیکن کیا اس کا فیصلہ ہوگیا کہ یہ حوض بڑا ہے یا بلخ کا حوض بڑا ہے؟ اب دونوں خاموش، شرمندہ ہو رہے تھے کہ حضرت والا نے ہماری گفتگو سن لی۔ حضرت والا نے فرمایا کہ ابھی فیصلہ نہیں ہوا تو ایسا کرو کہ بیعت تو تم بعد میں ہونا، پہلے بلخ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان، رقم: ۵۹۹۳، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء فی حفظ اللسان، رقم: ۲۳۳۲، مسند أحمد، رقم: ۲۱۷۵۷، مؤطا مالك، الكتاب الجامع، باب ما جاء فيما يخاف من اللسان، رقم: ۱۵۶۶

جاؤ اور اس حوض کو ناپ کر آؤ، اور واپس آکر پھر اس حوض کو ناپو، اور پھر فیصلہ کرو کہ کونسا حوض بڑا ہے اور کونسا حوض چھوٹا ہے، اس کے بعد بیعت ہونا۔

کیونکہ تمہاری بحث اور گفتگو سے پتہ چلا کہ تمہاری گفتگو میں اوّل تو تحقیق نہیں، احتیاط نہیں، ایک نے ناپے تولے بغیر یہ دعویٰ کر دیا کہ یہ حوض بڑا ہے، اور دوسرے نے یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ حوض بڑا ہے، اور آپس میں بحث شروع کر دی، اس سے معلوم ہوا کہ طبیعت میں احتیاط نہیں۔ دوسرے یہ کہ بیکار اور بے فائدہ گفتگو کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اگر یہ پتہ چل جاتا کہ یہ بڑا ہے یا وہ بڑا ہے تو اس سے دنیا یا آخرت کا کیا فائدہ حاصل ہوتا؟ لہٰذا واپس بلخ جاؤ اور وہ حوض ناپ کر آؤ۔ اس کے بغیر بیعت نہیں کروں گا۔

علاج کا فائدہ

پہلے زمانے میں ایسے ہی علاج ہوا کرتے تھے۔ اب یہ علاج تو بڑا سخت اور کڑوا ہوا، لیکن ساری زندگی کے لئے یہ علاج کافی ہو گیا ہوگا۔ پھر اس کے بعد ساری عمر بلا تحقیق اور بے فائدہ بات زبان سے نہیں نکلی ہوگی۔ بہر حال، اس طرح کے علاج ہوتے تھے۔ یہ نہیں کہ ذکر و تسبیحات بتا دیں اور اب بیٹھے ہوئے وظیفے کر رہے ہیں، بس وظیفہ گھونٹنے سے ہی کامل بن گئے، بلکہ اس طرح رگڑے دیے جاتے تھے، تب جا کر اصلاح ہوتی تھی۔

علاج سخت ہونے پر اشکال اور جواب

یہ واقعہ سنا کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان طلبہ نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ ایک غلط کام کیا، اگر غلط کام نہ کر رہے ہوتے تو پھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی، یہ طلبہ اسی لئے تو آئے تھے کہ اپنی اصلاح کرائیں، اگر پہلے سے کامل ہوتے اور زبان قابو میں ہوتی، خیالات قابو میں ہوتے، تو شیخ کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ لہٰذا اس غلطی پر شیخ نے بیعت کرنے سے کیوں انکار کر دیا؟ پہلے بیعت کر لیتے اور پھر علاج کرتے۔

پھر خود ہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس اشکال کا جواب دیا کہ یہاں دو باتیں ہیں: پہلی بات یہ ہے کہ اس انکار سے یہ بتلانا منظور ہے کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ طالب، سالک اور مرید کو پہلے سے ان کا دھیان اور ان کی فکر ہونی چاہئے۔ شیخ سے فائدہ اسی وقت ہوتا ہے کہ جب مرید نے پہلے سے بڑے بڑے امور کا دھیان اور خیال کیا ہوا ہے، البتہ جو دقائق اور باریک باتیں ہیں، ان کی اصلاح شیخ سے کرانی ہے، اس وجہ سے شیخ بیعت کرنے سے انکار کر دیتا ہے کہ تمہیں ابھی بیعت نہیں کرنا ہے۔

ہر شخص کا علاج علیحدہ ہوتا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی شیخ کے قلب پر وارد فرماتے ہیں کہ اس شخص کے ساتھ اس وقت کیا معاملہ کرنا ہے۔ ہر آدمی کا علاج الگ ہوتا ہے۔ کسی کا علاج تھپڑ مارنے سے ہوجاتا ہے، کسی کا علاج ڈانٹ دینے سے ہوجاتا ہے، کسی کا علاج پیار کرنے سے ہوتا ہے، کسی کا علاج چمکارنے سے ہوجاتا ہے، اور کسی کا علاج صرف ایک نظر دیکھ لینے سے ہوجاتا ہے۔ اب اللہ جل جلالہ شیخ کے دل پر یہ وارد فرماتے ہیں کہ اس کے لئے اس وقت کیا چیز فائدہ مند ہے۔ دوسرا آدمی دیکھ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ شیخ صاحب نے کچھ زیادتی کردی، لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح اسی میں رکھی ہے۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل

ہم نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے طرزِ عمل میں یہ چیز بارہا مشاہدہ کی، حالانکہ وہ انتہائی نرم خو آدمی تھے، غصہ تو نہ ہونے کے برابر تھا، ہر ایک کے ساتھ نرمی اور تحمل سے پیش آتے تھے، تواضع اور انکساری کے ساتھ ملتے، لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ اچانک کسی شخص پر چھوٹی سی بات پر شدید غصہ ہوجاتے، اب ظاہر بین کو یہ دیکھ کر شبہ ہوتا کہ انہوں نے اس شخص پر زیادتی کی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نیک بندوں کے قلب پر وارد فرماتے ہیں کہ کس شخص کے ساتھ کس وقت کیا معاملہ کرنا ہے۔

ایک صاحب کو ڈانٹنے کا واقعہ

چنانچہ ان کا ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ ایک بڑے صاحبِ حیثیت، پڑھے لکھے مشہور آدمی، والد صاحب سے ملاقات کے لئے آگئے۔ بات چیت کرنی شروع کی، ابھی دو تین جملے ہی کہے تھے کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو شدید ڈانٹنا شروع کردیا، میں بھی حیران ہوگیا کہ آج تک کبھی کسی کو اس طرح نہیں ڈانٹا، یہاں تک کہ ان سے یہ کہہ دیا کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ چنانچہ ان کو دفتر سے نکال دیا۔ آج تک میں نے ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ یا اللہ! یہ شخص تو کام سے گیا، اس لئے کہ تعلیم یافتہ آدمی ہے، کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہے، ڈاڑھی بھی برائے نام ہے، اور حضرت والد صاحبؒ نے اس کو ڈانٹ دیا، اب ہمیشہ کے لئے یہ شخص متنفر ہوکر جائے گا۔ اسی آدمی نے بعد میں خود اپنی زبان سے مجھے کہا کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس دن کی ڈانٹ نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی اور میرے اوپر اس ڈانٹ نے ایسا اثر کیا کہ میرا مرکزِ توجہ ہی بدل گیا۔

بہر حال، اللہ تعالیٰ ہی اپنے نیک بندوں کے دلوں پر یہ القاء فرماتے ہیں کہ کس کے ساتھ کس وقت کیا معاملہ کرنا چاہئے۔ کسی اللہ والے کے طرزِ عمل پر شبہ مت کرو کہ کسی شخص کو ڈانٹ رہے ہیں، کسی کو پھٹکار رہے ہیں، اور کسی سے محبت سے پیش آرہے ہیں۔ کیونکہ معطی حقیقی اور مبدأ فیاض تو اللہ تعالیٰ ہیں، شیخ تو ایک واسطہ ہوتا ہے، وہی شیخ کے دل میں ڈالتے ہیں کہ اس کی اصلاح کا کیا طریقہ مناسب ہوگا، ہر ایک کو ایک ہی نسخہ نہیں پلایا جاتا۔ اس لئے کبھی ان اللہ والوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔

لہٰذا حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے ان دو طالب علموں کو یہ سزا دی کہ واپس بلخ جاؤ اور وہاں کا حوض ناپ کر آؤ۔ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ ان کا علاج یہی ہے۔ ایک مرتبہ جب چوٹ لگ جائے گی تو ساری عمر کے لئے کارآمد ہو جائے گی، چنانچہ کارآمد ہوگئی۔ اور اس سے حضرت مرزا صاحب نے ان کو یہ سبق دیا کہ تم زبان کو احتیاط سے استعمال نہیں کرتے اور احتیاط ضروری ہے۔

پہلے سوچو پھر بولو

اور اس احتیاط کرنے کا طریقہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتا دیا کہ پہلے سوچو کہ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس میں حدود سے تجاوز تو نہیں ہے؟ اس میں جھوٹ تو شامل نہیں ہے؟ اس میں مبالغہ تو نہیں ہے؟ بے احتیاطی تو نہیں ہے؟

آج بہت سے فسادات اور جھگڑے صرف اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ ایک شخص نے بے سوچے سمجھے اِدھر کی بات اُدھر کہہ دی، تحقیق کی نہیں اور صحیح طور پر یاد رکھا نہیں، بس اس ایک بات کی وجہ سے خاندان میں فسادات کھڑے ہوگئے۔ لہٰذا پہلے سوچو کہ کیا بات کہی گئی ہے؟ کتنی مقدار میں کہی گئی ہے؟ اگر آگے نقل کرنی ہے تو بس اتنی ہی نقل کرو، اپنی طرف سے اس میں اضافہ نہ کرو۔

حضرت فرماتے ہیں کہ چونکہ زبان کو تو ہر وقت چلنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، وہ رکنے کا تو نام نہیں لیتی، تو انسان ہر وقت کس طرح سوچے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ ہر کام مشق کرنے سے ہوتا ہے، لہٰذا مشق کرو، اور شروع میں تو سوچنے کا خیال ہی نہیں آئے گا، لیکن سوچنے کا تھوڑا سا اہتمام کرو تو رفتہ رفتہ عادت پڑ جائے گی۔ اگر شروع میں سوچنا بھول جاؤ، تو جب یاد آئے اس وقت سوچو، پھر یاد آئے، پھر سوچو، اس طرح کرتے کرتے سوچنے کی عادت پڑ جائے گی، پھر بے تکلف سوچنا آئے گا، اور سوچنے کے لئے کسی خاص اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ پھر جو بات نکالو گے بالکل درست نکلے گی۔ غیبت، جھوٹ اور دل آزاری سب سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے۔

غیبت کو جائز کرنے کے لئے نفس کی تاویل

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا:

"میرا نفس مجھے یہ تاویل سکھاتا ہے کہ تیری بھی تو لوگ غیبت کرتے ہیں، قیامت میں جب پکڑ ہوگی تو اپنے مغتابین (غیبت کرنے والوں) سے جو اجر ملے گا وہ اجر جن کی تو نے غیبت کی، ان کو دے دیا جائے گا"(۱)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو آدمی کسی کی غیبت کرے تو اس کا اجر اس کو دے دیا جاتا ہے۔ ایک حدیث شریف ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کی غیبت کی گئی۔ اس لئے میرے دماغ میں یہ بات آتی ہے کہ میری بھی لوگ غیبت کرتے ہیں اور میں بھی کرتا ہوں۔ جو لوگ میری غیبت کرتے ہیں ان کا اجر مجھے ملتا ہے، میں دوسروں کی غیبت کرتا ہوں تو میرا اجر ان کو مل جاتا ہے، لہٰذا معاملہ برابر سرابر ہوگیا، اس لئے زیادہ پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس تاویل کا جواب

جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اوّل تو یہ کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ وہ اجر جو دوسروں سے ملا ہوا ہے اس کے تدارک کے لئے کافی ہے، ممکن ہے کہ یہ دوسروں سے ملا ہوا اجر تمہارے ہی پاس رہے، اور خاص تمہارے اعمال کا اجر اہل حقوق کو ملے اور نجات کے لئے دوسروں کا اجر کافی نہ ہو۔ دوسرے اس سے قطع نظر کرکے مساوات کی کوئی دلیل نہیں، ممکن ہے کہ تم کو کم ملے اور تم سے زیادہ لے لیا جائے تو تدارک کے لئے کیسے کافی ہو جائے گا؟"(۲)

یعنی تمہارے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ تمہیں جو اجر مغتابین سے حاصل ہوا ہے، وہی دوسروں کے پاس جائے گا، یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تمہاری نمازیں، تمہارے روزے، تمہاری تلاوت، تمہارا ذکر وغیرہ وہ سب تمہاری غیبت کے بدولت دوسروں کے پاس چلے جائیں اور دوسروں کا اجر تمہارے پاس آجائے۔ دوسرے تمہارے پاس مساوات کی بھی کوئی دلیل نہیں کہ جتنا اجر تمہیں ملا ہے، اتنا ہی اجر دوسروں کے پاس جائے گا، ممکن ہے کہ تمہیں کم اجر ملے اور تم سے زیادہ لے لیا جائے۔

(۱) انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۰ (۲) انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۰

یہ سب شیطانی تاویلات ہیں

یہ سب شیطان کی تاویلیں ہیں، جو انسان کو غلط کاموں میں مبتلا کرنے کے لئے دل میں ڈالتا ہے کہ ایسا کرلو، اور اس طرح معاملہ سیدھا ہو جائے گا۔

جب آخرت میں اجر وثواب کا معاملہ ہوگا اور اپنا اجر وثواب دوسروں کے پاس جائے گا تو اس وقت پتہ چلے گا کہ یہ کتنی زبردست دھوکے کی تاویل تھی، اچھے خاصے نیک اعمال کیے، نمازیں پڑھیں، روزے اور تلاوت کے ساتھ رمضان المبارک گزارا، اعتکاف کرنے کی توفیق ہوئی، رات بھر جاگ جاگ کر عبادات اور نوافل ادا کرتے رہے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ سارے اعمال دوسروں کے قبضے میں جا رہے ہیں اور جو کچھ کیا کرایا تھا وہ سب دوسروں کے پاس چلا گیا۔ اس وقت جو حسرت اور تکلیف ہوگی، اس کا کوئی علاج نہیں۔ لہٰذا یہ سوچنا کہ آخرت میں حساب برابر ہو جائے گا، یہ خیال اور سوچ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، آمین۔

غیبت کا علاج ہمت اور استحضار ہے

آگے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''غیبت'' ایک اختیاری امر ہے، اس کا طریق علاج ہمت و استحضار ہے اور معین طریق یہ ہے کہ جب ایک بار ایسا ہو جائے ایک وقت فاقہ کرے''(۱)

سب سے پہلے یہ فرمایا کہ غیبت اپنے اختیار سے ہوتی ہے، کبھی بے اختیار نہیں ہوتی، اگر غیبت بے اختیار ہوتی تو حرام نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا کام حرام نہیں کیا جس سے بچنا انسان کے اختیار میں نہ ہو۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾(۲)

لہٰذا غیبت سے بچنا اختیار میں تو ہے، البتہ اس سے بچنے کے لئے ہمت اور استحضار کی ضرورت ہے۔ یہ ہمت کرلے کہ میں یہ گناہ نہیں کروں گا، زبان سے غلط بات نہیں نکالوں گا۔ اور اس بات کا استحضار کرے کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے، کتنا بڑا گناہ ہے اور اس کے نتیجے میں اپنے اچھے اعمال دوسروں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ ان چیزوں کا استحضار کرے۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۰ (۲) البقرة: ۲۸۶

غیبت پر اپنے نفس کو سزا دینا

آگے فرمایا کہ اس سے بچنے میں یہ چیز معاون ہو جاتی ہے کہ آدمی یہ طے کر لے کہ اگر آئندہ غیبت ہوگی تو اپنے آپ کو یہ سزا دوں گا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ وہ سزا نہ تو اتنی معمولی ہو کہ آدمی کو اس کی پرواہ ہی نہ ہو، جیسے میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ جب ''علی گڑھ کالج'' قائم ہوا تو اس وقت یہ قانون تھا کہ تمام طلبہ کو نماز پڑھنا لازم ہے، اور نماز چھوڑنے پر جرمانہ مقرر تھا کہ جو طالب علم نماز چھوڑے فی نماز دو آنے ادا کرے۔ اب ہوتا یہ تھا کہ بہت سے طالب علم ایسے بھی تھے جو مہینہ بھر کا جرمانہ اکٹھا شروع میں جمع کرا دیا کرتے تھے۔ چونکہ جرمانہ ایسا تھا کہ اس کو ادا کرنے میں کوئی خاص مشقت نہیں تھی، اس لئے اس جرمانہ لگانے سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ جرمانہ ایسا ہونا چاہئے جس سے کچھ مشقت ہو اور وہ جرمانہ اتنا بھی سخت نہ ہو کہ آدمی اس کو برداشت نہ کر پائے اور پھر آدمی اصل عمل سے بھی جائے اور جرمانہ سے بھی جائے، لہٰذا جرمانہ درمیانہ درجے کا ہونا چاہئے۔

غیبت کرنے پر نفس کو فاقہ کرانا

لہٰذا کسی کے حق میں مالی جرمانہ فائدہ مند ہوتا ہے کہ جب کبھی مجھ سے یہ فعل سرزد ہوگا تو میں اتنے پیسے صدقہ کروں گا۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جن پر صدقہ کرنا بڑا شاق ہوتا ہے، کیونکہ اس سے بھی انسان کے نفس کو سزا ملتی ہے۔ اور جن لوگوں کو پیسوں کی پرواہ نہیں ہوتی، انہیں چاہئے کہ وہ اپنے اوپر ایسا جرمانہ عائد کریں جس سے ان پر تھوڑی مشقت ہو۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں یہ جرمانہ بیان فرمایا کہ آدمی یہ طے کر لے کہ اگر مجھ سے غیبت ہوگی تو ایک وقت کا فاقہ کروں گا، کھانا نہیں کھاؤں گا، بلکہ بھوک ہڑتال کروں گا۔ آج کل لوگوں نے بھوک ہڑتال کا اُلٹا طریقہ نکالا ہے کہ جب دوسرے پر دباؤ ڈالنا مقصود ہوتا ہے تو لوگ بھوک ہڑتال کرتے ہیں۔ اگر دوسرا شخص دباؤ قبول نہ کرے تو بھوک کی وجہ سے مر جائے۔ یہ طریقہ تو درست نہیں۔ حضرت والا نے جو طریقہ بیان فرمایا ہے وہ انسان کے اپنے اوپر دباؤ ڈالنے کے لئے بیان فرمایا کہ میں اس لئے فاقہ کر رہا ہوں تاکہ مجھ سے آئندہ غیبت سرزد نہ ہو، اور جب کبھی غیبت ہوگی تو اپنے نفس کو فاقے کی سزا دوں گا۔ اور یہ فاقہ ایسی چیز ہے کہ اگر انسان اس پر عمل کرے تو چند دن میں علاج ہو جائے گا اور غیبت چھوٹ جائے گی۔

دوسروں کے عیوب ظاہر کرنے کا حکم

ایک صاحب نے حضرت والا سے سوال کیا:

''بعض لوگ جو گناہِ کبیرہ میں مبتلا ہیں، ان کے عیوب اور گناہ کو ظاہر کرنا غیبت ہے یا نہیں؟ نفس اس تاویل پر ہمیشہ آمادہ رہتا ہے کہ ایسوں کے عیوب اگر لوگوں پر ظاہر نہ کیے جائیں تو لوگوں کو دھوکا ہوگا اور مسلمانوں کو دھوکہ سے بچانا ضروری ہے''(۱)

یعنی دوسروں کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ فلاں فلاں عیب میں مبتلا ہیں، اس عیب کی خبر لوگوں کو ہونی چاہئے تاکہ وہ اس سے دھوکہ نہ کھائیں، تو آیا ایسے آدمی کی غیبت کریں یا نہ کریں؟

مبتدی جائز غیبت بھی نہ کرے

جن صاحب نے یہ سوال کیا تھا وہ ابھی نئے نئے اس طریق میں داخل ہوئے تھے اور اپنی اصلاح کے لئے حاضر ہوئے تھے اور ابتداء ہی تھی کہ انہوں نے یہ سوال کرلیا۔ چنانچہ حضرت نے جواب تحریر فرمایا:

''یہ سوال قابل ہے، مبتدی کو جائز غیبت بھی نہ کرنی چاہئے''(۲)

یعنی جو مبتدی ابھی اپنی اصلاح کرانے کے لئے چلا ہے اور ابھی اس نے اصلاح کے لئے قدم بڑھایا ہے، ابھی تو اس کے نفس کی تہذیب ہونی ہے، اس کو چاہئے کہ وہ جائز غیبت بھی نہ کرے۔

یہ وہی بات ہے جس کو حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال سے سمجھایا تھا کہ جیسے ایک کاغذ کو ایک طرف موڑ دیا جائے، پھر اس کو اگر سیدھا کرنا چاہو گے تو یہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کے سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اُلٹی طرف موڑو، جب اُلٹی طرف موڑو گے تو یہ سیدھا ہو جائے گا۔ اسی طرح انسان کا نفس بھی اُلٹی طرف مڑا ہوا ہے، اس کو ناجائز غیبت کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس عادت کو چھڑانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ شروع میں جائز غیبت بھی چھوڑے، پھر یہ نفس سیدھا ہو جائے گا، اور آئندہ صرف جائز غیبت ہی سرزد ہوگی، ناجائز غیبت سرزد نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

انفعالی کیفیت کے تقاضے پر عمل

ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا:

''اگر کوئی شخص میری بے جا غیبت کرتا ہے تو بشرطِ اطلاع اس شخص سے دل میں کدورت بلکہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے''(۳)

(۱) انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۰ (۲) انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۰ (۳) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۰

یعنی جب مجھے پتہ چل جائے کہ فلاں شخص نے پیٹھ پیچھے میری برائی کی تھی تو اس شخص سے دل میں تکدر پیدا ہو جاتا ہے بلکہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے، یعنی طبیعت میں اس کے خلاف غصہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ ان صاحب کا حضرت والا کو یہ حال لکھنے کا منشا یہ تھا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو ٹھیک، اور اگر یہ غلط اور قابلِ اصلاح بات ہے تو پھر اس کا علاج ہو جائے۔

جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

> ''یہ دونوں کیفیتیں اِنفعال ہیں، اور انفعالات غیر اختیاری ہوتے ہیں، اور غیر اختیاری پر ذم واثم نہیں (یعنی مذمت اور گناہ نہیں) البتہ ان کے مقتضیات کہ اس کی غیبت کرنے لگے اور اس کو ایذاء پہنچانے لگے ومثل ذالک، یہ افعال ہیں، اور افعال اختیاری ہوتے ہیں، اور ان میں سے بعض پر ذم واثم بھی ہوتا ہے، پس جب یہ کیفیات انفعالیہ حادث ہوں (یعنی پیدا ہوں) ان کے مقتضیات فعلیہ پر عمل نہ کیا جائے اور ان کے ازالے کی دعا کی جائے، یا اللہ! میرے یہ خیالات میرے دل سے نکل جائیں تاکہ مفضی الی الافعال نہ ہو جائیں، اور اپنے عیوب و ذنوب کا استحضار کیا جائے تاکہ اس کا جزم ہو جائے کہ میں تو اس شخص کی بدگوئی سے بھی زیادہ کا مستحق ہوں، اور افعال پر عقوبت کا بھی استحضار کیا جائے تاکہ داعیہ افعال کا مضمحل ہو جائے، اور ایک ہفتہ کے بعد پھر اطلاع دی جائے''(۱)

برائی کا خیال دل میں آنا

اس ملفوظ میں حضرت والا نے ایک اصول بھی بیان فرمادیا اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ بھی بیان فرمادیا، اور مختصر لفظوں میں معاملے کی حقیقت پوری طرح واضح فرمادی۔ یہ بڑی کام کی بات ہے جو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بیان فرمائی ہے۔

وہ یہ کہ کسی برائی کا خیال خود بخود دل میں آجانا یہ ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، انسان کے اختیار کو اس میں دخل نہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر گرفت بھی نہیں ہے، گناہ بھی نہیں، یہاں تک کہ اگر شدید گناہ بلکہ (العیاذ باللہ) کفر و شرک کا خیال بھی دل میں آجائے، لیکن یہ خیال خود بخود آئے، تو محض اس خیال کا آجانا نہ تو موجب ملامت ہے یعنی وہ آدمی اس پر ملامت کا مستحق نہیں، نہ وہ سزا کا مستحق ہے، اور نہ ہی اس کا فعل گناہ ہے، کیونکہ غیر اختیاری طور پر یہ خیال اس کے دل میں آیا ہے۔

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۰

کیفیت انفعالیہ گناہ نہیں

اسی طرح کسی شخص کے کوئی عمل کرنے کے نتیجے میں دل کے اندر اگر کوئی تغیر پیدا ہوا جس کو ''انفعال'' کہا جاتا ہے۔ ''انفعال'' کا مطلب ہے کسی دوسرے کا اثر قبول کرنے کے نتیجے میں دل میں ایک حالت کا پیدا ہونا۔ مثلاً دوسرے نے گالی دی، اس کے نتیجے میں طبیعت کے اندر ایک جوش پیدا ہوا، اور غصہ آیا کہ اس نے مجھے گالی دی اور میرے خاندان کو برا کہا، اس غصہ اور جوش کے پیدا ہونے کو ''انفعال'' کہا جاتا ہے۔ یہ ''انفعال'' غیر اختیاری کیفیت ہے اور انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس لئے گناہ بھی نہیں۔

اس کے مقتضیات پر عمل گناہ ہے

بعض اللہ والے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے نفس کو اتنا کچل چکے ہوتے ہیں کہ ان کو غصہ آتا ہی نہیں، دوسرے شخص نے برا بھلا کہہ دیا، لیکن اس سے طبیعت میں کوئی تغیر اور تأثر نہیں ہوا۔ یہ خاص بندے ہوتے ہیں، ریاضتوں اور مجاہدوں کے نتیجے میں ان کا نفس کچلا جا چکا ہوتا ہے۔

لیکن یہاں عام انسان کی بات ہو رہی ہے۔ جب ایک عام انسان کو برا بھلا کہا جائے گا، یا گالی دی جائے گی، تو اس کے نتیجے میں اس کے اندر تأثر پیدا ہوگا، یہ تأثر کوئی گناہ نہیں، اور نہ ہی اس پر سزا ہے، نہ اس پر ملامت ہے، نہ اس پر مؤاخذہ ہے۔ لیکن جو تأثر پیدا ہوا، اگر تأثر کا مظاہرہ کر دیا، مثلاً کسی نے گالی دیتے ہوئے کہا کہ تو خبیث ہے، آپ نے جواب دیا کہ ''تو خبیث تیرا باپ خبیث'' اس جواب دینے میں غصہ پر عمل کرتے ہوئے حد سے تجاوز کر گئے، تو صرف غصہ آنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں تھا، کدورت پیدا ہونے پر کوئی مؤاخذہ نہیں تھا، بلکہ اس کدورت اور غصے کے نتیجے میں اگر برابر کا بدلہ لے لیتے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا، انشاء اللہ، لیکن جب بدلہ لینے میں ایک انچ آگے بڑھ گئے، تو بس اب پکڑ ہو گئی۔ کیونکہ جب آدمی اپنے غصے کے تقاضے پر عمل کرتا ہے تو اکثر و بیشتر حدود پر نہیں رہتا، بلکہ حدود سے متجاوز ہو جاتا ہے، یہ حد سے تجاوز کرنا بڑا خطرناک ہے، کیونکہ یہ اختیاری ہے اور اس پر آخرت میں پکڑ ہو جائے گی۔

معاف کرنے میں عافیت ہے

مثلاً اگر کسی نے آپ کو ایک مُکا مار دیا، اب بدلہ لیتے ہوئے تول کر مُکا مارنا کہ جتنی زور سے اس نے مُکا مارا تھا، اتنا ہی زور کا مُکا میں بھی ماروں، اس میں زیادتی نہ ہو جائے، اگر ترازو لے کر

مارے گا تبھی ایسا کر سکے گا، ورنہ انسان کے بس میں نہیں کہ برابری کر سکے۔ اسی لئے اللہ کے نیک بندے کو جب کوئی مارتا ہے تو وہ بدلہ نہیں لیتے، اور وہ معاف کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں، کیونکہ اگر ذرا بھی حد سے تجاوز کر گئے تو پکڑے جائیں گے۔

بزرگوں کے مختلف رنگ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ارواحِ ثلاثہ'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ کسی شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ حضرت! یہ جو اللہ والے ہوتے ہیں ان کے الوان (رنگ) مختلف ہوتے ہیں، کسی کا کوئی رنگ ہے، کسی کا کوئی رنگ ہے، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ بزرگوں کے کیا کیا رنگ ہوتے ہیں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ ارے بھائی چھوڑو، کس چکر میں پڑ گئے، مگر وہ صاحب ان بزرگ کے پیچھے ہی پڑ گئے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا ایسا کرو کہ فلاں گاؤں کی مسجد میں جاؤ، اس مسجد میں تمہیں تین بزرگ عبادت کرتے ہوئے نظر آئیں گے، تم پیچھے سے جا کر تینوں کو ایک ایک مُکا مار دینا اور پھر مجھے آ کر بتانا کہ کیا ہوا۔ چنانچہ وہ صاحب اس گاؤں کی مسجد میں پہنچے تو دیکھا کہ واقعۃً تین بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے جا کر پہلے ایک کو مُکا مارا، پھر دوسرے کو مارا، پھر تیسرے کو مارا۔ اور جب واپس آئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ ہاں بھائی، کیا معاملہ پیش آیا؟

ان صاحب نے جواب دیا کہ واقعۃً بڑا عجیب معاملہ ہوا، وہ یہ کہ جب میں نے پہلے بزرگ کے مُکا مارا تو انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا، بلکہ اپنے ذکر و اذکار میں لگے رہے۔ جب دوسرے کو مارا تو انہوں نے مڑ کر ایک مُکا مجھے بھی مار دیا۔ جب تیسرے کو مُکا مارا تو وہ مڑ کر میرا ہاتھ دبانے لگے کہ تمہارے ہاتھ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ پھر ان بزرگ نے فرمایا کہ تم جو یہ کہہ رہے تھے کہ مجھے اولیاء اللہ کے رنگ دکھائیں تو یہ مختلف رنگ تھے جو تم نے دیکھے۔

منزل کھوٹی ہوگی

پہلے بزرگ کا یہ رنگ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد میں لگے ہوئے ہیں، اگر اس دوران ایک شخص آ کر مُکا مار گیا تو کونسی قیامت آ گئی؟ اب اگر میں منہ موڑ کر دیکھوں کہ کون مارنے والا ہے اور کیوں مارا؟ اور پھر اس سے بدلہ لینے کی فکر کروں تو اس سے میری یہ منزل کھوٹی ہوگی، اور جس کام میں میں لگا ہوا ہوں اس میں خلل واقع ہوگا، اس لئے انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کون مار رہا ہے۔ یہ ایک رنگ تھا۔

شفقت کی بنیاد پر بدلہ

اور جن بزرگ نے پلٹ کر مُکّا مارا اور بدلہ لے لیا، تو یہ بتاؤ کہ انہوں نے جو مُکّا مارا وہ اتنا ہی زور کا مُکّا مارا جتنا زور کا تم نے مارا تھا یا زیادہ زور سے مارا؟ ان صاحب نے جواب دیا کہ اتنا ہی زور کا مارا تھا۔ فرمایا کہ یہ دوسرا رنگ ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے بدلہ لینے کی اجازت دی ہے، اس لئے بدلہ لے لیا۔ اور بعض اوقات بدلہ لینا بھی اللہ والوں کی طرف سے شفقت کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اوقات کسی اللہ والے کو ستایا جائے اور اس ستانے کے نتیجے میں وہ صبر کرے، تو اس صبر کا نتیجہ بعض اوقات اس تکلیف دینے والے کے حق میں بہت برا ہوتا ہے۔ (العیاذ باللہ) کیونکہ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ))(۱)

''جو شخص میرے کسی ولی کو ستائے تو اس کو میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے''

بہر حال، اس لئے ان بزرگ نے بدلہ لے لیا۔ یہ دوسرا رنگ تھا۔

تیسرا رنگ

تیسرے بزرگ کا یہ رنگ تھا کہ بھائی! ہمیں کیا چوٹ لگی، جس نے ہمیں مارا ہے، کہیں اس کو ہماری کمر سے تکلیف نہ پہنچ گئی ہو، اس لئے اس مارنے والے کا ہاتھ سہلانے لگے۔ بہر حال، بزرگوں کے یہ مختلف الوان تھے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی دوسرے کے فعل پر تمہیں جو غصہ آیا، اور تمہارے دل میں کدورت پیدا ہوئی، یہ کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اگر اس غصے کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے حد سے تجاوز ہو گیا تو یہ قابلِ مؤاخذہ ہے، اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ بدلہ ہی نہ لو، بلکہ معاف کر دو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہیں اجر بھی ملے گا اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔

اس خیال کو جمنے مت دو

لہٰذا دل میں جو انفعال کی کیفیت اور اثر پیدا ہوا اس پر کچھ مؤاخذہ تو نہیں ہے، لیکن اگر یہ تأثر زیادہ دیر تک دل میں بیٹھ جائے اور جم جائے، تو بالآخر یہ تأثر انسان کو کبھی نہ کبھی گناہ کے اندر مبتلا کر ہی

(۱) جامع العلوم والحکم، ابن رجب الحنبلی (۳۵۷/۱)، معارج القبول، حافظ بن احمد حکمی (۱۰۰۱/۳)

دیتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ "حسد" کا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو آپ نے بڑھتا چڑھتا دیکھا، اب آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ تو مجھ سے آگے بڑھ گیا، میں آگے بڑھتا تو اچھا تھا، اس کے پاس پیسہ زیادہ آگیا، اس کا مکان میرے مکان سے زیادہ بڑا، اس کی گاڑی زیادہ خوبصورت، اس کی شہرت مجھ سے زیادہ ہے، اس کی تعریف کرنے والے مجھ سے زیادہ، اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔ اور اس کے ساتھ غیر اختیاری طور پر دل میں یہ خیال بھی آگیا کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے اور مجھے مل جائے۔ اس حد تک بھی یہ عمل حرام نہیں۔

ورنہ یہ خیال گناہ میں مبتلا کر دے گا

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب یہ خیال دل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں کوئی نہ کوئی ایسا فعل سرزد ہو جاتا ہے جو اس شخص کی بدخواہی پر مشتمل ہوتا ہے جس سے وہ حسد کرتا ہے، مثلاً اس کے لئے بددعا کردی کہ یا اللہ! اس کی یہ دولت چھن جائے، یا کوئی ایسی تدبیر کرلی جس کے نتیجے میں اس کو نقصان پہنچے، یا لوگوں کے سامنے اس کا ذکر اس انداز سے کردیا جس سے لوگوں کے دلوں میں اس کی بے عزتی ہو، یا کوئی بھی ایسا کام کرلیا جس سے اپنے دل کے اس جذبے کو تسکین دینا مقصود ہو، تو یہ سب کام بالاتفاق حرام ہیں۔ لہٰذا صرف خیال کا آجانا بذاتِ خود حرام نہیں تھا، لیکن جب وہ خیال دل میں جم گیا اور اس خیال کے مطابق عمل کرلیا تو اب یہ حرام ہو گیا۔

غیر اختیاری خیال کا علاج

لہٰذا یہ غیر اختیاری خیال جو دل میں آیا ہے، چاہے وہ خیال "حسد" کا ہو یا "تکدر" کا ہو یا "غصہ" کا ہو، اس کا بھی علاج کرنا ضروری ہے، کیونکہ اگر تم نے اس غیر اختیاری خیال کا علاج نہیں کیا تو یہ تمہیں مار دے گا، گرا دے گا۔ اب اس کا علاج کیا ہے؟ اس کا علاج یہ ہے کہ پہلے اس خیال کو دل سے برا سمجھو کہ جو خیال میرے دل میں آرہا ہے یہ بہت غلط خیال ہے، میرے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہئے۔ مثلاً میرے دل میں یہ جو خیال آرہا ہے کہ فلاں شخص سے یہ نعمت چھن جائے اور مجھے مل جائے، یہ برا خیال ہے۔ یا مثلاً میرے دل میں فلاں کی طرف سے تکدر پیدا ہو رہا ہے کہ فلاں شخص بہت برا آدمی ہے، یہ اچھی بات نہیں۔ اور اس وقت اپنے اندر جو عیوب ہیں، ان کا استحضار کرو کہ میرے اندر کیا عیب ہیں؟ اس نے تو غیبت کرتے ہوئے میرے بارے میں ایک کلمہ کہا تھا، حقیقت میں تو میں اس سے زیادہ کا مستحق تھا۔

پہلا علاج دعا کرنا

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! میرے دل میں جو خیال پیدا ہو رہا ہے، کہیں میرا یہ خیال کسی ایسے فعل پر آمادہ نہ کر دے جو حرام ہو، اور اس کے نتیجے میں میں ہلاک ہو جاؤں۔ یا اللہ! میرے دل سے اس خیال کو نکال دیجئے۔ اس خیال کا اس طریقے سے علاج کرنا ضروری ہے اور اگر تم اس خیال کا اس طرح سے علاج نہیں کرو گے، بلکہ اس خیال کو اسی طرح چھوڑ دو گے تو وہ خیال دل میں جمتا چلا جائے گا اور کسی نہ کسی وقت وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے گا۔ لہٰذا اس خیال کو برا سمجھو اور اس کو ختم کرنے کی فکر کرو۔ اور اگر دوسرے کی طرف سے حسد پیدا ہو رہا ہے تو ایسی تدبیریں اختیار کرو جو تقاضۂ حسد کے اُلٹ ہوں۔ مثلاً دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ فلاں شخص ذلیل ہو جائے، لیکن تم دل پر پتھر رکھ کر یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو عزت عطا فرما۔ یا مثلاً دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ لوگ اس کی برائی کریں اور لوگوں کی نظروں میں یہ حقیر ہو جائے، لیکن تم اس کے لئے یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو لوگوں کی نظروں میں مقبول بنا دے۔ دعا کے یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے وقت حاسد کے دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن اس بیماری کا علاج یہ آرے چلانا ہی ہے۔ اسی طرح اگر دوسرے کی طرف سے دل میں تکدر پیدا ہو رہا ہے تو اس کا بھی یہی علاج ہے کہ اپنے اس تکدر کو برا سمجھے۔

دوسرا علاج، عذاب کا استحضار

آخر میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''افعال پر عقوبت کا استحضار کیا جائے'' یعنی میرے دل میں جو تکدر پیدا ہو رہا ہے اگر اس تکدر نے آگے بڑھ کر مجھ سے کوئی گناہ کا کام کرا لیا، مثلاً غیبت کرا لی یا دوسرے کی بدخواہی کا کام کرا لیا تو اس گناہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب ہو گا وہ عذاب کتنا سخت ہے۔ یہ عقوبت کا استحضار کیوں کرے؟ ''تاکہ داعیہ افعال کا مضمحل ہو جائے'' یعنی دل میں جو یہ خیال آ رہا ہے کہ میں اس کے خلاف کوئی کام کر گزروں، یہ خیال کمزور ہو جائے۔

ایک ہفتہ کے بعد اطلاع دو

پھر آخر میں حضرت نے فرمایا کہ ''ایک ہفتہ کے بعد پھر اطلاع دی جائے'' کیونکہ معالج تو یہ دیکھتا ہے کہ اس دوا سے کتنا فائدہ ہوا، اگر فائدہ ہوا تو ٹھیک، ورنہ بدل کر دوسری دوا دی جائے، اس لئے کہ بعض اوقات پہلے سے زیادہ کڑوی دوا دینی پڑتی ہے، اس لئے صرف ایک مرتبہ شیخ سے رہنمائی لینا کافی نہیں۔ لہٰذا حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے جو بیان فرمایا وہ اصول کے درجے میں تو درست ہے، لیکن

مختلف حضرات کے لحاظ سے یہ علاج کسی کے لئے کارآمد ہو جائے گا اور دوسرے کے لئے مزید کسی علاج معالجے کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا کوئی شخص یہ اصولی علاج پڑھ کر یہ نہ سمجھے کہ میں نے یہ اصول پڑھ لیا اور علم حاصل ہو گیا، اور اب میں خود ہی اس پر عمل کرلوں گا اور اپنے آپ کو اس گناہ سے بچا لوں گا، شیخ کی ضرورت ہی نہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ شیخ کی پھر بھی ضرورت ہے، اگرچہ تمہیں علم حاصل ہو گیا، لیکن ایک ہفتہ کے بعد شیخ کو اطلاع دینا کہ اس علاج سے کتنا فائدہ ہوا، اس کے بعد شیخ فیصلہ کرے گا کہ یہ علاج کافی ہے یا نہیں؟ اور مزید دوا کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

غیبت کی معافی کا طریقہ

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اگر کسی کی غیبت ہوگئی تو استغفار کے ساتھ مغتاب سے بھی معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔ لیکن تفصیل غیبت کی اس کو بتلانا اس کو ایذاء دینا ہے، اس لئے اجمالاً یوں کہنا کہ "میرا کہا سنا معاف کردو" کافی ہے"(۱)

حضرت والا نے اس ملفوظ میں غیبت کی معافی کا طریقہ بیان فرمایا ہے کہ اگر کسی کی غیبت ہو جائے تو اس کی معافی کا کیا طریقہ ہے؟ غیبت کا تعلق حقوق العباد سے ہے، کیونکہ غیبت میں دوسرے مسلمان بھائی کا حق پامال ہوتا ہے اور حقوق العباد کی معافی اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے۔ لہٰذا اگر آپ نے کسی کو جسمانی یا ذہنی یا کسی اور قسم کی تکلیف پہنچائی ہے تو محض توبہ استغفار کر لینے سے اس کی معافی نہیں ہوگی بلکہ صاحب حق کا معاف کرنا ضروری ہے۔

حقوق العباد کی سنگینی

جو گناہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے شراب نوشی اور زناکاری وغیرہ، ان کی معافی کا راستہ یہ ہے کہ اگر انسان ایک مرتبہ بیٹھ کر صدق دل سے یہ عزم کرلے کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا۔ اور پچھلے گناہ پر نادم اور شرمندہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر توبہ کرلے تو ان شاء اللہ یہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ لیکن حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کا حق پامال کیا گیا۔ غیبت بھی اسی میں داخل ہے۔ لہٰذا اگر خالی بیٹھ کر توبہ کرلی کہ یا اللہ! جو غیبت

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۱

کرلی ہے اس سے میں توبہ استغفار کرتا ہوں مجھے معاف فرما، صرف اتنا کرلینے سے غیبت کا گناہ معاف نہیں ہوگا جب تک اس شخص سے معافی نہ مانگی جائے جس کی غیبت کی گئی ہے اور وہ معاف نہ کردے۔ اس وقت تک غیبت کا گناہ معاف نہ ہوگا۔ اس لئے حضرت والا نے اس ملفوظ میں فرمایا کہ اگر کسی کی غیبت ہوگئی تو استغفار کے ساتھ ''مغتاب'' سے یعنی جس کی غیبت کی گئی تھی اس سے بھی معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔

غیبت کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں

پھر فرمایا:

''لیکن تفصیل غیبت کی اس کو بتلانا اس کی ایذاء دینا ہے''

مثلاً اس سے یہ کہنا کہ میں نے فلاں وقت میں فلاں غیبت کی تھی اور تمہیں یہ یہ کہا تھا اور تمہاری یہ برائی بیان کی تھی، اب تم مجھے معاف کردو۔

کیونکہ اندیشہ یہ ہے کہ اس تفصیل کے بیان سے اس کو تکلیف پہنچے گی۔ اس لئے ساری تفصیل بیان کرکے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اجمالاً یوں کہنا کہ میرا کہا سنا معاف کردو، یہ بھی کافی ہے۔ دیکھئے، اللہ تعالیٰ نے کتنی آسانی کے راستے پیدا فرمادیئے ہیں۔

کہا سنا معاف کردینا

یہ جملہ کہ ''کہا سنا معاف کردینا'' یہ ہمارے بزرگوں کا چلایا ہوا کتنا حکیمانہ جملہ ہے۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا اس وقت سے بڑوں سے یہ سنتے چلے آرہے ہیں کہ جب دو چار آدمی کچھ دن ساتھ رہنے کے بعد جدا ہونے لگتے ہیں تو اس وقت ایک دوسرے سے یہ جملہ کہتے ہیں کہ بھائی ہمارا کہا سنا معاف کردینا۔ اس لئے کہ جب سفر یا حضر میں دو چار آدمی ساتھ رہتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کی حق تلفی ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ لہٰذا جدا ہونے سے پہلے ان حقوق کو معاف کرالو، اگر یہ معاف نہ کرایا اور بعد میں کچھ عرصہ کے بعد خیال آیا کہ ہم نے تو فلاں کی حق تلفی کی تھی، تو اس وقت کہاں ڈھونڈتے پھروگے؟ بعد میں معلوم نہیں کہ ملاقات ہو یا نہ ہو، مافی مانگنے کا موقع ملے یا نہ ملے، لہٰذا جدا ہوتے وقت ہی یہ کام کرلینا چاہئے۔ اس جملہ میں غیبت بھی خود بخود داخل ہوجائے گی اور غیبت سے بھی معافی ہوجائے گی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل

میں نے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی شخص مجھ سے یہ کہتا ہے کہ میں نے آپ کی غیبت کی ہے، مجھے معاف کردو۔ تو میں اس سے کہتا ہوں کہ میں معاف تو ضرور کردوں گا، لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا غیبت کی تھی؟ ظاہر ہے کہ صاحبِ حق کو یہ پوچھنے کا حق ہے کہ کیا غیبت کی تھی۔ فرماتے تھے کہ اس سوال سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات غیبت سچی ہوتی ہے، اس لئے کہ غیبت کے اندر یہ ضروری نہیں ہے کہ غلط ہی ہو، تو اس کے بتانے سے اپنی غلطی کا پتہ لگ جاتا ہے۔

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا!

دوسرے اس کے ذریعہ یہ پتہ چل جاتا ہے کہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا غیر جانب دارانہ تبصرہ کیا ہے؟

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

کیونکہ جو لوگ تمہارے اردگرد رہتے ہیں وہ تو تمہاری تعریف ہی کریں گے، تمہیں اچھا ہی کہیں گے، لیکن پیٹھ پیچھے تمہیں لوگ کیا کہتے ہیں اور تمہارے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں، کیا تصور رکھتے ہیں، اس کا علم ہوجانا بھی مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر سب لوگ تمہاری تعریف کرتے رہیں تو اس کے نتیجے میں بعض اوقات آدمی کے دل میں عجب پیدا ہوجاتا ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ یہ ساری مخلوق جو میری تعریف کررہی ہے، تو ضرور میرے اندر کمال ہے جس کی وجہ سے یہ ساری مخلوق میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس طرح دل میں عُجب پیدا ہوجاتا ہے۔

اس عُجب کا علاج یہ ہے کہ تم یہ دیکھو کہ جو لوگ تمہارے پیچھے رہنے والے ہیں، وہ تمہیں کیا کہتے ہیں؟ اور تمہارے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟ اس کے ذریعہ انسان کے عُجب کا علاج ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب میرے پاس کوئی معافی مانگنے آتا تو میں اس سے کہتا کہ میں معاف تو کردوں گا، لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا غیبت کی تھی؟ جب بتاؤ گے تو میں معاف کردوں گا۔

اجمالی معافی تمام متعلقین سے مانگ لو

اب سوال یہ ہے کہ کس کس سے معافی مانگے؟ پہلے تو دھیان اور فکر نہیں تھی، نہ جانے کس کس

کی غیبت ہوگئی، تو کیا ان آدمیوں کی پہلے فہرست بنائے، اور پھر ان سے معافی مانگے؟ حضرت والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! اگر جنت لینی ہے تو جنت اس قدر سستی نہیں ہے، یہ کام تو کرنا پڑے گا۔ لہٰذا جو اپنے متعلقین ہیں، اپنے دوست احباب ہیں، ملنے جلنے والے ہیں، عزیز رشتہ دار ہیں، ان کی ایک فہرست بناؤ، اور پھر جا کر ان سے معافی مانگو۔

حضور ﷺ کا صحابہ سے معافی مانگنا

ہم اور آپ تو کس شمار و قطار میں ہیں، ہم سب کے سردار جناب محمد رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع میں کھڑے ہو کر معافی مانگ رہے ہیں، کہ کسی کا مجھ پر کوئی حق رہ گیا ہو تو وہ یا تو مجھ سے وصول کر لے، اور اگر جسمانی حق ہو تو مجھ سے بدلہ لے لے، یا معاف کر دے۔ چنانچہ ایک صحابی کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے ایک دن میری کمر پر مارا تھا، وہ میرا حق آپ کے ذمے ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں نے تمہاری کمر پر مارا تھا تو تمہیں حق ہے کہ تم میری کمر پر آ کر مار لو۔ اور وہ صحابی قریب آئے تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جس وقت آپ نے میری کمر پر مارا تھا، اس وقت میری کمر پر کپڑا نہیں تھا، جبکہ آپ کی کمر مبارک پر کپڑا ہے۔ چنانچہ رحمۃ للعالمین ﷺ نے کمر مبارک سے کپڑا اٹھالیا۔ ان صحابی کا اصل مقصد یہ تھا کہ میں مہر نبوت کو بوسہ دوں۔ چنانچہ وہ صحابی آگے بڑھے اور مہر نبوت کو بوسہ دیا۔[1]

لیکن آپ ﷺ اس بات کے لئے تیار تھے کہ کوئی چھوٹا بھی مجھ سے آ کر بدلہ لینا چاہے تو بدلہ لے لے۔ جب اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں ہو، آخرت کی فکر ہو، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس ہو، تو پھر دنیاوی طور پر لوگوں کے سامنے ذلیل ہونے کے سارے تصورات ہیچ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے نفس و شیطان نے ہمارے دلوں میں ان تصورات کے بت بنا رکھے ہیں کہ معافی مانگنے سے ہماری ذلت ہو جائے گی، ہماری ناک کٹ جائے گی، ہماری بے عزتی ہو جائے گی۔ ارے ایسی ہزار بے عزتیاں ہو جائیں، اس کے لئے ہم تیار ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ اپنی ناراضگی سے بچالے اور اپنے غضب سے بچالے۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا معافی نامہ شائع کرانا

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب دل کا دورہ پڑا، اسپتال میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے، جب ہوش آیا تو پہلا کام جو مجھ سے فرمایا، وہ یہ تھا:

(۱) مجمع الزوائد، باب فی وداعہ صلی اللہ علیہ وسلم (۲۷/۹)

''میری طرف سے میرے تمام متعلقین کو ایک تحریر لکھ کر بھیج دو کہ جس کسی کا کوئی حق مجھ سے فوت ہوا ہو، یا کسی کی غیبت کی ہو، یا برائی کی ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے لے یا مجھے معاف کر دے''

چنانچہ میں نے وہ تحریر لکھی اور ''کچھ تلافی مافات'' کے نام سے پہلے ''البلاغ'' میں شائع کی، اور پھر اس کو ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جتنے متعلقین تھے، ان سب کے پاس بھیجا۔

بہر حال، حقوق العباد کی معافی کے لئے صرف زبانی توبہ کافی نہیں، بلکہ صاحبِ حق سے معاف کرانا ضروری ہے، اور غیبت کرنا حق العبد کو ضائع کرنا ہے، لہٰذا جس کی غیبت کی ہے اس سے معافی مانگنا ضروری ہے۔

جس کی غیبت کی اس کی تعریف کرو

آگے فرمایا:

''اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کے سامنے غیبت کی تھی ان کے سامنے اس کی مدح وثنا بھی کرو اور پہلی بات کا غلط ہونا ثابت کر دو''(۱)

کیونکہ تم نے اس سے تو معافی مانگ لی، اور اللہ تعالیٰ سے بھی توبہ استغفار کر کے معاملہ صاف کر لیا، لیکن مخلوق کے دل میں تم نے اس شخص کی جو برائی پیدا کی ہے اس کی تلافی بھی ضروری ہے، تلافی کے لئے اب اس کی مدح وثنا اور تعریف کرو، اور پہلی بات کا غلط ہونا ثابت کر دو اور ان سے یہ کہو کہ جو بات میں نے کہی تھی وہ غلط تھی۔ آگے فرمایا:

''اور اگر وہ بات غلط نہ ہو، بلکہ سچی ہو تو یوں کہہ دو کہ بھائی! اس بات پر اعتماد کر کے تم فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا، کیونکہ مجھے خود اس پر اعتماد نہیں رہا۔ یہ تو ریہ ہو جائے گا، کیونکہ سچی بات پر بھی اعتماد قطعی بدون وحی کے ہو نہیں سکتا''(۲)

یعنی اگر تم نے غیبت کے دوران سچی برائی بیان کر دی تھی، کیونکہ غیبت سچی بھی ہوتی ہے، تو اب اس کے بارے میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ غلط تھی، لہٰذا اب یہ کہہ دو کہ میری اس بات پر اعتماد کر کے تم فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا، کیونکہ مجھے خود اس بات پر اعتماد نہیں رہا۔ اس لئے کہ سچی بات پر مکمل بھروسہ وحی کے بغیر نہیں ہو سکتا، مکمل بھروسہ کے لئے یا تو مشاہدہ ہو، یا وحی ہو، اس کے علاوہ سو فیصد اعتماد کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اب مجھے اس بات پر اعتماد

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۱ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۱

نہیں۔ انشاء اللہ اس کے ذریعہ اس غیبت کی تلافی ہو جائے گی جو آپ نے اس کی برائی بیان کرکے کی ہے۔

جس کی غیبت کی تھی اگر وہ مر چکا ہو تو؟

آگے ارشاد فرمایا:

''اگر وہ شخص مر گیا ہو جس کی غیبت کی ہے، تو اب معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے دعا و استغفار کرتے رہو، یہاں تک کہ دل گواہی دیدے کہ اب وہ تم سے راضی ہو گیا ہو گا''

یعنی جس شخص کی آپ نے غیبت کی تھی، اب اس کا انتقال ہو چکا ہے، تو اب اس سے کیسے معافی مانگی جائے؟ تو اس سے معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے دعاء و استغفار کرتے رہو، یہاں تک کہ تمہارا دل یہ گواہی دیدے کہ اب وہ شخص تم سے راضی ہو گیا ہو گا۔

لہٰذا حقوق العباد کا معاملہ اگرچہ بڑا سنگین ہے کہ جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے، اس وقت تک معاف نہیں ہو گا۔ اور اگر صاحبِ حق کا انتقال ہو گیا تو اور زیادہ مشکل، لیکن کسی صورت میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، کسی بھی حالت میں اللہ تعالیٰ نے مایوسی کا راستہ نہیں رکھا کہ اب تیرے لئے معافی کا راستہ بند ہے۔

ننانوے قتل کرنے والے کا راستہ

بخاری شریف میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے ننانوے قتل کر دیئے، پھر اس کو توبہ اور استغفار کا خیال آیا تو وہ ایک راہب کے پاس گیا، اور اس سے جا کر کہا کہ میں نے ننانوے قتل کیے ہیں، کیا میرے لئے توبہ اور معافی کا کوئی راستہ ہے؟ اس راہب نے کہا کہ تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، تو سیدھا جہنم میں جائے گا، اس لئے کہ تو نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا ہے۔ اور صرف توبہ کرنے سے یہ گناہ معاف نہیں ہو گا۔ جب تک کہ تو ان سب مقتولین کے ورثاء سے معافی نہ مانگ لے، اور ان سب کے ورثاء سے کیسے تو معافی مانگے گا؟ اس لئے تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، تو جہنمی ہے۔ اس نے کہا کہ اچھا میری معافی کا کوئی راستہ نہیں تو ننانوے قتل تو ہو گئے، سو واں ایک اور سہی، اور یہ کہہ کر اس نے اس راہب کو بھی قتل کر دیا۔ اس طرح اس نے سو کی تعداد پوری کر لی۔

اس کے بعد پھر ایک اور راہب کے پاس گیا، اس سے جا کر اس نے سارا واقعہ بتایا کہ ننانوے تو پہلے قتل کر دیئے تھے، ایک اور قتل کر دیا، اب بتایئے کہ میرے لئے توبہ اور استغفار کا کوئی

راستہ ہے؟ اس راہب نے کہا کہ ہاں! تیرے لئے توبہ کا راستہ ہے، وہ یہ کہ تو پہلے توبہ اور استغفار کر، اور پھر فلاں مقام پر ایک بستی ہے، وہاں نیک لوگ رہتے ہیں، وہاں جا کر ان کی صحبت اختیار کر۔ اس راہب نے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کا مشورہ اس لئے دیا تھا کہ جب برے لوگوں کی صحبت سے نکل کر نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرے گا تو اس گناہ سے بچنا اس کے لئے آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ قاتل توبہ اور استغفار کر کے یہ ارادہ کر کے اپنی بستی سے چل پڑا کہ میں اب اپنی زندگی میں انقلاب لاؤں گا اور آئندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کروں گا، کوئی نافرمانی نہیں کروں گا، نیک لوگوں کی صحبت اختیار کروں گا، جو میرے ذمے فرائض و واجبات ہیں ان کو ادا کروں گا۔ یہ سب ارادے لے کر چلا۔

ابھی وہ راستے میں تھا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آ گیا کہ اس کی روح قبض کر لو، چنانچہ اس کی روح قبض کر لی گئی اور اس کا انتقال ہو گیا، اب انتقال کے بعد ملائکہ کا آپس میں جھگڑا ہو گیا، ملائکہ رحمت نے کہا کہ یہ شخص توبہ کر کے پاک صاف ہو کر دوسری بستی کی طرف جا رہا تھا، اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے جا رہا تھا، لہٰذا ہم اس کو لے کر جائیں گے۔ جو ملائکہ عذاب تھے، انہوں نے کہا کہ اس شخص کی ساری زندگی گناہوں کے اندر گزری، اس نے سو آدمیوں کو قتل کیا ہے، لہٰذا ہم اس کو عذاب کے لئے لے جائیں گے۔ یہ جھگڑا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اچھا یہ دیکھو کہ جس بستی سے یہ نکلا تھا اور جس بستی کی طرف یہ جا رہا تھا، انتقال کے وقت یہ کس بستی سے زیادہ قریب تھا؟ جب ناپا گیا تو جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس سے چند گز زیادہ قریب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب یہ شخص توبہ کر کے نیک لوگوں کی بستی کی طرف چل پڑا تھا اور اس سے زیادہ قریب ہو گیا تھا تو اب ہم بھی اس کے ساتھ مغفرت کا معاملہ کرتے ہیں۔ (۱)

مایوس ہونے کی ضرورت نہیں

بہر حال، مایوسی کا کوئی راستہ نہیں کہ چونکہ ہم سے حقوق العباد ضائع ہو گئے ہیں، اور جن کے حقوق ضائع کیے ہیں ان کا انتقال ہو گیا ہے، لہٰذا اب ہماری مغفرت نہیں ہو سکتی، ایسا نہیں ہے۔ ابتداء میں تو حقوق العباد کا بہت اہتمام کرو، اور ان کے ضائع ہونے کو سنگین سمجھو، اور کسی اللہ کے بندے کے حق کو پامال نہ کرو، لیکن اگر کسی کا کوئی حق ضائع ہو جائے تو فوراً معاف کرا لو اور اگر معاف کرانے کا

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب حدیث الغار، رقم: ۳۲۱۱، صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب قبول توبة القاتل وان کثر قتله، رقم: ۴۹۶۷، سنن ابن ماجه، کتاب الدیات، باب هل لقاتل مؤمن توبة، رقم: ۲۶۱۲، مسند أحمد، رقم: ۱۰۷۲۷

کوئی راستہ نہ ہو تو مایوس نہ ہو، بلکہ اس کے لئے استغفار کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو کہ یا اللہ! اپنے فضل و کرم سے مجھ سے ان بندوں کو راضی کر دیجئے جن کے حقوق میں نے پامال کیے اور یہ دعا کرتے رہو کہ یا اللہ! ان کے درجات بلند فرمائیے، ان کی مغفرت فرمائیے، ان کو رضاء کاملہ عطا فرمائیے۔ یہ دعا کرتے رہو یہاں تک کہ یہ گمان غالب ہو جائے کہ وہ راضی ہو گئے ہوں گے۔

ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں مایوسی کا کوئی راستہ نہیں، ساری تعلیم یہ ہے کہ۔

سوئے نا امیدی مرو امید ہا است
سوئے تاریکی مرو خورشید ہا است

حضرت والا نا اُمیدی اور تاریکی کی طرف جانے ہی نہیں دیتے، بلکہ راستہ بتا دیتے ہیں کہ اب اس طرح کر لو، اب اس طرح کر لو، اللہ تعالیٰ نے ہر صورتِ حال کا علاج رکھا ہے۔

کفر و شرک سے توبہ

دیکھئے! کفر و شرک سے زیادہ خراب چیز دنیا میں کوئی اور نہیں، کفر اور شرک کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو معاف نہیں کروں گا، اس کے علاوہ ہر چیز معاف کر دوں گا۔ لیکن اس کفر و شرک سے بھی توبہ کرنے کا راستہ کھول دیا، اگر ستر برس کا کافر بھی کفر و شرک سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ قبول کر لیتے ہیں اور اس کو معاف فرما دیتے ہیں۔

شیطان کا بہکاوا

لہٰذا حقوق العباد کا معاملہ اگرچہ مشکل ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی نا اُمید ہو کر بیٹھ جائے۔ اسی لئے شیطان انسان کے اندر مایوسی پیدا کر کے بہکاتا ہے اور وہ انسان سے یہ کہتا ہے کہ اس گناہ کے نتیجے میں تو مردود ہو گیا، اب تیرا ٹھکانہ جہنم ہے، تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، لہٰذا جو تیری مرضی میں آئے وہ کام کر، اس لئے کہ جب جہنم میں جانا ہی ٹھہرا تو پھر دنیا میں خوب مزے اُڑا کر اور خوب گناہ کر کے جا۔ یہ شیطان اس طرح دھوکہ دیتا ہے اور زیادہ گناہوں کے اندر مبتلا کر دیتا ہے۔ جبکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا اُمیدی مؤمن کا کام نہیں، کتنے ہی بڑے سے بڑے گناہ کر لیے ہوں پھر بھی وہ گناہ اللہ کی رحمت سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔

''ابونواس'' کی مغفرت کا واقعہ

عرب کے ایک شاعر گزرے ہیں، جس کی کنیت ''ابونواس'' تھی، یہ آزاد منش قسم کا شاعر تھا،

ان شعراء میں اس کا شمار تھا جو ہر قسم کے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں، چنانچہ ساری عمر گناہوں میں اور پینے پلانے میں گزری۔ ایک شخص نے مرنے کے بعد ان کو خواب میں دیکھا، اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ اس نے کہا کہ میں کیا بتاؤں! جب میں مر رہا تھا، اس وقت میں بہت ڈر رہا تھا کہ جب اللہ میاں کے سامنے جاؤں گا تو وہاں میری ایسی پٹائی ہوگی کہ ساری زندگی کے مزے دھرے رہ جائیں گے، اس لئے مجھے بہت فکر اور تشویش تھی کہ کیا ہوگا؟ اسی فکر اور تشویش کے عالم میں میں نے تین شعر کہے، بس اللہ تعالیٰ نے ان شعروں کی وجہ سے مجھے بخش دیا۔ اب خواب میں اس نے وہ شعر سنائے کہ وہ شعر یہ تھے، وہ شعر بھی بڑے عجیب تھے، جب اللہ تعالیٰ شاعر کو توفیق دیدے تو شعر کے اندر اچھی بات بھی خوب بیان کرتا ہے۔ وہ شعر یہ ہیں۔

يَا رَبِّ اِنْ عَظُمَتْ ذُنُوْبِىْ كَثْرَةً
فَلَقَدْ عَلِمْتُ بِأَنَّ عَفْوَكَ أَعْظَمُ
اِنْ كَانَ لَا يَرْجُوْكَ اِلَّا مُحْسِنٌ
فَبِمَنْ يَلُوْذُ وَ يَسْتَجِيْرُ الْمُجْرِمُ

''اے پروردگار! اگرچہ میرے گناہ بہت زیادہ ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کی مغفرت اور آپ کی معاف کرنے کی صفت میرے گناہوں سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔ اگر آپ کی رحمت کی اُمید صرف نیک لوگ ہی کر سکتے ہیں تو یہ مجرم بیچارہ کہاں جائے گا؟ یہ کس کی پناہ حاصل کرے گا؟ یہ کس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا''

وَمَدَدْتُ يَدِىْ اِلَيْكَ تَضَرُّعًا
فَلَئِنْ رَدَدْتُ يَدِىْ فَمَنْ ذَا يَرْحَمُ (۱)

''میں آج آپ کے سامنے عاجزی کے ساتھ ہاتھ پھیلا رہا ہوں، اگر آپ نے یہ ہاتھ واپس کر دیئے تو پھر کون ہے جو ان پر رحم کرے''

جاتے جاتے یہ شعر کہے، پتہ نہیں کس دل سے یہ اشعار کہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ جا، میں تیری ان شعروں پر بخشش کرتا ہوں۔ اور یہ وہ اشعار ہیں جو ''ابونواس'' کے بیاض میں موجود نہیں تھے، اس لئے کہ بالکل آخر وقت میں دنیا سے جاتے جاتے کہے تھے، اس لئے بیاض میں لکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی، اس لئے خواب ہی میں خواب دیکھنے والے کو بتایا کہ میں نے یہ شعر کہے تھے۔ جس شخص نے خواب دیکھا تھا، اس نے اس خواب ہی کے حوالے سے یہ اشعار ابونواس کے دیوان میں تحریر کر دیئے۔

(۱) مختصر تاريخ دمشق (۲/۴۲۲)، بهجة المجالس وأنس المجالس (۱/۲۵۵)

ظاہری حالت پر فیصلہ مت کرو

اسی لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کی ظاہری حالت دیکھ کر اس کے بارے میں کبھی جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ نہ کرو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی کونسی ادا پسند آ جائے، کیا پتہ آخر میں اس کا خاتمہ کیسے عمل پر ہو، اور اللہ تعالیٰ اس کو نواز دے، اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "میں ہر مسلمان کو اپنے آپ سے حالاً اور ہر کافر کو احتمالاً افضل سمجھتا ہوں۔" "احتمالاً" کا مطلب یہ ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق دیدے اور مجھ سے آگے نکل جائے۔ اس لئے ظاہری حالت میں کوئی شخص کیسا بھی ہو، تم اس کے فعل سے نفرت کرو کہ یہ شراب پینا بری بات ہے، لیکن اس کی ذات سے نفرت مت کرو۔ کیا پتہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق دیدے اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر صحیح طور پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

غیبت مباح کی صورت میں

آگے حضرت والا نے فرمایا:

"اگر دینی ضرورت ہو تو پھر غیبت بھی مباح ہے، جیسے محدثین نے رواۃ حدیث پر جرح کی ہے۔ اگر دینی ضرورت نہیں بلکہ محض نفسانیت ہی نفسانیت ہے تو اس صورت میں امر محقق کا بیان کرنا بھی غیبت محرمہ ہے اور بلا تحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے۔ کِذب کا مدار تحقیق کذب پر نہیں بلکہ عدم تحقیق صدق پر ہے"

یعنی دینی ضرورت سے کسی کا عیب یا برائی بیان کرنا جائز ہے۔ چنانچہ تمام محدثین حضرات کا تو کام ہی لوگوں کے حالات کی تحقیق کرنا تھی کہ فلاں راوی کیسا ہے اور فلاں راوی کیسا ہے؟ چنانچہ جب کوئی شخص ان سے راوی کے بارے میں سوال کرتا تو وہ بتا دیتے کہ یہ راوی ضعیف ہے، اور یہ راوی جھوٹا ہے، یہ راوی کذاب ہے، یہ راوی شتام ہے۔ لیکن یہ بیان کرنا ان کے ذمے واجب تھا۔ اگر بیان نہ کرتے تو گناہ گار ہوتے، کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی حفاظت کا یہی طریقہ تھا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ کونسا راوی کیسا ہے؟ لہٰذا یہ غیبت چونکہ دینی ضرورت کے لئے تھی اس لئے یہ جائز تھی۔

علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے محدثین میں سے ہیں اور جرح وتعدیل

کے امام ہیں۔ البتہ ان کے والد حدیث کے معاملے میں پوری طرح قابلِ اعتماد نہیں تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ اپنے والد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ حدیث میں قوی ہیں یا ضعیف ہیں؟ پہلے تو فرمایا کہ میرے والد کے بارے میں یہ بات دوسرے محدثین سے پوچھ لو۔ سوال کرنے والے نے کہا کہ ان کے بارے میں مجھے آپ کی رائے معلوم کرنی ہے۔ جب سوال کرنے والے نے اصرار کیا تو آپ نے سر جھکایا اور پھر فرمایا:

"هُوَ الدِّيْنُ، إِنَّهُ ضَعِيْفٌ"(۱)

یہ دین کی بات ہے، اسلئے یہ بتا رہا ہوں کہ میرے والد حدیث کے معاملے میں ضعیف ہیں"

چونکہ دین کی بات ہے اور دین کی بات کو چھپانا نہیں ہے، چاہے وہ باپ کے خلاف ہو یا بیٹے کے خلاف ہو، وہ دین کی ضرورت کے تحت کہنی ہوگی۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

امام ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ جو "سنن ابوداؤد" کے مصنف ہیں، اتنے بڑے جلیل القدر محدث اور اتنے بڑے امام ہیں۔ ان کا بیٹا "ابن ابی داؤد" حدیث کے بارے میں ضعیف تھا۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ اپنے بیٹے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا:

"لَا تَحِلُّ عَنْهُ الرِّوَايَةُ"(۲)

"اس سے روایت کرنا حلال نہیں"

دیکھئے! حضرات محدثین نے عیب کا اظہار کرنے میں نہ باپ کی پرواہ کی، نہ بیٹے کی پرواہ کی، اور نہ عزیز و اقارب کی پرواہ کی، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی احادیث کا معاملہ تھا اور راوی کی خامی کا اظہار کرنا دینی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ محدثین کا گروہ پیدا ہی اسی مقصد کے لئے کیا تھا کہ ان کے ذریعہ احادیث کی حفاظت کا کام کرایا جائے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جہاں دین کی ضرورت ہو، وہاں نہ صرف یہ کہ غیبت کرنا جائز ہے بلکہ بعض اوقات غیبت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

نفسانیت کی غیبت حرام ہے

"لیکن اگر دینی ضرورت نہیں بلکہ محض نفسانیت ہی نفسانیت ہے تو اس صورت میں امرِ محقق کا بیان کرنا بھی غیبت محرمہ ہے"

---

(۱) ميزان الاعتدال (۴۰۱/۲)، لسان الميزان (۴۳۰/۸)، كتابات أعداء الإسلام ومناقشتها (۵۰۳/۱)

(۲) ميزان الاعتدال (۴۳۳/۲)، لسان الميزان (۳۱/۴)، كتابات أعداء الإسلام ومناقشتها (۵۰۴/۱)

اب یہ فرق کرنا ہے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں، یہ واقعی دینی ضرورت سے کہہ رہا ہوں یا اپنے نفس کی لذت لینے کے لئے نفسانیت کے طور پر کہہ رہا ہوں، جائزہ لینے پر پتہ چلے گا کہ غیبت کے شوق میں اب نفس نے یہ حیلہ تراش لیا کہ جو بات تم کہہ رہے ہو یہ دینی ضرورت کے تحت کہہ رہے ہو۔ لیکن جب اپنے باطن کے اندر کرید کر دیکھو گے تو پتہ چلے گا کہ حقیقت میں دینی ضرورت نہیں تھی بلکہ نفسانیت تھی، لہٰذا وہ غیبت محرمہ ہے، چاہے وہ ایسی بات ہو جو حقیقت میں صحیح اور درست ہو اور تحقیق سے ثابت ہو چکی ہو، تب بھی وہ حرام اور ناجائز ہے۔

بلاتحقیق بات کہنا بہتان ہے

''اور بلاتحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے۔ کذب کا مدار تحقیرِ کذب پر نہیں بلکہ عدمِ تحقیق صدق پر ہے''

یعنی جھوٹ کا مدار صرف اس بات پر نہیں کہ جب کسی چیز کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے تب جھوٹ ہوگا، بلکہ اگر کسی چیز کا سچا ہونا ثابت نہیں ہوا پھر بھی تم اس کو بیان کر رہے ہو تو تمہارے حق میں وہ کذب ہے، کیونکہ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے صاف صاف ارشاد فرما دیا:

((كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ))(۱)

''انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو آگے بیان کر دے''

لہٰذا جب ہم دوسرے کی غیبت کرتے ہیں تو شیطان آکر یہ سبق پڑھاتا ہے کہ تم جو برائی بیان کر رہے ہو، یہ کوئی گناہ کا کام نہیں ہے کیونکہ یہ دینی ضرورت ہے، حالانکہ حقیقت میں وہاں کوئی دینی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اپنی نفسانیت ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ایک محقق اور شیخ ہی اس کا فرق بتاتا ہے کہ یہ جو کام کیا ہے یہ دینی ضرورت سے کیا ہے یا نفسانیت کی وجہ سے کیا ہے۔ شیطان دینی ضرورت کو آڑ بنا کر غیبت میں مبتلا کرا دیتا ہے۔ یہ غیبت کھلی ہوئی غیبت سے زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتا ہے کہ یا اللہ! میں جو غیبت کر رہا ہوں، تیرے دین کی ضرورت سے کر رہا ہوں، لہٰذا اس میں غیبت کے گناہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا گناہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے غیبت کے گناہ سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

---

(۱) صحيح مسلم، المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع، رقم: ٦، سنن ابن داؤد، كتاب الأدب، باب التشديد في الكذب، رقم: ٤٣٤٠

غیبت سے حسی تکلیف ہوتی ہے

حضرت والا نے فرمایا:

"غیبت میں نہ معلوم لوگوں کو کیا مزا آتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے اپنا جی خوش کر لیتے ہیں، پھر اگر اس کو خبر ہوگئی اور اس سے دشمنی پڑ گئی تو عمر بھر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، اور اگر ذرا دل میں حس ہو تو غیبت کرنے کے ساتھ ہی قلب میں ایسی ظلمت پیدا ہوتی ہے جس سے سخت تکلیف ہوتی ہے جیسے کسی نے گلا گھونٹ دیا ہو"(۱)

چونکہ ہم لوگوں کے مزاج خراب ہو گئے ہیں اور حس جاتی رہی ہے، اس لئے ہم گناہ کرتے رہتے ہیں لیکن ہمیں گناہوں کی ظلمت کا احساس نہیں ہوتا، جن لوگوں کے قلوب کو اللہ تعالیٰ مجلّٰی اور مصفّٰی فرماتے ہیں ان کے قلب پر معمولی سے گناہ کی بھی ایسی ظلمت ہوتی ہے جیسے کسی نے ان پر پہاڑ رکھ دیا ہو۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

"اگر دل کے باغ سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے تو سالک کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں"

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک مرتبہ آپ بہت غمگین بیٹھے ہوئے تھے، اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ گیا ہو۔ ایک شاگرد نے حضرت سے جا کر پوچھا کہ حضرت! آپ کے چہرے پر غم کے آثار نظر آرہے ہیں، خیریت تو ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں کچھ غم ہے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ حضرت! کیا غم ہے؟ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں دستار بندی کا جلسہ ہو رہا تھا۔ فرمایا کہ جلسہ میں کچھ ایسی مصروفیت ہوگئی کہ آج جب ہم مسجد میں نماز پڑھنے گئے تو ہماری تکبیرِ اولیٰ چھوٹ گئی، امام سے نہیں سن سکے۔ پھر فرمایا کہ ۳۵ سال میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ نماز میں تکبیرِ اولیٰ چھوٹ گئی۔ اب آپ اندازہ لگائیں، کیونکہ صرف تکبیرِ اولیٰ چھوٹ جانے کا مطلب یہ ہے کہ قراءت سنی، رکوع میں شریک ہوئے، رکعت مل گئی، اور صحیح قول کے مطابق تکبیرِ اولیٰ میں بھی شرکت ہوگئی، لیکن اس کے باوجود

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۴

تکبیرِ اولیٰ کے چھوٹنے پر اتنے غمگین تھے۔

ہماری بے حسی کا حال

دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ ہماری جماعتیں نکل جاتی ہیں، اور اکثر نمازی حضرات مسبوق ہو کر اپنی نمازیں پوری کرتے ہیں، لیکن اس کا احساس نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے اندر بے حسی ہے۔ العیاذ باللہ! اللہ تعالیٰ اپنی رحمت فرما کر اسے دور فرمادے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک مشکوک لقمہ پیٹ میں چلا گیا، اس لقمہ کے حلال اور حرام ہونے میں شک تھا، فرمایا کہ ایک مہینے تک اس لقمہ کی ظلمت اپنے دل کے اندر محسوس کرتا رہا۔ ہماری تو حس خراب ہے، مزاج بگڑا ہوا ہے، اس لئے گناہ کی برائی کا احساس ہی نہیں ہوتا، بس ایسا سمجھتے ہیں جیسے ایک مکھی آکر بیٹھی اور اس کو اُڑا دیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہماری حس کو درست فرمائے اور مزاج درست فرمائے۔ آمین۔

غیبت سے کیا حاصل ہوا؟

بہرحال، غیبت کو چھوڑنے کے لئے یہ سوچنا چاہئے کہ اگر تم نے تھوڑا بہت وقت غیبت کے اندر خرچ کر بھی لیا اور غیبت سے تھوڑا مزہ بھی آ گیا، لیکن اس غیبت کا حاصل کیا ہوا؟ نتیجہ کیا ہوا؟ کیا فائدہ حاصل ہوا؟ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ اس کے نتیجے میں آخرت کا اتنا بڑا گناہ کما لیا۔ اور دنیا کے اندر یہ صورتِ حال ہے کہ اگر اس شخص کو خبر ہوگئی جس کی تم نے غیبت کی ہے کہ فلاں نے میری یہ غیبت کی ہے تو اس کی طبیعت میں تمہاری طرف سے جو کدورت اور عداوت پیدا ہوگی وہ نہ جانے کیا خمیازہ لے کر آئے گی۔

غیبت کے نتیجے میں کئی گناہ ہو جاتے ہیں

اور حقوق العباد کے گناہوں کا قاعدہ یہ ہے کہ جب آدمی ایک گناہ کرتا ہے تو اس کی بیچ میں اس کو دس غلط کام کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً جس کی غیبت کی تھی اس کو پتہ چل گیا، اس نے آکر اس سے پوچھ لیا کہ تم نے یہ غلط بات کہی تھی؟ اب یا تو اعتراف کرے کہ ہاں! میں نے یہ بات کہی تھی، اب اگر اعتراف کرے تو مجرم بنے، یا اعتراف نہ کرے تو پھر یا تو تاویل کرے گا کہ میں نے تو یوں کہا تھا، یا

جھوٹ بولے گا کہ میں نے تو یہ بات نہیں کہی۔ اب اگر اس دوسرے شخص کو پتہ چل گیا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے تو اس کے دل میں اس کی طرف سے اور زیادہ کدورت اور دشمنی پیدا ہوگی۔ لہٰذا انسان ایسا کام کیوں کرے جس کے نتیجے میں دشمنیاں پیدا ہوں، بغض اور عداوت پیدا ہو، ایسے کام کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ قلب میں ظلمت پیدا ہونے کا نقصان علیحدہ ہے۔

غیبت کا اصل علاج تواضع ہے

حضرت والا نے فرمایا:

''غیبت کا علاج بھی تواضع ہی ہے، مگر تواضع ایک دن میں پیدا نہیں ہوتی، اس لئے جب تک تواضع حاصل نہ ہو، غیبت سے بچنے کے لئے فوری علاج یہ کرو کہ بدون سوچے کوئی بات نہ کیا کرو، جو بات کرو سوچ کر کرو، اس سے غیبت کم ہو جائے گی، اور کچھ دنوں کے بعد بالکل نہ ہوگی، اور اگر کسی وقت بے سوچے کوئی بات نکل جائے تو اسی وقت دو رکعت نفل ''صلوٰۃ التوبہ'' کی نیت سے پڑھ لیا کرو''(۱)

اس ملفوظ میں پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ غیبت انسان سے سرزد ہی نہ ہو، اس کا اصل علاج یہ ہے کہ دل میں تواضع پیدا کرو۔ ہمیشہ یاد رکھو! غیبت تواضع کے فقدان کی وجہ سے ہوتی ہے، جب آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور تکبر میں مبتلا ہوتا ہے، تب دوسرے کی غیبت کرتا ہے۔ جس شخص کو اپنے عیوب کا دھیان ہو، اس کی اصلاح کی فکر ہو، اس کو دوسروں کے عیوب بیان کرنے کی کہاں فرصت، وہ تو اپنے درد میں مبتلا ہے کہ میرے اندر یہ عیب ہے، میرے اندر یہ خرابی ہے، کس طرح ان کو دور کروں، بس اسی اُدھیڑ بُن میں مبتلا ہے، وہ دوسروں کے عیوب کو کہاں دیکھتا پھرے گا۔ ہاں! اگر دل میں تکبر اور بڑائی ہے اور دوسروں کی تحقیر ہے، اس کو اپنی فکر تو نہیں ہے، اس لئے وہ دوسروں کے عیوب کو دیکھتا پھرتا ہے کہ اس میں فلاں برائی ہے، اس میں فلاں برائی ہے، پھر ان برائیوں کو دوسروں کے سامنے بیان کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا غیبت کی اصل جڑ عجب اور تکبر ہے، جب یہ تکبر اور عجب ختم ہو جائے گا تو پھر غیبت بھی سرزد ہی نہیں ہوگی۔ اس لئے غیبت کا اصل علاج تکبر کا ختم کرنا اور تواضع کا پیدا کرنا ہے۔

ہمارے بزرگوں کی تواضع

حضرت ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دار العلوم میں تشریف لائے۔ ان کی زبانی ایک واقعہ سنا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ خیر المدارس ملتان کے بانی) نے فرمایا کہ

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۲

جب میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں جاتا تو بلا مبالغہ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مجلس کے اندر جتنے لوگ موجود ہیں، ان میں سب سے کمتر اور حقیر اور بدحال میں ہوں، اور یہ سب مجھ سے افضل ہیں، بلکہ یہ سب انسان ہیں اور میں بیل ہوں۔ پھر مجھے خیال پیدا ہوا کہ میری یہ حالت درست ہے یا نہیں؟ چنانچہ میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی) کی خدمت میں حاضر ہوا، اور جا کر عرض کیا کہ میرا یہ معاملہ ہے کہ جب میں حضرت والا کی مجلس میں آتا ہوں کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس مجلس میں سب سے کمتر اور حقیر میں ہوں، مجھ سے زیادہ حقیر اور کمتر کوئی اور نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحب فرمانے لگے کہ یہ حالت تو میری بھی ہے کہ جب میں مجلس میں جاتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ سب حاضرین سے زیادہ کمتر اور بدحال میں ہی ہوں تو حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم بھی میرے ساتھ اس حال میں شریک ہو گئے، چلیں حضرت والا سے اپنی یہ حالت بیان کرتے ہیں۔

چنانچہ یہ دونوں حضرات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ جب ہم مجلس میں بیٹھتے ہیں تو ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ اس مجلس کے اندر جتنے حاضرین ہیں وہ سب ہم سے افضل ہیں اور ہم سب سے کمتر اور ذلیل ہیں اور حقیر ہیں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ کچھ فکر نہ کرو، ارے بھائی! میرا بھی یہی حال ہے، جب میں مجلس میں بیٹھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں ان سب کے مقابلے میں کمتر ہوں، سب مجھ سے افضل ہیں۔

غیبت کو ختم کرنے والی چیز تواضع

تواضع یہ نہیں ہے کہ آدمی صرف اپنی زبان سے یہ کہہ دے کہ احقر ناکارہ ہے، ناچیز ہے، بلکہ تواضع یہ ہے کہ واقعۃً اپنے عیوب پر اتنی نگاہ ہو کہ اپنے عیوب کے مقابلے میں دوسروں کے عیوب نظر ہی نہ آئیں۔ جس دن یہ تواضع پیدا ہو گئی تو پھر انشاء اللہ غیبت پاس بھی نہیں پھٹکے گی۔ اس لئے کہ جب انسان اپنے کو دوسروں سے کمتر سمجھ رہا ہے اور اس کو اپنے عیوب کا استحضار ہے تو وہ دوسروں کے عیوب کو کیسے دیکھے گا؟ لہٰذا اگر "غیبت" کا جڑ سے بالکلیہ خاتمہ کرنا ہے تو اپنے اندر تواضع پیدا کرو۔

اپنے عیوب کا استحضار کریں

اب تواضع کیسے پیدا کریں؟ تواضع پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کا استحضار کرو۔ یہ جو ہر وقت اپنی بڑائی کا خیال دل میں جما رہتا ہے کہ "ہم چوں ما دیگرے نیست" (ہم جیسا کوئی دوسرا نہیں) اور یہ جو ہمیں کبھی اپنے علم پر گھمنڈ، کبھی اپنے تقویٰ پر گھمنڈ، کبھی اپنے مال و دولت پر گھمنڈ، کبھی

اپنی صحت پر گھمنڈ، کبھی اپنی شکل وصورت پر گھمنڈ رہتا ہے، یہ گھمنڈ ہی انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔

انسان کی حقیقت یہ ہے

ایک بزرگ سے ایک نوجوان نے کہا کہ جانتے نہیں، میں کون ہوں؟ ان بزرگ نے فرمایا: ہاں! میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو، کہو تو بتادوں؟ چنانچہ ان بزرگ نے فرمایا:

"أَوَّلُكَ نُطْفَةٌ قَذِرَةٌ وَآخِرُكَ جِيْفَةٌ قَذِرَةٌ وَأَنْتَ فِيْمَا بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ"

''تیرا آغاز تو یہ ہے کہ تو ایک گندے نطفے سے پیدا ہوا ہے، اور تیرا انجام یہ ہے کہ تو بدبودار مردار بن جائے گا حتیٰ کہ تیرے گھر والے بھی تجھے رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ اور ولادت سے وفات تک جو درمیان کا عرصہ ہے، اس میں تو گندگی کے ٹوکرے اُٹھائے پھر رہا ہے''

جو کھال جسم پر ہے، اس کھال کو اللہ تعالیٰ نے "ستار العیوب" بنا رکھا ہے، اگر یہ کھال ذرا سی چھل جائے تو اندر نجاست ہی نجاست بھری ہوئی ہے، کہیں خون ہے، کہیں پیپ ہے، کہیں پیشاب ہے، کہیں پاخانہ ہے، یہ سب نجاستیں اُٹھائے پھر رہا ہے، یہ حقیقت ہے ہماری، مگر خود کو بڑا سمجھ رہا ہے، اور تکبر کے یہ خیالات پھر انسان کو غیبت پر آمادہ کرتے ہیں۔

لہٰذا ''غیبت'' کا اصل علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرے، جب تواضع پیدا ہو جائے گی تو پھر ان شاء اللہ کسی کی غیبت نہیں ہوگی۔ البتہ جہاں دینی ضرورت ہو وہاں ''غیبت'' جائز ہے، مثلاً کسی کو نقصان سے بچانا ہے، آپ اس کو بتادیں کہ فلاں شخص سے ہوشیار رہنا، یہ معاملات کا صاف نہیں ہے، تو یہ غیبت میں داخل ہی نہیں۔

تواضع کے لئے صحبتِ شیخ

تجربہ یہ ہے کہ رگڑے کھائے بغیر ''تواضع'' پیدا نہیں ہوتی۔ دراصل بات یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں خناس ہوتا ہے، اور وہ خناس یہ ہے کہ انسان اپنی رائے کو بالا سمجھتا ہے، اپنی سوچ کو بالکل صحیح سمجھتا ہے کہ جو میں سوچ رہا ہوں یہ صحیح ہے اور دوسرا جو سوچ رہا ہے وہ غلط ہے۔ جب انسان اپنی اس سوچ اور فکر کو کہیں جا کر اس طرح فنا نہیں کرے گا کہ جو میں سوچتا ہوں وہ غلط ہے اور جو آپ کہتے ہیں وہ صحیح ہے، چاہے مجھے آپ کی سوچ کتنی ہی غلط اور بری معلوم ہو رہی ہو اور دلیل کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، بداہت کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، لیکن میں آپ ہی کی بات مانوں گا۔ جب تک اس طرح اپنی سوچ و فکر کو نہیں مٹائے گا، اس وقت تک تواضع پیدا نہیں ہوگی اور تکبر ختم نہیں ہوگا۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت

اللہ تعالیٰ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ جب میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت مفصل خط مجھے اور بھائی صاحب حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کو لکھا، اس خط میں بہت ساری نصیحتیں فرمائیں، لیکن ایک نصیحت یہ فرمائی:

''میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ صاحبزادگی کا سور بہت دیر سے نکلتا ہے''

یعنی کسی بڑے آدمی کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دماغ میں ایک خناس پیدا ہوجاتا ہے، اس کو ''سور'' سے تعبیر فرمایا، اس خناس کا مطلب ''تکبر'' ہے اور یہ ''سور'' بہت دیر میں نکلتا ہے، یعنی دوسرے امراض کا علاج تو جلدی ہوجاتا ہے لیکن اس کا علاج بہت دیر سے ہوتا ہے۔ بہر حال، اس خط کے ذریعہ اس طرف ہمیں متوجہ فرمایا کہ اس کی فکر کرنی چاہئے کہ کسی طرح یہ مرض نکل جائے۔ اور پھر فرمایا:

''جب کوئی شخص اپنے آپ کو کسی کے سامنے فنا کردے اور رگڑے کھائے، جب یہ نکلے، جب تک یہ نہ نکلے اس وقت تک راستہ نہیں کھلتا''

علم کا ''سور'' دیر سے نکلتا ہے

اسی طرح ''علم کا سور'' ہے کہ ہم عالم ہیں، یہ عالم ہونے کا جو گھمنڈ ہے، یہ بھی بڑا خطرناک ہے اور یہ بھی دیر سے نکلتا ہے۔ جب تک اپنے آپ کو دوسرے کے سامنے فنا نہ کردے، اس وقت تک یہ نہیں نکلتا۔ اور اگر یہ دونوں جمع ہوجائیں کہ علم بھی ہو اور صاحبزادگی بھی ہو، پھر تو سور در سور جمع ہوگئے اس کا علاج آسان نہیں ہے، اس کا علاج صرف یہی ہے کہ کہیں رگڑے کھائے، اپنے آپ کو پامال کرے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

قال را بگزار صاحب حال شو
پیش مردے کاملے پامال شو

''پامال'' کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں پاؤں سے روندا جائے۔ پاؤں سے روندے جانے کا مطلب یہ ہے کہ چاہے تمہارے دل و دماغ میں بات نہیں آرہی ہے، عقل اور بداہت کے خلاف وہ بات معلوم ہورہی ہے، لیکن پھر بھی بڑے کی بات کے سامنے تم اپنے آپ کو اس طرح جھکادو جیسے پاؤں میں روندا جارہا ہے۔ جب تک اس پر عمل نہیں ہوگا، اس وقت تک یہ سور دماغ سے نہیں نکلے گا۔ لہٰذا جب تک تکبر دل میں موجود رہے گا، ''حسد'' بھی رہے گا، غیبت بھی رہے گی، بغض بھی رہے گا،

غصہ بھی رہے گا، اور جب تکبر چلا جائے گا اور تواضع پیدا ہو جائے گی، اس وقت یہ سارے امراض بھی چلے جائیں گے۔

غیبت ہونے پر جرمانہ

لیکن یہ تواضع اور انکساری ایک دو دن میں پیدا نہیں ہوگی، اس کے لئے محنت اور مشق کی ضرورت ہے، اور کسی شیخ کامل کی صحبت کی ضرورت ہے، تب جا کر تواضع پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب تک یہ بات حاصل نہ ہو یعنی تواضع نہ ہو اس وقت تک یہ کرے کہ بے سوچے بات نہ کرے، اور اگر کبھی غیبت ہو جائے تو اپنے اوپر جرمانہ مقرر کرے۔ ایک جرمانہ کا بیان پیچھے گزر چکا کہ ایک وقت کا فاقہ کرے، یہاں ایک دوسرا جرمانہ بیان فرمایا کہ دو رکعت صلوٰۃ التوبہ پڑھ لیا کرو۔ اس طرح کرنے سے رفتہ رفتہ انشاء اللہ یہ بیماری دور ہو جائے گی۔

صرف آرزو کرنا کافی نہیں

دیکھئے! دنیا میں کوئی کام محنت کے بغیر نہیں ہوتا، تھوڑی بہت محنت ضرور کرنی پڑتی ہے، محض آرزو کر لینے سے اور خواہش کر لینے سے کام نہیں بنتا ؎

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

یعنی صرف آرزو کر لینے سے تقدیر نہیں بدلا کرتی بلکہ اس کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔

ایک دیہاتی کا قصہ

جیسے ایک دیہاتی کا قصہ حضرت والا نے لکھا ہے کہ ایک دیہاتی بیٹھا ہوا اپنی دیہاتی زبان میں یہ کہہ رہا تھا کہ یوں جی کرے ڈھیر سارا دودھ ہو، اور ڈھیر سارا گڑ ہو اور میں ڈھیر سارے دودھ میں ڈھیر سارا گڑ ڈال کر انگڑ (انگلی) سے اس کو چلاؤں اور پھر خوب پیوں، یوں جی کرے۔ کسی نے اس دیہاتی سے کہا کہ تیرا یوں جی تو کرے، لیکن تیرے پاس کچھ ہے بھی؟ اس نے کہا: میرے پاس اُنگڑ (انگلی) ہے۔ یعنی نہ دودھ ہے اور نہ گڑ ہے، بس اُنگڑ ہے۔ اب وہ اس انگڑ کے بل بوتے پر آرزو کر رہا تھا۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ ”جیسے وہ بیوقوف اُنگڑ کی بنیاد پر یہ آرزو باندھ رہا تھا، حالانکہ صرف آرزو باندھنے سے کچھ نہیں ہوتا، ایسے ہی ہم بھی اصلاح کی محض آرزوئیں باندھا کرتے ہیں۔ ارے یہ دیکھو! تمہارے پاس کچھ عمل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اس کے حصول کے لئے کوشش اور محنت کرو تب جا کر وہ حاصل ہوگا۔

یہ عاجز بندہ ہے

لہٰذا کوئی کام محض آرزو کر لینے سے نہیں ہوتا کہ کاش میں ایسا ہو جاؤں، کاش میں نیک ہو جاؤں، کاش میں متقی بن جاؤں، کاش میں غیبت چھوڑ دوں، محض تمنائیں کرنے سے اور آرزوئیں کرنے سے بات نہیں بنتی۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰهِ))(۱)

عاجز وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے چھوڑ رکھا ہو۔ خواہشات جس طرف لے جارہی ہیں وہ جارہا ہے، کوئی روک اور لگام نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ پر تمنائیں باندھ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے، معاف کردے گا، ایسا بندہ عاجز ہے۔ لہٰذا محض تمنا اور آرزو کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ تمنا کے ساتھ ساتھ قدم آگے بڑھائے، تھوڑی سی محنت کرے، عمل کرے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے کہے کہ یا اللہ! میرے بس میں جتنا تھا، اتنا میں نے کرلیا، اب اس کی تکمیل کرنا آپ کے قبضہ وقدرت میں ہے، آپ اس کی تکمیل فرما دیجئے۔

ذرا چلو تو سہی

کیا اللہ تعالیٰ ہمیں مشقت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ میرا یہ بندہ ذرا سا میری طرف چلے، جب وہ چلے گا تو ہم خود اس کی رہنمائی کریں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۲)

جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کریں گے ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے چلیں گے۔ ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ اُٹھالیں گے

حضرت والا اس کی ایک مثال دیتے ہیں کہ جیسے ایک بچہ چلنا سیکھتا ہے، اور باپ یہ چاہتا ہے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۳۸۳، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر الموت والاستعداد له، رقم: ۴۲۵۰، مسند أحمد، رقم: ۱۶۵۰۱

(۲) العنکبوت: ۶۹

کہ میرا بیٹا چلنا سیکھ لے، تو اب باپ ذرا دور کھڑے ہو کر بچے کو بلاتا ہے کہ بیٹا میرے پاس آؤ، جب وہ بیٹا ذرا سا قدم بڑھاتا ہے اور گرنے لگتا ہے تو باپ جلدی سے اس کو گود میں اُٹھا لیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف چلے گا اور قدم بڑھائے گا اور پھر وہ گرنے لگے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو گرنے نہیں دیں گے بلکہ آگے بڑھ کر اس کو تھام لیں گے۔ جب ایک باپ اور ماں اپنی اولاد کے ساتھ یہ معاملہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ جو رحمٰن الرحیم ہے، اور جو ماں اور باپ کا خالق ہے، جس نے ماں اور باپ کے دل میں شفقت اور محبت ڈالی ہے، کیا وہ اپنے بندوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا؟ بس اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میرا بندہ میرے راستے پر چلا ہے، اس نے تھوڑی سی محنت کی ہے، پھر اللہ تعالیٰ خود ہی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔

غیبت کا ایک عجیب عملی علاج

پھر حضرت والا نے آگے ایک عجیب عملی علاج بیان فرمایا۔ یہ علاج کڑوا تو ہے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اس علاج کی توفیق دیدے تو چند دن میں غیبت چھوٹ جائے، فرمایا:

> ”غیبت کا ایک عجیب و غریب عملی علاج یہ ہے کہ جس کی غیبت کرے، اس کو اپنی اس حرکت کی اطلاع کر دیا کرے، تھوڑے دن اس پر مداومت سے انشاء اللہ یہ مرض بالکل دفع ہو جائے گا“(۱)

جب کسی شخص کی غیبت ہو جائے، جا کر اس کو بتا دو کہ آج میں نے تمہاری یہ غیبت کی ہے، جس وقت جا کر یہ بتائے گا اس وقت دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن یہ ”آرا“ ہی اس بیماری کا آپریشن کرے گا، اگر چند مرتبہ یہ عمل کر لیا تو انشاء اللہ یہ بیماری جڑ سے نکل جائے گی، اور دوسری بات یہ ہے کہ جب آدمی دوسرے سے جا کر کہے گا کہ میں نے تمہاری غیبت کی تھی، اس دوسرے آدمی کے دل میں بھی نرمی پیدا ہوگی کہ یہ شخص چونکہ ندامت اور پشیمانی کے ساتھ میرے پاس آیا ہے، چلو اس کو معاف کر دو، چنانچہ غیبت کے نتیجے میں جو عداوت اور دشمنی اور اشتعال پیدا ہوتا ہے، وہ اشتعال پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۵۳

کثرتِ کلام اور اس کا علاج ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

حضرات صوفیاء کرام اور بزرگانِ دین کے پاس جب کوئی شخص اپنی اصلاح کرانے جاتا تھا تو حضرات صوفیاء کرام اس شخص سے چار قسم کے مجاہدات، ریاضتیں اور مشقیں کرایا کرتے تھے۔ نمبر ایک ''تقلیلِ طعام'' یعنی کھانا کم کھانا۔ نمبر دو ''تقلیلِ کلام'' یعنی بات چیت کم کرنا۔ نمبر تین ''تقلیلِ منام'' یعنی کم سونا۔ نمبر چار ''تقلیل الاختلاط مع الانام'' یعنی لوگوں سے کم ملنا جلنا۔

یہ چار قسم کے مجاہدات کرانے کے نتیجے میں اس شخص کی طبیعت اعتدال پر آجاتی تھی اور اعتدال پر آجانے کے بعد یہ عادتیں قابو میں آجاتی تھیں۔ چنانچہ پھر وہ شخص کھانا حد سے زیادہ نہیں کھاتا تھا اور حد سے زیادہ بولتا نہیں تھا اور حد سے زیادہ سوتا نہیں تھا اور لوگوں سے ملنا جلنا بھی حد سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

حلال چیزوں کو کیوں چھڑوایا جاتا ہے؟

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان مجاہدات کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ ہماری نفسانی خواہشات اعتدال سے ہٹی ہوئی ہیں اور گناہوں کی طرف مائل ہیں، لہٰذا ان خواہشات کو اعتدال پر لانے کے لئے اور سیدھا کرنے کے لئے بعض اوقات کچھ جائز چیزوں کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔ ایک شخص نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک چیز جائز اور حلال قرار دی ہے تو پھر صوفیاء کرام ان جائز اور حلال چیزوں کو کیوں چھڑواتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے ان کو حلال کیا ہے تو کون ان کو حرام کرسکتا ہے؟ جواب میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دراصل یہ علاج ہے۔ جب تم ڈاکٹر اور حکیم کے پاس جاتے ہو تو وہ ڈاکٹر تم سے کہتا ہے کہ تمہیں شوگر کی بیماری ہے، مٹھائی مت کھانا۔ اب دیکھئے کہ مٹھائی حلال ہے لیکن ڈاکٹر نے اس کو کھانے سے روک دیا۔ کیوں روک دیا؟ تمہاری بیماری کی وجہ سے روک دیا، کیونکہ اگر تم مٹھائی کھاؤ گے تو تمہاری

☆ اصلاحی مجالس (۵/ ۴۸ تا ۷۲)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

شوگر بڑھ جائے گی اور اس کے نتیجے میں تمہاری بیماری میں اضافہ ہوگا۔ لہٰذا ڈاکٹر یا حکیم مٹھائی کھانے سے جو منع کر رہا ہے وہ حلال کو حرام نہیں کر رہا ہے بلکہ تمہاری ضرورت کی وجہ سے اس کے کھانے سے منع کر رہا ہے۔

طبیعت کو اعتدال پر لانا مقصود ہے

اسی طرح جب کوئی شیخ اپنے کسی مرید سے یہ کہتا ہے کہ باتیں کم کرو، کھانا کم کھاؤ، کم سو، لوگوں سے ملنا جلنا کم کرو، تو اس کا مقصد کسی حلال کو حرام کرنا نہیں ہے بلکہ تمہارا علاج کرنا ہے اور تمہیں پرہیز کرانا ہے، تاکہ اس پرہیز کے نتیجے میں تمہاری طبیعت اعتدال پر آجائے۔ لہٰذا صوفیاء کرام جو مجاہدات کراتے ہیں، ان پر اس قسم کے اعتراضات نہیں کرنے چاہئیں۔

ایک خوبصورت مثال

پھر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا کہ اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے یہ کاغذ ہے، اس کاغذ کو پہلے ایک طرف موڑو، اب اس کو سیدھا کرو، تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے ہو لیکن یہ سیدھا نہیں ہوتا، اس کو سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کاغذ کو مخالف سمت میں موڑ دو، جب مخالف سمت میں موڑ دو گے تو یہ سیدھا ہو جائے گا۔

ہمارا نفس گناہوں کی طرف مڑا ہوا ہے

اسی طرح ہمارا نفس بھی گناہوں کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کی طرف مڑا ہوا ہے جس کے نتیجے میں گناہوں کے خیالات آتے ہیں، گناہوں کی خواہشات دل میں پیدا ہوتی ہیں اور گناہوں کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس نفس کا علاج یہ ہے کہ اس کو مخالف سمت میں موڑا جائے اور اس سے کچھ جائز کام بھی چھڑوائے جائیں، جب اس نفس سے جائز کام چھڑاؤ گے تو یہ اعتدال پر آجائے گا۔ لہٰذا جب کوئی شخص حضرات صوفیاء کرام کے پاس جاتا تھا تو وہ اس سے یہ فرماتے تھے کہ تم کھانا کم کھایا کرو، باتیں کم کیا کرو، لوگوں سے کم ملا کرو، کم سویا کرو، یہ چار مجاہدات کرو۔

کم کھانے اور کم سونے کی حقیقت

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو اس طریق کے مجدد اور مجتہد ہیں، انہوں نے آج کل کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے فرمایا کہ کم کھانے کی فکر میں مت پڑو بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو وسعت دی ہے

اس کے اعتبار سے کھاؤ، لہٰذا میں تمہیں "کم کھانے" کا مجاہدہ نہیں کراتا۔ اسی طرح "کم سونے" کا مجاہدہ بھی نہیں کراتا، اس لئے کہ آج کل کے جسمانی قویٰ ایسے ہیں کہ اگر کھانا کم کھاؤ گے اور کم سو گے تو بیمار پڑ جاؤ گے اور جب بیمار پڑ جاؤ گے تو جو تھوڑی بہت عبادت پہلے کر سکتے تھے وہ بھی نہیں کر سکو گے۔ اس لئے میں نہ تو تقلیلِ طعام کراتا ہوں اور نہ ہی تقلیلِ منام کراتا ہوں۔

کم کھانے کی حد

البتہ "تقلیلِ طعام" اور "تقلیلِ منام" کا ایک نسخہ بتاتا ہوں، تم اس پر عمل کر لو، تقلیلِ طعام کا نسخہ یہ ہے کہ کھانا کھانے کے دوران ہر انسان کو یہ تردّد پیدا ہوتا ہے کہ مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں، جس وقت یہ تردّد پیدا ہو اس وقت کھانا چھوڑ دو، اس سے آگے نہ بڑھو، اگر اس پر عمل کر لیا تو انشاء اللہ تعالیٰ تقلیلِ طعام کی برکات حاصل ہو جائیں گی اور ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق کبھی بیمار نہ ہو گے۔

کم سونے کی حد

اسی طرح کم سونے کے بارے میں آج کے لوگ اگر اس طرح کا مجاہدہ شروع کر دیں جس طرح کا مجاہدہ پہلے کے لوگ کیا کرتے تھے کہ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک گھنٹے کے لئے سو گئے، اس طرح مجاہدہ کے نتیجے میں آدمی بیمار اور پاگل ہو جائے گا اور دماغ خراب ہو جائے گا۔ جو تھوڑا بہت پہلے کر لیتا تھا وہ بھی چھوڑ بیٹھے گا۔

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج کل کے دور میں اس پر عمل نہیں کرنا چاہئے بلکہ یہ کرو کہ اپنی صحت کے اعتبار سے سونے کے لئے گھنٹے مقرر کر لو کہ مجھے چوبیس گھنٹے میں اتنے گھنٹے سونا چاہئے، مثلاً چھ گھنٹے یا سات گھنٹے اور زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے، سونے کے گھنٹے مقرر کرنے کے بعد پھر اس سے زیادہ سونے سے پرہیز کرو۔ بس یہی "تقلیلِ منام" ہے، ان دو مجاہدات کے بارے میں تو حضرت نے یہ تفصیل بیان فرما دی ہے۔

اس طریق کا پہلا قدم "زبان پر قابو پانا ہے"

دو مجاہدات اور ہیں۔ ایک ہے "تقلیلِ کلام" یعنی کم بولنا، اس پر عمل کرنا بہت ضروری ہے، جب تک انسان اس پر قابو نہیں پائے گا، اس وقت تک وہ اس طریق میں نہیں چل سکے گا۔ جب تک یہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے اور اس پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کوئی پابندی نہیں ہے، کوئی کنٹرول نہیں ہے، اس وقت تک اس طریق پر نہیں چل سکتا۔ اس طریق کا پہلے قدم یہ ہے کہ زبان کو قابو میں کرو

اللہ تعالیٰ نے انسان کو گوشت کا یہ لوتھڑا عطا فرمایا ہے، یہ اتنی عظیم نعمت ہے کہ پیدائش کے وقت سے جسم میں لگی ہوئی ہے اور مرتے دم تک یہ مشین کام کر رہی ہے، اس مشین کو نہ تیل دینا پڑتا ہے، نہ اس کی سروس کرنی پڑتی ہے، نہ اس کی اوور ہالنگ کرانی پڑتی ہے، نہ اس کے پارٹس تبدیل کرنے پڑتے ہیں، اور جس دن سے یہ مشین لگی ہوئی ہے مسلسل اپنا کام کر رہی ہے، اور مشین بالکل مفت میں ملی ہوئی ہے، اس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔

زبان کی حرکات وسکنات

یہ ایسی مشین ہے کہ جب دماغ میں یہ خیال آتا ہے کہ مجھے یہ بات اس طرح کہنی ہے، تو اسی لمحے یہ مشین اپنی حرکت اس طرح شروع کر دیتی ہے کہ وہ بات واضح طور پر لوگ سن لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دماغ اور اس زبان میں ایک عجیب کنکشن لگا دیا ہے کہ میرے دماغ میں جو مضمون آیا، وہ مضمون لفظوں کے سانچے میں ڈھل کر زبان کے ذریعے ادا ہو کر دوسرے آدمی کے دماغ میں پہنچ جاتا ہے۔ کیا زبان کی مختلف حرکتوں کا طریقہ تم نے خود ایجاد کیا تھا کہ اس زبان کو اس طرح موڑوں گا تو یہ حرف ادا ہوگا اور اس طرح موڑوں گا تو یہ حرف ادا ہوگا؟ کیا تم نے خود یہ لغت وضع کی تھی جس کے ذریعہ اظہارِ خیال کرتے ہو؟ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اور اپنی حکمتِ بالغہ سے ذہن کو پہلے سکھایا اور پھر زبان کو اس طرح ذہن کے تابع کر دیا کہ اِدھر دماغ میں ایک بات آئی اور اُدھر زبان سے نکل گئی۔

دماغ اور زبان کے درمیان رابطہ

اگر دونوں کے درمیان وقفہ ہوتا کہ دماغ میں تو ایک بات آ گئی، لیکن اس کو زبان پر لانے کے لئے پہلے بٹن دبانا پڑتا تو درمیان کا یہ وقفہ عذاب بن جاتا اور مشکل پیش آ جاتی اور دنیا کا کوئی کام نہ ہو پاتا، لیکن اللہ جل شانہٗ نے اپنے فضل و کرم سے اور اپنی رحمت سے دونوں کے درمیان ایسا کنکشن قائم کر دیا کہ اِدھر دماغ میں بات آئی اور اُدھر زبان سے نکل گئی، اس کے لئے نہ کوئی سوچ آن کرنا پڑتا ہے اور نہ کوئی محنت کرنی پڑتی ہے۔

ایک عبرتناک واقعہ

ویسٹ انڈیز کا ایک جزیرہ جس کا نام ''باربڈوز'' ہے۔ ایک مرتبہ وہاں جانا ہوا۔ وہاں بڑی عبرت کا معاملہ تھا۔ ایک صاحب کو دیکھا کہ ان کی زبان تھی اور زبان حرکت بھی کرتی تھی لیکن ان کے

حلق میں ایسی خرابی پیدا ہوگئی تھی کہ زبان کی حرکت کے باوجود آواز نہیں نکلتی تھی، چنانچہ ان کے لئے ایک آلہ تجویز کیا گیا، ہر وقت وہ آلہ ان کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ جب کوئی بات ان کو کرنی ہوتی تو پہلے وہ آلہ اپنے گلے میں سوراخ پر زور سے لگاتے، اس کے دبانے سے آواز نکلتی تھی، جو آواز نکلتی تھی وہ بھی کسی انسان کی آواز معلوم نہیں ہوتی تھی بلکہ کسی جانور کی آواز معلوم ہوتی تھی، جس کو سن کر بچے بے ساختہ ہنستے تھے، البتہ اس کے ذریعہ وہ اپنی بات کم از کم دوسرے کو سمجھا دیتے تھے۔

لیکن میں ان کی بیتابی کا عالم دیکھتا تھا کہ جب ان کے دماغ میں کوئی بات آتی تو فوراً نہیں کہہ سکتے تھے بلکہ وہ آلہ نکال کر لگاتے پھر آواز نکلتی، لہٰذا دماغ میں بات آنے اور زبان سے ادا کرنے کے درمیان جو وقفہ ہوتا تھا وہ وقفہ بہت بے چینی کے ساتھ گزرتا تھا۔

ہم بے شمار نعمتوں کے مالک ہیں

ہمیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر اس لئے نہیں ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں مفت میں بے مانگے بغیر کسی محنت اور مشقت کے عطا فرما رکھی ہیں، زبان بھی دے رکھی ہے، قوتِ گویائی بھی دے رکھی ہے، حلق کے اندر آواز بھی دے رکھی ہے، دماغ کے ساتھ اس زبان کا کنکشن بھی جوڑ رکھا ہے، جب اور جو کلمہ زبان سے ادا کرنا چاہتے ہیں، فوراً ادا کر لیتے ہیں، اس لئے اس زبان کی قدر نہیں، اللہ بچائے، اگر ان میں سے کوئی ایک چیز ناکارہ ہو جائے یا ان میں سے ایک چیز کے عمل میں خلل واقع ہو جائے تب پتہ چلے کہ یہ کیسی عظیم نعمت تھی جو ہم سے چھن گئی ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک ایک ایک ذرہ اپنے اندر نعمتوں کی ایک کائنات رکھتا ہے، ان میں ایک زبان بھی ہے۔

اس نعمت کو گناہ میں استعمال مت کرنا

قرآن کریم میں بار بار یہ حکم آتا ہے کہ غور و فکر کیا کرو، تو اس سے مراد یہی باتیں ہیں جو غور و فکر کرنے کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا کچھ نعمتیں دے رکھی ہیں، یہ زبان جو اللہ تعالیٰ نے سرکاری مشین عطا فرما رکھی ہے جس کو ہم مسلسل استعمال کر رہے ہیں، کبھی یہ سوچنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے کیا نعمت دے رکھی ہے، اس کو ذرا سوچا کرو، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے ہماری کسی محنت کے بغیر، کسی مشقت کے بغیر، کسی طلب کے بغیر، پیسہ خرچ کیے بغیر محض اپنے فضل سے عطا فرمائی تو اس کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دے دیا کہ ہم تمہیں یہ مشین دے تو رہے ہیں لیکن اس مشین کو دیکھ بھال کر استعمال کرنا اور اس مشین کو گناہ میں استعمال مت کرنا۔

''زبان'' آخرت کے خزانے جمع کرنے کا ذریعہ

اگر اس مشین کو صحیح استعمال کرو گے تو یہ مشین تمہارے لئے آخرت کا خزانہ جمع کرنے کا ذریعہ بن جائے گی، اگر اس زبان سے ایک مرتبہ ''سبحان اللہ'' کہہ دو گے تو یہ کلمہ تمہارے میزانِ عمل کا پلڑا بھر دے گا، اگر اس زبان سے ایک مرتبہ ''الحمدللہ'' کہہ دو گے تو میزانِ عمل کا پلڑا بھر جائے گا، یعنی اگر اللہ جل شانہ کے کسی بھی ذکر میں اس زبان کو مشغول کرو گے تو ہم تمہارے لئے میزانِ عمل کا پلڑا بھر دیں گے اور تمہارے لئے آخرت میں نیکیوں کے خزانے جمع کر دیں گے۔ اگر اس زبان سے تم ہمارے کلام کی تلاوت کرو گے تو ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں تمہارے نامۂ اعمال میں لکھ دیں گے، اگر صرف ''الم'' پڑھو گے تو تمہارے نامۂ اعمال میں تیس نیکیاں لکھی جائیں گی۔

ذرا ان کی رحمت تو دیکھئے کہ یہ مشین ان کی دی ہوئی، اس مشین میں طاقت انہی کی دی ہوئی اور یہ کلمات بھی انہی کے سکھائے ہوئے اور انہی کی توفیق سے یہ کلمات زبان سے نکل رہے ہیں، یہ کلام بھی انہی کا ہے، اس کو نازل کرنا ایک مستقل عظیم الشان نعمت ہے، پھر بھی یہ کہا جا رہا ہے کہ ان کلمات پر تمہیں انعام دیں گے، جب اس کلام کو تم ہماری دی ہوئی مشین سے پڑھو گے تو اتنی نیکیاں تمہارے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔ ان کی رحمتوں کا کچھ ٹھکانہ ہے؟

''زبان'' جہنم سے نکالنے والی ہے

لہٰذا اگر اس زبان کو تم صحیح استعمال کرو گے تو یہ زبان تمہارے لئے جنت کے محل تعمیر کر سکتی ہے، اس لئے اس زبان کو اللہ کے ذکر سے تر رکھو کیونکہ یہ زبان تمہاری آخرت کی زندگی استوار کر رہی ہے اور تمہیں جہنم سے نکال رہی ہے۔ اگر کوئی ستر برس کا کافر بھی ''أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' پڑھ لے تو اسی لمحے وہ جہنم سے نکل کر جنت میں پہنچ جائے گا۔

بہر حال! یہ زبان اتنا بڑا کارنامہ انجام دے رہی ہے کہ انسان کو جہنم سے نکال رہی ہے اور جنت میں داخل کر رہی ہے، جنت میں داخل کرنے کے اسباب جمع کر رہی ہے اور آخرت کے خزانے اکٹھے کر رہی ہے۔

یہ زبان جہنم میں لے جانے والی ہے

اس زبان کے خالق اور مالک کی طرف سے اتنا مطالبہ ہے کہ اس زبان کو ذرا سنبھال کر استعمال کرو اور اس کو گناہ کے کاموں میں استعمال مت کرو۔ کیونکہ اگر تم نے اس کو گناہ کے کاموں میں

استعمال کرلیا تو پھر جہنم میں لے جانے والی اس سے زیادہ خطرناک بھی کوئی چیز نہیں، اس لئے کہ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں کو سب سے زیادہ اوندھے منہ جہنم میں ڈالنے والی چیز ان کی زبان ہے۔(۱)

یہ زبان انسان کو بہت تیزی سے جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ مثلاً اگر جھوٹ بولا تو اس کی سزا جہنم، اگر غیبت کی تو اس کی سزا جہنم، کسی کی دل آزاری کی تو اس کی سزا جہنم، جو لفظ بھی زبان سے ایسا نکلے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف ہو، وہ لفظ انسان کو جہنم کی طرف لے جانے والا ہے، لہٰذا آپ سے مطالبہ یہ ہے کہ اس زبان کو قابو میں رکھو تا کہ کوئی غلط بات زبان سے نہ نکلے۔

زبان کے ذریعہ غیبت

ہوتا یہ ہے کہ انسان یہ بھول جاتا ہے کہ مجھے کیسی عظیم الشان نعمت ملی ہوئی ہے اور کس نے یہ نعمت دی ہے اور کس کام کے لئے دی ہے؟ یہ سب باتیں بھول جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن رات صبح سے لے کر شام تک اس زبان کو بے دھڑک استعمال کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں جائز کام کر رہا ہوں۔

لیکن جب جائز کاموں کے اندر بھی اس زبان کو بے دھڑک استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں کچھ خرابی ضرور آجاتی ہے۔ مثلاً آپ کسی جاننے والے کا اچھائی کے ساتھ تذکرہ کر رہے ہیں کہ فلاں صاحب تو بڑے اچھے ہیں، نیک آدمی ہیں، نماز روزے کے پابند ہیں وغیرہ، آپ تو اس کے اوصاف بیان کر رہے ہیں لیکن شیطان درمیان میں ایک پیوند لگا دے گا کہ یہ صاحب ویسے تو بڑے نیک ہیں لیکن ذرا سے بیوقوف ہیں، اب ''لیکن'' لگا کر ایک جملہ بڑھا دیا، اس ایک جملے نے اس تعریف کو غیبت میں تبدیل کردیا، وہ غیبت جس کے بارے میں حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

((اَلْغِیْبَۃُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا))(۲)

''غیبت زنا سے زیادہ شدید تر ہے''

شیطان نے اس کو غیبت کے اندر مبتلا کردیا۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول اللہ، باب ما جاء فی حرمۃ الصلاۃ، رقم: ۲۵۴۱، سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب کف اللسان فی الفتنۃ، رقم: ۳۹۶۳، مسند أحمد، رقم: ۲۱۰۰۸

(۲) شعب الإیمان، رقم: ۶۷۴۱ (۵/۳۰۶)، کشف الخفاء، رقم: ۱۸۱۲ (۲/۸۱)، کنز العمال، رقم: ۸۰۲۶ (۳/۵۸۶)، مجمع الزوائد (۸/۹۱)

اس زبان کو قابو میں رکھیں

بات دراصل یہ ہے کہ جب آدمی باتیں زیادہ کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں زبان حد سے پھسل جاتی ہے اور حد پر نہیں رہتی، اس لئے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اس زبان کو قابو میں کرو اور باتیں ہی کم کرو، جب باتیں کم کرو گے تو زبان کے پھسلنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ زبان اس لئے پھسلتی ہے کہ وہ صبح سے لے کر شام تک قینچی کی طرح چل رہی ہے اور اس پر کوئی رکاوٹ اور پابندی نہیں ہے۔ جن لوگوں کو بزرگوں کی صحبت میسر نہیں ہوتی، ان کو زبان قابو میں کرنے کی کوئی فکر بھی نہیں ہوتی۔ جا کر بازاروں میں دیکھیں، لوگ بے دھڑک بلا سوچے زبان سے الفاظ نکالتے ہیں، کیا ان میں سے کسی کو اس بات کی فکر ہے کہ اس زبان کو بھی قابو کرنا چاہئے، بس صبح سے لے کر شام تک ان کی زبانیں چل رہی ہیں۔

بلاضرورت مت بولیں

اس صورتِ حال کو بدلنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے اوپر تھوڑی سی پابندی لگائی جائے، اسی وجہ سے حضرات صوفیا کرام فرماتے ہیں کہ کم بولو اور صرف ضرورت کے وقت بولو، بلاضرورت نہ بولو بلکہ خاموش رہو۔ اور بزرگوں نے فرمایا کہ پہلے بات کو تولو پھر بولو، اس پر عمل اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب انسان کم بولنے کی عادت ڈالے، دل تقاضا کر رہا ہے کہ بولو، لیکن اگر بولنے کی ضرورت نہیں ہے تو خاموش ہو جاؤ، مت بولو۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے ''حضرت میاں سیّد اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ'' بڑے عجیب وغریب بزرگ تھے، ہم نے ان کی عجیب عجیب باتیں سنی ہیں، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بے تکلف بھی تھے۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ میں ایک مرتبہ ان سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو وہ فرمانے لگے کہ مولوی شفیع صاحب! آج ہم عربی میں باتیں کریں گے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ساری عمر تو کبھی عربی میں بات نہیں کی، نہ عربی میں بات کرنے کی عادت ہے اور نہ اس کی مشق ہے، اس لئے میں نے پوچھ لیا کہ حضرت ایسا کیوں؟ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ جب ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں تو زبان پر قابو رہتا نہیں، جو چاہتے ہیں بولتے چلے جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں کثرتِ کلام میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور

عربی بولنے کی نہ تمہیں زیادہ مشق ہے اور نہ مجھے زیادہ مشق ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو ضرورت کی بات ہوگی وہی کریں گے اور وہ بھی ٹوٹے پھوٹے انداز میں کریں گے اور ضرورت کے بغیر کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکلے گا۔

ہماری مثال

پھر حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ ہماری مثال اس شخص جیسی ہے جو بہت ساری پونجی لے کر گھر سے نکلا تھا، شروع میں وہ اس پونجی کو بے کھٹکے لٹاتا رہا کہ کبھی یہ چیز خرید لی اور کبھی وہ چیز خرید لی، کبھی یہ چیز کھالی اور کبھی وہ چیز کھالی، یہاں تک کہ اس پونجی کا بہت تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا جبکہ اس کی منزل ابھی بہت دور ہے، اب اس شخص کا یہ حال ہوگا کہ جو پونجی باقی رہ گئی ہے اس کو سوچ سوچ کر پھونک پھونک کر خرچ کرے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ منزل تک پہنچنے سے پہلے پہلے یہ پونجی ختم ہو جائے۔

جائز بات بھی بلا ضرورت مت بولیں

ہماری مثال بھی ایسی ہی ہے کہ ہم نے اپنی عمر کے بہت بڑے حصے میں اس زبان کی نعمت کو بے تحاشا اور بے محابا خرچ کرنے میں ضائع کر دیا، یہ پتہ نہیں کہ کتنی عمر مزید باقی ہے، اس لئے اس کی کوشش کرلیں کہ آئندہ اس زبان کو صحیح مصرف میں استعمال کرلیں اور غلط مصرف سے اس کو بچالیں، ”تقلیل کلام“ کا اصل منشا یہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ شروع میں بہت کم بولو، جائز بات بھی بلا ضرورت مت بولو اور رفتہ رفتہ جب کم بولنے کی عادت ہو جائے گی اور طبیعت اعتدال پر آجائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے منہ سے وہی بات نکلے گی جو اعتدال کے اندر ہوگی۔

جب طبیعت اعتدال کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے تو پھر جو لفظ بھی زبان سے نکلتا ہے وہ تلا ہوا نکلتا ہے، ایک سوت اِدھر یا اُدھر نہیں ہوتا، کہیں مبالغہ نہیں ہوتا، کہیں حد سے زیادہ تعریف نہیں ہوتی، کہیں حد سے زیادہ مذمت نہیں ہوتی۔

نئی نسل کو کوئی زبان نہیں آتی

بعض لوگ جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت پڑھتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ حضرت والا بڑے ثقیل ثقیل لفظ استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے بعض اوقات حضرت کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ پہلی بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ حضرت والا نے جس زمانے میں یہ کتابیں لکھی ہیں اور یہ

ملفوظات ارشاد فرمائے ہیں، اس زمانے میں لوگوں کی ایسی حالت نہیں تھی جو حالت آج ہے، آج تو ایسی قوم تیار ہو گئی ہے جس کو کوئی زبان آتی ہی نہیں، نہ اُردو، نہ فارسی، نہ عربی، نہ انگریزی، کوئی زبان صحیح نہیں آتی۔ آج کا گریجویٹ اور ایم اے پاس شخص جب بات کرے گا تو یہ کہے گا کہ "میں تشریف لایا تھا، آپ حاضر ہوئے تھے" میں آپ کے پاس اس لئے تشریف لایا تھا کہ آپ میرے گھر پر حاضر ہو جائیں" اور "میں نے آپ سے فرمایا تھا کہ آپ نے جو عرض کیا تھا" اس طرح کے الفاظ کا عام رواج ہے، میرے پاس اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کے خطوط آتے ہیں، اس میں املاء کی غلطیاں ہوتی ہیں۔

بہر حال! ایک ایسی نسل تیار ہو رہی ہے جس کو کوئی زبان صحیح نہیں آتی، اللہ تعالیٰ ہی اس پر رحم کرے۔

اُردو بولنے والوں کے چند فقرے

جس زمانے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مواعظ اور ملفوظات ارشاد فرمائے ہیں، وہ زمانہ ایسا تھا کہ اس میں عام آدمی بھی علمی اصطلاحات سے اتنا بے خبر نہیں تھا، اس زمانے کے مڈل پاس لوگوں کے خطوط آج اُٹھا کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ اس کے اندر عربی زبان کے لفاظ اس طرح استعمال کرتے تھے کہ آج کا ایم اے اور بی اے پاس شخص بھی ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ آج کے لوگوں کا یہ حال ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ "میں آج ایک ضیافت میں مدعو تھا" دوسرے شخص نے کہا کہ تم عربی بول رہے ہو یا اُردو بول رہے ہو؟ اس شخص نے دوبارہ یوں کہا کہ "آج مجھے ایک فنکشن میں انوائٹ کیا گیا ہے" تو دوسرے شخص نے کہا کہ ہاں! اب تم نے اُردو بولی۔ آج ہماری یہ حالت ہو گئی ہے۔ گویا "ضیافت" اور "مدعو" کے الفاظ بڑے ثقیل ہو گئے۔ اس وجہ سے آج کے لوگ کہتے ہیں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور ملفوظات میں بڑے ثقیل لفظ ہوتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام جچا تلا ہوتا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ اگر پڑھا لکھا آدمی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں ذرا غور کر کے دیکھے تو یہ نظر آئے گا کہ حضرت کا کلام ایسا تلا ہوا ہوتا ہے کہ اس میں نہ تو ایک لفظ زائد ہوتا ہے نہ کم ہوتا ہے، اس لئے بعض اوقات ان کو اپنا کلام حدود کے اندر رکھنے کے لئے کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جو آسان ہو، اس وجہ سے وہ بعض اوقات اپنے کلام میں مشکل الفاظ لے آتے ہیں، لیکن یہ صرف اس لئے ایسا کرتے ہیں تا کہ بات حدود کے اندر رہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ سنایا کرتے تھے کہ حضرت نے فرمایا کہ خودرائی بہت بری بلا ہے، یعنی ہمیشہ صرف اپنی رائے پر بھروسہ کرنا اور صرف اپنے اوپر اعتماد کر کے ہر کام کا خود ہی فیصلہ کر لینا یہ بہت برا ہے، لہٰذا ہر کام سے پہلے مشورہ ضرور کر لیا کرو۔ اور فرمایا کہ ''جب تک ضابطے کے بڑے موجود ہوں، ان سے مشورہ کرو'' اب دیکھئے! یہ نہیں فرمایا کہ ''جب تک بڑے موجود ہوں'' بلکہ فرمایا کہ جب تک ضابطے کے بڑے موجود ہوں، پھر خود ہی اس لفظ کے بڑھانے کی وجہ بیان فرمائی کہ ''ضابطے کے بڑے'' اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حقیقت میں کون بڑا ہے اور کون چھوٹا ہے یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ﴾(۱)

بڑا وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نواز دیں، جس کی مغفرت فرما دیں اور جس سے خوش ہو جائیں، یہ نہیں ہے کہ جو شخص عمر میں بڑا ہے یا مرتبہ میں بڑا ہے، وہ ضرور اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی بڑا ہوگا، یہ ضروری نہیں، لیکن دنیا کے اندر ضابطے میں اللہ تعالیٰ نے کچھ مرتبے بنا دیئے ہیں، مثلاً باپ بیٹے سے بڑا ہے، استاد شاگرد سے بڑا ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب تک ضابطے کے بڑے موجود ہوں، ان سے مشورہ کیا کرو اور جب ضابطے کے بڑے موجود نہ رہیں تو اپنے برابر والوں سے مشورہ کیا کرو اور جب وہ بھی نہ رہیں تو اپنے چھوٹوں سے مشورہ کیا کرو۔

جب اعتدال ہو تو ایسا ہی کلام نکلتا ہے

اگر ہم اور آپ بولتے تو صرف یہ کہتے کہ بڑوں سے مشورہ کر لیا کرو، لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے یہ لفظ اس طرح نہیں نکلا، کیونکہ دوسرے کو بڑا کہہ دینا تو ''تزکیہ علی اللہ'' ہے، اس لئے انہوں نے ایک لفظ بڑھا کر فرمایا کہ ضابطے کے بڑوں سے مشورہ کیا کرو۔ جب اللہ تعالیٰ طبیعت میں اعتدال عطا فرما دیتے ہیں تو پھر منہ سے اور قلم سے جو لفظ بھی نکلتا ہے، وہ تلا ہوا نکلتا ہے، نہ ایک انچ اِدھر ہوتا ہے، نہ ایک انچ اُدھر ہوتا ہے۔ یہی حال زبان کا ہوتا ہے، یہی حال قلم کا ہوتا ہے۔ لہٰذا جب آدمی تحریر لکھے تو تحریر کے اندر یہ نہ ہو کہ آدمی جوشِ کتابت میں حدود سے تجاوز کر جائے اور ضرورت سے زیادہ کلمات استعمال کر لے بلکہ جو کلمہ لکھے وہ سوچ سمجھ کر لکھے۔

(۱) الحجرات: ۱۳، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے''

کس مقصد سے بات کر رہے ہیں؟

اس غرض کے لئے حضرات صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ کم بولو۔ جب شروع میں انسان اس طریق میں قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلے یہ کام کرنا ہی پڑتا ہے، چنانچہ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

''ہر قول اور ہر فعل اختیاری کسی نہ کسی غایت کے لئے مطلوب ہوتا ہے، پس ہر کام اور ہر بات میں یہ سوچنا چاہئے کہ اس کی غایت کیا ہے؟ جس کام اور جس بات کی کچھ غایت نہ ہو وہ فضول ہے، اور غایت معلوم ہو مگر مفید نہ ہو وہ بھی فضول ہے، اور اگر وہ غایت کوئی ضرر ہو لازم یا متعدی تو وہ کلام یا بات مضر ہے''(۱)

فرمایا کہ جب بھی کوئی بات کرو تو ایک لمحہ کے لئے تھوڑا سوچ لیا کرو کہ جو بات میں کرنے جا رہا ہوں، اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر مقصد صحیح ہے اور شریعت کے مطابق ہے تو ٹھیک ہے بات کر لو، لیکن اگر مقصد صحیح نہیں اور شریعت کے مطابق نہیں، یا اس بات کا نہ تو دنیا میں کوئی فائدہ ہے اور نہ آخرت میں کوئی فائدہ ہے تو پھر بلاوجہ زبان کو اس میں ملوث نہ کرو بلکہ اس کو چھوڑ دو اور رک جاؤ۔ اس کی عادت اور مشق کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تہیہ کر لو کہ زبان کو غلط استعمال نہیں کریں گے بلکہ اس کو قابو میں کریں گے۔ جب آدمی اللہ کے لئے تہیہ کر لیتا ہے اور ارادہ کر کے اپنا کام درست کرنا چاہتا ہے تو پھر اللہ جل شانہ کی طرف سے مدد بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۲)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں کہ جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں، ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستوں پر لے جاتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ''ہدایت'' سے مراد "اراءۃ الطریق" نہیں ہے بلکہ "ایصال الی المطلوب" ہے، یعنی ہاتھ پکڑ کر منزل تک لے جاتے ہیں، لیکن کوئی ارادہ تو کرے، قدم تو بڑھائے، ارادہ کرنے کے بعد پھر وہی سمجھاتے ہیں کہ کیا بولنا چاہئے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کے سفر میں مکہ مکرمہ سے

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۸۶

(۲) العنکبوت: ۶۹، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے''

مدینہ طیبہ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے، جبکہ اہل مکہ نے اعلانِ عام کر رکھا تھا کہ جو شخص جناب رسول اللہ ﷺ کو پکڑ لے آئے گا۔ العیاذ باللہ۔ زندہ یا مردہ، اس کو سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ آپ اندازہ کریں کہ آج بھی سو اُونٹ کی کیا قیمت ہوگی، اس زمانے میں کیا ہوگی، اتنا بڑا انعام مقرر کر رکھا تھا اور چاروں طرف ہرکارے دوڑا رکھے تھے اور چاروں طرف جاسوس بکھرے ہوئے تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ چھپتے چھپاتے جا رہے تھے۔

راستے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا کوئی پرانا جاننے والا مل گیا جو کسی اور شہر کا رہنے والا تھا۔ چونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہردلعزیز بھی تھے اور تاجر بھی تھے، اس لئے ان کے تعلقات لوگوں سے زیادہ تھے۔ بہرحال! وہ شخص آپ سے مل کر بہت خوش ہوا اور پھر پوچھا کہ یہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ چونکہ وہ شخص حضور ﷺ کو جانتا نہیں تھا، اس لئے آپ کے بارے میں پوچھا۔ اب اگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سچ بولتے ہیں کہ یہ جناب رسول اللہ ﷺ ہیں تو ان حالات میں بتانا خطرناک ہے، کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے ذریعہ دشمنوں تک خبر پہنچ جائے اور وہ سرکارِ دو عالم ﷺ کو تکلیف پہنچا دیں، اور اگر نہ بتائیں تو یہ بھی ممکن نہیں، اس لئے کہ وہ تو براہِ راست سوال کر رہا ہے اور اگر یہ کہیں کہ یہ کوئی اور آدمی ہے تو جھوٹ ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ وہ تو ''صدیق اکبر'' تھے، جھوٹ نہیں بول سکتے تھے، جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا، لہٰذا انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جواب مانگا ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب القاء ہوا کہ یوں کہہ دو ''هَادٍ يَهْدِيْنِى السَّبِيْلَ'' یہ میرے رہنما ہیں، مجھے راستہ دکھاتے ہیں۔

دیکھئے کہ اس وقت جبکہ جان پر بنی ہوئی ہے، موت آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہے، اس وقت بھی ''صدیق'' کی زبان سے کوئی کلمہ حد سے گزرا ہوا نہیں نکلا۔ جب کوئی شخص اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان بنا دیتا ہے تو پھر انہی کی طرف سے ہدایت ہوتی ہے کہ اس موقع پر کیا کہا جائے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا جھوٹ سے بچنا

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا، چنانچہ انگریزوں کی طرف سے ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوگئے، اس زمانے پر چوراہوں پر پھانسیاں لٹکی ہوئی تھیں، چنانچہ پولیس ان کو تلاش کر رہی تھی، حضرت مولانا دیوبند کی چھتہ کی مسجد میں تشریف فرما تھے، لنگی اور معمولی سا کرتہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب هجرة النبی وأصحابه إلى المدينة، رقم: ۳۶۲۱، مسند أحمد، رقم: ۱۱۶۱۵

پہنتے تھے، کوئی شخص دیکھ کر یہ پتہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ کوئی بڑے عالم ہوں گے، پولیس والے تلاش کرتے ہوئے چھتہ کی مسجد میں پہنچ گئے، پولیس والوں نے یہ سوچا کہ جب انہوں نے اتنا بڑا کام کیا ہے تو کوئی بہت بڑے عالم ہوں گے اور بڑی شان وشوکت کے ساتھ جبہ قبہ اور دستار لگائے ہوئے ہوں گے، مگر حضرت مولانا چھتہ کی مسجد میں لنگی پہنے بیٹھے تھے، ان پولیس والوں کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ یہ مولانا قاسم صاحب ہیں، وہ سمجھے کہ یہ مسجد کا کوئی خادم ہے، چنانچہ انہی سے جا کر پوچھا کہ مولانا قاسم صاحب کہاں ہیں؟ حضرت مولانا اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور ذرا سا ہٹ کر فرمایا کہ ابھی تو یہاں تھے۔ کیونکہ اگر بتادیں کہ میں قاسم ہوں تو پکڑے جائیں اور اگر جھوٹ بولیں تو وہ گوارا نہیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مدد ہوئی کہ ذہن میں جواب القاء فرمادیا۔ چنانچہ پولیس والے اِدھر اُدھر تلاش کرکے واپس چلے گئے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی جہادِ آزادی میں شریک تھے، وہ بھی پکڑے گئے اور مجسٹریٹ کی عدالت میں بلائے گئے، مجسٹریٹ نے کہا کہ تمہارے خلاف الزام یہ ہے کہ تمہارے پاس ہتھیار ہیں، بتاؤ تمہارے پاس ہتھیار ہیں؟

اب حضرت کے پاس ہتھیار تو تھے جو آپ نے تہہ خانے میں دفن کردیئے تھے، اب اگر یہ کہیں کہ ہتھیار نہیں ہیں تو جھوٹ ہوتا ہے، اگر سچ بولیں کہ ہتھیار ہیں تو پھانسی کا تختہ سامنے ہے، حالانکہ ایسے موقع پر جب آدمی کی جان پر بن جائے تو بعض اوقات جھوٹ بولنے کی بھی اجازت ہوجاتی ہے۔ حضرت کے ہاتھ میں تسبیح تھی، آپ نے وہ تسبیح اُوپر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ اتنے میں ایک دیہاتی آگیا اور مجسٹریٹ سے کہنے لگا کہ ارے تم کس کو پکڑ لائے، یہ تو ہماری مسید (مسجد) کا موجن (موذن) ہے۔ چنانچہ مجسٹریٹ نے جب یہ دیکھا کہ یہ تو ہاتھ میں تسبیح لئے گھوم رہا ہے اور دیہاتی بھی یہ کہہ رہا ہے کہ یہ موذن ہے، تو اس نے آپ کو چھوڑ دیا۔ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے اس طرح مدد ہوتی ہے۔

<u>خلاصہ:</u> بہرحال! جب آدمی ارادہ کرلے کہ میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس مشین کو صحیح استعمال کروں گا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق استعمال کروں گا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنی طرف سے ارادہ کرلو، عزم کرلو اور اس کی فکر کرو تو پھر انشاء اللہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

وساوس اور ان کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. اَمَّا بَعْدُ!

چونکہ یہ کتاب ''انفاسِ عیسیٰ'' بڑی جامع کتاب ہے، اور بہت سے ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب بے شمار ملفوظات پر مشتمل ہے، اس لئے بالاستیعاب اس کو پڑھ کر اس کی تشریح کرنا تو مشکل ہے۔ لہٰذا میں صرف منتخب حصہ پڑھ کر اس کی تشریح بیان کر دیتا ہوں تا کہ ضروری ضروری باتوں کا بیان ہو جائے۔ اس لئے آج میں اس کتاب کا نیا باب شروع کر رہا ہوں، جو ''وساوس'' سے متعلق ہے۔

وساوس کا علاج ''عدم التفات''

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''وساوس کا علاج عدم التفات ہے اور بس، لیکن ''عدم التفات'' کو مقصود بالغیر سمجھ کر کام میں نہ لائے بلکہ اس کو مقصود بالذات سمجھے، خواہ اندفاع وساوس اس پر مرتب ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح ''راحت'' کو مقصود بالذات نہ سمجھا جائے، بلکہ اس پر آمادہ رہنا چاہئے کہ اگر تمام عمر اس سے بھی زیادہ کلفت ہو تو وہ بھی محبوب کا عطیہ ہے۔ "لِأَنَّہٗ لَيْسَ بِمَعْصِيَةٍ وَلَا اخْتِيَارِيٍ وَكُلُّ مَا كَانَ كَذٰلِكَ فَهُوَ نِعْمَةٌ" اور عبدیت یہی ہے۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطافست

اس شعر کو کبھی کبھی پڑھ لیا کرے''(۱)

☆ اصلاحی مجالس (۳۱/۴ تا ۳۸)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۹۰

کوئی شخص وساوس سے خالی نہیں

حضرت والا نے اس ملفوظ میں وسوسہ کا اور ایک کثیرالورود شبہ کا علاج فرمایا ہے۔ لوگوں کو وسوسے اور خیالاتِ فاسدہ بہت آتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے خیالات اور وساوس آتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں انسان یہ سوچتا ہے کہ اس کی وجہ سے میں کہیں کافر تو نہیں ہوگیا۔ کوئی شخص شاید ایسا نہیں ہے جس کو برے برے خیالات اور وسوسے نہ آتے ہوں، بلکہ وسوسے آتے ہیں، اور اس سے لوگ پریشان ہوتے ہیں۔ خاص کر وہ شخص جس نے دین کے راستے پر چلنے کا ابھی قصد کیا ہے اور قدم بڑھایا ہے، ایسے شخص کو بہت زیادہ وسوسے آتے ہیں، اور اس کے دل میں بہت سے خطرات گزرتے ہیں۔

دین پر چلنے والے کو وسوسے زیادہ آتے ہیں

جس شخص کا دین کی طرف اور اصلاح کی طرف دھیان ہی نہیں ہے، اور دن رات دنیاوی مشاغل میں منہمک ہے، فسق و فجور میں مبتلا ہے، ایسے شخص کو وسوسے نہیں آتے، وسوسے اس شخص کو آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستے پر اور دین کے راستے پر چل پڑتا ہے، اس کو طرح طرح کے وسوسے آتے ہیں۔ ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ان کی وجہ سے آدمی کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ میرا ایمان بھی باقی رہا یا نہیں؟ کبھی اللہ تعالیٰ کے بارے میں وسوسے آئیں گے، کبھی اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں وسوسے آئیں گے، کبھی قرآن کریم اور حدیث کے بارے میں وسوسے آئیں گے، اور کبھی شریعت کے احکام کے بارے میں وسوسے آئیں گے۔ اگر ایسے موقع پر انسان کی صحیح رہنمائی نہ ہو تو انسان گمراہی کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

ان کی طرف توجہ نہ کی جائے

ان ''وساوس'' کا علاج حضرت والا یہ بیان فرمارہے ہیں کہ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ وساوس آتے ہیں تو آنے دو، کوئی پرواہ ہی نہ کرو، اس طرف دھیان ہی نہ دو کہ دل میں کیا وسوسہ آرہا ہے اور کیا جارہا ہے۔

''وساوس'' ایمان کی علامت ہیں

یہ بات یاد رکھیں کہ یہ ''وساوس'' خود ایمان کی علامت ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک

صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! بعض اوقات میرے دل میں ایسے وسوسے اور ایسے خیالات آتے ہیں کہ ان خیالات کو زبان پر لانے کے مقابلے میں جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے گوارا ہے، اس لئے میں کیا کروں؟ سبحان اللہ! نبی کریم ﷺ نے کیا جواب دیا، فرمایا:

((ذَاكَ صَرِيحُ الْإِيمَانِ))(۱)

''یہ کھلی ایمان کی علامت ہے''

یعنی ایسے وسوسوں کا اور ایسے خیالات کا آنا تو کھلے ایمان کی علامت ہے، مؤمن ہی کے دل میں ایسے وسوسے آسکتے ہیں، اور جو کافر ہو یا جو فسق و فجور میں مبتلا ہو، اس کو ایسے وسوسے نہیں آتے۔

چور اسی گھر میں آتا ہے جہاں دولت ہو

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ چور اسی گھر میں آتا ہے جہاں کچھ مال ہو، جہاں مال ہی نہ ہو وہاں چور کیوں جائے گا۔ جس گھر کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہاں مال ہے، اس گھر میں چور داخل ہوگا۔ لہٰذا دل میں یہ چور (شیطان) اس لئے آرہا ہے کہ اس کو معلوم ہے کہ اس دل میں کچھ ہے۔ اگر اس دل میں اللہ پر اور اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان نہ ہوتا تو اس چور کو آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا جب وسوسے اور خیالات آئیں تو پہلے اس بات پر شکر ادا کرو کہ الحمد للہ ایمان موجود ہے، ورنہ یہ خیالات آتے ہی نہیں۔

خیالات پر پریشانی ایمان کی موجودگی کی علامت

اور ایمان کے موجود ہونے کی دلیل اس طرح ہے کہ جب آپ کے دل میں یہ خیالات آتے ہیں تو آپ کو پریشانی ہوتی ہے اور ان خیالات کا آنا آپ کو برا معلوم ہوتا ہے۔ اگر دل میں ایمان نہ ہوتا تو پریشانی کیوں ہوتی۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو دل میں ان خیالات کے آنے پر برا کیوں لگتا، ان خیالات سے تکلیف کیوں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ دل میں ایمان ہے۔

وساوس کیوں آتے ہیں؟

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس پریشانی کے موقع کے لئے ایک تسلی کا جملہ ارشاد فرمادیا، وہ یہ ہے:

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان الوسوسة في الإيمان، رقم: ۱۸۸، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في رد الوسوسة، رقم: ٤٤٤٧، مسند أحمد، رقم: ۹۳۱۷

﴿إِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾(۱)

یعنی شیطان کی طرف سے جو وسوسے آتے ہیں، یہ درحقیقت شیطان کی طرف سے سرگوشی ہے، تاکہ مؤمنوں کو اس سرگوشی کے ذریعہ غم میں مبتلا کرے۔ آگے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ یہ سرگوشی کرنا مؤمنوں کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر اللہ کے حکم سے۔ لہٰذا جب یہ وسوسے آکر پریشان کریں تو اس وقت یہ تصور کرو کہ یہ تو ایمان کی علامت ہیں۔ یہ شیطان اپنی سی کوشش کر رہا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ چل تو بھی اپنی سی کوشش کرلے، ہم بھی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اگر تم ان خیالات کی طرف متوجہ ہوگئے اور ان کی طرف التفات شروع کردیا کہ اس وسوسے کو دور کروں اور اس خیال کو دور کروں، تو پھر تم اس دھندے میں رہ جاؤ گے، آگے تمہاری ترقی نہیں ہو پائے گی اور شیطان کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

وساوس وخیالات کی مثال

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال کے ذریعے ان خیالات کے بارے میں سمجھارہے ہیں، فرماتے ہیں کہ ان خیالات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو بادشاہ کے دربار سے بلاوا آیا کہ آج فلاں وقت تم دربار میں آنا، ہم تم کو ملاقات کا موقع بھی دیں گے اور تمہیں انعامات سے بھی نوازیں گے۔ اب یہ شخص تیار ہو کر بادشاہ کے دربار کی طرف چل دیا۔ راستے میں ایک کتا دائیں طرف سے بھونک رہا ہے، ایک کتا بائیں طرف سے بھونک رہا ہے، اور اس کو وقت پر بادشاہ کے دربار میں پہنچنا ہے، بتایئے عقل کی بات کیا ہے؟ کیا وہ کتوں سے لڑنے بیٹھ جائے، ان کو بھونکنے سے روکے اور ان کا پیچھا کرے اور ان کو بھگائے اور ان کو گھر تک چھوڑ کر آئے؟ اگر وہ ان دھندوں میں لگ گیا تو پھر تو دربار میں پہنچنے کا وقت ہی نکل جائے گا، وقت پر نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لئے عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کتوں کو بھونکنے دو اور تم جہاں جارہے ہو اور جس منزل پر پہنچنا چاہتے ہو، اس کی فکر کرو، ان کتوں کے بھونکنے کی فکر ہی مت کرو، اور اگر تم ان کتوں کے پیچھے پڑ و گے تو دربار میں حاضری کا شرف کھو بیٹھو گے۔

اسی طرح تم یہ جو عبادات کر رہے ہو اور اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو رہے ہو، یہ عبادت اللہ تعالیٰ کے دربار میں باریابی ہے، اب باریابی کے وقت دل میں جو خیالات اور وسوسے آرہے ہیں، دراصل یہ کتے بھونک رہے ہیں، اگر تم نے ان کی طرف التفات شروع کردیا اور ان کو بھگانے کی فکر میں لگ گئے اور اپنا دھیان اس طرف لگا دیا تو پھر شیطان کا مقصد حاصل ہو جائے گا اور تم دربار کی

(۱) المجادلة: ۱۰

باریابی سے محروم ہو جاؤ گے۔

وساوس کے وقت اپنے کام میں مشغول رہو

اس لئے ان وساوس اور خیالات کا علاج ہی یہ ہے کہ ان کی طرف التفات ہی نہ کرو۔ اور ''التفات'' نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس فکر میں مت پڑو کہ کیا وسوسہ آرہا ہے اور کیا وسوسہ جارہا ہے، کیا خیال آرہا ہے اور کیا جارہا ہے، بلکہ اپنے کام میں لگے رہو۔ مثلاً خیالات آرہے ہیں اور تمہیں نماز پڑھنی ہے تو تم اپنی نماز میں لگ جاؤ۔ خیالات آرہے ہیں اور تمہیں اس وقت تلاوت کرنی ہے تو تلاوت میں لگ جاؤ۔ کسی دوسرے کام کا وقت ہے تو اس دوسرے کام میں لگ جاؤ اور ان خیالات کو اپنے اعمال پر اثر انداز نہ ہونے دو۔ یہ علاج ہے ان خیالات کا، اگر ان خیالات اور وساوس کی طرف تم لٹھ لے کر دوڑو گے تو یہ اس کا علاج نہیں۔

وساوس کا ایک اور علاج

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کہیں اندھیرا ہو رہا ہو تو اس کا یہ علاج نہیں ہے کہ آدمی اس اندھیرے کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑے کہ یہ اندھیرا بھاگ جائے، اس طرح کبھی بھی اندھیرا نہیں جائے گا، اندھیرے کا علاج یہ ہے کہ ایک چراغ جلادو، جس جگہ پر اس چراغ کی روشنی پہنچے گی وہاں سے اندھیرا خود بخود بھاگ جائے گا اور اس اندھیرے کی ظلمت خود بخود دُور ہو جائے گی۔ اسی طرح یہ شیطانی خیالات اور وساوس بھی اندھیرا ہیں، ان کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں بھاگنا، بلکہ ان کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کا چراغ جلاؤ، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کا چراغ جلاؤ اور ان کی طرف التفات نہ کرو، بس یہ وساوس اور خیالات خود دُور ہو جائیں گے۔

دوسرے خیال کی طرف متوجہ ہو جاؤ

اگر یہ خیالات بہت زیادہ آرہے ہیں تو اس کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کو بھگانے کی فکر کرنا تو پھر بھی ٹھیک نہیں، اس لئے کہ ان کو جتنا بھگاؤ گے یہ اتنا ہی اور آئیں گے۔ ان کا علاج یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی اور کام میں لگالو یا کسی اور خیال کی طرف اپنے آپ کو متوجہ کرلو۔ اس لئے کہ فلسفہ کا قاعدہ ہے:

"اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَجَّهُ إِلَى شَيْئَيْنِ فِيْ آنٍ وَاحِدٍ"

''یعنی انسان کا نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوا کرتا''

لہٰذا اگر دل میں وسوسے آ رہے ہیں اور اس وقت تم نے اس کو دوسرے خیال میں مشغول کر دیا یا دوسرے کام میں مشغول کر دیا تو پہلا خیال اور وسوسہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

وساوس دور کرنے کے لئے کوئی وظیفہ نہیں

چنانچہ اس ملفوظ میں حضرت والا نے پہلا جملہ یہی ارشاد فرمایا کہ "وساوس کا علاج عدم التفات ہے اور بس" یعنی اور کوئی علاج نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وساوس بہت آ رہے ہیں، کوئی وظیفہ بتادو جس کے نتیجے میں وسوسے نہ آئیں۔ حضرت فرما رہے ہیں کہ اس کے لئے کوئی وظیفہ نہیں، کوئی علاج نہیں، بس یہی علاج ہے کہ ان کی طرف التفات نہ کرو۔

صحت مقصود ہوتی ہے نہ کہ دوا

پھر آگے ایک دقیق بات ارشاد فرمائی کہ "لیکن عدم التفات کو مقصود بالغیر سمجھ کر کام میں نہ لاوے بلکہ اس کو مقصود بالذات سمجھے، خواہ اندفاع وساوس اس پر مرتب ہو یا نہ ہو" یعنی یہ جو میں نے کہا کہ ان وساوس کا علاج "عدم التفات" ہے، اس عدم التفات کو یہ نہ سمجھو کہ یہ "مقصود بالغیر" ہے، لہٰذا علاج کرنے کے بعد اس کی فکر لگ گئی کہ اس کے ذریعہ شفا ہوئی یا نہیں؟ دیکھئے جب آدمی کسی بیماری کے لئے دوا کھاتا ہے تو کیا وہ دوا خود مقصود بالذات ہوتی ہے؟ نہیں، بلکہ اس دوا سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ صحت حاصل ہو جائے۔ چونکہ "صحت" دوا کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، اس لحاظ سے دوا بھی مقصود ہے، لیکن مقصود بالغیر ہے، چونکہ دوا مقصود بالغیر ہے، اس لئے آدمی دوا کھانے کے بعد اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب مجھے صحت ہو جائے، لہٰذا اگر کسی بیماری کے لئے ایک دن دوا کھائی، دو دن دوا کھائی، تین دن دوا کھائی، لیکن اس دوا سے فائدہ حاصل نہ ہوا تو وہ اس دوا کو کھانا چھوڑ دے گا، کسی دوسرے ڈاکٹر سے رجوع کرے گا، اس لئے کہ دوا کھانا خود مقصود نہیں تھا، شفا مقصود تھی، جب دوا سے شفا حاصل نہیں ہو رہی ہے تو دوا کھانی چھوڑ دی۔

"عدم التفات کا علاج" خود مقصود بالذات ہے

حضرت والا فرما رہے ہیں کہ وساوس کا جو علاج بتایا ہے کہ ان وساوس کی طرف التفات نہ کرو، شفا سے بے نیاز ہو کر یہ دوا اور یہ علاج استعمال کرتے رہو، کیونکہ یہ علاج "مقصود بالغیر" نہیں، بلکہ "مقصود بالذات" ہے۔ اس لئے کہ اگر آپ نے میرے اس علاج پر ایک دن عمل کیا، دو دن تک عمل کیا، تین دن تک عمل کیا اور پھر بھی وساوس آتے رہے تو تم یہ کہو گے کہ یہ علاج غلط تھا، حالانکہ یہ

علاج غلط نہیں ہے بلکہ یہ علاج ابدی اور دائمی ہے۔ اگر بالفرض علاج کرنے کے باوجود وساوس آرہے ہیں تو یہ نہ سمجھو کہ علاج بیکار ہے، اس لئے کہ یہ علاج بذاتِ خود مقصود ہے، لہٰذا اس علاج کو مت چھوڑنا بلکہ اس پر عمل کرتے رہنا، چاہے ساری عمر وسوسے آتے رہیں، لیکن اس کی طرف سے اپنا دھیان ہٹاتے رہو، پھر وسوسے آئیں، پھر دھیان ہٹاتے رہو، ساری عمر یہ عمل کرتے رہو، بس اس کا یہی علاج ہے۔

''راحت'' خود مقصود بالذات نہیں

اسی طرح آگے ایک اور دقیق بات یہ ارشاد فرمائی کہ ''راحت'' کو مقصود بالذات نہ سمجھا جائے'' یعنی تمہیں ان وساوس اور خیالات کو دفع کرنے کی فکر ہو رہی ہے، اس سے تمہارا کیا مقصود ہے؟ اگر تمہارا مقصود یہ ہے کہ چونکہ ان وسوسوں کے آنے سے ہر وقت دماغ پر پریشانی رہتی ہے، اور جب یہ وسوسے آنا بند ہو جائیں گے تو ''راحت'' حاصل ہو جائے گی۔ اس کے بارے میں حضرت فرمارہے ہیں کہ اس ''راحت'' کو مقصود نہ بنانا، بلکہ بذاتِ خود مقصود ہی یہ ہے کہ ان وساوس اور خیالات سے توجہ کو ہٹایا جائے اور کسی دوسرے مفید کام میں انسان اپنے آپ کو لگائے، کیونکہ اگر تم نے ''راحت'' کو مقصود بنالیا تو پھر تو تم نے نفسانی حظ کو مقصود بنالیا۔

پھر اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر پر راضی رہو

اور اگر ان وساوس کی طرف عدم التفات کے باوجود وساوس آتے ہیں اور ان وساوس کے آنے سے تکلیف ہوتی ہے اور صدمہ ہوتا ہے اور رنج ہوتا ہے، تو پھر اس تکلیف اور صدمہ پر بھی راضی رہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر یہی ہے اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہے۔ اگر وہ یہی چاہتے ہیں کہ میں ساری عمر وسوسوں کے اندر مبتلا رہوں اور ہمیشہ وسوسے آتے رہیں تو پھر میں کیا کروں! جب ان کی رضا وسوسوں کے آنے میں ہے تو پھر میری بھی رضا اسی میں ہے۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

وہ جس حال میں رکھ رہے ہیں وہی میرے لئے بہتر ہے۔ لہٰذا وسوسہ آنے کی تکلیف اور صدمہ پر بھی راضی رہو۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطافست

یعنی تجھے یہ حکم نہیں ہے کہ جو شربت تجھے پینے کو مل رہا ہے، اس میں یہ دیکھے کہ وہ گدلا ہے یا صاف ہے؟ بلکہ ہمارے ساقی نے جو کچھ عطا فرمایا ہے وہ عین اس کا کرم ہے۔ تمہیں اس کی حکمت معلوم ہو یا نہ ہو، مصلحت معلوم ہو یا نہ ہو، جو کچھ اس نے تمہارے لئے تجویز کیا ہے وہ ان کا کرم ہی کرم ہے۔

تیرے لئے یہی مناسب تھا

بہت سے لوگوں کو یہ اشکال ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو تو بالکل وسوسے نہیں آتے، وہ تو بہت اطمینان سے رہتا ہے اور اس کا تعلق فلاں شیخ سے ہے، یہ ان سے بیعت ہے، اور دوسری طرف میں ہوں کہ مجھے تو بہت وسوسے آتے ہیں، کیا میں ہی وسوسے کے لئے رہ گیا ہوں؟ مجھے ہی یہ وسوسے اور خیالات آتے ہیں؟ یاد رکھئے! یہ بے صبری ہے، ارے تیرے لئے یہی مناسب تھا جو تیرے ساتھ ہو رہا ہے، اور اس کے لئے وہی مناسب تھا جو اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہ بھی ان کا کرم ہے اور وہ بھی ان کا کرم ہے۔ اس شخص کے لحاظ سے وہ کرم ہے اور تمہارے لحاظ سے یہ کرم ہے۔ اگر تو ان وساوس پر صبر کر لے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے نہ معلوم کیا درجات تیرے لئے رکھے ہوئے ہیں۔

میرے پیمانے میں حاصلِ میخانہ

لہٰذا دوسروں کی طرف مت دیکھو کہ ان کو کیا مل رہا ہے، تمہیں جو کچھ مل رہا ہے وہ تمہارے لئے ٹھیک ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس مفہوم کا ایک شعر پڑھا کرتے تھے، فرمایا۔

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مے
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

یعنی مجھے اس سے کیا غرض کہ کس کو کیا ملا ہوا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے میرے پیمانہ میں مجھے عطا فرمایا ہے، میرے لئے تو وہ سارے میخانے کا حاصل ہے۔

صبر کرنے کا ثواب علیحدہ ملے گا

بہرحال! جو کرنے کے کام ہیں وہ کیے جاؤ اور جو غیر اختیاری خیالات اور وساوس آتے ہیں، ان کی طرف التفات نہ کرو، ان وساوس کے آنے سے جو تکلیف اور صدمہ ہو رہا ہے، اس کے بارے میں یہ سوچو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، یہ ان کا فیصلہ ہے، ان کی قضا ہے، ان کی تقدیر ہے، میں اس پر راضی ہوں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ وسوسے تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے، دوسرے یہ کہ ان وسوسوں کے آنے سے جو تکلیف ہو رہی ہے، اس پر اجر ملے گا اور ثواب ملے گا اور تمہارے درجات

بلند ہوں گے، لہٰذا ان وسوسوں سے فائدہ ہی فائدہ ہے، نقصان کوئی نہیں۔ اور جب تم اس پر راضی ہو جاؤ گے اور یہ کہو گے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ میرے لئے مقرر فرمایا ہے، میں اس پر راضی ہوں تو پھر ''رضا بالقضا'' کا اجر بھی تمہارے اعمال نامہ میں لکھا جائے گا، اس کے علاوہ صبر کا اجر بھی تمہارے لئے لکھا جائے گا۔

دنیا میں تکلیف ضرور پہنچنی ہے

یاد رکھو! اس دنیا میں مکمل راحت کسی کو حاصل ہو ہی نہیں سکتی، چاہے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگالے، چاہے وہ بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، بڑے سے بڑا امیر کبیر انسان ہو، اس لئے کہ یہ دنیا راحتِ کاملہ کی دنیا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں، ایک عالم وہ ہے جس میں راحت ہی راحت ہے، جس میں تکلیف کا اور غم کا اور صدمہ کا نام و نشان نہیں ہوگا، وہ عالمِ جنت ہے۔ دوسرا عالم وہ ہے جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، غم ہی غم اور صدمہ ہی صدمہ ہے، جس میں راحت اور سکون کا نام و نشان نہیں ہے، وہ عالمِ جہنم ہے۔ اور یہ عالمِ دنیا جس میں ہم اور آپ گزر رہے ہیں، اس میں راحت بھی ہے اور تکلیف بھی ہے، اس میں غم بھی ہے اور خوشی بھی ہے، یہاں کی کوئی راحت خالص نہیں ہے، بلکہ ہر راحت کے ساتھ تکلیف کا کانٹا لگا ہوا ہے، یہاں کی کوئی خوشی خالص نہیں ہے، بلکہ ہر خوشی کے ساتھ غم کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں یہاں اس دنیا میں صرف راحت ہی راحت حاصل کروں، مجھے کوئی صدمہ نہ پہنچے، کوئی تکلیف نہ پہنچے، تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ہو، بڑے سے بڑا حاکم ہو، بڑے سے بڑا دولت مند ہو، بڑے سے بڑا دانشور ہو، بڑے سے بڑا عالم ہو، بڑے سے بڑا ہنر مند ہو، اس کو لے آؤ اور اس سے پوچھو کہ کیا تمہیں کبھی بھی تکلیف نہیں پہنچی؟ وہ شخص کبھی یہ نہیں کہے گا کہ مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی، کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور پہنچی ہے۔

لہٰذا جب اس دنیا میں تکلیف پہنچنی ہی ہے تو اب چاہو تو اس تکلیف پر صبر کرلو، چاہو تو بے صبری کرلو، چاہو تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ اور یہ کہہ دو کہ جو تکلیف ان کی طرف سے پہنچ رہی ہے، میں اس پر راضی ہوں، تو اس کے نتیجے میں تم اس بشارت کے مستحق ہو جاؤ گے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے:

﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾(۱)

''بیشک صبر کرنے والوں کو بے شمار اجر ملے گا''

(۱) الزمر: ۱۰

لہٰذا اس دنیا میں جتنا سکون ''رضا بالقضا'' یعنی اللہ کے فیصلے پر راضی ہونے کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے، اتنا سکون کسی اور طریقے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ بہت اچھا حال ہے، بہت مزہ آرہا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا مزہ آرہا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ارے میاں! اس شخص کے مزہ کا کیا حال پوچھتے ہو کہ دنیا میں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہی نہیں، میرا تو حال یہ ہے کہ دنیا میں جو کام ہورہا ہے وہ میری مرضی کے مطابق ہورہا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت! آج تک دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں گزرا کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ ہوتا ہو، حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی مرضی کے خلاف بھی کام ہوتے تھے، آپ کو ایسا مقام کہاں سے مل گیا کہ آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہوتا؟ انہوں نے فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ میں نے اپنی مرضی مٹا کر مولیٰ کی مرضی کے تابع بنا دیا ہے، جو ان کی مرضی وہ میری مرضی، جو وہ چاہتے ہیں میں بھی وہی چاہتا ہوں، اور جب کائنات میں کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا تو میری مرضی کے خلاف بھی نہیں ہوتا، سکون کی یہ حالت اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل وکرم سے عطا فرمائی ہے۔

''رضا بالقضا'' میں سکون ہے

بہرحال! ''رضا بالقضا'' سے بڑھ کر کوئی اور سکون کا راستہ نہیں، اب یا تو اس ذریعہ سے سکون حاصل کرلو یا عمر بھر راحت کے لئے تڑپتے رہو، وہ میسر نہیں آئے گی۔ خلاصہ یہ کہ اس ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ اگر بالفرض وساوس کی طرف عدم التفات کے باوجود وسوسے ختم نہ ہوں، بلکہ پھر بھی مسلسل آتے رہیں تو اس سے مت گھبراؤ اور پریشان مت ہو، بلکہ ان وسوسوں کے آنے پر راضی ہوجاؤ اور یہ سوچو کہ جب میرے اللہ نے میرے لئے یہ مقدر کردیا ہے تو میں اس پر خوش ہوں۔ البتہ ان وساوس کے تقاضوں پر عمل مت کرو۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو صحیح فہم عطا فرمائے، اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

بدگمانی اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا﴾(١)

بدگمانی اور تجسس ایسے گناہ ہیں جن کو ہم نے گناہ سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے، حالانکہ قرآن کریم کی نص صریح ہے کہ دوسرے کے خلاف بدگمانی کرنا بھی حرام ہے اور تجسس کرنا یعنی دوسرے کی ٹوہ میں لگنا کہ یہ کیا غلط کام کر رہا ہے، اور دوسرے کے عیب تلاش کرنا بھی حرام ہے۔

قرآن کریم نے صاف لفظوں میں فرمادیا "وَلَا تَجَسَّسُوْا" دوسرے کی ٹوہ میں نہ لگو، بلکہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے کام سے کام رکھے، دوسرے کی فکر میں نہ پڑے۔ اسی طرح بدگمانی کرنا بھی حرام ہے، کسی کے بارے میں اگر کوئی بات سامنے آئی ہے تو آدمی کو چاہئے کہ اس کے بارے میں نیک گمانی کرے۔ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((ظُنُّوْا بِالْمُؤْمِنِيْنَ خَيْرًا))(٢)

"مؤمنین کے ساتھ نیک گمان رکھو"

خواہ مخواہ بلاوجہ بدگمانی کرنا کہ اس نے یہ کیا ہوگا، اس نیت سے کیا ہوگا، یہ بدگمانی ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا:

﴿اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾(٣)

"بعض گمان براہِ راست گناہ ہوتے ہیں"

☆ اصلاحی مجالس (١/٢١٥-٢٣٦)

(١) الحجرات: ١٢　(٢) العرف الشذی للکشمیری (١/٣٢٢)　(٣) الحجرات: ١٢

معاشرتی خرابیوں کا سبب

یہ سب کام ناجائز اور حرام ہیں اور قرآن وحدیث کی نصوص ان کے خلاف صریح ہیں، ان میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اور یہ گناہ معاشرتی خرابیاں پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ معاشرے میں آپس میں نااتفاقیاں، ناچاقیاں، ایک دوسرے سے لڑائیاں یہ سب بدگمانی اور تجسس سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ دونوں بڑے گناہ ہیں اور بہت سے فتنوں کی جڑ ہیں۔

ہمارے معاشرے کی حالت

لیکن ہمارا معاشرہ ان دونوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر شخص اپنی طرف سے دوسرے کے بارے میں ایک گمان قائم کرلیتا ہے اور پھر اس پر ایسا یقین کرلیتا ہے جیسے اس نے اپنی آنکھوں سے اسے وہ کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ذرا سی بات علم میں آگئی، بس اس پر اپنی طرف سے مفروضوں کا محل تعمیر کرلے گا، پھر ان مفروضوں کو دوسروں کی طرف منسوب کردے گا کہ اس نے ایسا کیا ہوگا۔ پھر بعد میں ''کیا ہوگا'' بھی نہیں رہتا بلکہ ''کیا ہے'' ہوجاتا ہے۔

آیتِ قرآنی میں عجیب ترتیب

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ قرآن کریم کی اس آیت:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا﴾(۱)

کی تفسیر کے تحت بیان فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عجیب ترتیب قائم فرمائی ہے، وہ یہ کہ پہلے تو یہ فرمایا کہ بدگمانی مت کرو، یعنی کسی شخص کے بارے میں کسی بات کا کوئی قرینہ اور شائبہ معلوم ہوا تو آپ اس کی تحقیق کیے بغیر اس کے بارے میں بدگمانی کرکے بیٹھ گئے، یہ فعل تو حرام ہے۔ اب جو شخص بدگمانی کر رہا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ اچھا آپ نے بدگمانی کو تو منع کردیا کہ بلاتحقیق کے کسی کے بارے میں بدگمان مت ہوجاؤ۔ تو اچھا مجھے تحقیق کرنے کی اجازت دے دو تاکہ میں تحقیق کروں کہ آیا اس نے یہ گناہ کیا یا نہیں؟ یہ عیب اس کے اندر موجود ہے یا نہیں؟ تو اب دوسرے مرحلے پر قرآن کریم نے یہ حکم دے دیا کہ ''وَلَا تَجَسَّسُوْا'' یعنی اگر تم کسی کے گناہ کی اور عیب کی تحقیق کرنا چاہتے ہو تو تمہیں اس تحقیق کی بھی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ تمہیں اس کے گناہوں کی کیا پڑی ہے کہ

---

(۱) الحجرات: ۱۲

تم اس کی فکر میں لگ گئے کہ اس نے یہ گناہ کیا ہے یا نہیں؟ ؏

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کا جواب اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ دے گا، تمہیں اس کی تحقیق کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے تجسّس کرنا منع ہے۔

تجسّس اور تحسّس میں فرق

حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے اس کے لئے دو لفظ استعمال فرمائے، فرمایا:

((وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا تَحَسَّسُوا))(۱)

''نہ تجسّس کرو اور نہ ہی تحسّس کرو''

''تجسّس'' کے معنی وہ ہیں جو اوپر بیان کیے یعنی انسان اس فکر میں پڑے کہ دوسرے کا عیب مجھے معلوم ہو جائے، چاہے اس کے لئے کوئی بھی طریقہ اختیار کرے۔ اور ''تحسّس'' کے معنی وہ ہیں جس کو اُردو میں ''کنسوئے لینا'' کہتے ہیں۔ یعنی کسی کی راز کی بات چپکے سے سننے کی کوشش کرنا۔ وہ چھپانا چاہتا ہے اور یہ سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ''تجسّس اور تحسّس'' دونوں کو حرام قرار دے دیا۔

تجسّس کیوں حرام ہے؟

کیوں حرام قرار دیا؟ اس لئے کہ تجسّس کرنا یا تحسّس کرنا اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنے عیب سے بے خبر اور بے فکر ہے۔ اگر اسے اپنے عیب کی فکر ہوتی تو کبھی دوسرے کے عیوب کی تجسّس میں نہ پڑتا۔ جس آدمی کے خود پیٹ میں درد ہو رہا ہو اور وہ اس درد سے بیتاب اور بے چین ہو، کیا اس کو یہ فکر ہوگی کہ فلاں کو نزلہ ہے یا نہیں؟ فلاں کو کھانسی ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ اس کو اپنی فکر پڑی ہوئی ہے، وہ اپنے درد سے بے چین ہے۔ جب تک اس درد سے اس کو سکون نہ مل جائے، وہ اس وقت تک دوسرے کی طرف کیسے دیکھے!

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لا یخطب علی خطبة أخیه حتی ینکح أو یدع، رقم: ۴۷۴۷، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظن والتجسّس والتنافس والتناجش، رقم: ۴۶۴۶، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الظن، رقم: ۴۲۷۱، مسند أحمد، رقم: ۷۵۲۰

اپنے عیوب کی فکر کریں

اگر ہم لوگوں کو اپنے عیب کی فکر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جا کر میرا کیا انجام ہونا ہے؟ آخرت میں میرا کیا حال ہوگا؟ جب یہ فکر پیدا ہو جائے تو پھر دوسرے کی طرف نگاہ پڑ ہی نہیں سکتی۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم فرماتے ہیں۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے ڈھونڈتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

جب تک اپنی برائیوں سے بے خبر تھے، اس وقت تک یہ حال تھا کہ کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں، کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں، اور انہی کو برا سمجھ رہے ہیں، لیکن جب اپنے عیوب پر نگاہ پڑی تو کوئی برا نہ رہا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی حالت

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے عیوب کی فکر عطا فرماتے ہیں، ان کو تو ساری دنیا اچھی نظر آتی ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو اس صدی کے مجدد تھے، وہ فرماتے ہیں:

''میں تمام مسلمانوں کو اپنے آپ سے حالاً اور تمام کافروں کو اپنے آپ سے مآلاً افضل سمجھتا ہوں''

یعنی مسلمان تو سارے کے سارے اس وقت بھی مجھ سے افضل ہیں اور کافروں کو بھی آئندہ کے اعتبار سے افضل سمجھتا ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کو کسی وقت ایمان کی توفیق دیدے اور مآل اور انجام کے اعتبار سے وہ بھی مجھ سے آگے نکل جائیں، اس لئے میں ان کو بھی افضل سمجھتا ہوں۔ جب اتنے بڑے آدمی کا یہ حال ہے تو ہما شما کس شمار قطار میں ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ اپنے عیوب کی فکر عطا فرماتے ہیں وہ ساری دنیا کو اپنے سے افضل سمجھتا ہے، وہ دوسروں کے عیوب کی فکر میں نہیں رہتا ہے۔

لہٰذا اپنی فکر کرو کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ کیا عمل کر رہے ہو؟ کیا کیا عیب تمہارے اندر موجود ہیں؟ کیا کیا خرابیاں تمہارے اندر پائی جاتی ہیں؟ ان کو دور کرنے کی فکر کرو۔ دوسروں کی فکر کرنا، دوسروں کا تجسس کرنا، ان کی ٹوہ میں لگنا، دوسروں کے بارے میں بدگمانی اور غیبت کرنا حرام ہے، اور اس کے ذریعہ ہم اپنی دنیا بھی خراب کر رہے ہیں اور آخرت بھی خراب کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل و کرم سے ان برائیوں سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مذموم بدگمانی کونسی؟

بہرحال، اس بدگمانی اور تجسس کے بارے میں حضرت والا کے ملفوظات ہیں:

فرمایا کہ بدگمانی تکبر سے پیدا ہوتی ہے۔ مذموم بدگمانی وہ ہے جو خود لائی جائے، باقی جو وسوسہ خود آئے وہ مذموم بدگمانی نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو، اور عمل کی صورت یہ ہے کہ یا دل سے اس پر اعتقاد جازم کرلے یا زبان سے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کردے، جب تک وسوسہ پر عمل نہ ہو اس وقت تک نہ اس پر مواخذہ ہے نہ وہ مضر ہے۔(۱)

ایک شخص کے طرزِ عمل سے اس کے بارے میں آپ کو کچھ شبہ ہوا، اور دل میں وسوسہ آیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فلاں کام کیا ہوگا، اگر دل میں یہ وسوسہ خود بخود آیا اور خود بخود دل میں شبہ پیدا ہوا تو اس پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ اس میں آپ کے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔

دوسرے کے عمل کی تاویل کریں

مثلاً رمضان کے دن میں آپ نے ایک شخص کو ہوٹل سے نکلتے دیکھا، آپ کے دل میں خیال آئے گا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے روزہ توڑا ہے، اب یہ جو خیال دل میں خود بخود پیدا ہوا، یہ کوئی گناہ نہیں۔ البتہ آدمی کو چاہئے کہ حتی الامکان اس کے اس عمل کو صحیح محمل پر محمول کرے۔ مثلاً یہ کہ یہ شخص جو ہوٹل سے نکل رہا ہے، شاید یہ اپنے بیمار کے لئے کھانا خریدنے گیا ہوگا یا کسی آدمی سے بات کرنے کے لئے ہوٹل کے اندر گیا ہوگا۔ یہ احتمالات بھی موجود ہیں، لہٰذا دل میں یہ احتمالات پیدا کرے کہ شاید ایسا ہوا ہو، زیادہ تحقیق میں پڑنے کے ہم مکلف نہیں۔

یہ بدگمانی حرام ہے

لہٰذا خود بخود دل میں جو خیال آیا تھا، وہ گناہ نہیں، اس پر مؤاخذہ بھی نہیں، لیکن اگر دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا، اس پر آپ نے پہلے اعتقاد اور یقین کرلیا کہ یہ صاحب ہوٹل میں روزہ توڑنے کے لئے داخل ہوئے تھے اور کھانا کھا کر باہر آئے ہیں، اس کا یقین کرلیا اور دوسرے احتمالات کی طرف دھیان نہیں کیا، اور پھر اس سے آگے بڑھ کر یہ کیا کہ دوسروں کے سامنے بیان کرنا شروع کردیا کہ میں نے خود اس کو روزہ میں کھاتے ہوئے دیکھا ہے، حالانکہ اس نے صرف یہ دیکھا تھا کہ وہ شخص ہوٹل سے

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۳

نکل رہا تھا، کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن دوسروں کے سامنے اس طرح بیان کر رہا ہے جیسے خود اس نے کھاتے ہوئے دیکھا تھا، اور سو فیصد یقین کے ساتھ دوسروں سے کہہ رہا ہے کہ یہ شخص روزہ خور ہے، یہ بدگمانی حرام اور ناجائز ہے۔

اس لئے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ دل میں خود بخود کسی کے بارے میں کوئی گمان پیدا ہو جانا، یہ کچھ گناہ نہیں، لیکن اس گمان پر سو فیصد یقین کر بیٹھنا اور پھر اس یقینی انداز میں اس کا تذکرہ کرنا گناہ ہے۔ اس لئے حضرت فرماتے ہیں:

> ''مذموم بدگمانی وہ ہے جو خود لائی جائے، باقی جو وسوسہ خود آئے وہ مذموم بدگمانی نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو، اور عمل کی صورت یہ ہے کہ یا دل سے اس پر اعتقاد جازم کر لے (یعنی یقین کر لے، پہلے صرف گمان تھا پھر اس گمان کو یقین سے تبدیل کر دیا) یا زبان سے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کر دے''

بدگمانی کے دو درجے

گویا کہ بدگمانی کے دو درجے ہوئے، ایک درجہ غیر اختیاری ہے، وہ یہ کہ اپنے کسی عمل کے بغیر دل میں کسی کی طرف سے کوئی گمان پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ دوسرا درجہ اختیاری ہے، وہ یہ کہ جو گمان دل میں پیدا ہوا، اس گمان کو لے کر بیٹھ گیا، اور اس سے مختلف باتیں نکال رہا ہے، اور اس پر یقین کر رہا ہے، یا اس کا تذکرہ دوسروں کے سامنے کر رہا ہے۔ یہ دوسرا درجہ حرام ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔

بدگمانی کا منشا کبر ہے

آگے حضرت والا نے بدگمانی کا علاج بیان فرمایا:

> ''جب کسی سے بدگمانی پیدا ہو جس کا منشا کبر ہے، تو اپنے عیوب کو پیشِ نظر کر لیا کرو''(۱)

یہ اس کا علاج ہے۔ یعنی دوسرے کے بارے میں دل میں برا گمان آیا، دل میں برا خیال آیا، بدگمانی پیدا ہوئی، اگرچہ وہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں، لیکن یہ غیر اختیاری بدگمانی بھی اگر دل میں زیادہ دیر جمی رہے گی تو گناہ کے اندر مبتلا کر دے گی، یا تو دل میں یقین پیدا کر دے گی یا دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ کرا دے گی۔ اس لئے اس کے علاج کی بھی فکر کرنی چاہئے۔

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۳

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چنگاری آ کر گر پڑی، اور آپ نے اس کو بجھایا نہیں، تو وہ چنگاری کسی بھی وقت شعلہ بن جائے گی۔ اسی طرح غیر اختیاری گمان کا بھی علاج کرنا ضروری ہے، وہ علاج یہ ہے کہ اپنے عیوب کو پیش نظر کر لے کہ میرے اندر تو فلاں فلاں عیب ہیں تو دوسرے کو کیا دیکھوں، اور اس کے بارے میں کیا گمان کروں، میری حالت خود خراب ہے، میرے اندر فلاں عیب ہے، میرے اندر فلاں عیب ہے۔ لہٰذا اپنے عیوب کے استحضار کرنے سے یہ بیماری رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔

تجسّس اور بدگمانی کی انتہاء ''غیبت'' ہے

آگے حضرت والا نے فرمایا:

> ''بدگمانی، تجسّس، غیبت، ان سب کا منشا کبر ہے، بلکہ متکبر کی غرض پوری طرح غیبت ہی سے حاصل ہوتی ہے، بدگمانی اور تجسّس سب اسی کے مقدمات ہیں۔ اگر کوئی شخص تجسّس اور بدگمانی کرے، مگر غیبت نہ کرے تو اس کا مقصود حاصل نہ ہوگا، اس لئے وہ بدگمانی اور تجسّس کو بھی ترک کر دے گا۔ پس غیبت سب سے اشد ہے''(۱)

یعنی یہ تینوں بیماریاں، بدگمانی، تجسّس اور غیبت، یہ سب ایک اور بیماری سے پیدا ہوتی ہیں، وہ ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، جب آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے تب ہی وہ دوسرے سے بدگمان ہوتا ہے، اور تب ہی دوسرے کی ٹوہ میں لگتا ہے کہ اس کا کوئی عیب میرے ہاتھ آ جائے، اور تب ہی اس کی غیبت کرتا ہے۔ اور اصل ان تینوں میں سے غیبت ہے، اور متکبر کو اصل مزہ تو غیبت کرنے میں آتا ہے، لیکن غیبت کی تمہید کے طور پر وہ متکبر بدگمانی اور تجسّس کو استعمال کرتا ہے کہ جب میں بدگمانی اور تجسّس کروں گا تو اس کے نتیجے میں غیبت کرنے کا موقع ملے گا۔ لہٰذا بدگمانی اور تجسّس غیبت کے مقدمات ہیں، کیونکہ تجسّس کے نتیجے میں کوئی عیب ظاہر ہوگا تو اس کو لوگوں کے سامنے بیان کروں گا اور بدگمانی کے نتیجے میں نقص دل میں آئے گا تو اس کو لوگوں کے سامنے بیان کروں گا۔ لہٰذا آخری نتیجہ تو غیبت ہے جو متکبر کی اصل غرض ہے۔ ایسا آدمی ملنا مشکل ہے جو بدگمانی کرے اور تجسّس بھی کرے لیکن پھر آگے غیبت نہ کرے، کیونکہ وہ بدگمانی اور تجسّس اسی لئے کر رہا ہے کہ وہ غیبت کا مزہ لینا چاہتا ہے۔ اصل مقصود تو غیبت ہے، یہ بدگمانی اور تجسّس تو درمیان کے آلے اور واسطے ہیں۔ لہٰذا ان سب بیماریوں میں سب سے زیادہ اشد اور قابل توجہ بیماری ''غیبت'' ہے۔ اگر غیبت چھوٹ گئی تو پھر بدگمانی اور تجسّس بآسانی چھوٹ جائیں گی۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۳

بدگمانی میں گناہ کا درجہ

آگے حضرت والا نے فرمایا:

''بدگمانی میں گناہ کا درجہ تو وہ ہے جس کا ذہن میں اعتقاد راسخ ہو، اگر راسخ نہ ہو تو مضر نہیں، مگر علاج اس کا بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ اپنے عیوب کو پیشِ نظر رکھے، پھر اگر علاج کے بعد کچھ اثر رہے تو وہ مذموم نہیں''(۱)

یعنی بدگمانی میں گناہ اس وقت ہے جب اس بدگمانی پر یقین کرلے، لیکن اگر یقین نہ کرے بلکہ محض احتمال کے درجے میں دل کے اندر موجود ہے کہ شاید اس نے یہ کام کیا ہو تو وہ مضر نہیں اور اس غیر اختیاری احتمال پر گناہ بھی نہیں۔ مثلاً رمضان میں کسی کو دن میں ہوٹل سے نکلتا ہوا دیکھا تو دل میں یہ خیال آیا کہ شاید اس نے روزہ توڑ دیا ہو، لیکن اس پر یقین نہیں کیا، یہ مضر تو نہیں لیکن علاج اس کا بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ خیال ابھی چنگاری کے درجے میں ہے، ابھی شعلہ نہیں بنی، لیکن کسی بھی وقت شعلہ بن کر تمہیں خاکستر کردے گی۔ لہٰذا اس کا بھی علاج کرے، وہ یہ کہ اپنے عیوب کو پیشِ نظر رکھے۔ البتہ علاج کے بعد اب بھی تھوڑا بہت بدگمانی کا خیال دل میں آتا ہے تو وہ مذموم نہیں، کیونکہ یہ اختیار سے باہر ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر صحیح طور پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بدگمانی اور تجسّس اور غیبت سے بچنے کے تین علاج

حضرت والا نے فرمایا:

''بدگمانی، تجسّس اور غیبت کا علاج یہ ہے کہ تواضع اختیار کرو، تکبر کو دل سے نکالو، اور جب تک اصلی مرض زائل نہ ہو اس وقت تک غیبت کا فوری علاج یہ کرو کہ (۱) فکر و تأمل سے کام لو (۲) اور کوتاہی پر جرمانہ مقرر کرو (۳) اور وسوسہ بدگمانی کے وقت توجہ کو ذکر اللہ وغیرہ کی طرف منعطف کرو''(۲)

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو علاج تجویز فرمائے ہیں۔ ایک علاج پائیدار، دوسرا علاج وقتی اور فوری۔ پھر فوری اور وقتی علاج کی بھی تین صورتیں بیان فرمائیں۔ پہلا علاج یہ ہے کہ فکر و تأمل سے کام لو۔ یعنی بات کرنے سے پہلے سوچو کہ یہ بات زبان سے نکالوں یا نہ نکالوں، پہلے تو لو پھر بولو۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۴ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۴

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا سکوت

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی شخص سوال کرتا تو آپ خاموش رہتے، فوراً جواب نہیں دیتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں لیکن آپ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ جواب میں فرمایا:

"حَتّٰی أَعْرِفَ أَنَّ الْفَضْلَ فِی السُّکُوْتِ أَوْ فِی الْکَلَامِ"

''یعنی میں اس وقت تک خاموش رہتا ہوں جب تک میرے سامنے یہ واضح نہ ہو جائے کہ بہتری بولنے میں ہے یا خاموش رہنے میں ہے''

یہ درحقیقت اس مقولے پر عمل ہو رہا تھا کہ ''پہلے تولو پھر بولو''

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زبان کو سزا دینا

روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی زبان کو بیٹھے ہوئے مروڑ رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ جواب دیا:

"إِنَّ هٰذَا أَوْرَدَنِيَ الْمَوَارِدَ"

''اس زبان نے مجھے ہلاکت کی جگہوں میں ڈالا ہے''(۱)

یہ کون کہہ رہا ہے؟ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، ''صدیق'' کون ہوتا ہے؟ نبی کا آئینہ، وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس زبان نے مجھے ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ فکر عطا فرماتے ہیں، وہ اس طرح زبان کا استعمال کرنے میں احتیاط اور اس کا استحضار رکھنے کی تدبیر کرتے ہیں۔

لہٰذا اگر انسان زبان کو صحیح استعمال کرے تو بڑی اچھی چیز ہے، اور اگر اس کو غلط استعمال کرے تو یہ بڑی خراب چیز ہے۔ یہی زبان جنت میں لے جانے والی ہے، اور یہی زبان جہنم میں ڈالنے والی ہے۔ اگر دل کے یقین کے ساتھ زبان سے یہ کلمہ "أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھ لیا، تو کافر جہنم سے جنت میں پہنچ جائے گا۔ اور اگر کسی مسلمان نے اس زبان سے کفر بول دیا تو وہ مسلمان سیدھا جہنم میں پہنچ جائے گا۔ حدیث شریف میں ہے کہ لوگ اپنی زبان کے کرتوت کی وجہ سے جہنم کے اندر اوندھے منہ ڈالے جائیں گے۔(۲)

(۱) موطا مالك، الكتاب الجامع، باب ما جاء فيما يخاف من اللسان، رقم: ۱۵۶۷

(۲) سنن الترمذي، كتاب الإيمان عن رسول الله، باب ما جاء في حرمة الصلاة، رقم: ۲۵۴۱، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب كف اللسان في الفتنة، رقم: ۳۹۶۳، مسند أحمد، رقم: ۲۱۰۰۸

اس زبان کا بے محابا استعمال کہ جو منہ میں آیا بک دیا، جو سمجھ میں آیا کہہ گزرے، اس کو چھوڑو اور بولنے سے پہلے سوچنے کی عادت ڈالو کہ یہ زبان سے جو کلمہ نکال رہا ہوں یہ کہیں مجھے ہلاکت میں تو نہیں ڈال دے گا۔

خاموش رہنے کا مجاہدہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، وہ بہت بولتے تھے، آتے ہی بولنا شروع کر دیتے اور پھر کوئی انتہاء نہیں ہوتی تھی۔ والد صاحب برداشت کرتے تھے۔ چند روز کے بعد ان صاحب نے کہا کہ حضرت! میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں اور اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتے ہو تو پہلا کام یہ کرو کہ اس زبان پر تالا لگاؤ، یہ زبان جو قینچی کی طرح چل رہی ہے اس کو روکو، بس یہی تمہارا وظیفہ اور علاج ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جب وہ مجلس میں آتے تو خاموش بیٹھے رہتے اور اسی علاج کے ذریعے ان کی اصلاح ہوگئی۔

غیبت ہونے پر جرمانہ

اس لئے بولنے میں فکر اور تأمل سے کام لو کہ میں جو بول رہا ہوں یہ غیبت ہے یا جھوٹ ہے، جائز ہے یا ناجائز ہے، حرام ہے یا حلال ہے، اس کو پہلے سوچو، اور اگر تأمل اور غور و فکر کرنے کے باوجود اور توبہ و استغفار کرنے کے باوجود پھر بھی کوتاہی ہو جائے اور غیبت سرزد ہو جائے تو پھر اپنے اُوپر جرمانہ مقرر کرو کہ آئندہ جب کبھی غیبت ہوگی تو اتنے پیسے ادا کروں گا۔ لیکن پیسے اتنے ہونے چاہئیں جن کو نکالنے میں تھوڑی سی تکلیف ہو، اتنا کم نہ ہو جیسے علی گڑھ کالج میں تھا۔

نماز چھوڑنے پر جرمانہ

علی گڑھ کالج میں تمام طلبہ کو مسجد میں نماز پڑھنا ضروری تھا۔ اگر کوئی حاضر نہ ہوتا تو فی نماز چار آنے جرمانہ ادا کرنا ضروری ہوتا۔ چنانچہ جو طلبہ بڑے بڑے رئیسوں کے بیٹے ہوتے وہ مہینے کے شروع میں ہی پورے مہینے کا جرمانہ جمع کرا دیتے۔ لہٰذا جرمانہ ایسا ہونا چاہئے جس کے ادا کرنے میں تھوڑی سی مشقت بھی ہو۔ اور یا یہ جرمانہ مقرر کرو کہ جب کبھی غیبت ہوگی تو چار رکعتیں نفل پڑھوں گا۔ اس کے نتیجے میں انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرما دیں گے۔

اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاؤ

ایک علاج یہ بھی ہے کہ جب کبھی دوسرے کی طرف سے بدگمانی کا خیال آئے تو اپنی توجہ کو ذکر اللہ کی طرف منعطف کر دو، مثلاً استغفر اللہ پڑھنا شروع کر دو، کلمہ پڑھنا شروع کر دو، کوئی تسبیح پڑھنا شروع کر دو اور اپنی توجہ اس طرف سے پھیر لو۔

تواضع پیدا کریں

یہ تو وقتی علاج تھے، مستقل علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرو، کیونکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا کہ یہ ساری بیماریاں تکبر کے ہونے سے اور تواضع کے نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ دل میں اپنی بڑائی ہے کہ جو میں سوچتا اور سمجھتا ہوں، وہ درست ہے، میں بڑا عقلمند ہوں، میں بڑا عالم ہوں، میں بڑا پارسا ہوں، یہ سب تکبر کے خیالات ہیں جو انسان کے اندر غیبت، بدگمانی اور تجسس کا داعیہ پیدا کرتے ہیں۔ ان سب کا علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرو۔

اپنی حقیقت میں غور کریں

اب تواضع کیسے پیدا ہو؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی شیخ کا دامن پکڑ لو، کیونکہ شیخ کے سامنے رگڑے کھائے بغیر کام نہیں بنتا، اس کی چپت کھاؤ، اس کی ڈانٹ کھاؤ، اس کے ساتھ لگے لپٹے رہو، اس کی نگاہوں کو برداشت کرو، اس کے خلاف طبع امور کو برداشت کرو، تو انشاء اللہ رفتہ رفتہ تواضع پیدا ہو جائے گی۔ اور جب تک شیخ نہ ملے یا شیخ سے تعلق قائم نہ ہو، اس وقت تک کم از کم اتنا کرو کہ اپنی حقیقت کو سوچا کرو کہ میری حقیقت کیا ہے؟ میری ذات میں کوئی کمال ہے؟ جو کچھ میرے اندر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ اگر صحت ہے وہ بھی اللہ کی عطا ہے، اگر میرے اندر حسن ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اگر علم میرے پاس ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اگر پیسہ ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اور وہ جب چاہے ان کو واپس لے لے۔ ایک آدمی بڑا صحت مند اور تندرست ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ چاہیں اس کی صحت کو واپس لے لیں۔

ایک صاحب کی قوت اور کمزوری

میرے ایک عزیز تھے، جن کا انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی قوت دی تھی کہ برف کی سِل کو ایک مُکا مار کر توڑ دیتے تھے۔ تربوز کو کبھی چھری سے نہیں کاٹتے تھے، بس ہاتھ مارا اور توڑ دیا۔

آخر عمر میں جب بیمار ہوئے تو میں ان کی عیادت کے لئے گیا۔ دیکھا کہ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں اور ہاتھ اُوپر اُٹھانے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ جب مجھے دیکھا اور ملاقات ہوئی تو میں نے دل میں کہا کہ یہ وہی "حامد" ہے جو برف کی سل اپنے ہاتھ سے توڑ دیا کرتا تھا، اور اب یہ حالت ہے کہ ہاتھ خود سے نہیں اُٹھا سکتا۔ لہٰذا انسان کس بات پر ناز اور فخر کرے۔

علم پر ناز نہ کریں

مولوی کو علم کا بہت ناز ہوتا ہے کہ میں بڑا عالم ہوں، مجھے بہت کچھ آتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہیں اس علم کو سلب فرمالیں۔ چنانچہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ دکھادیتے ہیں کہ کاغذ قلم لے کر لکھنے بیٹھے تو اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھیں، جبکہ ہمیں اپنے لکھنے پر ناز ہے، ہم بڑے اچھے اہل قلم ہیں۔ بعض اوقات اپنے نام کے ہجے نہیں آتے کہ کس طرح اپنا نام لکھیں۔ لہٰذا انسان کس چیز پر ناز کرے، کس چیز پر اکڑے، کس چیز پر بھروسہ کرے، جو کچھ حاصل ہے، وہ سب ان کی عطا ہے، وہ جب چاہیں سلب کرلیں۔ جس دن یہ بات دل میں بیٹھ گئی اور اپنی بڑائی کا احساس دل سے نکل گیا کہ میں تو کچھ نہیں ہوں، ذرہ ناچیز ہوں، بے مقدار ہوں، ہیچ در ہیچ ہوں، بس اس دن انشاء اللہ تواضع پیدا ہو جائے گی۔

آڑ میں بیٹھ کر باتیں سننا

آگے ارشاد فرمایا:

"آڑ میں بیٹھ کر کسی کی باتیں سننا بھی تجسس میں داخل ہے، جس کو آڑ میں بیٹھنا ہے تو زبان سے کہہ دینا چاہئے کہ میں بیٹھا ہوں یا اس کے سامنے بیٹھنا چاہئے، غرض کسی طرح اپنے بیٹھنے کی اطلاع کردے"(۱)

مثلاً دو آدمی آپس میں باتیں کررہے ہیں، اب آپ نے آڑ میں جاکر ان کی باتیں سننا شروع کردیں، یہ گناہ اور حرام ہے اور تجسس کے اندر داخل ہے۔ لہٰذا جو شخص آڑ میں بیٹھا ہو وہ باتیں کرنے والوں کو بتادے کہ میں یہاں پردے میں بیٹھا ہوں، تاکہ اگر وہ راز کی باتیں کرنا چاہتے ہیں تو نہ کریں، یا ان کے سامنے آکر بیٹھ جائے۔

(۱)　انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴

ہمارا طریقۂ زندگی

آج ہمارے معاشرے میں سب کام اُلٹے ہو رہے ہیں۔ ایسے موقع پر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو چھپالیں، اور باتیں کرنے والوں پر یہ ظاہر نہ کریں کہ میں یہاں پر موجود ہوں، اور آرام سے بیٹھ کر ان کی باتیں سنوں۔ یاد رکھئے! یہ سب تجسّس میں داخل ہے اور حرام ہے، ناجائز ہے۔ دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ تم اپنے وجود کو ان پر ظاہر کر دیتے تاکہ وہ لوگ سوچ سمجھ کر باتیں کرتے۔

لڑائی جھگڑے کی بنیاد

ہماری شریعت نے ہمیں ایسی ایسی باتیں بتائی ہیں کہ اگر واقعۃً ہم لوگ اس پر عمل کرلیں تو آپس میں کوئی جھگڑا پیدا ہی نہ ہو اور معاشرے میں کوئی فساد رونما ہی نہ ہو۔ جہاں کہیں فتنہ و فساد اور جھگڑا ہوتا ہے وہ شریعت کی کسی نہ کسی تعلیم کو چھوڑنے کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ شریعت نے فتنہ اور فساد اور جھگڑے کے راستے پر ایسے پہرے بٹھائے ہیں کہ اگر ہم ان پر عمل کرلیں تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہ ہو۔ چنانچہ ایک طرف تو نبی کریم ﷺ نے حدیث شریف میں یہ حکم دیا:

((لَا يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُوْنَ ثَالِثٍ))(۱)

یعنی اگر محفل میں تین آدمی ہیں، تو ان میں سے دو آدمیوں کو یہ نہیں کرنا چاہئے کہ آپس میں علیحدہ ہو کر اس طرح باتیں کرنے لگیں کہ تیسرا آدمی اکیلا رہ جائے، ایسا کرنا جائز نہیں، کیوں؟ اس لئے کہ تیسرے کو یہ احساس اور خیال ہوگا کہ انہوں نے مجھے اکیلا کر دیا اور میرے بارے میں کوئی بات کر رہے ہیں اور مجھ سے وہ بات چھپانا چاہتے ہیں، اس سے اس کی دل شکنی ہوگی۔ اس لئے دو آدمی علیحدہ ہو کر سرگوشی نہ کریں۔

ایسی جگہ پر مت جائیں

اور دوسری طرف یہ حکم دیا کہ اگر پہلے سے دو آدمی سرگوشی کر رہے ہیں تو تیسرے کو چاہئے کہ وہ وہاں نہ جائے، تاکہ ان کی باتوں میں خلل واقع نہ ہو، ان کو اپنی باتیں کرنے دو، تم بیچ میں جا کر کیوں

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الإستئذان، باب لا یتناجی اثنان دون الثالث، رقم: ۵۸۱۴، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم مناجاۃ الإثنین دون الثالث، رقم: ۴۰۵۲، سنن الترمذی، کتاب الأدب عن رسول اللہ، باب ما جاء لا یتناجی اثنان دون ثالث، رقم: ۲۷۵۱، سنن ابن ماجہ، کتاب الأدب، باب لا یتناجی اثنان دون الثالث، رقم: ۳۷۶۵

سمجھتے ہو؟ یہ ساری باتیں حضورِ اقدس ﷺ نے ہمیں بتادیں، لیکن ہم نے بس چند چیزوں کا نام دین رکھ لیا، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، بس قصہ ختم، دین کو اسی میں منحصر سمجھ لیا، زندگی گزارنے کے جو آداب حضورِ اقدس ﷺ نے ہمیں بتائے ہیں، ان کو قطعی طور پر دین سے خارج ہی کردیا، حالانکہ یہ بھی حضورِ اقدس ﷺ کا حکم ہے۔

فون پر دوسروں کی باتیں سننا

یا مثلاً ٹیلیفون ہے۔ اب آپ نے ٹیلیفون کرنے کے لئے ریسیور اُٹھایا اور جب کان سے لگایا تو اس میں دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں، کسی دوسرے کی لائن آپ کے فون سے مل گئی تھی، آپ نے ان کی باتیں سننا شروع کردیں، حالانکہ آپ کے لئے فون پر ان کی باتیں سننا جائز نہیں، بلکہ آپ فون بند کردیں۔ اگر آپ ان کی باتیں سنیں گے تو وہ تجسس میں داخل ہے جو ناجائز اور حرام ہے۔

دوسروں کے خط پڑھنا

یا مثلاً دوسرے کا خط آپ کے ہاتھ لگ گیا، تو آپ کے لئے اس کی اجازت کے بغیر اس کا خط پڑھنا جائز نہیں۔ یہ بھی تجسس کے اندر داخل ہے اور گناہ ہے۔

تجسس کی جائز صورت

بعض اوقات انتظامی طور پر ''تجسس'' ضروری ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ادارے کا سربراہ اور ذمہ دار ہے، وہ اگر تجسس نہ کرے تو ادارے میں فساد پھیل جائے۔ مثلاً ذمہ دار کا یہ تجسس کرنا کہ کہیں ہمارے زیرِ انتظام ادارے میں کوئی ایسا جرم تو نہیں ہورہا ہے جو خطرناک قسم کا ہو۔ اس حد تک تجسس کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اب پولیس کے محکمے کو دیکھ لیں وہ تو تجسس ہی کے کام کے لئے بنایا گیا ہے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ رات کو مدینہ منورہ کی گلیوں میں گشت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ گشت کے دوران دیکھا کہ ایک گھر سے گانے کی آواز آرہی ہے اور کچھ گلاسوں کے کھڑکنے کی بھی آواز آئی۔ ان کو خیال ہوا کہ شاید یہاں پینے پلانے کا شغل ہورہا ہے اور گانا بجانا بھی ہورہا ہے۔ تھوڑی دیر تو

آپ سب سنتے رہے، پھر دیوار پھاند کر اندر داخل ہوگئے، اور دیکھا کہ وہاں شراب پی جارہی ہے اور گانا بجانا ہو رہا ہے، چنانچہ آپ نے رنگے ہاتھوں ان کو پکڑ لیا۔ ان کا جو سربراہ تھا، وہ بڑا ہوشیار تھا، اس نے پوچھا کہ آپ نے ہمیں کیوں پکڑا؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم شراب پی رہے تھے اور گانا بجانا کر رہے تھے، تم مجرم ہو، اس لئے تمہیں پکڑ لیا۔ ان کے سربراہ نے کہا کہ ہم نے تو ایک ہی گناہ کیا تھا اور آپ نے کئی گناہ کیے۔ ایک گناہ تو آپ نے یہ کیا کہ آپ نے تجسس کیا اور ہماری ٹوہ میں لگے کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ دوسرا گناہ یہ کیا کہ اجازت کے بغیر ہمارے گھر میں داخل ہوئے اور اجازت کے بغیر دوسرے کے گھر میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تیسرا گناہ یہ کہا کہ دیوار پھاند کر داخل ہوئے، حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾(۱)

''یعنی گھروں میں دروازے کے ذریعہ آؤ''

لہٰذا ہم نے تو صرف ایک گناہ کیا تھا اور آپ نے تین گناہ کیے۔

آپ رضی اللہ عنہ کا استغفار کرنا

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کی یہ بات سن کر تینوں گناہوں پر استغفار کیا کہ کہیں واقعی مجھ سے یہ گناہ سرزد نہ ہوگئے ہوں، اس لئے میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہتا ہوں۔(۲)

ہم جیسا ہوتا تو اس شخص کو دو تھپڑ مارتا کہ کم بخت ایک طرف تو یہ گناہ کرتا ہے اور دوسری طرف میرے اُوپر یہ اعتراض کرتا ہے، چوری اور سینہ زوری۔ لیکن چونکہ یہ حضرات ساتھ ساتھ اپنے نفس کا بھی علاج کیا کرتے تھے، اس لئے انہوں نے یہ سوچا کہ چونکہ میری ذات پر اعتراض آیا ہے، تو اس کی مدافعت نہ کرنی چاہئے، بلکہ اس کے اندر جس خرابی کا احتمال ہے، اس کا تدارک کرنا چاہئے۔ اس لئے فوراً استغفار کیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فیصلہ

پھر یہ مسئلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے سامنے پیش کیا کہ یہ شخص مجھے یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے تین گناہ کیے۔ آیا واقعۃً میں نے تجسس کا گناہ کیا؟ اور یہ تجسس کرنا میرے لئے گناہ تھا یا نہیں تھا؟ اور میرا اس طرح دوسرے کے گھر میں داخل ہونا جائز تھا یا نہیں تھا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس جماعت نے مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ جو ذمہ دار آدمی ہے، اگر اس کو یہ اندیشہ ہو کہ یہ فساد ایسا

(۱) البقرۃ:۱۸۹ (۲) کنز العمال (۱۶۷/۲)

ہے جو معاشرے میں پھیل جائے گا اور لوگوں کے اندر اس کے برے اثرات مرتب ہوں گے تو اس صورت اس ذمہ دار کے لئے تجسس کرنا بھی جائز ہے، اور اجازت کے بغیر اندر داخل ہونا بھی اس کے لئے جائز ہے، اور دیوار پھاندنا بھی جائز ہے۔ لیکن اگر متعدی خرابی کا اندیشہ نہ ہو، مثلاً ایک آدمی اپنے گھر میں کوئی ایسا عمل کر رہا ہے جس کا فساد اس کی ذات کی حد تک محدود ہے، اس کے برے اثرات دوسروں تک متعدی نہیں ہوں گے، تو اس صورت میں ذمہ دار اور سربراہ کو بھی تجسس کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ فقہاء کرام نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے کہ کن حالات میں تجسس جائز ہے اور کن حالات میں تجسس جائز نہیں۔

فقہاء کا قولِ فیصل

امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''ادب القضاء'' ہے، اس کی شرح علامہ صدر الشہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے۔ اس میں اس موضوع پر بہت طویل بحث کی ہے اور فقہاء کرام کا اختلاف نقل کیا ہے کہ کس حالت میں تجسس جائز ہے اور کس حالت میں جائز نہیں۔ اس اختیار میں قولِ فیصل یہ ہے کہ جہاں کسی متعدی برائی کا اندیشہ ہو تو وہاں سربراہ کے لئے سب کچھ کرنا جائز ہے، تجسس کرنا بھی جائز، دیوار پھاندنا بھی جائز، اجازت کے بغیر اندر گھسنا بھی جائز۔ اور جہاں متعدی برائی کا اندیشہ نہ ہو بلکہ ایک شخص کا ذاتی عمل ہے، وہ اپنے گھر میں بیٹھا کر رہا ہے تو اس وقت سربراہ کے لئے بھی تجسس کرنا جائز نہیں۔

دار العلوم کراچی کی تھوڑی سی ذمہ داری ہمارے سپرد بھی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں یہ تجسس کرنا پڑتا ہے کہ دار الاقامہ میں کیا ہو رہا ہے، طلبہ کن سرگرمیوں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہ اس وقت جائز ہے جب کسی متعدی خرابی کا اندیشہ ہو، ورنہ سکوت افضل ہے۔

اپنے جاگنے کی اطلاع کر دے

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اسی طرح ایک آدمی سونے کو لیٹ گیا، اور دوسروں کو یہ خیال ہوا کہ یہ سو گیا ہے اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگیں، مگر یہ جاگ رہا تھا تو اس کو چاہئے کہ ان کو اطلاع کر دے کہ میں جاگ رہا ہوں، البتہ اگر وہ لوگ اسی کے متعلق باتیں کر رہے ہوں اور اس کو ضرر پہنچانا چاہتے ہوں تو تجسس کے ساتھ ان کی گفتگو سننا جائز ہے''(۱)

آج کل اُلٹا معاملہ ہوتا ہے کہ جاگنے والا اپنے آپ کو اور زیادہ سوتا ہوا ظاہر کرتا ہے تاکہ ان

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۴

کی گفتگو کے ذریعہ تمام رازوں کا پتہ چل جائے اور بعد میں وہ اپنی مہارت اور اُستادی دکھائے کہ تم نے جو جو باتیں کیں اس کا ہمیں پتہ چل گیا ہے۔ حالانکہ شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں، جاگنے والا بتادے کہ میں جاگ رہا ہوں، یہ بھی شریعت کا حکم ہے۔ البتہ اگر وہ گفتگو کرنے والے اسی کے متعلق گفتگو کر رہے ہوں اور اس کو نقصان پہنچانا چاہتے ہوں تو پھر اس طرح چپکے چپکے باتیں سننا جائز ہے تاکہ ان کے شر سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

زبان دانی کی اطلاع کر دے

آگے حضرت والا فرماتے ہیں:

''نیز اگر دو شخص انگریزی یا عربی میں گفتگو کر رہے ہوں، اور تیسرا شخص بھی ان زبانوں کو سمجھتا ہو، مگر ان دونوں کو خبر نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ ان دونوں کو مطلع کر دے کہ میں عربی یا انگریزی سمجھتا ہوں''(۱)

تاکہ دھوکہ میں آکر اپنا راز فاش نہ کر دیں۔ مقصد یہ ہے کہ نہ تو انسان خود تجسّس کرے اور نہ ہی تجسّس کے اسباب پیدا کرے، اور نہ ہی دوسرے کو ایسی غلط فہمی میں مبتلا کرے جس سے وہ یہ سمجھے کہ یہ بے خبر ہے اور تم اس کی نادانستگی میں اس کے کسی راز پر مطلع ہو جاؤ۔

ایک بزرگ کا تجسّس سے بچنا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں ایک بزرگ تھے، انگریزی تعلیم یافتہ تھے، مگر حضرت والا کی صحبت نصیب ہوئی تو ان کی وضع قطع بھی ایسی ہوگئی جیسے دیندار لوگوں کی اور مولویوں کی ہوتی ہے، چہرے پر ڈاڑھی، لمبا کرتا وغیرہ۔ وہ ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے قریب ہی دو آدمی اور بیٹھے تھے، وہ بھی انگریزی دان تھے۔ وہ دونوں ان کا حلیہ دیکھ کر یہ سمجھے کہ یہ کوئی مولوی ہے، ان کو انگریزی کیا آتی ہوگی، چنانچہ ان دونوں نے بیٹھ کر انہی کے بارے میں انگریزی میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ انگریزی میں باتیں کرنے کا مقصد ان سے چھپانا تھا کہ یہ مُلا آدمی ہے، انگریزی کیا سمجھے گا۔ ابھی گفتگو شروع ہی کی تھی کہ یہ بزرگ سمجھ گئے کہ یہ دونوں صاحب مجھ سے چھپ کر کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں، اس لئے انگریزی میں باتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ یہ بات دیانت کے خلاف ہے کہ میں اسی طرح بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا رہوں۔ چنانچہ ان بزرگ نے ان دونوں سے کہہ دیا کہ ''میں انگریزی جانتا ہوں، اگر آپ کو مجھ سے چھپ کر باتیں کرنی ہیں تو کوئی اور طریقہ اختیار کریں،

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۴

اس دھوکے میں نہ رہیں کہ میں انگریزی نہیں جانتا، اگر آپ کہیں تو میں اُٹھ کر چلا جاتا ہوں تاکہ آپ علیحدگی میں باتیں کرلیں۔

بہر حال، ان بزرگ کو یہ جو خیال آیا کہ یہ دونوں یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں زبان نہیں جانتا، اور مجھ سے چھپ کر باتیں کرنا چاہتے ہیں، اب اگر میں خاموش بیٹھا رہوں تو یہ "تجسس" میں داخل ہو جائے گا، یہ خیال ان کے ذہن میں کیوں پیدا ہوا؟ اس لئے کہ "تھانہ بھون" میں کچھ دن گزار لیے تھے اور حضرت والا کی صحبت نصیب ہوگئی تھی، ورنہ آج کیا کسی کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ میں بتا دوں کہ جس زبان میں تم باتیں کر رہے ہو، میں یہ زبان جانتا ہوں۔ آج اگر کوئی یہ بات بتائے گا بھی تو اپنا علم جتانے کے لئے بتائے گا کہ ہمیں جاہل مت سمجھنا، ہمیں بھی یہ زبان آتی ہے، اس لئے نہیں بتائے گا کہ کہیں تجسس کے گناہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ بلکہ آجکل تو اس کو کمال سمجھا جائے گا کہ چپکے چپکے بات سنتے رہیں اور بعد میں اس کا اظہار کریں گے کہ تم نے تو ہم سے چھپانے کی کوشش کی، لیکن ہم کو سب پتہ چل گیا کہ آپ نے کیا کیا باتیں کیں۔

بات یہ ہے کہ ان سب باتوں کا خیال کرنا دین کا ایک حصہ ہے۔ آج ہم نے ان کو دین سے خارج کر دیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ فکر عطا فرما دیں تو پھر یہ سب باتیں سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

غصہ اور اس کا علاج ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

رمضان المبارک میں کئی سالوں سے ظہر کی نماز کے بعد حضرت تھانویؒ کی کتاب "انفاسِ عیسیٰ" پڑھنے کا معمول چلا آرہا ہے اور اس میں رذائل کا بیان چل رہا ہے۔ اب یہاں جوش اور غصہ کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ یہ "غصہ" بھی رذائل میں سے ہے، بلکہ بعض حضرات صوفیاء نے فرمایا کہ یہ "اُمّ الامراض" ہے، یعنی یہ غصہ خود تو بیماری ہے اور نہ جانے کتنی بیماریاں پیدا کرتا ہے، اس غصہ کے نتیجے میں بیشمار گناہ سرزد ہوتے ہیں، مثلاً غصہ میں بے قابو ہو کر گالی گلوچ شروع کردی، نامناسب الفاظ استعمال کرنا شروع کردیئے، غصہ اور آگے بڑھا تو مار پٹائی شروع کردی اور اس میں حد سے آگے بڑھ گیا۔

غصہ کے ساتھ جمع ہونے والے امراض

اور پھر انسان دوسرے پر اس وقت غصہ کرتا ہے جب اپنے آپ کو اس سے بہتر سمجھتا ہے، کیونکہ اگر انسان اپنے آپ کو کمتر سمجھے تو اس کو کبھی غصہ نہیں آئے گا، اس لئے اس غصہ کے ساتھ "کبر اور عُجب" بھی جمع ہو جاتا ہے، کبھی اس کے ساتھ "بغض" بھی جمع ہو جاتا ہے، لہٰذا بیشمار باطنی امراض اس کے نتیجے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے حضرات صوفیاء کرام کے پاس جب کوئی شخص علاج کے لئے جاتا تھا تو وہ سب سے پہلے اس غصہ کا علاج کیا کرتے تھے۔

دو جبلی چیزیں

انسان کی جبلت میں دو بنیادی چیزیں ہیں، ایک غصہ، دوسرے شہوت، چاہے وہ شہوت بطن کی ہو یا فرج کی ہو۔ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ سارے گناہوں، ساری معصیتوں اور سارے گناہوں کی جڑ بھی دو چیزیں ہیں، اسی وجہ سے حضرات صوفیاء کرام سب سے پہلے غصے کا علاج کرتے ہیں، کیونکہ اگر غصہ قابو میں نہ ہوگا تو وہ نہ جانے کتنے گناہوں میں اور کتنے ضلالت کے گڑھوں میں جا کر گرے گا۔

☆ اصلاحی خطبات (۴/۸۶ تا ۱۳۲)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

حضور ﷺ سے مختصر نصیحت کا مطالبہ کرنا

ایک صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ سے عرض کیا کہ "عِظْ وأوجز" نصیحت فرمایئے اور مختصر فرمایئے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے اس پر برا نہیں منایا کہ نصیحت بھی طلب کر رہے ہو اور اوپر سے شرطیں بھی لگاتے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر نصیحت طلب کرنے والا یہ کہہ دے کہ مجھے مختصر نصیحت فرما دیجئے تو اس میں ناراضگی کی کوئی بات نہیں بلکہ یہ اس کا حق ہے، کیونکہ اگر اس نے آپ سے نصیحت طلب کی اور اس کے پاس وقت کم تھا، اب آپ نے اس کے سامنے ڈھائی گھنٹے کی تقریر کر دی، حالانکہ اس کو سفر میں جانا تھا اور وہ جلدی میں تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچارہ نصیحت طلب کرنے کے نتیجے میں مصیبت میں مبتلا ہو گیا، اور جب اس کے دماغ پر جلدی جانے کا بوجھ ہوگا تو وہ کیا آپ کی نصیحت سنے گا اور کیا سمجھے گا اور کیا اس پر عمل کرے گا، اس لئے بات کرنے والے کو چاہئے کہ مخاطب کے حال کا لحاظ کرے۔ اور اس حدیث میں تو خود مخاطب نے یہ کہہ دیا کہ میرے پاس وقت کم ہے، اس لئے مجھے مختصر نصیحت فرما دیجئے۔

غصہ مت کرنا

چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ مختصر نصیحت فرمائی کہ "لَا تَغْضَبْ" غصہ مت کرنا۔(۱)

یہ مختصر نصیحت فرمادی، اس سے پتہ چلا کہ یہ غصہ ہی درحقیقت بہت سی برائیوں کا سرچشمہ ہے، اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ساری برائیوں اور بداعمالیوں اور ساری معصیتوں میں سے اس کا انتخاب فرمایا، حالانکہ آپ چاہتے تو یہ فرما سکتے تھے کہ دیکھو جھوٹ مت بولنا، غیبت نہ کرنا، زنا نہ کرنا، چوری نہ کرنا وغیرہ، لیکن ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ غصہ مت کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی بہت بڑی برائی ہے اور یہ سب گناہوں کا باپ ہے جس کے نتیجے میں انسان اور بہت سے گناہوں کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے۔

غصہ ضروری بھی ہے

یہ غصہ ایسی چیز ہے کہ بعض اوقات اس کی ضرورت ہوتی ہے، اگر یہ غصہ بالکل نہ ہو تو انسان

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب الحذر من الغضب، رقم: ۵۶۵۱، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في كثرة الغضب، رقم: ۱۹۴۳، مسند أحمد، رقم: ۸۳۸۹، ہماری تخریج کردہ روایات میں عظ واوجز کی جگہ علّمني شيئًا ولا تكثر کے الفاظ ہیں۔ ایک مقام پر عظني وأوجز کے الفاظ ملتے ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نماز میں خشوع اختیار کرنے، غیر ضروری کلام سے اجتناب اور لوگوں سے بے نیازی کی نصیحت فرما رہے ہیں۔

زندہ ہی نہیں رہ سکتا، مثلاً کوئی دشمن یا کوئی درندہ آپ کے اوپر حملہ آور ہو گیا، اب اگر اس وقت آپ کو غصہ نہ آئے بلکہ پڑے رہیں اور مار کھاتے رہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ہی ختم ہو جائیں گے۔

ایک صاحب بہادر کا قصہ

ہمارے والد صاحبؒ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک صاحب بہادر تھے، کسی بڑے عہدے پر تھے، ہر کام نوکر سے کرانے کے عادی تھے، خود کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ ایک دن صبح بیدار ہوئے تو دیکھا کہ گھر کے اندر بندر آ گئے، ایک بندر ان کا سوٹ اٹھا کر لے گیا، ایک بندر ان کی پتلون اٹھا کر لے گیا، ایک بندر ان کا ہیٹ اٹھا کر لے گیا، اب صاحب بہادر بستر پر پڑے یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے اور آوازیں دے رہے تھے کہ ارے بھائی! کوئی مردوا (مرد) ہے جو ان بندروں کو روکے، اتنے میں ان کا کوئی دوست آ گیا، اس نے آ کر کہا کہ جناب! آپ بھی تو مردوے (مرد) ہیں، صاحب بہادر نے کہا کہ ہاں بھائی! خوب یاد دلایا، چنانچہ جلدی سے بستر سے اُٹھے اور بندروں کے پیچھے دوڑے، اتنی دیر میں وہ بندر سب چیزیں لے کر جنگل کی طرف بھاگ چکے تھے۔ لہٰذا یہ طرزِ عمل کہ بستر پر لیٹے ہیں اور اپنی مدافعت نہیں کر رہے ہیں، یہ صورت بھی انسان کی فطرت کے خلاف ہے، بلکہ انسان کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جب اس پر کوئی حملہ آور ہو تو وہ اپنی مدافعت کرے اور اس پر غصہ کرے۔

غصہ کرنا عبادت بھی ہے

لہٰذا غصہ ہر جگہ برا نہیں ہوتا بلکہ بعض جگہ صحیح اور برحق ہوتا ہے بلکہ عبادت ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص حضور اقدس ﷺ کی شان میں گستاخی کرے۔ نعوذ باللہ۔ اس وقت اگر مسلمان کو غصہ نہ آئے تو اس سے زیادہ بے غیرتی اور کیا ہوگی؟ اس موقع پر غصہ کرنا ہی عبادت ہے۔ لہٰذا بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں پر غصہ کا استعمال درست ہوتا ہے بلکہ بہتر ہوتا ہے بلکہ واجب بھی ہوتا ہے، اور بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں پر غصہ کا استعمال برا ہے بلکہ گناہ اور معصیت ہے۔

سالک ابتداءً بالکل غصہ نہ کرے

لیکن جب کوئی مرید اپنی تربیت کرانے کے لئے کسی سے تعلق قائم کرتا ہے تو شیخ اس مرید سے کہتا ہے کہ تم فی الحال غصہ بالکل مت کرنا، کیونکہ تم اس میں تمیز نہیں کر سکو گے کہ کہاں غصہ کرنا حق ہے اور کہاں ناحق ہے، لہٰذا ابھی تو تم یہ مشق کرو کہ کسی بھی موقع پر غصہ مت کرو۔ اسی کا نام "مجاہدہ" ہے، یعنی کسی محظور سے بچنے کے لئے سدِ ذریعہ کے طور پر کسی مباح چیز کو بھی ترک کر دینا، یہی مجاہدہ

ہے۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ''مجاہدہ'' کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ ایک کاغذ کو ایک طرف موڑ دو، پھر اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کے سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو مخالف سمت کی طرف موڑ دو، جب اس کو مخالف سمت کی طرف موڑ دو گے تو یہ کاغذ سیدھا ہو جائے گا۔

نفس کو دوسری سمت میں موڑ دو

اسی طرح ہمارا نفس بھی گناہوں کی طرف مڑ گیا ہے، اگر اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ سیدھا نہیں ہوتا، لہٰذا اس نفس کو دوسری طرف موڑ دو، یعنی اس سے کچھ مباح کام بھی چھڑاؤ، مباح کاموں کے چھڑانے کے نتیجے میں وہ نفس اعتدال پر آجائے گا، اسی کا نام مجاہدہ ہے۔ اس لئے حضرات صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ابتداءً تم بالکل بھی غصہ مت کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غصہ رفتہ رفتہ قابو میں آجائے گا، اس کے بعد جب غصہ کو استعمال کرو گے تو وہ صحیح جگہ پر استعمال ہوگا، غلط جگہ پر استعمال نہیں ہوگا۔ بہر حال! اسی غصہ کے بارے میں اور اس کو کم کرنے کے لئے حضرت والا نے کچھ تدبیریں بیان فرمائی ہیں، ان کی تھوڑی سی تشریح عرض کر دیتا ہوں۔

غصہ کا پہلا علاج، اپنے عیوب کو سوچنا

چنانچہ حضرت والا نے غصہ کا پہلا علاج یہ بیان فرمایا:

''بہ تکلف ضبط کر کے اپنے عیوب سوچنے لگا کیجئے، انشاء اللہ اشتعال کم ہو جائے گا''(۱)

کسی صاحب نے حضرت والا کو خط میں لکھا تھا کہ میرے اندر اشتعال بہت پیدا ہوتا ہے اور ذرا سی بات پر غصہ آجاتا ہے۔ اس کا علاج حضرت والا نے یہ تجویز فرمایا کہ جب غصہ آرہا ہو اور کسی بات پر اشتعال ہو رہا ہو تو اس وقت غصہ کو بہ تکلف ضبط کر کے اپنے عیوب سوچا کریں، کیونکہ غصہ کے اندر تھوڑا سا عُجب یعنی اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر سمجھنے کا پہلو ہوتا ہے اور دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے، اسی وجہ سے غصہ کرتا ہے، لہٰذا اس کا علاج یہ فرمایا کہ اپنے عیوب کو سوچے کہ میرے اندر کیا کیا عیوب ہیں اور یہ سوچے کہ اس وقت جو غصہ آرہا ہے، یہ بھی انہی عیوب کا ایک فرد ہے، اگر میں درست ہوتا تو مجھے اتنی شدت سے غصہ نہ آتا، اس طرح اپنے عیوب سوچنے سے غصہ اور اشتعال کم ہو جائے گا۔ البتہ اس کے لئے فکر کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ جس شخص کو فکر ہی نہیں کہ کتنا غصہ آیا اور غصہ کے نتیجے میں میری زبان سے کیا بات نکل گئی، کیا فعل مجھ سے سرزد ہو گیا، تو ایسا مرض تو ناقابل علاج ہے۔ بہر حال!

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰

غصہ کے علاج کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اندر فکر پیدا کرو، جب انسان کے اندر فکر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے بعد جو علاج بتائے جاتے ہیں وہ کارگر ہوتے ہیں، اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ جب غصہ آئے تو اپنے عیوب کو سوچ لو تو انشاء اللہ غصہ کم ہو جائے گا۔

غصہ کا دوسرا علاج، مغضوب علیہ کو دور کر دینا

دوسرا علاج حضرت والا نے یہ ارشاد فرمایا:

''جس پر غصہ آئے، اس کے پاس سے فوراً خود ہٹ جائے یا اس کو اپنے پاس سے ہٹا دے جیسا موقع ہو''(۱)

غصہ کی خاصیت یہ ہے کہ جس پر غصہ آتا ہے، اسی کے قریب جانے کی فکر کرتا ہے، اس سے غصہ کے اندر اور ترقی ہوتی ہے، اس لئے حضرت فرما رہے ہیں کہ جس پر غصہ آئے، اس کے پاس سے فوراً یا تو خود ہٹ جاؤ یا اس کو سامنے سے ہٹا دو، کیونکہ سامنے ہونے کی وجہ سے غصہ زیادہ آئے گا۔

حضور ﷺ سے یہ علاج کرنا ثابت ہے

یہ علاج خود حضور اقدس ﷺ سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت وحشی رضی اللہ عنہ جنہوں نے غزوۂ اُحد کے موقع پر حضور اقدس ﷺ کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کو اسلام لانے کی توفیق دے دی، حضور اقدس ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم میرے سامنے مت بیٹھا کرو، کیونکہ تمہارے سامنے آنے سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا غم تازہ ہو جاتا ہے، اس کے نتیجے میں غصہ آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔(۲)

اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ جس پر غصہ آ رہا ہے، اس کو اپنے سامنے سے ہٹا دو۔

غصہ کے وقت سزا مت دو

اسی طرح اگر اپنے سے چھوٹے پر جائز غصہ بھی آ رہا ہو، مثلاً اپنی اولاد پر یا اپنے شاگرد پر غصہ آ رہا ہو، تو اس اشتعال کی حالت میں نہ اس کو ڈانٹو اور نہ اس کو سزا دو، کیونکہ اشتعال کے وقت حدود پر قائم نہیں رہو گے، اسلئے اشتعال کے وقت معاملے کو ٹلا دو اور تھوڑا سا وقت گزار دو، یہاں تک کہ اشتعال ٹھنڈا پڑ جائے، اشتعال ٹھنڈا ہو جانے کے بعد اس کو اپنے پاس بلاؤ اور اس وقت اس کی غلطی بتاؤ، اس وقت اگر ڈانٹنے کی ضرورت ہو تو ڈانٹ بھی دو، اس وقت کی ڈانٹ چونکہ اشتعال کی حالت میں نہیں

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰ (۲) حیاۃ الصحابۃ (۱/ ۸۰، ۸۱)

ہوگی، اس لئے وہ حد کے اندر رہے گی اور اشتعال کے وقت حد سے آگے بڑھنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

غصہ کا تیسرا علاج، عذابِ الٰہی کا استحضار

غصہ کا تیسرا علاج حضرت والا نے یہ بیان فرمایا:

"استحضار عذابِ الٰہی کا کرے"

یعنی اللہ جل شانہ کے عذاب کا استحضار کرے۔ یہ علاج بھی حدیث شریف سے ماخوذ ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو ڈانٹ رہے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو اس حالت میں دیکھا تو فرمایا:

((لَلّٰهُ أَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَيْهِ))(۱)

"جتنی قدرت تمہیں اس غلام پر حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے"

تم اس غلام کو تو سزا دے رہے ہو، اگر اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دینے پر آجائے تو تمہارا کیا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے استحضار سے غصہ میں کچھ کمی واقع ہوتی ہے اور اشتعال ٹھنڈا پڑتا ہے۔

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ "اپنے گناہوں کو یاد کر کے استغفار کی کثرت کرنے لگے"

یہ اسی پہلے علاج کا حصہ ہے جو اُوپر بیان فرمایا کہ اپنے عیوب کو سوچا کرے اور استغفار کرے۔ بہر حال! حضرت نے اس ملفوظ میں غصے کے تین علاج بیان فرمائے، اگر کوئی شخص غصہ کے وقت ان پر عمل کرے تو انشاء اللہ وہ غصہ اس کے لئے مضر نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

غصے کے تقاضے پر عمل مت کرو

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا:

"اگر آپ کو کوئی کچھ کہتا ہے اور اعتراض کرتا ہے تو تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے"

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب صحبة المماليك وكفارة من لطم عبده، رقم: ۳۱۳۶، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب النهي عن ضرب الخدم وشتمهم، رقم: ۱۸۷۱، سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في حق المملوك، رقم: ۴۴۹۲، مسند أحمد، رقم: ۱۶۴۶۷، واضح رہے کہ ہماری تخریج کردہ روایات میں یہ واقعہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے، جن کا اصل نام "عقبہ بن عمرو" ہے۔

جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

''مگر غصہ سے آگے انتقام تک مت بڑھنا ولو باللسان''(۱)

یعنی اگر غصہ آیا تو آنے دو، مگر اس کے تقاضے پر عمل مت کرنا اور انتقام مت لینا اگرچہ وہ انتقام زبان سے ہی کیوں نہ ہو، یعنی زبان سے بھی انتقام لینے کی فکر مت کرنا۔

معاف کرنا افضل ہے

شریعت نے بعض جگہ غصے کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہے اور غصہ کرنا وہاں جائز اور مباح ہے، مثلاً حدود کے اندر رہتے ہوئے بدلہ لے لینا۔ (مگر تربیت کے لئے اور نا جائز حد تک پہنچنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے یہ مجاہدہ کرایا جاتا ہے کہ جائز انتقام بھی مت لو، گویا غصہ کے مقتضیٰ پر کسی وقت بھی عمل مت کرو اگرچہ حد کے اندر رہتے ہوئے انتقام لینا جائز ہے) لیکن افضل ہر حالت میں معاف کر دینا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط﴾(۲)

''یہ ایسے لوگ ہیں جو نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں ہر حال میں، فراغت میں بھی اور تنگی میں بھی اور غصہ کو ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں''

لہٰذا معاف کر دینا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اس کے فضائل بہت زیادہ ہیں، اس لئے مبتدی سے کہا جاتا ہے کہ تم انتقام مت لو بلکہ صبر کرو اور جس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے، اس کو معاف کر دو، اس کے نتیجے میں تمہیں صبر کرنے کا ثواب الگ ملے گا اور معاف کرنے کا ثواب الگ ملے گا۔

بزرگوں کی مختلف شانیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ارواحِ ثلاثہ'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے ایک مرتبہ اپنے شیخ سے کہا کہ حضرت! میں نے سنا ہے کہ صوفیاء اور اولیاء کی شانیں مختلف ہوتی ہیں، ان کے مزاج مختلف ہوتے ہیں اور ان کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کی مختلف شانیں کیا ہوتی ہیں؟ ان کے شیخ نے پہلے تو یہ جواب دیا کہ یہ سب چھوڑ دو، تم کس چکر میں پڑ گئے، بس جو تمہارا کام ہے، اس کام میں لگو۔ اس نے اصرار کیا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ دہلی میں قطب صاحب کا مزار ہے، اس کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰ (۲) آل عمران: ۱۳٤

ہے، اس مسجد میں جاؤ، اس میں تمہیں تین آدمی بیٹھے ذکر کرتے ہوئے نظر آئیں گے، تم جا کر ان تینوں کی کمر پر ایک ایک مُکّا مار دینا اور پھر جو کچھ وہ کریں، وہ مجھے آکر بتانا۔

چنانچہ یہ صاحب اس مسجد میں گئے، دیکھا تو واقعی تین آدمی بیٹھے ہوئے ذکر کر رہے ہیں، ان صاحب نے جا کر پہلے ایک شخص کو پیچھے سے مُکّا مارا، انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کس نے مارا اور کیوں مارا، بس اپنے ذکر کے اندر مشغول رہے۔ اس کے بعد دوسرے صاحب کے پاس گئے اور ان کو مُکّا مارا تو وہ پیچھے مڑے اور ان کو بھی مُکّا مارا اور پھر اپنے ذکر میں لگ گئے۔ جب تیسرے شخص کو مُکّا مارا تو وہ پیچھے مڑے اور میرا ہاتھ سہلانے لگے کہ تمہارے ہاتھ میں چوٹ تو نہیں لگی۔

بدلہ لینے میں وقت کیوں ضائع کروں

اس کے بعد وہ صاحب اپنے شیخ کے پاس واپس آگئے اور بتایا کہ میرے ساتھ بڑا عجیب و غریب معاملہ ہوا، وہ یہ کہ جب پہلے شخص کو مُکّا مارا تو انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں۔ شیخ نے پوچھا کہ وہ کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ ذکر کر رہے تھے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جب تم نے مُکّا مار دیا تو پھر وہ کیا کرتے رہے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ ذکر کرتے رہے۔ فرمایا کہ انہوں نے یہ سوچا کہ اگر کسی نے میری کمر پر مُکّا مار دیا تو اب تو مار دیا، اب وہ مُکّا واپس تو لوٹ نہیں سکتا، جو تکلیف پہنچنی تھی وہ پہنچ گئی، اب میں خواہ مخواہ بدلہ لے کر اور دوسرے کو تکلیف پہنچا کر اپنا وقت کیوں خراب کروں، جتنا وقت بدلہ لینے میں صرف ہوگا، اگر وہ وقت میں ذکر میں لگا دوں تو اس سے جو ثواب اور جو فضیلت حاصل ہوگی، وہ بدرجہا بہتر ہے اس سے کہ میں انتقام لوں، کیونکہ انتقام لینے سے مجھے کیا حاصل ہوگا، اس لئے انہوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی بلکہ اپنے کام میں لگے رہے۔

برابر کا بدلہ لے لیا

دوسرے صاحب جنہوں نے پلٹ کر تم سے بدلہ لیا، یہ بتاؤ کہ انہوں نے اتنا ہی زور کا مُکّا مارا جتنے زور کا تم نے مارا تھا یا اس سے زیادہ زور کا مُکّا مارا؟ اس نے کہا کہ انہوں نے اتنا ہی زور کا مارا جتنے زور کا میں نے مارا تھا۔ شیخ نے فرمایا کہ یہ وہ صاحب ہیں جنہوں نے شریعت کے مطابق انتقام لیا اور اس آیت پر عمل کیا:

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ﴾(۱)

”اور اگر تم بدلہ لو تو بدلہ اسی قدر لو جس قدر کہ تم کو تکلیف پہنچائی جائے“

(۱) النحل: ۱۲۶

بدلہ لینے میں تمہارا فائدہ تھا

ان صاحب نے جو بدلہ لیا، وہ بھی تمہارے فائدے کے لئے لیا، اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کے لئے نہیں لیا۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی اللہ کے بندے کو تکلیف پہنچائی جاتی ہے اور وہ اس کا انتقام نہیں لیتا بلکہ صبر کرتا ہے تو اس صبر کے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ جو زیادتی کرنے والا ہوتا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجاتا ہے، جس کو اُردو کے محاورے میں ''صبر پڑنا'' کہا جاتا ہے، اور کسی اللہ والے کا صبر پڑنا بڑا خطرناک ہوتا ہے، اس لئے ان بزرگ نے سوچا کہ اگر میں نے صبر کیا تو کہیں اس کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے، لہٰذا انہوں نے بدلہ لے لیا۔

ایک علمی اشکال

البتہ اس پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ بزرگ لوگ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بھی زیادہ شفیق اور مہربان ہوتے ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں:

((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ))(۱)

یعنی جو شخص میرے ولی کو ایذاء اور تکلیف دے، میرا اس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے جبکہ دوسری طرف ان بزرگ نے زیادہ شفقت کرتے ہوئے اس تکلیف پر صبر کرلیا اور اس کو معاف کردیا، لہٰذا وہ بزرگ اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ مہربان اور شفیق ہوگئے!

اشکال کا جواب

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو! اگر شیرنی کو کوئی شخص چھیڑے تو وہ درگزر کر جاتی ہے، لیکن اگر کوئی شیرنی کے بچے کو چھیڑے تو پھر شیرنی نہیں چھوڑتی۔ اسی طرح بسا اوقات اللہ تعالیٰ اپنے حقوق میں ہونے والی کوتاہی کو معاف فرما دیتے ہیں اور درگزر فرما دیتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اللہ کے اولیاء کی شان میں گستاخی کرے تو اس کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتے۔ اس لئے فرمایا:

((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ))(۲)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، رقم: ۶۰۲۱، جامع العلوم والحکم، ابن رجب الحنبلی (۱/۳۵۷)، معارج القبول، حافظ بن احمد حکمی (۳/۱۰۰۱)

(۲) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، رقم: ۶۰۲۱

اس حدیث پر کلام

یہ حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح بخاری میں لائے ہیں[1] لیکن کوئی حدیث پوری بخاری شریف میں ایسی نہیں ہے جس کی سند پر محدثین نے اتنا زیادہ کلام کیا ہو جتنا کلام اس حدیث کی سند پر کیا ہے، یہاں تک کہ بعض محدثین نے یہ کہہ دیا کہ اس حدیث کو اپنی صحیح بخاری میں نقل کرنے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے غلطی ہوگئی ہے، اس لئے کہ یہ حدیث ان کے معیار پر پوری نہیں اُترتی، لیکن اس کے باوجود اس حدیث کو اپنی کتاب میں لائے ہیں۔ اس کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ یہ حدیث بالکل موضوع اور بہت ضعیف ہے، البتہ امام بخاری کی شرائط پر پوری نہیں اُترتی، لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہ ہے کہ بعض اوقات اپنی شرائط کو ان مقامات پر نظرانداز کر جاتے ہیں جہاں خارجی قرائن سے ان کو یہ یقین ہوتا ہے کہ حدیث درست ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں ہیں اور دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست تھے، جنہوں نے سنت اور بدعت کے درمیان حدِ فاصل قائم کی، ایک مرتبہ وعظ فرما رہے تھے اور اس وعظ میں قوالی کے خلاف بیان تھا اور بڑے زور و شور سے بیان ہو رہا تھا، وعظ کے دوران ایک صاحب کھڑے ہوگئے اور اس نے کہا کہ آپ یہ فرما رہے ہیں کہ قوالی ناجائز ہے اور حرام ہے لیکن حضرت نظام الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ تو قوالی سنتے تھے۔ جواب میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت نظام الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو دلیل معلوم ہوگی، ہمیں معلوم نہیں، ہمیں جو معلوم ہے ہم اس کے مکلف ہیں۔ دیکھئے! ایک طرف تو قوالی کے خلاف اتنی جوشیلی تقریر ہو رہی ہے اور اسی دوران جب ایک بڑے بزرگ کا نام آگیا تو اس طرح جواب دیا۔

بزرگوں کے لئے ثقیل کلام مت نکالو

بات دراصل یہ ہے کہ بزرگوں سے اختلاف جتنا چاہو کرلو، تمہیں اختلاف کرنے کا حق ہے، لیکن ان کے لئے زبان سے کوئی ثقیل کلمہ نہ نکالو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا مقام ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کو کیا درجہ عطا فرمایا ہو۔ لہٰذا جس کے بارے میں شبہ بھی ہو کہ یہ اللہ والا ہے، اس کے خلاف کوئی ثقیل کلمہ بھی زبان سے نہ نکالو۔

بہرحال! غصہ کرنے کا ایک محل ہے، وہ ہے جائز انتقام لینا، اس حد تک انسان غصہ کرسکتا ہے،

لیکن پھر بھی معافی بہتر ہے اور خاص طور پر شروع میں تربیت کے لئے تو انسان کے لئے مناسب یہ ہے کہ جائز انتقام بھی نہ لے۔

غصہ آنا غیر اختیاری ہے

چنانچہ حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''سرعت غضب امر طبعی ہے، اختیار سے خارج ہے، اس پر ملامت نہیں، البتہ اس کے مقتضیٰ پر عمل جب کہ حدود سے تجاوز ہو جائے مذموم ہے''(۱)

یعنی غصہ کا آجانا غیر اختیاری ہے اور جتنا درجہ غیر اختیاری ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مؤاخذہ بھی نہیں۔ اس لئے کہ کوئی بھی ایسی چیز جو انسان کے اختیار سے باہر ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مؤاخذہ اور گرفت نہیں، گرفت ہمیشہ اس کام پر ہوتی ہے جس کو انسان اپنے اختیار اور قصد سے کرے، لہٰذا جو غیر اختیاری غصہ آگیا اور طبیعت کے اندر ایک اوٹن پیدا ہوگئی، اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں، لیکن اگر اس غصے کے مقتضیٰ پر عمل کرتے ہوئے کسی کے ساتھ زبان سے یا ہاتھ سے بدسلوکی کر دے گے تو اس پر گرفت ہو جائے گی، لہٰذا جب تک غصہ کے مقتضیٰ پر عمل نہیں ہوگا اس وقت تک انشاء اللہ اس غصہ سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

حد سے تجاوز کرنا مذموم ہے

لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب غصہ آتا ہے اور اس غصے کے اندر تیزی ہوتی ہے تو اس تیزی کے نتیجے میں آدمی کے اندر ایک بجلی سی بھر جاتی ہے، اور اس کے نتیجے میں آدمی بعض اوقات ایسی حرکتیں کرتا ہے جو حدود سے تجاوز ہو جاتی ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت والا اس ملفوظ میں فرما رہے ہیں کہ ''سرعت غضب امر طبعی ہے اور اختیار سے خارج ہے، اس پر ملامت نہیں، البتہ اس کے مقتضیٰ پر عمل جب کہ حدود سے تجاوز ہو جائے، مذموم ہے''

غصہ کا علاج: ہمت کا استعمال

آگے اس غصہ کا علاج بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''اور اس کا علاج بجز ہمت کے کچھ نہیں''(۲)

مثلاً کسی پر غصہ آیا اور دل چاہا کہ میں اس کا منہ نوچ ڈالوں، یہ جو دل چاہ رہا ہے، اس دل چاہنے پر عمل

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰

نہ کرو اور اپنے آپ کو زبردستی کر کے اس سے روکو اور یہ تہیہ کرلو کہ میں اپنے اس غصہ کے تقاضے پر عمل نہیں کروں گا، عزم کرے اور ہمت کو کام میں لائے کہ چاہے دل اس کام کے کرنے کو کتنا ہی چاہ رہا ہو لیکن میں یہ کام نہیں کروں گا۔ اسی لئے حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرْعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ))(۱)

''پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جس کو غصہ آ رہا ہو اور اس وقت وہ اپنے نفس کو قابو میں کرے''

ہمت کو کام میں لانے کی تدبیریں

بہرحال! غصہ کو قابو کرنے کے لئے اصل چیز تو ''ہمت'' ہے، البتہ اس ہمت کو کام میں لانے کے لئے کچھ تدبیریں معاون ہو جاتی ہیں، اگر وہ تدبیریں اختیار کرلی جائیں تو پھر ہمت میں پختگی آجاتی ہے اور آدمی غصہ کا مقابلہ کرلیتا ہے۔ ان تدبیروں کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا:

''اس ہمت میں مغضوب علیہ سے فوراً دور چلا جانا اور اعوذ باللہ پڑھنا اور اپنی خطاؤں اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے احتمال کو یاد کرنا، یہ بھی بہت معین ہے''(۲)

پہلی اور دوسری تدبیر

پہلی تدبیر یہ بیان فرمائی کہ جس پر غصہ آرہا ہے، اس سے دور چلے جاؤ یا اس کو اپنے سامنے سے دور کردو، اس سے غصہ کے اندر کمی آجاتی ہے۔ دوسری تدبیر یہ بیان فرمائی:

''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.''

پڑھنا، یہ قرآن کریم کا بتایا ہوا نسخہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾(۳)

یعنی جب شیطان کی طرف سے حملہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو اور پڑھو:

''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.''

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب الحذر من الغضب، رقم: ٥٦٤٩، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل من يملك نفسه عند الغضب، رقم: ٤٧٢٣، مسند أحمد، رقم: ٦٩٢١، موطا مالك، الكتاب الجامع، باب ما جاء في الغضب، رقم: ١٤٠٩

(۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰

(۳) الاعراف: ۲۰۰

غصہ کا ایک اور علاج: درود شریف پڑھنا

عربوں میں ایک بڑا اچھا دستور چلا آرہا تھا، اب اس کا رواج کم ہوگیا ہے، وہ یہ کہ جب دو آدمیوں میں لڑائی ہوجاتی اور ایک سخت غصے میں ہوتا تو دوسرا اس سے کہتا کہ صَلِّ عَلَی النَّبِی (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی نبی کریم ﷺ پر درود پڑھو۔ تجربہ یہ تھا کہ سامنے والے کو چاہے کتنا ہی غصہ آرہا ہو، جب اس سے یہ کہا جاتا کہ "صَلِّ عَلَی النَّبِی" تو وہ فوراً درود شریف پڑھتا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ اور غصہ ختم ہوجاتا اور صلح ہوجاتی۔ یہ بہت اچھا رواج تھا، عربوں کی بداوت کے اندر ایسے اچھے رواج تھے، لیکن جوں جوں وہاں نئی تہذیب اور تمدن آرہا ہے، یہ چیزیں رخصت ہوتی جارہی ہیں، یہ بھی غصہ دور کرنے کی ایک اچھی تدبیر تھی۔

اللہ تعالیٰ کے غضب کو سوچنا

تیسری تدبیر یہ بیان فرمائی کہ اپنی خطاؤں اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے احتمال کو یاد کرو کہ جتنا میں اس شخص پر غصہ کررہا ہوں، میں کہیں زیادہ اس بات کا مستحق ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر غصہ کریں، اس لئے کہ میری خطائیں اور میرے گناہ بہت زیادہ ہیں، اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر غصہ کرنے لگیں تو میرا کیا حال ہو؟ یہ تدبیر بہت مددگار ہے۔

تکلف کر کے نرمی اختیار کریں

آگے ارشاد فرمایا:

''اور نرمی وغیرہ مدت تک تکلف سے سوچ سوچ کر اختیار کرنی چاہئے، مدت کے بعد ملکہ ہوگا ہمت نہ ہارے''(۱)

یعنی باقاعدہ تکلف کر کے لوگوں کے ساتھ بات چیت میں نرم لہجہ اختیار کرو اور نرم برتاؤ کرنے کی مشق کرو اور مسلسل کرو، یہ نہیں کہ دو روز تین روز کرلیا اور پھر چھٹی ہوگئی، ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ تو جنم روگ ہے اور ساری زندگی اس پر عمل کرنا ہوگا۔ اس لئے ہر وقت اس کا دھیان رکھے اور ہمت نہ ہارے، البتہ اس طرح کرتے کرتے کچھ عرصہ گزر جائے گا تو اس کے بعد ملکہ پیدا ہوجائے گا اور پھر غصہ جاتا رہے گا اور غصہ کے مواقع پر بھی غصہ نہیں آئے گا۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰

غصہ کے وقت کی سات تدبیریں

آگے ایک ملفوظ میں ارشاد فرمایا:

جس وقت غصہ آوے، امور ذیل کی پابندی کریں:

(۱) یہ خیال کریں کہ میں بھی حق تعالیٰ کا خطاوار ہوں، اگر وہ بھی اسی طرح غصہ کریں تو میرا کہاں ٹھکانہ ہو۔

(۲) اگر میں اس کو معاف کردوں گا تو اللہ تعالیٰ مجھ کو معاف کردیں گے۔

(۳) اس وقت بے کار نہ رہیں، فوراً کسی کام میں لگ جائیں، خصوصاً مطالعۂ کتب میں۔

(۴) اس جگہ سے ہٹ جائیں۔

(۵) ''اعوذ باللہ'' پڑھنے کی کثرت کریں۔

(۶) پانی پی لیں۔

(۷) وضو کرلیں۔(۱)

اس ملفوظ میں حضرت والا نے غصہ دور کرنے کی چند تدابیر بیان فرمائی ہیں۔

میں بھی اللہ تعالیٰ کا خطاوار ہوں

پہلی تدبیر یہ ہے کہ اس وقت یہ سوچے کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا خطاوار ہوں، جس طرح میں اس شخص پر غصہ کررہا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ بھی میری خطاؤں کی وجہ سے میرے اُوپر غصہ کریں تو میرا کہاں ٹھکانہ ہوگا؟ یہ سوچنے سے وہ غصہ جاتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ مجھے معاف کردیں گے

دوسری تدبیر یہ بیان فرمائی کہ اس وقت آدمی یہ سوچے کہ میں جس شخص پر غصہ کررہا ہوں، اگر میں اس کو معاف کردوں گا تو اللہ تعالیٰ مجھ کو معاف فرمادیں گے، اگر میں نے انتقام اور بدلہ لے لیا تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ لیکن اگر میں نے معاف کردیا اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ مجھے آخرت میں معاف کردیں تو اس میں سے کون سا سودا نفع کا ہے؟ ظاہر ہے کہ دوسرا سودا نفع بخش ہے۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۱

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے معاف کرنے کا واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بہت غصے میں آئے اور کہا کہ فلاں شخص نے میرا دانت توڑ دیا ہے، میں اس سے قصاص لوں گا اور بدلہ میں اس کا دانت توڑوں گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو سمجھایا کہ اس کا دانت توڑنے سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا، تم پیسے لے لو اور صلح کرلو۔ اس نے کہا کہ میں صلح نہیں کرتا، میں تو اس کا دانت توڑوں گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اچھا اس کا دانت توڑ لے، شرعاً تمہیں حق ہے۔ جب وہ دانت توڑنے کے ارادے سے اس کی طرف چلا تو غالباً حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اس کو روک لیا اور اس سے فرمایا کہ تم اس کا دانت توڑنے تو جا رہے ہو، لیکن ایک بات سنتے جاؤ۔ اس نے کہا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اب تک تو تم مظلوم ہو، لیکن اگر تم نے دانت توڑتے ہوئے زیادہ زور کی چوٹ ماردی تو اس کے نتیجے میں تم ظالم بن جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہاری پکڑ ہو جائے گی، اور اگر تم اس کو معاف کردو گے تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص ہمارے بندے کی کسی زیادتی کو معاف کردے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو معاف فرمائیں گے جب اس کو معافی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ اس شخص نے پوچھا کہ کیا آپ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے؟ ان صحابی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا جی ہاں! میں نے خود یہ بات حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ میں نے اس کو معاف کردیا۔

اب کہاں تو وہ شخص جوش و خروش میں تھا، صلح کرنے کے لئے تیار نہیں تھا، پیسہ لینے پر تیار نہیں تھا، معاف کرنے پر تیار نہیں تھا، بلکہ اس بات پر مصر تھا کہ دانت توڑوں گا، لیکن جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف سن لی تو سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا، یہ ہے مؤمن کی شان۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا آسان اور سیدھا راستہ بتادیا کہ اگر تم معاف کردو گے تو آخرت میں تمہاری معافی ہو جائے گی۔

کسی کام میں لگ جائیں

اس ملفوظ میں تیسری تدبیر یہ بتائی کہ اس وقت بیکار نہ رہیں، یعنی انسان کو جب غصہ آرہا ہو تو وہ فارغ نہ بیٹھے بلکہ کسی نہ کسی کام میں لگ جائے، خصوصاً مطالعۂ کتب میں مشغول ہو جائے۔ چوتھی تدبیر یہ ہے کہ اس جگہ سے ہٹ جائیں۔ پانچویں تدبیر یہ ہے کہ "أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم" پڑھنے کی کثرت کریں۔ چھٹی تدبیر یہ ہے کہ غصے کے وقت پانی پی لیں۔ ساتویں تدبیر یہ ہے کہ غصے کے وقت وضو کرلیں۔

اپنے کو پستی کی طرف لے جانا

ایک اور تدبیر یہ ہے کہ اگر آدمی غصہ کے وقت کھڑا ہوا ہے تو بیٹھ جائے اور اگر بیٹھا ہوا ہے تو لیٹ جائے، کیونکہ غصہ دماغ کی طرف چڑھتا ہے اور طالبِ علو ہے، چنانچہ جس شخص کو غصہ آتا ہے تو وہ اگر لیٹا ہوا ہے تو بیٹھ جائے گا اور اگر بیٹھا ہوا ہے تو کھڑا ہو جائے گا اور اگر کھڑا ہے تو چلنا شروع کر دے گا، یہ غصہ کی خاصیت ہے۔ لہٰذا اس غصے کا علاج بالضد کرو، وہ یہ کہ اگر غصے کے وقت تم کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ اور اگر بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ۔ یہ تمام علاج ہیں، ان علاجوں پر عمل کرنے سے انشاء اللہ ہمت پیدا ہوگی اور ہمت کے ذریعہ غصہ پر قابو پانا آسان ہوگا۔

غصہ کو قابو کرنے کے لئے اصل چیز ''ہمت'' ہی ہے، لہٰذا چاہے تم پانی پی لو یا چاہے اعوذ باللہ پڑھ لو، جب تک دل میں تحمل کا ارادہ ہی نہیں کرو گے اور عزم اور ہمت سے کام نہیں لو گے تو اس وقت تک کچھ نہیں ہوگا۔ بہر حال! اپنی طرف سے یہ عزم اور ہمت کرو کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، غصے کے مقتضی پر عمل نہیں کروں گا، باقی یہ تمام تدابیر اس ہمت کے لئے معاون بن جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس غصہ کو ہمت کے ذریعہ قابو کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

غصہ کو قابو میں کرنے کا طریقہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے غصہ کے بارے میں ایک اصولی بات ایک ملفوظ میں ارشاد فرمائی ہے، وہ یہ ہے:

> ''غصہ میں جوش کا دفعۃً آنا تو غیر اختیاری ہے، اس پر ملامت نہیں، لیکن بعد کو اس پر قائم رہ کر اس کے مقتضی پر عمل کرنا اختیاری ہے اور اختیاری فعل کا ترک بھی اختیاری ہے، پس اس کے مقتضی پر عمل نہ کرنا اختیاری ہے، اور بار بار اس کے مقتضی پر عمل نہ کرنے سے تقاضا جوش کا بھی مضمحل ہو جائے گا''(۱)

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ غصہ آنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں، لیکن اس غصے کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے کسی کو ڈانٹ دیا، کسی کو جھڑک دیا، کسی کو مار دیا، اب اس پر مؤاخذہ ہوگا۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ اس غصے کا علاج ہی یہ ہے کہ جب غصہ آئے تو اس کے تقاضے پر عمل نہ کرو، خواہ غصے کے اندر کتنا ہی جوش آرہا ہو، لیکن اس جوش کی بنیاد پر کوئی بات زبان سے نہ نکالے، کوئی قدم آگے نہ بڑھائے بلکہ اس تقاضے کو دبائے، اور بار بار اس تقاضے کو دبائے گا تو رفتہ رفتہ اس جوش میں

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۱

بھی کمی آجائے گی اور غصے کا جو اُبال ہوتا تھا وہ بھی کم ہو جائے گا۔ غصہ کا علاج ہی یہی ہے کہ جتنا اس غصے کو پیو گے، اتنا ہی یہ قابو میں آئے گا اور جتنا اس غصے کے تقاضے پر عمل کرو گے اتنا ہی اس غصے میں اضافہ ہوگا۔

غصے کا گھونٹ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''احیاء العلوم'' میں یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ اللہ جل شانہ کو انسان کا کوئی گھونٹ پینا اتنا محبوب نہیں ہے جتنا غصے کا گھونٹ پینا محبوب ہے۔ (۱)

یعنی پانی کا گھونٹ پینا، شربت کا گھونٹ پینا، دودھ کا گھونٹ پینا سب جائز ہے، لیکن غصے کا گھونٹ پینا محبوب ہے، اس لئے کہ غصہ کا گھونٹ پینے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ جل شانہ کے ڈر سے اور اس کی عظمت کے تصور سے اپنے غصے کو دبائے اور اس کو پی جائے اور اس غصے کے تقاضے کو کچل دے اور اس کی خواہش کو پورا نہ کرے، یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بے انتہا محبوب ہے۔

دل توڑنے کے لئے ہے

یہی مجاہدہ درحقیقت مطلوب ہے، جب اس دل پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر چوٹیں پڑتی ہیں تو پھر یہ دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلی گاہ بن جاتا ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

جتنا یہ دل ٹوٹے گا، اتنا ہی یہ دل اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں محبوب ہوتا چلا جائے گا، اس دل پر جتنی چوٹیں پڑیں گی، اتنی ہی اس دل پر اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا نزول ہوگا، اللہ تعالیٰ نے دل کے اندر جو خواہشات پیدا کی ہیں، یہ اسی لئے پیدا کی ہیں تاکہ ان کو توڑا جائے، اس لئے نہیں ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ الْجَنَّةَ حُفَّتْ بِالْمَكَارِهِ))(۲)

یعنی جنت کو مکروہات سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ مکروہات ان کاموں کو کہا جاتا ہے جن کو دل

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، ومن مسند بنی هاشم، رقم: ۲۸٦۰، إحياء العلوم، باب علاج الغضب بعد هيجانه (۱۷٦/۳)

(۲) صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، رقم: ۵۰٤۹، سنن الترمذی، كتاب صفة الجنة عن رسول الله، باب ما جاء صفت الجنة بالمكاره، رقم: ۲٤۸۲

پسند نہیں کر رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ان پر عمل کر رہا ہے اور اس کے نتیجے میں دل پر چوٹ مار رہا ہے، مثلاً غصہ آیا لیکن اللہ تعالیٰ کی خاطر اس غصے کو پی گیا، یا مثلاً دل میں شہوت کی نظر ڈالنے کا تقاضا پیدا ہوا، لیکن اللہ تعالیٰ کی خاطر نظر جھکالی، ان کاموں کے نتیجے میں دل کی خواہشات کو کچلا جارہا ہے، اس کچلنے کے نتیجے میں یہ دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بن جاتا ہے۔

نفس کی خواہشات کو کچل دو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ آدمی ایک مرتبہ یہ طے کرلے کہ۔

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں برباد ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے

آدمی یہ عزم کرلے کہ دل میں جتنی خواہشات اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہورہی ہیں، ان کو کچلنا ہے اور ان کو پامال کرنا ہے اور پامال کرنے کے نتیجے میں ان پر قابو حاصل کرنا ہے۔ اور جب بندہ ایک مرتبہ یہ کام کرلیتا ہے اور اپنی خواہشات کو کچلتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خواہشات مضمحل ہوجاتی ہیں اور کمزور پڑجاتی ہیں۔ یاد رکھو! یہ خواہشات مرتے دم تک ختم نہیں ہوں گی بلکہ باقی رہیں گی، لیکن ان کے جوش وخروش میں اور ان کی شدت میں کمی آجاتی ہے۔

حلاوتِ ایمان کب نصیب ہوتی ہے؟

اور جب اس دل پر بار بار چوٹ پڑنے کے نتیجے میں اس کی خواہشات کمزور پڑجاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ حلاوتِ ایمان عطا فرمادیتے ہیں اور اپنی معرفت عطا فرماتے ہیں اور اس حلاوتِ ایمان اور معرفت کی جو لذت حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلے میں خواہشات کی لذت ہیچ در ہیچ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو حلاوتِ ایمان اور اپنی معرفت عطا فرمادے۔ آمین۔ اس حلاوت کے آگے گناہوں کی اور خواہشات کی لذت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

یہ حلاوت مفت نہیں ملتی

لیکن یہ حلاوت مفت میں نہیں ملتی بلکہ پہلے ان خواہشاتِ نفس پر چوٹ مارتے رہو، مارتے رہو، اور چوٹ مارنے سے شروع شروع میں بڑی تکلیف ہوگی، بڑی مشقت ہوگی، لیکن اس مشقت کو برداشت کرکے چوٹیں مارتے رہو، مارتے رہو، رفتہ رفتہ یہ دل ٹوٹ ٹوٹ کر اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بن جائے گا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت خوبصورت شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

یہ کہہ کے کوزہ گر نے پیالہ پٹک دیا
اب اور کچھ بنائیں گے اس کو بگاڑ کے

جس ذات نے بڑا خوبصورت پیالہ بنایا، اسی ذات نے یہ کہتے ہوئے اس پیالہ کو پٹک دیا کہ اب اس کو بگاڑ کر اور کچھ بنائیں گے۔ اس دل پر چوٹیں ماریں، اس پر ہتھوڑے چلائے، یہ سب کیوں کیا، تاکہ اس کو بگاڑ کر اور کچھ بنائیں گے۔

برباد دل پر تجلیات کا نزول

کسی نے اس پر بڑا خوبصورت شعر کہا ہے کہ۔

بتانِ ماہ وش اُجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
جسے برباد کرتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

لہٰذا خواہشات کو کچل کچل کر جب دل کو برباد کر دیا جاتا ہے تو اس دل پر اللہ تعالیٰ کا نزول اجلال ہوتا ہے اور ان کی تجلیات ظاہر ہوتی ہیں۔

دل پر ذرا نشتر لگایئے

حضرات صوفیاء کرام اور اولیاء کرام، ان سے بھی آگے صحابہ کرام، ان سے بھی آگے انبیاء کرام علیہم السلام، ان کے جو قلوب مجلّٰی مزکّٰی مصفّٰی ہوتے ہیں، وہ بھی اسی طرح ہوتے ہیں کہ یہ حضرات اپنی خواہشات کو توڑتے ہیں اور ان کو کچلتے ہیں، کیونکہ جب خواہشات کو کچلا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس دل کو مجلّٰی مزکّٰی بنا دیتے ہیں، اس دل میں پھر اللہ تعالیٰ کی معرفت کا نور آتا ہے، اس کے بعد پھر ان گناہوں کی خواہشات مضمحل ہو جاتی ہیں اور ان کا جوش و خروش ماند پڑ جاتا ہے، مگر اس کے لئے ابتداء میں ان خواہشات سے کشتی لڑنی پڑتی ہے۔ میں نے بھی اسی موضوع پر ایک شعر کہا تھا کہ۔

کتنے غنچے مضطرب ہیں دل میں کھلنے کے لئے
اپنے ہاتھوں سے ذرا نشتر لگا کر دیکھئے

اس دل پر جتنے نشتر لگاؤ گے، اتنے ہی غنچے کھلیں گے، اتنے ہی اس میں کمالات پیدا ہوں گے اور اتنے ہی اس میں انوارات اور تجلیات حاصل ہوں گی۔

رفتہ رفتہ یہ غصہ قابو میں آجائے گا

اس ملفوظ میں حضرت والا یہی فرما رہے ہیں کہ غصہ کا علاج یہی ہے کہ اگر غصہ آگیا تو آنے

دو، لیکن اس کے بعد دل میں جو یہ تقاضا پیدا ہوا کہ اُٹھ کر اس کو ایک تھپڑ ماروں یا اس کو گالی دوں یا اس کو برا بھلا کہوں، اس تقاضے کو زبردستی دبا جاؤ اور یہ سوچو کہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے اس تقاضے کو دبا رہا ہوں تو پھر اس غصے کو پامال کرنے میں بھی لذت اور حلاوت حاصل ہوگی انشاء اللہ، اور جتنا یہ عمل کرتے جاؤ گے، اتنا ہی یہ نفس قابو میں آتا جائے گا۔

انسان کا نفس دودھ پیتے بچے کی طرح ہے

قصیدہ بردہ میں علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اَلنَّفْسُ كَالطِّفْلِ اِنْ تُہْمِلْہُ شَبَّ عَلٰی

حُبِّ الرَّضَاعِ وَاِنْ تَفْطِمْہُ يَنْفَطِمْ

یعنی انسان کا نفس چھوٹے بچے کی طرح ہے جو ابھی دودھ پیتا ہے، وہ بچہ کبھی یہ چاہے گا کہ میں دودھ چھوڑ دوں؟ نہیں، کیونکہ اس کو تو دودھ پینے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس لئے وہ ماں کا دودھ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے، دودھ پیتے پیتے دو سال ہو چکے ہیں، اب اگر ماں باپ یہ سوچیں کہ اگر اس بچے کا دودھ چھڑائیں گے تو اس کو بہت تکلیف ہوگی، روئے گا، چلائے گا، خود بھی پریشان ہوگا اور ہمیں بھی پریشان کرے گا، لہٰذا دودھ نہ چھڑاؤ، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بچہ جوان ہو جائے گا اور دودھ پینے کی عادت نہیں جائے گی۔ لیکن اگر ماں باپ اس کا دودھ چھڑانے کی کوشش کریں گے تو وہ بچہ دودھ چھوڑ بھی دے گا، ایک دن، دو دن، تین دن تک روئے گا، چلائے گا، پریشان کرے گا، لیکن بالآخر چھوڑ دے گا، ہر بچے کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے۔

نفس کو بے مہار مت چھوڑیں

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کا نفس بھی بچے کی طرح ہے، اگر تم نے اس نفس کو بے مہار چھوڑ دیا کہ جو خواہش ہو رہی ہے، اس پر عمل کر رہے ہو اور اس کی ہر خواہش پوری کر رہے ہو تو یہ نفس تمہیں ہلاکت کے گڑھے میں لے جا کر گرا دے گا اور تم کبھی بھی گناہوں سے نجات نہیں پا سکو گے، لیکن اگر تم نے اس کو قابو کر لیا اور اس سے زبردستی گناہ چھڑانے کی کوشش کر لی تو یہ نفس گناہ چھوڑ بھی دے گا، بات ساری کوشش کی ہے۔ یہی معاملہ غصے کا ہے کہ اس کے تقاضے کو دباتے رہو تو رفتہ رفتہ غصہ کا جوش مضمحل ہو جائے گا۔

غصہ کا بہترین علاج

بعض اوقات غصے کو قابو میں کرنے کے لئے اور علاج بھی مفید ہو جاتے ہیں، لیکن وہ علاج بڑے سخت ہیں، وہ علاج حضرت والا نے اس ملفوظ میں بیان فرمائے ہیں، فرمایا:

''اگر طبعی طور سے غصہ زیادہ آجاتا ہو اور ذرا سی بات پر حد سے زیادہ غصہ آجاتا ہو کہ اس وقت عقل نہ رہتی ہو تو اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ جس پر غصہ کیا جائے، غصہ فرو ہونے کے بعد مجمع میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، پاؤں پکڑے، بلکہ اس کے جوتے اپنے سر پر رکھ لے، ایک دو بار ایسا کرنے سے نفس کو عقل آجائے گی''(۱)

یعنی جس شخص پر بہت زیادہ غصہ کر لیا اور حدود سے تجاوز کر گئے تو اس کا ایک علاج یہ ہے کہ جب غصہ ختم ہو جائے تو مجمع میں اس سے معافی مانگے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کر دو، اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، اس کے پاؤں پکڑے، اس کے جوتے سر پر رکھ لے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب اگلی مرتبہ غصہ کا موقع آئے گا تو اس وقت نفس یہ سوچے گا کہ یہ تو اچھی خاصی مصیبت ہے، پہلے تو صرف غصے کو پینا ہی تھا، اب تو مجمع کے سامنے ذلت اُٹھانی پڑتی ہے، اس ڈر سے غصے کے تقاضے کی شدت میں کمی آجائے گی، ایک دو بار ایسا کرنے سے انشاء اللہ نفس کو عقل آجائے گی۔

اپنی ماں کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگیں

میرے ایک دوست ہیں جو مغلوب الغضب ہیں، غصے کے بہت تیز ہیں، یہاں تک کہ اگر ماں نے بھی کچھ کہہ دیا تو ماں پر غصہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھ سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ فجر کی نماز میں کیا ذکر کروں، ظہر کی نماز میں کیا تسبیحات پڑھوں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم کچھ مت کرو، پہلا کام یہ کرو کہ ماں کے پاس جا کر اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگو اور کہو کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کر دو۔ میری یہ بات سن کر تعجب سے کہنے لگے کہ اچھا حضرت! میں معافی مانگوں، یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو تمہیں کرنا ہوگا، جا کر معافی مانگو اور پاؤں پکڑو اور یہ کام سب بہن بھائیوں کے سامنے کرو۔ کہنے لگے کہ بڑا مشکل ہے۔ میں نے کہا کہ کچھ بھی ہو جائے، لیکن تم یہ کام کرو۔ ان کو یہ عمل بہت شاق گزر رہا تھا کہ میں اپنے تمام بہن بھائیوں کے سامنے ماں سے معافی مانگوں۔ لیکن انہوں نے جا کر یہ کام کیا، جب واپس آئے تو مجھ سے کہا کہ کیا بتاؤں، اس وقت میرے

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۱

سینے پر سانپ لوٹ گئے، آرے چل گئے۔ میں نے کہا کہ میرا بھی یہی مقصد تھا۔ جب دو چار مرتبہ یہ کام ان سے کرایا تو طبیعت اعتدال پر آ گئی۔

بہر حال! انسان کا نفس ان کاموں کو سخت محسوس کرتا ہے، لیکن بعض اوقات یہی کرنا پڑتا ہے۔ جب انسان یہ کڑوی گولی نگل لیتا ہے تو اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شفا ہوتی ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس مرض سے نجات عطا فرمادیتے ہیں۔

شیخ کی نگرانی میں علاج کرے

مگر یہ کام بھی کسی شیخ کی نگرانی میں کرنے چاہئیں، خود اپنی رائے سے نہ کرے، بعض اوقات اپنی رائے سے کرنے سے بھی نقصان ہوجاتا ہے اور اُلٹا اثر پڑجاتا ہے، کیونکہ شیخ جانتا ہے کہ کتنی خوراک دوا دی جائے، اگر ضرورت سے زیادہ دوا دے دی تو مصیبت ہوجائے گی اور اگر کم دوا دے دی تو فائدہ نہیں کرے گی، اس لئے شیخ کے ذریعہ یہ علاج کرنا چاہئے۔

غصہ کا ایک اور علاج

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غصہ کے علاج کے لئے اس بات کا کثرت سے استحضار کرنا بھی مفید ہوتا ہے، وہ بات یہ ہے کہ

"تجربہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ غصہ روکنا ہمیشہ اچھا ہوا اور جب اس کو جاری کیا گیا تو اس کا انجام ہمیشہ برا ہوا اور دل کو قلق بھی ہمیشہ ہوا"(۱)

یعنی زمانہ ماضی کو یاد کرو کہ جتنی مرتبہ غصے کو روکا تو اس کا انجام اچھا ہی ہوا، غصہ روکنے سے نقصان نہ ہوا، اور جب بھی غصہ کیا اور اس کے تقاضے پر عمل کیا تو بکثرت ایسا ہوا کہ بعد میں ندامت اور شرمندگی ہوئی، اگر آدمی کے اندر ذرا بھی سلامتی طبع ہو تو غصہ کرنے کے بعد قلب میں ظلمت محسوس ہوتی ہے اور کدورت اور ندامت محسوس ہوتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا خوبصورت بات ارشاد فرمائی:

((مَا دَخَلَ الرِّفْقُ فِيْ شَيْءٍ إِلَّا زَانَهٗ وَمَا نُزِعَ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهٗ))(۲)

"نرمی جس چیز میں بھی داخل ہوجائے، اسے زینت بخشے گی اور جس چیز سے بھی نکال دی جائے تو اسے عیب دار بنادے گی"

لہٰذا نرمی جہاں بھی ہوگی، زینت کا سبب ہوگی۔ اس لئے جب غصہ کرنے سے بکثرت نقصان

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۲ (۲) المعجم الأوسط، رقم: ۲۱۸۰ (۲/۳٤٤)

ہوتا ہے اور ندامت ہوتی ہے اور غصہ نہ کرنے سے نہ نقصان ہوتا ہے اور نہ ہی ندامت ہوتی ہے تو پھر آدمی کو وہی کام کرنا چاہئے جس سے آدمی کو ندامت نہیں ہوتی۔

غصہ کے وقت بچے کو نہیں مارنا چاہئے

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''غصے میں بچوں کو ہرگز نہ مارا جائے (چاہے استاذ ہو یا باپ ہو) بلکہ غصہ فرو ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر سزا دی جائے، اور بہتر سزا یہ ہے کہ بچوں کی چھٹی بند کر دی جائے، اس کا ان پر کافی اثر ہوتا ہے، مُلّا جی مارنے میں اس واسطے آزاد ہیں کہ ان سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں، بچے تو باز پرس کے اہل نہیں اور والدین کا مقولہ ہے کہ ہڈی ہماری اور چمڑا میاں جی کا۔

مگر یاد رکھو جس حق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ ہو، اس کا مطالبہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوگا، یہاں تک کہ اگر کافر ذمی پر کوئی حاکم ظلم کرے تو حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ اس کی طرف سے مطالبہ کریں گے''(۱)

بچوں کو مارنا بڑا خطرناک معاملہ ہے

بچوں کو مارنے کا معاملہ بڑا خطرناک ہے۔ ہمارے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اور گناہوں کی معافی توبہ کے ذریعہ ممکن ہے، لیکن اگر بچوں پر ظلم کیا جائے تو اس کی معافی کا معاملہ بھی بڑا مشکل ہے، کیونکہ یہ حق العبد ہے اور حق العبد صرف توبہ سے معاف نہیں ہوتا جب تک وہ بندہ معاف نہ کرے جس بندے کی حق تلفی کی گئی ہے، اور یہاں پر بندہ نابالغ ہے اور نابالغ کی معافی بھی معتبر نہیں، حتیٰ کہ اگر وہ نابالغ زبان سے بھی یہ کہہ دے کہ میں نے معاف کیا، تب بھی وہ معافی معتبر نہیں اس لئے اس کی معافی بڑی مشکل ہے، لہٰذا بچوں کو مارنے اور ان پر سختی کرنے میں ڈرتے رہنا چاہئے۔

مدارس میں بچوں کے مارنے پر پابندی

ہمارے مدارس کے جو قاری صاحبان ہیں، وہ اس کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو عافیت عطا فرمائے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اصول بنا دیا تھا کہ مکتب میں کسی قاری صاحب کو

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۳

مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب کوئی قاری صاحب پٹائی کرتے تو آپ اس سے باز پرس فرماتے اور کبھی سزا بھی دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے یہاں تک فرمادیا کہ اب اگر مجھے پتہ چلا کہ کسی قاری صاحب نے بچے کو مارا ہے تو میں مسجد کے صحن میں قاری صاحب کو کھڑا کرکے اسی بچے سے پٹواؤں گا جس کو مارا ہے۔ یہ سختی اس لئے فرمائی کہ یہ معاملہ بڑا خطرناک ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

غصہ ختم ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر سزا دو

اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں کو پڑھانے والے اُستادوں کا کام بہت مشکل ہے، بچوں کو قابو کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے اور کبھی نہ کبھی مارنے کی نوبت آہی جاتی ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ کوئی اور علاج کارگر نہ ہو رہا ہو اور پٹائی کی نوبت آہی جائے تو اس کے بارے میں حضرت فرمارہے ہیں کہ غصے کی حالت میں نہ مارو بلکہ اس وقت طرح دے جاؤ اور جب غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس وقت سوچ سمجھ کر سزا دو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اتنی ہی سزا دو گے جتنی سزا کی ضرورت ہوگی اور حد سے تجاوز نہیں کرو گے، اور اگر غصے میں مارنا شروع کردو گے تو جہاں ایک طمانچہ کی ضرورت تھی، وہاں دس لگ جائیں گے، اس کی وجہ سے ایک تو فی نفسہٖ گناہ ہوا کہ جتنی مارنے کی ضرورت تھی، اس سے زیادہ ماردیا۔ دوسرا یہ کہ نقصان ہوا، کیونکہ جو چیز حد سے زیادہ ہوتی ہے وہ حقیقت میں نقصان دہ ہوتی ہے، تیسرے یہ کہ بعد میں ندامت بھی ہوئی۔

اس لئے اس ملفوظ میں حضرت نے بڑے گُر کی بات فرمادی کہ اس وقت سزا دو جب غصہ ٹھنڈا پڑ جائے، جب طبیعت میں اشتعال ہو رہا ہو، اس وقت سزا مت دو۔

اختتامیہ

غصہ کے بارے میں یہ چند اصول ہیں جو حضرت والا نے بیان فرمادیئے اور یہ بھی بتادیا کہ کونسی چیز مضر ہے اور کونسی چیز مضر نہیں اور اس غصے کے شر سے بچنے کا کیا طریقہ ہے، اب ہر انسان کو اپنے حساب سے ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، اور عمل کرنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ کسی شیخ سے اس نیت سے رابطہ رکھے کہ مجھے ان رذائل کی اصلاح کرانی ہے اور پھر ان سے مشورہ لیتا رہے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ ان رذائل کو دور فرمادیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمارے رذائل کو دور فرمادے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

حسد اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

گزشتہ تین دن سے غصہ کا بیان چل رہا تھا، اب آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ''حسد'' کا بیان شروع فرما رہے ہیں، یہ حسد بھی بڑی خراب باطنی بیماری ہے، یہ بڑی خطرناک بھی ہے اور اس کا چلن بھی بہت زیادہ ہے، یعنی یہ بیماری کثرت سے پیدا ہو جاتی ہے، خاص طور پر ہمارے طبقے میں یعنی طالب علموں کے طبقے میں یہ بیماری بہت زیادہ ہے، لہٰذا بہت زیادہ اہتمام کے ساتھ اس کے ازالے کی فکر کرنی چاہئے۔

تین چیزیں اور ان کا حکم

چنانچہ حسد کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جو ملفوظات ہیں، وہ ایک ایک پڑھ لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی ہو جائے گی۔ ایک ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا:

''ایک تو کیفیت انسانیہ ہے جس میں انسان ''معذور'' ہے، ایک عمل ہے مقتضی پر، اس میں انسان مازور (گناہ گار) ہے، ایک مخالفت ہے اس مقتضی کی، اس میں انسان ''ماجور'' ہے، یعنی حسد کے غلبہ سے کسی کی مذمت کا تقاضا ہو تو اس کی مدح کرو، اگر اس سے اعراض کو دل چاہے تو اس سے ملو، اس کی تعظیم کرو، اس کو ابتداء بالسلام کرو اور اس کے ساتھ احسان کرو''(۱)

حسد کس کو کہتے ہیں؟

حسد کے تمام مباحث کو اس مختصر سے ملفوظ میں سمیٹ دیا، سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ حسد کس کو کہتے ہیں؟ ''حسد'' اسے کہتے ہیں کہ دوسرے کسی شخص کو جو اچھائی حاصل ہے، اس کی اچھائی سے

☆ اصلاحی مجالس (۴/۱۴۴ تا ۱۶۴)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، دار العلوم، کراچی

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۳

رنجیدہ ہو کر اس کے زوال کی تمنا کرنا۔

حسد کی مثالیں

مثلاً میرا ایک ہم جماعت ہے، ہم دونوں ایک ساتھ پڑھتے ہیں، میرا ساتھی امتحان میں اوّل آجاتا ہے، اس کے نمبر زیادہ آتے ہیں، اب میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اس کے نمبر کیوں زیادہ آتے ہیں؟ وہ مجھ سے کیوں آگے بڑھ گیا؟ اب دل میں یہ خواہش ہے کہ اس کے نمبر کم آئیں، وہ آئندہ اوّل پوزیشن حاصل نہ کر سکے، چاہے میں پوزیشن حاصل کروں یا نہ کروں، اس سے کوئی بحث نہیں، لیکن یہ اوّل نہ آئے۔ یہ خیال اور جذبہ ''حسد'' ہے۔

یا مثلاً ایک شخص بڑا مالدار ہے، اب آپ کے دل میں یہ خیال آرہا ہے کہ اس کے پیسے کم ہو جائیں، اس کی آمدنی کم ہو جائے، یہ جذبہ ''حسد'' ہے۔ یا مثلاً ایک شخص کی عزت اور شہرت ہے، لوگ اس کی طرف زیادہ رجوع کرتے ہیں، اب دل میں یہ کڑھن ہو رہی ہے کہ لوگ اس کی طرف کیوں مائل ہیں؟ اور دل میں یہ خیال آرہا ہے کہ اس کی عزت اور شہرت ختم ہو جائے، یہ ''حسد'' ہے۔

رشک کرنا جائز ہے

ایک ''غبطہ'' ہوتا ہے، جس کو اردو میں ''رشک'' کہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ جب دوسرے شخص کے پاس کوئی نعمت دیکھی تو خیال آیا کہ اس شخص کے پاس یہ نعمت ہے، اللہ تعالیٰ یہ نعمت مجھے بھی عطا فرمادے اور اس کے پاس بھی یہ نعمت رہے۔ مثلاً اس کی صحت اچھی ہے، اللہ تعالیٰ میری صحت بھی اچھی کردے۔ اس کے پاس دولت ہے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی دولت عطا فرمادے۔ یا مثلاً فلاں کے پاس علم زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی علم عطا فرمادے۔ یہ ''رشک'' ہے، اس میں دوسرے کی نعمت کو دیکھ کر اپنے لئے بھی اسی نعمت کے حصول کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ ''رشک'' کرنا منع نہیں، جائز ہے، جبکہ ''حسد'' میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ مجھے یہ نعمت ملے یا نہ ملے، لیکن اس کے پاس سے زائل ہو جائے، یہ ''حسد'' ہے۔

صرف دل کا رنجیدہ ہونا گناہ نہیں

یہ ''حسد'' بڑی خراب چیز ہے۔ اگر صرف دل میں یہ خیال آگیا کہ یہ شخص مجھ سے فلاں چیز میں آگے بڑھ گیا ہے اور اس خیال کے نتیجے میں دل میں تکلیف اور صدمہ اور رنج ہو رہا ہے، لیکن اس رنج اور صدمہ کا کوئی اثر اپنے عمل سے ظاہر نہیں ہونے دیا تو یہ صدمہ اور رنج غیر اختیاری طور پر پیدا ہوا ہے۔

اس کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ یہ ''کیفیت انسانیہ'' ہے جس میں انسان معذور ہے بشرطیکہ صرف دل کے اندر تک رہے، نہ اس رنج کا کوئی اثر اپنے کسی عمل سے ظاہر ہو اور نہ اس رنج کے مقتضی پر عمل ہو، اس حد تک کوئی گناہ نہیں۔

دل کے تقاضے پر عمل کرنا گناہ ہے

ہاں! گناہ اس وقت ہوگا جب اس ''حسد'' کے نتیجے میں اس کی بدخواہی میں کوئی کام کر گزرے۔ مثلاً دل میں خیال آیا کہ یہ شخص مجھ سے آگے بڑھ گیا ہے، اب میں لوگوں کے سامنے اس کی برائی بیان کروں تاکہ اس کی عزت میں کمی آئے، یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے جس کے نتیجے میں اس کی دولت کم ہو جائے، اس کی صحت کم ہو جائے، اس کا علم کم ہو جائے، لوگوں پر اس کے اثرات کم ہو جائیں۔ یا اس کے لئے بددعا کرے کہ یا اللہ! اس کی فلاں نعمت اس سے زائل ہو جائے، یا لوگوں کے سامنے اس کی غیبت کرے، یا مجمع کے سامنے اس کو ذلیل کرنے کی فکر کرے، یا جب اس سے ملاقات ہو تو اس کو سلام نہ کرے وغیرہ، جب ''حسد'' کے نتیجے میں حسد کرنے والا یہ اعمال کرے گا تب یہ ''حسد'' گناہ اور معصیت کی شکل اختیار کرے گا۔ لیکن جب تک ''حسد'' کے نتیجے میں صرف دل میں ایک صدمہ اور تکلیف پیدا ہوئی ہے، اس حد تک یہ ''حسد'' گناہ اور معصیت نہیں کیونکہ یہ بات غیر اختیاری طور پر پیدا ہوئی ہے۔

البتہ دل کا خیال بھی خطرناک ہے

لیکن ''احیاء العلوم'' میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب یہ حسد دل میں پیدا ہوا اور دوسرے کے خلاف دل میں ایک کڑھن پیدا ہوئی کہ یہ مجھ سے آگے کیوں بڑھ گیا، اگرچہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے انسان اس میں معذور ہے اور یہ براہِ راست گناہ نہیں، لیکن یہ خیال اور کڑھن بھی بڑی خطرناک ہے، کیونکہ اگر یہ خیال دل میں کچھ عرصہ تک باقی رہا تو یہی خیال بالآخر اس کو معصیت اور گناہ میں مبتلا کر دے گا اور اس کے نتیجے میں اس سے کوئی نہ کوئی بدخواہی کا عمل دوسرے کے خلاف سرزد ہو جائے گا۔ لہٰذا چاہے ''حسد'' کا خیال بلا اختیار آیا ہو لیکن اس ''حسد'' کو دل میں رکھنا اور اس کی پرورش کرنا بڑا خطرناک ہے، اس لئے نہ اس خیال کی پرورش کرو اور نہ اس کو دل میں باقی رکھو۔

خیال کے علاج کے لئے تین کام کریں

بلکہ اس موقع پر اس کے علاج کے لئے تین کام کرو۔ پہلا کام یہ ہے کہ جو خیال دل میں آیا

ہے، اس کو برا سمجھو کہ یہ خیال جو میرے دل میں آیا ہے، یہ بری بات ہے، کسی مسلمان کے بارے میں ایسی بات سوچنا بہت برا ہے، اس طرح اس خیال کی برائی کا تصور کرو۔ دوسرا کام یہ کرو کہ جس آدمی کے بارے میں یہ خیال پیدا ہوا ہے، اس کے محاسن اور اس کی اچھائیوں کا استحضار کرو، خاص طور پر ان اچھائیوں کا جن کا تعلق تمہاری ذات سے ہو، مثلاً اگر تم کو اس کے ذریعہ کسی موقع پر کسی درجہ میں نفع پہنچا ہے تو گویا کہ اس کا تمہارے اوپر احسان ہے، اگر ایسا ہوا ہے تو خاص طور پر اس احسان کا استحضار کرو۔

تیسرا کام یہ کرو کہ اگرچہ تمہارے دل میں اس کے ''حسد'' کا خیال آرہا ہے اور حسد کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو تکلیف پہنچے، اس کو نیچا دکھایا جائے، اس کی برائی ہو، لیکن بہ تکلف اور زبردستی اس کے حق میں دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور زیادہ ترقی عطا فرما۔ یہ دعا کرنا بہت ہی کڑوا گھونٹ ہے، کیونکہ دل تو چاہ رہا ہے کہ وہ ذلیل وخوار ہو، لوگوں کے دلوں میں اس کی وقعت کم ہو اور وہ آگے ترقی نہ کرے، لیکن آپ اس کے لئے دعا کر رہے ہیں کہ یا اللہ! اس کو اور زیادہ ترقی درجات عطا فرما، اس کے علم میں ترقی عطا فرما، اس کی دولت میں ترقی عطا فرما، اس کی صحت میں ترقی عطا فرما، اور جب وہ سامنے آئے تو اس سے ابتداء بالسلام کرو اور اس کی تعظیم واکرام کرو اور لوگوں کے سامنے اس کی تعریف اور اچھائی بیان کرو، ایسا کرنے سے آپ کے سینے پر سانپ لوٹ جائیں گے، لیکن حسد کا علاج یہی ہے۔

ورنہ وہ خیال ہلاکت میں ڈال دے گا

بہرحال مندرجہ بالا تین کام کرو، اگر حسد کرنے والا شخص یہ تین کام نہیں کرے گا تو پھر جو غیر اختیاری خیال دل میں آیا تھا، وہ بالآخر معصیت پر منتج ہو کر رہے گا اور وہ خیال تمہیں ہلاکت میں ڈال دے گا، اور اگر مندرجہ بالا تین کام کر لیے تو انشاء اللہ وہ جو غیر اختیاری خیال آیا تھا، وہ معاف ہو جائے گا۔ اب دوبارہ حضرت والا کا ملفوظ دیکھ لیں۔ حضرت فرما رہے ہیں کہ

''ایک تو کیفیت انسانیہ ہے'' اس کیفیت انسانیہ سے مراد وہ غیر اختیاری خیال ہے جو دل میں آ گیا، مثلاً کسی کے تم سے آگے بڑھنے سے تمہارے دل پر چوٹ لگ گئی، اس میں انسان معذور ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر مؤاخذہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس خیال کے مقتضی پر عمل کرے، مثلاً اس کے درپے آزار ہو گیا، اس کی چغلیاں شروع کر دیں، اس کی غیبت شروع کر دی اور اس کو ذلیل وخوار کرنے کے لئے اس کے پیچھے پڑ گیا، اس کے اندر انسان مازور یعنی گناہ گار ہے۔

تیسرا یہ کہ اس کے مقتضی کی مخالفت کرے، مثلاً دل میں تو یہ خیال آرہا ہے کہ کسی طرح اس کو ذلیل وخوار کروں، لیکن اس تقاضے کے برخلاف اس کی تعریف کر رہا ہے اور اس کے لئے دعا کر رہا ہے، اس عمل کے نتیجے میں انسان ''ماجور'' ہے، یعنی ایسا کرنے پر اس کو اجر وثواب ملے گا۔

خیال کی مخالفت کا نتیجہ

نفس کے اس خیال کی مخالفت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شیطان تمہارے دل میں حسد کا خیال اس لئے لایا تھا تا کہ تمہیں جہنم میں پہنچادے، کیونکہ حسد کے نتیجے میں جو اعمال تم کرتے، وہ اعمال تم کو تباہ کر دیتے اور جہنم میں پہنچا دیتے، لیکن تم نے یہ کیا کہ جب حسد کا خیال آیا تو تم نے اس خیال کے تقاضے کی خلاف ورزی شروع کر دی، مثلاً اس کے حق میں دعا شروع کر دی اور اس کی تعریف شروع کر دی، تو خیال اوّلاً تمہیں معصیت میں مبتلا کرنے کے لئے آیا تھا، لیکن اس کے مقتضیٰ کے خلاف عمل کرنے کے نتیجے میں بالآخر نیکیوں اور ثواب کا خزانہ تمہارے نامۂ اعمال میں جمع ہو جائے گا۔

کیا گناہ اچھی چیز ہے؟

ہمارے ایک بزرگ حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز صحبت تھے، وہ بڑی عجیب و غریب باتیں کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ گناہ بڑی اچھی چیز ہے۔ ہم نے کہا کہ حضرت! گناہ اور اچھی چیز ہونا، سمجھ میں بات نہیں آئی۔ فرمایا کہ ہاں! گناہ بڑی اچھی چیز ہے، اس لئے کہ جب گناہ کا تقاضا دل میں پیدا ہو اور انسان زبردستی کر کے اس گناہ سے بچے تو اس کے درجات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ اگر گناہ نہ ہوتے تو یہ درجات نہ بڑھتے، کیونکہ گناہ انسان کے دل میں جو معصیت اور نافرمانی کا تقاضا پیدا کرتا ہے اور پھر انسان اس تقاضے کی مخالفت کرتا ہے اور اس کو کچلتا ہے تو اس کے درجات میں کہیں سے کہیں ترقی ہو جاتی ہے۔

دو شخصوں میں موازنہ کریں

دیکھئے! ایک وہ شخص ہے جس کے دل میں گناہ کا خیال ہی نہیں آیا، نہ اس کو گناہ کرنے کے مواقع میسر آئے اور وہ گناہوں سے بچتا ہوا گزر گیا تو ان شاء اللہ وہ عذاب سے نجات پا جائے گا۔ لیکن دوسرا شخص وہ ہے کہ قدم قدم پر اس کے دل میں گناہوں کے تقاضے اور داعیے پیدا ہو رہے ہیں، گناہوں کے مواقع بھی میسر آرہے ہیں، ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو اس کے سامنے گناہ کا ایک تقاضا آکر کھڑا ہو جاتا ہے، وہ کسی طرح اپنے آپ کو اس گناہ سے بچا کر آگے بڑھتا ہے، جب دوسرا قدم بڑھاتا ہے تو پھر ایک گناہ کا تقاضا پیدا ہوتا ہے، پھر وہ اپنے آپ کو کسی طرح اس سے بچا کر آگے بڑھا تو ایک داعیہ اور پیدا ہو گیا، اس طرح زندگی بھر گناہوں کے تقاضوں سے مقابلہ کرتے ہوئے قبر تک پہنچ گیا۔ فرمایا کہ یہ جو دوسرا شخص ہے جو گناہوں کی کشمکش سے گزرتا ہوا اور اپنے دامن کو گناہوں سے

بچاتا ہوا قبر تک پہنچا ہے، اس کا درجہ پہلے شخص کے مقابلے میں کہیں آگے ہے۔ یہ کیوں آگے بڑھ گیا؟ یہ گناہوں کی وجہ سے آگے بڑھ گیا۔ اس لئے حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ گناہ بڑی اچھی چیز ہے، کیونکہ گناہوں کے تقاضوں کو کچلنے سے درجات بلند ہوتے ہیں۔

انگریزوں کے کباب لذیذ بنیں گے

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی اور جہاد کیا، ان کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی، ان کی ہر چیز سے نفرت تھی اور یہ نفرت غلبۂ حال تک پہنچی ہوئی تھی۔ کسی صاحب نے آکر کہا کہ حضرت! آپ ہر وقت انگریزوں کی برائی ہی بیان کرتے رہتے ہیں، آخر ان میں کوئی اچھائی بھی تو ہوگی؟ دنیا میں کوئی بری چیز ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نہ کوئی اچھائی نہ ہو، تو ان انگریزوں میں بھی کوئی تو اچھائی ہوگی؟ کبھی آپ ان انگریزوں کی اچھائی بھی بیان کردیا کریں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہاں بھائی! ان انگریزوں کے کباب بنا کر کھائے جائیں تو بڑے لذیذ ہوں گے، ان میں یہ ایک اچھائی ہے۔

بہرحال! گناہوں کی اچھائی یہ ہے کہ ان گناہوں کے تقاضوں کو کچلا جائے اور ان کے تقاضوں کو دبایا جائے تو اس سے انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ اسی طرح حسد کا جو خیال تمہارے دل میں آیا تھا، یہ اگرچہ تمہیں گناہ کے اندر مبتلا کرنے کے لئے آیا تھا، لیکن جب اس خیال کے تقاضے کے خلاف تم نے عمل کیا تو یہ اُلٹا تمہاری ترقی درجات کا سبب بن گیا۔ اسی طرح گناہوں کے جتنے داعیے اور تقاضے ہیں، وہ بالآخر انسان کی ترقی درجات کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس لئے اگر تمہارے دل میں حسد کے خیالات آتے ہیں تو ان کو ترقی درجات کے حصول کا ذریعہ بنالو تو پھر انشاء اللہ اس حسد کے خیال سے کوئی ضرر نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حاسد خود حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے

''حسد'' کو صوفیاء کرام نے آگ سے تشبیہ دی ہے، کیونکہ ''حسد'' کے نتیجے میں انسان کے دل میں ''جلن'' پیدا ہوجاتی ہے، مثلاً کسی دوسرے کو اچھی حالت میں دیکھا اور اس کو اپنے سے بڑھتا ہوا دیکھا تو طبیعت میں ایک جلن پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ حسد کے بارے میں ایک عربی شاعر نے کہا ہے

اَلنَّارُ تَاْکُلُ بَعْضَھَا اِنْ لَمْ تَجِدْ مَا تَاْکُلُ (۱)

(۱) البلاغة العربية أسسها وعلومها وفنونها (۱/۶۱۸)، العقد الفريد (۱/۱۹٤)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ حسد کی مثال آگ جیسی ہے اور آگ کی خاصیت یہ ہے کہ جب اس کو دوسری چیز کھانے کو ملے تو تب تو یہ اس کو کھاتی رہے گی، مثلاً لکڑی کو آگ لگی ہوئی ہے تو وہ آگ لکڑی کو کھاتی رہے گی، لیکن جب لکڑی ختم ہو جائے گی تو آگ کا ایک حصہ خود اپنے دوسرے حصے کو کھانا شروع کر دے گا، یہاں تک کہ وہ آگ بھی ختم ہو جائے گی، اسی طرح حسد کی آگ بھی ایسی ہے کہ حسد کرنے والا پہلے تو دوسرے کو خراب کرنے اور دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب حاسد دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تو پھر خود حسد کی آگ میں جل جل کر بیمار ہو جاتا ہے اور اس کو ظاہری بیماری لگ جاتی ہے، کتنے لوگ ہیں جو اس حسد کی آگ میں جل جل کر خود ختم ہو گئے۔

''حاسد'' اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض کرنے والا ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ''حسد'' بہت بڑا گناہ ہے، اس لئے کہ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ ''حسد'' کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور تقسیم پر اعتراض کر رہا ہے، مثلاً یہ کہ فلاں کو مجھ سے کیوں آگے بڑھا دیا گیا؟ فلاں کو آپ نے یہ نعمت کیوں عطا کر دی؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو جو چیز دی ہے، وہ ہم نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کس شخص کو کیا چیز دی جائے اور کتنی مقدار میں دی جائے۔ لہٰذا یہ ان کی حکمت کا فیصلہ ہے، اب تم اعتراض کر رہے ہو کہ فلاں کو یہ نعمت اتنی کیوں دی گئی؟ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾(۱)

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت عطا فرمائی ہے، اس کی تمنا مت کرو، کیونکہ یہ غیر اختیاری چیزیں ہیں، ان کے اندر تمنا مت کرو کہ یہ چیز اس کو کیوں مل گئی اور مجھے کیوں نہیں ملی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے

یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے، کسی کو اچھی صحت دے دی لیکن اس کے پاس پیسہ نہیں، دوسرے کو پیسے کی نعمت دے دی لیکن صحت اچھی نہیں، کسی کو علم کی دولت دے دی لیکن پیسے کی دولت نہیں دی، کسی کو عزت اور شہرت کی دولت دے دی اور دوسری نعمت مثلاً اولاد کی نعمت اس کو میسر نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے فیصلے سے یہ نعمتیں مقرر فرمائی ہیں کہ کس کو کیا نعمت دی جائے، تم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو۔

---

(۱) النساء: ۳۲، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جن چیزوں میں ہم نے تم کو ایک دوسرے پر فوقیت دی ہے، ان کی تمنا نہ کرو''

اپنی نعمتوں کی طرف نظر کرو

''حسد'' کے اندر حاسد کو اپنی نعمت کی طرف نظر نہیں ہوتی بلکہ دوسرے کی نعمت کی زوال کی خواہش ہوتی ہے۔ لہٰذا حسد کرنے والا اگر یہ سوچے کہ فلاں کو یہ نعمت ملی ہوئی ہے، مجھے اس کے بجائے دوسری نعمت ملی ہوئی ہے، اس پر غور کرے گا تو حسد کی بیماری دل سے نکل جائے گی، مثلاً یہ کہ فلاں کو پیسے کی نعمت ملی ہوئی ہے لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے علم کی نعمت دی ہے۔ بقول کسی کے۔

رَضِینَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِینَا

لَنَا عِلْمٌ وَ لِلْجُهَّالِ مَالٌ (۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان جو تقسیم فرمائی ہے، اس پر ہم راضی ہیں کہ جاہلوں کو مال کی نعمت دیدی اور ہمیں انکے مقابلے میں علم کی دولت دے دی۔ لہٰذا آدمی کیوں غمگین اور رنجیدہ ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہئے۔

بہر حال! حسد کے اندر سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض ہوتا ہے، اس لئے اس سے بچنا چاہئے۔

ان خیالات کو برا سمجھو

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ بعض اوقات دل میں ''حسد'' کے غیر اختیاری خیالات آجاتے ہیں، ان غیر اختیاری خیالات کے آنے میں انسان ایک درجے میں معذور ہے اور اس میں گناہ بھی نہیں۔ لیکن یہ غیر اختیاری خیالات بھی خطرناک ہیں، کیونکہ کسی وقت بھی یہ انسان کو گناہ کے اندر مبتلا بھی کر دیتے ہیں، لہٰذا ان کا علاج کرنا ضروری ہے، ان خیالات کا علاج یہ ہے کہ ان کو برا سمجھو اور ان کے مقتضیٰ کے خلاف پر عمل کرو۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اختیاری کی ضد بھی اختیاری ہوتی ہے، پس جو امور حسد سے ناشی ہیں، ان کی ضد کو اپنے اختیار سے عمل میں لاؤ، اس طرح کہ بجائے غیبت کے محسود کی مدح زبان سے کیا کرو، گو نفس کو ناگوار ہو، مگر زبان پر تو اختیار ہے، اور اس سے نیازمندی کے

---

(۱) روضة الأدب، ص: ۱۲، ادب کی بہت سی کتابوں میں ہمیں اس مفہوم کا ایک اور خوبصورت شعر بھی ملتا ہے

رَضِینَا قِسْمَةَ الرَّحْمٰنِ فِینَا

لَنَا حَسَبٌ وَلِلثَّقَفِيِّ مَالٌ

ملاحظہ ہو: طبقات الشعراء (۱/۳۵)، بهجة المجالس وأنس المجالس (۱/۳۹)، الشعر والشعراء (۱/۱۹۲)

ساتھ ملاقات و کلام کرو، اور اس کے ضرر پر زبان سے رنج ظاہر کیا کرو، اس کے سامنے بھی اور دوسروں کے سامنے بھی، اور وہ اگر سامنے آجائے تو اس کی تعظیم کیا کرو، کبھی کبھی اس کو ہدیہ دیا کرو، ایک مدت تک ایسا کرنے سے حسد زائل ہو جائے گا، کم از کم بیس بار اس معاملہ کو واضح کیا جائے'' (۱)

یعنی جس کام کا کرنا اختیار میں ہے، اس کا چھوڑنا بھی اختیار میں ہوگا، لہٰذا حسد کے نتیجے میں جو خیال دل میں پیدا ہو رہا ہے کہ میں اس کو ماروں، اس کو برا بھلا کہوں، اس کی اہانت کروں، اس کو لوگوں میں بدنام کروں، اس کی غیبت کروں، حسد کی وجہ سے ان اعمال کو کرنے کا دل میں خیال پیدا ہو رہا ہے اور یہ سب اعمال اختیاری ہیں اور حرام ہیں، لہٰذا ان کی ضد بھی اختیاری ہے۔

جس سے حسد ہو رہا ہے اس کی تعریف کرو

مثلاً دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ اس کو بدنام کروں، لیکن بجائے بدنام کرنے کے اس کی تعریف لوگوں کے سامنے کرو، یہ بھی اختیار میں ہے، اور جب اختیار میں ہے تو اپنے اختیار سے اس کو عمل میں لاؤ۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ ''جو امور حسد سے ناشی ہیں، ان کی ضد کو اپنے اختیار سے عمل میں لاؤ، اس طرح کہ بجائے غیبت کے محسود کی مدح زبان سے کیا کرو'' یعنی جس سے دل میں حسد پیدا ہو رہا ہے، اس کی برائی کرنے کے بجائے اس کی تعریف کرو، دل تو اس پر آمادہ نہیں ہوگا، لیکن دل کو قابو کر کے زبردستی اس کی تعریف کرو، گو نفس کو ناگوار ہو۔

اب دل تو چاہ رہا ہے کہ میں اس کو گالی دوں یا ایسا برا بھلا کہوں کہ یہ ساری دنیا میں بدنام ہو جائے، لیکن اس حاسد سے اُلٹا یہ کہا جا رہا ہے کہ اس کی تعریف کرو، تعریف کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی کوئی مصنوعی تعریف کرو بلکہ اس کی حقیقی تعریف کرو، کیونکہ دنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر کوئی قابلِ تعریف پہلو نہ ہو، لہٰذا اس محسود کے اندر قابلِ تعریف پہلو کو تلاش کر کے پھر اس کی تعریف کرو کہ ماشاء اللہ اس کے اندر یہ بہت اچھا وصف موجود ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا چور کے پاؤں چومنا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے واقعہ لکھا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ کسی راستے سے گزر رہے تھے، دیکھا کہ ایک آدمی سولی پر لٹکایا ہوا ہے، اس کا دایاں ہاتھ بھی کٹا ہوا ہے اور اس کا بایاں پاؤں بھی کٹا ہوا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے بتایا

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۴

کہ اس نے پہلی مرتبہ جب چوری کی تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا تھا، جب دوسری مرتبہ اس نے چوری کی تو اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا گیا تھا، اس کے بعد پھر بھی باز نہ آیا اور پھر اس نے چوری کی تو اب اس کے نتیجے میں اس کو سولی پر لٹکایا جا رہا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے اور اس چور کے پاؤں کو جو لٹک رہا تھا، اس کو بوسہ دیا۔

لوگوں نے کہا کہ حضرت! آپ جیسا انسان اتنے بڑے چور اور ڈاکو کے پاؤں کو بوسہ دے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے کیوں بوسہ دیا؟ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس شخص کے اندر ایک بہت عمدہ وصف ہے، وہ ہے ''استقامت'' میں نے اس کے اس وصف کو بوسہ دیا ہے۔ اگرچہ اس شخص نے اس ''استقامت'' کے وصف کو غلط جگہ استعمال کیا اور گناہ کے کام میں استعمال کیا، یہ اس کی غلطی ہے، لیکن ''استقامت'' کا وصف بذاتِ خود قابلِ تعریف وصف ہے، اگر یہ شخص اس وصف کو کسی صحیح کام میں لگا لیتا تو یہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔

ہر انسان کے اندر کوئی خوبی ہوتی ہے

لہٰذا ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی کی بات ہوتی ہے۔ علامہ اقبال بچوں کے لئے لکھی ہوئی ایک نظم میں کہتے ہیں:

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

لہٰذا دنیا میں جتنی چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے پیدا فرمائی ہیں۔

محسود کی مدح کرو

لہٰذا جس شخص سے تمہارے دل میں حسد پیدا ہو رہا ہے، اس کے اندر کوئی اچھائی تلاش کرو، اس کی کوئی خوبی تلاش کرو، پھر لوگوں کے سامنے اس کی اس اچھائی کو اور خوبی کو بیان کرو، ایسا کرنے سے دل پر آرے چلیں گے، لیکن چلنے دو، کیونکہ جو ''حسد'' کی بیماری دل میں پیدا ہو رہی ہے، اس کا علاج ہی دل پر آرے چلانا ہے، اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''بجائے غیبت کے محسود کی مدح زبان سے کیا کرو گو نفس کو ناگوار ہو، مگر زبان پر تو اختیار ہے'' ایک کام تو یہ کرو۔

محسود سے نیازمندی کے ساتھ ملاقات کرو

دوسرا کام یہ کرو کہ ''اس سے نیازمندی کے ساتھ ملاقات اور کلام کرو''

مثلاً دل تو چاہ رہا ہے کہ اس کا منہ نوچ لوں، لیکن جب ملاقات ہو تو اس سے نیازمندی اور عاجزی کے ساتھ ملاقات کرو اور اس سے بات چیت بھی نرمی کے ساتھ کرو۔

محسود کے ضرر پر رنج ظاہر کرو اور اس کی تعظیم کرو

تیسرا کام یہ کرو کہ ''اس کے ضرر پر زبان سے رنج ظاہر کیا کرو''

یعنی اگر اس محسود کو کوئی صدمہ یا کوئی رنج یا کوئی تکلیف پہنچ جائے تو اس تکلیف پر خود بھی اظہارِ رنج کرو، اس کے سامنے بھی کرو اور دوسرے لوگوں کے سامنے بھی کرو۔

چوتھا کام یہ کرو کہ ''جب وہ سامنے آجائے تو اس کی تعظیم کیا کرو''

محسود کو ہدیہ دیا کرو

پانچواں کام یہ کرو کہ ''کبھی کبھی اس کو ہدیہ دیا کرو''

تاکہ اس کے دل میں بھی تمہاری محبت پیدا ہو، اور تمہارے دل میں بھی اس کی محبت پیدا ہو۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے لئے دوسرے سب کام کرنا تو گوارا ہو جاتا ہے لیکن پیسے خرچ کرنا طبیعت پر بڑا بھاری ہوتا ہے، بقول کسی کے ''گر جان طلبی حاضر است، گر زر طلبی سخن دریں است'' لہٰذا پیسہ جیب سے نکالنا بڑا بھاری ہوتا ہے، لیکن یہ کڑوا گھونٹ بھی پیو۔ اب تم اس کو ہدیہ دو گے تو یہ ہوگا کہ جیب سے پیسے بھی نکلیں گے اور ایسے شخص کے پاس جائیں گے جس سے سخت نفرت ہے، اور جب یہ سب کام ''حسد'' کی مخالفت میں کرو گے تو اس کے نتیجے میں انشاء اللہ یہ حسد کی بیماری زائل ہو جائے گی۔

یہ کام بار بار کرنے سے حسد دور ہوگا

آگے حضرت والا نے فرمایا: ''ایک مدت تک ایسا کرنے سے ''حسد'' زائل ہو جائے گا، کم از کم بیس بار اس معاملے کو واضح کیا جائے'' یعنی بیس مرتبہ یہ کام کرو۔ چونکہ ایک صاحب نے خط میں حضرت والا کو لکھا تھا کہ مجھے فلاں آدمی سے ''حسد'' ہے، اس پر حضرت والا نے اس کا علاج فرمایا کہ اس کی تعریف کرو، اس کی تعظیم کرو، اس کو ہدیہ دو، اور کم از کم بیس مرتبہ یہ عمل کرو تو انشاء اللہ یہ حسد زائل ہو جائے گا۔

حسد اور حِقد میں فرق

ایک اور خط کے جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

''اگر کسی کے نقصان کی خبر سننے یا برائی کی خبر سننے سے دل خوش ہو تو یہ ''حسد'' کا مادّہ ہے، اور اگر اس شخص سے رنج پہنچا ہو تو ''حقد'' کا مادہ ہے، مگر ''مادہ'' پر مواخذہ نہیں، اگر اس کے مقتضیٰ پر عمل کیا جائے تو مواخذہ ہے اور عمل اختیاری ہے، اس سے بچنا اختیاری ہے، لیکن مادہ کو مضمحل کرنا ضروری ہے تاکہ بڑھ نہ جائے، اس کی تدبیر یہی ہے کہ شرمندہ ہوں اور حق تعالیٰ سے توبہ کریں اور دعا کریں کہ اس کو (اللہ تعالیٰ) دفع کریں اور اس شخص کی اعانت کریں، خواہ مال سے، یا بدن سے یا دعا سے، اس سے وہ ''مادہ'' کالعدم ہو جائے گا''(۱)

اس خط میں حضرت والا نے ''حسد'' اور ''حِقد'' میں فرق بیان فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا کہ ''اگر کسی کے نقصان کی خبر سننے سے دل خوش ہو'' مثلاً کسی کے گھر میں چوری ہو گئی یا ڈاکہ پڑ گیا تو اب دل خوش ہوا کہ اچھا ہوا اس کے پیسے کم ہو گئے، یا مثلاً کسی کو تجارت میں نقصان ہو گیا تو دل خوش ہوا کہ چلو اچھا ہوا، یہ بہت اکڑ رہا تھا تو یہ زوالِ نعمت پر خوش ہونا، یہ بھی حسد کا ایک حصہ ہے، اگر اس طرح دل خوش ہو تو یہ ''حسد'' ہے۔

یہ کینہ ہے

اور اگر کسی شخص سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی اور اس تکلیف پہنچنے کے نتیجے میں دل میں اس شخص کی نفرت پیدا ہو گئی، اور اس نفرت کی وجہ سے اس کو صدمہ پہنچنے سے تمہیں خوشی ہوتی ہے، اس کو تکلیف پہنچنے سے تمہیں راحت حاصل ہوتی ہے، تو یہ صورت ''حقد'' کہلائے گی۔ گویا کہ تمہارے دل میں ''کینہ'' ہے، کیونکہ ''کینہ'' کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نے تمہیں تکلیف پہنچائی، اس کے نتیجے میں تمہارے دل میں اس سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوا، لیکن دل میں جس طرح کا انتقام لینے کی خواہش تھی، ویسا انتقام تم نہ لے سکے اور اس کے نتیجے میں تمہارے دل میں گھٹن پیدا ہو گئی، اور اس گھٹن نے اس آدمی کی نفرت تمہارے دل میں پیدا کر دی، اور اب اس کی برائی اور تکلیف سے دل میں خوشی کا جذبہ پیدا ہو گیا اور اس کی بدخواہی دل میں پیدا ہو گئی، اس کا نام ''کینہ'' ہے۔ اسی کا بیان آگے انشاء اللہ تعالیٰ مستقل آئے گا۔ بہرحال! حضرت والا یہاں پر ''حسد'' اور ''کینہ'' کے درمیان فرق بیان فرما رہے

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۴

ہیں کہ اگر صرف یہ بات ہو کہ اس کی برائی سے خوشی ہو تو یہ حسد ہے اور اگر اس شخص سے رنج پہنچا ہے، اور اس کے نتیجے میں یہ صورت پیدا ہوئی ہو تو یہ ''حقد'' اور ''کینہ'' ہے۔

مادہ کو کمزور کرنا ضروری ہے

آگے حضرت والا فرمارہے ہیں کہ ''مگر مادہ پر مواخذہ نہیں''

یعنی دل میں جو غیر اختیاری خیال پیدا ہوا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت نہیں، اگر اس کے مقتضیٰ پر عمل کیا جائے تو مواخذہ ہے۔ یعنی دل میں حسد کا خیال آنے کے بعد کوئی ایسا بدخواہی کا عمل کرنا جس سے اس کو تکلیف پہنچے، اس کو رنج اور صدمہ پہنچے تو اس پر مؤاخذہ ہے۔ اور عمل اختیاری ہے اور اس سے بچنا بھی اختیاری ہے لیکن مادہ کو مضمحل کرنا ضروری ہے تاکہ بڑھ نہ جائے، یعنی صرف مادہ کا پیدا ہونا گناہ نہیں لیکن اس مادہ کو کمزور کرنا بڑا ضروری ہے تاکہ بڑھے نہیں۔

''اس کی تدبیر یہی ہے کہ شرمندہ ہو اور حق تعالیٰ سے توبہ کرے، اور اللہ تعالیٰ سے اس کے دفع ہونے کی دعا کرے اور اس شخص کی اعانت کرے خواہ مال سے یا بدن سے یا دعا سے، اس سے وہ مادہ کالعدم ہو جائے گا''

شیطان کی حکایت

اللہ بچائے یہ ''حسد'' بڑی خراب چیز ہے، خاص طور پر ہمارے اہل علم کے طبقے میں زیادہ پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ علم ایسی چیز ہے کہ اس کے اندر ترفع کی شان ہے، اس وجہ سے دوسرے شخص کو علم میں آگے بڑھتا ہوا اور ترقی کرتا ہوا دیکھ کر اور اس کی مقبولیت دیکھ کر بعض اوقات اس کی طرف سے دل میں حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک شخص نے خواب میں شیطان کو ایک بنجارے کی شکل میں دیکھا۔ ''بنجارہ'' اس کو کہتے ہیں جو اپنا سامانِ تجارت ایک گٹھڑی میں باندھ کر اور اپنے کندھے پر لاد کر گاؤں گاؤں محلے محلے اس سامان کو بیچتا پھرتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم ہے جس میں وہ یہ کہتا ہے کہ

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

بہرحال! خواب میں دیکھا کہ شیطان ایک بنجارے کی طرح بہت ساری گٹھڑیاں اپنے کندھے پر لادے جارہا ہے، وہ گٹھڑیاں بھی عجیب و غریب تھیں، کسی گٹھڑی میں پاخانہ بھرا ہوا ہے، کسی گٹھڑی میں پیشاب بھرا ہوا ہے، کسی گٹھڑی میں پیپ وغیرہ، ساری دنیا کی نجاستیں اس کے پاس موجود تھیں اور ہر گٹھڑی پر کچھ نہ کچھ لکھا ہوا ہے، کسی پر لکھا ہے ''حسد'' کسی پر ''کینہ'' کسی پر ''حبِ مال''

کسی پر "حبِ جاہ" وغیرہ۔

کسی شخص نے شیطان سے پوچھا کہ تم یہ لے کر کہاں جارہے ہو؟ شیطان نے کہا کہ یہ سامانِ تجارت ہے، اس کو بیچنے جارہا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ یہ سب گندگی ہے، یہ کون تیرے سے خریدے گا؟ شیطان نے کہا کہ مجھے اپنے مال کی منڈیاں معلوم ہیں کہ کس منڈی میں میرا مال فروخت ہوگا، یہ "حبِ مال" تاجروں کے علاقے میں لے جاکر فروخت کروں گا، وہ مجھ سے یہ مال خرید لیں گے، یہ "حبِ جاہ" اور "حسد" اس کی منڈیاں علماء ہیں، جب علماء کے پاس لے جاؤں گا تو وہ اس کو ہاتھوں ہاتھ خرید لیں گے۔ العیاذ باللہ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

علم سے حبِ جاہ اور حسد پیدا ہوجاتا ہے

بہرحال! اگر علم کے ساتھ اخلاص نہ ہو تو اس علم کے نتیجے میں "حبِ جاہ" پیدا ہوتی ہے اور حبِ جاہ" کے نتیجے میں "حسد" پیدا ہوجاتا ہے، کیونکہ جب دوسرے کو علم کے اندر آگے بڑھتا ہوا دیکھے گا تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ یہ مجھ سے کیوں آگے بڑھ گیا؟ اس کی شہرت کیوں زیادہ ہوگئی؟ اس کی طرف لوگوں کا رجوع کیوں زیادہ ہونے لگا؟ اگر علم کے ساتھ اخلاص ہو کہ وہ علم اللہ تعالیٰ کے لئے ہو تو پھر "حسد" اور "حبِ جاہ" پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا، بلکہ کوئی دوسرا علم کے اندر آگے بڑھ جائے گا تو خوشی پیدا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے اخلاص عطا فرمائے۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اخلاص

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ یہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق تھے اور دونوں کو آپس میں ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی اور اس درجے کی محبت تھی کہ حضرت والد صاحب کی ہر کتاب کے دو نسخے رکھا کرتے تھے، اور چونکہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی تھا، اس لئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب کا جو نام رکھتے تھے، وہ بھی اپنی کتاب کا وہی نام رکھتے تھے، چنانچہ والد صاحب نے قرآن کریم کی تفسیر لکھی اور اس کا نام "معارف القرآن" رکھا، انہوں نے بھی قرآن کریم کی تفسیر لکھی اور اس کا نام بھی "معارف القرآن" رکھ دیا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب "دعاوی مرزا" کے نام سے لکھی، انہوں نے بھی ایک کتاب "دعاوی مرزا" کے نام سے لکھی، کئی کتابیں ایک ہی نام کی لکھیں۔

حسد کی وجہ سے تعلقات کی خرابی

لاہور میں قیام تھا، ایک مرتبہ میں لاہور گیا اور ان سے ملاقات کے لئے پہنچا تو مجھ سے فرمایا کہ "مولوی شفیع" سے میرا اسلام کہو"

لفظ "مولوی" سے آگے مولانا کا لفظ کبھی نہیں بولتے تھے، پھر فرمانے لگے کہ مولوی شفیع سے ہمارا باون سال کا تعلق ہے اور الحمدللہ اس باون سالہ تعلق کے دوران کبھی دل میں ایک دوسرے کے خلاف بال بھی نہیں آیا۔ پھر فرمانے لگے کہ یہ بتاؤں کہ ایک دوسرے کے خلاف بال بھی کیوں نہیں آیا؟ فرمایا کہ بال اس لئے نہیں آیا کہ مولویوں کے درمیاں جو تعلقات خراب ہوتے ہیں، اس کی وجہ "حسد" ہوتی ہے کہ فلاں ہم سے آگے کیوں نکل گیا؟ اس حسد کی وجہ سے کدورتیں پیدا ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے میں تعلقات خراب ہوتے ہیں، الحمدللہ! میرا مولوی شفیع سے اس قسم کا حسد کبھی ہوا ہی نہیں۔

بے مثال دوستی کا نمونہ

پھر فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤں کہ ہمارے درمیان "حسد" کیوں نہیں ہوا؟ میں نے کہا: بتادیں۔ فرمایا کہ تم نے "کافیہ" پڑھا؟ میں نے کہا: جی ہاں! پڑھا۔ فرمایا کہ اس میں توابع کا بیان آتا ہے، وہ تم نے پڑھا؟ میں نے کہا: جی ہاں! پڑھا۔ فرمایا کہ اس توابع میں ایک نعت ہوتی ہے، وہ پڑھی؟ میں نے کہا کہ جی ہاں! پڑھی۔ فرمایا کہ نعت کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک متبوع کی نعت اور ایک متعلق متبوع کی نعت، مثلاً اگر "زیدن العالم" کہو تو "عالم" زید کی نعت اور اس کی صفت ہے، اور کبھی متعلق متبوع کی نعت ہوتی ہے، جیسے "زیدن العالم غلامہ" اس میں "عالم" اگرچہ اصلاً غلام کی نعت ہے، لیکن جب ترکیب کروگے تو یوں کہوگے "زید" موصوف "العالم غلامہ" صفت، حالانکہ "العالم" زید کی صفت نہیں ہے بلکہ اس کے متعلق یعنی غلام کی صفت ہے، مگر پھر بھی ترکیب میں اس کو "زید" ہی کی صفت کہا جاتا ہے۔

یہ ساری تفصیل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ مولوی صاحب! جب مولوی شفیع کا کوئی علمی کارنامہ میرے سامنے آوے تو میں یوں سمجھوں کہ میں "زیدن العالم اخوہ" کی قبیل سے ہوں اور جو تصنیف انہوں نے کی ہے، وہ حقیقت میں تو ان کی ہے لیکن ان کے واسطے سے میری بھی ہے، اس وجہ سے ہمارے درمیان طویل عرصے کی دوستی کے باوجود کبھی دل میں حسد پیدا نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ یہ جذبہ ہم سب کو عطا فرمادے۔

علم کے ساتھ اخلاص اور خادمیت کا جذبہ

لہٰذا علم کے اندر اخلاص ہونا چاہئے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے علم حاصل کرنا چاہئے، یہ علم اس لئے نہیں ہے کہ اس کے ذریعے دوسروں پر فضیلت جتائی جائے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب کیا خوبصورت بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ کیا یہ علم اللہ تعالیٰ نے دوسروں پر جتلانے کے لئے دیا ہے؟ ارے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک نعمت دی ہے، اس نعمت کو صحیح مصرف پر استعمال کرو، اس علم کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اس علم کے ذریعہ دوسروں کو نفع پہنچاؤ اور اس کے ذریعہ دوسروں کی خدمت کرو، تم خادم ہو اور دوسری مخلوق مخدوم ہے، علم کے ساتھ یہی خدمت کا جذبہ انسان کے اندر پیدا ہونا چاہئے، نہ یہ کہ اس کے ذریعہ دوسروں پر اپنی فضیلت جتائی جائے۔

پھر حسد پیدا نہیں ہوگا

اور جب یہ اخلاص پیدا ہو جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کوئی دوسرا شخص علم کے اندر تم سے آگے بڑھتا نظر آئے گا اور اس کے ذریعہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا نظر آئے گا تو تم یہی سمجھو گے کہ میرا ہی مقصد حاصل ہو رہا ہے، لہٰذا اس پر خوش ہونا چاہئے، نہ یہ کہ اس پر رنجیدہ ہوں۔

شہرت خراب چیز ہے

یہ ''شہرت اور حبِ جاہ اور مقبولیت'' دین کے اعتبار سے تو یہ خراب چیز ہے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی راحت کے اعتبار سے بھی بڑی خراب چیز ہے، اس کے نتیجے میں آدمی کسی کام کا نہیں رہتا، آدمی ایسی فضول چیز کو حاصل کرنے کی طرف کیوں توجہ کرے اور اس کی وجہ سے دوسروں سے کیوں حسد کرے۔ ارے بھائی! اگر لوگ تمہارے مقابلے میں دوسروں کی طرف زیادہ متوجہ ہو رہے ہیں تو تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تمہارا کام آدھے سے زیادہ دوسرا انجام دے رہا ہے، اس لئے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، نہ یہ کہ اس سے حسد کرنے بیٹھ جاؤ۔

خلاصہ: بہر حال! اگر دل میں یہ اخلاص رہے تو پھر حسد کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور اس حسد سے بچنے کا بڑا ذریعہ یہ ہے کہ ہر عمل میں اخلاص پیدا کرو، جوں جوں اخلاص پیدا ہوگا، انشاء اللہ یہ حسد زائل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

کینہ اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِیْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

گزشتہ دو روز سے ''حسد'' کا بیان چل رہا تھا، جو الحمدللہ مکمل ہو گیا۔ آگے حضرت والا ایک اور باطنی بیماری حِقد یعنی کینہ کا بیان شروع فرما رہے ہیں۔

یہ ''کینہ'' بھی انسان کے دل کی ایک بہت بڑی بیماری ہے، یہ اتنی بڑی بیماری ہے کہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''شبِ براءت میں اللہ تعالیٰ بے شمار انسانوں کی مغفرت فرماتے ہیں اور قبیلہ بنی کلب کی بکریوں کے جسم پر جتنے بال ہیں، ان بالوں کی مقدار کے برابر انسانوں کی مغفرت فرماتے ہیں''

''قبیلہ بنی کلب'' بہت بڑا قبیلہ تھا جو ہزار ہا افراد پر مشتمل تھا اور ہر شخص کے پاس بکریوں کے ریوڑ تھے، ان کی بکریاں بھی ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہوں گی، آپ نے فرمایا کہ اس قبیلے کی بکریوں کے جسم پر جتنے بال ہیں، اتنے انسانوں کی مغفرت اللہ تعالیٰ اس رات میں فرماتے ہیں لیکن دو آدمیوں کی مغفرت نہیں فرماتے۔ (۱)

پاجامہ نیچے لٹکانے والا

دیکھئے! رحمت کا دروازہ اس رات میں کھلا ہوا ہے، رحمت کے پروانے تقسیم ہو رہے ہیں، لیکن اس رات میں دو آدمیوں کی مغفرت نہیں ہوتی، ایک وہ شخص جس کی شلوار یا پاجامہ یا تہبند ٹخنوں سے نیچے لٹکا ہوا ہو۔ العیاذ باللہ۔ کیونکہ یہ تکبر کی علامت ہے اور جو آدمی اس رات میں بھی تکبر سے باز نہ آئے، اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنے اور گڑگڑانے کے بجائے تکبر کا کام کرے تو اللہ تعالیٰ

☆ اصلاحی مجالس (۴/۱۶۶ تا ۱۸۶)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ما جاء في ليلة النصف من شعبان، رقم: ۱۳۸۰، مسند أحمد، رقم: ٦٣٥٣

فرماتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ہماری مغفرت کی ضرورت نہیں، اس لئے ہم اس کی مغفرت نہیں کرتے۔

کینہ رکھنے والے سے اللہ کی ناراضگی

دوسرا وہ شخص جس کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہو، بغض ہو، اللہ تعالیٰ اس کی بھی مغفرت نہیں فرماتے، چاہے وہ نمازیں پڑھ رہا ہو، چاہے وہ سجدے کر رہا ہو، چاہے وہ روزے رکھ رہا ہو یا رات کو جاگ رہا ہو، شبِ برأت اور شبِ قدر میں بھی اس کی مغفرت نہیں ہوتی۔ یہ کینہ اور بغض اتنی خراب چیز ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے خزانے لٹ رہے ہیں، اس وقت بھی یہ شخص محروم ہے جس کے دل میں کینہ ہے، اس لئے اس سے ڈرنا چاہئے اور اس کی فکر کرنی چاہئے کہ کسی مسلمان کی طرف سے دل میں کینہ نہ ہو۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ۔

کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن
آئین ما است سینہ چوں آئینہ داشتن

ہمارے طریقے میں دوسرے مسلمان کی طرف سے دل میں کینہ رکھنا کفر ہے، اور ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہمارا سینہ آئینہ کی طرح صاف شفاف ہو، اس میں کسی دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ نہ ہو۔

''کینہ'' کسے کہتے ہیں؟

''کینہ'' کیا ہے؟ اس کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''کینہ'' وہ ہے جو اختیار وقصد سے کسی کی برائی اور بدخواہی دل میں رکھی جائے اور اس کو ایذاء پہنچانے کی تدبیر بھی کرے''(۱)

اپنے اختیار سے کسی شخص کی بدخواہی دل میں پال لی اور اس کی تدبیر بھی کر رہا ہے کہ اس کو تکلیف پہنچے، اس کا نقصان ہو اور اس کے درپے آزار ہو جائے۔ اس کو ''کینہ'' کہا جاتا ہے۔

کینہ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

یہ ''کینہ'' اکثر اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص سے آپ کو کوئی رنج یا کوئی تکلیف پہنچی، اس رنج اور تکلیف پہنچنے کے نتیجے میں آپ کو اس پر غصہ آیا اور دل چاہ رہا ہے کہ میں بھی اس کو کوئی رنج اور تکلیف پہنچاؤں، لیکن جس شخص نے آپ کو تکلیف پہنچائی ہے وہ ایسا آدمی ہے کہ تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۴

سکتے، کیونکہ وہ یا تو عمر میں تم سے بڑا ہے یا مرتبے میں تم سے بڑا ہے اور تمہارا اس کے اوپر بس نہیں چلتا، اور بس نہ چلنے کی وجہ سے تم اس سے انتقام نہیں لے سکتے اور تمہارے پاس انتقام لینے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ لہٰذا ایک طرف تو غصہ آ رہا ہے اور طبیعت میں اس کے خلاف اوٹن ہو رہی ہے اور اس کے خلاف دل میں جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور دوسری طرف ان جذبات کے نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دل کے اندر گھٹن پیدا ہو رہی ہے، وہ گھٹن انسان کے اندر ''کینہ'' پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ وہ سوچتا ہے کہ اس وقت تو مجھے بدلہ لینے کا موقع نہیں ہے، لیکن جب کبھی موقع ملا تو میں اس کو چھوڑوں گا نہیں، یہ کینہ ہے۔

یہ خیال گناہ نہیں

اور اگر دل میں اتنا خیال ہو کہ جب مجھے موقع ملے گا تو جتنی تکلیف اس نے پہنچائی تھی، میں بھی اتنی تکلیف پہنچا دوں گا، تو یہ گناہ کی بات نہیں، کیونکہ شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ اگر کسی دوسرے شخص نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے تو تم بھی اس کو اتنی ہی تکلیف پہنچا سکتے ہو۔

غصہ میں انسان حد پر نہیں رہتا

لیکن یہ غصہ اور یہ گھٹن انسان کے دل میں یہ جذبہ پیدا کر دیتی ہے کہ اگر میرا قابو چل گیا تو اس نے جتنی تکلیف مجھے پہنچائی ہے، اس سے دس گنی تکلیف میں اس کو پہنچاؤں گا، کیونکہ جو آدمی حدود کا پابند نہیں ہوتا، وہ کبھی حد پر نہیں رہتا۔ جو لوگ آپس میں گالی گلوچ کرتے ہیں، ان کا طریقہ یہ ہے کہ جب ایک نے یہ گالی دی کہ تو احمق اور بیوقوف ہے تو دوسرا جواب میں فوراً یہ کہے گا کہ تو بیوقوف، تیرا باپ بیوقوف، تیرا دادا بیوقوف، وہ کبھی ایک پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ باپ دادا تک پہنچ جائے گا۔ جس شخص کے اخلاق کا تزکیہ نہ ہوا ہو، وہ کبھی حد پر قائم نہیں رہتا۔ جیسا کہ عربی کا مقولہ ہے:

''اَلْجَاھِلُ اِمَّا مُفْرِطٌ اَوْ مُفَرِّطٌ''

جاہل کا جذبہ صرف ایک مرتبہ ''بیوقوف'' کہہ دینے سے ٹھنڈا نہیں ہوتا بلکہ اور آگے بڑھتا ہے۔ اسی طرح جب دوسرے کو تکلیف پہنچانے کا موقع آجائے تو اس میں حد پر نہیں رہے گا، مثلاً کسی نے اس کو ایک ہاتھ مارا تو وہ جواب میں دو ہاتھ مار دے گا۔

انتقام لینے کا جذبہ کینہ ہے

لہٰذا جب آگے بڑھنے کا جذبہ موجود ہے تو وہ دل میں یہ ٹھانے ہوئے ہے کہ جب کبھی انتقام

کا موقع ملے گا تو اس کو چھوڑوں گا نہیں، یہ بدخواہی جو دل میں پیدا ہو رہی ہے، اسی کا نام ''کینہ'' اور ''بغض'' ہے، اس ''کینہ'' کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاں اس کو تکلیف پہنچانے کا موقع ہوگا تو اس کو تکلیف پہنچا دے گا، جہاں بدنام کرنے کا موقع آئے گا وہاں بدنام کر دے گا، جہاں اس کی غیبت کرنے کا موقع ملے گا، تو اس کی غیبت کر دے گا، جہاں زبان سے اس کی دل آزاری کا موقع ملے گا تو زبان سے دل آزاری کرے گا، طنز و طعنہ کے تیر اس کے اوپر برسائے گا، ان سب کاموں کا سبب بغض اور کینہ ہے، اس کینہ اور بغض کا ازالہ ضروری ہے۔

انسان کے پاس ترازو نہیں

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حق دیا ہے کہ جس شخص نے آپ کو جان بوجھ کر تکلیف پہنچائی ہے تو آپ اس سے انتقام لے سکتے ہیں، مگر اتنا ہی انتقام لے سکتے ہیں جتنی تکلیف اس نے پہنچائی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ یہ حد مقرر ہے، اس سے آگے بڑھنا جائز نہیں، لیکن یہ کیسے پتہ چلے کہ کس موقع پر انسان سرحد پار کر گیا؟ اس لئے کہ انسان کے اپنے پاس ایسا کوئی ترازو نہیں ہے جس سے وہ یہ پتہ چلائے کہ میں کس موقع پر حد پر قائم رہا اور کس موقع پر حد سے آگے بڑھ گیا، کہاں میں نفسانی جذبے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے انتقام لے رہا ہوں اور کہاں میں اللہ کے لئے بدلہ لے رہا ہوں، اس کا پتہ نہیں چلتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سبق آموز واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی نے ان کے سامنے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہہ دیا۔ العیاذ باللہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہاں برداشت کرنے والے تھے، انہوں نے اس کو پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو گئے، جب یہودی نے دیکھا کہ اب بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس نے نیچے پڑے پڑے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھوک دیا، جب یہودی نے تھوکا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو چھوڑ کر کھڑے ہو گئے، لوگوں نے کہا کہ اب تو اور زیادہ سزا دیئے جانے کے لائق تھا اور آپ نے اس کو چھوڑ دیا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب تک تو میں اس سے اس لئے لڑ رہا تھا کہ اس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی، لہٰذا میری اس کے ساتھ جو لڑائی تھی، وہ اپنی ذات کے لئے نہیں تھی بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھی، لیکن جب اس نے میرے منہ پر تھوک دیا تو مجھے غصہ آیا اور اس سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوا، لہٰذا اب اگر میں اس سے انتقام لیتا تو اپنی ذات کے لئے انتقام لیتا اور اپنی ذات کے لئے میں انتقام لینا نہیں چاہتا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تزکیہ شدہ تھے

یہ تھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "یُزَکِّیْھِمْ" یعنی اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے تزکیہ کے لئے بھیجا تھا۔ چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ایسا تزکیہ کیا جیسا کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں دیکھا۔

بہرحال! آدمی جب دوسرے سے انتقام لیتا ہے تو عام طور پر حد پر نہیں رہتا بلکہ حد سے آگے بڑھ جاتا ہے، اور اگر انتقام نہ لے سکا تو اس کے نتیجے میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ آمین۔ یہ کینہ بڑی خطرناک بیماری ہے۔

"کینہ" کا علاج

اس کا علاج بھی وہی ہے جو حسد کا علاج ہے یعنی اپنے نفس پر جبر کر کے لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرو اور اس کے حق میں دعاءِ خیر کرو کہ یا اللہ! دنیا و آخرت میں اس کے درجات بلند فرما، یا اللہ یہ شخص جس کی طرف سے میرے دل میں برائی کے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں، اس کو دنیا میں بھی ترقی عطا فرما اور آخرت میں بھی ترقی عطا فرما۔ اس طرح کرنے کے نتیجے میں سینے پر سانپ لوٹ جائیں گے، کیونکہ دل میں اس کی طرف سے کینہ، بغض اور بدخواہی ہے اور دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ اس کا منہ نوچ ڈالوں، لیکن زبان سے اس کی تعریف کر رہے ہو اور اس کے لئے دعا کر رہے ہو کہ یا اللہ! اس کے درجات بلند فرما۔ لیکن اس بیماری کا علاج بھی یہ ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ۝﴾(۱)

یعنی یہ کام وہی کر سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو صبر کا عادی بنایا ہو اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جو بڑا صاحبِ نصیب ہو۔ اس کے ذریعہ خوشخبری دے دی کہ جو شخص یہ کام کرے گا وہ بڑا صاحبِ نصیب ہوگا۔

جنت کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے

بھائی! جنت اس قدر سستی نہیں ہے، اس کے لئے تھوڑی سی قربانی دینی پڑتی ہے۔ بعض اوقات جان کی قربانی دینی پڑتی ہے، بعض اوقات مال کی قربانی دینی پڑتی ہے اور بعض اوقات جذبات

(۱) حٰمٓ السجدۃ: ۳۵، آیت مبارک کا ترجمہ یہ ہے: "اور یہ بات صرف انہی کو عطا ہوتی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں، اور یہ بات اسی کو عطا ہوتی ہے جو بڑے نصیبے والا ہو"

کی قربانی دینی پڑتی ہے اور جذبات کی قربانی بعض اوقات جان و مال کی قربانی سے زیادہ سخت ہوتی ہے، لیکن یہ جذبات کی قربانی اللہ تعالیٰ کے لئے دینی پڑتی ہے، بقول کسی کے۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لہٰذا جس آدمی کی طرف سے دل میں نفرت پیدا ہو رہی تھی، اسی کے حق میں دعا کی اور جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھتے ہیں کہ میرے بندے نے میری خاطر یہ کام کیا، اس نے میری خاطر اپنی نفسانی خواہشات کو کچلا، اپنے جذبات کو قربان کیا اور اپنے دل کی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کیا تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو بلند مقامات تک پہنچا دیتے ہیں۔

اس کے اندر اچھائی تلاش کرو

بہر حال! پہلا کام یہ کرو کہ تمہارے دل میں اس کی طرف سے جو برائی آرہی ہے، اس کو برا سمجھو کہ میرے دل میں جو بات آرہی ہے، وہ اچھی نہیں ہے، ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اور اس برے خیال کو دور کرنے کا ایک طریقہ حضور اقدس ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا:

((لَایَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ))(۱)

یعنی کوئی مؤمن مرد کسی مؤمنہ عورت کے ساتھ بغض نہ رکھے۔ دراصل یہ میاں بیوی کے تعلقات کے بارے میں ارشاد ہے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی سے بغض نہ رکھے، کیونکہ اگر اس کی کوئی بات ناپسندیدہ ہے تو اس کی کوئی بات پسندیدہ بھی ہوگی۔

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے بغض دور کرنے کا طریقہ بتا دیا کہ جس شخص کی طرف سے دل میں بغض پیدا ہو رہا ہے، اس کی اچھائیوں کی طرف نگاہ کرو اور اس کی اچھائیاں سوچ سوچ کر یاد کرو، یعنی یہ سوچو کہ میرے دل میں اس کی طرف سے جو بغض پیدا ہو رہا ہے، وہ اس کے فلاں وصف کی وجہ سے ہو رہا ہے، لیکن اس کے اندر صرف یہی ایک وصف نہیں ہے بلکہ اس کے اندر تو اور بہت سے اچھے اوصاف بھی ہیں، پھر ان اچھے اوصاف کو یاد کرو، اس کے نتیجے میں اس بغض میں کمی آجائے گی۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

یاد رکھئے! دنیا میں کوئی بھی آدمی ایسا نہیں ہے جس کے اندر کوئی نہ کوئی اچھائی نہ ہو، اللہ تعالیٰ

(۱) صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء، رقم: ۲۶۷۲، مسند أحمد، رقم: ۸۰۱۳

نے اس دنیا میں جو چیزیں بنائی ہیں، ان میں نہ کوئی سراپا سیاہ ہے اور نہ کوئی سراپا سفید ہے بلکہ ہر ایک میں کچھ عیوب بھی ہیں اور کچھ اچھائیاں بھی ہیں، کائنات میں یہی نظام چل رہا ہے۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

لہٰذا ایک کام یہ کرو کہ جن عیوب کی وجہ سے تمہارے دل میں کسی کی طرف سے بغض اور کینہ پیدا ہوا ہے، ان عیوب کو تھوڑی دیر کے لئے فراموش کردو اور ان اچھائیوں کی طرف نگاہ کرو جو اس کے اندر موجود ہیں۔

کینہ سے متعلق وعیدوں کی طرف نظر کرو

دوسرا کام یہ کرو کہ اس بغض اور کینہ رکھنے پر قرآن وحدیث میں جو وعیدیں آئی ہیں، مثلاً یہ کہ شب برأت میں بھی اس شخص کی مغفرت نہیں ہوگی جس کے دل میں دوسرے کی طرف سے بغض اور کینہ ہوگا، وغیرہ، ان وعیدوں کی طرف نظر کرو۔ پھر عمل میں اس بات کا اہتمام کرو کہ اس شخص کے خلاف کوئی کلمہ زبان سے نہ نکلے اور کوئی قدم عملاً اس کے خلاف نہ اُٹھے اور اس کے حق میں دعاء خیر کرو اور لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرو۔

یہ بات بغض میں داخل نہیں

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ بعض اوقات دل میں دوسرے کی طرف سے بغض اور کینہ نہیں ہوتا لیکن لوگ اس کو بغض سمجھ لیتے ہیں، بات یہ ہے کہ "بغض" اس وقت متحقق ہوتا ہے جب انسان دوسرے کی بدخواہی پر کمربستہ ہو جائے اور جان بوجھ کر اس کو تکلیف پہنچانے کی فکر میں لگ جائے اور تکلیف بھی پہنچائے، تب تو اس کو "بغض" کہیں گے۔ لیکن اگر صرف یہ بات ہے کہ اس آدمی سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے اور اس سے طبیعت نہیں ملتی ہے اور اس کے گھر ملاقات کرنے کے لئے جانے کو دل نہیں چاہتا تو یہ "بغض" نہیں بلکہ یہ طبیعت کا نہ ملنا ہے اور عدم مناسبت ہے۔ لہٰذا اگر کسی سے ملنے کو دل نہیں چاہتا تو نہ ملو، البتہ اس کے جو حقوق واجب ہیں، وہ ادا کرتے رہو، مثلاً جب سلام کرنے کا موقع آئے تو اس کو سلام کرو، وہ اگر سلام کرے تو اس کا جواب دو، اگر بیمار ہو جائے تو اس کی بیمار پرسی کرلو، اگر اس کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو جاؤ، اگر اس کے یہاں کوئی شادی یا غمی ہو تو اس میں شریک ہو جاؤ، بس، یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس سے میل جول رکھا جائے اور صبح شام اس کے ساتھ مجلسیں جمائی جائیں اور ہنسی مذاق کیا جائے، یہ سب فضول باتیں ہیں، ان کی

کوئی ضرورت نہیں، لیکن یہ بات ضروری ہے کہ اس کی بدخواہی نہ ہو۔

انقباضِ طبعی کینہ نہیں

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں بیان فرما رہے ہیں:

"اگر کسی سے رنج کی کوئی بات پیش آئے اور طبیعت اس سے ملنے کو نہ چاہے تو یہ کینہ نہیں بلکہ انقباض طبعی ہے جو گناہ نہیں"(۱)

یعنی انسانی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں، مزاج الگ ہوتے ہیں، ایک آدمی کا مزاج دوسرے سے نہیں ملتا تو یہ کوئی فرض نہیں کہ دوسرے سے ضرور ملا جائے، اس لئے یہ بغض اور کینہ نہیں۔

دوسرے کے نقصان سے دل میں فرحت

دیکھئے! جو لوگ اپنے شیخ سے اصلاح کراتے ہیں، وہ لوگ اپنے حالات اپنے شیخ کو لکھتے رہتے ہیں کہ میرے ساتھ اس قسم کی بات پیش آرہی ہے، یہ کوئی بیماری ہے یا نہیں؟ اگر یہ بیماری ہے تو اس کا علاج کیا ہے؟ شیخ سے یہی باتیں معلوم کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا:

"اپنے مخالف کو کوئی نقصان کسی سے پہنچ جاتا ہے تو قلب میں ایک فرحت محسوس ہوتی ہے"(۲)

یہ ہے شیخ سے اصلاح کرانے کا طریقہ کہ جو حالات دل پر گزر رہے ہیں، ان کی اطلاع شیخ کو کی جائے، چنانچہ ان صاحب نے یہ محسوس کیا کہ جب میرے مخالف کو کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے، مثلاً اس کے گھر میں آگ لگ گئی یا اس کے گھر میں چوری ہوگئی یا اس کی بدنامی ہوگئی تو اس سے دل میں ایک فرحت اور خوشی محسوس ہوتی ہے، آپ بتائیں کہ یہ فرحت ہونا گناہ ہے یا نہیں؟ اگر یہ گناہ اور بیماری ہے تو اس کا علاج کیا ہے؟

یہ فرحت قابلِ دفع ہے

جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

"عقلاً اور اعتقاداً اس کا استحضار کیا جائے کہ یہ فرحت قابلِ دفع ہے اور دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس فرحت کو دفع فرما دیں"(۳)

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۴　(۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۵　(۳) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۵

حضرت والا کا ایک ایک لفظ ٹکا ہوا ہوتا ہے، فرمایا کہ ایک کام تو یہ کرو کہ تمہیں دوسرے کے نقصان سے جو فرحت ہو رہی ہے، عقلاً اور اعتقاداً اس بات کا دھیان کرو کہ دل میں اس خوشی کا پیدا ہونا اچھی بات نہیں بلکہ بری بات ہے۔ ''عقلاً'' اور اعتقاداً'' کے الفاظ اس لئے بیان فرمائے کہ ''طبعاً'' جو خوشی ہو رہی ہے وہ غیر اختیاری ہے، وہ انسان کے اختیار میں نہیں، اور غیر اختیاری پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مؤاخذہ نہیں، لیکن عقلی اور اعتقادی طور پر یہ سمجھے اور اس کا دھیان کرے کہ مجھے یہ جو خوشی ہو رہی ہے، یہ بہت بری ہے، مجھے یہ خوشی نہیں ہونی چاہئے، یہ خوشی قابلِ دفع ہے، اس کو ختم ہو جانا چاہئے۔ دوسرا کام یہ کرو کہ دعا کرو کہ یا اللہ تعالیٰ! یہ خوشی بری بات ہے، سچی بات یہ ہے کہ مجھے یہ خوشی ہونی نہیں چاہئے تھی، لیکن اے اللہ! میرے قابو سے باہر ہے، اپنی رحمت سے میری یہ خوشی دور فرما دے۔

غیر اختیاری خیال گناہ نہیں لیکن برا ہے

دیکھئے! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمہارے دل میں یہ جو خوشی پیدا ہو رہی ہے، یہ بہت بڑا گناہ ہے، کیونکہ غیر اختیاری طور پر انسان کے دل میں جو خیال آ جاتا ہے، وہ گناہ نہیں ہوتا، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہ اختیار سے باہر ہے، لیکن اگر اس نے اس خیال کو دل میں جما لیا اور بٹھا لیا اور اس کے بارے میں یہ تصور نہ کیا کہ یہ گناہ ہے اور یہ خیال دل میں بیٹھ کر کینہ میں تبدیل ہو جائے گا اور اس کے نتیجے میں تم سے گناہ سرزد ہو جائیں گے، پھر غیبت ہوگی، دل آزاری ہوگی اور بدگوئی ہوگی۔ لہٰذا اس خیال کا علاج یہ کرو کہ دل سے اس کو برا سمجھو کہ یہ خیال جو میرے دل میں آ رہا ہے، یہ بہت برا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! میرے دل سے یہ خیال نکال دیجئے۔ یہ دو کام تو فوراً کر لو اور اس بات کا اہتمام کر لو کہ اس خیال کے نتیجے میں اس کے خلاف کوئی عمل نہ ہو۔

تکلیف پہنچنے کو اپنی بدعملی کا نتیجہ سمجھنا

ایک صاحب نے حضرت کو خط میں لکھا کہ

''آرزو ہے کہ مخالف کی مخالفت کو اپنی حرکات ناشائستہ و اعمال سیئہ کا نتیجہ سمجھوں''۔(۱)

کینہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مخالف کوئی تکلیف پہنچائے، اس لئے وہ صاحب یہ لکھتے ہیں کہ میرا

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص ۱۷۵

دل یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری طبیعت ایسی بنادے کہ جب بھی کسی شخص سے کوئی تکلیف پہنچے تو میرے دل میں اس کے خلاف جذبات پیدا ہونے کے بجائے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ میاں! دنیا میں جو تکلیف کسی انسان کو پہنچتی ہے، وہ اس کی بدعملی کی وجہ سے پہنچتی ہے، کیونکہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾(۱)

یعنی جو تکلیف اور مصیبت تمہیں پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے پہنچتی ہے۔ جب یہ بات ہے تو اب اگر دوسرا شخص مجھے برا بھلا کہہ رہا ہے یا دوسرا شخص مجھے تکلیف پہنچا رہا ہے تو درحقیقت وہ تکلیف بھی میری کسی بدعملی کی وجہ سے پہنچی ہے، اگر میں براعمل نہ کرتا تو یہ آدمی مجھے یہ تکلیف نہ پہنچاتا، چاہے وہ تکلیف کسی انسان سے پہنچے یا کسی جانور سے پہنچے یا زید عمرو بکر سے پہنچے، وہ تکلیف میرے کسی بدعمل کا نتیجہ ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص مجھے مار رہا ہے تو حقیقت میں وہ مجھے نہیں مار رہا ہے بلکہ میرے کسی برے عمل کی وجہ سے مجھے مارا جا رہا ہے۔

جلاد بادشاہ کے حکم کا تابع ہے

اگر بادشاہ جلاّد کو حکم دے کہ فلاں شخص کو سو کوڑے مارو تو اب بظاہر تو وہ جلاّد مار رہا ہے لیکن حقیقت میں تو بادشاہ کے حکم کی وجہ سے مار رہا ہے۔ لہٰذا جس شخص کو کوڑے مارے جا رہے ہیں، اس کے دل میں یہ بات ہوگی کہ میرا اصل دشمن یہ جلاّد نہیں بلکہ بادشاہ ہے، اس لئے اگر کبھی یہ شخص انتقام لینے کا ارادہ کرے گا تو جلاّد سے انتقام نہیں لے گا، کیونکہ جب بادشاہ نے مارنے کا حکم دے دیا تو اب جلاّد کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ مارنے سے رک جاتا، اس کو تو حکم کے مطابق عمل کرنا تھا، اس کی تو یہ ڈیوٹی تھی۔

"تقدیر" اس سے یہ کروا رہی ہے

لہٰذا اگر دل میں یہ بات آجائے کہ یہ شخص جو مجھے تکلیف پہنچا رہا ہے، اس کی کیا مجال تھی کہ مجھے تکلیف پہنچاتا، یہ تو درحقیقت "تقدیر" اس سے یہ عمل کروا رہی ہے، اور تقدیر اس لئے کروا رہی ہے کہ میں نے کوئی براعمل کیا تھا، اس کی سزا مجھے دنیا میں مل رہی ہے، لہٰذا میں تکلیف پہنچانے والے کو کیوں برا سمجھوں۔ جب یہ بات دل میں ہوگی تو پھر دوسرے کی طرف سے برائی اور کینہ دل میں نہیں آئے گا۔

---

(۱) الشوریٰ: ۳۰

یہ سوچنا اختیاری ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں تحریر فرمایا:

''اس کا استحضار اختیاری ہے، تکرار استحضار سے اس میں رسوخ ہو جائے گا''(۱)

یعنی اس بات کا دل میں دھیان کرتے رہنا کہ مجھے جو کچھ تکلیف پہنچ رہی ہے، وہ میرے برے اعمال کی وجہ سے پہنچ رہی ہے، یہ دھیان کرنا انسان کے اختیار میں ہے اور تکرار استحضار سے اس میں رسوخ ہو جائے گا، یعنی بار بار جب یہ دھیان کرے گا تو رفتہ رفتہ یہ بات دل میں پیوست ہو جائے گی۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ''رسالہ قشیریہ'' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ راستے میں جا رہے تھے، کوئی بیوقوف آپ کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے پیچھے پڑ گیا، اس بیوقوف کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا، وہ اس نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے سر پر مارنا شروع کر دیا، اس وقت حضرت کی زبان پر پہلا جملہ جو آیا، وہ جملہ یہ تھا:

''إِضْرِبْ رَأْسًا طَالَمَا عَصَى اللّٰهَ''(۲)

یعنی اس سر کو مارو، کیونکہ اس سر نے بہت عرصے تک اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے۔ لہٰذا جو مار پڑ رہی تھی، اس کو اپنی بدعملی کی طرف منسوب کیا۔

میں ہی سب سے زیادہ بدعمل ہوں

انہی ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ لوگ ان کے پاس آئے اور آکر کہا کہ حضرت! بارش نہیں ہو رہی ہے، قحط پڑا ہوا ہے، دعا فرما دیں کہ اللہ تعالیٰ اس قحط کو دور فرما دیں۔ جواب میں فرمایا کہ یہ بارش بدعملیوں کی وجہ سے نہیں ہو رہی ہے اور مجھ سے زیادہ بدعمل اس بستی میں کوئی اور نہیں، لہٰذا میں اس بستی سے نکل جاتا ہوں، شاید میرے نکلنے کے بعد اس بستی پر اللہ تعالیٰ کی رحمت آجائے اور بارش ہو جائے۔ اپنے آپ کو بدترین خلائق سمجھ رہے ہیں۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۵

(۲) حلية الأولياء (۳۸۸/۷)، وفيات الأعيان (۳۲/۱)، صفة الصلوة (٤٤٥/١)، الرسالة القشيرية (۷/۱) مذکورہ مراجع میں یہ واقعہ حضرت ذوالنون مصریؒ کے بجائے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کی طرف منسوب ہے۔

یہ سب کام کسی اور کے اشارے پر ہو رہے ہیں

بہر حال! یہ بات صحیح ہے کہ کسی کی مجال نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچائے، نہ کسی انسان کی مجال ہے، نہ کسی جانور کی یہ مجال ہے، نہ کسی جن کی یہ مجال ہے، جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی اور کی طرف سے ہو رہا ہے اور حکمت کی بنیاد پر ہو رہا ہے، چونکہ ہماری اور آپ کی سمجھ میں وہ حکمت نہیں آتی، اس لئے اس نقصان اور تکلیف پر واویلا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

دنیا ہی میں پاک صاف کرنا چاہتے ہیں

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شیر کے پنجرے میں آجائے تو وہ شخص بے اختیار ہوگا، سوائے تسلیم و رضا کے کوئی چارہ کار نہیں ہوگا کہ تجھے کھانا ہے تو کھالے، پھاڑنا ہے تو پھاڑ لے، اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔ اسی طرح ہر انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ اس کائنات میں سب کام مالک الملک والملکوت کی تقدیر سے ہو رہا ہے، اگر کوئی تمہیں پتھر بھی مار رہا ہے تو وہ کسی کی اذن سے مار رہا ہے، کسی کی مشیت سے مار رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ مشیت کیوں ہوئی؟ وہ مشیت اس لئے ہوئی کہ تم نے بد عملی کی تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ تمہیں دنیا ہی میں سزا دے دیں تاکہ آخرت میں عذاب نہ دینا پڑے۔ کیونکہ دو ہی راستے تھے، یا تو آخرت میں جہنم میں ڈالتے یا دنیا ہی میں سزا دے دیتے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تم پر رحمت فرمائی کہ آخرت کے عذاب کے بدلے دنیا میں ہی سزا دے دی تاکہ یہیں حساب کتاب صاف ہو جائے۔

یہ سوچنا کینہ کو ختم کر دے گا

لہٰذا دوسرا شخص تمہیں جو تکلیف پہنچا رہا ہے، یہ کسی کی تقدیر کے تحت ہے، لہٰذا اس آدمی سے بغض اور کینہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے، اگر کینہ رکھنا ہے تو اپنی بداعمالیوں سے کینہ رکھو، اپنی بداعمالیوں سے بغض رکھو جن کی وجہ سے اس کو تمہیں تکلیف پہنچانے کا یہ حوصلہ پیدا ہوا، اگر یہ خیال کرو گے تو پھر انشاء اللہ دل میں کسی دوسرے کی طرف سے بغض اور کینہ پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

ریاکاری اور اس کا علاج☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! عَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سُفْيَانَ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ((مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهِ وَمَنْ يُرَائِي يُرَائِي اللّٰهُ بِهِ))(۱)

''حضرت جندب بن عبداللہ بن سفیان رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص کوئی کام شہرت کے لئے کرتا ہے تو اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بدنام کر دیتے ہیں اور جو کوئی لوگوں کو دکھانے کی خاطر کوئی نیک کام کرتا ہے تو اس کا انجام بالآخر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقت لوگوں کو دکھا دیتے ہیں کہ یہ شخص جو کچھ کر رہا ہے، سب دکھاوے کے لئے کر رہا ہے''

اس حدیث کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بیماریوں کی طرف توجہ دلائی ہے:

(۱) ریاء (دکھلاوا) (۲) سمعۃ (شہرت پسندی)

''سمعۃ'' کا معنی ہوتا ہے کہ دین کا کوئی کام طلبِ شہرت کے لئے کیا جائے۔ اور اگر کوئی کام دکھاوے کے لئے کیا جائے تو اس کو ریا کہتے ہیں۔ گزشتہ جمعہ میں عرض کیا گیا تھا کہ جس خلق کی تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے وہ اخلاص ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ اللہ کی رضا کے لئے ہو دنیا مقصود نہ ہو۔ تو تحصیلِ اخلاص فرض اور اس کا برعکس یعنی ریا حرام ہے۔ دراصل اخلاص ہی تمام اعمال کی روح ہے۔ اگر اخلاص نہیں تو عمل خواہ کتنا ہی کر لے وہ بیکار ہے۔ اور جس نسبت سے اخلاص کی کمی ہوگی اسی نسبت سے اس عمل کا فائدہ کم ہو جائے گا، لہٰذا اخلاص اعمال کی روح ہے اور سمعۃ وریا اعمال کو برباد کر دینے والی چیزیں ہیں۔

دکھاوے کی بیماری ایسی ہے کہ اس سے چھٹکارا آسانی سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے محنت درکار ہے۔ یہ ایسا باریک مرض ہے کہ بسا اوقات مریض کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بیمار ہے، لہٰذا پہلے

☆ اصلاحی مواعظ (۲/۱۲۱ تا ۱۴۰)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب الرياء والسمعة، رقم: ۶۰۱۸، صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب من أشرك في عمله غير الله، رقم: ۵۳۰۱، سنن الترمذي، كتاب النكاح عن رسول الله، باب ما جاء في الوليمة، رقم: ۱۰۱۶، مسند أحمد، رقم: ۱۹۵۵۷

اس کی تھوڑی سی حقیقت سمجھ لیں پھر بزرگوں کا تجویز کردہ علاج بھی مقصودِ بیان ہے۔

ریا کی اصل

دراصل ریا ایک بہت بڑی بیماری ''حبِ جاہ'' کا ایک شعبہ ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ جاہ تو کسی بھی ایسے طریقے سے حاصل کیا جاسکتا ہے کہ جس سے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنا مقصود ہو، لیکن ریاء اس عبادت میں پائی جاتی ہے کہ جو آدمی اس غرض سے کرے کہ لوگوں کے دلوں میں میری وقعت پیدا ہو جائے یا بڑھ جائے۔ مثلاً ایک آدمی شہرت چاہتا ہے اور اس کی خاطر وہ ہر روز اخبارات میں اشتہار چھپواتا ہے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں اس کا نام اچھی طرح جم جائے اور اس کی شہرت ہو جائے تو اس کا یہ عمل جاہ طلبی اور حبِ جاہ تو ہے لیکن ریا نہیں، کیونکہ ریا عبادت میں ہوتی ہے اور اخبار میں اشتہار دے دینا عبادت نہیں ہے۔ ریا کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک آدمی لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھ رہا ہے یا صدقہ کر رہا ہے، اس غرض سے کہ لوگ اس کی تعریف کریں تو یہ ریا ہے۔ تو حبِ جاہ ایک عام چیز ہے جس کا ایک شعبہ ریا ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ عابد کی نگاہ خالق سے ہٹ کر مخلوق کی طرف چلی جاتی ہے

ریا کا پہلا درجہ

آدمیوں کے لحاظ سے ریا کے چند درجے ہیں جن میں سے بعض درجے تو ایسے ہیں کہ جن سے کفر اور شرک تک نوبت آجاتی ہے، بعض اس سے کچھ کم اور بعض اس سے بھی کم درجے ہیں۔ مثلاً سب سے بڑا اور خطرناک ریا ایمان کے اندر ریا کا ہونا ہے کہ دل میں ایمان نہیں ہے لیکن لوگوں کو اپنے ذاتی مقاصد حاصل کرنے کی خاطر، عبادت گذار بن کر دکھانا اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا جس کو دوسرے الفاظ میں ''نفاق'' کہتے ہیں یعنی دل میں کچھ ہو اور ظاہر میں کچھ ہو۔ نفاق بھی ریا کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ اور منافقین کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا ہے:

''منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے''(۱)

یعنی کفار سے زیادہ عذاب میں منافقین ہوں گے کیونکہ وہ کافر بھی ہیں اور دھوکہ بھی دے رہے ہیں جو کہ سب سے زیادہ خطرناک چیز ہے۔

ریا کا دوسرا درجہ

دوسرے درجے کی ریا کو ''فرائض کے اندر ریا'' کہا جاتا ہے کہ ویسے کسی شخص کو نماز پڑھنے کی

(۱) النساء: ۱۴۵

عادت نہیں ہے لیکن کسی موقع پر لوگوں میں پھنس گیا جہاں سوائے پڑھنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا، کیونکہ اگر نہیں پڑھتا تو لوگ ''بے نمازی'' کہیں گے تو لوگوں کے سامنے اپنے بے نمازی ہونے کو چھپانے کے لئے نماز میں شامل ہو گیا۔ تو ایک صورت تو یہ ہے کہ اس وقت خیال آیا کہ اگر اس وقت نماز کی توفیق مل رہی ہے تو پڑھ ہی لوں گا ایسی صورت میں اُمید ہے کہ انشاء اللہ ریا سے بچ جائے گا لیکن اگر دل میں بھاگنے کا ارادہ ہے مگر موقع نہ ملنے کی وجہ سے ادا کر لینا ''فرائض کے اندر ریا'' ہے۔ اگرچہ یہ شرک سے کم ہے لیکن صوفیاء کرام کے نزدیک پھر بھی شرک ہی ہے اس لئے کہ وہ خالق کے لئے نہیں پڑھ رہا بلکہ مخلوق کے لئے پڑھ رہا ہے۔ تو جو آدمی نماز کا پابند ہو گا وہ انشاء اللہ اس ریا میں شامل نہیں ہو گا۔

ریا کا تیسرا درجہ

تیسرا درجہ ''نوافل کی ریا'' کا ہے کہ ویسے تو نفل پڑھنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ نفل پڑھنے کا عادی ہے اور نہ اس کا پڑھنے کا ارادہ ہے لیکن ایسے مجمع میں پھنس گیا کہ جہاں تمام لوگ نوافل پڑھ رہے ہیں تو اگر دل میں خیال آ گیا کہ پہلے تو توفیق نہیں ہوئی لیکن آج اللہ نے توفیق عطا فرمادی ہے تو پڑھ لیتا ہوں، یہ ریا نہیں ہے، بشرطیکہ اللہ کو راضی کرنا مقصود ہو اور موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے پڑھے۔ لیکن اگر اس فکر میں ہے کہ موقع ملے تو بھاگ جاؤں مگر موقع نہ ملا اور دکھاوے کے لئے پڑھ لی تو یہ ریا ہی ہے۔

ریا کا چوتھا درجہ

اسی طرح ''نماز کی کیفیت کی ریا'' بھی ہوتی ہے، یعنی عام حالات میں نماز بڑی بھاگ دوڑ میں پڑھتا ہے اور آداب وغیرہ کی رعایت نہیں کرتا لیکن کسی ایسی جگہ چلا گیا، جہاں اس نے دیکھا کہ اگر میں نے اسی طریقے پر نماز پڑھی تو لوگ اس کو برا سمجھیں گے تو یہ ''نماز کی کیفیت'' میں ریا ہے اور اس کا مقصود بھی لوگوں کو دکھانا ہی ہے تو یہ بھی باعثِ گناہ ہے۔

ریا کا پانچواں درجہ

ریا کا پانچواں درجہ ''نوافل کی کیفیات میں ریا'' کا ہے کہ کبھی اتنی لمبی قرات، رکوع اور سجدہ نہیں کرتا لیکن معتقدین کے سامنے نماز کو لمبا کر کے پڑھ رہا ہے تا کہ وہ بدظن نہ ہو جائیں تو لوگوں کے اس اعتقاد کو سامنے رکھتے ہوئے نماز میں طوالت کرنا بھی ریا کاری ہے۔

اور یہ معاملہ بکثرت ہر شخص کو پیش آتا ہے کہ کسی کو دیکھ کر نماز میں خشوع وخضوع پیدا ہو گیا تو

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ریا سے بچنے کے لئے کیا کیا جائے؟ آیا اس پیدا ہونے والے خشوع و خضوع کو ترک کر دے؟ یا اسی طرح نماز پڑھتا رہے اور صرف نیت درست کر لے۔

اس کے بارے میں حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں محققین اور صوفیاء کی آراء مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسے آدمی کو پہلے طریقے ہی پر نماز پڑھنی چاہئے اور اس خشوع وخضوع کا دھیان نہ کرے جو دوسرے کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ خشوع وخضوع کی اس کیفیت کو ظاہر کر کے نیت خالص کر لینی چاہئے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہی بات زیادہ بہتر ہے اور اسی پر عمل کرنا چاہئے لیکن چونکہ ایسی حالت میں نیت درست کرنا عام طور پر بڑا مشکل ہوتا ہے اس لئے آسان تدبیر یہی ہے کہ اس میں تبدیلی پیدا نہ کرے اور اسی طریقے سے نماز پڑھتا رہے۔

یہ باتیں ایسی ہیں جو انسان خود حل نہیں کر سکتا اسی لئے ریا کا علاج یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کسی شیخ یا مرشد سے کرواؤ اور اس سے مشورہ حاصل کر کے اس کی رائے پر عمل کرو۔

ریا ہر عبادت میں ہو سکتی ہے

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ ریا صرف نماز کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام عبادات میں ریا ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی کسی کو صدقہ دے رہا تھا اس کا ارادہ پانچ روپے دینے کا تھا لیکن کسی ملنے والے کو سامنے سے آتا دیکھ کر دل میں خیال ہوا کہ طعنہ دے گا کہ اتنا امیر آدمی ہے اور پانچ روپے صدقہ دے رہا ہے اس لئے اس نے دس روپے صدقہ میں دے دیئے تو یہ اضافہ اللہ کے لئے نہ ہوا۔ اور اگر پانچ روپے دینے میں صدقہ کا داعیہ تھا تو وہ اللہ کے لئے ہوئے اور یہ زائد ریا ہوئے۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ریا ہر عبادت میں ہو سکتی ہے اور یہ شیطان کا بڑا موثر حربہ ہے، کیونکہ جب وہ انسان کے اندر اللہ کی طرف دھیان پیدا ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ بڑا گھبراتا ہے کہ اگر یہ ایسا ہی رہا تو پھر یہ میرے چنگل سے نکل جائے گا، لہٰذا اس وقت شیطان یہ حربہ استعمال کر کے اس کے عمل کو خراب کر دیتا ہے اور وہ عمل ریا میں شامل ہو جاتا ہے جو کہ حرام ہے۔

ریا کا ایک اور خفی درجہ

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اگر ایک آدمی نے تنہائی میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے پورے اخلاص کے ساتھ کوئی عمل کیا لیکن بعد میں ایک آدمی آ کر اس کے اس عمل کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے آپ کو اس وقت دیکھ لیا تھا، اللہ تعالیٰ مجھے بھی آپ جیسا اخلاص عطا فرمائے تو

وہ عمل کرنے والا شخص اس تعریفی جملے کو سن کر خوش ہوگیا اور مزے لینے لگا تو صوفیاء کرام کے نزدیک یہ بھی ریا کا ایک خفی درجہ ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس تعریفی جملے کی عادت پڑ جاتی ہے اور پھر انسان اسی کی خاطر عمل کرتا ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

ایک مرتبہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! بعض اوقات ہم بھرپور اخلاص سے کوئی عمل کرتے ہیں، بعد میں کسی کے منہ سے اپنی تعریف سن کر دل خوش ہو جاتا ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ))

''یہ مؤمن کے لئے فوری خوش خبری ہے''(۱)

چونکہ اس عمل میں محرک اللہ کی رضا تھی اس لئے اللہ تعالیٰ اس عمل پر دنیا ہی میں اپنے بندوں کے ذریعے خوشخبری دے دیتے ہیں کہ تمہارا یہ عمل اللہ کے یہاں قبول ہے لہٰذا یہ ریا نہیں۔ لیکن یہ اسی وقت ہے کہ وہ آدمی تعریف سنتے ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے میرا اچھا حال اس پر ظاہر کیا ہے، ورنہ اگر اس پر میری حقیقت ظاہر ہو جاتی تو یہ تعریف کرنے کے بجائے میرے اوپر لعنت بھیجتا تو اس خیال سے ان شاء اللہ وہ شیطان کے وار سے بچ جائے گا۔ لیکن اگر وہ مزے لے رہا ہے تو یہ کیفیت آئندہ چل کر اس کو حقیقی ریا میں مبتلا کر کے تباہ کر سکتی ہے۔ اسی لئے اس کو ''خفی ریا'' کہا گیا ہے۔

انسان کے تواضع کی پہچان

ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ یہ جو ہم اکثر اوقات اپنے آپ کو حقیر، فقیر اور عاجز و ناکارہ کہہ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ میری تواضع ہے لیکن درحقیقت یہ ''تواضع کی ریا'' ہوتی ہے اور کہنے والے کا مقصد ہوتا ہے کہ سننے والا اس کو عالم و فاضل کہے۔ اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر کسی نے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کیا اور دوسرے نے اس کی تائید میں جواباً ''بیشک'' کہہ دیا تو اس وقت اس کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے اور اس کے دل پر زبردست گرانی ہوتی ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ اپنے بارے میں سچے دل سے یہ الفاظ نہیں کہہ رہا تھا بلکہ وہ ان عاجزانہ الفاظ سے تواضع کا دکھاوا کر رہا تھا۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب اذا أثنی علی الصالح فهی بشری ولا تضره، رقم: ۴۷۸۰، مسند أحمد، حدیث أبی ذر الغفاری، رقم: ۲۰۴۱۶

تواضع کی حقیقت تو یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو فنا کر ڈالے اور اپنے آپ کو ناکارہ سمجھے اور اس کو اپنے اندر کسی فضیلت کا اعتقاد نہ ہو۔

ایک بزرگ کا قصہ

ایک بزرگ کا قصہ میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا ہے کہ ایک بزرگ کی مجلس میں لوگ آتے اور ان کے وعظ کی تعریف بھی کیا کرتے تو یہ بزرگ اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہوتے تھے۔ مریدین میں سے کسی نے کہا کہ حضرت! آپ کا عجیب معاملہ ہے کہ آپ تعریف سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ تو ان بزرگ نے فرمایا کہ دراصل بات یہ ہے کہ میرا اپنی تعریف پر خوش ہونا تعریف کی مسرت کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس وقت میں اس بات پر خوش ہوتا ہوں کہ اللہ کتنا کریم ہے کہ مجھ جیسے آدمی کے لئے اس کے دل میں کیسا خیال اور گمان پیدا کر دیا۔ تو نہ انہوں نے ظاہری اعتبار سے اپنے آپ کو حقیر کہا اور نہ ہی اپنی تعریف کا رد کیا لیکن دل میں اللہ کے کرم کا احساس ہے۔ خلاصہ یہ کہ ریا کے شعبے جزئیات بیشمار ہیں، بسا اوقات ان کو پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے۔

ریا کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان

اور ریا اتنی خطرناک بیماری ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ صَلّٰى يُرَائِيْ فَقَدْ أَشْرَكَ بِاللّٰهِ))(۱)

''جس شخص نے دکھاوے کے لئے نماز پڑھی تو اس نے مخلوق کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا''

اس لئے کہ حق تو اللہ کو راضی کرنا تھا لیکن تم نے مخلوق کو شریک کر لیا تو یہ شرک ہو گیا۔ آگے فرمایا:

((وَمَنْ صَامَ يُرَائِيْ فَقَدْ أَشْرَكَ بِاللّٰهِ))(۲)

''جو شخص ریا کی خاطر روزہ رکھے تو اس نے مخلوق کو اللہ کا شریک ٹھہرایا''

تو یہ ایسی خطرناک بیماری ہے کہ جس کی حد شرک کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور عام اتنی ہے کہ قدم قدم پر اس کے شائبے پیدا ہوتے ہیں۔

ریا کا علاج اور اس کی مثال

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ کسی اللہ والے سے تعلق قائم کر کے اس سے

(۱) مسند أحمد، رقم: ۱٦٥١٧ (۲) مسند أحمد، رقم: ۱٦٥١٧

ہدایات حاصل کرے۔ اور بزرگوں نے اس کا علاج یہ بھی فرمایا ہے کہ اس بیماری کی جڑ اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کی کمی ہے تو جتنی اللہ جل شانہ کی محبت پیدا ہوگی اتنی ہی ریا سے دوری ہوگی اور خالق کی طرف نگاہ رہے گی، مخلوق کی طرف نہیں جائے گی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک بادشاہ کا دربار لگا ہوا ہے اور بادشاہ نے آپ کو اپنے دربار میں کسی کام سے بلایا، آپ اس کے سامنے جا کر کھڑے تو ہو گئے لیکن نہ نگاہ بادشاہ کی طرف ہے اور نہ دھیان اس کی طرف ہے۔ اور دوسری طرف ایک حبشی غلام کھڑا ہے، اس کی طرف دیکھ بھی رہا ہے اور متوجہ بھی ہے۔ تو آپ کا بادشاہ کی طرف سے بے توجہ ہونا، بادشاہ کی بڑی زبردست توہین ہے جو وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں بادشاہ کی کوئی وقعت نہ ہو، اس لئے اگر دل میں اس کی وقعت ہے تو اس کے علاوہ کسی اور کی طرف دھیان جا ہی نہیں سکتا۔ ایسے ہی جب اللہ جل شانہ کی محبت یا عظمت دل میں آجائے تو پھر مخلوق کی طرف نگاہ ہو ہی نہیں سکتی اور حبِ جاہ اور ریا جیسی بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی محبت عطا فرما دیتے ہیں تو پھر وہ کسی کی طرف دھیان نہیں کرتے، اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ جب سورج نکل آتا ہے تو چونکہ تارے اس کے نور کو برداشت نہیں کر سکتے اس لئے وہ سورج کے احساس سے ہی غائب ہو جاتے ہیں، اسی طرح اللہ کی محبت کے آگے ساری محبتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

صوفیاء کرام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ

جدھر دیکھتا ہوں، ادھر تو ہی تو ہے

اس بات کے لئے صوفیاء کرام نے ''وحدت الوجود'' والی بات کو بڑے اچھے پیرائے میں بیان فرمایا ہے کہ۔

جب مہر نمایاں ہوا، سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

منصور حلاج کا قصہ

منصور حلاج ایک بہت بڑے صوفی گزرے ہیں، ایک مرتبہ انہوں نے ''انا الحق'' کہہ دیا کہ میں ہی حق یعنی اللہ ہوں۔ اس پر دنیوی احکام قتل پھانسی وغیرہ کے جاری ہو گئے، لیکن ان کا مقصد خدائی کا دعویٰ نہ تھا بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں، وہ اپنی جگہ درست تھے لیکن اس پر علماء کرام کے فتووں کے مطابق احکامات جاری ہوئے، میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا کہ جب علماء نے ان کے اس قول (انا الحق) کی وجہ سے ان پر فتویٰ لگایا کہ یہ تو ارتداد ہے اور مرتد واجب القتل ہوتا ہے لہٰذا اس کو قتل کر دیا جائے تو اسی وقت حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

بھی موجود تھے اور فتوے کے اوپر دستخط کے وقت بھی موجود تھے۔ تو منصور نے جب ان کو کھڑے دیکھا تو کہا کہ جنید! جتنے بھی لوگوں نے میرے قتل کا فتویٰ دیا ہے، مجھے نہ ان سے کوئی شکایت ہے اور نہ ہی ان کی پرواہ ہے، لیکن تم نے علم رکھنے کے باوجود دستخط کیوں کیے اور تم کیوں آئے؟ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حقیقت چاہے کچھ ہو، لیکن حکم وہی ہے جو فقہاء کرام نے دے دیا، اس لئے میں نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔ حالانکہ ان کا مقصد یہ تھا جو کچھ ہے وہ اللہ کی ذات ہے اور یہ بات درمیان میں آگئی تو کہہ دی لیکن یہ قابل تقلید نہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھار ایسا شدید احساس پیدا فرما دیتے ہیں کہ ایک اللہ کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔

کسی بزرگ سے ایک سوال

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! یہ عجیب معاملہ ہے کہ جب فرعون نے "أَنَا الْحَقُّ" اور "أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى" کہا تو قرآن نے بھی اس پر لعنت بھیجی ہے اور منصور نے بھی "أَنَا الْحَقُّ" کہا تھا لیکن منصور کا نام آنے پر رحمۃ اللہ علیہ کہا جاتا ہے تو ان دونوں کے کہنے میں کیا فرق ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ فرق یہ ہے کہ فرعون نے "انا الحق" کہا تھا تو اس نے اللہ کو مٹا کر کہا تھا اور منصور نے جب "انا الحق" کہا تو اپنے آپ کو مٹا کر کہا اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

تو عرض یہ کر رہا تھا کہ ان ساری بیماریوں کو دور کرنے کی بنیاد اللہ کی محبت ہے اور مخلوق سے نگاہ کو ہٹا کر خالق کی طرف کر لینا ہے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ایک دیہاتی

حضرت شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دہلی کی جامع مسجد میں کئی گھنٹے تقریر کرنے کے بعد واپس ہو رہے تھے تو ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بڑی تیزی سے پسینہ میں شرابور مسجد کی سیڑھیاں چڑھتا چلا آ رہا ہے۔ جب وہ اوپر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ لوگ تو جا رہے ہیں تو اس کو بہت افسوس ہوا۔ اتفاق سے شاہ صاحب ہی اس کے سامنے آگئے تو اس نے اپنی لاعلمی کی بناء پر پوچھا کہ کیا مولوی اسماعیل کا وعظ ختم ہو گیا؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! ختم ہو گیا تو اس نے "إِنَّا لِلّٰه" کہا کہ میں تو بڑی دور سے اسماعیل کا وعظ سننے آیا تھا، گویا اس نے بڑی حسرت ظاہر کی تو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا ہی نام اسماعیل ہے، بیٹھ جاؤ! میں نے جو کچھ کہا ہے وہ میں تم کو دوبارہ سنائے دیتا ہوں، اور انہی سیڑھیوں میں بیٹھ کر وہ سارا وعظ اس اکیلے آدمی کو سنا دیا۔ بعد میں

کسی نے کہا کہ حضرت! آپ نے بھی کمال کر دیا کہ ایک آدمی کی خاطر گھنٹوں کا وعظ دوبارہ سنا دیا؟ حضرت شاہ صاحبؒ نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ میں نے یہ پہلے بھی ایک ہی کیلئے کہا تھا اور اب بھی ایک ہی کیلئے کہا ہے، مجھے مجمع اور اس کی پسند کی کوئی پرواہ نہیں، میرا مقصد تو اللہ کو راضی کرنا ہے۔

سہاگن وہ جسے پیا چاہے

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ ہندی زبان کی ایک مثل مشہور ہے کہ ''سہاگن وہ جسے پیا چاہے''

تفصیل یہ بتائی کہ ایک لڑکی کی شادی ہوئی تو جیسا کہ شادی میں ہوتا ہے کہ عورتیں دلہن کا بناؤ سنگھار کرتی ہیں، ایسا ہی یہاں بھی ہو رہا تھا اور اس کی سہیلیاں اس سے مذاق کر رہی تھیں کہ آج تو تو بہت خوبصورت لگ رہی ہے اور تیرا بناؤ سنگھار تو بہت ہی اچھا ہے اور طرح طرح سے اس کی تعریفیں کر رہی ہیں۔ لیکن وہ کسی کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتی اور خاموش بیٹھی ہے، تو کسی نے اس سے پوچھا کہ نہ تو نے ان کا شکریہ ادا کیا اور نہ ان کی تعریف پر خوشی کا اظہار کیا؟ تو اس نے کہا کہ بیشک یہ میری تعریف کر رہی ہیں لیکن یہ بتاؤ کہ مجھے ان کی تعریف سے کیا فائدہ ہوگا؟ بات تو جب بنے گی کہ جس کے لئے سنوارا جا رہا ہے وہ تعریف کرے، تو میرے والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو کچھ ہم دنیا میں کر رہے ہیں تو کسی کی تعریف سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ ایسا ہوگیا کہ وہ ہوا میں اُڑ گیا، ہاں جس کے لئے کیا جا رہا ہے وہ کہہ دے تب فائدہ ہے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

اور اس کی طرف سے یہ خطاب آجائے:

﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾(۱)

خالق کی پسند کی فکر کرو

ایک بزرگ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ کبھی ہنستے نہیں تھے، مسکراہٹ تک چہرے پر نہیں

(۱) الفجر: ۲۷ تا ۳۰، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''(البتہ نیک لوگوں سے کہا جائے گا کہ:) ''اے وہ جان جو (اللہ کی اطاعت میں) چین پا چکی ہے! اپنے پروردگار کی طرف اس طرح لوٹ کر آجا کہ تو اس سے راضی ہو، اور وہ تجھ سے راضی، اور شامل ہو جا میرے نیک بندوں میں، اور داخل ہو جا میری جنت میں''

آتی تھی۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا؟ تو فرمایا کہ کچھ پتہ نہیں، دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس بارگاہ میں میرا کوئی عمل قبول ہوگا یا نہیں اس لئے میں نہیں ہنستا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو فوراً ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی، جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو "یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ" والا خطاب مل گیا تھا۔ لہٰذا فکر اس بات کی ہونی چاہئے کہ جس کے لئے یہ کام کیا جارہا ہے اس کو پسند آجائے، خواہ مخلوق کو پسند آئے یا نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی ایسی محبت پیدا ہوگئی تو انشاء اللہ ہر قسم کی بیماریوں سے حفاظت ہوجائے گی۔ اور محبت پیدا کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ محبت کرنے والوں کے پاس بیٹھو تو اس محبت کی آگ کی تھوڑی سی تپش تم پر بھی اثر انداز ہوجائے گی۔

اللہ کی محبت پیدا کرنے کا طریقہ

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی محبت پیدا کرنے کا ایک کسبی طریقہ بھی ہے وہ یہ کہ اللہ کی نعمتوں کا استحضار اور دھیان ہو کہ اللہ نے مجھ پر کیسی کیسی نعمتوں کی بارش برسائی ہے۔ اور حضرت فرماتے تھے کہ رات کو سونے سے پہلے اس کے بارے میں مراقبہ کرلیا کرو۔ مراقبہ سے مراد یہ ہے کہ خالی الذہن ہوکر دھیان کرو کہ اللہ نے کیا کیا نعمتیں عطا فرمائی ہیں؟ اور دوسری طرف اپنی تقصیرات کا استحضار کرے کہ میں نے اللہ کی نعمتوں کا کیا حق ادا کیا؟ صرف آنکھ ہی ایسی نعمت ہے کہ اگر ایک آنکھ خراب ہوجائے تو انسان لاکھوں روپے خرچ کرنے کو تیار ہوجاتا ہے اور اللہ نے مجھے مفت میں دے رکھی ہے، میں نے اس کا کیا حق ادا کیا؟ تو ایک طرف سے اللہ کی نعمتوں کا استحضار اور دوسری طرف سے اپنی تقصیرات کا دھیان کرو اور سوچو کہ اللہ کتنا بردبار ہے؟

اللہ بہت حلیم اور بردبار ہے

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک بے یار و مددگار آدمی پھر رہا تھا جس کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہ تھی اور سر چھپانے کی جگہ نہ تھی، تم اس پر ترس کھا کر اس کو اپنے گھر لے آئے اور بھائیوں کی طرح رکھا اور کھانے کو روٹی، پینے کو پانی اور رہنے کو جگہ دی۔ لیکن پھر وہ تمہاری نافرمانی کرتا ہے اور چوری وغیرہ کے کاموں میں لگ جاتا ہے تو آخر تم کب تک برداشت کروگے؟ ایک نہ ایک دن تو اس کو نکال ہی دوگے۔ لیکن اس مالک بے نیاز کا کرم دیکھو کہ دن رات اس کی نافرمانیوں میں لگے رہتے ہو لیکن وہ تم سے نعمتیں چھینتا نہیں ہے۔ اگر تم اس خیال کے ساتھ اپنی تقصیرات اور اللہ کی نعمتوں کا استحضار کروگے تو اللہ کی محبت دل میں ضرور آئے گی۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چالیس دن کا چلہ کرو اور خیال کرو کہ جو منعم حقیقی ایسی عطا فرمانے والا ہے تو کیا وہ محبت کے لائق نہیں ہے؟ اس خیال سے اللہ کی محبت پیدا ہو جائے گی اور جب اللہ کی محبت پیدا ہو جائے گی تو مخلوق کی طرف سے نگاہ ہٹ جائے گی بایں معنی کہ انسان مخلوق کی خاطر کام نہیں کرے گا بلکہ مخلوق سے معاملات اس خیال کے ساتھ کرے گا کہ یہ میرے مالک کی پیدا کردہ مخلوق ہے، میرے ذمے اس کے کچھ حقوق ہیں لہٰذا میں وہ حقوق ادا کر رہا ہوں لیکن وہ مخلوق سے اپنی تعریف نہیں چاہے گا۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ نکلا کہ ریاء اور حب جاہ جیسی بیماریاں اللہ کی عظمت و محبت کی کمی سے پیدا ہوتی ہیں اور محبت میں اضافہ کا طریقہ یہ ہے کہ ہر روز اللہ کی نعمتوں کا استحضار کرو۔ بعض آنکھیں ناشکری ہوتی ہیں کہ محض مصیبتوں کو دیکھتی ہیں اللہ کی نعمتوں کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوتی اور ہم لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اللہ کی نعمتوں کا پلڑا ہر آن بھاری رہے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾(۱)

”اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ انسان بڑا ظالم اور بڑا ناشکرا ہے“

ان آیات میں ہمارے لئے سبق ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرنا چاہئے، اگر اللہ کی نعمتوں کی طرف نگاہ ہو تو تکلیفیں تو ویسے ہی دور ہو جاتی ہیں۔

بزرگوں کی نگاہ نعمت کی طرف ہوتی ہے

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کے ایک استاذ حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، ایک مرتبہ بیمار ہو گئے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں عیادت کو گیا تو دیکھا کہ تیز بخار میں تپ رہے تھے۔ میں نے سلام عرض کر کے حال دریافت کیا تو فوراً فرمایا کہ الحمد للہ میری آنکھ، کان، ناک، پیٹ اور معدہ میں کوئی تکلیف نہیں اور جتنی بیماریاں نہیں تھیں، سب بیان کر دیں اور فرمایا کہ بس ایک بخار ہے، وہ بھی انشاء اللہ ختم ہو جائے گا۔ تو بیماری کی حالت میں بھی ان کی نگاہ نعمتوں کی طرف تھی۔

---

(۱) ابراھیم: ۳۴

تکالیف کے مقابلے میں نعمتیں زیادہ ہیں

ایک مرتبہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو درمیان میں یہ بات نکل آئی کہ جب بچوں کے دانت نکلتے ہیں تو مختلف قسم کی تکلیفیں ان کو ہوتی ہیں۔ تو گھر ہی کی ایک خاتون بھی بیٹھی ہوئی تھیں، انہوں نے کہا کہ یہ دانت بھی عجیب چیز ہیں کہ آتے ہوئے بھی تکلیف دیتے ہیں اور جاتے ہوئے بھی! کیونکہ ان کے دانت ہل رہے تھے اور نکلنے والے ہو رہے تھے۔ تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ کی بندی! تمہیں دانتوں کے متعلق صرف یہی دو باتیں یاد رہیں اور اپنی پچاس، ساٹھ سالہ زندگی میں منوں بلکہ ٹنوں کے اعتبار سے غذا چبا کر اپنے پیٹ میں اُتار گئیں وہ یاد نہیں رہی؟ تو اللہ والوں کی نگاہ نعمتوں کی طرف اور ہم جیسوں کی نگاہ تکلیفوں کی طرف ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ یقین نہیں ہوتا کہ اگرچہ اس دنیا میں مظلوم ترین انسان ہے لیکن اگر فہرست بنا کر دیکھا جائے تو تکلیفوں کے مقابلے میں نعمتوں کا پلڑا ہزار ہا گنا بھاری ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھو اور اس کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین فرمودہ دعا بھی پڑھتے رہا کرو جو کہ مناجات مقبول میں بھی ہے:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْتَغْفِرُكَ لِلنِّعَمِ الَّتِیْ تَقَوَّیْتُ بِهَا عَلٰی مَعْصِیَتِكَ))(۱)

”اے اللہ! میں مغفرت مانگتا ہوں ان نعمتوں پر کہ جن سے مجھے آپ کی نافرمانیوں پر تقویت ملی“

الفاظ یاد نہ رہیں تو معنی بھی کافی ہیں اور ان باتوں کو صرف سننے کی حد تک نہیں رکھیں بلکہ عملی زندگی میں لائیں اور وقت نکال کر اللہ کی نعمتوں کے بارے میں مراقبہ کریں جس سے اللہ کی محبت پیدا ہوگی اور یہ تمام بیماریاں ختم ہو جائیں گی، یہ سو علاجوں کا ایک علاج ہے، اس کے علاوہ جزوی علاج اور بھی ہیں لیکن بنیادی علاج یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

❀❀❀

(۱) پوری دعا کچھ یوں ہے: ((اللهم إني أستغفرك لما تبت إليك منه ثم عدت فيه وأستغفرك لما أعطيتك من نفسي ثم لم أوف لك به وأستغفرك للنعم التي أنعمت بها علي فتقويت بها على معاصيك وأستغفرك لكل خير أردت به وجهك فخالطني فيه ماليس لك اللهم لا تخزني فإنك بي عالم ولا تعذبني فإنك علي قادر)) كنز العمال، رقم:٥١٢٦ (٢/٨٠٨)، شعب الإيمان للبيهقي، رقم:٦٩٠٨ (١٥/٢٠٤)

تکبر اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ. وَعَلٰی آلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ. وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ. أَمَّا بَعْدُ!

کبر، یعنی تکبر بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے۔ اس سے بہت سی باطنی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو ''اُمّ الامراض'' کہا جاتا ہے۔ اور سب سے پہلا گناہ جو کائنات میں سرزد ہوا، وہ کبر کا گناہ تھا۔ جب اللہ جل شانہ نے ابلیس سے کہا کہ (حضرت) آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، تو اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور دلیل یہ دی:

﴿أَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ﴾(۱)

میں اس سے بہتر ہوں، اپنے کو اس ابلیس نے بڑا سمجھا اور حضرت آدم علیہ السلام کو چھوٹا سمجھا۔ اس کی دلیل بھی بہت مضبوط پیش کی کہ آپ نے ان کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آگ مٹی سے افضل ہے۔

اگر دلیل کی طرف دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ یہ دلیل بڑی قوی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نہ ماننے کے نتیجے میں کبر کا جو مظاہرہ ہوا، یہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی وہ نافرمانی تھی جو سب سے پہلے سرزد ہوئی، اور اسی تکبر کے نتیجے میں شیطان ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوا۔

''تکبر'' تمام گناہوں کی جڑ ہے

اسی تکبر سے ''حسد'' پیدا ہوتا ہے، کیونکہ جب دل میں یہ خیال ہے کہ میں بڑا ہوں، اب اگر دوسرا آدمی اس سے آگے بڑھ گیا اور ترقی کر گیا تو دل میں یہ حسد پیدا ہوتا ہے کہ یہ آدمی کیوں آگے بڑھ گیا، مجھے آگے بڑھنا چاہئے تھا۔

اسی تکبر سے ''بغض'' پیدا ہوتا ہے، ''غصہ'' کی کثرت تکبر کی وجہ سے ہوتی ہے، ''غیبت'' کا

☆ اصلاحی مجالس (۱/ ۲۴۹ تا ۳۱۳)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) الاعراف: ۱۲

گناہ عموماً تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، "تجسّس" بھی تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، غرض یہ کہ "تکبر" بیشمار امراض کی جڑ ہے۔ جس طرح جسمانی امراض کے ماہرین اور اسپیشلسٹ ہوتے ہیں، کوئی کان کا اسپیشلسٹ ہے، کوئی ناک کا اسپیشلسٹ ہے، کوئی حلق کا اسپیشلسٹ ہے، اسی طرح روحانی امراض کے اسپیشلسٹ بھی ہوتے ہیں، ان میں ایک امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، وہ اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں فرماتے ہیں کہ یہ تکبر "اُمّ الامراض" ہے، یعنی تمام بیماریوں کی ماں ہے۔ اگر یہ ایک مرتبہ پیدا ہو جائے تو دوسری بیماریاں اس سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لہٰذا اس بیماری کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس بیماری سے محفوظ فرمائے اور اگر یہ بیماری ہمارے اندر ہے تو اس کا علاج بھی فرما دے۔ آمین۔

کِبر کے معنی

"کِبر" کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا یعنی افضل سمجھنا، اگر کسی کی عمر تیس سال ہے اور دوسرے کی عمر بیس سال ہے تو ظاہر ہے کہ تیس سال والا شخص اپنے آپ کو بیس سال والے سے عمر کے اعتبار سے بڑا سمجھے گا، یہ کبر نہیں اور بری بات نہیں، اپنے آپ کو بڑا یعنی افضل سمجھنا کہ میں اس سے بہتر ہوں، میں اس سے اچھا ہوں، یہ کبر ہے۔

اور جب اپنی بڑائی دل میں ہوتی ہے تو پھر اپنے کسی انداز و ادا سے اس کا مظاہرہ بھی ہو جاتا ہے، مثلاً گفتگو سے، قول سے، فعل سے، اس کا نام ہے "تکبر"، لہٰذا دوسرے کے مقابلے میں بڑائی جتلانا تکبر ہے۔ یہ فرق ہے "تکبر" اور "کبر" میں۔ گویا کہ "کبر" یہ ہے کہ دل میں اپنی بڑائی کا پیدا ہونا اور "تکبر" یہ ہے کہ دوسرے کے مقابلے میں اپنی بڑائی جتلانا، مثلاً دوسرے سے اس طرح گفتگو کرنا جس میں دوسرے کی تحقیر شامل ہو۔ یہ تکبر کبر کا نتیجہ ہوتا ہے، جسے ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

تکبر ایک مخفی بیماری

یہ بیماری ایسی ہے کہ اکثر و بیشتر انسان کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ بیماری میرے اندر ہے یا نہیں۔ اور وہی بیماری سب سے زیادہ خطرناک ہے جو اندر ہی اندر بڑھتی چلی جائے، اور اس کا پتہ ہی نہ چلے۔ جیسے آج کل ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ سب سے خطرناک بیماری "کینسر" کی ہے، اس لئے کہ یہ بیماری ایسی ہے کہ جب انسان کے بدن میں پیدا ہو جاتی ہے تو اندر ہی اندر بڑھنے لگتی ہے، اس وقت نہ بیمار کو پتہ چلتا ہے، نہ ڈاکٹر کو پتہ چلتا ہے کہ اندر کیا ہو رہا ہے، کیونکہ جب بیماری میں انسان کو تکلیف ہوتی ہے اُس وقت پتہ چلتا ہے کہ میرے اندر یہ بیماری ہے۔ اس لئے بیماری کے اندر تکلیف کا ہونا یہ بھی اللہ

تعالیٰ کی رحمت ہے، کیونکہ تکلیف اس بات کا سگنل ہوتا ہے کہ اندر کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے، لہٰذا آدمی ڈاکٹر کے پاس اس کے علاج کے لئے جاتا ہے اور اپنا علاج کرالیتا ہے اور ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر بیماری تو اندر پیدا ہوگئی اور اس کی تکلیف نہیں ہوئی تو اب اس کے علاج کی طرف بھی دھیان نہیں جائے گا اور اس کے تدارک کی فکر نہیں ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بیماری اندر ہی اندر بڑھتی چلی جاتی ہے، اور انسان کو اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ ناقابلِ علاج ہو جاتی ہے اور اس کے بعد کوئی علاج ممکن نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

اسی طرح کبر کی بیماری بھی ایسی ہی ہے، آدمی اپنے آپ کو یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں، لیکن حقیقت میں وہ کبر اور تکبر کا شکار ہوتا ہے، اور یہ بیماری اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ کبھی آپ نے یہ سنا کہ کسی متکبر نے یہ کہا ہو کہ میں تکبر کرتا ہوں، آج تک کسی نے یہ اقرار نہیں کیا۔

ٹخنوں سے نیچے شلوار لٹکانا

ایک بات ہمارے معاشرے میں بہت مشہور ہوگئی ہے، وہ یہ کہ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ، شلوار وغیرہ پہننے کی جو ممانعت حدیث شریف میں آئی ہے، اس کے بارے میں لوگوں نے یہ حیلہ نکالا ہے کہ حدیث شریف میں تو یہ آیا ہے کہ جو شخص تکبر کی وجہ سے پاجامہ یا شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکائے گا تو وہ حصہ جہنم میں جائے گا، اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ دیکھئے! اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے تکبر کی قید لگائی ہے، لہٰذا تکبر کی وجہ سے شلوار کو نیچے لٹکانا تو ناجائز ہے، لیکن اگر تکبر کے بغیر ویسے ہی فیشن کے طور پر لٹکا لیا، یا اس لئے لٹکا لیا کہ ہمیں اس طرح لٹکانا اچھا لگتا ہے تو پھر کوئی گناہ نہیں، اور ہم تکبر سے نہیں لٹکاتے۔ یہ بات لوگوں نے بہت زیادہ مشہور کر رکھی ہے۔ میرا یورپ اور امریکہ جانا ہوا تو دیکھا کہ وہاں کے مسلمانوں میں یہ بات بہت مشہور ہے اور جس سے بھی پوچھا جائے تو وہ یہی کہتا ہے کہ ہم یہ کام تکبر کی وجہ سے نہیں کرتے۔

میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ اچھا تم مجھے کوئی ایک آدمی بھی ایسا دکھا دو جو کہتا ہو کہ میں تکبر کی وجہ سے شلوار نیچے لٹکاتا ہوں۔ کوئی آدمی ایسا نہیں ملے گا، کیونکہ تکبر ایسی چیز ہے کہ اگر متکبر کو پتہ چل جائے کہ میں تکبر کرتا ہوں تو بس تکبر ختم ہو جائے۔ تکبر تو پیدا ہی اس طرح ہوتا ہے کہ جس کے اندر تکبر ہے اس کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ میں کبر اور تکبر کے اندر مبتلا ہوں، یہ شیطان کا دھوکہ ہے کہ آدمی یہ کہے کہ میں یہ کام تکبر کی وجہ سے نہیں کرتا ہوں، لہٰذا میرے لئے یہ عمل جائز ہے۔

حضور ﷺ کے ازار کی کیفیت

حالانکہ دنیا میں کسی شخص کے بارے میں یہ گارنٹی نہیں ہے کہ وہ تکبر سے پاک ہوگا، سوائے حضورِ اقدس نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے، آپ کے بارے میں یہ گارنٹی ہے کہ آپ ﷺ تکبر سے پاک تھے، اب جس ذاتِ اقدس کے بارے میں یہ گارنٹی ہے کہ وہ تکبر سے پاک تھے، وہ تو اپنا ازار ٹخنوں سے نیچے نہیں لٹکاتے بلکہ آپ اپنا ازار نصف ساق تک رکھتے تھے، کیونکہ ٹخنوں سے نیچے لٹکانا تکبر والا کام ہے، اور ہم لوگ جن کے اندر تکبر پیدا ہونے کا ہر وقت خطرہ ہے، لیکن ازار نیچے لٹکا کر یہ کہتے ہیں کہ ہم تکبر سے نہیں لٹکاتے، اس سے زیادہ شیطان کا دھوکہ اور کیا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ تکبر ایک ایسا امر مخفی ہے کہ متکبر کو پتہ نہیں لگتا کہ میں تکبر کر رہا ہوں۔

ظاہری تواضع میں مخفی تکبر

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک آدمی ایسا کام کر رہا ہوتا ہے جو بظاہر تواضع کا ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ سراسر تکبر ہوتا ہے۔ جیسے آج کل یہ رواج ہے کہ لوگ اپنے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ میں بالکل ناکارہ ہوں، میں گیا گزرا جاہل ہوں۔ اب یہ الفاظ تو بظاہر تواضع کے ہیں کہ وہ شخص اپنے آپ کو ناکارہ اور جاہل کہہ رہا ہے، لیکن بسا اوقات یہ سراسر تکبر ہوتا ہے، کیونکہ وہ شخص یہ الفاظ اس لئے کہتا ہے تا کہ سامنے والا پلٹ کر یہ کہے کہ جناب! آپ جاہل کہاں، آپ تو بہت بڑے علامہ ہیں۔ اس کا آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں، وہ اس طرح کہ جو شخص اپنے آپ کو یہ کہہ رہا ہے کہ میں جاہل ہوں، میں ناکارہ ہوں، اس کے جواب میں کوئی دوسرا شخص یہ کہہ دے کہ بیشک آپ جاہل اور ناکارہ ہیں، بس اس وقت اس کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ سچے دل سے یہ الفاظ نہیں کہہ رہا تھا بلکہ اس لئے کہہ رہا تھا تا کہ سامنے والا پلٹ کر اس کے لئے تعریفی کلمات کہے، یہ تواضع نہیں بلکہ تکبر ہے۔

لہٰذا یہ تکبر بڑا دقیق اور باریک ہوتا ہے، اس کے وجود کا پتہ نہیں چلتا، اس لئے کسی معالج کی ضرورت ہوتی ہے جو یہ پہچان کر بتائے کہ اس کے اندر تکبر ہے۔

بظاہر تکبر حقیقت میں تکبر نہیں

بعض اوقات بظاہر دیکھنے میں تکبر نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں نہیں ہوتا، جیسے حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ))

''میں آدم کے تمام بیٹوں کا سردار ہوں''(۱)

یہ کون کہہ رہا ہے؟ نبی پاک ﷺ، اگر کوئی دوسرا آدمی یہ بات کہے تو یہ اس کے حق میں بڑائی کا جملہ ہے۔لیکن سرکار دو عالم ﷺ فرما رہے ہیں کہ میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، لیکن یہ بات کسی فخر اور تکبر کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے آدم کے بیٹوں کی سرداری عطا فرمائی ہے۔اب ظاہر میں یہ الفاظ بڑائی کے ہیں، حقیقت میں بڑائی نہیں۔بلکہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا تعریف پر ہنسنا

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ان کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص ان کے پاس آکر ان کی تعریف کرتا کہ حضرت! آپ نے بڑا اچھا وعظ فرمایا، فلاں بات بڑی اچھی ارشاد فرمائی، تو وہ بہت خوش ہوتے اور ہنستے تھے۔اب دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ یہ بزرگ اپنی تعریف سن کر خوش ہو رہے ہیں، اور جس شخص کے دل میں عجب اور کبر ہوتا ہے اس کی تو خواہش ہی یہ ہوتی ہے کہ دوسرا آدمی میری تعریف کرے اور تعریف سن کر اس کو بہت خوشی ہوتی ہے۔ کسی شخص نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت! آپ کو اپنی تعریف سن کر بڑا مزہ آتا ہے، کیونکہ جب کوئی آپ کے کسی کام کی تعریف کرتا ہے تو آپ بہت خوش ہوتے ہیں۔حضرت نے جواب میں فرمایا: ہاں بھائی! میں بہت خوش ہوتا ہوں، اس لئے کہ کوئی شخص میرے کسی عمل کی تعریف کرتا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرا تو کوئی عمل نہیں ہے، وہ تو میرے اللہ نے مجھے توفیق دی تو میں نے وہ عمل کرلیا، تو درحقیقت میرے اللہ کی تعریف ہوتی ہے، اور میں اللہ کی تعریف پر خوش ہوتا ہوں کہ میرے اللہ نے مجھ سے یہ کام کرادیا اور مجھے اس کام کی توفیق عطا فرمادی، میں اس پر خوش ہوتا ہوں۔ اب دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ یہ صاحب عجب اور کبر میں مبتلا ہیں، لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کے شکر کے مقام پر ہیں۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب تفضيل نبينا على الخلائق، رقم: ۴۲۲۳، سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة بني إسرائيل، رقم: ۳۰۷۳، سنن أبي داؤد، كتاب السنة، باب في التخيير بين الأنبياء، رقم: ۴۰۵۳، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الشفاعة، رقم: ۴۲۹۸، مسند أحمد، رقم: ۲۴۱۵

لہٰذا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تکبر کی بیماری ہوتی ہے، لیکن انسان کو پتہ نہیں لگتا، اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دیکھنے میں بیماری معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں بیماری نہیں ہوتی۔ اس لئے صرف یہ کہہ دینا کہ ہمارے اندر تکبر نہیں ہے، اس سے بات نہیں بنتی، اس لئے کہ جب تمہارے اندر تکبر ہوگا تو تمہیں پتہ بھی نہیں ہوگا کہ تمہارے اندر تکبر ہے یا نہیں۔

متکبر کی بہترین مثال

کسی نے عربی زبان میں متکبر کی ایک بہت اچھی مثال بیان کی ہے، کہ متکبر کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو اور نیچے کی طرف دیکھ رہا ہو، اب نیچے جو لوگ اس کو نظر آرہے ہیں، وہ ان سب کو چھوٹا سمجھتا ہے، کیونکہ وہ سب اس کو چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں، اور نیچے والے اس کو چھوٹا دیکھتے ہیں، اس لئے وہ اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ دوسروں کو چھوٹا سمجھتا ہے اور دوسرے اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس متکبر کو اپنے تکبر کا پتہ نہیں ہے، لہٰذا اپنے آپ کو ان سے افضل سمجھ کر ان کو چھوٹا سمجھ رہا ہے، اور دوسرے لوگ جن کو یہ معلوم ہے کہ یہ متکبر ہے، وہ چاہے منہ پر اس کی تعریف کریں، لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بیوقوف آدمی ہے اور تکبر کے اندر مبتلا ہے۔ اس لئے معالج کے بغیر تکبر کا پتہ نہیں چلتا۔ لہٰذا یہ دھوکہ مت کھانا کہ ہم تو تکبر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے ازار نہیں کرتے، کیونکہ ازار کو نیچے کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

تکبر کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ ملفوظات ہیں۔ ان کی مختصر تشریح عرض کرتا ہوں۔

عالم کا اپنے کو جاہل سے اچھا سمجھنے کا علاج

ایک صاحب نے حضرت والا سے پوچھا:

''اکثر بلا قصد یہ خیال آتا ہے کہ فلاں جاہل ہے، میں عالم ہوں، میں اس سے اچھا ہوں''(۱)

ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے واقعۃً علم عطا فرمایا ہے، عالم ہے، اور دوسرا شخص عالم نہیں ہے، اب اس عالم کو یہ خیال آہی جاتا ہے کہ مجھے الحمد للہ علم حاصل ہے جو دوسرے کو حاصل نہیں ہے، اور علم جہل سے اچھا ہے، اس لئے اپنے اچھے ہونے کا خیال دل میں آگیا۔ آیا یہ خیال تکبر ہے یا نہیں؟ حضرت والا نے جواب دیا:

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۴

''نفس سے کہے کہ کیا معلوم خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے، ممکن ہے کہ اس کا باطن اچھا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑا ذلیل وخوار ہوں، اور خدا تعالیٰ نے تجھ کو دو چار حرف ظاہری سکھلا دیئے ہیں، اس لئے تو بڑائی کرتا ہے، اگر وہ چاہے تو آج چھین لے تو کیا کرے گا، اسی کا استحضار بہ تکرار کرے اور دعا بھی کرے''(۱)

ایک اشکال

یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہئے، بعض اوقات دل میں یہ خیال آتا ہے کہ آدمی کسی حقیقت سے تو انکار نہیں کرسکتا، اگر ایک آدمی کے پاس علم ہے اور دوسرے کے پاس وہ علم نہیں ہے، اب جس کے پاس علم ہے وہ یہ کیسے کہہ دے کہ میرے پاس علم نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ علم جہل کے مقابلے میں بہتر ہے، قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾(۲)

یعنی علم رکھنے والا بہتر ہے اس کے بنسبت جو علم نہیں رکھتا۔ لہٰذا جس کے پاس علم ہے وہ کیسے جھٹلا دے کہ میرے اندر یہ وصف نہیں ہے۔ یا مثلاً ایک آدمی زیادہ صحتمند ہے، اس کے مقابلے میں دوسرا آدمی کمزور ہے، اب ظاہر ہے کہ صحتمند یہ سوچے گا کہ اس کے مقابلے میں میری صحت اچھی ہے، میں اس کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہوں، مضبوط ہوں۔

یا مثلاً ایک آدمی کے پاس پیسہ زیادہ ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسرے آدمی کے پاس پیسہ نہیں ہے، تو وہ یہ خیال کرے گا کہ میں اس کے مقابلے میں مالدار ہوں، اس کے پاس پیسہ نہیں ہے، میرے پاس پیسہ ہے۔ یا ایک آدمی بڑا افسر ہے، کسی بڑے عہدے پر فائز ہے، دوسرا آدمی چپراسی اور مزدور ہے، تو بڑے منصب اور عہدے والا اپنے آپ کو اس چپراسی سے بڑا سمجھے گا یا نہیں؟ اب اگر وہ اپنے کو بڑا سمجھے تو تکبر ہوگیا، اور اگر بڑا نہ سمجھے تو جھوٹ ہوگیا۔ مثلاً اگر وہ یہ سمجھے کہ میں افسر نہیں ہوں، بلکہ میں تو ایک مزدور ہوں، یہ تو بالکل جھوٹ ہوگیا، یا مثلاً ایک آدمی طاقتور ہے، صحتمند ہے، وہ یہ کہے کہ میں طاقتور نہیں ہوں، بلکہ میں کمزور ہوں، یا مثلاً ایک عالم ہے، وہ یہ کہے کہ میں عالم نہیں ہوں، بلکہ جاہل ہوں، یہ تو جھوٹ ہوگیا۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں باتوں کے درمیان کیسے تطبیق ہوگی کہ تکبر بھی نہ ہو اور جھوٹ بھی نہ ہو۔

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص۱۵۴

(۲) الزمر: ۹، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''کہو کہ: ''کیا وہ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے سب برابر ہیں؟''

اس اشکال کا جواب

ایک اور جگہ پر حضرت والا نے ایک اور جملہ ارشاد فرمایا ہے، اس کو یاد رکھنا چاہئے، اس سے یہ مسئلہ آسان ہو جاتا ہے وہ یہ کہ

''اپنے آپ کو اکمل سمجھنا تکبر نہیں، افضل سمجھنا تکبر ہے''

اکمل سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ دوسرے کے پاس بظاہر علم کم ہے اور میرے پاس علم زیادہ ہے، اس کی صحت اچھی نہیں ہے اور میری صحت اچھی ہے، اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس الحمد للہ اتنے پیسے ہیں، اس کے پاس چھوٹا مکان ہے اور میرے پاس بڑا مکان ہے، اس کی اولاد کم ہے اور میری اولاد زیادہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں مقدار کے اعتبار سے اپنے آپ کو زیادہ سمجھنا تکبر نہیں۔ البتہ افضل سمجھنا کہ میں اس سے افضل ہوں، یہ تکبر ہے۔ اور اس کا علاج حضرت والا نے یہ بتا دیا کہ آدمی یہ سوچے کہ کیا معلوم خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے۔

اس نعمت پر شکر ادا کرے

یہ جو اوپر بیان کیا کہ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں اکمل سمجھنا اور عِلم میں زیادہ سمجھنا تکبر نہیں، یا عمر میں زیادہ سمجھنا، یا صحت میں زیادہ سمجھنا، یا مال میں زیادہ سمجھنا تکبر نہیں، اس میں بھی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ دل میں جس زیادتی کا خیال آرہا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اور یہ کہے کہ یہ زیادتی میری قوتِ بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ جل جلالہ کی عطا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی عطا کا تصور کرے گا تو اس سے تکبر پیدا نہیں ہوگا۔

افضل سمجھنا بے بنیاد ہے

اور اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھنا بالکل بے بنیاد ہے، کیا معلوم کہ آخر میں جا کر کیا انجام ہونا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں کون مقرب ہے اور کون مقرب نہیں ہے، نہ وہاں علم کی بڑائی کام آئے گی، نہ عمر کی بڑائی کام آئے گی، نہ وہاں مال و دولت کی کثرت کام آئے گی، نہ اس کی گارنٹی ہے کہ جس کے پاس علم زیادہ ہے وہ ضرور افضل ہوگا، جبکہ حدیث شریف میں ہے کہ سب سے پہلے جہنم جس کے ذریعہ سلگائی جائے گی وہ ایک عالم ہوگا۔ لہٰذا صرف علم کے بھروسے پر یا اس بنا پر کہ لوگ دنیا میں میرے ہاتھ چومتے ہیں، یا مجھے بڑا سمجھتے ہیں، یا علامہ سمجھتے ہیں، میں افضل ہوں۔ یاد رکھئے! اس پر کوئی بھروسہ نہیں ہے، جب حساب کتاب کا منظر سامنے ہوگا تو بڑے بڑے علامہ دھرے رہ جائیں

گے، لہٰذا علم کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے کیا افضل سمجھے۔

اسی طرح مال کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے کیا افضل سمجھے، جبکہ قیامت کے دن بڑے بڑے مالدار جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ لہٰذا جب کسی بات کا بھروسہ نہیں تو پھر کس بنیاد پر آدمی اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ایک آدمی نے ان سے یہ کہہ دیا کہ تم تو میرے کتے سے بدتر ہو۔ ان بزرگ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ابھی میرا کچھ پتہ نہیں کہ میں کتے سے بدتر ہوں یا نہیں، جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اور وہاں پر میں حساب کتاب کے مرحلے کو پار کر گیا تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کتے سے افضل ہوں، اور اگر میں وہاں حساب کتاب کے مرحلے سے نہ گزر پایا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہوگیا تو پھر بیشک تم ٹھیک کہتے ہو کہ میں کتے سے بدتر ہوں، اس لئے کہ کم از کم اس کتے کو حساب کتاب نہیں دینا پڑے گا اور اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سامنا نہیں ہوگا۔

یہ خیال دل سے نکال دیں

یہ ہیں حقیقی معنی میں اللہ والے، دوسرا شخص گالی دے رہا ہے، لیکن یہ اپنے حقائق اور معارف میں گم ہیں، اور اپنی حقیقتِ حال کو دیکھ رہے ہیں کہ میری حقیقت تو یہ ہے۔ لہٰذا دماغ سے افضل ہونے کا خیال نکال دو۔ نفس سے کہے کہ تمہیں کیا معلوم کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے، ممکن ہے کہ اس کا باطن اچھا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑا ذلیل و خوار ہوں، اور خدا تعالیٰ نے تجھ کو دو چار حرف ظاہری سکھا دیئے ہیں، اس لئے تو بڑائی کرتا ہے، اگر وہ چاہے تو آج چھین لے۔ کس چیز پر تو اکڑتا ہے اور اتراتا ہے؟ کیا یہ علم تجھے ماں کے پیٹ سے حاصل ہوگیا تھا؟ کسی نے اپنے فضل و کرم سے عطا فرما دیا، اور جس نے عطا فرمایا ہے وہ جب چاہے سلب کر لے۔ جب چاہے واپس لے لے۔

کیا تو مال پر اکڑتا ہے، کیا یہ مال تجھے ماں کے پیٹ سے ملا تھا؟ کسی دینے والے نے مال دیا ہے، اور جس نے دیا ہے وہ جب چاہے واپس لے لے۔ کیا تو صحت پر اکڑتا ہے؟ بڑے بڑے تندرست اور توانا لوگ ایسے گزرے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے صحت واپس لی تو وہ بتاشے کی طرح بیٹھ گئے۔

سبق آموز واقعہ

ہمارے ایک عزیز تھے، جن کا ابھی ایک دو سال پہلے انتقال ہوا۔ ان کے بارے میں سارے دیوبند میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ برف کی سلی کو مُکا مار کر توڑ دیتے تھے، اتنے طاقتور تھے، انہوں نے کبھی بھی زندگی میں تربوز کو چاقو سے نہیں کاٹا، بس مُکا مارا اور توڑ دیا، اور اس کے ساتھ ساتھ بڑے عابد وزاہد آدمی تھے۔ بعد میں لاہور میں مقیم ہو گئے تھے، چار پانچ سال پہلے لاہور میں ان سے ملاقات کے لئے گیا تو دیکھا کہ کھانا کھانے کے لئے ہاتھ منہ تک نہیں اُٹھ رہا تھا، دوسرے لوگ کھانا کھلا رہے تھے، جب میں ان کے پاس پہنچا تو مجھے دیکھ کر رو پڑے، اور کہنے لگے کہ یہ وہی ''حامد'' ہے جو برف کی سلی مُکّے مار کر توڑ دیا کرتا تھا، اور اب یہ حال ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھا سکتا۔

تم کس بات پر اِتراتے ہو؟

ارے تم کس بات پر اتراتے ہو؟ صحت پر اتراتے ہو؟ قوت پر اتراتے ہو؟ کیا مال پر اتراتے ہو؟ کیا علم پر اتراتے ہو؟ ارے ان میں سے کوئی چیز ایسی ہے جس کی ہمیشہ تمہارے پاس رہنے کی گارنٹی ہو؟ بلکہ کسی دینے والے نے دی ہے، وہ جب چاہے واپس لے لے۔ اس لئے یہ دو چار حرف اس نے سکھا دیئے ہیں، وہ اگر آج چھین لے تو تم کیا کر لو گے؟ بس اس کا استحضار اور تکرار کیا جائے، جب کبھی دل میں بڑائی کا خیال آئے، بس اس کا دھیان کر لے کہ کسی دینے والے نے یہ وصف اپنے فضل سے دیا ہے، اپنے انعام سے دیا ہے، تیرا کوئی استحقاق نہیں تھا، کتنے لوگ ہم میں ایسے ہیں جو جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، اور جس طرح دیا ہے وہ اسی طرح واپس بھی لے سکتا ہے۔ لہٰذا تیرے لئے اترانے اور اکڑنے کا اور دوسروں پر بڑائی جتلانے کا اور اپنے آپ کو افضل سمجھنے کا کوئی موقع نہیں، ہاں، شکر کا موقع ہے کہ اے اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی، میں اس کا مستحق نہیں تھا، اور میرے قبضۂ قدرت میں نہیں تھا، آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمائی، اے اللہ! آپ کا شکر ہے۔

''اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ''

''شکر'' بے شمار بیماریوں کا علاج

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شکر ایسی چیز ہے کہ یہ بیشمار روحانی بیماریوں کا علاج ہے۔ جو آدمی شکر کرے گا، وہ کبھی تکبر میں مبتلا نہیں ہوگا، انشاء اللہ۔ اس لئے کہ شکر

کے معنی کیا ہیں؟ شکر کے معنی یہ ہیں کہ یہ نعمت جو مجھے ملی ہوئی ہے، میں اس کے لائق نہیں تھا، میں اس کا مستحق نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دی ہے، اس کا شکر و احسان ہے۔

فرض کی ادائیگی شکر کا موقع نہیں

شکر کب کیا جاتا ہے؟ اگر کوئی شخص اپنا فریضہ ادا کرے یا قرضہ ادا کرے، تو کیا قرض خواہ کے ذمے شکر ادا کرنا واجب ہے؟ نہیں۔ مثلاً ایک آدمی مجھ سے ایک ہزار روپے قرض لے گیا، اور یہ کہا کہ دو مہینے بعد واپس کروں گا، یہ احسان تو میں نے کیا کہ میں نے ایک ہزار روپے بطور قرض دیئے، اس کو چاہئے کہ میرا شکریہ ادا کرے، پھر جب دو ماہ بعد وہ ایک ہزار روپے مجھے واپس لا کر دے گا، تب بھی احسان دینے والے کا رہا کہ اس نے ایک ہزار روپے دیئے تھے اور دو ماہ تک اس ہزار روپے سے اپنے آپ کو محروم رکھا، لہٰذا وہ قرض دار جب واپس لا کر دے رہا ہے تو وہ کوئی احسان نہیں کر رہا ہے، لہٰذا وہ شکریہ کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔

شکر کا موقع یہ ہے

شکریہ اس وقت ادا کیا جاتا ہے جب آدمی اپنے فریضہ سے زیادہ کام کرے، مثلاً ایک ہزار روپے دوسرے کے ذمے واجب تھے، واپس کرتے وقت اس نے ایک ہزار کے بجائے بارہ سو روپے اپنی طرف سے خوشدلی کے ساتھ واپس کر دیئے۔ چونکہ اس نے زیادہ دے کر احسان کیا، لہٰذا اس کا شکریہ واجب ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذمے یہ کام ضروری اور واجب نہیں تھا، اور میں اس کا مستحق تو نہیں تھا لیکن اللہ جل جلالہ نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی۔ لہٰذا شکر کے اندر خود یہ اعتراف پنہاں ہے کہ میں اس کے لائق نہیں تھا، اور جو شخص لائق نہ ہونے کا اعتراف کرے کیا وہ تکبر میں مبتلا ہو سکتا ہے؟ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت ملے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، انشاء اللہ تکبر کی جڑ کٹتی جائے گی

شیطان کے داؤ سے بچنے کا طریقہ

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جب شیطان راندۂ درگاہ ہو گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے کہا:

﴿ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ﴾(۱)

(۱) الاعراف: ۱۷

چونکہ ابنِ آدم نے مجھے تباہ کیا ہے، اس لئے اس کا بدلہ لینے کے لئے اس کے پاس دائیں سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا، اور ابن آدم کو گمراہ کروں گا۔ (آخر میں کہتا ہے کہ) آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔

ہمارے حضرت والا فرماتے تھے کہ شیطان چونکہ بڑا اخرانٹ ہے، اس کو یہ معلوم ہے کہ جو آدمی شکر کرنے والا ہوگا، اس کے سامنے میری نہیں چلے گی، اس پر میرا داؤ نہیں چلے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا ہو، اس پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔

عین پریشانی میں نعمتوں کو یاد کرو

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی جو نعمت حاصل ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور ایک وقت میں صرف ایک نعمت نہیں ہے بلکہ ہر لمحے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش برس رہی ہے۔

﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا﴾(۱)

"اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو شمار نہیں کر سکو گے"

انسان چونکہ ناشکرا ہے، اس لئے اگر ذرا سی کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے یا پریشانی آجاتی ہے تو اس کو ہر وقت گاتا رہتا ہے، اور عین اس تکلیف اور پریشانی کے وقت میں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں متوجہ اور مبذول ہیں، ان کا کوئی ذکر نہیں، ان کی طرف ذرا سا دھیان نہیں، ورنہ عین تکلیف اور پریشانی کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی اتنی نعمتیں ہماری طرف متوجہ ہوتی ہیں کہ ہم ان کا شمار نہیں کر سکتے۔

"شکر" کا ایک انوکھا انداز

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک نانا تھے، حضرت والا کی تربیت میں ان کو بھی بڑا دخل رہا ہے، بڑے فاضل اور بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں بچپن میں رات کو سونے کے وقت ان کو دیکھتا تو مجھے عجیب نظر آتا تھا، وہ یہ کہ میرے نانا رات کو سونے کے وقت بستر پر بیٹھ جاتے اور بڑے والہانہ انداز میں پڑھنا شروع کر دیتے:

"اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ"

مسلسل جھوم جھوم کر کافی دیر تک یہ پڑھتے رہتے۔ جب میں نے کچھ ہوش سنبھالا تو میں نے ایک دن ان سے پوچھا کہ یہ رات کو سونے سے پہلے آپ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب میں فرمایا

(۱) ابراھیم: ۳٤

کہ بات دراصل یہ ہے کہ سارا دن تو غفلت میں گزر جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں ہوتا، اس لئے میں رات کو سونے سے پہلے بستر پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں۔

یا اللہ! آپ نے یہ مکان عطا فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ
آپ نے صحت عطا فرمائی ۔۔۔۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ
آپ نے رزق عطا فرمایا ۔۔۔۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ
آپ نے یہ آرام دہ بستر عطا فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ
آپ نے عافیت عطا فرمائی۔ ۔۔۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ
آپ نے بیوی عطا فرمائی ۔۔۔۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ
آپ نے بچے عطا فرمائے ۔۔۔۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں تا کہ ان نعمتوں کے شکر کا ہزارواں یا لاکھواں حصہ زبان سے ادا ہو جائے۔

سونے سے پہلے شکر ادا کرلو

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ تم بھی ایسا ہی کیا کرو، رات کو سونے سے پہلے تمام نعمتوں کا شکر ادا کرلیا کرو۔ ذرا سا دھیان کرو گے تو سینکڑوں نعمتوں کا استحضار ہو جائے گا۔ ارے صرف ایک نعمت کو سوچنا شروع کرو گے تو وہ بھی اتنی زیادہ نظر آئے گی کہ ساری عمر بھی سجدے میں پڑے رہو گے تب بھی اس ایک نعمت کا شکر ادا نہیں ہوگا۔ یہ دو آنکھیں اللہ تعالیٰ نے دی ہیں، ایک آنکھ کو لے لو اور اس کے بارے میں سوچو کہ یہ کیسی نعمت ہے؟ ذرا سا اس میں بال آجائے تب اندازہ ہوگا کہ کیسی نعمت ہے، اسی ایک نعمت کو سوچنا شروع کردو گے تو حق شکر ادا نہیں ہو سکے گا۔

تکبر سے بچنے کا ایک نسخہ

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میاں! یہ تکبر بڑی خراب چیز ہے، بڑے بڑے معالجوں کو چکر دے دیتی ہے، اس کا علاج کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن میں تمہیں ایک چٹکلہ بتا رہا ہوں، اس چٹکلے پر عمل کرلو تو انشاء اللہ پھر اس تکبر کی بیماری میں مبتلا ہی نہیں ہو گے، اور اگر ہو گئے تو انشاء اللہ جلدی نکل جاؤ گے، وہ چٹکلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔ ہر وقت، ہر لمحے، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کے شکر کی رٹ لگاؤ۔ موسم اچھا ہے......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

ہوا چل رہی ہے......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

جو اچھی بات سامنے آئے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، جتنا جتنا شکر ادا کرو گے، انشاء اللہ تکبر سے اتنی ہی حفاظت رہے گی۔ کہنے کو تو یہ چھوٹا سا چٹکلہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڑے کانٹے کی بات ہے، اور عمل کرنا بھی اس پر مشکل نہیں، صرف دھیان کرنے اور مشق کرنے کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تکبر کی اقسام

فرمایا:

''اقسام کبر کے اس کثرت سے ہیں کہ لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی۔ اور اکثر ان میں ادق اور اغمض اس قدر ہیں کہ بجز محقق کے کسی کی بھی نظر وہاں نہیں پہنچتی، اور اس میں علماء ظاہر کو بھی اس محقق کی تقلید بلا تفحص حقیقت کرنا پڑتی ہے''(۱)

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ کبر کی بیماری ایسی ہے کہ خود بیمار کو پتہ نہیں ہوتا کہ میں اس بیماری میں مبتلا ہوں اور کبر کی بعض قسمیں اتنی دقیق اور باریک ہیں کہ اکثر اوقات بیمار کو اس کا پتہ نہیں چلتا، ایسا شیخ جو محقق بھی ہو، وہی پتا لگاتا ہے کہ اس کو یہ بیماری ہے یا نہیں ہے، اور اس بیماری کا علاج کیا ہے؟

کبر کے مختلف علاج

ایک مثال کے ذریعہ اس کو سمجھئے! وہ یہ کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں یہ معمول تھا کہ جب کوئی شخص اپنی اصلاح کرانے کے لئے آتا تو ''کبر'' کا علاج سب سے پہلے کیا جاتا تھا، حضرت والا مختلف لوگوں کے لئے مختلف علاج تجویز فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً کسی کے اندر دیکھا کہ اس کے اندر ''تکبر'' ہے تو آپ نے اس سے فرمایا کہ تم ہر نماز کے بعد مسجد میں یہ اعلان کیا کرو کہ بھائیو! میرے اندر تکبر کی بیماری ہے، میرے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نجات عطا فرمائے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک متکبر آدمی جس کے دل میں تکبر اور اپنی بڑائی ہے، اس کو جب بھرے مجمع میں یہ اعلان کرنا پڑے کہ میرے اندر تکبر ہے تو اس اعلان کے نتیجے میں اس کے دل پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۴

لیکن جب شیخ کے حکم سے کرتا ہے تو دل پر اتنی زور کی ضرب پڑتی ہے کہ وہ سارا تکبر ختم ہو جاتا ہے۔

یا مثلاً کسی متکبر کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ تم نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو۔ ہر ایک کو مختلف علاج بتائے، کیونکہ ہر آدمی کے لئے ایک علاج نہیں ہوتا، چونکہ بیماریاں مختلف ہوتی ہیں، ان کے انداز مختلف ہوتے ہیں، اسباب مختلف ہوتے ہیں، حالات مختلف ہوتے ہیں، اس لئے ایسا نہیں ہے کہ ایک علاج سب کے لئے تجویز کردو، جیسے حکیم صاحب نے ایک ہی جوشاندہ سب کے لئے تجویز کردیا۔ یا کوئی شخص یہ سوچے کہ چونکہ حضرت والا نے فلاں شخص کو فلاں بیماری میں یہ علاج تجویز کیا تھا، لہٰذا میں بھی وہی علاج کرلوں، یہ ٹھیک نہیں ہے، بلکہ شیخ دیکھتا ہے کہ اس کے لئے کیا مناسب ہے۔

خود اپنا علاج کرنا

ایک صاحب نے یہ دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فلاں شخص کو یہ علاج بتایا ہے کہ تم نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو۔ اب بجائے اس کے کہ اپنے علاج کے لئے خود رجوع کرتے اور اپنے لئے علاج تجویز کراتے، ان صاحب کو دیکھ کر خود اپنا علاج شروع کردیا اور نمازیوں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کردیئے۔ حضرت کو پتہ چلا کہ فلاں صاحب نے خود سے یہ کام شروع کردیا ہے، آپ نے اس کو بلایا، اور اس سے فرمایا کہ اس طرح علاج نہیں ہوا کرتا، اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارے اس طرح لوگوں کے جوتے سیدھے کرنے سے تمہارے تکبر میں اور زیادہ اضافہ ہوگا، اس تکبر میں کمی نہیں ہوگی، اس لئے کہ دماغ میں شیطان یہ بات بٹھائے گا کہ دیکھو تو کتنا متواضع ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ آدمی خود اپنے تکبر کا علاج کرنے بیٹھ جائے، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس کو یہ علم عطا کیا ہو، وہی یہ کام کرسکتا ہے۔

کسی شیخ سے تربیت حاصل کرنا

عام طور پر یہ علم عطا نہیں ہوتا جب تک اس نے اپنے آپ کو پامال نہ کیا ہو، شیخ تھوڑے رگڑے دیتا ہے، اس رگڑے کھانے کے نتیجے میں وہ کبر دل سے نکلتا ہے اور اس وقت حقیقت کھلتی ہے کہ کس کبر کا کیسے علاج کیا جائے۔ ہمارے یہ جتنے بزرگ جن کا نام لے کر ہم زندہ ہیں: حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، یہ حضرات رگڑے کھائے ہوئے تھے، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو خود ساختہ پیر بن کر بیٹھ گیا ہو، بلکہ ان سب نے رگڑے کھائے تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ جب نئے نئے درسِ نظامی سے فارغ ہوئے اور عالم بن گئے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ علم تکبر پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے کہ عالم بننے کے بعد دماغ میں یہ بات آجاتی ہے کہ میں نے بہت کچھ پڑھ لیا، مجھے بہت کچھ آتا ہے۔ بہر حال، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، یہ ہمارے تمہارے جیسے عالم نہیں تھے کہ بس کچے پکے پڑھ کر عالم بن گئے بلکہ ان کی استعداد بڑی پختہ تھی۔ اس وقت تھانہ بھون کی خانقاہ میں تین بزرگ بیٹھتے تھے، ایک حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، دوسرے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور تیسرے حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ، ان کو "اقطابِ ثلاثہ" کہا جاتا ہے، یہ تین اولیاء اللہ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم تھے، ان کا ایک رسالہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر سے گزرا، اس رسالے میں کوئی ایسی بات لکھی ہوئی تھی جو علمی طور پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو صحیح معلوم نہیں ہو رہی تھی، چنانچہ انہوں نے ارادہ کیا کہ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلہ پر مناظرہ کروں۔ چنانچہ مناظرہ کی نیت سے گنگوہ سے تھانہ بھون کی طرف روانہ ہوئے۔

جب تھانہ بھون پہنچے تو چونکہ پہلے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، اور حضرت حاجی صاحب سے پہلے سے شناسائی تھی، اس لئے سلام کرنے کے لئے حاجی صاحب کے پاس رکے۔ حضرت حاجی صاحب نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ کہا کہ شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جا رہا ہوں۔ کیوں جا رہے ہو؟ ان سے مناظرہ کرنا ہے۔ توبہ توبہ، وہ اتنے بڑے عالم، اور تم ابھی نئے نئے فارغ ہوئے ہو، اور ابھی ابھی مولوی بنے ہو، اور اتنے بڑے عالم سے مناظرہ کرنے جا رہے ہو، جو اللہ والے بھی ہیں۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت! انہوں نے ایک رسالے کے اندر ایسی غلط بات لکھ دی ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا کو ٹھنڈا کیا، اور اسی ٹھنڈا کرنے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی کایا پلٹ دی، حاجی صاحب کی ان پر ایسی نظر پڑی کہ مناظرہ کرنے کا جو ارادہ تھا وہ تو ختم کر دیا، اور وہیں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے۔

تمہیں سب کچھ دے دیا

پھر چالیس دن وہاں رہے، حالانکہ جب گنگوہ سے چلے تھے اس خیال سے چلے تھے کہ تھوڑی دیر بعد واپس آجاؤں گا، اس لئے کوئی کپڑا وغیرہ بھی ساتھ نہیں لیے تھے، بلکہ جو جوڑا پہن کر آئے تھے،

اسی کو دھو کر سکھا کر دوبارہ پہن لیتے، اس طرح چالیس دن وہاں گزار دیئے۔ اس قیام کے دوران حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب رگڑے کھلائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب چالیس دن کے بعد واپس جانے لگے تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمایا:

''میاں رشید احمد! جو کچھ میرے پاس امانت تھی، وہ ساری میں نے تمہارے حوالے کر دی''

یہ کوئی معمولی مقام ہے کہ شیخ یہ کہے کہ جو کچھ میرے پاس تھا، وہ سب کچھ میں نے چالیس دن میں تمہیں دے دیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ مقام عطا فرمایا تھا۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب حالت

پھر جب آپ واپس گنگوہ پہنچے تو ایک عرصے تک عجیب استغراق کی حالت طاری رہی، حتیٰ کہ بہت عرصے تک حضرت حاجی صاحب کو خط بھی نہیں لکھا، تو حضرت حاجی صاحب نے خود خط لکھا کہ

''مدت سے آں عزیز کی خیریت معلوم نہیں ہوئی، کس حالت میں ہیں، خط کے ذریعہ اپنے حالات سے مطلع کریں''

اب دیکھئے! یہ خط شیخ اپنے مرید کو لکھ رہا ہے۔ جواب میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ

''حضرت! بہت دن سے خط نہیں لکھ سکا، کوتاہی رہی، لیکن اس لئے نہیں لکھا کہ اپنی حالت لکھتے ہوئے شرم معلوم ہوتی تھی کہ کیا اپنا حال لکھوں، آپ سے تعلق بھی ہو گیا، اس کے باوجود اپنی بے حالی کو کیا لکھوں۔ اس لئے شرم معلوم ہوتی تھی، البتہ آپ کی دعاؤں اور توجہ سے اتنا فرق ضرور معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) شریعت طبیعت بن گئی ہے۔

یعنی جس طرح انسان کے اندر طبعی تقاضے بھوک اور پیاس کے ہوتے ہیں اور جب تک انسان ان تقاضوں کو پورا نہ کر لے، انسان کو اس وقت تک چین نہیں آتا، اسی طرح شریعت کے تقاضوں پر جب تک عمل نہ کرلوں، اس وقت تک چین نہیں آتا۔

(۲) مادح اور ذام یکساں ہو گئے ہیں۔

یعنی تعریف کرنے والا اور برائی کرنے والا دونوں برابر ہو گئے ہیں، کوئی تعریف کرے تو، اور کوئی برائی کرے تو، دونوں کے اندر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا کہ یہ تعریف کر رہا ہے اور یہ برائی کر رہا ہے، نہ تعریف سے طبیعت میں کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے اور نہ برائی سے طبیعت میں کوئی تغیر آتا ہے۔

(۳) کسی مسئلہ شرعی میں کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔

جب یہ خط تھانہ بھون میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا تو آپ نے وہ خط اپنے سر پر رکھ لیا اور فرمایا کہ

''یہ حال جو انہوں نے لکھا ہے، یہ تو اب تک ہمیں بھی حاصل نہیں ہوا''

بہرحال! یہ کیسے شیخ اور کیسے مرید تھے۔ یہ ایسے ہی نہیں بن جاتے، بلکہ کچھ رگڑے کھانے پڑتے ہیں۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ

انہی چالیس دن کے قیام کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک دن حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا کہ آج تم ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ چنانچہ کھانے کے وقت تشریف لے آئے۔ دستر خوان پر سالن کے دو پیالے تھے۔ ایک میں کوفتے ایک میں دال تھی۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کوفتے کے سالن کا پیالہ اپنے پاس رکھا اور دال کا پیالہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ اشارہ اس طرح کر دیا کہ دال تم کھاؤ، کوفتے ہم کھائیں گے۔ کھانے کے دوران حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ پہنچ گئے۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ

''حضرت! یہ کیا آپ کر رہے ہیں کہ خود تو کوفتے کھا رہے ہیں اور اس کو دال کھلا رہے ہیں؟''

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ

''ارے یہ تو میرا احسان ہے کہ اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلا رہا ہوں، حق تو یہ تھا کہ روٹی پر دال رکھ کر ہاتھ میں دے دیتا کہ باہر سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھالے''

یہ الفاظ کہنے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے کی طرف دیکھا کہ اس بات سے ان کے چہرے پر کوئی تغیر آیا یا نہیں؟ دیکھا کہ کوئی تغیر نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ الحمدللہ کبر کی بیماری نکل گئی ہے۔ بہرحال! اس طرح رگڑے دیئے جاتے ہیں، تب جا کر علاج ہوتا ہے، ہر ایک کے بس کا کام نہیں کہ وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرلے کہ میرا کیا علاج ہے۔

شیخ سے علاج تجویز کراؤ

ایک صاحب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا کرتے تھے، وہ اپنا علاج خود تجویز کر لیا کرتے تھے، خود ہی فیصلہ کر لیا کہ میرے اندر تکبر کی بیماری ہے اور پھر خود ہی اپنا علاج تجویز کر لیا۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو پکڑ لیا اور فرمایا کہ اس طریقے سے تمہارا نفس اور زیادہ موٹا

ہو رہا ہے، اور تمہارے اندر اور زیادہ تکبر بڑھ رہا ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اس ''تکبر'' کی بیشمار قسمیں ہیں، ہر ایک کا حکم الگ ہے، ہر ایک کا علاج الگ ہے۔ اس لئے اس کے علاج کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو کسی شیخ کے حوالے کر دو۔ وہ شیخ پہلے یہ دیکھے گا کہ تکبر ہے یا نہیں؟ کیونکہ بعض اوقات حقیقت میں تکبر نہیں ہوتا، بلکہ تکبر کا شبہ اور دھوکہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات تکبر ہوتا ہے مگر اسے تکبر نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے شیخ پہلے تشخیص کرے گا کہ اس کے اندر تکبر ہے یا نہیں؟ تشخیص کرنے کے بعد وہی اس کا علاج بھی تجویز کرے گا۔

شیخ کی تقلید محض کرو

حتیٰ کہ جو شخص بظاہر عالم اور فارغ التحصیل ہے، قرآن و حدیث اور فقہ و تفسیر سب کچھ پڑھا ہوا ہے، بظاہر تو وہ سب کچھ جانتا ہے، لیکن ایسے عالم کو بھی شیخ محقق کی تقلید محض کرنی پڑتی ہے۔ جب شیخ یہ کہہ دے کہ تمہارے اندر کبر ہے تو سمجھ لے کہ ہاں میرے اندر کبر ہے، اور پھر اس کا علاج کرائے۔ چوں چرا کی گنجائش نہیں، اگر چوں چرا کرے گا تو مارا جائے گا۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ

''تلمیذے کہ چون و چرا نکند و مریدے کے چون و چرا کند، ہر دو را بصحرا باید فرستاد''

یعنی وہ شاگرد جو علم ظاہر حاصل کر رہا ہے، اگر وہ چوں و چرا نہ کرے، اس کو باہر نکال دو، وہ شاگرد بننے کے لائق نہیں، اس کا کام ہی یہ ہے کہ سمجھنے کے لئے سوال کرے، جو شبہ پیدا ہو جائے اسے پیش کرے۔ اور جو شخص کسی شیخ کا مرید ہو، وہ چوں و چرا کرے کہ یہ آپ نے کیوں کیا؟ ایسا کیوں کیا؟ ایسے مرید کو جنگل بھیج دینا چاہئے، وہ مرید بنائے جانے کے قابل نہیں ہے۔ لہٰذا شاگرد کا وظیفہ یہ ہے کہ چون و چرا کرے اور سوال کرے، جو شاگرد سبق میں خاموش بیٹھا ہے اور کبھی کچھ پوچھتا ہی نہیں، وہ احمق ہے، وہ سبق کا حق ادا نہیں کر رہا، اور مرید کا کام یہ ہے کہ وہ خاموش بیٹھے، وہ چون و چرا نہ کرے، وہ اگر چوں و چرا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر خرابی ہے۔

لہٰذا جو عالم ظاہر ہو، اس کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہ بلا چوں و چرا شیخ کی بات کو تسلیم کرے، اس لئے کہ علم کے اندر خود رفعت کی شان موجود ہے، لہٰذا جس شخص کو کوئی علم حاصل ہو جاتا ہے، اس کے اندر خود بخود ترفع اور بڑائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ میرے اندر یہ کمال حاصل ہوا۔ اس لئے اکثر و بیشتر علم کے ساتھ تکبر آ ہی جاتا ہے، جب تک اس کی تربیت نہ ہو اور رگڑے نہ کھائے۔

بھائی ذکی کیفی مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

میرے سب سے بڑے بھائی محمد ذکی کیفی مرحوم رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو شاعر بھی تھے۔ بچپن میں انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں کافیہ اور شرح جامی تک کتابیں پڑھی تھیں، اس کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا، پھر تجارت وغیرہ میں لگ گئے۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ بھائی جان! آپ نے تعلیم مکمل کیوں نہیں کی تھی، درمیان میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟ جواب میں فرمایا کہ بڑے میاں نے ہمارا معاملہ ختم کر دیا تھا۔ ''بڑے میاں'' سے مراد حضرت میاں سیّد اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ میں نے پھر سوال کیا کہ قصہ کیا ہوا تھا؟ فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میں گھر سے دارالعلوم دیوبند پڑھنے کے لئے جارہا تھا، راستے میں حضرت میاں صاحب کا مکان تھا، اور حضرت میاں صاحب گھر میں تشریف فرما تھے۔ ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا یہ اثر تھا کہ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ میاں صاحب کے گھر کے پاس سے گزریں اور میاں صاحب سے سلام کر کے اور دعا کرا کے نہ جائیں۔ میں نے سوچا کہ حضرت میاں صاحب موجود ہیں، چلو ان کو سلام کر کے دعا کرالوں پھر مدرسہ جاؤں۔ میاں صاحب اپنے پاس بادام وغیرہ بھی رکھا کرتے تھے، جب کوئی بچہ ان کے پاس ملاقات کے لئے آتا تو اس کو بادام وغیرہ بھی دیا کرتے تھے۔

''علم'' تعلّی کا سبب

بہر حال! میں ان کے پاس گیا اور جا کر سلام کیا۔ حضرت میاں صاحب نے جواب دیا۔ پھر میں نے دعا کی درخواست کی ''حضرت! میرے لئے دعا فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے علم عطا فرمادے'' بڑے میاں نے جواب دیا: نا بھائی نا، علم بڑی خراب چیز ہے، میں تمہارے واسطے دعا نہیں کرتا۔ میں بڑا پریشان ہوا کہ یا اللہ! یہ فرمارہے ہیں کہ علم بڑی خراب چیز ہے۔ پھر اپنے بارے میں فرمانے لگے کہ میاں صاحب پہلے دارالعلوم میں مولسری کے درخت کے نیچے پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھا کرتا تھا، اور اب چوکی پر بیٹھ کر پڑھاتا ہے، اور اب میاں صاحب سے کہو کہ نیچے بیٹھ کر پڑھاؤ تو میاں صاحب کے مزاج میں فرق آجاتا ہے۔ میاں! علم تو تکبر پیدا کرتا ہے، اس واسطے میں تمہارے واسطے علم کی دعا نہیں کرتا۔ بھائی جان کہتے ہیں کہ مجھے اسی دن خطرہ ہوگیا تھا کہ بڑے میاں نے ہمارا تو پتہ صاف کر دیا، اب یہ علم پورا ہونے والا نہیں۔ بہر حال! وہ تو صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان پر منکشف فرمایا ہوگا کہ اس علم کی تکمیل انکے حق میں مقدر نہیں ہے، اسلئے مناسب طریقے سے بچے کو بتا دیا

لیکن بات جو ارشاد فرمائی وہ یہ تھی کہ علم تکبر پیدا کرتا ہے، لہٰذا اگر علم کی وجہ سے تکبر پیدا ہوگیا، تو پھر اس علم سے ہزار درجہ بہتر یہ تھا کہ آدمی جاہل رہتا، اور ایک ان پڑھ دیہاتی کی طرح زندگی گزارتا تو کم از کم اللہ تعالیٰ کے یہاں جا کر علم کے اس تکبر اور بڑائی کا عذاب نہ ہوتا۔ اس لئے علم کے ساتھ اکثر و بیشتر یہ چیز جمع ہو جاتی ہے اور اس کا حل اس کے علاوہ کوئی اور نہیں کہ اپنی لگام کسی کے حوالے کرے، وہ یہ دیکھے کہ کیا بیماریاں اس کے اندر پیدا ہو رہی ہیں، اور جو بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں، ان کا علاج کرے۔

علم دو دھاری تلوار ہے

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ علم دو دھاری تلوار ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس علم میں نور عطا فرما دے، اس میں برکت عطا فرما دے اور اس کو نافع بنا دے تو پھر سبحان اللہ، یہ علم کیا عجیب و غریب چیز ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ اس علم میں نور اور برکت نہ ہو، اس میں نافعیت نہ ہو، اور یہ انسان کو کبر اور گھمنڈ میں مبتلا کر دے تو پھر اس علم سے زیادہ مہلک چیز بھی کوئی نہیں ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جتنی مرغن اور شاندار اور مزیدار غذا ہوتی ہے، سڑنے کے بعد وہ اتنی ہی زیادہ بدبودار بن جاتی ہے۔ اگر معمولی غذا ہے، جس میں روغن نہیں ہے، اس کے سڑنے سے تھوڑی بہت بدبو پیدا ہوگی، لیکن مرغن غذا سڑنے کے بعد سارے محلے کو متعفن کر دے گی۔ اسی طرح جتنے اونچے سے انسان گرتا ہے، اتنی ہی چوٹ زیادہ لگتی ہے، اسی طرح یہ علم اگرچہ اعلیٰ درجے کی چیز ہے، لیکن اگر یہ خراب ہو جائے اور انسان کو تکبر اور گھمنڈ میں مبتلا کر دے تو یہ علم انسان کے لئے اتنا ہی مہلک ہے، اس لئے خاص طور پر عالم کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ کسی سے اپنی اصلاح کرائے۔

شیطان کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا کہ کسی شخص نے خواب میں شیطان کو دیکھا کہ وہ بہت ساری گٹھڑیاں اپنی کمر پر اٹھائے لے جا رہا ہے۔ جیسے بنجارہ ایک شہر سے دوسرے شہر سامان اٹھا کر لے جاتا ہے اور بیچتا ہے، اسی طرح وہ بھی سامان لے جا رہا ہے۔ اب گٹھڑیوں کو دیکھا تو کسی گٹھڑی میں پاخانہ بھرا ہوا ہے، کسی میں لید، کسی میں گوبر، اور کسی میں پیشاب بھرا ہوا ہے۔ اس نے شیطان سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ شیطان نے ایک گٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ تکبر ہے، دوسری گٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ حبِ جاہ ہے، کسی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ حسد ہے،

وغیرہ، لیکن یہ سب چیز نجاستوں کی شکل میں تھیں۔ ان صاحب نے پھر شیطان سے پوچھا کہ ان کو کہاں لے جارہا ہے؟ شیطان نے جواب دیا کہ ان کو لے جاکر فروخت کروں گا۔ ان صاحب نے پھر پوچھا کہ پیسے دے کر تجھ سے یہ نجاستیں کون خریدے گا؟ شیطان نے جواب دیا کہ اپنے مال کی منڈی میں جانتا ہوں، اور اس کے گاہک اور خریداروں کو میں جانتا ہوں۔ یہ ''تکبر'' اور ''حب جاہ'' یہ دو نجاستیں میں مولویوں کے پاس جاکر بیچوں گا، وہ ان دونوں کے بڑے شوقین ہیں، ان کو ان دونوں کے کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ حبِ جاہ کا کیا مطلب ہے؟ ''حبِ جاہ'' کے معنی ہیں ''شہرت'' کہ لوگ میرے آگے جھکیں، لوگ میرے معتقد بنیں، لوگ میری تعریف کریں، میری شہرت ہو، یہ سب ''حبِ جاہ'' ہے۔ ''حبِ جاہ'' کو بیچنے کی سب سے بہترین منڈی ''مولوی صاحبان'' ہیں، وہاں جاکر اس کو بیچوں گا، وہ خوب مزے لے کر اس کو کھائیں گے۔

''ہم بھی کچھ ہیں'' کا خیال

بہرحال! یہ علم ایک تو بذاتِ خود فی نفسہ طالبِ علو ہے، اس لئے صاحبِ علم کے اندر تکبر پیدا کرتا ہے۔ دوسری آفت اس علم میں یہ ہے کہ لوگ حاملِ علمِ دین کی عزت کرتے ہیں، کوئی اس کے ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی اس کے پاؤں چوم رہا ہے، کوئی اس کے لئے عزت سے کھڑا ہورہا ہے، کوئی اس کے لئے ہدیہ لارہا ہے، کوئی دعوت کررہا ہے، ان افعال کے نتیجے میں وہ حاملِ علم اپنے بارے میں یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں، یہ اتنی ساری مخلوق جو ہماری عزت کررہی ہے، ہمارے پیچھے پھر رہی ہے، آخر کچھ تو ہمارے اندر کمال ہوگا۔

ایک لالچی کا واقعہ

چنانچہ اہلِ علم کی ایک مثال دیتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ''اشعب طماع'' ایک بہت لالچی انسان تھا۔ ایک مرتبہ راستے سے گزر رہا تھا، بچے اس کو چھیڑنے کے لئے اس کے پیچھے لگ گئے، ان بچوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس نے بچوں سے کہا کہ تم یہاں کیا کررہے ہو، فلاں جگہ جاؤ، وہاں مٹھائی تقسیم ہورہی ہے، چنانچہ بچے اس طرف بھاگے تو خود بھی بچوں کے پیچھے بھاگنے لگا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ سب بچے بھاگ رہے ہیں تو ضرور مٹھائی تقسیم ہورہی ہوگی۔ ہماری مثال بھی ایسی ہے کہ پہلے اپنے علم کے ذریعہ مخلوق کو دھوکہ دیا، اس دھوکہ دینے کے نتیجے میں جب مخلوق ہماری معتقد ہوگئی، اب کوئی ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی دعوت کررہا ہے، کوئی ہدیہ لارہا ہے، کوئی علامہ کا لقب دے رہا ہے، تو اب دماغ میں یہ خیال آیا کہ جب اتنی ساری

مخلوق ہمارے پیچھے چل رہی ہے اور ہماری معتقد ہو رہی ہے تو ہمارے اندر ضرور کوئی وصف ہوگا جس کی وجہ سے یہ ساری مخلوق ہماری معتقد ہو رہی ہے ؏

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

اس کے نتیجے میں وہ عالم اور زیادہ تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

علم پر شکر ادا کریں

لہٰذا جو حضرات علمِ دین سے وابستہ ہیں، یا جن کو اللہ تعالیٰ نے کوئی اور وصف عطا فرمایا ہے، ان کو اس کی بہت زیادہ فکر رکھنے کی ضرورت ہے کہ کہیں یہ بیماری پیدا نہ ہو جائے۔ اور اگر پیدا ہو جائے تو اس کا فوری علاج ضروری ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ اس علم پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کریں کہ یا اللہ! میں اس علم کا مستحق نہیں تھا، پھر بھی آپ نے عطا فرمادیا، اے اللہ! آپ کا شکر ہے۔ اور اس بات کا استحضار کرے کہ یہ علم ان کی عطا ہے، اور وہ جب چاہیں واپس لے لیں، میرا اس پر کوئی کنٹرول نہیں ـــ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿لِكَيۡ لَا يَعۡلَمَ بَعۡدَ عِلۡمٍ شَيۡـًٔا﴾(۱)

سب کچھ پہلے معلوم تھا، بعد میں سب رخصت ہوگیا، اور اب کچھ بھی باقی نہیں۔ اگر انسان کے دماغ کا ذرا سا اسکرو ڈھیلا ہو جائے، تو ایک سیکنڈ کے اندر سارا علم، ساری معرفت، ساری تحقیقات، سب ختم ہو جائیں، لہٰذا انسان کس بات پر اترائے؟ کس بات پر ناز کرے؟ کس بات پر اکڑے؟

عالم اور شیخ کے درمیان فرق

اسی وجہ سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے وقت میں علم کے پہاڑ تھے، لیکن اپنی اصلاح کے لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گئے، جو ضابطے کے پورے عالم بھی نہیں تھے۔ لوگوں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت! یہ کیا قصہ ہوا کہ اُلٹا معاملہ ہوگیا؟ ان کو چاہئے تھا کہ وہ آپ کے پاس آتے، اس لئے کہ آپ عالم ہیں، وہ عالم نہیں ہیں، لیکن آپ ان کے پاس چلے گئے۔

---

(۱) النحل: ۷۰

ایک مثال

جواب میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہماری اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو مٹھائی کے بارے میں پورا علم اور پوری تحقیق حاصل ہے، مثلاً اس کو گلاب جامن کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ یہ سب سے پہلے کس نے ایجاد کی، اس کا موجد کون ہے، کہاں کہاں یہ متعارف ہوئی، کن ملکوں میں یہ کھائی جاتی ہے، کن چیزوں سے اس کو بنایا جاتا ہے، اس کے اجزاء ترکیبی کیا کیا ہیں، اور اس کی کتنی قسمیں ہیں، اور اس کو کیسے پکایا جاتا ہے، اور کیسے تلا جاتا ہے، اور اگر اس سے کہا جائے تو وہ گلاب جامن کے فضائل پر ایک تقریر کردے اور ایک مقالہ لکھ دے لیکن اس سے پوچھا جائے کہ تم نے کبھی گلاب جامن کھائی ہے؟ تو وہ جواب میں کہے میں نے کبھی نہیں کھائی۔ ایک دوسرا شخص ہے جس کو گلاب جامن کی تاریخ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ کس نے ایجاد کی، کون اس کا موجد ہے، کس طرح پکائی جاتی ہے، لیکن روزانہ صبح و شام گلاب جامن کھاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ بتاؤ ان دونوں میں سے کون بہتر ہے؟ وہ بہتر ہے جس میں گلاب جامن پر مقالہ لکھنے کی صلاحیت ہے یا وہ بہتر ہے جو روزانہ صبح و شام گلاب جامن کھاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ بہتر ہے جو روزانہ صبح و شام کھاتا ہے، اگرچہ اس کی تعریف بیان نہیں کرسکتا۔

پھر فرمایا کہ ہماری مثال اس شخص کی سی ہے جس کو گلاب جامن کی پوری تاریخ معلوم ہے، اس کی لغوی اور اصطلاحی تعریف جانتا ہے، لیکن کھائی کبھی نہیں، اور حاجی صاحب وہ ہیں جو روزانہ کھاتے ہیں۔ جب ہم حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں گئے تو ہم نے صرف گلاب جامن کی تاریخ ہی پڑھی تھی، انہوں نے گلاب جامن اٹھا کر ہمارے منہ میں رکھ دی کہ لو گلاب جامن کھالو۔ اس لئے ہم حاجی صاحب کی خدمت میں گئے تھے۔ بہرحال! علم والے کو خاص طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ باطن کی اصلاح کرائے اور کسی شیخ سے تربیت حاصل کرے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کبر کا ایک علاج

فرمایا کہ ”کبر کا ایک علاج یہ ہے کہ عظمتِ حق سبحانہ کو پیش نظر رکھے، جس موقع پر کبر کا اندیشہ ہو اس وقت تو ضرور ورنہ اور بھی بہتر یہ ہے کہ روزانہ ایک وقت اس کے لئے نکال لے“

کبر کا ایک علاج یہ ہے کہ انسان اللہ جل جلالہ کی عظمت کا استحضار کرے، اور اس کے ساتھ

اپنی بے وقعتی کا استحضار کرے۔اس کے علاوہ ایک بزرگ کے جواب کا استحضار کرے جو جواب ان بزرگ نے ایک متکبر کو دیا تھا۔ایک متکبر نے ان بزرگ سے کہا کہ جانتے نہیں ہم کون ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ میں جانتا ہو تو کون ہے؟ تیری حقیقت یہ ہے کہ

"أَوَّلُكَ نُطْفَةٌ مَذِرَةٌ، وَآخِرُكَ جِيفَةٌ قَذِرَةٌ وَ أَنْتَ فِيمَا بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ"

یعنی تیری ابتداء تو ایک گندہ نطفہ ہے، اور تیری انتہاء بدبودار مردار پر ہونے والی ہے، تو ایسی حالت میں پہنچنے والا ہے کہ تیرے عزیز و اقارب اور رشتہ دار بھی تجھے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے، بلکہ تجھے گڑھے میں پھینک آئیں گے، اس لئے کہ اگر تجھے اور زیادہ گھر میں رکھا گیا تو گھر میں بدبو پھیلا دے گا۔لہٰذا تیری ابتداء اور انتہاء تو یہ ہے، اور دونوں کے درمیان کا جو زمانہ ہے، اس میں تو ہر وقت نجاست اُٹھا کر پھر رہا ہے۔

کھال کے ذریعہ پردہ پوشی

اللہ تعالیٰ نے اس کھال کے ذریعہ پردہ پوشی فرما رکھی ہے، یہ کھال اگر کسی جگہ سے چھیل دی جائے تو اندر سے گندگی برآمد ہو جائے گی، کہیں سے خون نکل آئے گا، کہیں سے پیپ نکل آئے گی، کہیں سے پیشاب نکل آئے گا، کہیں سے پاخانہ نکل آئے گا۔ پورے جسم میں گندگی ہی گندگی بھری ہوئی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کھال کے ذریعہ پردہ پوشی فرما رکھی ہے جس کی وجہ سے وہ نجاست نظر نہیں آتی۔حضرت والا فرماتے ہیں: جب کبھی تمہارے دل میں اپنی بڑائی کا احساس پیدا ہو تو ذرا اس بات کو سوچ لیا کرو کہ میری ابتداء کہاں سے ہوئی اور میرا انجام کیا ہونا ہے۔

قضاء حاجت کی حالت کا تصور

حضرت فرماتے ہیں: ایک کارآمد نسخہ اور بتاتا ہوں۔وہ یہ کہ جب دل میں تکبر پیدا ہو، اس وقت اپنی اس حالت کا تصور کر لیا کرو جب قضاء حاجت کے لئے بیٹھتے ہو، اس وقت کیا حالت ہوتی ہے اور کیا شان ہوتی ہے۔بس سارا تکبر دھرا رہ جائے گا اور پتہ چل جائے گا کہ میری حقیقت تو یہ ہے۔

بہرحال اللہ جل جلالہ کی عظمت کا استحضار اور اپنی بے وقعتی کا استحضار کرے۔کس بات پر انسان ناز کرے؟ کس چیز پر فخر کرے؟ نہ کوئی چیز اپنی ہے، نہ اپنی طاقت سے حاصل ہوئی، نہ اپنے بل بوتے پر باقی رہ سکتی ہے، جو کچھ حاصل ہے، وہ سب کسی کی عطا ہے۔

ایک اور علاج

فرمایا کہ ''علاج ہی کا ایک جزو یہ ہے کہ قصداً ایسے افعال اختیار کرے جو عرفاً موجبِ ذلت سمجھے جاتے ہیں۔ اور بدون اس کے دوسرے علاج ناکافی ہیں''

یعنی قصداً ایسا کام اختیار کرے جس کو عام طور پر لوگ ذلت کا کام سمجھتے ہیں، بطور علاج کے وہ کام کرے۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیا کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا علاج کرنا

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک شاندار جبہ پہن کر خطبہ دیا۔ وہ جبہ بہت پسند آیا اور اپنا سراپا اچھا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ جبہ اُتارا اور مشک اُٹھا کر کمر پر لادی، اور پانی بھر کر لوگوں کے گھروں میں پہنچانا شروع کر دیا۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرمانے لگے کہ چونکہ میرے دل میں عُجب کا خیال آ گیا تھا، اس لئے اس کے ذریعہ میں اس عُجب کا علاج کر رہا ہوں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور گورنری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ درس و تدریس کے کام میں لگے رہتے تھے، ان کو سیاست سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ایک مرتبہ بحرین کے گورنر چھٹی پر جا رہے تھے، ان کی جگہ پر ان کو گورنر بنا دیا گیا۔ چونکہ درویش آدمی تھے، ساری عمر قال اللہ و قال الرسول میں گزاری تھی۔ سارا دن گورنری کے کام میں مشغول رہتے، شام کو لکڑیوں کا ایک گٹھڑ سر پر رکھتے اور بازار کے درمیان سے اس طرح گزرتے کہ آواز لگاتے جاتے کہ ہٹو! امیر المؤمنین آ رہے ہیں، ہٹو! امیر المؤمنین آ رہے ہیں۔ گویا کہ راستے میں لوگوں کو متنبہ بھی کرتے جاتے کہ یہ امیر المؤمنین آ رہا ہے جس کے سر پر لکڑی کا گٹھڑ ہے۔ یہ کام اس لئے کرتے کہ کہیں گورنری کی شان کی وجہ سے دماغ میں تکبر پیدا نہ ہو جائے، اس طرح سے اپنا علاج خود کیا۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا طلبہ کے جوتے اُٹھانا

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، جو ''قطب الارشاد امامِ وقت اور ابوحنیفہ عصر'' کے لقب سے مشہور ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ارواحِ ثلاثہ'' میں ان کا واقعہ لکھا ہے کہ حضرت والا

ایک دفعہ سبق پڑھا رہے تھے اور بارش شروع ہوگئی اور طلبہ سے فرمایا کہ اندر چلیں۔ طلبہ اپنی اپنی کتابیں لے کر اندر جانے لگے، اور حضرت والا طلبہ کے جوتے سمیٹ کر اندر لے جانے لگے تا کہ وہ بارش میں بھیگ کر خراب نہ ہو جائیں۔

یہ طلبہ کے جوتے دو وجہ سے اُٹھا رہے تھے: ایک اپنے علاج کی غرض سے کہ کہیں میرے اندر تکبر کا شائبہ پیدا نہ ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جب انسان یہ علاج کر لیتا ہے تو اس کا نفس مزکی اور مجلی ہو جاتا ہے اور جب اللہ والے کا نفس مزکی اور مجلی ہو جاتا ہے تو اس کو یہ بات غیر معمولی معلوم نہیں ہوتی کہ میں طلبہ اور شاگردوں کے جوتے اُٹھا رہا ہوں بلکہ یہ کام بھی اس کے معمول کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو نصیحت

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حضرت سیّد سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے گئے۔ پورے ہندوستان میں جن کے علم کا ڈنکا بج رہا تھا۔ "سیرۃ النبی" کے مصنف، محقق وقت، اور سیاسی اعتبار سے بھی لوگوں کے اندر مشہور و معروف۔ حضرت سیّد صاحب خود بیان فرماتے ہیں کہ میں جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے رخصت ہونے لگا تو میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت! کوئی نصیحت فرما دیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! یہ اتنے بڑے عالم ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں نصیحت کروں۔ یا اللہ! ایسی نصیحت دل میں ڈال دیجئے جو ان کے حق میں فائدہ مند ہو۔ تو اس وقت بیساختہ میرے دل میں یہ بات آئی کہ ہمارے یہاں اوّل و آخر ایک ہی چیز ہے، وہ یہ کہ اپنے آپ کو مٹا دینا۔ حضرت سیّد صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بات کہتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا، وہ جھٹکا میرے دل پر ایسا لگا کہ اسی وقت گریہ طاری ہو گیا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس کے بعد حضرت سیّد صاحب نے اپنے آپ کو ایسا مٹایا، ایسا مٹایا کہ میں نے ایسی بہت کم نظیریں دیکھی ہیں کہ اتنے بڑے عالم نے اپنے آپ کو ایسا مٹایا ہو۔ اس طرح مٹایا کہ میں نے ایک دن حضرت سیّد صاحب کو دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کے باہر حاضرینِ مجلس کی جوتیاں سیدھی کر رہے ہیں۔

علوم تو ان بڑے میاں کے پاس ہیں

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سہ دری میں بیٹھ کر تصنیف کا کام کر رہے تھے، اور حضرت سیّد صاحب دور ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے جہاں سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ان کو نہ دیکھ سکیں۔ میں اچانک پیچھے سے ان کے قریب پہنچا اور کہا کہ حضرت! یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کیا دیکھ رہے ہیں؟ میرے سوال پر اچانک چونک پڑے اور کہا کہ کچھ نہیں۔ میں نے جب اصرار کیا تو فرمایا کہ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ساری زندگی جن چیزوں کو علوم سمجھتے رہے، وہ تو جہل ثابت ہوئے، علوم تو ان بڑے میاں کے پاس ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت سید صاحب کو وہ مقام بخشا کہ خود ان کے شیخ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں یہ شعر کہا۔

از سلیمان گیر اخلاصِ عمل
داں تو ندوی را منزہ از دغل

یہ شعر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سیّد صاحب کے بارے میں کہا۔ بہر حال، اپنے آپ کو مٹانا پڑتا ہے، تب جا کر کچھ بنتا ہے۔

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

کسی کے در پر رگڑے کھائے بغیر یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ شیخ کی نگرانی میں یہ عمل کرے۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مطب ابتداء میں رابسن روڈ پر تھا۔ اسی زمانہ میں میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا اسی مطلب کے کچھ فاصلے پر مکان تھا۔ حضرت ڈاکٹر صاحب خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مطب میں بیٹھا ہوا تھا اور میرے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب کے پاس ظاہری بیماریوں کے مریض بھی آتے تھے اور باطنی بیماریوں کے مریض بھی آیا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہاتھ میں دودھ کی پتیلی لیے ہوئے سڑک پر سامنے سے گزر رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یا اللہ! یہ مفتی اعظم اس طرح سڑک پر پتیلی ہاتھ میں لیے جا رہا ہے۔ جو لوگ مطلب میں بیٹھے ہوئے تھے، ان سے میں سنے پوچھا کہ یہ شخص جو پتیلی ہاتھ میں لیے جا رہا ہے، جانتے ہو یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم نہیں جانتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ پاکستان کے مفتی اعظم ہیں، اور ہاتھ میں پتیلی لیے ہوئے اس طرح جا رہے ہیں جس طرح ایک عام آدمی جاتا ہے۔

کبھی بڑائی کا تصور ہی نہیں آیا

اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تواضع کا وہ مقام عطا فرمایا تھا کہ سچی بات یہ ہے کہ میں نے ایسا متواضع آدمی کوئی نہیں دیکھا۔ ایک تو آدمی بتکلف تواضع کرتا ہے، لیکن ان کے یہاں تواضع کیلئے کوئی تکلف نہیں تھا، کیونکہ ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ میں تو بالکل بے حقیقت ہوں، اور اپنے بارے میں دماغ کے اندر کبھی بڑائی کا تصور کبھی آیا ہی نہیں، اسی وجہ سے ان کو معمولی سے معمولی کام کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ آپ کرتے کے دامن میں بازار سے آلو خرید کر لے آتے تھے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نصیحت

دیوبند میں بھی ایک دن اسی طرح دودھ لینے کے لئے پتیلی لے کر جارہے تھے، حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو دیکھ لیا۔ اگلے دن جب آپ دارالعلوم دیوبند میں پہنچے تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مفتی صاحب سے فرمایا کہ دیکھو بھائی مولوی شفیع صاحب! اللہ تعالیٰ نے آپ کو تواضع کا بہت اُونچا مقام عطا فرمایا ہے، لیکن اتنی تواضع بھی نہ کیا کرو، اس لئے کہ اب آپ دارالعلوم کے مفتی ہوگئے ہیں، اور اس طرح کے کام کرنے سے بعض اوقات عوام کی نگاہوں میں وقعت کم ہوجاتی ہے، اس لئے اتنی بھی تواضع نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ سمجھتے تھے کہ میں تو کچھ ہوں ہی نہیں، اس لئے میں کیا اہتمام کروں کہ فلاں کام کروں اور فلاں کام نہ کروں۔ اللہ تعالیٰ نے تواضع کا یہ مقام عطا فرمایا تھا۔

کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کرو

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کرو، اور کبھی کبھی دوسروں کے جوتے سیدھے کردیا کرو۔

''ارواحِ ثلاثہ'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ اس کے اندر تکبر ہے، اور اس کے تکبر کا علاج کرنا ہے تو اس کو مامور کرتے تھے کہ تم درسگاہ کے باہر طلبہ کے جوتے روزانہ سیدھے کیا کرو۔ اور جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ اس کے اندر کوئی خرابی نہیں ہے تو اس کے جوتے خود سیدھے فرمادیا کرتے تھے۔

شیخ کے بتانے پر ذلت کے کام کرے

یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس راستے میں بعض اوقات ذلت کے کام کرنے پڑتے ہیں، وہ ذلت کے کام بھی اپنی خودرائی سے نہ کرے، خودرائی سے کرنے سے بعض اوقات تکبر پیدا ہوجاتا ہے اور دماغ اور سڑ جاتا ہے بلکہ شیخ کی نگرانی میں کرے۔ جب شیخ کہے تو وہ کام کرے اور جب شیخ نہ کہے تو وہ کام نہ کرے۔

ایک صاحب نے کسی کتاب میں پڑھ لیا تھا کہ دوسروں کے جوتے سیدھے کرنے سے تکبر دور ہوتا ہے، چنانچہ وہ صاحب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں آئے اور دوسروں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کردیئے۔ حضرت والد صاحب نے ان کو منع کیا کہ یہ کام نہ کرو۔ پھر منع کرنے کی وجہ بتائی کہ اس شخص کے حالات ایسے ہیں کہ اگر یہ جوتے سیدھے کرے گا تو اور زیادہ اس کے دماغ میں تکبر پیدا ہوگا کہ میرے اندر اتنی تواضع پیدا ہوگئی ہے کہ میں لوگوں کے جوتے سیدھے کرتا ہوں۔ اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ اس راستے میں کسی کی نگرانی میں چلنا پڑتا ہے۔

کبر اور شکر کا فرق

فرمایا:

''نعمت پر فخر کرنا ''کبر'' ہے اور اس کو عطا حق سمجھنا اور اپنی نااہلی کو مستحضر رکھنا ''شکر'' ہے''

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ''تکبر'' کی بیماری کا بہترین علاج کثرتِ شکر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالنا۔ وہی بات حضرت نے اس ملفوظ میں ارشاد فرمائی کہ کسی نعمت کے حصول پر فخر کرنا کہ اس کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو کمتر سمجھنا، تکبر ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ میں تو اس نعمت کا مستحق نہیں تھا، اللہ جل شانہ نے محض اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرمادی ہے۔ یہ استحضار ''شکر'' ہے اور یہی شکر کبر کا علاج ہے۔

یہ ''تحدیثِ نعمت'' ہے

اسی کو ''تحدیثِ نعمت'' کہا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ذکر کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے، نہ صرف یہ کہ یہ چیز تکبر نہیں بلکہ عبادت ہے۔ اور اپنی بڑائی کا ذکر کرکے اپنا کوئی وصف بیان کرنا تکبر ہے اور زبردست گناہ ہے۔

باطن کے یہ گناہ بہت باریک ہیں، اور ان کی سرحدیں آپس میں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ ایک طرف ''تحدیثِ نعمت'' ہے، اگر تحدیثِ نعمت کی غرض سے انسان اپنا کوئی وصف بیان کر رہا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کا اور اس کی عطا کا اظہار کر رہا ہے تو یہ ''عبادت'' ہے، اور اگر اپنی بڑائی کے خیال سے اس کا اظہار کر رہا ہے تو یہ گناہِ کبیرہ ہے۔ لیکن دونوں کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنا کہ کیا بات تکبر ہے اور کیا بات ''تحدیثِ نعمت'' ہے، یہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

''تحدیثِ نعمت'' کا حکم

''تحدیثِ نعمت'' تو وہ چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب رسول اللہ ﷺ کو اس کا حکم دے رہے ہیں، فرماتے ہیں:

﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾(۱)

یعنی آپ پر آپ کے رب کی جو نعمتیں ہوئی ہیں، ان کو لوگوں کے سامنے بیان کیا کریں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔ اسی ''تحدیثِ نعمت'' کے طور پر آپ ﷺ نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ))

''میں آدم کے تمام بیٹوں کا سردار ہوں''(۲)

یہ ''تحدیثِ نعمت'' کے طور پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ مقام عطا فرمایا کہ مجھے تمام آدم کے بیٹوں کا سردار بنادیا۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ''تحدیثِ نعمت'' کبر کی حد میں داخل ہو جائے۔ اس لئے فوراً اگلا جملہ ارشاد فرمادیا ''وَلَا فَخْرَ'' یعنی میں اس پر کسی فخر کا اظہار نہیں کرتا، جس سے دوسروں کی تحقیر ہو۔ اب دیکھئے کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے اُوپر ہونے والی نعمتوں کا ذکر فرما رہے ہیں، لیکن دھڑکا یہ لگا ہوا ہے کہ کہیں حدود سے متجاوز نہ ہو جاؤں، اس لئے فوراً فرمایا ''وَلَا فَخْرَ'' میں فخر نہیں کرتا۔

---

(۱) الضحیٰ: ۱۱، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جو تمہارے پروردگار کی نعمت ہے، اس کا تذکرہ کرتے رہنا''

(۲) صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب تفضيل نبينا على الخلائق، رقم: ٤٢٢٣، سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة بني إسرائيل، رقم: ٣٠٧٣، سنن أبي داؤد، كتاب السنة، باب في التخيير بين الأنبياء، رقم: ٤٠٥٣، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الشفاعة، رقم: ٤٢٩٨، مسند أحمد، رقم: ٢٤١٥

تحدیثِ نعمت کی علامت

پھر ''تحدیثِ نعمت'' کی ایک علامت ہے، وہ یہ کہ ''تحدیثِ نعمت'' کے نتیجے میں سر اور زیادہ جھکتا ہے، اور تواضع پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے حضور مزید عاجزی اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یا اللہ! میں اس نعمت کا مستحق نہیں تھا، اور میں اس نعمت کو حاصل کرنے سے عاجز تھا، لیکن آپ نے محض اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرمادی۔ اس استحضار اور اقرار کے نتیجے میں اور زیادہ عاجزی پیدا ہوگی۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کی انکساری

فتح مکہ کے موقع پر جناب رسول اللہ ﷺ فاتح بن کر مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے ہیں، اور اس شہر میں فاتح بن کر داخل ہو رہے ہیں جس شہر کے لوگوں نے آپ کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا، جس شہر کے لوگوں نے آپ کو قتل کرنے کے منصوبے بنائے، جس شہر کے لوگوں نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے، جس شہر کے لوگوں نے آپ کے اوپر غلاظتیں ڈالنے کی کوشش کی، جہاں کے لوگوں نے آپ پر پتھر برسانے کی کوشش کی۔ اس شہر کے لوگوں پر فاتح بن کر تشریف لا رہے ہیں، صرف آٹھ سال کی مدت کے بعد تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کے علاوہ کوئی اور اس شہر میں فاتح بن کر داخل ہوتا تو اس کا سینہ تنا ہوا ہوتا، گردن اکڑی ہوئی ہوتی، '' أنا ولا غیری'' کے نعرے لگا رہا ہوتا۔ لیکن آپ مکہ مکرمہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آپ کی گردن مبارک جھکی ہوئی ہے، یہاں تک کہ سینہ مبارک سے آپ کی ٹھوڑی لگ رہی ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اور زبانِ مبارک پر قرآن کریم کی یہ آیات ہیں:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۙ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا﴾(۱)

یہ ہے ''تحدیثِ نعمت'' کیونکہ "إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا" کی آیات تلاوت کر کے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا ذکر فرما رہے ہیں کہ یا اللہ! آپ نے یہ فتح مجھے عطا فرمائی۔ اور اس نعمت کے استحضار کے نتیجے میں عاجزی اور انکساری پیدا ہو رہی ہے، اور شکستگی پیدا ہو رہی ہے، اور رجوع الی اللہ زیادہ ہو رہا ہے۔ یہ ''تحدیثِ نعمت'' کی علامت ہے۔

---

(۱) الفتح: ۱-۲، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''(اے پیغمبر!) یقین جانو، ہم نے تمہیں کھلی ہوئی فتح عطا کر دی ہے، تا کہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی تمام کوتاہیوں کو معاف کر دے، اور تا کہ اپنی نعمت تم پر مکمل کر دے، اور تمہیں سیدھے راستے پر لے چلے''

تکبر کی علامت

اور تعلّی اور تکبر کی علامت یہ ہے کہ اس سے گردن اکڑتی ہے، سینہ تنتا ہے، اور انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بالا سمجھتا ہے، اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، اور ان کے ساتھ حقارت کا معاملہ کرتا ہے۔ ورنہ کم از کم یہ تو ہوتا ہی ہے کہ وہ دل سے اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور افضل سمجھتا ہے۔ اب دونوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا کہ کہاں ''تحدیثِ نعمت'' ہے، اور کہاں ''تکبر'' شروع ہو گیا، یہ حد قائم کرنا آسان کام نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ شیخ یہ بتاتا ہے کہ تم جو نعمت کا اظہار کر رہے ہو، یہ ''تحدیثِ نعمت'' نہیں ہے بلکہ یہ تکبر ہے، لیکن اس کا نام تم نے ''تحدیثِ نعمت'' رکھ دیا، حالانکہ حقیقت میں وہ تکبر اور شیطانی عمل تھا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے نفس کی نگرانی کی توفیق عطا فرماتے ہیں، وہ قدم قدم پر اپنے نفس کا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ کہیں یہ نفس صحیح راستے سے نہ ہٹ جائے۔ میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنا کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی ایک مسجد میں وعظ فرما رہے تھے، بڑا مجمع وعظ سن رہا تھا، اور شرح صدر کے ساتھ وعظ ہو رہا تھا، علوم و معارف کے دریا بہہ رہے تھے۔ اسی وعظ کے دوران کوئی بات حضرت والا کے ذہن میں آئی۔ آپ نے فرمایا کہ اب میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں، اور میں ''تحدیثِ نعمت'' کے طور پر کہتا ہوں کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سنیں گے، کسی اور سے یہ بات آپ کو سننے میں نہیں آئے گی۔

ابھی وہ بات کہی نہیں تھی، بلکہ اسی وقت سر جھکایا اور فرمایا: استغفر اللہ، میں نے یہ کیا کہہ دیا، میں نے اس کو تحدیثِ نعمت کا نام دے دیا، حالانکہ یہ تو تعلّی ہو گئی اور اپنی بڑائی کا بیان ہو گیا کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سنیں گے اور کسی سے نہیں سنیں گے، میں استغفار کرتا ہوں، یا اللہ! مجھے معاف فرما ـــــ یہ عمل وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں میٹر لگا ہوا ہے، اور وہ میٹر یہ تول رہا ہے کہ کونسا کلمہ حد سے متجاوز ہو گیا اور کونسا حد کے اندر ہے۔ لہٰذا اتنے بڑے انسان، بزرگ، محقق یہ فرما رہے ہیں کہ میں نے تحدیثِ نعمت کا لفظ تو استعمال کیا، لیکن حقیقت میں تو یہ تعلّی اور تکبر ہو گیا، تو ہم اور آپ کس شمار و قطار میں ہیں۔ ہم لوگ نہ جانے کتنی مرتبہ ''تحدیثِ نعمت'' کے عنوان سے اپنے اوصاف بیان کرتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ تعلّی اور تکبر میں داخل ہوتا ہے۔

نعمتوں میں اضافے سے رجوع الی اللہ میں اضافہ

لہٰذا ''تحدیثِ نعمت'' کی جو علامت ہے، اس کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ اس ''تحدیثِ نعمت'' کے نتیجے میں عاجزی پیدا ہو رہی ہے یا نہیں؟ خشوع پیدا ہو رہا ہے یا نہیں؟ رجوع الی اللہ میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں؟ اگر یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں تو پھر سمجھ لیجئے کہ یہ ''تحدیثِ نعمت'' ہے۔ اور ایک مؤمن کی علامت ہی یہ ہے کہ اس کو جتنا جتنا نعمتوں سے نوازا جاتا ہے، وہ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ ریز ہوتا چلا جاتا ہے، اپنی بے حقیقتی اس پر عیاں ہوتی چلی جاتی ہے، اپنی عاجزی، اپنی فرومائیگی، اپنی عبدیت اور اپنی بندگی کا احساس اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے، اور اس کو اپنے بندہ ہونے کا احساس ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اس کو جس نعمت سے بھی نوازتے ہیں، وہ پکار اُٹھتا ہے کہ یا اللہ! میں تو اس نعمت کے قابل نہیں تھا، آپ نے اپنی رحمت سے عطا فرما دی ہے۔ لہٰذا جتنی نعمت بڑھتی ہے، رجوع الی اللہ میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور نعمتوں پر شکر

حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کی اولاد میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں۔ مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی حکومت عطا فرمائی جو تاریخ انسانیت میں کسی کو بھی ایسی حکومت نہ تو پہلے نصیب ہوئی اور نہ بعد میں نصیب ہوئی۔ وہ یہ کہ انسانوں پر حکومت، جنات پر، چرندوں پر، پرندوں پر، فضاؤں پر اور ہواؤں پر حکومت عطا فرمائی۔ یہ نعمتیں دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا:

﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾(۱)

''اے آلِ داؤد! شکر کا عمل اختیار کرو، اور میرے بندوں میں بہت کم لوگ شکر گزار ہیں''

روایت میں آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ طے کر رکھا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں کوئی لمحہ ایسا نہ گزرے جس میں ہمارے گھر میں کوئی شخص بھی اللہ کا ذکر یا شکر نہ کر رہا ہو، چنانچہ آپ نے اوقات کو تمام گھر والوں پر تقسیم کر دیا تھا کہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک فلاں ذکر میں لگا رہے گا، اس وقت سے اس وقت تک فلاں صاحب ذکر کریں گے۔ دیکھئے! جس طرح نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے تو اسی طرح رجوع الی اللہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور یہ دعا فرما رہے ہیں:

(۱) سبا:۱۳

﴿رَبِّ أَوْزِعْنِيْٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَأَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ۝﴾(۱)

''اے میرے رب! مجھ کو اس پر ہمیشگی دیجئے کہ میں آپ کی ان نعمتوں پر شکر کیا کروں، جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں، اور میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں، اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل رکھئے''

لہٰذا ایک مؤمن کی خاصیت یہ ہے کہ جوں جوں اس کو نعمتوں سے نوازا جائے گا، اس کے اندر عاجزی اور انکساری پیدا ہوگی، تواضع پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع میں اضافہ ہوگا۔

شریر آدمی کی خاصیت

دوسری طرف شریر آدمی کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو جتنی زیادہ نعمتیں ملیں گی، اتنا ہی اس کی رعونت میں اضافہ ہوگا، اس کی فرعونیت بڑھے گی۔ متنبی شاعر بھی کبھار بڑی حکیمانہ باتیں کہہ دیتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے کہ۔

إِذَا أَنْتَ أَكْرَمْتَ الْكَرِيْمَ مَلَكْتَهُ
وَ إِنْ أَنْتَ أَكْرَمْتَ اللَّئِيْمَ تَمَرَّدَا

''اگر تم ایک شریف آدمی کی عزت کرو گے، اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرو گے تو تم اس کے مالک بن جاؤ گے، وہ تمہارا غلام بن جائے گا، اس لئے کہ شریف آدمی تمہارا احسان نہیں بھولے گا، اس کے نتیجے میں وہ تمہارا غلام اور تم اس کے مالک بن جاؤ گے۔ اور اگر تم کمینے آدمی کا اکرام کرو گے، تو چونکہ وہ کمینہ آدمی تھا، وہ اکرام کے قابل نہیں تھا، مگر تم نے اس کی عزت کر کے اس کو سر پر چڑھا دیا، تو اس کے نتیجے میں وہ سرکش بن جائے گا''

یہی معاملہ ہر انسان کا ہے کہ اگر کسی انسان کو نعمتیں ملتی جائیں اور اس کے نتیجے میں اس کا سر اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتا چلا جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ بندہ شکر گزار ہے، اور اب اگر وہ نعمت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ الحمدللہ مجھے فلاں نعمت حاصل ہے اور یہ بات وہ ڈرتے ڈرتے کہتا ہے کہ کہیں تکبر اور تعلّی نہ ہو جائے، تو معلوم ہوا کہ یہ ''تحدیثِ نعمت'' کے طور پر یہ بات کہہ رہا ہے۔ اور اگر نعمت ملنے کے بعد وہ منہ اُٹھا کر اپنی بڑائی بیان کر رہا ہے کہ میں تو ایسا ہوں، میں نے ایسا

(۱) النمل: ۱۹

کیا، میں نے ایسا کیا، تو اس صورت میں وہ چاہے ''تحدیثِ نعمت'' کے الفاظ استعمال کرے، لیکن حقیقت میں وہ ''تحدیثِ نعمت'' نہیں بلکہ وہ تکبر ہے۔

شیخ کی ضرورت

یہ تو ''تحدیثِ نعمت'' کی علامت ہے، لیکن انسان خود سے اس علامت کو اپنے اوپر منطبق نہیں کر سکتا، اس لئے شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کسی نعمت کا اظہار کرے تو اپنے شیخ سے پوچھے کہ فلاں موقع پر میں نے فلاں نعمت کا اظہار کیا تھا، آیا یہ حدود سے متجاوز ہوا یا نہیں؟ وہ شیخ بتائے گا کہ اس حد تک ٹھیک ہے اور اس حد کے بعد غلط ہے۔ اور جب پندرہ بیس مرتبہ شیخ کو بتایا اور شیخ نے اس کی اصلاح کر دی تو اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ خود ذہن کے اندر ایک ترازو قائم ہو جائے گا، پھر انسان کو خود اس بات کا ادراک ہونے لگے گا کہ کہاں میرا قدم صحیح ہے اور کہاں غلط ہے، اور کہاں تکبر ہے اور کہاں ''تحدیثِ نعمت'' ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

خود پسندی اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ. وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ. وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ. أَمَّا بَعْدُ!

گزشتہ کئی روز سے ''تکبر'' کا بیان چل رہا تھا، الحمدللہ اس کے بارے میں کافی تفصیل سے بیان ہوگیا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ''تکبر'' سے محفوظ رکھے۔ آگے حضرت مولانا عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''عُجب'' کا عنوان لگایا ہے اور اس کے تحت بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات بیان فرمائے ہیں۔ دیکھئے! تصوف اور طریقت کی اصطلاح میں تین الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ایک عُجب، دوسرے کبر، تیسرے تکبر، بظاہر دیکھنے میں یہ تینوں ایک جیسے الفاظ ہیں لیکن تینوں کے مصداق میں باریک فرق ہے۔

''عُجب'' کی تعریف

سب سے پہلے انسان کے اندر ''عُجب'' پیدا ہوتا ہے اور اس عُجب کی انتہا تکبر پر ہوتی ہے۔ ''عُجب'' کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے کسی وصف کی طرف نگاہ کر کے اس کے نتیجے میں اپنے آپ کو دوسرے سے اچھا سمجھے اور اس وصف کے سلسلے میں عطاءِ حق تعالیٰ کی طرف نگاہ نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص عالم ہے، اب اس کے دل میں اپنے عالم ہونے کا احساس پیدا ہوا کہ میں عالم ہوں اور عالم ہونے کی بنیاد پر اپنے آپ کو دوسروں سے اچھا سمجھا اور اس علم کے اللہ تعالیٰ کی عطا اور نعمت ہونے کی طرف نگاہ نہیں کی، چاہے اس کے ساتھ دوسروں کی تحقیر ہو یا نہ ہو، دونوں صورتیں عُجب میں داخل ہیں۔ لہٰذا محض اپنے کسی اچھے وصف کا استحضار اللہ تعالیٰ کی عطا اور نعمت ہونے کے استحضار کے بغیر کرنا یہ ''عُجب'' ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''عُجب'' کے اندر دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا صرف اپنی ذات سے تعلق ہوتا ہے۔

☆ اصلاحی مجالس (۴/۳/۷ تا ۸۴) بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

عُجب، کبر اور تکبر میں فرق

اسی "عُجب" کے نتیجے میں انسان کے اندر "کبر" پیدا ہو جاتا ہے۔ "کبر" کا مطلب یہ ہے کہ دل میں یہ خیال آنا کہ چونکہ میرے اندر یہ وصف موجود ہے، لہٰذا میں بڑا ہوں۔ "عُجب" کے اندر اپنی اچھائی کی طرف نگاہ ہوتی ہے اور "کبر" کے اندر اپنی بڑائی کی طرف نگاہ ہوتی ہے، لہٰذا دوسروں سے اپنے کو بڑا سمجھ لینا "کبر" ہے۔ پھر اس بڑا سمجھنے کے نتیجے میں دوسروں پر اپنی بڑائی کا اظہار کرنا "تکبر" ہے، مثلاً اپنی اکڑ دکھا رہا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھ رہا ہے اور دوسروں کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کر رہا ہے، یہ سب "تکبر" کے اندر داخل ہے۔

چوتھی چیز "استکبار"

پھر اس کے بعد ایک چوتھا درجہ ہے جس کو قرآن کریم نے "استکبار" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ "استکبار" کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان "تکبر" کے نتیجے میں دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے تو اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کرتا ہے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا اور خود اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے فیصلے کرتا ہے اور بعض اوقات ظلم کے فیصلے بھی کر گزرتا ہے، یہ "استکبار" ہے۔ قرآن کریم نے یہ لفظ فرعون وغیرہ کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس "استکبار" کے اندر حق کو قبول کرنے سے عِناد پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

عُجب کا علاج

بہر حال! سب سے پہلے انسان کے اندر "عُجب" پیدا ہوتا ہے اور یہی عُجب آگے ترقی کر کے کبر اور تکبر اور استکبار پیدا کرتا ہے۔ اس لئے جب عُجب انسان کے اندر پیدا ہو تو پہلے ہی مرحلے میں اس کا علاج کرے۔ اس کے علاج کے سلسلے میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

> "عمل میں دو حیثیتیں ہیں، ایک اپنا کمال، اس اعتبار سے (یعنی اپنا کمال سمجھ کر) اس پر نظر نہ کرنی چاہئے، دوسرا یہ کہ یہ خدا کی نعمت ہے، اس اعتبار سے اس پر مسرت مامور بہ ہے ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ (۱)

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۶۲، یونس: ۵۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "(اے پیغمبر!) کہو کہ: "یہ سب کچھ اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوا ہے، لہٰذا اسی پر تو انہیں خوش ہونا چاہئے"

علم کو عطا حق سمجھو

اگر کوئی شخص کوئی عمل کر کے اس عمل کو اپنا کمال سمجھ کر خوش ہو رہا ہے کہ یہ میرا کمال ہے اور عطا حق تعالیٰ پر نظر نہیں تو ''عُجب'' ہے اور گناہ ہے، اور اگر اس عمل کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھ کر خوش ہو رہا ہے کہ میرے اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے تو یہ خوشی محمود اور مطلوب ہے جس کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾(۱)

گویا کہ اس کے دل میں یہ خیال آ رہا ہے کہ میرا تو کوئی کمال نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ چیز عطا فرما دی اور اس فضل پر خوش ہو رہا ہے تو یہ خوشی نہ صرف یہ کہ عُجب اور کبر نہیں بلکہ یہ خوشی مامور بہ ہے، کیونکہ اس آیت میں فَلْيَفْرَحُوْا امر کا صیغہ ہے۔

نیک کام کرنے پر خوشی ایمان کی علامت ہے

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ))(۲)

یعنی جب تمہیں اپنے کسی اچھے عمل پر خوشی ہو اور برے عمل پر رنج ہو تو یہ تمہارے مؤمن ہونے کی علامت ہے۔ لہٰذا اگر نماز پڑھ کر خوشی ہوئی اور کہا کہ یا اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ ایمان کی علامت ہے، اسی طرح روزہ رکھ کر خوشی ہوئی کہ الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے مجھ سے روزہ رکھوالیا، یا اعتکاف کر کے خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اعتکاف کرنے کی توفیق عطا فرما دی تو یہ خوشی پسندیدہ ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں۔

یہ خوشی نقد خوشخبری ہے

ایک صحابیؓ نے حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! جب میں کوئی اچھا عمل کرتا ہوں تو دل میں خوشی ہوتی ہے، اس خوشی پر مجھے خیال ہوا ہے کہ کہیں یہ عُجب تو نہیں ہے؟ جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) یونس: ۵۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''(اے پیغمبر!) کہو کہ: ''یہ سب کچھ اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوا ہے، لہٰذا اسی پر تو انہیں خوش ہونا چاہئے''

(۲) مسند أحمد بن حنبل، حديث أبي أمامة الباهلي، رقم: ۲۱۱٤٥

((لَا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ)) (۱)

''یہ خوشی مؤمن کے لئے نقد خوشخبری ہے''

یعنی یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نقد انعام مل گیا کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے بشاشت پیدا کردی، یہ کوئی عُجب اور تکبر نہیں، اس سے نہیں گھبرانا چاہئے جب تک اس عمل کو حق تعالیٰ کی عطا سمجھتے رہو، جیسے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا تھا:

لَوْ لَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَ لَا صَلَّيْنَا(۲)

''اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق نہ ہوتی تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے، نہ ہم ہدایت یافتہ ہوتے، نہ صدقہ خیرات کرتے، نہ نماز پڑھتے۔ لہٰذا ان اعمال کو عطاحق سمجھتے رہو اور ان پر خوش ہوتے رہو تو اس میں کوئی حرج نہیں''

اور اگر اس بات پر خوشی ہو رہی ہے کہ میں تو کمال تک پہنچ گیا اور اس عمل کے کرنے میں اللہ تعالیٰ کی عطا پر نظر نہیں بلکہ اس کو اپنا استحقاق اور اپنا کمال سمجھتا ہے اور اس کے نتیجے میں دوسروں کی تحقیر کرتا ہے تو یہ خوشی وہ ہے جس کو قرآن کریم میں ''لَا تَفْرَحْ'' کے الفاظ کے ذریعہ منع کیا گیا ہے۔

خوشی مطلوب، خوشی ممنوع

اور اس آیت میں فرمایا: فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا، خوش ہونے کا حکم دیا گیا تو ایک خوشی مطلوب اور مقصود اور مامور بہ ہے اور ایک خوشی ممنوع عنہ اور حرام ہے، جو خوشی مامور بہ ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عمل کی جو توفیق عطا فرمائی، اس پر نظر کر کے خوش ہونا لیکن اپنے کمال پر خوش ہونا کہ میرا یہ کمال ہے کہ میں نے یہ عمل سرانجام دیا تو یہ اتراہٹ ہے اور ممنوع عنہ اور حرام ہے۔

فرق کے لئے ''شیخ'' کی ضرورت

لیکن ان دونوں خوشیوں میں فرق انسان خود نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے لئے کسی شیخ کی اور معالج کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بتاتا ہے کہ یہاں پہلی قسم کی خوشی ہے، اس لئے فکر کی بات نہیں،

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب اذا أثنی علی الصالح فهی بشری ولا تضره، رقم: ۴۷۸۰، مسند أحمد، حديث أبي ذر الغفاري، رقم: ۲۰۴۱۶

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسير، باب حفر الخندق، رقم: ۲۶۲۵، صحيح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب غزوة خيبر، رقم: ۳۳۶۳، سنن النسائی، کتاب الجهاد، باب من قاتل فی سبيل الله فارتد عليه سيفه، رقم: ۳۰۹۹، مسند أحمد، رقم: ۱۵۰۰۵

جیسا کہ ان صحابی رضی اللہ عنہ کے دل میں شک پیدا ہوا کہ یہ خوشی جو میرے دل میں پیدا ہو رہی ہے، یہ پہلی خوشی ہو رہی ہے یا دوسری خوشی ہو رہی ہے، مامور بہ خوشی ہو رہی ہے یا منہی عنہ خوشی ہو رہی ہے؟ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا۔ آپ نے فرمایا:

((لَا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ))

''یہ خوشی مؤمن کے لئے نقد خوشخبری ہے''

یہ پہلی قسم کی خوشی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب پر اطمینان ہو گیا کہ الحمد للہ یہ خوشی بری نہیں ہے۔ اگر دوسری قسم کی خوشی ہوتی تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کا علاج فرماتے۔

آج کل ''شیخ'' بنانے کے مقاصد

شیخ کی ضرورت ان کاموں میں پڑتی ہے، لیکن آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شیخ اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ اس سے وظیفے پوچھے جائیں کہ کیا پڑھیں؟ اگر کوئی خواب دیکھو تو اس کی تعبیر شیخ سے پوچھو، اور اس سے یہ پوچھو کہ قرض ادا کرنے کی کیا دعا ہے؟ اور رزق بڑھانے کے لئے اور روزگار ملنے کی کیا دعا ہے؟ بس شیخ ان کاموں کے لئے ہوتا ہے۔ صبح سے لے کر شام تک انہی کاموں کے چکر ہوتے ہیں اور اسی کا نام پیری مریدی رکھ لیا ہے۔

یاد رکھئے! ان کاموں کا پیری مریدی سے کوئی تعلق نہیں، نہ تعویذ گنڈے، نہ دعائیں نہ وظیفے اور نہ خواب کی تعبیر، ان کا شیخ سے کوئی تعلق نہیں، اصل چیز پوچھنے کی یہ ہے کہ عمل کرنے پر مجھے جو خوشی ہو رہی ہے، یہ میری خوشی مقبول ہے یا نہیں؟ یہ خوشی عُجب اور گناہ تو نہیں ہے؟ اور پھر شیخ کے بتانے پر عمل کرو، پیری مریدی کا اصل مقصد یہ ہے۔ آج کل لوگ یہ باتیں تو پوچھتے نہیں، لیکن وظیفے اور ذکر اذکار پوچھتے رہتے ہیں۔

توفیقِ الٰہی پر شکر کرنا چاہئے

چنانچہ آگے حضرت والا فرماتے ہیں:

''کام کرنے والوں کو چاہئے کہ اپنے اعمال کو اپنا کمال نہ سمجھیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھ کر شکر کریں کہ انہوں نے ہم سے کام لے لیا ورنہ ہماری کیا طاقت تھی۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت (۱)

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۶۲

جو کچھ بھی کام ہو رہا ہے، مثلاً عبادت ہو رہی ہے، خدمتِ خلق ہو رہی ہے، کوئی علمی خدمت ہو رہی ہے، کوئی وعظ ہے، کوئی تبلیغ ہے، کوئی فتویٰ ہے، کوئی تصنیف ہے، کوئی تدریس ہے، جو کوئی خدمت ہو رہی ہے، اس کو اپنا کمال نہ سمجھو بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر شکر ادا کرو کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے اس کی توفیق عطا فرمادی، ورنہ کتنے لوگ ہیں جو جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، میری حقیقت ہی کیا تھی کہ میں یہ عمل کرتا، جب انسان یہ سوچتا ہے تو اس سے تکبر اور عُجب پیدا نہیں ہوتا۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی

منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

یہ کیا احسان جتاتے ہو کہ میں نے فلاں خدمت انجام دے دی، یا فلاں خدمت انجام دے دی، فلاں تقریر کردی، فلاں فتویٰ لکھ دیا، فلاں کتاب لکھ دی، احسان تو اللہ تعالیٰ کا مانو کہ اس نے تمہیں اس خدمت پر لگادیا۔ ارے کتنے لوگ ہیں جن کو ان اعمال کی توفیق نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کام پر لگادیا، کیا یہ ناز کی بات ہے؟ یہ کوئی فخر کرنے کی بات ہے؟ یا دوسروں پر بڑائی جتانے کی بات ہے؟ ارے یہ تو اللہ جل شانہ کا کرم ہے کہ اس نے تمہیں اس کام پر لگادیا، اس لئے اس کام پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

مثلاً کوئی عبادت انجام دے لی، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، اعتکاف کرلیا، تراویح پڑھ لی، تلاوت کرلی، ذکر کرلیا، تو ان عبادات کے کرنے پر احسان کس لئے جتاتے ہو؟ ارے یہ تو اس کا کرم ہے کہ اس نے تمہیں ان عبادات کی توفیق دے دی، اس توفیق پر اس کا شکر ادا کرو۔

شکر کے نتیجے میں مزید توفیق ہوگی

لہٰذا اس عبادت کی ناقدری نہ کرو اور ناشکری بھی مت کرو بلکہ شکر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کی توفیق عطا فرمادی اور یہ سوچو کہ اگر اس کی توفیق نہ ہوتی تو میں نہ جانے کس حال میں ہوتا۔ جب یہ سوچو گے اور شکر ادا کرو گے تو پھر نہ تو عُجب قریب آئے گا اور نہ تکبر قریب آئے گا اور شکر ادا کرنے کی بدولت اللہ تعالیٰ مزید عبادات کی اور اچھے کاموں کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

''شکر ادا کرنا'' قلندری عمل ہے

لیکن اس کام کی مشق کرنی پڑتی ہے، لہٰذا جب بھی کسی نیک کام کی توفیق ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ چنانچہ ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ بعض اعمال قلندری ہوتے ہیں اور یہ ''شکر'' بھی قلندری عمل ہے یعنی شکر ایسا عمل ہے کہ دیکھنے میں کوئی بڑا عمل نہیں، آپ نے چپکے سے کہہ دیا

"الحمدللہ" کسی کو پتہ چلا کہ آپ نے کیا عمل کیا؟ یا یہ کہہ دیا:

"اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ"

کسی کو پتہ بھی نہیں چلا کہ آپ نے کیا کیا، لیکن اندر ہی اندر ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا اور اس کے نتیجے میں تمہارا درجہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور دیکھنے والوں کو پتہ بھی نہیں چلا۔

میان عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

شکر ادا کرنے کی مشق کرو

ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ زبان پر شکر کا رٹا لگایا کرو، مثلاً گرمی لگ رہی تھی، ایک ہوا کا جھونکا آیا تو کہو......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

گھر میں داخل ہوئے اور بچہ کھیلتا ہوا اچھا معلوم ہوا اور اس سے دل خوش ہوا تو کہو......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

بھوک لگ رہی تھی، کھانا سامنے آیا تو کہو......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

دل ہی دل میں کہتے جاؤ اور اس کی عادت ڈالو کہ ہر وقت تمہارا دل اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی نعمت پر شکر کر رہا ہو۔ جب بار بار اس کی مشق کرو گے تو یہ بات حاصل ہو جائے گی۔ پھر یہ ہوگا کہ آدمی کام بھی کر رہا ہے اور دل اللہ تعالیٰ کے شکر میں مشغول ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

جگر پانی کیا ہے مدتوں غم کی کشاکش میں
کوئی آسان ہے کیا خوگرِ آزار ہو جانا

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سالہا سال مشق کی ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی نعمت پر شکر ادا ہوتا رہے، اندر ہی اندر اپنے مالک سے اپنے خالق سے اپنے آقا سے رشتہ جڑا ہوا ہے اور کسی دوسرے کو پتہ بھی نہیں ہے۔

شکر رذائل کی جڑ کاٹتا ہے

یہ "شکر" ایسا تریاق ہے جو بے شمار رذائل کی جڑ کاٹتا ہے اور بے شمار فضائل اس کے ذریعہ

حاصل ہوتے ہیں، اس لئے اس ''شکر'' کی عادت ڈالو، یہ قلندری عمل ہے، اس کے اندر بہت بڑے مجاہدات اور ریاضتیں نہیں ہیں، بہت مختصر سا کام ہے کہ صبح سے لے کر شام تک ہر عمل پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے چلے جاؤ، مثلاً آپ مسجد سے باہر نکلے اور دروازے پر جوتے آسانی سے مل گئے تو کہو......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

کسی سے ملاقات کے لئے گئے اور اس شخص سے ملاقات ہوگئی تو دل ہی دل میں کہو......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

جو بھی مقصد حاصل ہو جائے، چاہے وہ چھوٹے سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اس پر اللہ جل شانہ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔ لوگ اس شکر کی قدر نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ بہت معمولی سا عمل ہے، لیکن یہ عظیم تریاق ہے، اس پر عمل کر کے دیکھو، جوں جوں انسان اس کی مشق کرے گا اور اس پر عمل کرے گا تو پھر یہ عجب اور تکبر پاس نہیں پھٹکے گا۔ اور شیطان بھی یہ گُر جانتا تھا کہ جو بندہ شکر کرتا رہے گا وہ میرے قبضے میں نہیں آئے گا، اسی وجہ سے اس نے کہا تھا:

﴿وَلَا تَجِدُ اَکْثَرَھُمْ شٰکِرِیْنَ﴾(۱)

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے اور آپ کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

---

(۱) الأعراف: ۱۷، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گذار نہیں پائے گا''

دوسرے کو حقیر سمجھنے کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِيْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''اگر کسی بات میں دوسرے کو گھٹا ہوا دیکھو تو اس وقت یہ سوچو کہ ہم بھی کسی بات میں اس سے گھٹے ہوئے ہیں یا نہیں؟ ہر شخص میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور برائیاں بھی، اگر اس شخص میں ایک برائی ہے تو ممکن ہے کہ ہم میں بہت سی برائیاں ہوں، یا ہم میں ایک ہی برائی ہو لیکن اس برائی سے بدتر ہو جو اس کے اندر ہے، پھر کس طرح ہم اس کو گھٹا ہوا سمجھتے ہیں اور کیوں دوسرے کو اپنے آپ سے کم درجہ سمجھتے ہیں اور کیوں سلام میں ابتداء کرنے سے عار آتی ہے؟''(۱)

غیر اختیاری خیال کے آنے پر مؤاخذہ نہیں

کبھی کسی شخص کے بارے میں خیال آجائے، اور یہ خیال بعض اوقات آجاتا ہے کہ یہ شخص فلاں چیز میں مجھ سے گھٹا ہوا ہے اور میں اس سے بڑھا ہوا ہوں، تو تنہا اس خیال کا آجانا کوئی بری بات نہیں اور اس غیر اختیاری خیال پر اللہ تعالیٰ کے یہاں مؤاخذہ بھی نہیں ہے، لیکن بار بار اس خیال کا لانا اور اس خیال کا دل میں بٹھانا اور پھر اس خیال کے مقتضیٰ پر عمل کرنا، یہ سب تکبر میں داخل ہیں، لہٰذا اس کا علاج بھی ضروری ہے۔

ذہین طالب علم کے دل میں اپنی برتری کا خیال

مثلاً چند طلباء ایک جماعت میں پڑھتے ہیں، ایک طالب علم بڑا ذہین اور زیرک ہے، اچھی استعداد کا مالک ہے اور ہر امتحان میں اوّل نمبر پر آتا ہے، دوسرا طالب علم کند ذہن ہے، پڑھائی میں

☆ اصلاحی مجالس (۳۶/۲ تا ۵۹)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی۔

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۸

کمزور ہے، اب جو طالب علم پڑھائی میں تیز ہے، ذہین ہے، زیرک ہے، اس کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ میں اس کے مقابلے میں اچھی استعداد والا ہوں، لیکن ساتھ ہی وہ یہ سوچے کہ اگرچہ اس ایک وصف میں یہ مجھ سے گھٹا ہوا ہے اور میں اس سے بڑھا ہوا ہوں، لیکن نہ جانے اس کے اندر کتنے اوصاف ایسے ہوں جس میں یہ مجھ سے فائق ہو، اور یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کونسا وصف زیادہ مقبول ہو جائے اور میں اس سے پیچھے رہ جاؤں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے اندر بہت سی خرابیاں ہوں اور ان کے بارے میں مجھے پتہ بھی نہ ہو، یا میرے اندر ایک خرابی ہو، لیکن وہ خرابی اس طالب علم کی استعداد کی کمزوری کے مقابلے میں زیادہ سنگین ہو۔

کمزور طالب علم میں نیکی کی برتری حاصل ہے

دیکھئے، اگر ایک طالب علم پڑھائی میں کمزور ہے، لیکن نیک ہے اور اپنے فرائض و واجبات کو ٹھیک ٹھیک بجالاتا ہے، گناہوں سے بچتا ہے، اور ایک طالب علم بڑا ذہین، بڑا زیرک اور بڑا صاحبِ استعداد ہے اور ہر امتحان میں اوّل آتا ہے، لیکن گناہوں کے اندر مبتلا ہے یا وہ نمازوں میں کوتاہی کرتا ہے، ایسے طالب علم کے جو اچھے اوصاف ہیں وہ اکارت اور بیکار ہیں، اس لئے کہ جب عمل صحیح نہیں تو علمی استعداد موجود ہونے سے کیا حاصل؟ اگرچہ یہ طالب علم علمی استعداد کے وصف میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہے، لیکن اس کے اندر ایک خرابی ایسی ہے جس نے اس کے اچھے وصف پر پانی پھیر دیا۔

اصل خرابی ''بے دین'' ہونا ہے

آج کل لوگ دینی خرابی کو خرابی ہی نہیں سمجھتے، العیاذ باللہ، حالانکہ اصل خرابی اور کمزوری یہی ہے۔ ایک صاحب اپنے بیٹے کا تعارف مجھ سے کرا رہے تھے، کہنے لگے کہ میرا یہ بیٹا بڑا ذہین اور بڑا زیرک ہے، پڑھائی میں بہت تیز تھا، اور اب اس کو فلاں ملک میں اعلیٰ درجے کی ملازمت مل گئی ہے، اور وہاں پر اس نے سارے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔ پھر کہنے لگے، البتہ یہ تھوڑا سا بے دین ہو گیا ہے۔ ان صاحب نے بے دین ہونے کی خرابی کو اس طرح بیان کیا کہ جیسے یہ کوئی بڑی خرابی نہیں ہے، گویا کہ اصل معاملات میں تو یہ ٹھیک ہے، بس یہ ذرا سی کمزوری ہو گئی ہے۔

''بے دین'' ہونے کی مثال

میں نے کہا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گاؤں کے لوگ ایک حکیم صاحب کو ایک شخص

کے معائنے کے لئے لائے۔ وہ حکیم صاحب آئے اور اس کا سر سے لے کر پاؤں تک چاروں طرف سے معائنہ کیا۔ دیکھنے کے بعد حکیم صاحب کہنے لگے کہ یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک آدمی ہے، اس کے سارے اعضاء بالکل ٹھیک ہیں، اس کے ہاتھ بھی ٹھیک ہیں، کان بھی ٹھیک ہے، ناک بھی ٹھیک ہے، بس ذرا سی روح نکل گئی ہے۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ آپ نے اپنے بیٹے کے بارے میں جو تعریف کی، اس پر یہ مثال بالکل صادق آتی ہے کہ اس کے اندر سب باتیں تو ٹھیک ہیں، بس ذرا سا بے دین ہوگیا ہے۔ العیاذ باللہ۔

حالانکہ دین کی خرابی اور بدعملی کی خرابی ایسی ہے جو ساری خرابیوں پر بھاری ہے۔ لہٰذا جس شخص کو تم گھٹیا سمجھ رہے ہو، کیا پتہ تمہارے اندر ایک خرابی ایسی ہو جو اس کی خرابی پر بھاری ہو جائے۔

کمتر لوگ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوں گے

اور اگر بالفرض اس کے مقابلے میں تمہارے اندر عیوب کم بھی ہوں، لیکن کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کون مقبول ہے۔ جو لوگ بظاہر دیکھنے میں معمولی قسم کے لوگ نظر آتے ہیں، لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((رُبَّ أَشْعَثَ مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهٗ))(۱)

"ایسا شخص جس کے بال پراگندہ ہیں اور ایسا ہے کہ اگر وہ لوگوں کے دروازوں پر جائے تو لوگ دھکے دے کر نکال دیں، لیکن اگر وہ شخص اللہ تعالیٰ پر قسم کھالے، مثلاً وہ یہ کہے کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ ایسا ضرور ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم پوری فرما دیتے ہیں"

اگرچہ عام لوگوں کی نظروں میں وہ شخص بے حقیقت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بات کو نہیں ٹالتے ہیں کہ جب میرے بندے نے قسم کھالی ہے تو اب میں اس کو جھوٹا نہیں کروں گا۔

جنت کے اعلیٰ درجات والے لوگ

جنت میں جن لوگوں کو اعلیٰ ترین درجات ملنے والے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے حدیث شریف میں یہ الفاظ ہیں کہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب البرّ والصلة ولآداب، باب فضل الضعفاء والخاملین، رقم: ٤٧٥٤، سنن الترمذي، کتاب المناقب عن رسول الله، باب مناقب البراء بن مالك، رقم: ۳۷۸۹

((اَلَّذِیْنَ اِذَا غَابُوْا لَمْ یُفْتَقَدُوْا))(۱)

''وہ ایسے لوگ ہیں جب وہ کہیں چلے جائیں اور غائب ہو جائیں تو ان کو کوئی ڈھونڈنے والا بھی نہ ہو اور کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہو''

مثلاً ایک شخص روزانہ نماز پڑھنے مسجد میں آتا تھا، اگر کسی دن نہ آئے تو کوئی یہ نہ پوچھے کہ فلاں شخص روزانہ آتا تھا، آج کہاں چلا گیا؟ اور اگر وہ کہیں نکاح کا رشتہ لے کر چلے جائیں تو لوگ رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیں کہ یہ تو مولوی آدمی ہے۔ ایسے لوگوں کو جنت میں اعلیٰ ترین درجات ملنے والے ہیں۔

کسی کے ظاہر پر مت جاؤ

لہٰذا کسی شخص کے ظاہر پر مت جاؤ کہ ظاہری اعتبار سے یہ شخص کیسا ہے، کچھ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کیا قدر و قیمت ہو۔ اس لئے فرمایا کہ کسی انسان کو حقیر مت سمجھو، اور یاد رکھو کہ کسی مسلمان پر حقارت کی نگاہ ڈالنا گناہِ کبیرہ اور حرام ہے اور یہ ایسا ہی حرام ہے جیسے شراب پینا اور زنا کرنا حرام ہے۔ اس لئے اگر کبھی اپنے کسی کمال کا خیال آئے اور دوسرے شخص کے کسی نقص کا خیال آئے تو فوراً اس کا علاج اس طرح کرو کہ یہ سوچو کہ کیا معلوم اس کے اندر اور کوئی خوبیاں ہوں جو مجھے معلوم نہیں، کیا معلوم کہ میرے اندر ایسی برائیاں ہوں جو اس کی برائی سے زیادہ سنگین ہوں، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ شخص کتنا مقبول ہو۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض لوگ

اور جو لوگ بظاہر دیکھنے میں بڑے باعزت اور باوقعت نظر آتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک پر کاہ کے برابر بھی ان کی وقعت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا مصداق بننے سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَبْغَضَکُمْ اِلَیَّ وَاَبْعَدَکُمْ مِنِّیْ مَجْلِسًا یَوْمَ الْقِیَامَةِ الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ وَالْمُتَفَیْهِقُوْنَ))(۲)

وہ لوگ جن سے مجھے نفرت ہے اور جو قیامت کے دن مجھ سے دور ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جو

(۱) سنن ابن ماجة، کتاب الفتن، باب من ترجی له السلامة من الفتن، رقم: ۳۹۷۹

(۲) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی معالی الأخلاق، رقم: ۱۹۴۱، مسند أحمد، رقم: ۱۷۰۶۶

زیادہ بولنے والے ہیں اور باچھیں چیر کر بات کرنے والے اور تکبر کرنے والے ہیں، یعنی جو مجلسیں گرم کرنے والے اور بڑے فصیح و بلیغ مشہور ہیں، جو شعلہ بیان اور آتش نوا مشہور ہیں، لوگ ان کے اردگرد جمع ہیں، اور وہ لوگ باچھیں چیر چیر کر لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں، اور وہ لوگ جو لوگوں سے اپنی فصاحت و بلاغت کا لوہا منوائے ہوئے ہیں اور فصاحت و بلاغت اور حسن کلام کی وجہ سے لوگوں میں مقبولیت ہے، عام لوگ ان کو پسند کرتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں کہ یہ بڑے عالم، بڑے فقیہ، بڑے واعظ ہیں، بڑے خطیب ہیں، بڑے باغ و بہار اور مجلسی ہیں، لیکن ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین ہیں۔ العیاذ باللہ

کسی پر کوئی حکم مت لگاؤ

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ تو ظاہری خوبیاں مقبولیت کے لئے معیار ہیں اور نہ ہی ظاہری نقائص اللہ تعالیٰ کے یہاں غیر مقبول ہونے کی علامت ہیں۔ کس بات پر انسان فیصلہ کرے؟ کس چیز پر حکم لگائے؟ اس لئے ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہئے اور کسی بھی انسان کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی حکم مت لگاؤ۔ نہ تو کسی کی تعریف کرو اور نہ کسی کی برائی کرو۔

کافر کو بھی حقیر مت سمجھو

انسان ابتداء میں جب دین پر چلنا شروع کرتا ہے تو اس وقت اس کے اندر جوش و خروش ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں ساری مخلوق پر لعنت ملامت شروع کر دیتا ہے، ساری مخلوق کو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب جہنمی ہیں، بس میں ہی جنتی ہوں، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ ارے مسلمان تو مسلمان، کسی کافر کو بھی قطعی طور پر جہنمی مت کہو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ اس کو اسلام کی توفیق دیدے اور ایک لمحے میں اس کا بیڑہ پار ہو جائے۔

کافر پر "مخلّد فی النار" ہونے کا حکم مت لگاؤ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور باریک بات ارشاد فرمائی جو سمجھنے کی ہے، فرمایا کہ اگر کسی شخص کے ظاہری اقوال سے ایسی باتیں صادر ہو رہی ہیں جو کفر کی حد تک پہنچ رہی ہیں، تو مفتی کا کام یہ ہے کہ اس کے اوپر فتویٰ دیدے کہ یہ باتیں کفر کی ہیں اور دنیا میں اس کے ساتھ کافروں جیسا معاملہ کیا جائے گا، بشرطیکہ مفتی نے پوری احتیاط سے کام لیا ہو، وہ احتیاط یہ ہے کہ اگر کسی کے کلام میں ننانوے احتمالات کافر ہونے کے ہوں اور ایک احتمال مسلمان ہونے کا ہو،

تب بھی کافر ہونے کا فتویٰ نہیں دینا چاہئے۔ لیکن اس کے بارے میں کفر کا فتویٰ دیئے جانے کے باوجود یہ مت کہو کہ اس کی وجہ سے وہ ”مخلد فی النار“ ہو گیا، اس لئے کہ بیشک ظاہری اعتبار سے اس کی بات کفر تھی، لیکن کیا معلوم کہ باطنی طور پر اس کے قول کی ایسی تاویل ہو جو اس کو اللہ تعالیٰ کے یہاں کفر سے بری کر دے۔

ایک شخص کی مغفرت کا واقعہ

اس کی مثال میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ صحیح بخاری کی حدیث پیش فرماتے ہیں، جس میں پچھلی اُمتوں کے ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے کہ پچھلی اُمتوں میں ایک شخص تھا، جب اس کے انتقال کا وقت قریب آیا تو اس نے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میری لاش کو آگ میں جلا دینا اور لاش جلنے کے بعد جب راکھ ہو جائے تو جس دن بہت تیز ہوا چل رہی ہو، اس دن اس راکھ کو ہوا میں اُڑا دینا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ ایسی وصیت کیوں کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ بات یہ ہے کہ میں بہت گناہ گار آدمی ہوں، اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہ آؤں، کیونکہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ آ گیا تو اللہ تعالیٰ مجھے سخت سزا دیں گے، اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہ آؤں۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد اس کی وصیت کے مطابق عمل کر لیا گیا۔

جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ شخص اولاً ہمارے وجود پر ایمان لایا، دوسرے یہ کہ یہ شخص ہم سے ڈر بھی گیا اور ایسا ڈرا کہ اس نے لوگوں سے کہا کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گیا تو وہ مجھے سخت عذاب دیں گے، اس کی ان باتوں کی وجہ سے ہم اس کی مغفرت کرتے ہیں۔(۱)

ظاہری کفر کے باوجود مغفرت کی وجہ

اب بظاہر تو اس کی یہ وصیت کفر تک پہنچتی ہے، اس لئے کہ اس نے کہا تھا کہ میں یہ وصیت اس لئے کر رہا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہ آؤں، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کر رہا ہے کہ اگر ہوا میں میرے جسم کی راکھ اُڑا دی جائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ مجھے جمع نہیں کر سکیں گے، یہ کھلا کفر ہے۔ لیکن چونکہ اس وصیت کا منشا اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خوف تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول الله تعالیٰ یریدون أن یبدلوا کلام الله، رقم: ۶۹۵۲، صحیح مسلم، کتاب التوحید، باب فی سعة رحمة الله تعالیٰ وأنها سبقت غضبه، رقم: ۴۹۴۹، سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب أرواح المؤمنین، رقم: ۲۰۵۲، مسند أحمد، رقم: ۳۵۹۷

کی مغفرت فرمادی۔

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص سے ظاہراً کفر بھی صادر ہو گیا ہو، اس کے اوپر فتویٰ بھی کفر کا ہوگا، اس لئے کہ مفتی کا کام ہی یہ ہے کہ اس کے اوپر کفر کا حکم لگائے، لیکن اس کے "مخلّد فی النار" ہونے کا حکم نہ لگائے۔

"منصور حلاّج" پر کفر کا فتویٰ

دیکھئے! "منصور حلاج" جن کا "انا الحق" کہنے کا واقعہ مشہور ہے، یہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد بلکہ شاید ان کے خلیفہ بھی تھے، جب ان سے "انا الحق" کا کلمہ صادر ہوا جو ظاہراً کفر کا کلمہ تھا تو علماء نے ان کے اوپر کفر کا فتویٰ دے دیا، حالانکہ اندرونی طور پر وہ ہرگز کافر نہیں تھے، ان پر تو کفر کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی، بلکہ غلبۂ حال میں ان سے ایسا کلام صادر ہوا تھا اور اس کی تاویلیں موجود تھیں، لیکن چونکہ فتنہ پھیل رہا تھا، اس لئے علماء کرام نے کفر کا فتویٰ دے دیا۔

پھانسی کے وقت حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے گفتگو

جب ان کو پھانسی دینے کا وقت آیا تو بہت بڑی مخلوق ان کی پھانسی دینے کا نظارہ کرنے کے لئے آئی تھی، ان میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے، جب منصور حلاّج نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تو ان سے کہا کہ یہ ساری مخلوق جو جمع ہے یہ تو حقیقتِ حال سے بے خبر ہے، ان کو تو کچھ معلوم نہیں ہے، اس لئے میں ان کو معذور سمجھتا ہوں، لیکن اے جنید! آپ کو تو حقیقت کا پتہ ہے کہ میں کیا کہتا ہوں اور میری مراد کیا ہوتی ہے، اس لئے آپ کیوں آئے؟ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے خلاف جو فتویٰ دیا گیا ہے وہ صحیح ہے اور تمہارا یہی انجام ہونا چاہئے۔ حالانکہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جانتے تھے کہ اندر سے منصور کی مراد کچھ اور ہے۔

علماء دین کے چوکیدار ہیں

لیکن اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحبان اور فقہاء کو دین کا پاسبان بنایا ہے، ان کا فرض ہے کہ جو بات حق ہے وہ بتادیں، اگر کسی نے کفر کی بات کی ہے تو وہ کہہ دیں گے کہ یہ کفر ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ لوگ دین کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں، جس کو چاہا کافر بنادیا اور جس کو چاہا مسلمان بنادیا۔ میں نے کہا: ہم ٹھیکیدار تو نہیں ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین کا چوکیدار ضرور بنایا ہے، اور

چوکیدار کا کام یہ ہے کہ وہ شناخت کے بغیر کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ دے، حتیٰ کہ اگر وزیر اعظم بھی آجائے گا تو اس کو بھی روک لے گا کہ پہلے شناختی کارڈ دکھاؤ اور اپنی شناخت کراؤ کہ آپ وزیر اعظم ہیں، تب اندر جانے دوں گا ورنہ اندر نہیں جانے دوں گا۔ حالانکہ وہ وزیر اعظم ہے اور یہ چوکیدار ہے۔ اسی طرح ہم بھی دین کے چوکیدار ہیں، لہٰذا اگر کوئی دین کے اندر داخل ہونا چاہے لیکن وہ ان صفات کا حامل نہ ہو تو ہمارا حق ہے کہ اس کو دین کے اندر داخل ہونے سے روک دیں۔

کفر کے فتویٰ کے بعد جہنمی ہونے کا حکم مت لگاؤ

لہٰذا جو مفتیانِ کرام کسی شخص کے بارے میں صحیح طور پر کفر کا فتویٰ دے رہے ہیں، ان پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن فتویٰ دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس شخص کے ساتھ کیا معاملہ فرمائیں گے؟ وہ جنت میں جائے گا یا جہنم میں جائے گا؟ اگر وہ جہنم میں جائے گا تو وہاں پر ہمیشہ رہے گا یا اللہ تعالیٰ اس کو کسی وقت جہنم سے نکال دیں گے؟ یہ فیصلے ہم نہیں کر سکتے اور ان فیصلوں میں ہمیں پڑنا بھی نہیں چاہئے۔ کیا معلوم کہ ایک شخص ظاہری اعتبار سے کافر نظر آرہا ہے، لیکن اس کے پاس کوئی ایسی تاویل ہو جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس پر فضل کا معاملہ فرمادیں۔ اس لئے کسی بھی انسان کو کسی بھی لمحے حقیر سمجھنا تکبر کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

بخل کی حقیقت ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ. وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ. وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ. أَمَّا بَعْدُ!

بخل مال کی محبت کا نتیجہ ہے

مختلف باطنی بیماریوں کا بیان چل رہا ہے، یہاں سے حضرت والا نے ''بخل'' کا بیان شروع فرمایا ہے۔ یہ ''بخل'' بھی باطنی بیماریوں میں سے ایک بیماری ہے، جسے عرفِ عام میں کنجوسی کہتے ہیں۔ جب انسان کے دل میں مال کی اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ پیسے ہاتھ سے جاتے ہوئے جان نکلتی ہے تو یہ بخل ہے۔ اور یہ بڑا مذموم وصف ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ اس کی مذمت وارد ہوئی ہے۔ اس بخل کے نتیجے میں انسان اپنے فرائض وواجبات میں غفلت برتتا ہے اور گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔

بخل کے نتائج

''بخل'' انسان کے اندر یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ جو مال آگیا ہے، وہ اب کہیں نہ جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں شرعی اعتبار سے خرچ کرنا ضروری ہے، مثلاً زکوٰۃ ہے، مالی حقوقِ واجبہ ہیں، بیوی بچوں کا نفقہ ہے، ان میں بھی انسان پھر صحیح طور پر خرچ نہیں کرتا، بخل کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ بس کسی طرح بھی پیسہ میرے پاس آجائے اور پھر اسی جذبہ کے تحت انسان جائز اور ناجائز کی پرواہ مٹا دیتا ہے۔ بس مال آرہا ہے، اس کو آنے دو، چاہے وہ حلال طریقے سے آرہا ہے یا حرام طریقے سے آرہا ہے۔ اگر مال حرام طریقے سے آرہا ہے اور وہ شخص مولوی بھی ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس حرام مال کو کوئی تاویل کر کے حلال بنا لے، تاکہ یہ حرام مال جو آرہا ہے یہ کسی طرح میرے پاس رہ جائے اور دوسرے کے پاس نہ جائے۔

☆ اصلاحی مجالس (۵/۴ ۷۴تا ۸۶)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

بخل دودھاری تلوار ہے

لہٰذا یہ ''بخل'' ایک طرف حقوقِ واجبہ کی ادائیگی میں رکاوٹ بنتا ہے، دوسری طرف معصیتوں کے ارتکاب کا داعی بنتا ہے اور حرام طریقے سے مال اور پیسہ حاصل کرنے کی فکر انسان کے اندر پیدا کرتا ہے، اس لئے یہ ''بخل'' دودھاری تلوار ہے، اِدھر سے بھی کاٹتی ہے اور دوسری طرف سے بھی کاٹتی ہے، گناہ میں بھی مبتلا کرتی ہے اور حقوقِ واجبہ اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی بھی کراتی ہے، اس لئے یہ بڑی خطرناک بیماری ہے اور اس کا علاج بڑا ضروری ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں انفاسِ عیسیٰ میں جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ان سے اس بیماری کے کچھ اصول معلوم ہو جاتے ہیں۔

کتاب البخلاء

اگر آدمی اس ''بخل'' کی تفصیلات اور جزئیات کو بیان کرے تو بات بڑی لمبی ہو جاتی ہے، چنانچہ علامہ جاحظ رحمۃ اللہ علیہ جو ایک ادیب آدمی ہے، اس نے اسی موضوع پر ''کتاب البخلاء'' کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جو دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بخلاء کے حالات بیان کیے ہیں کہ دنیا میں کیسے کیسے بخیل ہوتے ہیں، کیا کیا ان کے اوصاف ہوتے ہیں اور ان بخلاء کے بڑے عجیب و غریب قصے لکھے ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے بخل کی اقسام کا پتہ چلتا ہے کہ کن کن دائروں میں ''بخل'' چلتا ہے اور کیا کیا اس کی صورتیں ہوتی ہیں اور یہ کس کس طرح سے انسان کو مارتا ہے۔ یہ کتاب ادب کا شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ ''احیاء العلوم'' میں بھی امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بخل'' پر لمبی بحث کی ہے۔ لیکن یہاں ''انفاسِ عیسیٰ'' میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''بخل'' پر حضرت والا کے جو ارشادات نقل فرمائے وہ اتنے جامع ہیں کہ ایک صفحے میں اس بیماری کے بارے میں جو بنیادی اور اصل الاصول باتیں ہیں، وہ سب یہاں جمع فرما دی ہیں۔

ایک صاحب نے حضرت والا کو خط میں لکھا:

''پیسہ اُٹھاتے ہوئے قلب بہت تنگ ہو جاتا ہے''

حضرت والا نے جواب دیا:

''اگر کوئی حق واجب فوت نہ ہو تو کچھ غم نہیں''

اصلاح کا طریقہ اپنے عیوب کا اظہار کرنا ہے

جو اللہ کے بندے اپنی اصلاح کے لئے کسی شیخ سے رجوع کرتے ہیں تو پھر اپنی ایک ایک

بات اپنے شیخ کو لکھتے ہیں، کیونکہ شیخ سے رجوع کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ جو حالات تم اپنے اندر محسوس کر رہے ہو، وہ شیخ کو بتاؤ۔ پھر شیخ دیکھ کر بتائے گا کہ واقعۃً یہ کوئی بیماری ہے یا نہیں؟ اگر بیماری ہے تو شیخ اس کا علاج کرے گا۔ اگر تم نہیں بتاؤ گے تو شیخ کے پاس علمِ غیب تو ہے نہیں، اس لئے شیخ کو اپنے حالات بتانے پڑتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ انسان کے اندر اپنی اصلاح کی فکر عطا فرما دیتے ہیں تو پھر انسان کی نگاہ اپنے حالات اور اپنے عیوب کی طرف جانے لگتی ہے اور جب تک فکر نہیں ہوتی تو پھر غفلت کی حالت میں انسان کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے، صحیح رخ پر جا رہا ہوں یا غلط رخ پر جا رہا ہوں، دل میں جو خیالات آ رہے ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط ہیں، بس کچھ پرواہ نہیں ہوتی، لیکن جب اللہ تعالیٰ فکر عطا فرماتے ہیں تو آدمی کے اندر ایک کھٹک پیدا ہو جاتی ہے۔

دل میں کھٹک پیدا ہونا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ''تقویٰ'' کے معنی ہیں ''کھٹک'' یعنی دل میں یہ کھٹک پیدا ہو جائے کہ میں جو کام کر رہا ہوں یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ جو خیال میرے دل میں آ رہا ہے، یہ درست ہے یا غلط ہے، یہ کھٹک ہی کامیابی کی کلید ہے، کیونکہ جب کسی کام کے وقت دل میں کھٹک پیدا ہوئی اور پھر شیخ کو اس کھٹک کی اطلاع کر دی تو اب شیخ اس کا علاج بتا دے گا۔ اب دیکھئے! اس اللہ کے بندے کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ جب میں کہیں پیسہ خرچ کرتا ہوں تو دل میں بہت تنگی ہوتی ہے اور دل دکھتا ہے کہ پیسہ جا رہا ہے، تو یہ کہیں بخل کی بیماری تو نہیں ہے، اگر یہ بیماری ہے تو شیخ سے اس کا علاج پوچھنا چاہئے۔

پیسے جانے کا غم گناہ نہیں

جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ ''اگر کوئی حق واجب فوت نہ ہو تو کچھ غم نہیں''

مطلب یہ ہے کہ پیسے کے جانے سے دل میں جو غم ہو رہا ہے یا صدمہ ہو رہا ہے یا دکھ ہو رہا ہے، یہ صدمہ اور غم بذاتِ خود کوئی گناہ نہیں، کیونکہ یہ ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، انسان کو اس پر اختیار نہیں اور اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایسے عمل پر سزا نہیں دیتے جو اس کے اختیار سے باہر ہو۔ ہاں! اگر یہ صدمہ اور غم کسی حق واجب کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جائے، مثلاً زکوٰۃ فرض تھی، وہ ادا نہیں کی، صدقۃ الفطر واجب تھا، وہ نہیں دیا، بیوی بچوں کو جتنا نان ونفقہ دینا چاہئے تھا، اتنا نہیں دیا، کسی ملازم کو رکھا تھا، اس کے پورے حقوق نہیں دیئے اور اس غم اور صدمہ کے نتیجے میں حقِ واجب فوت ہو گیا تو یہ گناہ ہے۔

صرف مال کی محبت مضر نہیں

اور اسی حق واجب فوت ہونے میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کسی معصیت کا ارتکاب کر لیا، مثلاً ناجائز اور حرام کام کے ذریعہ پیسے حاصل کر لیے، لہٰذا جب تک کسی حرام اور ناجائز کام کا ارتکاب نہ ہو تو محض دل کا تنگ ہو جانا گناہ کا سبب نہیں۔ اسی لئے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر کوئی حق واجب فوت نہ ہو تو کچھ غم نہیں۔ کیونکہ بخل کے اصل معنی ہیں "مال کی محبت" اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ میں نے تمہارے دل میں مال کی محبت ڈالی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾(۱)

لوگوں کے لئے مرغوب چیزوں کی محبت مزین کر دی گئی ہے، مثلاً عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیتی، جب اللہ تعالیٰ نے محبت ڈالی ہے تو وہ محبت دل میں موجود ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾(۲)

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر بنیادی طور پر بخل کا مادہ پیدا کیا ہے۔ لہٰذا محض بخل کا مادہ ہونا کوئی گناہ اور قابلِ مؤاخذہ بات نہیں، البتہ قابلِ مؤاخذہ اس وقت ہے جب انسان اس محبت کو گناہ کے کاموں کے لئے استعمال کرے، یا وہ محبت انسان کو گناہ پر آمادہ کر دے، یا حقِ واجب کو فوت کرنے پر آمادہ کر دے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دعا

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ جس وقت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایران فتح ہوا اور کسریٰ کا محل مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو اس وقت مسجد نبوی میں سونے کے اتنے ڈھیر لگ گئے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس ڈھیر کے پیچھے چھپ گئے۔ سونے کے اس ڈھیر کو دیکھ کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے اللہ! ہم یہ نہیں کہتے کہ

---

(۱) آل عمران: ۱٤، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "لوگوں کے لئے ان چیزوں کی محبت خوشنما بنا دی گئی ہے جو ان کی نفسانی خواہش کے مطابق ہوتی ہے، یعنی عورتیں، بچے، سونے چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر، نشان لگائے ہوئے گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں"

(۲) النساء: ۱۲۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اور انسانوں کے دل میں کچھ نہ کچھ لالچ کا مادہ تو رکھ ہی دیا گیا ہے"

ہمیں اس مال سے محبت نہیں ہے، نہ یہ دعا کرتے ہیں کہ یہ محبت بالکل ختم ہوجائے، البتہ ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ اس مال کی محبت آپ کے دین کے لئے فتنہ نہ بنے۔ یہ نہیں فرمایا کہ اس مال کی محبت ہمارے دل سے نکال دیجئے، کیونکہ یہ مال تو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، اسی کو "فضل اللہ" فرمایا ہے، اسی مال کو "خیر" فرمایا ہے، اسی مال کو "جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا"(۱) فرمایا ہے، اس لئے اس مال کی نفرت مطلوب نہیں، بلکہ فی نفسہٖ یہ مال کام کی چیز ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کا قوام بنایا ہے، اس لئے نہ تو ہم اس مال کی نفرت مانگتے ہیں اور نہ اس کی محبت کا ازالہ مانگتے ہیں، ہاں! اے اللہ! ہم یہ مانگتے ہیں کہ یہ مال ہمیں معصیت پر آمادہ نہ کرے اور ہمارے دین کو کسی فتنہ میں مبتلا نہ کرے۔

مال کی کونسی محبت گناہ ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ طبعی طور پر دل میں مال کی محبت ہونا نہ گناہ ہے اور نہ مضر ہے، ہاں! اگر مال کی محبت اتنی زیادہ ہوجائے کہ وہ انسان کو صحیح جگہ پر خرچ کرنے سے روک دے تو وہ "بخل" ہے اور حرام ہے اور بیماری ہے۔ اب دیکھئے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان صاحب کو تسلی دے دی کہ "اگر حق واجب فوت نہ ہو تو کچھ غم نہیں" لیکن یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ ہر انسان کے لئے ایک نسخہ نہیں ہوتا، طبیب اور معالج ہر مریض کے حالات دیکھ کر اس کے لئے نسخہ تجویز کرتا ہے، چنانچہ حضرت والا نے اس شخص کو دیکھا کہ یہ شخص حدِ اعتدال کے اندر ہے اور اعتدال سے آگے بڑھا ہوا نہیں ہے، اس لئے آپ نے اس کو تسلی دے دی اور کسی خطرے سے متنبہ نہیں فرمایا۔

یہ خطرہ کی گھنٹی ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جو مال کی محبت ہے اور مال خرچ کرتے ہوئے دل دکھ رہا ہے، یہ حالت مذموم تو نہیں اور نہ گناہ ہے، لیکن اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ حالت کسی وقت آگے بڑھ کر "بخل" کی حد تک پہنچ جائے گی اور کسی بھی وقت حقِ واجب کو بھی ادا کرنے کا راستہ روک دے گی، لہٰذا! جب مال خرچ کرنے سے دل دکھ رہا ہے تو یہ خطرہ کی گھنٹی ہے، اس خطرہ کی گھنٹی کا علاج یہ ہے کہ اس محبت کو ذرا پیچھے کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ سرحد سے اتنی دور رہے کہ سرحد پار کر جانے کا احتمال نہ ہو۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس محبت کو کم کرو یہاں تک کہ یا تو یہ دکھ بالکل ختم ہوجائے یا یہ کہ اتنا کم ہوجائے کہ وہ کالعدم ہوجائے، جب مشق کرو گے تو یہ حالت حاصل ہوجائے گی۔

---

(۱) النساء: ۵

دراہم، امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے محدث ہیں، ان کے ایک شاگرد ہیں امام معمر بن راشد رحمۃ اللہ علیہ، وہ شاگرد امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

(مَا رَأَیْتُ أَحَدًا الدُّنْیَا أَهْوَنُ عِنْدَهُ مِمَّا کَانَتْ عِنْدَ الزُّهْرِيِّ، کَانَتِ الدَّرَاهِمُ عِنْدَهُ بِمَنْزِلَةِ الْبَعْرِ)(۱)

''میں نے آج تک کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جس کے دل میں دنیا اتنی بے وقعت ہو جتنی امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں بے وقعت تھی، دراہم ان کے نزدیک ایسے تھے جیسے مینگنیاں''

جیسے مینگنیوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اسی طرح ان کے نزدیک دراہم کی بھی کوئی قیمت نہیں تھی، یعنی دراہم کی طرف کوئی التفات ہی نہیں تھا، کوئی محبت ہی نہیں تھی۔

میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ اور دنیا

حضرت میاں جی نور محمد جھنجانوی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات میں لکھا ہے کہ جب بازار جاکر کوئی چیز خریدتے تو پیسوں کی تھیلی دکاندار کو دے دیتے اور کہتے کہ تم اس چیز کی قیمت اس تھیلی میں سے لے لو، خود گن کر نہیں دیتے تھے اور یہ سوچتے کہ جتنا وقت تھیلی میں سے پیسے نکال کر گننے میں صرف ہوگا، اتنا وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کیوں نہ صرف کیا جائے۔ کسی چور نے دیکھ لیا کہ ان کے پاس پیسوں کی تھیلی ہے، چنانچہ وہ تھیلی کندھے پر لٹکائے جا رہے تھے کہ چور پیچھے سے آیا اور تھیلی لے کر بھاگ گیا، انہوں نے کوئی مزاحمت ہی نہیں کی، وہ تھیلی چھوڑ دی اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کون چھین کر لے جا رہا ہے۔

اب وہ چور تھیلی لے کر ان کے علاقے سے باہر نکلنا چاہتا ہے مگر اس کو راستہ ہی نہیں ملتا، وہ گلیاں اس کے لئے بھول بھلیاں بن گئیں، اب پریشانی کے عالم میں کبھی ایک گلی میں داخل ہوتا اور کبھی دوسری گلی میں داخل ہوتا، مگر باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا، آخر میں اس کو خیال آیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اس اللہ کے ولی کے ساتھ زیادتی کرنے کا وبال ہے، چنانچہ وہ چور میاں جی کے گھر پر پہنچا اور دروازے پر دستک دی، انہوں نے اندر سے پوچھا کہ کون ہے؟ چور نے کہا کہ یہ اپنی تھیلی لے لو۔ میاں جی نے فرمایا کہ میں یہ تھیلی نہیں لیتا، اس لئے کہ جس وقت تو نے چھینی تھی، اسی وقت میں

---

(۱) طرح التثریب (۲۳۸/۱)

نے تجھے صدقہ کردی تھی، لہٰذا اب یہ تھیلی میری ملکیت نہیں رہی۔ وہ چور کہتا ہے کہ خدا کے لئے لے لو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نہیں لیتا۔ آخر میں چور نے کہا کہ حضرت! مجھے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہے، یہ دعا کردو کہ راستہ مل جائے۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ اچھا چلا جا، میں دعا کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ چور تھیلی لے کر چلا گیا۔

مال کی محبت سے ذرا پیچھے رہو

بہرحال! ایسے بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہوتے ہیں کہ ان کے دل سے مال کی محبت بالکل جاتی رہی، اب یا تو یہ صورتِ حال پیدا ہو جائے یا کم از کم مال کی محبت اتنی کم ہو جائے کہ وہ خطرے کی حد سے دور ہو جائے۔ اس وجہ سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مال کی محبت سے ذرا پیچھے رہو۔ اس بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے دو باتیں بیان فرمائیں۔

اس کیفیت کو برا سمجھو اور دعا کرو

ایک یہ کہ جب تم یہ محسوس کرو کہ پیسوں کے جانے سے دل دکھ رہا ہے اور دل میں تنگی ہو رہی ہے تو ایک کام یہ کرو کہ دل کی اس کیفیت کو برا سمجھو کہ یہ کوئی اچھی کیفیت نہیں۔ دوسرا کام یہ کرو کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! یہ مال کی محبت کا سانپ کہیں مجھے ڈس نہ لے اور کسی وقت میرے لئے مصیبت نہ بن جائے، لہٰذا یا اللہ! میری اس مال کی محبت کو اعتدال سے بڑھنے سے روکئے اور حد کے اندر رکھئے۔ یہ دعا کرتے رہو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ پھر یہ محبت نقصان دہ نہیں ہوگی۔

آپ نے اس کو تسلی دے دی

البتہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں اس شخص کو تسلی دے دی کہ یہ دکھ اور تکلیف بری اور ناجائز نہیں اور اس شخص کو اس دکھ پر متنبہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس شخص کی خصوصیت تھی، آپ جانتے تھے کہ یہ شخص مال کی محبت میں آگے بڑھنے والا نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس کو تسلی نہ دیتے بلکہ اس کو متنبہ فرماتے کہ یہ دکھ ہونا تو بڑی خطرناک بات ہے، اس کی فکر کرو۔ شیخ کا اصل کام ہی یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ کس شخص کو کس وقت کیا نسخہ دیا جائے۔

یہ حبِ مال نہیں، حبِ اعتدال ہے

ایک اور صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا:

''خرچ کرنے میں فی الجملہ گرانی معلوم ہوتی ہے، ناداری اور قرض کرنے سے خوف رہتا ہے، گو حقوق واجبہ میں کوتاہی نہیں کرتا''

جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''یہ حب مال نہیں، حب اعتدال ہے''(۱)

ایک صاحب نے لکھا کہ جب میں پیسے خرچ کرتا ہوں تو دل میں گرانی ہوتی ہے اور خرچ کرتے ہوئے یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں بالکل ہی نادار نہ ہو جاؤں اور پھر قرض لینا پڑ جائے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حقوقِ واجبہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتا۔ جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ یہ حب مال نہیں بلکہ حب اعتدال ہے، کیونکہ جب حقوقِ واجبہ میں کوتاہی نہیں ہو رہی ہے تو پھر جو مقصود تھا وہ حاصل ہے، وہ حبِ مال جو مذموم ہے اور جو بیماری ہے اور گناہ ہے، وہ اس میں حاصل نہ ہوا، اس لئے یہ مذموم نہیں۔ البتہ پھر بھی آدمی کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی محبت رفتہ رفتہ آدمی کو گناہ میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۰

بخل کا علاج☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ. وَعَلٰی آلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ. وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ. أَمَّا بَعْدُ!

ہر کام اللہ تعالیٰ کے لئے ہونا چاہئے

باطن کی جو بیماریاں انسان کے لئے مہلک ہوتی ہیں، ان کا بیان چل رہا ہے، ان بیماریوں میں سے ایک بیماری ''بخل'' ہے جس کی تھوڑی سی تفصیل گزشتہ کل عرض کی تھی۔ اسی سلسلے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ارشاد ہے:

"مَنْ أَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْإِیْمَانَ [1] اس میں ''اعطاء'' اور ''منع'' دونوں کے ساتھ ''لِلّٰہ'' کی قید ہے، جس سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں اور نہ بخل مطلقاً مذموم ہے بلکہ اگر خدا کے لئے ہوں تو دونوں محمود ورنہ دونوں مذموم، غرض اخلاق سب فطری وجبلی ہیں اور درجہ فطرت میں کوئی خلق نہ مذموم ہے اور نہ محمود بلکہ مواقع استعمال سے ان میں مدح وذم آجاتی ہے" [2]

''بخل'' مطلقاً مذموم نہیں

''بخل'' کے معنی ہیں ''مال کو خرچ کرنے سے روکنا'' اس کے مقابلے میں سخاوت ہے، اس

☆ اصلاحی مجالس (۸۹/۵ تا ۱۰۸)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) پوری حدیث کے الفاظ کچھ یوں ہیں: ((مَنْ أَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ وَأَحَبَّ لِلّٰہِ وَأَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ إِیْمَانَہٗ)) ''جس نے اللہ کے لئے عطا کیا، اللہ کے لئے دینے سے روکا، اللہ کے لئے محبت کی اور اللہ کے لئے دشمنی رکھی، اس نے ایمان کی تکمیل کرلی'' سنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، رقم: ۲۴۴۵، سنن أبی داؤد، کتاب السنۃ، باب الدلیل علی زیادۃ الایمان ونقصانہ، رقم: ۴۰۶۱، مسند أحمد، مسند معاذ بن جبل، رقم: ۱۵۰۶۴

(۲) انفاسِ عیسیٰ، ص ۱۹۰

کے معنی ہیں ''کھلے دل سے مال خرچ کرنا اور دل تنگ نہ کرنا'' اس کو سخاوت کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بخل مذموم ہے یعنی بری بات ہے اور سخاوت اچھی بات ہے اور قابلِ تعریف بات ہے۔ اس ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ یہ تصور درست نہیں، نہ تو ہمیشہ مال کو روکنا برا ہے اور نہ ہمیشہ مال کو خرچ کرنا اچھا ہے، بلکہ بعض اوقات مال کو روکنا بھی اچھا ہوتا ہے، قابلِ تعریف اور قابلِ ثواب ہوتا ہے، اور بعض اوقات مال کا خرچ کرنا بھی اچھا نہیں ہوتا بلکہ گناہ ہوتا ہے یا کم از کم مذموم ہوتا ہے۔

صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مال خرچ کرو

دلیل میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پیش کی کہ آپ نے اس حدیث میں اصول بیان فرمادیا:

((مَنْ أَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ))(۱)

حدیث میں اور الفاظ بھی ہیں مگر یہاں صرف انہی الفاظ کو پیش کرنا مقصود ہے، اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اللہ کے لئے دے اور اللہ کے لئے روکے، اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔ یعنی جب دے رہا ہے تو اللہ کے لئے دے رہا ہے اور اگر روک رہا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے روک رہا ہے۔ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہاں بھی خرچ کررہا ہے، چاہے وہ غریبوں، مسکینوں اور ضرورت مند لوگوں کو صدقہ دے رہا ہو، زکوٰۃ دے رہا ہو، یا اپنے بیوی بچوں کا نفقہ ادا کررہا ہو، یا ان کے لئے کھانے پینے کا انتظام کررہا ہو، یا اپنے نفس پر خرچ کررہا ہو، لیکن ان سب جگہوں پر خرچ کرنے میں اللہ جل شانہ کی رضا مقصود ہو، مثلاً اگر فقیر کو پیسے دے رہا ہے تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہے، دکھاوا مقصود نہیں، بیوی بچوں پر خرچ کررہا ہے تو یہ سوچ کر خرچ کررہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق میرے ذمے وابستہ فرمائے ہیں، لہٰذا میں ان کے حقوق کی ادائیگی کا مکلف ہوں اور میں اپنے اس فریضے کو ادا کررہا ہوں، تو یہ خرچ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگیا اور ''من أعطى لِلّٰه'' میں داخل ہے۔

اپنی ذات پر خرچ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہے

اسی طرح جو کچھ خود کھارہا ہے، اس میں بھی اس کی یہ نیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نفس جو دیا ہے، یہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اس نفس کا بھی میرے اوپر حق ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم: ٢٤٤٥، سنن أبي داؤد، كتاب السنة، باب الدليل على زيادة الايمان ونقصانه، رقم: ٤٠٦١، مسند أحمد، مسند معاذ بن جبل، رقم: ١٥٠٦٤

نے فرمایا:

((إِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))(۱)

''تیرے نفس کا بھی تیرے اوپر حق ہے''

اب اگر میں اس نفس کو نہیں کھلاؤں گا اور بھوک کی وجہ سے یہ مرجائے گا تو یہ خودکشی ہوگی اور حرام موت ہوگی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نفس کا مجھ پر حق رکھا ہے۔ لہٰذا میں جو کچھ اس نفس کو کھلا رہا ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے کھلا رہا ہوں۔ یہ سب "مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ" میں داخل ہے۔

بازار سے چیز خریدنا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے

اگر بازار میں کوئی چیز خرید رہا ہے تو بظاہر اپنے نفع کے لئے وہ چیز خرید رہا ہے، لیکن مآل کار یا تو وہ چیز اپنے نفس کے لئے خرید رہا ہوگا یا اپنے بیوی بچوں کے لئے خرید رہا ہوگا یا کسی محتاج اور ضرورتمند کو دینے کے لئے خرید رہا ہوگا، ان تینوں باتوں میں کوئی ایک بات ضرور ہوگی اور ان تینوں باتوں میں سے ہر بات ایسی ہے کہ جس میں صحیح نیت کر لینے سے وہ عمل اللہ تعالیٰ کے لئے بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین دیا ہے جو ''ہم خرما و ہم ثواب ہے'' کہ کام تو اپنے لئے یا اپنے بیوی بچوں کے لئے کر رہے ہو لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ذرا سا زاویہ نگاہ بدلو تو یہ سب کام میرے لئے ہو رہا ہے اور "مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ" میں داخل ہے۔

بیوی کے منہ میں لقمہ دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے

اسی لئے حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((حَتَّى اللُّقْمَةَ الَّتِي تَرْفَعُهَا إِلَى فِي امْرَأَتِكَ وَهِيَ صَدَقَةٌ))(۲)

''جو ایک لقمہ تم اُٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں دیتے ہو، یہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک صدقہ کے حکم میں ہے''

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۳۳۷، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب ما یؤمر به من القصد فی الصلاة، رقم: ۱۱۶۲، مسند أحمد، رقم: ۲۵۱۰٤۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب النفقات، باب فضل النفقة علی الأهل، رقم: ٤۹۳۵، سنن الترمذی، کتاب الوصایا عن رسول الله، باب ما جاء فی الوصیة بالثلث، رقم: ۲۰٤۲، سنن أبی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی ما لا یجوز للموصی فی ماله، رقم: ۲٤۸۰، مسند أحمد، رقم: ۱۳۹۹

یہ دین جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، یہ مٹی کو سونا بنانے والا ہے۔ کھانا اپنے فائدہ کے لئے کھایا جارہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم یہ لکھ لیتے ہیں کہ یہ کھانا تم نے ہمارے لئے کھایا ہے، لہٰذا تمہارے اس عمل کو بھی تمہارے نیک اعمال میں اور ثواب والے اعمال میں درج کر لیتے ہیں۔ آخرت میں جو نیکیوں کا حساب ہوگا تو یہ کھانا پینا بھی تمہارے نیک اعمال کے اکاؤنٹ میں داخل ہو چکا ہوگا۔

یہ روکنا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے

حدیث میں دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا "مَنَعَ لِلّٰہِ" اگر روکے تو اللہ تعالیٰ کے لئے روکے، یعنی ایک جگہ پر پیسے دینے کا موقع آیا لیکن پیسے نہیں دیئے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے روک لیا۔ مثلاً مجمع عام میں کسی کام کے لئے چندہ ہو رہا تھا اور ہر شخص آگے بڑھ کر چندہ دے رہا تھا، تمہارے دل میں یہ خیال آیا کہ چندہ دینے کو دل تو نہیں چاہ رہا ہے، لیکن سب لوگ تو بڑھ چڑھ کر دے رہے ہیں، اگر میں نہیں دوں گا تو ناک کٹ جائے گی اور مجمع کے اندر بدنامی ہوگی کہ سب لوگ تو دے رہے ہیں اور یہ کنجوس بیٹھا ہے، لوگ مجھے کنجوس اور بخیل کہیں گے، اس خیال کے آنے پر چندہ دینے کا ارادہ کرلیا اور جیب سے پیسے نکال لیے، پھر خیال آیا کہ اگر اس وقت میں چندہ دوں گا تو یہ دکھاوے کا چندہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہوگا، اس طرح چندہ دینا تو جائز نہیں اور اس پر ثواب بھی نہیں، چنانچہ دوسرا خیال آنے کے بعد وہ پیسے واپس جیب میں رکھ لیے، اب یہ واپس رکھ لینا اور چندہ نہ دینا "مَنَعَ لِلّٰہِ" میں داخل ہے۔ اس لئے کہ یہ روکنا اللہ تعالیٰ کے لئے ہوا، اس نے سوچا کہ چاہے دنیا مجھے بخیل کہے چاہے کنجوس کہے، لیکن چونکہ اس وقت دینا جائز نہیں ہے، اس لئے میں نے روک لیا، لہٰذا یہ بھی "مَنَعَ لِلّٰہِ" ہو گیا۔

شادی بیاہ کے موقع پر دینا

آج کل شادی بیاہ کے موقع پر جو ہدیے اور تحفے دیئے جاتے ہیں اور اس میں باقاعدہ لکھت پڑھت ہوتی ہے کہ کس شخص نے کس کی شادی کے موقع پر کتنا دیا تھا، اب دوسرا شخص اس سے بڑھا کر دے یا برابر کر کے دے، یہ سب "نیوتہ" ہے جس کو قرآن کریم نے حرام کہا ہے، لہٰذا ایسے موقع پر مت دو۔ ہاں! اگر دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ میرا بھائی ہے اور اس کے گھر میں خوشی ہے، میرے اندر سے دل میں یہ داعیہ پیدا ہو رہا ہے کہ میں اس کو ہدیہ اور تحفہ پیش کروں۔ سبحان اللہ! بڑی اچھی بات ہے، تحفہ اور ہدیہ پیش کر دو، لیکن اگر ہدیہ اور تحفہ دینے کو دل تو نہیں چاہ رہا ہے، اس لئے کہ پیسے کی تنگی ہے یا اس سے کوئی خاص قریبی تعلق بھی نہیں ہے، مگر چونکہ اس شخص نے میری فلاں تقریب میں اتنے

پیسے دیئے تھے، لہٰذا اس شخص کی تقریب میں مجھے دینا ضروری ہوگیا، یا یہ کہ اگر میں کوئی ہدیہ تحفہ نہیں دوں گا تو سارے معاشرے میں نکوں بن جاؤں گا اور سب لوگ یہ کہیں گے کہ یہ اتنا کنجوس آدمی ہے کہ چاہے کسی کی شادی بیاہ ہو یا کوئی تقریب ہو، مگر اس کی جیب سے پیسے نہیں نکلتے، یہ سوچ کر تحفہ یا ہدیہ دیا، ایسا ہدیہ تحفہ دینا حرام اور ناجائز ہے۔

یہ صورت "مَنَعَ لِلّٰہِ" میں داخل ہے

اور اگر اس نے یہ سوچا کہ کوئی مجھے کنجوس کہتا ہے تو کہے، کوئی بخیل کہتا ہے تو کہے، کوئی مجھے غیر مہذب کہتا ہے تو کہے، کوئی مجھے ناشائستہ کہتا ہے تو کہے، مجھے تو اپنے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے میں نہیں دیتا۔ یہ نہ دینا "مَنَعَ لِلّٰہِ" میں داخل ہے۔ یا اس شخص کو معلوم ہے کہ میں اگر فلاں شخص کو پیسے دوں گا تو وہ اس کو ناجائز اور غلط کاموں میں استعمال کرے گا، ایسے شخص کو ہدیہ تحفہ یا پیسے دینا درست نہیں، یہ سوچ کر اس نے پیسے نہیں دیئے، یہ صورت بھی "مَنَعَ لِلّٰہِ" میں داخل ہے۔

دوسروں کو دینا جائز طریقے پر ہونا چاہئے

اس لئے اس ملفوظ میں حضرت تھانویؒ فرمارہے ہیں کہ نہ تو دینا ہمیشہ اچھا ہے اور نہ ہی روکنا ہمیشہ برا ہے بلکہ اس کا دارومدار نیت اور حالات پر ہے، بعض اوقات دینا برا ہے جیسا کہ ابھی چند مثالیں پیش کیں اور بعض حالات میں روکنا ثواب ہے، اصل مدار اس پر ہے کہ دینا مشروع طریقے پر ہورہا ہے یا نہیں؟ اور یہ دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہورہا ہے یا نہیں؟ مشروع طریقے پر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دینا شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟ جہاں شریعت کے خلاف دیا جارہا ہے وہ دینا بیکار ہے۔ اور دیتے وقت نیت اللہ جل شانہٗ کو راضی کرنے کی ہو، دکھاوے اور نام ونمود کی نیت نہ ہو، جب دو شرطیں پائی جائیں گی تو دینا ثواب ہوگا اور جب یہ دونوں شرطیں روکنے میں پائی جائیں گی تو روکنا ثواب ہوگا۔

مال کی طرف میلان فطری ہے

حدیث میں فرمایا کہ جو شخص یہ کام کرلے اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔ ایسے شخص کو اتنی بڑی بشارت یعنی تکمیلِ ایمان کی بشارت دی جارہی ہے۔ بہرحال! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں اور نہ بخل مطلقاً مذموم ہے بلکہ اگر خدا کے لئے ہوں تو دونوں محمود اور قابلِ تعریف ہیں اور اگر خدا کے لئے نہ ہوں تو دونوں مذموم ہیں۔ غرض اخلاق سب فطری اور جبلی ہیں اور درجہ فطرت

میں کوئی خلق نہ مذموم ہے اور نہ محمود۔ جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ محض یہ بات کہ دل میں مال کی محبت ہے یا جب ہاتھ سے پیسے جاتے ہیں تو دل میں تنگی پیدا ہوتی ہے، محض یہ باتیں انسان کی طبیعت کا حصہ ہیں، اس لئے کہ فطری طور پر انسان کی طبیعت مال کی طرف مائل ہوتی ہے، ''مال'' کی تعریف ہی یہ ہے کہ ''مَا یَمِیْلُ اِلَیْہِ الطَّبْعُ'' یعنی جس کی طرف طبیعت مائل ہو، لہٰذا مال کی طرف دل کا مائل ہونا فطرت کا ایک حصہ ہے۔

مال کی محبت کا صحیح استعمال اور غلط استعمال

اب اگر اس مال کی محبت کو جائز طریقے سے استعمال کیا تو اس میں کچھ حرج نہیں، مثلاً مال کی محبت میں تم نے حلال طریقے سے روزی کمانے کا اہتمام کیا اور اس میں اس بات کی بھی فکر کی کہ حلال طریقے سے جتنا زیادہ سے زیادہ مجھے مل جائے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اسی طرح جو تجارت، زراعت اور ملازمت وغیرہ ہے، یہ سب مال کی محبت کی وجہ سے کر رہے ہو، چونکہ مال کی محبت کو تم نے ایک جائز اور مباح کام میں استعمال کیا تو یہ مال کی محبت بری نہ ہوئی اور اس محبت نے تمہارے اوپر کوئی برا اثر نہیں چھوڑا، لیکن اگر مال کی محبت کو تم نے ناجائز کاموں میں استعمال کیا کہ ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنا شروع کر دیا اور مواقع واجبہ پر خرچ کرنے سے مال کو روک دیا تو یہ مال کی محبت کا غلط استعمال ہوا۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ مال کی محبت اپنی ذات میں نہ محمود ہے اور نہ مذموم ہے، لیکن اگر اس محبت کو صحیح استعمال کرو گے تو ٹھیک ہوگی اور اگر غلط استعمال کرو گے تو غلط ہوگی۔ البتہ جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس محبت کو ذرا کم رکھو، بالکل سرحد پر نہ کھڑے ہو جانا ورنہ اگلا قدم تمہیں گناہ کے اندر مبتلا کر دے گا، اس لئے اس مال کی محبت کو کم کرنے کی کوشش کرو۔

دوسروں کی چیزوں کا استعمال کب جائز ہے؟

ایک اور ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''اگر دل گواہی دے کہ میرا بدون اذن کے کھانا اس شخص کو ناگوار نہ ہوگا بلکہ خوش ہوگا، وہاں بدون اذن کے بھی کھانا جائز ہے بلکہ چھین کر بھی کھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ دوست سخی ہو بخیل نہ ہو، کیونکہ بخیل کو کسی سے محبت نہیں ہوتی، اگر ہوتی بھی ہے تو مال کے برابر نہیں، اس لئے بخیلوں کی اجازت بھی مشکوک ہے، ہاں سخی دوستوں سے اگر پوری بے تکلفی ہو تو چھین کر بھی کھانا جائز ہے''(۱)

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۰

اصل حکم یہ ہے کہ کسی بھی شخص کی کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرنا حلال نہیں، حدیث شریف میں ہے:

((لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسِہٖ مِنْہُ))(۱)

اس حدیث سے پتہ چلا کہ دوسرے شخص کی چیز کے استعمال کے لئے صرف اجازت ہی نہیں بلکہ خوشدلی سے اجازت دے تب تو استعمال کرنا جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔

بلا اجازت بلکہ چھین کر کھانا

حضرت والا اس ملفوظ میں فرما رہے ہیں کہ بعض لوگوں سے ایسی بے تکلفی کا تعلق ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں سو فیصد پکا یقین ہوتا ہے کہ اگر میں اس کی کوئی چیز اُٹھا کر کھالوں گا تو اس کو ناگوار تو کجا بلکہ یہ خوش ہوگا، ایسی صورت میں صریح لفظوں میں اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ معلوم ہے کہ یہ شخص خوش ہوگا، بلکہ ایسی صورت میں چھین کر کھانا بھی جائز ہے، مثلاً وہ شخص کوئی چیز کھا رہا ہے، آپ نے جھپٹا مار کر اس سے وہ چیز چھین کر کھالی تو یہ بھی جائز ہے، اس لئے کہ چھیننے سے وہ دوست ناراض کیا ہوتا بلکہ اور خوش ہوگا اور اس کو راحت ہوگی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ ظاہری اعتبار سے وہ روکنے کی بھی کوشش کرے، لیکن وہ دوست سے راضی اور خوش ہوگا کہ اگر یہ چیز میرا دوست کھالے تو اچھا ہوگا، جب یہ یقین ہو تو چھین کر بھی لے لو تو بھی کوئی حرج نہیں۔

خوش دلی کا یقین ہونا ضروری ہے

لیکن خوش دلی کا یقین واقعی ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ اپنی طرف سے فرض کر کے بیٹھ گئے کہ ہمارے کھانے سے اس کو خوش ہونا چاہئے، لہٰذا میں کھاؤں گا تو میرے لئے یہ کھانا جائز ہوگا، یہ کافی نہیں، بلکہ اس کے سابقہ طرزِ عمل سے یہ بات واضح ہو کہ میرے کھانے سے خوش ہوتا ہے، تب تو اس کی چیز چھین کر کھالو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی پینا

فقہاء کرام کو دیکھئے کہ وہ کس کس طرح احادیث نبویہ سے مسائل مستنبط فرماتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس وقت مکہ مکرمہ فتح ہوا اور فتح کے بعد آپ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو مسجد حرام

(۱) مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۷۷٤، حدیث مبارک کا ترجمہ یہ ہے: ''کسی مسلمان کا مال اس کی دلی اجازت کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں''

کے برابر میں حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا کا گھر تھا۔ حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد بہن تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حقیقی بہن تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر میں جا کر کچھ دیر آرام فرمایا۔ ان کے گھر میں ایک پانی کا مشکیزہ لٹکا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی پیا۔ (۱)

پانی کی ملکیت کا شرعی حکم

اس حدیث سے فقہاء کرام نے کم از کم دو درجن احکام مستنبط فرمائے ہیں، جب کوئی حدیث فقہاء کرام تک پہنچتی تھی تو فقہاء کرام خوردبین لگا کر بیٹھ جاتے اور یہ دیکھتے کہ اس حدیث سے اُمت کی رہنمائی کے لئے کیا کیا احکام نکل رہے ہیں۔ بہرحال! وہ مکان جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے وہ اُمِّ ہانی رضی اللہ عنہا کا تھا اور وہ مشکیزہ بھی انہی کا تھا، اور پانی کا قاعدہ یہ ہے کہ جب تک وہ پانی دریا یا سمندر یا بڑے تالاب میں ہے تو وہ پانی سب کے لئے مباح عام ہے کہ جو شخص جتنا چاہے پانی حاصل کرلے، لیکن اگر کوئی شخص وہاں سے پانی لے کر اپنے گھر میں لے آیا اور مشکیزے میں یا مٹکے میں رکھ لیا تو اب وہ پانی اس کی ملکیت ہوگیا، اب وہ اس پانی کو فروخت بھی کرسکتا ہے، خود بھی استعمال کرسکتا ہے، دوسرے کو ہدیۃً اور تحفۃً بھی دے سکتا ہے اور دوسرے کو حلال نہیں کہ اس کی اجازت کے بغیر وہ پانی پیئے، یہ شرعی حکم ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بلا اجازت پانی پینا جائز تھا

چنانچہ فقہاء کرام نے اس حدیث میں یہ سوال اُٹھایا کہ یہ مشکیزہ حضرت اُمِّ ہانی رضی اللہ عنہا کا تھا، لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اجازت کے بغیر اس مشکیزے سے پانی پی لیا، یہ پانی پینا آپ کے

---

(۱) محدثین کی ذکر کردہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر حضرت اُم ھانی رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے تھے اور وہاں چاشت کی نماز ادا فرمائی تھی۔ صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب صلاة الضحی فی السفر، رقم: ۱۱۰۵، صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرھا، باب استحباب صلاة الضحی وأن أقلها رکعتان، رقم: ۱۱۸۰، سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ماجاء فی صلاة الضحی، رقم: ٤٣٦، جبکہ دوسری طرف حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ اُم سلیم رضی اللہ عنہا کی روایت ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکیزہ کے ساتھ منہ مبارک لگا کر پانی پیا، حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ((أن رسول الله صلی الله دخل علیها وفی بیتها قربة معلقة قالت فشرب من القربة قائما قالت فعمدت إلی فم القربة فقطعتها)) مسند أحمد، رقم: ٢٥٨٦٦، گویا کہ حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا کی روایت میں فتح مکہ کا ذکر ہے اور حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا کی روایت میں کھڑے ہو کر مشکیزہ سے پانی پینے کا ذکر ہے۔

لئے کیسے جائز ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بغیر اجازت آپ کے لئے پینا اس لئے جائز ہوا کہ اگرچہ صریح لفظوں میں تو اجازت آپ نے ان سے نہیں لی، لیکن آپ ﷺ جانتے تھے کہ اگر میں اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر کی کوئی بھی چیز استعمال کروں گا تو وہ اپنے استعمال کرنے سے بھی زیادہ خوش ہوں گی، اس وجہ سے حضورِ اقدس ﷺ کے لئے ان کی اجازت کے بغیر ان کے مشکیزے سے پانی پینا جائز ہو گیا۔

قوم کی کوڑی کو پیشاب کے لئے استعمال کرنا

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ کسی جگہ سے گزر رہے تھے، وہاں پر اس قوم کا کوڑا دان تھا، لوگ اپنے گھروں کا کوڑا وہاں ڈالا کرتے تھے، اس کوڑے کے ڈھیر کے پاس جا کر آپ ﷺ نے پیشاب فرمایا۔(۱)

فقہاء کرام نے یہاں بھی یہ سوال اُٹھایا کہ یہ تو ایک قوم کی ''کوڑی'' تھی، آپ ﷺ نے ان کی اجازت کے بغیر اس کوڑی کو پیشاب کرنے کے لئے کیسے استعمال فرمایا؟ پھر اس کا جواب دیا کہ حضور ﷺ نے اس وجہ سے استعمال کیا کہ وہ کوڑی کی جگہ مباح عام تھی اور حدیث کے الفاظ "سُباطة قوم" میں لفظ "سُباطة" کی لفظ قوم کی طرف اضافت ''اضافتِ مِلک'' نہیں بلکہ یہ اضافت بادنیٰ ملابست ہے اور بعض حضرات فقہاء نے یہ جواب دیا کہ وہ ''کوڑی'' اگرچہ قوم کی ملکیت تھی، مگر قوم کا کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا کہ وہ حضورِ اقدس ﷺ کے استعمال کرنے سے ناگواری محسوس کرتا، لہٰذا قوم کی اجازت متعارفہ موجود تھی۔

سلام کے جواب کے لئے تیمّم کرنا

ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ راستے میں تشریف لے جا رہے تھے، ایک شخص نے راستے میں آپ ﷺ کو سلام کیا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''۔ آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب دینا چاہا لیکن آپ اس وقت وضو سے نہیں تھے، قریب ہی کسی شخص کے گھر کی دیوار تھی، آپ نے اس گھر کی دیوار پر ہاتھ مار کر تیمّم کیا اور پھر اس کے سلام کا جواب دیا ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' چونکہ سلام

(۱) صحيح البخاري، كتاب الوضوء، باب البول قائما وقاعدا، رقم: ۲۱۷، صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب المسح على الخفين، رقم: ۴۰۲، سنن الترمذي، كتاب الطهارة عن رسول الله، باب الرخصة في ذلك، رقم: ۱۳، سنن النسائي، كتاب الطهارة، باب الرخصة في ترك ذلك، رقم: ۱۸، سنن أبي داؤد، كتاب الطهارة، باب البول قائما، رقم: ۲۱، سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ما جاء في البول قائما، رقم: ۳۰۱، مسند أحمد، رقم: ۲۲۱۵۷

کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا نام آرہا تھا، اس لئے آپ ﷺ نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کا نام بغیر وضو کے لیا جائے، اس لئے آپ نے تیمم کر کے پھر جواب دیا۔(۱)

ایسا کرنا واجب اور ضروری نہیں تھا، محض اللہ تعالیٰ کے نام کے ادب کی خاطر تیمم کر لیا۔ یہ بات یاد رکھئے کہ اگر کوئی شخص اس مقصد کے لئے تیمم کر لے تو اس کے لئے اس تیمم سے نماز پڑھنا جائز نہیں۔

تیمم کے لئے دوسرے کی دیوار کا استعمال

اس حدیث پر فقہاء کرام نے پھر سوال اُٹھا دیا کہ یہ گھر تو کسی اور شخص کا تھا، اس شخص کے گھر کی دیوار کو اس کی اجازت کے بغیر تیمم کرنے کے لئے کیسے استعمال فرمایا؟ پھر جواب دیا کہ کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کو اس بات سے ناگواری ہو کہ حضور اقدس ﷺ اس کے گھر کی دیوار کے ذریعہ تیمم کر لیں۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اجازت متعارفہ کی وجہ سے اس دیوار کو استعمال فرمایا۔

دوسروں کی چیزوں کا استعمال شریعت کی نظر میں

ان واقعات کو بیان کرنے سے دراصل یہ بتلانا مقصود ہے کہ اسلامی شریعت اور اسلامی فقہ دوسرے شخص کی چیز کو استعمال کرنے کے معاملے میں کتنی حساس ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے بارے میں بھی یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ آپ نے ان چیزوں کو مالک کی اجازت کے بغیر کیسے استعمال فرمایا۔ لیکن ہمارے یہاں معاملہ ایسا بنا ہوا ہے کہ حلال و حرام کی کچھ پرواہ نہیں، خاص کر جو لوگ ساتھ ساتھ رہتے ہیں، ان میں یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی چیز استعمال کر لیتے ہیں اور اس کی فکر نہیں کہ دوسرے سے اجازت لی جائے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حدیث کی رو سے صرف اجازت بھی کافی نہیں جب تک کہ وہ اجازت خوشدلی کے ساتھ نہ ہو۔

بخیل کی اجازت مشکوک ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ ''بخیل'' کی اجازت بھی مشکوک ہے، مثلاً

(۱) صحیح البخاری، کتاب التیمم، باب التیمم فی الحضر إذا لم یجد الماء وخاف فوت الصلاۃ، رقم: ۳۲۵، صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب التیمم، رقم: ۵٥٤، سنن النسائی، کتاب الطھارۃ، باب التیمم فی الحضر، رقم: ۳۰۹، سنن أبی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب التیمم فی الحضر، رقم: ۲۷۸، مسند أحمد، رقم: ۱٦۸۸۳

آپ نے کسی بخیل سے اس کی چیز کو استعمال کرنے کی اجازت لے لی، جب اس نے اجازت دی تو اس وقت اس کے دل پر آرے چل گئے، اس نے سوچا کہ اگر اجازت نہیں دوں گا تو بری بات ہوگی، اب اجازت دوں تو مشکل، نہ دوں تو مشکل، اس مصیبت میں آکر اس نے اجازت دے دی۔ اس بخیل کی یہ اجازت مشکوک ہے، معتبر نہیں، کیونکہ خوشدلی سے اجازت نہیں دی۔

بخیل سے حق واجب زبردستی لینا

لیکن یہاں ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے، وہ یہ کہ اگر ''بخیل'' زبردستی اپنے دل پر پتھر رکھ کر دباؤ میں آکر اجازت دیدے تو اس کے دو حال ہیں: ایک حال یہ ہے کہ اس ''بخیل'' نے دباؤ میں آکر اگر ایسی چیز کی اجازت دی ہے جو اس بخیل کے ذمے حق واجب تھا اور وہ بخیل دیتا نہیں تھا، لیکن آپ نے زبردستی کر کے اس سے اجازت لے لی تو اس صورت میں اس چیز کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

مثلاً بخیل کی بیوی ہے، اس بیوی کا نفقہ اس کے شوہر کے ذمے واجب ہے، اب وہ شوہر اپنے بخل کی وجہ سے بیوی کو نفقہ نہیں دیتا یا ضرورت سے کم دیتا ہے جس سے بیوی کا گزارہ نہیں ہوتا، اب بیوی نے مجمع کے اندر نفقہ کا مسئلہ اُٹھادیا اور مجمع کے دباؤ میں شوہر سے نفقہ کی اجازت حاصل کرلی، حالانکہ بیوی جانتی ہے کہ اجازت دیتے وقت اس کے دل پر سانپ لوٹ رہے ہوں گے، بہرحال! شوہر نے مجمع کے دباؤ میں آکر اجازت دے دی، لیکن چونکہ بیوی کا حق شوہر کے ذمے واجب تھا، لہٰذا اگر اس شوہر نے زبردستی خوشدلی کے بغیر بھی اجازت دے دی تب بھی بیوی کے لئے نفقہ لینا حلال ہے، بلکہ ایسی حالت میں بیوی کے لئے اجازت کے بغیر بھی حلال ہے۔

شوہر کے مال سے بیوی کو خرچہ لینا

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی ''ہندہ'' تھیں، وہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا:

''يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ أَبَا سُفْيَانَ رَجُلٌ مُمْسِكٌ''

''میرے شوہر پیسے روک روک کر استعمال کرنے کے عادی ہیں''

میرا گزارہ نہیں ہوتا، میری اولاد کو اور مجھے خرچ نہیں دیتے، کبھی کبھار وہ اپنا روپیہ پیسہ گھر میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو کیا میں ان کے علم کے بغیر ان کے پیسوں میں سے لے لیا کروں؟ جواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((خُذِیْ مَا یَکْفِیْكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوْفِ))
''جتنا تمہارے اور تمہاری اولاد کے نفقہ کے لئے ضروری ہے، اتنا لے لیا کرو، اس میں کچھ حرج نہیں''(۱)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے اجازت کے بغیر بھی لینے کی اجازت دے دی، اس لئے کہ حق واجب تھا۔

غیر حق واجب وصول کرنا جائز نہیں

لیکن جہاں حق واجب نہ ہو وہاں زبردستی کر کے لینا جائز نہیں۔ بعض لوگ باقاعدہ اس کی پلاننگ کرتے ہیں کہ ہمارا فلاں دوست بڑا کنجوس ہے، لہٰذا ایک دن سب مل کر اس پر دھاوا بولو اور سب مل کر اس کو زچ کرو کہ وہ کسی طرح کچھ کھلانے پلانے پر آمادہ ہو جائے، یا ہدیہ تحفہ دینے پر آمادہ ہو جائے، آج اس سے ہر قیمت پر اس کے پیسے خرچ کروانے ہیں۔ چنانچہ سب نے اس کے گھر پر دھاوا بول دیا اور سب اس کے پیچھے پڑ گئے، اب وہ بیچارہ عاجز آ گیا اور ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، اب دل پر پتھر رکھ کر ان کی بات مان لی اور ان پر پیسے خرچ کر دیئے اور انہیں کھلایا پلایا۔ مگر اس کے دل پر قیامت گزر گئی۔ اس صورت میں جو کچھ تم نے اس بخیل سے زبردستی کھایا، وہ سب حرام ہوا، اس لئے کہ وہ شخص اگرچہ بخیل تھا، لیکن اس کے ذمے تمہارے اوپر خرچ کرنا واجب نہیں تھا، تم نے اس کو اس کی مرضی کے خلاف اور اس کی خوشدلی کے خلاف خرچ کرنے پر مجبور کیا، لہٰذا یہ خرچ کرنا ((لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسِهٖ مِنْهُ))(۲) کے اندر داخل ہو کر حرام ہو گیا۔

مدارس کے لئے چندہ کرنا

مدارس کا چندہ کرنا بھی اسی حدیث کے اندر داخل ہے، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنی وجاہت سے فائدہ اُٹھا کر چندہ کرتے ہیں، وہ چندہ مشکوک

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب من أجری أمر الأمصار علی ما یتعارفون بینهم، رقم: ۴۹۴۵، سنن النسائی، کتاب آداب القضاة، باب قضاة الحاکم علی الغائب إذا عرفه، رقم: ۵۳۲۵، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، باب ما للمرأة من مال زوجها، رقم: ۲۲۸۴، مسند أحمد، رقم: ۲۲۹۸۸

(۲) مسند أحمد، أول مسند البصریین، رقم: ۱۹۷۷۴، حدیث مبارک کا ترجمہ یہ ہے: ''کسی مسلمان کا مال اس کی دلی اجازت کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں''

ہے، اس لئے کہ جس سے چندہ کیا جا رہا ہے، جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اتنے بڑے مولانا صاحب چندے کے لئے میری دکان پر تشریف لائے ہیں، اب دل تو چندہ دینے کو نہیں چاہ رہا ہے، مگر ان بڑے مولانا صاحب کو کیسے رد کروں۔ چنانچہ اس نے دل پر پتھر رکھ کر کچھ پیسے بطور چندہ کے ان کو دے دیئے، لیکن یہ پیسے خوشدلی سے نہیں دیئے اور ایسا چندہ جو خوشدلی سے نہ ہو، وہ لینا جائز نہیں۔

مجمع عام میں چندہ کرنا

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج کل مجمع عام میں چندہ کرنا مناسب نہیں، مجمع عام میں چندہ کرنے سے بکثرت لوگ محض سر سے بلا ٹالنے کے لئے اور لوگوں کی ملامت سے بچنے کے لئے چندہ دے دیتے ہیں، اس دینے میں اخلاص بہت کم ہوتا ہے۔ آج کل کی قید اس لئے لگا دی کہ لوگ مجمع عام میں چندہ کے جواز پر ''غزوۂ تبوک'' کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ''غزوۂ تبوک'' کے موقع پر مسجد نبوی میں عام چندہ کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن حضرات سے چندہ مانگا جا رہا تھا، وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، جن کے بارے میں یہ یقین تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے لئے چندہ دینا ہوگا تو دیں گے، اگر اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں دینا ہوگا تو نہیں دیں گے، آج ہم اپنے آپ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کیسے قیاس کر سکتے ہیں۔ لہٰذا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجمع عام میں چندہ کرنے کی ریت اچھی نہیں ہے، اس میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ لوگوں کی خوشدلی کے بغیر چندہ وصول کر لیا گیا ہو، لہٰذا ایسا چندہ ((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسِهٖ مِنْهُ)) میں داخل ہونے کی بناء پر جائز نہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

اِسراف اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْکَرِیْمِ. وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ. اَمَّا بَعْدُ!

''بخل'' کی ضد ''اِسراف''

گزشتہ تین دن سے ''بخل'' کا بیان چل رہا تھا، الحمد للہ! وہ مکمل ہو گیا۔ اب آگے حضرت نے ''اسراف'' کا عنوان قائم کیا ہے، یہ ''اسراف'' ''بخل'' کی ضد ہے، کیونکہ بخل کے معنی یہ ہیں کہ جہاں آدمی کو خرچ کرنا چاہئے، وہاں خرچ نہ کرے اور ''اسراف'' کے معنی یہ ہیں کہ جہاں خرچ نہ کرنا چاہئے، وہاں خرچ کرے اور دونوں منع ہیں اور ناجائز ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ''عِبَادُ الرحمٰن'' کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا﴾(۱)

''رحمان کے بندے وہ ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف اور فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں اور اعتدال کا راستہ ان دونوں کے درمیان ہے''

نہ تو انسان ''اسراف'' کے اندر مبتلا ہو اور نہ ہی ''بخل'' کے اندر مبتلا ہو۔

خرچ سے پہلے سوچو

''اسراف'' کے بیان میں سب سے پہلے حضرت والا کا ایک ملفوظ نقل فرمایا ہے جو حضرت والا نے اپنے کسی مرید کے خط کے جواب میں ''تربیت السالک'' میں تحریر فرمایا تھا۔ وہ ملفوظ یہ ہے:

''خرچ کرنے سے قبل دو امر کا انتظام کرلیں، ایک یہ کہ پہلے سوچا کریں کہ اگر اس

☆ اصلاحی مجالس (۵/۱۴۴ تا ۱۶۴)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) الفرقان: ۶۷

جگہ خرچ نہ کروں تو آیا کچھ ضرر ہے یا نہیں؟ اگر ضرر نہ ہو تو اس کو ترک کر دیں، اور اگر ضرر معلوم ہوتا ہو تو کسی منتظم سے مشورہ کریں کہ یہ خرچ خلاف مصلحت اور نامناسب تو نہیں، وہ جو بتلائے اس پر عمل کریں، ضرر سے مراد ضرر واقعی اور حقیقی ہے جس کا معیار شریعت ہے، وہمی اور خیالی ضرر مراد نہیں"

مریض کے مطابق نسخہ

اس ملفوظ میں حضرت والا نے "اسراف" سے بچنے کا طریقہ لکھا ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ طبیب اپنے زیرِ علاج مریض کا جائزہ لے کر اس کے حالات کے مناسب نسخہ تجویز کرتا ہے، چنانچہ اس ملفوظ میں بھی حضرت والا نے یہ فرمادیا کہ اگر کسی جگہ خرچ کرنے میں ضرر معلوم نہ ہو تو وہاں بھی کسی منتظم سے مشورہ کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملفوظ میں جو صاحب مخاطب تھے، وہ شاید بہت زیادہ فضول خرچی میں مبتلا ہوں گے اور ان کی رائے پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ہوگا، اس لئے آپ نے یہ علاج تجویز فرمایا۔

ایسی صورت میں خرچ نہ کرے

ورنہ اصل بات یہ ہے کہ انسان خرچ کرنے سے پہلے سوچے کہ اگر خرچ نہ کروں تو کیا نقصان ہے، اگر خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے تو پھر خرچ کرلے، لیکن اگر خرچ نہ کرنے میں کوئی نقصان نہیں تو پھر خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے، وہ خرچ ضرورت سے زائد ہے اور اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

نقصان کا فیصلہ کون کرے؟

لیکن اب سوال یہ ہے کہ کہاں خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے اور کہاں نقصان نہیں؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا دو اور دو چار کرکے جواب دینا مشکل ہے، کسی بھی علم وفن میں جو قاعدے اور ضابطے ہوتے ہیں، وہ ایک حد تک کام دیتے ہیں، اس حد سے آگے پھر انسان کو اپنے مذاقِ سلیم سے فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

خرچ کرنے میں فائدہ ہے یا نہیں؟

یہ تو ہے منفی طریقہ کہ خرچ کرنے سے پہلے یہ دیکھو کہ خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے یا نہیں۔ ایک اس کے مقابلے میں مثبت طریقہ ہے، وہ یہ کہ خرچ کرتے وقت یہ دیکھو کہ خرچ کرنے میں فائدہ

ہے یا نہیں؟ اگر خرچ کرنے میں فائدہ ہے تو خرچ کرلو، اگر فائدہ نہیں تو ترک کردو، اصل معیار یہ ہے۔ لہٰذا ''اسراف'' کے اصل معنی ہیں ''ایسا خرچ جس کا کچھ فائدہ نہ ہو''، فائدہ سے مراد عام ہے، چاہے وہ دین کا فائدہ ہو یا دنیا کا فائدہ ہو، اور دنیا کے فائدے سے بھی وہ فائدہ مراد ہے جو مشروع ہو اور جائز ہو، ناجائز فائدہ مراد نہیں۔ لہٰذا جس خرچ میں دین کا فائدہ ہو یا دنیا کا جائز اور مشروع فائدہ ہو، وہ ''اسراف'' میں داخل نہیں اور اگر کوئی ایسا خرچ ہے جس کا سرے سے کوئی فائدہ ہی نہیں یا فائدہ ایسا ہے جس کا حاصل کرنا شرعاً جائز نہیں، ایسا خرچ اسراف میں داخل ہے۔

یہ صورت ''اسراف'' نہیں

اسی تفصیل سے یہ اصول نکلتا ہے کہ بہت سے خرچ جن کو لوگ ''اسراف'' سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ اسراف نہیں ہوتے، مثلاً ایک آدمی اپنی حدود استطاعت میں رہتے ہوئے اپنے راحت اور آرام کے لئے یا اپنا دل خوش کرنے کے لئے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ پیسے خرچ کر کے ایک چیز خرید کر لے آتا ہے۔ مثلاً ایک چیز بازار میں دس روپے کی بھی مل رہی ہے اور ۱۵ روپے کی بھی مل رہی ہے اور ۲۰ روپے کی بھی مل رہی ہے اور وہی چیز سو روپے کی بھی مل رہی ہے، البتہ معیار اور درجات میں فرق ہے۔ اب ایک آدمی کو وہی چیز خریدنے کے لئے سو روپے خرچ کرنے کی استطاعت ہے اور اس کو وہ چیز خریدنے کے لئے کسی سے قرض لینے کی بھی ضرورت نہیں، لہٰذا وہ شخص اپنی راحت کے لئے دس روپے والی چیز کے بجائے سو روپے والی چیز خریدتا ہے تو یہ ''اسراف'' نہیں اور کوئی گناہ نہیں۔

سفر کے لئے سہولت کی سواری اختیار کرنا

اسی طرح مثلاً تمہیں سفر کر کے دوسرے شہر جانا ہے، اب تم اس کے لئے ریل گاڑی کی تھرڈ کلاس میں بھی سفر کر سکتے ہو اور سیکنڈ کلاس میں بھی سفر کر سکتے ہو اور فرسٹ کلاس میں بھی کر سکتے ہو اور ایئر کنڈیشن میں بھی کر سکتے ہو اور ہوائی جہاز میں بھی کر سکتے ہو اور ان سب کے کرایوں میں بڑا فرق ہے۔ لیکن ایک شخص جو ایئر کنڈیشن کلاس میں سفر کرنے کی استطاعت رکھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں تو اپنی راحت کے لئے ایئر کنڈیشن کلاس میں سفر کروں گا تو یہ کوئی اسراف نہیں اور کوئی گناہ نہیں۔ اسی طرح کوئی شخص اپنا دل خوش کرنے کے لئے یا اپنے بیوی بچوں کا دل خوش کرنے کے لئے کچھ خرچ کر دے تو یہ اسراف میں داخل نہیں۔

رہائش میں تین درجے جائز ہیں

حضرت والا نے مکان کے سلسلے میں ایک اصول بیان فرمایا ہے جو اصول تمام چیزوں پر منطبق ہوتا ہے، فرمایا کہ مکان کے اندر چند درجات ہوتے ہیں، ایک درجہ ہے ''رہائش'' یعنی آپ کچا سا مکان بنالیں یا صرف پتھروں کا ایک مکان بنالیں اور ٹین کی چھت ڈال دیں اور اس میں رہائش اختیار کرلیں، اس میں نہ پلستر کیا اور نہ رنگ و روغن، یہ رہائش کا پہلا درجہ ہے۔ رہائش کا دوسرا درجہ ہے ''آسائش'' یعنی آرام دہ رہائش، مثلاً ایک مکان بنوایا، اس کی چھت پکی ڈلوائی اور سونے کے لئے چارپائی پر گدا بھی بچھایا تاکہ آرام اور سکون کی نیند آئے، یہ سب ''آسائش'' ہے اور جائز ہے، یہ دوسرا درجہ ہے۔ تیسرا درجہ ہے ''آرائش'' یعنی زینت اختیار کرنا، مثلاً پختہ مکان بنوایا اور آرائش کے لئے اس پر پلستر بھی کرایا اور پھر رنگ و روغن بھی کرایا تاکہ خوبصورت معلوم ہو اور باتھ روم میں ٹائل بھی لگوائے تاکہ خوبصورت معلوم ہو، یہ سب ''آرائش'' کے اندر داخل ہے۔ اگر حلال مال سے یہ سب کام کرایا ہے اور اس کام کے لئے کسی سے قرض وغیرہ نہیں لینا پڑا تو یہ بھی جائز ہے۔ یہ تینوں درجے جائز ہیں، یعنی رہائش جائز، آسائش جائز، آرائش جائز۔

چوتھا درجہ جائز نہیں

چوتھا درجہ ہے ''نمائش'' یعنی دکھلاوا، کوئی کام صرف اس لئے کیا جائے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ بڑا آدمی ہے، یہ بڑا دولت مند ہے، لوگ یہ کہیں کہ اس کا مکان بڑا شاندار ہے، اس کی گاڑی بڑی شاندار ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس لئے اختیار کی ہیں تاکہ اپنی دولت کی نمائش کرے، یہ درجہ حرام ہے۔ اس ''نمائش'' میں فائدہ تو ہے، اس لئے کہ جب وہ اپنی دولت کی نمائش کرے گا تو لوگ اس کو بڑا سمجھیں گے اور بڑا سمجھ کر اس کی تعظیم کریں گے اور اس کی عزت کریں گے اور اس کا حکم مانیں گے، لہٰذا اس ''نمائش'' کے اندر فائدہ تو ہے لیکن یہ فائدہ مشروع نہیں اور شریعت کے اندر معتبر نہیں۔ لہٰذا یہ فائدہ کالعدم ہے۔

اصل معیار ''مشروع فائدہ'' ہے

دیکھئے! ''رہائش'' فائدہ ہے، ''آسائش'' فائدہ ہے، ''آرائش'' فائدہ ہے، ان تینوں اغراض کی وجہ سے جو کچھ خرچ کیا جارہا ہے، وہ ''اسراف'' میں داخل نہیں، لیکن نمائش میں فائدہ تو ہے مگر وہ فائدہ مشروع نہیں، اس لئے وہ ''اسراف'' میں داخل ہے۔ لہٰذا اگر کوئی کام ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ

ہی نہیں، مثلاً پیسے اُٹھا کر پھینک دیئے یا مثلاً ایک چیز مہنگے داموں میں خرید لی، اگر ذرا توجہ سے کام لیتا تو چیز سستی مل جاتی لیکن اس نے وہی چیز خریدنے میں اپنی غفلت، بے پرواہی اور ناقدری سے زیادہ پیسے خرچ کردیئے تو یہ اسراف ہوگیا۔

دو پیسوں کی تلاش کا واقعہ

ایک مرتبہ میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ لاہور گیا ہوا تھا، اس وقت میں چھوٹا بچہ تھا، لاہور میں میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی صاحب مرحوم رہتے تھے، وہاں لاہور میں کسی جگہ میں اور والد صاحب اور بھائی صاحب ہم تینوں پیدل جارہے تھے، ایک جگہ لاہور میں ''کپورتھلہ ہاؤس'' کہلاتی تھی، رات کا وقت تھا، اندھیرا تھا، ایک جگہ پر خاردار تار لگے ہوئے تھے، آدمی بڑی مشکل سے وہاں سے نکلتا تھا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم جیب سے پیسے نکال رہے تھے کہ اس اندھیرے میں پیسے نکالتے ہوئے کوئی سکہ زمین پر گر گیا، اب اندھیرا بھی تھا، جلدی بھی تھی اور خاردار تار بھی لگے ہوئے تھے، اس لئے بھائی صاحب نے سوچا کہ کون اس سکے کو اندھیرے میں تلاش کرے، چنانچہ وہ اس کو چھوڑ کر آگے بڑھنے لگے۔ حضرت والد صاحب نے بھائی سے پوچھا کہ کیا گرا؟ بھائی صاحب نے کہا کہ کچھ سکے گر گئے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ ان کو کیوں نہیں اُٹھاتے؟ بھائی صاحب نے کہا کہ وہ صرف دو پیسے یا ایک آنہ تھا۔ والد صاحب نے فرمایا کہ دو پیسے تھے یا ایک آنہ تھا، پہلے تھوڑی دیر اس کو تلاش ضرور کرو، پھر اگر ملنے سے مایوسی ہوجائے تو خیر ہے، چھوڑ دو، لیکن تلاش ضرور کرو۔ چنانچہ والد صاحب نے کہیں سے ماچس منگوائی اور خود ہی ماچس جلائی اور پھر فرمایا کہ اب تلاش کرو۔ اب وہ دو پیسے تلاش کیے جارہے ہیں۔

پھر فرمایا کہ چاہے ایک پیسہ ہو یا دو پیسے ہوں، یہ اللہ جل شانہ کی نعمت ہے، اس کے بارے میں یہ سوچنا کہ یہ معمولی چیز ہے، گر گیا تو بس گر گیا، پھر اس کو اس طرح چھوڑ کر چلے جانا اللہ جل شانہ کی نعمت کی ناقدری ہے۔

اجزاءِ قلیلہ کی قدر بھی ضروری ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ملفوظ میں فرمایا ہے کہ ''جس نعمت کے اجزاءِ کثیرہ سے تم انتفاع کرتے ہو، اس کے اجزاءِ قلیلہ کی عزت کرنا تمہارے ذمے ضروری ہے۔ یعنی جس چیز کی بہت بڑی مقدار سے تم فائدہ اُٹھاتے ہو، اس چیز کی تھوڑی مقدار بھی اگر تمہارے پاس ہے تو اس کی بھی عزت کرو۔ اس لئے حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ جو پیسے گر گئے ہیں، چاہے وہ ایک آنہ ہے یا دو پیسے

ہیں، اس کو تھوڑی دیر کے لئے تلاش ضرور کرو، اس پر تھوڑا وقت صرف کرو تا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری نہ ہو، بغیر تلاش کیے ہوئے چھوڑ کر چلے جانا ''اسراف'' اور ناقدری ہے۔ البتہ اگر تمہیں سخاوت کرنی ہے تو کسی ضرورت مند کو دے دو، اس کے کام آ جائے گا، وہ اسراف نہ ہوگا بلکہ صدقہ ہوگا اور وہ پیسہ صحیح جگہ پر پہنچ جائے گا۔

فائدہ غیر مشروعہ میں خرچ

جب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چھوٹی چھوٹی نعمتوں کی قدر کرو گے اور اس پر شکر کرو گے تو اللہ تعالیٰ اور عطا فرمائیں گے اور اگر ناقدری کرو گے تو پھر وبال کا اور اس نعمت کے چھن جانے کا اندیشہ ہے۔ بہرحال پیسے گم ہونے پر تلاش نہ کرنا اس بات کی مثال ہوئی جہاں فائدے کے بغیر خرچ ہوا اور پیسے ویسے ہی ضائع ہو گئے۔ اور ''نمائش'' اس صورت کی مثال ہے جس میں خرچ کرنے پر فائدہ تو ہے لیکن وہ فائدہ مشروع نہیں، شرعاً جائز نہیں، یا پیسے خرچ کر کے کوئی ایسی لذت حاصل کی جا رہی ہے جو جائز نہیں، اس میں خرچ سے فائدہ ہے لیکن فائدہ غیر مشروعہ ہے، لہٰذا وہ ''اسراف'' میں داخل ہے۔

''اسراف'' اور ''تبذیر'' میں فرق

علماء فرماتے ہیں کہ ''اِسراف'' اور ''تبذیر'' میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ ''اِسراف'' عام ہے اور تبذیر خاص ہے۔ تبذیر صرف اس صورت میں ہوتی ہے جب خرچ کا محل غیر مشروع ہو، یعنی ناجائز کام میں پیسہ خرچ کرنا ''تبذیر'' ہے، مثلاً فلم دیکھنے میں یا جوے میں پیسے خرچ کر دے تو یہ تبذیر ہے اور یہی صورتیں ''اِسراف'' میں بھی داخل ہیں، البتہ جہاں پیسہ ناجائز اور حرام کام میں خرچ نہیں ہو رہا ہے لیکن بے فائدہ کام پر ہو رہا ہے تو اس صورت میں ''اِسراف'' تو ہے لیکن ''تبذیر'' نہیں۔ بہرحال! چونکہ ''اِسراف، تبذیر کو بھی شامل ہے، اس لئے میں نے ''اِسراف'' کی تعریف یہ کر دی کہ پیسے ایسی جگہ خرچ کرنا جہاں فائدہ نہ ہو، یا فائدہ ہو لیکن ناجائز ہو۔

مجاہدہ کیا ہے؟

جیسا کہ پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ جب کسی آدمی کی تربیت کی جاتی ہے تو اس کی جو اصل منزل ہے اور جہاں اس کو پہنچنا ہے، اس منزل تک پہنچنے سے پہلے اس کو تیار کیا جاتا ہے، اسی تیاری کا نام ''مجاہدہ'' ہے، مثلاً مقصود اصلی تو حرام سے بچنا ہے، لیکن اس مقصود اصلی تک پہنچنے کے لئے تمہیداً بعض اوقات کچھ جائز چیزیں بھی چھڑائی جاتی ہیں، یہ اس لئے چھڑائی جاتی ہیں تا کہ حرام سے بچنے کے

لئے راستہ ہموار کیا جاسکے، اسی کو ''مجاہدہ'' کہتے ہیں، اسی لئے مشائخ اپنے زیر تربیت افراد سے بعض اوقات کچھ جائز چیزیں بھی چھڑواتے ہیں۔ بہر حال! ''اِسراف'' کی جو اصل ممنوع حد ہے، وہ تو اس وقت آتی جبکہ خرچ کرنے میں کوئی فائدہ ہی نہ ہوتا، یا فائدہ ہوتا مگر وہ غیر مشروع ہوتا۔

خرچ نہ کرنے میں نقصان نہ ہو تو چھوڑ دو

لیکن تربیت کرنے کی غرض سے حضرت والا نے اپنے زیر تربیت افراد سے یہ کہہ دیا کہ خرچ کرنے سے پہلے یہ دیکھو کہ خرچ نہ کرنے میں ضرر ہے یا نہیں؟ اگر خرچ نہ کرنے میں کوئی نقصان نہیں تو چھوڑ دو، خرچ مت کرو۔ کیونکہ یہ صورت ''سلبِ ضرورۃ عن الجانب المخالف'' اور ''اِمکان عام'' ہے۔ حالانکہ اگر غور کرو گے تو اس میں ایسی صورت نکل آئے گی جو جائز ہے، مثلاً یہ کہ خرچ نہ کرنے میں کوئی نقصان تو نہیں لیکن خرچ کرنے میں فائدہ ہے، یہاں دونوں باتیں جمع ہو گئیں، لہٰذا اس میں اِسراف کی جائز صورت بھی شامل ہو گئی لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تربیت کی خاطر یہ حکم دے دیا کہ ''تمہارے لئے حکم یہ ہے کہ اگر نہ خرچ کرنے میں نقصان نہ ہو تو بھی چھوڑ دو، خواہ اس خاص جگہ پر اصلاً خرچ کرنا جائز ہی کیوں نہ ہو''

خرچ سے پہلے کسی منتظم سے مشورہ

پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگے ارشاد فرمایا کہ ''اگر ضرر معلوم ہوتا ہو تو کسی منتظم سے مشورہ کرو'' یعنی خرچ کرتے وقت یہ سوچو کہ اگر خرچ نہ کروں تو کوئی نقصان ہے یا نہیں؟ سوچنے پر پتہ چلا کہ اگر اس خاص موقع پر خرچ نہ کیا تو نقصان ہوگا تو اس صورت میں بھی خرچ کرنے سے پہلے کسی منتظم سے مشورہ کرو کہ یہ خرچ نامناسب اور خلافِ مصلحت تو نہیں، پھر وہ جو بتلائے، اس پر عمل کرو، خود اپنی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

یہ علاج ہر شخص کے لئے نہیں

البتہ یہ علاج ہر آدمی کے لئے نہیں ہے کہ ہر آدمی خرچ کرنے سے پہلے یہ سوچے کہ خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے یا نہیں؟ اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے تو پھر بھی خرچ کرنے سے پہلے منتظم سے مشورہ کرے اور پھر خرچ کرے، یہ علاج ہر آدمی کے لئے نہیں ہے، بلکہ جو آدمی ضرورت سے زیادہ اسراف میں مبتلا ہے، اس کے لئے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ علاج تجویز فرمایا ہے۔

فائدہ اور عدم فائدہ کی تعیین شیخ سے کرائے

پھر آگے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمادیا کہ "ضرر" سے مراد حقیقی اور واقعی "ضرر" ہے جس کا معیار شریعت ہے، وہمی اور خیالی ضرر مراد نہیں۔ بہر حال! اصل حقیقت وہ ہے جو میں نے آپ کے سامنے عرض کردی، وہ یہ کہ بغیر فائدہ کے خرچ کرنا یا فائدہ غیر مشروعہ کے ساتھ خرچ کرنا "اسراف" ہے، البتہ یہ بات کہ کہاں فائدہ ہے اور کہاں فائدہ نہیں، اس کے بارے میں دو اور دو چار کی طرح کوئی اصول بتانا مشکل ہے۔ بعض مرتبہ آدمی یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ یہاں خرچ کرنے میں فائدہ ہے لیکن حقیقت میں فائدہ نہیں ہوتا، یہ وہ مقام ہے جہاں شیخ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے سامنے صورتِ حال بیان کر کے اس سے پوچھا جاتا ہے کہ میں یہاں پر خرچ کروں یا خرچ نہ کروں؟ اگر قاعدہ اور ضابطہ بتانے سے کام چل جاتا تو پھر شیخ کی ضرورت ہی کیا تھی، بس "اسراف" کی تعریف بیان کردی جاتی اور "اسراف" کے فوائد و قیود بیان کر دیئے جاتے، ہر آدمی اس کو پڑھ کر اس پر عمل کر لیتا، لیکن ایسا نہیں ہوتا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم تنہا نازل نہیں فرمایا بلکہ قرآن کریم کے ساتھ پیغمبر بھی بھیجا، اس لئے کہ انسان صرف پڑھ کر ہر بات سمجھ نہیں سکتا جب تک کسی ہادی اور رہبر کی رہنمائی نہ ہو۔

رہبر اور رہنما کی ضرورت

حضرات صحابہ کرام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہدایت ملی اور تابعین کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعہ ہدایت ملی، تبع تابعین کو تابعین کے ذریعہ ہدایت ملی، اسی طرح آج تک یہ سلسلہ چلا آرہا ہے، اس لئے کہ قاعدے اور ضابطے ایک حد تک ساتھ دیتے ہیں، اس سے آگے ان قاعدوں اور ضابطوں کو حالات پر منطبق کرنے کا عمل شیخ کے ذریعہ ہوتا ہے، اسی مقصد کے لئے شیخ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور اس سے پوچھا جاتا ہے کہ یہاں پر خرچ کروں یا نہ کروں؟

وہ حقیقی ضرورت نہیں

آگے ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اِسراف کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ جب کوئی چیز خریدنا چاہو تو سوچ لو کہ ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ذہن میں ضرورت فوراً آجائے تو خرید لو اور اگر فوراً ضرورت ذہن میں نہ آئے تو نہ خریدو، کیونکہ جس ضرورت کو آدھے گھنٹے تک سوچ سوچ کر پیدا کیا جائے وہ ضرورت نہیں اور اگر دل میں بہت تقاضہ ہو اور ضرورت معتد بہا سمجھ میں نہ

آئے تو ایسی صورت میں چیز خرید لو اور اطمینان سے بیٹھ کر سوچتے رہو، اگر اسراف نہ ہونا متحقق ہو جائے تو کھالو ورنہ خیرات کر دو"(۱)

یعنی اگر ایک چیز کی ضرورت فوری طور پر سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ہے، خرید لو، لیکن اب آدھے گھنٹے تک سوچ رہے ہیں کہ اس چیز کا کیا مصرف ہوسکتا ہے، اور پھر اس کا مصرف سمجھ میں آیا، تو سوچ سوچ کر چیز کا مصرف اور ضرورت نکالی تو حقیقت میں وہ ضرورت ہی نہیں۔ لیکن اگر ایک چیز کے خریدنے کا دل بہت چاہ رہا ہے اور پھر سوچا کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تو سوچنے کے بعد بھی اس کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا ضرورت ہے، اس کے بارے میں فرمایا کہ وہ چیز خرید لو اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر سوچتے رہو، اگر "اسراف" نہ ہونا متحقق ہو جائے تو کھالو ورنہ خیرات کر دو۔ اس لئے کہ اس وقت اگر نہ خریدی تو موقع نکل جائے گا، لہٰذا اس وقت خرید تو لو لیکن بعد میں سوچو کہ ضرورت کی چیز لی یا بغیر ضرورت کے چیز لے لی، اگر سوچنے کے بعد پتہ چلا کہ ضرورت ہے تو اس کو استعمال کرلو اور اگر ضرورت نہیں ہے تو اس چیز کو خیرات کر دو۔

بیوی بچوں کو خوش کرنے کے لئے خرچ کرنا

آگے اسی ملفوظ میں ارشاد فرمایا:

"اور بیوی کو کھلا دینا بھی خیرات ہی ہے اور اگر بیوی کا جی خوش کرنے کو بلا ضرورت بھی کوئی چیز خرید لو تو وہ بھی اسراف نہیں، کیونکہ تطییب قلب زوجہ بھی مطلوب ہے، بشرطیکہ اس میں طاقت سے زیادہ قرض نہ کرے"(۲)

یعنی بیوی کا دل خوش کرنے کے لئے بلا ضرورت بھی کوئی چیز خریدنا اسراف نہیں، بیوی میں بچے بھی داخل ہیں۔ کیوں؟ اس کی وجہ بھی بیان فرمادی کہ تطییب قلب زوجہ بھی مطلوب ہے۔ بات وہی ہے جو اوپر عرض کی کہ خرچ کرنے میں فائدہ ہونا چاہئے، اب یہ ضروری نہیں کہ اپنا ہی فائدہ ہو بلکہ دوسرے کا فائدہ بھی اس میں داخل ہے، کیونکہ دوسرے کا دل خوش کرنا اور اس کی دلداری کرنا بھی فائدہ ہے، چاہے یہ دلداری بیوی کی ہو، بچوں کی ہو، ماں باپ کی ہو، بہن بھائیوں کی ہو، یہ بھی ایک معتدبہ فائدہ ہے، اس پر جو کچھ خرچ کیا جائے وہ بھی "اسراف" نہیں۔

استاذ کے اکرام میں باون قسم کے کھانے

ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ان کے استاذ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۱ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۱

آئے۔ میں نے اپنے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذ کے اکرام کے لئے باون قسم کے کھانے تیار کرائے۔ جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے دستر خوان پر باون کھانے دیکھے تو فرمایا کہ بھائی تم نے یہ کیا کرلیا؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سچی بات تو یہ ہے کہ دل تو اب بھی نہیں بھرا، دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ اور تیار کراتا۔ اب دوسرا آدمی تو ان باون قسم کے کھانوں کو دیکھ کر یہ کہے گا کہ یہ ''اسراف'' ہے، لیکن حقیقت میں یہاں پر استاذ کا اکرام مقصود تھا اور یہ معلوم تھا کہ کوئی چیز ضائع نہیں ہوگی بلکہ جو بچے گا وہ ضرور کسی اللہ کے بندے کے کام آئے گا، اگر خدانہ کرے ضائع ہوتا تو بیشک وہ ''اسراف'' تھا، لیکن وہاں تو اس بات کا یقین تھا کہ ضائع نہیں ہوگا۔ اور وہاں کوئی دکھاوا تو تھا نہیں کہ باون قسم کے کھانے لوگوں کو دکھانے کے لئے تیار کرائے ہوں بلکہ اپنی طبیعت کا تقاضا تھا اور استاذ کی خدمت اور استاذ کا اکرام مقصود تھا، اس لئے اس میں کوئی اسراف نہیں تھا۔

نیت کے فرق سے گناہ اور ثواب

اگر یہی کام آدمی اس نیت سے کرے کہ تاریخ میں ریکارڈ ہو جائے کہ فلاں شخص نے ایسی دعوت کی تھی کہ اس میں باون قسم کے کھانے تھے تو اس صورت میں یہی کام ''اسراف'' بھی ہے اور حرام بھی ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ کے موقع پر ہدیہ تحفہ دیا جاتا ہے، اگر یہ ہدیہ محبت میں دل کے تقاضے سے دیا کہ یہ شخص میرا قریبی عزیز ہے، دل چاہتا ہے کہ میں اس کی خدمت کروں اور کچھ دے کر اپنی خوشی کا اظہار کروں تو یہ سنت پر عمل ہے اور اس پر بڑا اجر وثواب ہے اور یہ برکت کی چیز ہے، اور اگر یہی کام اس نیت سے کیا کہ اس ہدیہ کے دینے سے نام ہوگا کہ فلاں نے شادی کے موقع پر یہ تحفہ دیا تو یہی چیز اسراف ہے اور گناہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بخل سے بھی ہماری حفاظت فرمائے اور اسراف سے بھی حفاظت فرمائے۔

اسراف سے بچنے کی ترکیب

اس ملفوظ پر حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''اسراف سے بچنے کی ترکیب'' کا عنوان لگایا ہوا ہے۔ اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کسی مرید کو کچھ نصیحتیں فرمائی ہیں، وہ نصیحتیں اس ملفوظ میں درج ہیں، اگر ان نصیحتوں پر عمل کرلیا جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ اسراف سے نجات مل جائے گی اور چونکہ یہ نصیحتیں عام نوعیت کی ہیں، اس لئے ان پر عمل کرنے سے دوسری خرابیوں سے بھی نجات مل جائے گی، چنانچہ پہلی نصیحت یہ فرمائی:

''اہل اللہ کا مذہب رکھو، وضعدار لوگوں کا مت رکھو، رسم و رواج کے ذرا بھی مقید نہ ہو۔''(۱)

اہل اللہ کی وضع اختیار کریں

اللہ تعالیٰ نے مباحات کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے، لیکن ان مباحات میں کچھ مباحات ایسے ہیں جن کو ہر دور کے اہل اللہ اختیار کر لیتے ہیں، پھر ان مباحات کے اختیار کرنے میں برکت ہوتی ہے، البتہ یہ بات نہیں ہے کہ ان مباحات کے خلاف کرنے میں گناہ ہے اور نہ ہی اہل اللہ کے اختیار کیے ہوئے طریقے کا مسنون ہونا ضروری ہے، مثلاً ''لباس'' ہے، لباس کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ''مباحات'' کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے، کسی خاص لباس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں پابند نہیں کیا کہ یہ لباس پہنو، شریعت نے ہم پر ایسی پابندی نہیں لگائی۔

رسم اور فیشن کے قیدی مت بنیں

اب ایک ''لباس'' وہ ہے جس کو اس دور کے علماء نے اور اہل اللہ نے اختیار کیا ہوا ہے اور ایک لباس وہ ہے جس کو عام لوگوں نے اختیار کیا ہوا ہے۔ جو لباس عام لوگوں نے اختیار کیا ہوا ہے وہ بھی کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ وہ بھی مباحات کے اندر داخل ہے۔ مثلاً کسی خاص قسم کے لباس کا ایک فیشن چلا ہوا ہے، جس میں کوئی اور محظور شرعی نہیں ہے، مثلاً شلوار قمیص کا سوٹ اور اس پر واسکٹ پہنتے ہیں، اس کا فیشن چلا ہوا ہے، یہ کوئی گناہ اور ناجائز نہیں ہے بلکہ یہ بھی مباحات میں دخل ہے۔ جو لباس علماء کرام، بزرگانِ دین اور اہل اللہ نے اختیار کیا ہوا ہے، وہ بھی مباحات میں ہے، لیکن تم اس بات کی کوشش کرو کہ اہل اللہ کا طریقہ اختیار کرو اور وضع دار لوگوں کا مذہب اور طریقہ اختیار مت کرو۔ ''وضعدار'' سے مراد ہیں ''فیشن والے'' اور رسم و رواج کے مقید نہ بنو، یعنی یہ مت دیکھو کہ آج کل تو ایسے لباس کا فیشن چل رہا ہے، یہ لباس پہننا چاہئے اور فلاں لباس آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے، اس لئے اس کو چھوڑ دینا چاہئے۔

بزرگوں کے لباس کی نقل کرنا اچھا ہے

اب یہاں چند باتیں سمجھنے کی ہیں جس میں ہمارے یہاں افراط اور تفریط پائی جاتی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جو لوگ اہل اللہ کے لباس کی نقل اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً اہل اللہ کی دوپلی ٹوپی

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۹۴

دیکھ کر یا ان کی گول ٹوپی دیکھ کر ان کی نقل کرتے ہیں، یا اہل اللہ کا سلیم شاہی جوتا دیکھ کر اس کی نقل کرتے ہیں یا اہل اللہ کے کرتے جیسا کرتا پہننے کی کوشش کرتے ہیں، خاص طور پر جب کوئی شخص نیا نیا دین کے قریب آتا ہے تو وہ بزرگوں کی نقل اُتارنے کی کوشش کرتا ہے۔

اب لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ بزرگوں کے لباس پوشاک کی نقل کرنے اور اس کا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا حضور اقدس ﷺ نے دوپلی ٹوپی پہنی تھی؟ کیا آپ نے ایسا جوتا اور ایسی قمیص اور ایسی شلوار پہنی تھی؟ قمیص کے بارے میں تو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے قمیص پہنی تھی لیکن حضور اقدس ﷺ کی قمیص ہماری قمیص سے مختلف تھی، ہماری قمیص اونچی ہوتی ہے، آپ ﷺ کی قمیص نیچی ہوتی تھی، اسی طرح شلوار پہننا حضور اقدس ﷺ سے ثابت نہیں، البتہ شلوار کو پسند کرنا ثابت ہے، لیکن یہ ٹوپی اور جوتا پہننا حضور اقدس ﷺ سے ثابت نہیں، یہ صدری اور یہ واسکٹ پہننا ثابت نہیں، لہٰذا لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب یہ چیزیں پہننا سنت نہیں ہے تو پھر لوگ ان کی طرف کیوں اتنا التفات کرتے ہیں اور ان کے پہننے کا اتنا اہتمام کیوں کرتے ہیں؟

اس کو سنت سمجھنا غلط ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اہتمام اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان چیزوں کو پہننا سنت ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص دوپلی ٹوپی یا پانچ کلی کی ٹوپی اس نیت سے پہنے کہ یہ سنت ہے تو اس کا پہننا بدعت اور گناہ ہوگا، بلکہ یہ اہتمام اس وجہ سے ہے کہ ہر دور کے صلحاء اور علماء جو لباس اختیار کرتے ہیں، اس کے پہننے میں فائدہ ہے، وہ فائدہ یہ ہے کہ ایسا لباس پہننے کے نتیجے میں ان سے قرب ہوتا ہے اور ان سے مشابہت حاصل ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ فال نیک ہوتی ہے کہ جب ہم نے ان کا لباس اختیار کیا ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے اخلاق اور ان کی سیرت اپنانے کی بھی توفیق عطا فرمائیں گے۔ لہٰذا اس لباس کو سنت سمجھ کر اختیار کرنا تو غلط ہے اور اس کو ضروری سمجھ کر اختیار کرنا تو بہت ہی غلط ہے۔

حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

مثلاً ہمارے بزرگوں نے اس کا اہتمام کیا کہ جب بھی جوتا پہنیں گے تو سلیم شاہی پہنیں گے۔ حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیوبند کے مہتمم تھے، حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد تھے، اس زمانے میں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور برطانیہ کی طرف سے حکمران مقرر ہوتا تھا، اس کو ''وائسرائے'' کہا جاتا تھا، اس نے سرکاری اعزاز کے طور پر حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا تھا۔ ایک مرتبہ اس وائسرائے نے حضرت والا کو ملاقات

کے لئے دہلی بلایا، اب حاکم وقت نے اعزاز کے ساتھ بلایا تھا، اس لئے آپ ملاقات کے لئے تشریف لے گئے، جب اس کے محل میں داخل ہونے لگے تو دروازے پر جو جنٹلمین دربان تھا، اس نے آپ کو روک لیا اور کہا کہ یہ جوتا جو آپ پہنے ہوئے ہیں، اس کو پہن کر اندر نہیں جاسکتے۔ آپ اس وقت دھوڑی کا جوتا پہنے ہوئے تھے، آج کل سلیم شاہی ناگرا جو رائج ہے، یہ تو بہت نازک قسم کا ہوتا ہے، وہ دھوڑی کا جوتا بہت موٹا ہوتا تھا۔ بہرحال! اس نے کہا کہ آپ وائسرائے سے ملنے کے لئے یہ جوتا پہن کر نہیں جاسکتے بلکہ آپ کو بوٹ پہننے پڑیں گے۔

مجھے ملاقات کا شوق نہیں

حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے خود تو وائسرائے سے ملنے کی درخواست نہیں دی ہے کہ میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا مجھے ملاقات کرنے کی کوئی حاجت نہیں، البتہ انہوں نے ہی مجھے ملاقات کے لئے بلایا ہے، اب اگر وہ ملاقات کے لئے یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ میں اپنی مرضی کا جوتا اُتار دوں اور ان کی مرضی کا جوتا پہنوں تو پھر مجھے ان کی ملاقات کی یہ دعوت قبول نہیں، میں معذرت خواہ ہوں اور اگر وہ میری مرضی کے لباس میں مجھ سے ملنے کو تیار ہیں تو پھر میں تیار ہوں، میرا یہ پیغام ان تک پہنچادو، اگر نہیں ملنا چاہتے تو میں واپس چلا جاتا ہوں اور اپنا منہ موڑ لیا۔

اب اس دربان کی ساری جنٹلمینی دھری رہ گئی۔ اس نے سوچا کہ جب وائسرائے کو یہ اطلاع ملے گی کہ مولانا صاحب تشریف لائے تھے اور اس وجہ سے واپس چلے گئے تو میری اپنی کھچائی نہ ہوجائے، چنانچہ اس نے جاکر اندر اطلاع دی کہ وہ مولانا صاحب تو یہ کہہ رہے ہیں۔ وہ وائسرائے بھی ناراض ہوئے کہ تم نے مولانا کے ساتھ کیا حرکت کی، ان کو فوراً اندر بلالو، چنانچہ آپ کو فوراً اندر بلوالیا۔

آپ نے ایسا جوتا کیوں اختیار کیا؟

اب حضرت مولاناؒ کا ایسا جوتا پہننے کا اہتمام کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ یہ سنت تھا، لہٰذا کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ ایسا جوتا پہننا کونسا فرض و واجب تھا، اگر اس وقت وہ دوسرے جوتے پہن کر چلے جاتے تو کوئی حرام اور گناہ نہیں تھا، لیکن دو وجہ سے اس جوتے کے پہننے کا اہتمام کیا، ایک وجہ تو یہ تھی کہ آپ نے اپنے علماء اپنے اساتذہ، اپنے صلحاء و مشائخ کو ایسا جوتا پہنتے دیکھا تھا تو ان کی سی صورت اختیار کرنے کی کوشش کی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ بات وقار کے خلاف تھی کہ ایک طرف عالم کو بلایا جارہا ہے اور دوسری طرف شرطیں عائد کی جارہی ہیں کہ ایسا لباس اور ایسا جوتا پہن کر آؤ ورنہ داخل نہیں ہونے دیں گے۔ چونکہ یہ بات وقار کے خلاف تھی، اس لئے حضرت والا نے اس کو گوارا نہیں فرمایا۔

کیا اہتمام بدعت ہے؟

اب بعض لوگ یہاں تک کہتے ہیں کہ تم لوگ جو یہ اہتمام کرتے ہو کہ ایسا لباس ہو، ایسا کرتا ہو، ایسی شلوار ہو، ایسا جوتا ہو، ایسی ٹوپی ہو، یہ اہتمام کرنا بدعت ہے، کیونکہ سنت سے ایسا لباس، ایسا جوتا، ایسی ٹوپی ثابت نہیں اور تم ان چیزوں کا ایسا التزام کررہے ہو جیسا التزام سنتوں کا اور واجبات کا ہوتا ہے، لہٰذا یہ "التزام ما لا یلزم"(1) ہے، اس لئے یہ بدعت ہے۔

محبوب کی شباہت

یہ بات درست نہیں، اس لئے کہ اس لباس کا اور اس جوتے کا اور اس ٹوپی کا سنت یا واجب ہونے کی وجہ سے التزام نہیں کیا جارہا ہے بلکہ اس لئے التزام کیا جارہا ہے کہ یہ ہمارے بزرگ، ہمارے اساتذہ اور ہمارے مشائخ کا طریقہ ہے۔ اگر ہم ان کا طریقہ اختیار کریں گے تو ان کی صورت بنانے کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہماری سیرت بھی ان جیسی بنادیں گے۔

تیرے محبوب کی یا رب شباہت لے کر آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کردے میں صورت لے کر آیا ہوں

بزرگوں کا لباس اختیار کرنے سے یہ مشابہت مقصود ہوتی ہے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا۔

التزام کرنا بدعت ہے

دوسری طرف بعض لوگوں نے واقعۃً ایسا سمجھ لیا ہے کہ یہ ہیئت اور یہ لباس اختیار کرنا فرض و واجب ہے یا کم از کم سنتِ مؤکدہ تو ضرور ہے۔ اگر کوئی شخص اس لباس اور اس ہیئت سے انحراف کرے تو اس پر نکیر کی جاتی ہے، ملامت کی جاتی ہے کہ اس نے یہ لباس کیوں اختیار نہیں کیا۔ یہ اہتمام اور التزام واقعۃً اس ہیئت اور لباس کو بدعت بنادیتا ہے، مثلاً یہ نکیر کرنا کہ فلاں شخص نے پنج گوشہ ٹوپی کیوں نہیں پہنی؟ اس نے فلاں قسم کا جوتا کیوں نہیں پہنا؟ اس نے فلاں طرز کا لباس کیوں نہیں پہنا؟ لہٰذا جب اس لباس اور اس ہیئت کے ترک پر اس طرح کی نکیر ہونے لگے جس طرح فرائض و واجبات کے ترک پر نکیر ہوتی ہے تو یہی لباس اور ہیئت بدعت بن جائے گا۔ بعض اوقات یہ بات ہمارے طبقے میں پیدا ہوجاتی ہے۔ اصل بات تو وہاں سے چلی تھی کہ اہل اللہ کا لباس اختیار کرو، اس میں برکت ہے، لیکن آگے چل کر اس لباس کو اتنی اہمیت دے دی کہ وہ فرائض و واجبات کا درجہ اختیار کرگیا، اس

(۱) یعنی جو چیز لازم نہ تھی اسے لازم کرلیا گیا۔

وجہ سے وہ لباس بدعت بن گیا، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

غیر منکر پر نکیر کرنا خود منکر ہے

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی عجیب بات فرمایا کرتے تھے، اور یہ بات ویسے ہی نہیں فرمائی بلکہ پہلے علماء کی کئی مجلسوں میں اس کی تصدیق کرائی اور ان علماء کے سامنے آپ نے فرمایا کہ میرے ذہن میں ایک بات آتی ہے، آپ حضرات سوچ کر بتائیں کہ وہ بات صحیح ہے یا غلط ہے؟ جب آٹھ دس علماء کی مجلسوں میں اس کی تصدیق ہوگئی کہ یہ بات بالکل صحیح ہے، اس کے بعد اس بات کو بطور قاعدہ کے آپ نے لوگوں کے سامنے بیان فرمایا، چنانچہ آپ نے فرمایا:

"غیر منکر پر نکیر کرنا خود منکر ہے"

یعنی جس کام کو شریعت نے منکر اور حرام اور ناجائز قرار نہیں دیا، اگر کوئی شخص وہ کام کر رہا ہے تو اس پر طعن و تشنیع کرنا اور اس کو برا بھلا کہنا خود منکر ہے اور قابلِ ترک ہے۔

زیرِ تربیت افراد کا معاملہ الگ ہے

یہ قاعدہ جو بیان کیا جا رہا ہے وہ عام انسانوں کے ساتھ طرزِ عمل کا بیان کیا جا رہا ہے، جہاں تک ان افراد کا تعلق ہے جو انسان کے زیرِ تربیت ہیں، جیسے استاذ کے لئے شاگرد، شیخ کے لئے مرید اور باپ کے لئے اولاد، ان کا معاملہ عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے، کیونکہ بعض اوقات ان کو مستحبات کا بھی پابند کیا جاتا ہے اور ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ ان مستحبات کو ادا کرو اور پھر ان مستحبات کے ترک پر نکیر بھی کی جاتی ہے۔ چونکہ ان افراد کو مستحبات کے پابند بنانے کا مقصد ان کی تربیت ہے تاکہ ان کو مستحبات کے ادا کرنے کی عادت پڑے، لہٰذا زیرِ تربیت افراد اس قاعدے کے اندر داخل نہیں۔ مثلاً اگر کسی شاگرد پر یا مرید پر یا اپنی اولاد پر کسی مستحب کے ترک پر نکیر ہو رہی ہے تو یہ نکیر کرنا درست ہے۔

کیا تم خدا ہو؟

لیکن عام آدمی جو تمہارے زیرِ تربیت نہیں، اس کے بارے میں آپ یہ چاہیں کہ یہ بھی ایسا ہی ہو جائے جیسا میں ہوں یا جیسا میں چاہتا ہوں تو تم پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم خدا ہو؟ یا تم اللہ کے پیغمبر ہو؟ یا اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس بات کا ٹھیکیدار بنایا ہے کہ ہر انسان تمہارے جیسا ہو جائے؟ بلکہ شریعت نے جو دائرہ مقرر کیا ہے، اگر ایک انسان اس دائرہ کے اندر رہتے ہوئے کسی مباح کام پر عمل کر رہا ہے تو تمہیں نکیر کرنے کا کوئی حق نہیں اور نہ ہی اس مباح پر عمل کرنے والے کو برا سمجھنے کا حق ہے۔

اہل اللہ کی نقل اُتاریں

بہرحال! اہل اللہ کا طریقہ اختیار کرنے کی فکر کرنی چاہئے، اسی میں برکت ہے، اسی میں خیر ہے، اسی میں حفاظت ہے اور اسی کی برکت سے اللہ تعالیٰ سیرت و کردار بھی ان جیسی بنانے کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں بشرطیکہ اس نیت سے اس طریقے کو اختیار کیا جائے کہ جب ہم ظاہر میں اہل اللہ کی نقل اُتاریں گے تو یہ فال نیک ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں باطن میں بھی ان جیسا بنادیں گے۔

نیت کی خرابی سے وبال کا اندیشہ

لیکن اگر بزرگوں کی نقل اس نیت سے کی جائے تاکہ ذرا ہم بھی دیکھنے میں بزرگ معلوم ہوں اور اس کے نتیجے میں لوگوں کی نگاہوں میں ہماری عزت ہو تو اس نیت کے نتیجے میں اُلٹا وبال کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا نیت یہ ہونی چاہئے کہ ان کی صورت اختیار کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان جیسی سیرت بھی عطا فرمادیں گے۔

وضعداری اچھی چیز نہیں

دوسرا جملہ حضرت والا نے یہ ارشاد فرمایا کہ ''وضعدار لوگوں کا مت رکھو''

''وضعداری'' کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے اپنا خاص طریقہ بنالیا کہ میں ہمیشہ اس انداز کی ٹوپی پہنوں گا، ہمیشہ ایسا کرتا پہنوں گا، ایسا پاجامہ پہنوں گا، ایسا موزہ پہنوں گا، ایسا جوتا پہنوں گا، اور پھر اس خاص لباس کا اتنا اہتمام کرلیا کہ وہ لباس اس آدمی کی پہچان بن گیا۔ یہ ہے ''وضعداری'' اس کے بارے میں حضرت والا فرماتے ہیں کہ طریقِ سلوک کے اندر یہ چیز اچھی نہیں، کیونکہ اس کے نتیجے میں لوگوں کی انگلیاں اُٹھتی ہیں اور لوگ اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص ایسا وضعدار ہے کہ جب بھی یہ شخص ٹوپی پہنے گا تو اس انداز کی پہنے گا، یہ شخص ہمیشہ سفید شیروانی پہنے گا، ہمیشہ ایسا جوتا پہنے گا۔ اس پر حضرت والا فرماتے ہیں کہ ایسا کام کیوں کرتے ہو جس کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان تمہارا امتیاز پیدا ہو بلکہ وقت پر جیسا میسر آجائے وہ اختیار کرلو اور جس وقت جس لباس میں راحت معلوم ہو وہ پہن لو۔

اکبر الٰہ آبادی کا ایک واقعہ

اکبر الٰہ آبادی مرحوم جو مشہور شاعر گزرے ہیں، میں نے ان کے بارے میں اپنے والد

ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک دن لوگوں نے ان کو سڑک پر اس طرح جاتے ہوئے دیکھا کہ تہبند پہنا ہوا ہے اور اس کے اوپر کالر والی شرٹ پہنی ہوئی ہے اور سر پر ہیٹ پہنا ہوا ہے۔ اب جو شخص بھی ان کو اس حالت میں دیکھتا تو اس کو ایک ہیولی نظر آتا، اس لئے کہ لباس میں کوئی مطابقت نہیں تھی۔ کسی نے ان سے پوچھ لیا کہ جناب! یہ آپ کیسا لباس پہنے جارہے ہیں؟ جواب میں انہوں نے کہا کہ تمہیں کیا اعتراض ہے؟ بھائی! ہمیں جس چیز میں راحت معلوم ہوئی وہ ہم نے پہن لی، ہمیں اس وقت تہبند پہننے میں راحت معلوم ہورہی تھی، اس لئے تہبند پہن لی اور کالردار شرٹ پہننے میں راحت معلوم ہورہی تھی، وہ شرٹ پہن لی اور چونکہ دھوپ تھی، دھوپ سے بچنے کے لئے سر پر ہیٹ پہن لیا، جس چیز میں راحت معلوم ہوئی وہ پہن لیا، آپ کو کیا اعتراض ہے؟

من بھاتا کھاؤ، من بھاتا پہنو

لوگوں میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ کھائے من بھاتا اور پہنے جگ بھاتا، یعنی وہ چیز کھائے جو آدمی کے دل کو اچھی لگے، یہ نہ ہو کہ اچھی تو دوسروں کو لگ رہی ہے اور کھا تم رہے ہو، یہ فضول بات ہے، لہٰذا وہ چیز کھاؤ جو تمہارے من کو بھائے، تمہارے دل کو اچھا لگے، جس کا ذائقہ تمہیں پسند ہو۔ اور پہنے وہ لباس جو ساری دنیا کو پسند ہو، اس لئے کہ جگ سے مراد زمانہ ہے، یعنی زمانہ جس لباس کو پسند کرے وہ پہنو۔ لوگوں میں یہ مقولہ مشہور ہے۔

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ مقولہ درست نہیں، بلکہ انسان کھائے بھی من بھاتا اور پہنے بھی من بھاتا، یعنی جو اصول کھانے میں ہے وہی اصول پہننے میں ہے کہ جو کھانا تمہیں پسند ہے وہ کھاؤ اور جو لباس تمہیں پسند ہے وہ پہنو، یہ نہ ہو کہ تمہیں تو کوئی اور لباس پسند آرہا تھا، لیکن زمانے نے فیشن بدل دیا، لہٰذا اب تم نے زمانے کی تقلید میں ایسا لباس پہن لیا جو تمہیں پسند نہیں تھا، یہ حماقت کی بات ہے۔

زمانے کی تقلید میں اسراف ہے

اور زمانے کی تقلید کرنے میں ''اسراف'' لازمی ہے، کیونکہ جو کپڑے پہلے بنائے تھے وہ اب بیکار ہو گئے اور ان کے استعمال کرنے کا مصرف نہیں رہا، اس لئے اب نئے کپڑے سلوائے جائیں گے، لہٰذا اس فیشن پرستی کا ایک لازمی نتیجہ ''اسراف'' ہے۔

دو باتیں اختیار کرلیں

بہر حال! حضرت والا کے ملفوظات پڑھ کر جو بات سمجھ میں آئی، وہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں علماء اور صلحاء کا لباس اور ان کا طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور یہ نیت ہونی چاہئے کہ میں ان کا لباس اس لئے اختیار کر رہا ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ ان جیسی صورت اختیار کرنے کی برکت سے ان کی جیسی سیرت بھی عطا فرمادیں۔ لیکن اس لباس اور اس طریقہ کو سنت اور واجب نہیں سمجھنا چاہئے، لہٰذا اگر دوسرا آدمی اس طریقے اور اس لباس کے علاوہ دوسرا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہے اور وہ طریقہ مباحات کے دائرے میں ہے تو اس پر نہ تو نکیر کرے اور نہ ہی اس کو برا سمجھے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ کسی خاص طریقے کا ایسا التزام کہ کبھی اس سے تخلف ہی نہ ہو، یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں، بلکہ جس وقت جیسا لباس میسر ہو وہ لباس اختیار کرلے، کبھی ایسی ٹوپی پہن لی، کبھی ویسی پہن لی، کبھی ایسا جوتا پہن لیا، کبھی دوسرا جوتا پہن لیا، ایک لباس کا بہت زیادہ اہتمام نہ ہونا چاہئے، اس اہتمام میں ایک طرف تو "التزام ما لا یلزم" کا خطرہ بھی ہے اور دوسری طرف اس اہتمام سے امتیاز پیدا ہوتا ہے اور یہ انسان کی بے تکلفی اور تواضع کے بھی منافی ہے۔

قرض لینے سے پرہیز کریں

دوسری نصیحت حضرت والا نے یہ فرمائی:

"بلا ضرورت ہرگز مقروض مت بنو، گو رسم و رواج کے خلاف کرنا پڑے، مقروض ہونے سے بڑی پریشانی ہوتی ہے جس کا انجام بہت برا ہے، ہر مسلمان کو وہی مذہب رکھنا چاہئے جو اہل اللہ کا ہے"(۱)

اس نصیحت میں "اسراف" سے بچنے کا بڑا زبردست قاعدہ بیان فرمادیا، وہ یہ کہ "قرض" سے بھاگو اور شدید ضرورت کے بغیر قرض نہ لو، کسی وقت پیٹ پر پتھر باندھنا پڑ جائے تو وہ گوارا کرلو لیکن قرض لینا گوارا نہ کرو۔ اگرچہ بعض اوقات آدمی بھوک سے مجبور ہو جاتا ہے تو بہر حال لینا پڑتا ہے، اس وقت اگر کوئی لے لے تو کوئی حرام اور ناجائز نہیں، لیکن اپنی ذہنیت یہ بناؤ کہ کسی غیر اللہ کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا، نہ تو مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلانا ہے اور نہ ہی قرض کے لئے، یہ ذہنیت بنالو۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۲

اخراجات کم کرلیں

جب تم یہ اصول بنالو گے کہ قرض نہیں لینا تو پھر خود بخود تمہیں اخراجات کم کرنے پڑیں گے۔ اب اس صورت میں اخراجات آمدنی کے دائرے میں کرنے پڑیں گے، کیونکہ اس سے زیادہ اخراجات کرے گا تو آدمی کو قرض لینا پڑے گا اور یہ اصول بنالیا ہے کہ قرض لے کر کوئی کام نہیں کرنا۔

استطاعت کم، کام زیادہ

ہمارے معاشرے میں یہ زبردست فساد پھیلا ہوا ہے کہ آدمی کی استطاعت تو تھوڑی ہے اور اخراجات زیادہ ہیں اور وہ اخراجات چونکہ تھوڑی آمدنی میں پورے نہیں ہوتے تو اب ان کے لئے قرض لیتا ہے اور پھر قرض در قرض ہوتے ہوتے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ یہ قرض لینے کی خرابی ہمارے اندر انفرادی سطح پر تو تھی مگر اب اجتماعی سطح پر ہمارا پورا ملک قرضوں پر چل رہا ہے۔

چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ

پہلے بزرگ کہا کرتے تھے کہ ”چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ“ یعنی یہ دیکھو کہ چادر کتنی ہے، پھر جتنی چادر ہے اتنے پاؤں پھیلاؤ، اس سے آگے مت پھیلاؤ۔ آج کا اصول یہ ہے کہ پاؤں پہلے پھیلاؤ اور پھر اس کے مطابق چادر بعد میں تلاش کرو اور اگر چادر نہ ملے تو بھیک مانگو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پوری کی پوری قوم مقروض ہے، آج ہمارے ملک کے بجٹ کا ۴۶٪ حصہ صرف قرضوں کی ادائیگی میں جاتا ہے۔ شیطان نے سود کا ایسا چرخہ چلایا ہے کہ آج پوری دنیا قرض کے اندر ڈوبی ہوئی ہے، صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ امریکہ بھی اتنے بڑے قرض میں ڈوبا ہوا ہے کہ کوئی حد وحساب نہیں، لیکن چونکہ وہ امیر ملک ہے، اس لئے فی الحال وہ اس قرض کو برداشت کر رہا ہے، مگر یہ ایک ایسا غبارہ ہے جو کسی وقت بھی پھٹ جائے گا۔ ہمارا ملک چونکہ غریب ہے، اس لئے ان قرضوں کا بوجھ ہمارے اُوپر بہت زیادہ ہے، اس وقت ہماری آزادی اور ہماری عزت ہر چیز داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ بہرحال، بلاوجہ قرض نہ کرو۔

مقروض کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک جنازہ حضور اقدس ﷺ کے پاس نمازِ جنازہ کے لئے لایا گیا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ ان پر قرض ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ ان پر قرض

ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((صَلُّوا عَلٰى صَاحِبِكُمْ))(۱)

''تم ہی اپنے ساتھی پر نماز پڑھ لو، میں نہیں پڑھتا''

ایک معمولی خاتون کی قبر پر نمازِ جنازہ

دوسری طرف وہ حدیث یاد رکھنی چاہئے کہ ایک دن حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ ایک خاتون جو مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی، وہ بہت دن سے نظر نہیں آرہی ہے، کہاں گئی؟ ایک روایت میں ہے کہ مرد تھا، ایک روایت میں ہے کہ عورت تھی۔ صحابہ کرام نے جواب دیا کہ یارسول اللہ ﷺ! اس کا انتقال ہوگیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہمیں بتایا نہیں۔ صحابہ کرام نے فرمایا کہ وہ ایسا وقت تھا کہ آپ کو اس وقت نمازِ جنازہ میں شریک ہونے میں زحمت ہوتی، اس لئے آپ کو نہیں بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، ایسا نہ کرو، بلکہ جب کسی کا انتقال ہوجائے تو مجھے بتاؤ۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا اس کی قبر دکھاؤ، کہاں ہے؟ چنانچہ آپ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور قبر پر آپ نے نمازِ جنازہ پڑھی۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ هٰذِهِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوَّةٌ ظُلْمًا فَيُنَوِّرُهَا اللّٰهُ بِصَلَاتِيْ))(۲)

''یہ قبریں اندھیرے سے بھری ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ میری نماز پڑھنے کی برکت سے ان میں نور پیدا فرما دیتے ہیں''

اسی لئے علماء حنفیہ فرماتے ہیں کہ یہ حضورِ اقدس ﷺ کی خصوصیت تھی، کوئی دوسرا شخص قبر پر جاکر نماز نہ پڑھے، اس لئے کہ ولی کے علاوہ دوسرے شخص کے لئے قبر پر نماز پڑھنا جائز نہیں، البتہ اگر ولی نے نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تو اس کے لئے قبر پر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

دیکھئے! ایک طرف تو یہ حال ہے کہ ایک ایسی خاتون جس کی نمازِ جنازہ پڑھادی گئی ہے اور اس کو دفن کردیا گیا، البتہ آپ ﷺ کے علم میں اس کے انتقال کی خبر نہیں آئی، لیکن جب آپ ﷺ کو

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب الحوالات، باب ان أحال دين الميت على رجل جاز، رقم: ۲۱۲۷، سنن الترمذی، كتاب الجنائز عن رسول الله، باب ما جاء فی الصلاة على المديون، رقم: ۹۸۹، سنن النسائی، كتاب الجنائز، باب الصلاة على من عليه دين، رقم: ۱۹۳٤، سنن أبی داؤد، كتاب البيوع، باب فی التشديد فی الدين، رقم: ۲۹۰۲، سنن ابن ماجه، كتاب الأحكام، باب الكفالة، رقم: ۲۳۹۸

(۲) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب الصلاة على القبر، رقم: ۱۵۸۸، مسند أحمد، رقم: ۸٦۷٦

اس کے انتقال کا علم ہوا تو آپ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی تا کہ اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو نور سے بھر دے۔

دوسری طرف یہ حال ہے کہ جنازہ سامنے رکھا ہے، اس لئے رکھا ہے تا کہ حضور ﷺ اس پر نمازِ جنازہ پڑھیں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ان پر نماز پڑھ لو، میں نہیں پڑھتا، کیونکہ ان کے ذمے قرض ہے۔

قرض کا ذمہ لینے کے بعد نمازِ جنازہ پڑھائی

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ان کا قرض میں اپنے ذمے لیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے سوال کیا کہ کیا پورا قرض اپنے ذمے لیتے ہو؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں یا رسول اللہ ﷺ! میں پورا قرض اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔

واپس کرنے کی طاقت نہ ہونے کے باوجود قرض کیوں لیا؟

آنحضرت ﷺ نے یہ جو مقروض آدمی کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے منع فرمایا، اس کی کیا وجہ تھی؟ بظاہر تو وہ شخص دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ستم رسیدہ تھا اور دوسروں کے مقابلے میں رحم کا زیادہ مستحق تھا لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی، اس سے اس طرف توجہ دلائی کہ جب قرض واپس کرنے کی استطاعت نہیں تھی تو پھر قرض لیا ہی کیوں تھا؟ معلوم ہوا کہ بلا ضرورت قرض لینا اور یہ معلوم ہوتے ہوئے قرض لینا کہ میں واپس ادا نہیں کرسکوں گا، یہ اتنی وبال کی بات ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی نمازِ جنازہ سے محرومی کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا کسی شخص کو بھی حتی الامکان قرض لینے کا اقدام نہیں کرنا چاہئے۔

ہمارے معاشرے میں قرض کی وبا

آج ہمارے معاشرے کے اندر اس معاملے میں بڑی افراط و تفریط پائی جارہی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے طبقے میں جو دیندار طبقہ کہلاتا ہے، اس میں خاص طور پر یہ وبا عام ہورہی ہے۔ نہ تو اس کا اہتمام ہے کہ قرض ہی نہ لیں اور نہ ہی اس کا اہتمام ہے کہ اگر قرض لیا ہے تو وقت پر واپس کردیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالہا سال گزر جاتے ہیں اور قرض واپس نہیں ہوتا۔ اس لئے میں حتی الامکان اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ کسی کو قرض نہ دینا پڑے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی مدد کرنے کی جو توفیق دیتے ہیں وہ کردیتا ہوں، لیکن قرض دینے سے بچتا ہوں، اس لئے کہ قرض دینے کے بعد اس کا حساب لکھواور پھر ہر وقت دماغ پر یہ فکر سوار ہے کہ وہ قرض واپس آئے گا اور وہ واپس آتا نہیں۔ ساری زندگی میں چند

واقعات کے علاوہ مجھے یاد نہیں کہ کوئی آدمی قرض لے کر واپس کر گیا ہو، حالانکہ قرض لے جانے والے اچھے خاصے دیندار، عالم و فاضل اور بزرگوں کی صحبت میں عمریں گزار دینے والے، قرض لے کر گئے مگر آج تک پتہ نہیں کہ وہ قرض کہاں گیا۔

آج گناہ کے لئے قرض لیے جاتے ہیں

بہر حال! اوّل تو آدمی قرض کیوں لے؟ اگر لے تو پھر وقت پر ادائیگی کا اہتمام کرے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں فرما رہے ہیں کہ ''بلا ضرورت ہرگز مقروض مت بنو، گو رسم و رواج کے خلاف کرنا پڑے'' یعنی اس لئے قرض لے رہے ہیں کہ ہمارے ہاں فلاں موقع پر دعوت کی جاتی ہے۔ العیاذ باللہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کرنے کے لئے قرض لے رہے ہیں۔ آگے فرمایا کہ ''مقروض ہونے سے بڑی پریشانی ہوتی ہے جس کا انجام بہت برا ہے، لہٰذا ہر مسلمان کو وہی مذہب رکھنا چاہئے جو اہل اللہ کا ہے''

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خطبات وتحریرات)

جلد نمبر ۹

اخلاق حسنہ اور ان کے فضائل

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

اخلاق حسنہ اور ان کے فضائل

جلد ۹

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں الجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۹

اخلاق حسنہ اور ان کے فضائل

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

مرتب

مولانا محمد اویس سرور صاحب

ادارہ اسلامیات

★ [illegible] دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی

فون [illegible] فیکس [illegible] فون [illegible] فون [illegible]

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات و تحریرات

جلد ۹

اخلاق حسنہ اور ان کے فضائل

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰- انارکلی لاہور- پاکستان ___ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱ ۰ ۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار کراچی- پاکستان ___ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

اچھے اخلاق اور ان کا مفہوم ۱۷

''دِل'' کی کیفیات کا نام ''اخلاق'' ہے ۱۸
فطری جذبات کو اعتدال پر رکھیں ۱۸
''غصہ'' فطری جذبہ ہے ۱۹
یہ بے غیرتی کی بات ہے ۱۹
غصہ کو صحیح جگہ پر استعمال کریں ۱۹
''غصہ'' حد کے اندر رہنا چاہئے ۲۰
''غصہ'' کی حدود ۲۰
''عزتِ نفس'' کا جذبہ فطری ہے ۲۱
''عزتِ نفس'' یا ''تکبر'' ۲۱
''تکبر'' مبغوض ترین جذبہ ہے ۲۱
''متکبر'' کو سب لوگ حقیر سمجھتے ہیں ۲۲
''امریکہ'' انتہائی تکبر کا مظاہرہ کر رہا ہے ۲۲
''تکبر'' دوسری بیماریوں کی جڑ ہے ۲۳
اخلاق کو پاک کرنے کا طریقہ ''نیک صحبت'' ۲۳
زمانۂ جاہلیت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا غصہ ۲۴
حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور غصہ میں اعتدال ۲۴
اللہ تعالیٰ کی حدود پر ٹھہر جانے والے ۲۵
اللہ والوں کی صحبت اختیار کیجئے ۲۵

تواضع: رفعت اور بلندی کا ذریعہ ۲۶

تواضع کی اہمیت ۲۶
تکبر کی حقیقت ۲۷
تمام گناہوں کی جڑ ''تکبر'' ۲۷
''تواضع'' کی حقیقت ۲۸
بزرگوں کی تواضع کا عالم ۲۸
حضورِ اقدس ﷺ کی تواضع ۲۹
حضور ﷺ کی عاجزانہ چال ۲۹
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اعلان ۳۰
شکستگی اور فنائیت پیدا کیجئے ۳۰
حضور ﷺ کا اظہارِ عاجزی ۳۱
''ابھی یہ چاول کچے ہیں'' ۳۲
سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع ۳۳
''انا'' کا بت دل سے نکال دیجئے ۳۴
عربی ادب میں متکبر کی مثال ۳۴
ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع ۳۴
مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع ۳۵
مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع ۳۵
مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع ۳۶
حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع ۳۷
مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع ۳۸
حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ ۳۸

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع ۳۹
سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اعزاز ۴۰
انہیں یہ مقام کیوں ملا؟ ۴۱
سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع ۴۲
بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ۴۳
''تواضع'' اور ''احساسِ کمتری'' میں فرق ۴۴
احساسِ کمتری میں تخلیق پر شکوہ ۴۴
''تواضع'' شکر کا نتیجہ ہے ۴۵
تواضع کا دکھاوا بھی ہوتا ہے ۴۵
ناشکری سے بچنا بھی ضروری ہے ۴۶
تواضع کا غلط مفہوم ۴۶
تکبر اور ناشکری دونوں غلط ہیں ۴۶
شکر اور تواضع کیسے جمع ہوں؟ ۴۷
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ ایک مثال ۴۷
تاریخ کا ایک عبرت ناک قصہ ۴۸
عبادت میں بھی تواضع ہونا چاہئے ۴۹
کیفیات ہرگز مقصود نہیں ۵۰
عبادت کے قبول ہونے کی ایک علامت ۵۰
مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کردہ ایک واقعہ ۵۰
ڈاکٹر عبد الحیؒ رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ ایک مثال ۵۱
تواضع حاصل کرنے کا طریقہ ۵۱
کثرت سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے ۵۲
شکر تواضع کا زینہ ہے ۵۲
خلاصۂ کلام ۵۳

توبہ: گناہوں کا تریاق ۵۴

حضور ﷺ بھی استغفار فرماتے ہیں ۵۴
گناہوں کے وساوس سب کو آتے ہیں ۵۵
ایک غلط خیال کا ازالہ ۵۵
جوانی میں توبہ کیجئے ۵۶
بزرگوں کی صحبت کا اثر ۵۶
ہر وقت نفس کی نگرانی ضروری ہے ۵۷
ایک لکڑ ہارے کا قصہ ۵۸
نفس بھی ایک اژدہا ہے ۵۸
گناہوں کا تریاق ''استغفار'' اور توبہ ۵۸
قدرت کا عجیب کرشمہ ۵۹
خلیفۃ الارض کو تریاق دے کر بھیجا ۶۰
''توبہ'' تین چیزوں کا مجموعہ ۶۱
''کراماً کاتبین'' میں ایک امیر اور ایک مامور ۶۱
صد بار گر توبہ شکستی..... ۶۲
رات کو سونے سے پہلے توبہ کر لیا کرو ۶۲
گناہ کا اندیشہ عزم کے منافی نہیں ۶۳
مایوسی بھی ایک رکاوٹ ہے ۶۳
شیطان مایوسی پیدا کرتا ہے ۶۴
ایسی تیسی میرے گناہوں کی ۶۴
استغفار کا درست مطلب ۶۵
کیا ایسا شخص مایوس ہو جائے؟ ۶۵
حرام روزگار والا شخص کیا کرے؟ ۶۵
ایسا شخص توبہ نہیں، استغفار کرے ۶۶
استغفار کے بہترین الفاظ ۶۷

''سید الاستغفار'' کو معمول بنائیے	۶۷
توبہ اللہ کو محبوب ہے	۶۹
انسان کے اندر گناہ کی صلاحیت پیدا کی	۶۹
یہ فرشتوں کا کمال نہیں	۷۰
جنت کی لذتیں صرف انسان کے لئے ہیں	۷۰
کفر بھی حکمت سے خالی نہیں	۷۱
دنیا کی شہوتیں اور گناہ ایندھن ہیں	۷۱
ایمان کی حلاوت	۷۱
گناہ پیدا کرنے کی حکمت	۷۲
توبہ کے ذریعہ درجات کی بلندی	۷۲
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۷۳
ورنہ دوسری مخلوق پیدا کردیں گے	۷۳
گناہ سے بچنا فرضِ عین ہے	۷۴
بیماری کے ذریعہ درجات کی بلندی	۷۴
توبہ اور استغفار کی تین قسمیں	۷۵
تکمیل توبہ	۷۵
توبہ اجمالی	۷۵
توبہ تفصیلی	۷۶
نماز کا حساب لگائے	۷۶
ایک وصیت نامہ لکھ لے	۷۷
''قضاء عمری'' کی ادائیگی	۷۸
سنتوں کے بجائے قضاء نماز پڑھنا درست نہیں	۷۸
قضاء روزوں کا حساب اور وصیت	۷۸
واجب زکوٰۃ کا حساب اور وصیت	۷۸
حقوق العباد ادا کرے یا معاف کرائے	۷۹
فکرِ آخرت والوں کا حال	۸۰
حقوق العباد باقی رہ جائیں تو؟	۸۰
اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا عجیب واقعہ	۸۱
پچھلے گناہ بھلا دو	۸۲
یاد آنے پر استغفار کرلو	۸۲
حال کو درست کرلو	۸۳
خیر القرون	۸۳
حضرات تابعین کی احتیاط اور ڈر	۸۴
حدیث بیان کرنے میں احتیاط کرنی چاہئے	۸۵
ابلیس کی بات درست تھی، لیکن	۸۵
میں آدم سے افضل ہوں	۸۶
اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگ لی	۸۶
شیطان بڑا عارف تھا	۸۶
میں موت تک اس کو بہکاتا رہوں گا	۸۷
میں موت تک توبہ قبول کرتا رہوں گا	۸۷
شیطان ایک آزمائش ہے	۸۸
بہترین گناہ گار بن جاؤ	۸۸
اللہ کی رحمت کے سو حصے ہیں	۸۹
اس ذات سے مایوسی کیسی؟	۹۰
صرف تمنا کرنا کافی نہیں	۹۰
ایک شخص کا عجیب واقعہ	۹۰
توبہ، اصلاحِ نفس کی پہلی سیڑھی	۹۳
روزے کا مقصد تقویٰ کا حصول	۹۳
اصلاحِ نفس کی پہلی سیڑھی ''توبہ''	۹۴
توبہ اجمالی	۹۴
توبہ تفصیلی	۹۴

تلافی ممکن ہو تو تلافی کرنی ہوگی	۹۵
قضاءِ عمری کا حکم	۹۵
توبہ کو اسلام لانے پر قیاس کرنا	۹۵
توبہ سے نمازیں معاف نہیں ہوں گی	۹۶
شراب سے توبہ	۹۶
چوری سے توبہ	۹۶
زکوٰۃ نہ دینے سے توبہ	۹۷
نمازیں ادا کرے اور وصیت بھی کرے	۹۷
بلا وصیت فدیہ ادا کرنا واجب نہیں	۹۷
زکوٰۃ روزے ادا کرے اور وصیت کرے	۹۷
گناہ نہ کرنے کا عزم دھرارہ جاتا ہے	۹۸
توبہ کی پہلی شرط گناہ پر ندامت	۹۸
توبہ کی دوسری شرط: گناہ کا ترک	۹۹
توبہ کی تیسری شرط: گناہ نہ کرنے کا عزم	۹۹
عزم نہ ہونے کا شبہ	۹۹
دھڑکا لگارہنا توبہ کے منافی نہیں	۹۹
دھڑکے کی ایک مثال	۱۰۰
آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم توبہ کے لئے کافی ہے	۱۰۰
توبہ کے نتیجے میں گناہ نامۂ اعمال سے مٹادیے جاتے ہیں	۱۰۰
''ستار'' ستاری کا معاملہ فرمائیں گے	۱۰۱
اللہ سے ہی توبہ پر استقامت طلب کرو	۱۰۱
اے اللہ! ہمارے اعضاء آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں	۱۰۲
اے اللہ! وہ چیز عطا فرما جو آپ کو راضی کردے	۱۰۲
پختہ کار بننے کے لئے لمبا سفر درکار ہے	۱۰۲
مرتے دم تک فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا	۱۰۳
آخر کار عنایت ہو ہی جاتی ہے	۱۰۳
جب توبہ ٹوٹے دوبارہ عزم کرلو	۱۰۴
انسان کے ارادے میں بڑی قوت ہے	۱۰۴
اگر ہتھیار ڈال دیئے تو مارا گیا	۱۰۴
پھر ہمیشہ نفس گرتا رہے گا	۱۰۵
مرتے دم تک نفس سے ہوشیار رہنا ہے	۱۰۵
جامِ مے توبہ شکن، توبہ میری جام شکن	۱۰۵
توبہ تازہ کرتے رہیں	۱۰۶
اللہ تعالیٰ سے باتیں کیا کرو	۱۰۷
حضرت یونس علیہ السلام سے سبق لو	۱۰۷
کیا ہر مؤمن پہلے مچھلی کے پیٹ میں جائے گا؟	۱۰۷
اس ذات کو پکارو	۱۰۸
حضور ﷺ سو مرتبہ استغفار فرماتے	۱۰۸
پچھلے درجات سے استغفار ہوتا تھا	۱۰۸
شیطان کا مکر کمزور ہے	۱۰۹
توبہ کے معنی ہیں لوٹ آنا	۱۰۹
گناہ چھوڑنے کا عزم کیجئے	۱۱۰
تکمیل توبہ کی تین شرطیں	۱۱۰
تیسری چیز کے پائے جانے میں شک	۱۱۰
رات کو سونے سے پہلے توبہ کرلیا کرو	۱۱۱
اللہ والے لوگوں کو قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں	۱۱۱
اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑ دیا	۱۱۲

اس آیت کا دوسرا ترجمہ	۱۱۲
اللہ تعالیٰ ضرور کھینچ لیں گے	۱۱۲
میرے دل میں عزم کے بارے میں اشکال	۱۱۳
آئندہ گناہ ہوجانے کا اندیشہ عزم کے منافی نہیں	۱۱۳
پھر اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کرو	۱۱۴
عزمِ عمل سے ذہن خالی ہونا چاہئے	۱۱۴
توبہ ''ندامت'' ہی کا نام ہے	۱۱۵
توبہ کے بعد یہ دعا کرلو	۱۱۵
توبہ کے بھروسہ پر گناہ مت کرو	۱۱۵
بچھو کے کاٹے کا عمل	۱۱۶
بچھو کے کاٹنے کا ایک واقعہ	۱۱۶
سارا عمل بیکار ہوگیا	۱۱۶
کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کارگر نہیں	۱۱۷
دوا اللہ تعالیٰ سے سوال کرتی ہے	۱۱۷
دوا کے بھروسہ پر بیماری کو دعوت مت دو	۱۱۷
توبہ کی مہلت ملے گی یا نہیں؟	۱۱۸
گناہ کے نتیجے میں ذوق خراب ہوجاتا ہے	۱۱۸
گناہ کا حجاب ختم ہوجاتا ہے	۱۱۸
موت سے پہلے توبہ کا دروازہ کھلا ہے	۱۱۹
توبہ ٹوٹ جائے تو دوبارہ توبہ کرلو	۱۲۰
استغفار کیلئے وقت مقرر کرلیں	۱۲۱
استغفار کے وقت ذہن میں گناہوں کا استحضار	۱۲۱
حضور ﷺ کی ایک خوبصورت دعا	۱۲۲
پہلے استغفار پھر دوسرے اذکار	۱۲۲
پہلے دوسرے اذکار پھر آخر میں استغفار	۱۲۳
ماتحتوں پر زیادتی کی صورت میں معافی کی تفصیل	۱۲۳
شاگردوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا	۱۲۳
شاگردوں سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں	۱۲۴
زیرِ تربیت افراد میں یہ اصول کیوں؟	۱۲۴
زجر میں اعتدال پر قائم رہیں	۱۲۵
حضرت صدیق اکبر ؓ کا واقعہ	۱۲۵
حضرت ابوذر غفاری ؓ کا واقعہ	۱۲۵
حضرت تھانوی ؒ کا واقعہ	۱۲۶
یک طرفہ بات سن کر ڈانٹنا	۱۲۶
حضرت فاروق اعظم ؓ کا واقعہ	۱۲۷
یہ چیز صحبت سے حاصل ہوتی ہے	۱۲۸
اخوت، ایک اسلامی رشتہ	۱۲۹
ایک جامع حدیث	۱۳۰
مسلمان مسلمان کا بھائی ہے	۱۳۰
فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے	۱۳۱
اسلام اور کفر کا فرق	۱۳۲
جنت میں حضرت بلال ؓ کا مقام	۱۳۲
حضرت بلال ؓ حضور ﷺ سے آگے کیوں؟	۱۳۳
اسلام کے رشتے نے سب کو جوڑ دیا	۱۳۳
آج ہم یہ اصول بھول گئے	۱۳۴

مسلمان دوسرے مسلمان کا مددگار ہوتا ہے	۱۳۵
موجودہ دور کا ایک عبرت آموز واقعہ	۱۳۵
حضور ﷺ کا معمول	۱۳۶
احسان کا بدلہ احسان	۱۳۷
نیکی کا بدلہ	۱۳۷
"نیوتہ" دینا جائز نہیں	۱۳۸
محبت کی خاطر بدلہ اور ہدیہ دو	۱۳۹
بدلہ دینے میں برابری کا لحاظ مت کرو	۱۳۹
تعریف کرنا بھی بدلہ ہے	۱۴۰
حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انداز	۱۴۰
چھپا کر ہدیہ دینا	۱۴۰
پریشانی میں درود شریف کی کثرت کیوں؟	۱۴۱
خلاصہ	۱۴۱
ایثار وقربانی کی فضیلت	۱۴۲
انصار کی ایثار وقربانی	۱۴۲
انصار اور مہاجرین میں مزارعت	۱۴۳
صحابہ رضی اللہ عنہم کے جذبات دیکھئے	۱۴۳
تمہیں بھی یہ ثواب مل سکتا ہے	۱۴۴
یہ دنیا چند روزہ ہے	۱۴۴
آخرت پیش نظر ہو تو	۱۴۴
"سکون" ایثار اور قربانی میں ہے	۱۴۵
ایک انصاری کے ایثار کا واقعہ	۱۴۵
افضل عمل کونسا؟	۱۴۶
دوسروں کی مدد کردو	۱۴۷
اگر مدد کرنے کی طاقت نہ ہو؟	۱۴۷
لوگوں کو اپنے شر سے بچالو	۱۴۷
حقیقی مسلمان کون ہے؟	۱۴۸
آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو	۱۴۸
حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا سبق آموز واقعہ	۱۴۹
تین قسم کے جانور	۱۵۰
امانت کی اہمیت	۱۵۱
امانت اور عہد کا پاس رکھنا	۱۵۲
امانت قرآن وحدیث میں	۱۵۲
امانت اُٹھ چکی ہے	۱۵۳
حضور ﷺ کا امین ہونا	۱۵۳
غزوۂ خیبر کا ایک واقعہ	۱۵۳
اسود چرواہا	۱۵۴
حضور ﷺ سے مکالمہ	۱۵۴
اور اسود مسلمان ہوگیا	۱۵۵
پہلے بکریاں مالکوں تک پہنچاؤ	۱۵۵
سخت حالات میں امانت کی پاسداری	۱۵۵
تلوار کے سائے میں عبادت	۱۵۶
جنت الفردوس میں پہنچ گیا	۱۵۶
امانت کی اہمیت کا اندازہ لگائیں	۱۵۷
امانت کا وسیع مفہوم	۱۵۸
ہمارے ذہنوں میں امانت کا مفہوم	۱۵۹

یہ زندگی اور جسم امانت ہیں	۱۵۹
خودکشی کیوں حرام ہے	۱۵۹
اجازت کے باوجود قتل کی اجازت نہیں	۱۶۰
اوقات امانت ہیں	۱۶۰
قرآن کریم میں امانت	۱۶۰
آسمان، زمین اور پہاڑ ڈر گئے	۱۶۱
انسان نے امانت قبول کرلی	۱۶۱
ملازمت کے فرائض امانت ہیں	۱۶۲
وہ تنخواہ حرام ہوگئی	۱۶۲
ملازمت کے اوقات امانت ہیں	۱۶۳
پسینہ نکلا یا نہیں؟	۱۶۳
خانقاہ تھانہ بھون کا اصول	۱۶۳
تنخواہ کاٹنے کی درخواست	۱۶۴
اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دو	۱۶۴
حلال اور حرام میں فرق	۱۶۵
عاریت کی چیز امانت ہے	۱۶۵
حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ؒ اور امانت کی فکر	۱۶۶
موت کا دھیان ہر وقت	۱۶۶
دوسرے کی چیز کا استعمال	۱۶۷
دفتری اشیاء کا استعمال	۱۶۷
دواؤں کا غلط استعمال	۱۶۷
حرام آمدنی کا ذریعہ	۱۶۸
باطل مٹنے کے لئے آیا ہے	۱۶۸
حق صفات نے ابھار دیا ہے	۱۶۹
مجلس کی باتیں امانت ہیں	۱۶۹
راز کی بات امانت ہے	۱۷۰

اعضاء امانت ہیں	۱۷۰
آنکھ کی خیانت	۱۷۰
کان اور ہاتھ کی خیانت	۱۷۱
چراغ سے چراغ جلتا ہے	۱۷۱
عہد اور وعدہ کی اہمیت	۱۷۲
قرآن وحدیث میں عہد	۱۷۲
وعدہ کرنے سے پہلے سوچ لو	۱۷۳
عذر کی صورت میں اطلاع دے	۱۷۴
ایک صحابی ؓ کا واقعہ	۱۷۴
بچے سے وعدہ کرکے پورا کریں	۱۷۵
بچے کے اخلاق بگاڑنے میں آپ مجرم ہیں	۱۷۵
بچوں کے ذریعے جھوٹ بلوانا	۱۷۵
حضور ﷺ کا تین دن انتظار کرنا	۱۷۶
حضرت حذیفہ ؓ کا ابوجہل سے وعدہ	۱۷۶
حق اور باطل کا پہلا معرکہ ''غزوۂ بدر''	۱۷۷
گردن پر تلوار رکھ کر لیا جانے والا وعدہ	۱۷۷
تم وعدہ کرکے زبان دے کر آئے ہو	۱۷۸
جہاد کا مقصد حق کی سربلندی	۱۷۸
یہ ہے وعدہ کا ایفاء	۱۷۹
حضرت معاویہ ؓ اور ایفائے عہد	۱۷۹
فتح حاصل کرنے کے لئے جنگی تدبیر	۱۷۹
یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے	۱۸۰
سارا مفتوحہ علاقہ واپس کردیا	۱۸۱
حضرت فاروق اعظم ؓ اور معاہدہ	۱۸۱

عہد اور وعدہ کا وسیع مفہوم	۱۸۳
ملکی قانون کی پابندی لازم ہے	۱۸۳
خلاف شریعت قانون کی مخالفت کریں	۱۸۴
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قانون	۱۸۴
ویزا ایک معاہدہ ہے	۱۸۵
اس وقت قانون توڑنے کا جواز تھا	۱۸۵
اب قانون توڑنا جائز نہیں	۱۸۶
ٹریفک کے قانون کی پابندی	۱۸۶
ویزے کی مدت سے زیادہ قیام کرنا	۱۸۶
ظالم حکومت کے قوانین کی پابندی بھی لازم ہے	۱۸۷
خیانت کرنے والے سے خیانت مت کرو	۱۸۷
صلح حدیبیہ	۱۸۸
حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کی التجاء	۱۸۸
ابوجندل کو واپس کرنا ہوگا	۱۸۹
میں معاہدہ کر چکا ہوں	۱۸۹
عہد کی پابندی کی مثال	۱۸۹
جیسے اعمال ویسے حکمران	۱۹۰
مصیبت پر صبر کریں	۱۹۱
۱۔ صبر علی الطاعة	۱۹۱
۲۔ صبر عن المعصية	۱۹۱
۳۔ صبر علی المصيبة	۱۹۱
صبر پر اجر	۱۹۲
بے صبری ذریعۂ جہنم ہے	۱۹۲
رونے کا نام بے صبری نہیں ہے	۱۹۳
صبر کرنے کا طریقہ	۱۹۳
حضور ﷺ کا عمل	۱۹۴
بے اختیار رونا گناہ نہیں	۱۹۴
صابرین کے لئے خوشخبری	۱۹۵
حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نکتہ	۱۹۶
کس کا مقام اُونچا ہے	۱۹۶
غلبۂ حال کی مثال	۱۹۶
اللہ کے سامنے بہادری مت دکھاؤ	۱۹۷
ایک سبق آموز قصہ	۱۹۷
روئیں بھی اور بے صبری نہ ہو!	۱۹۸
رحمتِ الٰہی کی مختلف شکلیں	۱۹۹
بیماری بھی نعمت ہے	۱۹۹
تین قسم کے حالات	۲۰۰
نفس ایک کاغذ کی مانند ہے	۲۰۱
مصائب پر صبر کریں	۲۰۱
صبر ایوب علیہ السلام	۲۰۲
مصائب میں دعا نہ چھوڑیں	۲۰۳
صبر کا خلاصہ	۲۰۳
صابر نام نہ رکھیں	۲۰۴
نام کے اثرات	۲۰۴
صدقہ وخیرات	۲۰۵
بعض پیر ایسے بھی ہوتے ہیں	۲۰۵
سوال کرنا کس کے لئے جائز ہے؟	۲۰۶
گداگری سے متعلق ایک اہم مسئلہ	۲۰۶
صدقہ کرنے کے بارے میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل	۲۰۶

اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا بہترین صدقہ ہے	۲۰۷
صدقہ کرنے میں اعتدال کی تعلیم	۲۰۸
صدقہ کرنے کے بارے میں ایک سوال اور اس کا جواب	۲۰۸
صوفیاء کرام کے احوال کا جائزہ	۲۱۰
حدیث کا آخری جملہ	۲۱۰
ایک عجیب وغریب واقعہ	۲۱۱
اگر یہ سوال ہو جائے	۲۱۲
آیت کریمہ کی فضیلت	۲۱۳
استغفار کی توفیق بھی بہت بڑی چیز ہے	۲۱۴
فضیلتِ صدقہ سے متعلق آیات	۲۱۵
حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی سخاوت	۲۱۵
دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جذبہ	۲۱۶
زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حقوق ہیں	۲۱۶
صدقہ کرنے میں بزرگوں کا معمول	۲۱۷
حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ والی حدیث	۲۱۸
خوف اور اُمید	۲۱۹
ایمان ''خوف'' اور ''رجا'' کے درمیان ہے	۲۱۹
خوف اور رجا دونوں کا ہونا ضروری ہے	۲۲۰
رحمت کی اُمید اور جہنم کا خوف	۲۲۰
کتنا خوف ہونا چاہئے؟	۲۲۰
''خوف'' اور ''تقویٰ'' میں فرق	۲۲۱
ناسخ اور منسوخ	۲۲۲
پہلی آیت دوسری آیت کی تفسیر ہے	۲۲۳
''احیاء العلوم'' کا باب الخوف	۲۲۳
''اُمید'' میں حدِ اعتدال مطلوب ہے	۲۲۳
دونوں کی حدِ اعتدال کس طرح معلوم ہو؟	۲۲۴
مایوس اور نا اُمید ہونا جائز نہیں	۲۲۵
جس کا اللہ ہو اس کو پریشانی کیسی؟	۲۲۵
نا اُمیدی کے غلبہ کا نتیجہ	۲۲۶
نا اُمیدی کس طرح پیدا ہوتی ہے؟	۲۲۶
نماز کے بعد استغفار کرلو	۲۲۷
توکل کی حقیقت	۲۲۸
اللہ تعالیٰ لاج رکھتے ہیں	۲۲۸
آخرت کے حالات مزید معلوم نہیں ہو سکتے	۲۳۰
یہاں کے حالات دیکھنے کے ہیں، بتانے کے نہیں	۲۳۰
عالمِ برزخ میں توکل کی اہمیت	۲۳۰
توکل کا معنی	۲۳۱
توکل کا صحیح مفہوم	۲۳۱
دوا بھی تاثیر کی اجازت طلب کرتی ہے	۲۳۲
توکل اس چیز کا نام نہیں	۲۳۲
ہماری مثال	۲۳۳
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کردہ ایک دلچسپ لطیفہ	۲۳۴
بعض بزرگوں کا طریقہ توکل	۲۳۴
اسباب کی تین قسمیں	۲۳۵
ایسے اسباب ترک کرنا حرام	۲۳۵
ایسے اسباب کو ترک کرنا ناجائز	۲۳۶
توکل پر ایک واقعہ	۲۳۶

ایسے اسباب توکل کے منافی ہیں	۲۳۷
خلاصۂ کلام	۲۳۷
رجوع الی اللہ کی عادت اپناؤ	۲۳۸
توکل ایسے اختیار کرتے ہیں	۲۳۹
اللہ کے لئے جینا مرنا	۲۴۰
اخلاص کی برکت	۲۴۰
اخلاص کی اہمیت پر ایک واقعہ	۲۴۱
زندگی کا ہر کام اللہ کے لئے ہو	۲۴۱
نفس کا حق	۲۴۲
یہ جان اللہ کی امانت ہے	۲۴۲
بسم اللہ پڑھنے کی وجہ	۲۴۳
موت اللہ کے لئے کیسے ہو؟	۲۴۴
مؤمن کا کسی حال میں گھاٹا نہیں	۲۴۵
سنت پر عمل کرنے والا قریب ہے	۲۴۵
ایک عجیب واقعہ	۲۴۶
محبت کا اصل تقاضا یہ ہے	۲۴۶
اللہ تعالیٰ کبھی اس طرح بھی نواز دیتے ہیں	۲۴۷
نیکی کی حسرت پر لوہار کا درجہ بڑھ گیا	۲۴۷
ایک بزرگ اور ایک عورت کی خواہش	۲۴۸
روزانہ کا معمول	۲۴۹
اللہ کا شکر ادا کیجئے	۲۵۱
رحمٰن اور رحیم، دو صفات	۲۵۱
مشرکین بھی اپنے کام کی ابتداء اللہ کے نام سے کرتے تھے	۲۵۲
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حضور ﷺ کا خاص امتیاز	۲۵۲
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	۲۵۲
ہر چیز کی تعریف درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے	۲۵۳
سائنسدانوں کی ترقی کی تعریف درحقیقت اللہ کی تعریف ہے	۲۵۴
انسان کا دماغ ایک نعمت ہے	۲۵۴
اللہ نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کے لئے مسخر کر دیا	۲۵۵
"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" ایک دعویٰ	۲۵۶
"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" سے قرآن کا آغاز	۲۵۶
شکر اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے کی کنجی	۲۵۶
اللہ تعالیٰ کی محبت سے تمام مشکلات آسان ہو جائیں گی	۲۵۷
محبت کی ایک عجیب مثال	۲۵۷
احکامات پر عمل کرنے کا آسان ترین نسخہ اللہ کی محبت ہے	۲۵۸
محبت حاصل کرنے کا طریقہ شکر ہے	۲۵۸
انسان مشکل میں اللہ کو پکارتا ہے	۲۵۹
مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکیمانہ بات	۲۶۰
حضرت مولانا اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شکر کا ایک عجیب واقعہ	۲۶۰
نعمت کا استحضار پہلے اور تکلیف بعد میں	۲۶۱
اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں	۲۶۱

تکالیف کا تناسب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں ہمیشہ کم ہوتا ہے ۲۶۲
انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہے ۲۶۲
تکبر کی جڑ کاٹنے والی چیز شکر ہے ۲۶۳
شکر کا مطلب ۲۶۳
شکر کو ختم کرنے کے لئے شیطان کا حربہ ۲۶۴
مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد، واقعات کو سیدھا پڑھنا چاہئے ۲۶۴
حضرت یوسف علیہ السلام کا شکر ۲۶۵
''الحمد للہ'' ہمیں کیا سبق دے رہا ہے ۲۶۶
شکر ادا کرنے کا طریقہ ۲۶۶
مغربی تہذیب کے نتیجہ میں ہماری حالت ۲۶۶
ایک بزرگ کا معمول ۲۶۷

''قناعت'' اختیار کرو ۲۶۸

قسمت کے لکھے ہوئے پر راضی ہو جاؤ ۲۶۹
غنی کون؟ ۲۶۹
غنی کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ۲۷۰
ہر خواہش پوری نہیں ہو سکتی ۲۷۰
اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ ۲۷۱
جائز اور حلال طریقے سے اعتدال سے کماؤ ۲۷۱
پیسوں کو خادم بناؤ، مخدوم نہ بناؤ ۲۷۲
سبق آموز واقعہ ۲۷۲
انسان کا پیٹ قبر کی مٹی بھر سکتی ہے ۲۷۳
حرص و ہوس چھوڑ دو ۲۷۳
اپنے سے اُونچے آدمی کو مت دیکھو ۲۷۴
حضرت عون بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ۲۷۴
دنیا کا مہنگا ترین بازار ۲۷۵
شہزادہ چارلس اور دِلی خواہش ۲۷۵
کس طرف دیکھو گے؟ ۲۷۶
حرص و ہوس انسان کو جلاتی رہتی ہے ۲۷۶
ایک خوبصورت دعا ۲۷۷
دولت نے بیٹے کو باپ سے دور کر دیا ۲۷۷
اولاد کا قرب بڑی نعمت ہے ۲۷۷
اس مقدار پر راضی ہو جاؤ ۲۷۸
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے ۲۷۸
تجارت کو ترقی دینا قناعت کے خلاف نہیں ۲۷۹

چار عظیم صفات ۲۸۰

پہلی صفت: امانت کی حفاظت ۲۸۰
نبوت سے پہلے آپ ﷺ کے مشہور اوصاف ۲۸۱
امانت کا وسیع مفہوم ۲۸۱
دوسری صفت: بات کی سچائی ۲۸۲
بات کیا سے کیا بن جاتی ہے ۲۸۲
میری طرف منسوب ایک خواب ۲۸۳
نقل کرنے میں احتیاط کریں ۲۸۳
ایک محدث کی احتیاط ۲۸۳
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور احتیاط ۲۸۴
غفلت اور لاپرواہی بڑی بلا ہے ۲۸۴
اگر آپ کی گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہو تو ۲۸۵

ہر لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے	۲۸۵
تیسری صفت: خوش اخلاقی	۲۸۶
خوش اخلاقی کیا چیز ہے	۲۸۶
مغربی ممالک اور خوش اخلاقی	۲۸۶
تجارتی خوش اخلاقی	۲۸۷
خوش اخلاقی کیسے پیدا ہوگی؟	۲۸۷
تواضع پیدا کریں	۲۸۸
تواضع سے بلندی عطا ہوتی ہے	۲۸۸
اپنی حقیقت پر غور کریں	۲۸۹
''بیت الخلاء'' دکانِ معرفت	۲۸۹
اپنے آپ کو خادم سمجھو	۲۹۰
منصب کے تقاضے پر عمل کرنا دوسری بات ہے	۲۹۰
خوبصورت مثال	۲۹۰
استاذ، شیخ اور باپ کا ڈانٹنا	۲۹۱
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل	۲۹۱
تواضع بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے	۲۹۱
جنت مسکینوں کا گھر ہے	۲۹۲
چوتھی صفت: لقمہ کا پاک ہونا	۲۹۲
حرام کی ظلمت اور نحوست	۲۹۳
حلال کھانے کی نورانیت	۲۹۳

❀❀❀

اچھے اخلاق اور ان کا مفہوم ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ﴾(۱)

آمَنْتُ بِاللّٰهِ صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! سورۃ المومنون کی ان ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان مؤمنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فلاح یافتہ ہیں، ان صفات میں سے جس صفت کا بیان چل رہا ہے وہ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ﴾

جیسے پہلے عرض کیا تھا کہ اس آیت کی دو تفسیریں ہیں، پہلی تفسیر کے مطابق اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں اور دوسری تفسیر کے مطابق اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ مؤمن فلاح یافتہ ہیں جو اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں، اپنے آپ کو پاک صاف

☆ اصلاحی خطبات (۸۲/۱۵ تا ۹۸)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) المؤمنون: ۱۔۶، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے۔ جو اپنی نمازوں میں دل سے جھکنے والے ہیں، اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابل ملامت نہیں ہیں''

کرنے والے ہیں، اپنے اخلاق کو گندگیوں اور ناپاکیوں سے محفوظ رکھنے والے ہیں اور اچھے اخلاق کو اختیار کرنے والے ہیں۔

''دِل'' کی کیفیات کا نام ''اخلاق'' ہے

اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ آج کل عرفِ عام میں ''اخلاق'' کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی دوسرے سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے، مسکرا کر اس سے مل لے اور نرمی سے بات کر لے، ہمدردی کے الفاظ اس سے کہے، بس اسی کو ''اخلاق'' سمجھا جاتا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ شریعت کی نظر میں ''اخلاق'' کا مفہوم بہت وسیع اور عام ہے، اس مفہوم میں بیشک یہ باتیں بھی داخل ہیں کہ جب انسان دوسرے سے ملے تو خندہ پیشانی سے ملے، اظہارِ محبت کرے اور اس کے چہرے پر ملاقات کے وقت بشاشت ہو، نرمی کے ساتھ گفتگو کرے، لیکن ''اخلاق'' صرف اس طرزِ عمل میں منحصر نہیں بلکہ ''اخلاق'' درحقیقت دل کی کیفیات کا نام ہے، دل میں جو جذبات اُٹھتے ہیں اور جو خواہشات دل میں پیدا ہوتی ہیں، ان کا نام ''اخلاق'' ہے۔ پھر اچھے اخلاق کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے جذبات میں اچھی اور خوشگوار باتیں پیدا ہوتی ہوں اور برے اخلاق کے معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں خراب جذبات اور غلط خواہشات پیدا ہوتی ہوں۔ لہٰذا شریعت کا ایک بہت اہم حصہ یہ ہے کہ انسان اپنے اخلاق کی اصلاح کرے اور دل میں پرورش پانے والے جذبات کو اعتدال پر لائے۔

فطری جذبات کو اعتدال پر رکھیں

اس کی تھوڑی سی تشریح یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں کچھ فطری جذبے رکھے ہیں، وہ اس کی فطرت کا حصہ ہیں، کوئی انسان ان سے خالی نہیں، مثلاً ''غصہ'' ہے جو ہر انسان کے اندر ہوتا ہے، کسی میں کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ، لیکن ہوتا ضرور ہے، یا مثلاً شہوت اور جنسی خواہش ہے جو ہر انسان کے اندر ہوتی ہے، کسی میں کم کسی میں زیادہ، یا مثلاً اپنی عزتِ نفس کا خیال کہ میں ذلیل نہ ہو جاؤں، بلکہ مجھے عزت حاصل ہو جائے، یہ جذبہ ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے، یہ سب فطری جذبات ہیں جو انسان کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں، لیکن ان جذبات کو اعتدال پر رکھنا ضروری ہے اور ان کو اعتدال پر رکھنے کا نام ہی ''حسنِ اخلاق'' ہے۔ اگر یہ اعتدال کے اندر ہیں تو بڑی اچھی بات ہے اور آدمی کے اخلاق پاکیزہ ہیں اور درست ہیں اور قابلِ تعریف ہیں، لیکن اگر اخلاق اعتدال سے گھٹے ہوئے ہیں یا اعتدال سے بڑھے ہوئے ہیں تو دونوں صورتوں میں انسان کے اخلاق خراب ہیں اور ان کے اصلاح کی ضرورت ہے۔

''غصہ'' فطری جذبہ ہے

مثلاً ''غصہ'' ایک فطری جذبہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں پیدا فرمایا ہے، یہ غصہ ضروری بھی ہے، کیونکہ اگر انسان کے اندر ''غصہ'' بالکل نہ ہو تو انسان اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں ہوسکتا، مثلاً ایک شخص پر دوسرا شخص حملہ آور ہے اور اس کے اُوپر ناجائز حملہ کر رہا ہے مگر وہ شخص خاموش بیٹھا ہے، اس کو غصہ ہی نہیں آتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ''غصہ'' اعتدال پر نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اس کے باپ پر یا اس کے بھائی پر یا اس کی بیوی پر حملہ کر رہا ہے اور یہ شخص خاموش بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے اور اس کو غصہ ہی نہیں آرہا ہے تو یہ بے غیرتی ہے، بے حمیتی ہے، اور شریعت میں اس بے غیرتی اور بے حمیتی کا کوئی جواز نہیں۔

یہ بے غیرتی کی بات ہے

آج عراق میں ہمارے بھائیوں پر وحشت اور بربریت والا حملہ ہو رہا ہے اور کتنے مسلمان ایسے ہیں جو نہ صرف یہ کہ خاموش ہیں اور ان کو غصہ نہیں آرہا ہے، بلکہ ان کے ساتھ تعاون بھی کر رہے ہیں، ان کو اپنی فضائی حدود اور زمینی حدود فراہم کر رہے ہیں اور غیر مسلموں کے ہیڈ کوارٹر ان کے ملک میں قائم ہیں، یہ بے غیرتی اور بے حمیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غصے کا جو جذبہ اللہ تعالیٰ نے رکھا تھا، وہ صحیح جگہ پر استعمال نہیں ہو رہا ہے، کیونکہ یہ غصہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے رکھا ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اپنا دفاع کرے، اپنے عزیز و اقارب اور گھر والوں کا دفاع کرے، اپنے دین کا دفاع کرے، اپنے ہم مذہب لوگوں کا دفاع کرے اور پوری انسانیت پر ہونے والے ظلم کا دفاع کرے، اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ غصہ رکھا ہے۔

غصہ کو صحیح جگہ پر استعمال کریں

چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾ (۱)

یعنی جو کفار تمہارے قریب ہیں، ان سے لڑائی کرو اور ان کفار کو یہ محسوس ہونا چاہئے کہ ان کے خلاف تمہارے دلوں میں غصہ ہے اور سختی ہے۔ لہٰذا اگر یہ غصہ صحیح جگہ پر ہے تو یہ غصہ قابلِ تعریف

---

(۱) التوبۃ: ۱۲۳، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''ان کافروں سے لڑو جو تم سے قریب ہیں اور ہونا یہ چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں''

ہے اور اچھے اخلاق کی نشانی ہے، مثلاً اگر گھر پر ڈاکو حملہ آور ہو گئے اور میرے پاس اتنی طاقت بھی ہے کہ میں ان پر حملہ کر سکوں لیکن میں خاموش بیٹھا ہوں اور ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا اور مجھے غصہ ہی نہیں آتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بے غیرت ہوں، شریعت کو یہ مطلوب نہیں، لہٰذا اگر انسان غصہ کو صحیح حدود میں استعمال کرے اور صحیح جگہ پر استعمال کرے تو یہ غصہ اچھے اخلاق کی نشانی ہے۔

''غصہ'' حد کے اندر رہنا چاہئے

میں نے دو لفظ استعمال کیے، ایک یہ کہ غصہ کو صحیح جگہ پر استعمال کرے اور غلط جگہ پر استعمال نہ کرے، یعنی جہاں غصہ کرنا چاہئے وہیں پر غصہ کرے۔ دوسرے یہ کہ غصہ کو حدود میں استعمال کرے، یعنی جتنا غصہ کرنا چاہئے اتنا ہی کرے، اس سے زیادہ نہ کرے، مثلاً آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی اولاد غلط راستے پر جا رہی ہے، گناہوں کا ارتکاب کر رہی ہے، اس کے اعمال خراب ہو رہے ہیں، آپ نے اس کو دو تین بار سمجھایا اور نصیحت کی، اس نے آپ کی نصیحت نہیں مانی تو اس موقع پر غصہ کا آنا صحیح محل صحیح جگہ پر ہے، غلط جگہ پر نہیں ہے، کیونکہ واقعۃً وہ غصہ کی بات تھی، لیکن جب اپنی اولاد پر غصہ کا اظہار کرنے پر آئے تو غصہ کا اتنا اظہار کیا کہ بچے کی چمڑی اُدھیڑ دی، اس صورت میں غصے کا محل تو صحیح تھا لیکن وہ غصہ حد کے اندر نہیں تھا بلکہ حد سے تجاوز کر کے آگے بڑھ گیا اور اعتدال سے نکل گیا تو یہ غصہ قابلِ تعریف نہیں، یہ اچھے اخلاق میں داخل نہیں۔

''غصہ'' کی حدود

لہٰذا غصہ کے اندر دو باتیں ہونی چاہئیں، ایک یہ کہ غصہ صحیح جگہ پر آئے اور غلط جگہ پر نہ آئے اور دوسرے یہ کہ جب غصہ کا اظہار ہو تو وہ غصہ حد کے اندر ہو، نہ حد سے کم ہو اور نہ حد سے بڑھا ہوا ہو۔ اس غصے کی حدود بھی شریعت نے متعین کر دی ہیں، ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز کی تعلیم دو تاکہ بچپن سے اس کو نماز کی عادت پڑ جائے، سات سال کی عمر میں مارنے کا حکم نہیں ہے، اور جب بچہ دس سال کا ہو جائے اور اس وقت تک اس کو نماز پڑھنے کی عادت نہ پڑی ہو تو اب اس کو نماز پڑھانے کے لئے مارنے کی بھی اجازت ہے،[۱] یہ حد مقرر کر دی، لیکن یہ فرما دیا کہ چہرے پر مت مارو، چہرے پر مارنا جائز نہیں اور ایسی مار نہ مارو جس سے جسم پر نشان پڑ جائے۔ یہ حدود حضورِ اقدس ﷺ نے احادیث میں بیان فرما دیں، آپ ﷺ نے ایک ایک چیز کھول کھول کر سمجھا کر واضح کر دی، یہ تو ایک مثال ہے۔

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، متى يؤمر الغلام بالصلاة، رقم: ٤١٨

''عزتِ نفس'' کا جذبہ فطری ہے

ایک اور مثال لے لیجئے۔ مثلاً دل میں عزتِ نفس کا داعیہ پیدا ہونا کہ میں لوگوں کے سامنے ذلیل نہ ہوں اور بحیثیت انسان اور بحیثیت مسلمان کے میری عزت ہونی چاہئے۔ اس حد تک یہ جذبہ قابلِ تعریف ہے، یہ جذبہ برا نہیں ہے، کیونکہ شریعت نے ہمیں اپنے آپ کو ذلیل کرنے سے منع فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں عزتِ نفس کا جذبہ بالکل نہ ہو تو وہ انسان دوسروں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ جائے، جو چاہے وہ اس کو ذلیل کر جائے۔ لیکن اگر ''عزتِ نفس'' کا جذبہ حد سے بڑھ جائے اور دل میں یہ خیال آئے کہ میں سب سے بڑا ہوں، میں عزت والا ہوں اور باقی سب لوگ ذلیل ہیں اور حقیر ہیں تو اب یہ دل میں ''تکبر'' آ گیا، اس لئے کہ ''تکبر'' کے معنی ہیں ''اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنا''

''عزتِ نفس'' یا ''تکبر''

آپ کو بیشک یہ حق حاصل ہے کہ آپ یہ چاہیں کہ میں دوسروں کی نظر میں بے عزت نہ ہوں، لیکن کسی بھی دوسرے شخص سے اپنے آپ کو افضل سمجھنا کہ میں اس سے اعلیٰ ہوں اور یہ مجھ سے کمتر ہے، یہ خیال لانا جائز نہیں، مثلاً آپ امیر ہیں، آپ کے پاس کوٹھی بنگلے ہیں، آپ کے پاس بینک بیلنس ہے، آپ کے پاس دولت ہے اور دوسرا شخص غریب ہے، ٹھیلے پر سامان بیچ کر اپنا پیٹ پالتا ہے، اپنے گھر والوں کے لئے روزی کماتا ہے، اگر آپ کے دل میں یہ خیال آ گیا کہ میں بڑا ہوں اور یہ چھوٹا ہے، میری عزت اس کی عزت سے زیادہ ہے، میں اس سے افضل ہوں اور یہ مجھ سے کمتر ہے، اس کا نام ''تکبر'' ہے، یہ ''عزتِ نفس'' کا جذبہ اپنی حد سے آگے بڑھ گیا۔

''تکبر'' مبغوض ترین جذبہ ہے

اب یہ ''جذبہ'' اتنا خبیث بن گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ''تکبر'' سے زیادہ کسی جذبے سے نفرت نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین جذبہ انسان کے اندر ''تکبر'' ہے، حالانکہ ''عزتِ نفس'' قابلِ تعریف چیز تھی لیکن جب وہ حد سے بڑھ گئی تو اس کے نتیجے میں وہ ''تکبر'' بن گئی اور تکبر بننے کے نتیجے میں وہ مبغوض بن گئی۔ اللہ تعالیٰ حدیث قدسی میں ارشاد فرماتے ہیں:

((اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ)) ''بڑائی تو تنہا میرا حق ہے''(۱)

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب اللباس، باب ما جاء في الكبر، رقم: ۳۵٦۷، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب البراءة من الكبر والتواضع، رقم: ٤١٦٤، مسند أحمد، رقم: ۷۰۷۸

''اللہ اکبر'' کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا ہے:

﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾(۱)

''اسی کے لئے ہے بڑائی آسمانوں میں بھی اور زمینوں میں بھی''

لہٰذا جو بندہ یہ کہتا ہے کہ میں دوسروں سے بڑا ہوں، میرا درجہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور میں افضل ہوں اور دوسرے سب لوگ مجھ سے چھوٹے ہیں اور حقیر ہیں تو یہ ''تکبر'' کی حد ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو انتہائی ناپسند ہے، اس کا انجام دنیا میں بھی برا ہے اور آخرت میں بھی برا ہے۔

''متکبر'' کو سب لوگ حقیر سمجھتے ہیں

دنیا کے اندر تو یہ صورت ہوتی ہے کہ ''متکبر'' اپنے آپ کو بڑا سمجھتا رہتا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھتا رہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ساری مخلوق اس کو برا سمجھتی ہے، اس لئے کہ جو شخص متکبر ہو اور لوگوں کو معلوم بھی ہو کہ یہ شخص متکبر ہے اور اس کے اندر تکبر ہے تو کوئی بھی شخص اس سے محبت نہیں کرے گا بلکہ ہر شخص اس کو برا سمجھے گا۔ ایک عربی کہاوت ہے جو بڑی خوبصورت ہے، اس کہاوت میں ''متکبر'' کی مثال دی ہے، فرمایا کہ ''متکبر'' کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو، وہ جب اُوپر سے لوگوں کو دیکھتا ہے تو سب لوگ اس کو چھوٹے نظر آتے ہیں، اس لئے وہ ان سب کو چھوٹا سمجھتا ہے، اور ساری مخلوق جب اس کو دیکھتی ہے تو وہ چھوٹا نظر آتا ہے، اس لئے وہ اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں۔ بہرحال! دنیا کے اندر صورت یہ ہوتی ہے کہ ساری مخلوق ''متکبر'' کو برا سمجھتی ہے، اور چھوٹا سمجھتی ہے چاہے اس کے دبدبہ اور اس کی طاقت کی وجہ سے مخلوق اس کے سامنے بات نہ کر سکے، لیکن کسی کے دل میں اس کی عزت اور محبت نہیں ہوتی۔

''امریکہ'' انتہائی تکبر کا مظاہرہ کر رہا ہے

آج ''امریکہ'' تکبر میں نمرود اور فرعون کے درجے تک بلکہ اس سے بھی آگے پہنچ چکا ہے، لوگوں کی زبانیں تو بعض اوقات اس کے سامنے اس کے ڈر کی وجہ سے نہیں کھلتیں لیکن اس کی نفرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، مسلمان اور غیر مسلم اور خود اس کے وطن کے رہنے والے اس سے نفرت کر رہے ہیں۔ اس لئے دنیا کے اندر ''متکبر'' کو نفرت ملتی ہے، عزت نہیں ملتی اور آخرت میں متکبر کے لئے بڑا سخت عذاب ہے۔

---

(۱) الجاثیۃ: ۳۷

''تکبر'' دوسری بیماریوں کی جڑ ہے

اور یہ ''تکبر'' ایسی بیماری ہے جس سے بیشمار بیماریاں جنم لیتی ہیں، اسی ''تکبر'' کے نتیجے میں ''حسد'' پیدا ہوتا ہے، اسی سے ''بغض'' پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم یہ کہہ رہا ہے کہ فلاح ان کو نصیب ہوتی ہے جو اپنے اخلاق کو ان تمام بیماریوں سے پاک کریں، ان کو جب غصہ آئے تو صحیح جگہ پر آئے اور جب غصہ کو استعمال کریں تو حدود کے اندر استعمال کریں، وہ اگر اپنی عزت کا تحفظ کریں تو حدود کے اندر کریں، تکبر نہ کریں اور جو کام کریں اخلاص کے ساتھ کریں، کسی کام میں دکھاوا اور نام ونمود نہ ہو، اسی کا نام ''اخلاق کی صفائی'' اور ''اخلاق کا تزکیہ'' ہے، جس کا ذکر اس آیتِ کریمہ میں ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴾(۱)

جس کے بارے میں فرمایا کہ حضورِ اقدس ﷺ اس دنیا میں اس لئے تشریف لائے کہ لوگوں کے اخلاق کو پاک صاف کریں۔

''اخلاق'' کو پاک کرنے کا طریقہ ''نیک صحبت''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اخلاق کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ خوب سمجھ لیجئے کہ ان اخلاق کو پاک کرنے کا طریقہ وہی ہے جو جناب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ اختیار فرمایا، وہ ہے ''نیک صحبت''، اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ کی صحبت کے نتیجے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق کو معتدل بنادیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے آپ کو حضورِ اقدس ﷺ کے حوالے کردیا، اس طرح کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنے آپ کو اصلاح کے لئے پیش کیا اور یہ تہیہ کرلیا کہ جو کچھ آپ ﷺ سے سنیں گے اور جو کچھ آپ ﷺ کو کرتا ہوا دیکھیں گے، اپنی زندگی میں اس کی اتباع کریں گے اور آپ ﷺ کی ہر بات مانیں گے۔ اب حضورِ اقدس ﷺ ایک ایک صحابی کو دیکھ رہے ہیں، تمام صحابہ آپ ﷺ کے سامنے ہیں، ان کے حالات آپ ﷺ کے سامنے ہیں، بعض اوقات خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے حالات آپ کے سامنے آکر بیان کرتے کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے دل میں اس کام کا خیال پیدا ہوا، میرے دل میں اس کام کا جذبہ پیدا ہوا، اس کے جواب میں آپ ﷺ فرماتے کہ تم فلاں کام اس حد تک کرسکتے ہو، اس سے آگے نہیں کرسکتے، چنانچہ رفتہ رفتہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی تعلیم اور تربیت کے نتیجے میں یہ ہوا کہ وہ اخلاق جو سرکارِ دو عالم جناب رسول اللہ ﷺ لے کر تشریف لائے تھے، وہ اخلاق ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں منتقل ہوگئے۔

---

(۱) المؤمنون: ٤، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جو زکوٰۃ پر عمل کرنے والے ہیں''

زمانۂ جاہلیت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا غصہ

زمانۂ جاہلیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قوم ایسی قوم تھی جس کا غصہ حد سے گزرا ہوا تھا، ذرا سی بات سے آپس میں جنگ چھڑ جاتی اور بعض اوقات چالیس چالیس سال تک وہ جنگ جاری رہتی، لیکن جب وہ لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ایسے موم بن گئے کہ پھر جب ان کو غصہ آتا تو صحیح جگہ پر آتا اور حد کے اندر رہتا، جتنا غصہ آنا چاہئے اتنا ہی غصہ آتا، اس سے آگے نہیں آتا۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نام سن کر کانپ جاتے تھے کہ اگر ان کو غصہ آ گیا تو ہماری خیر نہیں، اسی غصے کے عالم میں ایک مرتبہ اپنے گھر سے نکلے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور نیا دین لے کر آئے ہیں اور پرانے دین کو غلط قرار دیتے ہیں، لہٰذا میں ان کا سر قلم کروں گا۔ لمبا قصہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کے کان میں قرآن کریم کی آیات ڈال دیں اور ان آیاتِ قرآنی کو انقلاب کا ذریعہ بنا دیا اور دل میں اسلام گھر کر گیا اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی پوری جان نچھاور کر دی۔ (۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور غصہ میں اعتدال

پھر جب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لے آئے اور آپ کی صحبت اُٹھائی تو وہ غصہ جو انتہاء سے گزرا ہوا تھا، اس غصے کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تربیت سے اور اپنے فیضِ صحبت سے ایسا معتدل کر دیا کہ جب آپ خلیفہ اور امیر المؤمنین بن گئے تو ایک دن جب آپ جمعہ کے دن مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے، اس وقت آپ کے سامنے رعایا کا بہت بڑا مجمع تھا، اس مجمع میں آپ نے ایک سوال کیا تو جواب دینے کے لئے ایک دیہاتی کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا کہ اے عمر! اگر تم ٹیڑھے چلو گے تو ہم اپنی تلوار سے تمہیں سیدھا کریں گے۔ یہ بات اس شخص سے کہی جا رہی ہے جس کی آدھی دنیا پر حکومت ہے، کیونکہ زمین کا جتنا حصہ ان کے زیرِ حکومت تھا، آج اس زمین پر پچیس حکومتیں قائم ہیں، لیکن اس دیہاتی کے الفاظ پر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو غصہ نہیں آیا بلکہ آپ رضی اللہ عنہ نے اس وقت یہ فرمایا:

> ''اے اللہ! میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس اُمت میں ایسے لوگ پیدا کیے ہیں کہ اگر میں غلطی کروں تو مجھے سیدھا کر دیں''(۲)

(۱) سيرة ابن هشام (۱/ ۳۴۳-۳۴۴)، أسد الغابة، تذكرة عمر بن الخطاب رضي الله عنه،

(۲) الرياض النضرة في مناقب العشرة (۱/ ۱۸۰)

بہر حال! حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا وہ غصہ جو زمانۂ جاہلیت میں ضرب المثل تھا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تربیت کے اثر سے وہ غصہ معتدل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کی حدود پر ٹھہر جانے والے

اور جب غصہ کا صحیح موقع آ جاتا اور ظالم اور جابر حکمرانوں کے خلاف لڑائی اور جہاد کا وقت آتا تو قیصر و کسریٰ بڑی سے بڑی طاقتیں آپ کے نام سے لرزہ براندام ہو جاتیں اور ان پر کپکپی طاری ہو جاتی، آپ نے ہی قیصر و کسریٰ کے ایوانوں کو تاخت و تاراج کیا۔ تو جہاں غصہ نہیں آنا تھا وہاں نہیں آیا اور جہاں جس درجے میں غصہ آنا تھا، وہاں اسی درجے میں آیا، اس سے آگے نہ بڑھا۔ آپ ہی کے بارے میں کہا جاتا ہے:

"كَانَ وَقَّافًا عِنْدَ حُدُوْدِ اللّٰهِ"

یعنی حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدوں کے آگے رک جانے والے تھے۔ یہ بات کہاں سے حاصل ہوئی؟ کیا کتابیں پڑھ کر اور فلسفہ پڑھ کر یہ بات حاصل ہوئی؟ نہیں بلکہ اس کے حصول کا ایک ہی طریقہ تھا، وہ یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت میں رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہ کے تمام اخلاق کو مجلّٰی مزکّٰی اور مصفّٰی کر دیا۔

اللہ والوں کی صحبت اختیار کیجئے

پھر یہی طریقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے شاگردوں یعنی تابعین کے ساتھ اور تابعین نے اپنے شاگردوں کے ساتھ برتا، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾(۱)

یعنی اگر اپنے اخلاق درست کرنا چاہتے ہو تو ان کی صحبت اختیار کرو جن کے اخلاق درست ہیں۔ لہٰذا اپنی صحبت درست کرو اور ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرو جو اللہ والے ہوں، جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو، آخرت کی فکر ہو، جن کے اخلاق مصفّٰی اور مجلّٰی ہو چکے ہوں۔ اب کیسے ان کی صحبت اختیار کی جائے؟ اس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ جمعہ کو عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) التوبة: ۱۱۹، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو"

تواضع

رفعت اور بلندی کا ذریعہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ)) (۱)

اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تواضع کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ کا ایک ارشاد پڑھا، جس کے معنی یہ ہیں کہ ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلندی سے نوازتے ہیں۔''

اس وقت اسی ارشاد کی تھوڑی سی تشریح کرنی ہے، جس میں تواضع کی اہمیت، اس کی حقیقت، اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ بیان کرنا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے صحیح بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تواضع کی اہمیت

جہاں تک تواضع کی ''اہمیت'' کا تعلق ہے، تو یہ تواضع اتنی اہم چیز ہے کہ اگر انسان کے اندر تواضع نہ ہو، تو یہی انسان فرعون اور نمرود بن جاتا ہے، اس لئے کہ جب دل میں تواضع کی صفت نہیں ہوگی، تو پھر تکبر ہوگا، دل میں اپنی بڑائی ہوگی، اور یہ تکبر اور بڑائی، تمام امراضِ باطنہ کی جڑ ہے۔

دیکھئے اس کائنات میں سب سے پہلی نافرمانی ابلیس نے کی، اس نے نافرمانی کا بیج بویا، اس سے پہلے نافرمانی کا کوئی تصور نہیں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور تمام فرشتوں کو ان کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، اور کہا:

☆ اصلاحی خطبات (۵/ ۲۶ تا ۴۰)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في التواضع، رقم: ۱۹۵۲، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب البرائة من الكبر والتواضع، رقم: ٤١٦٦، مسند أحمد، رقم: ۱۱۲۹۹

﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۖ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ﴾(۱)

یعنی میں اس آدم سے اچھا ہوں، اس لئے کہ مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا ہے، اور اس کو آپ نے مٹی سے پیدا کیا ہے، اور آگ مٹی سے افضل ہے، اس لئے میں اس سے افضل ہوں، میں اس کو سجدہ کیوں کروں؟ یہ سب سے پہلی نافرمانی تھی، جو اس کائنات میں سرزد ہوئی، اس نافرمانی کی بنیاد تکبر اور بڑائی تھی کہ میں اس آدم سے افضل ہوں، یا اچھا ہوں، میں اس سے بہتر ہوں بس اس تکبر کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو راندۂ درگاہ کر دیا اس سے معلوم ہوا کہ ساری نافرمانیوں اور برائیوں کی جڑ "تکبر" ہے۔ جب دل میں تکبر ہوگا تو دوسری برائیاں بھی اس میں جمع ہوں گی۔

تکبر کی حقیقت

اس تکبر کی وجہ یہ ہوئی کہ شیطان نے اپنی عقل پر ناز کیا۔ اس نے سوچا کہ میں ایک ایسی عقلی دلیل پیش کر رہا ہوں، جس کا توڑ مشکل ہو، وہ یہ کہ اگر آگ اور مٹی کا تقابل کیا جائے تو آگ مٹی سے افضل ہے، اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے اپنی عقل چلائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارگاہِ خداوندی سے مطرود اور مردود ہوا اقبال مرحوم شعر میں بڑی حکیمانہ باتیں کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک شعر میں انہوں نے اسی واقعہ کی طرف اس طرح اشارہ کیا کہ۔

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول

اس لئے کہ جو عقل کا غلام بن گیا، اس نے اللہ تعالیٰ کی بندگی کا تو انکار کر دیا، اور اس شیطان نے یہ نہیں سوچا کہ جب معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، اسی نے تجھے پیدا کیا، اور اس نے آدم کو پیدا کیا، وہ خالق کائنات بھی ہے، وہ یہ کہہ رہا ہے کہ تو آدم کو سجدہ کر، تو اب تیرا کام یہ تھا کہ تو اس کے حکم کے آگے سر جھکا دیتا، مگر تو نے اس کے حکم کی نافرمانی کی، اس لئے مردود ہوا۔

تمام گناہوں کی جڑ "تکبر"

بہرحال، تکبر سارے گناہوں کی جڑ ہے، تکبر سے غصہ پیدا ہوتا ہے، تکبر سے حسد پیدا ہوتا ہے، تکبر سے بغض پیدا ہوتا ہے، تکبر کی بنیاد پر دوسروں کی دل آزاری ہوتی ہے، تکبر سے دوسروں کی غیبت ہوتی ہے۔ جب تک دل میں تواضع نہ ہوگی، اس وقت تک ان برائیوں سے نجات نہ ہوگی۔ اس لئے ایک مؤمن کے لئے تواضع کو حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔

(۱) ص: ۷۶

''تواضع'' کی حقیقت

''تواضع'' عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کے معنی ہیں ''اپنے آپ کو کم درجہ سمجھنا''،اپنے آپ کو کم درجہ والا کہنا تواضع نہیں، جیسا کہ آج کل لوگ تواضع اس کو سمجھتے ہیں کہ اپنے لئے تواضع اور انکساری کے الفاظ استعمال کر لیے،مثلاً اپنے آپ کو''احقر'' کہہ دیا،''ناچیز''''ناکارہ'' کہہ دیا۔یا''خطاکار'' ''گناہ گار'' کہہ دیا،اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ کے استعمال کے ذریعہ تواضع حاصل ہوگئی،حالانکہ اپنے آپ کو کمتر کہنا تواضع نہیں، بلکہ کمتر سمجھنا تواضع ہے،مثلاً یہ سمجھے کہ میری کوئی حیثیت،کوئی حقیقت نہیں، اگر میں کوئی اچھا کام کر رہا ہوں تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے،اس کی عنایت اور مہربانی ہے،اس میں میرا کوئی کمال نہیں یہ ہے تواضع کی حقیقت۔جب یہ حقیقت حاصل ہو جائے تو اس کے بعد زبان سے چاہے اپنے آپ کو''حقیر''اور''ناچیز''''ناکارہ'' کہو یا نہ کہو،اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جو شخص تواضع کی اس حقیقت کو حاصل کرتا ہے،اللہ تعالیٰ اس کو بلند مقام عطا فرماتے ہیں۔

بزرگوں کی تواضع کا عالم

جن بزرگوں کی باتیں سن اور پڑھ کر ہم لوگ دین سیکھتے ہیں،ان کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ وہ لوگ اپنے آپ کو اتنا بے حقیقت سمجھتے ہیں جس کی حد وحساب نہیں، چنانچہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد میں نے اپنے بیشمار بزرگوں سے سنا،وہ فرماتے تھے:

> ''میری حالت یہ ہے کہ میں ہر مسلمان کو اپنے آپ سے فی الحال،اور ہر کافر کو احتمالاً اپنے آپ سے افضل سمجھتا ہوں،مسلمان کو تو اس لئے افضل سمجھتا ہوں کہ وہ مسلمان اور صاحب ایمان ہے،اور کافر کو اس وجہ سے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کبھی ایمان کی توفیق دیدے،اور یہ مجھ سے آگے بڑھ جائے''

ایک مرتبہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کے خلیفۂ خاص حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ جب میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جتنے لوگ مجلس میں بیٹھے ہیں،سب مجھ سے افضل ہیں، میں ہی سب سے زیادہ نکما اور ناکارہ ہوں۔حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سن کر فرمایا کہ میری بھی یہی حالت ہوتی ہے،پھر دونوں نے مشورہ کیا کہ ہم حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے اپنی یہ حالت ذکر کرتے ہیں،معلوم نہیں کہ یہ حالت اچھی ہے یا بری ہے۔چنانچہ یہ دونوں حضرات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے،اور اپنی حالت بیان کی کہ حضرت آپ کی مجلس میں ہم دونوں کی یہ حالت

ہوتی ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ کچھ فکر کی بات نہیں۔ اس لئے کہ تم دونوں اپنی یہ حالت بیان کر رہے ہو۔ حالانکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب میں بھی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو میری بھی یہی حالت ہوتی ہے کہ اس مجلس میں سب سے زیادہ نکما اور ناکارہ میں ہی ہوں۔ یہ سب مجھ سے افضل ہیں۔

یہ ہے تواضع کی حقیقت، ارے جب تواضع کی یہ حقیقت غالب ہوتی ہے تو پھر انسان تو انسان، آدمی اپنے آپ کو جانوروں سے بھی کمتر سمجھنے لگتا ہے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع

ایک حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرتا تو آپ اپنا ہاتھ اس وقت تک نہیں کھینچتے تھے، جب تک دوسرا شخص اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے، اور آپ اپنا چہرہ اس وقت تک نہیں پھیرتے تھے، جب تک ملاقات کرنے والا شخص خود اپنا چہرہ نہ پھیر لے۔ جب آپ مسلسل مجلس میں بیٹھتے تو اپنا گھٹنا بھی دوسروں سے آگے نہیں کرتے تھے۔ یعنی امتیازی شان سے نہیں بیٹھتے تھے۔ (۱)

بعض روایات میں آتا ہے کہ شروع شروع میں جس طرح اور لوگ مجلس میں آکر بیٹھ جاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ مل جل کر بیٹھ جاتے، نہ تو بیٹھنے میں کوئی امتیازی شان ہوتی تھی، اور نہ ہی چلنے میں، لیکن بعد میں یہ ہوا کہ جب کوئی اجنبی شخص مجلس میں آتا تو اس کو آپ کے پہچاننے میں تکلیف ہوتی، اس کو پتہ نہ چلتا کہ ان میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں؟ اور بعض اوقات جب مجمع زیادہ ہو جاتا، تو پیچھے والوں کو آپ کی زیارت کرنی مشکل ہوتی۔ اور سب لوگوں کی یہ خواہش ہوتی کہ ہم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں۔ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ! آپ اپنے لئے کوئی اونچی جگہ بنوالیں اور اس پر بیٹھ کر بات کرلیا کریں، تاکہ آنے والوں کو پتہ بھی چل جائے، اور سب لوگ آپ کی زیارت بھی کرلیا کریں اور بات سننے میں بھی سہولت اور آسانی ہو۔ اس وقت آپ نے اجازت دے دی، اور آپ کے لئے ایک چوکی سی بنادی گئی، جس پر آپ تشریف فرما کر باتیں کیا کرتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عاجزانہ چال

اس سے معلوم ہوا کہ اصل یہ ہے کہ انسان اپنی کوئی امتیازی شان اور امتیازی مقام نہ بنائے،

(۱) شعب الإيمان للبيهقي، فصل في لين الجانب وسلامة الصدر، رقم: ۸۱۳۲ (۲۷۳/٦)

بلکہ عام آدمیوں کی طرح رہے۔ عام لوگوں کی طرح چلے۔ البتہ جہاں ضرورت ہو وہاں اس ضرورت کے مطابق عمل کرنے کی گنجائش ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ کے چلنے کی یہ صفت بیان فرمائی گئی:

"مَا رُئِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْكُلُ مُتَّكِئًا قَطُّ، وَلَا يَطَأُ عَقِبَهُ رَجُلَانِ"(۱)

"کبھی حضورِ اقدس ﷺ کو ٹیک لگا کر کھاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا اور نہ کبھی یہ دیکھا گیا کہ آپ کے پیچھے پیچھے لوگ چل رہے ہوں"

لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ انسان خود آگے آگے چلے اور اس کے معتقدین اس کے پیچھے اس کی ایڑیوں کے ساتھ ساتھ چلیں۔ اس لئے کہ اس وقت انسان کا نفس اور شیطان اس کو بہکاتا ہے کہ دیکھ تیرے اندر کوئی خوبی اور بھلائی ہے۔ تب ہی تو اتنا بڑا مجمع تیرے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اس لئے حتی الامکان اس سے پرہیز کرنا چاہئے کہ لوگ اس کے پیچھے چلیں۔ جب آدمی چلے تو یا تو اکیلا چلے، یا لوگوں کے ساتھ مل کر چلے۔ آگے آگے نہ چلے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا اعلان

چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے معمولات میں یہ بات لکھی ہے کہ آپ نے یہ عام اعلان کر رکھا تھا کہ کوئی شخص میرے پیچھے نہ چلے، میرے ساتھ نہ چلے، جب میں تنہا کہیں جا رہا ہوں تو مجھے تنہا جانے دیا کرو۔ حضرت فرماتے کہ یہ مقتدا کی شان بنانا کہ جب آدمی چلے تو دو آدمی اس کے دائیں طرف اور دو آدمی اس کے بائیں طرف چلیں، میں اس کو بالکل پسند نہیں کرتا، جس طرح ایک عام انسان چلتا ہے، اسی طرح چلنا چاہئے ایک مرتبہ آپ نے یہ اعلان فرمایا کہ اگر میں اپنے ہاتھ میں کوئی سامان اُٹھا کر جا رہا ہوں تو کوئی شخص آ کر میرے ہاتھ سے سامان نہ لے۔ مجھے اسی طرح جانے دے تاکہ آدمی کی اپنی کوئی امتیازی شان نہ ہو، اور جس طرح ایک عام آدمی رہتا ہے، اس طریقے سے رہے۔

شکستگی اور فنائیت پیدا کیجئے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہاں تو معاملہ عبدیت اور فنائیت اور بندگی کا ہے، شکستگی اور عاجزی کا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو جتنا مٹاؤ گے اور جتنا اپنی بندگی کا

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأطعمة، باب ما جاء في الأكل متكئا، رقم: ۳۲۷۸، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب من كره أن يوطأ عقباه، رقم: ۲۴۰، مسند أحمد، رقم: ۶۲۶۲

مظاہرہ کرو گے، اتنا ہی انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوں گے اور یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

فہم خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا یہ راستہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو زیادہ عقلمند اور ہوشیار جتائے بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل تو اسی شخص پر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سامنے شکستگی اور بندگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ارے کہاں کی شان اور کہاں کی بڑائی جتاتے ہو۔ شان اور بڑائی اور خوشی کا موقع تو وہ ہے جب اللہ تعالیٰ ہماری روح نکل رہی ہو، اس وقت اللہ تعالیٰ یہ فرمادیں:

﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ٥﴾(۱)

دیکھئے، اس آیت میں اس بندہ کی روح سے کہا جائے گا کہ میرے بندوں میں داخل ہو جاؤ، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا سب سے اعلیٰ مقام ''بندگی'' ہے۔

حضور ﷺ کا اظہارِ عاجزی

اس لئے حضورِ اقدس ﷺ ہر معاملے میں وہ طریقہ پسند فرماتے، جس میں عبدیت ہو، بندگی ہو، شکستگی کا اظہار ہو، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورِ اقدس ﷺ سے یہ پوچھا گیا کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کے لئے یہ اُحد پہاڑ سونے کا بنادیا جائے، تاکہ آپ کی معاش کی تکلیف دور ہو جائے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ مجھے تو یہ پسند ہے:

((اَشْبَعُ يَوْمًا وَ اَجُوْعُ يَوْمًا))

ایک دن کھاؤں، اور ایک دن بھوکا رہوں۔ جس دن کھاؤں تو آپ کا شکر ادا کروں۔ اور جس دن بھوکا رہوں اس دن صبر کروں۔ اور آپ سے مانگ کر کھاؤں۔ (۲)

ایک حدیث میں آتا ہے:

(۱) الفجر: ۲۷ تا ۳۰، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''(البتہ نیک لوگوں سے کہا جائے گا کہ:) ''اے وہ جان جو (اللہ کی اطاعت میں چین پا چکی ہے! اپنے پروردگار کی طرف اس طرح لوٹ کر آجا کہ تو اس سے راضی ہو، اور وہ تجھ سے راضی، اور شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں، اور داخل ہو جا میری جنت میں''

(۲) سنن الترمذي، كتاب الزهد، ماجاء في الكفاف والصبر، رقم: ۲۲۷۰، سنن ابن ماجه، كتاب الأطعمة، باب الاقتصاد في الأكل وكراهة الشبع، رقم: ۳۳٤۱، مسند أحمد، رقم: ۲۱۱٦٦

"مَا خُيِّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ اَمْرَيْنِ قَطُّ اِلَّا اَخَذَ اَيْسَرَهُمَا"(۱)

یعنی جب حضورِ اقدس ﷺ کو کسی معاملے میں دو راستوں کا اختیار دیا جاتا ہے، یا تو یہ راستہ اختیار کرلیں یا یہ راستہ اختیار کرلیں، تو حضورِ اقدس ﷺ ہمیشہ ان میں سے آسان راستے کو اختیار فرماتے، اس لئے کہ مشکل راستہ اختیار کرنے میں اپنی بہادری کا دعویٰ ہے کہ میں بڑا بہادر ہوں کہ یہ مشکل کام انجام دے لوں گا اور آسان راستہ اختیار کرنے میں عاجزی شکستگی اور بندگی کا اظہار ہے کہ میں تو بہت کمزور ہوں اور اس کمزوری کی وجہ سے آسان راستہ اختیار کرتا ہوں لہٰذا جو کچھ کسی کو حاصل ہوا وہ بندگی اور فنائیت ہی میں حاصل ہوا، اور فنا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی مرضی اور ان کی مشیت کے آگے اپنے وجود کو انسان فنا کردے، اور جب فنا کردیا تو سمجھو کہ سب کچھ اس فنائیت میں حاصل ہوگیا۔

"ابھی یہ چاول کچے ہیں"

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ کی زبان پر اللہ تعالیٰ بڑے عجیب غریب معارف جاری فرمایا کرتے تھے، ایک دن فرمانے لگے جب پلاؤ پکایا جاتا ہے، تو شروع شروع میں ان چاولوں کے اندر جوش ہوتا ہے، ان میں سے آواز آتی رہتی ہے اور وہ حرکت کرتے رہتے ہیں، اور ان چاولوں کا جوش مارنا، حرکت کرنا اس بات کی علامت ہے کہ چاول ابھی کچے ہیں، پکے نہیں ہیں۔ وہ ابھی کھانے کے لائق نہیں۔ اور نہ ان میں ذائقہ ہے اور نہ خوشبو، لیکن جب چاول پکنے کے بالکل قریب ہوجاتے ہیں، اس وقت اس کا دم نکالا جاتا ہے۔ اور دم نکالتے وقت نہ تو ان چاولوں میں جوش ہوتا ہے، نہ حرکت اور آواز ہوتی ہے۔ اس وقت وہ چاول بالکل خاموش پڑے رہتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی اس کا دم نکالا، ان چاولوں میں سے خوشبو پھوٹ پڑی۔ اور اب اس میں ذائقہ بھی پیدا ہوگیا اور کھانے کے قابل ہوگئے۔

صبا جو ملنا تو کہنا یہ میرے یوسف سے
کہ پھوٹ نکلی ترے پیرہن سے بو تیری

اسی طرح جب تک انسان کے اندر یہ دعوے ہوتے ہیں کہ میں ایسا ہوں، میں بڑا علامہ ہوں، میں بڑا متقی ہوں، بڑا نمازی ہوں، چاہے دعوے زبان پر ہوں، چاہے دل میں ہوں، اس وقت

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب صفة النبی، رقم: ۳۲۹۶، صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب مباعدته للآثام واختیاره من المباح أسهله وانتقامه، رقم: ٤٢٩٤، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی التجاوز فی الأمر، رقم: ٤١٥٣، مسند أحمد، رقم: ٢٣٤١٠

تک اس انسان میں نہ خوشبو ہے، اور نہ اس کے اندر ذائقہ ہے۔ وہ تو کچا چاول ہے۔ اور جس دن اس نے اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے ان دعووں کو فنا کر کے یہ کہہ دیا کہ میری تو کوئی حقیقت نہیں، میں کچھ نہیں۔ اس دن اس کی خوشبو پھوٹ پڑتی ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ اس کا فیض پھیلاتے ہیں۔

ایسے موقع پر ہمارے ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیا خوبصورت شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

میں عارفی، آوارہ صحراء فنا ہوں
ایک عالم بے نام و نشاں میرے لئے ہے

یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے فنائیت کے صحراء میں آوارگی عطا فرمائی ہے اور مجھے فنائیت کا درس عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں بھی عطا فرمادے۔

سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، جن کے علم و فضل کا طوطی بول رہا تھا، اور ڈنکا بج رہا تھا، وہ خود اپنا واقعہ سناتے ہیں کہ جب میں نے ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' چھ جلدوں میں مکمل کر لی، تو بار بار دل میں یہ خلش ہوتی تھی کہ جس ذاتِ گرامی کی یہ سیرت لکھی ہے ان کی سیرت کا کوئی عکس یا کوئی جھلک میری زندگی میں بھی آئی یا نہیں؟ اگر نہیں آئی تو کس طرح آئے؟ اس مقصد کے لئے کسی اللہ والے کی تلاش ہوئی، اور یہ سن رکھا تھا کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون کی خانقاہ میں مقیم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کا فیض پھیلایا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ تھانہ بھون جانے کا ارادہ کر لیا، سفر کر کے تھانہ بھون پہنچ گئے اور حضرت والا سے اصلاحی تعلق قائم کیا اور کئی روز وہاں مقیم رہے، جب واپس رخصت ہونے لگے تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! کوئی نصیحت فرمادیجئے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں اتنے بڑے علامہ کو کیا نصیحت کروں؟ علم و فضل کے اعتبار سے پوری دنیا میں ان کی شہرت ہے، چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: یا اللہ! میرے دل میں ایسی بات ڈال دیجئے جو ان کے حق میں بھی فائدہ مند ہو اور میرے حق میں بھی فائدہ مند ہو اس کے بعد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''بھائی ہمارے طریق میں تو اول و آخر اپنے آپ کو مٹا دینا ہے''

حضرت سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ الفاظ کہتے وقت اپنا ہاتھ سینے کی طرف لے جا کر نیچے کی طرف ایسا جھٹکا دیا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے دل پر جھٹکا لگ گیا۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد حضرت سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

نے اپنے آپ کو ایسا مٹایا کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ ایک دن دیکھا کہ خانقاہ کے باہر حضرت سلیمان ندوی مجلس میں آنے والوں کے جوتے سیدھے کررہے ہیں۔ یہ تواضع اور فنائیت اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں پیدا کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد وہ خوشبو پھوٹی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

''انا'' کا بت دل سے نکال دیجئے

بہرحال، جب تک ''انا'' (میں) کا بت دل میں موجود ہے، اس وقت تک یہ چاول کچا ہے، ابھی جوش مار رہا ہے اور اس وقت یہ خوشبودار بنے گا جب اس ''انا'' کو مٹادیا جائے گا فنائیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے، ''فنائیت'' کا مطلب یہ ہے کہ اپنے طور طریقے اور انداز ادا میں انسان تکبر سے پرہیز کرے، اور عاجزی کو اختیار کرے، اور جس دن عاجزی کو اختیار کرے گا انشاء اللہ اس دن راستہ کھل جائے گا، کیونکہ حق تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ''تکبر'' ہوتی ہے اور ''تکبر'' والا اپنے آپ کو کتنا ہی بڑا سمجھتا رہے۔ اور دنیا والوں کو کتنا ہی ذلیل سمجھتا رہے۔ لیکن انجام کار اللہ تعالیٰ تواضع والے کو ہی عزت عطا فرماتے ہیں اور تکبر والے کو ذلیل کرتے ہیں۔

عربی ادب میں متکبر کی مثال

عربی زبان میں کسی نے بڑی حکیمانہ بات کہی ہے، وہ یہ کہ متکبر کی مثال اس شخص جیسی ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو۔ اب وہ پہاڑ کے اُوپر سے نیچے چلنے پھرنے والوں کو چھوٹا سمجھتا ہے، اس لئے کہ اُوپر سے اس کو وہ لوگ چھوٹے نظر آرہے ہیں، اور جو لوگ نیچے سے اس کو پہاڑ پر دیکھنے والے ہیں وہ اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں، بالکل اسی طرح ساری دنیا متکبر کو حقیر سمجھتی ہے، اور وہ دنیا والوں کو حقیر سمجھتا ہے لیکن جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے آپ کو فنا کردیا، اللہ تعالیٰ اس کو عزت عطا فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ چیز ہمارے اندر بھی پیدا فرمادے۔

ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے گھر میں کبھی کبھی ننگے پیر بھی چلتا ہوں، اس لئے کہ کسی روایت میں پڑھ لیا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کسی موقع پر ننگے پاؤں بھی چلے تھے، میں بھی اس لئے چل رہا ہوں تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر بھی عمل ہوجائے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں ننگے پاؤں چلتے وقت اپنے آپ سے مخاطب ہوکر کہتا ہوں کہ دیکھ، تیری اصل

حقیقت تو یہ ہے کہ نہ پاؤں میں جوتا نہ سر پر ٹوپی اور نہ جسم پر لباس اور تو انجام کار مٹی میں مل جانے والا ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ راہسن روڈ کے مطب میں میں بیٹھا ہوا تھا، اس وقت حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ مطب کے سامنے سے اس حالت میں گزرے کہ ان کے دائیں طرف کوئی آدمی تھا اور نہ بائیں طرف، بس اکیلے جارہے تھے اور ہاتھ میں کوئی برتن اُٹھایا ہوا تھا، حضرت ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس وقت کچھ لوگ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان سے پوچھا: یہ صاحب جو جارہے ہیں، آپ ان کو جانتے ہیں کہ یہ کون صاحب ہیں؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ کیا تم یہ باور کرسکتے ہو کہ یہ پاکستان کا ''مفتی اعظم'' ہے، جو ہاتھ میں پتیلی لیے جارہا ہے۔ اور ان کے لباس و پوشاک سے، انداز و ادا سے، چال ڈھال سے کوئی پتہ بھی نہیں لگا سکتا کہ یہ اتنے بڑے علامہ ہیں۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میرے والد ماجد کے استاذ اور دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم تھے، ان کا واقعہ میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ آپ کے گھر کے آس پاس کچھ بیواؤں کے مکانات تھے، آپ کا روز کا معمول تھا کہ جب آپ اپنے گھر سے دارالعلوم دیوبند جانے کے لئے نکلتے تو پہلے ان بیواؤں کے مکانات پر جاتے، اور ان سے پوچھتے کہ بی بی، بازار سے کچھ سودا سلف منگانا ہے تو بتا دو، میں لادوں گا۔ اب وہ بیوہ ان سے کہتی کہ ہاں بھائی، بازار سے اتنا دھنیہ، اتنی پیاز، اتنے آلو وغیرہ لادو۔ اس طرح دوسری کے پاس، پھر تیسری کے پاس جاکر معلوم کرتے، اور پھر بازار جاکر سودا لاکر ان کو پہنچا دیتے، بعض اوقات یہ ہوتا کہ جب سودا لاکر دیتے تو کوئی بی بی کہتی، مولوی صاحب! آپ غلط سودا لے آئے، میں نے تو فلاں چیز کہی تھی، آپ فلاں چیز لے آئے۔ میں نے اتنی منگائی تھی، آپ اتنی لے آئے۔ آپ فرماتے: بی بی، کوئی بات نہیں، میں دوبارہ بازار سے لادیتا ہوں۔ چنانچہ دوبارہ بازار جاکر سودا لاکر ان کو دیتے۔ اس کے بعد فتاویٰ لکھنے کے لئے دارالعلوم دیوبند تشریف لے جاتے۔ میرے والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ شخص جو بیواؤں کا سودا سلف لینے کے لئے بازار میں پھر رہا ہے، یہ ''مفتی اعظم ہند'' ہے۔ کوئی شخص دیکھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ علم و فضل کا پہاڑ ہے۔ لیکن اس تواضع کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ان کے فتاویٰ پر مشتمل بارہ جلدیں چھپ

چکی ہیں اور ابھی تک اس پر کام جاری ہے۔اور ساری دنیا ان سے فیض اُٹھا رہی ہے وہی بات ہے کہ

کہ پھوٹ نکلی ترے پیرہن سے بو تیری

وہ خوشبو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادی آپ کا انتقال بھی اس حالت میں ہوا کہ آپ کے ہاتھ میں ایک فتویٰ تھا، اور فتویٰ لکھتے لکھتے آپ کی روح قبض ہوگئی

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیوبند کے بانی ہیں، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ہر وقت ایک تہبند پہنے رہتے تھے اور معمولی سا کرتہ ہوتا تھا۔کوئی شخص دیکھ کر یہ پہچان ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ اتنا بڑا علامہ ہے۔ جب مناظرہ کرنے پر آجائیں تو بڑوں بڑوں کے دانت کھٹے کر دیں۔لیکن سادگی اور تواضع کا یہ حال تھا کہ تہبند پہنے ہوئے مسجد میں جھاڑو دے رہے ہیں۔

چونکہ آپ نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا، تو انگریزوں کی طرف سے آپ کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوگیا۔ چنانچہ ایک آدمی ان کو گرفتار کرنے کے لئے آیا۔کسی نے بتادیا کہ وہ چھتے کی مسجد میں رہتے ہیں۔ جب وہ شخص مسجد میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک آدمی بنیان اور لنگی پہنے ہوئے مسجد میں جھاڑو دے رہا ہے۔اب چونکہ وارنٹ کے اندر یہ لکھا تھا کہ ’’مولانا محمد قاسم نانوتوی کو گرفتار کیا جائے‘‘ اس لئے جو شخص گرفتار کرنے آیا تھا وہ یہ سمجھا کہ یہ تو جبے قبے کے اندر ملبوس بڑے علامہ ہوں گے جنہوں نے اتنی بڑی تحریک کی قیادت کی ہے، اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ یہ صاحب جو مسجد میں جھاڑو دے رہے ہیں، یہی مولانا قاسم صاحب ہیں، بلکہ وہ سمجھا کہ یہ شخص مسجد کا خادم ہے۔ چنانچہ اس شخص نے انہیں سے پوچھا کہ مولانا محمد قسم صاحب کہاں ہیں؟ حضرت مولانا کو معلوم ہو چکا تھا کہ میرے خلاف وارنٹ نکلا ہوا ہے اس لئے چھپانا بھی ضروری ہے، اور جھوٹ بھی نہیں بولنا ہے، اس لئے آپ جس جگہ کھڑے تھے وہاں سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئے، پھر جواب دیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہاں تھے، چنانچہ وہ شخص یہی سمجھا کہ تھوڑی دیر پہلے تو مسجد میں تھے، لیکن اب موجود نہیں ہیں، چنانچہ وہ شخص تلاش کرتا ہوا واپس چلا گیا۔

اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر دو حرف علم کی تہمت محمد قاسم کے نام پر نہ ہوتی تو دنیا کو پتہ بھی نہ چلتا کہ قاسم کہاں پیدا ہوا تھا اور کہاں مرگیا۔اس طرح فنائیت کے ساتھ زندگی گزاری۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا محمد مغیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی آزادی کے لئے ایسی تحریک چلائی جس نے پورے ہندوستان، افغانستان اور ترکی سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آپ کی شہرت پورے ہندوستان میں تھی۔ چنانچہ اجمیر میں ایک عالم تھے مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، ان کو خیال آیا کہ دیوبند جا کر حضرت شیخ الہند سے ملاقات اور ان کی زیارت کرنی چاہئے۔ چنانچہ ریل گاڑی کے ذریعہ دیوبند پہنچے اور وہاں ایک تانگے والے سے کہا کہ مجھے مولانا شیخ الہند سے ملاقات کے لئے جانا ہے اب ساری دنیا میں تو وہ شیخ الہند کے نام سے مشہور تھے، مگر دیوبند میں ''بڑے مولوی صاحب'' کے نام سے مشہور تھے تانگے والے نے پوچھا کہ کیا بڑے مولوی صاحب کے پاس جانا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں، بڑے مولوی صاحب کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ تانگے والے نے حضرت شیخ الہند کے گھر کے دروازے پر اُتار دیا۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ جب انہوں نے دروازے پر دستک دی تو ایک آدمی بنیان اور لنگی پہنے ہوئے نکلا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ میں حضرت مولانا محمود الحسن صاحب سے ملنے کے لئے اجمیر سے آیا ہوں۔ میرا نام معین الدین ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت تشریف لائیں، اندر بیٹھیں۔ چنانچہ جب بیٹھ گئے تو پھر انہوں نے کہا کہ آپ حضرت مولانا کو اطلاع کر دیں کہ معین الدین اجمیری آپ سے ملنے آیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت آپ گرمی میں آئے ہیں تشریف رکھیں اور پھر پنکھا جھلنا شروع کر دیا جب کچھ دیر گزر گئی تو مولانا اجمیری صاحب نے پھر کہا کہ میں نے تم سے کہا کہ جا کر مولانا کو اطلاع کر دو کہ اجمیر سے کوئی ملنے کے لئے آیا ہے۔ انہوں نے کہا: اچھا ابھی اطلاع کرتا ہوں۔ پھر اندر تشریف لے گئے اور کھانا لے آئے۔ مولانا نے پھر کہا کہ بھائی میں یہاں کھانا کھانے نہیں آیا، میں تو مولانا محمود الحسن صاحب سے ملنے آیا ہوں، مجھے ان سے ملاؤ۔ انہوں نے فرمایا: حضرت، آپ کھانا تناول فرمائیں، ابھی ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کھانا کھایا، پانی پلایا یہاں تک کہ مولانا معین الدین صاحب ناراض ہونے لگے کہ میں تم سے بار بار کہہ رہا ہوں مگر تم جا کر ان کو اطلاع نہیں کرتے، پھر فرمایا کہ حضرت بات یہ ہے کہ یہاں شیخ الہند تو کوئی نہیں رہتا۔ البتہ بندہ محمود اسی عاجز کا ہی نام ہے تب جا کر مولانا معین الدین صاحب کو پتا چلا کہ شیخ الہند کہلانے والے محمود الحسن صاحب یہ ہیں جن سے میں اب تک ناراض ہو کر گفتگو کرتا رہا۔ یہ تھا ہمارے بزرگوں کا البیلا رنگ، اللہ تعالیٰ اس کا کچھ رنگ ہمیں بھی عطا فرمادے آمین۔

مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ کسی جگہ سے واپس کاندھلہ تشریف لا رہے تھے، جب ریل گاڑی سے کاندھلے کے اسٹیشن پر اُترے تو وہاں دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی سر پر سامان کا بوجھ اُٹھائے جارہا ہے، اور بوجھ کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جارہا ہے۔ آپ کو خیال آیا کہ یہ شخص بیچارہ تکلیف میں ہے، چنانچہ آپ نے اس بوڑھے سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کا تھوڑا سا بوجھ اُٹھالوں۔ اس بوڑھے نے کہا: آپ کا بہت شکریہ اگر آپ تھوڑا سا اُٹھالیں۔ چنانچہ مولانا صاحب اس کا سامان سر پر اُٹھا کر شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب چلتے چلتے راستے میں باتیں شروع ہوگئیں۔ حضرت مولانا نے پوچھا کہ کہاں جارہے ہیں؟ اس نے کہا کہ میں کاندھلے جارہا ہوں۔ مولانا نے پوچھا کہ کیوں جارہے ہیں؟ اس نے کہا کہ سنا ہے کہ وہاں ایک بڑے مولوی صاحب رہتے ہیں، ان سے ملنے جارہا ہوں۔ مولانا نے پوچھا کہ وہ بڑے مولوی صاحب کون ہیں؟ اس نے کہا: مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی، میں نے سنا ہے کہ وہ بہت بڑے مولانا ہیں، بڑے عالم ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ ہاں وہ عربی تو پڑھ لیتے ہیں یہاں تک کہ کاندھلہ قریب آگیا۔ کاندھلہ میں سب لوگ مولانا کو جانتے تھے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ مولانا مظفر حسین صاحب سامان اُٹھائے جارہے ہیں تو لوگ ان سے سامان لینے کے لئے اور ان کی تعظیم و تکریم کے لئے ان کی طرف دوڑے اب ان بڑے میاں کی جان نکلنے لگی اور پریشان ہوگئے کہ میں نے اتنا بڑا بوجھ حضرت مولانا پر لاد دیا چنانچہ مولانا نے ان سے کہا کہ بھائی اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، میں نے دیکھا کہ تم تکلیف میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس خدمت کی توفیق دے دی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں رمضان المبارک میں یہ معمول تھا کہ آپ کے یہاں عشاء کے بعد تراویح شروع ہوتی تو فجر تک ساری رات تراویح ہوتی تھی، ہر تیسرے یا چوتھے روز قرآن شریف ختم ہوتا تھا، ایک حافظ صاحب تراویح پڑھایا کرتے تھے، اور حضرت والا پیچھے کھڑے ہوکر سنتے تھے، خود حافظ نہیں تھے۔ تراویح سے فرغ ہونے کے بعد حافظ صاحب وہیں حضرت والا کے قریب تھوڑی دیر کے لئے سو جاتے تھے۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ کوئی آدمی میرے پاؤں دبا رہا ہے۔ میں سمجھا کہ کوئی شاگرد یا کوئی طالب علم ہوگا، چنانچہ میں نے دیکھا نہیں کہ کون دبا رہا ہے۔ کافی دیر گزرنے کے بعد میں نے جو

مڑ کر دیکھا تو حضرت شیخ الہند محمود الحسن صاحب میرے پاؤں دبا رہے تھے۔ میں ایک دم سے اُٹھ گیا اور کہا کہ حضرت! یہ آپ نے کیا غضب کر دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ غضب کیا کرتا، تم ساری رات تراویح میں کھڑے رہتے ہو، میں نے سوچا کہ دبانے سے تمہارے پیروں کو آرام ملے گا، اس لئے دبانے کے لئے آ گیا۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے۔ بڑے اُونچے درجے کے عالم تھے، ان کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وعظ میں بیان فرمایا کہ ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ان کے سامنے ان کی تعریف کرتا تو بالکل خاموش رہتے تھے، کچھ بولتے نہیں تھے جیسے آج کل بناوٹی تواضع اختیار کرتے ہیں کہ اگر کوئی ہمارے سامنے ہماری تعریف کرتا ہے تو جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ تو آپ کا حسنِ ظن ہے، ورنہ ہم تو اس قابل نہیں ہیں وغیرہ حالانکہ دل میں بہت خوش ہوتے ہیں کہ یہ شخص ہماری اور تعریف کرے، اور ساتھ ساتھ دل میں بھی اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں، لیکن ساتھ میں یہ الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ حقیقت میں بناوٹی تواضع ہوتی ہے، حقیقی تواضع نہیں ہوتی لیکن حضرت مولانا یعقوب صاحب خاموش رہتے۔ اب دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ حضرت مولانا اپنی تعریف پر خوش ہوتے ہیں، اپنی تعریف کرانا چاہتے ہیں، اس لئے تعریف کرنے سے نہ تو روکتے ہیں نہ ٹوکتے ہیں اور نہ ہی اس کی تردید کرتے ہیں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اب دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ ان کے اندر تواضع نہیں ہے۔ حالانکہ ان باتوں کا نام تواضع نہیں بلکہ تواضع تو دل کے اندر ہوتی ہے۔ اور اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ آدمی کبھی کسی کام کو اپنے سے فروتر نہیں سمجھتا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک صاحب نے آپ کو کھانے کی دعوت دی، آپ نے قبول فرمالی۔ اس شخص کا گاؤں فاصلے پر تھا۔ لیکن اس نے سواری کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو آپ پیدل ہی روانہ ہوگئے۔ دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ان صاحب نے سواری کا کوئی انتظام نہیں کیا، سواری کا انتظام کرنا چاہئے تھا۔ بہرحال، اس کے گھر پہنچے، کھانا کھایا، کچھ آم بھی کھائے، اس کے بعد جب واپس چلنے لگے تو اس وقت بھی اس نے سواری کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ بلکہ اُلٹا یہ غضب کیا کہ بہت سارے آموں کی گٹھڑی بنا کر حضرت کے حوالے کر دی کہ حضرت یہ کچھ آم گھر کے لئے لیتے جائیں۔ اس اللہ کے بندے نے یہ نہ سوچا کہ اتنی دور جانا ہے۔ اور سواری کا کوئی انتظام بھی نہیں ہے، کیسے اتنی بڑی گٹھڑی لے کر جائیں گے۔ مگر اس نے وہ گٹھڑی مولانا کو دے دی اور مولانا نے قبول فرمالی، اور اُٹھا کر چل دیئے۔ اب ساری عمر مولانا

نے کبھی اتنا بوجھ اُٹھایا نہیں، شہزادوں جیسی زندگی گزاری، اب اس گٹھڑی کو کبھی ایک ہاتھ میں اُٹھاتے، کبھی دوسرے ہاتھ میں اُٹھاتے، چلے جارہے ہیں، یہاں تک کہ جب دیو بند قریب آنے لگا تو اب دونوں ہاتھ تھک کر چور ہوگئے، نہ اس ہاتھ میں چین، نہ اس ہاتھ میں چین، آخرکار اس گٹھڑی کو اُٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ جب سر پر رکھا تو ہاتھوں کو کچھ آرام ملا تو فرمانے لگے: ہم بھی عجیب آدمی ہیں۔ پہلے خیال نہیں آیا کہ اس گٹھڑی کو سر پر رکھ دیں، ورنہ اتنی تکلیف اُٹھانی نہ پڑتی۔ اب مولانا اس حالت میں دیو بند میں داخل ہورہے ہیں کہ سر پر آموں کی گٹھڑی ہے۔ اب راستے میں جو لوگ ملتے وہ آپ کو سلام کررہے ہیں، آپ سے مصافحہ کررہے ہیں۔ اور آپ نے ایک ہاتھ سے گٹھڑی سنبھالی ہوئی ہے اور ایک ہاتھ سے مصافحہ کررہے ہیں، اسی حالت میں آپ اپنے گھر پہنچ گئے اور آپ کو ذرّہ برابر بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ کام میرے مرتبے کے خلاف ہے اور میرے مرتبے سے فروتر ہے بہرحال، انسان کسی بھی کام کو اپنے مرتبے سے فروتر نہ سمجھے یہ ہے تواضع کی علامت۔

سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اعزاز

حضرت سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا نام آپ نے سنا ہوگا، بڑے اُونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے گزرے ہیں۔ جن کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا کہ دنیا میں کسی اور کے ساتھ ایسا واقعہ پیش نہیں آیا وہ یہ کہ ساری عمر ان کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضری کی تمنا اور آرزو رہتی تھی۔ بہت آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت عطا فرمائی۔ حج کے لئے تشریف لے گئے، حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضری ہوئی تو اس وقت بے ساختہ عربی کے یہ دو اشعار پڑھے:

فِیْ حَالَۃِ الْبُعْدِ رُوْحِیْ کُنْتُ اُرْسِلُھَا
تُقَبِّلُ الْاَرْضَ عَنِّیْ وَ ھِیَ نَائِبَتِیْ
وَھٰذِہٖ دَوْلَۃُ الْاَشْبَاحِ قَدْ حَضَرَتْ
فَامْدُدْ یَمِیْنَکَ کَیْ تحظی بِھَا شَفَتِیْ

”یا رسول اللہ! جب میں آپ سے دور تھا تو دوری کی حالت میں روضۂ اقدس پر اپنی روح کو بھیجا کرتا تھا، وہ آکر میری نائب اور قائم مقام بن کر زمین کا بوسہ لیا کرتی تھی۔ آج جب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مجھے جسمانی طور پر حاضری نصیب ہوگئی ہے تو آپ اپنا دستِ مبارک بڑھائیں تاکہ میرے ہونٹ اس سے سیراب اور فیض یاب ہوسکیں۔ یعنی میں اس کا بوسہ لوں“

بس شعر کا پڑھنا تھا کہ فوراً روضۂ اقدس سے دستِ مبارک برآمد ہوا، اور جتنے لوگ وہاں حاضر تھے، سب نے دستِ مبارک کی زیارت کی، اور حضرت سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے دستِ مبارک کا بوسہ لیا، اور اس کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ اب حقیقت کیا تھی، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر تاریخ میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے۔[1]

اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں خیال آیا کہ آج اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا بڑا اعزاز عطا فرمایا اور اتنا بڑا اکرام فرمایا کہ جو آج تک کسی کو نصیب نہ ہوا، کہیں اس کے نتیجے میں میرے دل کے اندر عُجب اور تکبر اور بڑائی کا شائبہ پیدا نہ ہو جائے۔ چنانچہ آپ مسجد نبوی کے دروازے پر لیٹ گئے اور حاضرین سے فرمایا کہ میں سب کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے اُوپر سے پھلانگ پھلانگ کر باہر نکلیں تاکہ بڑائی کا یہ شائبہ بھی دل سے نکل جائے اس طرح آپ نے تکبر اور عجب کا علاج کیا۔

انہیں یہ مقام کیوں ملا؟

یہ واقعہ تو درمیان میں بطور تعارف کے عرض کر دیا، ورنہ اصل واقعہ یہ بیان کرنا تھا کہ ایک مرتبہ سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ بازار تشریف لے جا رہے تھے، سڑک پر ایک خارشی کتا دیکھا، خارش اور بیماری کی وجہ سے اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔

جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں، ان کو اللہ کی مخلوق سے بھی بے پناہ شفقت اور محبت ہوتی ہے، اور یہ محبت و شفقت اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ سے خصوصی تعلق ہے، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ز تسبیح و سجادہ و دلق نیست
طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

یعنی تسبیح، مصلی اور گدڑی کا نام طریقت نہیں، بلکہ خدمتِ خلق کا نام طریقت ہے میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھی اس سے محبت ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں مخلوق کی محبت ڈال دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اللہ والوں کو انسانوں، بلکہ جانوروں تک سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ ہم اور آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

بہرحال، جب سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتے کو اس حالت میں دیکھا تو آپ کو اس پر

(۱) أسنى المطالب (۱/۳۵۷)

ترس اور رحم آیا، اور اس کتے کو اُٹھا کر گھر لائے، پھر ڈاکٹر کو بلا کر اس کا علاج کرایا، اس کی دوا کی، اور روزانہ اس کی مرہم پٹی کرتے رہے، کئی مہینوں تک اس کا علاج کرتے رہے، یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو تندرست کر دیا تو آپ نے اپنے کسی ساتھی سے کہا کہ اگر کوئی شخص روزانہ اس کو کھلانے پلانے کا ذمہ لے تو اس کو لے جائے، ورنہ پھر میں ہی اس کو رکھتا ہوں، اور اس کو کھلاؤں گا، اس طرح آپ نے اس کتے کی پرورش کی۔

سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

اس واقعہ کے بعد ایک روز سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، بارش کا موسم تھا، کھیتوں کے درمیان جو پگڈنڈی ہوتی ہے، اس پر سے گزر رہے تھے، دونوں طرف پانی کھڑا تھا، کیچڑ تھی۔ چلتے چلتے سامنے سے اس پگڈنڈی پر ایک کتا آ گیا۔ اب یہ بھی رک گئے اور کتا بھی ان کو دیکھ کر رک گیا۔ وہ پگڈنڈی اتنی چھوٹی تھی کہ ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا، دو آدمی نہیں گزر سکتے تھے۔ اب یا تو کتا نیچے کیچڑ میں اُتر جائے، اور یہ اُوپر سے گزر جائیں، یا پھر یہ کیچڑ میں اُتر جائیں، اور کتا اُوپر سے گزر جائے۔ دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ کیا کیا جائے؟ کون نیچے اُترے، میں اُتروں، یا کتا اُترے؟

اس وقت سید احمد کبیر رفاعیؒ کا اس کتے کے ساتھ مکالمہ ہوا اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ مکالمہ کس طرح ہوا؟ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بطور کرامت کے اس کتے کو کچھ دیر کے لئے زبان دیدی ہو۔ اور واقعی مکالمہ ہوا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے دل میں یہ مکالمہ کیا ہو بہرحال، اس مکالمہ میں حضرت سید احمد کبیرؒ نے کتے سے کہا کہ تو نیچے اُتر جا تا کہ میں اُوپر سے گزر جاؤں۔

کتے نے جواب میں کہا ''میں نیچے کیوں اُتروں، تم بڑے درویش اور اللہ کے ولی بنے پھرتے ہو، اور اللہ کے ولیوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ وہ ایثار کا پیکر ہوتے ہیں، دوسروں کے لئے قربانی دیتے ہیں، تم کیسے اللہ کے ولی ہو کہ مجھے اُترنے کا حکم دے رہے ہو، خود کیوں نہیں اُتر جاتے؟''

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا ''بات دراصل یہ ہے کہ میرے اور تیرے اندر فرق ہے، وہ یہ کہ میں مکلّف ہوں، تو غیر مکلّف ہے، مجھے نماز پڑھنی ہے، تجھے نماز نہیں پڑھنی ہے، اگر نیچے اُترنے کی وجہ سے تیرا جسم گندہ اور ناپاک ہو گیا تو تجھے غسل اور طہارت کی ضرورت نہیں ہوگی اگر میں اُتر گیا تو میرے کپڑے ناپاک ہو جائیں گے اور میری نماز میں خلل واقع ہوگا، اس لئے میں تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ تو نیچے اُتر جا''

کتے نے جواب میں کہا ''واہ آپ نے بھی عجیب بات کہی کہ کپڑے گندے ہو جائیں گے۔

ارے، اگر آپ کے کپڑے گندے ہو جائیں گے تو ان کا علاج یہ ہے کہ ان کو اُتار کر دھو لینا، وہ کپڑے پاک ہو جائیں گے، لیکن اگر میں نیچے اُتر گیا تو تمہارا دل گندہ ہو جائے گا اور تمہارے دل میں یہ خیال آجائے گا کہ میں اس کتے سے افضل ہوں، میں انسان ہوں، اور یہ کتا ہے، اور اس خیال کی وجہ سے تمہارا دل ایسا گندہ ہو جائے گا کہ اس کی پاکی کا کوئی راستہ نہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ دل کی گندگی کے بجائے کپڑوں کی گندگی کو گوارا کر لو اور نیچے اُتر جاؤ''

بس، کتے کا یہ جواب سن کر حضرت شیخ نے ہتھیار ڈال دیئے اور کہا کہ تم نے صحیح کہا کہ کپڑوں کو دوبارہ دھو سکتا ہوں، لیکن دل نہیں دھو سکتا۔ یہ کہہ کر آپ کیچڑ میں اُتر گئے، اور کتے کو راستہ دے دیا۔

جب یہ مکالمہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کو الہام ہوا، اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ اے احمد کبیر! آج ہم نے تم کو ایک ایسے علم کی دولت سے نوازا، کہ سارے علوم ایک طرف اور یہ علم ایک طرف، اور یہ درحقیقت تمہارے اس عمل کا انعام ہے کہ تم نے چند روز پہلے ایک کتے پر ترس کھا کر اس کا علاج اور دیکھ بھال کی تھی اس عمل کی بدولت ہم نے تمہیں ایک کتے کے ذریعہ ایسا علم عطا کیا جس پر سارے علوم قربان ہیں وہ علم یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کتے سے بھی افضل نہ سمجھے اور کتے کو اپنے مقابلے میں حقیر خیال نہ کرے۔

بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ جو جلیل القدر بزرگ گزرے ہیں۔ ان کا واقعہ مشہور ہے کہ انتقال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ حضرت! اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا معاملہ فرمایا؟ جواب دیا کہ ہمارے ساتھ بڑا عجیب معاملہ ہوا، جب ہم یہاں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کیا عمل لے کر آئے ہو؟ میں نے سوچا کہ کیا جواب دوں، اور اپنا کون سا عمل پیش کروں، اس لئے کہ کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہے جس کو پیش کروں، لہٰذا میں نے جواب دیا، یا اللہ! کچھ بھی نہیں لایا، خالی ہاتھ آیا ہوں، آپ کے کرم کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ویسے تو تم نے بڑے بڑے عمل کیے، لیکن تمہارا ایک عمل ہمیں بہت پسند آیا، آج اسی عمل کی بدولت ہم تمہاری مغفرت کر رہے ہیں۔ وہ عمل یہ ہے کہ ایک رات جب تم اُٹھے تو تم نے دیکھا کہ ایک بلی کا بچہ سردی کی وجہ سے ٹھٹھر رہا ہے، کانپ رہا ہے، تم نے اس پر ترس کھا کر اس کو اپنے لحاف میں جگہ دے دی، اور اس کی سردی دور کر دی، اور اس بلی کے بچے نے آرام کے ساتھ ساری رات گزاری چونکہ تمہارا یہ عمل اخلاص پر مبنی تھا اور ہماری رضا کے علاوہ کوئی غرض شاملِ حال نہیں تھی، بس تمہارا یہ عمل ہمیں اتنا پسند آیا کہ اس عمل کی بدولت ہم نے تمہاری مغفرت کر دی۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں جو بڑے علوم و معارف حاصل کیے تھے، وہ سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہاں تو صرف ایک ہی عمل پسند آیا، وہ تھا "مخلوق کے ساتھ حسنِ اخلاق"

بہرحال، حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کو اس الہام کے ذریعہ یہ بتایا گیا کہ وہ سارے علوم ایک طرف، اور یہ ایک علم کہ میں بے حقیقت چیز ہوں اور میری اپنی ذات کے اندر کوئی حقیقت نہیں ہے، یہی سارے علوم کی جان ہے جو آج ہم نے تمہیں عطا کردی۔ اسی کا نام تواضع ہے۔ سارے بڑے بڑے اولیاء اللہ اس بات کی فکر میں لگے رہتے تھے کہ کہیں اپنے اندر تکبر کا کوئی شائبہ پیدا نہ ہو جائے۔

"تواضع" اور "احساسِ کمتری" میں فرق

آج کل "علم نفسیات" کا بڑا زور ہے، اور "علم نفسیات" میں سے ایک چیز آج کل لوگوں میں بہت مشہور ہے، وہ ہے "احساسِ کمتری"، اس کو بہت برا سمجھا جاتا ہے کہ "احساسِ کمتری" بہت بری چیز ہے، اگر کسی میں یہ پیدا ہو جائے تو اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ جب آپ لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ "اپنے آپ کو مٹاؤ" تو اس کے ذریعے آپ لوگوں کے اندر "احساسِ کمتری" پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو کیا یہ بات درست ہے کہ لوگ اپنے اندر احساسِ کمتری پیدا کریں؟

بات دراصل یہ ہے کہ "تواضع" اور "احساس کمتری" میں فرق ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ "علم نفسیات" ایجاد کی، انہیں دین کا علم یا اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں کوئی علم تھا ہی نہیں، انہوں نے ایک "احساسِ کمتری" کا لفظ اختیار کرلیا، حالانکہ اس میں بہت سی اچھی باتیں شامل ہو جاتی ہیں۔ ان کو "احساسِ کمتری" کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں "تواضع" اور "احساسِ کمتری" میں فرق ہے۔

احساسِ کمتری میں تخلیق پر شکوہ

دونوں میں فرق یہ ہے کہ "احساسِ کمتری" میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق پر شکوہ اور شکایت ہوتی ہے۔ یعنی احساسِ کمتری میں انسان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھے محروم اور پیچھے رکھا گیا ہے۔ میں مستحق تو زیادہ کا تھا، لیکن مجھے کم ملا، یا مثلاً یہ احساس کہ مجھے بدصورت پیدا کیا گیا، مجھے بیمار پیدا کیا گیا، مجھے دولت کم دی گئی، میرا رتبہ کم رکھا گیا۔ اس قسم کے شکوے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، اور پھر اس شکوے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت میں جھنجلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر اس احساسِ

کمتری کے نتیجے میں انسان دوسروں سے حسد کرنے لگتا ہے، اور اس کے اندر مایوسی پیدا ہوجاتی ہے کہ اب مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا بہرحال، احساسِ کمتری کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے شکوے پر ہوتی ہے۔

''تواضع'' شکر کا نتیجہ ہے

جہاں تک تواضع کا تعلق ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر شکوے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے انعامات پر شکر کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ تواضع کرنے والا یہ سوچتا ہے کہ میں تو اس قابل نہیں تھا کہ مجھے یہ نعمت ملتی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی، یہ ان کا کرم اور ان کی عطا ہے، میں تو اس کا مستحق نہیں تھا۔

اس سے اندازہ لگائیں کہ ''احساسِ کمتری'' اور ''تواضع'' میں کتنا بڑا فرق ہے۔ اس لئے تواضع محبوب اور پسندیدہ عمل ہے، حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو رفعت اور بلندی عطا فرماتے ہیں ''تکبر'' کی خاصیت یہ ہے کہ ''متکبر'' بالآخر ذلیل ہوتا ہے، اور تواضع کی خاصیت یہ ہے کہ ''متواضع'' شخص کو بالآخر عزت حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ صرف رفعت اور بلندی حاصل کرنے کے لئے جھوٹی اور بناوٹی تواضع نہ ہو، بلکہ وہ حقیقی تواضع ہو۔

تواضع کا دکھاوا بھی ہوتا ہے

بعض اوقات ہم لوگ زبان سے یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ہماری حقیقت کیا ہے؟ اور ہم تو ناچیز ہیں، ناکارہ ہیں، احقر ہیں وغیرہ، بسا اوقات یہ تواضع نہیں ہوتی بلکہ تواضع کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہمارے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ اس بات کا اندازہ لگانا کہ وہ یہ الفاظ واقعی تواضع سے کہہ رہا ہے یا دکھاوے سے کہہ رہا ہے اس کا امتحان بہت آسان ہے۔ وہ اس طرح کہ جب کوئی شخص کہے میں تو بڑا ناچیز ہوں، ناکارہ ہوں، خطا کار ہوں اور گناہ گار ہوں آپ اس وقت اگر جواب میں یہ کہہ دیں کہ بیشک آپ نے بالکل صحیح فرمایا، آپ واقعی بڑے ناچیز ہیں، بڑے ناکارہ ہیں، بڑے خطا کار ہیں، اور بڑے گناہ گار ہیں، پھر دیکھو کہ اس جواب کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اگر اس نے سچے دل سے یہ الفاظ کہے تھے تب تو اس جواب کا خیر مقدم کرے گا لیکن اگر اس جواب کی وجہ سے اس کے دل میں ملال پیدا ہوگیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچے دل سے یہ باتیں نہیں کہہ رہا تھا، بلکہ تواضع کے الفاظ اس لئے استعمال کر رہا تھا تاکہ جواب میں یہ کہا جائے کہ نہیں حضرت! آپ تو بڑے نیک ہیں، بڑے متقی ہیں، بڑے پرہیزگار ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ مصنوعی تواضع میں جو الفاظ کہے جاتے ہیں وہ سچے دل سے نہیں کہے جاتے، بلکہ دوسروں سے اپنی تعریف کروانے کے لئے کہے جاتے ہیں

لہٰذا یہ تواضع نہ ہوئی۔

ناشکری سے بچنا بھی ضروری ہے

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر کچھ اچھے اوصاف ہوتے ہی ہیں، کسی کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، کسی کو صحت دی ہے، کسی کو دولت دی ہے، کسی کو کوئی مرتبہ دیا ہے، کسی کو کوئی منصب دیا ہے، یہ ساری چیزیں موجود ہیں، تو انسان کیسے انکار کردے، اور کہے کہ یہ چیز ہمیں حاصل نہیں، اگر اس کا انکار کردے گا تو ناشکری، اور کفرانِ نعمت ہوگا، اس کے جواب میں بزرگوں نے فرمایا کہ تواضع کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ ناشکری کی حد تک پہنچ جائے، تواضع بھی ہو، لیکن ساتھ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناشکری بھی نہ ہو۔

تواضع کا غلط مفہوم

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک واقعہ بیان فرمایا کہ میں ایک مرتبہ الٰہ آباد سے کانپور کے لئے ریل میں سوار ہوا۔ چند جنٹلمین اس ہی ڈبہ میں سوار تھے اور ایک منصف صاحب بھی سوار تھے۔ یہ منصف صاحب پرانے اور سادی وضع کے آدمی تھے۔ ان جنٹلمینوں نے ان منصف صاحب کو بنانا شروع کیا۔ اگرچہ بے تکلفی کی ابتداء منصف صاحب کی طرف سے ہوئی۔ غرض ان جنٹلمینوں نے کھانے کا دسترخوان کھولا اور ان میں سے ایک نے منصف صاحب سے کہا کہ آیئے آپ بھی کچھ گوموت کھا لیجئے۔ دوسرے ساتھی بولے کہ کیا واہیات ہے؟ توبہ کرو، توبہ کرو، کھانے کو گوموت کہتے ہو؟ اس نے جواب میں کہا کہ اپنے کھانے کو کھانا کہنا بھی تکبر ہے اس حیثیت سے کہ وہ اپنا کھانا ہے گوموت ہی کہنا تواضع ہے۔

تکبر اور ناشکری دونوں غلط ہیں

ایک طرف ناشکری سے بھی بچنا ہے دوسری طرف تکبر سے بھی بچنا ہے، اور تواضع اختیار کرنی ہے، دونوں کام جمع کرے، مثلاً نماز پڑھی، روزہ رکھا اور اس عمل کو یہ سمجھنا کہ میں نے بڑا زبردست عمل کرلیا تو یہ بڑا تکبر ہے اور اگر اپنے عمل کے بارے میں یہ کہا کہ یہ تو بیکار ہے، جیسا کہ آج کل بعض لوگ نماز کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہم نے ٹکریں مارلیں، تو یہ اس عمل پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناشکری اور ناقدری ہے۔

شکر اور تواضع کیسے جمع ہوں؟

سوال یہ ہے کہ دونوں چیزوں کو کیسے جمع کیا جائے کہ ناشکری بھی نہ ہو، تکبر بھی نہ ہو۔ شکر بھی ادا ہو اور تواضع بھی ہو۔ حقیقت میں یہ کوئی مشکل کام نہیں دونوں کاموں کو جمع کرنا بالکل آسان ہے، وہ اس طرح کہ انسان یہ خیال کرے کہ اپنی ذات میں تو میرے اندر اس عمل کی ذرہ برابر طاقت اور صلاحیت نہیں تھی، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے یہ عمل کرادیا، اس طرح دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ اپنی ذات میں اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھا تو تواضع ہوگئی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا کا اقرار کیا تو یہ شکر ہوگیا اب دونوں باتیں جمع ہوگئیں۔ اس لئے جو بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر بجالاتا ہو، اس کے اندر کبھی تکبر نہیں آسکتا، کیونکہ شکر کے معنی یہ ہیں کہ میرے اندر اپنی ذات میں کوئی صلاحیت نہیں تھی، اللہ جل جلالہ نے اپنے فضل وکرم اور اپنی عطا سے مجھے یہ چیز عطا فرمائی ہے۔

دیکھئے! نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ نے دونوں کو جمع کر کے دکھادیا فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ))(۱)

میں سارے آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں اب اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اپنی بڑائی کا اظہار فرمارہے ہیں لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ "ولا فخر" یعنی کہ میں اپنا سردار ہونا بڑائی کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے اپنے فضل وکرم سے بڑا بنادیا، اور سارے آدم کے بیٹوں کا سردار بنایا، یہ محض ان کی عطا ہے، میری ذات کی بڑائی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ ایک مثال

اس بات کو حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا، فرمایا کہ اس کو ایک مثال سے سمجھو کہ پہلے زمانے میں غلام ہوا کرتے تھے، اور اپنے مالک کے مملوک ہوتے تھے، مالک ان کو بازار میں باقاعدہ بیچ سکتا تھا، آقا ان کی ہر چیز کا مالک ہوتا تھا، مالک جو بھی حکم دے گا غلام کو کرنا ہوگا، اگر وہ کہے کہ میں سفر میں جارہا ہوں میری غیر موجودگی میں اب تم حکمرانی کرو، اب وہ حکمرانی کر رہا ہے، گورنر بنا ہوا ہے، لیکن ہے غلام کا غلام، لہٰذا اس غلام کے دماغ میں یہ بات آہی نہیں سکتی کہ یہ جو اقتدار میرے پاس آیا ہے، یہ میری قوتِ بازو کا یا میری صلاحیت کا نتیجہ ہے، کچھ بھی نہیں، اس کو یہ خیال رہتا ہے کہ جب آقا آجائے گا تو کہہ دے گا کہ ہٹو، اب بیت الخلاء صاف کرو، تب وہ

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله، باب في فضل النبي، رقم: ۳۵۴۸، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الشفاعة، رقم: ٤٢٩٨، مسند أحمد، رقم: ٢٤١٥

سارا تخت اور ساری حکمرانی دھری رہ جائے گی، معلوم ہوا کہ وہ غلام بیشک حاکم بن کر حکم چلا رہا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اپنی حقیقت کا احساس بھی کر رہا ہے، کہ یہ حکمرانی میرے مالک کی عطا ہے حقیقت میں تو میں غلام ہی ہوں۔

یہ تو ایک غلام کا حال تھا، لیکن ''بندہ'' ہونے کا درجہ اس سے کہیں زیادہ نیچے ہے، لہٰذا جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بندہ کو کوئی منصب عطا فرمادیں تو ''بندہ'' کو سمجھنا چاہئے کہ منصب تو مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادیا، اسی وجہ سے یہ کام انجام دے رہا ہوں، لیکن میں ان کا بندہ ہوں، میری حقیقت اس غلام سے بھی فروتر ہے، جس کو مالک نے تخت پر بٹھادیا کتنے غلام گزرے ہیں، جنہوں نے بادشاہت کی ہے، لیکن رہے غلام کے غلام۔

تاریخ کا ایک عبرت ناک قصہ

ایک عبرت ناک قصہ یاد آیا، ایک غلام نے اپنے آقا کے خلاف بغاوت کرکے آقا کو قتل کردیا، اور باقاعدہ بادشاہ بن گیا، اب مدتوں تک بادشاہ بنا رہا، شہزادے بھی پیدا ہوگئے، لیکن حقیقت میں تو وہ بادشاہ کا غلام تھا۔ ایک مرتبہ اس غلام بادشاہ نے شیخ عزالدین بن عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے دربار میں بلایا، جو اولیاء اللہ میں سے تھے یہ اپنی صدی کے مجدد تھے اس غلام بادشاہ نے ان کو بلا کر کہا: میں آپ کو قاضی بنانا چاہتا ہوں۔ شیخ نے جواب میں کہا کہ بات یہ ہے کہ قاضی بنانے کا کام اس شخص کا ہے جو خلیفہ برحق ہو، اور آپ خلیفہ برحق نہیں ہیں، اس لئے کہ آپ تو غلام ہیں، آپ اپنے آقا کو قتل کرکے ازخود بادشاہ بن بیٹھے، اپنی ملکیت میں بہت ساری زمینیں آپ نے رکھی ہیں حالانکہ آپ مالک بن ہی نہیں سکتے، کیونکہ غلام کے اندر مالک بننے کی صلاحیت نہیں ہے، لہٰذا جب تک آپ اپنی اس حیثیت کی اصلاح نہیں کریں گے، میں اس وقت تک آپ کا کوئی منصب قبول نہیں کروں گا۔

اس زمانے میں بہرحال کچھ نہ کچھ خیر ہوا کرتی تھی، باوجودیکہ اپنے آقا کو قتل کرنے کا جرم کیا تھا، لیکن پھر بھی دل میں کچھ خدا کا خوف تھا، اور اللہ والوں کے کہنے کے انداز سے بھی دل پر اثر ہوتا ہے، اس بادشاہ نے کہا: بات تو آپ نے صحیح کہی، واقعی میں تو غلام ہوں، آپ مجھے کوئی ایسا راستہ بتادیجئے جس کے ذریعے میں اس غلامی سے نکل جاؤں۔ شیخ نے کہا کہ اس کا راستہ یہ ہوسکتا ہے کہ تم اور تمہارے سارے شہزادوں کو بازار میں کھڑا کرکے فروخت کیا جائے، اور جو قیمت وصول ہو وہ تمہارے مرحوم آقا کے ورثاء میں تقسیم کردیئے جائیں اور جو شخص تمہیں خریدے، وہ آزاد کردے، پھر تمہیں آزادی مل جائے گی اب اندازہ لگایئے بادشاہ کو یہ کہا جارہا ہے کہ تم کو اور بیٹوں کو بازار میں کھڑا کرکے بیچا جائے گا۔ قیمت لگائی جائے گی، نیلام ہوگا، اس کے بعد پھر تمہاری بادشاہت درست ہوگی،

لیکن چونکہ دل میں کچھ خوف خدا اور آخرت کی فکر تھی، اس لئے وہ بادشاہ اس پر راضی ہوگیا۔
چنانچہ تاریخ کا یہ منفرد واقعہ ہے کہ اس بادشاہ کو اور شہزادوں کو بازار میں کھڑا کر کے نیلام کیا گیا، بولی لگائی گئی، چنانچہ ایک شخص نے ان کو خرید کر پھر معاوضہ لے کر ان کو آزاد کیا، تب جا کر بادشاہ کی بادشاہت درست ہوئی۔ ہماری تاریخ کے اندر ایسی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں، جو دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آئیں گی۔ بہرحال جس طرح ایک غلام تخت کے اوپر بیٹھا ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ سمجھ رہا ہے کہ میں غلام ہوں، اسی طرح جب تم کسی منصب پر فائز ہو جاؤ تو ساتھ ساتھ دل میں یہ سمجھو کہ تم اللہ کے بندے ہو، اگر یہ حقیقت ذہن نشین رہے گی تو کبھی اس منصب پر بیٹھ کر دوسروں پر ظلم نہیں کر سکو گے۔

عبادت میں بھی تواضع ہونا چاہئے

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمادی اب نہ تو یہ کرو کہ اس نماز کو دوسروں کے سامنے بیان کرتے پھرو کہ میں نے نماز پڑھی تھی، اور نماز پڑھ کر میں تو بڑا بزرگ ہوگیا، جیسا کہ عربی کا محاورہ مشہور ہے:

"صَلَّى الْحَائِكُ رَكْعَتَيْنِ وَانْتَظَرَ الْوَحْيَ"

ایک جولاہے کو ایک مرتبہ دو رکعتیں نفل پڑھنے کا موقع مل گیا تھا، تو اس کے بعد وحی کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا، اس نے یہ سمجھا کہ میں نے جو عمل کیا ہے وہ اتنا بڑا اعلیٰ درجہ کا عمل ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہونی چاہئے لہٰذا نہ تو یہ کرو کہ اپنے عمل کو بہت بڑا سمجھ بیٹھو، اور اپنے لئے بڑے اعزاز تجویز کرنے لگو اور نہ اپنے عمل کو اتنا حقیر سمجھو جس سے ناشکری ہو جائے، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ میری نماز کیا، میں تو اُٹھک بیٹھک کرتا ہوں۔
ایسے الفاظ مت کہو، یہ نماز کی توہین ہے بلکہ یوں کہو کہ میں تو اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، اللہ جل جلالہ کا کرم ہے کہ انہوں نے مجھے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی۔
اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بھی کسی عبادت کی توفیق ہو جائے تو دو کام کرو، ایک شکر ادا کرو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے اس عمل کی توفیق دے دی، ورنہ کتنے لوگ ہیں جن کو توفیق نہیں ہوتی، اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے توفیق دی، دوسرے استغفار کرو کہ جو کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں اس عمل میں ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دے، ان شاء اللہ ان دو عمل کی برکت سے اللہ تعالیٰ اسی عبادت کو قبول فرمالیں گے۔

کیفیات ہرگز مقصود نہیں

ہمارے دلوں میں ہر وقت یہ اشکال رہتا ہے کہ اتنے دن سے نماز پڑھ رہے ہیں، تسبیح بھی پڑھ رہے ہیں، ذکر بھی کر رہے ہیں، معمولات بھی ہیں، نفلیں بھی پڑھی ہیں، تہجد اور اشراق بھی پڑھ رہے ہیں، لیکن دل کی حالت میں تبدیلی کیوں نظر نہیں آ رہی ہے، کوئی کیفیت کیوں پیدا نہیں ہو رہی ہے؟ خوب سمجھ لو کہ یہ کیفیات ہرگز مقصود نہیں، اور جو کچھ عمل کی توفیق ہو رہی ہے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی طرف سے انعام ہے، اور یہ جو فکر ہوتی ہے کہ یہ اعمال پتہ نہیں قبول ہوتے ہیں کہ نہیں، یہ خوف دل میں ہونا چاہئے، اور یہ سوچے کہ اپنی ذات میں تو یہ عمل اس قابل نہیں تھا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے لیکن جب اس نے اس عمل کی توفیق دے دی تو اس کی رحمت سے یہ بھی اُمید ہے کہ یہ عمل قبول ہوگا۔

عبادت کے قبول ہونے کی ایک علامت

حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ان سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت! اتنے دن سے نماز پڑھ رہا ہوں، معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوتی ہے کہ نہیں۔ حضرت نے جواب میں فرمایا: ارے بھئی! اگر یہ نماز قبول نہ ہوتی تو دوسری بار پڑھنے کی توفیق نہ ہوتی، جب تم نے ایک عمل کرلیا، اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہی عمل دوبارہ کرنے کی توفیق دے دی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ پہلا عمل قبول ہے ان شاء اللہ، اس وجہ سے نہیں کہ اس عمل کی کوئی خصوصیت تھی، بلکہ اس وجہ سے کہ اس نے تمہیں توفیق دی، اس لئے اپنی نماز اور عبادتوں کو کبھی حقیر نہ سمجھو۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کردہ ایک واقعہ

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ بہت دنوں تک نمازیں پڑھتے رہے، روزے رکھتے رہے اور تسبیحات واذکار کرتے رہے، ایک دن دل میں یہ خیال آیا کہ میں اتنے عرصے سے یہ سب کچھ کر رہا ہوں، لیکن اللہ میاں کی طرف سے کوئی جواب وغیرہ تو آتا نہیں ہے معلوم نہیں، اللہ تعالیٰ کو یہ اعمال پسند ہیں یا نہیں؟ اس کی بارگاہ میں مقبول ہیں یا نہیں؟ آخر کار اپنے شیخ کے پاس جا کر عرض کیا کہ حضرت! اتنے دن سے عمل کر رہا ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آتا۔ یہ سن کر شیخ نے فرمایا: ارے بیوقوف! یہ جو تمہیں اللہ اللہ کرنے کی توفیق ہو رہی

ہے، یہ ہی ان کی طرف سے جواب ہے، اس لئے کہ اگر تمہارا عمل قبول نہ ہوتا، تو تمہیں اللہ اللہ کرنے کی توفیق نہ ہوتی، کسی اور جواب کے انتظار میں رہنے کی ضرورت نہیں

کہ گفت آں اللہ تو لبیک ماست
زیں نیاز و درد و سوزک ماست

یعنی یہ جو تو اللہ اللہ کر رہا ہے یہ اللہ اللہ کرنا ہی ہماری طرف سے لبیک کہنا ہے، یہ تیرے اللہ اللہ کا جواب ہے کہ ایک مرتبہ کرنے کے بعد دوسری مرتبہ کرنے کی توفیق دے دی۔

ڈاکٹر عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ ایک مثال

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن کسی آدمی کے پاس جاکر اس کی تعریف کرو، اور اس کے بارے میں اچھے اچھے کلمات کہو، اور تم اگلے دن پھر جاکے اس کی تعریف کرو، اور اس کے بارے میں اچھے اچھے کلمات کہو، تیسرے دن پھر جاکر اس کے تعریفی کلمات کہو، اب اگر تمہارا یہ عمل اس شخص کو پسند ہوگا تو وہ تمہاری بات سنے گا، منع نہیں کرے گا، لیکن اگر تمہارا یہ عمل اس کو پسند نہیں ہوگا تو ایک مرتبہ کرو گے، دو مرتبہ کرو گے لیکن تیسری مرتبہ وہ تمہیں باہر نکال دے گا، اور تمہیں تعریف کرنے نہیں دے گا۔

اسی طرح جب تم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کیا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو جاری رکھا، اور تمہیں دوبارہ توفیق دی، تیسری بار توفیق دی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمہارا یہ عمل اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، یہی ٹوٹا پھوٹا عمل ان کے یہاں پسند ہے انشاء اللہ، لہٰذا اس کی ناقدری مت کرو، بلکہ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

ہمارے حضرت والا قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عمل کرتے رہو، اور ہر عمل پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ یا اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے توفیق عطا فرمائی، آپ کا شکر ہے۔ میرے اندر تو کوئی طاقت ہی نہیں تھی۔ اور جب اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا خیال آئے، اس پر توبہ واستغفار کرلو، کہ یا اللہ! مجھ سے کوتاہیاں ہوئی ہیں، مجھے معاف فرمادیجئے۔ ایسا کرنے سے انشاء اللہ تواضع کا بھی حق ادا ہوجائے گا، شکر کا بھی حق ادا ہوجائے گا اور تکبر بھی پاس نہیں آئے گا۔

تواضع حاصل کرنے کا طریقہ

تواضع حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو یہ سمجھو کہ میں تو بندہ ہوں، اللہ تعالیٰ جو کچھ

میرے ذمہ میں لگادیں گے، وہ کام کروں گا۔ اب اگر وہ کہیں منصب پر بٹھا دیں تو وہ کام کروں گا، میں ان کا بندہ ہوں، غلام ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو کچھ عطا فرمایا ہے یہ محض ان کی عطا ہے، اس طرح کرنے سے شکر اور تواضع دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔

اس لئے صوفیاء کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ عارف جامع اضداد ہوتا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ معرفت عطا فرمائیں وہ ایسی چیزوں کو جمع کرتا ہے جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد نظر آتی ہیں، مثلاً ایک طرف اپنے عمل کی تحقیر بھی نہیں کرنی اور دوسری طرف اس عمل پر عجب بھی نہیں کرنا، اور یہ سوچنا کہ میری نسبت سے یہ عمل حقیر ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نسبت سے یہ عمل عظیم ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق کی نسبت سے یہ ان کا انعام ہے، یہ کرنے سے دونوں چیزیں جمع ہو جائیں گی۔

کثرت سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے

ہمارے حضرت بار بار فرمایا کرتے تھے کہ میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں، آج تمہیں اس بات کی قدر نہیں ہوگی، جب کبھی اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق دیں گے، تب تمہیں قدر معلوم ہوگی، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر کثرت سے کیا کرو، اس لئے کہ جس قدر شکر کرو گے، امراضِ باطنہ کی جڑ کٹے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت وہ باتیں واقعی اتنی سمجھ میں نہیں آتی تھیں، اب تو کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ہیں کہ یہ شکر ایسی دولت ہے جو بہت سے امراضِ باطنہ کا خاتمہ کرنے والی ہے۔ حضرت فرماتے تھے کہ میاں وہ ریاضتیں اور مجاہدے کہاں کرو گے، جو پہلے زمانے میں لوگ اپنے شیوخ کے پاس جا کر کیا کرتے تھے، رگڑے کھایا کرتے تھے، محنتیں کرتے تھے، مشقتیں اُٹھاتے تھے، بھوکے رہتے تھے، تمہارے پاس اتنا وقت کہاں؟ اور تمہارے پاس اتنی فرصت کہاں؟ بس، ایک کام کرلو۔ وہ یہ کہ کثرت سے شکر کرو، جتنا شکر کرو گے، انشاء اللہ تواضع پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تکبر دور ہوگا، امراضِ باطنہ دفع ہوں گے۔

شکر تواضع کا زینہ ہے

اور جب شکر کرو تو ذرا سوچ سمجھ کر شکر کرو کہ شکر کے معنی کیا ہیں؟ شکر کے معنی یہ ہیں کہ میں تو اس چیز کا مستحق نہیں تھا، مگر اللہ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی، اسی کا نام تواضع ہے، اگر اپنے آپ کو مستحق سمجھا تو تواضع کیا ہوئی؟ پھر شکر کیا ہوا؟ اگر ایک آدمی ایک چیز کا مستحق ہو، اور اس کو وہ چیز دی جائے تو یہ شکر کا موقع نہیں ہے، مثلاً ایک آدمی نے کسی سے قرضہ لیا، تو مقروض پر واجب ہے کہ وہ قرض خواہ کو قرض لوٹائے، کیونکہ قرض خواہ اس رقم کا مستحق ہے، اب جب مقروض یہ رقم قرض خواہ کو

لوٹائے گا، اس وقت قرض خواہ پر کوئی شکر ادا کرنا واجب نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ رقم ادا کرکے مقروض نے کوئی احسان نہیں کیا، شکر تو اس وقت ہوتا جب انسان یہ سمجھے کہ میں اس چیز کا مستحق تو تھا نہیں، مجھے استحقاق سے زیادہ کوئی چیز دی گئی لہٰذا جب کسی نعمت پر شکر ادا کرو تو ذرا سوچ لیا کرو کہ یہ نعمت میرے استحقاق میں نہیں تھی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے عطاء فرمائی، بس یہ سوچ لوگے، انشاء اللہ تواضع حاصل ہو جائے گی۔ مثلاً کوئی منصب ملا، تو سوچ لو، یا اللہ! آپ کا کرم ہے، آپ نے دے دیا، میرے بس کا تو تھا نہیں، میرے اندر طاقت نہیں تھی، میرے اندر صلاحیت نہیں تھی، مگر آپ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے عطا فرمایا، بس یہ سوچ لیا، انشاء اللہ تواضع حاصل ہوگئی، اور جب تواضع حاصل ہو جائے گی تو اس پر حضور ﷺ کا وعدہ ہے:

((مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ))

''جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بلندی فرمادیتے ہیں''

خلاصۂ کلام

ایک بات اور سمجھ لیں، وہ یہ کہ تواضع اگرچہ دل کا عمل ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دل میں بے حقیقت سمجھے، لیکن دل میں یہ بات مستحضر رکھنے کے لئے آدمی عملاً یہ کرے کہ کسی بھی کام سے اپنے آپ کو بلند نہ سمجھے اور کسی بھی کام میں عار نہ ہو، یہ نہ سوچے کہ یہ کام میرے مرتبے کا نہیں بلکہ ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کے لئے بھی تیار رہے، دوسرے یہ کہ آدمی اپنی نشست و برخاست میں، اور انداز و ادا میں، چلنے پھرنے میں ایسا طریقہ اختیار کرے، جس میں تکبر نہ ہو، بلکہ عاجزی اور انکساری ہو، اگرچہ ساری تواضع اس پر منحصر نہیں، لیکن یہ بھی تواضع کے حصول کا ایک طریقہ ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ظاہری افعال کے اندر بھی آدمی عاجزی اور انکساری اختیار کرے، اس لئے کہ اگر یہ کرلیا تو پھر انشاء اللہ دل میں بھی تواضع پیدا ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمارے اندر بھی تواضع پیدا فرمادے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

توبہ
گناہوں کا تریاق ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

وَعَنِ الْاَغَرِّ الْمُزَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ((اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ وَ اِنِّيْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ))(۱)

''حضرت اغر مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے ارشاد فرمایا'' کبھی کبھی میرے دل پر بھی بادل سا آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اللہ جل جلالہ سے روزانہ سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی استغفار فرماتے ہیں

یہ کون فرما رہے ہیں؟ وہ ذات جن کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے پاک اور معصوم پیدا فرمایا، آپ سے کسی گناہ کا صادر ہونا ممکن ہی نہیں، اور اگر کبھی آپ سے کوئی بھول چوک ہوئی بھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان فرما دیا گیا کہ آپ کی اگلی پچھلی سب بھول چوک ہماری طرف سے معاف ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾(۲)

''تاکہ اللہ آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کردے''

☆ اصلاحی خطبات (۶/۲۲ تا ۷۶)، ۳۱ دسمبر ۱۹۹۳ء، بروز جمعہ، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والإستغفار، باب استحباب الإستغفار والاستكثار منه، رقم: ۴۸۷۰، سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب الإستغفار، رقم: ۳۸۰۵، مسند أحمد، رقم: ۱۷۱۷۴ (۲) الفتح: ۲

اس کے باوجود حضورِ اقدس ﷺ فرمارہے ہیں کہ میں دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں اس حدیث کی تشریح میں علماء نے فرمایا کہ اس حدیث میں ''سو'' کا جو عدد آپ نے بیان فرمایا، اس سے گنتی بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ استغفار کی کثرت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

گناہوں کے وساوس سب کو آتے ہیں

پھر اس حدیث میں استغفار کرنے کی وجہ بھی بیان فرمادی کہ میں اتنی کثرت سے استغفار اس لئے کرتا ہوں کہ کبھی کبھی میرے دل پر بھی بادل سا چھا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی بتقاضۂ بشریت ایک نبی کے دل میں بھی خیالات اور وساوس پیدا ہو سکتے ہیں۔ کوئی آدمی نیکی اور تقویٰ کے کتنے ہی بلند مقام پر پہنچ جائے، لیکن گناہوں کی جھلکیوں سے نہیں بچ سکتا۔ نبی کریم ﷺ کا مقام تو بہت اعلیٰ اور ارفع ہے، اس مقام تک کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا، لیکن جتنے اولیاء کرام، صوفیاء عظام، بزرگانِ دین گزرے ہیں، ان میں سے کوئی ایسا نہیں کہ ان کے دل میں گناہوں کا کبھی وسوسہ اور خیال بھی نہ آیا ہو، اور کوئی خواہش بھی پیدا نہ ہوئی ہو لہٰذا گناہوں کی جھلکیاں تو بڑوں بڑوں کو آتی ہیں۔ البتہ فرق یہ ہوتا ہے کہ ہم جیسے غافل لوگ تو گناہوں کی ذرا سی جھلکی پر ہتھیار ڈال دیتے ہیں، اور گناہ کا ارتکاب کر لیتے ہیں لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماتے ہیں، ان کو بھی گناہوں کے خیالات اور وساوس آتے ہیں۔ اور دل میں گناہوں کے ارادے پیدا ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل اور مجاہدے کی برکت سے وہ خیالات، وساوس اور ارادے کمزور ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ ارادے انسان پر غالب نہیں آتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گناہ کا خیال آنے کے باوجود اس خیال پر عمل نہیں ہوتا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا﴾(۱)

یعنی زلیخا نے گناہ کی دعوت دی تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی گناہ کا تھوڑا سا خیال آگیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اس گناہ سے محفوظ رکھا۔

ایک غلط خیال کا ازالہ

لہٰذا تصوف وطریقت کے بارے میں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس میں قدم رکھنے کے بعد رذائل اور گناہوں کا بالکل ازالہ ہو جائے گا۔ اور پھر گناہوں کا بالکل خیال ہی نہیں آئے گا، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ مجاہدہ کرنے اور مشق کرنے کے نتیجے میں گناہوں کے تقاضے مغلوب اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان

(۱) یوسف: ۲٤

کا مقابلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اس طریق میں بڑی کامیابی یہی ہے کہ گناہوں کے تقاضے مغلوب اور کمزور پڑ جائیں۔ اور انسان کے اُوپر غالب نہ آنے پائیں۔ لیکن یہ سوچنا کہ مجاہدہ کرنے کے بعد دل میں گناہوں کا خیال ہی نہیں آئے گا، یہ بات محال ہے، یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔

جوانی میں توبہ کیجئے

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں گناہ کا داعیہ اور تقاضا پیدا فرمایا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا﴾ (۱)

یعنی ہم نے انسان کے دل میں گناہ کا بھی تقاضہ پیدا کیا ہے اور تقویٰ کا تقاضہ بھی پیدا کیا ہے، اسی میں تو امتحان ہے۔ اس لئے کہ اگر انسان کے دل سے گناہ کا تقاضا بالکل ختم ہوجائے اور فنا ہوجائے، تو پھر گناہوں سے بچنے میں انسان کا کیا کمال ہوا؟ پھر نہ تو نفس سے مقابلہ ہوا، اور نہ شیطان سے مقابلہ ہوا، نہ ان سے معرکہ پیش آیا۔ تو پھر جنت کس کے بدلے ملے گی؟ اس لئے کہ جنت تو اسی بات کا انعام ہے کہ دل میں گناہوں کے تقاضے اور داعیے پیدا ہو رہے ہیں، لیکن انسان ان کو شکست دے کر اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت سے اور اللہ کی عظمت اور جلال سے ان تقاضوں پر عمل نہیں کرتا۔ تب جا کر انسان کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار

یعنی بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی متقی اور پرہیزگار بن جاتا ہے، اس لئے کہ اس وقت نہ منہ میں دانت رہے، اور نہ پیٹ میں آنت رہی، اب ظلم کرنے کی طاقت ہی نہیں ہے۔ اس لئے اب پرہیزگار نہیں بنے گا تو اور کیا بنے گا! لیکن پیغمبروں کا شیوہ یہ ہے کہ آدمی جوانی کے اندر توبہ کرے، جبکہ قوت اور طاقت موجود ہے۔ اور گناہوں کا تقاضہ بھی شدت سے پیدا ہو رہا ہے۔ اور گناہ کے مواقع بھی میسر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اللہ کے خوف سے آدمی گناہوں سے بچ جائے، یہ ہے پیغمبروں کا شیوہ۔

بزرگوں کی صحبت کا اثر

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ کوئی اللہ والا ہم پر ایسی نظر ڈال دے اور اپنے سینے سے لگالے، اور سینے سے اپنے انوارات منتقل کردے اور اس کے نتیجے میں گناہ کا داعیہ ہی دل سے مٹ جائے۔ یاد

(۱) الشمس: ۸

رکھو، ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا۔ جو شخص اس خیال میں ہے وہ دھوکے میں ہے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر دنیا میں کوئی کافر باقی نہ رہتا، اس لئے کہ پھر تصرفات کے ذریعہ ساری دنیا مسلمان ہو جاتی۔

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کی خدمت میں ایک مرتبہ ایک صاحب حاضر ہوئے۔ اور کہا کہ حضرت، کچھ نصیحت فرما دیجئے۔ حضرت نے نصیحت فرما دی۔ پھر وہ صاحب رخصت ہوتے ہوئے کہنے لگے کہ حضرت! مجھے آپ اپنے سینے میں سے کچھ عطا فرما دیجئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ سینے میں سے کوئی نور نکل کر ہمارے سینے میں داخل ہو جائے، اور اس کے نتیجے میں بیڑہ پار ہو جائے اور گناہوں کی خواہش ختم ہو جائے حضرت نے جواب میں میں فرمایا کہ سینے میں سے کیا دوں، میرے سینے میں تو بلغم ہے۔ چاہے تو لے لو۔ بہر حال یہ جو خیال ہے کہ کسی بزرگ کی نگاہ پڑ جائے گی، یا سینے میں سے کچھ مل جائے گا تو سب رذائل دور ہو جائیں گے۔ یہ خیال لغو ہے۔

این خیال است و محال است و جنوں

البتہ اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی صحبت میں تاثیر ضرور رکھی ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کی فکر اور سوچ کا رخ بدل جاتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان صحیح راستے پر چل پڑتا ہے۔ مگر کام خود ہی کرنا ہوگا، اور اپنے اختیار سے کرنا ہوگا۔

ہر وقت نفس کی نگرانی ضروری ہے

بہر حال، گناہوں کے وساوس اور ارادوں کا بالکل خاتمہ نہیں ہو سکتا، چاہے کسی بڑے سے بڑے مقام تک پہنچ جائے، البتہ کمزور ضرور پڑ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص سالہا سال تک کسی بزرگ کی صحبت میں رہا، اور جو چیز بزرگوں کی صحبت میں حاصل کی جاتی ہے، وہ حاصل بھی ہوگئی، اور تکمیل بھی ہوگئی، اور دل میں خوف، خشیت اور تقویٰ پیدا ہو گیا، نسبت مع اللہ اور تعلق مع اللہ بھی حاصل ہو گیا، ان سب چیزوں کے حاصل ہو جانے کے باوجود انسان کو ہر ہر قدم پر اپنی نگرانی رکھنی پڑتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اب شیخ بن گئے، اور شیخ سے اجازت حاصل ہوگئی تو اب اپنے آپ سے، اپنے نفس سے غافل ہو گئے، اور یہ سوچا کہ اب تو ہم پہنچ گئے۔ اس مقام پر پہنچ گئے کہ اب تو نفس اور شیطان بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، یہ خیال بالکل غلط ہے، اس لئے کہ شیخ کی صحبت کی برکت سے اتنا ضرور ہوا کہ گناہ کا داعیہ کمزور پڑ گیا۔ لیکن نفس کی نگرانی پھر بھی ہر وقت رکھنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ کسی وقت بھی یہ داعیہ دوبارہ زندہ ہو کر انسان کو پریشان کر سکتا ہے، اس لئے فرمایا کہ۔

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

یعنی اس راہ میں تراش وخراش ہمیشہ کی ہے، حتیٰ کہ آخری سانس آنے تک کسی وقت بھی غافل ہوکرمت بیٹھنا، اس لئے کہ یہ نفس کسی وقت بھی انسان کو دھوکہ دے سکتا ہے۔

ایک لکڑ ہارے کا قصہ

مثنوی میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک لکڑ ہارا تھا۔ جو جنگل سے جاکر لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتا تھا۔ اور ان کو بازار میں بیچ دیتا تھا، ایک مرتبہ جب لکڑیاں کاٹ کر لایا۔ لکڑیوں کے ساتھ ایک بڑا سانپ بھی لپٹ کر آگیا، اس کو پتہ نہیں چلا۔ لیکن جب گھر پہنچا تو تب اس نے دیکھا کہ ایک سانپ بھی آگیا ہے۔ البتہ اس میں جان نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ مردہ ہے، اس لئے اس لکڑ ہارے نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ وہیں گھر کے اندر ہی رہنے دیا۔ باہر نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، لیکن جب اس کو گرمی پہنچی تو اس کے اندر حرکت پیدا ہونی شروع ہوگئی، اور آہستہ آہستہ اس نے رینگنا شروع کردیا، لکڑ ہارا غفلت میں لیٹا ہوا تھا۔ اس سانپ نے جاکر اس کو ڈس لیا، اب گھر والے پریشان ہوئے کہ یہ تو مردہ سانپ تھا۔ کیسے زندہ ہوکر اس نے ڈس لیا؟

نفس بھی ایک اژدہا ہے

یہ قصہ نقل کرنے کے بعد مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کے نفس کا بھی یہی حال ہے۔ جب انسان کسی اللہ والے کی صحبت میں رہ کر مجاہدات اور ریاضتیں کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں یہ نفس کمزور ہوجاتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اب مردہ ہو چکا ہے، لیکن حقیقت میں وہ مردہ نہیں ہوتا۔ اگر انسان اس کی طرف سے غافل ہوجائے تو کسی بھی وقت زندہ ہوکر ڈس لے گا، چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔

نفس اژدہا است مردہ است
از غمِ بے آلتی افسردہ است

یعنی یہ انسان کا نفس بھی اژدہا کے مانند ہے، ابھی مرا نہیں ہے، لیکن چونکہ مجاہدے اور ریاضتیں کرنے کی چوٹیں اس پر پڑی ہیں، اس لئے یہ افسردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن کسی وقت بھی زندہ ہوکر ڈس لے گا۔ لہٰذا کسی لمحے بھی نفس سے غافل ہوکر مت بیٹھو۔

گناہوں کا تریاق ”استغفار“ اور توبہ

لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے نفس اور شیطان دو زہریلی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، جو انسان کو

پریشان اور خراب کرتی ہیں، اور جہنم کے عذاب کی طرف انسان کو لے جانا چاہتی ہیں۔ اسی طرح ان دونوں کا تریاق بھی بڑا زبردست پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت سے یہ بات بعید تھی کہ زہر تو پیدا فرمادیتے اور اس کا تریاق پیدا نہ فرماتے، اور وہ تریاق اتنا زبردست پیدا فرمایا کہ فوراً اس زہر کا اثر ختم کردیتا ہے، وہ تریاق ہے "استغفار"، "توبہ"، لہٰذا جب بھی یہ نفس کا سانپ تمہیں ڈسے، یا اس کے ڈسنے کا اندیشہ ہو تو تم فوراً یہ تریاق استعمال کرتے ہوئے کہو:

"أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ"

یہ تریاق اس زہر کا سارا اثر ختم کردے گا۔ بہرحال، جو بیماری یا زہر اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اس کا تریاق بھی پیدا فرمایا۔

قدرت کا عجیب کرشمہ

ایک مرتبہ میں جنوبی افریقہ میں کیپ ٹاؤن کے علاقے میں ریل گاڑی پر سفر کررہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ پہاڑی علاقے میں گاڑی رک گئی، ہم نماز کے لئے نیچے اترے، وہاں میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت پودا ہے، اس کے پتے بہت خوبصورت تھے اور وہ پودا بہت حسین و جمیل معلوم ہورہا تھا۔ بے اختیار دل چاہا کہ اس کے پتے کو توڑلیں۔ میں نے جیسے ہی اس کے پتے کو توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میرے جو رہنما تھے، وہ ایک دم زور سے چیخ پڑے کہ حضرت! اس کو ہاتھ مت لگائیے گا۔ میں نے پوچھا: کیوں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ بہت زہریلی جھاڑی ہے۔ اس کے پتے دیکھنے میں تو بہت خوشنما ہیں۔ لیکن یہ اتنا زہریلا ہے کہ اس کے چھونے سے انسان کے جسم میں زہر چڑھ جاتا ہے اور جس طرح بچھو کے ڈسنے سے زہر کی لہریں اُٹھتی ہیں، اسی طرح اس کے چھونے سے بھی لہریں اُٹھتی ہیں میں نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ اور پہلے سے معلوم ہوگیا۔ یہ تو بڑی خطرناک چیز ہے، دیکھنے میں بڑی خوبصورت ہے پھر میں نے ان سے کہا کہ یہ معاملہ تو بڑا خطرناک ہے۔ اس لئے کہ آپ نے مجھے تو بتادیا جس کی وجہ سے میں بچ گیا۔ لیکن اگر کوئی انجان آدمی جاکر اس کو ہاتھ لگادے، وہ تو مصیبت اور تکلیف میں مبتلا ہوجائے گا۔

اس پر انہوں نے اس سے بھی زیادہ عجیب بات بتائی۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ جہاں کہیں یہ زہریلی جھاڑی ہوتی ہے، اسی کی جڑ میں آس پاس لازماً ایک پودا اور ہوتا ہے، لہٰذا اگر کسی شخص کا ہاتھ اس زہریلے پودے پر لگ جائے تو وہ فوراً اس دوسرے پودے کے پتے کو ہاتھ لگادے۔ اسی وقت اس کا زہر ختم ہوجائے گا چنانچہ انہوں نے اسی کی جڑ میں وہ دوسرا پودا بھی دکھایا۔ یہ اس کا تریاق ہے۔

بس یہی مثال ہے ہمارے گناہوں کی اور استغفار و توبہ کی، لہٰذا جہاں کہیں گناہ کا زہر چڑھ جائے تو فوراً توبہ استغفار کا تریاق استعمال کرو۔ اسی وقت اس گناہ کا زہر اتر جائے گا۔

خلیفۃ الارض کو تریاق دے کر بھیجا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر گناہ کی صلاحیت رکھی، اور پھر اس کو خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیجا، اور جس مخلوق میں گناہ کرنے کی صلاحیت نہیں تھی، اس کو اپنا خلیفہ بنانے کا اہل بھی قرار نہیں دیا، یعنی فرشتے کہ ان کے اندر گناہ کرنے کی صلاحیت اور اہلیت موجود نہیں، تو وہ خلافت کے بھی اہل نہیں اور انسان کے اندر گناہ کی صلاحیت بھی رکھی، اور دنیا کے اندر بھیجنے سے پہلے نمونے اور مشق کے طور پر ایک غلطی بھی کروائی گئی، چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں بھیجا گیا تو یہ کہہ دیا گیا کہ پوری جنت میں جہاں چاہو جاؤ۔ جو چاہو کھاؤ۔ مگر اس درخت کو مت کھانا۔ اس کے بعد شیطان جنت میں پہنچ گیا۔ اور اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکا دیا۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے اس درخت کو کھا لیا۔ اور غلطی سرزد ہوگئی یہ غلطی ان سے کروائی گئی، اس لئے کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن غلطی کروانے کے بعد ان کے اندر پریشانی، شرمندگی پیدا ہوئی کہ یا اللہ مجھ سے کیسی غلطی ہوگئی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو چند کلمات سکھائے۔ اور ان سے فرمایا کہ اب تم یہ کلمات کہو:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾(۱)

قرآن کریم میں یہ فرمایا کہ ہم نے یہ کلمات حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے، یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تھا کہ یہ کلمات ان کو سکھائے بغیر اور ان سے کہلوائے بغیر ویسے ہی معاف فرما دیتے، اور ان سے کہہ دیتے کہ ہم نے تمہیں معاف کر دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں؟ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ کرا کر ان کو بتا دیا کہ جس دنیا میں تم جا رہے ہو، وہاں یہ سب کچھ ہوگا، وہاں بھی شیطان تمہارے پاس آئے گا، اور نفس بھی لگا ہوا ہوگا۔ اور کبھی تم سے کوئی گناہ کرائے گا۔ کبھی کوئی گناہ کرائے گا۔ اور تم جب تک ان کے لئے اپنے ساتھ تریاق لے کر نہیں جاؤ گے، اس وقت تک دنیا میں صحیح زندگی نہیں گزار سکو گے۔ وہ تریاق ہے "استغفار اور توبہ" لہٰذا غلطی اور استغفار دونوں چیزیں ان کو سکھا کر پھر فرمایا کہ اب دنیا میں جاؤ۔ اور یہ تریاق بھی بہت آسان ہے کہ زبان سے استغفار کر لے تو انشاء اللہ وہ گناہ معاف ہو جائے گا۔

---

(۱) الأعراف: ۲۳، اس قرآنی دعا کا ترجمہ یہ ہے: "اے ہمارے پروردگار! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گزرے ہیں اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں شامل ہو جائیں گے"

''توبہ'' تین چیزوں کا مجموعہ

عام طور پر دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ایک ''استغفار'' اور ایک ''توبہ''، اصل ان میں سے ''توبہ'' ہے اور ''استغفار'' اس توبہ کی طرف جانے والا راستہ ہے، اور یہ ''توبہ'' تین چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جب تک یہ تین چیزیں جمع نہ ہوں، اس وقت تک توبہ کامل نہیں ہوتی۔ایک یہ کہ جو غلطی اور گناہ سرزد ہوا ہے اس پر ندامت اور شرمندگی ہو، پشیمانی اور دل شکستگی ہو۔دوسرے یہ کہ جو گناہ ہوا، اس کو فی الحال فوراً چھوڑ دے، اور تیسرے یہ کہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کامل ہو، جب تین چیزیں جمع ہو جائیں، تب توبہ مکمل ہوتی ہے۔اور جب توبہ کر لی تو وہ توبہ کرنے والا شخص گناہ سے پاک ہو گیا، حدیث شریف میں ہے:

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهُ))(۱)

یعنی جس نے گناہ سے توبہ کر لی، وہ ایسا ہو گیا جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں، صرف یہ نہیں کہ اس کی توبہ قبول کر لی، اور نامۂ اعمال کے اندر یہ لکھ دیا کہ اس نے فلاں گناہ کیا تھا وہ گناہ معاف کر دیا گیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم دیکھئے کہ توبہ کرنے والے کے نامۂ اعمال ہی سے وہ گناہ مٹا دیتے ہیں، اور آخرت میں اس گناہ کا ذکر فکر بھی نہیں ہو گا کہ اس بندہ نے فلاں وقت میں فلاں گناہ کیا تھا۔

''کراماً کاتبین'' میں ایک امیر اور ایک مامور

میں نے ایک بات اپنے شیخ سے سنی، کسی کتاب میں نہیں دیکھی۔وہ یہ کہ ہر انسان کے ساتھ یہ جو دو فرشتے ہیں۔جن کو ''کراماً کاتبین'' کہا جاتا ہے، جو انسان کی نیکیاں اور برائیاں لکھتے ہیں، دائیں طرف والا فرشتہ نیکیاں لکھتا ہے، اور بائیں طرف والا فرشتہ برائیاں لکھتا ہے، تو میرے شیخ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دائیں طرف والے فرشتے کو بائیں طرف والے فرشتے کا امیر مقرر کیا ہے۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جہاں کہیں دو آدمی مل کر کام کریں تو ان میں سے ایک امیر ہو اور دوسرا مامور ہو۔لہٰذا جب انسان کوئی نیک عمل کرتا ہے تو دائیں طرف والا فرشتہ فوراً اس نیکی کو لکھ لیتا ہے۔اس لئے کہ اس کو نیکی لکھنے میں دوسرے فرشتے سے پوچھنے کی حاجت اور ضرورت نہیں، کیونکہ وہ امیر ہے۔ اور بائیں طرف والا فرشتہ چونکہ دائیں طرف والے فرشتے کا ماتحت ہے، اس لئے جب بندہ کوئی گناہ اور غلطی کرتا ہے، تو بائیں طرف والا فرشتہ دائیں طرف والے فرشتے سے پوچھتا ہے کہ اس بندہ نے فلاں گناہ کیا ہے میں اس کو لکھوں یا نہیں؟ تو دائیں طرف والا فرشتہ کہتا ہے، نہیں، ابھی مت لکھو، ابھی

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، رقم: ٤٢٤٠

ٹھہر جاؤ، ہوسکتا ہے کہ یہ بندہ توبہ کرلے، اگر لکھ لوگے تو پھر مٹانا پڑے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر پوچھتا ہے کہ اب لکھ لوں! وہ کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ یہ توبہ کرلے، پھر جب تیسری مرتبہ یہ فرشتہ پوچھتا ہے، اور بندہ اس وقت تک توبہ نہیں کرتا تو اس وقت کہتا ہے کہ اب لکھ لو۔

صد بار گر توبہ شکستی......

اللہ تعالیٰ کی رحمت یہ ہے کہ بندہ کو گناہ کے بعد مہلت دیتے ہیں، کہ وہ گناہ سے توبہ کرلے، معافی مانگ لے۔ تاکہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھنا ہی نہ پڑے، لیکن کوئی شخص توبہ نہ کرے تو پھر لکھ دیا جاتا ہے، اور اس کے لکھنے کے بعد بھی مرتے دم تک دروازہ کھلا ہے کہ جب چاہو، توبہ کرلو، اس کو اپنے نامۂ اعمال سے مٹوالو۔ ایک مرتبہ جب سچے دل سے توبہ کرلو گے تو وہ گناہ تمہارے نامۂ اعمال سے مٹادیا جائے گا، اور جب تک نزع کی حالت اور غرغرہ کی حالت طاری نہ ہو، اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے، ''اللہ اکبر'' کیسے کریم اور رحیم کی بارگاہ ہے۔ فرمایا:

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
از کفر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار گر توبہ شکستی باز آ

اگر سو بار توبہ ٹوٹ گئی ہے، تو پھر توبہ کرلو، اور گناہ سے رک جاؤ۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔

رات کو سونے سے پہلے توبہ کرلیا کرو

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ بڑے عجیب و غریب بزرگ تھے۔ جن لوگوں نے ان کی زیارت کی ہے، وہ ان کے مقام سے واقف ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو عجیب فہم و فراست عطا فرمائی تھی۔ عجیب باتیں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ توبہ پر بیان فرما رہے تھے، میں بھی قریب میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے چٹکلے ہوا کرتے تھے۔ ایک آزاد منش نوجوان اس مجلس میں آگیا وہ اپنے کسی مقصد سے آیا تھا، مگر یہ اللہ والے تو ہر وقت سکھانے اور تربیت کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، چنانچہ اس نوجوان سے فرمانے لگے کہ میاں! لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ دین بڑا مشکل ہے، ارے یہ دین کچھ بھی مشکل نہیں، بس رات کو بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلیا کرو۔ بس یہی سارا دین ہے۔

گناہ کا اندیشہ عزم کے منافی نہیں

جب وہ نوجوان چلا گیا تو میں نے کہا کہ حضرت! یہ توبہ واقعی بڑی عجیب وغریب چیز ہے۔ لیکن دل میں ایک سوال رہتا ہے، جس کی وجہ سے بے چینی رہتی ہے۔ فرمانے لگے کہ کیا؟ میں نے کہا کہ حضرت! توبہ کی تین شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ دل میں ندامت ہو، دوسرے یہ کہ فوراً اس گناہ کو چھوڑ دے، تیسرے یہ کہ آئندہ کے لئے یہ عزم کرلے کہ آئندہ یہ گناہ کبھی نہیں کروں گا۔ ان میں سے پہلی دو باتوں پر تو عمل کرنا آسان ہے کہ گناہ پر ندامت بھی ہوجاتی ہے، اور اس گناہ کو اس وقت چھوڑ بھی دیا جاتا ہے لیکن تیسری شرط کہ یہ پختہ عزم کرنا کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا، یہ بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور پتہ نہیں چلتا کہ یہ پختہ عزم صحیح ہوا یا نہیں؟ اور جب عزم صحیح نہیں ہوا تو توبہ بھی صحیح نہیں ہوئی، اور جب توبہ صحیح نہیں ہوئی تو اس گناہ کے باقی رہنے اور اس کے معاف نہ ہونے کی پریشانی رہتی ہے۔

جواب میں حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جاؤ میاں، تم تو عزم کا مطلب بھی نہیں سمجھتے، عزم کا مطلب یہ ہے کہ اپنی طرف سے یہ ارادہ کرلو کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا، اب اگر یہ ارادہ کرتے وقت دل میں یہ دھڑکا اور اندیشہ لگا ہوا ہے کہ پتہ نہیں، میں اس عزم پر ثابت قدم رہ سکوں گا یا نہیں؟ تو اندیشہ اور دھڑکا اس عزم کے منافی نہیں۔ اور اس اندیشے اور خطرے کی وجہ سے توبہ میں کوئی نقص نہیں آتا، بشرطیکہ اپنی طرف سے پختہ ارادہ کرلیا ہو، اور دل میں یہ جو خطرہ لگا ہوا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ توبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرلو کہ یا اللہ! میں توبہ تو کر رہا ہوں، اور آئندہ نہ کرنے کا عزم تو کر رہا ہوں۔ لیکن میں کیا اور میرا عزم کیا؟ میں کمزور ہوں، معلوم نہیں کہ اس عزم پر ثابت قدم رہ سکوں گا یا نہیں؟ یا اللہ! آپ ہی مجھے اس عزم پر ثابت قدم فرمادیجئے۔ آپ ہی مجھے استقامت عطا فرمایئے۔ جب یہ دعا کرلی تو انشاء اللہ وہ خطرہ اور اندیشہ زائل ہوجائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت حضرت بابا صاحب نے یہ بات ارشاد فرمائی، اس کے بعد سے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی۔

مایوسی بھی ایک رکاوٹ ہے

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں، حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جب تک تمہیں گناہوں سے ڈر لگتا ہو، اور گناہ کرکے دل میں ندامت پیدا ہوتی ہو، اس وقت تک مایوسی کا کوئی جواز نہیں۔ ہاں، یہ بات بڑی خطرناک ہے کہ دل سے گناہ کا ڈر مٹ جائے، اور گناہ کرنے کے بعد دل میں کوئی ندامت پیدا نہ ہو، اور انسان گناہ پر سینہ زوری

کرنے لگے، اور اس گناہ کو جائز کرنے کے لئے تاویلیں کرنا شروع کردے۔ البتہ جب تک دل میں ندامت پیدا ہوتی ہو، اس وقت تک مایوسی کا کوئی راستہ نہیں۔ ہمارے حضرت یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

سوئے نومیدی مرو کہ امیدہا ست
سوئے تاریکی مرو خورشیدہا ست

یعنی ناامیدی کی طرف مت جاؤ، کیونکہ امید کے راستے بیشمار ہیں۔ تاریکی کی طرف مت جاؤ کیونکہ بیشمار سورج موجود ہیں۔ لہٰذا توبہ کرلو تو گناہ سب ختم ہوجائیں گے۔

شیطان مایوسی پیدا کرتا ہے

اور جب تک اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھولا ہوا ہے تو پھر مایوسی کیسی؟ یہ جو بعض اوقات ہمارے دل میں خیال آتا ہے کہ ہم تو بڑے مردود ہوگئے ہیں، ہم سے عمل وغیرہ ہوتے نہیں ہیں، گناہوں میں مبتلا ہیں، اس خیال کے بعد مایوسی دل میں پیدا ہوجاتی ہے۔ یاد رکھو! یہ مایوسی پیدا کرنا بھی شیطان کا حربہ ہے، اس لئے کہ شیطان دل میں مایوسی پیدا کرکے انسان کو بے عمل بنانا چاہتا ہے ارے تم یہ دیکھو کہ جس بندہ کا مالک اتنا رحمٰن اور رحیم ہے کہ اس نے مرتے دم تک توبہ کا دروازہ کھول دیا ہے، اور یہ اعلان کردیا ہے کہ جو بندہ توبہ کرلے گا، اس کے گناہ نامۂ اعمال سے بھی مٹادیں گے، کیا وہ بندہ پھر بھی مایوس ہوجائے؟ اس کو مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوکر استغفار کرے، اور توبہ کرے۔ سب گناہ معاف ہوجائیں گے۔

ایسی تیسی میرے گناہوں کی

ارے ان گناہوں کی کیا حقیقت ہے؟ توبہ کے ذریعے ایک منٹ میں سب اُڑ جاتے ہیں، چاہے بڑے سے بڑے گناہ کیوں نہ ہوں۔ وہی حضرت بابا نجم احسن صاحب قدس اللہ سرہ، بڑے اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کے اشعار ہم جیسے لوگوں کے لئے بڑی تسلی کے شعر ہوتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

دولتیں مل گئی ہیں آہوں کی
ایسی تیسی میرے گناہوں کی

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے آہوں کی دولت عطا فرمادی کہ دل ندامت سے سلگ رہا ہے، اور انسان اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہے، اور اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا ہے، اور ندامت کا اظہار کررہا

ہے تو پھر یہ گناہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے؟ لہٰذا جب توبہ کا راستہ کھلا ہوا ہے تو اب مایوسی کا یہاں گزر نہیں۔

استغفار کا درست مطلب

بہرحال، ''توبہ'' کے اندر تین چیزیں شرط ہیں، ان کے بغیر توبہ کامل نہیں ہوتی دوسری چیز ہے ''استغفار''۔ یہ ''استغفار'' توبہ کے مقابلے میں عام ہے۔ استغفار کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا مانگنا، اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگنا حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''استغفار'' کے اندر یہ تین چیزیں شرط نہیں، بلکہ استغفار ہر انسان ہر حالت میں کرسکتا ہے۔ جب کوئی غلطی ہو جائے یا دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو جائے، یا عبادت میں کوتاہی ہو جائے، یا کسی بھی طرح کی کوئی غلطی سرزد ہو جائے، تو فوراً استغفار کرے اور کہے:

''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ.''

کیا ایسا شخص مایوس ہو جائے؟

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مؤمن کے لئے اصل راستہ تو یہ ہے کہ وہ توبہ کرے، اور تینوں شرائط کے ساتھ کرے، لیکن بعض اوقات ایک شخص بہت سے گناہ چھوڑ دیتا ہے۔ اور جن گناہوں میں مبتلا ہے، ان کو بھی چھوڑنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے، لیکن ایک گناہ ایسا رہ گیا، جس کو چھوڑنے پر کوشش کے باوجود وہ قادر نہیں ہو رہا ہے، بلکہ حالات یا ماحول کی وجہ سے مغلوب ہے، اور اس گناہ کو چھوڑ نہیں پا رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسا شخص توبہ سے مایوس اور نا امید ہو کر بیٹھ جائے کہ میں اس کے چھوڑنے پر قادر نہیں، اس لئے میں تو تباہ ہو گیا۔

حرام روزگار والا شخص کیا کرے؟

مثلاً ایک شخص بینک میں ملازم ہے، اور بینک کی ملازمت ناجائز اور حرام ہے۔ لیکن اس لئے کہ سود کی آمدنی ہے۔ جب وہ دین کی طرف آیا، اور آہستہ آہستہ اس نے بہت سے گناہ چھوڑ دیئے، نماز، روزہ شروع کر دیا۔ اور شریعت کے دوسرے احکام پر بھی عمل کرنا شروع کر دیا۔ اب وہ دل سے تو یہ چاہتا ہے کہ میں اس حرام آمدنی سے بھی کسی طرح بچ جاؤں، اور بینک کی ملازمت چھوڑ دوں۔ لیکن اس کے بیوی بچے ہیں، ان کی معاش اور حقوق کی ذمہ داری بھی اس کے اوپر ہے، اب اگر وہ ملازمت چھوڑ کر الگ ہو جائے تو خطرہ اس بات کا ہے کہ پریشانی اور تکلیف میں مبتلا ہو جائے۔ جس کی وجہ سے وہ بینک کی ملازمت چھوڑنے پر قادر نہیں ہو رہا ہے، البتہ دوسری جائز ملازمت کی تلاش میں بھی لگا ہوا

ہے (بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایسا شخص دوسری ملازمت اس طرح تلاش کرے، جس طرح ایک بے روزگار آدمی ملازمت تلاش کرتا ہے) تو کیا ایسا شخص مایوس ہو کر بیٹھ جائے؟ اس لئے کہ مجبوری کی وجہ سے ملازمت چھوڑ نہیں سکتا، جس کی وجہ سے چھوڑنے کا عزم بھی نہیں کر سکتا، جبکہ توبہ کے اندر چھوڑنے پر عزم کرنا شرط ہے، تو کیا ایسے مبتلا شخص کے لئے توبہ کا کوئی راستہ نہیں ہے؟

ایسا شخص توبہ نہیں، استغفار کرے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کے لئے بھی راستہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ سنجیدگی سے کوشش کرنے کے باوجود جب تک کوئی جائز اور حلال روزگار نہیں ملتا، اس وقت تک ملازمت نہ چھوڑے، لیکن ساتھ ساتھ اس پر استغفار بھی کرتا رہے۔ اس وقت توبہ نہیں کر سکتا، اس لئے کہ توبہ کے لئے گناہ کا چھوڑنا شرط ہے اور یہاں وہ ملازمت چھوڑنے پر قادر نہیں، اس لئے توبہ نہیں ہو سکتی، البتہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے، اور یہ کہے کہ یا اللہ! یہ کام تو غلط ہے، اور گناہ ہے، مجھے اس پر ندامت اور شرمندگی بھی ہے، لیکن یا اللہ! میں مجبور ہوں، اور اس کے چھوڑنے پر قادر نہیں ہو رہا ہوں، مجھے اپنی رحمت سے معاف فرما دیجئے، اور مجھے اس گناہ سے نکال دیجئے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی یہ کام کرے گا تو انشاء اللہ ایک نہ ایک دن آئندہ چل کر اس کو گناہ چھوڑنے کی توفیق ہو ہی جائے گی۔ اور ایک حدیث سے استدلال کیا، وہ یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ))(١)

یعنی جو شخص استغفار کرے، وہ اصرار کرنے والوں میں شمار نہیں ہوتا، اسی بات کو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾(٢)

(١) سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب في دعاء النبي، رقم: ٣٤٨٢، سنن أبي داؤد، كتاب في الاستغفار، رقم: ١٢٩٣

(٢) آل عمران: ١٣٥، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اور یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر کبھی کوئی بے حیائی کا کام کر بھی بیٹھتے ہیں یا (کسی اور طرح) اپنی جان پر ظلم کر گذرتے ہیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں... اور اللہ کے سوا ہے بھی کون جو گناہوں کی معافی دے؟... اور یہ اپنے کئے پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے"

یعنی اللہ کے نیک بندے وہ ہیں کہ اگر کبھی ان سے غلطی ہو جائے، یا اپنی جانوں پر ظلم کر لیں تو اس وقت وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کی مغفرت کرے اور جو گناہ انہوں نے کیا ہے، اس پر اصرار نہیں کرتے۔

اس لئے استغفار تو ہر حال میں کرتے رہنا چاہئے، اگر کسی گناہ کے چھوڑنے پر قدرت نہیں ہو رہی ہے، تب بھی استغفار نہ چھوڑے۔ بعض بزرگوں نے یہاں تک فرمایا کہ جس زمین پر گناہ اور غلطی سرزد ہوئی ہے، اسی زمین پر استغفار کر لے۔ تاکہ جس وقت وہ زمین تمہارے گناہ کی گواہی دے اس کے ساتھ وہ تمہارے استغفار کی بھی گواہی دے کہ اس بندہ نے ہمارے سامنے استغفار بھی کر لیا تھا۔

استغفار کے بہترین الفاظ

نبی کریم ﷺ پر قربان جایئے، آپ استغفار کے لئے ایسے ایسے الفاظ اُمت کو سکھا گئے کہ اگر کوئی انسان اپنے ذہن سے سوچ کر ان الفاظ تک پہنچنے کی کوشش بھی کرتا تو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ فرمایا:

((رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ، وَاعْفُ عَنَّا وَتَكَرَّمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمْ، فَإِنَّكَ تَعْلَمُ مَا لَا نَعْلَمُ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعَزُّ الْأَكْرَمُ))(۱)

جب حضورِ اقدس ﷺ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کیا کرتے تھے، اس وقت آپ میلین اخضرین (سبز نشان) کے درمیان یہ دعا پڑھا کرتے تھے یعنی اے اللہ! میری مغفرت فرمایئے، اور مجھ پر رحم فرمایئے، اور میرے جو گناہ آپ کے علم میں ہیں، وہ سب معاف فرما دیجئے، اس لئے کہ آپکے علم میں ہمارے وہ گناہ بھی ہیں، جن کا علم ہمیں بھی نہیں ہے، بیشک آپ ہی سب سے زیادہ معزز اور مکرم ہیں۔

دیکھئے! بہت سے گناہ ایسے ہوتے ہیں، جو حقیقت میں گناہ ہیں۔ لیکن ہمیں ان کے گناہ ہونے کا احساس نہیں ہوتا، اور بعض اوقات علم نہیں ہوتا، اب کہاں تک انسان اپنے گناہوں کو شمار کر کے ان کا احاطہ کرے گا؟ اس لئے دعا میں فرما دیا کہ جتنے گناہ آپ کے علم میں ہیں، یا اللہ ان سب کو معاف فرما۔

”سیّدالاستغفار“ کو معمول بنایئے

بہتر یہ ہے کہ ”سیدالاستغفار“ (استغفار کا سردار) کو یاد کر لیں۔ اور اسے پڑھا کریں۔ اس کا

(۱) إحياء علوم الدين (۷۳/۳)

معمول بنالیں:

((اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّیْ لَآ إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَأَنَا عَبْدُكَ وَأَنَا عَلٰی عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ. أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ وَأَبُوْءُ لَكَ بِذَنْبِیْ، فَاغْفِرْ لِیْ ذُنُوْبِیْ، فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ))(۱)

جس کا ترجمہ یہ ہے:

''یا اللہ! آپ میرے پروردگار ہیں۔ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ نے مجھے پیدا کیا، میں آپ کا بندہ ہوں، اور میں حتی الوسع آپ سے کیے ہوئے عہد اور وعدے پر قائم ہوں، میں نے جو کچھ کیا اس کے شر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، آپ نے جو نعمتیں مجھے عطا فرمائیں انہیں لے کر آپ سے رجوع کرتا ہوں، اور اپنے گناہ سے بھی آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ لہٰذا میرے گناہ معاف فرمادیجئے۔ کیونکہ آپ کے سوا کوئی گناہ کی مغفرت نہیں کرتا''

حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص صبح کے وقت اس کو پورے یقین کے ساتھ پڑھے، تو اگر شام تک اس کا انتقال ہوگیا تو سیدھا جنت میں جائے گا، اور اگر کوئی شخص شام کے وقت پڑھ لے، اور صبح تک اس کا انتقال ہوگیا تو سیدھا جنت میں جائے گا لہٰذا صبح شام اس سیّدالاستغفار کے پڑھنے کا معمول بنالیں، بلکہ ہر نماز کے بعد اس کو ایک مرتبہ پڑھ لیا کریں، اس لئے کہ اس کو حضور اقدس ﷺ نے سیّدالاستغفار کا لقب دیا۔ یعنی یہ تمام استغفاروں کا سردار ہے۔ جب استغفار کے یہ کلمات اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو سکھا رہے ہیں، اور نبی کریم ﷺ اپنی اُمت کو سکھا رہے ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ اس استغفار کے ذریعہ اپنے بندوں کو نوازنا ہی چاہتے ہیں، اور مغفرت کرنا ہی چاہتے ہیں، اس لئے اس کو معمولات میں ضرور شامل کرلیں۔ اگر چاہیں تو استغفار کے مختصر الفاظ بھی یاد کرلیں، وہ یہ ہیں:

''أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ''

اور اگر صرف ''استغفر اللہ'' ہی پڑھ لیا کریں تو بھی ٹھیک ہے۔

(۱) صحیح البخاری، كتاب الدعوات، باب أفضل الإستغفار، رقم: ۵۸۳۱، سنن الترمذی، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب منه، رقم: ۳۳۱۵، سنن النسائی، كتاب الإستعاذة، باب الإستعاذة من شر ما صنع، رقم: ۵۴۲۷، سنن أبی داؤد، كتاب الأدب، باب ما يقول إذا أصبح، رقم: ۴۴۰۸، سنن ابن ماجه، كتاب الدعاء، باب ما يدعو به الرجل إذا أصبح وإذا أمسى، رقم: ۳۸۶۲، مسند أحمد، رقم: ۱۶۴۸۸

توبہ اللہ کو محبوب ہے

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَذَهَبَ اللّٰهُ تَعَالٰی بِکُمْ وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ یُذْنِبُوْنَ فَیَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ تَعَالٰی فَیَغْفِرُ لَهُمْ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ (حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی بات زور دے کر تاکید اور اہتمام کے ساتھ بیان کرنی مقصود ہوتی تو قسم کھا کر وہ بات بیان فرماتے، اور قسم میں بھی یہ الفاظ فرماتے کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے) اگر تم بالکل گناہ نہ کرو، تو اللہ تعالیٰ تمہارا وجود ختم کر دیں، اور ایسے لوگوں کو پیدا کریں جو گناہ کریں، اور پھر استغفار کریں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمادیں۔

انسان کے اندر گناہ کی صلاحیت پیدا کی

اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا کہ اگر انسان کی تخلیق سے یہ مقصود ہوتا کہ ہم ایسی مخلوق پیدا کریں، جس کے اندر گناہ کرنے کی صلاحیت ہی موجود نہ ہو، تو پھر انسان کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، پھر تو فرشتے بھی کافی تھے۔ اس لئے کہ وہ ایسی مخلوق ہے جو ہر وقت طاعت اور عبادت ہی میں لگی رہتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس ہی میں مشغول رہتی ہے، اس میں گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں، اگر گناہ کرنا چاہے تو بھی نہیں کر سکتی۔

لیکن انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے نیکی اور گناہ دونوں کی صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اور پیش نظر یہ تھا کہ انسان میں گناہوں کی صلاحیت ہونے کے باوجود وہ گناہوں سے پرہیز کرے۔ اور اگر کبھی کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً استغفار کرے۔ اب اگر انسان یہ عمل نہ کرے تو اس کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر تو فرشتے ہی کافی تھے۔ چنانچہ جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا جارہا تھا تو فرشتوں نے یہی کہا تھا کہ یہ آپ کونسی مخلوق پیدا فرمارہے ہیں، جو زمین پر خونریزی کرے گی، فساد مچائے گی، اور ہم آپ کی تسبیح و تقدیس میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا:

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب سقوط الذنب بالإستغفار توبة، رقم: ٤٩٣٦، مسند أحمد، رقم: ٧٧٣٦

﴿إِنِّيْٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾(۱)
''میں وہ باتیں جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے''

یہ فرشتوں کا کمال نہیں

اس لئے کہ گناہ کی صلاحیت ہونے کے باوجود جب یہ مخلوق گناہوں سے اجتناب کرے گی تو یہ تم سے بھی آگے بڑھ جائے گی، اس لئے کہ تم جو گناہوں سے بچ رہے ہو، اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں۔ کیونکہ تمہارے اندر گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔

مثلاً ایک آدمی نابینا ہے، اس کو کچھ دکھائی نہیں دیتا، اگر وہ کسی غیر محرم کو نہ دیکھے، فلم نہ دیکھے، فحش قسم کی تصویر نہ دیکھے تو اس میں اس کا کیا کمال ہے؟ اس لئے کہ اس کے اندر دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں، وہ اگر دیکھنا بھی چاہے تو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن ایک شخص وہ ہے جس کی بینائی کامل ہے، ہر چیز دیکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور اس کے دل میں خواہشات، اُمنگیں اور شوق اُمڈ رہا ہے۔ لیکن اس سارے شوق اور اُمنگوں کے باوجود وہ اللہ کا بندہ ہونے کا تصور کر کے اپنی آنکھوں کو غلط جگہ پڑنے سے بچاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے جنت دینے کا وعدہ کیا ہے۔

جنت کی لذتیں صرف انسان کے لئے ہیں

خوب سمجھ لیجئے! فرشتے اگرچہ جنت میں رہیں، لیکن جنت کی لذتیں ان کے لئے نہیں، جنت کی راحتیں ان کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ ان کے اندر جنت کی لذتوں اور راحتوں کے ادراک کرنے کا مادہ ہی نہیں۔ جنت کی لذتیں اللہ تعالیٰ نے اسی مخلوق کے لئے پیدا فرمائی ہیں جس کے اندر گناہ کی بھی صلاحیت موجود ہے، اور نیکی کی بھی صلاحیت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور آپ کی مشیت میں کون دخل اندازی کر سکتا ہے، اس نے اپنی حکمتِ بالغہ ہی سے سارا جہاں اس لئے پیدا فرمایا تاکہ اس جہاں کے اندر ایسا انسان تخلیق کریں جس کے اندر گناہ کرنے کی بھی صلاحیت ہو، اور پھر وہ گناہ سے رکے۔ اور اگر کبھی بھول چوک اور بشریت کے تقاضے سے کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً وہ استغفار کرے۔ اور اس استغفار کرنے کے نتیجے میں وہ انسان اللہ تعالیٰ کی غفاری کا، اس کی ستاری کا، اور اس کے غفور رحیم ہونے کا مورد بنتا ہے۔ اب اگر گناہ ہی نہ ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ کی غفاری کہاں ظاہر ہوتی؟

---

(۱) البقرة: ۳۰

کفر بھی حکمت سے خالی نہیں

بزرگوں نے فرمایا کہ اس کائنات میں کوئی چیز حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں۔ حتیٰ کہ کفر بھی حکمت سے خالی نہیں، چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

در کارخانۂ عشق ہم کفر ناگزیر است
آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

یعنی اس کارخانے میں کفر کی بھی ضرورت ہے، اس لئے کہ اگر بولہب نہ ہوتا، یعنی کافر نہ ہوتا تو جہنم کی آگ کس کو جلاتی؟ لہٰذا گناہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ایک حصہ ہے، اور اس گناہ کی خواہش بندہ کے اندر اس لئے پیدا کی گئی، تا کہ بندہ اس خواہش کو کچلے اور اس کو جلائے، کیونکہ بندہ اس خواہش کو جتنا کچلے گا، جتنا جلائے گا، اتنا ہی اس کا تقویٰ کامل ہوگا، اور تقویٰ کا نور اس کو حاصل ہوگا۔

دنیا کی شہوتیں اور گناہ ایندھن ہیں

اللہ تعالیٰ نے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کو مثال دینے میں کمال عطا فرمایا تھا۔ آپ مثال دینے میں امام تھے۔ فرماتے ہیں کہ۔

شہوت دنیا مثال گلخن است
کہ ازو حمام تقویٰ روشن است

یعنی یہ دنیا کی شہوتیں، لذتیں اور گناہ اس لحاظ سے بڑے کام کی چیزیں ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایندھن عطا کیا ہے۔ تا کہ تم اس ایندھن کو جلا کر تقویٰ کا حمام روشن کرسکو۔ اس لئے کہ تقویٰ کا حمام اسی ایندھن کے ذریعہ روشن ہوگا لہٰذا جس وقت گناہ کی بھرپور خواہش پیدا ہو رہی ہو، گناہ کا تقاضہ دل میں موجیں مار رہا ہو، دل مچل رہا ہو، بیتاب ہو رہا ہو۔ اس وقت تم اس خواہش اور اس تقاضے کو اللہ تعالیٰ کے لئے کچل دو۔ جب اس کو کچل دو گے، اور جلادو گے تو اس کے ذریعہ تقویٰ کا حمام روشن ہوگا۔ اور تقویٰ کا نور حاصل ہوگا اب اگر یہ گناہ کا تقاضہ ہی نہ ہوتا تو تمہیں اس حمام کو روشن کرنے کا یہ ایندھن کہاں سے حاصل ہوتا؟

ایمان کی حلاوت

حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص کے دل میں نامحرم پر نگاہ ڈالنے کا تقاضا اور شوق پیدا ہوا، لیکن اس اللہ کے بندے نے اس شوق اور تقاضے کے باوجود اس نگاہ کو نامحرم پر ڈالنے سے روک لیا۔

اور یہ سوچا کہ میرے اللہ اور میرے مالک نے اس عمل سے منع فرمایا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے اس تقاضے کو روک لے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی ایسی حلاوت عطا فرمائیں گے کہ اگر وہ نظر ڈال لیتا تو اس کو ایسی حلاوت حاصل نہ ہوتی، جو اللہ تعالیٰ اس کو نظر نہ ڈالنے کی وجہ سے ایمان کی حلاوت عطا فرمائیں گے۔ دیکھئے! یہی گناہ کا تقاضہ ایمان کی حلاوت حاصل ہونے کا ذریعہ بن گیا، اگر یہ گناہ کا تقاضہ اور داعیہ نہ ہوتا تو ایمان کی حلاوت حاصل نہ ہوتی۔

گناہ پیدا کرنے کی حکمت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو بندہ سے گناہ کرانا نہیں تو پھر اس گناہ کو پیدا ہی کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس گناہ کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی دو حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ ایک مصلحت تو یہ ہے کہ جب بندہ پوری کوشش کر کے اس گناہ سے بچنے کا اہتمام کرے گا تو اس کو تقویٰ کا نور حاصل ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا، کیونکہ انسان جتنا جتنا گناہ سے دور ہوتا جائے گا، اسی اعتبار سے اس کے درجات میں ترقی ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾(۱)

''جو شخص اللہ سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے نئے نئے راستے پیدا فرمائیں گے''

توبہ کے ذریعہ درجات کی بلندی

لیکن اپنی پوری کوشش اور اہتمام کے باوجود بتقاضۂ بشریت انسان کسی جگہ پھسل گیا، اور گناہ کر لیا۔ تو جب اس گناہ پر وہ استغفار کرے گا اور ندامت اور شرمندگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوگا، اور یہ کہے گا:

''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ''

یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف فرما۔ تو اب اس ندامت اور توبہ کے نتیجے میں اس کے درجات اور زیادہ بلند ہو جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کی غفاری اور ستاری کا مظہر بنے گا۔

یہ باتیں بہت نازک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو غلط سمجھنے سے ہماری حفاظت فرمائے۔ یاد رکھو، گناہ پر کبھی جرأت نہیں کرنی چاہئے، لیکن اگر گناہ ہو جائے تو پھر مایوس بھی نہ ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے توبہ اور استغفار کے راستے اسی لئے رکھے ہیں تاکہ انسان مایوس نہ ہو۔

لہٰذا اگر کبھی گناہ سرزد ہو جائے اور اس کے بعد دل میں ندامت کی آگ بھڑک اُٹھے اور اس

(۱) الطلاق: ۳

ندامت کے نتیجے میں انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، توبہ کرے، اللہ تعالیٰ کے سامنے روئے، گڑگڑائے۔ تو اس رونے اور گڑگڑانے کے نتیجے میں بعض اوقات اس کو وہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ گناہ نہ کرتا تو اس مقام تک نہ پہنچ سکتا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ روزانہ تہجد کی نماز کے لئے اُٹھا کرتے تھے۔ ایک دن تہجد کے وقت آنکھ نہ کھلی، حتیٰ کہ تہجد کا وقت نکل گیا۔ چونکہ اس سے پہلے کبھی تہجد کی نماز نہیں چھوٹی تھی، پہلی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ تہجد کی نماز چھوٹ گئی، چنانچہ اس کی وجہ سے ان کو اس قدر ندامت اور رنج ہوا کہ سارا دن روتے روتے گزار دیا کہ یا اللہ! مجھ سے آج تہجد کی نماز چھوٹ گئی جب اگلی رات کو سوئے تو تہجد کے وقت ایک بزرگوار نے تشریف لا کر آپ کو تہجد کی نماز کے لئے جگانا شروع کر دیا کہ اُٹھ کر تہجد پڑھ لو۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فوراً اُٹھ گئے، اور اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور یہاں کیسے آئے؟ اس نے جواب دیا کہ میں وہی بدنام زمانہ ابلیس اور شیطان ہوں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تمہارا کام تو انسان کو غفلت میں مبتلا کرنا ہے۔ نماز کے لئے اُٹھانے سے تمہارا کیا کام؟ شیطان نے کہا: اس سے بحث مت کرو، جاؤ، تہجد پڑھو، اور اپنا کام کرو۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں، پہلے بتاؤ کیا وجہ ہے؟ مجھے کیوں اُٹھا رہے تھے؟ جب تک نہیں بتاؤ گے، میں نہیں چھوڑوں گا۔ جب بہت اصرار کیا تو شیطان نے بتایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ گذشتہ رات آپ پر میں نے غفلت طاری کر دی تھی، تاکہ آپ کی تہجد کی نماز فوت ہو جائے، چنانچہ آپ کی تہجد کی نماز فوت ہوگئی، لیکن تہجد چھوٹ جانے کے نتیجے میں آپ نے سارا دن روتے روتے گزار دیا۔ اور اس رونے کے نتیجے میں آپ کے اتنے درجات بلند ہو گئے کہ اگر آپ اُٹھ کر تہجد پڑھ لیتے تو آپ کے درجات اتنے بلند نہ ہوتے۔ یہ تو بہت خسارے کا سودا ہوا، اس لئے میں نے سوچا کہ آج آپ کو اُٹھا دوں، تاکہ اور زیادہ درجات کی بلندی کا راستہ پیدا نہ ہو۔

ورنہ دوسری مخلوق پیدا کر دیں گے

اس لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر انسان سچے دل سے توبہ اور استغفار کرے، اور اللہ تعالیٰ کے حضور ندامت اور شکستگی کے ساتھ حاضر ہو جائے تو بعض اوقات اس میں انسان کے درجات اتنے زیادہ بلند ہو جاتے ہیں کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا یہ توبہ و استغفار بڑی عظیم چیز ہے۔ اسی لئے اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ گر ساری مخلوق بالکل گناہ ترک کر دے، تو

اللہ تعالیٰ دوسری مخلوق پیدا فرمادیں گے جو گناہ کرے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ اور استغفار کرے گی تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف فرمادیں گے۔

بہرحال، اس حدیث کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے ہمیں عملی تعلیم یہ دی ہے کہ اگر کبھی غلطی ہو جائے تو مایوس مت ہو جاؤ۔ بلکہ توبہ و استغفار کی طرف رجوع کرو البتہ اپنی طرف سے گناہ کا اقدام مت کرو، بلکہ گناہ سے بچنے کی پوری کوشش کرو، لیکن اگر گناہ ہو جائے تو توبہ و استغفار کرلو۔

گناہ سے بچنا فرضِ عین ہے

بعض اوقات دل میں خیال ہوتا ہے کہ پھر تو گناہ چھوڑنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ گناہ بھی کرتے رہو، اور استغفار اور توبہ بھی کرتے رہو خوب سمجھ لیجئے کہ گناہ سے بچنا ہر انسان کے ذمے فرضِ عین ہے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر گوشۂ زندگی میں ہر وقت اپنے آپ کو گناہ سے بچائے، لیکن اگر بتقاضۂ بشریت کبھی گناہ سرزد ہو جائے تو مایوس نہ ہو، بلکہ توبہ کرلے یا اگر کوئی شخص کسی گناہ میں مبتلا ہے، اور اس کے لئے کسی وجہ سے اس کو چھوڑنا ممکن نہیں ہے، مثلاً بینک کی ملازمت میں مبتلا ہے، تو اس صورت میں وہ دوسری ملازمت اس طرح تلاش کرے جیسے ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے، لیکن ساتھ میں وہ توبہ و استغفار بھی کرتا رہے۔

بیماری کے ذریعہ درجات کی بلندی

آپ نے یہ حدیث سنی ہوگی کہ جب انسان بیمار ہوتا ہے تو بیماری سے گناہ معاف ہوتے ہیں، اور اس کے ذریعہ درجات بلند ہوتے ہیں، اور بیماری جتنی زیادہ شدید ہوگی، اتنے ہی انسان کے درجات زیادہ بلند ہوں گے۔ لیکن کیا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے بیماری مانگے؟ یا کوشش کر کے بیمار پڑے؟ تاکہ جب میں بیمار ہوں گا تو میرے گناہ معاف ہوں گے، اور میرے درجات بلند ہوں گے ظاہر ہے کہ بیماری ایسی چیز نہیں جس کو مانگا جائے۔ اور جس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، جس کی تمنا کی جائے۔ بلکہ حدیث میں خود حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، کبھی بیماری مت مانگو، لیکن اگر غیر اختیاری طور پر بیماری آجائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھو اور یہ سوچو کہ اس کے ذریعہ ہمارے گناہ معاف ہو رہے ہیں، اور ہمارے درجات بلند ہو رہے ہیں بالکل اسی طرح گناہ بھی کرنے کی چیز نہیں، بلکہ باز رہنے کی چیز ہے۔ اجتناب کرنے کی چیز ہے۔ لیکن کبھی حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر گناہ ہو گیا تو پھر انسان توبہ و استغفار کی طرف رجوع کرے، تو اس کے نتیجے میں اس کے درجات بلند ہوں گے، یہ ہے استغفار کی حقیقت۔

توبہ اور استغفار کی تین قسمیں

توبہ اور استغفار کی تین قسمیں ہیں:

(۱) ایک گناہوں سے توبہ و استغفار

(۲) دوسرے طاعت اور عبادات میں ہونے والی کوتاہیوں سے استغفار

(۳) تیسرے خود استغفار سے استغفار، یعنی استغفار کا بھی حق ادا نہیں کر سکے، اس سے بھی ہم استغفار کرتے ہیں۔

تکمیلِ توبہ

پہلی قسم یعنی گناہوں سے استغفار کرنا ہر انسان پر فرضِ عین ہے۔ کوئی انسان اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ہر انسان اپنے سابقہ گناہوں سے استغفار کرے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف اور طریقت میں سب سے پہلا قدم ''تکمیلِ توبہ'' ہے۔ اگلے تمام درجات ''تکمیلِ توبہ'' پر موقوف ہیں۔ جب تک توبہ کی تکمیل نہیں ہوگی آگے کچھ نہیں ہوگا، چنانچہ جب کوئی شخص اپنی اصلاح کے لئے کسی بزرگ کے پاس جاتا ہے تو وہ بزرگ سب سے پہلے توبہ کی تکمیل کراتے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ھو أول اقدام المریدین''

یعنی جو شخص کسی شیخ کے پاس مرید ہونے کے لئے جائے تو اس کا سب سے پہلا کام تکمیلِ توبہ ہے، اور شیخ کے ہاتھ پر جو بیعت کی جاتی ہے، وہ بھی درحقیقت توبہ ہی کی بیعت ہوتی ہے، بیعت کے وقت مرید اپنے پچھلے گناہوں سے توبہ کرتا ہے۔ اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم اور عہد کرتا ہے، اس کے بعد شیخ اس کی توبہ کی تکمیل کراتا ہے۔

توبہ اجمالی

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ تکمیلِ توبہ کے دو درجے ہیں، ایک ''توبہ اجمالی'' اور دوسری ''توبہ تفصیلی''۔ ''توبہ اجمالی'' یہ ہے کہ انسان ایک مرتبہ اطمینان سے بیٹھ کر اپنی پچھلی زندگی کے تمام گناہوں کو اجمالی طور پر یاد کر کے دھیان میں لا کر ان سب سے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرے۔ ''توبہ اجمالی'' کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے صلاۃ التوبہ کی نیت سے دو رکعت نماز پڑھے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی، انکساری، ندامت اور شرمندگی اور الحاح وزاری کے ساتھ ایک ایک گناہ کو یاد کر کے یہ دعا کرے کہ یا اللہ! اب تک میری پچھلی زندگی میں مجھ سے جو کچھ گناہ ہوئے ہیں، چاہے وہ

ظاہری گناہ ہوں یا باطنی، حقوق اللہ سے متعلق ہوئے ہوں، یا حقوق العباد سے متعلق ہوئے ہوں، چھوٹے گناہ ہوئے ہوں، یا بڑے گناہ ہوئے ہوں۔ یا اللہ! میں ان سب سے توبہ کرتا ہوں۔ یہ توبہ اجمالی ہوئی۔

توبہ تفصیلی

لیکن توبہ اجمالی کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اب بالکل پاک صاف ہو گئے، اب کچھ نہیں کرنا۔ بلکہ اس کے بعد توبہ تفصیلی ضروری ہے، وہ اس طرح کہ جن گناہوں کی تلافی ممکن ہے، ان کی تلافی کرنا شروع کردے۔ جب تک انسان ان کی تلافی نہیں کرے گا، اس وقت تک اس کی توبہ کامل نہیں ہوگی، مثلاً فرض نمازیں چھوٹ گئی تھیں۔ اب جب نمازیں چھوٹ جانے کا خیال آیا تو اب توبہ کرلی، لیکن زندگی کے اندر موت سے پہلے ان نمازوں کو قضاء کرنا واجب ہے، اور اگر توبہ کرکے اطمینان سے بیٹھ گیا، اور نمازوں کی قضاء نہیں کی، تو اس صورت میں توبہ کامل نہیں ہوئی، اس لئے کہ جن گناہوں کی تلافی ممکن تھی، ان کی تلافی نہیں کی، لہٰذا اصلاح کے اندر سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ توبہ کی تکمیل کرے، جب تک یہ نہیں کرے گا، اس وقت تک اصلاح ممکن نہیں۔

نماز کا حساب لگائے

توبہ تفصیلی کے اندر سب سے پہلا معاملہ نماز کا ہے، بالغ ہونے کے بعد سے اب تک جتنی نمازیں قضاء ہوئی ہیں، ان کا حساب لگائے بالغ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لڑکا اس وقت بالغ ہوتا ہے جب اس کو احتلام ہو۔ اور لڑکی اس وقت بالغ ہوتی ہے جب اس کو حیض آنا شروع ہو جائے، لیکن اگر کسی کے اندر یہ علامتیں ظاہر نہ ہوں تو اس صورت میں جس دن پندرہ سال عمر ہو جائے اس وقت وہ بالغ ہو جاتا ہے۔ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی ہو، اس دن سے اس کو بالغ سمجھا جائے گا۔ اس دن سے اس پر نماز بھی فرض ہے، روزے بھی فرض ہیں۔ اور دوسرے فرائضِ دینیہ بھی اس پر لاگو ہو جائیں گے

لہٰذا انسان سب سے پہلے یہ حساب لگائے کہ جب سے میں بالغ ہوا ہوں، اس وقت سے اب تک کتنی نمازیں چھوٹ گئی ہیں بہت سے لوگ تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اور بچپن ہی سے ماں باپ نے نماز پڑھنے کی عادت ڈال دی۔ جس کی وجہ سے بالغ ہونے کے بعد سے اب تک کوئی نماز قضاء ہی نہیں ہوئی۔ اگر ایسی صورت ہے تو سبحان اللہ۔ اور ایک مسلمان گھرانے میں ایسا ہی ہونا چاہئے، اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے نماز کی تلقین کرو۔ اور جب بچہ دس سال کا ہو جائے تو اس کو مار کر نماز پڑھواؤ(۱) لیکن

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، رقم: ٤١٨، مسند أحمد، رقم: ٦٥٠٢

اگر بالفرض بالغ ہونے کے بعد غفلت کی وجہ سے نمازیں چھوٹ گئیں، تو ان کی تلافی کرنا فرض ہے۔

تلافی کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لے کر یاد کرے کہ میرے ذمے کتنی نمازیں باقی ہیں۔ اگر ٹھیک ٹھیک حساب لگانا ممکن ہو تو ٹھیک ٹھیک حساب لگالے، لیکن اگر ٹھیک ٹھیک حساب لگانا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں ایک محتاط اندازہ کر کے اس طرح حساب لگائے کہ اس میں نمازیں کچھ زیادہ تو ہو جائیں، لیکن کم نہ ہوں۔ اور پھر اس کو ایک کاپی میں لکھ لے کہ "آج اس تاریخ میرے ذمے اتنی نمازیں فرض ہیں اور آج سے میں ان کو ادا کرنا شروع کر رہا ہوں، اور اگر میں اپنی زندگی میں ان نمازوں کو ادا نہ کر سکا تو میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے ترکے سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے"

ایک وصیت نامہ لکھ لے

یہ وصیت لکھنا اس لئے ضروری ہے کہ گر آپ نے یہ وصیت نہیں لکھی، اور قضاء نمازوں کو ادا کرنے سے پہلے آپ کا انتقال ہو گیا تو اس صورت میں ورثاء کے ذمے شرعاً یہ ضروری نہیں ہو گا کہ آپ کی نمازوں کا فدیہ ادا کریں۔ یہ فدیہ ادا کرنا ان کی مرضی پر موقوف ہو گا، چاہیں تو دیں اور چاہیں تو نہ دیں۔ اگر فدیہ ادا کریں گے تو یہ ان کا احسان ہو گا۔ شرعاً ان کے ذمے فرض و واجب نہیں لیکن اگر آپ نے فدیہ ادا کرنے کی وصیت کر دی تو اس صورت میں ورثاء شرعاً اس بات کے پابند ہوں گے کہ وہ کل مال کے ایک تہائی ترکہ کی حد تک اس وصیت کو نافذ کریں، اور نمازوں کا فدیہ ادا کریں۔

حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ "ہر وہ شخص جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اور اس کے پاس کوئی بات وصیت لکھنے کے لئے موجود ہو تو اس کے لئے دو راتیں بھی وصیت لکھے بغیر گزارنا جائز نہیں"(۱)

لہٰذا اگر کسی کے ذمے نمازیں قضاء ہیں تو اس حدیث کی روشنی میں اس کو وصیت لکھنا ضروری ہے۔ اب ہم لوگوں کو ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہئے کہ ہم میں سے کتنے لوگوں نے اپنا وصیت نامہ لکھ کر رکھا ہوا ہے، حالانکہ وصیت نامہ نہ لکھنا ایک مستقل گناہ ہے۔ جب تک وصیت نامہ نہیں لکھے گا، اس وقت تک یہ گناہ ہوتا رہے گا۔ اس لئے فوراً آج ہی ہم لوگوں کو اپنا وصیت نامہ لکھ لینا چاہئے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الوصایا، باب الوصایا، رقم: ۲۵۳۳، صحیح مسلم، کتاب الوصیة، باب، رقم: ۳۰۷۴، سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول اللہ، باب ما جاء فی الحث علی الوصیة، رقم: ۸۹۶، سنن النسائی، کتاب الوصایا، باب الکراهیة فی تأخیر الوصیة، رقم: ۳۵۵۷، سنن أبی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی ما یؤمر به من الوصیة، رقم: ۲۴۷۸، سنن ابن ماجه، کتاب الوصایا، باب الحث علی الوصیة، رقم: ۲۶۹۰، مسند أحمد، رقم: ۴۲۳۹

''قضاءعمری'' کی ادائیگی

اس کے بعد ان قضاء نمازوں کو ادا کرنا شروع کر دے۔ ان کو ''قضاء عمری'' بھی کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر وقتی نماز کے ساتھ ایک نماز قضاء بھی پڑھ لے، اور اگر کسی کے پاس وقت زیادہ ہو تو ایک سے زیادہ بھی پڑھ سکتا ہے، تا کہ جتنی جلدی یہ نمازیں پوری ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔ بلکہ وقتی نمازوں کے ساتھ جو نوافل ہوتے ہیں، ان کے بجائے قضاء نماز پڑھ لے، اور نمازِ فجر کے بعد اور عصر کی نماز کے بعد نفلی نماز پڑھنا تو جائز نہیں، لیکن قضاء نماز پڑھنا جائز ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اتنی آسانی فرما دی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس آسانی سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور جتنی نمازیں ادا کرتے جائیں، اس کاپی میں ساتھ ہی ساتھ لکھتے جائیں کہ اتنی ادا کر لیں، اتنی باقی ہیں۔

سنتوں کے بجائے قضاء نماز پڑھنا درست نہیں

بعض لوگ یہ مسئلہ پوچھتے ہیں کہ چونکہ ہمارے ذمے قضاء نمازیں بہت باقی ہیں تو کیا ہم سنتیں پڑھنے کے بجائے قضاء پڑھ سکتے ہیں؟ تا کہ قضاء نمازیں جلد پوری ہو جائیں اس کا جواب یہ ہے کہ سنتِ موکدہ پڑھنی چاہئے، ان کو چھوڑنا درست نہیں۔ البتہ نوافل کے بجائے قضاء نمازیں پڑھنا جائز ہے۔

قضاء روزوں کا حساب اور وصیت

اسی طرح روزوں کا جائزہ لیں، جب سے بالغ ہوئے ہیں، اس وقت سے اب تک روزے چھوٹے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں چھوٹے تو بہت اچھا، اگر چھوٹ گئے ہیں تو ان کا حساب لگا کر اپنے پاس وصیت نامہ کی کاپی میں لکھ لیں کہ آج فلاں تاریخ کو میرے ذمے اتنے روزے باقی ہیں۔ میں ان کی ادائیگی شروع کر رہا ہوں۔ اگر میں اپنی زندگی میں ان کو ادا نہیں کر سکا تو میرے مرنے کے بعد میرے ترکہ میں سے ان روزوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے۔ اس کے بعد جتنے روزے ادا کرتے جائیں، اس وصیت نامہ کی کاپی میں لکھتے جائیں کہ اتنے روزے ادا کر لیے اتنے باقی ہیں، تا کہ حساب صاف رہے۔

واجب زکوٰۃ کا حساب اور وصیت

اسی طرح زکوٰۃ کا جائزہ لیں، بالغ ہونے کے بعد زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بالغ ہونے کے بعد اگر اپنی ملکیت میں قابلِ زکوٰۃ اشیاء تھیں، اور ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی، تو اب تک جتنے سال گزرے ہیں، ہر سال کی علیحدہ علیحدہ زکوٰۃ نکالیں، اور اس کا باقاعدہ حساب لگائیں۔ اور پھر زکوٰۃ

ادا کریں۔ اور اگر یاد نہ ہو تو پھر احتیاط کر کے اندازہ کریں۔ جس میں زیادہ ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن کم نہ ہو۔ اور پھر اس کی ادائیگی کی فکر کریں۔ اور اس کو اپنے وصیت نامہ کی کاپی میں لکھ لیں۔ اور جتنی زکوٰۃ ادا کر دیں، اس کو کاپی میں لکھتے چلے جائیں۔ اور جلد از جلد ادا کرنے کی فکر کریں۔

اسی طرح حج زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہوتا ہے، اگر حج فرض ہے اور اب تک ادا نہیں کیا، تو جلد از جلد اس سے بھی سبکدوش ہونے کی فکر کریں۔ یہ سب حقوق اللہ ہیں، ان کو ادا کرنا بھی ''توبہ تفصیلی'' کا ایک حصہ ہے۔

حقوق العباد ادا کرے یا معاف کرائے

اس کے بعد حقوق العباد کا جائزہ لیں، کہ کسی کا کوئی جانی حق یا کسی کا کوئی مالی حق اپنے ذمے واجب ہو، اور اب تک ادا نہ کیا ہو تو اس کو ادا کریں یا معاف کرائیں۔ یا کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی ہو، اس سے معاف کرائیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نے باقاعدہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع میں کھڑے ہو کر یہ اعلان فرمایا:

''اگر میں نے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی ہو، یا کسی کو کوئی صدمہ پہنچایا ہو، یا کسی کا کوئی حق میرے ذمے ہو تو آج میں آپ سب کے سامنے کھڑا ہوں، وہ شخص آ کر مجھ سے بدلہ لے لے، یا معاف کر دے''(۱)

لہٰذا جب حضورِ اقدس ﷺ معافی مانگ رہے ہیں تو ہم اور آپ کس شمار میں ہیں، لہٰذا زندگی میں اب تک جن جن لوگوں سے تعلقات رہے، یا لین دین کے معاملات رہے، یا اُٹھنا بیٹھنا رہا، یا عزیز و اقارب ہیں، ان سب سے رابطہ کر کے زبانی یا خط لکھ کر ان سے معلوم کریں اور اگر ان کا تمہارے ذمے کوئی مالی حق نکلے تو اس کو ادا کریں، اور اگر مالی حق نہیں ہے، بلکہ جانی ہے، مثلاً کسی کی غیبت کی تھی، کسی کو برا بھلا کہہ دیا تھا، یا کسی کو صدمہ پہنچایا تھا، ان سب سے معافی مانگنا ضروری ہے۔

ایک دوسری حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

''اگر کسی شخص نے دوسرے شخص پر ظلم کر رکھا ہے چاہے وہ جانی ظلم ہو یا مالی ظلم ہو، آج وہ اس سے معافی مانگ لے، یا سونا چاندی دے کر اس دن کے آنے سے پہلے حساب صاف کر لے جس دن نہ درہم ہوگا اور نہ دینار ہوگا، کوئی سونا چاندی کام نہیں آئے گا''(۲)

(۱) مجمع الزوائد، باب ما جاء في وداعه (۲۷/۹)

(۲) صحيح البخاري، كتاب المظالم والغصب، باب من كانت له مظلمة عند الرجل محللها له، رقم: ۲۲۶۹، مسند أحمد، رقم: ۹۲۴۲

فکرِ آخرت والوں کا حال

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ آخرت کی فکر عطا فرماتے ہیں، وہ ایک ایک شخص کے پاس جا کر ان کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ یا ان سے حقوق کی معافی کراتے ہیں۔ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے "العذر والنظر" کے نام سے ایک رسالہ لکھ کر اپنے تمام اہلِ تعلقات کے پاس بھیجا جس میں حضرت نے یہ لکھا کہ چونکہ آپ سے میرے تعلقات رہے ہیں۔ خدا جانے کس وقت کیا غلطی مجھ سے ہوئی ہو، یا کوئی واجب حق میرے ذمے باقی ہو۔ خدا کے لئے آج مجھ سے وہ حق وصول کرلیں، یا معاف کردیں۔

اس طرح میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے تمام تعلقات رکھنے والوں کو "کچھ تلافیٔ مافات" کے نام سے ایک خط لکھ کر بھجوایا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع میں ہمارے بزرگوں کا یہ معمول رہا ہے، اس لئے ہر آدمی کو اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔ یہ سب باتیں "توبہ تفصیلی" کا حصہ ہیں۔

حقوق العباد باقی رہ جائیں تو؟

یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ "حقوق اللہ" توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے، یا اس کو ادا نہ کرے لیکن حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی سے زندگی میں حقوق العباد ضائع ہوئے۔ اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں ان حقوق کی ادائیگی کی فکر عطا فرمائی، اور توبہ کی توفیق عطا فرمائی، جس کے نتیجے میں اس نے ان حقوق کی ادائیگی کی فکر شروع کردی، اور اب لوگوں سے معلوم کر رہا ہے کہ میرے ذمے کس شخص کے کیا حقوق باقی رہ گئے ہیں۔ تاکہ میں ان کو ادا کردوں، لیکن ابھی ان حقوق کی ادائیگی کی تکمیل نہیں کر پایا تھا کہ اس سے پہلے ہی اس کا انتقال ہوگیا، اب سوال یہ ہے کہ چونکہ اس نے حقوق کی ادائیگی مکمل نہیں کی تھی، اور معاف بھی نہیں کرائے تھے، کیا آخرت کے عذاب سے اس کی نجات اور بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو بھی مایوس نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ جب یہ شخص حقوق کی ادائیگی اور توبہ کے راستے پر چل پڑا تھا، اور کوشش بھی شروع کردی تھی، تو انشاء اللہ، اس کوشش کی برکت سے آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کے اصحابِ حقوق کو راضی فرما دیں گے، اور وہ اصحابِ حقوق اپنا حق معاف فرما دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا عجیب واقعہ

دلیل میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث شریف کا وہ مشہور واقعہ پیش کیا کہ ایک شخص نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کو توبہ کی فکر لاحق ہوئی۔ اب سوچا کہ میں کیا کروں۔ چنانچہ وہ عیسائی راہب کے پاس گیا، اور اس کو جا کر بتایا کہ میں نے اس طرح ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا ہے، تو کیا میرے لئے توبہ کا اور نجات کا کوئی راستہ ہے؟ اس راہب نے جواب دیا کہ تو تباہ ہو گیا، اور اب تیری تباہی اور ہلاکت میں کوئی شک نہیں، تیرے لئے نجات کا اور توبہ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ جواب سن کر وہ شخص مایوس ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ ننانوے قتل کر دیئے ہیں، ایک اور سہی، چنانچہ اس راہب کو بھی قتل کر دیا۔ اور سو کا عدد پورا کر دیا۔ لیکن دل میں چونکہ توبہ کی فکر لگی ہوئی تھی، اس لئے دوبارہ کسی اللہ والے کی تلاش میں نکل گیا۔ تلاش کرتے کرتے ایک اللہ والا اس کو مل گیا۔ اور اس سے جا کر اپنا سارا قصہ بتایا۔ اس نے کہا کہ اس میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، اب تم پہلے توبہ کرو، اور پھر اس بستی کو چھوڑ کر فلاں بستی میں چلے جاؤ، اور وہ نیک لوگوں کی بستی ہے۔ ان کی صحبت اختیار کرو۔ چونکہ وہ توبہ کرنے میں مخلص تھا۔ اس لئے وہ اس بستی کی طرف چل پڑا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اس کی موت کا وقت آ گیا۔ روایات میں آتا ہے کہ جب وہ مرنے لگا تو مرتے مرتے بھی اپنے آپ کو سینے کے بل گھسیٹ کر اس بستی کے قریب کرنے لگا جس بستی کی طرف وہ جا رہا تھا۔ تاکہ میں اس بستی سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جاؤں۔ آخر کار جان نکل گئی۔ اب اس کی روح لے جانے کے لئے ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب دونوں پہنچ گئے۔ اور دونوں میں اختلاف شروع ہو گیا۔ ملائکہ رحمت کہنے لگے کہ چونکہ یہ شخص توبہ کر کے نیک لوگوں کی بستی کی طرف جا رہا تھا، اس لئے اس کی روح ہم لے جائیں گے۔ ملائکہ عذاب کہنے لگے کہ اس نے سو آدمیوں کو قتل کیا ہے اور ابھی اس کی معافی نہیں ہوئی، لہٰذا اس کی روح ہم لے جائیں گے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ دیکھا جائے کہ یہ شخص کونسی بستی سے زیادہ قریب ہے، جس بستی سے چلا تھا، اس سے زیادہ قریب ہے، یا جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس سے زیادہ قریب ہے۔ اب دونوں طرف کے فاصلوں کی پیمائش کی گئی تو معلوم ہوا کہ جس بستی کی طرف جا رہا تھا اس سے تھوڑا قریب ہے۔ چنانچہ ملائکہ رحمت اس کی روح لے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی کوشش کی برکت سے اس کو معاف فرما دیا۔ (۱)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس کے ذمے حقوق العباد تھے، لیکن چونکہ اپنی

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب قبول توبة القاتل وإن كثر قتله، رقم: ٤٩٦٧، سنن ابن ماجه، كتاب الديات، باب هل لقاتل مؤمن توبة، رقم: ٢٦١٢، مسند أحمد، رقم: ٦٣٧٠

طرف سے کوشش شروع کر دی تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی۔ اسی طرح جب کسی انسان کے ذمے حقوق العباد ہوں اور وہ ان کی ادائیگی کی کوشش شروع کر دے، اور اس فکر میں لگ جائے اور پھر درمیان میں موت آجائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ وہ اصحابِ حقوق کو قیامت کے دن راضی فرما دیں گے

بہرحال، یہ دو قسم کی توبہ کر لیں۔ ایک توبہ اجمالی، اور ایک توبہ تفصیلی، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

پچھلے گناہ بھلا دو

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم یہ دونوں قسم کی توبہ کر لو، تو اس کے بعد اپنے پچھلے گناہوں کو یاد بھی نہ کرو، بلکہ ان کو بھول جاؤ۔ اس لئے کہ جن گناہوں سے تم توبہ کر چکے ہو، ان کو یاد کرنا ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی ناقدری ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمالیا ہے کہ جب استغفار کرو گے، اور توبہ کرو گے تو میں تمہاری توبہ کو قبول کر لوں گا۔ اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دوں گا۔ اور تمہارے نامۂ اعمال سے مٹا دوں گا اب اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا۔ لیکن تم اُلٹا ان گناہوں کو یاد کر کے ان کا وظیفہ پڑھ رہے ہو۔ یہ ان کی رحمت کی ناقدری ہے۔ کیونکہ ان کی یاد بعض اوقات حجاب اور رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اس لئے ان کو یاد مت کرو، بلکہ بھول جاؤ۔

یاد آنے پر استغفار کر لو

محقق اور غیر محقق میں یہی فرق ہوتا ہے۔ غیر محقق بعض اوقات اُلٹا کام بتا دیتے ہیں۔ میرے ایک دوست بہت نیک تھے۔ ہر وقت روزے سے ہوتے تھے، تہجد گزار تھے، ایک پیر صاحب سے ان کا تعلق تھا، وہ بتایا کرتے تھے کہ میرے پیر صاحب نے مجھے یہ کہا ہے کہ رات کو جب تم تہجد کی نماز کے لئے اُٹھو تو تہجد پڑھنے کے بعد اپنے پچھلے سارے گناہوں کو یاد کیا کرو، اور ان کو یاد کر کے خوب رویا کرو لیکن ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ طریقہ درست نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تو توبہ کے بعد ہمارے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا ہے، اور ہمارے نامۂ اعمال سے مٹا دیا ہے۔ لیکن تم ان کو یاد کر کے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ ابھی ان گناہوں کو نہیں مٹایا، اور میں تو ان کو مٹنے نہیں دوں گا، بلکہ ان کو یاد کروں گا، تو اس طریقے میں اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمت کی ناقدری اور ناشکری ہے، اس لئے کہ جب انہوں نے تمہارے اعمال نامے سے ان کو مٹا دیا ہے تو اب ان کو بھول جاؤ، ان

کو یاد مت کرو، اور اگر کبھی بے اختیار ان گناہوں کا خیال آجائے تو اس وقت استغفار پڑھ کر اس خیال کو ختم کر دو۔

حال کو درست کرلو

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کیا اچھی بات بیان فرمائی، یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ جب تم توبہ کر چکو تو پھر ماضی کی فکر چھوڑ دو۔ اس لئے کہ جب توبہ کر لی تو یہ اُمید رکھو کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے قبول فرمائیں گے انشاء اللہ۔ اور مستقبل کی فکر بھی چھوڑ دو کہ آئندہ کیا ہوگا، کیا نہیں ہوگا۔ حال جو اس وقت گزر رہا ہے، اس کی فکر کرو کہ یہ درست ہو جائے، یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گزر جائے، اور اس میں کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔

آج کل ہمارا یہ حال ہے کہ یا تو ہم ماضی میں پڑے رہتے ہیں کہ ہم سے اتنے گناہ ہو چکے ہیں اب ہمارا کیا حال ہوگا، کس طرح بخشش ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مایوسی پیدا ہو کر حال بھی خراب ہو جاتا ہے۔ یا مستقبل کی فکر میں پڑے رہتے ہیں کہ اگر اس وقت توبہ کر بھی لی تو آئندہ کس طرح گناہ سے بچیں گے ارے یہ سوچو کہ جب آئندہ وقت آئے گا، اس وقت دیکھا جائے گا۔ اس وقت کی فکر کرو جو گزر رہا ہے، اس لئے کہ یہی حال ماضی بن رہا ہے، اور ہر مستقبل کو حال بننا ہے۔ اس لئے بس اپنے حال کو درست کرلو، اور ماضی کو یاد کر کے مایوس مت ہو جاؤ۔ حقیقت میں شیطان ہمیں بہکاتا ہے، وہ یہ ورغلاتا ہے کہ اپنے ماضی کو دیکھو کہ تم کتنے بڑے بڑے گناہ کر چکے ہو۔ اور اپنے مستقبل کو دیکھو کہ تم سے مستقبل میں کیا بنے گا؟ اور ماضی اور مستقبل کے چکر میں ڈال کر ہمارے حال کو خراب کرتا رہتا ہے۔ اس لئے شیطان کے دھوکے میں مت آؤ۔ اور اپنے حال کو درست کرنے کی فکر کرو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ فکر عطا فرما دے۔ آمین۔

عَنْ اَبِیْ قِلَابَۃَ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ لَمَّا لَعَنَ اِبْلِیْسَ سَأَلَہُ النَّظْرَۃَ، فَاَنْظَرَہٗ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ، قَالَ: وَعِزَّتِکَ لَا اَخْرُجُ مِنْ قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ مَا دَامَ فِیْہِ الرُّوْحُ، قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَعِزَّتِیْ لَا اَحْجُبُ عَنْہُ التَّوْبَۃَ مَا دَامَ الرُّوْحُ فِی الْجَسَدِ.(۱)

خیر القرون

حضرت ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں، اگر کسی نے اسلام کی حالت میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہو، اس کو ''صحابی'' کہتے ہیں، اور جس نے اسلام کی حالت میں

(۱) کتاب الزھد لابن المبارک، رقم: ۱۰۴۵ (۱/۳۶۹)، الدر المنثور (۲/۴۶۰)

کسی صحابی کی زیارت کی ہو، اس کو "تابعی" کہتے ہیں، اور اگر کسی نے اسلام کی حالت میں کسی تابعی کی زیارت کی ہو تو اس کو "تبع تابعی" کہتے ہیں، یہ تین قرون ہیں، جن کو حضورِ اقدس ﷺ نے خیر القرون قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ"(۱)

یعنی سب سے بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے متصل ہیں، اور پھر وہ جو ان کے متصل ہیں لہٰذا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے تابعین کو بھی بڑا اونچا مقام عطا فرمایا ہے۔ حضرت ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ بھی تابعین میں سے ہیں۔ انہوں نے براہِ راست حضورِ اقدس ﷺ کی زیارت نہیں کی لیکن متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زیارت کی ہے، اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد ہیں۔

حضرات تابعین کی احتیاط اور ڈر

یہ حدیث جو حضرت ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے، اگرچہ اپنے مقولے کے طور پر بیان فرمائی ہے، لیکن حقیقت میں یہ حدیث ہے، اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے اپنی عقل سے ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ اور اپنے مقولے کے طور پر اس لئے بیان فرمایا کہ حضرات تابعین حضورِ اقدس ﷺ کی طرف کوئی بات منسوب کرتے ہوئے ڈرتے تھے، اس لئے کہ کہیں کوئی بات منسوب کرنے میں اونچ نیچ ہو جائے، جس کے نتیجے میں ہماری پکڑ ہو جائے کہ تم نے حضورِ اقدس ﷺ کی طرف غلط بات منسوب کر دی، اس لئے کہ حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

"مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"(۲)

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الشهادات، باب لا يشهد على شهادة جور إذا أشهد، رقم: ٢٤٥٨، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم، رقم: ٤٦٠١، سنن الترمذي، كتاب الفتن عن رسول الله، باب ما جاء في القرن الثالث، رقم: ٢١٤٧، مسند أحمد، رقم: ٣٤١٣۔

(۲) صحيح البخاري، كتاب العلم، باب اثم من كذب على النبي، رقم: ١٠٧، صحيح مسلم، مقدمة، باب تغليظ الكذب على رسول الله، رقم: ٤، سنن الترمذي، كتاب العلم عن رسول الله، باب ما جاء في تعظيم الكذب على رسول الله، رقم: ٢٥٨٣، سنن أبي داؤد، كتاب العلم، باب في التشديد في الكذب على رسول الله، رقم: ٣١٦٦، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب في التغليظ في تعمد الكذب على رسول الله، رقم: ٣٠، مسند أحمد، رقم: ٥٥١، سنن الدارمي، المقدمة، باب اتقاء الحديث عن النبي والتثبت فيه، رقم: ٢٣٣۔

یعنی "جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے، اور میری طرف ایسی بات منسوب کرے جو میں نے نہیں کہی تو اس کو چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے" اتنی سخت وعید آپ ﷺ نے بیان فرمائی۔ اس لئے صحابہ کرام اور تابعین حدیث بیان کرتے ہوئے لرزتے تھے۔

حدیث بیان کرنے میں احتیاط کرنی چاہئے

ایک تابعی ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان فرماتے ہیں کہ جب وہ صحابی ہمارے سامنے حضورِ اقدس ﷺ کی کوئی حدیث بیان فرماتے تو اس وقت ان کا چہرہ پیلا پڑ جاتا تھا، اور بعض اوقات ان پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی، کہ کہیں کوئی بات بیان کرنے میں غلطی ہو جائے حتیٰ کہ بعض صحابہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے اس طرح کی، یا اس جیسی، یا اس قسم کی بات بیان فرمائی تھی، ہوسکتا ہے کہ میرے سے بیان کرنے میں کچھ اُلٹ پھیر ہو گیا ہو۔ یہ سب اس لئے کرتے تاکہ حضورِ اقدس ﷺ کی طرف کوئی بات غلط منسوب کرنے کا گناہ نہ ہو اس سے ہمیں اور آپ کو یہ سبق ملتا ہے کہ ہم لوگ بسا اوقات تحقیق اور احتیاط کے بغیر احادیث بیان کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ ذرا سی کوئی بات کہیں سنی، فوراً ہم نے کہہ دیا کہ حدیث میں یوں آیا ہے، حالانکہ یہ دیکھئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے براہِ راست حضورِ اقدس ﷺ سے باتیں سنیں، وہ کتنی احتیاط کر رہے ہیں۔ لیکن ہم اس میں احتیاط نہیں کرتے۔ اس لئے احادیث بیان کرنے میں ہمیشہ بہت احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ جب تک ٹھیک الفاظ معلوم نہ ہوں، اس وقت تک اس کو حدیث کے طور پر بیان نہیں کرنا چاہئے اس حدیث میں دیکھئے کہ حضرت ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے یوں فرمایا، بلکہ اس کو اپنے قول کے طور پر فرما رہے ہیں، حالانکہ حقیقت میں یہ حدیث ہے۔

بہرحال، وہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو راندۂ درگاہ کیا ہر مسلمان کو یہ واقعہ معلوم ہے کہ ابلیس کو حکم دیا گیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرے۔ اس نے انکار کر دیا کہ میں تو سجدہ نہیں کرتا۔ اس انکار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو راندۂ درگاہ کر دیا۔

ابلیس کی بات درست تھی، لیکن

ایک بات یہاں یہ سمجھ لیں کہ اگر غور کیا جائے تو بظاہر ابلیس جو بات کہہ رہا تھا، وہ کوئی بری بات نہیں تھی۔ کیونکہ اگر وہ یہ کہتا کہ یہ پیشانی تو آپ کے لئے خاص ہے۔ یہ پیشانی تو صرف آپ کے سامنے جھک سکتی ہے، کسی اور کے سامنے نہیں جھک سکتی۔ یہ خاکی پتلا جس کو آپ نے اپنے ہاتھ سے بنایا، اس کو میں سجدہ کیوں کروں؟ میرا سجدہ تو آپ کے لئے ہے تو بظاہر یہ بات غلط نہیں تھی۔ لیکن یہ

بات اس لئے غلط ہوئی کہ جس ذات کے آگے سجدہ کرنا ہے، جب وہ ذات خود ہی حکم دے رہی ہے کہ اس خاکی پتلے کو سجدہ کرو۔ تو اب چوں وچرا کی مجال نہ ہونی چاہئے تھی۔ اس حکم کے بعد پھر اپنے عقلی گھوڑے نہیں دوڑانے چاہئیں تھے کہ یہ خاکی پتلا سجدہ کرنے کے لائق ہے یا نہیں؟

دیکھئے! فی الواقع آدمی سجدہ کے لائق تو نہیں تھا۔ چنانچہ جب حضورِ اقدس ﷺ کی آخری اُمت اس دنیا میں آئی تو ہمیشہ کے لئے یہ حکم دے دیا گیا کہ اب کسی انسان کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔ معلوم ہوا کہ اصل حکم یہی تھا کہ انسان کو سجدہ کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ ہی حکم فرمائیں کہ سجدہ کرو تو اب عقلی گھوڑے نہیں دوڑانے چاہئیں۔ شیطان نے پہلی غلطی یہ کی کہ اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے۔

میں آدم سے افضل ہوں

دوسری غلطی یہ کی کہ شیطان نے سجدہ نہ کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ یہ پیشانی تو آپ کے لئے ہے، بلکہ یہ وجہ بتائی کہ اس آدم کو آپ نے مٹی سے بنایا ہے، اور مجھے آپ نے آگ سے بنایا ہے، اور آگ مٹی سے افضل ہے، اس لئے میں اس کو سجدہ نہیں کرتا، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اس کو راندۂ درگاہ کر دیا، اور حکم دے دیا کہ یہاں سے نکل جاؤ۔

اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگ لی

بہرحال، جس وقت اللہ تعالیٰ نے اس کو راندۂ درگاہ کیا، اس وقت اس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی، اور کہا:

"أَنْظِرْنِیْ إِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ"(۱)

اے اللہ، مجھے اس وقت تک کی مہلت دے دیجئے جس وقت آپ لوگوں کو اُٹھائیں گے، یعنی میں قیامت تک زندہ رہوں، مجھے موت نہ آئے۔

شیطان بڑا عارف تھا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ "ابلیس" اللہ تعالیٰ کی بہت معرفت رکھتا تھا، بہت بڑا عارف تھا، کیونکہ ایک طرف تو اس کو دھتکارا جارہا ہے، راندۂ درگاہ کیا جارہا ہے، جنت سے نکالا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ کا اس پر غضب نازل ہورہا ہے، لیکن عین غضب کی حالت میں

(۱) الاعراف: ۱۴

بھی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ لی، اور مہلت مانگ لی۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ غضب سے مغلوب نہیں ہوتے، اور غضب کی حالت میں بھی اگر ان سے کوئی چیز مانگی جائے تو وہ دے دیتے ہیں، چنانچہ اس نے مہلت مانگ لی۔

میں موت تک اس کو بہکاتا رہوں گا

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

"إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ٥ إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ٥(۱)

ہم تمہیں قیامت تک کے لئے مہلت دیتے ہیں، تمہیں قیامت تک موت نہیں آئے گی، جب مہلت مل گئی تو اب اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے اللہ! میں آپ کی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ابن آدم کے دل سے اس وقت تک نہیں نکلوں گا، جب تک اس کے جسم میں روح باقی ہے، یعنی موت آنے تک نہیں نکلوں گا۔ اور یہ ابن آدم جس کی وجہ سے مجھے راندۂ درگاہ ہونا پڑا، اس کے دل میں غلط قسم کے خیالات ڈالتا رہوں گا، اس کو بہکاتا رہوں گا، گناہوں کی خواہش، اس کے داعیے، اس کے محرکات اس کے دل میں پیدا کرتا رہوں گا، اور اس کو گناہوں کی طرف مائل کرتا رہوں گا، جب تک وہ زندہ ہے۔

میں موت تک توبہ قبول کرتا رہوں گا

شیطان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی عزت کی قسم کھائی، اور فرمایا کہ میری عزت کی قسم، میں اس ابن آدم کے لئے توبہ کا دروازہ بھی اس وقت تک بند نہیں کروں گا، جب تک اس کے جسم میں روح باقی ہے۔ تو میری عزت کی قسم کھاتا ہے کہ میں نہیں نکلوں گا، میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ میں اس کے لئے توبہ کا دروازہ بند نہیں کروں گا۔ تو اگر زہر ہے، تو میں نے ہر ابن آدم کو اس زہر کا تریاق بھی دے دیا ہے کہ اس کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جب ابن آدم گناہوں سے توبہ کرلے گا تو میں تیرے سارے مکروفریب اور تیرے سارے بہکاوے کو اس توبہ کے نتیجے میں ایک آن میں ختم کردوں گا۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے لئے اپنی رحمت کا عام اعلان فرمادیا، اور فرمادیا کہ یہ مت سمجھنا کہ ہم نے کوئی مافوق الفطرت طاقت شیطان کی صورت میں تمہارے اُوپر مسلط کردی ہے، جس سے تم نجات نہیں پاسکتے۔

---

(۱) الحجر: ۳۸

شیطان ایک آزمائش ہے

بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے شیطان کو صرف تمہاری ذراسی آزمائش اور امتحان کے لئے پیدا کر دیا ہے، ہم نے ہی اس کو بنایا، اور ہم نے ہی اس کو بہکانے کی طاقت دی ہے۔ لیکن ایسی طاقت نہیں دی کہ تم اس کو زیر نہ کرسکو۔ قرآن نے صاف اعلان کر دیا:

﴿إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا﴾(۱)

یعنی شیطان کا مکر بہت کمزور ہے، اور اتنا کمزور ہے کہ اگر کوئی شخص اس شیطان کے آگے ڈٹ جائے کہ تیری بات نہیں مانوں گا، تو جس گناہ پر آمادہ کرنا چاہ رہا ہے میں وہ گناہ نہیں کروں گا تو شیطان اسی وقت پگھل جاتا ہے۔ یہ شیطان بزدلوں پر اور ان لوگوں پر شیر ہو جاتا ہے جو اپنی ہمت سے کام لینے سے جی چراتے ہیں، اور جو گناہوں کو چھوڑنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے، لیکن بالفرض اگر اس کا داؤ چل جائے، اور کوئی بے ہمت آدمی اس کی بات مان لے تو پھر میں نے توبہ کا تریاق پیدا کر دیا ہے، ہمارے پاس آجاؤ، اور اپنے گناہوں کا اقرار کرلو کہ یا اللہ، ہم سے غلطی ہوگئی، اور اپنے گناہ سے توبہ کرو، اور کہو، أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّىْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ، تو اس کے نتیجے میں شیطان کا سارا اثر ایک لمحے میں زائل ہو جائے گا۔

بہترین گناہ گار بن جاؤ

چنانچہ اسی وجہ سے ایک دوسری حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ بَنِىْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ))(۲)

تم میں سے ہر شخص بہت خطا کار ہے، عربی میں ''خطاء'' اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ غلطیاں کرے، اور جو معمولی غلطی کرے اس کو عربی میں ''خاطی'' کہتے ہیں، یعنی غلطی کرنے والا، اور ''خطاء'' کے معنی ہیں: بہت زیادہ غلطی کرنے والا، تو فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص بہت خطا کار ہے۔ لیکن ساتھ میں یہ بھی فرمایا کہ خطا کاروں میں سے سب سے بہتر خطا کار وہ ہے جو توبہ بھی بہت کرتا ہے اس حدیث میں اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ دنیا کے اندر تم سے گناہ بھی ہوں گے، گناہوں کے داعیے

---

(۱) النساء: ۷۶

(۲) سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲٤۲۳، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، رقم: ٤۲٤۱، مسند أحمد، رقم: ۱۲۵۷٦، سنن الدارمي، كتاب الرقاق، باب في التوبة، رقم: ۲٦۱۱۔

بھی پیدا ہوں گے، لیکن ان کے آگے ڈٹ جانے کی کوشش کرو، اور اس کے آگے جلدی سے ہتھیار مت ڈالا کرو، اور اگر کبھی گناہ ہو جائے تو پھر مایوس ہونے کے بجائے ہمارے حضور حاضر ہو کر توبہ کر لیا کرو۔ یہاں بھی ''توّاب'' کا صیغہ استعمال کیا۔ ''تائب'' نہیں کہا، اس لئے کہ تائب کے معنی ہیں ''توبہ کرنے والا'' اور ''توّاب'' کے معنی ہیں ''بہت توبہ کرنے والا''، مطلب یہ ہے کہ صرف ایک مرتبہ توبہ کر لینا کافی نہیں، بلکہ ہر مرتبہ جب بھی گناہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرتے رہو، اور جب کثرت سے توبہ کرو گے تو پھر انشاء اللہ شیطان کا داؤ نہیں چلے گا، اور شیطان سے حفاظت رہے گی۔

اللہ کی رحمت کے سو حصے ہیں

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ، فَاَمْسَكَ عِنْدَهُ تِسْعَةً وَّتِسْعِیْنَ، وَاَنْزَلَ فِی الْاَرْضِ جُزْءًا وَاحِدًا، ذٰلِكَ الْجُزْءُ یَتَرَاحَمُ الْخَلَائِقُ حَتّٰی تَرْفَعَ الدَّابَّةُ حَافِرَهَا عَنْ وَلَدِهَا خَشْیَةَ اَنْ تُصِیْبَهٗ.''(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے جو رحمت پیدا فرمائی ہے، اس کے سو حصے کیے ہیں، ان سو میں سے صرف ایک حصہ رحمت کا اس دنیا میں اُتارا ہے، جس کی وجہ سے لوگ آپس میں ایک دوسرے پر رحمت کا، ترس کھانے کا اور شفقت کا معاملہ کرتے ہیں۔ جیسے باپ اپنے بیٹے پر رحم کر رہا ہے، یا ماں اپنے بچوں پر رحم کر رہی ہے، بھائی بھائی پر رحم کر رہا ہے، بھائی بہن پر کر رہا ہے، یا ایک دوست دوسرے دوست پر کر رہا ہے۔ گویا دنیا میں جتنے لوگ بھی آپس میں شفقت اور رحم کا معاملہ کر رہے ہیں، وہ ایک حصہ رحم کا نتیجہ اور طفیل ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں نازل فرمایا، حتیٰ کہ گھوڑی کا بچہ جب دودھ پینے کے لئے آتا ہے تو وہ گھوڑی اپنا پاؤں اُٹھا لیتی ہے۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دودھ پینے کے دوران یہ پاؤں بچے کو لگ جائے، یہ بھی اس سو دیں حصے کا ایک جز ہے۔ اور ننانوے حصے رحمت کے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس محفوظ رکھے ہوئے ہیں، ان کے ذریعہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحمت کا مظاہرہ فرمائیں گے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب جعل اللّٰه الرحمة مائة جزء، رقم: ۵۵۴۱، صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة اللّٰه تعالٰی وأنها سبقت غضبه، رقم: ۴۹۴۲، مسند أحمد، رقم: ۲۴۰۵۶، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب ان للّٰه مائة رحمة، رقم: ۲۶۶۶۔

اس ذات سے مایوسی کیسی؟

اس حدیث کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے ہمیں یہ بتادیا کہ کیا تم لوگ اس ذات کی رحمت سے مایوس ہوتے ہو، جس ذات نے تمہارے لئے آخرت میں اتنی ساری رحمتیں اکٹھی کر کے رکھی ہوئی ہیں، اس ذات سے مایوسی کا اظہار کرتے ہو؟ کیا وہ اپنی رحمت سے تم کو دور کردے گا؟ البتہ صرف اتنی بات ہے کہ ان رحمتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی دیر ہے۔ اور ان رحمتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کرو، استغفار کرو، گناہوں کو چھوڑو، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، جتنا رجوع کرو گے، اور توبہ استغفار کرو گے، اتنا ہی اللہ کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہوگی، اور آخرت میں تمہارا بیڑہ پار کردے گی۔

صرف تمنا کرنا کافی نہیں

لیکن یہ رحمت اسی شخص کو فائدہ دے گی جو یہ چاہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی اس رحمت سے فائدہ اُٹھالوں، اب اگر کوئی شخص اس رحمت سے فائدہ اُٹھانا ہی نہ چاہے، بلکہ ساری عمر غفلت ہی میں گزار دے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے تمنا رکھے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے، ایسے لوگوں کے لئے حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

"اَلْعَاجِزُ مَنْ اِتَّبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ"(۱)

عاجز شخص وہ ہے جو خواہشات کے پیچھے دوڑا چلا جارہا ہے، اور اللہ تعالیٰ پر اُمیدیں باندھے ہوئے ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے غفور رحیم ہیں، معاف فرمادیں گے ہاں، البتہ جو شخص اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اُمیدوار ہو، اور کوشش کررہا ہو، پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت انشاء اللہ اس کو آخرت میں ڈھانپ لے گی۔

ایک شخص کا عجیب واقعہ

ایک اور حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نے پچھلی اُمتوں کے ایک شخص کا واقعہ بیان فرمایا کہ ایک شخص تھا، جس نے اپنی جان

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۳۸۳، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذكر الموت والإستعداد له، رقم: ۴۲۵۰، مسند أحمد، رقم: ۱۶۵۰۱۔

پر بڑا ظلم کیا تھا۔ بڑے بڑے گناہ کیے تھے، بڑی خراب زندگی گزاری تھی، اور جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے گھر والوں سے وصیت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی زندگی گناہوں اور غفلتوں میں گزار دی ہے، کوئی نیک کام تو کیا نہیں ہے، اس لئے جب میں مرجاؤں تو میری نعش کو جلا دنا، اور جو راکھ بن جائے، تو اس کو بالکل باریک پیس لینا، پھر اس راکھ کو مختلف جگہوں پر تیز ہوا میں اُڑا دینا، تا کہ وہ ذرّات دور دور تک چلے جائیں۔ یہ وصیت میں اس لئے کر رہا ہوں کہ اللہ کی قسم! اگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ آ گیا تو مجھے اللہ تعالیٰ ایسا عذاب دے گا کہ ایسا عذاب دنیا میں کسی اور شخص کو نہیں دیا ہوگا، اس لئے کہ میں نے گناہ ہی ایسے کیے ہیں کہ اس عذاب کا مستحق ہوں۔

جب اس شخص کا انتقال ہو گیا تو اس کے گھر والوں نے اس کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اس کی نعش کو جلایا، پھر اس کو پیسا، اور پھر اس کو ہواؤں میں اُڑا دیا، جس کے نتیجے میں اس کے ذرات دور دور تک بکھر گئے یہ تو اس کی حماقت کی بات تھی کہ شاید اللہ تعالیٰ میرے ذرات کو جمع کرنے پر قادر نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا کہ اس کے سارے ذرات جمع کر دو۔ جب ذرات جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس کو دوبارہ مکمل انسان جیسا تھا ویسا بنا دیا جائے۔ چنانچہ وہ دوبارہ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے سوال کیا کہ تم نے اپنے گھر والوں کو یہ سب عمل کرنے کی وصیت کیوں کی تھی؟ جواب میں اس نے کہا:

"خَشْيَتَكَ يَا رَبِّ"

اے اللہ! آپ کے ڈر کی وجہ سے، اس لئے کہ میں نے گناہ بہت کیے تھے۔ اور ان گناہوں کے نتیجے میں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں آپ کے عذاب کا مستحق ہو گیا ہوں۔ اور آپ کا عذب بڑا سخت ہے، تو میں نے اس عذاب کے ڈر سے یہ وصیت کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے ڈر کی وجہ سے تم نے یہ عمل کیا تھا۔ جاؤ، میں نے تمہیں معاف کر دیا۔

یہ واقعہ خود حضورِ اقدس ﷺ نے بیان فرمایا۔ اور صحیح مسلم میں صحیح سند کے ساتھ موجود ہے۔ (۱)

اب ذرا سوچئے کہ اس شخص کی یہ وصیت بڑی احمقانہ تھی۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو وہ کافرانہ تھی، اس لئے کہ وہ شخص یہ کہہ رہا تھا کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ آ گیا تو اللہ تعالیٰ مجھے بہت عذاب دے گا، لیکن اگر تم لوگوں نے مجھے جلا کر اور راکھ بنا کر اُڑا دیا تو پھر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ معاذ اللہ۔ یہ عقیدہ رکھنا تو کفر اور شرک ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ راکھ کے ذرات جمع کرنے پر قادر نہیں

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة الله تعالی وأنها سبقت غضبه، رقم: ۴۹۴۹، مسند أحمد، رقم: ۷۳۲۷، موطا مالك، کتاب الجنائز، باب أن عائشة قالت...... رقم: ۵۰۶۔

ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا؟ تو اس نے جواب دیا: یا اللہ! آپ کے ڈر کی وجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اچھا تو جانتا تھا کہ ہم تیرے رب ہیں، اور مانتا تھا کہ ہم تیرے رب ہیں۔ اور یہ بھی مانتا تھا کہ تو نے ہماری نافرمانی کی ہے، اور اس نافرمانی پر تو شرمسار بھی تھا، اور نادم بھی تھا، اور تو نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے ان گناہوں پر ندامت کا اظہار کر دیا تھا، اس لئے ہم تیری مغفرت کرتے ہیں، اور تجھے معاف فرماتے ہیں۔

اس واقعہ کو بیان کرنے سے حضورِ اقدس ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت درحقیقت بندے سے صرف ایک چیز کا مطالبہ کرتی ہے، وہ یہ کہ بندہ ایک مرتبہ اپنے کیے پر سچے دل سے شرمسار ہو جائے، نادم ہو جائے، اور نادم ہو کر اس وقت جو کچھ کر سکتا ہے، وہ کر گزرے، تو پھر اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر کے اس کو معاف فرما دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح معنی میں اپنے گناہوں پر نادم ہونے اور توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اپنی رحمت سے ہم سب کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

توبہ، اصلاحِ نفس کی پہلی سیڑھی ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

روزے کا مقصد تقویٰ کا حصول

اس کتاب میں "انفاسِ عیسیٰ" میں آگے توبہ کا بیان ہے۔ توبہ سے متعلق بہت سی باتیں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بیان فرمائی ہیں جو بڑے فائدے کی ہیں۔ یہ بیان ہمارے مناسبِ حال بھی ہے، کیونکہ یہ رمضان المبارک کا مہینہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کا مہینہ ہے اور اس مہینے کا صحیح فائدہ یہ ہے کہ اس ماہِ مبارک میں انسان اپنے تمام پچھلے گناہوں سے تائب ہو جائے اور آئندہ کے لئے اپنی زندگی کو اللہ جل جلالہ کے احکام کے مطابق بنانے کا عزم تازہ کرے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ"(۱)

یعنی "اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسا کہ پچھلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تمہیں تقویٰ حاصل ہو" پورے مہینے بھر کی جو ریاضت اور کورس ہے، اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اپنے دل میں تقویٰ پیدا کیا جائے اور تقویٰ پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے دل میں یہ فکر پیدا ہو جائے کہ ماضی میں مجھ سے جو کچھ ہوا، اس سے توبہ کرلوں اور آئندہ کے لئے اس بات کا عزم کرے کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزاروں گا۔ اس لئے یہ توبہ کا بیان ہمارے مناسبِ حال ہے اور توبہ کی بہت سی جزئیات حضرت والا نے یہاں بیان فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆ اصلاحی مجالس (۵/ ۲۳۶ تا ۲۵۴) رمضان المبارک، بعد از نماز ظہر، جامع مسجد دار العلوم کراچی۔

(۱) البقرۃ: ۱۸۳

اصلاحِ نفس کی پہلی سیڑھی ''توبہ''

توبہ اصلاحِ نفس کی پہلی سیڑھی ہے، مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی اصلاح کے لئے قدم اُٹھائے تو سب سے پہلے اس کا کام یہ ہے کہ وہ ''توبہ'' کی تکمیل کرے، یعنی گزشتہ زمانے میں جو گناہ اور غلطیاں اس سے سرزد ہوئیں، ان سب سے اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار کرے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''احیاء العلوم'' میں توبہ کا بیان شروع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''أوّل اقدام المریدین التوبة'' یعنی وہ مریدین جو اپنی اصلاحِ نفس کا ارادہ لے کر کسی شیخ کے پاس جائیں تو ان کا سب سے پہلا کام ''تکمیلِ توبہ'' ہے۔ اسی لئے بزرگوں کا طریقہ یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنی اصلاح کی فکر عطاء فرماتے ہیں اور وہ شخص اپنی اصلاح کے لئے کسی شیخ کے پاس جاتا ہے تو اس کو سب سے پہلا کام جو تلقین کیا جاتا ہے، وہ ''تکمیلِ توبہ'' ہے۔ یعنی پہلے اپنے تمام سابقہ گناہوں سے سچی توبہ کرلے اور اپنے آپ کو ان گناہوں اور نجاستوں سے دھولے جن کے اندر ماضی کے ایام گزرے ہیں۔ جب توبہ کر کے نئی زندگی شروع کرلے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت متوجہ ہوگی۔ اس لئے توبہ کی بڑی اہمیت ہے اور اصلاحِ نفس کی طرف جانے والی سب سے پہلی سیڑھی ہے۔

توبہ اجمالی

پھر توبہ کی دو قسمیں ہیں: ایک اجمالی توبہ اور ایک تفصیلی توبہ۔ اجمالی توبہ یہ ہے کہ اب تک جتنے گناہ ہو چکے ہیں، ایک مرتبہ بیٹھ کر ان سب سے یکبارگی اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرلے اور توبہ کرنے سے پہلے دو رکعت ''صلوٰۃ التوبہ'' کی نیت سے پڑھے اور اس کے بعد یہ کہے کہ اے اللہ! اب تک مجھ سے جتنے گناہ ہوئے ہیں، جتنی غلطیاں ہوئی ہیں اور جتنی کوتاہیاں ہوئی ہیں، اے اللہ! میں ان سب سے معافی مانگتا ہوں اور توبہ استغفار کرتا ہوں اور پکا ارادہ کرتا ہوں کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا، یہ ہے ''توبہ اجمالی'' جو سب سے پہلا کام ہے۔

توبہ تفصیلی

اس کے بعد دوسرے نمبر پر ''توبہ تفصیلی'' ہے۔ توبہ تفصیلی یہ ہے کہ جتنے گناہ ہوئے ہیں، ان میں سے جن گناہوں کی تلافی ممکن ہے، ان گناہوں کی تلافی کی جائے۔

تلافی ممکن ہو تو تلافی کرنی ہوگی

توبہ کا قاعدہ یہ ہے کہ جس گناہ کی معافی مانگ رہے ہو، اگر اس کی کوئی تلافی ممکن ہے تو وہ تلافی کرنی ہوگی، مثلاً کسی دوسرے شخص کے پیسے کھالیے اور اب بیٹھ کر توبہ کر رہا ہے کہ یا اللہ! مجھے معاف کر دے، یہ توبہ قبول نہیں ہوگی، اس لئے کہ جس شخص کے پیسے کھائے ہیں، جب تک اس کے پیسے نہیں لوٹاؤ گے یا جب تک اس سے معاف نہیں کراؤ گے، اس وقت تک توبہ قبول نہیں ہوگی، کیونکہ یہاں پر تلافی ممکن ہے۔ یا مثلاً کسی کا دل دکھایا یا کسی کو تکلیف پہنچائی، اس کی تلافی ممکن ہے، وہ یہ کہ اس سے جا کر معافی مانگ لو۔

یہی قاعدہ حقوق اللہ سے توبہ کرنے کے بارے میں بھی ہے، مثلاً آپ نے زکوٰۃ ادا نہیں کی، چونکہ اس کی تلافی کرنی ممکن ہے، اس لئے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، لہٰذا توبہ کے ساتھ تلافی بھی کرو۔ اسی طرح اگر نمازیں رہ گئی ہیں یا روزے رہ گئے ہیں تو پہلے ان کی تلافی کرو اور پھر معافی مانگو۔

قضاءِ عمری کا حکم

آج کل یہ مسئلہ بہت زور و شور سے پھیلایا جارہا ہے کہ قضاء عمری کوئی چیز نہیں، دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "اَلْإِسْلَامُ يَجُبُّ مَا كَانَ قَبْلَهُ"(۱) یعنی اگر کوئی شخص نیا مسلمان ہو تو اسلام لانے سے پہلے جو اس نے گناہ کیے تھے، اسلام لانے سے وہ سب ختم ہو جاتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص ستر سال کی عمر میں اسلام لایا تو اب اسلام لانے کے بعد گزشتہ ستر سال کی نمازیں قضاء کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ جب وہ آج اسلام لایا تو اب آج ہی سے نمازیں شروع کر دے۔

توبہ کو اسلام لانے پر قیاس کرنا

بعض لوگوں نے اسلام لانے پر "توبہ" کرنے کو بھی قیاس کر لیا، وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ساری عمر نمازیں نہیں پڑھیں، اب توبہ کرلی تو اب گزشتہ زمانے کی نمازیں قضاء کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ بات درست نہیں، اس لئے کہ توبہ کو اسلام پر قیاس کرنا درست نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شخص ابھی مسلمان ہوا ہے، وہ جب کافر تھا تو اس کفر کے زمانے میں وہ فروع کا مخاطب ہی نہیں تھا،

---

(۱) مسند أحمد، رقم: ۱۷۱۰۹، سنن البیهقی، رقم: ۱۸۷۵۳ (۴۴۸/۲)

اس کو تو یہ حکم تھا کہ پہلے اسلام لا، اس زمانے میں اس پر نماز فرض نہیں تھی، کیونکہ نماز تو اس وقت فرض ہوگی جب وہ مسلمان ہوگا، اس لئے گزشتہ زمانے کی نمازیں اس پر قضاء کرنی ضروری نہیں۔

بخلاف مسلمان کے، اس پر تو بالغ ہوتے ہی نماز فرض ہوگئی اور جب اس نے وہ نمازیں نہیں پڑھیں تو وہ اس کے ذمے پر باقی رہیں، ایک عرصہ دراز کے بعد جب اس نے نماز چھوڑنے کے گناہ سے توبہ کی تو توبہ کا اصول یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کی ہے، اگر اس کی تلافی ممکن ہے تو تلافی کیے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی، لہٰذا اس کے ذمے ان نمازوں کی قضاء ضروری ہوگی۔ اسی طرح اگر روزے چھوڑے ہیں تو ان روزوں کی قضاء کرنی ہوگی، کیونکہ روزے اس کے ذمے باقی ہیں۔

توبہ سے نمازیں معاف نہیں ہوں گی

ورنہ اس کی تو کوئی معقول وجہ نہیں کہ ایک شخص تو اسی سال تک مسلسل نماز پڑھتا رہے اور دوسرا شخص اسی سال تک نماز نہ پڑھے اور پھر آخر میں اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کرلے کہ یا اللہ! میں توبہ استغفار کرتا ہوں اور اس توبہ کے نتیجے میں اس کی ساری نمازیں معاف ہوجائیں، یہ تو کوئی معقول بات نہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ایک دن کی نمازیں قضاء ہوجائیں تو ان کو قضاء کرلو اور پڑھ لو لیکن اگر ایک دن سے زیادہ کی نمازیں قضاء ہوجائیں تو ان کو قضاء کرنے کی ضرورت نہیں، صرف توبہ کرلو۔ یہ عجیب مسئلہ اپنی طرف سے بنالیا ہے، اس کے ذریعہ لوگوں کے ہاتھ میں بڑا اچھا نسخہ آگیا کہ جب نمازیں قضاء ہوجائیں تو ان کو ایک دن سے زیادہ کرلو اور اس کے بعد توبہ کرلو، یہ سب فضول باتیں ہیں، کیونکہ توبہ کا اصول یہ ہے کہ جس کی تلافی ممکن ہے اس کی تلافی کیے بغیر توبہ قبول نہیں ہوتی۔

شراب سے توبہ

ایک شخص بہت عرصے تک شراب پیتا رہا، اب توبہ کرنے کی توفیق ہوئی تو بس توبہ کرلینا کافی ہے، کیونکہ اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں، تلافی کے بغیر ہی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیں گے۔

چوری سے توبہ

کسی شخص نے کچھ پیسے چوری کیے اور کھالیے، بعد میں توبہ کی توفیق ہوئی تو اس کی تلافی ممکن ہے، وہ اس طرح کہ جس کے پیسے چوری کیے تھے، اس کو پیسے واپس کرے یا اس سے معاف کرائے، اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی۔

زکوٰۃ نہ دینے سے توبہ

یا مثلاً گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کی، اب توبہ کی توفیق ہوئی تو جب تک گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا، اس وقت تک توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یہی معاملہ نمازوں کا اور روزوں کا ہے کہ جب تک ان کو ادا نہیں کرے گا، صرف توبہ کر لینے سے معاف نہیں ہوں گے۔

نمازیں ادا کرے اور وصیت بھی کرے

بہر حال! توبہ تفصیلی یہ ہے کہ انسان اپنی گزشتہ زندگی کا جائزہ لے کر دیکھے کہ میرے ذمے اللہ تعالیٰ کے یا بندوں کے حقوق کچھ واجب ہیں یا نہیں؟ حقوق اللہ میں نماز کو دیکھے کہ میرے ذمے کتنی نمازیں باقی ہیں، ان کو قضاء کرنے کی فکر کرے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مستقل کاپی بنائے، اس کاپی کے اندر یہ لکھے کہ میرے ذمے اتنی نمازیں باقی ہیں، اگر پوری طرح یاد نہ ہوں تو ایک احتیاطی تخمینہ لگا کر ان کی تعداد لکھے اور یہ لکھے کہ میں آج فلاں تاریخ سے ان نمازوں کی ادائیگی شروع کر رہا ہوں اور ہر نماز کے ساتھ ایک سابقہ نماز کی قضاء کروں گا، اور جتنی نمازیں ادا کرلوں گا وہ اس کاپی کے اندر درج کردوں گا، اگر میں ان نمازوں کو قضاء کیے بغیر مر جاؤں تو میں اپنے ورثاء کو وصیت کرتا ہوں کہ میرے مال سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کردیں۔

بلا وصیت فدیہ ادا کرنا واجب نہیں

اگر کوئی شخص اس طرح وصیت نہیں کرے گا تو پھر اگرچہ یہ شخص لاکھوں روپے ترکہ میں چھوڑ کر چلا جائے، پھر بھی وارثوں کے ذمے نمازوں کا فدیہ ادا کرنا واجب نہیں ہوگا، وارثوں پر نماز روزوں کا فدیہ ادا کرنا اس وقت واجب ہوتا ہے جب مرنے والا وصیت کر جائے، اور یہ واجب بھی کُل مال کے ایک تہائی کی حد تک واجب ہوگا، ایک تہائی سے زیادہ میں وصیت نافذ نہیں ہوگی۔

زکوٰۃ روزے ادا کرے اور وصیت کرے

یہی معاملہ روزوں کا ہے۔ اب تک زندگی میں جتنے روزے چھوڑے ہیں، ان کو کاپی کے اندر لکھ لے، اگر یقینی تعداد یاد نہ ہو تو اندازے سے ایک احتیاطی تعداد لکھ لے، پھر ان کو ادا کرنا شروع کرے اور کاپی میں لکھتا رہے کہ میں نے اتنے روزے ادا کرلیے اور اس کاپی میں یہ وصیت بھی لکھے کہ اگر اس دوران میرا انتقال ہو جائے تو میرے ترکہ میں سے بقیہ روزوں کا فدیہ ادا کردیا جائے۔ اسی

طرح زکوٰۃ کا حساب کرے کہ گزشتہ سالوں میں میرے اوپر کتنی زکوٰۃ فرض ہوئی جو میں نے اب تک ادا نہیں کی، پھر اس کو کاپی کے اندر درج کرے اور اس کو ادا کرنا شروع کرے اور کاپی میں لکھتا رہے، اور یہ وصیت بھی لکھ دے کہ اگر اس دوران میرا انتقال ہو جائے تو بقیہ زکوٰۃ میرے مال میں سے ادا کر دی جائے، یہ توبہ تفصیلی ہے۔ بہرحال! اصلاحِ نفس کے لئے جب کوئی شخص کسی شیخ کے پاس جاتا ہے تو اس سے یہ دونوں کام کرائے جاتے ہیں، ایک توبہ اجمالی اور ایک توبہ تفصیلی۔ توبہ کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی جزئیات یہاں بیان فرمائی ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

گناہ نہ کرنے کا عزم دھرا رہ جاتا ہے

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ

''ہر ہفتہ توبہ کرتا ہوں لیکن بعد ایک روز کے تمام تہیہ وغیرہ غارت ہو جاتا ہے''(۱)

یہ وہ حالت ہے جو تقریباً ہر ایک کو زندگی میں پیش آتی ہے کہ توبہ کر لی اور ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے تمام پچھلے گناہوں سے معافی مانگ لی اور تہیہ اور عزم بھی کر لیا کہ آئندہ گناہ نہیں کریں گے، لیکن اگلے دن ہی وہ سب تہیہ اور عزم غارت ہو جاتا ہے، یعنی جس وقت گناہ نہ کرنے کا عزم کیا تھا، اس وقت تو بڑا پکا عزم اور ارادہ تھا کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کریں گے، لیکن جب کچھ وقت گزرتا ہے اور حالات اور واقعات سامنے آتے ہیں تو وہ سارا عزم دھرا رہ جاتا ہے اور آدمی دوبارہ اس گناہ کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے، اکثر و بیشتر یہ حالت ہر ایک کو پیش آتی ہے۔

توبہ کی پہلی شرط گناہ پر ندامت

بلکہ ایک بات اور عرض کر دوں، وہ یہ کہ پہلے تو آدمی کو اس بات میں شبہ رہتا ہے کہ میری توبہ سچی ہوئی یا نہیں، اس لئے کہ توبہ کے لئے تین شرائط ہیں، جب یہ تین شرائط پائی جائیں تب توبہ سچی ہوتی ہے، پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کو پچھلے تمام گناہوں پر دل میں ندامت ہو، شرمندگی ہو اور اس گناہ کا اقرار اور اعتراف ہو، اگر اقرار اور اعتراف نہیں ہے اور گناہ پر ندامت اور پشیمانی نہیں ہے بلکہ سینہ زوری ہے تو پھر توبہ کہاں ہوئی۔ لہٰذا یہ بات کہ انسان گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھے، یہ بڑی خطرناک بات ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔ لہٰذا توبہ کی پہلی شرط ندامت ہے کہ یا اللہ! مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی، میں اقراری مجرم ہوں، مجھے معاف فرما دے۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص:۱۹۴

توبہ کی دوسری شرط: گناہ کا ترک

توبہ کی دوسری شرط جس کے بغیر توبہ کامل نہیں ہوتی، وہ یہ ہے کہ فوراً اس گناہ کو چھوڑ دے، اس کے بغیر توبہ نہیں ہو سکتی، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ انسان ایک طرف توبہ کر رہا ہے اور دوسری طرف اس گناہ کو بھی کر رہا ہے، یہ تو کوئی توبہ نہ ہوئی۔

توبہ کی تیسری شرط: گناہ نہ کرنے کا عزم

تیسری شرط یہ ہے کہ آئندہ کے لئے دل میں یہ عزم اور ارادہ کر لے کہ میں آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا اور اس کے پاس نہیں پھٹکوں گا۔ بہر حال! توبہ کی یہ تین شرائط ہیں جن کے بغیر توبہ مکمل نہیں ہوتی۔

عزم نہ ہونے کا شبہ

جہاں تک پہلی شرط کا تعلق ہے کہ گناہ پر ندامت اور شرمندگی ہو، اکثر صاحبِ ایمان کو یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ اور دوسری شرط یعنی گناہ کو چھوڑ دینا، اس پر بھی عام طور پر عمل ہو جاتا ہے۔ البتہ تیسری شرط کہ یہ عزم کرنا کہ آئندہ کبھی اس گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا، اس شرط کے پورا ہونے میں اکثر شبہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں پکا ارادہ ہوا یا نہیں، کیونکہ توبہ کرتے وقت دل میں یہ دھڑ کا لگا ہوا ہے کہ توبہ تو کر رہا ہوں لیکن میں کتنا اس توبہ پر قائم رہوں گا اور کتنا میں اپنے آپ کو اس گناہ سے بچا سکوں گا، اس بارے میں دل میں شبہ رہتا ہے، اس شبہ کی موجودگی میں عزم مکمل ہوا یا نہیں، اور جب عزم مکمل ہونے میں شبہ ہے تو توبہ مکمل ہونے میں بھی شبہ ہوا، کیونکہ عزم کے بغیر توبہ مکمل نہیں ہوتی، اس وجہ سے آدمی پریشانی کا شکار رہتا ہے۔

دھڑ کا لگا رہنا توبہ کے منافی نہیں

غور سے سمجھ لیجئے کہ توبہ کے پکا اور سچا ہونے کے لئے عزم بیشک ضروری ہے، لیکن اگر دل میں ساتھ ساتھ یہ دھڑ کا لگا ہوا ہے کہ میں عزم تو کر رہا ہوں مگر پتہ نہیں میں آئندہ اس عزم پر قائم رہوں گا یا نہیں، اپنے نفس پر بھروسہ نہیں ہے، تو محض یہ دھڑ کا لگا رہنا توبہ کی تکمیل کے منافی نہیں، جب پکا ارادہ کر لیا تو دھڑ کے کے باوجود وہ ارادہ پکا ہی رہے گا اور اس کی وجہ سے توبہ میں کوئی نقص واقع نہیں ہو گا انشاء اللہ۔

دھڑکے کی ایک مثال

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے آپ نے ایک عمارت تعمیر کی اور اپنی طرف سے اس کو پختہ بنایا، ستون پختہ بنائے، بیم پختہ بنائے، لوہا اور سیمنٹ مناسب لگایا، لیکن ساتھ میں یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ اگر کسی دن زلزلہ آیا تو عمارت گر جائے گی، یا کسی وقت اس کے اوپر بم گر گیا تو یہ عمارت گر جائے گی، اب زلزلہ کا بھی اندیشہ ہے، بم گرنے کا بھی اندیشہ ہے اور کوئی حادثہ پیش آجانے کا بھی اندیشہ ہے لیکن ان اندیشوں کی وجہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ عمارت پکی نہیں بنی، بلکہ عمارت تو پکی ہے، البتہ اندیشے اپنی جگہ ہیں، ان اندیشوں کے لئے کوئی اور تدبیر اور سدِباب سوچو لیکن اس کی وجہ سے عمارت کو کمزور نہیں کہا جائے گا۔

آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم توبہ کے لئے کافی ہے

یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں اور نہ مجھے یہ بات کہنے کی جرأت ہوتی، بلکہ یہ بات میں نے اپنے ایک بزرگ حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہے جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازِ صحبت تھے اور بڑے عجیب وغریب صاحبِ کشف وکرامت بزرگ تھے، وہ اپنی ہر مجلس میں اس بات پر بہت زور دیا کرتے تھے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دین پر چلنا بڑا مشکل ہے، ارے میاں! روزانہ توبہ کر لیا کرو۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ یہ فرماتے ہیں کہ توبہ کر لیا کرو، ہمیں تو اسی میں شک رہتا ہے کہ پکی توبہ ہوئی یا نہیں؟ کیونکہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم پکا ہوا یا نہیں؟ اس وقت انہوں نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ اپنی طرف سے تو گناہ نہ کرنے کا عزم کر لو، پھر یہ جو گناہ ہو جانے کا اندیشہ اور دھڑکا لگا ہوا ہے، یہ توبہ کے منافی نہیں۔ بعد میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور ملفوظات میں کئی مقامات پر یہ مضمون نظر سے گزرا، حضرت والا نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ یہ اندیشہ توبہ کے منافی نہیں، اس لئے جب ایک مرتبہ اپنی طرف سے پکا ارادہ کر لیا کہ ان شاء اللہ یہ کام نہیں کروں گا تو بس توبہ ہوگئی۔

توبہ کے نتیجے میں گناہ نامۂ اعمال سے مٹا دیئے جاتے ہیں

اور توبہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت تم نے یہ توبہ کر لی، اس وقت تک تمہارے جتنے گناہ تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مٹا دیئے۔ اس بارگاہ کا کرم دیکھئے کہ توبہ کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ وہ گناہ معاف کر دیئے اور معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ تمہارے نامہ اعمال میں درج تو ہیں

لیکن اس پر تمہیں سزا نہیں دیں گے بلکہ توبہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ تمہارے نامۂ اعمال سے بھی مٹادیئے جائیں گے، اب وہ گناہ تمہارے نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے نہیں ہوں گے تاکہ آخرت میں ان گناہوں کو دیکھ کر شرمندگی بھی نہ ہو کہ میں نے فلاں کام کیا تھا۔

آج کل حساب کا جو طریقہ ہے، اس میں تین کالم ہوتے ہیں، ایک ڈیبٹ کا، ایک کریڈٹ کا، ایک بیلنس کا، یعنی یہ آمدنی ہوئی اور یہ خرچ ہوا اور یہ بیلنس ہوا۔ لہٰذا جتنے پیسے کسی کو دیئے ہیں وہ بھی حساب میں لکھے ہوئے ہیں اور جتنے پیسے کسی سے لیے ہیں وہ بھی حساب میں لکھے ہوئے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں حساب اس طرح ہے کہ وہاں ڈیبٹ کوئی نہیں، کیونکہ جب تم نے توبہ کرلی تو اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل کے ساتھ معافی مانگ لی تو اب تمہارے ڈیبٹ کے خانے میں کچھ بھی لکھا ہوا نہیں ہوگا بلکہ جو کچھ لکھا ہوگا وہ کریڈٹ کے خانے میں ہوگا اور اس پر تمہیں انشاء اللہ ثواب ملے گا۔

''ستّار'' ستاری کا معاملہ فرمائیں گے

بخاری شریف میں حدیث ہے کہ ایک بندے کو اللہ تعالیٰ بلائیں گے اور سرگوشی کے انداز میں اس سے کہیں گے کہ بتا تو نے دنیا میں یہ گناہ کیا تھا؟ وہ کہے گا: جی ہاں! کیا تھا۔ فلاں گناہ کیا تھا؟ وہ کہے گا: کیا تھا۔ فلاں گناہ کیا تھا؟ جی ہاں! کیا تھا۔ گناہ شمار کرانے اور اقرار لینے کے بعد پھر اس بندے سے فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں تیری ستاری کی، تیری پردہ پوشی کی اور کسی کو ان گناہوں کے بارے میں پتہ بھی نہیں چلا، ان گناہوں کو یا میں جانتا ہوں یا تو جانتا ہے، آج میں تیرے ان گناہوں کو معاف کرتا ہوں(۱) لہٰذا وہاں آخرت میں بھی کسی دوسرے کو وہ گناہ نہیں دکھائیں گے، اللہ تعالیٰ ایسی ستاری فرمائیں گے۔ بہرحال! اگر ایک مرتبہ توبہ پکی ہوگئی تو انشاء اللہ وہ گناہ معاف ہوگئے اور نامۂ اعمال سے مٹادیئے گئے۔

اللہ تعالیٰ سے ہی توبہ پر استقامت طلب کرو

اب اگر اس بات کا دھڑکا لگا ہوا ہے کہ کہیں یہ گناہ دوبارہ ہم سے سرزد نہ ہوجائے تو یہ دھڑکا لگا کرے اور اس کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ یا اللہ! میں نے توبہ کرلی، لیکن اے اللہ! جب تک آپ کی توفیق نہیں ہوگی، میں اپنے قوتِ بازو سے اس توبہ پر قائم نہیں رہ سکتا، آپ اپنے فضل و کرم سے مجھے اس پر استقامت عطا فرمایئے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المظالم والغصب، باب قول اللہ تعالیٰ ألا لعنة اللہ علی الظالمین، رقم: ۲۲٦۱، مسند أحمد، رقم: ۵۱۷۹

اے اللہ! ہمارے اعضاء آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں

ایک دعا میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ إِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِيَنَا وَجَوَارِحَنَا بِيَدِكَ لَمْ تُمَلِّكْنَا مِنْهَا شَيْئًا فَإِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ بِنَا فَكُنْ أَنْتَ وَلِيَّنَا وَاهْدِنَا إِلٰى سَوَاءِ السَّبِيْلِ))(۱)

''اے اللہ! ہمارے دل، ہماری پیشانیاں اور ہمارے اعضاء و جوارح، یہ سب آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، ان میں سے کسی چیز کا آپ نے ہمیں مالک نہیں بنایا، نہ ہم اپنے دل کے مالک ہیں، نہ اپنی زبان کے مالک ہیں اور نہ اعضاء کے مالک ہیں، لہٰذا جب یہ سب اعضاء آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں تو اے اللہ! آپ ہی ہمارے کارساز بن جائیے اور ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرمائیے''

اے اللہ! وہ چیز عطا فرما جو آپ کو راضی کردے

یہ بھی اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ! ہم نے توبہ تو کرلی لیکن یہ دل، یہ دماغ، یہ زبان، یہ ہاتھ، یہ پاؤں اور یہ اعضاء و جوارح سب آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اے اللہ! اب آپ ہی ان کو ثابت قدم رکھئے، ہمارے بس میں نہیں اور یہ دعا کریں:

((اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ سَأَلْتَنَا مِنْ أَنْفُسِنَا مَا لَا نَمْلِكُهُ إِلَّا بِكَ فَأَعْطِنَا مِنْهَا مَا يُرْضِيْكَ عَنَّا))(۲)

''اے اللہ! آپ نے ہم سے ایسی ایسی چیزوں کا مطالبہ فرمایا ہے جس کو پورا کرنے کی ہمارے اندر طاقت نہیں جب تک کہ آپ کی توفیق نہ ہو، لہٰذا اے اللہ! ہمیں وہ چیزیں عطا فرما جو آپ کو ہم سے راضی کردیں''

اس لئے اپنی توبہ پکی کرلو اور جو دھڑکا لگا ہوا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردو اور یہ کہو: اے اللہ! آپ ہی اس توبہ پر ثابت قدم رکھئے۔

پختہ کار بننے کے لئے لمبا سفر درکار ہے

دوسرا مسئلہ وہ ہے جو ان صاحب نے حضرت والا سے پوچھا کہ ہر ہفتہ توبہ کرتا ہوں اور ایک

(۱) تاریخ بغداد، رقم: ۷۱۷۷ (۱۳/۱۹۹)

(۲) کنز العمال، رقم: ۳۶۲۵ (۲/۱۷۸)، جامع الأحادیث، رقم: ٤٩٥٥ (٦/١٧٥)

دن کے بعد تمام تہیہ غارت ہو جاتا ہے، ایک دن توبہ کی، دوسرے دن پھر گناہ میں مبتلا ہو گیا۔ یہ معاملہ بکثرت ہم سب کو پیش آتا رہتا ہے۔ حضرت والا نے ان صاحب کے جواب میں پہلے تین شعر لکھے۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی
صوفی نہ شود صافی تا در نکشد جامی

یہ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے، یعنی کوئی صوفی صحیح معنوں میں صوفی نہیں ہو سکتا جب تک وہ پانی کے ساتھ تلچھٹ بھی نہ پیئے، جب صوفی پانی کے ساتھ تلچھٹ پینا گوارا کر لیتا ہے تو بالآخر اللہ تعالیٰ اس کو صاف کر دیتے ہیں، اور انسان کے اندر جو خامی ہے اس کو دور ہونے میں اور انسان کو پختہ کار بننے میں ایک دن ایک رات کافی نہیں بلکہ اس کے لئے لمبا سفر چاہئے۔

مرتے دم تک فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا

حضرت والا نے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا شعر نقل فرمایا کہ

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

یعنی اس راستے میں ہر وقت تراش و خراش کرنی پڑتی ہے اور مرتے دم تک ایک لمحے کے لئے بھی فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا۔ یعنی یہ نہیں کہ آدمی مطمئن ہو کر بیٹھ جائے کہ اب ہماری اصلاح ہو گئی۔ یہ نفس جو تمہارے ساتھ لگا ہوا ہے، یہ کسی وقت بھی تمہیں ڈس جائے گا، لہٰذا کسی وقت بھی بے فکر ہو کر نہیں بیٹھنا۔ جیسے آپ نے پھلواری لگائی تو اب اس پھلواری کو قاعدے میں رکھنے کے لئے کٹائی چھٹائی کی ضرورت ہر وقت لگی رہے گی، کبھی ایک پتہ کاٹ دیا، کبھی ٹہنی کاٹ دی، کبھی پھول کاٹ دیا، اگر اس پھلواری کو ویسے ہی چھوڑ دو گے تو وہ جھاڑ جھنکاڑ بن جائے گا۔ اسی طرح انسان کو اپنے نفس کی تراش خراش کرنی پڑتی ہے اور اس کی ہر وقت نگرانی کرنی پڑتی ہے، ایک لحہ کے لئے بھی فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا چاہئے۔

آخر کار عنایت ہو ہی جاتی ہے

تیسرا شعر یہ لکھا کہ

تا دمِ آخر دمے آخر بود
کہ عنایت با تو صاحب سر بود

یعنی اگر اللہ تعالیٰ آخر دم تک اپنی طرف رجوع کی توفیق عطا فرما دیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف

سے عنایت ہو ہی جاتی ہے۔

جب توبہ ٹوٹے دوبارہ عزم کرلو

یہ تین شعر لکھنے کے بعد حضرت والا نے یہ جملہ لکھا:

''حاصل یہ کہ فکر و کوشش جاری رکھنا چاہیے، انشاء اللہ تعالیٰ اسی طرح کامیابی ہو جائے گی''(۱)

یعنی اس گر کو پلّے باندھ لو، وہ یہ کہ جو بار بار توبہ ٹوٹ رہی ہے، اس سے مایوس ہو کر نہیں بیٹھنا ہے، بلکہ اس کا مقابلہ اس طرح کرنا ہے کہ جب توبہ ٹوٹے پھر دوبارہ پختہ عزم کرو، پھر توبہ ٹوٹے پھر دوبارہ پختہ عزم کرلو، یہ فکر اور کوشش آخر وقت تک جاری رہنی چاہیے، مایوس ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیے کہ یہ میری توبہ بار بار ٹوٹ رہی ہے لہٰذا توبہ کرنے کو چھوڑ دو، یہ مایوسی ٹھیک نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ پختہ عزم کرو۔

انسان کے ارادے میں بڑی قوت ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ارادے میں بڑی قوت دی ہے، انسان نے اپنے ارادے کی طاقت سے بڑے بڑے پہاڑ سر کرلیے ہیں، ارادے کی طاقت سے چاند پر پہنچ گیا، اور مریخ پر پہنچ گیا، ایٹم بم بنالیا، ہائیڈروجن بم بنالیا، اسی ہمت کی طاقت سے یہ سب کام کرلیے، اس ہمت کی طاقت کو نفس و شیطان کا مقابلہ کرنے کے لئے استعمال کرو، گناہ سے بچنے کے لئے اس کو استعمال کرو، اگر ایک مرتبہ گر گئے تو پھر دوبارہ تازہ دم ہو کر اٹھو اور اپنے عزم کو تازہ کرو کہ میں پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ اس گناہ کا مقابلہ کروں گا۔

اگر ہتھیار ڈال دیئے تو مارا گیا

ابتداء میں کشمکش ہوتی ہے، جب انسان قرآن و حدیث سنتا ہے یا بزرگوں کی باتیں سنتا ہے تو دل میں خیال آتا ہے کہ گناہوں کو چھوڑنا چاہئے اور صحیح راستے پر آنا چاہیے، لیکن نفس جو گناہ کا عادی بنا ہوا ہے وہ دوسری طرف لے جانا چاہتا ہے، اب نیکی کے تقاضے اور برائی کے تقاضے میں کشتی ہوتی ہے، نفس چونکہ موٹا ہے اور اس کے اندر گناہ کرنے کی طاقت موجود ہے جبکہ نیکی کے تقاضے کے اندر ابھی اتنی طاقت پیدا نہیں ہوئی، اس لئے جب دونوں کے درمیان کشتی ہوتی ہے تو یہ نفس نیکی کے تقاضے کو

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۹۴

گرا دیتا ہے، اب اگر نیکی کے تقاضے نے اس نفس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے کہ اس نفس نے مجھے ڈھا دیا، اب اس نفس سے مقابلہ کرنا بیکار ہے تو یہ نیکی کا تقاضا مارا گیا۔

پھر ہمیشہ نفس گرتا رہے گا

لیکن اگر نیکی کے تقاضے کو یہ سمجھایا کہ تو جتنی مرتبہ پٹے گا، اتنی مرتبہ تیرے اندر مزید قوت پیدا ہوگی، تو اب وہ نیکی کا تقاضا نئی طاقت کے ساتھ، نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ اُٹھے گا، اب جب دوبارہ نفس سے مقابلہ ہوگا تو یہ نیکی کا تقاضا کچھ دیر اس کے مقابلے میں ڈٹا رہے گا، یہ نہیں ہوگا کہ پہلے ہی داؤ میں گر جائے بلکہ پہلی مرتبہ کی بنسبت مقابلہ بہتر ہوگا، البتہ پھر دوبارہ گر جائے گا، پھر اس گرنے کے نتیجے میں دوبارہ اس کے اندر مزید طاقت اور قوت پیدا ہوگی، اب تیسری مرتبہ جب مقابلہ ہوگا تو یہ نفس کا ڈٹ کر برابر کا مقابلہ کرے گا، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نیکی کا تقاضا نفس کو بھی چت کر دے گا۔ زندگی بھر یہ ہوتا رہے گا کہ کبھی اس نے گرا دیا اور کبھی اس نے گرا دیا، کبھی یہ غالب آ گیا اور کبھی وہ غالب آ گیا، جب بار بار مقابلہ ہوتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر اتنی طاقت عطا فرما دیں گے کہ پھر ہمیشہ نیکی کا تقاضا نفس کو گرائے گا اور نفس ہمیشہ گرتا رہے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مرتے دم تک نفس سے ہوشیار رہنا ہے

لیکن قاعدہ یہ ہے کہ بڑے سے بڑا پہلوان بھی غافل ہو کر نہیں بیٹھتا کہ اب چونکہ میں بہت بڑا پہلوان ہو گیا ہوں، لہٰذا اب مجھے کسرت کی اور مشق کرنے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اس کو بھی روزانہ کسرت کرنی ہے اور روزانہ بادام کھانے ہیں اور روزانہ اپنی غذا کا اہتمام کرنا ہے، اگر اس نے یہ چیزیں چھوڑ دیں تو وہ ٹھس ہو جائے گا اور کسی کا مقابلہ کرنے کی طاقت اس میں نہیں رہے گی، لہٰذا اگر طاقت حاصل کر کے پہلوان بن بھی گیا اور نفس و شیطان کو گرا بھی دیا، تب بھی اس کو ہر وقت ریاضت کی ضرورت ہے تا کہ اس کی قوت اسی درجے میں بحال رہے، اسی لئے فرمایا:

تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

آخر دم تک ایک لمحے کے لئے بھی فارغ ہونے کا موقع نہیں ہے۔

جام سے توبہ شکن، توبہ میری جام شکن

بہر حال! توبہ ٹوٹنے کا معاملہ ہر انسان کے ساتھ پیش آتا ہے، لہٰذا گھبرانے کی ضرورت نہیں، جب توبہ ٹوٹے، دوبارہ توبہ کرلو اور أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّىْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ پڑھ لو۔ ایک شاعر

کا بڑے مزے کا شعر ہے کہ۔

جامِ مے توبہ شکن، توبہ میری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

جب جامِ مے سامنے آتا ہے تو توبہ ٹوٹ جاتی ہے اور جب توبہ آتی ہے تو جام کو توڑ دیتی ہے، اس کے نتیجے میں میرے سامنے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ ''پیمانوں'' کا لفظ شاعر نے یہاں دو معنوں میں استعمال کیا ہے، ایک تو ''عہد'' کے معنی میں، کیونکہ ''عہد'' کو بھی ''پیمان'' کہتے ہیں اور دوسرے ''گلاس'' کے معنی میں، کیونکہ شرب کے گلاس کو پیمانہ کہا جاتا ہے، اس لئے اس نے کہا کہ ''سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے'' یعنی ایک طرف پیمان ٹوٹ رہے ہیں اور دوسری طرف پیمانے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ ''پیمان'' میں اتنی طاقت عطا فرمادیتے ہیں کہ پھر ''پیمانے'' ہی ٹوٹتے ہیں، ''پیمان'' نہیں ٹوٹے۔ اگر آدمی شروع میں گھبرا جائے کہ یہ میری توبہ ٹوٹ رہی ہے اور ہار کر بیٹھ جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس و شیطان نے غلبہ پالیا، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی اس سے حفاظت فرمائے۔

توبہ تازہ کرتے رہیں

جتنی مرتبہ بھی توبہ ٹوٹے، اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً دوبارہ عہد کو تازہ کرو اور دوبارہ توبہ کی طرف بڑھو، ان کی بارگاہ تو ایسی ہے جیسے کسی شاعر نے کہا کہ

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
از کفر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار گر توبہ شکستی باز آ

یعنی اور جگہوں کا تو معاملہ یہ ہے کہ اگر تم ایک مرتبہ جرم کرو گے، دو مرتبہ کرو گے، تین مرتبہ کرو گے، معاف کردیئے جاؤ گے، لیکن اگر روزانہ ہی جرم کرو گے تو وہ کان سے پکڑ کر باہر نکال دیئے جاؤ گے اور یہ کہہ دیا جائے گا کہ اب یہاں مت آنا، مگر ان کی بارگاہ ایسی ہے کہ ان کی طرف سے یہ اعلان ہو رہا ہے کہ اگر سو بار بھی توبہ توڑ چکے ہو تو پھر میرے پاس واپس آجاؤ، پھر بھی تمہاری توبہ قبول کرلوں گا۔ مرتے دم تک نزع کی آخری حالت سے پہلے پہلے تک توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، لہٰذا گھبرانے کی ضرورت نہیں بلکہ کوشش جاری رکھنی چاہئے، انشاء اللہ اسی طرح کامیابی ہو جائے گی، ہمت نہ ہارو اور مایوس ہو کر مت بیٹھو اور کوشش کو چھوڑ کر نہ بیٹھ جاؤ، اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن کامیابی عطا فرمادیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے باتیں کیا کرو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں! اللہ تعالیٰ سے اس طرح باتیں کیا کرو کہ یا اللہ! میں اس گناہ کے سیلاب سے نہیں بچ سکوں گا، یہ میرے بس میں نہیں، میں آپ سے مانگتا ہوں کہ آپ ہی مجھے بچائیے ورنہ پھر مجھ سے مؤاخذہ نہ فرمائیے گا، ہر چیز آپ کی قدرت میں ہے، میں اپنے آپ کو آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اپنے اللہ میاں سے اس طرح کی باتیں کیا کرو، اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دعا رد نہیں فرماتے۔

حضرت یونس علیہ السلام سے سبق لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت یونس علیہ السلام کے قصے کے بیان میں اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب بات بیان فرمائی ہے، وہ یہ کہ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تین دن رہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات درمیان میں عرض کر دوں کہ اہلِ حکمت کے نزدیک اس کائنات میں کوئی خبر خبرِ محض نہیں بلکہ ہر خبر بمعنی انشاء ہوتی ہے، یعنی ہر خبر سے کوئی نہ کوئی امر یا نہی نکلتا ہے کہ یہ کام کرو یا یہ کام نہ کرو اور ہر خبر سے کوئی نہ کوئی سبق ملتا ہے، لہٰذا قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جتنے واقعات بیان فرمائے ہیں، ان کے اندر کوئی نہ کوئی سبق ہے۔

بہر حال! حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تین دن رہے، وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا، اس اندھیرے میں یہ کام کیا کہ اپنے رب کو پکارا اور کہا:

﴿لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾

آگے اللہ تعالیٰ نے بڑے مزے کی بات بیان فرمائی:

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۚ وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾(۱)

جب اس نے ہمیں پکارا تو ہم نے اس کی پکار کو قبول کر لیا اور اس کو ہم نے اس گھٹن سے نجات دے دی اور اسی طرح ہم مؤمنوں کو نجات دیتے ہیں یا نجات دیں گے۔

کیا ہر مؤمن پہلے مچھلی کے پیٹ میں جائے گا؟

اب سوال یہ ہے کہ اس آخری جملے کا کیا مطلب ہے کہ ہم اسی طرح مؤمنوں کو نجات دیں گے، کیا ہر مؤمن پہلے مچھلی کے پیٹ میں جائے گا، وہاں جا کر یہ کلمات "لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحٰنَكَ

(۱) الأنبياء: ۸۸

إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" پڑھے گا تو ہم اس کو بھی مچھلی کے پیٹ سے نجات دے دیں گے؟ ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں، بلکہ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی تم کسی بھی قسم کی ظلمت میں گھر جاؤ، گناہوں کی ظلمت میں یا ماحول کی ظلمت میں یا شر کی ظلمت میں گھر جاؤ تو ہمیں پکارو اور کہو "لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ"، اور جب تم ہمیں پکارو گے تو جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو ہم نے نجات دی تھی، اسی طرح ہم تمہیں بھی نجات دیں گے۔

اس ذات کو پکارو

لہٰذا ہم لوگ جو نفس کی اور گناہوں کی تاریکی میں گھرے ہوئے ہیں، اس کا حل یہ ہے کہ اسی ذات کو پکارو جس نے اس نفس کو پیدا کیا اور جو خالق نور بھی ہے اور خالق ظلمت بھی ہے، جو خالق خیر بھی ہے اور خالق شر بھی ہے، اسی کو پکارو اور کہو کہ اے اللہ! آپ نے ان کو پیدا فرمایا ہے، آپ ہی ان کو ہم سے دور فرما دیجئے، تم اس طرح پکارو گے تو اللہ تعالیٰ نجات عطا فرما دیں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سو مرتبہ استغفار فرماتے

خلاصہ یہ کہ توبہ ایسی چیز نہیں کہ اگر کسی وقت وہ ٹوٹ جائے تو آدمی مایوس ہو کر بیٹھ جائے۔ نہیں، بلکہ ساری عمر یہ کام کرتے رہنا ہے۔ ارے ہم اور آپ کس شمار وقطار میں ہیں، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اپنے پروردگار سے دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں، جبکہ آپ گناہوں سے معصوم ہیں اور گناہوں کا صدور آپ سے ممکن نہیں اور کوئی بھول چوک ہو بھی گئی تو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے اعلان فرما دیا ہے کہ وہ سب معاف ہے، اس کے باوجود آپ فرماتے ہیں کہ میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔(۱)

پچھلے درجات سے استغفار ہوتا تھا

بزرگوں نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے استغفار فرماتے تھے کہ آپ کے درجات میں ہر لمحہ اور ہر لحظہ ترقی ہو رہی تھی، جب آپ اگلے درجے پر پہنچتے تو پچھلا درجہ آپ کو بمنزلہ گناہ کے نظر آتا تھا، آپ اس پر استغفار فرماتے تھے، لہٰذا ہمیں تو ہر آن استغفار کرتے رہنا چاہئے،

(۱) صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والإستغفار، باب استحباب الإستغفار والاستكثار منه، رقم: ٤٨٧٠، سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب الإستغفار، رقم: ٣٨٠٥، مسند أحمد، رقم: ١٧١٧٤

جب غلطی ہو جائے پھر لوٹ آؤ، پھر غلطی ہو جائے تو پھر استغفار کرلو، یہی عمل کرتے رہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غلبہ عطا فرما دیں گے انشاء اللہ اور نفس و شیطان تمہارے قابو آ جائیں گے بشرطیکہ تم ان کے سامنے ڈٹ جاؤ۔

شیطان کا مکر کمزور ہے

قرآن کریم نے فرمایا:

﴿إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا﴾(۱)

یعنی شیطان کا مکر بڑا کمزور ہے، بظاہر تو یہ بڑا فوں فاں کرتا ہے اور بڑا رعب دار معلوم ہوتا ہے لیکن جو آدمی ایک مرتبہ اس کے سامنے ڈٹ گیا، یہ وہیں غبارے کی طرح بیٹھ جاتا ہے، بس اس کے سامنے ڈٹ جانا شرط ہے۔ بعض لوگ فوں فاں بہت کرتے ہیں اور شور مچاتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں لیکن ان کے اندر کچھ بھی نہیں ہوتا، چنانچہ اگر کوئی دوسرا آدمی ان کے مقابلے میں ڈٹ جائے تو وہ وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ روس کا سربراہ بڑی ڈینگیں مارا کرتا تھا کہ میں یہ کردوں گا، وہ کردوں گا، ساری دنیا کو تباہ و برباد کردوں گا، روزانہ اس کا ایک نیا بیان آجاتا تھا، لوگ پریشان تھے کہ معلوم نہیں یہ کیا چیز ہے، لیکن جب بیٹھا تو بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نفس و شیطان کو ایسا ہی بنایا ہے، ان کا مقابلہ کرنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے اور یہ بڑے طاقتور معلوم ہوتے ہیں لیکن ذرا سا آدمی ان کے سامنے ڈٹ جائے تو یہ بتاشے کی طرح بیٹھ جاتے ہیں، اس لئے ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، جتنی مرتبہ غلطی ہو جائے اور گناہ ہو جائے، ہر مرتبہ لوٹ آؤ۔

توبہ کے معنی ہیں لوٹ آنا

توبہ کے معنی کیا ہیں؟ توبہ کے لفظی معنی ہیں "لوٹ آنا" یہ تَابَ يَتُوبُ تَوْبَةً سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں لوٹ کے آجانا، یعنی گناہ کرنے کے نتیجے میں تم بھٹک گئے تھے، اب واپس لوٹ آؤ، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تم لوٹو گے تو میں لوٹوں گا، یعنی جب تم توبہ کرو گے تو میں گناہ معاف کردوں گا، لہٰذا جب بھی ذرا پٹری سے اُتر گئے، پھر واپس پٹری پر آجاؤ، پھر اُتر گئے پھر واپس آجاؤ، یہ نہ ہو کہ بس جب پٹری سے اُتر گئے تو بس اب اُتر ہی گئے، اب واپس لوٹنے کی ضرورت نہیں، یہ نہ کرو بلکہ دوبارہ لوٹ آؤ۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

(۱) النساء: ٧٦

گناہ چھوڑنے کا عزم کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

چند روز سے توبہ کا بیان چل رہا ہے اور اصلاحِ نفس کے راستے میں سب سے پہلا قدم توبہ کی تکمیل ہے۔ آگے ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اگر توبہ کے وقت عزمِ ترک فی المستقبل نہ ہو تو عزم عمل فی المستقبل بھی نہ ہو بلکہ عزم عمل سے ذہن خالی ہو، اگر اس طرح خالی الذہن ہو کر بھی توبہ ندامت کے ساتھ ہوگئی تو توبہ صحیح ہوگئی''(۱)

تکمیلِ توبہ کی تین شرطیں

اس ملفوظ میں مختصر لفظوں میں بہت بڑا مضمون حضرت والا نے بیان فرمایا ہے جس میں ہم جیسے کمزوروں کے لئے بڑی تسلی کا سامان ہے۔ توبہ کے بارے میں تمام حضرات صوفیاء یہ فرماتے ہیں کہ تین چیزوں سے توبہ کی تکمیل ہوتی ہے، پہلی چیز یہ ہے کہ جو گناہ سرزد ہوا ہے، دل سے اس پر ندامت اور شرمندگی ہو کہ مجھ سے یہ غلطی ہوگئی، دوسری چیز یہ ہے کہ اس گناہ کو فوراً چھوڑ دے، مثلاً ایک شخص نے جھوٹ بولا، اب اس جھوٹ سے توبہ کرنا چاہتا ہے تو پہلے تو ندامت پیدا کرے کہ مجھ سے یہ کیسی غلطی ہوگئی کہ میں نے یہ جھوٹ بول دیا اور پھر فوراً جھوٹ بولنا چھوڑ دے، تیسری چیز یہ ہے کہ آئندہ کے لئے یہ عزم کرے کہ میں آئندہ ہرگز یہ کام نہیں کروں گا، جب یہ تین چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تو پھر توبہ کامل ہو جاتی ہے۔

تیسری چیز کے پائے جانے میں شک

جہاں تک پہلی دو چیزوں کا تعلق ہے یعنی اس گناہ پر نادم اور شرمندہ ہونا اور اس گناہ کو چھوڑ دینا، ان دونوں پر عام طور پر عمل ہو جاتا ہے اور ان کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ جہاں تک تیسری

☆ اصلاحی مجالس (۵/۳۰۶ تا ۳۲۴)، رمضان المبارک، بعد از نماز ظہر، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) انفاس عیسیٰ: ص ۱۹۷

چیز کا تعلق ہے یعنی آئندہ کے لئے پختہ ارادہ کرنا کہ میں آئندہ ہرگز اس گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا، اس میں یہ شبہ رہتا ہے کہ میرا یہ عزم کامل ہوا یا نہیں؟ جبکہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کرنا توبہ کا لازمی جز ہے، جب اس میں شبہ پیدا ہو گیا تو اس کے نتیجے میں توبہ مشکوک ہو گئی، اور جب توبہ مشکوک ہو گئی تو گناہ معاف نہیں ہوں گے، کیونکہ اگر توبہ صحیح ہو تو اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کا وعدہ ہے، لیکن اگر توبہ کے صحیح ہونے میں ہی شک ہو گا تو گناہ کے معاف ہونے میں بھی شک ہو جائے گا۔ بہر حال! اس تیسری چیز کے بارے میں اکثر و بیشتر دِلوں میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے۔

رات کو سونے سے پہلے توبہ کر لیا کرو

ہمارے بزرگ حضرت بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ توبہ پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ چنانچہ میں ایک دن ان کے پاس گیا تو اس وقت ایک نوجوان اپنے کسی کام سے ان کے پاس آیا ہوا تھا۔ اس نوجوان میں سر سے لے کر پاؤں تک دینداری کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہ تھا کہ جو شخص بھی ان کے پاس آتا تو اس کے کان میں کوئی دین کی بات ڈال دیتے تھے، چاہے وہ کسی بھی مقصد سے آیا ہو، لہٰذا جب وہ نوجوان واپس جانے لگا تو آپ نے اس سے فرمایا:

''بیٹا ایک بات سنتے جاؤ، وہ یہ کہ لوگ دین کو بہت مشکل سمجھتے ہیں کہ دین پر عمل کرنا بڑا مشکل کام ہے، ارے کچھ بھی مشکل نہیں، بس رات کو سونے سے پہلے تھوڑی دیر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کر لیا کرو''

وہ نوجوان آدمی تھا، نہ نماز، نہ روزہ، نہ کوئی اور عبادت کرتا تھا لیکن حضرت والا نے اس کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ بس توبہ کر لیا کرو۔

اللہ والے لوگوں کو قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں

اب نیا آدمی جو ناشناسِ ادا ہو گا وہ تو اس واقعہ کو دیکھ کر یہ سمجھے گا کہ حضرت نے اس کو کھلی چھٹی دے دی کہ تو جو چاہے کرتا رہ، نماز بھی نہ پڑھ، روزہ بھی نہ رکھ اور گناہ بھی کرتا رہ، لیکن رات کو بیٹھ کر توبہ کر لیا کر۔ یہ چھوٹ دینا ان کے لئے کیسے درست ہوا؟

بات دراصل یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندے جن کو اللہ تعالیٰ فہم عطا فرماتے ہیں، یہ حضرات لوگوں کو شکار کرتے ہیں اور شکار کرنے کے لئے جس طرح دانہ ڈالا جاتا ہے، اسی طرح ان لوگوں کا بھی شکار کرنے کا ایک طریقہ ہے، کیونکہ اگر اس نوجوان سے یہ کہہ دیتے کہ تو روزانہ پانچ وقت نماز پڑھا کر اور یہ جو بے ہودہ لباس پہن رکھا ہے اس کو چھوڑ اور تو نے داڑھی منڈائی ہوئی ہے، اس کو چھوڑ، تو وہ

نوجوان پہلے دن ہی بھاگ جاتا اور کبھی واپس نہ آتا۔ اس لئے حضرت نے اس سے صرف ایک بات یہ فرمادی کہ رات کو بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرلیا کر۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑ دیا

بات دراصل یہ ہے کہ اگر اس نوجوان نے اس بات پر عمل کرلیا کہ روزانہ رات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرنے لگا تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا تعلق جڑ گیا، کیونکہ اب تک وہ غفلت میں تھا، اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق کٹا ہوا تھا اور کبھی اس کے دل میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا خیال بھی نہیں آتا تھا، اب جس وقت توبہ کرے گا تو ایک لمحہ کے لئے وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑے گا، اور جب روزانہ اس پر عمل کرے گا تو یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف نہ کھینچ لیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾(۱)

عام طور پر اس آیت کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور منتخب کرلیتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جس بندے کے بارے میں ارادہ فرمالیا کہ اس کو ہدایت دینی ہے اور اس کو اپنا مقرب بنانا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ عام طور پر یہ ترجمہ کیا جاتا ہے۔

اس آیت کا دوسرا ترجمہ

لیکن ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ عربی جاننے والوں سے پوچھو تو وہ بتائیں گے کہ اس آیت کا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ مجھے کھینچ لیا جائے۔ کیونکہ لفظ "يَشَآءُ" کے فاعل کی ضمیر جس طرح "اللّٰه" کی طرف لوٹ سکتی ہے، اسی طرح لفظ "مَنْ" کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، اور "يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ" کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف اس شخص کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے تعلق جوڑ لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ضرور کھینچ لیں گے

لہٰذا جب ایک بندے نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑ لیا، چاہے تھوڑی دیر کے لئے تعلق

(۱) الشوریٰ: ۳

جوڑا ہو اور کہا کہ یا اللہ! میں توبہ کرتا ہوں اور اے اللہ! مجھے اپنی طرف کھینچ لیجئے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کھینچ ہی لیں گے۔ بہر حال! بندے کا کام یہ ہے کہ ذرا سا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور اس سے مانگے کہ اے اللہ! مجھے آپ کیوں محروم فرماتے ہیں، مجھے بھی اپنی طرف کھینچ لیجئے، اور اے اللہ! اگر میرے اندر شرائط نہیں پائی جاتیں تو وہ شرائط میرے اندر پیدا کر دیجئے، اگر میرے اندر وہ تقاضے اور اوصاف نہیں ہیں تو اے اللہ! ان اوصاف کو میرے اندر پیدا کرنا آپ کی قدرت میں ہے، اے اللہ! وہ اوصاف اور تقاضے میرے اندر پیدا کر دیجئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ سے مانگو اور جب ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے تعلق جڑ گیا تو بس یہ تبدیلی کا نقطۂ آغاز ہے۔ اب جو شخص غفلت میں زندگی گزار رہا ہے، اس کو نہ تو اللہ تعالیٰ کا خیال اور نہ رسول ﷺ کا خیال، نہ نماز کا خیال، نہ روزے کا خیال، نہ آخرت کا خیال، نہ دین کا خیال، اس شخص کو حضرت نے یہ فرمادیا کہ تو رات کو بیٹھ کر توبہ کر لیا کر، اگر اس شخص نے اس پر عمل کر لیا ہوگا تو یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ شخص واپس نہ آیا ہو اور دین کی طرف نہ آیا ہو۔ بہر حال! دوسروں کی اصلاح کے لئے بزرگ یہ طریقے اختیار کرتے ہیں، اسی طرح حضرت بابا صاحب نے اس نوجوان کے کان میں یہ بات ڈال دی اور وہ چلا گیا۔

میرے دل میں عزم کے بارے میں اشکال

میں نے حضرت بابا صاحب سے عرض کیا کہ حضرت! میرے دل میں توبہ کے بارے میں یہ اشکال رہتا ہے کہ میں نے توبہ تو کر لی لیکن کیا پتہ کہ وہ توبہ صحیح ہوئی یا نہیں؟ کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ گناہ چھوڑنے کا جو عزم کیا ہے وہ پختہ ہوا یا نہیں، اس کا اطمینان نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ سے یہ تو کہہ دیا کہ اے اللہ! مجھ سے گناہ سرزد ہو گیا، میں آپ سے معافی مانگتا ہوں، اے اللہ! مجھے معاف فرما دیجئے، اور وقتی طور پر اس گناہ کو چھوڑ بھی دیا لیکن آئندہ ساری عمر کبھی اس گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا، یہ عزم پکا ہوا یا نہیں، اس کا اطمینان نہیں ہوتا اور یہ عزم توبہ کی تیسری شرط ہے، جب اس شرط کے پائے جانے میں شبہ ہوتا ہے تو توبہ کے درست ہونے میں بھی شبہ رہتا ہے کہ یہ توبہ درست ہوئی یا نہیں؟

آئندہ گناہ ہو جانے کا اندیشہ عزم کے منافی نہیں

حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میری بات سن کر فرمایا کہ ارے بھائی! تم نے اپنے ذہن میں عزم کا بہت بڑا لمبا چوڑا معیار قائم کر رکھا ہے، ارے بھائی! عزم کے معنی یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ارادہ کر لو کہ میں یہ کام دوبارہ نہیں کروں گا، پھر اگر دل میں یہ وسوسے، خدشات اور اندیشے آ رہے ہیں کہ معلوم نہیں کہ میں اس عزم پر ثابت قدم رہوں گا یا نہیں؟ میں اس عزم کو پورا کر سکوں گا یا نہیں؟ یہ

اندیشے اور وسوسے عزم کی صحت کے منافی نہیں۔

مثلاً اپنی طرف سے یہ عزم کرلیا کہ یا اللہ! اب میں جھوٹ نہیں بولوں گا، اب غیبت نہیں کروں گا، اب اپنی نگاہ غلط جگہ پر نہیں اُٹھاؤں گا۔ اب اس عزم کے بعد دل میں یہ وسوسہ آرہا ہے کہ پتہ نہیں میں اس عزم پر قائم رہ سکوں گا یا نہیں، تو اس وسوسے کو آنے دو، کیونکہ یہ وسوسہ عزم کے مکمل ہونے میں مانع نہیں، بس عزم مکمل ہوگیا۔

پھر اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کرو

پھر اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ یا اللہ! میں نے تو اپنی طرف سے عزم کرلیا، لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اس عزم پر کیسے قائم رہوں گا، اے اللہ! آپ ہی مجھے توفیق عطا فرمایئے، آپ ہی مجھے استقامت عطا فرمایئے اور آپ ہی مجھے اس عزم پر قائم اور دائم رکھئے۔ بس توبہ مکمل ہوگئی۔ اس لئے کہ ''عزم'' کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیار سے ارادہ کرلینا، اب اس ارادہ پر میں کتنا قائم رہوں گا اور کتنا قائم نہیں رہوں گا، اس کی پیشینگوئی تو کوئی بھی نہیں کرسکتا، یہ کسی کے بس میں نہیں، یہ اختیار سے باہر ہے، اور جب اختیار سے باہر ہے تو انسان اس کا مکلف نہیں، کیونکہ انسان اپنے اختیاری امور کا مکلف ہے۔ حضرت بابا صاحب نے ایسی بات فرمادی کہ الحمد للہ، اس سے بڑا اطمینان ہوا اور تسلی حاصل ہوگئی۔

عزمِ عمل سے ذہن خالی ہونا چاہئے

بعد میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ملفوظ نظر سے گزرا جس میں وہی بات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے جو حضرت بابا صاحب نے فرمائی، فرمایا:

> ''اگر توبہ کے وقت عزمِ ترک فی المستقبل نہ ہو تو عزمِ عمل فی المستقبل بھی نہ ہو بلکہ عزمِ عمل سے ذہن خالی ہو، اگر اس طرح خالی الذہن ہو کر بھی توبہ ندامت کے ساتھ ہوگئی تو توبہ صحیح ہوگئی''

یعنی اصل بات تو یہ ہے کہ توبہ کے وقت گناہ نہ کرنے کا ارادہ ہو کہ میں آئندہ کبھی کسی قیمت پر بھی یہ گناہ نہیں کروں گا، لیکن اگر کسی وجہ سے اس ارادہ کا استحضار نہ رہا تو کم از کم اس گناہ کے دوبارہ کرنے کا بھی ارادہ نہ ہو بلکہ عزمِ عمل سے ذہن خالی ہو، یعنی نہ تو یہ ارادہ ہو کہ یہ گناہ کروں گا اور نہ یہ ارادہ ہو کہ یہ گناہ نہیں کروں گا، دونوں سے ذہن خالی ہو تب بھی توبہ درست ہے۔ کیوں درست ہے؟

توبہ ''ندامت'' ہی کا نام ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ویسے ہی اپنی طرف سے بات نہیں کرتے بلکہ اس کے پیچھے کوئی دلیل ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی دلیل کے طور پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی طرف اشارہ فرمایا:

((اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ))(۱)

یعنی توبہ کا اصل عنصر اور اصل جوہر جس سے توبہ وجود میں آتی ہے، وہ ہے ندامت اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پشیمان ہونا، نادم ہونا، شرمسار ہونا۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے گناہ پر نادم ہے تو اس کے دل میں یہ بات ہے کہ یا اللہ! میں نہیں چاہتا کہ میں یہ عمل دوبارہ کروں، بس اس ندامت کے نتیجے میں توبہ درست ہوگئی اور جب توبہ درست ہوگئی تو انشاء اللہ وہ گناہ بھی معاف ہوگیا۔ اب اس وسوسہ کے اندر مت پڑو کہ پتہ نہیں عزم مکمل ہوا یا نہیں۔

توبہ کے بعد یہ دعا کرلو

البتہ ہر توبہ کے بعد یہ دعا ضرور کرلو کہ اے اللہ! میں نے یہ توبہ تو کرلی لیکن اے اللہ! جب تک آپ توفیق نہیں دیں گے، میں اس توبہ پر قائم نہیں رہ سکوں گا، اے اللہ! اپنی رحمت سے اس توبہ پر قائم رہنے کی آپ ہی توفیق عطا فرمادیجئے۔ فرض کرو کہ پھر غلطی سے کسی وقت بھٹک گئے تو پھر توبہ کرلو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ مرتے دم تک کھلا رکھا ہے، جب تک نزع کی کیفیت اور سکرات الموت کی کیفیت طاری نہیں ہو جاتی، اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، لہٰذا غلطی ہو جائے پھر لوٹ آؤ۔

توبہ کے بھروسہ پر گناہ مت کرو

البتہ کوئی شخص اس سے یہ نہ سمجھے کہ اب گناہ کی چھوٹ ہوگئی، بس گناہ کرتے رہو اور توبہ کرتے رہو اور گناہ پر جرأت حاصل کرلو۔ یہ نہیں، بلکہ اپنی طرف سے اس بات کا پورا اہتمام کرنا ہے کہ گناہ سے بچے، آدمی اگر گناہوں پر جری ہو جائے۔ العیاذ باللہ۔ اور توبہ کی اُمید پر گناہ کا ارتکاب کرلے کہ بعد میں توبہ کرلوں گا تو یہ بڑی خطرناک بات ہے، یہ شیطان کا انتہائی خطرناک اور زہریلا داؤ ہے۔ یاد رکھئے! توبہ کے بھروسہ پر گناہ کا ارتکاب کرنا ایسا ہی ہے جیسے ''تریاق'' کے بھروسہ پر زہر پی لینا۔

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة، رقم: ٤٢٤٢، مسند أحمد، رقم: ٣٣٧٨

بچھو کے کاٹے کا عمل

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی بات کو سمجھانے کے لئے اپنا ایک واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ دیوبند میں سانپ، بچھو بہت ہوا کرتے تھے، آئے دن لوگوں کو کاٹتے رہتے تھے، اس لئے وہاں سانپ بچھو کے کاٹنے کے بہت سے عمل بھی ہوتے تھے، اگر وہ عمل کرلیا جائے تو وہ زہر اُتر جاتا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بچھو کے کاٹنے کا ایک عمل سیکھ لیا تھا، اگر کسی کو بچھو کاٹ لیتا تو حضرت والد صاحب وہ عمل فرماتے تو اسی وقت بلاتاخیر وہ درد ختم ہوجاتا اور زہر اُتر جاتا، چنانچہ لوگ دور دور کے دیہاتوں سے اپنے مریضوں کو لے کر والد صاحب کے پاس آیا کرتے تھے، آپ دم فرمادیتے، وہ درد فوراً ختم ہوجاتا۔ حضرت والد صاحب کا یہ عمل ہر جگہ مشہور ہوگیا۔

بچھو کے کاٹنے کا ایک واقعہ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں ایک کوٹھری تھی جو بطور اسٹور کے استعمال ہوتی تھی، اس زمانے میں بجلی تو نہیں تھی، لالٹینوں کا زمانہ تھا، ایک دن ہماری والدہ صاحبہ اس کوٹھری سے کوئی چیز نکالنا چاہتی تھیں۔ گھر میں ایک لالٹین تھی جو اس وقت حضرت والد صاحب کے پاس تھی اور حضرت والد صاحب لالٹین کی روشنی میں لکھنے پڑھنے کا کام کررہے تھے۔ ہماری والدہ صاحبہ نے والد صاحب سے کہا کہ میں ذرا کوٹھری میں جانا چاہتی ہوں، آپ یہ لالٹین تھوڑی دیر کے لئے مجھے دے دیں تاکہ میں فلاں چیز اُٹھالاؤں۔ حضرت والد صاحب چونکہ کچھ لکھنے میں مشغول تھے، اس کو چھوڑنا گراں ہورہا تھا، والد صاحب نے فرمایا کہ یہ تو چھوٹی سی چیز ہے، بغیر لالٹین کے اُٹھالائیں۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ وہ چیز تو سامنے ہی رکھی ہے لیکن مجھے یہ خطرہ ہے کہ اگر میں نے اندھیرے میں وہاں پاؤں رکھ دیا تو کہیں مجھے کوئی بچھو نہ کاٹ لے۔ اس وقت حضرت والد صاحب کے منہ سے یہ بات نکلی کہ ''ارے میاں! اگر بچھو نے کاٹ بھی لیا تو کیا ہوگا، میرے پاس آجانا، فوراً دم کردوں گا، انشاء اللہ ٹھیک ہوجائے گا'' مطلب یہ تھا کہ ویسے تو بچھو کے کاٹنے کا صرف احتمال ہی ہے، لیکن اگر کاٹ بھی لیا تو مجھے دم کرنا تو آتا ہی ہے، دم کردوں گا۔

سارا عمل بیکار ہوگیا

اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ والدہ صاحبہ جیسے ہی کوٹھری میں داخل ہوئیں اور اندر پاؤں رکھا، بچھو نے کاٹ لیا۔ حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں اُٹھ کر فوراً ان کے پاس گیا اور جلدی سے وہی

بچھو کے کاٹے کا عمل شروع کیا، اب میں وہ عمل کرتا ہوں لیکن وہ عمل اثر ہی نہیں کرتا۔ جس عمل سے سینکڑوں بچھوؤں کے کاٹے کا علاج کیا، وہی عمل آج کر رہا ہوں لیکن ذرہ برابر اثر نہیں ہو رہا ہے۔ اس عمل کی جتنی طاقت تھی وہ ساری صرف کر دی، مگر درد کی لہریں ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ بالآخر دوسروں سے علاج کرانے پر مجبور ہوئے، اپنا علاج سارا بیکار ہو گیا۔

کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کارگر نہیں

یہ واقعہ سنا کر فرماتے تھے کہ دیکھو! میں نے اس عمل کے بھروسے پر بچھو کے کاٹنے سے احتیاط نہ کی اور یہ خیال کیا کہ اگر بچھو نے کاٹ بھی لیا تو کیا ہے، عمل ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایک سبق تو یہ دیا کہ یہ جتنے علاج ہیں، چاہے وہ علاج دواؤں سے ہوں یا وہ علاج عملیات سے ہوں، کوئی علاج اس وقت تک کارگر نہیں ہوتا جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو، ایک ہی دوا ایک مریض کو فائدہ کر رہی ہے اور ایک مریض کو نقصان کر رہی ہے جبکہ دونوں کی بیماری ایک ہے۔

دوا اللہ تعالیٰ سے سوال کرتی ہے

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک معالج تھے "ڈاکٹر ہاشمی صاحب" اسی سال ان کی عمر تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میری ساری زندگی کی ڈاکٹری کا تجربہ یہ ہے کہ جب دوا مریض کے پیٹ میں جاتی ہے تو اندر جا کر اللہ تعالیٰ سے پوچھتی ہے کہ یا اللہ! کیا کروں؟ فائدہ کروں یا اُلٹی پڑ جاؤں؟ جب وہاں سے کوئی جواب ملتا ہے تو عمل کرتی ہے۔ بہر حال! حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک سبق تو یہ دیا کہ تم یہ جو اپنے عمل پر بھروسہ کیے بیٹھے ہو، یاد رکھو! اس عمل میں کچھ نہیں رکھا، کوئی وظیفہ، کوئی تعویذ، کوئی گنڈا اس وقت تک کارگر نہیں ہوتا جب تک ہمارا حکم نہ ہو، اس وظیفہ پر اور اس تعویذ پر بھروسہ کر لینا اور یہ کہنا کہ بیماری آجائے تو کیا، ہمارے پاس علاج موجود ہے، یہ بات غلط ہے۔ ایک تو اس واقعہ نے یہ سبق دیا۔

دوا کے بھروسہ پر بیماری کو دعوت مت دو

دوسرا سبق یہ دیا کہ انسان کے پاس کتنا ہی بہتر سے بہتر علاج موجود ہو، لیکن اس علاج کی موجودگی کی وجہ سے بیماری کو مت بلاؤ بلکہ بیماری سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو اور یہ دعا کرو کہ اے اللہ! ہم بیماری کے متحمل نہیں ہیں۔

بہر حال! حضرت والد صاحب اسی مضمون کو بیان کرنے کے لئے یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ

توبہ کے بھروسہ پر گناہ کرلینا، یہ ایسا ہے جیسے عمل کے بھروسہ پر بچھو سے کٹوالینا، چونکہ دوا اور عمل موجود ہے، لہٰذا بچھو سے کٹوالوں۔ ارے! کیا پتہ کہ بچھو کے کاٹنے کے بعد دوا استعمال کرنے کا موقع بھی ملے گا یا نہیں؟ اور اگر دوا استعمال کرنے کا موقع مل بھی گیا تو وہ دوا کارآمد بھی ہوگی یا نہیں؟

توبہ کی مہلت ملے گی یا نہیں؟

لہٰذا جس وقت تم توبہ کے بھروسہ پر گناہ کا ارتکاب کرنے کا ارادہ کر رہے ہو، کیا پتہ کہ گناہ کے بعد توبہ کی مہلت بھی ملے یا نہ ملے؟ کیا اس بات کی گارنٹی ہے کہ گناہ کے بعد توبہ کی مہلت ضرور مل جائے گی؟ اور اگر بالفرض توبہ کی مہلت مل بھی گئی تو توبہ کی توفیق ملے گی یا نہیں؟ کیونکہ گناہ کے اندر نحوست ہوتی ہے، وہ نحوست یہی ہے کہ گناہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے غفلت پیدا کرتا ہے، انسان کو غافل بنا دیتا ہے۔ تم نے تو یہ سوچ کر گناہ کرلیا کہ بعد میں توبہ کرلوں گا، لیکن گناہ نے اپنی نحوست دکھائی اور تمہارے دل میں غفلت پیدا کردی اور گناہ کی لذت میں ایسے محو ہوئے کہ توبہ کرنے کا خیال ہی نہ آیا اور توبہ کرنے کی توفیق ہی نہ ہوئی۔

گناہ کے نتیجے میں ذوق خراب ہوجاتا ہے

پھر گناہ کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچتا ہے اور انسان کی عقل خراب کردیتا ہے، گناہ کی وجہ سے انسان کی مَت اُلٹی ہوجاتی ہے، اچھا عمل برا لگنے لگتا ہے اور برا عمل اچھا لگنے لگتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کا ذائقہ خراب ہوجائے تو اس کے نتیجے میں اچھی خاصی میٹھی چیز اس کو کڑوی لگنے لگتی ہے، اسی طرح گناہ کے نتیجے میں انسان کا ذوق خراب ہوجاتا ہے اور اس کی عقل ماری جاتی ہے، کڑوی چیز کو میٹھی اور میٹھی چیز کو کڑوی سمجھنے لگتا ہے، ایسی حالت میں پھر توبہ کی توفیق کیسے ہوگی؟ پھر انسان دوسرے گناہوں کی طرف اور بڑھ جاتا ہے۔

گناہ کا حجاب ختم ہوجاتا ہے

اور جب تک انسان گناہ نہیں کرتا تو اس کی طبیعت میں اس گناہ کو کرنے میں ایک رکاوٹ ہوتی ہے، ایک بند ہوتا ہے، جب تم نے توبہ کے بھروسہ پر اس گناہ کو ایک مرتبہ کرلیا تو وہ بند ٹوٹ گیا اور اب غلط کام کرنے کی جرأت پیدا ہوگئی، اب یہ جرأت تم سے اور گناہ کرائے گی۔ اس لئے کبھی بھی توبہ کے بھروسہ پر گناہ ہرگز مت کرو بلکہ ہر قیمت پر گناہ سے بچو۔

موت سے پہلے توبہ کا دروازہ کھلا ہے

البتہ اگر گناہ سے بچنے کی کوشش کے باوجود کسی وقت پھسل گئے اور غلطی ہوگئی اور گناہ میں مبتلا ہوگئے تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے اور مرتے دم تک کھلا رہے گا، جب چاہو آجاؤ اور توبہ کرلو۔ قرآن کریم نے صاف صاف فرمادیا:

﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّيْ تُبْتُ الْئٰنَ﴾(۱)

یعنی توبہ اس شخص کی نہیں ہے جو ساری عمر اس بھروسے پر گناہ کرتا رہا کہ جب مرنے لگوں گا تو توبہ کرلوں گا، پھر جب موت کا وقت آیا تو کہنے لگا کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ ایسی توبہ تو فرعون نے بھی کرلی تھی جب دریا میں ڈوبنے لگا تو کہنے لگا:

﴿اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ○ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ○﴾(۲)

یعنی میں اس ذات پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں مسلمانوں میں سے ہوتا ہوں۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب ایمان لاتا ہے جبکہ وقت گزر چکا۔

ایسے شخص کی توبہ قبول نہیں بلکہ توبہ اس شخص کی قبول ہوتی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾(۳)

یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی توبہ قبول فرماتے ہیں جو نادانی میں برا کام کر گزرتے ہیں اور پھر وہ جلد ہی لوٹ آتے ہیں۔ یعنی جن سے جہالت اور نادانی میں گناہ ہوگیا تو پھر فوراً جلد از جلد لوٹ آئیں،

---

(۱) النساء: ۱۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''توبہ کی قبولیت ان کے لئے نہیں جو برے کام کئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت کا وقت آکھڑا ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں نے اب توبہ کرلی ہے''

(۲) یونس: ۹۰، ۹۱، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''میں مان گیا کہ جس خدا پر بنو اسرائیل ایمان لائے ہیں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں بھی فرماں برداروں میں شامل ہوتا ہوں'' (جواب دیا گیا کہ:) ''اب ایمان لاتا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور مسلسل فساد ہی مچاتا رہا''

(۳) النساء: ۱۷، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ نے توبہ قبول کرنے کی جو ذمہ داری لی ہے وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی سے کوئی برائی کر ڈالتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کرلیتے ہیں، چنانچہ اللہ ان کی توبہ قبول کرلیتا ہے''

دیر نہ کریں، یہ نہ سوچیں کہ توبہ کرلیں گے، ابھی تو بہت وقت پڑا ہے، توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور مرتے دم تک کھلا ہوا ہے، یہ مت سوچو، اس لئے کہ کیا پتہ کہ آخری وقت کب آجائے۔

توبہ ٹوٹ جائے تو دوبارہ توبہ کرلو

لہٰذا جو لوگ توبہ کرتے ہیں لیکن اس پریشانی میں رہتے ہیں کہ ہماری توبہ بار بار ٹوٹ جاتی ہے، ایسے لوگ گھبرائیں نہیں بلکہ دوبارہ لوٹ آئیں اور دوبارہ توبہ کرلیں، لیکن ان کا یہ عمل گناہوں پر جرأت پیدا نہ کرے، اس لئے کہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کرلینا ایسا ہے جیسے تریاق کے بھروسہ پر زہر پی لیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سچے دل سے تمام گناہوں سے توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

استغفار کے لئے وقت مقرر کرلیں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو خط میں لکھا:

''استغفار جس میں کچھ بھی وقت صرف نہیں ہوتا اور نہایت آسان ہے، بہت بھولتا ہوں''(۱)

یعنی استغفار اتنی آسان چیز ہے کہ اس میں کوئی لمبا چوڑا وقت صرف نہیں ہوتا، ایک لمحہ کے اندر آدمی یہ کہہ دیتا ہے "أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ"، اتنا آسان ہونے کے باوجود میں یہ استغفار کرنا بھول جاتا ہوں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جواب میں ان کو لکھا:

''اس حالت میں استغفار بعد دخاص کسی وقت مقرر کر لیجئے تاکہ اگر ہر وقت یاد نہ رہ سکے تو قلق نہ ہو''(۲)

ویسے تو استغفار کے لئے نہ وقت مقرر ہے اور نہ تعداد مقرر ہے، اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو اپنی ہر غلطی پر استغفار کرنا چاہئے، لیکن ایسی حالت میں جبکہ آدمی استغفار کرنا بھول جاتا ہے تو اس کو چاہئے کہ کوئی خاص وقت مقرر کرلے کہ میں فلاں وقت استغفار کیا کروں گا اور عدد بھی متعین کرلے کہ اتنی مرتبہ استغفار کروں گا، مثلاً ایک تسبیح پڑھوں گا۔

استغفار کے وقت ذہن میں گناہوں کا استحضار

چنانچہ ہمارے بزرگ طالبین کو جب معمولات بتاتے ہیں تو ان میں استغفار کی ایک تسبیح ضرور شامل ہوتی ہے۔ وہ استغفار یہ ہے:

"أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ. یا

أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَلِيَّ الْعَظِيْمَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ.

☆ اصلاحی مجالس (۵/۲۵۶ تا ۲۶۸)، رمضان المبارک، بعد از نماز ظہر، دار العلوم، کراچی

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۴ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۴

اس استغفار کو خاص وقت میں اور خاص تعداد میں کر لینا مفید ہوتا ہے، اور یہ استغفار محض زبانی حرکت سے نہ ہو بلکہ استغفار کے وقت ذہن میں ذرا اس بات کا دھیان پیدا کرے کہ مجھ سے نہ جانے کتنی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، نہ جانے کتنے گناہ سرزد ہوئے ہیں، بہت سے گناہ وہ ہیں جن کو میں جانتا ہوں اور بہت سے گناہ وہ ہیں جن کو میں جانتا بھی نہیں ہوں، اے اللہ! میں آپ سے ان سب گناہوں کی معافی مانگ رہا ہوں۔

حضور ﷺ کی ایک خوبصورت دعا

حضور ﷺ نے ایک دعا تلقین فرمائی، یہ دعا آپ سے اس وقت پڑھنا ثابت ہے جب آپ حج یا عمرہ کے موقع پر صفا مروہ کی سعی کے دوران میلین اخضرین میں دوڑا کرتے تھے، وہ دعا یہ ہے:

((رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاعْفُ عَنَّا وَتَكَرَّمْ وَتُجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ فَإِنَّكَ تَعْلَمُ مَا لَا نَعْلَمُ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعَزُّ الْأَكْرَمُ))(۱)

''اے اللہ! میری مغفرت فرمایئے اور رحم فرمایئے اور درگزر فرمایئے اور مجھ پر کرم فرمایئے اور میرے ان گناہوں سے درگزر فرمایئے جو آپ جانتے ہیں، اس لئے کہ آپ وہ جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے، بیشک آپ سب سے زیادہ معزز اور مکرم ہیں''

اس دعا میں آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو گناہ میرے علم میں ہیں، ان کو معاف فرمایئے بلکہ یہ فرمایا کہ جو گناہ آپ کے علم میں ہیں، میں ان سے معافی طلب کرتا ہوں، آپ اپنی رحمت سے وہ سب معاف فرمادیجئے۔ اور ساتھ میں آپ نے یہ بھی فرمادیا کہ آپ وہ سب جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے، نہ جانے کتنے گناہ ایسے ہیں کہ ان کے گناہ ہونے کا بھی ہمیں احساس نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نامۂ اعمال میں گناہوں کا اضافہ ہو رہا ہے اور ہمیں پتہ بھی نہیں، اس لئے روزانہ ایک تسبیح استغفار کی پڑھ لی جائے تو انشاء اللہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ گناہوں سے نجات بھی عطا فرمائیں گے اور اگر گناہوں کا صدور بھی ہوگا تو استغفار کی برکت سے معاف بھی فرمادیں گے۔

پہلے استغفار پھر دوسرے اذکار

پھر استغفار کے سلسلے میں مشائخ کے مذاق مختلف ہیں، بعض مشائخ تو یہ فرماتے ہیں کہ جب آدمی اپنے روزانہ کے معمولات پورے کرنے بیٹھے تو استغفار سے شروع کرے، دوسری تسبیحات بعد میں کرے، استغفار سے شروع اس لئے کرے کہ پہلے پاک وصاف ہو جائے پھر آگے بڑھے، اس

(۱) إحياء علوم الدين (۷۳/۳)

لئے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح، تحمید، تقدیس وغیرہ یہ سب انوارات ہیں، ان انوارات کو حاصل کرنے سے پہلے ان کے قابل تو بن جائے۔لہٰذا پہلے استغفار کرے اور پھر دوسرے اذکار کرے۔

پہلے دوسرے اذکار پھر آخر میں استغفار

جبکہ بعض دوسرے مشائخ یہ فرماتے ہیں کہ استغفار آخر میں کرے، اس لئے کہ قرآن کریم میں نیک بندوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ۝ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے رات کو کم سوتے ہیں اور اللہ جل شانہ کے ذکر میں، نماز میں، عبادات میں رات گزارتے ہیں اور پھر سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں تاکہ یہ استغفار ان کوتاہیوں کو بھی شامل کرلے جو ان عبادات میں پائی گئیں۔اور یہ کہتے ہیں کہ یا اللہ! رات کو ہم نے عبادت تو کی لیکن آپ کی شایانِ شان عبادت نہ ہوسکی، مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ، اور جب ان عبادات میں ہونے والی کوتاہیوں سے بھی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی گئی تو اب یہ عبادات کامل اور مکمل ہوگئیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ قبول ہوگئیں۔بہرحال! استغفار کے بارے میں مشائخ کے مذاق مختلف ہیں، لہٰذا جس شخص کا جس مذاق کی طرف رجحان زیادہ ہو، اس مذاق کو اختیار کرلے، دونوں راستے بزرگوں کے بتائے ہوئے ہیں۔

ماتحتوں پر زیادتی کی صورت میں معافی کی تفصیل

آگے ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''شاگردوں کو ان کی کوتاہی پر بے وقوف پاگل وغیرہ کہہ دینا چنداں مذموم نہیں، اس لئے اس سے استغفار کی ضرورت نہیں کہ تمام طلبہ جماعت کے سامنے معافی چاہی جائے بلکہ بعض اوقات خلافِ مصلحت ہے کہ سبب ہے ان کی جسارت و جرأت اور فسادِ اخلاق کا، البتہ زجر میں اعتدال سے تجاوز نہ ہو، وعلی هذا مريدين وعيال وخدم ونحوهم من التابعين''(۲)

شاگردوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا

جو حضرات اکثر و بیشتر تعلیم و تدریس کے کام میں مشغول رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے دل

(۱) الذاریات: ۱۷، ۱۸ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۴

میں فکر عطا فرماتے ہیں، ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات شاگردوں کو ڈانٹنا پڑتا ہے اور بُرا بھلا کہنا پڑتا ہے، بعض اوقات تھوڑا بہت مارنا بھی پڑتا ہے اور ان افعال سے ظاہر ہے کہ دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے اور دوسرے کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے اور یہ ایسا گناہ ہے کہ اس سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ جس کو تکلیف پہنچائی جائے، اس سے معافی مانگے، اور جب تک اس سے معافی نہیں مانگے گا اور وہ شخص معاف نہیں کرے گا، وہ گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوگا۔

شاگردوں سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں

اس ملفوظ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا اصول بتا دیا کہ اگر استاذ شاگرد کو ڈانٹے یا بُرا بھلا کہے یا تھوڑا سا مار لے تو اس پر شاگرد سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں بلکہ بعض اوقات معافی مانگنا مضر ہوتا ہے، اس لئے کہ جو شریر طبیعت کا شاگرد ہوگا وہ اس کا اُلٹا اثر لے گا کہ اچھا استاذ جی بھی ہم سے معافی مانگ رہے ہیں، لہٰذا آئندہ اور زیادہ شرارت کرو اور زیادہ گستاخی کرو، کیونکہ اگر استاذ کسی وقت ڈانٹ ڈپٹ کریں گے تو بعد میں ہم سے معافی بھی مانگیں گے، اس کے نتیجے میں ان کے اندر اور زیادہ جرأت اور جسارت پیدا ہو جائے گی، اس لئے ان سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اصول ہر اس شخص میں جاری ہوگا جو آپ کے زیرِ تربیت ہو، چاہے وہ شاگرد ہو، چاہے مرید ہو، چاہے بیٹا ہو۔

زیرِ تربیت افراد میں یہ اصول کیوں؟

زیرِ تربیت افراد میں یہ اصول کیوں جاری ہوگا؟ اس لئے کہ جب ایک شخص نے اپنے آپ کو آپ کی تربیت میں دے دیا اور اس نے یا اس کے سرپرست نے یہ درخواست کی کہ آپ اس کی تربیت کریں، اور شاگرد استاذ کے پاس جب پڑھنے کے لئے آتا ہے تو وہ ایک طرح سے یہ درخواست کرتا ہے کہ آپ میری تربیت کریں، اسی طرح جو مرید شیخ کے پاس آتا ہے وہ یہ درخواست لے کر آتا ہے کہ آپ میری تربیت کریں اور اس درخواست کے اندر یہ بات بھی شامل ہے کہ میں آپ کو یہ حق دیتا ہوں کہ آپ میری تربیت کی خاطر جو طریقہ مناسب سمجھیں، وہ طریقہ اختیار کریں، لہٰذا اگر میری تربیت کے لئے مجھے ڈانٹنے کی ضرورت ہو تو بیشک مجھے ضرور ڈانٹیں، اور اس تربیت کے اندر تھوڑی بہت پٹائی بھی داخل ہے بشرطیکہ وہ ضرب غیر مبرح ہو، اس سے زیادہ مارنا کسی طرح بھی حلال نہیں، کیونکہ ایسی مار کی ممانعت منصوص ہے۔ بہرحال! اگر استاذ نے کسی شاگرد کو پاگل یا بیوقوف کہہ دیا تو یہ کہنے کا حق استاذ کو حاصل ہے اور ان شاء اللہ اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، لہٰذا ان الفاظ کے کہنے پر طلبہ سے معافی مانگنے کی بھی ضرورت نہیں۔

زجر میں اعتدال پر قائم رہیں

البتہ استاذ خود اس کا خیال کرے کہ زجر کرنے میں اعتدال سے تجاوز نہ ہو، یہ نہ ہو کہ جتنی ضرورت تھی اس سے زیادہ ڈانٹ دیا، یا جتنی ضرورت تھی اس سے زیادہ مار دیا، اس کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ لیکن اب درمیان میں کون خط کھینچ کر بتائے کہ اتنا ڈانٹنا جائز تھا اور اس سے زیادہ ناجائز تھا، یا اتنا مارنا جائز تھا اور اس سے زیادہ مارنا ناجائز تھا، یہ خط کھینچنا انسان کے لئے آسان نہیں، بلکہ اس کے لئے شیخ کی صحبت کی ضرورت ہوتی ہے، شیخ کی صحبت میں رہ کر شیخ سے اس کے بارے میں سوال کرے کہ میں کس حد تک ڈانٹ سکتا ہوں اور کس حد تک مار سکتا ہوں، کیونکہ اس کے بارے میں دو اور دو چار کر کے کوئی اصول بتانا بڑا مشکل ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو مار رہے تھے اور ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرمایا:

((لَعَّانِيْنَ وَصِدِّيْقِيْنَ كَلَّا وَرَبِّ الْكَعْبَةِ))(۱)

یعنی ایک طرف صدیق بنتے ہیں اور دوسری طرف لعنتیں بھی کر رہے ہیں، رب کعبہ کی قسم! یہ دونوں باتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر تلافی کے طور پر اس غلام کو تو آزاد کر دیا، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے غلام آزاد فرما دیئے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور اس دوران انہوں نے اس غلام کو اس کے وطن کی طرف نسبت کر کے کوئی تحقیر کا جملہ کہہ دیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سنا تو آپ نے فرمایا:

((إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ))(۲)

(۱) شعب الإيمان (۲۹۴/٤) رقم: ٥١٥٤، كنزالعمال (١١١٦/٣) رقم: ٨١٨٩، الترغيب والترهيب، (٣١٢/٣) رقم: ٤٢١٢

(۲) صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب المعاصي من أمر الجاهلية ولا يكفر صاحبها، رقم: ٢٩، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب اطعام المملوك مما يأكل، رقم: ٣١٣٩، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في حق المملوك، رقم: ٤٤٩٠

اے ابوذر! تم ایسے آدمی ہو کہ تمہارے اندر جاہلیت کی خو باقی ہے، اس لئے کہ تم نے اپنے غلام کو وطنیت کا طعنہ دے دیا۔

بہر حال! اعتدال پر قائم رہنا بہت ضروری ہے، لہٰذا احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی اس حد پر پہنچنے سے پہلے رک جائے جہاں یہ شبہ ہو کہ یہ اعتدال کے اندر داخل ہے یا نہیں۔ یہ وصف اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق اور بزرگوں کی صحبت کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے، ورنہ آدمی کے بس کی بات نہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے، بھائی نیاز، میں نے ان کی زیارت کی ہے، سیدھے سادھے بزرگ تھے اور حضرت والا کے خادمِ خاص تھے اور ذرا منہ چڑھے تھے، مگر حضرت کے مزاج شناس بھی تھے، حضرت والا کے پاس جو مریدین اور اہلِ تعلق آیا کرتے تھے یہ ان کے ساتھ ذرا بے تکلف بھی ہو جاتے تھے اور کبھی ان کو تنبیہ بھی کر دیا کرتے تھے کہ یہ کام اس طرح کرو اور یہ کام نہ کرو۔ ایک دن کسی نے حضرت والا سے ان کی شکایت کر دی کہ یہ بھائی نیاز صاحب آپ کے بہت منہ چڑھے ہیں، جو لوگ آپ کے پاس آتے ہیں یہ ان کے ساتھ بد اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ حضرت والا کو یہ سن کر تکلیف ہوئی کہ یہاں آنے والوں کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرنا بری بات ہے۔

چنانچہ آپ نے بھائی نیاز کو بلایا اور ڈانٹا کہ بھائی نیاز! یہاں آنے والے لوگوں کے ساتھ تم بدکلامی کرتے ہو اور ان کو ڈانٹتے ہو، ایسا کیوں کرتے ہو؟ بھائی نیاز نے کہا کہ حضرت! اللہ سے ڈرو اور جھوٹ نہ بولو۔ وہ دراصل کہنا یہ چاہتے تھے کہ جو لوگ آپ سے یہ شکایت کر رہے ہیں، وہ اللہ سے ڈریں اور جھوٹ نہ بولیں، اس لئے کہ حقیقت کے خلاف شکایت کر رہے ہیں، لیکن بے خیالی میں ان کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا کہ حضرت! اللہ سے ڈریں اور جھوٹ نہ بولیں۔ بتائیے اگر کوئی شخص اپنے نوکر کو ڈانٹے اور جواب میں نوکر یہ کہے کہ جھوٹ نہ بولو تو اور زیادہ غصہ آئے گا، لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جملہ سنا اور اپنی گردن جھکائی اور استغفر اللہ، استغفر اللہ کہتے ہوئے تشریف لے گئے۔

یک طرفہ بات سن کر ڈانٹنا

آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس لئے کہ جب آپ نے اپنے نوکر کو ڈانٹا اور اس نے کہا کہ اللہ سے ڈرو، تو اس وقت فوراً ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں نے ایک طرف کی بات سن کر اس کو ڈانٹنا شروع کر دیا اور میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ لوگ تمہاری یہ شکایت کر رہے ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟

اس کا بیان سننے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہئے تھا اور یک طرفہ شکایت سن کر ڈانٹنا مناسب نہیں تھا، اس لئے بجائے اس کے کہ اپنی بات پر اڑتے آپ ''استغفر اللہ، استغفر اللہ'' کہتے ہوئے تشریف لے گئے۔ یہ تھے ''کَانَ وَقَّافًا عِنْدَ حُدُوْدِ اللّٰهِ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حدود کے آگے رک جانے والے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ

یہ وصف حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا بیان کیا گیا ہے:

''كَانَ وَقَّافًا عِنْدَ حُدُوْدِ اللّٰهِ''

یعنی اللہ تعالیٰ کی حدود کے آگے رک جانے والے تھے۔ ویسے آپ کے اندر غصہ تھا، مزاج میں تیزی تھی، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی حد سامنے آگئی تو اب مزاج کی ساری تیزی ختم ہوگئی اور سارا غصہ بھی فرو ہوگیا۔ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں تشریف لائے، دیکھا کہ ایک گھر کا پرنالہ مسجد نبوی کی طرف لگا ہوا ہے، آپ نے حکم دیا کہ اس پرنالے کو توڑ دو، اس لئے کہ اس کے پانی سے مسجد نبوی خراب ہوتی ہے، چنانچہ وہ پرنالہ توڑ دیا گیا، یہ غصہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے اور مسجد نبوی کے لئے تھا۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے میرے گھر کا پرنالہ توڑ دیا ہے تو آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ناراض ہوئے اور ان سے فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کر دیا کہ ہمارے گھر کا پرنالہ توڑ دیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ پرنالہ مسجد میں گر رہا تھا اور مسجد نبوی کو خراب کر رہا تھا، اس لئے میں نے اس کو توڑ دیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہیں یہ پتہ نہیں کہ اس پرنالے کو لگانے کی خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اجازت دی تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اچھا! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی تھی؟ چنانچہ آپ وہیں جھک کر کھڑے ہوگئے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ میری کمر پر کھڑے ہو کر دوبارہ اس پرنالے کو اسی جگہ پر لگا دیں۔ پھر فرمایا کہ خطاب کے بیٹے کی یہ مجال نہیں کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لگے ہوئے پرنالے کو توڑے، چنانچہ وہ پرنالہ دوبارہ اسی جگہ لگا دیا گیا اور آج تک وہ پرنالہ مسجد نبوی میں لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ترکی خلافت کے دور کے لوگوں کو یہ عشق عطا فرمایا تھا کہ اب وہ نہ گھر موجود ہے نہ کوئی اور چیز موجود ہے، لیکن چونکہ وہ پرنالہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لگوایا تھا اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کا اس طرح سے اکرام کیا تھا، اس لئے وہ پرنالہ اسی جگہ لگا دیا، اب تک اس پرنالہ کی جگہ پر پرنالہ لگا ہوا ہے۔ [1]

(۱) طبقات ابن سعد (۱۲/٤)، كنز العمال (٦٦/٧)، مجمع الزوائد (٢٠٦/٤)، حياة الصحابة (٤٢٤/٢)

بہرحال! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ وصف عطا فرمایا تھا کہ "كَانَ وَقَّافًا عِنْدَ حُدُوْدِ اللّٰهِ"

یہ چیز صحبت سے حاصل ہوتی ہے

لیکن یہ بات صرف کتابیں پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ کسی کے سامنے رگڑے کھانے سے حاصل ہوتی ہے، جب کسی کے در پر آدمی رگڑے کھاتا ہے تب اللہ تعالیٰ یہ صفت عطا فرمادیتے ہیں، پھر وہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو پہچان جاتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو یہ وصف عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

اخوت، ایک اسلامی رشتہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾(۱)

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ، وَمَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ أَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))(۲)

ایک مسلمان کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ دے۔ اور اس پر ظلم اور زیادتی نہ کرے۔ اور اس کو ایذاء رسانی سے بچائے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کے کام آئے، اور اس کی ضرورت اور حاجت کو اپنی استطاعت کی حد تک پورا کرے، اور اگر کوئی مسلمان کسی مشکل یا پریشانی میں گرفتار ہے تو اس کو اس پریشانی سے نکالنے کی کوشش کرے، یہ بات بھی ایک مسلمان کے فرائض میں داخل ہے۔ چنانچہ جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی اس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''بھلائی کا کام کرو، تاکہ تم کو فلاح اور کامیابی حاصل ہو''۔ بھلائی کے اندر سب کچھ آجاتا ہے۔ مثلاً دوسرے کے ساتھ بھلائی کرنا۔ اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا، اس کے ساتھ رحم کا معاملہ کرنا، اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کو پورا کرنا، یہ سب چیزیں خیر اور بھلائی کے اندر داخل ہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۸/ ۱۹۸ تا ۲۰۹)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) الحج: ۷۷

(۲) صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن...... الخ، رقم: ٤٨٦٧، سنن الترمذي، كتاب الحدود عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الستر على المسلم، رقم: ١٣٤٥، مسند أحمد، مسند أبي هريرة، رقم: ٧١١٨

ایک جامع حدیث

جو حدیث میں نے تلاوت کی، وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہ تو مسلمان کسی دوسرے مسلمان پر ظلم کرتا ہے۔ اور نہ اس کو دشمنوں کے حوالے کرتا ہے۔ یعنی نہ اس کو بے یارومددگار چھوڑتا ہے۔ مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ أَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهِ، جو شخص اپنے کسی بھائی کی کسی ضرورت کے پورا کرنے میں لگا ہوا ہو، اس کا کوئی کام کر رہا ہو، تو جب تک وہ اپنے بھائی کا کام کرتا رہے گا، اللہ تعالیٰ اس کے کام بناتے رہیں گے۔ اور اس کی حاجتیں پوری کرتے رہیں گے۔ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، اور جو شخص کسی مسلمان سے کسی تکلیف یا مشقت کی بات دور کرے۔ یعنی وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے کسی مسلمان کی مشکل آسان ہو جائے۔ اور اس کی دشواری دور ہو جائے تو اس دور کرنے والے پر قیامت کے روز جو سختیاں آنے والی تھیں اللہ تعالیٰ ان سختیوں میں سے ایک سختی کو اس سختی کے مقابلے میں دور فرما دیتے ہیں۔ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے۔ مثلاً کسی مسلمان کا ایک عیب پتہ چل گیا کہ اس کے اندر فلاں عیب ہے، یا فلاں خرابی ہے، یا فلاں گناہ کے اندر مبتلا ہے۔ اب یہ شخص اس عیب کی پردہ پوشی کرے، اور دوسروں تک اس کو نہ پہنچائے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے اور اس کے گناہوں کو ڈھانپ دیں گے۔ یہ بڑی جامع حدیث ہے اور متعدد جملوں پر مشتمل ہے۔ جس میں سے ہر جملہ ہماری اور آپ کی توجہ چاہتا ہے۔ ان پر غور کرنے اور ان کو اپنی زندگی کا دستور بنانے کی ضرورت ہے۔

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جو جملہ ارشاد فرمایا، اس میں ایک اصول بیان فرما دیا:

((اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ))

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے''

لہٰذا انسان کا اپنے بھائی کے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے، ہر مسلمان کے ساتھ وہی معاملہ ہونا چاہئے۔ خواہ وہ مسلمان اجنبی ہو۔ اور بظاہر اس کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہ ہو۔ بظاہر اس کے ساتھ دوستی کا کوئی تعلق نہ ہو۔ لیکن تم اس کو اپنا بھائی سمجھو۔ اس ایک جملے کے ذریعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے امتیازات اور تعصبات کی جڑ کاٹ دی کہ یہ تو فلاں وطن کا رہنے والا

ہے، اور میں فلاں وطن کا رہنے والا ہوں، یہ فلاں زبان بولنے والا ہے، میں فلاں زبان بولنے والا، یہ فلاں خاندان اور قبیلے سے تعلق رکھنے والا، میں فلاں خاندان اور قبیلے سے تعلق رکھنے والا۔ اس ایک جملے نے ان امتیازات اور تعصبات کی جڑ کاٹ دی جو آج ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یعنی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی زبان بولتا ہو، کسی وطن کا باشندہ ہو، کسی بھی پیشے سے اس کا تعلق ہو، کسی بھی ذات یا نسل سے اس کا تعلق ہو۔ ہر حالت میں وہ تمہارا بھائی ہے۔

فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے

اسی بات کو قرآن کریم کی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑے پیارے انداز میں بیان فرمایا کہ

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾(۱)

اس آیت میں پوری انسانیت کا بڑا عجیب منشور بیان فرمایا، فرمایا کہ اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، یعنی تم سب کا سلسلۂ نسب ایک مرد اور ایک عورت یعنی حضرت آدم اور حضرت حوا علیہا السلام پر جاکر ختم ہوتا ہے۔ تم سب کے باپ ایک ہیں، یعنی حضرت آدم علیہ السلام، اور تم سب کی ماں ایک ہیں، حضرت حوا علیہا السلام۔ جب سب انسانوں کے باپ ایک، سب انسانوں کی ماں ایک، تو پھر کسی کو دوسرے پر فضیلت حاصل نہیں۔ پھر ایک سوال پیدا ہوا کہ جب تمام انسان ایک باپ اور ایک ماں کی اولاد ہیں تو اے اللہ! پھر آپ نے مختلف خاندان اور مختلف قبیلے کیوں بنائے؟ کہ یہ فلاں قبیلے کا ہے، یہ فلاں خاندان کا ہے، یہ فلاں گروہ کا ہے، یہ فلاں نسل کا ہے، یہ فلاں زبان بولنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: "لِتَعَارَفُوْا" یعنی یہ الگ الگ خاندان قبیلے اس لئے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اگر سب انسان ایک زبان بولنے والے، ایک وطن ایک نسل ایک خاندان کے ہوتے تو ایک دوسرے کو پہچاننا مشکل ہوجاتا۔ مثلاً تین آدمی ہیں، اور تینوں کا نام "عبداللہ" ہے، تو اب تم پہچان کرنے کے لئے ان کے ساتھ نسبتیں لگادیتے ہو کہ یہ عبداللہ کراچی کا رہنے والا ہے، یہ لاہور کا اور یہ پشاور کا رہنے والا ہے۔ اس طرح ان قبیلوں ان نسبتوں اور شہروں کے اختلاف سے ایک دوسرے کی پہچان ہوجاتی ہے۔ بس اسی غرض کے لئے ہم نے مختلف شہر اور مختلف زبانیں بنائیں۔ ورنہ کسی کو کسی پر فوقیت اور فضیلت نہیں ہے۔ ہاں صرف ایک چیز کی وجہ سے فضیلت ہوسکتی ہے۔ وہ ہے

(۱) الحجرات: ۱۳، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لئے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کرسکو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم سب سے زیادہ متقی ہو"

''تقویٰ'' جس کے اندر تقویٰ زیادہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ کریم اور زیادہ شریف ہے۔ چاہے بظاہر وہ نچلے خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔

اسلام اور کفر کا فرق

حضورِ اقدس ﷺ کی سنت دیکھئے کہ ابولہب جو آپ کا چچا تھا، اور آپ کے خاندان کا ایک بڑا سردار، اس کا تو یہ حال ہے کہ قرآن کریم کے اندر اس کے اُوپر لعنت آئی۔ اور ایسی لعنت آئی کہ قیامت تک جو مسلمان بھی قرآن کریم کی تلاوت کرے گا وہ "تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ"(۱) کے ذریعہ ابولہب پر لعنت بھیجے گا کہ اس کے ہاتھ ٹوٹیں اور اس پر لعنت ہو۔ بدر کے میدان میں اپنے چچا اور تایوں کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے، ان کے خلاف تلواریں اُٹھائی جا رہی ہے۔

جنت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا مقام

دوسری طرف حضرت بلال رضی اللہ عنہ جو حبشہ کے رہنے والے سیاہ فام ہیں، ان کو سینے سے لگایا جا رہا ہے۔ بلکہ آپ ان سے یہ پوچھتے ہیں کہ اے بلال! وہ عمل تو ذرا بتاؤ جس کی وجہ سے میں نے آج کی رات خواب کے اندر جنت دیکھی تو وہاں تمہارے قدموں کی چاپ اور آہٹ اپنے آگے آگے سنی۔ یہ سوال بلال حبشی سے کیا جا رہا ہے جو سیاہ فام ہیں، اور حبشہ کے رہنے والے ہیں۔ اور جن کو سارے عرب کے لوگ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جواب میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یا رسول اللہ، اور کوئی خاص عمل تو میں نہیں کرتا، البتہ ایک عمل ہے جس پر میں شروع سے پابندی کرتا آ رہا ہوں، وہ یہ کہ جب بھی میں دن یا رات میں وضو کرتا ہوں تو اس وضو سے دو چار رکعت نفل ضرور پڑھ لیتا ہوں۔ (جس کو تحیۃ الوضو کہتے ہیں)۔ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ جواب سن کر اس کی تصدیق فرمائی کہ شاید یہی بات ہوگی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں اتنا بڑا مقام عطا فرمایا۔(۲)

---

(۱) اللهب: ۱

(۲) صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب فضل الطهور بالليل والنهار وفضل الصلاة بعد الوضوء، رقم: ۱۰۸۱، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل بلال، رقم: ۴۴۹۷، سنن الترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله، باب في مناقب عمر بن الخطاب، رقم: ۳۶۲۲، مسند أحمد، رقم: ۸۰۵۲

حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے کیوں؟

بعض اوقات خیال آتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جنت میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے کیسے نکل گئے؟ جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے کوئی نہیں نکل سکتا۔ علماء کرام نے فرمایا کہ درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آگے اس لئے نہیں تھے کہ ان کا درجہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھا ہوا تھا، بلکہ دنیا میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جاتے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ راستہ دکھانے کے لئے آگے آگے چلتے، ان کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہوتی تھی۔ راستے میں اگر کوئی پتھر ہوتا تو اس کو ہٹا دیتے، اگر کوئی اور رکاوٹ ہوتی تو اس کو دور کر دیتے، سامنے سے آنے والے لوگوں پر نظر رکھتے، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سامنے سے کوئی دشمن آجائے، اور آپ کو تکلیف پہنچادے۔ چونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا کہ وہ آپ کے آگے آگے چلتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے جنت میں بھی وہی منظر دکھادیا کہ تم ہمارے حبیب کی دنیا میں اس طرح حفاظت کرتے تھے۔ چلو جنت میں بھی ہم تمہیں آگے رکھیں گے۔ اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت میں اپنے آگے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

اسلام کے رشتے نے سب کو جوڑ دیا

یہ مقام اس شخص نے پایا جس کو غلام کہا جاتا تھا، سیاہ فام اور حقیر سمجھا جاتا تھا نسل اور خاندان کے اعتبار سے اس کی کوئی وقعت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس کے مقابلے میں ''ابولہب'' پر قرآن کریم میں لعنت نازل ہورہی ہے کہ تَبَّتْ يَدَآ أَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ[1] روم کے رہنے والے ''حضرت صہیب'' تشریف لاتے ہیں، اور بڑا اُونچا مقام پاتے ہیں۔ ایران کے رہنے والے حضرت سلمان فارسی نے آکر اتنا اُونچا مقام پایا کہ ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سَلْمَانُ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ"[2] یعنی سلمان فارسی ہمارے گھر والوں میں شامل ہیں۔ اس طرح آپ نے وطن کے، نسل کے، رنگ کے اور زبان کے بتوں کو توڑ دیا، اور یہ اعلان فرمادیا کہ ہم تو اس ایک اللہ کو ماننے والے ہیں جس نے سارے انسانوں کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا فرمایا۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ[3] اور فرمایا کہ

---

(۱) اللهب: ۱

(۲) المعجم الكبير (۱۰/٦) رقم: ٥٩٠٨، أسد الغابة (٤٦٤/١)، مصنف ابن أبي شيبة (٦١٦/٧)، المستدرك للحاكم (٦٩١/٣) رقم: ٦٥٣٩، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (٢٤/٣)

(۳) الحجرات: ۱۰

تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

جب آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے اس وقت مدینہ طیبہ میں اوس اور خزرج کے قبیلوں کے درمیان لڑائی اور جنگ کی آگ سلگ رہی تھی۔ باپ جب مرتا تو بیٹے کو وصیت کر جاتا کہ بیٹا! اور سب کام کرنا، لیکن میرے دشمن سے انتقام ضرور لینا۔ زمانۂ جاہلیت میں ایک لڑائی ہوئی ہے، جس کو ''حرب بسوس'' کہا جاتا ہے، چالیس سال تک یہ لڑائی جاری رہی۔ اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ایک شخص کی مرغی کا بچہ دوسرے شخص کے کھیت میں چلا گیا۔ کھیت کے مالک نے غصہ میں آ کر مرغی کے بچے کو مار دیا، مرغی کا مالک نکل آیا۔ جس سے زبانی تو تکار شروع ہوئی۔ اور پھر ہاتھا پائی تک نوبت آ گئی۔ اس کے نتیجے میں تلواریں نکل آئیں۔ اس کا قبیلہ ایک طرف اور دوسرے کا قبیلہ ایک طرف، دونوں قبیلوں کے درمیان لڑائی شروع ہوئی، اور ایک مرغی کے بچے پر چالیس سال تک متواتر یہ لڑائی جاری رہی۔ لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے تشریف لانے کے بعد ان کو ایمان کی اور کلمہ لا الہ الا اللہ کی لڑی میں پرو دیا کہ ان کے درمیان عداوت کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ اور بعد میں ان کو دیکھ کر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے تھے۔ اور ان کے درمیان بھائی چارہ پیدا فرما دیا۔ قرآن کریم نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾(۱)

یعنی اس وقت کو یاد کرو جب تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ اب ایسا نہ ہو کہ یہ بھائی بھائی کا رشتہ ختم ہو جائے۔ اور پھر دوبارہ اسی جاہلیت کے طریقے کی طرف لوٹ جاؤ۔

آج ہم یہ اصول بھول گئے

بہر حال! نبی کریم ﷺ نے اس حدیث کے ذریعہ سب سے پہلے یہ اصول بتا دیا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ خواہ وہ کوئی زبان بولتا ہو۔ خواہ وہ کسی بھی قبیلے سے، کسی بھی قوم سے اس کا تعلق ہو۔ لہٰذا اس کے ساتھ بھائی جیسا معاملہ کرو۔ یہ نہ سوچو کہ چونکہ یہ دوسری نسل کا، دوسری قوم کا، یا دوسرے وطن کا آدمی ہے، لہٰذا یہ میرا نہیں ہے، میرا وہ ہے جو میرے وطن میں پیدا ہوا ہو۔ یہ تصور ذہن سے نکالو، اور ہر مسلمان کو اپنا بھائی سمجھو۔ پوری تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ جب کبھی مسلمانوں کو شکست یا زوال کا سامنا کرنا پڑا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مسلمان یہ اصول بھول گئے

(۱) آل عمران: ۱۰۳

کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اور کسی نے درمیان میں پھوٹ ڈال دی کہ یہ تو فلاں قوم کا ہے۔ وہ فلاں نسل کا ہے۔ بس لڑائی شروع ہوگئی اور اس کے نتیجے میں مسلمان تباہ و برباد ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ اس اصول کو ہمارے دلوں میں بٹھا دے۔ ہم زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو کیا ہم اس مسلمان کے ساتھ بھائیوں جیسا برتاؤ کرتے ہیں؟ ہر مسلمان اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لے، اور اپنا جائزہ لے۔ اگر ایسا برتاؤ نہیں کرتے تو پھر آج کے بعد یہ تہیہ کرلیں کہ ہم ہر مسلمان کے ساتھ اپنے بھائی جیسا سلوک کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ بات ہمارے اندر پیدا فرمادے۔

پھر حدیث کے اگلے جملے میں بھائی سمجھنے کی پہلی علامت یہ بیان فرمائی کہ لَا یَظْلِمُہٗ یعنی مسلمان چونکہ مسلمان کا بھائی ہے، لہٰذا وہ کبھی دوسرے مسلمان پر ظلم نہیں کرے گا۔ اور اس کی جان، اس کے مال، اس کی عزت اور آبرو پر کوئی حق تلفی نہیں کرے گا۔ اس کے حقوق ضائع نہیں کرے گا۔

مسلمان دوسرے مسلمان کا مددگار ہوتا ہے

آگے فرمایا کہ وَلَا یُسْلِمُہٗ یعنی صرف یہ نہیں کہ اس پر ظلم نہیں کرے گا بلکہ اس کو بے یارو مددگار بھی نہیں چھوڑے گا۔ اگر مسلمان کسی مشکل میں مبتلا ہے، یا کسی پریشانی کے اندر مبتلا ہے، اور اس کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے تو کوئی مسلمان اس کو بے یارو مددگار نہیں چھوڑے گا۔ وہ یہ نہیں سوچے گا کہ جو کچھ پیش آرہا ہے وہ اس کو پیش آرہا ہے۔ میرا اس سے کیا تعلق؟ میرا تو کچھ نہیں بگڑ رہا ہے۔ اور یہ سوچ کر الگ ہوجائے۔ یہ کام مسلمان کا نہیں ہے۔ بلکہ مسلمان کے فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ اگر وہ کسی دوسرے مسلمان پر مصیبت ٹوٹتے ہوئے دیکھ رہا ہے، یا کسی کو مشکل اور پریشانی میں گرفتار پا رہا ہے، تو دوسرے مسلمان کو چاہئے کہ حتی الامکان اس کی پریشانی کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اور یہ نہ سوچے کہ اگر میں اس کے کام میں لگ گیا تو میرا وقت ضائع ہوجائے گا، یا میں پھنس جاؤں گا۔

موجودہ دور کا ایک عبرت آموز واقعہ

جس دور سے ہم گذر رہے ہیں، یہ دور ایسا آگیا ہے کہ اس میں انسانیت کی قدریں بدل گئیں، انسان انسان نہ رہا۔ ایک وقت وہ تھا کہ اگر کسی انسان کو چلتے ہوئے ٹھوکر بھی لگ جاتی اور وہ گر پڑتا تو دوسرا انسان اس کو اٹھانے کے لئے اور کھڑا کرنے کے لئے اور سہارا دینے کے لئے آگے بڑھتا۔ اگر سڑک پر کوئی حادثہ پیش آجاتا تو ہر انسان آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن آج ہمارے اس دور میں جو صورت ہوچکی ہے، اس کو میں اپنے سامنے ہونے والے ایک واقعہ

کے ذریعے بیان کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ ایک گاڑی ایک شخص کو ٹکر مارتے ہوئے چلی گئی۔ اب وہ شخص ٹکر کھا کر چاروں شانے چیت سڑک پر گر گیا۔ اس واقعہ کے بعد کم از کم بیس، پچیس گاڑیاں وہاں سے گذر گئیں۔ ہر گاڑی والا جھانک کر اس گرے ہوئے شخص کو دیکھتا، اور آگے روانہ ہو جاتا۔ کسی اللہ کے بندے کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ گاڑی سے اُتر کر اس کی مدد کرتا۔ اس کے باوجود آج کے لوگوں کو اپنے بارے میں مہذب اور شائستہ ہونے کا دعویٰ ہے۔ اسلام تو بہت آگے کی چیز ہے، لیکن ایسے موقع پر ایک انسانیت کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی اُتر کر دیکھ تو لے کہ اس کو کیا تکلیف پہنچی ہے۔ اور اس کی جتنی مدد کر سکتا ہے کر دے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے اس حدیث میں فرمادیا کہ ایک مسلمان یہ کام نہیں کر سکتا کہ وہ دوسرے مسلمان کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا جائے۔ بلکہ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ اگر وہ دوسرے مسلمان کو کسی مصیبت میں گرفتار پائے یا کسی پریشانی یا مشکل میں دیکھے تو حتی الامکان اس کی اس پریشانی اور مصیبت کو دور کرنے کی کوشش کرے۔

حضور ﷺ کا معمول

حضورِ اقدس ﷺ کا زندگی بھر یہ معمول رہا کہ جب بھی کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہوتا کہ اس کو فلاں چیز کی ضرورت ہے، یا یہ مشکل میں گرفتار ہے تو آپ بے چین ہو جاتے۔ اور جب تک اپنی استطاعت کے مطابق اس کی مدد کی کوشش نہ فرما لیتے، آپ کو چین نہ آتا تھا۔ صرف صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کفار سے معاہدہ کر لیا، اور اس معاہدہ کے نتیجے میں آپ ان مسلمانوں کی مدد نہ کرنے پر اور ان کو واپس کرنے پر مجبور تھے جو مسلمان مکہ مکرمہ سے بھاگ کر مدینہ طیبہ آجاتے۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ میں واپس کرنے پر مجبور ہوں۔ اس واقعہ کے علاوہ شاید کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے کسی مسلمان کو مشکل اور تکلیف میں دیکھ کر اس کی مدد نہ فرمائی ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

احسان کا بدلہ احسان ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَنْ اَعْطٰى عَطَاءً فَوَجَدَ فَلْيَجْزِ بِهٖ، وَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيُثْنِ فَإِنَّ مَنْ اَثْنٰى فَقَدْ شَكَرَ وَمَنْ كَتَمَ فَقَدْ كَفَرَ وَ مَنْ تَحَلّٰى بِمَا لَمْ يُعْطَهٗ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ))(۱)

''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے ساتھ کوئی نیکی کی جائے اور اس کے پاس نیکی کا بدلہ دینے کیلئے کوئی چیز موجود ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اس نیکی کا بدلہ دے، اور اگر اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے وہ نیکی کا بدلہ دے سکے تو کم از کم یہ کرے کہ جو نیکی اس کے ساتھ کی گئی ہے، اس کا تذکرہ کر کے اس کی تعریف کرے کہ فلاں نے میرے ساتھ یہ احسان اور یہ نیکی کی ہے، اس لئے کہ جس شخص نے اس کی تعریف کر دی تو گویا کہ اس نے اس کا شکریہ ادا کر دیا، اور اگر اس شخص نے اس نیکی اور احسان کو چھپا کر رکھا تو اس نے اس کی ناشکری کی۔ اور جو شخص اس چیز سے آراستہ ہوا جو اس کو نہیں دی گئی تو اس نے گویا جھوٹ کے دو کپڑے پہنے''

نیکی کا بدلہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دو باتوں کی تعلیم دی ہے۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، یا کوئی نیکی کرے، تو اس کو چاہئے کہ جس نے اس کے ساتھ نیکی کی

☆ اصلاحی خطبات (۱۶۴/۵ تا ۱۷۲)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في المتشبع بما لم يعطه، رقم: ۱۹۵۷، سنن أبي داؤد، کتاب الأدب، باب في شکر المعروف، رقم: ٤١٧٩

ہے، اس کو اس کا کچھ نہ کچھ بدلہ دے۔ دوسری حدیث میں اسی بدلہ کو ''مکافات'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ بدلہ جس کا ذکر حضورِ اقدس ﷺ فرمارہے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس احساس کے ساتھ دوسرے سے اچھا برتاؤ کرے کہ اس نے چونکہ میرے ساتھ نیکی کی ہے تو میں بھی اس کے ساتھ کوئی نیک سلوک کروں۔ یہ بدلہ دینا تو حضورِ اقدس ﷺ کی سنت ہے، اس لئے کہ حضورِ اقدس ﷺ کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی شخص آپ کے ساتھ اچھا معاملہ کرتا، یا کوئی ہدیہ پیش کرتا تو آپ اس کو بدلہ دیا کرتے تھے، اور اس کے ساتھ بھی اچھائی کا معاملہ کیا کرتے تھے۔ اس لئے یہ بدلہ تو باعثِ اجروثواب ہے۔

''نیوتہ'' دینا جائز نہیں

ایک بدلہ وہ ہے جو آج ہمارے معاشرے میں پھیل گیا ہے، وہ یہ کہ کسی کو بدلہ دینے کو دل تو نہیں چاہ رہا ہے، لیکن اس غرض سے دے رہا ہے کہ اگر میں نہیں دوں گا تو معاشرے میں میری ناک کٹ جائے گی، یا اس نیت سے دے رہا ہے کہ اس وقت دے رہا ہوں تو میرے یہاں شادی بیاہ کے موقع پر یہ دے گا۔ جس کو ''نیوتہ'' کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر کوئی کسی کو دیتا ہے تو باقاعدہ اس کی فہرست بنتی ہے کہ فلاں شخص نے اتنے دیئے، فلاں شخص نے اتنے دیئے۔ پھر اس فہرست کو محفوظ رکھا جاتا ہے، اور پھر جب اس شخص کے یہاں شادی بیاہ کا موقع آتا ہے جس نے دیا تھا تو اس کو پوری توقع ہوتی ہے کہ میں نے اس کو جتنا دیا تھا، یہ کم ازکم اتنا ہی مجھے واپس دے گا۔ اور اگر اس سے کم دے تو پھر گلے شکوے، لڑائیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ یہ ''بدلہ'' بہت خراب ہے۔ اور اسی کو قرآن کریم میں سورۃ روم میں ''سود'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۝﴾(۱)

یعنی تم لوگ جو سود دیتے ہو، تاکہ لوگوں کے مالوں کے ساتھ مل کر اس میں اضافہ ہوجائے، تو یاد رکھو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس میں اضافہ نہیں ہوتا، اور جو تم اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر زکوٰۃ دیتے ہو، تو یہی لوگ اپنے مالوں میں اضافہ کرانے والے ہیں۔

اس آیت میں اس ''نیوتہ'' کو سود سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص دوسرے کو اس نیت سے دے کہ چونکہ اس نے مجھے شادی کے موقع پر دیا تھا، اب میرے ذمے فرض ہے کہ میں بھی اس کو ضرور دوں، اگر میں نہیں دوں گا تو معاشرے میں میری ناک کٹ جائے گی اور یہ مجھے مقروض سمجھے گا، یہ دینا

(۱) الروم: ۳۹

گناہ میں داخل ہے، اس میں کبھی مبتلا نہیں ہونا چاہئے، اس میں نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہے، اور نہ ہی آخرت کا کوئی فائدہ ہے۔

محبت کی خاطر بدلہ اور ہدیہ دو

لیکن ایک وہ "بدلہ" جس کی تلقین حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں۔ یعنی دینے والے کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ جو میں دے رہا ہوں، اس کا بدلہ مجھے ملے گا بلکہ اس نے محض محبت کی خاطر اللہ کو راضی کرنے کے لئے اپنے بہن یا بھائی کو کچھ دیا ہو۔ جیسا کہ حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

((تَهَادَوْا تَحَابُّوْا))(۱)

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو ہدیے دیا کرو، اس سے آپس میں محبت پیدا ہوگی۔ لہٰذا اگر آدمی حضورِ اقدس ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرنے کے لئے اپنے دل کے تقاضے سے دے رہا ہے، اور اس کے دل میں دُور دُور یہ خیال نہیں ہے کہ اس کا بدلہ بھی مجھے ملے گا، تو یہ دینا بڑی برکت کی چیز ہے۔ اور جس شخص کو وہ ہدیہ دیا گیا وہ بھی یہ سمجھ کر نہ لے کہ یہ "نیوتہ" ہے، اور اس کا بدلہ مجھے ادا کرنا ہے۔ بلکہ وہ یہ سوچے کہ یہ میرا بھائی ہے، اس نے میرے ساتھ ایک اچھائی کی ہے، تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ اچھائی کروں، اور میں بھی اپنی طاقت کے مطابق اس کو ہدیہ دے کر اس کا دل خوش کروں۔ تو اس کا نام ہے "مکافات" جس کی حضورِ اقدس ﷺ نے تاکید فرمائی ہے۔ یہ محمود ہے اور اس کی کوشش کرنی چاہئے۔

بدلہ دینے میں برابری کا لحاظ مت کرو

اس "مکافات" کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب دوسرا شخص تمہارے ہدیہ کا بدلہ دے گا تو اس بدلہ میں اس کا لحاظ نہیں ہوگا کہ جتنا قیمتی ہدیہ اس نے دیا تھا، اتنا ہی قیمتی ہدیہ میں بھی دوں۔ بلکہ مکافات کرنے والا یہ سوچے گا کہ اس نے اپنی استطاعت کے مطابق بدلہ دیا تھا، میں اپنی استطاعت کے مطابق بدلہ دوں۔ مثلاً کسی نے آپ کو بہت قیمتی تحفہ دے دیا تھا، اب آپ کی استطاعت قیمتی تحفہ دینے کی نہیں ہے تو آپ چھوٹا اور معمولی تحفہ دیتے وقت شرمائیں نہیں۔ اس لئے کہ اس کا مقصد بھی آپ کا دل خوش کرنا تھا، اور آپ کا مقصد بھی اس کا دل خوش کرنا ہے، اور دل چھوٹی چیز سے بھی خوش ہو جاتا ہے۔ یہ نہ سوچیں کہ جتنا قیمتی تحفہ اس نے مجھے دیا تھا، میں بھی اتنا ہی قیمتی تحفہ اس کو دوں، چاہے اس مقصد کے لئے مجھے قرض لینا پڑے، چاہے رشوت لینی پڑے، یا اس کے لئے مجھے ناجائز ذرائع آمدنی

(۱) مؤطا مالك، الكتاب الجامع، باب ما جاء في المهاجرة، رقم: ۱٤١٣

اختیار کرنے پڑیں، ہرگز نہیں، بلکہ جتنی استطاعت ہو، اس کے مطابق تحفہ دو۔

تعریف کرنا بھی بدلہ ہے

بلکہ اس حدیث میں یہاں تک فرما دیا کہ اگر تمہارے پاس ہدیہ کا بدلہ دینے کے لئے کچھ نہیں ہے تو پھر ''مکافات'' کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ تم اس کی تعریف کرو، اور لوگوں کو بتاؤ کہ میرے بھائی نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا اور مجھے ہدیہ میں یہ ضرورت کی چیز دے دی۔ یہ کہہ کر اس کا دل خوش کر دینا بھی ایک طرح کا بدلہ ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انداز

میرے حضرت جناب حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی شخص محبت سے کوئی چیز ہدیہ کے طور پر لے کر آئے تو کم از کم اس پر خوشی کا اظہار کر کے اس کا دل خوش کرو، تاکہ اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ تمہیں اس ہدیہ سے خوشی ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے حضرت والا کو دیکھا کہ جب کوئی شخص آپ کے پاس کوئی ہدیہ لے کر آتا تو آپ بہت خوشی سے اس کو قبول فرماتے، اور فرماتے کہ بھائی! یہ تو ہماری پسند کی اور ضرورت کی چیز ہے، آپ کا یہ ہدیہ تو ہمیں بہت پسند آیا، ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ بازار سے یہ چیز خرید لیں گے۔ یہ الفاظ اس لئے فرماتے تاکہ دینے والے کو یہ احساس ہو کہ ان کو میرے ہدیہ سے خوشی ہوئی ہے، اور اس حدیث پر عمل بھی ہو جائے۔ لہٰذا اس کی تعریف کرنی چاہئے۔ اور چھپا کر بیٹھنا اور اس پر اس کی تعریف نہ کرنا اور خوشی کا اظہار نہ کرنا، یہ اس ہدیہ کی ناشکری ہے۔

چھپا کر ہدیہ دینا

ایک مرتبہ ایک صاحب حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے، اور مصافحہ کرتے ہوئے چپکے سے کوئی چیز بطور ہدیہ کے دے دی، اس لئے کہ یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ چپکے سے مصافحہ کرتے ہوئے ہدیہ دے دیا جائے، تو ان صاحب نے بھی ایسا ہی کیا۔ حضرت والا نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت ہدیہ پیش کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ اس طرح چھپا کر دینے کا کیا مطلب ہے، کیا تم چوری کر رہے ہو، یا میں چوری کر رہا ہوں؟ جب نہ تم چوری کر رہے ہو اور نہ میں چوری کر رہا ہوں، بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد پر عمل کرنا چاہتے ہو تو پھر اس کو اس طرح چھپانے کی کیا ضرورت ہے، یہ تو ایک محبت اور تعلق کا اظہار ہے، سب

کے سامنے پیش کردو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہرحال، ہدیہ کے ذریعہ اصل میں دل کی محبت کا اظہار ہے، چاہے وہ چیز چھوٹی ہو یا بڑی ہو۔ اور جب کوئی شخص تمہیں کوئی چیز دے تو تم اس کا بدلہ دے دو، یا کم از کم اس کی تعریف کردو۔

پریشانی میں درود شریف کی کثرت کیوں؟

ایک مرتبہ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم کسی مشکل اور پریشانی میں ہوتو اس وقت درود شریف کثرت سے پڑھا کرو۔ پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے ذوق میں ایک بات آتی ہے وہ یہ کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کا اُمتی جب بھی حضور ﷺ پر درود بھیجتا ہے تو وہ درود شریف حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں فرشتے پہنچاتے ہیں، اور جا کر عرض کرتے ہیں کہ آپ کے فلاں اُمتی نے آپ کی خدمت میں درود شریف کا یہ ہدیہ بھیجا ہے۔(۱)

دوسری طرف زندگی میں حضورِ اقدس ﷺ کی سنت یہ تھی کہ جب بھی کوئی شخص آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کرتا تو آپ اس کی ''مکافات'' ضرور فرماتے تھے، اس کے بدلے میں اس کے ساتھ کوئی نیکی ضرور فرماتے تھے۔ ان دونوں باتوں کے ملانے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جب تم حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں درود بھیجو گے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ اس کا بدلہ نہ دیں، بلکہ ضرور بدلہ دیں گے۔ اور وہ بدلہ یہ ہوگا کہ آپ اس اُمتی کے حق میں دعا کریں گے کہ اے اللہ! یہ میرا اُمتی جو مجھ پر درود بھیج رہا ہے، وہ فلاں مشکل اور پریشانی میں مبتلا ہے، اے اللہ! اس کی مشکل دور فرما دیجئے۔ تو اس دعا کی برکت سے انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ تمہیں اس مشکل سے نجات عطا فرمائیں گے۔ اس لئے جب بھی کوئی پریشانی آئے تو اس وقت حضورِ اقدس ﷺ پر درود شریف کی کثرت کریں

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے اس حدیث میں پہلی تعلیم یہ دی کہ جب کوئی شخص تمہارے ساتھ نیکی کرے، تو تم اس کو بدلہ دینے کی کوشش کرو، اور اس نیت سے بدلہ دو کہ چونکہ یہ حضورِ اقدس ﷺ کی سنت ہے کہ آپ بدلہ دیا کرتے تھے، اس لئے میں بھی بدلہ دے رہا ہوں۔ لیکن قرضہ والا بدلہ نہ ہو، ''نیوتہ'' والا بدلہ نہ ہو، بلکہ وہ بدلہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اور حضورِ اقدس ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کے لئے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) سنن النسائی، کتاب السهو، باب السلام على النبی، رقم: ۱۲٦٥

ایثار و قربانی کی فضیلت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ الْمُهَاجِرِيْنَ قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! ذَهَبَتِ الْأَنْصَارُ بِالْأَجْرِ كُلِّهٖ قَالَ: ((لَا مَا دَعَوْتُمُ اللّٰهَ لَهُمْ وَأَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِمْ))(۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب مہاجرین مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے آئے تو انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو مدینہ منورہ کے انصاری صحابہ ہیں، سارا اجر و ثواب وہ لے گئے اور ہمارے لئے تو کچھ بچا ہی نہیں۔ جواب میں آپ نے فرمایا: نہیں، جب تک تم ان کے لئے دعا کرتے رہو گے اور ان کا شکر ادا کرتے رہو گے، اس وقت تک تم ثواب سے محروم نہیں رہو گے۔

جب مہاجرین مکہ مکرمہ سے آکر مدینہ منورہ میں آباد ہونا شروع ہوئے تو اس وقت آبادکاری کا بہت بڑا مسئلہ تھا، اور لوگوں کا ایک سیلاب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ منتقل ہو رہا تھا، اور اس وقت مدینہ منورہ ایک چھوٹی سی بستی تھی، اب آباد ہونے والوں کو گھر کی ضرورت تھی، ان کے لئے روزگار چاہئے تھا، اور ان کے لئے کھانے پینے کا سامان اور ضروریاتِ زندگی چاہئے تھیں۔ یہ حضرات جب مدینہ منورہ آئے تو خالی ہاتھ آئے تھے، مکہ مکرمہ میں ان کی زمینیں تھیں، جائدادیں تھیں، سب کچھ تھا، لیکن وہ سب مکہ مکرمہ میں چھوڑ کر آئے تھے۔

انصار کی ایثار و قربانی

اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کے انصار صحابہ کے دل میں ایسا ایثار ڈالا اور انہوں نے ایثار کی وہ مثال قائم کی کہ تاریخ میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ انصاری صحابہ نے اپنی دنیا کی ساری دولت مہاجرین کے لئے کھول دی۔ یہ سب خود اپنی طرف سے کیا، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی حکم نہیں دیا تھا،

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/ ۲۷۸ تا ۲۹۰)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في شكر المعروف، رقم: ۴۱۷۸

بلکہ انصاری صحابہ نے کہا کہ جو بھی مہاجر صحابی آرہے ہیں، ان کے لئے ہمارے گھر کے دروازے کھلے ہیں، وہ آکر ہمارے گھروں میں آباد ہو جائیں۔ وہ ہمارے مہمان ہیں، ان کے کھانے پینے کا انتظام ہم کریں گے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے ان کا یہ جذبہ دیکھ کر مہاجرین اور انصار کے درمیان "مواخات" (بھائی چارہ) قائم فرمادیا، یعنی ہر ایک مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی بنادیا۔ اب وہ اس کے ساتھ رہنے لگا، اسی کے ساتھ کھانے پینے لگا، یہاں تک کہ بعض انصاری صحابہ نے فرمایا کہ میری دو بیویاں ہیں، میں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ میں اپنی ایک بیوی سے دست بردار ہو جاؤں اور اس کو طلاق دے کر علیحدہ کردوں، پھر تمہارے ساتھ اس کا نکاح کردوں۔ اگرچہ ایسا واقعہ پیش نہیں آیا لیکن آمادگی ظاہر کی۔

انصار اور مہاجرین میں مزارعت

یہاں تک کہ ایک مرتبہ انصاری صحابہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے جو مہاجر بھائی ہیں، وہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں، اگرچہ ہم ان کو مہمان کے طور پر رکھے ہوئے ہیں، لیکن ان کے دل میں ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ ہم تو مہمان ہیں، اور یہاں ان کا باقاعدہ روزگار کا انتظام بھی نہیں ہے، اس لئے ہم نے آپس میں یہ طے کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں ہماری جتنی جائیدادیں ہیں، ہم آدھی آدھی آپس میں تقسیم کرلیں یعنی آدھی جائیداد مہاجر بھائی کو دے دیں اور آدھی جائیداد ہم رکھ لیں۔ تو اس پر حضورِ اقدس ﷺ نے مہاجر صحابہ سے مشورہ کیا کہ انصاری صحابہ یہ پیش کش کررہے ہیں۔ آپ حضرات کا کیا خیال ہے؟ اس پر مہاجرین صحابہ نے فرمایا کہ نہیں، ہمیں یہ پسند نہیں کہ ہم ان کی آدھی زمینیں لے لیں۔ اس کے بعد حضورِ اقدس ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اچھا تم انصاری صحابہ کی زمینوں پر کام کرو اور جو پھل اور پیداوار ہو وہ تم دونوں میں تقسیم ہو جایا کرے۔ چنانچہ مہاجر صحابہ انصاری صحابہ کی زمینوں پر کام کرتے تھے اور جو پھل اور پیداوار ہوتی وہ آپس میں تقسیم کرلیا کرتے تھے۔ اس طرح مہاجرین نے اپنا وقت گزارا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے جذبات دیکھئے

حضراتِ انصار نے ایثار کی وہ مثالیں پیش کیں جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ بہرحال، مہاجر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ دیکھا کہ سارے ثواب والے کام تو انصاری صحابہ کررہے ہیں، اور سارا ثواب تو وہ لے گئے، تو ایک مرتبہ یہ حضرات حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مدینہ منورہ کے جو انصاری صحابہ ہیں وہ سارا ثواب لے گئے، ہمارے لئے تو

کچھ بچا ہی نہیں۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ انصاری صحابہ کے جذبات کیا ہیں اور مہاجرین صحابہ کے جذبات کیا ہیں۔ ایک طرف انصاری صحابہ مہاجرین کے لئے دیدہ ودل فرشِ راہ کیے ہوئے ہیں اور دوسری طرح مہاجرین صحابہ کو یہ خیال ہو رہا ہے کہ سارا اجر وثواب تو انصاری صحابہ کے پاس چلا گیا، اب ہمارے اجر وثواب کا کیا ہوگا؟

تمہیں بھی یہ ثواب مل سکتا ہے

جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا مَا دَعَوْتُمُ اللّٰهَ لَهُمْ وَاَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِمْ))

تم یہ جو کہہ رہے ہو کہ سارا ثواب انصاری صحابہ لے گئے تو ایک بات سن لو! وہ یہ کہ یہ مت سمجھو کہ تمہیں کچھ ثواب نہیں ملا، بلکہ یہ ثواب تمہیں بھی مل سکتا ہے۔ جب تک تم ان کے حق میں دعائیں کرتے رہو گے اور ان کا شکر ادا کرتے رہو گے، اس وقت تک تم ثواب سے محروم نہیں ہو گے اور اس عمل کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ان کے ثواب میں تم کو بھی شریک کرلیں گے۔

یہ دنیا چند روزہ ہے

وہاں یہ نہیں تھا کہ مہاجرین اپنے لئے ''انجمن تحفظ حقوق مہاجرین'' بنالیں، اور انصار اپنے لئے ''انجمن تحفظ حقوق انصار'' بنالیں، اور پھر دونوں انجمنیں اپنے اپنے حقوق کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے دست وگریباں ہوجائیں کہ انہوں نے ہمارے حقوق پامال کردیئے، بلکہ وہاں تو اُلٹا معاملہ ہو رہا ہے اور ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ میں اپنے بھائی کے ساتھ کوئی بھلائی کروں۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ اس لئے تھا کہ سب کے پیشِ نظر یہ ہے کہ مرنے کے بعد ہمارے ساتھ کیا حالات پیش آنے والے ہیں۔ یہ دنیا تو چند روزہ ہے، کسی طرح گزر جائے گی۔ اچھی گزر جائے یا تھوڑی تنگی کے ساتھ گزر جائے لیکن گزر جائے گی۔ البتہ اصل بات یہ ہے کہ مرنے کے بعد جو حالات پیش آئیں گے، اس وقت ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ اس فکر کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایک کے دل میں دوسرے بھائی کے لئے ایثار تھا۔

آخرت پیشِ نظر ہو تو

جب انسان کے پیشِ نظر آخرت نہیں ہوتی، دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس نہیں ہوتا، تو پھر آدمی کے پیشِ نظر صرف دنیا ہی دنیا ہوتی ہے، اور پھر ہر وقت یہ فکر رہتی ہے کہ دوسرے شخص نے مجھ سے زیادہ دنیا حاصل کرلی، میرے پاس کم رہ گئی، تو آدمی

پھر اس وقت اس ادھیڑ بن میں رہتا ہے کہ میں کس طرح زیادہ کمالوں اور زیادہ حاصل کرلوں۔ لیکن اگر آدمی کے دل میں یہ فکر ہو کہ آخرت میں میرے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے، اور ساتھ میں یہ خیال ہو کہ حقیقی راحت اور خوشی روپے میں اضافہ کرنے اور بینک بیلنس زیادہ کرنے سے حاصل نہیں ہوگی، بلکہ حقیقی خوشی یہ ہے کہ انسان کے دل میں سکون ہو، انسان کا ضمیر مطمئن ہو، اس کو یہ خوف نہ ہو کہ جب میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جاؤں گا تو اپنے اس عمل کا کیا جواب دوں گا۔ اور حقیقی خوشی یہ ہے کہ آدمی اپنے مسلمان بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ لے، اس کا کوئی دکھ دور کردے، اس کی کوئی پریشانی رفع کردے۔ جب انسان کے دل میں اس قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں تو پھر انسان دوسروں کے ساتھ ایثار سے کام لیتا ہے۔

''سکون'' ایثار اور قربانی میں ہے

اسلام کی تعلیم صرف اتنی نہیں ہے کہ بس دوسرے کے صرف واجب حقوق ادا کردیئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تعلیم اسلام نے دی ہے کہ دوسروں کے لئے ایثار کرو، تھوڑی سی قربانی بھی دو۔ یقین کریں کہ جب آپ دوسرے مسلمان بھائی کے لئے قربانی دیں گے تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں جو سکون، عافیت اور راحت عطا فرمائیں گے، اس کے سامنے بینک بیلنس کی خوشی ہیچ در ہیچ ہے۔ چونکہ ہم نے ایثار اور قربانی پر عمل چھوڑ رکھا ہے اور ہماری زندگی میں اب ایثار کا کوئی خانہ ہی نہیں رہا کہ دوسرے کی خاطر تھوڑی سی تکلیف اُٹھالیں، تھوڑی سی قربانی دے دیں، اس لئے اس قربانی کی لذت اور راحت کا ہمیں اندازہ ہی نہیں۔

ایک انصاری کے ایثار کا واقعہ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انصاری صحابہ کے ایثار کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾(۱)

یہ انصاری صحابہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، چاہے یہ خود حالتِ افلاس میں کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ وہ واقعہ آپ حضرات نے سنا ہوگا کہ حضور اقدس ﷺ کے ایک مہمان ایک انصاری صحابی کے پاس آگئے، کھانا کم تھا، بس اتنا کھانا تھا کہ یا تو خود کھالیں یا مہمان کو کھلادیں۔ لیکن یہ خیال ہوا کہ اگر مہمان کے ساتھ ہم بیٹھیں گے اور اس کے ساتھ کھانا نہیں کھائیں گے تو اس کو اشکال ہوگا، اس لئے چراغ گل کردیا تا کہ مہمان کو پتہ نہ چلے، اور ظاہر ایسا کیا کہ وہ بھی ساتھ میں کھانا کھا رہے

(۱) الحشر: ۹

ہیں۔اس پر قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی، یعنی یہ لوگ افلاس اور تنگ دستی کی حالت میں بھی دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔لہٰذا اس ایثار اور قربانی کی لذت سے بھی ہمکنار ہو کر دیکھئے۔دوسرے مسلمان بھائی کے لئے ایثار اور قربانی دینے میں جو مزہ اور راحت، لذت اور سکون ہے، وہ ہزار بینک بیلنس کے جمع کرنے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔اسی لئے حضورِ اقدس ﷺ نے انصار صحابہ اور مہاجرین کے درمیان یہی ایثار اور قربانی کا رابطہ قائم فرمایا۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو دوسروں کے لئے ایثار اور قربانی کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔

افضل عمل کونسا؟

اگلی حدیث حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھا گیا:

"أَيُّ الْأَعْمَالِ خَيْرٌ؟"

''اللہ تعالیٰ کے یہاں کون سے اعمال سب سے بہتر ہیں؟''

جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا:

((إِيْمَانٌ بِاللّٰهِ وَجِهَادٌ فِيْ سَبِيْلِهٖ))

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر عمل اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے، اور دوسرے اس کے راستے میں جہاد کرنا ہے''

یہ دونوں افضل الاعمال ہیں۔پھر کسی نے دوسرا سوال کیا:

"أَيُّ الرِّقَابِ أَفْضَلُ؟"

''کون سے غلام کی آزادی زیادہ افضل ہے؟''

اس زمانے میں غلام اور باندیاں ہوا کرتی تھیں، اور حضورِ اقدس ﷺ نے غلام اور باندیوں کو آزاد کرنے کی بہت فضیلت بیان فرمائی تھی۔تو کسی نے سوال کیا کہ غلام آزاد کرنا تو افضل ہے، لیکن کون سا غلام آزاد کرنا زیادہ افضل ہے اور زیادہ موجبِ ثواب ہے؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جو غلام زیادہ قیمتی اور زیادہ نفیس ہے، اس کو آزاد کرنا زیادہ موجبِ اجر و ثواب اور زیادہ افضل ہے۔پھر کسی نے سوال کیا کہ حضور! یہ بتایئے کہ اگر میں ان میں سے کوئی عمل نہ کر سکوں۔مثلاً کسی عذر کی بناء پر جہاد نہ کر سکوں، اور غلام آزاد کرنے کا عمل تو اس وقت کرے جب آدمی کے پاس غلام ہو یا غلام خریدنے کے لئے پیسے ہوں، لیکن میرے پاس تو غلام بھی نہیں ہے اور پیسے بھی نہیں ہیں تو پھر میں کس طرح اجر و ثواب زیادہ حاصل کروں؟ جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ پھر اس صورت میں

تمہارے لئے اجر وثواب حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص جو بگڑی ہوئی حالت میں ہو تو تم اس کی مدد کردو۔

دوسروں کی مدد کردو

مثلاً ایک شخص کسی مشکل میں مبتلا ہے، پریشانی کا شکار ہے، اس کی حالت بگڑی ہوئی ہے تو تم اس کی مدد کردو، یا کسی اناڑی آدمی کا کوئی کام کردو۔ آپ نے ''اناڑی'' کا لفظ استعمال فرمایا، یعنی وہ شخص جسے کوئی ہنر نہیں آتا، یا تو اس لئے کہ وہ معذور ہے یا اس کی دماغی صلاحیت اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنے دماغ کو استعمال کر کے کوئی بڑا کام کر سکے، تو تم اس کی مدد کردو اور اس کا کام کردو، اس میں بھی تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا اجر وثواب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نہ جانے کتنے بندے ایسے ہیں جو یا تو معذور ہیں، یا تنگدست ہیں، یا ان کے پاس کوئی ہنر نہیں ہے، کوئی ذہنی صلاحیت ان کے پاس نہیں ہے، تو اگر دوسرا شخص ان کی مدد کا کوئی کام کردے تو اس پر بھی اجر وثواب ملے گا۔ اور حضورِ اقدس ﷺ فرمارہے ہیں کہ اگر تم جہاد نہیں کرسکتے تو یہ کام کرلو۔ اس سے پتہ چلا کہ اس کا ثواب بھی اللہ تعالیٰ جہاد کے قریب قریب عطا فرمائیں گے۔ انشاء اللہ۔

اگر مدد کرنے کی طاقت نہ ہو؟

ان صحابی نے پھر سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر میں اتنا کمزور ہوں کہ اتنا عمل بھی نہ کرسکوں، یعنی میں خود ہی کمزور ہوں اور دوسرے کمزور کی مدد نہ کرسکوں تو پھر کیا کروں؟ اب آپ حضورِ اقدس ﷺ کے جوابات کا اندازہ لگایئے کہ آپ کے یہاں ناامیدی کا کوئی خانہ نہیں ہے، جو شخص بھی آرہا ہے اس کو امید کا راستہ دکھا رہے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس مت ہو جاؤ، اگر یہ عمل نہیں کرسکتے تو یہ عمل کرلو، اگر یہ عمل نہیں کرسکتے تو یہ عمل کرلو۔

لوگوں کو اپنے شر سے بچالو

بہرحال، آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر تم کمزور ہونے کی وجہ سے دوسروں کی مدد نہیں کرسکتے تو یہ ایک عمل کرلو:

((تَدَعُ النَّاسَ مِنَ الشَّرِّ))

''لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ کرلو'' (۱)

(۱) صحيح البخاري، كتاب العتق، باب أي الرقاب أفضل، رقم: ۲۳۳٤، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

یعنی اس بات کا اہتمام کرلو کہ میری ذات سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔ اس لئے کہ دوسروں کو اپنے شر سے محفوظ کرنا یہ تمہارا اپنے نفس پر صدقہ ہوگا، کیونکہ اگر تم دوسرے کو تکلیف پہنچاتے تو تمہیں گناہ ہوتا، اب تم نے جب اپنے آپ کو دوسروں کو تکلیف دینے سے بچالیا تو گویا کہ تم نے اپنے نفس کو گناہ اور عذاب سے بچالیا۔ لہٰذا یہ بھی ایک صدقہ ہے جو تم اپنے نفس پر کررہے ہو۔

حقیقی مسلمان کون ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے جو معاشرتی احکام اور معاشرتی تعلیمات ہیں، ان کی بنیاد یہی ہے کہ اپنی ذات سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے صاف صاف ارشاد فرمادیا:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ))(۱)

''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں''

نہ زبان سے دوسرے کو تکلیف پہنچے، نہ ہاتھ سے دوسرے کو تکلیف پہنچے۔ لیکن یہ چیز اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کو اس کا اہتمام ہو اور جس کے دل میں یہ بات جمی ہوئی ہو کہ میری ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے کہ ؎

تمام عمر اس احتیاط میں گزری
آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب فضل الجهاد والرباط، رقم: ۳۵۰۱، سنن الترمذي، كتاب فضائل الجهاد عن رسول الله، باب ما جاء أي الناس افضل، رقم: ۱۵۸۴، سنن النسائي، كتاب الجهاد، باب فضل من يجاهد في سبيل الله بنفسه وماله، رقم: ۳۰۵۴، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب العزلة، رقم: ۳۹۶۸، مسند أحمد، رقم: ۱۰۷۰۱

(۱) صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ۹، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان تفاضل الإسلام وأى أموره أفضل، رقم: ۵۸، سنن الترمذي، كتاب الإيمان عن رسول الله، باب ما جاء في أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، رقم: ۲۵۵۱، سنن النسائي، كتاب الإيمان وشرائعه، باب صفة المسلم، رقم: ۴۹۱۰، سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في الهجرة هل انقطعت، رقم: ۲۱۲۲

اپنی وجہ سے کسی پر بوجھ نہ پڑے، اپنی وجہ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کے بارے میں اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کم از کم آپ کی آدھی سے زائد تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے آپ سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچنے دو۔ اور پھر تکلیف صرف یہ نہیں ہے کہ کسی کو مار پیٹ دیا بلکہ تکلیف دینے کے بیشمار پہلو ہیں، کبھی زبان سے تکلیف پہنچ جاتی ہے، کبھی عمل سے تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے اپنے آپ کو اس سے بچاؤ۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا سبق آموز واقعہ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ آپ کو پہلے بھی سنایا تھا کہ مرضِ وفات جس میں آپ کا انتقال ہوا، اسی مرضِ وفات میں رمضان المبارک کا مہینہ آگیا، اور رمضان المبارک میں بار بار آپ کو دل کی تکلیف اٹھتی رہی اور اتنی شدت سے تکلیف اٹھتی تھی کہ یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید یہ آخری حملہ ثابت نہ ہو جائے۔ اسی بیماری میں جب رمضان المبارک گزر گیا تو ایک دن فرمانے لگے: ہر مسلمان کی آرزو ہوتی ہے کہ اس کو رمضان لمبارک کی موت نصیب ہو، میرے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کی موت عطا فرما دے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رمضان المبارک میں جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن میری بھی عجیب حالت ہے کہ میں بار بار سوچتا تھا کہ یہ دعا کروں کہ یا اللہ! رمضان المبارک کی موت عطا فرما دے، لیکن میری زبان پر یہ دعا نہیں آسکی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں اپنے لئے رمضان المبارک کی موت طلب تو کرلوں، لیکن مجھے اندازہ ہے کہ میری موت کے وقت میرے تیماردار اور میرے جو ملنے جلنے والے ہیں، ان سب کو روزہ کی حالت میں شدید مشقت اٹھانی پڑے گی، اور روزہ کی حالت میں ان کو صدمہ ہوگا، اور روزہ کی حالت میں تجہیز و تکفین کے سارے انتظامات کریں گے تو ان کو مشقت ہوگی۔ اس وجہ سے میری زبان پر یہ دعا نہیں آئی کہ رمضان المبارک میں میرا انتقال ہو جائے۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

تمام عمر اس احتیاط میں گزری
آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

چنانچہ رمضان المبارک کے ۱۱ دن کے بعد ۱۱/ شوال کو آپ کی وفات ہوئی۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ جو شخص مرتے وقت یہ سوچ رہا ہے کہ میرے مرنے سے بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچے، اس شخص کا زندگی میں لوگوں کے جذبات کا خیال رکھنے کا کیا عالم ہوگا؟

تین قسم کے جانور

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تین قسم کے جانور پیدا کیے ہیں۔ ایک قسم کے جانور وہ ہیں جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، تکلیف نہیں پہنچاتے، مثلاً گائے ہے، بھینس ہے، بکری ہے، تم ان کا دودھ استعمال کرتے ہو، اور بالآخر ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت کھا جاتے ہو۔ گھوڑا ہے، گدھا ہے، تم ان پر سواری کرتے ہو۔ دوسری قسم کے جانور ایسے ہیں جو دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، جیسے سانپ بچھو ہیں، درندے ہیں۔ یہ جانور انسان کو تکلیف پہنچاتے ہیں، فائدہ نہیں پہنچاتے۔ تیسری قسم کے جانور وہ ہیں جو نہ تو انسان کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور نہ ہی تکلیف دیتے ہیں۔ اس کے بعد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ انسانوں سے مخاطب ہو کر فرما رہے ہیں: اے انسان! اگر تم ایسے جانور نہیں بن سکتے جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں تو کم از کم ایسے جانور بن جاؤ جو نہ فائدہ دیتے ہیں نہ تکلیف دیتے ہیں۔ خدا کے لئے ایسے جانور مت بنو جو دوسروں کو تکلیف ہی پہنچاتے ہیں، فائدہ کچھ نہیں پہنچاتے۔ یعنی کم از کم تم اپنے شر سے لوگوں کو محفوظ کر لو۔ اور یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا خلاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

❁❁❁

امانت کی اہمیت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۃ المؤمنون کی ان ابتدائی آیتوں کا بیان کئی مہینوں سے چل رہا ہے۔ یہ وہ آیتیں ہیں جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فلاح پانے والے مؤمنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں۔ پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں، دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لغو اور بیہودہ کاموں اور باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں۔ تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اس کے دو معنی عرض کیے تھے، ایک یہ کہ وہ لوگ زکوٰۃ کا فریضہ انجام دیتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے اخلاق کا تزکیہ کرتے ہیں۔ چوتھی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، یعنی اپنی عفت اور عصمت کا تحفظ کرنے والے ہیں، اس صفت کا بیان پچھلے پانچ چھ جمعوں میں ہوتا رہا ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۲۱۶ تا ۲۲۶)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) المؤمنون: ۱ ۔ ۸، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے۔ جو اپنی نمازوں میں دل سے جھکنے والے ہیں، اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابل ملامت نہیں ہیں، ہاں جو اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیں تو ایسے لوگ حد سے گذرے ہوئے ہیں، اور وہ جو اپنے امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں''

امانت اور عہد کا پاس رکھنا

اس سے اگلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں، آج اس آیتِ کریمہ کا بیان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ یعنی ایک مؤمن کی دنیا و آخرت دونوں کی فلاح کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی امانت کا پاس رکھے اور اپنے عہد کا پاس رکھے۔ قرآن کریم میں یہ دونوں چیزیں الگ الگ بیان فرمائی ہیں، ایک امانت اور ایک عہد۔ مؤمن کی علامت یہ ہے کہ وہ امانتوں کا پاس کرنے والا ہے، اور اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہے۔

امانت قرآن و حدیث میں

ان میں سے پہلی چیز ''امانت'' ہے، اور فلاح کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ انسان امانت میں کوئی خیانت نہ کرے، بلکہ امانت کو ٹھیک ٹھیک اس کے اہل تک پہنچائے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ امانتوں کو ان کے مستحق لوگوں تک پہنچاؤ۔ قرآن و حدیث میں اس کی بڑی تاکید وارد ہوئی ہے۔ ایک حدیث میں رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))(۲)

یعنی تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر وہ کسی انسان میں پائی جائیں تو وہ خالص منافق ہے۔ پہلی یہ ہے کہ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، دوسری یہ کہ جب وہ کسی سے وعدہ کرے تو وعدے کی خلاف ورزی کرے، اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے یا جب اس کو کسی چیز کا امانت دار بنایا جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔ یہ منافق کی علامات ہیں، مؤمن کا کام نہیں۔ اس لئے اس کی بڑی تاکید وارد ہوئی ہے۔

---

(۱) النساء: ۵۸

(۲) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب علامة المنافق، رقم: ۳۳، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال المنافق، رقم: ۸۸، سنن الترمذی، کتاب الایمان عن رسول اللہ، باب ما جاء فی علامة المنافق

امانت اُٹھ چکی ہے

آج ہمارے معاشرے میں یہ خیانت پھیل گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد ہمارے اس دور پر صادق آرہا ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ ایک وقت ایسا آجائے گا کہ امانت دنیا سے اُٹھ جائے گی، اور لوگ کہا کریں گے کہ فلاں ملک میں فلاں شہر میں فلاں بستی میں ایک شخص رہتا ہے، وہ امانت دار ہے۔ یعنی امانت دار لوگ ختم ہو جائیں گے، سب خائن ہو جائیں گے، اور اِکا دُکا لوگ ہوں گے جو امانت کا پاس رکھنے والے ہوں گے۔ ایک مؤمن کی خاصیت یہ ہے کہ وہ خیانت نہیں کرتا۔

حضور ﷺ کا امین ہونا

نبی کریم ﷺ نبوت سے پہلے بھی پورے مکہ میں ''صادق'' اور ''امین'' کے لقب سے مشہور تھے، یعنی آپ سچے تھے، آپ کی زبان پر کبھی جھوٹ نہیں آتا تھا، آپ امانت دار تھے، جو لوگ آپ کے پاس امانت رکھواتے تھے ان کو پورا بھروسہ ہوتا تھا کہ نبی کریم ﷺ اس امانت کا حق ادا کریں گے۔ چنانچہ جب آپ مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمارہے تھے، اس وقت یہ عالم تھا کہ کفار نے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے ہوئے تھے، آپ کے خلاف قتل کے منصوبے بنائے جارہے تھے، اس حالت میں رات کے وقت آپ کو اپنے شہر مکہ مکرمہ سے نکلنا پڑا۔ اس وقت بھی آپ کو یہ فکر تھی کہ میرے پاس لوگوں کی جو امانتیں رکھی ہوئی ہیں، ان کو اگر پہنچاؤں گا تو یہ راز کھل جائے گا کہ میں یہاں سے جارہا ہوں تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساری امانتیں سپرد فرمائیں، اور ان کو اپنے بستر پر لٹایا، اور ان سے فرمایا کہ میں جارہا ہوں، تم یہ امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچاؤ، اور جب اس کام سے فارغ ہو جاؤ تو پھر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجانا۔ اور وہ امانتیں صرف مسلمانوں کی نہیں تھیں، بلکہ کافروں کی بھی تھیں۔ وہ کافر جو آپ کے خون کے پیاسے تھے، جو آپ کے ساتھ دشمنی کا معاملہ کررہے تھے، ان کی امانتوں کو بھی ان تک واپس پہنچانے کا انتظام فرمایا۔

غزوۂ خیبر کا ایک واقعہ

غزوۂ خیبر کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ نے خیبر کے قلعوں کا محاصرہ کیا ہوا تھا، خیبر میں یہودی آباد تھے، اور ان کی خصلت شروع ہی سے سازشی ہے، مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال بنتے رہتے تھے، اور خیبر ان کی سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا، نبی کریم ﷺ نے ان کی سازشوں سے اُمتِ مسلمہ کو بچانے کے لئے خیبر شہر کا محاصرہ کیا۔ یہ شہر کئی قلعوں پر مشتمل تھا، یہودی اس محاصرے کے

دوران شہر کے اندر بند تھے، اور نبی کریم ﷺ کی فوجوں نے اس کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔

اسود چرواہا

جب محاصرے کو چند دن گزر گئے تو ایک چرواہا جس کا نام روایتوں میں ''اسود'' آتا ہے۔ جو لوگوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ وہ بکریوں کو چرانے کی خاطر قلعے سے باہر نکلا، باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کا لشکر محاصرہ کیے ہوئے ہے، اس چرواہے کے دل میں خیال آیا کہ میں جا کر دیکھوں کہ یہ کون لوگ ہیں؟ اور کیا ان کا پیغام ہے؟ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ ان کی دعوت کیا ہے؟ چنانچہ وہ اپنی بکریوں کو چراتے ہوئے لشکر کے قریب آ گیا۔ اور لشکر والوں سے پوچھنے لگا کہ آپ کا بادشاہ کہاں ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں بادشاہ تو کوئی نہیں ہے، البتہ نبی کریم ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور ان کی قیادت میں ہم لوگ یہاں آئے ہیں، وہ ہمارے قائد ہیں۔ اس چرواہے نے کہا کہ کیا میں ان کو دیکھ سکتا ہوں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا: کیوں نہیں دیکھ سکتے؟ چرواہے نے پوچھا کہ ان کا محل کہاں ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ ان کا کوئی محل نہیں ہے، وہ سامنے کھجور کے پتوں کا چھپر ہے، اس کے اندر وہ تشریف فرما ہیں، جاؤ، اور جا کر ان سے مل لو۔ اس چرواہے نے کہا کہ میں جا کر بادشاہ سے مل لوں؟ میں تو ایک غلام آدمی ہوں، سیاہ فام ہوں، میری رنگت کالی ہے، بکریاں چراتا ہوں، میں کسی بادشاہ سے کیسے مل سکتا ہوں؟ صحابہ کرام نے جواب دیا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو کسی سے ملنے میں کوئی عار نہیں ہے چاہے وہ کیسا بھی آدمی ہو۔

حضور ﷺ سے مکالمہ

چنانچہ وہ چرواہا حیرت کے عالم میں نبی کریم ﷺ کے خیمے میں پہنچ گیا، اور اندر جا کر سرکارِ دو عالم ﷺ جلوہ جہاں آرا کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔ اس چرواہے نے حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھا کہ آپ کیوں آئے ہیں؟ آپ کی دعوت کیا ہے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے توحید کا پیغام لے کر آیا ہوں کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس لئے صرف اللہ کی عبادت کی جائے، یہی میری بنیادی دعوت ہے۔ اس چرواہے نے کہا کہ اگر میں اس دعوت کو قبول کرلوں اور اللہ کے سوا ہر معبود کا انکار کردوں تو میرا انجام کیا ہوگا؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے۔ اور یہ موجودہ زندگی تو عارضی ہے، ناپائیدار ہے، ہر ایک کو اس دنیا سے جانا ہے، اور مرنے کے بعد جو زندگی ملے گی وہ دائمی اور ابدی ہوگی، اور اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اس ابدی زندگی میں اللہ تعالیٰ تمہیں بہت اعلیٰ مقام عطا فرمائیں گے۔

اور اسود مسلمان ہو گیا

پھر چرواہے نے سوال کیا کہ اچھا اگر میں مسلمان ہو گیا تو یہ مسلمان مجھے کیا سمجھیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ تمہیں اپنا بھائی سمجھیں گے، اور تمہیں اپنے سینے سے لگائیں گے۔ اس چرواہے نے حیرت سے پوچھا کہ مجھے سینے سے لگائیں گے؟ جبکہ میں سیاہ فام آدمی ہوں، اور میرے سینے سے بدبو اُٹھ رہی ہے، اس حالت میں کوئی مالدار آدمی مجھے سینے سے لگانے کے لئے تیار نہیں ہے، آپ فرمارہے ہیں کہ یہ مسلمان مجھے گلے لگائیں گے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اگر تم اللہ کی وحدانیت پر ایمان لے آتے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری بدبو کو خوشبو میں تبدیل کر دیں گے، اور تمہارے چہرے کی سیاہی کو تابناکی میں تبدیل کر دیں گے۔ اس اللہ کے بندے کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے پورا کلمہ پڑھا: "أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" اور ایمان لے آیا۔

پہلے بکریاں مالکوں تک پہنچاؤ

ایمان لانے کے بعد حضورِ اقدس ﷺ سے عرض کیا کہ میں ایمان لے آیا ہوں اور اب آپ کے ہاتھ میں ہوں، جو آپ حکم دیں گے اس کو بجالاؤں گا۔ لہٰذا اب آپ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ پہلا کام یہ کرو کہ یہ بکریاں جو تم لے کر آئے ہو، یہ تمہارے پاس ان کے مالکوں کی امانت ہیں، تم اس معاہدے کے تحت یہ بکریاں لائے ہو کہ تم ان کو چَراؤ گے، اور چَرانے کے بعد ان کو واپس کرو گے۔ لہٰذا پہلا کام یہ کرو کہ ان بکریوں کو واپس لے جاؤ، اور خیبر کے اندر لے جا کر ان کے مالکوں تک پہنچا آؤ۔

سخت حالات میں امانت کی پاسداری

ذرا اندازہ لگائیے کہ حالتِ جنگ ہے، اور دشمن کے قلعے کا محاصرہ کیا ہوا ہے، اور جنگ کی حالت میں نہ صرف یہ کہ دشمن کی جان لینا جائز ہو جاتا ہے، بلکہ جنگ کی حالت میں اس کے مال پر بھی قبضہ کر لینا جائز ہو جاتا ہے، ساری دنیا کا یہی قانون ہے۔ اور اس وقت مسلمانوں کے پاس کھانے کی کمی تھی، اور کھانے کی کمی کا یہ عالم تھا کہ اس غزوہ خیبر کے موقع پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مجبور ہو کر گدھے ذبح کر کے ان کا گوشت پکا کر کھانے کی کوشش کی، بعد میں حضورِ اقدس ﷺ نے منع فرمایا کہ گدھے کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے، چنانچہ گدھے کے گوشت کی پکی ہوئی دیگیں اُلٹی گئیں۔ اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کس حالت میں تعالیٰ تھے، لیکن چونکہ وہ چرواہا ایک معاہدے کے تحت وہ بکریاں لے کر آیا تھا، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ پہلے وہ بکریاں واپس کرو۔ اس کے بعد میرے پاس آنا۔

تلوار کے سائے میں عبادت

چنانچہ وہ چرواہا قلعے کے اندر گیا، اور قلعے کے اندر بکریاں چھوڑیں، اور پھر حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ اب کیا کروں؟ اب صورتِ حال یہ تھی کہ نہ تو اس وقت کسی نماز کا وقت تھا کہ آپ اس کو نماز کا حکم دیتے، نہ رمضان کا مہینہ تھا کہ آپ اس کو روزے کا حکم دیتے۔ اور نہ وہ اتنا مالدار تھا کہ اس کو زکوٰۃ کا حکم دیتے، نہ حج کا موسم تھا کہ اس سے حج کرایا جاتا۔ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت تو ایک عبادت ہو رہی ہے، جو تلواروں کے سائے میں انجام دی جا رہی ہے، وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ لہٰذا تم اس جہاد میں شامل ہو جاؤ۔ اس چرواہے نے کہا کہ اگر میں اس جہاد میں شامل ہو گیا تو اس میں امکان یہ بھی ہے کہ میں مر جاؤں۔ اگر میں مر گیا تو میرا کیا ہوگا؟ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم شہید ہو گئے تو اللہ تعالیٰ تمہارے چہرے کی سیاہی کو سفیدی میں تبدیل فرما دیں گے، اور تمہارے بدن کی بدبو کو خوشبو سے تبدیل کر دیں گے۔ چنانچہ وہ اللہ کا بندہ جہاد میں شامل ہو گیا، اور مسلمانوں کی طرف سے لڑا، اور شہید ہو گیا۔

جنت الفردوس میں پہنچ گیا

جب غزوۂ خیبر ختم ہوا تو رسول کریم ﷺ میدانِ جنگ کا جائزہ لینے کے لئے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ایک جگہ دیکھا کہ صحابہ کرام کا ہجوم ہے۔ آپ قریب پہنچے اور پوچھا: کیا بات ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ جو لوگ اس جہاد میں شہید ہوئے ہیں، اس میں ہمیں ایک لاش نظر آرہی ہے جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی، اس آدمی سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں، اس لئے سب آپس میں رائے زنی کر رہے ہیں کہ یہ کون آدمی ہے؟ اور کس طرح شہید ہوا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے دکھاؤ۔ آپ نے دیکھا تو یہ وہی اسود چرواہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ تم اس کو نہیں پہچانتے، لیکن میں اس کو پہچانتا ہوں۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی زندگی میں اللہ کے واسطے ایک سجدہ بھی نہیں کیا، اور جس نے اپنی زندگی میں اللہ کے واسطے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا، لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سیدھا جنت الفردوس میں پہنچا دیا ہے، اور میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے جسم کی سیاہی کو سفیدی میں تبدیل فرما دیا ہے، اور اس کے جسم کی بدبو کو مشک وعنبر سے زیادہ

حسین خوشبو سے تبدیل کر دیا ہے۔[1]

امانت کی اہمیت کا اندازہ لگائیں

اب دیکھئے کہ نبی کریم ﷺ نے عین حالتِ جنگ میں جہاں میدانِ کارزار کھلا ہوا ہے، جہاں لوگ ایک دوسرے کے خلاف جانیں لینے کے لئے تیار ہیں، وہاں پر بھی نبی کریم ﷺ نے اس بات کو گوارا نہیں فرمایا کہ یہ چرواہا امانت میں خیانت کرے، اور مسلمان ان بکریوں پر قبضہ کرلیں۔ بلکہ ان بکریوں کو واپس فرمایا۔ یہ ہے امانت کی اہمیت اور اس کی پاسداری۔ جس کو نبی کریم ﷺ نے اپنے مبارک عمل سے ثابت کیا، لہٰذا امانت میں خیانت کرنا یہ مؤمن کا کام نہیں۔ اسی لئے حدیث شریف میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جب وہ کسی شخص میں پائی جائیں تو وہ پکا منافق ہے، ایک یہ کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب وعدہ کرے تو اس وعدے کی خلاف ورزی کرے، اور جب اس کے پاس کوئی چیز امانت رکھوائی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔ یہ تین اوصاف جس انسان میں پائے جائیں گے تو وہ مؤمن نہیں کہلائے گا، بلکہ منافق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو امانت کا پاس کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور خیانت سے ہر مسلمان کو بچائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) البدایہ والنہایۃ (۶۰۹/۴۔۶۱۱)

امانت کا وسیع مفہوم ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ
﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ ۝ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُونَ ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کا بیان کافی عرصہ سے چل رہا ہے، ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مؤمنین کی ان صفات کو بیان فرمایا ہے، جن پر ان کی صلاح و فلاح کا دارومدار ہے، ان صفات میں سے اکثر کا بیان پہلے ہو چکا ہے، گذشتہ جمعہ کو "امانت" کا بیان شروع کیا تھا کہ مسلمان وہ ہے جو امانت کا پاس کرتا ہے۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ امانت میں خیانت کرنا کتنا بڑا جرم اور کتنا بڑا گناہ ہے۔ اور بہت سی امانتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں اکثر و بیشتر ہم لوگوں کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ بھی امانت ہے، اور ہم لوگ اس میں خیانت کرنا شروع کر دیتے ہیں، اور دل میں کسی جرم اور گناہ کا شعور بھی نہیں ہوتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس گناہ سے توبہ اور استغفار کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/ ۲۲۹ تا ۲۴۹)

(۱) المؤمنون: ۱ - ۸، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے۔ جو اپنی نمازوں میں دل سے جھکنے والے ہیں، اور جو لغو چیزوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اور جو زکوۃ پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابل ملامت نہیں ہیں، ہاں جو اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیں تو ایسے لوگ حد سے گذرے ہوئے ہیں، اور وہ جو اپنے امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں"

ہمارے ذہنوں میں امانت کا مفہوم

چنانچہ عام طور سے لوگ امانت کا جو مطلب سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ کسی شخص نے اپنے کچھ پیسے یا اپنی کوئی چیز ہمارے پاس لا کر رکھوادی، اور ہم نے اس کو حفاظت سے رکھ دیا، اور اس چیز کو خود استعمال نہیں کیا، اور کوئی گڑبڑ نہیں کی، خیانت نہیں کی۔ بس امانت کا یہی مفہوم سمجھتے ہیں۔ بیشک امانت کا ایک پہلو یہ بھی ہے، لیکن قرآن وحدیث میں جہاں امانت کا لفظ آیا ہے اس کے معنی اور اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اور بہت کشادہ ہے، بہت ساری چیزیں اس کے اندر آجاتی ہیں۔

یہ زندگی اور جسم امانت ہیں

سب سے پہلی چیز جو امانت کے اندر داخل ہے، وہ ہماری ''زندگی'' ہے، یہ ہماری زندگی جو ہمارے پاس ہے۔ اسی طرح ہمارا پورا جسم سر سے لے کر پاؤں تک یہ امانت ہے، ہم اس جسم کے مالک نہیں، اللہ جل شانہ نے یہ جسم جو ہمیں عطا فرمایا ہے، اور یہ اعضاء جو ہمیں عطا فرمائے ہیں، یہ آنکھیں جس سے ہم دیکھتے ہیں، یہ کان جس سے ہم سنتے ہیں، یہ ناک جس سے ہم سونگھتے ہیں، یہ منہ جس سے ہم کھاتے ہیں، یہ زبان جس سے ہم بولتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں۔ بتاؤ! کیا تم یہ اعضاء کہیں بازار سے خرید کر لائے تھے؟ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی معاوضے کے اور بغیر کسی محنت اور مشقت کے پیدا ہونے کے وقت سے ہمیں دے دیئے ہیں، اور ہمیں یہ فرمادیا کہ ان اعضاء سے اور ان قوتوں سے لطف اُٹھاؤ۔ ان اعضاء کو استعمال کرنے کی تمہیں کھلی اجازت ہے۔ البتہ ان اعضاء کو ہماری معصیت اور گناہ میں مت استعمال کرنا۔

خودکشی کیوں حرام ہے

چونکہ یہ زندگی یہ جسم اور یہ اعضاء امانت ہیں، اسی وجہ سے انسان کے لئے خودکشی کرنا حرام ہے، اور اپنے آپ کو قتل کردینا حرام ہے، کیوں حرام ہے؟ اس لئے کہ یہ جان اور یہ جسم ہماری اپنی ملکیت ہوتا تو ہم جو چاہتے کرتے، چاہے اس کو تباہ کرتے یا برباد کرتے یا آگ میں جلادیتے۔ لیکن چونکہ یہ جان اور یہ جسم اللہ کی امانت ہے، اس لئے یہ امانت اللہ کے سپرد کرنی ہے، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے پاس بلائیں گے، اس وقت ہم جائیں گے، پہلے سے خودکشی کرکے اپنی جان کو ختم کرنا امانت میں خیانت ہے۔

اجازت کے باوجود قتل کی اجازت نہیں

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے سے یہ کہہ دے کہ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم مجھے قتل کر دو، یا میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ میرا ہاتھ کاٹ لو، میرا پاؤں کاٹ لو۔ کوئی شخص چاہے کتنی ہی اجازت دیدے، اور اسٹامپ پیپر پر لکھ دے کہ میں اس سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔ لیکن دوسرے شخص کے لئے اس کی اس پیش کش کو قبول کرنا جائز نہیں، بلکہ حرام ہے، البتہ اگر کوئی شخص دوسرے سے کہے یہ میرے پیسے ہیں تم لے لو اور تم ان پیسوں کو جو چاہو کرو، تو دوسرے شخص کو یہ حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ پیسے لے لے اور جو چاہے کرے۔ لیکن جان لینے اور اعضاء کاٹنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ جسم اور جان ہمارے پاس اللہ تبارک وتعالیٰ کی امانت ہیں۔ اور جب امانت ہیں تو اس کو اس کام میں استعمال کرنا ہے جس کی مالک اجازت دے، اور اس کام سے ان کو بچانا ہے جس سے مالک ناراض ہو، اور جو مالک کو ناپسند ہو۔

اوقات امانت ہیں

اسی طرح زندگی کے یہ لمحات جو گزر رہے ہیں، اس کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ ان لمحات کو ایسے کام میں صرف کرنا ہے جو دنیا کے لحاظ سے یا آخرت کے لحاظ سے فائدہ مند ہو، اور جو کام اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہو، اگر ان لمحات کو اس کے خلاف کاموں میں خرچ کریں گے تو یہ امانت میں خیانت ہو جائے گی۔

قرآن کریم میں امانت

یہی وہ امانت ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ احزاب کے آخری رکوع میں فرمایا ہے:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾(۱)

اس امانت کو ہم نے آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا کہ یہ امانت تم اُٹھالو تو ان سب نے اس امانت کے اُٹھانے سے انکار کیا کہ نہیں یہ ہمارے بس کا کام نہیں ہے، اور اس امانت کے اُٹھانے سے ڈرے۔ وہ امانت کیا تھی؟ وہ امانت یہ تھی کہ ان سے کہا گیا کہ ہم تمہیں عقل دیں گے، اور سمجھ دیں گے، تمہیں زندگی دیں گے، اور یہ عقل، یہ سمجھ اور یہ زندگی تمہارے پاس ہماری امانت ہوگی،

---

(۱) الاحزاب: ۷۲

اور ہم تمہیں بتا دیں گے کہ فلاں کام میں اس زندگی کو خرچ کرنا ہے، اور فلاں کام میں نہیں کرنا، اگر تم اس زندگی کو ہمارے احکام کے مطابق استعمال کرو گے تو تمہارے لئے جنت ہوگی، اور اگر ہمارے احکام کے خلاف استعمال کرو گے تو تمہارے لئے جہنم ہوگی، اور دائمی عذاب ہوگا۔

آسمان، زمین اور پہاڑ ڈر گئے

جب اس امانت کی پیش کش آسمانوں پہ کی گئی کہ تم یہ امانت اُٹھالو تو آسمانوں نے کہا کہ ہم موجودہ حالت میں بہتر ہیں۔ اگر یہ امانت ہم نے لے لی تو پتہ نہیں کہ اس کو سنبھال سکیں گے یا نہیں۔ اور اگر نہ سنبھال سکے تو آپ کے فرمان کے مطابق دائمی جہنم کے مستحق ہوں گے، اور ہمیشہ کے لئے ایک عذاب کھڑا ہو جائے گا، اس لئے یہ بہتر ہے کہ نہ ہمیں جنت ملے، اور نہ جہنم ملے، اس وقت عافیت سے تو ہیں۔ چنانچہ آسمانوں نے انکار کر دیا۔

پھر اس امانت کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر پیش کیا کہ تو بہت بڑا اور ٹھوس کرہ ہے، تیرے اندر پہاڑ ہیں، سمندر ہیں، درخت، جمادات، نباتات تیرے اندر ہیں، تم یہ امانت لے لو، تو زمین نے کہا کہ میں اس کے اُٹھانے کے قابل نہیں ہوں، اگر یہ امانت میں نے اُٹھالی تو خدا جانے میرا کیا حشر بنے گا، لہٰذا اس نے بھی انکار کر دیا۔

اس کے بعد پہاڑوں پر اللہ تعالیٰ نے اس امانت کو پیش کیا کہ تم سخت جان ہو، اور لوگ سخت جان ہونے میں پہاڑوں سے تشبیہ دیتے ہیں، تم یہ امانت اُٹھالو۔ انہوں نے بھی انکار کر دیا کہ ہم یہ امانت نہیں لیتے، موجودہ حالت ہماری بہتر ہے، اور اگر اس آزمائش میں پڑ گئے تو پتہ نہیں کامیاب ہوں گے، یا ناکام ہوں گے، اور اگر ناکام ہوئے تو ہمارے اُوپر مصیبت آجائے گی۔

انسان نے امانت قبول کر لی

اس کے بعد ہم نے امانت انسان پر پیش کی کہ تم یہ امانت اُٹھالو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالمِ ازل میں انسانوں کی تخلیق سے ہزارہا سال پہلے ان تمام روحوں سے جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھیں، ان سب روحوں کو جمع فرمایا، اور ہر روح ایک چھوٹی سی چیونٹی کی شکل میں سامنے آئی، اور اس وقت ان کے سامنے یہ امانت پیش کی کہ آسمان، زمین اور پہاڑ تو سب اس امانت کے اُٹھانے سے انکار کر گئے، تم یہ امانت لیتے ہو؟ اس انسان نے کہا کہ ہاں میں لیتا ہوں، جب انسان نے قبول کر لیا تو یہ امانت اس کے پاس آ گئی۔

لہٰذا یہ زندگی امانت ہے، یہ جسم امانت ہے، یہ اعضا امانت ہیں، اور عمر کا ایک ایک لمحہ امانت

ہے۔اب جو اس امانت کا پاس کرے وہ انسان دنیا اور آخرت دونوں جگہ فلاح یافتہ ہے۔یہی وہ امانت ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾(۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو کہ تم نے اللہ تعالیٰ سے امانت لی تھی، اور اللہ کے رسول نے تمہیں اس امانت کے بارے میں بتا دیا تھا، اس امانت کے خلاف خیانت نہ کرو، اور جو امانتیں تمہارے پاس موجود ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک استعمال کرو۔امانت کا سب سے پہلا مفہوم یہ ہے۔

ملازمت کے فرائض امانت ہیں

امانت کا دوسرا مفہوم اس کے علاوہ ہے جس کو عام طور پر لوگ امانت نہیں سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ فرض کرو کہ ایک شخص نے کہیں ملازمت اختیار کی ہے، اس ملازمت میں جو فرائض اس کے سپرد کیے گئے ہیں وہ امانت ہیں، ان فرائض کو وہ ٹھیک ٹھیک بجالائے۔اور جن اوقات میں اس کو ڈیوٹی دینے کا پابند کیا گیا ہے، ان اوقات کا ایک ایک لمحہ امانت ہے۔لہٰذا جو فرائض اس کے سپرد کیے گئے ہیں، اگر وہ ان فرائض کو ٹھیک ٹھیک انجام نہیں دیتا، بلکہ کام چوری کرتا ہے تو ایسا شخص اپنے فرائض میں کوتاہی کر رہا ہے، اور امانت میں خیانت کر رہا ہے۔

وہ تنخواہ حرام ہوگئی

مثلاً ایک شخص سرکاری دفتر میں ملازم ہے، اور اس کو اس کام پر لگایا گیا ہے کہ جب فلاں کام کے لئے لوگ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کا کام کر دینا۔یہ کام اس کے ذمہ ایک فریضہ ہے جس کی وہ تنخواہ لے رہا ہے۔اب کوئی شخص اس کے پاس اس کام کے لئے آتا ہے، وہ اس کو ٹلا دیتا ہے، اس کو چکر کھلا رہا ہے، تاکہ یہ تنگ آکر مجھے کچھ رشوت دیدے۔آج کے سرکاری دفتر اس بلا سے بھرے پڑے ہیں، آج سرکاری ملازم جس عہدے پر بھی ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو شخص میرے پاس آرہا ہے اس کی کھال اُتارنا اور اس کا خون نچوڑنا میرے لئے حلال ہے۔یہ امانت میں خیانت ہے، اور وہ اس کام کی جو تنخواہ لے رہا ہے، وہ تنخواہ بھی حرام ہوگئی۔اگر وہ اپنے فرائض ٹھیک ٹھیک انجام دیتا، اور پھر تنخواہ لیتا تو وہ تنخواہ اس کے لئے حلال ہوتی، اور برکت کا سبب ہوتی۔لہٰذا اس کام کرنے پر جو رشوت لے رہا

(۱) الانفال: ۲۷

تھا وہ تو حرام ہی تھی، لیکن اس نے حلال تنخواہ کو بھی حرام کر دیا، اس لئے کہ اس نے اپنے فریضے کو صحیح طور پر انجام نہیں دیا۔

ملازمت کے اوقات امانت ہیں

اسی طرح ملازمت کے لئے یہ طے کیا تھا کہ میں آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دوں گا، اب اگر اس آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میں سے کچھ چوری کر گیا، اور کچھ وقت اپنے ذاتی کام میں استعمال کر لیا تو جتنا وقت اس نے اپنے ذاتی کام میں استعمال کیا، اس وقت میں اس نے امانت میں خیانت کی، کیونکہ یہ آٹھ گھنٹے اس کے پاس امانت تھے، اس کے لئے جائز نہیں تھا کہ اس میں اپنا کوئی ذاتی کام کرے، یہ اوقات بک چکے، اب اگر اس وقت میں دوستوں سے باتیں شروع کر دیں یہ امانت میں خیانت ہے۔ اور جتنی دیر یہ خیانت کی اتنی دیر کی تنخواہ اس کے لئے حلال نہیں۔

پسینہ نکلا یا نہیں؟

میں کہا کرتا ہوں کہ آج کل جب لوگ کہیں ملازمت کرتے ہیں یا مزدوری کرتے ہیں تو یہ حدیث بہت یاد رہتی ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو، مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ بھی تو دیکھو کہ پسینہ نکلا بھی یا نہیں؟ ہمیں پسینہ نکلنے کی تو کوئی فکر نہیں ہے کہ جس کام میں میرا پسینہ نکلنا چاہئے تھا وہ نکلا یا نہیں؟ اور واقعۃً ہم اُجرت کے حقدار بنے یا نہیں؟ اس کو تو کوئی نہیں دیکھتا، بس یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ مزدوری ادا کرو۔ بہر حال! یہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی، اور یہ اوقات کا چرانا یہ سب امانت میں خیانت ہے، اور اس کے عوض جو پیسے مل رہے ہیں وہ حرام ہیں، وہ انسان اپنے پیٹ میں آگ کے انگارے کھا رہا ہے۔

خانقاہ تھانہ بھون کا اصول

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ کی خانقاہ میں اور مدرسہ میں یہ طریقہ تھا کہ استادوں کے لئے گھنٹے مقرر تھے کہ فلاں وقت میں وہ استاد آئے گا، اور فلاں کتاب پڑھائے گا، اور مدرسہ کی طرف سے کوئی قانون اور ضابطہ مقرر نہیں تھا، مگر ہر شخص کا مزاج بنا دیا گیا تھا۔ اس لئے جب کوئی استاد تاخیر سے آتا تو وہ رجسٹر پر نوٹ لکھ دیتا کہ آج میں اتنی تاخیر سے آیا، اور اگر مدرسہ کے اوقات کے درمیان کوئی دوست یا کوئی عزیز رشتہ دار ملاقات کے لئے آ گیا، اور اس کے ساتھ بات چیت میں مشغول ہو گئے تو اس وقت گھڑی دیکھ کر استاد وقت نوٹ کر لیتا کہ یہ دوست اس

وقت آیا، اور اس وقت واپس گیا، اور آدھا گھنٹہ دوست کے ساتھ بات چیت میں صرف ہوگیا، اور جب تنخواہ وصول کرنے کا وقت آتا تو وہ پورے مہینے کا گوشوارا پیش کرتا اور ایک درخواست پیش کرتا کہ ہم سے اس ماہ میں یہ کوتاہی ہوئی ہے، اور ہم نے اتنا وقت اپنی ذاتی مصروفیات میں خرچ کر دیا تھا، لہٰذا اتنے وقت کی تنخواہ ہماری کاٹ لی جائے۔ اس طرح ہر استاد مہینے کے ختم پر درخواست دے کر اپنی تنخواہ کٹواتا تھا۔

تنخواہ کاٹنے کی درخواست

الحمد للہ، ہم نے دارالعلوم میں بھی یہ طریقہ رکھا ہوا ہے، اور صدر سے لے کر چپڑاسی تک ہر ایک کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جاتا ہے کہ جتنا وقت ذاتی مصروفیات میں استعمال ہوا ہے، اس کی تنخواہ کٹوادیتے ہیں۔ آج کے دور میں تنخواہ بڑھانے کی مثالیں تو بہت ملیں گی، لیکن کوئی درخواست آپ نے ایسی نہیں دیکھی ہوگی جس میں اس نے یہ درخواست دی ہو کہ میں نے ملازمت کے اوقات کے دوران اتنی دیر اپنا ذاتی کام کرلیا تھا، لہٰذا میری اتنی تنخواہ کاٹ لو، کیونکہ وہ حرام ہے، وہ میرے لئے حلال نہیں۔ آج اس کا کسی کو خیال نہیں۔

اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دو

اس کی وجہ یہ ہے کہ آج یہ نعرہ تو لگایا جاتا ہے کہ ہمارا حق ہمیں پورا ملنا چاہئے، لیکن ہم اپنا فریضہ پورا ادا کریں، اور ہمارے ذمہ جو واجبات ہیں ان کو ادا کریں، اس کی کسی کو فکر نہیں۔ قرآن و حدیث یہ کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے فرائض بجالانے کی فکر کرے۔ جب ہر انسان اپنے فرائض صحیح طور پر بجالائے گا تو دوسروں کے حقوق خود بخود ادا ہوجائیں گے۔ بہرحال، اوقات میں چوری کرنا امانت میں خیانت ہے، اور اس کے نتیجے میں اچھی خاصی حلال ملازمت کی آمدنی کو حرام بنالیتے ہیں۔ اگر یہی سرکاری ملازم صبح کو صحیح وقت پر آئے، اور شام کو صحیح وقت پر جائے، اور اپنے فرائض کو صحیح طور پر بجالائے، اور دل میں یہ نیت کرے کہ یا اللہ! میں آپ کی مخلوق کی خدمت کے لئے یہاں بیٹھا ہوں، چونکہ اپنا پیٹ اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے تنخواہ ضروری ہے اس وجہ سے تنخواہ لیتا ہوں، لیکن میری نیت یہ ہے کہ میں مخلوق کی خدمت کروں، تو اس صورت میں یہ پورے آٹھ گھنٹے اس کے لئے عبادت اور اجر وثواب کا باعث بن جائیں گے، اور تنخواہ بھی حلال ہوگی۔ لیکن اگر اوقات کی چوری کرلی، یا اپنے فرائض پورے طور پر انجام نہیں دیئے تو اس نے حلال آمدنی کو حرام بنالیا، اس تنخواہ کو آگ کے انگارے بنالیے۔

حلال اور حرام میں فرق

آج ان پیسوں میں فرق نظر نہیں آرہا ہے، بلکہ حلال اور حرام دونوں دیکھنے میں یکساں نظر آرہے ہیں، لیکن جب یہ ہماری ظاہری آنکھیں بند ہوں گی، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اس وقت پتہ چلے گا کہ یہ حرام آمدنی جو لے کر آیا تھا وہ آگ کے انگارے تھے، جو وہ اپنے پیٹ میں بھر رہا تھا، قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا﴾(۱)

یعنی جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں۔ آج ہماری پوری قوم عذاب میں مبتلا ہے، کسی کو سکون نہیں ہے، کسی کو چین نہیں ہے، کسی کو آرام نہیں ہے، کسی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، ہر ایک انسان بھاگ دوڑ میں مبتلا ہے، یہ سب اس لئے ہے کہ امانت میں خیانت کرنا اس قوم کی گھٹی میں پڑ گئی ہے، اور جس قوم کو حلال اور حرام کی پرواہ باقی نہ رہی ہو، وہ فلاح کہاں سے پائے گی۔ قرآن کریم کا فرمان یہ ہے کہ فلاح ان لوگوں کو ملے گی جو امانتوں کا اور عہد کا پاس کرنے والے ہیں۔

عاریت کی چیز امانت ہے

امانت کی ایک اہم قسم یہ ہے کہ کسی دوسرے کی کوئی چیز آپ کے پاس عاریتاً آگئی ہے، ''عاریت'' کا مطلب یہ ہے کہ جیسے کسی سے کوئی چیز استعمال کے لئے لے لینا، مثلاً کوئی کتاب دوسرے سے پڑھنے کے لئے لے لی، یا دوسرے کا قلم لے لیا، یا گاڑی لے لی، یہ چیزیں امانت ہیں، لہٰذا پہلی بات تو اس میں یہ ہے کہ جب ضرورت پوری ہو جائے اس کے بعد جلد از جلد اس چیز کو اس کے مالک تک پہنچانا ضروری ہے۔ آج لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے، چنانچہ ایک چیز وقتی ضرورت کے ساتھ آپ نے دوسرے سے لے لی تھی، اب ضرورت ختم ہوگئی، لیکن وہ چیز آپ کے پاس پڑی ہوئی ہے، واپس پہنچانے کی فکر نہیں ہے۔ اور اصل مالک بعض اوقات مانگتے ہوئے شرماتے ہیں کہ اگر میں نے مانگا تو اس کو برا لگے گا۔ لیکن اس کو ضرورت ہے اور اس کے دل پر ایک تشویش ہے کہ میری یہ چیز فلاں کے پاس ہے، اور آپ نے بے پرواہی میں وہ چیز ڈال رکھی ہے، تو جتنی دیر وہ چیز اس کے مالک کی خوشدلی کے بغیر آپ کے پاس رہے گی، اتنی دیر آپ امانت میں خیانت کے مرتکب ہوں گے۔

---

(۱) النساء: ۱۰

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور امانت کی فکر

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہٗ، جب آخری عمر میں بہت زیادہ بیمار ہوگئے تھے، اور صاحبِ فراش ہوگئے تھے، اور دل کی تکلیف تھی، چارپائی سے اُٹھ کر چلنا مشکل ہوتا تھا، اس لئے اپنی چارپائی پر ہی سارا کام انجام دیتے تھے، کھانا بھی چارپائی پر کھاتے تھے، اور جب کھانے سے فارغ ہوتے تو ہمیں حکم دیتے کہ یہ برتن فوراً باورچی خانے میں پہنچادو۔ بعض اوقات ہم کسی کام میں مشغول ہوتے اور برتن پہنچانے میں کچھ تاخیر ہوجاتی تو ناراض ہوجاتے۔ اسی طرح کوئی دوسری چیز دوسرے کمرے سے اس کمرے میں آجاتی تو ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً واپسی کا حکم دیتے کہ اس کو اپنی جگہ رکھ دو۔ ایک دن میں نے پوچھ لیا کہ حضرت! یہ سب آخر گھر ہی کی چیزیں ہیں، اگر ان چیزوں کو اپنی جگہ رکھنے میں تھوڑی تاخیر ہوجائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ اور آپ تاخیر کی وجہ سے اتنے پریشان کیوں ہوجاتے ہیں؟

اس وقت جو جواب دیا اس سے اندازہ ہوا کہ یہ اللہ والے کتنی دور کی بات سوچتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ اصل بات یہ ہے کہ میں نے اپنے وصیت نامے میں یہ لکھ دیا ہے کہ جتنی اشیاء اس کمرے میں ہیں، وہ صرف میری ملکیت ہیں، اور باقی گھر کی ساری اشیاء میں اپنی اہلیہ کی ملکیت کرچکا ہوں، وہ میری ملکیت میں نہیں ہیں، اب اگر کوئی چیز باہر سے یہاں آجاتی ہے تو وہ ان کی ملکیت ہے، اور میرے پاس امانت ہے، اور امانت کا حکم یہ ہے کہ اسے اس کے اصل مالک تک جلد از جلد پہنچاؤ۔

موت کا دھیان ہر وقت

دوسری بات یہ ہے کہ اگر میرا اس حالت میں انتقال ہوجائے، اور وہ چیز میرے کمرے میں پڑی رہ جائے، اور جبکہ وصیت نامے میں میں نے یہ لکھ دیا ہے کہ جو چیزیں میرے کمرے میں ہیں، وہ سب میری ملکیت ہیں، تو اس وصیت کے اعتبار سے جو چیزیں میری ملکیت نہیں وہ میری ملکیت شمار ہوجائیں گی، اور اندیشہ ہے اس کے نتیجے میں حقدار کا حق فوت ہوجائے گا، اس وجہ سے میں یہ چاہتا ہوں کہ جو چیز باہر سے آئے وہ جلد از جلد اپنی جگہ پر پہنچ جائے۔ اب آپ امانت کی اہمیت کا اندازہ لگائیں۔ یہ سب شریعت کے احکام ہیں، جن کا شریعت نے حکم دیا ہے لیکن ہم لوگ دن رات ان احکام سے لاپرواہی میں مبتلا ہیں۔ دوسروں کی چیز ہمارے پاس پڑی ہوئی ہے، ہمیں اس کو واپس کرنے کی کوئی فکر نہیں۔ کسی بیچارے نے آپ کے پاس اپنے برتنوں میں کھانا بھیج دیا تھا، اب آپ کھانا کھا کر ختم کرچکے، لیکن برتن پڑے ہوئے ہیں، ان کو بھجوانے کا کوئی اہتمام نہیں، حالانکہ وہ برتن آپ کے پاس

امانت ہیں، اگر اس دوران وہ برتن آپ کے پاس ٹوٹ جائے تو اس کا وبال آپ کے ذمے ہوگا، چونکہ آپ نے بروقت واپس کرنے کا اہتمام نہیں کیا۔

دوسرے کی چیز کا استعمال

ایک بات یہ ہے کہ اگر دوسرے کی چیز ہمارے استعمال میں ہے تو اس چیز کو مالک کی مرضی کے خلاف استعمال کرنا بھی امانت میں خیانت ہے، مالک نے جس کام کے لئے دی، اس کام میں استعمال کرنا تو جائز ہے، کیونکہ اس کی مرضی اس میں شامل ہے، لیکن اس کی مرضی کے خلاف چوری چھپے استعمال کیا جائے گا تو یہ امانت میں خیانت ہوگی، اور بڑا گناہ ہے، مثلاً کسی نے آپ کو کسی خاص مقصد کے استعمال کے لئے گاڑی دے دی تو اب خاص مقصد میں استعمال کرنا تو جائز ہے، لیکن اس خاص مقصد کے علاوہ دوسرے کسی کام استعمال کر لی تو ناجائز، حرام اور امانت میں خیانت ہے۔

دفتری اشیاء کا استعمال

جو لوگ دفتر میں ملازم ہوتے ہیں، ان کو دفتر کی طرف سے بہت سی چیزیں استعمال کرنے کے لئے ملتی ہیں۔ اب دفتر کے قواعد اور ضوابط کے تحت تو ان اشیاء کو استعمال کرنا جائز ہے، اور اگر ان قواعد اور ضوابط کے خلاف استعمال کیا جائے تو یہ حرام ہے، اور امانت میں خیانت ہے۔ مثلاً دفتر کی طرف سے آپ کو پین ملا ہے، پیڈ ملا ہے، لفافے ملے ہیں، یا دفتر میں آپ کے فون لگا ہوا ہے، یا دفتر کی طرف سے آپ کو گاڑی ملی ہوئی ہے، یا موٹر سائیکل ملی ہوئی ہے۔ اور اب ان چیزوں کے استعمال کے بارے میں دفتر کے کچھ قواعد ہیں کہ ان قوعد کے تحت ان اشیاء کو استعمال کیا جائے، تو اب قواعد کے دائرے میں ان اشیاء کو استعمال کرنا جائز ہے، ان قواعد سے الگ ہٹ کر آپ نے ان اشیاء کو اپنے کسی ذاتی کام میں استعمال کر لیا تو خیانت ہے، اور اس کے نتیجے میں خیانت کا عظیم گناہ انسان کے ذمے لازم آجاتا ہے۔ کہاں تک شمار کیا جائے، ورنہ زندگی کے ہر شعبے میں کہیں نہ کہیں ہمارے پاس امانت موجود ہے۔

دواؤں کا غلط استعمال

ایک صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے علاج کرانا بہت آسان کر دیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیسے آسان کر دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے پڑوس میں ایک صاحب ہیں، وہ ہم پر بڑے مہربان ہیں، ان کو اپنے دفتر سے علاج کی سہولت ملی ہوئی ہے، وہ جو دوا

خریدتے ہیں، اس کا بل دفتر میں جمع کرادیتے ہیں، دفتر والے وہ رقم ان کو ادا کردیتے ہیں۔ انہوں نے ہم سے کہہ دیا ہے کہ تمہیں جب بھی کوئی دوائی خریدنی ہو، تم خرید کر بل مجھے دے دیا کرو، میں دفتر سے اس کی رقم وصول کر کے تمہیں دے دیا کروں گا، اس طرح تمہیں یہ دوائیاں مفت مل جایا کریں گی۔

اب دیکھئے کہ ان صاحب کو دفتر والوں نے یہ سہولت دے رکھی تھی کہ ان کے گھر کا کوئی آدمی بیمار ہو جائے، اور اس کے علاج پر جو خرچہ آئے تو اس کا بل جمع کرادیں تو ان کو دفتر سے پیسے مل جائیں گے۔ لیکن انہوں نے یہ سخاوت شروع کردی کہ اپنے پڑوسیوں کو اور اپنے دستوں کو اس میں شامل کرلیا۔ اب جھوٹ اس کے اندر موجود ہے، دغابازی اس کے اندر موجود ہے، اور امانت میں خیانت اس میں موجود ہے، اس لئے کہ جو رقم تمہیں مل رہی ہے وہ امانت ہے، جہاں استعمال کرنے کی اجازت ہے بس وہیں پر استعمال کرنا آپ کے لئے حلال ہے، اس کے علاوہ حرام ہے۔ وہ صاحب یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نیکی کر رہے ہیں دوسروں کے ساتھ، لیکن حقیقت میں وہ بہت بڑا گناہ ہے، جس کے نتیجے میں آخرت میں گردن پکڑی جائے گی۔

حرام آمدنی کا ذریعہ

یہ تو صرف سخاوت کی حد تک بات تھی، جبکہ بہت سے لوگوں نے اس کو آمدنی کا ذریعہ بنا رکھا ہے، مثلاً دوسرے سے کہہ دیا کہ تم دوا خرید کر بل ہمیں دے دو، جو پیسے ملیں گے، اس میں سے آدھے تمہارے، آدھے ہمارے۔ آج امانت کا لحاظ نہ رکھنے کے نتیجے میں معاشرہ تباہ ہو چکا ہے، اور یہ جو دن رات مصیبتیں، پریشانیاں، بیماریاں اور دشمنوں کے حملے، بدامنیاں اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، یہ سب کیوں نہ ہو، جبکہ ہم نے اپنے آپ کو ان کاموں کے لئے منتخب کرلیا ہے جو کافروں کے تھے، ان کافروں نے کم از کم اپنی حد تک امانت اور دیانت کو اپنالیا ہے، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں عروج دے دیا۔ اور ہم نے قرآن کریم کی ہدایات کو ترک کردیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ہر جگہ پست اور ذلیل ہو رہے ہیں۔

باطل مٹنے کے لئے آیا ہے

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ ایک بڑی خوبصورت بات فرمایا کرتے تھے، جو ہر مسلمان کو یاد رکھنی چاہئے، فرمایا کرتے تھے کہ باطل میں اُبھرنے کی صلاحیت ہی نہیں، قرآن کریم تو یہ کہتا ہے:

﴿إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾(۱)

---

(۱) بنی اسرائیل: ۸۱

یعنی باطل تو دبنے کے لئے اور مٹنے کے لئے آیا ہے، اُبھرنے کے لئے نہیں آیا، لیکن اگر کسی باطل قوم کو تم دیکھو کہ وہ دنیا کے اندر اُبھر رہی ہے اور ترقی کر رہی ہے تو سمجھ لو کہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے، جس نے اس کو اُبھارا ہے۔ باطل میں اُبھرنے کا دم نہیں تھا۔

حق صفات نے اُبھار دیا ہے

لہٰذا یہ ہمارے دشمن جن کو ہم روزانہ برا بھلا کہتے ہیں، چاہے وہ امریکہ ہو، یا برطانیہ ہو، انہوں نے دنیا کے اندر جو مقام حاصل کیا ہے وہ باطل کی وجہ سے حاصل نہیں کیا، بلکہ کچھ حق کی صفات ان کے ساتھ لگ گئی ہیں، جو انہوں نے ہم سے لی ہیں، وہ یہ کہ انکے اندر آپس کے معاملوں میں امانت داری ہے، اور خیانت سے حتی الامکان اکثر و بیشتر لوگ پرہیز کرتے ہیں۔ وہاں بھی سب لوگ ایک جیسے نہیں ہیں، وہاں پر بھی بڑے بڑے دھوکہ باز پڑے ہوئے ہیں، لیکن عام طور پر آپس کے معاملات میں انہوں نے امانت اور دیانت کو اپنایا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر یہ قانون بنایا ہے کہ جو شخص صحیح راستہ اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں عروج دیں گے، آخرت میں اگرچہ ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا، لیکن دنیا میں ان کو ترقی دے دی جائے گی، اور مسلمانوں نے یہ چیزیں چھوڑ دیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ آج دنیا کے اندر ذلیل ہو رہے ہیں۔

مجلس کی باتیں امانت ہیں

ایک اور چیز ہے جس کی طرف نبی کریم ﷺ نے وضاحت کے ساتھ توجہ دلائی، چنانچہ آپ نے فرمایا:

((اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ))(۱)

یعنی انسانوں کی مجلسوں میں کہی گئی بات بھی ''امانت'' ہے، مثلاً دو چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے، ان میں سے کسی ایک نے کوئی بات کہی، تو آپ کے لئے جائز نہیں کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی بات کو کہیں اور جا کر نقل کر دیں، اس لئے کہ جو بات اس کے منہ سے نکل کر آپ کے کان میں پڑی ہے، وہ آپ کے پاس اس کی امانت ہے، لہٰذا اگر وہ بات کسی اور سے بیان کرنی ہے تو پہلے اس سے اجازت لو کہ میں تمہاری یہ بات فلاں سے نقل کرنا چاہتا ہوں، آپ کی اجازت ہے یا نہیں؟ اس کی اجازت کے بغیر اس بات کو کہیں اور جا کر بیان کرنا امانت میں خیانت ہے۔

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في نقل الحديث، رقم: ٤٢٢٦، مسند أحمد، رقم: ١٤١٦٦

راز کی بات امانت ہے

اسی طرح کسی نے آپ کو اپنے راز کی کوئی بات کہہ دی، اور ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ اس کو اپنی حد تک رکھنا، تو جب تک اس کی مرضی نہ ہو، اس بات کو کہیں اور جا کر نقل کرنا یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق امانت میں خیانت ہے۔ آج ہم لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر دوسرے کے راز کی کوئی بات معلوم ہوگئی تو اب اس کو ساری دنیا میں گاتے پھر رہے ہیں، یہ سب امانت میں خیانت کے اندر داخل ہے۔

اعضاء امانت ہیں

اگر ذرا گہری نظر سے دیکھو تو انسان کا اپنا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، یہ جسم سر سے لے کر پاؤں تک ہماری ملکیت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے استعمال کے لئے ہمیں دیا ہوا ہے، یہ ہمارے ہاتھ، یہ ہمارے پاؤں، یہ ہماری آنکھیں، یہ ہمارے کان، کیا ہم ان کو کہیں بازار سے خرید کر لائے تھے؟ یا خود ہم نے بنائے تھے؟ بلکہ یہ سب اللہ جل جلالہ کی عطا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں مفت دیئے ہیں۔ یہ آنکھیں بھی امانت ہیں، ہمارے کان بھی امانت ہیں، ہمارے ہاتھ بھی امانت، ہمارے پاؤں بھی امانت، لہٰذا جب امانت ہیں تو اگر ان کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف استعمال کیا جائے گا وہ امانت میں خیانت ہوگی۔

آنکھ کی خیانت

مثلاً اگر آنکھ سے ان چیزوں کو دیکھا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہیں، اور نامحرم پر لذت لینے کے لئے نگاہ ڈالی جا رہی ہے، ایسی فلمیں دیکھی جا رہی ہیں جن کا دیکھنا حرام ہے، تو یہ آنکھ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت میں استعمال ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو یہ آنکھ تمہیں اس لئے دی تھی کہ تم اس سے نفع اُٹھاؤ، دنیا کے حسین مناظر اس کے ذریعے دیکھو، اس کے ذریعے اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہو، اس کے ذریعے اپنے والدین کو دیکھ کر خوش ہو، اس کے ذریعے اپنے بھائی، بہن اور دوست احباب کو دیکھ کر خوش ہو، اور اس کے ذریعے دنیا کے کام چلاؤ۔ لیکن تم نے اس آنکھ کو فساد میں استعمال کر لیا، گناہ اور معصیت میں استعمال کر لیا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی امانت میں خیانت ہوئی۔

کان اور ہاتھ کی خیانت

یہ کان تمہیں اس لئے دیئے گئے تھے کہ اس کے ذریعے ضرورت کی باتیں سنو، اچھی باتیں بھی سنو، اور تفریح کی باتیں بھی سنو، لیکن معصیت کی باتیں سننے سے تمہیں روکا گیا تھا۔ لیکن تم نے اس کان کو معصیت کی باتیں سننے میں استعمال کیا، یہ اللہ تعالیٰ کی امانت میں خیانت ہوئی۔

یہ ہاتھ اللہ تعالیٰ نے اس لئے دیئے تھے تاکہ تم اس کے ذریعے جائز مقاصد حاصل کرسکو، کماؤ، محنت کرو، جدوجہد کرو۔ لیکن تم نے یہ ہاتھ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے سامنے پھیلا دیئے، جہاں پھیلانا تمہارے لئے جائز نہیں تھا، یہ ہاتھ کا غلط استعمال ہے، جو امانت میں خیانت ہے۔ یا ان ہاتھوں سے ایسی چیز پکڑ لی جس کا پکڑنا تمہارے لئے جائز نہیں تھا، یہ امانت میں خیانت ہے۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے

ہر انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دہ ہے، لوگ کیا کر رہے ہیں، ان کو دیکھ کر میں بھی ان جیسا بن جاؤں، اس کا کوئی جواز نہیں۔ اگر ہر انسان کے دل میں ضمیر کی شمع روشن ہو جائے، تقوے کی شمع روشن ہو جائے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے۔ اگر ایک آدمی کے دل میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا ہے، اور دوسرے سے تیسرا چراغ جلتا ہے، اور اس طرح ماحول میں اُجالا ہو جاتا ہے، لہٰذا ہر انسان اپنی جگہ پر امانت کا پاس کرنے کی فکر کرے، یہ نہ سوچے کہ ساری دنیا ایک طرف جارہی ہے، میں اکیلا کیا کروں گا۔ بات یہ ہے کہ دنیا میں جب بھی کوئی کام ہوا ہے وہ اکیلے ہی انسان سے ہوا ہے۔ پیغمبر جب دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو وہ تنہا ہوتے ہیں، کوئی ان کے ساتھ نہیں ہوتا، لیکن جب کام شروع کر دیتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مدد ہوتی ہے۔

میں تو تنہا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور امانتوں کا پاس رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

عہد اور وعدہ کی اہمیت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں، ان کی تشریح کا سلسلہ کافی عرصہ سے چل رہا ہے، اور ہم اس آیتِ کریمہ تک پہنچے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فلاح پانے والے مؤمنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ﴾

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی امانتوں کا لحاظ کرتے ہیں، اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔ امانتوں کی رعایتوں سے متعلق میں نے گزشتہ دو جمعوں میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس کی مختلف صورتیں بیان کی تھیں کہ امانت میں کیا کیا چیزیں داخل ہوتی ہیں، اور امانت میں خیانت کرنا، اور امانت کا پاس نہ رکھنے کی کیا کیا صورتیں ہمارے معاشرے میں رائج ہو چکی ہیں، اور ان سب سے بچنے کی ضرورت ہے۔

قرآن وحدیث میں عہد

دوسری چیز جو اس آیتِ کریمہ میں بیان کی گئی ہے، وہ ''عہد کا لحاظ'' رکھنا، یعنی مؤمن کا کام یہ

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۲۵۳ تا ۲۶۷)، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) المؤمنون: ۱ تا ۸

ہے کہ وہ جو عہد کرلیتا ہے یا جو وعدہ کرلیتا ہے وہ اس کا پورا پاس کرتا ہے، پورا لحاظ کرتا ہے، اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ''وعدہ'' اور ''عہد'' کی پاسداری کا حکم دیا ہے، ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾(۱)

یعنی جو عہد کرو اس کو پورا کرو، کیونکہ اس عہد کے بارے میں تم سے آخرت میں سوال ہوگا۔ کہ تم نے فلاں وعدہ کیا تھا، اس کو پورا کیا یا نہیں کیا؟ فلاں عہد کیا تھا، پورا کیا یا نہیں کیا؟ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾(۲)

اے ایمان والو! تم آپس میں کسی کے ساتھ عہد و پیمان باندھ لو تو اس کو پورا کرو۔

بہرحال! قرآن کریم میں جگہ جگہ اس کی تاکید آئی ہے، اور یہ بھی مسلمان کے مسلمان ہونے کی علامت قرار دی گئی کہ مسلمان کبھی عہد شکنی نہیں کرتا، جو وعدہ کرتا ہے اس کو پورا کرتا ہے۔ اور وعدہ کو پورا نہ کرنا یہ منافق کی علامت قرار دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

((ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))(۳)

''منافق کی تین علامتیں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدے کی خلاف ورزی کرے، اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت کرے''

وعدہ کرنے سے پہلے سوچ لو

اس سے معلوم ہوا کہ ان تینوں میں سے کوئی کام بھی مؤمن کا کام نہیں، مسلمان کا کام نہیں کہ وہ جھوٹ بولے، یا وعدہ خلافی کرے، یا امانت میں خیانت کرے۔ آدمی وعدہ کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچ لے کہ میں اس وعدے کو پورا کرسکوں گا یا نہیں، وعدہ کرنے میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن جب سوچ سمجھ کر مشورہ کرکے تمام نتائج کو سامنے رکھنے کے بعد جب ایک وعدہ کرلیا تو اب

(۱) بنی اسرائیل: ٣٤ (۲) المائدۃ: ١

(۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب علامة المنافق، رقم: ٣٣، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان خصال المنافق، رقم: ٨٨، سنن الترمذی، کتاب الایمان عن رسول الله، باب ما جاء فی علامة المنافق، رقم: ٢٥٥٦

مسلمان کا کام یہ ہے کہ اس وعدے پر قائم رہے۔ صرف ایک صورت ہے جو شریعت نے جائز قرار دی ہے، وہ یہ ہے کہ کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن کوئی حقیقی عذر پیش آ گیا، اور عذر کی حالت اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ فرمائی ہے، اس صورت میں دوسرے آدمی کو بتا دے کہ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا، لیکن مجھے کچھ عذر پیش آ گیا ہے، جس کی وجہ سے میں یہ وعدہ پورا کرنے سے قاصر ہوں۔

عذر کی صورت میں اطلاع دے

مثلاً فرض کریں کہ آپ نے کسی سے وعدہ کرلیا کہ میں کل تمہارے گھر آؤں گا، اور ارادہ بھی تھا کہ کل اس کے گھر جائیں گے، لیکن بعد میں تم بیمار ہو گئے، یا گھر میں کوئی اور بیمار ہو گیا، اور اس کی دیکھ بھال کے لئے اس کے پاس رہنا ضروری ہے، اور جانا ممکن نہیں ہے، تو یہ ایک عذر ہے اور عذر کی صورت میں اگر کوئی شخص وعدہ پورا نہ کرے تو شریعت میں اس کی گنجائش ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما دیتے ہیں۔ البتہ اس صورت میں حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ سامنے والے کو ایسے وقت میں بتا دیا جائے کہ وہ کسی اُلجھن اور پریشانی میں مبتلا نہ ہو۔ بہر حال، وعدہ پورا کرنا ایمان کی علامت ہے، اور وعدے کی خلاف ورزی کو حضورِ اقدس ﷺ نے نفاق کی علامت قرار دیا ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کے سامنے ایک صحابی کسی بچے کو اپنے پاس بلانا چاہتے تھے، اور وہ بچہ ان کے پاس نہیں آ رہا تھا، اور آنے سے انکار کر رہا تھا۔ ان صحابی نے اس بچے کو ترغیب دینے کے لئے یہ کہہ دیا کہ آؤ بیٹا! ہمارے پاس آ جاؤ، ہم تمہیں ایک چیز دیں گے۔ جب حضورِ اقدس ﷺ نے ان کے یہ الفاظ سنے کہ "ہم تمہیں ایک چیز دیں گے" تو آپ نے ان صحابی سے پوچھا کہ یہ بتاؤ تمہارا واقعی اس بچے کو چیز دینے کا ارادہ تھا یا ویسے ہی بہلانے کے لئے آپ نے اس سے یہ کہہ دیا تھا؟ ان صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس ایک کھجور تھی، اور میرا ارادہ تھا کہ جب وہ آئے گا تو اس کو کھجور دے دوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر واقعی تمہارا کھجور دینے کا ارادہ تھا، تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر تمہارا دل میں اس کو کچھ دینے کا ارادہ نہیں تھا، بلکہ محض اس کو اپنے پاس بلانے کے لئے اس کو یہ کہہ دیا کہ ہم تمہیں ایک چیز دیں گے تو یہ تمہاری طرف سے وعدہ خلافی ہوگی۔ (۱)

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في التشديد في الكذب، رقم: ٤٣٣٩، مسند أحمد، رقم: ١٥١٤٧

بچے سے وعدہ کر کے پورا کریں

اور بچے کے ساتھ وعدہ خلافی کرنے میں دوہرا نقصان ہے، ایک نقصان تو وعدہ خلافی کے گناہ کا ہے، اور دوسرا نقصان یہ ہے کہ پہلے دن سے ہی بچے کے ذہن میں آپ یہ بات ڈال رہے ہیں کہ وعدہ کر کے مکر جانا کوئی خرابی کی بات نہیں۔ بچہ کا ذہن ایسا صاف ہوتا ہے جیسے سادہ پتھر، اس پر جو چیز نقش کردی جائے تو ہمیشہ کے لئے وہ چیز نقش ہو جاتی ہے۔ گویا کہ پہلے دن سے آپ نے وعدہ خلافی کا بیج بچے کے ذہن میں بو دیا۔ اب اگر وہ بچہ آئندہ کبھی بھی وعدہ خلافی کرے گا تو اس وعدہ خلافیوں کے گناہ میں آپ بھی حصہ دار ہوں گے، اس لئے کہ آپ نے اپنے طرزِ عمل سے اس کو وعدہ خلاف بنایا، اس لئے بچے کے ساتھ خاص طور پر اس بات کا اہتمام کرنا چاہئے کہ یا تو بچہ سے وعدہ کرو نہیں، اگر وعدہ کرو تو اس کو پورا کرو، تا کہ بچے کو یہ احساس ہو کہ جب کوئی وعدہ کیا جاتا ہے تو اس کو پورا کیا جاتا ہے۔

بچے کے اخلاق بگاڑنے میں آپ مجرم ہیں

ہمارے معاشرے میں اس معاملے کے اندر غفلت اور بے احتیاطی بہت عام ہے، کہ بچے کو تعلیم دلانے کے لئے اچھے سے اچھے اسکول میں داخل کر دیا، لیکن گھر کا ماحول ایسا بنایا ہوا ہے جس سے اس بچے کا مزاج و مذاق اس کے اخلاق و کردار خراب ہو رہے ہیں۔ مثلاً آپ گھر سے باہر کہیں جا رہے ہیں، اور بچہ ضد کر رہا ہے کہ میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ اب آپ نے اس بچے سے جان چھڑانے کی خاطر کوئی وعدہ کر لیا کہ میں تمہارے لئے ایک چیز لے کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ چلے گئے۔ آپ نے اس بچے کو بہلا تو دیا، لیکن جو وعدہ آپ نے اس بچے کے کیا تھا، وہ پورا نہیں کیا تو ایک طرف تو آپ وعدہ خلافی کے مجرم بنے، دوسرے یہ کہ اس بچے کی تربیت خراب کرنے کے مجرم بنے، اس بچے کا ذہن پہلے دن سے آپ نے خراب کر دیا۔ لہٰذا بچے کے ساتھ معاملات کرنے میں بہت احتیاط کرنی چاہئے۔

بچوں کے ذریعے جھوٹ بلوانا

ہمارے معاشرے میں یہ بات بھی بکثرت عام ہے کہ ایک شخص آپ کے گھر پر آپ سے ملنے کے لئے آیا، یا کسی کا فون آیا، اور بچے نے آکر آپ کو اطلاع دی کہ فلاں صاحب آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں، یا فلاں صاحب آپ سے فون پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ اب آپ کا ان صاحب سے بات کرنے کو اور ملنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے، اس لئے آپ نے بچے سے کہہ دیا کہ جاؤ ان سے کہہ دو کہ

ابو گھر پر نہیں ہیں۔ اب بچہ تو یہ دیکھ رہا ہے کہ ابا جان گھر پر موجود ہیں، لیکن میرے ابا گھر پر موجود ہونے کے باوجود مجھ سے کہلوا رہے ہیں کہ جا کر جھوٹ بول دو کہ گھر پر موجود نہیں ہیں، تو آج جب آپ اس سے جھوٹ بلوائیں گے تو کل جب وہ جھوٹ بولے گا تو کس منہ سے آپ اس کو جھوٹ بولنے سے روکیں گے۔ اس لئے کہ آپ نے تو خود اس کو جھوٹ بولنے کا عادی بنا دیا، اپنے ذرا سے مفاد کی خاطر جھوٹ کی سنگینی اس بچے کے دماغ سے مٹا دی تو اب اگر وہ بچہ جھوٹ بولے گا، اور اس بچے کو جھوٹ کی عادت پڑ جائے گی تو اس گناہ میں آپ بھی برابر کے شریک ہوں گے، اور آپ نے اس بچے کی زندگی تباہ کر دی۔ اس لئے کہ جو آدمی جھوٹ بولنے کا عادی ہوتا ہے تو دنیا میں کہیں بھی اس پر اعتماد نہیں کیا جاتا، اس پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ اس لئے بچوں کے ساتھ معاملات کرنے میں خاص طور پر بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بچوں کو سچائی سکھائی جائے، ان کو امانت داری سکھائی جائے، ان کو وعدے کی پابندی سکھائی جائے۔

حضور ﷺ کا تین دن انتظار کرنا

روایات میں ایک واقعہ آتا ہے، جو نبوت کے عطا ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کا کسی شخص کے ساتھ معاملہ ہوا، اور آپس میں یہ طے ہوا کہ فلاں جگہ پر کل کو آپس میں ملاقات کریں گے۔ دن، جگہ اور وقت سب طے ہو گیا۔ جب وقتِ مقررہ آیا تو رسول کریم ﷺ اس جگہ پر پہنچ گئے۔ اب آپ وہاں جا کر کھڑے ہو گئے، مگر وہ شخص جس سے وعدہ کیا ہوا تھا، وہ اس جگہ نہیں آیا، انتظار کرتے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے، مگر وہ شخص نہیں آیا۔ رسول کریم ﷺ وہاں کھڑے رہے۔ روایات میں آتا ہے کہ تین دن تک متواتر حضورِ اقدس ﷺ نے اس شخص کا انتظار کیا۔ صرف ضرورت کے لئے گھر جاتے، پھر واپس اس جگہ آ جاتے۔ تین دن بعد جب وہ صاحب آئے تو آپ نے صرف اتنا کہا کہ تم نے وعدے پر نہ آ کر مجھے تکلیف پہنچائی —— تو صرف وعدے کو پورا کرنے کے لئے کہ کہیں اس وعدے کی خلاف ورزی نہ ہو جائے، تین دن تک متواتر آپ نے وہاں انتظار فرمایا۔(۱)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ابوجہل سے وعدہ

حضورِ اقدس ﷺ نے ایسے ایسے وعدوں کو نبھایا کہ آج اس کی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، اور حضور ﷺ کے راز دار ہیں۔ جب یہ اور ان کے والد یمان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، تو مسلمان ہونے کے بعد حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں مدینہ طیبہ

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في العدة، رقم: ٤٣٤٤

آرہے تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات ابوجہل اور اس کے لشکر سے ہوگئی۔ اس وقت ابوجہل اپنے لشکر کے ساتھ حضورِ اقدس ﷺ سے لڑنے کے لئے جارہا تھا۔ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ملاقات ابوجہل سے ہوئی تو اس نے پکڑ لیا، اور پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں مدینہ طیبہ جارہے ہیں۔ ابوجہل نے کہا کہ پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، اس لئے کہ تم مدینہ جاکر ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لوگے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد تو صرف حضور ﷺ سے ملاقات اور زیارت ہے۔ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ ابوجہل نے کہا کہ اچھا ہم سے وعدہ کرو کہ وہاں جاکر صرف ملاقات کروگے، لیکن جنگ میں حصہ نہیں لوگے۔ انہوں نے وعدہ کرلیا۔ چنانچہ ابوجہل نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ جب حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں پہنچے، اس وقت حضورِ اقدس ﷺ اپنے صحابہ کرام کے ساتھ غزوۂ بدر کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہوچکے تھے، اور راستے میں ملاقات ہوگئی۔

حق اور باطل کا پہلا معرکہ ''غزوۂ بدر''

اب اندازہ لگایئے کہ اسلام کا پہلا حق و باطل کا معرکہ (غزوۂ بدر) ہورہا ہے۔ اور یہ وہ معرکہ ہے جس کو قرآن کریم نے ''یوم الفرقان'' فرمایا، یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کردینے والا معرکہ، وہ معرکہ ہورہا ہے جس میں جو شخص شامل ہوگیا، وہ ''بدری'' کہلایا، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ''بدری'' صحابہ کا بہت اُونچا مقام ہے۔ اور ''اسمائے بدریین'' بطور وظیفے کے پڑھے جاتے ہیں۔ انکے نام پڑھنے سے اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں۔ وہ ''بدریین'' جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے یہ پیشین گوئی فرمادی کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اہلِ بدر کی، جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا، بخشش فرمادی، ایسا معرکہ ہونے والا ہے۔

گردن پر تلوار رکھ کر لیا جانے والا وعدہ

بہر حال! جب حضورِ اقدس ﷺ سے ملاقات ہوئی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سارا قصہ سنادیا کہ اس طرح راستے میں ہمیں ابوجہل نے پکڑ لیا تھا۔ اور ہم نے وعدہ کرکے بمشکل جان چھڑائی کہ ہم لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے، اور پھر درخواست کی کہ یا رسول اللہ! یہ بدر کا معرکہ ہونے والا ہے، آپ اس میں تشریف لے جارہے ہیں۔ ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہم بھی اس میں شریک ہوجائیں، اور جہاں تک اس وعدے کا تعلق ہے، وہ تو انہوں نے ہماری گردن پر تلوار رکھ کر ہم سے وعدہ لیا تھا کہ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، اور اگر ہم وعدہ نہ کرتے تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لئے ہم نے وعدہ

کرلیا، لیکن آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم اس جنگ میں حصہ لے لیں، اور فضیلت اور سعادت ہمیں حاصل ہو جائے۔

تم وعدہ کر کے زبان دے کر آئے ہو

لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم وعدہ کر کے آئے ہو، اور زبان دے کر آئے ہو، اور اسی شرط پر تمہیں رہا کیا گیا ہے کہ تم وہاں جا کر محمد ﷺ کی زیارت کرو گے، لیکن ان کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لو گے، اس لئے میں تم کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ وہ مواقع ہیں جہاں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے وعدے کا کتنا پاس کرتا ہے۔ اگر ہم جیسا آدمی ہوتا تو ہزار تاویلیں کر لیتا، مثلاً یہ تاویل کر لیتا کہ ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، وہ سچے دل سے تو نہیں کیا تھا، وہ تو ہم سے زبردستی لیا گیا تھا۔ اور خدا جانے کیا کیا تاویلیں ہمارے ذہنوں میں آجاتیں۔ یا یہ تاویل کر لیتا کہ یہ حالتِ عذر ہے، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا ہے اور کفر کا مقابلہ کرنا ہے۔ جبکہ وہاں ایک ایک آدمی کی بڑی قیمت ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے لشکر میں صرف ۳۱۳ نہتے افراد ہیں۔ جن کے پاس صرف ۷۰ اُونٹ، ۲ گھوڑے اور ۸ تلواریں ہیں۔ باقی افراد میں سے کسی نے لاٹھی اُٹھالی ہے، کسی نے ڈنڈے، اور کسی نے پتھر اُٹھا لیے ہیں، یہ لشکر ایک ہزار مسلح سورماؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے جا رہا ہے، اس لئے ایک ایک آدمی کی جان قیمتی ہے۔ لیکن محمد ﷺ نے فرمایا کہ جو بات کہہ دی گئی ہے، اور جو وعدہ کرلیا گیا ہے، اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ (۱)

جہاد کا مقصد حق کی سربلندی

یہ جہاد کوئی ملک حاصل کرنے کے لئے نہیں ہو رہا ہے، کوئی اقتدار حاصل کرنے کے لئے نہیں ہو رہا ہے، بلکہ یہ جہاد حق کی سربلندی کے لئے ہو رہا ہے۔ اور حق کو پامال کر کے جہاد کیا جائے، گناہ کا ارتکاب کر کے اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کیا جائے، یہ نہیں ہوسکتا۔ آج ہم لوگوں کی یہ ساری کوششیں بیکار جا رہی ہیں، اور ساری کوششیں بے اثر ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کر کے اسلام کی تبلیغ کریں، گناہ کر کے اسلام کو نافذ کریں، ہمارے دل و دماغ پر ہر وقت ہزاروں تاویلیں مسلط رہتی ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت کا یہ تقاضہ ہے، چلو، شریعت کے اس حکم کو نظر انداز کردو، اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت اس کام کے کرنے میں ہے۔ چلو، یہ کام کرلو۔

(۱) الإصابة (۱/۳۱٦)

یہ ہے وعدہ کا ایفاء

لیکن وہاں تو ایک ہی مقصود تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا۔ نہ مال مقصود ہے، نہ فتح مقصود ہے، نہ بہادر کہلانا مقصود ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں، اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں ہے کہ جو وعدہ کرلیا جائے، اس کو نبھاؤ۔ چنانچہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہما دونوں کو غزوۂ بدر جیسی فضیلت سے محروم رکھا گیا، اس لئے کہ یہ دونوں جنگ میں شرکت نہ کرنے پر زبان دے کر آئے تھے۔ یہ ہے وعدہ کا ایفاء۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ایفائے عہد

اگر آج اسکی مثال تلاش کریں تو اس دنیا میں ایسی مثالیں کہاں ملیں گی؟ ہاں! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں ایسی مثالیں مل جائیں گی۔ انہوں نے یہ مثالیں قائم کیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرام میں سے ہیں جن کے بارے میں لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا غلط قسم کے پروپیگنڈے کیے ہیں، اللہ تعالیٰ بچائے۔ آمین۔ لوگ ان کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ ان کا ایک قصہ سن لیجئے۔

فتح حاصل کرنے کے لئے جنگی تدبیر

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ شام میں تھے اس لئے روم کی حکومت سے ان کی ہر وقت جنگ رہتی تھی، ان کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے تھے، اور روم اس وقت کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی اور بڑی عظیم الشان عالمی طاقت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کرلیا، اور ایک تاریخ متعین کرلی کہ اس تاریخ تک ہم ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے۔ ابھی جنگ بندی کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی کہ اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ جنگ بندی کی مدت تو درست ہے لیکن اس مدت کے اندر میں اپنی فوجیں رومیوں کی سرحد پر لے جا کر ڈال دوں، تاکہ جس وقت جنگ بندی کی مدت ختم ہو اس وقت میں فوراً حملہ کردوں، اس لئے کہ دشمن کے ذہن میں تو یہ ہوگا کہ جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگی، پھر کہیں جا کر لشکر روانہ ہوگا، اور یہاں آنے میں وقت لگے گا، اس لئے معاہدے کی مدت ختم ہوتے ہی فوراً مسلمانوں کا لشکر حملہ آور نہیں ہوگا، اس لئے وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اگر میں اپنا لشکر سرحد پر ڈال دوں گا، اور مدت ختم ہوتے ہی فوراً حملہ کردوں گا تو جلدی فتح حاصل ہو جائے گی۔

یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندران کے علاقے میں ڈال دیا، اور حملے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدے کی آخری تاریخ کا سورج غروب ہوا، فوراً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو پیش قدمی کا حکم دے دیا، چنانچہ جب لشکر نے پیش قدمی کی تو یہ چال بڑی کامیاب ثابت ہوئی، اس لئے کہ وہ لوگ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر شہر کے شہر، بستیاں کی بستیاں فتح کرتا ہوا چلا جارہا تھا۔ اب فتح کے نشے کے اندر پورا لشکر آگے بڑھتا جارہا تھا کہ اچانک دیکھا کہ پیچھے سے ایک گھوڑ اسوار دوڑتا چلا آرہا ہے، اس کو دیکھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے انتظار میں رک گئے کہ شاید یہ امیر المؤمنین کا کوئی نیا پیغام لے کر آیا ہو، جب وہ گھوڑ اسوار قریب آیا تو اس نے آوازیں دینا شروع کر دیں:

”اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، قِفُوْا عِبَادَ اللّٰهِ قِفُوْا عِبَادَ اللّٰهِ“

اللہ کے بندو، ٹھہر جاؤ، اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ۔ جب وہ اور قریب آیا تو حضرت معاویہ نے دیکھا کہ وہ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا:

”وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ، وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ“

مؤمن کا شیوہ وفاداری ہے، غداری نہیں، عہد شکنی نہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے۔ میں نے تو اس وقت حملہ کیا ہے جب جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی۔ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگرچہ جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی، لیکن آپ نے اپنی فوجیں جنگ بندی کے دوران ہی سرحد پر ڈال دیں۔ اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر بھی داخل کر دیا تھا۔ اور یہ جنگ بندی کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی، اور میں نے اپنے کانوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

((مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَحِلَّنَّهُ وَلَا يَشُدَّنَّهُ اِلٰى اَنْ يَّمْضِيَ اَجَلٌ لَهُ اَوْ يَنْبِذَ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ))(۱)

یعنی جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو، تو اس وقت تک عہد نہ کھولے، اور نہ باندھے، یہاں تک کہ اس کی مدت نہ گزر جائے۔ یا ان کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان کر دے کہ ہم نے وہ عہد

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب السیر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی الغدر، رقم: ۱۵۰۶، سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، رقم: ۲۵۷۸، مسند احمد، مسند الشامیین، رقم: ۱٦٤٠

ختم کر دیا۔ لہٰذا مدت گزرنے سے پہلے یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کیے بغیر ان کے علاقے کے پاس لے جا کر فوجوں کو ڈال دینا حضورِ اقدس ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق آپ کے لئے جائز نہیں تھا۔

سارا مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا

اب آپ اندازہ لگائیے کہ ایک فاتح لشکر ہے، جو دشمن کا علاقہ فتح کرتا ہوا جا رہا ہے، اور بہت بڑا علاقہ فتح کر چکا ہے، اور فتح کے نشے میں چُور ہے۔ لیکن جب حضورِ اقدس ﷺ کا یہ ارشاد کان میں پڑا کہ اپنے عہد کی پابندی مسلمان کے ذمے لازم ہے، اسی وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ جتنا علاقہ فتح کیا ہے، وہ سب واپس کر دو، چنانچہ پورا علاقہ واپس کر دیا، اور اپنی سرحد میں دوبارہ واپس آگئے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی کہ اس نے صرف عہد شکنی کی بنا پر اپنا مفتوحہ علاقہ اس طرح واپس کر دیا ہو۔ لیکن یہاں پر چونکہ کوئی زمین کا حصہ حاصل کرنا پیشِ نظر نہیں تھا، کوئی اقتدار اور سلطنت مقصود نہیں تھی، بلکہ مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا، اس لئے جب اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم ہو گیا کہ وعدہ کی خلاف ورزی درست نہیں ہے، اور چونکہ یہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا تھوڑا سا شائبہ پیدا ہو رہا تھا، اس لئے واپس لوٹ گئے۔ یہ ہے وعدہ، کہ جب زبان سے بات نکل گئی، تو اب اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور معاہدہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت وہاں پر جو عیسائی اور یہودی تھے، ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے، تمہاری جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کے معاوضے میں تم ہمیں جزیہ ادا کرو گے۔ ''جزیہ'' ایک ٹیکس ہوتا ہے، جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب معاہدہ ہو گیا تو وہ لوگ ہر سال جزیہ ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کا دوسرے دشمنوں کے ساتھ معرکہ پیش آگیا، جس کے نتیجے میں وہ فوج جو بیت المقدس میں متعین تھی ان کی ضرورت پیش آئی۔ کسی نے یہ مشورہ دیا کہ اگر فوج کی کمی ہے تو بیت المقدس میں فوجیں بہت زیادہ ہیں، اس لئے وہاں سے ان کو محاذ پر بھیج دیا جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ مشورہ اور تجویز تو بہت اچھی ہے، اور فوجیں وہاں سے اُٹھا کر محاذ پر بھیج دو، لیکن اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کرو۔ وہ یہ کہ بیت المقدس کے جتنے عیسائی اور یہودی ہیں، ان سب کو ایک جگہ جمع کرو، اور ان سے کہو کہ ہم نے آپ کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا، اور یہ معاہدہ کیا تھا کہ آپ کی جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کام کے لئے ہم نے وہاں فوج ڈالی ہوئی تھی، لیکن اب

ہمیں دوسری جگہ فوج کی ضرورت پیش آگئی ہے، اس لئے ہم آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے، لہٰذا اس سال آپ نے ہمیں جو جزیہ بطور ٹیکس کے ادا کیا ہے، وہ ہم آپ کو واپس کر رہے ہیں، اور اس کے بعد ہم اپنی فوجوں کو یہاں سے لے جائیں گے۔ اور اب آپ اپنی حفاظت کا انتظام خود کریں۔ یہ مثالیں ہیں، اور میں کسی تردید کے خوف کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی کہ کسی نے اپنے مخالف مذہب والوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کیا ہو۔

بہرحال! مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ عہد اور وعدے کی پابندی کرے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وعدے کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے، اور ہر طرح کی عہد شکنی اور خلاف ورزی سے محفوظ رکھے۔ اس کی مزید تفصیل اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی دی تو اگلے جمعہ کو عرض کروں گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

عہد اور وعدہ کا وسیع مفہوم ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گذشتہ جمعہ کو سورۃ المؤمنون کی اس آیت کا بیان کیا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے فلاح پانے والے مؤمنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہد کا پاس کرتے ہیں، اس کی رعایت رکھتے ہیں۔

قرآن کریم و حدیث شریف میں عہد اور وعدہ کی پابندی کی کتنی تاکید آئی ہے، اور رسول کریم ﷺ نے اپنی سیرت اور سنت میں اس کی کیسی عظیم مثالیں قائم فرمائی ہیں، اس کے بارے میں کچھ روایات اور واقعات گذشتہ جمعہ کو عرض کیے تھے۔ آج اس عہد کو پورا کرنے کے سلسلے میں ایک ایسی بات کی طرف توجہ دلانی ہے، جس کی طرف سے ہم لوگ بکثرت غفلت میں رہتے ہیں، یعنی بعض عہد ایسے ہیں جو ہم نے باندھے ہیں، لیکن دن رات اس کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ خیال بھی دل میں نہیں آتا کہ ہم عہد کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اور کوئی گناہ ہم سے سرزد ہو رہا ہے۔

ملکی قانون کی پابندی لازم ہے

اس کی مثال یہ ہے کہ جو کوئی شخص جس ملک کا باشندہ ہوتا ہے، اور اس کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ عملاً اس بات کا عہد کرتا ہے کہ میں اس ملک کے قانون کی پابندی کروں گا، اب اگر آپ کسی ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور درخواست دیتے ہوئے یہ کہہ دیں کہ میں آپ کے ملک کی

☆ اصلاحی خطبات (۱۵/۲۷۰ تا ۲۸۲)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی (۱) المؤمنون: ۱ تا ۸

شہریت تو چاہتا ہوں، لیکن آپ کے قانون پر عمل نہیں کروں گا، تو کیا دنیا کا کوئی ملک ایسا ہے جو آپ کو شہریت دینے پر تیار ہو جائے؟ لہٰذا جب کوئی انسان کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ یا تو زبان سے یا عملاً یہ معاہدہ کرتا ہے کہ میں اس ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا۔ جیسے ہم اس ملک کے اندر پیدا ہوئے ہیں، تو شہریت حاصل کرنے کے لئے ہمیں زبانی درخواست دینے کی ضرورت تو پیش نہیں آئی، لیکن عملاً یہ معاہدہ کرلیا کہ ہم اس ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، لہٰذا شہری ہونے کے ناطے ہم اس ملک کے قانون کی پابندی کرنے کا عہد کر چکے ہیں۔

خلافِ شریعت قانون کی مخالفت کریں

البتہ مسلمان کا جو عہد ہوتا ہے، چاہے وہ کسی شخص سے ہو، یا کسی ادارے سے ہو، یا حکومت سے ہو، وہ ایک بنیادی عہد کا پابند ہوتا ہے، یہ بنیادی عہد وہ ہے جو ایک مسلمان نے کلمہ شہادت "أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھتے ہوئے کیا، اس عہد کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود مانتا ہوں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا، اور جناب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا سچا رسول مانتا ہوں، لہٰذا آپ کے ہر حکم کی اطاعت کروں گا۔ یہ سب سے پہلا عہد ہے جو انسان نے مسلمان ہوتے ہی کرلیا ہے، یہ عہد تمام عہدوں پر بالا ہے، اس کے اوپر کوئی اور عہد نہیں ہوسکتا ہے، لہٰذا اگر اس کے بعد آپ کسی سے کوئی عہد کرتے ہیں مثلاً کسی حکومت سے یا کسی ادارے سے یا کسی شخص سے کوئی عہد کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تک آپ کا قانون مجھے اللہ کے کسی قانون کے خلاف کام کرنے پر مجبور نہ کرے اس وقت تک میں آپ کی اطاعت کروں گا۔ اگر کوئی قانون ایسا ہے جو مجھے اللہ کی نافرمانی پر مجبور کرتا ہے، تو اس قانون کی اطاعت واجب نہیں۔ بلکہ اس قانون کی مخالفت واجب ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قانون

اس کی مثال میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ملک میں رہتے تھے، اور نبی بننے سے پہلے ایک قبطی کو مُکا مار کر قتل کر دیا تھا، جس کا واقعہ مشہور ہے، اور قرآن کریم نے بھی اس واقعہ کو ذکر کیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قتل پر استغفار کیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے:

﴿لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ﴾(۱)

(۱) الشعراء: ۱۴

یعنی میرے اوپر ان کا ایک گناہ ہے اور میں نے ان کا ایک جرم کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو جرم اور گناہ قرار دیتے تھے اور اس پر استغفار فرمایا کرتے تھے، اگر چہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ قتل جان بوجھ کر نہیں کیا تھا، بلکہ ایک مظلوم کی مدد فرمائی تھی اور یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایک مُکّا مارنے سے وہ مر جائے گا، اس لئے یہ حقیقۃً گناہ نہیں تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصمت کے منافی بھی نہیں تھا، لیکن چونکہ صورت گناہ کی سی تھی، اس لئے آپ نے اسے گناہ سے تعبیر فرمایا، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قبطی جس کو موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا تھا وہ تو کافر تھا، اور کافر بھی حربی تھا، لہٰذا اگر اسے جان بوجھ کر بھی قتل کرتے تو اس حربی کافر کو قتل کرنے میں کیا گناہ ہوا؟ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ اس لئے گناہ ہوا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے شہر میں رہ رہے ہیں تو عملاً اس بات کا وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم آپ کے ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، اور ان کا قانون یہ تھا کہ کسی کو قتل کرنا جائز نہیں، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو قتل کیا، وہ اس قانون کی خلاف ورزی میں کیا، لہٰذا ہر حکومت کا ہر شہری، چاہے حکومت مسلمان ہو یا غیر مسلم حکومت ہو، عملاً اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس ملک کے قوانین کی پابندی کرے گا، جب تک وہ قانون کسی گناہ پر مجبور نہ کرے۔

ویزا لینا ایک معاہدہ ہے

لیکن جو قانون مجھے اللہ تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر مجبور نہیں کر رہا ہے، بلکہ کوئی ایسا حکم مجھ پر عائد کر رہا ہے جس سے کوئی معصیت اور کوئی گناہ لازم نہیں آتا تو اس قانون کی پابندی بحیثیت اس ملک کے شہری ہونے کے مجھ پر واجب ہے۔ اس میں مسلمان ملک ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ اگر آپ کسی غیر مسلم ملک کا ویزا لے کر وہاں جاتے ہیں تو ویزا لینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس ملک سے درخواست کی ہے کہ میں آپ کے ملک میں آنا چاہتا ہوں، اور آپ کے ملک کے قانون کی پابندی کروں گا جب تک وہ قانون مجھے کسی گناہ پر مجبور نہیں کرے گا۔ یہ ایک عہد ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس ملک میں انسان رہتا ہے، اس ملک کے قانون کی پابندی بھی اس پر اس کے عہد کی پابندی کی وجہ سے لازم ہوگی۔

اس وقت قانون توڑنے کا جواز تھا

آج ہمارے معاشرے میں یہ فضا عام ہوگئی ہے کہ قانون شکنی کو ہنر سمجھا جاتا ہے، قانون کو علانیہ توڑا جاتا ہے، اور اس کو بڑی ہوشیاری اور چالاکی سمجھا جاتا ہے، یہ ذہنیت درحقیقت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ جب ہم ہندوستان میں رہتے تھے، اور وہاں انگریز کی حکومت تھی، انگریز غاصب تھا، اس

نے ہندوستان پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا، اور مسلمانوں نے اس کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی، ۱۸۵۷ء کے موقع پر اور بعد میں بھی اس کے ساتھ لڑائی کا سلسلہ جاری رہا، اور انگریز کی حکومت کو مسلمانوں نے کبھی دل و جان سے تسلیم نہیں کیا، لہٰذا ہندوستان میں انگریز کی حکومت کے خلاف علماء کرام نے یہ فتویٰ بھی دیا کہ قانون توڑو، کیونکہ انگریز کی حکومت جائز حکومت نہیں ہے، اگرچہ بعض علماء اس فتویٰ کی مخالفت کرتے تھے، بہر حال، اس وقت قانون توڑنے کا ایک جواز تھا۔

اب قانون توڑنا جائز نہیں

لیکن انگریز کے چلے جانے کے بعد جب پاکستان بنا، تو یہ ایک معاہدے کے تحت وجود میں آیا، اس کا ایک دستور اور قانون ہے، اور پاکستان کے قانون پر بھی یہی حکم عائد ہوتا ہے کہ جب تک وہ قانون ہمیں کسی گناہ پر مجبور نہ کرے اس وقت تک اس کی پابندی واجب ہے، اس لئے کہ ہم نے عہد کیا ہے کہ ہم اس ملک کے شہری ہیں، اس لئے ہم اس کے قانون کی پابندی کریں گے۔

ٹریفک کے قانون کی پابندی

اب آپ ٹریفک کے قوانین لے لیجئے۔ قانوناً بعض مقامات پر گاڑی کھڑی کرنا جائز ہے، اور بعض مقامات پر ناجائز ہے۔ جہاں گاڑی کھڑی کرنا قانوناً منع ہے وہاں گاڑی کھڑی کرنے میں قانون کی بھی خلاف ورزی ہے، اور عہد کی بھی خلاف ورزی ہے، اس لئے کہ آپ نے یہ عہد کیا ہے کہ میں اس قانون کی پابندی کروں گا۔ بعض مقامات پر گاڑی کی رفتار متعین کردی جاتی ہے کہ اس رفتار پر گاڑی چلا سکتے ہیں، اس سے زیادہ رفتار پر گاڑی چلانے میں قانون کی خلاف ورزی تو ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عہد کی خلاف ورزی ہونے کی وجہ سے شرعاً بھی گناہ ہے۔ یا مثلاً سگنل بند تھا، مگر آپ سگنل توڑ کر نکل گئے۔ آپ اس کو بڑی دلاوری اور بہادری سمجھ رہے ہیں کہ ہم سگنل توڑ کر نکل گئے۔ لیکن یہ بھی درحقیقت گناہ ہے۔ گناہ اس لئے ہے کہ آپ ایسے قانون کی خلاف ورزی کررہے ہیں جو ہمیں کسی گناہ پر مجبور نہیں کررہا ہے، بلکہ فلاحِ عامہ سے متعلق ایک قانون ہے۔ اس کی خلاف ورزی کرنا معاہدے کی خلاف ورزی ہے، اور اس آیت کی خلاف ورزی ہے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے تلاوت کی۔

ویزے کی مدت سے زیادہ قیام کرنا

اسی طرح جب آپ دوسرے کسی ملک میں ویزا لے کر جاتے ہیں تو گویا کہ آپ نے معاہدہ کیا ہے کہ ویزے کی جو مدت ہے اس مدت تک میں وہاں ٹھہروں گا، اس کے بعد واپس آجاؤں گا۔

اب اگر آپ مدت گزرنے کے بعد مزید وہاں قیام کر رہے ہیں تو معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔اور جتنے دن آپ وہاں قیام کر رہے ہیں وعدہ کی خلاف ورزی کا گناہ آپ پر لازم آرہا ہے۔

آج ہماری پاکستانی قوم ساری دنیا میں بدنام ہے، لوگ پاکستانی کا نام سن کر بدکتے ہیں، پاکستانی پاسپورٹ دیکھ کر شک میں پڑ جاتے ہیں کہ معلوم نہیں یہ کیا دھوکہ دے رہا ہوگا۔اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں سے گئے، اور وہاں جا کر ان کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ ہمارے ویزے کی مدت ختم ہو چکی ہے، پھر ذلیل وخوار ہو کر نکالے جاتے ہیں، بعض اوقات جیلوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں، تکلیفیں بھی اُٹھاتے ہیں۔اس طرح دنیا کا بھی خسارہ اور آخرت کا بھی خسارہ، دنیا کے اندر یہ ذلت حاصل ہو رہی ہے، اور آخرت میں عہد شکنی کا گناہ ہو رہا ہے۔

ظالم حکومت کے قوانین کی پابندی بھی لازم ہے

بعض لوگ آج کل یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ آج کل ہمارے ملک میں جو حکومتیں ہیں، وہ خود ظالم حکومتیں ہیں، رشوت خور ہیں، بدعنوان ہیں، مفاد پرست ہیں، اپنے مفاد کی خاطر پیسے لوٹ رہے ہیں، لہٰذا ایسی حکومت کے قوانین کی پابندی ہم کیوں کریں؟

خوب سمجھ لیجئے! جیسا کہ پچھلے جمعہ میں عرض کیا تھا کہ حضورِ اقدس ﷺ نے تو ابوجہل سے کیے ہوئے معاہدے کا بھی احترام کیا۔کیا ابوجہل سے زیادہ گمراہ کوئی ہوگا؟ کیا ابوجہل سے بڑا کافر کوئی ہوگا؟ لیکن وہ وعدہ جو حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور ان کے والد نے ابوجہل سے کیا تھا، اور ابوجہل نے زبردستی ان سے وعدہ لیا تھا، رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم چونکہ ابوجہل سے وعدہ کر چکے ہو، لہٰذا اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔معلوم ہوا کہ جس شخص سے آپ عہد کر رہے ہیں وہ چاہے کافر ہی کیوں نہ ہو، چاہے وہ فاسق ہو، بدعنوان ہو، رشوت خور ہو، لیکن جب آپ نے اس سے عہد کیا ہے تو اب اس عہد کی پابندی آپ کے ذمے لازم ہوگی۔ان کے ظلم اور ان کے فسق وفجور کا گناہ ان کے سر ہے، ان کی بدعنوانیوں کا بدلہ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت میں دیں گے، وہ جانیں ان کا اللہ جانے۔ہمارا کام یہ ہے کہ ہم نے جو معاہدہ کیا ہے، ہم اس کی پابندی کریں۔

خیانت کرنے والے سے خیانت مت کرو

حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ))(۱)

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ما جاء فی النھی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

دو لفظوں کا جملہ ہے، لیکن رسول کریم ﷺ نے کیسا عظیم اور سنہرا اصول ان دو لفظوں میں بیان فرمادیا، فرمایا کہ جو تم سے خیانت کرے، تم اس کے ساتھ خیانت کا معاملہ مت کرو، وہ اگر خیانت کر رہا ہے، وہ اگر دھوکہ باز ہے، وہ اگر بدعنوان ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بھی بدعنوانی شروع کر دو، تم بھی اس کے ساتھ خیانت کرو، تم بھی اس کے ساتھ عہد شکنی کرو، تم بھی گناہ کا ارتکاب کرو۔ بلکہ ان کا عمل ان کے ساتھ ہے، تمہارا عمل تمہارے ساتھ ہے، لہٰذا حکومت چاہے کتنی ہی بری کیوں نہ ہو، لیکن اگر آپ نے اس کے ساتھ کوئی معاہدہ کرلیا ہے تو اس معاہدے کی پابندی تمہارے اوپر لازم ہے۔

صلح حدیبیہ

آپ نے سنا ہوگا کہ "صلح حدیبیہ" کے موقع پر رسول کریم ﷺ نے مشرکین مکہ سے ایک صلح نامہ لکھا تھا، اس صلح نامہ کی ایک شرط یہ تھی کہ اگر مکہ مکرمہ سے کوئی شخص مسلمان ہوکر مدینہ منورہ جائے گا تو مسلمانوں پر اس شخص کو واپس کرنا واجب ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ آجائے گا تو مکہ والوں پر یہ واجب نہیں ہوگا کہ اس کو واپس کریں۔ یہ ایک امتیازی قسم کی شرط تھی جو مشرکین مکہ نے رکھی تھی، لیکن حضور اکرم ﷺ نے اس وقت مصلحت کے لحاظ سے اس شرط کو بھی قبول کرلیا تھا، اس لئے کہ آپ جانتے تھے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ مدینہ منورہ سے تو کوئی شخص مرتد ہوکر مکہ مکرمہ نہیں جائے گا، اس وجہ سے آپ نے یہ شرط قبول کرلی تھی، لیکن یہ شرط کہ اگر کوئی شخص ہجرت کرکے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے گا تو اس کو واپس مکہ مکرمہ بھیجا جائے گا، یہ شرط بھی مصلحتاً آپ نے قبول فرمالی تھی۔

حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کی التجاء

ابھی صلح نامہ لکھا جا رہا تھا، اور ابھی بات چیت ہو رہی تھی کہ اس دوران حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ جو ایک صحابی تھے، اور مکہ مکرمہ میں مسلمان ہوگئے تھے، اور ان کا باپ کافر تھا، اس نے ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں، اور روزانہ ان کو مارتا تھا، یہ بیچارے روزانہ اسلام کی خاطر اپنے باپ کے ظلم و ستم کا سامنا کرتے تھے، جب ان کو پتہ چلا کہ حضور اقدس ﷺ حدیبیہ کے مقام پر آئے ہوئے ہیں، اور وہاں ان کا لشکر ٹھہرا ہوا ہے تو وہ کسی طرح ان بیڑیوں کے ساتھ مکہ مکرمہ سے حدیبیہ پہنچ گئے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ وہ کس طرح وہاں پہنچے ہوں گے جبکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) للمسلم أن يدفع الى الذمي الخمر، رقم: ١١٨٥، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في الرجل يأخذ حقه من تحت يده، رقم: ٣٠٦٧، مسند أحمد، رقم: ١٤٨٧٧، سنن الدارمي، كتاب البيوع، باب في أداء الأمانة واجتناب الخيانة، رقم: ٢٤٨٤

''حدیبیہ'' کا مقام مکہ مکرمہ سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ کس مشقت اور تکلیف کے ساتھ پاؤں میں بیڑیاں ہونے کے باوجود وہاں پہنچے ہوں گے۔ اور آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میری زندگی اجیرن ہو چکی ہے، باپ نے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی ہوئی ہیں، وہ صبح شام مجھے مارتا ہے، خدا کے لئے مجھے اس ظلم سے بچایئے، میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔

ابو جندل کو واپس کرنا ہوگا

وہ شخص جس کے ساتھ معاہدہ ہو رہا تھا، وہ اس وقت وہاں موجود تھا، اس شخص سے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص بہت ستم رسیدہ ہے، کم از کم اس کی اجازت دے دو کہ میں اس شخص کو اپنے پاس رکھ لوں۔ اس شخص نے کہا کہ اگر آپ اس کو اپنے پاس رکھیں گے تو آپ سب سے پہلے غداری کے مرتکب ہوں گے، کیونکہ آپ نے عہد کر لیا ہے کہ جو شخص بھی مکہ مکرمہ سے آپ کے پاس آئے گا آپ اس کو واپس کریں گے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص مظلوم ہے، اس کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، اور ابھی معاہدہ مکمل بھی نہیں ہوا ہے، اس پر ابھی دستخط ہونا باقی ہے۔ اس لئے اس شخص کو تم چھوڑ دو۔ اس شخص نے کہا کہ میں کسی قیمت پر اس شخص کو نہیں چھوڑوں گا، اس کو واپس بھیجنا ہوگا۔ اب اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جوش و خروش کا ایک عجیب عالم تھا کہ ایک شخص مسلمان ہے، کافروں کے ہاتھوں ظلم و ستم کی چکی میں پس رہا ہے، وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پناہ چاہتا ہے۔ لیکن اس کو پناہ نہیں ملتی۔

میں معاہدہ کر چکا ہوں

چونکہ معاہدہ ہو چکا تھا، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے ابو جندل! میں نے تمہیں اپنے پاس رکھنے کی بہت کوشش کی، لیکن میں معاہدہ کر چکا ہوں، اور اس معاہدے کی وجہ سے مجبور ہوں، اور میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ تمہیں واپس بھیجوں۔ انہوں نے فرمایا: یا رسول اللہ! آپ مجھے درندوں کے پاس واپس بھیجیں گے؟ جو صبح شام میرے ساتھ درندگی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میں مجبور ہوں، اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کوئی راستہ نکالیں گے۔ میں چونکہ عہد کر چکا ہوں، اس عہد کی پابندی کرنی ضروری ہے۔

عہد کی پابندی کی مثال

آپ اندازہ لگایئے، اس سے زیادہ عہد کی پابندی کی کوئی مثال شاید دنیا نہ پیش کر سکے کہ

ایسے ستم رسیدہ شخص کو واپس کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی رہائی کے لئے اور اسباب پیدا کر دیئے، جس کا لمبا واقعہ ہے۔[1] بہرحال، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ رسول کریم ﷺ نے کافروں کے ساتھ بھی عہد کی کس قدر پابندی فرمائی۔ لہٰذا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ جس کے ساتھ ہم نے عہد کیا ہے، وہ کافر ہے، یا فاسق ہے، یا بدعنوان ہے، یا رشوت خور ہے، جب عہد کرلیا تو اب اس کی پابندی ضروری ہے۔ ہاں، یہ ضروری ہے کہ ایسے رشوت خور کرپٹ حکام کو ہٹا کر ان کی جگہ دوسرے عادل حکمران لانے کی کوشش اپنی جگہ لازم اور ضروری ہے، لیکن جہاں تک عہد کا تعلق ہے، اگر ان حکام کے ساتھ کوئی عہد کیا ہے تو اس عہد کی پابندی ضروری ہے۔

جیسے اعمال ویسے حکمران

یاد رکھئے! ہم ہر وقت یہ جو حکومت کا رونا روتے رہتے ہیں، اس بارے میں حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد سن لیں۔ کاش کہ ہماری سمجھ میں آجائے، اور ہمارے دل میں اُتر جائے۔ آپ نے فرمایا:

"أَعْمَالُكُمْ عُمَّالُكُمْ"(۲)

یعنی تمہارے حکمران تمہارے اعمال کا عکس ہیں۔ اگر تمہارے اعمال درست ہوں گے تو تمہارے حکمران بھی درست ہوں گے، اگر تمہارے اعمال خراب ہوں گے تو تمہارے حکام بھی خراب ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے۔ لہٰذا اگر ہم اپنے معاملات، اپنی عبادات، اپنی معاشرت، اپنے اخلاق کو دین کے مطابق کرلیں تو میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کرپٹ اور بدعنوان اور خطاکار حکمران جو ہم پر مسلط ہو رہے ہیں، انشاء اللہ ثم انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی جگہ عادل حکمران عطا فرمائیں گے۔ لیکن پہلے ہم اپنے حصے کا کام کریں اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگیں، اللہ تعالیٰ ضرور فضل فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی رحمت سے عہد کی پابندی کی جتنی اقسام ہیں، ان سب پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ان آیاتِ کریمہ میں ہماری فلاح کے جو طریقے بتائے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ہماری زندگیوں کے اندر پیوست فرما دے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب، رقم: ۲۵۲۹، مسند أحمد، رقم: ۱۸۱۵۲

(۲) المقاصد الحسنة للسخاوي (۵۲۰/۱) پوری حدیث یوں ہے: أَعْمَالُكُمْ عُمَّالُكُمْ كَمَا تَكُوْنُوْنَ يُوَلّٰى عَلَيْكُمْ" ایک شاعر کہتا ہے۔

بذنوبنا دامت بليتنا والله يكشفها اذا تبنا

مصیبت پر صبر کریں ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِينَ﴾ (۱)

ہمارے اُردو محاورے میں صبر کا مفہوم بہت ہی محدود ہے کہ انسان پر کوئی مصیبت آجائے تو رونے دھونے کی بجائے خاموشی سے وقت گزار لے اسی کو صبر کہتے ہیں جبکہ شریعت کی اصطلاح میں صبر کا مفہوم بہت عام اور وسیع ہے۔ اسی بات کو واضح کرنے کے لئے صبر کی اقسام اور درجات مقرر کر لیے گئے ہیں، صبر کی تین قسمیں ہیں:

(۱)صبر على الطاعة (۲) صبر عن المعصية (۳) صبر على المصيبة

۱۔ صبر على الطاعة

صبر علی الطاعۃ کا یہ مطلب ہے کہ احکام خداوندی کی فرمانبرداری اور پیروی میں اپنے نفس کو مجبور کر کے نیکی پر آمادہ کرے چاہے وہ کام نفس پر کتنا ہی گراں گزرے مگر نفس کو مجبور کرتے ہوئے اس کام میں لگ جائے۔

۲۔ صبر عن المعصية

گناہ اور معصیت کرنے کو دل چاہ رہا ہے مگر اس گناہ اور برائی سے اپنے نفس کو روکے رکھنا صبر عن المعصیت ہے۔

۳۔ صبر على المصيبة

یہ ہے کہ کوئی بھی مصیبت یا پریشانی پیش آئے تو اس پر کوئی شکوہ شکایت نہ کرے بلکہ اللہ کے

☆ اصلاحی مواعظ (۱/۹۰ تا ۱۱۱)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) البقرة: ۱۵۳

فیصلے پر راضی رہے۔ پہلی دونوں قسموں کو مختصراً ان الفاظ میں سمجھا جاسکتا ہے کہ اپنے نفس کو اللہ کے احکامات میں باندھنا اور اپنی خواہشات کو اللہ کے احکام کے آگے پامال کرنا۔ چاہے یہ کام کسی گناہ سے بچنے کے لئے ہو یا کسی نیکی کے لئے ہو، آدمی اس بات کا ارادہ کرے خواہ میرے ارمانوں کا خون ہو جائے یا میری خواہشات پامال ہو جائیں لیکن اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو صبر عن المصیبۃ اور صبر علی الطاعۃ عطا فرمائے۔

صبر کی تیسری قسم یعنی صبر علی المصیبۃ کا بیان بقدرِ ضرورت مقصود ہے، اللہ اس پر ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

صبر پر اجر

اگر انسان کو کوئی مشکل پریشانی یا تکلیف پیش آجائے اور اس پر صبر کیا جائے تو اس پر بھی اللہ کی طرف سے بے حد وحساب اجر کے وعدے کیے گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں ایک حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب کوئی بندۂ مؤمن بیمار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے طرزِ عمل کا معائنہ کرنے کے لئے دو فرشتوں کو مقرر فرماتے ہیں آیا وہ بندہ اس بیماری اور مصیبت کی حالت میں اللہ سے اچھی اُمید رکھتا ہے یا اس کے خلاف طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جب کوئی صبر سے کام لیتا ہے تو فرشتے جاکر عرض کرتے ہیں کہ پروردگارِ عالم! وہ آپ سے ثواب کا طلبگار ہے اور آپ سے اچھی اُمیدیں رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میں تمہیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اس بیماری کے بعد میں اس کو ایسا خون دوں گا جو اس کے پہلے خون سے بہتر ہوگا اور ایسا گوشت عطا کروں گا جو پہلے گوشت سے بہتر ہوگا اور اس کے تمام گناہ معاف کر دوں گا اور اگر اسی بیماری میں اس کی موت کا فیصلہ کروں گا تو ایسی موت دوں گا کہ وہ سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔

بے صبری ذریعۂ جہنم ہے

اگر بیمار آدمی اللہ کی تقدیر پر شکایت کرتا ہے، جزع فزع کا معاملہ کرتا ہے یا اُلٹی سیدھی باتیں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر میں اس کی بیماری دور کروں گا تو اس حالت میں کہ پہلے سے موجود خون اور گوشت سے بدتر گوشت اور خون عطا کروں گا اور بے صبری کی سزا بھی دوں گا اور اسی بے صبری کی حالت میں اگر موت کا فیصلہ کرلیا تو اسے جہنم میں داخل کروں گا۔ اس حدیث مبارک میں صبر علی المصیبۃ کی اہمیت بیان فرمائی اور اس صبر کو چھوڑنے پر جو وعیدیں ہیں وہ کھول کھول کر بیان فرمائیں۔ دراصل صبر کا مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ صبر کے بارے میں لوگوں کے ذہن

میں عجیب وغریب باتیں پائی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صبر اس چیز کا نام ہے کہ کسی بھی تکلیف کا بالکل اظہار ہی نہ کیا جائے۔ نہ روئے اور نہ آنسو بہائے۔ اور اگر کبھی بے اختیار رونا آ گیا تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بے صبری ہوئی، جبکہ اللہ تعالیٰ بندے پر کسی بھی ایسے کام کو فرض نہیں کرتے جو اس کے اختیار سے باہر ہو، اس لئے اگر کسی موقع پر رونا آ جائے یا آنسو بہہ نکلیں تو اس پر بے صبری کا اطلاق نہیں ہوگا، اس لئے کہ بے صبری اللہ کی تقدیر پر شکوہ اور شکایت کرنے کا نام ہے۔

رونے کا نام بے صبری نہیں ہے

مثلاً اگر کوئی شخص یوں کہے کہ میں ہی رہ گیا تھا اس مصیبت کے لئے میرے علاوہ اللہ کو کوئی نظر نہیں آتا۔ گویا یہ اعتراض ہے کہ میرے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہوا؟ کسی اور کے ساتھ کیوں نہ ہوا؟ یہ بے صبری کا جملہ ہے، یا مثلاً کسی کا انتقال ہو جائے تو یوں کہے کہ بڑی بے وقت موت آئی ہے (معاذ اللہ) اللہ کو اپنے بندے کی روح قبض کرنے کا صحیح وقت معلوم نہیں ہے، یہ انتہائی خطرناک جملہ ہے جو اکثر لوگوں کی زبان پر آ جاتا ہے کہ فلاں کو بے وقت موت آ گئی۔ یاد رکھیں کہ دنیا کا کوئی کام بھی بے وقت نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ کس کام میں کس وقت میں کیا حکمت اور بہتری ہے۔ وہ اس کے مطابق فیصلے فرماتے ہیں۔ ایک اصولی بات اور سمجھ لیں کہ تکلیف کے اظہار میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ تکلیف کے اظہار میں اعتراض نہ ہو۔ اگر یوں کہے کہ اللہ میاں یہ کام میرے ساتھ ہی کرنا تھا دوسرے سب بڑے مزے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ایسا اظہار ہے جس میں اعتراض بھی شامل ہے اور اس سے بچنا ضروری ہے۔

صبر کرنے کا طریقہ

اگر اسی بات کو اس پیرائے میں ادا کرے کہ اے اللہ حکم اور مشیت تو آپ ہی کی چلتی ہے، آپ وہی کریں گے جو میرے حق میں بہتر ہوگا لیکن میں بہت کمزور بندہ ہوں، اس مصیبت کی وجہ سے مجھے بہت صدمہ پہنچا ہے اس لئے رونا آ رہا ہے، یہ رونا آپ کے فیصلے پر نہیں اپنی بے بسی اور کمزوری پر ہے تو یہی جملہ صبر ہوگا اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف اظہار ہے اعتراض نہیں ہے، چاہے دل میں ایک آگ سلگ رہی ہو مگر زبان پر یہی ہونا چاہئے کہ اے اللہ آپ حکیم وعلیم ہیں، فیصلہ آپ کا ہی چلے گا، میں تو نہیں جانتا اس میں یقیناً میری ہی کوئی بہتری ہوگی۔ یہ عمل حضور اکرم ﷺ نے خود کر کے دکھایا کہ صبر اس چیز کا نام ہے۔

حضور ﷺ کا عمل

رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے جناب ابراہیم رضی اللہ عنہ کا جب انتقال ہوا تو آپ ﷺ نے بیٹے کو گود میں اُٹھا کر فرمایا:

((إِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُونَ))(۱)

''اے ابراہیم تمہاری جدائی پر ہم بہت غمزدہ ہیں''

اظہارِ غم اپنی جگہ مگر دل میں مضبوطی سے یہ بات رچی بسی ہے کہ اے اللہ! آپ نے جو فیصلہ فرمایا اسی میں خیر اور بہتری ہے، ہم اپنی بہتری آپ سے زیادہ نہیں جانتے۔ حضور اکرم ﷺ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ایک نومولود صاحبزادے تھے، ان پر نزع کا عالم طاری ہوگیا تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے حضور سرورِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ بچہ بہت بیمار ہے، اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ سرورِ دو عالم ﷺ تشریف لے گئے۔ دیکھا تو بچے پر نزع کی کیفیت طاری تھی اور روح پرواز کر رہی تھی، اور پھر یہ صرف بچہ ہی نہیں تھا نواسہ بھی تھا۔ اس سارے منظر کو دیکھ کر رحمتِ عالم ﷺ کی پاکیزہ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ وہاں موجود ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ بھی روتے ہیں۔ سرورِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو وہ رحمت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا فرمائی ہے، اسی لئے جب کسی کا کوئی پیارا اس سے جدا ہو اور وہ اس کی جدائی پر غم کرے یا روئے تو یہ رونا بے صبری میں داخل نہیں بلکہ یہ تو رحمت ہے، اور اظہارِ غم بے صبری نہیں بلکہ بے صبری یہ ہے کہ گریبان چاک کر کے ماتم کرے، نوحہ خوانی کرے یا تقدیرِ خداوندی پر شکوہ کرے تو یہ چیز گناہ بن جائے گی۔ (۲)

بے اختیار رونا گناہ نہیں

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال ہوتا ہے کہ مرنے والے کے عزیز جو روتے ہیں اس سے گناہ ہوتا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیں کہ غیر اختیاری طور پر رونا کوئی گناہ نہیں، البتہ رونے کے لئے

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب في قول النبي إنا بك لمحزونون، رقم: ١٢٢٠، صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب رحمة الصبيان والعيال وتواضعه وفضل ذلك، رقم: ٤٢٧٩، سنن ابن ماجه، كتاب ما جاء في الجنائز، باب ما جاء في البكاء على الميت، رقم: ١٥٧٨

(۲) صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب البكاء على الميت، رقم: ١٥٣٠، مسند أحمد، رقم: ٢٠٧٩٠

اہتمام سے مصنوعی طریقے اختیار کرنا، ماتم ہو رہا ہے، سینہ کوبی ہو رہی ہے، سروں میں خاک ڈال کر گریبان چاک کیے جارہے ہیں اور اہتمام کے ساتھ ایسے الفاظ اختیار کیے جارہے ہیں کہ جسے رونا نہیں بھی آرہا وہ بھی رو دے تو یہ تمام کام حرام اور گناہ بن جاتے ہیں لیکن اگر کسی شخص کو غیر اختیاری طور پر رونا آ گیا تو اس سے گناہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو چیز بھی انسان کی قدرت و اختیار سے باہر ہے اس پر گرفت نہیں ہوتی۔ قرآن خود کہتا ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾(۱)

گویا انسان کو اللہ تعالیٰ نے کسی بھی ایسی چیز کا مکلف نہیں بنایا جو اس کی طاقت سے باہر ہو اور اگر رونے کے ساتھ یہ کہہ دیا جائے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہ ہم تو اللہ کی ملکیت ہیں، اس نے جو فیصلہ کیا وہ بالکل برحق ہے، جس میں کسی شکوے شکایت کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو یہی الفاظ عبادت بن جائیں گے۔

صابرین کے لئے خوشخبری

ہمارے حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جتنا رنج اور صدمہ زیادہ ہوگا اتنا ہی صبر کا ثواب بھی بڑھتا جائے گا۔ اس لئے کہ تکلیف کے بڑھنے سے اجر بڑھتا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ قرآن کریم میں آتا ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ﴾(۲)

اے بندو! ہم تمہیں کبھی خوف سے آزمائیں گے، کبھی بھوک سے آزمائیں گے، کبھی مال اور جانوں میں کمی کے ذریعے سے آزمائیں گے اور کبھی پیداوار میں کمی سے آزمائیں گے اور اس آزمائش کے بعد

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾(۳)

خوشخبری سنا دیں انہیں جو ان آزمائش کے موقع پر صبر کرتے ہیں۔ کہ جب بھی کوئی مصیبت پہنچی تو انہوں نے کہا کہ ہم تو اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

﴿أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾(۴)

ایسے لوگوں پر اللہ کی طرف سے رحمتیں ہی رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے۔

(۱) البقرة: ۲۸۶ (۲) البقرة: ۱۵۵ (۳) البقرة: ۱۵۶ (۴) البقرة: ۱۵۷

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نکتہ

میرے مرشد حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیتِ مبارکہ سے ایک عجیب نکتہ سمجھایا کہ اللہ نے یوں ذکر کیا: قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ الخ کہ جب مصیبت آپہنچے تو اِنَّا لِلّٰهِ کہہ دو، یہ نہیں فرمایا کہ رومت یا مصیبت پر اظہارِ غم نہ کرو۔ بس اپنی تمام تکلیفوں کو برداشت کر کے چپکے سے کہہ دیا کرو کہ اِنَّا لِلّٰهِ (الآیۃ) تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمتیں ہی رحمتیں نازل ہوں گی۔ اللہ نے صبر کو اور اس کے اجر کو کس قدر آسان فرمادیا کہ ہر ایک مصیبت زدہ اس سے فائدہ اُٹھا سکے بلکہ بعض اوقات بندے کا رونا اور آنسو بہانا بھی اللہ کو پسند آتا ہے کہ کبھی بندہ اظہارِ تکلیف بھی کرے۔ اس لئے کہ بالکل اظہارِ غم نہ کرنا کوئی کمال کا درجہ نہیں ہے، اس لئے کہ یہ سنت طریقہ نہیں ہے بلکہ سنت طریقہ یہی ہے کہ اظہارِ غم بھی ہو اور رضا بالقضا بھی ہو۔

کس کا مقام اُونچا ہے

ایک بزرگ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہیں بیٹے کی موت کی خبر ملی تو جواب میں رونے دھونے کے بجائے فرمایا ''الحمدللہ'' اللہ تیرا شکر ہے۔ کوئی اظہارِ صدمہ اور غم نہیں۔ یعنی اللہ کی نعمتوں کا اس قدر استحضار ہے کہ مصیبت کو بھی نعمت سمجھ کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے کہ نواسہ گود میں ہے، نزع کی کیفیت طاری ہے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں ان بزرگ کا مقام زیادہ نظر آتا ہے جو بیٹے کی موت پر بھی شکر ادا کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بلند کام وہی ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور یہ صاحب جو بیٹے کی موت پر ''الحمدللہ'' کہتے ہیں، وہ کوئی فرشتے ہوں تو معلوم نہیں البتہ کسی انسان میں یہ درجہ کمال کی بات نہیں۔ البتہ اللہ والوں کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ ان بزرگوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا غلبۂ حال تھا اس لئے انہیں تکلیف میں بھی نعمت نظر آئی اس لئے کہہ دیا کہ الحمدللہ اور غلبۂ حال کا مقام پیروی کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔

غلبۂ حال کی مثال

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مثال یوں دی کہ ایک شخص کی ٹانگ کا آپریشن ہونا ہے۔ ڈاکٹر نے بیہوش کر کے ٹانگ کاٹ دی، اسے معلوم ہی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے، نہ تکلیف، نہ صدمہ، نہ رنج اور نہ غم، اس لئے کہ تکلیف کا احساس ہی ختم ہو چکا ہے۔ اور ایک وہ آدمی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے بیہوش

مت کرو، میرے سامنے میری ٹانگ کاٹو۔ چنانچہ ٹانگ بھی کٹوا رہا ہے اور ساتھ ساتھ سسکیاں اور آہیں بھی بھر رہا ہے۔ بتائیں کس کا مقام زیادہ اُونچا ہے؟ ایک تو وہ ہے جسے معلوم ہی نہیں کہ تکلیف کسے کہتے ہیں، اور دوسرا وہ ہے جسے تکلیف ہورہی ہے اور صبر کررہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی کی بہادری قابلِ داد ہے، جو جیتے جاگتے آنکھوں کے سامنے ٹانگ کٹوا رہا ہے۔ لہٰذا جنہوں نے موت کی خبر سن کر الحمدللہ کہا وہ ایسے ہی ہیں جیسے بیہوشی کی حالت میں ٹانگ کٹوالی۔ اور وہ جو اپنے بیٹے اور نواسے کی موت پر آنسو بہارہے ہیں وہ ایسے ہی ہیں جیسے بیہوشی کے بغیر ٹانگ کٹوائی ہے اور تکلیف کے باوجود اللہ کے فیصلے پر راضی ہیں۔ اور یہی بندگی کا اعلیٰ ترین مقام ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تکلیف دینا چاہ رہے ہیں تو اس تکلیف کا تھوڑا سا اظہار بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری کا اظہار کرنا یہ کوئی اعلیٰ مقام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے تو اپنی شکستگی اور عاجزی کا اظہار کرنا ہی کمالِ بندگی ہے۔

اللہ کے سامنے بہادری مت دکھاؤ

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ بیمار تھے، دوسرے بزرگ ان کی عیادت کو گئے تو بیمار بزرگ الحمدللہ، الحمدللہ کا ورد کرتے رہے لیکن بیماری کے ازالے کی دعا نہیں کررہے۔ دوسرے بزرگ جو عیادت کے لئے گئے تھے انہوں نے کہا کہ جب تک یہ عمل کرتے رہو گے شفا نہیں ہوگی۔ اگر شفا چاہتے ہو تو اللہ سے مانگو۔ یا اللہ یہ تکلیف ہورہی ہے اسے دور فرمادے۔ میرے بڑے بھائی محمد زکی کیفی مرحوم بڑے اچھے شاعر تھے، ان کا ایک شعر یاد آیا جس میں اسی بات کو سمجھایا گیا ہے۔

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں
توڑنا ہے حسن کا پندار کیا

یہ کمال نہیں کہ اللہ تو غم دیئے جائیں میں اظہار نہیں کروں گا۔ لیکن بندگی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جب غم ہو تو اظہارِ غم بھی کرے۔ لیکن اظہارِ غم کی حالت میں بھی اگر اللہ کی مشیت کو سامنے رکھے تو پھر اللہ کی طرف سے انعامات و ہدایت کی بارش ہوتی ہے۔ اللہ کی مصیبتوں کے سامنے بہادری کا اظہار نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ بندگی کے منافی ہے۔

ایک سبق آموز قصہ

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کا قصہ سنایا کہ غلبۂ حال میں یوں کہہ بیٹھے "اے اللہ! مجھے آپ کی یاد کے علاوہ کسی چیز میں مزہ نہیں آتا آپ جیسے چاہیں مجھے آزما کر دیکھ لیں" (معاذ اللہ) اور تو کچھ نہیں ہوا صرف پیشاب بند ہوگیا، جان پر بن آئی مگر تکلیف کم نہیں ہوتی تھی، کئی

دن اسی کیفیت میں رہے، اللہ کی طرف سے تنبیہ ہوئی کہ بڑی غلطی ہوئی، بندہ تو ایک ایک چیز میں اللہ کی نعمتوں کا محتاج ہے۔ پھر یہ بزرگ بہت توبہ استغفار کرتے تھے، بچوں کو پڑھاتے تھے، بچوں کو بلا کر کہتے کہ اپنے ''جھوٹے'' چچا کے لئے دعا کرو۔ لہٰذا اللہ کے سامنے کبھی بھی بہادری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ جب بھی آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو کام لائے جاتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ آسان راستہ اختیار فرماتے تھے۔ (۱)

حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون صاحبِ عزیمت ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ مشکل راستہ اختیار کرنے میں اپنی بہادری اور مردانگی کا ایک قسم کا دعویٰ ہے کہ میں اس مشکل کو سر کرسکتا ہوں، اللہ کی بارگاہ میں دعویٰ نہیں بلکہ عاجزی اور بندگی پسند ہے۔ صاف اور سادہ اقرار کرلے کہ یا اللہ میں تو کمزور ہوں، اس لئے آسان راستہ اختیار کرتا ہوں۔ آپ کی مدد اور توفیق کا طلب گار ہوں۔ کیونکہ انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں، ایک تو یہ کہ تکلیف پر صبر کرے۔ اور دوسرا یہ کہ تقدیر کا شکوہ کرے اور اللہ سے ناراضگی کا اظہار کرے۔ عقلمند خود سوچ سکتا ہے کہ کیا شکوہ شکایت کرنے سے مصیبت ٹل سکتی ہے؟ جو نقصان ہو چکا وہ پورا ہوسکتا ہے؟ جو ہونا تھا سو ہو چکا، اب اس شکوے کے ذریعے اجر کے راستے کو بند کرکے دوہرا نقصان کر رہا ہے، دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی۔

روئیں بھی اور بے صبری نہ ہو!

بعض ذہنوں میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ ہم مصیبت پر روئیں بھی اور اللہ کی مرضی پر راضی بھی رہیں اور دونوں کام بیک وقت کیسے ہوسکتے ہیں؟ اس کی مثال ایسے سمجھیں کہ دانت میں تکلیف ہے، ڈاکٹر کے پاس جا کر اسے ''فیس'' بھی ادا کرتے ہیں، اس کے کام سے روتے چلاتے بھی ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے کام پر راضی بھی ہیں کہ آپ کی بڑی مہربانی آپ نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائی۔ گویا ہم پیسے دے کر ڈاکٹر سے کہتے ہیں کہ ہمیں تکلیف پہنچاؤ اس لئے کہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ یہ تکلیف درحقیقت فائدے کا سبب ہے۔ اور اگر تکلیف نہ دی گئی تو صحت کے فائدے سے محروم رہیں گے۔ لہٰذا صحت کے فائدے سے لطف اندوز ہونے کے لئے پیسے خرچ کرکے اور خوشامد کرکے اپنے بدن کو چیر پھاڑ کے لئے خود پیش کرتے ہیں۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب صفة النبي، رقم: ٣٢٩٦، صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب مباعدته للآثام واختياره من المباح أسهله وانتقامه، رقم: ٤٢٩٤، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في التجاوز في الأمر، رقم: ٤١٥٣، مسند أحمد، رقم: ٢٣٤١٠

رحمتِ الٰہی کی مختلف شکلیں

دراصل دنیا میں جتنی بھی پریشانیاں اور مصیبتیں آتی ہیں یہ اللہ کی طرف سے آپریشن ہے، بظاہر نقصان نظر آتا ہے لیکن درحقیقت اسی میں ہمارا فائدہ ہے۔ اس کائنات کا کوئی ذرّہ اللہ کی مشیت کے بغیر حرکت نہیں کرتا اور کوئی بھی حرکت حکمت کے بغیر نہیں ہوتی۔ اگر اللہ تعالیٰ دیکھنے والی آنکھ عطا فرمادے تو معلوم ہوگا کہ یہ مصائب بھی درحقیقت اللہ کی رحمت ہی ہیں۔ کہیں رحمتِ الٰہی ہنسا کر آتی ہے اور کہیں رلا کر آتی ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ کی رحمت راحت کی شکل میں آتی ہے، اور کبھی تکلیف کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ اس تکلیف میں اللہ نے ہمارے لئے کتنا اجر مخفی رکھا ہے؟ دنیا میں یہ چند روزہ تکالیف تو سب کو نظر آتی ہیں مگر ان پر صبر کرنے کے عوض جو سرمدی خوشیاں، دائمی مسرتیں اور ہمیشہ ہمیشہ کا سکون چھپا ہوا ہے وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ حضور اکرم ﷺ کے ایک فرمان کا مفہوم ہے کہ جب اللہ کی طرف سے آخرت میں مصائب پر صبر کرنے والوں کو ان کا بدلہ اور اجر دیا جائے گا، تو اس وقت لوگ تمنا کریں گے کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچی سے کاٹی جاتیں اور ہم اس پر صبر کرتے اور اجر کے مستحق بنتے[1] کوئی چھوٹی بڑی تکلیف ایسی نہیں جس پر اللہ کی طرف سے اجر مقرر نہ ہو، یہاں تک کہ بندۂ مؤمن کو کانٹا چبھنے پر بھی اجر ملتا ہے[2] دراصل ہر تکلیف نعمت ہے، چونکہ ہم کمزور اور جلد باز ہیں اس لئے ہم تکلیف کا پہلو دیکھتے ہیں اور نعمت کو بھلا بیٹھتے ہیں۔

بیماری بھی نعمت ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سیّد الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہی مضمون بیان فرمارہے تھے کہ کوئی مصیبت ایسی نہیں جو حقیقت میں نعمت نہ ہو۔ اسی دوران دیکھا کہ مجلس میں ایک کوڑھی شخص آیا جس کے ہاتھ پاؤں جذام کی وجہ سے گل سڑ کر جھڑ رہے تھے۔ ایسی تکلیف دہ حالت میں آیا اور کہنے لگا: حضرت میرے لئے دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس مصیبت اور تکلیف سے نجات عطا فرمائے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی ذھاب الصبر، رقم: ۲۳۲۶

(۲) صحیح البخاری، کتاب المرضی، باب ما جاء فی کفارۃ المرض، رقم: ۵۲۰۹، صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ ولآداب، باب ثواب المؤمن فیما یصیبہ من مرض أو حزن، رقم: ۴۶۶۴، سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی ثواب المریض، رقم: ۸۸۸، مسند أحمد، رقم: ۳۲۹۸۵

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم سب اس سوچ میں پڑ گئے اور اپنے کانوں کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف متوجہ کرلیا کہ کیا جواب ارشاد ہوتا ہے؟ اس لئے کہ ابھی تو حضرت یہ فرمار ہے تھے کہ ہر مصیبت نعمت ہے اور بیماری بھی ایک مصیبت ہے۔ اب اگر یہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ اس کی بیماری کو دور کردے تو گویا یہ زوالِ نعمت کی دعا کررہے ہیں۔ ان ہی سوالوں اور تجسس کے ساتھ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جواب کے منتظر تھے۔ حضرت نے عجیب الفاظ میں دعا فرمائی اور سب سے کہا کہ ہاتھ اُٹھا کر اس کوڑھی کے لئے دعا کرو کہ "یا اللہ! یہ تکلیف اور بیماری حقیقت میں تو نعمت ہے لیکن ہم بہت کمزور اور لاغر ہیں، اس نعمت کو برداشت نہیں کرسکتے، لہٰذا اے اللہ! اس بیماری کی نعمت کو صحت کی نعمت سے تبدیل فرمادیں"

اب ذہن میں ایک اور شبہ ہوتا ہے کہ مصیبت اتنی بڑی نعمت ہے تو اس سے محرومی کیوں؟ لہٰذا سب مل کر اللہ سے مصیبت کو مانگیں۔ اسی شبہ کا ازالہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ مصیبت کو طلب نہ کرو اس لئے مصیبت کا مانگنا اظہارِ جرات کرنا ہے جو اللہ کو بہت ناپسند ہے۔ اور اگر کوئی مصیبت آجائے تو شکوہ شکایت نہ ہو بلکہ یہ کہو کہ اے اللہ میں کمزور ہوں، یہ مصیبت میری طاقت سے باہر ہے اس لئے اسے دور فرمادیں۔ لیکن جب تک یہ مصیبت رہے تو یہ سمجھتے رہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔

تین قسم کے حالات

اگر یوں کہا جائے کہ دنیا میں کوئی دکھ، پریشانی، رنج اور خوف نہیں ہوسکتا تو یہ ناممکن ہے، اس لئے کہ عالم کُل تین ہیں۔

۱۔ جنت ــــ جو عالمِ راحت ہے وہاں کوئی رنج وغم نہیں ہوگا۔

۲۔ جہنم ــــ جو عالمِ مصیبت ہے جہاں کوئی راحت نہیں ہوگی۔

۳۔ دنیا ــــ جہاں راحت بھی ہے اور رنج بھی، صدمہ بھی ہے اور مسرت بھی، آنسو بھی ہیں اور خوشیاں بھی۔ لہٰذا اب اگر کوئی چاہے کہ مجھے صرف خوشیاں ہی خوشیاں ملیں تو اس دنیا میں یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ کسی انسان کی قدرت میں نہیں ہے کہ وہ صرف خوشیوں کو سمیٹ لے اور مصائب کو جھاڑ پھینکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر مصائب اور صدمے نہ آئیں تو انسان بندہ نہ رہے بلکہ فرعون اور ہامان بن کر زندگی گزارے۔ خدا کا بندہ بننے کی بجائے بندوں کا خدا بن بیٹھے۔ صدمے اور مصیبت کا نقد فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہوجاتا ہے۔ جب بھی مصیبت آتی ہے چاہے وقتی طور پر ہو انسان فوراً اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی کہ ایک لمحہ کے لئے ہی سہی، مگر اللہ سے تعلق قائم کرنے کا موقع تو ہاتھ آگیا، اور بندے نے اپنے اللہ کی عظمت کو دل میں بسالیا۔

چنانچہ جتنی مرتبہ بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ "اے اللہ مصیبت بہت بڑی ہے نا قابل برداشت ہے، آپ قوتِ برداشت دیں" تو ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہوگا۔ کیا تعلق مع اللہ کوئی معمولی چیز ہے؟ اگر چہ ہم اسے بڑی چیز نہ سمجھیں۔ لیکن درحقیت تعلق مع اللہ ہفت اقلیم کی سلطنت سے زیادہ قیمتی شی ہے۔ یہ نعمت جو صدیوں کے مجاہدوں سے حاصل نہیں ہوتی وہ ان تکالیف اور مصائب کی وجہ سے پل بھر میں حاصل ہو جاتی ہے۔

نفس ایک کاغذ کی مانند ہے

بزرگوں نے ایک بات بڑے کام کی بتائی کہ دنیا میں اللہ کے حکموں کے مطابق زندگی گزارنا مجاہدے کے بغیر ناممکن ہے۔ قطب عالم، فقیہ الامت حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی رضا کے حصول کے لئے بعض اوقات بعض مباحات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک مثال سے سمجھایا کہ ایک کاغذ کو موڑ دیں پھر اسے سیدھا کرنا چاہیں تو وہ بالکل سیدھا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس میں ایک سلوٹ پڑ چکی ہے اور اسے سیدھا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے اُلٹی طرف موڑ دیا جائے کیونکہ اُلٹی طرف موڑنے سے کاغذ سیدھا ہو جائے گا۔ بالکل یہی حال مجاہدے کا ہے کہ نفسِ انسانی گناہوں کا خوگر اور عادی بن چکا ہے، اسے سیدھے رخ پر لانا چاہیں تو وہ نہیں آتا۔ لہٰذا اسے سیدھا کرنے کے لئے اُلٹے رخ پر موڑنا پڑے گا، اب اس سے کچھ جائز کام بھی چھڑوانے پڑیں گے۔ جب اس سے کھانا پینا اور جائز خواہشات کی تکمیل چھڑائی جائے گی تو انشاء اللہ اُلٹا مڑنے سے خود بخود سیدھا ہو جائے گا۔ لہٰذا نفس کے سرکش گھوڑے کو قابو کرنے کے لئے مجاہدہ بہت ضروری ہے، لیکن بعض اوقات اپنی فطرتی کمزوری کی وجہ سے آدمی مجاہدہ نہیں کرنا چاہتا اور اگر کرنا بھی چاہے تو نہیں کر پاتا، جیسے ہم لوگ آج کل مجاہدے اور ریاضتیں نہیں کر سکتے۔ لیکن یاد رکھیں! یہ مصائب غیر اختیاری مجاہدے ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنے نفس کو گناہوں کی طرف موڑ رکھا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس غیر اختیاری مجاہدے کے ذریعے اپنی طرف موڑ دیا تاکہ گناہوں سے بچنا آسان ہو جائے۔ بعض اوقات اس غیر اختیاری مجاہدے کے ذریعے باطنی طور پر اتنی زیادہ ترقی ہوتی ہے جو اختیاری مجاہدے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

مصائب پر صبر کریں

یہ مصائب دراصل ہماری روح کے فاسد مادے ہوتے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ روحانی آپریشن کے ذریعے صاف کرتے ہیں، انسان خواہ لاکھ چیخے چلائے لیکن اللہ تعالیٰ روحانی ترقی کے لئے اپنی

ذات کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اسی لئے فرمایا گیا کہ بخار آئے تو سمجھو کہ گناہ معاف ہو رہے ہیں۔ حضور ﷺ کی یہ تعلیم ہے کہ جب کسی بیمار کے پاس خصوصاً کسی بخار والے کے پاس جاؤ تو کہو

((لَا بَأْسَ طَهُورٌ إِنْشَاءَ اللّٰهُ))(۱)

"کوئی حرج نہیں انشاء اللہ یہ بیماری تمہارے لئے پاکی کا ذریعہ ہوگی"

یعنی یہ بخار گناہوں اور گندگیوں سے پاکیزگی کا ذریعہ ہے، اسے مصیبت یا پریشانی سمجھ کر اپنے اوپر طاری نہ کرلینا۔ دنیا میں جتنے بھی خلافِ طبیعت امور پیش آئیں تو سمجھیں کہ یہ سب غیر اختیاری مجاہدات ہیں۔ لیکن زندگی میں کبھی بھی مصائب کو طلب نہ کریں، آجائیں تو اضافہ نہ چاہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ان کا ازالہ طلب کریں۔ اور اس بات کا یقین بھی ہو کہ ان مصائب میں میری دنیا و آخرت کا نفع پوشیدہ ہے۔ اسی کا نام صبر ہے اور اسی پر اللہ تعالیٰ انعامات کی بارش فرماتے ہیں۔ اس بات کا تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ مصائب میں صبر کرنے سے اس مصیبت کے دور ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ سے تعلق میں کتنا اضافہ ہوتا ہے؟ اور یہی چیز اس بات کی علامت بھی ہے کہ آیا یہ مصیبت اللہ کی طرف سے رحمت ہے یا اس کی طرف سے عذاب ہے، اس لئے کہ بعض اوقات مصائب رحمت ہوتے ہیں، جبکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے عذاب اور زحمت کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ جس مصیبت میں اللہ کی طرف رجوع کی توفیق میسر ہو جائے اور اللہ کی قدرت اور مشیت پر راضی بھی ہو تو سمجھ لیں کہ یہ مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے اور اگر کسی مصیبت میں اللہ سے شکوہ ہو یا اللہ کی طرف رجوع میں کمی واقع ہو جائے تو اس چیز کی علامت ہے کہ یہ تکلیف وبال اور مصیبت ہے۔

صبرِ ایوب علیہ السلام

انبیاء کرام علیہم السلام کی زندگیوں میں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کا نمونہ عمل رکھا ہے، حضرت ایوب علیہ السلام پر کیسی خطرناک بیماری مسلط کردی گئی کہ تمام چاہنے والے اعزاء و اقارب نے ساتھ چھوڑ دیا، ایسے وقت میں شیطان آکر بہکاتا ہے کہ "ایوب یہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر عذاب ہے"، جواباً حضرت ایوب علیہ السلام یہ فرماتے ہیں کہ نہیں یہ بیماری عذاب نہیں بلکہ نعمت ہے اس لئے کہ اس حالت میں بھی مجھے اللہ سے شکوہ کرنے کی نہیں بلکہ اسے پکارنے کی توفیق مل رہی ہے۔

﴿إِنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾(۲)

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب المرضى، باب ما يقال للمريض وما يجيب، رقم: ۵۲۳۰

(۲) الأنبياء: ۸۳

اے اللہ! اس بیماری نے مجھے پریشان کردیا ہے، آپ رحم کرنے والے ہیں مجھ پر رحم فرمایئے۔

مصائب میں دعا نہ چھوڑیں

اسی لئے بزرگوں نے تجویز فرمایا کہ بیماری یا تکلیف میں اپنے معمولات کو بالکل ترک کرنے کے بجائے کچھ کم کرنا چاہئے، تعداد میں کمی کردے یا کیفیت میں کمی کردے، لیکن مکمل طور پر ترک نہ کرے اس لئے کہ اگر مکمل طور پر ترک کردیا تو اندیشہ ہے کہ کہیں یہ مصیبت باعثِ وبال نہ بن جائے۔ بعض اوقات لوگ کہہ دیتے ہیں کہ دعا کرتے کرتے تھک گئے لیکن معاملہ تو جوں کا توں ہے کوئی فرق نہیں پڑا۔ یاد رکھیں کہ دعا کرتے کرتے کبھی تھکنا نہیں چاہئے اس لئے کہ دعا کبھی رائیگاں اور بیکار نہیں جاتی۔ کبھی تو وہی مل جاتا ہے جو طلب کیا تھا اور کبھی اس سے بہتر مل جاتا ہے اور کبھی دنیا میں کچھ نہیں ملتا بلکہ آخرت میں مل جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ دعا سے تھک کر بیٹھ گئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ تکلیف عذاب میں داخل تھی یہ خدا کی رحمت نہ تھی۔ اس بات سے بالکل بے پرواہ ہوکر کہ کیا مل رہا ہے، اور کتنا مل رہا ہے، بس دعا مانگتے ہی رہیں۔ مانگنے میں بالکل شرم اور جھجک محسوس نہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اے اللہ! آپ آقا ہیں اور میں بندہ ہوں، آپ دیں گے تب بھی مانگوں گا، نہیں دیں گے تب بھی مانگوں گا۔ اے میرے مالک! اس در کے سوا کوئی در نہیں ہے، جاؤں تو کہاں جاؤں؟ تیرے سوا کوئی آستانہ دکھائی نہیں دیتا، اپنی پیشانی کو ٹیکوں تو کہاں ٹیکوں؟ اپنے سر کو جھکاؤں تو کہاں جھکاؤں؟ جو بھی اس بات کی عادت بنالیتا ہے کہ مانگتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا خواہ ملے یا نہ ملے بس مانگتا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے وہ مقام عطا فرما دیتے ہیں جو اس کے وہم و گمان سے بھی باہر ہوتا ہے۔

صبر کا خلاصہ

لہٰذا صبر کا خلاصہ یہ نکلا کہ اظہارِ تکلیف یعنی رونا وغیرہ صبر کے منافی نہیں البتہ اللہ کے فیصلے پر شکوہ اور شکایت کرنا بے صبری ہے۔ اظہارِ تکلیف بھی ہو اور ازالۂ تکلیف یعنی اللہ کے سامنے اپنی عاجزی کا اقرار ہو، کوئی جرأت اور بہادری کا مظاہرہ نہ ہو، اے اللہ میں کمزور ہوں، اس بات کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے کہ دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں انسان کو تکلیف کے ازالے کے لئے دعا مانگتے رہنا چاہئے۔ جس سے ان شاء اللہ یہ تکلیف باعثِ اجر بنے گی اور اُخروی راحت کا ذریعہ بن سکے گی۔ اور یہ مصائب جس نوعیت کے بھی ہوں، چھوٹے ہوں یا بڑے، بیماری ہو یا آزاری ہو، تنگ دستی ہو یا بے روزگاری، خواہ کوئی بھی تکلیف ہو ہر تکلیف کے بارے میں یہی اصول ہے، جس پر عمل کرنے سے

انسان مستحق اجر وثواب بنتا ہے، اور صوفیائے کرام نے اپنی پوری زندگی کے مجاہدوں اور ریاضتوں سے یہ بات بتائی کہ باطنی ترقی کے لئے صبر کی عبادت جس قدر مفید ہوتی ہے کوئی دوسری عبادت اس قدر اثر انداز نہیں ہو سکتی، جیسے ایک شاعر نے کہا۔

وادی عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادہ صد سالہ با آہے گاہے

عشق کی وادی یوں تو بہت دور دراز ہے لیکن کبھی یہ فاصلہ صرف ایک آہ میں طے ہو جاتا ہے۔

صابر نام نہ رکھیں

لیکن مصائب اور صبر وغیرہ کو کبھی طلب نہ کریں یہاں تک کہ میرے والد ماجد حضرت مفتی اعظمؒ کبھی بھی یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ کسی بچے کا نام صابر یا بچی کا نام صابرہ رکھا جائے۔ اس لئے نہیں کہ یہ نام رکھنا ناجائز ہے بلکہ وہ فرماتے تھے کہ ان ناموں میں ایک قسم کا دعویٰ ہے کہ مجھ پر مصائب آئیں اور میں ان پر صبر کرنے کو تیار ہوں اور بندے کا کام مصائب کو دعوت دینا نہیں بلکہ ان سے پناہ مانگنا ہے۔

نام کے اثرات

اس نام رکھنے کے اور اسے بدلنے کے اثرات ہم نے خود دیکھے ہیں۔ ہماری ایک عزیز صابرہ نامی تھیں، بہت پریشانی اور تنگ دستی اور فقر وفاقے میں زندگی گزار رہی تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحبؒ کے پاس آئیں۔ حضرت نے دعا بھی فرمائی اور کہا کہ تم اپنا نام بدل لو اور صابرہ کی جگہ شاکرہ رکھ لو۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ چند دنوں میں ہی ان خاتون کی تمام تکالیف اور پریشانیاں دور ہو گئیں۔ اس لئے مصائب خود طلب نہ کریں، آجائیں تو اللہ کی مشیت سمجھتے ہوئے راضی رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صبر کی تینوں اقسام صبر علی الطاعۃ، صبر عن المعصیۃ اور صبر علی المصیبۃ پر اپنے اپنے مواقع پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس اجر کا مستحق بنائے جو صابرین کو عطا فرماتے ہیں۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

صدقہ و خیرات ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ))(۱)

گذشتہ جمعہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ ایک سفر درپیش ہے جس کی وجہ سے شاید حاضری نہ ہوسکے لیکن بعض وجوہات کی بناء پر سفر ملتوی ہوگیا تو سوچا کہ حسبِ معمول حاضری کی سعادت حاصل کی جائے۔ جو حدیث آپ کے سامنے پڑھی گئی چونکہ اس کا بیان گذشتہ جمعہ کو شروع کیا گیا تھا اس لئے اس کی تکمیل کا بھی خیال آیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى))

جو کہ حدیث کے کئی جملوں میں سے ایک جملہ ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اوپر والے ہاتھ سے مراد دینے والا اور نیچے والے ہاتھ سے مراد لینے والا ہے۔ چونکہ آدمی جب کسی کو کوئی چیز دیتا ہے تو اس کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے اور لینے والے کا ہاتھ نیچے ہوتا ہے، لیکن یہاں مراد محض اوپر اور نیچے والا نہیں بلکہ یہ لینے اور دینے سے کنایہ ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

بعض پیر ایسے بھی ہوتے ہیں

مشہور ہے کہ بعض جاہل قسم کے پیروں نے اپنے مریدوں کو تاکید کی ہوتی ہے کہ جب کوئی ہدیہ

☆ اصلاحی مواعظ (۲/۹۵۔۱۱۸)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غني، رقم: ۱۳۳۸، مسند أحمد، رقم: ۱۵۰۲۶

آئے تو دینے والا ہاتھ نیچے رکھے اور پیر صاحب اوپر سے اُٹھائیں تاکہ مذکورہ بالا حدیث کا مصداق نہ بننا پڑے، حالانکہ حقیقت میں مراد اوپر اور نیچے ہونا نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے، اور اشارہ اس طرف کرنا مقصود ہے کہ انسان کو چاہئے کہ حتی الامکان اپنی حاجت کسی دوسرے کے سامنے پیش نہ کرے اور اس سے سوال نہ کرے بلکہ اس بات کے مواقع پیدا کرے کہ خود دے۔

سوال کرنا کس کے لئے جائز ہے؟

حدیث میں ہے کہ جس شخص کے پاس ایک دن اور ایک رات کی غذا موجود ہو تو اس کے لئے سوال کرنا حرام ہے۔ دیکھیں شریعت میں سوال کے بارے میں اس قدر سخت حکم رکھا گیا ہے نیز حدیث میں ہے کہ ''جس شخص کے لئے سوال کرنا حلال نہ ہو اور وہ پھر بھی لوگوں سے سوال کرے تو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر خراشوں اور زخموں کے نشان ہوں گے''(۱)

یعنی وہ سوال جو اس نے لوگوں سے کیا وہ چہرے کی خراشوں اور زخموں کی صورت میں اس کے سامنے آئے گا۔ اور سوال میں صرف یہ داخل نہیں کہ آدمی پیالہ لے کر بھیک مانگے بلکہ کسی بھی شخص سے پیسے، کھانے کی چیز مانگنا خواہ وہ خفیہ طریقے ہی سے ہو سوال میں داخل ہے اور اس کا حکم بھی یہی ہے کہ یہ حرام ہے۔

گداگری سے متعلق ایک اہم مسئلہ

اس کے ساتھ ہی فقہاء کرام نے یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ جس شخص کے لئے سوال کرنا حرام ہو اس کو دینا بھی ناجائز ہے۔ اس لئے کہ جب وہ سوال کر رہا ہے تو حرام کا ارتکاب کر رہا ہے، اور اگر آپ نے اس کو دے دیا تو یہ گناہ میں معاونت اور امداد شمار ہوگی، لہٰذا ایسے شخص کو دینا بھی ناجائز ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں معلوم نہ ہو تو محض بدگمانی سے یا اس کے ظاہر حال سے اندازہ لگانا کہ یہ تو پیشہ ور آدمی ہے، دینے سے نہیں رکنا چاہئے۔

صدقہ کرنے کے بارے میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل

مجھے یاد آیا کہ جب ہم نئے نئے دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے تو ایک مرتبہ میں اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہٗ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا ہوا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے گاڑی سگنل پر رکی۔ ایسی

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزکاۃ عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء من تحلّ له الزکوۃ، رقم: ۵۸۸، سنن أبی داؤد، کتاب الزکاۃ، رقم: ۱۳۸۵

جگہوں پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ بھکاری بہت زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں۔ایسے ہی ایک بھکاری آ گیا اور اس نے کچھ مانگا۔حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ نے اسے کچھ نکال کر دے دیا۔ہم نے چونکہ اس وقت تازہ تازہ پڑھ رکھا تھا کہ جس شخص کے لئے سوال کرنا حرام ہو، اس کو دینا بھی ناجائز ہے تو میں نے اپنے اس تازہ مسئلے کی یاد کی وجہ سے حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ سے پوچھا کہ حضرت! یہ تو سب پیشہ ور قسم کے بھکاری ہوتے ہیں اور ان کو تو سوال کرنا ہی حلال نہیں ہوتا اور علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے تو لکھا ہے کہ اس کو دینا بھی جائز نہیں ہوتا لہٰذا یہ مستحق بھی نہیں ہے۔تو حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ نے جو جملہ ارشاد فرمایا وہ انہی کے مقام کی بات ہے۔فرمایا کہ بھئی! یہ کہاں کا استحقاق اور مستحق لیے پھرتے ہو، ذرا یہ تو بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں ہی مستحق ہونے کی بناء پر دینے کا فیصلہ کر لیں تو ہمارا اور تمہارا کیا حق بنتا ہے؟ یہ جو رزق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل رہا ہے، اور اس کی نعمتیں تم پر نچھاور ہو کر بارش کی طرح برس رہی ہیں، کیا تم اس کے مستحق ہو؟ اگر تم اپنے اعمال اور اپنے خیالاتِ زندگی کو دیکھو تو کوئی استحقاق دُور دُور سے بھی نظر نہیں آتا بلکہ اس بات کے مستحق ہیں کہ رزق کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔

تو اگر اللہ تعالیٰ مستحق اور غیر مستحق کی بنیاد پر دینے لگے تو پھر ہمارا کیا حال بنے گا؟ اصل بات یہ تھی کہ فقہاء کرام نے یہ مسئلہ اسی شخص کے بارے میں کہا تھا جس کے بارے میں متعین طور پر معلوم ہو کہ اس کے لئے سوال کرنا حلال نہیں ہے اور اس کو دینے سے گناہ میں مزید ابتلاء کا اندیشہ ہو، لیکن اگر کوئی بھکاری آ جائے تو اگرچہ قرائن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ پیشہ ور ہے لیکن چونکہ یقینی طور پر معلوم نہیں اس لئے اس کو جھڑکنے کے بجائے دے دینا بہتر ہے۔اور اسی کو قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَأَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾(۱)

کہ سائل کو مت جھڑکیے کیونکہ اس کے استحقاق کی حقیقت کا تو یقینی علم نہیں، ہاں اپنے نہ دینے کے عوامل میں اپنی حاجت و موقع اور حوصلہ دیکھا جا سکتا ہے مگر جھڑکنے سے ہر حال پر پرہیز کیا جائے۔

اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا بہترین صدقہ ہے

شروع میں تلاوت کی گئی حدیث کا دوسرا جملہ ہے:

((وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ))

''جب خرچ کرنے کا موقع آئے تو اس کی ابتداء ان لوگوں سے کرو جو تمہاری زیرِ کفالت ہیں''

(۱) الضحیٰ: ۱۰

مثلاً بیوی، بچے اور اگر والدین معذور ہوں تو ان کو اور دوسرے اعزا و اقرباء کو دینے سے پہل کریں، ان کو دینا بھی ثواب ہے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ سب سے بہترین صدقہ وہ ہے جو انسان اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے۔(۱)

صدقہ کرنے میں اعتدال کی تعلیم

آنحضرت ﷺ نے حدیث کا تیسرا جملہ ارشاد فرمایا:

((وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى))

یعنی ایسا نہ ہو کہ پہلے تو دے دیا اب دوسروں سے مانگتے پھر رہے ہیں تو اس صدقہ کا کوئی حاصل نہیں۔ صدقہ بہترین وہی ہے کہ اتنا دو کہ اس کے بعد تمہیں احتیاج نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین عطا فرمایا ہے کہ جو ہر چیز میں اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔ اب دیکھیں! صدقہ کے بیشمار فضائل ہیں لیکن فرمایا کہ اس حد تک دو کہ اس میں بھی اعتدال کو مدِنظر رکھو کہ خود تمہیں پریشانی نہ پیش آجائے، کیونکہ زکوٰۃ ہم پر فرض ہے وہ مال کا چالیسواں حصہ ہے اور اس کے علاوہ جو ہے وہ مستحب ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ آج تو جوش میں آکر سب دے دیا جائے اور پھر بعد میں حسرت اور افسوس کریں تو ایک نیک کام کرنے کے بعد اس پر حسرت میں مبتلا ہو جاؤ گے جو اتنا برا ہے کہ اس سے نہ کرنا بہتر ہے۔ اسی لئے قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ إِذَآ أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا﴾(۲)

''جو لوگ خرچ کرتے ہیں وہ نہ تو بہت اسراف کرتے ہیں اور نہ بہت بخل سے کام لیتے ہیں اور صحیح اعتدال کا راستہ ان دونوں کے درمیان ہے''

لہٰذا خرچ میں اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ انسان اعتدال سے کام لے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ﴾(۳)

''لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ تو آپ فرما دیجئے کہ جو زائد ہو وہ خرچ کرو''

صدقہ کرنے کے بارے میں ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے بارے میں بعض روایات ایسی آتی ہیں کہ

(۱) صحيح مسلم، كتاب الوصية، باب الوصية بالثلث، رقم: ۳۰۷۹

(۲) الفرقان: ٦٧ (۳) البقرة: ۲۱۹

جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے۔ ایک طرف اس بات کا حکم ہے کہ صدقہ اتنا کرو کہ تمہیں پریشانی نہ ہو اور دوسری طرف خود اپنے گھر تین تین مہینے تک آگ نہیں جلتی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم بعض اوقات متواتر تین مہینے تک ایسے رہتے تھے کہ ہمارے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ پھر کس طرح گزارا ہوتا تھا؟ تو فرمایا:

"اَلْأَسْوَدَانِ اَلتَّمْرُ وَالْمَاءُ"

''دو چیزوں پر گزارا ہوتا تھا کھجور اور پانی''(۱)

ایک روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک مرتبہ مصلے پر نماز پڑھانے کے لئے تشریف لائے تو ابھی اقامت ہی کہی گئی تھی کہ ایک دم کوئی خیال آیا اور آپ ﷺ گھر تشریف لے گئے اور گھر سے پھر واپس تشریف لائے۔ بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آج آپ نے ایسا عمل فرمایا جو پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ مصلے پر کھڑے ہونے کے بعد گھر تشریف لے گئے اور پھر واپس تشریف لائے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب میں مصلے پر کھڑا ہوا تو مجھے خیال آیا کہ میرے گھر میں سات دینار پڑے رہ گئے ہیں، مجھے اللہ کے سامنے حاضر ہوتے ہوئے شرم آئی کہ اس حال میں سورج غروب ہو کہ میرے پاس سات دینار ہوں، لہٰذا پہلے جا کر ان کو صدقہ کیا پھر نماز پڑھانے آیا ہوں۔ گویا روایات کا حاصل یہ نکلا کہ جب آپ کے پاس کوئی آتا تو آپ اسے دے دیتے تھے کہ آپ کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہتا تھا۔(۲)

تو ایک طرف آپ ﷺ کا عمل ہے اور دوسری طرف یہ فرمان ہے کہ صدقہ اتنا کرو جس سے پریشانی نہ ہو۔ تو خوب سمجھ لیجئے کہ آنحضرت ﷺ اپنی تمام ازواجِ مطہرات کا نفقہ اور خرچ ہر سال، شروع سال میں اکٹھا دے دیتے تھے، لہٰذا جو نفقہ واجب تھا وہ ادا ہو جاتا تھا۔ اور ازواجِ مطہرات بھی سخی النفس تھیں، وہ بھی صدقہ کر دیتی تھیں اور آنحضرت ﷺ خود بھی صدقہ کرتے رہتے تھے، لیکن ازواجِ مطہرات اپنا نفقہ وصول کرنے کے بعد اپنی خوشی اور رغبت سے صدقہ کرتی تھیں۔

اور ایسا بھی نہ تھا کہ اگر کچھ بھی نہ ہو تو پھر دوسروں سے مانگنا پڑے، کیونکہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا وہاں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ طریقہ ہم جیسے کمزور لوگوں کے لئے نہیں ہے بلکہ فرمایا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبی وأصحابه وتخلیهم من الدنیا، رقم: ۵۹۷۸، صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقاق، باب، رقم: ۵۲۸۲، مسند أحمد، رقم: ۲۳۲۸٤

(۲) مسند أحمد، رقم: ۲٤۳۱۷

((خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى))

''بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنے پیچھے غناء چھوڑ جائے''

خلاصہ یہ کہ انسان کو اپنے گھر میں بھی کچھ رکھنا چاہئے اور حضور اکرم ﷺ کے اپنے عمل کو سب کے لئے اصل حکم نہ سمجھا جائے۔

صوفیاء کرام کے احوال کا جائزہ

اسی طرح بعض صوفیاء کرام کے متعلق بھی ایسے ہی واقعات سننے میں آتے ہیں، مثلاً حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ جو بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے، گنگوہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے گھر اور خانقاہ میں عالمِ استغراق میں بیٹھے رہتے تھے اور گھر میں کچھ کھانے پینے کو نہیں ہوتا تھا اور ہفتہ ہفتہ فاقے گزر جاتے تھے۔ ایک مرتبہ دس دن ایسے ہی گزر گئے، بچے رو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ کھانے کو کچھ نہیں ہے تو ذرا سا منہ اُٹھا کر تین مرتبہ فرمایا کہ بہت دیگیں چڑھ رہی ہیں اور اس میں سے تمہارے لئے بھی بہت سا کھانا آنے والا ہے۔ اشارہ ان دیگوں کی طرف تھا جو جنت میں تیار ہو رہی ہیں۔ تو ادھر بچے بھوکے ہیں اور خود جنت کی باتوں میں محو ہیں۔ تو یہ بات بظاہر حدیثِ مذکور کے خلاف نظر آتی ہے کہ بچوں کے لئے خصوصاً نابالغ بچوں کے لئے تو ایسا حق ہے کہ وہ معاف کرنے سے بھی نہیں ہوتا یہ تو نفقہ ضروری ہوتا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ یہ واقعات ان کے اس وقت کے خاص غلبۂ حال کی کیفیت میں واقع ہوتے ہیں۔ بعض بزرگوں پر استغراق کا ایسا عالم طاری ہوتا ہے کہ دنیا و مافیہا کا ہوش ہی نہیں رہتا تو اس حالت میں وہ جو بھی عمل کریں، اس میں معذور ہوتے ہیں۔ جیسے ایک آدمی بے ہوش ہو اور وہ اسی مدہوشی کے عالم میں کوئی کام ایسا کرتا ہے تو وہ اللہ کے یہاں قابلِ مواخذہ نہیں ہے بلکہ معاف ہے، حتیٰ کہ اگر اس پر مسلسل چھ نمازوں کا وقت گزر گیا تو اس پر نماز بھی معاف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح صوفیاء کرام بھی ایسے غلبۂ حال کی وجہ سے مکلّف نہیں رہتے۔ لیکن دوسرے کے لئے ان کے اس فعل کی تقلید کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ ان کی معذوری کی کیفیت ہوتی ہے۔

حدیث کا آخری جملہ

((وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ))

''جو شخص پاکدامنی اختیار کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کو پاکدامنی عطا فرما دیتے ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے یہ چاہے کہ میں کسی کا محتاج نہ بنوں تو اللہ تعالیٰ اس کو بے نیازی عطا فرما دیتے ہیں''

یعنی جو شخص سچے دل سے عفت والی زندگی یا اللہ کے علاوہ دوسروں کی محتاجی سے بچنے والی زندگی کا طلبگار ہو تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمادیتے ہیں اگرچہ مشکلات اور مصائب آئیں۔

ایک عجیب وغریب واقعہ

حافظ ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں ایک عجیب وغریب سچا واقعہ نقل کیا ہے کہ روسی ترکستان کی طرف تین بزرگ رہتے تھے اور تینوں کا نام ''محمد'' تھا۔ ایک تو محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ جن کی تفسیر، تفسیر ابن جریر کے نام سے مشہور ہے، اور دوسرے محمد بن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے محدث تھے اور ان کی ''صحیفہ خزیمہ'' حدیث کی مشہور کتاب ہے، اور تیسرے محمد بن نصرانی المروزی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ بہت بڑے محدث تھے اور ''قیام اللیل'' کے نام سے ان کی ایک تصنیف مشہور ہے۔

ابتداء میں اپنے شہر میں رہ کر علم حاصل کیا لیکن سُن رکھا تھا کہ بڑے بڑے علماء، محدثین، فقہاء اور مفسرین عراق بغداد کے اندر رہنے والے ہیں۔ چنانچہ ان سے علم حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ لیکن کہاں ترکستان اور کہاں بغداد اور عراق؟ بالآخر سفر کے ارادے سے جو کچھ بھی زادِ سفر تھا، لے کر بغداد کی طرف چل پڑے۔ اب ہوائی جہاز یا ریل گاڑی کا زمانہ تو تھا نہیں کہ اتنا لمبا سفر آسانی سے طے ہو جاتا۔ خدا جانے کسی گھوڑے یا اُونٹ پر یا پیدل ہی سفر طے کیا ہوگا۔ مہینوں کا سفر طے کرنے کے بعد ایسی حالت میں بغداد پہنچے کہ زادِ سفر ختم ہو چکا تھا۔ ایک دانہ بھی کھانے کے لئے موجود نہ تھا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ بغداد میں کوئی جاننے والا بھی نہیں کہ اسی کے پاس جا کر ٹھہر جائیں۔ بہر حال شہر کے کنارے ایک مسجد تھی اس میں جا کر ٹھہر گئے اور آپس میں مشورہ کیا کہ زادِ سفر تو ختم ہو گیا ہے اور آگے جانے سے پہلے کھانے پینے کا بندوبست کرنا ہے، اس لئے کہیں مزدوری کرتے ہیں تاکہ کچھ پیسے حاصل ہو جائیں اور کھانے پینے کا سامان حاصل ہو جائے، پھر کسی عالم کے پاس جا کر علم حاصل کریں۔ چنانچہ مزدوری کی تلاش میں نکلے لیکن کہیں مزدوری نہیں ملی اور سارا دن چکر لگا کر واپس آ گئے، اسی حال میں تین دن فاقے کے گزر گئے اور کام بھی نہیں ملا۔ بالآخر تینوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب ایسی حالت ہو گئی ہے کہ اب اگر کچھ کھانے کو نہ ملا تو جان جانے کا اندیشہ ہے اور اس حال میں اللہ تعالیٰ نے سوال کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ لہٰذا اب سوائے سوال کرنے کے اور کسی کے پاس جا کر اپنی حالت بیان کرنے کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ جبکہ تینوں بزرگ ایسے تھے کہ ساری عمر کسی نے ایسا کام کیا ہی نہیں تھا، چنانچہ انہوں نے کہا کہ ایک آدمی ہی جا کر یہ کام کرے۔ پھر یہ سوال ہوا کہ کون کرے؟ تو قرعہ ڈالنے کی تجویز پر عمل کیا گیا، اس میں سے محمد بن جریر طبری کا نام نکلا۔ محمد بن جریر طبری نے کہا کہ قرعہ میں نام نکلنے کی وجہ سے جانا تو پڑے گا لیکن جانے سے پہلے دو رکعت نفل پڑھنے کی مہلت دے دو، چنانچہ انہوں نے

اجازت دے دی۔ محمد بن جریر نے وضو کر کے دو رکعت نفل کی نیت باندھ لی اور نماز پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ اے اللہ! یہ ہاتھ آج تک آپ کی بارگاہ کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں پھیلے، آج ایسی مجبوری آپڑی ہے کہ اگر آپ اپنے فضل سے کوئی ایسا راستہ نکالیں تو یہ ہاتھ کسی دوسرے کے سامنے نہیں پھیلیں گے، اور آپ تو ہر چیز پر قادر ہیں۔ نجانے ان کی دعا میں کیا تاثیر تھی کہ ابھی دعا مانگ ہی رہے تھے کہ مسجد کے دروازے پر ایک آدمی ایک خوان لیے کھڑا نظر آیا، اور تینوں بزرگوں کا نام لے کر ان کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ یہ بڑے حیران ہوئے کہ پورے بغداد میں ہمیں جاننے والا کوئی نہیں، ہم تو اجنبی اور مسافر ہیں۔ غرض اس نے کہا کہ آپ کے لئے حاکمِ بغداد نے کھانا بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کھانا تو ہم بعد میں لیں گے لیکن یہ بتاؤ کہ بغداد کے حاکم سے ہمارا کیا تعلق؟ بغداد شہر میں تو ہمیں کوئی جانتا ہی نہیں اور نہ ہم کسی کو جانتے ہیں۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ آج رات جب بغداد کا حاکم سویا تو اسے خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت ہوئی اور آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تم کیسے بغداد کے حاکم ہو؟ تمہارے شہر کے اندر ہمارے تین مہمان اس حال میں پڑے ہیں کہ ان پر تین دن سے فاقہ ہے اور ان کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں، پھر خواب میں آنحضرت ﷺ نے ان کا پورا پتہ بتایا کہ بغداد کی فلاں مسجد ہے اور ان میں سے ایک کا نام محمد بن جریر ہے، دوسرے کا نام محمد بن خزیمہ اور تیسرے کا نام محمد بن نصر ہے۔ تو حاکمِ بغداد نے بیدار ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مجھے یہ کھانا دے کر آپ حضرات کی خدمت میں بھیجا ہے۔ تو ابھی دعا سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرما دیا۔[1] اصل بات تو یہ ہے کہ یہاں مانگنے کی دیر ہے اور حقیقت میں ہم لوگ مانگنا بھی نہیں جانتے، مانگنا آجائے تو اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

کوئی جو ناشناس اداء ہو تو کیا علاج؟
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

اگر یہ سوال ہو جائے

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یوں سمجھو اور ذرا تصور کرو کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں حاضر ہو، میدانِ حشر قائم ہے اور نامۂ اعمال کے دفتر کھلے ہوئے ہیں، سوال و جواب ہو رہا ہے اور پوچھا جا رہا ہے کہ تم نے یہ عمل کیوں کیا؟ فلاں معصیت کیوں کی؟ تو تم نے جواب دے دیا کہ ہمارا ماحول خراب ہو چکا تھا، چاروں طرف گناہ کا راج تھا، حالات بگڑ چکے تھے، بچنا چاہتے تھے مگر بچ نہیں سکتے تھے کیونکہ سنبھلنا ہی

(۱) سير أعلام النبلاء (۱۴/ ۲۷۰)، تذكرة الحفاظ (۲/۷۵۳)

مشکل تھا، لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے یہ پوچھ لیا کہ تمہارے لئے گناہوں سے بچنا مشکل تھا تو کیا ہمارے لئے بچانا بھی مشکل تھا؟ ہم سے کیوں نہ بچنے کی توفیق مانگی؟ کہ اے اللہ! موجودہ حالات میرے بس سے باہر ہیں تو ہی مجھے بچنے کی توفیق عطا فرما۔ ہم پورے قرآن میں بار بار اعلان کرتے رہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (۱)

''بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''

جب ہم ہر چیز پر قادر تھے تو ہم سے اسی قدرت کے واسطے سے کیوں نہ مانگا؟ تو پھر کیا جواب دو گے؟ تو حضرت فرماتے تھے کہ اس لئے اگر آدمی ابھی بچنا چاہے تو عذر اگرچہ وہی رہے لیکن اللہ سے مانگے اور اسی کی طرف رجوع کرے اور جب کسی گناہ کا محرک سامنے آئے تو فوراً اللہ کی طرف رجوع کرے۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں آتا ہے:

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا﴾ (۲)

''عورت نے ان کا فکر کیا اور انہوں نے عورت کا فکر کیا''

لیکن جب اس بڑی آزمائش میں گھر گئے تو فوراً اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آگئے، اس نے قبول فرما کر آپ کی مدد کی۔

آیت کریمہ کی فضیلت

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ بڑی بڑی عجیب باتیں فرماتے تھے۔ ایک دن فرمانے لگے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ سنایا کہ وہ کس طرح مچھلی کے پیٹ میں گئے کہ ان کو کشتی والوں نے پھینک دیا، مچھلی آئی اور نگل گئی اور تین دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہے اور تاریکیوں میں گھرے ہوئے پکارنے لگے۔

﴿لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِينَ﴾ (۳)

اور مسلسل تین دن تک پڑھتے رہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

﴿فَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ﴾ (٤)

ہم نے حضرت یونس علیہ السلام کو اس غم سے جس میں وہ مبتلا تھے، نجات دی اور تین دن کے بعد مچھلی کے پیٹ سے نکال لیا۔ اگلا جملہ ارشاد فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِينَ﴾

''اسی طرح ہم مومنوں کو نجات دیتے ہیں''

---

(۱) الطلاق: ۱۲ (۲) یوسف: ۲٤ (۳) الانبیاء: ۸۷ (٤) الانبیاء: ۸۸

تو ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ مچھلی کا قصہ ہر ایک کے ساتھ پیش نہیں آتا لیکن اس کا منشاء یہ ہے کہ مچھلی کے پیٹ کی تاریکیاں تو حضرت یونس علیہ السلام نے دیکھیں لیکن گناہوں، معصیتوں اور فسق و فجور کا سامنا ہر مؤمن مرد و عورت کو پیش آتا ہے۔ گویا حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ کی تاریکی میں پھنسے اور مؤمنین گناہوں کی تاریکیوں میں پھنستے ہیں، تو جو کام حضرت یونس علیہ السلام نے کیا وہی کام ہمیں بھی کرنا ہوگا یعنی "لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" پڑھنا ہوگا، انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے فضل فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت ہمارے دلوں میں ڈال دے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

استغفار کی توفیق بھی بہت بڑی چیز ہے

اور اسی طرح حضرت یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ دعا تو مشرق کی طرف جانے کی کر رہا ہے اور سفر مغرب کی طرف کر رہا ہے، کیونکہ وہ دعا نہ ہوگی بلکہ وہ تو مذاق ہو جائے گا۔ اور پھر بھی بتقاضۂ بشریت کوئی کمی رہ جائے اور کسی گناہ میں مبتلاء ہو جائے تو استغفار کی توفیق ہو جانا بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ چنانچہ اس توفیق سے وہ گناہ بھی تمہارے حق میں بہترین کیا گیا، اس لئے کہ اس کے نتیجے میں دل میں ملامت پیدا ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، اس لئے یہ دعا کسی بھی حال میں فائدے سے خالی نہیں۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو چاہئے کہ ہر روز سونے سے پہلے اس کو پڑھا کرے اور دعا کیا کرے کہ اے اللہ! حالات ایسے ہیں، معاشرہ بگڑا ہوا ہے اور معصیتوں کا ایک طوفان چھایا ہوا ہے، چاروں طرف گناہوں کی آگ لگی ہوئی ہے جس کی وجہ سے بچنا بہت مشکل ہے، میں توبہ کی ہمت اور توجہ کرتا ہوں لیکن وہ برقرار نہیں رہتی، لہٰذا حوصلہ عطا فرما دیجئے۔ یہ عمل روزانہ کریں گے تو ایک انقلاب آپ کی زندگی میں رونما ہوگا۔ آنکھوں نے اس دعا کے بیشمار کرشمے دیکھے ہیں، اگرچہ یہ نسخہ بہت آسان سا ہے لیکن اس کے فوائد بڑے عظیم الشان ہیں، مگر چونکہ معمولی ہے اس لئے توجہ ہی نہیں کی جاتی اور جب توجہ دلائی جاتی ہے تو سوچتے ہیں کہ کل کریں گے۔ یاد رکھیں! جو کام کل پر ٹالا گیا وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا فوری طور پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

مفہومِ حدیث پر بھی عمل ہو جائے گا۔ غرض بات چل رہی تھی صدقہ کی جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر صدقہ کرنے کی تلقین فرمائی۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

فضیلتِ صدقہ سے متعلق آیات

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ﴾(۱)

''اے ایمان والو! (نیک کام میں) خرچ کیا کرو، عمدہ چیز ہو، اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیا ہے اور ردّی (ناکارہ) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کرو، حالانکہ تم کبھی اس کے لینے والے نہیں، ہاں مگر چشم پوشی کر جاؤ (تو اور بات ہے)''

صدقہ کے متعلق قرآن وحدیث میں ایک اہم مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگ سب سے گھٹیا اور بے قیمت صدقہ میں دے دیتے ہیں جیسا کہ ہمارے یہاں اُردو میں مثل مشہور ہے کہ ''مری ہوئی بھیڑ اللہ کے نام'' اور اسی طرزِ عمل پر قرآن کریم نے آیت مذکورہ میں توجہ دلائی ہے۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾

''تم نیکی کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے جب تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو''(۲)

اور ہمارے معاشرے میں یہ عمل پایا جاتا ہے کہ بیکار چیز صدقہ میں دے دی جاتی ہے۔ جس سے صدقہ کی فضیلت جو کہ مقصود ہے، حاصل نہیں ہوتی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے حضرات صحابہ کرام کا حال یہ تھا کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جوق در جوق آنا شروع ہو گئے اور ہر شخص نے اپنی مملوکہ چیزوں میں سے سب سے زیادہ محبوب چیز آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کر دی۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی سخاوت

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے اپنی تمام مملوکات میں سے زیادہ محبوب وہ باغ ہے جس میں ایک کنواں ہے جس کا پانی بڑا میٹھا تھا اور بڑی وافر مقدار میں تھا۔ آنحضرت ﷺ اکثر وہاں پر تشریف لے جاتے اور پانی نوش فرماتے تھے۔ تو وہ باغ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اور اللہ کا ارشاد ہے:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾(۳)

(۱) البقرة: ۲۶۷ (۲) آل عمران: ۹۲ (۳) آل عمران: ۹۲

اس لئے میں اسے صدقہ کرنا چاہتا ہوں تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((بَخٍ ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ))

''واہ واہ! یہ تو بڑے نفع کا مال ہے''

اور پھر مشورہ دیا کہ اپنے قریبی اعزا کو صدقہ کرو چنانچہ انہوں نے اسے اپنی قریبی اعزا جن میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ وغیرہ بھی تھے، پر صدقہ کر دیا۔(۱)

دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جذبہ

ایک مرتبہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے اپنے سارے مال میں سب سے زیادہ پسندیدہ اپنا وہ گھوڑا ہے جسے میں نے بڑے پیسے خرچ کر کے شوق سے حاصل کیا تھا، میں اسے صدقہ کرنا چاہا ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مذکور پر عمل ہو جائے۔(۲)

ایک اور صحابی رضی اللہ عنہ نے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنی تمام مملوکات میں غور کیا تو مجھے اپنی کنیز سب سے زیادہ محبوب نظر آئی، میں اسے صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔(۳)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو اس حد تک عمل فرماتے تھے کہ سب سے زیادہ محبوب چیز صدقہ فرما دیتے تھے حالانکہ حکم صرف محبوب چیز کو خرچ کرنا تھا لیکن صحابہ کرام اس میں زیادہ ثواب سمجھتے تھے۔

زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حقوق ہیں

اس لئے ہمیں چاہئے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں۔ کہ زکوٰۃ فرض ہے ہی لیکن اس کے ادا کرنے سے چھٹی نہیں ہو جاتی۔ جس طرح نماز میں فرائض پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا بلکہ سنتیں بھی پڑھنی پڑتی ہیں اس کے بغیر نماز مکمل نہیں ہوتی، اس طرح زکوٰۃ ادا کر کے یہ سمجھنا کہ اب آپ کو کچھ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں رہی یہ بڑی غلط فہمی کی بات ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب تفسير القرآن، باب لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون، رقم: ٤١٨٩، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب فضل النفقة والصدقة على الأقربين، رقم: ١٦٦٤، مسند أحمد، رقم: ١١٩٨٥

(۲) تفسير الطبري، رقم: ٧٣٩٧ (٥٩٢/٦)، فتح القدير للشوكاني (٥٤٣/١)، تفسير القرطبي (١٣٢/٤) یہ واقعہ صحابی رسول ﷺ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔

(۳) تفسير ابن كثير (٧٤/٢)، یہ واقعہ صحابی رسول ﷺ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔

((إِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكٰوةِ))

''انسان کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حق ہیں (یعنی صدقات وغیرہ)''(۱)

چنانچہ ہمارے بزرگوں کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ نکال کر الگ کر لیتے تھے تا کہ صدقہ کرسکیں۔

صدقہ کرنے میں بزرگوں کا معمول

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا ہے کہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ اپنے مال کا خمس یعنی پانچواں حصہ جو کہ بیس فیصد بنتا ہے نکال کر ایک الگ تھیلے میں رکھ لیتے تھے تا کہ ان کو مصارف خیر میں خرچ کرسکیں۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس اللہ سرہ کے بارے میں میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ وہ اپنی املاک کا دسواں حصہ اسی کام کے لئے نکالا کرتے تھے۔ اور میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کا معمول بھی یہی تھا۔ بلکہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کر رکھا تھا کہ جو آمدنی محنت سے حاصل ہو اس کا بیسواں حصہ اور بلا محنت کے اس کا دسواں حصہ نکالا کرتے تھے۔ اور ایک تھیلا بنا رکھا تھا جس پر ''صدقات وخیرات'' لکھا ہوا تھا، جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خرچ کرنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے اور وقت پر انسان کو سوچنا نہیں پڑتا۔ میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ کو دیکھا کہ ان کے پاس دس روپے آئے تو فوراً اس میں سے ایک روپیہ الگ کرنا چاہا لیکن پیسے ٹوٹے ہوئے نہ تھے تو کسی کو بھیج کر ٹوٹے ہوئے پیسے منگوائے اور اس میں سے ایک روپیہ اس تھیلے میں ڈال دیا۔ اس اہتمام کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس تھیلے میں ایسی برکت رکھی تھی کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ سے اس تھیلے کے ذریعے ایسے ایسے کام لیے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے کہ یہاں بیٹھے بیٹھے اپنے ہندوستان کے اعزاء کے کام کروا رہے ہیں اور اسی کی برکت سے کبھی وہ تھیلا میں نے خالی نہیں دیکھا۔ یہ کام بظاہر دشوار دکھائی دیتا ہے لیکن اس سے بہت سے لوگوں کے حقوق ادا ہو جاتے ہیں اور یہ کام ہر انسان کرسکتا ہے خواہ کتنا ہی غریب ہو۔ مثلاً ایک آدمی کے پاس ایک روپیہ آیا اور اس نے ایک آنہ نکال لیا، ہوتے ہوتے وہ ایک روپیہ بن گیا اور وہ اس نے صدقہ کر دیا تو وہ صدقہ اور ایک امیر آدمی کا ایک لاکھ میں سے ایک ہزار کا صدقہ دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کہ دونوں نے برابر حصہ نکالا ہے اور اللہ تعالیٰ گنتی کو نہیں دیکھتے، وہ تو دل اور جذبہ کو دیکھتے ہیں۔ دنیا اور مال کی محبت سارے فساد کی جڑ ہے، اس کو ختم کرنے کے لئے ہی

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزکاۃ عن رسول اللہ، باب ما جاء أن فی المال حقا سوی الزکاۃ، رقم: ۵۹۵، سنن الدارمی، کتاب الزکاۃ، رقم: ۱۵۸۱۔

صدقات کا حکم اور ترغیب دی گئی ہے۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ والی حدیث

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ انصارِ مدینہ میں کھجوروں کے باغات کے اعتبار سے سب سے زیادہ مالدار تھے اور انہیں اپنے مالوں میں سب سے زیادہ محبوب بیرحاء تھا جو مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے واقع تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لاتے اور اس میں پاکیزہ پانی پیا کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ) نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ باغ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے صدقہ ہے، اللہ تعالیٰ کے پاس اس کی بہتری اور ذخیرہ ہونے کی اُمید رکھتا ہوں۔ پس یا رسول اللہ! آپ جہاں مناسب خیال فرمائیں اسے تصرف میں لائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا: واہ واہ، وہ تو نفع والا مال ہے اور میں نے تمہاری بات سن لی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تم اسے رشتہ داروں میں تقسیم کردو۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ایسا ہی کروں گا، اور اسے اپنے رشتے داروں اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کردیا۔ (۱)

اللہ تعالیٰ ہمیں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں اور ان کی طرح اللہ کی راہ پر خرچ کرنے والا بنائیں۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون، رقم: ٤١٨٩، صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فضل النفقة والصدقة علی الأقربین، رقم: ١٦٦٤، مسند أحمد، رقم: ١١٩٨٥

خوف اور اُمید ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی آلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ، أَمَّا بَعْدُ!

گذشتہ رمضان ۱۴۲۱ھ میں "انفاسِ عیسیٰ" کے جس حصے کی تشریح کی تھی، وہ "تعلق مع اللہ اور محبتِ خداوندی" سے متعلق تھا، الحمد للہ بقدرِ ضرورت اس کی تشریح ہوگئی تھی، آگے ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے، جس کا عنوان ہے "خوف ورجا" اس کے بارے میں حضرت والا کے ملفوظات یہاں پر مذکور ہیں، اللہ کے نام پر اس رمضان ۱۴۲۲ھ میں یہ باب شروع کرتے ہیں۔

ایمان "خوف" اور "رجا" کے درمیان ہے

جن باطنی اخلاق اور اعمال کا حصول انسان کے لئے ضروری اور مطلوب ہے، ان میں "خوف ورجا" بھی ہیں۔ "خوف" کے معنی ہیں "اللہ کا ڈر" کیونکہ اگر انسان کو اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہو تو آدمی غفلت میں، گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور "رجا" کے معنی ہیں "اُمید" یعنی انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا ڈر بھی ہو، اور اللہ جل شانہ کی ذات سے اور اس کی رحمت سے اُمید بھی ہو، دونوں چیزیں جب ساتھ ساتھ ہوں تب ایمان کامل ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ "الإیمان بین الخوف والرجاء"[1] یعنی ایمان خوف ورجا کے درمیان ہے۔ اگر ان دونوں میں توازن صحیح ہو جائے تو ایمان کامل ہو جائے۔ جتنا انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا چاہئے، اتنا ہی خوف ہو، اس سے کم زیادہ نہیں ہو، اسی طرح جتنی "رجا" ہونی چاہئے، اتنی ہی رجا ہو، اس سے کم زیادہ نہیں ہو، تو اس انسان کا ایمان کامل ہے۔

☆ اصلاحی مجالس (۶/۲۷۳ تا ۲۸۶)

(۱) قرآن وحدیث کی مختلف نصوص کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ ایمان خوف اور اُمید کی درمیانی کیفیت کا نام ہے، البتہ ہمیں نبی پاک ﷺ کا کوئی ارشاد ان الفاظ کے ساتھ نہیں مل سکا جو اُوپر بیان کیے گئے ہیں۔

خوف اور رجا دونوں کا ہونا ضروری ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "خوف اور رجا" دو پَر ہیں، جن کے ذریعہ صالحین اس دنیا سے جنت کی طرف پرواز کرتے ہیں، جس طرح پرندہ اپنے پروں کے ذریعہ پرواز کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کو حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ اس کے ضروری ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ خوف کے بارے میں فرمایا:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾(۱)

یعنی جو اللہ کے نیک بندے ہیں، ان کے پہلورات کے وقت اپنے بستر سے جدا رہتے ہیں، اور اپنے پروردگار کو اس حالت میں پکارتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈر بھی رہے ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے اُمید بھی رکھے ہوتے ہیں۔

رحمت کی اُمید اور جہنم کا خوف

پورے قرآن کریم میں آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کا ذکر علیحدہ اور جہنم کا ذکر علیحدہ کہیں نہیں کیا، بلکہ جہاں کہیں جنت کا ذکر فرمایا وہیں جہنم کا ذکر بھی فرمایا، اور جہاں جہنم کا ذکر فرمایا وہیں جنت کا بھی ذکر فرمایا، مجھے اس میں کہیں استثناء نظر نہیں آیا۔ یہ اس لئے کیا تا کہ ایک مرتبہ جنت کی جھلک دکھا کر لوگوں کے دلوں میں اپنی رحمت سے اُمید پیدا کریں، اور دوسری طرف جہنم کی جھلک دکھا کر لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف پیدا کریں۔ چنانچہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۙ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ﴾(۲)

یعنی میرے بندوں کو بتا دو کہ میں بڑا غفور رحیم ہوں، بڑی مغفرت کرنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہوں، اور ساتھ میں یہ بھی بتا دو کہ میرا عذاب بھی بڑا دردناک ہے، دیکھئے! دونوں باتیں ساتھ ساتھ بتادیں۔ اب رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید باندھے، اور اس کے عذاب کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے ڈرے، جب انسان دونوں چیزیں ساتھ ساتھ لے کر چلے گا تو اپنا ایمان کامل کرے گا۔

کتنا خوف ہونا چاہئے؟

اگر انسان پر تنہا "خوف" طاری ہو جائے تو وہ بھی خطرناک چیز ہے، جب خوف ہی خوف

(۱) السجدة: ١٦ (۲) الحجر: ٤٩، ٥٠

طاری ہو گیا، اور ''اُمید'' بالکل نہیں ہے تو اس کے نتیجے میں ایک طرف تو زندگی اجیرن ہو جائے گی، اور دوسری طرف ''یاس'' اور ''نا اُمیدی'' پیدا ہو جائے گی، وہ یہ سوچے گا کہ میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں، اور یہ ''نا اُمیدی'' بڑی خطرناک چیز ہے، یہ انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے، اس لئے اگر اللہ کی عظمت کا، اس کے جلال کا، اس کے عذاب کے خوف کا استحضار اس قدر ہو جائے کہ ہر وقت وہی دماغ پر چھا جائے تو آدمی کھانے سے، پینے سے رک جائے، اور دنیا کے کام بھی نہ کر سکے، اسی لئے حضورِ اقدس ﷺ نے بھی اللہ تعالیٰ سے خوف مانگا، لیکن کتنا مانگا؟ فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهِ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ))(۱)

مطلق یہ نہیں کہا کہ مجھے اپنا ڈر دیجئے، بلکہ فرمایا کہ یا اللہ! اتنا خوف دیدے جو میرے اور آپ کی معصیت کے درمیان حائل ہو جائے۔ مطلق ڈر نہیں مانگا، اس لئے کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا مطلق ڈر طاری ہو جاتا ہے، اور خوف کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس سے ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ دوسری دعا میں آپ نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُكَ مَخَافَةً تَحْجِزُنِیْ عَنْ مَعَاصِيْكَ))(۲)

اے اللہ! میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھے آپ کی معصیت سے روک دے، اس میں آپ نے قید لگا کر خوف مانگا کہ اس سے زیادہ نہیں مانگا، اس لئے کہ اگر خوف کی زیادتی کے نتیجے میں مایوسی پیدا ہو جائے تو انسان کی زندگی اجیرن ہو جائے۔

''خوف'' اور ''تقویٰ'' میں فرق

یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ قرآن کریم میں بعض جگہوں پر ''تقویٰ'' کا لفظ بھی آیا ہے، اور بعض جگہوں پر ''خوف'' کا لفظ بھی آیا ہے۔ ''تقویٰ'' کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾(۳)

یعنی اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اللہ کا حق ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید، رقم: ۳٤۲٤، پوری دعا کچھ یوں ہے: "اللّٰهم قسم لنا من خشيتك ما يحل بيننا وبين معصيك ومن طاعتك ما تبلغنا به جنتك ومن اليقين ما تهوّن به علينا مصيبات الدنيا ومتعنا بأسماعنا وأبصارنا وقوتنا ما أحييتنا واجعله الوارث منا واجعل ثأرنا على من ظلمنا وانصرنا على من عادانا ولا تجعل مصيبتنا في ديننا ولا تجعل الدنيا اكبر همّنا ولا مبلغ علمنا ولا تسلط علينا من لا يرحمنا"

(۲) مجمع الزوائد و منبع الفوائد (۱/۱٤۰)

(۳) آل عمران: ۱۰۲

جبکہ ''خوف'' کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اتنا خوف کرو جتنا کہ اللہ کا حق ہے، اس لئے کہ ''تقویٰ'' اور ''خوف'' میں فرق ہے، ''خوف'' کے معنی ہیں مطلق ڈر جس سے آدمی مرعوب ہو جائے، اور دل و دماغ پر اس کا ڈر مسلط ہو جائے، یہ ہے ''خوف''، جبکہ ''تقویٰ'' مطلق ''ڈر'' کا نام نہیں، بلکہ تقویٰ اس کیفیت کا نام ہے جو ''خوف'' کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، یعنی یہ فکر کہ جس سے مجھے خوف ہو رہا ہے، میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں، اس کیفیت کا نام ''تقویٰ'' ہے، لہٰذا ''خوف'' نام ہے ڈر کا، اور اس ڈر کی وجہ سے گناہ سے بچنے کا نام ''تقویٰ'' ہے، چنانچہ یہ ڈر کہ اللہ تعالیٰ زبردست طاقت والے ہیں، بدلہ لینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا شدید ہے، اس نے ایسی جہنم تیار کر رکھی ہے، اس تصور کے بعد جو ڈر پیدا ہو رہا ہے اس کا نام ہے ''خوف'' اور اس ڈر کی وجہ سے اگر تم جھوٹ بولنے سے بچ گئے تو اس کا نام ''تقویٰ'' ہے، اگر اس ڈر کے نتیجے میں تم غیبت سے بچ گئے، بدنظری سے بچ گئے تو اس کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

ناسخ اور منسوخ

بعض حضرات علماء یہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ جو آیت ہے:

﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾(۱)

یہ آیت منسوخ ہوگئی ہے، اور اس آیت کا ناسخ دوسری آیت ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾(۲)

یعنی پہلے یہ حکم آیا تھا کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا حق ہے ویسا تقویٰ اختیار کرو، یہ حکم سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بڑی پریشانی ہوگئی کہ یا اللہ! ہم تقویٰ کا حق کیسے ادا کر سکتے ہیں؟ ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ہم اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کریں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس پریشانی کے بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا، اور پھر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾(۳)

یعنی اتنا تقویٰ اختیار کرو، جتنا تمہاری استطاعت میں ہو۔ لہٰذا اب "حَقَّ تُقٰتِهٖ" کا مطالبہ باقی نہیں رہا۔

---

(۱) آل عمران: ۱۰۲، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اے ایمان والو! دل میں اللہ کا ویسا ہی خوف رکھو جیسا خوف رکھنا اس کا حق ہے اور خبردار! تمہیں کسی اور حالت میں موت نہ آئے، بلکہ اسی حالت میں آئے کہ تم مسلمان ہو''

(۲) التغابن: ۱۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''لہٰذا جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو''

(۳) التغابن: ۱۶

پہلی آیت دوسری آیت کی تفسیر ہے

لیکن دوسرے اہلِ علم یہ کہتے ہیں کہ ان آیات کو ناسخ اور منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں، بلکہ درحقیقت پہلی آیت دوسری آیت کی تفسیر ہے، یعنی جب یہ کہا گیا کہ جیسا اللہ کا حق ہے ویسا تقویٰ اختیار کرو، اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ڈر گئے کہ تقویٰ کا حق ہم سے کہاں ادا ہوگا؟ تو ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ تقویٰ کا حق اتنا ہی ہے جتنی تمہارے اندر طاقت ہے، ہم نے تم سے تقویٰ کا بہت اُونچا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ "حَقَّ تُقٰتِهٖ" سے مراد "مَا اسْتَطَعْتُمْ" ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی استطاعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتے "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" لہٰذا یہ دوسری آیت پہلی آیت کی تفسیر ہے۔

"احیاء العلوم" کا باب الخوف

خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اتنا "خوف" مطلوب نہیں جس کے نتیجے میں آدمی کے اندر "مایوسی" پیدا ہو جائے، اور "تقویٰ" اتنا مطلوب ہے جو استطاعت کے مطابق ہو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "احیاء العلوم" بڑی زبردست کتاب ہے، ہر چیز کے اندر اس کی عجیب شان ہے، لیکن میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ اس کتاب کا باب الخوف ایک مجلس میں پورا نہیں پڑھنا چاہئے، بلکہ مختلف مجلسوں میں تھوڑا تھوڑا پڑھنا چاہئے، اس لئے کہ اگر کوئی شخص پورے باب کو ایک مجلس میں پڑھے گا تو بعض اوقات پڑھنے والے پر "خوف" کا اتنا غلبہ ہو جائے گا جو مطلوبہ خوف سے بڑھ جائے گا، چنانچہ اس باب کو پڑھنے کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے حالات خراب ہو گئے، ان کے ذہن اُلٹ گئے، اور وہ مایوسی کی طرف چل پڑے، یہ تفصیل تو "خوف" کے بارے میں تھی۔

"اُمید" میں حدِ اعتدال مطلوب ہے

دوسری چیز "رجا" ہے، جس کے معنی ہیں "اُمید"۔ یہ "اُمید" بھی مطلوب ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید رکھنا مطلوب ہے، لیکن یہ "اُمید" بھی اعتدال کے اندر ہو، اگر "اُمید" اعتدال سے بڑھ جائے تو اس کا نام "دھوکہ" اور "غرور" ہے۔ "اُمید" اعتدال سے کس طرح بڑھ جاتی ہے؟ اس کے بارے میں ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوٰى هَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ))(۱)

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللہ، باب منه، رقم: ۲۳۸۳، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر الموت والاستعداد له، رقم: ۴۲۵۰، مسند أحمد، رقم: ۱۶۵۰۱

یعنی ''عاجز'' وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو ''خواہشات'' کے پیچھے لگائے ہوئے ہے، اس کی نفسانی خواہشات اس کو جہاں لے جارہی ہیں، وہ جارہا ہے، گناہ کرنے میں کبھی کوئی کھٹک نہیں ہوتی، گناہوں سے بچنے کا کوئی اہتمام نہیں، دل میں جو خواہش پیدا ہورہی ہے، اس کو پورا کررہا ہے، حلال حرام ایک کررہا ہے، ساتھ میں اللہ تعالیٰ پر آرزو باندھے بیٹھا ہے، چنانچہ جب اس کو یہ کہا جائے کہ یہ کام ناجائز ہے تو جواب میں کہتا ہے کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے، اس شخص کو ''غفور رحیم'' ہونے کا دھوکہ ہوگیا ہے، یہ ''رجا'' نہیں، اس لئے کہ جب ''اُمید'' اپنی حد سے آگے بڑھ جائے تو وہ غرور اور دھوکہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا ''رجا'' کو اپنی حد پر رکھنا چاہئے، تاکہ یہ دھوکہ نہ بنے، اور ''خوف'' کو اپنی حد میں رکھنا چاہئے، تاکہ وہ ''یاس'' اور ''نااُمیدی'' میں تبدیل نہ ہوجائے، دونوں کو اپنی اپنی حد پر رکھ کر چلنا چاہئے۔

دونوں کی حدِ اعتدال کس طرح معلوم ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ انسان ان دونوں کو اپنی اپنی حد پر رکھ کر کس طرح چلے؟ کون شخص یہ بتائے گا کہ یہ ''خوف'' اپنی حد کے اندر ہے، اور یہ ''رجا'' اپنی حد کے اندر ہے؟ اور کون بتائے گا کہ تمہیں ''خوف'' کا مطلوبہ درجہ حاصل ہے، اور ''رجا'' کا بھی مطلوبہ درجہ حاصل ہے؟ یہ پتہ لگانے ہی کے لئے ''فنِ تصوف'' ہے، اور یہ پیری مریدی اس کام کے لئے ہے، اور شیخ سے رجوع اسی مقصد کے لئے کیا جاتا ہے، وہ شیخ بتاتا ہے کہ ''خوف'' کا وہ درجہ جو مطلوب ہے وہ الحمدللہ تمہیں حاصل ہوچکا ہے، اور جتنی ''رجا'' مطلوب تھی، اللہ تعالیٰ نے وہ تمہیں عطا فرمادی، اور تم اعتدال کے اندر ہو، اور اگر کوئی شخص اعتدال کی حد کے اندر نہیں ہے تو شیخ اس کی اصلاح کرکے اس کو اعتدال کی حد کے اندر لاتا ہے، تصوف کا اور کسی شیخ سے رجوع کرنے کا اصل مقصود یہی ہے۔ آجکل لوگوں نے ''تصوف'' کا مقصد یہ سمجھ لیا ہے کہ شیخ کچھ تسبیحات پڑھنے کو بتادے گا کہ صبح یہ پڑھا کرو، اور شام کو یہ پڑھا کرو، یاد رکھئے! یہ تسبیحات اصلاح کے اندر معاون ضرور ہیں، لیکن اصل مقصود نہیں، تسبیح تو آپ شیخ کے بغیر گھر میں بیٹھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تصوف کا اور شیخ سے تعلق کا اصل مقصود یہ ہے کہ جو اعمالِ باطنہ مقصود ہیں وہ انسان کے اندر پیدا ہوجائیں، اور جن اعمال سے بچنا ضروری ہے انسان ان سے بچ جائے۔ بہرحال! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں ''خوف'' اور ''رجا'' دونوں کو بیان کیا ہے، تاکہ ہم دونوں کے درمیان رہتے ہوئے زندگی گزاریں۔

مایوس اور نا اُمید ہونا جائز نہیں

چنانچہ ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''نا اُمیدی عقلی مذموم ہے، یعنی اگر یہ اعتقاد ہو جائے کہ مجھ پر ہرگز رحمت نہ ہوگی، اور میری موجودہ حالت ایسی نہیں کہ اس پر رحمت ہو''(۱)

اگر کسی کے دماغ میں یہ بات بیٹھ جائے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کبھی نہیں ہوگی، تو یہ ''یاس'' ہے، اسی کا نام ''نا اُمیدی'' ہے، یہ مذموم ہے، اور کسی مؤمن کے لئے یہ ''یاس'' جائز نہیں، ہرگز نہیں ہونی چاہئے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا﴾(۲)

اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہے، اور زیادتیاں کر بیٹھے ہو، تم اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا، بیشک اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو معاف فرمانے والے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، چاہے انسان نے کتنا ہی بڑے سے بڑا گناہ کر لیا ہو، اور برے سے برا گناہ کر بیٹھا ہو، تب بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کسی حال میں مایوس نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسی ہے کہ تم نے چاہے کیسا ہی بڑے سے بڑا گناہ کر لیا ہو، ایک مرتبہ جب تم سچے دل سے توبہ کر لوگے، اور یہ کہوگے "أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ" تو انشاء اللہ اسی لمحے اللہ تعالیٰ تمہیں سارے گناہوں سے پاک صاف کر دیں گے، اس میں کوئی شبہ اور شک نہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کے دل میں مایوسی کا کہاں گزر ہو سکتا ہے۔

جس کا اللہ ہو اس کو پریشانی کیسی؟

مایوسی تو اس شخص کو ہو جس کے ساتھ یہ وعدے نہ کیے گئے ہوں، جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ راستے نہ بتائے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ میں نے تمہارے لئے توبہ کا دروازہ کھولا ہوا ہے، اور مرتے دم تک کھلا رہے گا، پھر مایوسی کیوں؟ میرے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ

جس کا اللہ ہو، اس کو پریشانی کیسی؟

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے یہ وعدے فرما رکھے ہیں، اور طریقے بھی بتا رکھے ہیں، پھر کہاں کی پریشانی؟ کیسی مایوسی؟ جب گناہ کر کے پریشان ہو تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، توبہ کرو، استغفار

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص:۲۰۴ (۲) الزمر: ۵۳

کرو، اور آئندہ اس گناہ سے بچنے کی فکر کرو، باقی اپنے گناہ کا مراقبہ کبھی مت کرو کہ میں نے فلاں گناہ کیا، میں نے فلاں گناہ کیا، فلاں گناہ کیا۔ ارے جتنا وقت تم اس مراقبہ میں گزار رہے ہو، وہ وقت ''اللہ کے ذکر'' میں، اور ''سبحان اللہ'' پڑھنے میں گزار دو، اور توبہ کرو کہ یا اللہ! میں نے جو کچھ گناہ کیے، میں ان پر اقراری مجرم ہوں، گناہوں کا اقرار کرتا ہوں، لیکن یا اللہ! آپ کی رحمت بڑی وسیع ہے، آپ کی رحمت سے توبہ کرتا ہوں، اور استغفار کرتا ہوں۔ لہٰذا اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو۔ یہ خیال کہ میں تو راندۂ درگاہ ہوں، اور میں تو اللہ کی رحمت سے دور ہوں، اللہ کی رحمت مجھ پر ہو ہی نہیں سکتی، یہ سب شیطانی خیالات ہیں۔

نا اُمیدی کے غلبہ کا نتیجہ

بعض اوقات غلبۂ حال کے نتیجے میں ''خوف'' کا یا ''یاس'' کا انسان پر غلبہ ہو جاتا ہے، یہ غلبہ بڑی خراب چیز ہے، اس لئے کہ اس کے نتیجے میں انسان پر قبض کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، عبادت میں دل نہیں لگتا، توبہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اور دماغ میں یہی خیال سوار ہو جاتا ہے کہ میں اللہ کی رحمت سے دور ہوں۔ ایسے موقع پر شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، اور حکمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا ایک مرید تھا، اس پر ''قبض'' کی کیفیت طاری ہو گئی، اور اس کے دماغ پر یہ خیال مسلط ہو گیا کہ میں شیطان ہوں، اور شیطان کے بارے میں یہ طے ہے کہ وہ جہنمی ہے، اس لئے اپنے جہنمی ہونے کا یقین ہو گیا، جس سے ملاقات ہوتی تو اس سے یہ کہتا کہ میں شیطان ہوں۔ جب ان کے شیخ کو پتہ چلا تو ان کو بلایا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ میں تو شیطان ہو گیا ہوں، اور میں اللہ کی رحمت سے دور ہو گیا ہوں، اور اب سوائے جہنم کے میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ شیخ نے اس سے کہا یہ بتاؤ شیطان کس کی مخلوق ہے؟ ارے شیطان بھی انہی کی مخلوق ہے، انہوں نے ہی تو شیطان کو پیدا کیا ہے، پھر کیوں ڈرتا ہے؟ بس یہ سن کر اس کی گرہ کھل گئی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی کیفیت زائل کر دی۔ بہر حال! علاج کے لئے بھی شیخ کو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس وقت اس کے لئے کیا مفید ہوگا؟ اسی لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ یہ اعتقاد کہ مجھ پر ہرگز اللہ کی رحمت نہ ہوگی، یہ نا اُمیدی ہے، اور مذموم ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

نا اُمیدی کس طرح پیدا ہوتی ہے؟

یہ نا اُمیدی کی کیفیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ جو اعمال کرنے کی اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرما رہے ہیں، ان کی ناقدری کرنے سے رفتہ رفتہ یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر و بیشتر ہماری

زبانوں پہ یہ رہتا ہے کہ ہماری نمازیں کیا ہیں؟ یہ تو ٹکریں مارنا ہے، یہ وقت گزاری کر رہے ہیں۔ یہ سب ناقدری کی باتیں ہیں، یہ ناقدری نہیں کرنی چاہئے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ارے بھائی! اس عبادت کی ادائیگی کی توفیق پر پہلے شکر ادا کرلو، کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو ایسی عبادت کرنے کی بھی توفیق میسر نہیں، اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس عبادت کو انجام دینے کی توفیق دے دی تو پہلے اس پر شکر ادا کرلو، اور یہ کہو: یا اللہ! آپ کی توفیق اور آپ کے فضل و کرم سے مجھے یہ توفیق ملی، آپ مجھے مسجد میں لے آئے، مجھ سے نماز پڑھوا دی، اے اللہ! اس پر آپ کا شکر ہے۔

نماز کے بعد استغفار کرلو

شکر ادا کرنے کے بعد یہ کہو کہ یا اللہ! مجھ سے یہ نماز صحیح طور پر نہیں پڑھی گئی، اور اس نماز کے اندر کمی کوتاہی ہوگئی، اس پر میں استغفار کرتا ہوں، لہٰذا نماز پڑھنے کے بعد ''الحمدللہ'' بھی کہو، اور ''استغفر اللہ'' بھی کہو، اس کے بعد پھر اپنی نماز کی ناقدری مت کرو، اس لئے کہ یہ ناقدری رفتہ رفتہ انسان کو ''مایوسی'' کی طرف لے جاتی ہے، اور یہ خیال ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی عبادت کرلوں، لیکن وہ قابلِ قبول نہیں ہوگی، اس مایوسی سے بچو، اور جو عبادت کرنے کی توفیق ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، لہٰذا توفیق پر ''شکر'' اور کوتاہی پر ''استغفار'' کرتے رہو، ساری عمر یہ کرتے رہو، انشاء اللہ پھر ''مایوسی'' پیدا نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

توکل کی حقیقت ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ اَنَّ سَلْمَانَ وَعَبْدَاللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا الْتَقَيَا فَقَالَ اَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهِ اِنْ لَقِيْتَ رَبَّكَ قَبْلِيْ فَالْقِنِيْ وَاَعْلِمْنِيْ مَا لَقِيْتَ وَاِنْ لَقِيْتُهُ قَبْلَكَ لَقِيْتُكَ وَاَخْبَرْتُكَ فَتُوُفِّيَ اَحَدُهُمَا وَلَقِيَ صَاحِبَهُ فِي الْمَنَامِ فَقَالَ لَهُ تَوَكَّلْ وَاَبْشِرْ فَاِنِّيْ لَمْ اَرَ مِثْلَ التَّوَكُّلِ قَالَ ذٰلِكَ ثَلٰثَ مِرَارًا.“(۱)

یہ ایک واقعہ ہے جو حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے۔ حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ اُونچے درجے کے تابعین، اولیاء کرام اور محدثین میں سے ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ آپس میں ملے۔ یہ دونوں صحابی پہلے اہل کتاب میں سے تھے۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پہلے تو نصرانی رہے پھر یہودیت بھی انہوں نے اختیار کی اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق عطا فرمائی۔ اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پہلے یہودی تھے، یہود کے سردار مانے جاتے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی توفیق عطا فرمادی۔ اب ان دونوں بزرگوں نے اپنی اس ملاقات میں ایک دوسرے سے ایک معاہدہ کیا کہ ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر تمہارا انتقال پہلے ہو جائے تو تم مجھے خواب میں آکر بتانا کہ تمہارے ساتھ کیا گزری اور اگر میرا انتقال پہلے ہوگیا تو میں تمہیں خواب میں آکر بتاؤں گا کہ میرے ساتھ کیا گزری اور کیا حالات وہاں پر دیکھنے میں آئے؟

اللہ تعالیٰ لاج رکھتے ہیں

ویسے تو یہ انسان کے اختیار میں نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے دوسرے کے خواب میں آجائے

☆ اصلاحی مواعظ (۳/۹۱ تا ۱۰۸)، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔ زیر نظر بیان عبداللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الزہد کے ((باب ما جاء فی التوکل)) کا درس ہے۔

(۱) الزهد لابن المبارك (۱۴۳/۱)

لیکن اللہ کے کچھ نیک بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ اللہ کے بھروسے پر کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی لاج رکھتے ہوئے ان کی بات کو سچا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ))(۱)

''بعض لوگ بظاہر بڑے پراگندہ حال و بال ہوتے ہیں اور لوگ ان کو اپنے دروازوں سے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں۔ اگر وہ اللہ کے بھروسے پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دیتے ہیں''

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے خواہ ایسی بات کی قسم کھائیں جو ان کے اختیار میں نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کی خاطر اتنی عزیز ہوتی ہے کہ ان کی زبان سے نکلی ہوئی بات اللہ تعالیٰ پوری کر دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے یہ حدیث اس وقت ارشاد فرمائی تھی جبکہ دو عورتوں کا آپس میں جھگڑا ہو گیا اور ان میں سے ایک نے دوسری کا دانت توڑ دیا۔ یہ مقدمہ نبی کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا گیا۔ چونکہ اس وقت تک قصاص کا قانون نازل ہو چکا تھا اس لئے حضور ﷺ نے قصاص کا فیصلہ سنا دیا۔ اب وہ عورت کہ جس سے دانت کا قصاص لینا تھا ان کے ایک عزیز جو کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا بھی تھے، موجود تھے کہ اچانک ان کے منہ سے نکلا:

"لَا وَاللّٰهِ لَا تُكْسَرُ ثَنِيَّتُهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ"(۲)

''یا رسول اللہ! میں قسم کھاتا ہوں کہ اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا''

اب اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس مظلوم خاتون نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگرچہ مجھے اس کا دانت توڑنے کا حق حاصل ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ اختیار بھی تو دیا ہے کہ میں اس کو معاف کر دوں۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں مجھے اسی کے بدلے معاف فرما دیں۔

یوں اس عورت کا دانت ٹوٹنے سے بچ گیا۔ اس موقع پر آنحضور ﷺ نے مذکورہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔

---

(۱) صحیح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب النار يدخلها الجبارون والجنة يدخلها الضعفاء، رقم: ۵۰۹۴

(۲) صحيح البخارى، كتاب الصلح، باب الصلح فى الدية، رقم: ۲۵۰۴، سنن النسائى، كتاب القسامة، باب القصاص من الثنية، رقم: ۴۶۷۵، سنن أبى داؤد، كتاب الديات، باب القصاص من السن، رقم: ۳۹۷۹، مسند أحمد، رقم: ۱۱۸۵۴

آخرت کے حالات مزید معلوم نہیں ہو سکتے

خیر! ان دونوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک کا انتقال پہلے ہوگیا تو دوسرے کو اسی بات کا انتظار رہا کہ وہ خواب میں آکر انہیں وہاں کے حالات بتائیں۔ چنانچہ وہ خواب میں آگئے۔ اب ان کو یہ خیال تھا کہ یہ وہاں کے حالات اور کیفیات کے بارے میں بتلائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو ایسا پردۂ راز میں رکھا ہے کہ کسی کو بھی اس کی خبر کسی طریقے سے نہیں ہو پاتی۔ بس جو علم اللہ تعالیٰ نے دے دیا اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتلا دیا اس سے آگے جانے کی کسی میں مجال ہی نہیں ہے۔

یہاں کے حالات دیکھنے کے ہیں، بتانے کے نہیں

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے ایک واقعہ سنا کہ ایک بزرگ سے کسی نے کہا کہ ہم جو مرنے کے بعد کے حالات پڑھتے ہیں تو محض تصور سے تو اس کی تفصیل سمجھ میں نہیں آسکتی، اس لئے آپ کوئی ایسی ترکیب بتائیے کہ جس کے ذریعے ہمیں تمام تفصیلات اچھی طرح معلوم ہو جائیں۔ ان بزرگ نے کہا: اچھا! میں تمہیں بتانے کی کوشش کروں گا۔ تم ایسا کرنا کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میرے دفن کے وقت میرے ساتھ ایک قلم اور کاغذ رکھ دینا اور دفن کے کچھ دن بعد تم میری قبر پر آنا تو وہاں پر تمہیں ایک پرچہ رکھا ہوا ملے گا جس میں وہاں کے حالات لکھے ہوں گے۔ اس شخص نے ایسا ہی کیا اور کچھ دن کے بعد جب وہ ان کی قبر پر پہنچا تو واقعۃً وہاں ایک پرچہ پڑا ہوا پایا۔ اب یہ شخص بڑی خوشی اور شوق سے آگے بڑھا کہ اس کے ذریعے مجھے وہاں کے حالات معلوم ہوں گے لیکن جب اس نے پرچہ اُٹھا کر دیکھا تو اس میں یہ لکھا ہوا پایا کہ یہاں کے حالات دیکھنے کے ہیں بتانے کے نہیں۔ اور اس عالم کے حالات کو مخفی رکھنے میں بھی حکمت ہے کہ اگر کسی وقت عالمِ برزخ کے مناظر سامنے آجائیں تو کوئی انسان بھی دنیا کا کوئی کام کر ہی نہ سکے۔ اسی لئے روایات میں آتا ہے کہ قبر میں جب عذاب ہوتا ہے تو بعض اوقات جانور بھی اس کی آواز سن لیتے ہیں لیکن انسان کو وہ آواز نہیں سنائی دیتی کیونکہ اگر انسان وہ آواز سن لے تو پھر وہ دنیا کے کام نہیں کر سکے گا۔

عالمِ برزخ میں توکّل کی اہمیت

بہر حال! جو صحابی خواب میں آئے انہوں نے انہیں وہاں کے حالات تو نہ بتائے البتہ ایک ایسا جملہ بتا گئے جو ہمارے اور آپ کے عمل سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں یہاں آنے کے بعد جس چیز کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں وہ توکّل ہے۔ اگر تم نے اللہ پر بھروسہ کر لیا تو پھر خوشخبری سن

لو کہ اس کا انجام بہت بہتر ہے اس لئے کہ اس جہان میں آنے کے بعد میں نے توکل کے علاوہ کسی اور صفت کو نہیں دیکھا جو انسان کے درجات کو بلند کردے۔

توکّل کا معنی

توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاحی معنی اللہ پر بھروسہ کرنے کے ہیں۔یعنی اس کائنات میں ہونے والے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی مشیت، قدرت اور اس کی حکمت سے ہورہے ہیں۔اور توکل درحقیقت توحید ہی کا ایک لازمی حصہ ہے کیونکہ توحید صرف کلمہ طیبہ زبان سے پڑھ لینے کا نام نہیں ہے بلکہ توحید کا مفہوم بہت وسیع ہے۔چنانچہ جب "لا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہا تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات میں نہ کوئی عبادت کے لائق اور نہ کوئی محبت کے لائق، اس کائنات میں نہ کسی کے پاس قدرت اور نہ وسعت، اس کائنات کے اندر ہونے والے تمام تصرفات اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہورہے ہیں۔کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ ''توحید خدا، خدا را واحد دیدن است نہ کہ واحد گفتن'' یعنی درحقیقت توحید اللہ تعالیٰ کو ایک دیکھنے کا نام ہے نہ کہ ایک کہنے کا۔مطلب یہ کہ فقط زبان سے ایک کہہ دینا کافی نہیں بلکہ اللہ کی دی ہوئی آنکھ سے دیکھے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہورہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہورہا ہے، اسی کو توحید کہا جاتا ہے اور اسی کا ایک لازمی تقاضا توکل بھی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اگرچہ اسباب پیدا کر رکھے ہیں لیکن وہ اسباب فی نفسہٖ کوئی حقیقت نہیں رکھتے، ان اسباب میں قوت پیدا کرنے والی ذات اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے، اسی کو توکل کہا جاتا ہے۔اب توکل کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا نہ کہ اسباب و ذرائع پر۔اگرچہ اسباب اختیار کرنے کا ہمیں شریعت ہی نے حکم دیا ہے لیکن انسان اسباب کو اختیار کرتے ہوئے یہ سوچ لے کہ اس کی اپنی ذات میں کچھ نہیں رکھا بلکہ اس میں قوت دینے والی ذات کوئی اور ہے لہٰذا اصل رجوع مجھے اسی کی طرف کرنا چاہئے۔

توکل کا صحیح مفہوم

مثال کے طور پر کسی شخص کو بیماری لاحق ہوجاتی ہے۔اب بیماری کا علاج کرنا تو نبی کریم ﷺ کی سنت بھی ہے، لیکن ایک مسلمان کے دوا کھانے میں ایک کافر کے ساتھ امتیاز ہونا چاہئے۔کیونکہ کافر جو کہ خدا پر ایمان نہیں رکھتا اس کا سارا بھروسہ اس دوا پر ہے۔لیکن ایک مسلمان جب دوا کھاتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ یہ دوا کوئی حقیقت نہیں رکھتی، اس دوا کے اندر تاثیر پیدا کرنے والی کوئی اور ذات ہے اور اسی کو ''توکل'' کہا جاتا ہے۔لیکن یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگرچہ یہ اعتقاد ایک مسلمان کے دل

میں ہوتا ہے مگر عمل کے وقت اس کا دھیان نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر عمل کے وقت دھیان ہوگا تب جا کر توکل کا صحیح مفہوم حاصل ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس بات کا مشاہدہ بھی کراتے رہتے ہیں کہ اسباب انسان کو دھوکہ دے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک دوا کسی بیماری میں بڑی موثر ثابت ہوئی لیکن دوسری مرتبہ اسی مرض میں وہی دوا کھانے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

دوا بھی تاثیر کی اجازت طلب کرتی ہے

ہمارے ایک بزرگ ڈاکٹر صغیر احمد ہاشمی صاحب تھے جو کہ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ کے خاص معالج اور بڑے تجربہ کار ڈاکٹر تھے۔ ایک دن میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری ساری عمر کا تجربہ یہ ہے کہ دوا جب مریض کے حلق میں جاتی ہے تو (اللہ تعالیٰ سے) پوچھتی ہے کہ کیا اثر کروں؟ فائدہ یا نقصان؟ پھر جو اشارہ وہاں سے ملتا ہے اس کے مطابق وہ دوا کام کرتی ہے۔ یہی بزرگ ہمیں سناتے تھے کہ کسی وقت میں لاہور کے گنگا رام ہسپتال کا انچارج ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں رات کے وقت ہسپتال میں گیا تو وہاں میں نے واپسی کے وقت موجود عملے سے کہا کہ جو چھ نمبر بیڈ کا مریض ہے اس پر میں ساری تدبیریں اختیار کر چکا، اب اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں، بس یہ ایک دو گھنٹے کا مہمان ہے۔ جب اس کا انتقال ہو جائے تو اس کے ورثاء کو اس کی اطلاع کر دینا۔ اور وہ جو بارہ نمبر بیڈ کا مریض ہے وہ اب تندرست ہو چکا ہے، صبح کو تم اسے چھٹی دے دینا کیونکہ مجھے صبح آنے میں دیر ہو جائے گی۔ اس کے بعد جب میں اگلے دن وہاں پر گیا تو معلوم ہوا کہ چھ نمبر بیڈ والا مریض تو صحت یاب ہو کر اپنے گھر کو روانہ ہو چکا ہے اور بارہ نمبر بیڈ کا مریض فوت ہو چکا ہے۔ معلوم ہوا کہ دوا اپنا اثر دکھانے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے اجازت لیتی ہے پھر اپنا اثر دکھاتی ہے۔

توکل اس چیز کا نام نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ توکل اس چیز کا نام ہے کہ انسان تدبیر کیے بغیر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ توکل اس کا نام ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں اپنی اُونٹنیوں کو چَرانے جاتا ہوں تو نماز کے وقت ان اُونٹنیوں کو باندھ دیا کروں یا کھلا رہنے دیا کروں اور اللہ پر توکل کرلوں؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ پہلے اس کی پنڈلی کو رسی سے باندھو پھر توکل کرو یعنی اسباب اختیار کرنے کے بعد توکل کرو۔ (۱)

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع، باب منه، رقم: ۲۴۴۱

ہماری مثال

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ بطور تمثیل سنایا کرتے تھے کہ ایک دیہاتی ہندو تھا۔ جس زمانے میں ہندوستان کے اندر نئی نئی ریل چلی تو اس نے دیکھا کہ سارا کا سارا شہر خود بخود بھاگا چلا جارہا ہے، اسے بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیا بات ہے؟ اس نے حیرانی سے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیسے خود بخود چل رہی ہے۔ تو کسی نے کہا کہ بھئی! یہ گاڑی خود سے نہیں چل رہی بلکہ درحقیقت گارڈ جب سبز جھنڈی ہلاتا ہے تو اس وقت ریل چلتی ہے، اس لئے اصل تو گاڑی چلانے والی سبز جھنڈی ہے۔ اس نے یہ سن کر سبز جھنڈی کو بڑا معزز سمجھا اور جاکر اس کی تعظیم کرنے لگا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا کررہے ہو؟ اس نے کہا کہ یہ سبز جھنڈی بڑی طاقتور ہے کہ اتنی بڑی ریل کو چلارہی ہے۔ لوگوں نے اس سے کہا: درحقیقت یہ گارڈ کے ایک ہاتھ کا کمال ہے جس میں اس نے یہ جھنڈی اُٹھائی ہوئی ہے۔ اس لئے اصل وہ گارڈ ہے، سبز جھنڈی کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ اس نے گارڈ کے پاس جاکر اس کی تعریف شروع کردی کہ آپ تو بہت طاقتور آدمی ہیں کیونکہ آپ ہی کی بدولت یہ پوری گاڑی چلتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو اتنا طاقتور آدمی نہیں ہوں کہ اس گاڑی کو چلاسکوں، اصل تو ڈرائیور ہے جو سب سے آگے بیٹھا ہے، وہ گاڑی چلاتا ہے۔ پھر وہ شخص ڈرائیور کے پاس پہنچ کر اس کو کہتا ہے تم تو بڑے طاقتور ہو کہ اتنی بڑی گاڑی چلارہے ہو۔ اس نے کہا کہ بھئی! میں تو کوئی طاقتور آدمی نہیں بس یہ چند پرزے ہلاتا ہوں اس سے یہ گاڑی چلتی ہے اور یہ پرزے بھی خود کچھ نہیں بلکہ ان کے پیچھے بھاپ کی طاقت ہے جو اسے چلاتی ہے۔ اب یہ دیہاتی بیچارہ اس مقام پر پہنچ کر رک گیا کہ اس کو کون چلاتا ہوگا؟ لیکن اگر غور وفکر کی نظر ہوتی تو سمجھ لیتا کہ بھاپ میں بھی کوئی طاقت نہیں، اس میں طاقت پیدا کرنے والی بھی کوئی اور ہستی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ اس دیہاتی کی طرح کبھی سبز جھنڈی پر بھروسہ کرلیا کبھی گارڈ پر، کبھی ڈرائیور پر اور کبھی بھاپ پر، اور اس سے آگے جو سب سے بڑی طاقت ہے اس کی طرف دھیان نہیں جاتا جس کی وجہ سے توکل سے محروم رہ جاتے ہیں۔ توکل یہ ہے کہ انسان ہر چیز میں یہ نظریہ رکھے کہ اس کام میں کچھ بھی نہیں رکھا، حقیقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ ہی اس کام کو کررہے ہیں۔

اور اس بات کا استحضار کرنے کیلئے شریعت نے کچھ احکام دیئے ہیں، مثلاً قرآن کریم میں فرمایا:

﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ﴾(۱)

''کبھی بھی کسی کام کے بارے میں یہ نہ کہو کہ میں یہ کل کردوں گا بلکہ ساتھ یہ کہو انشاء اللہ یہ کام کروں گا''

(۱) الکھف: ۲۳

انشاء اللہ کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ کا حکم اور اس کی مشیت ہوئی تو میں فلاں کام کروں گا۔

آج لوگوں نے انشاء اللہ کا معنی ہی بگاڑ کر رکھ دیا اور یہ سمجھ لیا کہ انشاء اللہ کہنے سے کچا ارادہ مراد ہوتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت انشاء اللہ کا مقصود یہ ہے کہ دل میں اس بات کا استحضار پیدا کیا جائے کہ کوئی کام بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کردہ ایک دلچسپ لطیفہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کسی وعظ میں ایک لطیفہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب راستے میں چلتے ہوئے اپنے کسی دوست سے ملے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ بکری خریدنے جا رہا ہوں! اس نے کہا کہ جب کوئی کام کرنے کا ارادہ ہو تو انشاء اللہ کہہ لیا کرو۔ انہوں نے کہا: انشاء اللہ کا کیا مقصد؟ پیسے میری جیب میں ہیں، بکری بازار میں ہے، جاؤں گا اور بکری خرید کر لے آؤں گا۔ اور یہ کہہ کر چل دیئے۔ اب جب آگے چلے تو راستے میں جیب کٹ گئی جس کی وجہ سے وہ بکری نہ خرید سکے۔ چنانچہ واپسی کے ارادے سے روانہ ہوئے تو راستے میں وہی صاحب پھر مل گئے۔ انہوں نے پوچھا کیا ہوا تو کہا کہ میں انشاء اللہ بکری خریدنے گیا تھا تو انشاء اللہ میری جیب کٹ گئی اور انشاء اللہ میں بکری نہیں خرید سکا۔

غرضیکہ توکل کی تعلیم درحقیقت اس لئے دی گئی ہے کہ انسان کو یہ استحضار رہے کہ میں کوئی بھی کام اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں کرسکتا اور یہ چیز انشاء اللہ کہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی کی وجہ سے پھر انسان کی نظر اسباب سے ہٹ کر مسبب کی طرف چلی جاتی ہے۔ آپ ذرا اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ بیماری ہوتی ہے تو سارا زور سبب یعنی دوا پر ہوتا ہے۔ لیکن اس دوا کے اندر تاثیر پیدا کرنے والے کی طرف رجوع ہر ایک کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب بھی دوا کھائیں تو یہ نیت کرلیا کیجئے کہ یا اللہ! یہ دعا تو کھا رہا ہوں آپ اس میں تاثیر بھی ڈال دیجئے تو توکل پر عمل ہو جائے گا۔ اسی طرح تجارت وغیرہ کے اندر بھی یہی حکم ہے۔

بعض بزرگوں کا طریقۂ توکل

اس مقام پر تھوڑی سی تفصیل مزید عرض کردوں کہ جس کے بارے میں ذہنوں میں اکثر خلجان رہتا ہے۔ بعض بزرگوں نے توکل کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ انہوں نے معاش کا کوئی کام کیا ہی نہیں، مثلاً اپنے گھر یا جنگل میں بیٹھ گئے اور کوئی کام نہیں کیا جس سے کبھی فاقہ کی نوبت بھی آئی اور کبھی اللہ نے عطا بھی فرما دیا اور خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہ حال تھا۔ مثلاً

اصحاب صفہ حضور ﷺ سے علم حاصل کرنے کی خاطر صفہ پر آکر پڑ گئے تھے اور مقصد صرف قال اللہ وقال الرسول کی تعلیم حاصل کرنا تھا۔ اب ظاہری طور پر ان کے معاش کی کوئی صورت نہ تھی اور وہ صفہ پر اس ارادے سے آئے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادیا تو کھالیں گے ورنہ صبر کرلیں گے۔ بلکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس دو بھائی آیا کرتے تھے۔ ایک بھائی برسرِ روزگار اور ہنرمند اور محنت مزدوری کے ذریعے کمانے والا تھا اور دوسرا بھائی اکثر حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھا احادیث سنتا رہتا تھا، تو اس برسرِ روزگار بھائی نے ایک مرتبہ حضور ﷺ سے اپنے بھائی کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ! میرا یہ بھائی کوئی کام نہیں کرتا، ہر وقت آپ ہی کے پاس بیٹھا رہتا ہے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((لَعَلَّكَ تُرْزَقُ بِهٖ))

''اس پر اعتراض نہ کرو کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اسی کی وجہ سے رزق عطا فرمارہے ہوں''(۱)

یعنی حضور ﷺ نے اس توکل پر نکیر نہیں فرمائی اور اسی طرح یہ سلسلہ اولیاء کرام اور صوفیاء عظام تک منتقل ہوتا رہا۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک مرتبہ انہیں کئی وقت کا فاقہ ہوگیا۔ ایک آدمی نے آکر کھانے کے بارے میں عرض کیا تو فرمایا کہ ہاں! دیگیں چڑھ رہی ہیں، یعنی یہاں فاقے کرلو اور جنت میں مزے لے لو۔ اسی لئے بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ ایک طرف تو کسبِ معاش کے لئے تدابیر اختیار کرنے کے بعد توکل کا حکم ہے اور دوسری طرف بعض بزرگوں کا یہ معمول ہے۔

اسباب کی تین قسمیں

تو خوب یاد رکھئے! کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کا ہر کام سبب سے وابستہ کر رکھا ہے لیکن اسباب کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

ایسے اسباب ترک کرنا حرام

(۱) وہ اسباب کہ جن سے عادۃً نتیجہ مرتب ہوجاتا ہے، مثلاً انسان کو بھوک لگے تو کھانا بھوک مٹانے کا سبب ہے اور کھانا ایسا سبب ہے کہ جس پر نتیجے کا مرتب ہوجانا تقریباً یقینی ہے۔ چنانچہ آج تک سوائے کسی غیر معمولی شخص کے کسی کے بارے میں یہ نہیں سنا گیا کہ اس نے

(۱) سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب في التوكل على الله، رقم: ٢٢٦٧

کھانا کھایا لیکن اس کی بھوک نہ مٹی، ایسے اسباب کو ترک کرنا حرام ہے۔ یعنی اگر کسی شخص کے سامنے کھانا موجود ہو اور وہ کہے کہ میں اللہ پر توکل کرتا ہوں کہ وہ میری بھوک مٹا دے گا اور اس کھانے کو نہیں کھاتا تو یاد رکھیں کہ اگر وہ شخص اسی حالت میں مرگیا تو وہ حرام موت مرے گا، کیونکہ سبب یعنی کھانا کھانے کو اختیار کرنا فرض اور واجب ہے۔ نیز بزرگانِ دین میں سے کسی ایک سے بھی اس سبب کو ترک کرنا منقول نہیں۔

ایسے اسباب کو ترک کرنا جائز

(۲) اسباب کی دوسری قسم وہ اسباب ہیں جن پر کبھی تو نتیجہ مرتب ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں، جیسے دوا کی مثال ہے کہ وہ کبھی فائدہ دیتی ہے اور کبھی نہیں، ان کو ''ظنی اسباب'' کہا جاتا ہے اور ان کا حکم یہ ہے کہ ہم جیسے کمزور لوگوں کے لئے ایسے اسباب کو بھی ترک کرنا جائز نہیں، ان اسباب کو اختیار کرنے کے بعد پھر اللہ پر بھروسہ کرنا چاہئے، لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ خصوصی تعلق عطا فرمایا ہے ان کے لئے اسباب کو ترک کرنا بھی جائز ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ سے کسی حال میں بھی شکوہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ پر قوی ایمان رکھنے والے لوگ بعض اوقات اس قسم کے اسباب ترک کر دیتے ہیں کہ اگر کھانا وغیرہ موجود ہے تو اس کو ترک نہ کیا لیکن روزگار کے حصول کے معاملے میں توکل کیا۔ چنانچہ خود حضور ﷺ نے، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اور بہت سے بزرگانِ دین نے بھی ایسا کیا۔ اگر کسی میں قوتِ برداشت ہو تو ایسا کرنا بھی جائز ہے لیکن یہ ہم جیسے کمزوروں کے لئے نہیں کیونکہ ہم میں قوت نہیں۔ اگر کوئی نقل بھی اُتارنا چاہے تو مارا جائے گا۔ لہٰذا اس میں نقل بھی کرنی مناسب نہیں ہے۔

توکل پر ایک واقعہ

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک صاحب نے یہ بات سنی کہ اللہ کے بعض قوی بندے اللہ پر توکل کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ان کو نوازتے ضرور ہیں۔ اگرچہ کچھ دیر سویر ہو جائے لیکن پھر بھی وہ فراخی سے زندگی گزارتے ہیں۔ چنانچہ ان صاحب نے بھی یہ کام کرنے کا ارادہ کیا اور جنگل میں جا کر بیٹھ گئے۔ اب ایک دن، دو دن، حتیٰ کہ تین دن گزر گئے اور فاقے پر فاقے ہو رہے ہیں اور کوئی بھی نہیں آرہا، تو طرح طرح کے خیالات دل میں پیدا ہونے لگے، لیکن جب تیسرا دن گزر گیا تو دیکھا کہ ایک صاحب خوان لیے چلے آرہے ہیں۔ ان کی جان میں جان آئی کہ اب کام بن گیا، لیکن اس شخص نے وہاں پہنچ کر یہ کیا کہ بیٹھ پھیر کر بیٹھ کر خود کھانے لگا، اب

یہ تو سمجھے تھے کہ میرے لئے آرہا ہے اور اس نے خود کھانا شروع کر دیا تو تھوڑی دیر تک تو وہ دیکھتے رہے لیکن پھر رہا نہ گیا اور پیٹھ پھیر کر کھنکھارنا شروع کیا تاکہ اسے اپنی موجودگی کا احساس دلاسکیں۔ چنانچہ اس نے مڑ کر جب انہیں دیکھا تو کہا: آیئے آپ بھی شریک ہو جایئے، لہٰذا یہ بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ بعد میں ان صاحب کی کسی سے ملاقات ہوئی تو اس سے کہنے لگے کہ ہم نے تو یہ سنا تھا کہ توکل میں اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں سے انتظام کر ہی دیتے ہیں تو میرا تجربہ یہ ہے کہ ایسا ہو تو جاتا ہے لیکن کچھ کھنکھارنا پڑتا ہے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ایسے توکل سے تو ہزار درجہ بہتر ہے کہ انسان محنت مزدوری کر کے کما کر کھائے اور جس توکل میں کھنکھارنا پڑے اس توکل سے اللہ کی پناہ!

لہٰذا ہم جیسے کمزور لوگوں کے لئے یہ راستہ نہیں ہے بلکہ ہمارے لئے راستہ یہی ہے کہ ہم اسباب اختیار کریں، لیکن اس پر مکمل بھروسہ ہونے کے بجائے اللہ کی ذات پر ہو۔ جن کو نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں یوں تعبیر فرمایا:

((أَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ وَتَوَكَّلُوْا عَلَيْهِ))

"اعتدال کے ساتھ کسی چیز کی جستجو کرو اور اللہ پر بھروسہ کرو"(۱)

ایسے اسباب توکل کے منافی ہیں

(۳) اسباب کی تیسری قسم وہمی قسم کے اسباب ہیں، یعنی انسان اس چکر میں پڑا رہے کہ فلاں زمین خریدوں گا پھر اس کو بیچ کر فلاں جاگیر خریدوں گا اور پھر اس سے فلاں چیز خریدوں گا، یعنی ہر وقت خیالی منصوبے بناتا رہے تو یہ توکل کے منافی ہے۔ لہٰذا چاہئے کہ کسی چیز کی جستجو میں اعتدال ہو لیکن اس قدر انہماک نہ ہو کہ اس کے علاوہ کسی اور طرف دھیان ہی نہ جائے۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ اسباب کو ضرور اختیار کریں لیکن ایک تو اس میں انہماک نہ ہو، دوسرے یہ کہ بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہو اور اسی سے انسان مانگے۔ جس کا راستہ یہ ہے کہ جب کوئی تدبیر کرنی ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے کہ یا اللہ! میں یہ تدبیر تو کر رہا ہوں لیکن اس تدبیر کا نتیجہ نکالنا آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اے اللہ! اس کو کامیاب کر دیجئے۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے اس مختصر سے جملے میں بیان فرمایا:

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب الاقتصاد في طلب المعيشة، رقم: ۲۱۳۵، مؤطا مالك، كتاب الجامع، باب أنه كان يقال الحمد لله الذي خلق كل شيء ......الخ، كنز العمال، رقم: ۹۲۹۱

((اَللّٰھُمَّ ھٰذَا الْجُھْدُ وَعَلَیْکَ التُّکْلَانُ)) (۱)
''اے اللہ! یہ میری کوشش ہے لیکن بھروسہ آپ ہی پر ہے''
تدبیر خواہ کسی بھی صورت میں ہو، چاہے وہ تدبیر ملازمت کی صورت میں ہو یا تجارت کی، حصولِ علم کی یا علاجِ مرض کی بہرصورت اس دعا کو پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیا کرو۔ انشاء اللہ توکل کی دولت حاصل ہوجائے گی۔

رجوع اِلی اللہ کی عادت اپناؤ

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ تم کہاں وہ مجاہدے کرو گے جو پہلے بزرگوں نے کیے، اس لئے تمہیں چھوٹے چھوٹے چٹکلے بتا دیتا ہوں کہ اگر ان پر عمل کرلو گے تو انشاء اللہ محروم نہیں رہو گے۔ وہ چٹکلے یہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی عادت ڈالو۔ یہاں تک کہ اگر گھر سے کسی مقصد کے لئے نکلے ہو اور وہاں سواری کے ذریعے جانا ہے تو اس کو اختیار کرو لیکن دل میں یہ خیال لاؤ کہ اے اللہ! یہ سواری تو آپ نے مجھے دے دی اب اس کو منزلِ مقصود تک آپ پہنچا دیجئے۔ اور ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ منقول دعا بھی پڑھ لیا کرو:

۱۔ ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ﴾ (۲)
''پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لئے اس سواری کو مسخر فرما دیا حالانکہ ہم اس کو قابو میں کرنے والے نہ تھے''

۲۔ ((اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِیْفَةُ فِی الْاَھْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَّعْثَاءِ السَّفَرِ وَکَآبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِی الْاَھْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ))
''اے اللہ! سفر کے ساتھی بھی آپ ہیں اور میرے پیچھے میرے گھر والوں، مال اور اولاد کی نگہبانی کرنے والے بھی آپ ہیں۔ اے اللہ! میں سفر کی مشقت سے اور بری حالت کے دیکھنے سے اور گھربار، اہل وعیال میں بری واپسی سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں'' (۳)
یعنی اسباب کو اختیار کرنا تو ہے لیکن نگاہ اللہ تعالیٰ پر ہے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰه، باب منه، رقم: ۳۳۴۱
(۲) الزخرف: ۱۳، ۱۴
(۳) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ما یقول إذا رکب إلی سفر الحج وغیره، رقم: ۲۳۹۲، سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰه، باب ما یقول إذا خرج مسافرا، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

توکل ایسے اختیار کرتے ہیں

غرض توکل کے بارے میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کے بعد میں نے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں دیکھی، یعنی اس کی وجہ سے جو درجات بلند ہوتے ہیں وہ کسی اور عمل کی بدولت نہیں ہوتے۔ لہٰذا اس کو حاصل کرنا ہم سب کے لئے ضروری ہے جس کی ہمیں مشق کرنی ہے۔ ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے "الحمد للہ کبھی اس میں تخلف نہیں ہوتا کہ جب کوئی شخص سوال کرنے کے لئے آتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے تو میں فوراً دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ یا اللہ! نامعلوم یہ کیا سوال کر بیٹھے، اس سوال کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دے" اسی کو توکل کہا جاتا ہے۔

نبی اکرم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ سے مانگو![1] اسلئے کہ موچی اور پیسے سب اس کے تابع فرمان ہیں۔ جب تک اس کا حکم نہیں ہوگا آپ کے جوتے کا تسمہ بھی نہیں لگے گا۔ اور اس کا اندازہ عمل کے وقت ہوگا کہ یہ کیسی عجیب دولت ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں یہ باتیں تم کو ایک لمحے میں بتا دیتا ہوں اسلئے اس کی قدر نہیں ہوتی، جب اس کی مشق کرو گے تب اس دولت کے بارے میں پتہ لگے گا۔

توکل کا ایک لازمی حصہ یہ بھی ہے کہ جو دل میں خیر کا کام آئے اس کو اللہ سے ضرور مانگو لیکن پھر اللہ کے فیصلے پر راضی بھی رہو۔ اسی کو "رضا بالقضاء" کہا جاتا ہے۔ لہٰذا جب اللہ جل شانہ کی طرف سے فیصلہ ہو جائے تو اس پر بہت زیادہ واویلا کرنے اور شور مچانے کی کوئی ضرورت نہیں، ہاں اگر طبعی طور پر فیصلہ دوسرا ہو جانے کی وجہ سے کچھ رنج و ملال ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھتے رہا کریں:

﴿وَأُفَوِّضُ أَمْرِيْ إِلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ﴾

"میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے"[2]

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رقم: ۳۳٦٠، سنن النسائي، كتاب الإستعاذة، باب الإستعاذة من الحور بعد الكور، رقم: ٥٤٠٣، سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب ما يقول الرجل إذا سافر، رقم: ٢٢٣١، سنن ابن ماجه، كتاب الدعاء، باب ما يدعو به الرجل إذا سافر، رقم: ٣٨٧٨

(١) سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب يسأل الحاجة مهما صغرت، رقم: ٣٥٣٦

(٢) المؤمن: ٤٤

اللہ کے لئے جینا مرنا☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

عرصۂ طویل کے بعد آپ حضرات سے ملاقات کا موقع مل رہا ہے اور شاید اس سے قبل اتنا لمبا عرصہ نہ ہوا ہو۔ مختلف سفر اور مختلف اعذار کی وجہ سے حاضری نہ ہوسکی، لیکن الحمد للہ مؤمن کا کسی بھی حال میں گھاٹا نہیں بشرطیکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ایمانِ کامل عطا فرمادیں اور صحیح فکر وعمل عطا فرمائیں۔ انسان جس حال میں ہو اگر اس حال کے مناسب انسان کام کرتا رہے تو یہ سب دین کا حصہ ہے۔

یہ جو ہم قربانی کرتے ہوئے ایک آیتِ کریمہ پڑھتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی ہے کہ قربانی کے وقت یہ آیت پڑھی جائے۔

﴿إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

''بیشک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کیلئے ہے''(۱)

یہ ایک عجیب وغریب آیت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں حضور اکرم ﷺ کو یہ حکم دیا ہے، آپ فرمادیجئے کہ میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ نے قربانی کے وقت ان الفاظ کی ادائیگی کو سنت بنادیا۔

اخلاص کی برکت

دراصل اس آیت کریمہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ مؤمن کا ہر لمحہ خواہ وہ کسی بھی حال میں ہو اللہ کے لئے ہونا چاہئے۔ جہاں تک عبادتوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں تو یہ آیت واضح ہی ہے کہ ہر عبادت اللہ کے لئے ہونی چاہے۔ اور یہی معنی اخلاص کے بھی ہیں کہ انسان کی عبادت کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو جو ہر عبادت کی روح ہے۔ چنانچہ اگر کسی مختصر سی عبادت میں بھی اخلاص ہو تو اللہ تعالیٰ

☆ اصلاحی مواعظ (۳/ ۱۱۱ تا ۱۲۶)

(۱) الأنعام: ۱۶۳

کے یہاں بہت زیادہ اجروثواب کا موجب ہے اور اگر بڑی سے بڑی عبادت میں اخلاص نہ ہو تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

اخلاص کی اہمیت پر ایک واقعہ

قربانی کا معنی عربی زبان میں یہ ہے کہ وہ چیز جس سے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے اور قرب حاصل ہوتا ہے اخلاص سے۔ پس اگر کوئی آدمی چھوٹی سی بھی قربانی کر دے لیکن اس میں اخلاص شامل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہے اور اگر بڑے سے بڑے جانور کی قربانی کی لیکن اس میں اخلاص شامل نہ تھا تو اس قربانی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں نے قربانی پیش کی جن میں سے ایک کا نام ہابیل تھا اور دوسرے کا قابیل۔ قابیل نے ایک موٹے تازے دنبے کی قربانی پیش کی اور ہابیل کو کوئی دنبہ وغیرہ میسر نہیں آیا تو اس زمانے میں اس بات کی بھی اجازت تھی کہ اگر نفلی قربانی ہو اور کوئی جانور میسر نہ ہو تو گندم کے خوشے قربانی کے طور پر دے دیئے جائیں۔ اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ جو قربانی اللہ تعالیٰ قبول فرما لیتے تھے اس کے لئے آسمان سے آگ اُترتی تھی اور اس کو جلا دیتی تھی، اور آگ نہ اُترنا اس بات کی علامت تھی کہ قربانی قبول نہیں ہے۔ تو ہابیل اور قابیل کی قربانی میں سے ہابیل کی قربانی کو آگ نے جلا دیا اور دنبہ یونہی پڑا رہ گیا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ﴾(۱)

''ہابیل اور قابیل نے قربانی پیش کی تو ان دونوں میں سے ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی''

اب قابیل کہ جس کی قربانی قبول نہیں ہوئی تھی اس نے ہابیل سے کہا کہ میں تجھے مار ڈالوں گا۔ قصہ تو طویل ہے لیکن کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بظاہر دیکھنے میں قابیل کی قربانی زیادہ قیمتی ہے اور ہابیل کی قربانی معمولی ہے لیکن اس کے باوجود ہابیل کی معمولی قربانی قبول ہوگئی۔ معلوم یہ ہوا کہ اخلاص بہت اہم چیز ہے۔

زندگی کا ہر کام اللہ کے لئے ہو

یاد رکھیے! کہ عبادات میں تو اخلاص ضروری ہے جیسا کہ قرآن حکیم نے فرمایا "إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي" لیکن آگے جو عجیب بات ارشاد فرمائی وہ یہ ہے:

(۱) المائدة: ۲۷

﴿وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾
''میرا جینا مرنا بھی اللہ کے لئے ہے''
یعنی عبادات کے علاوہ تمام کام جو زندگی سے متعلق ہیں، وہ سب اللہ رب العالمین کے لئے ہوں۔ چنانچہ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، کمانا، ہنسنا اور بولنا سب اللہ کے لئے ہونا چاہئے۔ اگرچہ بظاہر یہ تمام کام اپنے نفس کے لئے نظر آرہے ہیں لیکن اگر انسان چاہے تو صحیح نیت کرکے اس کام کو اللہ تعالیٰ کے لئے بنا سکتا ہے اور جب وہ کام اللہ تعالیٰ کے لئے ہوجاتا ہے تو وہ عبادت بن جاتی ہے اور پھر اس پر اجر وثواب مرتب ہوتا ہے۔

نفس کا حق

مثلاً انسان بھوک کے تقاضے کی وجہ سے کچھ کھانا چاہتا ہے، اب بظاہر تو وہ کھانا ہی ہے اور نفس کے تقاضے کا عمل ہے۔ اب اس وقت ایک لمحے کے لئے رک کر یہ تصور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے میرے نفس کا بھی مجھ پر حق رکھا ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:
((إِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))
''تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے''(۱)
نفس کا حق یہ ہے کہ اسے مناسب غذا فراہم کی جائے کیونکہ یہ نفس میری ملکیت میں نہیں بلکہ یہ بھی دینے والے کی عطا ہے جو میرے پاس امانت ہے اور اس کو غذا اس نیت سے فراہم کی جائے تاکہ اس میں اللہ کی بندگی کی طاقت پیدا ہوجائے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کو بھوک لگی ہو اور کھانا بھی موجود ہو لیکن وہ اس کو نہ کھائے اور مسلسل بھوکا رہے اور اسی بھوک کے عالم میں بھوک کی وجہ سے وہ مرجائے، یاد رکھئے! وہ حرام موت مرا۔

یہ جان اللہ کی امانت ہے

اسی سے بھوک ہڑتال کا حکم بھی معلوم ہوگیا کہ بہت سے لوگ نہ کھانے کا ارادہ کرلیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی جان کو اپنی ملکیت میں سمجھ رکھا ہے، اسی وجہ سے وہ اس کے ساتھ جو چاہتے ہیں کرگزرتے ہیں۔ اور لوگوں میں ایک مرض یہ بھی ہے کہ اگر بھوک ہڑتال کے دوران کوئی شخص مرجائے تو وہ ''شہیدِ اعظم'' کہلاتا ہے کہ اس نے اپنے حقوق کے لئے لڑتے ہوئے جان دے دی اور یہ معلوم

(۱) سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۳۳۷، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب ما يؤمر به من القصد في الصلاة، ۱۱٦۲، مسند أحمد، رقم: ۲۵۱۰٤

نہیں ہوتا کہ وہ حرام موت مرا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا کہ ہم نے یہ نفس جو تمہیں امانت کے طور پر دیا ہے تم پر اس کے کچھ حقوق ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾

''اے رسولو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک کام کرو''(۱)

یہ نفس ہم نے تمہیں اس لئے دیا ہے کہ تم اسے اچھے سے اچھا کھلاؤ اور ساتھ ساتھ اچھے سے اچھا عمل بھی کرو۔ یہ نفس تمہیں اس لئے نہیں دیا کہ تم اسے بھوکا ماردو۔ لہٰذا یہ تصور کہ یہ نفس میری ملکیت ہے غلط ہے۔ جب بھوکا رہنے سے بچنا ضروری ہوا اور بھوکا رہنا بلاوجہ حرام ہوا تو مطلب یہ ہوگیا کہ کھانا واجب ہے۔ لہٰذا کھانا کھاتے وقت یہ نیت کرو کہ اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے فریضے کی وجہ سے میں کھا رہا ہوں تو یہ عمل اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگا اور اس پر اجر وثواب ہوگا۔ نیز یہ بھی نیت کرلو کہ جناب رسول اللہ ﷺ بھی کھانا کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ معترضین نے اعتراض کردیا کہ کیسا پیغمبر ہے کہ ہماری طرح کھانا کھاتا ہے اور ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ آسمان سے کوئی فرشتہ پیغمبر بن کر نازل ہوگا جس کو کھانے پینے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ حالانکہ پیغمبر انسانوں میں اسی لئے بھیجا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ کوئی اور مخلوق نہیں بلکہ تمہیں میں سے ایک فرد ہے اور جیسی خواہشات تمہاری ہیں اسی طرح اس کی بھی خواہشات ہیں اور اسی لحاظ سے یہ کھانا بھی کھاتا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے کھانا کھانا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہوا۔

بسم اللہ پڑھنے کی وجہ

پھر کھانا کھاتے وقت ابتداء میں بسم اللہ پڑھنی چاہئے۔ یہ بسم اللہ کا جو حکم ہے اس لئے نہیں کہ بسم اللہ کوئی منتر ہے بلکہ اس طرف توجہ مبذول کرانے کے لئے ہے کہ میں جو کھانا کھا رہا ہوں وہ اللہ کی رضا کے لئے کھا رہا ہوں۔ یہ کھانا اسی کی عطا ہے، اسی کا حکم ہے اور اسی کے نبی ﷺ کی سنت ہے۔ پھر کھانا کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرو۔

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا))(۲)

تو یہ کھانا اللہ کے لئے ہوجائے گا۔ اسی طرح نیند آنے کے وقت سونے کا عمل بظاہر تو نفس کا

---

(۱) المؤمنون: ۵۱

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما يقول إذا فرغ من الطعام، رقم: ۳۳۷۹، سنن ابن ماجه، کتاب الأطعمة، باب ما يقال إذا فرغ من الطعام، رقم: ۳۲۷٤، مسند أحمد، رقم: ۱۰۸٤٦

تقاضا ہے لیکن اگر یہ نیت کر لی جائے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))(۱)

''تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے''

تو یہ سونا بھی اللہ کے لئے ہو جائے گا۔ یہ جو سرکاری مشین اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہے یہ پیدائش سے لے کر مرتے دم تک تمہارا ساتھ دیتی ہے۔ اس کو نہ کسی سروس کی ضرورت ہے اور نہ تیل ڈالنے کی۔ لہٰذا اس کا حق یہ ہے کہ اس کو تھوڑا آرام بھی دو۔ اسی طرح مزدوری کے ذریعے بظاہر تو مقصد پیسے کمانا ہوتا ہے لیکن نیت یہ کی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس اور بیوی بچوں کے جو حقوق رکھے ہیں ان کی ادائیگی کے لئے کسبِ معاش بھی ضروری ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دوسرے فرائض کے بعد سب سے بڑا فریضہ حلال روزی کمانا ہے۔(۲)

تو اس نیت سے مزدوری اور تجارت وغیرہ بھی ثواب بن جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ صبح سے لے کر شام تک زندگی میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جس کو صحیح نیت کر کے اللہ کے لئے نہ بنایا جا سکے۔

موت اللہ کے لئے کیسے ہو؟

اور شانِ کریم کی آیت میں لفظ ''وَمَمَاتِیْ'' یعنی میری موت بھی اللہ کے لئے کا مطلب یہ ہے کہ یا تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا جان دیدے یا پھر اگر جہاد کا موقع نہیں ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ میرے حق میں بہتر سمجھیں گے مجھے موت عطا فرما دیں گے۔

اگر چہ موت کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے لیکن اسکی جگہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا تلقین فرما دی

((اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مَا عَلِمْتَ الْحَيٰوةَ خَيْرًا لِيْ وَتَوَفَّنِيْ إِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاةَ خَيْرًا لِيْ))(۳)

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم، رقم: ۱۸۳۹، سنن النسائی، كتاب الصيام، باب صوم يوم وإفطار يوم، رقم: ۲۳۵۰

(۲) ((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ)) كنز العمال، رقم: ۹۲۳۱ (۱٦/٤)، كشف الخفاء، رقم: ۱٦۷۱ (٤٦/۲)، سنن البيهقی، رقم: ۱۲۰۳۰ (۲٤/۲)، الجامع الكبير للسيوطی، رقم: ۳۵ (۱٤۰۸۵/۱)، جامع الأحاديث، رقم: ۱۳۹۳۷ (۱۲۸/۱٤)، مشكوٰة المصابيح، رقم: ۲۷۸۱ (۱۲۹/۲)، شعب الإيمان، رقم: ۸۷٤۱ (٤۲۱/٦)

(۳) سنن النسائی، كتاب السهو، باب نوع آخر، رقم: ۱۲۸۸، مسند أحمد، رقم: ۱۷٦۰۵

''اے اللہ! جب تک میرے حق میں زندگی بہتر ہے تب تک تو مجھے زندہ رکھ اور جب میرے حق میں موت بہتر ہو جائے تو تو مجھے موت دیدے''

پس جب انسان نے اپنی زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دی تو جینا بھی اللہ کے لئے ہوا اور مرنا بھی اللہ کے لئے ہوا۔

مؤمن کا کسی حال میں گھاٹا نہیں

ایک مرتبہ اس چیز کا ارادہ کرکے مشق کرنے کی ضرورت ہے کہ زندگی کے ہر کام میں اللہ کو راضی کرنے کی نیت کرو۔ اگر یہ کام کرلیا تو اس سے ہر جائز کام ثواب بن جاتا ہے کیونکہ مؤمن کا کسی حال میں گھاٹا نہیں۔ اگر اس کو کوئی خوشی ملتی ہے وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ عبادت ہوتا ہے۔ اگر اس کو غم لاحق ہو جائے، وہ اس پر صبر کرتا ہے اور "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور مشیت پر سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے تو پھر اس کی طرف قرآن حکیم کا یہ ارشاد متوجہ ہوتا ہے:

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾(۱)

''صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا''

گویا جب اللہ کی خاطر کسی بھی چیز پر صبر کیا جاتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ بے بہا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

سنت پر عمل کرنے والا قریب ہے

میں نے شاید اس سے قبل یہ واقعہ سنایا ہو کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک مشہور اور بڑے لاڈلے صحابی تھے۔ ان سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دِلی باتیں بھی کہہ دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتے تھے۔

تقریباً ۹ ہجری کا واقعہ ہے کہ دینی مصلحت کا تقاضا یہ ہوا کہ ان کو یمن بھیج دیا جائے کیونکہ یمن فتح ہو چکا تھا اور وہاں کسی ایسے حاکم کی ضرورت تھی جو حکومت بھی کرے اور لوگوں کی تعلیم وتربیت کا فریضہ بھی انجام دے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ انتخاب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پر پڑی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم یمن چلے جاؤ اور ان کو مدینہ منورہ سے اس شان کے ساتھ رخصت کیا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدل ان کے گھوڑے کی باگ تھامے انہیں کافی دور تک رخصت کرنے کے لئے جارہے تھے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ

(۱) الزمر: ۱۰

بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میری زندگی اب اس دنیا میں تھوڑی ہی ہے۔ ادھر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی جلدی واپسی کی کوئی توقع نہ تھی۔ لہٰذا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چلتے چلتے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے معاذ! شاید یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہو اور اس کے بعد تم مجھے نہ دیکھ سکو۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اتنے جانثار صحابی اب تک نجانے کس طرح ضبط کر رہے تھے لیکن جب یہ جملہ سنا کہ اے معاذ! آج کے بعد شاید تم مجھے نہ دیکھ سکو تو اندر سے غم واندوہ کا لاوہ ایک دم پھوٹ پڑا اور حضرت معاذ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں بھی آنسو آنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرہ آبادی کی طرف پھیر لیا اور فرمایا: اے معاذ! اگرچہ تم مجھ سے جدا ہو رہے ہو لیکن یاد رکھو کہ جو شخص میری سنت پر عمل کرنے والا ہے وہ ہر وقت مجھ سے قریب ہے چاہے وہ دور ہی کیوں نہ ہو اور جو شخص میری سنت پر عمل نہیں کرتا وہ مجھ سے دور ہے چاہے وہ کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔[1]

ایک عجیب واقعہ

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوتے تھے تو عام طور سے روضۂ اقدس کی جالی کے سامنے کچھ دور جو ایک ستون ہے اس کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے تھے، جالی کے قریب نہیں جاتے تھے۔ ایک دن فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ مجھے یہ خیال ہوا کہ پتہ نہیں تمہارے دل کی کیا قساوت ہے کہ سب لوگ تو جالی کے قریب جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس تک پہنچ جاتے ہیں اور تم آگے نہیں بڑھ پاتے، پیچھے ہی رہتے ہو، تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے روضۂ اقدس میں سے آواز آ رہی ہو کہ جو شخص ہماری سنت پر عمل پیرا ہے وہ ہم سے قریب ہے خواہ ظاہری نظر میں ہم سے کتنے ہی فاصلے پر ہو، اور جو شخص ہماری سنت پر عمل پیرا نہیں وہ ہم سے دور ہے چاہے وہ ہمارے روضے کی جالیوں سے چمٹا ہوا ہو۔

حاصل کلام یہ کہ ایک مؤمن کا مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرتے ہوئے اللہ جل جلالہ کی رضامندی ہے۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا، نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

محبت کا اصل تقاضا یہ ہے

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھ لیجئے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

(۱) مختصر تاریخ دمشق (۳۳۱۱/۱)

صحبت سے فیض یاب ہوئے لیکن موت کے وقت یہ کیفیت ہے کہ کوئی تو قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے فوت ہو رہا ہے اور کوئی سندھ میں آکر شہید ہو رہا ہے۔ حالانکہ بظاہر محبت کا تقاضا تو یہ تھا کہ جہاں آپ ﷺ تشریف فرما ہیں انسان وہاں سے ہلے ہی نہ۔ لیکن وہ محبت کے اصل تقاضے کو جانتے تھے کہ محبت کا اصل تقاضا یہ نہیں ہے کہ محبوب سے چمٹے رہو بلکہ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ محبوب کی رضا کے مطابق کام کرو۔

عشق تسلیم و رضا کے ماسوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں تو پھر وفا کچھ بھی نہیں

لہٰذا اگر ایک مؤمن اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے قریب ہے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی دور ہو۔

اللہ تعالیٰ کبھی اس طرح بھی نواز دیتے ہیں

حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ کا ایک واقعہ میں نے اپنے والد ماجد اور اپنے شیخ حضرت عارفی قدس اللہ اسرارہما سے سنا ہے کہ ایک شخص حضرت حاجی صاحب کے سامنے آکر یہ کہتا تھا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ہر سال حج کرتے ہیں تو حسرت ہوتی ہے کہ لوگوں کو تو بار بار حاضری ہو رہی ہے اور مجھے چونکہ وسائل میسر نہیں اس لئے حاضری کی توفیق نہیں ملتی۔ تو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے فرمایا: یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ صرف مکہ اور مدینہ میں ہی ہیں یا یہاں بھی ہیں؟ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ ہر جگہ ہیں اور تم وسائل نہ ہونے کی وجہ سے وہاں نہ پہنچ پائے تو کیا اللہ تمہیں صرف اس وجہ سے محروم کر دیں گے کہ تمہارے پاس پیسے نہیں تھے؟ تم اللہ کے ساتھ ایسی بدگمانی کرتے ہو؟ یاد رکھو! اگر تمہاری نیت یہ ہو کہ جب بھی وسائل مہیا ہوں گے تو ان شاء اللہ وہاں حاضری دوں گا تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں سے بھی حصہ عطا فرمائیں گے اور تمہیں محروم نہیں فرمائیں گے۔ ان کی شان تو یہ ہے کہ کبھی تو نیکی پر نواز دیتے ہیں اور کبھی نیکی کی حسرت پر انعام عطا فرما دیتے ہیں۔

نیکی کی حسرت پر لوہار کا درجہ بڑھ گیا

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو کسی شخص نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑی رحمت کا معاملہ فرمایا لیکن وہ درجہ مجھے نصیب نہ ہوا جو میرے پڑوس میں رہنے والے لوہار کو ملا، کیونکہ اگرچہ وہ لوہار تھا لیکن جونہی اس کے کان میں "حی علی الصلوۃ" کی آواز پڑتی تو اگر اس نے ہتھوڑا سر پر بلند کر رکھا ہوتا تو بجائے اس

کے کہ وہ لوہے پر دے مارتا، وہ ہتھوڑا پیچھے پھینک دیتا تھا اور نماز کے لئے چلا جاتا تھا اور اپنی بیوی سے یہ کہا کرتا تھا کہ ہم تو دن رات دنیاداری کے کام میں مشغول رہتے ہیں اس لئے ہمیں موقع نہیں ملتا کہ جس طرح یہ اللہ کے بندے ساری رات کھڑے ہو کر نماز پڑھتے رہتے ہیں اسی طرح ہم بھی پڑھتے۔ اگر ہمیں بھی فراغت ہوتی تو ہم بھی عبداللہ بن مبارک کی طرح رات کے وقت عبادت کرلیا کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تجھے تیری اسی حسرت پر نواز دیا اور تجھے وہ درجہ دیا جو عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو بھی نہ دیا۔

ایک بزرگ اور ایک عورت کی خواہش

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے اپنے ایک وعظ میں ارشاد فرمایا کہ ایک بزرگ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں بڑے خزائن سے نوازا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت بڑے بزرگ بھی سمجھے جاتے تھے۔ آخری عمر میں انہوں نے سوچا کہ مدینہ منورہ چلا جاؤں تاکہ وہیں پر موت آئے اور جنت البقیع کی مٹی نصیب ہو۔ چنانچہ وہ بزرگ وہاں جاکر مقیم ہوگئے۔ پھر ان کا انتقال ہوگیا اور انہیں جنت البقیع میں دفن کردیا گیا اور بظاہر ان کی آرزو پوری ہوگئی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد اس بزرگ کے مدفن کو کھودنے کی ضرورت کسی وجہ سے پیش آگئی، چنانچہ جب اسے کھود کر دیکھا تو وہ بزرگ وہاں سے غائب تھے اور ان کی جگہ ایک یورپین عورت پڑی ہوئی تھی۔ لوگ بڑے حیران و پریشان ہوئے اور یہ خبر سن کر بہت بڑا مجمع اسے دیکھنے کے لئے آگیا۔ اس مجمع میں شامل لوگوں نے دیکھا تو اس میں ایک شخص کچھ عرصہ فرانس میں رہ کر آیا ہوا تھا، اس نے کہا کہ میں اس عوت کو پہچانتا ہوں۔ یہ تو پیرس میں تھی اور مسلمان ہوگئی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ ہم نے تو اس جگہ ان بزرگ کو دفن کیا تھا، یہ عورت یہاں کیسے آگئی؟ پھر اس قصے کی تحقیق کی گئی۔ چنانچہ لوگوں نے ان کی بیوی سے اس بارے میں پوچھا کہ کیا کوئی خاص بات ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں یہاں دفن ہونے کی فضیلت سے محروم رکھا؟ تو انہوں نے کہا: ویسے تو وہ بزرگ آدمی تھے، البتہ ان میں ایک یہ بات تھی کہ کبھی کبھی کہا کرتے تھے کہ اسلام میں ساری باتیں تو بہت اچھی ہیں لیکن غسلِ جنابت کی پابندی بڑی کٹھن ہے، جبکہ عیسائی مذہب میں یہ بات اچھی ہے کہ اس میں غسلِ جنابت فرض نہیں، اور اس عورت کے متعلق اس شخص نے بتایا کہ اس عورت کی مسلمان ہونے کے بعد یہ خواہش تھی کہ کاش! میں کسی طرح مدینہ منورہ جاکر مروں اور جنت البقیع میرا مدفن ہو، تو اللہ تعالیٰ نے دفن کے بعد بھی اس عورت کی حسرت کو اس طرح پورا کیا کہ اس کو اندر ہی اندر جنت البقیع منتقل فرمادیا۔

لہٰذا نیک کام کی توفیق ہوجائے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرو اور جو کام بن نہ پڑے تو کم از کم دل

میں یہ ہمت رکھو کہ اگر وسائل میسر آتے تو میں یہ کام کرتا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں نوازنے میں کوئی کمی نہیں۔

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

روزانہ کا معمول

میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم نمازِ فجر پڑھ چکو تو ایک مرتبہ دل سے نیت کرو کہ آج میں جو کام بھی کروں گا وہ اللہ کے لئے کروں گا۔ اس کے بعد جب اپنی ڈیوٹی پر جانے کے لئے گھر سے نکلنے لگو تو یہ نیت کر لو کہ میں اللہ تعالیٰ کے عائد کیے ہوئے فریضے کو ادا کرنے جا رہا ہوں۔ اس سے خود بخود دل میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ یہ کام میں اللہ کے لئے کر رہا ہوں۔ لہٰذا اس کے عائد کیے ہوئے احکام کے مطابق کروں گا۔ پھر وہ شخص رشوت، جھوٹ، فریب، دھوکے دہی وغیرہ چیزوں کے ارتکاب میں مبتلا نہ ہوگا۔ پھر جب گھر واپس آ جاؤ تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے یہ نیت کر لو کہ میں اپنے گھر والوں سے گفتگو، ہنسنا بولنا اللہ کے حکم کی وجہ سے کروں گا۔ پھر رات کے وقت اس بات کا جائزہ لو کہ میں اپنی نیت کے مطابق کام میں مشغول رہا یا نہیں۔ جتنے کام نیت کے مطابق ہوئے اس پر اللہ کا شکر ادا کرو اور جو نیت کے مطابق نہ ہو سکے اس پر استغفار کرو۔ اس استغفار و توبہ کی برکت سے ایک درجہ بلند ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت نصیب ہوگی اور توبہ اللہ تعالیٰ کو بڑی محبوب ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

یہ اپنے روزانہ کا معمول بنا لو اور صبح کو اُٹھ کر یہ آیت پڑھ لو:

﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ﴾(۱)

اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ انشاء اللہ رفتہ رفتہ بھٹکنے کے مواقع ختم ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جو شخص اس کے راستے پر چلنا شروع کرے تو وہ گرتا پڑتا منزل تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ جو شخص ہمارے راستے میں کوشش کرتا ہے ہم اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے راستے پر لے جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۲)

(۱) الأنعام: ۱۶۳ (۲) العنکبوت: ۶۹

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بچہ جب چلنا شروع کرتا ہے تو ایک دم ہی چلنا شروع نہیں کر دیتا بلکہ گرتے پڑتے چلتا ہے تو سامنے سے ماں باپ اسے بلاتے ہیں، جب وہ چلتے چلتے گرنے لگتا ہے تو ماں باپ اسے آگے بڑھ کر پکڑ لیتے ہیں اور اسے گرنے نہیں دیتے، تو پھر ارحم الراحمین اپنے بندوں کو کیسے چھوڑ سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا کی خاطر عمل کی توفیق عطا فرمائیں اور اپنی رضا کی خاطر جینے اور مرنے کا جذبہ عطا فرمائیں۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

اللہ کا شکر ادا کیجئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أما بعد!

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾(۱) صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْم.

پچھلی مجلس میں میں نے یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ ہم اپنی گفتگو اور سوچ بچار کا آغاز سورۃ فاتحہ سے کریں گے کیونکہ اللہ جل جلالہ نے بھی اپنی کتاب کا آغاز سورۃ فاتحہ سے فرمایا ہے۔

اور تمام مفسرین اور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سورۃ فاتحہ پورے قرآن کا عطر اور نچوڑ ہے، اور اسی وجہ سے ہر مسلمان پانچ وقت کی نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے، اور اس کو پڑھنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ جب اس کلام کی ابتدائی منزل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے صحیح فہم عطا فرمائیں گے اور انشاء اللہ اس کی برکات عمل کی صورت میں بھی نمودار ہوں گی۔

رحمٰن اور رحیم، دو صفات

پچھلے اجتماع میں میں نے مختصراً بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پر کچھ بیان کیا تھا۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے صرف ایک حصہ کا پچھلی مرتبہ بیان ہوا تھا وہ ہے بسم اللہ، یعنی "اللہ کے نام پر شروع کرتا ہوں"۔ اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی دو صفتیں بیان ہو رہی ہیں، ایک رحمٰن دوسرے رحیم، یعنی اس اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے۔ یہ جو دو صفتیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی بیان فرمائی گئیں ہیں یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا امتیاز ہیں۔

☆ اصلاحی مواعظ (۴/۳۹ تا ۷۴)، جامع مسجد نیلا گنبد، لاہور۔

(۱) الفاتحة: ۱ تا ۷

مشرکین بھی اپنے کام کی ابتداء اللہ کے نام سے کرتے تھے

حضور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے جو مشرکین تھے وہ بھی اللہ کے وجود کے قائل تھے، اور نہ صرف قائل تھے بلکہ ان کا معمول یہ تھا کہ جب بھی کوئی کام شروع کرتے تو وہ بھی اللہ کے نام سے شروع کیا کرتے تھے، اور اللہ کا نام لینے کے لئے ان کے ہاں جو جملہ مقرر تھا وہ تھا باسمك اللّٰهم کہ اے اللہ ہم آپ کے نام سے شروع کرتے ہیں، تو اللہ کے نام سے تو وہ بھی شروع کرتے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حضور ﷺ کا خاص امتیاز

لیکن جب سرورِ دو عالم ﷺ تشریف لائے تو باسمك اللّٰهم کے بجائے فرمایا کہ یوں کہو کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، یہ تبدیلی پیدا فرمائی۔ اس تبدیلی میں جو بنیادی امتیاز ہے وہ الرحمٰن الرحیم کی صفت ہے ورنہ اللہ کا نام تو مشرکین بھی لیتے تھے، البتہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ الرحمٰن الرحیم کا اضافہ یہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ہوا۔ چونکہ یہ دونوں صفتیں الرحمٰن الرحیم آگے سورۃ فاتحہ میں بھی آرہی ہیں اس لئے ان کے متعلق جو بات ہے اسے میں اس آیت تک موقوف کر رہا ہوں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اب جو سورۃ فاتحہ شروع ہو رہی ہے اس کی پہلی آیت ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، یہ سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت ہے جس سے سورۃ فاتحہ شروع کی گئی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے معنی یہ ہیں کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا صحیح مفہوم اگر انسان کے دل میں بیٹھ جائے تو اس کے سارے معاملات خود بخود درست ہو جائیں گے۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم شروع ہو رہا ہے۔ اور قرآن ایک خاص پیغام، ایک خاص تعلیم اور ایک خاص ہدایت لے کر آیا ہے، اور وہ تعلیم اور ہدایت وہ ہے جس میں عقائد بھی ہیں، توحید اور رسالت کی دعوت بھی ہے اور آخرت کی دعوت بھی ہے، اس میں عبادات بھی ہیں، نماز بھی ہے، روزہ بھی ہے، زکوٰۃ بھی ہے اور حج بھی ہے۔ اس میں معاملات بھی ہیں، جائز و ناجائز، حلال اور حرام اور بیع و شراء وغیرہ بھی اس میں موجود ہیں، اس میں معاشرت بھی ہے کہ ایک دوسرے سے کس طریقہ سے ملنا چاہئے، اس میں اخلاق بھی ہیں کہ کونسے اخلاق انسان کو اختیار کرنے چاہئیں اور کون سے نہیں، یہ ساری تفصیلات اس پیغام ہدایت میں موجود ہیں، لیکن عجیب بات ہے کہ قرآن شروع

ہو رہا ہے سورۃ فاتحہ سے، تو اس کی ابتدا میں نہ عقائد کا کوئی مسئلہ بیان ہوا، نہ توحید و رسالت کا، نہ آخرت کا، نہ نماز کا حکم، نہ روزے کا حکم، نہ زکوٰۃ کا حکم اور نہ حج کا کوئی حکم، بلکہ شروع یہاں سے کیا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رب ہے تمام جہانوں کا۔ اس میں کیا راز ہے کہ سارے مسائل اور سارے احکامات کو چھوڑ کر ابتدا کی جا رہی ہے اللہ رب العالمین کی تعریف سے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد سے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے شکر سے، اس سے درحقیقت اس بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اور راز اس میں یہ ہے (واللہ سبحانہ اعلم) کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا صحیح مفہوم اگر انسان کے دل میں بیٹھ جائے اور ذہن نشین ہو جائے اور یہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا فقرہ جو پیغام دے رہا ہے اس پیغام کو اگر انسان اپنے اندر جذب کر لے تو سارے عقائد، ساری عبادات، سارے معاملات، سارے اخلاق اور ساری معاشرت، خود بخود درست ہو جائے گی۔ اگر انسان اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا صحیح مفہوم سمجھ لے اور اس سے نکلنے والے پیغام کو اپنے اندر جذب کر لے تو اس کے سارے کے سارے معاملات خود بخود درست ہو جائیں گے، اس لئے سب کو چھوڑ کر بات اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے شروع کی گئی۔

ہر چیز کی تعریف درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے

یہاں بات سمجھنے کی یہ ہے کہ اس میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہہ کر ایک دعویٰ کیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے معنی یہ ہیں کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں اور اس کائنات میں کوئی دوسرا حقیقی معنی میں تعریف کے لائق نہیں ہے، اگر کوئی ہے تو صرف اللہ جل جلالہ کی ذات ہے۔ اور ساتھ میں یہ جملہ خبریہ بھی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی کی تعریف ہوگی حقیقت میں وہ تعریف اللہ رب العالمین کی ہی ہوگی، چاہے تعریف کرنے والا اللہ کے نام کے بجائے کسی اور کا نام لے رہا ہو۔ اس لئے کہ ایک انسان کی عام عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جب کسی چیز کی تعریف کی جائے حقیقت میں وہ تعریف اس چیز کی نہیں ہوتی بلکہ وہ تعریف اس چیز کے بنانے والے کی ہوتی ہے۔ اگر آپ لاہور کی شاہی مسجد کی تعریف کریں کہ بڑی عالیشان مسجد ہے، بڑی شاندار بنائی گئی ہے، اس کا نقشہ بڑا اعلیٰ درجہ کا تیار کیا گیا ہے، یہ بڑی مستحکم ہے، جتنی چاہے آپ تعریف کرلیں وہ تعریف نہ اس پتھر کی ہے، نہ اس عمارت کی ہے، نہ اس مینار کی ہے اور نہ اس گنبد کی ہے، حقیقت میں تعریف اس معمار کی ہے کہ جس نے یہ شاہی مسجد کا نقشہ بنایا اور اس کو اس شاندار اعلیٰ طریقہ سے تعمیر کیا۔

اگر آپ کسی کپڑے کی تعریف کرتے ہیں تو حقیقت میں تعریف اس کپڑے کی نہیں ہوتی کہ کپڑا بڑا خوبصورت ہے، بڑا شاندار لباس ہے، حقیقت میں یہ تعریف اس شخص کی ہے کہ جس نے اس کپڑے کو بنایا یا اس کا ڈیزائن تیار کیا۔ تو دنیا میں جس کسی کی بھی چیز کی تعریف ہوگی تو وہ درحقیقت اس

چیز کی نہیں بلکہ اس کے بنانے والے کی تعریف ہوگی کہ جس نے وہ چیز بنائی۔ پھر اس کائنات کی ہر چیز کے اندر یہ حکم جاری ہوگا، لہٰذا اگر آپ نے شاہی مسجد کی تعریف کی ہے تو شاہی مسجد کی تعریف درحقیقت اس کے معمار کی تعریف ہے۔ لیکن معمار کے پاس وہ ذہن کہاں سے آیا، معمار کے پاس وہ سوچ کہاں سے آئی، اس کے دل میں یہ ڈیزائن کس نے ڈالا اور اس کو یہ قوتِ کارکردگی کس نے عطا کی، کہ اتنی عالیشان عمارت کھڑی کردی، درحقیقت اگر غور کرو گے تو آخر میں یہی بات آئے گی کہ وہ معمار کی تعریف درحقیقت معمار کی تعریف نہیں ہے بلکہ معمار کے بنانے والے کی تعریف ہے کہ جس نے اس معمار کو بنایا، جس نے اس معمار کا ذہن تیار کیا اور جس نے اس معمار کے ذہن کی تخلیق کی۔

سائنسدانوں کی ترقی کی تعریف درحقیقت اللہ کی تعریف ہے

آج دنیا میں سائنسدانوں کی تعریفیں ہورہی ہیں کہ انہوں نے سائنس کو عروج اور کمال پر پہنچایا اور واقعی میں پہنچا دیا اور دنیا میں انقلاب برپا کردیا، کمپیوٹرز کے ذریعہ انسان کے دماغ کا کام کیا جارہا ہے اور روبوٹ تیار ہورہے ہیں، وہ انسان کے طریقہ سے کام کررہے ہیں، انسان چاند پر اور مریخ پر پہنچ رہا ہے، یہ ساری کی ساری جو ترقیات ہیں، یہ سائنسدانوں کی طرف منسوب کی جارہی ہیں اور یہ تعریف ساری دنیا میں ہورہی ہے۔ جن آدمیوں کی نگاہیں محدود ہیں وہ ان سائنسدانوں پر پہنچ کر رک جاتی ہیں۔ لیکن جس کو اللہ نے نورِ بصیرت عطا کیا ہو وہ اس سے تھوڑا آگے بڑھتا ہے اور آگے بڑھ کر کہتا ہے، بیشک یہ ترقیات بڑی حیرت انگیز ہیں، بڑی شاندار ہیں اور ان سائنسدانوں نے یہ ترقیاں کی ہیں لیکن ان سائنسدانوں کے ذہن میں اس چھوٹے سے دماغ کے اندر اگر بھیجہ نکال کر دیکھا جائے تو شاید آدھے سیر کا بھی نہ ہو، اس چھوٹے سے دماغ کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا احکامات پیدا فرمادیئے، اس دماغ کے اندر اللہ تعالیٰ نے کیا کیا قوتیں عطا فرمادیں کہ اس دماغ کو کام میں لاکر انسان کہاں سے کہاں پہنچ گیا، تو اگر انسان حقیقت پسند نگاہ سے دیکھے تو یہ جتنی تعریفیں ہورہی ہیں حقیقت میں یہ تعریف اللہ تعالیٰ کی ہے جس نے یہ دماغ بنایا ہے۔

انسان کا دماغ ایک نعمت ہے

آج اس دماغ کا یہ حال ہے کہ سارے سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ یہ دماغ جو انسان کے اندر ہے اس میں ایک چھوٹا سا خلیہ ہے، وہ ایک ارب واقعات کو محفوظ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے، اور ایک انسان کے دماغ میں اربوں خلیات ہیں، ان خلیات کے ذریعہ انسان کو یادداشت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ جو ہوتا ہے کہ انسان کوئی چیز بھول گیا یا یادداشت جاتی رہی تو وہ خلیات ٹوٹتے پھوٹتے

رہتے ہیں، ان میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل ہوتا رہتا ہے، اگر وہ عمل ختم ہو گیا تو یادداشت جاتی رہی۔ ان خلیات کے اندر اربوں واقعات انسان کے چھوٹے سے دماغ میں محفوظ ہیں۔ اور اس چھوٹے سے دماغ کے اندر اب بھی سارے ڈاکٹر صاحبان اور میڈیکل سائنس کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ جتنا انسان کا دماغ ہے اس دماغ کا صرف ۱/۸ حصہ ایسا ہے کہ جس کے بارے میں ہمیں پتہ ہے کہ اس کا عمل یہ ہوتا ہے اور اس کا فنکشن یہ ہے کہ یہ فلاں فلاں کام کرتا ہے، باقی انسان کے دماغ کے سات حصے ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں معلوم نہیں کہ یہ کیا کام کرتے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں اگر کوئی خرابی وہاں پیدا ہو جائے تو کوئی ڈاکٹر اس کو چھونے پر بھی تیار نہیں ہوتا، اس حصہ کو چھو کر نہ جانے انسان کے جسم کی کونسی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ تو اس چھوٹے سے دماغ کے بھی سات حصے غیر معلوم ہیں اور صرف ایک حصہ معلوم ہوا ہے۔ اس ایک حصہ سے انسان کام لے کر کہاں سے کہاں پہنچ رہا ہے اور اس دماغ کے ذریعہ سے کیا کچھ ترقیات کر رہا ہے۔ بیشک یہ ترقیات ہیں لیکن ذرا اس بنانے والے کو تو دیکھو جس نے انسان کو یہ دماغ عطا فرمایا اور اس دماغ کے بل بوتے پر اس نے کائنات کو مسخر کر کے رکھ دیا ہے۔

اللہ نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کے لئے مسخر کر دیا

ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾(۱)

''زمین اور آسمان میں جو بھی چیزیں ہیں سب تمہارے لئے مسخر کر دیں ہیں'' صرف اور صرف اسی دماغ کے بل بوتے پر۔

میرے والد ماجد قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو ہم سواری پر بیٹھتے ہیں تو دعاء یہ تلقین فرمائی گئی کہ ہر سواری پر بیٹھتے ہوئے یہ دعاء پڑھ لو:

﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ﴾(۲)

''پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لئے یہ سواری مسخر کر دی''

مسخر کرنے کے معنی ہیں کہ رام کر دی یعنی ہمارے تابع کر دی اور ہم اس سے کام لے رہے ہیں۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے اب تو خیر ریلوں اور ہوائی جہازوں کا زمانہ ہے، پہلے زمانہ میں گھوڑے اور گدھے اس کام کے لئے استعمال کیے جاتے تھے، تو گھوڑے کا حال یہ ہے کہ ایک

(۱) البقرة: ۲۹ (۲) الزخرف: ۱۳، ۱۴

چھوٹا سا بچہ اس کے منہ میں لگام ڈال کر اس کے اوپر سوار ہو کر جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے۔ کبھی گھوڑے نے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ بھئی میں تجھ سے دس گنا زیادہ طاقتور ہوں، یہ کیا ظلم ہے کہ تو میرے اوپر سواری کرتا ہے، میں تیرے اوپر سواری کیوں نہ کروں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان کے لئے مسخر کر دیا کہ اس گھوڑے کے منہ میں لگام ڈال کر جہاں چاہے لے جاسکتا ہے یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کرشمہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو قوت کے اعتبار سے تو گھوڑے کی قوت کہاں اور انسان کی قوت کہاں۔ آج ساری قوتیں ہارس پاور کی شکل میں ناپی جارہی ہیں کہ اس میں اتنے ہارس پاور پائے جاتے ہیں، اس میں اتنے ہارس پاور پائے جاتے ہیں۔ لیکن انسان کو یہ دماغ عطا فرما کر اور اس دماغ کے اندر عقل عطاء فرما کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو ایسا بنادیا کہ وہ ساری کائنات کو مسخر کرتا جارہا ہے۔ تو حقیقت میں اس کائنات میں جس چیز کی بھی تعریف کرو گے تو وہ تعریف آخر میں جاکر اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اللہ جل جلالہ کی تعریف ہے، اس لئے فرمایا جارہا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی تمام تعریفیں رب العالمین کے لئے ہیں۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" ایک دعویٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یہ ایک دعویٰ ہے اور رب العالمین جو اگلا جملہ ہے یہ اس دعویٰ کی دلیل ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا، انسانوں کے عالم کا بھی، حیوانوں کے عالم کا بھی، جنات کے عالم کا بھی، آسمانوں کا بھی اور زمینوں کا بھی۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" سے قرآن کا آغاز

دوسری بات یہ کہ قرآن کریم کو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع کرکے اس بات پر متنبہ فرمادیا کہ اگر اللہ کے حکم کے مطابق اور اس کی رضا کے مطابق اس دنیا میں زندگی گزارنا چاہتے ہو تو اس کا پہلا قدم اور اس کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ اللہ کی تعریف کرنے اور شکر کرنے کی عادت ڈالو۔

شکر اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے کی کنجی

اللہ کا شکر اور اس کی حمد اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات پر عمل کرنے کی کنجی ہے۔ وہ اس طرح کہ اسلام کی جتنی بھی تعلیمات ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ ادا کرو، حج کرو، اور فلاں چیز حلال ہے فلاں چیز حرام ہے، یہ جو ساری پابندیاں اور قیود بظاہر آدمی کو مشکل لگتی ہیں، نفس تقاضا کرتا ہے کہ یہ کام کروں لیکن اسلام نے اس کو حرام قرار دے دیا، دل چاہ رہا ہے کہ سوؤں لیکن اسلام نے حکم دیا کہ نہیں

اُٹھو نماز پڑھو، بظاہر یہ ساری چیزیں مشکل لگتی ہیں اور اللہ کا شکر اور اس کی حمد یہ کنجی ہے اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات پر عمل کرنے کی۔

اللہ تعالیٰ کی محبت سے تمام مشکلات آسان ہو جائیں گی

بظاہر تو اسلام کے ان احکامات پر عمل کرنا بہت مشکل لگتا ہے، اس مشکل کو دور کرنے کا واحد علاج یہ ہے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرو۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آجائے گی تو یہ ساری مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ کیونکہ محبت ہی وہ چیز ہے جو انسان کے لئے دشواریوں کو آسان بناتی ہے، مشکلات کو حل کرتی ہے اور محبت کے ذریعہ انسان بڑے سے بڑے سخت کام کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ دیکھو کہ صبح سویرے اُٹھنا اور اُٹھتے ہی بس پکڑنے کے لئے جلدی سے گھر سے نکلنا، اور دفتر میں جا کر آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ادا کرنا اور مسلسل محنت کرنا اور وہاں سے واپس شام کو ایسے وقت میں واپس آنا کہ جس وقت بچے سو گئے ہوں، سارا دن محنت کے اندر گزارنا مشکل کام ہے کہ نہیں؟ لیکن چونکہ دل میں محبت اس بات کی ہے کہ سارا مہینہ کام کرنے کے بعد جب اگلا مہینہ شروع ہو گا تو اس وقت تنخواہ ملے گی اور اس تنخواہ کی محبت سے ساری تلخیاں برداشت ہو جاتی ہیں اور ساری مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ بھائی یہ تو بڑا مشکل کام ہے صبح سویرے اُٹھتے ہو اور سارا دن محنت کرتے ہو اور رات کو کہیں جا کر گھر میں پہنچتے ہو، یہ سب مشکل کام ہے اس لئے یہ سب مشکل کام چھوڑ دو، لاؤ تمہارا کام چھڑوا دیتے ہیں تو وہ کہے گا کہ خدا کے لئے ایسا نہ کیجئے، یہ مصیبت میرے لئے بہتر ہے بہ نسبت اس کام کے کہ آپ میرے روزگار پر لات ماردیں اور میری ملازمت چھڑوا دیں۔ تاجر آدمی دن رات اپنی محنت کے اندر لگا ہوا ہے لیکن ساری محنت برداشت اس لئے کر رہا ہے کہ اس نفع سے محبت ہے جو اس کے نتیجہ میں ملنے والا ہے۔ تو محبت وہ چیز ہوتی ہے جو بڑی سے بڑی چیز کو آسان کر دیتی ہے۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "از محبت تلخہا شیریں شود" کہ محبت کے ذریعہ تلخ سے تلخ کام اور مشکل سے مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔

محبت کی ایک عجیب مثال

دیکھو ماں ہے جو اپنے بچہ کو پالتی ہے اور اس طرح پالتی ہے کہ سردی کا موسم ہے، جاڑے کا موسم ہے، کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے اور رات کا وقت ہے، ماں لحاف میں لیٹی ہوئی ہے اور بچہ نے کوئی پیشاب پاخانہ وغیرہ کر دیا۔ اب وہ اس سردی کے اندر اُٹھ کر جا رہی ہے اس کو دھو رہی ہے، اور یہ

کام اس کے لئے کس قدر مشکل کام ہے جو وہ کر رہی ہے، کوئی کہے کہ یہ مشکل تمہیں اس بچہ کی خاطر پڑی ہے، لاؤ دعا کرتے ہیں کہ یہ بچہ تمہارا نہ رہے کہ جس نے تمہیں اس مشکل میں ڈال دیا یا آئندہ تمہارا کوئی بچہ نہ ہو جو تمہیں اس مشکل میں ڈالے، تو وہ ماں کہے گی، ہزار ہا ایسی مشکلات میرے لئے آسان ہیں کیونکہ اس بچہ سے مجھے محبت اور تعلق ہے۔ تو ساری مشکلات ساری پریشانیاں درحقیقت جو چیز آسان کر دیتی ہے وہ ہے محبت، جس دن یہ محبت پیدا ہوگئی تو ساری مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ ہمارے لئے شریعت کے جتنے احکام ہیں، حلال وحرام، جائز ناجائز، فرض، واجب، سنت، مستحب وغیرہ، ان کو آسان بنانے کا ایک ہی نسخہ ہے اور وہ نسخہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت ہمارے دل میں پیدا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ محبت ہم سب کو عطا فرما دیں تو یقین رکھو کہ سب مشقتیں آسان ہو جائیں گی۔

احکامات پر عمل کرنے کا آسان ترین نسخہ اللہ کی محبت ہے

حضور نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

((قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ))(۱)

''میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز ہے''

حالانکہ نماز ویسے تو مشقت ہی کا کام ہے لیکن وہ آسان اس لئے ہوگئی کہ اس کے اندر لطف آنے لگا اور اس کے اندر لذت حاصل ہونے لگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پناہ گزیر ہے اور اس محبت کے نتیجہ میں ساری مشقتیں آسان ہیں، رات کو اُٹھنا بھی مشکل نہیں، پھر صبح سویرے اُٹھنا بھی مشکل نہیں، پھر روزے رکھنا بھی مشکل نہیں، پھر انسان کو اس مشقت میں بھی لذت آتی ہے کہ یہ مشقت میں اپنے محبوب کی خاطر برداشت کر رہا ہوں، جب آدمی یہ تصور کرتا ہے کہ یہ میں اپنے محبوب کی خاطر برداشت کر رہا ہوں تو اس مشقت میں بھی مزا آتا ہے۔ تو سارے احکامِ شریعت پر عمل کرنے کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت دل میں پیدا ہو جائے۔

محبت حاصل کرنے کا طریقہ شکر ہے

اللہ کی محبت کیسے حاصل ہو کہ جس سے یہ سارے کام آسان ہو جائیں، اس محبت کو حاصل کرنے کا سب سے آسان اور بہترین نسخہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرو! جتنا اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرو گے، اس کی نعمتوں کا استحضار کرو گے، اس کی نعمتوں کو سوچو گے اور اس کا دھیان کرو

---

(۱) سنن النسائي، كتاب عشرة النساء، باب حب النساء، رقم: ۳۸۷۸، مسند أحمد، رقم: ۱۱۸٤٥

گے اتنی ہی محبت میں ترقی ہوتی جائے گی۔ آپ اپنے روزمرہ زندگی کی مثال دیکھ لیجئے کہ جب آپ ماں کو دیکھتے ہیں کہ اس نے میری خاطر کیا کیا مشقتیں برداشت کیں، کتنے دن تک مجھے پیٹ میں رکھا، اس نے کتنی مشکلات برداشت کیں، اس نے کتنی مشکل سے مجھے پالا، اور اب جب بھی کوئی مصیبت کا موقع آتا ہے تو یہ ماں میرے لئے اپنی جان بھی حاضر کردیتی ہے۔ جب آدمی اس کی قربانیوں کو دیکھتا ہے اور اس کے انعامات کو دیکھتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کو اس سے محبت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ باپ سے بھی محبت پیدا ہوتی ہے کیونکہ دیکھتا ہے کہ باپ نے میرے ساتھ کیا کیا احسانات کیے ہیں۔ جتنے انسان کے محسن ہیں ان کے احسانات کا انسان جتنا تصور کرے گا اتنی ہی ان سے محبت پیدا ہوگی۔ ایک آدمی ہے جو روز صبح کو آپ کے گھر میں ہدیہ لاکر ڈال دیتا ہے، آپ نے چاہے اس کو دیکھا بھی نہ ہو لیکن خود بخود آپ کے دل میں محبت پیدا ہو جائے گی کہ کون ایسا مخلص آدمی ہے جو روزانہ مجھے کوئی نہ کوئی تحفہ دے کر چلا جاتا ہے۔ تو اللہ جل جلالہ کے انعامات کا جتنا استحضار انسان کرے گا اور جتنا اس کا دھیان کرے گا تو اتنی ہی اللہ تبارک وتعالیٰ سے محبت پیدا ہو جائے گی، اور محبت پیدا کرنے کا نسخہ ہے شکر۔ گویا دین پر عمل کرنے کا آسان نسخہ ہے محبت پیدا کرنا اور محبت حاصل کرنے کا آسان ترین نسخہ ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا۔ اسی لئے قرآن نے جگہ جگہ حکم دیا ہے کہ شکر ادا کرو۔ ایک جگہ آتا ہے:

﴿اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ﴾(۱)

''اے داؤد کے اہلِ خاندان شکر کرو اللہ کا اور میرے بندوں میں شکر کرنے والے بہت ہی کم ہیں''

غرض قرآن کا آغاز کیا جارہا ہے اللہ کے شکر سے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ اے انسان اگر تو اپنی خیر چاہتا ہے تو اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ اللہ کا شکر گذار بندہ بن جا، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کر، اس کو سوچ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر اور یہ کہہ کہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ اور یہی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کا نسخہ ہے۔

انسان مشکل میں اللہ کو پکارتا ہے

قرآن مجید نے جگہ جگہ انسان کی ایک خصلت بیان کی ہے اور قرآن نے جگہ جگہ اس کا ایک عجیب مزاج بیان فرمایا ہے کہ جب انسان کو کوئی مشکل پڑتی ہے تو وہ اس مشکل میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے کہ اے اللہ! میں اس مشکل میں مبتلا ہو گیا ہوں یہ مجھ سے دور کر دیجئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

(۱) سبا: ۱۳

جب وہ مشکل کام اس سے دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے ہمیں پکارا ہی نہیں اور ہم سے کبھی اس مشکل کو دور کرنے کی درخواست کی ہی نہیں۔

دوسری خصلت انسان کی یہ ہے کہ اگر ہم نے انسان کو ہزار انعامات دیئے ہوں اور ایک تکلیف دے دی ہو تو انسان ان ہزار انعامات کو بھلا دے گا اور اس تکلیف کو لے کر بیٹھ جائے گا کہ یہ تکلیف مجھے پہنچ گئی۔

مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکیمانہ بات

مجھے اپنے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بڑی حکیمانہ بات یاد آئی کہ میری ایک ہمشیرہ ہیں جو الحمد للہ اب بھی حیات ہیں، ان کی عمر کے تقاضا سے ان کے دانت بار بار ٹوٹ رہے تھے اور کچھ دن بعد ایک نہ ایک دانت نکلوانا پڑتا تھا، تو ایک مرتبہ انہوں نے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ یہ دانت بھی بڑی عجیب چیز ہیں کہ یہ آتے ہوئے بھی تکلیف دیتے ہیں اور جاتے ہوئے بھی تکلیف دیتے ہیں کہ کبھی اس دانت میں درد ہو رہا ہے کبھی اس دانت میں درد ہو رہا ہے، کبھی اس دانت کو نکلوانا پڑتا ہے اور کبھی اس دانت کو نکلوانا پڑتا ہے۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خدا کی بندی! تمہیں دانت کی دو ہی باتیں یاد آ رہی ہیں کہ آتے ہوئے بھی اس نے تکلیف دی تھی اور جاتے ہوئے بھی اس نے تکلیف دی اور یہ جو پچاس سال تک اس سرکاری مشین سے فائدہ اُٹھایا وہ تمہیں یاد نہ آیا۔ اس کا تو ذکر کر رہی ہو کہ اس نے آتے ہوئے بھی تکلیف دی اور جاتے ہوئے بھی تکلیف دی اور یہ درمیان میں جو عرصہ گزرا اس میں نجانے کتنی غذائیں کھائیں، کتنی لذتیں حاصل کیں، اس کا خیال نہیں آیا۔

اگر انسان کو اللہ والوں کی صحبت میسر نہ ہو اور اللہ والوں کی نگاہ نہ پڑی ہو تو انسان کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ ذرا سی تکلیف کو لے کر بیٹھ جاتا ہے اور ہزاروں نعمتیں جو عین اسی وقت اس انسان کے اوپر اللہ کی طرف سے بارش کی طرح برس رہی ہیں ان کو بھول جاتا ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا:

﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ﴾ (۱)

"انسان بڑا ناشکرا ہے"

حضرت مولانا اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شکر کا ایک عجیب واقعہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات یاد آئی۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک استاذ

(۱) الحج: ٦٦

حضرت مولانا اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جو حضرت میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے اور بڑے عجیب وغریب بزرگ تھے۔ان کے عجیب وغریب واقعات ہیں۔ان کو شاید اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یادیں تازہ کرنے کے لئے پیدا فرمایا تھا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ وہ بیمار ہیں اور بخار چڑھا ہوا ہے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور جاکر دیکھا تو شدید بخار کی حالت میں تپ رہے تھے، اور جس طرح بخار کی حالت میں انسان کو غفلت ہوتی ہے اس طرح کی غفلت کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے جاکر پوچھا کہ حضرت کیسے مزاج ہیں؟ تو فرمانے لگے کہ بھائی الحمدللہ بہت اچھا ہوں، اللہ کا شکر ہے کہ آنکھ میں درد نہیں ہو رہا، اللہ کا شکر ہے کان میں درد نہیں ہو رہا، اللہ کا شکر ہے ناک بھی ٹھیک ہے، اللہ کا شکر ہے زبان ٹھیک ہے، اللہ کا شکر ہے دل ٹھیک ہے، اللہ کا شکر ہے کہ جگر ٹھیک ہے، جتنی تکلیفیں نہیں تھیں وہ پہلے شمار کرائیں اور اس پر شکر ادا کیا، اور پھر فرمایا کہ ہاں بخار ہو رہا ہے، دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دور فرمادیں۔

نعمت کا استحضار پہلے اور تکلیف بعد میں

جو نعمتیں میسر ہیں ان کا استحضار پہلے کرو اور اگر کوئی تھوڑی بہت تکلیف آئی ہے تو اس تکلیف کا ازالہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو، لیکن یہ کیا کہ آدمی اس تکلیف کو لے کر بیٹھ جائے اور جو بیشمار نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں ان کو بھول جائے، یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے اس کے بجائے انسان پہلے نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر تو ادا کرے پھر تکلیف کی بات کرے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں۔ایک عالم وہ ہے جس میں راحت ہی راحت ہے، آرام ہی آرام ہے، لذت ہی لذت ہے، تکلیف اور غم کا نام نہیں، وہ عالمِ جنت ہے۔اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عطا فرمائے۔دوسرا عالم وہ ہے جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، عذاب ہی عذاب ہے، پریشانی ہی پریشانی ہے، غم ہی غم ہے، راحت اور خوشی کا نام نہیں، اور وہ جہنم ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔تیسرا عالم وہ ہے جس میں راحت بھی ہے، تکلیف بھی ہے، خوشی بھی ہے، غم بھی ہے، پریشانی بھی ہے اور امن وسکون بھی ہے، یعنی دونوں کا مخلوط آمیزہ اور دونوں کا مجموعہ ہے، یہ وہ عالم ہے جس سے ہم اور آپ گزر رہے ہیں یعنی عالمِ دنیا۔

تکالیف کا تناسب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں ہمیشہ کم ہوتا ہے

اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس دنیا میں مجھے راحت ہی راحت ملے، تکلیف کبھی نہ ہو یہ کبھی نہیں ہوسکتا، بڑے سے بڑا سرمایہ دار، بڑے سے بڑا حکمران، بڑے سے بڑا صاحبِ اقتدار یہ منزل حاصل نہیں کرسکتا کہ اس کو دنیا میں کبھی غم اور تکلیف نہ پہنچے۔ تکلیف تو پہنچے گی چاہے مسلمان ہو، چاہے کافر، چاہے عام مسلمان ہو، چاہے ولی اللہ ہو، چاہے صحابی ہو یا پیغمبر ہو، کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، تکلیف بھی ہوگی راحت بھی ہوگی۔ لیکن ہمیشہ یاد رکھو کہ کیسی ہی بڑی سے بڑی تکلیف آجائے اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں اس کا تناسب ہمیشہ کم ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یقیناً زیادہ ہوں گی۔ اگر تکلیف کا تناسب نعمتوں سے بڑھ جائے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب تک زندگی ہے اس وقت تک یہ ضرور ہوگا کہ تکلیفیں بھی ہوں گی اور راحت بھی ہوگی، لیکن ہمیشہ اگر غور کرو تو راحتیں زیادہ ہوں گی اور تکلیفیں کم ہوں گی۔ یہ کائنات کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہے

انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرے اور تکلیف پر صبر کرکے اسی سے مانگے کہ یا اللہ! یہ تکلیف مجھ سے دور فرمادے۔ اور اگر ناشکری کی کہ ساری نعمتوں کو تو بھول گیا اور صرف تکلیف کو لے کر بیٹھ گیا اور اسی بنا پر ناشکری کی اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ تقدیر کا شکوہ کیا کہ میں ہی رہ گیا تھا اس مصیبت کے لئے، اس مصیبت کو اُٹھانے کے لئے، (العیاذ باللہ) تو یہ بات خطرناک ہے۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرکے اس کا شکر ادا کرے۔ دیکھو خدا نہ کرے کہ ایک بیماری آگئی، لیکن ذرا یہ تو دیکھو کہ وہ بیماری کتنی نعمتوں کے ساتھ لپٹ کر آئی ہے، اس بیماری کی حالت میں الحمدللہ تیماردار میسر ہیں، اس بیماری کی حالت میں اللہ کا شکر ہے کہ طبیب یا ڈاکٹر موجود ہیں، اس بیماری کی حالت میں الحمدللہ علاج کے لئے پیسے موجود ہیں، یہ بیماری کی حالت الحمدللہ دوسروں کی بیماری کی حالت سے بہتر ہے کہ دوسرے کی بیماری زیادہ تکلیف دہ اور میری بیماری اس کی نسبت کم تکلیف دہ ہے۔ اگر غور کرو تو اس بیماری کے اندر بھی اتنی نعمتیں نظر آئیں گی کہ انسان اس کا شکر ادا نہیں کرسکے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔ یہ جو قرآن کریم کا آغاز اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے ہورہا ہے وہ ہمیں یہ پیغام دے رہا ہے کہ شکرگذار بننے کی عادت ڈالو کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کو سوچو اور نعمت کو سوچ کر کثرت سے اس پر شکر ادا کرو۔

قرآن کریم نے فرمایا: اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا کہ اے داؤد کی اولاد تم ایسا عمل کرو جس کے

نتیجہ میں شکر پیدا ہو، مطلب یہ کہ شکر گزار بننے کی عادت یہ صرف زبان سے ایک مرتبہ الحمدللہ کہنے سے ادا نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے، اس کے لئے ریاضت کرنی پڑتی ہے، ریاضت کرو اور شکر گذار بندے بن جاؤ۔

تکبر کی جڑ کاٹنے والی چیز شکر ہے

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تمہیں پتہ نہیں کہ شکر کیا چیز ہے۔ شکر وہ چیز ہے کہ اگر اپنی زندگی میں اس کی عادت ڈال لی تو یقین رکھو کہ تنہا یہ شکر تمہیں نہ جانے کتنے روحانی امراض سے نجات عطا کردے گا۔ مثلاً ایک مثال دیتا ہوں کہ جتنے روحانی امراض ہیں ان کی سب سے بڑی جڑ تکبر ہے، یہ تکبر وہ ہے جس نے شیطان کو ہلاکت میں ڈالا، اس تکبر کی جڑ کاٹنے والی چیز شکر ہے۔ کسی زمانہ میں تکبر کا علاج کرنے کے لئے صوفیائے کرام بڑے بڑے مجاہدے اور بڑی بڑی ریاضتیں کروایا کرتے تھے، ایسے ایسے کام پر لگادیتے تھے کہ جس میں انسان کا نفس اور اس کی انا کا پندار ٹوٹ جائے، ایسے کاموں پر مدتیں لگا کر کہیں جا کر تکبر کا علاج ہوتا تھا۔ تو میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اس کا علاج ریاضتیں اور مجاہدات ہیں جس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو تو یہ تکبر کی بیماری خود بخود ختم ہو جائے گی۔

شکر کا مطلب

جب آدمی شکر ادا کرتا ہے کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے کھانا دیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ کپڑا دیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ رتبہ دیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ملازمت دی، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ منصب دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ میں تو اس لائق نہیں تھا، نہ اس کھانے کے لائق تھا، نہ اس کپڑے کے لائق تھا، نہ اس رتبہ اور منصب کے لائق تھا یہ محض آپ نے اپنے فضل سے اپنی رحمت سے مجھے دے دیا۔ ورنہ اگر کسی کے ذمہ تمہارا کوئی قرض تھا اور اس نے وہ قرض ادا کردیا تو کوئی شکر کی بات نہ ہوئی۔ لیکن کوئی شخص تمہارے استحقاق کے بغیر تم کو کوئی چیز دیدے تو یہ شکر کی بات ہے۔ تو جب اللہ کا شکر ادا کیا کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے آپ نے مجھے پیدا کیا، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے آنکھ دی، آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے کان دیا، آپ کا شکر ہے کہ آپنے مجھے گویائی دی، معنی یہ ہیں کہ اے اللہ میں اس کا مستحق نہیں تھا، میرا کوئی حق نہیں تھا آپ پر، آپ نے جو عطاء فرمایا اپنے فضل کرم سے مجھے عطا فرمایا۔ تو جب پہلے ہی قدم پہ آپ نے یہ

اعتراف کرلیا کہ میں مستحق نہیں تھا تو تکبر کی جڑ کٹ گئی۔

شکر کو ختم کرنے کے لئے شیطان کا حربہ

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ فرماتے تھے کہ جب شیطان کو اللہ تعالیٰ نے جنت سے نکالا اور کہا کہ مردود ہوجا! تو چلتے چلتے اس نے بھی درخواست کی کہ یا اللہ نکال تو رہے ہیں تو آپ مجھے اتنی عمر دے دیجئے کہ جب تک یہ دنیا قائم ہے اس وقت تک میں زندہ رہوں، تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ چل دے دی۔ اب جب مل گئی تو اس نے اپنے عزائم کا اظہار اس طرح کیا کہ اچھا جب آپ نے مجھے یہ عمر دے دی تو اب یہ عمر آدم کے بیٹوں کو گمراہ کرنے میں صرف کروں گا۔

قرآن کریم نے فرمایا:

﴿لَاٰتِیَنَّهُمۡ مِّنۡ بَیۡنِ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَعَنۡ اَیۡمَانِهِمۡ وَعَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ﴾(۱)

میں ان کو گمراہ کرنے کے لئے ان کے سامنے سے آؤں گا ان کے پیچھے سے آؤں گا، ان کے دائیں سے آؤں گا، ان کے بائیں سے آؤں گا، یعنی ان پر چاروں طرف سے حملہ کروں گا، اور میرے اس گمراہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا:

﴿وَلَا تَجِدُ اَکۡثَرَهُمۡ شٰکِرِیۡنَ﴾(۲)

آپ ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔ یعنی انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے میرا حربہ یہ ہوگا کہ میں ان کے دلوں سے شکر کو کھرچ دوں گا اور ان کو ناشکرا بنادوں گا۔ اس کے نتیجہ میں یہ گمراہی کے راستہ پر پڑ جائیں گے۔

تو پتہ چلا کہ شیطان کے حربوں سے اگر بچنا ہے تو اس کا راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر گذار بنو اور ہر ہر بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد، واقعات کو سیدھا پڑھنا چاہئے

محترم بھائی مصطفیٰ صادق صاحب نے بڑی اچھی بات یاد دلائی، میرے بڑے بھائی زکی کیفی مرحوم صاحب کی وفات کا واقعہ ہے کہ اس موقع پر حضرت والد صاحب قدس سرہ بہت ہی سخت بیماری میں مبتلا تھے، دل کی تکلیف، بدن میں بہت سخت پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں اور وہ انگارے کی طرح دہک رہی تھیں، اس حالت میں اپنے محبوب ترین بیٹے کے انتقال کی خبر آئی، کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اس دکھ کو لے بیٹھتا، لیکن اس حالت میں جو خط انہوں نے لاہور میں بچوں کے نام لکھا وہ خط پورا پڑھنے کے

(۱) الاعراف: ۱۷ (۲) الاعراف: ۱۷

قابل ہے، اس خط میں لکھا کہ حادثہ تو بڑا عظیم ہے لیکن میرے بچو! یہ غم اس واسطہ ہوتا ہے کہ ہم واقعات کو الٹا پڑھتے ہیں اور الٹا اس طرح پڑھتے ہیں کہ بھئی ایک جوان آدمی پچاس سال کی عمر اور ابھی کسی بچے کی شادی بھی نہیں ہوئی، ایک بچہ مدینہ منورہ میں پڑھ رہا ہے، اور اس حالت میں حج سے آکر اچانک ان کا انتقال ہوگیا۔ فرمایا کہ اس واقعہ کو سیدھا پڑھو اور وہ اس طرح کہ ہر انسان کا ایک ایک سانس اللہ کے ہاں لکھا ہوا ہے، لہٰذا وہ ایک متعین سانس لے کر آئے تھے، گنے چنے سانس لے کر آئے تھے، اتنے ہی سانس ان کو ملنے تھے، اس سے کم و بیش ہو نہیں سکتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس حادثہ کے لئے کیا اسباب تمہاری تسلی کے لئے مہیا فرمائے کہ ایک بیٹا مدینہ منورہ میں پڑھ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حج کا سامان مہیا فرمادیا۔ حج کے لئے گئے تو وہاں بیٹے کو خدمت کا موقع دیا، وہاں بھی انتقال ہوسکتا تھا لیکن حج کی پوری عبادت مکمل کرنے کے بعد یہاں آئے اور یہاں پر آکر الحمدللہ اپنے عزیزوں سے مل بھی لیے اور ملنے کے بعد اپنے دوست احباب کی دعوت بھی کردی اور ماں باپ سے کراچی سے مل کر آگئے، اور یہ سارے اسباب مہیا کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو بلایا۔ گویا واقعات کو الٹا پڑھنے کے بجائے واقعات کو سیدھا پڑھو تو پتہ چلے کہ یہ تکلیف جو تھی وہ کتنی رحمتوں کے ساتھ لپٹ کر آئی تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا شکر

میرے والد ماجد قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ کس طرح کنویں میں ڈالے گئے، غلام بنائے گئے، قید خانہ میں رہے، مدتوں ماں باپ سے جدا رہے، باپ ان کے لئے روتا رہا اور بیٹا باپ کے لئے روتا رہا، سارے سال کے بعد جب مصر میں ملاقات ہوئی تو ایک بیٹا جس کو اس طرح کنویں میں ڈالا گیا ہو، غلام بنایا گیا ہو، قید کیا گیا ہو اور فتنوں میں مبتلا کیا گیا ہو، وہ بعد میں باپ سے ملا تو بجائے زمانہ کا دکھڑا سنانے کے اپنے والد سے فرمایا، جس کو قرآن نے بھی ذکر کیا:

﴿وَقَدْ أَحْسَنَ بِيٓ إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِنۢ بَعْدِ أَن نَّزَغَ الشَّيْطَٰنُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِيٓ﴾(۱)

کہ اللہ نے کتنا احسان کیا میرے اوپر کہ مجھے قید خانہ سے نکال دیا۔ قید خانہ میں جانے کا ذکر نہیں کیا بلکہ ذکر یہ کیا کہ اللہ نے کتنا احسان کیا مجھ پر کہ مجھے قید خانہ سے نکال دیا:

﴿وَجَآءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ﴾(۲)

(۱) یوسف: ۱۰۰ (۲) یوسف: ۱۰۰

اور اے میرے والدین میرے بہن بھائیوں پر کتنا اللہ نے احسان کیا کہ آپ کو دیہات سے لے آیا اور مجھ سے لا کر ملاقات کروائی۔ گویا جدائی کا ذکر نہیں بلکہ ملاقات کا ذکر کیا، اور پیچھے جو واقعات پیش آئے تھے اور بھائیوں نے ظلم کیا تھا، اس کو شیطان کے سر ڈال دیا:

﴿مِنْ بَعْدِ أَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي﴾(۱)

شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان ایک مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ساری تکلیفیں چھوڑ کر اللہ کی نعمتوں کا ذکر کیا اور یہی شکر گذار بندوں کا طریقہ ہے۔

’’الحمد للہ‘‘ ہمیں کیا سبق دے رہا ہے

الحمد للہ کا لفظ جب شروع میں آ گیا تو یہ ہمیں اور آپ کو یہ سبق دے رہا ہے کہ اگر قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو پہلی سیڑھی اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر گذار بندے بن جاؤ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

شکر ادا کرنے کا طریقہ

شکر ادا کرنے کا طریقہ میرے شیخ حضرت عارفی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈال لو اور شکر ادا کرنے کی رٹ لگاؤ! رٹ کا کیا مطلب کہ ہر وقت، ہر لمحہ سوچو، ہوا کا جھونکا چلے اور اچھا معلوم ہو تو کہو، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، گھر میں داخل ہوئے اور بچہ کھیلتا ہوا اچھا معلوم ہوا کہو، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، بھوک کے وقت کھانا سامنے آیا تو کہو، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، جو چھوٹی سے چھوٹی نعمت اور چھوٹی سے چھوٹی خوشی حاصل ہو اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔

مغربی تہذیب کے نتیجہ میں ہماری حالت

مغربی تہذیب کے نتیجہ میں آج ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ جو چیزیں مسلمان کے ادنیٰ خاندان کے اندر معروف اور متعارف تھیں وہ سب چھوٹ گئیں اور ادنیٰ مسلمان خاندان کا یہ حال ہوتا تھا کہ پوچھا کہ بھائی کیسا مزاج ہے تو جواب ہوتا تھا کہ الحمد للہ، اللہ کا شکر ہے۔ تو بچپن سے یہ مزاج بنایا جاتا تھا کہ الحمد للہ کہنے کی عادت ڈالو۔ آج اگر کسی بچے سے پوچھو کہ بیٹے کیسے ہو تو جواب میں وہ کہے گا، ٹھیک ہوں اور الحمد للہ شاذ ونادر ہی کسی کی زبان پر آئے گا، کیونکہ بچے کو سکھایا ہی نہیں گیا اور

(۱) یوسف: ۱۰۰

عادت ہی نہیں ڈالی گئی۔ انگریزوں کا طریقہ ہے کہ جب کوئی کسی سے پوچھتا ہے کہ بھئی کیسے مزاج ہیں تو انگریزی میں کہتے ہیں Fine thanks جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بھئی اچھا ہوں تمہارا شکریہ، یعنی شکریہ اس کا کہ تم نے مجھ سے میرا حال پوچھ لیا، آج وہی عادت ہمارے اندر ہے اور جوان مغربی تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے ہیں یہ عادت ان کو بھی پڑ رہی ہے۔

تو اپنے بچوں کو پہلے دن سے الحمدللہ کہنے کی عادت ڈالو اور خود رٹ لگاؤ اور اس کی مشق کرو کہ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

ایک بزرگ کا معمول

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میرے ایک بزرگ تھے، ایک روز مجھے رات کو ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں جا کر دیکھا کہ جب سونے لگے تو میں دوسرے کمرہ میں تھا، تو میں نے اچانک دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر مستقل کہہ رہے ہیں، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، بڑی دیر تک بڑے جوش کے عالم میں پڑھتے رہے، تو میں نے حضرت سے پوچھا کہ حضرت کیا یہ معمول ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہر وقت مبذول رہتی ہیں لیکن ہم لوگ غفلت کے دھندوں میں پڑے رہتے ہیں۔ لہٰذا میں یہ کرتا ہوں کہ دن میں جو کچھ توفیق ہوگئی سو ہوگئی لیکن میں رات سونے سے پہلے جتنی دن بھر کی نعمتیں میرے تفکر میں آتی ہیں، میں ان کا تصور کرتا رہتا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں کہ یا اللہ جب میں صبح کو اُٹھا تو مجھے سواری مل گئی، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، جب میں دفتر گیا تو وہاں میرے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، جب میں گھر آیا تو گھر والے صحت مند تھے، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، یا اللہ اس وقت مجھے یہ آرام دہ بستر میسر ہے، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، میں اس وقت مکان میں چھت کے نیچے بیٹھا ہوا ہوں کہیں باہر نہیں ہوں، اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، فرماتے ہیں کہ جتنی نعمتیں میسر ہیں ان کا تصور کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر دیتا ہوں۔

اللہ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جس دن یہ کام کر لیا دیکھنا کتنی ترقی ہوتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت میں ترقی ہوگی تو یقیناً اسلام پر عمل آسان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو شکر ادا کرنے کی توفیق عطاء فرمائے اور دین کی صحیح سمجھ اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

”قناعت“ اختیار کرو ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ))(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گذشتہ کل ایک حدیث کا بیان شروع کیا تھا، جس میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کون ہے جو پانچ باتیں مجھ سے سیکھے، اور خود بھی عمل کرے، اور دوسروں تک ان باتوں کو پہنچائے، اور عمل کرائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یا رسول اللہ میں یہ کام کرنے کو تیار ہوں، تو آپ نے یہ پانچ باتیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان فرمادیں، جن میں سے پہلا جملہ وہ تھا جس کی تشریح میں نے کل عرض کی تھی:

((اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ))

”تم حرام چیزوں سے بچو تو تم سارے لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے“

جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انسان کے عبادت گزار ہونے کے لئے سب سے اہم شرط یہ ہے کہ گناہوں سے پرہیز کرے، اور تقویٰ اختیار کرے، اگر گناہوں سے تو پرہیز نہیں کیا، اور نفلی عبادتیں خوب ہو رہی ہیں، تو محض نفلی عبادتوں کی کثرت سے انسان عبادت گزار نہیں بنتا، جب تک اس کے ساتھ ساتھ گناہوں کو بھی ترک نہ کرے، اس کی تھوڑی سی وضاحت اور تفصیل عرض کردی تھی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ظاہر کے گناہ، باطن کے گناہ، حقوق اللہ سے متعلق گناہ، معاشرت سے متعلق گناہ، اخلاق سے متعلق گناہ، اللہ تعالیٰ ان سب گناہوں سے نجات عطا فرمادے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/۴/۱۰۴ تا ۱۲۲) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب من اتقى المحارم فهو أعبد الناس، رقم: ۲۲۲۷، مسند أحمد، رقم: ۷۷٤۸

قسمت کے لکھے ہوئے پر راضی ہو جاؤ

دوسرا فقرہ جو اس حدیث میں ارشاد فرمایا، وہ یہ ہے:

((وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ))

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہاری قسمت میں جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر راضی ہو جاؤ، اگر تم راضی ہو جاؤ گے تو تم دنیا کے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے۔ پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ ''غنی'' کا عام طور پر ترجمہ ''مالدار'' اور ''دولتمند'' سے کیا جاتا ہے، جس کے پاس دولت اور پیسہ زیادہ ہو، وہ غنی ہے، حقیقت میں ''غنی'' کے معنی ''دولتمند'' کے نہیں ہیں، بلکہ حقیقت میں ''غنی'' کے معنی ہیں ''وہ شخص جو کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو''، چونکہ جس شخص کے پاس دولت ہے، پیسہ ہے، امیر آدمی ہے، ایسا شخص کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا، کسی سے اس کو مانگنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، اس وجہ سے اس کو ''غنی'' کہتے ہیں، ورنہ اصل میں ''غنی'' کے معنی ''مالداری'' کے نہیں، بلکہ اس کے اصل معنی ''حاجت سے بے نیاز'' ہونے کے ہیں کہ آدمی کو کسی دوسرے کی حاجت نہیں۔

غنی کون؟

ایک حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ))(۱)

اصل میں ''غنیٰ'' روپے، پیسے اور سامان کی کثرت سے نہیں ہوتی، بلکہ اصل میں ''غنیٰ'' نفس کا ''غنیٰ'' ہے کہ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تقدیر پر ''قناعت'' ہو جائے، اور اس صورت میں وہ دوسروں سے بے نیاز ہو جائے کہ بس جو مجھے مل گیا وہ ہی میرے لئے کافی ہے، انسان کے دل میں جب یہ خیال پیدا ہو جائے تو انسان ''غنی'' ہے۔ اس لئے کہ پیسہ بذاتِ خود تو کوئی چیز نہیں۔ کیا پیسوں کو بھوک کے وقت کھا لو گے؟ نہیں۔ یا اس کو کپڑوں کی جگہ پہن لو گے؟ نہیں۔ بلکہ پیسوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو تنگ دستی نہ ہو، اس کی ضرورت پوری ہو جائے، اور دوسروں کا محتاج نہ ہو۔ اب اگر ایک آدمی کے پاس بہت سارا روپیہ ہے، بینک بیلنس ہے، کوٹھی بنگلہ ہے، کاریں ہیں، دنیا کا سارا ساز و سامان موجود ہے، ان سب کے ہونے کے باوجود اس کے اندر ''بے نیازی'' پیدا نہیں ہوئی، پھر بھی وہ شخص

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب الغنى غنى النفس، رقم: ۵۹٦۵، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب ليس الغنى عن كثرة العرض، رقم: ۱۷٤۱، سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء أن الغنى غنى النفس، رقم: ۲۲۹۵، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب القناعة، رقم: ٤۱۲۷۔ مسند أحمد، رقم: ۷۰۱۵

دوسروں کا حاجت مند رہا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ''غنیٰ'' حاصل نہیں۔ دوسرا شخص وہ ہے جس کی آمدنی کم ہے، گنتی میں اس کے پیسے کم ہیں، لیکن وہ شخص دوسروں سے بے نیاز ہے، وہ کسی کے مال کی طرف منہ اُٹھا کر نہیں دیکھتا، کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا، کسی کے پیچھے نہیں پھرتا، یہ شخص ''غنی'' ہے، اس کو ''غنیٰ'' حاصل ہے۔ لہٰذا اصل غنیٰ دل کا غنیٰ ہے کہ دل دوسروں سے بے نیاز ہو جائے۔

غنیٰ کے لئے دو چیزوں کی ضرورت

بہر حال! اس جملے میں حضورِ اقدس ﷺ بڑے کام کی بات ارشاد فرما رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین، وہ یہ کہ اپنی قسمت پر راضی ہو جاؤ تو ساری دنیا میں سب سے ''غنی'' تم ہو گے۔ اس جملے میں حضورِ اقدس ﷺ نے دو باتوں کی تلقین فرمائی، ایک ''قناعت'' دوسرے ''رضا بالقضاء'' تقدیر پر راضی ہونا، اگر یہ باتیں حاصل ہو جائیں تو تم سارے انسانوں میں ''غنی'' ہو جاؤ گے۔ پہلی بات ہے ''قناعت''، قناعت کے معنی ہیں جائز اور مناسب تدبیر اور دوڑ دھوپ کے بعد حلال طریقے سے جو کچھ مجھے مل گیا، بس وہ میرے لئے کافی ہے، مجھے اور زیادہ کی ہوس نہیں، حرص نہیں، اس کا نام ہے قناعت، یہ بہت اہم صفت ہے، جو ہر مؤمن کے اندر مطلوب ہے، اور خود حضورِ اقدس ﷺ نے اپنے لئے دعا مانگی ہے، فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ))(۱)

اے اللہ! جو رزق آپ نے مجھے عطا فرمایا ہے، اس پر مجھے قناعت بھی عطا فرما۔ اس قناعت کے بغیر انسان کو راحت اور سکون حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔

ہر خواہش پوری نہیں ہو سکتی

قناعت حاصل کرنے کے لئے آدمی کو یہ سوچنا چاہئے کہ دل میں خواہشات تو بیشمار پیدا ہوتی رہتی ہیں کہ ایسا بن جاؤں، مجھے اتنی دولت حاصل ہو جائے، مجھے کوٹھی اور بنگلہ حاصل ہو جائے، کاریں مل جائیں، یہ سب خواہشات تو دل میں پیدا ہوتی رہتی ہیں، لیکن اس روئے زمین پر کون سا انسان ایسا ہے جس کی ہر خواہش پوری ہو جاتی ہو؟ کوئی ہے؟ نہیں۔ چاہے بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، چاہے بڑے سے بڑا ولی اللہ ہو، بڑے سے بڑا صوفی ہو، بزرگ ہو، عالم ہو، کوئی نہیں ہے جس کی ہر خواہش پوری

(۱) المستدرك للحاكم (۲۰۲/۳) رقم: ۳۳٦۰، شعب الإيمان (۳۵۳/۳)، رقم: ٤۰٤۷، صحيح ابن خزيمة (٤۳/۱۰) رقم: ۲۵۲۲۔ پوری دعا کچھ یوں ہے: "اَللّٰھُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَاخْلُفْ عَلٰی کُلِّ غَائِبَةٍ لِّیْ مِنْكَ بِخَیْرٍ"

ہو جاتی ہو، یہ تو دنیا ہے، جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ اس میں تمہاری کچھ خواہشات پوری ہوں گی، اور کچھ نہیں ہوں گی، جب ہر خواہش پوری نہیں ہوگی تو اب دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ یا تو ساری زندگی خواہش پوری نہ ہونے پر کڑھتے رہو، اور یہ شکوہ شکایت کرتے رہو کہ میری فلاں خواہش پوری نہیں ہوئی، میں فلاں چیز چاہ رہا تھا، وہ نہیں ملی، ساری زندگی اس حسرت اور افسوس میں گزار دو۔ اس لئے کہ تقدیر سے زیادہ تو تمہیں کبھی کوئی چیز نہیں مل سکتی، چاہے رو، چاہے فریاد کرو، چاہے کڑھتے رہو، اور لوگوں کے سامنے شکوے کرتے رہو، ملے گا وہی جو تقدیر میں لکھا ہے۔

اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ

دوسری صورت یہ ہے کہ جو کچھ مل رہا ہے اس کو ہنسی خوشی قبول کرلو، اور اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ، اور قناعت اختیار کرلو، بس یہی دو صورتیں ہیں، لہٰذا اللہ جل شانہ کی تقدیر پر اور اس کی تقسیم پر راضی ہو جاؤ کہ تمہیں جتنا کچھ دیا ہے، تمہارے لئے وہ ہی مناسب ہے۔ البتہ جائز اور حلال طریقوں سے تدبیر کرنا منع نہیں، لیکن تدبیر کرنے کے بعد جو مل گیا، اس پر خوش ہو جاؤ کہ ہاں! میرا حق اتنا ہی تھا، جو مجھے میرے اللہ نے دیا، اب اس سے زیادہ کی ہوس میں مبتلا ہوکر خود بھی پریشان ہونا اور دوسروں کو بھی پریشان کرنا، اور اس کے لئے جائز اور ناجائز طریقے استعمال کرنا یہ وہ بلا ہے جس میں آج پوری دنیا مبتلا ہے، اور نبی کریم ﷺ اس جملے کے ذریعے اس سے بچانے کی کوشش فرمارہے ہیں۔

جائز اور حلال طریقے سے اعتدال سے کماؤ

پہلی بات یہ ہے کہ دولت اور پیسے کے حاصل کرنے کے لئے ناجائز اور حرام تدبیر نہ ہو، بلکہ جو طریقہ بھی پیسے کمانے کا اختیار کرو وہ حلال اور جائز ہونا چاہئے، اور جو کچھ ملے اس پر قناعت اختیار کرو۔ دوسری بات یہ ہے کہ جائز اور حلال طریقوں کو بھی اعتدال کے ساتھ اختیار کرو، یہ نہیں کہ صبح سے لے کر شام تک بس پیسے کمانے میں منہمک ہے، اور دنیا کی دوڑ دھوپ میں لگا ہوا ہے، سب کچھ مل جانے کے باوجود خواہش یہ ہے کہ اور مل جائے، اس دنیا کی حرص و ہوس اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ہر وقت دل و دماغ پر دنیا کی فکر سوار ہے۔ ایک مؤمن کے اندر یہ چیز مطلوب نہیں، چاہے وہ جائز اور حلال طریقے سے کر رہا ہو، اس لئے کہ جائز اور حلال طریقوں کے اندر بھی اعتدال مطلوب ہے، یہ نہ ہو کہ دنیا کو اپنے اوپر اس طرح سوار کرلیا کہ اب خواب بھی اس کے آرہے ہیں، بقول شخصے کہ ''جس تاجر کے دماغ پر دنیا سوار ہوتی ہے، جب وہ رات کو بستر پر لیٹتا ہے تو آسمان کے ستارے بھی اس کو آپس میں تجارت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں'' یہ حالت اچھی نہیں۔

پیسوں کو خادم بناؤ، مخدوم نہ بناؤ

ارے بھائی! یہ پیسہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا خادم بنا کر پیدا کیا ہے کہ تمہاری خدمت کرے، نہ یہ کہ یہ پیسہ تمہارا مخدوم بن جائے، اور تم اس کے خادم بن جاؤ کہ میں کس طرح اس کو حاصل کرلوں، کس طرح اس کو رکھوں، کہاں خرچ کروں؟ اور کس طرح مزید پیسہ پیدا کروں؟ ہم نے اُلٹا معاملہ کرلیا ہے کہ وہ پیسہ جو ہمارا خادم تھا، ہم نے اس کو مخدوم بنادیا ہے۔ اب اس پیسے کے پیچھے اپنی جان بھی جارہی ہے صحت بھی خراب ہورہی ہے، دین بھی خراب ہورہا ہے، لوگوں سے تعلقات بھی خراب ہورہے ہیں، اور دن رات یہی فکر ہے۔

سبق آموز واقعہ

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ''گلستان'' میں اپنا ایک قصہ لکھا ہے کہ میں ایک مرتبہ سفر پر تھا کہ ایک شہر میں ایک تاجر کے گھر میں مقیم ہوگیا، بہت بڑا تاجر تھا، اس کا گھر بھی عالیشان تھا، اور اس میں دنیا کی ہر چیز موجود تھی۔ جب دسترخوان پر کھانے کے لئے بیٹھے تو بات چیت شروع ہوئی، اس تاجر کی عمر تقریباً ۷۰ سال تھی، میں نے اس تاجر سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت مال و دولت سے نوازا ہے، اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ اس تاجر نے کہا کہ میں نے ساری دنیا میں گھوم لیا، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت کچھ عطا فرمایا، لیکن میرے دل میں ایک حسرت ہے وہ یہ کہ میں ایک آخری تجارتی چکر لگانا چاہتا ہوں، اس کے بعد اپنی بقیہ زندگی اپنے وطن میں گزار دوں گا۔ میں نے پوچھا کہ وہ آخری چکر کہاں کا ہے؟ اس تاجر نے اس آخری چکر کی تفصیل یہ بتائی کہ میں ایرانؔ سے گندھک خرید کر چینؔ جاؤں گا، وہاں سے چینی برتن خریدوں گا، وہ برتن رومؔ میں لے جاکر فروخت کروں گا، اور رومؔ سے ریشم خرید کر ہندوستانؔ میں فروخت کروں گا، اور ہندوستانؔ سے لوہا خرید کر حلبؔ میں فروخت کروں گا، اور حلبؔ کا آئینہ خرید کر یمنؔ میں فروخت کروں گا، اور یمنؔ سے چادریں خرید کر ایرانؔ میں فروخت کروں گا، اور اس کے بعد سفر چھوڑ کر ایک دکان میں بیٹھ کر بقیہ زندگی گزار دوں گا، اس کے بعد اس نے شیخ سعدی سے کہا کہ تم بھی تو کہو، تم نے جو سفر میں دیکھا سنا ہو اس کے بارے میں بتاؤ، شیخ سعدی نے کہا کہ یہ دو شعر سن لو:

آں شنیدستی کہ در صحرای غور
بار سالارے بیفتاد از ستور
گفت چشمِ تنگِ دنیا دار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

کہ تم نے یہ قصہ سنا ہے کہ غور کے صحراء میں ایک سردار اپنے خچر پر سامان لے جا رہا تھا، خچر نے اس تاجر کو نیچے گرایا، وہ تاجر مر گیا، اور تجارت کا سارا سامان جنگل میں پڑا رہ گیا، وہ بکھرا ہوا سامان زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا دار کی تنگ نظر کو یا تو قناعت بھر سکتی ہے، یا قبر کی مٹی بھر سکتی ہے، اس کے بھرنے کا کوئی اور راستہ نہیں۔ (۱)

انسان کا پیٹ قبر کی مٹی بھر سکتی ہے

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ اشعار درحقیقت ایک حدیث کا مضمون ہیں، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا:

((لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ لَابْتَغٰى أَنْ يَكُوْنَ لَهٗ وَادِيَانِ، وَلَوْ كَانَ لَهٗ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُوْنَ لَهٗ ثَالِثًا، وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ)) (۲)

اگر ابن آدم کو سونے سے بھری ہوئی ایک وادی مل جائے تو وہ چاہے گا کہ میرے پاس سونے کی دو وادیاں ہو جائیں، اور اگر دو وادیاں سونے سے بھری ہوئی مل جائیں تو وہ چاہے گا کہ مجھے تیسری وادی مل جائے، اور ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی، اس کا پیٹ ہر وقت خالی رہتا ہے، اور دل چاہتا ہے کہ اس کے اندر اور آ جائے، اور آ جائے، اور یہ پیٹ اس وقت بھرے گا جب وہ قبر میں جائے گا، اور قبر کی مٹی اس میں داخل ہوگی تب وہ بھرے گا، اس سے پہلے قناعت حاصل نہیں ہوگی۔

حرص و ہوس چھوڑ دو

اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ اگر راحت چاہتے ہو تو قناعت پیدا کرو، وہ یہ کہ جائز اور حلال طریقے سے جو کچھ مجھے مل رہا ہے، وہ الحمد للہ میرے لئے ایک نعمت ہے، مجھے زیادہ کی ہوس نہیں۔ ایک بہت بڑا فتنہ جو ہمیشہ سے ہے، لیکن آج یہ فتنہ بہت بڑھا ہوا ہے، وہ حرص و ہوس ہے،

---

(۱) گلستانِ سعدی، ص ۱۲۰

(۲) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب ما يتقي من فتنة المال، رقم: ۵۹۵۹، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب لو أن لابن آدم واديين لابتغى ثالثا، رقم: ۱۷۳۸، سنن الترمذي، كتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء لو كان لابن آدم واديان من مال، رقم: ۲۲۵۹، مسند أحمد، رقم: ۱۲۲۵۶

مثلاً یہ حرص ہے کہ فلاں کے پاس جیسا بنگلہ ہے، میرے پاس بھی ویسا بنگلہ ہو، فلاں کے پاس جیسی گاڑی ہے، میرے پاس بھی ویسی گاڑی ہو، فلاں کے پاس جیسا کارخانہ ہے، میرے پاس بھی ایسا کارخانہ ہو۔ بلکہ میں اس سے بھی آگے بڑھ جاؤں۔ آگے بڑھنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اگر فرض کرو کہ اس دوڑ کے باوجود حلال وحرام کی فکر ہے، تب بھی اپنے دل کا سکون تو اس دوڑ کے نتیجے میں غارت کیے ہوئے ہے کہ مجھے اور مل جائے، اور مل جائے۔

اپنے سے اُونچے آدمی کو مت دیکھو

اب سوال یہ ہے کہ قناعت کیسے پیدا ہوگی؟ اس کے بارے میں فرمایا کہ دنیا کے معاملات میں اپنے سے اُونچے آدمی کو مت دیکھو، بلکہ اپنے سے نیچے آدمی کو دیکھو، اس لئے کہ اگر اپنے سے اُونچے آدمی کو دیکھو گے تو ہر وقت دل میں یہ حسرت رہے گی کہ اچھا اس کے پاس ایسی گاڑی ہے، میرے پاس بھی ایسی گاڑی ہونی چاہئے، اس کے پاس ایسا مکان ہے، میرے پاس بھی ایسا مکان ہونا چاہئے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہوس بڑھتی چلی جائے گی، لیکن جب تم اپنے سے نیچے آدمی کو دیکھو گے تو اس صورت میں شکر کے جذبات پیدا ہوں گے، تم یہ سوچو گے کہ یہ بھی میری طرح گوشت پوست کا انسان ہے، اور یہ اس حالت میں زندگی گزار رہا ہے، مجھے تو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ نوازا ہے، مجھے تو اس کا شکر ادا کرنا چاہئے، یہ سوچنے سے انسان کے اندر ''قناعت'' پیدا ہوگی۔ لہٰذا اپنے سے کمتر کو دیکھا کرو

حضرت عون بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

ایک محدث عون بن عبداللہ بن عتبہ فرماتے ہیں:

> ''میں نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ مالداروں کے ساتھ گزارا (خود بھی مالدار تھے) صبح سے شام تک مالداروں کے ساتھ رہتا تھا، لیکن جب تک مالداروں کی صحبت میں رہا، مجھ سے زیادہ غمگین انسان کوئی نہیں تھا، کیونکہ جہاں جاتا، یہ دیکھتا کہ اس کا گھر میرے گھر سے اچھا ہے، اس کی سواری میری سواری سے اچھی ہے، اس کا کپڑا میرے کپڑے سے اچھا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ دیکھ کر میرے دل میں کڑھن پیدا ہوتی تھی کہ مجھے تو ملا نہیں اور اس کو مل گیا۔ لیکن بعد میں دنیاوی حیثیت سے جو کم مال والے تھے، اُن کی صحبت اختیار کی، اور ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگا، تو میں راحت میں آ گیا، اس واسطے کہ جس کو بھی دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں تو بہت خوشحال ہوں، میرا کھانا بھی اس کے کھانے سے اچھا ہے، میرا کپڑا بھی اس کے

کپڑے سے اچھا ہے، میرا گھر بھی اس کے گھر سے اچھا ہے، میری سواری بھی اس کی سواری سے اچھی ہے، اس واسطے میں اب الحمدللہ راحت میں آگیا ہوں"۔(۱)

دنیا کا مہنگا ترین بازار

ارے بھائی! اگر تم اپنے سے اوپر دیکھنا شروع کرو گے تو اوپر والوں کی کوئی حد اور انتہا ہی نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میں امریکہ میں گیا، امریکا کے شہر لاس اینجلس میں ایک بازار ہے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا مہنگا ترین بازار ہے، اس بازار میں میرا جانا ہوا، میرے میزبان نے ایک دکان کی طرف اشارہ کیا، اور کہا کہ یہ دکان ایسی ہے کہ اس دکان میں رکھی ہوئی اشیاء کی قیمتیں تصور سے بھی زیادہ ہیں، مثلاً یہ موزے جو سامنے رکھے ہوئے ہیں، ان کی قیمت ۲۰۰ ڈالر ہے، اور یہ سوٹ بیس ہزار ڈالر کا ہے، ہمارے حساب سے بارہ لاکھ روپے کا ایک سوٹ، اور یہ دکاندار صرف کپڑے اور سوٹ فروخت نہیں کرتا، بلکہ یہ مشورہ بھی دیتا ہے کہ آپ کے جسم پر کس قسم کا، کس ڈیزائن کا اور کس کلر کا لباس مناسب ہوگا، اور اس مشورے کے دس ہزار ڈالر الگ چارج کرتا ہے، اور پھر اس سوٹ کی تیاری پر چالیس، پچاس ہزار ڈالر الگ ہوں گے، اس طرح ایک سوٹ جو آپ سر سے لے کر پاؤں تک پہنیں گے پچاس، ساٹھ ہزار ڈالر میں تیار ہوگا۔

شہزادہ چارلس اور دِلی خواہش

اور اس شخص سے لباس کے بارے میں مشورہ لینے کے لئے مہینوں پہلے وقت لینا پڑتا ہے، اور برطانیہ کے شہزادہ چارلس نے اس سے وقت مانگا تو دو مہینے بعد کا وقت ملا۔ اب وہ شہزادہ چارلس دو مہینے تک تکلیف میں رہا، اس لئے کہ اس کا دل چاہ رہا ہے کہ اس سے ملاقات کی فضیلت مجھے حاصل ہو جائے، اور پھر اس کے مشورے سے تیار کردہ سوٹ میں بھی پہنوں، اور پیسے خرچ کرنے کے لئے بھی تیار ہے، لیکن اس کے باوجود بھی دل کی خواہش پوری نہیں ہو رہی ہے۔ یہ بھی دولت خرچ کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اب اس کو دیکھو، اور سوچو کہ میں اس طرح لباس تیار کرا کر پہنوں، نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری زندگی حسرت میں گزر جائے گی، لیکن یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر تم اپنے سے اوپر دیکھنا شروع کرو گے تو اس کی کوئی حد نہیں۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب اللباس عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی ترقیع الثوب، رقم: ۱۷۰۲، حلیة الأولیاء (۱۸۹/۲)، فیض القدیر (۹۳/۲)، تفسیر ابن کثیر (۶۴۵/۱)، صفة الصفوة (۱۱۰/۳)

کس طرف دیکھو گے؟

جس بازار کا میں یہ واقعہ بتا رہا ہوں، اسی بازار سے دو میل کے فاصلے پر ایک اور بازار میں یہ منظر بھی دیکھا کہ وہاں پر لوگ ٹرالیاں لے کر جا رہے ہیں، اور کوکا کولا، اور پیپسی کولا کے خالی ڈبے جمع کر رہے ہیں، اور ان کو فروخت کر کے اپنا پیٹ پال رہے ہیں، اور رات کو سوتے وقت اسی ٹرالی میں سے ایک کمبل نکالا، اور راستے کے کنارے ٹرالی کھڑی کی، اور وہیں فٹ پاتھ پر سردی میں سو گئے۔ اب بتاؤ! اُدھر دیکھو گے یا اِدھر دیکھو گے؟ اگر اُدھر دیکھو گے تو تمہارا پیٹ کبھی نہیں بھرے گا، کبھی تمہاری آنکھ سیر نہیں ہوگی، کبھی تمہیں آرام اور سکون حاصل نہیں ہوگا، لیکن اگر دوسری طرف دیکھو گے اور یہ سوچو گے کہ یہ بھی اللہ کے بندے ہیں، کس طرح رات گزارتے ہیں، ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سو کر رات گزار رہے ہیں، اللہ نے مجھے تو راحت اور آرام والا مکان عطا فرمایا ہے، اس سوچ کے نتیجے میں اطمینان اور سکون عطا ہوگا۔ اس لئے حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے اصول بتا دیا کہ دین کے معاملے میں اپنے سے اعلیٰ کو دیکھو، اور دنیا کے معاملے میں اپنے سے کمتر کو دیکھو، تو اس کے نتیجے میں شکر پیدا ہوگا، اور قناعت پیدا ہوگی۔ (۱)

حرص و ہوس انسان کو جلاتی رہتی ہے

قناعت سے بہتر کوئی دولت نہیں، کیونکہ جب انسان کے دل میں ہوس کی آگ لگ جاتی ہے تو پھر اس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہوتی، پھر یہ ہوس انسان کو جلاتی رہتی ہے، اور حاصل کچھ نہیں ہوتا، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے ہمیں یہ دعا سکھائی، ہم سب کو یہ دعا مانگنی چاہئے، اگر عربی الفاظ یاد ہو جائیں تو بہت اچھا ہے، ورنہ اُردو میں ہی مانگ لیا کریں، وہ دعا یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَاخْلُفْ عَلٰی كُلِّ غَائِبَةٍ لِّیْ مِنْكَ بِخَیْرٍ))(۲)

اے اللہ! جو کچھ آپ نے مجھے رزق عطا فرمایا ہے، اس پر مجھے قناعت عطا فرما دیجئے، اور جو نعمتیں مجھے حاصل نہیں ہیں، ان کے بدلے میں مجھے اپنی طرف سے جو میرے حق میں بہتر ہو وہ عطا فرما۔ ہو سکتا ہے کہ میں جس چیز کی خواہش کر رہا ہوں، وہ میرے حق میں ٹھیک نہ ہو، مناسب نہ ہو، لیکن آپ اپنے فضل و کرم سے جو ہمیں عطا فرمائیں گے، وہی میرے حق میں مناسب ہوگا، وہی مجھے عطا فرما دیں۔

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، مسند الأنصار، مسند أبي ذر الغفاري، رقم: ۲۰۴۴۷، ۲۰۵۴۰

(۲) المستدرك للحاكم (۲۰۲/۳) رقم: ۳۳۶۰، شعب الإيمان (۳۵۳/۳)، رقم: ۴۰۴۷، صحيح ابن خزيمة (۴۳/۱۰) رقم: ۲۵۲۲

ایک خوبصورت دعا

ایک اور دعا حضور اقدس ﷺ نے یہ سکھائی:

((اَللّٰهُمَّ مَا رَزَقْتَنِیْ مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ قُوَّةً لِّیْ فِیْمَا تُحِبُّ، وَمَا زَوَیْتَ عَنِّیْ مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ فَرَاغًا لِّیْ فِیْمَا تُحِبُّ))(۱)

کیا عجیب وغریب دعا حضور اقدس ﷺ نے مانگی ہے، فرمایا کہ اے اللہ! میری پسندیدہ چیز جو آپ نے مجھے عطا فرمائی ہے، اس چیز کو ان کاموں کا ذریعہ بنا دیجئے جو آپ کو پسند ہیں۔ اور میری پسندیدہ چیز جو آپ نے مجھے نہیں دی تو اس کے بدلے میں مجھے وہ چیز عطا فرما دیجئے جو آپ کی پسند ہے۔ نبی کے علاوہ کوئی دوسرا شخص یہ دعا مانگ ہی نہیں سکتا۔ بہر حال! قناعت کے بغیر اس دنیا میں راحت حاصل نہیں ہوسکتی۔

دولت نے بیٹے کو باپ سے دور کر دیا

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ والد صاحب کے جاننے والوں میں ایک تاجر تھے، ان کا ایک کاروبار کراچی میں تھا، ایک ممبئی میں، ایک سنگاپور میں، ایک بنکاک میں تھا، کئی شہروں میں فیکٹریاں لگی ہوئی تھیں، ایک بیٹا سنگاپور میں کام کر رہا ہے، ایک بنکاک میں کام کر رہا ہے، ایک ممبئی میں کام کر رہا ہے، اور خود کراچی میں کام کر رہے ہیں۔ والد صاحب نے ایک دن ان سے پوچھا کہ آپ کی اپنے بیٹوں سے ملاقات ہو جاتی ہے؟ جواب میں کہنے لگے کہ میری اپنے بیٹے سے ملاقات کو اتنے سال ہو گئے ہیں۔ گویا کہ ایک بیٹا اپنے کاروبار میں مگن ہے، اور دوسرا بیٹا اپنے کاروبار میں مگن ہے، اور باپ اپنے کاروبار میں مگن ہیں، سالہا سال سے باپ نے اپنے بیٹے کی شکل نہیں دیکھی، اور بیٹے نے باپ کی شکل نہیں دیکھی، اور پیسوں کی گنتی میں روز اضافہ ہو رہا ہے۔ ارے بھائی! جن پیسوں کے نتیجے میں انسان کو اپنی اولاد سے، اپنے باپ سے ملنے کی نعمت نصیب نہ ہو، ایسا پیسہ کس کام کا؟

اولاد کا قرب بڑی نعمت ہے

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم میں ایک کافر کا واقعہ بیان کیا ہے، جو بڑا اکڑ قسم کا کافر تھا اور ہم نے اس کو کیسی نعمتوں سے نوازا تھا، فرمایا:

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید، رقم: ۳۴۱۳

﴿وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًاۙ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًاۙ﴾(۱)

یعنی ہم نے اس کو مال بھی بے انتہا دیا تھا، اور اس کو اولاد بھی دی تھی جو اس کے پاس موجود تھی۔ جس سے معلوم ہوا کہ اولاد کا پاس موجود ہونا یہ اللہ جل شانہ کی عظیم نعمت ہے، اگر انسان کے پاس روپیہ پیسہ تو ہو لیکن اولاد قریب نہ ہو تو ان پیسوں کا کیا فائدہ؟

اس مقدار پر راضی ہو جاؤ

اس لئے حضورِ اقدس ﷺ فرما رہے ہیں کہ اگر تم صحیح معنی میں مالداری چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے کہ اس مقدار پر راضی ہو جاؤ جو اللہ جل شانہ نے تمہاری قسمت کے حساب سے تمہیں عطا فرما دی، تو پھر انشاء اللہ راحت اور آرام میں رہو گے، اور پھر کسی کے محتاج نہیں ہو گے، اور نہ کسی کی طرف تمہاری نگاہیں اُٹھیں گی، اور تم سیر چشم رہو گے۔ لیکن اگر تم اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی نہ ہو گے تو پھر ہزار ہاتھ پاؤں مارتے رہو، اور دل میں غمگین بھی ہوتے رہو، کبھی بھی دل کا غنیٰ حاصل نہیں ہوگا، جو اصل مقصود ہے۔

میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

خلاصہ یہ کہ حضور ﷺ نے اس جملے میں دو باتوں کی تاکید فرمائی ہے، ایک قناعت حاصل کرنے کی، دوسرے رضا بالقضاء کی، آج مختصراً ''قناعت'' کے بارے میں عرض کر دیا کہ اپنے تمام معاملات میں جائز اور حلال طریقے سے جو کچھ حاصل ہو رہا ہے، اس پر خوش ہو جاؤ، دوسروں کی طرف مت دیکھو کہ دوسروں کے پاس کیا ہے؟ ارے بھائی! دوسرے کا معاملہ وہ جانے، تمہارا معاملہ تم جانو، تم اس فکر میں کیوں پڑے ہو کہ دوسرے کے پاس کیا ہے؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بڑا خوبصورت، بڑا معنی خیز شعر ہے، اگر انسان اس پر عمل کرے تو اس کو بڑا سکون حاصل ہو جائے، فرماتے ہیں ؂

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مے
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

مجھے اس سے کیا غرض کہ کس کے گلاس میں کتنی ہے، ہاں مجھے جو کچھ ملا ہے، وہ میرے لئے حاصلِ میخانہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے، درحقیقت وہی میرے لئے کافی ہے، قناعت یہ ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے پر راضی ہو جاؤ، اور اس کو اپنے لئے نعمت سمجھو، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا

(۱) المدثر: ۱۲، ۱۳

کرو، اور دوسروں کی طرف دیکھ کر حرص وہوس میں مبتلا نہ ہو۔

تجارت کو ترقی دینا قناعت کے خلاف نہیں

یہاں میں ایک اور وضاحت کردوں، وہ یہ کہ لوگ بعض اوقات ''قناعت'' کا مطلب یہ سمجھ بیٹھتے ہیں، اور اس ساری گفتگو کا یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ جو شخص تاجر ہے اس کو آگے تجارت بڑھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، قناعت کا مقصد یہ نہیں، میں نے تین الفاظ استعمال کیے، ایک یہ کہ مال کمانے کا طریقہ جائز ہو، دوسرے وہ مال حلال ہو، تیسرے یہ کہ اعتدال کے ساتھ ہو، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((أَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ))(۱)

لہٰذا اعتدال کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کمانے کو اپنے اوپر سوار نہ کرو، مال کے خادم نہ بنو، اب اگر ایک شخص جائز طریقے سے اور اعتدال کے ساتھ اپنے کاروبار کو بڑھا رہا ہے، تو شریعت نے اس پر نہ صرف یہ کہ پابندی عائد نہیں کی، بلکہ یہ عمل قناعت کے بھی منافی نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے کاروبار کو ناجائز اور حرام طریقے سے بڑھا رہا ہے، وہ تو بالکل ہی حرام ہے، دوسرا یہ کہ اگرچہ ناجائز کا ارتکاب نہیں ہو رہا ہے، لیکن اعتدال سے بڑھا ہوا ہے، اس لئے کہ دن رات مال بڑھانے کے علاوہ کوئی اور فکر ہی نہیں ہے، یا اس کاروبار کے نتیجے میں دوسروں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں، یہ بھی اعتدال سے بڑھنے میں داخل ہے، تیسرے یہ کہ آدمی اس کاروبار میں ایسا مشغول ہوگیا ہے کہ اب اس کو کسی دینی محفل میں جانے کی فرصت نہیں، دین کی بات سیکھنے کی فرصت نہیں، کسی اللہ والے کے پاس جاکر بیٹھنے کی فرصت نہیں، یہ بھی اعتدال سے خارج ہے، اور قناعت کے خلاف ہے۔

بہرحال! اعتدال کے ساتھ، جائز طریقے سے دنیا کماؤ، اور جو ملے اس پر راضی رہو، بس اسی کا نام قناعت ہے۔ اس دنیا میں قناعت کے علاوہ راحت حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو قناعت کی دولت عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب الاقتصاد في طلب المعيشة، رقم: ۲۱۳۵، مؤطا مالك، الكتاب الجامع، باب أنه كان يقال الحمد لله الذي خلق كل شيء

چار عظیم صفات☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((أَرْبَعٌ إِنْ كُنَّ فِيْكَ فَلَا عَلَيْكَ مَا فَاتَكَ مِنَ الدُّنْيَا، حِفْظُ أَمَانَةٍ، وَصِدْقُ حَدِيْثٍ، وَحُسْنُ خَلِيْقَةٍ، وَعِفَّةٌ فِيْ طُعْمَةٍ))(۱)

ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لوگوں کے سامنے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا:

((أَرْبَعٌ إِنْ كُنَّ فِيْكَ فَلَا عَلَيْكَ مَا فَاتَكَ مِنَ الدُّنْيَا))

چار صفتیں ہیں کہ اگر وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں تو اگر دنیا کی کوئی نعمت تمہیں نہ ملی ہو تو تمہیں اس کا کوئی غم نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ چار صفتیں اتنی بڑی دولت ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی اور دولت کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا یہ چار صفتیں دنیا کی ساری دولت سے بالا و برتر ہیں، وہ چار صفتیں کیا ہیں؟ فرمایا:

((حِفْظُ أَمَانَةٍ، وَصِدْقُ حَدِيْثٍ، وَحُسْنُ خَلِيْقَةٍ، وَعِفَّةٌ فِيْ طُعْمَةٍ))

وہ چار صفتیں جو دنیا کی ساری دولتوں سے بڑھ کر دولت ہیں، ان میں سب سے پہلی صفت ''امانت کی حفاظت'' کرنا، دوسری صفت ''بات کی سچائی''، تیسری صفت ''خوش اخلاقی'' اور چوتھی صفت یہ کہ ''جو لقمہ کھا رہے ہو اس کا پاک دامن ہونا'' کہ اس میں حرام کا شائبہ نہ ہو، یہ چار صفتیں بہت مختصر ہیں، لیکن اتنی جامع ہیں کہ سارا دین ان کے اندر سمٹ آیا ہے۔

پہلی صفت: امانت کی حفاظت

پہلی صفت بیان فرمائی کہ ''امانت کی حفاظت'' قرآن و حدیث کے ارشادات اس کی تاکید

☆ اصلاحی خطبات (۱۶/۱۸۴ تا ۲۰۶)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) مسند أحمد بن حنبل، رقم: ٦٣٦٥

سے بھرے ہوئے ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾(۱)

اور حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے امانت میں خیانت کرنے کو منافق کی خصلت قرار دیا ہے، فرمایا کہ تین باتیں جس کے اندر پائی جائیں وہ پکا منافق ہے، ان میں سے ایک ہے ''وعدہ خلافی'' اور دوسرے ''امانت میں خیانت'' اور تیسرے ''جھوٹ بولنا'' ان تین چیزوں کو آپ نے نفاق کی علامت قرار دیا، مسلمان کا کام نہیں کہ وہ یہ تین کام کرے، بہرحال! ''امانت'' وہ چیز ہے جس کی رعایت سے مسلمان مسلمان بنتا ہے۔

نبوت سے پہلے آپ ﷺ کے مشہور اوصاف

نبی کریم ﷺ کی ایک اہم صفت جو عطاءِ نبوت سے پہلے سے لوگوں میں معروف تھی، وہ صادق اور امین ہونا تھی، یعنی سچائی اور امانت داری۔ بڑے سے بڑا دشمن بھی اپنی امانت حضورِ اقدس ﷺ کے پاس رکھوانے کے لئے تیار تھا، یہاں تک کہ جب آپ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرما رہے تھے، اس وقت لوگوں کی امانتیں آپ کے پاس رکھی ہوئی تھیں، ان امانتوں کو ان کے مالکوں تک پہنچانے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، یہ آپ کا خاص وصف تھا، جو کافروں میں بھی معروف اور مشہور تھا۔ لہٰذا حضورِ اقدس ﷺ کے اُمتی ہونے کے ناطے ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ ''امانت'' کا خصوصی خیال رکھے۔

امانت کا وسیع مفہوم

لیکن امانت کا مطلب عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی آدمی ہمارے پاس پیسے یا کوئی چیز لاکر رکھوادے، ہم اس کو صندوقچی میں بند کر کے رکھ دیں، اور جب وہ طلب کرے تو اس کو واپس کر دیں، اور خیانت یہ ہے کہ اس کو کھا جائیں۔ چونکہ جان بوجھ کر اس قسم کی خیانت الحمدللہ سرزد نہیں ہوتی، اس لئے ہم مطمئن ہیں کہ ہم امانت دار ہیں، اور ہم امانت کی حفاظت کر رہے ہیں۔ لیکن امانت کا مفہوم بہت وسیع ہے، بیشمار چیزیں اس کے اندر داخل ہیں، جس کی پوری تفصیل ایک بیان میں عرض کی تھی، وہ بیان چھپ چکا ہے۔

(۱) النساء: ۵۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''(مسلمانو!) یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ''

دوسری صفت: بات کی سچائی

دوسری صفت جو اس حدیث میں بیان فرمائی وہ ہے "صدقِ حدیث" بات کی سچائی، یعنی آدمی جھوٹ نہ بولے، غلط بیانی نہ کرے۔ دیکھئے! ایک تو کھلا جھوٹ ہوتا ہے، جس کو ہر ایک جھوٹ سمجھتا ہے، اور دوسرا ہوتا ہے پوشیدہ قسم کا جھوٹ، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جس شخص کو دین کا اور جھوٹ سے بچنے کا تھوڑا بہت دھیان ہے، وہ عام طور پر کھلے جھوٹ سے تو پرہیز کرتا ہے، اور اگر اس کا کسی دینی حلقے سے تعلق ہے تو وہ کھلا جھوٹ بولتے ہوئے ڈرے گا، لیکن جھوٹ کی کچھ شکلیں ایسی ہیں جو ہمارے معاشرے میں سرایت کر گئی ہیں، اور ان کے جھوٹ ہونے اور گناہ ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا، مثلاً یہ کہ ایک آدمی کی بات دوسرے کو نقل کرنے میں بے احتیاطی اور لاپرواہی برتی جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل بات تو کچھ تھی، لیکن آگے نقل ہوتے ہوتے اس کا حلیہ ایسا بگڑا کہ اصل بات سے کوئی نسبت ہی باقی نہیں رہی، اور غلط بات پھیل گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ نقل کرتے وقت یہ احتیاط نہیں کی کہ جو بات جس طرح کہی جا رہی ہے، وہ بات اسی طرح یاد رکھوں، اور اسی طرح آگے نقل کر دوں، بلکہ سنا کچھ، اور سمجھا کچھ، اور پھر اس میں اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر آگے چلتا کر دیا، اب اس کو جھوٹ بھی نہیں سمجھا جاتا۔

بات کیا سے کیا بن جاتی ہے

میرے پاس تقریباً پانچ دس جگہوں سے خطوط آئے، اور یہ لکھا کہ ایک صاحب اپنی تقریروں میں آپ کی طرف منسوب کر کے یہ مسئلہ بیان کر رہے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ٹیپ ریکارڈر پر قرآن کریم سننا گانے سننے سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اب میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ میں نے کبھی یہ مسئلہ بیان کیا ہو، جب میں نے اس میں غور کیا کہ یہ بات کہاں سے چلی ہے تو اندازہ ہوا کہ ایک مرتبہ ایک مجلس کے اندر میں نے وعظ کیا۔ اس مجلس میں سے ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ اگر ٹیپ ریکارڈر پر قرآن کریم کی تلاوت سن رہے ہوں، سجدہ تلاوت آجائے تو سجدہ واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ میں نے یہ جواب دیا تھا کہ وہ تلاوت جو ٹیپ ریکارڈر میں ہوتی ہے، وہ حقیقی تلاوت کے حکم میں نہیں ہوتی، لہٰذا اس کے سننے سے سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔ اب چونکہ میں نے یہ کہہ دیا کہ ٹیپ ریکارڈر کی تلاوت حقیقی تلاوت کے برابر نہیں، تو یہاں سے انہوں نے یہ سمجھا کہ پھر وہ تلاوت حرام اور ناجائز ہے، اور اس کو اپنی طرف سے آگے بڑھا دیا کہ وہ تلاوت گانے سننے سے بدتر ہے، اور یہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولا، بلکہ بے احتیاطی اور لاپرواہی سے اپنے خیالات کو اس میں داخل کر دیا۔

میری طرف منسوب ایک خواب

ابھی چند روز پہلے جناب بھائی کلیم صاحب مجھے یہ بتا رہے تھے کہ جن علاقوں میں زلزلہ آیا ہوا ہے، وہاں میری طرف منسوب ہو کر یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ اس نے ایک خواب دیکھا ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ رمضان المبارک کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے زلزلے کو ہلکا کر دیا، اور عید کے بعد اس سے بڑا زلزلہ آئے گا۔ اب میرے پاس ٹیلیفون آ رہے ہیں کہ کیا آپ نے یہ خواب دیکھا ہے؟ خدا جانے یہ بات کہاں سے نکلی، اور کس طرح چلتی کر دی۔ پہلی بات کا تو کچھ سراغ لگ گیا تھا، اس کا تو کوئی سراغ بھی نہیں ملا کہ کہاں سے نکلی ہوگی۔

نقل کرنے میں احتیاط کریں

غرض یہ کہ بات کو آگے نقل کرنے میں احتیاط ختم ہو چکی ہے، شریعت اور دین نے جتنا اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ آدمی کے منہ سے کوئی بات غلط نہ نکلے، آج اتنی ہی بے احتیاطی ہو رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں فتنے اور فساد پھیل رہے ہیں۔ افواہیں پھیل رہی ہیں۔ یا تو بات آگے نقل ہی مت کرو، اور اگر بات آگے نقل کرنی ہے تو خدا کے لئے اپنی جانوں پر رحم کھاؤ، اور جو بات دوسروں تک پہنچانی ہے اس کو صحیح صحیح یاد کرو کہ کیا کہا گیا، پھر آگے پہنچاؤ۔

ایک محدث کی احتیاط

علامہ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الکفایہ'' میں ایک محدث کا واقعہ لکھا ہے کہ جب وہ ایک حدیث سنایا کرتے تھے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ حدیث روایت کرنے والے حدیث روایت کرتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں، حَدَّثَنَا فُلَانٌ قال: حَدَّثَنَا فُلَانٌ قال: حَدَّثَنَا فُلَانٌ

حَدَّثَنَا کے معنی ہیں مجھے فلاں نے یہ حدیث سنائی۔ بہر حال! وہ محدث ایک حدیث کو اپنے استاد کی طرف منسوب کر کے سناتے تو یوں کہتے:

"حَدَّثَنَا فُلَانٌ قال: ثنا فلان"

پورا لفظ "حَدَّثَنَا" کے بجائے "ثنا" کہتے۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہ لفظ پورا "حَدَّثَنَا" کیوں نہیں پڑھتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جب میں استاد کے درس میں پہنچا تو استاد نے درس شروع کر دیا تھا، اور میرے آنے سے پہلے "حد" کا لفظ کہہ چکے تھے، اور میں نے "حد" کا لفظ ان کی زبان سے نہیں سنا، بلکہ صرف "ثنا" سنا، لہٰذا اب اگر میں آگے روایت کرتے ہوئے پورا لفظ

"حَدَّثَنَا" کہوں گا تو جھوٹ ہو جائے گا، اس لئے میں صرف "ثنا" کہتا ہوں۔ اس احتیاط کے ساتھ یہ احادیث ہم تک پہنچی ہیں، ان حضرات نے آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو محفوظ کرنے میں اتنی احتیاط کی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور احتیاط

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں نے حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، آپ نے خودرائی کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"جب تک تمہارے "ضابطے" کے بڑے موجود ہوں تو ان سے مشورہ کرو، جب وہ نہ رہیں تو برابر کے لوگوں سے مشورہ کرو، اور جب وہ بھی نہ رہیں تو چھوٹوں سے مشورہ کرو، بغیر مشورہ کے کوئی کام مت کرو"

پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"ضابطے کے بڑے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حقیقت میں کون بڑا ہے؟ اور کون چھوٹا ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے، اس لئے کہ حقیقت میں بڑائی اور چھوٹائی تقویٰ کی وجہ سے ہے اور اللہ کی اطاعت کی بنیاد پر ہے، لیکن "ضابطے" میں ہم دیکھتے ہیں کہ "باپ" بیٹے سے بڑا ہے، استاد شاگرد سے بڑا ہے، شیخ مرید سے بڑا ہے، یہ سب "ضابطے" کے بڑے ہیں۔ لیکن حقیقت میں کون بڑا ہے، اللہ ہی جانتا ہے"

حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ حضرت والا یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ جب تک "بڑے" موجود ہوں، بڑوں سے مشورہ کرو، لیکن چونکہ دماغ میں وہ ترازو لگا ہوا ہے کہ کوئی بات خلاف واقعہ نہ نکلے، اس ترازو نے صرف "بڑا" نہیں کہنے دیا، بلکہ یہ کہلوایا کہ "ضابطے کے بڑے" تاکہ بات نفس الامر کے خلاف نہ ہو۔

غفلت اور لاپرواہی بڑی بلا ہے

جب دل میں فکر پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ صحیح لفظ دل میں ڈال دیتے ہیں کہ انسان اس وقت یہ لفظ استعمال کرے، سب سے بڑی "بلا" غفلت ہے، بے پرواہی ہے، اس بات سے غفلت کہ میرے منہ سے کیا لفظ نکل رہا ہے، بس جو چاہے الم غلم نکل جائے، کوئی پرواہ نہیں، اس "بلا" نے ہمیں "صدقِ حدیث" سے دور کر دیا ہے، "بات کی سچائی" یہ ہے کہ جو لفظ منہ سے نکلے وہ تُلا ہوا نکلے، وہ سو فیصد صحیح ہو، اس میں اتنا مبالغہ نہ ہو کہ وہ جھوٹ کی حد تک پہنچ جائے، تھوڑا بہت مبالغہ تو محاورۃً آدمی

بول دیتا ہے، لیکن ایسا مبالغہ جو جھوٹ کی حد تک پہنچ جائے، یہ "صدقِ حدیث" کے خلاف ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جب زبان سے کوئی لفظ نکال رہے ہو تو ذرا دھیان سے نکالو۔

اگر آپ کی گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہو تو

اور اس کا بہترین معیار میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا تھا، اور الحمد للہ دل میں اُتر گیا، وہ یہ کہ جب کوئی کلمہ زبان سے کہو، یا قلم سے لکھو تو سوچ لو کہ یہ بات مجھے کسی عدالت میں ثابت کرنی ہے، آپ ذرا اس کا تجربہ کریں کہ اگر آپ کو یہ بتا دیا جائے کہ آج آپ ان دو گھنٹوں کے درمیان جو بات کریں گے وہ ریکارڈ ہو کر تھانے میں پیش ہوگی، اور اس کی بنیاد پر آپ کو گرفتار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا، پھر بتاؤ کہ ان دو گھنٹوں میں کس طرح گفتگو کرو گے؟ کیا اس وقت بھی بے سوچے بولتے چلے جاؤ گے، یا زبان پر کوئی قدغن لگے گی؟ اس وقت اگر تم سے کوئی بات کرنا چاہے گا تو تم کہو گے کہ ارے بھائی اس وقت تو میری ہر بات ریکارڈ ہو رہی ہے، اور اسی پر میری گرفتاری اور رہائی کا فیصلہ ہونا ہے، لہٰذا اس وقت مجھ سے ایسی فضول باتیں نہ کرو، نہ کرواؤ، اس وقت تمہارے منہ سے کیسے موتی کی طرح تلے ہوئے الفاظ نکلیں گے۔

ہر لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ارے بھائی! یہ ٹیپ ریکارڈر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر انسان کے لئے لگا ہوا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾(۱)

اور اسی ٹیپ ریکارڈر کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا کہ تم سچ بول رہے تھے، یا جھوٹ بول رہے تھے، لہٰذا جب اس وقت بولنے میں احتیاط کرتے تو اب یہ سوچ کر احتیاط کرلو کہ ایک ایک لفظ جو منہ سے نکل رہا ہے آخرت میں اس کی جواب دہی ہونی ہے، لہٰذا سوچ سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے منہ سے بات نکالو، جن لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت ہوتی ہے وہ بولنے میں بہت احتیاط کرتے ہیں، صرف ضروری بات ہی زبان سے نکالتے ہیں، ورنہ وہ خاموش رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں "امانت داری" بھی عطا فرمائیں، اور "صدقِ حدیث" بھی عطا فرمائیں کہ جو بات منہ سے نکلے، وہ سو فیصد درست ہو۔

---

(۱) ق: ۱۸

تیسری صفت: خوش اخلاقی

تیسری صفت جو اس حدیث میں بیان فرمائی وہ ہے:

((حُسْنُ خَلِيْقَةٍ))

''خوش اخلاقی''

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ''مؤمن خوش اخلاق ہوتا ہے''(۱) بداخلاق، کینہ پرور، لوگوں کے ساتھ درشت کھردرا معاملہ کرنے والا نہیں ہوتا، یہ ایک مسلمان کی شان نہیں، مسلمان تو دوسرے لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کرتا ہے، سختی کا برتاؤ نہیں کرتا۔

خوش اخلاقی کیا چیز ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ''خوش اخلاقی'' کیا چیز ہے؟ اور کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ یہ طویل الذیل موضوع ہے، مختصر وقت میں بیان کرنا مشکل ہے، مختصر بات یہ ہے کہ خوش اخلاقی صرف اس کا نام نہیں کہ آپ نے ظاہری طور پر دوسرے سے مسکرا کر بات کر لی، یہ بھی بیشک خوش اخلاقی کا ایک حصہ ہے، لیکن اگر ظاہری طور پر تو آپ مسکرا کر بات کر رہے ہیں، اور دل میں بغض بھرا ہوا ہے، یہ تو خوش اخلاقی کا مصنوعی مظاہرہ ہوا، جس میں اخلاص نہ ہوا، بلکہ ایک بناوٹی کاروائی ہوئی، جو ایک مؤمن کے لئے زیبا نہیں۔

مغربی ممالک اور خوش اخلاقی

آج کل مغربی ممالک میں اس موضوع پر بہت کتابیں لکھی جارہی ہیں کہ لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آئیں؟ اور لوگوں کو کس طرح اپنی طرف مائل کریں؟ لوگ ایسی کتابوں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، ان کتابوں میں یہ لکھتے ہیں کہ جب لوگوں سے ملو تو اس طرح ملو، جب باتیں کرو تو اس طرح باتیں کرو، اس طرح لوگوں کے ساتھ پیش آؤ، یہ خوش اخلاقی کا طریقہ ہے۔ لیکن اس خوش اخلاقی کا مطلب صرف یہ ہے کہ دوسرے کے دل کو اپنے حق میں کیسے مسخر کریں؟ دوسرے کے دل میں اپنی عظمت کیسے پیدا کریں؟ بس اس کے لئے خوش اخلاقی کے سارے طریقے اختیار کیے جارہے ہیں، وہ خوش اخلاقی جو ''دینِ اسلام'' کے اندر مطلوب ہے، اور جس کا نبی کریم ﷺ نے ذکر فرمایا، اس

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ماجاء فی البخیل، رقم:۱۸۸۷، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی حسن العشرة، رقم:٤١٥٨، مسند أحمد، رقم:٨٧٥٥

خوش اخلاقی کا مقصد دوسرے کو مسخر کرنا نہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بحیثیت ایک مسلمان کے میرا فرض ہے کہ میں دوسروں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤں، لہٰذا دونوں مقصد میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اس لئے کہ وہاں جو خوش اخلاقی ہو رہی ہے، وہ لوگوں کو اپنا بنانے کے لئے ہو رہی ہے، اپنا گاہک بنانے کے لئے ہو رہی ہے، مارکیٹنگ کے لئے ہو رہی ہے، لیکن اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو جو خوش اخلاقی مطلوب ہے، وہ خوش اخلاقی دوسروں کو مسخر کرنے کے لئے نہیں، بلکہ خود اپنے فائدے کے لئے ہے کہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملوں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ بھی ایک صدقہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملو، تاکہ میرا اللہ راضی ہو جائے۔

تجارتی خوش اخلاقی

آج کل لوگ مغربی قوم کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ یہ بڑے خوش اخلاق ہیں، اور ان کی خوش اخلاقی کی تعریف کرکے بسا اوقات مسلمانوں اور اسلام کے مقابلے میں ان کی برتری دل میں آنے لگتی ہے۔ ٹھیک ہے، بعض لوگ حقیقی معنوں میں خوش اخلاق ہوتے ہوں گے، لیکن عام طور پر ان کی خوش اخلاقی تجارتی ہے، وہ مارکیٹنگ کی خوش اخلاقی ہے، ایک سیلز مین جو ایک دکان پر کھڑا ہوا ہے، وہ اگر اپنے گاہکوں سے مسکرا کر بات نہ کرے، اور خوش اخلاقی سے پیش نہ آئے تو کون اس کا سامان خریدنے آئے گا، وہ تو اپنی تجارت کی خاطر اور اپنے نفع کی خاطر لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنے پر مجبور ہے، لیکن اگر آپ اس سے یہ کہہ دیں کہ تم میرے ساتھ بڑے خوش اخلاقی سے پیش آرہے ہو، تو میرے لئے دس روپے کم کردو، تو پھر وہ ساری خوش اخلاقی رخصت ہو جائے گی، اس لئے کہ وہ ساری خوش اخلاقی تو اس لئے ہو رہی ہے کہ میں اس سے زیادہ سے زیادہ پیسے کھینچ لوں، اور اپنا سامان اس کو فروخت کروں، یہ کیا خوش اخلاقی ہوئی؟ خوش اخلاقی وہ ہے جو انسان کے دل سے اُمڈے اور جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے ہو، جس کا مقصد آخرت کی فلاح ہو، دنیا کے اندر اس کا صلہ مطلوب نہ ہو، یہ ہے "خوش اخلاقی"

خوش اخلاقی کیسے پیدا ہوگی؟

یہ خوش اخلاقی کیسے پیدا ہوگی؟ یہ سارا "تصوف اور سلوک" درحقیقت اسی خوش اخلاقی کو پیدا کرنے کا علم ہے، لوگ بزرگوں کی صحبت میں جو جاتے ہیں، وہ درحقیقت اسی خوش اخلاقی کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے جاتے ہیں، اس کا ایک پورا نظام ہے، جس کو اس وقت پوری تفصیل سے بیان کرنا

تو ممکن نہیں، لیکن میرے نزدیک خوش اخلاقی کی جو کلید ہے، وہ اس وقت عرض کر دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

خوش اخلاقی کی بنیادی کنجی اگر حاصل ہوگئی تو خوش اخلاقی حاصل ہوگئی، وہ ہے ''تواضع'' یہ ساری خوش اخلاقی کی بنیاد ہے، اگر تواضع پیدا ہوگئی تو اب ''متواضع'' آدمی بد اخلاق نہیں ہوسکتا، اس لئے بد اخلاقی جب بھی ہوگی اس میں تکبر شامل ہوگا، اور تواضع کا مطلب ہے ''اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھنا'' اور دوسروں کو اپنے سے بڑا سمجھنا، اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنا، اگر آدمی کے دل میں یہ بات آجائے کہ میں چھوٹا ہوں، باقی سب بڑے ہیں، اور بڑے ہونے سے مراد ''عمر'' اور ''علم'' میں بڑا ہونا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت میں اور تقویٰ میں نیکی میں سب مجھ سے بڑے ہیں، یا فی الحال بڑے ہیں، یا فی المآل ان کے بڑے ہونے کا احتمال ہے۔

تواضع پیدا کریں

لہٰذا دل میں اپنی کوئی بڑائی نہ ہو، بلکہ یہ سوچے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کی عطا ہے، جب چاہیں واپس لے لیں، نہ میں اپنی ذات میں کوئی کمال رکھتا ہوں، نہ میرے پاس اپنی ذات میں کوئی خوبی ہے، اور دوسری مخلوق سب کو اللہ تعالیٰ نے بڑا نوازا ہوا ہے۔ یہ اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھنا تواضع ہے، جب ایک شخص کے دل میں تواضع ہوگی، اور وہ یہ کہے گا کہ میں چھوٹا ہوں، یہ بڑا ہے، تو کیا ایسا شخص کسی بڑے کے ساتھ بد اخلاقی کرے گا؟ نہیں کرے گا، اس لئے کہ بد اخلاقی اس وقت ہوتی ہے جب دل میں اپنی بڑائی ہو، اور دوسروں کی تحقیر ہو کہ میں تو بڑا آدمی ہوں، میرے حقوق لوگوں پر ہیں، اور لوگوں پر واجب ہے کہ وہ میرا فلاں حق ادا کریں، اگر وہ میرا حق ادا نہیں کر رہے ہیں تو وہ غلطی کر رہے ہیں، لہٰذا میں ان کے ساتھ اچھے انداز میں پیش نہیں آؤں گا، ساری بد اخلاقی کی بنیاد اور جڑ یہ ہے۔

تواضع سے بلندی عطا ہوتی ہے

اگر تواضع پیدا ہو جائے تو پھر کوئی ''بد اخلاقی'' سرزد نہیں ہوگی، اس لئے میں کہتا ہوں کہ خوش اخلاقی کی کلید اور بنیاد تواضع ہے، اور بد اخلاقی کی بنیاد تکبر اور عجب ہے، اگر انسان اس تکبر اور عجب کا علاج کروالے، اور تواضع پیدا کرنے کی تدبیر اختیار کرلے، اور کسی اللہ والے کی صحبت کے نتیجے میں یہ تواضع پیدا ہو جائے تو پھر ان شاء اللہ بد اخلاقی قریب نہیں آئے گی۔ حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ))(۱)

یعنی جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔

اپنی حقیقت پر غور کریں

لہٰذا تواضع اختیار کرنے کے لئے انسان کو پہلے تو اپنی حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہ میں کیا ہوں، قرآن کریم نے دو لفظوں میں انسان کی حقیقت بیان کر دی، فرمایا:

﴿مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ؕ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾(۲)

اگر انسان اس میں غور کرے تو سارا تکبر ختم ہو جائے گا، وہ یہ کہ کس چیز سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا؟ تمہاری اصل بنیاد کیا؟ وہ ایک نطفہ ہے، دوسری جگہ فرمایا:

﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾(۳)

کیا ہم نے تمہیں ایک ذلیل اور گندے پانی سے پیدا نہیں کیا؟ یہ تمہاری اصل ہے، اگر انسان اپنی اس اصل میں غور کرے تو کبھی دماغ میں تکبر نہ آئے، اور پھر تو جب مرے گا تو اپنے پیارے اور اپنے محبت کرنے والے بھی تجھے گھر میں رکھنا گوارہ نہیں کریں گے، اس لئے کہ بدبو پیدا ہو جائے گی، اور سڑ جائے گا، لہٰذا تجھ کو لے جا کر قبر میں دفن کریں گے، وہ تیری ابتداء ہے، یہ تیری انتہاء ہے۔

”بیت الخلاء“ دکانِ معرفت

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی اگر تمہارے دل میں اپنی بڑائی آئے تو اس وقت یہ تصور کر لیا کرو کہ بیت الخلاء میں میری کیا پوزیشن ہوتی ہے، میری اس حالت کو کوئی دیکھ لے تو مجھ سے گھن کرے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے جسم پر کھال کا پردہ ڈال رکھا ہے، ورنہ ذرا سی کھال کہیں سے الگ کرو تو یہ نظر آئے گا کہ اندر نجاست ہی نجاست بھری ہوئی ہے، کہیں خون ہے، کہیں پیپ ہے، کہیں پیشاب ہے، کہیں پاخانہ ہے، بس اس کھال کے پردے نے ان تمام نجاستوں کو چھپا رکھا ہے۔ یہ ہے تمہاری حقیقت۔ ویسے تو بڑا غرور ہے کہ میں ایسا ہوں، ویسا ہوں، یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا، ذرا سا دماغ کا اسکرو ڈھیلا ہو جائے تو سب ختم ہو جائے گا، پھر بھی کہتے ہو کہ میں بڑا ہوں، تو یہ شیطان تمہیں دھوکے میں ڈال رہا ہے، لہٰذا اپنی اصل پر غور کرو۔

(۱) مسند أحمد، رقم: ۱۱۲۹۹ (۲) عبس: ۱۸، ۱۹ (۳) المرسلٰت: ۲۰

اپنے آپ کو خادم سمجھو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے کہ یہ سارا فساد اس بنیاد پر ہے کہ تم نے اپنے آپ کو مخدوم بنایا ہوا ہے، ارے اپنے آپ کو خادم سمجھو کہ میں خادم ہوں، میں چھوٹوں کا بھی خادم ہوں، بڑوں کا بھی خادم ہوں، البتہ خدمت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، اگر استاد اپنے شاگرد کو پڑھا رہا ہے، یہ بھی خدمت کر رہا ہے، اس لئے استاذ کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو طالب علموں کا خادم سمجھے، کبھی تعلیم اور تلقین کے ذریعے خدمت ہوتی ہے، لہٰذا یہ سمجھو کہ میں اپنی بیوی بچوں کا بھی خادم ہوں، اپنے بہن بھائیوں کا بھی خادم ہوں، اپنے عزیز و اقارب کا بھی خادم ہوں، خادمیت اختیار کرو، پھر جب بھی کسی سے واسطہ پیش آئے تو یہ سمجھو کہ میں جس سے بات کر رہا ہوں، میں اس کا خادم ہوں۔

منصب کے تقاضے پر عمل کرنا دوسری بات ہے

اگر کوئی بڑا ہو، صاحبِ اقتدار ہو، اس کے سامنے تو سبھی کو سر جھکانا پڑتا ہے، اس کا حکم ماننا پڑتا ہے، اس کے سامنے سب تواضع کرنے لگتے ہیں، اور اس کے سامنے بولتی بند ہو جائے گی۔ لیکن وہ تواضع جو قابلِ تعریف اور قابلِ تحسین ہے، وہ یہ کہ اپنے برابر والوں کے ساتھ اور اپنے چھوٹوں کے ساتھ تواضع سے پیش آئے، البتہ بعض اوقات کسی منصب کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے پر غصہ کرے، مثلاً ایک ملازم کام ٹھیک نہیں کر رہا ہے، اب اس کی اصلاح کے لئے بعض اوقات غصہ بھی کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات سزا بھی دینی پڑ جاتی ہے، بعض اوقات استاد شاگرد کو سزا دیتا ہے، بعض اوقات باپ بیٹے کو سزا دیتا ہے۔ یہ سزا دینا بھی خدمت ہے۔ لیکن اس وقت آدمی یہ سوچے کہ میں اپنے فریضۂ منصبی کو ادا کرتے ہوئے یہ کام کر رہا ہوں، اس وجہ سے یہ کام نہیں کر رہا ہوں کہ میں بڑا ہوں، اور یہ مجھ سے چھوٹا ہے، اس لئے کہ کچھ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا مقام مجھ سے بہت اونچا ہو۔

خوبصورت مثال

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی ایک مثال دیا کرتے ہیں کہ اگر بادشاہ اپنے کسی غلام کو چوکیدار بنا کر کھڑا کر دے کہ تم دروازے پر کھڑے ہو جاؤ، اور صرف ان لوگوں کو اندر آنے دو جن کو اجازت ہو، اور دوسروں کو اندر مت آنے دینا، اب اگر کوئی شہزادہ بھی آئے گا تو چوکیدار کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ شہزادے سے کہے کہ پہلے اپنی شناخت پیش کرو کہ تم کون ہو؟ پھر اندر آنے کی اجازت ہوگی۔ اگر وہ

زبردستی اندر داخل ہونا چاہے گا تو چوکیدار کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اس کو روک دے۔ اب دیکھئے کہ چوکیدار شہزادے کو روک رہا ہے، اور بظاہر اس پر حکم چلا رہا ہے، لیکن بتاؤ ان دونوں میں سے افضل کون ہے؟ جس وقت وہ چوکیدار شہزادے کو روک رہا ہوتا ہے، اس وقت بھی اس کے دل ودماغ میں یہ بات نہیں ہوتی کہ میں شہزادے سے افضل ہوں، یا میں بڑا ہوں، اور یہ چھوٹا ہے، بلکہ اس کے دل میں اس وقت بھی یہ بات ہوتی ہے کہ بڑا تو شہزادہ ہی ہے، لیکن میں فرضِ منصبی کی ادائیگی کی خاطر اس کو روکنے پر مجبور ہوں۔

استاذ، شیخ اور باپ کا ڈانٹنا

اسی طرح اگر کوئی استاذ کسی شاگرد کو ڈانٹ رہا ہے، یا کوئی شیخ مرید کو ڈانٹ رہا ہے، یا کوئی باپ بیٹے کو ڈانٹ رہا ہے، یا اس کو کسی کام سے روک رہا ہے، تو اس کو یہ تصور کرنا چاہئے کہ میں اپنا فرض منصبی ادا کر رہا ہوں، حقیقت میں شاید یہ اللہ کا بندہ مجھ سے درجات کے اعتبار سے آگے بڑھا ہوا ہو۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خانقاہ میں آنے والوں کے لئے بڑے اصول مقرر فرمائے تھے، جب کوئی شخص ان اصولوں کی خلاف ورزی کرتا تو اس کی ڈانٹ ڈپٹ ہوتی۔ ان سب کے باوجود حضرت والا فرماتے ہیں کہ الحمدللہ میں جب کبھی کسی کو ڈانٹتا ہوں تو دل میں یہ تصور کر لیتا ہوں کہ میں چوکیدار ہوں، اور یہ شہزادہ ہے، میرا چونکہ فرضِ منصبی ہے، اس لئے ڈانٹ رہا ہوں، ورنہ حقیقت میں یہ مجھ سے افضل ہے۔ دوسرا یہ کہ جس وقت ڈانٹ رہا ہوتا ہوں، اس وقت دل میں یہ بھی کہہ رہا ہوتا ہوں کہ یا اللہ! جس طرح میں اس سے مؤاخذہ کر رہا ہوں، میرا آخرت میں اس طرح مؤاخذہ نہ فرمائیے گا۔ بتایئے! جو شخص اپنے سے چھوٹے کے بارے میں دل میں یہ تصور بٹھا رہا ہو کہ یہ شہزادہ ہے، میں چوکیدار ہوں، اس کے دل میں تکبر کہاں سے آئے گا، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں بھی ایسی تواضع پیدا فرمادے۔

تواضع بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے

یہ تواضع صحبت سے حاصل ہوتی ہے، متواضعین کی صحبت اختیار کرے گا، تو اضع آئے گی، متکبروں کی صحبت اختیار کرے گا تو تکبر آئے گا۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے صفتِ تواضع سے نوازا ہے، ان کی صحبت اختیار کرے، اور اپنی حقیقت پر غور کرتا رہے، اور یہ سمجھے کہ آخرت میں جو کچھ ملنے والا ہے

وہ تنی ہوئی گردنوں کو نہیں ملے گا، بلکہ جھکی ہوئی گردنوں کو ملنے والا ہے، شکستگی کا مظاہرہ کرنے والوں کو، فنائیت کا مظاہرہ کرنے والوں کو، اپنی بڑائی دل میں نہ لانے والوں کو ملنے والا ہے۔

جنت مسکینوں کا گھر ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ جنت اور جہنم کے درمیان مناظرہ ہوا کہ کون افضل ہے؟ جہنم اس بات پر فخر کرنے لگی کہ میں متکبروں کا گھر ہوں، جابروں کا گھر ہوں، یعنی میرے اندر والے بڑے بڑے متکبرین ہیں، کوئی بادشاہ ہے، کوئی جابر ہے، کوئی وزیر ہے، کوئی فرعون ہے، میں ان کا گھر ہوں، اور جنت کہتی ہے کہ میں مسکینوں کا گھر ہوں، ''مسکین'' اس کو کہتے ہیں جس کی طبیعت میں عاجزی ہو، مسکنت ہو، اسی وجہ سے حضورِ اقدس ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَةِ الْمَسَاکِیْنِ))(۱)

اے اللہ! مسکینی کی حالت میں مجھے زندہ رکھئے، اور مسکینی کی حالت میں مجھے موت دیجئے، اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرمایئے۔ تو جنت یہ کہہ رہی ہے کہ مسکینوں کا گھر ہوں، بہر حال! مسکنت اور عاجزی اور فروتنی انسان کو جنت میں لے جاتی ہیں۔ تکبر اور گھمنڈ اور بڑائی انسان کو جہنم میں لے جانے والی ہیں۔ لہٰذا اپنے اندر تواضع پیدا کرنے کی فکر کرلو، اور اگر یہ پیدا ہوگئی تو پھر خوش خلقی خود بخود پیدا ہو جائے گی۔

چوتھی صفت: لقمہ کا پاک ہونا

چوتھی صفت حضورِ اقدس ﷺ نے یہ بیان فرمائی:

((عِفَّةٌ فِیْ طُعْمَةٍ))

''تمہارا لقمہ پاک اور حلال ہونا چاہئے''

''عفت'' کے لفظ سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ جو چیز صریح گناہ اور حرام ہے، اس سے بچنا ہی ہے، لیکن جہاں حرام کا شبہ ہو، اس شبہ والی چیز سے بھی بچنا ضروری ہے، اور مشتبہ چیز بھی اپنے پیٹ میں نہ لے جاؤ، حتی الامکان اس کی کوشش کرو۔ بعض اوقات ایک چیز ''فتویٰ'' کی رو سے حلال تو ہوتی ہے، لیکن مشکوک ہوتی ہے، اور مشکوک ہونے کی صورت میں اگر وہ چیز حقیقت میں بھی حرام ہوئی تو چاہے اس کے کھانے کا گناہ آپ کو نہ ہو، اس لئے کہ فتویٰ کے رو سے وہ حلال تھی، لیکن چونکہ وہ چیز

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللہ، باب ما جاء أن فقراء المھاجرین یدخلون الجنة، رقم: ۲۲۷۵، سنن ابن ماجه، کتاب الزھد، باب مجالسة الفقراء، رقم: ٤١١٦

نفس الامر میں حرام تھی، اس لئے اس چیز کے برے اثرات اخلاق پر ضرور پڑتے ہیں۔

حرام کی ظلمت اور نحوست

ہم لوگوں کی تو حس خراب ہوگئی ہے، اس لئے حرام کھالیں، یا مشکوک کھالیں، کچھ پتہ نہیں چلتا، سب چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن جن کو اللہ تعالیٰ حس عطا فرماتے ہیں، ان کو پتہ چلتا ہے کہ حلال اور حرام میں کیا فرق ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ایک دعوت میں چلا گیا، اور پہلے سے پتہ نہیں تھا کہ اس شخص کی آمدنی حرام ہے، ناواقفیت میں چلا گیا کہ وہ مسلمان ہے، آمدنی حلال ہوگی، اس لئے کچھ کھالیا، اور جب پتہ چلا تو فوراً کھانا چھوڑ کر کھڑا ہوگیا، لیکن وہ ایک دو لقمے جو ناواقفی میں کھالیے اس کی ظلمت قلب میں ایک مہینے تک محسوس ہوتی رہی، وہ ظلمت یہ تھی کہ بار بار دل میں گناہوں کے خیالات آتے رہے کہ یہ گناہ کرلوں، فلاں گناہ کرلوں، حالانکہ فتویٰ کی رو سے وہ حلال تھا، اس لئے کہ پتہ نہیں تھا۔

حلال کھانے کی نورانیت

ذرا غور کریں کہ ہم لوگ کس شمار و قطار میں ہیں، ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس میں نور ہے، اور کس میں ظلمت ہے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ دیوبند میں ایک گھسیارے تھے، جو گھاس کاٹ کر اس کو فروخت کرکے زندگی بسر کرتے تھے، اس میں سے دو پیسے بچا کر دارالعلوم دیوبند کے بڑے بڑے اساتذہ کی دعوت کیا کرتے تھے، اور اس دعوت میں خشکہ اور دال پکاتے تھے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مجھے مہینوں سے اس اللہ کے بندے کی دعوت کا انتظار رہتا تھا کہ کب یہ دعوت کریں گے، اس لئے کہ جس دن ان کی دعوت کھالیتا ہوں، مہینوں تک اس کا نور اپنے قلب میں محسوس کرتا ہوں۔

بہر حال! اگر کھانے میں پاکدامنی حاصل کرنی ہے، اس کیلئے مشکوک غذاؤں سے بھی حتی الامکان پرہیز کرنا ہوگا، اللہ تعالیٰ مجھے بھی آپ سب کو بھی ان چاروں صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

ہماری روز مرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۷

اسلامی زندگی کے سنہری آداب

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات پبلشرز بکسیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۳۷۲۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲

★ ۱۹۰ انار کلی، لاہور پاکستان
فون ۳۷۲۳۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی
فون ۰۱ ۳۲۷۲۲

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ "اسلام اور ہماری زندگی" انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۸

اخلاقِ سیئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات

★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی ★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور

[illegible]

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعۂ خطبات وتحریرات

جلد ۱۰

روزمرہ کی سُنتیں اور اعمال

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۲۔ دینا ناتھ مینشن مال روڈ لاہور ★ ۱۹۰ انارکلی لاہور پاکستان ★ موہن روڈ چوک اردو بازار کراچی
فون [illegible] فیکس [illegible] فون [illegible] فون [illegible]

اسلام اور ہماری زندگی

(مجموعہ خطبات و تحریرات)

جلد نمبر ۱۰

روزمرہ کی سُنتیں اور اعمال

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

روزمرہ کی سنتیں اور اعمال

جلد ۱۰

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۱۰

روزمرہ کی سُنتیں اور اعمال

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

مرتب

مولانا محمد اویس سرور صاحب

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور
فون ۳۷۳۲۴۴۱۲، فیکس ۹۲۰۴۲۰۳۷۳۲۳۲۸۵

★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی
فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات و تحریرات

جلد ۱۰

روزمرہ کی سنتیں اور اعمال

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان ___ فون ۳۷۲۲۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان ___ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com

E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ اردو بازار، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

مسنون دعائیں

کثرتِ ذکر اللہ کا بہترین طریقہ	۱۹
اصطلاحات کی فکر میں مت پڑو	۱۹
اصل مقصد اللہ کی یاد کا دل میں بس جانا ہے	۲۰
مسنون دعاؤں کا اہتمام کریں	۲۰
ان دعاؤں کو معمولی مت سمجھیں	۲۰
یہ الہامی دعائیں ہیں	۲۱
ہر کام کے وقت اللہ تعالیٰ سے تعلق	۲۱
خدائی ''پاور ہاؤس'' سے تعلق جڑ جائے گا	۲۲
اللہ تعالیٰ کا دروازہ بار بار کھٹکھٹاؤ	۲۲
زندگی کے ہر موڑ کیلئے دعائیں موجود ہیں	۲۲
زباں بھی ذاکر اور تعلق بھی قائم	۲۳
ہر وقت مانگتے رہو	۲۳
انسان حاجتوں کا پتلا ہے	۲۳
اس طرح مانگو	۲۴
یقینی طور پر حاصل ہونے والی چیز بھی اللہ سے مانگو	۲۴
اعلیٰ درجہ کا ''توکل'' یہ ہے	۲۵
اسباب کی موجودگی میں ''توکل'' کی ضرورت کیوں؟	۲۵
کھانا الگ نعمت، کھلانا الگ نعمت	۲۵
مانگنے سے محبوب بن جاؤ گے	۲۶
عجیب وغریب دعا	۲۷
دِل دِل میں مانگ لو	۲۷
ان تسبیحات کا معمول بنالو	۲۸
پابندی والا عمل پسندیدہ ہے	۲۸
کائنات کی ہر چیز کا ذکر کرنا	۲۹
ذکر میں دلجمعی پیدا ہوتی ہے	۲۹
ذکر کے وقت یہ تصور کیا کرو	۳۰
خلاصہ	۳۰

ہر کام سے پہلے ''بسم اللہ''

ہر کام سے پہلے ''بسم اللہ''	۳۱
ہر کام کے پیچھے نظامِ ربوبیت	۳۱
ایک گلاس پانی پر نظامِ ربوبیت کارفرما ہے	۳۲
زندگی پانی پر موقوف ہے	۳۲
پانی صرف سمندر میں ہوتا تو کیا ہوتا؟	۳۳
پانی کو میٹھا کرنے اور سپلائی کرنے کا خدائی نظام	۳۳
بادل'' مفت کارگو سروس'' مہیا کرتے ہیں	۳۳
پانی کی ذخیرہ اندوزی ہمارے بس میں نہیں	۳۴
یہ برفانی پہاڑ کولڈ اسٹوریج ہیں	۳۴

دریاؤں اور ندیوں کے ذریعہ پانی کی فراہمی	۳۴
یہ پانی اللہ تعالیٰ نے پہنچایا ہے	۳۵
جسم کے ہر ہر عضو کو پانی کی ضرورت ہے	۳۵
ضرورت سے زائد پانی نقصان دہ ہے	۳۶
جسم میں خودکار میٹر نصب ہے	۳۶
جسم کے اندر پانی کیا کام کر رہا ہے؟	۳۶
ہارون رشید کا ایک واقعہ	۳۷
پوری سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی سے بھی کم ہے	۳۷
''بسم اللہ'' کے ذریعہ اعترافِ بندگی	۳۸
انسانی گردے کی قیمت	۳۸
جسم کے اندر کارخانۂ ربوبیت	۳۹
محبت اور خشیت کے حصول کا ذریعہ	۳۹
کافر اور مسلمان کے پانی پینے میں فرق	۴۰
صلوٰۃ الحاجۃ، پریشانیوں کا علاج	۴۱
ایک مسلمان اور کافر میں فرق	۴۲
ملازمت کے لئے کوشش	۴۲
بیمار آدمی کی تدابیر	۴۳
تدبیر کے ساتھ دعا	۴۳
زاویۂ نگاہ بدل دو	۴۴
''ھو الشافی'' نسخہ پر لکھنا	۴۴
مغربی تہذیب کی لعنت کا اثر	۴۴
اسلامی شعائر کی حفاظت	۴۵
''اتفاق'' کی حقیقت	۴۵
کوئی کام ''اتفاقی'' نہیں	۴۵
مسبب الاسباب پر نظر ہو	۴۶
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر پینا	۴۶
ہر کام میں مشیتِ خداوندی	۴۷
حضورِ اقدس ﷺ کا ایک واقعہ	۴۸
پہلے اسباب پھر توکل	۴۸
اسباب کی یقینی موجودگی کی صورت میں توکل	۴۹
توکل کا اصل موقع یہی ہے	۵۰
دونوں صورتوں میں اللہ سے مانگے	۵۰
اطمینان سے وضو کریں	۵۱
وضو سے گناہ دھل جاتے ہیں	۵۱
وضو کے دوران کی دعائیں	۵۲
''صلوٰۃ الحاجۃ'' کے لئے خاص طریقہ مقرر نہیں	۵۲
نماز کے لئے نیت کس طرح کی جائے؟	۵۳
دعا سے پہلے اللہ کی حمد و ثناء	۵۳
حمد و ثناء کی کیا ضرورت ہے؟	۵۴
غم اور تکالیف بھی نعمت ہیں	۵۵
حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب دعا	۵۵
تکلیف کے وقت دوسری نعمتوں کا استحضار	۵۶
حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شکرِ نعمت	۵۶
حاصل شدہ نعمتوں پر شکر	۵۶
حمد و ثناء کے بعد درود شریف کیوں؟	۵۷
درود شریف بھی قبول اور دعا بھی قبول	۵۷
حضور ﷺ اور ہدیہ کا بدلہ	۵۸
دعاء حاجت کے الفاظ	۵۸

ہر ضرورت کے لئے صلوٰۃ الحاجۃ پڑھیں	۶۰
اگر وقت تنگ ہو تو صرف دعا کرے	۶۰
یہ پریشانیاں اور ہمارا حال	۶۱
تبصرہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں	۶۲
تبصرہ کے بجائے دعا کریں	۶۲
اللہ کی طرف رجوع کریں	۶۳
پھر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں	۶۳
اپنی جانوں پر رحم کرتے ہوئے یہ کام کرلو	۶۳

استخارہ کا مسنون طریقہ ۶۵

استخارہ کا طریقہ اور اس کی دعا	۶۶
استخارہ کا کوئی وقت مقرر نہیں	۶۷
خواب آنا ضروری نہیں	۶۷
استخارہ کا نتیجہ	۶۷
تمہارے حق میں یہی بہتر تھا	۶۸
تم بچے کی طرح ہو	۶۸
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ	۶۹
جاؤ ہم نے اس کو زیادہ دے دی	۶۹
ساری دنیا بھی تھوڑی ہے	۶۹
استخارہ کرنے کے بعد مطمئن ہو جاؤ	۷۰
استخارہ کرنے والا ناکام نہیں ہوگا	۷۰
استخارہ کی مختصر دعا	۷۱
حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا معمول	۷۲
ہر کام کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلو	۷۲
جواب سے پہلے دعا کا معمول	۷۳

مشورہ، ایک باعثِ خیر عمل ۷۴

مشورہ کیسے شخص سے کیا جائے؟	۷۵
''جمہوریت'' کی ناکامی	۷۵
نااہلوں کا انتخاب	۷۶
''جمہوریت'' اور ''شورائیت'' کا فرق	۷۶
فن کے ماہر سے مشورہ کرو	۷۶
دین کے معاملات میں علماء سے مشورہ کریں	۷۷
مشورہ کے لئے اہلیت کی ضرورت	۷۷
کن معاملات میں مشورہ کیا جائے؟	۷۸
''مشیر'' کا پہلا فرض: اہلیت ہونا	۷۸
دوسرا فرض: امانت داری	۷۹
مشورہ دینے میں ضرورۃً غیبت جائز ہے	۷۹
''مشیر'' کا تیسرا فرض: رازداری	۸۰
راز فاش کرنا گناہ ہے	۸۰
چوتھا فرض: صحیح مشورہ دینا	۸۰
''مشیر'' کا عمر میں بڑا ہونا ضروری نہیں	۸۱
بڑے آپ، عمر میری زیادہ	۸۱
ہم عمروں اور چھوٹوں سے مشورہ	۸۲
صلح حدیبیہ کا واقعہ	۸۲
حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ کرنا	۸۴
اس مشورے کا نتیجہ	۸۴
جذبات کی تسکین کا نام ''دین'' نہیں ''دین'' اتباع کا نام ہے	۸۵
لیڈر اور قائد کیسا ہو	۸۵

قائد ہو تو ایسا......	۸۵
مشورہ پر عمل ضروری نہیں	۸۶
حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ	۸۶
حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کی حالتِ زار	۸۷
آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے؟	۸۷
صحابیات کی فراست	۸۸
"حکم" اور "مشورے" میں فرق	۸۸
خلاصہ	۸۸
سو کر اُٹھنے کی مسنون دُعا	۸۹
وہ شخص کیسا دن گزارے گا؟	۹۰
وہ شخص ناکام نہیں ہوگا	۹۰
فرشتے اور شیطان کا مقابلہ	۹۰
رات کو پھر مقابلہ	۹۱
صبح کی دعا	۹۱
دن کی روشنی اللہ تعالیٰ کی نعمت	۹۱
شام کی دعا	۹۲
ایسا شخص محروم نہیں ہوگا	۹۲
بیت الخلاء میں داخل ہونے اور نکلنے کی دعا	۹۳
بیت الخلاء میں جانے کی دعا	۹۳
خبیث مخلوقات سے پناہ مانگنے کی حکمت	۹۴
شیاطین جسمانی نقصان پہنچاتے ہیں	۹۴
شیاطین روحانی نقصان پہنچاتے ہیں	۹۵
بایاں پاؤں پہلے داخل کرنا	۹۵
بیت الخلاء سے نکلتے وقت کی دعا	۹۵
جسم سے گندگی کا نکل جانا نعمت ہے	۹۶
بیت الخلاء سے نکلنے کی ایک اور دعا	۹۶
زبان کے ذائقے کے لئے کھاتے ہیں	۹۷
جسم کے اندر خودکار مشین لگی ہوئی ہے	۹۷
جسم کے اجزاء اور ان کے کام	۹۸
اگر گردہ فیل ہوجائے تو!	۹۸
یہ مشین ہر ایک کو حاصل ہے	۹۸
قضاء حاجت کے بعد شکر ادا کرو	۹۹
یہ دعائیں دھیان سے پڑھنی چاہئیں	۹۹
وضو۔ ظاہری اور باطنی پاکی کا ذریعہ	۱۰۰
سب سے پہلے نماز کی تیاری	۱۰۰
وضو کا ظاہری اور باطنی پہلو	۱۰۱
تیمم میں باطنی پہلو موجود ہے	۱۰۱
صرف ظاہری صفائی مقصود نہیں	۱۰۱
روح کی صفائی بھی مقصود ہے	۱۰۲
وضو کی حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ	۱۰۲
ورنہ نیت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی	۱۰۲
دوبارہ وضو کرنے کا حکم کیوں؟	۱۰۳
حکم ماننے سے روحانیت مضبوط ہوگی	۱۰۳
پاکی اور صفائی میں فرق	۱۰۳
خنزیر صاف ہونے کے باوجود ناپاک ہے	۱۰۴
شراب صاف ہونے کے باوجود ناپاک ہے	۱۰۴
وہ پانی ناپاک ہے	۱۰۴

پاکی اور صفائی دونوں مطلوب ہیں ۱۰۴
انگریزوں کی ظاہری صفائی کی حقیقت ۱۰۵
مسلمانوں میں پاکی اور صفائی کا اہتمام ۱۰۵
ایک یہودی کا اعتراض اور اس کا جواب ۱۰۶
قضاء حاجت کے بارے میں حضور ﷺ کی تعلیم ۱۰۶
وضو سے ظاہری اور باطنی پاکی حاصل ہوتی ہے ۱۰۷
وضو کے دوران کی مسنون دعا ۱۰۸
تین جملوں کی جامعیت ۱۰۹
پہلا جملہ طلبِ مغفرت ۱۰۹
حضور ﷺ کا مغفرت طلب کرنا ۱۱۰
نامعلوم گناہوں سے استغفار ۱۱۱
ہماری نمازیں ان کی شایانِ شان نہیں ۱۱۱
توبہ سے ترقی درجات ۱۱۲
نماز کے بعد استغفار کیوں ہے؟ ۱۱۲
ہر عبادت کے بعد دو کام کرو ۱۱۳
حقِ عبادت ادا نہ ہو سکنے پر استغفار ۱۱۳
ظاہری اور باطنی میل کچیل دور ہو جائے ۱۱۳
صغیرہ اور کبیرہ دونوں قسم کے گناہوں کی معافی ۱۱۴
گھر میں دونوں قسم کی کشادگی مطلوب ہے ۱۱۴
گھر کا اصل وصف ''سکون'' ہے ۱۱۵
گھر میں خوبصورتی سے زیادہ کشادگی مطلوب ہے ۱۱۵
تین چیزیں نیک بختی کی علامت ہیں ۱۱۶
دلوں کا ملا ہوا ہونا کشادگی میں داخل ہے ۱۱۶
برکت کی دعا کی وجہ ۱۱۶
مانگنے کی چیز ''برکت'' ہے ۱۱۶
ایک سبق آموز واقعہ ۱۱۷
اللہ تعالیٰ یہ دولت لے لیں اور سکون کی نیند دے دیں ۱۱۸
آج سب کچھ ہے، مگر برکت نہیں ۱۱۸
آج وقت میں برکت نہیں ۱۱۸
حضور ﷺ کے وقت کی برکت ۱۱۹
حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور وقت کی برکت ۱۱۹
برکت حاصل ہے تو سب کچھ حاصل ہے ۱۱۹
تمام حاجتیں ان دعاؤں میں سمٹ گئیں ۱۲۰
وضو کے دوران کی دوسری دعا ۱۲۰
وضو کے بعد کی دعا ۱۲۰
وضو کے دوران ہر عضو دھونے کی علیحدہ دعا ۱۲۲
وضو شروع کرتے وقت کی دعا ۱۲۲
گٹوں تک ہاتھ دھونے کی دعا ۱۲۳
کلی کرنے کی دعا ۱۲۳
ناک میں پانی ڈالتے وقت کی دعا ۱۲۳
چہرہ دھوتے وقت کی دعا ۱۲۳
قیامت کے دن اعضاء چمکتے ہوں گے ۱۲۴
دایاں ہاتھ دھونے کی دعا ۱۲۵
مجموعی زندگی درست کرنے کی فکر کریں ۱۲۶
بایاں ہاتھ دھونے کی دعا ۱۲۶
سر کا مسح کرتے وقت کی دعا ۱۲۷

عرش کے سائے والے سات افراد	۱۲۷
گردن کے مسح کے وقت کی دعا	۱۲۸
دایاں پاؤں دھوتے وقت کی دعا	۱۲۸
پُل صراط پر ہر ایک کو گزرنا ہوگا	۱۲۸
بایاں پاؤں دھوتے وقت کی دعا	۱۲۹
وضو کے بعد کی دعا	۱۳۰
وضو کے دوران پڑھنے کی دعا	۱۳۰
وضو کے بعد کی دعا	۱۳۱
صغیرہ کے ساتھ کبیرہ کی بھی معافی	۱۳۱
بار بار توبہ کرنے والا بنادیں	۱۳۲
بہت زیادہ رجوع کرنے والا بنادیں	۱۳۲
باطن کو بھی پاک کرنے والا بنادیں	۱۳۳
وضو کے بعد کی دوسری دعا	۱۳۳
ایسا شخص محروم نہیں رہے گا	۱۳۴
نمازِ فجر کے لئے جاتے وقت کی دعا	۱۳۵
ایسا شخص محروم نہیں رہے گا	۱۳۶
دل کے اندر نور ہونے کا مطلب	۱۳۶
آنکھ میں نور ہونے کا مطلب	۱۳۷
ماں باپ کو دیکھنے سے حج وعمرہ کا ثواب	۱۳۷
دوسروں کے گھروں میں جھانکنا	۱۳۸
اجازت لینے کی اہمیت	۱۳۸
یہ نگاہ کا غلط استعمال ہے	۱۳۹
آنکھوں کے ذریعہ گناہ اور ثواب دونوں کما سکتے ہو	۱۳۹
کان میں نور ہونے کا مطلب	۱۳۹
کان کا صحیح استعمال	۱۴۰
کان کا غلط استعمال	۱۴۰
دائیں بائیں، آگے پیچھے نور ہونا	۱۴۱
شیطان چار طرف سے حملہ کرتا ہے	۱۴۱
میرے بندوں پر داؤ نہیں چلے گا	۱۴۲
میرے بندے کون ہیں؟	۱۴۲
شیطان کے حملے سے بچاؤ	۱۴۲
کوئی شریف انسان بھی ایسا نہیں کرے گا	۱۴۳
مانگنے والا ہونا چاہئے	۱۴۳
ہم زبردستی نور نہیں دیتے	۱۴۴
طلب کا اظہار کرکے قدم بڑھاؤ	۱۴۴
مسجد میں داخل ہوتے وقت کی دعا	۱۴۵
مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ پڑھیں	۱۴۵
دعا کے ساتھ درود شریف پڑھیں	۱۴۶
درود شریف میں اپنا فائدہ بھی ہے	۱۴۶
رحمت کے دروازے کھل جائیں	۱۴۷
''باب'' کے بجائے ''ابواب'' کہنے کی حکمت	۱۴۷
رحمت کی مختلف قسمیں ہیں	۱۴۸
''رحمت عطا فرمادیں'' کیوں نہیں فرمایا؟	۱۴۸
نماز شروع ہونے سے پہلے رحمت کو متوجہ کرنا	۱۴۹
تاکہ یہ وقت میں برباد نہ کردوں	۱۴۹
کیا ایسا شخص محروم رہے گا؟	۱۴۹

دعا کرتے وقت سوچ لیا کریں	۱۵۰
مسجد میں جاکر تحیۃ المسجد پڑھ لیں	۱۵۰
سنتوں میں تحیۃ المسجد کی نیت کرنا	۱۵۱
جماعت کے انتظار میں بیٹھے ہوئے یہ دعا پڑھیں	۱۵۱
مسجد میں کرنے کے کام	۱۵۱

مسجد سے نکلتے وقت کی دعا ۱۵۳

مسجد سے نکلتے وقت بایاں پاؤں نکالے	۱۵۳
وہ شخص فضیلت سے محروم ہوگیا	۱۵۴
داخل ہونے اور نکلنے کی دعاؤں میں فرق	۱۵۴
''رحمت'' سے مراد دینی نعمت	۱۵۵
''فضل'' سے مراد دنیاوی نعمت	۱۵۵
مسجد سے نکلنے کے بعد فضل کی ضرورت	۱۵۶
اگر یہ دعائیں قبول ہوجائیں تو	۱۵۶
دنیاوی نعمتیں اللہ کا فضل کیسے ہیں؟	۱۵۶
انسان کو دھوکہ لگ گیا ہے	۱۵۷
اللہ کے فضل کے بغیر کچھ حاصل نہیں کرسکتے	۱۵۷
گاہک اللہ بھیجتا ہے	۱۵۸
دینے والا کوئی اور ہے	۱۵۸
میرا حجازِ مقدس کا پہلا سفر	۱۵۹
اسلامی معاشرے کی ایک جھلک	۱۵۹
فضل کے بغیر اسباب میں تاثیر نہیں	۱۶۰
ملازمت کے لئے ڈگریاں کافی نہیں	۱۶۰
کھیتی اُگانا انسان کے اختیار میں نہیں	۱۶۰
فضل کے اندر ساری نعمتیں داخل ہیں	۱۶۱

سورج نکلتے وقت کی دعا ۱۶۲

نمازِ اشراق کی فضیلت	۱۶۲
روزانہ ایک حج اور ایک عمرہ کریں	۱۶۳
سورج نکلتے وقت کی دعا	۱۶۳
سوتے وقت روح قبض ہوجاتی ہے	۱۶۴
سونے سے پہلے کی دعا	۱۶۴
یہ دن اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے	۱۶۵
اگر یہ دن نہ ملتا تو!	۱۶۵
وقت آجانے کے بعد مہلت نہیں ملے گی	۱۶۶
یہ سمجھو کہ یہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہے	۱۶۶
حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۱۶۶
اللہ تعالیٰ نے گناہوں کی وجہ سے ہلاک نہیں کیا	۱۶۷
قوم عاد پر عذاب	۱۶۷
قومِ ثمود اور قومِ شعیب پر عذاب	۱۶۸
قومِ لوط پر عذاب	۱۶۸
دنیا کا سب سے زیادہ پست علاقہ	۱۶۸
اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم عام عذاب سے محفوظ ہے	۱۶۹
جزوی عذاب اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آئیں گے	۱۶۹

صبح کے وقت پڑھنے کی دعائیں ۱۷۱

پہلی دعا	۱۷۲

دوسری دعا	۱۷۲
تیسری دعا	۱۷۳
لفظ "فتح" کی تشریح	۱۷۳
رحمت کے دروازے کھول دے	۱۷۳
دروازہ کھل گیا	۱۷۴
دروازہ کھل جانا "فتح" ہے	۱۷۴
زندگی "جہدِ مسلسل" سے عبارت ہے	۱۷۵
"بیماری" ایک رکاوٹ ہے	۱۷۵
نماز میں سستی ایک رکاوٹ ہے	۱۷۵
گناہوں کے داعیے رکاوٹ ہیں	۱۷۶
لفظ "نصرۃ" کی تشریح	۱۷۶
انسان کا کام صرف اسباب جمع کرنا ہے	۱۷۷
صحت حاصل ہونا اختیار میں نہیں	۱۷۷
ملازمت مل جانا اختیار میں نہیں	۱۷۷
خشوع وخضوع اختیار میں نہیں	۱۷۸
دن کے آغاز میں "نصرت" طلب کرلو	۱۷۸
لفظ "نُورَہٗ" کی تشریح	۱۷۸
نور سے دل کا نور مراد ہے	۱۷۸
اپنے رضا والے کاموں کی توفیق دے	۱۷۹
کام کی ظلمت سے دل میں گھٹن ہوتی ہے	۱۷۹
کام کے نور سے دل میں انشراح	۱۸۰
لفظ "بَرَکَتَہٗ" کی تشریح	۱۸۰
برکت کا مطلب	۱۸۰
بیڈروم کی برکت نہیں ملی	۱۸۱
گھر ملا لیکن برکت نہ ملی	۱۸۱
گاڑی ملی لیکن برکت نہ ملی	۱۸۱
جھونپڑا ملا اور برکت بھی ملی	۱۸۱
یہ سب اسبابِ راحت ہیں	۱۸۲
"مبارک ہو" کا مطلب	۱۸۲
آج ہر شخص پریشان ہے	۱۸۲
تین لاکھ روپے ماہانہ آمدنی والے کا حال	۱۸۲
وقت نہ ہونے کا سب کو شکوہ ہے	۱۸۳
دن کے آغاز میں برکت کی دعا کرلو	۱۸۳
وقت بچانے کے اسباب	۱۸۳
جو وقت بچا وہ کہاں گیا؟	۱۸۴
گناہ برکت کو ختم کردیتے ہیں	۱۸۴
حضور ﷺ کے وقت میں برکت کی مثال	۱۸۴
لفظ "ھُدَاہُ" کی تشریح	۱۸۵
دنیا وآخرت کے کاموں میں ہدایت کی ضرورت	۱۸۵
ہدایت حاصل ہوجائے تو کام بن جائے	۱۸۶
"اتفاق" کوئی چیز نہیں	۱۸۶
میرا ایک واقعہ	۱۸۶
دن کے آغاز میں ہدایت مانگ لیں	۱۸۸
یہ بڑی جامع دعا ہے	۱۸۸
صبح کے وقت کی ایک اور دعا	۱۸۹
دن کا آغاز اچھے کام سے کرو	۱۹۰
صبح اُٹھ کر یہ کام کرو	۱۹۰
دن کا آغاز رجوع الی اللہ سے	۱۹۱
صبح کے وقت نئی زندگی کا ملنا	۱۹۱
صبح کے وقت ہمارا حال	۱۹۱
صبح کے وقت میں برکت	۱۹۲

کاروبار مندہ کیوں نہ ہو؟ ۱۹۲
یہ کامیابی کا زینہ ہے ۱۹۳
دن کے درمیانی اور آخری حصے کے لئے دعائیں ۱۹۳

گھر سے نکلنے کی دعا اور بازار میں داخل ہونے کی دعا ۱۹۴

اللہ کا سہارا لے لو ۱۹۵
اللہ کے سہارے پر بھروسہ کرلو ۱۹۵
اب یہ سفر عبادت بن گیا ۱۹۵
ساری طاقتیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں ۱۹۵
بازار ناپسندیدہ جگہیں ہیں ۱۹۶
بازار کے اندر ہونے والی برائیاں ۱۹۶
ایسے تاجر فجار بنا کر قیامت کے دن اُٹھائے جائیں گے ۱۹۷
امانت دار تاجروں کا حشر انبیاء کے ساتھ ہوگا ۱۹۷
بلاضرورت بازار مت جاؤ ۱۹۷
بازار جاتے وقت یہ دعا پڑھ لیں ۱۹۸
بازار پہنچ کر اللہ تعالیٰ کو مت بھولو ۱۹۸
دنیا کی حقیقت یہ ہے ۱۹۸
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دنیا ۱۹۹
ایک سبق آموز واقعہ ۱۹۹
دنیا میں رہ کر اللہ تعالیٰ کو نہ بھولو ۲۰۰
خرید و فروخت کے وقت کی دعا ۲۰۱
ایسا بندہ ناکام نہیں ہوگا ۲۰۱

گھر میں داخل ہونے کی دعا ۲۰۲

داخلے کی بھلائی مانگتا ہوں ۲۰۲
میرا داخلہ اچھا ہو جائے ۲۰۳
نکلنے کی بھلائی مانگتا ہوں ۲۰۳
''بھلائی'' بہت جامع لفظ ہے ۲۰۳
اگر بھلائی مل جائے تو بیڑہ پار ہے ۲۰۴
اللہ تعالیٰ کے نام سے داخل ہوتے ہیں ۲۰۴
اللہ تعالیٰ کے نام سے نکلتے ہیں ۲۰۴
اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں ۲۰۵
ہمیشہ عافیت مانگو ۲۰۵
جیسے بیٹا اپنے کو باپ کے حوالے کردے ۲۰۵
دعا کر کے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کردیا ۲۰۶
بیماری کے ذریعہ تمہاری صفائی مقصود ہے ۲۰۶
اپنے پروردگار پر بھروسہ ہے ۲۰۷
عافیت کی زندگی حاصل ہوگی ۲۰۷
خلاصہ ۲۰۸

کھانا سامنے آنے پر دعا ۲۰۹

مسلمان کو کافر سے ممتاز کرنے والا جملہ ۲۰۹
قارون کا دعویٰ ۲۱۰
قارون کا انجام ۲۱۰
صرف اسباب جمع کرنا انسان کا کام ہے ۲۱۱
گاہک کون بھیج رہا ہے؟ ۲۱۱
پیسہ سب کچھ نہیں ۲۱۲
صرف مال کا موجود ہونا کافی نہیں ۲۱۲

ہر چیز اللہ کی عطا کی ہوئی ہے	۲۱۳
کھانا سامنے آنے پر دوسری دعا	۲۱۳
برکت کے معنی	۲۱۴
برکت کے دوسرے معنی	۲۱۴
برکت تلاش کرو	۲۱۵
انگلیاں چاٹنے میں برکت کا حصول	۲۱۵
تین انگلیوں سے کھانا	۲۱۵
اس سے اچھا عطا فرمایئے	۲۱۵
حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ	۲۱۶
کہیں دماغ خراب نہ ہو جائے	۲۱۶
خلاصہ	۲۱۷

کھانے سے پہلے اور بعد کی دعا

کھانے سے پہلے اور بعد کی دعا	۲۱۸
بسم اللہ پڑھنے کا فلسفہ	۲۱۸
''بسم اللہ'' بھول جانے پر درمیانِ طعام کی دعا	۲۱۹
مسلمان اور کافر کے کھانے میں امتیاز	۲۱۹
کھانے کے بعد کی دعا	۲۱۹
رزق علیحدہ نعمت، کھلانا علیحدہ نعمت	۲۲۰
ایک نواب صاحب کا قصہ	۲۲۰
پانی کی نعمت پر شکر	۲۲۱
کھانا کافی ہونے کی نعمت پر شکر	۲۲۱
رہائش کی نعمت پر شکر	۲۲۱
تمام نعمتوں کے جمع ہونے پر شکر	۲۲۲
اسلام کی دولت پر شکر	۲۲۲
معنی کی کائنات پوشیدہ ہے	۲۲۲
خلاصہ	۲۲۳

سلام کرنے کے آداب

سلام کرنے کے آداب	۲۲۴
سات باتوں کا حکم	۲۲۴
سلام کرنے کا فائدہ	۲۲۵
سلام اللہ کا عطیہ ہے	۲۲۵
سلام کرنے کا اجر وثواب	۲۲۶
سلام کے وقت یہ نیت کرلیں	۲۲۶
نماز میں سلام پھیرتے وقت کی نیت	۲۲۷
جواب سلام سے بڑھ کر ہونا چاہئے	۲۲۷
مجلس میں ایک مرتبہ سلام کرنا	۲۲۸
ان مواقع پر سلام کرنا جائز نہیں	۲۲۸
دوسرے کے ذریعہ سلام بھیجنا	۲۲۸
تحریری سلام کا جواب واجب ہے	۲۲۹
غیر مسلموں کو سلام کرنے کا طریقہ	۲۲۹
ایک یہودی کا سلام کرنے کا واقعہ	۲۳۰
حتی الامکان نرمی کرنا چاہئے	۲۳۱
سلام ایک دعا ہے	۲۳۱
حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کی حالت	۲۳۱
حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۲۳۲
''شکریہ'' کے بجائے ''جزاکم اللہ'' کہنا چاہئے	۲۳۲
سلام کا جواب بلند آواز سے دینا چاہئے	۲۳۳

سفر کی مختلف دعائیں

سفر کی مختلف دعائیں	۲۳۴
سواری پر بیٹھنے کی دعا	۲۳۴
ان جانوروں کو تمہارے تابع بنا دیا ہے	۲۳۵
اُونٹ تمہارا تابع ہے	۲۳۵

انسان اس موقع پر اللہ کو یاد کرے	۲۳۶
موجودہ دور کی سواریوں کا قرآن میں ذکر	۲۳۶
قرآن کریم میں ہوائی جہاز کا ذکر	۲۳۷
موجودہ دور کی سواریاں بھی مسخر کردی گئیں	۲۳۷
اس سفر میں اصل سفر کو یاد کرو	۲۳۸
کہیں یہ سفر آخرت کو تباہ نہ کردے	۲۳۸
لمبے سفر پر جاتے وقت حضورِ اقدس ﷺ کا معمول	۲۳۹
سفر میں اللہ تعالیٰ کو ساتھی بنالیں	۲۳۹
اللہ تعالیٰ کو گھر والوں کیلئے نگران بنالیں	۲۴۰
دونوں مشکلات حل ہوگئیں	۲۴۰
اے اللہ سفر آسان فرمادے	۲۴۰
سفر کی مشقتوں سے پناہ مانگ لیں	۲۴۱
واپسی پر گھر والوں کی خیریت کی اطلاع ملے	۲۴۱
اس دعا کی جامعیت	۲۴۲
نئی بستی سے گزرتے وقت کی دعا	۲۴۲
کسی بستی میں داخل ہوتے وقت کی دعا	۲۴۳
خلاصہ	۲۴۴
جنازے کے آداب اور چھینکنے کے آداب	۲۴۵
جنازے کے پیچھے چلنے کی فضیلت	۲۴۶
جنازے میں شرکت کے وقت نیت کیا ہو؟	۲۴۶
جنازے کے ساتھ چلتے وقت کلمہ شہادت پڑھنا	۲۴۶
جنازہ اٹھاتے وقت موت کا مراقبہ کریں	۲۴۷
جنازے کے آگے نہ چلیں	۲۴۷
جنازے کو کندھا دینے کا طریقہ	۲۴۸
جنازے کو تیز قدم سے لے کر چلنا	۲۴۸
جنازہ زمین پر رکھنے تک کھڑے رہنا	۲۴۹
اسلامی الفاظ اور اصطلاحات	۲۴۹
اسلامی اصطلاحات سے ناواقفی کا نتیجہ	۲۴۹
انگریزی الفاظ کا رواج	۲۵۰
آج ''معارف القرآن'' سمجھ میں نہیں آتی	۲۵۰
چھینکنے کے آداب	۲۵۱
جمائی سستی کی علامت ہے	۲۵۱
حضورِ اقدس ﷺ کا عاجزی اور سستی سے پناہ مانگنا	۲۵۱
چھینک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے	۲۵۲
اللہ تعالیٰ کو مت بھولو	۲۵۲
یہ سنت مردہ ہوتی جارہی ہے	۲۵۳
چھینکنے والے کا جواب دینا واجب ہے	۲۵۳
فرضِ عین اور فرضِ کفایہ کا مطلب	۲۵۴
یہ مسلمان کا ایک حق ہے	۲۵۴
کتنی مرتبہ جواب دینا چاہئے	۲۵۴
حضور ﷺ کا طرزِ عمل	۲۵۵
یہ جواب دینا کب واجب ہے؟	۲۵۵
حضورِ اقدس ﷺ کا جواب نہ دینا	۲۵۵
چھینکنے والا بھی دعا دے	۲۵۶
ایک چھینک پر تین مرتبہ ذکر	۲۵۷
کمزور اور مظلوم کی مدد کرنا	۲۵۷

مظلوم کی مدد واجب ہے ۲۵۷
ورنہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے گا ۲۵۸
عذاب کی مختلف شکلیں ۲۵۸
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات ۲۵۸
ایک عبرتناک واقعہ ۲۵۹
مسلمان کی مدد کرنے کی فضیلت ۲۵۹
زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا ۲۵۹
قسم کھانے والے کی مدد کرنا ۲۶۰

مصیبت کے وقت کی دعا ۲۶۱

دنیا میں کوئی تکلیف سے خالی نہیں ۲۶۱
مؤمن اور کافر میں فرق ۲۶۱
تکلیف کے وقت کی دعا ۲۶۲
"إِنَّا لِلّٰهِ" کا مطلب ۲۶۲
"وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کا مطلب ۲۶۳
دوسری دعا کا مطلب اور ترجمہ ۲۶۳
مصیبت کا بدل مانگئے ۲۶۴
مصیبت دور ہونے کی دعا کیجئے ۲۶۴
میرے والد ماجد اور بیماری ۲۶۴
یہ تکالیف بھی نعمت ہیں ۲۶۵
تکلیف میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ۲۶۵

صحت کی دعا کرنا سنت ہے ۲۶۶

صحت کی دعا عبدیت کی علامت ہے ۲۶۶
بیماری میں دعا کرنے کا ثبوت ۲۶۷
ایک بزرگ کا واقعہ ۲۶۸
اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں ۲۶۸
بھوک کی وجہ سے ایک بزرگ کا رونا ۲۶۹
بیماری میں ہائے ہائے کرنا ۲۶۹
حضرت مفتی صاحب ؒ کا تکالیف پر صبر ۲۶۹
رحم کی دعا پر استغفار ۲۷۰
دعا میں شکوہ کا رنگ نہ ہو ۲۷۰
حضور ﷺ کی شان میں توصیف کے کلمات ۲۷۰
معراج کے تذکرے میں "عبد" کا لفظ لانا ۲۷۱
یہ بے ادبی کے الفاظ ہیں ۲۷۲
یہ تکلیف تمہیں کس بلند مقام پر پہنچا رہی ہے ۲۷۲
ایک مسلمان اور ایک یہودی کا قصہ ۲۷۳
فرشتوں نے اپنا کام کرلیا ۲۷۳
یا اللہ! بات سمجھ میں نہیں آئی ۲۷۳
کافروں کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے ۲۷۴
مسلمانوں کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے ۲۷۴
حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کو نوازنے کا انداز ۲۷۵
تکالیف پر رضامندی، درجات کی بلندی کا ذریعہ ۲۷۶
موت کی دعا کے بجائے یہ دعا کریں ۲۷۶
تین سبق ۲۷۷
اپنی طرف سے تجویز مت کرو ۲۷۸
حضرت قاری فتح محمد صاحب ؒ ۲۷۸

ہمارا حکم اور ہمارا فیصلہ ہی سب کچھ ہے	۲۷۹
بیماری میں سابقہ عمل کا ثواب ملتا رہتا ہے	۲۸۰
بینائی کی دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں	۲۸۰
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور فہم دین	۲۸۰
سوتے وقت کی دعائیں اور اذکار	۲۸۱
سونے سے پہلے ''استغفار''	۲۸۱
اگلا دن ملے یا نہ ملے	۲۸۲
توبہ کا مطلب	۲۸۲
سوتے وقت کی دو دعائیں	۲۸۲
نیک بندوں کی طرح زندگی کی حفاظت	۲۸۳
فاسقوں اور فاجروں کی حفاظت کیوں؟	۲۸۳
کافروں کو ڈھیل دی جاتی ہے	۲۸۴
اچانک ان کی گرفت ہوگی	۲۸۴
سامری کی پرورش حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ	۲۸۴
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے ذریعہ	۲۸۵
سوتے وقت حفاظت کی دعا کرنا	۲۸۵
اگر موت آجائے تو مغفرت	۲۸۶
سوتے وقت کے دوسرے اذکار	۲۸۶
تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد	۲۸۷
بیداری کے آخری الفاظ	۲۸۷
اگر نیند نہ آئے تو یہ پڑھے	۲۸۸
اختتامی کلمات	۲۸۸

مسنون دعائیں

کثرتِ ذکر اللہ کا بہترین طریقہ ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا۔

اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

گزشتہ دو روز سے یہ بات چل رہی تھی کہ سارے طریقت، تصوف اور سلوک کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی محبت دل میں جاگزیں ہو جائے، اور اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق اتنا مضبوط ہو جائے کہ ہر وقت اللہ جل شانہ کا دھیان رہے۔ اگر یہ چیز حاصل ہو جائے تو دین کے سارے احکام پر عمل آسان ہو جائے۔

اصطلاحات کی فکر میں مت پڑو

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اصطلاحات کی فکر میں مت پڑو، چنانچہ تصوف میں بہت سی اصطلاحات ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس درجہ کا تعلق قائم ہو جائے تو اس کا یہ نام ہے، اس سے زیادہ ہو جائے تو اس کا یہ نام ہے، سب سے آخری اور انتہائی درجہ کو ''ملکۂ یادداشت'' کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت دل میں اللہ جل شانہ کا دھیان رہے۔ لیکن حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اصطلاحات کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں، بہت سے لوگ اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت میں جس حالت سے گزر رہا ہوں، یہ حالت کس قسم کی ہے؟ اور اس کا کیا نام ہے؟ حضرت والا فرماتے تھے کہ تمہیں آم کھانے کی فکر

☆ اصلاحی مجالس (۶/۱۱۲ تا ۱۲۹)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

ہونی چاہئے، پیڑ گننے سے کیا مطلب؟ اگر تمہیں وہ چیز حاصل ہو رہی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ جیسے ایک آدمی ریل گاڑی کے ذریعے لاہور جا رہا ہے، اب سفر کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہر اسٹیشن کا نام یاد کرے کہ فلاں فلاں اسٹیشن راستے میں آئے، فلاں فلاں اسٹیشن پر گاڑی رکی، اور ایک طریقہ یہ ہے کہ پڑا سوتا رہے، صبح جب بیدار ہوگا تو انشاء اللہ لاہور پہنچ جائے گا۔ اگر اس سے پوچھا جائے کہ راستے میں کون کون سے اسٹیشن آئے تو وہ ان کے نام تو نہیں بتا سکتا، لیکن لاہور پہنچ گیا۔

اصل مقصد اللہ کی یاد کا دل میں بس جانا ہے

اسی طرح تصوف وسلوک کی اصطلاحات کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں، لیکن تصوف کا حاصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں بس جائے، اللہ جل شانہ کی محبت دل میں قائم ہو جائے، اور تعلق مضبوط ہو جائے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے اسباب بتلا رہے تھے، پہلا سبب بیان فرمایا ''کثرتِ ذکر اللہ'' یعنی اللہ جل شانہ کے ذکر کی کثرت، اس کا بیان گذشتہ کل شروع کیا تھا۔

مسنون دعاؤں کا اہتمام کریں

کثرتِ ''ذکر اللہ'' کا مقصد جن طریقوں سے حاصل ہوتا ہے، ان میں سے ایک طریقہ ''ادعیۂ ماثورہ'' کا اہتمام ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عجیب طریقہ تلقین فرمایا، وہ یہ کہ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی میں ہم جن مراحل سے گزرتے ہیں، ان میں سے ہر ہر مرحلے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا تجویز فرمادی کہ جب صبح کو سو کر بیدار ہو تو یہ دعا پڑھو، جب غسل خانے میں داخل ہونے لگو تو یہ دعا پڑھو اور جب باہر نکلو تو یہ دعا پڑھو، جب وضو کرنا شروع کرو تو یہ دعا پڑھو، جب وضو سے فارغ ہو جاؤ تو یہ دعا پڑھو، مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھو، مسجد سے باہر نکلتے وقت یہ دعا پڑھو، کھانا سامنے آئے تو یہ دعا پڑھو، کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو یہ دعا پڑھو، جب دسترخوان اُٹھاؤ تو یہ دعا پڑھو، وغیرہ، اس طرح حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مراحل میں مختلف دعائیں تجویز فرمادیں۔

ان دعاؤں کو معمولی مت سمجھیں

لوگ ان دعاؤں کے پڑھنے کو معمولی سمجھتے ہیں کہ کسی موقع پر دعا پڑھ لی تو کیا نہیں پڑھی تو کیا! خاص طور پر مولوی صاحبان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دعائیں پڑھنا مستحب ہے، اور مستحب کی تعریف یہ ہے کہ

پڑھو تو ثواب، نہ پڑھو تو کوئی گناہ نہیں۔ لہٰذا دعائیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ وہ دعائیں پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتے، حالانکہ ہر موقع پر حضورِ اقدس ﷺ کی مانگی ہوئی دعا کو مانگنا اتنی عجیب و غریب چیز ہے کہ اس کے منافع اور فوائد کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں۔

یہ الہامی دعائیں ہیں

اوّل تو ان میں سے ایک ایک دعا ایسی ہے کہ اگر ان میں سے ایک دعا بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت پالے تو ہمارا بیڑا پار ہو جائے، اس کے علاوہ یہ کہ ان دعاؤں کے الفاظ میں نور ہے، ان کے معنی میں نور ہے، ان کے فوائد میں نور ہے، گویا کہ ان دعاؤں میں نور ہی نور بھرا ہوا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ دعائیں نبی کریم ﷺ کے "دلائل النبوۃ" میں سے ہیں، کسی انسان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ ایسی چیزیں اللہ تعالیٰ سے مانگے جو حضور ﷺ مانگنا سکھا گئے، اور جن الفاظ سے مانگنا سکھا گئے، وہ حاجتیں جو ہمارے اور آپ کے تصور میں نہیں آسکتیں، ایسی حاجتیں سرکارِ دو عالم ﷺ مانگ گئے، دنیا و آخرت کی کوئی بہتری ایسی نہیں جو ان دعاؤں کے اندر موجود نہ ہو۔ اس لئے میں تو کہتا ہوں کہ یہ دعائیں حضورِ اقدس ﷺ کے "دلائل النبوۃ" میں سے ہیں، کیونکہ یہ دعائیں ایسی ہیں کہ انسان وحی کی روشنی کے بغیر نہیں مانگ سکتا، ایسے ایسے جامع کلمات ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ ان دعاؤں کی شرح کی جائے، چنانچہ جامع مسجد بیت المکرّم کے جمعہ کے بیانات میں ان دعاؤں کی تشریح شروع کی ہے، اللہ تعالیٰ آسانی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔

ہر کام کے وقت اللہ تعالیٰ سے تعلق

یہ دعائیں اپنے پیچھے معنی کی بڑی کائنات رکھتی ہیں، لہٰذا ایک طرف تو یہ دعائیں بڑی مؤثر ہیں، دوسری طرف آپ ﷺ نے زندگی کے مختلف مراحل پر یہ دعائیں تجویز فرما دیں۔ اس لئے کہ اگر تم ایک مرتبہ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہو گے تو کتنا ذکر کرو گے؟ ہزار مرتبہ، پانچ ہزار مرتبہ، یا زیادہ سے زیادہ دس ہزار مرتبہ کر لو گے، لیکن فارغ ہونے کے بعد پھر اپنے کاموں میں مشغول ہو کر غافل ہو جاؤ گے، ہم تمہیں ذکر کا ایسا طریقہ بتا دیتے ہیں کہ تم جس کام میں لگے ہوئے ہو، اس کام کے اندر ہی تمہارا ذکر کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، یہاں تک کہ اگر تم بیت الخلاء جا رہے ہو، وہاں بھی ذکر کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، اگر وہاں سے نکل رہے ہو تو بھی ذکر کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، گویا کہ ہر کام میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی فضیلت عطا کی جا رہی ہے، اور تمہارا تعلق اللہ تعالیٰ سے جوڑا جا رہا ہے۔

خدائی ''پاور ہاؤس'' سے تعلق جڑ جائے گا

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تمہارے گھر کے اندر بجلی آرہی ہے، تم نے جیسے ہی بٹن دبایا، تمہارے گھر کا تعلق پاور ہاؤس سے جڑ گیا، اور پاور ہاؤس سے یہاں تک بجلی آنے میں بے شمار تار ہیں، بے شمار کھمبے ہیں، بے شمار ٹرانسفارمر ہیں، ان کے ذریعے سینکڑوں میل سے بجلی تمہارے گھر میں آرہی ہے، جیسے ہی تم نے سوئچ آن کیا، اس بجلی نے سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کرلیا، اور تمہارا تعلق پاور ہاؤس سے جڑ گیا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ادعیہ ماثورہ تلقین فرما کر گویا کہ یوں فرمادیا کہ بار بار اپنا سوئچ آن کرتے رہو اور جس جس وقت تم ان دعاؤں کا سوئچ آن کرو گے، تمہارا تعلق خدائی پاور ہاؤس سے جڑتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کا دروازہ بار بار کھٹکھٹاؤ

دنیا کے دوسرے تعلقات کا تو یہ حال ہے کہ اگر تمہارا کسی سے تعلق ہو جائے اور تم اس کو بار بار پکارو، بار بار اس کے گھر جاکر اس کے دروازے پر دستک دو، تو وہ ایک مرتبہ برداشت کرلے گا، دو مرتبہ برداشت کرلے گا، تین مرتبہ برداشت کرلے گا، چوتھی مرتبہ دستک دینے پر پٹائی کرے گا، یا مثلاً آپ نے کسی کو ایک مرتبہ ٹیلیفون کیا، تھوڑی دیر بعد دوبارہ ٹیلیفون کیا، تو وہ اس سے ناراض اور غصہ ہو جائے گا کہ بار بار مجھے فون پر پریشان کر رہا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھ سے جتنی مرتبہ چاہو، تعلق قائم کرلو، اور جس وقت چاہو، جس لمحے چاہو، جس کام کے لئے چاہو، تعلق قائم کرلو، میرے پاس آجاؤ، میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ، اور مجھ سے تعلق قائم کرنے کے لئے سوئچ آن کرتے رہو۔ یہ ادعیہ ماثورہ دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق جوڑ رہی ہیں، اور جتنی مرتبہ دعا کرو گے، اتنا ہی اس تعلق میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اتنی ہی اللہ تعالیٰ سے محبت بڑھے گی، لہٰذا یہ ادعیہ ماثورہ معمولی چیز نہیں، ان کو خوب یاد کرو، اور ہر وقت ان دعاؤں کے پڑھنے کی عادت ڈالو۔

زندگی کے ہر موڑ کے لئے دعائیں موجود ہیں

مسنون دعاؤں کی بے شمار کتابیں چھپی ہوئی ہیں، مناجات مقبول ہے، حصن حصین ہے، میں نے بھی ایک رسالہ ''پُر نور دعائیں'' کے نام سے لکھا ہے، جس میں ساری دعائیں جمع کردی ہیں، ان کتابوں کو پڑھو، اور دیکھو کہ کہاں کہاں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا دعائیں مانگی ہیں، اگر کوئی شخص ان دعاؤں کے پڑھنے کی پابندی کرلے تو صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کا کوئی موڑ ایسا نہیں ہے جس

میں وہ اپنے اللہ سے رجوع نہ کر رہا ہو، اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کا ایک نایاب طریقہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ہمیں تلقین فرمادیا۔

زبان بھی ذاکر اور تعلق بھی قائم

تجربہ یہ ہے کہ جو شخص ان دعاؤں کے پڑھنے کا عادی بن جاتا ہے، اس کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ سے جڑ جاتا ہے، البتہ بعد میں ایسا لگتا ہے کہ چونکہ الفاظ یاد ہوگئے ہیں اور پڑھنے کی عادت ہوگئی ہے، اس لئے اس دعا کو پڑھتے وقت معنی اور مفہوم کی طرف دھیان نہیں رہتا۔ اس وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح دعا پڑھنے سے کیا فائدہ؟ آٹومیٹک مشین چل پڑی، اور زبان سے خود بخود الفاظ ادا ہوگئے، حالانکہ دل کہیں ہے، اور دماغ کہیں ہے، اس لئے اس طرح دعا پڑھنا بے فائدہ ہے۔ یہ خیال غلط ہے، کیونکہ اس طرح دعا پڑھنا بھی فائدہ سے خالی نہیں، کم از کم تمہاری زبان تو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہے، تمہارا ایک عضو تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگا ہوا ہے، اس لئے یہ بھی کوئی کم نعمت نہیں، لیکن اگر ان دعاؤں کو ان کے معنی کی طرف دھیان کر کے توجہ سے پڑھو گے تو اس کے نتیجے میں جو فائدہ ہوگا، اور جو تعلق مع اللہ حاصل ہوگا، وہ عظیم الشان ہے۔ بہرحال، یہ ادعیۂ ماثورہ کا پڑھنا کثرتِ ذکر اللہ کا دوسرا طریقہ ہے۔

ہر وقت مانگتے رہو

کثرتِ ذکر اللہ کا تیسرا طریقہ "کثرتِ دعا" ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی کثرت، کثرتِ دعا کی اتنی مشق کی جائے کہ ہر وقت تمہارا دل اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہو، چاہے زبان پر دعا ہو یا نہ ہو، لیکن دل میں اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہو، مثلاً چلتے، پھرتے، اُٹھتے، بیٹھتے کام میں لگے ہوئے مانگتے رہو، اب سوال یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کیا چیز مانگیں؟

انسان حاجتوں کا پُتلا ہے

اگر غور کر کے دیکھو تو یہ نظر آئے گا کہ انسان حاجتوں کا پُتلا ہے، ہر لمحہ اس کو کوئی نہ کوئی حاجت اور ضرورت ہے، کوئی لمحہ اس کا احتیاج سے خالی نہیں، مثلاً اس وقت ہم یہاں مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں، بظاہر تو کوئی حاجت نہیں، لیکن بے شمار حاجتیں اس وقت بھی ہمارے ساتھ لگی ہوئی ہیں، مثلاً اگر گرمی لگ رہی ہے تو پنکھے اور ہوا کی حاجت ہے، اگر دھوپ آرہی ہے تو سائے کی حاجت ہے، اگر سردی زیادہ لگ رہی ہے تو گرمائش کی حاجت ہے، کیونکہ انسان کو کسی ایک حال پر قرار نہیں، ذرا سی

ٹھنڈ زیادہ ہوجائے تو پریشان ہوجاتا ہے، اگر گرمی زیادہ ہوجائے تو پریشان ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ہر وقت اس کو کوئی نہ کوئی حاجت ہے، لہٰذا ہر ہر لمحے جو حاجتیں تم کو پیش آرہی ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو۔

اس طرح مانگو

مثلاً اگر گرمی لگ رہی ہے تو یہ کہو: یا اللہ! گرمی دور فرمادیجئے۔

اگر سردی لگ رہی ہے تو کہو: یا اللہ! یہ سردی دور فرمادیجئے۔

کسی آدمی کی تلاش ہے، دعا کرو: یا اللہ! فلاں آدمی سے ملاقات ہوجائے۔

کہیں جانا ہے، اور بس کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑے ہو، کہو: یا اللہ! آسانی سے بس مل جائے۔

ٹیکسی کی تلاش ہے، کہو: یا اللہ! آسانی سے ٹیکسی مل جائے۔

جب سواری میں بیٹھ گئے، کہو: یا اللہ! سگنل کھلا مل جائے، یا اللہ! ٹریفک جام نہ ہو۔

لہٰذا جو حاجت جس وقت پیش آرہی ہے، اسی وقت وہ حاجت اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو۔

نبی کریم ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر تمہارے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو۔(۱)

یقینی طور پر حاصل ہونے والی چیز بھی اللہ سے مانگو

ایک اور باریک بات جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی، وہ یہ کہ جو چیز آنکھوں سے نظر آرہی ہے کہ یہ چیز یقینی طور پر ابھی مجھے حاصل ہونے والی ہے، وہ بھی اللہ سے مانگو۔ مثلاً آپ روزہ افطار کرنے بیٹھے، سامنے دسترخوان پر افطاری کا سامان موجود ہے، اب بظاہر یہ بات یقینی ہے کہ ہاتھ بڑھا کر افطاری کھالیں گے۔

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ اس وقت بھی اللہ سے مانگو: یا اللہ! مجھے یہ چیز کھانی نصیب ہوجائے، اور اس چیز کی لذت مجھے عطا فرمادیجئے، اس کے ذریعے مجھے طاقت اور صحت عطا فرمادیجئے، اور اس کے ذریعے مجھے بدہضمی نہ ہو، میرا پیٹ خراب نہ ہو، بلکہ صحت و عافیت کے ساتھ مجھے کھلادیجئے۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب لیسأل الحاجة مهما صغرت، رقم: ۳۵۳۶

اعلیٰ درجہ کا ’’توکل‘‘ یہ ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو عجیب علوم عطا فرمائے تھے، انسان کی عقل حیران رہ جاتی ہے، فرماتے ہیں کہ جہاں آدمی کے سامنے اسباب موجود نہیں ہیں، اگر اس جگہ پر ’’توکل‘‘ کیا تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، کیونکہ وہاں اسباب موجود ہی نہیں، اور ’’توکل‘‘ کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ ’’توکل‘‘ کا مزہ تو اس جگہ پر ہے جہاں اسباب سو فیصد موجود ہیں، جیسے ابھی میں نے مثال دی کہ کھانا سامنے موجود ہے، کھانے کے لئے صرف ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے، اس موقع پر بھی نظر ان اسباب پر نہ ہو، بلکہ اس وقت بھی نظر مسبب الاسباب پر ہو، اور اس وقت یہ کہو: اے اللہ! یہ کھانا سامنے موجود تو ہے، لیکن تیری توفیق کے بغیر نہ میں کھا سکتا ہوں اور نہ ہی اس کھانے سے فائدہ اُٹھا سکتا ہوں، یہ ’’توکل‘‘ اعلیٰ درجے کا ہے، کیونکہ سو فیصد اسباب موجود ہونے کے باوجود نگاہ ان اسباب کی طرف نہیں ہے۔ اس ’’توکل‘‘ کی بھی مشق کرنی چاہئے۔

اسباب کی موجودگی میں ’’توکل‘‘ کی ضرورت کیوں؟

تمام اسباب موجود ہونے کے موقع پر ’’توکل‘‘ کی ضرورت اس لئے ہے کہ بے شمار واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ سو فیصد اسباب موجود ہونے کے باوجود اور کھانا سامنے ہونے کے باوجود وہ کھانا منہ تک نہیں پہنچ سکا، مثلاً یہ کہ عین اس وقت کسی بیماری کا حملہ ہو گیا، فالج ہو گیا، موت واقع ہو گئی، بیہوشی طاری ہو گئی، تو اب وہ کھانا تو سامنے موجود ہے، لیکن کھانے کی توفیق نہیں ہوئی۔

کھانا الگ نعمت، کھلانا الگ نعمت

کھانے کے بعد جو دعا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے، اس کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَزَقَنَا وَاَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ))(۱)

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس میں دو الفاظ الگ الگ ارشاد فرمائے ہیں، ایک ’’رَزَقَنَا‘‘ اور دوسرا ’’اَطْعَمَنَا‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہمیں غذا عطا فرمائی، ہمیں رزق

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰه، باب ما یقول إذا فرغ من الطعام، رقم: ۳۳۷۹، سنن أبی داؤد، کتاب الأطعمة، باب ما یقول الرجل إذا طعم، رقم: ۳۳۵۲، سنن ابن ماجه، کتاب الأطعمة، باب ما یقال إذا فرغ من الطعام، رقم: ۳۲۷٤، مسند أحمد، رقم: ۱۰۸٤٦

دیا، اور ہمیں کھلایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رزق دینا الگ نعمت ہے اور رزق کھلانا الگ نعمت ہے، کیونکہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ رزق کی نعمت تو موجود ہوتی، لیکن معدہ خراب ہوتا، بدہضمی ہورہی ہوتی، تو اس صورت میں "رَزَقْنَا" تو ہے، لیکن "أَطْعَمَنَا" نہیں ہے، کیونکہ کھلانے کی نعمت حاصل نہیں ہوئی۔ ایسے واقعات زندگی میں بہت پیش آتے ہیں کہ چیز تو موجود ہے، لیکن اس سے فائدہ نہیں اُٹھاسکتے۔ یہ موقع اللہ تعالیٰ پر "توکل" اور بھروسہ کرنے کا ہے کہ اے اللہ! آپ کی مشیت پر اس سے فائدہ اُٹھانا موقوف ہے، آپ کی مشیت ہوگی تو میں اس سے فائدہ اُٹھاؤں گا، آپ کی مشیت نہیں ہوگی تو فائدہ نہیں اُٹھاسکوں گا، لہٰذا میں آپ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ آپ مجھے یہ چیز کھلا بھی دیجئے، اور اس کا نفع بھی پہنچا دیجئے۔

مانگنے سے محبوب بن جاؤ گے

بہر حال، انسان حاجتوں کا پُتلا ہے، جو بھی حاجت پیش آئے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش کرے۔ اور دعا کی قبولیت کے جو اوقات ہیں، نمازوں کے بعد اور دوسرے اوقات میں، ان اوقات میں ذرا اہتمام کے ساتھ ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگ لو۔ دنیا کے اندر تو یہ معاملہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی سخی داتا ہو، اگر تم اس کے پاس جا کر ایک مرتبہ مانگو گے، دیدے گا، دوسری مرتبہ بھی دیدے گا، تیسری مرتبہ بھی دیدے گا، اس کے بعد مانگو گے تو اس شخص کو تمہارے چہرے سے نفرت ہوجائے گی کہ یہ شخص اب مانگنے کے لئے پھر آگیا ہے۔ لیکن اللہ جل شانہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اصول یہ ہے:

((مَنْ لَمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ))(۱)

"جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا، اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں"

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم سے جب چاہو، مانگو، جتنا چاہو، مانگو، جتنی مرتبہ چاہو، مانگو، اور تم جتنا زیادہ مانگو گے، اتنا ہی تم ہمارے یہاں محبوب ہوگے، اگر نہیں مانگو گے تو ہم ناراض ہوں گے کہ تم نے کیوں نہیں مانگا۔ لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو، منگتے بنے رہو، یہ ایسا دربار ہے تو اس دربار سے فائدہ اُٹھاؤ، اور مانگو، اور دعا کرو۔ اس دعا کی کثرت کا فائدہ یہ ہورہا ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق مضبوط ہورہا ہے، اور کثرتِ ذکر کا فائدہ حاصل ہورہا ہے۔

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب منه، رقم: ۳۲۹۵، سنن ابن ماجه، كتاب الدعاء، باب فضل الدعاء، رقم: ۳۸۱۷

عجیب وغریب دعا

بہرحال، کثرتِ ذکر کے تین طریقے ہوئے، ایک یہ کہ ان چار اعمال کا اہتمام کرنا (جن کا بیان گذشتہ مجلس میں تفصیل سے ہو چکا) دوسرے یہ کہ ''ادعیۂ ماثورہ'' پڑھنے کا اہتمام کرنا، تیسرے یہ کہ ''دعا کی کثرت'' کرنا۔ یہاں تک کہ جب حضور ﷺ نے ساری دعائیں کرلیں، اور دنیا و آخرت کی کوئی حاجت نہیں چھوڑی تو آخر میں پھر ایک عجیب وغریب دعا فرمائی، وہ یہ ہے:

((أَيُّمَا عَبْدٍ أَوْ أَمَةٍ مِنْ أَهْلِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَقَبَّلْتَ دَعْوَتَهُمْ وَاسْتَجَبْتَ دُعَائَهُمْ، فَإِنَّا نَسْئَلُكَ أَنْ تُشْرِكَنَا فِيْ صَالِحِ مَا يَدْعُوْنَكَ فِيْهِ، وَأَنْ تُشْرِكَهُمْ فِيْ صَالِحِ مَا نَدْعُوْكَ فِيْهِ وَأَنْ تُعَافِيَنَا وَإِيَّاهُمْ وَأَنْ تَجَاوَزَ عَنَّا وَعَنْهُمْ))(۱)

''اے اللہ! خشکی اور سمندر میں آپ کے کسی بندے نے اور کسی بندی نے ساری زندگی میں جو بھی دعا مانگی ہو، اے اللہ! ہمیں بھی اس دعا میں شامل کرلیجئے، اور اُن کو ہماری دعاؤں میں شامل کرلیجئے، اور اُن کی مغفرت فرما دیجئے، اور ہماری بھی مغفرت فرما دیجئے''

یہ ایسی عجیب دعا ہے کہ کسی دوسرے انسان کے تصور میں بھی یہ الفاظ نہیں آسکتے۔

دل دل میں مانگ لو

اور صرف زبان سے نہیں، بلکہ دل دل میں ذکر کرتے رہو۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الحمدللہ، کبھی اس سے تخلف نہیں ہوتا کہ ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ حضرت! ایک مسئلہ پوچھنا ہے، اسی وقت فوراً اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرلیتا ہوں کہ یا اللہ! یہ شخص پتہ نہیں کیا سوال کرے گا، اس کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دیجئے، اس طرح دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہے۔ لہٰذا جو آدمی ماضی پر استغفار کر رہا ہے، حال میں صبر کر رہا ہے یا شکر کر رہا ہے، اور مستقبل کے لئے استعاذہ کر رہا ہے، اور مختلف مراحلِ زندگی میں ادعیۂ ماثورہ کا پابند ہے، اور اس کا دل ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہے، اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ضرور قائم ہو جائے گا، لہٰذا کثرتِ ذکر اللہ، اللہ تعالیٰ کی محبت اور تعلق قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

---

(۱) الدر المنثور (۲/۲۲۴)، کنز العمال، رقم: ۴۹۷۷ (۲/۶۴۴)، جامع الأحادیث، رقم: ۴۱۸۰۲ (۳۸/۴۳۰)

ان تسبیحات کا معمول بنالو

پھر ہمارے بزرگوں نے یہ بھی فرمادیا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے تھوڑا وقت ایسا مخصوص کرلو جس میں ذکر ہی مقصود ہو، اور بہتر یہ ہے کہ فجر سے پہلے کا وقت یا فجر کے بعد کا متصل وقت اس کے لئے مخصوص کرلو، لیکن اگر اس وقت عذر ہو تو دوسرے اوقات میں کوئی وقت ذکر کے لئے مختص کرلو، اور اس وقت میں یکسوئی کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو، تلاوت کرو، تسبیحات پڑھو، مثلاً "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ" ایک تسبیح، "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ" کی ایک تسبیح اور استغفار کی ایک تسبیح، درود شریف کی ایک تسبیح، اور لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ کی ایک تسبیح، اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کی ایک تسبیح۔ ان اذکار کے پڑھنے کا اہتمام کرو، ان سب اذکار کی ایک ایک تسبیح پڑھنے کا معمول بنالو، اگر زیادہ وقت نہیں تو ایک تہائی تسبیح کا معمول بنالو، اور ۳۳۔۳۳ مرتبہ تمام اذکار پڑھ لیا کرو، لیکن جب ذکر کے لئے وقت مقرر کرلو تو پھر اس وقت کو اسی کام میں صرف کرو، اور پہلے یہ دیکھو کہ میں چوبیس گھنٹے میں سے کتنا وقت اس کام کے لئے نکال سکتا ہوں، پھر اس کے حساب سے معمولات مقرر کرلو، چاہے آدھا گھنٹہ ہو یا پندرہ منٹ ہوں، یا دس منٹ ہوں، لیکن پھر اس کی پابندی کرو، اور اس وقت کے اعتبار سے اذکار کی تعداد میں کمی کرلو، اگر اس وقت میں سو کی تعداد پوری نہیں ہوتی تو ۶۶ کی تعداد مقرر کرلو، ۶۶ کی تعداد پوری نہیں ہوتی تو ۳۳ کی تعداد مقرر کرلو، ۳۳ کی تعداد پوری نہیں ہوتی تو گیارہ کی تعداد مقرر کرلو۔

پابندی والا عمل پسندیدہ ہے

لیکن جو مقرر کرو پھر اس کی پابندی بھی کرو۔ ایک حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((قَلِیْلٌ تَدُوْمُ عَلَیْہِ اَرْجٰی مِنْ کَثِیْرٍ مَّمْلُوْلٍ))(۱)

''وہ تھوڑا سا عمل جس پر تم مداومت کرو، اس میں اللہ تعالیٰ یہاں اجر وثواب اور قبولیت کی زیادہ اُمید ہے بنسبت اس کثیر عمل کے جس کو آج کیا اور کل چھوڑ دیا''

ایک اور حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) یہ جملہ احادیثِ نبویہ میں تو نہیں مل سکا البتہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اقوال میں ملتا ہے۔ التذکرۃ الحملونیۃ (۱/۱۲۹) نہج البلاغۃ، ص: ۲۷۸

((أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ))(۱)

''بہترین عمل وہ ہے جس پر مداومت کی جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہو''

مداومت کے اندر برکت ہوتی ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اذکار کا وقت بھی مقرر ہو، اور جگہ بھی مقرر ہو، اور تعداد بھی مقرر ہو، کیونکہ ایک جگہ پر بیٹھ کر جب آدمی ذکر کرتا ہے تو اس کا فائدہ بھی زیادہ ہوتا ہے، بنسبت اس کے کہ آدمی چلتے پھرتے ذکر کرے، جگہ اور وقت مقرر کرنے میں زیادہ فائدہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس ذکر کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس زمان و مکان کو ذکر اللہ کے نور سے منور کردیتے ہیں۔

کائنات کی ہر چیز کا ذکر کرنا

قرآن کریم میں ہے:

﴿إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ﴾(۲)

یعنی جب حضرت داؤد علیہ السلام ذکر کرتے تھے تو ان کے ساتھ پہاڑ بھی ذکر کرتے تھے، اور پرندے بھی ذکر کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو انعام کے طور پر ذکر فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام پر ہمارا یہ انعام تھا جب وہ ذکر کرتے تو ان کے ساتھ پہاڑ بھی ذکر و تسبیح کیا کرتے تھے۔

ذکر میں دلجمعی پیدا ہوتی ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پہاڑ ذکر و تسبیح کرتے تھے تو حضرت داؤد علیہ السلام پر کیا احسان اور انعام ہوا؟ اگر وہ تسبیح کررہے ہیں تو کرنے دو، ان کا حضرت داؤد علیہ السلام سے کیا تعلق؟ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ پہاڑوں کا ذکر کرنا حضرت داؤد علیہ السلام پر انعام اس طرح ہے کہ جب ذاکر ذکر کرتا ہے، اور اس کے ساتھ کائنات کے دوسرے عناصر بھی ذکر کرنے میں مشغول ہوتے ہیں تو اس کے ذکر میں دلجمعی اور لطف زیادہ پیدا ہوتا ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل، رقم: ۵۹۸۳، صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب فضیلة العمل الدائم من قیام اللیل وغیره، رقم: ۱۳۰۵، سنن النسائی، کتاب القبلة، باب المصلی یکون بینه وبین الإمام سترة، رقم: ۷۵٤، مسند أحمد، رقم: ۲٤۱۵۳

(۲) ص: ۱۸

ذکر کے وقت یہ تصور کیا کرو

اسی وجہ سے صوفیاء کرام نے ذکر کا ایک طریقہ ایسا تجویز فرمایا ہے جس میں ذاکر ذکر کرتے وقت یہ تصور کرتا ہے کہ میرے ساتھ پوری کائنات ذکر کررہی ہے، یہ چاند بھی ذکر کررہا ہے، یہ سورج بھی ذکر کررہا ہے، یہ آسمان بھی ذکر کررہا ہے، یہ پہاڑ وغیرہ سب میرے ساتھ ذکر کررہے ہیں، اس تصور کا بڑا عظیم فائدہ خود ذاکر کو محسوس ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جب آدمی ذکر کے لئے کوئی جگہ اور وقت مقرر کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذکر سے اس جگہ اور وقت کو منور فرمادیتے ہیں، اور اب وہ وقت اور جگہ بھی اس کے ساتھ ذکر میں شریک ہوجاتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے ذکر کی برکت کا انعکاس ایک دوسرے پر ہوتا ہے، اس لئے ایک جگہ اور ایک وقت مقرر کرکے ذکر کرنے میں زیادہ فائدہ ہے، اگرچہ تھوڑی دیر کے لئے کرو، مگر پابندی سے کرو۔

خلاصہ

بہرحال، کثرتِ ذکر کا چوتھا طریقہ یہ ہے کہ تھوڑا سا وقت مقرر کرکے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو، اگر یہ کام کرلیا تو انشاء اللہ کثرتِ ذکر کا مقصود حاصل ہوگا، اور اس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کے ساتھ محبت پیدا ہوگی، اور تعلق مضبوط ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

ہر کام سے پہلے ''بسم اللہ''☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((كُلُّ أَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيْهِ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ أَقْطَعُ))(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! پچھلے جمعہ کو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے بارے میں کچھ گزارشات عرض کی تھیں۔ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر کوئی اہم کام جو اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع نہ کیا جائے، وہ ادھورا اور ناقص ہے۔ اس حدیث کے ذریعہ حضور اقدس ﷺ نے ہر مسلمان کو یہ تلقین فرمائی کہ اپنی زندگی کا ہر اہم کام اللہ کے نام سے شروع کرے۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ایک ایسا کلمہ ہے جو ہمیں ہر کام سے پہلے پڑھنے کا حکم دیا گیا، صبح کو بستر سے بیدار ہوتے وقت، غسل خانے میں جاتے وقت، غسل خانے سے نکلتے وقت، کھانا کھانے سے پہلے، پانی پینے سے پہلے، بازار میں جانے سے پہلے، مسجد میں داخل ہونے سے پہلے، مسجد سے باہر نکلتے وقت، کپڑے پہنتے وقت، گاڑی چلاتے وقت، سوار ہوتے وقت، سواری سے اُترتے وقت، گھر میں داخل ہوتے وقت، تمام اوقات میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کا کلمہ ہم سے کہلوایا جا رہا ہے۔

ہر کام کے پیچھے نظامِ ربوبیت

جیسا کہ پچھلے جمعہ عرض کیا تھا کہ یہ کوئی منتر نہیں ہے جو ہم سے پڑھوایا جا رہا ہو، بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم الشان فلسفہ ہے اور ایک عظیم الشان حقیقت کی طرف اس کے ذریعہ متوجہ کیا جا رہا ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/ ۸۵ تا ۱۰۰) قبل از نمازِ جمعہ، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی اہمیت پر ایک اثر انگیز بیان ''اصلاحی مواعظ'' مطبوعہ بیت العلوم کی جلد سوم کے صفحہ ۲۶ تا ۴۶ پر بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کنز العمال، رقم: ۲۴۹۱

وہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا جو بھی کام انسان کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں، دیکھنے میں چاہے یہ نظر آرہا ہو کہ جو کام میں کر رہا ہوں وہ میری کوشش اور محنت کا نتیجہ ہے، لیکن اگر انسان گہری نظر سے دیکھے تو اس کو اپنی کوشش اور محنت کا عمل دخل اس میں بہت تھوڑا نظر آئے گا اور اس کے پیچھے اللہ جل شانہ کا بنایا ہوا عظیم الشان نظامِ ربوبیت کام کرتا نظر آئے گا۔

ایک گلاس پانی پر نظامِ ربوبیت کارفرما ہے

مثال کے طور پر دیکھئے! ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب پانی پیو تو پانی پینے سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھو۔ دیکھنے میں تو یہ نظر آتا ہے کہ پانی پینا معمولی بات ہے۔ گھر میں پانی مہیا کرنے کے لئے ہم نے پائپ لائن لے رکھی ہے اور پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کولر اور فرج موجود ہے، چنانچہ آپ نے فرج سے ٹھنڈا پانی نکالا اور گلاس میں بھرا اور پی لیا۔ اب بظاہر یہ نظر آرہا ہے کہ اس ٹھنڈے پانی کا حصول ہماری اپنی محنت اور کوشش اور پیسہ خرچ کرنے کا نتیجہ ہے، لیکن یہ خیال بہت کم لوگوں کو آتا ہے کہ یہ ایک گلاس ٹھنڈا پانی جو ہم نے ایک لمحے میں حلق سے نیچے اُتارلیا، اس پانی کو ہمارے حلق تک پہنچانے کے لئے اللہ جل شانہ کی نظامِ ربوبیت کا عظیم کارخانہ کس طرح کام کر رہا ہے۔

زندگی پانی پر موقوف ہے

دیکھئے! پانی ایسی چیز ہے کہ اس پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (۱)

یعنی ہم نے ہر جاندار کو پانی ہی سے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا پانی صرف انسان کا ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کا اصل مبدأ بھی ہے اور اس کی زندگی کا دارومدار بھی اسی پر ہے، اسی لئے اللہ جل شانہ نے اس کائنات میں پانی اتنی وافر مقدار میں پیدا فرمایا کہ اگر اس روئے زمین پر ایک تہائی خشکی ہے تو دو تہائی سمندر کی شکل میں پانی ہے، اور اس سمندر میں بھی بے شمار مخلوقات کا جہان آباد ہے جو ہر روز پیدا ہو رہے ہیں اور مر رہے ہیں، اگر سمندر کا یہ پانی میٹھا ہوتا تو جو جانور اس پانی میں مر کر سڑتے ہیں، ان کی وجہ سے وہ پانی خراب ہو جاتا، اس لئے اللہ جل جلالہ کی حکمتِ بالغہ نے اس پانی کو کھارا اور نمکین بلکہ کڑوا بنایا، تاکہ اس کے نمکین اجزاء اس پانی کو خراب ہونے اور سڑنے سے محفوظ رکھیں۔

---

(۱) الأنبياء: ۳۰

پانی صرف سمندر میں ہوتا تو کیا ہوتا؟

پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرمادیتے کہ ہم نے تمہارے لئے سمندر کی شکل میں پانی پیدا کردیا ہے اور اس کو خراب ہونے اور سڑنے سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے اندر نمکیات بھی پیدا کردی ہیں، اب تم جانو تمہارا کام جانے، تمہیں اگر پانی کی ضرورت ہو تو جاکر سمندر سے پانی بھرو اور اس کو میٹھا کرو اور پیو اور اس کو اپنے استعمال میں لاؤ۔ اگر یہ حکم دیدیا جاتا تو کیا کسی انسان کے بس میں تھا کہ وہ سمندر سے پانی لے کر آئے اور اس سے اپنی ضروریات پوری کرے؟ چلیں! اگر سمندر سے پانی لے بھی آئے تو پھر اس کو میٹھا کیسے کرے؟

پانی کو میٹھا کرنے اور سپلائی کرنے کا خدائی نظام

سعودی عرب میں سمندر کے پانی کو میٹھا کرنے کے لئے ایک زبردست پلانٹ کروڑوں اور اربوں روپے کے خرچ سے نصب کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے جگہ جگہ یہ اعلان لگایا گیا ہے کہ اس پانی کو میٹھا کرنے کے لئے بہت بڑی رقم خرچ ہوئی ہے، اس لئے اس کو احتیاط سے استعمال کیا جائے۔ لیکن اللہ جل شانہ نے انسان کی خاطر سمندر کا پانی میٹھا کرنے کے لئے یہ نظام بنایا کہ سمندر سے ''مون سون'' کے بادل اُٹھائے اور اس بادل میں ایسا خودکار پلانٹ نصب کردیا کہ وہ پانی جو سمندر کے اندر کڑوا اور کھارا تھا، جب وہ بادل کی شکل میں اُوپر اُٹھتا ہے تو اس کی کڑواہٹ دور ہو جاتی ہے اور وہ پانی میٹھا بن جاتا ہے، اور پھر وہ لوگ جو سمندر سے ہزاروں میل دور آباد ہیں اور ان کے لئے سمندر سے پانی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے، ان لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے بادلوں کی شکل میں مفت ''کارگوسروس'' مہیا فرمادی۔

بادل ''مفت کارگوسروس'' مہیا کرتے ہیں

پچھلے دنوں میں ناروے گیا، وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ چونکہ یہاں کا پانی بہت اچھا اور صحت بخش سمجھا جاتا ہے، لہٰذا بہت سے ممالک یہ پانی یہاں سے امپورٹ کرتے ہیں، چنانچہ وہ پانی بڑے بڑے کنٹینروں میں پانی کے جہازوں کے ذریعہ دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے، اس کے نتیجے میں ایک لیٹر پانی پر ایک ڈالر خرچ آتا ہے جو ہمارے حساب سے ۶۲/ روپے بنتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ساری انسانیت کے لئے، اس میں مسلمان اور کافر کی بھی قید نہیں، بادلوں کی شکل میں یہ کارگوسروس مفت مہیا کردی ہے، یہ بادل سمندر سے پانی اُٹھا کر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لے

جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام بنادیا کہ روئے زمین کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جو اس "کارگو سروس" سے فیض یاب نہ ہوتا ہو، بادل آتے ہیں، گرجتے ہیں، پانی برساتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

پانی کی ذخیرہ اندوزی ہمارے بس میں نہیں

جب بادلوں کے ذریعہ ہمارے گھر تک پانی پہنچادیا تو اب اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ ہم نے تو تمہارے گھر تک پانی پہنچادیا، اب تم خود ذخیرہ کر کے سال بھر کا پانی جمع کرلو اور حوض اور ٹنکیاں بنا کر اس کے اندر محفوظ رکھو، کیا انسان کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ بارش کے موقع پر سال بھر کے لئے پانی کا ذخیرہ کرلیتا؟ کیا انسان کے پاس ایسا اسٹوریج نظام ہے کہ سال بھر کا پانی اس کے اندر جمع کرلے اور پھر پورے سال اس میں سے پانی لے لے کر استعمال کیا کرے۔ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ اس کمزور اور ضعیف انسان کے بس میں یہ بھی نہیں ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بارش کو جتنا تم جمع کرسکتے ہو اور استعمال کرسکتے ہو کرلو، باقی سارے سال کے لئے ذخیرہ کرنے کی ذمہ داری بھی ہم ہی لیتے ہیں۔

یہ برفانی پہاڑ کولڈ اسٹوریج ہیں

چنانچہ ان بادلوں کا پانی پہاڑوں پر برسایا اور ان پہاڑوں کو اس پانی کے لئے "کولڈ اسٹوریج" بنادیا اور ان پہاڑوں پر وہ پانی برف کی شکل میں محفوظ کردیا اور اتنی بلندی پر اس پانی کو محفوظ کردیا کہ کوئی خراب کرنے والا اس پانی کو خراب کرنے کے لئے وہاں تک نہ پہنچ سکے اور اتنے ٹمپریچر پر رکھا کہ وہاں سے پگھل بھی نہ سکے۔ یہ بلند پہاڑ ایک طرف انسان کو خوشنما نظارہ مہیا کررہے ہیں اور دوسری طرف انسان کے لئے زندگی بھر کے لئے پانی کے ذخیرہ کو محفوظ کررہے ہیں۔

دریاؤں اور ندیوں کے ذریعہ پانی کی فراہمی

اگر اس مرحلے پر انسان سے یہ کہہ دیا جاتا کہ ہم نے تمہارے لئے پہاڑوں پر پانی کا ذخیرہ جمع کردیا ہے، اب جس کو ضرورت ہو وہاں سے جا کر لے آیا کرے۔ کیا انسان کے لئے یہ ممکن تھا کہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں سے اس برف کو پگھلا کر اس پانی کو اپنی ضرورت میں استعمال کرے؟ یہ بھی انسان کے بس میں نہیں تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ذمہ داری بھی ہم ہی پوری کرلیتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورج کو حکم دیا کہ تم اپنی کرنیں اس برف پر ڈالو اور اس برف کو پگھلاؤ، اور پھر اس پانی کے لئے دریاؤں اور ندیوں کی شکل میں راستے بھی اللہ پاک نے بنادیئے، چنانچہ وہ برف پانی کی

شکل میں پہاڑوں سے نیچے اُترتا ہے اور دریاؤں اور ندیوں کی شکل میں بہتا ہوا پوری دنیا کے اندر سپلائی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تہہ میں پانی کی سوتیں اور رگیں اس طرح بچھا دیں جس طرح پائپ لائنیں بچھائی جاتی ہیں، اب تم دنیا کے جس خطے میں چاہو زمین کھودو اور پانی برآمد کرلو۔

یہ پانی اللہ تعالیٰ نے پہنچایا ہے

بس انسان کا صرف اتنا کام ہے کہ جو پانی اللہ تعالیٰ نے سمندر سے اُٹھا کر پہاڑوں پر برسایا اور پھر پہاڑوں سے پگھلا کر زمین کے ایک ایک گوشے میں پہنچایا ہے، اس پانی کو ذرا سی محنت کر کے اپنے گھر تک لے آئے۔ لہٰذا جو پانی تم اپنے حلق سے اُتار رہے ہو، اگر غور کرو تو یہ نظر آئے گا کہ اس تھوڑے سے پانی پر کائنات کی ساری طاقتیں صرف ہوئی ہیں، تب جا کر یہ پانی تمہارے منہ تک پہنچا۔ اس لئے یہ جو کہا جا رہا ہے کہ پانی پیتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لو اور ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھو، اس کے ذریعہ انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارے حلق تک اس پانی کا پہنچنا تمہارے زور بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے جس کے ذریعہ انسان اس پانی سے سیراب ہو رہا ہے۔

جسم کے ہر ہر عضو کو پانی کی ضرورت ہے

پھر ہم نے گلاس میں پانی بھرا اور اس کو حلق سے نیچے اُتار لیا، اب آگے کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم کہ وہ پانی کہاں جا رہا ہے اور جسم کے کس حصے کو کیا فائدہ پہنچا رہا ہے؟ اس غریب انسان کو اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں، بس وہ تو اتنا جانتا ہے کہ مجھے پیاس لگی تھی، پانی پیا وہ پیاس بجھ گئی، اس کو یہ معلوم نہیں کہ وہ پیاس کیوں لگی تھی؟ اور پیاس لگنے کے بعد جب پانی پیا تو اس پانی کا انجام کیا ہوا؟ اس کو کچھ نہیں معلوم۔ ارے تمہیں پیاس اس لئے لگی تھی کہ تمہارے جسم کے ایک ایک عضو کو پانی کی ضرورت تھی، صرف منہ کو اور حلق کو ہی ضرورت نہیں تھی، بلکہ جسم کے تمام اعضاء کو پانی کی ضرورت تھی۔ اگر جسم میں پانی نہ ہو تو انسان کی موت واقع ہو جائے۔ ذرا کسی کو دست لگ جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں جسم کے اندر پانی کی کمی ہو جاتی ہے تو اس وقت کمزوری کی وجہ سے انسان کے لئے چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ضرورت سے زائد پانی نقصان دہ ہے

لہٰذا ایک طرف تو انسان کے جسم کے ہر ہر عضو کو پانی کی ضرورت ہے، اس لئے انسان کو پیاس لگتی ہے اور وہ پانی پیتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پانی جسم کے اندر ضرورت سے زیادہ نہ ہو جائے، کیونکہ اگر ضرورت سے زیادہ پانی جسم کے اندر جمع ہو جائے تو جسم پر ورم آ جاتا ہے اور سوج جاتا ہے، یا یہ پانی اگر جسم کے اندر کسی ایسی جگہ پر رک جائے جہاں رکنا نہیں چاہئے تو اس کے نتیجے میں بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، مثلاً اگر وہ پانی پھیپھڑوں میں رک جائے تو انسان کو ٹی بی ہو جاتی ہے، پسلیوں میں پانی رک جائے تو دمہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر ضرورت سے زیادہ پانی جمع ہو جائے تو وہ بھی انسان کے لئے خطرہ ہے، اور اگر پانی کم ہو جائے یا ختم ہو جائے تو بھی انسان کے لئے خطرہ ہے، انسان کے جسم کے اندر پانی ایک خاص حد تک رہنا ضروری ہے۔

جسم میں خود کار میٹر نصب ہے

پانی کی وہ حد کیا ہے؟ ایک انسان جو اَن پڑھ ہے، جس کو ایک حرف پڑھنا نہیں آتا، وہ کیسے پہچانے کہ کتنا پانی میرے جسم میں ہونا چاہئے اور کتنا نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے جسم میں ایک خود کار میٹر نصب کر دیا ہے۔ جس وقت انسان کے جسم کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو پیاس لگ جاتی ہے۔ پیاس کیوں لگ رہی ہے؟ اس وجہ سے نہیں لگ رہی ہے کہ حلق خشک ہے اور ہونٹ خشک ہیں، بلکہ اس وجہ سے لگ رہی ہے کہ تمہارے جسم کو پانی کی ضرورت ہے، انسان کو اس ضرورت کا احساس دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیاس کو پیدا کر دیا۔ ایک بچہ جو کچھ نہیں جانتا، لیکن یہ ضرور جانتا ہے کہ مجھے پیاس لگ رہی ہے، اس کو بجھانا چاہئے۔

جسم کے اندر پانی کیا کام کر رہا ہے؟

پھر جسم کے اندر پہنچنے کے بعد وہ پانی جسم کے اندر کی پائپ لائن کے ذریعہ ان تمام مقامات تک پہنچ رہا ہے جہاں اس کی ضرورت ہے، اور جو پانی ضرورت سے زائد ہے، وہ جسم کی صفائی کرنے کے بعد پیشاب کے ذریعہ باہر آ جاتا ہے، تا کہ وہ گندا پانی جسم کے اندر باقی نہ رہے۔

ہم اور آپ ایک لمحہ کے اندر پانی پی لیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ وہ پانی کہاں سے آیا تھا اور کس طرح ہمارے منہ تک پہنچا اور نہ یہ سوچا کہ اندر جانے کے بعد اس کا کیا انجام ہونے والا ہے اور کون اس پانی کی نگرانی کر رہا ہے؟ لہٰذا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کا کلمہ درحقیقت ہمیں ان سارے

حقائق کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

ہارون رشید کا ایک واقعہ

ہارون رشید ایک مرتبہ اپنے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے، پینے کے لئے پانی منگوایا، قریب میں مجذوب صفت بزرگ حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے تھے، جب ہارون رشید پانی پینے لگے تو انہوں نے ہارون رشید سے کہا کہ امیر المؤمنین! ذرا ایک منٹ کے لئے رک جائیں، وہ رک گئے اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ امیر المؤمنین! میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ آپ کو اس وقت پیاس لگ رہی ہے اور پانی کا گلاس آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ بتائیں کہ اگر آپ کو ایسی ہی پیاس لگ رہی ہو اور آپ کسی صحراء یا جنگل میں ہوں اور وہاں پانی موجود نہ ہو اور پیاس شدت کی لگ رہی ہو، تو آپ ایک گلاس پانی حاصل کرنے کے لئے کتنی دولت خرچ کر دیں گے؟ ہارون رشید نے جواب دیا کہ اگر شدید پیاس کے عالم میں پانی نہ ملے تو چونکہ پانی نہ ملنے کی صورت میں موت ہے، تو اپنی جان بچانے کے لئے میرے پاس جتنی دولت ہوگی، خرچ کر دوں گا تاکہ جان بچ جائے۔ یہ جواب سننے کے بعد حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب آپ ''بسم اللہ'' پڑھ کر پانی پی لیجئے۔

پوری سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی سے بھی کم ہے

جب بادشاہ پانی پی چکے تو حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! میں ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا سوال ہے؟ بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سوال یہ ہے کہ یہ پانی جو آپ نے ابھی پیا ہے، اگر یہ پانی آپ کے جسم کے اندر ہی رہ جائے اور باہر نہ نکلے اور پیشاب بند ہو جائے، اب مثانے کے اندر پیشاب بھرا ہوا ہے اور باہر نکالنے کی کوئی صورت نہیں تو اس کو باہر نکالنے کے لئے کتنی دولت خرچ کر دیں گے؟ ہارون رشید نے جواب دیا کہ اگر پیشاب نہ آئے بلکہ پیشاب آنا بند ہو جائے اور مثانہ پیشاب سے بھر جائے تو یہ صورت بھی ناقابلِ برداشت ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اس کے علاج کے لئے جتنی دولت مانگے گا، میں اس کو دے دوں گا، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص پوری سلطنت بھی مانگے گا تو میں دے دوں گا۔ بہلول رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! اس کے ذریعہ میں یہ حقیقت بتانا چاہتا تھا کہ آپ کی پوری سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی پینے اور اس کو باہر نکالنے کے برابر بھی نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو سارا نظام مفت میں دے رکھا ہے، مفت میں پانی مل رہا ہے اور مفت میں خارج ہو رہا ہے، اس کے خارج کرنے کے لئے کوئی قیمت اور کوئی پریشانی اُٹھانی نہیں پڑتی۔

''بسم اللہ'' کے ذریعہ اعترافِ بندگی

بہرحال! اللہ جل شانہ نے ہر انسان کو یہ نظام مفت میں دے رکھا ہے، کیونکہ اس نے نہ کوئی پیسہ خرچ کیا اور نہ ہی محنت اُٹھائی۔ اس لئے یہ جو حکم دیا جارہا ہے کہ پانی پینے سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھو، اس کے ذریعہ اس طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نظامِ ربوبیت کا کرشمہ ہے اور اس کے ذریعہ یہ اعتراف بھی ہورہا ہے کہ یا اللہ! ہمارے بس میں یہ نہیں تھا کہ ہم یہ پانی پی سکتے، اگر آپ کا بنایا ہوا یہ کارخانۂ ربوبیت نہ ہوتا تو ہم تک یہ پانی کیسے پہنچتا، آپ نے محض اپنے فضل و کرم سے ہم تک یہ پانی پہنچایا، اور جب یہ پانی آپ نے ہی پہنچایا ہے تو اے اللہ! ہم آپ ہی سے یہ درخواست اور دعا کرتے ہیں کہ جو پانی ہم پی رہے ہیں، یہ پانی جسم کے اندر جانے کے بعد خیر کا سبب بنے اور کوئی فساد نہ پھیلائے، کیونکہ اگر اس پانی میں بیماریاں اور خرابیاں ہوں گی تو یہ پانی جسم میں فساد مچائے گا، اسی طرح اگر جسم کے اندر کے نظام میں خرابی پیدا ہوجائے، مثلاً جگر اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو وہ پانی جسم کے اندر تو جائے گا لیکن اس پانی کو صاف کرنے کا اور گندگی کو باہر پھینکنے کا جو نظام ہے وہ خراب ہوجائے گا، اس لئے ہم پانی پیتے وقت دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! اس پانی کا انجام بھی بخیر فرمادے۔

انسانی گردے کی قیمت

کراچی میں گردے کے ایک اسپیشلسٹ ہیں، ان سے ایک مرتبہ میرے بھائی صاحب نے پوچھا کہ آپ انسانی گردہ ایک انسان کے جسم سے نکال کر دوسرے انسان کے جسم میں منتقل کر دیتے ہیں، لیکن اب تو سائنس نے بڑی ترقی کرلی ہے تو کوئی مصنوعی گردہ کیوں نہیں بنالیا جاتا، تاکہ دوسرے انسان کے گردے کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے؟ وہ ہنس کر جواب دینے لگے کہ اول تو سائنس کی اس ترقی کے باوجود مصنوعی گردہ بنانا بڑا مشکل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گردے کے اندر جو چھلنی لگائی ہے، وہ اتنی لطیف اور باریک ہے کہ ابھی کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو اتنی لطیف چھلنی بنا سکے، اگر بالفرض ایسی مشین ایجاد بھی کرلی جائے جو ایسی چھلنی بنا سکے تو اس کی تیاری پر اربوں روپے خرچ ہوں گے، اور اگر اربوں روپے خرچ کر کے ایسی چھلنی بنا بھی لی جائے تب بھی گردے کے اندر ایک چیز ایسی ہے جس کو بنانا ہماری قدرت سے باہر ہے، وہ یہ کہ گردے کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک دماغ بنایا ہے جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس آدمی کے جسم میں کتنا پانی رکھنا چاہئے اور کتنا پانی باہر پھینکنا چاہئے۔ ہر انسان کا گردہ اس انسان کے حالات کے مطابق، اس کی جسامت کے مطابق اور اس کے

وزن کے مطابق یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کتنا پانی اس کے جسم میں رہنا چاہئے اور کتنا پانی باہر پھینکنا چاہئے، اور اس کا یہ فیصلہ سو فیصد درست ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں وہ اتنا پانی جسم میں روکتا ہے جتنے پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور ضرورت سے زائد پانی کو پیشاب کی شکل میں باہر پھینک دیتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم اربوں روپیہ خرچ کرکے ربر کا مصنوعی گردہ بنا بھی لیں، تب بھی ہم اس میں دماغ نہیں بنا سکتے جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے گردے میں پیدا فرمایا ہے۔

جسم کے اندر کارخانۂ ربوبیت

قرآن کریم بار بار اس طرف توجہ دلا رہا ہے:

﴿وَفِیٓ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ﴾(۱)

تم اپنی جانوں میں غور کیا کرو کہ تمہارے جسم میں ہماری قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا کیا کارخانہ کام کر رہا ہے، اس پر کبھی کبھی غور کیا کرو۔ اور اس گردے کا انجام بھی اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے کہ کب تک یہ گردہ کام کرے اور کب یہ کام کرنا بند کردے۔ لہٰذا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کا یہ پیغام ہے کہ ایک طرف یہ یاد کرو کہ یہ پانی تمہارے پاس کیسے پہنچا اور دوسری طرف یہ خیال کرو کہ یہ پانی تمہارے جسم کے اندر جاکر فساد نہ پھیلائے بلکہ یہ پانی صحت اور برکت کا سبب بنے، اور اس بسم اللہ کے پڑھنے میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا اعتراف ہے اور دوسری طرف یہ دعا اور درخواست ہے کہ ہم اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے دعا اور درخواست کر رہے ہیں کہ یا اللہ! ہم یہ پانی پی تو رہے ہیں لیکن یا اللہ! یہ پانی اندر جاکر کہیں فساد کا سبب نہ بن جائے، بلکہ یہ پانی صحت اور صلاح و فلاح کا سبب بنے۔ پانی پینے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کا یہ فلسفہ ہے، لہٰذا پانی پیتے وقت اس فلسفہ کو سامنے رکھو پھر دیکھو کہ پانی پینے میں کیا لطف ہے اور کیا برکت ہے اور اس طرح پانی پینے کو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے عبادت بھی بنا دیں گے اور اس پر اجر و ثواب بھی عطا فرمائیں گے۔

محبت اور خشیت کے حصول کا ذریعہ

اور جب پانی پیتے وقت یہ فلسفہ سامنے رکھو گے تو کیا اس کے نتیجہ میں اس ذات سے محبت پیدا نہیں ہوگی؟ جب تم اس تصور کے ساتھ پانی پیو گے تو یہ چیز تمہارے دل میں اللہ جل شانہ کی محبت میں اضافہ کرے گی اور اللہ تعالیٰ کی عظمت میں اضافہ کرے گی اور اس محبت کے نتیجے میں تمہارے دل میں خشیت پیدا ہوگی اور پھر یہ خشیت تمہیں گناہوں سے بھی روک دے گی۔

(۱) الذاریات: ۲۱

کافر اور مسلمان کے پانی پینے میں فرق

ایک کافر بھی پانی پیتا ہے، لیکن وہ غفلت کی حالت میں پانی پیتا ہے، اپنے خالق اور مالک کو یاد نہیں کرتا، ایک مومن بھی پانی پیتا ہے، لیکن اس تصور اور دھیان کے ساتھ پیتا ہے، اگرچہ پانی کی نعمت اللہ تعالیٰ نے کافر کو بھی دے رکھی ہے اور مومن کو بھی دے رکھی ہے، لیکن ایک ایسے شخص کے پانی پینے کی کیفیت میں جو ناشکرا ہے اور ایک ایسے شخص کے پانی پینے میں جو شکر گزار ہے، ان دونوں میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے، وہ فرق یہ ہے کہ مومن کو چاہئے کہ وہ دھیان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے پانی پیئے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس اور اعتراف کرتے ہوئے پانی پیئے اور برکت کی دعا کرتے ہوئے پانی پیئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان حقائق کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

صلوۃ الحاجۃ، پریشانیوں کا علاج☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((مَنْ كَانَتْ لَهُ اِلَی اللّٰهِ حَاجَةٌ اَوْ اِلٰی اَحَدٍ مِّنْ بَنِیْ آدَمَ فَلْيَتَوَضَّأْ وَلْيُحْسِنِ الْوُضُوْءَ ثُمَّ لِيُصَلِّ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ لِيُثْنِ عَلَی اللّٰهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی وَلْيُصَلِّ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ لِيَقُلْ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، اَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ لَا تَدَعْ لِیْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهُ، وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهُ وَلَاحَاجَةً هِیَ لَكَ رِضًی اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ)) (۱)

یہ حدیث حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فقہاء صحابہ میں سے ہیں۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو اللہ تعالیٰ سے کوئی ضرورت پیش آئے یا کسی آدمی سے کوئی کام پیش آجائے تو اس کو چاہئے کہ وہ وضو کرے اور اچھی طرح سنت کے مطابق تمام آداب کے ساتھ وضو کرے، پھر دو رکعتیں پڑھے اور پھر دو رکعت پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرے اور پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور پھر دعا کے یہ کلمات کہے۔ (کلمات اُوپر حدیث میں موجود ہیں)

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس نماز کا طریقہ بیان فرمایا ہے جس کو عرفِ عام میں ''صلوۃ الحاجۃ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی ''نمازِ حاجت'' جب بھی کسی شخص کو کوئی ضرورت پیش آئے یا کوئی

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/۲۶ تا ۵۷) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، كتاب الصلاة، باب ما جاء فی صلاة الحاجة، رقم: ٤٤١، سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ما جاء فی صلاة الحاجة، رقم: ١٣٧٤

پریشانی لاحق ہو جائے یا کوئی کام کرنا چاہتا ہو لیکن وہ کام ہوتا نظر نہ آ رہا ہو یا اس کام کے ہونے میں رکاوٹیں ہوں تو اس صورت میں نبی کریم ﷺ نے ایک مسلمان کو یہ تلقین فرمائی کہ وہ ''نمازِ حاجت'' پڑھے، اور نمازِ حاجت پڑھنے کے بعد ''دعائے حاجت'' پڑھے، اور پھر اپنا جو مقصد ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں پیش کرے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ اُمید ہے کہ اگر اس کام میں خیر ہوگی تو انشاء اللہ وہ کام ضرور انجام پا جائے گا۔ لہٰذا حضورِ اقدس ﷺ کی سنت یہ ہے کہ ضرورت کے وقت نمازِ حاجت پڑھی جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

ایک مسلمان اور کافر میں فرق

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان کو جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ ظاہری اسباب اور دنیاوی اسباب تو اختیار کرتا ہے اور شرعاً ان اسباب کو اختیار کرنے کی اجازت بھی ہے، لیکن ایک مسلمان اور ایک کافر کے درمیان یہی فرق ہے کہ جب ایک کافر دنیا کے ظاہری اسباب اختیار کرتا ہے تو وہ انہی اسباب پر بھروسہ کرتا ہے کہ جو اسباب میں اختیار کر رہا ہوں، انہی اسباب کے ذریعہ میرا کام بن جائے گا۔

ملازمت کے لئے کوشش

مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص بے روزگار ہے اور اس بات کے لئے کوشش کر رہا ہے کہ مجھے اچھی ملازمت مل جائے، اب ملازمت حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ جگہیں تلاش کرے، اور جہاں کہیں ملازمت ملنے کا امکان ہو وہاں درخواست دے، اور اگر کوئی جاننے والا ہے تو اس سے اپنے حق میں سفارش کروائے وغیرہ۔ یہ سب ظاہری اسباب ہیں۔ اب ایک کافر سارا بھروسہ انہی ظاہری اسباب پر کرتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ درخواست ٹھیک طریقے سے لکھ دوں، سفارش اچھی کرادوں اور تمام ظاہری اسباب اختیار کرلوں اور بس۔ اس کی پوری نگاہ اور پورا بھروسہ انہی اسباب پر ہے۔ یہ کام کافر کا ہے۔

اور مسلمان کا کام یہ ہے کہ اسباب تو وہ بھی اختیار کرتا ہے، درخواست وہ بھی دیتا ہے، اور اگر سفارش کی ضرورت ہے تو جائز طریقے سے وہ سفارش بھی کراتا ہے، لیکن اس کی نگاہ ان اسباب پر نہیں ہوتی، وہ جانتا ہے کہ نہ یہ درخواست کچھ کرسکتی ہے اور نہ یہ سفارش کچھ کرسکتی ہے، کسی مخلوق کی قدرت اور اختیار میں کوئی چیز نہیں، ان اسباب کے اندر تاثیر پیدا کرنے والی ذات اللہ جل جلالہ کی ذات ہے، وہ مسلمان تمام اسباب اختیار کرنے کے بعد اسی ذات سے مانگتا ہے کہ یا اللہ! ان اسباب کو اختیار کرنا آپ کا حکم تھا، میں نے یہ اسباب اختیار کرلیے، لیکن ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والے آپ ہیں،

میں آپ ہی سے مانگتا ہوں کہ آپ میری یہ مراد پوری فرما دیجئے۔

بیمار آدمی کی تدابیر

مثلاً ایک شخص بیمار ہوگیا، اب ظاہری اسباب یہ ہیں کہ وہ ڈاکٹر کے پاس جائے اور جو دوا وہ تجویز کرے وہ دوا استعمال کرے، جو تدبیر وہ بتائے وہ تدبیر اختیار کرے، یہ سب ظاہری اسباب ہیں۔ لیکن ایک کافر شخص جس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں ہے، وہ سارا بھروسہ ان دواؤں اور تدبیروں پر کرے گا، ڈاکٹر پر کرے گا، البتہ ایک مؤمن بندے کو حضور اقدس ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ تم دوا اور تدبیر ضرور کرو، لیکن تمہارا بھروسہ ان دواؤں اور تدبیروں پر نہ ہونا چاہئے بلکہ تمہارا بھروسہ اللہ جل شانہ کی ذات پر ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ کی ذات شفا دینے والی ہے۔ اگر وہ ذات ان دواؤں اور تدبیروں میں تاثیر نہ ڈالیں تو پھر ان دواؤں اور تدبیروں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ ایک ہی دوا، ایک ہی بیماری میں ایک انسان کو فائدہ پہنچا رہی ہے، لیکن وہی دوا اسی بیماری میں دوسرے انسان کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ اس لئے کہ درحقیقت دوا میں تاثیر پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو مٹی کی ایک چٹکی میں تاثیر عطا فرما دیں، اگر وہ تاثیر عطا نہ فرمائیں تو بڑی سے بڑی دوا اور مہنگی سے مہنگی دوا میں تاثیر عطا نہ فرمائیں۔

لہٰذا حضور اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ اسباب ضرور اختیار کرو لیکن تمہارا بھروسہ ان اسباب پر نہ ہونا چاہئے، بلکہ بھروسہ اللہ جل شانہ کی ذات پر ہونا چاہئے، اور ان اسباب کو اختیار کرنے کے بعد یہ دعا کرو کہ یا اللہ! جو کچھ میرے بس میں تھا اور جو ظاہری تدابیر اختیار کرنا میرے اختیار میں تھا وہ میں نے کرلیا، لیکن یا اللہ! ان تدابیر میں تاثیر پیدا کرنے والے آپ ہیں، ان تدابیر کو کامیاب بنانے والے آپ ہیں، آپ ہی ان میں تاثیر عطا فرمائیے اور آپ ہی ان کو کامیاب بنائیے۔

تدبیر کے ساتھ دعا

حضور اقدس ﷺ سے دعا کا ایک عجیب اور خوبصورت جملہ منقول ہے کہ جب بھی آپ کسی کام کی کوئی تدبیر فرماتے، چاہے دعا کی ہی تدبیر فرماتے تو اس تدبیر کے بعد یہ جملہ ارشاد فرماتے:

((اَللّٰهُمَّ هٰذَا الْجُهْدُ وَعَلَيْكَ التُّكْلَانُ)) (۱)

”یا اللہ! میری طاقت میں جو کچھ تھا وہ میں نے اختیار کرلیا، لیکن بھروسہ آپ کی ذات پر ہے، آپ ہی اپنی رحمت سے اس مقصد کو پورا فرما دیجئے“

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰه، باب منه، رقم: ۳۳۴۱

زاویۂ نگاہ بدل دو

یہ وہ بات ہے جو ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ دین درحقیقت زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے، بس ذرا سا زاویۂ نگاہ بدل لو تو دین ہوگیا، اور اگر زاویۂ نگاہ نہ بدلو تو وہی دنیا ہے، مثلاً ہر مذہب یہ کہتا ہے کہ جب بیماری آئے تو علاج کرو، اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ بیمار ہونے پر علاج کرو، لیکن بس زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کا فرق ہے، وہ یہ کہ علاج ضرور کرو لیکن بھروسہ اس علاج پر مت کرو بلکہ بھروسہ اللہ جل جلالہ کی ذات پر کرو۔

''ھوالشافی'' نسخہ پر لکھنا

اسی وجہ سے اس زمانہ میں مسلمان اطباء کا یہ طریقہ تھا کہ جب وہ کسی مریض کا نسخہ لکھتے تو سب سے پہلے نسخہ کے اُوپر ''ھوالشافی'' لکھا کرتے تھے یعنی شفاء دینے والا اللہ ہے۔ یہ ''ھوالشافی'' لکھنا ایک اسلامی طریقۂ کار تھا۔ اس زمانے میں انسان کے ہر ہر نقل وحرکت اور ہر ہر قول وفعل میں اسلامی ذہنیت، اسلامی عقیدہ اور اسلامی تعلیمات منعکس ہوتی تھیں۔ ایک طبیب ہے جو علاج کر رہا ہے لیکن نسخہ لکھنے سے پہلے اس نے ''ھوالشافی'' لکھ دیا، یہ لکھ کر اس نے اس بات کا اعلان کر دیا کہ میں اس بیماری کا نسخہ تو لکھ رہا ہوں لیکن یہ نسخہ اس وقت تک کارآمد نہیں ہوگا جب تک وہ شفا دینے والا شفا نہیں دے گا۔ ایک مؤمن ڈاکٹر اور طبیب پہلے ہی قدم پر اس کا اعتراف کر لیتا تھا، اور جب ''ھوالشافی'' کا اعتراف کر کے نسخہ لکھتا تو اس کا نسخہ لکھنا بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کا ایک حصہ بن جاتا تھا۔

مغربی تہذیب کی لعنت کا اثر

لیکن جب سے ہمارے اُوپر مغربی تہذیب کی لعنت مسلط ہوئی ہے، اس وقت سے اس نے ہمارے اسلامی شعائر کا ملیامیٹ کر ڈالا۔ اب آج کل کے ڈاکٹر کو نسخہ لکھتے وقت نہ ''بسم اللہ'' لکھنے کی ضرورت ہے اور نہ ''ھوالشافی'' لکھنے کی ضرورت ہے، بس اس نے تو مریض کا معائنہ کیا اور نسخہ لکھنا شروع کر دیا، اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ سائنس ہمارے پاس ایسے کافروں کے واسطے سے پہنچی ہے جن کے دماغ میں اللہ تعالیٰ کے شافی ہونے کا کوئی تصور موجود نہیں۔ ان کا سارا بھروسہ اور اعتماد انہی اسباب اور انہی تدابیر پر ہے، اس لئے وہ صرف تدابیر اختیار کرتے ہیں۔

اسلامی شعائر کی حفاظت

اللہ تعالیٰ نے سائنس کو حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی، سائنس کسی قوم کی میراث نہیں ہوا کرتی، علم کسی قوم اور مذہب کی میراث نہیں ہوتی، مسلمان بھی سائنس ضرور حاصل کرے، لیکن اپنے اسلامی شعائر کو تو محفوظ رکھے اور اپنے دین و ایمان کی تو حفاظت کرے، اپنے عقیدہ کی کوئی جھلک تو اس کے اندر داخل کرے۔ یہ تو نہیں ہے کہ جو شخص ڈاکٹر بن گیا اس کے لئے "ھوالشافی" لکھنا حرام ہو گیا، اب اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے "شافی" ہونے کے عقیدے کا اعلان کرنا ناجائز ہو گیا، اور وہ ڈاکٹر یہ سوچنے لگے کہ اگر میں نے نسخہ کے اُوپر "ھوالشافی" لکھ دیا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ "بیک ورڈ" آدمی ہے، بہت پسماندہ ہے، اور یہ لکھنا تو ڈاکٹری کے اصول کے خلاف ہے۔ ارے بھائی! اگر تم ڈاکٹر ہو تو ایک مسلمان ڈاکٹر ہو، اللہ جل جلالہ پر ایمان رکھنے والے ہو، لہٰذا تم اس بات کا پہلے ہی اعلان کر دو کہ جو کچھ تدبیر ہم کر رہے ہیں یہ ساری تدبیر اللہ جل جلالہ کی تاثیر کے بغیر بیکار ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

"اتفاق" کی حقیقت

بڑے بڑے ڈاکٹر، اطباء اور معالجین روزانہ اللہ جل جلالہ کی تاثیر اور فیصلوں کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہم تدبیر کچھ کر رہے تھے مگر اچانک کیا سے کیا ہو گیا، اور اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ ہماری ظاہری سائنس سب بیکار ہو گئی۔ لیکن اس اچانک اور ان کی ظاہری سائنس کے خلاف پیش آنے والے واقعہ کو "اتفاق" کا نام دے دیتے ہیں کہ اتفاقاً ایسا ہو گیا۔

کوئی کام "اتفاقی" نہیں

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کی دنیا جس کو "اتفاق" کا نام دیتی ہے کہ اتفاقاً یہ کام اس طرح ہو گیا، یہ سب غلط ہے۔ اس لئے کہ اس کائنات میں کوئی کام اتفاقاً نہیں ہوتا بلکہ اس کائنات کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی حکمت، مشیت اور نظم کے ماتحت ہوتا ہے۔ جب کسی کام کی علت اور سبب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کام کن اسباب کی وجہ سے ہوا تو بس ہم کہہ دیتے ہیں کہ اتفاقاً یہ کام اس طرح ہو گیا۔ ارے جو اس کائنات کا مالک اور خالق ہے وہی اس پورے نظام کو چلا رہا ہے اور ہر کام پورے مستحکم نظام کے تحت ہو رہا ہے، کوئی ذرّہ اس کی مشیت کے بغیر ہل نہیں سکتا، اس لئے سیدھی سی بات یہ ہے کہ اس دوا میں بذاتِ خود کوئی تاثیر نہیں تھی،

جب اللہ تعالیٰ نے اس دوا میں تاثیر پیدا فرمائی تھی تو فائدہ ہوگیا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے تاثیر پیدا نہیں فرمائی، تو اس دوا سے فائدہ نہیں ہوا۔ بس یہ سیدھی سی بات ہے "اتفاق" کا کیا مطلب؟

مسبّب الاسباب پر نظر ہو

بس انسان یہی زاویہ نگاہ بدل لے کہ تدبیروں اور اسباب پر بھروسہ نہ ہو، بلکہ مسبّب الاسباب پر بھروسہ ہو کہ وہ سب کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف تدبیر اختیار کرنے کی اجازت دی بلکہ تدبیر اختیار کرنے کا حکم دیا کہ تدبیر اختیار کرو اور ان اسباب کو اختیار کرو، اس لئے کہ ہم نے ہی یہ اسباب تمہارے لئے پیدا کیے ہیں۔ لیکن تمہارا امتحان یہ ہے کہ آیا تمہاری نگاہ ان اسباب کی حد تک محدود رہ جاتی ہے یا ان اسباب کے پیدا کرنے والے پر بھی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ عقیدہ اس طرح پیوست فرمادیا تھا کہ ان کی نگاہ ہمیشہ مسبّب الاسباب پر رہتی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسباب کو صرف اس وجہ سے اختیار کرتے تھے کہ ہمیں اسباب اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل یقین اور بھروسہ حاصل ہو جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے عجیب وغریب کرشمے بندے کو دکھاتے ہیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر پینا

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ شام کے ایک قلعے کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ قلعہ کے لوگ محاصرہ سے تنگ آگئے تھے، وہ چاہتے تھے کہ صلح ہو جائے۔ لہٰذا ان لوگوں نے قلعے کے سردار کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس صلح کی بات چیت کے لئے بھیجا۔ چنانچہ ان کا سردار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی شیشی ہے، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ یہ شیشی میں کیا ہے اور کیوں لے کر آئے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ اس شیشی میں زہر بھرا ہوا ہے اور یہ سوچ کر آیا ہوں کہ اگر آپ سے صلح کی بات چیت کامیاب ہوگئی تو ٹھیک، اور اگر بات چیت ناکام ہوگئی اور صلح نہ ہوسکی تو ناکامی کا منہ لے کر اپنی قوم کے پاس واپس نہیں جاؤں گا بلکہ یہ زہر پی کر خودکشی کرلوں گا۔

تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اصل کام تو لوگوں کو دین کی دعوت دینا ہوتا تھا، اس لئے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ اس کو اس وقت دین کی دعوت دینے کا اچھا موقع ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سردار سے پوچھا: کیا تمہیں اس زہر پر اتنا بھروسہ ہے کہ جیسے ہی تم یہ زہر پیو گے تو فوراً موت واقع ہو جائے گی؟ اس سردار نے جواب دیا کہ ہاں مجھے اس پر بھروسہ ہے، اس لئے کہ یہ ایسا سخت زہر ہے

کہ اس کے بارے میں معالجین کا کہنا یہ ہے کہ آج تک کوئی شخص اس زہر کا ذائقہ نہیں بتاسکا، کیونکہ جیسے ہی کوئی شخص یہ زہر کھاتا ہے تو فوراً اس کی موت واقع ہو جاتی ہے، اس کو اتنی مہلت نہیں ملتی کہ وہ اس کا ذائقہ بتاسکے۔ اس وجہ سے مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس کو پی لوں گا تو فوراً مر جاؤں گا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس سردار سے کہا کہ یہ زہر کی شیشی جس پر تمہیں اتنا یقین ہے، یہ ذرا مجھے دو۔ اس نے وہ شیشی آپ کو دے دی۔ آپ نے وہ شیشی اپنے ہاتھ میں لی اور پھر فرمایا کہ اس کائنات کی کسی چیز میں کوئی تاثیر نہیں، جب تک اللہ تعالیٰ اس کے اندر اثر نہ پیدا فرمادیں، میں اللہ کا نام لیتا ہوں اور یہ دعا پڑھتا ہوں:

((بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِىْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَىْءٌ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ))

"اس اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جس کے نام کے ساتھ کوئی چیز نقصان نہیں پہنچاسکتی، نہ آسمان میں اور نہ زمین میں، وہی سننے اور جاننے والا ہے"

میں اس زہر کو پیتا ہوں، آپ دیکھنا کہ مجھے موت آتی ہے یا نہیں۔ اس سردار نے کہا کہ جناب! یہ آپ اپنے اُوپر ظلم کر رہے ہیں، یہ زہر تو اتنا سخت ہے کہ اگر انسان تھوڑا سا بھی منہ میں ڈال لے تو ختم ہو جاتا ہے اور آپ نے پوری شیشی پینے کا ارادہ کرلیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انشاء اللہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ دعا پڑھ کر وہ زہر کی پوری شیشی پی گئے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت کا کرشمہ دکھانا تھا۔ اس سردار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پوری شیشی پی گئے لیکن ان پر موت کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے، وہ سردار یہ کرشمہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ (۱)

ہر کام میں مشیتِ خداوندی

بہرحال، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ عقیدہ جما ہوا تھا کہ جو کچھ اس کائنات میں ہو رہا ہے وہ اللہ جل شانہ کی مشیت سے ہو رہا ہے، ان کی مشیت کے بغیر کوئی ذرہ حرکت نہیں کرسکتا۔ یہ عقیدہ ان کے دلوں میں اس طرح پیوست ہو چکا تھا کہ اس کے بعد یہ تمام اسباب بے حقیقت نظر آرہے تھے۔ اور جب آدمی اس ایمان و یقین کے ساتھ کام کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی قدرت کے کرشمے بھی دکھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ تم اسباب پر جتنا بھروسہ کرو گے، اتنا ہی ہم تمہیں اسباب کے ساتھ باندھ دیں گے، اور جتنا تم اس کی ذات پر بھروسہ کرو گے تو اتنا ہی اللہ تعالیٰ تم

(۱) دلائل النبوة، ص: ۱۵۹، الإصابة (۱/۴۱۴)، تاريخ الطبری (۲/۵۶۷)، حياة الصحابة (۳/۷۳۰)

کو اسباب سے بے نیاز کر کے تمہیں اپنی قدرت کے کرشمے دکھائیں گے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں قدم قدم پر یہ چیز نظر آتی ہے۔

حضورِ اقدس ﷺ کا ایک واقعہ

ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ ایک غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے، راستے میں ایک منزل پر قیام فرمایا اور وہاں ایک درخت کے نیچے آپ تن تنہا سو گئے، آپ کے قریب کوئی محافظ اور کوئی نگہبان نہیں تھا، کسی کافر نے آپ کو تنہا دیکھا تو تلوار سونت کر آ گیا اور بالکل آپ کے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا، جب آپ کی آنکھ کھلی تو آپ نے دیکھا کہ اس کافر کے ہاتھ میں تلوار ہے اور آپ نہتے ہیں اور وہ کافر یہ کہہ رہا ہے کہ اے محمد (ﷺ) اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ اس شخص کو یہ خیال تھا کہ جب حضورِ اقدس ﷺ یہ دیکھیں گے کہ اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور میں نہتا ہوں اور اچانک یہ شخص میرے سر پر آ کھڑا ہوا ہے تو آپ گھبرا جائیں گے اور پریشان ہو جائیں گے، لیکن آپ کے چہرہ مبارک پر دور دور تک پریشانی کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے۔ آپ نے اطمینان سے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ بچائیں گے۔ جب اس شخص نے دیکھا کہ آپ کے اُوپر پریشانی اور گھبراہٹ کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر ایسا رعب مسلط فرما دیا کہ اس کے ہاتھوں میں لرزہ آ گیا اور اس لرزہ کی وجہ سے تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ اب سرکارِ دو عالم ﷺ نے وہ تلوار ہاتھ میں اُٹھالی اور فرمایا کہ اب بتاؤ تمہیں کون بچائے گا؟(۱)

اس واقعہ کے ذریعہ اس شخص کو یہ دعوت دے دی تھی کہ درحقیقت تم اس تلوار پر بھروسہ کر رہے تھے اور میں اس تلوار کے پیدا کرنے والے پر بھروسہ کر رہا تھا اور اس تلوار میں تاثیر دینے والے پر بھروسہ کر رہا تھا۔ یہی اُسوہ حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش فرمایا، اور اس کے نتیجے میں ایک ایک صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ اسباب بھی اختیار کرتے تھے مگر ساتھ میں بھروسہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کرتے تھے۔

پہلے اسباب پھر توکل

ایک صحابی حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں جنگل میں

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب من علق سیفه بالشجر فی السفر عند القائلة، رقم: ۲۶۹٤، صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب صلاة الخوف، رقم: ۱۳۰۰، مسند أحمد، رقم: ۱۳۸۱٦

اُونٹنی لے کر جاتا ہوں اور وہاں نماز کا وقت آجاتا ہے، تو جب نماز کا وقت آجائے اور اس وقت جنگل میں نماز کی نیت باندھنے کا ارادہ کروں تو اس وقت اپنی اُونٹنی کا پاؤں کسی درخت کے ساتھ باندھ کر نماز پڑھوں یا اس اُونٹنی کو نماز کے وقت کھلا چھوڑ دوں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کروں؟ جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِعْقِلْ سَاقَهَا وَتَوَكَّلْ))(۱)

''اس اُونٹنی کی پنڈلی رسّی سے باندھ دو، لیکن باندھنے کے بعد پھر بھروسہ اسی رسّی پر مت کرو بلکہ بھروسہ اللہ تعالیٰ پر کرو''

اس لئے کہ وہ رسّی ٹوٹ بھی سکتی ہے، وہ رسّی دھوکہ بھی دے سکتی ہے۔

اسی حدیث کے مضمون کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک مصرعہ کے اندر بیان فرماتے ہیں کہ ؏

بہ توکل پایۂ اشتر بہ بند

یعنی توکل پر اُونٹنی کا پاؤں باندھو۔ لہٰذا توکل اور اسباب کا اختیار کرنا یہ دونوں چیزیں ایک مؤمن کے ساتھ اس کی زندگی میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، پہلے اسباب اختیار کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے کہہ دے:

((اَللّٰهُمَّ هٰذَا الْجُهْدُ وَعَلَيْكَ التُّكْلَانُ))

''یا اللہ جو تدبیر اور جو کوشش میرے اختیار میں تھی وہ میں نے اختیار کرلی، اب آگے بھروسہ آپ کی ذات پر ہے''(۲)

اسباب کی یقینی موجودگی کی صورت میں توکل

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک لطیف بات یاد آگئی، وہ فرماتے ہیں کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ توکل صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب ظاہری اسباب کے ذریعہ کسی کام کے ہونے یا نہ ہونے دونوں کا احتمال موجود ہو، ہوسکتا ہے کہ یہ کام ہوجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کام نہ ہو، اس وقت تو توکل کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہئے، لیکن جہاں پر کسی کام کے ہوجانے کی یقینی صورت موجود ہو، وہاں پر اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں، وہ نہ توکل کا موقع ہے اور نہ ہی دعا کا موقع ہے۔

مثلاً ہم دسترخوان پر کھانا کھانے کے لئے بیٹھے ہیں، کھانا سامنے چنا ہوا ہے، بھوک لگی ہوئی

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ٢٤٤١

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب منه، رقم: ٣٣٤١

ہے، یہ بات بالکل یقینی ہے کہ ہم یہ اُٹھا کر کھالیں گے، اب ایسے موقع پر کوئی شخص بھی نہ توکل کرتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! یہ کھانا مجھے کھلا دیجئے۔ اور نہ ہی کوئی شخص توکل اور دعا کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

توکل کا اصل موقع یہی ہے

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توکل کا اصل موقع تو یہی ہے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا اصل موقع یہی ہے۔ اس لئے کہ اگر اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے مانگے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے اس ظاہری سبب پر بھروسہ نہیں ہے جو میرے سامنے رکھا ہے، بلکہ مجھے آپ کے رزق دینے پر، آپ کی تخلیق پر، آپ کی قدرت اور رحمت پر بھروسہ ہے۔ اس لئے جب کھانا سامنے دسترخوان پر آجائے تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! یہ کھانا عافیت کے ساتھ کھلا دیجئے۔ کیونکہ اگرچہ غالب گمان یہ ہے کہ کھانا سامنے رکھا ہے، صرف ہاتھ بڑھا کر کھانے کی دیر ہے، لیکن یہ مت بھولو کہ یہ کھانا بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نہیں ہوگا۔ کتنے واقعات ایسے پیش آچکے ہیں کہ کھانا دسترخوان پر رکھا تھا، صرف ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی لیکن کوئی ایسا عارض پیش آگیا یا کوئی ایسی پریشانی کھڑی ہوگئی یا کوئی ایسا حادثہ پیش آگیا کہ آدمی وہ کھانا نہیں کھا سکا، وہ کھانا رکھا کا رکھا رہ گیا۔ لہٰذا اگر کھانا سامنے موجود ہو تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! یہ کھانا مجھے کھلا دیجئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس جگہ پر تمہیں یقینی طور پر معلوم ہو کہ یہ کام ہوجائے گا، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! مجھے تو بظاہر نظر آرہا ہے کہ یہ کام ہوجائے گا، لیکن مجھے پتہ نہیں کہ حقیقت میں یہ کام ہوجائے گا یا نہیں، کیونکہ حقیقت میں تو آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اے اللہ! اس کام کو ٹھیک ٹھیک انجام تک پہنچا دیجئے۔

دونوں صورتوں میں اللہ سے مانگے

جو حدیث میں نے شروع میں بیان کی تھی، اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دو لفظ ارشاد فرمائے، وہ یہ کہ تمہیں یا تو اللہ تعالیٰ سے کوئی ضرورت پیش آئے یا کسی آدمی سے کوئی ضرورت پیش آئے۔ یہ دو لفظ اس لئے ارشاد فرمائے کہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جس میں کسی آدمی کی مدد یا اس کی مداخلت کا کوئی راستہ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کو اولاد کی خواہش ہے، اب ظاہری اسباب میں بھی کسی انسان سے اولاد نہیں مانگی جاسکتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگی جاسکتی ہے۔ بہرحال، وہ خواہش اور ضرورت خواہ ایسی ہو جو براہِ راست اللہ تعالیٰ دینے والے

ہیں یا ایسی ضرورت ہو جو آدمی کے واسطے سے اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں، جیسے ملازمت اور روزی وغیرہ، دونوں صورتوں میں حقیقت میں تمہارا مانگنا اللہ تعالیٰ سے ہونا چاہئے۔

اطمینان سے وضو کریں

بہرحال، اب اگر تمہارے پاس وقت میں گنجائش ہے اور وہ کام بہت جلدی اور ایمرجنسی کا کام نہیں ہے تو اس کام کے لئے پہلے صلوٰۃ الحاجۃ پڑھو۔ اور صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کا طریقہ اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے وضو کرو اور اچھی طرح وضو کرو۔ یعنی وہ وضو محض فرض ٹالنے کے انداز میں نہ کرو بلکہ یہ سمجھ کر کرو کہ یہ وضو درحقیقت ایک عظیم الشان عبادت کی تمہید ہے، اس وضو کے کچھ آداب اور کچھ سنتیں ہیں جو نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائی ہیں، ان سب کا اہتمام کرکے وضو کرو۔ ہم لوگ دن رات بے خیالی میں جلدی جلدی وضو کرکے فارغ ہو جاتے ہیں، بیشک اس طرح وضو کرنے سے وضو ہو تو جاتا ہے لیکن اس وضو کے انوار و برکات حاصل نہیں ہوتیں۔

وضو سے گناہ دُھل جاتے ہیں

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس وقت بندہ وضو کرتا ہے اور وضو کے دوران اپنا چہرہ دھوتا ہے تو چہرے سے جتنے گناہ کیے ہیں وہ سب چہرہ کے پانی کے ساتھ دُھل جاتے ہیں، اور جب دایاں ہاتھ دھوتا ہے تو دائیں ہاتھ کے جتنے گناہ ہوتے ہیں وہ سب دُھل جاتے ہیں، اور جب بایاں ہاتھ دھوتا ہے تو بائیں ہاتھ کے تمام گناہ دُھل جاتے ہیں۔ اس طرح جو جو عضو وہ دھوتا ہے اس عضو کے گناہِ صغیرہ معاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (۱)

میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب وضو کیا کرو تو ذرا یہ تصور کیا کرو کہ میں اپنا چہرہ دھو رہا ہوں تو حضورِ اقدس ﷺ کی بشارت کے مطابق میرے چہرے کے گناہ دُھل رہے ہیں، اب ہاتھ دھو رہا ہوں تو ہاتھ کے گناہ دُھل رہے ہیں، اسی تصور کے ساتھ مسح کرو اور اسی تصور کے ساتھ پاؤں دھوؤ۔ وہ وضو جو اس تصور کے ساتھ کیا جائے اور وہ وضو جو اس تصور کے بغیر کیا جائے، دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا اور اس وضو کا لطف محسوس ہوگا۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب خروج الخطایا مع ماء الوضوء، رقم: ۳۶۰، سنن الترمذی، کتاب الطھارۃ عن رسول اللہ، رقم: ۲، مسند أحمد، رقم: ۷۶۷۷، مؤطا مالک، کتاب الطھارۃ، رقم: ۵۶

وضو کے دوران کی دعائیں

بہر حال، ذرا دھیان کے ساتھ وضو کرو اور وضو کے جو آداب اور سنتیں ہیں، ان کو ٹھیک ٹھیک بجالاؤ۔ مثلاً قبلہ رُو ہو کر بیٹھو، اور ہر ہر عضو کو تین تین مرتبہ اطمینان سے دھوؤ، اور وضو کی جو مسنون دعائیں ہیں وہ وضو کے دوران پڑھو۔ مثلاً یہ دعا پڑھو:

((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْ رِزْقِیْ))(۱)

اور کلمہ شہادت پڑھے:

((أَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ)) (۲)

اور وضو کے بعد یہ دعا پڑھے:

((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِیْنَ))(۳)

بس اچھی طرح وضو کرنے کا یہی مطلب ہے۔

''صلوٰۃ الحاجۃ'' کے لئے خاص طریقہ مقرر نہیں

پھر دو رکعت ''صلوٰۃ الحاجۃ'' کی نیت سے پڑھو، اور اس صلوٰۃ الحاجۃ کے طریقے میں کوئی فرق نہیں ہے، جس طرح عام نماز پڑھی جاتی ہے اسی طرح سے یہ دو رکعتیں پڑھی جائیں گی۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ''صلوٰۃ الحاجۃ'' پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ ہے، لوگوں نے اپنی طرف سے اس کے خاص خاص طریقے گھڑ رکھے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے لئے خاص خاص سورتیں بھی متعین کر رکھی ہیں کہ پہلی رکعت میں فلاں سورۃ پڑھے اور دوسری رکعت میں فلاں سورۃ پڑھے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حضور اقدس ﷺ نے ''صلوٰۃ الحاجۃ'' کا جو طریقہ بیان فرمایا ہے اس میں نماز پڑھنے کا کوئی الگ طریقہ بیان نہیں فرمایا اور نہ کسی سورۃ کی تعیین فرمائی۔

البتہ بعض بزرگوں کے تجربات ہیں کہ اگر ''صلوٰۃ الحاجۃ'' میں فلاں فلاں سورتیں پڑھ لی

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید، رقم: ۳۴۲۲، مسند أحمد، أول مسند المدنیین أجمعین، رقم: ۱۶۰۰۴

(۲) سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول اللّٰہ، باب فیما یقال بعد الوضوء، رقم: ۵۰، سنن النسائی، کتاب الطهارة، رقم: ۱۴۸، سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب ما یقال بعد الوضوء، رقم: ۴۶۳

(۳) سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب فیما یقال بعد الوضوء، رقم: ۵۰، والنسائی، کتاب الطهارة، رقم: ۱۴۸، وابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، رقم: ۴۶۳

جائیں تو بعض اوقات اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے، تو اس کو سنت سمجھ کر انسان اختیار نہ کرے، اس لئے کہ اگر سنت سمجھ کر اختیار کرے گا تو وہ بدعت ہو جائے گا۔ چنانچہ میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنی ہو تو پہلی رکعت میں سورۃ الم نشرح اور دوسری رکعت میں سورۃ ''اذا جاء نصر اللہ'' پڑھ لیا کرو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان سورتوں کے پڑھنے سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص سنت سمجھے بغیر ان سورتوں کو پڑھے تو بھی ٹھیک ہے اور اگر ان کے علاوہ کوئی دوسری سورت پڑھ لے تو اس میں سنت کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی۔ بہرحال، صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ نہیں ہے بلکہ جس طرح عام نمازیں پڑھی جاتی ہیں، اسی طرح صلوٰۃ الحاجۃ کی دو رکعتیں پڑھی جائیں گی۔ بس نماز شروع کرتے وقت دل میں یہ نیت کرلے کہ میں یہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ کے طور پر پڑھتا ہوں۔

نماز کے لئے نیت کس طرح کی جائے؟

یہاں پر یہ بھی عرض کردوں کہ آج کل لوگوں میں یہ مشہور ہوگیا ہے کہ ہر نماز کی نیت کے الفاظ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور جب تک وہ الفاظ نہ کہے جائیں اس وقت تک نماز نہیں ہوتی، اسی وجہ سے لوگ بار بار یہ پوچھتے بھی رہتے ہیں کہ فلاں نماز کی نیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور فلاں نماز کی نیت کس طرح ہوگی؟ اور لوگوں نے نیت کے الفاظ کو باقاعدہ نماز کا حصہ بنا رکھا ہے۔ مثلاً یہ الفاظ کہ ''نیت کرتا ہوں دو رکعت نماز کی، پیچھے اس امام کے، واسطے اللہ تعالیٰ کے، منہ میرا کعبہ شریف کی طرف وغیرہ وغیرہ''، خوب سمجھ لیں کہ نیت ان الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ نیت تو دل کے ارادے کا نام ہے، جب آپ نے گھر سے نکلتے وقت دل میں یہ نیت کرلی کہ میں ظہر کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں، بس نیت ہوگئی۔ میں نمازِ جنازہ پڑھنے جا رہا ہوں، بس نیت ہوگئی۔ میں نمازِ عید پڑھنے جا رہا ہوں، بس نیت ہوگئی۔ میں نمازِ حاجت پڑھنے جا رہا ہوں، بس نیت ہوگئی۔ اب یہ الفاظ زبان سے کہنا نہ تو واجب ہیں نہ ضروری ہیں، نہ سنت ہیں، نہ مستحب ہیں، زیادہ سے زیادہ جائز ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لہٰذا صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنے کا نہ کوئی مخصوص طریقہ ہے اور نہ ہی نیت کے لئے الفاظ مخصوص ہیں، بلکہ عام نمازوں کی طرح دو رکعتیں پڑھ لو۔

دعا سے پہلے اللہ کی حمد وثناء

پھر جب دو رکعتیں پڑھ لیں تو اب دعا کرو۔ اور یہ دعا کس طرح کرو، اس کے آداب بھی خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیئے۔ یہ نہیں کہ بس سلام پھیرتے ہی دعا شروع کردو، بلکہ سب سے پہلے تو

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرو اور یہ کہو: یا اللہ! تمام تعریفیں آپ کے لئے ہیں، آپ کا شکر اور احسان ہے۔

حمد وثناء کی کیا ضرورت ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کیوں کی جائے؟ اور اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی ایک وجہ تو علماء کرام رحمہم اللہ نے یہ بتائی ہے کہ جب آدمی کسی دنیاوی حاکم کے پاس اپنی غرض لے کر جاتا ہے تو پہلے اس کی تعظیم اور تکریم کے لئے کچھ الفاظ زبان سے ادا کرتا ہے تاکہ یہ خوش ہو کر میری مراد پوری کردے۔ لہٰذا جب دنیا کے ایک معمولی سے حاکم کے سامنے پیش ہوتے وقت اس کے لئے تعریفی کلمات استعمال کرتے ہو تو جب تم احکم الحاکمین کے دربار میں جارہے ہو تو اس کے لئے بھی تعریف کے الفاظ زبان سے کہو کہ یا اللہ! تمام تعریفیں آپ کے لئے ہیں اور آپ کا شکر واحسان ہے، آپ میری یہ ضرورت پوری فرمادیجئے۔

دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرنے کی دوسری وجہ بھی ہے اور مجھے ذوقی طور پر اس دوسری وجہ کی طرف زیادہ رجحان ہوتا ہے، وہ وجہ یہ ہے کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی حاجت پیش کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو چونکہ انسان اپنی ضرورت کا غلام ہے اور غرض کا بندہ ہے، اور جب اس کو کسی چیز کی ضرورت اور غرض پیش آتی ہے تو وہ ضرورت اس کے دل ودماغ پر مسلط ہو جاتی ہے، اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! میری فلاں ضرورت پوری فرمادیجئے۔ اس دعا کے وقت اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس دعا میں ناشکری کا پہلو شامل نہ ہو جائے کہ یا اللہ! آپ میری ضرورت پوری نہیں فرمارہے ہیں، میری حاجتیں آپ پوری نہیں فرمارہے ہیں۔ حالانکہ انسان پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں بارش کی طرح برس رہی ہیں، دعا کے وقت ان نعمتوں کی طرف انسان کا دھیان نہیں جاتا اور بس اپنی ضرورت اور غرض کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔

بہر حال، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تلقین فرمائی کہ جب تم اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی حاجت اور ضرورت لے کر جاؤ تو اس حاجت اور ضرورت کو اللہ تعالیٰ سے ضرور مانگو، لیکن پہلے اس بات کا استحضار کرلو کہ اس حاجت اور ضرورت کے ابھی تک پورا نہ ہونے کے باوجود تمہارے اُوپر اللہ تعالیٰ کی کتنی بے شمار نعمتیں بارش کی طرح برس رہی ہیں۔ پہلے ان کا تو شکر ادا کرلو کہ یا اللہ! یہ نعمتیں جو آپ نے اپنی رحمت سے مجھے دے رکھی ہیں، اس پر آپ کا شکر ہے اور آپ کی حمد ہے، آپ کی ثناء ہے، البتہ ایک حاجت اور ضرورت اور ہے، یا اللہ! اس کو بھی اپنے فضل سے پورا فرمادیجئے۔۔۔ تاکہ انسان کی دعا میں ناشکری کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو۔

غم اور تکالیف بھی نعمت ہیں

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مجلس میں یہ مضمون بیان فرمارہے تھے کہ انسان کو زندگی میں جو غم، صدمے اور تکلیفیں پیش آتی ہیں، اگر انسان غور کرے تو یہ تکلیفیں بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، بیماری بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، فقر و فاقہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اگر انسان کو حقیقت شناس نگاہ مل جائے تو وہ یہ دیکھے کہ یہ سب چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ چیزیں کس طرح سے نعمت ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آخرت میں اللہ تعالیٰ تکالیف اور مصیبتوں پر صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے، تو جن لوگوں پر دنیا میں زیادہ تکالیف اور مصیبتیں نہیں گزری ہوں گی، وہ تمنا کریں گے کہ کاش! دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں اور پھر ہم اس پر صبر کرتے۔ (۱)

اور اس صبر پر وہ اجر ملتا جو آج ان صبر کرنے والوں کو مل رہا ہے۔ بہرحال، حقیقت میں یہ تکالیف بھی نعمت ہیں، مگر چونکہ ہم کمزور ہیں اس وجہ سے ہمیں ان کے نعمت ہونے کا استحضار نہیں ہوتا۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب دعا

جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ مضمون بیان فرمارہے تھے کہ اسی دوران مجلس میں ایک شخص آگیا جو معذور تھا اور مختلف بیماریوں میں مبتلا تھا۔ وہ آکر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہنے لگا کہ حضرت! میرے لئے دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس تکلیف سے نجات دے دیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جو حاضرینِ مجلس تھے، حیران ہوگئے کہ ابھی تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے تھے کہ ساری تکلیفیں اور مصیبتیں نعمت ہوتی ہیں اور اب یہ شخص تکلیف کے ازالے کی دعا کرارہا ہے، اب اگر حضرت حاجی صاحب اس شخص کے لئے تکلیف کے ازالے کی دعا کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نعمت کے ازالے کی دعا کریں گے؟ حضرت حاجی صاحب نے اسی وقت ہاتھ اُٹھا کر یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ! حقیقت میں یہ ساری تکلیفیں اور مصیبتیں نعمت ہیں، لیکن اے اللہ! ہم کمزور ہیں، آپ ہماری کمزوری پر نظر فرماتے ہوئے اس تکلیف کی نعمت کو صحت کی نعمت سے بدل دیجئے۔

---

(۱) کنز العمال، رقم: ۶۶۶۰ (۳/۳۰۳)، المعجم الکبیر للطبرانی، رقم: ۸۶۸۹ (۸/۶۶)، الزواجر عن اقتراف الکبائر (۱/۴۲۷)

تکلیف کے وقت دوسری نعمتوں کا استحضار

اور پھر عین تکلیف کے وقت انسان کو جو بے شمار نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، انسان ان کو بھول جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے، تو اب وہ اس پیٹ کے درد کو لے کر بیٹھ جاتا ہے، لیکن وہ یہ نہیں دیکھتا کہ آنکھ جو اتنی بڑی نعمت اس کو ملی ہوئی ہے، اس میں کوئی تکلیف نہیں۔ زبان میں کوئی تکلیف نہیں۔ دانتوں میں کوئی تکلیف نہیں۔ سارے جسم میں اور کسی جگہ تکلیف نہیں۔ بس صرف پیٹ میں معمولی تکلیف ہو رہی ہے۔ اب یہ دعا ضرور کرو کہ یا اللہ! پیٹ کی تکلیف دور کر دیجئے، لیکن دعا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی اس پر حمد و ثناء کرو کہ یا اللہ! جو اور بے شمار نعمتیں آپ نے عطا کی ہوئی ہیں، اے اللہ! ہم اس پر آپ کا شکر ادا کرتے ہیں، البتہ اس وقت جو یہ تکلیف آگئی ہے اس کے لئے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اس تکلیف کو دور کر دیجئے۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شکرِ نعمت

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، یہ مادرزاد ولی اللہ تھے اور عجیب و غریب بزرگ تھے۔ حضرت والد صاحب ان کا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ حضرت میاں صاحب بیمار ہیں اور ان کو بخار ہے۔ میں عیادت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ شدید بخار میں تپ رہے ہیں اور بخار کی کرب اور بے چینی کی تکلیف میں ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا اور پوچھا کہ حضرت! کیسے مزاج ہیں؟ طبیعت کیسی ہے؟ جواب میں فرمایا:

> ''الحمدللہ میری آنکھیں صحیح کام کر رہی ہیں۔ الحمدللہ میرے کان صحیح کام کر رہے ہیں۔ الحمدللہ میری زبان صحیح کام کر رہی ہے۔ جتنی تکلیفیں نہیں تھیں ان سب کا ایک ایک کر کے ذکر کیا کہ ان سب میں کوئی بیماری نہیں ہے، البتہ بخار ہے، دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دور فرما دے''

یہ ہے ایک شکر گزار بندے کا عمل جو عین تکلیف میں بھی ان راحتوں اور نعمتوں کا استحضار کر رہا ہے جو اس وقت حاصل ہیں، جس کی وجہ سے اس تکلیف کی شدت میں بھی کمی آتی ہے۔

حاصل شدہ نعمتوں پر شکر

بہر حال، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ جو تلقین فرما رہے ہیں کہ دعا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء

کرو، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس وقت جو حاجت اور ضرورت پیش کرنے جارہے ہو، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں اس وقت تمہیں حاصل ہیں، پہلے ان کا استحضار کر کے ان پر شکر ادا کرو اور اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرو۔

حمد وثناء کے بعد درود شریف کیوں؟

اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد کیا کرے؟ اس کے لئے ارشاد فرمایا:

((وَلْيُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ))

''حمد وثناء کے بعد اور اپنی حاجت پیش کرنے سے پہلے نبی کریم ﷺ پر درود بھیجو''

اب سوال یہ ہے کہ اس وقت درود بھیجنے کا کیا موقع ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ اپنی اُمت پر بہت ہی زیادہ شفیق اور مہربان ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جب میرا اُمتی اللہ تعالیٰ کے حضور دعا مانگے تو اس کی وہ دعا رد نہ ہو۔ پوری کائنات میں درود شریف کے علاوہ کسی دعا کے بارے میں یہ گارنٹی نہیں ہے کہ وہ ضرور قبول ہوگی، لیکن اگر نبی کریم ﷺ پر درود بھیجا جائے تو اس کے بارے میں یہ گارنٹی یقینی ہے کہ وہ ضرور قبول ہوگا۔ جب ہم درود بھیجتے ہیں اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! محمد رسول اللہ ﷺ پر رحمتیں نازل فرمایئے۔ یہ ایسی دعا ہے کہ اس کے رد ہونے کا کوئی امکان نہیں، اس کی قبولیت کا وعدہ ہے، اس کی قبولیت کی گارنٹی ہے کہ یہ دعا ضرور قبول ہوگی۔ اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ پر تو پہلے سے رحمتیں نازل ہو رہی ہیں اور مزید نازل ہوتی رہیں گی، وہ ہمارے درود بھیجنے کے محتاج نہیں ہیں۔

درود شریف بھی قبول اور دعا بھی قبول

لیکن حضور اقدس ﷺ یہ چاہتے ہیں کہ میرے اُمتی اپنی مراد اور ضرورت مانگنے سے پہلے مجھ پر درود بھیج دیں تو اللہ تعالیٰ اس درود کو ضرور قبول فرمائیں گے، اور جب درود شریف کو قبول فرمائیں گے تو اس حاجت اور ضرورت کی دعا کو بھی ضرور قبول فرمائیں گے، اس لئے کہ ان کی رحمت سے یہ بات بعید ہے کہ ایک دعا کو تو قبول فرمالیں اور دوسری دعا کو رد فرمادیں۔ اس لئے درود شریف کے بعد کی جانے والی دعا کی قبولیت کی زیادہ اُمید ہے۔

حضور ﷺ اور ہدیہ کا بدلہ

ایک دوسری وجہ میرے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ حضورِ اقدس ﷺ کا عمر بھر کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ لے کر آتا تو آپ اس ہدیہ کا کچھ نہ کچھ بدلہ ضرور دیا کرتے تھے اور ہدیہ کی مکافات فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ درود شریف بھی ایک ہدیہ ہے، اس لئے کہ حدیث شریف میں صراحت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص دور سے درود شریف بھیجتا ہے تو وہ درود مجھ تک پہنچایا جاتا ہے، اور جو شخص قبر پر آ کر مجھ کو سلام کرے اور درود بھیجے تو میں خود اس کو سنتا ہوں۔ (۱)

یہ درود شریف ایک اُمتی کا تحفہ اور ہدیہ ہے جو آپ تک پہنچایا جاتا ہے۔ لہٰذا جب دنیا میں اور زندگی میں آپ کی سنت یہ تھی کہ جب آپ کے پاس کوئی شخص ہدیہ لے کر آتا تو آپ اس کی مکافات فرمایا کرتے تھے اور اس ہدیہ کے بدلے ہدیہ دیا کرتے تھے، تو اُمید یہ ہے کہ عالمِ برزخ میں جب ایک اُمتی کی طرف سے حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں درود شریف کا یہ ہدیہ پہنچے گا تو آپ اس ہدیہ کا بھی بدلہ عطا فرمائیں گے، وہ بدلہ یہ ہوگا کہ آپ ﷺ اس اُمتی کے حق میں دعائیں کریں گے کہ یا اللہ! اس اُمتی نے میرے لئے یہ تحفہ بھیجا ہے اور میرے لئے دعا کی ہے، اے اللہ! میں اس کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اس کی مراد پوری فرمادیں۔ لہٰذا جو اُمتی درود بھیجنے کے بعد دعا کرے گا تو حضور اکرم ﷺ اس کے لئے وہاں دعا فرمائیں گے۔ اس لئے جب دعا کرنے بیٹھو تو پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرو اور پھر حضورِ اقدس ﷺ پر درود بھیجو۔

دعاء حاجت کے الفاظ

اس کے بعد دعا کے یہ الفاظ کہو:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ))

اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ کے اندر کیا کیا انوارات اور کیا کیا خواص پوشیدہ ہیں یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں یا اللہ کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں، ہم لوگ اس کی تہہ تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ان اسماءِ حسنیٰ میں اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود خاصیتیں رکھی ہیں اس لئے جب خود حضورِ اقدس ﷺ یہ تلقین فرمائیں کہ ان اسماءِ حسنیٰ کا ذکر کرو تو اس کے پیچھے ضرور کوئی راز ہوتا ہے۔ لہٰذا خاص طور پر وہی کلمات

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب المناسك، باب زيارة القبور، رقم: ۱۷۴۵، سنن النسائي، كتاب السهو، باب السلام على النبي، رقم: ۱۲٦۵، مسند أحمد، رقم: ۳۴۸۴

کہنے چاہئیں تاکہ وہ مقصد حاصل ہو۔ چنانچہ فرمایا:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ))

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اللہ جو حلیم ہیں اور کریم ہیں''

''حلم'' بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور ''کرم'' بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ ان دونوں صفتوں کو خاص طور پر بظاہر اس لئے ذکر فرمایا کہ بندہ پہلے مرحلے پر ہی یہ اعتراف کرے کہ یا اللہ! میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ آپ میری دعا قبول کریں، اپنی ذات کے لحاظ سے میں اس لائق نہیں ہوں کہ آپ کی بارگاہ میں کوئی درخواست پیش کرسکوں، اس وجہ سے کہ میرے گناہ بیشمار ہیں، میری خطائیں بے شمار ہیں، میری بداعمالیاں اتنی ہیں کہ آپ کے حضور درخواست پیش کرنے کی لیاقت مجھ میں نہیں ہے، لیکن چونکہ آپ حلیم ہیں، بردباری آپ کی صفت ہے، اور اس کی وجہ سے کوئی بندہ چاہے وہ کتنا ہی خطا کار ہو، اس خطا کار کی خطاؤں کی وجہ سے جذبات میں آکر آپ کوئی فیصلہ نہیں فرماتے، بلکہ اپنی صفتِ ''حلم'' کے تحت فیصلہ فرماتے ہیں، اس لئے میں صفتِ ''حلم'' کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہوں، اور آپ کی صفتِ ''حلم'' کا تقاضا یہ ہے کہ آپ میرے گناہوں سے درگزر فرمائیں۔ اور پھر صفتِ ''کرم'' کا معاملہ فرمائیں یعنی صرف یہ نہ ہو کہ گناہوں سے درگزر فرمائیں بلکہ اُوپر سے مزید نوازشیں عطا فرمائیں، مزید اپنا کرم میرے اُوپر فرمائیں۔ صفتِ کرم اور صفتِ حلم کا واسطہ دے کر دعا کرو۔

اس کے بعد فرمایا:

((سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ))

''اللہ تعالیٰ پاک ہے جو عرشِ عظیم کا مالک ہے''

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ))

''اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے''

پہلے یہ تعریفی کلمات کہے اور اس کے بعد ان الفاظ کے ساتھ دعا کرے:

((اَللّٰهُمَّ اَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ))

''اے اللہ میں آپ سے ان چیزوں کا سوال کرتا ہوں جو آپ کی رحمت کا موجب ہوں''

((وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ))

''اور آپ کی پختہ مغفرت کا سوال کرتا ہوں''

((وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ))

''اور اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ مجھے ہر نیکی سے حصہ عطا فرمایئے''

((وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ إِثْمٍ))
''اور مجھے ہر گناہ سے محفوظ رکھئے''
((لَا تَدَعْ لَنَا ذَنْبًا إِلَّا غَفَرْتَهُ))
''ہمارا کوئی گناہ ایسا نہ چھوڑیئے جس کو آپ نے معاف نہ فرمایا ہو۔ یعنی ہر گناہ کو معاف فرمادیجئے''
((وَلَا هَمًّا إِلَّا فَرَّجْتَهُ))
''اور کوئی تکلیف ایسی نہ چھوڑیئے جس کو آپ نے دور نہ فرمادیا ہو''
((وَلَا حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًى إِلَّا قَضَيْتَهَا يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ))
''اور کوئی حاجت جس میں آپ کی رضامندی ہو ایسی نہ چھوڑیئے کہ اس کو آپ نے پورا نہ فرمایا ہو''

یہ دعا کے الفاظ اور اس کا ترجمہ ہے اور مسنون دعاؤں کی کتابوں میں بھی یہ دعا موجود ہے، یہ دعا ہر مسلمان کو یاد کر لینی چاہئے۔ اس کے بعد پھر اپنے الفاظ میں جو حاجت مانگنا چاہتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ اُمید ہے اللہ تعالیٰ اس دعا کو ضرور قبول فرمائیں گے۔

ہر ضرورت کے لئے صلوٰۃ الحاجۃ پڑھیں

ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ کی یہ سنت بیان کی گئی ہے:
"كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ صَلَّى"(۱)
''جب کبھی حضورِ اقدس ﷺ کو کوئی تشویش کا معاملہ پیش آتا تو آپ سب سے پہلے نماز کی طرف دوڑتے''

اور یہی صلوٰۃ الحاجۃ پڑھتے اور دعا کرتے کہ یا اللہ! یہ مشکل پیش آگئی ہے، آپ اس کو دور فرمادیجئے۔ اس لئے ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے لئے صلوٰۃ الحاجۃ کی کثرت کرے۔

اگر وقت تنگ ہو تو صرف دعا کرے

یہ تفصیل تو اس صورت میں ہے جب انسان کے پاس فیصلہ کرنے کے لئے وقت ہے اور دو

(۱) سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب قيام النبي من الليل، رقم: ۱۱۲٤، مسند أحمد، حديث حذيفة بن اليمان، رقم: ۲۲۲۱۰

رکعت پڑھنے کی گنجائش ہے، لیکن اگر جلدی کا موقع ہے اور اتنی مہلت نہیں ہے کہ وہ دو رکعت پڑھ کر دعا کرے، تو اس صورت میں دو رکعت پڑھے بغیر ہی دعا کے یہ الفاظ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ لیکن اپنی ہر حاجت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ضرور پیش کردے، چاہے وہ چھوٹی حاجت ہو یا بڑی حاجت ہو۔ حتیٰ کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ (۱)

لہٰذا جب چھوٹی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو بڑی چیز اور زیادہ اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہئے۔ اور درحقیقت یہ چھوٹی اور بڑی ہماری نسبت سے ہے، جوتے کے تسمہ کا درست ہو جانا یہ چھوٹی بات ہے اور سلطنت کا مل جانا بڑی بات ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں چھوٹے بڑے کا کوئی فرق نہیں، ان کے نزدیک سب کام چھوٹے ہیں، ہماری بڑی سے بڑی حاجت، بڑے سے بڑا مقصد اللہ تعالیٰ کے نزدیک چھوٹا ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (۲)

''اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''

ان کی قدرت ہر چیز پر یکساں ہے، اس کے لئے کوئی کام مشکل نہیں، اس کے لئے کوئی کام بڑا نہیں۔ اس لئے بڑی حاجت ہو یا چھوٹی حاجت ہو، بس اللہ ہی سے مانگو۔

یہ پریشانیاں اور ہمارا حال

آج کل ہمارے شہر میں ہر شخص پریشان ہے، ہمارے شہر کی کیا حالت بنی ہوئی ہے۔ العیاذ باللہ۔ کوئی گھرانہ ایسا نہیں ہے جو ان حالات کی وجہ سے بے چینی اور بے تابی کا شکار نہ ہو، کوئی براہِ راست مبتلا ہے اور کوئی بالواسطہ مبتلا ہے، کوئی اندیشوں کا شکار ہے، کسی کی جان مال عزت آبرو محفوظ نہیں، سب کا بُرا حال ہے۔ لیکن دوسری طرف ہمارا حال یہ ہے کہ صبح سے لے کر شام تک اس صورتِ حال پر تبصرے تو بہت کرتے ہیں، جہاں چار آدمی بیٹھے اور تبصرے شروع ہو گئے، فلاں جگہ یہ ہو گیا، فلاں جگہ یہ ہو گیا، فلاں نے یہ غلطی کی، فلاں نے یہ غلطی کی، حکومت نے یہ غلطی کی وغیرہ۔ لیکن ہم میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو تڑپ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کی توفیق ہوئی، کہ یا اللہ! یہ مصیبت ہم پر مسلط ہے، ہمارے گناہوں کا وبال ہم پر مسلط ہے، ہماری شامتِ اعمال ہم پر مسلط ہے، یا اللہ! اپنی رحمت سے اس کو دور فرما دیں۔ بتایئے کہ ہم میں سے کتنوں کو اس کی توفیق ہوئی؟

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب لیسأل الحاجة مهما صغرت، رقم: ۳۵۳۶

(۲) البقرة: ۲۰

تبصرہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں

۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان کے سقوط کا واقعہ پیش آیا اور مسلمانوں کی تاریخ میں ذلت کا ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا جو اس موقع پر پیش آیا کہ نوے ہزار مسلمانوں کی فوج ہندوؤں کے آگے ہتھیار ڈال کر ذلیل ہوگئی۔ تمام مسلمانوں پر اس کے صدمے کا اثر تھا، سب لوگ پریشان تھے۔ اسی دوران میری حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ کے یہاں حاضری ہوئی، میرے ساتھ میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم بھی تھے، جب وہاں پہنچے تو کچھ خاص خاص لوگ وہاں موجود تھے۔ اب وہاں پر تبصرے شروع ہوگئے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ کون اس کا سبب بنا؟ کس کی غلطی ہے؟ کسی نے کہا کہ فلاں پارٹی کی غلطی ہے، کسی نے کہا کہ فلاں پارٹی کی غلطی ہے، کسی نے کہا کہ فوج کی غلطی ہے۔ حضرت والا تھوڑی دیر تک سب کی باتیں سنتے رہے، اس کے بعد حضرت والا فرمانے لگے کہ اچھا بھائی! آپ لوگوں نے کوئی فیصلہ کرلیا کہ کون مجرم ہے؟ اور کون بے گناہ ہے؟ اور اس فیصلے کے نتائج کیا نکلے؟ جو مجرم ہے کیا اس کو سزا دو گے؟ اور جو بے گناہ ہے اس کی برأت کا اظہار کردو گے؟ یہ بتاؤ کہ اتنی دیر تک تم جو تبصرے کرتے رہے اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ کیا دنیا یا آخرت کا کوئی فائدہ تمہیں حاصل ہوا؟

تبصرہ کے بجائے دعا کریں

اگر اتنی دیر تم اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیتے اور اللہ تعالیٰ سے کہتے کہ یا اللہ! ہماری شامتِ اعمال کے نتیجے میں ہم پر یہ مصیبت آگئی ہے، اے اللہ! ہمیں معاف فرما اور ہم سے اس مصیبت کو دور فرما اور ہماری شامتِ اعمال کو رفع فرما اور اس ذلت کو عزت سے بدل دیجئے۔ اگر یہ دعا کرلی ہوتی تو کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دعا کو قبول فرمالیتے اور اگر بالفرض وہ دعا قبول نہ ہوتی تب بھی اس دعا کے کرنے کا ثواب تو حاصل ہوجاتا اور آخرت کی نعمت تمہیں حاصل ہوجاتی۔ اب یہ تم نے بیٹھ کر جو فضول تبصرے کیے اس سے نہ کوئی دنیا کا فائدہ ہوا اور نہ ہی آخرت کا کوئی فائدہ ہوا۔

اس وقت ہماری آنکھیں کھلیں کہ واقعۃً ہم دن رات اس مرض میں مبتلا ہیں کہ دن رات بس ان باتوں پر تبصرے ہورہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوکر مانگنے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ہم میں کتنے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ان حالات سے بیتاب ہوکر اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں کیں اور صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر دعا کی ہو، کہ یا اللہ! میں صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ رہا ہوں، اے اللہ! اپنی رحمت سے یہ عذاب ہم سے دور فرمادیجئے۔ یہ کام شاذ و نادر ہی کسی اللہ کے بندے نے کیا ہوگا، لیکن صبح سے لے کر شام تک

تبصرے ہورہے ہیں، وقت ان تبصروں میں صرف ہورہا ہے، اور پھران تبصروں میں معلوم نہیں کتنی غیبت ہورہی ہے، کتنے بہتان باندھے جارہے ہیں، اوران کے ذریعہ اُلٹا اپنے سر گناہ لے رہے ہیں۔

اللہ کی طرف رجوع کریں

تمام حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ان حالات میں دعا کی طرف توجہ کریں۔ اگر کسی کے بس میں کوئی تدبیر ہے تو وہ تدبیر اختیار کرے اور اگر تدبیر اختیار میں نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا تو ہر ایک کے اختیار میں ہے۔ ہمارے اندر سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا سلسلہ اب ختم ہوتا جارہا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب پاکستان بن رہا تھا، اس وقت ملک میں فسادات ہورہے تھے، اس وقت دیوبند اور دوسرے شہروں میں گھر گھر آیتِ کریمہ کا ختم ہورہا تھا، کسی کی طرف سے اپیل نہیں تھی، بلکہ مسلمان اپنی تحریک سے اور اپنے شوق سے اور ضرورت محسوس کرکے گھر گھر اور محلہ محلہ آیتِ کریمہ کا ختم کررہے تھے، عورتیں اپنے گھروں میں بیٹھی ہوئی آیتِ کریمہ کا ختم کررہی تھیں اور دعائیں ہورہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس مصیبت سے نکال دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس مصیبت سے نجات دیدی۔

پھر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں

آج ہمارے شہر میں سب کچھ ہورہا ہے، آنکھوں کے سامنے لاشیں تڑپ رہی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ کیا آپ نے کہیں سنا کہ محلوں میں یا گھروں میں آیتِ کریمہ کا ختم کیا جارہا ہو اور دعا کرنے کا اہتمام ہورہا ہو۔ بلکہ یہ ہورہا ہے کہ آنکھوں کے سامنے لاشیں تڑپ رہی ہیں، موت آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہے، اور لوگ گھروں میں بیٹھ کر وی سی آر دیکھ رہے ہیں۔ اب بتایئے ان حالات میں اللہ تعالیٰ کا قہر اور عذاب نازل نہ ہو تو کیا ہو۔ تمہارے سامنے اچھا خاصا آدمی ذرا سی دیر میں دنیا سے چل بسا، لیکن پھر بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں، پھر بھی تم گناہوں کو نہیں چھوڑتے، پھر بھی اللہ کی نافرمانی پر کمر باندھے ہوئے ہو۔

اپنی جانوں پر رحم کرتے ہوئے یہ کام کرلو

خدا کے لئے اپنی جانوں پر رحم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا سلسلہ شروع کردو۔ اور کون مسلمان ایسا ہے جو یہ نہیں کرسکتا کہ وہ اس مقصد کے لئے دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ کی نیت سے پڑھ لیا کرے۔ دو رکعتیں پڑھنے میں کتنی دیر لگتی ہے، اوسطاً دو رکعت پڑھنے میں دو منٹ لگتے ہیں،

اور دو رکعت کے بعد دعا کرنے میں تین منٹ مزید لگ جائیں گے۔ اپنی اس قوم اور اس ملت کے لئے پانچ منٹ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر دعا مانگنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی تو پھر کس منہ سے کہتے ہو کہ ہمیں قوم میں ہونے والے ان فسادات کی وجہ سے صدمہ اور رنج اور تکلیف ہو رہی ہے۔ لہٰذا جب تک ان فسادات کا سلسلہ جاری ہے، اس وقت تک روزانہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ اور خدا کے لئے اپنے جانوں پر رحم کرتے ہوئے اپنے گھروں سے نافرمانی کے ذرائع اور آلے کو نکال دو اور نافرمانی اور گناہ کے سلسلے کو بند کردو، اور اللہ تعالیٰ کے حضور رو رو کر اور گڑگڑا کر دعا کرو۔

آیتِ کریمہ:

﴿لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾(۱)

کا ختم کرو اور "یَا سَلَامُ" کا ورد کرو اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ فضول تبصروں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس کام میں لگو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

❁❁❁

(۱) الأنبياء: ۸۷

استخارہ کا مسنون طریقہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

”عَنْ مَكْحُوْلٍ الْأَزْدِيِّ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ يَقُوْلُ: إِنَّ الرَّجُلَ يَسْتَخِيْرُ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فَيَخْتَارُ لَهُ، فَيَسْخَطُ عَلٰى رَبِّهِ عَزَّوَجَلَّ، فَلَا يَلْبَثُ أَنْ يَّنْظُرَ فِى الْعَاقِبَةِ فَإِذَا هُوَ خَيْرٌ لَّهُ“(۱)

یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک ارشاد ہے۔ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات انسان اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہے کہ جس کام میں میرے لئے خیر ہو وہ کام ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے وہ کام اختیار فرما دیتے ہیں جو اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے، لیکن ظاہری اعتبار سے وہ کام اس بندہ کی سمجھ میں نہیں آتا تو وہ بندہ اپنے پروردگار پر ناراض ہوتا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے تو یہ کہا تھا کہ میرے لئے اچھا کام تلاش کیجئے، لیکن جو کام ملا وہ تو مجھے اچھا نظر نہیں آ رہا ہے، اس میں تو میرے لئے تکلیف اور پریشانی ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب انجام سامنے آتا ہے تب اس کو پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جو فیصلہ کیا تھا وہی میرے حق میں بہتر تھا۔ اس وقت اس کو پتہ نہیں تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ میرے ساتھ زیادتی اور ظلم ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا صحیح ہونا بعض اوقات دنیا میں ظاہر ہو جاتا ہے اور بعض اوقات آخرت میں ظاہر ہوگا۔

اس روایت میں چند باتیں قابلِ ذکر ہیں، ان کو سمجھ لینا چاہئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے خیر کا فیصلہ فرما دیتے ہیں۔ استخارہ کسے کہتے ہیں؟ اس بارے میں لوگوں کے درمیان طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، عام طور پر لوگ یہ

☆ اصلاحی خطبات (۱۰/ ۱۴۹ تا ۱۶۱) بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم کراچی۔ زیرِ نظر بیان حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ”کتاب الزھد“ کے باب ”باب فی الرضاء والقدر“ کی ایک حدیث کا درس ہے۔

(۱) كتاب الزهد لابن المبارك، باب فى الرضا بالقضاء، رقم: ۱۲۸ (۱/ ۳۳)

سمجھتے ہیں کہ ''استخارہ'' کرنے کا کوئی خاص طریقہ اور خاص عمل ہوتا ہے، اس کے بعد کوئی خواب نظر آتا ہے اور اس خواب کے اندر ہدایت دی جاتی ہے کہ فلاں کام کرو یا نہ کرو۔ خوب سمجھ لیں کہ حضورِ اقدس ﷺ سے ''استخارہ'' کا جو مسنون طریقہ ثابت ہے اس میں اس قسم کی کوئی بات موجود نہیں.

استخارہ کا طریقہ اور اس کی دعا

''استخارہ'' کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ آدمی دو رکعت نفل استخارہ کی نیت سے پڑھے۔ نیت یہ کرے کہ میرے سامنے دو راستے ہیں، ان میں سے جو راستہ میرے حق میں بہتر ہو، اللہ تعالیٰ اس کا فیصلہ فرمادیں۔ پھر دو رکعت پڑھے اور نماز کے بعد استخارہ کی وہ مسنون دعا پڑھے جو حضورِ اقدس ﷺ نے تلقین فرمائی ہے۔ یہ بڑی عجیب دعا ہے، پیغمبر ہی یہ دعا مانگ سکتا ہے، اور کسی کے بس کی بات نہیں، اگر انسان ایڑی چوٹی کا زور لگالیتا تو بھی ایسی دعا کبھی نہ کرسکتا جو نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائی۔ وہ دعا یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِیْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاقْدِرْهُ لِیْ وَیَسِّرْهُ لِیْ ثُمَّ بَارِكْ لِیْ فِیْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاصْرِفْهُ عَنِّیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْهُ وَاقْدِرْ لِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ كَانَ ثُمَّ اَرْضِنِیْ بِهٖ))(۱)

''اے اللہ! میں آپ کے علم کا واسطہ دے کر آپ سے خیر طلب کرتا ہوں اور آپ کی قدرت کا واسطہ دے کر میں اچھائی پر قدرت طلب کرتا ہوں، آپ غیب کو جاننے والے ہیں۔ اے اللہ! آپ علم رکھتے ہیں، میں علم نہیں رکھتا۔ یعنی یہ معاملہ میرے حق میں بہتر ہے یا نہیں، اس کا علم آپ کو ہے مجھے نہیں۔ اور آپ قدرت رکھتے ہیں اور میرے اندر قدرت نہیں۔ یا اللہ! اگر آپ کے علم میں ہے کہ یہ معاملہ (اس موقع پر اس معاملہ کا تصور دل میں لائے جس کے لئے استخارہ کررہا ہے) میرے حق میں

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء عند الإستخارة، رقم: ۵۹۰۳، سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ما جاء فی صلاة الإستخارة، رقم: ۴۴۲، سنن النسائی، کتاب النکاح، باب کیف الإستخارة، رقم: ۳۲۰۱، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب فی الإستخارة، رقم: ۱۳۱۵، سنن ابن ماجه، کتاب اقامة الصلاة والسنة فیها، باب ما جاء فی صلاة الإستخارة، رقم: ۱۳۷۳، مسند أحمد، رقم: ۱۴۱۸۰

بہتر ہے، میرے دین کے لئے بھی بہتر ہے، میری معاش اور دنیا کے اعتبار سے بھی بہتر ہے اور انجام کار کے اعتبار سے بھی بہتر ہے تو اس کو میرے لئے مقدر فرما دیجئے اور اس کو میرے لئے آسان فرما دیجئے اور اس میں میرے لئے برکت پیدا فرما دیجئے۔ اور اگر آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ یہ معاملہ میرے حق میں بُرا ہے، میرے دین کے حق میں برا ہے یا میری دنیا اور معاش کے حق میں برا ہے یا میرے انجام کار کے اعتبار سے برا ہے تو اس کام کو مجھ سے پھیر دیجئے اور مجھے اس سے پھیر دیجئے، اور میرے لئے خیر مقدر فرما دیجئے جہاں بھی ہو۔ یعنی اگر یہ معاملہ میرے لئے بہتر نہیں ہے تو اس کو تو چھوڑ دیجئے اور اس کے بدلے جو کام میرے لئے بہتر ہو اس کو مقدر فرما دیجئے، پھر مجھے اس پر راضی بھی کر دیجئے اور اس پر مطمئن بھی کر دیجئے"

دو رکعت نفل پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر لی تو بس استخارہ ہو گیا۔

استخارہ کا کوئی وقت مقرر نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ استخارہ ہمیشہ رات کو سوتے وقت ہی کرنا چاہئے یا عشاء کی نماز کے بعد ہی کرنا چاہئے۔ ایسا کوئی ضروری نہیں، بلکہ جب بھی موقع ملے اس وقت یہ استخارہ کر لے۔ نہ رات کی کوئی قید ہے، اور نہ دن کی کوئی قید ہے نہ سونے کی کوئی قید ہے اور نہ جاگنے کی کوئی قید ہے۔

خواب آنا ضروری نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ استخارہ کرنے کے بعد خواب آئے گا اور خواب کے ذریعہ ہمیں بتایا جائے گا کہ یہ کام کرو یا نہ کرو۔ یاد رکھئے! خواب آنا کوئی ضروری نہیں کہ خواب میں کوئی بات ضرور بتائی جائے یا خواب میں کوئی اشارہ ضرور دیا جائے، بعض مرتبہ خواب میں آ جاتا ہے اور بعض مرتبہ خواب میں نہیں آتا۔

استخارہ کا نتیجہ

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ استخارہ کرنے کے بعد خود انسان کے دل کا رجحان ایک طرف ہو جاتا ہے، بس جس طرف رجحان ہو جائے وہ کام کر لے، اور بکثرت ایسا رجحان ہو جاتا ہے۔ لیکن بالفرض اگر کسی ایک طرف دل میں رجحان نہ بھی ہو بلکہ دل میں کشمکش موجود ہو تو بھی استخارہ کا مقصد پھر بھی حاصل ہے، اس لئے کہ بندہ کے استخارہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ وہی کرتے ہیں جو اس کے حق

میں بہتر ہوتا ہے۔ اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں پھر وہی ہوتا ہے جس میں بندے کے لئے خیر ہوتی ہے اور اس کو پہلے سے پتا بھی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات انسان ایک راستے کو بہت اچھا سمجھ رہا ہوتا ہے لیکن اچانک رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کو اس بندے سے پھیر دیتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ استخارہ کے بعد اسباب ایسے پیدا فرما دیتے ہیں کہ پھر وہی ہوتا ہے جس میں بندے کے لئے خیر ہوتی ہے۔ اب خیر کس میں ہے، انسان کو پتا نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما دیتے ہیں۔

تمہارے حق میں یہی بہتر تھا

اب جب وہ کام ہو گیا تو اب ظاہری اعتبار سے بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ جو کام ہوا وہ اچھا نظر نہیں آ رہا ہے، دل کے مطابق نہیں ہے، تو اب بندہ اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرتا ہے کہ یا اللہ! میں نے آپ سے مشورہ اور استخارہ کیا تھا مگر کام وہ ہو گیا جو میری مرضی اور طبیعت کے خلاف ہے اور بظاہر یہ کام اچھا معلوم نہیں ہو رہا ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرما رہے ہیں کہ ارے نادان! تو اپنی محدود عقل سے سوچ رہا ہے کہ یہ کام تیرے حق میں بہتر نہیں ہوا، لیکن جس کے علم میں ساری کائنات کا نظام ہے، وہ جانتا ہے کہ تیرے حق میں کیا بہتر تھا اور کیا بہتر نہیں تھا، اس نے جو کیا وہی تیرے حق میں بہتر تھا۔ بعض اوقات دنیا میں تجھے پتا چل جائے گا کہ تیرے حق میں کیا بہتر تھا اور بعض اوقات پوری زندگی میں کبھی پتا نہیں چلے گا، جب آخرت میں پہنچے گا تب وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ واقعۃً یہی میرے لئے بہتر تھا۔

تم بچے کی طرح ہو

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے ایک بچہ ہے جو ماں باپ کے سامنے مچل رہا ہے کہ فلاں چیز کھاؤں گا اور ماں باپ جانتے ہیں کہ اس وقت بچے کا یہ چیز کھانا بچے کے لئے نقصان دہ ہے اور مہلک ہے۔ چنانچہ ماں باپ بچے کو وہ چیز نہیں دیتے۔ اب بچہ اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میرے ماں باپ نے میرے ساتھ ظلم کیا، میں جو چیز مانگ رہا تھا وہ چیز مجھے نہیں دی اور اس کے بدلے میں مجھے کڑوی کڑوی دوا کھلا رہے ہیں۔ اب وہ بچہ اس دوا کو اپنے حق میں خیر نہیں سمجھ رہا ہے لیکن بڑا ہونے کے بعد جب اللہ تعالیٰ اس بچے کو عقل اور فہم عطا فرمائیں گے اور اس کو سمجھ آئے گی تو اس وقت اس کو پتہ چلے گا کہ میں تو اپنے لئے موت مانگ رہا تھا اور میرے ماں باپ میرے لئے زندگی اور صحت کا راستہ تلاش کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں پر ماں باپ سے زیادہ مہربان ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ وہ راستہ اختیار فرماتے ہیں جو انجام کار بندہ کے لئے بہتر ہوتا ہے۔ اب بعض اوقات اس کا بہتر ہونا دنیا میں پتہ چل جاتا ہے اور بعض اوقات دنیا میں پتہ نہیں چلتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحبؒ نے ایک مرتبہ ایک واقعہ سنایا۔ یہ واقعہ میں نے انہیں سے سنا ہے، کہیں کتاب میں نظر سے نہیں گزرا لیکن کتابوں میں کسی جگہ ضرور منقول ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لئے کوہِ طور پر تشریف لے جارہے تھے تو راستے میں ایک شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ حضرت! آپ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لئے تشریف لے جارہے ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوگا اور اپنی خواہشات، اپنی تمنائیں اور اپنی آرزوئیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کا اس سے زیادہ اچھا موقع اور کیا ہوسکتا ہے، اس لئے جب آپ وہاں پہنچیں تو میرے حق میں بھی دعا کردیجئے گا۔ کیونکہ میری زندگی میں مصیبتیں بہت ہیں اور میرے اُوپر تکلیفوں کا ایک پہاڑ ٹوٹا ہوا ہے، فقروفاقہ کا عالم ہے اور طرح طرح کی پریشانیوں میں گرفتار ہوں۔ میرے لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیجئے گا کہ اللہ تعالیٰ مجھے راحت اور عافیت عطا فرمادیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کرلیا کہ اچھی بات ہے، میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔

جاؤ ہم نے اس کو زیادہ دے دی

جب کوہِ طور پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔ ہم کلامی کے بعد آپ کو وہ شخص یاد آیا جس نے دعا کے لئے کہا تھا۔ آپ نے دعا کی، یا اللہ! آپ کا ایک بندہ ہے جو فلاں جگہ رہتا ہے، اس کا یہ نام ہے، اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جب میں آپ کے سامنے حاضر ہوں تو اس کی پریشانی پیش کردوں۔ یا اللہ! وہ بھی آپ کا بندہ ہے، آپ اپنی رحمت سے اس کو راحت عطا فرمادیجئے تاکہ وہ آرام اور عافیت میں آجائے اور اس کی مصیبتیں دور ہوجائیں اور اس کو بھی اپنی نعمتیں عطا فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اے موسیٰ! اس کو تھوڑی نعمت دوں یا زیادہ دوں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوچا کہ جب اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں تو تھوڑی کیوں مانگیں۔ اس لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے فرمایا کہ یا اللہ! جب نعمت دینی ہے تو زیادہ ہی دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جاؤ ہم نے اس کو زیادہ دے دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مطمئن ہوگئے۔ اس کے بعد کوہِ طور پر جتنے دن قیام کرنا تھا قیام کیا۔

ساری دنیا بھی تھوڑی ہے

جب کوہِ طور سے واپس تشریف لے جانے لگے تو خیال آیا کہ جاکر ذرا اس بندہ کا حال دیکھیں کہ وہ کس حال میں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں دعا قبول فرمائی تھی۔ چنانچہ اس کے گھر

جا کر دروازے پر دستک دی تو ایک دوسرا شخص باہر نکلا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے فلاں شخص سے ملاقات کرنی ہے۔ اس نے کہا کہ اس کا تو کافی عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ کب انتقال ہوا؟ اس نے کہا: فلاں دن اور فلاں وقت انتقال ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اندازہ لگایا کہ جس وقت میں نے اس کے حق میں دعا کی تھی اس کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کا انتقال ہوا ہے۔ اب موسیٰ علیہ السلام بہت پریشان ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا اللہ! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی، میں نے اس کے لئے عافیت اور راحت مانگی تھی اور نعمت مانگی تھی، مگر آپ نے اس کو زندگی سے ختم کر دیا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تم سے پوچھا تھا کہ تھوڑی نعمت دیں یا زیادہ دیں؟ تم نے کہا تھا کہ زیادہ دیں۔ اگر ہم ساری دنیا بھی اُٹھا کر دے دیتے تب بھی تھوڑی ہی ہوتی اور اب ہم نے اس کو آخرت اور جنت کی جو نعمتیں دی ہیں ان پر واقعی یہ بات صادق آتی ہے کہ وہ زیادہ نعمتیں ہیں، دنیا کے اندر زیادہ نعمتیں اس کو مل ہی نہیں سکتی تھیں، لہٰذا ہم نے اس کو آخرت کی نعمتیں عطا فرما دیں۔

یہ انسان کس طرح اپنی محدود عقل سے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ وہی جانتے ہیں کہ کس بندے کے حق میں کیا بہتر ہے۔ اور انسان صرف ظاہر میں چند چیزوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو برا ماننے لگتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا کہ کس کے حق میں کیا بہتر ہے۔

استخارہ کرنے کے بعد مطمئن ہو جاؤ

اسی وجہ سے اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرما رہے ہیں کہ جب تم کسی کام کا استخارہ کر چکو تو اس کے بعد اس پر مطمئن ہو جاؤ کہ اب اللہ تعالیٰ جو بھی فیصلہ فرمائیں گے وہ خیر ہی کا فیصلہ فرمائیں گے، چاہے وہ فیصلہ ظاہر نظر میں تمہیں اچھا نظر نہ آ رہا ہو، لیکن انجام کے اعتبار سے وہی بہتر ہو گا۔ اور پھر اس کا بہتر ہونا یا تو دنیا ہی میں معلوم ہو جائے گا ورنہ آخرت میں جا کر تو یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا تھا وہی میرے حق میں بہتر تھا۔

استخارہ کرنے والا ناکام نہیں ہو گا

ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَا خَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ))(۱)

(۱) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، باب الإستخارة (۱/۴۰۰)، كنزالعمال، رقم: ۲۱۵۳۲ (۸۱۳/۷)، المعجم الأوسط، رقم: ۶۸۱۶ (۳۹۴/۱۴)

''جو آدمی اپنے معاملات میں استخارہ کرتا ہو وہ کبھی ناکام نہیں ہوگا اور جو شخص اپنے کاموں میں مشورہ کرتا ہو وہ کبھی نادم اور پشیمان نہیں ہوگا''

کہ میں نے یہ کام کیوں کرلیا یا میں نے یہ کام کیوں نہیں کیا، اس لئے کہ جو کام کیا وہ مشورہ کے بعد کیا اور اگر نہیں کیا تو مشورہ کے بعد نہیں کیا، اس وجہ سے وہ نادم نہیں ہوگا۔ اس حدیث میں یہ جو فرمایا کہ استخارہ کرنے والا ناکام نہیں ہوگا، مطلب اس کا یہی ہے کہ انجام کار استخارہ کرنے والے کو ضرور کامیابی ہوگی، چاہے کسی موقع پر اس کے دل میں یہ خیال بھی آجائے کہ جو کام ہوا وہ اچھا نہیں ہوا، لیکن اس خیال کے آنے کے باوجود کامیابی اسی شخص کو ہوگی جو اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہے۔ اور جو شخص مشورہ کرکے کام کرے گا وہ پچھتائے گا نہیں، اس لئے کہ بالفرض اگر وہ کام خراب بھی ہوگیا تو اس کے دل میں اس بات کی تسلی موجود ہوگی کہ میں نے یہ کام اپنی خودرائی سے اور اپنے بل بوتے پر نہیں کیا تھا بلکہ اپنے دوستوں سے اور بڑوں سے مشورہ کے بعد یہ کام کیا تھا، اب آگے اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے کہ وہ جیسا چاہیں فیصلہ فرمادیں۔ اس لئے اس حدیث میں دو باتوں کا مشورہ دیا ہے کہ جب بھی کسی کام میں کشمکش ہو تو دو کام کرلیا کرو، ایک استخارہ اور دوسرے استشارہ۔ یعنی مشورہ۔

استخارہ کی مختصر دعا

اُوپر استخارہ کا جو مسنون طریقہ عرض کیا، یہ تو اس وقت ہے جب آدمی کو استخارہ کرنے کی مہلت اور موقع ہو، اس وقت تو دو رکعت پڑھ کر وہ مسنون دعا پڑھے۔ لیکن بسا اوقات انسان کو اتنی جلدی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کو پوری دو رکعت پڑھ کر دعا کرنے کا موقع ہی نہیں ہوتا، اس لئے کہ اچانک کوئی کام سامنے آگیا اور فوراً اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس موقع کے لئے خود نبی کریم ﷺ نے ایک دعا تلقین فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے:

((اَللّٰھُمَّ خِرْ لِیْ وَاخْتَرْ لِیْ))(۱)

''اے اللہ! میرے لئے آپ پسند فرمادیجئے کہ مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے''

بس یہ دعا پڑھ لے۔ اس کے علاوہ ایک اور دعا حضور ﷺ نے تلقین فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے:

((اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ وَسَدِّدْنِیْ))(۲)

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب منه، رقم: ۳۴۳۸، کنزالعمال، رقم: ۱۷۱٤۸

(۲) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب التعوذ من شر ما عمل ومن شر ما لم یعمل، رقم: ٤۹۰٤، مسند أحمد، رقم: ۱۲۵۲

''اے اللہ! میری صحیح ہدایت فرمایئے اور مجھے سیدھے راستے پر رکھئے''

اسی طرح ایک اور مسنون دعا ہے:

((اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ))(۱)

''اے اللہ! جو صحیح راستہ ہے وہ میرے دل پر القا فرمادیجئے''

ان دعاؤں میں سے جو دعا یاد آجائے اس کو اسی وقت پڑھ لے۔ اور اگر عربی میں دعا یاد نہ آئے تو اُردو ہی میں دعا کرلو کہ یا اللہ! مجھے یہ کشمکش پیش آگئی ہے آپ مجھے صحیح راستہ دکھا دیجئے۔ اگر زبان سے نہ کہہ سکو تو دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ یا اللہ! یہ مشکل اور یہ پریشانی پیش آگئی ہے، آپ صحیح راستہ دل میں ڈال دیجئے۔ جو راستہ آپ کی رضا کے مطابق ہو اور جس میں میرے لئے خیر ہو۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

میں نے اپنے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ساری عمر یہ عمل کرتے ہوئے دیکھا کہ جب کبھی کوئی ایسا معاملہ پیش آتا جس میں فوراً فیصلہ کرنا ہوتا کہ یہ دو راستے ہیں، ان میں سے ایک راستے کو اختیار کرنا ہے تو آپ اس وقت چند لمحوں کے لئے آنکھ بند کرلیتے، اب جو شخص آپ کی عادت سے واقف نہیں اس کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ آنکھ بند کر کے کیا کام ہو رہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ آنکھ بند کر کے ذرا سی دیر میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیتے اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرلیتے کہ یا اللہ! میرے سامنے یہ کشمکش کی بات پیش آگئی ہے، میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا فیصلہ کروں، آپ میرے دل میں وہ بات ڈال دیجئے جو آپ کے نزدیک بہتر ہو۔ بس دل ہی دل میں یہ چھوٹا سا اور مختصر سا استخارہ ہوگیا۔

ہر کام کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلو

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص ہر کام کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ تمہیں اس کا اندازہ نہیں کہ تم نے ایک لمحہ کے اندر کیا سے کیا کرلیا، یعنی اس ایک لمحہ کے اندر تم نے اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑ لیا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرلیا، اللہ تعالیٰ سے خیر مانگ لی اور اپنے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی جامع الدعوات عن النبی، رقم: ۳۴۰۵

لئے صحیح راستہ طلب کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تمہیں صحیح راستہ مل گیا اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا اجر بھی مل گیا اور دعا کرنے کا بھی اجر وثواب مل گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو بہت پسند فرماتے ہیں کہ بندہ ایسے مواقع پر مجھ سے رجوع کرتا ہے اور اس پر خاص اجر وثواب بھی عطا فرماتے ہیں۔ اس لئے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ صبح سے لے کر شام تک نہ جانے کتنے واقعات ایسے پیش آتے ہیں جس میں آدمی کو کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یہ کام کروں یا نہ کروں۔ اس وقت فوراً ایک لمحہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے رجوع کرلو، یا اللہ! میرے دل میں وہ بات ڈال دیجئے جو آپ کی رضا کے مطابق ہو۔

جواب سے پہلے دعا کا معمول

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی اس سے تخلف نہیں ہوتا کہ جب بھی کوئی شخص آکر یہ کہتا ہے کہ حضرت! ایک بات پوچھنی ہے تو میں اس وقت فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ معلوم نہیں یہ کیا بات پوچھے گا؟ اے اللہ! یہ شخص جو سوال کرنے والا ہے اس کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دیجئے۔ کبھی بھی اس رجوع کرنے کو ترک نہیں کرتا ہوں۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق۔ لہٰذا جب بھی کوئی بات پیش آئے فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلو۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! اپنے اللہ میاں سے باتیں کیا کرو کہ جہاں کوئی واقعہ پیش آئے، اس میں فوراً اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ لو، اللہ تعالیٰ سے رجوع کرلو، اس میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرلو اور اپنی زندگی میں اس کام کی عادت ڈال لو۔ رفتہ رفتہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کردیتی ہے، اور یہ تعلق اتنا مضبوط ہوجاتا ہے کہ پھر ہر وقت اللہ تعالیٰ کا دھیان دل میں رہتا ہے۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ کہاں کروگے وہ مجاہدات اور ریاضتیں جو پچھلے صوفیاء کرام اور اولیاء کرام کرکے چلے گئے، لیکن میں تمہیں ایسے چٹکلے بتادیتا ہوں کہ اگر تم ان پر عمل کرلوگے تو انشاء اللہ جو مقصودِ اصلی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا قائم ہوجانا، وہ انشاء اللہ اسی طرح حاصل ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مشورہ، ایک باعثِ خیر عمل ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! ہر انسان کو اپنی زندگی میں ایسے مرحلے پیش آتے ہیں جن میں اس کو یہ کشمکش ہوتی ہے کہ یہ کام کروں یا نہ کروں؟ یا اس کے سامنے کئی راستے ہوتے ہیں، اب اس کو یہ کشمکش ہوتی ہے کہ کونسا راستہ اختیار کروں؟ حضورِ اقدس نبی کریم ﷺ نے ایسے مواقع کے لئے دو کاموں کی ہدایت دی ہے: ایک استخارہ کرنا، دوسرے مشورہ کرنا۔ استخارہ کا بیان پچھلے جمعہ کو بقدرِ ضرورت الحمدللہ ہوگیا تھا، دوسری چیز جس کا اس حدیث میں بیان ہے، وہ ہے ''مشورہ'' یہ مشورہ بھی دین کا ایک عظیم باب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾(۲)

یعنی ان کے معاملات آپس میں مشورے کے ذریعہ طے کیے جاتے ہیں۔ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں خود حضورِ اقدس ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾(۳)

یعنی آپ صحابہ کرام سے اپنے معاملات میں مشورہ کیا کریں۔ لہٰذا جب نبی کریم ﷺ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا جارہا ہے تو ہم جیسے لوگ تو بطریق اولیٰ مشورہ کے محتاج ہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۲۹ تا ۵۰)، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی۔

(۱) آل عمران: ۱۵۹، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''لہٰذا ان کو معاف کردو، ان کے لئے مغفرت کی دعا کرو، اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ لیتے رہو۔ پھر جب تم رائے پختہ کر کے کسی بات کا عزم کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ یقیناً توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے''

(۲) الشوریٰ: ۳۸ (۳) آل عمران: ۱۵۹

مشورہ کیسے شخص سے کیا جائے؟

لیکن اس مشورے کے سلسلے میں چند باتیں سمجھ لینی ضروری ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ مشورہ ہمیشہ ایسے شخص سے کرنا چاہئے جس کو اس متعلقہ معاملے میں پوری بصیرت حاصل ہو، جب ایسے شخص کے پاس جاکر مشورہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائیں گے، لیکن اگر ہم نے ایسے شخص سے مشورہ کیا جس کو اس معاملے میں کوئی علم اور کوئی بصیرت حاصل نہیں ہے، اولاً تو وہ شخص مشورہ ہی کیا دے گا، اور اگر مشورہ دے گا تو اس مشورے سے فائدہ کیا ہوگا۔ لہٰذا جس شخص سے ہم مشورہ لینے جارہے ہیں، اس کے بارے میں پہلے اچھی طرح معلوم کرلیں کہ وہ مشورہ کا اہل بھی ہے یا نہیں؟ اگر وہ اہل ہو تو اس سے مشورہ لیں، اگر اہل نہ ہو تو اس سے مشورہ لینے سے کچھ حاصل نہیں۔

''جمہوریت'' کی ناکامی

اسلام کے نظامِ حکومت کی ''شورائیت'' میں اور موجودہ دور کی ''جمہوریت'' میں یہی بڑا فرق ہے۔ جمہوریت کا جو نظام اس وقت پوری دنیا میں چھا گیا ہے، اس نظام جمہوریت میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جس سے مشورہ لیا جارہا ہے وہ واقعۃً مشورہ دینے کا اہل بھی ہے یا نہیں؟ اس کو اس معاملے میں بصیرت بھی حاصل ہے یا نہیں؟ دنیا بھر کے اہم معاملات میں مشورہ کرنے کے لئے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ایک جماعت کا انتخاب کرلیا، اس انتخاب کے نتیجے میں ایک سے ایک دنیا پرست، مکار، عیار شخص ووٹ حاصل کرنے کے لئے کھڑا ہوگیا، اور پھر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات شروع ہوئے۔ اب ہر ایک سے یہ پوچھا جارہا ہے کہ تمہارے نزدیک یہ آدمی ٹھیک ہے یا نہیں؟ پھر انتخابات بھی سیاسی جماعتوں کی بنیادوں پر ہونے والے جس میں پارٹی کے منشوروں کی بنیاد پر ووٹ دیئے جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص دیہات کا رہنے والا کاشت کار ہے اور کسان ہے، جو بیچارہ غیر تعلیم یافتہ ہے، وہ ووٹ دینے سے پہلے تمام پارٹیوں کے منشوروں کا مطالعہ کرے، اور پھر یہ فیصلہ کرے کہ کونسی پارٹی ملک کے حق میں مفید ہے، اور پھر اس پارٹی کے نامزد شخص کو ووٹ دے۔ پھر عام طور پر شریف آدمی جس میں ان کاموں کو انجام دینے کی اہلیت ہو، اس کو تو اس میدان میں اُترتے ہوئے بھی گھن آتی ہے کہ گندے تالاب میں کہاں اُتروں!

نا اہلوں کا انتخاب

بہر حال، انتخابات کے نتیجے میں جو لوگ اسمبلی میں پہنچے وہ نا اہل ہونے کے باوجود پوری قوم کے معاملات میں مشورے دیتے ہیں اور پوری قوم ان کے مشوروں پر عمل کرنے کی پابند ہے۔ لہٰذا موجودہ جمہوریت کے نظام میں اہلیت کا کوئی معیار نہیں، نہ ووٹ دینے والے میں اہلیت کا کوئی معیار ہے اور نہ منتخب ہونے والے میں اہلیت کا کوئی معیار ہے، بس اتنا معیار ہے کہ اس کی عمر ۱۸ سال یا ۲۱ سال ہو اور اس کا نام ووٹر لسٹ کے اندر درج ہو، بس یہ اہلیت ہے۔ اب یہ دیکھنا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے یا نہیں؟ قوم کے معاملات کو سمجھنے کی بصیرت رکھتا ہے یا نہیں؟ اس کا کوئی معیار نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگوٹھا چھاپ لوگ منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچ جاتے ہیں۔

''جمہوریت'' اور ''شورائیت'' کا فرق

اسلام میں ''شورائیت'' ضرور ہے، لیکن مجلسِ شوریٰ کے لئے معیارِ اہلیت ہے، یعنی ایسے شخص سے مشورہ کرو جو اس کام کی اہلیت رکھتا ہے اور اس کی بصیرت رکھتا ہے۔ اسلام کی ''شورائیت'' اور موجودہ مغربی جمہوریت میں یہی بڑا فرق ہے، جمہوریت میں اکثریت کی بنیاد پر فیصلے ہوتے ہیں، جبکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ﴾(۱)

اگر آپ زمین کے رہنے والوں میں سے اکثر کی اتباع کرو گے تو وہ اللہ کے راستے سے تم کو گمراہ کر دیں گے۔ لہٰذا جب کسی کے پاس مشورہ کے لئے جاؤ تو پہلے یہ دیکھو کہ اس شخص کو اس معاملے میں بصیرت حاصل ہے یا نہیں؟

فن کے ماہر سے مشورہ کرو

مثلاً بعض لوگ مجھ سے مشورہ کرتے ہیں کہ فلاں بیماری میں مبتلا ہوں، آپ مشورہ دیجئے کہ کس طرح اس کا علاج کراؤں اور کس سے کراؤں؟ اب میں بیماری کو اور اس کے علاج کو کیا جانوں۔ بھائی! کسی طبیب اور ڈاکٹر کے پاس جاؤ، اگر اس بارے میں مجھ سے مشورہ کرو گے تو اس سے کیا حاصل ہوگا! جو شخص وہ کام جانتا نہ ہو تو وہ اس کے بارے میں کیا مشورہ دے گا۔ یاد رکھو! مشورہ ہمیشہ اس شخص سے لو جو اس کام کا اہل ہو۔ میرے پاس روزانہ بے شمار لوگوں کے خط اور فون آتے ہیں کہ ہم

(۱) الانعام: ۱۱۶

نے یہ خواب دیکھا ہے، آپ اس کی تعبیر بتا دیجئے، حالانکہ مجھے ساری عمر خواب کی تعبیر سے مناسبت نہیں ہوئی۔

لوگ میرے پاس آتے ہیں کہ فلاں کام کے لئے تعویذ دے دیجئے اور مجھے تعویذ بنانا نہیں آتا۔ بھائی! جس آدمی کے پاس اس کام کی اہلیت نہ ہو، اس کے پاس اس کام کے لئے کیوں جاتے ہو؟ ہر شخص سے وہ کام لو جس کام کی اہلیت اللہ تعالیٰ نے اس کو دی ہے۔

دین کے معاملات میں علماء سے مشورہ کریں

بہر حال، مشورہ کے لئے سب سے پہلا کام صحیح آدمی کی تلاش ہے۔ بعض اوقات دین کے معاملات میں لوگ ایسے لوگوں کے پاس مشورے کے لئے چلے جاتے ہیں جن کو دین کا علم نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس سے مشورہ لیا گیا اس نے غلط جواب دے دیا اور سوال کرنے والے نے اس پر عمل شروع کر دیا، خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسرں کو بھی گمراہ کیا۔ مشورہ میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ جس سے مشورہ لیا جارہا ہے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ اب بہت سے لوگ میرے پاس تجارت کے بارے میں مشورہ کرنے کے لئے آجاتے ہیں کہ یہ تجارت کریں یا فلاں تجارت کریں۔ اب مجھے کیا معلوم کہ تجارت کیا ہوتی ہے اور کس کے لئے کون سی تجارت مفید ہے۔

مشورہ کے لئے اہلیت کی ضرورت

لہٰذا مشورہ کرنے سے پہلے اس کے اندر اہلیت دیکھو کہ یہ شخص اس بارے میں مشورہ دینے کا اہل ہے یا نہیں؟ اگر انجینئرنگ کا کوئی کام ہو اور وہ مشورہ کرنے کے لئے ڈاکٹر کے پاس چلا جائے، اور جب گھر میں کوئی بیمار ہو جائے تو اس کے بارے میں مشورہ کرنے کے لئے انجینئر کے پاس چلا جائے، اب بتایئے وہ شخص احمق ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح جب دین کے معاملات میں کسی سے مشورہ لینے کے لئے جاؤ تو پہلے یہ دیکھو کہ جس سے مشورہ لے رہا ہوں ہو مستند عالم دین ہے یا نہیں؟ آج ہمارا پورا معاشرہ اس گمراہی کے اندر مبتلا ہے کہ دین کے معاملات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور مشورے کے لئے ایسے لوگوں کے پاس چلے جاتے ہیں جن کے پاس دین کا کما حقہ علم نہیں ہوتا، مثلاً کسی کے بارے میں یہ سن لیا کہ وہ بڑی کچھے دار تقریر کرتے ہیں، یا کسی کو دیکھ لیا کہ ان کا حلیہ بڑا بزرگانہ اور دیندارانہ ہے، بس ان سے دین کے بارے میں مشورے شروع کر دیئے اور ان سے فتوے پوچھنے شروع کر دیئے۔ یاد رکھئے! مشورے کے لئے غلط آدمی کا انتخاب انسان کو غلط راستے پر ڈال دیتا ہے۔

کن معاملات میں مشورہ کیا جائے؟

مشورے کے بارے میں دوسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ مشورہ کس چیز کے بارے میں کیا جائے؟ جو کام شریعت نے فرض قرار دے دیئے ہیں یا جو کام واجب قرار دے دیئے ہیں یا حرام کر دیئے ہیں تو ایسے تمام کام مشورے کا محل نہیں ہیں، لہٰذا ان کے بارے میں مشورہ نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے فرض و واجب قرار دے کر کرنے کا حکم دے دیا، وہ تو کرنے ہی ہیں، اور جن کاموں کو حرام قرار دے کر ان سے روک دیا، ان سے تو ضرور رکنا ہی ہے، ان میں مشورے کا کیا سوال؟ مثلاً کوئی شخص یہ مشورہ کرے کہ نماز پڑھوں یا نہ پڑھوں، یا یہ مشورہ کرلے کہ شراب پیوں یا نہ پیوں؟ ظاہر ہے کہ ان کے بارے میں مشورہ کرنا حماقت ہے، کیونکہ یہ کام مشورے کے محل ہی نہیں ہیں۔

''مشیر'' کا پہلا فرض: اہلیت ہونا

تیسری بات یہ ہے کہ جس شخص سے مشورہ لیا جارہا ہے اس کے کچھ فرائض ہیں۔ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ))(۱)

''جس شخص سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے''

یہ مشورہ لینا ایسا ہے جیسے دوسرے کے پاس امانت رکھوادی۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرے اور خیانت نہ کرے، لہٰذا جس شخص سے مشورہ لیا جارہا ہے اگر اس کو اس معاملے میں بصیرت حاصل نہیں ہے، تو اس کو صاف صاف کہہ دینا چاہئے کہ مجھے اس بارے میں بصیرت حاصل نہیں ہے، اس لئے میں اس سلسلے میں مشورہ دینے کا اہل نہیں ہوں۔ لیکن آج کل اگر کسی سے کسی معاملے میں مشورہ لیا جائے تو چاہے اس کو اس معاملے میں بصیرت ہو یا نہ ہو، لیکن کچھ نہ کچھ جواب اور مشورہ ضرور دے دیتے ہیں۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ وہ کہہ دے کہ یہ مشورہ دینا امانت کی بات ہے، اور میں اس کا اہل نہیں، لہٰذا مشورہ لینے کے لئے ایسے آدمی کے پاس جاؤ جو مشورہ دینے کا اہل ہو۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الأدب، باب إن المستشار مؤتمن، رقم: ۲۷۴۷، سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی المشورة، رقم: ٤٤٦۳، سنن ابن ماجه، کتاب الأدب، باب المستشار مؤتمن، رقم: ۳۷۳۵، مسند أحمد، رقم: ۲۱۳۲۶، سنن الدارمی، کتاب السیر، باب فی المستشار مؤتمن، رقم: ۲۳٤۱

دوسرا فرض: امانت داری

اور اگر آپ کے اندر اہلیت ہے تو پھر مشورہ لینے والے کی پوری خیر خواہی مدِنظر رکھتے ہوئے اس کے مناسب جو مشورہ ذہن میں آئے، دیانت داری کے ساتھ اس کے سامنے بیان کر دے، اس مشورہ دینے میں اس بات کی پرواہ نہ کرے کہ اگر میں اس کو یہ مشورہ دوں گا تو شاید اس کا دل ٹوٹ جائے گا یا یہ مجھ سے ناراض اور رنجیدہ ہو جائے گا، کیونکہ جب اس نے مشورہ طلب کیا ہے تو اب اس کو وہ بات بتاؤ جو تمہارے نزدیک دیانتدارانہ طور پر اس کے حق میں خیر خواہی کی ہو، یہ نہ ہو کہ اس کو راضی اور خوش کرنے کے لئے اس کو غلط مشورہ دے دیا تاکہ وہ خوش ہو کر چلا جائے، چاہے وہ بعد میں گڑھے میں جا گرے اس کی پرواہ نہیں، یہ بات درست نہیں۔

مثلاً میرے پاس بعض لوگ کتاب لکھنے کے بارے میں مشورہ لینے کے لئے آتے ہیں۔ اب بظاہر اس کی دلداری کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور کتاب لکھنے پر اس کو مبارکباد دی جائے، لیکن جب یہ دیکھا کہ یہ شخص کتاب لکھنے کا اہل نہیں ہے تو اس کو نرمی سے اور پیار سے سمجھا دیا کہ یہ کتاب لکھنا آپ کا کام نہیں، یہ آپ کا میدان نہیں ہے، آپ کوئی اور کام کریں۔ لہٰذا اس کے مناسب مشورہ یہی تھا، اب چاہے اس مشورے سے ناراض ہو یا خوش ہو۔

مشورہ دینے میں ضرورۃً غیبت جائز ہے

یا مثلاً کسی شخص نے رشتہ مانگنے کا مشورہ لیا کہ فلاں جگہ رشتہ کروں یا نہ کروں۔ اس وقت آپ کے نزدیک اس کے حق میں جو خیر خواہی کی بات ہو وہ بتادو، چاہے وہ راضی ہو چاہے ناراض ہو۔ اس کے بارے میں جتنی معلومات حاصل ہیں وہ بتادو۔ یہ وہ چیز ہے کہ اس میں شریعت نے ''غیبت'' کو بھی معاف کیا ہے، مثلاً رشتہ کے معاملے میں کوئی شخص آپ سے مشورہ کر رہا ہے اور آپ کے علم میں اس کی کوئی بات خرابی اور عیب کی ہے اور آپ نے اس مشورہ لینے والے کو بتادیا کہ اس کے اندر یہ خرابی ہے تو اس سے غیبت کا گناہ نہیں ہوگا، کیونکہ جو مشورہ لے رہا ہے اس کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو صحیح بات بتادی جائے، یہ نہ سوچے کہ اگر میں اس کو بتادوں گا تو فلاں شخص ناراض ہو جائے گا، اس سے دشمنی کھڑی ہو جائے گی، اور اس وجہ سے خاموش رہے، یہ بات ٹھیک نہیں۔

بلکہ اس کو بتادے اور اس سے یہ بھی کہہ دے کہ میں آپ کی خیر خواہی کے تحت آپ کو بتا رہا ہوں، لیکن اگر اس کو علم ہو گیا کہ یہ بات میں نے بتائی ہے تو اس کو صدمہ ہوگا، لہٰذا آپ اس کو نہ بتائیں۔ حدیث کے الفاظ ((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ)) کے یہ معنی ہیں یعنی جس سے مشورہ لیا گیا ہے، وہ

امانت دار ہے، اور امانت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صحیح مشورہ دے۔

''مشیر'' کا تیسرا فرض: راز داری

اور ((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ)) کا ایک مطلب اور بھی ہے، وہ یہ کہ جو شخص تمہارے پاس مشورہ لینے کے لئے آیا ہے اس نے تمہیں اپنا ہمراز بنایا ہے، اپنے دل کی بات اس نے تم سے کہہ دی ہے، اپنی مشکل تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔ اب یہ تمہارے اور اس کے درمیان راز داری کا معاملہ ہو گیا، تم اس کے امانت دار ہو، یہ نہ ہو کہ وہ تو آپ سے مشورہ لینے آیا اور اس نے اپنی کوئی الجھن آپ کے سامنے پیش کی، اب آپ نے ساری دنیا میں اس کو لوگوں کے سامنے گانا شروع کر دیا کہ فلاں شخص تو یہ بات کہہ رہا تھا، یا اس کے اندر تو یہ خرابی ہے۔ بھائی! جب اس نے تم سے مشورہ لیا ہے اور تمہیں اپنا ہمراز بنایا ہے تو اس کے راز کو راز رکھنا تمہارا فرض ہے، وہ تمہارے پاس امانت ہے، اب اس مشورے کی بات کو دوسرں سے ذکر کرنا راز کا افشاء کرنا ہے، جو گناہ ہے اور ایک مسلمان کو رُسوا کرنا ہے۔

مثلاً کوئی شخص اپنی کسی بیماری کے سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنے آیا، آپ نے اس کو مشورہ دے دیا، تو اب اس بات کو اپنے سینے میں محفوظ رکھو، اپنے اور اس کے درمیان محدود رکھو، کسی اور سے اس کا ذکر نہ کرو، کیونکہ وہ مشورہ تمہارے پاس اس کی امانت ہے، اس امانت کے اندر اگر تم خیانت کرد گے تو بہت بڑی خیانت ہوگی اور بہت بڑا گناہ ہوگا۔

راز فاش کرنا گناہ ہے

آج کل ہمارے معاشرے میں اس بارے میں کتنی خرابی پائی جاتی ہے اور مشورہ لینے دینے میں ان باتوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ بیچارہ ایک شخص آپ کو خیر خواہ سمجھ کر آپ سے مشورہ لینے کے لئے آیا تھا، تم نے اس کا راز افشاء کرنا شروع کر دیا، حالانکہ اسی کے نتیجے میں جھگڑے، فسادات اور دشمنیاں پھیلتی ہیں، اور پھر آپس میں ناچاقیاں ہو جاتی ہیں۔ حضورِ اقدس ﷺ نے ((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ)) کہہ کر ان تمام چیزوں کا دروازہ بند کر دیا۔

چوتھا فرض: صحیح مشورہ دینا

پھر جانتے بوجھتے غلط مشورہ دینا، یعنی آپ جانتے ہیں کہ جو مشورہ میں دے رہا ہوں وہ صحیح نہیں، لیکن اس کی بدخواہی کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے آپ نے اس کو غلط مشورہ دے دیا تو اس کے بارے میں حدیث شریف میں فرمایا کہ جس شخص سے دوسرے بھائی نے مشورہ کیا اور اس نے اس کو

غلط مشورہ دے دیا تو فرمایا:

((فَقَدْ خَانَهُ))

''اس نے اس کی امانت میں خیانت کی''(۱)

یہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص تمہارے پاس امانت کے طور پر پیسے رکھوائے اور تم ہڑپ کر جاؤ، جیسے ان پیسوں کو ہڑپ کرنا حرام ہے اسی طرح یہ بھی حرام ہے۔

''مشیر'' کا عمر میں بڑا ہونا ضروری نہیں

مشورے کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ مشورے کے اندر اہلیت تو دیکھنی چاہئے، لیکن اس میں چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں ہے، یعنی مشورہ کرنے والا یہ نہ سوچے کہ میں بڑا ہوں، چھوٹے سے کیا مشورہ کروں، بلکہ جو بھی اہلیت رکھنے والا ہو اس سے مشورہ کرو۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے وصیت کرتے ہوئے فرمایا کہ جب تک تمہارے ضابطے کے بڑے دنیا میں موجود ہوں اس وقت تک اپنے بڑوں سے مشورہ کرو، ضابطے کے بڑے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حقیقت میں کون بڑا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

بزرگی بعلم است نہ بسال

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی عمر میں بڑا ہے لیکن درجے میں چھوٹا ہے، اور ایک شخص عمر میں کم ہے لیکن درجے میں بڑا ہے۔

بڑے آپ، عمر میری زیادہ

ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ اگرچہ رشتے میں آپ کے چچا تھے لیکن عمر میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: چچا جان! میں بڑا ہوں یا آپ بڑے ہیں؟ مقصد یہ تھا کہ کس کی عمر زیادہ ہے؟ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کیا خوبصورت جواب دیا۔ فرمایا کہ بڑے تو آپ ہی ہیں، عمر میری زیادہ ہے(۲)

بہرحال، عمر میں بڑا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان درجے میں بھی بڑا ہو، چھوٹے کا علم

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب العلم، باب التوقي في الفتيا، رقم: ۳۱۷۲، مسند أحمد، رقم: ۷۹۱۸

(۲) قيل للعباس بن عبد المطلب: أيما أكبر أنت أم النبي صلى الله عليه وسلم؟ فقال: "هو أكبر مني وأنا ولدت قبله" كنز العمال، رقم: ۳۷۳٤۸ (۱۳/٤٦۸)، مصنف ابن أبي شيبة (۸/٤۸)، المستدرك للحاكم، رقم: ٥٤۰٥ (۱۲/۳۲٥)

زیادہ ہوسکتا ہے، چھوٹے کا تقویٰ زیادہ ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں چھوٹے کی فضیلت زیادہ ہوسکتی ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "ضابطے کے بڑے" اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حقیقت میں کون بڑا ہے، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے، لیکن ضابطے میں اللہ تعالیٰ نے جس کو بڑا بنایا ہے جیسے بیٹے کے لئے باپ، شاگرد کے لئے استاد، مرید کے لئے شیخ، چھوٹے بھائی کے لئے بڑا بھائی، یہ ضابطے کے بڑے ہیں، جب تک یہ زندہ ہوں ان سے مشورہ کرو۔

ہم عمروں اور چھوٹوں سے مشورہ

پھر فرمایا: جب ضابطے کے بڑے موجود نہ رہیں تو اپنے برابر کے لوگوں سے مشورہ کرو، اور جب اپنے برابر کے لوگ بھی موجود نہ رہیں تو اپنے چھوٹوں سے مشورہ کرو۔ اور یہ دیکھئے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جارہا ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾(۱)

اب ظاہر ہے کہ آپ سے درجے میں کوئی دوسرا شخص تو بڑا ہو سکتا نہیں، لیکن آپ سے کہا جارہا ہے کہ آپ صحابہ کرام سے مشورہ کریں۔ اس کے ذریعہ یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ بڑے کو بھی اپنے آپ کو مشورے سے بے نیاز نہیں سمجھنا چاہئے، چاہے چھوٹوں سے مشورہ کرنا پڑے، لیکن پھر بھی مشورہ کرے۔ مشورے میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے۔ لہٰذا مشورہ لیتے وقت یہ نہ دیکھو کہ جس سے میں مشورہ لے رہا ہوں یہ بڑا ہے یا چھوٹا ہے۔

صلح حدیبیہ کا واقعہ

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ چھوٹا بھی ایسا مشورہ دے دیتا ہے کہ بڑے کے ذہن میں وہ بات نہیں آتی۔ دیکھئے! صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، مقام ذوالحلیفہ سے احرام باندھا، اور جب مکہ مکرمہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مشرکین مکہ نے آپ کو اور صحابہ کرام کو روک دیا اور کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اب صحابہ کرام عمرہ ادا کرنا چاہتے ہیں، اور احرام باندھ کر آئے ہوئے ہیں، جب کفارِ مکہ نے عمرہ کرنے سے روک دیا تو صحابہ کرام کو غصہ آگیا کہ یہ لوگ عمرہ کی عبادت ادا کرنے میں رکاوٹ بن رہے ہیں، بالآخر مذاکرات ہوئے اور مذاکرات کے نتیجے میں صلح ہوگئی، اور صلح اس بات پر ہوئی کہ اس مرتبہ تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام واپس مدینہ منورہ چلے جائیں، اس مرتبہ

(۱) آل عمران: ۱۵۹

عمرہ نہیں کریں گے اور آئندہ سال اس عمرے کی قضا کریں گے۔

اب بظاہر کفارِ قریش کا یہ مطالبہ بالکل غلط تھا، کیونکہ یہ حضرات حرم کے دروازے تک پہنچے ہوئے ہیں، پھر بھی ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہیں سے واپس چلے جائیں اور آئندہ سال عمرہ ادا کرنے کے لئے آئیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی شرائط تھیں جو بظاہر مسلمانوں کے لئے دبی ہوئی شرائط تھیں، لیکن چونکہ حضورِ اقدس ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی حکم تھا کہ اس وقت ان کی یہ شرائط مان لی جائیں اگرچہ مسلمانوں کے لئے وہ دبی ہوئی شرائط ہیں، چنانچہ مسلمانوں نے مان لیں، اس مان لینے میں بھی بہت سی حکمتیں تھیں۔

چونکہ حضورِ اقدس ﷺ اور صحابہ کرام حالتِ احرام میں تھے، اس لئے یہاں سے شریعت کا یہ مسئلہ سامنے آیا کہ جب کوئی احرام باندھ کر آئے اور پھر اس کے لئے عمرہ کرنا ممکن نہ رہے اور کوئی دشمن روک دے تو اس وقت اس کو کیا کرنا چاہئے اور کس طرح احرام کھولنا چاہئے؟ اس وقت قرآن کریم کے ذریعہ یہ حکم نازل ہوا کہ اگر یہ صورت پیش آئے تو ایک جانور قربان کرنے کے لئے حرم بھیج دو، جس وقت وہ جانور حرم میں ذبح ہو جائے اس وقت محرم اپنے سر کے بال منڈوا کر احرام کھول دے۔ چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ سب اپنے اپنے جانور حرم بھیج دیں اور جانور ذبح ہو جانے کے بعد احرام کھول دیں۔ صحابہ کرام نے جانور بھیج دیئے اور ان کی قربانی ہوگئی۔

پھر حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ اپنے سر منڈوا دو اور احرام کھول دو، تاکہ پھر مدینہ منورہ واپس چلیں۔ لیکن صحابہ کرام میں سے کوئی بھی اس کام کے لئے آگے نہیں بڑھا۔ شاید پوری سیرتِ طیبہ کے دور میں یہ ایک واقعہ ایسا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام کو کسی کام کا حکم دیا اور صحابہ کرام اس کے لئے آگے نہیں بڑھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ صحابہ کرام کی طبیعت میں یہ جوشیلے جذبات تھے کہ اگر ہم چاہیں تو قریشِ مکہ کو مزہ چکھا دیں اور ان پر حملہ کر کے زبردستی عمرہ کر لیں۔ اس قسم کے جذبات کی وجہ سے آپ کا حکم ماننے کے لئے اور احرام کھولنے اور سر منڈوانے کے لئے کوئی بھی آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے دوبارہ صحابہ کرام کو حکم دیا کہ سر منڈوا کر احرام کھول دیں، لیکن پھر بھی کوئی اس کام کے لئے آگے نہیں بڑھا۔ یہ وہ صحابہ ہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر کفار کی طرف سے بات چیت کرنے کے لئے جو ایلچی آیا تھا، اس نے واپس جا کر لوگوں کو بتایا کہ میں نے صحابہ کرام کا عجیب منظر دیکھا، وہ یہ کہ جب حضورِ اقدس ﷺ وضو فرماتے ہیں تو وضو کا پانی ابھی زمین پر نہیں گرتا کہ اس سے پہلے ہی صحابہ کرام اس کو لے کر اپنے جسموں پر مل لیتے ہیں، اور آپ کا تھوک زمین پر نہیں گرتا، بلکہ صحابہ کرام آگے بڑھ کر اس کو اپنے جسم پر مل لیتے ہیں، ایسے فداکار صحابہ کرام ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ ان سے احرام کھولنے کے لئے فرما رہے ہیں لیکن احرام کھولنے کے

لئے کوئی آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ کرنا

اس کے بعد آپؐ اپنے خیمے کے اندر تشریف لے گئے۔ آپ کی زوجۂ مطہرہ اور اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں آپ کے ساتھ تھیں، آپ نے جاکر ان سے فرمایا کہ آج میں نے عجیب معاملہ دیکھا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا، یہ وہ لوگ ہیں جو میرے ایک اشارے پر جان چھڑکنے کے لئے تیار ہیں، لیکن آج میں نے دو مرتبہ احرام کھولنے کے لئے کہا لیکن کوئی بھی احرام کھولنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ گویا کہ آپ نے اس بارے میں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ حالانکہ وہ آپ سے چھوٹی ہیں، ان کو آپ سے کیا نسبت؟ لیکن چونکہ مشورہ کا حکم ہے اس لئے ان سے مشورہ کیا۔ بہرحال! حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیتے ہوئے فرمایا کہ یا رسول اللہ! یہ حضرات صحابہ جذبات اور جوش کے عالم میں مغلوب ہیں، اس لئے آپ ان کے اس طرزِ عمل کا خیال مت کیجئے، کیونکہ ان کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں، اور بار بار ان کو کہنے کی ضرورت نہیں، البتہ آپ ایک کام کیجئے! وہ یہ کہ آپ باہر تشریف لے جائیں اور خود اپنا سر منڈوا کر اپنا احرام کھول دیں، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

اس مشورے کا نتیجہ

آپ نے ان سے فرمایا کہ تم نے بہت اچھا مشورہ دیا۔ چنانچہ آپ خیمے سے باہر تشریف لے گئے، اور ایک صحابی کو بلا کر خود حلق کرانا شروع کر دیا، بس آپ کے حلق کرانے کی دیر تھی کہ صحابہ کرام نے ایک دوسرے کے سر حلق کرنے شروع کر دیئے اور احرام کھولنا شروع کر دیا، اور یہ سوچا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھول دیا تو ہم آپ سے زیادہ غیرت کرنے والے کون ہیں۔(۱)

اب دیکھئے کہ یہ مشورہ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے دیا۔ چنانچہ انہی حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ عاقلات میں سے تھیں، یعنی ان خواتین میں سے تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عقل اور فہم و فراست کا اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا، اور یہ مشورہ ان کے اعلیٰ فہم کی دلیل ہے، اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نفسیات کو سمجھتی تھیں کہ جب یہ حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی کام کرتا ہوا دیکھیں گے تو پھر ان سے نہیں رہا جائے گا بلکہ فوراً آپ کی اتباع میں وہ کام کرنا شروع کر دیں گے۔

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب الشروط في الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب، رقم: ۲۵۲۹، مسند أحمد، رقم: ۱۸۱۶۶، جامع الأصول من أحاديث الرسول، رقم: ۶۱۰۸ (۶۱۸۳/۱)

بہرحال! حضور اقدس ﷺ نے اپنے سے چھوٹے سے مشورہ کیا۔ اور حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے ذہن میں وہ بات آگئی جو ابتداءً حضور اقدس ﷺ کے ذہن میں نہیں آئی۔ بہرحال! اس واقعے سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ چھوٹے سے مشورہ کرنا بھی شریعت کا تقاضا ہے۔ اور بعض اوقات اللہ تعالیٰ چھوٹے کے دل میں وہ بات ڈال دیتے ہیں جو بڑوں کے دل میں بھی نہیں آتی۔ نہ جانے کتنے مواقع پر حضور اقدس ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ لہٰذا چھوٹے سے مشورہ کرتے ہوئے عار اور شرم محسوس نہیں کرنی چاہئے۔

جذبات کی تسکین کا نام ''دین'' نہیں ''دین'' اتباع کا نام ہے

حدیبیہ کے اس واقعہ سے ایک دوسرا بڑا عظیم الشان سبق بھی ملتا ہے، وہ یہ کہ اپنے جذبات کی تسکین کا نام ''دین'' نہیں ہے، اپنے جوش کو ٹھنڈا کرنے کا نام ''دین'' نہیں ہے، بلکہ دین درحقیقت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کی اتباع کا نام ہے، خواہ جذبات کچھ بھی ہوں، مگر اس وقت میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کا جو مطالبہ ہے وہ کرو، یہی دین ہے۔ اب دیکھئے! صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کرام کے جذبات تو یہ تھے کہ کفار سے مقابلہ ہو جائے اور ہم بزدلی میں مبتلا ہو کر ان کی دبی ہوئی شرائط کو کیوں مانیں؟ لیکن جب حضور اقدس نبی کریم ﷺ کا عمل دیکھا تو سارے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔

لیڈر اور قائد کیسا ہو

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ بڑی پیاری بات فرمایا کرتے تھے، وہ یہ کہ لیڈر اور قائد وہ ہوتا ہے جو عوام کو جس طرح جوش دلا کر چڑھائے، اسی طرح ان کا جوش اُتار بھی سکے، یہ نہ ہو کہ بانس پر چڑھا تو دیا لیکن جب اُتارنے کا وقت آیا تو خود بے قابو ہو گئے۔ عوام کے اندر جوش و خروش پیدا کر دیا، اور اس کے نتیجے میں لوگ قابو سے باہر ہو گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر قائد عوام کے پیچھے چلتا ہے، اور عوام جو کہتی ہے وہی وہ کرتا ہے، حالانکہ قائد کا کام تو رہنمائی کرنا ہے، اگر لوگ غلط راستے پر جا رہے ہیں تو ان کی رہنمائی کرے۔ لہٰذا قائد وہ ہے جو عوام کو جوش دلا کر چڑھائے تو اُتار بھی سکے۔

قائد ہو تو ایسا......

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں حضور اقدس ﷺ نے جذبۂ جہاد پیدا فرمایا، لیکن جب جہاد کا

موقع نہیں تھا جیسے صلح حدیبیہ کے موقع پر تو پھر ان کو اس طرح اُتار دیا کہ ایک صحابی نے بھی اس موقع پر ایک تلوار نہیں لہرائی۔ اس سے پتہ چلا کہ دین درحقیقت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کی اتباع کا نام ہے، اس وقت مجھ سے اللہ کے رسول ﷺ کا کیا مطالبہ ہے؟ اس مطالبے کو پورا کرنے کا نام دین ہے، اپنے جذبات اور اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے کہا وہ کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا نمونہ بن کر دکھا دیا کہ جب غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد میں فدا کاری اور جانثاری کا موقع آیا تو وہاں پہاڑوں کی مانند ڈٹ گئے، اور جہاں پیچھے ہٹنے کا موقع آیا جیسے صلح حدیبیہ پر تو وہاں پر حضور اقدس ﷺ کے حکم کے عین مطابق پیچھے ہٹ گئے۔ اسی کا نام دین ہے۔ بہر حال! بات یہ چل رہی تھی کہ مشورہ چھوٹوں سے بھی ہوتا ہے۔

مشورہ پر عمل ضروری نہیں

مشورہ کے بارے میں ایک اور مسئلہ سنئے! وہ یہ کہ مشورہ لینے کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ مشورہ لینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک صاحبِ بصیرت شخص کی رائے سامنے آجائے، لیکن جس نے مشورہ لیا ہے وہ آپ کے مشورے پر عمل کرنے کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کو اختیار ہے، اگر اس کے دل میں وہ مشورہ اُتر جائے تو اس پر عمل کرے، اور اگر اس کے دل میں یہ خیال آرہا ہے کہ یہ مشورہ تو مناسب معلوم نہیں ہو رہا ہے تو اس مشورے پر عمل نہ کرے، شرعی اعتبار سے اس کو اختیار ہے۔ اب مثلاً فرض کریں کہ آپ نے کسی کو کسی بات پر مشورہ دیا اور اس نے اس مشورے پر عمل نہیں کیا تو اس میں ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں کہ اس نے ہماری بات نہیں رکھی اور ہماری بات نہیں مانی یا ہمارا مشورہ قبول نہیں کیا، اس لئے کہ مشورہ کا مقصد تو آپ کی رائے معلوم کرنی تھی، وہ معلوم ہوگئی، اب اس کو اختیار ہے چاہے اس مشورے پر عمل کرے اور چاہے عمل نہ کرے۔

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ

حضور اقدس ﷺ سے زیادہ کون اس دنیا میں صاحب الرائے ہوگا، لیکن ایک صحابیہ تھیں حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا، یہ پہلے باندی تھیں، بعد میں مسلمان ہوگئی تھیں، ان کے آقا نے ان کا نکاح حضرت مغیث رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا۔ شریعت کا اصول یہ ہے کہ جب کوئی عورت کسی کی باندی ہو تو آقا اس کا ولی اور سرپرست ہوتا ہے، اور آقا کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنی باندی کا جس سے چاہے نکاح کر دے، وہ باندی منع نہیں کر سکتی۔ بہر حال! آقا نے ان کا نکاح کر دیا، اور کچھ عرصہ کے بعد آقا نے ان کو آزاد کر دیا۔ اور شریعت کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اگر باندی آزاد کر دی جائے اور آقا نے اس کا نکاح پہلے کسی سے کر رکھا

ہو تو باندی کو آزادی کے بعد اختیار ملتا ہے کہ چاہے اس نکاح کو برقرار رکھے یا چاہے تو ختم کر دے۔ چنانچہ جب حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا آزاد ہوئیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کا یہ حکم حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو بتا دیا کہ اب تمہیں اختیار ہے کہ چاہو تو اپنے شوہر کے نکاح میں رہو اور چاہو تو علیحدگی اختیار کرلو۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا اپنے شوہر سے خوش نہیں تھیں، اس لئے انہوں نے علیحدگی اختیار کرنے کا ارادہ کرلیا۔ ان کے شوہر حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کو ان سے بہت محبت تھی، وہ یہ چاہتے تھے کہ حضرت بریرہ اس نکاح کو ختم نہ کریں بلکہ باقی رکھیں۔

حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کی حالتِ زار

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ منظر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں حضرت مغیث رضی اللہ عنہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے جا رہے ہوتے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے تھے، اور ان سے کہہ رہے ہوتے تھے کہ خدا کے لئے میرے ساتھ نکاح کو ختم نہ کریں۔ لیکن حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نہیں مان رہی تھیں۔

آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے؟

بالآخر حضرت مغیث رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں یہ چاہتا ہوں کہ حضرت بریرہ نکاح ختم نہ کریں، لیکن ان کا ارادہ نکاح ختم کرنے کا ہے، آپ کچھ سفارش فرما دیں کہ یہ میرے ساتھ نکاح کو برقرار رکھیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ تم ان کے ساتھ نکاح کیوں برقرار نہیں رکھتیں، اس نکاح کو برقرار رکھو۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ حضور! آپ یہ جو فرما رہے ہیں کہ اس نکاح کو برقرار رکھو، یہ آپ کا مشورہ ہے یا حکم ہے؟ اگر حکم ہے تو مجھے سرتابی کرنے کی مجال نہیں، پھر تو یقیناً اس حکم کو مانوں گی اور اس نکاح کو برقرار رکھوں گی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میرا حکم نہیں ہے بلکہ مشورہ ہے۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: پھر تو میں آزاد ہوں کہ اس مشورے کو قبول کروں یا نہ کروں۔ بات یہ ہے کہ ان کے ساتھ میری زندگی گزرنی مشکل ہے، اس لئے میں ان سے علیحدگی اختیار کرتی ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔(۱)

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الطلاق، باب شفاعة النبي في زوج بريرة، رقم: ٤٨٧٥، سنن النسائي، كتاب آداب القضاة، باب شفاعة الحاكم للخصوم قبل فصل الحكم، رقم: ٥٣٢٢، سنن ابن ماجه، كتاب الطلاق، باب خيار الأمة إذا أعتقت، رقم: ٢٠٦٥

صحابیات کی فراست

اب آپ صحابیات کی فہم و فراست دیکھئے! ایک طرف نبی کریم ﷺ کی عظمت کا بھی حق ادا فرمایا اور آپ سے یہ پوچھ لیا کہ اگر آپ کا یہ حکم ہے تو پھر اپنی رائے، اپنی خواہش، اپنے جذبات، ہر چیز کو آپ کے حکم پر قربان کردوں گی۔ لیکن اگر آپ کا مشورہ ہے تو مشورہ کے اندر شریعت نے اختیار دیا ہے کہ چاہے مشورہ پر عمل کریں یا عمل نہ کریں، لہٰذا مشورہ کی صورت میں میں اپنی رائے کو اختیار کروں گی۔ چنانچہ خود حضورِ اقدس ﷺ نے بھی اس بات کا برا نہیں منایا اور یہ نہیں فرمایا کہ اے بریرہ! تم نے ہمارے مشورے کو بھی نہیں مانا؟ ہمارے مشورے کو قبول نہیں کیا؟ کوئی برا نہیں منایا، بلکہ ایک اعتبار سے ان کے اس فعل کی توثیق فرمائی۔

''حکم'' اور ''مشورے'' میں فرق

اور شریعت کا یہ حکم بتادیا کہ جب کوئی بڑا کسی کام کو کہے تو پہلے یہ اندازہ کرلو کہ آیا وہ حکم دے رہا ہے یا مشورہ دے رہا ہے، اگر حکم دے رہا ہے تو اس کی بات ماننی چاہئے، مثلاً باپ یا استاد یا شیخ کسی بات کا حکم دے رہے ہیں تو ان کی بات ماننی چاہئے، لیکن اگر مشورہ دے رہے ہیں تو مشورے کے اندر دونوں راستے کھلے ہیں۔ لہٰذا جب حضورِ اقدس ﷺ نے اپنا مشورہ نہ ماننے پر برا نہیں منایا تو ہم اور آپ کیوں برا مناتے ہیں کہ میں نے فلاں کو یہ مشورہ دیا تھا لیکن ہمارا مشورہ نہیں مانا گیا۔

خوب سمجھ لیجئے کہ دوسرے کو مشورہ دیتے وقت یہ ذہن میں نہ رکھیں کہ وہ ہمارا مشورہ مانتا ہے یا نہیں مانتا، بس اپنی طرف سے آپ صرف اس بات کے مکلّف ہیں کہ دیانتدارانہ طور پر اس کی خیرخواہی کو مدِنظر رکھتے ہوئے جو مشورہ دینا چاہیں وہ دے دیں، آگے اس کو اختیار ہے۔ اور آپ سے آخرت میں یہ سوال نہیں ہوگا کہ اس نے آپ کے مشورے پر کیوں عمل نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو داروغہ نہیں بنایا ہے، آپ کا فرض ادا ہوگیا، اب اس کا کام ہے کہ وہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو

خلاصہ

یہ مشورے کے آداب ہیں جو ہمیں قرآن کریم نے سکھائے ہیں، اور نبی کریم ﷺ کی سنت نے ہمیں سکھائے ہیں۔ ان کو مدِنظر رکھتے ہوئے مشورہ لیا جائے اور مشورہ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرماتے ہیں، پھر اس مشورے سے کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوتا، اس سے کوئی ناچاقی، عداوت اور اختلافات پیدا نہیں ہوتے، لیکن جب ان احکام کو نظرانداز کردیا جاتا ہے تو پھر لوگوں کے درمیان اس کی وجہ سے ناچاقیاں اور عداوتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

سوکر اُٹھنے کی مسنون دُعا☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ط أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۝﴾(۱)

جناب رسول اللہ ﷺ نے مختلف مواقع پر جو دعائیں ارشاد فرمائیں، ان دعاؤں کی تھوڑی تھوڑی تشریح آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے وہ دعا جو بیدار ہوتے وقت پڑھنا منقول ہے، اس کی تھوڑی سی تشریح عرض کرتا ہوں۔ جناب رسول اللہ ﷺ جب صبح کے وقت بیدار ہوتے تو یہ کلمات فرماتے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ))(۲)

"تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہمیں موت کے بعد دوبارہ زندگی عطا فرمائی اور اسی کی طرف زندہ ہوکر جانا ہے"

اس دعا میں ایک طرف تو اس بات پر شکر ادا ہو رہا ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی مل گئی، کیونکہ ہوسکتا تھا کہ میں سوتے سوتے مرجاتا جیسے بہت سے لوگ سوتے سوتے مرجاتے ہیں، لیکن اے اللہ! آپ نے مرنے کے بعد مجھے دوبارہ زندگی عطا فرمائی۔ دوسری طرف اس دعا میں اس بات کا

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/الف تاز)

(۱) البقرة: ۱۸۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں"

(۲) صحيح البخاري، كتاب الدعوات، باب ما يقول إذا نام، رقم: ۵۸۳۷، صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب ما يقول عند النوم وأخذ المضجع، رقم: ۴۸۸۶، سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب ما يقال عند النوم، رقم: ۴۳۹۰، سنن ابن ماجه، كتاب الدعاء، باب ما يدعو به إذا انتبه من الليل، رقم: ۳۸۷۰، مسند أحمد، رقم: ۱۰۷۸۴

استحضار ہو رہا ہے کہ یہ زندگی جو مل گئی ہے، یہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک وقت مجھے ضرور اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے۔

وہ شخص کیسا دن گزارے گا؟

لہٰذا جو شخص صبح اُٹھتے ہی اپنے اللہ کو یاد کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہے اور جو زندگی ملی ہے اس کو نعمت سمجھ رہا ہے اور ساتھ میں یہ بھی سمجھ رہا ہے کہ یہ زندگی ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں ہے بلکہ ایک وقت مجھے یہاں سے جانا بھی ہے، اگر ایک شخص صبح اُٹھ کر یہ باتیں سوچے گا تو ایسا شخص اس دن کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات میں گزارنے کی کوشش کرے گا۔

وہ شخص ناکام نہیں ہوگا

جب ایک شخص نے صبح اُٹھتے ہی کوئی کام نہیں کیا، نہ ابھی وضو کیا، نہ کسی سے بات کی، نہ کوئی اور کام کیا بلکہ سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق جوڑ لیا اور یہ دعا پڑھ لی:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ))

کیا اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو نامراد کریں گے؟ کیا اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ناکام کریں گے جو صبح اُٹھ کر سب سے پہلے یہ کہتا ہے کہ یا اللہ! میں کسی سے تعلق قائم نہیں کرتا بلکہ سب سے پہلے آپ سے تعلق جوڑتا ہوں۔

فرشتے اور شیطان کا مقابلہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب بندہ صبح بیدار ہوتا ہے تو بیدار ہوتے ہی اس کے پاس ایک فرشتہ اور ایک شیطان پہنچ جاتا ہے۔ شیطان یہ چاہتا ہے کہ یہ شخص میرا بن جائے اور صبح سے ہی میں اس کو اپنے قابو میں کرلوں اور اپنے ماتحت کرلوں اور یہ شخص میرے حکم پر چلے، جبکہ فرشتہ یہ چاہتا ہے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق دن گزارے۔ پھر دونوں میں مقابلہ ہوتا ہے کہ دیکھیں یہ شخص شیطان کی بات مانتا ہے یا فرشتے کی بات مانتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر اس وقت وہ بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کر لے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کر لے تو شیطان نامراد ہو جاتا ہے کہ اب یہ میرا بندہ نہیں رہا، اس نے تو اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کر لیا، لہٰذا اب میرا اس کے اُوپر بس نہیں چلے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی حفاظت میں لے لیتے ہیں اور شیطان نامراد ہو جاتا ہے۔

رات کو پھر مقابلہ

اسی طرح رات کو جب بندہ سونے کا ارادہ کرتا ہے اور بستر کی طرف جانے لگتا ہے تو اس وقت بھی ایک فرشتہ اور ایک شیطان اس کے پاس آجاتے ہیں۔ شیطان یہ چاہتا ہے کہ یہ میرا بندہ بن کر سوئے تاکہ رات کو اگر اس کا انتقال ہوجائے تو میں اس کو اپنے ساتھ جہنم میں لے جاؤں۔ لیکن اگر وہ بندہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر سوتا ہے تو شیطان نامراد ہوجاتا ہے کہ اب اس کے اوپر میرا داؤ نہیں چلے گا۔(۱)

یہ بات حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی۔ اس لئے فرمایا کہ صبح اُٹھ کر پہلا کام یہ کرو کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرلو۔

صبح کی دعا

وہ اللہ کا بندہ جس نے صبح سب سے پہلے اُٹھتے ہی اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرلیا اور پھر اس کے بعد بھی جو کام کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نام پر کر رہا ہے، جب صبح ہو رہی ہے تو یہ دعا کر رہا ہے:

((اَللّٰهُمَّ بِكَ أَصْبَحْنَا وَبِكَ أَمْسَيْنَا وَبِكَ نَحْيٰ وَبِكَ نَمُوْتُ وَإِلَيْكَ النُّشُوْرُ))(۲)

اے اللہ! یہ جو صبح ہو رہی ہے، یہ آپ کی بدولت ہو رہی ہے، اگر آپ کی رحمت نہ ہوتی تو یہ صبح کہاں سے آتی۔ ذرا غور کریں کہ ان الفاظ میں کیا کیا معانی پوشیدہ ہیں، ایک یہ کہ سوتے سوتے ہمارا انتقال نہیں ہوا، ہم مرے نہیں، کتنے لوگ ہیں جو سوتے سوتے مرجاتے ہیں۔

دن کی روشنی اللہ تعالیٰ کی نعمت

دوسرے یہ کہ یہ جو صبح ہوئی، کیا ہمارے بس میں تھا کہ اس صبح کو لے آتے، اگر رات کا اندھیرا

---

(۱) كنز العمال، رقم:٤١٣٠٦ (١٥/٥٥٠)، المستدرك للحاكم، رقم:١٩٦٩ (٥/٦٧)، جامع الأحاديث، رقم:٣٦٧١٩ (٣٤/١٠)، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (٤/٣٩٣)، مسند أبي يعلى، رقم:١٧٩١ (٣/٣٢٦)

(۲) سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما جاء في الدعاء إذا أصبح وإذا أمسى، رقم: ٣٣١٣، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب ما يقول إذا أصبح، رقم: ٤٤٠٦، سنن ابن ماجه، كتاب الدعاء، باب ما يدعو به الرجل إذا أصبح وإذا أمسى، رقم: ٣٨٥٨، مسند أحمد، رقم: ٨٢٩٥، اس مسنون دعا کا ترجمہ یہ ہے: اے اللہ! ہم آپ کے نام سے صبح کرتے ہیں اور آپ ہی کے نام سے شام کرتے، آپ کی مرضی سے ہم جیتے ہیں اور آپ کی ہی مرضی سے ہم مریں گے اور ہمیں آپ کی طرف لوٹ کر آنا ہے"

چھپا ہوا ہوتا اور چھپا ہی رہتا تو کیا ہمارے بس میں تھا کہ ہم روشنی نکال لاتے؟ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿أَرَءَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ إِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَأْتِيْكُمْ بِضِيَاءٍ ۝﴾(۱)

یعنی اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر دائمی طور پر رات مسلط کردے تو کون ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جو تمہارے پاس روشنی لے کر آئے۔ یا اللہ! یہ صبح آپ کے تخلیق کردہ نظام کے تحت ہورہی ہے، آپ نے ایسا نظام مقرر کردیا ہے کہ جب سورج غروب ہوتا ہے تو ستارے نکل آتے ہیں، پھر جب ستارے غروب ہوتے ہیں تو سورج نکل آتا ہے۔ اس دعا میں اسی طرف اشارہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ بِكَ أَصْبَحْنَا وَبِكَ أَمْسَيْنَا وَبِكَ نَحْيٰ وَبِكَ نَمُوْتُ))

آخر میں فرمایا: وَإِلَيْكَ النُّشُوْرُ۔ اس جملے سے یہ بات یاد دلائی جارہی ہے کہ آخر میں اے اللہ! آپ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

شام کی دعا

پھر جب شام ہوجائے تو یہ دعا پڑھو:

((اَللّٰهُمَّ بِكَ أَمْسَيْنَا وَبِكَ أَصْبَحْنَا وَبِكَ نَحْيٰ وَبِكَ نَمُوْتُ))

یا اللہ! یہ جو شام ہوئی، یہ بھی آپ کی بدولت ہوئی اور جو صبح ہوئی تھی وہ بھی آپ کی بدولت ہوئی تھی، ہم آپ کی بدولت زندہ ہیں اور آپ کی بدولت مرتے ہیں، آخر میں آپ کی طرف ہمارا ٹھکانہ ہوگا۔

ایسا شخص محروم نہیں ہوگا

جب بندہ صبح شام اس طرح اللہ تعالیٰ کو یاد کررہا ہے، کیا اللہ تعالیٰ ایسے بندے کو محروم کردیں گے؟ ایسا بندہ کبھی محروم نہیں ہوسکتا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ بہرحال! حضور اقدس ﷺ نے جو اذکار اور دعائیں تلقین فرمائی ہیں، ان کا اہتمام کریں، خود بھی ان کو یاد کریں اور اپنے بچوں کو بچپن سے ان اذکار کے پڑھنے کی عادت ڈالیں اور ان دعاؤں پر کبھی کبھی ترجمہ کے ساتھ غور کیا کریں کہ معانی کی عجیب کائنات ان کے اندر پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) القصص: ۷۱

بیت الخلاء میں داخل ہونے اور نکلنے کی دعا☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ط أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ٥﴾(۱)

جناب رسول اللہ ﷺ نے مختلف مواقع پر جو دعائیں تلقین فرمائی ہیں، ان دعاؤں کی تھوڑی تھوڑی تشریح آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے پہلی دعا جو سرکارِ دو عالم ﷺ سے بیدار ہوتے وقت پڑھنا منقول ہے، اس کی تھوڑی سی تشریح پچھلے جمعہ میں عرض کی تھی۔

بیت الخلاء میں جانے کی دعا

بیدار ہونے کے بعد عام طور پر انسان کو اپنی حاجت پوری کرنے کے لئے بیت الخلاء جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ تلقین فرمائی ہے کہ جب آدمی قضاء حاجت کے لئے بیت الخلاء میں جانے لگے تو داخل ہونے سے پہلے یہ دعا پڑھے:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ))(۲)

''اے اللہ! میں خبیث مذکر مخلوقات سے اور خبیث مؤنث مخلوقات سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں''

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۳۱ تا ۵۲)، قبل از نماز جمعہ، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) البقرة: ۱۸۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں''

(۲) صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب ما یقول عند الخلاء، رقم: ۱۳۹، صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب ما یقول إذا أراد دخول الخلاء، رقم: ۵۶۳، سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب ما یقول إذا دخل الخلاء، رقم: ٦، سنن النسائی، کتاب الطهارة، باب القول عن دخول الخلاء، رقم: ۱۹، سنن أبي داؤد، کتاب الطهارة، باب ما یقول الرجل إذا دخل الخلاء، رقم: ٤، سنن ابن ماجه، کتاب الطهارة وسننها، باب ما یقول الرجل إذا دخل الخلاء، رقم: ۲۹۲

دین اسلام کا یہ امتیاز ہے کہ ان مواقع پر جہاں پر انسان ذکر کرتے ہوئے شرماتا ہے، وہاں کے لئے بھی حضور اقدس ﷺ نے کوئی نہ کوئی دعا اور کوئی نہ کوئی ذکر تلقین فرمایا ہے، تاکہ اس موقع پر بھی انسان کا رابطہ اللہ جل شانہ کے ساتھ قائم رہے۔

خبیث مخلوقات سے پناہ مانگنے کی حکمت

اس دعا میں خبیث مذکر اور خبیث مؤنث مخلوقات سے پناہ مانگنے کی جو تلقین فرمائی گئی ہے، اس کی حکمت نبی کریم ﷺ نے ایک اور حدیث میں ارشاد فرمائی:

((إِنَّ هٰذِهِ الْحُشُوْشَ مُحْتَضَرَةٌ فَإِذَا أَتٰى أَحَدُكُمُ الْخَلَاءَ فَلْيَقُلْ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ))(١)

یعنی وہ مقامات جہاں انسان قضاء حاجت کے لئے جاتا ہے، وہ شیاطین کی آماجگاہ ہوتے ہیں، کیونکہ شیاطین عام طور پر گندے اور ناپاک مقامات پر پائے جاتے ہیں، اور چونکہ یہ خود خبیث مخلوق ہے، اس لئے گندی جگہ کو پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا جب تم ان گندے مقامات پر جاؤ تو اللہ کی پناہ میں آجاؤ، کیونکہ وہ شیاطین بسا اوقات تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

شیاطین جسمانی نقصان پہنچاتے ہیں

اب سوال یہ ہے کہ یہ شیاطین انسان کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ اس کی تفصیل تو نبی کریم ﷺ نے بیان نہیں فرمائی، لیکن دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیاطین جسمانی طور پر بھی انسان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور روحانی طور پر بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ جسمانی نقصان یہ پہنچا سکتے ہیں کہ تمہیں ظاہری گندگی میں ملوث کر دیں اور اس کے نتیجے میں تمہارے کپڑے اور جسم ناپاک ہو جائیں۔ اور بعض اوقات جسمانی بیماری میں مبتلا کر دیتے ہیں، چنانچہ تاریخ میں بعض ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ شیاطین نے ان گندے مقامات پر باقاعدہ کسی انسان پر حملہ کیا اور بالآخر اس کو موت کے منہ میں پہنچا دیا۔

بہرحال! ان مقامات پر اس بات کا احتمال ہے کہ شیاطین کی طرف سے انسان کی صحت کو نقصان پہنچانے والے کام سرزد ہوں۔ بعض علماء نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بیماری کے جراثیم شیاطین ہی کا

---

(١) سنن أبي داود، كتاب الطهارة، باب ما يقول الرجل إذا دخل الخلاء، رقم: ٥، سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ما يقول الرجل إذا دخل الخلاء، رقم: ٢٩٢، مسند أحمد، رقم: ١٨٤٨٣

ایک حصہ ہوتے ہیں، لہٰذا ان مقامات پر انسان کی صحت کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے اور جسمانی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔

شیاطین روحانی نقصان پہنچاتے ہیں

اس کے علاوہ شیاطین روحانی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں، وہ اس طرح کہ ان مقامات پر شیاطین موجود ہوتے ہیں اور انسان وہاں پر ستر کھلا ہونے کی حالت میں ہوتا ہے، اس وقت شیطان انسان کے دل میں فاسد خیالات پیدا کرتا ہے، غلط قسم کے خیالات، غلط قسم کی خواہشات، غلط قسم کی آرزوئیں انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے، چنانچہ ان مقامات پر انسان کے سفلی جذبات، سفلی خواہشات زیادہ زور دکھاتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی پناہ شامل حال نہ ہو تو انسان ان مقامات پر گناہوں کا بھی ارتکاب کر لیتا ہے۔

اس وجہ سے نبی کریم ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے تم اللہ جل شانہ کی پناہ میں آجاؤ اور یہ کہو کہ یا اللہ! میں ایسی جگہ پر جا رہا ہوں جہاں شیاطین کا اجتماع ہوگا اور جہاں شیاطین انسان کو بہکانے کی کوشش کرتے ہیں، اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں تاکہ ان شیاطین کے شر سے محفوظ رہوں۔

اس دعا کے پڑھنے کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آگئے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ تمہارا رابطہ اللہ جل شانہ کے ساتھ جڑ گیا، اس گندی حالت میں بھی انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ قائم کیے ہوئے ہے، اس کے نتیجے میں وہ انشاء اللہ وہاں پر گناہوں سے اور غلط کاموں سے محفوظ رہے گا۔

بایاں پاؤں پہلے داخل کرنا

اور حضور اقدس ﷺ نے یہ بھی سنت قرار دیا کہ جب آدمی بیت الخلاء میں داخل ہو تو پہلے بایاں پاؤں اندر داخل کرے اور اندر داخل ہونے سے پہلے وہ دعا پڑھ لے جو اوپر گزری۔

بیت الخلاء سے نکلتے وقت کی دعا

پھر انسان جب فارغ ہو کر بیت الخلاء سے باہر نکلے تو اس وقت کے لئے حضور اقدس ﷺ نے دوسری دعا تلقین فرمائی اور دوسرا ادب بیان فرمایا۔ وہ یہ کہ جب باہر نکلنے لگو تو پہلے دایاں پاؤں باہر نکالو اور پھر یہ دعا پڑھو:

((غُفْرَانَكَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَذْهَبَ عَنِّی الْأَذٰی وَعَافَانِیْ))(۱)

"غُفْرَانَكَ" کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ! میں آپ سے مغفرت اور بخشش مانگتا ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ کس چیز سے مغفرت مانگتا ہوں؟ اس لئے کہ اس موقع پر بظاہر کسی گناہ کا ارتکاب تو نہیں کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس موقع پر دو باتوں سے مغفرت مانگتا ہوں۔ ایک اس بات سے کہ اس وقت میں جس حالت میں تھا، ہوسکتا ہے کہ مجھ سے کوئی غلط عمل سرزد ہوگیا ہو، اس سے مغفرت مانگتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اے اللہ! آپ نے اپنے فضل وکرم سے مجھ پر جتنے انعامات فرمائے ہیں، میں ان انعامات پر شکر کا حق ادا نہیں کر پایا، اب ایک نعمت اور مجھے حاصل ہوگئی ہے۔

جسم سے گندگی کا نکل جانا نعمت ہے

کیونکہ جسم سے نجاست کا نکل جانا یہ اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا انعام ہے کہ انسان کی زندگی کا دار و مدار اس پر ہے۔ اب اس وقت اے اللہ! آپ نے جو یہ نعمت عطا فرمائی ہے، میں اس نعمت کے شکر کا حق ادا نہیں کرسکتا، اس پر میں آپ سے پہلے ہی مغفرت مانگتا ہوں۔ مغفرت مانگنے کے بعد یہ دعا فرمائی:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَذْهَبَ عَنِّی الْأَذٰی وَعَافَانِیْ))

یعنی اس اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھ سے گندگی کو دور کردیا اور مجھے عافیت عطا فرمائی۔ اگر اس دعا میں غور کریں تو یہ نظر آئے گا کہ اس مختصر سی دعا میں نبی کریم ﷺ نے معانی کی عظیم کائنات بیان فرمادی ہے۔

بیت الخلاء سے نکلنے کی ایک اور دعا

اس کے علاوہ ایک اور روایت میں حضورِ اقدس ﷺ سے دوسری دعا بھی منقول ہے جس میں اس سے زیادہ وضاحت ہے۔ وہ یہ کہ حضورِ اقدس ﷺ جب بیت الخلاء سے واپس تشریف لاتے تو یہ دعا پڑھتے:

---

(۱) جب نبی کریم ﷺ بیت الخلاء سے باہر تشریف لاتے تو بعض اوقات صرف "غُفْرَانَكَ" کہتے: سنن الترمذی، کتاب الطهارة عن رسول الله، باب ما يقول إذا خرج من الخلاء، رقم: ۷، سنن أبی داود، كتاب الطهارة، باب ما يقول الرجل إذا خرج من الخلاء، رقم: ۲۸، سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ما يقول إذا خرج من الخلاء، رقم: ۲۹٦، مسند أحمد، رقم: ۲٤۰٦۳۔ اور بعض اوقات یہ دعا پڑھتے: الحمد لله الذی أذهب عنی الأذی وعافانی: سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ما يقول إذا خرج من الخلاء، رقم: ۲۹۷

((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذَاقَنِیْ لَذَّتَہٗ وَاَبْقٰی فِیَّ قُوَّتَہٗ وَاَذْھَبَ عَنِّیْ اَذَاہُ))(۱)

اس دعا میں عجیب وغریب فقرے ہیں، ایسے فقرے کہنا پیغمبر کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ اس دعا کا ترجمہ یہ ہے کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اس کھانے کی لذت عطا فرمائی اور اس کھانے میں جو قوت والے اجزاء تھے اور جو میرے جسم کو طاقت بخش سکتے تھے، وہ اجزاء میرے جسم میں باقی رکھے اور جو اجزاء تکلیف دہ اور گندے تھے، وہ میرے جسم سے دور کر دیئے۔ آپ غور کریں کہ انسان دن رات یہ کام کرتا رہتا ہے لیکن اس کے نعمت ہونے کی طرف دھیان نہیں جاتا۔

زبان کے ذائقے کے لئے کھاتے ہیں

ہم جب کھانا کھاتے ہیں تو ہمارے پیش نظر صرف زبان کا ذائقہ اور لذت ہوتی ہے، کھاتے وقت اس طرف دھیان نہیں ہوتا کہ یہ کھانا ہمارے اندر جا کر کیا فساد مچائے گا، چنانچہ جس چیز کے کھانے کو دل چاہا کھالیا، روٹی بھی کھالی، گوشت بھی کھالیا، چاول بھی کھالیے، پھل بھی کھالیے، میٹھی چیز بھی کھالی، کبھی چٹخارے دار چیز بھی کھالی، سب کچھ منہ کے ذریعہ اندر جا رہا ہے، لیکن کچھ پتہ نہیں کہ یہ سب کچھ اندر جا کر کیا فساد مچائے گا۔ اب اگر آپ ان اشیاء کا تجزیہ کریں جن کو آپ بغیر سوچے سمجھے کھاتے رہے ہیں تو یہ نظر آئے گا کہ کسی چیز کا جسم پر کوئی اثر ہے اور کسی چیز کا جسم پر کوئی اثر ہے۔

جسم کے اندر خودکار مشین لگی ہوئی ہے

وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے ہر انسان کے جسم میں خودکار مشین لگائی ہوئی ہے، وہ مشین تمہارے کھانے کے تمام اجزاء کا تجزیہ کرتی ہے، جو اجزاء جسم کے لئے نقصان دہ ہیں، ان کو الگ کرتی ہے، اور جو اجزاء فائدہ مند ہیں، ان کو الگ کرتی ہے، اگر یہ مشین خراب ہو جائے تو تمہارے لئے آج ہزاروں روپیہ خرچ کرنے کے باوجود اور لیبارٹریوں میں ٹیسٹ کرانے کے باوجود بھی یہ فیصلہ کرانا آسان نہ ہوتا کہ کون سے اجزاء تمہارے لئے مفید ہیں اور کون سے اجزاء تمہارے لئے مضر ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے جسم کے اندر جو مشین رکھی ہے، وہ مشین خود ٹیسٹ کرتی ہے اور اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ جو کچھ اس بے وقوف انسان نے کھایا ہے، اس نے تو صرف اپنی زبان کے ذائقے کی خاطر کھالیا ہے، اس غذا کے کتنے حصے سے خون بنانا ہے اور کتنے حصے سے ہڈیوں کو طاقت پہنچانی ہے، کتنے حصے سے گوشت بنانا ہے، کتنے حصے سے بینائی کو تقویت دینی ہے، کتنے حصے سے بالوں کو تقویت دینی ہے اور بالوں کو لمبا اور سیاہ کرنا ہے۔ یہ خودکار مشین اس غذا کے ہر حصے کو چھانٹ

(۱) کنز العمال، رقم: ۱۷۸۷۷

چھانٹ کر الگ کرتی ہے۔

جسم کے اجزاء اور ان کے کام

اور اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مشین یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اس غذا میں کون سے اجزاء مضر ہیں کہ اگر وہ اجزاء جسم کے اندر رہ گئے تو وہ اجزاء اس آدمی کو بیمار کر دیں گے اور یہ بیماریوں کا شکار ہو جائے گا، پھر ان مضر اجزاء کو یہ مشین الگ کرتی ہے۔ اس پوری مشین کے ہر حصے نے اپنا اپنا کام الگ الگ تقسیم کر رکھا ہے، مثلاً معدہ کھانے کو ہضم کرتا ہے، جگر خون بناتا ہے، گردہ یہ کام کرتا ہے کہ جسم کو جتنے پانی کی ضرورت ہے، اس کو باقی رکھتا ہے اور باقی زائد پانی کو پیشاب بنا کر خارج کرتا ہے، آنتیں سارے فضلے کو جمع کر کے خارج کرتی ہیں۔ اور ہر انسان کے جسم کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایسا سیورج نظام قائم فرما دیا ہے کہ آج کی بڑی سے بڑی سائنس کی قدرت میں نہیں ہے کہ وہ ایسا سیورج نظام قائم کر دے، یہ نظام اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس کی طلب کے بغیر، محنت کے بغیر اور اس کے لئے پیسے خرچ کیے بغیر دے رکھا ہے۔

اگر گردہ فیل ہو جائے تو!

اگر اس مشین کے کسی پرزے میں ذرا سی خرابی پیدا ہو جائے، مثلاً گردہ فیل ہو گیا اور باقی سب پرزے صحیح کام کر رہے ہیں، جگر بھی صحیح کام کر رہا ہے، دل بھی صحیح ہے، معدہ بھی صحیح ہے، آنتیں بھی صحیح کام کر رہی ہیں، صرف گردہ فیل ہو گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مشین جو سیال اشیاء میں سے مفید اجزاء کو باقی رکھنے کے لئے اور مضر اجزاء کو خارج کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بنائی تھی، وہ مشین کام نہیں کر رہی ہے، اب جب ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اس کے عمل کو جاری رکھنے کے لئے ہر ہفتہ میں تین مرتبہ ڈائی لیسز (گردوں کی صفائی) کرانا ہوگا، اس کے نتیجے میں تھوڑا بہت اس کا تدارک ہو جائے گا، اور ایک ڈائی لیسز پر ہزاروں روپیہ خرچ ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ گردہ کے عمل کو صرف اس حد تک برقرار رکھنے کے لئے کہ انسان زندہ رہ سکے، اس پر ایک ہفتہ میں ہزار ہا روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔

یہ مشین ہر ایک کو حاصل ہے

لیکن اللہ جل شانہ نے ہر انسان کو چاہے وہ امیر ہو یا غریب ہو، شہری ہو یا دیہاتی ہو، عالم ہو یا جاہل ہو، تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ ہو، ہر ایک کو یہ مشین دے رکھی ہے۔ یہ خودکار مشین ہے جو بغیر مانگے

ہوئے اور بغیر پیسہ خرچ کیے ہوئے دے رکھی ہے۔ اس مشین کا ہر جز اپنا اپنا کام کر رہا ہے اور اس کام کرنے کے نتیجے میں جو اجزاء قوت والے اور جسم کے لئے فائدہ مند ہیں، ان کو محفوظ رکھ رہا ہے اور جو بے فائدہ ہیں ان کو پیشاب پاخانہ کے ذریعہ خارج کر رہا ہے۔

قضاء حاجت کے بعد شکر ادا کرو

اس لئے جب تم قضاء حاجت سے فارغ ہو تو اس پر شکر ادا کر لو اور کہو:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَذْهَبَ عَنِّی الْأَذٰی وَعَافَانِیْ))

دیکھئے! یہ کام ایک مسلمان بھی کرتا ہے اور ایک کافر بھی کرتا ہے، لیکن مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ جب تم بیت الخلاء سے باہر نکلو تو ذرا اس کا تصور کر لیا کرو کہ یہ نجاست، یہ گندگی، یہ تکلیف دہ اجزاء اگر میرے جسم سے خارج نہ ہوتے بلکہ اندر ہی رہ جاتے تو نہ جانے یہ میرے جسم کے اندر کیا خرابیاں اور کیا بیماریاں پیدا کرتے، اے اللہ! آپ کا شکر ہے اور آپ کا فضل و کرم ہے کہ آپ نے مجھ سے یہ گندگی دور فرما دی اور مجھے عافیت عطا فرما دی۔

یہ دعائیں دھیان سے پڑھنی چاہئیں

اگر ہر مسلمان روزانہ بیت الخلاء جاتے وقت داخل ہونے کی دعا پڑھے اور نکلتے وقت خارج ہونے کی دعا پڑھے اور اس دھیان کے ساتھ پڑھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کیسی عظیم نعمت عطا فرمائی ہے تو کیا اس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کی عظمت اور محبت پیدا نہیں ہوگی؟ کیا اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی خشیت پیدا نہیں ہوگی کہ جو مالک بے نیاز میرے جسم میں اتنی قیمتی مشینیں لگا کر میرے لئے یہ کام کرا رہا ہے، کیا میں اس کے حکم کی نافرمانی کروں؟ کیا میں اس کی نافرمانی پر کمربستہ ہو جاؤں؟ کیا میں اس کی مرضی کے خلاف زندگی گزاروں؟ کیا میں اس کی دی ہوئی نعمتوں کو غلط استعمال کروں؟ اگر انسان یہ تصور کرنے لگے تو پھر کبھی گناہ کے پاس بھی نہ پھٹکے۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ بیت الخلاء سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھ لو۔ یہ کوئی منتر نہیں ہے جو حضور اقدس ﷺ نے سکھا دیا ہے، بلکہ اس کے پیچھے ایک پورا فلسفہ ہے اور معانی کی پوری کائنات ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے ذریعہ ہم کو عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا ان دعاؤں کو پڑھنے کی عادت ڈالئے اور اس تصور کے ساتھ پڑھئے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا نعمت ہم کو عطا فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

وضو

ظاہری اور باطنی پاکی کا ذریعہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ط أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! حضورِ اقدس ﷺ نے مختلف مواقع پر جو دعائیں تلقین فرمائی ہیں، وہ اللہ جل شانہ کی قدرتِ کاملہ اور اس کی حکمتِ بالغہ کا احساس اور اس کے ساتھ تعلق کو قوی کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں، اس لئے ان کی تشریح گزشتہ چند جمعوں سے شروع کی ہے۔ جب انسان صبح کے وقت بیدار ہو، اس وقت کیا دعا پڑھے؟ اور جب آدمی اپنی طبعی ضرورت کے لئے بیت الخلاء جائے تو اس وقت کیا دعا پڑھے؟ اور وہاں سے جب باہر نکلے تو اس وقت کیا دعا پڑھے؟ ان دعاؤں کی تشریح پچھلے جمعوں میں عرض کر دی۔

سب سے پہلے نماز کی تیاری

جب آدمی اپنی ضروریات سے فارغ ہو جائے تو سنت یہ ہے کہ اس کے بعد سب سے پہلے وضو کرے، اگر صبح صادق سے پہلے اُٹھنے کی توفیق ہوئی ہے تو وضو کر کے تہجد کی نیت سے چند رکعات ادا کر لے، اور اگر فجر کے وقت بیدار ہوا ہے تو مسلمان کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ فجر کی نماز ادا کرے اور نماز کی ادائیگی کے لئے پہلے وضو کرے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۵۳ تا ۶۶)

(۱) البقرۃ: ۱۸۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں''

وضو کا ظاہری اور باطنی پہلو

اس وضو کا ایک ظاہری پہلو ہے اور ایک باطنی پہلو ہے۔ اس کا ظاہری پہلو یہ ہے کہ انسان کے ہاتھ منہ صاف ہو جائیں اور اس کا میل کچیل دور ہو جائے۔ اس مقصد کے تحت تو سب انسان ہاتھ منہ دھوتے ہیں، چاہے وہ مسلمان ہو، چاہے وہ کافر ہو۔ وضو کا باطنی پہلو یہ ہے کہ جس طرح وضو سے ظاہری اعضاء دھل رہے ہیں اور ان اعضاء کا میل کچیل دور ہو رہا ہے اور صفائی حاصل ہو رہی ہے، اسی طرح جب یہ کام اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ہو رہا ہو اور نبی کریم ﷺ کی سنت کے مطابق ہو رہا ہو اور آپ ﷺ کی اتباع میں ہو رہا ہو تو اس عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انسان کے باطن کے اندر ایک روحانیت اور نورانیت پیدا فرما دیتے ہیں اور قلب میں ایمان کا نور پیدا فرما دیتے ہیں اور اتباع سنت کی برکات عطا فرما دیتے ہیں۔ وضو کے یہ دو فائدے ہیں۔

تیمّم میں باطنی پہلو موجود ہے

چنانچہ اگر کسی وقت انسان کو وضو کے لئے پانی نہ ملے یا پانی تو ہے لیکن بیماری کی وجہ سے وہ پانی استعمال نہیں کرسکتا، تو اس وقت شریعت کا حکم یہ ہے کہ وضو کے بجائے تیمّم کرلو، یعنی مٹی پر ہاتھ مار کر اپنے چہرے پر اور اپنے ہاتھ پر پھیرلو۔ اس تیمّم میں ہاتھ اور چہرے کی ظاہری صفائی کا تو کوئی پہلو نہیں ہے، بلکہ اُلٹا ہاتھ اور چہرے پر مٹی لگا رہے ہیں، لیکن باطنی پہلو پھر بھی موجود ہے، وہ یہ کہ اس تیمّم کے ذریعہ باطن کے اندر روحانیت اور نورانیت پیدا ہو رہی ہے اور دل میں ایمان کا نور حاصل ہو رہا ہے۔

صرف ظاہری صفائی مقصود نہیں

اس سے معلوم ہوا کہ وضو کے ذریعہ محض ہاتھ منہ کو ظاہری میل کچیل سے صاف کرلینا مقصود نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ چیز مقصود ہوتی تو اللہ تعالیٰ پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمّم کا حکم نہ دیتے، بلکہ یہ حکم دیتے کہ ایسی صورت میں اسپنج کرلیا کرو اور اپنے تولیے کو پانی سے بھگو کر منہ اور ہاتھ پر پھیرلیا کرو، تاکہ اس کے ذریعہ تمہارے ہاتھ منہ کا میل کچیل دور ہو جائے، لیکن اللہ جل شانہ نے اس صورت میں اسپنج کا حکم دینے کے بجائے تیمّم کا حکم دیا۔

روح کی صفائی بھی مقصود ہے

اب بظاہر تو یہ بات اُلٹی معلوم ہو رہی ہے، کیونکہ اگر پانی سے منہ دھوتے تو ہاتھ منہ کی مٹی دور ہوتی، اور اب تیمم کا حکم دے کر یہ کہا جا رہا ہے کہ مٹی پر ہاتھ مار کر چہرے اور ہاتھ پر پھیر لو۔ اس کے ذریعہ یہ حقیقت بتلانی مقصود ہے کہ نہ پانی کی کوئی حقیقت ہے اور نہ وضو کی کوئی حقیقت ہے، بلکہ اصل بات ہمارے حکم کی اتباع میں ہے، جب ہم نے یہ حکم دیا کہ پانی استعمال کرو تو وہ پانی تمہارے لئے پاکی، صفائی، نورانیت اور روحانیت کا سبب بن گیا اور جب ہم نے یہ کہا کہ مٹی استعمال کرو تو وہی مٹی جو بظاہر دیکھنے میں انسان کو میلا بناتی ہے لیکن وہ تمہاری روح کو پاک وصاف کر دے گی اور تمہارے باطن کے اندر نور پیدا کر دے گی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ وضو کا اصل مقصد صرف ہاتھ منہ کی صفائی نہیں ہے بلکہ روح کی صفائی بھی مقصود ہے۔

وضو کی حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ

چنانچہ آج کل بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے نماز کے لئے وضو کرنے کا جو حکم دیا تھا، اس کا مقصود ظاہری صفائی حاصل کرنا تھا، اور وضو میں پاؤں دھونے کا حکم اس لئے دیا تھا کہ اس زمانے میں عرب کے لوگ کاشتکاری کا کام کرتے تھے، جس کے نتیجے میں ان کے پاؤں میلے ہو جاتے تھے، اب تو آدمی صاف ستھرا رہتا ہے، ہر وقت موزے اور بوٹ پہنے ہوئے ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے پاؤں کو مٹی لگتی ہی نہیں، لہٰذا اگر ہم پاؤں نہ دھوئیں یا جو کپڑے کے موزے ہم نے پہنے ہوئے ہیں، اس کے اوپر مسح کر لیں تو مقصد حاصل ہو جائے گا، پھر پاؤں دھونے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ باتیں وضو کی حقیقت سے ناواقفیت کی بنیاد پر کہی جاتی ہیں، اس لئے کہ لوگ وضو کی حقیقت صرف یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں صاف ہو جائیں۔

ورنہ نیت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی

یاد رکھئے! صرف ہاتھ پاؤں کا صاف ہو جانا تنہا یہ مقصد نہیں ہے، کیونکہ اگر تنہا یہ مقصد ہوتا تو پھر شرعاً یہ حکم نہ ہوتا کہ جب آپ نے ایک مرتبہ اچھی طرح منہ ہاتھ دھو لیے، لیکن وضو کی نیت نہیں کی تو وضو کی نیت نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ پاؤں تو صاف ہو گئے اور وضو بھی ہو گیا، لیکن وضو کے انوار و برکات حاصل نہ ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف ہاتھ پاؤں کا صاف ہونا تنہا یہ مقصود نہیں۔

دوبارہ وضو کرنے کا حکم کیوں؟

اسی طرح اگر کسی شخص نے نیت کر کے وضو کیا اور ہاتھ پاؤں اچھی طرح دھو لیے، لیکن وضو کرنے کے بعد ہی وضو ٹوٹ گیا، اب شریعت کا حکم یہ ہے کہ دوبارہ وضو کرلو۔ اگر صرف ہاتھ پاؤں کی صفائی مقصود ہوتی تو دوبارہ وضو کرنے کا حکم نہ دیا جاتا، کیونکہ ابھی ابھی تو اس نے وضو کیا ہے اور مکمل صفائی حاصل کی ہے، لیکن حکم یہ ہے کہ اگر وضو ٹوٹ جائے تو دوبارہ وضو کرو۔ اس لئے کہ صرف ظاہر کی صفائی مقصود نہیں، بلکہ باطن کی صفائی بھی مقصود ہے، اور باطن کی صفائی یہ ہے کہ انسان زندگی کے ہر ہر لمحے میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کا تابع بن جائے، اس کے حکم کا فرمانبردار بن جائے اور دل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جذبہ اس طرح پیدا ہو جائے کہ جب اس کا حکم آجائے گا تو میں اس کے حکم کے آگے سر جھکادوں گا، چاہے وہ حکم میری سمجھ میں آرہا ہو یا سمجھ میں نہ آرہا ہو، اس حکم کی عقلی حکمت معلوم ہو یا معلوم نہ ہو۔ اسی کا نام باطن کی صفائی ہے۔

حکم ماننے سے روحانیت مضبوط ہوگی

لہٰذا اگر کسی نے ابھی وضو کیا اور وضو کرتے ہی وضو ٹوٹ گیا، تو اب اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ نیا وضو کرو، حالانکہ یہ حکم عقل کے خلاف ہے، کیونکہ ابھی ابھی تو وضو کر کے بیٹھے ہیں، ابھی ابھی تو لیے سے ہاتھ منہ صاف کیے ہیں، اب دوبارہ وضو کرنے سے کیا حاصل؟ لیکن عقل میں اس حکم کی حکمت نہ آنے کے باوجود جب آدمی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں یہ کام کرے گا تو اس کے باطن میں اتباع سنت کا نور پیدا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے جذبے کے نتیجے میں اس کی روحانیت مضبوط ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوگا۔

پاکی اور صفائی میں فرق

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکی اور صفائی دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ یہ بات درست نہیں، پاکی اور صفائی میں فرق ہے، اسلام میں پاکی بھی مطلوب ہے اور صفائی بھی مطلوب ہے، تنہا صفائی سے کام نہیں چلے گا، لہٰذا اگر آپ نے صفائی تو حاصل کر لی لیکن پاکی حاصل نہیں کی تو مقصود حاصل نہیں ہوا، کیونکہ ''پاکی'' کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول ﷺ کہہ دیں کہ یہ پاک ہے تو وہ پاک ہے اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ یہ کہہ دیں کہ یہ ناپاک ہے تو وہ ناپاک ہے، لہٰذا اگر کوئی چیز دیکھنے میں کتنی ہی صاف نظر آرہی ہو، لیکن اگر اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے

مطابق وہ چیز پاک نہیں تو مقصود حاصل نہیں ہوا۔

خنزیر صاف ہونے کے باوجود ناپاک ہے

دیکھئے! خنزیر کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا کہ وہ ناپاک ہے۔ اب آج کل جو قومیں خنزیر کھاتی ہیں وہ خنزیر کی بہت صاف ستھرے فارم میں پرورش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ دیکھنے میں بڑا صاف ستھرا نظر آتا ہے، لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ خنزیر سر سے لے کر پاؤں تک ناپاک ہے، چاہے وہ دیکھنے میں کتنا ہی صاف ستھرا نظر آرہا ہو، لہٰذا وہ صاف تو ہے لیکن پاک نہیں ہے۔

شراب صاف ہونے کے باوجود ناپاک ہے

دیکھئے! شراب کو اللہ تعالیٰ نے ناپاک قرار دیا ہے اور بالکل اسی طرح ناپاک ہے جس طرح پیشاب ناپاک ہے۔ اب وہ شراب دیکھنے میں بظاہر صاف ستھری ہے، صاف شفاف خوبصورت بوتلوں میں رکھی ہوئی ہے، اور باقاعدہ لیبارٹریز میں ٹیسٹ کی ہوئی ہے کہ اس میں کوئی مضر صحت جراثیم موجود نہیں ہیں، لیکن ان سب کے باوجود وہ شراب ''پاک'' نہیں، اس لئے کہ اللہ جل شانہ نے فرمادیا کہ یہ ناپاک ہے، اب بندہ کا کام یہ ہے کہ اس کو ناپاک ہی سمجھے۔

وہ پانی ناپاک ہے

مثلاً ایک بالٹی پانی کی بھری ہوئی ہے، اس بالٹی میں ایک قطرہ پیشاب کا گر گیا، دیکھئے! پیشاب کے ایک قطرے کے گرنے سے بظاہر بالٹی کے پانی کے صاف ہونے پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اگر اسی بالٹی کے پانی سے کوئی کپڑا دھوگے تو وہ کپڑا بالکل صاف ستھرا ہو جائے گا، لیکن وہ کپڑا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق پاک نہیں ہوگا، چنانچہ اگر اس کو پہن کر نماز پڑھو گے تو نماز نہیں ہوگی۔

پاکی اور صفائی دونوں مطلوب ہیں

اگر ایک کپڑے میں پیشاب کا قطرہ لگ گیا اور آپ نے اس کپڑے کو تین مرتبہ پانی سے دھولیا تو وہ کپڑا پاک ہو جائے گا، اگرچہ وہ میلا ہی کیوں نہ ہو، لہٰذا وہ کپڑا صاف تو نہیں ہے لیکن پاک ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر صاف چیز پاک ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر پاک چیز صاف بھی ہو، دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ ہیں اور اسلام میں دونوں چیزیں مطلوب ہیں، پاکی بھی مطلوب ہے اور صفائی بھی مطلوب ہے۔ اسی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ جمعہ کے روز

طہارت بھی حاصل کرو، غسل کرو، وضو کرو، پاک کپڑے پہنو، لیکن ساتھ میں یہ بھی فرمایا کہ جتنا ہو سکے انسان جمعہ کے دن صاف کپڑے پہن کر مسجد میں آئے، میلے کچیلے کپڑے پہن کر نہ آئے، تاکہ ساتھ بیٹھنے والے کو تکلیف نہ ہو۔ (۱)

لہٰذا اسلام میں پاکی بھی مطلوب ہے اور صفائی بھی مطلوب ہے اور ایک کو حاصل کرنے سے دوسرا حاصل نہیں ہوتا۔ وضو کے اندر اللہ تعالیٰ نے دونوں باتیں رکھی ہیں، اس میں پاکی بھی ہے اور صفائی بھی ہے۔

انگریزوں کی ظاہری صفائی کی حقیقت

یہ انگریز اور مغربی ممالک کے لوگ دیکھنے میں بڑے صاف ستھرے نظر آتے ہیں اور ساری دنیا پر ان کی صفائی ستھرائی کا رعب جما ہوا ہے، لیکن اگر ان کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھو تو یہ نظر آئے گا کہ ان کے یہاں پاکی کا کوئی تصور نہیں، چنانچہ جب وہ لوگ قضاء حاجت سے فارغ ہوتے ہیں تو اس کے بعد پانی کے استعمال کا کوئی تصور نہیں، صرف ٹائیلٹ پیپر سے اپنی نجاست صاف کر لیتے ہیں۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ انسان ٹائیلٹ پیپر سے کس حد تک نجاست کو صاف کر سکتا ہے۔ اور اگر کسی نے بہت زیادہ صفائی حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے یہ کیا کہ غسل کرنے کے ٹب میں پانی بھر کے اسی گندگی اور ناپاکی کی حالت میں جا کر بیٹھ گیا اور اسی میں بیٹھ کر صابن بھی لگا لیا۔ اب اس ٹب کا پانی صابن اور نجاست کا مکسچر بن گیا اور اسی مکسچر میں اس نے دو چار غوطے لگا لیے۔ غوطے لگانے کے نتیجے میں ظاہری طور پر جسم پر سے میل کچیل صاف ہو گیا۔ اور اگر کسی کو اس سے زیادہ صفائی کا خیال آیا تو اس نے شاور لے لیا اور اس سے اپنے بدن کو دھو لیا، لیکن اکثر شاور کی نوبت نہیں آتی، بلکہ اسی حالت میں ٹب سے نکل کر جسم خشک کر لیا اور پاؤڈر اور کریم لگا کر ظاہری ٹیپ ٹاپ کر کے غسل خانے میں سے باہر آ گئے اور صاف ستھرے ہو گئے، یہ ہے ان انگریزوں کی صفائی کی حقیقت۔

مسلمانوں میں پاکی اور صفائی کا اہتمام

لیکن اللہ جل شانہ نے مسلمانوں کو دونوں چیزوں کا ایک ساتھ حکم دیا، طہارت کا بھی حکم دیا اور نظافت کا بھی حکم دیا، فرمایا کہ پاک بھی رہو اور صاف ستھرے بھی رہو۔ اسی لئے اللہ جل شانہ نے استنجاء کرنے کا ایسا طریقہ مقرر فرمایا کہ گندگی سے پاکی حاصل کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب وقت الجمعة إذا زالت الشمس، رقم: ۸۵۲، کتاب الجمعة، باب الدهن للجمعة، رقم: ۸۳٤

ہوسکتا، چنانچہ آپ اگر مسلمانوں کے علاقوں کے علاوہ دنیا کے جس علاقے میں چلے جائیں تو وہاں آپ کو قضاء حاجت کے بعد صفائی ستھرائی حاصل کرنے کا ایسا انتظام نہیں ملے گا جو مسلمانوں کے ہاں آپ کو نظر آئے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دونوں باتوں کا حکم دیا ہے، طہارت کا بھی اور صفائی کا بھی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے یہ نعمت مسلمانوں کو عطا فرمائی۔

ایک یہودی کا اعتراض اور اس کا جواب

حضورِ اقدس ﷺ نے استنجاء کرنے کی عملی صورتیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سکھائیں، یہاں تک کہ ایک یہودی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے بطور اعتراض کے یہ کہنے لگا:

"عَلَّمَكُمْ نَبِيُّكُمْ كُلَّ شَيْءٍ حَتَّى الْخِرَاءَةِ"

''تمہارے نبی ﷺ بھی بڑے عجیب ہیں کہ تمہیں گندی گندی باتیں بھی سکھاتے ہیں کہ بیت الخلاء میں کس طرح داخل ہوں اور کس طرح فارغ ہوں''

اس نے یہ بات اعتراض کے طور پر کہی کہ نبی کی شان تو بڑی ہوتی ہے، وہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں کیوں الجھتے ہیں۔ جواب میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"أَجَلْ"(۱)

یعنی ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے ہر چیز سکھائی ہے، یہاں تک کہ قضاء حاجت کا طریقہ بھی سکھایا ہے، کیونکہ ہمارے نبی ہمارے اوپر شفیق باپ کی طرح ہیں، ماں باپ جس طرح بچے کو دوسری باتیں سکھاتے ہیں، اسی طرح بچے کو یہ بھی سکھاتے ہیں کہ قضاء حاجت کیسے کی جائے اور پاکی کیسے حاصل کی جائے۔

قضاء حاجت کے بارے میں حضور ﷺ کی تعلیم

چنانچہ ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں بتایا کہ جب قضاء حاجت کے لئے بیٹھو تو قبلے کی طرف رخ کر کے نہ بیٹھو اور نہ ہی قبلے کی طرف پشت کر کے بیٹھو۔ اور ہمیں حکم فرمایا کہ تین پتھر استعمال کرو۔ اس زمانے میں پتھر استعمال ہوتے تھے۔ اور ہمیں وہ چیزیں بتائیں کہ ہم کس چیز سے استنجاء کر سکتے ہیں اور کس چیز سے استنجاء نہیں کر سکتے۔ لہٰذا تم تو ان چیزوں پر اعتراض کر رہے ہو لیکن ہمارے لئے یہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب الاستطابة، رقم: ۳۸۵، سنن الترمذي، کتاب الطهارة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب الاستنجاء بالحجارة، رقم: ۱٦، سنن أبي داؤد، کتاب الطهارة، باب كراهية استقبال القبلة عند قضاء الحاجة، رقم: ٦

باعثِ فخر ہے کہ ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں یہ سب باتیں بتائی ہیں اور الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے ایسا جامع دین عطا فرمایا ہے۔

وضو سے ظاہری اور باطنی پاکی حاصل ہوتی ہے

بہرحال! جو وضو اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھایا ہے، یہ محض ہاتھ منہ صاف کرنے کا ذریعہ نہیں، بیشک اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے ہاتھ منہ صاف ہوتے ہیں، اور جو شخص دن میں پانچ مرتبہ وضو کرے گا، اس کے جسم پر گندگی نہیں رہے گی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ وضو ایک روحانی عمل بھی ہے جس کے ذریعہ باطن کی صفائی کی جارہی ہے، باطن کا تزکیہ کیا جارہا ہے۔ اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ وضو کے وقت تمہاری زبان پر ذکر ہونا چاہئے، تاکہ باطن کی صفائی پختہ اور مستحکم اور دیرپا ہوجائے، چنانچہ فرمایا کہ وضو کرتے وقت بلاضرورت باتیں مت کرو اور یہ کوشش کرو کہ جتنا وقت وضو میں لگ رہا ہے، وہ وقت بھی اللہ کے ذکر میں صرف ہو۔ چنانچہ احادیث میں وضو کے دوران جو اذکار حضورِ اقدس ﷺ سے منقول ہیں، ان کے بارے میں انشاء اللہ آئندہ جمعہ میں عرض کروں گا۔

آج کی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تم وضو کرنے بیٹھو تو اس وقت ذرا دھیان اور توجہ کو اس طرف لگاؤ کہ جو کام میں شروع کر رہا ہوں، اس سے صرف ظاہری اعضاء ہی کی صفائی مقصود نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ میرے باطن کو بھی صاف کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا مجھے یہ کام سنت کے مطابق کرنا چاہئے، تاکہ یہ دونوں مقصد ایک ساتھ حاصل ہوجائیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

وضو کے دوران کی مسنون دعا ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ط أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ٥﴾(۱)

ادعیۂ ماثورہ کی تشریح کا بیان پچھلے کئی جمعوں سے چل رہا ہے۔ پچھلے جمعہ وضو کے اذکار کا بیان شروع کیا تھا اور یہ عرض کیا تھا کہ وضو شروع کرنے سے پہلے جو ذکر مسنون ہے، وہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ہے، اس کی کچھ تفصیل گزشتہ جمعہ کو عرض کردی تھی۔

وضو کرنے کے دوران جناب رسول اللہ ﷺ جو دعا بکثرت مانگا کرتے تھے، وہ یہ دعا ہے:

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ وَوَسِّعْ لِيْ فِيْ دَارِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ))(۲)

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۱۰۲ تا ۱۲۳)، قبل از نماز جمعہ، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) البقرة: ۱۸۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں''

(۲) سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما جاء في عقد التسبيح باليد، رقم: ۳٤۲۲، مسند أحمد، رقم: ١٦٠٠٤، مصنف ابن أبي شيبة ۲۹۳۹۱ (٦/٥٠)، المعجم الكبير للطبراني، رقم: ۸۷۳ (۱۹/۳۵۹)، مجمع الزوائد (۱۰/٦۲)، السنن الكبرىٰ للنسائي، رقم: ۹۹۰۸ (٦/۲٤)، مسند أبي يعلى الموصلي، رقم: ۷۱۱۲ (۱۵/۸۱)، جامع الأصول من أحاديث الرسول، رقم: ۵۲۱۳ (۷/۵۲۱۳) یہ دعا وضو کے ساتھ خاص نہیں بلکہ دوسرے مواقع پر بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ کتب احادیث میں اس دعا کے پڑھنے کے مختلف مواقع درج ہیں۔ مسند ابی یعلیٰ اور السنن الکبریٰ للنسائی میں مذکور ہے کہ یہ دعا حضور ﷺ نے وضو کے بعد پڑھی تھی۔ جامع الاصول من أحادیث الرسول کے مطابق یہ دعا رسول اللہ ﷺ نے وضو کے دوران پڑھی تھی۔ جبکہ دوسرے مصادر کے مطابق اسے وضو کے علاوہ دوسرے مقامات پر پڑھا گیا ہے۔

تین جملوں کی جامعیت

یہ دعا تین جملوں پر مشتمل ہے، پہلا جملہ ہے:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ"

"اے اللہ! میرے گناہ کی مغفرت فرما"

دوسرا جملہ ہے:

"وَوَسِّعْ لِيْ فِيْ دَارِيْ"

"اے اللہ! میرے گھر میں کشادگی اور وسعت پیدا فرما"

تیسرا جملہ ہے:

"وَبَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ"

"اے اللہ! میرے رزق میں برکت عطا فرما"

اگر آپ غور کریں تو یہ نظر آئے گا کہ یہ تینوں جملے ایسے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ بھی اللہ جل شانہ اس دعا کو قبول فرمالیں تو دنیا و آخرت میں انسان کا بیڑہ پار ہو جائے۔ کیونکہ یہ گناہوں کی مغفرت، گھر کی کشادگی اور رزق کی برکت کی دعا ہے، اگر انسان کو یہ بات حاصل ہو جائے کہ اس کے گناہوں کی مغفرت ہو جائے اور اس کے گھر میں کشادگی حاصل ہو جائے اور رزق میں برکت ہو جائے تو انسان کو اور کیا چاہئے، دنیا اور آخرت کی ساری حاجتیں اور سارے مقاصد اور سارے اغراض نبی کریم ﷺ نے ان تینوں جملوں میں سمیٹ دیئے ہیں، کیونکہ ان میں سے پہلی دعا آخرت کے بارے میں ہے اور دوسری دعائیں دنیا سے متعلق ہیں۔

پہلا جملہ طلبِ مغفرت

پہلا جملہ جو آخرت سے متعلق ہے، وہ یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ))

"اے اللہ! میرے گناہوں کو معاف فرما"

اب اگر کسی کو مغفرت مل گئی تو اس کو آخرت کی ساری نعمتیں حاصل ہو گئیں، کیونکہ جنت میں جانے میں رکاوٹ یہ گناہ ہیں، جب اللہ تعالیٰ مغفرت فرمادیں تو یہ رکاوٹ دور ہو گئی اور جنت پکی ہو گئی۔ کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہے جو گناہوں سے پاک ہو، غلطیوں سے مبرا ہو، ہر انسان سے کبھی نہ کبھی کوئی غلطی کوئی گناہ چھوٹا یا بڑا ہو جاتا ہے اور کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے

بے نیاز ہو۔ صرف نبی کریم ﷺ کی ایک ذات ایسی تھی جن کو مکمل طور پر گناہوں سے پاک کہا جاسکتا ہے۔ آپ ﷺ کی ذات گناہوں سے اس طرح معصوم تھی کہ کوئی گناہ آپ سے سرزد ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کوئی چھوٹی موٹی بھول چوک ہو بھی گئی ہو تو اس کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا ہے:

﴿لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾(۱)

''اللہ تعالیٰ نے اگلی پچھلی تمام بھول چوک کو بھی معاف فرمادیا ہے''

اس کے باوجود سرکارِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں:

((إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً))(۲)

''میں روزانہ ستر مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں''

اور یہ ستر کا لفظ بھی گنتی کے بیان کے لئے ارشاد نہیں فرمایا بلکہ کثرت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بیان فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ ستر سے زیادہ مرتبہ آپ استغفار کیا کرتے تھے۔

حضور ﷺ کا مغفرت طلب کرنا

اس کے باوجود اللہ تعالیٰ یہ حکم فرمارہے ہیں:

﴿وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ﴾(۳)

''اے نبی ﷺ! آپ فرمائیے کہ اے پروردگار! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما اور آپ سارے رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضورِ اقدس ﷺ خود بھی کثرت سے استغفار فرمارہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کی مغفرت کا اعلان فرمادیا ہے، اس کے بعد بھی آپ سے یہ کہا جارہا ہے کہ آپ مجھ سے مغفرت طلب کریں، ایسا کیوں ہے؟

(۱) الفتح: ۲

(۲) صحيح البخاري، كتاب الدعوات، باب استغفار النبي في اليوم والليلة، رقم: ۵۸۳۲، سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة محمد، رقم: ۳۱۸۲، سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب الاستغفار، رقم: ۳۸۰۶، مسند أحمد، رقم: ۷۴۶۱۔ بعض روایات میں سو مرتبہ استغفار کرنے کا حکم ہے: صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب استحباب الاستغفار والإستكثار منه، رقم: ۴۸۷۰، سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في الاستغفار، رقم: ۱۲۹۴

(۳) المؤمنون: ۱۱۸

نامعلوم گناہوں سے استغفار

بات دراصل یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ جس چیز کو وہ گناہ اور برائی سمجھتا ہے، وہ اس سے پرہیز کر لے گا، لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ انسان کو اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ مجھ سے یہ غلط کام ہوا ہے، حالانکہ حقیقت میں وہ غلط کام ہوتا ہے۔

مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں، یہ نماز حقیقت میں تو بڑی عبادت ہے، بڑے ثواب کا کام ہے، اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے، لیکن جس انداز میں ہم نماز پڑھتے ہیں کہ جیسے ہی تکبیر تحریمہ ''اللہ اکبر'' کہہ کر نیت باندھی تو بس ایک سوئچ آن ہو گیا اور پھر وہ زبان خود کار طریقے پر چل رہی ہے، نہ اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان ہے، نہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا استحضار ہے، اور جو الفاظ زبان سے نکل رہے ہیں، نہ ان کی طرف توجہ ہے، دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے، دھیان کہیں ہے، اگر نماز کے بعد یہ پوچھا جائے کہ پہلی رکعت میں کونسی سورت پڑھی تھی اور دوسری رکعت میں کونسی سورت پڑھی تھی تو بعض اوقات وہ بھی یاد نہیں آتا۔ حالانکہ یہ نماز درحقیقت اللہ جل شانہ کے دربار میں حاضری ہے اور احکم الحاکمین کے دربار میں حاضری ہے، اگر ایک معمولی سے بادشاہ اور معمولی سے سربراہِ حکومت کے دربار میں تمہاری حاضری ہو جائے اور وہاں پر یہ رویہ اختیار کرو کہ بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو اور تمہارا دماغ اپنے دفتر میں ہو یا گھر میں ہو یا تجارت میں ہو، نہ تم اس بادشاہ کی بات سن رہے ہو اور نہ تمہیں اس بات کا دھیان ہے کہ میں بادشاہ کے دربار میں کیا درخواست پیش کر رہا ہوں، تو بادشاہ کے دربار میں ایسی حاضری قابلِ سزا ہونی چاہئے کہ تم بادشاہ کے دربار میں آئے ہو یا اپنا کاروبار کرنے آئے ہو۔ اصل تقاضا تو یہ تھا کہ اس حاضری کو منہ پر مار دیا جائے اور اس حاضری پر سزا دی جائے۔

ہماری نمازیں ان کی شایانِ شان نہیں

لیکن اللہ جل شانہ کا بڑا کرم ہے کہ ہماری ان زیادتیوں کے باوجود اور ہماری طرف سے ان کوتاہیوں کے باوجود محض اپنے فضل و کرم سے ان نمازوں کو قبول فرما لیتے ہیں۔ لہٰذا یہ نماز جس کو ہم عبادت کہہ رہے ہیں، حقیقت شناس نگاہوں سے دیکھو تو یہ نماز اللہ تعالیٰ کی توہین ہے، مگر اس طرح نماز پڑھتے ہوئے ہمیں کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ہم کوئی گناہ کر رہے ہیں۔ اس لئے بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں یہ خیال بھی نہیں آتا، لیکن حقیقت میں وہ مغفرت کے قابل ہوتی ہیں۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

((رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاعْفُ عَنَّا وَتَكَرَّمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا لَا نَعْلَمُ))(۱)

اے اللہ! ہماری مغفرت فرمایئے اور ہم پر رحم فرمایئے اور ہمیں معاف کر دیجئے اور کرم فرمایئے اور ہمارے ان گناہوں سے درگزر کیجئے جو آپ کے علم میں ہیں، کیونکہ آپ کے علم میں ہمارے وہ گناہ بھی ہیں جو ہمارے علم میں نہیں۔ یہ گناہ ہم نے کیے تھے، لیکن ہمیں ان کے گناہ ہونے کا پتہ نہیں، لہٰذا کوئی انسان کسی بھی لمحے استغفار سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

توبہ سے ترقیٔ درجات

استغفار کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسا نسخۂ کیمیا عطا فرمایا ہے کہ یہ مٹی کو سونا بنادے اور گندگی اور نجاست کو پاک چیز میں تبدیل کر دے۔ گناہ گندگی اور نجاست ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب میرا بندہ گناہ کرنے کے بعد خلوصِ دل سے استغفار کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو وہ گناہ اس کی ترقیٔ درجات کا سبب بن جاتا ہے، گناہ ہو جانے کے بعد جب دل میں ندامت، شرمندگی اور عاجزی پیدا ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ یا اللہ! مجھ سے سخت غلطی ہوئی، اپنی رحمت سے مجھے معاف فرمادیں تو یہ معافی انسان کے درجات کی بلندی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اس استغفار کے ذریعہ اللہ تعالیٰ گندگی کو بھی پاکی سے تبدیل فرمادیتے ہیں، اس لئے ہر مرحلے پر استغفار کرتے رہنا چاہئے، یہاں تک کہ عبادت کے بعد بھی استغفار کرنا چاہئے۔

نماز کے بعد استغفار کیوں ہے؟

حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز سے سلام پھیرتے تھے تو سلام پھرنے کے بعد پہلا لفظ جو زبان سے ادا فرماتے، وہ تین مرتبہ استغفار ہوتا تھا، ''استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ''(۲)

اب سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ استغفار تو کسی گناہ کے بعد ہونا چاہئے، لیکن یہاں تو ایک عبادت انجام دی اور ایک ثواب کا کام کیا، اس کے بعد استغفار کیوں کیا؟ استغفار اس بات سے کیا کہ یا اللہ! نماز ادا کرنے کا جو حق تھا، وہ ہم سے ادا نہیں ہوسکا:

---

(۱) إحياء علوم الدين (۳/۷۳)، نبی پاک ﷺ یہ دعا سعی کے دوران پڑھا کرتے تھے۔

(۲) سنن الترمذی، کتاب الصلاة، باب ما يقول إذا سلم من الصلاة، رقم:۲۷۶، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، باب ما يقول الرجل إذا سلم، رقم: ۱۲۹۲، مسند أحمد، رقم:۲۱۳۳۱

((مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ وَمَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ))

اے اللہ! ہم سے آپ کی عبادت کا حق ادا نہیں ہو پایا، نہ جانے کتنی کوتاہیاں اور کتنی غلطیاں اس عبادت کے اندر سرزد ہوئیں، اے اللہ! ہم پہلے آپ سے ان کوتاہیوں اور غلطیوں پر مغفرت مانگتے ہیں جو ہم سے اس نماز کے ادا کرنے کے دوران سرزد ہوئیں۔

ہر عبادت کے بعد دو کام کرو

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص کوئی عبادت انجام دے تو اس عبادت کو انجام دینے کے فوراً بعد دو کام کرے، چاہے وہ عبادت نماز ہو، تلاوت ہو، صدقہ ہو، روزہ ہو، ذکر ہو، ان سب کے بعد دو کام انجام دے، ایک یہ کہ ''الحمدللہ'' کہے اور دوسرے ''استغفراللہ'' کہے۔ الحمدللہ اس بات پر کہے کہ اے اللہ! آپ نے مجھے یہ عبادت انجام دینے کی توفیق عطا فرمادی، اگر آپ توفیق نہ دیتے تو مجھ سے یہ عبادت انجام نہ پاتی، اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہمیں ہدایت نہ ملتی، اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہمیں نماز پڑھنے اور روزے رکھنے کی توفیق نہ ہوتی، لہٰذا پہلے اس عبادت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرلو کہ اس نے اتنی توفیق دے دی کہ اس کی بارگاہ میں آکر کھڑے ہوگئے، ورنہ کتنے لوگ ہیں جو اس سے محروم ہیں۔

حقِ عبادت ادا نہ ہوسکنے پر استغفار

پھر اس کے بعد ''استغفراللہ'' کہے کہ یا اللہ! اس عبادت کا جو حق تھا وہ مجھ سے ادا نہ ہوسکا، جس طرح اس عبادت کو ادا کرنا چاہئے تھا، اس طرح ادا نہیں کیا، اس لئے اے اللہ! میں اس کوتاہی پر آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ لہٰذا انسان کسی بھی لمحے استغفار سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ یہ بڑی عظیم دولت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر جو دعائیں تلقین فرمائیں، ان میں استغفار کو بھی شامل فرمایا، چنانچہ وضو کے دوران کی دعا میں بھی پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ))

ظاہری اور باطنی میل کچیل دور ہوجائے

وضو کے دوران اس جملے کو پڑھنے میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ جس وقت انسان وضو کرتا ہے تو اس کے ذریعہ وہ اپنے ظاہری اعضاء کے میل کچیل کو صاف کرتا ہے، اس جملے کے ذریعہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرنے والے کو اس طرف متوجہ فرمارہے ہیں کہ وہ اپنے باطنی میل کچیل کی صفائی

کا بھی خیال کرے اور اس کی بھی فکر کرے، کہیں ایسا نہ ہو وضو کے ذریعہ اس نے اپنے چہرے کو تو دھو کر صاف کرلیا اور اب وہ چہرہ صاف ستھرا نظر آ رہا ہے، لیکن باطن کے اندر گناہوں کی گندگی جمی ہوئی ہے تو پھر اس ظاہری صفائی کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ جب تم ظاہری اعضاء کو دھو رہے ہو اور اس کا میل کچیل دور کر رہے ہو تو اس وقت تم اللہ تعالیٰ سے اندرونی میل کچیل کی صفائی بھی مانگو اور کہو:

((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ))

اے اللہ! میرے اندر کے میل کچیل کو بھی صاف کر دیجئے اور میرے گناہوں کو بھی معاف فرما دیجئے۔

صغیرہ اور کبیرہ دونوں قسم کے گناہوں کی معافی

اس دعا میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صغیرہ گناہ تو وضو کے ذریعہ خود بخود معاف ہوتے رہتے ہیں، چاہے توبہ کرے یا نہ کرے، چنانچہ جو صغیرہ گناہ ہاتھوں کے ذریعہ کیے ہیں، وضو میں ہاتھ دھونے سے وہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں، آنکھ سے جو گناہ کیے ہیں، وہ چہرہ دھونے سے معاف ہو جاتے ہیں، کان سے جو گناہ کیے ہیں، وہ کان کا مسح کرنے سے معاف ہو جاتے ہیں، جو گناہ پاؤں کے ذریعہ چل کر کیے ہیں، وہ پاؤں دھونے سے معاف ہو جاتے ہیں، لہٰذا صغیرہ گناہ تو اس طرح خود بخود معاف ہو جاتے ہیں، لیکن کبیرہ گناہ خود بخود معاف نہیں ہوتے جب تک توبہ نہ کی جائے، اس لئے حضور اقدس ﷺ یہ ترکیب بتا رہے ہیں کہ صغیرہ گناہ تو اللہ تعالیٰ خود معاف فرما رہے ہیں البتہ کبیرہ گناہوں کے لئے تم اللہ تعالیٰ سے اس وقت مغفرت مانگ لو اور کہو:

((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ))

اے اللہ! جو میرے بڑے گناہ ہیں، ان کی بھی مغفرت فرما، اس طرح صغیرہ اور کبیرہ دونوں قسم کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جو بندہ نیک نیتی سے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما ہی دیتے ہیں۔ بہر حال! یہ جملہ تو آخرت سے متعلق ہے۔

گھر میں دونوں قسم کی کشادگی مطلوب ہے

اس کے بعد دو جملے دنیا سے متعلق ارشاد فرمائے، پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَوَسِّعْ لِیْ فِیْ دَارِیْ))

اے اللہ! میرے گھر میں کشادگی عطا فرما۔ اسی وجہ سے علماء نے فرمایا کہ گھر کی کشادگی

مطلوب ہے، تنگی مطلوب نہیں۔ اور یہ کشادگی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک کشادگی ظاہری ہوتی ہے کہ گھر لمبا چوڑا ہے، کمرے بڑے ہیں، صحن بڑا ہے، برآمدہ وسیع و عریض ہے، ایک کشادگی تو یہ ہے۔ دوسری کشادگی معنوی ہے، وہ یہ کہ جب آدمی گھر کے اندر جائے تو اس کے دل کو سکون نصیب ہو، آرام اور راحت نصیب ہو، لیکن اگر گھر تو بہت بڑا ہے، بڑی کوٹھی اور بنگلہ ہے، مگر جب گھر میں داخل ہوتا ہے تو گھر والوں کا طرزِ عمل اور بیوی بچوں کا طرزِ عمل ایسا ہے جس سے انسان کو ضیق اور تنگی ہوتی ہے اور اس گھر میں اس کو آرام اور سکون نہیں ملتا تو اس صورت میں گھر کی ظاہری کشادگی کس کام کی، وہ کشادگی بیکار ہے۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ نے جو کشادگی مانگی، اس کے اندر دونوں قسم کی کشادگی داخل ہے، یعنی اے اللہ! ظاہری کشادگی بھی عطا فرما اور باطنی کشادگی بھی عطا فرما، تاکہ جب میں گھر میں جاؤں تو راحت اور سکون نصیب ہو۔

گھر کا اصل وصف ''سکون'' ہے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ م بُيُوتِكُمْ سَكَنًا﴾(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لئے سکون کی جگہ بنایا۔ لہٰذا گھر کا سب سے اعلیٰ وصف یہ ہے کہ اس کے اندر جانے کے بعد انسان کو سکون نصیب ہو، اگر سکون نصیب نہیں تو پھر وہ گھر چاہے کتنا ہی بڑا بنگلہ ہو، اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ اور اگر جھونپڑی ہو اور اس کے اندر سکون حاصل ہو جائے تو وہ بڑے بڑے محلات سے بہتر ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اے اللہ! میرے گھر میں کشادگی عطا فرما۔

گھر میں خوبصورتی سے زیادہ کشادگی مطلوب ہے

اور حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا نہیں فرمائی کہ میرے گھر کو خوبصورت بنا دیجئے یا میرے گھر کو عالیشان بنا دیجئے، بلکہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ''کشادگی'' کا لفظ استعمال فرمایا۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس جملے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ گھر کی اصل صفت یہ ہے کہ اس میں کشادگی ہو، تنگی نہ ہو، کیونکہ اگر تنگی ہوگی تو وہ انسان کے لئے تکلیف دہ ہوگی اور کشادگی انسان کے لئے راحت کا سبب ہوگی، باقی ٹیپ ٹاپ اور آرائش یہ زائد چیزیں ہیں، انسان کی اصل ضرورت یہ ہے کہ گھر کے اندر کشادگی ہو، اس لئے آپ نے یہ دعا فرمائی۔

(۱) النحل: ۸۰

تین چیزیں نیک بختی کی علامت ہیں

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تین چیزیں انسان کی سعادت میں سے ہیں، ایک اچھی بیوی، دوسرے کشادگی والا گھر، تیسرے خوشگوار اور آرام دہ سواری۔ (۱)

اس لئے آپ نے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! میرے گھر میں کشادگی عطا فرما۔

دلوں کا ملا ہوا ہونا کشادگی میں داخل ہے

پھر ''کشادگی'' کا لفظ اتنا وسیع ہے کہ اس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ گھر بڑا ہو، بلکہ اس کے اندر یہ بات بھی داخل ہے کہ گھر والوں کے دل باہم ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہوں، اگر گھر تو بڑا ہے لیکن گھر والوں کے دل ملے ہوئے نہیں ہیں تو وہ گھر بڑا ہونے کے باوجود گھر کی راحت اس میں حاصل نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا اِس دعا کے اندر یہ بات بھی داخل ہے کہ گھر کے ماحول کے اندر راحت ملے۔ یہ نہ ہو کہ گھر میں داخل ہو کر انسان ایک عذاب کے اندر مبتلا ہو جائے۔

برکت کی دعا کی وجہ

تیسرا جملہ ارشاد فرمایا:

((وَبَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ))

اے اللہ! میرے رزق میں برکت عطا فرما۔ اس جملہ میں بھی غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ دعا نہیں فرمائی کہ اے اللہ! مجھے بہت زیادہ رزق عطا فرما، میرے مال میں اضافہ فرما، بلکہ یہ دعا فرمائی کہ میرے رزق میں برکت عطا فرما۔ اس کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ سبق دے دیا کہ مال و دولت ہو یا دنیا کے اور ساز و سامان ہوں، چاہے کھانے پینے کا سامان ہو یا پہننے اور اوڑھنے کا سامان ہو، یا گھر کے اندر برتنے کا سامان ہو، یہ سب رزق کے اندر داخل ہے۔ بہر حال! یہ جتنے بھی سامان ہیں، محض ان کی گنتی بڑھ جانے سے کچھ نہیں ہوتا، یا بینک بیلنس بڑھ جانے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مال میں برکت نہ ہو۔

مانگنے کی چیز ''برکت'' ہے

اگر اللہ تعالیٰ برکت عطا فرما دیں تو مزدور کی تھوڑی سی تنخواہ میں بھی برکت عطا فرما دیتے ہیں

---

(۱) صحیح ابن حبان، رقم: ٤١٠٧ (٦٨/١٧)، شعب الإيمان للبيهقي، رقم: ٩٢٣٤ (٤٤/٢٠)

جس سے اس کو سکون اور چین نصیب ہو جاتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ برکت اُٹھالیں تو کروڑ پتی اور ارب پتی انسان کے لئے اس کا مال راحت کا سبب بننے کے بجائے اُلٹا عذاب کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لئے فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی چیز گنتی کا اضافہ نہیں ہے بلکہ مانگنے کی چیز ''برکت'' ہے۔ گنتی کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے کافر کا ذکر کرتے ہوئے سورۃ ہمزہ میں فرمایا:

﴿وَيْلٌ لِكُلِّ هُمَزَةٍ لُمَزَةٍ نِ٥ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهُ٥﴾(۱)

افسوس ہے اس کافر کے لئے جو دوسروں پر طعنے مارتا پھرتا ہے اور دوسروں کی عیب جوئی کرتا پھرتا ہے اور مال جمع کر کے پھر ہر وقت گنتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس کو گنتی کرنے میں مزہ آتا ہے کہ اب اتنے ہو گئے اور اب اتنے ہو گئے۔ قرآن کریم نے اس کو مذمت کے پیرائے میں بیان فرمایا کہ گنتی بڑھ جانے میں دھوکہ ہی دھوکہ ہے، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس گنتی بڑھنے کے نتیجے میں تجھے سکون کتنا ملا اور تجھے راحت اور آرام کتنا نصیب ہوا۔ اگر گنتی تو لاکھوں اور اربوں تک پہنچ گئی اور جائیدادیں بنالیں، لیکن خود جیل خانے میں پڑا ہے تو وہ ساری دولت راحت کا سبب بننے کے بجائے اُلٹا عذاب کا سبب بن رہی ہے، اس دولت میں برکت نصیب نہیں ہوئی۔ دوسری طرف ایک معمولی سے مزدور کو جو آٹھ گھنٹے محنت کرنے کے بعد تھوڑے سے پیسے ملے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پیسوں میں برکت عطا فرمادی، اس کے نتیجے میں اس نے بھرپور بھوک کے ساتھ کھانا کھایا، اطمینان کے ساتھ وہ کھانا ہضم ہوا اور رات کو آٹھ گھنٹے تک بھرپور نیند لی اور صبح تازہ دم ہو کر بیدار ہوا۔

ایک سبق آموز واقعہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ لکھنؤ کے ایک بہت بڑے نواب صاحب بہت بڑے جاگیردار تھے، ان کے محلات اور قلعے تھے، نوکر چاکر، حشم و خدم تھے، انواع و اقسام کی نعمتیں مہیا تھیں، مگر ان نواب صاحب کے معدے میں ایک ایسی بیماری پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ان کے معالج نے یہ کہہ دیا تھا کہ اب آپ کی غذا ساری عمر ایک ہی ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ بکری کا آدھا پاؤ قیمہ لیا جائے اور اس کو ململ کے کپڑے میں رکھ کر اس کا جوس نکالا جائے، بس وہ جوس آپ کی غذا ہے، اس کے علاوہ کوئی بھی چیز آپ نہیں کھا سکتے۔ اب گھر میں انواع و اقسام کے کھانے پک رہے ہیں، پھل فروٹ موجود ہیں، میوے موجود ہیں، اور دنیا بھر کی نعمتیں موجود ہیں، لیکن نواب صاحب کو صرف قیمہ کا جوس ملتا ہے اور کچھ نہیں ملتا۔

---

(۱) الھمزۃ: ۱۔ ۲، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''بڑی خرابی ہے اس شخص کی جو پیٹھ پیچھے دوسروں پر عیب لگانے والا، اور منہ پر طعنے دینے کا عادی ہو، جس نے مال اکٹھا کیا ہو، اور اسے گنتا رہتا ہو''

اللہ تعالیٰ یہ دولت لے لیں اور سکون کی نیند دے دیں

ایک دن وہ نواب صاحب دریائے گومتی کے کنارے اپنے محل میں بیٹھے ہوئے تھے اور دریا کا نظارہ کر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک مزدور آیا، دوپہر کا وقت تھا، وہ دریا کے کنارے ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا اور پھر اس نے اپنی گٹھڑی کھولی اور اس میں سے جو کی دو موٹی موٹی روٹیاں نکالیں اور پیاز نکالی، اور پھر ان روٹیوں کو اس پیاز کے ساتھ خوب شوق اور رغبت کے ساتھ کھایا، پھر دریا سے پانی پیا اور پھر اسی درخت کے نیچے سو گیا اور خراٹے لینے شروع کر دیئے۔ نواب صاحب اُوپر سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ نواب صاحب نے کہا کہ میں اس پر راضی ہوں کہ یہ ساری دولت، یہ کوٹھی، یہ بنگلے وغیرہ یہ سب اللہ تعالیٰ مجھ سے لے لیں اور آرام وسکون کی جو نیند اس مزدور کو حاصل ہے، وہ مجھے مل جائے۔ لہٰذا دولت ہے لیکن برکت نہیں۔

آج سب کچھ ہے، مگر برکت نہیں

اگر غور کیا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ ہمارا آج کا مسئلہ یہ ہے کہ آج ہمارے پاس سب کچھ ہے لیکن برکت نہیں ہے۔ جو شخص ماہانہ ایک ہزار روپے کما رہا ہے اور وہ شخص جو ماہانہ ایک لاکھ روپے کما رہا ہے، دونوں کی زبان سے ایک ہی جملہ سننے کو ملے گا کہ "گزارہ نہیں ہوتا"، بلکہ بعض اوقات لاکھوں کمانے والا اس مزدور کے مقابلے میں زیادہ شکوہ کر رہا ہوتا ہے جو مہینے میں دو ہزار روپے کماتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ آج برکت اُٹھ گئی ہے، نہ مال میں برکت ہے، نہ کھانے میں برکت ہے، نہ پانی میں برکت ہے، نہ لباس میں برکت ہے، نہ اوقات میں برکت ہے۔

آج وقت میں برکت نہیں

آج کے دور میں سائنس کی ایجادات نے انسان کا کتنا وقت بچایا ہے۔ پہلے زمانے میں پکانے کے لئے چولہا جھونکنا پڑتا تھا، لکڑیاں سلگائی جاتی تھیں، اگر ایک کپ چائے بنانی ہو تو آدھا گھنٹہ چاہئے۔ مگر آج کے دور میں تم نے چولہے کا کان موڑا اور چولہا جل گیا اور دو منٹ میں چائے تیار ہوگئی، گویا کہ اس چولہے نے تمہارا آدھا گھنٹہ بچالیا۔ لیکن ذرا غور کرو کہ یہ آدھا گھنٹہ کہاں گیا؟ اسی طرح پہلے سفر پیدل ہوتے تھے یا گھوڑوں اور اُونٹوں پر ہوتے تھے، آج تیز رفتار سواریاں موجود ہیں، یہاں تک کہ صرف تین گھنٹے میں ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں پہنچ سکتے ہو، چوبیس گھنٹے میں پوری دنیا کے گرد چکر لگا سکتے ہو، لہٰذا ان تیز رفتار سواریوں سے ہمارا کتنا وقت بچ گیا، لیکن اس کے

باوجود یہ رونا ہے کہ وقت نہیں ملتا، فرصت نہیں ہے۔ نئی ایجادات نے جو اوقات بچائے وہ کہاں گئے؟ یہ سب اوقات بے برکتی کی نذر ہو رہے ہیں کہ اوقات میں برکت نہیں ہے۔

حضور ﷺ کے وقت کی برکت

جب اللہ تعالیٰ وقت میں برکت عطا فرماتے ہیں تو پھر تیئس سال کے اندر پوری دنیا میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی کو دیکھئے! اگر تعلیم کی طرف نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ساری عمر تعلیم ہی دیتے رہے، اگر اصلاح کے کام کی طرف دیکھو تو یہ نظر آئے گا کہ ساری عمر لوگوں کی اصلاح ہی کرتے رہے، اگر جہاد کے کام کو دیکھو تو یہ نظر آئے گا کہ آپ ساری عمر جہاد ہی کرتے رہے، لیکن اللہ جل شانہ نے حضورِ اقدس ﷺ سے صرف تیئس سال میں سارے بڑے بڑے کام انجام دلوا دیئے، یہ سب وقت کی برکت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے سرکارِ دو عالم ﷺ کے اوقات میں جو برکت عطا فرمائی تھی، سرکار کے ان غلاموں کے اوقات میں بھی وہ برکت عطاء فرما دی جنہوں نے آپ ﷺ کی غلامی کو سر کا تاج سمجھا، تھوڑے وقت میں اللہ تعالیٰ نے ان سے بھی کتنے بڑے بڑے کام لے لیے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور وقت کی برکت

بہت دور کی بات نہیں، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کو دیکھئے! ایک ہزار تصانیف چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے، آج اگر کوئی شخص ان کی تصانیف کو اوّل سے آخر تک صرف پڑھنا ہی چاہے تو اس کے لئے بھی سالہا سال درکار ہیں۔ ان تصانیف کے ساتھ ساتھ مجالس بھی جاری تھیں، اصلاح و ارشاد کا کام بھی جاری تھا، خط و کتابت بھی جاری تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کے اوقات میں یہ برکت عطا فرمائی تھی۔

برکت حاصل ہے تو سب کچھ حاصل ہے

بہر حال! اللہ تعالیٰ سے اصل مانگنے کی چیز برکت ہے، جب یہ برکت اُٹھ جاتی ہے تو پھر رونا ہی رونا ہوتا ہے، کھانے میں رونا، پینے میں رونا، پیسے میں رونا، مکان میں رونا، وقت میں رونا، ہر چیز میں رونا ہوتا ہے، یہ سب برکت کے فقدان کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے یہ دعا تلقین فرمائی کہ یہ دعا کرو:

((وَبَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ))
''اے اللہ میرے رزق میں برکت عطا فرما''
وہ رزق چاہے تھوڑا ہو لیکن برکت والا ہو، پھر دیکھو کہ اس رزق میں کیا لطف آتا ہے۔

تمام حاجتیں ان دعاؤں میں سمٹ گئیں

سرکار دو عالم ﷺ نے مندرجہ بالا جو تین دعائیں وضو کے دوران تلقین فرمائیں، اگر انسان پانچوں نمازوں کے وقت وضو کرتے ہوئے یہ دعائیں مانگے تو کبھی نہ کبھی تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے انشاء اللہ۔ اور جب اس نیت سے یہ دعائیں مانگو گے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعائیں مانگی ہیں تو ممکن نہیں ہے کہ یہ دعائیں قبول نہ ہوں، انشاء اللہ ضرور قبول فرمائیں گے اور دنیا و آخرت کی کوئی حاجت ایسی نہیں ہے جو ان تین دعاؤں میں سمٹ نہ گئی ہو۔

وضو کے دوران کی دوسری دعا

وضو کے دوران حضور اقدس ﷺ سے جو دوسرا ذکر ثابت ہے، وہ یہ ہے:
((أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ))
بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ وضو کے دوران یہ ذکر فرمایا کرتے تھے اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ وضو کے بعد آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر یہ ذکر فرمایا کرتے تھے۔ (۱)

وضو کے بعد کی دعا

وضو کے ختم ہونے کے بعد حضور اقدس ﷺ یہ دعا پڑھتے تھے:
((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ))(۲)

---

(۱) صحیح مسلم، كتاب الطهارة، باب الذكر المستحب عقب الوضوء، رقم: ۳٤٥، سنن الترمذي، كتاب الطهارة عن رسول الله، باب فيما يقال بعد الوضوء، رقم: ٥٠، سنن أبي داؤد، كتاب الطهارة، باب ما يقول الرجل إذا توضأ، رقم: ١٤٥، سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ما يقال بعد الوضوء، رقم: ٤٦٢، مسند أحمد، رقم: ١٣٢٩١۔ سنن الدارمي، كتاب الطهارة، باب القول بعد الوضوء، رقم: ٧١٠۔ مسند أحمد میں "ثم رفع نظره إلى السماء" اور سنن الدارمی میں "ثم رفع بصره إلى السماء" کا اضافہ بھی ہے۔

(۲) سنن الترمذي، كتاب الطهارة عن رسول الله، باب فيما يقال بعد الوضوء، رقم: ٥٠

''اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والوں میں سے بنا دیجئے اور پاکی حاصل کرنے والوں میں سے بنا دیجئے''

اس دعا کی کچھ تفصیل اور بزرگوں نے وضو کے دوران جو ہر ہر عضو کے دھونے کے وقت کی دعائیں بتائی ہیں، اگر زندگی رہی تو انشاء اللہ اگلے جمعہ کو اس کی تفصیل عرض کروں گا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے ہم سب کے حق میں ان دعاؤں کو قبول فرمائے، اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کی بھی مغفرت فرمائے، ہمارے گھروں میں بھی کشادگی عطا فرمائے اور ہمارے رزق میں بھی برکت عطا فرمائے اور وضو کو جناب رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

وضو کے دوران ہر عضو دھونے کی علیحدہ دعا☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ط أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گزشتہ جمعہ کو ان دعاؤں کا بیان ہوا تھا جو دعائیں حضورِ اقدس ﷺ سے وضو کے دوران پڑھنا ثابت ہیں، لیکن بزرگوں نے وضو کے دوران ہر عضو کو دھوتے وقت مستقل دعاؤں کی بھی تعلیم دی ہے، یہ دعائیں حضورِ اقدس ﷺ سے اس طرح ثابت نہیں کہ آپ وضو کے دوران فلاں عضو کو دھوتے وقت فلاں دعا پڑھا کرتے تھے اور فلاں عضو کو دھوتے وقت فلاں دعا پڑھا کرتے تھے، البتہ یہ دعائیں حضورِ اقدس ﷺ ہی سے دوسرے مواقع پر پڑھنا ثابت ہے۔ بزرگوں نے وضو کے دوران اعضاء کو دھوتے وقت بھی ان دعاؤں کو پڑھنے کی تعلیم دی تا کہ انسان کو وضو کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان رہے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں مانگتا رہے۔

وضو شروع کرتے وقت کی دعا

چنانچہ بزرگوں نے فرمایا کہ جب آدمی وضو شروع کرے تو یہ دعا پڑھے:

"بِسْمِ اللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى مِلَّةِ الْإِسْلَامِ"

"اس اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بلند اور عظیم ہے اور تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ملتِ اسلام کی دولت عطا فرمائی"

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/ ۱۲۵ تا ۱۳۸)

(۱) البقرۃ: ۱۸۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں"

گٹوں تک ہاتھ دھونے کی دعا

اس کے بعد جب گٹوں تک ہاتھ دھوئے تو یہ دعا پڑھے:
"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ الْيُمْنَ وَالْبَرَكَةَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشُّؤْمِ وَالْهَلَاكَةِ"
''اے اللہ! میں آپ سے خیر و برکت کا سوال کرتا ہوں اور نحوست اور ہلاکت سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں''

کلّی کرنے کی دعا

اس کے بعد جب کلّی کرے تو یہ دعا پڑھے:
"اَللّٰهُمَّ أَعِنِّيْ عَلٰى تِلَاوَةِ الْقُرْآنِ وَذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ"
''یا اللہ! تلاوتِ قرآن کریم کرنے پر اور آپ کا ذکر کرنے پر اور آپ کا شکر ادا کرنے پر اور آپ کی بہتر طریقے سے عبادت کرنے پر میری اعانت فرما''

ناک میں پانی ڈالتے وقت کی دعا

اس کے بعد جب ناک میں پانی ڈالے تو یہ دعا پڑھے:
"اَللّٰهُمَّ أَرِحْنِيْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَلَا تُرِحْنِيْ رَائِحَةَ النَّارِ"
''اے اللہ! مجھے جنت کی خوشبو سنگھایئے اور جہنم کی خوشبو نہ سنگھایئے''

چہرہ دھوتے وقت کی دعا

اس کے بعد جب چہرہ دھوئے تو یہ دعا پڑھے:
"اَللّٰهُمَّ بَيِّضْ وَجْهِيْ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ"
''اے اللہ! جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے، اس دن میرے چہرے کو سفید بنایئے گا''
قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:
﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾(۱)
''اس دن میدانِ حشر میں کچھ چہرے سفید چمکتے ہوئے ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے''

(۱) آل عمران: ۱۰۶

مومنوں کے چہرے جنہوں نے عمل صالح کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سفید ہوں گے اور کافروں کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ۝ إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۝ وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ۝ تَظُنُّ أَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ۝﴾(۱)

''قیامت کے دن کچھ چہرے تو شاداب ہوں گے اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے، اور کچھ چہرے مرجھائے ہوئے پژمردہ اور کملائے ہوئے ہوں گے اور ان کا یہ گمان ہوگا کہ اب ہمارے ساتھ کمر توڑنے والا معاملہ کیا جائے گا''

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ۝ وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ۝﴾(۲)

بہت سے چہرے اس دن روشن، ہنستے اور خوشیاں کرتے ہوں گے اور کچھ چہرے ایسے ہوں گے کہ ان پر اس دن غبار اور سیاہی چھائی ہوگی، یہی لوگ کافر اور فاجر ہوں گے۔

قیامت کے دن اعضاء چمکتے ہوں گے

بہرحال! میدانِ حشر ہی میں چہروں کی سیاہی اور سفیدی سے انسان کو اپنے انجام کا پتہ لگ جائے گا کہ مجھے کہاں جانا ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو لوگ دنیا میں وضو کرنے کے عادی تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اس حال میں اُٹھائیں گے کہ ان کے چہرے، ان کی پیشانیاں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں، یہ سب اعضاء چمکتے ہوئے ہوں گے اور اس چمک کی وجہ سے دور سے یہ نظر آئے گا کہ یہ بندہ نماز کے لئے وضو کیا کرتا تھا۔(۳) اور حضورِ اقدس ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ قیامت

(۱) القیامۃ: ۲۲ ـ ۲۵

(۲) عبس: ۳۸ ـ ٤۲، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اس روز کتنے چہرے تو چمکتے دمکتے ہوں گے، ہنستے، خوشی مناتے ہوئے، اور کتنے چہرے اس دن ایسے ہوں گے کہ ان پر خاک پڑی ہوگی، سیاہی نے انہیں ڈھانپ رکھا ہوگا، یہ وہی لوگ ہوں گے جو کافر تھے، بدکار تھے''

(۳) صحيح البخاری، كتاب الوضوء، باب الغر المحجلون من آثار الوضوء، رقم:۱۳۳، صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب استحباب إطالة الغرة والتحجيل في الوضوء، رقم:۳٦۲، سنن النسائي، كتاب الطهارة، باب حلية الوضوء، رقم: ۱۵۰، سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ثواب الطهور، رقم: ۲۸۰

کے روز میری اُمت کے لوگ "غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ" کی صورت میں اُٹھائے جائیں گے، یعنی ان کے چہرے بھی سفید ہوں گے اور ان کے ہاتھ اور پاؤں بھی سفید ہوں گے۔

چونکہ وہ دن آنے والا ہے اور چہرے کی سفیدی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہونے کی علامت ہے اور چہرے کی سیاہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مردود ہونے کی علامت ہے، اس لئے بزرگوں نے فرمایا کہ وضو کے دوران چہرہ دھوتے وقت یہ دعا کیا کرو:

''اے اللہ! میرا چہرہ اس دن سفید رکھئے جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے''

دایاں ہاتھ دھونے کی دعا

اس کے بعد دایاں ہاتھ کہنی تک دھوئے تو اس وقت یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ أَعْطِنِيْ كِتَابِيْ بِيَمِيْنِيْ وَحَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَّسِيْرًا"

''اے اللہ! میرا نامۂ اعمال مجھے دائیں ہاتھ میں دیجئے گا اور میرا حساب آسان فرمائیے گا''

اس دعا میں قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ وَيَنْقَلِبُ إِلٰى أَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝﴾(۱)

''جس شخص کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور پھر وہ اپنے متعلقین کے پاس خوش خوش آئے گا''

یعنی اس سے سرسری حساب لے کر اس سے کہا جائے گا کہ جاؤ۔ کیونکہ جس شخص سے باقاعدہ حساب لیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ اپنے ایک ایک عمل کا پورا حساب دو تو اس کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے:

((مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ))(۲)

جس شخص سے پورا پورا حساب لیا جائے اور اس کو ایک ایک عمل کا جواب دینا پڑے تو بالآخر

---

(۱) الانشقاق: ۷۔ ۹

(۲) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب من نوقش الحساب عذب، رقم: ٦٠٥٥، صحيح مسلم كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب إثبات الحساب، رقم: ٥١٢٢، سنن أبي داود، كتاب الجنائز، باب عيادة النساء، رقم: ٢٦٨٩، مسند أحمد، رقم: ٢٣٠٦٩

اس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

مجموعی زندگی درست کرنے کی فکر کریں

یہ ایمان کی دولت ایسی چیز ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ دولت کسی کو عطا فرما دیتے ہیں تو اس پر یہ کرم ہوتا ہے کہ اگر اس کی مجموعی زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گزری ہے، اگرچہ اس سے چھوٹے چھوٹے گناہ بھی ہو گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے حساب کتاب میں زیادہ جانچ پڑتال نہیں کریں گے بلکہ اس کے ساتھ آسانی کا معاملہ فرمائیں گے، بس اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی پیشی ہوگی اور پیشی ہونے کے بعد اس کا نامۂ اعمال سرسری طور پر دکھا دیا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ اپنے کرم کا معاملہ فرمائیں گے اور جنت میں بھیج دیں گے۔ لیکن جس شخص کی مجموعی زندگی معصیت میں گزری ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ سے غافل رہا تھا اور اللہ تعالیٰ کو بھولا ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کا احساس ہی دل سے جاتا رہا تھا، ایسے شخص سے حساب پورا پورا لیا جائے گا، اور جس شخص سے پورا پورا حساب لیا جائے گا وہ عذاب میں دھر لیا جائے گا۔ اسی لئے خود بزرگوں نے فرمایا کہ یہ دعا مانگا کرو:

''اے اللہ! میرا نامۂ اعمال مجھے دائیں ہاتھ میں عطا فرمائیے گا اور میرا حساب آسان لیجئے گا''

عربی کے الفاظ یاد نہ ہوں تو اُردو میں یہ دعا کر لیا کرو۔

بایاں ہاتھ دھونے کی دعا

اس کے بعد جب بایاں ہاتھ دھوئے تو یہ دعا کرے:

"اَللّٰهُمَّ لَا تُعْطِنِيْ كِتَابِيْ بِشِمَالِيْ وَلَا مِنْ وَّرَاءِ ظَهْرِيْ"

''اے اللہ! میرا نامۂ اعمال میرے بائیں ہاتھ میں نہ دیجئے گا اور نہ پشت کی طرف سے دیجئے گا''

قرآن کریم میں آیا ہے کہ مؤمنوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ان کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور کافروں کو اور بدعمل لوگوں کو ان کا نامۂ اعمال پشت کی جانب سے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اس لئے یہ دعا کرنی چاہئے:

''اے اللہ! میرا نامۂ اعمال نہ تو بائیں ہاتھ میں دیجئے اور نہ پشت کی جانب سے دیجئے تاکہ کافروں اور بدعملوں میں میرا شمار نہ ہو''

سر کا مسح کرتے وقت کی دعا

اس کے بعد جب انسان سر کا مسح کرے تو اس کے لئے بزرگوں نے فرمایا کہ یہ دعا کرنی چاہئے:

"اَللّٰھُمَّ اَظِلَّنِیْ تَحْتَ ظِلِّ عَرْشِکَ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّ عَرْشِکَ"

''اے اللہ! مجھے اپنے عرش کا سایہ عطا فرمایئے گا اس دن جس دن آپ کے عرش کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا''

ہر مسلمان جانتا ہے کہ جب میدانِ حشر میں لوگ جمع ہوں گے تو وہاں پر شدید گرمی کا عالم ہوگا اور سورج قریب ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ لوگ اس دن اپنے پسینے میں غرق ہوں گے، بعض لوگوں کے گھٹنوں تک پسینہ ہوگا، بعض لوگوں کی کمر تک پسینہ ہوگا، بعض لوگوں کے سینے تک پسینہ ہوگا اور بعض لوگوں کے ہونٹوں تک پسینہ ہوگا، اس طرح لوگ اپنے پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حشر کے دن کی اس گرمی سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔ اس لئے بزرگوں نے فرمایا کہ یہ دعا کیا کرو:

''اے اللہ! جس دن آپ کے عرش کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا، مجھے اس دن اپنے عرش کا سایہ عطا فرما''

عرش کے سائے والے سات افراد

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عرش کے سائے میں جگہ عطا فرمائیں گے، ان میں سات قسم کے لوگوں کا بطورِ خاص ذکر فرمایا:

(۱) ایک وہ نوجوان جس نے اپنی جوانی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاری ہو اور بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ نے اس کو عبادت کا ذوق عطا فرمایا ہو۔

(۲) دوسرے وہ شخص جس کا دل ہر وقت مسجد میں اٹکا ہوا ہو، ایک نماز پڑھ کر گھر گیا، اب دوسری نماز کی فکر اور اس کا انتظار لگ گیا کہ مجھے دوبارہ مسجد میں جانا ہے۔

(۳) تیسرے وہ شخص جس کو کسی صاحبِ منصب اور حسن و جمال والی عورت نے گناہ کی دعوت دی ہو، لیکن اس نے جواب میں کہا ہو کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

(۴) چوتھے وہ شخص جس نے دوسرے شخص سے صرف اللہ کے لئے محبت کی ہو، کسی دنیاوی غرض کے لئے دوستی اور محبت نہ کی ہو۔

(۵) پانچویں وہ شخص جس نے دائیں ہاتھ سے اس طرح صدقہ دیا ہو کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلا ہو کہ کیا دیا ہے۔

(۶)　چھٹا وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کے نتیجے میں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔
(۷)　ساتویں امام عادل۔[۱]

ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ عرش کے سائے میں جگہ عطا فرمائیں گے۔ اس لئے سر کا مسح کرتے وقت یہ دعا کرنی چاہئے کہ یا اللہ! مجھے اس دن عرش کا سایہ عطا فرما جس دن عرش کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

گردن کے مسح کے وقت کی دعا

اس کے بعد جب آدمی گردن کا مسح کرے تو یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ اَعْتِقْ رَقَبَتِیْ مِنَ النَّارِ"

''اے اللہ! میری گردن کو آگ (جہنم) سے آزاد کر دیجئے''

دایاں پاؤں دھوتے وقت کی دعا

اس کے بعد جب داہنا پاؤں دھوئے تو یہ دعا پڑھے:

"اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ قَدَمَیَّ عَلَی الصِّرَاطِ یَوْمَ تَضِلُّ فِیْهِ الْاَقْدَامُ"

''اے اللہ! میرے پاؤں کو اس دن پل صراط پر ثابت قدم رکھئے گا جس دن وہاں پر لوگوں کے پاؤں پھسل رہے ہوں گے''

یہ پل صراط جہنم کے اوپر ایک پُل ہے جس سے گزر کر آدمی جنت میں جائے گا۔ جو لوگ جہنمی ہوں گے ان کے پاؤں اس پُل پر پھسل جائیں گے جس کے نتیجے میں وہ جہنم کے اندر جا گریں گے۔

پُل صراط پر ہر ایک کو گزرنا ہوگا

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جہنم میں آنکڑے لگے ہوئے ہیں، جب کوئی جہنمی اس پُل کے

---

(۱)　صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب الصدقۃ بالیمین، رقم: ۱۳۳٤، صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فضل إخفاء الصدقۃ، رقم: ۱۷۱۲، سنن الترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی الحب فی اللہ، رقم: ۲۳۱۳، سنن النسائی، کتاب آداب القضاء، باب الإمام العادل، رقم: ۵۲۸۵، مسند أحمد، رقم: ۹۲۸۸، موطا الإمام مالك، الکتاب الجامع، باب ماجاء فی المتحابین فی اللہ، رقم: ۱۵۰۱

اوپر سے گزرے گا تو نیچے سے آنکڑا آکر اس کو کھینچ کر جہنم میں گرادے گا۔(۱) العیاذ باللہ العلی العظیم۔
یہ وقت بہت سخت ہوگا اور ہر شخص کو اس پُل پر سے گزرنا ہوگا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:
﴿وَإِنْ مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ (۲)
یعنی تم میں سے ہر شخص کو جہنم پر سے گزرنا ہی ہے، چاہے وہ مؤمن ہو یا کافر ہو، نیک ہو یا برا ہو۔ لیکن اگر اس کے اعمال اچھے ہوں گے اور وہ اطاعت گزار ہوگا تو وہ بجلی کی طرح تیزی سے اس پُل پر سے گزر جائے گا، جہنم کی کوئی تپش اس کو نہیں پہنچے گی، لیکن اگر وہ کافر ہوگا یا فاسق و فاجر ہوگا تو اس صورت میں جہنم کے آنکڑے اس کو اپنی طرف کھینچ لیں گے۔ اس لئے بزرگوں نے فرمایا کہ یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ! مجھے اس دن ثابت قدم رکھئے گا جس دن لوگوں کے پاؤں پھسل رہے ہوں گے۔

بایاں پاؤں دھوتے وقت کی دعا

اس کے بعد جب بایاں پاؤں دھوئے تو یہ دعا پڑھے:
"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ ذَنْبِيْ مَغْفُوْرًا وَّسَعْيِيْ مَشْكُوْرًا وَّتِجَارَتِيْ لَنْ تَبُوْرَ"
اے اللہ! میرے گناہوں کی مغفرت فرمادیجئے اور میں نے جو کچھ عمل کیا ہے اپنے فضل سے اس کا اجر مجھے عطا فرمایئے اور جو میں نے تجارت کی ہے یعنی جو زندگی گزاری ہے، جو حقیقت میں تجارت ہی ہے، اس کا نتیجہ آخرت میں ظاہر ہونے والا ہے، تو اے اللہ تعالیٰ! میری زندگی کی تجارت کو گھاٹے کی تجارت نہ بنایئے گا بلکہ نفع کی تجارت ہو کر آخرت میں اس کا اجر مجھے مل جائے۔
بہرحال! بزرگوں نے فرمایا کہ وضو کے دوران یہ دعائیں پڑھتے رہنا چاہئے، بہترین دعائیں ہیں۔ حضورِ اقدس ﷺ سے بھی دوسرے مواقع پر ان دعاؤں کا پڑھنا ثابت ہے، اگرچہ وضو کے وقت پڑھنا ثابت نہیں۔ اگر ان میں ایک دعا بھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی تو انشاء اللہ تعالیٰ بیڑہ پار ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ ہم سب کے حق میں یہ ساری دعائیں قبول فرمالے۔
دعاؤں کے عربی الفاظ یاد کرلیں اور جب تک عربی الفاظ یاد نہ ہوں، اس وقت تک اُردو ہی میں مانگ لیں تو اس وضو کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ظاہری صفائی کے ساتھ ساتھ باطنی صفائی بھی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان دعاؤں کی برکات ہم سب کو عطا فرمائے اور ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔
وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الصراط جسر جهنم، رقم: ٦٠٨٨، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب معرفة طریق الرؤیة، رقم: ٢٦٩، مسند أحمد، رقم: ٧٣٩٢
(۲) مریم: ٧١

وضو کے بعد کی دعا☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ط أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ O﴾(۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! اللہ جل شانہ سے تعلق قوی اور مضبوط کرنے کے لئے جناب رسول اللہ ﷺ نے ادعیۂ ماثورہ تعلیم فرمائی ہیں، صبح سے شام تک تمہاری زندگی میں جو مختلف موڑ آتے ہیں، ہر موڑ کے لئے ایک دعا تلقین فرمادی ہے کہ یہ دعا مانگا کرو، جب صبح بیدار ہو تو یہ دعا کرو، جب گھر سے باہر نکلو تو یہ دعا کرو، جب بازار جاؤ تو یہ دعا کرو، جب بیت الخلاء میں جاؤ تو یہ دعا کرو، جب مسجد میں جاؤ تو یہ دعا کرو، وغیرہ۔ انہی ادعیۂ ماثورہ میں سے بعض کی تشریح پچھلے جمعوں میں عرض کی تھی۔

وضو کے دوران پڑھنے کی دعا

وضو کی دعاؤں کا بیان چل رہا تھا، وضو کے دوران نبی کریم ﷺ جو دعا پڑھا کرتے تھے وہ یہ تھی:

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ وَوَسِّعْ لِيْ فِيْ دَارِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ))(۲)

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۱۳۹ تا ۱۴۶)

(۱) البقرة: ۱۸٦، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں"

(۲) سنن الترمذی، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما جاء في عقد التسبيح باليد، رقم: ۳٤۲۲، مسند أحمد، رقم: ۱٦۰۰٤، مصنف ابن أبي شيبة ۲۹۳۹۱ (٦/۵۰)، المعجم الكبير للطبراني، رقم: ۸۷۳ (۱۹/۳۵۹)، مجمع الزوائد (۱۰/٦۲)، السنن الكبرى للنسائي، رقم: ۹۹۰۸ (٦/۲٤)، مسند أبي يعلى الموصلي، رقم: ۷۱۱۲ (۱۵/۸۱)، جامع الأصول من أحاديث الرسول، رقم: ۵۲۱۳ (۷/۵۲۱۳)

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ وضو کے دوران اور بعض روایتوں میں آتا ہے کہ وضو کے بعد آپ ﷺ یہ پڑھا کرتے تھے:

((أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ))(۱)

وضو کے بعد کی دعا

جب آدمی وضو سے فارغ ہو جائے تو اس وقت کیا دعا کرے؟ نبی کریم ﷺ سے اس موقع پر دو دعائیں پڑھنا ثابت ہے، ایک یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ))(۲)

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ جب بندہ وضو کرتا ہے تو ظاہری صفائی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ باطنی صفائی بھی کرتے جاتے ہیں، اور ہر عضو سے ارتکاب کیے ہوئے صغیرہ گناہ اللہ تعالیٰ معاف فرماتے جاتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب بندہ وضو سے فارغ ہوتا ہے تو وہ صغیرہ گناہوں سے پاک ہو چکا ہوتا ہے۔ البتہ ابھی اس کے ذمے کبیرہ گناہ باقی ہوتے ہیں، اب کبیرہ گناہوں سے پاکی کے لئے اس موقع پر حضورِ اقدس ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ))

یعنی اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے کر دیجئے جو بہت توبہ کرنے والے ہیں اور ان لوگوں میں سے بنا دیجئے جو طہارت اور پاکی حاصل کرنے والے ہیں۔

صغیرہ کے ساتھ کبیرہ کی بھی معافی

اس دعا میں دو جملے ارشاد فرمائے، ایک جملہ یہ کہ مجھے بہت توبہ کرنے والوں میں سے بنا دیجئے۔ اس جملے کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ وضو کے ذریعہ صغیرہ گناہ تو معاف ہو گئے، اس

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب الذكر المستحب عقب الوضوء، رقم: ٣٤٥، سنن الترمذي، كتاب الطهارة عن رسول الله، باب فيما يقال بعد الوضوء، رقم: ٥٠، سنن أبي داؤد، كتاب الطهارة، باب ما يقول الرجل إذا توضأ، رقم: ١٤٥، سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ما يقال بعد الوضوء، رقم: ٤٦٢، مسند أحمد، رقم: ١٣٢٩١۔ سنن الدارمي، كتاب الطهارة، باب القول بعد الوضوء، رقم: ٧١٠۔ مسند احمد ''ثم رفع نظره إلى السماء'' اور سنن الدارمی میں ''ثم رفع بصره إلى السماء'' کا اضافہ بھی ہے۔

(۲) سنن الترمذي، كتاب الطهارة عن رسول الله، باب فيما يقال بعد الوضوء، رقم: ٥٠

لئے کہ صغیرہ گناہ نیک اعمال کے ذریعہ معاف ہو جاتے ہیں، لیکن کبیرہ گناہوں کے بارے میں قانون یہ ہے کہ وہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، اس لئے اس موقع پر یہ دعا تلقین فرمائی کہ اے اللہ! میرے صغیرہ گناہ تو معاف ہو گئے لیکن میرے بڑے بڑے گناہ ابھی باقی ہیں، ان سے پاک ہونے کے لئے اے اللہ! مجھے توبہ کی توفیق عطا فرمایئے تاکہ اس توفیق کے بعد میں توبہ کروں اور اس کے نتیجے میں میرے کبیرہ گناہ بھی معاف ہو جائیں۔

بار بار توبہ کرنے والا بنادیں

اس جملے کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ مجھے توبہ کی توفیق عطا فرمایئے بلکہ یہ فرمایا کہ مجھے ان لوگوں میں سے بنا دیجئے جو بہت توبہ کرنے والے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں مبالغہ کا صیغہ کیوں استعمال فرمایا، جبکہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں کہ جو شخص مجھ سے توبہ کرے گا، میں اس کے گناہ معاف کر دوں گا، اب بہت توبہ کرنے کا کیا مطلب؟ مطلب اس کا یہ ہے کہ یا اللہ! میں اس وقت تو توبہ کرلوں گا اور اس کے نتیجے میں آپ میری مغفرت بھی فرما دیں گے، لیکن اس کے بعد بھی مجھے اپنے اُوپر بھروسہ نہیں ہے، نہ جانے کب دوبارہ پھسل جاؤں اور پھر دوبارہ گناہ میں مبتلا ہو جاؤں، اگر ایسا ہو جائے تو اے اللہ! مجھے دوبارہ توبہ کرنے کی توفیق دیجئے گا۔ جس طرح انسان کے کپڑے ایک مرتبہ دھلنے کے بعد دوبارہ میلے ہو جاتے ہیں اور ان کو دوبارہ دھونے کی ضرورت پیش آجاتی ہے، اسی طرح انسان توبہ کے ذریعہ پاک ہو جاتا ہے اور پاک ہونے کے بعد جب وہ دوبارہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو پھر ناپاک ہو جاتا ہے اور پھر دوبارہ توبہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس لئے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! اوّل تو میری حفاظت فرمایئے اور اگر گناہ ہو جائے تو مجھے دوبارہ توبہ کی توفیق عطا فرمایئے۔

بہت زیادہ رجوع کرنے والا بنادیں

اس جملے کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ اس میں لفظ "توّاب" آیا ہے۔ جس کے معنی ہیں "بہت لوٹنے والا اور بہت رجوع کرنے والا"۔ دعا کے اب معنی یہ ہوئے کہ اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے بنا دیجئے جو ہر وقت آپ سے رجوع کرتے ہیں، ہر وقت آپ کی طرف لوٹتے ہیں، جنہوں نے آپ کے ساتھ مضبوط تعلق قائم کر رکھا ہے، ان کو جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو یہ لوگ آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ دعا اس وقت کی جارہی ہے جب آدمی ابھی وضو سے فارغ ہوا ہے اور وضو کے دوران بھی ادعیۂ ماثورہ پڑھتا رہا ہے، اب یہ دعا کر رہا ہے کہ یا اللہ! مجھے کثرت سے آپ کی طرف رجوع کرنے والا بنا دیجئے تاکہ ہر وقت میں آپ سے رابطہ قائم رکھوں۔

باطن کو بھی پاک کرنے والا بنادیں

اس دعا کا دوسرا جملہ یہ ہے:

((وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ))

اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے بنا دیجئے جو کوشش کر کے پاکی حاصل کرتے ہیں۔ ''طاہر'' کے معنی ہیں ''پاک'' لیکن لفظ مُتَطَهِّرِيْنَ ''باب تفعّل'' سے ہے اور باب تفعّل کی خاصیت مشقت اور تکلف ہے، لہٰذا اس لفظ کے معنی یہ ہوئے کہ جو اہتمام کر کے اور کوشش کر کے پاکی حاصل کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ظاہری پاکی کے ساتھ ساتھ باطنی پاکی بھی حاصل کرتے ہیں اور اپنے دل کی دنیا کو بھی پاک کرتے ہیں۔ لہٰذا اے اللہ! وضو کرنے کے نتیجے میں میرے اعضاء تو دھل گئے اور ان پر جو ظاہری میل کچیل تھا وہ بھی زائل ہو گیا، لیکن اب میرے باطن کا میل کچیل بھی دور کر دیجئے۔ وضو کے بعد حضور اقدس ﷺ سے ایک تو یہ دعا پڑھنا ثابت ہے۔

وضو کے بعد کی دوسری دعا

وضو کے بعد ایک اور ذکر بھی حضور اقدس ﷺ سے ثابت ہے، آپ یہ پڑھا کرتے تھے:

((سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ))(۱)

اے اللہ! میں آپ کی پاکی بیان کرتا ہوں اور آپ کی حمد کرتا ہوں، آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ کا کوئی شریک نہیں، میں آپ سے استغفار کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔ اس دعا میں بھی وہی بات دوبارہ آ گئی، یعنی صغیرہ گناہ تو وضو سے خود بخود معاف ہو گئے تھے، کبیرہ گناہوں کے لئے توبہ کی ضرورت تھی، اس لئے وضو کے بعد آپ نے یہ دعا فرمائی:

''أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ''

اے اللہ! میں آپ سے مغفرت مانگتا ہوں اور آپ سے توبہ کرتا ہوں۔ لہٰذا توبہ کے ذریعہ کبیرہ گناہوں کو بھی معاف کرا لیا۔

---

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في كفارة المجلس، رقم: ٤٢١٦، مسند أحمد، رقم: ١٥١٧٠۔ عام طور پر محدثین نے اس دعا کو کفارۂ مجلس کے لئے نقل فرمایا ہے۔

ایسا شخص محروم نہیں رہے گا

آپ ذرا تصور کریں کہ جو انسان دن میں پانچ مرتبہ وضو کرے گا اور وضو کرنے کے دوران وہ اذکار پڑھے گا جو حضورِ اقدس ﷺ نے تلقین فرمائے اور ہر وضو کے بعد یہ کہے گا:

((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ))

اور یہ کہے گا کہ اے اللہ! میں آپ سے مغفرت مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں، تو گویا کہ وہ شخص دن میں پانچ مرتبہ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ اور استغفار کرے گا، تو کیا اللہ تعالیٰ ایسے بندے کی توبہ قبول نہیں فرمائیں گے؟ کیا ایسے بندے کو اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ مضبوط تعلق نہیں عطا فرمائیں گے؟ جو بندہ یہ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ! مجھے اپنی طرف رجوع کرنے والا بنا دیجئے اور اپنی طرف مائل ہونے والا بنا دیجئے تو کیا ایسے بندے کو اللہ تعالیٰ محروم فرما دیں گے؟ ہرگز نہیں۔ ارے وہ تو رحمٰن الرحیم ہیں، وہ تو ہمارے پروردگار ہیں، اگر ایک بیٹا اپنے باپ سے یا اپنی ماں سے روزانہ دن میں پانچ مرتبہ ایک درخواست کرے، وہ درخواست بھی نامعقول نہ ہو، تو کیا کوئی باپ ایسا ہوگا جو اس کی درخواست کو قبول نہیں کرے گا؟ ضرور قبول کرے گا۔ اللہ تعالیٰ تو ماں باپ سے کہیں زیادہ رحیم و کریم ہیں، مہربان ہیں، وہ کیسے بندے کی اس دعا کو رد فرما دیں گے، بلکہ انشاء اللہ تعالیٰ یہ دعا ضرور قبول ہوگی اور قبول ہونے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس بندے کو اپنے ساتھ مضبوط تعلق عطا فرمائیں گے اور اس تعلق کے نتیجے میں انشاء اللہ تعالیٰ اس کی زندگی درست ہو جائے گی۔

بہرحال! یہ وضو کے بعد پڑھنے کی دعائیں تھیں جو نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

نمازِ فجر کے لئے جاتے وقت کی دعا☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز!

فجر کی نماز کے لئے جب مسلمان بیدار ہوگا اور وضو کرے گا اور وضو کے بعد وہ نمازِ فجر باجماعت ادا کرنے کے لئے مسجد کی طرف جائے گا تو فجر کی نماز کے لئے جاتے ہوئے راستے میں جو دعا پڑھنا حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت ہے، وہ یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَّفِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا وَّفِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا وَّعَنْ يَّمِيْنِيْ نُوْرًا وَّعَنْ يَّسَارِيْ نُوْرًا وَّفَوْقِيْ نُوْرًا وَّتَحْتِيْ نُوْرًا وَّأَمَامِيْ نُوْرًا وَّخَلْفِيْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ لِّيْ نُوْرًا وَّأَعْظِمْ لِيْ نُوْرًا اَللّٰهُمَّ أَعْطِنِيْ نُوْرًا))(۲)

اے اللہ! میرے دل میں نور پیدا فرما دیجئے۔ دیکھئے! فجر کا وقت ہے اور آدمی نمازِ فجر کے لئے جا رہا ہے، اس وقت میں رات کی تاریکی جا رہی ہوتی ہے اور دن کی روشنی آ رہی ہوتی ہے، دن کی روشنی

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۱۴۷ تا ۱۶۲)

(۱) البقرة: ۱۸۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں''

(۲) صحيح البخاري، كتاب الدعوات، باب الدعاء إذا انتبه بالليل، رقم: ۵۸۴۱، صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب الدعاء في صلاة الليل وقيامه، رقم: ۱۲۷۴، سنن النسائي، كتاب التطبيق، باب الدعاء في السجود، رقم: ۱۱۰۹، سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب في صلاة الليل، رقم: ۱۱۴۸، مسند أحمد، رقم: ۲۴۳۶

کی آمد کے وقت حضور اقدس ﷺ یہ دعا مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ! یہ ظاہری روشنی تو آپ پھیلا رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرے دل میں بھی نور عطا فرمائیے، میری آنکھوں میں نور عطا فرمائیے، میرے کانوں میں نور عطا فرمائیے، میرے دائیں طرف نور ہو، میرے بائیں طرف نور ہو، میرے اُوپر نور ہو، میرے نیچے نور ہو، میرے آگے نور ہو، میرے پیچھے نور ہو، اے اللہ! میرے لئے نور مقرر فرمادیجئے، اے اللہ! میرے نور کو بڑا کر دیجئے، اے اللہ! مجھے نور عطا فرمائیے۔ ایک روایت میں اس لفظ کا اضافہ ہے:

((وَاجْعَلْنِىْ نُوْرًا))

''اے اللہ! مجھے سراپا نور بنا دیجئے''

فجر کی نماز کے لئے جاتے وقت حضورِ اقدس ﷺ کا یہ معمول تھا کہ یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

ایسا شخص محروم نہیں رہے گا

اگر ایک شخص روزانہ بلاناغہ صبح کے وقت نماز کے لئے جاتے ہوئے راستے میں یہ دعا مانگ رہا ہے کہ اے اللہ! مجھے سراپا نور بنا دیجئے، میرے دل میں نور ہو، میری آنکھوں میں نور ہو، میرے کانوں میں نور ہو، میرے آگے، میرے پیچھے، میرے اوپر، میرے نیچے، میرے دائیں، میرے بائیں نور ہو، میرے ہر طرف نور ہو، اے اللہ! مجھے نور بنا دیجئے، تو کیا اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول نہیں فرمائیں گے؟ جو شخص روزانہ یہ دعا مانگ رہا ہو اور ایسے وقت میں مانگ رہا ہو جبکہ وہ بستر کو چھوڑ کر نیند کی قربانی دے کر اپنی خواہشات کو پامال کر کے اللہ تعالیٰ کے لئے نکلا ہے، وضو کر کے پاک صاف ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے جا رہا ہے، کیا اس کی دعا قبول نہیں فرمائیں گے؟ کیا اس کو نور عطا نہیں فرمائیں گے؟ ضرور عطا فرمائیں گے۔

دل کے اندر نور ہونے کا مطلب

پھر ہر چیز کا نور الگ ہوتا ہے، چراغ اور بجلی کا نور روشنی ہے، آنکھوں کا نور بینائی ہے، لیکن یہ بینائی ظاہری نور ہے، البتہ ہر چیز کا حقیقی اور باطنی نور یہ ہے کہ جب اعضاء میں وہ نور پیدا ہو تو یہ اعضاء اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق استعمال ہوں، یہ ہے اصل نور۔ لہٰذا اس دعا میں یہ جو فرمایا کہ میرے قلب میں نور ہو، قلب میں نور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میرے قلب میں ایسے خیالات آئیں جو منور ہوں، ایسے ارادے پیدا ہوں جو نور والے ہوں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہوں، اور قلب کے اندر سے نفاق کی بیماری دور ہو، قلب کے اندر سے تکبر دور ہو، قلب کے اندر سے حسد نکل جائے، حرص

نکل جائے، مال و جاہ کی محبت نکل جائے اور اس کی جگہ اللہ جل شانہ کی محبت دل میں پیدا ہو اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی محبت دل میں پیدا ہو، نیکیوں کی محبت دل میں پیدا ہو، یہ سب قلب کا نور ہے۔ جب انسان روزانہ اللہ تعالیٰ سے یہ نور مانگے گا تو کیا اللہ تعالیٰ اس کو نور نہیں دیں گے؟ ضرور دیں گے۔ البتہ مانگنے والا صدقِ دل سے مانگے، حسنِ نیت سے مانگے، توجہ اور اہتمام اور دھیان سے مانگے تو انشاء اللہ یہ نور ضرور عطا ہوگا۔

آنکھ میں نور ہونے کا مطلب

اور اس دعا میں یہ جو فرمایا کہ میری آنکھوں میں نور پیدا فرما۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آنکھ جائز اور حلال چیز کو دیکھے اور ناجائز چیز سے پرہیز کرے، ایسی چیز کو دیکھے جس کو دیکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آنکھ بنائی ہے، اس کا دنیا میں بھی فائدہ ہے اور آخرت میں بھی فائدہ ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص اپنے گھر میں داخل ہوا اور اس نے اپنی بیوی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور بیوی نے شوہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھا تو اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ آنکھ کا جائز اور مستحب بلکہ واجب استعمال ہے۔

ماں باپ کو دیکھنے سے حج وعمرہ کا ثواب

ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اولاد اپنے باپ کو یا ماں کو یا دونوں کو محبت کی نگاہ سے دیکھیں تو ایک مرتبہ ان پر محبت کی نگاہ ڈالنا ایک مقبول حج اور ایک مقبول عمرہ کا ثواب رکھتا ہے۔(۱)

اب ہم حج کے لئے کتنی محنت کرتے ہیں اور عمرہ کرنے کے لئے کتنی مشقت اُٹھاتے ہیں، لیکن جس کو اللہ تعالیٰ نے والدین کی نعمت عطا کی ہوئی ہے، وہ دن میں سینکڑوں مرتبہ حج وعمرہ کا ثواب حاصل کر لیتا ہے، یہ آنکھ کا صحیح استعمال ہے۔ لیکن اگر یہ آنکھ ناجائز جگہ پر پڑے، مثلاً لذت حاصل کرنے کی نیت سے نامحرم کو دیکھے، یا کسی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے، ذلت کی نگاہ سے دیکھے، تو یہ اس آنکھ کا ناجائز استعمال ہے، یا کوئی شخص اس آنکھ کو دوسرے کی دل آزاری کے لئے استعمال کرے، یا کوئی ایسی چیز اس آنکھ سے دیکھے جس کو اس کا مالک چھپانا چاہتا ہے، تو یہ آنکھ کا ناجائز استعمال ہے۔

---

(۱) شعب الإیمان، رقم:۱۱۷۶ (۳۶۵/۱۶)، کنز العمال، رقم:۴۵۵۳۵ (۴۷۷/۱۶)، الدر المنثور (۲۶٤/۵)

دوسرں کے گھروں میں جھانکنا

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی دوسرے کے گھر جاؤ تو پہلے اجازت لے لو، اجازت لینے سے پہلے کسی کے گھر میں داخل ہونا جائز نہیں۔ اسی حدیث میں آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

((فَإِنْ نَظَرَ فَقَدْ دَخَلَ))(۱)

یعنی ایک شخص ابھی دوسرے کے گھر میں داخل نہیں ہوا اور ابھی اس کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملی، لیکن وہ گھر کے اندر جھانک رہا ہے، جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ اجازت لینے کے انتظار میں دروازے پر کھڑے ہوتے ہیں تو کھڑے کھڑے اندر جھانکنا شروع کر دیتے ہیں، اس کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اجازت کے بغیر اندر جھانکنا بھی جائز نہیں۔

اجازت لینے کی اہمیت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم ﷺ اپنے گھر میں تشریف فرما تھے، آپ کے ہاتھ میں ایک کنگھی تھی جس کے ذریعہ آپ اپنے جسم پر خارش فرمار ہے تھے، اچانک آپ ﷺ کی نظر دروازے پر پڑی تو دیکھا کہ کوئی شخص دروازے کے سوراخ سے اندر جھانک رہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو صاحب اندر جھانک رہے تھے ان کی نیت خراب نہیں ہوگی، کیونکہ عام طور پر حضورِ اقدس ﷺ کے گھر میں کوئی ایسی چیز ہوتی نہیں تھی کہ آدمی چوری کرنے یا ڈاکہ ڈالنے کے لئے آئے، بظاہر وہ نبی کریم ﷺ کی محبت میں جھانک رہا تھا کہ آپ ﷺ کو دیکھوں کہ آپ کیا کر رہے ہیں، لہٰذا ان کی نیت بظاہر خراب نہیں تھی لیکن چونکہ اجازت کے بغیر جھانک رہے تھے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے جب ان کو اس طرح جھانکتے ہوئے دیکھا تو ان سے فرمایا کہ تم نے اتنا بڑا گناہ کیا ہے کہ تم اس لائق ہو کہ اس کنگھی سے تمہاری آنکھ پھوڑ دی جائے۔(۲)

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء فی کراھیة أن یخص الإمام نفسه بالدعاء، رقم: ۳۲۵، مسند أحمد، رقم: ۲۱۳۸۱

(۲) صحیح البخاری، کتاب الإستئذان، باب الإستئذان من أجل البصر، رقم: ۵۷۷۲، صحیح مسلم، کتاب الأداب، باب تحریم النظر فی بیت غیرہ، رقم: ۴۰۱۳، مسند أحمد، رقم: ۲۱۷۳۷، سنن الدارمی، کتاب الدیات، باب من اطلع فی دار قوم بغیر إذنھم، رقم: ۲۲۷۹

یہ نگاہ کا غلط استعمال ہے

ایک دوسری حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص دوسرے کے گھر میں اجازت کے بغیر دیکھے اور وہ گھر والا اس دیکھنے والے شخص کی آنکھ پھوڑ دے تو وہ شخص اپنے آپ کو ملامت کرے، پھوڑنے والے کو ملامت نہ کرے۔ (۱)

آپ ﷺ نے اتنی سخت سزا اس کی بیان فرمائی۔ بہرحال! یہ نگاہ کا غلط استعمال ہے۔ اسی طرح ایک شخص کا گھر اُونچا ہے اور دوسرے شخص کا گھر نیچے کی طرف ہے، اور اوپر گھر والا شخص نیچے والے گھر میں جھانک رہا ہے تو یہ نگاہ کا غلط استعمال ہے اور ناجائز استعمال ہے۔

آنکھوں کے ذریعہ گناہ اور ثواب دونوں کما سکتے ہو

لہٰذا اس نگاہ کے ذریعہ اگر کوئی شخص چاہے تو روزانہ بیسیوں مرتبہ حج وعمرہ کا ثواب حاصل کر سکتا ہے اور اس نگاہ کے ذریعہ اپنے دامن میں اللہ تعالیٰ کی رحمت جمع کر سکتا ہے، اور یہی نگاہ ہے کہ اگر انسان اس کو غلط استعمال کرے گا تو اس کے نامۂ اعمال میں گناہوں کا انبار جمع ہوتا رہے گا۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! میری آنکھ میں نور عطا فرمایئے۔ اس نور سے مراد ظاہری بینائی نہیں، ظاہری بینائی تو الحمدللہ پہلے سے موجود ہے، بلکہ اس نور سے مراد آنکھ کا وہ نور ہے جو آنکھ کو جائز استعمال کی حد کے اندر محدود رکھے اور اس کو گناہوں سے محفوظ رکھے۔

کان میں نور ہونے کا مطلب

اسی طرح آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

((وَفِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا))

''اے اللہ! میرے کان میں نور عطا فرما''

اب کان میں نور عطا فرمانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نور کے نتیجے میں کان میں کوئی بلب جل جائے گا یا کوئی چراغ جل جائے گا، بلکہ کان میں نور عطا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کان صحیح کاموں میں استعمال ہو، ناجائز کاموں سے وہ بچے، مثلاً اس کے ذریعہ قرآن کریم کی تلاوت سنی جائے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدیات، باب أخذ حقه أو اقتص دون الرحمٰن، رقم: ۶۳۸۰، صحیح مسلم، کتاب الآداب، باب تحریم النظر فی بیت غیرہ، رقم: ۴۰۱۷، سنن الترمذی، کتاب الإستئذان والآداب عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی الإستئذان قبالة البیت، رقم: ۲۶۳۱

جس کے نتیجے میں ایک ایک لفظ تمہارے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ کر رہا ہے، اس کان کے ذریعہ حضور نبی کریم ﷺ کے ارشادات سنو اور دین کی باتیں سنو تو اس صورت میں یہ کان عبادت میں مصروف ہے، اللہ تعالیٰ اس پر اجر و ثواب عطا فرما رہے ہیں۔

کان کا صحیح استعمال

ایک شخص کسی کے پاس دین کا علم حاصل کرنے کے لئے جاتا ہے یا دین کی بات سننے کے لئے جاتا ہے تو اس کے بارے میں حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ))(۱)

''جو شخص علم کی بات سننے کے لئے کسی راستے پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس راستے پر چلنے کی وجہ سے اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیتے ہیں''

لہٰذا اگر کوئی شخص گھر سے چل کر مسجد کی طرف آتا ہے اور نماز پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں یہ نیت بھی ہے کہ میں مسجد میں جا کر دین کی باتیں سنوں گا اور قرآن کریم کی تعلیمات اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور دین کے احکام سنوں گا تو یہ کان کا صحیح استعمال ہے، اس کے نتیجے میں اس کو حدیث میں بیان کردہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

کان کا غلط استعمال

لیکن اگر کوئی شخص اس کان کے ذریعہ فحش باتیں سنتا ہے یا گانا بجانا سنتا ہے، یا نامحرموں کی آواز سے لطف اندوز ہونے کے لئے ان کی باتیں سنتا ہے، یا اس کان کے ذریعہ غیبت سنتا ہے تو یہ سب کان کا غلط اور ناجائز استعمال ہے۔ اس لئے حضورِ اقدس ﷺ یہ دعا مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ! میرے کان میں نور عطا فرما، یعنی یہ کان جائز اور حلال کام میں استعمال ہو اور ناجائز اور حرام کام سے بچے، اور یہ کان جنت میں لے جائے اور جہنم سے بچائے، یہ کان کا نور ہے۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب فضل الاجتماع وتلاوة القرآن، رقم:۴۸٦٧، سنن الترمذي، كتاب العلم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب فضل طلب العلم، رقم:۲۵٧۰، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، رقم: ۲۲۱، مسند أحمد، رقم:٧١١٨

دائیں بائیں، آگے پیچھے نور ہونا

اس کے بعد یہ دعا فرمائی:

((وَّعَنْ یَّمِیْنِیْ نُوْرًا وَّعَنْ یَّسَارِیْ نُوْرًا وَّفَوْقِیْ نُوْرًا وَّتَحْتِیْ نُوْرًا وَّأَمَامِیْ نُوْرًا وَّخَلْفِیْ نُوْرًا))

''میرے دائیں نور عطا فرما، میرے بائیں نور عطا فرما، میرے آگے نور عطا فرما اور میرے پیچھے نور عطا فرما''

یعنی اے اللہ! میں جس جگہ بھی چل کر جاؤں، وہاں مجھے نورانی ماحول عطا فرمایئے، ایسا ماحول ہو جو مجھے نیکیوں پر اُبھارے اور گناہوں سے بچائے، جو مجھے آپ کا خوف دلائے اور میرے دل میں آخرت کی فکر پیدا کرے۔

شیطان چار طرف سے حملہ کرتا ہے

جس وقت اللہ تعالیٰ ابلیس کو جنت سے نکال رہے تھے تو پہلے تو اس نے یہ چالاکی کی کہ اللہ تعالیٰ سے یہ مہلت مانگ لی کہ اے اللہ! مجھے قیامت تک زندگی عطا فرمادیں، قیامت تک مجھے موت نہ آئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قیامت تک زندگی عطا فرمادی۔ جب اس کو مہلت مل گئی تو پھر کہتا ہے کہ اب میں آپ کی مخلوق کو گمراہ کروں گا، قرآن کریم میں ہے:

﴿لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ۝﴾(۱)

یعنی انسان کو گمراہ کرنے کے لئے اس کے آگے سے اس کے پیچھے سے اس کے دائیں طرف سے اور اس کے بائیں طرف سے آؤں گا، چاروں طرف سے انسان پر حملے کروں گا، آپ ان میں سے اکثر بندوں کو شکر گزار نہیں پائیں گے، وہ ناشکرے ہوں گے اور آپ کے احکام کی تعمیل نہیں کریں گے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے اسی وقت فرمادیا تھا کہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو کہ میں دائیں طرف سے آؤں گا اور بائیں طرف سے آؤں گا اور چاروں طرف سے آؤں گا اور آپ اکثر بندوں کو شکر گزار نہیں پائیں گے، یہ تو کیا شیخی بھگارتا ہے، حقیقت یہ ہے:

---

(۱) الأعراف: ۱۷، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''پھر میں ان پر (چاروں طرف سے) حملے کروں گا، ان کے سامنے سے بھی، اور ان کے پیچھے سے بھی، اور ان کی دائیں طرف سے بھی، اور ان کی بائیں طرف سے بھی، اور تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گذار نہیں پائے گا''

میرے بندوں پر داؤ نہیں چلے گا

﴿إِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ﴾(۱)

جو میرے بندے ہوں گے، ان پر تیرا کوئی قابو نہیں چلے گا، ان پر تیرا کوئی وار کارگر نہیں ہوگا، ہاں تیرا وار ان پر کارگر ہوگا جو میری بندگی سے ہٹے ہوئے ہوں گے، جو میرا بندہ نہیں بننا چاہتے اور میری بندگی سے انحراف کرنا چاہتے ہیں، وہ تیرے جال میں آجائیں گے، لیکن جہاں تک میرے بندوں کا تعلق ہے، یعنی جن کو اپنا بندہ ہونے کا احساس ہوگا اور اس احساس کے نتیجے میں وہ مجھ سے رجوع کرتے رہیں گے اور یہ کہتے رہیں گے کہ یا اللہ! ہم تیرے بندے ہیں، ہمیں اس شیطان سے بچالے، میرے ان بندوں پر تیرا داؤ نہیں چلے گا، ان پر تیرا قابو نہیں ہوگا۔ مگر وہ لوگ جو گمراہ ہیں، جن کو یہ احساس ہی نہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں، جو اس زمین پر خدا بن کر رہنا چاہتے ہیں، فرعون بن کر رہنا چاہتے ہیں، وہ تیرے داؤ میں آجائیں گے، لیکن میرے بندوں پر تیرا داؤ نہیں چلے گا۔

میرے بندے کون ہیں؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میرے ''بندے'' سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ تمام انسان اللہ کے بندے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''میرے بندے'' کہہ کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اس سے وہ بندے مراد ہیں جن کے دل میں عبدیت کا جذبہ ہو، بندگی کا جذبہ ہو اور جو مجھ سے رجوع کریں، جہاں شیطان گمراہ کرے اور اپنا داؤ چلائے تو وہ فوراً میری طرف رجوع کریں کہ یا اللہ! یہ شیطان مجھے پریشان کررہا ہے، یہ مجھے بہکانا چاہتا ہے، اے اللہ! مجھے بچالیجئے۔ ایسے بندوں پر شیطان کا داؤ نہیں چلے گا۔

شیطان کے حملے سے بچاؤ

لہٰذا چونکہ شیطان نے یہ کہا تھا کہ میں انسان کو بہکانے کے لئے دائیں سے، بائیں سے، آگے سے، پیچھے سے آؤں گا، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! ہمارے آگے بھی نور عطا فرما، پیچھے بھی نور عطا فرما، دائیں بھی نور عطا فرما اور بائیں بھی نور عطا فرما۔ وہ شیطان تو ظلمت اور تاریکی لا رہا ہوگا، وہ تو معصیت کا اندھیرا لا رہا ہوگا، اے اللہ! آپ ہمارے آگے اور پیچھے،

(۱) الحجر: ۴۲، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''یقین رکھ کہ جو میرے بندے ہیں، ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا، سوائے ان گمراہ لوگوں کے جو تیرے پیچھے چلیں گے''

دائیں اور بائیں نور پیدا فرمائیں، تاکہ اس کی لائی ہوئی ظلمت سے ہماری حفاظت ہو جائے۔ اب جو شخص صبح کو فجر کی نماز کے لئے جاتے وقت روزانہ اللہ تعالیٰ سے یہ مانگے گا تو کیا اللہ تعالیٰ اس کو نور نہیں دیں گے؟ ضرور دیں گے۔ ارے انہوں نے ہی حضور نبی کریم ﷺ کے دل پر یہ الفاظ القاء فرمائے اور پھر حضورِ اقدس ﷺ نے اپنی اُمت کو یہ الفاظ سکھائے، لہٰذا جب انہی کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ مجھ سے یہ چیز اس طرح مانگو تو کیا پھر بھی نہیں دیں گے؟ یہ کام تو ایک معمولی شریف انسان بھی نہیں کرسکتا۔

کوئی شریف انسان بھی ایسا نہیں کرے گا

ایک فقیر آدمی تھا، وہ تم سے مانگ رہا تھا، تم نے اس سے کہا کہ میرے گھر چلو، ہم تمہیں دیں گے، پھر تم اس کو اپنے ساتھ گھر لائے، جب گھر پہنچے تو تم نے اس سے پوچھا کہ بتاؤ کیا مانگتے ہو؟ اس فقیر نے کہا کہ مجھے اتنے پیسوں کی ضرورت ہے، اب تم نے اس سے کہا کہ بھاگ جاؤ۔ بتایئے کوئی شریف انسان یہ کام کرے گا؟ کوئی احمق اور کمینہ شخص ہی ایسا کام کرسکتا ہے، کیونکہ گھر پر ساتھ لایا ہے، اسی لئے لایا ہے تاکہ اس کو کچھ دے۔

مانگنے والا ہونا چاہئے

اسی طرح جب اللہ جل شانہ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کی معرفت یہ دعائیں ہم سے منگوائیں اور فرمایا کہ مجھ سے مانگو تو اس بات میں کوئی ادنیٰ شک وشبہ کی بھی گنجائش نہیں کہ وہ نہیں عطا کریں گے بلکہ وہ ضرور عطا کریں گے، بس مانگنے والا چاہئے۔ اور جب وہ نور عطا کریں گے تو پھر شیطان کا داؤ ہمارے اُوپر نہیں چلے گا، انشاء اللہ۔ کیونکہ شیطان میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ ہمیں زبردستی جہنم میں گھسیٹ کر لے جائے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ط اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○﴾ (۱)

اللہ ولی ہے یعنی اللہ ذمہ دار ہے، اللہ دوست اور نگراں ہے ایمان والوں کا کہ ان کو اندھیروں

(۱) البقرة: ۲۵۷، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اللہ ایمان والوں کا رکھوالا ہے؛ وہ انہیں اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کے رکھوالے وہ شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیریوں میں لے جاتے ہیں۔ وہ سب آگ کے باسی ہیں؛ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے"

سے نور کی طرف نکال کر لاتا ہے اور جو لوگ کافر ہیں، ان کے ذمہ دار اور ان کے ولی اور سرپرست شیاطین ہیں جو ان کو نور سے تاریکیوں اور اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں، یہ جہنم والے ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

ہم زبردستی نور نہیں دیتے

لہٰذا اللہ تعالیٰ تو ایمان والوں کو اندھیروں سے نور کی طرف نکال کر لانا چاہتا ہے، اس لئے فرمایا کہ ہم سے نور مانگو، جب تم مانگو گے تو ہم تم کو ضرور دیں گے۔ ہاں! اگر تم ایسے بے نیاز بن جاؤ اور یہ کہو کہ آپ نور دیا کریں لیکن ہمیں ضرورت نہیں، العیاذ باللہ، تو اس کے بارے میں قرآن کریم میں صاف ارشاد ہے:

﴿أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُونَ﴾(۱)

یا زبردستی ہم تم کو دے دیں جب تم اس کو ناپسند کر رہے ہو؟ جب تم نور لینا نہیں چاہتے، جب تم ہدایت لینا نہیں چاہتے، پھر بھی ہم زبردستی تم پر نور اور ہدایت تھوپ دیں، ہم ایسا نہیں کریں گے۔

طلب کا اظہار کر کے قدم بڑھاؤ

ہم تو یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ تمہاری طرف سے طلب کا اظہار ہو جائے اور پھر اس طلب کے مطابق تھوڑا قدم بڑھا دو، پھر ہم تم کو دیں گے۔ جب تم فجر کی نماز کے لئے آ رہے ہو، اس وقت تمہارا قدم خیر کی طرف، ایمان کی طرف، عملِ صالح کی طرف اُٹھا ہوا ہے، اس وقت تم زبان سے نور مانگتے ہوئے چلے آؤ تو انشاء اللہ ضرور عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے بھی اور آپ کو بھی اور سب مسلمانوں کو یہ نورِ ہدایت عطا فرمادے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ

---

(۱) ھود: ۲۸

مسجد میں داخل ہوتے وقت کی دعا☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَإِنِّىْ قَرِيْبٌ ط أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ o﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گزشتہ چند جمعوں سے ان ادعیۂ ماثورہ کی تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے زندگی کے مختلف مرحلوں میں تلقین فرمائیں۔ اب تک چند دعاؤں کی تشریح بیان کردی گئی ہے یعنی بیدار ہوتے وقت کی دعا، وضو کے دوران پڑھنے کی دعائیں اور صبح کو فجر کی نماز کے لئے جاتے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے، آخر میں اس کا بیان ہوا تھا۔

مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ پڑھیں

اس کے بعد انسان مسجد میں نماز کے لئے داخل ہوتا ہے، مسجد میں داخل ہوتے وقت جو دعا حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت ہے، وہ یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِىْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ))(۲)

بعض روایتوں میں دعا سے پہلے بسم اللہ اور درود شریف کے اضافہ کے ساتھ اس طرح یہ دعا

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۱۶۴ تا ۱۷۶)، قبل از نماز جمعہ، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) البقرۃ: ۱۸۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں"

(۲) صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها، باب ما یقول اذا دخل المسجد، رقم: ۱۱۶۵، سنن النسائی، کتاب المساجد، باب القول عند دخول المسجد وعند الخروج منه، رقم: ۷۲۱، سنن النسائی، کتاب الصلاۃ، باب ما یقوله الرجل عند دخوله المسجد، رقم: ۳۹۳

منقول ہے:

((بِسْمِ اللّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ))(۱)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ انسان مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے اللہ کا نام لے اور ''بسم اللہ'' کہے، تاکہ اس کے ذریعہ اس بات کا اقرار ہو جائے کہ میرا مسجد میں آنا اللہ جل شانہ کی توفیق سے ہے، اس لئے میں اللہ کا نام لے کر اس کی نعمت کا اعتراف کر کے اور اس کی توفیق کا سہارا لے کر مسجد میں داخل ہو رہا ہوں۔

دعا کے ساتھ درود شریف پڑھیں

''بسم اللہ'' پڑھنے کے بعد حضورِ اقدس ﷺ پر درود و سلام پڑھے اور یہ کہے:

((وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ))

کیونکہ جس نیکی کے کرنے کی توفیق ہو رہی ہے، وہ درحقیقت حضورِ اقدس ﷺ کی تعلیم و تلقین کا صدقہ ہے۔ اگر آپ کی تعلیمات نہ ہوتیں اور آپ ﷺ کی رہنمائی نہ ہوتی تو کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مسجد کے دروازے تک پہنچ جائے۔ اس درود شریف کے ذریعہ اس بات کا اعتراف ہے کہ میں جو مسجد کے دروازے تک پہنچا اور مسجد کے اندر داخل ہونے کی جو توفیق ہو رہی ہے، یہ درحقیقت نبی کریم ﷺ کا احسانِ عظیم ہے۔ لہٰذا جب نبی کریم ﷺ پر درود بھیجا تو اس کے ذریعہ ایک طرف آپ ﷺ کے احسان کا اعتراف ہے۔

درود شریف میں اپنا فائدہ بھی ہے

دوسری طرف درود شریف پڑھنا خود اپنے فائدے کی چیز ہے، کیونکہ جب کوئی شخص حضورِ اقدس ﷺ پر درود بھیجتا ہے تو یہ ایک ادنیٰ اُمتی کی طرف سے درحقیقت ایک ہدیہ ہے جو نبی کریم ﷺ کو پیش کیا جا رہا ہے۔ اور حضورِ اقدس ﷺ کی ساری زندگی کا یہ معمول رہا ہے کہ جب کوئی شخص حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کرتا تو آپ ﷺ اس ہدیہ کا کوئی نہ کوئی بدلہ کسی بھی عنوان سے اس کو ضرور عطا فرمایا کرتے تھے۔ یہ آپ ﷺ کی زندگی بھر کا معمول تھا۔ لہٰذا

---

(۱) مصنف ابن أبی شیبة، رقم: ۳٤۱۸ (۲۹۸/۱)، تحفة الذاکرین بعدة الحصن الحصین (۱٤٥/۱)، زادالمعاد (۳۷٦/۲) دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت نازل ہو، اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے''

جب کوئی اُمتی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں درود و سلام کا ہدیہ پیش کرتا ہے تو آپ کی صفت ''رحمۃ للعالمین'' سے یہ اُمید ہے کہ آپ جس طرح زندگی میں ہر ہدیہ کا بدلہ دیا کرتے تھے تو اس درود و سلام کے ہدیہ کا بدلہ بھی ضرور عطا فرمائیں گے، اب عالمِ دنیا میں اس کا بدلہ دینا تو ممکن نہیں، البتہ عالمِ آخرت میں اس کا یہ بدلہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ اس درود و سلام بھیجنے والے اُمتی کے حق میں دعا فرمائیں، لہٰذا جب ہم نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں درود و سلام کا ہدیہ بھیجا تو اُمید یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دعائے مغفرت اور دعائے رحمت ہمارے شاملِ حال ہو جائے گی، اور جب مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا ہمیں ملے گی تو اس کے نتیجے میں مسجد میں داخل ہونے کے بعد ایسی عبادت کرنے کی توفیق ہوگی جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوگی اور جناب رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق ہوگی۔ انشاء اللہ۔

رحمت کے دروازے کھل جائیں

مسجد میں داخل ہوتے وقت درود شریف پڑھنے کے بعد یہ دعا تلقین فرمائی:

((اَللّٰھُمَّ افۡتَحۡ لِیۡ اَبۡوَابَ رَحۡمَتِكَ))

اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دیجئے۔ یعنی اے اللہ! مسجد کا دروازہ تو میرے لئے کھلا ہوا ہے اور میں اس میں داخل ہو رہا ہوں، لیکن میرا مسجد کے اندر داخلہ اسی وقت کارآمد اور مفید ہوسکتا ہے جب اے اللہ! آپ میرے لئے رحمت کے دروازے کھول دیں، ورنہ مسجد میں تو فاسق و فاجر لوگ بھی داخل ہو جاتے ہیں، تماشائی بھی داخل ہو جاتے ہیں، محض سیر و تفریح کرنے والے بھی داخل ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ غیر مسلم بھی داخل ہو جاتے ہیں، لیکن اے اللہ! میں مسجد میں اس آرزو کے ساتھ داخل ہو رہا ہوں کہ میرا یہ داخلہ آپ کی رحمت کے دروازے کھولنے کا سبب بنے۔

''باب'' کے بجائے ''ابواب'' کہنے کی حکمت

اور پھر اس دعا میں یہ نہیں فرمایا: اَللّٰھُمَّ افۡتَحۡ لِیۡ بَابَ رَحۡمَتِكَ اے اللہ! اپنی رحمت کا دروازہ کھول دیجئے، بلکہ یہ فرمایا: اَبۡوَابَ رَحۡمَتِكَ یعنی اپنی رحمت کے دروازے کھول دیجئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مختلف عنوان ہیں، مختلف انواع و اقسام ہیں اور ہر قسم کا ایک دروازہ ہے، لہٰذا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اے اللہ! میں آپ کی رحمت کی تمام قسموں کا محتاج ہوں اور میں ان سب کے کھولنے کی دعا مانگتا ہوں، اے اللہ! میرے لئے وہ سب کھول دیجئے۔

رحمت کی مختلف قسمیں ہیں

اب اللہ تعالیٰ کی رحمت کی کیا کیا قسمیں ہیں؟ کوئی انسان ان کا احاطہ نہیں کر سکتا، دنیا کے اندر نازل ہونے والی رحمتیں علیحدہ ہیں، قبر میں نازل ہونیوالی رحمتیں علیحدہ ہیں، آخرت میں نازل ہونے والی رحمتیں علیحدہ ہیں۔ اور پھر دنیا میں نازل ہونے والی رحمتوں کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً صحت اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت ہے، رزق اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت ہے، پھر صحت کے اندر رحمتوں کی کئی قسمیں ہیں، جسم کی صحت علیحدہ رحمت ہے، دماغ کی صحت علیحدہ رحمت ہے۔ اور سر سے لے کر پاؤں تک جتنے اعضاء ہیں، ان سب کی صحت اللہ تعالیٰ کی علیحدہ علیحدہ رحمتیں ہیں۔ اس کے دل پر نازل ہونے والی رحمتیں، خیالات پر نازل ہونے والی رحمتیں، ارادوں پر نازل ہونے والی رحمتیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ ہو تو انسان صحت مند زندگی نہیں گزار سکتا، اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ ہو تو دل میں پاکیزہ ارادے پیدا نہیں ہوتے بلکہ برائیوں کے ارادے جنم لیتے ہیں۔ لہٰذا جب مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا کی کہ اے اللہ! میرے لئے رحمت کے دروازے کھول دیجئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی رحمت کی جتنی قسمیں ہیں، میں ان سب کے دروازے کھولنے کی دعا کرتا ہوں۔

”رحمت عطا فرمادیں“ کیوں نہیں فرمایا؟

پھر ایک طریقہ مانگنے کا یہ تھا کہ اے اللہ! میں آپ کی ساری رحمتوں کا محتاج ہوں، آپ مجھے وہ سب رحمتیں عطا فرمادیجئے۔ یہ کہنے کے بجائے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! میرے اُوپر اپنی رحمت کے سارے دروازے کھول دیجئے۔ اس سے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اے اللہ! میں اس وقت مسجد میں داخل ہو رہا ہوں اور ایک مسلمان کا مسجد میں داخل ہونے کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہاں جا کر نماز پڑھے اور آپ کی عبادت کرے، تو اے اللہ! میں مسجد میں داخل ہو کر جن عبادات کو انجام دینے جارہا ہوں، اے اللہ! یہ عبادتیں میرے لئے رحمت کے دروازے بن جائیں، نماز پڑھوں تو ایسی پڑھوں جو آپ کی رحمت کو متوجہ کرنے والی ہو، تلاوت کروں تو ایسی کروں جو آپ کی رحمت کو متوجہ کرنے والی ہو، ذکر کروں تو ایسا کروں جو آپ کی رحمت کو متوجہ کرنے والا ہو۔ لہٰذا میں مسجد میں عبادت کرنے کے لئے داخل تو ہو رہا ہوں لیکن یہ عبادت اسی وقت کارآمد ہے جب آپ کی طرف سے اخلاص شامل حال ہو جائے، ورنہ اگر میں مسجد میں داخل بھی ہو گیا اور وہاں جا کر نماز بھی پڑھ لی لیکن وہ نماز اخلاص سے نہیں پڑھی اور سنت کے مطابق نہیں پڑھی، بلکہ دکھاوے کے لئے پڑھی اور غلط طریقے پر بے ادبی کے ساتھ پڑھی تو اس نماز کے بارے میں اگرچہ مفتی یہ فتویٰ دے گا کہ یہ نماز درست ہو گئی، لیکن اے اللہ!

آپ کی بارگاہ میں تو قابل قبول نہ ہوگی اور آپ کی رحمت کو متوجہ کرنے والی نہ ہوگی، لہٰذا میرے لئے رحمت کا ایسا دروازہ کھول دیجئے کہ اس کے نتیجے میں میری یہ عبادت آپ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لائق بن جائے اور آپ کی رحمت کو متوجہ کرنے والی بن جائے اور آپ کی بارگاہ میں قابل قبول ہو جائے۔

نماز شروع ہونے سے پہلے رحمت کو متوجہ کرنا

دیکھئے! ابھی نماز شروع نہیں ہوئی اور ابھی عبادت شروع نہیں ہوئی، لیکن پہلے سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو متوجہ کیا جارہا ہے کہ اے اللہ! جب تک آپ کی توفیق اور رحمت شامل حال نہ ہوگی، اس وقت تک وہ عبادت جو مسجد میں جاکر کروں گا، کارآمد اور مفید نہیں ہوسکتی، اس لئے میرے لئے رحمت کے دروازے کھول دیجئے۔

تاکہ یہ وقت میں برباد نہ کردوں

یہ بھی تو ممکن ہے کہ مسجد میں داخل تو ہو جاؤں لیکن اپنی طبیعت کی ناپاکی کی وجہ سے عبادت کے بجائے کسی اور غلط کام میں مشغول ہو جاؤں، مثلاً مسجد میں جاکر لوگوں سے باتیں کرنا شروع کردوں یا مسجد میں جاکر تجارت شروع کردوں، چونکہ یہ سب احتمالات موجود ہیں، لہٰذا اے اللہ! پہلے ہی قدم پر میں آپ سے دعا کر رہا ہوں کہ میرا مسجد میں داخلہ آپ کی رحمت کے دروازے کھولنے کا سبب بن جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس وقت کو ضائع کردوں اور غلط کاموں میں برباد کردوں۔

کیا ایسا شخص محروم رہے گا؟

اب آپ اندازہ لگایئے کہ جو بندہ بیدار ہوتے ہی اپنے اللہ کو پکار رہا ہے اور اس کا شکر ادا کر رہا ہے، اور جب بیت الخلاء میں جارہا ہے تو اپنے اللہ کو پکار رہا ہے، جب بیت الخلاء سے باہر نکل رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہے، اور وضو کر رہا ہے تو ہر عضو دھوتے وقت اپنے مالک کو پکار رہا ہے، اور جب وضو کر کے فارغ ہوتا ہے تو اس وقت اپنے مالک کو پکار رہا ہے، اور فجر کی نماز کے لئے جب مسجد کی طرف جارہا ہے تو راستے میں دعائیں کرتا جارہا ہے، اب جب مسجد میں داخل ہو رہا ہے تو یہ دعا کر رہا ہے کہ اے اللہ! میرے لئے رحمت کے دروازے کھول دیجئے، کیا ایسے بندے کو اللہ تعالیٰ محروم فرمادیں گے؟ اللہ جل شانہ جو ارحم الراحمین ہیں اور ہر بندے پر ماں باپ سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں، کیا وہ ایسے بندے کو محروم فرمادیں گے؟ جب اس بندے نے صدق دل سے مانگ لیا کہ اے اللہ! میرے لئے رحمت کے دروازے کھول دیجئے، انشاء اللہ جب وہ مسجد میں داخل ہوگا تو ایسی عبادت

کی توفیق ہوگی جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں قابل قبول ہوگی، یہ اس دعا کا عظیم فائدہ ہے۔

دعا کرتے وقت سوچ لیا کریں

ہم مسجد میں داخل ہوتے وقت عادۃً یہ دعا پڑھ تو لیتے ہیں، لیکن یہ پورا پس منظر ذہن میں نہیں ہوتا، اسلئے ذرا یہ سوچ کر مانگو کہ مسجد میں داخل ہو رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے رحمت کے دروازے کھولنے کی استدعا کر رہا ہوں تو انشاء اللہ! اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رضا کے مطابق عبادت کی توفیق بخشیں گے۔

مسجد میں جا کر تحیۃ المسجد پڑھ لیں

جب مسجد میں داخل ہو گئے اور ابھی جماعت کھڑی ہونے میں وقت ہے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز "تحیۃ المسجد" کی نیت سے پڑھ لیں۔ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا أَتٰى أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ))(۱)

جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے تو دو رکعتیں پڑھ لے۔ ان رکعتوں کو "تحیۃ المسجد" کہا جاتا ہے۔ لفظ "تحیۃ" عربی زبان میں اس جملے کو کہتے ہیں جو کوئی شخص دوسرے سے ملاقات کے وقت اس کے استقبال کرنے کے لئے کہتا ہے، جیسے مسلمانوں کا تحیۃ "السلام علیکم" ہے کہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملاقات کرتا ہے تو وہ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہہ کر اس کا استقبال کرتا ہے، اس کو عربی میں "تحیۃ" کہا جاتا ہے۔ دوسری قومیں دوسرے الفاظ استعمال کرتی ہیں، کوئی "گڈ مارننگ" کہتا ہے کوئی "گڈ ایوننگ" کہتا ہے، کوئی "نمستے" کہتا ہے، یہ سب "تحیۃ" ہے، اسی طرح ان دو رکعتوں کا نام "تحیۃ المسجد" رکھا گیا ہے، یعنی یہ دو رکعتیں تمہاری طرف سے مسجد کے نام ایک "تحیۃ" ہے، مسجد سے تمہاری ملاقات ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے گھر کی زیارت اور اس میں داخل ہونے کی توفیق ہوئی تو جس طرح تم کسی انسان سے ملتے وقت پہلے اس کو "السلام علیکم" کرتے ہو، اسی طرح جب تم مسجد میں آئے تو بیٹھنے سے پہلے مسجد کو سلام کرلو اور دو رکعت پڑھ لو، اور اس بات کا اعتراف کرلو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور اس میں حاضری کی توفیق ہوئی ہے، اس حاضری کی توفیق کے نتیجے میں اس کا اس طرح اکرام کر رہا ہوں کہ داخلے کے فوراً بعد دو رکعت ادا کر رہا ہوں، لہٰذا اگر ابھی جماعت کھڑی نہیں ہوئی تو پہلے دو رکعت "تحیۃ المسجد" کی نیت سے پڑھ لینی چاہئے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب إذا دخل أحدکم المسجد فلیرکع رکعتین، رقم: ٤٢٥، صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها، باب استحباب تحیۃ المسجد، رقم: ١١٦٦، سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء إذا دخل أحدکم المسجد فلیرکع رکعتین، رقم: ٢٩٠

سنتوں میں تحیۃ المسجد کی نیت کرنا

یہ بات یاد رکھیں کہ جن نمازوں میں فرض سے پہلے سنت مؤکدہ ہیں، جیسے ظہر میں فرضوں سے پہلے چار رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں، تو اس میں بہتر تو یہ ہے کہ ''تحیۃ المسجد'' کی دو رکعتیں علیحدہ پڑھیں اور چار رکعت سنت مؤکدہ علیحدہ پڑھیں، لیکن اگر وقت میں گنجائش نہیں ہے تو شرعاً ہمارے لئے یہ آسانی کردی گئی ہے کہ جو چار رکعت سنت آپ پڑھ رہے ہیں، اسی میں ''تحیۃ المسجد'' کی نیت بھی کرلیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ وہ دونوں کا ثواب عطا فرمائیں گے، سنتوں کا بھی اور تحیۃ المسجد کا بھی۔

جماعت کے انتظار میں بیٹھے ہوئے یہ دعا پڑھیں

''تحیۃ المسجد'' پڑھنے کے بعد وقت باقی ہو اور جماعت کھڑی ہونے میں دیر ہو تو اس وقت کے بارے میں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھا ہے تو وہ شخص ایسا ہے جیسا کہ وہ جنت کی کیاریوں میں بیٹھا ہے۔ اور آپ ﷺ نے یہ ارشاد بھی فرمایا کہ جب تم جنت کی کیاریوں میں بیٹھو تو جنت کے پھل بھی کھایا کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جنت کے پھل کیسے کھائیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھے ہو تو جتنی دیر بیٹھے ہو اتنی دیر یہ کلمات پڑھتے رہا کرو:

((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ))(۱)

یہ کلمات پڑھنا ایسا ہے جیسے جنت کے پھل کھانا، کیونکہ اس کے نتیجے میں انشاء اللہ تمہیں آخرت میں پھل ملیں گے۔ لہٰذا جتنا وقت مسجد میں گزرے، اس وقت یہ کلمہ تمہاری زبان پر رہے۔

مسجد میں کرنے کے کام

بلکہ بزرگوں نے فرمایا کہ اگر کسی شخص کے لئے وقت کی کمی کی وجہ سے ''تحیۃ المسجد'' پڑھنے کا موقع نہ ہو تو اس وقت اس کو چاہئے کہ وہ یہ کلمات پڑھتا رہے تو وہ شخص انشاء اللہ ''تحیۃ المسجد'' کی فضیلت سے محروم نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ مسجد کے آداب کا خیال رکھو اور مسجد میں بیٹھ کر بلا ضرورت فضول باتیں نہ کرو، ذکر اللہ کی طرف متوجہ رہو، تلاوتِ قرآن کا موقع ہو تو تلاوت کرلو، نفلیں پڑھتے رہو، اور جب جماعت کھڑی ہو جائے تو اس کے آداب اور سنتوں کے مطابق نماز ادا کرو۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید، رقم: ۳۴۳۱

ان سب کاموں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو دعا داخل ہوتے وقت مانگی تھی کہ اے اللہ! میرے لئے رحمت کے دروازے کھول دیجئے، انشاء اللہ مسجد میں رہتے ہوئے رحمت کے دروازے کھل جائیں گے اور اس کی وجہ سے ایسی عبادت کی توفیق ہو جائے گی جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہوگی۔ اب جب نماز کے بعد مسجد سے باہر نکلو گے تو کامیاب و کامران ہو کر باہر نکلو گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مسجد سے نکلتے وقت کی دعا☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ط إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ٥﴾(۱)

بزرگان محترم و برادران عزیز! گزشتہ چند جمعوں سے مسنون دعاؤں کا بیان چل رہا ہے، گزشتہ جمعہ مسجد میں داخل ہونے کی دعا کی تشریح عرض کی تھی۔ اور مسجد سے باہر نکلتے وقت جو دعا حضور اقدس ﷺ نے تلقین فرمائی ہے وہ یہ ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ"(۲)

مسجد سے نکلتے وقت بایاں پاؤں نکالے

مسنون یہ ہے کہ جب آدمی مسجد سے باہر نکلے تو بایاں پاؤں پہلے نکالے۔ بظاہر تو یہ معمولی سی بات ہے کہ جب آدمی مسجد میں داخل ہو تو دایاں پاؤں داخل کرے اور جب مسجد سے باہر نکلے تو پہلے بایاں پاؤں نکالے، لیکن جب بندہ حضور اقدس ﷺ کی اتباع میں یہ کام کرتا ہے تو اللہ جل شانہ کی طرف سے "محبوبیت" کا پروانہ اس کو مل جاتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/ ۱۷۷ تا ۱۹۲)

(۱) المؤمن: ٦٠، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ: "مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، بے شک جو لوگ تکبر کی بنا پر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے"

(۲) صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب ما يقول (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾(۱)

نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ لوگوں سے فرمایئے کہ اگر اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے۔ لہٰذا ہر وہ عمل جو نبی کریم ﷺ کی سنت کی اتباع میں کیا جائے، وہ انسان کو اللہ کا محبوب بنا دیتا ہے، چاہے وہ عمل دیکھنے میں کتنا ہی چھوٹا نظر آ رہا ہو۔

وہ شخص فضیلت سے محروم ہو گیا

دایاں پاؤں پہلے داخل کرنے میں اور بایاں پاؤں پہلے نکالنے میں کوئی محنت خرچ نہیں ہوتی، کوئی وقت زیادہ نہیں لگتا، کوئی پیسہ خرچ نہیں ہوتا، لیکن اگر آدمی اس بات کا ذرا اہتمام کر لے اور دھیان سے بایاں پاؤں پہلے نکالے تو اتباع سنت کی عظیم فضیلت اس کو حاصل ہو جاتی ہے، اور اگر بے دھیانی میں دایاں پاؤں پہلے نکال دیا تو اگرچہ اس میں کوئی گناہ نہیں ہوا، لیکن اتباع سنت کی عظیم فضیلت سے وہ محروم ہو گیا۔ لہٰذا اس بات کی عادت ڈالنی چاہئے کہ جب بھی مسجد میں داخل ہوں تو دایاں پاؤں پہلے داخل کریں اور جب باہر نکلیں تو بایاں پاؤں پہلے نکالیں۔

داخل ہونے اور نکلنے کی دعاؤں میں فرق

اور مسجد سے نکلتے وقت یہ مختصر سی دعا پڑھے:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ))

اے اللہ! میں آپ سے آپ کے فضل کا سوال کرتا ہوں۔ دیکھئے جب مسجد میں داخل ہو رہے تھے تو اس وقت یہ دعا کی تھی:

((اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ))

اے اللہ! میرے لئے رحمت کے دروازے کھول دیجئے، اور جب باہر نکل رہے ہیں تو اب یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ! میں آپ سے آپ کے فضل کا سوال کرتا ہوں۔ داخل ہوتے وقت اللہ کی رحمت مانگی گئی تھی اور اب نکلتے وقت اللہ کا فضل مانگا جا رہا ہے۔ بظاہر رحمت اور فضل میں کوئی خاص

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اذا دخل المسجد، رقم:۱۱۶۵، سنن النسائی، کتاب المساجد، باب القول عند دخول المسجد وعند الخروج منه، رقم:۷۲۱، سنن النسائی، کتاب الصلاة، باب ما يقوله الرجل عند دخوله المسجد، رقم:۳۹۳، مصنف ابن أبی شيبة، رقم: ۳٤۱۸ (۲۹۸/۱)، تحفة الذاكرين بعدة الحصن الحصين (۱٤٥/۱)، زاد المعاد (۳۷٦/۲)

(۱) آل عمران:۳۱

فرق نظر نہیں آتا، لیکن قرآن و حدیث کی اصطلاح میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔

''رحمت'' سے مراد دینی نعمت

قرآن کریم میں اور احادیثِ رسول اللہ ﷺ میں جب اللہ تعالیٰ کی رحمت کا لفظ آتا ہے تو اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی دینی نعمت ہوتی ہے جو انسان کو دینی معاملات میں حاصل ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ انسان کو صحیح طور پر عبادت کرنے کی توفیق حاصل ہو جائے، انسان کو اخلاص کی اور اتباعِ سنت کی توفیق حاصل ہو جائے، یہ سب دینی رحمت ہے، اور مسجد میں انسان اس لئے داخل ہوتا ہے کہ وہاں جا کر عبادت انجام دے، اس لئے داخل ہوتے وقت یہ دعا مانگی گئی کہ اے اللہ! میرے لئے رحمت کے دروازے کھول دیجئے یعنی دینی نعمتوں کے دروازے کھول دیجئے، تاکہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد مجھے عبادت کی توفیق ہو اور نماز ٹھیک طریقے پر انجام دوں اور آپ کی عبادت اخلاص کے ساتھ انجام دوں، ورنہ یہ بھی تو عین ممکن ہے کہ آدمی مسجد میں داخل ہونے کے بعد فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع کردے یا ایسے کاموں میں وقت گزار دے جس کا کچھ حاصل نہیں۔

''فضل'' سے مراد دنیاوی نعمت

اور ''فضل'' کا لفظ قرآن و حدیث میں اکثر و بیشتر دنیوی نعمتوں کے لئے آتا ہے، مثلاً یہ کہ رزق اچھا ملے، روزگار اچھا ملے، آمدنی اچھی ہو، صحت حاصل ہو، گھر میں خوشحالی ہو، ان سب نعمتوں کو ''فضل'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں نمازِ جمعہ کے بارے میں آیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾(۱)

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے لئے اذان کہی جائے تو تم اللہ کے ذکر کی طرف چل پڑو اور بیع و شرا اور تجارت کے معاملات ترک کردو، یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم کو سمجھ ہے۔ آگے ارشاد فرمایا: جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا ''فضل'' تلاش کرو''

اللہ کا ''فضل'' تلاش کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی نعمتیں، تجارت، روزگار کے ذرائع تلاش

(۱) الجمعة: ۹، ۱۰

کرو۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر بھی تجارت کو اور مال کو "فضل" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مسجد سے نکلنے کے بعد فضل کی ضرورت

لہٰذا جب عبادت کرنے کے بعد آدمی مسجد سے باہر نکلے گا تو باہر اس کو دنیاوی ضروریات پیش آئیں گی اور دنیوی حاجتیں اس کو لاحق ہوں گی اور ان حاجتوں کو پورا کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا اس موقع پر یہ دعا مانگی جارہی ہے کہ اے اللہ! میں اب کاروبارِ زندگی میں نکل رہا ہوں اور معرکۂ حیات میں داخل ہورہا ہوں، اے اللہ! اس معرکۂ حیات میں مجھے اپنا فضل عطا فرمائیے، آپ کا رزقِ حلال مجھے حاصل ہو، آپ کی طرف سے مجھے کاموں میں برکت حاصل ہو، میرے کاموں میں نور ہو اور جائز طریقے سے میں آپ کا رزق حاصل کروں۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت رحمت کی ضرورت تھی، اس لئے اس وقت "رحمت" طلب کی اور مسجد سے باہر نکلنے کے بعد "فضل" کی ضرورت تھی، اس لئے اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا "فضل" طلب کیا۔ کیسی باریکی کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے دعائیں تلقین فرمائی ہیں، جس وقت انسان کی جو حاجت ہے، اس حاجت کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نے وہ دعا تلقین فرمائی جو اس وقت کے مطابق ہے۔

اگر یہ دعائیں قبول ہو جائیں تو

حضورِ اقدس ﷺ کی یہ دعائیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک دعا بھی قبول ہوجائے تو انسان کا بیڑہ پار ہوجائے۔ جب مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا کی کہ اے اللہ! میرے لئے رحمت کے دروازے کھول دیجئے، اگر یہ دعا قبول ہوجائے اور رحمت کے دروازے کھل جائیں تو ساری دینی نعمتیں حاصل ہوجائیں۔ اور باہر نکلتے وقت جب یہ دعا کی کہ اے اللہ! میں آپ سے فضل کا سوال کرتا ہوں، اگر یہ دعا قبول ہوکر "فضل" مل جائے تو دنیا کی تمام حاجتیں اور تمام مقاصد اللہ تعالیٰ کے فضل سے پورے ہوجائیں۔

دنیاوی نعمتیں اللہ کا فضل کیسے ہیں؟

جیسا کہ میں نے بتایا کہ قرآن وحدیث میں جب "فضل" کا لفظ آتا ہے تو عام طور پر اس سے رزق، تجارت اور معیشت کے دوسرے وسائل مراد ہوتے ہیں، لہٰذا تجارت، ملازمت، زراعت وغیرہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل کے اندر شامل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ملازمت کو، تجارت کو، زراعت اور

معیشت کو اللہ تعالیٰ کا فضل کیوں کہا گیا؟ حالانکہ آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ تجارت تو ایک دنیوی معاملہ ہے اور ایک رواج چلا آ رہا ہے کہ ایک شخص اپنا سامان لے جا کر بازار میں بیٹھ جاتا ہے، خریدار آ کر اس سے سامان خریدتے ہیں، اس کے نتیجے میں بیچنے والے کو نفع حاصل ہوتا ہے، یا کوئی شخص ملازم ہے تو وہ پورے مہینے محنت کرتا ہے اور وقت لگاتا ہے تو اس کے نتیجے میں مہینے کے ختم پر اس کو تنخواہ مل جاتی ہے، یا کوئی زراعت کرتا ہے اور ہل جوتتا ہے، بیج ڈالتا ہے، پانی ڈالتا ہے، محنت کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں چھ مہینے کے بعد اس کی فصل تیار ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ سب چیزیں تو انسان کی اپنی محنت کے نتیجے میں حاصل ہو رہی ہیں، تو پھر ان کو اللہ کے ''فضل'' سے کیوں تعبیر کیا جا رہا ہے؟

انسان کو دھوکہ لگ گیا ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نے ان چیزوں کے لئے لفظ ''فضل'' استعمال فرما کر ایک بڑی عظیم حقیقت کی طرف انسانوں کو متوجہ کیا ہے اور ایک بہت بڑے دھوکہ سے نکالا ہے۔ وہ یہ کہ انسان نے جب تجارت کرنے کے لئے سرمایہ اکٹھا کیا، دکان لگائی، اس دکان میں سامان جمع کیا، اس دکان پر بورڈ لگایا اور پھر صبح سے شام تک اس دکان میں بیٹھا رہا اور اس کے نتیجے میں اس کو منافع ملا اور آمدنی ہوئی تو اس انسان کو یہ دھوکہ لگ جاتا ہے کہ یہ جو آمدنی مجھے حاصل ہوئی، یہ میری محنت اور میری قوتِ بازو کا نتیجہ ہے، میں نے چونکہ پیسہ لگایا، میں نے محنت کی، میں نے وقت لگایا تو اس کے نتیجے میں مجھے یہ منافع حاصل ہوا، پھر اس دھوکہ کے نتیجے میں وہ انسان انہی ظاہری اسباب کو رزق حاصل ہونے کا اصل سبب سمجھنے لگتا ہے۔

اللہ کے فضل کے بغیر کچھ حاصل نہیں کر سکتے

قرآن کریم ہمیں اس طرف متوجہ کر رہا ہے کہ خدا کے لئے اس دھوکے میں مت آنا، کیونکہ یہ آمدنی اور جو منافع مل رہا ہے، بیشک تم نے اس کو حاصل کرنے کے لئے محنت کی ہے، تم نے سرمایہ لگایا ہے، تم نے وقت خرچ کیا ہے، لیکن اگر ہمارا ''فضل'' شامل نہ ہوتا تو پھر تم ہزار محنت کرتے، ہزار سرمایہ لگاتے، ہزار وقت لگاتے تب بھی تمہیں ایک پیسے کی آمدنی نہ ہوتی، تمہارے اختیار میں تو بس اتنا تھا کہ تم دکان کھول کر بیٹھ گئے، لیکن گاہک کو لانا تمہارے اختیار میں نہیں تھا، کتنے لوگ ایسے ہیں جو دکان کھول کر بیٹھتے ہیں، صبح سے لے کر شام تک دکان کھولے بیٹھے ہیں لیکن گاہک نہیں آتا، گاہک کو کون بھیج رہا ہے؟ کون اس کے دل میں یہ بات ڈال رہا ہے کہ فلاں دکان پر جا کر سامان خریدو؟ حالانکہ وہی سودا دوسری دکان پر بھی مل رہا ہے، وہ گاہک وہاں کیوں نہیں جا رہا ہے، تمہارے پاس کیوں آ رہا ہے؟ لہٰذا

تجارت کے ظاہری اسباب تو تم نے جمع کر لیے ہیں، لیکن ان ظاہری اسباب میں تاثیر پیدا کر کے ان کو تمہارے لئے آمدنی کا ذریعہ بنانا، یہ اللہ جل شانہ کے فضل کے علاوہ کوئی نہیں کرتا۔

گاہک اللہ بھیجتا ہے

میرے بڑے بھائی محمد ذکی کیفی مرحوم، لاہور میں ان کی دینی کتابوں کی دکان تھی، یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنا واقعہ سنایا کہ ایک دن جب صبح میں اُٹھا تو بہت تیز موسلا دھار بارش ہورہی تھی، بارش مسلسل جاری تھی، یہاں تک کہ دکان کھولنے کا وقت آ گیا اور سڑکوں پر گھٹنوں کے برابر پانی بہہ رہا تھا، اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ اس وقت دکان کھولنے سے کیا حاصل! بارش تیز ہورہی ہے، لوگوں کے لئے گھر سے باہر نکلنا مشکل ہے، بہت شدید ضرورت کے لئے تو کوئی شخص گھر سے باہر نکلے گا، لیکن اس وقت دینی کتاب خریدنے کے لئے کون نکلے گا، اگر افسانوں اور ناولوں کی دکان ہوتی تو شاید اس موسم کی دلچسپی کے لئے کتاب خریدنے آجاتے، لیکن یہ تو خشک دینی کتابوں کی دکان ہے، کون ایسے موسم میں کتاب خریدنے آئے گا، لہٰذا دکان کھولنے کی کیا ضرورت ہے، چلو آج چھٹی کر لیں۔

لیکن ساتھ ساتھ اس کا جواب بھی میرے دل میں آیا کہ ارے بھائی! تمہارا کام یہ ہے کہ جا کر دکان کھولو، گاہک کو بھیجنا نہ بھیجنا تمہارا کام نہیں، تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ دکان کھول کر بیٹھ جاؤ، اگر اللہ کو منظور ہوگا تو گاہک بھیج دیں گے، منظور نہیں ہوگا تو نہیں بھیجیں گے، لیکن اگر تم گاہک کی فکر میں پڑ گئے تو دکان چل گئی۔ چنانچہ میں نے چھتری اُٹھائی اور پانی کے اندر چلتا ہوا دکان پر آ گیا اور دکان کھول کر بیٹھ گیا، اور یہ سوچ کر کہ گاہک تو کوئی آئے گا نہیں، بیٹھ کر تلاوت شروع کر دی، لیکن تھوڑی دیر کے بعد میری حیرت کی انتہا ہوگئی کہ لوگ برساتیاں پہن کر اور چھتریاں تان کر دکان پر آنا شروع ہو گئے اور کتابیں خریدنے لگے، میں حیران تھا کہ اس بارش کے موسم میں ان کو ان کتابوں کی ایسی فوری کیا ضرورت پیش آئی کہ یہ لوگ کتابیں خریدنے آرہے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ جواب بھی ذہن میں آیا کہ یہ لوگ خود نہیں آرہے ہیں۔ بلکہ کوئی بھیجنے والی ذات ان کو بھیج رہی ہے۔

دینے والا کوئی اور ہے

یہ ہے اللہ کا فضل، انسان کو یہ دھوکہ لگ جاتا ہے اور وہ ظاہری اسباب جمع کر کے یہ سوچنے لگتا ہے کہ مجھے جو کچھ مل رہا ہے وہ مجھے ظاہری اسباب سے مل رہا ہے، میری دکان سے مل رہا ہے، میری محنت سے مل رہا ہے۔ ارے حقیقت میں دینے والا کوئی اور ہے، بیشک تمہارے ذمے یہ ضروری ہے کہ

ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھو بلکہ محنت کرو، اپنا وقت لگاؤ، لیکن محنت اور وقت لگانے کے بعد اس محنت اور وقت کو کارگر بنانے والا سوائے اللہ کے فضل کے کوئی اور نہیں ہے، اگر ان کا فضل نہ ہو تو سارا دن دکان پر بیٹھے رہو اور کوئی گاہک نہ آئے۔

میرا حجازِ مقدس کا پہلا سفر

جب میرا پہلی مرتبہ ۱۹۶۳ء میں حجازِ مقدس جانا ہوا تو ایک صاحب نے وہاں پر اپنا ایک بڑا عجیب واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ میں بازار میں کپڑا خریدنے گیا، ایک دکان پر جا کر کپڑا دیکھا، کپڑا پسند آیا تو میں نے اس سے بھاؤ تاؤ کیا اور سودا کر لیا، میں نے اس سے کہا کہ اس میں سے اتنا کپڑا مجھے کاٹ دو۔ اس دکاندار نے کہا کہ آپ کو یہ کپڑا پسند ہے؟ میں نے کہا کہ پسند ہے۔ پھر اس نے کہا کہ دام مناسب ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں مناسب ہیں۔ وہ دکاندار کہنے لگا کہ آپ ایسا کریں کہ یہی کپڑا سامنے والی دکان پر اسی دام میں مل جائے گا، آپ وہاں سے جا کر لے لیں۔ میں بڑا حیران ہوا اور اس دکاندار سے کہا کہ میرا سودا آپ سے ہوا ہے، بات آپ سے ہوئی ہے، اب میں دوسری دکان سے کیوں لوں؟ دکاندار نے کہا کہ آپ کو تو کپڑا خریدنے سے مطلب، آپ اس بحث میں نہ پڑیں اور وہاں سے جا کر کپڑا خرید لیجئے۔

میں نے کہا کہ میں سودا وہاں سے نہیں لوں گا، میرا سودا تو آپ سے ہوا ہے، آپ سے ہی لوں گا، ورنہ آپ اس کی وجہ بتائیں کہ آپ سے کپڑا نہ لوں اور اس دکاندار سے جا کر لوں۔ اس دکاندار نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میرے پاس صبح سے بہت سے گاہک آ چکے ہیں اور صبح سے لے کر اب تک الحمدللہ میری آمدنی ہو چکی ہے، لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میرے سامنے والا دکاندار صبح سے اپنی دکان پر بیٹھا ہے، مگر اس کے پاس صبح سے اب تک کوئی گاہک نہیں آیا، میرا دل چاہتا ہے کہ اس کے پاس بھی گاہک آئے، اس لئے میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم یہ کپڑا وہاں سے خرید لو تاکہ اس کی بکری ہو جائے۔

اسلامی معاشرے کی ایک جھلک

یہ درحقیقت اس معاشرے کی چھوٹی سی جھلک تھی جو نبی کریم ﷺ نے اس خطے میں پیدا فرمایا تھا کہ صرف اپنا پیٹ نہیں دیکھنا بلکہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ بھی خیر خواہی کرنی ہے۔ بہرحال! جب میں نے اس کی یہ بات سنی تو میرے دل میں اس کی بڑی قدر ہوئی اور میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں یہ کپڑا وہاں سے خرید لوں گا۔

فضل کے بغیر اسباب میں تاثیر نہیں

لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس تاجر کے دل میں یہ بات ڈالنے والا کون تھا کہ تم اپنے گاہک سے فائدے اُٹھانے کے بجائے اس گاہک کو دوسرے کے پاس بھیجو۔ یہ اللہ کا ''فضل'' نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ دنیا کی ان نعمتوں کو اپنا ''فضل'' قرار دے کر انسان کو اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ تم جو محنت اور کوشش کرتے ہو اور سرمایہ لگاتے ہو، بیشک یہ سب ظاہری اسباب ہیں، لیکن تم اس دھوکے میں نہ آنا کہ ان اسباب کے اندر تاثیر بذاتِ خود موجود ہے، جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہو تو اس وقت تک ان اسباب میں تاثیر نہیں آسکتی۔

ملازمت کے لئے ڈگریاں کافی نہیں

آپ نے کالج اور یونیورسٹی میں پڑھ کر ڈگریاں حاصل کرلیں اور بڑے اعلیٰ درجے کے عہدے پر کام کرنے کے قابل ہوگئے اور آپ ایسی صلاحیت کے مالک ہوگئے کہ آپ کو سونے میں تولا جائے، لوگ آپ کی عزت کریں، لیکن کتنے ڈگریوں والے اور صلاحیتوں والے ایسے ہیں جو جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں مگر ان کو ملازمت نہیں ملتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ ڈگریاں حاصل کرلینا ایک سبب ہے، صلاحیت حاصل کرلینا ایک سبب ہے، لیکن اس سبب کو مؤثر بنا کر اس کے ذریعہ اچھی ملازمت دلوا دینا، یہ اللہ کے ''فضل'' کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

کھیتی اُگانا انسان کے اختیار میں نہیں

دیکھئے! کسان زمین پر ہل چلاتا ہے، اس کو نرم کرتا ہے، اس کو صاف کرتا ہے، اس میں سے پتھر نکالتا ہے، اور اس طرح اس زمین سے کھیتی نکلنے کے موانع کو اپنی طرف سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور پھر بیج ڈالتا ہے اور پانی دیتا ہے، یہ سب محنت وہ کرتا ہے، لیکن کسان کی اس محنت کو بارآور کرنا اور اس نے جو بیج زمین کے اندر ڈالا تھا، اس کو پھاڑنا اور اس میں سے کونپل نکالنا اور اس کونپل کا زمین کے پیٹ کو چاک کرکے باہر نکلنا اور پھر کونپل سے پودا بننا اور اس پودے سے درخت بننا اور اس درخت پر پھل لگنا، یہ سب کام اللہ کے ''فضل'' کے بغیر نہیں ہوسکتے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ○ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ○﴾(۱)

---

(۱) الواقعة: ٦٣، ٦٤

یعنی زمین میں جو چیز تم بوتے ہو، اس کو تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں۔ تم نے تو بس بیج ڈال دیا، لیکن اس بیج کا پھٹنا اور اس میں سے شگوفے پھوٹنا اور اس میں سے کلی نکلنا وغیرہ، یہ کام تمہارے بس میں ہیں؟ نہیں، اگر ساری دنیا کی سائنس کی طاقتیں بھی لگادو تب بھی تم یہ کام نہیں کر سکتے جب تک کہ ہمارا فضل شامل حال نہ ہو۔ اس لئے دنیا میں تمہیں جتنی نعمتیں مل رہی ہیں، وہ سب ''فضل اللہ'' ہیں، اور تم نے معیشت کے جتنے ذرائع اختیار کیے ہوئے ہیں، وہ سب ہمارے فضل و کرم سے بارآور ہوتے ہیں، لہٰذا ہمارے فضل و کرم کو بھول کر کچھ حاصل کرنا چاہو گے تو منہ کی کھاؤ گے، کچھ حاصل نہ ہوگا۔

فضل کے اندر ساری نعمتیں داخل ہیں

لہٰذا جس وقت تم مسجد سے باہر نکل رہے ہو تو اس وقت ہم سے ہمارا ''فضل'' مانگو اور کہو:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ))

''اے اللہ! میں آپ سے آپ کے فضل کا سوال کرتا ہوں''

اس ''فضل'' کے اندر دنیا کی ساری نعمتیں آ گئیں، اگر کوئی شخص تاجر ہے تو اس ''فضل'' میں اس کی تجارت کی کامیابی آ گئی، اگر کوئی شخص ملازم ہے تو اس کی ملازمت کا رزقِ حلال اس میں آ گیا، اگر کوئی شخص کاشتکار ہے تو اس کی فصل کی خوبی اس کے اندر آ گئی، اور اس کے علاوہ دنیا کی جتنی نعمتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً صحت کی نعمت، خوشحالی کی نعمت، گھر والوں کی خوشحالی کی نعمت اور اپنے درمیان اتفاق اور اتحاد کی نعمت وغیرہ، یہ سب نعمتیں اس دعا کے اندر آ گئیں۔ اس لئے اگر یہ چھوٹی سی دعا ایک مرتبہ بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے تو دنیا کی ساری مصیبتیں دور ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

سورج نکلتے وقت کی دعا☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ط إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ٥﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گزشتہ چند جمعوں سے مسنون دعاؤں کی تشریح کا بیان چل رہا ہے اور سب سے آخری دعا جس کا بیان گزشتہ جمعہ ہوا، وہ مسجد سے نکلنے کی دعا تھی کہ جب آدمی مسجد سے نکلے تو یہ دعا پڑھے:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ))(۲)

نمازِ اشراق کی فضیلت

البتہ جب آدمی نمازِ فجر سے فارغ ہو جائے تو اگر اس کے لئے ممکن ہو تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد مسجد سے باہر نکلنے کے بجائے مسجد ہی میں بیٹھ جائے۔ حدیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے کہ جو شخص فجر کی نماز پڑھنے کے بعد جس جگہ نماز پڑھی ہے، طلوعِ آفتاب تک اسی جگہ بیٹھا رہے اور

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۱۹۳ تا ۲۰۶)

(۱) المؤمن: ٦٠، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ: ''مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، بے شک جو لوگ تکبر کی بنا پر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے''

(۲) صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب ما يقول اذا دخل المسجد، رقم: ١١٦٥، سنن النسائي، كتاب المساجد، باب القول عند دخول المسجد وعند الخروج منه، رقم: ٧٢١، سنن النسائي، كتاب الصلاة، باب ما يقوله الرجل عند دخوله المسجد، رقم: ٣٩٣، مصنف ابن أبي شيبة، رقم: ٣٤١٨ (١/٢٩٨)، تحفة الذاكرين بعدة الحصن الحصين (١/١٤٥)، زادالمعاد (٣٧٦/٢)

اس دوران ذکر کرتا رہے، تسبیحات پڑھتا رہے، قرآن کریم کی تلاوت کرتا رہے اور دعائیں کرتا رہے، پھر جب سورج طلوع ہونے کے بعد بلند ہو جائے، اس وقت دو رکعت یا چار رکعت اشراق کی نماز پڑھے تو اس شخص کو ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب ملے گا۔ (۱)

روزانہ ایک حج اور ایک عمرہ کریں

اب آپ اندازہ لگائیں کہ آدمی حج ادا کرنے کے لئے کیا کچھ خرچ کرتا ہے، کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، عمرہ ادا کرنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس چھوٹے سے عمل پر ایک حج اور ایک عمرہ کا ثواب عطا فرما دیتے ہیں۔ لہٰذا جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ توفیق دیں، ان کو اس سے فائدہ اُٹھانا چاہئے، یہ عمل کوئی فرض و واجب نہیں ہے، اگر کوئی شخص نہ کرے تو کوئی گناہ بھی نہیں ہے لیکن بڑی فضیلت والا عمل ہے۔

سورج نکلتے وقت کی دعا

مسجد میں بیٹھنے کے دوران جس وقت سورج طلوع ہو تو اس وقت وہ کلمات ادا کرے جو کلمات حضور اقدس ﷺ سورج نکلتے وقت پڑھا کرتے تھے۔ وہ یہ ہیں:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَقَالَنَا یَوْمَنَا هٰذَا وَلَمْ یُهْلِکْنَا بِذُنُوْبِنَا)) (۲)

"تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہمیں ہمارا یہ دن روشن کر دیا اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہمیں ہلاک اور برباد نہیں کیا"

اس دعا میں دو جملے ہیں، لیکن ان دو جملوں میں معنی کی کائنات پوشیدہ ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی قدرتِ کاملہ کی اور اس کی حکمتِ بالغہ کی اور اس کے انعامات کے اعتراف کی کائنات پوشیدہ ہے۔ جب عربی الفاظ یاد نہ ہوں اس وقت اُردو میں یہ دعا کر لیا کریں کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے یہ دن ہمیں واپس کر دیا۔ اس شکر کی وجہ یہ ہے کہ جب ہم رات کو سو رہے تھے، کیا ہمیں اس وقت معلوم تھا کہ صبح کو ہماری آنکھ کھلے گی یا نہیں؟ زندگی کے یہ لمحات سوتے میں ختم تو نہیں ہو جائیں گے، نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو رات کو اچھے خاصے سوئے اور پھر سوتے ہی رہ گئے اور دن کے آنے سے پہلے ہی ان کے دل پر ایسا حملہ ہوا کہ انہیں دن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الجمعة عن رسول اللّٰه، باب ذکر ما یستحب من الجلوس فی المسجد بعد صلاة، رقم: ۵۳۵

(۲) صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب ترتیل القراءة واجتناب الهذ، رقم: ۱۳۵۹

سوتے وقت روح قبض ہو جاتی ہے

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾(۱)

یعنی موت کے وقت اللہ تعالیٰ انسانوں کی روح کو قبض کر لیتا ہے۔ اب موت کے وقت انسان کا سارا جسم تو ویسا ہی نظر آتا ہے، بس جسم کے اندر جو روح تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو قبض فرما لیا۔ آگے فرمایا اور جن کی موت کا وقت نہیں آیا، اللہ تعالیٰ ان کی روحوں کو بھی روزانہ نیند کے وقت قبض فرما لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سونے کے بعد ہمیں کچھ احساس اور شعور باقی نہیں ہوتا، یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ روح جزوی طور پر جسم سے علیحدہ ہو جاتی ہے، پھر جن کے لئے تقدیر میں موت لکھی ہوتی ہے ان کی روحوں کو اللہ تعالیٰ واپس نہیں چھوڑتے، یعنی سوتے سوتے میں موت واقع ہو جاتی ہے اور جن کی موت ابھی مقدر نہیں ہے ان کی روحوں کو اللہ تعالیٰ واپس چھوڑ دیتے ہیں، چنانچہ وہ روح دوبارہ جسم میں واپس چلی جاتی ہے اور آدمی دوبارہ بیدار ہو جاتا ہے اور پہلے جس طرح چاق و چوبند تھا، دوبارہ چاق و چوبند ہو جاتا ہے۔

سونے سے پہلے کی دعا

لہٰذا نبی کریم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ سونے سے پہلے قرآن کریم کی اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

((بِاسْمِكَ رَبِّيْ وَضَعْتُ جَنْبِيْ وَبِكَ اَرْفَعُهٗ اِنْ اَمْسَكْتَ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لَهَا وَاِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ))(۲)

(۱) الزمر: ٤٢، آیت مبارکہ کا ترجمہ ہے: "اللہ تمام روحوں کو ان کی موت کے وقت قبض کر لیتا ہے، اور جن کو ابھی موت نہیں آئی ہوتی، ان کو بھی ان کی نیند کی حالت میں (قبض کر لیتا ہے،) پھر جن کے بارے میں اس نے موت کا فیصلہ کر لیا، انہیں اپنے پاس روک لیتا ہے، اور دوسری روحوں کو ایک معین وقت تک کے لئے چھوڑ دیتا ہے"

(۲) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب التعوذ والقراءة عند المنام، رقم: ٥٨٤٥، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب ما یقول عند النوم وأخذ المضجع، رقم: ٤٨٨٩، سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب منه، رقم: ٣٣٢٣، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب ما یقال عند النوم، رقم: ٤٣٩١

اے میرے پروردگار! میں نے آپ ہی کے نام سے بستر پر اپنا پہلو رکھا ہے اور آپ ہی کے نام سے اُٹھاؤں گا، اگر آپ میری روح کو روک لیں، یعنی سوتے ہوئے میری روح کو قبض کر لیں تو اس کی مغفرت فرما دیجئے گا اور اگر آپ اس روح کو چھوڑ دیں یعنی زندگی کی حالت میں صبح کو بیدار کر دیں تو اس کی حفاظت فرمائیے گا جس طرح آپ اپنے نیک بندوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یعنی میری روح کا واپس آنا اسی وقت فائدہ مند ہے جب آپ کی حفاظت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہو، وہ گناہوں میں مبتلا نہ ہو، وہ بداعمالیوں میں مبتلا نہ ہو، وہ جہنم کا شکار نہ ہو اور شیطان کے جال میں نہ پھنسے۔ کون ایسی دعائیں مانگے گا جو دعائیں نبی کریم ﷺ مانگ کر تشریف لے گئے۔ بہر حال! یہ دعا کر کے آپ سویا کرتے تھے۔

یہ دن اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے

اور پھر جب رات گزر گئی اور صبح ہو گئی اور دن نکل آیا اور سورج نکل آیا تو اس سے معلوم ہوا کہ الحمدللہ، یہ رات میرے لئے موت کا پیغام نہیں لائی تھی اور مجھے اللہ تعالیٰ نے زندگی کا ایک دن مزید عطا فرما دیا ہے۔ اس لئے سورج نکلتے وقت دعا فرما رہے ہیں کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے یہ دن ہمیں واپس لوٹا دیا۔ آج اس وقت جمعہ کے دن ہم سب یہاں جمع ہیں، ہم میں سے کسی کو علم ہے کہ کل کا دن ہمیں ملے گا یا نہیں؟ لہٰذا دن کے آغاز میں حضور اقدس ﷺ اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ یہ دن جو تمہیں ملا ہے، یہ اللہ جل شانہ کی عظیم نعمت ہے، اگر یہ دن تمہیں نہ ملتا تو تم کیا کر لیتے، اس لئے پہلے تو اس عظیم نعمت پر شکر ادا کرو اور پھر اس دن کو صحیح مصرف میں اور صحیح کاموں میں خرچ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دن غفلت میں ضائع ہو جائے۔

اگر یہ دن نہ ملتا تو!

اور اگر یہ دن تمہیں نہ ملتا بلکہ سوتے میں تمہیں موت آگئی ہوتی اور اس حالت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوتی اور اعمال خراب ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوال ہوتا تو اس وقت یہ حسرت ہوتی کہ کاش! مجھے زندگی کا ایک دن اور مل جائے تو اپنے تمام گناہوں سے توبہ کر لوں اور اپنی سابقہ زندگی کی گندگی کو صاف کر لوں اور اپنا حساب برابر کر لوں۔ آج اللہ تعالیٰ نے اس حسرت کے بغیر تمہیں یہ دن دے دیا ہے تو اب اس دن سے کام لو اور اس کو ان کاموں میں خرچ کرو جس کے نتیجے میں بعد میں تمہارے لئے حسرت کا سبب نہ بنے۔ چلئے آج کا دن تو آپ کو مل گیا، لیکن اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ اگلا دن تمہیں ملے گا یا نہیں؟ لہٰذا آج کے اس دن کو صحیح کاموں میں خرچ کرو۔

وقت آجانے کے بعد مہلت نہیں ملے گی

قرآن شریف میں ہے کہ جب آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے لوگوں کی پیشی ہوگی تو اس وقت ایک بندہ کہے گا:

﴿لَوْ لَآ أَخَّرْتَنِيٓ إِلَىٰٓ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ الصَّٰلِحِينَ۝﴾(۱)

یعنی اے اللہ! آپ نے مجھے موت دے دی لیکن مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دیجئے اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے دنیا میں واپس بھیج دیجئے تو پھر آپ دیکھئے گا کہ میں کتنا نیک بن جاؤں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَن يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَآءَ أَجَلُهَا﴾(۲)

یعنی جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کسی کی موت میں کوئی تاخیر نہیں کرتے، ایک منٹ اِدھر سے اُدھر نہیں ہوسکتا۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ اس دعا کے ذریعہ اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ قبل اس کے کہ تم اللہ تعالیٰ کے سامنے جاکر یہ کہو کہ اے اللہ! مجھے ایک دن کے لئے اور دنیا میں بھیج دیجئے تاکہ اس میں توبہ کرکے نیک بن جاؤں، آج تمہیں اللہ تعالیٰ نے یہ نیا دن عطا فرمایا ہے، اس دن کے بارے میں یہ سمجھو کہ تم موت کے منہ سے نکل کر آرہے ہو۔

یہ سمجھو کہ یہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہے

ذرا تصور کرو کہ ایک آدمی کے لئے پھانسی کا حکم ہوچکا ہے، آج اس کو پھانسی دی جانی ہے، پھانسی کا پھندا لٹکا ہوا تیار ہے، اس آدمی کو پھانسی کے تختے پر لے جایا گیا اور بس اتنی دیر باقی ہے کہ جلاّد رسّی کھینچ کر کام تمام کردے۔ اس وقت اگر کوئی حاکم یہ کہے کہ ہم تمہاری پھانسی کو ایک دن کے لئے مؤخر کرتے ہیں، لہٰذا آج کے بجائے کل پھانسی دی جائے گی۔ بتایئے! ایک طرف تو اس کو خوشی کتنی ہوگی؟ دوسری طرف وہ شخص وہ ایک دن کس طرح گزارے گا؟ اسی کی طرف حضور اقدس ﷺ توجہ دلا رہے ہیں کہ یہ جو تمہیں نیا دن ملا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے پھانسی کا حکم ہوجانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک دن اور عطا فرمادیا، جس طرح تم وہ دن گزارتے، آج کا دن بھی اسی طرح گزارو۔

حضرت عبد الرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہوتے ہیں، وہ ہر دن اسی طرح گزارتے ہیں۔ حضرت

(۱) المنافقون: ۱۰ (۲) المنافقون: ۱۱

عبدالرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ جو تبع تابعین میں سے تھے اور بڑے جلیل القدر محدث تھے۔ ان کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میرے زمانے کے جتنے بزرگانِ دین ہیں، ان سب سے ملاقات کروں اور ان سے یہ پوچھوں کہ اگر آپ کو کسی طرح یہ پتہ چل جائے کہ کل بارہ بجے آپ کو موت آنے والی ہے اور آپ کے پاس زندگی کے صرف چوبیس گھنٹے باقی ہیں تو آپ ان چوبیس گھنٹوں میں کیا عمل کریں گے؟ ان صاحب کے پیشِ نظر یہ تھا کہ ہر بزرگ کی الگ شان ہوتی ہے اور ہر ایک کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں، اس لئے ہر بزرگ وہ کام بتائے گا جو اس کے نزدیک سب سے زیادہ افضل اور سب سے زیادہ فائدے والا اور سب سے زیادہ اجر و ثواب والا ہوگا۔

چنانچہ وہ شخص مختلف بزرگوں کے پاس گئے، ہر بزرگ نے مختلف جواب دیئے، جب حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچے اور ان سے سوال کیا کہ آپ ان چوبیس گھنٹوں میں کیا عمل کریں گے؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میں وہی کام کروں گا جو آج کر رہا ہوں۔ یعنی میں نے تو ہر دن ایسا بنایا ہوا ہے گویا کہ وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہے، لہٰذا جو عمل میں کرتا ہوں، اس پر کسی دوسرے عمل کا اضافہ نہیں کر سکتا۔ بہرحال اس دعا کے پہلے جملے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرما رہے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آج کا دن ہمیں واپس دے دیا۔ اس جملے میں یہ سارے مضامین پوشیدہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے گناہوں کی وجہ سے ہلاک نہیں کیا

اس دعا میں دوسرا جملہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا:

((وَلَمْ يُهْلِكْنَا بِذُنُوْبِنَا))

اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہلاک نہیں کیا۔ یہ جملہ بھی اپنے اندر معنی کی ایک کائنات رکھتا ہے، اس جملہ میں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم سے اس دنیاوی زندگی میں نہ جانے کتنے گناہ سرزد ہو رہے ہیں اور ان گناہوں کی وجہ سے ہم اس بات کے مستحق ہیں کہ ہم پر عذاب نازل ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس عذاب سے محفوظ رکھا، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ہلاک نہیں کیا۔

قومِ عاد پر عذاب

آج اگر ہم اپنی زندگی پر نگاہ ڈالیں تو یہ نظر آئے گا کہ وہ بڑے بڑے گناہ جن کی وجہ سے پچھلی اُمتوں میں پوری پوری قوم کو تباہ کر دیا گیا، تقریباً وہ سب گناہ آج ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے

ہیں۔ قوم عاد پر اللہ تعالیٰ نے ہوا کا عذاب نازل فرمایا، تین دن تک اس طرح ہوا کا طوفان آیا کہ بعض دیکھنے والوں نے لکھا ہے کہ وہ طوفانی ہوا عورتوں اور جانوروں کو اُڑا کر لے گئی اور بادلوں سے ان کے رونے اور چیخنے کی آوازیں آتی تھیں۔

قوم ثمود اور قوم شعیب پر عذاب

قوم ثمود کو ایک ایسی چیخ کے ذریعہ ہلاک کیا گیا جس سے ان کے کلیجے پھٹ گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے بارے میں قرآن کریم میں آیا ہے کہ یہ قوم ناپ تول میں کمی کیا کرتی تھی، تولتے وقت ڈنڈی مارنے کی عادت تھی، ان پر ''یوم الظلۃ'' کا عذاب اس طرح آیا کہ تین روز تک شدید گرمی پڑی، آسمان سے آگ برس رہی تھی اور زمین شعلے اُگل رہی تھی، تین دن کی گرمی سے بلبلا اُٹھے، اس کے بعد اچانک ٹھنڈی ہوائیں چلنی شروع ہوئیں اور بستی سے باہر کھلے میدان میں ایک بادل کا ٹکڑا آیا اور اس میں سے ٹھنڈی ہوا آنے لگی، چونکہ وہ قوم تین دن سے گرمی کی سختی برداشت کر رہی تھی، جب اس ٹھنڈے بادل کو بستی کے باہر دیکھا تو پوری قوم بستی سے باہر نکل کر اس بادل کے نیچے جمع ہوگئی، جب ساری قوم جمع ہوگئی تو اس بادل سے انگارے برسائے گئے اور ان انگاروں کے نتیجے میں پوری قوم تباہ ہوگئی۔ یہ عذاب اس وجہ سے آیا کہ وہ کفر و شرک کے علاوہ ناپ تول میں کمی کیا کرتے تھے۔

قوم لوط پر عذاب

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر بدفعلی کی وجہ سے اور لوگوں کا مال لوٹنے کی وجہ سے عذاب آیا۔ یعنی ایک تو خلاف فطرت بدفعلی کا ارتکاب کرنے کی عادت تھی، دوسرے لوگوں کا مال لوٹ کر اس کو ناحق کھانے کی عادت تھی، ان دو خرابیوں کی وجہ سے ان پر پتھروں کی بارش کا عذاب آیا، اور دوسرا عذاب یہ آیا کہ ان کی بستیاں اُلٹ دی گئیں، اُوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر کر دیا گیا۔ آج بھی ان کی بستیوں کا حشر اُردن میں دیکھا جاسکتا ہے، میں نے خود جا کر دیکھا ہے۔ وہ جگہ جہاں ان کی بستیاں آباد تھیں، آج وہاں پر ایسا سمندر ہے جس میں کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا، جس کی وجہ سے اس کو ''بحر میت'' کہا جاتا ہے، اگر کوئی مچھلی دریا سے اس سمندر میں آجائے تو وہ فوراً مر جاتی ہے۔

دنیا کا سب سے زیادہ پست علاقہ

جغرافیہ کے ماہرین نے بتایا ہے کہ وہ جگہ جہاں لوط علیہ السلام کی بستیاں تھیں، وہ جگہ آج سارے

روئے زمین پر سب سے زیادہ پست جگہ ہے، یعنی وہ جگہ سطح سمندر کے اعتبار سے پورے کرۂ ارض میں سب سے زیادہ نچلی جگہ ہے، چنانچہ جگہ جگہ پر راستے میں بورڈ لگے ہوئے ہیں کہ اب اس کی سطح اتنی نیچے ہوگئی، اب اتنی نیچے ہوگئی، اب اتنی نیچے ہوگئی۔ قرآن کریم نے یہ جو فرمایا تھا:

﴿فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا﴾(۱)

یعنی ہم نے اس کے بلند مقامات کو نیچے کردیا۔ آج بھی انسان اس کا مشاہدہ وہاں پر کرسکتا ہے۔

اُمتِ محمدیہ ﷺ عام عذاب سے محفوظ ہے

بہرحال! پچھلی اُمتوں پر ان کی مختلف بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مختلف اوقات میں مختلف عذاب نازل کرتے رہے ہیں، لیکن حضورِ اقدس ﷺ کی اُمتِ محمدیہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے طفیل یہ خصوصیت بخشی ہے کہ اس اُمت پر کوئی ایسا عذابِ عام نہیں آئے گا جو پوری اُمت کو ایک ہی مرتبہ ہلاک کردے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ط وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ o﴾(۲)

یعنی اللہ تعالیٰ آپ کی اُمت کو اس وقت تک عذاب نہیں دیں گے جب تک آپ ان کے اندر موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت تک عذاب نہیں دیں گے جب تک یہ استغفار کرتے رہیں گے۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہے کہ آج شدید بداعمالیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ اس اُمت پر ایسا عذاب نازل نہیں فرمائیں گے جس میں پوری اُمت تباہ و برباد ہو جائے۔

جزوی عذاب اُمتِ محمدیہ ﷺ پر آئیں گے

لیکن خوب یاد رکھئے! اس اعلان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جزوی عذاب سے بھی چھٹی مل ہوئی ہے، بلکہ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمت میں بھی جزوی عذاب آئیں گے، کبھی زلزلے کے ذریعہ سے تباہ کیا جائے گا، کبھی صورتیں مسخ کی جائیں گی، کبھی پتھر برسیں گے، کبھی ہواؤں کے طوفان آئیں گے۔ لہٰذا جزوی عذاب کا سلسلہ بند نہیں ہوا، بلکہ جزوی عذاب مختلف مواقع پر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

---

(۱) الحجر: ۷۴ (۲) الأنفال: ۳۳

بہرحال! حضورِ اقدس ﷺ نے طلوعِ آفتاب کے وقت یہ دعا فرمائی:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَقَالَنَا یَوْمَنَا هٰذَا وَلَمْ یُهْلِکْنَا بِذُنُوْبِنَا))

یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے یہ دن ہمیں واپس دے دیا، اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہمیں ہلاک نہیں کیا۔ ایک نبی ہی کا مقام ہے کہ وہ ایسے الفاظ سے دعا کرے۔ اس دعا میں صرف دو فقرے ہیں، لیکن ان میں معنی کی کائنات پوشیدہ ہے، ایک طرف ان میں اللہ جل شانہ کے انعامات کا شکر بھی ہے اور دوسری طرف اللہ کے عذاب سے خوف اور خشیت بھی ہے اور اس میں گناہوں سے توبہ کرنے کا موقع مل جانے کا اعتراف بھی ہے اور ساتھ ساتھ یہ دعوت بھی ہے کہ جب ایک نیا دن ملا ہے تو اس دن کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے میں اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے میں صرف کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اس دعا کی خصوصیات کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

صبح کے وقت پڑھنے کی دعائیں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گزشتہ جمعہ کو اس دعا کی تشریح عرض کی تھی جو دعا حضورِ اقدس ﷺ سورج نکلتے وقت پڑھا کرتے تھے، وہ دعا یہ تھی:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَقَالَنَا يَوْمَنَا هٰذَا وَلَمْ يُهْلِكْنَا بِذُنُوْبِنَا))(۲)

پھر دن کے آغاز میں حضورِ اقدس ﷺ سے چند اور دعائیں پڑھنا بھی ثابت ہیں۔ اور بہتر یہ ہے کہ سورج طلوع ہونے کے بعد جب بلند ہو جائے اور نماز پڑھنا جائز ہو جائے یعنی سورج طلوع ہونے کے تقریباً بارہ منٹ کے بعد تو پہلے اشراق کی نماز پڑھیں اور پھر یہ دعائیں پڑھیں، کیونکہ اس وقت حضورِ اقدس ﷺ سے دو رکعت یا چار رکعت نماز ''اشراق'' کی نیت سے پڑھنا ثابت ہیں اور احادیث میں ان کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ یہ دو رکعت گویا کہ اس بات کا شکرانہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کا ایک دن اور عطا فرمایا۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ یہ دعائیں نمازِ اشراق کے بعد پڑھی جائیں اور فجر کی نماز کے بعد بھی پڑھ سکتے ہیں۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۲۰۹ تا ۲۲۸)

(۱) المؤمن: ۶۰، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ: ''مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، بے شک جو لوگ تکبر کی بنا پر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے''

(۲) صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب ترتيل القراءة واجتناب الهذ، رقم: ۱۳۵۹

پہلی دعا

پہلی دعا جو دن کے آغاز میں حضورِ اقدس ﷺ سے پڑھنا ثابت ہے وہ یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ بِكَ أَصْبَحْنَا وَبِكَ أَمْسَيْنَا وَبِكَ نَحْيٰ وَبِكَ نَمُوْتُ))(۱)

''اے اللہ! ہماری صبح بھی آپ ہی کے کرم سے ہے اور ہماری شام بھی آپ ہی کے کرم سے ہے اور ہماری زندگی بھی آپ ہی کی بدولت ہے اور جب ہمیں موت آئے گی تو وہ موت بھی آپ ہی کی طرف سے ہے''

اس دعا میں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارے صبح سے لے کر شام تک کے سارے اوقات اللہ جل شانہ کے مرہونِ منت ہیں۔

دوسری دعا

صبح کے وقت دوسری یہ دعا پڑھنا ثابت ہے:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذَا الْيَوْمِ وَخَيْرَ مَا بَعْدَهٗ))(۲)

''اے اللہ! جو دن شروع ہو رہا ہے، میں اس دن کی بھلائی آپ سے مانگتا ہوں اور اس دن کے بعد جو دن آنے والے ہیں، ان کی بھی بھلائی آپ سے مانگتا ہوں''

اس دعا میں لفظ ''خیر'' بیان فرمایا، جس کے معنی ہیں ''بھلائی'' یہ اتنا جامع اور عام لفظ ہے کہ اس میں دنیا اور آخرت کی ساری حاجتیں جمع ہو جاتی ہیں، لہٰذا جب یہ کہا کہ میں اس دن کی بھلائی مانگتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دن میں جو بھی واقعہ پیش آئے جو جو حالات پیش آئیں، وہ میرے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ما جاء فی الدعاء إذا أصبح وإذا أمسٰی، رقم: ۳۳۱۳، سنن ابن ماجه، کتاب الدعاء، باب ما یدعو به الرجل إذا أصبح وإذا أمسٰی، رقم: ۳۸۵۸

(۲) حلیة الأولیاء (۲۸/۵)، الدعاء للطبرانی، رقم: ۲۶۷ (۳۰۲/۱)، پوری دعا کچھ یوں ہے: "أصبحنا وأصبح الملك للہ والحمد للہ لا إله إلا اللہ وحده لا شریك له اَللّٰهم إنی أسألك خیر هذا الیوم وخیر ما بعده وأعوذ بك من شر هذا الیوم وشر ما بعده اَللّٰهم إنی أعوذ بك من الکسل والکبر وعذاب القبر" پوری دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''ہم نے اور ساری کائنات نے اللہ کے حکم سے صبح کی، تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اے اللہ! میں تجھ سے اس دن کی اور اس دن کے بعد آنے والے زمانے کی خیر مانگتا ہوں اور اس دن کی برائیوں سے اور اس دن کے بعد آنے والی برائیوں سے پناہ مانگتا ہوں، اے اللہ! مجھے سستی، تکبر اور قبر کے عذاب سے نجات عطا فرما''

لئے خیر ہوں اور وہ میرے لئے بھلائی کا سبب ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان دعاؤں میں سے ایک دعا بھی اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے تو انسان کا بیڑہ پار ہو جائے۔ چنانچہ اس دعا میں بھی دنیا اور آخرت کی ساری بھلائیاں جمع ہیں۔

تیسری دعا

پھر ایک اور دعا میں حضور اقدس ﷺ نے اس ''خیر'' کی تھوڑی سی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذَا الْيَوْمِ وَفَتْحَهٗ وَنَصْرَهٗ وَنُوْرَهٗ وَبَرَكَتَهٗ وَهُدَاهُ))(۱)

''اے اللہ! میں آپ سے اس دن کی بھلائی اور اس دن کی فتح اور اس دن میں آپ کی مدد اور نصرت اور اس دن کا نور اور اس دن کی برکت اور اس دن میں حاصل ہونے والی ہدایت مانگتا ہوں''

لفظ ''فتح'' کی تشریح

اس دعا میں حضور اقدس ﷺ نے ''فتح'' کا لفظ ارشاد فرمایا۔ ہماری اُردو زبان اتنی تنگ ہے کہ عربی کا لفظ ''فتح'' کا صحیح ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اس کا یہ ترجمہ کیا کہ اے اللہ! میں آپ سے اس دن کی فتح مانگتا ہوں، کیونکہ اُردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو اس لفظ کی پوری پوری نمائندگی کر سکے۔

''فتح'' کے لفظی معنی ہیں ''کھولنا''، جیسے کوئی چیز بند ہے اور پھر اس کو کھول دیا جائے تو اس کے لئے فتح کا لفظ بولا جائے گا۔ چنانچہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قلعہ فتح کر لیا یا فلاں شہر فتح کر لیا، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ پہلے ہمارے لئے بند تھا اور ہمارا اس پر قابو نہیں تھا اور ہمیں اس بات کی طاقت نہیں تھی کہ اس کے اندر داخل ہو سکتے، لیکن وہ فتح ہو گیا ہے اور ہمارے لئے کھل گیا ہے۔ لہٰذا اُردو میں سب سے قریب تر اس کا ترجمہ ''دروازے کھول دینا'' ہو سکتا ہے۔

رحمت کے دروازے کھول دے

لہٰذا اس دعا کے معنی یہ ہوئے کہ اے اللہ! میں آپ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ آپ میرے لئے

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب ما یقول إذا اصبح، رقم: ٤٤٢١

اس دن کے اندر اپنی توفیق اور رحمت کے دروازے کھول دیں۔ کیونکہ انسان جب دن کے آغاز میں اپنی سرگرمیوں میں داخل ہوتا ہے، مثلاً صبح کے وقت روزی کمانے کے لئے اور دوسری ضروریات پوری کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلتا ہے تو اس وقت انسان کو قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دروازے بند ہیں، پھر بعض اوقات وہ رکاوٹیں برقرار رہتی ہیں اور انسان اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام ہوجاتا ہے اور بعض اوقات اللہ تعالیٰ غیب سے وہ رکاوٹ دور فرمادیتے ہیں اور انسان اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

دروازہ کھل گیا

مثلاً آپ دفتر یا دکان جانے کے لئے گھر سے نکلے، اب آپ سواری کے انتظار میں کھڑے ہیں اور سواری نہیں مل رہی ہے، بس میں سوار ہونا چاہتے ہیں لیکن بس نہیں آرہی ہے، یا ٹیکسی کرنا چاہتے ہیں لیکن کوئی ٹیکسی نہیں مل رہی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ رکاوٹ ہے اور ابھی دروازہ بند ہے، پھر اچانک بس آگئی یا ٹیکسی مل گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دروازہ کھل گیا اور جو رکاوٹ تھی وہ دور ہوگئی۔ یا مثلاً آپ کسی کام کے لئے سرکاری دفتر گئے، وہاں جاکر دیکھا کہ لمبی قطار لگی ہوئی ہے، آپ بھی قطار میں کھڑے ہوگئے اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگے، مگر آپ کا نمبر ہی نہیں آرہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دروازہ بند ہے اور کوئی رکاوٹ ہے، لیکن اچانک یہ ہوا کہ آگے کے لوگ جلدی جلدی فارغ ہوگئے اور آپ کا نمبر جلدی آگیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رکاوٹ دور ہوگئی اور جو دروازہ بند تھا وہ کھل گیا۔ دنیا کے اور آخرت کے ہر کام میں آپ کو یہ سلسلہ نظر آئے گا۔

دروازہ کھل جانا ''فتح'' ہے

بعض اوقات یہ رکاوٹ اتنی لمبی ہوجاتی ہے کہ انسان اپنا مقصد حاصل نہیں کرپاتا اور بعض اوقات وہ رکاوٹ جلدی دور ہوجاتی ہے اور انسان اپنے مقصد کو جلدی حاصل کرلیتا ہے۔ یہ جو رکاوٹ دور ہورہی ہے اور دروازے کھل رہے ہیں، اس کا نام ''فتح'' ہے۔ اسی لئے حضور اقدس ﷺ دن کے آغاز میں یہ دعا فرمارہے ہیں:

((اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُكَ خَیْرَ ھٰذَا الْیَوْمِ وَفَتْحَهٗ))

یعنی اے اللہ! آپ نے زندگی کا ایک نیا دن عطا فرمادیا ہے، اب اس دن میں اپنے کاروبارِ زندگی میں داخل ہوں گا، وہاں قدم قدم پر رکاوٹیں آئیں گی، اے اللہ! میں آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ رکاوٹیں دائمی نہ ہوں، بلکہ وہ رکاوٹیں دور ہوجائیں اور آپ کی طرف سے دروازے کھل جائیں۔

زندگی ''جہدِ مسلسل'' سے عبارت ہے

اگر ہر شخص صبح سے لے کر شام تک اپنی زندگی کا جائزہ لے کر دیکھے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ یہ ساری زندگی اس طرح گزر رہی ہے کہ رکاوٹیں آتی ہیں، کبھی وہ رکاوٹیں جلدی ختم ہو جاتی ہیں اور کبھی دیر سے ختم ہوتی ہیں اور کبھی باقی رہتی ہیں، کبھی انسان کامیاب ہو جاتا ہے اور کبھی ناکام ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میرے کاموں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوا کرے بلکہ میں جو چاہوں وہ کام ہو جایا کرے تو یہ بات اس دنیا کے اندر تو ممکن نہیں ہے یہ حالت تو انشاء اللہ تعالیٰ جنت میں حاصل ہوگی، وہاں پر آدمی جو چاہے گا وہ ہوگا، جو مانگے گا وہ ملے گا، لیکن اس دنیا میں بڑے سے بڑے بادشاہ، بڑے سے بڑے صاحبِ اقتدار، بڑے سے بڑے دولتمند کو بھی یہ بات نصیب نہیں کہ جو وہ چاہے وہ ہو جائے اور وہ جو مانگے وہ مل جائے، بلکہ یہ دنیا کی زندگی تو معرکہ کارزارِ حیات ہے، یہ زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت ہے، اس میں رکاوٹیں آتی بھی ہیں اور دور بھی ہوتی ہیں، یہاں دروازے بند بھی ہوتے ہیں اور کھلتے بھی ہیں۔

بہرحال! حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے آغاز میں دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! میں کارزارِ زندگی میں داخل ہونے والا ہوں، معرکہ زندگی میں اُترنے والا ہوں، یہاں قدم قدم پر رکاوٹیں آئیں گی، اے اللہ! میرے لئے دروازے کھول دیجئے، تاکہ وہ رکاوٹیں دائمی اور ابدی نہ ہوں۔

''بیماری'' ایک رکاوٹ ہے

دیکھئے! بیماری آگئی تو یہ بیماری ایک رکاوٹ ہے، اس لئے کہ اس کی وجہ سے انسان اپنے معمولاتِ زندگی ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اب بیماری کو دور کرنے کے لئے دوا کھائی تو اب وہ دوا اثر ہی نہیں کر رہی ہے اور دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے، یہ رکاوٹ ہے، لیکن اچانک بعد میں دوا سے فائدہ ہونا شروع ہو گیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دروازہ کھل گیا، اس کا نام ''فتح'' ہے۔ اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! جب میں صبح کے وقت زندگی کا آغاز کروں اور کاروبارِ زندگی میں اُتروں تو اس وقت آپ کی طرف سے دروازے کھلے ہوئے ہوں اور جو رکاوٹیں آئیں آپ ان کو دور فرما دیں۔

نماز میں سُستی ایک رکاوٹ ہے

آپ اندازہ کریں کہ اگر کسی بندے کو صرف یہ بات حاصل ہو جائے کہ اس کے لئے

دروازے کھلے ہوئے ہوں، دنیا کے معاملات میں بھی دروازے کھلے ہوئے ہوں اور دین کے معاملات میں بھی دروازے کھلے ہوئے ہوں تو اس کو اور کیا چاہئے۔ یہ مثالیں تو میں نے دنیا کے معاملات میں بتائیں۔ آخرت کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کوئی اطاعت کرنا چاہتا ہے اور عبادت کرنا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرنا چاہتا ہے لیکن درمیان میں رکاوٹ آجاتی ہے، مثلاً فجر کی نماز پڑھنے کے لئے بیدار ہونا چاہتا ہے لیکن نیند کا غلبہ ہے، تو یہ ایک رکاوٹ ہے جو اس کو نماز سے روک رہی ہے اور دروازہ بند ہے، لیکن اس وقت اس کے دل میں یہ خیال آگیا کہ یہ نماز پڑھنا تو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، اس کو ضرور پڑھنا چاہئے، اس خیال کے آتے ہی طبیعت میں ہمت پیدا ہوگئی اور اُٹھ کر نماز کے لئے چل پڑا، تو اس کے لئے دروازہ کھل گیا اور رکاوٹ دور ہوگئی۔

گناہوں کے داعیے رکاوٹ ہیں

یا مثلاً آپ کسی کام سے گھر سے باہر نکلے، لیکن باہر آنکھوں کو پناہ ملنی مشکل ہے، چاروں طرف فتنے پھیلے ہوئے ہیں، نفسانی خواہشات اس کو اس بات پر اُبھار رہی ہیں کہ وہ اس کو غلط استعمال کرکے لذت حاصل کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنے میں رکاوٹ ہے، دروازہ بند ہے، اور نفس کا تقاضا اتنا شدید ہے کہ آدمی مغلوب ہورہا ہے، نفس و شیطان کا بہکانا اتنا شدید ہے کہ انسان ہتھیار ڈالے جارہا ہے، لیکن جب اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! اس نفس و شیطان نے مجھے مغلوب کررکھا ہے، اے اللہ! مجھے اس بات کی توفیق عطا فرمادے کہ میں اس گناہ سے بچ جاؤں، چنانچہ اس دعا کے نتیجے میں توفیق مل گئی اور اس گناہ سے بچنے کی ہمت ہوگئی اور دروازہ کھل گیا۔ بہرحال! دنیا کے کاموں میں بھی اور آخرت کے کاموں میں بھی دروازہ کھلنے کی ضرورت ہے، اور ہم اس بات میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں کہ اس کی طرف سے دروازہ کھل جائے، اس لئے حضور اقدس ﷺ دن کے شروع ہی میں یہ دعا فرمارہے ہیں کہ اے اللہ! اس دن کی بھلائی عطا فرما اور اس دن کی ''فتح'' عطا فرما، تاکہ رکاوٹیں دور ہوں اور دروازے کھل جائیں۔

لفظ ''نَصْرَہٗ'' کی تشریح

اس کے بعد تیسرا لفظ ارشاد فرمایا: ''نَصْرَہٗ''۔ ''نَصْرَہٗ'' کے معنی ہیں ''مدد'' یعنی اے اللہ! میں آپ سے اس دن کی مدد مانگتا ہوں۔ اس لئے کہ انسان صبح سے شام تک کی زندگی میں جتنے کام انجام دیتا ہے، ان میں سے کوئی کام ایسا نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت نہ ہو، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی مدد نہ ہو تو پھر انسان کوئی بھی کام اس دنیا میں انجام نہیں دے سکتا، اس لئے

حضورِ اقدس ﷺ دن کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ سے یہ التجا اور درخواست فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! آپ کی نصرت میرے شاملِ حال رہے اور میں جب بھی کوئی کام کرنے جاؤں تو آپ کی طرف سے میری مدد ہو، چاہے وہ دنیا کا کام ہو یا آخرت کا کام ہو۔

انسان کا کام صرف اسباب جمع کرنا ہے

دیکھئے! انسان کے اختیار میں بس اتنا ہے کہ وہ کسی کام کے اسباب مہیا کرلے، لیکن ان اسباب کا کارگر ہونا، ان سے فائدہ حاصل ہونا اور ان سے مقصود حاصل ہو جانا انسان کے اختیار میں نہیں۔ مثلاً ایک شخص نے پیسے جمع کیے، دکان بنائی، اس دکان میں سامان رکھا اور اس دکان میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ کام تو اس کے اختیار میں تھے جو اس نے انجام دے دیئے، لیکن اس دکان پر گاہک کا آنا اور سامان کو پسند کرنا اور اس سامان کی جو قیمت طلب کی جارہی ہے، اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار ہو جانا، یہ کام انسان کے اختیار میں نہیں۔ وہ کون ذات ہے جو اس کی دکان پر گاہک کو بھیج رہا ہے، وہ کون ذات ہے جو گاہک کے دل میں یہ ڈال رہا ہے کہ اس دکان میں فلاں چیز رکھی ہے تم پسند کرلو، کون اس گاہک کے دل میں یہ بات ڈال رہا ہے کہ اس چیز کو اتنی قیمت پر خرید لو۔ کتنے لوگ ایسے ہیں کہ وہ دکان کھول کر مال سجا کر بیٹھے ہیں لیکن گاہک نہیں آتا، یا گاہک آتا ہے لیکن چیز پسند نہیں کرتا، یا چیز پسند کرتا ہے لیکن اس کی جو مناسب قیمت ہے، وہ دینے پر تیار نہیں ہوتا، نتیجہ یہ ہے کہ وہ دکاندار دکان کھولے بیٹھا ہے لیکن فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ اب ظاہری اسباب تو اس نے جمع کر لیے ہیں، لیکن اللہ جل شانہ کی طرف سے مدد اور نصرت نہیں جس کے نتیجے میں یہ سارے اسباب بیکار ہو گئے۔

صحت حاصل ہونا اختیار میں نہیں

یا مثلاً انسان کے اختیار میں اتنا ہی ہے کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو وہ کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کرے اور وہ ڈاکٹر اس کو دوا لکھ دے، پھر وہ بازار سے وہ دوا خرید کر لے آئے اور اس دوا کو کھا لے، لیکن دوا کے کھا لینے کے بعد وہ دوا کارگر ہو، وہ دوا فائدہ پہنچائے اور بیماری کو دور کرے اور اس کے نتیجے میں شفا حاصل ہو جائے، یہ انسان کے بس کا کام نہیں جب تک اللہ جل شانہ کی طرف سے مدد اور نصرت نہ ہو۔

ملازمت مل جانا اختیار میں نہیں

یا مثلاً انسان کے اختیار میں اتنا ہی ہے کہ اپنے روزگار اور ملازمت کے لئے درخواست

دیدے، لیکن وہ درخواست منظور ہو جائے اور ملازمت مل جائے اور اس کے بعد دونوں کے درمیان مناسبت بھی قائم ہو جائے اور اس کام کے نتیجے میں تنخواہ مل جائے، یہ انسان کے اختیار میں نہیں بلکہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اور نصرت کی ضرورت ہے۔ یہ تو دنیا کے کام ہوئے۔

خشوع وخضوع اختیار میں نہیں

دوسری طرف آخرت کے کاموں میں بھی یہی اصول ہے۔ مثلاً انسان کے اختیار میں صرف اتنا ہے کہ مسجد جا کر نماز کی نیت باندھ لے، لیکن اس کا دل اور اس کا دماغ اور اس کی توجہ اللہ جل شانہ کی طرف ہو جائے اور اس کی نماز میں خشوع اور خضوع پیدا ہو جائے، یہ اس کے اختیار میں نہیں جب تک اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہو۔ بہرحال! دنیا اور آخرت کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جس میں اللہ جل شانہ کی مدد کی ضرورت نہ ہو۔

دن کے آغاز میں ''نصرت'' طلب کرلو

اس لئے حضور اقدس ﷺ دن کے شروع ہی میں یہ دعا مانگ رہے ہیں اور گویا کہ اللہ تعالیٰ سے یہ فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! یہ دن شروع ہو رہا ہے، میں کاروبارِ زندگی میں داخل ہونے والا ہوں، معرکۂ حیات پیش آنے والا ہے، نہ جانے کیسے حالات پیش آئیں، نہ جانے کیا واقعات سامنے آئیں، اس لئے مجھے ہر ہر قدم پر آپ کی نصرت درکار ہے، میں آپ سے آپ کی نصرت مانگتا ہوں۔

لفظ ''نُوْرَہٗ'' کی تشریح

آگے چوتھا لفظ ارشاد فرمایا ''وَنُوْرَہٗ'' یعنی میں آپ سے اس دن کا نور مانگتا ہوں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دن تو ہوتا ہی نور ہے، اس لئے کہ ''نور'' کے معنی ہیں ''روشنی'' اور دن کے اندر روشنی ہی ہوتی ہے، جب سورج نکلتا ہے تو ساری کائنات منور اور روشن ہو جاتی ہے، مؤمن اور کافر، فاسق و فاجر، ہر ایک کو اللہ تعالیٰ دن کی روشنی عطا فرماتے ہیں، پھر اس دعا کا کیا مطلب ہے کہ اے اللہ! مجھے اس دن کا نور عطا فرما۔

نور سے دل کا نور مراد ہے

بات دراصل یہ ہے کہ اس دعا میں نور سے مراد یہ ظاہری روشنی نہیں، بلکہ یہ دعا کی جا رہی ہے کہ اے اللہ! ظاہری روشنی تو آپ نے اس دن کے ذریعہ سب کو عطا فرما دی، مؤمن کو بھی اور کافر کو

بھی، فاسق کو بھی اور فاجر کو بھی، بچے کو بھی اور بوڑھے کو بھی، مرد کو بھی اور عورت کو بھی، لیکن اے اللہ! میرے لئے تنہا یہ ظاہری روشنی کافی نہیں جب تک آپ مجھے میرے دل کا نور عطا نہ فرمائیں۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے کہ۔

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

لہٰذا صرف آنکھوں کا نور کافی نہیں بلکہ باطن کا نور اور دل کے نور کی ضرورت ہے۔

اپنے رضا والے کاموں کی توفیق دے

اس لئے یہ دعا کی جارہی ہے کہ اے اللہ! آپ نے یہ جو ظاہری روشنی پیدا فرمائی ہے، یہ اس لئے پیدا فرمائی ہے تاکہ لوگ اس روشنی سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے اپنے کام انجام دیں، کیونکہ اگر اندھیرا ہوتا اور سورج نہ نکلتا تو کوئی آدمی اپنا کوئی کام انجام نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ﴾(۱)

یعنی ہم نے تمہیں یہ دن اس لئے دیا ہے تاکہ اس دن کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ لہٰذا یہ تو ہماری جسمانی ضرورت ہے کہ ہمیں یہ روشنی ملے، لیکن میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! دن کی یہ روشنی اس وقت کارگر ہوگی جب میں اس روشنی میں کام بھی نور والے کروں، ظلمت والے کام نہ کروں۔ اور نور والے کام وہ ہیں جن کے کرنے سے آپ راضی ہوتے ہیں، اور جن کاموں کے کرنے سے آپ راضی نہیں، وہ کام چاہے کتنے ہی درخشاں اور تاباں نظر آتے ہوں، لیکن حقیقت میں وہ ظلمت اور اندھیرے ہیں، اس لئے میں آپ سے اس دن کا نور مانگتا ہوں۔

کام کی ظلمت سے دل میں گھٹن ہوتی ہے

یہ ''نور'' کا لفظ بڑا جامع ہے، قرآن وحدیث میں ''نور'' ایک خاص کیفیت کا نام ہے۔ آپ دنیا کے اندر بہت سے کام انجام دیتے ہیں، لیکن بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو انجام دینے کے بعد طبیعت میں بہت نشاط اور انشراح ہوتا ہے، خوشی اور اطمینان اور سکینت حاصل ہوتی ہے، اور بعض کام ایسے کرتے ہیں کہ ان کو انجام دینے کے بعد طبیعت میں انقباض ہو جاتا ہے، گھٹن اور الجھن ہو جاتی ہے، اطمینان اور سکون نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر کسی کام کے کرنے میں بڑا لطف اور مزہ تو آیا لیکن اس کے

(۱) الروم: ۲۳

کرنے کے بعد طبیعت میں گھٹن اور ایک الجھن پیدا ہوگئی، تو یہ گھٹن اور الجھن اس کام کی ظلمت ہے اور اس ظلمت نے دل کو گھیرا ہوا ہے۔

کام کے نور سے دل میں انشراح

بعض اوقات ایک کام انجام دینے سے طبیعت کے اندر خوشی پیدا ہوگئی، اطمینان اور سکون حاصل ہوگیا، سکینت حاصل ہوگئی، یہ درحقیقت اس کام کا نور ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کام کے ذریعہ عطا فرمایا۔ صبح سے شام تک کی زندگی کا جائزہ لے کر دیکھیں، ہر انسان کو یہ حالت پیش آتی ہے، کوئی انسان اس سے مستثنیٰ نہیں ہوگا۔ اس لئے دن کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرلیں کہ اے اللہ! وہ کام کرنے کی توفیق عطا فرمایئے جس کے نتیجے میں دل کا نور حاصل ہو اور جس سے قلب کو سکون اور اطمینان نصیب ہو۔

لفظ "بَرَکَتَہٗ" کی تشریح

اس کے بعد پانچواں لفظ ارشاد فرمایا: "وَبَرَکَتَہٗ" اے اللہ! میں آپ سے اس دن کی برکت مانگتا ہوں۔ یہ "برکت" بڑی عجیب چیز ہے۔ اُردو میں یا دنیا کی دوسری زبان میں اس کا ایک لفظ کے ذریعہ ترجمہ کرنا ممکن نہیں۔ ہم لوگ "برکت" کا لفظ ہر وقت بولتے رہتے ہیں، اور اسی برکت سے لفظ "مبارک" نکلا ہے، کسی کا نکاح ہوگیا، تو کہتے ہیں نکاح مبارک ہو، شادی مبارک ہو، مکان بن گیا مبارک ہو، گاڑی مبارک ہو، کاروبار مبارک ہو، ملازمت مبارک ہو، دن رات "مبارک" کا لفظ استعمال کرتے رہتے ہیں، لیکن اس لفظ کا مطلب بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔

برکت کا مطلب

"برکت" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کسی چیز کا حقیقی فائدہ انسان کو عطا فرمادیں اور تھوڑی محنت و مشقت سے اور تھوڑے پیسے سے زیادہ فائدہ حاصل ہوجائے، اس کا نام "برکت" ہے۔ یہ "برکت" خالص اللہ جل شانہ کی عطا ہے، انسان پیسے سے چیز خرید سکتا ہے لیکن اس کی "برکت" پیسے سے نہیں خرید سکتا اور نہ محنت سے حاصل کرسکتا ہے، بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، انہی کی طرف سے نصیب ہوتی ہے، جس پر ان کا فضل ہوتا ہے، اسی کو یہ برکت عطا ہوتی ہے۔

بیڈروم کی برکت نہیں ملی

مثلاً آپ نے ایک بڑا عالیشان مکان بنالیا، اس مکان پر کروڑوں روپیہ خرچ کردیا، اس کو زیب و زینت سے آراستہ کرلیا، دنیا کی تمام ضروریات اس مکان کے اندر جمع کرلیں، اس مکان کا بیڈروم بڑا شاندار بنایا، اس کے اندر شاندار قسم کا بیڈ لگایا، اس پر عالیشان گدا لگایا، اس بیڈ کے چاروں اطراف کا ماحول بڑا خوبصورت بنایا، اس کے اندر خوشبو چھڑکی، یہ سب کچھ کرلیا، لیکن جب رات کو آکر اس بیڈ پر لیٹے تو ساری رات نیند نہیں آئی، کروٹیں بدلتے بدلتے رات گزر گئی۔ بتایئے! وہ بیڈروم جو لاکھوں روپے میں تیار کیا اور اس کے اندر سارے اسباب جمع کیے، لیکن جب اس میں نیند نہیں آئی تو کیا وہ بیڈروم کسی کام کا ہے؟ اس بیڈروم سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا، اب ڈاکٹر کے پاس جارہے ہیں اور نیند کی گولیاں کھارہے ہیں، جس کے نتیجے میں کبھی نیند آتی ہے اور کبھی نہیں آتی، لہٰذا بیڈروم تو حاصل ہوگیا لیکن اس کی برکت نہ ملی۔

گھر ملا لیکن برکت نہ ملی

اسی طرح گھر خریدا، لیکن اس گھر میں روزانہ کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہوا ہے، کبھی یہ چیز ٹوٹ گئی اور کبھی وہ چیز ٹوٹ گئی، کبھی اس چیز کی مرمت کرارہے ہیں اور کبھی دوسری چیز کی مرمت کرارہے ہیں، کبھی اس چیز پر ہزاروں روپے خرچ ہورہے ہیں اور کبھی دوسری چیز پر خرچ ہورہے ہیں، لہٰذا گھر تو ملا لیکن گھر کی برکت نہ ملی۔ اب بتایئے! کیا یہ برکت بازار سے خرید کر لاسکتے ہیں؟ لاکھوں روپے خرچ کرکے گھر تو بناسکتے ہیں لیکن اس گھر کی برکت پیسوں سے نہیں خرید سکتے۔

گاڑی ملی لیکن برکت نہ ملی

یا مثلاً آپ نے پیسے خرچ کرکے گاڑی تو خرید لی لیکن وہ گاڑی کبھی اسٹارٹ ہونے سے انکار کررہی ہے اور اس کو دھکا لگانا پڑتا ہے اور کبھی وہ مکینک کے پاس کھڑی ہے، یہ سب پریشانیاں ہورہی ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ گاڑی تو ملی لیکن گاڑی کی برکت نہ ملی۔

جھونپڑا ملا اور برکت بھی ملی

دوسری طرف وہ شخص ہے جس نے حلال کمائی سے جھونپڑا بنایا اور اپنے گھر والوں کے ساتھ اس میں آرام سے رہتا ہے، رات کو عشاء کی نماز کے بعد گھر میں آتا ہے اور بستر کے تکیے پر سر رکھتے ہی

نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے اور آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند کر کے صبح اُٹھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو جھونپڑا بھی ملا اور جھونپڑے کی برکت بھی ملی اور اس کی راحت بھی ملی۔

یہ سب اسبابِ راحت ہیں

آج کی دنیا نے راحت کے اسباب کا نام راحت رکھا ہوا ہے، مال و دولت کا نام، مکان کا نام، گاڑی کا نام راحت رکھا ہوا ہے، اس کو یہ معلوم نہیں کہ یہ سب چیزیں راحت کے اسباب تو ہیں لیکن حقیقی راحت نہیں، حقیقی راحت تو کہیں اور سے عطا ہوتی ہے، وہ اگر دینا چاہے تو جھونپڑے میں راحت و آرام عطا فرمادے اور اگر وہ راحت چھیننا چاہے تو بڑے بڑے محلات کے مکینوں سے چھین لے۔ لہٰذا ''برکت'' اللہ تعالیٰ کی اس عطا کا نام ہے جو اپنے بندے کو اس طرح عطا فرماتے ہیں کہ تھوڑی سی چیز سے بہت سے کام بن جاتے ہیں۔

''مبارک ہو'' کا مطلب

لہٰذا ہم جو دوسرں کو یہ دعا دیتے ہیں کہ ''مبارک ہو'' اس کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ اے اللہ! آپ نے اس کو راحت کا سبب تو عطا فرمایا، اب اس سبب کو کارگر بھی بنادیجئے اور اس کے ذریعہ اس کو راحت بھی عطا فرمادیجئے۔

آج ہر شخص پریشان ہے

آج ہر شخص کو یہ شکایت ہے کہ اس آمدنی میں گزارہ نہیں ہوتا، جو شخص تین ہزار روپے ماہانہ کمار ہا ہے، اس کو بھی یہی شکایت ہے، جو شخص دس ہزار روپے کمارہا ہے، اس کو بھی یہی شکایت ہے اور جو ماہانہ تیس ہزار روپے کمارہا ہے، وہ بھی یہی شکایت کرتا ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جو شخص ماہانہ ایک لاکھ روپے کمارہا ہے، وہ بھی یہی کہتا ہے کہ گزارہ نہیں ہوتا، جب مہینے کی آخری تاریخیں آتی ہیں تو جیبیں خالی ہوجاتی ہیں، جو پریشانی تین ہزار روپے کمانے والے کو ہے، وہی پریشانی ایک لاکھ روپے کمانے والے کو بھی ہے۔

تین لاکھ روپے ماہانہ آمدنی والے کا حال

ایک شخص کی آمدنی تین لاکھ روپے ماہانہ تھی، میں نے اپنے کانوں سے ان کی زبان سے بھی یہی سنا کہ گزارہ نہیں ہوتا۔ بات اصل یہ تھی کہ تین لاکھ تو مل رہے ہیں، لیکن تین لاکھ کی برکت نہیں مل

رہی ہے، وہ برکت اللہ تعالیٰ نے چھین لی ہے، اور اس لئے چھین لی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں زندگی گزاری جارہی ہے، اب برکت کہاں سے آئے؟

وقت نہ ہونے کا سب کو شکوہ ہے

ہر شخص کی زبان پر یہ شکوہ ہے کہ وقت نہیں ملتا، کسی سے کہا جائے کہ فلاں کام کرلیا کرو تو فوراً جواب میں کہیں گے کہ وقت ہی نہیں ملتا، کیا کریں فرصت ہی نہیں ہے۔ آج ضروری کاموں کے لئے وقت نہیں ملتا، کیوں وقت نہیں ملتا؟ حالانکہ سب کو دن رات میں ۲۴ گھنٹے کا وقت دیا گیا ہے، چاہے وہ فقیر ہو یا امیر ہو، غریب ہو یا سرمایہ دار ہو، عالم ہو یا جاہل ہو، مزدور ہو یا کسان ہو یا افسر ہو، چوبیس گھنٹے کا وقت تو سب کو دیا گیا ہے، پھر وقت کیوں نہیں ملتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت تو سب کے پاس ہے، لیکن اس وقت کی برکت نہیں ہے، پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب دن شروع ہوا اور کب ختم ہوگیا۔ کیونکہ وقت کی قدر دلوں میں نہیں ہے، یہ نہیں سمجھتے کہ جب یہ وقت برباد کردیا تو کتنی بڑی دولت برباد کردی، اس لئے وقت کے اندر بے برکتی ہے۔

دن کے آغاز میں برکت کی دعا کرلو

اس لئے حضور اقدس ﷺ دعا فرمارہے ہیں کہ اے اللہ! دن شروع ہورہا ہے، اس لئے میں آپ سے اس دن کی برکت بھی مانگتا ہوں تاکہ تھوڑے وقت میں زیادہ کام ہوجائے، یہ برکت صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

وقت بچانے کے اسباب

آج کے اس جدید دور میں وقت بچانے کے اتنے اسباب پیدا ہوگئے ہیں جس کا شمار نہیں کرسکتے، چنانچہ جو سفر پہلے گھوڑوں اور اُونٹوں پر مہینوں میں ہوا کرتا تھا، آج وہ سفر ایک گھنٹے میں ہوائی جہاز کے ذریعہ ہوجاتا ہے۔ پہلے زمانے میں یہ تھا کہ اگر کھانا پکانا ہے تو پہلے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاؤ، ان کو سکھاؤ، پھر ان کو سُلگاؤ، صرف چولہا جلانے کے لئے ایک وقت درکار ہوتا تھا، اس کے بعد کھانا پکانے میں جو وقت صرف ہوتا تھا وہ اس کے علاوہ ہوتا تھا، ایک چائے بھی پکانی ہے تو ایک گھنٹہ کم از کم لگتا تھا۔ لیکن آج یہ صورت ہے کہ اگر تمہیں چائے پکانی ہے تو تم نے ماچس جلائی اور چولہے کا کان مروڑا اور دو منٹ میں چائے تیار کرلی۔ اب سوال یہ ہے کہ آج تمہارے چائے پکانے میں جو ۵۸ منٹ بچ گئے، وہ ۵۸ منٹ کہاں چلے گئے؟

جو وقت بچا وہ کہاں گیا؟

پہلے زمانے میں روٹی پکانے کے لئے خواتین پہلے چکی کے ذریعہ گندم پیستی تھیں، پھر اس کا آٹا بنا کر اس کو گوندتیں، پھر روٹی پکاتیں، سالن بنانا ہوتا تو پہلے تمام مصالحے پیستیں اور پھر ہانڈی چڑھاتیں، صبح سے لے کر دوپہر تک سارا وقت صرف کھانا پکانے میں صرف ہو جاتا تھا۔ آج وہ کھانا ایک گھنٹہ میں تیار ہو جاتا ہے، جو کام پہلے پانچ گھنٹے میں ہوتا تھا، وہ اب ایک گھنٹے میں ہونے لگا اور اس کے نتیجے میں چار گھنٹے بچے، یہ چار گھنٹے کہاں گئے؟ لیکن پھر بھی یہ شکایت ہے کہ وقت نہیں ملتا۔ کیوں؟ یہ سب اس لئے کہ آج وقت تو ہے لیکن وقت کی برکت اُٹھ گئی ہے۔

گناہ برکت کو ختم کر دیتے ہیں

اور یہ درحقیقت گناہوں کا خاصہ ہے، یہ گناہ برکت کو ختم کر دیتے ہیں، پیسوں کی برکت بھی، اوقات کی برکت بھی اور کاموں کی برکت بھی اُٹھا دیتے ہیں۔ لہٰذا ان گناہوں کے نتیجے میں نہ پیسوں میں برکت رہی، نہ اوقات میں برکت رہی اور نہ کاموں میں برکت رہی۔ اس لئے حضور اقدس ﷺ دن کے شروع ہی میں یہ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! دن شروع ہونے والا ہے، اب میں کاربار زندگی میں داخل ہونے والا ہوں، اے اللہ! اپنی رحمت سے مجھے برکت عطا فرما دیجئے۔

حضور ﷺ کے وقت میں برکت کی مثال

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اقدس ﷺ نے ۱۰ ذی الحج کی صبح ''مزدلفہ'' میں فجر کی نماز ادا کی، فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب سے کچھ پہلے تک وہاں پر وقوف فرمایا اور دعائیں فرمائیں۔ پھر اُونٹ پر سوار ہو کر ''منیٰ'' تشریف لائے، پھر ''منیٰ'' میں جمرہ عقبیٰ کی رمی فرمائی، اس کے بعد آپ نے سو اُونٹوں کی قربانی فرمائی، جس میں سے تریسٹھ اُونٹ خود اپنے دستِ مبارک سے قربان فرمائے۔

پھر ہر اُونٹ کے گوشت میں سے ایک ایک پارچہ کاٹا گیا، اور پھر ان تمام گوشت کے پارچوں سے شوربہ تیار کیا گیا، تاکہ تمام اُونٹوں کو حضور اقدس ﷺ کی برکت نصیب ہو جائے، اور پھر آپ نے ہر پارچہ میں سے تھوڑا تھوڑا تناول فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے سر کا حلق فرمایا، اس کے بعد مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور وہاں پر طواف زیارت فرمایا، طوافِ زیارت کے بعد واپس ''منیٰ'' تشریف لائے اور ظہر کی نماز ''منیٰ'' میں ادا فرمائی۔

آج اگر ہمیں ایک اُونٹ ذبح کرنا ہو تو ہمیں اس کے لئے پورا دن چاہئے، لیکن

حضورِ اقدس ﷺ نے تریسٹھ اُونٹ ذبح کرنے کے ساتھ اتنے سارے کام انجام دیئے اور حضور ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی یہ سب کام انجام دیے۔ یہ درحقیقت وقت کی برکت تھی، جو شخص جتنا اللہ تعالیٰ سے قریب ہوگا اور جس کو اللہ تعالیٰ عبادات کی توفیق عطا فرمائیں گے اور گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیں گے، اس کے اوقات میں اتنی ہی برکت ہوگی۔ اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے دن کے شروع ہی میں برکت کا سوال کرلیا۔

لفظ ''ہُدَاہُ'' کی تشریح

اس دعا میں آخری لفظ یہ ارشاد فرمایا: ''وَھُدَاہُ'' یعنی اے اللہ! مجھے اس دن میں ہدایت عطا فرما۔ ''ہدایت'' کے لفظی معنی ہیں ''سیدھا اور صحیح راستہ پالینا''، مثلاً ایک شخص کسی منزل کی طرف جارہا ہے، اگر اس کا راستہ صحیح نہیں ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ محنت کرے گا، اس کو تھکن بھی ہوگی، وقت بھی صرف ہوگا، لیکن فائدہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کیونکہ انسان کو اپنی زندگی کے ہر لمحے میں منزل تک پہنچنے کے لئے صحیح راستہ درکار ہے، اگر راستہ غلط ہو تو انسان اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے آپ ﷺ نے دن کے آغاز میں ہی یہ دعا مانگ لی کہ جو کام بھی میں کروں، وہ صحیح راستے سے کروں، غلط راستے پر نہ پڑوں اور ہدایت سے نہ بھٹک جاؤں، بلکہ آپ کی طرف سے ہدایت میرے شاملِ حال رہے۔

دنیا و آخرت کے کاموں میں ہدایت کی ضرورت

اب دنیا کے کاموں کے لئے بھی ہدایت درکار ہے اور آخرت کے کاموں کے لئے بھی ہدایت درکار ہے، مثلاً کوئی شخص روزی کمانے کے لئے گھر سے نکلے تو اس میں بھی ہدایت درکار ہے، تاکہ وہ شخص ایسا راستہ اختیار کرے جو اس کو روزی فراہم کرنے کا صحیح ذریعہ ہو، اگر وہ روزی کمانے کے لئے غلط راستے پر چل پڑے تو محنت بیکار جائے گی اور روزی بھی حاصل نہ ہوگی۔ مثلاً ایک آدمی بے روزگار ہے اور وہ ملازمت کی تلاش میں ہے، اب وہ کبھی ایک جگہ درخواست دے رہا ہے، کبھی دوسری جگہ درخواست دے رہا ہے، کبھی کسی شخص سے فرمائش کررہا ہے کہ مجھے ملازم رکھ لو، کبھی دوسرے سے فرمائش کررہا ہے، چنانچہ اس نے ملازمت کے لئے دس جگہوں پر درخواستیں دیں، لیکن وہ تمام جگہوں پر ناکام ہوگیا اور کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ لہٰذا اس کی محنت بھی اکارت گئی اور وقت بھی برباد ہوا اور مقصد بھی حاصل نہ ہوا۔

ہدایت حاصل ہوجائے تو کام بن جائے

لیکن اگر اللہ تعالیٰ اس کے دل میں وہ جگہ ڈال دے جہاں اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ملازمت مقدر فرمائی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ پہلی ہی مرتبہ درخواست دے گا تو اس کی درخواست قبول ہوجائے گی اور ملازمت پر بلالیا جائے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے پہلے ہی یہ دعا کرلینی چاہئے کہ اے اللہ! آپ نے جس کام میں میرے لئے خیر مقدر فرمائی ہے، اس کا سراغ مجھے پہلی مرتبہ ہی میں مل جائے تاکہ مجھے اِدھر اُدھر بھٹکنا نہ پڑے۔

جب اللہ تعالیٰ دلوں کو جوڑتے ہیں تب ہدایت حاصل ہوتی ہے اور نفع حاصل ہوتا ہے، مثلاً ملازمت تلاش کرنے والے کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ڈالی کہ تم فلاں جگہ درخواست دو اور دوسری طرف ملازم رکھنے والے کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تم اس کو ملازمت پر رکھ لو، نہ اس کی قدرت میں یہ بات تھی کہ وہ اس پر زور ڈالتا کہ مجھے ضرور ملازمت پر رکھ لو اور نہ اس کے قبضے میں یہ بات تھی کہ صحیح ملازم تلاش کرلے۔ یہ دنیا تو اللہ تعالیٰ کا کارخانۂ قدرت ہے کہ ہر ایک کے مفاد کو دوسرے سے وابستہ کر رکھا ہے اور اس کے نتیجے میں انسانوں کو روزی حاصل ہوتی ہے۔

''اتفاق'' کوئی چیز نہیں

ویسے تو انسان کے ساتھ دن رات واقعات پیش آتے رہتے ہیں لیکن بعض اوقات انسان غفلت کی وجہ سے ان واقعات کو اتفاق کا نتیجہ سمجھتا ہے اور دوسروں سے کہتا ہے کہ ''اتفاق سے ایسا ہوگیا'' مثلاً وہ کہتا ہے کہ میں گھر سے باہر نکلا تو اتفاق سے ایک آدمی مل گیا اور اس نے کہا کہ مجھے ایک ملازم کی تلاش ہے، میں نے کہا کہ میں فارغ ہوں، چنانچہ اس نے مجھے ملازم رکھ لیا۔ اس کا نام اس نے ''اتفاق'' رکھ دیا، حالانکہ اس کائنات میں کوئی کام اتفاق سے نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو ایک حکیم مطلق کا کارخانۂ حکمت ہے، اس کی منصوبہ بندی کے تحت سب کچھ انجام پارہا ہے۔ یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ تم گھر سے نکلے اور تمہاری اس آدمی سے ملاقات ہوگئی، بلکہ وہ کسی کا بھیجا ہوا آیا تھا اور تم بھی کسی کے بھیجے ہوئے گئے تھے، دونوں کا آپس میں ملاپ ہوگیا اور بات بن گئی۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت ہے۔

میرا ایک واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی تفسیر اُردو زبان میں لکھی ہے جو ''معارف القرآن'' کے نام سے مشہور ہے، لوگ اس سے فائدہ اُٹھارہے ہیں، ہم اس کا

انگریزی ترجمہ کرنا چاہتے تھے، ایک صاحب نے اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا، اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ ابھی وہ سورہ بقرہ ہی کا ترجمہ کر رہے تھے، جب سورہ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر پر پہنچے:

﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾(۱)

تو ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ بہت اچھا ترجمہ کرنے والے تھے، ان کے انتقال کے بعد میں کافی عرصہ تک تلاش کرتا رہا کہ کوئی اچھا ترجمہ کرنے والا مل جائے لیکن کوئی نہیں مل رہا تھا۔ اس دوران ایک مرتبہ میری حاضری مکہ میں ہوئی، میں نے وہاں جاکر "ملتزم" پر اور دعاؤں کے ساتھ ایک دعا یہ کی کہ یا اللہ! آپ کے کلام پاک کی تفسیر کا ترجمہ کرنے کا کام ہے، کوئی مناسب آدمی نہیں مل رہا ہے، اے اللہ! اپنی رحمت سے اچھا آدمی عطا فرمادے جو اس کام کی تکمیل کردے۔

یہ دعا کر کے واپس جب پہنچا تو میرے دفتر میں مجھے اطلاع ملی کہ ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں، آپ کی غیر موجودگی میں وہ آئے تھے اور آپ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا کہ ان کو بلالیں۔ اگلے دن وہ ملاقات کے لئے آگئے اور آکر انہوں نے بتایا کہ امریکہ میں میرے بیٹے رہتے ہیں، میں بھی وہاں گیا ہوا تھا، جب میں وہاں سے واپس آرہا تھا تو راستے میں عمرہ کرنے کے ارادے سے سعودی عرب چلا گیا، عمرہ ادا کرنے کے بعد میں نے "ملتزم" پر جاکر یہ دعا کی کہ یا اللہ! میری باقی زندگی قرآن شریف کی خدمت میں صرف کرادے۔ میں نے سنا ہے آپ کے والد صاحب کی جو تفسیر ہے "معارف القرآن" آپ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہتے ہیں، اس کام کے لئے میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ ملتزم پر یہ دعا کر کے آرہے ہیں کہ مجھے قرآن کریم کی کوئی خدمت عطا فرمادیجئے اور میں یہ دعا کر کے آرہا ہوں کہ قرآن کریم کی خدمت کرنے والا عطا فرمادیجئے، دونوں کی دعائیں مل گئی ہیں، لہٰذا آپ خود سے یہاں نہیں آئے ہیں بلکہ کسی کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ چنانچہ وہ اللہ کے بندے کسی معاوضے کے بغیر اور کسی دنیاوی لالچ کے بغیر خالص اللہ کے لئے سالہا سال سے یہ کام کر رہے ہیں۔ الحمدللہ پانچ جلدیں اس کی چھپ چکی ہیں (لیکن افسوس کہ چند روز پہلے ان کا بھی انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ اب دیکھنے والے سمجھ رہے ہوں گے کہ وہ اتفاقاً یہاں پہنچ گئے۔ لیکن یاد رکھئے! اس کائنات میں کوئی کام "اتفاق" سے نہیں ہوتا بلکہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظامِ حکمت کے تحت ہوتا ہے۔

البتہ بعض اوقات جب ہمیں کسی کام کا ظاہری سبب آنکھوں سے نظر نہیں آتا تو ہم اپنی حماقت سے کہہ دیتے ہیں کہ اتفاق سے ایسا ہوگیا، حقیقت میں اتفاق کوئی چیز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی حکمت ہوتی ہے۔

(۱) البقرہ: ۱۵٦

دن کے آغاز میں ہدایت مانگ لیں

لہٰذا جب ہم دن کے شروع میں حضورِ اقدس ﷺ کی ہدایت کے مطابق اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے آج کے دن میں ہدایت عطا فرمایئے، دنیا کے کاموں میں بھی اور آخرت کے کاموں میں بھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ یا اللہ! آج کے دن میری کوششیں بیکار نہ جائیں، بلکہ میں آج کے دن وہی کام کروں جس میں آپ نے میرے لئے خیر مقدر فرمائی ہے۔ لہٰذا جب انسان کی زندگی میں کشمکش کے مواقع آتے ہیں کہ یہ کام کروں یا یہ کروں، یہاں جاؤں یا وہاں جاؤں تو ان سب مواقع میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت درکار ہے، اس لئے یہ دعا کرنی چاہئے کہ اے اللہ! مجھے ایسا راستہ اختیار کرنے کی توفیق دیجئے جو آپ کے نزدیک میرے لئے دنیا و آخرت کے اعتبار سے بہتر ہے۔

یہ بڑی جامع دعا ہے

بہرحال! حضورِ اقدس ﷺ کی اس دعا کو دیکھ لیجئے کہ کسی بھی انسان کی دنیا کی، آخرت کی، معاش کی، معاد کی کوئی حاجت ایسی ہے جو اس دعا میں آپ ﷺ نے طلب نہ فرمائی ہو؟ یہ بڑی جامع دعا ہے۔ اگر کسی کو عربی میں دعا یاد نہ ہو تو اُردو میں مانگ لے کہ اے اللہ! میں اس دن کی خیر مانگتا ہوں اور اس دن کی فتح مانگتا ہوں تاکہ کوئی رکاوٹ نہ آئے، اگر کوئی رکاوٹ آئے تو وہ کھل جائے، اور اس دن میں آپ کی مدد مانگتا ہوں، اور اس دن کا نور مانگتا ہوں اور اس دن کی برکت مانگتا ہوں اور اس دن کی ہدایت مانگتا ہوں۔ اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ حضورِ اقدس ﷺ کی سکھائی ہوئی اگر ایک دعا بھی قبول ہو جائے تو انسان کی دِلدّر دور ہو جائیں، اور اس کا بیڑہ پار ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

❖❖❖

صبح کے وقت کی ایک اور دعا☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ط أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گزشتہ دو جمعوں سے ایک دعا کی تشریح کا بیان چل رہا ہے جو دعا نبی کریم ﷺ صبح کے وقت مانگا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضورِ اقدس ﷺ صبح کے وقت ایک اور دعا یہ مانگا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ أَوَّلَ هٰذَا النَّهَارِ صَلَاحًا وَّأَوْسَطَهُ فَلَاحًا وَّآخِرَهُ نَجَاحًا))(۲)

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۲۳۹ تا ۲۴۶)

(۱) البقرة: ۱۸۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں"

(۲) مصنف ابن أبي شيبة، باب الدعاء بلا نية ولا عمل (۷/۴۰)، عمل اليوم والليلة، رقم: ۳۸ (۱/۶۹)، الزهد لابن المبارك، رقم: ۱۰۸۵ (۱/۳۸۴)، الدعاء للطبراني، رقم: ۲۶۸ (۱/۳۰۳) پوری دعا کچھ یوں ہے: "أصبحت وأصبح الملك والكبرياء والعظمة والخلق والليل والنهار وما سكن فيهما لله وحده لا شريك له، اَللّٰهم اجعل أول هذا النهار صلاحا، وأوسطه فلاحا وآخره نجاحا، أسألك خير الدنيا والآخرة يا أرحم الراحمين" دعا کا ترجمہ یہ ہے: "میں نے اور اس کائنات نے، کبریائی نے، عظمت نے، مخلوق نے، دن اور رات نے اور ان کے درمیان موجود ہر چیز نے اللہ کے حکم سے صبح کی جو اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں، اے اللہ! اس دن کے شروع کے حصے کو درستگی، درمیانی حصے کو کامیابی اور آخری حصے کو سرخروئی کا سبب بنا دے اے ارحم الراحمین! میں تجھ سے دنیا اور آخرت کی خیروں کا سوال کرتا ہوں"

اے اللہ! اس دن کے ابتدائی حصے کو میرے لئے نیکی کا ذریعہ بنادیجئے یعنی جب یہ دن شروع ہو تو میرے کسی نیک عمل سے شروع ہو اور دن کے اول حصے میں نیکی کروں۔ اور اے اللہ! دن کے درمیانی حصے کو میرے لئے فلاح بنادیجئے۔ اور اے اللہ! دن کے آخری حصے کو میرے لئے کامیابی بنادیجئے۔

دن کا آغاز اچھے کام سے کرو

اس دعا کے اندر آپ نے دن کو تین حصوں میں تقسیم فرمادیا، یعنی اے اللہ! دن کے ابتدائی حصے میں مجھے صالح اور نیک عمل کرنے کی توفیق ہو۔ اس کے ذریعہ آپ نے اُمت کو یہ تعلیم دے دی کہ اگر تم دن کو اچھا گزارنا چاہتے ہو اور بہتر نتائج حاصل کرنا چاہتے ہو تو دن کے اوّل حصے کو نیک کاموں میں لگاؤ، اور آپ اس کی دعا بھی کر رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے اس کی توفیق دیجئے کہ میں دن کے اوّل حصے کو نیک کام میں لگاؤں، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کی سنت یہ ہے کہ جو بندہ دن کے اوّل حصے کو نیک کاموں میں لگائے گا تو آپ اس کا دن اچھا گزروائیں گے۔

صبح اُٹھ کر یہ کام کرو

اسی وجہ سے بستر سے اُٹھنے کے بعد پہلا فریضہ اللہ تعالیٰ نے یہ عائد فرمایا ہے کہ نمازِ فجر کے لئے آجاؤ۔ یہ تو فرض ہے، اس کے بعد فرمایا کہ جب سورج طلوع ہو کر تھوڑا سا بلند ہوجائے تو اس وقت اشراق کی دو رکعت ادا کرلو، یہ فرض نہیں، واجب نہیں، سنت مؤکدہ بھی نہیں بلکہ نفلی نماز ہے، لیکن اس نفلی نماز کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے فرماتے ہیں:

((يَا ابْنَ آدَمَ! اِرْكَعْ لِيْ رَكْعَتَيْنِ فِي أَوَّلِ النَّهَارِ أَكْفِكَ آخِرَهُ))(1)

''اے ابن آدم! تو اوّل دن میں میرے لئے دو رکعتیں پڑھ لیا کر تو میں تیرے لئے دن کے آخر تک حامی اور مددگار رہوں گا''

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب الصلاة، باب صلاة الضحى، رقم: ١٠٩٧، مسند أحمد، رقم: ٢١٤٣٤، سنن الدارمي، كتاب الصلاة، باب في أربع ركعات في أول النهار، رقم: ١٤١٥، جامع الأصول من احاديث الرسول، رقم: ٧١١٧ (٧١١٧/٩)، غاية المقصد في زوائد المسند (١٢٨١/١) کتب احادیث میں ہمیں اس حدیث کے یہ الفاظ ملتے ہیں: ''يا ابن آدم لا تعجزني من أربع ركعات في أول النهار وأكفك آخره'' دو رکعات والی حدیث ہمیں نہیں مل سکی۔

اس لئے حضور اقدس ﷺ یہ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! میرے دن کے آغاز کو نیک عمل کا حصہ بنا دیجئے کہ مجھے اس میں نیک عمل کی توفیق ہو جائے تاکہ سارا دن اللہ تعالیٰ کی حمایت اور نصرت میرے ساتھ رہے۔

دن کا آغاز رجوع الی اللہ سے

اس دعا کے ذریعہ اپنی اُمت کو یہ ترغیب دے دی کہ دن کے اوّل حصے کو رجوع الی اللہ میں صرف کرو، فجر کی نماز تو پڑھنی ہی ہے لیکن اس کے بعد کچھ اشراق کی نوافل پڑھ لو، کچھ قرآن کریم کی تلاوت کرلو اور کچھ ذکر کرلو، تسبیحات پڑھ لو، دعائیں کرلو۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کا ذکر جس وقت بھی کیا جائے فضیلت کی چیز ہے لیکن صبح کے وقت کے ذکر میں اللہ تعالیٰ نے بڑی خصوصیت رکھی ہے۔

صبح کے وقت نئی زندگی کا ملنا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے صبح کے وقت کو ایسا بنایا ہے کہ اس وقت کائنات کی ہر چیز میں نئی زندگی آتی ہے، سوئے ہوئے لوگ بیدار ہوتے ہیں، کلیاں چٹکتی ہیں، غنچے کھلتے ہیں، پھول کھلتے ہیں، پرندے جاگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ وقت نئی زندگی عطا کرنے والا ہے، اگر اس نئی زندگی کے وقت کو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں گزارو گے تو تمہارے قلب کے اندر رجوع الی اللہ کا نور پیدا ہوگا، اتنا نور دوسرے اوقات میں ذکر کرنے سے حاصل نہیں ہوگا۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ اگر فجر کے وقت مسلمانوں کی کسی بستی سے گزر جاؤ تو ہر گھر سے تلاوتِ قرآنِ کریم کی آواز آیا کرتی تھی، چاہے وہ کسی عالم کا گھر ہو یا جاہل کا ہو، پڑھے لکھے کا گھر ہو یا اَن پڑھ کا ہو۔ مجھے بچپن کا وہ دور یاد ہے کہ جب سارے گھروں سے صبح کے وقت تلاوت کی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور اس کے نتیجے میں معاشرے کے اندر ایک نورانیت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اب افسوس یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی بستیوں سے گزرو تو تلاوت کی آواز آنے کے بجائے فلمی گانوں کی آوازیں آتی ہیں۔

صبح کے وقت ہمارا حال

ایک شاعر گزرے ہیں ''مجید لاہوری مرحوم''، یہ روزنامہ جنگ میں مزاحیہ نظمیں لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کی تصویر کھینچتے ہوئے کہا تھا کہ۔

پہلے کے لوگ سویرے اُٹھتے تھے
اور اُٹھ کر قرآن پڑھتے تھے
یہ سو کر نو بجے اُٹھتے ہیں
اور اُٹھ کر ڈان پڑھتے ہیں

جب دن کا پہلا حصہ ہی ایسے کام میں لگا دیا جو گناہ کا کام ہے یا بیکار کام ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو گئے تو پھر سارے دن کے کاموں میں نور کہاں سے آئے گا؟ بہرحال! اللہ تعالیٰ نے صبح کے وقت میں بڑی برکت رکھی ہے اور بڑا نور رکھا ہے۔ اگر انسان اس وقت کو اللہ کے ذکر میں اور تلاوت میں اور تسبیحات میں صرف کرلے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کا نور حاصل ہوگا۔

صبح کے وقت میں برکت

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بَارَكَ اللّٰهُ لِأُمَّتِيْ فِيْ بُكُوْرِهَا))(۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے لئے صبح سویرے کے وقت میں برکت رکھی ہے۔ اور یہ بات آپ نے صرف ذکر اور عبادت کی حد تک بیان نہیں فرمائی بلکہ ایک شخص جو تاجر تھے، ان سے آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ تم صبح سویرے اپنی تجارت کے کام انجام دیا کرو۔ وہ صحابی فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ کا یہ ارشاد سننے کے بعد میں نے اس پر عمل کیا اور صبح ہی اوّل وقت میں تجارت کا عمل شروع کردیا کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی برکت سے اتنا مال عطا فرمایا کہ لوگ مجھ پر رشک کرنے لگے۔

کاروبار مندہ کیوں نہ ہو؟

اب ہمارے یہاں ساری قدریں اُلٹ گئیں، دن کے گیارہ بجے تک بازار بند رہتا ہے، گیارہ بجے کے بعد کاروبار شروع ہوتا ہے، گیارہ بجے کا مطلب ہے دوپہر، دن کا ایک پہر تو بیکار نیند اور

---

(۱) التاريخ الكبير، رقم: ۲٤۳۲ (۲۸۹/٦)۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ نے اپنی اُمت کے لئے برکت کی دعا بھی مانگی: "اللّٰهم بارك لأمتي في بكورها" سنن الترمذي، كتاب البيوع، باب ما جاء في التبكير بالتجارة، رقم: ۱۱۳۳، سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في الابتكار في السفر، رقم: ۲۲۳۹، سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب ما يرجى من البركة في البكور، رقم: ۲۲۲۷، مسند أحمد، رقم: ۱۲۵۱

غفلت کی حالت میں اور گناہوں میں گزر گیا، اس طرح آدھا دن تو گنوا دیا۔ پھر ہر شخص کی زبان پر یہ رونا ہے کہ کاروبار مندہ ہے، چلتا نہیں ہے، لیکن کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ جس ذات کے قبضۂ قدرت میں کاروبار کی ترقی اور زوال ہے، اس کے ساتھ کیسا تعلق قائم کیا ہوا ہے، حالانکہ کاروبار میں ترقی کا طریقہ یہ ہے کہ جس کے قبضۂ قدرت میں سارے معاملات ہیں، اس کے ساتھ تعلقات قائم کرو، اس کی بات مانو اور اس کی دی ہوئی برکت سے فائدہ اُٹھاؤ۔ اس ذات کے ساتھ تو تعلق خراب کر رکھا ہے اور پھر یہ رونا رو رہے ہو کہ کاربار مندہ ہے۔

یہ کامیابی کا زینہ ہے

اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! میرے دن کے اوّل حصے کو ''صلاح'' بنا دیجئے یعنی نیکی والے اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کلمات کے ذریعہ دعا بھی فرمادی اور اُمت کو سبق اور پیغام بھی دے دیا کہ اے میری اُمت! تم اگر کامیابی چاہتے ہو تو دن کے اوّل حصے کو ''صلاح'' بناؤ۔

دن کے درمیانی اور آخری حصے کے لئے دعائیں

آگے فرمایا کہ اے اللہ! اس دن کے بیچ کے حصے کو ''فلاح'' بنا دیجئے یعنی میں اس دن میں وہ کام کروں جو میرے فلاح کے ہیں۔ اور اے اللہ! اس دن کے آخری حصے کو میرے لئے ''نجاح'' یعنی کامیابی بنا دیجئے۔ یعنی جب میں دن کی جدوجہد کے بعد شام کے وقت گھر میں داخل ہوں تو میں پوری طرح کامیاب ہو کر جاؤں اور مطمئن ہو کر جاؤں کہ آج کا دن میں نے صحیح مصرف پر لگایا ہے اور اس کا صحیح نتیجہ مجھے حاصل ہوا ہے۔ اگر یہ دعا قبول ہو جائے تو سب کچھ حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ دعائیں کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے اور یہ دعائیں قبول بھی فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

گھر سے نکلنے کی دعا
اور
بازار میں داخل ہونے کی دعا☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ط أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ O﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گزشتہ چند جمعوں سے حضورِ اقدس ﷺ کی مسنون دعاؤں کی تشریح کا بیان چل رہا ہے، جب صبح کے وقت انسان اپنی ابتدائی ضروریات پوری کر کے گھر سے نکلتا ہے، تو گھر سے باہر قدم نکالتے وقت یہ دعا پڑھے:

((بِسْمِ اللّٰهِ وَاعْتَصَمْتُ بِاللّٰهِ وَتَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ))(۲)

اس دعا میں دو کلمات تو ایسے ہیں جو ہر مسلمان کو یاد ہوتے ہیں، ایک پہلا کلمہ "بِسْمِ اللّٰهِ" اور آخری کلمہ "وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" درمیان میں دو کلمے اور ہیں، ایک کلمہ ہے "وَاعْتَصَمْتُ بِاللّٰهِ" اور دوسرا ہے "وَتَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ" یہ دونوں بھی چھوٹے چھوٹے کلمے ہیں، ان کا یاد کرنا بھی کچھ مشکل نہیں۔

(۱) البقرة: ۱۸٦، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں"

(۲) سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما جاء ما يقول إذا خرج من بيته، رقم: ۳۳٤۸، سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب ما يقول إذا خرج من بيته، رقم: ٤٤۳۱، مسند أحمد، رقم: ٤٤۱، دعا کا ترجمہ یہ ہے: اللہ کے نام سے، میں اللہ پر اعتماد اور اسی پر بھروسہ کرتا ہوں، نیکی کرنے کی قوت اور گناہ سے بچنے کی طاقت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، وہ بلند اور عظمت والا ہے"

اللہ کا سہارا لے لو

اس دعا کے معنی یہ ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کے نام پر اس گھر سے قدم نکال رہا ہوں اور میں اللہ تعالیٰ کا سہارا لیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہوں۔ جب انسان گھر سے نکلتا ہے تو کسی نہ کسی مقصد سے نکلتا ہے، کسی کا مقصد دوسرے سے ملنا ہوتا ہے، کسی کا مقصد بازار سے خریداری ہوتا ہے، کسی کا مقصد بیچنا ہوتا ہے، کوئی ملازمت کی غرض سے، کوئی تجارت کی غرض سے، کوئی زراعت کی غرض سے نکلتا ہے، لیکن اس مقصد میں کامیابی ہوگی یا نہیں ہوگی، اس کا کسی کو پتہ نہیں، اس لئے نبی کریم ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ جب تم کسی کام کے لئے نکلے ہو تو اللہ کا سہارا لے لو اور یہ کہہ دو کہ جو میں دوسرے سہارے اپنے کام کے لئے اختیار کروں گا، وہ تو ظاہری اسباب ہیں، لیکن حقیقی سہارا تو اے اللہ! آپ ہی کا ہے۔

اللہ کے سہارے پر بھروسہ کر لو

مثلاً کسی جگہ جانے کے لئے وہ ظاہری سہارا یہ اختیار کرے گا کہ کسی سواری میں سوار ہو جائے گا تاکہ وہ سواری اس کو منزل تک پہنچا دے، لیکن کیا معلوم کہ سواری ملے یا نہ ملے، اگر وہ سواری مل جائے تو معلوم نہیں کہ کتنی دور وہ سواری ساتھ چلے اور وہ صحیح منزل پر پہنچا سکے یا نہ پہنچا سکے، راستہ میں کوئی ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے یا اور کوئی رکاوٹ کھڑی نہ ہو جائے۔ یہ سارے احتمالات موجود ہیں۔ اس لئے گھر سے نکلتے وقت انسان یہ کہہ دے کہ میں ظاہری سہارے اختیار تو کروں گا، لیکن کسی سہارے پر بھروسہ نہیں، بھروسہ تو صرف آپ کے سہارے پر ہے۔

اب یہ سفر عبادت بن گیا

اب جو بندہ گھر سے نکلتے وقت اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دے اور یہ کہہ دے کہ اے اللہ میں آپ ہی کا سہارا پکڑ رہا ہوں اور آپ ہی پر بھروسہ کر رہا ہوں، ان ظاہری اسباب پر، اس سواری پر اور ان آلات پر بھروسہ نہیں، میرا بھروسہ تو اے اللہ! آپ پر ہے، تو جو بندہ اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر رہا ہے، کیا اللہ تعالیٰ اس کی مدد نہیں فرمائیں گے؟ اور جب ان کا سہارا پکڑ لیا تو اب یہ سارا سفر عبادت بن گیا۔

ساری طاقتیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں

آگے فرمایا:

((وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ))

یعنی کسی کے اندر کوئی طاقت اور قوت نہیں ہے مگر وہ اللہ کی دی ہوئی ہے۔ یعنی میں جو چل رہا ہوں، یہ چلنے کی طاقت بھی اللہ کی دی ہوئی ہے، اگر میں کسی سواری پر سوار ہوں گا اور وہ سواری چلے گی تو وہ سواری بھی اللہ کی دی ہوئی قوت سے چلے گی، اور اگر اس کے ذریعہ کسی منزل پر پہنچوں گا تو یہ پہنچنا بھی اللہ تعالیٰ کی عطاء ہوگی، کیونکہ اللہ کے سوا کسی کے اندر کوئی طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا گھر سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھنا حضورِ اقدس ﷺ نے مسنون قرار دیا تا کہ تمہارا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جائے اور تمہارا گھر سے نکلنا بھی عبادت بن جائے۔

اس کے بعد اگر کسی سواری پر سوار ہوں تو اس موقع کی دعا پیچھے بیان میں عرض کر دی تھی، وہ دعائیں سوار ہوتے وقت پڑھ لیں۔

بازار ناپسندیدہ جگہیں ہیں

اس کے بعد آپ کسی ضرورت کی چیز خریدنے کے لئے یا اپنی دکان کھولنے کے لئے بازار کی طرف چلے، تو بازار کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

((إِنَّ أَحَبَّ الْبِلَادِ إِلَى اللّٰهِ الْمَسَاجِدُ وَأَبْغَضُ الْبِلَادِ إِلَى اللّٰهِ الْأَسْوَاقُ))(۱)

یعنی اس روئے زمین پر جتنی جگہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ جگہ مسجدیں ہیں جہاں اس کے بندے اس کے سامنے آکر سربسجود ہوتے ہیں اور اپنی بندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور سب سے ناپسندیدہ اور مبغوض جگہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بازار ہیں، اس لئے کہ بازار میں گناہ، معصیت اور فسق و فجور کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

بازار کے اندر ہونیوالی برائیاں

بازاروں میں تاجر لوگ گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، مثلاً تاجر لوگ گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے فحش تصاویر لگاتے ہیں، جس کے نتیجے میں لوگوں کے سفلی جذبات برانگیختہ کر کے ان کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں، عورت کو ایک بکاؤ مال قرار دے کر اس کے ایک ایک عضو کو برسرِ بازار رسوا کیا جا رہا ہے تا کہ لوگ آکر ہماری دکان سے مال خریدیں۔ اس کے علاوہ جھوٹ اور دھوکے کا بازار گرم ہے، حقیقت میں جو صفت موجود نہیں ہے، اس کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب فضل الجلوس فی مصلاه بعد الصبح وفضل المساجد، رقم: ۱۰۷۶

لہٰذا دھوکہ، فریب، جھوٹ، فحاشی اور عریانی اور ان کے علاوہ بے شمار برائیاں بازاروں میں پائی جاتی ہیں، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ جگہ بازار ہیں۔

ایسے تاجر فجار بنا کر قیامت کے دن اُٹھائے جائیں گے

اگر صحیح معنی میں وہ مسلمانوں کا بازار ہو اور سارے تاجر اور خریدار اسلام کے احکام کی پابندی کریں تو پھر وہ بازار بھی عبادت گاہ بن جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ''رہبانیت'' کی تعلیم نہیں دی کہ دنیا کو چھوڑ کر جنگل میں بیٹھ جاؤ، بلکہ ہمیں اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے اسلامی احکام کی پابندی کی تلقین فرمائی۔ تاجروں کے بارے میں ایک طرف تو حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ التُّجَّارَ يُبْعَثُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا إِلَّا مَنِ اتَّقَى اللّٰهَ وَبَرَّ وَصَدَقَ))(۱)

یعنی تاجر لوگ آخرت میں فاجر بنا کر اُٹھائے جائیں گے، ''فاجر'' کے معنی ہیں ''گناہ گار'' سوائے ان کے جو متقی ہوں اور نیک کام کریں اور سچائی سے کام لیں۔

امانت دار تاجروں کا حشر انبیاء کے ساتھ ہوگا

دوسری طرف ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ))(۲)

یعنی اگر کوئی تاجر سچا اور امانت دار ہے تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کا حشر انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کے ساتھ فرمائیں گے۔ چونکہ بازار میں انسان اس لئے بیٹھتا ہے کہ لوگوں سے پیسے کھینچے، اس لئے اس موقع پر اکثر ناجائز امور کا ارتکاب ہو جاتا ہے، جھوٹ بول کر اور جھوٹی قسم کھا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ بازار بدترین جگہیں ہیں۔

بلاضرورت بازار مت جاؤ

چونکہ یہ بازار بدترین جگہیں ہیں، اس لئے بلاضرورت وہاں مت جاؤ، ضرورت ہو تو بیشک

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله، باب ماجاء فی التجار وتسمية النبی ایاهم، رقم: ۱۱۳۱، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، رقم: ۲۱۳۷، سنن الدارمی، کتاب البیوع، رقم: ۲٤۲٦

(۲) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول الله، باب ماجاء فی التجار وتسمية النبی ایاهم، رقم: ۱۱۳۰، سنن الدارمی، کتاب البیوع، باب فی التاجر الصدوق، رقم: ۲٤۲۷

جاؤ لیکن ویسے ہی گھومنے کے لئے بازار جانا ٹھیک نہیں۔ اس لئے کہ وہاں فسق و فجور کے ہرکارے پھر رہے ہیں، گناہوں کے داعیے انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں، کچھ پتہ نہیں کہ وہاں پر کس گناہ کے جال میں پھنس جاؤ، اس لئے بلاضرورت مت جاؤ۔

بازار جاتے وقت یہ دعا پڑھ لیں

ہاں! جب ضرورت کی وجہ سے بازار گئے تو اس موقع کے لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضورِ اقدس ﷺ بازار تشریف لے جاتے تو یہ ذکر فرماتے:

((لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ))(۱)

یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا معبود ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، بادشاہت اسی کی ہے اور تمام تعریفیں اسی کی ہیں، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

بازار پہنچ کر اللہ تعالیٰ کو مت بھولو

یہ کلمات بازار پہنچتے وقت حضورِ اقدس ﷺ نے ادا فرمائے۔ کیوں ادا فرمائے؟ اسلئے ادا فرمائے تاکہ بندے کو یہ احساس ہو جائے کہ میں ایک ایسے خالق اور مالک کا بندہ ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اسی کے حکم اور اسی کی مشیت سے ہو رہا ہے۔ اور بازار میں پہنچنے کے بعد عام طور پر انسان کو اس احساس سے غفلت ہو جاتی ہے، اسلئے کہ بازار میں دنیا کی چمک دمک انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے جس سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس چمک دمک کو دیکھ کر کہیں یہ انسان اپنے خالق و مالک کو نہ بھلا بیٹھے، اسلئے اس دعا کے ذریعہ بتادیا کہ دنیا کی یہ چمک دمک اپنی جگہ لیکن تم اللہ تعالیٰ کے بندے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کی اس چمک دمک سے مرعوب ہو کر اور اس سے دھوکہ کھا کر اپنے مالک کے حکم کے خلاف کوئی کام کر بیٹھو، لہٰذا دنیا کو برتو لیکن دنیا کے پیدا کرنے والے کو مت بھولو۔

دنیا کی حقیقت یہ ہے

یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے عجیب چیز بنائی ہے، اس دنیا کے بغیر گزارہ بھی نہیں، اگر آدمی کے پاس

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ما یقول إذا دخل السوق، رقم: ۳۳۵۰، سنن ابن ماجه، کتاب التجارات، باب الأسواق ودخولها، رقم: ۲۲۲۶، سنن الدارمی، کتاب الاستئذان، باب ما یقول إذا دخل السوق، رقم: ۲۵۷۶

پیسے نہ ہوں، کھانے کو کوئی چیز میسر نہ ہو، پہننے کو کپڑا نہ ہو، رہنے کو مکان نہ ہو تو وہ کیسے زندہ رہے گا؟ لیکن اگر یہی دنیا انسان کے دل و دماغ پر چھا جائے اور اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے تو اس سے زیادہ مہلک کوئی چیز نہیں اور اس سے زیادہ تباہ کن کوئی چیز نہیں۔ اس لئے ایک مؤمن کو اس دنیا میں بہت پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتے ہوئے رہنا پڑتا ہے، اس کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ میں اس دنیا کو برتوں ضرور لیکن یہ دنیا میرے دل کے اندر داخل نہ ہو جائے، اس کی محبت میرے اُوپر غالب نہ آ جائے، یہ دنیا مجھے اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے کا ذریعہ نہ بنے، ایک مؤمن کو یہ احتیاط کرنی پڑتی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دنیا

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی شان سے فرمائی تھی کہ دنیا ان کے قدموں میں ڈھیر ہوئی، قیصر و کسریٰ کے خزانے ان کے اُوپر نچھاور کیے گئے اور روم اور ایران کی عالیشان تہذیبیں انہوں نے فتح کیں اور ان تہذیبوں کے بازاروں میں بھی پہنچے اور ان تہذیبوں کی چمک دمک کو بھی دیکھا، لیکن وہ چمک دمک اور ان بازاروں کی رونق ان کو دھوکہ نہ دے سکی۔

ایک سبق آموز واقعہ

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا واقعہ کتابوں میں آتا ہے کہ انہوں نے روم کے ایک شہر کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور رومی لوگ قلعہ میں بند ہو کر لڑ رہے تھے، جب محاصرہ لمبا ہو گیا تو شہر والوں نے ایک چال چلی اور یہ فیصلہ کیا کہ ان مسلمانوں کے لئے شہر کا دروازہ کھول دیا جائے اور ان کو اندر داخل ہونے دیا جائے، اور چال یہ چلی کہ وہ دروازہ کھولا جو شہر کے بارونق بازار سے گزرتا تھا جس کے دونوں طرف عالیشان دکانیں تھیں اور ہر دکان پر زیب و زینت کے ساتھ ایک عورت کو بٹھا دیا۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ یہ عرب کے صحراء نشین لوگ ہیں اور مدتوں سے اپنے گھروں سے دور ہیں، فاقہ مست لوگ ہیں، جب یہ اچانک بازار میں داخل ہوں گے اور وہاں کی زرق برق دکانیں دیکھیں گے اور ان دکانوں میں حسین و جمیل عورتوں کو بیٹھا ہوا دیکھیں گے تو اس کے نتیجے میں یہ ان دکانوں کی طرف اور ان عورتوں کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور ہم پیچھے سے ان پر حملہ کر کے ان پر فتح پا لیں گے، دوسری طرف عورتوں کو بھی یہ تاکید کر دی گئی تھی کہ اگر کوئی تم سے تعرض کرے تو انکار مت کرنا۔

چنانچہ شہر کے امیر نے اچانک حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے نام پیغام بھیجا کہ ہم اپنے شہر کا دروازہ کھول رہے ہیں، آپ اپنے لشکر کو لے کر اندر آ جائیں۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے جب یہ پیغام سنا تو اپنے لشکر سے کہا کہ تمہارے لئے دروازہ کھول دیا گیا ہے، تم اس کے اندر داخل

ہو جاؤ، لیکن میں تمہارے سامنے قرآن کریم کی ایک آیت پڑھتا ہوں، اس آیت کو اپنے ذہن میں رکھنا اور اس آیت پر عمل کرتے ہوئے داخل ہونا، وہ آیت یہ ہے:

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ﴾(۱)

یعنی آپ مؤمنوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا لشکر شہر میں داخل ہوا اور پورے بازار سے گزر گیا لیکن کسی ایک شخص نے دائیں بائیں نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ وہاں کیا ہے، یہاں تک کہ محل پر قبضہ کر لیا۔

جب اہل شہر نے یہ منظر دیکھا کہ یہ ایسی قوم ہے جو فاتح بن کر شہر میں داخل ہوئی ہے اور راستے کے دونوں طرف جو زرق برق دکانیں تھیں اور جو حسین و جمیل عورتیں تھیں ان کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور سیدھے محل پر پہنچ گئے ہیں تو ان کو دیکھ کر یہ یقین ہو گیا کہ ضرور اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہیں، اور صرف یہ منظر دیکھ کر شہر کے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے اور کلمہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھ لیا۔

دنیا میں رہ کر اللہ تعالیٰ کو نہ بھولو

اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت اس طرح فرمائی تھی کہ ؏

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی

چاہے کتنے بڑے سے بڑے جہاں دار آجائیں یا دنیا کی رونقیں آجائیں، لیکن ان کا دل ہر وقت اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ لگا ہوا تھا اور آخرت کے ساتھ لگا ہوا تھا، اس لئے دنیا ان کو دھوکہ نہیں دے سکتی تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر مسلمان سے یہ چاہتے ہیں کہ تم بیشک دنیا میں رہو، بازار میں جاؤ، دنیا کو برتو، لیکن اللہ تعالیٰ کو نہ بھولو۔ اکبر الہ آبادی نے خوب کہا ہے کہ

تم شوق سے کالج میں پھلو، پارک میں پھولو
تم چاہے غبارے میں اُڑو، چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

کہیں بھی چلے جاؤ لیکن اللہ تعالیٰ کو اور اپنی حقیقت کو فراموش نہ کرو، اسلئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بازار جاتے ہوئے ہر مسلمان کو یہ دعا پڑھنے کی تلقین فرمائی، جو بندہ بازار جاتے ہوئے یہ کلمات

(۱) النور: ۳۰

پڑھ لے گا تو انشاء اللہ بازار کی رنگینیاں اور بازار کی رونقیں اس کو اللہ تعالیٰ سے غافل نہیں کر پائیں گی۔

خرید وفروخت کے وقت کی دعا

پھر جب بازار میں پہنچ گئے اور وہاں کچھ خریداری کرنی ہے یا سامان فروخت کرنا ہے تو اس موقع پر حضور اقدس ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ صَفْقَةٍ خَاسِرَةٍ وَيَمِيْنٍ فَاجِرَةٍ))(۱)

''اے اللہ! میں کسی گھاٹے کے سودے سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں اور جھوٹی قسم سے پناہ مانگتا ہوں''

جب انسان سودا کرتا ہے تو بعض اوقات فائدہ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات نقصان ہو جاتا ہے اور بعض اوقات جھوٹی قسم کھانی پڑ جاتی ہے۔ اس لئے دعا کرلی کہ اے اللہ! میں آپ سے گھاٹے کے سودے سے پناہ مانگتا ہوں اور جھوٹی قسم سے پناہ مانگتا ہوں، تاکہ گھاٹے کا سودا بھی نہ ہو اور کہیں جھوٹی قسم کھانے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے۔

ایسا بندہ ناکام نہیں ہوگا

اب جو بندہ گھر سے نکلتے وقت اللہ کا نام لے رہا ہے اور اللہ کا سہارا لے کر اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرکے نکل رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قوت کا اعتراف کرکے نکل رہا ہے اور پھر جب بازار میں آ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کر رہا ہے اور اپنی حاجت اللہ تعالیٰ سے مانگ رہا ہے تو ایسے بندے کو اللہ تعالیٰ کبھی خائب اور ناکام و نامراد نہیں فرمائیں گے۔ بہرحال! یہ وہ دعائیں تھیں جو بازار سے متعلق حضور اقدس نے تلقین فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائیں اور ان کی حقیقت سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) کنز العمال، رقم: ١٨٥٤٦ (٢٨٤/٧)، مستدرك الحاكم (٥٣٩/١)، مجمع الزوائد، باب ما يقول إذا دخل السوق (٧٤/٢)، المعجم الكبير للطبراني، رقم: ١١٤٢ (٤٩٧/١)۔ پوری دعا کچھ یوں ہے: "اللّٰهم إني أسألك من خير هذا السوق وخير ما فيها وأعوذ بك من شرها وشر ما فيها اللّٰهم إني أعوذ بك أن أصيب فيها يمينا فاجرة أو صفقة خاسرة" دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اے اللہ! میں تجھ سے اس بازار اور اس میں موجود چیزوں کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور اس بازار اور اس میں موجود چیزوں سے پناہ مانگتا ہوں، اے اللہ میں گھاٹے کے سودے اور جھوٹی قسم سے بھی پناہ مانگتا ہوں''

گھر میں داخل ہونے کی دعا ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَإِنِّىْ قَرِيْبٌ ط أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۝﴾(۱)

گزشتہ چند جمعوں سے مسنون دعاؤں کی تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے، آخر میں صبح کے وقت جو دعائیں حضورِ اقدس ﷺ مانگا کرتے تھے، ان کی تھوڑی سی تشریح عرض کی تھی۔ فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہو تو اس موقع کے لئے جو دعا حضورِ اقدس ﷺ سے منقول ہے وہ یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّىْ أَسْئَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلَجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللّٰهِ خَرَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا))(۲)

داخلے کی بھلائی مانگتا ہوں

یہ مختصر سی دعا ہے لیکن اس دعا میں معنی کی ایک کائنات پوشیدہ ہے، اس دعا میں کیا کیا چیزیں حضورِ اقدس ﷺ نے مانگ لیں۔ اس دعا کے پہلے جملے کا ترجمہ یہ ہے کہ اے اللہ! میں آپ سے اپنے داخلے کی بھلائی مانگتا ہوں، یعنی داخلے کے بعد مجھے اچھے حالات سے سابقہ پیش آئے، کیونکہ میں کچھ دیر تک گھر سے باہر رہا، مجھے نہیں معلوم کہ میرے پیچھے گھر میں کیا واقعات پیش آئے، اے اللہ!

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۲۴۸ تا ۲۶۰)

(۱) البقرة: ۱۸۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں"

(۲) سنن أبى داود، كتاب الأدب، باب ما يقول الرجل إذا دخل بيته، رقم: ۴۴۳۲

اب جب کہ میں گھر میں داخل ہو رہا ہوں تو وہاں پر میں اطمینان کا، مسرت کا اور بھلائی کا منظر دیکھوں اور عافیت کا منظر دیکھوں۔

میرا داخلہ اچھا ہو جائے

کتنی مرتبہ انسان کے ساتھ یہ واقعات پیش آتے ہیں کہ اچھی حالت میں گھر سے نکلا اور کچھ دیر گھر سے باہر رہا، لیکن جب دوبارہ گھر میں داخل ہوا تو منظر بڑا تشویش ناک نظر آیا، مثلاً کسی کو بیمار دیکھا یا کسی کو کسی حادثے کا شکار دیکھا یا کسی کو کوئی پریشانی پیش آگئی، اس لئے حضورِ اقدس ﷺ نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے یہ دعا مانگنے کی تلقین فرمائی کہ اے اللہ! میں آپ سے گھر میں داخل ہونے کی بھلائی چاہتا ہوں تاکہ داخل ہونے کے بعد مجھے عافیت کا منظر نظر آئے، گھر والے عافیت سے ہوں، کوئی پریشانی کی بات نظر نہ آئے، کوئی معصیت اور گناہ کی بات پیش نہ آئے، اے اللہ! میرا داخلہ اچھا ہو۔

نکلنے کی بھلائی مانگتا ہوں

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ))

یعنی اے اللہ! میں آپ سے گھر سے نکلنے کی بھی بھلائی مانگتا ہوں کہ میرا گھر سے نکلنا بھی بہتر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ گھر میں داخل ہونے کے بعد میں کافی دیر تک گھر میں رہوں گا، لیکن ہمیشہ تو گھر میں رہنا نہیں ہوگا بلکہ کسی موقع پر دوبارہ گھر سے نکلنا ہوگا، لہٰذا جب دوبارہ نکلوں تو اس نکلنے کے وقت بھی میرے لئے خیر مقدر فرما دیجئے اور اس وقت بھی بھلائی ہی بھلائی ہو اور عافیت ہی عافیت ہو۔ اس جملہ کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ نے دونوں کناروں کا احاطہ فرما دیا کہ میرا داخلہ بھی بہتر ہو اور جب نکلوں تو میرا نکلنا بھی بہتر ہو۔ گویا کہ جب تک میں گھر میں رہوں، عافیت سے اور اطمینان سے رہوں، کوئی تکلیف پیش نہ آئے اور کوئی پریشانی سامنے نہ آئے۔

''بھلائی'' بہت جامع لفظ ہے

اس دعا میں آپ نے ''خیر'' کا لفظ استعمال فرمایا، جس کے معنی ہیں ''بھلائی''، یعنی داخلے کے وقت بھی بھلائی ہو اور نکلنے کے وقت بھی بھلائی ہو۔ یہ ''بھلائی'' ایسا جامع لفظ ہے کہ اس میں دین و دنیا کی ساری حاجتیں جمع ہیں، دنیا کی بھلائی یہ ہے کہ آدمی کو عافیت میسر ہو، صحت میسر ہو، کوئی بیماری نہ ہو،

کوئی تکلیف اور پریشانی نہ ہو، گھر کے سب افراد خیر وعافیت سے ہوں، کوئی معاشی تنگ دستی نہ ہو۔ اور آخرت کی بھلائی بھی اس دعا میں شامل ہے کہ اے اللہ! جب تک میں گھر میں رہوں، مجھے آخرت کے اعتبار سے بھی بھلائی نصیب ہو، یعنی گناہ اور معصیت کا ارتکاب نہ کروں، آپ کو ناراض کرنے والا کوئی عمل مجھ سے سرزد نہ ہو اور اپنے بیوی بچوں کو گناہوں سے محفوظ پاؤں۔

جب انسان یہ دعا مانگتے ہوئے گھر میں داخل ہو رہا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گھر کی پوری زندگی اس دعا کے اندر داخل ہوگئی اور دنیا و آخرت کی ساری بھلائیاں اس دعا کے اندر آگئیں۔

اگر بھلائی مل جائے تو بیڑہ پار ہے

اگر ہر مسلمان روزانہ گھر میں داخل ہوتے وقت یہ دعا مانگے اور ذرا دھیان سے مانگے اور مانگنے کے انداز میں مانگے، توجہ کر کے مانگے، چاہے اُردو ہی میں مانگے کہ اے اللہ! میں داخلے کی بھی بھلائی چاہتا ہوں اور نکلنے کی بھی بھلائی چاہتا ہوں۔ اگر یہ ایک دعا اپنے تمام لوازم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے تو سارے مسائل دُور ہو جائیں اور گھر کی ساری زندگی جنت کی زندگی بن جائے اور گھر کی زندگی دنیا و آخرت کی نعمتوں سے مالا مال ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کے نام سے داخل ہوتے ہیں

آگے یہ جملہ ارشاد فرمایا:

((بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا))

''ہم اللہ تعالیٰ کا نام لے کر داخل ہوتے ہیں''

مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! میں نے دعا تو مانگ لی کہ میرے حالات درست ہوں لیکن حالات کو میں خود سے درست کرنے پر قادر نہیں ہوں، میرے بس میں یہ بات نہیں ہے کہ گھر میں جا کر جو منظر دیکھوں، وہ میرے اطمینان اور مسرت کا ہو، جب تک آپ کی مشیت اور فیصلہ شامل حال نہیں ہوگا اس وقت تک یہ بات نہیں ہوسکتی۔۔ اس لئے میں آپ کا نام لے کر داخل ہوتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے نام سے نکلتے ہیں

آگے فرمایا:

((وَبِسْمِ اللّٰهِ خَرَجْنَا))

اور اللہ ہی کا نام لے کر ہم نکلتے ہیں۔ جب داخل ہوں تو اللہ کا نام لے کر داخل ہوں اور جس

وقت گھر سے باہر نکلیں تو اس وقت بھی اللہ کا نام لے کر نکلیں، اس دعا کے ذریعہ ہم اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہمارا داخلہ اور خارجہ دونوں درست فرمادیں۔

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں

آخر میں یہ جملہ ارشاد فرمایا:

((وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا))

اور اللہ ہی پر جو ہمارا پروردگار ہے، ہم بھروسہ کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! میں نے دعا تو کرلی اور آپ سے مانگ لیا کہ خیر ہی خیر ہو، کوئی شر پیش نہ آئے، لیکن اگر بالفرض اس دعا کے مانگنے کے بعد کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جو بظاہر دیکھنے میں خیر نہیں لگ رہا ہے تو اے اللہ! ہم آپ پر بھروسہ کرتے ہیں کہ آپ نے جو فیصلہ فرمایا وہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔

جب تک اللہ تعالیٰ سے مانگا نہیں تھا، اس وقت تک تو کچھ بھی ہوسکتا تھا، بڑے سے بڑا شر پیدا ہو جاتا، لیکن اے اللہ! جب ہم نے معاملہ آپ کے حوالے کر دیا اور آپ سے خیر مانگ لی اور اس یقین کے ساتھ مانگ لی کہ آپ ضرور عطا فرمائیں گے، پھر اگر اتفاقاً کوئی ایسا واقعہ پیش آگیا جو بظاہر دیکھنے میں خیر نہیں معلوم ہو رہا ہے بلکہ برا لگ رہا ہے تو بھی ہمیں آپ پر یقین اور بھروسہ ہے کہ جو واقعہ بظاہر شر نظر آرہا ہے اور دیکھنے میں یہ ناگوار معلوم ہو رہا ہے لیکن آپ کے فیصلے کے مطابق ہمارے حق میں وہی بہتر ہے۔

ہمیشہ عافیت مانگو

درحقیقت ایک مؤمن کا یہی کام ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ خیر ہی مانگے اور عافیت ہی مانگے، کبھی مصیبت نہ مانگے، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی ناگوار واقعہ پیش آجاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو کہ یہ ناگوار واقعہ بھی ہمارے لئے مآل کار بہتر اور خیر ہوگا، کیونکہ ہم نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا ہے۔

جیسے بیٹا اپنے کو باپ کے حوالے کردے

اس کی بغیر مثال کے نظیر یہ ہوسکتی ہے کہ جیسے ایک بیٹا اپنا معاملہ باپ کے حوالے کر دیتا ہے کہ آپ میری تربیت کیجئے اور میرے دنیا و آخرت کے مفادات کی نگرانی کیجئے۔ اب باپ اس کے مفادات کی نگرانی کرتا ہے، اس نگرانی کے نتیجے میں بعض اوقات باپ کوئی ایسی بات بھی کرگزرتا ہے جو

بیٹے کو بظاہر ناگوار معلوم ہوتی ہے، بیٹے کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ یہ بات ہوتی، لیکن باپ جانتا ہے کہ مجھے اس بیٹے کی تربیت کرنی ہے اور اس تربیت کے نقطۂ نظر سے یہ بات ضروری ہے۔

مثلاً بیٹا کسی جگہ تفریح کے لئے جانا چاہتا ہے اور باپ جانتا ہے کہ اس کا وہاں جانا مآل کار فائدہ مند نہیں ہوگا، لہٰذا باپ بیٹے کو تفریح کے لئے جانے کی اجازت نہیں دیتا، اب بیٹے کو صدمہ اور رنج ہو رہا ہے کہ میرا دل تفریح کو چاہ رہا تھا لیکن باپ نے مجھے روک دیا۔ اب بظاہر باپ کا تفریح پر جانے سے روک دینا بیٹے کے لئے ناگوار ہے، لیکن چونکہ معاملہ باپ کے حوالے کر دیا گیا تھا، وہی اس کی بہتری جانتا ہے، اس لئے اگر وہ بیٹا سعادت مند ہے تو اسے یہ یقین ہونا چاہئے کہ اگرچہ تفریح کی اجازت نہ دینا مجھے ناگوار ہوا لیکن فیصلہ میرے باپ ہی کا بہتر ہے، مآل کار اور انجام کار میرا فائدہ اسی میں ہے۔

دعا کر کے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا

لہٰذا نبی کریم ﷺ نے یہ تلقین فرمائی کہ جب تم اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرتے ہو تو اس دعا کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تم نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔ مثلاً آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! مجھے فلاں بیماری ہو رہی ہے، میری اس بیماری کو دور فرما۔ لیکن دعا مانگنے کے باوجود وہ بیماری نہیں جا رہی ہے، ایسا بکثرت ہوتا رہتا ہے کہ وہ بیماری لمبی ہوگئی اور بہت عرصہ کے بعد وہ بیماری دور ہوئی۔ اب بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو دعا مانگی تھی وہ قبول نہ ہوئی، لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ یہ تلقین فرما رہے ہیں کہ دعا مانگنے کے معنی یہ ہیں کہ تم نے اپنا معاملہ اپنے اللہ کے حوالے کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ میری خواہش یہ ہے کہ میری یہ بیماری دور ہو جائے، اب اگر اللہ تعالیٰ نے اس بیماری کو مزید چند دن جاری رکھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بیماری کا جاری رہنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے، کیونکہ تم نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا تھا، اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے حوالے نہ کیا ہوتا اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہ کیا ہوتا تو پھر یہ بیماری تمہارے حق میں اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا تو اب یہ بیماری تمہارے حق میں بہتر ہے۔

بیماری کے ذریعہ تمہاری صفائی مقصود ہے

وہ بیماری تمہارے حق میں کیسے بہتر ہے؟ وہ اس طرح بہتر ہے کہ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جب بھی کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے تو بیماری کے دوران اس کو جتنی تکلیفیں پہنچتی ہیں، وہ سب اس کے حق میں کفارۂ سیئات ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتے کہ تم اس حالت

میں ان کے پاس جاؤ کہ تمہارے نامۂ اعمال میں گناہ موجود ہوں، اس لئے اسی دنیا میں معاملہ صاف کر کے تمہیں اپنے پاس بلانا چاہتے ہیں، لہٰذا یہ بیماری تمہارے حق میں خیر ہے، لیکن اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ عافیت ہی مانگنی چاہئے، بیماری نہیں مانگنی چاہئے۔

یہی معاملہ یہاں پر ہے کہ گھر میں داخل ہوتے وقت یہ دعا کر لی کہ اے اللہ! میں گھر میں داخل ہو رہا ہوں، گھر میں اچھا منظر دیکھوں، اور دنیا و آخرت کی بھلائی مانگتا ہوں، نکلنے کے وقت بھی اور داخل ہونے کے وقت بھی اور گھر میں رہنے کے دوران بھی بھلائی مانگتا ہوں، لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ پر جو ہمارا پروردگار ہے، اس پر بھروسہ ہے۔

اپنے پروردگار پر بھروسہ ہے

دیکھئے! یہاں پر صرف یہ نہیں کہا:

((وَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا))

بلکہ "رَبَّنَا" لفظ بڑھا کر یہ فرمایا:

((وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا))

یعنی ہمیں اس اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے جو ہمارا پروردگار ہے اور ہمارا پالنے والا ہے۔ جب وہ ہمارا پروردگار ہے تو وہ جو فیصلہ ہمارے حق میں کرے گا، وہی فیصلہ ہمارے حق میں بہتر ہوگا، وہی جانتا ہے کہ نظامِ ربوبیت کے تحت کونسی چیز میرے حق میں بہتر اور فائدہ مند ہے، لہٰذا ہم اسی پر بھروسہ کرتے ہیں، ہم اپنی عقل نہیں چلاتے کہ ہمارے حق میں کیا بہتر ہے بلکہ اپنا معاملہ اس کے حوالے کرتے ہیں اور اسی کے بھروسہ پر ہم گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔

عافیت کی زندگی حاصل ہوگی

آپ اندازہ لگائیں کہ جو بندہ گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ تعالیٰ سے خیر مانگ رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ! میں آپ ہی کے نام سے داخل ہو رہا ہوں اور جب نکلوں گا تو آپ ہی کے نام سے نکلوں گا، اور جو بندہ یہ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ! میں نے سارا بھروسہ آپ کی ذات پر کر دیا، اے اللہ! میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ آپ میرے پروردگار ہیں، آپ جو فیصلہ کریں گے وہ میرے حق میں بہتر ہوگا۔ تو جو بندہ یہ سب دعائیں کر کے گھر میں داخل ہو رہا ہے، کیا اللہ تعالیٰ اس کو نامراد فرما دیں گے؟ کیا اللہ تعالیٰ اس کو محروم فرما دیں گے؟ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کے گھر کی زندگی کو عافیت کی زندگی بنائیں گے، دنیا کے اعتبار سے بھی اور آخرت کے اعتبار سے بھی۔

خلاصہ

بہر حال! یہ وہ دعا ہے جو حضور اقدس ﷺ نے گھر میں داخلے کے وقت تلقین فرمائی، اس کو یاد کرلیں، جب تک عربی الفاظ یاد نہ ہوں تو اس وقت تک اُردو ہی میں دعا کرلیا کریں کہ یا اللہ! گھر میں داخلے کی بھلائی بھی چاہتا ہوں اور گھر سے نکلنے کی بھلائی بھی چاہتا ہوں، آپ کے نام سے داخل ہوتا ہوں اور آپ پر بھروسہ کرتا ہوں۔ اور اس بات کی عادت ڈال لو کہ جب بھی گھر میں داخل ہوں اس وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرلو، انشاء اللہ تعالیٰ اس دعا کے انوار و برکات کھلی آنکھوں سے مشاہدہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

کھانا سامنے آنے پر دعا☆

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ط أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۝﴾(۱)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب کوئی کھانے کی چیز حضورِ اقدس ﷺ کے سامنے آتی تو آپ اس وقت یہ کلمات فرمایا کرتے تھے؟

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَزَقَنِيْهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِّنِّيْ وَلَا قُوَّةٍ))(۲)

اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کی ہیں جس نے مجھے میری قدرت اور طاقت کے بغیر یہ رزق عطا فرمایا۔ اس دعا کے اندر اس بات کا اعتراف ہے کہ میرے اندر نہ قدرت تھی اور نہ طاقت تھی کہ میں یہ رزق اپنے لئے مہیا کرسکتا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے میری طاقت اور قدرت کے بغیر یہ رزق مجھے عطا فرمایا۔ لہٰذا سنت یہ ہے کہ جب کسی کے سامنے کوئی کھانے کی چیز آئے تو وہ یہ کلمات کہے۔

مسلمان کو کافر سے ممتاز کرنے والا جملہ

اگر حقیقت پر غور کریں تو یہ جملہ ایک مسلمان کو کافر سے اور ایک اللہ کے بندے کو غافل سے

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۲۷۶ تا ۲۸۸)، قبل از نماز جمعہ، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) البقرة: ۱۸۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں"

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰہ، باب ما يقول إذا فرغ من الطعام، رقم: ۳۳۸۰، سنن أبی داؤد، کتاب اللباس، باب، رقم: ۳۵۰۵، سنن ابن ماجه، کتاب الأطعمة، باب ما يقال إذا فرغ من الطعام، رقم: ۳۲۷۶، مسند أحمد، رقم: ۱۵۰۷۹

ممتاز کرتا ہے، اس لئے کہ وہ مسلمان کھانا سامنے آنے کے بعد اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ کھانا میری قوتِ بازو کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ یہ کھانا اللہ جل شانہ کی عطا ہے جو میری کسی قدرت اور طاقت کے بغیر مجھے عطا ہوا ہے۔ جبکہ ایک غیر مسلم اور ایک کافر یہ سوچتا ہے کہ یہ کھانا میرے خون پسینہ کی محنت سے حاصل ہوا ہے، میں نے مزدوری کی، میں نے محنت کی، میں نے ملازمت کی، میں نے تجارت کی، میں نے زراعت کی، اس کے نتیجے میں مجھے پیسے ملے اور ان پیسوں کے ذریعہ میں بازار سے کھانا خرید کر لایا، اس میں اللہ تعالیٰ کا کہاں دخل آگیا؟ نعوذ باللہ۔

قارون کا دعویٰ

قرآن کریم میں قارون کا ذکر آتا ہے کہ وہ بہت بڑا سرمایہ دار اور بہت بڑا دولت مند تھا، اس کے خزانے اتنے زیادہ تھے کہ ان خزانوں کی صرف چابیاں اُٹھانے کے لئے لوگوں کی ایک طاقتور بڑی جماعت درکار ہوتی تھی، صرف ایک آدمی ان چابیوں کو نہیں اُٹھا سکتا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے اتنا مال عطا فرمایا تھا۔ لیکن جب مال کی وجہ سے اس کے دماغ میں تکبر آگیا اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ میں دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند شخص ہوں اور میں بڑا آدمی ہوں، چنانچہ جب اس سے کہا گیا کہ یہ دولت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اس لئے تم غریبوں کا بھی کچھ خیال کرو اور ان کو اس مال میں سے کچھ دو تو جواب میں اس نے کہا:

﴿إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِىٓ﴾(۱)

یعنی جو کچھ میرے پاس مال اور سرمایہ ہے، یہ میرے علم کا کرشمہ ہے، میں نے یہ علم حاصل کیا کہ روپیہ کیسے کمایا جائے اور اس علم کے بعد میں نے محنت کی، اس محنت کے نتیجے میں یہ خزانہ جمع ہو گیا، لہٰذا یہ تو میرے علم کا کرشمہ ہے، کسی کی عطا نہیں ہے۔ یہ قارون کی ذہنیت تھی، ایک کافر سرمایہ دار کی اور ایک کافر دولت مند کی یہ ذہنیت تھی۔

قارون کا انجام

تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ جب وہ اپنے تمام خزانوں اور لاؤلشکر کے ساتھ نکلا تو ظاہر میں لوگوں نے تو اس کی دولت دیکھ کر کہا:

﴿يَٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ أُوتِىَ قَٰرُونُ إِنَّهُۥ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ﴾(۲)

''کاش ہمیں بھی ایسی ہی دولت ملی ہوتی جیسی قارون کو ملی ہے، یہ تو بڑا خوش نصیب آدمی ہے''

(۱) القصص: ۷۸ (۲) القصص: ۷۹

لیکن کچھ دیر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر عذاب نازل کیا، اس عذاب کے نتیجے میں زلزلہ آیا اور اس کا سارا خزانہ زمین میں دھنس گیا اور وہ خود بھی زمین میں دھنس کر ہلاک ہوگیا۔

صرف اسباب جمع کرنا انسان کا کام ہے

بہرحال! ایک کافر اور ایک غیر مسلم کی ذہنیت اور سوچ یہ ہے کہ جو کچھ مجھے مل رہا ہے، یہ میری قوت بازو کا کرشمہ ہے، میری محنت کا صلہ ہے، میرے علم و ہنر کا ثمرہ ہے۔ لیکن ایک مسلمان کا کہنا یہ ہے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے اے اللہ! آپ کی عطا ہے اور میری کسی قدرت اور طاقت کے بغیر حاصل ہوا ہے۔ اس لئے کہ اگر انسان ذرا سا غور کرے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ انسان کا کام بس اتنا ہے کہ وہ اسباب کو جمع کرنے کی کوشش کرلے، انسان کا کام زیادہ سے زیادہ اتنا ہے کہ وہ دکان کھول کر بیٹھ جائے، لیکن اگر وہ دکان کھول کر بیٹھ جائے اور کوئی گاہک نہ آئے تو وہ کیا کرلے گا۔ اور اس دکان کو بھی اپنے اسی ہاتھ سے اور جسم کی اسی طاقت کے ذریعہ کھول رہا ہے جو اسی کی عطا کی ہوئی ہے، وہ جب چاہے اس طاقت کو سلب کرلے۔ دکان میں اسی لئے بیٹھا تھا کہ صحت مند تھا، ہاتھ پاؤں ٹھیک کام کر رہے تھے، اگر بیمار ہوگیا ہوتا یا ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے ہوتے، اور چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا ہوتا تو ایسی حالت میں اس کی مجال تھی کہ وہ دکان کھول کر بیٹھ جاتا؟

گاہک کون بھیج رہا ہے؟

بالفرض اگر مان بھی لیا جائے کہ دکان کھول کر بیٹھنا اس کا اپنا عمل ہے، لیکن اس میں ذرا غور کرو کہ اس دکان پر گاہک کون بھیج رہا ہے؟ کون گاہک کے دل میں یہ ڈال رہا ہے کہ اس دکان سے جاکر سودا خریدو؟ اور پھر اس گاہک کے ذریعہ جو پیسے حاصل ہو رہے ہیں وہ پیسے تو بذات خود ایسی چیز نہیں ہیں کہ انسان اس کو کھا کر اپنی بھوک مٹالے یا اس کو پی کر اپنی پیاس بجھالے بلکہ پیسے کے ذریعہ سے اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کی جاتی ہیں اور ضرورت کی چیزیں عام طور پر بازار میں ملتی ہیں تو ذرا غور کرو کہ وہ کون ذات ہے جس نے یہ بازار قائم کیا ہے اور کون وہ ذات ہے کہ جو کسی کے دل میں یہ خیال ڈال رہا ہے کہ فلاں جگہ جاکر روٹی کی دکان کھول لو اور کسی کے دل میں یہ خیال ڈال رہا ہے کہ تم گوشت کی دکان کھول لو، تم چینی کی دکان کھول لو، تم گندم کی دکان کھول لو، تم کپڑے کی دکان کھول لو، تم جاکر جوتے کی دکان کھول لو۔ کس نے یہ دنیا کا نظام بنایا ہے؟ کیا کوئی عالمی کانفرنس ہوئی تھی کہ جس میں طے یہ کیا گیا تھا کہ فلاں شخص آٹا بیچے گا، فلاں شخص چینی فروخت کرے گا، فلاں شخص گھی کی تجارت کرے گا اور فلاں شخص تیل کی تجارت کرے گا۔

پیسہ سب کچھ نہیں

بلکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا یہ نظام اس طرح بنایا کہ ایک شخص کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم تیل کی تجارت کرو، دوسرے شخص کے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ تم چینی کی تجارت کرو، تیسرے شخص کے دل میں یہ خیال ڈالا کہ تم پھل کی تجارت کرو۔ اس نظام کا نتیجہ یہ ہے کہ جب آدمی پیسے لے کر بازار جاتا ہے تو اس کو ضرورت کی ہر چیز بازار میں مل جاتی ہے، اگر اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا یہ نظام نہ ہوتا تو آدمی پیسے لئے پھرتا رہتا لیکن اس کو ضرورت کی چیز نہ ملتی۔

صرف مال کا موجود ہونا کافی نہیں

میرے ایک دوست واقعہ سنا رہے تھے کہ میں ایک مرتبہ رمضان المبارک میں عمرہ ادا کرنے جا رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک اور صاحب بھی سفر کر رہے تھے جو بہت بڑے مالدار تھے۔ ساتھ میں بیٹھ کر باتیں شروع ہوگئیں۔ میں نے ان سے کہا کہ رمضان کا موسم ہے، رمضان میں لوگوں کا ہجوم زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا پہلے سے اس بات کا اہتمام کر لیجئے گا کہ قیام کے لئے مناسب جگہ مل جائے، کھانے پینے کا مناسب انتظام ہو جائے تا کہ وقت پر حرم میں حاضری ہو جائے۔ وہ صاحب اپنی دولت کے گھمنڈ اور فخر میں مبتلا تھے، اس لئے میری باتوں کے جواب میں کہنے لگے کہ پیسوں سے سب کچھ ہو جاتا ہے، بس پیسہ ہونا چاہئے، اگر پیسہ ہے تو سب کچھ ہے، اس لئے آپ ہماری فکر نہ کریں، ہمارے پاس پیسہ بہت ہے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

دو دن کے بعد پھر ان مالدار صاحب سے اس حالت میں ملاقات ہوئی کہ وہ حرم کی سیڑھیوں پر اپنا سر پکڑے بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بھائی صاحب! خیریت تو ہے؟ کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ آج سحری کھانے کو نہ ملی۔ میں نے ان سے کہا کہ سحری کیوں نہیں ملی، آپ کے پاس پیسے تو بہت تھے؟ وہ کہنے لگے کہ پیسے تو میرے پاس تھے، جب میں پیسے لے کر قیام گاہ سے سحری کے لئے نکلا تو وہاں اتنی لمبی لائن لگی ہوئی تھی کہ جب ہمارا نمبر آیا تو سحری کا وقت ختم ہو چکا تھا، اس لئے سحری نہ مل سکی۔

پھر وہ صاحب کہنے لگے کہ میں جو آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ پیسے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے، آج اللہ تعالیٰ نے مجھے دکھا دیا کہ پیسے سے ہر کام نہیں ہو سکتا، جب تک ہم نہ چاہیں اور جب تک ہماری طرف سے توفیق نہ ہو اور ہماری طرف سے حالات سازگار نہ کیے جائیں تو اس وقت تک پیسے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ پیسے سے آپ دنیا کی ہر راحت خرید لیں، یہ پیسہ تو ہم نے راحت

کا ایک ذریعہ بنادیا ہے لیکن یہ پیسہ بذاتِ خود راحت کی چیز نہیں ہے، اس لئے یہ سوچنا کہ ہم پیسے سے سب کچھ خرید لیں گے، یہ شیطان کا بہت بڑا دھوکہ ہے۔ اگر تم نے پیسہ کما بھی لیا لیکن کمانے کے بعد اس کے ذریعہ سے مناسب رزق کا حاصل ہوجانا بھی اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام کے ماتحت ہے، انسان کی قدرت میں یہ نہیں ہے کہ وہ اس رزق کو مہیا کر سکے۔

ہر چیز اللہ کی عطا کی ہوئی ہے

بہر حال! ہمارے اور آپ کے سامنے جب کھانا سامنے آتا ہے تو ہم غفلت کے عالم میں فوراً کھانا شروع کر دیتے ہیں، لیکن حضور اقدس ﷺ کی دوررس نگاہیں کھانا سامنے آنے کے بعد یہ دیکھ رہی ہیں کہ یہ کھانا میری قوتِ بازو کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ کسی دینے والے کی عطا ہے، میرے جسم میں قوت اور صحت بھی اسی نے دی ہے اور اس قوت کے ذریعہ میں نے روزی کمائی اور روزی کمانے کے اسباب اختیار کیے، دکان کھولی، ملازمت کی، کاشتکاری کی، یہ قوت بھی اسی کی عطا ہے، اور پھر ان اسباب کو اختیار کرنے کے بعد ان اسباب کو موثر بنانا بھی اسی ذات کا کام ہے، اسی ذات نے گاہکوں کو آمادہ کیا کہ وہ میری دکان پر آئیں، اسی نے میرے افسر کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ مجھے ملازم رکھ لے، ورنہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی بڑی بڑی ڈگریاں ہاتھ میں لے کر پھرتا ہے مگر ملازمت نہیں ملتی، بے روزگاری کا عالم ہے۔ لہٰذا ملازمت دینا بھی اسی کا کام ہے، پھر ملازمت دینے کے بعد جو کام سپرد کیا گیا ہے، اس کام کو ٹھیک ٹھیک انجام دینے کی طاقت عطا کرنا بھی اسی کا کام ہے۔ اور پھر آخر میں ملازم رکھنے والے کے دل میں یہ خیال ڈالنا کہ اس کو اتنی تنخواہ دو، یہ بھی اسی کا کام ہے۔ اور تنخواہ ملنے کے بعد جب ہاتھ میں پیسے آگئے تو ان پیسوں کے ذریعہ میری راحت اور ضرورت کی چیزیں عطا کرنا بھی اسی کا کام ہے۔ لہٰذا اوّل سے لے کر سارے کام اسی کی طرف سے ہو رہے ہیں، میں تو بس ایک بہانہ ہوں۔ یہی معنی ہیں اس دعا کے:

”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةٍ“

یعنی تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کی ہیں جس نے مجھے میری کسی قدرت اور طاقت کے بغیر یہ رزق عطا فرمایا۔ بہر حال! کھانا سامنے آنے کے بعد حضور اقدس ﷺ ایک تو یہ دعا فرماتے تھے۔

کھانا سامنے آنے پر دوسری دعا

کھانا سامنے آنے کے بعد حضور اقدس ﷺ دوسری دعا یہ فرماتے:

((اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ وَأَطْعِمْنِيْ خَيْرًا مِّنْهُ))(۱)

''اے اللہ! اس کھانے میں میرے لئے برکت عطا فرما اور آئندہ مجھے اس سے بھی اچھا کھانا عطا فرمائیے''

اس دعا میں آپ نے دو جملے ارشاد فرمائے۔ پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ میرے لئے اس کھانے میں برکت عطا فرمائیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! یہ رزق آپ کی عطا تو ہے لیکن جب تک آپ کی طرف سے اس میں برکت نہیں ڈالی جائے گی، اس وقت تک یہ رزق میرے حق میں فائدہ مند نہیں ہوگا، اس لئے کہ اگر اس رزق میں برکت نہ ہوئی تو اس سے میری بھوک نہیں مٹے گی۔

برکت کے معنی

کیونکہ برکت کے معنی ہیں کہ آدمی کے پاس چیز تھوڑی ہو لیکن اس سے فائدہ زیادہ حاصل ہو جائے۔ اس لئے برکت کی دعا فرما رہے ہیں کہ یہ کھانا جو میرے سامنے آیا ہے، یہ کھانا میرے لئے اور میرے گھر والوں کے لئے کافی ہو جائے اور اس سے سب کی بھوک مٹ جائے، اگر برکت نہ ہو تو کھانا زیادہ ہونے کے باوجود بھوک نہیں مٹتی۔ برکت کے ایک معنی تو یہ ہوئے۔

برکت کے دوسرے معنی

برکت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب یہ کھانا میرے جسم کے اندر پہنچے تو صحت اور قوت کا ذریعہ بنے، بیماری اور تکلیف کا ذریعہ نہ بنے۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کھانا سامنے آیا اور لذیذ معلوم ہوا تو لذت کے شوق میں زیادہ کھا گئے، اس کے نتیجے میں بدہضمی ہوگئی، اب دست آنے شروع ہوگئے، اُلٹیاں شروع ہوگئیں اور ایک وقت کے کھانے نے تین دن تک بستر پر ڈالے رکھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کھانا اچھا بھی تھا، لذیذ بھی تھا اور صحت مند بھی تھا لیکن اس کھانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت نہیں تھی، اس لئے کھانا سامنے آنے کے بعد حضور اقدس ﷺ یہ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! میں جانتا ہوں کہ یہ کھانا آپ کی عطا ہے اور یہ بڑی عظیم نعمت ہے، لیکن یہ نعمت اسی وقت فائدہ مند ہوگی جب آپ اس میں برکت ڈالیں گے، اس لئے میں آپ سے یہ سوال کرتا ہوں اور محتاج بن کر مانگتا ہوں کہ اے اللہ! میرے لئے اس کھانے میں برکت ڈال دیجئے۔

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح (۳۶۴/۶)

برکت تلاش کرو

متعدد احادیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی ہے کہ کھانے میں برکت تلاش کرو۔ لہٰذا جب کھانا شروع کرو تو یہ کہو:

((بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ))(۱)

''اللہ کے نام سے شروع کر رہا ہوں اور اللہ کی برکت کا طلب گار ہوں''

اسی طرح اگر کھانا کھاتے وقت انگلیوں پر کھانا لگ جائے تو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد انگلیوں کو خود چاٹ لے یا دوسرے کسی کو چٹا دے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے رزق کی ناقدری نہ ہوگی، کیونکہ اگر ان انگلیوں پر کچھ کھانا لگا رہ گیا اور تم نے جا کر ہاتھ دھو لیے تو کھانے کے کچھ اجزاء پانی کے ساتھ گٹر میں چلے جائیں گے اور اس کے نتیجے میں رزق کی بے حرمتی ہو جائے گی۔

انگلیاں چاٹنے میں برکت کا حصول

انگلیاں چاٹنے کا دوسرا فائدہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ بیان فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے کھانے کے کونسے حصے میں برکت ہے، ہوسکتا ہے کہ جو کھانا تم نے کھایا، اس میں برکت نہ ہو اور جو حصہ تمہاری انگلیوں پر لگا رہ گیا، اس میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہو، اس لئے فرمایا کہ ان انگلیوں کو چاٹ لو۔

تین انگلیوں سے کھانا

البتہ حضورِ اقدس ﷺ اس طرح کھانا تناول نہیں فرماتے تھے کہ پانچوں انگلیاں کھانے میں ملوث ہو جائیں، بلکہ آپ ﷺ تین انگلیوں سے کھانا تناول فرمایا کرتے تھے اور چھوٹے نوالے لیتے تھے اور اس زمانے میں عام طور سے کھانے میں خشک چیزیں ہوتی تھیں۔ بہر حال! جب کھانا سامنے آتا تو ایک تو آپ برکت کی دعا فرماتے۔

اس سے اچھا عطا فرمایئے

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

---

(۱) تفسیر الثعالبی (۴/ ۴۴۰)

"وَاَنْعِمْنِیْ خَیْرًا مِّنْهُ"

یعنی اے اللہ! مجھے آئندہ اس سے بھی اچھا کھانا عطا فرمائیے۔ کیونکہ ہم آپ کی عطا اور بخشش سے کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتے، جب آپ کی عطا ہو تو اس کو آپ سے محتاج بن کر مانگیں گے اور عبدیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے محتاج بن کر مانگے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ

صحیح بخاری میں حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ آتا ہے کہ آپ ایک مرتبہ غسل فرما رہے تھے، اس دوران آسمان سے آپ کے اوپر سونے کی تتلیاں گرنی شروع ہوئیں، اب حضرت ایوب علیہ السلام نے غسل چھوڑ کر سونے کی تتلیاں جمع کرنی شروع کردیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ایوب! ہم نے پہلے ہی سے تمہیں بہت ساری نعمتیں نہیں دے رکھی ہیں، اس کے باوجود اب تم سونے کے پیچھے بھاگ رہے ہو؟ جواب میں حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا کہ اے اللہ! بیشک آپ نے مجھے بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں، میں ان کا شکر بھی ادا نہیں کرسکتا، لیکن جب آپ مزید عطا فرما رہے ہیں تو اے اللہ! میں آپ کی بھیجی ہوئی برکت سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، جب آپ دے رہے ہیں تو میرا کام یہ ہے کہ میں محتاج بن کر اس کو وصول کروں۔

((لَا غِنٰی بِیْ عَنْ بَرَکَتِكَ))(۱)

جب آپ میرے اوپر کوئی نعمت نازل فرمائیں تو یہ بات ادب کے خلاف ہے کہ میں اس سے بے نیازی کا اظہار کروں۔

کہیں دماغ خراب نہ ہوجائے

لہٰذا ایسا نہ ہو کہ جب آدمی کے سامنے اچھا کھانا آجائے تو اس کا دماغ خراب ہوجائے اور یہ سوچے کہ مجھے تو اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا مل گیا ہے، اب میں دوسرے کھانے سے بے نیاز ہوں۔ اس جملہ نے اس سوچ اور خیال کو ختم کردیا کہ بیشک آپ نے جو کچھ عطا فرمایا ہے، یہ آپ کا بہت بڑا انعام ہے جس پر میں شکر ادا نہیں کرسکتا، لیکن میں اب بھی آپ کی عطا کا محتاج ہوں اور میں آپ سے یہ مانگتا ہوں کہ مجھے اور اچھا عطا فرمائیے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الغسل، باب من اغتسل عریانا وحده فی الخلوة ومن تستر، رقم: ۲۷۰، سنن النسائی، کتاب الغسل والتیمم، باب الاستتار عن الاغتسال، رقم: ۴۰۶، مسند احمد، مسند ابی هریرة، رقم: ۷۸۱۲

خلاصہ

آپ اندازہ کریں کہ جو انسان کھانا سامنے آنے کے بعد کھانا شروع کرنے سے پہلے ہی یہ اعتراف کر رہا ہے کہ اے اللہ! یہ کھانا آپ کی عطا ہے، اس پر میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں، آپ کی تعریف کرتا ہوں، میری قوت اور میری قدرت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے اور یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! میں آپ سے اس کھانے کی برکت مانگتا ہوں اور آئندہ اس سے بہتر رزق عطا فرمایئے۔ تو کیا اللہ تعالیٰ اس کے کھانے میں برکت نہیں ڈالیں گے؟ کیا اللہ تعالیٰ کھانے کے ذریعہ اس کے اندر نور پیدا نہیں کریں گے؟ یقیناً ایسے انسان کے کھانے میں پینے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضرور برکت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس دعا کے پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

کھانے سے پہلے اور بعد کی دعا☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ط إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ٥﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! حضورِ اقدس ﷺ نے مختلف مواقع پر جو دعائیں تلقین فرمائی ہیں، ان کا بیان ایک عرصہ سے چل رہا ہے۔ اس سے پہلے اس دعا کی تشریح بیان کی تھی جو دعا حضورِ اقدس ﷺ کھانا سامنے آنے کے وقت پڑھا کرتے تھے۔ جب آپ کھانا شروع فرماتے تو اس وقت آپ یہ دعا پڑھتے:

"بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى"(۲)

بسم اللہ پڑھنے کا فلسفہ

یہ وہی "بسم اللہ" ہے جس کا فلسفہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہر کام کو شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا نام لینا یہ درحقیقت بندے کی طرف سے اس بات کا اعتراف ہے کہ اے اللہ! یہ جو کچھ میں کھانا شروع کرنے والا ہوں، یہ سب آپ کی عطا ہے اور آپ کا انعام و احسان ہے اور اب میں آپ ہی کے نام سے اس کو کھانا شروع کرتا ہوں۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۲۹۱ تا ۲۹۸)

(۱) المؤمن: ٦٠، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ: "مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، بے شک جو لوگ تکبر کی بنا پر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔"

(۲) تفسیر الثعالبی (٤/٤٤٠)

''بسم اللہ'' بھول جانے پر درمیانِ طعام کی دعا

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص کھانے کے شروع میں ''بسم اللہ'' پڑھنا بھول جائے تو کھانے کے دوران جس وقت یاد آجائے اس وقت یہ دعا کرلے:

((بِسْمِ اللّٰہِ أَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ))(۱)

یعنی میں اللہ کے نام کے ساتھ کھارہا ہوں، اوّل میں بھی اللہ کا نام اور آخر میں بھی اللہ کا نام۔ اس لئے یہ مت سوچو کہ اگر شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول گئے تو بات ختم ہوگئی اور موقع ہاتھ سے نکل گیا نہیں، بلکہ جب یاد آجائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا نام لےلو۔

مسلمان اور کافر کے کھانے میں امتیاز

ایک مسلمان کے کھانے میں اور ایک کافر کے کھانے میں یہ فرق ہے، ایک اللہ کی بندگی کا احساس رکھنے والے کے کھانے میں اور ایک غافل انسان کے کھانے میں یہی فرق ہے، کھانا مسلمان بھی کھاتا ہے اور کھانا کافر بھی کھاتا ہے، لیکن وہ کافر غفلت کے عالم میں کھاتا ہے، وہ اپنے پروردگار کو بھولے ہوئے ہے، صرف کھانے کی لذت حاصل کرنا اور اپنی بھوک مٹانا اس کے پیش نظر ہے، اس لئے وہ کھانا کھانا ایک دنیاوی کام ہوکر رہ گیا ہے، لیکن ایک مسلمان اور اللہ جل جلالہ کی یاد رکھنے والا انسان جب کھانا کھاتا ہے تو چونکہ وہ کھانے کا عمل اللہ تعالیٰ کی یاد میں بسا ہوا ہے، اس لئے وہ کھانا کھانا بھی اس کے لئے عبادت بن جاتا ہے۔

کھانے کے بعد کی دعا

جب کھانے سے فارغ ہوگئے تو اس موقع کے لئے نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ یہ کہو:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَکَفَانَا وَآوَانَا وَأَرْوَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ))(۲)

یعنی تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں کھلایا۔ دیکھئے! جس وقت کھانا سامنے آیا

---

(۱) سنن أبی داود، کتاب الأطعمة، باب التسمیة علی الطعام، رقم: ۳۲۷۵، مسند أحمد، رقم: ۱۸۱۹۵، سنن الدارمی، کتاب الاطعمة، باب فی التسمیة علی الطعام، رقم: ۱۹۳۵

(۲) مذکورہ دعا ہمیں تین طرح سے کتب احادیث میں ملتی ہے: (۱) ((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ)) کنز العمال، رقم: ۱۸۱۷۹ (۷/۱۰٤)، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

تھا، اس وقت یہ دعا کی تھی کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمیں یہ رزق دیا، اور یہاں یہ دعا کی جارہی ہے کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمیں کھلایا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں نعمتیں علیحدہ علیحدہ ہیں، رزق دینا الگ نعمت ہے اور کھلانا الگ نعمت ہے۔

رزق علیحدہ نعمت، کھلانا علیحدہ نعمت

یہ ہوسکتا ہے کہ کھانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو، لیکن انسان اس کو نہ کھا سکے۔ مثلاً ایک انسان کے پاس طرح طرح کی نعمتیں موجود ہیں، انواع واقسام کے کھانے موجود ہیں، اعلیٰ سے اعلیٰ پھل موجود ہیں، لذت والی چیزیں سب موجود ہیں، لیکن معدہ خراب ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر نے کھانے سے منع کردیا ہے کہ خبردار! کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا، صرف سوپ پینے کی اجازت ہے اور کسی چیز کے کھانے کی اجازت نہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ "رَزَقَنَا" تو پایا گیا لیکن "أَطْعَمَنَا" نہیں پایا گیا، رزق تو حاصل ہے لیکن کھانے کی توفیق حاصل نہیں۔

ایک نواب صاحب کا قصہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے لکھنؤ کے ایک بڑے نواب صاحب کو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کی ساری نعمتیں دی ہوئی تھیں، روپیہ پیسہ، کوٹھیاں، بنگلے، کاریں، نوکر چاکر، سب کچھ تھا، لیکن بیماری کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے ان کو ہر چیز کھانے سے منع کردیا تھا، صرف اس کی اجازت تھی کہ ایک پاؤ قیمہ لے کر اس کو پکائیں پھر اس قیمہ کو ململ کے کپڑے میں چھان لیں، اس قیمہ کا جوس آپ پی سکتے ہیں، اس کے علاوہ کسی چیز کے کھانے کی اجازت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) الكلم الطيب (۳٦/١) اس روایت میں "جعلنا من المسلمين" کے الفاظ ہیں۔

(۲) ((الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِيْنَ)) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما يقول إذا فرغ من الطعام، رقم: ۳۳۷۹، سنن أبي داؤد، كتاب الأطعمة، باب ما يقول الرجل إذ طعم، رقم: ۳۳۵۲، سنن ابن ماجه، كتاب الأطعمة، باب ما يقال إذا فرغ من الطعام، رقم: ۳۲۷٤، مسند أحمد، رقم: ١٠٨٤٦ اس روایت میں "جعلنا مسلمين" ہے (۳) ((الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَآوَانَا فَكَمْ مِمَّنْ لَاكَافِيَ لَهُ وَلَامُؤْوِيَ)) صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب ما يقول عند النوم وأخذ المضجع، رقم: ٤٨٩٠، سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الدعا إذا آوى إلى فراشه، رقم: ۳۳۱۸، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب مايقال عند النوم، رقم: ٤٣٩٤، مسند أحمد، رقم: ١٢٠٩٤، واضح رہے کہ آخر الذکر دعا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بستر پر جاتے وقت پڑھی ہے۔

کہ "رَزَقَنَا" تو پایا گیا لیکن "اَطْعَمَنَا" نہیں پایا گیا۔

بہر حال! اگر اللہ تعالیٰ نے رزق بھی دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس رزق کو کھانے کی بھی توفیق دی ہے اور صحت بھی دی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دو نعمتیں مستقل نعمتیں ہیں، رزق دینا ایک مستقل نعمت ہے اور اس کو کھانے کی توفیق دینا ایک مستقل نعمت ہے۔ اس لئے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اے اللہ! اس بات پر بھی شکر ہے کہ آپ نے رزق عطا فرمایا اور اس بات پر بھی شکر ہے کہ آپ نے کھلایا۔

پانی کی نعمت پر شکر

آگے ارشاد فرمایا:

((وَسَقَانَا))

اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہمیں پلایا۔ اگر کھانے کے لئے کھانا موجود ہوتا لیکن پینے کے لئے پانی نہ ہوتا تو وہ کھانا عذاب بن جاتا، اس لئے اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے کھانا بھی دیا اور پینے کو بھی دیا۔

کھانا کافی ہونے کی نعمت پر شکر

تیسرا جملہ عجیب ارشاد فرمایا:

((وَكَفَانَا))

اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے اس کھانے کو ہمارے لئے کافی بنا دیا۔ اُردو میں "کافی بنا دینے" کا مطلب اتنا جامع نہیں، عربی زبان میں کافی بنا دینے کا مطلب بہت وسیع ہے، ایک مطلب تو یہ ہے کہ کھانا اتنا تھا کہ وہ ہمارے لئے کافی ہو گیا اور اس کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ہماری بھوک مٹ گئی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس کے کھانے سے ہمیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی، اگر بالفرض کھانا تو وافر مقدار میں مل جاتا لیکن کھانے کے دوران کوئی بری خبر آ جاتی مثلاً کسی عزیز یا دوست کے انتقال کی خبر آ جاتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کھانے کی ساری حلاوت ختم ہو جاتی اور اس کی وجہ سے وہ کھانا کافی نہ ہوتا۔

رہائش کی نعمت پر شکر

چوتھا جملہ ارشاد فرمایا:

((وَآوَانَا))

اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہمیں ٹھکانہ دیا۔ کیونکہ اگر کھانے کو بھی مل جاتا اور پینے کو بھی مل جاتا لیکن سر چھپانے کو گھر نہ ہوتا تو یہ کھانا بیکار ہو جاتا۔ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہمیں سر چھپانے کو گھر بھی عطا فرمایا جس میں ہم آرام کر سکیں۔

تمام نعمتوں کے جمع ہونے پر شکر

پانچواں جملہ ارشاد فرمایا:

((وَأَرْوَانَا))

اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہمیں سیراب کر دیا۔ سیراب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کھانے اور پینے سے متعلق جتنی نعمتیں ہو سکتی تھیں، وہ سب آپ نے ہمارے لئے جمع فرما دیں۔

اسلام کی دولت پر شکر

پھر آخری جملہ ارشاد فرمایا:

((وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ))

اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہمیں مسلمانوں میں سے کر دیا۔ یہ نعمت تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے، کیونکہ بالفرض اگر ہمیں کھانا تو اچھا میسر ہوتا اور پیٹ بھر کر خوشگوار حالات میں کھانا کھاتے، پینے کو پانی بھی میسر ہوتا، سر چھپانے کو گھر بھی میسر ہوتا، لیکن ایمان کی دولت نہ ہوتی تو یہ سب نعمتیں بیکار تھیں، اس لئے کہ ایمان کے بغیر ان نعمتوں کا انجام جہنم کی سزا کی شکل میں ہمیں بھگتنا پڑتا، اس لئے اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہمیں یہ نعمتیں بھی عطا فرمائیں اور پھر ہمیں مسلمانوں میں سے بنایا اور ہمیں اسلام کی اور ایمان کی توفیق عطا فرمائی۔

معنی کی کائنات پوشیدہ ہے

آپ دیکھیں کہ اس دعا کے الفاظ چند سیکنڈ میں زبان سے ادا ہو جاتے ہیں لیکن ان الفاظ میں معنی کی کائنات پوشیدہ ہے۔ جو اللہ کا بندہ ہر کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور یہ درخواست پیش کرتا ہو اور اس طرح شکر ادا کرتا ہو، کیا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتوں سے محروم فرما دیں گے؟ کیا اللہ تعالیٰ اس پر کرم نہیں فرمائیں گے؟ کیا اس کی دنیا و آخرت بہتر نہیں ہو جائے گی؟ یقیناً ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے حضورِ اقدس ﷺ نے یہ دعا تلقین فرمائی۔

خلاصہ

یہ مختصر سی دعا ہے، اگر ہر مسلمان اس کے پڑھنے کا اہتمام کرلے اور ذرا دھیان کر کے پڑھے کہ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ کی عطا ہیں، ان کی دی ہوئی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس میں میرے لئے برکت عطا فرمائی ہے اور یہ سوچ کر دعا کرے گا تو اس کا رُواں رُواں اللہ تعالیٰ کا شکرگزار ہوگا، اور شکر کرنے پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾(۱)

اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور تمہیں اور زیادہ دوں گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو حضور اقدس ﷺ کی اس تعلیم پر اور تمام تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(۱) ابراھیم: ۷

سلام کرنے کے آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِسَبْعٍ: ((عِيَادَةِ الْمَرِيْضِ وَ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَتَشْمِيْتِ الْعَاطِسِ وَنَصْرِ الضَّعِيْفِ وَعَوْنِ الْمَظْلُوْمِ وَاِفْشَاءِ السَّلَامِ وَاِبْرَارِ الْمُقْسِمِ))(۱)

سات باتوں کا حکم

''حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا (۱) مریض کی عیادت کرنا (۲) جنازوں کے پیچھے چلنا (۳) چھینکنے والے کہنے کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا (۴) کمزور آدمی کی مدد کرنا (۵) مظلوم کی امداد کرنا (۶) سلام کو رواج دینا (۷) قسم کھانے والے کی قسم کو پورا کرنے میں تعاون کرنا''

ان سات میں سے الحمدللہ پانچ چیزوں کا بیان ہو چکا' چھٹی چیز ہے سلام کو رواج دینا' اور آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت سلام کرنا۔ سلام کرنے کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ایسا مقرر فرمایا ہے جو ساری دوسری قوموں سے بالکل ممتاز ہے' ہر قوم کا یہ دستور ہے کہ جب وہ آپس میں ملاقات کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی لفظ ضرور استعمال کرتے ہیں۔ کوئی ''ہیلو'' کہتا ہے۔ کوئی ''گڈ مارننگ'' کہتا ہے۔ کوئی ''گڈ ایوننگ'' کہتا ہے۔ کوئی ''نمستے'' کہتا ہے۔ کوئی ''نمسکار'' کہتا ہے۔ گویا کہ ہر قوم والے کوئی نہ کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اللہ جل جلالہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے

☆ اصلاحی خطبات (۶/۱۸۲ تا ۱۹۵) ستمبر ۱۹۹۳ء جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاري، كتاب الاستئذان، باب افشاء السلام، رقم: ۵۷٦٦، مسند أحمد، رقم: ۱۷۷۷۳

ہمارے لئے جو لفظ تجویز فرمایا ہے وہ تمام الفاظ سے نمایاں اور ممتاز ہے، وہ ہے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ''

سلام کرنے کا فائدہ

دیکھئے اگر آپ نے کسی سے ملاقات کے وقت ''ہیلو'' کہہ دیا تو آپ کے اس لفظ سے اس کو کیا فائدہ ہوا؟ دنیا کا کوئی فائدہ ہوا یا آخرت کا کوئی فائدہ ہوا؟ ظاہر ہے کہ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لیکن اگر آپ نے ملاقات کے وقت یہ الفاظ کہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''تم پر سلامتی ہو، اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں'' تو ان الفاظ سے یہ فائدہ ہوا کہ آپ نے ملاقات کرنے والے کو تین دعائیں دیدیں، اور اگر آپ نے کسی کو ''گڈ مارننگ'' کہا یعنی صبح بخیر، تو اگر اس کو دعا کے معنی پر بھی محمول کرلیں تو اس صورت میں آپ نے جو اس کو دعا دی، وہ صرف صبح اور شام کی حد تک محدود ہے کہ تمہاری صبح اچھی ہو جائے، یا تمہاری شام اچھی ہو جائے، لیکن اسلام نے ہمیں جو کلمہ سکھایا، وہ ایسا جامع کلمہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ بھی کسی مخلص مسلمان کا سلام اور دعا ہمارے حق میں اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے تو انشاء اللہ ساری گندگی ہم سے دور ہو جائے گی، اور دنیا و آخرت کی فلاح حاصل ہو جائے گی۔ یہ نعمت آپ کو دنیا کی دوسری قوموں میں نہیں ملے گی۔

سلام اللہ کا عطیہ ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کو جاؤ اور فرشتوں کی جو جماعت بیٹھی ہے اس کو سلام کرو۔ اور وہ فرشتے جو جواب دیں اس کو سننا، اس لئے کہ وہ تمہارا اور تمہاری اولاد کو سلام ہوگا، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے جا کر سلام کیا اور ''السلام علیکم'' کہا تو فرشتوں نے جواب میں کہا: ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' چنانچہ فرشتوں نے لفظ ''رحمۃ اللہ'' بڑھا کر جواب دیا۔ (۱)

یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس طرح عطا فرمائی۔ اگر ذرا غور کریں تو یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کا حد وحساب ہی نہیں۔ اب اس سے زیادہ ہماری بدنصیبی کیا ہوگی کہ اس اعلیٰ ترین کلمے کو چھوڑ کر ہم اپنے بچوں کو ''گڈ مارننگ'' ''گڈ ایوننگ'' سکھائیں۔ اور دوسری قوموں کی نقالی کریں۔ اس سے زیادہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب بدء السلام، رقم: ٥٧٥٩، صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها وأهلها، باب یدخل الجنة أقوام أفئدتهم مثل أفئدة الطیر، رقم: ٥٠٧٥، مسند أحمد، رقم: ٧٨٢٤

ناقدری اور ناشکری اور محرومی اور کیا ہوگی۔

سلام کرنے کا اجر وثواب

افضل طریقہ یہ ہے کہ ملاقات کے وقت پورا سلام کیا جائے۔ یعنی "السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہ" صرف "السلام علیکم" کہہ دیا تب بھی سلام ہو جائے گا۔ لیکن تین جملے بولنے میں زیادہ اجر وثواب ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ مجلس میں تشریف فرما تھے، ایک صحابی تشریف لائے اور کہا: "السلام علیکم" آپ نے ان کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: "دس" اس کے بعد دوسرے صحابی آئے اور آکر سلام کیا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" آپ نے ان کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا "بیس" اس کے بعد تیسرے صحابی آئے اور آکر سلام کیا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آپ نے ان کو سلام کا جواب دیا اور فرمایا "تیس"۔(۱)

آپ کا مطلب یہ تھا کہ "السلام علیکم" کہنے میں دس اور ساتھ ورحمۃ اللہ کہنے میں بیس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اور "السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہنے میں تیس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ اگرچہ سلام کی سنت صرف "السلام علیکم" کہنے سے ادا ہو جاتی ہے۔ دیکھئے: ان الفاظ میں دعا بھی ہے اور اجر وثواب الگ ہے۔

اور جب سلام کیا جائے تو صاف الفاظ سے سلام کرنا چاہیے، الفاظ بگاڑ کر مسخ کر کے سلام نہیں کرنا چاہئے، بعض لوگ اس طرح سلام کرتے ہیں کہ جس کی وجہ سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا کیا الفاظ کہے؟ اس لئے پوری طرح واضح کر کے "السلام علیکم" کہنا چاہئے۔

سلام کے وقت یہ نیت کرلیں

ایک بات میں اور غور کیجئے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ہمیں جو کلمہ تلقین فرمایا وہ ہے "السلام علیکم" جو جمع کا صیغہ ہے۔ "السلام علیک" نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ "السلام علیک" کے معنی ہیں "تجھ پر سلامتی ہو" اور السلام علیکم کے معنی ہیں کہ تم پر سلامتی ہو۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس طرح ہم لوگ اپنی گفتگو میں "تو" کے بجائے "تم" یا "آپ" کے لفظ سے خطاب کرتے ہیں اس کے ذریعہ مخاطب کی تعظیم مقصود ہوتی ہے اسی طرح "السلام علیکم" میں جمع کا لفظ مخاطب کی تعظیم کے لئے لایا گیا ہے۔

(۱) سنن أبی داود، کتاب الادب، باب کیف السلام، رقم: ٤٥٢١، سنن الدارمی، کتاب الاستئذان، باب فی فضل التسلیم ورده، رقم: ٢٥٢٦

لیکن بعض علماء نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ اس لفظ سے ایک تو مخاطب کی تعظیم مقصود ہے۔ دوسرے یہ کہ جب تم کسی کو سلام کرو تو سلام کرتے وقت یہ نیت کرو کہ تین افراد پر سلام کرتا ہوں۔ جو اس کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں۔ جن کو "کراماً کاتبین" کہا گیا ہے ایک فرشتہ انسان کی نیکیاں لکھتا ہے، دوسرا فرشتہ اس کی برائیاں لکھتا ہے' اس لئے سلام کرتے وقت ان کی بھی نیت کرلو، تا کہ تمہارا سلام تین افراد کو ہو جائے۔ اور اب انشاء اللہ تین افراد کو سلام کرنے کا ثواب مل جائے۔ اور جب تم فرشتوں کو سلام کرو گے تو وہ تمہارے سلام کا ضرور جواب بھی دیں گے۔ اور اس طرح ان فرشتوں کی دعائیں تمہیں حاصل ہو جائیں گی جو اللہ تعالیٰ کی معصوم مخلوق ہیں۔

نماز میں سلام پھیرتے وقت کی نیت

اسی وجہ سے بزرگوں نے فرمایا کہ نماز کے اندر جب آدمی سلام پھیرے تو داہنی طرف سلام پھیرتے وقت یہ نیت کرلے کہ میرے دائیں جانب جتنے مسلمان اور جتنے فرشتے ہیں۔ ان سب پر سلامتی بھیج رہا ہوں۔ اور جب بائیں جانب سلام پھیرے تو اس وقت یہ نیت کرلے کہ میرے بائیں جانب جتنے مسلمان اور جتنے فرشتے ہیں۔ ان سب پر سلامتی بھیج رہا ہوں۔ اور پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ تم فرشتوں کو سلام کرو اور وہ جواب نہ دیں۔ وہ ضرور جواب دیں گے اور اس طرح ان کی دعائیں تمہیں حاصل ہو جائیں گی۔ لیکن ہم لوگ بے خیالی میں سلام پھیر دیتے ہیں اور نیت نہیں کرتے جس کی وجہ سے اس عظیم فائدے اور ثواب سے محروم رہ جاتے ہیں۔

جواب سلام سے بڑھ کر ہونا چاہئے

سلام کی ابتداء کرنا بڑا اجر و ثواب کا موجب ہے اور سنت ہے۔ اور سلام کا جواب دینا واجب ہے' قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا﴾(۱)

فرمایا کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس کے سلام سے بڑھ کر جواب دو کم از کم ویسا جواب دو جیسا اس نے سلام کیا۔ مثلاً کسی نے "السلام علیکم" کہا تو تم جواب میں "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہو، تا کہ جواب سلام سے بڑھ کر ہو جائے، ورنہ کم از کم "وعلیکم السلام" ہی کہہ دو تا کہ جواب برابر ہو جائے۔

(۱) النساء: ۸۶

مجلس میں ایک مرتبہ سلام کرنا

اگر مجلس میں بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔اور ایک شخص اس مجلس میں آئے، تو وہ آنے والا شخص ایک مرتبہ سب کو سلام کرلے تو یہ کافی ہے۔اور مجلس میں سے ایک شخص اس کے سلام کا جواب دیدے تو سب کی طرف سے واجب ادا ہو جاتا ہے۔ ہر ایک کو علیحدہ جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

ان مواقع پر سلام کرنا جائز نہیں

سلام کرنا بہت سی جگہ پرنا جائز بھی ہوتا ہے۔مثال جب کوئی شخص دوسرے لوگوں سے کوئی دین کی بات کررہا ہو، اور دوسرے لوگ سن رہے ہوں۔تو اس وقت آنے والے کو سلام کرنا جائز نہیں۔ بلکہ سلام کئے بغیر مجلس میں بیٹھ جانا چاہئے۔اسی طرح اگر ایک شخص تلاوت کررہا ہے۔اس کو سلام کرنا بھی جائز نہیں۔اسی طرح ذکر کرنے والے کو سلام کرنا جائز نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی آدمی کسی کام میں مشغول ہو اور اس بات کا اندیشہ ہو کہ تمہارے سلام کا جواب دینے سے اس کے کام میں حرج ہوگا، ایسی صورت میں سلام کرنے کو پسند نہیں کیا گیا۔اس لئے ایسے موقع پر سلام نہیں کرنا چاہئے۔

دوسرے کے ذریعہ سلام بھیجنا

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کا سلام پہنچاتا ہے۔کہ فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے، اور دوسرے شخص کے ذریعہ سلام بھیجنا بھی سنت ہے۔اور یہ بھی سلام کے قائم مقام ہے، اور اس کے ذریعے بھی سلام کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔لہٰذا جب کسی کو دوسرے کا سلام پہنچایا جائے تو اس کے جواب کا مسنون طریقہ یہ ہے ''علیھم وعلیکم السلام'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر بھی سلامتی ہو، جنہوں نے سلام بھیجا ہے۔اور تم پر بھی سلامتی ہو۔اس میں دو سلام اور دو دعائیں جمع ہو گئیں۔اور دو آدمیوں کو دعا دینے کا ثواب مل گیا۔

بعض لوگ اس موقع پر بھی صرف ''وعلیکم السلام'' سے جواب دیتے ہیں۔اس سے جواب تو ادا ہو جائے گا۔لیکن صحیح جواب نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس صورت میں آپ نے اس شخص کو تو سلامتی کی دعا دے دی جو سلام لانے والا ہے۔اور وہ شخص جو اصل سلام بھیجنے والا تھا۔اس کو دعا نہیں دی۔اس لئے جواب دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ''علیھم وعلیکم السلام'' کہہ کر جواب دیا جائے۔

تحریری سلام کا جواب واجب ہے

اگر کسی کے پاس کسی شخص کا خط آئے اور اس خط میں ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' لکھا ہو تو اس کے بارے میں بعض علماء نے فرمایا کہ اس سلام کا تحریری جواب دینا چونکہ واجب ہے' اس لئے خط کا جواب دینا بھی واجب ہے۔ اگر خط کے ذریعہ اس کے سلام کا جواب اور اس کے خط کا جواب نہیں دیں گے تو ایسا ہوگا کہ جیسے کوئی شخص آپ کو سلام کرے اور آپ جواب نہ دیں۔

لیکن بعض دوسرے علماء نے فرمایا کہ اس خط کا جواب دینا واجب نہیں ہے۔ اس لئے کہ خط کا جواب دینے میں پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ اور کسی انسان کے حالات بعض اوقات اس کے متحمل نہیں ہوتے کہ وہ پیسے خرچ کرے، اس لئے اس خط کا جواب دینا واجب تو نہیں ہے، لیکن مستحب ضرور ہے، البتہ جس وقت خط کے اندر سلام کے الفاظ پڑھے، اس وقت زبان سے اس سلام کا جواب دینا واجب ہے اور اگر خط پڑھتے وقت بھی زبان سے سلام کا جواب نہ دیا اور نہ خط کا جواب دیا۔ تو اس صورت میں ترک واجب کا گناہ ہوگا، اس میں ہم سے کتنی کوتاہی ہوتی ہے کہ خط آتے ہیں اور پڑھ کر اس کو ویسے ہی ڈال دیتے ہیں نہ زبانی جواب دیتے ہیں نہ تحریری جواب دیتے ہیں۔ اور مفت میں ترک واجب کا گناہ اپنے نامہ اعمال میں لکھوا لیتے ہیں۔ یہ سب ناواقفیت کی وجہ سے کر لیتے ہیں۔ اس لئے جب بھی خط آئے تو فوراً زبانی سلام کا جوب دیدینا چاہئے۔

غیر مسلموں کو سلام کرنے کا طریقہ

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ غیر مسلم کو سلام کرنا جائز نہیں۔ اگر غیر مسلم سے ملاقات ہو اور اسے سلام کرنے کی ضرورت پیش آئے تو سلام کے لئے وہ لفظ استعمال کرے جو لفظ وہ لوگ خود استعمال کرتے ہیں، لیکن اگر غیر مسلم کسی مسلمان سے ملاقات کے وقت'' السلام علیکم'' کہے تو ان کے جواب میں صرف ''وعلیکم'' کہے۔ اور پورا جواب نہ دے۔ اور یہ لفظ کہتے وقت یہ نیت کر لے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو ہدایت کی اور مسلمان بننے کی توفیق ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں مدینے منورہ میں اور اس کے آس پاس بڑی تعداد میں یہودی آباد تھے' یہ قوم ہمیشہ سے شریر قوم ہے۔ چنانچہ جب حضور اقدس ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب سامنے آتے تو یہ لوگ خباثت سے کام لیتے ہوئے ان کو سلام کرتے ہوئے کہتے ''السام علیکم'' لام درمیان سے نکال دیتے تھے' اب سننے والا جلدی میں یہی سمجھتا ہے کہ اس نے'' السلام علیکم'' کہا ہے۔'' سام'' کے معنی عربی زبان میں موت اور ہلاکت کے ہیں۔'' السام علیکم'' کے معنی ہوئے کہ تمہیں موت آجائے۔ اور تم ہلاک اور تباہ ہو جاؤ،

ظاہر میں تو سلام کرتے۔ اور حقیقت میں بددعا دیتے تھے۔ کچھ روز تک یہ معاملہ چل گیا۔ لیکن چند روز کے بعد صحابہ نے سمجھ لیا کہ یہ لوگ جان بوجھ کر درمیان سے لام حذف کر کے ''السام علیکم'' کہتے ہیں۔ (۱)

ایک یہودی کا سلام کرنے کا واقعہ

ایک مرتبہ یہودیوں کی ایک جماعت نے آ کر حضورِ اقدس ﷺ کو اس طرح سلام کیا:

''اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ الفاظ سنے تو ان کو غصہ آ گیا اور جواب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''عَلَیْکُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ''

''تم پر ہلاکت ہو اور لعنت ہو''

دو لفظ بول دیئے، حضورِ اقدس ﷺ نے سن لیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ترکی بترکی جواب دیا ہے، تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

((مَهْلًا یَا عَائِشَةُ))

''اے عائشہ! رک جاؤ اور نرمی سے کام لو''

پھر فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الرِّفْقَ فِی الْأَمْرِ کُلِّهِ))

''اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں نرمی کو پسند فرماتے ہیں''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ کیسے گستاخ ہیں کہ آپ سے خطاب کرتے ہوئے ''السام علیکم'' کہہ رہے ہیں۔ اور ہلاکت کی بددعا کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا: اے عائشہ! ''السام علیکم'' کہا تو میں نے جواب میں کہا ''وعلیکم''

مطلب یہ ہے کہ جو بددعا تم ہمارے لئے کر رہے ہو اللہ تعالیٰ وہ تمہارے حق میں قبول کرلے۔ لہٰذا غیر مسلم کے سلام کے جواب میں صرف ''وعلیکم'' کہنا چاہئے۔ پھر آپ نے فرمایا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب کیف یرد علی أهل الذمة السلام، رقم: ۵۷۸۶، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب النهی عن ابتداء أهل الکتاب بالسلام و کیف یرد، رقم: ۴۰۲۷، سنن الترمذی، کتاب الاستئذان و الآداب عن رسول الله، باب ماجاء فی التسلیم علی اهل الذمة، رقم: ۲۶۲۵، مسند أحمد، رقم: ۲۲۹۶۱

((يَا عَائِشَةُ! مَا كَانَ الرِّفْقُ فِيْ شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ وَلَانُزِعَ عَنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ))

''اے عائشہ! نرمی جس چیز میں ہوگی اس کو زینت بخشے گی اور جس چیز سے نکال دی جائے گی اس کو عیب دار کردے گی''(۱)

اس لئے معاملہ حتی الامکان نرمی سے کرنا چاہئے۔ چاہے مقابلے پر کفار ہی ہوں۔

حتی الامکان نرمی کرنا چاہئے

آپ دیکھئے کہ یہودی نے حضور اقدس ﷺ کے ساتھ گستاخی کی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو الفاظ جواب میں فرمائے بظاہر وہ انصاف کے خلاف نہیں تھے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے یہ سکھا دیا کہ میری سنت یہ ہے کہ نرمی کا معاملہ کرو۔ اور صرف اتنی بات زبان سے ادا کرو جتنی ضرورت ہے۔ بلاوجہ اپنی طرف سے بات آگے بڑھا کر سختی کا برتاؤ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔

سلام ایک دعا ہے

بہرحال یہ ''سلام'' معمولی چیز نہیں یہ زبردست دعا ہے۔ اور اس کو دعا کی نیت سے کہنا اور سننا چاہئے۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر ایک آدمی کی بھی دعا ہمارے حق میں قبول ہو جائے تو ہمارا بیڑہ پار ہو جائے۔ اس لئے کہ اس میں دنیا و آخرت کی ساری نعمتیں جمع ہیں۔ یعنی تم پر سلامتی ہو۔ اللہ کی رحمت ہو۔ اور اللہ کی برکت ہو۔ اس لئے یہ دعا لوگوں سے لینی چاہئے۔ اور اس شوق اور ذوق میں لینی چاہئے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کی زبان میرے حق میں مبارک کردے۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کی حالت

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے دادا پیر ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں۔ اور حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں۔ ہر وقت ذکر اللہ میں مصروف رہتے تھے۔ کوئی وقت اللہ کے ذکر سے خالی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ حجام سے حجامت بنوا رہے تھے

(۱) صحيح البخاري، كتاب الاستئذان، باب كيف يرد على أهل الذمة السلام، رقم: ۵۷۸۶، صحيح مسلم، كتاب السلام، باب النهي عن ابتداء أهل الكتاب بالسلام و كيف يرد، رقم: ۴۰۲۷، سنن الترمذي، كتاب الاستئذان و الآداب عن رسول الله، باب ماجاء في التسليم على أهل الذمة، رقم: ۲۶۲۵، مسند أحمد، رقم: ۲۲۹۶۱

جب مونچھیں بنانے کا وقت آیا تو حجام نے دیکھا کہ زبان حرکت کر رہی ہے۔ اور ہونٹ ہل رہے ہیں۔ حجام نے کہا کہ حضرت تھوڑی دیر کے لئے منہ بند کر لیجئے، تاکہ میں آپ کی مونچھیں بنالوں، حضرت نے جواب دیا کہ تم تو اپنا کام کر رہے ہو، میں اپنا کام نہ کروں؟ آپ کا یہ حال تھا۔ ہر وقت زبان پر ذکر جاری تھا۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

ان کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ راستے میں دیکھا کہ ایک سقہ لوگوں کو پانی پلا رہا ہے اور یہ آواز لگا رہا ہے کہ ''اللہ اس بندے پر رحم کرے جو مجھ سے پانی پئے'' حضرت معروف کرخی اس سقہ کے پاس گئے۔ اور اس سے کہا کہ ایک گلاس پانی مجھے بھی پلا دو چنانچہ اس نے دیدیا آپ نے پانی لے کر پی لیا، ایک ساتھی جوان کے ساتھ تھے، انہوں نے کہا کہ حضرت آپ تو روزے سے تھے اور آپ نے پانی پی کر روزہ توڑ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اللہ کا بندہ دعا کر رہا تھا کہ اللہ اس بندے پر رحم کرے جو مجھ سے پانی پی لے، مجھے خیال آیا کہ کیا معلوم اللہ تعالیٰ اس کی دعا میرے حق میں قبول کر لے، نفل روزہ جو توڑ دیا اس کی قضا تو بعد میں کر لوں گا، لیکن بعد میں اس بندے کی دعا مجھے مل سکے گی یا نہیں، اس لئے میں نے اس بندے کی دعا لینے کے لئے پانی پی لیا۔

اب آپ اندازہ لگائیے کہ اتنے بڑے اللہ کے ولی، اتنے بڑے بزرگ، اتنے بڑے صوفی، لیکن ایک معمولی سے سقے کی دعا لینے کے لئے روزہ توڑ دیا۔ کیوں روزہ توڑ دیا؟ اس لئے کہ یہ حضرات اللہ کے بندوں کی دعائیں لینے کے حریص ہوتے ہیں کہ پتہ نہیں کس کی دعا کس وقت ہمارے حق میں قبول ہو جائے۔

''شکریہ'' کے بجائے ''جزاکم اللہ'' کہنا چاہئے

اسی وجہ سے ہمارے دین میں ہر ہر موقع کے لئے دعائیں تلقین کی گئی ہیں۔ مثلاً چھینکنے والے کے جواب میں کہو: ''یرحمک اللہ'' اللہ تم پر رحم کرے۔ ملاقات کے وقت ''السلام علیکم'' کہو یعنی تم پر سلامتی ہو، کوئی تمہارے ساتھ بھلائی کرے تو کہو ''جزاکم اللہ'' اللہ تعالیٰ تمہیں بدلہ دے۔

آج کل یہ رواج ہو گیا ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے کے ساتھ کوئی بھلائی کرتا ہے تو اس کے جواب میں کہتا ہے کہ ''آپ کا بہت بہت شکریہ'' یہ لفظ کہنا یا شکریہ ادا کرنا کوئی گناہ کی بات نہیں۔ اچھی بات ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

((مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ))(۱)

''جو شخص انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتا''

لیکن شکریہ ادا کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جس کا شکر ادا کر رہے ہو اس کو کچھ دعا دے دو۔ تاکہ اس دعا کے نتیجے میں اس کا فائدہ ہو جائے۔ کیونکہ اگر آپ نے کہا کہ ''بہت بہت شکریہ'' تو ان الفاظ کے کہنے سے اس کو کیا ملا؟ کیا دنیا یا آخرت کی کوئی نعمت مل گئی؟ یا اس کو کوئی فائدہ پہنچا؟ کچھ نہیں ملا۔ لیکن جب تم نے ''جزاکم اللہ'' کہا تو اس کو ایک دعا مل گئی۔

بہرحال! اسلام میں یہ طریقہ سکھایا گیا کہ قدم قدم پر دوسروں کو دعائیں دو اور دعائیں لو۔ اس لئے ان کو اپنے معمولات میں اور شب و روز کی گفتگو میں شامل کر لینا چاہئے۔ خود بھی ان کی عادت ڈالیں۔ اور بچوں کو بھی بچپن ہی سے ان کلمات کو ادا کرنا سکھائیں۔

سلام کا جواب بلند آواز سے دینا چاہئے

ایک صاحب نے پوچھا ہے کہ سلام کا جواب بلند آواز سے دینا ضروری ہے یا آہستہ آواز سے بھی جواب دے سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ویسے تو سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ البتہ اتنی آواز سے جواب دینا کہ سلام کرنے والا وہ جواب سن لے، یہ مستحب اور سنت ہے لیکن اگر اتنی آہستہ آواز سے جواب دیا کہ مخاطب نے وہ جواب نہیں سنا تو واجب تو ادا ہو جائے گا، لیکن مستحب ادا نہیں ہوگا۔ لہٰذا بلند آواز سے جواب دینے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

❀❀❀

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ماجاء فی الشکر لمن أحسن إلیك، رقم: ۱۸۷۸، مسند أحمد، رقم: ۷۱۹۱

سفر کی مختلف دعائیں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ط إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ o﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گزشتہ چند جمعوں سے حضورِ اقدس ﷺ کی مسنون دعاؤں کی تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے، متعدد دعاؤں کے بارے میں تفصیلی بیان ہو چکا۔ جب صبح کو انسان اپنی ابتدائی ضروریات پوری کرنے کے بعد گھر سے نکلتا ہے اور اپنی عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اس وقت اس کے سامنے بے شمار حاجتیں ہوتی ہیں، کبھی ان حاجتوں کے پورا کرنے کے لئے گھر سے نکلنا پڑتا ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا پڑتا ہے، اس کے لئے اس کو سواری کی ضرورت ہوتی ہے، اور جس مقصد کے لئے جا رہا ہے اس میں کامیابی چاہتا ہے، اس لئے جب آدمی گھر سے نکلے تو اس وقت یہ دعا کرلے کہ یا اللہ! جس مقصد کے لئے میں جا رہا ہوں، اس مقصد میں مجھے کامیابی عطاء فرمایئے اور اس مقصد کو میرے لئے آسان کر دیجئے۔ یہ دعا کرنے کے بعد گھر سے نکلے۔

سواری پر بیٹھنے کی دعا

اس کے بعد جب سواری پر بیٹھے تو یہ دعا پڑھے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ o وَإِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾(۲)

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۲۹۹ تا ۳۱۴)

(۱) المؤمن: ٦٠، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ: "مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، بے شک جو لوگ تکبر کی بنا پر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے"

(۲) الزخرف: ١٣۔ ١٤، اس قرآنی دعا کا ترجمہ یہ ہے:

قرآن کریم میں اس دعا کا ذکر گھوڑوں اور اُونٹوں کی سواری کے سیاق میں آیا ہے کہ جب گھوڑوں اور اُونٹوں پر سواری کرو تو یہ دعا پڑھو۔ اب چونکہ گھوڑوں اور اُونٹوں کا زمانہ نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ اللہ تعالیٰ نے دوسری سواریاں پیدا فرمادی ہیں، اس لئے جب ان سواریوں پر سوار ہوں تو اس وقت یہ دعا پڑھیں۔

ان جانوروں کو تمہارے تابع بنادیا ہے

اس دعا کا ترجمہ یہ ہے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے لئے مسخر کردیا یعنی رام کردیا اور ہمارے اندر اپنی ذات میں وہ طاقت نہیں تھی کہ اس سواری کو اپنے لئے رام کر لیتے اور ہم سب کو لوٹ کر اپنے رب کے پاس جانا ہے۔ یہ دعا اس وقت بتائی گئی تھی جب گھوڑوں اور اُونٹوں پر سفر ہوتے تھے۔ لہٰذا اس دعا کے ذریعہ اس طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ جب تم گھوڑے پر سواری کررہے ہو، ذرا اس بات پر غور کرو کہ تم زیادہ طاقتور ہو یا گھوڑا زیادہ طاقتور ہے؟ اگر طاقت کے اعتبار سے موازنہ کرو تو تمہارا گھوڑے سے کوئی مقابلہ نہیں، گھوڑا تم سے کہیں زیادہ طاقت والا ہے۔ آج کل تو انجنوں کی طاقت کو گھوڑے کی طاقت سے ناپتے ہیں کہ یہ انجن اتنے ''ہارس پار'' کا ہے اور یہ انجن اتنے ''ہارس پاور'' کا ہے۔ بہرحال! یہ گھوڑا انسان سے کئی گنا زیادہ طاقتور ہے، لیکن اتنا قوی جانور تمہارے ہاتھ میں ایسا رام ہوگیا ہے کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی اس کے منہ میں لگام ڈال کر اس کو جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے، کبھی گھوڑے نے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ تم مجھ پر کیوں سواری کرتے ہو، تم کمزور ہو، میں زیادہ طاقتور ہوں، لہٰذا میں تمہارے اُوپر سواری کیوں نہ کروں؟ تم مجھ سے خدمت کیوں لے رہے ہو، تم میری خدمت کیوں نہ کرو؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان جانوروں کو تمہارے تابع فرمان بنادیا ہے، تمہارے ہاتھ میں مسخر کردیا ہے، تمہارے ہاتھ میں رام کردیا ہے۔

اُونٹ تمہارا تابع ہے

یہ صرف گھوڑے کی خصوصیت نہیں بلکہ اور جتنے جانور جن سے انسان کام لیتا ہے، ان سب کا یہی حال ہے، اُونٹ گھوڑے سے بھی زیادہ طاقت والا ہے، خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اُونٹ کے بارے میں فرمایا:

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ''پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے بس میں دے دیا، ورنہ ہم میں یہ طاقت نہیں تھی کہ اس کو قابو میں لاسکتے، اور بیشک ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں''

﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ﴾(۱)

''کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے''

یہ اُونٹ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا عجوبہ ہے۔ اسی طرح گائے ہے، تم روزانہ اس کا دودھ نکال کر پیتے ہو، اس گائے نے کبھی انکار نہیں کیا، نہ کبھی یہ کہا کہ میں تمہاری خدمت کیوں کروں؟ تم میری خدمت کیوں نہ کرو؟ ان ساری مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے تابع فرمان کردیا اور تمہارے کام پر لگادیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔

انسان اس موقع پر اللہ کو یاد کرے

جب تم ان سب مخلوقات کے مخدوم بنے پھرتے ہو تو آخر تمہارا بھی تو کچھ فرض ہے یا نہیں؟ تم ان سب سے کام لے رہے ہو، لہٰذا جب تم ان سے کام لو اور ان پر سواری کرو تو زبان سے یہ کہہ دو:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ o وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾(۲)

اگر اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کے دل میں یہ بات نہ ڈالی ہوتی کہ انسانوں کی خدمت کرو بلکہ خود انسان کو اپنے طور پر ان جانوروں کو رام کرنا پڑتا تو یہ بات انسان کے بس میں نہیں تھی۔

موجودہ دور کی سواریوں کا قرآن میں ذکر

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس دعا کا موقع اس وقت تھا جب گھوڑوں اور اُونٹوں پر سواری ہوتی تھی اور ان جانوروں کو انسانوں کے لئے مسخر کردیا گیا تھا اور اب چونکہ گھوڑوں اور اُونٹوں پر سواری نہیں ہوتی، اس لئے اس دعا کے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات درست نہیں، بلکہ جتنی سواریاں پیدا ہونے والی تھیں اور جو سواریاں قیامت تک پیدا ہوں گی، اللہ تعالیٰ نے ان سب کا ذکر قرآن کریم میں پہلے ہی فرمادیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْکَبُوْھَا وَزِیْنَةًط وَیَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَo﴾(۳)

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے گھوڑے، گدھے اور خچر پیدا کیے تاکہ تم ان پر سواری کرو اور تمہارے لئے یہ زینت کا بھی سامان ہیں اور اللہ تعالیٰ وہ چیزیں پیدا کریں گے جو تم ابھی نہیں جانتے''

جس وقت قرآن کریم نازل ہورہا تھا، اس وقت صحابہ کرام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

---

(۱) الغاشیة: ۱۷ (۲) الزخرف: ۱۳۔ ۱۴ (۳) النحل: ۸

اللہ تعالیٰ تمہاری سواری کے لئے وہ چیزیں پیدا کرے گا جو تم ابھی نہیں جانتے، لہٰذا اس کے اندر موٹر بھی آگئی، اس میں ریل بھی آگئی، ہوائی جہاز بھی آگیا، اور قیامت تک جتنی سواریاں پیدا ہونے والی ہیں، وہ سب اس میں آگئیں۔

قرآن کریم میں ہوائی جہاز کا ذکر

سورۃ یٰسین میں ایک جگہ کشتی کا ذکر فرمایا کہ ہم نے سمندر میں سفر کے لئے کشتی پیدا کی، اس کے بعد فرمایا:

﴿وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ﴾(۱)

''تمہارے لئے کشتی جیسی ایک اور سواری پیدا کی ہے جس میں آئندہ تم سواری کرو گے''

بہت سے علماء نے فرمایا کہ اس سے ہوائی جہاز کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ لہٰذا جتنی سواریاں ہیں، وہ سب اللہ جل شانہ کی تخلیق ہیں، انسان نے ان کو بیشک اپنی ذہانت اور عقل سے ایجاد کیا ہے، لیکن یہ عقل اور ذہانت کس کی دی ہوئی تھی؟ کس نے وہ سمجھ اور ذہانت بخشی؟ کس ذات نے علم عطاء کیا جس کے ذریعہ وہ ان سواریوں کو ایجاد کر سکے؟ لہٰذا وہ حکم جو گھوڑوں اور اُونٹوں کے لئے تھا، وہ آج کی تمام سواریوں کے لئے ہے، چاہے وہ سائیکل ہو، چاہے موٹر سائیکل ہو، موٹر کار ہو، بس ہو، رکشہ ہو، ریل ہو، جہاز ہو، ان سب پر یہ حکم لاگو ہوتا ہے، کیونکہ یہ سواریاں بھی اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مسخر فرمادی ہیں۔

موجودہ دور کی سواریاں بھی مسخر کردی گئیں

لہٰذا اس مسخر کرنے کا ادراک کرکے یہ دعا پڑھ لو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے یہ سواری ہمارے لئے مسخر فرمادی۔ کیونکہ بعض اوقات یہ سواریاں بھی خراب ہوجاتی ہیں، چل کر نہیں دیتیں بلکہ پریشان کرتی ہیں، لیکن اس وقت جب میں ان پر سوار ہو رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اس کو میرے لئے مسخر کردیا ہے، میں اس سے فائدہ اُٹھا رہا ہوں۔ جب ایک مرتبہ تم اس بات کا احساس اور ادراک کرلو گے تو ایک طرف تو تمہارا رابطہ اللہ تعالیٰ سے جڑ گیا اور دوسری طرف تمہارا یہ سوار ہونا اور یہ سفر کرنا پورا کا پورا عبادت بن گیا، اس لئے کہ تم نے یہ سفر اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اور اس کے انعام پر شکر ادا کرنے کے بعد شروع کیا ہے اور شکر بڑی عظیم عبادت ہے۔

---

(۱) یٰس: ۴۲

اس سفر میں اصل سفر کو یاد کرو

پھر آخر میں ایک جملہ ارشاد فرمایا:

﴿وَإِنَّآ إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾

یعنی ہم ایک دن اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یعنی ہم جو سفر کر رہے ہیں، یہ تو ایک چھوٹا سا سفر ہے جس میں ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے گئے، یہ بھی دنیا ہے اور وہ بھی دنیا ہے، لیکن اصل سفر ایک آنے والا ہے جو دنیا سے آخرت کی طرف ہوگا، اس عالم سے اُس عالم کی طرف ہوگا، اس فانی جہان سے ابدی اور دائمی جہان کی طرف ہوگا۔ لہٰذا اس آخری جملے میں اس طرف توجہ دلا دی کہ یہ سفر تو معمولی ہے، اگر اس سفر میں کامیاب ہوں تو کوئی بہت بڑا فائدہ نہیں اور اگر ناکامی ہو تو کوئی بہت بڑا نقصان نہیں، لیکن وہ سفر جس میں انسان بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جائے گا، وہ سفر بڑا عظیم الشان ہے، اس کی فکر کرنی چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کے اس معمولی سفر کی بھلائی کی خاطر ہم اس بڑے سفر کو قربان کر دیں اور اس کو بھول جائیں، بلکہ ہمیں اس موقع پر اس بڑے سفر کو بھی یاد رکھنا چاہئے۔ لہٰذا یہ کہو:

﴿وَإِنَّآ إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾

''ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں''

کہیں یہ سفر آخرت کو تباہ نہ کر دے

لہٰذا جس کام کے لئے جا رہے ہو، اس کام کو کرتے وقت اس بات کو مدِنظر رکھو کہ وہ کام کہیں آخرت کے سفر میں رکاوٹ نہ بن جائے اور آخرت کے سفر کو خراب نہ کر دے اور ہمارا انجام برا نہ ہو جائے۔ بہر حال! یہ دعا تین جملوں پر مشتمل ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ٥ وَإِنَّآ إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾(۱)

اگر آدمی ذرا سا ان کو سمجھ کر پڑھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سواری کی یہ نعمت عطاء فرمائی ہے جس کو قابو کرنا میرے بس میں نہیں تھا، اور ایک دن بڑا سفر پیش آنے والا ہے جو یا تو بالآخر ہمارے لئے دائمی عذاب کا ذریعہ ہوگا یا دائمی نعمتوں کا ذریعہ ہوگا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس چھوٹے سے سفر میں ہم کوئی ایسا کام کر گزریں جو ہماری آخرت کو تباہ کرنے والا ہو۔

(۱) الزخرف: ۱۳۔ ۱۴

لمبے سفر پر جاتے وقت حضورِ اقدس ﷺ کا معمول

یہ تو وہ دعا تھی جو ہر قسم کی سواری کے لئے پڑھی جاتی ہے، چاہے وہ سفر چھوٹا ہو یا بڑا ہو، قریبی مسافت پر جانا ہو یا بعید کی مسافت پر جانا ہو، لیکن اگر کوئی شخص لمبے سفر پر اور اپنے شہر سے باہر دوسرے شہر کی طرف جا رہا ہو تو اس موقع کے لئے حضورِ اقدس ﷺ نے اور عظیم دعائیں تلقین فرمائی ہیں، یہ ایسی دعائیں ہیں کہ کوئی انسان اس طرح مانگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ حضورِ اقدس ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب آپ مدینہ منورہ سے باہر کسی سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ فرماتے تو سب سے پہلے تین مرتبہ تکبیر فرماتے:

((اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ))

اس کے بعد جب سواری پر سوار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ٥ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾(۱)

اس کے بعد ایک عجیب دعا یہ فرماتے:

((اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِیْفَةُ فِی الْأَهْلِ اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَیْنَا هٰذَا السَّفَرَ وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهٗ))(۲)

سفر میں اللہ تعالیٰ کو ساتھی بنالیں

اس دعا میں پہلا جملہ ارشاد فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ))

اے اللہ! ہم آپ کو سفر میں اپنا ساتھی بناتے ہیں کہ آپ سفر میں ہمارے ساتھی ہیں۔ کیونکہ ہر انسان کو سفر میں ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے، اور جب سفر میں کوئی دشواری پیش آجائے تو وہ ساتھی کام دیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ فرمارہے ہیں کہ اے اللہ! ہم سفر پر روانہ ہو رہے ہیں، اس سفر میں ہم

---

(۱) الزخرف: ۱۳۔ ۱٤

(۲) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ما یقول إذا رکب إلی سفر الحج وغیرہ، رقم: ۲۳۹۲، سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ما یقول إذا خرج مسافرا، رقم: ۳۳٦۰، سنن النسائی، کتاب الإستعاذۃ، باب الإستعاذۃ من الحور بعد الکور، رقم: ٥٤۰۳، سنن أبی داؤد، کتاب الجهاد، باب ما یقول الرجل إذا سافر، رقم: ۲۲۳۱، مسند أحمد، رقم: ٦۰۲۹

آپ کو اپنا ساتھی بناتے ہیں، آپ ہمارے ساتھ رہئے گا۔ بتایئے! جب سفر میں اللہ تعالیٰ ساتھ ہو جائیں تو کہاں دشواری پیش آسکتی ہے، کہاں پریشانی آسکتی ہے۔ اگر یہ دعا قبول ہو جائے اور اللہ تعالیٰ واقعی ہمارے ساتھی بن جائیں تو پھر ہر کام آسان ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کو گھر والوں کے لئے نگران بنالیں

دوسرا جملہ ارشاد فرمایا:

((وَالْخَلِیْفَةُ فِی الْأَهْلِ))

اس جملے میں عجیب بات ارشاد فرمائی، وہ یہ کہ آپ سفر میں ہمارے ساتھی بھی ہوں اور ہمارے پیچھے ہمارے گھر والوں کے نگہبان بھی ہوں۔ کیونکہ اگر کوئی شخص ہمارے ساتھ ہوگا تو پھر گھر میں وہ نگہبان بن کر نہیں رہے گا، لیکن اے اللہ! آپ ایسے ہیں کہ جو ہر جگہ موجود ہیں، لہٰذا آپ ہمارے ساتھ سفر میں بھی ہوں اور ہمارے پیچھے ہمارے گھر والوں کے نگران اور نگہبان بھی بن جائیں اور ان کی حفاظت فرمائیں۔

دونوں مشکلات حل ہو گئیں

انسان جب کسی سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اس کے سامنے دو بڑی فکریں ہوتی ہیں۔ ایک فکر یہ ہوتی ہے کہ میرا سفر آسان ہو جائے، اس میں کوئی دشواری پیش نہ آئے اور میں اپنے سفر کے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔ دوسری فکر یہ ہوتی ہے کہ میں گھر سے باہر جا رہا ہوں، میرے پیچھے میرے گھر والوں کا کیا ہوگا؟ وہ کہیں کسی مشکل کا شکار نہ ہو جائیں۔ حضور اقدس ﷺ نے اس دعا میں مسافر کی دونوں مشکلات کو حل فرما دیا کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو، اپنے سفر کو بھی اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو اور اپنے پیچھے رہنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو۔ اگر مسافر کی یہ دونوں دعائیں قبول ہو جائیں تو پھر مسافر کی کوئی مشکل باقی نہیں رہے گی۔

اے اللہ سفر آسان فرما دے

پھر تیسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا هٰذَا السَّفَرَ وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهٗ))

''اے اللہ! ہمارے اس سفر کو آسان کر دیجئے اور اس کی دوری اور فاصلے کو لپیٹ دیجئے''

جب مسافر لمبے سفر پر روانہ ہوتا ہے تو وہ مسافت بڑی لمبی ہوتی ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے، اس لئے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے یہ دعا کرنی چاہئے تا کہ یہ سفر آسان ہو جائے اور اس سفر کی لمبی مسافت سمٹ جائے، یعنی ہمیں پتہ بھی نہ چلے اور ہم منزل تک پہنچ جائیں۔

سفر کی مشقتوں سے پناہ مانگ لیں

اس کے بعد ایک دوسری دعا اور فرماتے:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْأَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ))(۱)

اے اللہ! میں سفر کی مشقت سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ یعنی میں اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھے سفر میں مشقتیں اور مصیبتیں پیش آئیں اور اے اللہ! میں اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ میرے سامنے کوئی دکھ دینے والا منظر آجائے۔

یعنی اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ کوئی حادثہ یا ایکسیڈنٹ ہو جائے یا کوئی تصادم ہو جائے، لہٰذا ایسا منظر جو برا ہو اور تکلیف دینے والا ہو، اے اللہ! میں اس سے بھی آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔

واپسی پر گھر والوں کی خیریت کی اطلاع ملے

پھر فرمایا:

((وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْأَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ))

''اے اللہ! میں اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ جب میں واپس لوٹ کر اپنے گھر آؤں تو وہاں آکر کوئی برا منظر دیکھوں''

جب انسان سفر میں ہوتا ہے تو اس کو اس بات کی بھی فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ جب میں واپس گھر جاؤں تو میرے گھر والے خوش وخرم ہوں، ان کو اچھی حالت میں دیکھوں، وہ بیمار نہ ہوں، کسی حادثے کا شکار نہ ہوں اور ان کو اطمینان کی حالت میں پاؤں۔ اس لئے دعا کرلی کہ اے اللہ! میں اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں گھر والوں کو برے حال میں پاؤں یا اپنے مال کو برے حال میں پاؤں یا

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ما یقول إذا رکب إلی سفر الحج وغیرہ، رقم: ۲۳۹۲، سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰہ، باب ما یقول إذا خرج مسافرا، رقم: ۳۳۶۰، سنن النسائی، کتاب الإستعاذۃ، باب الإستعاذۃ من الحور بعد الکور، رقم: ۵۴۰۳، سنن أبی داود، کتاب الجهاد، باب ما یقول الرجل إذا سافر، رقم: ۲۲۳۱، مسند أحمد، رقم: ۶۰۲۹

اپنی اولاد کو برے حال میں پاؤں۔ اے اللہ! جب میں واپس آؤں تو یہ سب اچھی حالت میں مجھے دکھائی دیں۔

اس دعا کی جامعیت

بتائیے! کیا کوئی شخص ایسی دعائیں مانگے گا؟ کسی کے حاشیہ خیال میں یہ بات آسکتی ہے کہ وہ مسافر ہونے کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں مانگے، مسافر کی جتنی ضروریات ہوسکتی ہیں، وہ سب حضور اقدس ﷺ نے ان دعاؤں میں جمع فرمادیں۔ ''اللہ اکبر'' کے ذریعہ سفر کا آغاز کیا، جب سواری پر بیٹھے تو یہ دعا پڑھ لے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ٥ وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾

اور اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اللہ کے حوالے کردیا اور یہ دعا کرلی کہ اے اللہ! ہر قسم کی مشقت اور مصیبت سے بچایئے گا اور خیر و عافیت سے واپس لایئے گا۔ یہ دعائیں کرنے کے بعد سفر شروع کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردیا۔

نئی بستی سے گزرتے وقت کی دعا

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آپ سفر کے دوران کسی نئی بستی سے گزرتے تو اس موقع پر یہ دعا فرماتے:

((اَللّٰهُمَّ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ وَخَيْرَ اَهْلِهَا وَخَيْرَ مَا فِيْهَا وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ اَهْلِهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا))(۱)

''اے اللہ! جس بستی سے میں گزر رہا ہوں، اس بستی کی بھلائیاں عطاء فرمایئے اور

(۱) مجمع الزوائد، رقم: ۱۷۱۱۷ (۱۰/۱۹۲)، زادالمعاد، فصل فی هدیه صلی اللّٰه علیه وسلم فی سفره وعبادته فیه (۱/۴۴۴)، المعجم الکبیر للطبرانی، رقم: ۱۸۳۳۷ (۱۶/۲۱۷) پوری دعا کچھ یوں ہے: "اللّٰهم رب السموات وما أظللن ورب الأرضین وما أقللن ورب الشیاطین وما أضللن ورب الریاحین وما ذرین أسألك خیر هذه القریة وخیر أهلها وأعوذ بك من شرها وشر أهلها وشر ما فیها" پوری دعا کا ترجمہ کچھ یوں ہے: ''اے اللہ! تو آسمانوں اور ان کے نیچے جو کچھ ہے ان سب کا رب ہے، زمینوں اور زمینوں کے اوپر جو کچھ ہے ان سب کا رب ہے، تو شیاطین کا بھی رب ہے اور جنہیں وہ گمراہ کرتے ہیں ان کا بھی رب ہے، تو ہواؤں کا بھی رب اور جن چیزوں کو وہ اڑاتی ہیں ان کا بھی رب ہے، میں تجھ سے اس بستی کی اور اس میں رہنے والوں کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور اس بستی کی برائی اور اس میں رہنے والوں کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں''

اس بستی کے جو اچھے لوگ ہوں، ان سے واسطہ ڈالئے اور اس بستی میں جتنی اچھائیاں ہیں، ان سے میرا واسطہ پڑے۔ اور اے اللہ! میں اس بستی کے شر سے پناہ مانگتا ہوں اور اس بستی کے برے رہنے والوں سے اور اس بستی میں جو برائیاں ہیں، ان سے پناہ مانگتا ہوں، ان سے مجھے بچائیے گا''

یہ دعا حضور اقدس ﷺ اس وقت پڑھتے جب کسی نئی بستی سے گزرتے، چاہے وہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔

کسی بستی میں داخل ہوتے وقت کی دعا

اور اگر کسی بستی میں ٹھہرنے کا ارادہ ہوتا تو اس بستی میں داخل ہونے سے پہلے حضور اقدس ﷺ یہ دعا فرماتے:

((اَللّٰهُمَّ حَبِّبْنَا إِلٰى أَهْلِهَا وَحَبِّبْ صَالِحِيْ أَهْلِهَا إِلَيْنَا))(۱)

''اے اللہ! ہمیں ان بستی والوں کی نظر میں محبوب بنا دیجئے، یعنی ایسا بنا دیجئے کہ یہ ہم سے محبت کریں اور اس بستی کے جو نیک لوگ ہیں ان کی محبت ہمارے دل میں پیدا کر دیجئے''

پہلے جملے میں تو یہ فرمایا کہ اس بستی کے سارے باشندوں کے دل میں ہماری محبت پیدا کر دیجئے، چاہے وہ صالح ہوں یا نہ ہوں، لیکن دوسرے جملے میں یہ فرمایا کہ اس بستی کے جو صالح اور نیک لوگ ہوں، ان کی محبت ہمارے دلوں میں پیدا کر دیجئے۔ کیونکہ جب آدمی کسی نئی بستی میں داخل ہوتا ہے تو وہاں پر اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے کہ معلوم نہیں کہ کونسا شخص میرے ساتھ کیا معاملہ کرے، اس لئے دعا کرلی کہ اے اللہ! ہماری محبت ان کے دلوں میں ڈال دیجئے، اور ان کے نیک لوگوں کی محبت ہمارے دل میں آجائے۔ یہ دعا کرنے کے بعد بستی میں داخل ہوتے اور وہاں قیام فرماتے، اللہ تعالیٰ ان دعاؤں کی برکت سے ان کے ہر سفر کو کامیاب بنا دیتے تھے۔

---

(۱) المعجم الكبير للطبراني، رقم: ٦٣٢ (٢٩٤/١١)، سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد (٤٢٢/٧)، المعجم الأوسط للطبراني، رقم: ٤٩١١ (٤٦٨/١٠)، بستی میں داخل ہونے سے پہلے آپ ﷺ تین مرتبہ "اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهَا" کہتے پھر یہ دعا پڑھتے: ((اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا جَنَاهَا وَحَبِّبْنَا إِلٰى أَهْلِهَا وَحَبِّبْ صَالِحِيْ أَهْلِهَا إِلَيْنَا))

خلاصہ

بہرحال! یہ چند دعائیں ہیں جو حضورِ اقدس ﷺ سفر کی حالت میں مانگا کرتے تھے، ہر مسلمان کو ان کے پڑھنے کی عادت ڈال لینی چاہئے۔ اور یہ درحقیقت مسلمان اور کافر میں ایک بہت بڑا امتیاز ہے کہ کافر بھی سوار ہوتا ہے اور مؤمن بھی سوار ہوتا ہے، لیکن کافر غفلت کی حالت میں سوار ہوتا ہے، اور اس کا دھیان اپنے خالق کی طرف نہیں ہوتا، جبکہ مؤمن اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان کے ساتھ، اس کے ذکر کے ساتھ، اس کے شکر کے ساتھ اور اس کی نعمتوں کے اعتراف کے ساتھ سوار ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں اس کا پورا سفر عبادت بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

جنازے کے آداب
اور
چھینکنے کے آداب ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِسَبْعٍ ((بِعِيَادَةِ الْمَرِيْضِ وَاتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَتَشْمِيْتِ الْعَاطِسِ وَنَصْرِ الضَّعِيْفِ وَعَوْنِ الْمَظْلُوْمِ وَإِفْشَاءِ السَّلَامِ وَإِبْرَارِ الْمُقْسِمِ))(۱)

ایک مسلمان کے ذمے دوسرے مسلمانوں کے جو حقوق ہیں، ان میں سے دو کا بیان پیچھے ہو چکا:

(۱) سلام کا جواب دینا (۲) مریض کی عیادت کرنا

تیسرا حق جو اس حدیث میں بیان فرمایا وہ ہے "اتباع الجنائز" جنازوں کے پیچھے جانا۔ یہ بھی بڑی فضیلت والا کام ہے اور مرنے والے کا حق ہے۔ البتہ یہ حق مردوں پر ہے، عورتوں پر یہ حق نہیں ہے، اور عیادت مریض کا عمل مرد کے لئے بھی ہے اور عورت کے لئے بھی ہے اور عیادت مریض کا جو ثواب مرد کے لئے ہے، وہی ثواب عورت کے لئے بھی ہے۔ لیکن جنازوں کے پیچھے جانا صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے، البتہ خواتین تعزیت کے لئے جا سکتی ہیں، اور "انشاء اللہ" اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ ان کو تعزیت کرنے میں بھی وہی اجر و ثواب حاصل ہو جائے گا جو مردوں کو جنازے کے پیچھے جانے سے حاصل ہوتا ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۲/۱۰۲ تا ۱۲۷) بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب افشاء السلام، رقم ۵۷٦٦، مسند أحمد، رقم: ۱۷۷۷۳

جنازے کے پیچھے چلنے کی فضیلت

حضورِ اقدس ﷺ نے جنازے کے پیچھے چلنے کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهَا فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَهَا حَتّٰى تُدْفَنَ فَلَهُ قِيرَاطَانِ)) قِيلَ: وَمَا الْقِيرَاطَانِ؟ قَالَ: ((مِثْلُ الْجَبَلَيْنِ الْعَظِيمَيْنِ))(۱)

''جو شخص جنازے کے ساتھ اس کی نماز پڑھی جانے تک حاضر رہے، اس کو ایک قیراط ثواب ملے گا اور جو شخص دفن تک شریک رہے، اس کو دو قیراط ثواب ملے گا۔ کسی صحابی نے سوال کیا یا رسول اللہ! یہ دو قیراط کیسے ہونگے؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ یہ قیراط دو بڑے پہاڑوں کے برابر ہوں گے''

بہرحال، نماز جنازہ پڑھنے اور دفن تک شریک ہونے کا بڑا عظیم ثواب ہے۔

جنازے میں شرکت کے وقت نیت کیا ہو؟

جنازہ کے پیچھے جانے کا عمل ایسا ہے جو ہم سب کرتے ہیں، شاید ہی کوئی شخص ہوگا جو کبھی بھی جنازے کے پیچھے نہیں گیا ہوگا، بلکہ ہر شخص کو اس عمل سے سابقہ پڑتا ہے، لیکن صحیح طریقہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یہ عمل بھی ایک رسمی خانہ پری ہو کر رہ جاتا ہے، مثلاً بعض اوقات جنازہ میں شرکت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر شرکت نہ کی تو لوگ ناراض ہو جائیں گے، یہ نیت اور مقصد غلط ہے۔ اس لئے جنازہ میں شرکت کرتے وقت اپنی نیت درست کرلو اور یہ نیت کرلو کہ میں اس مسلمان کا حق ادا کرنے کے لئے شرکت کر رہا ہوں، اور جنازے کے پیچھے چلنا چونکہ حضورِ اقدس ﷺ کی سنت ہے اور آپ ﷺ کا حکم ہے، اس لئے میں بھی آپ ﷺ کی اتباع میں شریک ہو رہا ہوں۔ اس نیت سے جب شرکت کرو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ یہ عمل بڑے اجر و ثواب کا باعث بن جائے گا۔

جنازے کے ساتھ چلتے وقت کلمہ شہادت پڑھنا

دوسرے یہ کہ جنازہ میں شرکت کرنے کا طریقہ سنت کے مطابق ہونا چاہئے، ناواقفیت اور

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب من انتظر حتی تدفن، رقم: ۱۲۴۰، صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب فضل الصلاة علی الجنازة واتباعها، رقم: ۱۵۷۰، سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب ثواب من صلی علی جنازة، رقم: ۱۹٦۸

بے دھیانی کی وجہ سے ہم بہت سی سنتوں پر عمل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں اور بلاوجہ اجروثواب ضائع کر دیتے ہیں، ذرا سا دھیان اگر کرلیں گے تو ایک ہی عمل میں بہت سارے ثواب حاصل ہو جائیں گے۔ مثلاً ناواقفیت کی وجہ سے ہمارے یہاں ایک طریقہ یہ چل پڑا ہے کہ جب جنازے کو کندھا دیا جاتا ہے تو ایک آدمی بلند آواز سے نعرہ لگاتا ہے ''کلمہ شہادت'' اور دوسرے لوگ اس کے جواب میں بلند آواز سے "اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" پڑھتے ہیں۔ یہ طریقہ بالکل غلط ہے، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، یہ عمل نہ تو حضور اقدس ﷺ نے کیا، نہ صحابہ کرام نے کیا، اور نہ ہی ہمارے بزرگان دین سے یہ عمل منقول ہے۔ بلکہ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جنازے کے ساتھ جاتے ہوئے کسی قسم کا کوئی ذکر بلند آواز سے کرنا مکروہ ہے، اور جنازے کے ساتھ جانے کا ادب یہ ہے کہ، خاموش چلے، بلاضرورت باتیں کرنا بھی اچھا نہیں، لہٰذا ''کلمہ شہادت'' کا نعرہ لگانا یا ''شہادت'' بلند آواز سے پڑھنا سنت کے خلاف ہے، اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

جنازہ اٹھاتے وقت موت کا مراقبہ کریں

اور خاموش چلنے میں حکمت یہ ہے کہ خاموش رہ کر یہ غور کرو اور سوچو کہ جو وقت اس پر آیا ہے، تم پر بھی آنے والا ہے، یہ نہیں کہ اس جنازے کو تو تم لے جا کر قبر میں دفن کر دو گے اور تم ہمیشہ زندہ رہو گے، لہٰذا خاموش رہ کر اس موت کا مراقبہ کرو کہ ایک دن اسی طرح میں بھی مر جاؤں گا اور میرا بھی جنازہ اسی طرح اٹھایا جائے گا اور مجھے بھی قبر میں دفن کر دیا جائے گا اس طرح موت کا مراقبہ کرنے کے نتیجے میں دل میں کچھ نرمی پیدا ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا احساس بڑھے گا، اس لئے خاموش رہ کر موت کا مراقبہ کرنا چاہئے، البتہ کوئی ضروری بات کرنی ہو تو کر سکتے ہیں، کوئی ناجائز اور حرام نہیں ہے، البتہ ادب کے خلاف ہے۔

جنازے کے آگے نہ چلیں

ایک ادب یہ ہے کہ جب جنازہ لے جا رہے ہوں تو جنازہ آگے ہونا چاہئے اور لوگ اس کے پیچھے پیچھے چلیں، دائیں بائیں چلیں تو بھی ٹھیک ہے، لیکن جنازے کے آگے آگے چلنا ٹھیک نہیں، ادب کے خلاف ہے۔ البتہ کندھا دینے کی غرض سے وقتی طور پر آگے بڑھ جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن کندھا دینے کے لئے بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جنازے کے آگے دو رویہ لمبی قطار لگا لیتے ہیں، جس کے نتیجے میں جنازہ کے ساتھ چلنے والے تمام لوگ جنازہ سے آگے ہو جاتے ہیں اور جنازہ پیچھے ہو جاتا ہے، یہ طریقہ بھی کچھ اچھا نہیں ہے۔

جنازے کو کندھا دینے کا طریقہ

اسی طرح جنازے کو کندھا دینے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے میت کے دائیں ہاتھ کی طرف والا پایہ اپنے داھنے کندھے پر رکھیں اور کم از کم دس قدم چلیں، یہ افضل ہے، بشرطیکہ دس قدم چلنے کی طاقت ہو۔ لہٰذا دوسرے لوگوں کو اتنی جلدی نہیں کرنی چاہئے کہ ابھی ایک نے جنازہ کندھے پر رکھا اور دوسرے شخص نے فوراً آگے بڑھ کر اس کو لے لیا، ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ البتہ اگر کوئی کمزور اور ضعیف آدمی ہے تو اس صورت میں دوسرے لوگوں کو چاہئے کہ اس سے جلدی لے لیں تا کہ اس کو تکلیف نہ ہو۔ پھر میت کے دائیں پاؤں کی طرف کا پایہ اپنے داہنے کندھے پر اٹھائے اور دس قدم چلے، اور پھر میت کے بائیں ہاتھ کی طرف کا پایہ اپنے بائیں کندھے پر اٹھائے اور دس قدم چلے، پھر میت کے بائیں پاؤں کی طرف کا پایہ اپنے بائیں کندھے پر اٹھائے اور دس قدم چلے، اس طرح ہر شخص جنازے کے چاروں اطراف میں کندھا دے اور چالیس قدم چلے، یہ طریقہ سنت سے زیادہ قریب ہے اور افضل ہے، اگرچہ اس کے خلاف کرنا ناجائز نہیں ہے، لیکن سنت کا ثواب ضائع ہو جائے گا۔

آج کل جنازہ لے جاتے وقت دھکم پیل ہوتی ہے، کندھا دینے کے شوق میں دوسرے مسلمان بھائیوں کو دھکا دیدیا جاتا ہے اور اس بات کا خیال ہی نہیں ہوتا کہ ہم ایذاء مسلم کر کے حرام کا ارتکاب کر رہے ہیں، کندھا دینے کا ثواب ضائع کر کے الٹا گناہ کما رہے ہیں۔ اس لیے ایسا نہ کرنا چاہئے، بلکہ اطمینان سے کندھا دینا چاہئے اور دوسروں کو اس کا موقع دینا چاہئے کہ دوسرا مسلمان بھائی کندھا دیتے ہوئے دس قدم پورے کر لے، اس کے بعد آپ اس سے لے لیں۔

جنازے کو تیز قدم سے لے کر چلنا

حضور اقدس ﷺ نے ایک حدیث میں جنازہ لے جانے کا یہ ادب بھی بیان فرمایا کہ جب جنازہ لے کر جاؤ تو ذرا تیز تیز قدم بڑھاؤ، آہستہ مت چلو، اور اس کی وجہ بھی بیان فرمادی کہ اگر وہ جنتی ہے تو اس کو جنت میں پہنچانے میں کیوں دیر کرتے؟ اس کو جلدی اس کے اچھے ٹھکانے پر پہنچا دو، اور اگر وہ دوزخی ہے۔ معاذ اللہ۔ تو دوزخ والے کو جلدی اس کے ٹھکانے تک پہنچا کر اپنے کندھے سے اس بوجھ کو دور کر دو۔ البتہ اتنی تیزی بھی نہیں کرنی چاہئے جس سے جنازہ حرکت کرنے لگے، ہلنے لگے، بلکہ متوسط انداز کی چال سے چلو اور اس کو جلدی پہنچا دو۔ (۱)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب السرعة با لجنازة، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

جنازہ زمین پر رکھنے تک کھڑے رہنا

اسی طرح ایک ادب اور سنت یہ ہے کہ قبرستان میں جب تک جنازہ کندھوں سے اتار کر نیچے نہ رکھ دیا جائے، اس وقت تک لوگ نہ بیٹھیں بلکہ کھڑے رہیں، البتہ جب جنازہ نیچے رکھ دیا جائے تو اس وقت بیٹھ سکتے ہیں۔ ہاں! اگر کوئی شخص کمزور اور ضعیف ہے، وہ بیٹھنا چاہتا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، لہٰذا ہر عمل اتباع سنت کا اہتمام کر کے کیا جائے تو پھر ہر ہر موقع پر کیا جانے والا ہر عمل عبادت بن جاتا ہے۔

اسلامی الفاظ اور اصطلاحات

چوتھا حق جس کا حدیث میں ذکر ہے وہ ہے " تشمیت العاطس" یعنی چھینکنے والے کے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہنے کے جواب میں "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کہنا، حضور اقدس ﷺ نے اس کو "تشمیت" کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

حضور اقدس ﷺ سے جو الفاظ احادیث میں مروی ہیں یا قرآن کریم میں جو الفاظ آئے ہیں، وہ الفاظ بھی سیکھنے چاہئیں، ایک زمانہ وہ تھا کہ مسلمان چاہے وہ با قاعدہ عالم نہ ہو اور اس نے کسی مدرسہ سے علم دین حاصل نہ کیا ہو، لیکن وہ اسلامی الفاظ اور اسلامی اصطلاحات سے وہ اتنا مانوس ہوتا تھا کہ بہت سے اسلامی الفاظ اور اسلامی اصطلاحات لوگوں کی زبانوں پر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ علماء کی تصانیف، کتابیں، تقاریر، وعظ وغیرہ کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، معاشرے میں ان اسلامی الفاظ اور اسلامی اصطلاحات کا عام رواج تھا، اس کا بڑا فائدہ تھا۔

اسلامی اصطلاحات سے ناواقفی کا نتیجہ

لیکن اب ان اسلامی اصطلاحات سے رفتہ رفتہ ناواقفیت اس درجہ بڑھ گئی ہے اور لوگ اس درجہ ان سے غافل اور لاعلم ہو گئے ہیں کہ اگر عام لفظ بھی ان کے سامنے بولا جائے تو اس طرح حیرت سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رقم:۱۲۳۱، صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب الاسراع بالجنازة، رقم: ۱۵۶۸، سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول الله، باب ماجاء فی المشی خلف الجنائز، رقم:۹۳۲، سنن النسائی، کتاب الجنائز باب السرعة بالجنازة، رقم:۱۸۸٤، سنن أبی داؤد، کتاب الجنائز، باب الاسراع بالجنازة، رقم:۲۷٦۷، سنن ابن ماجه، کتاب ما جاء فی الجنائز، باب ما جاء فی شهود الجنائز، رقم:۱٤٦٦، مسند أحمد، رقم:٦٩٦٩

چہرہ تکنے لگتے ہیں کہ معلوم نہیں کس زبان کا لفظ بول دیا۔ اس ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ ابھی قریب ہی زمانے کی لکھی علماء کی تصانیف، کتابیں، ملفوظات اور مواعظ پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے اور شکایت کرتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آئیں۔ اب آج کے دور کا عام آدمی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف، آپ کے مواعظ اور ملفوظات کو نہیں سمجھتا، اس لئے کہ عام آدمی ان الفاظ سے اور ان اسلامی اصطلاحات سے نابلد ہے، اور نہ ہی ان الفاظ کے سمجھنے کی طرف دھیان اور توجہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان علماء کی تصانیف اور مواعظ اور ملفوظات کے استفادہ سے محروم رہ جاتا ہے۔

انگریزی الفاظ کا رواج

لہٰذا یہ وبا اور بیماری ہمارے اندر پھیل گئی ہے کہ ''اسلامی اصطلاحات'' ہماری بول چال سے خارج ہوگئی ہیں اور دوسری طرف انگریزی زبان داخل ہوگئی، آج اگر کوئی شخص تھوڑا سا پڑھ لکھ لے اور میٹرک کرلے یا انٹر پاس کرلے تو اب وہ اپنی گفتگو میں آدھے الفاظ انگریزی کے بولے گا اور آدھے الفاظ اردو کے بولے گا، حالانکہ نہ تو اس کو اردو پوری طرح آتی ہے اور نہ انگریزی پوری طرح آتی ہے، تو انگریزی الفاظ بولنے کا اتنا خیال ہے، لیکن اسلامی اصطلاحات سے اتنا بعد اتنی دوری ہے کہ ان کا مطلب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا، حالانکہ ان کو بھی سیکھنے کی فکر کرنی چاہئے۔

آج ''معارف القرآن'' سمجھ میں نہیں آتی

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی تفسیر ''معارف القرآن'' لکھی ہے، انہوں نے لکھی ہی اس مقصد سے تھی کہ ایک عام آدمی کو آسان انداز میں قرآن کریم کی تفسیر سمجھ میں آجائے۔ لیکن بہت سے لوگ آکر یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو ''معارف القرآن'' سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر اس سے بھی کوئی آسان تفسیر لکھ دیں تو کہیں گے کہ وہ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتی، وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کو حاصل کرنے اور ان الفاظ سے اپنے آپ کو مانوس کرنے کی فکر ہی نہیں ہے۔ ورنہ آج سے پچاس سال پہلے ایک عام آدمی جس نے باقاعدہ علم دین حاصل نہیں کیا تھا، اس کے خطوط میں ایسے بہت سے الفاظ نظر آئیں گے کہ آج کل کا گریجویٹ اور ایم اے بھی اس خط کو نہیں سمجھ سکتا۔ بہر حال! اس کی فکر کرنی چاہئے، اس لئے جب حدیث سنا کریں تو اس کے الفاظ سے بھی اپنے کو مانوس کیا کریں۔

چھینکنے کے آداب

بہرحال! یہ لفظ ''تشمیت'' ہے۔ اس لفظ کو ''س'' سے ''تسمیت'' پڑھنا بھی درست ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ جب کسی شخص کو چھینک آئے تو اس کے بارے میں حضور اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ چھینکنے والے کو ''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ'' کہنا چاہئے، اور جو شخص پاس بیٹھا سن رہا ہے اس کو ''یَرْحَمُكَ اللّٰہُ'' کہنا چاہئے، یعنی اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے، یہ ''یَرْحَمُكَ اللّٰہُ'' کے الفاظ کہنا ''تشمیت'' ہے۔ یہ عربی ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اس بات کی دعا دیں کہ وہ صحیح راستے پر رہے۔

جمائی سستی کی علامت ہے

حضور اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ چھینکنے والا ''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ'' کہے اور اس کے ذریعہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ ویسے تو ہر فعل اللہ تعالیٰ کے شکر کا متقاضی ہے، لیکن حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلتَّثَاؤُبُ مِنَ الشَّيْطَانِ وَالْعُطَاسُ مِنَ الرَّحْمٰنِ))(۱)

یعنی ''جمائی'' شیطانی اثرات کی حامل ہوتی ہے اور چھینک اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک حصہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ''جمائی'' سستی کے وقت آتی ہے اور اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس کو سستی آرہی ہے، اور ''سستی'' شیطانی اثرات لئے ہوئے ہوتی ہے جو انسان کو بھلائی سے، نیک کاموں سے اور صحیح طرز عمل سے باز رکھتی ہے، اگر انسان اس سستی پر عمل کرتا چلا جائے تو بالآخر وہ ہر طرح کی خیرات سے محروم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حضور اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ اس سستی کو دور کرو، کاہلی کو دور کرو اور جس خیر کے کام میں سستی آرہی ہے، اس سستی کا مقابلہ کر کے وہ خیر کا کام کر گزرو۔

حضورِ اقدس ﷺ کا عاجزی اور سستی سے پناہ مانگنا

اسی لئے حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا فرمائی ہے:

---

(۱) ((اَلتَّثَاؤُبُ مِنَ الشَّيْطَانِ)) کے لئے دیکھئے: صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة ابلیس وجنوده، رقم:۳۰۴۶، صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب تشمیت العاطس وكراهة التثاؤب، رقم:۵۳۱۰، سنن الترمذی، کتاب الادب عن رسول الله، باب ماجاء ان الله یحب العطاس ویكره التثاؤب، رقم:۲۶۷۰، مسند أحمد، رقم:۸۷۹۷، ((وَالْعُطَاسُ مِنَ الرَّحْمٰنِ)) کے الفاظ نہیں مل سکے۔

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ))(۱)

''اے اللہ! میں عاجزی اور سستی سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں''

اس لئے کہ یہ سستی بہت خراب چیز ہے، اس سے بچنا چاہئے، اور اگر کسی کو سستی ہوتی ہو تو اس کا اس کے علاوہ کوئی علاج نہیں کہ اس سستی کا مقابلہ کرے، مثلاً سستی کی وجہ سے دل چاہ رہا ہے کہ گھر میں پڑا رہوں اور کام پر نہ جاؤں، تو اس کا علاج یہ ہے کہ زبردستی کر کے کھڑا ہو جائے اور اس سستی کا مقابلہ کرے۔ اور ''جمائی'' اس سستی کی ایک علامت ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ''جمائی'' شیطانی اثرات کی حامل ہے۔

چھینک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

اور چھینک کے بارے میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ چھینک ''رحمٰن'' کی طرف سے ہے، یعنی اللہ جل شانہ کی رحمت کا ایک عنوان ہے۔ ایک چھینک وہ ہوتی ہے جو نزلہ اور زکام کی وجہ سے آنی شروع ہو جاتی ہے اور مسلسل آتی چلی جاتی ہے، یہ تو بیماری ہے، لیکن اگر ایک آدمی صحت مند ہے اور نزلہ زکام کی کوئی بیماری نہیں ہے، اس کے باوجود اس کو چھینک آرہی ہے تو اس کے بارے میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ رحمٰن کی طرف سے رحمت کی علامت ہے۔ چنانچہ اطباء نے لکھا ہے کہ بعض اوقات انسان کے جسم پر کسی بیماری کا حملہ ہونے والا ہوتا ہے تو چھینک اس حملے کو روک دیتی ہے، اس طرح یہ چھینک اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا ایک عنوان ہے یہ تو ظاہری رحمت ہے، ورنہ اس کے اندر جو باطنی رحمتیں ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ چونکہ چھینک اللہ تعالیٰ کی رحمت کے عنوان میں سے ایک عنوانات ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی کو چھینک آئے تو ''الحمد للہ'' کہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

اللہ تعالیٰ کو مت بھولو

ان احکام کے ذریعہ قدم قدم پر یہ سکھایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مت بھولو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہر موقع پر رجوع کرو، اور ہر ہر موقع پر یہ کہا جا رہا ہے کہ اس وقت یہ پڑھ لو، اس وقت یہ پڑھ لو، یہ سب

(۱) صحیح البخاری، كتاب الجهاد والسير، باب ما يتعوذ من الجبن، رقم: ۲۶۱۱، صحیح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب التعوذ من العجز والكسل وغيره، رقم: ٤٨٧٨، سنن النسائی، كتاب الاستعاذة، باب الاستعاذة من البخل، رقم: ٥٣٥٣، سنن أبی داؤد، كتاب الصلاة، باب فی الاستعاذة، رقم: ۱۳۱۷، مسند أحمد، رقم: ۱۱٦٧٠

اس لئے کہا جارہا ہے تاکہ ہماری زندگی کا ہر لمحہ اللہ تعالی کے ذکر سے معمور ہو جائے اور ہر تغیر کے وقت اللہ تعالی کی طرف رجوع کرنے کی عادت پڑ جائے۔ ساری عبادتوں، سارے زہد، سارے مجاہدوں، ساری ریاضتوں اور سارے تصوف اور سلوک کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالی کی طرف رجوع کرنے کی عادت پڑ جائے اور جس سے اللہ تعالی کا تعلق حاصل ہو جائے۔ اس رجوع الی اللہ کی عادت ڈالنے کے لئے حضور اقدس ﷺ نے یہ مختلف طریقے تلقین فرمائے ہیں۔ مثلاً یہ کہ چھینک آئے تو فوراً کہو ''الحمدللہ''

یہ سنت مردہ ہوتی جارہی ہے

ایک زمانہ وہ تھا کہ جب یہ بات مسلمانوں کے شعائر میں داخل تھی اس کو سکھانے اور بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، اور اس وقت اس بات کا تصور بھی نہیں تھا کہ اگر کسی مسلمان کو چھینک آئے گی تو وہ ''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ'' نہیں کہے گا، بچپن سے تربیت ایسی کی جاتی تھی کہ اس کے خلاف ہوتا ہی نہیں تھا۔ لیکن اب یہ چیز مٹتی جارہی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ یہ سنت بھی مردہ ہوتی جارہی ہے، اس سنت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے جب چھینک آئے تو فوراً کہو ''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ''

چھینکنے والے کا جواب دینا واجب ہے

پھر دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو شخص چھینکنے والے کے پاس بیٹھا ہے اور اس نے یہ سنا کہ چھینکنے والے نے ''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ'' کہا تو اس سننے والے پر شرعاً واجب ہے کہ جواب میں ''یَرْحَمُكَ اللّٰہُ'' کہے، اسی کا نام ''تشمیت'' ہے۔ اور یہ جواب دینا صرف سنت یا مستحب نہیں بلکہ واجب ہے لہٰذا اگر کوئی شخص ''یَرْحَمُكَ اللّٰہُ'' کے ذریعہ جواب نہیں دے گا تو اس کو ترک واجب کا گناہ ہوگا۔ البتہ یہ اس وقت واجب ہے کہ چھینکنے والے نے ''الحمدللہ'' کہا ہو، اور اگر چھینکنے والے نے ''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ'' نہیں کہا تو پھر سننے والے پر ''یَرْحَمُكَ اللّٰہُ'' کہنا واجب نہیں۔

البتہ اللہ تعالی نے اس میں اتنی آسانی فرمادی ہے کہ اس کو واجب علی الکفایہ قرار دیا ہے، یعنی واجب علی العین نہیں ہے کہ ہر سننے والے پر جواب دینا ضروری ہو، بلکہ اگر سننے والے دس افراد ہیں اور ان میں سے ایک نے ''یَرْحَمُكَ اللّٰہُ'' کہہ دیا تو سب کی طرف سے واجب ادا ہوگیا۔ لیکن ساری مجلس میں کسی ایک فرد نے بھی ''یَرْحَمُكَ اللّٰہُ'' نہیں کہا تو تمام افراد ترک واجب کی وجہ سے گناہ گار ہوں گے۔

فرضِ عین اور فرضِ کفایہ کا مطلب

یہ سب اصطلاحات بھی جاننے کی ہیں اور سیکھنی چاہئیں۔ دیکھئے! ایک ہے "فرضِ عین" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کام ہر ایک آدمی پر فرض ہے، جیسے نماز ہر ہر آدمی پر علیحدہ علیحدہ فرض ہے، ایک کی نماز سے دوسرے کی نماز ادا نہیں ہوتی، اس کو "فرضِ عین" کہا جاتا ہے۔ دوسرا ہے "فرضِ کفایہ" اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بہت سے افراد میں سے ایک دو افراد نے بھی وہ کام کرلیا تو سب کی طرف سے وہ فریضہ ادا ہو جائے گا، جیسے نماز جنازہ "فرضِ کفایہ" ہے، اگر چند افراد بھی نماز جنازہ ادا کرلیں گے تو سب کی طرف سے وہ فرض ادا ہو جائے گا، لیکن اگر کوئی بھی نہیں پڑھے گا تو سب گناہ گار ہوں گے۔

مثلاً رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرنا "سنت موکدہ علی الکفایہ" ہے۔ یعنی اگر محلے میں سے کوئی ایک شخص بھی مسجد میں جا کر اعتکاف میں بیٹھ گیا تو تمام اہل محلہ کی طرف سے وہ سنت ادا ہو جائے گی، لیکن اگر ایک شخص بھی اعتکاف میں نہیں بیٹھا تو سارے محلے والے ترک سنت موکدہ کے گناہ گار ہوں گے۔ اسی طرح چھینکنے والے کا جواب دینا" واجب علی الکفایہ" ہے، یعنی اگر مجلس میں ایک شخص نے بھی جواب دیدیا تو سب کی طرف سے واجب ادا ہو گیا، لیکن اگر کسی نے بھی جواب نہ دیا تو سب کے سب ترک واجب کے گناہ گار ہوں گے۔

یہ مسلمان کا ایک حق ہے

ہم لوگ ذرا جائزہ لیں کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس واجب سے کتنی غفلت برتتے ہیں۔ اول تو چھینکنے والا "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" نہیں کہتا، اور اگر وہ "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہے تو سننے والے "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کے ذریعہ جواب دینے کا اتنا اہتمام نہیں کرتے جتنا اہتمام کرنا چاہئے۔ حضورِ اقدس ﷺ اس حدیث کے ذریعہ یہ بتا رہے ہیں کہ "تشمیت" کرنا ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے اور اس کے ذمے واجب ہے۔

کتنی مرتبہ جواب دینا چاہئے

البتہ جیسا کہ ابھی بتلایا کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے آسانی یہ فرمادی ہے کہ ایک تو اس حق کو "واجب علی الکفایہ" قرار دیا، دوسرے یہ کہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو مسلسل چھینکیں آرہی ہیں اور وہ مسلسل الحمدللہ کہہ رہا ہے، اور سننے والا مسلسل "یَرْحَمُکَ اللّٰہُ" کہتا جارہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ دوسرے کام چھوڑ کر بس یہی کرتا رہے۔ تو اس کے بارے میں بھی حضورِ اقدس ﷺ نے یہ ادب بتادیا کہ اگر ایک مرتبہ چھینک آئے تو جواب دینا واجب ہے، اور دوسری مرتبہ چھینک آئے تو

جواب دینا سنت ہے، اور تیسری مرتبہ جواب دینا بھی سنت ہے اور باعث اجر وثواب ہے۔ اس کے بعد اگر چھینک آئے تو جواب نہ تو واجب ہے اور نہ سنت ہے البتہ اگر کوئی شخص جواب دینا چاہے تو جواب دیدے، انشاء اللہ اس پر بھی ثواب ملے گا۔

حضور ﷺ کا طرز عمل

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مجلس میں حضور اقدس ﷺ تشریف فرما تھے، ایک صحابی کو چھینک آئی، انہوں نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہا، آپ ﷺ نے جواب میں "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" فرمایا، دوسری مرتبہ پھر چھینک آئی، آپ ﷺ نے جواب دیا "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" تیسری مرتبہ پھر چھینک آئی آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ جواب دیا "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" جب چوتھی مرتبہ ان کو چھینک آئی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((رَجُلٌ مَزْكُومٌ))(۱)

یعنی ان صاحب کو زکام ہے اور اس مرتبہ آپ ﷺ نے جواب نہیں دیا۔

اس حدیث کے ذریعہ آپ ﷺ نے یہ مسئلہ بتا دیا کہ تیسری مرتبہ کے بعد جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ دیکھئے! شریعت نے ہماری اور آپ کی سہولت کے لئے کن کن باریکیوں کی رعایت فرمائی ہے تاکہ یہ نہ ہو کہ آدمی بس اسی کام میں لگا رہے اور دوسرے ضروری کام چھوڑ بیٹھے۔

یہ جواب دینا کب واجب ہے؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" کے ذریعہ جواب دینا اس وقت واجب ہے جب چھینکنے والا "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہے، اگر چھینکنے والے نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" نہیں کہا تو اس کا جواب دینا واجب نہیں، لیکن جواب دینا اچھا ہے، تاکہ چھینکنے والے کو تنبیہ ہو جائے کہ مجھے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہنا چاہئے تھا۔

حضورِ اقدس ﷺ کا جواب نہ دینا

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ مجلس میں تشریف فرما تھے، ایک صحابی کو چھینک آئی، انہوں نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہا، آپ نے ﷺ جواب میں "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" فرمایا، تھوڑی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب تشمیت العاطس و کراهة التثاؤب، رقم: ۵۳۰۹، سنن الترمذی، کتاب الأدب عن رسول الله، باب ما جاء کم یشمت العاطس، رقم: ۲۶۶۷، سنن أبی داود، کتاب الادب، باب کم مرة یشمت العاطس، رقم: ۴۳۸۰، مسند أحمد، رقم: ۱۵۹۰۴

دیر کے بعد ایک اور صحابی کو چھینک آئی، لیکن انہوں نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" نہیں کہا، آپ ﷺ نے "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" بھی نہیں کہا۔ ان صحابی نے حضور اقدس ﷺ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ان صاحب کو تھوڑی دیر پہلے چھینک آئی تھی تو آپ نے ان کو "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" کے ذریعہ دعا دی تھی اور اب مجھے چھینک آئی تھی تو آپ ﷺ مجھے دعا نہیں دی۔ آپ نے جواب دیا کہ ان صاحب نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہہ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا، اس لئے میں نے ان کے جواب میں "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" کہا، تم نے "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" نہیں کہا، اس لئے میں نے جواب میں "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" نہیں کہا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" کے ذریعہ جواب دینا اس وقت واجب ہے جب چھینکنے والا "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کہے۔ (۱)

چھینکنے والا بھی دعا دے

پھر تیسری بات یہ ہے کہ جب "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" کے جواب میں سننے والے نے "یَرْحَمُكَ اللّٰہُ" کہا تو اب چھینکنے والے کو چاہئے کہ وہ "یَهْدِیْکُمُ اللّٰہُ" کہے۔ اور ایک روایت میں آتا ہے کہ وہ "یَهْدِیْکُمُ اللّٰہُ" کہے۔

اس لئے کہ جب سننے والے نے یہ دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے تو اب جواب میں چھینکنے والا اس کو یہ دعا دے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت عطا فرمائے اور تمہارے سب کام ٹھیک کر دے۔ ان احکام کے ذریعہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو دعا دینے کی عادت ڈالی جارہی ہے، کیونکہ جب ایک مومن دوسرے مومن کے لئے دعا کرتا ہے تو اس دعا کو قبولیت کی بہت امید ہوتی ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ دوسروں کے لئے دعا کیا کرو۔ (۲)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الحمد للعاطس، رقم:۵۷۵۳، صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، باب تشمیت العاطس وکراهة التثاؤب، رقم:۵۳۰۷، سنن الترمذی، کتاب الادب عن رسول الله، باب ما جاء فی إیجاب التشمیت بحمد العاطس، رقم:۲۶۶۶، سنن أبی داؤد، کتاب الادب، باب فیمن یعطس ولایحمد الله، رقم:۴۳۸۲، سنن ابن ماجه، کتاب الادب، باب تشمیت العاطس، رقم:۳۷۰۳، مسند أحمد، رقم:۷۹۹۶

(۲) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب اذا عطس کیف یشمت، رقم:۵۷۵۶، سنن الترمذی، کتاب الادب عن رسول الله، باب ماجاء کیف تشمیت العاطس، رقم:۲۶۶۳: سنن أبی داؤد، کتاب الادب، باب ماجاء فی تشمیت العاطس، رقم:۴۳۷۷، سنن ابن ماجه، کتاب الادب، باب تشمیت العاطس، رقم:۳۷۰۵، مسند أحمد، رقم:۹۲۵، سنن الدارمی، کتاب الاستئذان، باب اذاعطس الرجل مایقول، رقم:۲۵٤٤

ایک چھینک پر تین مرتبہ ذکر

دیکھئے! چھینک ایک مرتبہ آئی، لیکن اس میں تین مرتبہ اللہ کا ذکر ہو گیا، تین مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو گیا اور تین دعائیں ہو گئیں۔ اور دو مسلمانوں کے درمیان آپس میں دعاؤں کا تبادلہ ہوا، اور اس تبادلے کے نتیجے میں ایک دوسرے سے ہمدردی اور خیر خواہی کرنے کا ثواب بھی ملا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بھی قائم ہو گیا۔ یہ وہ نسخہ کیمیا ہے جو حضور اقدس ﷺ بیان کر کے تشریف لے گئے۔ بہر حال! ''تشمیت'' کرنا، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے اور واجب ہے۔

کمزور اور مظلوم کی مدد کرنا

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر پانچواں حق یہ بیان فرمایا:

((نَصْرُ الضَّعِیْفِ))

''کمزور کی مدد کرنا''

اسی کے ساتھ چھٹا حق یہ بیان فرمایا:

((عَوْنُ الْمَظْلُوْمِ))

''مظلوم کی مدد کرنا''

''جو شخص کسی ظلم کا شکار ہے، اس سے ظلم دور کرنے کے لئے اس کی مدد کرنا بھی ایک مومن کا دوسرے مومن پر حق ہے''

اور یہ انسان کے اندر جتنی استطاعت ہو، اس استطاعت کی حد تک دوسرے مسلمان کی مدد کرنا واجب ہے، اگر ایک مومن قدرت کے باوجود دوسرے مومن کو ظلم سے نہ بچائے یا اس کی مدد نہ کرے تو وہ گناہ گار ہوگا۔

مظلوم کی مدد واجب ہے

ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَایَظْلِمُهٗ وَلَا یُسْلِمُهٗ))(۱)

''ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ خود اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے''

---

(۱) حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

یعنی اگر کوئی شخص کسی مسلمان پر ظلم کر رہا ہے اور تم اس کو روک سکتے ہو، تو ایسے موقع پر اس کو بے یار و مددگار چھوڑنا جائز نہیں، بلکہ اس کی مدد کرنا واجب ہے۔

ورنہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جائے گا

بلکہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے بڑی سخت وعید بیان فرمائی کہ اگر کچھ لوگ یہ دیکھ رہے ہوں کہ کوئی شخص کسی مسلمان پر ظلم کر رہا ہے، چاہے وہ ظلم جانی ہو یا مالی ہو، اور ان کو اس ظالم کا ہاتھ پکڑنے کی اور اس شخص کو ظلم سے بچانے کی قدرت ہو، پھر بھی وہ اس ظالم کا ہاتھ نہ پکڑیں، اور اس کو ظلم سے نہ بچائیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر اپنا عذاب نازل فرمادے۔

عذاب کی مختلف شکلیں

پھر یہ ضروری نہیں کہ وہ عذاب اسی قسم کا ہو جیسے پچھلی امتوں پر عذاب آئے، مثلاً آسمان سے انگارے برسیں، یا طوفان آجائے، یا ہوا کے جھکڑ چل پڑیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے عذاب اور عتاب سے محفوظ رکھے۔ آمین ہم دن رات جو دیکھ رہے ہیں کہ ڈاکے پڑ رہے ہیں، چوریاں ہو رہی ہیں، بدامنی اور بے چینی کا دور دورہ ہے، کسی شخص کی جان، کسی کا مال، کسی کی عزت آبرو محفوظ نہیں، ہر شخص بے چینی اور بے اطمینانی کا شکار ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کے عذاب کے عنوانات ہیں، یہ سب عذاب کی مختلف شکلیں ہیں۔ اب یہ تو دور آ گیا ہے کہ اپنی آنکھوں سے ایک انسان پر ظلم ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اور اس کو ظلم سے بچانے کی قدرت بھی ہے، لیکن اس کے باوجود اس کو ظلم سے بچانے کی طرف توجہ نہیں ہے۔

احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

خاص طور پر جب سے ہمارے یہاں مغربی تہذیب کا سیلاب امڈ آیا ہے اور لوگوں کے پاس دولت آ گئی ہے تو اس دولت نے لوگوں کو اس طرح اندھا کر دیا ہے مروت، انسانیت، شرافت سب کچل کر رہ گیا ہے۔ اقبال مرحوم نے کہا تھا۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) (١) صحيح البخاری، كتاب المظالم والغصب، باب لايظلم المسلم المسلم ولا يسلمه، رقم:٢٢٦٢، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم الظلم، رقم:٤٦٧٧، سنن الترمذی، كتاب الحدود عن رسول الله، باب ماجاء في الستر على المسلم، رقم:١٣٤٦، سنن أبی داود، كتاب الأدب، باب المؤاخاة، رقم:٤٢٤٨، مسند أحمد، رقم:٥١٠٣

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

لہٰذا ان جدید آلات نے مروت کے احساس کو کچل دیا ہے۔

ایک عبرتناک واقعہ

ایک مرتبہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بہت شاندار کار سڑک پر گزری، جس میں کوئی صاحب بہادر بیٹھے تھے، اور اس کار نے ایک راہ گیر کو ٹکر ماری، وہ سڑک پر گرا اور اس کے جسم سے خون بہنے لگا، مگر ان صاحب بہادر کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ کار روک کر دیکھ لے کہ کتنی چوٹ آئی، صرف اتنا ہوا کہ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ ایک شخص زمین پر گرا ہوا ہے، بس یہ دیکھ کر وہ روانہ ہوگیا۔ وجہ یہ ہے کہ اس دولت نے اور اس مغربی تہذیب نے ہمیں اس درجہ پر پہنچا دیا کہ کسی آدمی کی جان مکھی اور مچھر سے زیادہ بے وقعت ہو کر رہ گئی ہے، آج کا انسان انسان نہیں رہا۔

مسلمان کی مدد کرنے کی فضیلت

واقعہ یہ ہے کہ انسان اس وقت تک انسان نہیں بن سکتا جب تک وہ محمد ﷺ کی سنت پر عمل نہ کرے، آپ کی سنت یہ ہے کہ آدمی ضعیف کی مدد کرے اور مظلوم کے ساتھ تعاون کرے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے اس کی بڑی فضیلت بھی ارشاد فرمائی ہے:

((وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ))(۱)

یعنی جب تک مسلمان کسی معاملے میں اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی مدد کرتا رہتا ہے اور اس کے کام بناتا رہتا ہے۔

زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے بڑا اچھا ارشاد فرمایا۔ اس حدیث کے بارے میں محدثین کے یہاں یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ جب بھی کوئی طالب علم کسی محدث کے پاس حدیث پڑھنے جاتا ہے

(۱) صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر، رقم: ٤٨٦٧، سنن الترمذی، كتاب الحدود عن رسول الله، باب ما جاء فی الستر علی المسلم، رقم: ١٣٤٥، سنن أبی داؤد، كتاب الادب، باب فی المعونة للمسلم، رقم: ٤٦٩٥، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، رقم: ٢٢١، مسند أحمد، رقم: ٧١١٨

تو استاذ اس طالب علم کو سب سے پہلے یہ حدیث سناتے ہیں، وہ حدیث یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اِرْحَمُوْا مَنْ فِى الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِى السَّمَآءِ))(۱)

''رحم کرنے والوں پر ''رحمٰن'' رحم کرتا ہے تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا''

اور جو آدمی زمین والوں پر رحم کرنا نہیں جانتا، اس کو آسمان والے سے بھی رحمت کی توقع مشکل ہے۔ بہر حال! ضعیف کی مدد کرنا اور مظلوم کی اعانت کرنا اسلامی تعلیمات کا اہم شعار ہے۔

قسم کھانے والے کی مدد کرنا

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر حقوق ہیں، ان میں سے ساتواں حق جو حدیث میں بیان فرمایا: وہ ہے:

((اِبْرَارُ الْمُقْسِمِ))

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کوئی قسم کھالی ہے اور اب وہ اس قسم کو پورا کرنے پر قادر نہیں ہے، تو ایسے مسلمان کی مدد کرنا تاکہ وہ اپنی قسم پوری کرلے، یہ بھی مسلمان کے حقوق میں داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء في رحمة الناس، رقم: ۱۸٤۷، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في الرحمة، رقم: ٤۲۹۰

مصیبت کے وقت کی دعا ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گزشتہ تقریباً ایک سال سے مسنون دعاؤں کی تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے، اب چند دعائیں باقی ہیں، انشاء اللہ ان کی تشریح کر کے اس سلسلے کو مکمل کرنے کا ارادہ ہے، اللہ جل شانہ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

دنیا میں کوئی تکلیف سے خالی نہیں

جب آدمی صبح کے وقت کاروبارِ زندگی میں داخل ہوتا ہے تو وہاں پر اس کو ہر قسم کے حالات و واقعات سے سابقہ پیش آتا ہے کوئی انسان اس روئے زمین پر ایسا نہیں ہے جس کو ان حالات اور واقعات سے کبھی بھی تکلیف نہ پہنچتی ہو، بڑے سے بڑا سرمایہ دار، بڑے سے بڑا دولت مند، بڑے سے بڑا حاکم، بڑے سے بڑا صاحبِ اقتدار، یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی، اگر انسان ہے اور وہ اس دنیا میں ہے تو اس کو کبھی نہ کبھی تکلیف ضرور پہنچے گی، اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔

مؤمن اور کافر میں فرق

لیکن تکلیف پہنچنے پر ایک کافر کے رویہ میں اور ایک مسلمان کے رویہ میں زمین و آسمان کا فرق

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۳۳۰ تا ۳۳۸)

(۱) المؤمن: ٦٠، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ: "مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، بے شک جو لوگ تکبر کی بنا پر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے"

ہے۔ جب کافر کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اس تکلیف کا زبان سے اظہار کرتا ہے، بعض اوقات روتا چلا تا ہے، بعض اوقات شکوہ کرتا ہے، بعض اوقات وہ تقدیر کا گلہ کرنے لگتا ہے اور ''نعوذ باللہ'' اللہ تعالیٰ سے گلہ شکوہ کرنے لگتا ہے۔

تکلیف کے وقت کی دعا

مگر حضورِ اقدس ﷺ نے ایک مؤمن کو یہ تلقین فرمائی کہ جب کبھی تمہیں کوئی تکلیف کی بات پیش آئے تو یہ کلمات پڑھو:

﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾(۱)

اور اس کے بعد یہ دعا پڑھو:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَحْتَسِبُ عِنْدَكَ فِیْ مُصِيْبَتِیْ وَأْجُرْنِیْ فِيْهَا وَأَبْدِلْنِیْ خَيْرًا مِّنْهَا))(۲)

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تکلیف پہنچنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی بڑی مصیبت آجائے بلکہ اگر چھوٹی سی تکلیف پہنچے تو بھی یہی حکم ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب چراغ گل ہو گیا تو حضورِ اقدس ﷺ نے إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔(۳)

''إِنَّا لِلّٰهِ'' کا مطلب

یہ جملہ درحقیقت بڑا عجیب جملہ ہے، اگر انسان اس جملے کو سوچ سمجھ کر زبان سے ادا کرے تو دنیا کی کوئی مصیبت اور کوئی تکلیف ایسی نہیں ہے جس پر یہ جملہ ٹھنڈک نہ ڈال دیتا ہو۔ اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ ''ہم سب اللہ تعالیٰ کے ہیں'' یعنی اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی کی مملوک ہیں اور ہم سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں'' اور جب یہ کہا ''انا للہ''

---

(۱) البقرہ: ۱۵٦

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللّٰه، باب منه، رقم: ۳٤۳۳، سنن أبی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی الاسترجاع، رقم: ۲۷۱۲، سنن ابن ماجه، کتاب ما جاء فی الجنائز، باب ما جاء فی الصبر علی المصيبة، رقم: ۱۵۸۷، مسند أحمد، رقم: ۱۵۷۵۰، دعا کا ترجمہ یہ ہے: ''اے اللہ! میں اپنی اس مصیبت میں تجھ سے ثواب کی امید رکھتا ہوں، مجھے اس کا اجر عطا فرما اور مجھے اس سے بہتر عطا فرما''

(۳) تفسیر القرطبی (۱۷۵/۲)، تسلية أهل المصائب (۱۳/۱)، تفسير الثعالبی (۱۲۳/۱)

کہ ہم تو ہیں ہی اللہ کے بندے، اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہیں، اللہ تعالیٰ ہی ہمارا خالق اور مالک ہے، لہٰذا اگر ہمیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو یقیناً اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔

دیکھنے میں یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہمیں تکلیف پہنچی ہے، ہمیں پریشانی لاحق ہوئی ہے، لیکن حقیقت میں اللہ جل شانہ کی حکمت اس میں حاوی ہے اور یہ کام اس کی حکمت کے بغیر نہیں ہوسکتا، جو تصرف ہماری ذات میں چل رہا ہے، وہ سب حکمت پر مبنی ہے اور اس پر کسی کو گلہ شکوہ کرنے کا کوئی موقع نہیں۔

"وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کا مطلب

دوسرا جملہ ہے:

﴿وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾

اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یعنی یہ تکلیف جو پہنچی ہے، یہ ہمیشہ رہنے والی نہیں، ایک وقت آئے گا کہ ہم بھی اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جائیں گے، اگر ہم نے اس مصیبت پر صبر کیا اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھا تو اس کے نتیجے میں ہمیں اللہ تعالیٰ کے پاس اجر حاصل ہوگا۔

دوسری دعا کا مطلب اور ترجمہ

اس کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَحْتَسِبُ عِنْدَكَ فِیْ مُصِيْبَتِیْ وَأْجُرْنِیْ فِيْهَا وَأَبْدِلْنِیْ خَيْرًا مِّنْهَا))

اے اللہ! میں اس مصیبت میں آپ سے ثواب طلب کرتا ہوں، یعنی یہ تکلیف جو مجھے پہنچی ہے، آپ کی رحمت سے مجھے اُمید ہے کہ اس مصیبت کے عوض آپ مجھے آخرت میں ثواب عطاء فرمائیں گے، لہٰذا آپ مجھے اس پر اجر عطاء فرمائیے۔ پہلے تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرلی کہ اے اللہ! جو تکلیف پہنچنی تھی وہ پہنچ گئی اور چونکہ وہ تکلیف آپ کی طرف سے آئی ہے، اس لئے میں اس پر راضی ہوں، لیکن ساتھ ہی آپ سے یہ التجاء ہے کہ اس مصیبت کے بدلے مجھے آخرت میں اجر عطاء فرمائیے۔

مصیبت کا بدل مانگئے

اب اس پر کسی کو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ جب تم مصیبت پر راضی ہوگئے اور اللہ تعالیٰ سے اس مصیبت پر اجر بھی مانگ رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مصیبت باقی رہے، لیکن سرکار دو عالم ﷺ نے اگلا جملہ ارشاد فرما کر اس خیال کی تردید فرمادی، چنانچہ فرمایا کہ یہ کہو کہ اے اللہ! مجھے اس مصیبت کے بدلے کوئی بہتر چیز عطاء فرمادیجئے۔ یعنی میں اگرچہ آپ کے فیصلے پر راضی ہوں اور آپ کے فیصلے پر مجھے کوئی گلہ اور شکوہ نہیں ہے اور نہ اعتراض ہے، لیکن اے اللہ! میں کمزور ہوں، میں مصیبت کا تحمل نہیں کرسکتا، اس لئے آپ میری کمزوری پر رحم فرمایئے اور آپ مجھ سے یہ مصیبت دور فرمادیجئے اور اس کے بدلے میں مجھے اچھی حالت عطا فرمادیجئے۔

مصیبت دور ہونے کی دعا کیجئے

لہٰذا اس دعا میں ایک طرف تو جو مصیبت اور تکلیف پہنچی ہے، اس تکلیف اور مصیبت پر گلہ اور شکوہ کوئی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کا اعلان ہے، دوسری طرف اپنی کمزوری کا اعتراف ہے کہ اے اللہ! میرے اندر اس مصیبت اور تکلیف کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اگر یہ مصیبت مزید جاری رہے تو میں بے صبری کا شکار ہوجاؤں، اس لئے اے اللہ! میں آپ سے دعا یہی کرتا ہوں کہ مجھ سے یہ مصیبت اور تکلیف دور فرمادیجئے۔ اس دعا میں حضور اقدس ﷺ نے دونوں چیزوں کو جمع فرمادیا۔

میرے والد ماجد اور بیماری

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ، شدید تکلیف میں مبتلا تھے، ایک طرف دل کی تکلیف، دوسری طرف بواسیر کا پھوڑا نکل آیا، تیسری طرف جسم پر ہرپیز کی پھنسیاں نکل آئی تھیں جو شدید تکلیف دہ ہوتی ہیں، ڈاکٹروں کا کہنا یہ تھا کہ ان پھنسیوں میں ایسی تکلیف ہوتی ہے جیسے کسی نے آگ کا انگارہ جسم پر رکھ دیا ہو۔ اسی حالت میں جوان بیٹے کے انتقال کی خبر آگئی اور بیماری کی وجہ سے بیٹے کے جنازے میں بھی شرکت کے متحمل نہیں تھے، اس حالت میں زبان سے یہ کلمہ نکلا: یا اللہ! رحم فرما، یا اللہ! رحم فرما، یا اللہ! رحم فرما۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد فرمانے لگے کہ یہ میں نے کیا جملہ زبان سے نکال دیا، ''یا اللہ رحم فرما'' اس جملے کا کہیں یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ گویا اللہ تعالیٰ اب تک رحم نہیں فرما رہے تھے۔ ارے ہم تو اللہ تعالیٰ کے رحم میں جی رہے ہیں،

یہ تھوڑی سی تکلیف ضرور ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل کی ہر وقت بارش ہو رہی ہے۔ لہٰذا اب میں یہ دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ! اس تکلیف کی نعمت کو راحت کی نعمت سے تبدیل فرما دیجئے۔ یعنی یہ تکلیف بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس لئے کہ اس تکلیف پر اللہ تعالیٰ نے جو اجر و ثواب رکھا ہے، وہ بڑا عظیم الشان ہے، لہٰذا یہ تکلیف بھی نعمت ہے، لیکن ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے اور اپنے ضعف اور ناتوانی کی وجہ سے اس نعمت کو نعمت نہیں سمجھتے، لہٰذا اے اللہ! اس تکلیف کی نعمت کو راحت کی نعمت سے بدل دیجئے۔

یہ تکالیف بھی نعمت ہیں

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو جتنی بھی تکلیفیں پیش آتی ہیں، چاہے وہ صدمہ ہو یا رنج ہو، کوئی فکر ہو، کوئی تشویش ہو، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہیں۔ اس لئے نعمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب تکلیفیں اپنی حکمت سے مؤمن کے اوپر ڈالی ہیں اور یہ سب مؤمن کے لئے ثواب اور ترقی درجات کا ذریعہ بن رہی ہیں اور گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ لیکن ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! اس کے بجائے ہمیں راحت کی نعمت عطاء فرمایئے اور اس پر شکر کی توفیق عطاء فرمایئے۔

تکلیف میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع

حضور اقدس ﷺ نے اس حدیث میں یہی دعا فرمائی کہ اے اللہ! اس مصیبت کے بدلے اس سے بہتر کوئی ایسی چیز عطاء فرما دیجئے جس کو میں برداشت کرسکوں اور جو میری کمزوری کے مطابق ہو۔ لہٰذا جب بھی انسان کو کوئی صدمہ، تکلیف، مصیبت پیش آئے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور کہے: یا اللہ! یہ مصیبت پیش آگئی ہے، آپ اس پر مجھے ثواب دیجئے اور اس کے بدلے مجھے راحت عطاء فرما دیجئے۔ جب یہ دو کام کرلیے تو یہ مصیبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انشاء اللہ نعمت بن جائے گی اور رحمت کا ذریعہ بن جائے گی۔

یہ نسخہ بظاہر دیکھنے میں چھوٹا سا ہے لیکن اس پر عمل کرکے دیکھیں۔ لہٰذا چھوٹی سے چھوٹی تکلیف بھی پہنچے یا چھوٹے سے چھوٹا صدمہ بھی پیش آئے، بس اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرکے یہ بات کہہ دو، پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کہاں سے کہاں پہنچاتے ہیں اور کیسے تمہارے درجات میں ترقی عطاء فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

صحت کی دعا کرنا سنت ہے ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ. وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا:

''اب پروردگارِ عالم ساتھ ایمان کے بلالیں، بلا بصارت زندگی بیکار ہے، تلاوت و مواعظ وغیرہ سے محرومی کا سخت رنج ہے''(۱)

ان صاحب کی آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی اور بینائی کا چلے جانا بلاشبہ سخت مصیبت کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حفاظت میں رکھے۔ خاص طور پر وہ شخص جو اچھا بھلا دیکھنے والا اور مطالعہ کرنے والا ہو، اگر اس کی بینائی جاتی رہے تو بڑی سخت تکلیف کی بات ہے۔ اس تکلیف پر انہوں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ بس اب تو یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان کے ساتھ اپنے پاس بلالیں، کیونکہ جب آنکھ ہی نہ رہی تو اب زندگی سے کچھ فائدہ نہیں، اب تو قرآن کریم کی تلاوت بھی نہیں کرسکتے، مواعظ بھی نہیں پڑھ سکتے، ان سب سے محرومی ہوگئی ہے۔

صحت کی دعا عبدیت کی علامت ہے

حضرت والا نے جواب میں لکھا:

''صحت کی دعا تو سنت ہے اور علامت ''عبدیت'' کی ہے، مگر یہ کہنا کہ اب پروردگارِ عالم ساتھ ایمان کے بلالیں، بلا بصارت زندگی بیکار ہے'' یہ نہایت بے ادبی ہے اور بعید از ''عبدیت'' ہے، ہم کورائیں لگانے کا کیا حق ہے، حضرت حق سے جو پیش آئے خیر ہے، تلاوت و کتب بینی میں ثواب اور رضا منحصر نہیں، اوّل تو صحت کی حالت میں تطوّع پر مداومت کرنے والے کو مرض میں بدون عمل کیے بھی ثواب عمل سابق کا ملتا رہتا ہے۔ دوسرے بعض اوقات صبر کا اجر عمل کے اجر سے بڑھ جاتا

☆ اصلاحی مجالس (۳/۲۸۰ تا ۳۰۵)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم کراچی۔

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۷۸

ہے، البتہ بیتابی کی دعا خودرائی نہیں، اس کی اجازت ہے، دعا مانگے اور دل سے مانگے اور ساتھ میں یہ سمجھے کہ اگر اس کے خلاف واقع ہوا وہ بھی خیر ہے، اس پر بھی راضی رہے"(۱)

بیماری میں دعا کرنے کا ثبوت

دو باتیں الگ الگ ہیں، دونوں کی حقیقت سمجھنے کی ضرورت ہے، پہلی بات تو یہ کہ جب آدمی بیمار ہو یا تکلیف میں ہو تو اس بیماری کی حالت میں صحت مانگنا کہ یا اللہ! مجھے صحت عطا فرما دے، یہ دعا کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ سنت ہے، اس لئے یہ دعا مانگنی چاہئے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیۤ اَسْئَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعِفَّةَ وَالْاَمَانَةَ وَحُسْنَ الْخُلُقِ وَالرِّضَا بِالْقَدَرِ))(۲)

"اے اللہ! میں آپ سے صحت، عفت، امانت، حسنِ اخلاق اور رضا بالقدر کا سوال کرتا ہوں"

اور ایک مرتبہ جب حضور اقدس ﷺ تکلیف کے عالم میں تھے تو آپ ﷺ نے ان الفاظ سے دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیۤ اَسْئَلُكَ تَعْجِيْلَ عَافِيَتِكَ وَصَبْرًا عَلٰى بَلِيَّتِكَ وَخُرُوْجًا مِّنَ الدُّنْيَا اِلٰى رَحْمَتِكَ))(۳)

اس دعا میں صرف یہ نہیں کیا کہ عافیت مانگ رہے ہیں، بلکہ جلدی مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! جلدی سے عافیت دے دیجئے اور مصیبتوں پر صبر عطا فرمائیے۔ لہٰذا تعجیلِ عافیت کی دعا مانگنا بھی سنت ہے اور اس میں ثواب بھی ہے۔ اور عبدیت اور بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے تکلیف کے ازالے کی دعا کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری کا مظاہرہ کرنا اچھی بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ، ص: ۸۷

(۲) كنز العمال، رقم: ٣٦٥٠ (١٨٣/٢)، شعب الإيمان، رقم: ١٩٥ (٢١٧/١)، الأدب المفرد، رقم: ٣٠٧ (١١٥/١)، مجمع الزوائد، رقم: ١٧٣٦٧ (٢٧٤/١٠)

(۳) كنز العمال، رقم: ٣٦٩٨ (٢٨٦/٢)، المستدرك للحاكم، رقم: ١٨٧٢ (٤٦٥/٤)، صحيح ابن حبان، رقم: ٢٠٣ (١٩٨/٣)، دعا کا ترجمہ یہ ہے: "اے اللہ! میں آپ سے عافیت کا جلدی حصول، مصیبت پر صبر اور دنیا سے آپ کی رحمت کی طرف روانگی مانگتا ہوں"

کے سامنے عبدیت، شکستگی، عاجزی کا مظاہرہ کرنا مطلوب ہے، یہ نہ ہو کہ سینہ تان کر کہیں کہ اور بیماری لاؤ، ہم تو برداشت کریں گے، یہ عبدیت کا تقاضا نہیں۔ عبدیت کا تقاضا یہ ہے کہ جب بیماری آئے تو اللہ تعالیٰ سے صحت مانگے کہ یا اللہ! مجھے صحت عطا فرما دے، جیسے حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا:

﴿وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾(۱)

دوسری جگہ فرمایا:

﴿أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرْ﴾(۲)

''میں مصیبت اور پریشانی میں ہوں ہوں میری مدد فرما''

بہرحال، صحت مانگنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا کہ ایک بزرگ بیمار ہوگئے، دوسرے بزرگ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، انہوں نے جاکر دیکھا کہ وہ بیمار بزرگ تکلیف میں ہیں، لیکن اس تکلیف کے عالم میں ''الحمد للہ، الحمد للہ'' کا ورد کر رہے ہیں، نہ تو آپ آہ کر رہے ہیں اور نہ ہی صحت کی دعا کر رہے ہیں۔ جو بزرگ عیادت کرنے کے لئے گئے تھے، انہوں نے کہا کہ دیکھو بھائی! اگر تم نے اس طرح ''الحمد للہ'' کا ورد جاری رکھا تو صحت حاصل نہیں ہوگی، اگر صحت چاہتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ یہ تکلیف دور ہو جائے تو تھوڑا ہائے ہائے کرو، اور اللہ تعالیٰ سے صحت مانگو اور کہو کہ یا اللہ! میں عاجز اور کمزور ہوں، مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی، آپ مجھ سے اس تکلیف کو دور فرما دیجئے اور صحت عطا فرما دیجئے۔ بہرحال، اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور شکستگی کا اظہار کرنا مطلوب ہے، نہ یہ کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری کا اظہار کرے۔

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں

ہمارے بڑے بھائی تھے، محمد ذکی کیفی صاحب، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین شعر بہت اچھے کہتے تھے، ایک شعر میں انہوں نے یہی بات بیان فرمائی ہے، فرمایا کہ۔

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں
توڑنا ہے حسن کا پندار کیا؟

---

(۱) الأنبیاء: ۸۳، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور ایوب کو دیکھو! جب انہوں نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ: ''مجھے تکلیف لگ گئی ہے اور تو سارے رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے'' (۲) القمر: ۱۰

ضبطِ غم ویسے تو اچھی چیز ہے، لیکن اس قدر بھی ضبطِ غم نہ ہو کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادر بن جائے، کیا اللہ تعالیٰ کا پندار توڑنا چاہتے ہو کہ آپ مجھے کتنی بھی تکلیف دیں، لیکن میں بڑا بہادر ہوں، میں سب برداشت کروں گا۔ یاد رکھو! یہ بندگی کا تقاضا نہیں ہے، بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگے کہ یا اللہ! مجھے صحت عطا فرما دیجئے۔

بھوک کی وجہ سے ایک بزرگ کا رونا

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سنایا کرتے تھے کہ ایک بزرگ بیٹھے رو رہے تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! کیوں رو رہے ہیں؟ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس لئے رو رہا ہوں کہ بھوک لگ رہی ہے، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا ہوں کہ یا اللہ! بھوک لگ رہی ہے، کھانا کھلا دیجئے۔ کسی نے کہا کہ آپ تو بچوں کی طرح رو رہے ہیں! انہوں نے فرمایا کہ اللہ میاں نے مجھے اسی لئے بھوک دی ہے تاکہ میں رو رو کر اس سے مانگوں اور اس کے سامنے عاجزی کا اظہار کروں۔

بیماری میں ہائے ہائے کرنا

بہرحال، بیماری کی حالت میں صحت کی دعا کرنا تو سنت ہے، بشرطیکہ وہ ایسے طریقے سے نہ ہو کہ اس میں شکوہ پنہاں ہو، معاذ اللہ۔ بیماری کی حالت میں ہائے ہائے کرنے میں کوئی حرج نہیں، تکلیف کے اظہار میں کوئی حرج نہیں، لیکن تکلیف کا اظہار ایسے الفاظ سے نہ ہو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ ہو، کیونکہ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یا اللہ! فیصلہ آپ ہی کا برحق ہے، مشیت آپ ہی کی درست ہے، لیکن میں کمزور ہوں، عاجز ہوں، اس تکلیف کو برداشت نہیں کر پا رہا ہوں، اے اللہ! اس تکلیف کو دور فرما دیجئے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تکالیف پر صبر

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کو دیکھا کہ آپ کو شدید دل کی تکلیف تھی، اس کے ساتھ ساتھ پاؤں میں نقرس کا درد، اور پھر اس کے علاوہ جسم پر پھنسیاں بھی نکل آئیں، جس کو ڈاکٹر ہرپیز کی پھنسیاں کہتے ہیں، جو ڈاکٹر اور اطباء آکر ان پھنسیوں کو دیکھ رہے تھے، وہ بتاتے تھے کہ یہ پھنسیاں ایسی ہیں کہ جب جسم پر نکل آتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسم پر کسی نے انگارہ رکھ دیا ہو، اور پوری ٹانگ ان پھنسیوں سے بھری ہوئی تھی اور سینے پر بھی نکلی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس دوران حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھنے کے لئے چھ سات بڑے بڑے اطباء اور ڈاکٹر

آئے جن میں حکیم سعید صاحب بھی تھے، جب یہ حضرات دیکھ کر باہر تشریف لائے تو انہوں نے کہا کہ ہمیں اس پر حیرت ہے کہ مفتی صاحب کیسے اس کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں، اس لئے کہ یہ پھنسیاں تو بالکل انگاروں کی طرح تکلیف دہ ہوتی ہیں۔

رحم کی دعا پر استغفار

ابھی اپنی ان تکالیف کے اندر مبتلا تھے کہ اسی حالت میں ہمارے بڑے بھائی صاحب ''بھائی ذکی کیفی مرحوم'' کے انتقال کی خبر آئی، جو جوان اور محبوب بیٹے تھے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ ایک طرف دل کی تکلیف، دوسری طرف نقرس کا درد، تیسرے ہر پیز کی پھنسیاں، اور چوتھے جوان بیٹے کے انتقال کی خبر۔ اس وقت بے ساختہ زبان پر یہ الفاظ آئے: یا اللہ! فضل فرما، یا اللہ! رحم فرما۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد فرمایا کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا کہ یا اللہ! رحم فرما، اس کا تو مطلب یہ ہے کہ اب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحم نہیں ہو رہا ہے، یہ تو معاذ اللہ شکوہ کی بات ہوگئی، اس میں شکوہ کا شائبہ پیدا ہو گیا، حالانکہ ہم تو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش میں زندگی گزار رہے ہیں، یا اللہ! میں ان الفاظ پر آپ سے استغفار کرتا ہوں، استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ۔ پھر یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ! یہ بیماری بھی آپ کی نعمت ہے، لیکن یا اللہ! ہم کمزور ہیں، عاجز ہیں، اس نعمت کو برداشت کرنے کی طاقت ہمارے اندر نہیں ہے، اے اللہ! اس بیماری کی نعمت کو صحت کی نعمت سے تبدیل فرما۔

دعا میں شکوہ کا رنگ نہ ہو

آپ اندازہ لگائیں کہ جس شخص پر یہ تکالیف اور پریشانی گزر رہی ہو، اس وقت ذہن کا اس بات کی طرف جانا کہ میرا یہ جملہ ''یا اللہ! رحم فرما'' کہیں غلط نہ ہو گیا ہو، یہ اسی شخص کا ذہن اس طرف جا سکتا ہے جس کا رابطہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے جڑا ہوا ہو، ہر کس و ناکس کا ذہن اس طرف نہیں جا سکتا۔ اس کے ذریعہ ادب سکھا دیا کہ صحت کی دعا مانگو، لیکن اس طرح نہ مانگو کہ اس میں شکوہ کا رنگ پیدا ہو جائے، بلکہ اپنی کمزوری اور اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے صحت کی دعا کرو، اپنی شکستگی کا اظہار کرتے ہوئے مانگو، پھر انشاء اللہ اس دعا پر اللہ تعالیٰ ثواب بھی عطا فرمائیں گے۔ اسی لئے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: صحت کی دعا تو سنت ہے اور علامت ''عبدیت'' کی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں توصیف کے کلمات

یاد رکھئے! انسان کا اعلیٰ ترین مقام جس سے اعلیٰ مقام کوئی اور نہیں ہو سکتا، وہ ''عبدیت'' کا

مقام ہے، یعنی انسان اللہ کا بندہ بن جائے۔ دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضورِ اقدس ﷺ کا ذکر کتنے عنوانات سے فرمایا کہ تعریف اور توصیف کا کوئی کلمہ نہیں چھوڑا۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ٥ وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ٥﴾(۱)

"اے نبی ہم نے آپ (ﷺ) کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ٥﴾(۲)

"یعنی تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے، جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں، مؤمنین کے ساتھ بڑے شفیق مہربان ہیں"

مختلف عنوانات سے اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ کی توصیف فرمائی ہے، کہیں "يَاأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ" فرما رہے ہیں، اور کہیں "يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ" فرما رہے ہیں، کہیں "کملی والے" کہہ کر خطاب کر رہے ہیں، کہیں "چادر والے" کہہ کر خطاب کر رہے ہیں، محبت اور پیار کا اور تعظیم و تکریم کا کوئی عنوان نہیں چھوڑا۔

معراج کے تذکرے میں "عبد" کا لفظ لانا

لیکن جب اللہ تعالیٰ نے معراج کے موقع پر آپ کو قرب کا سب سے اعلیٰ مقام عطا فرمایا، جہاں پر آپ ﷺ کو ہم کلامی کا شرف عطا فرمایا اور اس مقام پر پہنچایا کہ جبرائیل امین بھی وہاں نہ جاسکے، تو قرآن کریم میں جہاں اس بلند مقام کے عطا کرنے کا ذکر فرمایا، وہاں آپ ﷺ کے لئے صرف ایک لفظ "عبد" کا ذکر فرمایا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾(۳)

"پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے وقت مسجدِ حرام سے لے گئی"

اب یہاں پر نہ "شاهدا" کا لفظ ارشاد فرمایا، نہ "مبشرا" نہ "نذیرا" لائے، یہاں صرف

(۱) الأحزاب: ٤٥ (۲) التوبة: ۱۲۸ (۳) بني اسرائيل: ۱

"بعبدہ" کا لفظ لائے کہ اپنے بندے کو لے گئے، اس سے اشارہ اس طرف فرمادیا کہ "بندگی" سے زیادہ اُونچا کوئی دوسرا مقام نہیں ہوسکتا، چاہے کوئی انسان کتنا ہی آگے بڑھ جائے، لیکن اس کی معراج یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جائے۔ لہٰذا انسان کا اعلیٰ ترین مقام "عبدیت" ہے، اور یہ "عبدیت" اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے روئے، گڑگڑائے، شکستگی اور عاجزی کا اظہار کرے۔

یہ بے ادبی کے الفاظ ہیں

بہر حال! حضرت والا نے فرمایا کہ "صحت کی دعا کرنا تو سنت ہے اور علامت عبدیت کی ہے۔ مگر یہ کہنا کہ اب پروردگارِ عالم ساتھ ایمان کے بلالے، بلا بصارت زندگی بیکار ہے، یہ نہایت بے ادبی ہے۔ یہ الفاظ اکثر و بیشتر لوگوں کی زبان پر آجاتے ہیں کہ اب تو اللہ میاں ایمان کے ساتھ اُٹھالے، اب تو زندگی بیکار ہے۔ ان الفاظ کے بارے میں فرمایا کہ یہ بہت بے ادبی کی بات ہے اور عبدیت سے بہت بعید ہے۔ ارے ہم کو رائے قائم کرنے کا کیا حق ہے کہ ہم زندگی کے بارے میں یہ رائے قائم کریں کہ اب تو زندگی بیکار ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فضول زندہ رکھا ہے، معاذ اللہ۔

یہ تکلیف تمہیں کس بلند مقام پر پہنچارہی ہے

تمہیں کیا معلوم کہ تمہارے لئے زندگی بہتر ہے یا موت بہتر ہے، کیا معلوم کہ اس آنے والی زندگی میں کوئی ایک عمل ایسا ہوجائے جس سے بیڑہ پار ہوجائے، کیا معلوم کہ یہ تکلیف جس کی وجہ سے تم کراہ رہے ہو اور یہ تمنا کر رہے ہو کہ مجھے موت آجائے تو بہتر ہے، یہی تکلیف تمہیں معلوم نہیں کس بلند مرتبے پر پہنچارہی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے یہاں معاملات بڑے عجیب ہوتے ہیں، کوئی ان کو سمجھ نہیں سکتا۔

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کسے چراں و چوں نہ رسد در قضاء ما

یعنی ہم دشمنوں کو پالتے ہیں اور دوستوں کو مار دیتے ہیں، کسی کو ہمارے فیصلے میں چوں وچرا کرنے کی گنجائش نہیں۔ اچھے خاصے دشمن خدا اور دشمن دین کو ڈھیل دی جارہی ہے، وہ چاند پر جھنڈے گاڑ رہے ہیں، اور جو اپنے پیارے اور محبوب ہیں، ان کو آروں سے چروایا جارہا ہے۔

ایک حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی بندے کو کسی خاص مقام تک پہنچانا چاہتے ہیں، لیکن وہ شخص اپنے اعمال کے ذریعہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکا تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی تکلیف میں مبتلا کردیتے ہیں، کبھی جسم میں، کبھی جان میں، کبھی خیالات میں، کبھی

جذبات میں تکلیف دے دیتے ہیں، پھر اس تکلیف کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کو کہاں سے کہاں پہنچادیتے ہیں۔

ایک مسلمان اور ایک یہودی کا قصہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک شہر میں ایک یہودی تھا اور ایک مسلمان تھا، دونوں بسترِ مرگ پر مرنے کے قریب تھے، یہودی کے دل میں مچھلی کھانے کی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش کہ کہیں سے مچھلی مل جائے تو کھاؤں اور مسلمان کے دل میں زیتون کا تیل کھانے کا دل چاہا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے سے فرمایا کہ فلاں شہر میں ایک یہودی ہے، اس کا مچھلی کھانے کو دل چاہ رہا ہے، تم ایسا کرو کہ ایک مچھلی پکڑ کر اس کے گھر کے اندر جو تالاب ہے اس میں ڈال دو، تاکہ وہ مچھلی وہاں سے نکلوا کر کھالے۔ اور ایک فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ فلاں مسلمان کو زیتون کھانے کا دل چاہ رہا ہے اور اس کے گھر کی الماری میں زیتون موجود ہے، تم جا کر وہ زیتون ضائع کردو۔ چنانچہ وہ دونوں فرشتے اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کے لئے روانہ ہوگئے۔

فرشتوں نے اپنا اپنا کام کرلیا

راستے میں دونوں فرشتوں کی ملاقات ہوگئی، ایک فرشتے سے دوسرے نے پوچھا کہ تم کہاں جارہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ ایک یہودی کا مچھلی کھانے کو دل چاہ رہا ہے، اس کے تالاب میں مچھلی ڈال دوں، تاکہ وہ اس کو کھالے۔ دوسرے فرشتے نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں جارہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ فلان مسلمان کو زیتون کا تیل کھانے کو دل چاہ رہا ہے، تم جا کر اس کے تیل کو ضائع کردو، تاکہ وہ اس کو نہ کھاسکے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم تو بہرحال حکم ہے، اس کو ماننا ضروری ہے، چنانچہ دونوں فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنا اپنا کام کرلیا۔

یا اللہ! بات سمجھ میں نہیں آئی

جب وہ دونوں فرشتے اپنا اپنا کام کر کے واپس ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچے اور عرض کیا کہ یا اللہ! یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک طرف یہودی ہے جو کافر ہے، اس کی خواہش تو آپ اس طرح پوری کرارہے ہیں کہ اس کے تالاب میں مچھلی موجود بھی نہیں تھی، اس کے باوجود اس کی خواہش پوری کرنے کے لئے اس کے تالاب میں مچھلی ڈلوادی۔ دوسری طرف مسلمان ہے جس

کے گھر میں زیتون کا تیل موجود تھا، اس کے باوجود آپ نے اس کے تیل کو ضائع کرا دیا، تا کہ وہ اپنی خواہش پوری نہ کر سکے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

کافروں کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ یہ جو غیر مسلم اور کافر ہیں ان کے ساتھ میرا معاملہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ دنیا میں اچھے کام کرتے ہیں، مثلاً کوئی صدقہ خیرات کر دیا، دوسرں کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آگئے، کوئی خیراتی کام کر دیئے وغیرہ، میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کے اچھے کاموں کا بدلہ دنیا میں ہی چکا دیا جائے، اور جب یہ میرے پاس آئیں تو ان کی اچھائیوں کا حساب دنیا میں صاف ہو چکا ہو، اور میرے ذمے آخرت میں ان کی نیکی کا بدلہ کوئی نہ ہو، اس لئے میں ان کی نیکیوں کا بدلہ دنیا میں دیتا رہتا ہوں۔ یہ یہودی بھی بہت سے اچھے کام کرتا تھا، ان تمام اچھے کاموں کا بدلہ میں دنیا میں دے چکا تھا، صرف ایک اچھے کام کا بدلہ اس کو دنیا میں نہیں ملا تھا، اور اب یہ یہودی ہمارے پاس آنے والا تھا، اس لئے ہم نے چاہا کہ اس کی یہ آخری خواہش اور پوری کر دی جائے تا کہ اس کے نتیجے میں اس کا حساب کتاب برابر ہو جائے، لہٰذا اس کی اس خواہش کو پورا کر کے ہم نے اس کا حساب کتاب برابر کر دیا، اب یہ ہمارے پاس آئے گا تو ہمارے ذمے اس کی کسی نیکی کا بدلہ دینا باقی نہیں ہوگا۔

مسلمانوں کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے

اور مسلمانوں کے ساتھ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں گناہ کرتا ہے تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس کے گناہوں کا حساب دنیا ہی میں بیباق ہو جائے، تا کہ جب وہ ہمارے پاس آئے تو گناہ کا کوئی حساب اس کے کھاتے میں نہ ہو اور ہمیں اس کو عذاب دینے کے لئے جہنم میں نہ بھیجنا پڑے۔ لہٰذا اگر کسی مسلمان کے ذمے کوئی گناہ باقی ہوتا ہے تو ہم تکلیفوں کے ذریعہ اور بیماریوں کے ذریعہ اس کے گناہ ختم کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اس مسلمان کے اور سارے گناہ تو معاف ہو گئے تھے، صرف ایک گناہ باقی رہ گیا تھا، ہم نے چاہا کہ اس کا یہ گناہ بھی باقی نہ رہے، تا کہ جب یہ ہمارے پاس آئے تو پاک صاف ہو کر ہمارے پاس آئے، اس لئے جب اس کے دل میں زیتون کا تیل کھانے کی خواہش ہوئی تو ہم نے اس کا زیتون کا تیل ضائع کرا دیا اور اس کے دل پر ایک چوٹ اور لگا دی اور اس کے نتیجے میں اس کا وہ گناہ بھی ختم ہو گیا، اور اب وہ ہمارے پاس دھلا دھلایا پاک صاف ہو کر آئے گا۔ لہٰذا کہاں تک انسان اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا ادراک کرے گا۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو نوازنے کا انداز

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا، اتفاق سے کسی کتاب میں نہیں دیکھا، اور تلاش بھی کیا لیکن نہیں ملا، آپ حضرات بھی تلاش کیجئے گا، مل جائے تو مجھے اس کا حوالہ بتادیں۔ وہ قصہ یہ ہے کہ جس وقت حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا بیمار تھیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اپنی تکلیف کا اظہار کر رہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ یہ تمہاری تکلیف جان لیوا تکلیف ہے، تم اب بچوگی نہیں، اسی بیماری میں تمہارا انتقال ہو جائے گا۔(۱)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت رحیم و کریم تھے، بڑے شفیق اور مہربان تھے، اور پھر عام لوگوں کو بھی یہ حکم ہے کہ جب آدمی کسی کی عیادت کے لئے جائے تو جا کر اس کو تسلی دے، نہ یہ کہ اس کو یہ کہے کہ تم اس بیماری میں مرجاؤ گے، پھر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں، اور بیوی بھی ایسی ہمدرد اور غمگسار تھیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر ان کو یاد فرمایا۔ ایسی بیوی سے آپ نے یہ جملہ کیسے فرمادیا کہ تم اس بیماری میں بچوگی نہیں، بلکہ مرجاؤ گی۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ علماء کرام نے اس کے بارے میں فرمایا کہ بات دراصل یہ تھی کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو آخرت میں جنت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنا تھا، لیکن اعمال کے ذریعہ وہ ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکی تھیں، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنت میں اپنے ساتھ رکھنے کی خاطر یہ عمل کیا کہ ان کے سامنے ایسے الفاظ کہے، تاکہ اس کے ذریعہ ان کے دل پر چوٹ لگے اور اس چوٹ لگنے کے نتیجے میں ان کے درجات بلند ہو جائیں اور آخرت میں یہ میرے پاس آجائیں۔

---

(۱) روایات میں آتا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مرض الوفاۃ میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا "اے خدیجہ! آپ کی تکلیف دیکھ کر مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے تکلیف میں بہت سی بھلائی رکھی ہے، کیا آپ جانتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں میرا نکاح آپ کے ساتھ بھی کر دیا ہے اور آپ کے ساتھ ساتھ مریم بنت عمران، موسیٰ علیہ السلام کی بہن کلثوم اور فرعون کی بیوی آسیہ سے بھی کر دیا ہے؟" حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے واقعی ایسا کر دیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں، اللہ نے ایسا کر دیا ہے" حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا "پھر تو میں اللہ کی اس تقدیر پر راضی ہوں" المعجم الکبیر، رقم: ۱۸۵۳۱ (۳۱۱/۱۶)، مجمع الزوائد (۱۹۳/۴)، تاریخ دمشق (۱۱۹/۷۰) اس واقعہ سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت خدیجہ کی وفات کی طرف اشارہ کرنا معلوم ہوتا ہے۔

تکالیف پر رضامندی، درجات کی بلندی کا ذریعہ

بہرحال! یہ تکلیف اور یہ بیماری جو تمہیں دنیا میں پہنچ رہی ہے، تمہیں کیا معلوم کہ یہ تمہارے حق میں فائدہ مند ہے یا نقصان دہ ہے، لیکن حقیقت میں ان کے آخرت میں فائدہ مند ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں، بشرطیکہ تم اس پر راضی رہو۔ لہٰذا اپنی طرف سے یہ کہنا کہ اب تو زندگی بیکار ہے، یہ بہت غلط بات ہے اور بے ادبی کا جملہ ہے۔ اسی وجہ سے موت کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ارے کیا معلوم کہ اگر وہ موت جس کو تم مانگ رہے ہو، وہ ابھی آگئی، اور مرنے کے بعد سیدھے مقامِ غضب میں پہنچ گئے، تو بتایئے موت آنے کا کیا نتیجہ ہوا؟

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

موت اس وقت قابلِ محبت ہے جب اس کے ذریعے سے اللہ جل شانہ کا مقامِ رضا حاصل ہو، اس وقت بیشک موت محبوب چیز ہے، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ مرنے کے بعد کہاں پہنچو گے، اس لئے موت کی تمنا مت کرو۔

موت کی دعا کے بجائے یہ دعا کریں

جناب رسول اللہ ﷺ نے جو دعا تلقین فرمائی، وہ تو یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبَ وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ أَحْيِنِيْ مَا عَلِمْتَ الْحَيَاةَ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ إِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاةَ خَيْرًا لِّيْ))(۱)

"اے اللہ! آپ کے علمِ غیب کا واسطہ دے کر اور مخلوق پر آپ کی قدرت کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ یا اللہ! جب تک آپ کے علم میں میرے لئے زندگی بہتر ہو، مجھے زندہ رکھئے، اور جب میرے حق میں موت بہتر ہو، اس وقت مجھے موت دیدیجئے"

یہ دعا کرنی چاہئے، نہ یہ کہ یہ کہا جائے کہ بس اب تو مجھے موت ہی آجائے تو اچھا ہے، اب تو زندگی سے دل بیزار ہو گیا ہے، اب تو بس اللہ تعالیٰ اپنے پاس بلالے۔ یہ سب بے ادبی کی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی رائے چلانا ہے۔

---

(۱) سنن النسائي، كتاب السهو، باب، رقم: ۱۲۸۸، مسند أحمد، رقم: ۱۷۶۰۵، صحيح ابن حبان، رقم: ۱۹۷۱ (۵/۳۰۴)، كنزالعمال، رقم: ۳۶۱۱ (۲/۱۷٤)، پوری دعا یوں ہے: اللهم بعلمك الغيب وقدرتك على الخلق أحيني ما علمت الحياة (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

تین سبق

بہر حال، اس ملفوظ سے تین سبق ملے، پہلا سبق یہ ملا کہ صحت کی دعا کرنا سنت ہے، دوسرا سبق یہ ملا کہ ایسے انداز سے دعا نہ کرے جس میں شکوہ و شکایت کا انداز ہو، تیسرا سبق یہ ملا کہ تکلیف کی شدت کی وجہ سے یا بیماری کے طول کی وجہ سے یہ دعا کرنا کہ مجھے موت آجائے، یہ دعا کرنا درست نہیں۔ دعا وہ کرے جو حضور اقدس نبی کریم ﷺ نے فرمائی کہ یا اللہ! جب تک زندگی بہتر ہو، اس وقت تک زندہ رکھئے، اور جب میرے حق میں موت بہتر ہو، اس وقت موت عطا فرما دیجئے۔ یا پھر حضور اقدس ﷺ کی مانگی ہوئی یہ دعا کرے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ تَعْجِيْلَ عَافِيَتِكَ وَصَبْرًا عَلٰى بَلِيَّتِكَ وَخُرُوْجًا مِنَ الدُّنْيَا اِلٰى رَحْمَتِكَ))(۱)

”اے اللہ! میں آپ سے جلدی کی عافیت اور مصیبت پر صبر اور دنیا سے آپ کی رحمت کی طرف خروج کا سوال کرتا ہوں“

لہٰذا یہ دعا کرنی چاہئے اور براہ راست موت کی دعا نہیں کرنی چاہئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) خيرا لي وتوفني إذا علمت الوفاة خيرا لي وأسألك خشيتك في الغيب والشهادة وأسألك كلمة الحق في الرضا والغضب وأسألك القصد في الفقر والغنى وأسألك نعيما لا ينفد وأسألك قرة عين لا تنقطع وأسألك الرضاء بعد القضاء وأسألك برد العيش بعد الموت وأسألك لذة النظر إلى وجهك والشوق إلى لقائك في غير ضراء مضرة ولا فتنة مضلة اللهم زيّنا بزينة الإيمان واجعلنا هداة مهتدين)) پوری دعا کا ترجمہ یہ ہے: ”اے اللہ! آپ کے علم غیب کا واسطہ دے کر اور مخلوق پر آپ کی قدرت کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ یا اللہ! جب تک آپ کے علم میں میرے لئے زندگی بہتر ہو، مجھے زندہ رکھئے، اور جب میرے حق میں موت بہتر ہو، اس وقت مجھے موت دے دیجئے۔ اے اللہ! میں آپ سے خفیہ اور ظاہری طور پر آپ کی خشیت کا سوال کرتا ہوں، میں آپ سے ناراضگی اور خوشی دونوں حالتوں میں حق بات کہنے کا سوال کرتا ہوں، میں آپ سے فقر اور غنی میں میانہ روی کا سوال کرتا ہوں، میں آپ سے ایسی نعمت مانگتا ہوں جو کبھی ختم نہ ہو، میں آنکھوں کی ایسی ٹھنڈک مانگتا ہوں جو کبھی زائل نہ ہو، میں تیرے فیصلوں پر رضامندی کا سوال کرتا ہوں، میں موت کے بعد زندگی کی ٹھنڈک مانگتا ہوں، میں تیرے چہرے کے دیدار کی لذت کے حصول کا سوال کرتا ہوں، میں بغیر کسی نقصان دینے والی مصیبت اور کسی ہولناک فتنے کا شکار ہوئے بغیر آپ کی ملاقات کے شوق کا سوال کرتا ہوں، اے اللہ ہمیں ایمان کی زینت سے مزین فرما، اور ہمیں ہدایت یافتہ اور ہدایت کے لوگوں میں شامل فرما“

(۱) كنز العمال، رقم: ۳٦۹۸ (۲/۲۸٦)، المعجم الأوسط للطبراني، رقم: ۹۸۲ (۲/٤۸۱)، المستدرك للحاكم، رقم: ۱۹۱۷ (۱/۷۰۳)، صحيح ابن حبان، رقم: ۲۰۳ (۳/۱۹۸)

اپنی طرف سے تجویز مت کرو

بہرحال، ان صاحب نے خط میں یہ لکھا تھا کہ رنج اس بات کا ہے کہ آنکھ جاتی رہی، اب تلاوت نہیں کرسکتا، مواعظ نہیں پڑھ سکتا، اس کا بڑا سخت رنج ہے۔ اس کے جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ تلاوت اور کتب بینی میں ثواب اور رضا منحصر نہیں، تم نے اپنی طرف سے تجویز کرلیا کہ مجھے تو ثواب تلاوتِ قرآنِ کریم ہی کے ذریعہ حاصل ہوگا، اور چونکہ اب آنکھیں نہ رہیں تو اب میں ثواب سے محروم ہوگیا۔ ارے یہ تو اللہ جل شانہ کے ساتھ بدگمانی ہے، یہ بدگمانی مت کرو، البتہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر راضی رہو، اسی پر اللہ تعالیٰ اجر عطا فرمائیں گے۔

حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

بڑے قاری صاحب حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ساری عمر مجسم تلاوت تھے، روئیں روئیں میں قرآن کریم بسا ہوا تھا ان کی کیفیت بالکل اس دعا کے مطابق تھی:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْآنَ الْعَظِيْمَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ بَصَرِيْ وَجِلَاءَ حُزْنِيْ وَذَهَابَ هَمِّيْ"(۱)

اے اللہ! قرآنِ عظیم کو میرے دل کی تازگی، میری آنکھوں کے لئے نور، میرے غم اور پریشانی کو دور کرنے کا سبب بنا دیجئے۔ اگر قاری صاحب کو دیکھا نہ ہوتا تو یقین نہ آتا کہ ایسا انسان بھی دنیا میں ہوسکتا ہے، قرآنِ کریم ان کی زندگی میں رچا بسا ہوا تھا، اور رگ و پے میں سرایت کیا ہوا تھا، ہر وقت سراپا تلاوت تھے، کوئی لمحہ تلاوت سے خالی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن آخر میں فالج کا حملہ ہوا، اور زبان بند ہوگئی، اب وہ شخص جس کی زبان ہر وقت تلاوت سے تر رہتی تھی، اس کی زبان بند ہوگئی، جب میں ان کو اس حالت میں دیکھتا تو کبھی کبھی بڑا دل دکھتا اور صدمہ ہوتا کہ یا اللہ! جس نے ساری عمر تلاوتِ قرآن میں گزاری، اب اس کی زبان بند ہوگئی، یہ بھی

---

(۱) مسند أحمد، رقم: ۳۵۲۸، الدر المنثور (۶۱۶/۳)، زاد المعاد (۱۸۰/۴)، سبل الهدی والرشاد فی سيرة خير العباد (۸۹/۱۲)۔ پوری دعا کچھ یوں ہے: "اللهم إني عبدك وابن عبدك وابن أمتك ناصيتي بيدك ماض فی حكمك عدل وفی قضاءك أسألك بكل اسم هولك سميت به نفسك او علّمته احدا من خلقك او أنزلته فی كتابك أو استأثرت به فی علم الغيب عندك ان تجعل القرآن ربيع قلبي ونور صدري وجلاء حزني وذهاب همي" اس دعا کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مصیبت یا پریشانی میں اس دعا کو پڑھ لے اللہ تعالیٰ اسے راحت اور عافیت عطا فرمادیتے ہیں۔

نہیں ہوسکتا کہ اب آخری وقت میں بیٹے لیٹے تلاوت کرتے رہیں۔ بہرحال، ان کو دیکھ کر بڑی حسرت ہوتی تھی، لیکن فوراً میرے دل میں دوسرا خیال آیا کہ درحقیقت اللہ جل شانہ اس کے ذریعے یہی تو دکھانا چاہتے ہیں کہ نہ تلاوت میں کچھ رکھا ہے، اور نہ ترکِ تلاوت میں کچھ رکھا ہے، ہم جس حالت میں رکھیں، بندے کے لئے اسی میں خیر ہے۔ جب ان کو تلاوت کا ذوق تھا اور زبان سے ہر وقت تلاوت جاری تھی، اس وقت اللہ تعالیٰ تلاوت کے ذریعہ ان کے درجات بلند فرمارہے تھے، اور اب جبکہ تلاوت جزوِ زندگی بن گئی تو ان کی زبان بند کردی گئی، اب ان کو اس خاموشی پر اور زبان بندی پر وہی اجر مل رہا ہے جو تلاوت پر مل رہا تھا، بلکہ شاید تلاوت سے زیادہ اب اجر مل رہا ہے، اس لئے کہ تلاوت میں تو ان کو لذت آنے لگی تھی، اور اب تو تلاوت کے لئے زبان بند کردی گئی، اب تلاوت کے لئے دل چاہ رہا ہے اور حسرت ہورہی ہے، مگر زبان نہیں کھلتی، تو اب تلاوت کا ثواب ان کو الگ مل رہا ہے اور تلاوت نہ کرنے پر حسرت کا ثواب الگ مل رہا ہے، اس طرح ہم نے ان کے درجات کی بلندی کا ڈبل سامان کردیا۔ یہ سب کام اللہ تعالیٰ کی حکمتوں سے ہورہے ہیں، کون اس میں دخل دے سکتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

چونکہ برمیخد ببندد بستہ باش
چوں کشاید چابک و برجستہ باش

یعنی جب اللہ تعالیٰ تمہیں کہیں باندھ کر ڈال دیں تو بندھے پڑے رہو، تمہاری عبادت یہی ہے، اس لئے کہ یہ ان کی طرف سے ہے۔

ہمارا حکم اور ہمارا فیصلہ ہی سب کچھ ہے

لہٰذا تمہارے دل میں یہ جو خیال پیدا ہورہا ہے کہ مجھ سے تلاوت نہیں ہورہی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا شوق پورا نہیں ہورہا ہے، اس لئے اس کا صدمہ ہورہا ہے۔ ارے اگر مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے تو پھر تلاوت بند ہونے کے وقت بھی وہی رضا حاصل ہوگی جو رضا تلاوت کے وقت حاصل تھی، اس لئے یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کس عمل سے خوش ہیں۔ حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے واقعہ میں بڑی عبرت ہے، میں ان کو دیکھ کر یہ سوچتا کہ یہ شخص جس نے ساری عمر قرآنِ کریم کی تلاوت میں گزاری، لیکن آج اللہ تعالیٰ یہ جلوہ دکھا رہے ہیں کہ دیکھو! وہ شخص جو ہمارے کلام کا ایسا عاشق تھا، میں نے اس کی زبان بند کردی کہ قرآن کا ایک لفظ نہ پڑھ سکے۔ یہ سب اس لئے کیا تاکہ دنیا کو دکھادیں کہ کسی چیز میں کچھ نہیں رکھا، سب کچھ ہمارے حکم اور ہمارے فیصلے میں ہے، ہم جو فیصلہ کریں اور جو حکم دیں حقیقت میں وہ دین ہے۔

بیماری میں سابقہ عمل کا ثواب ملتا رہتا ہے

آگے فرمایا:

''اوّل تو صحت کی حالت میں تطوع پر مداومت کرنے والے کو مرض میں بدون عمل کیے بھی ثواب عمل سابق کا ملتا رہتا ہے، دوسرے بعض اوقات صبر کا اجر عمل کے اجر سے بڑھ جاتا ہے''

یعنی ایک شخص صحت کی حالت میں ایک نفلی عبادت کا عادی ہے، مثلاً وہ روزانہ ایک پارہ تلاوتِ قرآن کرتا ہے، اب بیمار ہوگیا اور بیماری کی وجہ سے تلاوت نہیں کرسکتا، تو جتنے دن بیماری کی وجہ سے تلاوت نہیں کرے گا تو اس کو روزانہ ایک پارہ تلاوت کرنے کا ثواب ملتا رہے گا، دوسرے بعض اوقات صبر کا اجر عمل کے اجر سے بڑھ جاتا ہے، مثلاً ایک شخص عمل کرنے کا اتنا عادی ہوگیا کہ وہ عمل اس کی زندگی کا جز بن گیا کہ اس کی رگ و پے میں سما گیا، اب اللہ تعالیٰ نے کوئی مجبوری ایسی پیدا کردی کہ اب وہ اس عمل کو نہیں کرسکتا، تو اب وہ شخص عمل نہ ہوسکنے پر جو صبر کر رہا ہے، اس صبر کا اجر اصل عمل کے اجر سے بڑھ جاتا ہے، چنانچہ خود تلاوت کرنے پر اس کو اتنا اجر نہ ملتا جتنا اس کو صبر کرنے پر مل رہا ہے۔

بینائی کی دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ ''البتہ بینائی کی دعا خود رائی نہیں'' یعنی یہ دعا کرنا کہ یا اللہ! بینائی عطا فرما دیجئے، اس میں کوئی حرج نہیں، اس کی اجازت ہے۔ لہٰذا دعا مانگے اور دل سے مانگے اور ساتھ میں یہ سمجھے کہ اگر اس کے خلاف واقع ہوا وہ بھی خیر ہے، اس پر بھی راضی رہے'' یعنی دعا کرنے کے باوجود بینائی نہ ملی تو یہ سمجھے کہ میرے لئے بہتری اسی میں ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور فہم دین

اللہ تعالیٰ نے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دین کی جو فہم عطا فرمائی تھی، جس کے نتیجے میں دین کی ایک ایک بات واضح فرما دی، حقیقت یہ ہے کہ اب ان جیسی فہم کا آدمی نظر نہیں آتا، انہوں نے تجزیہ کر کے چھان پھٹک کر ایک ایک چیز الگ کردی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے چلے گئے اور صدیوں کے لئے راستہ واضح کردیا۔ اب اسی ملفوظ کے اندر دیکھئے کہ ایک چھوٹی سی بات تھی، لیکن اس میں کتنے سبق سکھا دیئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

سوتے وقت کی دعائیں اور اذکار ☆

بعد از خطبہ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دٰخِرِينَ۝﴾(۱)

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! کچھ عرصہ سے نبی کریم ﷺ کی ماثور دعاؤں کا بیان چل رہا ہے اور ان میں سے بہت سی دعاؤں کی تشریح اور وضاحت آپ حضرات کے سامنے پچھلے بیانات میں پیش کی گئیں، آج یہ اس سلسلے کی شاید آخری کڑی ہے اور یہ آخری کڑی ان دعاؤں پر مشتمل ہے جو نبی کریم ﷺ سے سونے سے پہلے پڑھنا ثابت ہے، آج ان کا تھوڑا سا بیان کرنا چاہتا ہوں، اللہ تعالیٰ اپنی رضا کے مطابق بیان کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

سونے سے پہلے ''استغفار''

یوں تو سونے سے پہلے ایک مسلمان کے لئے مختصر مختصر بہت سے کام ہیں جن کو انجام دینا بہت مناسب اور ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب آدمی رات کو بستر پر سونے کے لئے جاتا ہے تو ایک دن کی تمام کاروائیوں کا اختتام بستر پر ہوتا ہے، اس وجہ سے بزرگوں نے فرمایا کہ رات کو سونے سے پہلے مناسب یہ ہے کہ آدمی سارے دن کی کاروائیوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال لے کہ جب آج صبح میں بیدار ہوا تھا، اس وقت سے لے کر سونے تک میں نے کتنے کام کیے، ان میں سے کتنے کام اچھے تھے اور کتنے کام برے تھے، اور پھر اجمالی طور پر انسان اللہ تعالیٰ سے استغفار کرلے کہ یا اللہ! میں نے

☆ اصلاحی خطبات (۱۳/۳۴۱ تا ۳۵۲)

(۱) المومن: ۶۰، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ: ''مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، بے شک جو لوگ تکبر کی بنا پر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے''

آج کا جو دن گزارا ہے، اس میں نہ جانے مجھ سے کتنی غلطیاں ہوئی ہوں گی، نہ جانے کہاں کہاں میرے قدم صحیح راستے سے پھسلے ہوں گے، کہاں کہاں میری نگاہ بہکی ہوگی، کہاں کہاں مجھ سے گناہ سرزد ہوا ہوگا، اے اللہ! اب میں دن ختم کر رہا ہوں، اس وقت میں آپ سے سارے دن کی خطاؤں کی معافی مانگتا ہوں:

((أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ إِلَيْهِ))(۱)

اگلا دن ملے یا نہ ملے

لہٰذا رات کو سوتے وقت دن بھر کے گناہوں سے توبہ استغفار کر لے، اس لئے کہ رات کی نیند بھی ایک قسم کی چھوٹی موت ہے، آدمی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے، اور نہ جانے کتنے واقعات پیش آتے ہیں کہ آدمی رات کو سویا اور پھر بیدار نہ ہوا، لہٰذا یہ معلوم نہیں کہ اگلا دن ملتا ہے یا نہیں، اگلے دن کے آنے سے پہلے ہی اپنی پچھلی ساری زندگی کا حساب و کتاب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صاف کر لے اور توبہ استغفار کر لے۔

توبہ کا مطلب

توبہ کا مطلب یہ ہے کہ جتنے گناہ یاد آ رہے ہیں، ان پر ندامت کا اظہار کرے اور ان کو آئندہ نہ کرنے کا عزم کر لے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر لے۔ بس یہ کام کر لے تو پھر اللہ تعالیٰ سے یہ اُمید ہے کہ دن بھر کی جتنی غلطیاں اور کوتاہیاں اور گناہ ہوں گے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرما دیں گے۔

سوتے وقت کی دو دعائیں

سوتے وقت پہلی دعا جو حضور اقدس ﷺ سے ثابت ہے وہ یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ أَحْيٰى وَبِكَ أَمُوْتُ))(۲)

"اے اللہ! میں آپ ہی کے نام سے زندہ ہوں اور آپ ہی کے نام سے مروں گا"

اس کے بعد ایک دوسری دعا سونے سے پہلے حضور اقدس ﷺ سے پڑھنا ثابت ہے، وہ

---

(۱) سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب في الاستغفار، رقم: ۱۲۹۶، مسند أحمد، رقم: ۱۰۶۵۲

(۲) صحيح البخاري، كتاب الدعوات، باب ما يقول إذا نام، رقم: ۵۸۳۷، سنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب منه، رقم: ۳۳۳۹، مسند أحمد، رقم: ۲۰۴۰۴

بہترین دعا ہے وہ یہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ خَلَقْتَ نَفْسِیْ وَاَنْتَ تَوَفَّاهَا لَكَ مَمَاتُهَا وَمَحْیَاهَا اِنْ اَحْیَیْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادَكَ الصَّالِحِیْنَ وَاِنْ اَمَتَّهَا فَاغْفِرْ لَهَا وَارْحَمْهَا))(۱)

یہ لمبی دعا ہے لیکن مسنون دعاؤں کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے، یاد کر لینے سے انشاء اللہ یاد ہو جائے گی۔ اور جب تک اس دعا کے عربی الفاظ یاد نہ ہوں، اس وقت تک اُردو ہی میں یہ دعا مانگ لی جائے، انشاء اللہ اس کا بھی فائدہ ہوگا۔

نیک بندوں کی طرح زندگی کی حفاظت

اس دعا کا ترجمہ یہ ہے کہ اے اللہ! آپ ہی نے مجھے پیدا کیا اور آپ ہی مجھے موت دیں گے، یعنی زندگی بھی مجھے آپ ہی کے ذریعہ حاصل ہوئی اور زندگی کا خاتمہ بھی آپ ہی کے ذریعہ ہوگا۔ میری زندگی اور موت سب آپ کے ہاتھ میں ہے، اے اللہ! اگر آپ مجھے دوبارہ زندہ کریں، یعنی سونے کے بعد دوبارہ بیداری عطاء فرمائیں تو پھر میری اسی طرح حفاظت کریں جس طرح آپ اپنے نیک بندوں کی حفاظت کرتے ہیں، یعنی میں سونے کے لئے جارہا ہوں، یہ بھی عارضی موت ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ دوبارہ بیدار ہوں گا یا نہیں، لیکن اگر آپ نے مجھے دوبارہ زندگی عطاء فرمائی تو وہ زندگی اسی وقت فائدہ مند ہے جب آپ مجھے اس طرح اپنی حفاظت میں لے لیں جس طرح آپ اپنے نیک بندوں کو حفاظت میں لیتے ہیں۔

فاسقوں اور فاجروں کی حفاظت کیوں؟

کیونکہ حفاظت تو بعض اوقات اللہ تعالیٰ فاسقوں اور فاجروں کی بھی کرتے ہیں، کافروں اور غیر مسلموں کی بھی حفاظت کرتے ہیں، چنانچہ اس حفاظت کی وجہ سے بعض اوقات شبہ ہوتا ہے کہ جو لوگ کافر ہیں اور فاسق و فاجر ہیں، وہ دنیا میں خوب پھل پھول رہے ہیں، اگر ان کو دنیا میں کوئی خطرہ پیش آتا بھی ہے تو وہ اس خطرہ سے نکل آتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ دنیا علیم و حکیم کا کارخانہ ہے، جس کا کہنا یہ ہے کہ ۔

ما پروریم دشمن و ما میکشیم دوست
کس را چرا و چوں نہ رسد در قضاءِ ما

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب ما یقول عند النوم وأخذ المضجع، رقم: ۴۸۸۷، مسند أحمد، رقم: ۵۲۴۵، کنز العمال، رقم: ۴۱۲۹۲ (۳۳۷/۱۵)

یعنی بعض اوقات ہم دشمن کو پالتے ہیں اور اس کو پروان چڑھایا جاتا ہے اور اس کو ڈھیل دی جاتی ہے اور دوست کو مار دیا جاتا ہے۔

کافروں کو ڈھیل دی جاتی ہے

دیکھئے! بڑے بڑے کافر، فرعون، نمرود، ہامان، قارون، جنہوں نے ''انا ولا غیری'' کے نعرے لگائے، لیکن اس کے باوجود ایک عرصہ دراز تک اللہ تعالیٰ نے ان کی رسّی دراز کی اور ان کو ڈھیل دی اور ان کی حفاظت کرتے رہے، جبکہ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو آروں سے چروا دیا گیا۔ لیکن یہ سب کام انہی کی حکمت سے ہو رہے ہیں، دشمنوں کو ایک وقت تک ڈھیل دی جاتی ہے، جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ پکڑ لیتے ہیں، فرعون نے ایک وقت تک خدائی کے دعوے کیے، لوگوں پر ظلم وستم کے شکنجے کسے، لیکن بالآخر اس کا یہ انجام ہوا کہ سمندر میں غرق ہوا۔

اچانک ان کی گرفت ہوگی

لہٰذا حفاظت تو ان کافروں کی بھی ہو رہی ہے اور دشمنوں کی بھی ہو رہی ہے، چنانچہ آج کے حالات کو دیکھ لیں کہ کس طرح عالمِ اسلام ابتری کا شکار ہے اور دشمنانِ اسلام نے بظاہر قوت حاصل کی ہوئی ہے اور برتری حاصل کیے ہوئے ہیں اور ان کی حفاظت کی جارہی ہے۔ لیکن یہ حفاظت ایک وقت تک ہوگی، جب اللہ تعالیٰ ان کو پکڑنے کا ارادہ فرمائیں گے تو اچانک سخت گرفت میں پکڑ لیں گے۔

﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾ (۱)

''تیرے پروردگار کی گرفت بڑی سخت ہے''

سامری کی پرورش حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ

آپ نے سنا ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک ''سامری'' جادوگر تھا جو کافر تھا اور جس نے ایک بچھڑا بنا کر لوگوں کو کہا کہ اس کی پوجا کرو۔ اس ''سامری'' کی پرورش کا بھی عجیب وغریب واقعہ ہے، وہ یہ کہ چونکہ یہ بھی بنی اسرائیل میں سے تھا، اور فرعون نے بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے بچوں کے قتل کا حکم دے دیا تھا، اس لئے جب یہ پیدا ہوا تو اس کی ماں نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرح اس کو تابوت میں رکھ کر دریا میں یہ سوچ کر ڈال دیا تھا کہ اگر اس کی زندگی ہوگی تو بچ جائے گا، ورنہ کم از کم میری آنکھوں کے سامنے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

(۱) البروج: ۱۲

اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ دریا میں ایک تابوت کے اندر ایک بچہ ہے، اس کو نکالو اور پہاڑ کی چوٹی پر جو غار ہے، اس کے اندر رکھ دو، چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس کو اُٹھا کر غار کے اندر رکھ دیا، اور پھر اس کی اس طرح پرورش کی روزانہ دودھ اور شہد لاکر اس کو چٹایا کرتے تھے، اس "سامری" کا نام بھی موسیٰ تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے ذریعہ

جس موسیٰ کی پرورش حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کی وہ تو اتنا بڑا بت پرست نکلا کہ بنی اسرائیل کے اندر بت پرستی کا بانی بن گیا، جبکہ دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش اللہ تعالیٰ نے فرعون کے ذریعہ کرائی، فرعون کے گھر میں جس موسیٰ کی پرورش ہوئی وہ پیغمبر بنے اور جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ جس موسیٰ کی پرورش ہوئی وہ کافر ہوا اور بت پرست ہوا۔ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کا کارخانہ ہے، کسی انسان کی عقل اور فہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اسی بات کو ایک عربی شاعر نے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے کہ۔

وَ مُوْسَى الَّذِي رَبَّاهُ جِبْرِيْلُ كَافِرٌ
وَمُوْسَى الَّذِي رَبَّاهُ فِرْعَوْنُ مُرْسَلٌ

یعنی وہ موسیٰ جس کی پرورش جبرائیل علیہ السلام نے کی، وہ کافر نکلا اور وہ موسیٰ جس کی پرورش فرعون نے کی، وہ رسول بنا، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کا کارخانہ ہے۔

سوتے وقت حفاظت کی دعا کرنا

بہر حال! اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق حفاظت تو کافروں اور فاسقوں اور فاجروں کی بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا سوتے وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

"اے اللہ! جب میں بیدار ہوں تو میری حفاظت فرمایئے، لیکن جیسے آپ اپنے نیک بندوں کی حفاظت کرتے ہیں اس طرح حفاظت فرمایئے"

یعنی جب میں صبح کو بیدار ہوں اور زندگی کے کارزار میں داخل ہوں تو پھر میری حفاظت فرمایئے کہ میرے قدم گناہ کی طرف نہ بڑھیں اور معصیت کی طرف نہ بڑھیں بلکہ آپ کی اطاعت کی طرف بڑھیں۔

اگر موت آجائے تو مغفرت

آگے یہ جملہ ارشاد فرمایا:

((وَإِنْ أَمَتَّهَا فَاغْفِرْ لَهَا وَارْحَمْهَا))

"اے اللہ! اگر میرے مقدر میں یہ ہے کہ اس نیند کے بعد میں بیدار نہ ہوں بلکہ مجھے موت دینی مقصود ہے تو اے اللہ! میری مغفرت فرمایئے اور مجھ پر رحم فرمایئے"

لہٰذا رات کو سوتے وقت زندگی اور موت دونوں کے بارے میں یہ دعا حضور اقدس ﷺ نے تلقین فرمادی۔ بتایئے! اگر انسان کی یہ دعا قبول ہو جائے یعنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت مل جائے، اور مرنے کے بعد مغفرت اور رحمت مل جائے ـــ اور اس کو کیا چاہئے۔

سوتے وقت کے دوسرے اذکار

روایات میں آتا ہے کہ اگر انسان رات کو سوتے وقت سورۃ بقرہ کے آخری رکوع اور سورۃ آل عمران کے آخری رکوع کی تلاوت کرلے تو یہ بھی بڑی فضیلت کی چیز ہے۔[1] اس کے علاوہ رات کو سوتے وقت سورۃ ملک کی تلاوت کرنا ایسا عمل ہے جو انسان کو عذاب قبر سے محفوظ رکھتا ہے۔[2] اس کے علاوہ توبہ اور استغفار کرلے۔

اور آخری دعا جس کے بارے میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اس دعا کے بعد کوئی اور کلمہ زبان سے نہ نکالے بلکہ دعا کے بعد فوراً سو جائے، یہ وہ دعا ہے جو حضور اقدس ﷺ نے ایک صحابی کو تلقین فرمائی کہ جب تم رات کو سوتے وقت بستر پر داہنی کروٹ پر لیٹو تو اس وقت یہ دعا پڑھو:

---

(۱) قال النبی صلی الله علیه وسلم: "من قرأ بالآیتین من آخرسورةالبقرة فی لیلة کفتاه" صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل سورة البقرة،رقم:٤٦٢٤، سنن الترمذی، کتاب فضائل القرآن عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ماجاء فی آخر سورة البقرة، رقم: ٢٨٠٦،عن عثمان بن عفان قال: "من قرأ آخر آل عمران فی لیلة کتب له قیام لیلة"سنن الدارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فی فضل آل عمران،رقم:٣٢٦٢

(۲) قال عبد الله بن مسعود رضی الله عنه : "من قرأ تبارك الذی بیده الملك کل لیلة منعه الله بها من عذاب القبر وکنا فی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم نسمیها المانعة" الترغیب والترهیب، رقم:٢٤٥٣(٢/٢٩٤)، عمل الیوم واللیلة، باب الفضل فی قراءة تبارك الذی بیده الملك ،رقم:٧١١ (١/٤٣٣)، السنن الکبری للنسائی،رقم:١٠٥٤٧ (٦/١٧٩)

((اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْلَمْتُ نَفْسِیْ إِلَیْكَ وَوَجَّهْتُ وَجْهِیْ إِلَیْكَ وَفَوَّضْتُ أَمْرِیْ إِلَیْكَ وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِیْ إِلَیْكَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَأَ مِنْكَ إِلَّا إِلَیْكَ اَللّٰهُمَّ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِیْ أَنْزَلْتَ وَبِنَبِیِّكَ الَّذِیْ أَرْسَلْتَ))(۱)

اے اللہ! میں نے اپنی جان آپ کے حوالے کردی اور میں نے اپنا چہرہ آپ کی طرف کر دیا اور میں نے اپنے سارے معاملات آپ کے سپرد کر دیئے۔

تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد

دیکھئے! انسان کے ساتھ ہزاروں حاجتیں اور ہزاروں ضرورتیں لگی ہوئی ہیں، چنانچہ سوتے وقت بھی اس کے دماغ میں یہ خیالات آتے ہیں کہ کل کو کیا ہوگا؟ کس طرح کماؤں گا؟ پیسے کہاں سے آئیں گے؟ بچوں کا کیا ہوگا؟ اس طرح کے بہت سے خیالات انسان کے دل پر مسلط ہوتے ہیں، لیکن اب رات کا وقت ہے، سونے کے لئے بستر پر لیٹا ہوا ہے، کچھ نہیں کرسکتا، اس لئے اس وقت یہ دعا کرلو کہ اے اللہ! میں نے اپنے سارے معاملات آپ کے سپرد کر دیئے، جو واقعات مجھے کل پیش آنے ہیں، وہ سب آپ کے سپرد ہیں، اے اللہ! ان میں آپ میرے لئے بہتری پیدا فرما دیجئے۔

بیداری کے آخری الفاظ

آگے فرمایا:

''اے اللہ! میں نے اپنی پشت آپ کے آگے رام کردی، اے اللہ! میں اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو آپ نے نازل کی ہے۔ یعنی قرآن کریم، اور جو نبی ﷺ آپ نے دنیا میں بھیجے، میں ان پر ایمان لاتا ہوں''

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ الفاظ تمہاری بیداری کے آخری الفاظ ہونے چاہئیں، اس کے بعد سو جاؤ اور زبان سے کوئی کلمہ نہ نکالو۔ تو اس کے نتیجے میں ان شاء اللہ یہ ساری نیند بھی نور اور عبادت بن جائے گی اور اگر اس حالت میں موت آگئی تو ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ سیدھے جنت میں لے جائیں گے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب إذا بات طاهرا وفضله، رقم: ۵۸۳۶، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب ما یقول عند النوم وأخذ المضجع، رقم: ۴۸۸۵، سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما جاء فی الدعاء إذا أوی الی فراشه، رقم: ۳۳۱۶، مسند أحمد، رقم: ۱۷۷۸۲، سنن الدارمی، کتاب الإستئذان، باب الدعاء عند النوم، رقم: ۲۵۶۷

اگر نیند نہ آئے تو یہ پڑھے

اگر آدمی سونے کے لئے بستر پر لیٹ گیا اور اس کو نیند نہیں آرہی ہے تو اس موقع پر حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ غَارَتِ النُّجُوْمُ وَهَدَاْتِ الْعُيُوْنُ وَاَنْتَ حَيٌّ قَيُّوْمٌ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ اَهْدِئْ لَيْلِيْ وَاَنِمْ عَيْنِيْ))(۱)

''یا اللہ! ستارے چھپ گئے اور آنکھیں پُرسکون ہوگئیں، آپ حی وقیوم ہیں۔ آپ کو نہ اُونگھ آتی ہے نہ نیند، اے حی وقیوم میری رات کو پُرسکون بنا دیجئے اور میری آنکھ کو نیند عطاء فرما دیجئے''

یہ کلمات پڑھ لوگے تو ان کلمات کی برکت سے اللہ تعالیٰ شیاطین کے شر سے محفوظ فرمائیں گے۔

بہرحال! یہ چند اعمال اور چند دعائیں سوتے وقت کی حضور اقدس ﷺ سے منقول ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اختتامی کلمات

ادعیہ ماثورہ کا بیان جو کافی عرصہ سے چل رہا ہے، اب میں اس کو ختم کرتا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی دی تو اب دوسرے موضوعات پر بیان کروں گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے صبح سے لے کر شام تک کی زندگی میں قدم قدم پر ہمارا رشتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ سے رابطہ مستحکم کرنے کے لئے یہ مسنون دعائیں تلقین فرمائیں، ان میں سے ہر ہر دعا ایسی ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے تو دنیا وآخرت میں انسان کا بیڑہ پار ہو جائے۔ اس لئے ہر مسلمان کو ان دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہئے اور ان کو یاد کرنے کی فکر کرنی چاہئے اور صحیح وقت پر ان دعاؤں کو دھیان کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان دعاؤں کے پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) المعجم الكبير، رقم: ٤٦٨٣ (٣٣/٥)، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (٣٩٧/٤)، عمل اليوم والليلة لابن السني (٤٢٥/٣)